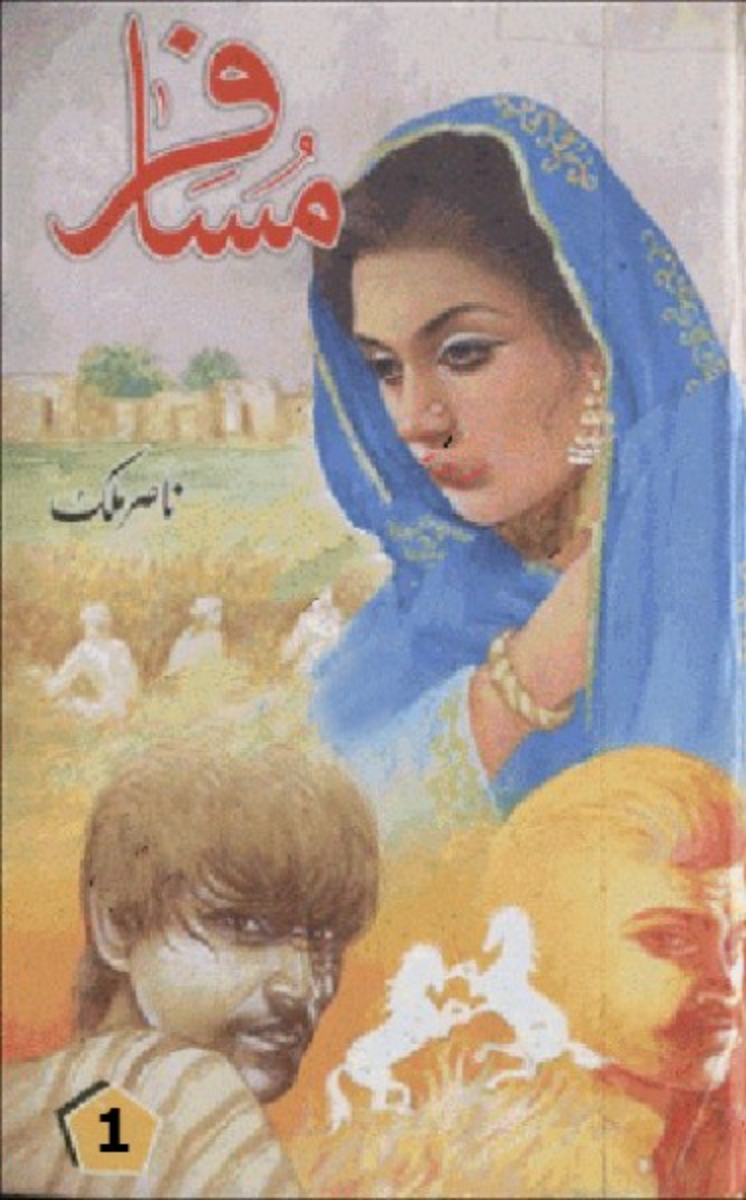
مسافر



ناصر ملک

1

.....اور داستاں تمام ہوئی

(دیباچہ)

زندگی ایک بار ملتی ہے اور ان دیکھے سفر کی نذر ہو جاتی ہے۔ انسان مسافر، زندگی مسافت اور اعمال زادِ سفر۔۔۔۔ خوشی ملی تو نخلستان، دکھ ملا تو کڑی دھوپ اور اگر کچھ ہاتھ نہ آیا تو ملال۔ قافلے، پڑاؤ، ہم سفر، تھکن، طوفان، سرد و گرم، دھوپ، برکھا۔۔۔۔۔ یہ اس سفر کے لوازمات ہیں جو کم و بیش ہر مسافر کے حصے میں آتے ہیں۔ یہ سفر تب تک جاری رہتا ہے جب تک قدم آگے بڑھنے سے انکاری نہیں ہو جاتے، جب تک آنکھوں میں نئی منزلوں کی جستجو خواب بن کر جگمگاتی رہتی ہے اور دل میں کسی نئے جہاں کی تسخیر کی خواہش بیدار رہتی ہے۔ ہاں! جب خاموش فضاؤں میں چھپے ہوئے طوفان تھم جائیں، دریا کے بہاؤ میں چھپی کہانیاں تمام ہو جائیں، کہانیوں اور کہانیوں میں چھپے ہوئے کردار رخ پھیرنے لگیں اور بے عنوان کارِ جستجو میں دم نہ رہے تو آخری پڑاؤ رونما ہو جاتا ہے۔

یہ داستانِ دل پذیر ہمارے عمومی نوع کے معاشرتی ماحول میں جنم لیتی ہے اور اپنے مسافر کردار کو ساتھ لے کر ان دیکھے سفر پر گامزن ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس داستان کے لمحہءِ اول سے تا بہ آخر میں اس کے کرداروں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور سوتا جاگتا رہا، اس کے لحظہ لحظہ کو قلم بند کرتا رہا، اس لیے اس داستان کے آخری پڑاؤ کا اتنا یا کچھ زیادہ دکھ مجھے ہوا، جتنا اس داستان کے سننے والوں کو ہوا ہو گا۔ معاشرہ ہمیشہ بیشتر روایتی کرداروں اور چند ایک روایت شکن کرداروں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ مختلف کرداروں پر مبنی کہانیوں کو دوام ملتا ہے جبکہ روایتی اور عمومی نوع کے کرداروں کی زندگی ہونے اور نہ ہونے کے تصادم میں ہی چکراتی رہتی ہے۔ ہمارے اردگرد لاکھوں ایسے مسافر اپنی منزلیں پاتے نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں عمومی نوع کے راستے، مسائل، وسائل، مصائب اور منزلیں ہوتی ہیں۔ پیدا ہوئے، پڑھا، نوکری، کاروبار یا مزدوری کی، ایک آدھ ناکام یا کامیاب عشق ہوا، شادی ہوئی، بچے پیدا ہوئے، انہیں پالا پوسا اور گلوں شکووں سے بھرا بڑھاپا گزارا اور زمیں برد ہو گئے۔ ان کے ہاں کامیابی کا معیار دولت کا اجتماع ہوتا ہے۔ جس نے زیادہ ترکہ چھوڑا، وہ زیادہ کامیاب رہا اور جو تمام عمر پیسے کے پیچھے تشنہ کام دوڑتا رہا، وہ ناکام اور بدقسمت قرار پایا۔ ایسی لاکھوں زندگیاں سفر قرار پاتی ہیں مگر کسی داستاں کا حصہ نہیں بنتیں۔ اب ایک ہی سفر کا سفر نامہ کب تک لکھا جا سکتا ہے؟

مرحوم کا ہونا تھا نہ ہونے جیسا
اس قبر کے کتبے کو اتارا جائے

یا اس کیفیت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

مرا ہونا نہ ہونا اک برابر ہے زمانے میں
مجھے دفنایا جا سکتا ہے گرچہ سانس باقی ہے

زیرِ مطالعہ داستان ایک مختلف اور منفرد سفر کا سفر نامہ ہے جس کے کردار ان خواہشات اور مقاصد سے ماورا تھے جنہوں نے زمانے کی اربوں زندگیوں کو محض مشین بنا کر معمول کے گھر اس میں جوت دیا۔ "مسافر" کا مرکزی کردار شہریار خان عرف شہرا ہے جس نے غربت کی کوکھ سے جنم لیا اور اس کے بچپن نے والدین کے بیہمانہ قتل کو اپنی آنکھوں میں ثبت کر لیا۔ اس کی زندگی معاشرے کے روایتی طاقتور کرداروں سے نبرد آزما ہوئی تو اسے اپنے جیسے ایک اور مرکزی کردار کی ہمرہی نصیب ہو گئی۔ چندو ماہی کے لہو سے گندھی ہوئی اس داستان میں کئی کردار ایسے ہیں جن کا کہانی میں ورود لاکھوں قارئین کے دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ، بخت خان، رضوان اور خالد عرف کھالا۔ چندو ماہی کے شعلہ جوالا حسن کی ساحرانہ بسلط پر غزالہ کا سادہ رُو کردار اپنی آب و تاب بکھیرتا رہا اور پھر اپنی مشعل اپنے جیسے ہی ایک کردار "شانو" کے سپرد کر گیا۔

"مسافر" وہ داستان ثابت ہوئی جس کے کرداروں نے مجھے ہنسایا، رُلایا، بے چین کیا، رت جگے بخشے اور انگلی پکڑ کر کبھی چاہتے ہوئے اور کبھی نہ چاہتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ کئی ایسے مقام بھی آئے کہ اس کہانی کے قارئین کے ساتھ ساتھ میں بھی افسردہ ہوا۔ پھر۔۔۔۔۔۔ اچانک ایسا ہوا کہ یہ داستان تھم گئی۔ ایسے، کہ مجھے علم ہی نہ ہوا۔ جب ایک طویل سانس لے کر میں نے قلم روکا تو مجھے یکبارگی احساس ہوا کہ آخری پڑاؤ نے تمام مسافروں کے قدم تھام لیے ہیں اور کہانی اپنا فطری انجام پا چکی ہے۔ تب میں نے اپنے کرداروں کو دو آنسوؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

کیا یہ کردار آپ سے بھی بچھڑ چکے ہیں؟

ناصر ملک
چوک اعظم (لیہ)
nasirmalik.01@gmail.com

سفر کا آغاز آنکھ کھلنے پر ہوتا ہے اور تب تک جاری رہتا ہے جب تک آنکھ کھلی رہتی ہے۔
مسافرت کسی نہ کسی رنگ میں اپنے فطری تسلسل کے ساتھ زندگی کو گھن کی طرح چاٹتی جاتی
ہے۔ بدن شکست خوردہ ہوتا جاتا ہے اور پھر ایک دن سپر ڈال کر کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ تب مضمحل
روح کو دھڑ میں اَٹ کر بے وفائی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ہر شخص مسافر، ہر زندگی مسافرت
اور نام تراعمال زادِ سفر ہیں۔ میں بھی خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا
مسافر جذبات سوختہ ہوں جس نے ایک دور اُفتادہ بستی 'نور پور' میں آنکھ کھولی۔

میرا نام شہریار ہے۔ میری داستان معاشرے کی انصافیوں سے آلودفضا میں سانسیں لیتے
ہوئے ان گنت لوگوں سے ہٹ کر نہیں بلکہ ملتی جلتی ہے۔ فرق شاید یہی ہے کہ ان کی کہانیاں
صفحۂ قرطاس پر نہیں آ سکیں جبکہ میں نے اپنے واقعات کو لفظوں کا پیراہن دے کر ہر نظرِ احساس
پر آشکار کر دیا ہے۔

خلوص، ہمدردی اور پسپائی..... یہ سب بہت پہلے کی باتیں ہیں، جب میں ایک بے ضرر
انسان تھا اور میری خواہشیں اس نہج تک نہیں پہنچی تھیں کہ میں اپنے اور بیگانے کی پہچان بھول
جاتا۔ انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں، یہ تو
پل دو پل کی متحرک بساط ہے۔ میں بھی ایسے ہی کسی لمحے کی لپیٹ میں آیا تھا اور بے دھیانی میں
اس قدر دور نکل گیا کہ میرا اپنا سایہ مجھ سے گریزاں دکھائی دینے لگا تھا۔

سوچتا ہوں کہ اچھا ہوتا اگر میری زندگی بھی ان ہزاروں اشخاص کے جیسی ہوتی جو اس
کائنات میں آتے ہیں اور بغیر کچھ کیے واپس چلے جاتے ہیں۔ معدودے چند لوگ انہیں

PakistaniPoint.com
Waqar Azeem

جانتے ہیں اور مابعد اُن کا تذکرہ اچھے یا بُرے لفظوں میں کرتے ہیں، پھر بھول جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان پر شاکی یا مطمئن لوگوں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

میرے ماں باپ کھیتوں سے رزق اُگاتے، مزدوری کرتے ایک رات مجھے اور پروین کو دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مدتوں قبل رخصت ہو گئے تھے۔ میرا باپ امام دین بڑا وجیہہ اور وضع دار انسان تھا۔ قد آور، خوب رو اور خوش لباس تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بڑے دھیمے لہجے میں مسکرا کر بات کرنے کا عادی تھا۔ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ یاد آتی ہے مگر یہ یاد نہیں آتا کہ مجھے کبھی باپ نے کسی بات پر ڈانٹا ہو یا مارا پیٹا ہو۔ پروین میری سگی بہن تھی جو مجھ سے تین سال چھوٹی تھی۔ جب ایک اندوہ ناک شب خون میں ماں اور باپ کا انتقال ہوا، تب وہ محض پانچ سال کی تھی۔ اگر میرے والدین کی موت طبعی ہوتی تو شاید مجھے اُن کا محبت بھرا اور انیہ یاد تک نہ رہتا۔ اَب یہ حتمی جدائی ایک کسک، ایک نہ بھول پانے والی چبھن بن کر ہمیشہ ذہن میں ابھرتی رہتی تھی۔

زمین و جائیداد تو تھی نہیں جس پر ہم عیش سے زندگی گزارتے، اس لئے ہم دونوں طفیلے بن کر چچا چراغ دین کے گھر آ گئے۔ وہ ہمارا سگا چچا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جو ابھی چند سال کا ہی تھا۔ آبائی زمین بہ مشکل ان کا پیٹ پالتی تھی۔ جب ہم بھی مستقل بوجھ کی صورت ان کے سروں پر آن وارد ہوئے تو معاشی مشکلات دو چند ہو گئیں۔ قریبی قصبے کے ہائر سیکنڈری سکول سے ایف ایس سی کرنے کے بعد میں نے بہ امرِ مجبوری تعلیم کو خیر باد کہنا چاہا مگر چچا چراغ نے کہا، ''نہیں پتر نہیں..... تیرا باپ، میرا بڑا بھائی تجھے پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ میں اُس کی بے چارگی کی موت کا اَپاہ تو نہیں کر سکا مگر اُس کی خواہش کو پروان ضرور چڑھا سکتا ہوں۔ تم اللہ کا نام لو اور آگے پڑھنے کیلئے شہر چلے جاؤ۔''

شہر سے اُس کی مراد ملتان شہر تھی۔ ملتان یہاں سے گھنٹہ بھر کی مسافت پر واقع تھا۔ میں نے اُس کی پُر اصرار خواہش پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ملتان کا قصد کیا۔ پہلی مرتبہ شہر دیکھا تھا۔ پریشان ہو گیا مگر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے اور ہوسٹل میں چند دن رہنے کے بعد میں نے اپنی راہیں متعین کر لی تھیں۔ اولین روز جس احساسِ کمتری سے واسطہ پڑا تھا، جلد ہی میں نے اُس سے جان چھڑا لی تھی۔ اِس کالج میں امرا اور اعلیٰ افسروں کے لڑکے زیرِ تعلیم تھے جن کی فضول خرچیاں مجھ سمیت تمام دیہاتی لڑکوں کو کمتری کے احساس میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ ابتدائی

دو تین مہینوں میں ہی میں اِس ماحول میں رَچ بس گیا اور مفاہمت کرنے کے لائق ہو گیا تھا۔

کالج کی فضا پر ایک سیاسی جماعت کی مکمل اجارہ داری قائم تھی۔ اِس جماعت کا طلبہ ونگ جو چاہتا، وہی کرتا تھا۔ کالج کی انتظامیہ اس طلبہ تنظیم کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی تھی۔ اِنہی دنوں ایک اور بڑی سیاسی جماعت نے بھی یہاں ڈیرہ ڈال دیا۔ پہلے سے موجود تنظیم کے ہاتھوں ستائے ہوئے لڑکوں نے اُسے جوائن کر لیا۔ یوں کالج میں دو متحارب دھڑے بن گئے۔ مجھے بھی ایک تنظیم کی رکنیت اختیار کرنا پڑی۔ چند مہینوں میں ہی مجھے تنظیم کا ایک کلیدی عہدہ میسر آ گیا اور مجھ پر غیر نصابی سرگرمیوں کا بوجھ لد گیا۔

گاؤں کی فضا سے نکلنے والے سادہ لوح شہریار کو یہاں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ دلیرانہ فیصلوں، جذباتی مزاج اور چہرے کے بھول پن نے مجھ سے وہ کام بھی کروائے جن کے بارے میں کالج میں آنے سے قبل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کالج بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا ہی ایک اور کالج پڑوس میں موجود تھا۔ اِسی سڑک کے آخر پر یونیورسٹی کی طویل و عریض عمارت بھی سر اُٹھائے موجود تھی۔ کہنے کو یہ علاقہ تعلیمی زون کہلاتا تھا مگر عملی طور پر تمام متصلہ رہائشی کالونیوں اور سڑکوں پر طلبہ کا راج قائم تھا۔ یعنی یہ کہنا بجا تھا کہ ہوسٹ تنظیم کے واسطے سے میری دہشت چار سُو طاری تھی۔ میں نائب صدر تھا۔ عرفان مرزا گزشتہ کئی سالوں سے صدر چلا آ رہا تھا۔ اُس کا رابطہ تنظیم کے بڑوں سے رہتا تھا۔ حکم تنظیم کے ہیڈ آفس سے جُاری ہو کر صدر تک پہنچتا تھا، پھر مجھ تک اور پھر تنظیم کے ہر رُکن تک پہنچتا تھا۔ ہم اسلحے کے جلو میں ہوسٹل سے آندھی اور طوفان کی طرح نکلتے اور اپنا مشن مکمل کر کے عام طالب علموں میں شامل ہو جاتے۔

جب میں بوسن روڈ پر واقع اِس عظیم الشان سرکاری تعلیم گاہ سے نکلا تو نہ صرف میرے ہاتھوں میں گریجویشن کی ڈگری دَبی ہوئی تھی بلکہ میں کئی اقسام کا اسلحہ استعمال کرنے میں بھی طاق ہو چکا تھا۔ میری تنظیم کے بڑوں نے بہت کوشش کی کہ میں کالج میں رہوں، ایم ایس سی پارٹ ون میں داخلہ لے لوں تا کہ ان کے تنظیمی معاملات پہلے کی طرح چلتے رہیں مگر میں اِس دلدلی زندگی سے اکتا گیا تھا۔ دو سالوں میں ہی میری طبیعت بھر گئی تھی۔ تنظیم کے بڑے، عرفان مرزا کے توسط سے مجھ تک اپنی پیشکش متعدد بار پہنچا چکے تھے کہ وہ میرے تعلیمی اخراجات برداشت کریں گے۔ چونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ میں جس راستے پر چل نکلا ہوں، اِس کی منزل اندھی کھائی، بے زمین آسمان یا آگ بھری جہنم تھی اس لیے میں یہاں سے جلد از جلد

بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ برس میں تنظیم نے مجھ سے کئی ایسے کام بھی لیے تھے جن کا تعلق کسی بھی لحاظ سے کالج کے معاملات سے نہیں تھا۔

غیر نصابی سرگرمیوں میں غیر معمولی شرکت کے باوجود میں نے فرسٹ ڈویژن میں بی ایس سی کیا تھا۔ جب میں مٹھائی کا ڈبہ تھامے نور پور میں داخل ہوا تھا تو نہ جانے کتنے گھروں کے دروازے کھلے تھے، کتنی مبارکبادیں میسر آئی تھیں اور نہیں معلوم کہ کتنے چہروں سے ستائش اور داد و آفرین کے ڈونگرے برسے تھے۔ پروین، غزالہ اور فرزانہ میٹرک کر چکی تھیں اور اَب فراغت کے ایام گزار رہی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے انداز میں مجھے ملنے والی اِس خوشی کو جشن کی صورت میں منایا تھا۔

غربت حوصلہ دیتی ہے۔ اس کے دامن میں دِلاسوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ چاچا اگر امیر ہوتا اور عہدِ حاضر کی نام نہاد تہذیب میں رنگا ہوتا تو ہم دونوں بہن بھائیوں کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا۔ شکر تھا کہ وہ غریب محنت کش تھا۔ چونکہ غربت کے ماروں کو اپنی عزت دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے اور خون کے رشتوں کی کشش مستزاد، اسی لیے اس نے ہمیں اپنی اولاد کی طرح سینے سے لگا لیا۔ چاچی بھی بھلے مانس دیہاتی عورت تھی جس نے مسکینوں کی بددعا سے ڈرتے ہوئے اپنی سلطنت میں قبول کر لیا۔ وہ اکثر اپنی ملنے جلنے والیوں سے کہا کرتی تھی ''یتیموں اور مسکینوں کی دعا تو سیدھی عرش پر جاتی ہے۔ مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ میں کہیں ان دونوں کی بددعا نہ لے بیٹھوں۔''

اِسی گاؤں میں، ہماری ہمسائیگی میں، میری پھوپھی رہتی تھی۔ پھوپھی کبریٰ مجھ سے اور پروین سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس پیار کے عقب میں یتیم اور مسکین ہونے کی وجہ سے ہمدردی کارفرما تھی یا خونی رشتوں کی ان دیکھی کشش، یہ تفریق کرنا بہت مشکل تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی چاچی کی طرح مسکینوں کی بددعا سے ڈرتی ہو اور عرش والے کو ناراض نہ کرنا چاہتی ہو۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ میری ماں، رضیہ بی بی عرف رجو نے اپنی زندگی میں ہی اپنی نند زادی غزالہ کے ساتھ میری منگنی طے کر دی تھی۔ تب شاید مجھے اِس لفظ کے معانی کا بھی علم نہیں تھا۔ اب جبکہ میں اِس میں پنہاں مفہوم و لذت سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا، غزالہ نویں کلاس میں پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں پر منگنی کی روایتی پابندیاں عائد ہو چکی تھیں لیکن قریبی رشتہ دار اور ہمسایہ

ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے بہ آسانی بات چیت کرلیا کرتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ شادی سے قبل آزادانہ ملاقاتوں کا سلسلہ مناسب نہیں مگر دل میں اک چور چھپا رہتا تھا جو ہر دم چوری پر اُکساتا رہتا تھا۔ ہم جب بھی دل کی کوئی بات کرنے لگتے، ہمارا احساس ہمیں چوکنا کر دیتا۔ کچھ آزادی اور کچھ رکاوٹیں عشق کو ہوا دیتی ہیں۔ ہم دونوں بھی اس ہوا کے دوش پر لہراتے ڈگمگاتے رفتہ رفتہ محبت کی عمیق دلدل میں گرتے چلے گئے۔

پرانے زمانے میں جنوں پریوں کی جان کسی دور پار کے جزیرے میں سونے کے پنجرے میں بند طوطے یا مینا میں قید ہوتی تھی اور اگر اس طوطے یا مینا کی گردن مروڑ دی جاتی تھی تو وہ جن یا پری فوراً ہی ہلاک ہو جاتی۔ اس طرح شاید میری جان بھی پروین کے وجود میں اٹکی ہوئی تھی۔ اسے بخار آن لیتا تو میں جاں بہ لب ہو جاتا اور یوں دکھائی دیتا کہ اس کی بجائے میں بخار کی آگ میں تپ رہا ہوں۔ ماں باپ کی فوتیدگی کے بعد میں ہی اُس کا سہارا تھا، میں ہی غم گسار تھا اِس لیے وہ میرے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار پاتی تھی۔ میں اگر دو تین دنوں کیلئے کہیں چلا جاتا تو وہ رو رو کر ہلکان ہو جاتی۔ فطرتاً کم گو نہیں تھی اور اک بے نام سی خاموش مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں رہتی۔ اسے ہنسنے کیلئے کسی خاص لطیفے کی ضرورت نہیں تھی، وہ کسی بھی لمحے بات بے بات کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھی۔

چچا اور چچی کا اس کے ساتھ رویہ بہت مشفقانہ اور محبت بھرا تھا۔ چچا کی دونوں بیٹیاں، فرزانہ اور شبانہ، پروین سے عمر میں کچھ ہی بڑی تھیں۔ بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے پروین کو اپنی تیسری بہن اور مجھے اپنا بھائی مان لیا تھا۔ چاچا چراغ عام دیہاتیوں کی طرح بیٹیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے بیاہ کے بارے میں سوچنے لگ گیا تھا اور جب اس نے پروین کو دیکھا تو اس کی نیم خمیدہ کمر میں ایک بل اور پڑ گیا۔ دو سے تین ہو گئیں تو فکر دو چند ہو گئی۔

گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا میرا دوست تھا۔ چونکہ میرے پاس ایف ایس سی کر لینے کے بعد کوئی کام نہیں تھا، اس لئے میں سارا دن اس کے ساتھ گھوما کرتا تھا اور اس کے ملیتوں میں کام کرتا تھا۔ یہ بڑے لوگ بہت سیانے ہوتے ہیں۔ امیر نواز کی میرے ساتھ دوستی بھی شاید اس وجہ سے تھی کہ میں اس کے عام نوعیت کا م کاج کر دیا کرتا تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اس کے والد حیات خان کا ایک طرح سے منشی بھی تھا۔

میرا دوسرا دوست خالد عرف کھالا تھا جو گاؤں کی اکلوتی ویگن کا ڈرائیور تھا۔ یہ کھٹارا سی ویگن حیات خان کی تھی جس پر کھالا ماہانہ تنخواہ پر کام کرتا تھا۔ میں کبھی کبھار اس کے ساتھ دس کلومیٹر کی دُوری پر واقع بستی قریشی موڑ تک چلا جاتا تھا اور وہاں گھوم پھر کر واپس آ جاتا تھا۔ کھالے کی دوستی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ میں نے تھوڑے ہی عرصے میں ڈرائیونگ سیکھ لی۔ میری کارکردگی سے مطمئن ہو کر وہ اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ میرا لائسنس بن جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہنر انسان کے کبھی نہ کبھی کام آ جاتا ہے۔ لائسنس ڈرائیونگ کے ہنر کا دستاویزی ثبوت تھا۔ وہ کہتا تھا ''لائسنس کے بغیر شہر میں ڈرائیوری کی نوکری نہیں مل سکتی۔ اسٹیرنگ ویل پر تمہارا ہاتھ ٹِک گیا ہے، اَب کوشش کرو، چار پیسے خرچ کرو اور اپنا لائسنس بنوالو۔''

مجھے اس کا مشورہ پسند آیا۔ سرِ دست میرا نوکری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس صلاحیت سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

کھالا میرا ہم عمر، میٹرک تک ہم جماعت اور لنگوٹیا تھا۔ جان وجھّے میں مجھ سے برتر ہونے کے باوصف مجھ سے دَب کر رہتا تھا۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ وہ پڑھائی میں نالائق واقع ہوا تھا جبکہ میں ہونہار طالب علم مانا جاتا تھا۔ اُس کی شرارتوں، پٹائی، چھوٹی موٹی چوریوں اور سکول سے غیر حاضری سمیت اَن گنت عیوب پر پردہ اِسی صورت میں ہی پڑا رہ سکتا تھا کہ وہ مجھ سے بنا کر رکھتا۔

اُس نے میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی اور حیات خان کی ویگن پر بطور کنڈیکٹر ملازم ہو گیا تھا۔ ساتھ ساتھ ڈرائیونگ بھی سیکھتا رہا۔ جب اُس کے استاد کو ملتان ڈیرہ رُوٹ پر جی ٹی ایس کے کوسٹر پر نوکری ملی، کھالے کو ویگن کی ڈرائیونگ عنایت ہو گئی۔ وہ عام سے خال وخد والا چالاک اور زیرک انسان تھا۔ جھوٹ بڑے دھڑلے سے بولتا، جمعہ کے جمعہ سستی شراب ''کپی'' پیتا اور اپنے پیشے کو اپنے ہر عمل وفعل سے آشکار کرتا تھا۔ اُس کا باپ گاؤں کا واحد لوہار تھا۔ اللہ بخش عرف بخشو لوہار تمام دِن اپنے گھر سے ملحقہ دُکان پر درانتیاں، وَہولے، کلھاڑے اور ٹریننگل بنایا کرتا تھا۔ اُس کے بنائے ہوئے اوزار مقامی سطح پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جایا کرتے تھے۔ اپنے بیچے ہوئے آلات کی مرمت کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ کھالا اپنے باپ کی دُکان کے پہلو میں پختہ سڑک کے کنارے پر کھلے میدان میں ویگن کھڑی کرتا تھا۔ یہ ایک طرح کا بستی کا ویگن اسٹینڈ قرار پا چکا تھا۔ ویگن بھرنے تک سواریاں اپنے سامان سمیت بخشو

لوہار کے سرکنڈوں کے چھپر تلے بیٹھی رہتی تھیں۔

جب سواریوں کی مطلوبہ تعداد پوری ہو جاتی، اللہ بخش گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوتا، کمر پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہوئے دکان اور گھر کے درمیانی دروازے میں آن کھڑا ہوتا۔ دونوں بانہیں دروازے کی اوپر والی چوکھٹ پر ٹکا کر کھالے کو زوردار آواز دیتا اور کہتا ''چل اوئے کھالیا! گڈی اڈّے وِچوں کڈھ گھن.....''

کھالا ایک شانِ بے نیازی سے اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے برآمد ہوتا اور سواریوں پر طائرانہ نگاہ ڈال کر اپنی سیٹ پر براجمان ہو کر ہارن بجانے لگتا۔ اُس کا خالہ زاد بھائی، عبدالرشید عرف شیدو، فٹافٹ سواریوں کو بٹھانے لگتا۔ سامان ویگن کی چھت پر رکھواتا۔ وہ کنڈیکٹر تھا۔ گہری سنولائی رنگت والا شیدو چاق و چوبند، چست اور خاصا پھرتیلا واقع ہوا تھا۔ بہ مشکل بارہ تیرہ کے سن میں ہوگا۔

کچھ لوگ ویگن اسٹینڈ کے عین مشرق میں واقع حیات خان کے بڑے سے مہمان خانے کے برآمدے میں بچھی چارپائیوں پر بیٹھ کر کھالے کی آمد کا انتظار کیا کرتے تھے۔ وہ بھی اپنا اپنا سامان اُٹھائے لپک کر آ جاتے۔ خواتین کو ویگن کی سیٹوں پر بٹھا دیا جاتا جبکہ مرد ویگن کے عقبی حصے میں کھڑے ہو جاتے۔ کچھ چھت پر چڑھ جاتے اور باہر کی سمت ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتے۔ میں نے کبھی بھی لوگوں کو سیٹ کے حصول کے لیے آپس لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا بلکہ ایک خاموش اور خود کار معاہدہ بستی والوں کے بیچ طے پا چکا تھا۔ یہ شاید علاقے کی واحد ٹرانسپورٹ سروس تھی جو سواریوں کو بہ وقتِ ضرورت 'ادھار' کی شاندار سہولت بھی فراہم کرتی تھی۔

میرا تیسرا دوست ڈاکٹر منور علی شاہ تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کے چھوٹے سرکاری ہسپتال میں تعینات تھا۔ میں اس کی بہت زیادہ عزت کیا کرتا تھا۔ علاقے کے ہر بڑے چھوٹے کی طرح میں بھی اُسے 'شاہ جی' کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ اس سے میری شناسائی کی ابتدا تب ہوئی تھی جب میں گندم کی کٹائی کے موسم میں بیمار ہو کر اس کے پاس گیا تھا۔

وہ درویش منش ہونے کے باوجود انتہائی آدم بیزار شخص واقع ہوا تھا۔ کسی کے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا مگر مریضوں کو ضرورت پڑنے پر اپنے خون کا عطیہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کی شخصیت میں بڑا تضاد تھا۔ اس نے کبھی اس بارے میں کوئی بات کھل کر نہیں بتائی تھی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اسے کرید نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ نہ صرف مجھ سے عمر میں

بلکہ تعلیم، مرتبہ الغرض ہر لحاظ سے بڑا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ شادی نہیں کی تھی، اس لئے بال بچوں کے جھنجٹ سے دور تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے میرے استفسار پر کہا تھا ''میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا، مجھے عورتوں سے نفرت ہے۔''

مجھے اچنبھا ہوا، زیرِ لب بڑبڑایا ''بھلا عورت سے بھی کسی کو نفرت ہو سکتی ہے؟''

میں اس کے چھوٹے موٹے گھریلو کام کر دیا کرتا تھا۔ وہ خود کھانا پکایا کرتا تھا۔ ایسے میں اگر میں اُس کی کوٹھی پر ہوتا تو اس کی مدد کیا کرتا۔ اُس کی سرکاری کوٹھی کی ہفتہ وار صفائی بھی کر دیا کرتا۔ کوٹھی سے ملحقہ چھوٹا سا لان مستقلاً میرے سپرد تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ مجھے پیسے دینا چاہے تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں پیسوں کے لالچ میں کام نہیں کرتا۔ وہ اس بات پر بہت پریشان ہوا تھا۔ بڑا افسر تھا مگر اُس میں افسروں والی کوئی بات میں نے نہ دیکھی تھی۔

دیہاتیوں کے پاس وقت وافر مقدار میں ہوتا ہے۔ شام کا کھانا کھانے کے بعد ہم گھر والے اکٹھے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ ایسے میں کوئی موضوع بھی ہاتھ لگ جاتا جس پر دل کھول کر بحث کی جاتی۔ اسلم کریانہ والے کے مویشی کیوں بیمار رہتے ہیں، جمیل ڈونہ کے بکروں کا بڑا ریٹ لگا ہے، ہمسائے بدر دین کے بیٹے صادق کو نمبردار نے پانی چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اس نے کیسے جرمانہ دے کر جان چھڑائی وغیرہ۔ میں البتہ کبھی کبھار ڈاکٹر منور علی شاہ کے پاس چلا جاتا تھا جہاں بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کرتا۔

ایک دن کھانے کے بعد چاچا چراغ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''پتر! بات دراصل یہ ہے کہ تینوں لڑکیاں سفیدے کے بوٹے کی طرح بڑھی جا رہی ہیں۔ ان کی شادیوں پر سینکڑوں نہیں، ہزاروں روپے خرچ ہوں گے۔ ان کا جہیز بھی اَبھی بنانا ہے اور تم جانتے ہو کہ ہماری زمین ہمیں کیا دے رہی ہیں۔ بہ مشکل ہمیں پال رہی ہے۔ روٹی مشکل سے بنتی ہے، کپڑا لتا کہاں سے بنے گا، تروڑ (زیور) اور بھانڈے ٹنڈر (برتن) کا کیا ہوگا۔ میں اکیلا کام کرتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ صرف میرے کرنے سے شادی کیلئے چار پیسے اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ پانچ سات سال اور بھی کر لوں گا۔ اتنا عرصہ تم شہر میں جا کر کام کر سکتے ہو اور چار ٹکے جوڑ سکتے ہو۔ شہر میں محنت مزدوری کی کمی نہیں۔ تم تو پڑھے لکھے بھی ہو، تمہیں آسانی سے کوئی سہل سا، لکھائی پڑھائی والا کام مل جائے گا۔''

چاچا درست کہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر چچا نے کہا ''تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں یہاں سے

جانے کیلئے کہہ رہا ہوں۔ تم میرے جوان جہان پتر ہو۔ اولاد کو کوئی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا مگر میں کیا کروں۔ تین بیٹیوں کا باپ ہوں جنہیں اُن کے اصل گھر بھیجنا میری ذمہ داری ہے۔ شہرے! یہ ذمہ داری تمہارے کندھوں پر بھی ہے۔ زیادہ نہ سہی، تھوڑا ہی سہی، کچھ نہ کچھ تو گھر میں آئے گا ناں.....''

مجھے شش و پنج میں دیکھ کر وہ رَسان سے بولا، ''پتر! کیا تم اپنی بہن کی وجہ سے کہیں جانا نہیں چاہتے ہو؟''

میں نے آہستگی سے کہا، ''چاچا! میں کچھ کرتا ہوں۔''

''نور پور میں؟''

''ہاں.....'' میں نے نیم دلانہ انداز میں کہا، ''یا نزدیک میں۔''

''کوئی دُکان ہی بنالو قریشی موڑ پر..... ہیں؟''

''اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا چاچا؟'' میں نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا۔

''میں حیات خان سے بات کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے، وہ مجھے اُدھار دے دے جو تھوڑا تھوڑا کرکے چکا دیا جائے۔''

''چاچا! دکان کے لیے کم از کم چالیس پچاس ہزار رُپے چاہئیں۔''

''میں جانتا ہوں پتر.....''

''خان نہیں دے گا۔'' میں نے اپنے تئیں فیصلہ سنایا۔

''کوشش کرکے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بہر حال پتر! کچھ نہ کچھ کرنے کی سوچو..... ایسے کام نہیں چلتا۔'' چاچے چراغ نے گفتگو کی بساط سمیٹتے ہوئے کہا اور حسبِ عادت مجھے میرے حال پر چھوڑ گیا۔

فطرت دکھائی نہیں دیتی، مظاہر بنا کر اپنا آپ بھاتی ہے۔ چڑیاں جب انڈے دینے پر آتی ہیں تو ان کے لاشعور میں یہ بات آپوں آپ سما جاتی ہے کہ انڈوں اور ان سے نکلنے والے بچوں کیلئے نرم اور حدت انگیز جگہ کا ہونا ضروری ہے اور وہ ایک لگن کے ساتھ تنکے اکٹھے کرنے میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ ثمرُت کے آنے تک وہ اپنا آشیانہ تیار کر چکی ہوتی ہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہوتا ہے۔ آنول کٹتی ہے تو نوزائیدہ بچے کو عرفان مل جاتا ہے کہ اب اسے خوراک اس نالی کے ذریعے نہیں، منہ کے ذریعے ملے گی۔ ساتھ ہی چوسنے کا ہنر مل جاتا ہے۔ ماں کے

اوّل

سینے سے دودھ کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور بچہ اپنے لب ان سوتوں پر رکھ دیتا ہے۔ جب یہ نوری دھارے اُس کی بھوک مٹانے کے لیے ناکافی ہو جاتے ہیں تو وہ فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر پہلی بے وفائی کا ارتکاب کرتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے۔ تب ذائقوں کا اِک جہان اُس پر کھل جاتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو ماں یا باپ بننا چاہتا ہے اور اس لگن میں سب کچھ کرتا جاتا ہے۔ صدیوں سے اِس عمل کو دہرائے جانے کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ ہی کبھی آئے گا۔ تن ڈھانپنے اور پیٹ پالنے کا چکر بھی فطری تقاضوں پر مبنی ہے۔

چاچے کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ چاچا کیا، ہر کوئی کہتا ہے کہ گھر کے سبھی افراد نہ کمائیں تو گزر بسر نہیں ہوتی۔ شہروں میں جوان لڑکیاں کمانے کیلئے روزانہ گھر سے دفتر یا فیکٹری کیلئے نکلتی ہیں۔ میں تو پھر مرد تھا۔ مرد بھی وہ جس پر ایک نہیں تین بہنوں کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر ہم غریبوں کے ہاں بیٹی کسی کڑے امتحان کی خبر سے کم نہیں ہوتی۔ مجھے چاچے کی بات سے کوئی اختلاف نہ تھا مگر شہر میں جا کر کام کرنا بڑا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان بنانے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ مانگے تانگے سے کام چلتا تو ہر کوئی چلا لیتا۔

اِنہی سوچوں میں غلطاں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس چلا گیا۔ آج پی ٹی وی پر ہفتہ وار نشر ہونے والے ایک ڈرامے کی آخری قسط تھی جسے میں مس نہیں کر سکتا تھا۔ ڈرامہ لگنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ نے مجھے کہا ''شہریار! چائے کا موڈ ہے، بنا لو یار۔ بڑا جی چاہ رہا ہے مگر سستی کی وجہ سے اٹھا نہیں جا رہا۔''

گاؤں میں وہ واحد شخص تھا جو مجھے میرے پورے نام سے پکارتا تھا۔ مجھے عجیب لگتا تھا تبھی میں نے ایک مرتبہ اُس سے دریافت کیا تھا ''شاہ جی! آپ مجھے پورے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟''

وہ حیرت سے بولا ''تو اور کیا کروں؟''

''سبھی مجھے 'شہرا' یا 'شیرا' کہتے ہیں، آپ بھی اسی نام.....''

اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور کہا ''نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سلجھی ہوئی کمیونٹی میں آدھا، نامکمل یا بگڑا ہوا نام لینا بدتہذیبی اور بدکلامی میں شمار کیا جاتا ہے۔'' اپنے غیر معمولی درشت رویے کے باوجود وہ اپنے ہاں آنے والے غریب مریضوں کو بھی ایسے ہی احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

۔جب ں نے کچن کا رخ کیا۔ دو کپ چائے بنائی اور ٹرے میں رکھ کر ڈاکٹر کے کمرے میں تھوں ا۔

اُس م ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ بجلی چلی گئی۔ چار سُو پُرسکوت اندھیرا طاری ہوگیا۔ گاؤں کچھ المناجب اندھیرا پکڑتی ہے تو اتنی پُرسکون ہوجاتی ہے کہ ساگر کی بے موج نیند کا سا گماں ں آیا نے لگتا ہے۔ کہیں کوئی مینڈک یا جھینگر ٹراتا ہے تو کئی فرلانگ تک اُس کی آواز سنائی دیتی م نے ڈرامے کی وجہ سے بجلی کے آنے کا کچھ دیر انتظار کیا مگر نہ آئی تو ڈاکٹر نے کہا ''چل ر نہ ا باہر بیٹھتے ہیں۔ کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

ں نے چارپائی نکال کر صحن میں بچھائی۔ وہ سرھانے کی جانب جبکہ میں پائنتی پر بیٹھ گیا۔ ا۔ یاہ بدلی کی اوٹ سے چاند جھانکنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پوری روشنی سمیت ہ گیا۔ سفید ریشمی چادر جیسی چاندنی میں ڈاکٹر منور کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے ں میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد خوبرو انسان تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ایسے آدمی نے ا۔ شادی کیوں نہیں کی حالانکہ وہ جس لڑکی کو چاہتا، اپنی نوکری اور شخصی جاذبیت کی بدولت ا ل سکتا تھا۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہونے کے باوجود وہ پُرکشش تھا اور چاہتا تو ابھی بھی ا۔ صورت بیوی مل سکتی تھی۔

ں نے میرے انہماک کو تاڑ لیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

ں چونک گیا ''شاہ جی! ایک بات پوچھوں؟''

ضرور''

''آپ کا گھر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ں نے عجیب نگاہوں سے مجھے گھورا۔

ں گڑبڑا گیا ''میرا کہنے کا مقصد ہے کہ آپ گھر کیوں نہیں جاتے؟ چھٹیاں بھی یہیں ا تے ہیں اور عیدیں بھی، کیا آپ اپنے گھر والوں سے ناراض ہیں؟''

ا لھوں کا مشتعل الاؤ سمٹ گیا، طنزیہ مسکراہٹ آہستگی سے افسردگی میں تبدیل ہوگئی اور ا ں میں نامانوس خاموشی چھا گئی۔ وہ ہونٹ بھینچے بہت دیر تک بیٹھا رہا، پھر بولا ''میرا کوئی گھر ۔''

''گھر والا؟'' میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

سینے سے دودھ کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور بچہ اپنے لب ان سوتوں پر رکھ دیتا ہے۔ جب یہ نوری دھارے اُس کی بھوک مٹانے کے لیے ناکافی ہوجاتے ہیں تو وہ فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوکر پہلی بے وفائی کا ارتکاب کرتا ہے اور منہ پھیر لیتا ہے۔ تب ذائقوں کا اِک جہان اُس پر کھل جاتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو ماں یا باپ بننا چاہتا ہے اور اس لگن میں سب کچھ کرتا جاتا ہے۔ صدیوں سے اس عمل کو دہرائے جانے کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا اور نہ ہی کبھی آئے گا۔ تن ڈھانپنے اور پیٹ پالنے کا چکر بھی فطری تقاضوں پر مبنی ہے۔

چاچے کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ چاچا کیا، ہر کوئی کہتا ہے کہ گھر کے سبھی افراد نہ کمائیں تو گزر بسر نہیں ہوتی۔ شہروں میں جوان لڑکیاں کمانے کیلئے روزانہ گھر سے دفتر یا فیکٹری کیلئے نکلتی ہیں۔ میں تو پھر مرد تھا۔ مرد بھی وہ جس پر ایک نہیں تین بہنوں کا بوجھ لدا ہوا تھا۔ بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے مگر ہم غریبوں کے ہاں بیٹی کسی کڑے امتحان کی خبر سے کم نہیں ہوتی۔ مجھے چاچے کی بات سے کوئی اختلاف نہ تھا مگر شہر میں جا کر کام کرنا بڑا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ دکان بنانے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ مانگے تانگے سے کام چلتا تو ہر کوئی چلا لیتا۔

اِنہی سوچوں میں غلطاں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس چلا گیا۔ آج پی ٹی وی پر ہفتہ وار نشر ہونے والے ایک ڈرامے کی آخری قسط تھی جسے میں مس نہیں کر سکتا تھا۔ ڈرامہ لگنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ نے مجھے کہا ''شہریار! چائے کا موڈ ہے، بنالو یار۔ بڑا جی چاہ رہا ہے مگر سستی کی وجہ سے اٹھا نہیں جا رہا۔''

گاؤں میں وہ واحد شخص تھا جو مجھے میرے پورے نام سے پکارتا تھا۔ مجھے عجیب لگتا تھا تبھی میں نے ایک مرتبہ اُس سے دریافت کیا تھا ''شاہ جی! آپ مجھے پورے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟''

وہ حیرت سے بولا ''تو اور کیا کروں؟''

''سبھی مجھے 'شہرا' یا 'شیرا' کہتے ہیں، آپ بھی اسی نام.....''

اُس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور کہا ''نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سلجھی ہوئی کمیونٹی میں آدھا، نامکمل یا بگڑا ہوا نام لینا بدتہذیبی اور بدکلامی میں شمار کیا جاتا ہے۔''

اپنے غیر معمولی درشت رویے کے باوجود وہ اپنے ہاں آنے والے غریب مریضوں کو بھی ایسے ہی احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

میں نے کچن کا رخ کیا۔ دو کپ چائے بنائی اور ٹرے میں رکھ کر ڈاکٹر کے کمرے میں آ گیا۔

ہم ابھی چائے پی ہی رہے تھے کہ بجلی چلی گئی۔ چار سُو پُرسکوت اندھیرا طاری ہو گیا۔ گاؤں کی فضا جب اندھیرا پکڑتی ہے تو اتنی پُرسکون ہو جاتی ہے کہ ساگر کی بے موج نیند کا سا گماں اُبھرنے لگتا ہے۔ کہیں کوئی مینڈک یا جھینگر ٹراتا ہے تو کئی فرلانگ تک اُس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہم نے ڈرامے کی وجہ سے بجلی کے آنے کا کچھ دیر انتظار کیا مگر نہ آئی تو ڈاکٹر نے کہا ''چل کر باہر بیٹھتے ہیں۔ کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

میں نے چارپائی نکال کر صحن میں بچھائی۔ وہ سرھانے کی جانب جبکہ میں پائنتی پر بیٹھ گیا۔ اچانک سیاہ بدلی کی اوٹ سے چاند جھانکنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پوری روشنی سمیت آشکار ہو گیا۔ سفید ریشمی چادر جیسی چاندنی میں ڈاکٹر منور کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد خوبرو انسان تھا۔ میں سوچنے لگا کہ ایسے آدمی نے اب تک شادی کیوں نہیں کی حالانکہ وہ جس لڑکی کو چاہتا، اپنی نوکری اور شخصی جاذبیت کی بدولت حاصل کر سکتا تھا۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہونے کے باوجود وہ پُرکشش تھا اور چاہتا تو ابھی بھی اسے خوبصورت بیوی مل سکتی تھی۔

اس نے میرے انہماک کو تاڑ لیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں چونک گیا ''شاہ جی! ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور.....''

''آپ کا گھر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے عجیب نگاہوں سے مجھے گھورا۔

میں گڑبڑا گیا ''میرا کہنے کا مقصد ہے کہ آپ گھر کیوں نہیں جاتے؟ چھٹیاں بھی یہیں گزارتے ہیں اور عیدیں بھی، کیا آپ اپنے گھر والوں سے ناراض ہیں؟''

آنکھوں کا مشتعل الاؤ سمٹ گیا، طنزیہ مسکراہٹ آہستگی سے افسردگی میں تبدیل ہو گئی اور ماحول میں نامانوس خاموشی چھا گئی۔ وہ ہونٹ بھینچے بہت دیر تک بیٹھا رہا، پھر بولا ''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔''

''گھر والا؟'' میں نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

''جب گھر ہی نہیں تو گھر والا کون ہوگا؟''

میں نے اچنبھے سے اسے دیکھا اور کہا ''یہ کس طرح ممکن ہے؟''

وہ مجبوراً مسکرایا ''تمہارے ماں باپ فوت ہوگئے ہیں۔ اللہ نہ کرے تمہاری بہن بھی فوت ہو جائے تو تم کیا کہو گے؟..... یہی کہو گے ناں کہ تمہارے گھر والے نہیں ہیں؟''

میں نے جلدی سے کہا ''چاچا چراغ، چاچی، فرزانہ اور شانو تو ہوں گے ناں!''

اُس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رقصاں ہوگئی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ''نہیں شہریار! ماں جائے بھی اپنے نہیں ہوتے، دل میں بسنے والے بھی اپنے نہیں ہوتے، تم رشتہ داروں کی بات کرتے ہو۔ یہ جھوٹے رشتے ہیں۔ یہی لوگ تو منافقت کا کاری وار کرتے ہیں۔ جیتے جی مارنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔''

میں نے اختلاف کیا ''نہیں شاہ جی! میرے رشتہ دار ایسے نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے اور میری بہن سے بہت محبت کرتے ہیں۔''

''محض دھوکہ، بہلاوا..... حقیقت میں کچھ نہیں۔'' اُس کی آواز بڑبڑاہٹ میں تحلیل ہو کر گم ہوگئی۔

میں نے یہ سوچ کر کہ اس کے ماں باپ فوت ہوگئے ہوں گے اور رشتہ داروں نے کسی موڑ پر اُسے بے وفائی یا بے اعتنائی کا دُکھ دیا ہوگا، دکھ سے کہا ''پھر آپ شادی ہی کر لیتے!''

وہ بوریت بھرے لہجے میں بولا ''آج تم کیسی باتیں لے بیٹھے ہو شہریار! فضول تذکرہ چھوڑو، کوئی اچھی سی بات کرو۔''

میں خاموش ہوگیا۔ عادتاً چارپائی کے بان کے ساتھ الجھتا رہا اور ڈاکٹر شاہ جی کے بارے میں سوچتا رہا۔

ایک طویل توقف کے بعد وہ از خود گویا ہوا ''ہر انسان کی طرح میں بھی اس دنیا میں تنہا آیا تھا مگر میرا دُکھ اِس لحاظ سے جداگانہ رہا کہ میں اپنی مکمل تنہائی کی گود میں ہی پلا بڑھا۔ مجھے کسی کے ساتھ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کبھی اپنی نسل بڑھانے کی تمنا رہی ہے۔ آج میں تنہا ہوں تو خوش ہوں، جب کچھ عرصہ کیلئے تنہا نہیں تھا تو میں نے بہت سارے دکھ دیکھے تھے۔''

اس کا لہجہ اچانک غیر معمولی حد تک سخت ہوگیا اور پھر مجھے جرأت نہ ہوئی کہ بات کو آگے

بڑھاتا۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک کے لیے خاموشی عود کر آئی۔ میں کبھی کبھی نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتا۔ وہ میرے اور آسمان پر چمکتے چاند کے درمیان حائل تھا۔ اس کے وجود کے گرد روشنی کا سفید ہالا قائم تھا جو اس کے وجود کی احاطی نشاندہی کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ بڑا پراسرار اور عجیب لگ رہا تھا۔

آخر میں نے ہی اس اعصاب شکن سکوت کو توڑا اور آہستگی سے کہا ''شاہ جی! میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں۔ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ بہت سارا پڑھوں، اتنا، جتنا آپ نے پڑھ رکھا ہے مگر کیا کروں؟ چاچا کہتا ہے کہ میں شہر چلا جاؤں یا کوئی کام کروں۔ یہاں ایسا کوئی کام دکھائی نہیں دیتا۔ شہر سے دل ڈرتا ہے۔ آپ کہیں، کیا کروں؟''

''مجھے تمہاری یا کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے انسانوں کو دودھ پلایا اور اپنی رگوں میں زہر اُترتا محسوس کیا۔ اُن خوش نصیبوں کو نہیں دیکھ پایا جن کے ہاتھوں دودھ پی کر جوان ہونے والے سانپ اپنی زہر چکاں سرشت بھول جاتے ہیں۔ تم وہی کرو جو تمہارا چاچا کہتا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں واقعی فکر مند ہے۔ پرسوں مجھ سے بھی کہہ رہا تھا کہ شہریار کو کہیں جا کر کام وام کرنا چاہئے تاکہ گاڑی چل سکے۔''

کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا ''دیکھو ناں! وہ بوڑھا آدمی ہے۔ آج نہیں تو کل اس کے ہڈ پیر جواب دے جائیں گے اور تمہیں گھر کا بھار اُٹھانا پڑ جائے گا۔ آج اُٹھالو گے تو کل تنگی محسوس نہیں ہوگی۔ کیا تمہارا کوئی جاننے والا شہر میں نہیں ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کوئی کام وام جانتے ہو؟''

''میں کوئی کام نہیں جانتا مگر.....'' میں نے سوچ کر کہا ''کھالے سے ڈرائیونگ سیکھ رکھی ہے پر ابھی لائسنس نہیں بنا۔''

''ہوں!'' اس نے کہا اور کچھ دیر کیلئے سوچ میں گم ہوگیا۔ ناخن سے چارپائی کی چوبی بانہہ کو کھرچنے لگا۔

''میرا ایک جاننے والا ہے شہر میں.....'' وہ خودکلامی کے سے انداز میں بولا پھر چارپائی میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اپنے سینے کے گھنیرے سفید و سیاہ کھچڑی بالوں میں کھجلی کرنے

کے سے انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ''تم ایسا کرو کہ اس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ تمہاری ہر ممکن مدد کرے گا۔''

میں نے جلدی سے پوچھا ''کس کے پاس؟''

''اُس کے پاس..... وہ، ایک ہے، میرا دوست ہے۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔'' اُس کا بیانیہ بے ربطگی کا شکار تھا۔

''کہاں؟ ملتان میں؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''نہیں۔ لاہور میں.....'' اس نے کہا۔

میں قدرے مایوس ہو گیا، بولا ''نہیں شاہ جی! پروین اکیلی رہ جائے گی۔ رو رو کر پاگل ہو جائے گی۔''

وہ میرا شانہ تھپکتے ہوئے بولا ''جب کام کرنے اور کمانے کیلئے گھر سے نکلنا ہے تو پھر قریشی موڑ کیا اور لاہور کیا؟ وہاں تم سوکھے رہو گے۔ بڑا شہر ہے، زیادہ مزدوری ملے گی اور کام بھی آسانی سے مل جائے گا۔''

میں نے نے سر ہلایا، ''نہیں شاہ جی!''

''تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''مجھے اگر چالیس پچاس ہزار رُپے مل جائیں تو میں قریشی موڑ میں دکان کھول لوں گا تاکہ میں روزانہ شام کو گھر آ جایا کروں۔''

''اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟''

شاہ جی کے اِس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ تبھی خاموش ہو گیا۔ ایک پل کو سہارا اُبھرا، کہ اپنے مال مویشی بیچ دوں..... ساتھ ہی اِس ناتواں سہارے پر سے ہاتھ پھسل گیا۔ مال مویشی بیچ دیا تو پھر دودھ کہاں سے آئے گا؟ گھر کی گزر بسر کہاں سے ہو گی؟ اُس کے علاوہ کچھ بیچنے کو نہیں تھا۔ ماں کے چھوڑے ہوئے چند گہنے تھے جنہیں بیچنے کی بات سن کر پروین کمر کے بل جا گرے گی اور کبھی نہیں اُٹھے گی۔

شاہ جی نے اپنا سوال دہرایا، ''شہر یار! تم نے بتایا نہیں، اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟''

''چاچا کہہ رہا تھا کہ وہ حیات خان سے اُدھار مانگے گا۔''

''مجھے حیات خان سے توقع نہیں ہے۔''

توقع تو مجھے بھی نہیں تھی، تبھی کہا، ''شاہ جی! آپ کوئی راہ دکھائیں ناں!''

''سوچوں گا، پھر کچھ کہہ سکوں گا!''

اس کے بعد ہم کافی دیر تک بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ گیارہ کے لگ بھگ اسے نیند ستانے لگی تو میں نے گھر کا راستہ لیا۔ بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس کے آنے یا نہ آنے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ہمارے گاؤں میں سوائے ہماری برادری کے چند بڑے گھروں، جیت شاہ کے مزار اور سرکاری ہسپتال کے، کسی گھر تک بجلی نہیں پہنچی تھی۔ بدقسمتی سے یہ سرکاری اُجالے ہماری دسترس سے بھی کہیں دُور تھے۔ سردار حیدر خان نے صوبائی اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر گھر گھر میں بجلی پہنچانے کا وعدہ کیا تھا، بڑھ چڑھ کر تقریریں کی تھیں مگر اَبھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب بھی نور پور آتا، لوگ وعدے کی تکمیل کا مؤدبانہ تقاضا کرتے مگر اَبھی تک وعدہ وَفا نہیں ہوا تھا۔

کھالا حسبِ معمول شام کو مجھ سے ملنے کے لیے آیا تو خاصا پُرجوش دکھائی دیا۔ میں نے پوچھا ''خیر تو ہے کھالے؟ آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔''

اُس نے میرے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا، بولا ''ہاں یار! سمجھو، لاٹری نکل آئی ہے۔''

ہم دونوں گھر سے نکل کر حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے واقع پکے کھال کے نکے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہم عموماً اس جگہ پر آن بیٹھتے تھے اور دن بھر کی کارگزاری پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ میں نے پوچھا ''کیسی لاٹری؟''

اُفق کی ڈھلتی لالگی اُس کی آنکھوں میں چمک اُٹھی، بولا ''کسی سے ذکر تو نہیں کرو گے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟''

وہ بولا ''نہیں مگر اِس امانت کا بوجھ کہیں بھاری ہے۔''

''میرا حوصلہ بھی تم نے آزما رکھا ہے کھالے!''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر.....''

میں نے قدرے مایوسی سے کہا ''اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تو دل کی بات دل میں ہی رکھو۔''

وہ عجیب ادھیڑ بن میں پڑ کر سراسر افگندہ ہو گیا۔ جوتے اُتارے، پاؤں کھال کے مُیالے پانی میں ڈالے اور تھرکانے کے سے انداز میں جھٹکنے لگا۔ مجھے اُس کا مسرت آمیز اضطراب بُری طرح کھلنے لگا۔ میں نے قدرے خفگی سے کہا ''میں نے کہا ہے کہ مجھے شریکِ رازمت کرو مگر یہ نہیں کہا کہ یوں سر جھکا کر بیٹھ جاؤ۔ تم اپنی نکلنے والی لاٹری کے علاوہ کوئی اور بات تو کر ہی سکتے ہو، کروناں۔''

وہ مسکرا کر بولا ''بتاتا ہوں یار! ذرا سا صبر بھی نہیں کر سکتے ہو؟''

میں خاموش ہو گیا۔ وہ کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے کچھ بتائے، نہ بتائے، پھر از خود فیصلہ کرتے ہوئے بولا ''اسما کو جانتے ہوناں؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''اسما!''

''ہاں اسما..... سردار حیدر خان کی بیٹی..... وہی جو ملتان میں پڑھتی ہے۔'' اُس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔

''ہاں یار! جانتا ہوں اُسے، پَر یہ بتا کہ ہوا کیا ہے؟''

''یہ پوچھ کہ کیا نہیں ہوا ہے؟''

میں نے زِچ ہو کر پوچھا ''اچھا چلو یونہی سہی۔ یہ بتا کہ کیا نہیں ہوا ہے؟''

وہ مزید میرے قریب ہو کر سرگوشی کے سے انداز میں بولا ''اُس نے مجھے سردار حیات خان کی نوکری چھوڑنے کا کہا ہے۔''

مجھ پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا۔ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا۔ میں نے نیم اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا ''یار! یہ بات تو وہ پہلے بھی کئی مرتبہ تجھے کہہ چکی ہے۔''

''سن تو سہی یار!'' وہ عادتاً بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا ''اَب کی بار اُس نے مجھے سنجیدگی سے کہا ہے۔''

''پہلے مخول کیا کرتی تھی کیا؟'' میں نے جھٹ سے پوچھا۔

اُس نے اِک نگہِ شکایت مجھے دیکھا۔

''تو اُس کی بات مان لوناں، کون روکتا ہے تجھے؟'' میں نے بے دِلی سے کہا ''اُس سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ یہ نوکری چھوڑ کر کیا کروں، کیا گلے میں ڈھول ڈال کر شادی بیاہ پر خسروں کی طرح ناچوں یا گھر میں باپ کے ساتھ بیٹھ کر لوہا کوٹوں؟''

''ہاہ! ناچوں، لوہا کوٹوں!'' اُس نے منہ بنایا، پھر اپنی ترنگ میں لوٹ آیا، ''یہی تو خوشی کی بات ہے کہ اُس نے مجھے ملتان بلایا ہے۔ وہاں اُس نے میرے لیے اِس سے کہیں بہتر نوکری تلاش کر رکھی ہے۔ سچ شہرے! زندگی کا مزہ آ جائے گا۔'' کھالے کے انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔

مجھے خاموش پا کر اُس نے پھر میرا کندھا ٹھونکا ''اوئے! تجھے سانپ سونگھ گیا یا زبان پر تالا لگ گیا، بولتا کیوں نہیں تُو؟''

مجھے اُس پر افسوس ہوا۔ میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا ''اوئے کھالے! تو ایک لڑکی کی خاطر اپنے ماں باپ، بہنوں اور ہم سب کو چھوڑ جائے گا اور تجھے ذرا دُکھ بھی نہیں ہوگا۔ ہیں؟''

وہ بھڑک گیا ''میں اسما کے لیے نہیں، زیادہ پیسوں والی نوکری کے لیے ملتان جا رہا ہوں۔ حیات خان مجھے اَسی روپے روزانہ دیتا ہے۔ بیس پچیس روپے کی پھٹی لگ جاتی ہے۔ اسما بتا رہی تھی کہ وہاں میری تنخواہ پانچ ہزار ہوگی۔ پانچ ہزار.....'' اُس نے مضحکہ خیز انداز میں اپنے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں، دونوں آنکھیں اور منہ پوری وسعت میں کھول کر کہا ''روٹی پانی بھی مالک دیں گے۔ کچھ نہ کچھ اُوپر سے بھی بن جایا کرے گا۔''

''یہاں بھی تم اچھی خاصی نوکری کرتے ہو، پیسہ کماتے ہو اور ہر رات اپنے گھر میں گزارتے ہو۔ سردار حیات خان تجھے اپنا پتر سمجھتا ہے اور کسی بھی شئے کی کمی نہیں آنے دیتا۔ پھر بھی تم اتنی خوشی کے ساتھ ملتان جانے کی خبر سنا رہے ہو؟'' میرا غصہ فزوں تر ہو گیا۔

''سمجھانے کی بجائے سمجھنے کی کوشش کرو بے وقوف انسان! میں ایک دو روز میں ملتان چلا جاؤں گا۔ کل صبح حیات خان سے بات کر کے اپنی جگہ پر تجھے ویگن پر رکھوا دوں گا۔ موج میلہ کرنا اور اپنے یار کھالے کو دُعائیں دینا کہ تجھے بیٹھے بٹھائے 'اچھی خاصی نوکری' مل گئی۔'' اُس نے 'اچھی خاصی نوکری' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''بکواس نہ کرو، تم کہیں نہیں جاؤ گے۔'' میں نے فیصلہ سنایا۔

''تم مجھے ملتان جانے سے کیوں روکتے ہو؟'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولا ''میرے دل کی دُنیا موج میں ہے، تم جانو، نہ جانو، مجھے فرق نہیں پڑتا۔ یہاں چوری چھپے اسما سے ملاقات ہوتی ہے، وہاں جب جی چاہے گا، مل لیا کروں گا۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ ترقی کرنے کیلئے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے

اور اماں ابا سے بات کر لی ہے۔ جب میں نے اُنہیں تنخواہ کے بارے میں بتایا تو مارے خوشی کے اُن کی باچھیں کانوں سے جا لگیں۔ ایک تم ہو کہ میری خوشی دیکھ کر کالے سُواہ ہو گئے ہو۔ ہے ناں!''

کوئی جواب دیے بغیر، میں نے اُس کے چہرے پر خوشی کے اَن گنت عکس، جوش اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر اپنا سنایا ہوا فیصلہ واپس لیا اور خاموشی کی چادر اَوڑھ لی کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ وہ اپنی مستی میں مست، اپنی محبت کی الوہی ترنگ کے بہاؤ میں رقصاں کافی دیر تک مسرت بھری بہکی بہکی باتیں کرتا رہا، خواب بنتا رہا اور میں 'ہاں'، 'ہوں' میں جواب دیتا رہا۔ گاؤں میں اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی ہماری محفل اُجڑ گئی۔

بے رغبتی کے ساتھ کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ پروین دودھ کا بھرا ہوا پیالہ تھما کر چلی گئی اور میں چاند کے نُور تلے دودھ بھرے پیالے میں اُبھرتی ہوئی اسما کی شبیہہ میں کھو گیا۔ دودھ حلق سے اُترنے والا نشہ تھا۔ اسما آنکھوں کے راستے گزر کر دل کی گہرائیوں تک کو چھیدنے والے حسن کا نام تھا جو دِل سے اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ آواز دیتی، کھالا تو کیا، دُنیا کا مضبوط سے مضبوط تر مرد بھی خود کو صدائے حسن کی کشش کے ہاتھ میں گروی رکھ چھوڑتا، تھم جاتا۔ میں جب اُسے کھالے کے لیے بے چین دیکھتا تو اِک بے نام سا حسد میرے روم روم میں بھر جایا کرتا تھا۔

سردار حیدر خان نور پور کے نمبردار حیات خان کا دور پار کا رشتہ دار اور برادری وال تھا۔ بڑے کروفر والا آدمی تھا۔ قریشی موڑ سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع بلوچ موڑ کے اطراف کی تمام تر اراضی اُسی کی ملکیت تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ کم وبیش پچاس مربع زمین کا مالک تھا۔ صوبائی اسمبلی کے ہر انتخاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اَب تک دو مرتبہ ممبر بن چکا تھا۔ اِس سال بھی وہ اپنے روائتی حریف کو پچھاڑ کر اسمبلی میں پہنچ گیا تھا۔ باوجود کہ وہ جس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا تھا، وہ حکومت بنانے میں ناکام ہو گئی تھی، اُس کے اختیارات اور رسوخ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی پارٹی حزبِ اختلاف میں آ جانے کے باوجود خاصی مضبوط تھی۔

بلوچ موڑ سے مغربی جانب تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر اُس کی عالیشان کوٹھی، اُس کے جاہ وجلال کا استعارہ، سڑک پر سے دکھائی دیتی تھی۔ کوٹھی کے اطراف میں چونکہ اُسی کی اراضی واقع

تھی، اِس لیے بلوچ نگر، سردار حیدر خان کی بستی، میں صرف اُس کے مزارعین اور نوکر چاکر ہی رہائش پذیر تھے۔ گاہے بہ گاہے وہ سردار حیات خان اور وریام خان کے پاس آتا رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اُس کی حریف سیاسی پارٹی کے فعال کارکن امان اللہ قریشی کی بھی بڑی سی حویلی واقع تھی جہاں اُس کے مخالفین مہینے میں ایک آدھ چکر لگا لیا کرتے تھے۔ انتخابات کے دنوں میں کئی مرتبہ نور پور میں دونوں پارٹیوں کے کارکن دست و گریباں بھی ہو چکے تھے۔

سردار حیدر خان چونکہ سردار حیات خان کی سرپرستی کرتا تھا، اِس لیے انتخابات کے دنوں میں سردار حیات خان اُس کی بھرپور معاونت کیا کرتا تھا۔ اپنے نوکروں چاکروں اور کاروں کو اُس کے ڈیرے پر پہنچا دیا کرتا تھا۔ کھالا بھی انتخابی دنوں میں سردار حیدر خان کی کوٹھی پر چلا جاتا تھا۔ بطور ڈرائیور وہ الیکشن کے نتائج تک انتخابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا۔

یہیں کہیں اُس کی نظر حیدر خان کی پُرشکوہ کوٹھی کے چاند پر پڑ گئی۔ سردار حیدر خان کی بیٹی، اسما حیدر، پر کھالے کی نگاہ یوں پڑی کہ پلٹنا بھول گئی۔ جب اُس نے میرے سامنے اسما کے ماورائی حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اُسے دیکھنے کا تجسس مجھ میں ہلکورے لینے لگا۔ چونکہ انتخابی دنوں کے علاوہ کھالے کا بلوچ نگر میں آنا جانا نہیں تھا، اِس لیے میری یہ خواہش پوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کھالے کو سمجھایا کہ وہ اِس نظر بازی سے پرہیز کرے۔ سردار حیدر خان بہت ظالم فطرت واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے غصے اور جلال کی تاب خود بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ کھالے کے لیے معافی کی گنجائش کہاں رکھتا؟ مگر کھالے کے سر پر نہایت غیر فطری اور ناموزوں عشق کا بھوت ایسے چڑھا کہ اُس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا بلکہ سرپٹ اندھی راہوں پر دوڑتا چلا گیا۔

اُس نے کھوج نکال لی۔ پتہ چلا کہ اسما ملتان میں پڑھتی ہے۔ وہ گاہے بگاہے اُس کا دیدار کرنے کے لیے ملتان جانے لگا۔ وہ کالج کے گیٹ سے کچھ دوری پر جا کھڑا ہوتا۔ چھٹی ہونے پر سلور کلر کی نئی چمکدار گاڑی کے شیشوں میں مقید حسن کا لمحاتی دیدار کرتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا لوٹ آتا۔

مجھے وہ دِن بخوبی یاد ہے جب اس نے ایک شام مجھے مایوسی آمیز لہجے میں کہا تھا، ''شہرے! سچ کہتے ہیں، اپنے سے بڑے کی نہ یاری چنگی نہ دشمنی۔ اگر وہ نور پور میں رہنے والی ہوتی یا قریشی موڑ کی، تو میں اُسے جی بھر کے دیکھ لیا کرتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اَب تک راہ و رسم بھی پیدا

کر چکا ہوتا۔ وہ بڑے گھر کی کڑی ہے۔ دیکھنے سے میلی ہوتی ہے۔ اُسے جی بھر کے دیکھنے اور چھونے کی حسرت میں تمہارا یار کھالا دنیا سے گزر جائے گا۔''

میں نے کہا، ''جب تمہیں اپنی اوقات کا علم ہے ہی تو کیوں چاند کو چھونے کی خواہش کرتے ہو؟''

''مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں ہے۔''

''کب تک ملتان کی خاک چھانتے رہو گے؟''

''جب تک وہ جاتی رہے گی۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کی شادی ملتان میں ہی ہو جائے، پھر؟''

''تو کیا ہے؟ اَب بھی جاتا ہوں، دیکھ کر پلٹ آتا ہوں۔ تب بھی جایا کروں گا اور اُس کی ایک جھلک دیکھ کر آ جایا کروں گا۔''

''اِس سے تمہیں حاصل کیا ہوگا؟'' میں متعجب ہوا۔

''مجھے حاصل کی پروا نہیں۔''

''تجھے تو شاید اپنی اور اپنے خاندان کی عزت اور سلامتی کی بھی پروا نہیں ہے۔'' میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

''اگر سردار حیدر خان کو پتہ چل گیا تو وہ تجھے اور تیرے گھر بار کو آگ لگا دے گا۔''

''اُسے کیسے پتہ چلے گا؟'' وہ عام سے لہجے میں بولا، ''میں نے اسما کا ذکر سوائے تمہارے، کسی سے بھی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ عزت کے معاملے میں سردار حیدر خان اور اُس کا خاندان کتنا ظالم اور سخت گیر ہے۔ ویسے بھی، میں نے کبھی اسما کو مخاطب نہیں کیا، کبھی چھیڑنے کی کوشش تک نہیں کی، پھر اُسے کیا شکایت ہوگی؟ کسی کو دیکھنا تو کوئی جرم نہیں ہے۔''

مجھے اُس کے حماقت آمیز رویے پر دُکھ ہوا۔ جب کچھ لینا دینا ہی نہیں تھا تو پھر خود کو اِس عذاب میں ڈالنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے کہا، ''دیکھ کھالے! سردار حیات خان اور امیر نواز کے سامنے کبھی بھول کر بھی حیدر خان کے گھر کی بات نہ کرنا ورنہ وہ تمہیں الٹا لٹکا دیں گے۔ تم نے دل لگانا ہی ہے تو کوئی ہم پلہ لڑکی دیکھو۔ اُس کی یاد میں آہیں بھرو جس تک تمہاری

آہ کا اثر پہنچ سکتا ہو۔ اُسے شوق سے دیکھو جس تک تمہاری نظر کی حدت پہنچ سکتی ہو۔ میں تو ویسے بھی عاشقی معشوقی کے معاملات کو اچھا نہیں سمجھتا، ایسے نامعقول رومانس پر سوائے سر پیٹنے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ خود پر رحم کرو، اپنے خاندان کی فکر کرو اور سکون کے ساتھ روزی کماؤ۔ یہ جو تم پیتے پلاتے ہو ناں، یہ ہومیو پیتھک کپی کا نشہ کرتے ہو ناں، اِس سارے خرابے کی جڑ یہی ہے۔ یہی نشہ تمہیں ایک نہ ایک دن لے ڈوبے گا۔ تمہیں ہوش نہیں رہتا۔ کیا کہنا ہے، کیا نہیں کہنا ہے، سدھ نہیں رہتی۔ نشے کے خمار نے تمہیں پاگل کر رکھا ہے اور تم 'اسما، اسما' کا ورد کرتے رہتے ہو۔ کبھی امیر نواز کے سامنے تمہارے لبوں پر یہ نام آ گیا تو سمجھو قیامت آ گئی۔''

اُس نے لاپروائی سے کہا، ''اللہ مالک ہے۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا، خواہ مخواہ دل ڈرانے والی باتیں نہ کرو۔ تم ایسا کرو کہ مجھے اپنی خوبصورت لکھائی میں ایسا خط لکھ کر دو جسے پڑھتے ہی اسما کی آنکھیں کھل جائیں اور.....''

''اور اُس کے باپ کی توپوں کا منہ بھی کھل جائے..... ہے ناں؟'' میں نے اُسے ڈانٹا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' کھالے نے بُرا منایا، ''تم سردار حیدر خان سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ انسان ہی تو ہے وہ۔ کیا ہے؟ اُس کی بیٹی کیا عورت نہیں ہے؟ کیا اُس کے سینے میں دل نہیں ہے یا وہ کسی سے بھی پیار نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے، جیسے میں اُس کے بارے میں رات دن سوچتا رہتا ہوں، وہ بھی میرے بارے میں دن رات سوچتی رہتی ہو۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ تم نے سنا نہیں کہ کوٹھیوں میں رہنے والی امیر زادیوں کے تعلقات ہمیشہ اپنے ڈرائیوروں کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بعض گھروں سے بھاگ کر شادیاں بھی کر لیتی ہیں اُن بے اوقات نوکروں کے ساتھ۔''

میری آنکھیں حیرت سے وا ہو گئیں۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں اُتر گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اِس حد تک آگے نکل چکا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے آگے جوڑ دیے، ''کھالے! مجھے معاف کر دے بھئی، اپنے گھر والوں کو معاف کر دے..... تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم پی پی کر پاگل ہو گئے ہو اور اگر تمہارے شغل میلے کی کیفیت یہی رہی تو وہ دن دور نہیں، جب نور پور کی گلیوں میں تم پر بچے پتھر مارا کریں گے اور تو ننگے پنڈے اِدھر اُدھر دوڑا پھرے گا۔ اسما کو مت دیکھو، اپنی اوقات کو دیکھو۔ اپنی شکل وصورت اور اپنی حیثیت پر نگاہ ڈالو۔ تجھ میں ایسی کوئی ایک خوبی بھی تو نہیں ہے جس کی بنیاد پر تمہیں کوئی پڑھی لکھی عام سی لڑکی

بھی چاہے۔ وہ تو پھر بڑے گھر کی لاڈلی بیٹی ہے۔ وہ تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دے گی یا کسی دیوار میں چنوا دے گی۔''

وہ اپنے مخصوص بے نیازانہ انداز میں گویا ہوا، ''پروا نہیں..... میں پہلا آدمی نہیں ہوں گا جسے زمین میں گاڑا جائے گا یا دیوار میں چنا جائے گا۔ عشق تو عشق ہے، کبھی ایسی دھمکیوں سے خوفزدہ نہیں ہوا۔ تم اگر میرے سچے یار ہو تو مجھے اُس کے نام پیار اسا خط لکھ کر دو، یہ اگر نہیں کر سکتے تو اپنی زبان بند رکھو اور مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔''

میں خاموش ہو گیا۔ اُس کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ یہ ہوّا جس سر پر بیٹھ جائے، ارد گرد کی سوجھ بوجھ ختم کر دیتا ہے۔

اُسے سمجھانے کا عمل میں نے گاہے بگاہے جاری رکھا۔ بات بے بات اُس کی مرمت کرتا مگر میں جوں جوں اُسے باز رکھنے کی کوشش کرتا، توں توں اُس کا جنوں شدت اختیار کرتا گیا۔ میں ناتجربہ کاری میں اُس کے شوق کو مہمیز کرتا گیا۔

ماہ بھر بعد کی بات ہے۔ ہم شام کا دھندلکا گزارنے حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے پختہ کھال کے نکے پر حسبِ عادت بیٹھ کر خوش گپیاں لگا رہے تھے کہ یک لخت کھالے کے منہ سے پھوٹا، ''شہرے! مزے کی بات سناؤں؟''

میں مستفسر ہوا، ''ہاں، ہاں! کیوں نہیں۔''

''میں نے آج اسما کو جی بھر کے دیکھا ہے۔''

''کہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ملتان میں، اور کہاں!'' وہ بولا، ''میرے عین سامنے سڑک پر اُس کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ ڈرائیور ٹائر بدلنے لگا۔ وہ گاڑی کا گیٹ کھول کر سڑک پر آ گئی۔ کچھ دیر کھڑی بیٹھے ہوئے ٹائر کو دیکھتی رہی، میں اُسے دیکھتا رہا، پھر وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں بت کی طرح کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ اوئے شہرے! ایمان سے سچ کہہ رہا ہوں، اُس نے بھی مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اُس کے دیکھنے سے مجھے یوں لگا تھا جیسے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ لگا ہو، جیسے میرے بدن کا سارا خون نچڑ کر میری آنکھوں میں آ گیا ہو۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اُس کے جیسی تو پوری دُنیا میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اتنے لمبے لمبے سیاہ بال..... موٹی موٹی کالی آنکھیں..... سیبوں کی طرح لال لال گال.....''

''اچھا اچھا..... زیادہ تعریف مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ اُس نے تمہیں پہچانا تو نہیں؟''

''کیا مطلب؟'' وہ حیرانی سے بولا، ''اُسے کیا پتہ، میں کون ہوں؟ جب میں نے بلوچ نگر میں اُسے دیکھا تھا تو وہ گاڑی سے اُتر کر حویلی کے بڑے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔ اُس نے یقیناً مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو اتنے آدمیوں میں اُسے میری شکل کہاں یاد رہی ہوگی۔''

''تم تو کہا کرتے تھے کہ ہوسکتا ہے وہ تمہیں یاد کرتی ہو؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''وہ تو میں ایسے ہی کہتا تھا۔ لیکن آج وہ ضرور میرے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔''

''وہ کیوں؟''

''آج اُس نے مجھے غور سے دیکھ جو لیا ہے۔''

میں ہنسا، ''تب تو وہ ڈر کے مارے کانپ رہی ہوگی۔''

''کیا میں اتنا ہی بدصورت ہوں؟''

''تو اور کیا تم خوب صورت ہو؟ مجھے یقین ہے کہ تمہارے بچے بھی تمہیں دیکھ کر ڈر کے مارے ماں کی گود میں چھپ جایا کریں گے۔'' میں نے کہا۔

اُس نے قہقہہ لگایا، ''وہ نہیں ڈریں گے شہرے خان!''

''کیوں؟''

''اِس لیے کہ وہ میرے بچے ہوں گے، مجھ پر ہی جائیں گے بلکہ مجھ سے بھی دو چار قدم آگے ہوں گے۔''

اُس کی زبانِ شوق پر اسما کی خوب صورتی اور خوش لباسی کے نہ ختم ہونے والے تذکرے ٹپک گئے۔ آنے والے کئی دنوں تک وہ جب بھی ملتا، اُسی نازنین کا قصہ چھیڑ لیتا۔ وہ کیسے چلتی ہے، وہ کیسے دکھائی دیتی ہے اور باتیں کرتی ہے تو اُس کے نین ونقوش کیسے مدمقابل کے ساتھ گویائی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔

میں اُسے مذاق کرتا، ''اَبھی تو تم نے محض اُسے ایک نظر دیکھا ہے، اگر کبھی حسنِ اتفاق سے مل بیٹھے تو پھر کیا ہوگا؟''

روز بروز اُس کی دیوانگی فزوں تر ہوتی گئی۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ اُس کا جنوں محض لحاتی اور ہذیاتی ہے۔ جب بھی اُسے اپنی اور اسما کی حیثیتوں کے مابین حائل فرق کی آگہی ہوگی، مایوس

ہو کر پلٹ آئے گا اور پھر کبھی اُس کا نام بھی نہیں لے گا۔ اس کا باپ لوہار تھا۔ نور پور کے زمینداروں کا سپلی تھا۔ پاکستان کے دوسرے تمام زمینداروں کی طرح نور پور کے زمیندار بھی اپنے مقرر کیے ہوئے کمین لوگوں کو ایک حد تک قریب آنے دیتے تھے۔ بلاشبہ کھالے اور اُس کے باپ کا ہر گھر میں کھلا آنا جانا تھا اور کسی گھر میں بھی اُن سے پردہ نہیں کیا جاتا تھا مگر اِس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ انہیں اپنا ہم سر قرار دیا جاتا تھا۔

یہی صورتِ حال سردار حیدر خان اور اُس کے خاندان کی تھی۔ وہ خاندانی پسِ منظر کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ اِس پر استزاد اُس کا صوبائی اسمبلی کا ممبر بن جانا تھا۔ اس کی جواں سال بیٹی ملتان کے کالج میں پڑھتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ وہاں کیا پڑھتی ہے مگر یہ ضرور اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہی وہاں مقیم ہوگی۔ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ عام سے خال وخد والے سانولے لوہار کے لیے اپنے دل میں نرم جذبات پالتی۔ یہ بعید نہیں تھا کہ اگر کبھی کھالا اپنی اوقات سے اوپر اُٹھ کر اُسے دیکھنے کی غلطی کرتا تو وہ اپنے باپ کے کارندوں کے ذریعے اُسے بالکل اوپر اُٹھوا دیتی۔

میں نے یہ باتیں وقتاً فوقتاً کھالے سے بھی کی تھیں۔ اُسے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی تھی مگر اُس کے پاس اپنے مؤقف پر ان گنت جذباتی استدلال تھے۔ بجز و کہ وہ سبھی استدلال کتابی تھے، وہ بضد تھا کہ ممکن ہے کہ اسما اُس کے جنون و محبت اور شوق کو دیکھتے ہوئے مائل ہو جائے۔ وہ احمقوں کی جنت میں رہنے والا تو نہیں تھا مگر نہ جانے اُس کی ذہنی رو اِس قدر بھٹک کیوں گئی تھی۔

ہم دونوں جب بھی حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے سیمنٹ والے نکے پر بیٹھتے، بلا اِرادہ اسما کا تذکرہ چھڑ جاتا۔ ہم نے ہمیشہ یہ احتیاط برتی تھی کہ امیر نواز یا سردار حیات خان کے کسی بھی عزیز کی موجودگی میں اسما کا تذکرہ نہ چھڑے۔ ہم اِس پیش بندی پر بہ حسن و کامیابی گامزن تھے۔ یہ بھی ہوا تھا کہ کھالے کی باتیں سن سن کر میرے من میں اسما کو دیکھنے کا تجسس حد سے تجاوز کر گیا تھا اور میں گاہے بگاہے اُسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار بھی کرنے لگا تھا۔

ایسے میں کھالا بڑی شکست خوردہ سی آواز نکالتا، ''یار! میں اَبھی خود دیکھنے سے عاری ہوں، تمہیں اُس ماہ جبیں کا دیدار کیسے کروا سکتا ہوں۔ میرے لیے دعا کرو، وہ مجھے اپنا دیدار بخش دیا کرے، میں تھوڑا بہت حصہ تجھ تک پہنچا دیا کروں گا۔''

میں نے اُس کے شوقِ دیدار کی آبیاری کے لیے کیا دعا کرنا تھی، اُس کی خیریت اور سلامتی کے لیے دل ہی دل میں دعا گو رہتا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ ستائے رکھتا تھا کہ اُس کی یک طرفہ نظر بازی کا علم اگر حیدر خان یا اُس کے خاندان کے کسی فرد کو ہو گیا تو اُس کی تکہ بوٹی کر دی جائے گی۔ کھالا یا کھالے کا غریب خاندان اُس فرعون صفت وڈیرے کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

ایک صبح کھالا مجھے لینے کے لیے میرے گھر پہنچ آیا۔ اُس کا کنڈیکٹر 'شیدو' پنکچر ہو گیا تھا۔ اُس کے دائیں گھٹنے کی چپنی ہڈی کے عین اوپر پھنسی نکل آئی تھی جس کی وجہ سے اُس کا چلنا پھرنا یکسر موقوف ہو کر رہ گیا تھا۔ اِسی پھنسی کی وجہ سے ہی اُسے بخار نے آن لیا اور وہ چارپائی کا ہو کر رہ گیا۔ کھالا مجھے اپنے ساتھ بطور کنڈیکٹر دو چار روز کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے دلچسپی نہیں تھی مگر کھالے کی منت سماجت پر اُس کی مدد کے ارادے سے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ ویگن پر سامان لادنے اور سواریاں بٹھانے کے مشکل کام میں اُس نے میری اعانت کی۔ مجھے کرایہ وصول کرنے کے زریں اصول بتائے۔ نور پور سے قریشی موڑ تک دو بڑے اسٹاپ تھے۔ پہلا اسٹاپ نوری چوک تھا۔ کوٹ ادو سے قریشی چوک جانے والی بڑی سڑک پر نور پور کی لنک روڈ یہیں آن ملتی تھی۔ کہنے کو یہ چوک تھا مگر یہاں تین سڑکوں کا اتصال ہوتا تھا۔ چوتھی سڑک نہیں تھی۔ یہ نور پور سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر بلوچ موڑ تھا۔ قریشی موڑ یہاں سے مزید تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ اِن بڑے اڈوں کے علاوہ چند ایک چھوٹے چھوٹے اسٹاپ بھی واقع تھے۔ ویسے تو نور پور والی اِس کھٹارا ویگن کے ہر مسافر کو حق حاصل تھا کہ وہ جہاں چاہتا، ویگن کو رُکوا سکتا تھا۔

نوری چوک پر واقع خستہ حال 'خٹک ہوٹل' کے سرکنڈوں کے بنے ہوئے چھپر کے عین سامنے کھالے نے ویگن روکی۔ ہوٹل والے کا ننھا کارندہ چائے کا پیالہ تھامے بھاگتا آیا۔ کھالے نے ڈپٹ کر کہا، ''چل اوئے بھتنی کے! ایک پیالہ اور پکڑ.....''

میلے چیکٹ کپڑوں میں ملبوس لڑکے نے الٹے پیروں دوڑ لگا دی۔ کھالے نے 'پائلٹ گیٹ' والا اشارے سے مجھے اپنی جانب بلایا اور ایک آنکھ دبا کر بولا، ''شہرے! دعا کر۔ پیر کا دن بلوچ موڑ پر جل پری کا دیدار نصیب ہو جائے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا، ''پیر کا دن خاص ہے؟''

''ہاں.....وہ ہفتہ کی شام کو گھر آتی ہے۔ پیر کی صبح کو ملتان جاتی ہے۔ کبھی کبھی بلوچ موڑ پر یا قریشی موڑ تک کہیں راستے میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اُس پر چار حرف بھیجے اور ہوٹل والے لڑکے کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ تھام کر چسکیاں لینے لگا۔ ایسے میں ویگن میں مقید سواریوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ وقت کی کمی کا رونا رونے لگیں۔ کھالا حسبِ مراتب اُن کا سواگت کرنے لگا۔ مجھے کھالے کا رویہ کھلتا تھا مگر وہ جواباً ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا، ''تم اِن لوگوں کو نہیں جانتے، میں جانتا ہوں۔ اِن کے ساتھ تمیز اور ادب کے ساتھ بات کرو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر رکھو تو سیدھے ٹیک رہتے ہیں اور کبھی پریشانی کا سبب نہیں بنتے۔''

چائے کا پیالہ حلق سے اُتارنے کے بعد کھالا اپنی 'پائلٹ سیٹ' پر بیٹھ گیا۔ اُس کی ڈرائیونگ نشست بھی عجوبہ تھی۔ سیٹ کا فوم بیٹھ گیا تھا اور سیٹ کی اونچائی کو برقرار رکھنے کے لیے کھالے نے اپنے گھر سے ایک سرہانہ اُٹھا کر یہاں رکھ دیا تھا۔ پھر سیٹ کی ٹیک بھی پیچھے کی طرف جھک گئی تو ایک سرہانہ وہاں پر بھی رکھنا پڑا۔ مہینوں تک نہ دھلانے کی وجہ سے دونوں سرہانوں کا اصل رنگ میل میں چھپ گیا تھا اور وہ سیاہ افیونی رنگت اختیار کر چکے تھے۔ سن ستر ماڈل کی فورڈ ویگن کی رفتار کی حد بھی بمشکل چالیس پچاس ہی تھی۔ کبھی یہ چاروں طرف سے بند ہوا کرتی تھی۔ باڈی گل کھپ گئی تو اس پر ملتان کے ایک باڈی میکر سے ڈالہ نما باڈی بنوا کر رکھ دی گئی تھی۔ یہ شتر غربہ ویگن دیکھنے کے لائق تھی اور اِس روٹ پر یقیناً ایسی ہی ویگن کی ضرورت تھی۔

بلوچ موڑ پر پہنچ کر کھالے نے پھر بریک لگا دیے۔ کچھ دیر گزری، ایک مسافر نے ویگن کے اندر سے ہی چلا کر کہا، ''کھالے اُستاد! دور دور تک کوئی سواری دکھائی نہیں دیتی، چلتے رہو۔''

کھالے نے اِک نگاہِ غیظ اُسے دیکھا اور مغرب کی جانب جاتی سرمئی سڑک پر نگاہیں ٹکا لیں۔ چند ثانیے بعد اُس نے آواز لگائی، ''شہرے! ذرا ٹائروں کی ہوا چیک کر لے۔ مجھے لگتا ہے کہ کنڈیکٹر سائیڈ والا ٹائر گڑبڑ کر رہا ہے۔''

میں اُس کی پیشہ ورانہ چالاکی کو سمجھ گیا۔ طوعاً و کرہاً ویگن کے پچھلے بمپر سے اُترا۔ باری باری چاروں ٹائروں کو ہاتھ سے ٹھونک بجا کر ہوا کی کمی کا جائزہ لیا۔ کچھ وقت یوں گزر گیا۔ کھالے

نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ مجھ سے رپورٹ لینے میں کچھ گھڑیاں بیت گئیں۔ ایسے میں اُس کی دعا کی قبولیت کی گھڑی آ گئی۔ دور مغرب میں کار کے آثار دکھائی دیے۔ چند ہی لمحوں میں کار بلوچ موڑ پر پہنچ گئی اور ڈرائیور ادھر اُدھر دیکھ کر کار کو مین روڈ پر چڑھانے لگا۔ کھالے نے میرے پہلو میں ٹہوکا دیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر کار کے پچھلے حصے میں جھانکا۔ ایک چاند گاڑی میں سمٹا دکھائی دیا۔ چند ثانیوں کے دیدار نے ہی مجھے باور کرا دیا کہ کھالے نے اسما کے بارے میں اَب تک جو بھی کہا تھا، وہ بکواس نہیں تھا، عین حقیقت پر مبنی اظہار تھا۔ چونکہ چند ثانیوں میں حسن کی محض ایک جھلک، سرخ و سپید رنگت اور وڈیرہ زادی کا کروفر ہی ملاحظہ ہوا تھا، اِس لیے اُس کے خال و خد بصارت میں ٹھہر نہ پائے۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مجھے اپنے عقب میں کھالے کے حلق سے پھوٹتی آہ کی صدائے موہوم سنائی دی اور میں بھاگ کر ویگن کے بمپر پر چڑھ گیا۔

کھالے نے شترِ بے مہار کی طرح ویگن کو سرپٹ دوڑایا مگر کھالے اور اسما کی حیثیتوں میں موجود فرق کی طرح دونوں گاڑیوں کی رفتار میں بھی زمین و آسمان کا فرق موجود تھا۔ ویگن کی باڈی سے مختلف اقسام کی آوازیں نکلنے لگیں۔ مسافر خوف زدہ ہو گئے۔ اُنہیں جو آیات اور وظائف یاد تھے، چند منٹوں میں اُنہیں پڑھ بیٹھے اور تیز رفتاری کے نقصانات پر بحث کناں ہو گئے۔

میں نے گردن باہر نکالی۔ ویگن کا سائیڈ مرر ٹوٹا ہوا تھا۔ آدھا آئینہ موجود تھا، آدھا غائب تھا۔ میں نے آدھے سائیڈ مرر میں جھانکا اور کھالے کو مخاطب کرتے ہوئے چیخ کر کہا، ''استاد! ہولی چل متاں گڈی سڑک اُتّے اِی کھلر جاوے.....''

کھالے نے پیر کا دباؤ کم کر دیا۔ قریشی موڑ پہنچ کر گاڑی اَڈے پر لگائی اور ہم دونوں ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ قریبی ہوٹل کے ہماچے (بڑی چارپائی) پر جا بیٹھے۔ میری ران پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر کھالے نے پوچھا، ''سنا بھئی شہرے! دیکھا اُسے؟''

میں نے کہا، ''ہاں..... دیکھ لیا۔''

''پھر؟'' اِک عجب شوق آمیز سوال اُس کے چہرے سے ہویدا تھا۔

''ڈکھ ہوا۔''

''کیوں؟''

''میرے بے وقوف یار نے اپنا دل ایسی جگہ پر لگایا جہاں مراد برآری کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''تمہاری اوقات دیکھ کر۔''

''کیا ہوا میری اوقات کو؟'' وہ جھلا کر بولا۔

''تم چاند کو دیکھ سکتے ہو، اُس کی خواہش کر سکتے ہو مگر اُسے کبھی بھی چھونے کی ہمت نہیں کر سکتے۔''

''کیا اِس لیے کہ میں غریب ہوں؟''

''نہ صرف غریب بلکہ خاندانی پس منظر اور شکل وصورت کے لحاظ سے اسما سے بہت کم تر ہو۔'' میں نے حق گوئی میں اُس کی دل آزاری کا دھیان نہیں کیا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر میری نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ چائے کا آرڈر دے کر اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، چند ثانیوں بعد بڑے مضبوط لہجے میں بولا، ''شہرے! میں اُسے حاصل نہیں کر سکتا مگر اُس کے دل کی دنیا کو زیر وزبر کر سکتا ہوں۔ دیکھ لینا، وہ کسی دن میرا نام لے کر آہیں بھرے گی، مجھے دیکھے گی۔ مجھے بس یہی چاہیے۔''

میں اُس کی حالتِ زار پر ہنس پڑا۔ اُسے رنج ہوا، بولا، ''ہاں! تم بھی مجھ پر ہنستے ہو۔ جب میں اسما کے بارے میں سوچتا ہوں تو میں بھی اپنی سوچ پر ہنسے بنا نہیں رہتا مگر عشق ذاتیں اوقاتیں نہیں پوچھتا، بس ہو جاتا ہے اور مجھے بھی اسما سے عشق ہو گیا ہے۔''

عشق ہر نوع میں ایسے ہی تند رَو ثابت ہوتا ہے مگر عشق کا ثمر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ کہیں گل و گلزار مہکتے ہیں، کہیں بادِ سموم چلتی ہے تو کہیں پر آگ کے جھلساوے مقدر ٹھہرتے ہیں۔ کھالا فطرتاً ضدی اور اَنا پرست واقع ہوا تھا۔ میرے سمجھانے سے سمجھنے والا نہیں تھا۔ مجھے ہی سمجھنا تھا کہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دینے میں ہی عافیت تھی۔ آنے والے کسی وقت میں اُسے شعور از خود عطا ہو جانا تھا۔

میں نے اُس کی توجہ بٹانے کے لیے شموں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ پوچھا، ''اسما کے چکر میں تم اپنی شموں کو بھول ہی گئے ہو۔ کیا اُسے پتہ ہے کہ تم نے اپنی راہ بدل لی ہے؟''

اُس نے نیم لاپروائی سے کہا، ''کبھی کبھی شکوہ کرتی ہے۔ میں نے اُسے سمجھا دیا ہے کہ میری اور اُس کی راہیں الگ ہیں اِس لیے مجھے نہ بلایا کرے اور نہ ہی تحفے بھیجا کرے۔''

''کیا شیرے قصائی کو تمہاری اُس عشق کہانی کا پتہ چل گیا تھا؟''

''اگر پتہ چل گیا ہوتا تو اپنے بڑے سے بغدے کے ساتھ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر چکا ہوتا اور اَب تک نور پور کے آلسی کتے میری بوٹیاں ہضم بھی کر چکے ہوتے۔'' اُس نے ہنس کر کہا۔

شیرا قصائی شموں کا باپ تھا۔ وہ بخشو لوہار کی ملحقہ دکان کے آگے گوشت کا پھٹہ لگایا کرتا تھا جبکہ اُس کا گھر کھالے کے گھر کے سامنے، جنوب مغربی جانب میں کرکٹ کے میدان کے پار واقع تھا۔ عام دیہاتی گھروں کی طرح شیرے قصائی کے گھر کی چہار دیواری بھی بلند نہیں تھی۔ صحن میں چلتی پھرتی ہوئی اُس کی بیوی اور بیٹی شمیم عرف شموں پکی سڑک پر کھڑے ہونے والے ہر فرد کو با آسانی دکھائی دیتی رہتی تھیں۔ کھالے اور شموں کا آنکھ مٹکا بھی اِسی دستیاب سہولت کے سبب شروع ہوا تھا جو ہوتے ہوتے اچھے خاصے پر جوش عشق میں بدل گیا تھا۔ اگر بیچ میں اسما کا معاملہ کھڑا نہ ہوا ہوتا تو اَب تک اُس عشق کی وارداتوں میں خاصا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ شموں کھالے کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ اُس نے اپنے اور کھالے کے مابین استوار ہونے والے جذباتی تعلق کو ازلی رابطہ سمجھ لیا تھا اور اُس کی ڈولی میں بیٹھنے کے خواب دیکھ رکھے تھے۔

میں نے آنے والے چند دن، جب تک شیدو تندرست نہیں ہوا، کھالے کے ساتھ گزارے اور پایا کہ اُس نے اپنی دل پھینک فطرت کو ایک ہی جستجو پر مرتکز کر دیا تھا۔ وہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اسما کے نام کا ہی ورد کرنے لگا تھا۔ وہ کھالا جو ہر واقعے میں حظ کے پہلو ڈھونڈا کرتا تھا اور ہر دِن کی گزران کے لیے نئی جہت تلاشتا تھا، بالکل بدل گیا تھا۔ اُس کی عادات میں نمایاں تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں۔ اُس کے حوالے سے میرا بھی اسما کے ساتھ ایک بے عنوان ربط استوار ہو گیا تھا۔

شیدو کے گھٹنے میں لگی ہوئی پھنسی کی آگ بجھ گئی اور میری جان اُس جاں کش ویگن سے بھی چھوٹ گئی۔

ماہ بھر کے بعد سردار وریام خان کی بیٹی کی شادی سرانجام پائی تھی۔ مجھ سمیت نور پور کے لڑکے بالے وریام خان کے دارے میں مجتمع تھے۔ وریام خان اور حیات خان اپنے روائتی

خاندانی لباس میں ہر ایک کو اُس کی ذمہ داری سمجھا رہے تھے اور بار بار تاکید کر رہے تھے کہ بارات کی آمد پر انتظامات بالکل بے داغ ہونے چاہئیں وگرنہ نور پور کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ ہمیں بخوبی احساس تھا کہ ایسے نازک موقع پر سردار حیات اور وریام خان کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کریں گے۔ اُن کے متوقع مہمان اُنہی کے ہم مرتبہ تھے یا اُن سے بھی اونچے شملے والے تھے۔ میں نے دیکھا کہ کھالے کا چہرہ کسی نامعلوم خوشی کے باعث دمک رہا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر کام کرتا دکھائی دیتا تھا۔ کبھی ٹرالیوں سے ٹینٹ، قناتیں اور شامیانے اتارنے والوں کے ساتھ ہوتا، کبھی دیگوں اور برتنوں کو سنبھالنے میں مشغول ہوتا تو کبھی اپنی کھٹارا ویگن کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان سودا سلف کی پرچی پر نظریں گاڑے منہمک دکھائی دیتا۔

میں نے چھیڑا، ''کیوں بھئی خالد محمود! آج کوئی خاص بات ہے؟''

اُس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے گھورا۔

''آج تم بڑے شوق سے شادی کے انتظامات میں جتے ہوئے ہو حالانکہ تم فطرتاً بیگار کو بیگار سمجھنے اور جان چھڑانے والے شخص ہو۔'' میں نے اُسے ٹٹولا۔

اُس کے گہرے سانولے رنگ پر کئی رنگ جھلملا گئے۔ میرے بہت زیادہ قریب ہو کر رازداری سے بولا، ''زنان خانے میں اسما آئی ہوئی ہے۔''

میں نے ایک طویل سانس حلق سے خارج کی۔ اس کی غیر معمولی خوشی کا سبب معلوم ہونے پر میں حیران نہیں ہوا تھا مگر مجھے بتائے جانے سے پہلے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''تم نے دیکھا ہے اُسے؟''

اُس نے بتایا، ''ہاں! میں اُسے دو تین مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔''

''کیسے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

اُس نے مجھے بازو سے پکڑا، ٹینٹ کے ایستادہ بانسوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے دارے کی مغربی دیوار کے پاس لے گیا اور دیوار کی جانب منہ کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ تب وہ روزن دکھائی دی جو اینٹ کے نکلنے سے دیوار میں پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے روزن پر آنکھ لگائی۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا، ''وہ دیکھو..... وہ بڑے برآمدے کے تیسرے ستون کے

ساتھ ٹیک لگائے کھڑی ہے۔''

میں نے دیکھا، کچھ لمحوں تک منظر پوری طرح آشکار نہیں ہوا، سُدھ مندی کے اُترتے ہی ستون کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑی اسما دکھائی دی۔ اُس کا منہ شمال کی جانب تھا اور روزن سے دیکھنے پر اُس کے چہرے کی ایک سائیڈ دکھائی دے رہی تھی۔ کھالے نے اچانک مجھے شانے سے دھکیل کر پَرے ہٹا دیا۔ خود آنکھ لگا کر چند لمحے دیکھتا رہا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا، ''میں اُسے یہاں سے دیکھتا ہوں کیونکہ سنتھے کی باڑ کی وجہ سے کوئی مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ نہیں سکتا۔ چلو، دارے کی طرف چلیں۔''

ہم دونوں دارے کے صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے ہم عمر، کچھ کم و بیش عمر والے، تفویض شدہ کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں سرگرداں تھے۔ آواز نیچی رکھتے ہوئے کھالا مجھ سے مخاطب ہوا، ''میں نے رات کو اسما کو ناچتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔''

''سچ؟'' میری حیرانی فزوں تر ہوگئی۔

''ہاں تو.....'' وہ اپنی آنکھوں کو پوری وسعت میں کھول کر بولا، ''وریام خان کی بیٹی کی مہندی کی رسم کا دھوم دھڑکا رات بھر چلتا رہا۔ باری باری سبھی لڑکیوں نے ڈانس کیا، ڈھولک بجی اور خوب دھما چوکڑی ہوئی۔ میں یہاں پانی چھڑکنے پر مامور تھا۔ پانی والا پائپ درست کرنے کے بہانے بار بار سنتھے کی باڑ کے پیچھے چلا جاتا اور روزن سے جھانک کر اُسے دیکھتا۔ اچانک لڑکیوں نے اُس سے ناچنے کی فرمائش کی۔ اُس نے پوری کی اور میں دُنیا سے بے خبر اُسے تھرکتے ہوئے دیکھتا رہا.....''

''کیا واقعی اُس نے ڈانس کیا؟''

''تو اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' وہ نیم خفگی سے بولا، ''یار کیا بتاؤں تمہیں؟ وہ جب ناچ رہی تھی تو یوں لگ رہا تھا جیسے پورا زمانہ اُس کا ساتھ دے رہا ہو۔ اُس کے بدن کی معمولی سی حرکت پر زمین حرکت میں آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُس نے سب سے عمدہ ڈانس کیا تھا۔''

وہ جھوٹ نہیں کہتا تھا۔ وہ اُس ذہنی سطح پر پہنچ چکا تھا کہ اُسے اسما کی معمولی اچھل کود بھی دنیا کا سب سے بہترین رقص محسوس ہونا چاہیے تھی۔

میں نے پُر اندیشہ لہجے میں کہا، ''اگر کوئی تمہیں چوروں کی طرح جھانکا تانی کرتے ہوئے

دیکھ لیتا تو؟''

''رات کے اُس سمے یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔''

علاقائی روایات کھالے کے لیے بہت بڑی رکاوٹ تھیں۔ وہ شادی کے پُرہجوم موقع پر بھی زنان خانے کا دروازہ عبور نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سرحد صرف سردار حیات خان اور وریام خان کے خاندان کے لڑکوں اور مردوں کے لیے کھلتی تھی۔ ہمیں بھی اگر کوئی کام ہوتا یا کچھ درکار ہوتا تو ہم اُنہیں کہتے۔ وہ زنان خانے میں جاتے اور ہماری مطلوبہ شے ڈھونڈ لاتے۔ جب دِن چڑھے نور پور والی سڑک پر شہنائیاں گونجیں، پٹاخے پھوٹے تب شاید کھالے کی قسمت بھی ہڑبڑا کر جاگ گئی۔ سردار وریام خان کا بڑا بیٹا، بہرام خان بھاگا ہوا دارے میں داخل ہوا۔ ہماری ٹولی پر نگاہ پڑی تو تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا۔ مجھے مخاطب کر کے بولا، ''شہرے! تم اندر جا کر بتاؤ کہ بارات آ گئی ہے۔ یہ بھی بتانا کہ پھول آخری کمرے میں سفید چادر کے نیچے چارپائی پر رکھے ہوئے ہیں۔''

وہ کافی جلدی میں تھا، حکم دے کر اُلٹے پیروں باہر کی طرف بھاگا۔ اُسے یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ اُن کے ہاں مہمانوں کی آمد کے بعد ہمارا زنان خانے میں داخلہ ممنوع قرار پایا تھا۔ میں نے قدم بڑھانا چاہے تو کھالے نے جلدی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کھالے کی آنکھوں میں ایک ہی التجا تھی۔ میں اُس کے بولنے سے پہلے ہی سمجھ گیا اور اُنہی پیروں تھم گیا۔ اُسے زنان خانے میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی ٹولی کے ہمراہ دارے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بارات کا شاندار استقبال ہوا۔ نور پور کی لڑکیوں نے بارات پر پھول نچھاور کیے۔ میں نے اِس موقع پر پہلی مرتبہ اسما کو بہ حسن و کمال دیکھا تھا۔ کھالا بھی وفورِ شوق سے اُسی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جب باراتی دارے میں بچھی ہوئی چارپائیوں اور لال پیلی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو اُن کی تواضع کا کام شروع ہو گیا جو ہمیں سونپا گیا تھا۔

جب کچھ فرصت ملی تو میں نے کھالے کو علیحدہ کر لیا، پوچھا، ''سناؤ بھئی مجنوں میاں! کیا رہا؟''

وہ بولا، ''اللہ تیرا بھلا کرے شہرے! تیرے طفیل آج مجھے اسما سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔''

میں نے اشتیاق سے دریافت کیا، ''وہ کیسے؟''

''زنان خانے میں داخل ہوتے ہی میں نے اسما کو تاڑ لیا۔ بس پھر کیا تھا، تیر کی طرح اس کے پاس پہنچا۔ براہِ راست، اسی کو بہرام خان کا پیغام دیا۔ اُس نے 'اچھا' کہا، اور ہاں شہرے! آج میں نے اُسے قریب سے دیکھا ہے۔ وہ تو بہت ہی سوہنی ہے۔ دور سے دیکھنے پر بھی خوب صورت لگتی تھی مگر نزدیک سے دیکھنے پر یوں محسوس ہوا جیسے عین آنکھوں کے بیچ چاند چمک اُٹھا ہو۔ اُس نے مجھے کہا کہ ''اب کھڑے کیوں ہو، جاؤ، اُسے کہہ دو کہ تمام انتظامات مکمل ہیں، ہم نے بارات پر گل پاشی کا اہتمام کرلیا ہے''..... پھر میں اُسے اپنی آنکھوں میں بسا کر لوٹ آیا۔''

''اُس نے اور کچھ نہیں کہا؟''

''نہیں تو.....''

''اکیلی تھی؟''

''نہیں۔ اُس کے ساتھ پانچ چھ لڑکیاں اور بھی کھڑی تھیں۔''

''انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا؟''

''نہیں۔''

نور پور کا مولوی نکاح پڑھانے میں مصروف تھا۔ کھالا مجھے پڑھانے میں مشغول تھا۔ عشق کی نگاہ سے دیکھے ہوئے محبوب کے حسن کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے وہ ماحول سے یکسر بے خبر دکھائی دیتا تھا۔ لباس، خوشبو، آنکھیں، زلفیں، چال..... اُس نے چند ہی منٹوں میں کس کس موضوع کو نہیں چھیڑا تھا۔ مولوی نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ ہم نے بھی اُٹھا دیے۔

کھالے نے کھسر پھسر کی، ''شہرے! میرے ہاتھوں میں اُسی کی تصویر سجی ہوئی ہے۔''

میں نے ڈانٹا، ''انسان بنو اور دعا کو غور سے سنو۔''

اُسے مولوی صاحب کی مانگی جانے والی دعا سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ آنے والے کئی دِنوں تک اِسی ملاقات کے حصار میں گم رہنے والا عاشق تھا۔ بارات آئی، بیٹھی اور چلی گئی مگر کھالے کی نگاہوں میں پَرَ اجما کر بیٹھی ہوئی محبوبہ نے پردۂ بصارت سے کبھی نہ اُترنے کی قسم کھالی تھی۔

رخصتی کے بعد شادی والے گھر میں خوشیوں اور پُر مسرت افراتفریوں کی جگہ ملال، اضمحلال اور تھکن نے لے لی تھی۔ عجیب اداس اور بے نام سی کیفیت میں لتھڑی ہوئی فضا دِل میں حبس پیدا کرنے لگی تو میں چپکے سے وریام خان کے دارے سے نکل آیا۔

وریام خان کے عین سامنے مشرقی سمت میں سردار بخت خان کی حویلی واقع تھی۔ وہ وریام خان کا سگا بھائی تھا مگر دونوں کے بیچ اختلافات اِس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ دشمنی کی واضح اور ناپسندیدہ فضا دونوں گھر پر مسلط ہوگئی تھی۔ سردار بخت خان اپنی بھتیجی کی شادی میں مدعو ہونے کے باوجود شریک نہیں ہوا تھا۔ شادی سے چند دن قبل وریام خان نے برادری کے رسم و رواج کے مطابق اُس کا 'میلہ' کیا تھا۔ اُس کے گھر میں سردار حیات خان، اپنی بیوی اور بچوں اور برادری کے چند معززین کو لے کر گیا تھا اور شادی میں شریک ہونے کی استدعا کی تھی مگر اُس نے سب کو ناراض کر کے گھر سے اُٹھا دیا۔ اُس نے رسماً بھی تو شادی میں شرکت کی حامی نہیں بھری تھی۔

میں نے نظر اُٹھا کر جاہ و حشم والی حویلی کو دیکھا۔ عجب یاسیت اور تنہائی کا احساس دل میں جاگزیں ہوگیا۔ بخت خان اپنے رویے اور خود ساختہ اصولوں کے باعث عملی طور پر نور پور میں بالکل تنہا ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی برادری کے ہم پلہ گھرانوں کے علاوہ، ہم جیسے درجہ دوم کے باسی بھی اُسے ناپسند کرتے تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے مرمریں ڈیرے پر کوئی پنچائت بیٹھی ہو، کوئی سائل یا فریادی آیا ہو یا کوئی مہمان آن ٹھہرا ہو۔ میرا بھی اُس کے ساتھ تعلق بس 'السلام علیکم' تک ہی محدود رہا تھا۔

وریام خان اور بخت خان کی حویلیاں گلی کے چوک میں غربی اور شرقی کونوں میں واقع تھیں۔ یہی گلی مشرقی سمت میں میرے گھر کی طرف جاتی تھی۔ بخت خان کے پچھواڑے پھوپھی کبریٰ کا گھر واقع تھا۔ اُس سے ملحقہ گھر لعل خان کی ملکیت تھا جبکہ لعل خان کی شرقی جانب میرا یعنی چاچے چراغ کا گھر واقع تھا۔ اپنے والدین کی زندگی میں ہم دونوں بہن بھائی اپنے گھر میں رہتے تھے جو وریام خان کی حویلی کے جنوب میں گلی کے آخر پر واقع تھا۔ وہ گھر اَبھی تک خالی پڑا تھا۔ چونکہ گھر کی تعمیر کچی اینٹوں اور چکنی مٹی کے ساتھ ہوئی تھی، اِس لیے وہ زمانہ بردگی کا شکار ہو چکا تھا۔ مناسب دیکھ بھال اور رہائش نہ ہونے کی وجہ سے اَب وہ گھر نہیں، کھنڈر دکھائی دینے لگا تھا۔

یہ کھنڈر مجھے پیارا تھا۔ یہ مجھے ایک ایسا اکساوا دیا کرتا تھا، جو بھری دُنیا میں مجھے کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ بے اختیار میرے قدم اُس طرف اُٹھنے لگے اور میں عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت لئے اپنے آبائی گھر کی طرف چل دیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ پہلو کی جیب میں گیا، نامراد

پلٹا، کیونکہ اِس سمے میرے پاس گھر کی چابیاں نہیں تھیں۔ ناچار مجھے اپنے کھنڈر نُما گھر میں جا کر یادوں کے اعادے کو اگلے دن پر موقوف کر کے اَدھ رستے سے پلٹنا پڑا۔

اگلے دن سہ پہر کو میں اپنے آبائی مکان کی طرف نکلا۔ سالخوردہ چابیوں کا گچھا میرے ہاتھ میں تھا جس میں کی رنگ کی جگہ سرخ رنگ کے کپڑے کا پٹی نما ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ حویلی کا بڑا چوبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ صحن میں ہر سُو ویرانی کا راج تھا۔ برسوں کی دھول کواڑوں اور تالوں پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ پر واقع آخری دروازے کا قفل کھولا۔ چرچراہٹ کی مخصوص آواز سنائی دی۔ چند ہی لمحوں بعد میں کمرے کے عین وسط میں کھڑا تھا۔ دائیں ہاتھ پر تین چارپائیاں ایک دوسرے پر رکھی نظر آ رہی تھیں جبکہ سامنے، دیوار کے ساتھ پیٹیاں اور پیٹیوں کے اوپر چند ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔

پیٹیوں اور ٹرنکوں پر میلی سی چادریں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے بائیں ہاتھ پر کمرے کی نکڑ میں چکنی مٹی کا بنا ہوا ایک بڑے سائز کا بھڑولا موجود تھا جس کے عین وسط میں ایک سوراخ تھا۔ سوراخ کا سائز محض اتنا سا تھا جس میں سے بمشکل ہاتھ کا انگوٹھا گزر سکتا تھا۔ میں اس بھڑولے کو، بھڑولے کے غیر روایتی سوراخ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں مٹی کا فرش اُکھڑا ہوا تھا اور میں اِس اکھاڑ کے پسِ منظر سے بخوبی آگاہ تھا۔

میں گرد میں اَٹی ہوئی چیزوں پر حسرت کناں نگاہ ڈال کر بھڑولے تک گیا اور اُس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سوراخ کے اندر جھانکا، سوائے اندھیرے کے کچھ دکھائی نہ دیا تو میں بھڑولے کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ میری حالت خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔ دل کی دھڑکن بھی حد سے متجاوز تھی۔ میرے دونوں ہاتھ بھڑولے کی نچلی کنارے پر ٹک گئے اور میں سسک سسک کر رونے لگا۔ کمرے میں میری سسکیاں آسیبی آوازوں کی طرح گونجنے لگیں مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ ایسے میں اچانک کمرے میں دہشت زدہ چیخیں گونجنے لگیں۔ میرے کانوں کے پردے پھٹنے کو آ گئے۔ میں نے بھڑولہ چھوڑ کر دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر سختی سے رکھ دیے مگر شاید یہ آوازیں باہر سے نہیں، اندر سے پھوٹ رہی تھیں جن کا کوئی علاج نہیں تھا۔

ہاتھوں کے لمس نے بتایا کہ میرا چہرہ میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ میں نے آنکھیں سختی سے بند کیں۔ اچانک ناک پر بڑے سے تل والا ایک بھیانک چہرہ اُبھر کر سامنے آ گیا۔ بھری ہی جانب اُٹھا ہوا، قدرے زمین کی طرف جھکا ہوا، بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ جسے

میں شاید زندگی کے آخری منظر کو دیکھنے تک فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

میں بدقت تمام اُٹھا اور دروازے کے دائیں ہاتھ پر دیوار میں بنی ہوئی الماری کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ یہاں عام استعمال کی اشیا کے نرغے میں ایک پرانی طرز کا چوبی فریم موجود تھا۔ اس طرز کے تصویروں والے فریم نور پور کے ہر گھر میں موجود تھے مگر اِس جیسا تو شاید دُنیا میں کہیں اور موجود نہیں تھا۔ میں نے قمیص کے اگلے پلو سے شیشے پر جمی ہوئی گرد صاف کی۔ ایک خوب صورت جوڑے کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر دکھائی دینے لگی۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھ کر حسین اور خوش دکھائی دیتے تھے۔ ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے ہو کر تصویر کھنچوانے کا مسرت آمیز ہیجان الوہی مسکراہٹوں کی صورت میں اُن کے چہروں پر ثبت تھا۔ عورت دلہن تھی، میری ماں تھی۔ مرد دولہا تھا، میرا باپ امام دین تھا جسے اُس کی خوب روئی کے غیر معمولی وصف کی بنا پر نور پور والے اُسے پیار سے 'سوہنا خان' کہا کرتے تھے۔

فریم میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میں نے گردن موڑ کر بھڑولے کو دیکھا۔ بھڑولے کے سوراخ کو دیکھا اور پھر میری نظریں بے اختیار اکھڑے ہوئے فرش پر جم گئیں۔ میرے ہاتھوں میں تھامی ہوئی تصویر کے حقیقی کردار اِسی فرش پر ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہوئے تھے۔ جہاں یہ بے ڈھنگا گڑھا سا دکھائی دے رہا تھا، وہاں دونوں کا خون ایک دوجے میں خلط ملط ہوا تھا۔ کیڑوں مکوڑوں نے خون کے ساتھ فرش کی مٹی بھی چاٹ لی تھی جس کی وجہ سے چکنی مٹی کے لیپ والا فرش اکھڑ گیا تھا۔ میں سست روی سے چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آ گیا۔ تصویر کو سینے سے لگا کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر جھکتے جھکتے زمین پر دراز ہو گیا اور پھر دیوانہ وار زمین کو جانوروں کی طرح چاٹنے لگا تھا۔ مٹی کا ذائقہ میرے دہن میں گھل گیا مگر مجھے اِس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

مجھے تو اپنی نمک آلود پانی ابلتی ہوئی آنکھوں کی بھی اُس سمے پروا نہیں تھی۔ میں کتنا رویا، کیسے رویا، کچھ خبر نہیں تھی۔ بہت دیر گزر گئی۔ شاید گھنٹے گزر گئے تھے جب میں شکست خوردہ انداز میں اس محشر بداں کمرے کو تالا لگا کر باہر نکل آیا تھا۔

میں اپنی حویلی سے دل گسل نکلا، گلی کے چوک میں کچھ دیر رُکا پھر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنے گھر سے بھی آگے نکل گیا۔ افسر علی کے گھر کی شرقی جانب پختہ کھال گلی کو کراس کرتا تھا۔ اُس پر پکی پلی بنی ہوئی تھی۔ میں پلی پر جا کھڑا ہوا۔ لہلہاتی فصلوں

سے ٹکرا کر آنے والی ہوا مجھے اپنے سحر میں لینے لگی۔ اپنی سرمستی میں مگن میرے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ میرا گاؤں بہت خوب صورت تھا۔ یہاں کے لوگ سادہ دل اور منافقانہ رویوں سے نسبتاً ناشناسا تھے۔

میں نے پلی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایستادہ دیسی کیکر کی ایک ٹہنی توڑی، اُس کے کانٹے توڑ پھینکے اور دانتوں میں کچلتے ہوئے کھال کے پختہ کنارے پر چلنے لگا۔ میرے بائیں ہاتھ پر سردار حیات خان کے ڈیری فارم کا اونچی چھت والا شیڈ تھا جبکہ دائیں ہاتھ پر تاحدِ نگاہ لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ فارم کا شیڈ حیات خان کی حویلی سے ملحق تھا۔ حویلی کی سیدھ سے آٹھ دس فٹ باہر کی طرف نکلا ہوا تھا جس کی وجہ سے کھال میں شیڈ اور حویلی کے اتصال پر پُل پڑا ہوا تھا۔ میں وہ موڑ عبور کر کے آہستہ روی سے چلتا ہوا حویلی کی عقبی سمت میں واقع نکے پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ میری اور کھالے کی مخصوص نشست گاہ تھی اور ہر لحاظ سے طویل اور رازدارانہ گفتگو کے لیے بہت موزوں تھی۔

مسواک کرتے ہوئے میں مسلسل آج سرانجام پانے والی شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ چند دِن پہلے تک پورے گاؤں میں خوشیاں اور مسرت کی عجیب کیفیات دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ بارات کے جاتے ہی جیسے ہر وجود پر غیر مرئی تھکن اُتر آئی تھی۔ رخصتی کے بعد میں نے سردار وریام خان کے سرخ وسپید چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ سارا رعب ودبدبہ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا، معدوم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ شکست خوردگی، بے بسی اور وفورِ حزن نے لے لی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اشک نہیں تھے مگر اُس کی ایک ایک ادا اشک بار تھی۔ اُس کی مونچھوں کے اکڑے ہوئے سرے بھی جھکے جھکے محسوس ہوتے تھے۔ ایک ہی وقت میں جب کوئی دِلاسا دے رہا تھا، کوئی فرض کی سرانجام دہی پر مبارک باد دے رہا تھا اور زنان خانے سے اُٹھتی سسکیوں اور آہوں کی آواز کانوں میں مسلسل روزن کاری کر رہی تھی، وہ مجھے نہایت عجیب لگا۔ جب ہر نوع کے جذبات ایک ہی وقت میں انسان پر یلغار کرتے ہیں تو شاید ایسی ہی ملی جلی عکاسی چہرے پر بکھر جاتی ہے۔

بخت خان کی لاپروائی اور سفاکی پر دل ایک پل کو بے چین ہوا۔ کیا تھا، اگر وہ اپنی بھتیجی کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے زنان خانے میں چلا جاتا۔ اختلافات اور عداوت تو اُس کی اپنے بھائی کے ساتھ تھی، اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کے ساتھ تو دشمنی نہیں تھی۔ شادی میں شریک ہو جاتا،

بھلے اپنے بھائی کو نہ بلاتا مگر جو ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ کر جا رہی تھی، اُس کی دل جوئی تو کر دیتا۔ شاید اُس کا خون سپید ہو گیا تھا، جذبات پر سنگیں خصلتیں اپنا تسلط جما چکی تھیں یا کیا تھا کہ اُسے رخصت ہوتی ہوئی بیٹی بھی اپنے پاس بلانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

میں کچھ دیر تک نکے پر بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر کھال کے پختہ کنارے پر چلتا ہوا شمال کی جانب واقع سرکاری ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ حیات خان کی حویلی کے ملحقہ مکانات کے بعد ناپختہ گلی تھی جس کی دوسری جانب ہسپتال کی سرکاری ہیئت والی عمارت واقع تھی۔ یہ کھال بنیادی مرکز صحت کے پچھواڑے سے گزر کر ایک لکیر کی صورت اختیار کر جاتا تھا اور دور گھنے درختوں کے جھنڈ میں گم ہو جاتا تھا۔

ہسپتال کی عقبی دیوار کا ایک بلاک بہت عرصہ پہلے گر چکا تھا جہاں سے میں بہ آسانی گزر کر کوارٹروں کے بیچ سے گزرتے ہوئے راستے پر پہنچ جاتا تھا۔ اِسی راستے کے دائیں طرف لان تھا جس کی نگہداشت میری عملداری میں تھی جبکہ بائیں ہاتھ پر ہسپتال کے عملے کیلئے ایک قطار میں تعمیر کیے گئے چار کوارٹر موجود تھے۔ ان میں سے ایک کوارٹر غیر آباد تھا جبکہ باقی تینوں میں ہسپتال کا عملہ رہائش پذیر تھا۔ لان کے ساتھ، اینٹوں کی اِس روش کے دائیں ہاتھ پر بھی تین کوارٹر ایک لائن میں بنے ہوئے تھے۔ ان تینوں میں قریبی گاؤں کے سیکنڈری سکول میں پڑھانے والے اساتذہ رہائش پذیر تھے۔ اُن کو دی جانے والی یہ ناجائز سہولت ڈاکٹر منور علی شاہ کی مرہونِ منت تھی۔

میں آہستہ روی سے چلتا ہوا ڈاکٹر شاہ جی کے کوارٹر میں داخل ہوا۔ توقع کے عین مطابق اُسے صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر نیم دراز ایک ضخیم کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پایا۔

وہ مطالعہ کا بے حد شائق تھا۔ فارغ وقت میں کوئی نہ کوئی کتاب اُس کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ تنخواہ لینے کے لیے جب بھی ضلعی ہیڈ کوارٹر، مظفر گڑھ، جاتا، دو چار نئی کتابیں اور رسائل کا پلندہ اُٹھا لاتا۔ جو کتاب اُس کے شوق کو سیراب کر لیتی، وہ مجھے عنایت ہو جاتی۔ میں ڈاکٹر شاہ جی کے اِس اصول کی پاسداری کیا کرتا تھا کہ جو کتاب پڑھ لیتا، کوئی وقت ضائع کیے بغیر واپس کر دیتا اور دوسری اُٹھا لیتا۔

قریب پہنچ کر میں نے اپنی موجودگی کی خبر دینے کی خاطر آہستگی سے کہا، ''ڈاکٹر شاہ جی! کس کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں؟''

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا، کتاب بند کی اور میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے کمرے سے دوسری چارپائی نکال لانے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے تعمیل کی۔

چارپائی پر بیٹھ گیا تو اُس نے پوچھا، ''دریام خان کی بیٹی کی شادی کیسی رہی؟''

''بہت اچھا انتظام تھا۔''

''پیسہ تو پانی کی طرح بہایا گیا ہوگا؟''

''جی! سردار لوگ شادی بیاہ کے موقع پر سدّھر اُتارتے ہیں۔''

''یہ سدّھر کیا بلا ہے؟'' وہ متحیر ہوا۔

''یہ مقامی زبان کا لفظ ہے۔ اِس کے معانی ہیں 'شوق پورا کرنا'' میں نے تفصیل سے بتایا، ''شادی کے موقع پر جب برادری اکٹھی ہوتی ہے تو ہمارے یہاں کے لوگ اپنی اوقات سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں اور اپنی سدھریں اُتارتے ہیں یعنی اپنے شوق پورے کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر اگر پیسہ پانی کی طرح نہ بہایا گیا تو برادری میں ناک کٹ جائے گی۔''

اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کی استہزائیہ لکیر کھنچ گئی۔ قدرے توقف کے بعد گویا ہوا، ''میں نے تعلیم حاصل کرنے کے دوران کسی نصابی کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ وہ ایک پنجابی زمیندار کی ایسی ہی سدّھروں اور نام نہاد رسومات کی ادائیگی پر لکھی گئی تھی۔ وہ اپنی سدّھریں پوری کرتے کرتے خود پورا ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، شادی بیاہ کے موقع پر لوگ اتنے فضول خرچ ہو جاتے ہیں کہ چند لمحوں میں ہی خون پسینے کے عوض حاصل کی گئی جمع پونجی کو بے دردی سے لٹا دیتے ہیں۔''

''شاہ جی! یہ کہاں خون پسینہ بہاتے ہیں؟'' میرا لہجہ طنز سے معمور تھا۔

''ہاں! مگر حلال کمانے والے بھی اِس موقع پر بھول جاتے ہیں کہ اُنھوں نے بڑی جانفشانی سے چند ٹکے جوڑ رکھے ہیں۔'' شاہ جی نے کہا اور میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

قدرے توقف کے بعد ڈاکٹر شاہ جی نے اپنی مخصوص بھرّائی ہوئی آواز میں کہا، ''شادی، انسانوں کا پوری ہم آہنگی کے ساتھ بقیہ زندگی مشترکہ طور پر گزارنے کے عہد کا نام ہے۔ اس میں دکھاوے اور زمانے کو اپنی امارت دکھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ معاشرے کی رگوں میں سرایت شدہ عدم مساوات کو آشکار کرنے کی ضرورت بھی تو نہیں دکھائی دیتی، پھر نہ جانے کیوں لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بنیادی ضرورت اِس امر کی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے اِس نئے تعلق کے

پسِ منظر میں دونوں کی کامل رضامندی شامل ہو۔ اِس پر توجہ نہیں دی جاتی بلکہ غیر ضروری معاملات کو خوشی کا ذریعہ سمجھ لیا جاتا ہے۔"

"آپ کے خیال میں شادی کا طریق کار کیا ہونا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی دانش بھری باتیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ مذہبی، سماجی یا معاشرتی، کسی بھی موضوع پر پوری دیانت داری اور غیر جانبداری سے بات کرتا تھا۔ لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ ہونے والی عالمانہ نشستوں، اُس سے لے کر پڑھی جانے والی کتابوں اور میری ذہانت نے میرے ذہن میں بے شمار معلومات اکٹھی کر دی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں محض گریجویٹ ہونے کے باوجود اپنی گفتگو کی سلاست اور روانی سے کسی طرح بھی ماسٹر سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اُس نے اپنے مخصوص گھمبیر لہجے میں کہا، "شہریار! دُنیا میں دو ہی خاندان آباد ہیں۔ ایک انسان، دوسرا انسان کا دشمن۔ انسان کے دشمن کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان نفرت، ناانصافی اور عدم توازن کے بیج بوتا رہے۔ چونکہ اِس خاندان کے افراد کے پاس لفاظی، بہروپ سازی اور جھوٹے دلائل کی اجلی شکلیں موجود ہیں، اِس لیے یہ اپنے مذموم مقاصد میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔ انسان بھولا بھالا اور سادہ لوح رہا جس کی وجہ سے انارکی، انتشار اور خون کے بے دریغ بہاؤ نے اُسے کبھی بھی آسودہ نہیں رہنے دیا۔ شادی کے موقع پر خوشی منانے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جتنی رقم عیاشیوں اور رسموں کی نام نہاد ادائیگی میں خرچ کی جاتی ہے، اُس کے برابر یا اُس سے نصف معاشرے کے غریبوں اور بے چاروں میں بانٹ دی جائے۔ جو جتنی زیادہ رقم بانٹے، اُتنا زیادہ امیر اور معزز کہلائے مگر انسانوں کا دشمن قبیلہ یہ نہیں چاہتا۔ کیونکہ اگر امراء ایسا کرنے لگ جائیں گے تو غریبوں کے پاس اُن سے نفرت کا کوئی جواز نہیں رہے گا اور معاشرہ مطمئن اور آسودہ ہو جائے گا۔"

چند لمحے لمبی لمبی سانسیں لیں، پھر سلسلۂ کلام جوڑا، "وریام خان، جس نے میرے اندازے کے مطابق لاکھوں روپے شادی پر ضائع کر دیے مگر اُس نے یہ نہیں سوچا کہ اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ وہ گاؤں کے کسی غریب گھر کی لڑکی کی رخصتی کا بھی اہتمام کر دیتا تو کیا بھوکا ہو جاتا..... اپنی بیٹی کے جہیز میں ایک غریب خاندان کی مخلصانہ دعائیں بھی شامل کر دیتا جو اُسے سدا خوش حال رکھتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر انسانوں کے دشمن قبیلے نے انسانوں کی سوچ اور عمل کو

یرغمال بنا رکھا ہے۔''

میں بڑی توجہ اور انہماک سے ڈاکٹر شاہ جی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دھیمے اور گھمبیر لہجے میں بڑی تلخ اور سفاک باتیں روانی میں کر جاتا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر بولا، ''تمہیں یاد ہوگا، جب شیرے قصائی کی بہن کا ہاتھ چارہ کاٹنے والی مشین میں آ کر کٹ گیا تھا اور اُس کا شوہر اُسے ہسپتال میں لے آیا تھا، یاد ہے ناں؟..... تب ہسپتال میں روائتی دوائیں موجود تھیں مگر وہ دوائیں موجود نہیں تھیں جن کی ضرورت تھی۔ شیرے کی بہن کی معاشی حالت ایسی تھی کہ وہ ایک وقت کی دوا بھی خرید نہیں سکتی تھی۔ مجھے ترس آیا، میں نے اپنے ڈسپنسر کو بھیج کر تین دنوں کی دوا اپنی گرہ سے منگوالی کیونکہ اُن دنوں ہسپتال میں ایل پی (لوکل پرچیزنگ) کی سہولت موجود نہیں تھی۔ دوا کا استعمال ایک ماہ کے لیے ناگزیر تھا۔ میرے کہنے پر شیرے کا بہنوئی اپنی بیوی کو لے کر وریام خان سمیت نور پور کے سبھی خانوں کے گھروں میں گیا تھا۔ دو چار ہزار کی بات تھی، لاکھوں کا معاملہ نہیں تھا اور فاطمہ نے تو اپنی تمام عمر اِن لوگوں کی خوشامد کرنے، ان کے گھروں کے کام کاج کرنے میں گزار دی تھی۔ کیا تھا کہ چار ٹکے اُس کی خدمت کا عوضانہ سمجھ کر دے دیے جاتے۔ کسی نے نہیں دیے۔ اُس کا زخم خراب ہوگیا اور اُسے ڈی ایچ کیو میں داخل کرانا پڑا۔ جب میں فاطمہ کو لے کر مظفر گڑھ کے ہسپتال کی طرف روانہ ہوا تو میرے اور فاطمہ کے علاوہ ساتھ چلنے والا بھی کوئی نہیں تھا..... پھر؟ وریام خان کی بیٹی کی رخصتی پر مجھے کیا خوشی ہو، فاطمہ اور اُس کے خاندان کو کیا مسرت ہو، مگر یقیناً وہی فاطمہ اپنے ایک ہاتھ کے ساتھ وریام خان کے زنان خانے میں پھرکی کی طرح پھرکتی ہوئی دکھائی دیتی ہوگی۔ ایسا ہی ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ بات کرتے کرتے نڈھال سا ہوگیا تھا۔ وہ گاہے بگاہے مجھے انسانوں کے بیچ میں پلنے والی بے عنوان نفرت اور عدم تعاون پر مبنی رویوں کے بارے میں متعلقہ واقعات سناتا رہتا تھا اور اپنے آپ میں کڑھتا رہتا تھا۔ پورے گاؤں میں اُس کا میں ہی سامع تھا اور بارہا تجربے سے ثابت ہوا تھا کہ میں بہت اچھا سامع تھا۔

اُس نے موضوع بدل دیا ''کافی دِنوں سے خالد محمود دکھائی نہیں دے رہا، کہیں گیا ہوا ہے؟''

''وہ کئی دن وریام خان کے دارے پر، شادی کے کام کاج میں مصروف رہا ہے۔'' میں نے

بتایا۔

''حیات خان کی ویگن چلا رہا ہے؟''

''جی! اچھی دیہاڑی بن جاتی ہے اُس کی۔''

''وہ اگر ویگن چلانے کی بجائے اپنے باپ کے کام کاج کو سنبھال لے تو کہیں زیادہ بچت متوقع ہے۔''

میں نے بلاوجہ ہنس کر کہا، ''اُسے اپنے باپ دادا کے کام سے نفرت ہے۔''

''اُس کی احمقانہ سوچ پر تعجب ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا، ''کسی کی نوکری سے اپنا کاروبار بہرحال بہتر ہوتا ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے، خاموش رہا، پھر بولا، ''آپ شادی میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟''

''میں ایسی محفلوں سے کتراتا ہوں۔''

''کیوں؟'' میرے منہ سے بے ساختہ برآمد ہوا۔

اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کچھ کہہ نہ پایا۔ کوٹھی کے مرکزی دروازے پر اچانک شور بپا ہو گیا۔ شور میں نسوانی آواز نمایاں تھی۔ ہم دونوں اَبھی معاملے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ فاطمہ، جس کا تذکرہ ہمارے درمیان کچھ دیر پہلا چھڑا تھا، دوپٹے سے بے نیاز بھاگتی ہوئی صحن میں گھس آئی۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پھولی ہوئی سانس میں بدقت تمام بولی، ''ڈاکٹر جی! وہ..... حویلی میں چلو..... وہ..... وہ بیمار ہو گئی ہے.....''

''کس حویلی میں؟ کون بیمار ہے؟ ذرا دم لے کر بتاؤ تو کچھ سمجھ آئے۔'' ڈاکٹر شاہ جی نے نامانوس کوفت زدگی کے عالم میں کہا۔

میں چارپائی سے اُترا اور اُس کے قریب ہو کر بولا، ''کون بیمار ہوا ہے ماسی فاطمہ؟''

وہ ایک ذرا تھم گئی، گردن میں دوپٹے کی موجودگی کو بھانپا اور نہ پا کر شرمسار سی ہو گئی، بولی، ''خان صاحب دی مہمان (مہمان) بیمار تھی گئی اے..... پٹ میں بڑا سخت مروڑ اُٹھا ہے بے چاری کے، دوہری ہو گئی۔ ڈاکٹر جی! فوراً میرے ساتھ چلیں، خان صاحب بڑے پریشان ہیں۔''

''کون خان صاحب؟'' ڈاکٹر شاہ جی کے تیور بدل گئے۔

''اپنے خان صاحب، وریام خان..... بلوچ نگر سے شادی پر اُن کے ہز مان (مہمان) آئے ہوئے تھے۔ اُن کی بچی.....''

ڈاکٹر شاہ جی نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور تلخ لہجے میں بولا، ''تم منہ اُٹھا کر میرے پاس دوڑی چلی آئی ہو، جاؤ، اپنے خان صاحب سے کہو کہ مریضہ کو گاڑی میں بٹھا کر ہسپتال لے آئیں۔''

''آپ اگر.....''

''جو میں نے کہا، اُس پر عمل کرو، جاؤ اور مریضہ کو یہاں لے آؤ۔'' ڈاکٹر شاہ جی نے نیم بر انگیختہ لہجے میں کہا اور منہ پھیر لیا۔ فاطمہ الٹے قدموں دوڑتی ہوئی کوٹھی سے نکل گئی۔ ایسے میں پتہ چلا کہ اُس کے ساتھ چند عورتیں اور بھی آئی تھیں جو دروازے پر ہی ٹھہر گئی تھیں۔

میں نے شکوہ کناں انداز میں ڈاکٹر شاہ جی سے کہا، ''شاہ جی! اگر دو پل کے لیے وریام خان کی حویلی پر چلے جاتے تو کچھ بگڑنے والا تو نہ تھا۔''

اُس نے ایک نگہِ عجب مجھ پر ڈالی، کچھ سوچا، پھر استہزائیہ انداز میں مسکرا کر کہا، ''شہریار! دُنیا ایسی ہی ہے۔ میں اگر اپنے پیروں پر چل کر کسی مریض کے پاس جاؤں گا تو میرا کچھ بگڑ نہیں جائے گا مگر میں صرف اور صرف غریب اور بے کس لوگوں کے لیے اپنی توانائیاں خرچ کرتا ہوں۔ خصوصاً وہ جن کے پاس مریض کو ہسپتال لانے کے لیے سواری کا انتظام نہیں ہوتا۔ وریام خان کے پاس کار ہے۔ وہ چاہتا تو فاطمہ کے یہاں پہنچنے سے پہلے مریضہ کو یہاں تک لا سکتا تھا مگر وہ محض اپنی بڑائی کو حیثیت دینے اور نور پور والوں کو یہ سمجھانے کے لیے مجھے بلا رہا ہے کہ وہ مجھے بلانے کی قدرت رکھتا ہے۔''

''شاہ جی! آپ کے نہ جانے سے مریضہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ناں کہ وریام خان کو۔'' میں اپنے مؤقف پر بضد رہا۔

وہ بولا، ''چھوڑو اِس تذکرے کو، کیا تم نے فاطمہ کے رویے پر غور کیا ہے؟''

میں نے کہا، ''ہاں! وہ بے چاری سخت پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس سے بات کرنی بھی مشکل ہو رہی تھی۔''

''ہاں..... مگر وہ پریشان کس کے لیے تھی؟ اُن لوگوں کی اولاد کے لیے جنہوں نے اُس کے کٹے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر نخوت سے منہ پھیر لیا تھا۔ زخم خراب ہو گیا، بدبو آنے لگی تو اُس پر

اپنی حویلی کے دروازے بند کر لیے اور اپنے بچوں کو اُس کے گھر جانے سے منع کر دیا تھا..... اُنہی لوگوں کے لیے وہ ننگے پاؤں، ننگے سر دوڑی چلی آئی..... شہریار! یہی خامی معاشرے کے سدھار میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جھٹلانے اور ٹھکرانے والے کو ٹھکرایا جائے، بے عزت کرنے والے کو بے عزت کیا جائے تو وہ اپنی اوقات میں لوٹ آتا ہے۔ ٹھوکروں کی زد میں رہ کر بھی خوشامدیں کی جائیں، جھوٹی سچی تعریفیں کی جائیں تو وہ انسانی مقام سے پھسل کر فرعونیت کی پستی میں لڑھکنے لگتا ہے۔''

مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کون بیمار ہوا تھا؟ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی بات سنی، کچھ اتفاق ہوا، کچھ اختلاف بھی رہا مگر میں شاید اِس وقت اِس بحث کا متحمل نہیں تھا، بولا، ''میں میڈیکل کٹ لے آؤں؟''

کٹ ہسپتال کی مرکزی عمارت میں، ڈاکٹر شاہ جی کے دفتر میں پڑی رہتی تھی۔ ڈیوٹی کے اوقات کے بعد ضرورت پڑنے پر میں مقفل ہسپتال کو کھول کر اُسے اُٹھا لایا کرتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں یہ کام ہسپتال کا چوکیدار سرانجام دیتا تھا۔

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دی اور میں چابیاں اُٹھا کر کوٹھی سے نکل آیا۔

میں کٹ نکال کر ہسپتال کی سیڑھیاں اُتر ہی رہا تھا کہ کھلا مین گیٹ عبور کر کے وریام خان کی کار ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوئی۔ میرے قریب پہنچ کر کار کی عقبی کھڑکی سے وریام خان نے جھانک کر دبنگ لہجے میں کہا، ''اوئے شہرے! ڈاکٹر کتھاں ہے؟''

''اوئے شہرے! ڈاکٹر کہاں ہے؟''

میں نے کوارٹر کی طرف اشارہ کیا، ''ڈاکٹر صاحب اپنی کوٹھی پر ہیں۔''

اُس نے 'ہونہہ' کہہ کر سر اندر کر لیا اور کار بائیں طرف مڑ کر کوٹھی کی طرف تیز رفتاری سے بڑھ گئی۔ مجھے وریام خان کے چہرے پر خفگی کے آثار مترشح دکھائی دیے تھے اِس لیے میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر شاہ جی کی خیر نہیں۔ اُس نے وریام خان کی حکم عدولی کی تھی اور اَب اُسے اپنے اس عاقبت نااندیش رویے کی سزا بھگتنا تھی۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا کار کے پیچھے پیچھے کوٹھی کے دروازے تک پہنچا۔ وریام خان کار سے اُتر کر مجھ سے مخاطب ہوا، ''اندر ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا وہ اکیلا ہی رہتا ہے؟''

میں نے کہا، ''جی خان جی! آپ اندر آ جائیں۔''

میں دروازہ عبور کر کے کھلے صحن میں آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کو چارپائی پر بدستور مطالعے میں غرق پایا۔ میں نے گلا کھنکار کر اُسے متوجہ کیا، ''شاہ جی! خان جی آئے ہیں، آپ سے ملنے کے لیے۔''

اُس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں وریام خان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہمارے قریب پہنچ گیا۔ خشمگیں آنکھوں سے ڈاکٹر شاہ جی کو گھورتے ہوئے اکھڑ لہجے میں بولا، ''فاطمہ قصائین تمہیں بلانے کے لیے آئی تھی۔''

ڈاکٹر شاہ جی نے کتاب بند کر دی، چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، قدرے لاپروائی سے بولا، ''ہاں! آئی تھی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ مریضہ کو یہاں لے آئے۔ مریضہ کی بجائے آپ تشریف لے آئے۔ خوش آمدید!''

''میں نے تمہیں کسی دعوت پر نہیں، مریضہ کو دیکھنے اور اس کا علاج کرنے کے لیے بلا بھیجا تھا۔ چلو میرے ساتھ اور بچی کو دیکھو..... اُس کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔'' وریام خان کے لہجے کا اشتعال برابر مستزاد ہوتا جاتا تھا۔

میں نے آہستگی سے کہا، ''چلیں ڈاکٹر شاہ جی! چند منٹوں کی تو بات ہے۔''

شاہ جی نے ایک نگہِ سرزنش مجھے دیکھا، پھر وریام خان کو مخاطب کر کے بولا، ''اپنا لہجہ درست کریں۔ میں آپ لوگوں کا ملازم نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کا رعب و دبدبہ برداشت کرتا ہوں۔ آپ جس گاڑی میں آئے ہیں، اُسی گاڑی کی ایک سیٹ پر مریضہ کو بٹھا کر لایا جا سکتا تھا۔ اَب براہِ کرم جائیں اور اُسے یہاں لے آئیں۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ہاں! کبھی خدانخواستہ ایمرجنسی ہوئی تو آپ کو لینے کے لیے آنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔''

شاہ جی کے لہجے میں غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم میرے ساتھ نہیں چل رہے؟'' وریام خان نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''یقیناً نہیں..... وقت ضائع مت کریں اور مریضہ کو یہاں لے آئیں۔ یہ ہسپتال ہے، یہاں ضرورت کی تمام دوائیں اور آلات موجود ہیں، وہاں کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔''

وریام خان ایسے جواب کا عادی نہیں تھا۔ اُس کی صورت چند لمحوں میں ہی بگڑ کر رہ گئی۔ قدم بڑھایا، آنکھیں دکھائیں اور دانت پیس کر بولا، ''تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔''

''مجھے ایسی کوئی مجبوری لاحق نہیں ہے خان صاحب!'' شاہ جی کا لہجہ بدستور لاپروائی سے پُر تھا۔

میں ایسی صورتِ حال میں پہلی مرتبہ اُس کا شخصی استحکام ملاحظہ کر رہا تھا جو میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔

عین ممکن تھا کہ وریام خان اپنی سرشت کے مطابق ڈاکٹر شاہ جی پر حملہ آور ہو جاتا مگر خیر گزری کہ کوٹھی کے دروازے میں جھانک کر ڈرائیور نے باآوازِ بلند کہا، ''خان جی! چھوٹا خان بی بی کو اپنی کار میں لے آیا ہے، کیا اُسے اندر بلا لوں؟''

وریام خان مشتعل سانپ کی طرح پھنکار کر پلٹا، چیخا، ''میں ڈاکٹر کو لے کر حویلی میں آ ہی رہا تھا، تم لوگوں نے کیوں 'مز مان بی بی' کو تکلیف دی۔''

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر شاہ جی کے لبوں پر مخصوص زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر میڈیکل کٹ چارپائی پر رکھ دی۔ ڈھکن کھول کر اُس میں موجود آلات اور ادویات کو دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی معیت نے مجھے ڈسپنسر بنا دیا تھا۔ پٹی کرنا، ٹیکہ لگانا اور چھوٹے موٹے امراض کی تشخیص و علاج پر مجھے قدرت حاصل ہو چکی تھی۔ مجھے علم تھا کہ پیٹ درد کی مریضہ کو سپاس ردِ انجیکٹ کرنا ہوگی، اِس لیے میں نے فوری طور پر مطلوبہ امپیول توڑ کر سرنج میں بھر لیا۔

بہرام خان اور فاطمہ قصائین سہارا دے 'بی بی' کو اندر لے آئے۔ میں نے بی بی کو دیکھا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ اسما تھی جسے میں نے گزشتہ شب میں بالکل تندرست اور چہکتے کودتے دیکھا تھا۔ اِس وقت اُس کی حالت واقعی بہت زیادہ خراب تھی۔ اُن کے ساتھ آئے ہوئے دوسرے افراد کوٹھی کے باہر رہ گئے جبکہ وریام خان کا ڈرائیور بھی سر جھکائے کوٹھی سے نکل گیا۔ اَب وریام خان، اُس کا بیٹا، فاطمہ قصائین، میں اور ڈاکٹر شاہ جی چارپائی پر لٹائی گئی اسما کے چہار اطراف میں کھڑے تھے۔

وریام خان نے مجھے مخاطب کر کے کہا، ''اوئے شہرے! تم بھی جا کر باہر ٹھہرو۔''

میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سرنج میڈیکل کٹ کے کھلے ڈھکن پر رکھی اور سر جھکا کر

جانے لگا۔ ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے روک لیا، ''تم کہاں جا رہے ہو، اِدھر آؤ، میری مدد کرو۔''

میں رُک گیا۔ چابی بھرے کھلونے کی طرح جس کی اچانک چابی ختم ہوگئی ہو۔ اُس کے ہاتھ کے اشارے پر مریضہ کے قریب ہوگیا۔ وہ اسما سے کیس کی ہسٹری لے رہا تھا۔ کیا کھایا، کب کھایا اور درد کہاں محسوس ہو رہا ہے، وغیرہ۔

میں، دانت بھینچ کر کراہتی اور تڑپتی اسما کو دیکھ کر بلاوجہ بے چین ہو رہا تھا۔ مجھے اُس پر ترس آ رہا تھا۔ وریام خان بھی مضطرب تھا۔ بار بار دریافت کر رہا تھا، ''خطرے کی بات تو نہیں؟''

ڈاکٹر شاہ جی کوئی جواب دیے بغیر اپنے کام میں مشغول رہا۔ پیٹ کو ٹٹولتے ہوئے بولا، ''شہریار!''

''جی شاہ جی!''

''فورسی سی سپاس رِڈ.....انجیکٹ ہَر آئی وی پلیز۔''

میں نے سرعت سے سرنج اُٹھائی۔ وریام خان کے بیٹے بہرام خان کو مخصوص طریقے سے اسما کا بازو سختی سے پکڑایا اور کپڑا ہٹا کر انگلی کی مدد سے ورید کو اُبھارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری یہ کوشش غیر ارادی اور نافہمیدہ تھی کیونکہ اسما کے بازو کی نیلگوں رگیں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوئی پرک کی۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ اُس کے چہرے پر پڑی۔ وہ نیم سراسیمگی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایک ثانیے کو ہماری نگاہیں چار ہوئیں، پھر میں نے اپنی توجہ انجیکٹ ہونے والی دوا کی طرف مبذول کر لی۔

ایک عجیب طرح کی نامانوس ہیجان خیز کیفیت مجھ پر اُتر آئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے مزید دو انجیکشن ملا کر ماس میں لگانے کا حکم صادر کیا۔ میں تعمیل میں مشغول ہوگیا مگر میرا ذہن گلاب کے پھول کی طرح نرم و ملائم بازو کے لمس پر اٹک کر رہ گیا۔ شاہ جی کے حکم پر میں نے اَن گنت لڑکیوں اور عورتوں کے بازوؤں میں ٹیکے لگائے تھے مگر آج تک کسی بھی لمس میں اتنی جاندار گرفت اور خطرناک تندی نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے بازو کے اوپر والے حصے میں سوئی چبھوتے ہوئے میرے ہاتھوں میں واضح ارتعاش موجود تھا۔

ٹیکہ لگانے کے بعد ارادتاً زیادہ دیر تک شانے کو سہلاتا رہا پھر پیچھے ہٹ گیا۔ دس منٹ کے دورانیے میں اسما شانت ہوگئی۔ اُس کے چہرے کی غیر معمولی سرخی کم ہوتی گئی اور اگلے پانچ دس

منٹ میں وہ چارپائی میں اُٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے پوچھا، ''جی بیٹا! کیا محسوس کرتی ہو؟''

اُس نے بے ساختہ پیٹ پر ہاتھ پھیرا، ہونٹوں کو زبان سے نم کیا اور بولی، ''درد ہے تو سہی مگر بہت کم ہے، چلوں پھروں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تو اللہ کا نام لے کر چلو پھرو اور اپنے ڈاکٹر انکل کے سرکاری گھر کا وِزٹ کرو۔'' شاہ جی کے چہرے پر کبھی کبھار دکھائی دینے والی معصوم سی مسکراہٹ دمکنے لگی۔

''انکل! پہلے کبھی اتنی شدت کا درد نہیں ہوا تھا۔''

''پریشانی کی بات نہیں ہے بیٹا! کھانے پینے میں بے ضابطگی اور کھانے کے اوقات میں تبدیلی کی وجہ سے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ دیگوں میں تیز مصالحے والا سالن تیار کیا جاتا ہے۔ معدہ ایسے کھانے کا عادی نہیں ہوتا، اِس لیے جسم کی طرف سے شدید نوعیت کی مزاحمت دیکھنے میں آتی ہے۔'' ڈاکٹر شاہ جی نے تفصیل سے بتایا۔

یہ پُر تضاد شخص مجھے قدم بہ قدم حیران کرتا رہتا تھا۔ سمجھنے کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اُسے آج تک سمجھ نہیں پایا تھا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کس بات پر خوش ہوگا، کس پر ناراض اور کس بات پر خاموش رہے گا۔ اُس کے ردِعمل کا قبل از وقت اندازہ کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ وریام خان کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے والا، اُس سے بڑا اور کہیں زیادہ مضبوط دکھائی دینے والا ڈاکٹر منور، اسما کے مقابل، معصوم بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ چہرہ اندرونی آسودگی کے گل رنگ عکس سے مالا مال تھا۔

میں اس کے پہلو میں چارپائی کی پائنتی کی جانب بیٹھا چور نگاہوں سے کسی تتلی کی مانند کمرہ کمرہ گھومتی اسما کو دیکھتا رہا۔ وہ پوری کوٹھی کو دیکھ بھال آئی اور فاطمہ کے قریب کھڑی ہو کر بولی، ''چلیں؟''

''تم اَب بالکل ٹھیک ہو ناں؟'' وریام خان اَبھی متفکر تھا۔

''جی انکل..... میں فٹ ہوں۔'' وہ بولی۔

وریام خان کھڑا ہو گیا۔ جاتے جاتے رُک کر پلٹا، چبھتی ہوئی نگاہیں ڈاکٹر شاہ جی پر گاڑ کر بولا، ''تم نے اچھا نہیں کیا۔ ساگر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنے والا اَوکھ (مشکل) میں پڑ جاتا ہے۔''

شاہ جی نے جواباً مسکرا کر کہا، ''مگر مچھ کو بھی محتاط رہنا چاہیے۔ بدہضمی کی صورت میں اُسے

اپنے معالج کے پاس ہی آنا پڑتا ہے جو علاج کے بہانے اُس کے نوکیلے دانت بھی کھینچ سکتا ہے۔"

"نوکر، نوکر ہی ہوتا ہے خواہ سرکار کا ہی کیوں نہ ہو۔ سیانے کہتے ہیں کہ نوکری کر کے پیٹ پالنے والے کو اکڑ زیب ہی نہیں دیتی۔" وریام خان کے لہجے سے عیاں دھمکی کو میں بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

"ہاں..... ٹھیک کہتے ہیں آپ، مگر آپ کو شاید علم نہیں کہ میں نے فاقہ کشی کو پہلے ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ رہی بات نوکری کی، تو آپ لوگوں کے اختیار میں فقط اتنا ہے کہ میل جول کر کے میرا اِس ہسپتال سے کسی اور ہسپتال میں تبادلہ کروا سکتے ہو۔ جی مانے تو تبادلہ کروا دو۔ میں جہاں بھی جاؤں گا، ایسی ہی کوٹھی اور ہسپتال میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اَن گنت غریب اور دو چار فرعون میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔" شاہ جی کے لہجے میں تلخی آمیز لاپروائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ "ہاں! یہ ممکن ہے کہ یہاں میری جگہ پر آنے والا ڈاکٹر اپنی رہائش شہر میں ہی اختیار رکھے۔ ڈیوٹی کے بعد ہسپتال میں آپ لوگوں کو ایک آدھ شیر مار کہ گولی دینے والا بھی نہیں ملے گا۔"

"شاید تمہیں علم نہیں ہے کہ تمہارے پاس لائی جانے والی کون ہے وگرنہ تم اتنا اونچا نہ بولتے..... ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"میں واقعتاً نہیں جانتا مگر یقیناً یہ آپ کی عزیزہ ہے۔ یہ نور پور کی رہنے والی نہیں ہے۔"

"یہ سردار حیدر خان کی بیٹی ہے۔ حیدر خان کو تو تم جانتے ہوگے۔ ہیں؟" وریام خان کا لہجہ بپھرا ہوا تھا۔

"شاید آپ بلوچ نگر والے سردار حیدر خان کی بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں! میں اُسی کی بات کر رہا ہوں۔ اگر اُسے تمہاری ہٹ دھرمی کا پتہ چل گیا تو وہ تمہیں کھڑے پیر نوکری سے نکلوا دے گا۔" وریام خان کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

زہر خند مسکراہٹ ڈاکٹر شاہ جی کے لبوں پر تیر گئی۔ اُس نے اپنے تئیں سردار وریام خان کی دھمکی کا مکمل اور مختصر جواب دے دیا تھا جو اپنے مفہوم انگیز متن کے ساتھ وریام خان سمیت ہر شخص پر آشکار ہو گیا تھا۔

وریام خان کا بیٹا اپنے باپ سے آنکھوں ہی آنکھوں میں صورتِ حال سے آگہی مانگنے

لگا۔ باپ نے جواں سال بیٹے کو دیکھا اور پھر دھیمی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کوٹھی سے نکل گیا۔ اسما نے ڈاکٹر شاہ جی کو سلام کیا، اجازت چاہی اور مسکرا کر کہا، ''انکل! ویٹ فارمی، آئی شیل کم بیک سُون!''

''او کے مائی سن! آئی کیئر اباؤٹ یو.....'' ڈاکٹر نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اسما نے ایک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ سلام، شکریہ یا کچھ اور..... بہرحال کچھ مفہوم آمیز تاثر اُس کی آنکھوں سے ایک ثانیے کو ہویدا ہوا تھا پھر اُس نے وریام خان کی تقلید میں قدم بڑھا دیے۔ گاڑیوں کے دروازے بند ہونے، گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے اور چلے جانے تک میری نگاہیں کوٹھی کے کھلے دروازے کے خلا پر جمی رہیں۔ اسما کے لہرا کر نکلنے کا آخری منظر کئی ساعتوں تک ٹھہرا رہا، پھر ہولے ہولے تحلیل ہو گیا۔

دُور سے ملنے والی، حسن کی ایک جھلک پر جینے والا کھلا اگر میرے ساتھ ہوتا یا میری جگہ پر ڈاکٹر شاہ جی کو اسسٹ کر رہا ہوتا تو یقیناً اسما کے دروازے سے نکلتے ہی اینٹوں کے بے فرش پر ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ اُس کے جنون کو دیکھتے ہوئے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ حسن کے دیدار کی اتنی طویل مہلت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

دن دھندلا گیا۔ شام اُتر آئی۔ میدان صاف ہونے پر شاہ جی نے مجھے بانہہ سے پکڑ کر اپنے پاس بیٹھا لیا، سمجھایا، ''شہریار! پڑھنے سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں بارہا سمجھایا کہ کسی بھی انسان کو فرعون بنانے میں مرکزی کردار اُس کے اردگرد بسنے والے لوگ ہی ادا کرتے ہیں۔ کوئی از خود اتنا بڑا غیر فطری بہروپ اختیار نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مریضہ کون ہے، یہ ضرور جانتا تھا کہ اس کے لیے نور پور کا بپھرا ہوا خانزادہ دیوانگی کی ہر حد عبور کر سکتا ہے مگر یہ ضروری تھا کہ اُسے ہسپتال میں لایا جاتا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو نور پور کے غریبوں کے دل پر اس کی مزید دھاک بیٹھ جاتی کہ جو ڈاکٹر کسی کو سیدھے منہ بلانا پسند نہیں کرتا، وہ خان کے ایک ہی بلاوے پر سر کے بَل دوڑا چلا آیا۔ میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتا۔ غریب اپنے پیروں پر چل کر میرے پاس آتا ہے تو امیر کو بھی ایسا کرنا ہوگا۔ اُسے یہ رعایت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی کار پر سوار ہو کر میرے پاس آ سکے۔ میں سوائے ناگزیر حالت کے، کسی کے گھر نہیں جاؤں گا۔''

''خان زادی بیمار بھی تو تھی ناں!'' میں نے ہولے سے کہا۔

''بیمار تھی مگر اتنی نہیں کہ وریام خان کی حویلی سے ہسپتال تک نہ پہنچ سکتی۔ تم نے دیکھا، یہاں کی دیہاتی غریب عورتیں کس طرح اپنے لاغر اور بیمار بدنوں کو اپنی طاقت سے گھسیٹتے ہوئے مجھ تک پہنچ جاتی ہیں۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں؟ کیا اُن کے بدنوں میں سرایت کرتے ہی بیماری اپنی نوع اور شکل بدل لیتی ہے؟ نہیں شہریار! ایسا نہیں ہے۔ مجبوری سب کچھ کرواتی ہے۔''

گفتگو میں کچھ توقف آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی خاموش رہا، پھر بولا، ''تم نے نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے کہ شہروں میں امیر زادیاں ائرکنڈیشنڈ گاڑی پر شاپنگ مال جاتی ہیں۔ اپنے ملازموں کی مدد سے شاپنگ کرتی ہیں۔ اُن کے انتخاب کو شاپنگ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ملازم سامان اُٹھا کر ڈگی میں ڈالتے ہیں، اُتارتے ہیں اور جب وہ گھر پہنچ کر گاڑی سے قدم زمین پر رکھتی ہیں تو بے ساختہ اُن کے مونہوں سے نکلتا ہے کہ 'ہائے گاڈ! آج تو تھکن کے مارے بُرا حال ہو گیا ہے'..... پھول اُٹھاتی ہیں، کلائی میں بل آ جاتا ہے۔ بالوں کا گجرا گردن تھکا دیتا ہے۔ مہنگے جوتے ایڑیاں مسل دیتے ہیں۔ یہاں کیا ہوتا ہے؟ ایک عورت جس کی فزیبلٹی عین وہی ہے، منہ اندھیرے مویشیوں کو چارہ ڈال کر دودھ دوہتی ہے اور پورے گھر کو ناشتہ کرواتی ہے۔ برتنوں کی دھلائی سے فارغ ہوتے ہی کھیتوں میں چلی جاتی ہے۔ سارا دن کپاس چنتی ہے، چارہ کاٹتی ہے، گوڈی کرتی ہے اور گھر واپس آ کر شام کا کھانا تیار کرتی ہے۔ رات گئے سونے کے لیے لیٹتی ہے تو اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے کہ 'اللہ سوہنا! سِدھ کریں'..... گھر والا مونچھوں کو بل دے کر کہتا ہے کہ 'سارا دن پڑی اینڈتی ہو، ہڈ پیر ہلا لیا کرو تو نیند جلد آ جایا کرے گی'..... یہ فرق وہی ہے جو انسان دشمن قوتوں نے ہر دو انسانوں کے بیچ حائل کر دیا ہے۔ اِسے ختم کرنے کا اَب ایک ہی طریقہ ہے کہ جو تنہا ہونا چاہتا ہے، اُسے تنہا کر دیا جائے۔ بس!''

میں ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ منہ پھٹ انسان تھا، بدتمیز، لگی لپٹی کے بغیر سیدھی بات کہہ دینے والا، اپنے دل میں غریبوں کے لیے کتنا نرم گوشہ رکھتا تھا۔ شاید کسی فاقہ مست و خاک بسر کا دل امیر زادے کی پسلیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے میڈیکل کٹ میں سامان ترتیب کے ساتھ سمیٹا اور کٹ بغل میں دابے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی سے نکل آیا۔

کھال کے نکے پر کھالے کو براجمان پایا۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا اِدھر آن نکلا تھا۔ اُسے شاید

اسما کی بیماری کا علم نہیں ہوا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا، ''کل بارات چار بجے واپس روانہ ہوئی تھی۔ پانچ بجے تک سبھی مہمان بھی رخصت ہو گئے مگر میں اپنی دکان کے باہر بنچ پر بیٹھا رہا۔ خواہش تھی کہ اُس کی ایک جھلک دیکھ لوں مگر شاید خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر گئی ہی نہیں۔ مایوس ہو کر میں گھر جا کر لیٹ گیا۔ آج بھی سارا دن دکھائی نہیں دی۔''

''تو کیا تم نے آج کام سے چھٹی کی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یار! گاڑی کو بڑی محنت سے خراب کرنا پڑا تھا۔''

''کیا اسماء کو ایک مرتبہ قریب سے دیکھنے کے بعد بھی دیکھنے کی حسرت تمہارے دل میں موجود ہے؟'' میں نے چھیڑا، ''تم نے مجھے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر خدا ایک بار اُسے قریب سے دیکھنے کا موقع دے دے، آئندہ اُس کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔''

''ابھی تو پتہ چلا ہے کہ وہ کتنی خوب صورت ہے۔'' وہ شرارت آمیز بے ایمانی سے بولا، ''میرے کانوں میں اَبھی تک اُس کی آواز گونج رہی ہے۔ اُس کی آواز اُس سے بھی زیادہ خوب صورت ہے شہرے!''

''اُس نے گانا گایا تھا؟''

''ہاں تو..... مہندی والی رات اُس نے ڈانس کرنے کے ساتھ ساتھ گانا بھی گایا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے.....''

میں نے شرارت سے ٹوکا، ''جیسے ساری کی ساری دُنیا یک لخت گنگنانے لگی ہو..... ہے ناں؟''

اُس نے ہرگز برا نہیں مانا، بولا، ''ہاں یار! اُس کی آواز بڑی سریلی تھی۔ کسی بھی گلوکارہ کی آواز اُس کے جتنی خوب صورت نہیں ہے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، پوچھا، ''اُس نے کون سا گیت گایا تھا، یاد ہے؟''

''میں تھال مہندی دا چائی کھڑی ہاں..... میں تاں پھلاں والی سیج سجائی کھڑی ہاں.....''

اُس نے اپنی بھونڈی آواز میں سر لگانے کی کوشش کی تو میں بہ صد کوشش بھی اپنے حلق سے برآمد ہونے والے قہقہے کو روک نہیں پایا۔

ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں امیر نواز کی آواز گونجی، ''ابے کیوں حلق پھاڑ کے ہنس

رہے ہو؟ منہ بند کرو ورنہ میرے سبھی ڈھور ڈنگر (مویشی) پریشان ہو جائیں گے۔''

میرا خون چہرے کی رگوں میں سمٹ آیا۔ میں نے ارد گرد دیکھا مگر امیر نواز دکھائی نہیں دیا۔ گردن موڑ کر عقب میں دیکھا۔ تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر کھال کے خم کے عین اوپر ڈائری فارم کے شیڈ کے غیر معمولی بڑے روشن دان میں سے جھانکتا ہوا امیر نواز کا چہرہ دکھائی دیا۔ عافیت کی سانس حلق سے خارج ہوئی۔ اتنی دور کھڑا ہونے والا ہماری گفتگو یقیناً سن نہیں پایا تھا۔ میں نے کھالے کو دیکھا۔ اُس کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

میں نے اونچی آواز میں کہا، ''سردار کی گائیں بھینسیں جنوں بھوتوں سے نہیں ڈرتیں، میری آواز سے کیا پریشان ہوں گی۔ تم بتاؤ! اِس وقت شیڈ میں کیا کر رہے ہو؟''

''ڈاکٹر مہدی ویکسین لگانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ اُس کے ساتھ ہوں۔'' امیر نواز نے کہا اور اُس کا جھانکتا ہوا چہرہ غائب ہو گیا۔

''شکر ہے، اُس نے ہماری گفتگو نہیں سنی۔'' کھالے نے کہا۔

''نہ سنتے ہوئے بھی سمجھا گیا ہے کہ آئندہ یہاں بیٹھ کر راز کی باتیں مت کرنا۔ شیڈ میں کھڑا ہونے والا ہماری بات چیت نہیں سن سکتا مگر حویلی کی اِس دیوار کے پار کھڑا ہو کر سننے والا قیامت ڈھا سکتا ہے۔ سچ کہتے ہیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ سمجھ گیا، بولا، ''آئندہ ہم یہاں بیٹھ کر اِس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔''

میں نے کہا، ''ہمیں یہ تذکرہ کہیں بھی چھیڑنا نہیں چاہیے۔''

اُس نے سر جھکا لیا مگر آنے والے دنوں میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اُس مہ جبیں کے ذکر سے پہلو تہی پر قادر نہیں تھا۔ جہاں بھی ہم دونوں ملتے، اسا ہماری ساعتوں میں اور بساطِ گویائی پر آن براجمان ہوتی۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہوا کہ حیات خان کی حویلی کے پچھواڑے کی عمومی نشستوں میں وہ غیر حاضر ہو گئی اور میری خواہش کے باوصف کبھی بھولے سے بھی ہمارے درمیان نہیں آئی۔

ایک دوپہر میں، جب میں اپنے کھیت کو پانی لگا رہا تھا، کھالا مست چال چلتا ہوا میرے پاس آن پہنچا۔ بشرے سے برہمی ٹپک رہی تھی جس کی وجہ سے اُس کی سنولائی ہوئی رنگت میں مزید گہرا پن شامل ہو گیا تھا۔ میں نے کسی زمین پر رکھ دی اور پوچھا، ''خیریت تو ہے نا؟''

وہ میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ

اُس کا رویہ میرے لیے ناشناسا تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولا، ''مجھے توقع نہیں تھی کہ تم ایسا کرو گے۔''

''کیا مطلب؟ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے جو تم یوں منہ پھلا کر بات کرنے لگے ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے ناں کہ میں اسما کو کتنا چاہتا ہوں؟'' اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''ہاں..... میں تمہاری بے وقوفیوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔''

''یہ بے وقوفی نہیں ہے.....'' وہ جز بز ہوا۔

''عقل مندی سہی، آگے بولو!'' میں نے کہا۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ وہ بیمار ہو کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس لائی گئی تھی جہاں تم نے اُسے ٹیکے بھی لگائے، اُس کو غور سے دیکھا بھی اور.....''

میرے لبوں سے قہقہہ ابل پڑا، ''کیا اور؟''

''تم نے اُسے چھوا، اُس کا بازو تھاما اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' اُس کی شکل دیدنی تھی۔

میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں کہا، ''یار کھالے! مجھ سے واقعی غلطی ہوگئی۔ اصل میں میرے نزدیک یہ کوئی اہم واقعہ نہیں تھا۔ شاید اِس لیے کہ اسما کے بارے میں جو خیالات اور جذبات تمہارے دل میں جگہ بنائے بیٹھے ہیں، وہ میرے دل میں نہیں ہیں، میں نے تو اِس واقعے کو عام نوعیت کا ہی سمجھا تھا۔ اُس وقت میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی پر بلالوں، مگر اتنی مہلت ہی نہیں تھی۔''

اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر وَٹ (پگ ڈنڈی) پر بٹھا دیا۔ خود میرے پہلو سے جُڑ کر بیٹھ گیا۔ بڑے اشتیاق سے بولا، ''اچھا! چلو یہ بتاؤ کہ وہ کیسی ہے؟''

''وہ پیٹ کے درد کے مارے دوہری ہو رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات دوہری ہوتی جا رہی ہو.....''

وہ میری شرارت کو بھانپ گیا۔ شکایت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا، ''یار! سیدھی طرح بتاؤ ناں!''

''میں کیا بتاؤں کہ وہ کیسی ہے؟'' میں نے کہا، ''جس وقت وہ ڈاکٹر جی کے پاس لائی گئی تھی، اُس وقت اُس کا چہرہ تکلیف سے بگڑا ہوا تھا۔ چارپائی پر لیٹی بل پر بل کھا رہی تھی۔''

''تم نے اُسے ٹیکے بھی تو لگائے تھے ناں!''

''ہاں!'' میں نے اُس کے تجسس کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

''پھر؟''

''کیا پھر؟''

''پھر بتاؤ ناں کہ وہ کیسی تھی؟'' وہ زِچ ہو کر بولا۔

''تم نرے جاہل اور گنوار ہو۔ میں کیا بتاؤں کہ وہ کیسی تھی۔ جیسی نور پور کی دوسری لڑکیاں ہیں، وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ ناک، کان، آنکھیں، ہاتھ اور پیر..... سب لوگوں کے ایک جیسے ہی تو ہوتے ہیں۔'' میں اُسے ستانے کے اِس سنہرے موقع کو گنوانے کے حق میں نہیں تھا۔

وہ مجھ پر شکایت بھری نگاہ ڈال کر خاموش ہو گیا۔ سائیڈ والی جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی۔ اپنے مخصوص انداز میں سگرٹ سلگائی، لمبا کش پھیپھڑوں میں اُتارا اور دھواں اگلتے ہوئے بولا، ''اچھا یار! تیری مرضی۔ ویگن کی خرابی کا بہانہ بنا کر بڑی مشکل سے تم تک پہنچا ہوں۔ مجھے آج ہی اسما کے بیمار ہونے کی کہانی شموں کی پھوپھی نے سنائی۔ تم نہیں سمجھ سکتے، مجھے تم پر کتنا غصہ آیا تھا۔ اگر تم اُس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں تمہاری درگت بنا دیتا مگر میں کملا ہوں ناں! میں جھلا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ تم میرے یار نہیں ہو سکتے کیونکہ تم اُسی خاندان کے پڑھے لکھے فرد ہو۔ میں جاہل ہوں، کمین ہوں اور ویگن کا دیہاڑی دار ڈرائیور ہوں۔ تمہاری یاری ڈاکٹر شاہ جی سے ہو سکتی ہے، امیر نواز سے ہو سکتی ہے یا کسی بھی خانزادے کے ساتھ تمہاری جوڑی سج سکتی ہے، میرے ساتھ نہیں.....''

اُس کے چہرے پر افسردگی اور اضمحلال کے واضح پرتو جھلملانے لگے۔ یہ اُس کا پرانا ہتھکنڈا تھا۔ میں اُس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات کو بہ نظرِ احتیاط دیکھتا رہا، پھر قہقہہ مار ہو گیا۔ اُس کے شانے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا، ''بکواس بند کرو اور میری طرف منہ کر کے اپنی محبوبہ کے حسن کے قصیدے سنو.....''

وہ جھٹ سے میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا، ''یار شہرے! ٹھیک ٹھیک اور آسان لفظوں میں بتانا۔''

میں نے اُسے فاطمہ قصائین کی اطلاعی آمد سے لے کر وریام خان کی دھمکیوں تک، من و عن بتا دیا۔ وہ بڑے انہماک سے سنتا رہا، پھر میرے خاموش ہونے پر بے ساختہ بولا، ''دوسروں کو چھوڑو، اسما کے بارے میں بتاؤ۔''

''تو اَب تک کیا تیرے باپ کا قصہ لیے بیٹھا رہا ہوں؟'' میں نے تپ کر کہا۔

''میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ لوہا کوٹتے ہوئے دیکھا ہے، اُسے چھوڑو، جس کے بارے میں میں پوچھ رہا ہوں اُس کے بارے میں بتاتے رہو۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے اُس کی فرمائش اور نا وقت آمد کی غرض و غایت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسما کے نین و نقوش، چال ڈھال اور حرف بہ حرف گفتگو کی بساط بچھا دی۔ ڈاکٹر شاہ جی سے مستعار مانگ کر پڑھی ہوئی کتابوں نے میری قوتِ بیان کو خاصا مہمیز کر دیا تھا جس کا میں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ گاہے بگاہے مجبور عاشقِ نامدار، خالد محمود عرف کھالے کے ہاتھ میں کسی تھما کر کیاریوں میں پانی بھی بدلوایا۔ اُس نے کسی مزاحمت کے بغیر میرے احکامات کی تعمیل کی کیونکہ میں ہر حکم سے قبل اپنے تقریظی بیان کو پُر تجسس نقطے پر روک دیتا تھا۔ یوں جیسے پی ٹی وی والے ڈرامے کو کسی ایسے پارٹ پر روک دیتے تھے جو آئندہ قسط دیکھنے کے شوق کو تجسس کی پنچ لگا دیا کرتا تھا۔

میرا بیان ختم ہوا ہی تھا کہ وہ بے ساختہ بول پڑا، ''کیا اُس نے میرے بارے میں پوچھا تھا؟''

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ جز بز ہو کر بولا، ''ہاں! اُس نے ڈاکٹر شاہ جی سے کہا تھا کہ اُس کے پیٹ میں درد خالد لوہار عرف کھالے کو دیکھنے کی وجہ سے پڑا ہے۔ وہ میرا ماں جایا ہے، اُسے پکڑ کر فوراً میرے روبرو پیش کیا جائے۔''

وہ شرمسار سا ہو گیا اور دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔

میں نے کہا، ''ڈاکٹر شاہ جی نے وریام خان کی پھوت پھات کے ٹائر میں سے ہوا ایسے نکالی تھی کہ وہ جاتے ہوئے بھی 'شوں شوں' کر رہا تھا۔ دھمکی دے کر گیا ہے کہ وہ سردار حیدر خان کو ڈاکٹر کے ناروا رویے کے بارے میں بتا دے گا۔''

کھالے نے کندھے اُچکائے، ''سردار حیدر خان اُسے چٹکی بجانے کی دیر میں نوکری سے نکلوا دے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔''

''وہ کیوں؟''

''میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر شاہ جی کے پیچھے بھی کوئی بہت بڑا آدمی موجود ہے۔ دیکھو کھالے! کوئی بھی شخص، جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، وریام خان جیسے وڈیرے کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کرسکتا۔ اُس نے تو نہ صرف اونچی باتیں کی ہیں بلکہ اُس نے وریام خان کی دھمکیوں اور لال پیلے چہرے کی بھی پروا نہیں کی اور نہ ہی سردار حیدر خان کے نام سے ہراساں ہوا۔ وہ مجھے کہتا رہتا ہے کہ یہ نام نہاد وڈیرے اور خان محض بھوکے چیونٹے ہیں۔ اِنہیں پیروں تلے مسل دیا جانا چاہیے۔ یہ بظاہر بہت مضبوط مگر درحقیقت انتہائی بزدل اور خوف زدہ لوگ ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ ان کے ملبوسات اُجلے اور کلف لگے ہیں مگر اِن کے اندر گناہوں کی دلدلیں، خوف کی سلوٹیں اور بے ایمانیوں کے ان گنت داغ لگے ہوئے ہیں۔''

''پڑھا لکھا ہے ناں! پڑھے لکھے لوگ تو کتابی باتیں کرتے ہیں۔ کتابیں محض بغلوں میں دَبی رہتی ہیں اور وریام خان جیسے وڈیرے بانہیں کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔'' کھالے نے اپنی دانست میں بڑے پتے کی بات کی تھی۔

انہی لوگوں کی مسلط کردہ لاقانونیت اور غیر اخلاقی اقدار نے واقعتاً کتابیں تھامنے والی بانہیں کاٹ رکھی تھیں اور کتابوں میں لکھے قوانین، ضابطوں، اخلاقی پیرائیوں اور مذہب کے ہر ہر جملے کی تفسیر پر استہزائیہ قدغنیں لگائی تھیں۔ معاشرے کی آسودگی اور بھائی چارے کے بدن پر وہ چرکے لگائے تھے جن سے لحظہ بہ لحظہ ناسور پھوٹتے تھے، خون رستا تھا اور تکلیف کا احساس دنیا و مافیہا سے بے خبر کیے رکھتا تھا۔ سردار حیدر خان کے بارے میں پورا علاقہ جانتا تھا کہ جس پولنگ اسٹیشن میں اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اُس بستی کے لوگوں کی شامت آجایا کرتی تھی۔ وہاں بجلی کی بندش، پٹواری کا پُر عداوت رویہ، بستی کے سرکاری ملازمین کے آئے روز دُور افتادہ علاقوں میں تبادلے اور تھانہ کلچر کی ہٹ دھرمیاں معمول بن جایا کرتی تھیں۔ وہ بہت منتقم مزاج فطرت کا مالک ہے۔ معمولی نوعیت کی حکم عدولی پر بھی برافگختہ ہوکر انسانیت کی حدیں عبور کرنے پر تل جاتا تھا۔ کھالا ٹھیک کہتا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی کا علم اور غریب پرور رویہ کسی دن اُس کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گا۔

''اسمانے اور کچھ کہا تھا؟'' کھالا پھر عشق پٹڑی پر چڑھ گیا۔

''ہاں!'' میں نے کہا، ''اُس نے جاتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی سے کہا تھا کہ وہ کبھی اُس سے

ملنے کے لیے آئے گی۔''

''کب؟''

''جب اُس کا جی چاہا۔''

''ڈاکٹر شاہ جی نے پھر کیا کہا؟''

''انگریزی میں کچھ کہا تھا، مجھے سمجھ نہیں آیا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تم مجھے بتانا نہیں چاہتے ہو۔''

''یہی کہا ہوگا کہ ٹھیک ہے، جب جی چاہے، آجانا۔'' میں نے جان چھڑانا چاہی۔

''کیا وہ واقعی ہسپتال میں آئے گی؟'' کھالا پُر اشتیاق تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ضرور آئے گی۔''

''تم دھیان رکھنا، جب بھی آئے، مجھے ضرور بتانا۔''

''اگر اس وقت تمہارا جہاز قریشی موڑ کے اڈے پر لینڈ کر چکا ہوا تو کیسے اطلاع کروں گا؟'' مجھے اُس پر ترس آیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر مصنوعی لاپروائی سے بولا، ''چلو! بعد میں بتا دینا۔''

''یہی کہ وہ کیسی ہے؟''

''بکواس مت کرو۔ اَب میں چلتا ہوں، کافی دیر ہوگئی ہے۔''

اسما کا ذکر تمام ہوتے ہی کھالے کو اپنی ویگن اور اڈے پر بیٹھی ہوئی سواریاں یاد آ گئیں جو اُسے کوس رہی ہوں گی۔ تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میرا کام بھی ختم ہونے والا تھا۔ آخری کیارے میں پانی تھا۔ پانی باندھنے کے لیے میرا 'وارہ شریک' کالا بزدار کسی کندھے پر رکھے نکے پر کھڑا تھا اور ہاتھوں کے اشاروں کنائیوں سے مجھے میرا وقت ختم ہونے کی اطلاع دینے لگا تھا۔

سردار وریام خان اپنے ذہن میں عدو کے انگارے بھر کر ہسپتال سے نکلا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق اُن انگاروں کا تمام تر سینک سردار حیدر خان تک پہنچ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہفتہ کے دِن شام کو پانچ کے لگ بھگ ہسپتال کا چوکیدار خادم حسین بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے کہا، ''ڈاکٹر صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔''

''خیریت تو ہے؟'' میں نے عام سے انداز میں استفسار کیا کیونکہ چوکیدار عمومی طور پر مجھے

بلانے کے لیے میرے گھر آیا کرتا تھا۔ بعض اوقات کسی پیشنٹ کی آمد پر ڈسپنسر یا کوئی بھی معاون ڈاکٹر صاحب کے پاس موجود نہیں ہوتا تھا تو مجھے بلا لیا جاتا تھا۔

خادم نے کہا، ''ذرا جلدی کرو، بڑے صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔''

میں متعجب ہوا، ''کون بڑے صاحب؟''

''ڈی ایچ او صاحب!'' اُس نے قدرے تامل سے کہا۔

میں اُس کے ساتھ ہی ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کے باہر پختہ اینٹوں کی روش پر سرکاری جیپ کھڑی دکھائی دی۔ میں سبز نمبر پلیٹ والی اس سفید جیپ کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر عرفان حمید کو بھی جانتا تھا جو ضلعی آفیسر تھا اور دو تین مرتبہ ہسپتال کا عمومی معائنہ کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔

میں صحن میں براجمان ضلعی افسر کے سامنے رُکا اور سلام گو ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور ضلعی افسر کے علاوہ دو تین اور بھی افراد چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جن سے فرداً فرداً سلام لینے کے بعد میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

شاہ جی نے کہا، ''یہ نوجوان اُس وقت یہاں موجود تھا جب ایم پی اے صاحب کی بیٹی کو یہاں لایا گیا۔ یہ اُس وقت بھی یہیں تھا جب اُس کی بیماری کی اطلاع دینے اور وریام خان کا حکم سنانے کے لیے فاطمہ نامی عورت بھاگتی ہوئی آئی تھی۔''

سبھی لوگ میری طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر عرفان حمید نے اپنی غیر محسوس مونچھوں کو چھیڑتے ہوئے کہا، ''ہاں بھئی جوان! کیا نام ہے تمہارا؟''

میں نے کہا، ''شہریار!''

''کیا کام کرتے ہو؟'' لہجہ حاکمانہ سا تھا۔

''میں کاشت کاری کرتا ہوں۔''

''کیا جب ڈاکٹر منور علی شاہ کو وریام خان نے بلوایا تھا تو تم یہیں تھے؟''

''جی سر! میں اُس وقت یہاں موجود تھا۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''مجھے تفصیل سے پورا واقعہ سناؤ۔''

میں اپنی دانست کو بروئے کار لاتے ہوئے داستان گوئی کرنے لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر یہ احتیاط برتی کہ میرا بیان کسی بھی لحاظ سے ڈاکٹر شاہ جی کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔

میرے خاموش ہونے پر ڈاکٹر عرفان حمید نے کہا، ''کیا مریضہ کی حالت بہت زیادہ خراب تھی؟''

میں نے کہا، ''نہیں سر! وہ اپنے پیروں پر چل کر آئی تھی۔ لاڈلی ہونے کی وجہ سے اُس نے ماسی فاطمہ کا سہارا لے رکھا تھا۔ معمولی نوعیت کی بدہضمی تھی، ہیضہ نہیں تھا اور نہ ہی حالت خراب تھی۔''

ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی نے اپنے مخصوص سنجیدہ، گھمبیر اور بے نیازانہ لہجے میں کسی کو بالخصوص مخاطب کیے بغیر کہا، ''میرا خیال ہے کہ میری پوزیشن واضح ہو چکی ہے۔ میں نے پہلے بھی اپنے تحریری بیان میں بجا طور پر لکھا ہے کہ میں ڈیوٹی اوقات کے بعد مریضوں کو دیکھنے اور ان کا علاج معالجہ کرنے کا پابند نہیں ہوں۔ چونکہ میں یہاں رہائش پذیر ہوں اور میں نے کوئی کلینک نہیں بنا رکھا، اِس لیے بطور انسانی ہمدرد، مریضوں کا معائنہ کرتا ہوں اور اُنہیں ابتدائی طبی امداد دیا کرتا ہوں۔ میں نور پور کے کسی بھی گھر میں خواہ وہ سردار حیات خان کا ہو یا وریام خان کا، جانا پسند نہیں کرتا۔ رہی بات مجھ پر دباؤ ڈالنے کی یا ایم پی اے کے نام پر دھمکانے کی، تو پورے وثوق سے عرض گزار ہوں کہ مجھے اِس کی ہرگز پروا نہیں ہے۔ میرا تبادلہ کیا جائے تو بھی میری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں! یہ ضرور کہوں گا کہ اگر مجھے نور پور سے ٹرانسفر کیا جائے تو کسی ایسے بی ایچ یو میں بھیجا جائے جہاں کی متعلقہ کمیونٹی میں سردار اور خان قسم کے فرعون موجود نہ ہوں وگرنہ آپ کو پھر انکوائری اور تبادلے کی زحمت سے دوچار ہونا پڑے گا۔''

''شاہ جی! کیا آپ اپنے آپ کو تھوڑا بدل نہیں سکتے؟'' ڈاکٹر عرفان حمید کے لہجے میں منت اور ناگواری کا ملا جلا تاثر موجود تھا۔

''کیا میں نے کچھ غلط کیا؟''

''یہ غلط رویہ ہی تو ہے شاہ جی! آپ اپنی کمیونٹی کے معزز اور معروف لوگوں کو ہمیشہ ناراض رکھتے ہیں۔ سردار حیدر خان نے میرے آفس میں پہنچ کر میری انسلٹ کی ہے۔ دیکھیں ناں! اگر آپ وریام خان کے بلانے پر دو گھڑی کے لیے اُس کی حویلی میں چلے جاتے تو کیا قیامت آ جاتی؟ علاج تو آپ نے یہاں بھی کیا، وریام خان سے منہ ماری الگ ہوئی، کیا فائدہ ہوا؟''

''میں کسی کے گھر میں جانا پسند نہیں کرتا۔'' شاہ جی نے کہا۔

''بہ امر مجبوری جانے میں ہرج بھی کیا ہے؟''

''نہ جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اُن کے گیراجوں میں کاریں موجود ہیں، زرخرید ڈرائیور اور ملازم دستیاب ہیں۔ اُنہیں غریبوں کے لیے بنائے گئے ہسپتال اور تعینات کیے گئے ڈاکٹر کے پاس آنے یا بلانے کی احتیاج نہیں ہے۔ وہ مظفرگڑھ، ڈی ایچ کیو میں، کسی نجی ہسپتال میں یا کہیں بھی جاسکتے ہیں۔ میں کسی کو روکتا نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اِن خانزادوں کے ناز نخرے اُٹھانے کی کوئی ضرورت ہے۔ میں نے جو کہنا تھا، کہہ دیا، اَب اِس موضوع پر کچھ بھی کہنا پسند نہیں کروں گا۔ آپ کوئی اور بات کیجئے، کوئی اور حکم صادر کیجئے۔'' ڈاکٹر شاہ جی کا لہجہ اَٹل تھا۔

ضلعی افسر بہ حقیقت سر تھام کر رہ گیا۔ دوسرے اشخاص چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ کچھ توقف کے بعد ضلعی افسر نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا، ''چلیں ٹھیک ہے، آپ سفید کاغذ پر معذرت نامہ تحریر کر دیں۔ میں اُنہیں مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے بے ساختہ ڈاکٹر شاہ جی کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ میری توقع کے عین مطابق مخصوص زہریلی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر تیر گئی۔ سرنفی میں ہل گیا، لبوں پر شعلہ سا بھڑک گیا، بولا ''آپ میرے آفیسر اِن چارج ہیں اور سرکار کہتی ہے کہ آپ کا حکم بجالاؤں۔ آپ کے ساتھ ساتھ میں اپنے ضمیر اور ایمان کا بھی تابع فرمان ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی اِس لیے مجھے معافی نہیں مانگنی چاہیے۔ میں اُس کے حکم پر سر جھکاتا ہوں اور واشگاف الفاظ میں انکار کرتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے سے معافی نہیں مانگوں گا اور اُس جرم پر ندامت کا اظہار نہیں کروں گا جو میری دانست میں جرم نہیں، میری شخصیت کا اعزاز ہے۔ انکوائری بھگت چکا، شوکاز نوٹس کا تحریری جواب دے چکا، اب محکمانہ سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ میں فیس (Face) کروں گا۔''

ڈاکٹر شاہ جی کی گفتگو کے آخری جملوں سے اتنی درشتی اور زہر باری مترشح تھی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ عمومی طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام الناس کے سامنے بانس پر چڑھنے والا اپنے مجاز افسروں کے پیروں کی زمین میں اُتر جاتا ہے مگر وہ ایسا ثابت نہیں ہوا تھا۔

''شاہ جی! آپ کی ہٹ دھرمی آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔'' ضلعی افسر نے واضح دھمکی دی۔

''پروا نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں، لوگوں کا علاج کرنا میرے فرائض میں شامل ہے مگر بے

ایمان اور جھوٹے لوگوں کی نوکری کرنا اور ناپسندیدہ امور کو انجام دینا مجھ پر واجب نہیں ہے۔ نوکری نہ سہی، کوئی چھوٹا موٹا کلینک بنا کر بیٹھ جاؤں گا، تب دیکھوں گا، مجھے کون روکتا ہے۔'' شاہ جی نے سخت لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر عثمان حمید چند ثانیوں تک اُسے برہم نگاہوں سے گھورتا رہا، پھر یک لخت مفاہمانہ انداز میں گویا ہوا، ''میں آپ کی عزت کرتا ہوں، یہ جانتا ہوں کہ آپ راشی نہیں، بے ایمان نہیں اور نہ ہی کبھی آپ نے اپنے پیشہ وارانہ فرائض میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔ سردار حیدر خان عوامی نمائندہ ہے۔ اسمبلی میں بیٹھتا ہے۔ جس ڈیسک پر وہ بول سکتا ہے، اُس ڈیسک تک ہماری رسائی نہیں ہے۔ اُس کا کہا ہوا ہر الزام فی الفور ہمیں ملزم سے مجرم بنا دے گا۔ آپ تحریری طور پر معذرت نہ کریں، سردار حیدر خان کو مطمئن کر دیں۔''

''واٹ؟'' ڈاکٹر شاہ جی کے حلق سے چنگاری سی پھوٹی، ''میں..... ڈاکٹر منور علی شاہ..... اُس جاہل اور انسان دُشمن سے معذرت کروں؟ اُس کے سامنے جا کر ہاتھ باندھوں اور اپنے علم اور فرض شناس رویے کو اَن گنت لوگوں کی موجودگی میں حقیر اور جھوٹا قرار دوں؟..... نہیں ڈاکٹر صاحب! میرے ہاتھ استعفیٰ تو لکھ سکتے ہیں مگر حیدر خان کے سامنے بندھ نہیں سکتے۔''

ڈاکٹر عثمان اپنے دونوں ہاتھ چارپائی کی بانہہ پر رکھ کر زیرِ لب بڑبڑایا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے سے بے بسی اور نیم برہمی کا امتزاج عیاں تھا۔ اپنے ساتھیوں کو اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''شاہ جی! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے خلاف کوئی محکمانہ کارروائی عمل میں نہ لائی جائے۔ مگر یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سردار حیدر خان آپ سے سخت ناراض ہے اور وہ ایسا شخص ہے جو اپنے مخالفین کو معاف کرنے کی رواداری نہیں رکھتا۔ آپ کے لیے دعا گو ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ اپنا دھیان رکھیے گا۔ کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ یا غیر متوقع صورتِ حال درپیش ہو سکتی ہے۔''

ڈاکٹر شاہ جی نے قدرے لاپروائی سے سر جھٹکا اور اُنہیں کوٹھی کے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ واپسی پر اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال سا تنا ہوا تھا۔ بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں بولا، ''اچھا نہیں ہوا مگر خیر سلاّ..... اچھا ہوا کب ہے کہ اَب قسمت پر گلہ ہو۔''

اُس کے ایک بے ساختہ فقرے نے اُس کی زندگی کی تمام تر تھکاوٹوں اور مزاحمتوں کا احاطہ

کر دیا تھا۔

میں نے ماحولی کی کبیدگی کو محو کرنے کے لیے اُسے متوجہ کیا، ''آپ نے کھانا کھالیا ہے؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا، ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

میں اُس کے روکتے رہنے کے باوجود کچن میں گھس گیا۔ کچن میں ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ میں جانتا تھا فریج میں اور کچھ ہو نہ ہو، انڈوں کی خاصی تعداد ضرور موجود رہتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی انڈوں کا سالن تیار کیا، گندھا ہوا آٹا فریج سے نکال کر دو تین روٹیاں پکائیں اور تقریباً نصف گھنٹے کی مشقت کے بعد ڈاکٹر شاہ جی کو کھانا پیش کر دیا۔

وہ بولا، ''شہریار! تم جب میری خاطر اتنی تکلیف اُٹھاتے ہو تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔''

میں نے تعجب سے کہا، ''کیوں شاہ جی! آپ اِس طرح کیوں سوچتے ہیں۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں، مسیحا ہیں، آپ کی خدمت کرنا تو پورے نور پور کا فرض ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے لوگوں کی شعوری سطح کم ہے جبکہ میں چار جماعتیں پڑھ چکا ہوں۔ آپ کو قریب سے دیکھتا ہوں، وہ دور سے دیکھتے ہیں، فرق تو ہے ناں۔ ویسے بھی، میں فارغ اوقات میں آپ کے ہاں آتا ہوں۔ تھوڑا ہڈ پیر ہلا لینے سے میرا کیا بگڑتا ہے؟''

وہ سر جھکائے کھانا کھانے میں مشغول رہا اور میری 'نان اسٹاپ' باتوں کا جواب 'ہوں، ہاں' میں دیتا رہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر بولا، ''شہریار! میری تمام نوکری کا یہی دورانیہ جو نور پور میں اَب تک گزرا، عافیت اور خاموشی کا ہے۔ مجھے میری تمام سروس کے دوران فرعونوں نے چین سے سانس نہیں لینے دی۔ کبھی تبادلہ ہوا، کبھی انکوائری تو کبھی مجھے معطل کیا گیا حالانکہ میں نے اپنے فرائض میں کہیں بھی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کیا، کسی بھی مریض سے لاپروائی نہیں برتی اور..... اور تو اور..... میری اے سی آر میں کوئی غبن، فراڈ یا رشوت کی شکایت درج نہیں ہے۔ مگر میں اس معاشرے میں اَن فٹ ہوں۔ میں انسان تو ہوں مگر انسانوں جیسا نہیں ہوں۔''

سانس لے کر بولا، ''لگتا ہے، یہاں بھی تمہارے ڈاکٹر شاہ جی کا دانہ پانی تمام ہو چکا ہے۔ اس مسافر کو پھر نئی مسافت درپیش ہے اور یقیناً میں جہاں بھی بھیجا گیا، وہاں میرے انتظار میں غریب اور لاچار لوگ جھولیاں پھیلائے مسیحائی تلاش کرتے پھرتے ہوں گے اور وڈیرے اپنی کینچلیوں سے اپنے رَچھ نکال کر گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ آہ! نہ اِس دنیا کو بدلنا منظور ہے

اور نہ ہی یہ ڈھیٹ شخص مائل بہ تغیر ہے۔''

''کیا آپ کی مرضی کے بغیر آپ کا یہاں سے ٹرانسفر کیا جاسکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوں! مجھے پنجاب کے کسی بھی بی ایچ یو میں پھینکا جاسکتا ہے۔ محکمانہ رولز کے مطابق تو مجھے ضلعی حدود سے باہر نہیں بھیجا جاسکتا مگر ایسا محض اُس جگہ پر ہوسکتا ہے جہاں قانون کی بالادستی ہو، جہاں انسانی حقوق کا احترام واجب ہو..... یہاں نہیں۔ یہاں صرف اُس کے حکم کی تعمیل کی جاتی ہے جس کے پاس ووٹ کی طاقت ہو، خاندانی نجابت ہو، اثر ورسوخ کا تازیانہ ہو کہ جب جی چاہا، نکال کر مقابل کے منہ پر دے مارا۔''

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں استفسار کیا، ''تو کیا آپ کا تبادلہ کر دیا جائے گا؟''

اُس نے کندھے اُچکائے، ''ہاں! یہ بھی یار باش لوگوں کی عنایت ہوگی وگرنہ ممکن ہے مجھے معطل کروا دیا جائے۔''

''معطل؟ یعنی نوکری سے فارغ؟'' میں دم بخود رہ گیا۔

''نہیں! دفتر بلاوا، انکوائری اور پھر تین ماہ کی بے سود خجل خواری کے بعد بصد احسان بحالی.....'' اُس کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ تیر گئی۔

''یہ تو بہت غلط ہوا شاہ جی!'' میرے لبوں سے نکلا۔

''ہاں! مگر دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے، سردار حیدر خان کو ڈاکٹر عثمان مطمئن کر لے اور بات یہیں ختم ہو جائے۔''

''اللہ کرے!''

''تم کیوں پریشان ہو گئے ہو؟''

''اگر آپ کا یہاں سے تبادلہ ہو گیا تو؟'' میرا اندیشہ میرے لبوں پر مچل گیا۔

''تو کیا ہوگا؟ یہاں کوئی اور ڈاکٹر آ جائے گا۔ میں جہاں جاؤں گا، قسمت میں ہوگا تو کوئی اور شہریار مجھے مل جائے گا۔ بس!''

مجھے دُکھ ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی کے سپاٹ اور جذبات سے قطعی عاری لہجے نے مجھے آنِ واحد میں مایوس کر دیا۔ میں اُس کے ٹرانسفر کے اندیشے میں پریشان ہو رہا تھا جبکہ اُسے میری کوئی پروا نہیں تھی۔

اُس نے میرے تاثرات کے تغیر کو بھانپ لیا، میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکرایا اور از حد نرم لہجے میں بولا، ''کبھی جانے والے کا دُکھ نہیں کرتے، بس! الوداع کہہ کر آنے والے کا خوش دِلی سے سواگت کرتے ہیں۔ تم اچھے انسان ہو، یقیناً تمہیں اچھے انسان ہی ملیں گے۔''

میں خاموشی سے اُسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ وہ اَب پوری طرح سنبھل چکا تھا اور اُسے ہرگز کوئی خوف یا پریشانی نہیں رہی تھی۔ میں نے اجازت چاہی اور کوٹھی سے نکل آیا۔

اگلے دن میں نے اِس واقعے کا تذکرہ کھالے سے کیا۔ وہ فکرمند ہوگیا۔ بولا، ''شہرے! اپنے ڈاکٹر کی خیر مانو۔ سردار وریام خان اور سردار حیدر خان اُس پر وار کریں گے۔ ڈاکٹر شریف آدمی ہے، ان لمبے ہاتھ والوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''میں بھی تو دُعا مانگنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا ناں!'' میں نے بے بسی سے کہا۔

اُس نے ایک نگہِ عجب مجھ پر ڈالی، مجھے ٹٹولا پھر بولا، ''بات اگر ڈاکٹر کے ٹرانسفر یا معطلی تک محدود رہی تو خیر ہی گزرے گی۔ اگر محکمہ صحت نے ڈاکٹر کے خلاف کارروائی نہ کی تو پھر یہ لوگ اپنے کارندوں کے ذریعے ڈاکٹر پر وار کریں گے جو بے حد خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

میں حیرت سے بولا، ''کیا مطلب؟''

''تم بڑے بھولے ہو۔ دیکھتے ہو، سمجھتے نہیں ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ سردار حیدر خان کو لوگ ووٹ ڈالتے ہیں اور وہ جیت جاتا ہے۔ ہے ناں؟ سبھی سادہ اور معصوم لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ جہاں گھی سیدھی انگلیوں سے نکلتا دکھائی نہیں دیتا، سردار حیدر خان وہاں اپنی انگلیاں ٹیڑھی کرلیتا ہے اور اُس کے پالتو غنڈے دندناتے ہوئے اپنے مورچوں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی ووٹ بیچ دیتا ہے، کوئی ڈر کر حامی بھر لیتا ہے اور جو اکڑ جاتا ہے اُس کی گردن میں سے سریے کے ساتھ ساتھ ہڈی بھی نکال لی جاتی ہے۔ الیکشن کے بعد وہی غنڈے کامل توجہ کے ساتھ سرگرم ہوجاتے ہیں۔ اُن لوگوں سے آہنی ہاتھوں کے ساتھ نبٹتے ہیں جنہوں نے سردار حیدر خان کا دِل دکھایا ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ ڈاکٹر شاہ جی نے بھی سردار کا دل دُکھا دیا ہے۔''

مجھے کھالے کی دانش بھری باتوں پر حیرت ہوئی۔ یہ اعتراف تو مجھے تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ دُنیا کے چلن سے آگاہ تھا، یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اِن سرداروں کے ہتھکنڈوں کا بھی ادراک رکھتا تھا۔

میں نے کہا، ''یعنی تمہارا خیال ہے کہ سردار حیدر خان کے پالتو غنڈے ڈاکٹر شاہ جی کو ماریں پیٹیں گے؟''

''اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی بغیر نمبر پلیٹ والی گاڑی اُس کی موٹر سائیکل کو کچلتی ہوئی گزر جائے۔'' کھالے کا لہجہ بڑا ہول ناک تھا، ''رات کے سناٹے میں کوئی دردناک چیخ اُبھرے اور صبح لوگ مونھوں میں انگلیاں دابے بے رحم ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہونے والے ڈاکٹر شاہ جی کا آخری دیدار کر رہے ہوں.....''

مجھے جھرجھری آ گئی۔ کھالے کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے جلدی سے بولا، ''یہ منحوس منہ بند کرو یار! کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ شاہ جی پر کوئی آنچ آئے۔ وہ نور پور کا مسیحا ہے، غریبوں کا سچا ہمدرد ہے اور نہایت بے غرض بندہ ہے۔ اُس نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔''

''یہاں خربوزے چوری کرنے والے کو سزائے موت کا حکم نامہ تھمایا جا سکتا ہے میرے جگری یار! کیا بات کرتے ہو۔ ہاں! اگر تمہیں ڈاکٹر کی اتنی ہی فکر لاحق ہے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے مت رہو۔ میری مانو تو اپنا بوریا بستر اُٹھا کر شاہ جی کی کوٹھی پر چلے جاؤ۔ کسی وقت، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر شاہ جی کو قائل کرو کہ وہ رات کو تنہا نہ رہے، ہر وقت چوکنا رہے اور اگر ممکن ہو تو رات کو کسی دوست کے ہاں شب گزاری کے لیے چلا جایا کرے۔''

کھالے نے مجھے اور بھی بہت کارآمد باتیں سمجھائیں۔ میں دھڑکتے دل سے اُس کی دل دہلانے والی باتیں سنتا رہا، دل ہی دل میں دہراتا رہا پھر میں نے اپنے تئیں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ میں کسی بھی صورت میں ڈاکٹر شاہ جی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا اور اُس کی حفاظت کروں گا۔ دل کے نہاں خانوں میں یہ خدشہ بھی کلبلا رہا تھا کہ میں اپنی کم مائیگی کے باعث سردار حیدر خان جیسے بارسوخ آدمی کے مقابلے میں ڈاکٹر شاہ جی کی مدد نہیں کر پاؤں گا۔ کھالے نے مجھے حوصلہ دیا اور میری سخنے درے مدد کا وعدہ بھی کیا۔

چند دِن عافیت میں گزرے۔ ایک صبح جب میں گھر میں بیٹھا چائے کا پیالہ شکم میں اُتار رہا تھا، سردار وریام خان کا پیغام مجھے موصول ہوا۔ فاطمہ قصائین اپنی غیر معمولی باریک اور شوخ آواز میں مجھے بتلا رہی تھی کہ وریام خان نے مجھے اپنی حویلی پر فوراً پہنچنے کا حکم صادر کیا ہے۔ میں اُسے پسند نہیں کرتا تھا مگر اپنی ناپسندیدگی کے اظہار اور اُس کی حکم عدولی کی جرأت بھی نہیں رکھتا

تھا۔ میں نے ماسی فاطمہ کو چلتا کیا اور ناشتہ کرنے کے بعد حویلی پہنچ گیا۔

سردار اَبھی تک حویلی کے اندر تھا۔ میں دارے میں رکھے ہوئے بڑے پائیوں والے ہماچے پر بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے وریام خان کے دارے کی بیرونی چہار دیواری کے اوپر، گلی کے پار ایستادہ بخت خان کی خوب صورت حویلی واقع تھی۔ ہلکے پیلے اور سرخ کلر کا نفیس امتزاج بڑا دل کش تھا۔ بخت خان بہت وجیہہ، باذوق اور نفاست پسند انسان تھا مگر اُس کا رویہ بہت ناشائستہ اور جاہلانہ تھا۔ غرور اور نخوت نے اُسے گاؤں بھر میں تنہا کر رکھا تھا۔

سردار وریام خان اُس سے کہیں زیادہ بُرا اور سفاک انسان تھا مگر وہ لوگوں میں گھل مل کر رہتا تھا۔ در پردہ ظلم کرتا تھا، سرِعام محبت کا پرچار کرتا تھا۔ وہ اور نور پور کا نمبردار سردار حیات خان مقامی سیاست کے اہم مہرے تھے۔ سردار حیدر خان کی بچھائی ہوئی سیاسی بساط پر پوری دل جمعی سے کھل کھیلتے اور اُسے فتح یابی سے ہم کنار کرتے ہوئے اپنے لیے ظلم اور بربریت کے دروازے کھول لیتے۔ نور پور اور نواح میں ہونے والے ہر تنازعاتی واقعے کے پس منظر میں انہی دونوں بڑوں کی چالاکیاں اور سازشیں موجود ہوتیں اور جب فریقین جذباتی حماقتوں کے زیرِ اثر اپنی پونجی بے دردی سے لٹا بیٹھتے تو پھر اِنہی کے داروں پر پہنچ کر انصاف کے لیے ملتمس ہو جاتے۔ میں نے اَن گنت پنچائتیں دیکھ رکھی تھیں۔ کبھی سردار حیات خان کے ڈیرے پر تو کبھی سردار وریام خان کے دارے پر۔ ہر پنچائت کا ایک سا انجام ہی دیکھا تھا۔ جو سردار نے چاہا، وہی فیصلہ مسلط کر دیا گیا۔ بعض اوقات تو ایسے ایسے فیصلے بھی ڈنکے کی چوٹ پر کر دیے گئے جن کی اجازت نہ تو مذہب دیتا تھا اور نہ ہی دُنیا کے کسی معاشرے کی کوئی اخلاق ساز کتاب.....

علی بخش عرف ملنگی سردار وریام خان کے ڈیرے پر حقہ پانی بھرنے پر مامور تھا۔ وہ چائے کا پیالہ اُٹھائے میرے پاس آیا۔ مجھے تھماتے ہوئے بولا، ''شہرے خان! تیرا چاچا کہہ رہا تھا کہ تم نے پڑھائی مکمل کر لی ہے اور اَب نوکری کے چکر میں ہو؟''

میں نے چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ہماچے کے سرِ بالیں رکھے ہوئے حقے کو اپنی جانب کھینچ کر بے سبب چھیڑتے ہوئے بولا، ''دور جانے کی کیا ضرورت ہے، یہاں کسی خان کے ہاں منشی ٹھہر جاؤ۔''

میں نے کہا، ''یہ کام مشکل ہے، مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔''

''واہ جی واہ! یہ منشی گیری بھی کوئی مشکل کام ہے، اچھی خاصی لَو ہر ہوتی ہے منشی کی، جو چاہے

کرے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔''

''مجھے ایسی نُوہر کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں از حد اختصار سے کام لے رہا تھا کیونکہ میں ادھیڑ عمر ملنگی کی چرب زبانی اور قوتِ گویائی سے بخوبی واقف تھا۔ بات سے بات نکالنے کا ہنر اُسے وراثت میں ملا تھا۔ گاؤں کے بڑے کہتے تھے کہ اُس کا باپ اُس سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ خود ملنگی اپنے باپ کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے بتایا کرتا تھا کہ کیسے اُس کے باپ نے پنچائت میں کسی جھوٹے کو سچا ثابت کیا، سچے کو جھوٹا ثابت کیا تھا۔ وہ اپنے آنجہانی باپ کی قوتِ بیان پر استدلال لاتے ہوئے یہ بھول بیٹھتا تھا کہ وہ اپنے منہ سے اپنے باپ کو بے ایمان اور مکار ثابت کرتا تھا۔

''تجھے خان نے کیوں بلایا ہے؟'' وہ ایک تنکے کو چلم کے نچلے حصے میں ڈال کر گھماتے ہوئے بولا۔

''یہ تو خان کو ہی پتہ ہوگا۔''

''اگر وہ تجھے اپنے ہاں منشی ٹھہرانے کی بات کرے تو اُس کی بات مان لینا۔ میری مانو، سراسر فائدے کا کام ہے۔ موج ہی موج ہے۔'' اُس نے پھر اپنے اندازے کی بنیاد پر کھڑی کی جانے والی عمارت کو چونا چاٹی کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بند مٹھی پر ٹھوڑی ٹکا کر دارے اور زنان خانے کی درمیانی دیوار کے دیدار بخش روزن کو تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے سامنے بیٹھ کر کھالے نے اسما کو دیکھا تھا اور مجھے بھی دیدار کی خیرات میں سے حصہ دیا تھا۔ روزن دکھائی نہیں دی۔ میں ایسے زاویے پر بیٹھا تھا کہ سنتھے کی گنجان باڑ کی وجہ سے دیوار کا وہ حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''پریشان دکھائی دیتے ہو، کیا بات ہے؟'' ملنگی نے مجھے کریدنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

ایسے ہی وقت میں سردار وریام خان بوسکی کے بے داغ سوٹ میں، پیروں میں تلے دار کھسہ پہنے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے دارے میں قدم رنجہ ہوا۔ ماحول میں بڑی خوش گوار اور بھینی بھینی خوشبو پھیل گئی۔ یہ کسی قیمتی اور غیر ملکی پرفیوم کا اعجاز تھا جس کی غالباً پوری کی پوری شیشی اُس نے اپنے اوپر انڈیل رکھی تھی۔ میں نے روایتی انداز میں ادب سے کھڑے ہو کر سلام کیا، اُس کے براجمان ہونے کے بعد ہمایچے پر بیٹھ گیا، بولا، ''جی خان جی! آپ نے مجھے یاد کیا

تھا۔"

"اوچھڈ پڑھو کیا! سوکھیاں گلاں کیتیاں کر، وَخت ءِچ نہ پایا کر سانوں بڈھیاں ٹھیریاں نوں....." وریام خان نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ وہ بڑی ٹھیٹ سرائیکی بولتا تھا۔ سر پر کلف دار طرہ درست کرتے ہوئے بولا، "میں نے ایک خاص بات کے لیے تمہیں بلایا ہے۔ تم نور پور کے باسی ہو، پڑھے لکھے ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نقصان ہو۔ رب سوہنا کرم کرے، وہ حکم دیتا ہے کہ غریبوں مسکینوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھنا چاہیے اس لیے تمہارے ساتھ میں نے کبھی بھی اَوکھے مونہہ بات نہیں کی۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو اپنا سوتر، ہائے کیا دلیر بندہ تھا، جنتی امام بخش خان، یاد آ جاتا ہے۔ بڑا بیبا اور سنگت باش انسان تھا پَر بے چارہ تھوڑی حیاتی مانگ لایا تھا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اُس کے بولنے کا انتظار کیا۔ میں اَبھی تک اپنے طلب کیے جانے کا سبب بھانپ نہیں سکا تھا۔

ملنگی نے حقے کی نَے جیبی رومال سے صاف کی اور گھما کر خان کے سامنے کر دی۔ اُس نے ایک دو گڑگڑاہٹیں کشید کیں، مجھے نظروں ہی نظروں میں ٹٹولا اور بولا، "شہرے پتر! میں نے تمہیں اُس دن ڈاکٹر کی کوٹھی پر دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ تمہارے جیسا سمجھ دار انسان اُس خبیث اور بے ایمان ڈاکٹر کے پاس کیا کر رہا ہے۔ کیا تم اُس کی شاگردی میں ہو؟"

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا، "جی خان جی! میں نے اُس سے ڈسپنسنگ سیکھ لی ہے۔ اَب میں چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج معالجہ کر لیتا ہوں۔"

"جب میں نے فاطمہ قصائین کو اُس کے ہاں بھیجا تھا، تم وہیں تھے؟" اُس کی کریدتی نگاہیں مجھ پر مرتکز تھیں۔

"جی!"

"وہ خبیث میرے بلانے پر آیا کیوں نہیں تھا؟"

"وہ کہیں بھی نہیں جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے چوبیس گھنٹے ہسپتال میں رہنا چاہیے، کب کیا ہو جائے، خبر نہیں ہوتی۔" میں نے اپنی دانست میں بڑی معقول بات کی۔

"ماسٹر ولی محمد کی بیٹی جب سیڑھیوں سے گری تھی تو وہ بھاگا چلا آیا تھا۔ کہیں زنّاں کے ساتھ اُس کے....."

''ناں خان جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے غیر ارادی طور پر اُس کی بات کاٹ دی۔

ماسٹر ولی محمد ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھا۔ میں اُس سے دو سال تک ٹیوشن پڑھتا رہا تھا۔ وہ بہت مخلص اور دین دار آدمی تھا۔ اُس نے کبھی میرے سمیت کسی بھی پڑھنے والے سے ٹیوشن فیس وصول نہیں کی تھی۔ اُس کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔ اوپر تلے چار بیٹیاں خدا نے دے رکھی تھیں مگر اُسے کبھی بھی قسمت پر یا قسمت بنانے والی پر میں نے شاکی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اِنہی بیٹیوں کی مناسب تربیت کا صلہ اُسے خدا جنت میں شاندار محل کی صورت میں دے گا۔ اُس کی بیٹی 'زیناں' دو ماہ قبل چوبی سیڑھی سے گر پڑی تھی۔ سیڑھی کا نچلا ڈنڈا اُس کی کمر میں اِس شدت سے لگا تھا کہ اُس کا نچلا دھڑ ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ ولی محمد ننگے پیر دوڑتا ہوا ہسپتال پہنچا تھا اور ڈاکٹر کو گھر لے آیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے زیناں کا معائنہ کیا، ابتدائی طبی امداد دی، اپنے ڈسپنسر کو بھیج کر ڈی ایچ کیو ہسپتال سے ایمبولینس منگوائی اور زیناں، اُس کی ماں اور باپ کو ہسپتال روانہ کر دیا تھا۔ چند دِنوں میں وہ ٹھیک ہو گئی تو پھر لاٹھی کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ہسپتال آ جایا کرتی تھی۔ وہ اَب بھی ڈاکٹر شاہ جی کے زیرِ علاج تھی۔

مجھے وریام خان کی سوچ پر گھن آئی۔ نگہِ شکایت اُس پر ڈالی اور کہا، ''خان جی! ڈاکٹر شاہ جی ایسا شخص نہیں ہے۔ چونکہ زیناں کا نچلا دھڑ سُن ہو گیا تھا، اُسے کسی بھی طرح ہسپتال نہیں لایا جا سکتا تھا، اِس لیے ڈاکٹر اپنے آلات سمیت ماسٹر جی کے گھر تک چلا آیا تھا۔''

''مگر میں نے سنا ہے کہ زیناں اَب بھی ہر دوجے چوتھے روز ہسپتال جاتی رہتی ہے اور بہت دیر تک ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی رہتی ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے؟''

''نہیں! یہ سچ ہے۔ وہ آتی ہے، اپنا معائنہ کراتی ہے اور دوائیں لے کر گھر چلی جاتی ہے۔ اُس کے ہمراہ کبھی ماسی فاطمہ ہوتی ہے، کبھی اُس کی ماں اور کبھی غفوراں؛ وہ کبھی بھی اکیلی نہیں آئی۔'' میں نے وضاحت کی۔

''غفوراں؟ علم دین پٹواری کی دِھی؟''

''نہیں۔ استاد کھالے کی چھوٹی بہن غفوراں۔'' میں نے کہا، ''کئی مرتبہ زیناں میری موجودگی میں وہاں آ چکی ہے۔ ڈاکٹر اُسے 'بیٹی' کہہ کر بلاتا ہے۔ وہ ہر لڑکی کو بیٹی یا دِھی کہہ کر پکارتا ہے۔''

''تم ڈاکٹر کی اتنی طرف داری کیوں کرتے ہو؟'' خان کا لہجہ خاصا سرد ہوگیا۔ اُسے شاید میرے تسلی بخش جوابات نے مضطرب کر دیا تھا۔

''خان جی! مجھے اُس کی طرف داری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نور پور کا رہنے والا ہوں، وہ پتہ نہیں کہاں کا وسنیک ہے، مجھے اُس سے سوائے ہنر کے کیا لینا ہے۔ سچ بات کرتا ہوں کہ وہ بہت نیک اور 'اللہ لوک' آدمی ہے۔ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ کسی کو برا نہیں کہتا اور نہ ہی کسی سے ڈرتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُس کے علاوہ کوئی بھی ڈاکٹر اِس ہسپتال میں آج تک رہائش پذیر نہیں ہوا۔ جو بھی تعینات ہوتا تھا، ہفتوں شکل نہیں دکھاتا تھا جبکہ یہ چوبیس گھنٹے موجود رہتا ہے۔ اتوار کے دن بھی اگر کوئی آ جائے تو اُس کا معائنہ کرتا ہے اور ہسپتال کھول کر دوائیں دیتا ہے۔ کیا یہ نور پور کی خوش بختی نہیں ہے؟'' میں نے پہلی مرتبہ ہمت پکڑتے ہوئے پوری فصاحت سے اپنا مدعا بیان کیا۔

اُسے میری تقریر اچھی نہیں لگی۔ پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ہاتھ لہرا کر بولا، ''بس گودا! میں نے تمہاری بہت ساری بکواس سن لی۔ مزید سننا نہیں چاہتا اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم آئندہ ہسپتال نہیں جاؤ گے۔ ڈاکٹر کی چاپلوسی نہیں کرو گے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تم اُسے کھانا بنا کر دیتے ہو، کوارٹر کی صفائی ستھرائی کرتے ہو اور کپڑے لتے بھی دھوتے ہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ میری برادری کا خان زادہ، خواہ غریب ہو یا مسکین، کسی کمین اور خبیث بندے کی خدمت خاطر کرے۔ کیا وہ تمہیں تنخواہ وغیرہ بھی دیتا ہے؟''

میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ دونوں ہاتھ باندھ کر بولا، ''خان جی! آپ میرے بڑے ہیں، مائی باپ ہیں۔ مجھے بخوبی احساس ہے کہ میں آپ کا رشتہ دار اور برادری وال ہوں مگر آپ سے بہت کم تر اور غریب ہوں۔ اگر میں اُس کی خدمت کرتا ہوں تو یہ میرا معاملہ ہے۔ میں اُس کی نہیں، اُس کے سینے میں بھرے ہوئے علم اور انسان دوستی کے جذبے کو سلام کرنے جاتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں کہ وہ اِس دور کا ولی ہے، اللہ کا بہت پیارا انسان ہے۔ آپ نہیں مانیں گے اور میں منوانا بھی نہیں چاہتا مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ اُس کے اور میرے بیچ کوئی دیوار کھڑی نہ کریں۔ جیسے کام چل رہا ہے، چلنے دیں اور ڈاکٹر کی حکم عدولی کو اَنا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ رہی بات تنخواہ کی، تو مجھے تنخواہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اُس کے کام کاج کرتا ہوں۔ میں تو سردار حیات خان کے کھاتوں کو بھی مفت میں سنبھالا کرتا ہوں۔

امیر نواز کے کام کاج بھی کر دیتا ہوں۔ وہ مجھے کچھ بھی نہیں دیتے۔ ڈاکٹر خدمت کے بدلے میں مجھے پڑھاتا ہے۔ مجھے سبق دیتا ہے۔ میں پرائیویٹ طور پر ماسٹر کرنا چاہتا ہوں اِس لیے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہ کریں ورنہ میں حکم عدولی پر مجبور ہوں گا۔''

اُسے میرے واضح انکار کی توقع نہیں تھی۔ چند لمحوں تک مجھے شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا، پھر پھٹ پڑا۔ غیظ و غضب نے اُس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا تھا۔ اُس نے مجھے نہ صرف کمین، غریب اور بے غیرت کے القابات سے نوازا بلکہ اپنی سرشت کے مطابق غلیظ گالیاں بھی دیں۔

اچانک ملنگی سے مخاطب ہو کر بولا، ''اوئے ملنگی! اِس احسان فراموش کیڑے کو دھکے دے کر حویلی سے نکال دے اور اس کے چاچے کو پکڑ لا۔ اُس سے پوچھوں کہ ایسے احسان فراموش اور کمینے بندے کو اُس نے اپنے گھر میں کیوں ڈال رکھا ہے۔ چل اوئے خبیث! میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے اُس ملعون کے پاس جاتے ہو۔ واہ! میں ماسٹر کرنا چاہتا ہوں..... ہاہ!''

فرطِ تضحیک سے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ غلطی میری ہی تو تھی۔ جانتا تھا کہ وہ بظاہر انسان مگر بہ باطن بھیڑیا ہے۔ مجھے اُس کے منہ لگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے معاملے کو سلجھانے کی اپنی سی کوشش کی، ''خان جی! آپ تو بلاوجہ ناراض.....''

''کہا ناں! دفعان ہو جاؤ اور دوبارہ اپنی منحوس شکل مجھے نہ دکھانا۔'' اُس نے پھاڑ کھانے کے سے انداز میں کہا۔

میں نڈھال اور پژمردہ قدموں سے اپنے وجود کو رگیدتا ہوا حویلی سے نکل آیا۔ میں نے ملنگی کو دھکے دینے کی زحمت سے بچا لیا تھا۔ حویلی سے نکل کر گھر تک پہنچنا محال ہو گیا۔ اُس فرعون صفت وڈیرے نے چاچا چراغ کو بلا کر ڈانٹنے اور برا بھلا کہنے کا ارادہ کر رکھا تھا اور طلب کیے جانے پر چاچے کو نہ جانے دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے چاچی اور بہنوں کو وریام خان کی دھمکیوں اور گالی گلوچ کے بارے میں بتایا تو وہ سبھی گھبرا گئیں۔ نور پور میں رہتے ہوئے وریام خان کو ناراض کرنا بڑا کٹھن اور جاں کش کام تھا جو میں نادانی کی بدولت سرانجام دے آیا تھا۔ سبھی نے اپنے اپنے انداز میں مجھے کوسا کہ مجھے خان کے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئے تھیں۔ وہ بڑا تھا اور مجھے اپنی اوقات میں رہ کر محض 'جی خان جی' ہی کہنا

زیب دیتا تھا۔

ملنگی نے دوپہر سے پہلے ہی چاچا چراغ کو کھیتوں میں جا پکڑا اور خان جی کی عدالت میں پیش کر دیا۔ جب دوپہر کو چاچا چراغ گھر میں داخل ہوا تو اُس کی حالت خاصی غیر تھی۔ میں نے چور نگاہوں سے اُسے دیکھا تو کٹ کر رہ گیا۔ اُس کا چہرہ بھی فرطِ تضحیک سے سرخ تھا۔ کافی دیر تک چارپائی پر سر نیہوڑائے بیٹھا رہا۔ چاچی اُس کی پائنتی کی جانب بیٹھی اُسے خاموشی سے دیکھتی رہی، جب وہ قدرے سنبھل گیا تو بولی، ''کیا بات ہے؟ تم کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دیتے ہو۔''

اُس نے میری طرف ہاتھ کا اشارہ کیا، ''پوچھ لو اپنے اُس..... سے، بھرے دارے میں میری پگڑی اچھالی گئی، مجھے برا بھلا کہا گیا.....''

وہ فرطِ اشتعال و بے بسی سے اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر پایا۔ چاچی نے دِلاسہ دیا، ''نادان ہے، برے بھلے کی تمیز نہیں رکھتا۔ تم نے خان جی کو سمجھانا تھا ناں کہ.....''

''خاک سمجھاتا؟'' چاچے کا لہجہ بھرا گیا، ''اُس نے میری کوئی بات سنی ہی نہیں، بس ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا اور بار بار کہتا رہا کہ میں دیکھوں گا، اَب کیسے وہ ہسپتال میں قدم رکھتا ہے۔ میں نے اِسے کئی بار کہا کہ ہسپتال جانا چھوڑ دے، یہ نہیں مانا۔ آج اِس کی ضد کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا۔''

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ندامت اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت مجھ پر حاوی تھی۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ کافی دیر کے بعد میرے لبوں سے پھوٹا، ''چاچا! میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ میں نے اُسے یہی بتایا تھا کہ میں ڈاکٹر کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا ہوں۔ اُس نے ڈاکٹر اور ماسٹر جی کی بیٹی زیناں پر تہمت لگائی تھی جس پر میں نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ایسا آدمی نہیں ہے۔ بس وہ میری بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ٹھیک ہے، اُس نے اپنے گھر بلا کر میری اور تمہاری بے عزتی کی ہے، خدا ہمیں بھی کوئی موقع دے دے گا کہ اُس کی پگڑی ہمارے پیروں تلے رُلے گی۔''

چاچا میری بات سن کر بھڑک اُٹھا۔ اُس کے منہ میں جو الم غلم آیا، اُس نے مجھے کہہ سنایا۔ اُس نے بھی میرے ہسپتال جانے پر پابندی عائد کر دی اور مجھے وریام خان کی حویلی پر جا کر معافی مانگنے کا حکم صادر کر دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے ڈی ایچ او کے مقابل چٹانوں کی طرح ایستادہ ڈاکٹر شاہ جی کا چہرہ لہرا گیا۔ اُس نے معافی نہیں مانگی تھی۔ معزول ہونے پر خود کو آمادہ کرلیا تھا۔ میں نے بھی آن کی آن میں فیصلہ کرلیا۔ مجھے نور پور سے نکالا جا سکتا تھا، مجھے پنچایت میں مجرم بنا کر کھڑا کیا جا سکتا تھا اور بس!..... شاہ جی کو اگر ہزاروں روپے کی نوکری کا فکر نہیں تھا تو اُس کے 'مرید' کو کیا فکر لاحق ہو سکتا تھا۔ تبھی میں نے کہا، ''چاچا! میں زندگی میں کبھی خان کی حویلی پر معافی مانگنے کے لیے نہیں جاؤں گا۔''

''تمہیں جانا ہوگا..... دیکھ سرور مائی! اپنے پتر کو سمجھا لے، اِسے حویلی پر بھیج دے ورنہ ہم سب کے لیے بہت بُرا ہوگا۔'' چاچا چراغ خاصا برانگیختہ ہو گیا تھا۔

میں نے پھر انکار کیا۔ ایسے میں پروین میرے قریب ہوگئی۔ میرے گالوں پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''بھائی! ضد نہ کر۔ دیکھ! سب لوگ پریشان ہیں۔ میرا تیرے سوا اور ہے بھی کون؟ تجھے کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟ اللہ کا نام مان..... دیکھ شہرے! میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔''

میں ٹھٹک گیا۔ پروین کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے اور لجائی اور سماجت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں مجھ پر جہانِ ادراک کھلا۔ شاہ جی اور اپنی حیثیت کا فرق معلوم ہوا۔ اُس کا دُنیا میں کوئی نہیں تھا جس کے آنسو اُسے شکست سے دوچار کرتے۔ جس کا دُکھ اُسے رُلاتا۔ جبکہ میری ایک بہن تھی۔ جس کا اُترا ہوا چہرہ مجھ سے ہر بات منوا سکتا تھا۔

مخمصہ پھیل کر دل و دماغ کو اپنے حصار میں لینے لگا۔ میں نے پروین کے آنسو پونچھے، دِلاسہ دیا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔ چاچی کی بیٹیوں نے بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں احتجاجاً کھانا کھائے بغیر گھر سے نکل آیا۔ میرا رُخ نور پور کے ویگن اسٹینڈ کی طرف تھا۔ میری توقع کے مطابق کھالے کی ویگن اسٹینڈ پر موجود تھی اور شیدو بڑی سی ٹاکی سے ویگن کا نہ چمکنے والا بونٹ چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بخشو لوہار کو سلام کیا، دکان کا عقبی دروازہ عبور کیا اور کھالے کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ماسی صفو پہلو میں پانی کا بھرا ہوا گھڑا دبائے دیوار کے ساتھ پڑی چوبی گھڑونچی کی طرف جا رہی تھی۔ کھالے کی بہن خالدہ صحن میں تنی ہوئی تار پر دھلے ہوئے گیلے کپڑے پھیلانے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''سلام

صاحب جی! بڑے دنوں کے بعد راستہ بھولے ہیں آپ!''

وہ بہت شریر اور کھلنڈری لڑکی تھی۔ کھالے سے محض دو سال چھوٹی تھی۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود ایسی باتیں کر جاتی کہ سننے والا دم بخود رہ جاتا تھا۔ عمومی طور مجھے 'بھائی' جبکہ چھیڑنے کی غرض سے 'صاحب جی' کہا کرتی تھی۔ میں نے نیم دلی سے سلام کا جواب دیا اور کھالے کے کمرے میں گھس گیا۔ کھالے کو بستر پر نیم دراز پایا۔

وہ مجھے دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ بولا، ''خیر نہیں لگتی سجن جی!''

میں ٹوٹی بانہہ والی کرسی گھسیٹ کر اُس کی چارپائی کے قریب ہو بیٹھا۔ اُس نے بلند آواز میں ہانک لگائی، ''بلو! اَب تو چائے بنالا، دیکھ، تیرا دوجاویر بھی آ گیا ہے۔''

گھر میں خالدہ کو پیار سے بلو کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

وہ جواباً چلائی، ''صاحب جی کو تو چاء پینے کے سوا اور کوئی کام ہے ہی نہیں۔ جب کہیں سے نہیں ملتی تو یہاں بھاگا چلا آتا ہے اور کہتا ہے 'میں ملنے کے لیے آیا ہوں'..... تھوڑے سے کپڑے رہ گئے ہیں، تار پر ڈال لوں، پھر چائے بنالاؤں گی۔''

کھالا زیرِلب مسکرایا، ''بڑی جھلی کڑی ہے۔ ذرا خیال نہیں کرتی، کیا کہنا، کیا نہیں کہنا ہے۔ چلو چھوڑو! صفر پر آؤٹ ہونے والے جے سوریا جیسا منہ کیوں بنا رکھا ہے؟''

میں نے طویل سانس لی اور اُسے 'الف' سے 'یے' تک تمام روئیداد کہہ سنائی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑی توجہ اور انہماک سے سنتا رہا۔

میرے خاموش ہونے پر بولا، ''تم نے بڑی غلطی کی شہرے! تمہیں کیا ضرورت تھی خان کے سامنے شاہ جی کی وکالت کرنے کی، کہہ دیتے، آئندہ نہیں جاؤں گا، مگر دیکھ بھال کر جاتے رہتے۔ خیر! اَب بھی ایک راستہ ہے۔''

''وہ کون سا؟'' میں جلدی سے بولا۔

''تم جا کر امیر نواز سے بات کرو۔ وہ تمہیں لے کر حیات خان کے پاس چلا جائے گا۔ تم اُسے قائل کرنا۔ اُمید ہے وہ تمہاری بات سمجھ جائے گا اور وریام خان کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دے گا۔'' کھالے نے کہا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ کھالے نے کیسے چٹکی بجاتے میں میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ وہ بولا، ''مجھے یہ خان لوگ 'کھالا' کہتے ہیں۔ تم بھی کہتے ہو مگر تم پیار سے کہتے ہو، وہ نفرت سے کہتے ہیں۔ کبھی

بھی مجھے 'خالد محمود' نہیں کہیں گے۔ تمہیں کبھی کبھار 'شہریار' کہہ لیتے ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اَبھی تک اِن لوگوں نے تمہیں اور تمہارے گھرانے کو اپنے قبیلے سے نہیں نکالا۔ اگر تم ایسے ہی اِن کے سامنے آتے رہو گے تو وہ دن دور نہیں جب تمہارا خاندان اِن لوگوں کی برداشت سے باہر ہو جائے گا اور تم لوگوں کو نور پور سے دیس نکالا دے دیا جائے گا۔ میں نے کئی مرتبہ تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تم پڑھ لکھ کر کوئی افسر شفسر لگ جاؤ اور اپنی بہن کو لے کر کسی شہر میں، کسی اور گاؤں میں، جہاں ایسے وڈیرے اور خان زادے نہ ہوں، نکل جاؤ۔ تم میری بات مانتے نہیں ہو۔ ہل چلاتے رہو گے، کھیتوں کو پانی دیتے رہو گے تو یہ لوگ تمہارا خون نچوڑ کر تمہیں کھوکھلا کر دیں گے۔ پھر یہ گالیاں دیں گے، تم سر نہیں اُٹھاؤ گے۔ یہ جوتے ماریں گے، تم جوتے اُٹھا کر انہیں تھماؤ گے..... جیسے میرا باپ اور مَیں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اِن کے دربار میں، ایسے ہی تم اور تمہاری آنے والی نسل دست بستہ ہو گی۔ پھر تم بلوچ نہیں رہو گے، کمین گنے جاؤ گے۔ جیسے میرا خاندان!''

وہ بہت گہری بات کر گیا تھا۔ میں نے تعجب سے دیکھا۔ میٹرک پاس ڈرائیور کے منہ سے ایسی باتوں کا جھڑنا حیران کن دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے کہا، ''تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھ رکھی ہیں؟ یہی باتیں تو ڈاکٹر شاہ جی کرتا ہے۔''

وہ بولا، ''وہ سنی سنائی اور کتابی باتیں کرتا ہے۔ میں تن پر بیتے ہوئے واقعات کے نتیجے بیان کرتا ہوں۔''

ایسے میں خالدہ چائے کے دو پیالے میلا مائن کی نسبتاً میلی سی ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ چارپائی پر ٹکا کر رکھتے ہوئے بولی، ''لے صاحب جی! خالص دودھ میں پتی ڈال کر لائی ہوں۔ پیو گے تو عش عش کر اُٹھو گے۔''

کھالے نے آنکھیں دکھائیں، ''اَبھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ گھر میں دودھ نہیں ہے، اَب دودھ پتی بنا لائی ہو۔ چکر دیتی ہو؟''

''نہیں بھائی! تم خاموش رہو۔ یہ میرا اور صاحب جی کا مسئلہ ہے۔'' وہ شرارت بھری مسکراہٹ میری طرف اُچھال کر بولی، ''پروین کیا کر رہی تھی؟''

میں نے جھوٹ بولا، ''کڑھائی کر رہی تھی۔''

''اَبھی سے ہی؟'' اُس کی آنکھیں شرارت سے جلنے بجھنے لگیں۔

''کیا مطلب؟'' میں نے گھورا۔

''اپنی غزالہ سے جا کر پوچھ لو، تفصیل سے بتا دے گی۔''

''اس سے کیا پوچھوں؟''

''یہی کہ لڑکیاں کڑھائی کب کرتی ہیں؟'' وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر 'کھی کھی' کرنے لگی۔

کھالے نے ڈانٹا، ''چل دفع ہو، جا کر کپڑے دھو۔ دماغ ہے یا شیطان کا گھر ہے۔''

اُس پر ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کھلکھلا کر ہنسی اور پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں کھسیا گیا۔

کھالا بولا، ''اُس کی بات سمجھے ہو؟''

میں سمجھ گیا تھا مگر دانستہ نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا، ''جب لڑکیوں کی منگنی ہوتی ہے یا شادی طے پا جاتی ہے تو وہ اپنے جہیز کا سامان تیار کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ چادریں کاڑھتی ہیں، سرہانے بناتی ہیں اور کپڑوں پر موتی ٹانکنے بیٹھ جاتی ہیں۔''

میں پھیکے رُو مسکرا دیا۔ مجھے یہ موضوع مضطرب کرتا تھا۔

چائے پینے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں کھالے کے گھر سے نکل آیا۔ حیات خان کے دارے پر پہنچا۔ امیر نواز کا پتہ کیا۔ پتہ چلا کہ وہ جیت شاہ کے مزار کی طرف گیا ہے۔ جیت شاہ کا مزار میرے گھر کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ مزار کے بیرونی احاطے میں اُسے نہ پا کر میں مقبرے میں داخل ہو گیا۔ اُسے جیت شاہ کی سبز منقش چادر میں لپٹی بڑی سی قبر کے پہلو میں دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑے دیکھا۔

میں جوتے اُتار کر اُس کے پہلو میں کھڑا ہو کر اُس کے فارغ ہونے انتظار کرنے لگا۔ کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ تعجب ہوا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں، آنکھوں کے گوشوں سے نم پانی کی دو لکیریں پھوٹ کر رخساروں تک آ گئی تھیں اور ہونٹ بالکل ساکت تھے۔ ساکت ہونٹوں پر دل کی لرزش مچلا کرتی ہے۔ وہ بھی دل ہی دل میں کچھ مانگ رہا تھا، کچھ طلب کر رہا تھا۔ مجھے یہ امیر نواز بڑا عجیب لگا۔ کہاں وہ؛ جو شراب کے نشے میں دھت اول فول بکتا ہوا، لڑکیوں کے جذبات خیز تذکرے کرتا ہوا لاپروا امیر زادہ اور کہاں مزار پر اشکوں سے تر چہرہ لیے لب بستہ

کھڑا مایوس، طلب گار، امیر نواز!

کافی دیر گزر گئی۔ اُس پر طاری کیفیت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تو میں نے کھنکار کر اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے، لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور آنکھیں کھول دیں۔ اُسے شاید اپنے رونے کا احساس نہیں ہوا تھا، قدرے بیٹھی بیٹھی آواز میں بولا، ''ہاں بھئی شہرے! کیسے آنا ہوا؟''

میں نے کہا، ''یہ کیا ماجرا ہے؟''

''کیا؟''

میں نے اُس کی نم آنکھوں میں اشارتاً جھانکا۔

''بس ویسے ہی دِل بھر آیا تھا یار، وگرنہ رونے کی بات تو کوئی نہیں تھی۔'' اُس نے نیم آزردگی سے کہا۔

ہم دونوں مقبرے سے نکل کر ٹہلتے ہوئے پختہ احاطے کے شمالی گوشے کی طرف آ گئے۔ میں نے اُسے ماسی فاطمہ کے ڈاکٹر شاہ جی کے پاس آنے، اطلاع دینے اور وریام خان کے پُر اشتعال رویے تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔ میرے خاموش ہونے پر بولا، ''اَب تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا، ''وریام خان مجھ سے ناراض ہے، میں چاہتا ہوں کہ وہ ناراض نہ رہے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔''

''مشکل ہے!'' وہ نیم مایوسی سے بولا۔

''اگر بڑا خان اُسے سمجھائے تو وہ.....'' میرا اشارہ حیات خان کی طرف تھا۔

''خیر! تم فکر نہ کرو، میں ابا جی سے بات کر لوں گا۔ ڈاکٹر شاہ جی والا کیا قصہ ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''یہ زَیناں والا کیا چکر ہے؟''

میں نے زیناں اور ڈاکٹر کے باہمی تعلق کی نوعیت پر دوٹوک مؤقف اختیار کیا۔ جو سچ تھا، بیان کر دیا۔

وہ بولا، ''کہیں یہ نہ ہو کہ چاچا خان اِس کہانی کو نمک مرچ لگا کر نور پور کے گھر گھر میں پہنچا دے۔ تم یہاں کے لوگوں کو تو جانتے ہی ہو، بات کو بتنگڑ بنانے میں دیر نہیں کرتے۔ زَیناں پر

انگلیاں اُٹھنے لگیں گی اور ڈاکٹر شاہ جی کا یہاں رہنا دشوار ہو جائے گا۔''

میں نے کندھے اُچکائے، ''اِس کا حل بھی تمہی کو ڈھونڈنا ہوگا۔''

''شاہ جی نے بڑی غلطی کی۔ کیا تھا، دو گھڑی کو چلا جاتا اور مریضہ کو دیکھ آتا۔ اَب چاچے وریام کو یہ ایڈوانٹیج بھی حاصل ہے کہ مریضہ، اسما، سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ بیٹی بھی وہ، جس پر اُس کا باپ اور بھائی جان وارتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اَبھی چاچے وریام خان نے سردار حیدر خان تک یہ ماجرا اپنے مخصوص اشتعال انگیز انداز میں نہیں پہنچایا وگرنہ اَب تک ڈاکٹر شاہ جی کو نور پور کی گلیوں میں مردہ جانور کی طرح گھسیٹا جا چکا ہوتا، اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دی گئی ہوتی۔'' امیر نواز کے لہجے میں گھمبیرتا تھی۔

ایک سرد نامانوس سی لہر میرے تن بدن میں اُتر گئی۔ میں نے اُسے بڑے رسان سے باور کرایا کہ ڈاکٹر شاہ جی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ نور پور صحت کی غیر معمولی سہولتوں سے محروم ہو جائے گا۔ وہ خود بھی ڈاکٹر شاہ جی کا فین تھا۔ اُس کی دل سے عزت کرتا تھا۔ اُس نے مجھے دِلاسا دیا۔ چونکہ وہ اَبھی کچھ دیر مزار میں ہی رہنا چاہتا تھا اِس لیے میں اجازت لے کر جیت شاہ کے احاطے سے نکل آیا۔ میرے دل پر پڑے ہوئے بوجھ میں خاطر خواہ کمی واقع ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ امیر نواز بہت کم وقت میں اِس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھا کر ڈاکٹر شاہ جی کو محفوظ کر دے گا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہوتے ہی چاچا چراغ مجھے ایک بار پھر سمجھانے بیٹھ گیا۔ زمانے کی اونچ نیچ، جمع تفریق اور حیثیتوں کے تفاوت کا فلسفہ میرے ذہن میں اُتارنے لگا۔ میں سر جھکائے سنتا رہا۔ چاچا اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کر رہا تھا جبکہ میں غیر محسوس انداز میں کھالے کی باتوں کو دل ہی دل میں دُہرا رہا تھا۔ دونوں کی باتوں میں تضاد تھا۔

کھالا کہتا تھا، ایک بار جھکنے والا زندگی میں کبھی سر اُٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں ہو پاتا۔

چاچا سمجھا رہا تھا کہ پھل سے لدی ٹہنی ہی جھکتی ہے۔ جس شاخ پر پھل نہیں لگتا، وہ جھکتی نہیں بلکہ ہواؤں کے دوش پر تڑپتی مچلتی رہتی ہے۔ کھالے کی باتیں دل کو لگتی تھیں، چاچے کی باتیں کھوکھلی اور اجنبی سی محسوس ہوتی تھیں۔ یک طرفہ گفتگو کی اِس نشست میں چاچی اور پروین نے بھی حصہ ڈالا۔ میں نادان نہیں تھا مگر اُس گھڑی نادان بنا بیٹھا، سر افگندہ، سن رہا تھا، اثبات میں سر دھن رہا تھا۔ وقتی طور پر اِسی خاموشی اور ثبات میں ہی عافیت تھی۔

رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ذہن بار بار ڈاکٹر شاہ جی کی طرف چلا جاتا۔ وہ مجھے بہت پیارا تھا۔ اُسے پہنچنے والے نقصان کے اندیشے نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ مبادا کہ کچھ ہو نہ جائے۔ باوصف اِس کے کہ امیر نواز نے مجھے مضبوط تسلی دی تھی، میرے دل میں ان گنت واہمے سر سرانے لگے تھے۔ کئی مرتبہ جی چاہا کہ خاموشی سے اُٹھ کر ہسپتال چلا جاؤں اور اپنی آنکھوں سے اُسے صحن کے وسط میں چارپائی پر لیٹے دیکھ آؤں مگر مصلحت آڑے آئی۔

علی الصبح کھال کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں ہسپتال پہنچ گیا۔ کھال چونکہ سطح زمین سے تین چار فٹ بلند تھا، اِس لیے کھال پر کھڑا ہو کر دیکھنے سے ہسپتال کا مکمل اندرونی منظر دکھائی دیتا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہی دکھائی دیتا تھا۔ میں اردگرد دیکھتا ہوا چہار دیواری کا ٹوٹا ہوا حصہ عبور کر کے اینٹوں کی روش پر آ گیا۔ صبح کے ملگجے ماحول میں پہلے بھی بارہا ڈاکٹر شاہ جی کے کوارٹر پر آ چکا تھا۔ ڈاکٹر منہ اندھیرے جاگ جانے کا عادی تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد کھیتوں میں چہل قدمی کرنا اُس کا معمول تھا مگر آج یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اَبھی تک نہیں جاگا یا اگر جاگ بھی گیا ہے تو کوٹھی سے باہر نہیں آیا۔

چھوٹے کوارٹروں میں زندگی ہڑبڑا کر بیدار ہو چکی تھی۔ برتنوں کی کھنک اور جھاڑو کی مخصوص آواز ہر آباد کوارٹر سے برآمد ہو رہی تھی۔ میں آہستہ رَوی سے چلتے ہوئے ڈاکٹر کی کوٹھی کے سامنے آیا۔ دروازہ حسبِ معمول چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں بیرونی دروازہ عبور کر کے کوٹھی میں داخل ہوا، اِدھر اُدھر دیکھا مگر صحن میں کہیں بھی ڈاکٹر شاہ جی دکھائی نہیں دیا۔

میرا دِل یک بارگی ہول کھانے لگا۔ اِس وقت تک بیڈروم میں رہنا اُس کے معمول کا حصہ نہیں تھا۔ وہ اپنے بیڈروم میں بھی نہیں تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے کوٹھی کے بقیہ دونوں کمرے اور کچن بھی دیکھ ڈالا۔ وہ دکھائی نہیں دیا تو میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ خالی الذہنی کی کیفیت سے دوچار برآمدے میں، اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے ڈاکٹر شاہ جی کو دو تین مرتبہ پکارا۔ آواز نہیں آئی۔ پھر میری آواز خاصی بلند ہو گئی مگر بے سود۔ ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں ایک نامانوس اور سماعت شکن آواز گونجی۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ غیر ارادی طور پر میں ایڑیوں کے بَل گھوما۔ ایک عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والا منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

❖❖○❖❖

بانس کی بنی ہوئی عام طرز کی سیڑھی میری نگاہوں کے عین سامنے، برآمدے کے دونوں ستونوں کے بیچ، ہوا میں معلق تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ نیچے کی اَور تیزی سے سرکتی ہوئی سطحِ زمین پر ٹک گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کچھ ہی دیر لگی تھی کہ چند لمحے پیشتر سنائی دینے والی مہیب آواز سیڑھی کے پختہ منڈیر سے رگڑ کھانے سے پیدا ہوئی تھی۔ مجھ پر تسلط جمانے والا خوف تحلیل ہو گیا مگر دھڑکن اَبھی بھی تیز تھی۔

میں لپک کر برآمدے سے نکل کر صحن میں آیا۔ اوپر دیکھا تو ایک طویل سانس میرے حلق سے خارج ہو گئی۔ ڈاکٹر شاہ جی کھجور کی بنی ہوئی چٹائی میں اپنا بستر لپیٹے، بغل میں دابے سیڑھی کے ڈنڈوں پر سنبھل کر اُترتا دکھائی دیا۔

مجھے دیکھ کر ایک ذرا مسکرایا، بولا، ''حیران ہو گئے ناں؟''

میں خاموش رہا۔ چند ہی لمحوں میں وہ زمین پر تھا۔ اُس نے لپٹا ہوا بستر میرے حوالے کیا۔ سیڑھی کو زمین پر اُتارا اور اُٹھا کر سٹور میں جا رکھا۔ میں نے بستر اُس کے بیڈ روم میں لے جا کر ہان کی چارپائی پر رکھ دیا۔ وہ بھی کمرے میں آ گیا۔

میں نے پوچھا، ''آپ رات کو چھت پر سوئے تھے؟''

''ہاں!'' اُس نے عام سے انداز میں کہا۔

''مگر کیوں؟''

اُس نے میری 'کیوں' کا جواب دینے کی بجائے بات بدل دی، ''کیا تم نماز پڑھ چکے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُس نے کہا ''مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں بھی نماز پڑھ لوں۔ پھر دونوں واک کے لیے نکلتے ہیں۔ میں تمہیں راستے میں چھت پر سونے کی وجہ بتاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے کندھے اُچکا کر اُس کا بستر چارپائی پر کھول دیا۔ ۔ے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں بے اختیار چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بستر کھلتے ہی مجھے ہلدار سیاہ رنگ کی رائفل دکھائی دی تھی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا حالانکہ میں نے ہا ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کی صفائی ستھرائی بھی کی تھی۔ مختصر سے سامان کی ترتیب کو بھی کئی مرتبہ ا الٹا تھا۔

میں چند لمحوں تک اُسے یوں خوفزدگی کے عالم میں دیکھتا رہا جیسے وہ آپوں آپ چل کر میرا سینہ چھلنی کر دے گی۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے بہ دستِ احتیاط اُسے اُٹھایا، ڈرتے ڈرتے معائنہ کیا اور پھر بستر پر رکھ دیا۔ بالکل ایسی ہی ری پیٹر گن میں نے امیر نواز کے پاس دیکھ رکھی تھی۔ تقریباً ڈھائی فٹ لمبائی کی حامل اِس گن کی حشر سامانیاں بھی میں نے دیکھ رکھی تھیں۔ امیر نواز جب بھی اپنے شہر سے آنے والے دوستوں کے ہمراہ شکار کی غرض سے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر واقع بیلے میں جاتا تھا، مجھے بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ وہاں مرغابی، سؤر اور تلور کا شکار بہ کثرت ملتا تھا۔ اِس کی نالیوں سے کیا نکلتا ہے؟ کارتوس اور گولی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ یہ سبق میں نے ملتان کالج کے ہوسٹل میں پڑھ رکھے تھے۔ میں جانتا تھا کہ بندوق کے پیچھے آگ اور سامنے موت کھڑی ہوتی ہے۔ اِس بندوق کے پیچھے ڈاکٹر شاہ جی کا کندھا تھا۔ مقابل کون تھا؟ وریام خان یا حیدر خان؟ یا اُن کا کوئی وفادار ہرکارہ..... اِس بارے میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی کے پاس یہ رائفل کہاں سے آئی تھی؟ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ڈنک مار رہا تھا۔ میں نے اُسے جتنا بے ضرر اور بزدلی کی حد تک پڑھا لکھا شریف آدمی سمجھ رکھا تھا، وہ اتنا بھی ڈرپوک اور بے دست و پا نہیں تھا۔ اُسے یقیناً یہ اندازہ تھا کہ اُس نے وریام خان کے ساتھ بگاڑ کر اپنے لیے بے سکونی اور عدم تحفظ کا احساس خرید لیا ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنی حفاظت کی غرض سے کوٹھی کی چھت پر سویا تھا۔ چونکہ کسی نامعلوم مصلحت کے تحت محکمہ تعمیرات والوں نے کوٹھی کی چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں نہیں بنائی تھیں، اِس لیے ڈاکٹر شاہ جی بانس کی بنی ہوئی سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھا، سیڑھی کو کھینچ کر اپنی تلاش میں اپنے پیچھے آنے والوں کا راستہ مسدود کیا اور بے فکری کی نیند سو گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اُس کی چالاکی کو سراہا اور غیر ارادی طور پر رائفل سے نظریں چراتا ہوا کمرے کے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

برآمدے کے ایک گوشے میں ڈاکٹر شاہ جی جائے نماز بچھائے سجدہ گزیں دکھائی دیا۔ میں اُس کے فارغ ہونے تک بغور اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا مگر اُس کا جسم جوانوں کی طرح توانا اور مضبوط تھا۔ پچاس کے سن میں آنکھوں تلے جھریاں پڑ جاتی ہیں، ہاتھوں کی پشت اور گردن کی جلد ڈھلکنے لگتی ہے مگر اُس کے یہاں ایسا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر وہ سفید چمک

دار بالوں کو خضاب سے رنگ لیتا تو با آسانی پینتیس کا دکھائی دے سکتا تھا مگر اُس نے کبھی جوان دکھائی دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''آؤ! باہر چلتے ہیں۔''

''ناشتہ؟''

''کر لیتے ہیں، پہلے چہل قدمی کر لیں۔'' اُس نے مسکرا کر کہا۔

ہم دونوں کوٹھی سے، پھر ہسپتال سے نکل آئے۔ کھال عبور کر کے کھیتوں میں گھس گئے۔ وہ آگے آگے، میں تقلید میں، چلتے ہوئے کافی دور تک چلے گئے۔ ہمارے پائنچے اَوس زدہ فصل نے گیلے کر دیے تھے۔ ہر روز کی طرح عجیب اور بے عنوان سی آسودگی مجھے اپنی روح میں اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دو ایکڑ کے فاصلے پر ناپختہ کھال کھیتوں میں سے گزرتا تھا۔ اُس کے گھاس بھرے بنے پر پانی میں پیر ڈال کر ڈاکٹر شاہ جی بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''کیا تم نے میرا بستر چارپائی پر پھیلا دیا تھا؟''

''جی شاہ جی! پنیال (اوس) میں بھیگ گیا تھا۔ ذرا ہوا پھر گئی تو سوکھ جائے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر تم نے بستر میں رکھی ہوئی گن بھی دیکھ لی ہوگی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کچھ دیر تک مجھے کریدتی نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر اَز خود مطمئن ہو کر بولا، ''شہریار! تمہارے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ میں رات کو کوٹھی کی چھت پر سوتا ہوں۔ یہ احتیاط میں نے وریام خان اور سردار حیدر خان کی دھمکیوں کے پیشِ نظر برتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ محکمانہ طور پر میرا کچھ بگاڑ نہ پائے تو مجھ پر براہِ راست حملہ آور ہو جائیں گے۔ یقین مانو! ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا، ماضی میں بھی قدم قدم پر ایسے کانٹے چننا پڑے ہیں۔ اسمبلی میں جانے والے وڈیروں نے دو چار یا بہت سے ایسے لوگ ضرور پال رکھے ہوتے ہیں جو اُن کی ایک جنبشِ اَبرو پر خون کی ندیاں بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اُس نے کھال کے مٹیالے پانی سے ہاتھ منہ دھوئے، ہاتھوں کی مدد سے چہرہ پونچھا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا، ''قانون! قانون کیا ہے؟..... کتابیں کہتی ہیں کہ ہر

انسان کو دوسرے سے محفوظ رکھنے اور اُس کے حقوق کی حفاظت کرنے کے اصول وضوابط کا نام قانون ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ محض انسانوں کے سروں پر مسلط شیطانوں کو تحفظ دینے کے لیے اختراع کیا گیا بہکاوا ہے۔ لولی پاپ ہے جو مونھوں میں ڈال کر زبانیں بند کر دی جاتی ہیں۔ وہی تھانیدار جو سچائی اور انصاف کے نام پر ہر ماہ ہزاروں روپے سرکار سے اینٹھتا ہے، وہ انہی لوگوں کی عیاشیوں اور مظالم کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ مجرموں کی گردنیں ناپنے کی بجائے مجرموں کے سامنے سر جھکا کر خاموش نگاہوں سے اعزازیہ مانگتا ہے، بھیک مانگتا ہے، راتب طلب کرتا ہے۔ اسے اللہ پر یقین نہیں ہے کہ وہ روٹی دے گا یا ہاتھ کھینچ لے گا۔ غریبوں کے لیے سور ما بننے والا محض اُس وقتی نقل مکانی سے ڈرتا ہے جو سیاست دانوں اور وڈیروں کی حکم عدولی پر اُسے ملتی ہے۔''

وہ بولتے بولتے بہکنے لگا تھا، یوں جیسے اُس نے پی رکھی ہو۔ کہنے لگا، ''شہریار! سردار حیدر خان مجھے مروا سکتا ہے۔ اُسے کسی تھانیدار کا خوف نہیں ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ وہ تو خدا سے بھی نہیں ڈرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا، ہمیشہ خاموش نہیں رہتا مگر سچ یہ ہے کہ اِس موئے قانون نے خون کو بھی گونگا کر دیا ہے۔ میرے مرنے کے بعد میرا خون کبھی بھی بولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اِس لیے میں نے اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔ کوٹھی کی عمارت کافی اونچی ہے۔ اول تو کوئی بھی میری تلاش میں چھت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوگا اور اگر کوئی اوپر آنے کی کوشش بھی کرے گا تو اُسے میری گن اپنا شکار بنا لے گی۔ دیکھ لینا! کوئی بندہ جب میرے ہاتھوں قتل ہوگا تو یہی خان لوگ اُسے پہچاننے سے بھی انکاری ہو جائیں گے اور لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے ہمدردی جتانے بیٹھ جائیں گے۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ قتل اور خون کی باتیں کتنے عام سے انداز میں کر رہا تھا۔ میں نے کہا، ''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں رات کو آپ کے پاس آ جایا کروں؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا، بولا، ''تم بس یہ احتیاط کرو گے کہ ہسپتال کے عملے سمیت کسی بھی فرد کو یہ نہیں بتاؤ گے کہ میں چھت پر سوتا ہوں اور میرے پاس گن بھی ہے۔''

وہ اگر نہ بھی کہتا، تب بھی میں نے اِس ہدایت پر عمل پیرا ہونا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہسپتال کا عملہ اُس کے جیسا نہیں تھا۔ سبھی اہل کار خانزادوں کی خوشامد کرتے تھے۔ بعید نہ تھا کہ وہ سردار حیدر خان کی خوشنودی کے لیے ڈاکٹر کے خلاف محاذ کھڑا کر لیتے اور اُس کے معمولات

کی مکمل رپورٹ وہاں پہنچا دیتے۔

میں نے پوچھا، ''آپ نے یہ گن کہاں سے لی؟''

''یہ گزشتہ دو سالوں سے میرے پاس ہے۔'' اُس نے کہا، ''اِس سے پہلے میرے پاس سیمی آٹو میٹک رائفل تھی۔ اُس کا لائسنس اَبھی تک میرے پاس ہے۔ رائفل کسی چور نے میرے کوارٹر سے چُرالی تھی۔ تب میں نے یہ گن مجبوراً باڑے سے منگوائی تھی۔''

''مجبوراً؟ میں سمجھا نہیں کہ آپ کو کیا مجبوری لاحق تھی؟''

''یہاں سے ایک نمبر مال نہیں ملتا۔ یہ ولائتی ہے۔ اچھے لوہے کی بنی ہے۔ اِس کی نال جلد گرم نہیں ہوتی۔'' اُس نے بتایا۔

''شاہ جی! مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔'' میرے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا۔

اُس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ چند ثانیوں تک مجھے گھورتا رہا، پھر بولا، ''زندگی کے چھننے کا ڈر؟''

''جی! کچھ بھی تو ہوسکتا ہے ناں!''

اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، تھوڑا دبایا، پھر بولا، ''ناں دوست! ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سانپ کو دیکھ کر دہشت سے سن ہوجانا اُسے ڈنک مارنے کا بھرپور موقع فراہم کرتا ہے۔ پستول کی نال کے سامنے ڈر کے مارے ساکت ہونے کا مطلب زندگی کا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ دینا ہے۔ اوسان خطا نہ ہوں تو کبھی سانپ ڈس نہیں سکتا۔ دماغ جاگتا رہے تو کوئی تمہیں گولی نہیں مار سکے گا۔ تمہیں ایک کارآمد بات بتاتا ہوں۔ جب بس یا ویگن کا ایکسی ڈنٹ ہوتا ہے تو جاگنے والے مرجاتے ہیں یا شدید زخمی ہوجاتے ہیں جبکہ خوابیدہ مسافر شدید زخمی ہونے یا موت کا شکار ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ جانتے ہو کیوں؟''

میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

وہ بولا، ''اِس لیے کہ سوئے ہوئے دہشت کے ابتدائی خطرناک حملے سے بچ جاتے ہیں اور ہارٹ اٹیک کا شکار نہیں ہوتے۔ جسم ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے اس لیے سیٹوں کے بیچ میں لڑھک کر زخم کھانے سے بچ جاتا ہے۔ سمجھے؟''

مجھے اُس کے فلسفے کی پوری طرح سمجھ تو نہیں آئی مگر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا، ''مرجانا بھی فطرت کا شاخسانہ ہے۔ کوئی بے موت زندگی نہیں رکھتا۔ سبھی نے مرنا ہے۔ تم نے،

میں نے، دُنیا میں سانسیں لیتے ہوئے ہر وجود نے ایک نہ ایک دن مر جانا ہے۔ جب مرنا طے ہے تو پھر اِس سے خوف کیوں محسوس ہو۔ زندگی کے ہر لمحے کو غنیمت سمجھ کر گزارو، دُنیا کو انجوائے کرو اور اپنی مستقل مزاجی اور بے خوفی سے مقابل کو پریشان کیے رکھو..... یہی کامیابی کا راز ہے۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ پڑھا لکھا آدمی دلیر نہیں ہوتا۔ آپ پڑھے لکھے ہیں، پھر بھی دلیر ہیں، اِس کی وجہ کیا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھ لیا۔

وہ مسکرایا، لمحاتی لذت کشیدگی کے بعد گویا ہوا، ''تم بھی تو دلیر ہو!''

''میں؟'' میں متحیر ہوا۔

''ہاں تم! وریام خان کے سامنے تم نے اپنا مؤقف پوری دلیری کے ساتھ پیش کیا۔ یہی بہادری کی ابتدا ہے۔ جوں جوں تمہارا ذہن بالغ ہوتا جائے گا، مضبوط ہوتا جائے گا۔ دست و گریباں ہونا یا کسی سے لڑنا بھڑنا، غنڈہ گردی کرنا اور دھونس دھمکیاں جمانا، جیسا کہ تمہارا دوست خالد محمود کرتا ہے، دلیری نہیں کہلاتا۔ وہ دلیر نہیں، پَرلے درجے کا بزدل انسان ہے۔ اُس نے ابھی تک اپنے اوپر لگی ہوئی کمین زادے کی چھاپ کو اُتارا نہیں۔ اُس کا جھکا ہوا سر اَبھی تک نہیں اُٹھا اور یقیناً کبھی بھی نہیں اُٹھے گا۔ تم نے اپنا مؤقف پیش کرنا سیکھ لیا ہے، اپنے مؤقف پر استدلال لانا اور پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ڈٹ جانا بھی سیکھ جاؤ گے۔ تب تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔''

عمومی طور پر دل کو اچھی لگنے والی باتیں اس وقت مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ چونکہ وہ بڑا افسر تھا، اُس کی پہنچ اوپر تک تھی، اِس لیے وہ ایسی باتیں کرتا تھا۔ وہ اگر میری جگہ پر ہوتا، گھاٹے کے جیسا ہوتا تو شاید اَبھی تک وہ بھی خان زادوں کے سامنے سر اُٹھا کر بات نہ کر پایا ہوتا۔ ہمیں جنم گھٹی میں خدمت اور ادب کا سبق گھول کر پڑھایا جاتا تھا۔ باپ سے تو تکار کرنا اُس ناخواندہ سوسائٹی میں روا تھا مگر سرداروں کے سامنے سر اُٹھا کر بات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

وہ کافی دیر تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور اُجلی دھوپ فصلوں پر اپنی تاب نچھاور کرنے لگی تھی۔ اُسے اَبھی تیار ہونا تھا، ناشتہ کرنا تھا، اِس لیے چونک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ واپسی کے سفر میں وہ یکسر خاموش رہا اور میرے آگے

آگے چلتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق گیلی گھاس کو فٹ بال کھیلنے کے سے انداز میں ٹھوکریں مارتا رہا۔

میں اُس کے لیے ناشتہ تیار کرنا چاہتا تھا مگر اُس نے رسان سے منع کر دیا۔ ہسپتال کی مرکزی عمارت کے بیرونی برآمدے میں ڈسپنسر کی سائیکل، اسٹینڈ پر لگی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ آج نسبتاً ہسپتال جلدی پہنچ گیا تھا۔ وہ ہسپتال کے پہلے کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ وہ ہر روز اپنی سائیکل کوارٹر سے نکال کر ہسپتال کے برآمدے میں کھڑی کر دیتا تھا۔ دِن میں اُسے یا عملے کے کسی آدمی کو باہر جانا پڑتا تو وہ سائیکل نکال لیتا تھا۔

دوپہر میں سردار حیات خان کی حویلی سے بلاوا آ گیا۔ حیات خان مہمان خانے کے خاص کمرے میں میرا منتظر تھا۔

مجھے دیکھتے ہی بولا، ''شہرے! تیڈی بیٔ نہیں تھیندی یارا! پَر دھیان رکھا کر، بڑا ہمیشہ بڑا ہی رہتا ہے۔ جسے خدا رتبہ دیتا ہے اس کی بڑائی کو ماننا ہی دانش مندی کہلاتا ہے۔''

میں نے بیٹھتے ہوئے شکایت کے انداز میں کہا، ''خان جی! میں نے کبھی آپ کی شان میں گستاخی تو نہیں کی۔''

''میں اپنی بات نہیں کرتا، سردار وریام خان کی بات کرتا ہوں۔ امیر نواز نے بتایا ہے کہ تم نے اُس کے سامنے اونچی آواز میں بات کی ہے۔ کوئی لحاظ کیے بغیر اُس کے منہ پر ہی بڑھ چڑھ کر جواب دیتے رہے ہو۔ کیا یہ درست ہے؟''

میں نے چونک کر سردار حیات خان کو دیکھا۔ اُس کے لہجے میں تندی کی آمیزش نے آنِ واحد میں مجھے سمجھا دیا تھا کہ اُس کے منہ میں وریام خان کی زبان رکھی جا چکی تھی۔

میں نے مؤدبانہ انداز میں صفائی پیش کی، ''خان جی! میں نے کوئی بے ادبی نہیں کی تھی مگر وریام خان نے میری ماں بہن ایک کر دی۔ گالیاں دیں، دھمکایا اور میرے چاچے کو بلا کر بے عزت کیا۔ آپ میری دَھاں (شکایت) سننے کی بجائے الٹا مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے خان جی؟''

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں تک مجھے کڑی نگاہوں سے گھورتا رہا، پھر پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے کی مشرقی دیوار تک چلا گیا۔ وہاں رُک کر ایڑیوں کے بل گھوما اور مجھے مخاطب کر کے سرد لہجے میں بولا، ''شہرے! تم نے چار جماعتیں کیا پڑھ لیں کہ بڑے چھوٹے کا

فرق ہی بھول گئے۔ تم میرے رشتہ دار تو ہو مگر اُس جگہ پر نہیں جہاں میرا سوتر سردار وریام خان کھڑا ہے۔ اگر تمہیں میری حویلی میں آنے جانے کی اجازت ہے تو تمہاری پڑھائی کی وجہ سے نہیں، بلکہ رشتہ داری کی بدولت ہے۔ پَر خان میرے سگے چاچے کا پتر ہے۔ خون کا رشتہ ہے اُس سے میرا.....''

اُس کی باتیں اپنی زہریلی معنویت سمیت سیدھی میرے دل میں چبھتی جاتی تھیں۔ میں کبھی بھی اِس حویلی میں دستِ سوال پھیلا کر نہیں آیا تھا۔ مجھے ہمیشہ بلایا گیا تھا اور مجھ سے کوئی نہ کوئی کام ہی لیا گیا تھا۔ بغیر کسی معاوضے کے مجھ سے کام کروانا بھی اُس کے نزدیک مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ اگر میں رشتہ دار نہ ہوتا تو بقول اُس کے، مجھے حویلی میں داخل ہونے کی اجازت میسر نہ آتی اور نہ ہی مجھ سے بیگار لی جاتی۔

میں بھی اُس کے مقابل میں کھڑا ہو گیا، ''خان جی! آپ ہمارے مائی باپ ہیں، بھاگ وند ہیں، مگر اِس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اپنے چچازاد بھائی کی وجہ سے گھر بلا کر بے عزت کریں۔ وریام خان بھی باپ کی جگہ پر تھا میرے لیے، تبھی گونگوں کی طرح کھڑا اُس کی گالیاں سنتا رہا۔ آپ بھی اپنے من کی موج، بھلے پوری کر لیں مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں کمین زادہ نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کا مزارع ہوں۔ خواہ دو تین ایکڑ سہی، اپنی زمین ہے، جسے کاشت کرتا ہوں اور کبھی ہاتھ پھیلا کر آپ کے سامنے نہیں آیا۔ ہاں! آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ نے مجھ پر اپنی حویلی کے دروازے آج تک کھلے رکھے؛ جی چاہے تو آج ہی یہ دروازے مجھ پر بند کر دیجیے۔ مجھے پروا نہیں ہے۔''

وہ کسی کی بات، کسی کا مؤقف سننے کا فطری طور پر روادار نہیں تھا مگر میری بات کو، دخل دیے بغیر، سن رہا تھا۔ یہ اچنبھے کی بات تھی۔

میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی گھل گئی، ''خان جی! میں نے وریام خان کی بے جا ناراضی محو کرنے کے لیے چھوٹے خان سے بات کی تھی۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میرا اَپاہ (ازالہ) نہیں کیا جائے گا بلکہ مجھے مزید بے عزت کیا جائے گا۔ آپ نے مجھ سے وریام خان کی ناراضی کی وجہ تک دریافت نہیں کی، مجھے اُس سے یا آپ سے معافی مانگنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلتا ہوں۔ جاتے ہوئے کہتا ہوں کہ آپ اپنے رویے پر غور کیجیے گا۔ اگر خان آپ کا رشتہ دار ہے تو میں بھی رشتہ دار ہوں۔ کیا ہوا جو خدائی وَنڈ (تقسیم) نے آپ کو جاگیردار بنا دیا

اور مجھ سے میرے ماں باپ تک چھین لیے۔ جو دیتا ہے، وہ لے سکتا ہے اور جو لیتا ہے وہ دے بھی سکتا ہے۔''

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ بغیر اجازت طلب کیے خان کے خاص کمرے سے اخراج کا قصد کیا۔ اُس کی بھاری بھرکم آواز نے عین دروازے کی دہلیز پر میرے قدم روک دیے، وہ کہہ رہا تھا، ''شہرے! اِنج ویسیں تے ساری حیاتی بیٹھا روسیں!''

(اِس طرح سے جاؤ گے تو تمام عمر پچھتاؤ گے۔)

میں اُس کی جانب پشت کر کے کھڑا تھا۔ عین اِسی وقت مجھے اپنے سامنے، مہمان خانے کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا امیر نواز دکھائی دیا۔ اُس نے مسکرا کر کہا، ''بابا نے تمہارا مسئلہ حل کر دیا ہے، جاؤ، موج کرو۔ تمہیں خان چاچا کچھ نہیں کہے گا۔''

میں نے اُسے دیکھا، پلٹ کر اُس کے باپ کو دیکھا۔ سردار حیات خان کے سرخ چہرے پر اپنے لیے نفرت اور حقارت کے واضح پرتو دیکھے۔ چند لمحوں تک میں ہونٹ کاٹتے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔

جب امیر نواز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، میں نے کہا، ''خان جی! ماں باپ نے اپنی اگلی چھڑا کر مجھے نور پور میں اپنے رشتہ داروں کی ٹھوکروں پر رکھ دیا تھا۔ چاچے چراغ کے علاوہ کسی نے مجھ یتیم کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ ہاں! تب آپ نے بھی حویلی کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ آج تک مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ میں نے پڑھائی کیوں چھوڑ دی۔ صرف اس لیے کہ میرے پاس کالج کے داخلے کے لیے رقم نہیں تھی۔ کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی، جس سے میرا خون کا کوئی رشتہ نہیں ہے، جس نے میرے ماں باپ کو دیکھا تک نہیں، اُسے میرے خاندانی پس منظر سے بھی سروکار نہیں، اُس نے مجھے کتابیں خرید کر دیں۔ ہر روز وقت نکالتا ہے اور میرے ساتھ مغز ماری کرتا ہے۔ آپ لوگوں نے میرے لیے کیا کیا؟ کوئی ایک انعام..... کوئی ایک بخشش..... کوئی ایک دلاسا..... آپ لوگوں نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔ پھر آپ لوگوں کو مجھ پر حق بھی کیا حاصل ہے۔ خان جی! آپ رشتے میں میرے کچھ بھی نہیں ہیں، باپ مان ہیں مگر مجھے جب بھی بھتیجا سمجھا گیا، میرے لبوں پر 'چاچا جی' کا لفظ آئے گا اگر نہیں آئے گا۔''

میرے کندھے پر رکھے ہوئے امیر نواز کے ہاتھ میں بتدریج سختی پیدا ہوتی گئی مگر میں نے

مطلق پروا نہیں کی۔ میں اپنی بات ختم کر کے پلٹا اور امیر نواز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا ہوا، ''امیر نواز! تمہارے بابا اور وریام خان میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔ ان سے تو بخت خان ہمارے لیے اچھا ہے جو ہمارا فائدہ نہیں کرتا تو اُس نے کبھی ہمارا نقصان بھی نہیں کیا۔ یارن خان بھلا ہے جو سال میں دو تین ماہ یہاں گزارنے کے لیے آتا ہے اور کسی کو منہ لگائے بغیر شہر چلا جاتا ہے۔''

''بکواس کیے جاتے ہو، بتاؤ تو، ہوا کیا ہے؟'' امیر نواز کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''ہاں! میں بکواس کرتا ہوں۔ تم خان زادے ہو، تمہارے چہرے کے اتار چڑھاؤ مجھے سمجھا رہے ہیں کہ تم بھی اِسی کلاس کے انسان ہو۔ اَب تک تم نے جو یاری دوستی اور انسانوں میں برابری کی باتیں کی ہیں، وہ سب جھوٹی ہیں۔ تم خان ہو اور غریب پروری تمہارا بہروپ ہے۔ تم بھی اپنے باپ کی طرح میرے کاندھے پر شکار کا سامان لاد کر مجھ پر احسان کرتے رہے ہو۔ میرے ہاتھ میں بھینس کی رسی تھما کر وٹرنری ہسپتال سے 'ٹیکہ رکھوانے' بھیج دیتے تھے تو مجھ پر احسان ہی کیا کرتے تھے ناں۔''

میں اُس کے اشتعال کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اُس کے باپ کی دھاڑ نے اُس کی زبان کو نوک سے پکڑ لیا۔ سردار حیات خان زخمی شیر کی طرح دھاڑنے لگا، گرجنے برسنے لگا۔ اُس کی برانگیختگی کسی بھی طور سے وریام خان سے مختلف نہیں تھی۔ اُس نے ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا، یہ اپنا ہاتھ روک نہیں پایا۔ اُس نے عقب سے میرا کالر پکڑا اور جھٹکا دے کر میرا رُخ اپنی جانب موڑ لیا۔ میں اَبھی سنبھل ہی نہیں پایا تھا کہ ایک زناٹے دار تھپڑ میرے دائیں گال پر پڑا۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ حیات خان کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ اُسے ایک طمانچے پر صبر نہیں آیا تھا، دوسرا مارنا چاہتا تھا کہ امیر نواز نے مجھے پیچھے کی جانب کھینچ لیا۔ میں بیچ سے ہٹ گیا تو باپ بیٹا مقابل میں آ گئے۔ باوصف اِس کے کہ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے، مجھے دونوں کے بیچ ہونے والے مکالمے کی بخوبی سمجھ آ رہی تھی۔ بیٹا باپ کی دونوں بانہیں تھام کر کہہ رہا تھا، ''بابا! ہوش کریں۔ آپ نے شہرے کو مار کر اچھا نہیں کیا۔''

''میں نے اچھا نہیں کیا؟ میں نے؟..... تم بھی اس کمینے کی طرف داری کر رہے ہو جس

نے تمہارے چاچے کے آگے اپنی لمبی زبان کھولی، جس نے میرے مقام پر نگاہ نہیں کی، اپنے اور میرے رشتے کا خیال نہیں کیا، بلکہ یہ تک کہہ دیا کہ مجھ سے اور تمہارے چاچے خان سے بخت خان بہتر ہے..... ہیں؟ تم پرے ہٹ جاؤ۔ میں اِسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اِس پر دہی ڈال کر کتے چھوڑوں گا۔'' فرطِ اشتعال سے حیات خان لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''تو کیا ہوا بابا؟ بخت خان بھی تو میرا چاچا ہی ہے ناں! آپ غصہ تھوکیں اور اندر چلیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں ساری بات۔'' امیر نواز نے غصے سے کانپتے بوڑھے وجود کو بانہوں میں بھرا اور دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ اُس نے دروازے میں ایک پل کو ٹھہر کر مجھے آنکھ سے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

میں سر جھکائے حویلی سے نکلا۔ کھالا اپنی دکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔ اُس کی نگاہ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی ویگن پر جمی ہوئی تھی۔ میں چند قدم بڑھ کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ پلٹا، حویلی پر نگاہ ڈالی، اپنے تپتے ہوئے رخسار کو سہلایا اور بے اختیار اپنی آنکھوں میں اُمڈ آنے والے اشکوں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرنے لگا۔ یہ تھپڑ کی تکلیف کے باعث نہیں بلکہ اُس تضحیک کے احساس کے مرہون تھے جو مجھے حیات خان کے روبرو ملا تھا۔ نور پور کی ان حویلیوں میں اَن گنت ہزیمت بھری داستانیں سرگرداں تھیں۔ بے شمار پگڑیاں اپنے کلف اور اُجالے یہاں کی خاک کے حوالے کر گئی تھیں۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر شاہ جی کی ایک بات چکرانے لگی جسے وہ بار بار مختلف انداز میں بیان کرتا تھا، ''ان لوگوں کی خود ساختہ عزت کا تقاضا ہے کہ پوری دُنیا کے غریب لوگ بے عزت ہو کر ان کی دہلیزوں پر سجدہ ریز ہو جائیں۔''

وہ سچ کہتا تھا۔ میں نے کسی کا کچھ نہ بگاڑ کے سزا پائی تھی۔ وریام خان اور سردار حیات خان دونوں ایک جیسے ہی تھے۔ دونوں کے بیچ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں کچھ دیر کھڑا رہا، پلٹا اور کھالے کو اُسی انداز میں کھڑے دیکھا تو سست روی سے اُس کی طرف بڑھ گیا۔

میرے قریب پہنچنے پر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ بولا، ''امیر نواز سے ملنے کے لیے آئے ہو؟''

میرے کچھ بولنے سے پہلے اُس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑ گئی۔ چونک کر مجھے بغور دیکھنے لگا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنے رخسار پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ بولا، ''تمہیں کس نے مارا ہے؟''

میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے ردِ عمل کو دیکھ کر خود پر اختیار نہیں رکھ سکا اور گلوگیر ہوگیا، ''وہ حیات خان نے.....''

''مگر کیوں؟'' وہ تڑپ کر بولا۔

فرطِ غم سے میری آنکھوں سے دو آنسو رِس آئے۔ اُس نے فوراً قدم بڑھائے، بہت قریب ہوکر میری آنکھیں پونچھیں اور کہا، ''دل ناں ڈھایار! تو کوئی بچہ ہے جو یوں رونے لگا ہے۔ مجھے بتا، کیا ہوا ہے؟ خان نے تمہیں کیوں مارا ہے؟''

میں نے اُسے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اُس نے کوئی جواب دیے بغیر میرا ہاتھ تھاما اور گھر میں لے گیا۔ کمرے میں بٹھا کر پانی کا گلاس بھر لایا۔ بلو کو چائے تیار کرنے کا حکم دے کر میرے پاس آن بیٹھا۔ میں اِس دوران خاصا سنبھل چکا تھا۔

میں نے کہا، ''مجھے نہیں معلوم کہ میرا، ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانا اِن لوگوں کے لیے تکلیف دہ کیوں ہے؟''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سر جھکا کر کچھ سوچتا رہا۔ توقف کے بعد بولا، ''شہرے! میرے جانی وِیر! میری مانو تو نور پور سے چلے جاؤ۔ دُور، جہاں تمہیں تمہاری قسمت لے جائے، چلے جاؤ۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہ کرنا۔ تم اَب ان سرداروں کی آنکھوں میں چبھنے لگے ہو۔ رڑکنے لگے ہو۔ آنکھ کی رڑک یا چبھن کو کوئی بھی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتا۔ تمہاری پڑھائی تمہاری دشمن بن گئی ہے۔ حیات خان اور وریام خان کو اندازہ ہوگیا ہے کہ تمہاری پڑھائی تمہیں غلامی سے نکل بھاگنے پر اکسانے لگی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی سے تمہاری تعلق داری اِسی وجہ سے اُنہیں کھلنے لگی ہے۔ تم میری مانو! یہاں سے چلے جاؤ۔''

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''اور پروین؟''

''کسی قابل ہو جاؤ تو اُسے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔ اَبھی اُس کا خیال دل سے نکال دو۔'' کھالے نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''وہ میرے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتی۔''

''اُسے سمجھاؤ۔ وہ عقل مند ہے، سمجھانے سے فائدے کی بات سمجھ جائے گی۔''

''کہاں جاؤں؟''

''جہاں بھی سینگ سمائیں۔''

''نہیں کھالے! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ ادھر ہی رہوں گا اور خان زادوں کا مقابلہ کروں گا۔'' میں نے اٹل انداز اختیار کیا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا، ''کس بل بوتے پر؟''

''اللہ کی آس پر!''

اُس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ بولا، ''نہیں میرے یار! اللہ نے ان لوگوں کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ ہم لوگ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر شاہ جی کی تقلید نہ کرو۔ وہ بڑا افسر ہے۔ سنا ہے کہ اُس کے پیچھے کسی بڑے آدمی کا ہاتھ بھی ہے اور ویسے بھی وہ 'کلم کارا' انسان ہے۔ اُس کے ساتھ محض اُس کی اپنی زندگی ہے۔ گھر بار کا فکر نہیں ہے۔ تمہارے پیچھے بھرا پُرا گھر ہے جو سرداروں کی دشمنی کی آگ کی پہلی لپٹ بھی سہہ نہیں سکتا۔''

میں نے بے چارگی سے اُسے دیکھا، ''تو کیا ان کے قدموں میں جھک جاؤں؟''

''بے شک نہ جھکو مگر اِن کے معاملات میں ٹانگیں نہ اڑاؤ۔''

''میں نے کب دخل دیا ہے ان کے کام کاج میں؟''

''اُن کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنا اور اختلاف کرنا بھی تو ان کی ناراضی کا سبب ہے۔''

''تو کیا زبان کو تالا لگا دوں؟''

''ہاں! اگر تم ایسا نہیں کر سکتے ہو تو فوری طور پر نور پور سے بھاگ جاؤ اور کبھی پلٹ کر یہاں نہ آنا۔''

اُس کی سوئی بار بار اِسی نقطے پر آن ٹھہرتی تھی۔ بلو چائے لائی، ساتھ ہی امیر نواز کے آنے کی خبر بھی لے آئی۔ وہ آج خلافِ معمول سنجیدگی کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ کھالا متفکر دکھائی دینے لگا۔ اُٹھ کر باہر جانا چاہتا تھا کہ امیر نواز صحن عبور کر کے کمرے کے دروازے تک آ گیا۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔

وہ چارپائی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا، ''تم نے اچھا نہیں کیا شہرے!''

کھالے نے دوسری کرسی کھینچ لی۔

میں نے کہا، ''میرا خیال ہے کہ خان چاچا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

وہ اپنی پیشانی سہلانے لگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے سخت سست کہے گا مگر کافی دیر کے بعد،

جب بلو تیسرا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی، بولا، ''شہرے! ہر الجھے ہوئے معاملے کو کھینچا تانی اور جذباتی جھٹکوں سے سلجھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ مانا کہ بابا اور چاچا خان روایتی وڈیروں جیسا سلوک کرتے ہیں، مگر تم یہ بھی تو مانو کہ تم نے بھی اَن پڑھوں اور غیر اخلاق یافتہ لوگوں والا رویہ اپنایا ہے۔ مشتعل آدمی کو پتھر کھینچ مارو گے تو جواباً گولی ہی آئے گی، کسی بھی طرح سے خیر سگالی کا پیغام نہیں آئے گا۔ کیوں کھالے؟''

کھالا سر جھکائے بیٹھا تھا، چونک پڑا، ''بالکل جی!''

امیر نواز کا شائستہ رویہ دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا۔ میں نے ہمت پکڑ کر کہا، ''یار امیر نواز! میں نے کوئی غلطی کی ہو تو.....''

اُس نے میری بات کاٹ دی، ''کیا تم اتنا سا جھوٹ نہیں بول سکتے تھے کہ 'ٹھیک ہے میں آئندہ ہسپتال میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں نہیں جایا کروں گا'۔ بعد میں چاچے خان کی نظر بچا کر جاتے رہتے۔ کیا وہ چوبیس گھنٹے پہرے داری کرتا ہے ہسپتال کی؟ چھوڑ یار! تم بھی نرے جاہل ثابت ہوئے ہو۔''

میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دانستہ خاموش رہا۔ کھالا اور امیر نواز باری باری اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ایسے میں بلو چائے کے خالی پیالے اُٹھانے کے لیے آئی تو اُس نے دونوں کی نظریں بچا کر مجھے صحن میں آنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے مجھے کبھی ایسے بلایا نہیں تھا، اس لیے گھبرا سا گیا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے بیت الخلا میں جانے کا بہانہ کیا اور کمرے سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ مشرقی دیوار کی جڑ میں چارپائی بچھائے خالدہ اور غفوراں پیٹی پر ڈالنے والی چادر کاڑھ رہی تھیں۔ میں ان کے قریب چلا گیا۔ دونوں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھیں، سفید رنگ کی سوتی چادر ان کے گھٹنوں پر پھیلی ہوئی تھی جس پر سوئی دھاگے کی مدد سے وہ چار سُوتی کڑھائی کرنے میں مشغول تھیں۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا، ''کیا بات ہے؟''

خالدہ نے اپنی چھوٹی بہن کو کن اکھیوں سے دیکھا، قدرے نیچی آواز میں کہا، ''تم سے.....''

وہ بات کرتے کرتے اچانک رُک گئی۔ میں نے اُس کی نظروں کے تعاقب میں حویلی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ماسی صفو لکڑیوں کا گٹھا سر پر اُٹھائے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ خالدہ

نے جلدی سے کہا، ''میں شام کو تمہارے گھر آؤں گی، وہیں بتاؤں گی۔''

غفوراں اپنی ماں کو سنانے کے لیے چالاکی سے بلند آواز میں بولی، ''بھائی! یہ دیکھ تو..... کتنی پیاری بیل کاڑھی ہے باجی بلو نے!'

میں نے غیر ارادی طور پر اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر چادر کے پھیلے ہوئے حصے کو دیکھا۔ عام سی بیل تھی۔ ایسی چادریں نور پور کے ہر گھر کی سامان بھری پیٹیوں کے اوپر اور پڑچھتیوں پر سے لٹکتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ سفید رنگ کی سوتی چادر پر نیلے دھاگے کی کڑھائی کو ایک نظر دیکھتے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ اِس کا استعمال کیا ہے۔ میں نے روایتی الفاظ میں کڑھائی کی تعریف کی۔

ماسی صفو لکڑیوں کا گٹھا تندور کے قریب پھینک کر دوپٹے سے پسینہ پونچھتی ہوئی وہیں آ گئی۔ اُسے تیسرے چوتھے دِن یہ مشقت باقاعدگی سے کرنا پڑتی تھی۔ غفوراں کو مخاطب کرتے ہوئے پھولی ہوئی سانس میں بولی، ''چل نی پھوری! ٹھنڈا پانی نکال لا۔''

چونکہ سرداروں کے گھروں کے علاوہ کسی گھر میں فریج نہیں تھی، اِس لیے پینے کے لیے نلکے کے ساتھ زور آزمائی کر کے ٹھنڈا پانی نکالا جاتا تھا۔ غفوراں جلدی سے چارپائی سے اُتری اور بڑی سی کٹوری اُٹھا کر نلکے کی طرف بھاگ گئی۔ میں نے رسمی طور پر ماسی کا حال دریافت کیا اور پھر کمرے میں آ گیا۔

دونوں اَبھی اُسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر امیر نواز نے کہا، ''میں چلتا ہوں، کچھ نہ کچھ کرتا ہوں، مگر یہ دھیان رہے کہ آئندہ تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کرنی۔ بڑوں کا رویہ اپنی جگہ، بڑوں کا ادب کرنا ہم سب پر فرض ہے۔''

وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہوا تو کھالے نے بے ساختہ کہا، ''یار! یہ شخص بھی بڑا عجیب ہے۔''

میں نے تائید کی، ''ہاں! یہ تو ہے۔''

''کبھی کبھی شک گزرتا ہے کہ یہ سردار حیات خان کا سگا پتر نہیں، لے پالک ہے۔ دیکھا، کتنا تضاد ہے دونوں میں!''

''پڑھا لکھا ہے، تبھی مختلف ہے اپنے باپ اور چچا وریام خان سے۔'' میں نے کہا۔

''اَن پڑھ تو وہ دونوں بھی نہیں ہیں۔'' کھالا بولا۔

''شاید اس عمر تک پہنچ کر یہ بھی اُن کے جیسا ہو جائے گا۔''

''ایسا لگتا تو نہیں۔ سانپ کو ڈنک مارنے کی عادت پیدا ہوتے ہی پڑ جاتی ہے۔''

ہمیں کمرے میں بیٹھے کافی دیر گزر گئی تھی۔ وقت کے گزرنے کا ہمیں مطلق احساس نہیں ہوا تھا۔ جب کھالے کے باپ نے اُسے مطلع کیا کہ ویگن کا ٹائم ہو گیا ہے، تو ہم چونکے۔ کھالے نے صافہ جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور اپنی کھیڑی چپل کو صافی کی مدد سے چمکانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ باہر نکلا تو میں اُس کی تقلید میں اُس کے گھر سے نکل آیا۔

واپسی کے راستے میں میرے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔ خالدہ کبھی بھی بات کرتے ہوئے ٹھٹکی نہیں تھی۔ اُس کے اور میرے درمیان ایسا تعلق کبھی بھی نہیں رہا تھا کہ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے جھجک جاتی۔ نہ جانے وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی کہ ماسی صفو کی غیر متوقع آمد کے سبب نہ کہہ پائی۔ میں تمام راستے اُسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ گھر میں سبھی اپنے اپنے معمولات میں رُجھے ہوئے تھے۔ میں کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

میرے لیے گاؤں کی فضا یک لخت ناسازگار ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ایک کر کے سبھی لوگ میرے دشمن بنتے جائیں گے اور آخر کار بخت خان کی طرح میں نور پور میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ کھالا درست کہتا تھا۔ مجھے شاہ جی کے ساتھ تعلق استوار کرنے اور پڑھائی کو ایسے تیسے جاری رکھنے کی سزا بڑے غیر محسوس انداز میں دی جا رہی تھی۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں تعلیم کے حصول کی خواہش نے ضد کی چولی اوڑھی اور میں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ جو بھی ہو جائے، تعلیم کا حصول جاری رکھوں گا۔ میرے گھر میں پیسہ کم تھا مگر اِس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ چاچا چراغ نے کھیتوں کے جو کام میرے ذمہ لگا رکھے تھے، پوری ذمہ داری کے ساتھ اُنہیں سرانجام دینے کے بعد میرے پاس اتنا وقت ضرور ہوتا تھا کہ میں باآسانی پڑھ سکتا تھا۔

سہ پہر ڈھلنے کو آ گئی۔ مجھے ہلکا سا بخار ہو گیا۔ جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ پروین نے مجھے چائے پلائی، پیراسیٹامول کی ایک گولی جسے نور پور میں عرف عام میں 'شیر مارکہ گولی' کہا جاتا تھا، کھلائی اور کھیس تان کر لیٹے رہنے کی تاکید کی۔ ہمارے گھروں میں یہ رواج بڑی مضبوط جڑ پکڑ چکا تھا کہ بخار زدہ انسان چائے کے ساتھ گولی حلق میں اُتار کر کھیس یا لحاف اچھی طرح لپیٹ کر سو جاتا تھا تاکہ خوب پسینہ آئے اور بدن کا مسام مسام کھل جائے۔ چاچی کہتی تھی کہ پسینے کے ساتھ ساتھ بخار بھی جسم سے نکل جاتا ہے۔

جبکہ ڈاکٹر شاہ جی کہتا تھا کہ بخار میں نہانا چاہیے۔ جسم کے درجہ حرارت کو ہمیشہ پانی ہی کم کرتا ہے۔ دونوں فلسفے ایک دوسرے سے یک سر مختلف تھے مگر نتیجہ ایک ہی تھا۔ پسینہ بھی تو پانی ہی ہوتا ہے اور ٹمپریچر کو کم کر دیتا ہے۔ میں عمومی طور پر چاچی، پروین، فرزانہ اور شبانہ کے ہمراہ سہ پہر کو کھیتوں میں واقع اپنے ڈیرے پر جایا کرتا تھا۔ میں اور فرزانہ چارہ کاٹتے، پروین اور چاچی بھانڑے (مویشیوں کا چھپر نما کمرہ) کی صفائی کرتیں اور پھر سب ہم مل کر مویشیوں کو چارہ ڈالتے۔ میں اپنے حصے کا کام ختم کر کے نور پور آ جاتا اور نہا دھو کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا جبکہ دوسرے لوگ مویشیوں کا دودھ دوہ کر گھر آیا کرتے تھے۔ مجھے بخار کی وجہ سے گھر میں چھوڑ کر سبھی ڈیرے پر چلے گئے۔

مجھ پر کسل مندی سوار تھی۔ گھر والوں کو گئے نصف گھنٹہ ہو چکا تھا جب اچانک میرے کمرے کے دروازے پر شوخ سبز رنگ کا آنچل لہرایا۔ میں سمجھا کہ غزالہ آئی ہے، مگر جونہی میں نے غور سے دیکھا، گھبرا سا گیا۔ وہ غزالہ نہیں، خالدہ تھی۔ وہ صحن سے گزر کر آئی تھی، جان چکی تھی کہ گھر میں میرے سوا کوئی نہیں، تبھی گھبرا کر بولی، ''باقی لوگ کہاں ہیں؟''

میں نے کہا، ''ڈیرے پر گئے ہیں۔ آؤ ناں، کھڑی کیوں ہو؟''

وہ میری چارپائی کے متوازی بچھی ہوئی چارپائی کی بانہہ پر ٹک گئی۔ بولی، ''صاحب جی! میں ایک بڑی ضروری بات کرنے کے لیے آئی ہوں۔''

میں بے ساختہ بولا، ''خیر تو ہے؟''

''نہیں..... خیر نہیں ہے۔'' وہ بولتے بولتے رُک سی گئی، پھر دروازے کے باہر جھانک کر بولی، ''مجھے صدف بی بی نے ایک رقعہ تم تک پہنچانے کے لیے دیا تھا، آج صبح۔ یہ بھی کہا تھا کہ فوری طور پر اس رقعے کا تم تک پہنچنا بے حد ضروری ہے۔''

میں چارپائی میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھیس لڑھک گیا۔ میں فرطِ اشتیاق سے بولا، ''کہاں ہے وہ رقعہ؟''

اچانک اُس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ چند لمحے بڑی عجیب سرد گیں نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی، پھر بولی، ''صاحب جی! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔''

میں متعجب ہوا، ''کیا مطلب؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

''تمہاری بات چیت صدف بی بی سے چل رہی ہے اور تم نے کسی کو خبر تک نہیں ہونے

دی۔ کتنے چالاک ہو تم!'' اُس کے لہجے کی مایوسیت قطعاً بے محل سی لگ رہی تھی۔

''میری بات چیت..... وہ بھی صدف بی بی سے؟ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟''

''کیا کوئی لڑکی بغیر تعلق واسطے کے بھی رقعہ دیتی ہے؟''

''رقعہ ادھر کرو، دیکھوں تو کیا لکھا ہے؟'' میں نے جز بز ہو کر کہا۔

''وہ تو میں تمہیں دے ہی دوں گی مگر سچ سچ بتاؤ، کیا تمہیں بی بی بہت اچھی لگتی ہے؟'' وہ بجھارت پر بجھارت ڈال رہی تھی اور میں عجیب سی کیفیت میں ڈوبا اُسے دیکھ رہا تھا۔

''میں سچ کہتا ہوں کہ میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لاؤ، رقعہ مجھے دو۔''

اُس نے اِک نگہِ شکایت مجھ پر ڈالی اور گریبان میں چھپایا ہوا رُقعہ نکال کر میرے بڑھے ہوئے ہاتھ میں دے دیا۔ بالکل ننھا سا کاغذ کا دستی تیار کیا ہوا لفافہ تھا، لفافے میں چھپا ہوا کوئی راز..... میں نے دھڑکتے دل سے گوند سے بند کیا لفافہ چاک کیا، رُقعہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ بڑے اختصار مگر زہر آلود کاملیت کے ساتھ لکھا تھا.....

''ڈاکٹر منور علی شاہ پر آج رات خطرناک حملہ کیا جائے گا، اُسے بچاؤ۔''

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ میں نے بغیر کسی کو مخاطب کر کے لکھی گئی تحریر کو تین چار مرتبہ پڑھا۔ لکھنے والے کا نام بھی نہیں لکھا ہوا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ تحریر سردار وریام خان کی چھوٹی بیٹی صدف بی بی کی ہے کیونکہ میں اُس کی سکول کی کاپیاں بارہا دیکھ چکا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے کئی سورج اچانک طلوع ہو گئے تھے۔ بلو مجھ سے مسلسل پوچھ رہی تھی کہ رقعے میں کیا لکھا ہوا ہے، وہ کہاں ملنے کا لکھتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر میں شاید ذہنی طور پر کمرے میں موجود ہی نہیں تھا۔

میں نے پوچھا، ''تمہیں یقین ہے کہ صدف بی بی نے یہ رقعہ میرے لیے ہی بھیجا ہے؟''

''ہاں تو..... پہلے مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا مگر جب اُس نے 'پروین کا بھائی' شہزا' کہا تو میں تمہارے پاس آئی ہوں۔''

اُس نے رقعہ چاک نہیں کیا تھا۔ کر بھی لیتی تو اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے پڑھ لینے سے قاصر تھی۔ میری نظریں اُس کا طواف کرتے ہوئے بھٹک کر پھر ہاتھوں میں دَبے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے پر ٹھہر گئیں۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں واضح ارتعاش محسوس ہونے لگا۔

وہ بہ نظرِ احتیاط میری کیفیت بھانپ رہی تھی، مایوس ہو کر بولی: ''تمہاری مرضی ہے جی!

میں تو یہ سمجھتی رہی ہوں کہ تم بس غزالہ کے ہو، تمہیں دیکھنا اور تمہارے بارے میں سوچنا گناہ ہے مگر تم تو اونچی اُڑانوں میں ہو۔''

مجھے فی الفور اُس کے جملے کا متن سمجھ نہیں آیا تھا۔ میں چارپائی سے اُتر آیا۔ وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ میں نے رقعہ لپیٹ کر جیب میں ڈالا، دھڑکتے دل سے کہا، ''بلو! تم اِس رقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا ورنہ ہم سب کی شامت آجائے گی۔''

وہ ایک قدم بڑھ کر میرے عین سامنے آ گئی، بولی، ''میں کملی تو نہیں ہوں، جانتی ہوں کہ میرے منہ سے نکلنے والا ایک جملہ بھرے نور پور میں آگ لگا دے گا۔ پر سچ کہتی ہوں، تم اِس راہ پر نہ چلو۔ یہ تو موت کی راہ ہے۔ جو بھی چلے گا، جان گنوا بیٹھے گا۔ بڑے خان کو پتہ چل گیا تو قیامت آجائے گی۔''

میں جلدی سے بولا، ''یہ وہ والا چکر نہیں ہے بلو! یہ اُس سے بھی بڑی قیامت والا سلسلہ ہے۔ تم جاؤ اور اگر صدف بی بی سے ملو تو کہہ دینا کہ رقعہ مجھ تک پہنچ گیا ہے۔''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرے پہلو سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے میں تھم گئی۔ میری طرف منہ کیے بغیر بولی، ''صاحب جی! میں غزالہ کو بھی نہیں بتاؤں گی۔''

وہ غلط سمجھ رہی تھی مگر میں اُس کی غلط فہمی دور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ اگر پڑھی لکھی ہوتی تو شاید میں اُس کے ہاتھ میں خط تھمانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اَب جانتا تھا کہ میں لاکھ قسمیں دوں، وہ ماننے پر تیار نہیں ہوگی کہ میرا صدف بی بی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وہ جیسے آئی تھی، ایسے ہی چنی لہراتے ہوئے گھر سے نکل گئی۔ میں اپنی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ یہ مسئلہ بہت گھمبیر صورتِ حال اختیار کر گیا تھا۔ رقعے میں تفصیل نہیں دی گئی تھی۔ یقیناً صدف بی بی کو تفصیل مہیا کرنے کی مہلت نہیں ملی ہوگی یا اُسے جس حد تک پتہ چلا تھا اُس نے لکھ بھیجا تھا۔ اُس نے یہ کیا کم احسان کیا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی پر ٹوٹنے والی مصیبت کی خبر قبل از وقت دے دی تھی۔ میرے لیے تو یہ بھی حیرت ناک تھا کہ اُس نے اپنے باپ کے اِس بے داغ منصوبے کا سراغ کیسے لگا لیا۔ امیر نواز کے بعد اُس کے کردار نے مجھ پر حیرت کا نیا جہان کھول دیا تھا۔ وریام خان جیسے وڈیرے کے گھر میں بھی تعلیم اپنا ہاتھ دکھا چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں صدف بی بی کو داد دی کہ ایک اچھے کام کے لیے اُس نے اپنی نیک نامی تک داؤ پر لگا دی تھی۔ اُس کا بھیجا ہوا خط کسی اور کے ہاتھ میں بھی لگ سکتا تھا۔

خالدہ حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے معاملے کو اتنا بگاڑ سکتی تھی کہ سلجھاوے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہتی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ اَبھی کافی وقت تھا۔ غیر ارادی طور پر میں آنکھیں بند کر کے تصور میں آنے والی قیامت کی منظر کشی کرنے لگا۔ ڈاکٹر کی کوٹھی میں بڑی بڑی مونچھوں والے، صافوں میں چہرے چھپائے، جدید اور ڈراؤنی بندوقوں سے لیس بہت سارے غنڈے میری چشمِ تصور میں اُبھر آئے۔ اُنہوں نے ڈاکٹر شاہ جی کو کوٹھی کے صحن میں لا کر مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اُس کی چیخ و پکار پر کان دھرنے والا کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اُسے اَدھ موا کر کے، ٹانگیں اور بازو توڑ دیے اور جیسے دندناتے ہوئے آئے تھے، ویسے ہی نعرہ زنی کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ میں جوں جوں سوچتا جاتا، میرے روئیں روئیں میں دھواں بھرتا جاتا تھا۔ سمجھ میں نہ آنے والا کوئی کریہہ اور ظالمانہ ہتھکنڈا تھا جو ایک درویش مسیحا پر محض چھوٹی سی حکم عدولی کے جرم میں آزمایا جانے والا تھا۔

میں نے بہ عجلت غسل کیا۔ جسم کو توڑنے موڑنے والا بخار جاتا رہا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی پر پہنچا۔ اُسے حسبِ توقع ایک کتاب کے مطالعے میں غرق پایا۔ میں نے صدف بی بی کا حوالہ دیے بغیر تمام رام کہانی سے آگاہ کیا۔ معاملے کی نوعیت کو پوری سنگینی سے آشکار کرنے کے لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اُسے اپنی، سردار وریام خان اور سردار حیات خان سے یکے بعد دیگرے ہونے والی دونوں ملاقاتوں کے احوال اور منہ پر پڑنے والے طمانچے کے بارے میں آگاہ کر دوں۔

اُس نے میری باتوں اور اندیشوں کو بڑے انہماک سے سنا، پھر لبوں پر زہر خند مسکراہٹ سجا کر بولا، ''تم میری فکر نہ کرو، اپنے آپ کو اِن وڈیروں کے شر سے بچانے کی کوشش کرو۔ تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے درپیش آنے والے حادثے کے بارے میں قبل از وقت بتا دیا۔ میں آنے والوں سے بخوبی نبٹ لوں گا۔''

''کیسے؟'' مجھے اُس کے لہجے کی مضبوطی نے متحیر کر دیا۔

''یہ میرا کام ہے، میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔''

''شاہ جی! میں بہت پریشان ہوں۔ آپ نہیں جانتے، خان زادے کتنے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔'' میری آواز کا ارتعاش مخفی نہ رہ سکا۔

اُس نے میرا کندھا تھپتھپایا، ''شہریار! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میرا بہت خیال رکھتے ہو مگر یہ بڑوں کے کھیل ہیں۔ بڑے ہی کھیل سکتے ہیں۔ چھوٹے حصہ لینے لگیں تو بڑوں کے بیچ مسلے کچلے جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ امیر نواز اپنے باپ کی طرح جاگیردار بننا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ مجھ پر کیے جانے والے وار کے بارے میں تمہیں وریام خان یا حیات خان کے گھر کے کسی فرد نے بتایا ہوگا۔ یہ کتنی اچھی شروعات ہیں کہ ظالموں کی گود میں پلنے والوں کے دلوں کی کایا پلٹتی جارہی ہے۔ یہ اعجاز صرف اور صرف تعلیم کا ہے جو نئی نسل نے حاصل کی ہے۔ اَبھی اُن کی تربیت اُس لحاظ سے نہیں ہو پائی کہ وہ فرعونی قیود سے نکل کر انسانیت دوست بن جاتے مگر مجھے یقین ہے کہ آنے والا وقت اِس معاشرے کی مروجہ اکائیوں کی نوعیت کو بدل کر جنت نما بنا دے گا۔''

میں نے شکایت آمیز نظروں سے دیکھا، ''شاہ جی! آپ بھی کمال آدمی ہیں۔ اِن باتوں کو سرِ دست چھوڑیں اور اپنے بچاؤ کی فکر کریں۔ وقت لحظہ بہ لحظہ کم ہوتا جارہا ہے۔ اَبھی تک یہ بھی طے نہیں کیا جاسکا کہ وریام خان کے لوگ کس انداز سے حملہ آور ہوں گے۔''

وہ میری بے چینی کو بھانپ کر ہنس پڑا۔ میں نے اپنے تعلق کے دورانیے میں پہلی مرتبہ اُسے ہنستا دیکھا تھا وگرنہ عمومی طور پر اُس کے لبوں کا موہوم سا کھنچاؤ اُس کی زہریلی سی مسکراہٹ عیاں کرتا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں تھا کہ اُس کی ہنسی بھی عام لوگوں کی ہنسی نہیں تھی بلکہ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نقرئی پیالے سے نیلگوں زہر چھلک پڑا ہو۔

کھلی کتاب میں لیٹر پیڈ رکھ کر بند کرتے ہوئے بولا، ''شہریار! تم نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتا مگر یہ اندازہ ضرور کرسکتا ہوں کہ مجھ پر حملے کے منصوبے کا ماسٹر مائنڈ وریام خان نہیں، سردار حیدر خان ہوگا۔ کیونکہ وریام خان اَبھی وہ چالاکیاں اور منصوبہ سازیاں نہیں سیکھ سکا جو اسمبلی میں پہنچنے اور اپنے بھائی بندوں سے لمبی ملاقاتوں کے بعد حیدر خان سیکھ آیا ہے۔ وریام خان محض ڈنڈا ڈولی اور دھمکیوں کی بدمعاشی کرسکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا مگر یہ ضرور سوچا جاسکتا ہے کہ عام سے غنڈے مجھے مارنے پیٹنے کے لیے رات میں نہیں آئیں گے، کچھ اور ارادے لے کر آئیں گے۔ میں اُن کے لیے کچھ نہ کرلوں گا۔ تم فکر نہ کرو اور گھر جا کر سوؤ۔''

''مگر شاہ.....''

''اگر مگر مت کرو دوست! جاؤ..... مجھے سوچنے دو، کچھ کرنے دو۔ میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم میرے لیے اتنے مخلصانہ جذبات اپنے سینے میں رکھتے ہو۔ میں بے کار انسان ہوں مگر احسان فراموش نہیں ہوں۔ زندگی وفا کرتی رہی تو کبھی نہ کبھی اِس احسان کو چکانے کی کوشش کروں گا۔'' اُس نے نیم افسردہ لہجے میں کہا۔

میں خاموشی سے کچھ دیر بیٹھا رہا۔ مجھے بھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں اُس کی حفاظت کے لیے کیا کروں؟ اچانک میرے ذہن میں کھالے کا خیال آیا۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ چالاک اور فوری فیصلہ کرنے کی طاقت رکھنے والا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کے لیے دل ہی دل میں خدا سے سلامتی کی دعا مانگی اور اجازت لے کر ہسپتال سے نکل آیا۔ ہسپتال کے مین گیٹ کے عین سامنے یارن خان کی حویلی کا لکڑی کا بنا ہوا گیٹ تھا۔ لکڑیوں کی ماہرانہ بنت بڑی خوب صورت تھی۔ گیٹ کی اونچائی بمشکل چار ساڑھے چار فٹ تھی جس کی وجہ سے عمارت تک جاتی ہوئی دو تین سو فٹ لمبی شش پہلوی اینٹوں کی روش با آسانی دکھائی دیتی تھی۔ روش کے دونوں کناروں پر پھولوں کی خوب صورت کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔

حویلی کا بڑا دروازہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا مہراب دار دروازہ تھا۔ حویلی کو ایک نظر دیکھتے ہی مغلیہ دور کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ یارن خان کی حویلی دو منزلہ تھی۔ سنبل کے بلند و بالا درختوں نے چاروں طرف سے حویلی کو چھپا رکھا تھا۔ بلاشبہ تین ایکڑ رقبے پر مشتمل یہ پُرشکوہ حویلی نور پور کی سب سے خوب صورت حویلی تھی۔ اِس حویلی میں داخل ہونے کی اجازت سردار حیات خان اور وریام خان سمیت کسی بھی شخص کو حاصل نہیں تھی۔ چونکہ یارن خان یہاں نہیں رہتا تھا، اِس لیے یہاں کسی کے آنے کا جواز بھی نہیں بنتا تھا۔ یارن خان کے دو نوکر یہاں رہائش پذیر تھے جو نہ صرف حویلی کی صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال کرتے تھے بلکہ حویلی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے جدید طرز کے باغ کی آبیاری بھی کرتے تھے۔

یارن خان نے دُنیا جہان کے خوب صورت پودے، اَن گنت رنگوں کے گلاب اور پھول یہاں اکٹھے کر رکھے تھے۔ مور پنکھ، سرو، املتاس اور ڈیورانٹا جیسی قدرتی صناعیاں میں نے یہیں دیکھی تھیں۔ پودوں اور درختوں کی ایسی بھی اَن گنت اقسام یہاں موجود تھیں جن کے مجھے یا کھالے کو نام تک نہیں آتے تھے۔

یارن خان کی حویلی کی جنوبی سمت میں شریف ارائیں کا گھر واقع تھا۔ گھر کے آگے ڈیرہ نما

جگہ پر اُس نے آٹا پیسنے والی چکی لگا رکھی تھی جو پیٹرانجن پر چلتی تھی۔ ایک چھوٹی آرا مشین بھی نصب کر رکھی تھی جسے جمعہ کے جمعہ چلایا کرتا تھا۔ نور پور اور اطراف کے چارپائی ساز اور مستری لکڑی چرانے کے لیے اکٹھے ہو جایا کرتے تھے اور اُس کی روٹی روزی کا سامان کر دیتے۔ شریف ارائیں کا بے دانت پوپلا منہ ہر وقت ہلتا رہتا تھا۔ وہ ہکلاتا بھی تھا۔ طبعاً بڑا مزاح کار اور زندہ دل واقع ہوا تھا۔ جس محفل میں براجمان ہوتا، گل وگلزار کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ چکی کے اگلے صحن میں چارپائی بننے میں مصروف تھا۔ یہ اُس کی پارٹ ٹائم جاب تھی۔ عام استعمال کی چارپائیاں بننے کے ساتھ ساتھ وہ جہیز کی رنگین پائیوں والی چارپائیوں کو رنگ برنگے سوت سے بنتا تھا۔ اُسے اِس کام میں اتنی مہارت حاصل تھی کہ اُس کی بنی ہوئی چارپائی کو دیکھنے والا انگشت بدنداں ہو جاتا تھا۔ میں چند ثانیوں کے لیے تھم گیا۔ اُسے چارپائی کے اردگرد مخصوص انداز میں چکراتے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔

کھالا گھر میں نہیں تھا۔ میں اُس کے باپ کے پاس کچھ دیر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ دور کہیں ہارن بجا۔ بخشو لوہار نے فوراً کہا، ''شہرے پتر! تیرا یار آ گیا ہے۔ ویگن کا ہارن سنائی دے رہا ہے۔''

کھالے کی ویگن کا ہارن علاقے بھر میں مشہور تھا۔ ہر کان کے لیے شناسا تھا۔ چند منٹوں کے بعد سواریوں سے لدی پھندی ویگن دکھائی دی جو سڑک سے اُتر کر اپنی مخصوص جگہ پر جا رکی۔ میں نے کھالے کو ویگن سے نکلتے ہی پکڑ لیا، ''میرے ساتھ چلو۔''

اُس نے شیدو کو پیشہ ورانہ ہدایات سے نوازا اور میرے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں نوری چوک والی سڑک کے کنارے سب سے آخری دکان میں بنے ہوئے ججی کے حمام میں آ بیٹھے۔ اس وقت ججی عموی طور پر دکان پر نہیں ملتا تھا۔ وہ سردار حیات خان کے ڈیرے پر مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف ہوتا تھا۔

کھالے نے پوچھا، ''ہاں بھئی شہزادے! کیا بات ہے؟ کوئی نیا مسئلہ؟''

میری زبان ٹیپ پلیئر کی طرح رواں ہو گئی۔ اُس نے مجھے بہت کریدا کہ میں اُسے مخبر کے بارے میں بتاؤں مگر میں ثابت قدمی سے صدف بی بی اور بلو کے ماجرے کو چھپانے میں کامیاب رہا۔

اُس نے کہا، ''شہرے! معاملہ خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ رات کو

ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی پر ڈاکوؤں کی صورت میں خان کے بندے حملہ آور ہوں گے۔ ہم سوائے ڈاکٹر شاہ جی کو خبردار کرنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتے اور یہ کام تم کر ہی چکے ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''شاہ جی کو چاہیے کہ رات بھر کے لیے شہر چلا جائے مگر وہ بھی بہت ضدی ہے۔ اُس کی جگہ پر میں ہوتا تو میں سردار حیات خان کے ڈیرے پر رات گزارتا۔'' اُس نے کہا۔

''کیا مطلب؟ جو تکلیف دینا چاہتا ہو، اُسی کے پاس اپنے قدموں چلے جانا دانش مندی ہوتی ہے؟''

''ہاں! اُس کی برائی کا راستہ اِس طرح با آسانی روکا جا سکتا ہے۔'' کھالے نے اپنی فہم کے مطابق بہترین رائے دی۔

''ان باتوں کو چھوڑو، یہ سوچو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

''ہمیں مزے سے، کھیس تان کر سونا چاہیے۔'' اُس نے لاپروائی سے کہا۔

''ڈاکٹر شاہ جی کا معاملہ ہے، میں یوں دست بردار کیسے ہو سکتا ہوں؟'' مجھے غصہ آ گیا۔

''تو ٹھیک ہے، رات بھر جاگو، جیت شاہ کے مزار پر جا کر اللہ اللہ کرو اور دعائیں مانگو۔ سنا ہے، بے غرض دعائیں سیدھی عرش پر جاتی ہیں اور اثر ڈھونڈ لاتی ہیں۔'' اُس نے مسکرا کر کہا۔

میرا غصہ سوا ہو گیا۔ اُس پر سرد نگاہ ڈال کر میں اُٹھنا چاہتا تھا کہ اُس نے میری کلائی تھام لی۔ بولا، ''اتنا غصہ مت دکھاؤ، مجھے سوچنے دو۔''

''ہاں! تم نے ایٹم بم بنانے کا فارمولا سوچنا ہے ناں؟'' میرے لہجے میں استہزا مخفی تھی۔

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا، پھر بولا، ''ہاہ! اگر یہ اتنا ہی آسان کام ہوتا تو تم خود کر لیتے، میرے پاس نہ آتے۔ آخر تم نے سائنس کے ساتھ چودہ جماعتیں پڑھ رکھی ہیں۔ اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ؛ ڈاکٹر شاہ کے پاس کوئی اسلحہ ہے؟''

''ہاں! اُس کے پاس بندوق ہے۔ بالکل ویسی، جیسی امیر نواز کے پاس ہے۔'' میں نے کہا۔

''ری پیٹر گن؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''ہاں!'' میں نے کہا، ''مگر ایک گن کے ساتھ وہ کہاں تک مقابلہ کرے گا؟''

''حملہ آوروں کو جب پتہ چلے گا کہ وہ نہتا نہیں ہے تو وہ دُم دبا کر بھاگ جائیں گے۔''

کھالے کی فراست قابلِ داد تھی۔

میں نے ججی کے شوکیس میں رکھا ہوا آہنی نیرنا (ناخن تراش) اُٹھالیا اور بنچ پر بیٹھ کر پیروں کے ناخن تراشنے لگا۔ میرا مقصد کھالے کو سوچنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق اُس کی شیطانی کھوپڑی نے حل ڈھونڈ لیا۔ مجھے متوجہ کر کے بولا، ''تمہاری دوربین کہاں ہے؟''

میں نے کہا، ''وہی جو میں نے جیت شاہ کے میلے سے خریدی تھی؟''

''وہی جو میں نے جیت شاہ کے میلے سے.....ارے واہ! کوئی ڈھیٹ ہو تو تمہارے جیسا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ دوربین جو میں نے میلے کے اسٹال سے چوری کر کے تمہیں دی تھی۔'' وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں جھینپ کر بولا، ''میں نے تو خریدی ہی تھی ناں۔ وہ گھر میں پڑی ہے۔ اُس کا کیا کرنا ہے؟''

وہ بولا، ''بتاتا ہوں، کچھ صبر تو کر لیا کرو۔ میں نے پلان بنا لیا ہے۔ تم ایسا کرنا کہ کھانا کھانے کے بعد، عشاء کے وقت، دوربین اور دو بھاری کھیس اُٹھا کر ہسپتال کی عقبی سائیڈ میں کھال پر آ جانا۔ یہ خیال رکھنا کہ تمہیں آتے ہوئے کوئی نہ دیکھے اور اگر دیکھ بھی لے تو وہ کھیسوں پر توجہ نہ دے سکے۔ سمجھ گئے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''مگر تمہارا پلان کیا ہے؟''

''اور کڑوے تیل کی مالش بھی کر رکھنا۔ رات کو مچھر بہت ہوتا ہے۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے ایک ذرا مسکرا کر مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے فوری ترتیب دیے ہوئے منصوبے کے بارے میں قبل از وقت کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں جانا اور ججی کے حمام سے نکل آیا۔

میرے دل کو اطمینان ہو گیا تھا کہ شاہ جی کا پہرہ دینے کے لیے مجھے اُس کا ساتھ میسر آ گیا تھا۔ مجھے اُس کی چالاکی اور معاملہ فہمی کی صلاحیت پر بھروسہ تھا۔ میں گھر پہنچا، کھانا کھایا اور اپنے سالخوردہ جستی ٹرنک کو کھول کر بیٹھ گیا۔ دوربین نکالی۔ یہ سگرٹ کی ڈبیا کے سائز کی اسٹین لیس اسٹیل کی جدید طرز کی دوربین تھی جو با آسانی جیب میں سما جاتی تھی۔ اِس کے ایک کونے میں

پش بٹن لگا ہوا تھا جسے دبانے سے اِس کا دو عدسوں والا دہانہ 'کٹاک' کی زوردار آواز کے ساتھ کھل جاتا تھا۔ آئی لینز کے عین وسط میں گراری نما 'لینز مینجر' نصب تھا جسے گھما کر منظر کو زوم اِن کیا جاسکتا تھا۔ میں نے دوربین کے لینز قمیص کے پلے سے صاف کیے اور اِسے جیب میں ڈال لیا۔

عشاء کی اذان مسجد کے سپیکر سے نکل کر نور پور کی فضا میں گونج رہی تھی جب میں نے گھر سے نکلنے کا قصد کیا۔ کھیسوں کو گھر والوں کی نگاہ سے چھپا کر باہر لے جانا خاصا مشکل کام تھا مگر میں اِس مشن میں کامیابی سے ہمکنار ہوگیا۔ ابتدائے شب کا اندھیرا ہر سو محیط تھا۔ نصف شب کے بعد چاند کا طلوع متوقع تھا۔ پختہ کھال کے کنارے چلتا ہوا ہسپتال کے عقب میں آیا۔ کھالا دکھائی نہیں دیا۔ میں دیوار کے ٹوٹے ہوئے حصے سے شمالی جانب کچھ فاصلے پر دیوار کی جڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رات کی تاریکی سے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ ویسے بھی نور پور کی گلیوں میں نصف شب تک بچپن کا کھیل اَبھی تک چکراتا پھرتا تھا۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ آج میری کیفیت پہلے سے جدا تھی۔ دل بے اعتدال چال چل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔ میری نگاہیں چار دیواری کی نکڑ پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے کھالے نے نمودار ہونا تھا۔

مجھے، اچانک، جیت شاہ کا میلہ یاد آ گیا جو ہر سال باقاعدگی سے لگتا تھا۔ اطراف کے دیہاتوں اور قصبوں سے ہزاروں لوگ میلہ دیکھنے کے لیے وہاں آتے تھے۔ سرکس، موت کا کنواں، چڑیا گھر، جھولے اور ہیجڑوں کے ناچ گھر سج جاتے، لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اُمڈ آتے اور کھلے میدان میں لگے ہوئے عارضی اسٹال خریداروں سے بھر جاتے۔ نئی نئی اشیاء دیکھنے کو ملتیں۔

تین سال پہلے لگنے والے میلے میں میں نے ایک اسٹال پر یہی دوربین، جو اِس وقت میری بغلی جیب میں تھی، دیکھ لی تھی۔ دکان دار نے میری دلچسپی بھانپ لی۔ اُس نے بڑے مشاقانہ انداز میں دوربین میرے ہاتھ میں تھمائی، مجھے اُس کے فنکشنز سمجھائے اور آئی لینز میری آنکھ سے لگا دیے۔ میں نے کافی فاصلے پر نصب شدہ موت کے کنویں کا دعوتی پلیٹ فارم دیکھا۔ گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے جس لڑکی کا ناچ میں بڑے شوق سے دیکھتا آ رہا تھا، دوربین اُس کا پول کھولنے لگی تھی۔ وہ لڑکی نہیں، لڑکا تھا جو میک اَپ کر کے لوگوں کو دھوکہ دے رہا تھا۔ میں نے جھٹ سے دوربین آنکھوں سے ہٹائی، آنکھیں مل کر اونچے پلیٹ فارم کو دیکھا پھر آپ تئیں

شرمسار سا ہو گیا۔ مجھے دوربین اچھی لگی۔ دکاندار نے اُس کی قیمت دوسو روپے بتائی۔ میرے شوق پر اوس پڑ گئی۔ میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں تھی۔

میں نے موت کے کنویں کے سامنے لگے ہوئے مجمع میں سے کھالے کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ بڑے انہماک سے بیجڑوں کا ڈانس دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کے پہلو میں کہنی چبھوئی، ''اُس لڑکی کو دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں یار! اُسی کو دیکھ رہا ہوں۔ یار کیا غضب کی ڈانسر ہے!'' اُس کی نظریں بدستور چوبی پلیٹ فارم پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا، ''وہ لڑکی نہیں، لڑکا ہے۔''

''اونہیں یار! تمہیں بکریوں میں کھڑا اونٹ نظر نہیں آتا، وہ کیا نظر آئے گی۔'' کھالے نے مجھے ڈپٹ کر کہا۔

مجھے تاؤ آ گیا، ''میں قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ لڑکا ہے۔ اُس نے خوب رگڑ کر شیو کر رکھی ہے۔''

''شوق سے قسم کھاؤ، مگر وہ یقیناً لڑکی ہے۔''

میں بہ ضد رہا تو اُس نے قدرے غصے سے کہا، ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ لڑکی نہیں ہے؟''

''میں نے دوربین میں دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کہاں ہے وہ دوربین؟'' وہ چونکا۔

میں نے اسٹال کی طرف اشارہ کیا، ''وہاں پڑی ہے۔ دوسو کی دیتا ہے، کم نہیں کرتا۔''

یہی باتیں کرتے ہوئے ہم لوگوں کے ہجوم سے باہر آ گئے۔ چڑیا گھر کے پنجرے کے قریب کھڑے ہو کر میں نے اُسے کہا، ''میرے پاس دوسو روپے نہیں ہیں وگرنہ میں ضرور خرید لیتا۔''

اُن دنوں کھالا بے روزگار تھا۔ مخصوص انداز میں ایک آنکھ دبا کر بولا، ''میں تجھے وہ والی دوربین لا دوں؟''

میں خوشی سے بولا، ''لا دو ناں!''

''کیا دو گے؟''

''پچاس روپے!'' میں نے جیب میں سے نوٹ نکال کر نمائش کی۔

وہ مان گیا۔ میں نے دور سے اشارہ کر کے اُسے دوربین کا محلِ وقوع سمجھایا۔ پھر اُس کی

ہدایت کے مطابق ٹہلتا ہوا اسٹال پر چلا گیا۔ اسٹال پر گاہکوں کا رش تھا۔ میں نے عقبی حصے میں لٹکے ہوئے فٹ بال کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فٹ بال اُتارنے کے لیے عقبی حصے میں چلا گیا۔ اس کا ساتھی ایک چھوٹی سی کھلونا کشتی کے چلانے کا طریقہ گاہک کو بتا رہا تھا۔ ایسے میں مجھے گاہکوں کے بیچ میں کھالے کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ دکاندار میرا مطلوبہ فٹ بال لے آیا۔ میں اُسے ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔ اُسے مصروف کرنے کے لیے پوچھنے لگا کہ اِس کا بلیڈر کیسا ہے، والو اور نوزل کی پوزیشن کیا ہے، کیا یہ سیالکوٹ کا بنا ہوا ہے، وغیرہ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ عاجز آ گیا۔ بولا، ''باؤ! لگتا ہے تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ادھر لاؤ فٹ بال اور چلتے بنو۔ جب پیسے ہوں جیب میں تو میلہ دیکھنے آنا..... چل شاباش!''

میں نے غصہ بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور فٹ بال اُس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اردگرد دیکھا، کھالا نظر نہ آیا۔ ریک پر نگاہ ڈالی، دوربین نظر نہ آئی۔ میرے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ کھالا اپنے مشن میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں تیر کی طرح میلہ کے لیے مختص بے فصل کھیتوں پر مبنی میدان سے نکلا۔ خوشی تھی کہ سنبھالی نہیں جا رہی تھی اور تابِ انتظار بھی نہ تھی، اِس لیے سیدھے راستے پر جانے کی بجائے فصل چیر کر آن کی آن میں افسر علی کے گھر کی نکڑ پر پہنچا۔ وہاں کھالا میرا منتظر تھا۔

میں نے بے تابی سے دوربین مانگی۔ وہ بولا، ''ناں سجن! پہلے اُہ نوٹ کڈھ جس دی شو منڑی کر ویندا ہائیں!''

(ناں دوست! وہ نوٹ نکالو جس کی نمائش کر رہے تھے۔)

میں نے اُس کا مطالبہ پورا کیا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دوربین نکال کر میرے پھیلے ہوئے مشتاق ہاتھ پر رکھ دی۔ میرے کمرے میں بیٹھ کر ہم دونوں نے اِس کے استعمال پر دسترس حاصل کی تھی۔ بعد میں یہ دوربین کھالے کے بہت کام آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی چھت پر بیٹھ کر باآسانی شموں کو تاڑ لیتا تھا۔ اُس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہتا اور ملاقات ہونے پر اُسے حیران کرنے کے لیے بتاتا کہ وہ فلاں وقت کیا کر رہی تھی۔

ایسے ہی وقت میں کھالا نکڑ پر نمودار ہوا۔ مجھے دیکھ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ بولا، ''ہاں شہرے! تم مشن کے لیے تیار ہو ناں؟''

میں نے کہا، ''ہاں!''

''گھر والوں سے کیا بہانہ کیا؟''

''میں نے کہا ہے کہ میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پڑھنے کے لیے جا رہا ہوں۔ دیر ہونے کی صورت میں وہیں سو جاؤں گا۔'' میں نے بتایا۔

وہ اردگرد دیکھتے ہوئے ہسپتال کی حدود میں داخل ہو گیا۔ میں اُس کی تقلید میں سنبھل کر چل رہا تھا۔ وہ ہسپتال کی مرکزی عمارت کی مشرقی نکڑ تک گیا، رُک کر بولا، ''کیا اِس دیوار پر چڑھ جاؤ گے؟''

میں نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا، ''چڑھ تو جاؤں گا مگر کیوں؟''

اُس نے جواب دینے کی بجائے جوتے اُتارے، اُنہیں اپنی قمیص کے پلو سے باندھا اور بندر کی سی پھرتی سے ٹیپ شدہ دیوار پر، کھڑکی میں لگی گرل اور نکڑ کی اینٹوں پر ہاتھ جما کر اوپر چڑھتا گیا۔ اِس چودہ پندرہ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا مگر ہم دونوں اِس کام میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔ یارن خان کی حویلی میں بار بار داخلے کی کوششوں نے ہمیں دیواروں پر چڑھنے کے ہنر میں طاق کر دیا تھا۔

کھالا چھت پر پہنچ گیا۔ ہاتھ کے اِشارے سے مجھے اوپر بلانے لگا۔ میں نے باری باری دونوں کھیس اُوپر پھینکے۔ اُس نے تھام لیے۔ جوتے اُتار کر خالصتاً کھالے کی تکنیک پر عمل پیرا ہوتے ہوئے قمیص کے اگلے پلو سے باندھے اور ہاتھوں پیروں کی انگلیاں گرل اور اینٹوں کے درمیانی خلا میں پھنسا دیں۔ چند منٹوں میں چھت پر کھڑا تھا۔ پختہ اینٹوں کی رگڑ سے میری انگلیاں چھِل گئی تھیں اور پوروں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔

چھت پر پختہ اینٹوں کا فرش بنا ہوا تھا اور صاف ستھرا تھا۔ ہم ننگے پاؤں چلتے ہوئے مغربی منڈیر تک آئے۔ منڈیر چھت سے ڈیڑھ فٹ اونچی اور خاصی مضبوط تھی۔ یہاں سے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کی چھت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ کھالے نے مجھے دیکھا، بولا، ''تم نے تو کہا تھا کہ شاہ جی چھت پر سوتا ہے۔''

''میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے چھت پر سے اُترتے دیکھا تھا۔ اَبھی شاید وہ اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوگا۔ کچھ دیر بعد چھت پر آ جائے گا، دیکھنا۔''

کھالے نے ایک کھیس فرش پر بچھایا۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ جیب میں سے ایک پاکٹ سائز ریڈیو، ایک چوبی غلیل اور چند غُلے نکال کر کھیس پر ڈھیر کر دیے۔ دوسری جیب سے دو

پٹاخے، سگرٹ کیس اور ماچس بھی نکال کر رکھ دی۔ میں نے اِس دوران قریب پڑی ہوئی چند اینٹوں کو اُٹھایا اور کھیس کے نیچے رکھ کر سرھانے کی شکل دے دی۔ کھالے نے ریڈیو آن کیا۔ بغیر ٹیوننگ کیے ہی ملتان اسٹیشن کی نشریات ننھے سے اسپیکر سے پھوٹنے لگیں۔ اِس ریڈیو پر صرف ملتان چلتا تھا۔ ٹیوننگ ناب گھومتی تھی مگر کام نہیں کرتی تھی۔

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھا، ''پروگرام کیا ہے؟''

وہ معصومیت سے بولا، ''پہرا دینا ہے۔''

''یعنی تماشا دیکھنا ہے، اور بس؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''تو اور کیا ہم نے بندوں کو پھڑکانا ہے؟'' اُس نے کندھے اُچکائے۔

''تو پھر یہ کیوں اُٹھا لائے ہو؟'' میرا اشارہ غلیل کی طرف تھا ''چڑوں کا شکار کھیلنا ہے؟''

''تو کیا اِس سے غنڈوں کو مار بھگایا جا سکتا ہے؟'' وہ ہنسا۔

''تم سے بعید بھی تو نہیں ہے۔ اور ہاں! اِن پٹاخوں کا کیا کردار ہے ہمارے مشن میں؟''

''دیکھ لو گے۔'' اُس نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا۔

''یہ تمہارے پاس کہاں سے آئے؟ نور پور میں تو کسی دکان پر نہیں ملتے۔'' میں نے پوچھا۔

''بہرام خان نے شادی کے موقع پر منگوائے تھے۔ میں نے دو چار اپنے پاس رکھ چھوڑے تھے۔''

میں نے جز بز ہو کر کہا، ''یار! کچھ بتاؤ تو سہی، کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''ڈاکٹر شاہ جی نیند پر قابو نہیں پا سکے گا، سو جائے گا۔ جب خطرہ محسوس ہوا تو اُسے ایسا چُٹ کر غلّہ ماروں گا کہ نیند آنِ واحد میں اُڑن چھو ہو جائے گی۔ اُس کے پاس گن ہے۔ بیدار ہونے پر حملہ آوروں سے خود ہی نبٹ لے گا۔ ہم دونوں شاہ جی کے لیے یہی کر سکتے ہیں۔'' کھالے نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

مجھے غصہ آیا مگر خاموش رہا۔ اُسے تاؤ دلانا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسے وقت میں ڈاکٹر کی چھت پر نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ چونکہ ڈاکٹر کی کوٹھی کے صحن اور بیرونی دروازے پر بلب روشن تھے، اِس لیے چھت کا منظر صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے کھالے کو کہنی ماری، وہ بھی متوجہ ہو کر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد، جب آنکھیں دیکھنے کی عادی ہوئیں، شاہ جی

نظر آیا۔ وہ بانس کی سیڑھی اوپر کھینچ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بستر بچھا کر دراز ہو گیا۔ منڈیر کے قریب لیٹنے کی وجہ سے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ فاصلہ اور اندھیرا حائل ہونے کی وجہ سے ہم یہ نہیں دیکھ پائے تھے کہ اُس نے اپنے دفاع کے لیے کیا انتظامات کیے تھے۔ میں نے اگر اُس کے بستر میں گن نہ دیکھ رکھی ہوتی تو ہمیں اُس کی موجودگی کا بھی علم نہ ہوتا۔

کھالے نے دھیمی آواز میں کہا، ''یار! تمہارا ڈاکٹر تو پاگل پن کی حد تک بے خوفا انسان ہے۔''

میں نے محض کندھے اُچکانے پر اکتفا کیا۔

''دیکھو یار شہرے! وہ اتنے مزے سے بستر میں لیٹ گیا ہے جیسے اُسے کوئی ڈر، کوئی اندیشہ لاحق نہ ہو۔ ایسی بھی کیا بے نیازی!'' کھالے کے لہجے میں ہلکی سی برہمی تھی۔

''اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو خان اُس کا دشمن کیوں بنتا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں! تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اچھا! یہ بتاؤ، کوٹھی کا دروازہ اِس وقت کھلا ہوگا؟'' کھالے نے اچانک پوچھا۔

''یقیناً..... کیونکہ میں نے آج تک کوٹھی کے دروازے کو کبھی بند نہیں دیکھا۔''

کھالے نے مجھ سے دوربین لی، آنکھوں پر لگائی اور گھٹنوں کے بل منڈیر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے چھوٹے کوارٹروں کے اندر جھانکا۔ مشرقی منڈیر سے چمٹ کر کافی دیر تک جھانکا تانی کرتا رہا پھر جھک کر چلتا ہوا فرش پر بچھے ہوئے کھیس پر آ گیا، ''شہرے! یہاں تو مچھر بھی بہت ہے۔''

''خنکی میں تھوڑا اضافہ ہوا تو دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔''

ریڈیو پر فرمائش کا پروگرام نشر ہونے لگا۔ کھالے نے مجھے ہاتھ اُٹھا کر خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور کان لگا کر سرائیکی نغموں کا فرمائشی پروگرام سننے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اُس کی لاپروائی قطعاً مصنوعی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

میں نے دوسرا کھیس اوڑھ لیا۔ خاموشی مجھے کھلنے لگی تھی مگر بولنے پر کھالے نے پابندی عائد کر دی تھی۔ اچانک ڈاکٹر کی کوٹھی کی سمت واقع پہلے کوارٹر کے صحن کا بلب روشن ہو گیا۔ میں چونک کر منڈیر کے قریب سرکا۔ جھانک کر دیکھا۔ چونکہ کوارٹر کے صحن اور میرے بیچ کوارٹر کے کمرے حائل تھے، اِس لیے مجھے آدھا صحن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک سایہ سامنے والی دیوار پر

لہرایا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے ڈسپنسر دکھائی دیا جو نپے تلے انداز میں چلتا ہوا دیوار تک پہنچا۔ منڈیر پر ہاتھ رکھ کر فضا میں بلند ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کو دیکھتا رہا، پھر بائیں ہاتھ والی دیوار تک گیا۔ جھانک کر ہسپتال کے مین گیٹ کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کیے برآمدے کی سمت بڑھا۔ پھر دیوار پر سایہ لہرایا اور صحن کی بتی بجھ گئی۔

کھالا ہاتھ کے اشارے سے مستفسر تھا۔ میں نے اُسے ڈسپنسر کی مشکوک سرگرمی کے بارے میں بتایا۔

وہ سر ہلا کر بولا، ''اس کا مطلب ہے کہ ڈسپنسر بھی آج رات کو کھیلی جانے والی گیم کا حصہ ہے۔''

مجھے اُس کی بات سے اتفاق تھا۔ بارہ بجے کے قریب یارن خان کی حویلی میں ایستادہ اونچے سنبلوں پر سے آدھے چاند نے جھانک کر ماحول کو خاصا روشن کر دیا۔ کھالے نے سرگوشی کی، ''شہرے! کیا اِس ڈسپنسر کو ڈاکٹر کے چھت پر سونے کا علم ہے؟''

میں گھبرا سا گیا، ''میرا خیال ہے کہ اُسے پتہ نہیں ہے۔''

''اگر اُسے علم ہے تو لازمی طور پر اُس نے خان کے آدمیوں کو بتا دیا ہوگا۔ معاملہ بگڑ جائے گا۔'' کھالے کے لہجے میں تشویش تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ غور کیا، سجھائی دیا کہ ہم نے ڈاکٹر شاہ جی کو چھت پر چڑھتے ہوئے اِس لیے دیکھ لیا تھا کہ ہم اُس کی چھت سے قدرے بلند چھت پر چڑھے ہوئے تھے جبکہ ڈسپنسر کے کوارٹر میں کھڑے ہونے سے ڈاکٹر کی یہ حرکت دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ میں پُر یقین انداز میں گویا ہوا، ''کھالے! مجھے یقین ہے کہ ڈسپنسر کو علم نہیں ہے۔''

اُس نے جواباً کچھ نہیں کہا بلکہ ریڈیو کی ناکارہ ٹیوننگ ناب کو گھمانے لگا۔ اس نے اندازہ کر رکھا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی پر حملہ کرنے والے ایک سے دو بجے تک کے دورانیے میں ہسپتال میں داخل ہوں گے کیونکہ واردات کے لیے یہ مناسب ترین وقت گنا جاتا ہے۔ اُس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ڈیڑھ کا عمل تھا جب یارن خان کی حویلی کے درختوں کے اوپر متحرک روشنی کے عکس دیکھ کر کھالا اُٹھ بیٹھا۔ چند لمحے جنوب کی طرف منہ اُٹھائے ساکت بیٹھا رہا، پھر سرگوشی میں بولا، ''شہرے! کھیل شروع ہو چکا ہے۔''

میں چونکا، ''کیسے؟''

''نوری چوک کی طرف سے آنے والی کوئی گاڑی نور پور کی حدود میں داخل ہو رہی ہے۔''
کھالے نے سنبل کے درختوں کے اوپر کی طرف انگلی لہرا کر کہا، ''یہ اُسی کی ہیڈ لائٹس ہیں۔ اَب تم خاموش رہنا، کوئی سوال مت کرنا۔''

میں نے بطورِ احتیاط ڈسپنسر کے کوارٹر میں جھانکا۔ وہ بائیں ہاتھ والی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے کھیس پر پڑی دوربین اُٹھا کر آنکھوں سے لگائی تو مجھے وہ ٹارچ بھی دکھائی دی جو اُس نے پکڑ رکھی تھی۔ کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ فضا میں گونجی۔ کھالا بلی کی طرح منڈیر سے چپک گیا اور مجھے بھی نیچے کی طرف کھینچ لیا۔ میری حالت خاصی دِگرگوں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میری رگ رگ میں بے چینی اور خوف بھر گیا ہو حالانکہ میں زندگی میں پہلے بھی کئی مرتبہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ مگر میں اپنی زندگی کے اُس رخ کو ملتان کے کالج ہاسٹل میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ میں جیسا نور پور سے گیا تھا، واپسی پر بالکل ویسا ہی تھا۔ آج بھی اگر کھالا میرا ساتھ نہ دیتا تو میں ایسی جرأت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

انجن کی آواز قریب آ گئی۔ ہم نے دیکھا کہ بجھی ہیڈ لائٹس والی ہائی لیکس ویگن ہسپتال کے گیٹ سے کچھ دوری پر آ کر رُک گئی تھی۔ اُس کے عقبی حصے میں سے تین آدمی نیچے اُترے۔ چاند چونکہ آدھا تھا، فاصلہ بھی زیادہ تھا، اِس لیے اُن کی ہیئت کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈسپنسر نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کو تین مرتبہ روشن کر کے 'اوکے' کا سگنل دیا۔

کھالے نے سرگوشی کی، ''شہرے! جب میں کہوں، تم نے دونوں پٹاخوں کو آگ لگا کر پھینک دینا ہے۔ خیال رہے کہ ایک، کسی سرکاری کوارٹر میں جا کر گرے، دوسرا اگلی کے پار کسی گھر کے صحن میں۔ اوکے؟''

''اِس سے کیا ہوگا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اُس نے میرے کان میں کہا، ''لوگ جاگ جائیں گے، گھروں سے نکل آئیں گے اور حملہ آوروں کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔''

''اور ہم کیا کریں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''چپ چاپ تماشا دیکھیں گے۔ تم یہ خیال رکھنا کہ ڈسپنسر کے کوارٹر میں گولہ نہ پھینک دینا۔ وہ دشمنوں کا مورچہ ہے۔ سمجھے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہماری نظریں متواتر ہسپتال کے گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ تینوں سائے جالی دار گیٹ تک آئے اور کوئی آواز پیدا کیے بغیر گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ عمومی طور پر ہسپتال کا گیٹ رات کو بند کر دیا جاتا تھا مگر اُس شب کھلا ہوا تھا جو یقیناً ڈسپنسر کا ہی کام تھا۔ کھالے نے ہاتھ بڑھا کر غلیل اُٹھائی اور غلہ ڈال کر کھینچ مارا۔ اُس کا نشانہ واقعی کمال کا تھا۔ بچوں کے کھیلنے والی شیشے کی گولی اُڑتی ہوئی ڈاکٹر کی چھت پر گری۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سوئے ہوئے ڈاکٹر کو ہی لگی ہوگی یا اُس کے بہت قریب گری ہوگی۔ کھالے نے برق کی سی مستعدی سے دو تین غُلے ڈاکٹر کی چھت پر داغ دیے۔

اِس وقت تک تینوں نو وارد ہمارے سامنے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی کی طرف جانے والی اینٹوں کی روش پر پہنچ چکے تھے۔ قریب ہونے پر واضح ہو گیا تھا کہ اُن تینوں میں، بیچ میں چلنے والا سایہ نسوانی تھا۔ تینوں بڑی مستعدی سے چلتے ہوئے ڈاکٹر کی کوٹھی کے دروازے تک پہنچے۔ بلب کی روشنی میں تینوں کے خال وخد تو دکھائی نہیں دیتے تھے مگر اُن کے حلیے صاف نظر آ رہے تھے۔ عورت نے سبز دوپٹہ اور نارنجی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے جبکہ دونوں مرد سفید لباس میں تھے۔ دونوں لمبے تڑنگے اور جسیم تھے۔

ڈاکٹر کی چھت پر کوئی نقل وحرکت نہیں تھی۔ ہم دونوں نے اپنی پوری توجہ اُن تینوں کی حرکات پر مرکوز کر دی۔ ہم یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ نو واردوں کے ہمراہ عورت کا کیا کام تھا۔ عورت نے دروازے پر دستک دی۔ اُس کے دونوں ہمراہی دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے اور دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ہسپتال کے بیرونی گیٹ کی طرف دیکھا۔ گاڑی ریورس ہو رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ مکانوں کی اوٹ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

دستک کا جواب نہ پا کر اُس عورت نے دوسری مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر بھی کوئی ردِعمل دکھائی نہیں دیا تو اُس نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا اور عورت اردگرد دیکھ کر اندر گھس گئی۔ میں سانس روکے، آنکھیں پھیلائے دیکھ رہا تھا۔ کھالے نے میرے کان میں کہا، ''میں سارے کھیل کو سمجھ گیا ہوں۔ یہ عورت مریضہ بن کر ڈاکٹر کے پاس آئی ہے۔''

میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ پایا۔ کھالے نے پٹاخوں اور ماچس کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے احتیاط سے سرک کر مطلوبہ اشیا اُٹھا کر ہاتھ میں کر لیں۔ کئی منٹ گزر گئے۔

دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہوئے ایک شخص نے ڈسپنسر کو ہاتھ لہرا کر کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ ڈسپنسر نے پھر گیٹ پر ٹارچ کی روشنی پھینکی جو جالی دار گیٹ میں سے گزر کر یارن خان کی حویلی کی دیوار پر پڑی۔ یک لخت سوئے ہوئے ماحول میں عجیب نوعیت کی افراتفری پیدا ہوگئی۔ دروازے کے پاس کھڑے ہوئے دونوں شخص گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگے۔ اندر سے عورت کے چیخنے کے آوازیں بھی ماحول میں ہولنا کی پیدا کرنے لگی۔ سردار حیات خان کی حویلی کے سامنے سڑک پر کھڑی ویگن کی ہیڈ لائٹس روشن ہوگئیں، چکراتے ہوئے ایمرجنسی بلب کی نیلی روشنی گھومنے لگی اور ہوٹر کی تیز آواز نے نور پور کے پُرسکوت ماحول کو آناً فاناً تہس نہس کر دیا۔

ایسے میں کھالے نے میرے پہلو میں زور سے کہنی ماری۔ میں نے فی الفور دیا سلائی جلائی اور دونوں پٹاخوں کے فیتوں کو آگ لگا کر دونوں اطراف میں یکے بعد دیگرے پھینک دیا۔

اندھیرے میں ہائی لیکس ویگن دکھائی دینے والی گاڑی درحقیقت پولیس وین تھی جو تیز رفتاری سے ہسپتال کے مین گیٹ تک آئی۔ ایک اہلکار برق رفتاری سے نیچے اُترا، گیٹ کھولا اور ہنگامی حالت میں اندر داخل ہوتی ویگن کے عقبی بمپر پر بمشکل چڑھ پایا۔ جونہی گاڑی روش پر مڑی، میرے پھینکے ہوئے دونوں پٹاخے پھٹ گئے۔ کان پھاڑ دینے والی آواز نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نور پور ہڑبڑا کر بیدار ہوگیا۔ بتیاں روشن ہوگئیں، گلیوں میں مرد دکھائی دینے لگے جو بھاگم بھاگ ہسپتال کی طرف آرہے تھے۔ گاڑی میں سے سات آٹھ پولیس والے اُترے اور گنیں سنبھالتے ہوئے، آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی میں گھس گئے۔ ہسپتال کے کوارٹروں میں خوابیدہ رہائش پذیر جاگ کر باہر نکل آئے تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ سمجھ میں آنے والے منظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈسپنسر دوڑ کر پولیس وین کے قریب ہوگیا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس دونوں افراد اور پولیس والوں کو کوٹھی میں گئے دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ اِس دوران ہسپتال کے گیٹ پر مجمع سا لگ گیا۔ نور پور کا شاید ہی کوئی مرد ہو جو وہاں موجود نہ ہو۔ مہیب شور بپا تھا، ہر آواز کانوں تک آرہی تھی مگر اپنا مفہوم واضح نہیں کر پا رہی تھی۔

کھالے نے سرگوشی کی، ''اندر کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے شہرے!''

میرا دل دھک سے رہ گیا، ''کیا ہوا؟''

''یہ تو پتہ نہیں کہ کیا ہوا، یہ اندازہ ہے کہ جو ہوا، بہت برا ہوا ہے۔'' کھالے نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر نیچے تو نہیں اُترا'' میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

''ہاں! مگر اندر ہو کیا رہا ہے؟''

''میرا خیال ہے، ڈاکٹر کو تلاش کیا جا رہا ہے۔'' میں نے آسرا لیا۔

میں نے ناگاہ ہسپتال کے مین گیٹ کی طرف دیکھا۔ لمبا تڑنگا بخت خان دکھائی دیا جو ایک سپاہی کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے اَن گنت افراد ہسپتال میں گھس آئے۔ ہر کوئی پریشان تھا کہ نصف رات کو ہسپتال میں ایسی کیا قیامت آ گئی کہ قریشی موڑ میں واقع تھانے سے پولیس کو اسلحہ تانے نور پور آنا پڑا تھا۔ بخت خان تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر کی کوٹھی کے سامنے کھڑی پولیس وین کی طرف بڑھا۔

ایسے میں کھالے نے مجھے کہا، ''چل بھئی شہرے! ہمارا کام ختم، ہم بھی نیچے اُتر کر تماشا دیکھیں۔''

میں گھبرایا ہوا تھا کیونکہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ ہم جس نکڑ سے چھت پر چڑھے تھے، اُسی نکڑ سے گھسٹ کر نیچے اُتر آئے۔ ہمارا جملہ سامان اوپر ہی رہ گیا تھا جس کی سرِ دست ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ ہم چار دیواری کے ٹوٹے ہوئے حصے سے باہر نکلے اور چکر کاٹ کر ہسپتال کے دروازے پر موجود ہجوم میں شامل ہو گئے۔ کسی نے ہماری آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

کھالے نے تعجب بھری آواز میں یکے بعد دیگرے وہاں موجود کئی لوگوں سے سوال کیا، ''یہاں کیا ہوا ہے؟ آپ لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہیں؟''

ظاہر ہے، کسی کے پاس اُس کے سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ ہم دونوں گیٹ میں گھس کر اندر جانے لگے تو سپاہی نے ہمیں روک دیا۔ کھالے نے جلدی سے کہا، ''ہم بڑے خان کے ساتھ آئے ہیں۔''

اُس نے کوئی سوال نہیں کیا اور ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے پولیس کی نیلی ویگن کے پاس کھڑے بخت خان کے پاس پہنچے۔

وہ ایک وردی پوش سے مخاطب تھا، ''آخر کچھ پتہ تو چلے کہ آپ نے یہاں کیوں ریڈ کیا

ہے؟''

مخاطب کیے جانے والے نے اپنے عقب میں ڈاکٹر شاہ جی کے اَدھ کھلے دروازے کی سمت دیکھا اور کہا، ''تھانیدار صاحب اندر گئے ہیں۔ اَبھی باہر آ جائیں گے تو اُن سے پوچھ لیجئے گا۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں جی!''

بخت خان اندر جانا چاہتا تھا مگر اُس نے روک دیا۔ کہا، ''خان جی! تھانیدار صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔''

بخت خان ہتھے سے اکھڑ گیا، ''کیا مطلب؟ نور پور میرا گاؤں ہے، مجھے کہیں بھی جانے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ پَرے ہٹو!''

میرے عقب میں سردار حیات خان کی پاٹ دار آواز گونجی، ''بخت خاناں! کھڑتھی..... تھانیدار کنوں پچھ گھنسوں، آندا اِی ہوسی!''

(بخت خان! ٹھہر جاؤ، تھانیدار سے پوچھ لیں گے، آتا ہی ہوگا۔)

بخت خان رُکنے والا نہیں تھا۔ اُسے دھکیل کر دروازے میں گھسنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا۔ پولیس کی وردی میں ملبوس ایک قوی الجثہ شخص ایک نیم برہنہ عورت کو گھسیٹتا ہوا باہر نکلا۔ مجھے اور کھالے کو یقین تھا کہ نصف گھنٹہ پیشتر کوٹھی میں گھسنے والی عورت یہی تھی۔

تھانیدار نے بے رحمی سے اُسے سیڑھیوں پر پٹخا، پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا، ''بتا! تیرا یار، وہ حرامی ڈاکٹر، کہاں چھپا ہے؟ بول! نہیں تو تیری چمڑی ادھیڑ دوں گا۔''

وہ سر نیہوڑائے لب بستہ کھڑی تھی۔ وہ جب کوٹھی میں داخل ہوئی تھی تو ہم نے اُسے پورے لباس میں دیکھا تھا، اَب وہ محض شلوار پہنے ہوئے تھی، قمیص اور دوپٹہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آن کی آن میں وریام خان یا حیدر خان کا پورا پلان میری سمجھ میں آ گیا۔ نفرت، کراہت اور غصے سے میرے ہونٹ بھنچ گئے اور جی چاہا کہ اَبھی یہاں سے نکلوں اور جا کر خان کا منہ توڑ دوں۔ اتنی گری ہوئی حرکت..... میں نے زمین پر تھوک دیا۔

دو چار ٹھڈے پڑے تو وہ عورت چیخ پڑی، ''وہ دیوار پھاند کر بھاگ گیا ہے جی!''

اُس کے ایک ہی جملے نے نور پور کے تمام لوگوں پر ماجرا عیاں کر دیا۔ سب لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ ایک اہلکار ایک بوتل اور دو [illegible] شیشے کے گلاس اندر سے اُٹھا لایا، ''سر جی! یہ

شراب برآمد ہوئی ہے۔ بیڈروم سے!''

عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے والا وردی پوش استہزائیہ انداز میں ہنسا، ''واہ! دونوں شراب وشباب کی رنگ رلیاں منا رہے تھے۔''

عورت کا سر جھکا ہوا تھا۔ جم غفیر میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پھیل گئی۔ کوئی کہہ رہا تھا، ''اِسی لیے تو موئے ڈاکٹر نے شادی نہیں کی۔''

''ہم بھی کہیں، آخر یہ یہاں ٹِکا ہوا کیوں ہے؟ عید، شب رات پر بھی اپنے گھر کیوں نہیں جاتا؟''

''اِسے گولی مار دینی چاہیے، ہماری دھیاں بھیناں یہاں علاج کروانے آتی ہیں۔ کیا پتہ تھا کہ یہ اتنا بے حیا اور بے غیرت ہے۔''

مجمع کا حجم پہلے سے کہیں بڑھ گیا تھا۔ ہر کوئی اپنی فراست کے مطابق رائے پیش کر رہا تھا مگر ہر کسی کی رائے ڈاکٹر شاہ جی کے خلاف ہی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر کھالے کو دیکھا۔ وہ بھی متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اچانک مجھے بانہہ سے پکڑا، کھینچتے ہوئے بخت خان کے عقب تک لے گیا اور قدرے بلند آواز میں بولا، ''شہرے! مجھے تو یہ ٹوپی ڈرامہ لگتا ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی بڈھا آدمی ہے، دو دیواریں پھاند کر اتنی جلدی نکل نہیں سکتا۔''

بخت خان کے کانوں میں کھالے کی آواز پڑ گئی۔ کھالے کا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ چونک کر پلٹا، مجھے اور کھالے کو دیکھ کر بولا، ''تم لوگ کیا کہہ رہے ہو؟''

کھالے نے گھبرا کر کہا، ''کچھ نہیں خان جی! ہم تو بس ویسے.....''

''سیدھی طرح بتاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' بخت خان بھڑک اُٹھا۔

کھالا بولا، ''میں شہرے سے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی بڈھا آدمی ہے۔ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔''

''مگر یہ عورت اِس کوٹھی سے گرفتار کی گئی ہے۔'' کھالے کی منشا کے مطابق بخت خان کے ذہن میں شک کا کیڑا رینگ گیا تھا۔ ایسے میں ہمارے اطراف میں شور بڑھ گیا۔ پولیس والے لوگوں کو پَرے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے۔

سردار حیات خان نے ہم دونوں کو بخت خان سے محوِ گفتگو دیکھا تو جھٹ سے قریب آ گیا۔ بولا، ''کھالے! اوئے شہرے! جاؤ، امیر نواز کو بلا کر لاؤ۔''

بخت خان اُس کی چالاکی کو تاڑ گیا، بولا، ''نہیں خان! میں اِن سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ تم کسی اور کو بھیج دو۔''

حیات خان نے مجھے کڑی نگاہوں سے گھورا۔ اُس کی آنکھوں سے عیاں پیغام کو میں نے دانستہ نظر انداز کیا۔ کھالا کہہ رہا تھا، ''خان جی! آپ اِس عورت سے ڈاکٹر شاہ جی کی عمر، حلیہ اور دیگر ایسی باتیں پوچھیں جن سے واضح ہو جائے کہ اُس نے واقعی شاہ جی کو دیکھ رکھا ہے۔''

بخت خان نے قدم بڑھائے۔ کھالے نے فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور ہولے سے بخت خان کے عقب میں چلا گیا۔ بخت خان اپنی رعب دار آواز میں کہہ رہا تھا، ''تھانیدار صاحب! ایک منٹ۔ اِس عورت کو ویگن میں بٹھانے سے پہلے مجھے کچھ پوچھنے دیں۔''

''آپ نے کیا پوچھنا ہے خان جی؟'' تھانیدار نے چونک کر کہا۔

''آپ کے سامنے ہی پوچھوں گا۔ اے بی بی! بول، تو نے شاہ جی کو دیکھا ہے؟''

وہ خاموش رہی۔

بخت خان نے مزید سختی سے پوچھا۔ وہ سر اُٹھا کر بولی، ''یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے جی؟''

''پوچھنے والی ہے تو پوچھ رہا ہوں۔ بولو؟''

مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ بخت خان کو باز رکھنا نور پور میں کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

حیات خان نے کچھ کہنا چاہا تو بخت خان نے غصہ بھری نظر سے دیکھا، کہا، ''خان! کہہ رہا ہوں کہ اِس معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤ، میں اَبھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتا ہوں۔''

عورت گڑبڑا گئی۔ اُس نے شاہ جی کو نہیں دیکھا تھا۔ بخت خان نے پوچھا، ''بتا، ڈاکٹر شاہ کی داڑھی کتنی لمبی ہے؟''

''وہ..... وہ جی اتنی'' عورت ہکلا گئی۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے بتلایا تھا کہ داڑھی بالشت بھر لمبی تھی۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ بخت خان نے اوپر تلے دو چار سوال کیے۔ وہ کسی ایک بھی سوال کا درست جواب نہیں دے پائی۔

بخت خان دھاڑا، ''حرامزادی! یہ بتا، ڈاکٹر شاہ کی ایف ایکس کار کس رنگ کی ہے جس میں وہ تمہیں گزشتہ شام بٹھا کر یہاں لایا تھا؟''

''سس..... سفید.....'' وہ بری طرح نروس ہو گئی تھی۔

''اُس نے پینٹ کس رنگ کی پہن رکھی تھی؟''

''وہ.....وہ جی.....کک.....کالا سا رنگ تھا شاید!''

بخت خان آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے پوری قوت سے اُس کے منہ پر طمانچہ جڑا، غصیلی نگاہ تھانیدار پر ڈالی، بولا، ''آپ کیا کہتے ہیں انسپکٹر صاحب؟''

''کیا مطلب؟'' وہ بخت خان کا سوال سمجھ نہیں پایا تھا۔

''یہ حرافہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی کی نہ تو بالشت بھر داڑھی ہے، نہ وہ لمبا تڑنگا ہے، نہ وہ پینٹ شرٹ پہنتا ہے اور نہ ہی اُس کے پاس ایف ایکس کار ہے، وہ بھی سفید رنگ کی۔ اُس کے پاس تو ایک پرانی سی موٹر سائیکل ہے، پھٹ پھٹی.....وہ اِس قماش کا آدمی ہی نہیں ہے۔ آپ سے تو میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے اتنا بڑا پلان بناتے ہوئے بنیادی جزئیات پر توجہ کیوں نہیں دی؟'' بخت خان کا لہجہ بڑا کڑا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خان صاحب؟ میں نے کون سا پلان بنایا ہے جو آپ مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔'' تھانیدار کے لہجے میں از حد درشتی تھی۔

''یہ عورت کون ہے؟'' بخت خان نے براہِ راست اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''میں اِسے نہیں جانتا۔''

''یہ کس گاڑی پر سوار ہو کے نور پور آئی تھی؟''

''میں نہیں جانتا، میں تو اپنے ڈالے پر آیا ہوں۔ اِس کی تفتیش کروں گا تو بول پڑے گی۔ اچھا، اَب میں چلتا ہوں۔ چند لوگ میرے ساتھ تھانے آئیں، بیان لکھوانے ہیں۔'' تھانیدار نے بخت خان سے جان چھڑانے کی غرض سے نیم برہنہ عورت کو سرکاری ڈالے میں دھکیلتے ہوئے کہا۔

بخت خان نے اُس کی کلائی تھام لی، ''ناں تھانیدار صاحب! آپ تب تک یہاں سے نہیں جا سکتے، جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ ڈاکٹر شاہ جی کے خلاف کس نے اتنی بے ہودہ پلاننگ کی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو کس نے رنگ رلیاں منانے والے جوڑے کے بارے میں مطلع کیا تھا؟''

تھانیدار ایک ذرا ٹھٹکا، چور نظروں سے سردار حیات خان کو دیکھا، بولا، ''ہمیں مخبر نے اطلاع دی تھی۔''

''مخبر کون ہے؟''

''یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔''

سردار حیات خان، اپنے عم زاد کو بازو سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ اُسے کچھ سمجھانا چاہتا تھا۔ وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا، اِس لیے اُس پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ تھانیدار، علاقے کا اَن داتا تھا، جواب دِہ ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ گفتگو اِس مرحلے پر پہنچ گئی کہ اُس کے لہجے میں تندی شامل ہوگئی۔ تب بخت خان نے کہا، ''انسپکٹر صاحب! میں بچہ نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں، نور پور میں کون کیا کر رہا ہے۔ مجھے کل شام میں ہی ڈاکٹر منور علی شاہ نے بتا دیا تھا کہ اُس پر شدید نوعیت کا حملہ ہونے والا ہے۔ تبھی میں نے سلیم شہزاد صاحب کو اپنے ہاں مدعو کر لیا تھا۔ اَب بھی وہ میرے گھر میں محوِ استراحت ہیں۔ اوئے چل اوئے بشیریا! مہمان خانے میں سوئے ہوئے مہمان کو اُٹھالا، دیکھتا ہوں، اِس ڈرامے کا ڈائریکٹر اور رائٹر کون ہے؟''

تھانیدار ٹھٹک کر رُک گیا۔ ہراساں نظروں سے بخت خان کو دیکھنے لگا۔ چند ثانیوں میں ہی اُس نے محسوس کر لیا کہ بگڑا ہوا خان جھوٹ نہیں بول رہا، سچ کہہ رہا ہے اور جو دعویٰ کر رہا ہے، اُسے پورا کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔

گڑبڑا کر بولا، ''کون سلیم شہزاد صاحب؟''

اُس کے پوچھنے کے سراسیمگی آمیز انداز سے ہی عیاں تھا کہ وہ موصوف کو بخوبی جانتا تھا۔ بخت خان بدستور تن کر کھڑا رہا۔ اُس نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔

تھانیدار پھر بولا، ''کیا اپنے ایس پی صاحب کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''ہوں! اَبھی دیکھ ہی لوگے، کون سلیم شہزاد!'' بخت خان کی آواز زخمی سانپ کی پھنکار لیے ہوئے تھی۔

میں نے جھٹ سے سردار حیات خان کی طرف دیکھا۔ خنکی کے باوجود اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ پولیس والوں کی حالت بھی خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ وہ اپنے ہی دام میں بری طرح پھنس چکے تھے۔ تھانیدار نے سب کو ویگن میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود برق رفتاری سے اگلی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی ڈالا اسٹارٹ کر دیا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ راہِ فرار اختیار کر رہا ہے۔

بخت خان بپھر گیا۔ اُس نے باآوازِ بلند کہا، ''نور پور والو! اِن دھوکہ بازوں کو گھیرے میں

لے لو، یہ بھاگنے نہ پائیں۔ ایس پی صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔''

دیہاتیوں کے لیے خان کی شہہ کافی تھی۔ اُنہوں نے آنِ واحد میں ڈالے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کھالے نے جھٹ سے دو اینٹیں ڈھونڈ نکالیں جنہیں ڈالے کے ٹائروں کے پیچھے خاص تکنیک کے ساتھ ٹِکا دیا۔ ڈالہ آگے جا نہیں سکتا تھا کیونکہ اگلا بمپر دیوار سے بمشکل بالشت بھر کی دوری پر تھا۔

شور بپا تھا، کانوں پڑی آواز سنائی دیتی تھی، سجھائی نہیں دیتی تھی۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے، کے مصداق نور پور کے باشندوں کا قبلہ بدل گیا۔ شاہ جی کو بے حیا قرار دینے اور کوسنے والے اَب پولیس کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر شاہ جی کو 'ولی' قرار دے رہے تھے۔ اُنہیں ہر وہ بھلائی یاد آ گئی تھی جو شاہ جی نے کسی نہ کسی موقع پر اُن سے روا رکھی تھی۔ میرے کانوں میں مختلف آوازیں چکرانے لگیں۔

''میں بھی کہوں، اللہ کا نیک بندہ، ایسا کام کر ہی نہیں سکتا۔''

''ڈاکٹر صاحب اور شراب؟ ناممکن۔''

''پنج وقتا نمازی زنا کر ہی نہیں سکتا۔''

''اگر اتنا ہی بھوکا ہوتا تو کب کی شادی کر چکا ہوتا۔''

انسپکٹر کی حالتِ زار دیدنی تھی۔ ڈالے سے اُتر آیا۔ لوگوں کو ہاتھ سے دھکیلتا ہوا بخت خان کے پاس آیا، رازدارانہ انداز میں کچھ کہنے لگا۔ بخت خان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ اُٹھا کر بولا، ''مجھے پروا نہیں۔''

سردار حیات خان بھی بخت خان سے سر جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ تینوں کسی اختلاف کا شکار تھے۔ بخت خان کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر اُس کے چہرے کے تاثرات سے باآسانی عیاں ہو رہا تھا کہ وہ دونوں سے متفق نہیں تھا۔ ایسے میں بخت خان کا نوکر، بشیر علی عرف بشیرا، بھاگتا ہوا تینوں کے قریب پہنچا، عادتاً بلند آواز میں بولا، ''خان جی! وہ آپ کو اور پولیس والوں کو وہیں بلا رہے ہیں۔''

بخت خان نے تھانیدار سے کہا، ''ڈالہ یہیں کھڑا رہے، آپ میرے ساتھ میری حویلی تک چلیں۔ ملزمہ اور اپنے اہلکاروں کو بھی ساتھ لے لیں۔''

یک بارگی، انسپکٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ کبھی اپنے ماتحت عملے پر نگاہ ڈالتا تو کبھی بخت خان کو

مدد طلب نظروں سے دیکھتا۔ اونٹ پہاڑ تلے آنے سے گھبرا رہا تھا۔ بخت خان نے اُس پر غصیلی نگاہ ڈالی اور گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

سردار حیات خان کی آواز گونجی، ''سوتر! چنگی نویں کریندا کھڑا!''

(عم زاد! تم اچھا نہیں کر رہے۔)

بخت خان نے مڑ کر دیکھا نہ کوئی جواب دیا۔ سبھی اہل کاروں کو مجبوراً اُس کی تقلید کرنا پڑی۔ میں نے کھالے کو دیکھا۔ کم روشنی کے باوصف اُس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر خوشی رقصاں دیکھی۔ چند لمحوں کے بعد سبھی لوگ جلوس کی شکل میں ہسپتال کے باہر سڑک پر تھے اور اپنے اپنے انداز سے اِس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے بخت خان کی حویلی کی طرف عازمِ سفر تھے۔

میں اور کھالا سب سے پیچھے رہ گئے۔ کھالے نے کہا، ''مزہ آ گیا یار! سردار بخت خان نے تو دلیری کی حد کر دی۔ وریام خان اور حیات خان اُسے اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آج اُس نے سب کو نتھ ڈال کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اِن سے بڑا خان ہے۔''

میں نے کہا، ''اپنے ڈاکٹر شاہ جی کا بخت خان سے کیا تعلق ہے؟ میں نے تو آج تک دونوں کو کہیں ملتے نہیں دیکھا۔''

''بس دیکھتے جاؤ، کیا ہو رہا ہے، وقت آنے پر سب پتہ چل جائے گا۔'' کھالے نے نیم لاپروائی سے کہا، ''لگتا ہے، تھانیدار کی وردی اُتر جائے گی۔''

''اللہ کرے!'' میرے دل سے دعا نکلی۔

جب جلوس کے پیش رو بخت خان کی حویلی کے گیٹ پر پہنچے، ہم حیات خان کی حویلی کے سامنے پہنچ کر رُک گئے۔

کھالے نے کہا، ''یار! آگے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں کسی نے حویلی میں داخل تو ہونے نہیں دینا، پھر خواہ مخواہ ٹانگیں کیوں مارتے رہیں۔ چلو یار! اپنی 'لال پری' کے بونٹ پر بیٹھ کر گپ مارتے ہیں۔'' وہ اپنی ویگن کو لال پری بھی کہہ لیا کرتا تھا۔

میں سمجھ گیا۔ اُسے اسما کی یاد ستانے لگی تھی۔ وہ جب بھی 'گپ مارنے' کی بات کرتا، مجھے باور ہو جاتا تھا کہ اُس کی زبانِ عشق پر کھجلی ہونے لگی ہے۔ بہت عرصہ تک شموں اُس کی گپوں کا طرہ تھی، پھر اسما کو یہ سعادت نصیب ہو گئی تھی۔

کھالے کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ خان کی حویلی کے باہر کچھ دیر تک لوگوں کی بھیڑ چھائی رہی، پھر ہولے ہولے چھٹ گئی۔ مہمان خانے میں داخلے کی اجازت کسی کو نہ ملی تھی۔ نصف گھنٹے میں نور پور، جو ہنگامی حالات کے سبب ہڑبڑا کر جاگ پڑا تھا، پُرسکون ہو گیا۔ فصلوں پر اَوس پڑنے لگی تھی، ہنگامہ خیزی پر بھی اَوس پڑ گئی۔ میں اسما کا تذکرہ بہ زبانِ عشق سن رہا تھا مگر سوچ ڈاکٹر شاہ جی کے بارے میں رہا تھا۔ اچانک، غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا، ''یار کھالے! ڈاکٹر شاہ جی کو دیکھو، اتنے شور و غوغا کے باوجود کیسے دَم سادھے چھت پر لیٹا رہا۔ اُس نے محاذ کو سامنے آئے بغیر فتح کر لیا۔''

اُس نے بپھر کر زوردار دھپ میری کمر پر رسید کی۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل زمین پر آن گرا۔ چکنی مٹی کی دُھول نے میرا منہ سرا ایک کر دیا۔ بدقت تمام اُٹھا، قمیص کے پلو سے منہ صاف کیا، چند گالیوں سے کھالے کو سرفراز کیا اور پھدک کر بونٹ پر بیٹھ گیا، ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

وہ تپ کر بولا، ''اتنی خوب صورت گفتگو کے بیچ ڈاکٹر کہاں سے آن ٹپکا۔ میں اپنی جانِ جاناں کے تذکرے میں ٹانگ اڑانے والے کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہوں۔''

''اوئے کھالے! تم نے یہ 'جانِ جاناں' کہاں سے سن لیا؟''

وہ کھسیا کر بولا، ''ایک فلم کا ڈائیلاگ سنا تھا، یاد رہ گیا۔ اچھا! اب بک بک نہ کرو، غور سے سنو۔''

میں طوعاً و کرہاً خاموش ہو گیا۔ وہ پھر اپنی رو میں بہکنے لگا۔ اَب گاہے بگاہے جائزہ لینے لگا تھا کہ میں اُس کی بات توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں یا پہلے کی طرح ڈاکٹر کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کافی دیر گزر گئی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ بند کمرے میں ہونے والے مذاکرات طوالت پکڑ چکے ہیں مگر اِس ڈر سے خاموش رہا کہ اُس کا ہاتھ پھر نہ چل پڑے۔ میرا جسم لوہا رزادے کی آہنی ضرب کا متحمل نہیں تھا۔ جب نور پور کے جنوبی کونے میں واقع مسجد کے سپیکر سے مؤذن کی صدا اُبھری تو انسپکٹر، اُس کے ماتحت عملے اور سردار حیات خان کی صورتیں دکھائی دیں۔ حیات خان اپنی حویلی میں گھس گیا جبکہ پولیس والے اُس بازاری عورت کے ہمراہ ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میں نے تھانیدار کے ہم قدم چلتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کو دیکھ لیا

تھا۔ کھالے کو متوجہ کیا تو اُس کا ردِعمل بھی میرے جیسا ہی تھا۔ کھالے کے منہ سے بے اختیار نکلا، ''یہ ڈاکٹر کہاں سے ٹپک پڑا؟''

''یار! یہ بندہ ہے یا چھلاوہ!''

''تم نے اِسے چھت سے اُترتے دیکھا تھا؟'' کھالے نے تشکیک آمیز نظروں سے مجھے گھورا۔

''کمال کرتے ہو تم بھی۔ ہم دونوں اکٹھے ہی تو تھے۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

تھانیدار اور ڈاکٹر کے نقشِ قدم پر چلتی ہوئی جھوٹی عورت کے بدن پر ایک گھریلو قسم کی سفید چادر لپٹی ہوئی تھی جس نے اُس کے بالائی بدن کی برہنگی کو چھپا لیا تھا۔ چند منٹوں کے بعد پولیس کا ڈالہ تیز رفتاری کے ساتھ نور پور سے نکل گیا۔ نصف شب کو شروع ہونے والا اپنی نوعیت کا عجیب ہنگامہ علی الصبح کے ملگجے اندھیرے میں سرد ہو گیا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔ کھالے نے طویل سانس سینے میں اُتاری، بولا، ''بند کمرے میں چاند چڑھا دیا گیا کاکا بلو!''

''کیا مطلب؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''یہی کہ خان زادوں نے آپس میں مفاہمت کر لی۔ ڈاکٹر شاہ جی کا معاملہ گول سمجھو۔'' کھالے نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''کیا ڈاکٹر خاموش ہو جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''تو کیا وہ مرغے کی طرح ٹوکرے پر چڑھ کر بانگیں دے گا؟'' کھالے نے منہ بنا کر کہا ''مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہمیں اور ڈسپنسر کو ڈاج دینے کے لیے ڈاکٹر شاہ جی چھت پر چڑھا اور پھر بڑی صفائی سے اُتر بھی گیا۔ وہ بخت خان کے مہمان خانے میں ایس پی کے ساتھ موجود تھا۔ بخت خان بڑا گھنا نکلا شہرے!''

''پھر بھی ڈاکٹر شاہ جی کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔'' میں نے 'زیادتی' لفظ پر بالخصوص زور دے کر کہا۔

''زیادتی ہوئی نہیں، کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے، اَب ڈاکٹر شاہ جی پولیس والوں پر یا سرداروں پر کیس کرنے سے تو رہا۔ اُس کی جان چھوٹ گئی، یہی بڑی بات ہے۔''

کھالا محفل برخاست کرنے کا اعلان کرتے ہوئے بونٹ سے اُتر گیا۔ میں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس جانا چاہتا تھا مگر کھالے نے سختی سے منع کر دیا۔ اُس نے سمجھایا کہ مجھے اَب جا کر سو جانا چاہیے کیونکہ اگلے دن مجھے حیات خان اور وریام خان کی پیشی بھگتنا تھی۔ میں حیرت سے سوال کناں ہوا، ''کیا وہ مجھے بلائیں گے؟''

''مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری اچھی خاصی درگت بنائیں گے۔''

''پَر میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے اور تمہارے یار خالد محمود عرف کھالے اُستاد نے بخت خان کے کان میں کانا پھوسی کی تھی۔ یہ ناقابلِ معافی جرم ہے۔'' کھالے نے مسکرا کر کہا۔

''تو پھر تمہیں بھی بلایا جائے گا۔ ہے ناں؟''

''ہاں مگر میں منت سماجت کر کے اپنی جان چھڑا لوں گا۔ میرا کیا ہے، جھوٹی سچی قسمیں اُٹھا سکتا ہوں۔ تم انقلابی فلاسفر بن کر اکڑ جاتے ہو، خان جو ہوئے۔ کیا ہوا جو گھر میں کھانے کو دانہ پھکا نہیں ہے۔ خاندانی اکڑ دکھاتے ہو، تبھی مارے جاتے ہو۔''

وہ ہنستے ہوئے، مجھے ایک زور دار انعامی دھپ رسید کر کے اپنے گھر کی چار دیواری پھلانگ گیا۔ میں نے تازہ صبح کی مست ہوا پھیپھڑوں میں اُتاری اور تھکن زدہ گام سنبھالتے ہوئے اپنے گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔ مجھے بھی کھالے کی طرح گھر کی دیوار پھلانگنا تھی کیونکہ باہر والا دروازہ یقینی طور پر بند ملنا تھا۔ دستک دینے پر بیسیوں سوالات کا سامنا کرنا تھا جن سے بچنے کی ایک یہی صورت تھی کہ چوروں کی طرح گھر میں گھس کر اپنے بستر تک رسائی حاصل کر لی جائے۔

بستر پر گرتے ہی نیند نے آن دبوچا۔ جاگا تو پورا جسم دُکھ رہا تھا۔ فوری طور پر مجھے احساس ہو گیا کہ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ سبھی معمول کے کام کاج کو نبٹانے کے لیے کھیتوں کا رُخ کر چکے تھے۔ دھوپ سر پر آ گئی تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا، تین ٹانگوں والے چوبی میز پر دھری ہوئی چنگیر اُٹھا کر اپنے سامنے چارپائی پر رکھی اور ناشتہ کرنے میں مشغول ہو گیا۔ پروین میرے لیے ناشتے کا خصوصی اہتمام کرتی تھی۔ دیسی گھی میں تلے دو بھاری بھرکم پراٹھے، مکھن سے بھری ہوئی کٹوری، شکر کا پیالہ، توے پر تڑکا ہوا نمک مرچ والا دیسی مرغی کا انڈہ اور لکی لسی کا لبالب جگ..... میں عمومی طور پر ناشتے کے جملہ لوازمات چٹ کر جاتا تھا۔ بسا اوقات دوپہر کا کھانا

نہیں ملتا تھا، مگر مجھے اُس کی احتیاج نہیں رہتی تھی۔

میں نے کاغذ قلم سنبھالا۔ کھالے کے احسان کا بدلہ چکانے کی فوری ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اسما کے نام خط لکھنا شروع کر دیا۔ میرا حاصلِ مطالعہ خوب تھا۔ عشقیہ خط لکھتے ہوئے میں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور اپنی تمام تر علمیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسا مضمون باندھا، جذبات کی ایسی سونخیں منظر کشی کی کہ جب اپنے لکھے ہوئے کو پڑھا تو بے ساختہ عش عش کر اُٹھا۔ چونکہ داد دینے والا کوئی نہیں تھا، اِس لیے 'واہ بھئی شہرے خان! جیو ہزار سال' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنا کندھا تھپتھپایا اور خط کو چوم لیا۔ رومانوی خطوط نویسی میں برسوں کا تجربہ بھی تحریر میں شامل تھا۔ غزالہ کو میں نے اَن گنت خط لکھے تھے۔ وہ بھی کسی نہ کسی رسالے سے 'نقل مار کر' مجھے جواب سے نوازتی تھی۔ یوں یہ سلسلہ ملاقاتوں کے متوازی چلتا رہتا تھا۔

غزالہ عموماً سکول کی کھلی لکیروں والی کاپی کے دھاگے والے دو ورق پھاڑ کر نیلے مارکر کے ساتھ لکھتی تھی۔ مارکر کی نب خاصی موٹی تھی جس کی وجہ سے لفظوں کی جسامت غیر معمولی بڑی ہو جاتی تھی۔ چاروں صفحوں پر محبت کا متن پھیلا ہوتا تھا۔ دو صفحات بے محل مگر رومانی اشعار کے لیے مختص ہوا کرتے تھے۔ اگر میں غزالہ کے اُن تمام خطوں کو اکٹھا کرتا، ان میں دیے گئے مفہوم کا بہ نظرِ احتیاط موازنہ کرتا تو دو تین ہی پیغام سامنے آتے تھے کہ 'میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی' یا 'جب تک تمہیں دیکھ نہ لوں دل کو چین نہیں آتا' اور 'اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں مر جاؤں گی' ہاں! البتہ ہر خط میں مرنے کا طریقہ مختلف ہوتا تھا۔ کبھی تو وہ ریل گاڑی کے نیچے آنے کی بات کرتی، کبھی کنویں میں چھلانگ لگانے کا عزم ظاہر کرتی تو کبھی گلے میں رسی باندھ کر شہتیر کے ساتھ لٹکنے کا عندیہ دیتی۔

اِسی طرح اگر وہ میرے خطوں کا احتساب کرتی تو ایک ہی عزم شکلیں بدلتا ہوا طشت از بام ہونے لگتا کہ میں اُس کے بغیر ادھورا ہوں، وہ نہ ملی تو کسی کے ساتھ بھی شادی نہیں کروں گا؛ وغیرہ۔ نور پور میں موجود وہ تمام عاشق، جن سے میں روشناس تھا، ایسے ہی اعادوں پر اپنے عشق کی آبیاری کیا کرتے تھے۔

صحن میں آہٹ سنائی دی۔ میرے بدن میں برقی رو دوڑ گئی۔ اِس وقت سوائے غزالہ کے گھر میں کسی کی آمد متوقع نہیں تھی۔ میں نے فی الفور اسما کو لکھا جانے والا خط چھپا لیا۔ خالی ورق پر سرنامہ لکھا، 'جان سے پیاری غزالہ!' اور قلم دانتوں میں دبا لیا۔ آنکھیں کھلے دروازے پر

جم گئیں۔ غزالہ نے جھانکا۔ بدلی سے چاند نکلا، میں نے دیکھا اور مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ وہ جھوم کر سامنے آ گئی، دہلیز کو تھام کر کھڑی ہو گئی، بولی، ''کیا لکھ رہے ہو؟''

''میں خط لکھنے لگا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کس کو؟''

''تمہیں کیوں بتاؤں؟''

وہ لہرا کر اندر داخل ہوئی۔ میرے پہلو میں بیٹھ کر پڑھنے لگی، شرم سے لال ہو گئی۔ اکیلے بیٹھ کر پڑھنے کی عادی تھی، روبرو پڑھنا خاصا مشکل تھا۔ لجائی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ''تم نے میرا نام لکھا، میں خود چل کر آ گئی، ہے ناں مزے کی بات!''

''کبھی قسمت کے پنّے پر تمہارا نام لکھ کر دیکھوں گا، ہمیشہ کے لیے آتی ہو یا نہیں؟'' میں نے چھیڑا۔

اُس کے گال تمتما اُٹھے۔

میں نے کاغذ اور قلم سرہانے رکھ دیے۔ اُس کی کلائی تھام لی۔ کانچ کی دو تین چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ بولی، ''ہائے اللہ! اتنی پیاری چوڑیاں تھیں، توڑ دیں تم نے۔''

''میں نے ہی لا کر دی تھیں، اور لے آؤں گا۔'' میں نے ایک اور وَنگ بھی توڑ دی۔ اُس نے کہا، ''چھوڑو مجھے! میں تمہیں 'پیار' نکال کر دکھاتی ہوں۔''

میں نے وِینی چھوڑ دی۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں میں سے ایک نسبتاً بڑا ٹکڑا اُٹھایا، چوم کر آنکھوں سے لگایا اور آنکھیں موند کر زیرِ لب کچھ پڑھا۔ پھر چوڑی کو دونوں انگوٹھوں کی داب سے توڑ دیا۔ کئی ننھے ننھے ٹکڑے اُس کی جھولی میں جا گرے۔ اُس نے اُن ٹکڑوں کو اکٹھا کیا، بولی، ''دیکھ شہرے! میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں!''

میں اُس کی معصوم سی شکل اور تاثرات کے بے ساختہ اُتار چڑھاؤ کو وارفتگی سے دیکھے جا رہا تھا۔ پوچھا، ''تم نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا بھی ہے، بتاؤ، کیا تھا؟''

اُس نے منہ پھیر لیا۔ میں بضد ہوا مگر وہ خاموش رہی۔ میں نے اُس کے چہرے کا رُخ اپنی جانب موڑ کر اپنا سوال دہرایا۔ وہ آنکھیں جھکا کر، شرمیلے سے انداز میں گنگنانے کے سے انداز میں بولی، ''اَچ کچ سوہنی ونگ ڈَس سچ سچ..... میڈا امیڈے ماہیے نال پیار کنّا!''

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

وہ جھینپ کر بولی، ''اَب میں تمہارا پیار نکال کر دیکھتی ہوں۔''

اُس نے اپنے عمل کو دُہرایا۔ اتفاق سے کوئی کنکرہ نہیں جھڑا۔ اُس نے اپنی انگلی اور انگوٹھے کی اگلی پوروں کو دیکھا۔ پارہ دکھائی نہیں دیا۔ منہ بنا کر بیٹھ گئی، ''تم تو مجھ سے پیار کرتے ہی نہیں ہو۔ دیکھو، چوڑیاں تو جھوٹ نہیں بولتیں ناں!''

چوڑیاں واقعتاً جھوٹ نہیں بولتیں۔ جس کلائی سے بندھی ہوتی ہیں، کرچی کرچی ہو کر بھی اُسی کی خیر مانگتی ہیں۔ نور پور کی لڑکیوں کا یہ محبوب مشغلہ تھا۔ جہاں بھی دو چار اکٹھی ہوئیں، چوڑیاں توڑ کر اپنے پسندیدہ لوگوں کے جذبات کی دُنیا میں جھانکنے لگیں۔ چوڑی کے ننھے ٹکڑوں کی تعداد زیادہ ہوتی تو دل خوش ہو جاتا، مسکرا کر سکھیوں کو بتانے لگتیں۔ اگر چوڑی نے ٹھینگا دکھا دیا تو دل مسوس کر رہ گیا اور آنکھیں جھک گئیں۔ میرے پاس بیٹھی غزالہ کے چہرے پر بھی قوسِ قزح رقصاں تھی۔ کبھی تو مسکرا دیتی، کبھی افسردہ ہو جاتی۔

میں نے آہستگی سے اُس کا دوپٹہ سر سے سرکایا، سیدھی مانگ والی زلفوں کو چھیڑا اور کہا، ''غزالہ! تمہیں میری محبت پر بھروسہ نہیں ہے جو اپنی چوڑیوں سے پوچھنے بیٹھ جاتی ہو۔''

اُس نے شرما کر مجھے دیکھا۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے اُس کے اُبھرے گالوں والے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی، پھر چونک کر کھڑی ہو گئی۔ بے ساختگی سے گویا ہوئی، ''تم مجھے ہاتھ نہ لگایا کرو۔''

میں نے پوچھا، ''کیوں؟''

''مجھے کچھ ہونے لگتا ہے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔ میں نے اُس کے چہرے کو یک لخت لاگی پکڑتے دیکھا تو بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ میری محبت پاش نظروں کا سامنا نہ کر پائی اور پلٹ کر دوڑتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ اُس کے پیچھے جانا فضول تھا کیونکہ میرے کمرے سے نکلنے تک وہ یقیناً حویلی کا دروازہ عبور کر چکی ہوتی۔

میرے اندیشے بے محل ثابت ہوئے۔ مجھے وریام خان یا سردار حیات خان نے شام تک طلب نہیں کیا تھا البتہ شام ڈھلتے ہی، جب میں کھانا کھا کر ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کی تیاری کر رہا تھا، بخت خان کا نوکر بشیرا دستک کناں ہو گیا۔ چاچے چراغ نے اُس سے آمد کی غرض و غایت دریافت کی، پھر مجھے آواز دے کر دروازے پر بلا لیا۔ میں بشیرے کے ساتھ سردار بخت خان کے ڈیرے پر گیا۔ بخت خان کو مہمان خانے کے آگے بنے ہوئے چھوٹے

سے لان میں بے چینی سے ٹہلتے پایا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے مخصوص پاٹ دار لہجے میں بولا،
''نوجوان! کیا حال ہے تمہارا؟''

میں نے ادب سے سلام کیا، خیریت بتا کر خیریت دریافت کی۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ لان میں بچھی لوہے کی بنی ہوئی سرخ رنگ کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''میرا خیال ہے، یہاں، کھلی فضا میں بیٹھنا مناسب ہوگا۔ چائے پانی؟''

میں نے انکار کیا۔ ہم دونوں کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اُس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''شہرے پتر! مجھے خوشی ہے کہ تم پڑھ لکھ گئے ہو اور آگے بھی پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ مجھے یہ جان کر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے بھائی وریام خان کے سامنے دلیری کے ساتھ حقی سچی بات کر دی۔ زندگی کا یہ قرینہ علم ہی انسان کو سونپتا ہے۔ جھوٹے کو جھوٹا اور سچے کو سچا کہنے کا حوصلہ علم دیتا ہے اور تم نے اِس کی لاج رکھی۔ ڈاکٹر شاہ بہت اچھا انسان ہے۔ مخلص اور ایماندار ہے۔ تم نے اور تمہارے دوست خالد نے اُسے خبردار کیا، اُسے خطرے کی پیشگی اطلاع دی، یہ بہت بڑا کام تھا۔''

میں پوری توجہ سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے طلب کرنے کی وجہ کیا رہی ہوگی۔

وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا، ''حیات خان اور بھائی خان سے میری اِسی وجہ سے بنتی نہیں ہے کہ وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں، لوگوں کو آپس میں لڑاتے ہیں اور پھر پرہیاں (پنچایت) میں سرپنچ بنے بیٹھ کر تماشا دیکھتے ہیں۔ مجھے شروع سے ایسی نمبرداری یا ڈیرے داری اچھی نہیں لگتی تھی۔ لوگوں کو شاید ایسے ہی وڈیروں کی ضرورت تھی، اِس لیے مجھے بدتمیز اور بداخلاق جان کر مجھ سے دور ہٹتے چلے گئے۔ میں نے بھی اُن کے اِس قلبی فیصلے کو قبول کر لیا۔''

''جی!'' میں نے ہولے سے کہا۔

''شہرے پتر! مجھے خوشی ہوئی کہ نور پور میں تمہارے جیسے نوجوان سر اُبھارنے لگے ہیں۔ اِس وڈیرہ شاہی کے خلاف تمہارے ہم خیال کون کون لڑکے ہیں؟''

میرے دِل میں شبہ جاگزیں ہوا۔ کہیں وہ اِس بہانے مجھ سے میرے گروپ کے بارے میں معلومات لینے کا طالب نہ ہو، میں نے جلدی سے کہا، ''میرے ساتھ کوئی بھی نہیں۔ کھالا

میرا یار ہے۔ میرے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے اور بس!''

اُس کے لبوں پر میں نے پہلی مرتبہ مسکراہٹ ابھرتی دیکھی۔ بولا، ''ڈرومت! میں تمہارے گروپ میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔''

میں نے فوراً موضوع بدلنے کی کوشش کی، ''خان جی! ڈاکٹر شاہ جی کس وقت آپ کے پاس آئے تھے؟''

''کوئی دس کا عمل ہوگا۔'' وہ بولا۔

''پھر آپ نے اُسے یہیں روک لیا؟''

''ہاں! اُس کی ضد پر میں نے سلیم شہزاد کو بھی بلا لیا تھا۔'' اُس نے از خود بتایا، ''سلیم شہزاد کا بیٹا شاہد سلیم میرے بیٹے ظفر یاب خان کے ساتھ لفٹین بن رہا ہے (سیکنڈ لیفٹیننٹ کا کورس کر رہا ہے)۔ اِسی تعلق کے باعث ہمارے دونوں گھرانوں کا، کافی عرصے سے، ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا معمول بنا ہوا ہے۔''

میں نے ہمت کی، پوچھا، ''خان جی! پھر کیا فیصلہ ہوا تھا؟''

میرا اشارہ بند کمرے میں چڑھائے جانے والے چاند کی طرف تھا۔

''حیات خان، انسپکٹر اور اُس کے عملے نے ڈاکٹر شاہ سے معافی مانگی اور اپنی زیادتی کا اعتراف کیا۔ آئندہ اُس کے خلاف کوئی حرکت نہ کرنے کا تحریری وعدہ کیا اور بس.....'' اُس نے غیر ملکی برانڈ کی سفید فلٹر والی سگریٹ نکالی، گیس والے سنہرے لائٹر سے شعلہ دکھایا اور بڑی نفاست سے کش لینے لگا۔ میں اُس کی شخصی جاذبیت سے پہلے بھی مرعوب تھا، اَب اور زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔

اُس نے دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا، ''شہرے! مجھے ڈاکٹر شاہ نے بتایا تھا کہ تم اُس سے بہت محبت کرتے ہو۔ اُس نے تو یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم اور تمہارا ساتھی، خالد عرف کھالا، اُس کی پہرہ داری کے نقطہ نظر سے ہسپتال کی چھت پر چڑھے ہوئے تھے۔ ویری نائس ینگ مین!''

اُس کی کھلم کھلا گفتگو سے میرے دل و دماغ پر مسلط خوف بتدریج کم ہو گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ہمارا گروپ صرف تین لڑکوں پر مشتمل ہے۔ امیر نواز، خالد اور میں؛ ہم تینوں ہی ڈاکٹر ... کے ایک طرح کے مرید تھے۔ وہ ہماری گاہے بگاہے برین واشنگ کرتا رہتا تھا۔ وہ امیر نواز کے بارے میں جان کر سخت متعجب ہوا۔

پھر اچانک اُس نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا، ''شہرے پتر! یہ بتاؤ، تمہیں کس نے پیشگی خبردار کیا تھا کہ ڈاکٹر شاہ پر گزشتہ رات حملہ ہونے والا ہے؟''

اُس نے اتنی بے ساختگی سے مجھ پر سوال داغا تھا کہ بعید نہ تھا کہ میں سچ اُگل دیتا۔ میں گڑبڑا گیا مگر فوراً سنبھل کر بولا، ''خان جی! یہ سوال مت کریں۔ مجبور کریں گے تو میں جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑالوں گا۔''

''یعنی تم بتانا نہیں چاہتے ہو؟'' اُس نے کریدا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کندھے اُچکا کر بولا، ''خیر! کوئی بات نہیں۔ میں اصل بات کی طرف لوٹتا ہوں۔''

کچھ دیر سوچ کے استغراق میں رہا، سگریٹ کے لمبے کش سینے میں اُتارتا رہا، پھر بولا، ''میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمہارا گروپ ڈاکٹر شاہ کے ساتھ اِسی طرح نتھی رہے۔ اپنے آپ کو حیات خان اور وریام خان کے عتاب سے بچا کر رکھتے ہوئے نور پور کے لوگوں کے شعور کو اُجاگر کرو۔ اُنہیں اپنی معمول کی گفتگو میں باور کراؤ کہ یہ لوگ اُن کے مسائل کا حل پیش نہیں کرتے بلکہ بڑے شاطرانہ انداز میں مسائل پیدا کرتے ہیں تاکہ لوگ دستِ سوال دراز کر کے اُن کے تلوے چاٹیں۔ اُنہیں اَن داتا تسلیم کریں۔ میری بات غور سے سن رہے ہو ناں؟''

''جی!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں تمہیں ایک اور ٹاسک دیتا ہوں۔ سائیں جیت شاہ کے مزار پر جایا کرو۔ جیت شاہ کا گدی نشین، سائیں دل جیت شاہ، کیا کرتا ہے، اُس کا طریقۂ واردات کیا ہے، کھوج نکالو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ فراڈیا ہے۔ اُسے بے نقاب کرتے ہوئے کوشش کرنا کہ یہ خان لوگ تمہارے آڑے نہ آئیں اور اگر کہیں، بالفرض، متصادم ہوتے ہیں تو کسی جھجک کے بغیر تم میرے پاس پہنچ جانا۔ میں اُن کا توڑ کر دیا کروں گا۔ کیا میری بات پوری طرح سمجھ چکے ہو ناں؟''

اُس کا لفظ لفظ میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ میں اپنے تئیں شرمسار بھی تھا کہ میں نے آج تک اُس کے بارے میں جو رائے اپنے دماغ میں پال رکھی تھی، وہ سراسر غلط تھی۔ اُس کے دل میں نور پور کے غریبوں کے لیے نفرت نہیں تھی، بلکہ ایک طرح کی مایوسی کی شدید نوعیت تھی جو لوگوں کے عدم تعاون کے سبب اُس کے رگ و پے میں اُتر گئی تھی۔ میں نے اُس کا شکریہ اد

کیا اور اجازت طلب کی۔

وہ میری کمر میں اپنا بازو حمائل کئے لان کے ننھے سے چوبی دروازے تک آیا، تھپکی دیتے ہوئے بولا، ''شہرے پتر! تم بہت اچھے انسان ہو۔ تمہارا جب بھی جی چاہے، میرے پاس آ جایا کرو۔ اگر تمہارے پاس کچھ وقت ہو تو آ کر اپنی بہن، ملکہ، کو پڑھا جایا کرو۔ وہ پڑھائی میں خاصی کمزور واقع ہوئی ہے۔''

میں مصافحہ کر کے حویلی سے نکل آیا۔ نور پور کی گلیوں میں اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اَبھی گلی کے چوک میں ہی پہنچا تھا کہ بجلی چلی گئی۔ اندھیرے میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ چونکہ انہی گلیوں میں بھاگتے دوڑتے بچپن اور لڑکپن گزرا تھا، اس لیے ٹھوکر لگنے کا احتمال نہیں تھا۔ اپنی گلی میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ میرے کانوں میں کھالے کی آواز پڑی۔ وہ حیات خان کی حویلی کے سامنے سڑک پر کھڑا مجھے بلا رہا تھا۔ میں اُس کے پاس چلا آیا۔

وہ بولا، ''چھت پر سے اپنا سامان تو اُٹھا لائیں..... ہیں؟''

میں نے کہا، ''اَبھی نہیں، رات تھوڑی اور ڈھل جائے، تب چھت پر چڑھیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں چلتے ہیں۔ گپ شپ میں کچھ وقت گزر جائے گا۔''

ہم دونوں شاہ جی کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہ اَبھی تک اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مٹی کے تیل والی لالٹین روشن تھی جس کی پیلاہٹ زدہ کرنیں اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

ہمیں دیکھ کر خوش ہوا۔ دفتری طرز کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''ادھر بیٹھو! تم دونوں کو اکٹھا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔''

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گزشتہ شب کی ہولنا کی زیر بحث آئی۔ پھر میں ڈاکٹر شاہ جی کی فرمائش پر چائے تیار کرنے کے لیے کچن میں آ گیا۔ کیتلی میں کھولتا ہوا پانی، میرے ذہن میں کھولتا ہوا لاوہ..... دونوں یکساں تھے۔ میں چوکی پر بیٹھا بے اختیار ڈاکٹر شاہ جی کو بھول کر بخت خان کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

سردار بخت خان، سردار وریام خان کا چھوٹا بھائی تھا۔ فراخ پیشانی، گوری رنگت اور باریک مونچھیں اُس کی وجاہت میں اضافہ کرتی تھیں۔ قد آور مگر سمارٹ جسم کا مالک تھا۔ اُلٹے رُخ پر سیٹ کیے ہوئے بالوں میں سفیدی جھانکنے لگی تھی مگر وہ کلف لگانے کا عادی نہیں تھا۔ اُسے وراثت میں نور پور میں گیارہ مربع اراضی جبکہ مظفر گڑھ کی ایک نواحی بستی میں ایک مربع

اراضی میسر آئی تھی۔ اُس نے اپنی جائیداد میں محض ایک پٹرول پمپ کا اضافہ کیا تھا جبکہ اُس کے بھائی وریام خان نے گزشتہ سالوں میں بہت کچھ بنالیا تھا۔ وہ اَب تیس مربعوں کے قریب زرعی اراضی کا مالک تھا جبکہ سننے میں آیا تھا کہ اُس نے ملتان میں ایک بہت بڑا پرنٹنگ پریس بھی لگا رکھا تھا۔

سردار بخت خان قیمتی پوشاک پہننے اور سجے سنورے رہنے کا رسیا تھا۔ وہ نور پور کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا انسان تھا۔ اُس نے لاہور میں رہ کر جرنلزم میں ایم اے کیا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر اُس نے ایک اخبار بھی نکالا تھا جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر سال بھر کے بعد بند کر دیا گیا۔ پُرکشش شخصیت کا مالک ہونے کے سبب اُس پر لڑکیاں تتلیوں کی طرح منڈلاتی رہتی تھیں مگر سنا تھا کہ وہ بڑے مضبوط کردار کا مالک ثابت ہوا تھا۔ مگر ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر جب لاہور کے کسی ہسپتال میں ایڈمٹ ہوا تو اُس کے مضبوط ارادوں کی دیوار محض ریت کی اُساری ثابت ہوئی اور دھڑام سے گر گئی۔ زرینہ، ہسپتال کی خوب رُو نرس، اُس کے زخموں کو بھرتی رہی مگر دل میں چرکے لگاتی رہی۔ بدن سدھر گیا، دل اختیار سے باہر ہو گیا۔ جب اُس نے اپنی حویلی میں زرینہ سے شادی کرنے کا اعلان کیا تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ خاندانی روایات اِس بے جوڑ شادی کی متحمل نہیں تھی۔ لاہور کے ہسپتال میں کام کرنے والی نرس، جس کے آگے کا پتہ تھا نہ پیچھے کی خبر، کیسے سردار خاندان کی بہو بن سکتی تھی۔ خان کے باپ اور بھائی نے حشر بپا کر دیا مگر وہ اپنی ہٹ پر پوری استقامت سے ڈٹا رہا۔

نور پور کے بڑے بتایا کرتے تھے کہ اُس نے ہار نہیں مانی تھی اور زرینہ سے شادی کرنے کی غرض سے گھر کو خیرباد کہہ گیا تھا۔ لاہور جاتے ہی اُس نے زرینہ کے ساتھ کورٹ میرج کر لی۔ باپ نے نوکر کے ہاتھ پیغام بھیج دیا کہ وہ آئندہ کبھی نور پور میں قدم نہ رکھے ورنہ اُس کی اور اُس کی بیوی کی ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باپ کی زندگی میں کبھی نور پور میں نہیں آیا تھا۔

وہیں، لاہور میں، کسی اخبار میں ایڈیٹر کے طور پر کام کرتا رہا، گزر بسر کرتا رہا۔ اُس کے خون میں بھی سردار خاندان کے جرثومے متحرک تھے، اِس لیے اُس نے شادی کے فوراً بعد ہی زرینہ سے جاب چھڑوا دی تھی۔ اُسے باپ کے مرنے کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اُسے مہینہ بھر کے بعد پتہ چلا تھا۔ لال بگولا ہو کر نور پور پہنچا۔ آتے ہی اُس نے خاندان بھر کے بڑوں کو اکٹھا کیا۔

اپنے بڑے بھائی وریام خان اور بہنوں کی خوب بے عزتی کی اور ڈنڈے کے زور پر جائیداد میں سے اپنا نصف حصہ الگ کرلیا۔ وریام خان نے اُسے ٹالنے اور نور پور سے نکالنے کی بہت کوشش کی مگر اُس نے کوئی پیش نہیں چلنے دی۔

اپنی جائیداد کا انتظام سنبھالتے ہی اُس نے یہ خوب صورت حویلی تعمیر کرائی تھی۔ سنا تھا کہ وہ حویلی کا نقشہ لاہور کے کسی بڑے نقشہ نویس سے بنوا کر لایا تھا۔ حویلی تعمیر ہوگئی تو وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی نور پور میں لے آیا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ نور پور والوں نے جب اُس کی بیوی کو دیکھا تو دانتوں میں انگلیاں کاٹ لیں۔ وہ بہت خوب صورت اور وضع دار عورت تھی۔ اُس نے آتے ہی بستی کی تمام عورتوں کو اپنے حسنِ سلوک اور ہاتھ کی سخاوت سے گرویدہ کرلیا مگر بخت خان اپنے آپ کو اِس ماحول میں پوری طرح ایڈجسٹ نہیں کر سکا تھا۔ اُس کے خیالات کو رَد کر دیا گیا۔ اُس کی سوچ کو احمقانہ اور ناقابلِ عمل قرار دیتے ہوئے پیٹھ پیچھے تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ سنتا رہا، اپنی سی کرتا رہا پھر ہار مان کر اپنی تصوراتی دنیا میں سمٹ گیا۔ اُس کا ڈیرہ غیر آباد ہوتے ہوتے آخر کار ویران ہوگیا مگر اُس نے اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔

بڑی بیٹی، عائشہ، ملتان کے زنانہ کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔ اُس سے چھوٹا بیٹا ظفریاب خان آرمی میں چلا گیا تھا۔ اُس نے نین ونقوش اور عادات اپنے باپ کی چُرا رکھی تھیں۔ چھوٹی بیٹی، ملکہ، کو ابھی گھر میں ہی پڑھایا جا رہا تھا۔ چھوٹا بیٹا، سکندر بخت، ملتان کے کسی بورڈنگ ہاؤس میں تھا۔ وہ بھی خاصا کم گو واقع ہوا تھا۔ سردار بخت خان کا گھرانہ نور پور کے بڑے گھرانوں میں سے ایک ہونے کے باوجود جدا سا لگتا تھا۔ اُن کا رہن سہن، عادات واطوار اور خال وخد کی نفاست کسی طور پر بھی نور پور سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ طویل عرصہ تک لاہور کی اخباری دُنیا سے منسلک رہنے کی وجہ سے اُس کے ہاتھ خاصے لمبے تھے۔ سردار حیدر خان علاقے کا بے تاج بادشاہ ہونے کے باوجود اُس سے دَب کر رہتا تھا اور اُس کے معاملات میں ٹانگ نہیں اَڑاتا تھا۔

چائے تیار ہو چکی تھی۔ میں تین پیالوں میں بھر کر کمرے میں آ گیا۔ زیادہ پکنے کی وجہ سے چائے کی رنگت قدرے گہری ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے گھونٹ بھرا، حیرت سے بولا، ''ذائقہ خاصا بدلا ہوا ہے۔''

کھالے نے لقمہ دیا، ''پورا گاؤں ہی بدلا ہوا ہے شاہ جی!''

گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ میں نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا کہ اُسے کیسے ہسپتال کی چھت پر ہماری موجودگی کی خبر ہوئی تھی۔ اُس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کھالا ضروری کام نبٹا آنے کا کہہ کر کوٹھی سے نکل گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ چھت پر پڑا ہوا سامان اُٹھانے کے لیے نکلا تھا۔ کچھ دیر کے بعد لوٹا تو اُس کی بغل میں کھیس دَبے ہوئے تھے۔ باقی سامان یقینی طور پر اُس کی جہازی سائز کی جیبوں میں چھپا ہوا تھا۔

ڈاکٹر کی مستفسر نگاہوں کو مطمئن کرنے کے لیے بولا، ''شہرے! یہ کھیس اپنے گھر لے جانا، ماں نے دیے ہیں۔ مہمانوں کے لیے مانگ کر لائی تھی۔''

ڈاکٹر مطمئن ہو گیا۔ مہمانوں کی آمد پر نور پور میں عمومی طور پر سامان مستعار لیا جاتا تھا جو ضرورت پوری ہو جانے پر لوٹا دیا جاتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو اپنی اور بخت خان کی ملاقات کے بارے میں بتلایا۔ ڈاکٹر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

کافی دیر کے بعد بولا، ''اُس کی ہدایات پر عمل نہ کرو، اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ اُس کے سامنے کوئی ٹارگٹ نہیں، وہ جو حاصل کر سکتا تھا، کر چکا۔ تم اَبھی اپنی عملی زندگی کی شروعات کرنے جا رہے ہو۔ اَبھی سے رکاوٹوں کے ساتھ اُلجھنے لگو گے تو سفر رُک جائے گا۔ منزل دور ہوتی چلی جائے گی۔ سائیں جگ جیت شاہ کیا کرتا تھا، اُس کا جان نشیں سائیں دل جیت کیا کرتا پھرتا ہے، تمہیں اِس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ جب تعلیمی مراحل بخوبی سرانجام پا جائیں، روزگار کا مضبوط سہارا حاصل ہو جائے، تب ایسے امور پر توجہ دینا۔ دل جیت فردِ واحد نہیں، حیدر خان اکیلا نہیں بلکہ یہ ایک چین کی کڑیاں ہیں۔ برائی کی چین..... اَن گنت کڑیوں سے مل کر بنی ہے۔ کس کس سے سر ٹکراؤ گے؟''

ڈاکٹر کے لہجے میں مایوسی کا عنصر غالب تھا۔ میں نے استعجاب آمیز لہجے میں دریافت کیا، ''یہ دل جیت شاہ والا قصہ کیا ہے؟ میں تو یہی سمجھتا رہا ہوں کہ وہ بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہے، دم کرتا ہے تو بیماری جاتی رہتی ہے، پھونک مارتا ہے تو مشکلات حل ہو جاتی ہیں مگر اَب سمجھائی دیتا ہے کہ یہ چکر اور طرح کا ہے۔''

شاہ جی نے سر جھکا لیا۔ وہ بتانا چاہتا تھا مگر کوئی مصلحت آڑے آ رہی تھی۔ کھالے نے مجھے اشارہ کیا کہ میں زیادہ نہ کریدوں۔ کھالے نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا، ''ڈاکٹر شاہ جی! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ وہ بازاری عورت جو آپ کو بدنام کرنے کے لیے لائی گئی تھی،

اُس نے آپ کو کوٹھی میں موجود نہ پا کر شور کیوں مچایا تھا؟ اُسے تو چاہیے تھا کہ وہ خاموشی سے کوٹھی سے نکل جاتی اور واردات کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرتی۔''

شاہ جی کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ تیر گئی، بولا ''ہر چالاک آدمی سے کہیں نہ کہیں غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی سقم رہ جاتا ہے۔ میں نے بھی اِس پہلو پر بہت غور کیا ہے۔ یہاں کی سچوئیشن اور سردار بخت خان کی حویلی میں ہونے والے مذاکرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ڈسپنسر کو میری یہاں موجودگی کا مکمل یقین تھا۔ اُس نے بیرونی افراد کو سگنل دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ وہ عورت چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو بتا رہی ہوگی کہ میں اندر موجود نہیں ہوں مگر وہ سمجھ نہیں پائے ہوں گے۔ اِس کے علاوہ کوئی اور صورت بنتی دکھائی نہیں دیتی۔''

ہم دونوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اُس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ باتوں میں بہت دیر گزر گئی تھی مگر اَبھی تک بجلی نہیں آئی تھی۔ ہم دونوں نے شاہ جی سے اجازت لی اور کوٹھی سے نکل آئے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے ہماری موجودگی میں ہی سٹور کا رُخ کر لیا تھا۔ ہمیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ سٹور سے سیڑھی نکال کر چھت پر چڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اَبھی آسمان پر چھائے ہوئے سنگین بادل پوری طرح چھٹے نہیں تھے۔

کھالے کی ویگن کے بونٹ پر بیٹھ کر میں نے بتایا، ''کھالے! میں نے تمہاری جَل پری کے لیے بڑی محنت سے خط لکھا ہے۔''

وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ ہاتھ بڑھا کر بولا، ''اِدھر لاؤ، کہاں ہے وہ خط؟''

میں نے جیب سے خط نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے فرطِ مسرت سے چوم لیا۔ بولا، ''تم اِدھر ہی بیٹھو، میں لالٹین کی روشنی میں اِسے پڑھ کر آتا ہوں۔''

میں گھر جانا چاہتا تھا مگر اُس نے جانے نہ دیا۔ بھاگتے ہوئے گھر میں گھس گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد اُس کی واپسی ہوئی۔ دیوانوں کی طرح مجھے چومنے لگا۔ میں نے بدقت جان چھڑائی۔

وہ بہت خوش تھا۔ کہہ رہا تھا، ''یار شہرے! تم نے تو کمال کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُس نے یہ خط ایک مرتبہ پڑھ لیا تو 'کھالا، کھالا' کرتی گلیوں میں دوڑتی پھرے گی۔''

میں نے مصنوعی تعجب سے کہا، ''کیا مطلب؟ میں نے خط لکھا ہے، دھتورے کی پڑیا تو نہیں

بنائی۔''

''یہ دھتورے کی پُڑیا سے کم نہیں ہے کاکا بلو! تم نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔'' خوشی سے اُس کی باچھیں کانوں سے لگ رہی تھیں۔ خط کی خوشی میں وہ بالکل بھول گیا تھا کہ اَبھی اس سے بھی کہیں مشکل مرحلہ، اسما تک خط پہنچانا، باقی تھا۔

''تم یہ خط اُس تک کیسے پہنچاؤ گے؟''

وہ ایک ذرا ٹھٹکا، پھر ہاتھ نچا کر بولا، ''یہ کوئی مشکل کام ہے.....''

پھر اچانک گھبرا سا گیا، اپنی تردید کرتے ہوئے گویا ہوا، ''کام مشکل تو ہے، مگر خیر سلاّ..... لکھا گیا ہے تو 'خیری سلامتی' ماہی تک پہنچ بھی جائے گا۔''

''کیسے؟'' میں نے ضد کی۔

اُس نے چٹکی بجائی، بولا، ''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

''یہ نہ ہو کہ حیدر خان تم پر وحشی کتے چھوڑ دے۔''

''پروا نہیں!''

اگلی صبح وہ مجھے اپنے ساتھ قریشی موڑ پر لے گیا۔ ویگن میرے حوالے کر کے ملتان سدھار گیا۔ آج اُس نے اپنے بناؤ کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ میں اُس کا میک اَپ دیکھ کر بدقت اپنی ہنسی روکے ہوئے تھا۔ تیل سے چپڑے ہوئے گہرے سیاہ گھنگھریالے بال، سیدھی مانگ، سرمہ بھری سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، سفید کلف لگا لٹھے کا سوٹ اور فیس پاؤڈر سے لتھڑی ہوئی سیاہ گردن..... وہ اپنے چہرے پر بھی فیس پاؤڈر لگایا کرتا تھا۔ عمومی طور پر میں اُسے دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ جب تم پاؤڈر لگاتے ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کالے بکرے نے آٹے کے کنستر میں منہ مارا ہو۔ میں نے اُسے چھیڑنا سرِ دست مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ میری ایک استہزائیہ ہنسی اُسے پریشان اور احساسِ کمتری کا شکار کر سکتی تھی۔ اِس لیے بہ امرِ مجبوری اُس کے مضحکہ خیز بناؤ کی جھوٹی تعریف کی۔

وہ قدرے شرما کر بولا، ''میں اتنا بدصورت بھی نہیں ہوں، بس خود کو بنائے سنوارے رکھنے کا عادی نہیں ہوں۔''

میں اُس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو کر جی کھول کر ہنسا۔ پھر اُسے ملتان والی بس پر سوار کر کے ویگن کے اڈے پر آ گیا۔ شیدو چائے کا بڑا سا پیالہ تھامے میرا منتظر تھا۔ ایک آنکھ میچ کر بولا،

''اَج اُستاد دِی بئی نہیں تھیندی!''

میں نے اُس کے سر پر چپت لگائی اور کھالے کے حق میں دعائیں مانگتے ہوئے چائے نوش کرنے لگا۔ مجھے یقین کی حد تک اُمید تھی کہ وہ اسما کو خط تھمانے کی جرأت نہیں کر پائے گا اور طنطنے سے جانے والا بے نیلِ مرام لوٹے گا۔ اپنی عادت کے مطابق اسما کو خط نہ دے پانے کے کئی مضبوط مگر جھوٹے جواز تراش کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔ شکست کو تسلیم کرنا اُس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ بسا اوقات اُس کی اِسی خو کی وجہ سے ہم دونوں کے بیچ زور دار لڑائی ہو جایا کرتی تھی۔ کئی دنوں تک بات چیت کا سلسلہ موقوف رہتا پھر گزر نہ ہو پانے کی وجہ سے آپوں آپ ہی صلح ہو جاتی تھی۔

میں نے ویگن کا پھیرا لگایا۔ ڈھلتی دوپہر میں جب میں ہوٹل کے بڑے ہماچے پر محوِ استراحت تھا اور رشید و میرے پاس بیٹھا نوٹ سیدھے کر رہا تھا، کھالا بس سے اُتر کر تیر کی طرح ہوٹل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی چال بدلی ہوئی تھی۔ لمبی بانہہ مار کر چلتے ہوئے کھالے کو دیکھتے ہی پتہ چلتا تھا کہ وہ میدان مار آیا ہے۔ میرے تمام تر اندازے خاک میں مل گئے تھے۔ قریب آنے پر میں نے بے تابی سے پوچھا، ''کیا رہا کھالے اُستاد؟''

اُس نے اپنی دو نمبر نوروزی چپل اُتارتے ہوئے مسکرا کر کہا، ''دم تو لینے دو یار۔ چل اوئے شیدو! ٹھنڈے ٹھار پانی کا جگ بھر لا اور ہوٹل والے کو پاؤ دودھ پتی کا آرڈر دے آ۔ فٹافٹ کر، گولی کی طرح جا۔''

میں اُس کے ہیجان انگیز چہرے اور پُر جوش کیفیت کو ملاحظہ کرتے ہوئے بے حد متجسس ہو گیا۔ وہ میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میرے زانو پر زور دار دھپ رسید کرتے ہوئے بولا، ''شہرے خان! تیڈے یار فتح پا گھدی اے۔ رَب دی سوں، رب کولوں کجھ ہور منگا ہوندا تاں شیت اَج او وی لبھ وینداں!''

(شہرے خان! تمہارے یار نے فتح پا لی ہے۔ اللہ کی قسم، اللہ سے کچھ اور مانگا ہوتا تو وہ بھی مل جاتا۔)

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھا، ''تفصیل سے بتاؤ ناں!''

اُس نے پانی کا گلاس حلق سے اُتارا، رسمی انداز میں اردگرد دیکھا، بولا، ''آج تو یوں لگتا

ہے.....''

''جیسے پوری دُنیا خط میں لپٹ گئی ہو اور خط تمہارے ہاتھ میں گلاب کا پھول بن گیا ہو۔'' میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

اُس نے اِک نگہِ شکایت مجھے دیکھا، بولا،'' بکواس نہ کرو۔ میں اگر تھوڑا سا بھی لیٹ ہوتا تو اُس نے میرے ہاتھ نہیں آنا تھا۔ آج اُسے معمول سے پہلے چھٹی ہوگئی تھی۔ میں اَبھی کھڑا ہو کر اپنے حلیے کا جائزہ لے رہا تھا.....''

''یعنی اپنے حسن کو ملاحظہ کر رہے تھے؟''

اب کی بار اُس کی برداشت جواب دے گئی۔ میری ران پر پوری قوت سے دھپ رسید کرتے ہوئے بولا،'' انسانوں کی طرح میری بات سنو ورنہ تجھے گولی ماردوں گا اور تمہاری لاش کے سینے پر مونگ دَلتے ہوئے پوری عشق کہانی بیان کروں گا۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا،'' اچھا یار! لڑتے کیوں ہو۔ اَب جی کھول کر اپنے دل کا غبارِ خاطر نکال کر میرے سامنے رکھ دو۔''

ایسے میں ہوٹل والا چینک اور چائے کے تین کپ ہمارے پر رکھ گیا۔ شیدو نے جلدی سے چائے ڈالی اور مہک دار چائے کے لبالب کپ ہمارے سامنے رکھ دیے۔ کھالے نے اُسے چلتا کیا۔ چائے کا زوردار گھونٹ بھرا اور بولا،'' شہرے! میں ابھی کھڑا ہی تھا کہ اُس کی کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ پتہ، کیا ہوا، میں بغیر کچھ سوچے سمجھے کار کے سامنے آ گیا.....''

''اور ایک عاشق اپنے ہی خون میں نہا گیا۔ اناللہ وانا.....'' میں نے جلدی سے لقمہ دیا تو وہ بپھر گیا۔ خیر گزری کہ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا وگرنہ اُس نے تھپڑ مارنے سے گریز نہیں کرنا تھا۔

دانت پیس کر بولا،'' یار! انسانوں کی طرح میری بات سنو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں کار کے سامنے آ گیا، ڈرائیور نے بریک لگائے اور گیٹ کھول کر مجھے بے نقط سنانے لگا مگر میں اُسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا جسے دیکھنے کے لیے اتنا سفر کر کے وہاں پہنچا تھا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ میں اُس کی وجہ سے کار کے سامنے آیا ہوں۔ وہ گیٹ کھول کر باہر آئی۔ میرے پاس آ کر بولی' گاڑی کے سامنے کیوں آئے ہو؟''

اُس نے پھر چائے کے گھونٹ کا مزہ کشید کیا، بولا،'' شہرے! پتہ ہے، پھر کیا ہوا؟''

''ہاں ہاں! مجھے پتہ ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کیا پتہ ہے؟'' وہ گھور کر بولا۔

''یہی کہ تم نے فی الفور کہا کہ اللہ کے نام پر مجھ نابینے کو روپیہ دو روپے دو..... بھاگ سلامت!''

''میں بھی نرا پاگل کا بچہ ہوں۔ جانتا بھی ہوں کہ تمہیں کچھ علم نہیں ہے، پھر پوچھ بیٹھتا ہوں۔'' اُس کا چہرہ فرطِ غیظ سے متغیر ہونے لگا تھا۔ چائے کا لمبا گھونٹ شکم میں اُتار کر، سنبھل کر بولا، ''میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا کہ 'میں آپ کو دیکھنے کے لیے گاڑی کے آگے آیا ہوں'..... اُس نے بڑے غصے سے مجھے دیکھا۔ میں ڈر کر بھاگنے ہی لگا تھا کہ وہ اچانک مسکرا دی۔ بولی 'دیکھ لیا، اَب گاڑی کے سامنے سے ہٹو'..... میں نہیں ہٹا بلکہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر خط نکالا اور اُس کے سامنے کر دیا۔ اُس نے میرے ہاتھ سے خط لے لیا، پوچھا، 'اس میں کیا ہے؟'..... میں نے کہا کہ 'دیکھ لیجئے گا' اور جلدی سے فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور..... چلی گئی۔'' کھالے نے بڑے انداز سے رام کہانی مکالموں سمیت کہہ سنائی۔

''اُس نے تمہیں واقعی کچھ نہیں کہا؟'' مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں یار! رب دی سوں، سچ کہہ رہا ہوں۔'' اُس نے کہا، ''میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا مگر اُس نے کچھ بھی نہیں کہا بلکہ جاتے ہوئے اُس کی نگاہیں مسلسل مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔''

''یعنی وہ دُنیا کے خوب صورت جوان کو دیدے پھاڑ کر دیکھ رہی تھی؟'' میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''بکواس مت کرو، میں جانتا ہوں کہ تم جل بھن گئے ہو یہ سن کر کہ میں بی بی تک خط پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔'' اُس نے تپ کر کہا۔

''میں نہیں مانتا۔ تلاشی دو، خط تمہارے پاس موجود ہو گا۔'' میں نے اُس کی برہمی کی پروا نہیں کی۔ میرا شک بجا تھا۔

''بڑے بے ایمان ہو تم بھی!'' اُس نے غصہ بھری نگاہ سے مجھے دیکھا، پھر اپنی سبھی جیبیں اُلٹ دیں۔ خط اُس کے پاس نہیں تھا۔ مجھے یقین دلانے کے لیے اُس نے اَن گنت قسمیں کھائیں۔ آخر کار میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اُس نے گریبان کے بٹن کھولے، کالر کو گردن کی عقبی سمت دھکیلا اور چھاتی پھلا کر بولا، ''آج تیرا یار جشن منائے گا، پوری بوتل چڑھائے گا اور

تمہیں جھوم کر دکھائے گا۔''

میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے، کہا، ''میں ایسے جشن پر لعنت بھیجتا ہوں۔ ایک یہی بُری عادت ہے تم میں..... ہونہہ!''

اُس نے میرے چہرے سے ہویدا ناپسندیدگی کے تاثرات کی کوئی پروا نہ کی اور اپنی ترنگ میں لہراتا رہا۔ میں نے زیادہ ضد نہیں کی کیونکہ اُس پر میری نصیحتوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ مجھے قوی یقین تھا کہ وہ قریشی موڑ کی ایک مضافاتی بستی میں واقع ہومیوڈاکٹر عبدالحمید کے کلینک پر جائے گا اور جب ویگن کا آخری پھیرا لے کر نور پور میں داخل ہوگا تو اُس کی ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے بنے ہوئے عارضی ٹول بکس میں گھٹیا قسم کی شراب کی بوتل موجود ہوگی۔

ڈاکٹر حمید علاج معالجے کی آڑ میں یہی کام کرتا تھا۔ آدھے لٹر کی پلاسٹک کی بوتل میں الکحل بھر کر بیچتا تھا۔ الکحل میں ملاوٹ بھی کرتا تھا۔ مے نوشوں کی سوسائٹی میں اس شراب کو 'کپی' کا نام دیا جاتا تھا۔ کھالا جب بھی بہت زیادہ خوش ہوتا، معمول سے کہیں زیادہ رنجیدہ ہوتا یا کسی نوعیت کی بھی ٹینشن میں مبتلا ہوتا، کپی سے دل بہلانے بیٹھ جاتا تھا۔ میں نے بارہا اُس کے موج میلے کے اوقات میں اُسے دیکھا تھا۔ بالکل 'آؤٹ' نہیں ہوتا تھا۔ بس سرخی مائل متورم آنکھوں اور چہرے کی ہلکی تمازت سے پتہ چلتا تھا کہ اُس نے شغل کر رکھا ہے۔ مجھے اِس بلائے جان کی بوسخت ناگوار گزرتی تھی۔ جب اُس نے پی رکھی ہوتی تھی، تب میں اپنے اور اُس کے درمیان کئی فٹ کا فاصلہ حائل رکھتا تھا۔ اُس نے کبھی بھی مجھے پینے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی تو میں اُس کا سر پھوڑ دیتا، بوتل انڈیل دیتا مگر شراب کو منہ سے نہ لگاتا۔

آج، اُس نے بڑی اہم کامیابی حاصل کر لی تھی اور ناممکن تھا کہ شغل نہ کرتا۔ دودھ پتی کا ایک دور اور چلا۔ سواریاں ویگن کے گرد اکٹھی ہو چکی تھیں اور شیدو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر، ہارن بجا کر کھالے کو متوجہ کرنے لگا تھا۔ کھالے نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا اور خود ویگن کے پائیدان پر کھڑا ہو گیا۔

گھر پہنچتے ہی میں اپنے معمول کے کاموں میں الجھ گیا۔ شام کو کھانا کھانے کے بعد ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں گیا۔ ٹی وی پر اپنے پسندیدہ سیریل کی قسط دیکھی، احوال کا تبادلہ کیا اور دس کے قریب گھر کے لیے روانہ ہوا۔ شریف چکی والے کے گھر سے نکل کر گھر کی طرف بھاگتی ہوئی خالدہ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ رُک کر میرے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔ میرے استفسار

پر اُس نے بتایا کہ وہ شریف کی بیٹی کو کڑھائی کے ڈیزائن دینے آئی تھی۔ چھدے ہوئے بیل بوٹوں والے بٹر پیپر، جنہیں 'ڈیزائن' کا نام دیا جاتا تھا، نور پور کے گھروں میں محوِ گردش رہا کرتے تھے۔ اِن باریک کاغذوں کو کپڑے کی مطلوبہ جگہ پر رکھا جاتا تھا اور اوپر پانی میں گھلے ہوئے نیل سے لتھڑی روئی پھیر دی جاتی تھی۔ نیل، بٹر پیپر کے سوراخوں میں سے گزر کر کپڑے پر پھول بوٹے بنا دیتا تھا جس پر لڑکیاں سوئی دھاگے سے کشیدہ کاری کرتی تھیں۔

وہ چند قدم میرے برابر چلی، پھر تھم گئی، بولی، ''تم نے بی بی کے خط کا جواب لکھا ہے؟''

مجھے توقع تھی کہ وہ یہ سوال ضرور کرے گی۔ میں نے انکار کیا۔ بولی، ''اُس نے اَبھی تک مانگا نہیں ہے۔ مانگے تو کیا جواب دوں؟''

میں نے مسکرا کر کہا، ''وہ نہیں مانگے گی۔''

''کیوں؟'' وہ متعجب ہوئی۔

''یہ بات تمہاری چھوٹی سی کھوپڑی میں نہیں سمائے گی۔''

''اے واہ!'' وہ مچلی، ''میں جانتی ہوں کہ تم اور وہ.....''

''کیا وہ؟'' میں چونکا۔

جواباً اُس نے میرے سینے کے برابر اپنے ہاتھوں کی دونوں شہادت انگلیوں کو سوئے آسمان بلند کر کے جوڑا، شرارت سے مسکرائی اور آنکھیں بند کر کے بولی، ''بڑے بھولے بنتے ہو صاحب جی!''

میں نے اُس کی چوٹی پکڑ لی۔ جھٹکا دیا، کہا، ''تم نری بے وقوف ہو۔ میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میں نے اُسے پیچھے کی طرف ہولے سے دھکیلا تھا، وہ ٹہنی کی طرح لچک کھا کر آگے کی طرف بڑھی اور سنبھلنے کا موقع دیے بغیر مجھ سے آن ٹکرائی۔ وہ اِس سے پہلے کئی مرتبہ مجھ سے ٹکرائی تھی، کئی بار اُس نے ہاتھا پائی کی تھی، مگر اُس کے لمس میں اُس گھڑی کوئی نئی تپش تھی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹی بلکہ میرے سینے پر سر ٹکا کر میرے وجود سے چپک گئی۔ میں نے اُسے پیچھے ہٹانا چاہا مگر یوں لگا جیسے میرے بازوؤں میں سکت نہ رہی ہو۔ چند ساعتیں نادیدہ تمازت کے بل پر پھیل کر لمبے دورانیے کی شکل اختیار کر گئیں۔ پھر اچانک مجھے ہوش آ گیا اور میں نے اُسے پوری قوت سے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑائی، سنبھلی پھر آنکھیں

کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظر میں عجیب وارفتگی پنہاں تھی کہ میں تاب نہ لاتے ہوئے سر جھکا کر بولا، ''بلو! ایسا نہ کیا کرو، تم اَب بچی نہیں رہی ہو۔''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اُس کا انگ انگ بول اُٹھا، ''یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ میں اَب بچی نہیں رہی۔''

وہ تیزی سے پلٹ کر بھاگ گئی۔ سڑک اور اُس کے گھر کے دروازے کے بیچ میں کھلی جگہ حائل تھی جہاں کھالا اپنی ویگن کھڑی کیا کرتا تھا۔ دو کنال کا قطعہ ارضی اُس نے پل جھپکتے میں عبور کیا اور میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ مبادا کہ کوئی دیکھ رہا ہو مگر کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ میں نے عافیت کی سانس لی۔

سڑک سے گھر تک کا راستہ بہت طویل ہوگیا۔ پہلی بار پکی سڑک نے میرے پیروں تلے ریت کھسکا دی تھی۔ برق تھی جو بدن کو آن کی آن میں جلا کر بھسم کر گئی تھی؛ ترنگ تھی جو سنبھلنے سے پیشتر بپھر کر جو دوراں میں سرایت کر گئی تھی؛ شباب آ گہی تھی جو آنکھ سے دل کا فاصلہ ایک ہی جست میں طے کر گئی تھی۔ چارپائی پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتے ہوئے میں یک سر بھول بیٹھا تھا کہ بلو کے علاوہ بھی نور پور میں کوئی لڑکی رہتی تھی۔ غزالہ کون تھی، اسما کہاں تھی؛ کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ آنکھ کھولتا تھا، بند کرتا تھا یا کروٹ بدلتا تھا، خالدہ عرف بلو نظر آتی تھی۔ میں گھبرا گیا کہ وہ اتنی اہم تو میری زندگی میں کبھی نہیں رہی تھی۔

غزالہ کم و بیش ہر روز ہی مجھے ملتی تھی۔ مجھے دکھائی دیتی تھی، چھونے کی اجازت دیتی تھی مگر اُس کا لمس اضطراب گیں نہیں تھا۔ خالدہ کا جسم بھی میرے لیے ناشناسا نہیں تھا۔ وہ اپنے بچپن سے ہی میرے ساتھ دھینگا مشتی کرتی آ رہی تھی۔ چند دن قبل تک اُس کا بدن بولتا نہیں تھا، صدف بی بی کے خط کے ساتھ ہی بولنے لگا تھا۔ میں نے سوچا، کوئی تغیر ایسا ذہن پر نہیں کھلا جو گزشتہ چند دنوں میں بلو کے جسم میں رونما پذیر ہوا ہو۔ میں نے بے اختیار سر کو سرہانے پر دائیں بائیں پٹخا۔ اچانک مجھے سمجھ آئی کہ میرے ہاتھ لگانے سے غزالہ کو 'کچھ کچھ' کیوں ہونے لگتا تھا۔

شب ڈھلتے ڈھلتے سرد ہوگئی۔ میں قمیص اور کھیس کے بغیر چارپائی پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ سرہانے رکھی ہوئی ننھی سی ٹارچ کو روشن کر کے دیوار گیر کلاک میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بجنے کو آ گیا تھا مگر نیند تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بے کراں سکوت نور پور کی فضا میں

طاری تھا۔ کوئی کتا، کوئی ہینڈ یا کوئی ذی نفس جاگ نہیں رہا تھا، ماسوائے میرے۔ کھالا کہا کرتا تھا کہ چور، کتا اور عاشق رات بھر جاگتے ہیں۔ میں جاگ رہا تھا۔ یقیناً میں چور یا کتا نہیں تھا۔ پہلے کبھی اتنی دیر گئے تک بیدار بھی نہیں رہا تھا۔

شاید دو کا عمل تھا، جب مجھے اپنی گلی میں سے گزرنے والی کار کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں چونک کر سوچنے لگا کہ اِس وقت کون یہاں سے گزر سکتا تھا۔ کار کے انجن کی گھر گھراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ کار میں بیٹھ کر آنے والا بخت خان کی حویلی کی طرف سے نور پور کے پختہ کھال کی طرف گیا ہے۔ میرے گھر سے کھال تک کے بیچ دو گھر واقع تھے۔ میرے متصلہ گھر میں بدر دین جبکہ آخری گھر افسر علی کا تھا۔ پختہ کھال اُس کے گھر کی مشرقی دیوار کے ساتھ ساتھ گزرتا تھا۔ کھال کے پَرے کوئی گھر واقع نہیں تھا۔ گلی کی سیدھ میں کچی سڑک موجود تھی جو فصلوں کے بیچ دو چار موڑ کاٹتی ہوئی بخت خان اور وریام خان کے ڈیروں تک جاتی تھی۔ کھال کے متوازی کچی سڑک جنوبی سمت میں واقع سائیں کے دربار تک جاتی تھی۔ کار سوار یا تو کسی خان کے ڈیرے پر جا سکتا تھا یا مزار تک۔ رات کے اِس سمے دونوں جگہوں پر کسی کی آمد میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

میں نے کار کی آواز پر کان دھرے۔ مجھے یوں لگا جیسے کار پلی سے اُترتے ہی دائیں ہاتھ مڑی ہو۔ میری بڑبڑاہٹ مجھے اجنبی سی لگی، ''یا خدا! اِس وقت دربار پر کوئی کیا کرنے آیا ہے؟''

مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں قمیص اور جوتے پہن کر کمرے سے نکل آیا۔ دَبے پاؤں صحن سے گزر کر گھر کے عقبی حصے میں آیا۔ گھر کی جنوبی دیوار میں چھوٹی سی دروازہ نما کھڑکی نصب تھی جسے بہ وقت ضرورت باہر جانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ کھڑکی خاصی پرانی تھی۔ چٹخنی بھی سالخوردہ اور زنگ آلود تھی۔ تیز ہوا یا ہاتھ کے معمولی سے دھکے سے کھل جاتی تھی اِس لیے چاچی نے اُس میں لوہے کی سلاخ پھنسا رکھی تھی۔ میں نے سلاخ نکالی، کھڑکی کھولی اور باہر نکل آیا۔ معمول سے قدرے زیادہ تیز اور خنک ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں چند لمحوں تک کھڑکی کے سامنے بنے ہوئے مٹی کے ڈھلوانی تھڑے پر کھڑا رہا۔ میرے سامنے دیسی کیکر کا گھنا اور خود رو جھنڈ تھا جبکہ دائیں ہاتھ پر بڑا سا گندے پانی کا جوہڑ واقع تھا جس میں نہ صرف بارشی پانی جمع رہتا تھا بلکہ گھروں کے استعمال شدہ پانی کی نکاسی بھی اِس میں کی جاتی تھی۔

میرے گھر کی عقبی کھڑکی کے عین سامنے، ڈراؤنے جھنڈ اور بدبودار جوہڑ کے درمیان ایک

پگڈنڈی پار جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ مسجد کی طرف، جیت شاہ کے مزار پر یا گاؤں سے باہر اپنی زمین پر جانے کے لیے ہم یہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ یہی پگڈنڈی میرے گھر کے مغربی سمت میں رہائش پذیر ہمسائے لعل خان کا گھرانہ اور خالہ کبریٰ کے بھی زیرِ استعمال تھی۔ یہیں، دیسی کیکر اور جھاڑ جھنکار پر مشتمل جھنڈ کے شمالی کونے میں میں نے بڑی محنت سے ایک مورچہ بنا رکھا تھا جہاں کبھی کبھار میں اور غزالہ مل بیٹھتے تھے اور دُنیا جہاں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ مورچہ بلاضرورت ہی بنایا گیا تھا کیونکہ مجھے اور غزالہ کو درحقیقت کسی بھی نوعیت کی تنہائی کی ضرورت درپیش نہیں تھی۔ گھنے جھنڈ کے بیچ میں کسی اور کلہاڑی کی مدد سے میں نے کئی دِنوں میں یہ ننھا سا جزیرہ بنایا تھا۔ میرے نزدیک یہ جگہ نور پور کی سب سے محفوظ اور پوشیدہ جگہ تھی۔

لوگوں نے بارہا اِس جھنڈ کے آس پاس خطرناک اور زہریلے سانپ دیکھے تھے۔ نیولے اور گوئے بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اِس لیے اِس جھنڈ کو خطرناک قرار دے دیا گیا تھا اور کوئی بھی اِس میں گھسنے کی کوشش کرتا تھا نہ ہی یہاں سے درخت کاٹے جاتے تھے۔ سائیں دل جیت شاہ نے بھی لوگوں کو جھنڈ میں داخل ہونے اور یہاں سے بالن وغیرہ کاٹنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا، جن میں عورتوں کی تعداد غالب تھی، کہ یہاں بلائیں، چڑیلیں اور جنات رہائش پذیر ہیں۔ میں اور کھالا اَن گنت مرتبہ اِس جنگل کا شمالی جانب والا آدھا حصہ کنگھال چکے تھے۔ ہمیں ایسی کوئی بھی شئے دکھائی نہیں دی تھی جس کی سمجھ نہ آتی ہو اِس لیے مجھے کبھی بھی یہاں سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ البتہ میں کبھی جھنڈ کے جنوبی آدھے حصے میں کبھی داخل نہیں ہوا تھا۔ احتراز کی وجہ کوئی خوف نہیں بلکہ اِس کا غیر معمولی گھنا پن تھا۔

میں پگڈنڈی پر سنبھل کر چلتے چلتے جھنڈ کے آخری سرے تک چلا گیا۔ یہاں پگڈنڈی دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔ دائیں ہاتھ والا راستہ مسجد کی طرف جاتا تھا جبکہ بائیں ہاتھ والی پگڈنڈی جنگل کے کنارے کنارے سائیں جیت شاہ کے مزار تک چلی جاتی تھی۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مزار کی طرف چل پڑا۔ شاید کار کا انجن بند ہو گیا تھا، اِس لیے ماحول قطعی طور پر بے آواز ہو گیا تھا۔ میں چند منٹوں میں مزار کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ یہاں دیوار کی اونچائی محض پانچ فٹ کے لگ بھگ تھی۔ میں نے دیوار پر ہاتھ ٹکا کر اندر جھانکا۔ فوری طور پر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میری نظر کے سامنے وسیع و عریض صحن خالی پڑا تھا۔ بائیں ہاتھ پر سائیں جگ جیت شاہ کی قبر پر تعمیر کیا گیا بلند و بالا گنبد دار مقبرہ تھا جس پر اَن گنت کبوتروں اور فاختاؤں

نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ تمام دِن یہاں 'گٹرگوں، گھوں گھوں' کی مانوس صدائیں برآمد ہوتی تھیں۔ میرے دائیں ہاتھ، کچھ دوری پر، سائیں کے تخت نشیں دل جیت شاہ کی رہائش گاہ، بڑا سا مہمان خانہ اور وہ بڑا سا ہال واقع تھا جہاں وہ سارا دن مسند نشیں ہوتا اور اپنے ارادت مندوں کو تعویذ دیتا، دم کرتا اور نذرانے وصول کرتا تھا۔ کھلا اور میں بارہا ہال میں بیٹھ کر اُس کی دل نشیں باتیں سن چکے تھے۔ وہ بہت نیک اور خدا ترس آدمی تھا۔ لوگوں کے بقول، اُس کی دعا سیدھی عرش پر جاتی تھی اور بجلی کی سی رفتار سے مراد لاتی تھی۔ اُس کے تعویذ اور دم کا شہرہ بھی چار دانگ پھیلا ہوا تھا۔

بغیر چھت والی کار پارکنگ، ہال کے مغرب میں واقع تھی اِس لیے مجھے کار یا کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ مجھے ناگاہ خیال آیا کہ کوئی مریض لایا گیا ہوگا، میں بلاوجہ متجسس ہو کر رات کے اِس پہر میں یہاں چلا آیا ہوں۔

میں لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میری نگاہ ہال کے ملحقہ سائیں جیت شاہ کے خاص حجرے کے روشن دان سے چھن کر آتی روشنی پر پڑی۔ کوئی وہاں موجود تھا کیونکہ اِس وقت شاہ سائیں کو اپنی رہائش گاہ میں محوِ استراحت ہونا چاہیے تھا۔ اُس کی عدم موجودگی میں مہمان خانے اور حجرے میں روشنی کا کوئی کام نہیں تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ جنوبی سمت میں چل دیا۔ عمارت کا چکر کاٹ کر پارکنگ کے عین عقب میں آ گیا جہاں چہار دیواری کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے دیوار کے باہر کو نکلے ہوئے ڈی پی سی پر پاؤں ٹکائے اور اندر جھانکا۔ سفید رنگ کی چھیاسی ماڈل کی کار دکھائی دی۔ اسے میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھ رکھا تھا۔ پہلی نظر میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ کار کسی کے ذاتی استعمال کی ہے، بطور ٹیکسی اِسے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ کیونکہ کرایہ پر چلائی جانے والی کاروں کے ڈرائیور بڑے من موجی واقع ہوتے تھے۔ وہ پچھلے بمپر اور سائلنسر کے ساتھ رنگ برنگے کپڑے کی پھمن دار جھنڈیاں باندھ رکھتے تھے اور اِسے اپنے پیشے کے فرائض میں شمار کرتے تھے۔ ونڈ سکرین، فرنٹ گلاس اور چاروں مڈمیٹس پر چمک پٹی (ری فلیکٹڈ ٹیپ) کے ساتھ اپنا نام، کار کا 'نک نیم' اور اپنے قلبی احساسات سے میل کھاتا ہوا کوئی 'یونیورسل جملہ' لکھوانا بھی ڈرائیوروں کی پیشہ وارانہ عادات کا حصہ تھا۔ دور سے دیکھنے پر ہی پتہ چل جاتا تھا کہ یہ کار بطور ٹیکسی استعمال کی جاتی ہے۔

کار میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ جو بھی آیا تھا، وہ جیت شاہ کے حجرے میں پہنچ گیا تھا۔

پارکنگ میں جیت شاہ کی سرخ رنگ کی کار بھی موجود تھی جو اُس کی موجودگی کی خبر دیتی تھی۔ یہ بھی چھیاسی ماڈل کی کرولا کار تھی۔ اِس کا بونٹ سیاہ رنگ کا تھا۔ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کھالے نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اس کار کا مین ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور اس کا بونٹ اس حد تک خراب ہو گیا تھا کہ ڈینٹر نے بجائے مرمت کرنے کے، لاہور سے نیا منگوا کر ڈال دیا تھا۔ منگوائے جانے والے سیاہ بونٹ پر سفید میچنگ کلر کیا جانا ضروری تھا جو کسی نامعلوم وجہ سے نہیں کیا جا سکا تھا۔ اِس لیے گاڑی کا یہ ڈیزائن بن گیا تھا اور پھر یوں یہ کار علاقے بھر میں دل جیت شاہ کے نام سے موسوم ہو کر معروف ہو گئی تھی۔ پیسے کی کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود شاہ سائیں نے اِس پر اَبھی تک رنگ کا فوارا نہیں پھروایا تھا۔

میں پنجوں کے بل اُٹھ کر دیوار پر چڑھ گیا۔ بغیر آواز پیدا کیے پارکنگ میں اتر گیا۔ فرش پر پختہ اینٹوں کا چورا ڈالا ہوا تھا جس کی وجہ سے فرش کا رنگ سرخی مائل زرد تھا۔ اِس کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ بارش کے بعد مٹی پیروں کے ساتھ چمٹتی نہیں تھی۔ مزار کے صحن کا فرش پکا تھا۔ میں نے کار کی نمبر پلیٹ پر نگاہ ماری۔ نمبر بڑا عجیب سا تھا؛ ٹرپل تھری..... ایسے نمبر یاد رکھنے کی کوشش کے بغیر ہی ازبر ہو جاتے ہیں۔ سائیں جی کی سرخ کار کے آگے سے گزر کر میں ہال کی کھڑکی کے سامنے آ گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر جھانکا، بہت تھوڑی روشنی کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ تمام کی تمام صفیں خالی پڑی ہیں۔ شاہ سائیں کی چبوترہ نما مسند بھی خالی پڑی تھی۔ دائیں کونے میں خاص حجرے کے اَدھ کھلے دروازے سے دودھیا روشنی برآمد ہو رہی تھی۔ اِسی روشنی کی وجہ سے ہال کے اندر کا دھندلا سا منظر مجھے دکھائی دیا تھا۔

کمرے میں کوئی موجود تھا، یہ تو طے ہو گیا مگر کون؟ یہ اندازہ نہیں تھا۔ میں بڑے انہماک سے کھڑکی کے اندر جھانک رہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں پھر کار کے انجن کی گھرگھراتی آواز پڑی۔ میں چونک گیا۔ جلدی سے پارکنگ کے جنوب مشرقی کونے میں گیا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ فصلوں کے اوپر روشنی تیر رہی تھی۔ کوئی کار یا جیپ میری گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے سوچنے میں کوئی وقت ضائع کیے بغیر دیوار پھاند کر خود کو محفوظ کر لیا۔ چند لمحوں کے بعد دیوار کے اوپر رقص کرتی ہوئی روشنی نے مجھے سمجھا دیا کہ کوئی اور گاڑی دربار کی چار دیواری میں داخل ہو گئی ہے۔ گاڑی کے انجن کے بند ہونے، دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی مخصوص آوازوں کی مدد سے میں نے اندازہ لگایا کہ آنے والے گاڑی سے اُتر کر ہال میں

داخل ہو گئے ہیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا تو میں نے چار دیواری کے اوپر سے جھانکا۔

سوائے سفید رنگ کی ایک پٹھو ہار جیپ کے اضافے کے، کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ جیپ ٹرپل تھری نمبروں والی کار کے متوازاً کھڑی کی گئی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اِس وقت شاہ جی کے ہاں کون لوگ آئے تھے اور اُنہیں کون سی احتیاج رات کے اِس پہر میں یہاں کھینچ لائی تھی۔ میں پھر دیوار پر چڑھا۔ اندر کودنا ہی چاہتا تھا کہ پھر فصلوں کی سبز زمین پر روشنی تھرکنے لگی۔ میں دیوار سے اُترا اور چپک کر کھڑا ہو گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک اور گاڑی دربار کی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ چونکہ میں جہاں کھڑا تھا، وہیں پر کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑنا ناگزیر تھی، اِس لیے میں فوراً نیچے ہو گیا۔ جب کار کا انجن بند ہوا، میں نے سر اوپر نکال کر دیکھا۔ دو آدمی سفید رنگ کی چھ ہتر ماڈل کی کرولا کار کے اگلے دروازے کھول کر باہر نکل رہے تھے۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ دروازوں کو صرف بند کیا گیا، مقفل نہیں، پھر آگے پیچھے چلتے ہوئے دونوں نو وارد ہال میں گھس گئے۔ اُن میں سے ایک قدرے پستہ قامت جبکہ دوسرا عام قد و قامت کا شخص تھا۔ پستہ قامت شخص کی توند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اُن کے طور و انداز سے عیاں تھا کہ وہ نہ صرف اِس علاقے سے بخوبی روشناس تھے بلکہ مزار کی حدود میں بھی کئی مرتبہ آنے کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

ایک کار کی آمد تو حادثاتی طور پر بھی ممکن تھی مگر ایک ہی وقت میں، جب سارا نور پور خوابیدہ تھا، تین گاڑیوں کا یہاں آنا اچنبھے کی بات تھی۔ کچھ ایسا ضرور تھا جس کی پردہ داری کی جا رہی تھی۔ کچھ دیر اور انتظار کیا، مبادا کہ کسی اور گاڑی نے آنا ہو، پھر تسلی ہونے پر میں حرکت میں آ گیا۔ جوتے اُتارے، دیوار پھاندی اور آواز پیدا کیے بغیر خاص حجرے کی بیرونی کھڑکی کا قصد کیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چور نہیں تھا مگر چوروں کی طرح قدم اُٹھا رہا تھا۔

ہال کی نکڑ پر کچھ دیر ٹھہرا، سن گن لینے کی کوشش کی اور محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر میری مطلوبہ کھڑکی ایستادہ تھی جو یقینی طور پر بند تھی۔ کیونکہ، اگر کھلی ہوتی تو روشنی ضرور جھلکتی۔ بلی کی سی چال چلتے ہوئے میں کھڑکی تک پہنچا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ ماسوائے مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ کے، کچھ سنائی نہ دیا۔ کھڑکی کے طاق پوری طرح بند تھے اور اندر بیٹھے ہوئے افراد بھی نسبتاً دھیمی آواز میں محوِ گفتگو تھے۔ میں نے اپنی قوتِ سماعت پر ذہن کو مرتکز کیا، پھر بھی خاص کامیابی حاصل نہیں

ہوئی۔ حجرے کے ہال میں کھلنے والے دروازے تک جانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

میں مایوس ہو کر پلٹنا ہی چاہتا تھا کہ ناگاہ میری نگاہ چار دیواری کے اُس حصے پر پڑ گئی جہاں میں کچھ دیر پہلے کھڑا ہو کر صحن میں جھانک رہا تھا۔ جنگل کی جانب واقع اِس دیوار کے سامنے پگڈنڈی واقع تھی جس پر چل کر میں پارکنگ کے عقبی حصے تک پہنچا تھا۔ وہاں مجھے دیوار کے اوپر اُبھرا ہوا انسانی سر دکھائی دیا تھا جو فوراً غائب ہو گیا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایسے ہی وقت میں حجرے سے ایسی آوازیں برآمد ہونے لگیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ محفل برخاست ہو رہی ہے۔

یہ بہت برا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے کھڑکی سے کان لگائے کھڑا دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ محفل کے برخاست ہوتے ہی میں بھاگ کر جنگل کی طرف والی دیوار پھلانگ جاؤں گا۔ اَب پریشان ہو گیا تھا کہ اُدھر کوئی موجود تھا جو میری یا میری طرح سائیں دل جیت شاہ کی سرگرمیوں اور ناوقت کی نقل و حرکت کو اِنٹرکر رہا تھا۔

میں تیزی سے چلتا ہوا ہال کی نکڑ کراس کر گیا۔ میں نے دیوار کے ساتھ چپک کر ہال کی کھڑکی میں جھانکا۔ پانچ چھ بندے ایک وفد کی صورت میں چلتے ہوئے ہال کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ میرے دیکھ لیے جانے کا شدید خطرہ تھا۔ میں جھک کر آگے کی طرف دوڑا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں دیوار تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ ہال کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی شاہ سائیں کی کار کے ڈرائیور گیٹ کے ساتھ چپک کر بیٹھنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ میں نے دیر نہیں کی اور چھپ گیا۔ میں کسی کو دیکھ سکتا تھا نہ کوئی مجھے چھپا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

اچانک خوف کی سرد لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اگر شاہ سائیں بھی مہمانوں کے ساتھ جانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی گاڑی کی طرف آ جائے تو کیا ہو گا؟ اِس صورت میں میری پوشیدگی کا راز افشا ہو جائے گا اور مجھے پکڑ کر 'چور' بنا دیا جائے گا۔ میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے تھوڑا اوپر اُٹھ کر دیکھا۔ کار کے شیشوں کی وجہ سے سوائے اپنے چہرے کے، کچھ دکھائی نہیں دیا۔ مجبوراً پھر دبک گیا۔

خیر گزری کہ شاہ سائیں یا تو باہر آیا ہی نہیں تھا یا جانے والوں کو الوداع کہہ کر واپس چلا گیا۔ چند منٹوں میں میدان صاف ہو گیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ تینوں گاڑیاں گیٹ عبور کر گئی ہیں تو کار کی اوٹ سے نکل آیا۔ تب یاد آیا کہ میں برہنہ پا تھا اور میرے جوتے کھڑکی کے قریب

دیوار کی جڑ کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ اگر کسی کا دھیان اس طرف چلا جاتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا اور میری تلاش کا عمل شروع ہو جاتا۔ میں جلدی سے اپنے جوتے پہن کر دیوار کے اُس پار کود گیا۔

دھیان بٹ چکا تھا۔ جیت شاہ کے پاس رات کے پچھلے پہر میں چوروں کی طرح آنے والے کون تھے؟ میری طرح اُس کی جاسوسی کرنے والا کون تھا؟ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا توقع کر رہا تھا کہ جونہی میں نکڑ کا موڑ مڑوں گا، وہ شخص مجھے نظر آ جائے گا۔ میں نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا اور نکڑ پر جا کر رُک گیا۔ دیوار کے ساتھ چپک کر دوسری جانب جھانکا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ وہ چلا گیا تھا یا کہیں چھپ گیا تھا۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا جنگل کی طرف بڑھا۔ جونہی میں جوہڑ کے کنارے پر پہنچا، مجھے بے اختیار رُکنا پڑا۔ بڑے کیکر کے تنے کی اوٹ میں کوئی میرا منتظر تھا۔ نہایت کم روشنی کے باوجود مجھے اُس کا سفید لباس اور غیر معمولی بلند قامت دکھائی دے گئی۔

وہ آدھا چھپا ہوا تھا، آدھا عیاں تھا۔ میں نے ہولے سے پکارا، ''اے! کون ہو تم؟''

مجھے اپنی آواز میں لرزش کا احساس ہوا۔

وہ اچانک سامنے آ گیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''خان جی! آپ؟''

وہ بخت خان تھا۔ میری حیرت بجا تھی کیونکہ اُس جیسے وضع دار اور نوابانہ مزاج رکھنے والے آدمی کا ایسی جگہ پر پایا جانا، چوروں کی طرح جھانکا تانی کرنا بڑا معیوب اور غیر متوقع عمل تھا۔

''ینگ مین! تم یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''وہ جی..... مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا، تھوڑا گھوم پھر لوں تو تھک کر سو جاؤں گا۔ اِدھر آیا تو کاروں کی بے موقع آمد نے تجسس پیدا کر دیا اور میں دربار میں، یہ دیکھنے کے لیے کہ اِس وقت کون آیا ہے، چلا آیا۔ مگر آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں خان جی؟'' میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہی سوال داغ دیا۔

''میں تو اکثر رات کو یہاں آتا رہتا ہوں۔'' وہ مسجد کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر سست قدموں سے چل پڑا۔ میں نے بھی مجبوراً ساتھ دیا۔ وہ رُک کر، اپنی پہلو والی جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگانے لگا۔ کش لگا کر بولا، ''تم نے کیا دیکھا؟''

''سفید کلر کی دو کاریں اور ایک جیپ۔''

''کاروں کے نمبر یاد ہیں؟''

''جی۔ایک کا نمبر ٹرپل تھری تھا جبکہ جیپ کا بائیس پندرہ تھا۔تیسری کار کا نمبر پڑھا نہیں جا سکا۔عجیب ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں نمبر لکھے ہوئے تھے۔''میں نے تفصیلاً بتایا۔

''لوگوں کو دیکھا؟''اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''جی خان جی.....بس ایک جھلک دیکھ پایا تھا۔''میں نے کہا۔

''کتنے تھے؟''

''میرا خیال ہے کہ پانچ.....یا شاید چھ تھے۔''

''کسی کا چہرہ دیکھا؟''اُس نے کریدا۔

''جی!ایک شخص کی محض ایک جھلک دیکھی تھی۔باقی لوگوں کو اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ پایا۔''

''جسے دیکھا،اُس کا حلیہ بتاؤ۔''

میں نے بلاکم وکاست بتا دیا۔وہ بولا،''کیا دوبارہ دیکھ کر پہچان لو گے؟''

میں نے پُر یقین لہجے میں کہا،''ہاں!اُسے تو میں ضرور پہچان لوں گا۔''

''کیا کبھی پہلے بھی اِس طرف رات کو نکلے ہو؟''

''نہیں خان جی!آج پہلی مرتبہ ادھر آیا ہوں۔یہ کون لوگ تھے؟''

''میں انہیں جانتا نہیں ہوں مگر یہ جانتا ہوں کہ یہ لوگ ہر بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات کو یہاں باقاعدگی سے آتے ہیں۔''اُس نے کہا۔

''یہ یہاں کیا کرنے آتے ہیں؟''میرا تجسس جاگ اُٹھا۔

''یہی دیکھنے کے لیے تو میں یہاں آتا ہوں۔''اُس نے کہا۔

میں اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مسجد اور اپنے پُرانے متروکہ گھر تک آ گیا تھا۔گلی سنسان پڑی تھی۔گھروں کے آگے تھڑوں پر پالتو کتے لم لیٹ دکھائی دے رہے تھے۔ایک آدھ نے سر اُٹھا کر ہمیں دیکھا اور پہچان کر نظر انداز کر دیا۔

''آئندہ ادھر نکلو تو اپنے ساتھ کھالے کو بھی لے آنا۔وہ تم سے زیادہ چالاک اور ہوشیار بندہ ہے۔اگلے بدھ کی رات کو یہ فیصلہ کریں گے کہ آنے والوں کے مقاصد کو کیسے طشت از بام کرنا ہے۔بہر حال!یہ طے ہے کہ سائیں جیت شاہ اور اس کے ملاقاتیوں کے ارادے اچھے نہیں

ہیں۔ یہاں کوئی بڑے پیمانے پر غلط کام ہو رہا ہے۔ تعویذوں والا ڈرامہ تو محض پردہ ہے۔ پسِ پردہ جو کچھ بھی ہے، بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔'' بخت خان نے کہا اور میرے شانے پر تھپکی دی۔

میں اُس کا اشارہ سمجھ گیا اور پلٹ کر جوہڑ والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ میرا رُخ اپنے گھر کی جانب تھا۔

اگلے دِن میں کھالے سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ میرے پاس مزے کی خبر تھی۔ شام کو جب فراغت ملی تو میں اُس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنی نگرانی میں شیدو سے ویگن کی صفائی کروا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا، ''مسات! آج میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں نہیں جاؤں گا۔''

'مسات' سرائیکی میں خالہ زاد کو کہتے ہیں۔ جب بھی کھالا ترنگ میں ہوتا، مجھے مسات یا سوتر (چچازاد) کہہ کر پکارتا تھا۔

مجھے اچنبھا ہوا، ''کیوں مگر؟''

''گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔'' اُس نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تمہیں دیکھنے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں یار!'' اُس نے بتایا۔

میں اُس کا بازو پکڑ کر، کھینچ کر اُس کے باپ کی دکان کے باہر پڑی جھلنگا سی چارپائی پر آ گیا۔ پوچھا، ''اگر وہ تمہیں پسند کر کے 'ہاں' کر دیتے ہیں تو اسما کا کیا بنے گا؟''

وہ عجیب احمقانہ انداز میں ہنس دیا۔

میں نے غصہ بھرے لہجے میں کہا، ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

اُس کا سر جھک گیا۔ چہرے پر یکبارگی یاس اور نا اُمیدی نے ڈیرہ ڈال دیا۔ کچھ توقف کے بعد بولا، ''اسما کا کیا بننا ہے؟ اُس کے ساتھ میری شادی زندگی میں تو کیا، اگلے جہان میں بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر پوری دُنیا کے مرد باجماعت خودکشی کر جائیں اور تمہارا یار 'کھالا' تن تنہا مردرہ جائے تو وہ تب بھی میرے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔''

وہ شکست خوردہ آواز میں میری کہی ہوئی باتیں دہرا رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ میں نے کہا، ''تو پھر ملتان کے پھیرے کیا ہوئے؟ وہ خط کیا ہوا جو تم نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس کے حوالے کیا تھا؟''

اُس کے جواب نے مجھے دم بخود کر دیا، ''وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور میں دل کے کہے میں آ جاتا ہوں وگرنہ میں جانتا ہوں کہ اُس کا اور میرا میل قسمت میں نہیں ہے۔ میں اور میرا عشق تو اندھا ہو سکتا ہے مگر لیکھ کی آنکھیں اندھی نہیں ہو سکتیں۔''

''اچھا چھوڑو! یہ بتاؤ، اُس کی طرف سے کوئی ردِعمل دیکھنے میں آیا؟''

''اسما کی طرف سے؟''

''ہاں!''

''نہیں۔ دل سارا دن ڈرتا رہا کہ اچانک دو چار بندے آئیں گے اور مجھے اُٹھا کر کہیں ویرانے میں لے جائیں گے، قتل شتل کر کے پھینک دیں گے مگر کوئی ایسا واقعہ تمہارے خوش نصیب یار کے ساتھ پیش نہیں آیا۔'' اُس نے کہا۔ وہ عادت کے مطابق فی الفور مایوسی کے حصار سے نکل آیا تھا۔

''میرے پاس بڑی چونکا دینے والی خبر ہے کھالے! سنو گے تو ہوش اُڑ جائیں گے۔''

''شموں کے بارے میں؟'' اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''لعنت ہے تمہاری گندی سوچ پر۔'' میں نے بھڑک کر کہا، ''میں رات کو سائیں جیت شاہ کے مزار پر گیا تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو بجے کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا.....''

میں نے رات کی مکمل کارگزاری من وعن بیان کر دی۔ وہ گہری سوچ میں غرقاں ہو گیا۔

میں نے ٹہوکہ دیا، ''اَبے گدھے کی دُم! زبان تالو کے ساتھ چپک گئی کیا؟''

''شہرے! مجھے تو کوئی لمبا چکر لگتا ہے۔'' اُس کی آواز بدقت تمام برآمد ہوئی، ''خان نے اُس دن اشارہ بھی کیا تھا اِس معاملے کی طرف مگر ہم نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ خود بھی ٹوہ لگا رہا ہے تو اِس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ سائیں جی بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم آئندہ رات کو مزار کی طرف نہیں جاؤ گے۔ سمجھے؟''

میں نے کہا، ''مگر خان جی نے کہا ہے کہ بدھ کی رات کو تمہیں بھی ساتھ لے کر وہاں پہنچوں۔''

''گولی مارو خان کو۔'' اُس نے جھنجلا کر کہا، ''وہ بڑا آدمی ہے، اُس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ مارے تو ہم جائیں گے جن کا نہ کوئی آگے ہے نہ کوئی پیچھے۔ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑائیں گے تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ ناں بابا ناں! مجھے تو ایسے کارناموں سے دور ہی رکھو۔''

اُس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر مجھے ڈرانے کی بھرپور کوشش کی مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے کہا، ''نہیں یار! دیکھنا تو چاہیے کہ ہمارے گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔ بخت خان ہمارے ساتھ ہوگا، پھر ہمیں ڈرنے کی ضرورت کیا ہے۔''

وہ نہیں مانا مگر مجھے یقین تھا کہ میں اُسے قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ہم اَبھی کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتے تھے مگر اُس کے باپ نے اپنی زوردار آواز میں اُسے گھر بلا لیا۔ کھالا مجھ سے ہاتھ ملا کر جھینپتا ہوا گھر چلا گیا اور میں اُٹھ کر ہسپتال کی طرف چل پڑا۔ یہ رپورٹ ڈاکٹر شاہ جی کے گوش گزار نا بھی میرے نزدیک بے حد ضروری تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میری کہانی کو بڑے انہماک سے سنا۔ پھر بولا، ''میرا خیال ہے کہ مزار پر یا تو منشیات کا وسیع پیمانے پر دھندہ ہو رہا ہے یا ناجائز اسلحے کا چکر ہے۔ کوئی اور چکر بھی ہو سکتا ہے۔ کیا تم نے اُن لوگوں کے ہاتھوں میں کچھ دیکھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کوئی جملہ کانوں میں پڑا؟''

''نہیں۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ہم نے اَبھی اِس موضوع پر بہت سی باتیں کرنا تھیں مگر دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ میں دروازے پر آیا۔ باہر زیناں کے باپ ماسٹر ولی محمد کو کھڑے پایا۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا، ''خیر تو ہے اُستاد جی؟''

وہ بولا، ''ہاں پتر! خیر ہی ہے۔ ویسے ہی، جی چاہا تو ڈاکٹر صاحب سے ملنے چلا آیا۔ اندر موجود ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اُسے لے کر ڈاکٹر شاہ جی کے کمرے میں آ گیا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر میں چائے بنا لایا۔ ہم تینوں نے چائے پی لی تو ماسٹر جی نے جھجکتے ہوئے کہا، ''ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے کچھ کہنے کے لیے آیا ہوں۔''

ڈاکٹر شاہ جی نے کہا، ''جی ضرور..... حکم کیجئے۔''

ماسٹر جی نے میری طرف دیکھا، پھر ہولے سے کہا، ''آپ شہریار پتر کی بات سن لیں، میں کسی وقت آ جاؤں گا۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں اُستاد جی! مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ آپ بات کریں، میں چلتا ہوں۔''

وہ تخلیہ چاہتا تھا اور مروت کے مارے مجھے یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں۔ میں برتن کچن میں رکھ کر کوٹھی سے نکل آیا۔ اَبھی سیڑھیاں اُترا ہی تھا کہ فطری تجسس نے آن دبوچا۔ ماسٹر جی ایسی کون سی بات کرنے آئے تھے جس کے لیے تنہائی ضروری تھی؟ میں بے اختیار روِش سے اُتر کر لان میں آ گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈاکٹر شاہ جی کے کمرے کی عقبی کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کمرے کے اندر ہونے والی گفتگو کا لفظ لفظ باآسانی سنائی دے رہا تھا۔ میں دیوار کی جڑ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ حسنِ اتفاق تھا کہ یہ جگہ ہسپتال میں ہر آنے جانے والے کی نظروں سے پوشیدہ تھی کیونکہ کوٹھی کے اِس حصے کو لان کے پودوں نے چھپا رکھا تھا۔

ٹی وی سے پھوٹتی ہوئی آوازوں کے بیچ سے ڈاکٹر شاہ جی کی آواز سنائی دی، ''ماسٹر صاحب! آپ جو کہنا چاہتے ہیں، کھل کر کہیں۔ میں پوری توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ شاید ماسٹر جی الفاظ کے چناؤ میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کہا، ''زیناں کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''وہ تو اَب بالکل ٹھیک ہے۔ اُس نے لاٹھی بھی چھوڑ دی ہے۔ آسانی کے ساتھ گھر کے کام کاج کر لیتی ہے۔'' ماسٹر جی نے کہا۔

''تو پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''میں کچھ ذاتی نوعیت کی باتیں آپ کے ساتھ شیئر کرنے آیا ہوں۔'' ماسٹر ولی محمد شاید اَبھی تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ ڈاکٹر شاہ جی سے دل کی بات کہے یا خاموشی سے اُٹھ جائے۔

ڈاکٹر شاہ جی نے اُٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ بات سننے میں جو تھوڑی سی مشکل پیش آ رہی تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ ماسٹر جی نے مدعا بیان کرنے کے لیے اپنے خاندانی پسِ منظر کو اجاگر کرتی لمبی تمہید باندھی، پھر کہا، ''میں اِن دنوں اپنی بیٹیوں کے لیے پریشان ہوں۔ میری برادری میں بچوں کو پڑھانے کا رواج ہے تو سہی مگر کم کم۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی کا رشتہ کسی پڑھے لکھے اور باشعور انسان کے ساتھ ہو جائے۔ میں نے اپنے ایک شاگرد جو اِن دنوں کوٹ ادو والے

گرڈ اسٹیشن میں الیکٹریشن ہے، کے ساتھ زَیناں بیٹی کی منگنی اِسی وجہ سے کر دی تھی۔ اُس کی تنخواہ کم ہے مگر میں نے پروا نہیں کی، یہ سوچا کہ وہ پڑھا لکھا اور باشعور تو ہے۔ برادری والوں کی کڑوی باتیں بھی اِس وجہ سے برداشت کر لیں۔''

میری طرح ڈاکٹر شاہ جی بھی اُس کا مدعا بھانپ نہیں پایا تھا۔ قدرے استعجاب سے سوال کناں ہوا، ''تو پھر اب مسئلہ کیا ہے؟''

وہ بولا، ''اَب اشفاق نے منگنی توڑنے کا پیغام بھیج دیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ زَیناں کو بَج لگ گیا ہے۔ 'بَج' سمجھتے ہیں ناں ڈاکٹر صاحب آپ؟'' اُس نے ڈاکٹر صاحب کا جواب لیے بغیر اپنا بیان جاری رکھا، ''ہماری زبان میں عیب کو 'بَج' کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کا نقص زندگی بھر نہیں جاتا۔ کیا وہ ٹھیک کہتا ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''اوہ نو!'' ڈاکٹر شاہ جی کی افسوس بھری آواز سنائی دی، ''اسے کسی نے مِس گائیڈ کیا ہے۔ اگر مہرا ٹوٹ جائے، کریک ہو جائے یا اپنی جگہ سے کھسک جائے تو مشکلات پیش آتی ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کیا کریں ماسٹر جی کہ آپ کی بیٹی کی ریڑھ کی ہڈی بالکل محفوظ رہی ہے۔ اُمید ہے کہ اُس کی زندگی میں کوئی پرابلم کری ایٹ (Create) نہیں ہوگی۔''

''میں تو آپ کی بات پر یقین رکھتا ہوں مگر وہ نہیں مانتا۔''

''اسے میرے پاس لے آئیں۔ میں اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ پڑھا لکھا ہے، امید ہے کہ میری بات سمجھ جائے گا۔''

''وہ مجھ سے ملنے اور میری بات سننے کا روادار تک نہیں رہا ڈاکٹر صاحب! میں اُسے کیسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں؟'' ماسٹر جی کے لہجے سے دُکھ اور بے بسی عیاں تھی۔

''تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اُس کے پاس جاؤں اور اُسے زَیناں کی بیماری کے بارے میں بریفنگ دوں؟'' ڈاکٹر شاہ جی کی آواز آئی۔

اچانک میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔ میں تڑپ کر اُٹھا اور اپنی دائیں ران کے اندرونی حصے کو ہاتھ کے ساتھ رگڑنے لگا پھر شلوار کو جھٹکنے لگا۔ کوئی چیونٹا یا کیڑا مکوڑا اپنی سلطنت میں میری دخل اندازی کے سبب برانگیختہ ہو کر میری ٹانگ پر چڑھ گیا تھا جس نے گھٹنے سے کچھ اوپر ران پر اِس زور سے کاٹا تھا کہ درد کی کٹیلی لہر میرے پورے بدن میں پھر گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی۔

شکر ہوا کہ میری سسکی اور شلوار جھٹکنے سے پیدا ہونے والی آواز اندر بیٹھے ہوؤں تک نہیں پہنچی تھی یا پہنچی تھی تو اُنہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ لان میں کالے رنگ کے موٹے چیونٹوں کی راجدھانی قائم تھی۔ میں نے کئی مرتبہ کیڑے مار پاؤڈر چھڑکا تھا مگر وہ چند دنوں کے غیاب کے بعد پھر دندنانے لگتے تھے۔

وہ یقیناً کوئی صحت مند چیونٹا ہی تھا کیونکہ کچھ ہی دیر میں درد اُڑن چھو ہو گیا تھا۔ اگر کاٹنے والا کیڑا زہریلا ہوتا تو چبھن اور درد میں کمی واقع نہ ہوتی۔ تنہائی میں ہونے والی گفتگو کے کئی قیمتی ڈائیلاگ اِس ایمرجنسی کی نذر ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی توجہ دوبارہ مرکوز کی۔

ماسٹر جی کہہ رہے تھے، ''.....نہیں جی! میں نے اشفاق کے فیصلے کو قبول کر لیا ہے۔ دیکھیں ناں جی! میاں بیوی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے اتنا نازک بھی ہوتا ہے۔ اچھا ہوا کہ اُس کی فطرت رخصتی سے پہلے ہی میرے سامنے آ گئی۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟'' ڈاکٹر شاہ جی نے پوچھا۔ میں حیران ہوا کہ شاہ جی اتنی دیر تک بے سروپا بات چیت کی بھول بھلیوں میں چکرانے کے باوجود اَبھی تک نرمی سے محوِ کلام تھا۔ یہ نرمی اُس کی فطرت کا خاصہ نہیں تھی۔ شاید ماسٹر جی کی عمر کا لحاظ کیے ہوئے تھا۔

''میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب! کہ زَیناں جیسی حساس لڑکی کو اشفاق کے پلے باندھنا کسی بھی طور سے مناسب نہیں ہے۔ آپ کئی مرتبہ زَیناں سے مل چکے ہیں، وہ آپ کے زیرِ علاج رہی ہے، آپ ہی بتائیں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں۔ آپ کا کہا بجا ہے مگر ایک چھوٹی سی غلط فہمی سے سامنے آنے والے ردِ عمل کو جذباتی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔''

''آپ بتائیں، آپ نے زَیناں بیٹی کو کیسا پایا؟'' ماسٹر جی نے سوال کیا۔

''وہ بہت اچھی اور فرمانبردار بچی ہے۔ باشعور ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس نے بڑی دلیری کے ساتھ اپنے ساتھ درپیش آنے والے عارضے کو فیس کیا ہے۔ یہ خوبی خواتین میں ناپید ہے۔ مگر ماسٹر جی! میں آپ کی اِس طویل گفتگو سے کوئی بھی نتیجہ اخذ نہیں کر پایا۔ آپ میرے پاس کیوں تشریف لائے ہیں؟''

میری توقع کے عین مطابق ڈاکٹر شاہ جی اپنی فطرت کی طرف لوٹنے لگا تھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے زَیناں نے بتایا تھا کہ آپ نے اَبھی تک شادی نہیں کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ میری برادری اور ملنے جلنے والوں نے یہ باتیں پھیلانا شروع کر دی ہیں کہ میری بیٹی شادی کے قابل نہیں رہی۔ ریڑھ کی ہڈی کا نقص مرتے دم تک بندے کی چوک (دامن) نہیں چھوڑتا۔ مگر آپ چونکہ ڈاکٹر ہیں، آپ نے اُس کا علاج کیا ہے اور جانتے ہیں کہ لوگوں کی یہ باتیں بے سروپا ہیں۔ میں آپ کے پاس درخواست لے کر آیا ہوں کہ آپ میری شودھی (بے چاری) بیٹی کا ہاتھ تھام لیں۔'' ماسٹر جی کی آواز آخری الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی بھرا گئی۔ اُس نے جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا اور بلاشبہ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے کسی بھی لڑکی کا باپ شرم سے آدھا مر جاتا ہے۔ مجبوری نے اُسے بھی ندامت بھری دہلیز پر لا جھکایا تھا۔

میرے کانوں میں ڈاکٹر شاہ جی کی استعجاب بھری بلند آواز پڑی، ''واٹ؟..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ماسٹر صاحب؟''

جواباً ایک کٹھن خاموشی چھا گئی۔ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی حالتِ زار کی خبر نہیں تھی کہ ماسٹر جی کا آخری جملہ سن کر اُس پر کیا بیتی۔ ہاں البتہ جو مجھ پر گزری تھی، وہ بڑی دردناک اور غیر متوقع تھی۔

''آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی بیٹی سے شادی کر لوں۔ ہے ناں؟'' ڈاکٹر شاہ جی کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب! یہ میری خواہش ہے۔'' ماسٹر جی کی آواز مجھے لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اس لیے کہ میری اَبھی تک شادی نہیں ہوئی؟''

جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

''اِس لیے کہ زَینا ں کی بیماری کو تمہارے رشتہ داروں نے طعنہ بنا لیا ہے۔ واہ ماسٹر جی! نہ جانے آپ نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کر لیا۔ میں پچاس کی عمر میں ہوں، اُس کی عمر بمشکل بیس بائیس سال ہے۔ میرا اور اُس کا جوڑ کسی بھی لحاظ سے بنایا نہیں جا سکتا مگر آپ نے بنا دیا۔ میں نور پور کے خانزادوں کو بُرا کیا سمجھوں؟ وہ مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں آپ کی بیٹی کو دیکھنے کے لیے آپ کے گھر جاتا ہوں، اُس پر مرمٹا ہوں۔ آپ اُس کا رشتہ لے کر میرے پاس چلے آئے ہیں۔ وہ نہیں، یہاں کے سبھی لوگ بُرے ہیں۔ غیر فطری اور غلیظ ذہنیت کے مالک ہیں۔ آپ بھی۔ ماسٹر صاحب! وہ میری بیٹیوں کے برابر ہے۔ اُس کا علاج محض مریضہ سمجھ

کے اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داری کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ آپ لوگوں کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے آپ کے گھر چلا جاتا تھا کیونکہ آپ کے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ مگر افسوس! آپ بھی مجھے سمجھ نہیں پائے۔ اگر میں شادی کا ارادہ رکھتا تو بہت پہلے میری کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ شادی ہو چکی ہوتی۔''

اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ماسٹر جی کی زبان بند تھی۔ وہ کہتا بھی تو کیا کہتا؛ بڑی دیر بعد، جب ڈاکٹر شاہ جی بول بول کر تھک گیا، نڈھال ہو گیا تو ماسٹر جی نے کہا، ''ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ نے شرم سے ڈوب مرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اللہ کی قسم! میرے دِل میں کوئی میل نہیں ہے۔ آپ کے کردار پر شبہ نہیں، فخر ہے۔ مجھے آپ پر اور اپنی بیٹی پر مکمل بھروسہ ہے۔''

''تو پھر آپ نے کیا سوچ کر اتنی بڑی بات کہہ دی؟''

''اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے؟'' ماسٹر جی کی شکست خوردہ آواز سنائی دی۔

''مجھے کسی کے مستقبل سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر شاہ جی نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا، ''آپ مزید کچھ کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ اِس موضوع پر سوچنے کی زحمت کبھی نہ کریں۔ مجھے شادی نہیں کرنی اور نہ ہی مجھے عورت کی ضرورت ہے۔ ہاں! آئندہ اپنی بیٹی کو ہسپتال بھی نہ بھیجئے گا۔ پہلے وہ مریضہ بن کر آتی تھی، اَب میرے لیے گالی بن کر آئے گی اور میرے لیے اُس کی موجودگی کو برداشت کرنا مسئلہ بن جائے گا۔ جائیں پلیز!''

میری حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ ماسٹر ولی محمد کا چہرہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر سجھائی دیتا تھا کہ اُس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اُس کے شرم سے مر جانے کے لیے یہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے رشتے کی بات اپنے منہ سے کرنے کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔ اس پر مستزاد ڈاکٹر کا نازیبا اور ناشائستہ رویہ تھا۔

وہ کیسے ہمت کر کے اُٹھا ہو گا، کیسے دروازے تک پہنچا ہو گا، محض اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اُسے پختہ اینٹوں کی بنی روش پر کندھے جھکائے، سر نیہوڑائے جاتے ہوئے دیکھا تو کٹ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کو یقیناً ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انکار ہی کرنا تھا تو بے عزتی کیے بغیر بھی کیا جا سکتا تھا۔ کم از کم اُسے یہ دھیان تو رکھنا چاہیے تھا کہ وہ ایک بوڑھے باپ کو دھتکار رہا ہے جو اپنی جان سے پیاری بیٹی کو اُس کی زندگی کا حصہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ماسٹر جی نے گھر

سے چلتے ہوئے عمروں کے فرق کا تجزیہ کیا ہوگا۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔

میں ڈاکٹر صاحب سے ملے بغیر ماسٹر جی کے پیچھے پیچھے ہسپتال سے نکل آیا۔ جب ہسپتال کے گیٹ کے سامنے پکی سڑک پر پہنچا، وہ مجھے امان اللہ قریشی کی کوٹھی کے باہر لگی ہوئی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں سڑک پر چند لمحوں کے لیے رُکا پھر گھر کی طرف چل دیا۔

علم دین پٹواری کے گھر کی نکڑ تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک میری نظروں کے سامنے ایک سایہ سا لہرایا۔ میں ٹھٹک کر رُک گیا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ خالدہ عرف بلو تھی۔ میرے رگ وپے میں اچانک شناسا سی برق کوند گئی۔

ایک پل میں ہی میرے قدم من بھر کے ہو گئے اور میں بے حس وحرکت ہو کر رہ گیا۔ وہ بھاگ کر میرے مقابل آ گئی، ''مجھے پتہ تھا کہ تم اِس وقت یہاں سے گزرو گے۔ اَب تک تین چکر لگا چکی ہوں۔''

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کیوں چکر لگاتی رہی ہو، مگر پوچھ نہ سکا۔ غیر ارادی طور پر اردگرد دیکھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے کہا، ''کوئی کام تھا کیا؟''

وہ میری طرف بڑھی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا، بولا، ''دیکھ بلو! کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟ جاؤ، میں جلدی میں ہوں۔''

وہ ٹھٹک کر رُک گئی اور شکوہ کرنے لگی، ''کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی صاحب جی؟''

میں نے جی کڑا کر کے کہا، ''ہاں! تم مجھے اچھی نہیں لگتی ہو۔''

''مگر کیوں؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''تم کھالے کی بہن ہو اور کھالا میرا یار ہے۔ میں نہ تو نمک حرام کہلوانا پسند کرتا ہوں اور نہ ہی بے غیرت..... تم اچھی ہو مگر آج کل تمہارا رویہ اچھا نہیں ہے۔'' میں نے ہمت کر کے اُسے کہہ ہی دیا۔

وہ چند لمحوں تک مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی، پھر سسکی لے کر پلٹی اور بھاگتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے دل کو ٹھیس سی لگی۔ دُکھ ہوا کہ اُسے یوں دھتکار دینا مجھے زیب نہیں دیتا تھا مگر میں مجبور تھا کیونکہ غلط راستے پر ایک تواتر کے ساتھ اُس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنا

ضروری تھا۔ بے رُخی سے جھڑکنے کے علاوہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے غلط فہمی ہوئی تھی کہ میں اور صدف بی بی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں بہ یک وقت دو لڑکیوں سے دل بستگی کا تعلق استوار کیے ہوئے تھا تو ایسے میں تیسرا تعلق بھی قائم کر سکتا تھا۔ اُس کی پیش قدمی نہ صرف اُس کے لیے بلکہ میرے اور کھالے کے باہمی تعلق کے لیے بے حد خطرناک اور زہر خیز تھی۔

اِنہی سوچوں میں غلطاں میں امان اللہ قریشی کی حویلی عبور کر کے شفیع محمد کے گھر کی نکڑ پر پہنچ گیا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر مغربی گلی میں پڑی۔ یکبارگی چونک گیا۔ ماسٹر ولی محمد اپنے چوبی دروازے کی بالائی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

میں چاروں گلیوں کے سنگم پر کھڑا تھا۔ اِس چوک کی چاروں نکڑوں پر بخت خان اور وریام خان کی حویلیاں، سردار حیات خان کا ڈیری فارم اور شفیع محمد کے گھر واقع تھے۔ شفیع محمد کا گھر چوک کی شمال مغربی نکڑ پر واقع تھا جبکہ اُس کے مغرب میں مراد بخش دیوانہ کا 'گھروندا' واقع تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کا ٹیلر ماسٹر تھا۔ ساتھ ساتھ سرائیکی اور اُردو زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اُس نے اپنے کچے گھر کے باہر بڑا خوب صورت بورڈ آویزاں کر رکھا تھا جس پر 'گھروندا' کا لفظ اور سرائیکی کا ایک شعر خوش خطی سے لکھا ہوا تھا۔ شعر کا مفہوم یہ نکلتا تھا کہ 'آپ غریب مگر محبت کرنے والے کے گھر کیا آئے، بہار آ گئی'۔ وہ خود بھی بڑی باغ و بہار طبیعت کا مالک تھا۔ اُس کے گھروندے کی مغربی سمت میں ماسٹر ولی محمد کا پکا، سادہ مگر صاف ستھرا گھر واقع تھا۔

ماسٹر ولی محمد نے چوکھٹ پر سے ایک ہاتھ اُٹھایا اور دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر آہستہ سے اندر گھس گیا۔ اچانک ایک خیال برق کی رفتار سے میرے ذہن میں کوندا اور میں دوڑ کر ماسٹر جی کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازے سے چند قدم آگے دیوار کے ساتھ سطحِ زمین سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر نکلا ہوا گٹر تعمیر کیا گیا تھا۔ ایسے گٹر نور پور کی اکثر گلیوں میں موجود تھے۔ میں بھاگ کر گٹر کے اوپر چڑھ گیا۔ یہاں سے باآسانی ماسٹر ولی محمد کے گھر کے اندر جھانکا جا سکتا تھا۔ میں نے صحن میں روشن بلب کی روشنی میں ماسٹر جی کو صحن میں کھڑے دیکھا۔ اُس کی بیٹی زیناں بھی کھڑی تھی۔ باقی افراد کمروں کے اندر تھے۔ میں نے کان لگائے۔ زیناں نے پوچھا،

''بابا! کیا بنا؟ کیا ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ زیناں کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا کہ میں فوراً سمجھ گیا کہ اُس نے ہی

اپنے باپ کو مجبور کر کے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پیغام رساں بنا کر بھیجا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

ماسٹر جی نے نفی میں سر ہلایا۔ کوئی بات بھی کی تھی جو لہجے کے دھیمے پن کی وجہ سے مجھے سنائی نہیں دی تھی۔ ماسٹر جی کی بات سنتے ہی یوں لگا جیسے زیناں کے پیروں کو زمین نے مضبوطی سے جکڑ لیا ہو۔ وہ وہیں تھم گئی۔ اُس کی پشت میری جانب تھی، میں اُس کا چہرہ دیکھ نہیں سکتا تھا مگر میں اُس کے احساسات کی دُنیا کو تہس نہس ہوتا محسوس کر سکتا تھا۔

ماسٹر جی اُس پر توجہ دیے بغیر برآمدے سے گزر کر درمیانی کمرے میں گھس گئے جبکہ وہ صحن کے وسط میں کسی بے جان مورتی کی طرح ایستادہ رہی۔ میں گٹر پر سے نیچے اُتر آیا اور بوجھل دل لیے سر جھکا کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

چاچا چراغ مجھ پر بگڑا ہوا تھا۔ اُسے میرا گھر سے زیادہ وقت باہر رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے اُسے بارہا پیش کی جانے والی دلیل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی، ''چاچا! میں اپنے حصے کا کام کر کے ہی باہر جاتا ہوں۔ ویسے بھی آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ میں کہاں جایا کرتا ہوں۔''

چاچا حسبِ معمول زمانے کی تبدیلی، لوگوں کی بے حسی اور معاشرتی خرابیوں کا رونا رونے کے بعد خاموش ہو گیا تھا مگر آج اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ پہلے کی طرح میری پیش کردہ توجیہات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ پروین اور فرزانہ نے میری حمایت کی۔ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا ہوں اور 'ڈاکٹری' سیکھنے کے لیے زیادہ وقت وہاں گزارتا ہوں تو اِس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سیکھا ہوا ہنر زندگی میں کام آتا ہے۔

دوپہر کے ایک بجے کا عمل ہوگا جب بشیرا میرے پاس ڈیرے پر پہنچ گیا۔ میں اپنے مویشیوں کا چارہ کاٹنے کے بعد ٹاہلی کے گھنے درخت کے نیچے چارپائی بچھائے لیٹا ہوا تھا اور ڈاکٹر شاہ جی سے مستعار لیا ہوا ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ میں اگرچہ دوپہر میں آرام کرنے کا عادی نہیں تھا تاہم کھال کے کنارے واقع اِس تیس پینتیس سالہ بوڑھی ٹاہلی کی مامتائی چھاؤں اتنی سکون بخش تھی کہ میں موقع ملتے ہی اِس کے نیچے لیٹ جایا کرتا تھا۔ بشیرے نے مجھے سردار بخت خان کا پیغام دیا۔

اُس نے بتایا، ''باؤ! شام تک، جب تمہیں فرصت ملے، حویلی کا چکر لگا لینا۔ خان جی کو کوئی

خاص کام ہے تجھ سے۔''

میں نے حامی بھر لی۔ وہ چلا گیا۔ میں نے ایک ایکڑ باجرہ کاشت کر رکھا تھا جو ان دنوں ثمر بار تھا۔ جب ہم اپنے کام کاج سے فارغ ہوئے تو ہم سب نے درانتیوں کی مدد سے باجرے کے سٹے کاٹے اور اُنہیں پڑ (مخصوص، صاف ستھری میدانی جگہ) پر سوکھنے کے لیے جمع کیا۔ اِس کام میں سہ پہر ڈھلنے کو آ گئی۔ سردار وریام خان کا ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے غسل کیا اور گھر کی راہ لی۔ کپڑے بدل کر سردار بخت خان کی حویلی پر پہنچ گیا۔

وہ مہمان خانے کے لان میں سرخ رنگ کی لوہے کی کرسی پر بیٹھا ملا۔ بڑی بڑی رنگین تصاویر سے مزین کسی میگزین کے مطالعے میں غرقاں تھا۔ مجھے دیکھ کر، رسمی تبادلۂ احوال کے بعد میرا ہاتھ تھام کر حویلی کے مستور خانے میں داخل ہو گیا۔ میں اِس حویلی میں بڑے سالوں کے بعد داخل ہو رہا تھا۔ کوئی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملی۔ کنال بھر کا وسیع اور صاف ستھرا صحن، رگڑے ہوئے پتھروں کا رنگ برنگا فرش؛ خوبصورت ستونوں والے بڑے بڑے برآمدے اور جالی دار دوہرے دروازوں والے کمرے..... کچھ بھی بدلا نہیں تھا۔ میں ہچکچاتا ہوا، شرماتا ہوا اُس کے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔ برآمدے میں بچھی ہوئی رنگین چارپائی پر چاچی براجمان تھی۔ ساتھ والی چارپائی پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ مزارعوں کی بیویاں تھیں جنہیں کسی کام سے بلایا گیا تھا یا وہ اَز خود اپنے کسی کام کے سبب یہاں آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اُن کے چہروں سے حیرانی مترشح ہو گئی۔ خان کی حویلی کے زنان خانے میں میری موجودگی تحیر خیز تھی۔

مجھے دیکھ کر چاچی چارپائی سے اُتر کر کھڑی ہو گئی، ''خان جی! بڑے عرصہ کے بعد شہزاد پتر حویلی میں آیا ہے۔''

اُس نے نور پور کی روایات کے مطابق میرے سر پر ہاتھ پھیرا، پروین، فرزانہ، شبانہ اور چاچی کی فرداً فرداً خیریت دریافت کی۔ گلہ کیا کہ اُن میں سے کوئی بھی حویلی میں قدم نہیں رکھتی۔ میں نے کام کی زیادتی کو جواز بنا کر اُسے مطمئن کرنے کی رسمی کوشش کی۔

اُس نے بخت خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''ملکہ دِھی اپنے کمرے میں ہے۔''

مجھے اپنے ساتھ لیے بخت خان برآمدے میں کھلنے والے آخری دروازے میں داخل ہوا۔ ملکہ بڑے سے بیڈ کے بیچوں بیچ آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے سامنے کاپیاں اور

کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

خان میرا تعارف کرانے کے بعد بولا، ''ملکہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ چونکہ یہاں کوئی اچھا سکول نہیں ہے، اِس لیے ہم نے اَبھی تک اِسے سکول میں نہیں بھیجا۔ ہاں! اِس کا نام سکول کے ریکارڈ میں درج ہے اور سال بہ سال اِسے اگلی کلاس میں ریفر بھی کر دیا جاتا ہے۔''

میں دل ہی دل میں حیران ہوا۔ عام لڑکیاں اگر بغیر چھٹی لیے دو چار دن کی غیر حاضری کر لیتی تھیں تو اُن کا نام سکول سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ پروین کا نام بھی اِسی جرم کی پاداش میں خارج کیا جا چکا تھا۔ پھر سردار حیات خان کی سفارش کے ساتھ اُسے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت مرحمت ہوئی تھی۔ ملکہ عام لڑکی نہیں تھی، بخت خان کی بیٹی ہونے کے ناتے خاص تھی جس نے آج تک سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اُس کی نہ صرف روز بروز حاضری لگائی جاتی تھی بلکہ ہر سال امتحان میں حاضری ظاہر کر کے پاس بھی کر دیا جاتا تھا۔ بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی تھیں جو کم از کم عوام کی محدود فہم سے بالاتر تھیں۔

ملکہ مجھے دیکھ کر، دوپٹہ درست کرتے ہوئے، بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام گو ہوئی۔ مجھے اُس کا مؤدبانہ انداز بھلا لگا۔ یہ اُس کی ماں، زرینہ خانم کی تربیت کا اعجاز تھا ورنہ سردار حیات خان اور سردار دریام خان کے گھروں میں اخلاق کا یہ معیار دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ خان کے اشارے پر میں بیڈ کے کونے پر ٹکنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر، سفید فلٹر والی سگرٹ سلگا کر، پیار سے بولا، ''شہرے پتر! چار ماہ کے بعد ملکہ بی بی نے بورڈ کا امتحان دینا ہے۔ سکول کی ہیڈ مسٹریس اِس کی پڑھائی سے مطمئن ہے مگر میں کوئی رِسک لینے پر تیار نہیں ہوں۔ اِس کو پڑھانے کے لیے آنے والی استانی ہر روز دو سے تین گھنٹے اِسے دیتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کچھ دیر کے لیے یہاں آیا کرو اور اسے انگریزی اور ریاضی پڑھا دیا کرو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔''

مجھے پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں انکار کرنا چاہتا تھا مگر مروت آڑے آئی۔

اُس نے اپنی بات آگے بڑھائی، ''تم میرے اپنے ہو۔ میرے خاندان کے ہو۔ میں استانی کو ٹیوشن فیس دیتا ہوں، تمہیں بھی دوں گا اور تمہارا احسان بھی مانوں گا۔''

میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے میری خاموشی کو اقرار جانا اور اطمینان بھرے انداز میں

کمرے سے جاتے ہوئے بولا، ''میں اَب چلتا ہوں، تم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو جاؤ اور اپنا کام شروع کر دو۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہاری چاچی تمہارا خیال رکھے گی۔''

میں بھی کھڑا ہو گیا، جلدی سے بولا، ''مگر خان جی! میں نے اپنا کام کاج بھی کرنا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا زمینوں کا کام ایسا ہے کہ کبھی تمام دن مصروف رکھتا ہے تو کبھی بندے کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں باقاعدگی کے ساتھ ملکہ بی بی کو پڑھانے کے لیے نہیں آ سکتا۔''

وہ دروازے میں رُک گیا۔ مسکرا کر بولا، ''کوئی بات نہیں۔ دِن بھر میں تمہیں جب بھی وقت ملے، نو سے گیارہ بارہ بجے تک کے دورانیے کے علاوہ، آ کر پڑھا جایا کرو۔ اب تو ٹھیک ہے ناں؟''

میں چونکا، ''نو سے بارہ بجے تک کیوں نہیں؟''

''اُس وقت بی بی کو اُس کی استانی پڑھانے کے لیے آتی ہے۔'' خان نے کہا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اُس نے جاتے ہوئے جالی والا دروازہ بند کر دیا تھا۔

مجھ پر ہلکی سی گھبراہٹ طاری تھی۔ آج تک کسی کو پڑھایا نہیں تھا۔ ناتجربہ کاری میں بخت خان کی بیٹی کو پڑھانا بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ بدقت تمام خود کو سنبھالا اور ملکہ کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی، بولی، ''آپ باجی پروین کے بھائی ہیں ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اَبھی تک بیڈ کے میٹرس کے ساتھ گھٹنے ٹکا کر کھڑی تھی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ فوراً اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ میں نے اُس کے سامنے بکھری ہوئی کتابوں میں سے ایک اٹھائی، ورق گردانی کی پھر اُس کی کاپیوں کا معائنہ کیا۔ اُس کی ہینڈ رائٹنگ کافی خراب تھی۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اور میں اِس کام کے لیے ذہنی طور پر تیار بھی نہیں تھا، اِس لیے محض باتوں کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے کوئی نصف گھنٹہ کے قریب ایک دوسرے کے ساتھ تعلیم سے متعلقہ اور غیر متعلقہ باتیں کیں۔ مجھے ایک طرح کا اطمینان ہوا تھا کہ وہ بہت با اخلاق اور مؤدب واقع ہوئی تھی۔ میں اُسے با آسانی پڑھا سکتا تھا۔

اَبھی میں اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ نوکرانی چائے کا کپ اور بسکٹ وغیرہ سے بھری پلیٹ

ایک نفیس سی ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ میرے سامنے میٹرس پر رکھتے ہوئے بولی، ''شہرے پتر! تم اگر چائے پینے کے عادی نہیں ہو تو بلا تکلف بتاؤ، میں دودھ گرم کرلاتی ہوں۔ یہ بڑی بی بی کا حکم ہے۔''

میں نے کہا، ''بڑی بی بی سے جا کر کہہ دو کہ اِس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک دن کا نہیں، چار پانچ مہینوں کا مزمان (مہمان) ہوں۔''

''سرا کھیں تے پتر! بھانویں جو ساری زندگی مزمان تھیویں، اِہ تیڈا اپنا گھر ہے۔ میرے ہاتھ ٹوٹ تو نہیں جائیں گے تو تیرے لیے کچھ تیار کرلاؤں گی۔'' وہ محبت سے بولی۔

''مگر میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی بلکہ ایک عجیب نگاہ میرے پیروں پر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اپنے پیروں کی جانب تفہیم طلب نظروں سے دیکھا۔

ایسے میں ملکہ بولی، ''پریشان نہ ہوں سر! دراصل آپ نے دھیان نہیں دیا اور قالین پر جوتوں سمیت چڑھ گئے ہیں۔ وہ اِس لیے حیران ہو رہی تھی۔''

ملکہ درست کہہ رہی تھی۔ سرخ مخملیں قالین پر میرے جوتوں کے نشان واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے اپنی بے دھیانی پر شرمندگی ہوئی جو یقیناً چہرے سے بھی ہویدا ہونے لگی تھی۔

ملکہ بولی، ''سر جی! اِس میں ٹینس ہونے کی بات نہیں ہے۔ شہروں میں لوگ جوتوں سمیت قالین پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہاں چونکہ دیہاتی ماحول ہے، جوتوں کے سول مٹی سے لتھڑے ہوتے ہیں اِس لیے جوتوں کو دروازے کے قریب اُتار دیا جاتا ہے۔''

وہ اپنی دانست میں میری غلطی کو جائز قرار دینے اور میری شرمساری کو محو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے توجہ ہٹانے کے لیے اُس کی ریاضی کی کاپی اُٹھالی۔ اُس کی تحریر کو پڑھنا اَز حد مشکل تھا۔ میں نے کہا، ''بی بی! تمہاری لکھائی اچھی نہیں ہے۔ اِس پر اضافی محنت کرنا ہوگی۔''

وہ 'جی سر' کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اُس کا مجھے 'سر' کہنا بہت بھار رہا تھا۔ شاید یہ اعزاز پہلی مرتبہ مجھے مل رہا تھا، تبھی اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ اُردو بول رہی تھی۔ یہاں کے تمام لوگوں پر مقامی لہجہ اتنا غالب تھا کہ اُردو بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں 'ڈنڈی' مار جایا کرتے تھے۔ چونکہ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی طویل رفاقت میسر تھی، اِس لیے میرا لہجہ بھی قدرے

بہتر تھا۔

کافی دیر گزر گئی تھی۔ میں کمرے سے نکل کر، چاچی سے رسمی علیک سلیک کر کے مہمان خانے میں بخت خان کے پاس آ گیا۔

اُس نے مجھے دیکھ کر پوچھا، ''ہاں بھئی ینگ مین! تم نے اپنی اسٹوڈنٹ کو کیسا پایا؟ کیا خیال ہے، بورڈ کے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرے گی؟''

میں نے کہا، ''ہاں بشرطیکہ اُس کی ہینڈ رائٹنگ کچھ بہتر ہو جائے۔ اُس کے لکھے ہوئے کو پڑھنا مشکل ہے۔ جواب ٹھیک بھی ہوا تو اچھے نمبر نہیں ملیں گے۔''

اُس نے میری بات سے اتفاق کیا۔ بولا، ''یہ کام تم ہی اپنے ذمہ لو کیونکہ اُس کی اُستانی اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کر سکتی۔ اس کی اپنی لکھائی بھی بس 'اینویں' ہی ہے۔''

کچھ غیر متعلقہ باتوں کے بعد اُس نے پوچھا، ''تم نے کھالے سے بات کی تھی؟''

میں چونکا، ''کون سی بات؟''

''سائیں دل جیت شاہ کی سرگرمیوں کی خفیہ نگرانی والی بات!'' اُس نے یاد دِلایا۔

''ہاں! ابھی وہ ساتھ دینے پر رضامند نہیں ہوا مگر مجھے یقین ہے کہ میری ضد کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے گا۔''

''تم دونوں کسی شام کو یہاں آؤ گے۔ اکٹھے بیٹھ کر پلاننگ کریں گے، پھر مزار پر جائیں گے۔'' بخت خان نے سمجھایا، ''بلکہ ایسا ہے کہ میں بشیر کو بھیج کر سب کو یہاں اکٹھا کر لوں گا تا کہ کھل کھلا کر بات کی جا سکے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اجازت لے کر حویلی سے نکل آیا۔ اس کے بعد ملکہ کو ہر روز پڑھانے کے لیے حویلی جانا میرا معمول بن گیا۔

شام نور پور کے کچے گھروں کے منڈیروں تک پہنچ آئی تھی۔ سورج نوری چوک والی سڑک کے کنارے ایستادہ بڑے درختوں کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر مراد بخش دیوانہ کے 'گھروندے' پر پہنچ گیا۔ اُس نے اپنی کچی بیٹھک کو ہی دکان بنا رکھا تھا۔

وہ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے بڑا سا چوبی تختہ دھرا ہوا تھا جس پر کوئلوں والی استری، لوہے کا ایک کڑا جس پر گرم استری رکھی جاتی تھی اور ایک پرانی سلائی مشین رکھی ہوئی تھی۔ مشین بہت پرانی تھی۔ باڈی گھسی ہوئی تھی۔ اُس پر انگریزی میں لکھے

ہوئے حروف بصد کوشش پڑھے نہیں جا سکتے تھے مگر وہ ہر ملنے والے کو بتا چکا تھا کہ اُس کی سلائی مشین اصلی 'پائلٹ' کمپنی کی تیار کردہ تھی اور اس جیسی مشینیں اب کہیں بھی دستیاب نہیں تھیں۔ اس سے تو یہ بھی بعید نہیں تھا کہ اپنی مشین کی تعریف کرتے کرتے اُسے تاریخی اثاثہ قرار دے دیتا اور نور پور کے لوگوں کو اس کی باقاعدہ زیارت کرنے پر مجبور کر دیتا۔

ایک بڑی سی تپائی بھی دکھائی دے رہی تھی جسے ہاتھ لگانا بھی جُرم قرار پاتا تھا۔ اپنے پیچھے اُس نے دیوار پر میخوں کی مدد سے کئی رسیاں متوازاً باندھ رکھی تھیں جن پر سلائی شدہ سوٹ ایک خاص تکنیک سے ٹنگے ہوئے تھے۔ لوگوں کو بٹھانے کے لیے اُس نے اپنے پھٹے کے سامنے اور دائیں ہاتھ پر چٹائیاں بچھا رکھی تھیں۔ معزز مہمانوں کے لیے عقبی دیوار کے ساتھ ایک پھول دار چادر یافتہ چارپائی بھی رکھ چھوڑی تھی۔ یہی سامان اُس کی دکان کا یا 'گھروندے' کا کل اثاثہ تھا۔

مجھے دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھا مخصوص پرجوش لہجے میں بولا، ''آہا! شہزاخان میرے گھروندے پر آیا ہے، کوئی ہو تو دہلیز پر تیل انڈیلے، کوئی ہو تو نائی کو دیگ چڑھانے کا سنیہا (پیغام) دے آئے۔''

میں جھینپ کر بولا، ''ناں کیا کریار! بلاوجہ شرمسار کر دیتے ہو۔''

''لوسنو! تم بھی تو مہینوں بعد اپنی سوہنی سی صورت دکھاتے ہو ہم غریبوں کو..... اَب بتاؤ، لسی پیو گے یا چاہ بنواؤں؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''کسی چیز کی طلب نہیں۔ بیٹھو اور اپنا کام کرو۔''

وہ سلائی مشین کے دو اطراف میں پھیلا ہوا آسمانی نیلے رنگ کا کپڑا سمیٹ کر، سلائی مشین کو تھوڑا پرے دھکیل کر ہمہ تن گوش ہو گیا اور بولا، ''آج کیسے گھروندے کی طرف آن بھٹکے؟ خیر تو ہے؟''

میں نے بتایا کہ مجھے کوئی کام نہیں بلکہ محض ملنے اور گپ شپ کرنے کے لیے آیا ہوں تو وہ بڑا خوش ہوا۔ چند ہی منٹوں میں نور پور کے سیاسی اور سماجی حالات زیرِ بحث آ گئے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ نور پور کے لیے بڑا خان نئی گرانٹ منظور کروا لایا ہے۔ وہ بہت خوش تھا کہ اَب چند ہی دنوں میں نور پور کے ہر گھر میں بجلی پہنچ جائے گی اور لوگوں کی مٹی کے تیل سے جان چھوٹ جائے گی۔

ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے بولا، ''یار دیکھنا اسلم مغل کو، سر پر بانہیں رکھ کر پیٹتا پھرے گا کہ اُس کی کمائی آدھی رہ جائے گی۔''

اسلم مغل نے اپنی دکان کے آگے بڑا سا ڈیزل ٹینک رکھا ہوا تھا۔ ڈرم کو ٹونٹی لگوا کر مٹی کے تیل کی بھی چھوٹی سی ٹینکی بنا رکھی تھی جو سارا سال دکان کے باہر دھری رہتی تھی۔ دونوں ٹینکیوں کی ٹونٹیوں پر شام کو تالے لگا کر گھر چلا جاتا تھا۔ بقول اُس کے، ڈیزل سے زیادہ مٹی کا تیل منافع بخش ثابت ہوتا تھا کیونکہ یہ پرچون بکتا تھا اور تمام دِن لوگوں کی 'بوتلیں' آنے جانے سے رونق بھی بنی رہتی تھی۔ ڈیزل کے خریدار کم تھے۔ مراد بخش دیوانے کا خیال بالکل درست تھا کہ بجلی آنے کے بعد اسلم مغل کی دکانداری کا ماند پڑ جانا قریب از حقیقت تھا۔

میں نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا، ''اتنی اہم خبر تم تک کیسے پہنچ گئی؟''

''بڑے خان کا 'پی آر او' اپنے کپڑے سلوانے کے لیے میرے پاس آتا رہتا ہے۔ کل اُسی نے بتایا تھا۔'' وہ عادتاً گردن اکڑا کر بولا۔

''پی آر او؟ یہ کیا شے ہے؟''

''پتہ نہیں کن جاہل لوگوں سے دیوانے کا پالا پڑ گیا ہے۔ اوئے اللہ کے بندے! 'پی آر او' یعنی پبلک ریلیشن آفیسر، اس کے معانی ہیں منشی..... منشی اللہ دتے کی بات کر رہا ہوں۔'' اُس نے مصنوعی تأسف بھرے انداز میں ماتھے پر 'چٹاک' سے ہتھیلی مارتے ہوئے کہا۔

میں 'پی آر او' کی تفسیر و تشریح سن کر بمشکل اپنی ہنسی روک پایا۔ بولا، ''اور بھی کچھ بتایا اُس نے؟''

''ہاں! بتا رہا تھا کہ چند مہینوں میں بڑا خان نور پور کی گلیوں کے لیے بھی گرانٹ منظور کروا لے گا۔ یہاں نالیاں اور سولنگ لگوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' وہ دیدے گھما کر بولا۔

میں نے نیم مایوسی سے کہا، ''یہ بات میں گزشتہ تین برسوں سے سن رہا ہوں۔''

''افوہ! اللہ تمہیں ہدایت دے۔ دیوانہ جھوٹ بولتا ہے کیا؟''

جواباً میرے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ گردن کو اکڑاتے ہوئے دائیں بائیں پھیرا اور بجلی کی مستعدی سے سلائی مشین اپنی جانب گھسیٹ کر سوئی میں دھاگہ ڈالنے لگا۔ اُس نے زبان سے نہیں کہا تھا مگر اُس کی اکڑی ہوئی گردن نے باور کرا دیا تھا کہ مجھے اَب 'گھروندے' سے رخصت ہو جانا چاہیے۔

میں نے ہنستے ہوئے 'خدا حافظ' کہا اور گھروندے سے نکل آیا۔ مجھے علم تھا کہ اَب دو تین دنوں تک گھروندے میں میرا ذکرِ خیر بکثرت چھڑے گا اور ہر موجود و ناموجود خامی میری شخصیت میں بڑے شاعرانہ انداز میں فِٹ کی جائے گی۔

میں کھالے کی منہ پھاڑے کھڑی ویگن کی طرف بڑھ گیا۔ شیدو بونٹ کھول کر انجن پر جھکا ہوا تھا۔ کھالا چھپر تلے پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی پر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر نیم دراز تھا۔ میں کھالے کو نور پور میں بجلی کی گرانٹ آنے کی خوش خبری دینا چاہتا تھا مگر اُس تک یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

بولا، ''دیوانے کے پاس بات پہنچے اور نور پور کا گھگوٹی پڑا بچہ بھی سن نہ پائے، ناممکن ہے۔ وہ تو پھٹا ڈھول ہے۔ جس بات کی مشہوری کرنی ہو، وہ بات دیوانے کو بتا دی جائے، آن کی آن میں پورے علاقے میں پھیل جاتی ہے۔''

میں نے کہا، ''مگر ایک بات ہے کھالے! وہ زبان کا اتنا کچا بھی نہیں ہے۔ جس بات کو اُس نے اپنے دل میں دَبا کر رکھنا ہو، لاکھ کریدتے رہو، اس کی ہوا تک نہیں لگنے دیتا۔''

کھالے نے میری بات کی تردید نہیں کی۔ موضوع بدل کر مجھے ایک راز کی بات بتانے لگا۔ اُس کی عقابی نظروں نے چند دن قبل تاڑ لیا تھا کہ دیوانہ ہسپتال میں ڈیوٹی پر آنے والی ایل ایچ وی، شمیم، کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ مجھے سمجھ آنے لگی کہ ہر شام کو کھالا گھروندے میں بیٹھا دیوانے کے ہاتھوں کی 'دودھ پتی چاء' پیتا ہوا کیوں دکھائی دیتا تھا۔ شمیم ہفتے میں تین دن ڈیوٹی پر آیا کرتی تھی۔ وہ قریشی موڑ کی رہنے والی تھی۔ اُس کا چھوٹا بھائی موٹر سائیکل پر اُسے لاتا تھا اور اُس کی واپسی تک ہسپتال میں رہتا تھا۔ کئی دِنوں بعد، کھالے کے بیان پر میں تب ایمان لایا تھا جب میں نے دیوانے کو بڑے شرمائے ہوئے انداز میں ایک خط شمیم کو تھماتے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس سے بھی زیادہ حیرت مجھے تب ہوئی جب مجھے پتہ چلا کہ شمیم بھی اُس کانگڑی شاعر میں انٹرسٹڈ تھی۔

مراد بخش دیوانہ کا تذکرہ دیر گئے تک چھڑا رہا۔ یادوں کے اعادے میں کافی دیر گزر گئی تھی۔ ایسے میں وہ تذکرہ بھی آن چھڑا جس سے دامن چھڑاتے، آنکھیں چُراتے بچپن اور پھر لڑکپن گزر گیا تھا۔ کھالے کے دماغ کی پھرکی اُلٹی گھومنے لگی تھی، تبھی اچانک بولا، ''یار شہرے! تم اس قصے کو تو بالکل بھول بیٹھے ہو۔''

میں چونکا، ''کس قصے کو؟''

''اُس خونیں قصے کو جو تم نے بچپن میں بھڑولے کے اندر کھڑے ہو کر سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا تھا.....''

اچانک ہی جیسے میری سانسوں کو آگ لگ گئی۔ دھڑکن سینے میں ہی کہیں بھنچ کر رہ گئی۔ برس ہا برس سے آنکھوں کے پردوں پر ٹھہرے ہوئے اس سفاک انسانی چہرے نے تو مجھے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا تھا۔ لانبے قد کے شخص کا جھکا ہوا مگر تھوڑا سا اُٹھا ہوا بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ، غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی دہشت ناک آنکھیں اور چہرے کے تاریک پسِ منظر میں خون کی سرخ آمیزش..... اِسے تو میں گزشتہ کئی سالوں سے بلاناغہ دیکھتا چلا آیا تھا۔

میں نے پوری سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ دانتوں کی کڑکڑاہٹ ذہن کے پردوں پر دھمکنے لگی۔ وہ کھردری اور پاٹ دار آواز بھی مجھے فراموش نہیں ہوئی تھی جو میں نے اُس رات سنی تھی۔ چونکہ میں اور کھالا اپنے بچپن میں اُس چہرے کی تلاش کے نام پر اطراف کے تمام دیہاتوں کی سائیکلوں پر آوارہ گردی کر چکے تھے۔ اُسے ڈھونڈنے کی اپنے تئیں کوششیں بھی کر چکے تھے مگر اُسے نہیں ملنا تھا، نہیں ملا۔ میں نے کھالے کو اَن گنت مرتبہ وہ خوں چکاں منظر لفظوں کے پردے پر سجا کر دکھایا تھا اور اِس عہد کو دہرایا تھا کہ زندگی میں اُسے تلاش کر کے اپنے معصوم والدین کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔ ہر بار کھالے نے اپنی اعانت کا یقین واشگاف انداز میں کرایا تھا۔

ہمارے درمیان خاموشی کی طویل رہ گزر حائل ہو گئی۔ کھالا متاسف تھا کہ اُس نے یہ تذکرہ کیوں چھیڑا۔ میں سلگ اُٹھا تھا کہ میری جوانی بھری بانہیں اَبھی اپنے ماں باپ کے قاتل کی گردن ماپنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں۔ کھالے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ہمدردی سے بولا، ''شہرے! مجھے یقین ہے کہ وہ اِک نہ اک دن ہمیں ضرور ملے گا اور اُس کا گندا جسم اُس کے اپنے خون سے رنگ جائے گا۔ ہاں! مجھے یقین ہے کیونکہ سوہنے خان کی جوانی تمہاری بانہوں میں سمٹ چکی ہے۔ اُس کی بے گناہی اپنے قاتل کی تلاش میں نکلی ہوئی ہے۔''

وفورِ اشتعال و کرب سے میرے لب سل گئے تھے۔ ندامت آنکھوں میں نمک گھولنے لگی۔ کھالے نے درست کہا تھا کہ میں اب پہلے کی طرح اپنے مقتول والدین کو یاد نہیں کرتا تھا۔ میں

نے ایک طویل سانس سینے میں اُتاری۔ الاؤ کچھ کم ہوا۔ بولا، ''کھالے! نور پور والے کہتے ہیں کہ وہ ڈکیتی کی واردات تھی جس میں میرے والدین قتل ہوئے تھے مگر میں آج تک اِس نظریے کو دل سے مان نہیں سکا کیونکہ اُنہوں نے گھر سے کوئی چیز اُٹھائی نہیں تھی اور نہ ہی قاتلوں نے میرے باپ کی جیبیں ٹٹولی تھیں۔''

کھالا نور پور کے لوگوں کی اکثریت کی طرح اُس واقعے کو ڈکیتی کا نتیجہ قرار دیا کرتا تھا، بولا، ''مگر تمہارے باپ، سوہنے خان کی کسی سے دشمنی بھی تو نہیں تھی کہ اُسے اور تمہاری ماں کو یوں بیہمانہ طریقے سے قتل کیا جاتا۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو آج تک کھل کر سامنے آ چکی ہوتی۔''

کھالے کی سوچوں کا غیر معمولی استغراق اُس کی پیشانی پر لکیروں کی صورت ثبت تھا۔ انگلیوں میں دَبی ہوئی سگریٹ کانپ رہی تھی اور وہ لب بستہ، ایک ٹک خلا میں گھورتے ہوئے کسی نادیدہ شئے کو تلاش کر رہا تھا۔ اپنے سر کو تفہیمی انداز میں اوپر نیچے جنبش دیتے ہوئے بولا، ''شہرے! تم مانو یا نہ مانو، اِس کہانی کا خونی سرا شاہ جمال میں سے ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اتنے بڑے واقعے کے پیچھے کوئی اتنی معمولی سی وجہ نہیں ہوتی جو تلاش کرنے سے نہ مل سکے۔ تمہارے نانکے (ننھیال) بہت سی باتوں پر مٹی ڈال چکے ہیں۔ اُس مٹی کو اُٹھانا ہوگا تب کہیں جا کر ہم اُس شخص تک پہنچنے کے قابل ہوں گے جس کا چہرہ تمہارے ذہن میں نقش ہے۔''

''مگر ہم شاہ جمال سے دو مرتبہ ناکام واپس آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

شاہ جمال، چوک قریشی سے جنوبی سمت کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع میرا ننھیالی قصبہ تھا۔ میں اور کھالا آخری بار یہی کوئی تین سال پہلے وہاں گئے تھے اور میں آخری مرتبہ اپنے ماموں سے ملا تھا کیونکہ اُس کے دو ماہ بعد وہ کھانستا ہوا دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ ٹی بی نے اُس کا اندر چاٹ لیا تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا جو نشے میں دھت تھا۔ اُس کی حالتِ زار بتاتی تھی کہ وہ آخری سانسیں شمار کرنے پر مامور ہو چکا تھا۔ میری ممانی اپنا آسیب زدہ بڑھاپا کھنڈر نما در و دیوار پر اوڑھائے موجود تھی۔ مجھ سے مل کر تینوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اگر ہوئی تھی تو اُن کے چہروں پر نمودار ہونے سے قبل ہی رخصت ہو گئی تھی۔

میں نے کھالے کی ہدایات کے عین مطابق ماموں اور ممانی کو احتیاط سے کریدنے کی کوشش کی تھی اور چاہا تھا کہ اپنی ماں کے بارے میں کچھ مفید معلومات حاصل ہو جائیں مگر اُن

دونوں نے میری باتوں میں نہ تو خاص دلچسپی لی اور نہ ہی کوئی راز افشائی کی۔ میری ہر دوسری بات کا جواب غربت اور بیٹے کی حالتِ زار کے رونے کی صورت میں ملا۔ مایوس ہو کر ہم کچھ کھائے پیئے بغیر وہاں سے اُٹھ آئے۔ کھالا چاہتا تھا کہ محلے کے کسی اور شخص سے ملاقات کی جائے مگر میں ماموں کے گھر کی صورتِ حال کو دیکھ کر اتنا کبیدہ خاطر ہوا تھا کہ ایک پل بھی رہنا دشوار محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے کھالے سے کہا، ''نور پور میرا گاؤں ہے۔ کل تک یہی میرے باپ دادا کا گاؤں تھا۔ میرے باپ کو ہر کوئی اچھے لفظوں میں یاد کرتا ہے۔ اُس کو اپنا رشتہ دار مان کر، اُس کے سونہپ (خوب صورتی) اور دلیری کے قصے سناتا ہے مگر کوئی بھی نہیں جانتا کہ اُس کی کس کے ساتھ دشمنی تھی۔ میں نے چاچا چراغ سے، چاچی، حیات خان اور امیر نواز کو بھی کرید کرد یکھا ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ تب کوئی نہیں جانتا تھا۔ اب کوئی کیا یاد کیے بیٹھا ہوگا۔''

میرے لہجے میں اغلب مایوسی کے عنصر کو بھانپ کر کھالے نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا، آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، بولا، ''شہرے! میں کہتا ہوں ناں کہ زیادہ پڑھ لکھ کر انسان ڈرپوک ہو جاتا ہے، زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے اور خدا کی رحمتوں پر بھروسہ نہیں کرتا، تو ٹھیک ہی کہتا ہوں ناں..... مجھے یقین ہے کہ اک نہ اک دن تمہارے باپ کے قتل کے پیچھے کھڑی ہوئی کہانی پر سے پردہ ضرور اُٹھے گا اور ہم قاتل کی گردن دبوچ لیں گے۔''

شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میرا یقین متزلزل ہو چکا تھا۔ مجھے اَب کوئی اُمید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ بولا، ''میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے دونوں ماموؤں کا اِس قتل سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔''

میں چونکا، ''یہ کیا حماقت ہے؟''

''یہ حماقت نہیں، شبہ ہے۔'' وہ میرے چہرے کا بغور مشاہدہ کرتے ہوئے بولا، ''میری ماں کہتی ہے کہ مرگ کی تمام رسموں پر تمہارے ننھیال سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ جنازہ، قل خوانی اور چہلم..... کسی پر بھی نہیں حالانکہ انہیں بروقت اطلاع مل گئی تھی۔ چاہتے تو منہ پر بھی پہنچ سکتے تھے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''وہ تو اختلافات کی وجہ.....''

اُس نے جلدی سے میری بات کاٹ دی، بولا، ''اختلاف زندوں سے ہوتا ہے، مردوں

سے نہیں۔ ویسے بھی بیٹی یا بہن سے ایسا کیا تنازع ہوسکتا ہے کہ اُن کی میتوں کو کاندھا تک نہ دیا جائے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولا، ''پھر اُن دونوں ماموؤں کا انجام بھی نظر میں رکھو تو صاف پتہ چل جائے گا کہ قدرت نے اُن سے کوئی انتقام لیا ہے۔ کسی جرم کی پاداش میں اُنہیں دنیا میں رسوا اور ذلیل وخوار کر کے مارا ہے۔ ممکن ہے، وہ جُرم یہی ہو جس کی سزا تم دونوں بہن بھائی کاٹ رہے ہو۔''

''کوئی اپنی بہن کو بیٹی کو قتل کرے گا؟'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ''نہیں کھالے..... ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں بیزاری سے بولا، ''میں تمہاری بے تکی باتوں کے جواب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''تم کچھ نہ کہو، سوچو..... سوچنے سے بہت سی راہیں کھلتی ہیں۔''

''تمہارے ساتھ میں نے گھنٹوں اِس موضوع پر باتیں کی ہیں، تم نے کون سی راہ کھولی ہے اب تک؟''

وہ خاصا جزبز دکھائی دینے لگا۔ بولا، ''کسی دِن تو کھل ہی جائے گی، اللہ پر یقین رکھنا چاہیے۔''

''تب تک شاید میرے بازوؤں میں دم نہ رہے۔ تب تک شاید میرے باپ کا قاتل اپنی طبعی عمر پوری کر لے اور میں اُس کی قبر پر کھڑے ہو کر اپنی ناکام کوششوں کا ماتم کروں۔'' میرے لہجے میں بے حد تلخی سرایت کر گئی۔

اُس نے میرے گالوں پر ہاتھ رکھے، چہرہ اُوپر اُٹھایا اور بولا، ''شہرے! دیکھ، رونا مردوں کے لیے گالی ہوتا ہے۔ اپنے دُکھ کو سنبھال رکھ، اِس کی گرمی کو آنسوؤں کی شکل میں ضائع نہ کرو..... دیکھنا! ایک نہ ایک دن وہ ضرور ملے گا۔''

تب مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھیں چھلک اُٹھی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے موجود منظر دھندلا گیا اور کھالے کا چہرہ پانی میں تیرتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے پوری طاقت سے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور رُندھے ہوئے لہجے میں کہا، ''کھالے! بھری دُنیا میں تمہیں یار بنایا ہے، تمہارے پاس آ کر روتا ہوں، میرے اتھروؤں کی لاج رکھ لو اور کہیں سے اُسے ڈھونڈ نکالو ورنہ میں سکھ کا سانس نہیں لے پاؤں گا۔''

''فکر نہ کراوئے! وہ لومڑ کا بچہ کھالے کی نظروں سے چھپ نہیں پائے گا۔ کھتی (گردن) سے پکڑ کر یار کے قدموں میں لا پھینکوں گا ایک دن۔ ہاں!'' اُس کے لہجے کا اکھڑ پن عود کر آیا ''تم اپنے رشتہ داروں کو باتوں باتوں میں ٹٹولتے رہا کرو۔ بخت خان کو شاید علم ہو۔ یار ن خان ایک دو ماہ تک آنے والا ہے، اُس کے قریب ہونا اور ٹوہ لینا۔ شاید کوئی کلیوُل جائے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُس نے باتوں کا رُخ بدل دیا اور کچھ ہی دیر میں ہماری ملاقات کی بساط سمٹ گئی۔ آج میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں بھی نہیں جا سکا تھا، اِس لیے علی الصبح ہسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نماز پڑھنے کے بعد کھیتوں کی طرف نکل رہا تھا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ معمول سے زیادہ دور نکل آئے۔

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا، ''ڈاکٹر جی! ماسٹر ولی محمد آپ سے کیا کہنے آیا تھا؟''

''تمہیں علم تو ہے، پھر کیوں پوچھتے ہو؟''

میں دم بخود رہ گیا، ''مجھے تو علم نہیں ہے۔''

وہ ٹھہر گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، ''کیا تم مجھے 'نان سینس' خیال کرتے ہو؟''

میں جلدی سے بولا، ''نہیں شاہ جی! میں ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں۔''

''تو پھر جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟'' شاہ کے لہجے میں غصہ نہیں تھا ''مجھے علم ہو گیا تھا کہ تم کھڑکی سے چپک کر بیٹھے ہو اور میری اور ماسٹر صاحب کی باتیں سن رہے ہو مگر یہ سوچ کر کہ یہ تمہارا فطری عمل تھا، درگزر کر گیا۔

''مم..... میں.....'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

وہ بولا، ''شہریار! تجسس ایک فطری مادہ ہے۔ اِس پر انسان کو بعض اوقات مکمل اختیار نہیں رہتا اور انسان وہ کام کر جاتا ہے جسے عام طور پر وہ خود نامناسب اور غیر اخلاقی قرار دیتا ہے۔ دو افراد کی نجی گفتگو کو چوری چھپے سننا جرم کی ہم سطح غیر اخلاقی حرکت ہے جو اُس رات تم سے سرزد ہوئی۔''

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے فوراً معذرت کی اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

وہ بولا، ''میں کافی دنوں سے زَینا ں کا احمقانہ رویہ بھانپ رہا تھا مگر چونکہ اُس نے اپنے باؤلے پن کا کھل کر اظہار نہیں کیا تھا، اِس لیے میں نے اُسے سمجھانا اور باز رکھنا مناسب خیال

نہیں کیا تھا۔ ماسٹر صاحب کی دل شکنی بھی میں نے محض اِس لیے کی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اِس باب کو بند سمجھے اور مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ اگر میں نرم رویہ رَوا رکھتا تو وہ دو چار دن گزار کر پھر میرے سر پر آن سوار ہوتا۔''

''کیا زَیناں کا احمقانہ رویہ غیر فطری تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں۔ ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ایک ربط، ایک تعلق بڑے غیر محسوس انداز میں اَز خود پیدا ہو جاتا ہے جس کے لیے ہم ٹرانس فی ریشن کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہی تعلق آفیسر اور ماتحت کے درمیان استوار ہو سکتا ہے۔ ایک استاد اور شاگرد کے درمیان بھی پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اِس میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ اِسے محبت کے تعلق سے جدا سمجھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ زیناں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مجھ سے مانوس اِس قدر ہو گئی تھی کہ محبت کا مغالطہ کھا بیٹھی۔ میں چونکہ اِس تعلق سے ہر دو جے چوتھے مہینے گزرتا رہتا ہوں، اِس لیے اِس کا شکار نہیں بنتا، وہ بن گئی۔'' اُس نے مجھے بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔

''تو پھر اُسے حق بجانب سمجھنا چاہیے تھا آپ کو۔''

اچانک اُس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ بولا، ''بڑے چالاک ہو۔''

''فرض کریں، آپ کی شادی زَیناں سے ہو جائے، تب کیا ہوگا؟'' میں نے متذبذب انداز میں پوچھ ہی لیا۔

''نہیں شہریار! جس مفروضے کو ذہن سینچ ہی نہ سکے، اُس پر بحث کرنا فضول ہوتا ہے۔''

''مگر کیوں؟ آپ اِس موضوع پر کیوں سوچنا نہیں چاہتے؟''

''میرے جذبات کا سورج ناوقت ڈھل گیا تھا۔'' اُس نے بے حد اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا، ''میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ تم کوئی اور بات کرو۔''

''مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ آپ نے کسی کو بے حد چاہا تھا اور وہ آپ سے.....''

''میں نے کہا ناں کہ تم کوئی اور بات کرو۔'' اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔ جستجوئے آگہی کی اِس حد تک میں کئی مرتبہ پہنچا تھا اور ہر بار ہزیمت بار ہونا پڑا تھا۔ میں نے جیبی چاقو کی مدد اُسے کیکر کی مسواک بنا کر دی اور خاموشی سے اُس کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ میری گفتگو نے اُسے بے چین اور مضطرب کر دیا تھا۔ چال میں بھی فرق

آ گیا تھا۔ میں اُسے مزید کریدنے کی بجائے اُس کے بیان کیے ہوئے فلسفے میں الجھ گیا۔ اُس کی بات 'یہی تعلق استاد اور شاگرد کے درمیان بھی پیدا ہوتا ہے' میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا میرے اور ملکہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا؟ وہ بچی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ میرے بارے میں کچھ نہ سوچتی۔ اُسے اگرچہ نادان قرار دیا جا سکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ کیا ڈاکٹر شاہ جی کی طرح میں اُسے جھٹکنے کی قدرت رکھتا تھا؟ میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کا اَزخود جواب دیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

آج میری پانی لگانے کی باری تھی۔ نکے پر پہنچ کر پتہ چلا کہ رات میں کسی وقت نہر گر گئی تھی۔ مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ اَب وریام خان سے پانی خرید کر لگانا تھا۔ میں نے اپنی کسی نکے پر چھوڑی، ڈیرے سے درانتی اُٹھائی اور باجرے کی باقی ماندہ دو کیاروں کے سٹے کاٹنے لگا۔ کھیت کے آخری کیارے میں، باجرے کے بے ثمر پودے مخصوص انداز میں ہل رہے تھے۔ کوئی مویشیوں کے چارے کے لیے باجرہ کاٹ رہا تھا۔ کون کاٹ رہا ہے؟ میں نے دھیان نہیں دیا کیونکہ باجرے کے سر کٹے پودے مویشیوں کو ڈالنے کے ہی کام آتے تھے۔ جو بھی باجرہ کاٹ رہا تھا، وہ ہمارا فائدہ ہی کر رہا تھا، ہماری زمین صاف کر رہا تھا۔ چونکہ ہمارے ہاں مویشیوں کا چارہ موجود تھا، اِس لیے ہم اپنے ڈھور ڈنگروں کو باجرہ نہیں ڈالتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ باجرہ کھانے والی بھینسیں اور گائیں دودھ کم دیتی تھیں۔

کچھ دیر بعد میرے کانوں میں نسوانی آواز پڑی۔ میں نے چونک کر، جدھر سے آواز سنائی دی تھی، دیکھا۔ زَیناں کھڑی دی۔ وہ ہاتھ لہرا کر مجھے پکار رہی تھی، ''شہرے!''

پتہ چلا کہ وہی باجرہ کاٹ رہی تھی۔ میں درانتی لہراتے ہوئے اُس کے پاس چلا گیا۔ وہ پہلو پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی جبکہ اُس کی ماں اور ایک بہن باجرہ کاٹنے میں مصروف تھیں۔ میں نے سب کو سلام کیا۔ بلائے جانے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی، ''میں نے ویسے ہی آواز دی ہے۔ ٹھیک تو ہو ناں؟''

اُس کی ماں اور بہن درانتیاں زمین میں گاڑ کر میرے قریب آ گئیں۔ تبادلۂ احوال کے بعد بنے پر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ زمین، گھر، تعلیم اور میرا خاندان زیرِ بحث آیا۔ پھر زیناں کی ماں اور بہن اُٹھ کر باجرہ کاٹنے میں مصروف ہو گئیں جبکہ وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ آہستگی سے بولی، ''ڈاکٹر شاہ جی کیسے ہیں؟''

مجھے بلانے کے پیچھے یہی مقصد کارفرما تھا۔ میں نے کہا، ''بالکل ٹھیک ہیں۔''

وہ کوئی بات کرنا چاہتی تھی مگر جھجک رہی تھی۔ میں نے اُس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہہ دیا، ''کیا تمہیں اُس کا فکر لاحق ہے؟''

وہ تذبذب کا شکار ہوگئی۔ گھاس کے تنکے کھینچنے لگی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ جھکا ہوا سر اثبات میں ہلنے لگا۔

مجھے دکھ ہوا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا، ''زیناں! تم اُس کا خیال دِل سے نکال دو۔ وہ تمہارے بلکہ کسی بھی انسان کے بارے میں نرم گوشہ نہیں رکھتا۔''

اُس نے سر اُٹھانے سے احتراز کیا، بولی، ''مگر میں اپنے دل کا کیا کروں؟ میں تو مانتی ہوں، یہ نہیں مانتا۔''

''اسے سمجھاؤ کہ وہ بوڑھا ہے، خبطی ہے، پردیسی ہے۔''

''سب کچھ جانتے بوجھتے اُنہیں مانگتا ہے۔''

''میری طرف دیکھ کر بات کرو۔''

''نہیں! مجھے لاج آتی ہے۔''

میں ہنسا، ''اپنے منگیتر کو خط لکھو۔ اُسے بتاؤ کہ تم بالکل فٹ ہو۔''

''دل نہیں مانتا۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''دل کیا مانتا ہے؟''

''مانتا نہیں، مانگتا ہے۔ کیا تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟'' اُس کے لہجے میں بڑی اپنائیت بھری التجا در آئی تھی۔

''میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟'' میں چونکا۔

''اُنہیں سمجھا سکتے ہو کہ وہ میرے ساتھ.....'' اُس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں سمجھ کر بولا، ''وہ بچہ تھوڑا ہے، سمجھنے والا نہیں بلکہ سمجھانے والا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ہی سمجھنا ہوگا۔''

اُس نے پہلی مرتبہ سر اُٹھایا۔ اُس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی، ''کیا؟''

''یہی کہ اِن تلوں میں تیل نہیں۔''

اُس نے نفی میں سر ہلایا پھر اُمید بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی، بولی ''وہ نور پور میں صرف تمہاری بات مانتے ہیں۔''

بے چاری غلط فہمی کا شکار تھی۔ عشق ایسی ہی بھول بھلیوں میں انسان کو لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ جہاں پر انسان سہارے کے لیے تنکوں سے بھی چمٹنے لگتا ہے۔

میں نے کہا، ''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ وہ میری بات سنتا تو ہے مگر مانتا نہیں۔''

''ہاں شہرے! شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں نے سائیں جیت شاہ سے لے کر کئی تعویذ گھول پلائے، دعا بھی کروائی اور تین جمعراتوں کو مزار پر دیے بھی جلائے مگر اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سائیں جیت شاہ نے تو کہا تھا.....''

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا، ''جیت شاہ نے کیا کہا تھا؟''

''یہی کہا تھا کہ وہ میری طرف مائل ہو جائیں گے۔'' وہ منہ بنا کر بولی، ''سائیں نے وظیفہ پڑھنے کے لیے دیا تھا، اکیس دِنوں تک سَرگی ویلے (نماز فجر کے وقت) پڑھتی رہی مگر کچھ نہیں ہوا۔ شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔''

اُس کی قسمت خراب نہیں تھی۔ خرابی اُس کے دماغ میں دَر آئی تھی۔ میں اُسے ڈاکٹر شاہ جی سے باز رکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اُس کی مراد کبھی بھی بَر لانے والی نہیں تھی مگر میری باتیں محض اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، دماغ تک رسائی نہیں پا رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک آس بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی، ''تم میرا ایک کام تو کر سکتے ہو ناں؟''

''کیا؟''

''کوئی چیز تمہیں دوں تو ڈاکٹر جی تک پہنچا دو گے؟''

''خط؟'' میں نے جواب دینے کی بجائے فوراً سوال داغ دیا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کچھ دیر سوچا پھر حامی بھر لی۔

اُس کی ماں کٹے ہوئے باجرے کو دو جگہوں پر باندھنے میں مشغول تھی جبکہ اُس کی بہن عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں ٹہلتے ہوئے کھیت سے نکل آیا اور دوبارہ

اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ پروین وغیرہ بھی پہنچ گئیں۔ آج ان کے ہمراہ غزالہ بھی آئی تھی۔ اُن کی نگاہ زَیناں پر پڑی تو میرے پاس درانتیاں رکھ کر بھاگتی ہوئی زیناں کے پاس پہنچ گئیں۔ یہ دیہاتی عورتوں کا خاص وطیرہ ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ ضروری کام پر میل ملاقات کو فوقیت دیتی ہیں۔

غزالہ میرے پاس رُک گئی تھی، تاسف بھرے لہجے میں بولی ''یہ بھی نری جھلی ہے۔''

''کون؟''

''یہ زَیناں..... ماسٹر جی کی دِھی!'' وہ تاسف بھرے انداز میں بولی۔

''کیوں؟ کیا ہوا اِسے۔ چنگی بھلی تو ہے۔''

اُس نے اپنے کان کے گرد انگلی گھمائی، بولی، ''دماغ پھر گیا ہے شودھی (بیچاری) کا۔ بُڈھے ڈاکٹر کیلئے سارا دِن آہیں بھرتی رہتی ہے۔''

''آہیں تو تم بھی بھرتی رہتی ہو؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں تو نور پور کے سب سے سوہنے چھوہَر (لڑکے) کے لیے آہیں بھرتی ہوں۔'' وہ اِترائی۔

''تم نے ڈاکٹر شاہ جی کو دیکھا ہے؟''

''ہاں!'' وہ بولی، ''منہ متھے لگتا ہے پَر ہے تو بوڑھا ناں!''

''کیا بوڑھے سینے میں دل نہیں ہوتا؟''

''ہوتا تو ہے مگر دھڑک دھڑک کر تھک چکا ہوتا ہے۔'' وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

میں نے بطور احتیاط باجرے کے سرکٹے کھیت کی طرف دیکھا۔ کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سبھی زمین پر بیٹھ کر گپیں ہانک رہی تھیں۔ میں نے غزالہ کو بانہہ سے پکڑ کر نیچے بیٹھا لیا۔ پیار کی پہلی گستاخی سرزد ہوئی۔ میں نے اُس کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں سنبھال کر اُس کی بند آنکھوں کو چوم لیا۔ اُس نے کوئی مزاحمت کی اور نہ اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔ مجھے شہہ ملی۔ محبت کی وارفتگی کے بَل پر حسن کی سلطنت میں گام بہ گام بڑھتا گیا۔ وہ نڈھال سی ہو کر میرے سینے سے آ لگی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ اُس کی سانسیں غیر معتدل تھیں۔ بلو کی طرح اُس کے بدن کو بھی گویائی نصیب ہوگئی تھی۔ میں نے اُس کے ہاتھ کی پشت کو لبوں پر لگایا، وہ غیر متوقع طور پر تڑپ کر دور ہوگئی، قدرے پھولی ہوئی سانسوں میں

بولی، ''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے شہرے؟''

میں نے پوری شدت سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

''تو نرا جھلا ہے۔''

''تو بھی تو جھلی ہے ناں!''

''تو کیا ہوا؟ یہاں سارے ہی جھلے ہیں۔ تمہیں کون سیانا دکھائی دیتا ہے؟'' وہ ایڑیوں کے بل پیچھے گھسٹ گئی۔

میں نے بات بدلنے کیلئے اُسے بتایا کہ میں ملکہ کو پڑھانے کے لیے ہر روز بخت خان کی حویلی پر جایا کروں گا۔ وہ متفکر ہو گئی۔ بولی، ''تم وہاں نہ جایا کرو۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''عائشہ بی بی بہت مغرور اور نک چڑھی ہے۔''

''مجھے اُس سے کیا مطلب؟'' مجھے حیرانی ہوئی، ''میں تو ملکہ کو پڑھانے کے لیے وہاں جاؤں گا۔''

''آتے جاتے ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔''

''اوئے جاپَرے! وہ یہاں نہیں، ملتان میں رہتی ہے۔''

''جانتی ہوں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ ہر جمعرات کی شام کو آتی ہے اور ہفتہ کی صبح کو جاتی ہے۔'' اُس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

''تو کیا ہوا؟'' مجھے اَبھی تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

''وہ سوہنی بھی بہت ہے۔'' اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ میں اُس پر فریفتہ ہو جاؤں گا۔ ہیں؟'' میں ہنسا۔

''ماسی فاطمہ کہتی ہے کہ مرد اور اونٹ کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کس کروٹ بیٹھ جائیں۔'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

''تم خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ وہ بڑی مغرور لڑکی ہے۔ وہ مجھے کیوں لفٹ کرائے گی؟''

ایسے ہی وقت میں اُس کی نگاہ بھانے پر پڑ گئی۔ اُچھل کر کھڑی ہوئی اور اُس طرف بھاگ گئی۔ میں نے اُس کے تعاقب میں بھانے کی طرف دیکھا۔ پروین کی لاڈلی بچھڑی رسی چھڑا کر اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہی تھی۔ بچھڑی کی آنکھیں غزالہ کی جولانی کو دیکھ کر تازہ دم ہو گئی

تھیں۔ وہ اپنی دُم کمر پر دہری کیے شرارت بھرے انداز میں اُچھل کود رہی تھی، دوڑ رہی تھی اور غزالہ اُسے پکڑنے کے لیے آوازیں دیتے ہوئے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بچپنا لڑکپن کے مقابل آ گیا تھا۔ بچپن شریر ہوتا ہے، لڑکپن مست ہوتا ہے، دونوں تھکنے کا نام نہیں لیتے۔ میں بڑے شوق اور انہماک سے دونوں کی بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ آخر کار بچھڑی اپنی ماں کی ٹانگوں میں پناہ گزیں ہونے کے جُرم میں پکڑی گئی۔

جب سبھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں تو میں وریام خان کے منشی کے پاس چلا گیا۔ اُس نے مجھے رات کو پانی باندھنے کا حکم صادر کیا۔ مجبوری تھی وگرنہ رات کو پانی لگانا میرے لیے بڑا تکلیف دہ کام تھا۔ تین گھنٹوں کے پانی کی ادائیگی کی اور واپسی کا قصد کیا۔

مجھے سہ پہر تک کوئی کام نہیں تھا۔ کپڑے بدل کر مزار کی طرف جا نکلا۔ مزار کے کھلے صحن میں کئی مرد و زن چلتے پھرتے اور ستانے کی غرض سے بیٹھے دکھائی دیے۔ کوئی مقبرے کی طرف جا رہا تھا، کوئی مقبرے سے نکل کر شاہ سائیں کی خدمت میں سلام عرض کرنے ہال کی طرف جا رہا تھا۔ میں بھی جوتے اُتار کر چادر پوش قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور قبر کی اطراف میں نصب شدہ خوب صورت ریلنگ کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔ تین چار پیشانیاں ریلنگ کے بالائی موٹے پائپ پر ٹکی ہوئی تھیں اور سسکیاں گنبد دار مقبرے میں چکرا رہی تھیں۔ دو عورتیں اپنے اندرونی کرب کو قبر نشین پر آشکار کرنے کی کوشش میں اپنے دل کا غبار ہلکا کر رہی تھیں۔ وہ نور پور کی نہیں تھی، میرا اندازہ تھا کہ وہ فرید آباد سے آئی ہوں گی۔ فرید آباد یہاں سے کوئی آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گاؤں تھا۔ وہاں ہمارے بھی چند رشتہ دار رہائش پذیر تھے۔

ناگاہ میری نگاہ قبر کے قدِ آدم مرمریں کتبے پر سر ٹکائے روتی ہوئی لڑکی پر پڑی۔ وہ بھی نور پور کی نہیں تھی۔ میں نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی عمر بمشکل اٹھارہ ہو گی۔ خوب صورت ایسی تھی کہ میں اُسے دیکھنے کے بعد اُس پر سے نگاہیں ہٹانے کی سکت خود میں مجتمع نہیں کر پایا تھا۔ بادامی رنگ کی ستارے دار چادر کے نیچے سیاہ، گھنگریالے اور لمبے بالوں نے اُس کی پشت کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس نے سر اُٹھایا، سیدھی ہوئی، ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور ریلنگ تھام لی۔ اُس کے ہونٹ رونے کی وجہ سے بہت زیادہ سرخ ہو رہے تھے۔ جی چاہا کہ اُس سے رونے کی وجہ دریافت کروں مگر ہمت نہ ہوئی۔

اُس کے لبوں سے ایک سسکی برآمد ہوئی، ''ربا! توں تے دِلاں دے حال جاندا ایں!''

(رہا! تم تو دلوں کے حالوں سے بخوبی واقف ہو)

نڈھال اور پژمردہ چال چلتی ہوئی الٹے قدموں مزار سے نکل گئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ اُن دو عورتوں کے ساتھ یہاں آئی تھی جو ریلنگ پر پیشانی ٹکائے ہولے ہولے سسک رہی تھیں مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میں مقبرے سے باہر نکلا تو میں نے اُسے ایک دس بارہ سالہ لڑکے کے ساتھ ہال کی طرف جاتے دیکھا۔ جھکا ہوا سر، سست رفتار اور اطراف سے یکسر بے نیازی.....وہ اِس حال میں بھی یکتا معلوم ہوتی تھی۔

اُسے کسی نے دُکھ دیا تھا۔ دُکھ کی نوعیت کیا تھی؟ علم نہیں تھا۔ تبھی میں غیر اختیاری طور پر جاننا چاہتا تھا۔

میں جب ہال میں داخل ہوا تو وہ پھولدار قالین میں لپٹے ہوئے سنگیں چبوترے کے پاس بیٹھ رہی تھی۔ ہال میں تیس کے قریب عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دل جیت شاہ پھسن دار تکیے کی ٹیک لگائے مسند پر نیم دراز تھا۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح متحرک تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ ایک عورت اور مرد، جو میاں بیوی دکھائی دیتے تھے، اُس کے پیروں کی جانب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

میں اُس لڑکی کے عین پیچھے جا بیٹھا۔ اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اُس کے ساتھ آنے والے لڑکے کے خال و خد نظر آ رہے تھے۔ با آسانی پتہ چلتا تھا کہ دونوں بہن بھائی تھے۔ دونوں کے نقوش میں بے حد مماثلت تھی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ تقریباً سبھی سر جھکے ہوئے تھے۔ اطراف کا جائزہ لینے کے بعد میری نظر سائیں دل جیت شاہ پر ٹک گئی۔

وہ جسیم، قوی الاعضاء اور اَدھیڑ عمر انسان تھا۔ سرخ و سپید رنگت، سیاہ اور چمکدار داڑھی جو یقیناً کلف شدہ تھی، سر پر بڑی سی سفید عمامے دار پگڑی اور ہاتھوں کی انگلیوں میں گوناگوں رنگ کے پتھروں والی انگوٹھیاں اُس کی شخصیت کو خاصا رعب دار بناتی تھیں۔ تسبیح، چرمی جلد والی ایک نوٹ بک اور بل دار چھڑی اُس کے پاس ہر وقت موجود رہنے والی اشیاء تھیں۔ ہال میں میرے بیٹھنے سے پہلے ہی بوڑھے میاں بیوی نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا تھا۔ اَب وہ دونوں سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔

سائیں نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا اور اپنی مخصوص بھرائی ہوئی آواز میں بولا، ''شیر علی! تمہاری نونہہ (بہو) پر اُس کی پھوپھی

نے کسی عامل سے جادو کروا رکھا ہے۔ وہ تمہارے بیٹے کو دل سے چاہتی ہے مگر جونہی دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، جادو اپنا کام دکھانے لگتا ہے۔''

شیر علی نے سائیں کے دونوں پیر تھام لیے، ''سائیں جی! آپ ہماری مدد کریں ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ وٹے کی شادی ہے۔ بہو گھر میں نہیں رہے گی تو بیٹی روتی ہوئی گھر آ جائے گی۔ اُس شودھی کے تو چار بچے بھی ہیں، رو رو کر مر جائیں گے۔''

شیر علی کی بیوی نے دوپٹے میں چہرہ چھپا لیا اور اُس کا جسم سسکیوں کی تال پر ہچکولے لینے لگا۔ وہ کوئی فریاد نہیں کر رہی تھی مگر اُس کا فرطِ کرب سے رونا ہی فریاد سے کم نہیں تھا۔

سائیں نے ایک نگاہِ جلال اُس پر ڈالی اور کہا، ''دُکھی نہ تھی میڈی بھین! اللہ سائیں بھلا کرے گا۔ تمہارے لیے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ یہ تعویذ لے جاؤ اور پانی میں گھول کر سات دن تک اپنی بہو کو باقاعدگی سے پلاؤ۔ پھر اِسی دن اُسے یہاں لے کر آ جانا۔ فکر نہ کرو، ہم اُسے دم بھی کر دیں گے۔''

اُس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے منقش پیالے میں انگلی ڈبوئی۔ کاپی میں رکھی ہوئی پرچیوں میں سے ایک باہر کھینچی، انگلی اُس پرچی کے بیچ میں رکھی اور اُسے تعویذ کی شکل میں لپیٹ دیا۔ پیتل کا یہ منقش پیالہ ہمہ وقت زعفران سے بھرا ہوتا تھا۔ شیر علی نے بڑے ادب سے تعویذ کو تھاما اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سائیں کے عقب سے گزر کر دونوں میاں بیوی چبوترے کی سیڑھیاں اُترے اور الٹے قدموں چلتے ہوئے ہال سے نکل گئے۔ سائیں نے 'حق ہُو' کا نعرہ بلند کیا، ارادت مندوں نے ساتھ دیا، پھر ہال نعرۂ تکبیر کی صدا سے گونج اُٹھا۔ سائیں جی نے پُرجلال انداز میں سب پر نگاہ ڈالی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میری مطلوبہ مریدنی اپنے بھائی کا ہاتھ تھام کر چبوترے پر چڑھی۔ مریدوں کے بیٹھنے کی مخصوص جگہ پر جا بیٹھی۔ سائیں نے آنکھیں کھولیں، دیکھا، پھر آنکھیں بند نہ ہو پائیں۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا، پھر لڑکے کو رسمی انداز میں دیکھ کر بولا، ''بول لڑکی! کس پریشانی میں ہے؟''

لڑکی کا سر جھک گیا۔ آنسو گرنے لگے، پھر ہچکیاں لینے لگی۔

دل جیت سائیں نے ڈانٹا، ''بولتی کیوں نہیں ہے تُو؟ کیا اپنا رونا دھونا دکھانے کے لیے یہاں آئی ہے؟''

وہ سہم گئی۔ بولی، ''سائیں جی.....''

آواز کانپ گئی۔ سر جھک گیا۔ سائیں نے ایک طائرانہ نگاہ ارادت مندوں پر ڈالی اور بڑبڑایا، ''لگتا ہے کہ لوگوں کی وجہ سے بتا نہیں پا رہی۔ اے لڑکی! تو ادھر حجرے میں جا کر بیٹھ جا۔ میں فارغ ہو کر اکیلے میں تیری بات سنوں گا۔''

لڑکی نے اُسے دیکھا، پیروں کو چھوا اور اُٹھ کر اپنے بھائی کی معیت میں حجرے میں چلی گئی۔ سائیں کے ہاتھ کے اشارے پر ایک اور آدمی اُٹھا اور سائیں کے پیروں میں جا بیٹھا۔ میں اُس کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اگر اُس سے ملے بغیر ہال سے نکلتا تو وہ تاڑ جاتا، اِس لیے میں نے بھی چبوترے پر جا کر پیر چھوئے اور دُعا کا طالب ہوا۔ وہ بولا، ''خان زادے! آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''ڈاکٹر منور شاہ کے ہاں کام سیکھ رہا ہوں۔ ساتھ میں ایم اے کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔'' میں نے ادب سے کہا۔

''نماز پڑھتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میرے لیے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر زیرِ لب کچھ پڑھنے لگا۔ پھر مجھ پر پھونک مار کر بولا، ''تم بڑے اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ بڑا وہی ہوتا ہے جو بڑوں کو بڑا سمجھتا ہے اور مرتبے کو مان کر ادب کرتا ہے۔ ادب عشق کا پہلا زینہ ہے۔ عشق کے بغیر انسان نامکمل ہوتا ہے۔ مجاز میں بھٹکتے بھٹکتے انسان حقیقت کا سراغ پاتا ہے۔ عشق انسان کو خدا کا دیدار بھی بخشتا ہے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ازراہِ گفتگو کہا، ''میں باادب ہوں، کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔''

اُس نے سر ہلایا، ''بہت اچھی بات ہے۔ کوئی مسئلہ درپیش آئے تو ہمارے پاس آ جانا۔ ہمیں اپنا بزرگ اور دوست پاؤ گے۔''

اُس کے انداز نے سمجھایا کہ مجھے اَب رخصت ہو جانا چاہیے۔ میں چونکہ ارادت مند کے رُوپ میں آیا تھا، اِسی روپ میں جاتا تو اچھا لگتا۔ اِس لیے میں الٹے قدموں ہال سے نکل آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے ٹہلانے کے بعد وہ اپنے حجرے میں جائے گا۔ میں پنجوں کے بل دوڑتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جھانکا مگر باریک جالی کی وجہ سے کچھ دیکھنے میں

کامیاب نہیں ہو پایا۔ میں کھڑکی کے نیچے، دیوار کی جڑ کے ساتھ کمر ٹکا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ مقبرے اور مہمان خانے کی دیواروں کی جڑوں میں کئی تھکے ہارے زائرین بیٹھے ستا رہے تھے، اِس لیے میرا وہاں بیٹھنا معیوب یا نامناسب نہیں تھا۔ میری تمام تر توجہ حجرے کے اندر ہونے والی گفتگو پر مرتکز تھی۔

حجرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، پھر بند ہوا اور دل جیت شاہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی، ''بچے! تم ادھر کمرے میں جا کر کچھ دیر بیٹھو۔''

حجرے کے اندر ایک اور کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر سائیں کی آواز سنائی دی، ''اب بتا لڑکی! تیرا مسئلہ کیا ہے؟''

لڑکی کی آواز بہت دھیمی تھی۔ پوری طرح اُس کا بیان کیا ہوا دکھڑا مجھے سنائی نہیں دیا مگر یہ پتہ چل گیا کہ اُس کا باپ اپنے بھتیجے یا بھانجے کے ساتھ اُس کی شادی کرنا چاہتا ہے جبکہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔

دل جیت شاہ کا لہجہ بھی غیر معمولی حد تک دھیما ہو گیا۔ دونوں کی کھسر پھسر مجھ پر گفتگو کا متن بھی واضح نہیں کر رہی تھی۔ میں نے بہتیری کوشش کی، جگہیں بدلیں مگر نا کام رہا۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ میں جہاں بیٹھا تھا، وہاں سے سایہ رخصت ہو گیا تھا اور سرما کے ابتدائی دنوں کی دھوپ بدن میں چبھنے لگی تھی مگر میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دیوار تھامے بیٹھا تھا۔ آخر مایوس ہو کر صحن میں ایستادہ نیم کے چھتری نما درخت تلے آن کھڑا ہوا۔

اَبھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ لڑکی اپنے خوب رُو بھائی کے ساتھ ہال سے برآمد ہوئی۔ دونوں میرے قریب سے گزر کر صحن کے شمالی گوشے کی طرف بڑھے جہاں تین چار سائیکلیں اور دو موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ لڑکی کے چہرے کو میں نے غور سے دیکھا تھا۔ وہ قدرے بہتر حالت میں تھی۔

وہ موٹر سائیکل پر آئے تھے۔ لڑکے نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، وہ اچھل کر پیچھے بیٹھ گئی اور دونوں مزار کا بڑا گیٹ عبور کر کے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے عقبی نمبر پلیٹ کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ موٹر سائیکل کا نمبر سینتیس چھیاسی تھا۔ یہ کوئی منفرد نمبر نہیں تھا مگر نمبر پلیٹ پر رقم کرنے کا طریقہ نیا تھا۔ نمبر پلیٹ بنانے والے نے تین کا ہندسہ بہت چھوٹا لکھا تھا جبکہ باقی تینوں ہندسے 'سات، آٹھ اور چھ' کافی بڑے لکھے ہوئے تھے۔ سرسری نظر میں نمبر

پلیٹ پر صرف 'سات سو چھیاسی' کے ہندسے ہی پڑھے جاتے تھے۔

جیت شاہ کے مزار پر بیسیوں ایسے افراد دکھائی دیتے تھے جن سے میں شناسا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ نور پور کے مضافاتی دیہاتوں سے یہاں منتیں ماننے اور مرادیں پانے کے لیے آتے تھے۔ جیت شاہ کی ارادت کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی میرے لیے اجنبی تھے۔ اُن کے لباس، انداز و اطوار سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لڑکی نے بادامی رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ یہاں، دیہاتی علاقوں میں کالی چادر، دوپٹے یا دیسی طرز کے شٹل کاک برقعے کا رواج عام تھا۔

کھالے کی ویگن کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے یہ وقت مشکل سے گزارا۔ جب ویگن اپنے اڈے پر پہنچی، میں اُس کے باپ کی دکان کے باہر چارپائی پر نیم دراز تھا۔ وہ ویگن سے اُتر کر سیدھا میری جانب آیا۔ ہاتھ ملانے کے بعد مستفسر ہوا، ''خیر تو ہے؟''

میں نے بے تابی سے پوچھا، ''سینتیس چھیاسی نمبر کی موٹر سائیکل کبھی دیکھی ہے علاقے میں؟''

اُس نے فی الفور نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا، ''ذرا ذہن پر زور دو۔''

اُس کے مطالبے پر میں نے نمبر دہرایا۔ یاد آنے پر سمجھایا، ''تین چھوٹا لکھا ہوا ہے جبکہ سات سو چھیاسی بڑے ہندسوں میں لکھا ہوا ہے۔''

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولا، ''ہوں! تو یہ بات ہے۔ سچ سچ بتاؤ، چکر کیا ہے؟''

میں نے کہا، ''تمہیں بتانے کے لیے ہی تو گھنٹہ بھر سے یہاں پڑا ہوا ہوں۔ تم پہلے بتاؤ، یہ نمبر کس کا ہے؟''

وہ بولا، ''یہ سجاول قریشی کی موٹر سائیکل کا نمبر ہے۔''

''وہ کون ہے؟'' میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میری توقع برلائی تھی۔

''یار تم بھی تو کچھ بتاؤ ناں، چکر کیا ہے؟''

''بکواس نہ کرو، سیدھی طرح بتاؤ، سجاول قریشی کون ہے، کہاں رہتا ہے؟'' میں نے ڈانٹا۔

وہ منہ بنا کر بولا، ''میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ چوک قریشی میں، ڈیرے والی سڑک پر تھوڑا

آگے جا کر ڈرائیور سائیڈ پر، کریانہ کی دکان کرتا ہے۔ چھوٹا قد، گنجا سر اور سانولا رنگ؛ میرے جیسا۔ بڑا خرانٹ اور بد دماغ انسان ہے۔''

اُس کی آنکھوں کی چمک ایک دم سوا ہوگئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، ''تم مجھے بچہ سمجھتے ہو کیا؟''

میں نے مسکرا کر کہا، ''نہیں بلکہ بوڑھا شیطان سمجھتا ہوں تمہیں۔''

اُس کی ہنسی میں طنز کی آمیزش ہوگئی۔ بولا، ''آج جب میں پھیرا لے کر واپس آ رہا تھا تو میں نے بلوچ نگر اور نوری چوک کے درمیان میں ان دونوں کو موٹر سائیکل پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

میں بے اختیار بولا، ''کن دونوں کو دیکھا تھا؟''

''وہی جن کو دیکھ کر تمہاری رال ٹپک رہی ہے۔''

''بکواس نہ کرو۔'' میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔ پھر میں نے مناسب جانا کہ اُسے تمام تر ماجرا کہہ سناؤں۔

میرے چپ ہونے پر بولا، ''وہ لڑکی بڑی نک چڑھی ہے۔ اُس کا نام عشرت ہے مگر گھر اور محلے میں سبھی 'عاشی' کہتے ہیں۔ اُس کے ساتھ آنے والا اُس کا بھائی تھا۔ وحید۔ بس دو ہی بہن بھائی ہیں۔ ماں کسی پرائمری سکول میں پڑھاتی ہے جبکہ باپ کے بارے میں میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ عاشی مظفر گڑھ کے کالج میں پڑھتی ہے جبکہ وحید چوک قریشی کے مڈل سکول میں پڑھتا ہے۔''

میں نے پوچھا، ''اس کا گھر کہاں ہے؟''

''تم نے دیکھ رکھا ہے مگر تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ وہ عاشی کا گھر ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا، ''شاہ جمال والی سڑک کی پہلی گلی کے آخر میں ایک دو منزلہ گھر ہے۔ یاد کرو؛ میرے ساتھ امجد ڈرائیور کے گھر گئے تھے ناں تم..... یاد کرو!''

''وہی جہاں تم جا کر تاش کھیلتے تھے؟'' میں چونکا۔

''ہاں..... اس کے سامنے والا گھر سجاول قریشی کا ہی تو ہے۔'' وہ بولا، ''میں عاشی کو دیکھنے کے لیے ہی تو امجد کی بیٹھک میں بیٹھ کر گھنٹوں تاش کھیلا کرتا تھا۔ وہ بے غیرت انسان مجھ سے دس پندرہ روپے اینٹھ لیتا تھا۔ ایک آدھ بازی جان بوجھ کے ہار جاتا، پھر مجھے ہراتا جاتا اور

میری جیب خالی کرتا جاتا۔''

میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی بات سن کر بے ساختہ مسکرا دیا۔ میں نے کہا، ''کیا عاشی نے لفٹ کرائی تھی تمہیں؟''

اُس نے منہ بنا کر نفی میں سر ہلایا، ''نہیں یار! وہ اونچی ہواؤں میں اڑتی تھی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؛ سائیں جیت شاہ نے اُسے کیا کہا ہوگا؟'' میں نے دلچسپی لی۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ اُسے کوئی وظیفہ بتایا ہو یا تعویذ وغیرہ دیے ہوں۔'' اس نے کچھ سوچ کر کہا، ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس نے دوبارہ آنے کا کہا ہو۔''

''تب تم نے کسی لڑکے کے ساتھ اُس کا میل جول دیکھا تھا، جب تم امجد کے ہاں جایا کرتے تھے؟''

''میں نے کسی کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اُن دنوں وہ سکول میں پڑھتی تھی۔ ماں کے ساتھ جاتی تھی، ماں کے ساتھ واپس آتی تھی۔ اب کالج جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مظفر گڑھ میں پلکیں جھکائے جاتی ہو اور کسی بے چارے، میرے جیسے کا دل مٹھی میں جکڑے واپس آتی ہو۔'' اُس نے کہا۔

ہم دونوں نے پروگرام ترتیب دیا کہ آنے والی صبح میں اُس کے ساتھ چوک قریشی جاؤں گا۔ وہ ملتان سدھارے گا اور اپنی اسما کو ایک نظر دیکھ آئے گا جبکہ میں ممکنہ حد تک عاشی کے بارے میں سن گن لوں گا۔ پہلے پھیرے کے بیچ میں کافی وقت فراغت کا میسر ہوتا تھا۔ کھالا عمومی طور پر یہ وقت اڈے والے ہوٹل پر اپنے پٹی بھائیوں سے گپ شپ اور 'چاء' کی عیاشی میں گزارا کرتا تھا۔

جب پروگرام طے پا گیا تو کھالے نے خوشامدگیں لہجے میں کہا، ''یار شہرے! ایک خط اور لکھ دو۔''

''لکھ کر تو دیا تھا؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''تو اُس کے جیسا اور لکھ دو ناں!'' وہ لجاجت سے بولا، ''ایسا کہ تھری ناٹ تھری کی گولی بن کر سیدھا سینے میں لگے اور دل میں سوراخ کر جائے۔''

''اور تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دے۔ ہیں ناں!'' میں نے لطف لیا۔

''لکھ دو، چاہے ایسا ہی ہو۔''

اُس کی منت سماجت پر میں نے حامی بھر لی۔ چونکہ اُس نے کھانا کھا کر ویگن کا پھیرا لے کر جانا تھا، اس لیے میں گھر آ گیا۔

شام کو بخت خان کی حویلی سے نکلا تو میرا رُخ ہسپتال کی طرف تھا۔ آج میں نسبتاً جلد ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پہنچ گیا تھا۔ اُسے لان میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر بولا، ''شہر یار! ڈسپنسر کے گھر میں گھاس کاٹنے والی مشین پڑی ہے، اُٹھالاؤ، مل کر گھاس کاٹتے ہیں۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ڈسپنسر کے کوارٹر کے دروازے پر دستک دی۔ اُس کی بیوی نے دروازے کے اندر سے پوچھا، ''کون؟''

میں نے اپنا نام بتایا اور آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ وہ گھر میں گئی اور مشین گھسیٹ لائی۔ دروازہ کھول کر، دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر بولی، ''یہ اُٹھا کر لے جاؤ۔ مجھ سے اُٹھائی نہیں جاتی۔''

میں نے مشین اُٹھائی اور لان میں آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی اُسے چلانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ نصف گھنٹہ کی مشقت رنگ لائی۔ لان خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ کٹی ہوئی گھاس کو ایک کونے میں ڈھیر کر کے مشین کو ڈاکٹر شاہ کی کوٹھی کے سٹور میں لا پھینکا۔ کٹی ہوئی گھاس خشک ہونے کے بعد ڈسپنسر کی بیوی کے کام آتی تھی۔ وہ 'لو' پر روٹیاں پکاتی تھی۔ لوگرم کرنے کیلئے یہ گھاس بہت مفید اور زود روایندھن ثابت ہوتی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میرے پسینے سے تر جسم کو ستائش بھری نگاہوں سے ٹٹولا، کہا، ''شہر یار! تم بہت لکی ہو۔ تمہاری تعلیم تمہارے ذہن کو مضبوط بنا رہی ہے۔ تمہاری کاشت کارانہ مشقت تمہارے بدن کو لوہا بنا رہی ہے۔ یقیناً تم دو دُنیاؤں میں بیک وقت رہنے والے انسان ہو۔''

''یہ دو دُنیائیں کہیں دو کشتیوں کی طرح مجھے پاٹ نہ دیں؟''

وہ مسکرایا، ''دریائی مزاج کو سمجھ کر قدم بڑھاتے رہو گے تو سفر تمہاری مرضی پر سر تسلیم خم کرے گا۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور کمرے میں آ کر کتابیں کھول بیٹھا۔ اسٹڈی سے فراغت کے بعد میں جب اُس کی کوٹھی سے نکلا تو اپنے تئیں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آنے والے دِنوں میں عاشی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُس پر کڑی نگاہ رکھوں گا کہ وہ کب شاہ سائیں کے ہاں آتی ہے، کیا کرتی ہے، وغیرہ۔ رات کو تادیر نیند نہیں

آئی اور میں عاشی سے راہ ورسم بڑھانے کے طریقوں پر غور کرتا رہا۔

علی الصبح میں تیار ہو کر کھالے کے پاس پہنچ گیا۔ شیدو کے ساتھ بطور معاون کنڈیکٹر چوک قریشی تک آیا۔ ویگن اڈے پر لگائی اور کھالے کو ملتان روانہ کرنے کے بعد ڈیرہ روڈ والے ویگن اڈے کی طرف نکل گیا۔ مجھے کھالے نے عاشی کی فیملی سے متعارف ہونے کا ایک نادر نسخہ بتا دیا تھا جس پر عمل کرتے ہوئے میں ٹہلتے ہوئے منیاری کی دکانوں کی طرف نکل گیا۔ ایک دکان پر سے میں نے ایک زنانہ ہار خریدا۔ یہ پیتل ساختہ تھا مگر عام نظر میں سونے کا مغالطہ دیتا تھا۔ موتیوں اور سنہرے دھاگے نے اِس کی خوب صورتی میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ ہار کو جیب میں ڈال کر میں استاد امجد کی گلی میں گھس گیا۔ دو منزلہ گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کچھ پیش و پس کے بعد میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ عاشی کے بھائی نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ شناسائی کی ایک لہر اُس کی آنکھوں میں پل بھر کو دکھائی دی پھر معدوم ہو گئی۔

میں نے پوچھا، ''مجھے پہچانا؟''

''آپ کو کہیں دیکھا تو ہے۔ کہاں؟ یہ ذہن میں نہیں آ رہا۔'' اُس نے الجھے الجھے انداز میں کہا۔

''تم نے مجھے سائیں جیت شاہ کے مزار پر دیکھا ہو گا۔ میں نے تمہیں اور تمہاری بہن کو وہاں دیکھا تھا۔ یاد آیا؟''

اُس کی آنکھوں میں سراسیمگی سمٹ آئی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا، ''آپ کو کیا کام ہے؟''

میں نے کہا، ''تم دونوں میرے سامنے سے گزر کر اپنی موٹر سائیکل کی طرف گئے تھے۔ میری سائیکل بھی وہیں کھڑی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد جب میں اپنی سائیکل نکالنے لگا تو میں نے ایک ہار عین اُسی جگہ پر پڑے دیکھا، جہاں تمہاری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہار تمہاری بہن کا گرا ہو گا۔''

وہ ہکلا سا گیا، ''مم..... مگر..... باجی نے تو.....''

ایسے ہی وقت میں اُس کے عقب میں دروازے کا ایک طاق تھوڑا سا ہلا اور ایک نسوانی آواز اُبھری، ''کیسا ہار بیٹا؟ میری بیٹی تو ہار پہنتی ہی نہیں ہے۔''

میں نے کہا، ''خالہ جان! میں نے ہار اُس وقت دیکھا تھا جب آپ کے بچے موٹر سائیکل پر

بیٹھ کر مزار سے نکل گئے تھے۔ مجھے نہیں علم کہ وہ ہار آپ کی بیٹی کا ہے یا کسی اور کا..... میں نے تو محض اندازہ لگایا تھا۔ مجھے تو ہار کی قیمت کا بھی اندازہ نہیں کہ وہ سستا ہے یا مہنگا۔ دیکھنے میں تو سونے کا لگتا تھا، اِس لیے اتنی محنت کر کے آپ کا گھر تلاش کیا ہے میں نے۔''

تجسس نے اُسے دروازے کی اوٹ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اُسے دیکھا۔ وہ ہاتھ بڑھائے ہار مانگ رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے ہار نکالا اور اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر ہار لوٹاتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''بیٹا! تم نے ناحق تکلیف کی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ میری بیٹی کا ہار نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ سونے کا نہیں، پیتل کا ہے۔ منیاری والی دکانوں پر ایسے جھوٹے زیورات عام ملتے ہیں۔''

میں نے مصنوعی شرمندگی کا مظاہرہ کیا۔ تکلیف دہی پر معذرت چاہی اور از راہِ گفتگو کہا، ''چونکہ میں نے آج تک سونا خریدا ہے نہ زیورات؛ اِس لیے میری نظر دھوکہ کھا گئی۔ میں سمجھا تھا کہ یہ بہت قیمتی ہوگا۔ اگر پتہ ہوتا کہ یہ معمولی نوعیت کا ہار ہے تو وہیں پڑا رہنے دیتا یا پھینک دیتا۔''

اُس نے مجھے سراہتی نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئی، ''بیٹھک کھول کر بھائی کو بٹھاؤ، میں چائے بنا لاتی ہوں۔''

میری مراد بَر لا رہی تھی۔ بظاہر میں نے معذرت چاہی۔ وہ بولی، ''نہیں بیٹا! کسی نیک ماں کی اولاد لگتے ہو، چائے پلائے بغیر نہیں بھیجوں گی۔ چل وحید! دَر کھول ناں بیٹھک دا!''

وحید اُس کے پہلو سے نکل کر اندر کی طرف بھاگ گیا۔ چند ثانیوں کے بعد اُس نے ڈرائنگ روم کا گلی میں کھلنے والا دروازہ کھول دیا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ چند لمحوں کے بعد میں بیٹھک میں تھا۔ کمرے کی آرائش سے ذوق اور نفاست جھانک رہی تھی۔

میں وحید کے ساتھ محوِ کلام تھا جب اُس کی ماں چائے کا کپ ٹرے میں رکھے بیٹھک میں آ گئی۔ اُس نے چائے میرے سامنے میز پر رکھی، بیٹھک کا بیرونی دروازہ بند کیا اور کرسی میں بیٹھ گئی۔ میں چائے پیتا رہا؛ وہ مجھے دیکھتی رہی اور مجھ سے میرا بائیو ڈیٹا پوچھتی رہی۔ پڑھا ہوں؟ کہاں تک پڑھا ہوں؟ آگے کیا پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟..... اُس نے چند ہی منٹوں میں اَن گنت سوالات مجھ پر کر دیے۔ اُس نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ بھی دریافت کیا اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد بولی، ''میں کبھی تمہارے گھر آؤں گی اور تمہاری بہن سے ملوں گی۔ تم

مجھے بہت اچھے لگے ہو۔''

میں اُس کی نگاہوں کو اچھا لگا تھا، وہ میرے دل کو بھائی تھی۔ ادھیڑ عمری میں بھی خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ ویسے بھی عاشی جیسی خوب صورت لڑکی کو جنم دینے والی ماں کو خوب رُو ہونا چاہیے تھا۔ چہرے پہ پھیلی معصومیت، لہجے میں غیر معمولی مٹھاس اور اپنائیت بھرے رویے نے مجھے اُس کا گرویدہ کر دیا تھا۔ پہلی ملاقات میں اُس کے نجی معاملات کو زیرِ بحث لانا اُسے چونکانے کے مترادف تھا اِس لیے میں خواہش کے باوجود اُس کے شوہر اور بیٹی کے بارے میں کچھ نہ پوچھ سکا۔ اُس کے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر زیادہ دیر بیٹھنا بھی معیوب اور بے محل تھا، اِس لیے بادلِ نخواستہ اُٹھنا پڑا۔

اجازت لے کر عاشی کے گھر سے نکلا اور دل ہی دل میں 'کھالا استاد زندہ باد' کا نعرہ لگاتے ہوئے ویگن کے اڈے کی طرف چل دیا۔ کھالے نے ہی مجھے عاشی کے دروازے پر دستک دینے کیلئے مضبوط جواز فراہم کیا تھا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اُس کا ذہن شیطان کی راجواڑی تھا۔ ہر مقفل دَر کی چابی اُس کے ہاں سے میسر آ جاتی تھی۔

آ کر ہوٹل کے ہماچے پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر دو چار ڈرائیور اکٹھے ہو گئے۔ اُنہیں کھالے کی کمی بُری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ آج کھالا اپنے وقت پر نہیں پہنچا۔ مجھے تشویش ہوئی۔ شیدو نے ویگن کی روانگی کا وقت ہونے کی اطلاع دی اور حسبِ عادت ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ہارن بجانے لگا۔ سواریاں خود کار معمول کے مطابق ویگن کی سیٹوں پر براجمان ہو گئی تھیں۔ اِس لیے ویگن کو اڈے سے نکالنا پڑا۔

مجھے ویگن سمیت نور پور میں ایک گھنٹہ ٹھہرنا تھا جو مجھ پر کٹھن ثابت ہوا۔ خدا خدا کر کے روانگی کا وقت ہوا اور میں نے ویگن نور پور سے نکالی۔ چوک قریشی والے ویگن اڈے پر پہنچا تو پتہ چلا کہ کھالا اَبھی تک نہیں پہنچا تھا۔ دل میں بے طرح کی کھد بُد ہونے لگی۔ اسما خان زادی تھی، اُس سے بعید نہ تھا کہ وہ کھالے کو کسی مصیبت میں ڈال دیتی۔ جوں جوں ویگن کی روانگی کا وقت قریب ہوتا جاتا تھا، میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ دل میں متعدد بُرے خیال آئے، ہر بار ''اللہ خیر رکھے'' کا جملہ بے اختیار دل سے دُعا بن کر نکلا اور لبوں پر مچل گیا۔

کھالا دکھائی دیا تو دل کو چین آیا۔ حسبِ سابق اُس کی چال اور چہرے بشرے سے عیاں جوش کی کیفیت نے مجھے اُس کے بتانے سے پہلے ہی سمجھا دیا کہ کھالے کی واپسی نہیں، بلکہ یہ

ٹارزن کی واپسی تھی۔ ہوٹل والے کو بلند آواز میں چاء کا آرڈر دینے کے بعد میرے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے گلہ کیا، ''اتنی دیر لگا دی تم نے کھالے اُستاد! کچھ تو خیال کرتے، دل میں برے برے خیال آ رہے تھے کہ کہیں جنگلی بلا حیدر خان کی کُڑکی میں نہ پھنس گیا ہو۔''

اُس نے اپنی مونچھوں کو بل دیا، کالر کھول کر گریبان کو کندھوں پر ڈالا اور فخر سے بولا، ''دھت تیرے بزدل کی، کھالا گیا تھا، ہاں کھالا..... کوئی نتھو خیرا نہیں گیا تھا کہ پھنس جاتا۔ سمجھو کہ بلی پھنس گئی ہے محبت کی کڑکی میں..... ہاں!''

میں نے اُسے تاؤ دلانے کے لیے منہ بنایا، ''ہونہہ! بلی پھنس گئی..... یہ بتاؤ، اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے؟''

وہ اردگرد دیکھ کر بولا، ''میں حسین آگاہی چلا گیا تھا۔ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگا، سوچا کہ کوئی تحفہ ہی لے جاؤں۔''

''پھر؟'' میں چونکا۔

''پھر کیا؟'' وہ بولا، ''کوئی شئے پسند ہی نہیں آئی۔''

میں نے کھوجتی نظروں سے اُسے گھورا، ''تمہارے پاس پیسے کتنے تھے؟''

وہ بولا، ''کل کے دو پھیروں کا سارا کیش میرے پاس تھا۔''

''خرچ کر دیتے تو خان کو کیا جواب دیتے؟'' میں نے کہا، ''وہ تو تمہاری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتا۔''

اُس نے ہاتھ نچایا، ''اوئے پروا نہیں۔ دمڑی کے لیے چمڑی کی قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔''

''یہ تو تمہارے جیسے کسی احمق انسان کا قولِ زریں لگتا ہے۔''

''یہ میرا اپنا قول ہے، بکواس نہ کرو اور کان کھول کر میری فتح یابی کا ماجرا سنو۔ دنگ رہ جاؤ گے۔'' وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

چائے سرو کر دی گئی۔ وہ چائے پینے کے ساتھ ساتھ مجھے دن بھر کی کارگزاری بتاتا رہا، میں انہماک سے سنتا رہا۔

وہ حسین آگاہی سے بے نیلِ مرام نکلا تھا۔ دل بوجھل سا تھا۔ محبوبہ کے پاس خالی ہاتھ جانے پر طبیعت پُر ملال تھی۔ اُس نے اپنے جیسے کسی ڈرائیور کو جا پھانسا۔ اُس کے پلان میں

ایک رکشے کی اشد ضرورت تھی۔ رکشا ڈرائیور کے ساتھ اُس نے اپنی مرضی کے مطابق سودے بازی کی اور اُسے لے کر کالج کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ رکشے سے چند قدموں کی دوری پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد اُسے اسما کی کار دکھائی دی۔ وہ اُس کے قریب سے گزر گئی۔ اُسے افسوس ہوا کہ جس کے لیے وہ اتنی مسافت طے کر کے یہاں پہنچا تھا، اُس نے اُسے ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ جلدی سے رکشا میں بیٹھا اور کار کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

سکولوں اور کالجوں میں چھٹی ہونے پر شہر میں گہما گہمی خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کھوئے سے کھویا چھلتا ہے تو لوگوں کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے مگر عاشقوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ رکشا کبھی کار کی دُم پکڑ کر چل نہیں سکتا مگر بے انتہا رش کی وجہ سے وہ کار کے ساتھ چپکے رہنے میں کامیاب رہا تھا۔ کھالے کی پُر اشتیاق نظروں نے اسما کی رہائش گاہ دیکھ لی۔ شہر کے پوش ایریا میں واقع کوٹھی کو دیکھنے کے بعد بڑے دو جزوی آہنی گیٹ پر دست کناں ہونے کی جرأت کھالے میں پیدا نہ ہو سکی۔ اُس نے رکشا ڈرائیور کو فارغ کیا اور زیبائشی پودوں سے لدی پھندی کوٹھی کے عین سامنے، سڑک کے دوسرے ہاتھ پر واقع فٹ پاتھ پر کافی دیر تک کھڑا رہا۔ مبادا کہ حسن کی جھلک ہی دکھائی دے، مگر وہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوا۔

اگر عام رہائشی علاقہ ہوتا تو بعید نہیں تھا کہ کھالا کوٹھی کے بارے میں مکمل جان کاری لے کر لوٹتا۔ وہ جدید طرز کی کالونی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک امیر زادہ وہاں سکونت پذیر تھا۔ کھالے کو احساسِ کمتری نے کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ حدود اربعہ، کوٹھی کا ایلی ویشن اور علاقے کا نام پتہ ذہن نشین کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ اُس کی بتائی ہوئی کہانی تمام ہو گئی۔ میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ عجیب جذبات آ گئیں قوسِ قزح رقصاں تھی۔ میں نے کہا، ''فرض کرو، وہ تمہارے سامنے آ جاتی تو تم اُسے کیا کہتے؟''

دل میں پلتے کئی حساس جذبے آنکھوں سے ہویدا ہو گئے، بولا، ''اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیتا۔''

میں ہنسا، ''پھر کیا ہوتا؟''

وہ بولا، ''وہی ہوتا جو منظورِ خدا ہوتا۔ اسما کی بات چھوڑو، اَب تم مجھے عاشی کے بارے میں بتاؤ۔ تم نے کیا تیر مارا؟''

میں نے بھی اپنی رام کہانی سنائی۔ وہ مسکرانے لگا، ''اگر میں تمہارے جتنا پڑھا ہوتا اور میرا رنگ روپ بھی تمہارے جیسا ہی ہوتا تو میں نے اُسے پٹا لینا تھا۔''

''کیسے؟'' میں متعجب ہوا۔

''عاشی کو اور کیسے؟''

میں نے ملامت انگیز نگاہوں سے اُسے گھورا۔ باتوں میں خاصی دیر گزر گئی تھی۔ ویگن کی سواریاں اشاروں کنائیوں سے کھالے کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

گھر پہنچتے ہی چاچا چراغ کی عدالت میں پیشی بھگتنا پڑی۔ میری عدم موجودگی میں میرے حصے کا زیادہ کام اُسے سرانجام دینا پڑتا تھا۔ بڑھاپے کے باعث زیادہ تھک جاتا تھا۔ تھکن غصے کا روپ دھار کر مجھ پر برس پڑتی تھی۔ میں نے بدقت تمام اُسے مطمئن کیا۔ ملکہ کو پڑھانے کے لیے شام کو بخت خان کی حویلی پر پہنچا تو بخت خان نے کہا کہ میں پڑھانے کے بعد کچھ دیر یہیں رہوں۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ اُس نے اور بھی چند لوگوں کو شام میں بلوا رکھا ہے۔ کوئی خاص معاملہ زیرِ بحث آئے گا۔

میں ملکہ کے کمرے میں ہی تھا جب نوکرانی نے آ کر کہا، ''خان جی تمہیں دارے پر بلا رہے ہیں۔''

میں نے اپنی گود میں رکھی ہوئی ملکہ کی کاپی صوفے پر رکھی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دارے کے خاص کمرے میں پہنچ کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ صوفوں پر ڈاکٹر شاہ جی، امیر نواز، کھالا اور مراد بخش دیوانہ براجمان تھے۔ میری حیرت کا سبب امیر نواز اور دیوانے کی وہاں موجودگی تھا۔

چائے کا دور چل رہا تھا۔ میں سب کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بھی بشیرے نے چائے لا رکھی۔

رسمی گفتگو کے بعد امیر نواز نے کہا، ''خان چاچا! میرا خیال ہے کہ بات شروع کی جائے۔''

بخت خان نے باری باری سب کو دیکھا پھر گھمبیر لہجے میں گویا ہوا، ''فرداً فرداً، اِس موضوع پر میری آپ تمام لوگوں کے ساتھ بات چیت ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ مل بیٹھ کر کوئی حتمی لائحہ عمل تیار کر لیا جائے۔ مشاورت کا عمل ہمیشہ کامیابی کی طرف بڑھاتا ہے۔ کیوں ڈاکٹر شاہ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

ڈاکٹر شاہ جی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ غیر فطری انداز میں سرد نگاہوں سے اُسے گھورتا

رہا۔

بخت خان نے بات جاری رکھی، ''یہ طے ہو چکا ہے کہ سائیں دل جیت شاہ کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ میں گزشتہ دو تین مہینوں سے اپنے طور پر نگرانی کر رہا ہوں، اِس کھوج میں ہوں کہ اُس کے کاروبار کی نوعیت مجھ پر کھل جائے مگر بے سود۔ اُس کے ہاں آنے والے لوگوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں کر سکا سوائے گاڑیوں کے نمبروں کے۔ میں نے گاڑیوں کے متعلقہ رجسٹریشن کے دفاتر سے رابطہ کیا۔ مختلف اوقات میں یہاں آنے والی گاڑیوں کی تعداد سات ہے۔ آج تک ساتوں گاڑیاں یہاں اکٹھی نہیں ہوئیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ رجسٹریشن والوں کے ریکارڈ کے مطابق اُن گاڑیوں کے مالکان کی فہرست یہ ہے.....''

اُس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے شیشے کے نفیس میز کی طرف اشارہ کیا۔ ایک آف وائیٹ کلر کی فائل پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر ہمیں دکھایا، بولا، ''مگر اَب اِن ساتوں مالکان کا گاڑیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی دو مرتبہ تو کوئی ان گنت مرتبہ بک چکی ہے۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ مجھے موجودہ مالکان تک رسائی حاصل ہو سکے مگر ایسا عملی طور پر ممکن نہ ہو سکا۔''

ہم سب پوری توجہ اور انہماک سے اُس کی بات سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا، ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں بڑے پیمانے پر کوئی دو نمبر دھندا ہو رہا ہے۔ غالب قیاس یہی ہے کہ یہ گینگ اسلحے یا منشیات کے کاروبار سے منسلک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم سب مل کر سراغ لگائیں اور نور پور کو بُرائی سے پاک کریں۔ چونکہ دل جیت شاہ کے ارادت مندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور لوگوں کی شعوری سطح بھی کم ہے، اِس لیے ہمیں سائیں پر بڑا مضبوط ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ محتاط ہو جائے اور ہمیں رسوائی کا شکار ہونا پڑے۔''

اُس نے ایک ذرا توقف کیا، سگرٹ سلگائی اور ڈاکٹر شاہ جی سے مخاطب ہوا، ''ڈاکٹر شاہ! آپ کیا کہتے ہیں اِس بارے میں؟''

ڈاکٹر شاہ جی نے صوفے میں پہلو بدلا اور قدرے مضطرب انداز میں بولا، ''بُرائی کی ایک سمت نہیں ہوتی، یہ چاروں طرف اپنے اثرات پھیلاتی ہے۔ شاہ سائیں لوگوں کی سادگی اور عقیدت سے بھرپور فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ نہ صرف لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے بلکہ

وہ کسی کرمنل گینگ کا مرکزی کردار بھی بنا ہوا ہے۔ میں پردیسی ہوں، آج یہاں، کل وہاں یا نہ جانے کہاں..... مگر نور پور آپ لوگوں کا مستقل بسیرا ہے۔ گاؤں تو گھر کے صحن کی طرح مقدس ہوتا ہے۔ اِسے پاک صاف رکھنا ہر فرد کا فرض ہے۔ میں اور کیا کہوں..... ماسوائے اِس کے کہ جیسے بھی ممکن ہو، کسی بھی قربانی کے عوض، جیت شاہ کی بیخ کنی کی جائے۔ مجھ سے جو ممکن ہوا، آپ کے لیے کروں گا بھلے نور پور میں میرا عارضی قیام ہی کیوں نہیں۔''

میں نے امیر نواز اور دیوانہ کے چہروں کو دیکھا جن کے مونھوں سے میں نے دل جیت شاہ کے خلاف کچھ نہیں سنا تھا۔ دیوانہ تو شاہ سائیں کا بیعت شدہ مرید تھا۔ سوال کرنا مناسب نہیں تھا، اِس لیے خاموش بیٹھ کر تیل اور تیل کی دھار کو دیکھنے پر ہی اکتفا کر رہا تھا۔ اپنی اپنی آرا پیش کرنے کا سلسلہ چھڑ گیا۔ امیر نواز بڑا پُر جوش دکھائی دے رہا تھا جبکہ میں، دیوانہ اور کھالا بڑے انہماک سے ڈاکٹر شاہ جی، بخت خان اور امیر نواز کی باتیں سن رہے تھے۔

چائے کا دوسرا دور چلا۔ کھالے نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے عاشی کی مزار پر آمد، جیت شاہ سے ملاقات اور میری حاصل کردہ معلومات کا قضیہ اپنے انداز میں پیش کر دیا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے ستائش بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا، ''مجھے یقین ہے کہ عاشی پر اَب کوئی جن بھوت عاشق ہوگا اور اُسے دورے پڑنے لگیں گے۔ وہ اپنے بڑوں کی حکم عدولیاں کرے گی، الٹی سیدھی باتیں کرے گی اور جیت شاہ کے کارندے بڑے مشاقانہ انداز میں عاشی کے بڑوں تک یہ سمجھاوا پہنچائیں گے کہ اس کا علاج محض دل جیت شاہ کے پاس ہے۔ عاشی کی نگرانی بھی ہمیں شاہ سائیں تک پہنچنے میں خاصی معاون ثابت ہو سکتی ہے۔''

سبھی نے تائید کی۔ بخت خان بولا، ''کیا جنوں بھوتوں کی کہانیوں میں کچھ بھی صداقت نہیں ہے؟''

ڈاکٹر شاہ جی نے محتاط لہجے میں کہا، ''جو لوگ جنوں کی عمل داری کو مانتے ہیں، وہ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، بہت سے واقعات کو دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں مگر اُن کے ہاں منطق اور سائنسی رویوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جن خدا کی مخلوق تو ہیں مگر وہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتے وہ بڑی مضبوط اور نہ جھٹلائی جانے والی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔''

امیر نواز متجسس ہوا، ''مثلاً؟''

''وہ کہتے ہیں کہ جن علاقوں تک پیروں کی پہنچ نہیں ہوئی، وہاں کبھی کوئی لڑکی جنوں کے زیرِ اثر نہیں آئی۔ یورپ سمیت دُنیا کا نسبتاً بڑا حصہ اِس کی مثال ہے۔ یہ لوگ کوہِ قاف کو جنوں، پریوں اور دیوزادوں کا مرکز بیان کرتے ہیں مگر وہاں ایسا کوئی مظہر آج تک سامنے نہیں آیا۔ ترقی یافتہ شہروں کی خوب صورت اور نازک اندام لڑکیوں تک بھی جنوں کی رسائی دیکھنے میں نہیں آتی؛ پھر کوئی وجہ بھی تو سامنے نہیں آتی کہ آخر دیہاتوں پر ہی یہ نادیدہ مخلوق حملہ آور کیوں ہے؟'' ڈاکٹر شاہ جی کے لہجے سے تأسف کا دبیز تاثر عیاں تھا۔

''رائی ہو تو اُس کو پہاڑ بنایا جاتا ہے۔ آخر کسی نہ کسی حد تک تو.....'' بخت خان نے کہا۔

''ان لوگوں کی کچھ پیش گوئیاں سچ بھی تو ثابت ہوتی رہتی ہیں، یہ کیا ہے؟'' دیوانے نے اپنا حصہ ڈالا۔

''جوا دو آدمیوں کے درمیان کھیلا جائے تو ایک کی جیت یقینی ہوتی ہے۔ فرض کیا کہ کسی عورت کو جیت شاہ پھونک مارتا ہے اور دعویٰ کرتا کہ اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ بچہ پیدا ہوگا یا نہیں پیدا ہوگا۔ اگر پیدا ہوتا ہے تو جیت شاہ کی بلّے بلّے ہو جائے گی۔ لوگ اس کے دعوے کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں گے اور اگر نہیں پیدا ہوگا تو بات دَب جائے گی اور قسمت کو موردِ الزام ٹھہرا دیا جائے گا۔ جیت شاہ مزید انتظار کرنے کا مشورہ دیتا رہے گا۔ سمجھاتا رہے گا کہ اَبھی کچھ دیر ہے، اندھیر میری دُعا سے ٹل جائے گا۔'' ڈاکٹر شاہ جی نے قدرے کھل کر کہا۔

کھالا استعجاب آمیز آواز میں بولا، ''تو کیا ان لوگوں کی دعا سیدھی عرش پر نہیں جاتی؟''

''ہر دعا عرش پر جاتی ہے۔ خدا ہر کسی کی سنتا ہے۔ وہ ہر ایک سے محبت کرتا ہے۔''

''مگر جو اُس کے پیارے ہوتے ہیں، ان کی جلد مراد پوری ہو جاتی ہے۔''

''کون اُس کا پیارا ہے؟ یہ تعین ہم کیسے کر سکتے ہیں؟''

''نشانیاں دیکھ کر..... آخر خدا بھی تو اپنی نشانیوں سے ہی دکھائی دیتا ہے ناں!'' میں نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر نشانیوں کو ہمیشہ آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھے بغیر دیکھا جائے تو سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ خدا نے اپنی جو نشانیاں بیان کی ہیں، وہ سائنس، منطق اور ذہنی استدلال پر پوری اترتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ماورائی یا غیر فطری نہیں ہے۔

یہاں جن نشانیوں کو بیان کیا جاتا ہے، جن کرامتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، اُنہیں عقیدت بھرا دل تو قبول کر لیتا ہے مگر وہ کسی بھی پیمانے پر، کسی بھی کسوٹی پر اپنی سچائی ثابت نہیں کر سکتیں۔ میں سائیں جگ جیت شاہ کو نہیں جانتا۔ میں نے دل جیت شاہ کو دیکھا ہے۔ مجھے اُس میں کوئی بھی ایسی نشانی دکھائی نہیں دی جو اُس کا اللہ سے قرب کا رشتہ آشکار کرتی ہو۔''

بہت دیر تک ڈاکٹر شاہ جی نے اِس موضوع پر ہمارے سوالوں کے جواب دیے اور ہمیں اَزحد مطمئن کیا۔ پھر یہ طے پایا کہ میں عاشی کی جبکہ کھالا اور امیر نواز جیت شاہ کی خفیہ نگرانی کریں گے۔ دیوانے کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ وہ بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات میں آنے والوں کو گھیرنے کا پلان ترتیب دے گا۔ اُسے تفویض کیا گیا کام مشکل تھا مگر بخت خان کو اُس کی ذہانت پر بھروسہ تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی معترض تھا کہ جب تک رات کی تاریکی میں آنے والوں کے عزائم کا علم نہ ہو، اُن کے طریقِ کار سے آگہی نہ ہو، تب تک اُنہیں گھیرنا کسی بھی لحاظ سے سودمند اور مناسب نہیں ہوگا۔ کمزوری مزاحمت کے بعد اُس کی بات مان لی گئی۔

بخت خان نے حویلی کے بیرونی دروازے پر سب کو الوداع کیا۔ مجھے روک لیا۔ مجھے کہنے لگا، ''شہرے خان! ملکہ بی بی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

میں نے ملکہ کی تعلیمی استبداد کے بارے میں بتایا۔ مطمئن ہو کر اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر مجھے تھما دیے۔ بولا، ''یہ رہی تمہاری ٹیوشن فیس..... مجھے تمہاری صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔''

میں نے غیر ارادی طور پر نوٹ گنے۔ سو روپے والے نوٹوں کی تعداد دس تھی۔

میں نے تعجب سے کہا، ''مگر خان جی! یہ تو بہت زیادہ ہیں۔''

وہ مسکرا کر بولا، ''میں کسی بے گانے کو نہیں، اپنے پتر کو دے رہا ہوں اور دِھی پتر کو دی جانے والی رقم کم یا زیادہ نہیں ہوتی۔''

میں نے پس وپیش کیا مگر اُس نے میری ایک نہیں چلنے دی بلکہ میرے ہاتھ سے نوٹ لے کر میری جیب میں ڈال دیے۔ کاشت کاری کے بعد یہ میری زندگی کی پہلی کمائی تھی۔ میں نے نوٹ چاچی کے ہاتھ پر جا رکھے۔ اُس کے پوچھنے پر میں نے اُسے بتایا کہ یہ رقم بخت خان نے مجھے ملکہ کو پڑھانے کی اُجرت کے طور پر دیے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

پھر اچانک، کچھ سوچ کر، اُس نے نوٹ میری طرف بڑھائے، بولی، ''شہرے پتر! تیری

پہلی کمائی پر میرا حق نہیں بنتا، جاؤ، اپنی بہن کے ہاتھ پر رکھو۔''

میں ہچکچا گیا۔ فرزانہ اور شانو نے بھی اپنی ماں کی تائید کی۔ بادلِ نخواستہ میں نے نوٹ لے کر پروین کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا، آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی اور لبوں پر کوئی بے صدا دُعا مچل گئی تھی۔ مٹھی بھینچ کر چند ثانیوں تک مجھے وارفتگی کے عالم میں دیکھتی رہی پھر 'بھائی' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پگلی خوشی کے عالم میں بھی رو رہی تھی۔ وہ لمحہ بڑا عجیب تھا کہ میرے اندر دیوانہ وار پدرانہ جذبات کو نمود دینے لگا تھا، میرے دل میں مامتائی محسوسات کی آبیاری کر رہا تھا اور میرے بدن میں وہ طاقت بھر رہا تھا جو کسی بھی انسان کو مقدس بھار اُٹھانے والا 'بھرا' بنا دیتی ہے۔ میں نے اُس کی پیشانی کو چوما، زُلفوں پر ہاتھ پھیرا اور دِلاسہ دیا۔

اُس نے آدھے نوٹ میری جیب میں ڈال دیے، آدھے چاچی کی اجازت سے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لیے اور بھاگتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔

کھانا کھانے کے بعد میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا۔ بغیر سوچے سمجھے میں نے کھال والے راستے کی بجائے گلی کا راستہ لیا۔ بخت خان کی حویلی والے چوک میں شفیع محمد کی دیوار کے پاس پہنچا ہی تھا کہ زَیناں کی مدھم سی پکار سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا، گلی کی نکڑ میں کھڑی دکھائی دی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے بلائے جانے کا مقصد پوچھا۔ اُس نے، جواب دیے بغیر، قریب آ کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس کے ہاتھ میں تہہ کیا ہوا سفید کاغذ دَبا ہوا تھا۔ مجھے یاد آ گیا، اُس نے وعدہ لیا تھا کہ میں اُس کا خط ڈاکٹر شاہ جی تک پہنچاؤں گا۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ عافیت تھی کہ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ یہ عجلت رقعہ تھاما اور بغیر کچھ کہے پلٹ کر تیز تیز چلتا ہوا اُس سے دور ہو گیا۔ میرا ارادہ بغیر کہیں رُکے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کا تھا مگر خط جیب میں ڈالتے ہی دِل میں اُسے پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ جانتے ہوئے کہ کسی کا خط پڑھنا غیر اخلاقی حرکت ہے اور اِس خط میں ماسوائے عشقیہ التجاؤں کے کچھ بھی ہونا متوقع نہیں تھا، میں اسے پڑھنے کی خواہش پر قابو نہ پا سکا اور کھالے کے گھر پہنچ گیا۔ کھالا اپنے کمرے میں موجود تھا۔ شکر ہوا کہ خالدہ سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔

میں نے لالٹین کی روشنی میں خط پڑھا۔ خط میں وہ تمام لذتیں، اظہار کی تمازتیں اور وصل کی

التجائیں موجود تھیں جو محبوب کی لاپروائی اور بے نیازی سے دل برداشتہ ہو کر کی جاتی ہیں۔ اپنی قلبی بے چینی کو عیاں کرنے کے بعد اُس نے لکھا تھا، ''آپ نے کہا تھا کہ انسان کو جس منزل کی طلب ہو، اُسے پانے کے لیے اُسے اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ میں نے آپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کی اور پہلے قدم پر ہی ٹھوکر کھائی۔ آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ناکامیاں کبھی حتمی نہیں ہوتیں، جزوی ہوتی ہیں اور ایک بڑی کامیابی کو جنم دیتی ہیں۔ میں بھی اُس گھڑی کی منتظر ہوں جب میری طلب میں حائل ناکامیاں کسی بڑی اور معتبر کامیابی کو جنم دیں گی اور آپ میرے وجود کو اپنی زندگی کا جزو بنانے پر رضامند ہو جائیں گے.....''

اُس کے باپ نے ہزاروں طالبوں کو پڑھایا تھا۔ وہ ایک مطلوب کو پڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے خوابوں کی تعبیریں کاغذ میں لپیٹ کر ڈاکٹر شاہ جی کی طرف روانہ کی تھیں۔ اَب اپنے بستر میں لیٹی خوابوں کی نئی بنت سے الجھ رہی ہوگی۔ چشمِ تصور میں اپنے محبوب کو خط پڑھتے اور سرِ تسلیم خم کرتے دیکھ رہی ہوگی مگر مجھے یقین تھا کہ اُس کی ہر التجا درِ قبول سے سر ٹکرا کر مایوس پلٹے گی۔ وہ ایک پتھر سے اَوس میں بھیگی پتیوں سے بھی نرم جذبات کا لمس مانگ رہی تھی جو سوائے احمقانہ خواہش کے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے کھالے کے شدید اصرار پر خط کے چند منتخب اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ وہ سنتا رہا، سر دھنتا رہا پھر انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے مخصوص اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''یار شہرے! ایک دم زبردست کُڑی ہے یہ زیناں..... کیا پٹاخہ قسم کا خط لکھا ہے اُس نے۔ تم نے ایسا ہی جاندار خط مجھے لکھ کر دینا ہے جو میں اسما کو دے کر آؤں گا۔''

میں نے کہا، ''فکر نہ کر اُستاد کھالے! تمہیں تو اپنے خالص بی پازیٹو خون کے ساتھ خط لکھ کر دوں گا جو آنکھوں کے راستے اُس کے دل میں اُتر کر پورے جسم میں پھیل جائے گا۔''

وہ متشکر نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر اچانک دانت پیس کر بولا، ''مگر میرے خون کا گروپ تو بی پازیٹو نہیں ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ تمہارے جیسے عاقبت نااندیش عاشقوں کے خون کا گروپ بدلتا رہتا ہے۔'' میں ہنسا۔

''کب بدلتا ہے؟'' وہ جز بز ہوا۔

''جب محبوبہ بدلتی ہے۔''

چند ساعتوں تک مجھے برانگیختہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر پٹڑی بدل گیا، بولا، ''مجھے تو زیناں بے چاری پر ترس آ رہا ہے۔ اُسے بھرے پُرے نور پور میں سے کوئی بانکا پسند ہی نہیں آیا۔''

''تو کیا تمہیں خط لکھتی؟'' میں نے گھورا۔

''کیا میں انسان نہیں ہوں، بانکا سجیلا جوان نہیں ہوں؟''

''تم میں یہ خوبیاں موجود نہیں ہیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ توقف کے بعد بولا، ''افسوس! اُس بیوقوف نے اگر دل لگانے کا ارادہ کیا بھی تو کس سے؟ اُس سے جس کو شاید اُس کی ماں نے بھی پیار سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا خیال ہے؟''

میں نے ڈانٹا، ''بکواس نہ کیا کرو۔ تم نہیں جانتے ہو کہ ڈاکٹر شاہ جی کتنا عظیم شخص ہے۔''

''ہونہہ! عظیم وزیم کچھ نہیں..... بس مغرور اور عقل سے فارغ انسان ہے۔ وہ زیناں جیسی خوب صورت اور سمجھ دار لڑکی کے قابل ہی نہیں ہے مگر اُسے دیکھو! وہ خود کو دُنیا سے بلند تر خیال کرتا ہے۔ واہ!'' وہ استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچا کر بولا۔

میں مسکرایا، ''اُس کا خیال غلط بھی تو نہیں ہے۔''

اس کی شکل سے عیاں تھا کہ اُس نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا مگر خاموش رہا۔ پھر جماہیاں لینے لگا۔

میں اُس کے گھر سے نکل کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دم چونک گیا۔ اپنی جھولی میں پھیلی ہوئی تصاویر کو بجلی کی سرعت کے ساتھ سمیٹنے لگا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اُس کی غیر معمولی عجلت کے باوجود اُس کے قریب پہنچ جاؤں گا؛ اِس لیے اُس نے مجھے دیکھتے ہی کچن میں جانے اور چائے بنا کر لانے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے ایک نظر اُس کے ہاتھوں میں دبی تصاویر کو دیکھا۔ عام نوع کی، چھ ضرب چار انچ سائز کی، رنگین تصویریں تھیں جن کی تعداد میرے اندازے کے مطابق دَس کے اوپر تلے تھی۔

میں پلٹ کر کچن میں چلا گیا۔ چائے بنا کر لایا، پیش کی، پھر پوچھا، ''شاہ جی! کس کی تصویریں دیکھ رہے تھے آپ؟''

''یہ میرے بچپن کی چند تصویریں تھیں جنہیں میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ کبھی جی

چاہے تو اپنے بچپن میں جھانک لیتا ہوں۔'' اُس نے کہا۔

''آپ تو پلٹ کر دیکھنے کو حماقت قرار دیتے ہیں۔''

''حماقت غیر انسانی عمل تو نہیں ہے۔''

''کیا آپ اپنا بچپن مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں!'' اُس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا، ''تصویریں میرے کسی راز کو آشکار نہیں کرتیں مگر میں پھر بھی اِنہیں دُنیا سے چھپا کر، تنہائی میں بیٹھ کر دیکھنے کا خواہاں ہوں۔''

میں نے کہا، ''میں بھی ایک راز آپ کے لیے اُٹھا لایا ہوں۔'' میں کہنا تو چاہتا تھا کہ 'اس راز کا لفظ لفظ عیاں ہے، حرف حرف پوشیدہ ہے۔ دماغ کی آنکھ سے دیکھا جائے تو طفلانہ لگتا ہے، دل کی آنکھ سے دیکھا جائے تو نظمِ حیات کو ایک محور سے منسلک رکھنے کا مضبوط جواز محسوس ہوتا ہے'..... مگر کہہ نہ پایا۔

میں نے جیب میں سے تہہ کیا ہوا محبت نامہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا، ''یہ لیجئے! ملاحظہ کیجئے۔''

وہ چند لمحے الجھی الجھی نگاہوں سے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا، پھر ہاتھ بڑھائے بغیر بولا، ''یہ کیا ہے؟''

''میں آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''پھر بھی!''

''اٹھا کر دیکھ لیجئے۔''

اُس نے ایک شکوہ بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور خط اُٹھا لیا۔ کھول کر پڑھا۔ میری متجسس آنکھیں اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ پر جمی ہوئی تھیں۔ جوں جوں پڑھتا جاتا تھا، رنگ بدلتا جاتا تھا۔ کبھی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کی بساط بچھ جاتی، کبھی ہونٹ بھنچ جاتے تو کبھی ایک زہر خندی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تیرنے لگتی۔ اُس نے خط پڑھنے کے بعد احتیاط کے ساتھ تہہ کیا اور جیب میں ڈال لیا۔ میرا قیاس غلط ثابت ہوا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ خط پڑھتے ہی پھاڑ کر پھینک دے گا اور مجھے ڈانٹے گا۔ مجھے اُس کے چہرے پر برہمی کے آثار دکھائی نہیں دیے تو مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے پوچھا، ''شاہ جی! کیا لکھا ہے اُس نے؟''

وہی سفاک اور زہر میں بجھی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ناچنے لگی، بولا، ''شہریار! تمہاری

پھوپھی تمہیں کیا لکھتی ہے؟''

میں ایک ذرا ٹھٹک گیا۔ جھینپ کر بولا، ''وہ تو بس ایسے ہی.....''

''ہاں! زیناں نے بھی بس ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں لکھ بھیجی ہیں، کوئی کام کی بات نہیں ہے اِس میں۔''

''کچھ تو لکھا ہی ہوگا؟''

''کیا تم نے یہ تحریر بغیر پڑھے مجھ تک پہنچائی ہے؟'' میرے سوال پر توجہ دیے بغیر اُس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

میں گڑبڑا گیا۔

وہ میری نگاہوں کی چوری کو پکڑ چکا تھا، بولا، ''شہریار! بعض جھوٹ بے مقصد نہیں ہوتے۔ یقیناً تم نے خط پڑھ لیا تھا۔ مجھ سے میرا ردِعمل دریافت کرنے کے لیے پوچھ رہے تھے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ بتاؤں تمہیں، کیا لکھا ہے؟ اِس میں لکھا ہے کہ اُس نے مجھے اپنا سب کچھ مان لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نہیں جانتی کہ 'سب کچھ' کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ محبت کا رُکھ آبیاری کا مسلسل عمل مانگتا ہے۔ خالی بالٹی کو دیکھ کر جڑیں مایوس ہو جاتی ہیں، پیڑ سوکھ جاتا ہے۔ ہاں! وہ بے چاری تو یہ بھی نہیں جانتی کہ جب پیڑ سوکھ جائے تو کیا ہوتا ہے؟..... چھاؤں روٹھ جاتی ہے۔''

اُس کا لہجہ دَم بہ دَم تغیر پذیر تھا۔ کہہ رہا تھا، ''اُس نے سوچ رکھا ہے کہ محبت ملاقاتوں، جذبوں کے تبادلے اور چوری چھپے دیکھنے دکھانے کے سادہ سے عمل کا نام ہے۔ میں اُس کے نزدیک تنہائی کا مارا ہوا شخص ہوں، محبت سے محروم رہا ہوں اور مجھے چاہنے والے کسی وجود کی اشد ضرورت ہے۔ وہ ہرگز نہیں جانتی کہ میرے ہاتھوں میں تھامی ہوئی بالٹی پانی سے محروم ہے۔ میں تھکا ہارا انسان ہوں۔ مجھے چھاؤں دینے والا شجر جب سیراب نہیں ہو پائے گا، تب سوکھ جائے گا اور پھر میں جو چھاؤں کا عادی ہو چکا ہوں گا، دھوپ میں جلنے لگوں گا۔ تب میرا کیا بنے گا؟ نہیں..... میں محروم ہوں، ٹھیک ہوں۔ مایوسی کا شکار ہو کر زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ تم اُسے کہہ دینا، مجھے دوسرا خط نہ لکھے۔ مانتا ہوں کہ منہ زور عمر میں ایسے الفاظ ترا شنا ناگزیر ہوتا ہے مگر وہ اُسے لکھے جو سیراب کار ہو، جو زندگی کا طلب گار ہو اور جسے سایہ کشا زُلف درکار ہو۔''

وہ شعلہ گماں تھا، جل بجھا اور راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اُسے بکھرا ہوا دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا

لگا۔ اُس کی آنکھیں بجھ سی گئی تھیں۔ اک نئے روپ میں میرے سامنے کھل گیا تھا۔ میں نے اُسے کبھی اتنا دل گرفتہ اور نڈھال نہیں دیکھا تھا۔ سر جھکائے، بہت دیر تک گم صم بیٹھا غیر محسوس آہیں بھرتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں چائے کے دوسرے کپ کا متقاضی ہو گیا۔ میں اُسے تنہا چھوڑ کر کچن میں چلا آیا۔

واپس کمرے میں آیا تو اُسے پہلی سی حالت میں سرافگندہ دیکھا۔ میں نے چائے پیش کی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا، میں اُسے دیکھتا رہا پھر کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ اُسے سنبھلنے میں کچھ وقت دستیاب تھا۔ آج پہلی مرتبہ میں نے اُسے عام انسان کے رُوپ میں دیکھا تھا اور سمجھ میں آیا تھا کہ اُس پر دُکھ، عشق اور جذبے اپنے عمیق اثرات چھوڑتے ہیں وگرنہ میں اُسے آج تک پتھر دل سمجھتا آیا تھا۔ وہ نامساعد حالات سے گھبراتا تھا، دل پر ہونے والی دستک پر مضطرب ہوتا تھا، نقاہت اور پژمردگی اُس پر مسلط ہوتی تھی مگر اُس کے پاس اپنے تاثرات چھپانے کا ہنر موجود تھا۔ وہ اپنے ردِعمل کو چھپا لینے کی قدرت رکھتا تھا۔

میں ڈاکٹر شاہ جی کی کوٹھی سے نکل کر گھر روانہ ہوا۔ اپنی گلی سے گزرتے ہوئے اچانک زیناں، عاشی اور ملکہ کے چہرے میری نظروں میں لہرا گئے۔ میں ناگاہ تھم گیا۔ سوچ میں پڑ گیا کہ اُن کی بے طرح کی یادداشتوں نے مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟ سمجھ نہ آئی۔ ایسی باتیں سمجھنے اور سمجھانے کی نہیں ہوتیں۔ دماغ سوچتا رہتا ہے، دل بغیر سوچے بھانپ لیتا ہے۔ مجھے بھی میرے دل نے جتلایا کہ میں کافی دِنوں سے اپنی عزیز از جان غزالہ کو فراموش کیے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کہا تھا کہ عشق ایسا رُکھ ہے جو سدا بہار آبیاری مانگتا ہے۔ میرے پیڑ کی جڑوں کی مٹی بے آب و گیاہ ہونے لگی تھی۔ میں غیر معتدل دھڑکنوں کو پہلو میں سنبھالے ہوئے پھوپھی کبریٰ کے دروازے کے سامنے رُک گیا۔

چوبی دروازے کی درزوں سے جھانکا۔ صحن میں لالٹین کی متحرک روشنی تھرک رہی تھی۔ کوئی لالٹین اُٹھائے صحن میں چل پھر رہا تھا۔ میں اِس انتظار میں کچھ دیر کھڑا رہا کہ لالٹین بردار سامنے آئے گی مگر وہ پھوپھی کبریٰ تھی یا غزالہ، کمروں کی اوٹ میں ہی رہی۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے دھکیل کر دیکھا۔ دروازے کی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ دونوں طاقوں کے بیچ میں ہاتھ ڈالا اور اپنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے چٹخنی کھول دی۔ دَبے پاؤں کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا نکڑ تک آیا۔ سر نکال کر صحن میں دیکھا۔ دل بلیوں اُچھل پڑا۔ وہ غزالہ ہی تھی

جو ایک ہاتھ میں لالٹین جبکہ دوسرے ہاتھ میں برتن پکڑے چولھے سے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے ہلکی آواز میں سیٹی بجا کر اُسے متوجہ کیا۔ وہ ٹھٹک کر دیکھنے لگی۔ پہچان کر اٹھلاتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ کچھ ہی دیر بعد لہراتی ہوئی لالٹین کمرے سے برآمد ہوئی اور سیدھی میری طرف چلی آئی۔

ایک سرگوشی فضا میں سرسرائی، ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اماں جاگ رہی ہے، دیکھ لے گی تو میری شامت آ جائے گی۔''

''دیکھنے کو جی چاہا، چلا آیا۔ کہتی ہو تو واپس چلا جاتا ہوں۔'' میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''مجھے دیکھ لیا ہے، اَب جاؤ۔ ورنہ اماں.....''

میں نے اُسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ ڈگمگائی اور سنبھلنے کی کوشش میں مجھ سے آن ٹکرائی۔

میں نے اُسے بانہوں میں جکڑتے ہوئے کہا، ''تم نجانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟ میں تمہیں دیکھنے اور ملنے کے لیے آیا ہوں، تمہاری دھمکیاں سننے نہیں آیا۔ بتاؤ! پھوپھو کس کمرے میں ہے؟''

اُس نے اپنا چہرہ میری چھاتی میں چھپا لیا اور ہاتھ کے اشارے سے کمرے کی نشان دہی کی۔ لالٹین کی ناکافی روشنی میں اُس کا حسن دکھائی نہیں دیتا تھا مگر بھائی دیتا تھا۔ میں چند لمحوں میں ہی بے خود ہونے لگا۔ خالدہ نے غزالہ کے بدن کو بولنا نہیں سکھایا تھا مگر مجھے سننا سمجھا دیا تھا۔ اُس کا بدن آنِ واحد میں زبان بن گیا، میرا پورا وجود کان بن کر جوانی کے پھوٹتے نغموں کی تال پر دھڑکنے لگا۔

ایسے میں وہ کراہی، ''اے! چھوڑو، مجھے کچھ کچھ ہو رہا ہے۔''

میں نے اُس کی زلفوں کو لبوں سے پَرے ہٹا کر کان میں سرگوشی کی، ''پہلے بتاؤ، کیا' کچھ کچھ' ہوتا ہے، پھر چھوڑوں گا۔''

''مجھے نہیں پتہ.....اَب چھوڑو بھی، ورنہ میں اماں کو آواز دے کر بلا لوں گی۔'' اس کی آواز مرتعش تھی۔

''بھلے بلا لو، میں کوئی ڈرتا ہوں اُس سے۔ تم میری منگیتر ہو۔ عنقریب بیوی بن جاؤ گی۔ پورا نور پور جانتا ہے۔''

''جب بیوی بنوں گی تب دیکھا جائے گا، اَبھی تو میری جان چھوڑو ناں!'' وہ کسمسائی۔

''چھوڑ دوں؟''

''ہاں تو!''

''دل سے کہو تو اَبھی چھوڑ دوں گا۔''

وہ کہنا چاہتی تھی مگر دل آڑے آیا۔ زبان پکڑی گئی۔

''بولو ناں!''

حسن کے دربار میں میری وارفتگی کی گستاخیاں برابر بڑھتی جا رہی تھیں اور اُس کی برائے نام مزاحمت بھی دَم توڑتی جاتی تھی۔ گزرنے کو تو شاید پانچ دَس منٹ گزر گئے تھے مگر یوں لگا جیسے وقت نے محض چند پلکیں ہی جھپکائی تھیں کہ پھوپھی کبریٰ کی تیز آواز ہمارے کانوں میں پڑی، ''اے کرماں ماری! کہاں مر گئی ہو، جاتی ہو تو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتی ہو۔''

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مجھ سے علیحدہ ہوئی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی، ''اس سے پہلے کہ اماں بے نقط سناتی ہوئی کمرے سے نکل آئے اور تمہاری شامت آ جائے، فوراً چلے جاؤ۔''

میں نے اُس کی بانہہ پکڑنا چاہی مگر وہ میرا ارادہ بھانپ کر لہراتی ہوئی دسترس سے نکل گئی۔ صحن کے وسط میں پہنچ کر پلٹی اور ہاتھ لہراتے ہوئے جانے کا اشارہ کرنے لگی۔ وہ میرے اور اپنی ماں کے بیچ میں حائل کھڑی تھی۔ ماں اپنی جانب بلا رہی تھی۔ میری لب بستگی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

ایسے میں ماں کی طرف منہ کر کے بولی، ''آ رہی ہوں اماں! سانس تو لے لیا کرو۔ میں چولھے سے راکھ نکال رہی ہوں۔''

پھر میری طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولی، ''کیا پتہ تھا، راکھ میں انگارے دَبے ہوں گے۔ ہاتھ کیا جلے، یوں لگتا ہے جیسے پورے جسم میں آگ جل اُٹھی ہو۔''

میرے لبوں پر زندگی ایک مسکراہٹ بن کر دم بھر کو اُبھری، پھر دل تک چلی گئی۔ میں نے ہاتھ لہرا کر باہر کا قصد کیا۔ اَبھی لعل خان کے دروازے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ اپنے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ مجھے گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی تھی اور چوروں کی طرح دیوار پھلانگنا ضروری ہو گیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں شب کے پچھلے پہر میں گھر کی عقبی کھڑکی سے نکل کر جیت شاہ کے مزار

کی طرف جاؤں گا اور سن گن لینے کی کوشش کروں گا مگر سویا تو پھر علی الصبح آنکھ کھلی۔ میں کمرے میں ہی نماز پڑھنے کا عادی تھا مگر اس دن میں سائیں جیت شاہ کے مزار کی طرف جا نکلا۔ ایسے ہی وقت میں مسجد کے اسپیکروں سے اذان کی روح افروز صدا پھوٹنے لگی۔ میں نے ٹینکی کے یخ بستہ پانی سے وضو کیا، مزار کے بائیں پہلو میں صحن کو 'صافے' کی مدد سے جھاڑ کر نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنائی اور خدا کے حضور سر بسجود ہو گیا۔

دعا مانگنے کے بعد مزار کے احاطے کا کھوجتی نظروں سے جائزہ لیا۔ یہاں کے باسیوں کی ابھی آنکھ نہیں کھلی تھی، صبح نہیں ہوئی تھی۔ سائیں دل جیت شاہ کی رہائش گاہ میں زندگی کی علامتیں ندارد تھیں۔ میں ٹہلتے ہوئے مشرقی دیوار تک گیا، پارکنگ کا سرسری انداز میں جائزہ لینے کے بعد پلٹ کر مغربی دیوار تک چلا گیا۔ دیوار کے پار جنگل میں جھانکا۔ پرندوں کو صبح کی خبر ہو گئی تھی۔ چہکاروں نے ماحول میں موسیقی بکھیر دی تھی۔ کافی دیر تک دیوار کی منڈیر پر ٹھوڑی ٹکائے درختوں کے بیچ نظریں جمائے کھڑا رہا۔ کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تھک کر پلٹا، سائیں کی رہائش گاہ کو خوابیدہ پایا تو سوچ میں پڑ گیا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے گزشتہ شام کو ہمیں مخاطب کر کے کہا تھا کہ نشانیوں کو کھلی آنکھ سے دیکھنا اور ٹٹولنا پڑتا ہے۔ ہرے شیشوں والی عینک کے پار ہر طرف ہرا ہرا ہی دکھائی دیتا ہے۔ صبح کی روئیدگی نے اُس گھڑی میری آنکھوں کو تازہ دَم رکھا تھا اور میری آنکھوں پر کوئی پٹی بندھی ہوئی نہیں تھی۔ یعنی میں منظر کے قلب میں پیوست سچائی تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

میں سائیں کی رہائش گاہ کی بیرونی دیوار تک گیا۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ نور پور کے تمام گھروں سے اِس وقت جھاڑو پھیرنے سے پیدا ہونے والی مخصوص آواز برآمد ہوتی تھی۔ عورتیں نماز سے فارغ ہوتے ہی صحن کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ دل جیت شاہ کی دو بیویاں تھیں۔ اندازے کے مطابق ایک دو نوکرانیاں بھی ضرور موجود ہوں گی مگر تا حال گھر سے جھاڑو کی مخصوص سرسراہٹ، برتنوں کی جھنکار، نلکے کا شور، بچوں کی چہکاریں..... کچھ بھی تو سنائی نہیں دیتا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی ٹھیک کہتا تھا۔ نشانیاں دیکھنے سے دکھائی دیتی ہیں۔ لوگوں کو علی الصبح جاگنے اور نماز پڑھنے کی تلقین کرنے والا خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ وہ راستہ دکھاتا تھا مگر خود اُس راستے کے برابر اپنا راستہ بنا کر چلتا تھا۔ میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ نور پور کے بڑے کہتے

تھے کہ سائیں جگ جیت شاہ دریائے سندھ کے پار سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ اُس نے اپنی نور پور کی زندگی نہایت عسرت اور مشقت میں گزاری تھی۔ ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا، محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ تب نور پور کی مسجد ایسی نہیں تھی۔ چکنی مٹی کی چار دیواری میں گھرا ہوا بے چھت احاطہ مسجد کہلاتا تھا جس میں سب سے پہلی صف سائیں جگ جیت نے کہیں سے لا کر بچھائی تھی۔ وہ اِس صحن کی صفائی کرنے کے بعد فجر کی اذان دیا کرتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اسپیکر کے بغیر ہی اُس کی جاندار اور دل کش آواز ساتھ کے دیہاتوں تک پہنچا کرتی تھی۔ وہ امامت کی سعادت بھی باقاعدگی سے حاصل کیا کرتا تھا۔

اُس نے علم کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ علی الصبح گاؤں کے تمام بچے اُس کے پاس قرآن پاک کا سبق لینے آیا کرتے تھے۔ سہ پہر میں وہ پھر سب کو بلوا لیا کرتا تھا۔ سائیں جگ جیت شاہ کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ اُس نے اپنی زندگی میں کسی سے نقد رقم کا تحفہ یا نذرانہ قبول نہیں کیا تھا۔ جب بھی کوئی بچہ قرآن پاک پڑھ جاتا، اُس کے والدین سلے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا، جوتے، لٹھے کی سفید پگڑی اور دیسی شکر کی بنی ہوئی مٹھائی لے کر سائیں کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ سائیں دو چار پیڑے اپنے اور اپنی بیوی بچے کے لیے رکھ لیتا، باقی اپنے شاگردوں میں بانٹ دیتا اور فارغ ہونے والے لڑکے کے حق میں خدا کے حضور دونوں ہاتھ پھیلا دیتا۔

اُس کی بیوی کے پاس نور پور کی لڑکیاں اور عورتیں پڑھا کرتی تھیں۔ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ کڑھائی سلائی کا کام بھی کرتی تھی۔ اِسی جگہ پر، جہاں جگ جیت شاہ کا مزار سر اُٹھائے کھڑا تھا، دونوں میاں بیوی ایک کچے کمرے میں سر جھکائے کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا، دل جیت؛ جسے سائیں جگ جیت نے بڑی محنت سے پڑھایا۔ چوک قریشی کے سرکاری سکول میں اُسے چھوڑنے جاتا اور خود سارا دِن وہاں پلے داری کرتا۔ جب دل جیت کو چھٹی ہوتی، وہ اُسے سائیکل پر بٹھا کر نور پور لے آتا۔

سائیں جگ جیت شاہ کی آخر دم تک معاشی حالت جوں کی توں رہی تھی۔ اُس کے بعد اُس کے بیٹے سائیں دل جیت نے اُس کی کچی قبر پر خانزادوں کی مالی معاونت کے ساتھ عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کر دی۔ مقبرہ، پھر رہائش گاہ، پھر مہمان خانے..... آج دل جیت کے پاس دُنیا کی ہر نعمت موجود تھی مگر مجھے اُس کے ہاں وہ نشانی دکھائی نہیں دی تھی جو اُس کے

باپ کی زندگی کے لمحے لمحے سے عیاں تھی۔ جس نشانی کا تذکرہ نور پور کے بڑے بوڑھے کرتے تھے، جن کی آنکھیں کورے کی ٹھٹھرتی راتوں میں بھی، جب وہ کھیتوں کو پانی لگا کر گھروں کو لوٹ رہے ہوتے تھے، خستہ حال حجرہ نما کمرے میں گھی کے چراغ کی روشنی میں سائیں جگ جیت شاہ کو خدا کے دربار میں جھکا دیکھا کرتی تھیں۔

دل میں شک جاگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل جیت شاہ بغیر بتی جلائے نماز پڑھ رہا ہو۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پارکنگ ایریا میں آیا۔ دیوار پھاند کر رہائش گاہ کے پچھواڑے پہنچا۔ برساتی پرنالے کی دونوں اینوں پر پیر ٹکائے اوپر اُٹھتا گیا۔ چند ہی منٹوں کی مشقت نے مجھے چھت پر پہنچا دیا۔ میں دو کمروں کی چھتوں کے بیچ کی ننھی سی منڈیر پر چلتا ہوا آگے بڑھا تا کہ میرے پیروں کی چاپ سے چھت میں دھمک پیدا نہ ہو۔ صحن کی سمت والی منڈیر کے پاس سینے کے بل لیٹ کر احتیاط سے صحن میں جھانکا۔ صحن سنسان تھا اور سبھی کمروں کے دروازے بند تھے۔ کمروں کی بتیاں بھی گل تھیں۔ اگر کوئی بتی روشن ہوتی تو دروازے کے نچلے حصے کا خلا روشن ہوتا۔

مجھے وہاں لیٹے ہوئے کافی دیر گزر گئی۔ سورج نے اپنا آپ دکھانا شروع کر دیا۔ پورا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے دھندوں میں رُجھ گئے تھے لیکن دل جیت شاہ کے گھر کے سبھی دروازے بند تھے۔ میں مایوس ہو کر چھت سے اُترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شمالی گوشے کا آخری دروازہ کھلا۔ میں محتاط ہو گیا۔ دیکھا، سائیں دل جیت شاہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ چیک دار دھوتی اور سفید رنگ کی بغیر بازوؤں والی بنیان پہنے وہ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ جماہیاں لیتے ہوئے، سلیپر کو کاہلانہ انداز میں فرش پر رگیدتے ہوئے سیڑھیوں کی مخالف سمت میں برآمدے کے آخر پر واقع غسل خانے کی طرف بڑھا۔ میں سرک کر پیچھے ہٹا اور جنوبی منڈیر پر سے لٹک کر دیوار کے ساتھ گھسٹتا ہوا زمین پر جا گرا۔

میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ کھلی آنکھوں دیکھ چکا تھا کہ سائیں دل جیت دِن چڑھے بیدار ہوا تھا اور اُس نے یقینی طور پر فجر کی نماز ادا نہیں کی تھی۔ یہ اچنبھے کی بات تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کہتا تھا کہ جو شخص پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اللہ اُس سے ناراض ہوتا ہے، راضی نہیں ہوتا اور وہ جس سے راضی ہوتا ہے، وہ تقویٰ اور عبادت شعاری کو اپنا وطیرہ بنا لیتا ہے۔ اپنے گھر میں بیدار ہونے والا پہلا شخص سائیں تھا جس کا واضح مطلب

یہی تھا کہ گھر میں علی الصبح بیدار ہونے کی روایت سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔

تاخیر کے سبب میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں نہیں جا سکا، اِس لیے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ زندگی کے معمولات کے ساتھ ساتھ نور پور میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں بھی میرے جلو میں چلتی آ رہی تھیں۔ میں سردار حیات خان اور وریام خان کے ڈیروں سے اُٹھ کر بخت خان کی چھتری تلے آن بیٹھا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا چلن دونوں وڈیروں پر سخت گراں گزر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُنہیں اپنے رویے پر بھی پچھتاوے کا احساس ہونے لگا تھا کیونکہ میں وریام خان کی گالیاں اور سردار حیات خان کا طمانچہ رخسار پر وصول کرنے کے بعد دونوں کے پاس ایک بار بھی نہیں گیا تھا۔ میں نے اپنے تئیں یہ طے کر لیا تھا کہ اَب میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ بخت خان، جو میرے سمیت پورے نور پور کی نظروں میں اکھڑ مزاج، بدتمیز اور کھری ٹائپ کا وڈیرہ تھا، ایک نئے روپ میں مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور خان لوگوں کی نظروں میں اَب بھی پہلے جیسے ہی تھے مگر میں اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ وہ انسانیت کے سچے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔

سردار حیات خان کو میرے غیاب (غائب ہونے) کے سبب کچھ مشکلات کا سامنا درپیش تھا۔ میں بغیر تنخواہ کا ملازم تھا جو اُس کے 'شعبہ اکاؤنٹس' کو سنبھالا کرتا تھا۔ اُس کے منشیوں کا ایک طرح کا سپروائزر تھا۔ اَب اُسے وہ سارا حساب کتاب خود کرنا پڑتا تھا جس سے اُس کی اب تک جان چھوٹی رہی تھی۔ اُس نے ایک دو مرتبہ مجھے بلوایا تھا مگر میں نے بڑے اَدب سے معذرت کر لی تھی جبکہ وریام خان کا غصہ اَنا کا رُوپ دھار گیا تھا۔ اُس نے مجھے بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تاڑ چکا تھا کہ وریام خان، حیات خان اور حیدر خان؛ تینوں وڈیرے ہی، بخت خان سے بگاڑ پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اِسی میں عافیت سمجھتے تھے کہ وہ اُن کے معاملات میں دخل نہ دے اور مقابل میں آن کھڑا نہ ہو۔

مجھے امیر نواز نے ٹیوب ویل کی پختہ حوضی میں نہاتے ہوئے سمجھایا تھا، ''شہرے خان! بابا کوئی آدمی نہیں ہے۔ چاچا وریام کچھ مختلف سوچ رکھنے والا خان ہے۔ ہاں! چاچا بخت خان تو فرشتہ ہے۔ ہمارا خاندان اُس کی مخالفت محض اُس کے خیالات کی وجہ سے کرتا ہے۔ میں ایسا نہیں کرتا۔ تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ بخت خان کا تھاما ہوا ہاتھ کبھی نہ جھٹکنا۔ وہ تمہیں انسان بنائے گا، چاچا وریام اور چاچا حیدر خان تمہیں بدمعاشی کے راستے پر لے جائیں گے۔ بخت

خان تم پر مہربان ہے، بعید نہیں کہ وہ تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملتان، لاہور یا کسی بھی بڑے شہر میں بھیج دے۔ دولت کے لحاظ سے وہ نور پور کے دوسرے وڈیروں سے کم تر ہے مگر ہاتھ کا سخی ہے۔''

میں نے اُس کی باتیں پلے سے باندھ لی تھیں۔ امیر نواز کی ایک خوبی مجھے پسند تھی۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ شراب پیتا تھا مگر آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ شکل وصورت میں یکتا تھا، جوان جہان تھا مگر نور پور کی کڑیوں پر میلی نگاہ نہیں ڈالتا تھا۔ جوانی کے تیز الاؤ والے شعلوں کے لیے اُس نے نور پور سے دور کئی سرد مورچے بنا رکھے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اپنی موج میں رہنے والا شخص ہے مگر بخت خان نے مجھے اُس کے بارے میں کہا تھا کہ امیر نواز کی جملہ خرابیوں اور خامیوں پر اُس کا انسان دوست رویہ پانی پھیر دیتا ہے۔

کھالے کی ہدایات سے سرفراز ہوتے ہوئے میں نے چوک قریشی پر بکثرت جانا شروع کر دیا تھا۔ عاشی کی گلی میں، مین روڈ کی طرف، منظور درزی کی دکان تھی۔ وہ اَدھیڑ عمر مگر جواں قلب انسان تھا۔ موسیقی اُس کی کمزوری تھی۔ اُس نے مظفر گڑھ کے کسی کاریگر سے بڑا سا ڈیک (دیسی ساختہ ٹیپ پلیئر) اور دو عدد جہازی سائز کے چوبی دھامے (اسپیکر باکس) بنوا کر دکان میں سجائے ہوئے تھے۔ اُس کے پاس فوک گلوکار عطاء اللہ خان کے اَب تک ریلیز ہونے والے تمام البم موجود تھے جو اُس نے اپنے دائیں ہاتھ پر رکھے ہوئے مقفل چوبی ریک میں ترتیب وار رکھے ہوئے تھے۔ سرائیکی اور اردو گیتوں کا اتنا بڑا ذخیرہ میں نے اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے ایک سوٹ سلائی کے لیے دیا اور راہ ورسم پیدا کر لیے۔

اُس نے علاقائی رواج کے مطابق مجھ سے میرا شجرہ نسب دریافت کیا۔ وہ میرے باپ کا واقف کار نکلا۔ نور پور کے اکثر بڑوں کو جانتا تھا۔ دُکھ آمیز لہجے میں بولا، ''ہائے! کیا جوانی تھی سوہنے خان کی..... پر بھو کی زمین اُسے چاٹ گئی۔ بڑا گرم خون ہوا کرتا تھا اُس کا، اِدھر کوئی بات ہوئی، اُدھر اُس کا ہاتھ گھوم گیا۔ طاقت بھی تو سوہنے رَب نے اُس کے وجود میں بہت بھر رکھی تھی ناں.....''

''کیا وہ تم سے کپڑے سلوایا کرتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کہنے لگا، ''سوہنا تو ہر عید پر میرے پاس ہی آیا کرتا تھا۔ بڑا نخرہ تھا اُس کے ذہن میں۔ اُس موئے دیوانے شاعر کے کام سیکھنے سے پہلے نور پور کے سبھی لوگ میرے پاس آیا کرتے

تھے۔ اِسی بہانے گاؤں کے حالات کا بھی پتہ چلتا رہتا تھا۔ اَب میرے پاس کوئی نہیں آتا۔ بڑے عرصے کے بعد تمہاری شکل دیکھی ہے۔''

میں نے کہا، ''میں بھی اُسی سے کپڑے سلوایا کرتا تھا۔ اب وہ نخرے دکھانے لگا ہے۔''

ماں کے دل میں جگہ بنانے کے لئے اُس کی اولاد کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ میں نے بھی منظور درزی کے ہنر کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اُس کے موسیقی کے شوق کو سراہا، عطاء اللہ کو دُنیا کا سب سے زیادہ سُنا جانے والا فوک گلوکار قرار دیا اور یوں دوسری ملاقات میں ہی ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔

عاشی کا گھر اُس کی دکان سے تقریباً سوسوا سو فٹ کے فاصلے پر واقع تھا۔ چوک قریشی چونکہ بڑا شہر نہیں تھا، بلکہ اَبھی پوری طرح قصبہ بھی نہیں بنا تھا، اِس لیے منظور درزی یہاں کے باسیوں کو فرداً فرداً جانتا تھا۔ کون کیا کرتا ہے؟ کیسا ہے؟ اُسے کیسا ہونا چاہیے؟ وہ جانتا تھا اور کے ٹو فلٹر سگرٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے اظہار بھی کرتا جاتا تھا۔

میں آدھے دن کا بیشتر حصہ اُس کے پاس گزارنے لگا۔ اپنا سوٹ سِل جانے کے بعد بھی دکان پر آمد و رفت کا میں نے جواز یہ پیش کیا تھا کہ مجھے آدھا دن ویگن کے سلسلے میں چوک قریشی میں رہنا پڑتا تھا۔ میں ڈرائیوروں کی صحبت پسند نہیں کرتا تھا اور آوارہ گردی کرنے کی بجائے اُس کے ہاں آ بیٹھتا تھا۔ اُس نے میرے خیالات کی تعریف کی اور کھلے دل سے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت مرحمت کر دی۔

میں اُس سے عاشی کے خاندانی معاملات پر گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر جھجک آڑے آ جاتی۔ میرا کام وحید نے آسان کر دیا۔ اُس نے گلی میں سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھ کر پہچان لیا۔ 'بھائی جان' کہہ کر مخاطب ہوا اور اپنے گھر لے جانے پر بضد ہوا مگر میں نے اُسے ٹال دیا۔ اُس کے جانے کے بعد منظور نے پوچھا، ''تم سجاول کے بیٹے کو جانتے ہو؟''

میں نے کہا، ''ہاں! اِس محلے میں امجد ڈرائیور کو بھی جانتا ہوں۔ کبھی کبھار اُس کے ہاں آیا کرتا تھا، گلی میں آتے جاتے وحید سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔''

ہم اَبھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ وحید دوبارہ پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کا اعادہ کیا۔ میں بظاہر طوعاً و کرہاً اُس کے ساتھ چل پڑا۔ دکان سے نکل کر اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں نے مجھے بلوایا تھا۔

عاشی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا دوسرا اتفاق تھا۔ حسبِ سابق اُس کی ماں چائے بنالائی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی، ''میرے بیٹے نے جب تمہارے بارے میں بتایا کہ تم بھائی منظور کی دکان پر بیٹھے ہو تو میرے دل میں تم سے ملنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟''

ہماری ثقافت کا ایک اہم جزو 'حال دینا' ہے۔ ملنے والے اپنے ہر متعلقہ شخص کا فرداً فرداً نام لے کر اُس کا احوال بیان کرتے ہیں۔ اختصار کو بے رُخی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ پروا نہیں کی جاتی کہ اِس 'حال دینے' کے عمل میں کتنا وقت برباد ہوتا ہے۔ وہ چونکہ پڑھی لکھی خاتون تھی، اِس لیے میں نے مختصر طور پر حال بیان کیا۔ اُس سے اُس کے شوہر اور بیٹی کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ بولی، ''عاشی کے ابو کو بلب کی روشنی میں الوداع کرتی ہوں، بلب کی روشنی میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ رہی عاشی، تو وہ آدھا دن کالج میں گزار کر آتی ہے تو پڑھنے بیٹھ جاتی ہے۔''

وحید بولا، ''آپ بھی تو آدھا دن سکول میں لگا آتی ہیں۔''

میں نے پوچھا، ''عاشی کو پڑھا کر استانی لگوانے کا ارادہ ہے؟''

وہ بولی، ''ہاں پتر! ارادہ تو یہی ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ بھی اپنے منہ سر جوگی ہو جائے گی۔''

ہمارا خاندان لڑکیوں کی پڑھائی کو بادلِ نخواستہ قبول کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ نوکری کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی کمائی کو بُرا بلکہ حرام خیال کیا جاتا تھا مگر اِس طرف دھیان نہیں جاتا تھا کہ سبھی بالواسطہ طور پر لڑکیوں کی کمائی کھا بھی رہے تھے۔ چونکہ عورتیں اور بچیاں کھیتوں میں باقاعدگی سے جایا کرتی تھیں اور کام کاج میں اپنے گھر کے مردوں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔ اس طرح وہ گھر میں آنے والی آمدنی کی حصہ دار ہوتی تھیں۔ چارے کی من ڈیڑھ من کی گٹھڑی سر پر لادنا معیوب خیال نہیں کیا جاتا تھا، دو چار کتابوں اور ایک ہینڈ بیگ کا وزن بُرا سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی عموماً کہا کرتے تھے کہ ہمارے معاشرے میں منافقت اس حد تک رچی بسی ہے کہ اِسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''ہم تو بیٹیوں کی نوکری کو اچھا نہیں سمجھتے خالہ جان!''

وہ ایک ذرا مسکرائی، نرم لہجے میں بولی، ''تم ٹھیک کہتے ہو مگر جس چیز کو تم آسانی جھیل سکتے ہو، میں نہیں جھیل سکتی۔ تم یہ گوارا کر لیتے ہو کہ تمہاری بہن یا بیٹی تمام عمر کسی کی غلامی کرتی رہے، دستِ سوال دراز کیے پائتی کی جانب ایک ٹانگ پر کھڑی رہے، اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں

کے لیے جھڑکیاں سنتی رہے..... جب، اور جس کا جی چاہے، مار پیٹ کر گھر سے نکال دے اور وہ بھائیوں کے در پر، بھابیوں کے رحم و کرم پر بیٹھ جائے، تاعمر آنسو بہاتی رہے، اُس کے فیصلے کیے جائیں اور اُس سے پوچھا تک نہ جائے۔ ہاں! تم لوگ یہ بھی گوارا کر لیتے ہو کہ اپنی اُجڑ کر آئی ہوئی بہن کو اُس کے چار پانچ بچوں سمیت تمام عمر پالتے رہو، اپنی قسمت کو کوستے رہو اور اسے جیتے جی درگور رکھو مگر میں یہ دُکھ نہیں جھیل سکتی۔"

میں متعجب ہوا، "میں سمجھا نہیں خالہ جی!"

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی، "سمجھنے کی کوشش کرو گے تو سمجھ میں آ جائے گا۔ میں ایک دوسرے انداز سے بتاتی ہوں۔ وحید کے ابو بہت جذباتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کئی سال پہلے، ایک مرتبہ مجھے معمولی جواز پر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اُن کا مؤقف تھا کہ میں سکول میں پڑھانے جاتی ہوں۔ لوگ مجھے دیکھتے ہیں۔ عورت، جس کی جوانی کو لوگ آتے جاتے ہوئے دیکھیں، وہ گھر میں رکھے جانے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ وحید کے ابو کا قول تھا۔"

چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا، "اُس وقت عاشی میری گود میں تھی۔ میں اُسے لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ ایک سال وہاں رہی۔ چونکہ میری تنخواہ معقول تھی، میں کسی پر بوجھ نہیں تھی بلکہ میرے والدین کو میرے وہاں رہنے سے مالی معاونت حاصل ہو گئی تھی، اِس لیے مجھے اکڑ کر بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ وحید کے ابو کی ضد ایک سال میں ہی اپنی موت آپ مر گئی۔ برادری نے منت سماجت کی، بڑوں نے اُنہیں برا بھلا کہا اور میں بڑے ناز و نخرے سے واپس اِس گھر میں آئی۔ وہ دن گیا، آج کا آیا، اُنہیں جرأت نہیں ہوئی کہ مجھ پر ہاتھ اُٹھاتے یا گالی دیتے۔"

میں انہماک سے اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس نے کچھ توقف کیا، میرے تاثرات کو بھانپنے کی کوشش کی، پھر بولی، "میں اِس گھر کی آدھی مالک ہوں۔ میں کیوں اُن کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، چند روپوں کی خاطر خوشامدیں کروں، وہ اپنے حصے کا کام کریں اور میں اپنے حصے کا کام کروں۔"

میں اُس کی باتیں سمجھ رہا تھا۔ سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے جھگڑالو ہونے کے باوجود کس برتے پر اتنی بے باکی سے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیتی ہے۔

وہ کہہ رہی تھی، ''عاشی میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اِسے اپنے خون سے پال کر جوان کیا ہے میں نے۔ اس کی پھوپھیوں نے آج تک اُنگلی تانے رکھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بے حیا ہو جائے گی، پَر لے شہر جا کر آوارہ اور بدچلن ہو جائے گی کیونکہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو پڑھانا اور نوکری کرانا بے غیرتی قرار دیا جاتا ہے۔ میں نے ان کے ابو کو باور کرا دیا کہ جو کام بیوی کر سکتی ہے، وہ کام بیٹی بھی کر سکتی ہے۔ وہ مان گئے۔ اَب جب وہ پڑھ لکھ گئی ہے اور اللہ نے چاہا تو عن قریب سی ٹی کر کے کسی سرکاری سکول میں استانی لگ جائے گی تو اُنہی پھوپھیوں کی رال ٹپکنے لگی ہے۔ جو کل تک آ کر حال نہیں پوچھتی تھیں، اَب صبح و شام وحید کے ابو کے پیر دھونے لگی ہیں۔ بیٹوں کے لیے رشتہ مانگنے لگی ہیں۔ اُن کا دل بھی بہنوں کے لیے پسیجا ہوا ہے مگر مجھے پروا نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میری بیٹی ہے، میں جس کے ساتھ چاہوں، نکاح میں باندھ دوں۔ میں کہتی ہوں کہ وہ آپ کی نہیں، میری بیٹی ہے۔ آپ اپنا استحقاق اپنے بیٹے پر جتائیں، میں اپنی بیٹی پر.....''

میری تمنا پوری ہو رہی تھی۔ جو میں پوچھنا چاہتا تھا اور پوچھنے سے جھجکتا تھا، وہ اَز خود مجھے بتلا رہی تھی، ''اُن کے بھانجے اور بھتیجے اَن پڑھ ہیں یا بہت کم پڑھے ہیں۔ اُن کے رویے بھی میرے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ میں اپنی مرضی کروں گی، کسی باشعور اور سلجھے ہوئے بندے کو اپنی دِھی کی بانہہ تھماؤں گی۔''

میں نے محتاط انداز میں کہا، ''ہونا تو پھر یہ چاہیے کہ آپ بھی اپنی مرضی نہ جتائیں بلکہ اپنی بیٹی کو انتخاب کا حق تفویض کریں۔''

وہ جھٹ سے بولی، ''کیوں نہیں! میں یقیناً ایسا ہی کروں گی۔ وہ جسے چاہے گی، اگر وہ اُس کے لائق ہو گا میری نظر میں، تو میں اُس کے انتخاب کو قبول کروں گی۔''

''کوئی ایسا سامنے آیا؟''

''نہیں۔ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔''

دوسری ملاقات میں ہی وحید مجھ سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ بہت با اخلاق اور عام لڑکوں سے جُدا مزاج رکھنے والا لڑکا تھا۔ اپنی انہی عادات کے سبب مجھے بہت اچھا لگا۔

میں جب اُن کے ڈرائنگ روم سے نکل کر منظور درزی کے پاس آیا تو اُس نے چھوٹتے ہی پوچھا، ''بڑی دیر لگا دی جوان! خیر تو تھی؟''

میں نے اُسے مطمئن کیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے امجد ڈرائیور کی نظر بھی مجھ پر پڑی۔ اُس نے گھر چلنے کا حکم صادر کیا۔ میں نے تھوڑی پس وپیش کے بعد حکم مان لیا اور اُس کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ ایک ہی دِن میں مجھے عاشی کے بارے میں مطلوبہ معلومات حاصل ہوگئیں مگر اُس لڑکے کے بارے میں پتہ نہیں چلا جس کے ساتھ اُس کا 'معاشقہ' چل رہا تھا۔ اَبھی یہ طے بھی نہیں ہوا تھا کہ کیا دونوں کے بیچ استوار ہونے والے تعلق کو معاشقہ کہا جاسکتا تھا یا نہیں۔ دیکھنے والے تو لڑکے لڑکی کو اکٹھے کھڑے یا باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ہی 'پریمی جوڑا' قرار دے دیتے ہیں۔

میں دوپہر کو ویگن پر کھالے کے ساتھ بیٹھ کر یا شیدو کے ساتھ پائیدان پر لٹک کر نور پور لوٹ آتا تھا۔ کھالے کو اپنی پیش رفت سے آگاہ کرتا اور راہنمائی حاصل کرتا۔ وہ بڑے کام کے مشورے عنایت کرتا تھا۔ مجھے بعض اوقات حیرانی ہوتی کہ اُس نے اتنی چالاکیاں اور نفسیاتی الجھنوں کے فوری سلجھاوے کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔ اُس کی ہر ترکیب کائیاں ہوتی، ہر تدبیر ثمر بار ثابت ہوتی اور ہر تیر نشانے پر جا لگتا تھا۔

منظور درزی کے ہاں آمد ورفت کے مختصر دورانیے میں عاشی ایک مرتبہ مجھے دکھائی دی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کے دو جزوی برقعے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اِس نوع کے برقع کو یہاں 'امبریلا برقع' یا 'فیشنی برقع' کہا جاتا تھا۔ اِس کے مقابلے میں سفید رنگ کے شٹل کاک برقعے کو 'دیسی' یا 'ٹوپی والا برقع' کہا جاتا تھا جو یہاں زیادہ رائج تھا۔

عاشی کو اُس کے چمک دار سیاہ برقعے نے پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ محض سفید اور نازک ہاتھ دکھائی دیتے تھے۔ میں اُسے پہچان نہ پاتا اگر اُسے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھتا۔

ان دنوں مجھے بیک وقت کاشتکاری کے معمول کے کام کاج کرنا پڑتے تھے، ملکہ کو پڑھانے اور ڈاکٹر شاہ جی سے پڑھنے کے لیے جانا پڑتا تھا اور کھالے کے ساتھ ہر روز صبح چوک قریشی جانا پڑتا تھا۔ آدھا دِن وہاں گزر جاتا تھا۔ بعض اوقات ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں سے اُٹھ کر کھالے اور مراد بخش کی محفل میں بیٹھنے کا اعزاز بھی حاصل کرنا پڑتا تھا۔ کھالے اور دیوانے کی آپس میں لوک جھونک کا سلسلہ ہر دم جاری رہتا تھا مگر طویل اور مختصر دورانیے کے ترکِ تعلقات کے باوجود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ زَیناں جب بھی ملتی، کبھی

زُبان سے تو کبھی لوگوں کی موجودگی کے باعث آنکھوں سے ڈاکٹر شاہ جی کا جوابی خط طلب کرتی اور میں مایوسی سے اپنا سر نفی میں ہلا دیتا۔

ایک دِن اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ دیے۔ چونکہ وہ مجھ سے تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی، اِس لیے اشارے کنائے سے ہی اپنا مدعا بیان کرنے پر مجبور تھی۔ میں اتفاق سے ڈاکٹر شاہ جی کے پاس جا رہا تھا۔

میں نے ہمت کر کے شاہ جی سے کہہ ہی دیا، ''زَیناں ہر روز مجھ سے اپنے خط کا جواب مانگتی ہے۔''

اُس نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورا، ''کیا تم نے دلالی شروع کر دی ہے؟''

جملہ خاصا تضحیک انگیز تھا۔ ندامت ہوئی۔ میں نے جلدی سے کہا، ''دراصل مجھے اُس کی رونی صورت پر ترس آتا ہے۔''

''اُس پر ترس آتا ہے تو اُسے سمجھاؤ کہ اپنی محبت کی ٹارچ کا رُخ کسی اور جانب موڑ لے۔ مجھے معاف ہی رکھے۔'' اُس کے لہجے کی زہر خیزی میرے لیے تعجب کا باعث نہیں تھی۔

میں نے کہا، ''آپ تو کہتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں خدا بستا ہے، پھر دل توڑتے ہوئے آپ اپنے کہے ہوئے الفاظ سے انحراف کیوں کرتے ہیں؟''

اُس نے ایک نگاہِ تأسف مجھے دیکھا، بولا، ''شہریار! بچہ ناسمجھی میں آگ کو چھونا چاہے، نہر میں کودنا چاہے یا بوڑھا کڑواہٹ محسوس کرتے ہوئے دوا کھانے سے انکار کر دے تو کیا اُس کی دل آزاری کے خوف سے اُس کی بات کو مان لینا دانشمندی کہلائے گا؟''

میں لاجواب ہو گیا۔ باتوں میں اُس سے جیتنا مشکل تھا۔ میں نے کہا، ''مگر وہ آگ کو چھونے کی کوشش نہیں کر رہی؛ وہ اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کی خواہش دل میں رکھتی ہے۔ جانتی ہے کہ اُس کی بیماری کو اس انداز میں مشتہر کر دیا گیا ہے کہ کوئی اُسے لینے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ آپ جانتے ہیں، آپ اُسے قبول کر سکتے ہیں۔''

اُس کے لبوں پر پھر وہی موئی زہریلی مسکراہٹ تیر گئی، بولا، ''نہیں! ابھی اُس کے مستقبل پر سوالیہ نشان معلق نہیں ہوا۔ ابھی وہ محض اپنی جسمانی ضرورت کے محاذ پر کھڑی بل کھا رہی ہے۔''

میں زَیناں کی حمایت میں اپنی تمام تر قابلیت اور علمیت کو بروئے کار لا دیا مگر وہ ٹس سے مس

نہ ہوا بلکہ ہر بار کی طرح مجھے ہی پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور آن کی آن میں میرے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ میں نے کھالے سے اپنے باپ کے قتل کے محرک پر ہونے والی گفتگو کے دوران یہ سوچا تھا کہ میں ڈاکٹر شاہ جی کو یہ خوں چکاں داستان سناؤں گا اور اُن سے قاتل کی تلاش میں مدد طلب کروں گا۔ چونکہ میری نظر میں وہ بہت ذہین اور معاملہ فہم انسان تھا، اِس لیے ممکن تھا، کہ کوئی ایسا نکتہ سُجھا دیتا کہ میری مشکل حل ہو جاتی۔ میں نے اپنی اُسی سوچ کے تابع کہا، ''شاہ جی! میرا ذاتی نوعیت کا ایک پیچیدہ معمہ ہے، کیا اُسے حل کرنے میں آپ میری مدد کریں گے؟''

وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو کر بولا، ''وائے ناٹ! تمہارے کام آ کر مجھے خوشی ہوگی۔''

چونکہ کہانی طویل تھی، اِس لیے میں نے مناسب جانا کہ پہلے چائے تیار کر کے ڈاکٹر شاہ جی کو پیش کر دوں تا کہ بیچ میں اُٹھنا نہ پڑے۔ میں نے جب اپنے خاندانی پسِ منظر کو چھیڑا، ڈاکٹر شاہ کی تمام تر توجہ میرے الفاظ پر مرکوز ہوگئی۔ میں نے اپنے تئیں جزئیات تک کو موضوعِ سخن بنایا تھا اور کوشش کی تھی کہ اُس پر سب کچھ عیاں ہو جائے۔ وہ سنتا رہا، پل پل چہرہ متغیر ہوتا رہا اور میں اپنی ہی رو میں آگے، اور آگے بڑھتا رہا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد میرے دُکھ کا اعادہ تمام ہوا تو اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ہولے سے بولا، ''چائے.....''

مجھے اُس کے لبوں سے پھوٹنے والے اِس واحد لفظ کی توقع تھی، اِس لیے کوئی دیر کیے بغیر مَیں اُٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ اُس نے چائے کا ایک گھونٹ حلق میں اُتارا، طویل سانس حلق سے خارج کی اور بولا، ''شہریار! کیا تم چاہتے ہو کہ اِس موضوع پر ہم گفتگو کریں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا، ''تو اَب جو میں کہنے جا رہا ہوں، غور سے سنو۔ پھر فیصلہ کرنا کہ ہمیں اِس راکھ کو کریدنا چاہیے یا نہیں۔ اوکے؟''

''یس سر!''

''تمہاری سنائی ہوئی داستان میں کئی جذباتی موڑ ہیں، کئی نفسیاتی خامیاں ہیں اور کئی گنجلک الجھنیں ہیں جنہیں سلجھاتے ہوئے، کہیں انگلیاں، کہیں زبان تو کہیں ہونٹ چھل جائیں گے۔ تب کہیں جا کے چھپے ہوئے کرداروں پر سے پردہ کشائی ہوگی۔ کہو! کیا اتنی ہمت رکھتے ہو؟''

میں اُس کی بات سمجھ نہیں پایا تھا، مگر اثبات میں سر ہلا کر بولا، ''آپ بات کیجئے، مجھ میں حوصلہ ہے۔''

وہ چند لمحے تک مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا، اپنے تئیں کچھ طے کرتا رہا، پھر بولا، ''شہریار! کیا تمہاری ماں بہت خوب صورت تھی؟''

میں نے کہا، ''لوگ یہی کہتے ہیں۔ شادی پر لیا گیا ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔''

''اور تمھارا باپ بھی؟''

میں نے کہا، ''ہاں! وہ بہت خوبصورت اور کڑیل جوان تھا۔ اُس کا نام امام بخش تھا، مگر لوگ اُسے سوہنا خان کہتے تھے۔''

''کیا تمہارے ننھیال سے تمہارے باپ کی رشتہ داری تھی؟''

''نہیں..... جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، ایک دوسرے سے شناسائی کا تعلق بھی نہیں تھا۔''

''پھر دونوں کی شادی کس طرح سرانجام پائی؟'' ڈاکٹر شاہ جی نے مجھ پر نظریں گاڑ دیں۔

میرا سر جھک گیا۔ سوچا جھوٹ بول دوں، پھر سوچا، جھوٹ بولوں گا تو پہلے کی طرح بھٹکتا رہوں گا اور ڈاکٹر شاہ جی میری کوئی مدد نہیں کر پائے گا۔ میں نے کہا، ''میرا باپ بیل خریدنے کے لیے شاہ جمال گیا تھا۔ بیل پسند نہیں آیا، میری ماں نظر آ گئی جو پہلی نظر میں ہی اُسے پسند آ گئی۔ میرے ننھیال والے امیر لوگ نہیں تھے، بلکہ ہم سے بھی گئے گزرے تھے مگر اُنہوں نے غیر برادری کی بنیاد پر رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ میرا دادا اور چاچا چراغ بھی اِس رشتے پر رضامند نہیں تھے۔''

''تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟''

''رضیہ..... سبھی اُسے 'رجو' کہتے تھے۔'' میں نے بتایا، ''پھر دونوں کے بیچ میل ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا جس کے نتیجے میں ایک دن دونوں غائب ہو گئے۔ دونوں دیہاتوں میں بڑا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ ایک ماہ کے بعد، جب معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تو دونوں نور پور میں آئے۔ اُنہوں نے شادی کر لی تھی۔''

''کیا تمہارے ننھیال والوں نے کوئی رابطہ کیا؟''

''نہیں..... بلکہ میرے بڑے ماموں نے یہ کہا تھا کہ رجو ہمارے لیے مر چکی ہے۔ اگر وہ یا سوہنا خان کبھی شاہ جمال میں نظر آئے تو اُن کا خون کر دیا جائے گا۔''

''بڑوں نے صلح کی کوشش کی؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں کی ہوگی۔ اگر کی بھی ہو تو اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔''

''کیا یہ ممکن ہے کہ دونوں کو تمہارے کسی ماموں نے قتل کیا ہو؟''

میں نے پورے وثوق سے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں شاہ جی! اُن کے بازوؤں میں اتنا دم نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو فوری طور پر حملہ کرتے۔ اتنا لمبا انتظار نہ کرتے۔ ویسے بھی اتنے برسوں کی گرد انتقام کے شعلوں کو بجھا دیتی ہے۔''

اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ بولا، ''بالکل ٹھیک۔ اَب ہم اِس کہانی کو دوسرے رُخ سے دیکھتے ہیں۔ کیا اِس کہانی میں کوئی تیسرا کردار بھی تھا؟ ولن؟''

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ چہرہ پل بھر کو متغیر ہوا۔

ڈاکٹر شاہ جی، جو ایک ٹک مجھے گھور رہا تھا، فوراً بولا، ''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اِس راکھ کو کریدنے کے مراحل میں بہت سے جذباتی موڑ آئیں گے۔''

میں سنبھل گیا، بولا، ''جی! مجھے احساس ہے۔ میں نے اِس انداز سے کبھی نہیں سوچا۔''

''غیرت کے بعد رقابت ہی ایسا جذبہ رہ جاتا ہے جو انسان کو خون خرابے پر مجبور کرتا ہے۔'' شاہ جی نے قدرے سرد لہجے میں کہا، ''غیرت والے دُبک گئے مگر ضروری تو نہیں کہ ناکام عاشق نے بھی مفاہمت کر لی ہو۔''

میرے لبوں سے بدقت نکلا، ''جی.....'' چند ساعتیں سوچ کر کہا، ''ممکن تو ہے مگر.....''

''مگر تمہیں معلوم نہیں ہے۔'' شاہ جی نے ہنکارا بھرا، ''تھوڑا ذہن پر زور دو، سوچو، کسی ایسے شخص کے بارے میں جو اُس رات کے بعد ہمیشہ کے لیے یا کچھ عرصہ کے لیے غائب ہو گیا ہو؟''

اُس رات سے اُس کی مراد وہ بھیانک رات تھی جس نے میری زندگی میں سرخ اندھیرے بھر دیے تھے۔

میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ کھالے، چاچے چراغ اور امیر نواز سے ہونے والی گفتگو کو ذہن میں کھنگالا، کوئی ایسا فرد سجھائی نہیں دیا۔ میں نے انکار کیا تو وہ بولا، ''تم نے جو کچھ اُس رات

میں مٹی کے بھڑولے میں سے جھانک کر دیکھا، تفصیل سے بتاؤ۔ کسی بھی بات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا۔''

میری زُبان ٹیپ پلیئر کی طرح چل پڑی۔ میں نے اُس خوں چکاں واقعے کو برسہا کے دورانیے میں کبھی بھی محو نہیں ہونے دیا تھا۔ کبھی زبان سے، کبھی دل ہی دل میں، دہراتے ہوئے زندہ رکھا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا، توجہ سے سنتا رہا اور تفہیمی انداز میں سر ہلاتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر بولا، ''میرا خیال ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو قاتل تک پہنچا جا سکتا ہے۔''

وہ شاید تھک گیا تھا۔ جماہیاں لینے لگا۔ مجھے اب جانا چاہیے تھا۔ اجازت چاہی تو اُس نے کہا، ''تم صرف اتنا کھوج لگاؤ کہ نور پور کا کون سا شخص اِس واقعے کے بعد سے اَب تک غیر موجود ہے یا کوئی ایسا فرد جو چند ماہ غائب رہنے کے بعد لوٹ آیا ہو۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے، مگر کس طرح ممکن ہے، یہ تم بہتر جانتے ہو۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور گھر کی راہ لی۔ گزشتہ چند دنوں سے کام کاج میں میری عدم دلچسپی چاچا چراغ کا پارہ چڑھنے کا سبب بن رہی تھی۔ فرزانہ اور پروین، دونوں مل کر میری عدم موجودگی میں میری جھوٹی سچی وکالت کر کے اُسے ٹھنڈا کر دیتی تھیں۔ وہ کبھی چپ ہو جاتا، کبھی دونوں کی خبر لینے لگتا۔ میں کوشش کیا کرتا تھا کہ میرا سامنا اُس سے کم سے کم ہو۔ اسی آنکھ مچولی میں بدھ کا دِن آ گیا۔ طبیعت میں عجیب ہیجان اور بے قراری کی ملی جلی کیفیت علی الصبح سے محسوس ہو رہی تھی۔ کھالا اپنی ویگن پر تھا، بخت خان دکھائی نہیں دیا تو مجبوراً مجھے مراد بخش دیوانے کی صحبت اختیار کرنا پڑی۔ وہ ماسٹر ولی محمد کا کرتا سینے میں جتا ہوا تھا۔ ابھی ہم روایتی تبادلۂ احوال کر رہے تھے کہ ماسٹر ولی محمد چائے کی چینک اور پیالہ اُٹھائے آن وارد ہوا۔ مجھے دیکھ کر قدرے خوش دلی سے بولا، ''شہرے پتر! یہ پکڑو، میں دوسرا پیالہ اُٹھالاتا ہوں۔''

وہ میرے روکنے کے باوجود پلٹا اور گھر سے پیالہ اُٹھالایا۔ ہمیں چائے کے لبالب پیالے تھمانے کے بعد اَدھ سلے کرتے کا جائزہ لینے لگا۔ اپنی ہی رو میں گویا ہوا، ''میں نے کہا کہ یارن خان کے آنے سے پہلے سوٹ سلوالوں۔ بعد میں تو دیوانہ اُس کی حویلی کا ہو کر رہ جائے گا۔''

دیوانے نے جھٹ پوچھا، ''خان کب آ رہا ہے ماسٹر جی؟''

وہ بولا، ''ٹھیک سے تو علم نہیں ہے مگر اُس کا نوکر بتا رہا تھا کہ چند دِنوں میں ہی آ نکلے گا۔''

دیوانے کی آنکھیں جگمگا اُٹھیں۔ یارن خان کی آمد کی موہوم سی اطلاع بھی اُس کے لیے بڑی جاں افزا تھی۔ ماسٹر جی کی بات درست تھی۔ یارن خان جتنا عرصہ بھی یہاں رہتا تھا، دیوانے کا گھروندا مقفل رہتا تھا۔ رات دن خان کی حویلی میں گھسا رہتا تھا۔ چونکہ خان شعر و شاعری کا دلدادہ تھا، اِس لیے دیوانے کی چاندی ہو جایا کرتی تھی۔ مہینہ بھر دُم چھلا بنے رہنے کا تگڑا انعام وصول کیا کرتا تھا اور صبح تا شام اُس کی سخاوتوں، اچھی عادتوں اور ادب پروریوں کے قصیدے سنایا کرتا تھا۔

دیوانے کی حد سے متجاوز دلچسپی کے سبب یارن خان کا قصہ چھڑ گیا۔ وہ بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرنے لگا۔ میرا چائے کا پیالہ خالی ہو گیا تو ماسٹر ولی محمد نے اپنے لیے چائے انڈیل لی۔ ایک لمبا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے بولا، ''اوئے چاپلوس شاعر! اَب اُس کی اتنی تعریفیں بھی مت کر کہ میری زُبان کھل جائے۔ وہ نور پور کا بڑا خان زادہ ہے۔ ایک وقت تھا، جب اُسی کا حکم چلتا تھا۔ میں نے وہ زمانہ دیکھ رکھا ہے جب یہ حیات خان اور وریام خان دونوں اُس کے دارے پر کھڑے (چارپائیاں) سیدھے کیا کرتے تھے۔''

''ماسٹر جی!'' دیوانے نے صدائے احتجاج بلند کی، ''وہ اِن کی طرح ظالم اور کنجوس نہیں ہے۔''

''وہ اِن سے بھی آگے کی شئے ہے پتر!'' ماسٹر جی کے جھریوں بھرے چہرے میں یک دم کئی داستانیں سمٹ آئیں، ہاتھ لہرا کر بولا، ''یہ نور پور کی قسمت چنگی (اچھی) ہے کہ یہاں سے چلا گیا ورنہ تم لوگ دیکھتے کہ یہاں سانسیں بھی اُس کی اجازت سے لینا پڑتیں۔''

مجھے ماسٹر کی بات سن کر اچنبھا ہوا۔ میں یارن خان کو بہت پڑھا لکھا، سنجیدہ اور تارکِ دنیا قسم کا بندہ سمجھتا آیا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا، ''ماسٹر جی! وہ ایسا دکھائی تو نہیں دیتا۔''

''اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اُس کی حویلی میں کوئی قدم نہ رکھے، بتاؤ، کسی نے حویلی میں قدم رکھا؟'' اُس کے لہجے میں عجیب سی نفرت گھلی ہوئی تھی، ''کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ صرف اِس لیے کہ نور پور کے خانزادے اور قریشی جانتے ہیں کہ وہ ہتھے سے اُکھڑا تو کوئی بھی سنبھال نہیں پائے گا۔''

''وہ اَب کہاں رہتا ہے؟''

''لاہور میں بہت بڑا بنگلہ ہے اُس کا۔'' دیوانے نے جھٹ دیدے پھیلائے، ''دھاگے

والی فیکٹری بھی ہے اُس کی بھائی پھیرو میں۔ تم جاہل آدمی ہو، تم نے تو بھائی پھیرو کا نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہوگا۔ ہے ناں؟''

اُس کی ٹیڑھی گردن اور ناچتی آنکھیں دیکھ کر مجھے تاؤ تو بہت آیا مگر حقیقت یہی تھی کہ میں نے یہ لفظ پہلی مرتبہ سنا تھا۔ پوچھا، ''کیا یہ کوئی شہر ہے؟''

''ہاں..... لاہور کے نیڑے تیڑے (قریب) واقع ہے۔'' اُس نے فاتحانہ انداز میں اپنی علمیت کا رعب جمایا، ''ماسٹر جی پتہ نہیں کس زمانے کی بات کرتے ہیں۔ میں نے خان کو بڑا ایبا (اچھا) اور غریب پرور پایا ہے۔ سچ کہتا ہوں شہرے!''

ماسٹر ولی محمد کی سوختہ نظریں دیوانے پر چپک گئیں۔ چند لمحے ایسے ہی گھورتا رہا، پھر لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتارتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے بولا، ''ایک یہی بھرے نور پور میں غریب رہ گیا ہے۔ باقی تو سب جائیدادوں والے بن گئے ہیں۔''

اُس کے لہجے میں غیر معمولی کاٹ پنہاں تھی جبکہ ہاتھ کا اِشارہ دیوانے کی طرف تھا۔ دیوانے کی حالت متغیر ہوگئی۔ طنز برداشت کرنا محال ہوگیا تو مشین اور تختے پر پھیلی قمیص کو سمیٹ کر اُٹھا اور رفع حاجت کے بہانے گھروندے سے نکل گیا۔ ماسٹر جی کے ہونٹ نفریں انداز میں سکڑے، ہنکارا بھرا اور کہا، ''شہرے! سوہنے کریم کا کرم ہے کہ یارن خان کا دِل نور پور سے اُچاٹ ہوگیا اور وہ لاہور چلا گیا۔ ورنہ اَب تک نور پور کی گلیاں ویران اور گھر کھنڈر ہو چکے ہوتے۔''

میں نے کہا، ''وہ ایسا کیا کرتا تھا؟''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لمبی آہ کھینچی اور اُٹھ کر برتن سمیٹنے لگا۔ جاتے ہوئے دروازے میں رُک کر پلٹے بنا بولا، ''اُس چاپلوس شاعر سے کہنا کہ میرا سوٹ جلد سی دے۔ میں نے کل کہیں جانا ہے۔''

مجھے اُس کا رویہ عجیب سا لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، کہنے سے ڈرتا بھی تھا حالانکہ یہ اُس کی فطرت کے منافی تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ یارن خان سے قلبی پرکاش رکھتا تھا ورنہ یارن خان ایسا شخص نہیں تھا۔ جو اپنی حویلی، جہاں اُس نے سال کا محض ایک مہینہ گزارنا ہوتا تھا، اتنا سجائے سنوارے رکھتا تھا، وہ ظالم یا بُرا نہیں ہوسکتا تھا۔ ظالم نہ صرف انسانوں پر بلکہ حیوانات و نباتات پر بھی ظلم ڈھانے پر سرشت کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ وہ شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ تنہائی پسند

تھا۔ ایسا شخص بے ایمان اور فرعون صفت نہیں ہوتا۔ یہ بات مجھے بارہا ڈاکٹر شاہ جی نے کہی تھی کہ مطالعے اور کتاب بینی کا شائق شخص ہزار خامیاں رکھتا ہو، منافق اور ظالم نہیں ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ یارن خان نے کسی موقع پر ماسٹر ولی محمد کا دل دکھایا ہو، اُس کی کسی فرمائش کو سختی سے رَد کیا ہو یا اُس پر کبھی ہاتھ اُٹھایا ہو جس کا پُر غیظ شکوہ ماسٹر جی کے لبوں پر مچل اُٹھتا ہو۔

میری اِن سوچوں کی تائید دیوانے نے کی جب وہ کھیتوں سے لوٹ کر آیا۔ ماسٹر جی کی غیر موجودگی کو غنیمت قرار دیتے ہوئے بولا، ''بُڈھا ماسٹر سٹھیا (ساٹھ برس کا) گیا ہے..... نہیں بلکہ بہتریا (بہتر برس کی عمر کا) ہو گیا ہے۔''

میں نے کہا، ''اچھا چھوڑو یار اِس قضیے کو، یہ بتاؤ، تم نے دل جیت کے مہمانوں کو گھیرنے کا کیا منصوبہ تیار کیا ہے؟''

اُس کی گردن حسبِ توقع تن گئی، لہجے میں فخر سما گیا، بولا، ''شہرے خان! میں نے ایسا زبردست پلان بنایا ہے کہ آنے والے سبھی چوہے کڑکی میں پھنس جائیں گے۔''

میرے کریدنے کے باوجود اُس نے محض 'دیکھ ہی لو گے' کہنے پر اکتفا کیا۔ کچھ دیر تک اُس کی دکان میں بیٹھنے کے بعد میں اپنے ڈیرے پر آ گیا اور پوری تن دہی سے اپنے کام میں جُت گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ سہ پہر کو میں نہا دھو کر کھالے کے باپ کی دکان پر آ بیٹھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بجائے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں رات گزارنے کے، چوک قریشی چلا جاؤں گا۔ عشرت کالج سے لوٹ آئی ہوگی۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں دکھائی دے جاتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُس کا بھائی مجھے اپنے گھر لے جاتا اور اُس کی ماں کے ساتھ ساتھ میری عاشی سے ملاقات بھی ہو جاتی۔ آج تک اُس کی محض ایک جھلک دیکھی تھی، اُسے سنا نہیں تھا، سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دل کہتا تھا کہ جتنی وہ بھلی دکھائی دیتی ہے، اِس سے کہیں زیادہ بھلی محسوس بھی ہوگی۔

کھالے کا باپ دکان پر موجود نہیں تھا۔ کوئی گاہک بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایسے میں دکان کا اندرونی دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ خالدہ دروازے میں کھڑی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے پوچھا، ''کیا بات ہے؟''

''اماں بلا رہی ہے صاحب جی!'' وہ معصومیت سے بولی۔

میں بادلِ نخواستہ اُٹھا اور گھر میں چلا آیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتی ہوئی بڑے کمرے کے

دروازے تک آئی۔ میں نے پوچھا، ''ماسی صفو کو کیا کام ہے مجھ سے؟''

وہ بولی، ''اندر لیٹی ہے، خود ہی آ کر پوچھ لو۔''

میں اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ ماسی صفو کسی بھی چارپائی پر لیٹی دکھائی نہیں دی۔ میں نے حیرت سے پوچھا، ''کہاں ہے ماسی؟ مجھے تو دکھائی نہیں دیتی۔''

وہ پلٹی، میری طرف بڑھی اور عین مقابل ٹھہر کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کے معصوم چہرے پر شرارت کے عکس لرزاں تھے۔ میں آنِ واحد میں اُس کا ارادہ بھانپ گیا تھا مگر اَبھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ اُس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور خاموش مگر ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے بلو! جھوٹ کیوں بولا تم نے؟''

''یہاں بیٹھ جاؤ، سچ سننے کی ہمت ہے تو سچ بولنے لگتی ہوں۔'' اُس نے مجھے آہستگی سے پیچھے دھکیلا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔

''ماسی اور غفوراں کہاں ہیں؟''

''اُنہیں بڑی بی بی نے حویلی میں بلایا تھا۔ اَبھی گئی ہیں، گھنٹہ بھر وہیں رہیں گی۔'' وہ میرے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ ٹکا کر پیروں میں بیٹھ گئی، ''اباحیات خان کے فارم پر گیا ہے۔ کھرلیوں کے کنڈے اور مویشیوں کے سنگل (آہنی زنجیریں) ٹھیک کر رہا ہے۔ شام سے پہلے کسی صورت میں نہیں لوٹے گا۔''

یکبارگی مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ کھالے کے آنے میں اَبھی دیر تھی۔ خالی گھر کے کمرے کی تنہائی میں خالدہ اور میں کسی بھی دیکھنے والی نگاہ میں مجرم بن سکتے تھے۔ میں نے اُٹھنا چاہا مگر وہ اپنے پورے بوجھ سمیت میرے گھٹنوں پر لد گئی۔ اپنا چہرہ بھی ٹکا دیا۔ بولی، ''صاحب جی! مجھ سے بھاگتے کیوں ہو؟ مجھے تم اچھے لگتے ہو، دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے، کچھ مانگتی بھی تو نہیں ہوں..... پھر مجھے دھکے کیوں دیتے ہو؟''

اُس نے سر اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ اُس گھڑی اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنکھوں کی تیز چمک پریشان کن تھی۔ میں نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔ اُس کے لیے میری یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ پیچھے کی جانب گری مگر دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر سنبھل گئی۔ میں اِس دوران میں کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھا مگر پہنچ نہیں پایا۔ اُس نے عقب میں آ کر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

میں نے غصہ سے کہا، ''چھوڑو مجھے، جانے دو۔ یہ کیا بے ہودگی ہے؟''

اُس کی گرفت میں مزید سختی آ گئی۔ بولی، ''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ کچھ دیر رُکو، پھر چلے جانا۔''

میں نے گردن جھکا کر اپنے پیٹ کے بالائی حصے پر اُس کے ہاتھ دیکھے۔ اُس نے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا رکھی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور علیحدہ کر دیے۔ وہ بجلی کی مستعدی سے میرے پہلو سے نکل کر سامنے آ گئی۔ میں گھبرا گیا۔ بھاگ نکلنے کی راہ مسدود دکھائی دی تو اُسے باہر کی طرف دھکیلنا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹنے کی بجائے مجھ سے چپک گئی اور مجھے دھکیلنے لگی۔

کچھ دن پہلے وہ نیم تاریکی میں ٹکرائی تھی۔ آدھی دکھائی دی تھی، آدھی دکھائی نہیں دی تھی۔ آج پوری کی پوری نظر آ رہی تھی اور حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ مجھے چارپائی پر گرانا چاہتی تھی مگر کامیاب نہ ہو پائی۔ یہ ضرور ہوا کہ میری پشت سامان والی جستی پیٹی سے جا ٹکرائی۔ پیٹی کا آہنی کنڈا ریڑھ کی ہڈی میں لگا۔ یوں لگا جیسے طاقتور برقی رو بدن میں اُتر گئی ہو اور آنِ واحد میں پورا بدن مفلوج ہو گیا ہو۔ میں بدقت تمام اپنے پیروں پر کھڑا رہ پایا۔ وہ میری حالت سے بے خبر اپنی یورش پر تمام تر قوتیں مرتکز کیے مجھے بانہوں میں جکڑے ہوئے تھی۔ میں نے اُسے تھپڑ مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اُٹھانا چاہا مگر دل دھک سے رہ گیا۔ میری شدید تر خواہش کے باوجود ہاتھ میں حرکت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے باری باری دونوں پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر ناکامی پر بُری طرح گھبرا گیا۔

میں پھٹی پھٹی نظروں سے اُس کی وارفتہ یلغاروں کو دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا مگر پورا بدن سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ بدقت تمام میرے منہ سے نکلا، ''چھوڑو مجھے، ہلو! پَرے ہٹو۔''

اُس نے میرے کہے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں پھر چلایا، ''میں کہہ رہا ہوں، مجھے چھوڑو۔ مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔''

''مجھے بھی چوٹ لگی ہوئی ہے۔ پہلے اِس زخم پر پھاہا (مرہم) رکھو۔''

''خدا کے لیے ہلو! پَرے ہٹو، میں کہیں نہیں جاؤں گا مگر مجھے چھوڑو تو سہی..... مجھے تمہاری یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔'' میرا گلا خشک ہو گیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میری آواز پورے نور پور میں گونج رہی ہوگی اور آدھی دُنیا سن رہی ہوگی مگر اُس نے جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ وہ اپنی پیش قدمی میں حدیں پھلانگنے پر کمر بستہ تھی۔ ایڑیوں کے بل اوپر اُٹھی اور میرے بھانپنے سے قبل میرے سینے سے آ لگی۔ اُس نے میری بغلوں میں سے ہاتھ نکال کر پیٹی پر رکھ لیے تھے یا پیٹی کی باہر کو نکلی ہوئی اَنی کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا کہ میں بُری طرح اُس کی بانہوں کے شکنجے میں جکڑا گیا۔ میں پوری قوت اور تمام تر خفگی کو بروئے کار لا کر اُسے پَرے ہٹنے کا کہہ رہا تھا مگر وہ جیسے بہری ہو کر رہ گئی تھی۔

ایسے میں اچانک کمرے میں روشنی کچھ کم ہوگئی۔ ایک سایہ سا لہرا گیا۔ میں نے بے ساختگی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ میرا دل جیسے اچانک نیچے اَٹک گیا تھا اور بدن کو یکبارگی سے اوپر کھینچ لیا گیا تھا۔

بلو میری جسمانی کیفیت اور ذہنی اذیت سے بے نیاز جوانی کے شجرِ تشنہ کام کو سیراب کرنے کے لیے میری گردن کو چوم رہی تھی اور میں دہشت زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دروازے کے بیچوں بیچ کھالا شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دونوں بانہیں پھیلا کر دروازے کی چوبی چوکھٹیں تھام رکھی تھیں۔ میں خالدہ کو کھالے کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر میری زبان نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا۔ بلو نہ تو میرا چہرہ دیکھ رہی تھی اور نہ ہی اپنے عقب میں کھالے کو دیکھ رہی تھی۔

میرے نیم مفلوج ذہن نے اچانک کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک خیال بڑی تیز رفتاری سے میرے دماغ میں اُترا کہ کھالا دروازے میں رُکا ہوا کیوں ہے؟ اُسے تو فی الفور ہم پر شکرے کی طرح جھپٹ پڑنا چاہیے تھا مگر وہ یوں کھڑا تھا جیسے اُس کے بدن میں حرکت کی سکت ہی نہ رہی ہو۔ یہ اُس کا غیر فطری فعل تھا۔

میں نے اپنی ہمت مجتمع کی، ''بلو! چھوڑ دے مجھے، وہ دیکھ، تمہارا بھائی دروازے میں کھڑا دیکھ رہا ہے۔''

مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے علیحدہ ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ میں نے قدم اُٹھانا چاہا مگر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پہلو کے بل زمین پر دھم سے آن گرا۔ کھالے کو دیکھ کر میں

دہشت سے بھول گیا تھا کہ میرا جسم بے حس و حرکت ہو گیا ہے۔

میں نے اُٹھنے کیلئے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی تو بے اختیار میرے منہ سے چیخ برآمد ہو گئی۔ میری بانہیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ چارپائیوں کے نیچے سے کھالے اور بلو کے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر ساکت کھڑے تھے۔ میں کھالے کی سرشت سے آگاہ تھا۔ غیرت کے معاملے میں وہ کسی مفاہمت کا قائل نہیں تھا۔ پوری سختی کے ساتھ اپنے دانت بھینچ کر میں انتظار کرنے لگا کہ کب وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا ہے اور اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھے ہوئے چمکدار خنجر سے میری گردن کاٹتا ہے۔ ایسا ہی ایک خنجر اُس نے مجھے بھی تحفے میں دے رکھا تھا جو اِس وقت میرے ٹرنک میں پڑا تھا۔ اگر وہ اِس وقت میرے پاس ہوتا بھی تو میرے کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔

میں مسلسل اپنے جسمانی اعضا کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر سوائے گردن کے، کسی عضو میں حرکت نہیں دے پا سکا تھا۔ خالدہ دونوں چارپائیوں کے بیچ، جہاں سے وہ مجھے دھکیل کر پیٹی کے پاس لائی تھی، کھڑی تھی جبکہ کھالے کے گھٹنوں تک دونوں پیر مجھے دروازے میں دکھائی دے رہے تھے۔

تین چار..... یا زیادہ منٹ گزر گئے تھے۔ میری آنکھوں میں بے بسی سے آنسو تیرنے لگے۔ ایسے ہی وقت میں خالدہ روتی ہوئی کھالے کی ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ خدا کے واسطے دیتے ہوئے معافیاں مانگنے لگی۔ کھالا لب بستہ، بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ شاید میرے اُٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر اُس نے پوری قوت سے خالدہ کو ٹھڈا مارا اور چنگھاڑا، ''اوئے خان کے بچے! چوہوں کی طرح بل میں کیوں پڑے ہو؟ اُٹھو اور میرا سامنا کرو۔''

اُس کی دھاڑ سن کر میرا دِل کانپ اُٹھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بے گناہی کا واسطہ دیتے ہوئے خدا سے مدد مانگی۔ خالدہ اُٹھ کر پھر اپنے بھائی سے چمٹی۔ اُس نے زوردار طمانچہ اُس کے منہ پر جڑا اور بالوں سے پکڑ کر پرے گھما پھینکا۔ کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ چارپائیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اُن سے ٹکرائی۔ اوپر والی چارپائیاں گرنے کی آواز سنائی دی۔

کھالا قدم بقدم چلتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ دونوں چارپائیوں کے بیچ ایک ذرا رُکا، جھکا اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اُس کے عزائم دیکھ کر میری رہی سہی جان

بھی ہوا ہو گئی۔

چند لمحوں بعد وہ میری پنڈلی پر پاؤں رکھ کر دھاڑ رہا تھا، ''بے غیرت انسان! اُٹھ کھڑا ہو، دیکھ، اپنا حشر ہوتا تو دیکھ ناں..... یار کے گھر میں ڈاکہ مارنے کا انجام تو اپنی آنکھوں سے دیکھتا جا..... اُٹھ اوئے.....''

وہ غراتی ہوئی آواز میں گالیاں دیتے ہوئے میرے پہلو سے جڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا، ''اگر کلیجہ ساتھ نہیں دیتا تھا تو اِس گھر میں داخل نہ ہوتے۔ سوچ لیتے کہ یہ کھالے کا گھر ہے۔ کھالا ہر گناہ معاف کر سکتا ہے مگر کسی یار مار کو معاف نہیں کر سکتا۔''

میں گھگھیایا، ''یار کھالے.....''

اُس نے اُلٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارا، ''گندی زبان سے میرا نام نہ لے، مجھے یار نہ کہہ بے غیرت.....''

اُس نے اوپر تلے تین چار گالیاں دیں۔ مجھے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ میرا گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ کھالے کا چہرہ فرطِ غیظ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ اُس نے خنجر والا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ میں اُسے روکنا چاہتا تھا مگر خوف اور دہشت سے میرے منہ سے سوائے گھر گھراہٹ کے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا خنجر والا ہاتھ نیچے آنے سے پہلے ہی میرا دل دھڑکنا بند کر دے گا۔ خالدہ بھاگتی ہوئی آئی۔ کھالے سے چمٹ گئی اور خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ کھالے نے اُسے جھٹک کر چارپائیوں کے بیچ پھینک دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

جان بچانے کے لیے میں نے اپنی آخری کوشش کی، ''کھالے! مم..... میں اُٹھ نہیں سکتا..... میں مر رہا ہوں کھالے.....''

اُس کا وحشیانہ قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔ ہنستے ہنستے پھر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، ''ہاں شہرے خان! تو مر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں، مگر تو یہ نہیں جانتا کہ میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ یہ دیکھ.....''

اُس نے خنجر پوری قوت سے میرے بازو میں گھونپ دیا۔ مجھے اُس کا خنجر والا ہاتھ نیچے آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں لگا جیسے خنجر راہ میں ہی رُک گیا ہو۔ تکلیف

نہیں ہوئی۔ اُس کا ہاتھ پھر ہوا میں بلند ہوا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں کہ خنجر کا پھل خون سے تر تھا۔ میں نے گردن اُٹھا کر اپنے بازو کو دیکھا۔ خون سے قمیص سرخ ہو رہی تھی۔ ایسے میں اُس نے دوسرا وار بھی کر دیا۔ پہلے زخم کے اوپر یا کچھ فاصلے پر خنجر بازو کی مچھلی میں پیوست ہو گیا۔ اَب کے تھوڑی سی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ میں چلایا، ''کھالے! میرا قصور نہیں ہے.....''

''اَبے چپ رہ گدھے کی اولاد.....''

اُس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور آنکھوں سے موت کا رقص ہویدا تھا۔ مجھے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا، پھر اُس نے میرے بازو کی طرف نگاہ کی۔ ایسے میں چونک گیا۔ ایک انچ چوڑا پھل دو مرتبہ بازو کے پار ہو چکا تھا مگر میرے بازو میں حرکت نہیں ہوئی تھی۔ اتنے ضبط کی توقع کسی ذی حس انسان سے نہیں کی جا سکتی۔ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا، ''اس کا مطلب ہے کہ تجھے درد نہیں ہوتا۔ ہیں؟ اچھا..... اپنی برداشت دکھا رہا ہے کھالے کو۔ ہیں؟''

اُس کے لبوں سے پھر قہقہہ ابل پڑا۔ میں نے بدقت تمام کہا، ''کھالے! میرا جسم سُن ہو گیا ہے۔ مجھے چوٹ لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے مت مارو، میری مدد کرو، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا..... خدا کے لیے کھالے..... پہلے میری بات تو سن لو؛ پھر بے شک مار دینا.....''

اُس نے پہلو بدلا۔ اُس کا چہرہ فرطِ غیظ سے بالکل سیاہ پڑ گیا اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ دانت کچکچا کر بولا، ''پہلے میری بات سن لو..... ہائیں..... تاکہ تم مجھے اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا لو۔ اور تم نے کوئی گناہ نہیں کیا..... ہاں..... کارے (کمین) کی عزت پر ہاتھ ڈالنا کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے۔ ہم نے اپنی بہنیں خانزادوں کے لیے ہی تو پال رکھی ہیں۔ شہرے! تم معافی کے قابل نہیں ہو۔ تم یار مار ہو، تم نمک حرام ہو۔ بس!''

اُس کا ہاتھ برق رفتاری سے ہوا میں بلند ہوا اور آنکھیں میرے سینے پر جم گئیں۔

❖❖○❖❖

کسی آن بھی خنجر والا ہاتھ نیچے آنے والا تھا۔ اُس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور زیرِ لب کلمہ طیبہ پڑھنے لگا۔ چند ساعتیں گزر گئیں۔ کھالے کا ہاتھ نیچے نہیں آیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ اُس کا اُٹھا ہوا ہاتھ فضا میں ساکت تھا اور وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید غیبی مدد مجھ تک پہنچ آئی تھی۔ آنکھوں میں تشکیک کی گہری پرچھائیاں لرز گئیں۔ اچانک اُس نے اپنا ارادہ بدل لیا اور میرے نچلے دھڑ کی

طرف متوجہ ہوا۔ ایسے میں اُس کا ہاتھ بھی آہستگی سے نیچے آ گیا تھا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے اُس نے خنجر کی نوک سے میری ران پر لکیر کھینچی ہو۔ کپڑا چرنے کی آواز سنائی دی۔ پھر گھٹنے سے کچھ نیچے، پھر دونوں ٹانگوں پر اَن گنت لکیریں لگائیں۔ مجھے اُس کا آدھا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اُس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ اُس نے میری ایک ٹانگ کو ٹخنے سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا، اچانک چھوڑ دیا۔ میرے کانوں میں 'دھپ' کی آواز پڑی۔ پھر اُس نے میرا بازو اُٹھایا۔ وہی سلوک کیا۔ اُس پر طاری وحشت کا جمود ٹوٹ گیا تھا۔ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

''کیا ہوا ہے تجھے؟ بولتا کیوں نہیں۔'' وہ غرایا۔

''کمر میں پیٹی لگ..... ہائے.....''

میری بات ادھوری رہ گئی۔ خالدہ کا ہاتھ دکھائی دیا تھا۔ اُس نے چارپائی کے نیچے گھس کر کھالے کا گرا ہوا خنجر اُٹھا لیا تھا۔ جلدی سے باہر نکلی اور چیختی چلاتی کمرے سے نکل گئی۔ کھالے نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ مجھے روتے ہوئے دیکھ کر اُس کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہو گئے تھے۔

اُس نے جلدی جلدی زخم والی جگہ پر چٹکیاں بھریں۔ کھڑے ہو کر دو تین ٹھڈے مارے پھر اچانک جھک کر مجھے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے اُس نے مجھے گھسیٹ کر پیٹی اور چارپائی کے درمیان سے نکالا اور کھلی زمین پر چت لٹا دیا۔ اُسے معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے اُس نے اپنے صافے سے میرا بازو کس کر باندھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی قمیص خون سے تر ہو چکی تھی۔ اَب مجھے اپنی رانوں اور پنڈلیوں پر چبھن ہونے لگی تھی۔ یوں جیسے چیونٹیاں کاٹ رہی ہوں۔ میں نے جلدی جلدی اُسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ الٹے پیروں دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ سمجھ میں آ رہا تھا کہ خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا ہے۔ مجھے پیاس لگی تھی۔ حلق سوکھ گیا تھا۔ میں نے اونچی آواز میں چلا کر کسی کو بلانا چاہا مگر میری آواز میرے حلق میں ہی اَٹک گئی۔ میری نظروں کے عین سامنے صافے کے لٹکتے ہوئے حصے سے خون کچے فرش پر ٹپکنے لگا تھا۔ ایسے میں روشنی کے بڑے بڑے دائرے میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگے۔ دُنیا گھومنے لگی۔ کمرے کا منظر دھندلانے لگا۔ بمشکل ایک منٹ یا دو چار منٹ گزرے ہوں گے

کہ اچانک میں پُرسکون ہونے لگا۔ یوں جیسے میٹھی نیند نے اپنا دامن مجھ پر وا کر دیا ہو۔

آنکھ کھلی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی حیرت کدے میں پڑا ہوں۔ ہر شئے ناشناسا، ہر چہرہ اجنبی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''میں کہاں ہوں؟''

کئی چہرے مجھ پر جھک گئے۔ اجنبیت کی دھند چھٹنے لگی۔ مجھ پر جھکا ہوا پہلا چہرہ جو میں نے پہچانا، وہ پروین کا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ آنکھیں متورم تھیں۔ چند منٹوں میں ہی مجھ پر صورتِ حال آشکار ہوگئی۔ کمرے کی چھت میری دیکھی بھالی تھی۔ میں یقیناً ڈاکٹر شاہ جی کے کمرے میں چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے تینوں اطراف میں نظر دوڑائی۔ چاچا چراغ اور بخشو لوہار سمیت سبھی موجود تھے۔ کھالا پروین کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے عجیب وحشت برس رہی تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا، پھر میری نگاہ پلٹی نہیں، ہٹی نہیں۔ ایسے میں ڈاکٹر شاہ جی کی آواز سنائی دی، ''ہیلو ینگ مین! کیا محسوس کر رہے ہو؟''

وہ میرے بائیں طرف، چارپائی پر ایک پاؤں ٹکا کر کھڑا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا تو دل بھر آیا اور آنکھیں بے اختیار نم ہوگئیں۔ اُس نے مسکرا کر کہا، ''میں نے پوچھا ہے کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

مجھے اپنا بے حس ہونا یاد آ گیا۔ میں نے جلدی سے اپنی انگلیوں کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ نہ جانے انگلیوں نے حرکت کی، نہیں کی، مگر بازو میں درد کی شدید ٹیس اُٹھی۔ میں کراہ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کہا، ''بازو کو مت ہلاؤ، پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کرو۔''

میں نے ہدایت پر عمل کیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بولا، ''اللہ نے تم پر کرم کر دیا ہے شہریار! تم چند دنوں میں ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

پروین سے کھڑا نہ رہا جا سکا اور وہ چارپائی پر ماتھا ٹیک کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ بایاں بازو اُٹھانے کی کوشش کی تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کئی من بھاری ہوگیا ہو لیکن دل مطمئن ہوگیا کہ میں نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ میرا جسم حرکت کرنے لگا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کہہ رہا تھا، ''تم لوگ جا کر تسلی سے سو جاؤ۔ یہ اَب ٹھیک ہے۔''

کوئی بھی جانے پر تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کا لہجہ سخت ہوگیا، ''یہ اَبھی دو چار دِن یہیں رہے گا۔ مجھے کسی کی اعانت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں البتہ اِس کا کھانا وقت پر پہنچا دیا کرنا۔''

پھر پروین سے مخاطب ہوا، ''بیٹا! مجھ پر اعتماد رکھو۔ یہ میرا بیٹا بھی ہے اور دوست بھی۔ اِسے کچھ نہیں ہوگا۔ تم وہی کچھ تیار کر بھیجنا جو میں نے بتایا ہے۔ ٹھیک ہے ناں!''

اُس نے سر ہلایا، ''میں کہیں نہیں جاؤں گی جب تک میرا بھائی ٹھیک نہیں.....''

وہ اپنی بات پوری نہیں کر پائی۔ گلا رُندھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے وقت میں ڈسپنسر کی شکل دکھائی دی۔ وہ ہلکے پیلے رنگ کی دوا سے بھری ہوئی سرنج میرے بازو میں انجیکٹ کر رہا تھا۔ نیڈل کے پرک ہونے کی مخصوص تکلیف بھی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ میں نے ایک شکوہ بھری نگاہ کھالے پر ڈالی اور آنکھیں بند کر لیں۔ سبھی باتیں کر رہے تھے۔ کھالے کو کوس رہے تھے جبکہ وہ لب بستہ، مجرموں کی طرح، سر جھکائے کھڑا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر دیوار گیر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دونوں سوئیاں بارہ کے ہندسے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ میں کم و بیش آٹھ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مجھ پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی۔ خود کو جگائے رکھنے کی کوشش میں نہ جانے کس وقت ہار گیا اور گہری نیند سو گیا۔

صبح کے آٹھ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں شاہ جی کی چارپائی پر دراز تھا اور سرکاری کمبل میں لپٹا ہونے کے باوجود سردی محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ شام کے واقعات برقی کوندے کی طرح ذہن میں لپکنے لگے۔ کھالے کی وحشت بھری آنکھیں، خون آشام لہجہ اور ہاتھوں کی سفاک حرکت چشمِ تصور میں اُبھری تو میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ خدا نے میری مدد کی تھی اور اُس کی ذہنی رو کو بدل دیا تھا ورنہ مجھے قتل کر دینے کے ارادے میں کوئی کمی موجود نہیں تھی۔ مجھ پر پہلی مرتبہ خالد محمود عرف کھالے اُستاد کی بربریت آمیز سرشت آشکار ہوئی تھی۔

میں نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ہونٹ اور زبان کھردرے محسوس ہوئے۔ اپنے بدن کی بے حسی یاد آئی۔ میں نے بطور احتیاط دائیں بازو کو حرکت نہیں دی بلکہ دائیں پیر کو اوپر اُٹھانے کی کوشش کی۔ ٹانگ میں تکلیف نہیں ہوئی، کمر میں ننھی سی ٹیس اُٹھی۔ پیٹ میں بھی مروڑ اُٹھا۔ دل خوشی سے معمور ہو گیا جب میں نے اپنی ٹانگ کو کمبل سمیت اوپر اُٹھتے دیکھا۔ دوسرے پیر کو ہلایا جلایا۔ ایسا کرنے سے جہاں کمر میں تکلیف کا احساس جاگا وہاں دونوں رانوں کی جلد کھنچی کھنچی محسوس ہوئی۔ یاد آیا کہ کھالا میری بدنی بے حسی کو جانچنے کے

لیے میری ٹانگوں پر چیرے لگا تار ہا تھا۔ بینڈ یج کی وجہ سے ہی جسم کھنچا کھنچا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ بھی کام کر رہے تھے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے کمبل ہٹایا اور دائیں بازو کو دیکھا۔ کندھے سے نیچے قمیص کا کپڑا پھاڑ دیا گیا تھا۔ بازو کہنی سے کندھے تک پٹی میں لپٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی یا ڈسپنسر نے بازو پر سے خون صاف کر دیا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے انگلیوں کو ہلایا۔ تکلیف نہیں ہوئی۔ آہستہ سے کلائی کو موڑا، مُڑ گئی مگر کندھے سے کچھ نیچے ٹیس اُٹھی۔ میں نے اپنا بایاں ہاتھ چارپائی کی بانہہ پر مضبوطی سے ٹکایا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔ بدقت تمام ایک فٹ تک اوپر اُٹھ پایا۔ نچلی پسلیوں کے درمیان ریڑھ کی ہڈی میں برقی رو دوڑی۔ پیٹ میں شدید درد جاگا اور میں گرنے کے سے انداز میں پشت کے بل لیٹ گیا۔ کروٹ بدلنے کی کوشش میں بھی ناکامی ہوئی۔

میری بائیں جانب ڈرپ اسٹینڈ پر خالی بوتل لٹک رہی تھی جس کے نچلے سرے سے پائپ جھول رہا تھا۔ رات کو کسی وقت ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے ڈرپ لگائی تھی کیونکہ جب میں نصف شب کو جاگا تھا تو میں نے اسٹینڈ دیکھا تھا نہ میرے بازو میں سوئی پیوست تھی۔

دَس پندرہ منٹ تک میں اپنی گنجلک سوچوں کی ادھیڑ بن میں کھویا رہا۔ ڈاکٹر شاہ جی کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے جاگتا پا کر میرے پاس آ گیا۔ اپنے پیشہ ورانہ معمول کے مطابق میری نبض چیک کی۔ جسم کو ٹٹول کر دیکھا پھر دریافت کیا، ''تمہیں پیاس لگی ہے؟''

میں نے کہا، ''جی!''

''سردی؟''

''لگ رہی ہے۔''

اُس نے کمبل درست کیا۔ پانی کا بھرا ہوا گلاس میرے سینے پر قدرے جھکایا اور اُس میں رکھا ہوا 'سٹرا' میرے منہ میں ڈال دیا۔ میں نے چند گھونٹ پیا پھر سٹرا نکال دیا۔ کچھ قرار آیا۔ میں نے کہا، ''مجھ سے اوپر اُٹھا نہیں گیا شاہ جی؟''

''ابھی اٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ تمہاری ریڑھ کی ہڈی کے ایک مہرے پر چوٹ لگی ہے۔ شکر ہے کہ مہرا ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔ بس 'نرو' پر دباؤ آیا ہے۔ دو چار دِنوں کی مالش سے ٹھیک ہو جائے گا۔'' اُس نے مجھے تفصیل سے بتایا پھر میرے استفسار پر اس نے بازو اور ٹانگوں کے زخموں کے بارے میں بتایا۔

''پروین کہاں ہے؟''

''وہ رات بھر تمہارے سرہانے بیٹھی جاگتی رہی ہے، اَب تمہارے لیے ناشتہ تیار کرنے گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔''

''دوسرے لوگ؟''

''اُنہیں بمشکل میں نے یہاں سے بھگایا ہے۔''

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ پروین میرا پرہیزی ناشتہ لے آئی۔ اُس کے عقب میں غزالہ، شانو اور چاچا چراغ دکھائی دیے۔ پروین نے چنگیر اور برتن میز پر رکھے۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر فرطِ جذبات سے مجھ پر جھکی اور دیوانہ وار چومنے لگی۔ میرے بازو کے زخم کا بچاؤ کرتے ہوئے لپٹ گئی۔ وہ رو بھی رہی تھی، مسکرا بھی رہی تھی اور یقین کر رہی تھی کہ میں بالکل تندرست ہوں۔ ڈاکٹر شاہ جی کی ہدایات کے مطابق اُس نے مجھے ساگودانہ کھلایا، دودھ پلایا اور میرا منہ اپنی چنی سے صاف کیا۔

ناشتے کے بعد ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے دو انجکشن دیے۔ ٹمپریچر چیک کیا۔ سر میں شدید درد کی شکایت پر اُس نے غزالہ کو ذمہ داری سونپی کہ وہ میرا سر دَبائے۔ اُس نے ہدایت پر عمل کیا۔ روح تک مسیحائی کا اعجاز اُترنے لگا۔ میں خود پر جھکے ہوئے اُس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اَب تک کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا۔ مجھ سے واقعے کی تفصیل جاننا تو دور کی بات تھی، کسی نے اِس موضوع پر آپس میں بھی بات نہیں کی تھی۔ میں نے غزالہ سے پوچھا، ''کھالا نہیں آیا؟''

''رات تو یہیں تھا؛ اَب دکھائی نہیں دیا۔'' اُس نے منہ بنا کر کہا۔

میں نے پروین سے پوچھا تو اُس نے بتایا، ''ماسی صفو اور چاچا بخشو صبح آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ تیز بخار میں پھنک رہا ہے۔''

''دوا دارو لیا اُس نے؟''

''تمہیں کیا، وہ دوائی لے یا زہر پھانکے؟'' غزالہ نے تلخی سے کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔

''تم کھالے کے گھر کیا لینے گئے تھے؟''

''کھالے سے ملنے گیا تھا۔''

وہ تشکیک آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اُسے بتانا چاہتا تھا مگر اُس نے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولی، ''ابھی نہیں..... ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گے تب پوچھوں گی۔''

دوپہر تک کمرے میں میلا لگا رہا۔ نور پور کا ہر شخص، کم و بیش، میری عیادت کو آیا۔ تین بجے کے قریب ڈاکٹر شاہ جی نے میرے کمرے میں لوگوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ میرے پاس اُس کے علاوہ غزالہ اور چاچی رہ گئیں۔

غزالہ نے مجھے دلیہ وغیرہ کھلایا، پانی پلایا اور چاچی کی نظریں بچا کر میری پیشانی کو اَن گنت مرتبہ چوما۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو اُس نے آنکھوں کو چوما۔ بولی، ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُس کمینے کا گلا گھونٹ دوں۔''

''کس کمینے کا؟'' میں چونکا۔

''کھالے لوہار کا..... اور کس کا۔''

''اس کا قصور نہیں ہے، قصور میرا اپنا ہی تو تھا۔''

وہ دانت پیس کر خاموش ہو گئی۔ اُسے میری بات اچھی نہیں لگی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے قریب آ کر پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ مسکرایا، بولا، ''لگتا ہے کہ اَب تمہاری دوائی بند بھی کر دی جائے تو تم دو چار گھنٹوں میں ہی فٹ فاٹ ہو جاؤ گے۔''

میں اُس کا کنایہ سمجھ گیا۔ جھینپ کر بولا، ''ڈاکٹر جی! اَب ایسی بھی بات نہیں۔''

غزالہ شرمسار ہو کر مجھ پر مزید جھک گئی۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ڈاکٹر شاہ جی ایسی ہی کوئی اور پھبتی کس کر غزالہ کو میرے اور قریب کر دے مگر وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ایسے میں بخت خان کمرے میں داخل ہوا۔ غزالہ کے سر پر ہاتھ رکھنے کے بعد میری طرف بڑھتے ہوئے بولا، ''ڈاکٹر شاہ! آپ کی مطلوبہ میڈیسن آ گئی ہیں۔''

اُس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا لفافہ میرے پیروں کے قریب چارپائی پر رکھ دیا پھر میری عیادت میں رُجھ گیا۔ اُس کی آمد کو محض چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کھالا اور مراد بخش دیوانہ بھی آ گئے۔ چاچی اور غزالہ اپنا سامان سمیٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں جا بیٹھی تھیں۔

دونوں میری چارپائی کی پائنتی کے پاس آ کر رُک گئے۔ بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی نے

ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا سنا اور بلا کچھ کہے کمرے سے نکل گئے۔ عیاں تھا کہ اُنہوں نے ہمیں کھل کر گفتگو کرنے کا موقع دیا تھا۔

مراد بخش نے کہا، ''شہرے خان! لگتا ہے کافی بہتر حالت میں ہو۔ ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے کھالے کو بغور دیکھا۔ وہ کافی بدلا بدلا دکھائی دیا۔ شاید اِس لیے کہ میں نے اُسے نہایت مختلف انداز میں دیکھ لیا تھا۔ میں نے کہا، ''کھالے! دور کیوں کھڑے ہو، قریب آؤ ناں۔''

وہ لب بستہ کھڑا رہا۔ مراد بخش نے کہنی چبھوئی۔ وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے کہا، ''میں اُٹھ نہیں سکتا، تم چل پھر سکتے ہو، اِس لیے میرے قریب چلے آؤ۔ میں بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نہ تو نمک حرام ہوں اور نہ ہی یار مار..... مگر تم نے مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔''

وہ بڑی آہستگی سے چارپائی پر ٹک گیا۔ میں نے کہا، ''دُنیا کی کوئی عدالت بغیر صفائی طلب کیے سزا نہیں سناتی مگر تم نے سنا دی۔ میں بلو کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ بالکل پروین کی طرح۔ وہ بھی مجھے اپنا بھائی ہی سمجھتی تھی مگر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ بھٹک گئی۔ بچی ہے ناں اَبھی..... مگر میں اُسے سمجھا لیتا۔ اُسے روک لیتا۔ مگر برا یہ ہوا کہ میری کمر میں چوٹ آ گئی اور میرا بدن شل ہو گیا جس کی وجہ سے وہ حد سے بڑھ گئی۔''

اُس نے میری بات خاموشی سے سنی۔ منہ سے کچھ نہیں کہا بلکہ اچانک پلٹ کر میرے پیروں کو تھام کر چارپائی پر لڑھک گیا۔ دیوانہ دوسری چارپائی پر براجمان ہو گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں کھالے کی سسکیاں پورے کمرے میں گونجنے لگیں۔ مجھے اپنے پیروں پر نمی کا احساس ہوا۔ میں نے پکارا، ''کھالے! یہ کیا کر رہے ہو؟ اِدھر میرے پاس آؤ ناں!''

اُس پر میری پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دو چار مرتبہ اُسے باز رہنے کے لیے کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو میں خاموش ہو گیا۔ اُسے اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع دیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ اُس نے سر اُٹھایا۔ مجھے اُس کی حالتِ زار پر ترس آیا۔ وہ میرے کہنے پر میرے پہلو میں چارپائی کی بانہہ پر آ کر ٹک گیا۔ اُس کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

سر اُٹھا کر بولا، ''شہرے خان! تم مجرم نہیں ہو، میں تمہارا مجرم ہوں۔ جو چاہے سزا دے لو۔ میرا سر تمہارے سامنے جھکا ہوا ہے۔''

میں نے اُسے معاف کر دیا۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اور ڈاکٹر شاہ جی مجھے اُٹھا کر ہسپتال لائے تھے۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو بغیر حیل وحجت تمام ماجرا، من وعن، کہہ سنایا تھا اور اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ خالدہ نے اپنے والدین کے سامنے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے میری بے گناہی پر تصدیقی مہر ثبت کر دی تھی۔ اِس جرم کی پاداش میں اُسے اچھی خاصی مار کھانا پڑی تھی۔ کھالے کے بقول، وہ اَبھی تک چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ چاچا چراغ اور بخت خان کھالے کو پولیس کے حوالے کر دیتے مگر کھالا اور اُس کے والدین اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے چاچی اور چاچا چراغ کے پیروں میں گر گئے تھے۔ قدموں میں گرے ہوئے معترف کو گلے سے لگانا ہماری علاقائی روایات کا حصہ تھا۔

بات پورے نور پور میں پھیل گئی تھی۔ زبانوں کی بیساکھیوں پر چلتی ہوئی لمبی مسافت طے کر گئی تھی۔ ہر کوئی اُسے اور خالدہ کو لعن طعن کر رہا تھا اور وہ اپنے آہنی کلیجے پر زبانوں کے زخم سنبھالے ندامت کی اتھاہ گہرائی میں گر کر سنبھلنے کی کوشش میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ پشیمانی اور پچھتاوے نے اُسے تیز بخار میں جھونک دیا۔ میں چونکہ اُس کے ردِعمل کو فطری سمجھتا تھا، یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر اُس کی جگہ پر میں ہوتا اور میری جگہ پر وہ ہوتا تو میں بعینہٖ وہی کرتا جو کچھ اُس نے کیا تھا، اِس لیے میں نے اُسے دل سے معاف کر دیا۔ وہ میرا متشکر تھا۔ اُسے شاید میرے اِس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ اُس کی ندامت کو تحلیل کرنے میں مراد بخش کے ذومعنی فقروں نے بڑا کام دکھایا۔

بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی کو مراد بخش بلا لایا۔ محفل جم گئی۔ ایسے میں گزشتہ شب کا تذکرہ چھڑ گیا۔ بخت خان اور مراد بخش نے مزار کی نگرانی کی تھی۔ اِس مرتبہ صرف ٹرپل تھری نمبروں والی کار دل جیت شاہ کے ہاں آئی تھی۔ اُسے ایک آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اُس نے پون گھنٹہ دل جیت شاہ کے خاص حجرے میں گزارا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میری کمر اور گردن کے پیچھے مضبوطی سے ہاتھ جمائے اور سہارا دے کر بٹھا دیا۔ درد کی ایک کٹیلی لہر پورے بدن میں پھر گئی۔ ضبط کرنے کے باوجود منہ سے سسکاری نکل گئی۔

دیوانہ جھٹ سے بولا، ''یار یہ کیا؟ ہر وقت سوانیوں (عورتوں) کی طرح چیختے رہتے ہو، کوئی ایک مردانہ اَدا بھی اپنے پاس رکھ چھوڑو۔''

میں نے ہنسنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چند ہی لمحوں میں میری پیشانی پسینے سے تر ہوگئی۔ میں نے کراہ کر کہا، ''ڈاکٹر جی! بیٹھا نہیں جاتا، لٹا دیں مجھے۔''

اُس نے میری درخواست پر توجہ نہیں دی۔ سمجھایا، ''خود کو بٹھائے رکھنے کی پوری کوشش کرو۔''

میری چارپائی کے نیچے یورِن بیگ دکھائی دیا۔ تب پتہ چلا کہ مجھے 'کیتھی ٹر' پاس کی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غیر معمولی طویل دورانیہ گزرنے پر بھی حاجت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں بمشکل تین یا چار منٹ بیٹھا رہ سکا پھر ہار گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی اور مسکراتے ہوئے لٹا دیا۔ کمر تلے اُبھار کا احساس ہوا۔ پہلے نہیں ہوا تھا۔ شاید کپڑے کا کوئی گولا دباؤ دینے کے لیے میرے تلے رکھا گیا تھا۔

ایک محفل اُجڑ گئی۔ دوسری سج گئی۔ میرے اہلِ خانہ میرے اردگرد آن بیٹھے۔ مجھے پرہیزی غذا کھلانے کے بعد چائے پلائی گئی۔ دوائیں کھلائی گئیں اور مختلف ادویات کے انجکشن دیے گئے۔ غزالہ مجھ سے ناراض تھی کہ میں نے کھالے کو معاف کیوں کیا؟ اُس کی خواہش تھی کہ وہ دو چار مہینے جیل کی دال روٹی کھا آتا تو شاید انسان بن جاتا۔ وہ میری اور کھالے کی دوستی کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ مخصوص 'ڈرائیورانہ' قماش کا آدمی ہے۔ اُس کے خیال میں وہ اعتماد کے لائق ہرگز نہیں تھا۔

میں اگلی صبح کھالے اور دیوانے کے سہارے کوٹھی کے صحن میں ہولے ہولے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر قدم پر دماغ میں دھمک پیدا ہوتی تھی۔ پورے جسم میں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مراد بخش دیوانہ کہہ رہا تھا، ''ہر کام میں خدا کی مصلحت ہوتی ہے۔ جو کرتا ہے، بھلا ہی کرتا ہے۔ فی الوقت انسان کو درست نہیں لگتا مگر جب اُس کے اثرات سامنے آتے ہیں تو عش عش کر اُٹھتا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' کھالے نے گھورا۔

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ پیٹی کے کنڈے کی ضرب نے ہمیں ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا۔ اگر شہرا ٹھیک ٹھاک ہوتا تو تم اپنی بے غیرتی کی عظیم مثال قائم کر کے اپنا ہاتھ کبھی نہ روکتے اور اب تک شہرا بے چارہ..... پچ پچ..... روح بالائے بریں ہوتی، جسم زیرِ زمیں ہوتا اور تم سرکار کے راج محل میں تخت نشیں ہوتے.....'' مراد بخش نے اپنے ہاتھ سے چکی پینے کا مضحکہ

خیز اشارہ کرتے ہوئے اِس انداز سے کہا کہ میں اور کھالا اپنی ہنسی نہ روک پائے۔

کھالا بولا، ''ایسی کی تیسی تیرے منحوس شاعر کی..... اپنی منظر کشی اپنے پاس رکھو۔ اللہ سوہنے نے ہم دونوں پر خاص کرم کیا ہے۔''

میں بڑی احتیاط سے قدم بڑھا رہا تھا مگر پھر بھی ہانپ گیا۔ رُک کر سانسیں ہموار کرتے ہوئے بولا، ''مگر کھالے! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔ میرے کانوں میں تمہاری ویگن کی نہ آواز پڑی تھی اور نہ ہی ہارن سنائی دیا تھا۔ شاید چوٹ نے میرے ذہن کو بھی متاثر کیا تھا۔''

وہ بولا، ''نہیں۔ ویگن نہر والے پُل پر ٹھہر گئی تھی۔ اُس حرام زادی کا اگلا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ سٹپنی ابا کی دکان میں پڑی تھی۔ میں اور سبھی مسافر وہیں اُتر گئے تھے۔ ارادہ تھا کہ میں اور رشیدو سٹپنی لے کر پل پر جائیں گے اور ٹائر بدل کر ویگن کو اڈے پر لے آئیں گے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ دل میں سوچا کہ میں جس وقت کو نہایت کم دورانیہ قرار دے رہا تھا، وہ اتنا مختصر بھی نہیں تھا۔ میں خالدہ کے حصار میں کم و بیش نصف گھنٹہ گھرا رہا تھا۔ میں نے کسی کو بالخصوص مخاطب کیے بغیر پوچھا، ''ڈاکٹر شاہ جی کیا کہتا ہے؛ کیا میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا؟''

مراد بخش بولا، ''وہ کہتا ہے کہ تمہاری ہڈی پسلی بڑی جاندار ہے۔ 'یہ زاغ کچھ بگاڑیں گے کیا تیرا' کے مصداق، کھالا تو کیا، کھالے کا باپ بھی ہوتا تو اپنے دوسیری ہتھوڑے سے تمہاری ناک کی ہڈی تک نہ توڑ پاتا..... فکر نہ کرو، ڈاکٹر کہتا ہے کہ تم کل پرسوں تک تھارو پر ایڈ گھوڑے کی طرح ہوا سے باتیں کرنے لگو گے۔''

کھالے نے بپھر کر کہا، ''انسان کا بچہ بن وگرنہ الٹے ہاتھ کی دوں گا اور دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔ اپنے دل کی بھڑاس سیدھے لفظوں میں نکالا کرتا کہ میری سمجھ میں آ جائے کہ تو کیا بکواس کرتا ہے؟''

میں خاصا سنبھل گیا تھا۔ رانوں اور پنڈلیوں کے زخموں میں چبھن کم ہو گئی تھی۔ کمر اور بازو دُکھتا تھا۔ میں نے کھالے سے فرمائش کی کہ مجھے کوٹھی سے باہر لے جائے۔ دونوں مجھے باہر لے آئے۔ ہم چلتے ہوئے ہسپتال میں آ گئے۔ ڈاکٹر شاہ جی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ مریض معائنہ اور علاج معالجے کے لیے آ رہے تھے۔ وہ اِس وقت خاصا مصروف ہوا کرتا تھا۔

حیات خان نے عیادت کو آنے میں خاصی دیر کی تھی۔ پہلے تو مجھے اُس کے ہمدردانہ رویے

میں منافقت کا شبہ ہوا مگر کچھ دیر کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف اپنے روا رکھے گئے رویے پر متاسف تھا بلکہ ایک بھیانک غلط فہمی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جان لیوا صورتِ حال پر بھی افسردہ تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے اُس کی پیشکش پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں چار دِن بیت گئے۔ جب میری ریڑھ کی ہڈی کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر شاہ جی نے اطمینان بھرے انداز میں کہا 'اب تم مکمل طور پر فٹ ہو' تو میں نے گھر کا قصد کیا۔ ہسپتال کی حدود میں مسلسل مقید رہنے کی بدولت مجھے اس ماحول سے بوریت ہونے لگی تھی۔ دو تین دِنوں کے بعد میرے بازو کے زخموں کے ٹانکے کھولے جانے تھے۔ ران کے ایک جبکہ پنڈلی کے دو زخموں کی بھی اسٹیچنگ کی گئی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے بقول خنجر کا پھل بازو کی ہڈی کو چھو گیا تھا مگر دونوں زخموں میں کوئی بھی عصبی ریشہ نہیں کٹا تھا اور نہ ہی کوئی بڑی شریان یا ورید زخمی ہوئی تھی۔ اُس نے میرے زخموں کو خراب ہونے سے بچائے رکھنے کے لیے شہر سے بخت خان کے ذریعے مہنگی انٹی بائیوٹک ادویات منگوائی تھیں۔ مجھے دوائی کی باقاعدگی کے اثرات پر لیکچر بھی دیا اور یہ تنبیہہ کی کہ ٹانکے کھلنے تک میں کوئی بھاری کام نہیں کروں گا۔

اگلی شام کو کھالا میرے گھر پہنچ گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد اُس نے جیب میں سے ایک تہہ کیا ہوا رُقعہ نکالا اور میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ انگریزی میں لکھا ہوا ایک جملہ میری آنکھوں کے آگے جھلملا گیا۔

''مجھے بدھ کی شام کو پانچ بجے چمن زار عسکری میں ملو۔''

میں نے استفہامیہ نظروں سے کھالے کو دیکھا، ''اسما نے لکھا ہے؟''

اُس نے فاخرانہ انداز میں سر ہلایا۔

میں سوچ میں غرق ہو گیا۔ اُس نے کھالے کو کیوں بلایا تھا؟ وہ کھالے کو اتنی اہمیت کیوں دینے لگی تھی؟ یہ اور اس جیسے کئی سوالات زہریلے کیڑوں کی طرح میرے ذہن میں رینگ گئے۔

اُس نے میرے پہلو میں کہنی چبھوئی، ''کیوں؟ اچھا نہیں لگا کیا؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں کھالے! ایسی بات نہیں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہاری خان زادی تمہیں کس مصیبت میں ڈالنے کا ارادہ رکھتی ہے۔''

''یعنی وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی بلکہ وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو؟''
کھالے نے شکوہ بار لہجے میں کہا، ''تم یہ سوچتے ہو کہ لڑکیوں کو تم جیسے چٹی چمڑی والے لوگ اچھے لگتے ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ غریبوں کے لیے دنیا میں کسی پہلو میں نرم گوشہ نہیں ہے؟ ہاں ہاں! شہرے خان! یہ تمہاری سوچ ہے۔ مانا کہ کالے، کمین اور غریب شخص سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ وہ بھی نہیں کرتی۔ مگر کھیلنا چاہتی ہے۔ مجھے کھلونا بنا کر دل بہلانا چاہتی ہے۔ میرا کیا جائے گا؛ کیا ٹوٹ جاؤں گا؟ نہیں۔ وہ اپنے طور سے کھیلتی رہے، میں اپنے انداز میں کھیلتا رہوں گا۔ جب اُس کا دل بھر جائے گا تب میرا راستہ بھی بدل جائے گا۔ اور تم تو یقیناً ڈرپوک شخص ہو۔ ڈرتے رہو گے؛ مگر زندگی میں کچھ بھی نہیں کر پاؤ گے۔''

مجھے اُس کی سوچ پر حیرانی ہوئی۔ اُس نے آنے والے چند ہی لمحوں میں مجھے بُری طرح اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ پھر مجھے خاموش پا کر اُس نے میرا کندھا ٹھونکا ''اوئے! تجھے سانپ سونگھ گیا یا زبان پر تالا لگ گیا، بولتا کیوں نہیں تُو؟''

میں نے ملامت آمیز لہجے میں کہا ''کھالے! تم ایک لڑکی کی خاطر اپنے ماں باپ اور بہنوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہو۔ کیا تمہیں کسی پر ترس نہیں آتا۔ ہیں؟''

وہ بھڑک گیا ''میں اسما کے لیے نہیں، کسی اور مشن کی تکمیل کے لیے جھیل پر جانا چاہتا ہوں۔''

مجھے اچنبھا ہوا، ''کیا مطلب؟ کیا مشن ہے تمہارا؟''

وہ پُرسوچ انداز میں بولا، ''مجھے ملتان میں کسی اچھی سی نوکری کی تلاش ہے۔ ملاقات کے دوران اُسے فرمائش کروں گا کہ وہ میرے لیے کوئی مناسب سی نوکری تلاش کرے تاکہ میں اُس کے قریب رہ سکوں۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے ملتان میں بلا چکی ہے۔''

''بکواس نہ کرو، تم کہیں نہیں جاؤ گے اور اِس غلط فہمی میں مت رہو کہ وہ تمہارے جیسے کن ٹٹے عاشق کے لیے نوکری تلاش کرے گی۔'' میں نے مصنوعی لاپروائی سے اپنا فیصلہ سنایا، ''تم نور پور میں رہو، ملتان چلے جاؤ یا کہیں بھی جا کر ایڈجسٹ ہو جاؤ، مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا..... سمجھے تم!''

''اچھا!'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولا ''میرے دل کی دُنیا موج میں ہے، تم جانو، نہ جانو، مجھے فرق نہیں پڑتا۔ یہاں چوری چھپے اسما کا دیدار میسر آتا ہے، وہاں جب جی چاہے گا، مل لیا

کروں گا۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ ویسے بھی سیانے کہتے ہیں کہ ترقی کرنے کیلئے اپنا گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے بھی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اماں ابا سے بات بھی کر لی ہے۔ جب میں اُنہیں تنخواہ کی رقم بھیجا کروں گا تو مارے خوشی کے اُن کی باچھیں کانوں سے جالگیں گی۔ ایک تم ہو کہ میری خوشی دیکھ کر کالے سُواہ ہو گئے ہو۔ ہے ناں!''

کوئی جواب دیے بغیر، میں نے اُس کے چہرے پر خوشی کے اَن گنت عکس، جوش اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت دیکھ کر خاموشی کی چادر اُوڑھ لی کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں تھا۔ وہ اپنی مستی میں مست، اپنی محبت کی ترنگ کے بہاؤ میں رقصاں کافی دیر تک مسرت بھری بہکی بہکی باتیں کرتا رہا، خواب بنتا رہا اور میں 'ہاں، ہوں' میں جواب دیتا رہا۔ پھر یہ طے پایا کہ میں اُس کے ساتھ ملتان جاؤں گا جہاں وہ اسما سے چمن زار میں ملاقات کرے گا اور میں خطرات کے پیشِ نظر اُس کی پہرے داری کروں گا۔ گاؤں میں اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی ہماری محفل اُجڑ گئی۔

میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی ہدایت کے مطابق کھوج لگانا شروع کر دیا تھا کہ میرے ماں باپ کے اندوہ ناک قتل کے فوری بعد نور پور سے کون رخصت ہوا تھا۔ چونکہ میں کسی کو بھی چونکانا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں اپنے والدین کے قاتل کی تلاش میں ہوں، اِس لیے میں نے کچھ احتیاطیں بروئے کار رکھ لی تھیں۔

جس دن میرے والدین کے انتقال کو تین دِن گزرے تھے، اُس دن سردار حیات خان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کے انتقال کو حوالہ بنا لیا تھا۔ اِس طرح دو آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک تو مقابل کے ذہن میں فوری طور پر وہ دورانیہ اُبھر آتا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہو رہا تھا کہ میرا مطمعِ نظر پوشیدہ رہتا تھا۔

میری جستجو کے نتیجے میں تین اشخاص سامنے آئے جو اِس واقعے کے فوری بعد نور پور سے چلے گئے تھے۔ افسر علی، شریف چکی والا اور سردار یار خان..... مجھے ایک طرح کی مایوسی ہوئی کیونکہ اِن تینوں کا تعلق کسی بھی انداز سے میرے والدین کے قتل سے جوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کو اِن تینوں کے بارے میں بتایا تو اُس نے کہا، ''خود کو غیر جانب دار رکھ کر اپنا کام آگے بڑھاؤ۔ اِن تینوں افراد سے ملو۔ اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اِنہیں ٹٹولو۔ بظاہر غیر متعلق دکھائی دینے والا فرد بھی ہمارا ٹارگٹ ہو سکتا ہے۔''

میں نے افسر علی سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ افسر علی میری گلی میں مشرقی کنارے پر رہائش پذیر تھا۔ بے ضرر اور معصوم بندہ تھا۔ وہ یقیناً میرا مطلوبہ شخص نہیں تھا۔ اُس نے مجھے بتایا، ''میں اُن دنوں یارن خان کے مال ڈنگر چرایا کرتا تھا۔ ایک دِن خان کی ایک گائے ریوڑ سے علیحدہ ہو کر کھو گئی۔ میں رات بھر اُسے تلاش کرتا رہا مگر وہ نہ ملی۔ صبح جب خان کو پتہ چلا تو اُس نے مجھے بھانے والے بڑے کیکر پر الٹا لٹکا دیا۔ تین بندوں نے مل کر میری تونی لگائی (مارا پیٹا)۔ اس پر بھی خان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو اُس نے میری اکلوتی بھینس چھین لی اور مجھے نوکری سے نکال دیا۔''

میں اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بہ نظرِ غایت جائزہ لے رہا تھا۔ سچ جھوٹ کی پرچھائیوں میں امتیاز کر رہا تھا۔ اُس کے پل پل بدلتے تاثرات غمازی تھے کہ وہ سچ بول رہا تھا۔

''شہرے خان! وہ بڑا ظالم انسان تھا۔ میں کافی دن تک گھر میں پڑا رہا۔ اُس کے کیوں نے مجھے اتنا مارا تھا کہ میں کئی دن تک چارپائی سے اُتر نہیں سکا تھا۔ پھر میرا ایک یار میرا پتہ لینے آیا۔ اسلم پنوار بصیرے میں رہتا تھا اور مظفر گڑھ کی ایک دھاگے والی مل میں کام کرتا تھا۔ اُس نے جب ماجرا سُنا تو مل میں نوکری کی پیش کش کی۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں..... میں نے حامی بھر لی۔ میں نے تیاری بھی کر لی مگر اُسی دن جس دن میں مظفر گڑھ جانا چاہتا تھا، تمہارے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہائے اللہ! وہ دن دوبارہ نہ دکھانا۔''

اُس کے دونوں ہاتھ کانوں سے چپک گئے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی، پھر بولا، ''بس پھر کیا تھا، نور پور سنج (ویران) ہو گیا۔ دوسرے دن حیات خان ہسپتال سے میتیں اٹھا کر لایا۔ ہم سبھی کفن دفن میں رُجھے رہے۔ فارغ نہیں ہوئے تھے کہ بڑا خان فوت ہو گیا۔ پھر ایک آدھ دن رکنا پڑا۔ قل خوانی کے بعد میں اپنا بوریا بستر اُٹھا کر مظفر گڑھ چلا گیا۔ جا کر مل میں بھرتی ہو گیا۔''

میں نے پوچھا، ''تو پھر تم کب واپس آئے؟''

وہ بولا، ''شاید کبھی نہ آتا، اپنے گھر والوں کو وہیں بلا لیتا مگر مجھے چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے واپس آ گیا۔''

''چوٹ؟''

''ہاں! میں وہاں رنگ کھاتے میں ڈافر بھرتی ہوا تھا۔ پہیوں والی ٹرالی میں مال بھر کر دوسرے کھاتے میں لے جاتا تھا۔ ایسے میں میرا پاؤں پھسل گیا اور چوکنا (کولہا) نکل گیا۔ کوئی دو مہینے چارپائی پر پڑا رہا۔ ٹھیک ہونے پر جب مل میں گیا تو پتہ چلا کہ میری شفٹ کا حساب ہو گیا تھا اور سارے ورکر سامان اُٹھا کر شیخوپورے کی کسی مل میں چلے گئے تھے۔'' اُس نے تفصیل بتائی۔

اُسے مزید کریدنے پر مجھے کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ وہ میرا مطلوبہ شخص نہیں تھا۔ میں شریف چکی والے سے ملا۔ باتوں ہی باتوں میں اُسے اپنی پٹڑی پر چڑھایا تو اُس کے پوپلے منہ کا ٹیپ پلیئر فرفر چلنے لگا، ''شہرے خان! میں بڑھئی تھا۔ کہاں جانا تھا میں نے، اُبھے (شمال) میں محمود کوٹ تک، لتا (جنوب) میں شاہ جمال تک، ڈبھار (مشرق) میں نور کبڑا اور ڈلا (مغرب) میں غازی گھاٹ تک رندا، آری اور تیشہ اُٹھائے گلی گلی پھر کر ہوکا لگایا کرتا تھا۔ نئی چارپائیاں اور پیڑھیاں بنایا کرتا تھا۔ مرمت بھی کرتا تھا۔ گھر سے نکلتا تھا تو کبھی دو مہینے بعد لوٹتا، کبھی چار کے بعد۔ بڑے خان کا جنازہ پڑھ کر نکلا تھا، چار مہینے بعد واپسی ہوئی تھی۔ یہ تو اللہ بھلا کرے سردار یارن خان کا، اُس نے مجھے دُکان بنا دی اور مجھے دَر دَر کی مزدوری سے نجات مل گئی۔''

میں نے پوچھا، ''یہ یارن خان کیسا آدمی تھا؟''

اُس نے یارن خان کی تعریفوں میں بعینہٖ دیوانے کی طرح، زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ چونکہ یارن خان یہاں موجود نہیں تھا اور میں اُس سے یوں بے تکلفی سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتا تھا اِس لیے شریف چکی والے کو اُس کے بارے میں کریدنے لگا۔ اُس کی معلومات کے مطابق حیات خان کے باپ کے مرنے کے ایک ہفتہ بعد اُس نے اچانک ہی لاہور کا قصد کیا تھا۔ وہاں جا کر شادی کر لی اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شریف چکی والا ایک مرتبہ یارن خان سے ملنے کے لیے لاہور جا چکا تھا مگر اُس کے گھر کا پتہ سمجھانے سے قاصر تھا کیونکہ وہ اَن پڑھ آدمی تھا، ایک وزٹنگ کارڈ ہاتھ میں تھامے پوچھتا پچھاتا یارن خان کی کوٹھی تک پہنچا تھا اور اُس کی گاڑی میں بیٹھ کر لاری اڈے گیا تھا۔

میں اِس کارِ بے کار سے خاصا دل برداشتہ اور مایوس ہوا تھا۔ یارن خان کا میرے والدین کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے برعکس ڈاکٹر شاہ جی پُر امید تھا اور مجھے اِس کام کی تکمیل پر

اکساتا رہتا تھا۔

آج کھالے کی مراد بَر آنے والی تھی۔ اپنے کاشتکارانہ امور سے فراغت پا کر طے شدہ پروگرام کے تحت میں اس کے انتظار میں بخشو لوہار کی دکان پر آ بیٹھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی ویگن آتی ہوئی دکھائی دی۔ مخصوص وقت گزار کر، ویگن کا دوسرا پھیرا لے کر میں اور کھالا چوک قریشی پہنچے۔ ویگن عزت خان ڈرائیور کے حوالے کی۔ وہ پہلے فرید آباد کے لیے بیڈفورڈ بس چلاتا تھا۔ اس کی بس چند دن قبل اُلٹ گئی تھی جس کی وجہ سے اُسے باڈی میکر کے ہاں ہفتہ بھر کے لئے کھڑا کرنا پڑا۔ ان دنوں فارغ تھا اور ویگن اڈے پر بیٹھ کر پیٹی بندوں کی 'پھٹیک' بھگتتا تھا۔ دیہاڑی بن جاتی تھی۔

ہم مظفر گڑھ کے لیے بس میں بیٹھے۔ مظفر گڑھ سے ملتان جانے کے لیے ڈیرہ اڈہ والی ویگن پر سوار ہو گئے۔ راستے میں کھالے نے مجھے چند سنہری ہدایات دیں۔ اُس نے درپیش آنے والی ہر ممکنہ صورتِ حال پر مجھے مفید ردِعمل سے آگاہ کیا۔ میں نے اُس کی باتیں ذہن نشین کر لیں۔ اس کے دل کی دُنیا سے میں بے خبر تھا۔ اپنے دل کی جانتا تھا۔ تجسس اور جوش میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

جب ہم چمن زار کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ویگن سے اُترے، سوا چار بجے کا وقت تھا۔ دن مضمحل ہونے لگا تھا۔ میں چند لمحے رُکا رہا۔ جب کھالا گیٹ کے قریب ٹکٹ والے کیبن کی کھڑکی پر جھکا، میں بھی کیبن کی طرف چل پڑا۔ ٹکٹ لیتے ہوئے پارکنگ ایریا کا جائزہ لیا۔ تفریح کے لیے آنے والوں کا ہجوم تھا۔ کوئی فیملی کار میں بیٹھ رہی تھی، کوئی نکل کر کیبن کی طرف آ رہی تھی۔ اک جہانِ حیرت سجا تھا، بساطِ شوق بچھی تھی اور میں کھالے کی پشت پر نظریں جمائے پھول پودوں میں گھری روش پر چل رہا تھا۔ یہ ملتان کا سب سے خوب صورت پارک تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اپنے کلاس فیلوؤں کے ہمراہ بارہا یہاں آیا تھا مگر آج سب کچھ نیا نیا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں بچوں، بڑوں اور خواتین کی دل بستگی کے لیے ان گنت اہتمام کیے گئے تھے۔ اگر کھالے نے خانزادوں اور اُن کے بچوں کو نہ دیکھ رکھا ہوتا تو یہاں دوڑتے کودتے بچوں اور ٹہلتی پھرتی عورتوں کو دیکھ کر یقیناً انگشتِ بدنداں ہو جاتا۔

جھیل کے وسط میں ایک جزیرہ بنا ہوا تھا جس کے چاروں اطراف لوہے کی مضبوط ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ ایک کمان دار چوبی پل جزیرے کو پارک سے ملاتا تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے

چلتے ہوئے جزیرے پر گئے۔ کافی دیر تک کارِ آوارگی جاری رکھا۔ کھالا جھیل کے کنارے پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ اس نے جگہ کے انتخاب میں خاصی چالاکی سے کام لیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ گیٹ میں داخل ہونے والے ہر چہرے کا طواف کر سکتا تھا۔ میں اُس کے عقب میں، جھیل سے کچھ فاصلے پر، ایستادہ پنگھوڑے کے پاس جا کھڑا ہوا اور بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے لگا۔

اسما نے وقت کی پابندی کو ملحوظ رکھا تھا۔ عین مقررہ وقت پر گیٹ میں داخل ہوئی۔ شانِ بے نیازی سے چلتی ہوئی جھیل پر آئی۔ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ کھالے کو دیکھ کر جھیل کا چکر کاٹ کر اُس کے قریب پہنچ گئی۔ کھالا فرطِ محبت سے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ جھک کر سلام گو ہوا۔ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے مگر کھالے کی محبت اندھی نہیں تھی، سٹیٹس کے فرق کو دیکھ کر مؤدب ہو رہی تھی۔ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی اور نہ ہی میں اُن کے لبوں کی حرکات سے موضوعِ سخن اخذ کر پایا تھا۔ کھالے نے اپنا صافہ پھیلا کر گھاس پر پھیلایا اور اُسے بٹھا دیا۔ خود چند قدموں کی دوری پر گھٹنوں کے بل گھاس پر بیٹھ گیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''اَبے الو کے پٹھے! نماز پڑھنے کا ارادہ ہے کیا؟''

وہ اکیلی آئی تھی۔ اگر ڈرائیور ساتھ آیا تھا تو وہ باہر پارکنگ میں ہی رُک گیا تھا۔ وہ ڈرنکس شاپ کی طرف متوجہ تھی۔ ہاتھ لہرا کر دکاندار کو بلا رہی تھی۔ ایک لڑکا بھاگ کر دونوں کے قریب گیا۔ آرڈر لے کر پلٹ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے دونوں کو آئس کریم کھاتے دیکھا۔ جی ہی جی میں کھالے کو مخاطب کیا، ''تمہارے برے دن آ گئے ہیں کھالے اُستاد! سردیوں میں قلفہ کھاؤ گے تو کئی دنوں تک کھانستے چھینکتے رہو گے۔''

مجھے کھالے کی قسمت پر رشک آیا اور میں غزالہ کو یہاں لا کر آئس کریم کھلانے کا منصوبہ ترتیب دینے لگا۔ وہ یقیناً اِس دُنیا کو دیکھ کر پریشان ہو جائے گی۔ اُس نے ابھی تک محض نور پور کی دُنیا ہی دیکھ رکھی تھی۔ وہاں اور یہاں کے بیچ زمین و آسمان کا فرق حائل تھا۔ اسما اور کھالے کو دیکھ رہا تھا، اپنی محبت کی تصوراتی آبیاری کر رہا تھا کہ اچانک میں چونک پڑا۔ قیمتی پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک بڑے بالوں والا ہیرو ٹائپ آدمی دونوں کے سروں پر جا کھڑا ہوا تھا۔ میں پنگھوڑے کے آہنی اسٹینڈ کے ساتھ کمر ٹکا کر کھڑا تھا۔ اُن کے قریب جانا چاہتا تھا مگر پھر کھالے کی ہدایت یاد آ گئی اور میں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے۔

نو وارد نے اسما کو مخاطب کیا پھر دونوں کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں۔ مجھے اسما کا چہرہ

دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریشان اور برہم دکھائی دیتی تھی۔ کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی تبھی کھالا ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ اسما کو بھی اُٹھنا پڑا۔ کھالے نے کچھ کہتے ہوئے ہیرو ٹائپ لمبے تڑنگے شخص کی طرف انگلی اُٹھائی۔ یہ اُس کا دھمکی دینے کا مخصوص انداز تھا۔ ہیرو نے اُسے دونوں ہاتھ چھاتی پر رکھ کر پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ ایسے ہی وقت میں اُس کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا.....''

کھالا چند قدم پیچھے ہٹا پھر سنبھل کر آگے بڑھا اور اُس نے دائیں ہاتھ کا زوردار تھپڑ ہیرو کے منہ پر دے مارا۔ چٹاخ کی آواز سنائی دی۔ ہیرو چند لمحوں تک اپنا بایاں ہاتھ گال پر رکھے اُسے خون آشام نظروں سے گھورتا رہا پھر چیختے ہوئے حملہ آور ہوگیا۔ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اینٹوں کی روش پر آ گیا۔ اَب میں تینوں کے کافی قریب تھا۔ کئی لوگ متوجہ ہو گئے تھے اور میری طرح میدانِ جنگ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔

اسما نے دونوں کو روکنے کی کوشش کی مگر پھر سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ کھالے نے ہیرو کے لانبے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑا اور پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ وہ کمان کی صورت خم کھا گیا۔ اُس نے کھالے کو لات مارنا چاہی مگر کھالے نے اس سے پہلے ہی اپنا داہنا گھٹنا اُس کے پیٹ کے نیچے مار دیا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔ اُس نے گالیاں دیتے ہوئے کھالے پر مکوں کی بارش کر دی۔ کھالا اُس کے بالوں پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور اُسے چھوڑ کر بے اختیار سینے اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ہیرو کو موقع مل گیا۔ اُس نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگ اُٹھا کر ایڑی کی ٹھوکر کھالے کی پشت پر ماری۔ وہ منہ کے بل گرا مگر اُس نے اُٹھنے میں غیر معمولی مستعدی دکھائی۔ ایسے میں 'دھپ' کی زوردار آواز کے ساتھ ہیرو کا پنچ اُس کے جبڑے پر لگا۔ وار کارگر رہا تھا۔ کھالا ڈگمگایا اور ڈھلوانی گھاس پر جھیل کے پانی تک لڑھکتا گیا۔ میرے دائیں بائیں کئی لوگ اکٹھے ہوگئے تھے اور ہر کوئی ایک دوسرے سے اِس لڑائی کا پسِ منظر دریافت کر رہا تھا۔

اسما معاملے کی سنگینی کو بھانپ چکی تھی۔ اُس کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''موبی! فار گاڈ سیک.....''

میدانِ کارزار گرم تھا۔ اُس کی آواز پر دونوں میں سے کسی نے کان نہ دھرے۔ مجھے ہیرو ٹائپ شخص کے نام کا پتہ چل گیا۔ اُس کا نک نیم موبی تھا۔ پورا نام محبوب، محبّ یا مبین ہوسکتا

تھا۔

میں نے بے بس کھڑی اسما کی آنکھوں میں نمی تیرتی دیکھ لی تھی۔ وہ اچانک پلٹی اور تیز تیز قدموں سے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اُس کا یہاں رُکنا کسی بھی طور سے مناسب نہیں تھا۔

موبی کھالے کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اُس نے کھالے کو دھکیل کر جھیل میں پھینکنا چاہا مگر دھوکہ کھا گیا۔ کھالے نے بڑا پھرتیلا دیہاتی داؤ کھیلا تھا۔ اُس نے موبی کی دونوں ٹانگوں کو پکڑا اور بغل میں سر دے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دو تین چکر لیے اور اُسے گھما کر جھیل میں پھینک دیا۔ چھپاک کی زوردار آواز سے موبی پانی میں گرا، زیرِ آب گیا پھر سر جھٹکتا ہوا پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔ اَب صورتِ حال کافی بدل گئی تھی۔ وہ جھیل سے نکلنا چاہتا تھا مگر کھالے کی پے در پے ٹھوکریں اُسے واپس پانی میں دھکیل دیتی تھیں۔ چند ہی ٹھوکروں نے اُس کے چہرے کو خون سے رنگ دیا۔ ایسے میں لوگوں نے کھالے کو پکڑ لیا۔ وہ پانی سے نکلنے کی کوشش میں مصروف اجنبی کو نہ صرف گالیاں دے رہا تھا بلکہ لوگوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے بری طرح مچل رہا تھا۔ موبی پانی سے باہر آیا تو اُس کی حالت بہت خراب تھی۔ لباس پانی میں بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا، بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور اُس کی تمام شان و شوکت ہوا ہو گئی تھی۔ چہرے کی جلد کئی جگہوں سے پھٹ کر خون اگلنے لگی تھی جس کی وجہ سے شرٹ کا اگلا حصہ سرخ ہو گیا تھا۔ اُس نے کھالے کو گالیوں سے نوازا اور نبٹ لینے کی دھمکیاں دیتے ہوئے تیز تیز چلتا ہوا دور ہو گیا۔ اُس کا رُخ بھی چمن زار کے بڑے گیٹ کی طرف تھا۔

لوگوں نے کھالے کو چھوڑ دیا۔ لوگ ماجرا پوچھ رہے تھے۔ ایسے میں ایک آدمی نے جلدی سے کہا، ''پولیس آ رہی ہے، بھاگو!''

تماشائی یہ دیکھے بغیر کہ پولیس کس طرف سے آ رہی ہے، بھاگ اُٹھے۔ چند ہی لمحوں بعد میں اور کھالا اکیلے رہ گئے۔ میں نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ تین سپاہی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے گیٹ کی طرف سے جائے وقوعہ کی طرف آتے دکھائی دیے۔ میں نے کھالے کو آنکھ کے اشارے سے بھاگ جانے کا کہا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں لرزی اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے پنگھوڑوں والے احاطے کی طرف بھاگ نکلا۔ پولیس والوں نے اُسے فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا، وہیں سے سیدھ کی اور اُس کے پیچھے بھاگ کھڑے

ہوئے۔ اُن کی رفتار چغلی کھاتی تھی کہ وہ کھالے کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔ چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی کے عقب میں جا کر فرض نبھانے والے تینوں سپاہی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا مگر چونکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا، اِس لیے میں نے بھاگنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ کھالے کا صافہ ہنوز گھاس پر پڑا تھا۔ اُسے جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ اچانک میرے کانوں میں بوٹوں کی دھمک گونجی۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ تینوں سپاہی کھڑے ہانپ رہے تھے۔ ایک بولا، ''اوئے جوان! یہاں لڑنے والے کون تھے؟''

میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا، ''ایک شخص نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی، لمبے بال اور لمبا قد تھا اُس کا..... دوسرا.....''

میں نے کھالے کا حلیہ بھی بیان کر دیا۔ وہ منہ بنا کر بولا، ''تم اُنہیں جانتے نہیں ہو کیا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اسی اثنا میں بھاگ جانے والے تماشائیوں نے پھر حلقہ باندھ لیا۔ پولیس والوں نے بالخصوص کسی کو مخاطب کیے بغیر پوچھا، ''تم میں سے کوئی جانتا ہے اُن لونڈوں کو؟''

ایک دس گیارہ سالہ بچے نے مسکرا کر کہا، ''میں بتاؤں انکل؟''

سپاہی متوجہ ہوا۔ خوش ہو کر بولا، ''تم جانتے ہو؟''

''جی انکل!'' بچہ شرارت آمیز معصومیت سے بولا، ''ایک شان مائیکل تھا، دوسرا انڈر ٹیکر..... سچ انکل! مزہ آ گیا دونوں کا ایکشن دیکھ کر۔''

اس کے ایک ہم عمر ساتھی نے کہا، ''آج انڈر ٹیکر دُم دبا کر بھاگ نکلا۔ شان مائیکل اِز دا گریٹ ریسلر!''

لوگوں کی بے ساختہ مسکراہٹوں پر سپاہی کھسیا گیا۔ تفریح کی غرض سے آنے والے کسی کو نہیں جانتے، اپنی موج مستی میں گم ہوتے ہیں۔ سبھی نے انکار کیا۔ ایک سپاہی بولا، ''چلو شریف علی! دونوں ہمیں دیکھ کر بھاگ گئے ہیں۔ اِن بے چاروں کو کیا علم کہ وہ کون تھے۔ چلو بھئی مجمع ختم کرو..... چلو شاباش..... اگر اُن دونوں میں سے کوئی دکھائی دے تو فوراً ہمیں گیٹ پر مطلع کرنا۔ ٹھیک ہے ناں!''

اُس نے ڈنڈا لہرا کر تماشائیوں کو تتر بتر کیا اور گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ میری جان میں

جان آئی۔ میں پہاڑی کے پاس ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر جھانکا تانی کرنے لگا۔ کھالا دکھائی نہیں دیا۔ کہیں چھپ گیا تھا یا چمن زار سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مجھے وہ ہیرو ٹائپ شخص بھی کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اپنے ڈیل ڈول سے ہار ماننے والا نہیں لگتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو بلانے کے لیے بھاگ نکلا تھا یا کھالے سے نبٹنے کے لیے کوئی اسلحہ لینے گیا تھا۔

میرا خیال ٹھیک نکلا۔ لمبے بالوں والا موبی دو ساتھیوں سمیت آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چڑیا گھر والی سمت سے برآمد ہوا تھا۔ اُس نے شرٹ کہیں اُتار پھینکی تھی اور اَب ہائی نیک بنیان پہن رکھی تھی۔ بال سوکھ چکے تھے جبکہ پینٹ اَبھی گیلی تھی۔ تینوں نے جائے وقوعہ پر کھڑے ہو کر اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ کھالا وہاں ہوتا تو دکھائی دیتا۔ موبی کولہوں پر ہاتھ رکھے وہیں رُک گیا جبکہ اُس کے دونوں ساتھی پارک میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ مجھے اُن کی حماقت پر ہنسی آئی۔ جس نے کھالے کو دیکھ رکھا تھا، وہ وہیں کھڑا تھا جبکہ وہ جو اُس کی شکل سے ناآشنا تھے، اُسے تلاش کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

موبی مضطربانہ انداز میں ٹہلتے ہوئے میرے قریب آیا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بڑبڑایا، ''زندہ نہیں چھوڑوں گا حرامزادے کو۔''

میں نے پوچھا، ''آپ کس کو تلاش کر رہے ہیں؟''

اُس نے غصہ بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میں نے کہا، ''اَبھی پولیس والے آپ کو تلاش کرتے پھرتے تھے۔''

''پولیس والوں کی تو.....'' اُس نے نہایت واہیات لہجے میں کہا، پھر ٹھٹک گیا، بولا، ''تم کتنی دیر سے یہاں ہو؟''

میں نے کہا، ''جب آپ کی لڑائی ہو رہی تھی، تب یہاں آیا تھا۔''

اُس نے مجھ میں دلچسپی لی۔ بولا، ''میرے ساتھ لڑنے والا کدھر گیا؟''

اصولاً اُسے پوچھنا چاہیے تھا کہ اُسے مار مار کر اَدھ موا کرنے والا کہاں گیا مگر وہ مار کھانے والی بات کو سرے سے گول کر گیا تھا۔ ایسا اعتراف کرنے سے اَنا پر چوٹ پڑتی تھی۔

میں نے مختلف سمت میں ہاتھ کا اشارہ کیا، ''اُدھر بھاگ گیا۔ پولیس والے اُس کے پیچھے لگے تھا؛ مگر وہ کون تھا؟''

وہ بولا، ''میں اُس حرامزادے کو نہیں جانتا۔''

''پھر لڑائی کیوں ہوئی تھی؟''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ خاصا خوب رُو انسان تھا مگر کھالے کی ٹھوکروں نے اُس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں اُس کے ساتھی بے نیلِ مرام لوٹ آئے۔ اُن کی باہمی گفتگو کو سن کر مجھے علم ہوا کہ اُس ہیرو ٹائپ شخص کا پورا نام محبوب الحسن تھا۔ تینوں کھالے کو غائبانہ گالیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

کھالے نے کسی طرف سے بھی سر نہیں نکالا تھا۔ غالب خیال یہی تھا کہ وہ اپنا کام کر کے رخصت ہو گیا تھا۔ میں نے بھی چمن زار سے نکلنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس کا انتظار فضول تھا۔ پارکنگ ایریا میں موبی اور اُس کے دونوں ساتھی ایک کار میں بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ اَبھی بھی کھوجتی نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ناگاہ پارکنگ میں کھڑی ایک فورویل جیپ کے بونٹ کے پار سے جھانکتا ہوا کھالے کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ موبی کی کار سے کچھ ہی فاصلے پر چھپا کھڑا تھا۔ چونکہ موبی اور اُس کے ساتھی میری طرف متوجہ تھے، اِس لیے میں اُسے کوئی اشارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ یقیناً کھالا موبی کی کار کو نہیں پہچانتا تھا اِس لیے وہ اردگرد دیکھ کر جیپ کے عقب سے نکل کر میری جانب بڑھنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں موبی کی نگاہ اُس پر پڑ گئی۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے کار میں سے اُترا اور کھالے کی طرف دوڑ پڑا۔ میں بری طرح گھبرا گیا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں بڑا سا خوف ناک پستول دَبا ہوا تھا جسے وہ دوڑتے ہوئے لہراتا جاتا تھا۔

میں بے اختیار حلق کے بَل چیخا، ''کھالے! ذرا سنبھل کے.....''

ساتھ ہی میں نے کھالے کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ موبی اس پر بائیں سمت سے حملہ آور ہونے والا ہے۔ کھالے نے موبی کو دیکھا تو اچانک ٹھہر گیا جبکہ موبی کا ایک ساتھی موبی کے تعاقب میں جبکہ دوسرا میری طرف دوڑ پڑا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ اَبھی تک میرا اور کھالے کا تعلق چھپا ہوا تھا؛ خیر تھی۔ اَب طشت از بام ہو گیا تھا؛ خیر نہیں رہی تھی۔ موبی کا ساتھی کاروں کے بیچ زِگ زیگ کے سے انداز میں دوڑتا ہوا خطرناک ارادے کے ساتھ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک فائر کی خوف ناک آواز فضا میں گونج اُٹھی۔ غیر ارادی طور پر میں

نے کھالے کو دیکھا تو میری سانس سینے میں ہی کہیں گھٹ کر رہ گئی۔

میری نظروں کے سامنے کھالا فائر کی آواز کے ساتھ ہی اُچھل کر زمین پر اوندھے منہ گر گیا جبکہ موبی اُس کے سر پر کھڑا پستول ہاتھ میں لہرا کر چیخ رہا تھا۔ میرے کانوں میں اُس کی بے ہنگم چیخ و پکار پڑ رہی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پارکنگ ایریا میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لوگ چلاتے ہوئے وہاں سے دور بھاگ رہے تھے۔

اِسی اثنا میں موبی کا ساتھی میرے قریب پہنچ آیا۔ میں چونکہ کھالے کی طرف متوجہ تھا جو یقینی طور پر گولی کھا کر زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اِس لیے موبی کے ساتھی کے پہلے وار سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا اور رُخسار پر زوردار مُکا لگتے ہی پہلو کے بل لڑھک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے رقصاں ہو گئے۔ میں جب تک سنبھل کر اُٹھتا، حملہ آور مجھ پر دوبارہ حملہ کر چکا تھا۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا جھیل کی آہنی ریلنگ تک لے گیا اور گردن سے پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اُس کے اس مسلسل عمل سے میری کمر بار بار ریلنگ کی ابھری ہوئی نوکوں سے ٹکرا رہی تھی اور شدید تکلیف کا احساس میرے رگ و پے میں اترتا جاتا تھا۔

بدقت میں نے اُسے پیچھے دھکیلا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر پوری قوت سے ٹکر مارنے کی غرض سے میری سمت بڑھا۔ میں بجلی کی سی مستعدی سے ایک جانب ہٹ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں ریلنگ سے ٹکرایا اور دوہرا ہو گیا۔ اُس کے پیٹ میں ریلنگ کے نوکیلے راڈ چبھ گئے تھے۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پوری قوت سے اُسے لات ماری۔ وہ چیخ کر سیدھا ہوا، پلٹا پھر میرا طوفانی مکا چہرے پر وصول کرتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے اُچھل کر اپنی کہنی پوری قوت سے اُس کے سر پر ماری۔ وہ 'ہائے' کی دردناک حلق سے خارج کرتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں پھر فائر کا ہولناک دھماکہ فضا میں گونجا جس کے ساتھ ہی ایک سماعت شکن انسانی چیخ بھی گونجی۔ میرا دل دہل گیا اور میں اپنی کہنی کو مسلتے ہوئے پلٹ کر کھالے کی طرف دوڑا۔ پارکنگ کا وسیع ایریا اِس وقت انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے، جو وہاں موجود تھے، اپنی اپنی گاڑیاں وہاں سے نکال لی تھیں اور اَب یک رویہ سڑک پر تماشائی بنے کھڑے تھے۔ میں آدمیوں کے بیچ میں سے نکل کر جونہی اُس جگہ پر پہنچا جہاں کچھ لمحے قبل کھالا زمین پر گرا ہوا تھا، تو دیکھا کہ کایا پلٹ چکی تھی۔ کھالے کی جگہ پر موبی زمین پر گرا خون میں لت پت تڑپ رہا تھا جبکہ کھالا چند قدموں کی دوری پر مجھے دو

کاروں کے بیچ میں بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس کے عقب میں دو پولیس والے دوڑ رہے تھے۔ کاروں سے آگے نکل کر وہ رُکا، پلٹا اور فضا میں پستول لہرانے لگا۔

اپنے تعاقب کاروں کو خوفزدہ کر کے خود سے دور رکھنے کے لیے اُس نے ایک ہوائی فائر کیا اور حلق کے بَل چیخا، ''خبردار! جو بھی میرے قریب آیا، زندہ نہیں بچے گا۔''

اُس کے پیچھے بھاگنے والے جہاں کے تہاں رُک گئے جبکہ وہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھ پر دوڑنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے داہنی جانب ایک سپاہی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ چونکہ یہ وقت معاملہ فہمی کا نہیں تھا، اس لیے میں نے لمبی جست بھری اور کھالے کی مخالف سمت میں، مظفر گڑھ جانے والی سڑک پر دُڑکی لگا دی۔ یہ میرا بے ساختہ اقدام تھا جو میرے حق میں بہتر ثابت ہوا کیونکہ گیٹ خالی تھا اور گیٹ پر تعینات پولیس اہلکار اس وقت پارکنگ میں ہنگامی صورت حال سے نبرد آزما تھے۔ میرے عقب میں بوٹوں کی خوفناک دھمک اور 'وہ گیا، پکڑو، جانے نہ پائے' جیسی ملی جلی آوازوں کا شور بپا تھا جس نے میری رفتار کو کئی گنا تک مہمیز کر دیا تھا۔ چند ہی منٹوں میں، میں اپنے پیچھے دوڑنے والوں سے کافی مہلت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کرنے کے بعد میں اُس پوش علاقے سے نکل کر پُر ہجوم آبادی میں داخل ہو چکا تھا۔ یہاں میرے لیے چھپنا قدرے آسان تھا۔ میں نے رُک کر اپنے تعاقب کناؤں کا جائزہ لیا۔ وہ خاصے فاصلے پر دکھائی دیے۔

اُنہیں دھوکہ دینے کی غرض سے ایک تنگ اور مصروف بازار میں گھس گیا۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کافی دور تک نکل گیا۔ سمت کا دھیان رکھتے ہوئے چکر کاٹ کر دوسرے بازار میں سے گزرتا ہوا دوبارہ سڑک پر آ گیا۔ ایک ہی وقت میں مجھے نیلے رنگ کی پولیس وین اور سٹی بس دکھائی دیں۔ میں نے فی الفور بس میں گھس کر خود کو پولیس والوں کی متلاشی نظروں سے اوجھل کر لیا۔ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں بمشکل اپنی جگہ بنا پایا تھا کہ بس روانہ ہو گئی۔ بس شیر شاہ بائی پاس سے آ رہی تھی۔ ملتان کے وسطی بس اسٹاپ ڈیرہ اڈہ کی طرف جا رہی تھی۔ یعنی میں پھر پارک کی طرف جا رہا تھا۔ اِس کے سوا میرے پاس چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے پارک کے داخلی گیٹ کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر رَش کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بس وہاں پر مسافروں کو اُتار کر آگے بڑھ گئی تو میرے دم میں دم آیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں

ڈیرہ اڈہ کے چوک میں اُتر گیا۔

عین سامنے ایک ہوٹل دکھائی دیا۔ محفوظ ہونے کا احساس پاتے ہی بھوک ستانے لگی۔ دوپہر میں کھایا ہوا کھانا اچھل کود اور سفر کی دھکم پیل میں ہضم ہو گیا تھا۔ ہوٹل میں گھس کر ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ کھانے کا آرڈر دیا اور کھالے کے بارے میں سوچنے بیٹھ گیا۔

نہیں معلوم تھا کہ وہ کس حال میں تھا۔ پہلے فائر کی آواز سنتے ہی میں نے اُسے فرش پر لیٹے دیکھا تھا۔ دوسرے فائر کی آواز پر موبی کو خون میں لت پت تڑپتے دیکھا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی نکلتا تھا کہ موبی کا نشانہ چوک گیا تھا۔ دو بدو لڑائی میں وہ کھالے سے ہزیمت اُٹھانے کے بعد اپنے پستول سے بھی دستبردار ہو گیا تھا اور کھالے نے، جب کوئی بات بنتی نہیں دیکھی، اُسے گولی مار دی ہوگی۔ اگلا منظر میں نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا کہ وہ پستول لہراتا ہوا وہاں سے بھاگ رہا تھا۔ اُس کے متعاقب اُس کی دھمکی سن کر رُک گئے تھے۔ پھر خدا جانے وہ پولیس والوں کی گرفت میں آ گیا تھا یا بھاگ نکلا تھا۔ اُس کی پھرتی اور دلیری کو مدنظر رکھتے ہوئے اغلب اُمید تھی کہ وہ جُل دے کر اَب تک نور پور پہنچ چکا ہوگا۔ موبی زندہ تھا یا مر گیا تھا؟ اس بارے میں کچھ کہنا محض قیاس تھا۔

کھانا کھانے کے دوران بھی میرے ذہن میں گزشتہ فلم اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت چلتی رہی۔ تیز پتی والی چائے پیتے ہوئے پہلو میں ایک نئی کسک جاگ گئی۔ اگر کھالا ہاتھ نہیں لگا تھا تو اَب تک پولیس میری اور کھالے کی تلاش میں نور پور پہنچ چکی ہوگی۔ موبی کی موت واقع ہونے کی صورت میں موبی کے ساتھیوں نے اسما کی نشاندہی کر دینا تھی جو کھالے کے بارے میں معلومات فراہم کر سکتی تھی۔ اگر موبی مرنے سے بچ گیا تھا تو بذات خود اسما کا نام پولیس کو دے دیتا۔ یعنی دونوں صورتوں میں ہم قانون کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ہاں! تیسری صورت یہ نکلتی تھی کہ اسما کھالے کے بارے میں لب کشائی نہ کرتی مگر یہ ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔

شکم سیرابی نے ذہن کی آبیاری کر دی تھی۔ سوچنے کی صلاحیتیں عود کر آئیں۔ سجھائی دینے لگا تھا کہ مجھے منہ اُٹھائے نور پور نہیں جانا چاہیے۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر نور پور کے حالات کا جائزہ لینا چاہیے یا اسما اور کھالے کو ڈھونڈنا چاہیے۔ دونوں میں سے کوئی بھی مل جاتا، حالات سے آگہی ہو جاتی۔ ایک نئی پریشانی جاگ پڑی۔ میرے پاس اسما سے رابطے کی کوئی سبیل نہیں

تھی۔نور پور میں سیلولر سگنلز نہ ہونے کی وجہ سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ اَبھی تک نور پور اور اطراف میں کسی جگہ پر بھی کوئی سیلولر ٹاور نصب نہیں ہوا تھا۔دل کو ایک ذرا تسلی ہوئی کہ خانزادوں کے پاس کارڈلیس فونز کی سہولت موجود تھی۔ میں امیر نواز اور بخت خان سے رابطہ کر کے نور پور کے حالات کے بارے میں دریافت کر سکتا تھا۔

ہوٹل سے نکل کر 'یو' شکل کی مارکیٹ کے کارنر میں واقع ایک 'پی سی او' پر پہنچا۔امیر نواز کا نمبر ایک چٹ پر لکھ کر دکاندار کو دیا۔اُس نے بہتیری کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو پایا۔پھر میں نے بخت خان کا نمبر دیا۔میری بدقسمتی شاید پورے جوبن پر تھی کیونکہ بخت خان کا نمبر بھی نہیں لگا۔دکاندار نے کہا،''نہیں بھائی صاحب! شاید متعلقہ ایکس چینج بند ہے یا لائن میں گڑبڑ ہے۔''

میں مایوس ہو کر پھر سڑک پر آن کھڑا ہوا۔نور پور کے خانزادوں کے لینڈ لائن نمبر چوک قریشی میں تھے جہاں پر اُنہوں نے کارڈلیس فون کے اونچے ایریل نصب کر رکھے تھے۔چوک قریشی والی ایکس چینج آئے روز فنی خرابیوں کا شکار ہوتی رہتی تھی جس کا واویلا امیر نواز بکثرت کرتا رہتا تھا۔

رات خاصی گہری ہونے لگی تھی۔دُکانیں بند ہونے لگیں۔ زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنا میرے لیے کسی نئی پریشانی کا پیشِ خیمہ بن سکتا تھا۔اتنے بڑے شہر میں سے کھالے کو ڈھونڈ نکالنا ممکن تھا نہ ہی اُس کے اتفاقاً مل جانے کی امید پر تکیہ کرتے ہوئے شب کا آوارگی میں گزاری جا سکتی تھی۔ڈیرہ اڈہ سے روانہ ہونے والی ویگنیں چمن زار والے راستے سے مظفر گڑھ جاتی تھیں۔ مجھے پکڑ لیے جانے کا خوف لاحق تھا اس لیے میں جنرل بس اسٹینڈ پر سے بس یا ویگن پکڑنے کے ارادے سے کسی رکشے کو دیکھ رہا تھا۔

ایسے ہی وقت میں میرے قریب سے ایک ڈارک بلو کار نہایت کم رفتار سے گزری۔ چند قدم آگے جا کر اُسے بریک لگ گئے۔ میں اُسے نہایت سرسری انداز میں دیکھ کر رکشے کا انتظار کرنے لگا۔میں سمجھا تھا کہ کار والے مارکیٹ سے کچھ خریدنے کے ارادے سے رُکے تھے مگر تب بُری طرح چونکا جب کار ریورس ہو کر عین میرے سامنے رُک گئی۔ کار کے دونوں دروازے یکبارگی کھلے اور دو افراد غیر معمولی تیزی سے اُتر کر میری جانب بڑھے۔میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجا دیا۔جب اگلے گیٹ سے نکل کر مجھ تک پہنچنے والے شخص کا چہرہ دکھائی دیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔وہ موبی کا ساتھی تھا جسے میں نے پارک کی ریلنگ کے

پاس پہلوانوں کے سے انداز میں خوب ٹھونکا بجایا تھا اور پچھاڑ کے رکھ دیا تھا۔

نامساعد اور کبیدہ خاطر صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھنے تک مجھے بہت دیر ہو چکی تھی۔ دونوں میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میرے مارگزیدہ نے سیاہ رنگ کا لیدر کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ اُس کے ساتھی نے ہلکے رنگ کی نفیس سی جرسی پہن رکھی تھی۔ اسے میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ کوٹ والا میرے مقابل ٹھہر کر خشونت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور بے ساختہ پیچھے ہٹ کر کہا، ''کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ اور اِس طرح مجھے کیوں گھور رہے ہو؟''

جرسی والا اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا، ''زور آور! کیا تم نے پہچاننے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟''

''نہیں.....'' زور آور نے کڑی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی کوٹ کی پاکٹ سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ میرے جسم کا خون میری آنکھوں میں مجتمع ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول دبا ہوا تھا جس کی نال میرے سینے کی طرف اُٹھی ہوئی تھی، ''کوئی بھی حرکت کرو گے تو یہیں ڈھیر کر دوں گا۔ چلو..... گاڑی کی طرف چلو!''

اُس کے سنگین اور تحکمانہ لہجے نے اُس کے عزائم مجھ پر آناً فاناً آشکار کر دیے۔ وہ مجھے اغوا کر کے کہیں لے جانا چاہتا تھا۔ کہیں مار پھینکنے کا ارادہ رکھتا تھا یا مجھے پولیس کی تحویل میں دینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ ابتدائی خوف اور ہیجانی کیفیت سے میں اتنی دیر میں چھٹکارا حاصل کر چکا تھا۔ اپنے تئیں طے کر چکا تھا کہ میں اُن کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

میں نے کہا، ''مگر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتا اور نہ ہی تم سے کبھی ملا ہوں۔ کوئی غلط فہمی.....''

اُس نے غرا کر کہا، ''جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو ورنہ.....''

میں نے ایک نظر پستول کی نال کو دیکھا، اُس کی آنکھوں میں پھیلی بربریت کو پرکھا اور اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ اُسے شاید مجھ سے ایسی پھرتی کی توقع نہیں تھی، اِس لیے دھوکہ کھا گیا۔ پستول پر اُس کی گرفت مضبوط تھی مگر اَب وہ مجھ پر فائر نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ہم دونوں کے ہاتھوں میں دبے ہوئے پستول کی نال کا رُخ آسمان کی طرف تھا۔ میں نے دایاں گھٹنا پوری قوت سے اُس کی ٹانگوں کی بیچ دے مارا۔ وہ 'اوغ' کی آواز نکال کر گھٹنوں

کے بل فٹ پاتھ پر ڈھے گیا۔ میرا دوسرا وار اُس کے سینے پر پڑا۔ پستول پر اُس کی گرفت دم توڑ گئی اور وہ کمر کے بل سڑک پر جا گرا۔ میں پستول کو ہاتھ میں سیدھا کر ہی رہا تھا کہ اُس کے ساتھی نے، جسے میں جلد بازی میں بھلا بیٹھا تھا، پوری قوت سے میری گردن کے عقبی حصے پر مکا دے مارا۔ اُس نے شاید اپنے بدن کی پوری طاقت مکے پر صرف کر دی تھی کیونکہ میں زمین پر چت گرے ہوئے زور آور پر دھڑام سے گر گیا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر فٹ پاتھ پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ زور آور کے حلق سے دبی دبی چیخ برآمد ہوئی اور اُس نے مجھے بانہوں کے حصار میں جکڑ کر بھینچ لیا جبکہ اُس کے ساتھی نے مجھ پر ٹھڈوں کی بارش کر دی۔

میں بیک وقت دو محاذوں پر نبرد آزما تھا۔ زور آور صرف نام کا زور آور نہیں تھا بلکہ اُس کی آہنی گرفت کے سبب میری سانس رُکنے لگی تھی جبکہ اُس کے ساتھی کی پے در پے لگنے والی ٹھوکروں نے مجھے دن میں تارے دکھا دیے تھے۔ میں نے سانس روک کر، دونوں ٹانگیں اُٹھا کر پوری قوت سے گدھے کی طرح جھاڑیں۔ مجھے جرسی والے کی پوزیشن کا علم نہیں تھا مگر میرا 'تکا' کام کر گیا۔ میری دولتی اُس کے سینے پر یا کندھوں پر پوری قوت سے لگی تھی اور اُس کا سر دکان کی دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ اُس کے حلق سے نکلنے والی چیخ سن کر زور آور نے دانت پیستے ہوئے اپنی بانہوں کی جکڑن میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا۔ میں نے خود کو چھڑانے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر ڈالی مگر اُس کی بانہوں کا حلقہ نہ توڑ سکا۔ اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے اُس کے ماتھے پر زوردار ٹکر رسید کی۔ اُس کی گرفت پل بھر کو کمزور ہوئی۔ میں نے اوپر تلے تین چار ٹکریں رسید کیں تو اُس کے ہاتھ کھل گئے۔ پیشانی کی جلد پھٹ گئی اور خون رِسنے لگا۔ اُس نے دو تین مرتبہ سر کو دائیں بائیں جھٹک کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پھیپھڑوں میں لمبی سانس اُتارتے ہوئے مکوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ بائیں رخسار کی جلد بھی پھٹ گئی۔

زور آور کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میرا یہاں سے فی الفور بھاگ نکلنا ضروری تھا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا۔ عین اِسی وقت مجھے زور کا دھکا لگا اور میں زور آور کے اوپر سے ہوتا ہوا سڑک پر جا گرا۔ میرا سر کار کے پچھلے ٹائر سے ٹکرایا۔ ذہن بھک سے خالی ہو گیا۔ سر جھٹکا۔ اپنے اوسان ٹھکانے پر لانے میں کئی قیمتی لمحے میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ زور آور کے ساتھی نے جس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا، مجھے بالوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ تکلیف سے میرے دانت بھنچ گئے۔ جونہی

اُس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا، میں نے نیچے جھک کر اُس کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈالا اور اس کے تنومند جسم کو اوپر اُٹھا کر پوری قوت سے سڑک پر پٹخ دیا۔ اُس نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی مگر کمر پر ہاتھ رکھ کر پھر ڈھے سا گیا۔ میں نے فٹ بال کو کک مارنے کے انداز میں دایاں پیر اُس کے منہ پر دے مارا۔ وہ چوٹ کھا کر پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے دیوار کی جانب چھلانگ لگائی اور پیروں کے فٹ پاتھ پر ٹکتے ہی مارکیٹ کی مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔

اپنے عقب میں اچانک بلند ہونے والے شور نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ ہماری لڑائی کو دیکھنے کے لیے بہت سے تماشائی آن جمع ہوئے تھے۔ میں ایک ذرا ٹھہرا، پلٹا اور دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ کار میں بیٹھا ہوا ڈرائیور کار کا دروازہ کھولے کھڑا چیخ رہا تھا۔ اُس کی چیخ اچانک ہی پولیس سائرن میں دَب گئی۔ تیز ہوٹر کی ہولناک آواز سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں اُچھل کر فٹ پاتھ پر ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ مارکیٹ ختم ہو گئی۔ کوٹھیوں کا دراز سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں فٹ پاتھ سے اُتر کر سفید رنگ کی ایک جدید طرز کی کوٹھی کی دیوار اور سڑک کے بیچ بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کیاریوں اور پودوں کو پھلانگتا ہوا زیادہ دور تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ دو موٹر سائیکلوں پر سوار سیاہ وردی پوش میرے سر پر پہنچ گئے۔ ایک نے مجھ سے آگے نکل کر تیزی سے ٹرن لیا اور کوٹھی کے گیٹ کے سامنے بنے ہوئے پارکنگ وے پر موٹر سائیکل روک لی۔ دوسرے نے مجھے دائیں پہلو سے آن گھیرا۔ میں نے سراسیمہ نگاہوں سے اُنہیں، پھر پیچھے کی سمت دیکھا۔ پولیس وین کو بالکل قریب پا کر مجھے ناچار مجھے رکنا پڑا۔ پارکنگ وے پر ٹھہرے ہوئے پولیس اہلکار نے اپنا ہیلمٹ اُتارا، ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور مجھ پر تان لیا۔ میرے پہلو میں کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے سپاہی نے بھی ایسا ہی کیا۔ جونہی میری نگاہ وین کی روف ونڈو میں کھڑے ہوئے سپاہی کے ہاتھ میں دَبی شارٹ گن پر پڑی، میرے اوسان خطا ہو گئے اور رہے سہے مزاحمانہ ارادے بھی دم توڑ گئے۔

میرے سامنے کھڑے سپاہی نے للکارا، ''تم میرے نشانے پر ہو۔ جتنا بھاگنا تھا، بھاگ لیا۔ ہاتھ اپنے سر پر رکھ لو۔ چلو شاباش!''

میں نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ سڑک پر کھڑا ہوا موٹر سائیکل سوار اُتر کر میرے عقب میں آیا۔ کمر پر ریوالور کی نالی کا احساس بڑا تکلیف دہ تھا۔ اِس دوران پولیس کی موبائل وین سے دو تین سپاہی اُتر کر اُس ملائم گھاس والے چھوٹے سے لان میں آ گئے۔ اُن میں سے ایک،

جس کے شناختی بیج پر ملک ارشد لکھا ہوا تھا، نے مجھے سرتا پا کریدتی نظروں سے گھورا اور استہزائیہ لہجے میں بولا، ''بڑی پھرتی دکھائی تم نے؟''

میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ میرے پاس سوائے خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ ملک ارشد نے اپنے ساتھیوں کو میری جامہ تلاشی لینے کا حکم دیا۔ بڑے ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لی گئی۔ قدرے بھاری ناؤ نوش والے نے میری جیب میں موجود تمام رقم نکالی اور گنے بغیر اپنی جیب میں ڈال لی۔ اِسی اثناء میں زورآور کی ڈارک بلو کار ایک بریکوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ پولیس وین کے متوازی آن رُکی۔ چند ہی لمحوں میں زورآور اور اُس کا ساتھی میرے سامنے کھڑے خشمگیں نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

''تمھارا ساتھی کہاں ہے؟'' زورآور نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔

میں نے اطراف میں کھڑے پولیس والوں کو دیکھا۔ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو میں زورآور کو اُس کی گستاخی کا مزہ چکھا دیتا۔ کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہیں پا سکا اور جھنجلا کر بولا، ''میرا کوئی ساتھی ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہوتا۔''

اُس کا جارحانہ رویہ دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ شکر ہوا کہ وہ دانت پیس کر، میرا گریبان چھوڑ کر ملک ارشد کی طرف گھوم گیا۔ پاٹ دار آواز میں بولا، ''ملک! اسے اَریسٹ کرلو۔ یہ موبی کے قاتل کا ساتھی ہے۔''

''فکر نہ کر زورآور!'' ملک ارشد نے کہا، ''اِس کے فرشتے بھی چیخ چیخ کر بتائیں گے کہ وہ نامراد کہاں روپوش ہوا ہے۔''

زورآور کے الفاظ میں پنہاں سنگینی میرا دل دہلا گئی۔ موبی مر چکا تھا۔ کھلے قاتل اور میں قاتل کا معاون قرار پا چکے تھے۔ میں نے اپنے دفاع میں کہا، ''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں اور اِسے غلط فہمی ہوئی ہے۔''

ایک گن بردار زور سے ہنسا، ''الو کے پٹھے! یہ دوڑا دوڑی ماں کی وصیت پر کر رہے تھے کیا؟''

اُس کا لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔ اُس نے میرا جواب سنے بغیر اپنے بوٹ کی ٹھوکر میرے گھٹنے کے عقبی حصے میں ماری۔ میں اپنا توازن بُرقرار نہ رکھ سکا اور گھٹنوں کے بل گھاس والی زمین پر گر گیا۔ ملک ارشد نے میرے پیٹ میں ٹھوکر رسید کی۔ شاید یک طرفہ اعلانِ جنگ ہو گیا تھا کیونکہ

سبھی اہلکاروں نے مجھ پر یلغار کر دی تھی۔ کچھ دیر تک تو میں نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مارے، منت سماجت کی اور اپنی بے گناہی کا رونا رویا، پھر تھک گیا اور اپنا چہرہ بانہوں میں لے کر گٹھڑی بن کر ادھر اُدھر لڑھکنے لگا۔

جب مجھے پیٹنے والے تھک گئے، تب ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پڑی،

''اوئے ملک! تین سو دو لگوانے کا ارادہ ہے کیا؟ بس کر۔ بہت ہو گئی۔ اِسے ویگن میں ڈال اور لاک اَپ میں ڈال آ۔''

نہایت تکلیف دِہ ٹھوکروں کی برستی ہوئی بارش رُک گئی۔ میں گھاس پر پڑا تھا اور میرے حلق سے متواتر کراہیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُنہوں نے چند ہی منٹوں میں میرا منہ سرا ایک کر دیا تھا۔ جسم کا شاید ہی کوئی ایسا عضو تھا جس پر ٹھوکریں نہیں لگی تھیں۔ کرخت آواز پھر کانوں میں پڑی،

''اوئے نامراد! اَب اُٹھ کھڑ..... زیادہ مکر نہ کرو رنہ.....''

میں نے کھڑا ہونے میں اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کر دیں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بمشکل ایک ثانیے کو کھڑا رہ پایا، پھر لہرا کر پہلو کے بل گر گیا۔ ملک ارشد کی ٹھوکر پسلیوں پر لگی۔ میں بلبلا کر رہ گیا۔ بھاری آواز والے نے آگے بڑھ کر میری بغل میں ہاتھ ڈالا اور کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور حلق سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ جب میں کوشش کے باوجود بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ پایا تو اُس نے مجھے دھکا دے کر زمین بوس کرتے ہوئے کہا، ''کھوتے دا پتر نہ ہو تو! سرکاری تواضع کی ہمت نہیں تھی تو محنت مزدوری کرتا، کوئی کام وام سیکھ لیتا۔ اوئے جوان! اِسے کھینچ کر ویگن میں ڈال دے۔ چل، جلدی کر۔ ابھی وی آئی پی موومنٹ کے لیے روڈ کلیئر کرنا ہے۔ ہری اَپ.....''

میرا ایک بازو ملک ارشد نے پکڑا، دوسرا بازو ایک بھاری مونچھ بردار سپاہی نے سختی سے پکڑا اور مجھے بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے ویگن تک لائے۔ باریک بجری والی سڑک پر گھسٹنے کی وجہ سے میرے جسم کا عقبی حصہ بُری طرح چھل گیا تھا۔ میں چیخ رہا تھا اور بے ربط انداز میں اُنہیں بتا رہا تھا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ ماننے پر آمادہ نہیں تھے۔

میرے ساتھ پولیس والوں کا رویہ ایسا تھا جیسے ان کے ہاتھ کوئی اشتہاری مجرم لگ گیا تھا جس کی نوک پلک سنوارنا اُن کے فرائضِ منصبی میں شامل ہو۔ سرِ عام انجام پذیر ہونے والے تماشے کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے جنہیں ایک سپاہی کی دھاڑ، 'چلو بھئی، مجمع

ختم کرواور ٹریفک بلاک نہ کرو'نے منتشر کر دیا تھا۔

مجھے ویگن کے عقبی حصے تک لا کر وہ مجھے چھوڑ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ملک ارشد اور بڑی مونچھوں والے نے مجھے کھینچ کر ویگن میں ڈال دیا۔ میرے جسم کا زیریں حصہ پہلے سڑک اور مابعد ویگن کے ڈالے سے رگڑ کھا کر بُری طرح چھل گیا۔ ویگن کے فرش پر پھینک کر وہ آمنے سامنے سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ اُنہوں نے نخوت بھرے انداز میں مجھ پر اپنے پاؤں رکھ دیے۔ حوالدار نے موٹر سائیکل سواروں کو ہدایات دیں، ڈرائیور کو تھانے چلنے کا حکم دیا اور خود ویگن کے کیبن میں اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ویگن اسٹارٹ ہوئی اور ان دیکھی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔

ہچکولوں کے بل پر جونہی میرا جسم فرش پر ہلتا جلتا، درد کی شدید ٹیسیں اُٹھتیں۔ منہ سے چیخ بھی نکل جاتی۔ ملک ارشد نے دایاں پیر اُٹھا کر زور سے میری پسلیوں پر مارا، ''منہ بند رکھو ورنہ ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دوں گا۔''

میں نے دانت بھینچ لیے۔ آج تک ایسی تذلیل اور مار پیٹ سے واسطہ نہیں پڑا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہمیشہ حالات کی زد پر ایسی ٹھوکریں کھاتا چلا آ رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ریخت خوردہ بدن کی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے میرا بدن کسی بڑے ٹرالر کے ان گنت پہیوں تلے آ کر کچلا گیا ہو اور اس کے درست ہونے کا امکان تک نہ رہا ہو۔ مجھ پر لمحہ لمحہ گراں گزر رہا تھا جبکہ ملک ارشد اور مونچھ بردار سپاہی جس کا نام فرید علی تھا، آپس میں کسی وفاقی منسٹر کی آمد پر رائے زن تھے۔ اچانک فرید کو میرا خیال آ گیا، بولا، ''اِس حرامی چڑے کا کیا کرنا ہے؟''

''جا کے حوالات میں ڈال کر روزنامچے میں درج کر دیتے ہیں۔ پھر سب انسپکٹر جانے اور اُس کا کام۔ ہمیں کیا؟''

فرید علی نے میرے پیٹ پر پاؤں کا زور بڑھاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا، ''وہ اِس کھوتے کو چڑی کا بچہ کہہ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اُسے کہوں کہ اِس چڑی کے بچے کو اُٹھا کر ویگن میں ڈال دے۔ چپ رہا کیونکہ وہ تھانیدار صاحب کے سامنے بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتا ہے۔''

چھوٹے تھانیدار کے چھوٹے پن پر ملک ارشد بھی شکوہ کناں ہو گیا۔ بولا، ''نیچے سے ترقی کر کے اوپر جانے والا افسر اور کمین سے خان یا چودھری بننے والا شخص ہمیشہ نیچ اور گری ہوئی

حرکتیں ہی کرتا ہے۔''

''اگر ایسا نہ ہو تو پہچانا کیسے جائے؟''

''ہاں یار! تم سچ کہتے ہو۔ اِس چڑے کی پاکٹ سے جو ملا، اُس کے چیلے نے اپنے پاس رکھ لیا اور گٹھلی ہماری جھولی میں ڈال دی ہے کم بختوں نے!''

نکے تھانیدار کے سامنے 'جی، جی' کرنے والے اُس کی عدم موجودگی میں غبارِ دل نکال رہے تھے۔ وہ ویگن کے اگلے حصے میں بیٹھا تھا۔ کہیں دور چلا گیا ہوتا تو وہ غلیظ گالیوں سے سرفراز کرنے میں بھی لیت ولال سے کام نہ لیتے۔

اچانک ملک ارشد نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''موبی کو تم لوگوں نے کیوں گولی ماری؟''

میں کراہا، ''میں موبی کو جانتا تک نہیں جی!''

''اچھا! پھر تو تم زور آور کو بھی نہیں جانتے ہو گے؟'' اُس کے لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

جواباً نفی میں سر ہلا کر ملتجیانہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ بولا، ''تمھارا تعلق کس گینگ سے ہے؟ پھیکے مچھل کے لونڈے ہو؟''

یہ نام میرے لیے قطعاً اجنبی تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ فرید علی نے ڈانٹ کر کہا، ''پانچ سیر کا سر ہلاتے ہو، ایک چھٹانک کی زبان نہیں ہلا سکتے۔ سیدھی طرح بات کرو ورنہ یہیں لمبا لیٹ کر دوں گا۔''

میں نے تھوک نگلا۔ بولنا چاہا مگر زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔ اُس نے مجھے لمبا لیٹ کرنے کی دھمکی دی تھی جبکہ میں پہلے ہی اُن کے پیروں تلے چت پڑا تھا۔ ملک ارشد نے اوپر تلے دو چار نام اور گنوائے۔ میں کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ ناموں کی ساخت ایسی تھی کہ میں سمجھ گیا کہ وہ مختلف جرائم پیشہ لوگوں کے گروہوں میں سے کسی جتھے کے ساتھ میرا تعلق کریدنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میں کس گینگ کا رکن تھا۔ اُس کے اندازِ استفسار سے معلوم پڑتا تھا کہ زور آور اور مقتول موبی کا تعلق کسی کریمنل گینگ سے تھا اور وہ اپنی تفتیش کا آغاز اسی نقطہ نظر سے کر رہا تھا۔

فرید تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا، ''یہ یہاں کا وارداتیا نہیں لگتا۔ یا تو نیا نیا کسی گینگ میں

شامل ہوا ہے یا کسی اور شہر سے آیا ہے۔ کیوں بے بھولے بدمعاش! کہاں سے آئے ہو؟ لاہور سے؟''

مجھے اپنی آواز بھی اجنبی سی لگی، ''میں مظفر گڑھ سے آیا ہوں۔''

''وہاں بھی یہی کام کرتے تھے؟''

میں نے بے دھیانی میں پوچھ لیا، ''کون سا کام؟''

اُس نے اپنی داہنی ہتھیلی کو گردن کے متوازی حرکت دیتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا، ''یہی..... کرایے پر خون خرابے والا دھندا!''

میں نے جبڑے بھینچ لیے، بولا، ''میں ایسا نہیں ہوں۔''

اُس نے مصنوعی ہمدردی سے 'چچ، چچ' کی اور پچکارنے کے سے انداز میں کہا، ''تم تو واقعی ایسے نہیں ہو۔ تم تو بس ذرا 'واک شاک' کرنے گھر سے نکلے تھے اور ہم نے تمہاری ساتھ زیادتی کی کہ پکڑ کر ذرا 'پیار شیار' کر دیا۔ ہے ناں؟''

میں نے بے بسی سے آنکھیں موند لیں۔ ایسے میں ویگن اوپر تلے تین چار موڑ کاٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی۔ فرید اور ملک ارشد اُترنے سے پہلے مجھ پر اپنے پلے پلائے جسموں کا پورا وزن ڈال گئے۔ فرید کا ایک پیر میرے پیٹ پر چند ثانیوں کے لیے تھما تھا۔ تب میں نے بڑی مشکل سے حلق تک آئی کڑوی قے کو باہر آنے سے روکا تھا۔

سب انسپکٹر دکھائی دیا۔ مجھ پر ایک نگاہِ تنفر ڈال کر حوالات کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اوجھل ہو گیا۔ ملک ارشد نے مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ چونکہ اُن کی ظالمانہ ٹھوکروں نے حکم کی بے چوں چراں تعمیل کا سبق مجھے ازبر کرا دیا تھا، اِس لیے دونوں ہاتھ سیٹوں پر ٹِکا کر اُٹھنے کیلئے جسم کی تمام تر توانائی خرچ کر دی۔ عضو عضو سے ندائے احتجاج بلند ہوئی مگر میں اُٹھ کر بیٹھنے اور پھر ویگن کے ڈالے کا سہارا لے کر اینٹوں کے فرش پر اُترنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند لمحوں تک ویگن سے ٹیک لگا کر ہانپتا رہا اور اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔ میں قدیم دور کی سالخوردہ عمارت پر مشتمل تھانے کی حدود میں کھڑا تھا۔ میرے اردگرد ملک ارشد اور فرید علی کے علاوہ اَن گنت وردی پوش موجود تھے۔ سپاہی سے لے کر سب انسپکٹر تک ہر عہدہ متحرک تھا۔

میری سراسیمہ، منت آمیز اور وحشت انگیز نگاہوں کے جواب میں دونوں طنزیہ نظروں سے مجھے گھورتے رہے۔ فرید علی بولا، ''اَب کیا یہاں ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے برخوردار؟''

میں نے التجا کی، ''سر جی! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔''

ملک ارشد نے ڈپٹ کر کہا، ''نہیں کیا تو اَب کر لو..... کون روکتا ہے تمہیں؟..... اَب بک بک بند کرواور گاڑی اڈے پر لگاؤ۔''

میرے احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرید نے مجھے تھانے کی حوالات کی طرف دھکیلا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ حوالات کا منہ دیکھنے جا رہا تھا۔ آج تک لوگوں کی زبانی اس سرکاری مہمان خانے کے بارے میں جو کچھ سنا اور کچھ دیر قبل پولیس والوں کا جو رویہ مجھے دیکھنے کو ملا تھا، اُسے مدنظر رکھتے ہوئے میں خاصا دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ ٹریلر اتنا ڈراؤنا تھا، فلم کیسی ہوگی؟ یہ سوچ کر دل لرز رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں حوالات کا سلاخوں والا دروازہ کھول کر مجھے دھکا دے دیا گیا۔

میں ٹوٹے پھوٹے پلستر والے فرش پر گرا۔ نڈھال انداز میں اُٹھا۔ سامان سے یکسر عاری عام طول وعرض کے کمرے کا ایک نظری جائزہ لیا۔ دیوار سے ٹیک لگائے دس بارہ افراد دکھائی دیے جن کے چہروں پر لکھی ہوئی عبارتیں بادی النظر میں ایک جیسی تھیں۔ ایک تیز چبھتی ہوئی آواز کانوں میں پڑی، ''جیوندارہ باچھا (بادشاہ)! وسدا رَسدارہ بھائی.....''

مجھے علم نہ ہو سکا کہ بیٹھے ہوؤں میں سے کس نے مجھے اِس تضحیک آمیز انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔ ایک مریل مرنج، سیاہ ہونٹوں اور غیر معمولی حد تک بڑھے ہوئے بالوں والے نے مجھ پر طنزیہ نظر اُچھالی، ''اڑے غنچے! ایسی غصے بھری نجر سے نہ دیکھ..... ماڑا قصور نہ ہووت، نہ ہم نے تجھے دعوت دے کر یہاں بلایا ہووے ہے.....''

میں نے اُسے گہری نظروں سے گھورا۔ وہ ہتھیلیوں کے بل اُٹھا اور پاس آ کر مجھے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ مجھے اُٹھا نہ پایا تو ہانپتے ہوئے بولا، ''اڑے او جالمو! ماڑا ساتھ دیجو ناں، ماڑے سے نہ اٹھایا جاوت اے۔ جالم (ظالم) پلے پوسے سانڈ کے ماپق بھاری ہے۔''

اس کی اعانت کے لیے ایک قدرے جسیم شخص پاس آ گیا۔ دونوں نے مل کر مجھے کھڑا کیا۔ قدم قدم چلاتے ہوئے دیوار تک لائے۔ بوسیدہ روئی والے گدے پر بٹھاتے ہوئے جسیم شخص نے پوچھا، ''پولیس والے تمہیں کیوں پکڑ لائے ہیں؟''

''اڑے جا پَرے نامراد! نجر نہیں آوے کیا؟ موتیا آنکھوں پہ اُتر آیا یا ککرے پڑ گئے تیری

نجر (نظر) کو..... غنچہ ہے اَبھی بے چارہ۔ کھل کر مسکراوے گا تو پتہ چلے گا ناں!''

میرا بدن ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ روئیں روئیں سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ شدید پیاس لگی تھی۔ اردگرد نظر دوڑائی۔ حوالاتی کمرے کے ایک کونے میں گھڑا دیکھ کر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا، ''پپ..... پانی.....''

گھڑے کے قریب بیٹھا ہوا شخص پانی بھر لایا۔ جستی کٹورا خاصا میل آلود اور پچکا ہوا تھا۔ کراہت کا احساس ہوا۔ کراہت کو آنکھیں بند کر کے بھگایا جا سکتا تھا۔ پیاس سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی تھی اس لیے میں نے کٹورا تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔ پانی حلق سے اُترا تو کچھ سکون کا احساس ہوا۔

میرے پہلو سے جڑ کر بیٹھے ہوئے مہین شخص نے مجھ سے پوچھا، ''کہاں سے آوت ہے لاڈے میاں..... اڑے غنچے! کیا جرم تیرے کھاتے میں پاوت ہے ان خبیثوں نے؟''

میں نے اُسے بغور دیکھا۔ اس کی عمر چوتھی دہائی میں داخل ہو چکی تھی۔ بے تحاشا پان خوری کی عادت نے اُس کے دانتوں کو چاٹ لیا تھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہمدردی کا غالب عنصر دکھائی دیا۔ مجھے خاموش پا کر حوالات کی نکڑ میں بیٹھے ہوئے فربہی مائل شخص نے جھومتے ہوئے کہا، ''قانون کے رکھوالے چراغ لے کر رُخِ زیبا ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔ کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔ کبھی رُخِ زیبا تو کبھی رُخِ نامراد اُٹھا لاتے ہیں۔ ہفتہ بھر سے یہی تماشا دیکھ رہے ہیں یہاں پر۔''

اُس کا لڑکھڑاتا لہجہ اور متورم چہرہ بتاتا تھا کہ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر کو خاموشی چاہتا تھا۔ جب سے ملتان کی حدود میں قدم رکھا تھا، پَے در پَے مصیبتوں سے دوچار ہو رہا تھا۔ مجھ سے جڑ کر بیٹھے ہوئے نے مجھے جھنجوڑ کر دریافت کیا، ''اڑے بابا! جیالوں نے کیا مالش والش بھی کری ہے؟''

میں نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''درد ہووے ہے کیا؟ بول ناں.....''

میں نے آہستگی سے کہا، ''پورا جسم دکھ رہا ہے۔''

اُس نے اپنے پہلو کی جیب میں سے بروفن کی گولیوں کا بولسٹر پیک نکالا۔ ایک ٹیبلٹ نکال کر تھماتے ہوئے اونچی آواز میں بولا، ''او جانِ من! اِک جرا (ذرا) پانی کا کٹورا بانکے کے

لیے بھرت ناں!''

اُس کی آواز خاصی باریک تھی۔ لہجہ بھی بڑا عجیب سا تھا۔ اگر عام حالات میں وہ مجھ سے ملا ہوتا تو میں اُس کی شخصیت سے خاصا لطف اندوز ہوتا۔ اِس وقت مجھے چونکہ کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی، اِس لیے اُس کا اندازِ گفتگو بھی ناگوار گزر رہا تھا۔

''اڑے جبان پر رکھ ناں گولی کو۔ یہ چٹکی بجاتے میں درداں پیڑاں چن لیوے ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس کر کے گھوڑا بنا دیوے ہے۔ لو بابا!''

میں نے پانی کی مدد سے گولی حلق میں اُتاری اور کٹورا فرش پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

میرے دونوں اطراف میں قطار باندھے بیٹھے ہوؤں نے میری شخصیت پر، شکل سے جھلکتے بھولپن پر اور جسم کے عریاں حصوں پر دکھائی دینے والے نیلوں پر رائے زنی شروع کر دی۔

ایسے میں کمرے کے کونے میں پھیل کر لیٹے ہوئے شرابی نے سلاخوں والے جنگلے کے باہر کھڑے سپاہی کو مخاطب کیا، ''اوئے کالے گھوڑے..... ہم سے بھی لائن مارناں یار۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔''

وہ شاید اُس کا کوئی جاننے والا تھا کیونکہ اُس کی آواز سن کر ہنستا ہوا قریب آیا اور سلاخیں تھام کر مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''اس خطرناک اشتہاری مجرم کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟''

''میں نہیں جانتا۔ پکڑ کر لانے والے لوٹیں گے تو پتہ چلے گا کہ اِس نے کیا واردات کی ہے۔'' پولیس والے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا اَب ایسے لونڈے بھی بدمعاشیاں کرنے لگے ہیں یا قانون کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں؟''

اُس نے کندھے اُچکائے، ''ایس ایچ او صاحب کچھ ہی دیر میں آنے والے ہیں۔ اُن سے پوچھ لینا۔''

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا، ''اُس سے کیا پوچھوں گا؟ وہ تو زرا ہومیو پیتھک تھانیدار ہے۔''

میرے پہلو سے میرے بہی خواہ کی آواز پھوٹی، ''اڑے واہ جی! کیا بات کرت ہے۔ ہومیو پیتھک تھانیدار..... انگریجی دواؤں سی گرمی ناں ہووت؛ دیسی داروسی ٹھنڈک ناں ہووت..... ایک دم فسٹ کلاس بول بچن مارے ہے تم نے اَجی ڈاکٹر صاحب!''

''ابے تو چپ رہ پلے!'' ڈاکٹر کہلائے جانے والے نے اُسے ڈانٹا اور پھر سپاہی سے محوِ کلام ہوگیا۔

گولی نے کافی افاقہ دیا۔ جسم کی تکلیف کم ہوئی تو سر میں بھاری پن کا احساس بتدریج بڑھنے لگا۔ سر کے مخصوص درد اور سانس کی از حد گرمی نے مجھے باور کرا دیا کہ میرا جسم ہولے ہولے بخار پکڑنے لگا تھا۔ میں متفکر ہوگیا۔ اس حالت میں، جبکہ میرے پاس دوا دارو کی سہولت میسر نہیں تھی، بخار کا ہونا بہت خطرناک تھا۔ میں نے اپنے ساتھ جڑ کر بیٹھے ہوئے فقرہ باز شخص سے مانگ کر بروفن کی ایک اور گولی معدے میں اُتاری۔ ڈاکٹر منور شاہ کی طویل رفاقت کے باعث مجھے علم تھا کہ یہ دوا درد اور تکلیف میں آرام پہنچانے کے ساتھ ساتھ بخار کے زور کو بھی توڑنے کی زبردست اہلیت رکھتی تھی۔

حوالات کی مسافر خانے جیسی عجیب دُنیا کو اپنی آنکھوں سے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ جتنے اشخاص وہاں موجود تھے، فضا میں اُتنی ہی بولیاں رَچی ہوئی تھیں۔ کئی زبانیں، کئی لہجے اور کئی خیالات یکجا تھے۔ شام تک میرے بخار نے خاصی شدت اختیار کر لی۔ دبلے پتلے شخص، جس کا نام امیر شاہ معلوم ہوا تھا، نے تھانے کے قریبی چھپر ہوٹل سے چائے اور کیک رس منگوائے۔ پیراسیٹامول کی گولیوں کا پورا پتہ منگوایا۔ پانی کے ساتھ دو گولیاں مجھے کھلا کر زبردستی کیک رس کھلائے اور چائے پلائی۔ باوجود اس کے کہ وہ میرا کچھ نہیں تھا، ہمارے مابین دوستی تو کجا، شناسائی کا رشتہ بھی موجود نہیں تھا، پھر بھی اُس کا ہمدردی آمیز رویہ دیدنی تھا۔ معدے میں کچھ پڑا تو جان میں جان آئی۔

امیر شاہ کہہ رہا تھا، ''اڑے یہ ڈاکٹر ہے سالا، ہومیو پیتھک ڈاکٹر! بیٹھا دارو پیوت پر کسی مجلوم (مظلوم) کو صبح تک نہ مارے ہے..... ادھر اپنے ہومیو پیتھک دارو خانے میں بھی سارا دن مجے (مزے) لوٹے، ادھر بھی مجے لوٹے ہے۔''

ڈاکٹر ہاتھ اُٹھا کر بولا، ''اوئے پلّے! ہے جنابِ شیخ کا فلسفہ بھی عجیب سارے جہان سے؛ جو یہاں پیو تو شراب ہے جو وہاں پیو تو ثواب ہے.....''

اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا، ''ایک لقمہ منہ میں ڈال کر سارا دن بکریوں کی طرح منہ چلانے والے دارو کی شان کو کیا جانیں۔ ہومیو پیتھک کی یہی ایک دوائی دُنیا کی ہر دوائی پر بھاری ہے۔''

وہ بات کرتے کرتے ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بولا، ''ہاں بھاری ہے! جس طرف بھی جاتی ہے، آگ لگاتی جاتی ہے۔ برف پگھلا دیتی ہے۔ بھلے سینے پر کیتلی رکھ کر چائے پکالو یا اصیل مرغ کو تڑکا لگالو..... ہاں بھاری ہے۔ ہائے! شمع بولی بہ صد انداز یہ دیوانے سے..... پر تم کیا جانو..... جگالی کرنے والے میمنے!''

اپنے لہجے سے وہ خاصا پڑھا لکھا انسان معلوم ہوتا تھا مگر بہت زیادہ پینے کی عادت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔ اُسے یہ دھیان بھی نہ رہا کہ اُس کی بے ربط اور لایعنی باتوں پر کوئی توجہ دے رہا تھا یا نہیں۔ امیر شاہ نے ایک طنزیہ نظر اُس پر ڈالی، میری پسلی میں آہستگی سے کہنی چبھوئی، بولا، ''سینے پر چاء پکے یا ناں پکے۔ لاڈے ڈاکٹر کے منہ کی کیتلی اُبلنے لگت ہے۔ سالا کہیں کا..... جرور کسی دِن گٹر کی سیر بھی کرے گا..... آہ! ماڑے کو جگالی کرنے والا آکھت ہے۔''

اچانک تھانے کی چہل پہل میں اضافہ ہو گیا تھا مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حوالات کا بیرونی دُنیا سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ کسی نے بھی اِدھر آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ حوالاتیوں کے لیے چھپر ہوٹل کا لڑکا کھانے کا آرڈر لینے کے لیے آ گیا۔ ہوٹل پر صرف دال اور گوشت پکا ہوا تھا۔ چونکہ میرے پاس پیسے موجود نہیں تھے، اِس لیے میں خاموشی سے بیٹھا رہا۔ روٹیاں اور سلور کی کٹوریاں جب سلاخوں سے گزر کر حوالات کے سالخوردہ فرش پر پہنچیں، سبھی اُٹھ کر ایک بڑا سا دائرہ بنا بیٹھے۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

امیر شاہ نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا، ''اڑے بانکے! کیا دوزخ (دوزخ) میں کچھ نہیں ڈالے ہے؟''

میری خاموشی کو اقرار جان کر وہ اپنی پلیٹ اور روٹیاں اُٹھا کر میرے پاس آ بیٹھا۔ کھانا کھانے کے بعد سب کے لیے کڑک چائے آ گئی۔ عام حالات میں شاید میں ایسی چائے کبھی نہ پیتا مگر اُس وقت وہ کڑوی کسیلی اور بے دودھ کی چائے بھی دودھ پتی محسوس ہوئی۔ بخار کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ تکلیف اور اینٹھن میں کچھ کمی واقع ہو گئی تھی۔ میں امیر شاہ کے کہنے پر کھڑا ہوا۔ قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے محدود جگہ میں چہل قدمی کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ میں میں کافی حد تک سنبھل گیا۔ میں اور امیر شاہ دوسرے حوالاتیوں سے قدرے الگ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ مجھے سلاخوں میں سے وہی ویگن صحن میں آ کر رُکتی دکھائی دی جس پر مجھے تھانے میں لایا

گیا تھا۔ سب انسپکٹر، ملک ارشد اور فرید علی کی تھکی تھکی صورتیں دکھائی دیں۔ وہ حوالات کی طرف دیکھے بغیر آگے گزر گئے۔ امیر شاہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا، پوچھنے لگا، ''انہی جالموں نے تجھے دبوچا تھا کیا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا، ''ہاں! کیا اَب پھر یہ لوگ مجھے ماریں گے؟''

''نہیں لاڈے بابا! یہ سؤر کے بچے تھک کر آوے ہیں۔ اپنے ہومیو پیتھک باپو جی کے چرنوں میں حرام کا مال ڈالیں گے اور جا کر مرداروں کی طرح سو جاویں گے..... یہ خرشی مارے کتے کے مافق لوگ ہوویں، نہ ہڈی چھوڑیں نہ آنتیں چچوڑنے سے باج (باز) آویں۔ آخ تھوہ!''

اُس نے سلاخوں کے پار زمین پر زور سے تھوک دیا۔ کچھ دیر تک آنکھوں سے آگ برساتے ہوئے چلتے پھرتے سپاہیوں کو دیکھتا رہا پھر چونک کر بولا، ''اڑے بابا! تم سے کیا برآمدگی کرت ان خبیثوں نے؟''

میں اس کے سوال کو سمجھ نہیں پایا تو اُس نے وضاحت کی۔ میں نے بتایا کہ میرے پاس سوائے پیسوں کے کچھ بھی نہیں تھا جو اُنہوں نے نکال کر اپنے پاس رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ بڑا متاسف ہوا۔ بولا، ''اُن سالوں کو موئی بدہجمی (بدہضمی) بھی نہیں ہووت ہے۔ دیکھ تو جرا (ذرا) ان کے بڑے بڑے پیٹوں کو..... لکڑ ہجم، لوہا ہجم.....''

پھر امیر شاہ کے خلوص بھرے استفسار نے مجھے زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنا فرضی نام بتایا۔ خود پر بیتی ہوئی کہانی کو بلاکم و کاست بیان کر دیا۔ وہ پورے انہماک سے سنتا رہا۔ بارہا اُس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال بنا، پھر جلد میں تحلیل ہو گیا۔ میری داستان کے تسلسل میں اُس نے کہیں بھی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ خاموش ہوا تو وہ لمبی سانس سینے اُتار کر، جیب میں سے پان کا پیک نکال کر منہ میں ڈال کر، دھیمی آواز میں بولا، ''اڑے لاڈے! تو اِن جالموں میں بُرا پھنسا ہووت..... پچ پچ..... مگر شکر کرت بابا کہ ان جورا ور (زور آور) کی گولی سے بچ نکلت ہو۔ سالا ہومیو پیتھک تھانیدار جورا ور کالے پالک کتا ہووت ہے۔ اس کے کہنے پر تمہاری چمڑی ادھیڑ دیوت۔ ہائے غنچے! تو بُرا پھنسے ہے۔''

میں نے بے بسی سے کہا، ''اب کیا ہوگا؟''

''جو بھی ہووت، جُرا (ذرا) اچھا نہ ہووت.....'' اُس نے تشویش آمیز انداز میں کہا، ''تم

جانت ہو کہ موبی کا خونی کدھر ہووت ہے؟''

میں نے کہا، ''نہیں۔''

وہ کچھ دیر تک خموش بیٹھا رہا پھر اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، اپنا اپنا منحنی سا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور کہا، ''تم فکر نہ کرت ہے لاڈے میاں! ماڑے کو سب ٹھیک کرنا آوے ہے۔ ہومیو پیتھک تھانیدار جو بھی آ کھت، تو زبان نہ کھولت..... غنچے! یہ دل پر لکھت کہ تم نہ جانے کسی خونی کو، تم نہ جانت جو راور یا موبی کو..... گونگا ہووت تو..... سمجھا؟''

دیکھنے میں وہ اُستاد آدمی لگتا تھا۔ نہ میں نے اُس سے دریافت کیا تھا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں حوالات میں بند تھا اور نہ ہی اُس نے بتانے کی زحمت کی تھی۔ میں حالات کے ایسے گرداب میں آن پھنسا تھا کہ میرا شعور مکمل طور پر میرا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے گھر والوں اور بالخصوص پروین کی پریشانی کا خیال آتا تھا۔ کھالا یاد آنے لگتا تھا۔ پولیس والوں کی متوقع مار پیٹ کا خیال بھی دل کو ہولائے دے رہا تھا۔ گھبراہٹ اور اضطراب کے عالم میں امیر شاہ پر بھی خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہا تھا مگر اُس نے میری بے رُخی کے باوجود مجھے بڑی ڈھارس بندھائی تھی۔ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے یہ تسلی بھی دی تھی کہ وہ تھانیدار کے سامنے میری بے گناہی کی بات کرے گا۔ اگر تھانیدار پھر بھی نہیں مانے گا تو وہ اپنی 'میڈم' سے کہہ کر مجھے حوالات سے نکلوا دے گا۔ میرے استفسار پر اُس نے میڈم کا نام 'میڈم شکیلہ' بتایا اور مزید بتایا کہ وہ ایسی عورت ہے کہ جس کے نام پر شہر کے سبھی تھانوں کے گیٹ آنِ واحد میں کھل جاتے ہیں۔

رات دس بجے کے قریب سبھی انٹا غفیل ہو گئے۔ امیر شاہ بھی نیند کے گہرے استغراق میں چلا گیا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں اُس کے کمبل میں گھسا ہوا، دیوار سے پشت ٹکا کر سامنے والی دیوار کے اکھڑے ہوئے پلستر کو دیکھ رہا تھا۔ باری باری کئی شباہتیں آنکھوں میں ابھرتیں، اپنا اپنا مقدمہ پیش کر کے اوجھل ہو جاتیں۔ چاچی، فرزانہ، شانو، پروین اور غزالہ کی بے چینیوں پر دل کڑھ کر رہ گیا۔ چونکہ کھالا مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ایسا غوطہ لگا لیا کرتا تھا اِس لیے اُس کے گھر والوں کیلئے اُس کا غیاب کوئی نئی بات نہیں تھی مگر میرے گھر والوں کے لیے میرا نور پور سے اِس طرح جانا نئی بات تھی۔

میں خواہ مخواہ کھالے کی یاری کی آبیاری کرنے کے ارادے سے ملتان چلا آیا تھا۔ مجھے کیا

پتہ تھا کہ اس اجنبی شہر میں ایسے خطرناک لمحات میری تاک میں تھے۔ مسلسل بھاگ دوڑ، غیر متوقع وحشیانہ مار پیٹ اور گرفتاری نے مجھے بدحال اور نڈھال کر دیا تھا۔ مجھے جو آیات اور دعائیں یاد تھیں، دل ہی دل میں تمام پڑھ ڈالیں۔ خدا سے مدد مانگی۔ اپنے آپ سے عہد کیا کہ یہاں سے نکلتے ہی کھالے کی سنگت کا خیال دل سے نکال کر سیدھا نور پور چلا جاؤں گا اور آئندہ اِس غلطی کا اعادہ نہیں کروں گا۔

حوالات کی بدبودار فضا میں کئی نوعیات کے خراٹے گونج رہے تھے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے بڑے بڑے پھیپھڑوں سے پھوٹنے والے خراٹے خاصے ڈراؤنے تھے۔ جونہی گھومتی ہوئی نیلی بتی والی ویگن تھانے کی حدود میں داخل ہوئی، میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ شاید تھانیدار گشت سے لوٹا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد سلاخوں کے باہر بوٹوں کی دھمک گونجی۔ ایک لمبا تڑنگا شخص پانچ سات اہلکاروں کے جلوس میں چلتا ہوا حوالات کے دروازے پر آ کر تھم گیا۔ اُس کی آن بان کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تھانیدار تھا، اس تھانے کا بے تاج بادشاہ تھا۔

اُس کی ٹٹولتی ہوئی نظروں نے فوراً مجھے تاڑ لیا۔ ساکت کھڑا مجھے گھورنے لگا۔ اُس کے چہرے پر سیاہ اور سفید بالوں والی داڑھی بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اُس کی قد آور شخصیت بڑی بارعب تھی۔ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کھڑے سپاہی سے میرے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا کہ مجھے موبی کے قتل کے سلسلے میں سب انسپکٹر حوالات میں ڈال گیا ہے اور خصوصی نگرانی کی تاکید کر گیا ہے۔

میں نے ہمت کرتے ہوئے کہا، ''سر جی! مجھے بے گناہ پکڑ کر مارا پیٹا گیا ہے اور یہاں لا پھینکا گیا ہے۔''

وہ چونکا۔ میرا اندازہ تھا کہ اُسے میرا مؤدبانہ اور پڑھا لکھا لہجہ عجیب لگا تھا۔ مجھے بغور دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی بات کو دہرایا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا، ''کوئی تو وجہ رہی ہوگی تم پر شک کرنے اور تمہیں گرفتار کرنے کی؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''میں خان مارکیٹ میں داخل ہونے لگا تھا کہ ایک ڈارک بلو کار میرے قریب آن رکی۔ اُس میں سے دو آدمی اُترے۔ وہ مجھے کسی غلط فہمی کی بنا پر زبردستی کہیں لے جانا چاہتے تھے جبکہ میں جانے پر تیار نہیں تھا۔ وہیں ہماری لڑائی ہوگئی۔ پولیس والے آ گئے اور انہوں نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ پھر ڈالے میں ڈال کر یہاں لے آئے۔'' میں نے

اپنی پوری کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ بے حد معصوم اور شائستہ رہے اور میں اپنی کوشش میں خاصا کامیاب رہا تھا۔

''تمہیں اغوا کرنے والے کون تھے؟ کیا تم اُنہیں جانتے ہو؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''میں نے دونوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے جی۔ ایک کا نام زورآور ہے اور دوسرے کے نام کا مجھے علم نہیں۔''

''زورآور.....'' اُس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے۔ ''زورآور کو کیا غلط فہمی تھی؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ میرا ساتھی اُس کے کسی موبی نامی دوست کو گولی مار کر بھاگ گیا ہے۔ میں نہ تو کسی موبی کو جانتا ہوں، نہ زورآور کو اور نہ ہی میرا کوئی ساتھی ہے۔ سر جی! میں تو ایک سیدھا سادا کسان ہوں۔ زمینوں پر ہل چلاتا ہوں۔ زمینوں کا اُگلا ہوا اناج کھا کر سو جاتا ہوں۔''

اُس کی نظریں مجھے اپنے بدن کے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اُس نے برآمدے میں کھڑے ہوئے اہلکار کو ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا۔ پوچھا، ''اِسے کون لاک اَپ میں ڈال گیا ہے؟''

وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا، ''اِسے سب انسپکٹر صاحب کہیں سے پکڑ کر لائے تھے۔ اُن کے ساتھ ملک ارشد اور فرید علی تھے سر!''

''زورآور بھی آیا تھا؟''

''جی سر! بہت غصے میں تھا۔''

''کیا کہتا تھا؟''

''کہہ رہا تھا کہ اِسے الٹا لٹکا کر پوچھا جائے کہ اِس کا ساتھی کہاں چھپا ہوا ہے۔''

''اُن تینوں میں سے کوئی یہاں موجود ہے؟'' اُس کا اشارہ سب انسپکٹر، فرید اور ملک ارشد کی طرف تھا۔

''نہیں سر..... وی آئی پی موومنٹ کی کوریج کے لیے گئے تھے۔ لوٹے تو خاصے تھکے ہوئے تھے، گھروں کو چلے گئے۔''

تھانیدار نے سر کو ہولے سے حرکت دی، پھر میری طرف متوجہ ہوا، ''تمہیں کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟''

میں نے کہا، ''خان مارکیٹ کے باہر سے، سر!''

''کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''مظفر گڑھ سے پَرے ایک بستی میں رہتا ہوں جی!''

میرے عقب میں امیر شاہ کے قہقہے کی تیز آواز گونجی۔ تھانیدار نے اُسے ڈانٹا۔ وہ بہ مشکل اپنی ہنسی روک کر بولا، ''اڑے باچھا! ماڑا کیا، ماڑا کھانہ تو جرموں سے بھرا پڑا ہووت پَر اِن کرموں مارے دیہاتیوں پر تو رحم کرو ناں بابا..... ماں بہن کی چوڑیاں گجرے خرید نے دو ناں اپنے وجیر (وزیر) سے فون پر پوچھ لیو، اِس پر کون سی دفعہ لاگو ہووت ہے صاحب؟''

اُس کے طنز پر تھانیدار یک بارگی تلملا اُٹھا۔ اُسے ڈانٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا اور مجھ پر ایک سرد نگاہ ڈال کر وہ اپنے کروفر کو سنبھالتے ہوئے سلاخوں سے پَرے ہٹ گیا۔ سرکاری وردیوں کی سیاہ دھند سلاخوں سے چھٹ گئی۔ چند لمحوں کے بعد ایک سپاہی سلاخوں کے سامنے دکھائی دیا۔ اُس نے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑا ہوا تھا۔ تالے میں چابی گھماتے ہوئے اُس نے ذومعنی مسکراہٹ اُچھالتے ہوئے کہا، ''میر وشاہ! لگتا ہے تمہاری سفارش پھر آن پہنچی ہے۔ چلو! باہر آؤ۔ صاحب نے تمہیں بھی بلوایا ہے۔''

میرا دِل مٹھی میں آ گیا۔ میرا غم گسار رہائی پانے والا تھا۔ اِک آس لگی تھی، وہ بھی بجھنے لگی۔ میر وشاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ایک آنکھ دَبائی اور کہا، ''فکر نہ کرت اڑے لاڈے! تیرے پر آنچ نہ آنے دیوت ہے میر وشاہ.....''

وہ گیٹ سے باہر نکلا تو میں نے سلاخیں تھام لیں۔ اُسے تھانیدار کے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر ماتھا سلاخوں پر ٹکا کر ساکت ہو گیا۔ میں نے نادانی میں اوکھلی میں سر دیا تھا، موسلوں نے میری جان مٹھی میں بھر لی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ اِدھر میر وشاہ ایس ایچ او کے دفتر سے نکلا، اُدھر زور آور اپنے تین چار ساتھیوں سمیت تھانے کے بیرونی دروازے میں دکھائی دیا۔ وہ تیر کی طرح ایس ایچ او کے کمرے کی طرف گیا جبکہ میر وشاہ نے مجھے دیکھ کر انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا اور پھر وہ دایاں ہاتھ لہرا کر 'بائی بائی' کرتے ہوئے تھانے کا گیٹ عبور کر گیا۔

وہ چلا گیا تھا، مایوسی کی بات تھی۔ زور آور تھانے تک آن پہنچا تھا، خطرے کی بات تھی۔ حوالات میں موجود سبھی اپنے اپنے انداز سے میر وشاہ پر محوِ گفتگو تھے۔ کسی کو میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا دِل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور مجھے چشم تصور میں پولیس کے

بدنام زمانہ ٹارچر روم میں اُلٹا لٹکا ہوا 'شہریار' دکھائی دے رہا تھا جس سے کھالے کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔

کوئی نصف گھنٹہ کے بعد دو سپاہیوں نے مجھے حوالات سے نکالا، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنائی اور ایس ایچ او کے سامنے پیش کر دیا۔ کشادہ اور سرکاری آرائش کے حامل دفتر میں ایس ایچ او کے سامنے والی کرسی پر زور آور براجمان تھا جبکہ دیوار کے ساتھ قطار میں رکھی گئی کرسیوں پر اُس کے چار ساتھی براجمان تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے جبکہ میرے عقب میں دونوں سپاہی یوں چوکس کھڑے تھے جیسے اُنہیں میرے بھاگ جانے کا خطرہ لاحق ہو۔ تھانیدار اور زور آور کی تیز چبھتی ہوئی نظریں مجھ پر ثبت ہو گئیں۔ تھانیدار نے کہا، ''اگر تم کچھ چھپائے بغیر اپنے ساتھی کا نام بتا دو، یہ بتا دو کہ وہ اِس وقت کہاں ہے تو تمہارے ساتھ رعائت برتی جا سکتی ہے، وگرنہ تمھارا انجام بہت بُرا ہوگا۔''

اُس کی نظریں مجھے اپنے بدن سے پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا اندازہ یکسر غلط نکلا تھا۔ اُس نے میری معصومیت پر ذرا بھر یقین نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا، ''سر جی! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میری نہ تو کسی سے دشمنی ہے اور نہ دوستی..... ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''یعنی تم تعاون پر آمادہ نہیں ہو؟''

میرے پاس اُس کے سفاک سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''قتل..... ایک شہری کا قتل..... اِس سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی نہیں۔'' تھانیدار کے لہجے کی سنگینی میں درشتی شامل ہو گئی، ''ایک شہری قتل ہو گیا ہے۔ تمہیں قاتل کے ساتھ نہ صرف دیکھا گیا ہے بلکہ تم نے اُسے کور دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ زور آور کو مارا پیٹا بھی ہے، کیا میرے پاس کوئی گنجائش رہتی ہے تمہاری بات کا یقین کرنے کی؟''

زور آور کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تھانیدار نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرا دیا اور میرے عقب میں کھڑے ہوؤں کو مخاطب کر کے کہا، ''اِسے سپیشل روم میں لے جاؤ۔ ہاں! فرید اور ملک ارشد سے کہو کہ یہ مجھے صبح فر فر بولتا ہوا ملے۔ او کے؟''

اُنہوں نے بیک زبان ''جی سر!'' کہا اور مجھے پیچھے کی طرف کھینچا۔ میں بے اختیار قدرے بلند آواز میں بولا، ''سر! آپ میری بات کا یقین.....''

میری بات پوری ہونے سے قبل ہی میری گردن پر زور کا ہاتھ پڑا اور آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اُٹھے۔ کم بخت سپاہی کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب میں حواس باختہ پلٹ رہا تھا، میرے کانوں میں میروشاہ کی آواز گونجی، ''اڑے واہ باچھا کے سنتریو! غنچے پر ہاتھ جھاڑیو ہو..... ایک جَرا (ذرا) سی دیر کو رُکت ناں بابا!''

دروازے کے عین بیچوں بیچ میروشاہ اپنے کھڑا دکھائی دیا۔ اُس نے مجھے کھینچ کر باہر لے جانے والے سپاہیوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ فاتحانہ نظروں سے تھانیدار کی طرف دیکھا، ہاتھ سے کمرے کے باہر کسی کی طرف اشارہ کیا اور بولا، ''اڑے باچھا جی! دیکھو تو کون ملنے آوت ہے تم سے؟''

نہ صرف میں، بلکہ تھانیدار اور زور آور کے نزدیک بھی میروشاہ کی ڈرامائی آمد تعجب خیز تھی۔ وہ دونوں ایک جھٹکے سے کھڑے ہوئے۔ تھانیدار نے قدرے سخت لہجے میں کہا، ''میرو شاہ! اَب یہ نیا ڈراما کیا ہے؟''

میروشاہ نے باہر گیلری میں دیکھا اور یکا یک دروازہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک دراز قامت لڑکی ایک شانِ استغنا سے چلتی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی اور عین میرے مقابل آ کر تھم گئی۔ اُس کی تاب و تمکنت اور پُر وقار شخصیت نے مجھ پر آنِ واحد میں سکتہ طاری کر دیا تھا۔ میروشاہ لپک کر دونوں سپاہیوں کے بیچ کھڑا ہوا اور بولا، ''میڈم! یہ ہے ماڑا غنچہ..... اِس کو جالموں نے خواہ مخواہ قتل کے الزام میں دھر لیوت ہے۔''

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی، پھر ایک اَدا سے چلتی ہوئی تھانیدار کی میز تک گئی اور دونوں ہاتھ شیشے پر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی شخصیت کا اثر تھا یا اُس کے رسوخ کا دبدبہ..... دفتر میں موجود سبھی افراد بالکل خاموش تھے۔ اُس نے زور آور کو بغور دیکھا، پھر تھانیدار سے مخاطب ہوئی، ''اظہر صاحب! میں اِس جوان کو لینے آئی ہوں۔''

تھانیدار نے ایک طویل سانس حلق میں اُتاری اور شائستگی سے بولا، ''یہ موبی کے قتل میں ملوث ہے۔''

''موبی ہماری سوسائٹی کا 'بریو' تھا۔ قتل ہو گیا۔ اَب اُس کی جگہ زور آور 'بریو' ہے۔ چاہے تو اپنے باس کے خون کا بدلہ لے، چاہے تو ملنے والی کمانڈ کے مزے لوٹے۔ کیوں زور آور؟'' اُس کی آواز بڑی جاندار اور خوب صورت تھی، الفاظ میں نہاں بربریت مشاقانہ تھی۔

زورآور نے کہا، ''آپ کو اِس مسئلے میں دخل نہیں دینا چاہیے میڈم! موبی ہمارا ساتھی تھا اور قتل کا بدلہ لینا ہمارا حق ہے۔''

''اور پولیس کی مدد لینا کیا ہماری سوسائٹی کے لئے مناسب ہے؟'' میڈم کی آواز میں زبردست کاٹ تھی، ''اظہر صاحب! میں اسے اپنے ساتھ لے کر جارہی ہوں۔ فکر نہ کیجئے، کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں سنبھال لوں گی، آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اور..... میں اِس کی بھرپور قیمت چکاؤں گی۔'' پھر ایک ادا سے زورآور کی طرف مڑی، ''اور زورآور! موبی بڑا زندہ دل جوان تھا۔ اُس کی موت کا مجھے رنج ہے۔ تم اُس کے قاتل کی تلاش جاری کرو۔ اگر یہ جوان واقعتاً ملوث ہوا، اور اِسے اس کے بارے میں علم ہوا تو میں تمہاری مدد کروں گی اور اسے پوائنٹ آؤٹ کروں گی۔ ٹیک کیئر!''

میں ہونقوں کی طرح سبھی کے چہروں کا طواف کر رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ میڈم کہلوانے والی جوان العمر لڑکی کے سامنے تھانیدار، تھانیدار نہیں رہا تھا اور زورآور کے تمطراق کی ہوا بھی نکل چکی تھی۔ اُس کے جبڑوں کے اعصاب مسلسل تھرک رہے تھے اور آنکھوں سے میرے لیے وحشت اور سفاکی ٹپک رہی تھی مگر مجھ پر ہاتھ اُٹھانے اور رہا ہونے سے روکنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ تھانیدار نے زورآور کی طرف دیکھا، کچھ سوچا، پھر اپنے سپاہیوں کو میری رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں کھٹاک کی مخصوص آواز کے ساتھ میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔

مجھے چند ثانیے تو یقین نہ آیا کہ میں قتل کے الزام میں گرفتار ہونے کے بعد اتنی مختصر اور قلیل مدت میں رہائی پا چکا ہوں، جب ایک شانِ بے نیازی سے میڈم دفتر سے نکلی اور میر وشاہ نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا، میں چونک گیا۔ بے اختیار اُس کے ساتھ گھسٹتا ہوا گیلری میں آیا۔ میڈم صحن میں سے گزر رہی تھی اور تھانے میں موجود اہلکار پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ وہ حسن کا اتنا کامل شہکار تھی کہ نظر ہٹائے سے نہیں ہٹتی تھی۔ تمکنت کا یہ عالم تھا کہ دیکھتے رہنا بھی محال تھا۔

میر وشاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہنس کر بولا، ''اڑے بابا! کیا دیکھت ہے؟ یہ ماڑی میڈم شکیلہ ہووت ہے۔ جہاں ہاتھ ڈالت، سانس کھینچ لیوت ہے۔ تم آجاد (آزاد) ہے، جاوے۔ جندگی (زندگی) میں دُعا کرنا ماڑے لیے..... ماڑے کرم اچھے ہو جاویں گے ناں!''

میں نے تشکرانہ انداز میں اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ میڈم کے پیچھے پیچھے چلتے

ہوئے ہم تھانے سے باہر آئے۔ وہ سیاہ رنگ کی چمکدار پراڈو جیپ میں بیٹھ گئی۔ شیشہ تھوڑا سا کھلا۔ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے میر وشاہ کو اپنے پاس بلایا، کچھ کہا اور شیشہ چڑھا دیا۔ جیپ روانہ ہوگئی تو میر وشاہ نے پلٹ کر نشئیوں کے سے انداز میں میرا ہاتھ تھاما، چوما اور عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا، ''یہ جالم جمانہ! (ظالم زمانہ) بڑے رُوپ دکھاوت ہے، بہروپ دکھاوت ہے۔ ماڑا چہرا بھی جھوٹ مافق، تم بھی جھوٹ مافق..... سالا جمانہ جھوٹا، بہروپیا..... جاؤ، اپنی چودہ اگست مناؤناں جی۔ وہ دیکھو، سالا جورآور خرشی کتے کی طرح تڑپ تڑپ جاوت ہے۔''

اچانک اُس کی نظر تھانے کے کھلے مین گیٹ میں سے گزر حوالات کے سلاخوں والے دروازے پر پڑی۔ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا، ''اوہ جالم ہومیو پیتھک ڈاکٹر..... ماڑے کو بھول ہی گیا کہ تم بھی اِدھر پڑے ہووت ہو۔''

وہ مجھے وہیں ٹھہرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے تھانے میں گھس کر حوالات کی طرف بڑھ گیا۔ سلاخیں تھامیں اور شرابی ڈاکٹر کو آوازیں دے کر جگانے کی کوشش کرنے لگا۔ سونے والا شاید اپنی زندگی کی تمام تر جمع پونجی بیچ کر انتا غفیل ہوا تھا۔ امیر شاہ کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں تو وہ باآواز بلند گالیاں دیتا ہوا میرے پاس آ گیا، بڑبڑایا، ''سالا! مُردوں کے مافق سووے ہے۔ قبرستان میں کھڑا ہو کر کسی کو اتنی اونچی آواجیں (آوازیں) دیویں تو کئی مردے کانوں پر ہاتھ رکھے آجاویں۔ وہ مُردار ناں جاگے ہے۔''

میں میر وشاہ کی تقلید میں قدم بڑھاتا، دل ہی دل میں اُسے دعائیں دیتا ہوا چل رہا تھا اور جلد از جلد تھانے سے دور جانا چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ لاحق تھا کہ پھر مجھے پکڑ نہ لیا جائے اور مار مار کر رہی سہی کسر نہ نکال دی جائے۔

اندھیرے کی دبیز چادر شہر نے اپنے اوپر لپیٹ لی تھی۔ تھانے کے باہر کی دُنیا خوابیدگی کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اِکا دُکا دکانیں اور سگرٹ پان کے کھوکھے کھلے ہوئے تھے۔ امیر شاہ نے ایک کھوکھے پر رُک کر دو تین پان پیک کرائے، سگرٹ کی ڈبیا اور ماچس خریدی۔ سگرٹ سلگائی اور فضا میں منہ کھول کر دھواں چھوڑتے ہوئے خاصی بلند آواز میں بولا، ''ماڑے کو سال چھ ماہ میں ایک نہ ایک چکر تھانے کا جرور (ضرور) لگ جاوے۔ قسمت میں ہیر پھیر ہے۔''

آدھے کلومیٹر کی مسافت طے کر کے ہم ایک بارونق چوک میں پہنچے۔ چوک کی ایک نکڑ

مرغ کی یخنی اور انڈے بیچنے والوں نے اپنے تصرف میں لے رکھی تھی۔ ریہڑیوں پر پہلوان نُما بے بال و پر مرغ لٹک رہے تھے اور فضا میں بھینی بھینی مہک رچی ہوئی تھی۔ دو تین ہوٹل، ایک کال سنٹر اور چند شبانہ نوعیت کی دکانیں کھلی تھیں۔

ہم ایک یخنی فروش کے چوبی تختے پر بیٹھ گئے۔ اُسے ابلے ہوئے انڈوں اور یخنی کا آرڈر دے کر رنگ برنگ برقی قمقموں کی روشنی میں محوِ کلام ہو گئے۔ میں بے دھیانی کے عالم میں 'ہوں، ہاں' کرتا ہوا متحرک لوگوں کو دیکھتا رہا۔ انڈے اور تیز مصالحے دار یخنی نے جسم میں کچھ حرارت پیدا کر دی۔ ایسے میں زور آور کی ڈارک بلو کار ہمارے قریب آن رُکی۔ شیشہ اُترا اور زور آور کا چہرہ دکھائی دیا۔ اُس کی سفاک آواز میرے کانوں میں پڑی، ''سی یو اگین مسٹر..... انتظار کرنا زور آور کا!''

میرے بولنے سے پہلے میر وشاہ نے ہاتھ لہرا کر کہا، ''ماڑے کو نہ چھیڑ جور آور..... یہ چھیڑ چھاڑ جرا بھی اچھی نہ ہووت ہے۔''

زور آور نے دانت کچکچائے اور شیشہ چڑھا لیا۔ کار آگے بڑھ گئی۔ میر وشاہ نے میرے کندھے پر عادتاً ہاتھ مارا، بولا، ''اڑے او غنچے! فکر کاہے کا ہووے تیرے کو..... ہم اِدھر ہی ہووت ہے۔ یہ سالا تیرے کو ہاتھ بھی نہ لگا پاوے گا۔ یہ نگری میر وشاہ کی میڈم کی ہووت ہے۔''

میں زور آور سے ڈرا نہیں تھا اور نہ ہی میں اتنا ناتوانا تھا کہ اُس سے چت ہو جاتا۔ ڈر قانون کے ہرکاروں کا تھا اور اپنی حالتِ زار کا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور لاری اڈے کی سمت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُسے یہ بھی بتایا کہ میرے پاس کرایہ وغیرہ کے پیسے نہیں ہیں۔ وہ قہقہہ لگا کر بولا، ''لاڈے میاں! فکر نہ کرے ہے۔ اگلے چوک پر تانگے کھڑے ہوویں۔ جالم رکشے والے تو چمڑی کھینچ لیوت ہیں۔ پَر تیرے کو اِس وقت کہاں جانا ہووے۔ بھلے غنچے! میڈم کا شکریہ تو ادا کرے جاوت، جندگی (زندگی) میں پھر کبھی جرورت (ضرورت) آن پڑت ہے بندے پر۔ ہیں؟''

اُس نے بڑی معقول بات کی تھی۔ مجھے اپنی محسنہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا وگرنہ میرا ملتان سے بھاگ نکلنا بدتہذیبی میں شمار کیا جاتا۔ میں نے کہا، ''ہاں! مجھے واقعی میڈم شکیلہ کے پاس جانا چاہیے۔''

وہ خوش ہوگیا۔ لاری اڈے جانے کا ارادہ بدلا تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک نیم خوابیدہ رکشا والے کو بلا لیا۔ رکشے کی 'ٹریں ٹریں' فضا میں گونج اٹھی اور مجھ پر ایک مرتبہ پھر پریشان کن سوچوں کی یلغار ہوگئی۔ کھالے کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ کس حال میں تھا۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ کسی اور تھانے کی حوالات میں پڑا ہو۔ میں نے میر وشاہ سے کہا، ''کیا میرے یار کھالے کو تلاش کیا جا سکتا ہے؟''

امیر شاہ منہ میرے قریب کر کے بولا، ''ہومیو پیتھک ڈاکٹر کہوے تھا کہ دُنیا لاڈے خانوں سے بھری ہووت ہے۔ وہ سچ کہوے تھا۔ تم بھی لاڈے خان ہووے؛ غنچہ ہووے۔ کہہ جو دیا کہ فکر مت کیجو، ماڑی بات پہ یقین ناں ہووے ہے۔ ہے ناں؟''

میں نے کہا، ''قتل کا معاملہ ہے امیر شاہ! میں کیسے بے فکر ہو سکتا ہوں۔ میرے نصیب ہار گئے ہیں شاید۔ ادھر میں ملتان میں آ کر مصیبت میں پھنس گیا ہوں جبکہ میرے گھر والے میری وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔''

''یار! ایک بات تو بتاوے ناں!'' وہ میری طرف قدرے جھک کر بولا، ''کوئی اندا جا (اندازہ) ہے کہ تیرا لاڈا، تیرا یار کہاں ہووے ہے اِس سے؟''

میں نے مایوسی سے کندھے اُچکائے، ''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''کہنا جروری ناں ہووے، سوچنا لاجم (لازم) ہووے ہے یار لاڈے!'' وہ دانش مندانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا، ''وہ اگر دھر لیا جاوے گا تو پولیس تیرے کو بھی دبوچ لیوے گی۔ ہاں!''

چائے پینے تک خاموشی چھائی رہی۔ اُس نے ایک اور پان منہ میں ٹھونسا۔ ساتھ ہی ایک سگرٹ سلگا لیا۔ قدرے دھیمی آواز میں بولا، ''اب تم کہاں جاوت ہے؟''

میں نے اُسے خالی نظروں سے گھورا۔

''میرا پوچھنے کا مطلب ہووے کہ تم اپنی بستی میں اَب جاوے تو پکڑا جاوت ہے۔ ادھر بھی غنڈے مافق جور آور (زور آور) تمہارے پیچھے کتوں کی طرح لگا ہووے ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''مگر میں نے اپنے گاؤں کے بارے میں تو کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ حتیٰ کہ تمہیں بھی علم نہیں ہے۔ پھر وہ کیسے وہاں تک پہنچے گا۔''

وہ بولا، ''تیرا ساتھی تیرے گھر کا پتہ جانت ہے ناں؟''

''ہاں!'' میں نے سر ہلایا، اِس کے ساتھ ہی گھبرا گیا۔ مجھ تک کھالے کے ذریعے با آسانی پہنچا جا سکتا تھا۔

''اگر وہ پکڑا جاوت ہے تو کالے خاکی بھوتوں کو اُدھر کی راہ دکھا دیوے ہے۔'' وہ اپنا سر اور چھاتی ایک تال سے ہلاتے ہوئے بولا، ''تین سو دو میں تو جالم وردی پوش بجلی کے مافق پھرتیاں دکھاوے ہیں۔''

میری خاموشی پر وہ نتیجہ خیز انداز میں بولا، ''تم ماڑا یار ہووے ہے اور یار کے لیے تو دل کی کھولی بھی ہردم کھلی ہووے ہے۔ تمہارے کو اِدھر میڈم کی کوٹھی پہ ایک آدھ دِن رہنا ہووت ہے۔ پھر گھر کی راہ لیوت ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟''

میں نے اُسے اچنبھے سے دیکھا۔ اُس کے کھنچے اعصاب والے چہرے پر سنجیدگی ثبت تھی۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیں لرز رہی تھیں۔ کوئی منٹ بھر کا دورانیہ یوں ہی گزر گیا۔ پھر مجھ پر نظریں ساکت کر کے بولا، ''تم اَبھی غنچے ہو۔ تم دُنیا کو نہیں جانتے ہو۔ یہ موئی دُنیا بڑی جالم ہے۔ چٹکی میں پکڑ کر کھینچ لیوے ہے اور پھول نہ بننے دیوے ہے۔ اوپر باج (باز) نیچے جالم شکاری..... تم ایسے پھنسے ہووت لاڈے!''

وہ سچ کہہ رہا تھا۔ مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ ہوا جو چہرے سے بھی عیاں ہو گیا اور میں رکشے سے جھانک کر پیچھے کی سمت دوڑتی بند دکانوں کی بتیاں دیکھنے لگا۔ سڑکوں کا لامتناہی سلسلہ..... رکشے کی ناگوار آواز اور سوئے ہوئے محل کی طرح خوابیدہ شہر کی خوبصورت کوٹھیاں..... کوئی نصف گھنٹے کے بعد رکشا ایک محل نما کوٹھی کے جہازی سائز کے گیٹ پر آن رکا۔ امیر شاہ نے ڈرائیور کو فارغ کیا اور میرا بازو تھام کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ بند تھا۔ اُس نے گیٹ کے ستون پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبایا۔ دور کہیں مترنم گھنٹی بجی۔ کال بیل کے بڑے سے بٹن میں نصب انٹر کام میں سے بھاری آواز برآمد ہوئی، ''کون؟''

''ظاہر خان! میں امیر شاہ ہوں۔ گیٹ کھولو۔''

''اوئے چڑی مار کا بچہ! تم کو نیند کیوں نہیں آتا!'' بولنے والے کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ پٹھان تھا۔

''بکواس نہ کر، دروا جا (دروازہ) کھول۔ بڑے جروری کام سے آوت ہوں۔'' امیر شاہ کے لہجے سے ہلکا سا تحکمانہ تاثر جھلکتا تھا۔

ہلکی سی 'کٹاک' کی آواز کے ساتھ ہی انٹر کام خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کا بغلی دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ ایک چہرے نے جھانک کر ہمارا جائزہ لیا۔ کم روشنی کی وجہ سے اُس کے خال وخد دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ امیر شاہ نے قدرے تیز آواز میں کہا، ''ماڑے کو ایکس رے مشین پر بٹھاوت ہے کیا؟''

جھانکنے والا شرمسار ہو کر غائب ہو گیا۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ظاہر شاہ نامی طویل قامت پٹھان اپنے کندھے پر کلاشن کوف جیسی گن لٹکائے گیٹ لاک کر کے ہمارے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ کوٹھی کے بڑے دروازے کو عبور کر کے ہم ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں آ گئے جس کے تینوں اطراف میں گیلریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ امیر شاہ نے پوچھا، ''اپنی میڈم سوت ہیں کیا؟''

ظاہر شاہ نے آنکھیں دکھائیں، ''انسان کا بچہ بن امیر شاہ! تھوڑا دیر پہلے میڈم صاب آیا تھا، اَب سوئے گا نہیں تو کیا غلیل سے چڑیوں کا شکار کرے گا۔ تم اُدھر مہمان خانے میں جا کر سو جاؤ۔ اپنے یار کو بھی ادھر ہی لے جاؤ۔ جب میڈم صاب جاگے گا تو اُس کو اَم بتا دے گا۔ چلو، اپنا چڑی مار کہ شکل گم کرو۔''

دونوں کے درمیان کچھ دیر نوک جھونک چلتی رہی۔ امیر شاہ فوری طور پر میڈم سے ملنا چاہتا تھا جبکہ ظاہر شاہ اُسے دائیں ہاتھ والی گیلری میں دھکیل کر بولا، ''چلو اُدھر کمرے میں۔ ام تمہارے لیے سبز قہوہ بنا کر لاتا ہے۔ عقل ٹھکانے لگے گا تو سمجھ آئے گا کہ یہ کسی سے ملنے کا ٹیم نہیں ہے۔''

امیر شاہ میرا ہاتھ تھام کر، ظاہر شاہ پر غصہ بھری نگاہ ڈال کر بادلِ نخواستہ خوبصورت فرشی ٹائیلوں والی گیلری میں داخل ہو گیا اور آخری کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میں جو اُس کی تقلید کر رہا تھا، کمرے کی آرائش دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ کمرے کے وسط میں ایک جہازی سائز کا خوب صورت بیڈ پڑا تھا۔ کمرے کے انتہائی گوشے میں باتھ روم کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ کمرہ خاصا کشادہ اور 'وال ٹو وال' کارپٹڈ تھا جو کوٹھی میں رہنے والی میڈم شکیلہ نامی عورت کی امارت کا منہ بولتا مظہر تھا۔

میں بیڈ پر بیٹھنے سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ میرا لباس بہت میلا کچیلا تھا۔ امیر شاہ نے میرے تامل کو تاڑ لیا۔ بازو سے پکڑ کر بیڈ پر کھینچ لیا۔ بولا، ''تم ماڑے یار ہو۔ ماڑی نجر (نظر) تن پر نہیں

ہووے، سوہنے سچے من پر ہووت ہے۔''

میٹرس بڑا آرام دہ تھا۔ بیٹھتے ہی آدھا دھنس گیا۔ کچھ ہی دیر میں ظاہر شاہ قہوے کے تین پیالے ٹرے میں رکھے آن وارد ہوا۔ ہم نے قہوہ پیا، کچھ باتیں کیں اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ بہت تھوڑی دیر بعد ہی امیر شاہ کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے جب کہ میں اپنی کبیدہ خاطر حالت پر کڑھنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے حالات میری دسترس سے نکل گئے تھے۔ اپنی زندگی کے بارے میں، میں نے جو لائحہ عمل مرتب کر رکھا تھا، وہ نظروں کی حد سے بھی کہیں پرے ہو گیا تھا۔ نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی اور نیند کی پُر فریب وادی میں اُتر گیا۔

آنکھ کھلی تو دیوار گیر کلاک میں نو بج رہے تھے۔ میں اُچھل کر بیڈ سے اُترا۔ اپنے دائیں طرف لیٹے ہوئے امیر شاہ کو دیکھا تو اُسے ندارد پایا۔ وہ میرے جاگنے سے پیشتر اُٹھ کر کہیں چلا گیا تھا۔ سر بھاری بھاری سا تھا۔ جسم درد مین لپٹ کر خاصا بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ گزشتہ دن کی تمام سرگرمیاں ٹیسوں کی شکل میں مجھ میں سمائی ہوئی تھیں۔ میں نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اُجلی دھوپ میں ہر شے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں دیر تک سونے کا عادی نہیں تھا مگر بھاگ دوڑ کے طویل دورانیے نے میرے معمول میں ریخت بھر دی تھی۔

میں باتھ روم جانے کا سوچ رہا تھا جب دروازہ کھلا اور امیر شاہ کی شکل دکھائی دی۔ اُس نے ہینگر میں لٹکا ہوا گرے کلر کا سوٹ اور جوتے وغیرہ اُٹھا رکھے تھے۔ میں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا، ''ماڑے کو معلوم تھا کہ تم گدھے کے مافق جرورت سے جیادہ (زیادہ) انٹا غفیل ہووت ہے، اِس لیے میڈم کو جا کر تمہارے بارے میں سب باتیں کر دیوت ہیں۔ ماڑی میڈم بڑے کھلے دل کی مالک ہووے ہے۔ اُس نے بجار (بازار) سے کپڑے منگوائے ہیں۔ نہا کر سوٹ پہن لیوے اور پھر بابو بن کے میڈم سے ملاقات کرے ہے۔''

میں کپڑے اُٹھائے باتھ روم میں گھس گیا۔ نفیس پلاسٹک کے سفید رنگ کے ریک پر شیونگ کا سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر شاہ جی کی رفاقت میں اپنی شیو بنانی سیکھ رکھی تھی۔ وہ تجربہ کام آ گیا۔ جدید طرز کا پُر آسائش باتھ روم میری آنکھیں کھول رہا تھا، میں کھلی آنکھوں اِس حیرت کدے کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ پہلے امیر شاہ اور پھر میڈم شکیلہ نامی امیر زادی مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو گئی ہے۔ میں خاص آدمی نہیں تھا۔ یہ دنیا میرے جیسے عمومی نوعیت کے لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ ایسے میں خود کو ملنے والی غیر معمولی توجہ میری

چھٹی حس کو جگا رہی تھی۔

میں جب باتھ روم سے برآمد ہوا تو میری جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ میں اَب میں دیہاتی اور گنوار شخص دکھائی دے رہا تھا۔ 'باس' کی گرے کلر کی لٹھے کی قیمتی سوٹنگ، سیم کلر کا ویسٹ کوٹ، چمکدار سیاہ جوتے..... مجھے اپنا آپ ہلکا پھلکا، خوب صورت اور خوشگوار لگنے لگا۔

میر وشاہ نے غسل اور چینج کی زحمت نہیں اُٹھائی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھ کر آنکھیں نچائیں، ''اڑے واہ لاڈے میاں! اَب تو تم نرے غنچے نظر آوت ہو۔ ماڑی میڈم کو ہی نہ لے اُڑت کہیں!''

اُس کی آنکھوں میں رَچی ہوئی شوخی اور چست کیے گئے فقرے کے سبب میں جھینپ گیا۔ ایک باوردی ملازم نے بلوریں روم ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات چن دیے۔ میں اور امیر شاہ نے بے حد آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر پیٹ کی طلب کو شانت کیا۔ اِس دوران مجھے امیر شاہ اپنے مخصوص انداز میں میڈم سے ملنے اور اُس کے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب سمجھاتا رہا۔

اُس کی ہدایات کا خلاصہ یہی تھا کہ وہ بہت تیز نظر اور لہجہ شناس عورت تھی۔ اپنے سامنے بولے گئے جھوٹ کو کونے سے پکڑ کر ذہن تک رَسائی حاصل کر لیتی تھی۔ جتنی مہربان تھی، اُس سے کہیں زیادہ منتقم مزاج تھی۔ امیر شاہ نے مجھے سمجھایا کہ اگر میں اُسے اپنی شخصیت اور زورِ بیاں سے مطمئن کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں تو وہ چٹکی بجانے کی سی دیر میں میرے تمام مسائل حل کر دے گی۔ خوش ہو کر میرے روم روم میں نوٹوں کی خوشبو بھر دے گی؛ وغیرہ وغیرہ۔

مجھے دولت کی ایسی طلب لاحق نہیں تھی کہ میں اُسے خوش کرنے چل پڑتا۔ مجھے اس مصیبت سے نجات درکار تھی جو بنا دستک دیے میری زندگی کی دہلیز تک چلی آئی تھی۔ میڈم شکیلہ کی امارت کی تھوڑی سی نمائش اور رسوخ کا مظہر دیکھ چکا تھا۔ اگر وہ میرے کام آنے کا ارادہ کر لیتی تو کام آ سکتی تھی۔ میں نے اُس کے نام پر بتھکڑی کے کھلتے ہوئے قفل کو دیکھ رکھا تھا۔ تھانیدار اور زور آور کی بجھی ہوئی شکلوں کو دیکھ رکھا تھا۔ امیر شاہ مضبوط، امیر اور بھاری بھرکم شخصیت کا مالک نہیں تھا کہ وہ تھانیدار پر کوئی پھبتی کسنے کی جرأت کرتا مگر وہ اپنے مخصوص انداز میں آوازے کستا تھا۔ ظاہر تھا کہ اُس کے منہ میں میڈم کی زبان حرکت کرتی تھی جس پر قانون کا رکھوالا قفل نہیں لگا سکتا تھا۔

تجسس اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ گیارہ کے لگ بھگ ملازم نے آ کر بتایا

کہ میڈم ہم دونوں کو اپنے کمرے میں بلا رہی ہے۔ امیر شاہ نے میڈم کے کمرے کے دروازے تک کے مختصر سفر میں اپنی ہدایات کا اعادہ کیا اور مطمئن ہو کر مجھے میڈم کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ اپنے آراستہ و پیراستہ کمرے میں صوفے پر بیٹھی دکھائی دی۔ اگر میں نے اُس کے شباب کی لپک اور حسن کی تاب کو پہلے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ جاتیں۔ نازک اندام، سرخ و سپید جلد اور تیکھے نقوش والی لڑکی پر 'میڈم' کا لفظ کسی بھی طور جچتا نہیں تھا۔ اُس کا لباس جاذبِ نظر، مسکراہٹ بے حد جاندار اور بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں ثبت عجیب سی سرد مہری.....

میں نے امیر شاہ کی تقلید کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں اُسے سلام کیا اور کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے بڑی گہری اور سرد نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ سر سے پاؤں تک کر دیا۔ پھر امیر شاہ سے مخاطب ہوئی، ''میر وشاہ! اِس کے باوجود کہ تم نے مجھے اِس جوان کی کہانی بڑی تفصیل سے بیان کر دی ہے، میں چاہوں گی کہ اِس کے منہ سے سنوں۔ کیا خیال ہے؟''

وہ بولا، ''ماڑے کو اعتراج (اعتراض) نہیں ہووے میڈم! تمہاری مرجی (مرضی) ہووے تو اِس کڑوے پیاج (پیاز) کو چھیل کر دیکھت ہے۔ ماڑے کو تو یہی پتہ ہووے ہے کہ تم اِس غنچے کی مدد کرے ہو۔ بس!''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم اِس طرح کرو کہ گاڑی لے کر مظفر آباد چلے جاؤ۔ مخدوم جی کے ٹھکانے سے مال وصول کر کے جگت پور کے سائیں مراد قریشی تک پہنچا آؤ۔ دیکھنا، سائیں بڑا نامراد آدمی ہے۔ میٹھے منہ زہر کی پھانک کھلاتا ہے۔ رقم کی تسلی وہیں بیٹھ کر کر لینا۔ پچھلی مرتبہ کی طرح دھوکے میں نہ آ جانا۔ اُسے خان باز وخیل ہر ماہ نوٹوں کی سپلائی دیتا ہے، دھیان رکھنا۔''

اُس نے سینے پر ہاتھ رکھا، جھکا اور سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ اُس کی تعظیم کرنے کا انداز بڑا مضحکہ خیز اور مسخرانہ تھا۔ مجھے عجیب لگا مگر میڈم نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ عادی ہو چکی تھی۔

وہ پلٹا ہی تھا کہ میڈم نے کہا، ''اور ہاں! وہ انسپکٹر اظہر کو بھی راضی کر دینا۔ بہت عزت کرتا ہے۔''

میر وشاہ نے دوبارہ سرِ تسلیم خم کیا اور پلٹ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب

ہوئی، ''ہاں! تمہارا نام کیا ہے؟''

اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتے پایا تو میں قدرے گڑبڑا گیا مگر میں نے سنبھلنے میں دیر نہیں کی۔ ایک طویل سانس خارج کی اور مستحکم لہجے میں کہا، ''میڈم! میرا نام شہریار ہے۔''

''ویری گڈ!'' اُس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی، ''یہ ہوئی نا بات۔ شہریار بڑا کیوٹ نام ہے۔ تمہاری آپ بیتی بھی بڑی کیوٹ ہوگی۔ کچھ چھپاؤ گے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ مجھے اچھا سامع جان کر شروع ہو جاؤ۔ تم یہاں کیوں ہو؟ مجھے اِس سوال کا تفصیلی جواب درکار ہے۔''

میری بات طویل تھی۔ خود اعتمادی بھی لوٹ رہی تھی۔ اِس لیے میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، ''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟''

اُس نے ایک ادا سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی، ''نہیں۔ اَبھی یہ طے نہیں ہوا کہ تم قابلِ اعتماد ہو۔ جب تم نے خود کو سچا اور مخلص ثابت کر دیا، تمہیں اپنے سامنے بٹھاؤں گی۔''

اُس کے ہاں لفظوں کی ادائیگی بڑی رواں اور کامل تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ خاصی پڑھی لکھی تھی۔ بڑی بڑی شفاف آنکھیں سے پھوٹتی نادیدہ شعاعیں ذہن تک اُترتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں نے نور پور سے اپنی کہانی کا آغاز کیا۔ بغیر کوئی آمیزش کیے، جھوٹ بولے، اُسے ماجرا کہہ سنایا۔ وہ شیشے کے ایک نفیس گلاس کو گاہے بہ گاہے لبوں سے لگا کر پانی کا گھونٹ بھرتی، پھر میری طرف متوجہ ہو جاتی۔ وہ تب مسکرا دیتی جب میں اُسے دیکھنے کے بعد چند لمحوں کے لیے اپنی روانی کھو بیٹھتا تھا۔ ایسے میں میری توجہ اُس کے خال وخد کی ندرت اور شخصی نکھار پر مرکوز ہو جاتی تھی۔

جب میری کہانی میں عشرت عرف عاشی اور جیت شاہ کا کردار داخل ہوا، وہ بُری طرح چونکی۔ صوفے کی ٹیک چھوڑ کر بولی، ''اوہ..... وہ والا نور پور۔ اچھا، ٹھیک ہے، تم اپنی کتھا جاری رکھو۔''

مجھے اُس کے اچانک بدلنے والے تاثرات پر حیرت ہوئی مگر میں نے زیادہ توجہ نہیں دی اور بولتا رہا۔

وہ اسما کے تذکرے پر بھی چونکی اور اپنے غیر معمولی سرخ ہونٹ سکیڑ کر بولی، ''کیا سردار حیدر خان کی بیٹی کی بات کرتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور سلسلہ کلام جوڑ لیا۔ میرے بیان کے بیچ میں وہ گاہے بگاہے

کوئی سوال کر دیتی، کچھ پوچھ لیتی، میں جواب دے کر مطمئن کر دیتا۔ جونہی میری کہانی ختم ہوئی، وہ بولی، ''شہر یار! تمہاری بیان کردہ کہانی کے اکثر کرداروں کو میں جانتی ہوں۔ تم نے کہیں جھوٹ بولا ہے تو اُس کی تصحیح کر لو کیونکہ میں وِیری فی کیشن کروں گی۔''

میں نے کہا، ''میڈم! آپ جس طرح چاہیں، پرکھ لیں۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

وہ عجیب مزاج رکھتی تھی۔ کافی دیر تک مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی، پھر بولی، ''ہاں! اَب تم اُدھر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے بیٹھ کر کہا، ''میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

اُس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''ہوسکتا ہے، زور آور نے کسی اور تھانے میں موبی کے قتل کا مقدمہ درج کرا دیا ہو، قاتل تک پہنچنے کے لیے مجھے دھر لیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میرا دوست کھالا گرفتار ہو جائے اور اُسے مار پیٹ کر میرا نام پتہ پوچھ لیا گیا ہو۔ جونہی نور پور پہنچوں، گرفتار کر لیا جاؤں اور موبی کے قتل کے مقدمے میں ڈال کر چالان کر دیا جاؤں۔''

وہ بولی، ''ہاں! اگرچہ تم نے قتل نہیں کیا مگر اعانتِ جرم کے الزام میں ہی تمہارا کباڑا ہو جائے گا۔ پھر؟''

''تم کھالے کی موجودہ پوزیشن سے بھی لاعلم ہو۔ ہے نا؟''

''جی میڈم!'' میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا، ''میں نہیں جانتا کہ وہ کس حال میں ہے۔''

''اَسما سے اُس کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں ایک مرتبہ پھر بتاؤ۔ اسما کس حد تک اُس کی ذات میں انوالو ہے؟''

میں نے، جو کچھ میں جانتا تھا، دہرایا۔ وہ لمبی 'ہوں' کر کے خاموش ہو گئی۔ ایسے میں اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ صوفے پر نیم دراز تھی۔ میں نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ پیرٹ کلر کی کڑھائی دار قمیص، گہرے سبز رنگ کی شلوار اور اِسی رنگ کا میچنگ دوپٹہ اُس کی شخصیت کے گرد زبردست مقناطیسی حصار کھینچ رہا تھا۔ وہ گھریلو، سادہ اور کیوٹ دکھائی دیتی تھی مگر میر وشاہ نے اُس کی طاقت اور رسوخ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بیان کرتا تھا کہ وہ بہت پہنچی ہوئی، زیرک اور زمانہ ساز عورت ہے۔

''تم نور پور میں رہتے ہو، نور پور کے معاملات سے بخوبی واقف ہو گے؟''

''میں سمجھا نہیں میڈم؟''

''وہاں ایک نہیں، کئی 'بڑے' رہتے ہیں۔ یارن خان، وریام خان، حیات خان اور اِن سب سے بڑا کردار دل جیت شاہ..... یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے ہیں مگر دولت ہے کہ دن بدن ان کے پاس جمع ہوتی جاتی ہے۔ آخر ایسا کیا ہنر ہے ان لوگوں کے پاس؟'' اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

میرے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کہا، ''میڈم! میں اِنہیں جانتا تو ہوں، ان میں اُٹھتا بیٹھتا تو ہوں مگر ان کے کسی ہنر سے آگاہ نہیں ہوں۔ میرے لیے تو یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ آپ ان سب لوگوں کو جانتی ہیں۔''

''نور پور میں کسی کو بھی ان کے کرتوتوں کا علم نہیں ہے؟'' اُس کے لہجے سے حیرت مترشح تھی۔

''کون سے کرتوت؟''

وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ منہ سے کچھ نہ بولی، تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی اور پھر اُس نے اپنی آنکھیں موند کر اپنا سر صوفے کی ہیڈ ٹیک پر رکھ دیا۔ کوئی پانچ منٹ کا دورانیہ اِسی حالت میں تمام ہوا۔ پھر اچانک اُس نے آنکھیں کھول کر مجھ پر گاڑ دیں۔ بولی، ''شہریار! تم مستقبل میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

میرے جی میں آئی کہ میں اُس پر اپنا وہ دکھ بھی آشکار کر دوں جس نے آج تک مجھے چین لینے نہیں دیا تھا، اور اُس سے مدد طلب کروں مگر جھجک آڑے آئی اور کچھ نہ کہہ پایا۔ وہ بولی، ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نو میڈم! میں اندھیرے میں ہوں۔''

''جس نے تمہاری زندگی میں یہ اندھیرا طاری کیا ہے، اُسے جلا دو۔ تاریکی چھٹ جائے گی۔''

یہی تو میری مشکل تھی۔ میں اُس شخص کی تلاش میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ مجھے اُدھیڑ بن میں مبتلا پا کر اُس نے موضوعِ گفتگو بدلا، ''اچھا چھوڑو اِس بات کو، یہ بتاؤ، تم میرے لیے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہو؟''

دُنیا کا نظام 'کچھ لو اور کچھ دو' پر چلتا ہے۔ اس نے میری مدد کی تھی، اُسے حق حاصل تھا کہ

اپنی اعانت کی کچھ قیمت بھی طلب کرتی۔ میں نے مایوس دلی سے کہا، ''میڈم! میں تو غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔''

وہ ایک دم مسکرائی، بولی، ''یہ اندازہ تو مجھے بھی ہے۔ میرے سوال کو نئے رُخ سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیا احسان کا بدلہ احسان سے چُکانے کی ہمت رکھتے ہو؟''

میں اُس کے کس کام آ سکتا تھا؟ سوچ کر دل بیٹھنے لگا۔ کہا، ''میرے پاس دینے کے لیے، سوائے اپنے خون کے، کچھ نہیں ہے۔''

اُس کی مسکراہٹ میں مزید گہراؤ سمٹ گیا۔ آنکھیں نیم باز ہو گئیں۔ قدرے شوخی سے بولی، ''دیہاتی خون میں جھوٹ نہیں رچتا۔ منافقت اور دھوکہ شامل نہیں ہوتا۔ تم مجھے خون دو، بڑی بات ہے۔ میں اُسے بدن سے کیسے کشید کروں گی، یہ میرا کام ہے۔''

پھر اُس نے اپنے بائیں جانب پڑی ہوئی چھوٹی سی بلوریں تپائی پر سے انٹر کام ریسیور اُٹھایا۔ کوئی نمبر پش کیا اور کان سے لگا کر کسی کو فوراً کمرے میں پہنچنے کا حکم صادر کیا۔ چند لمحوں بعد ایک باوردی ملازم کمرے میں تھا۔ وہ حاکمانہ انداز میں بولی، ''شبو! مہمان کو گیسٹ روم میں لے جاؤ۔ اِسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں! ٹیلی فون کی ایکسٹینشن چالو کر دینا۔ کہیں فون کرنا چاہے گا تو کر لے گا۔''

پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی، ''شہریار! اَب تم گیسٹ روم میں جا کر آرام کرو۔ کسی شئے کی ضرورت ہو تو روم میں موجود انٹر کام کا بزر بجا دینا۔ شبو کمرے میں ٹیلی فون چالو کر دے گا۔ تم اپنے گاؤں میں کسی کو فون کر کے اپنے گھر میں اپنی خیریت کی اطلاع کر دینا مگر ایک دھیان رکھنا کہ میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ اوکے؟''

''بہت شکریہ میڈم! میں شاید آپ کے احسانات کا بدلہ کبھی چکا نہیں پاؤں گا۔'' میں نے کہا اور شبو کی معیت میں اُس کے کمرے سے نکل کر اُسی گیسٹ روم میں آ گیا جہاں پر میری اور امیر شاہ عرف میرو شاہ کی شب بسری کا ہنگامی اہتمام ہوا تھا۔ شبو، جس کا نام شبیر یا شبر ہو سکتا تھا، نے فون کی سہولت مہیا کی۔ گیلری میں ہی ٹی وی لاؤنج اور لائبریری کے دروازے کھلتے تھے۔ گیلری کا آخری دروازہ ایک بڑے اور خوبصورت لان میں کھلتا تھا۔ شبو نے حقِ میزبانی ادا کرتے ہوئے مجھے بہت سی کارآمد معلومات فراہم کیں۔ سات آٹھ بڑے چھوٹے کمروں پر مشتمل یہ حصہ گیسٹ ہاؤس کہلاتا تھا۔ میڈم کے سامنے خاموش گو دکھائی دینے والا شبو حقیقت

میں خاصا باتونی ثابت ہوا تھا۔ میرے استفسار پر اُس نے میر وشاہ کی واپسی کا وقت بتانے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ میں اُسے مل کر یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔

اُس کے جانے کے بعد میں نے فون پر امیر نواز سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر قریشی چوک والی ایکس چینج میں کوئی فنی خرابی عود کر آئی تھی جس کی وجہ سے 'ٹوں، ٹوں' کی ناپسندیدہ آواز نے ہی میرا استقبال کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ امیر نواز کے سیٹ کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی تھی۔

ایک مسلسل اضطرابی کسک کے باوصف میں خود کو اِس جگہ پر کافی محفوظ خیال کرنے لگا تھا۔ گھر والوں کی اُداسی، پروین کی پریشانی کا احساس، کھالے کی عدم دستیابی اور نور پور میں درپیش آنے والے ممکنہ خطرات نے ذہن کو خاصا پراگندہ کر رکھا تھا جبکہ میں اِن سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اور مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی اکثر کہا کرتا تھا کہ جب سوچ کی چشمِ ارتکاز کوئی واضح شبیہہ بنانے میں کامیاب نہ ہو پا رہی ہو تو اُس سوچ سے فی الوقت چھٹکارا حاصل کر کے ذہن کی صحت کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ مطمئن، آسودہ اور پہلی ڈگر سے ہٹا ہوا ذہن ہی فائدہ مند صورت کی تشکیل دے سکتا ہے۔ شاہ جی کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے اِن تکلیف دہ سوچوں کو پسِ پشت ڈال کر دوپہر تک کا وقت میں نے لان، کوٹھی کے بیرونی لان، لائبریری اور ٹی وی لاؤنج میں گزارا۔ اِس عرصے میں شبو، ظاہر خان اور دو ملازموں کے علاوہ مجھے کوئی شخص دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ ہی میڈم کی شکل دکھائی دی تھی۔ ظاہر خان خاصا خشک مزاج آدمی تھا۔ اُس کا کمرہ الٹے ہاتھ والی گیلری کے آخری سرے پر واقع تھا۔ وہ رات میں کوٹھی کی چوکیداری کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور دن بھر آرام کرتا تھا۔ گیٹ پر زوار نامی شخص بطور واچ مین کم سکیورٹی گارڈ تعینات تھا۔ اُس کے کندھے پر وہی کلاشن کوف جیسی منی گن لٹک رہی تھی جسے میں نے رات کو ظاہر خان کے کاندھے پر لٹکا دیکھا تھا۔

وقفے وقفے سے میں نے کئی مرتبہ امیر نواز کو فون کیا۔ سردار بخت خان کا نمبر بھی ٹرائی کیا مگر کام نہیں بنا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ نور پور تک سیلولر سسٹم پھیل چکا ہوتا تو مجھے وہاں کے حالات سے آگہی حاصل کرنے میں اتنی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

دو بجے شبو نے میرے آگے پُرتکلف کھانا چُن دیا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا، چائے پی اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ دو تین گھنٹوں کی نیند، نیم گرم پانی کے غسل اور محفوظ ہونے کے احساس نے

باعث میری خود اعتمادی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جلا بخش دی تھی۔ مجھے اَب میر وشاہ کی آمد یا میڈم شکیلہ کے طلب کیے جانے کا انتظار تھا اور اِسی انتظار میں شام ڈھل گئی۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شبو نے پھر پُر تکلف کھانا میرے سامنے سجا دیا۔ میں نے اُس سے میر وشاہ کے بارے میں پوچھا تو اُس نے مجھے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ میر وشاہ آیا تھا اور میڈم سے ملنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اُس نے مجھ سے ملنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ جدا ہونے تک وہ مجھ پر بے حد مہربان تھا۔ میڈم سے ملاقات ہوتے ہی میں نہ جانے کیوں اُس کے لیے بالکل غیر اہم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ نکتہ میری فہم سے بالاتر تھا۔ میں نے شبو سے اُس کا فون نمبر مانگا۔ اُسے زبانی یاد تھا۔ اُس نے ایک پرچی پر لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ بولا، ''کھانے کے بعد آپ اُس سے رابطہ کر سکتے ہیں۔''

میں نے اُس کا موبائل فون نمبر ملایا تو اُس کی تیز آواز کانوں میں پڑی، ''لاڈے خان! ماڑے کو یاد کرے ہو۔ ہے نا!''

میں نے گِلہ کیا، ''تم مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے، کیوں؟''

''ماڑا دھندا ہی بڑا غلط ہووے ہے۔ پاؤں ملتان میں تو کھوپڑی لاہور میں ہووے..... پَر تم فکرمند کیوں ہووت ہے؟''

''میں اکیلا ہوں۔ بور ہو رہا ہوں۔ تم وقت نکال کر یہاں آ جاؤ، کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''ماڑے کو مت چھیڑو۔ وقت نکال کر ملنے کے لیے آوت ہوں۔ اگر کسی چیج (چیز) کی جرورت ہو تو شبو میاں سے کہوے ہے۔ وہ اللہ دین کے جن کی طرح فٹافٹ حاضر کر دیوت ہے۔ لاڈے خان! موج کرے۔ میڈم جنّے میں چھپے کانٹے جبان (زبان) سے چن لیوت ہے۔ ہاں.....''

اُس کی نان اسٹاپ زبان چل پڑی تھی۔ میں نے ملنے کی استدعا کو دہرانے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک اُمید بندھ کر ٹوٹ چلی تھی۔ اگر کھالے نے امیر نواز سے رابطہ کیا تو اُسے میرا نمبر مل جائے گا اور وہ یقیناً مجھے فون کرے گا۔ ساتھ ہی یاد آ گیا کہ امیر نواز کا فون ہی اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ کھالا اُس سے رابطہ کیسے کر سکتا تھا؟

گیسٹ ہاؤس کے لان میں کھڑے ہو کر کوٹھی کو دیکھنے سے اُس کے حجم اور وسعت کا

قدرے درست اندازہ ہوتا تھا۔ نور پور میں خانزادوں کی حویلیوں کو دیکھ رکھا تھا۔ ذہن نے تصور باندھ رکھا تھا کہ اُن سے بڑی اور لگژری کوٹھیاں کم از کم اِس ملک میں نہیں ہیں مگر جب میڈم کی اِس پراسرار کوٹھی کو دیکھا تو حیرت دوچند ہوگئی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق تین فلورز پر مشتمل اِس عمارت میں کم از کم چالیس کمرے تھے۔ گراؤنڈ فلور، جس میں گیسٹ ہاؤس واقع تھا، کسی بیابان کی طرح پُرسکون تھا جبکہ فرسٹ فلور پر نقل وحرکت اور ملی جلی آوازوں کا شور کبھی کبھار سنائی دیتا تھا۔ شبو، ظاہر خان، زوار اور دو مسکین طبع ملازموں کو میں نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ اُنہیں محض گیسٹ ہاؤس تک محدود رہنے کی ہدایت ملی ہوئی تھی۔ شبو اور ظاہر خان بے تکلفی کے ابتدائی مراحل عبور کر رہے تھے جبکہ باقیوں نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

رات میرے بستر پر کانٹے چنتے ہوئے گزرتی جا رہی تھی مگر میڈم کی طرف سے بلاوا نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے دِلاسہ دینے کے بعد فراموش کر بیٹھی تھی۔ گیارہ کے قریب میں کروٹیں بدل بدل کر اکتا گیا اور سست روی سے چلتا ہوا لان میں آ گیا۔ تراشیدہ مخملیں گھاس اَوس زدہ ہو کر سرد رات کی نصف خنکی اپنے اندر سمیٹے میری طرح جاگ رہی تھی۔ میں نے جوتے اُتار دیے اور لان کے آخری سرے تک ٹہلتا چلا گیا۔ جلتے ہوئے بدن کے ساتھ برف پر چلنا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

پہلے سا خوف میرے ذہن پر سوار نہیں تھا۔ چونکہ حیات خان کے دارے پر بکثرت آنے جانے کی بدولت تھانے کچہری کے معاملات سے کافی حد تک آگاہ تھا۔ لوگ زمین، قبضے اور چھوٹے موٹے جرائم کے سلسلے میں حیات خان سے قانونی اور پنچائتی معاونت لینے کے لیے آتے رہتے تھے۔ اُن کے حل طلب مسائل اور خان کے مشورے سنتا سمجھتا رہتا تھا۔ معمولی نوعیت کے قانونی معاملے گھروں کو چاٹ جاتے تھے۔ میں تو قتل کی لرزہ خیز اور سرِعام وقوع پذیر ہونے والی واردات میں ملوث ہوا تھا۔ بجا طور پر اگر امیر شاہ اور میڈم میری مدد نہ کرتے تو شاید میری بقیہ زندگی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرتی۔ چاچا چراغ میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ میرے کیس کی پیروی کرتے، کوئی اچھا وکیل کرتے یا بیل (ضمانت) کی کامیاب کوشش کرتے۔ صحیح معنوں میں مجھے اچانک اور غیر متوقع میسر آنے والی کمک ناقابلِ یقین امداد تھی۔

رات ڈٹ کر سویا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میر و شاہ آن پہنچا۔ وہ خاصا تر و تازہ

دکھائی دیتا تھا۔ ہاتھ ملا کر صوفے پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ بولا، ''کیوں رے غنچے! کوئی پرابلم تو نہ ہووت ہے اِدھر؟''

میں نے کہا، ''نہیں۔ البتہ بہت زیادہ بوریت محسوس کرتا رہا ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو شاید وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلتا۔ کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''کہا تو تھا کہ ماڑا کام ہی ایسا ہے۔ نہ جانے کا پتہ چلے نہ آنے کا۔ اَبھی میڈم سے مل کر آوے ہوں۔''

''اُس نے کچھ کہا؟''

''ارے صبر تو کریو دو چار گھڑی لاڈے میاں! جرا دَم تو لینے دیوت ہے کہ نہیں.....'' وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا، ''میرے مافق میڈم بھی لٹو ہو گئی ہے تیرے پر..... ماڑے کو آکھت ہے کہ لاڈا تو ایک دم نواں نکور ہووے ہے، معشوق کے مافق! تیری چاندی ہو گئی ہے غنچے، چاندی.....سووے تو ہیروں کی سیج پر، جاگے تو سونے کی چپل پہنے، چلے تو نوٹوں کی گڈیوں پر نخرے سے پاؤں دھرے.....اڑے کیا کہنے میڈم کے معشوق کے!''

میں نے اُسے بغور دیکھا۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر ستائش کے جذبات کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا، ''میں یہاں سے جانے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''جانے کو چلا ہی جاوت ہے پَر کچھ باتیں کان کھول کے سنتا جاوے ہے تُو!'' وہ ایک دَم سنجیدہ ہو گیا اور مجھے اپنے مخصوص انداز میں 'راز' کی باتیں بتانے لگا۔

اُس کی گھنٹہ بھر کے دورانیے پر مشتمل مخصوص انداز کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ میڈم کی آنکھوں نے مجھے قابلِ اعتبار قرار دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہاں ملازمت دینے کی خواہاں تھی۔ میرو شاہ نے تنخواہ کی جو رقم بتائی، وہ اتنی زیادہ تھی کہ مجھے کافی دیر یقین نہیں آیا۔ جب اُس نے اپنی تنخواہ کے بارے میں بتایا تو میری آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ مجھے ڈاکٹر شاہ جی تنخواہ بہت زیادہ محسوس ہوا کرتی تھی۔ میڈم شکیلہ نے اُس سے دگنی تنخواہ کی آفر کی تھی۔ میرو شاہ نے میرے استفسار پر بتایا کہ میڈم نے ابھی کام کی نوعیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، صرف اتنا ہی کہا تھا کہ میں نور پور چلا جاؤں اور ہر دو جے چوتھے روز میڈم سے فون پر رابطہ کر لیا کروں۔ وہ مجھے ڈکٹیشن دے گی۔ جب میں نور پور سے ملتان آنے پر آمادہ ہو جاؤں گا، میری پکی نوکری کر

دی جائے گی۔

میر وشاہ نے ایک پرچی پر میڈم کا فون نمبر لکھ کر دیا اور کہا، ''غنچے! اپنے گاؤں میں جا کر جندگی (زندگی) کے مجے (مزے) لوٹو۔ گھر جا کر ماڑے کو دعائیں دیوے گا ناں؟ جرور (ضرور) دیوے گا ماڑ الاڈا.....''

اُس نے اپنی بغلی جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میری جھولی میں ڈال دی، ''موجاں کرنے کو روکڑا ہاتھ میں ہونا جروری ہووے ہے لاڈے میاں! یہ میڈم کا تحفہ ہووے۔ چل، اَب میر وشاہ تیرے کو لاری اڈے پر چھوڑ آوے۔''

میں عجیب گومگو کی کیفیت میں ڈوبا، نوٹوں کی گڈی کو ہاتھوں میں سختی سے تھامے بیٹھا میر و شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ بجا طور پر اتنی بڑی رقم پہلی مرتبہ میرے ہاتھوں میں آئی تھی۔ میں نے تھوک نگلا، ''یہ تو بہت زیادہ ہے۔ مجھے تو بس کرایہ.....''

وہ صوفے سے اُٹھ کر میرے قریب آ گیا، اپنی عادت کے مطابق میرے کندھے پر دھپ مار کر بولا، ''اڑے کیا جیادہ (زیادہ) ہووے..... یہ سسری کے نوٹ جیادہ ہیں؟ اڑے غنچے! تیرے پہ ماڑی میڈم عاشق ہو جاوت ہے۔ یہ دس ہجار (ہزار) ہووت، وہ لاکھوں تیری جوانی پر وار دیوے اور پوچھے بھی نہیں..... ہاں تو!''

اُس نے میری خالی الذہنی کی کیفیت کو تاڑ لیا اور ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی اور فون نمبر والی پرچی کھینچ کر میری بغلی جیب میں ڈال دیں۔ مجھے چونکہ نور پور جانے کی اجازت مل چکی تھی، اِس لیے میں یہاں سے نکلنے کے لیے خاصا بے تاب تھا۔ میڈم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میر وشاہ نے بتایا کہ میڈم بہت زیادہ مصروف ہونے کے سبب ملاقات نہیں کرے گی۔ اَب جو بھی بات ہو گی، ٹیلی فون پر ہو گی۔

ہم دونوں گیسٹ روم سے نکل کر پارکنگ میں آ گئے۔ ایک سفید رنگ کی ہنڈا اِکارڈ ہمارے لیے تیار تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی پارکنگ سے نکال لی۔ دس منٹ کے بعد میں لاری اڈے میں ڈیرہ اسٹینڈ کے عین سامنے سڑک پر کھڑا تھا جبکہ میر وشاہ اپنے مخصوص انداز میں گل کاریاں کرتا ہوا، ہاتھ لہرا کر خدا حافظ کہتا ہوا اِکارڈ میں بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

میں نے غیر محسوس انداز میں اپنی بغلی جیب کو ٹٹولا۔ سو سو کے سرخ نوٹوں کی گڈی کی

موجودگی کے احساس نے باور کرادیا کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ جو کچھ دیکھا تھا، سچ دیکھا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈیرہ جانے والی بس اسٹینڈ سے نکلتی دکھائی دی اور میں لپک کر اُس میں سوار ہوگیا۔

میں ایک ڈیڑھ بجے چوک قریشی پہنچ گیا۔ شیدو نے مجھے کہیں بس سے اُترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ بھاگ کر میرے پاس آیا، سلام لے کر جھٹ سے پوچھنے لگا، ''اُستاد کہاں ہے؟''

اُس کا اشارہ کھالے کی طرف تھا۔ میں نے کہا، ''کیا وہ اَبھی تک نہیں پہنچا؟''

''نہیں تو! وہ تمہارے ساتھ گیا تھا، اکیلا کیسے آجاتا؟'' شیدو متفکر ہوگیا، ''سارے گھر والے بڑے پریشان ہیں، تمہارے گھر والے بھی بار بار پوچھنے آتے ہیں اُستاد!''

ہم دونوں چلتے ہوئے ویگن کے قریب آگئے۔ ڈرائیور عزت خان ہوٹل کے ہماچے پر براجمان تھا۔ ابھی ویگن کو نکلنے میں دیر تھی۔

موسم بہت اچھا تھا۔ بادل جھوم جھوم کر اٹکھیلیاں کررہے تھے اور کسی دَم بھی بارش ہونے والی تھی۔ جب میں نور پور میں پہنچا تو بوندا باندی شروع ہوچکی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنی گلی میں داخل ہوا اور میں نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اطراف کا احتیاط بھری نظروں سے جائزہ لے لیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق پروین اور چاچی نے مجھے دیکھتے ہی سخت باز پرس شروع کردی۔ اُن کے لہجوں میں جہاں برہمی عیاں تھی وہاں گہرے تفکر اور اندیشے بھی سرسرا رہے تھے۔ اُن کی بلند آوازیں سن کر گھر کے دوسرے افراد بھی وہاں آگئے اور ہر ایک نے میری 'آؤ بھگت' میں مقدور بھر حصہ ڈالا۔

شانو میرے لیے چائے کا بڑا پیالہ تیار کرلائی۔ میں نے ماقبل شیدو اور عزت خان اور اَب گھر والوں کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ نور پور میں میری اور کھالے کی واردات کی خبر نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی کوئی ہمارے تعاقب میں یہاں تک آیا تھا۔ میں نے اپنے ٹرنک میں میڈم کی دی ہوئی نوٹوں کی گڈی چھپا کر محفوظ کردی تھی کیونکہ اتنی بڑی رقم کی موجودگی گھر میں طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی تھی۔

کچھ دیر ستانے کے بعد بھرپور انداز میں غسل لیا اور کھیتوں میں چلا گیا۔ معمول کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا اور شام اپنی سرمئی چادر نور پور پر پھیلائے خندہ زَن تھی جب میں ویگن اسٹینڈ پر پہنچا۔ کرکٹ کے گراؤنڈ میں لڑکوں کی ایک ٹولی بڑا سا دائرہ بنا کر بیٹھی دکھائی دی۔ مراد

بخش دیوانے کی موجودگی کا شبہ ہوا۔ قریب پہنچ کر میں نے اُسے لڑکوں پر اپنے علم کی دھاک بٹھاتے سنا۔ وہ تھوڑا کھسک کر میرے بیٹھنے کی جگہ بناتے ہوئے بولا، ''ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اِس وقت سرائیکی دوہڑا عالمی ادب میں اپنی انفرادی جگہ بنا چکا ہے۔''

ایک لڑکے نے جھٹ سے پوچھا، ''کیا انگریزوں کو سرائیکی کی سمجھ آتی ہے؟''

وہ تأسف بھرے انداز میں بولا، ''یار ایک تو میں تم جیسے جاہلوں سے بڑا تنگ ہوں۔ او میرے بھائی! سرائیکی دوہڑوں کا ہر زبان میں ترجمہ ہوتا ہے، انگریزی میں بھی۔''

میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا، ''اور اپنے دیوانے کے دوہڑوں نے تو یورپ کی لڑکیوں کو حواس باختہ کر کے رکھ دیا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں مراد بخش دیوانے کے مجسمے نصب کیے جا رہے ہیں۔''

سبھی لڑکوں کے چہرے مصنوعی استعجاب سے دمک اُٹھے۔ دیوانے کا چہرہ فرطِ غیظ سے دہک اُٹھا۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اَبے الو کے پٹھے! میں تمہاری چالاکی سمجھتا ہوں۔

میں نے اُس کی پھڑکتی ہوئی رگوں کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اُسے دوہڑا سنانے کی فرمائش کی۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی اور لبوں سے سینکڑوں مرتبہ کے جھڑے ہوئے 'پھول' تواتر سے جھڑنے لگے۔ میں نے کچھ دیر مراد بخش دیوانے کے چکنے چپڑے دوہڑے سنے پھر اُس سے جان چھڑا کر کھالے کی خبر لینے کے لیے ویگن سٹینڈ کا رُخ کیا۔ ویگن آخری پھیرا لے آئی تھی مگر کھالا نہیں آیا تھا۔ چونکہ دیہاڑی دار ڈرائیور عزت خان نے واپس چوک قریشی جانا تھا، اِس لیے وہ خالی ویگن لے کر چلا گیا اور میں دل ہی دل میں کھالے کی پریشانی ذہنی بساط پر سمیٹے نڈھال سا ہو گیا۔ وہ نہ جانے اِس وقت کس حال میں تھا۔ آج ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کی سکت نہیں تھی مگر علی الصبح چہل قدمی کے دوران میں ڈاکٹر شاہ جی کے نقشِ پا پر چل رہا تھا۔

میں نے چمن زار جھیل پر ہونے والے بھیانک واقعے کا تذکرہ گول کر لیا اور اُس کے تقاضے پر عاشی کے بارے میں حاصل کردہ معلوماتی چارٹ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا، ''تمہیں ایک دن مظفر گڑھ میں جا کر گزارنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ عشرت پڑھنے جاتی ہے، کیا پڑھتی ہے اور کسے پڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔''

میں نے کہا، ''اگلے ہفتے جاؤں گا۔''

''اِس ہفتے کیوں نہیں؟''

''بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات جیت شاہ کے مزار پر مصروف رہوں گا۔''

''نہیں۔ تم مزار کے نزدیک بھی نہیں جاؤ گے۔ بخت خان جو کھیل کھیلتا ہے، کھیلنے دو اور دُور بیٹھ کر تماشا دیکھو۔''

''اگر اُس نے مجھے بلا لیا تو؟''

''کوئی سا بہانہ کر دینا۔ کہہ دینا کہ بخار نے آن دبوچا ہے۔ میرے پاس آ کر سو جانا اور ظاہر کر دینا کہ تم نور پور سے باہر کسی ضروری کام کے سلسلے میں جا رہے ہو۔'' اُس نے اٹل لہجے میں کہا۔

''مگر کیوں؟'' میں سخت متعجب ہوا۔

''تم ابھی نادان ہو، ضائع ہو جاؤ گے۔''

''شاہ جی! میں بچہ تو نہیں ہوں۔''

''مگر بڑے بھی نہیں ہو برخوردار! کسی زعم میں مت رہنا۔ بخت خان بھی آج نہیں تو کل پیچھے ہٹ جائے گا۔ میرا جہاں تک خیال ہے، دل جیت شاہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کا ساتھ وریام خان دے رہا ہے جبکہ حیدر خان پشت پناہی کر رہا ہے۔ یقینی بات ہے کہ بڑے خان کی مرضی اور شہہ کے بغیر سائیں جیت شاہ کوئی بھی ناجائز کام نہیں کر سکتا۔ جب بخت خان پر اپنے بھائی کے کرتوت عیاں ہوں گے، وہ مجبوراً پیچھے ہٹ جائے گا اور تب تک تم خان اور دل جیت شاہ کی نظروں میں کانٹے کی طرح چبھ چکے ہو گے۔ وہ تمہیں توڑ دیں گے، جلا دیں گے یا پرے پھینک دیں گے۔''

خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے اندازے کبھی غلط ثابت نہیں ہوتے تھے۔ اگر ایسا تھا تو بہت ہی بُرا تھا۔ واضح تھا کہ وریام خان کے مقابلے میں سردار بخت خان زیادہ دیر سینہ سپر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہار جاتا، پیچھے ہٹ جاتا تو میرا کیا ہوتا؟ وہی ہوتا جو ڈاکٹر شاہ جی مجھ پر قبل از وقت آشکار کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا، ''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میں یہ نہیں کہتا کہ تم بالکل غیر متعلق ہو جاؤ، نہیں..... بخت خان سے مفاد حاصل کرنے

کے لیے اُس کی ہاں میں اپنی ہاں ملاتے رہو، زبانی کلامی اپنی وفاداریاں گنگناتے رہو مگر جہاں بھی اوکھلی دکھائی دے، موصلوں کے ڈر سے اپنا سر پیچھے ہٹالینا۔'' اُس نے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا، ''اب چھوڑو ان باتوں کو، نرم سی مسواک بنالاؤ..... تم کام کم اور باتیں زیادہ کرنے کے عادی ہوتے جارہے ہو اور یہ اچھی عادت نہیں ہے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ایک دیسی کیکر کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کی باتیں میرے دل کو لگی تھیں۔ ویسے بھی میں اُس کے اخلاص پر شک کرنے کی کوئی توجیہہ نہیں رکھتا تھا۔

میرا دن واہموں کی زد میں گزر رہا تھا۔ سہ پہر تک حیلے بہانے سے متعدد بار ویگن اسٹینڈ کا چکر لگایا۔ بے ساختہ میری نگاہیں نوری چوک کو جانے والی سڑک کا بھی احاطہ کرتی رہیں۔ میں کھالے کا منتظر تھا مگر اُس نے ابھی تک کسی طرف سے سر نہیں نکالا تھا۔ میری عافیت اُس کی سلامتی سے مشروط تھی۔ اگر وہ ملتان میں پولیس والوں کے ہتھے لگ جاتا تو میری بھی خیر نہیں تھی۔ ایک پُرسہ دل کو ڈھارس دیتا تھا کہ اگر کھالا پکڑا گیا تو وہ میرا نام نہیں لے گا۔ میں اُس کی سرشت سے بخوبی آگاہ تھا کہ وہ مرتو سکتا تھا مگر پولیس کے سامنے زبان کھول کر مجھے مصیبت میں مبتلا نہیں کرسکتا تھا۔ خود کو مصروف کرنے کے لیے میں ڈھلتی سہ پہر میں تیار ہوکر بخت خان کی حویلی پہنچ گیا۔ خان موجود نہیں تھا۔ نوکرانی نے مجھے سابق معمول کے مطابق ملکہ کے کمرے میں پہنچادیا۔ صحن میں چاچی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے اُس کی غیر موجودگی کو اہمیت نہیں دی کہ وہ کہیں گئی ہوئی ہوگی یا کسی کمرے میں محوِ استراحت ہوگی۔

ملکہ کمرے کے انتہائی کونے میں رکھے ہوئے جدید طرز کے سنگھار میز کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی پشت میری جانب تھی۔ کمر کو اُس کے چمک دار بالوں نے چھپالیا تھا۔ وہ بڑی نزاکت کے ساتھ ہیئر برش کو پیشانی پر جھولنے والے بالوں میں پھیر رہی تھی۔ ایسے میں اُس کی نگاہ آئینے میں مجھ پر پڑی۔ چونک کر پلٹی اور بیڈ پر سے لٹکتے ہوئے دوپٹے کو اُٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے سلام گو ہوئی۔ میں بیڈ کے بڑے چوبی تختے سے لگ کر کھڑا وفورِ شوق سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جوانی کی طرف مائل لڑکپن کی آخری سرحد پر پورے طمطراق سے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا رنگ گورا نہیں تھا مگر سرخی آمیز تھا۔ گال تمتماتے تھے۔ آنکھیں بڑی، پلکیں بھری بھری اور ہونٹ نسبتاً موٹے اور گداز تھے۔ وہ گھر والوں کی نظر میں بچی تھی، دیکھنے والے کی نگاہ بچی نہیں رہی تھی۔ کتابیں کھول کر قالین پر بیٹھ گئی اور اُس نے بیڈ کے میٹرس کے ساتھ کمر ٹکا کر

خود کو آسان کر لیا تھا، ''سر! کون سی کتاب کھولوں؟''

''ریاضی یا انگریزی کی..... یا جس بھی مضمون میں تم خود کو کمزور محسوس کرتی ہو۔''

وہ بولی، ''مجھے ریاضی مشکل لگتی ہے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اُس نے ریاضی کی کتاب کھول کر مجھے تھما دی۔ کاپی اپنے زانوؤں پر رکھ لی۔ مجھے پڑھانے کا تجربہ نہیں تھا۔ جیسے پڑھا تھا، ویسے پڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ سوال حل کرنے میں اُس کی مدد کی۔ ہمارے یہاں ایک المیہ عام رہا ہے کہ سبق سمجھائے نہیں جاتے تھے، رَٹوائے جاتے تھے۔ نتیجتاً جونہی ایک کلاس کے نصاب سے جان چھوٹتی تھی، وہ بھول جاتا تھا۔ مجھے بھی آٹھویں کلاس کی ریاضی کے سوالات بھول گئے تھے۔ میں نے نصابی کتاب میں دی گئی مثالوں پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ میرا طریقہ کارگر رہا اور میں ملکہ کو مشقی سوالات حل کرانے میں کامیاب رہا۔

نصف گھنٹے میں ہی وہ ریاضی سے اکتا گئی۔ بولی، ''میری ہینڈ رائٹنگ بھی خاصی کمزور ہے۔''

میں نے اُسے اُردو کی کتاب اور کاپی لانے کا حکم صادر کیا۔ وہ دونوں چیزیں لے آئی۔ میں نے مارکر اور شیونگ بلیڈ کا تقاضا کر دیا۔ اُس نے نوکرانی کو کریانہ کی دکان پر بھیج کر دونوں چیزیں منگوالیں۔ میں نے ماہرانہ انداز میں مارکر کی گول نب کو 'ٹکا' لگایا، چند الفاظ لکھ کر تجربہ کیا، پھر مارکر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُسے اُردو کی کتاب کا کوئی سبق لکھنے کو دیا۔ اُس نے لکھنا شروع کیا تو بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ اُس کی لکھائی واقعی بہت خراب تھی۔ میں نے اُسے 'الف، ب، ج' لکھ کر دیا۔ اُس نے نقل کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہو کر میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

لکھنا آسان نہیں ہوتا؛ خوب صورت لکھنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ میں نے اُسے اپنے پاس صوفے پر بٹھایا۔ ہاتھ پکڑ کر حروف لکھنے سکھائے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ نسبتاً اچھا لکھنے لگی۔ شوق کے عالم میں اُس نے میرے بیٹھے بیٹھے کئی صفحات بھر دیے۔ میں نے مشق چیک کی اور اُسے ستائش بھری آنکھوں سے دیکھا۔ اُس کی پہلی کوشش نے باور کرا دیا کہ اُس پر محنت نہیں کی گئی تھی۔

وہ بولی، ''مجھے میری مس جیسا لکھ کر دیتی ہیں، میں ویسا لکھ دیتی ہوں۔ پھر وہ خود ہی کہہ

دیتی ہیں کہ 'تمہاری لکھائی اچھی نہیں ہے'..... آپ جیسا لکھ کر دیں گے، میں بالکل ویسا لکھنے کی کوشش کروں گی۔ کہیں یہ نہ ہو کہ مس کی طرح آپ بھی کہہ دیں کہ مجھے لکھنا نہیں آتا۔''

میں مسکرایا، ''نہیں بی بی! اچھی چیز ہر ایک کو اچھی لگتی ہے۔''

وہ جواباً مسکرائی، ''یہ ضروری بھی تو نہیں ہوتا سر! بابا کو کالے تیتر اچھے لگتے ہیں، مجھے اور باجی کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔''

میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ کھالے اُستاد کو مرغوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اصیل مرغ اُس کی کمزوری تھے جبکہ مجھے اُس کا یہ شوق زہر لگتا تھا۔ مرغوں کو دیکھتے ہی میرے ماتھے پر بل پڑ جایا کرتے تھے۔ نور پور کی ڈھلتی شام میں کئی لوگ کالے تیتروں کے خوب صورت، رنگین اور لیس دار پنجرے اُٹھائے کھیتوں کو نکلتے تھے۔ اپنے پالتو پرندوں کو چھوٹے قد والی ملائم گھاس پر جا کر چھوڑتے تھے۔ وہ اٹکھیلیاں کرتے، مٹی میں لوٹ پوٹ ہوتے اور گھاس میں پھدکتے ہوئے ننھے ننھے کیڑوں پتنگوں کو شکار کرتے۔ ایسے وقت میں شائق دیہاتیوں کی شکلیں دیدنی ہوئی کرتی تھیں۔ وارفتگیِ شوق آنکھوں سے اُمڈ اُمڈ آتی اور یوں لگتا جیسے اس گھڑی وہ اپنی زندگی کی سچی خوشیاں کشید کر رہے ہوں۔

میں نے کہا، ''اَب میں چلتا ہوں، کل آؤں گا، تم فارغ وقت میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کرو گی۔ جتنا زیادہ لکھو گی، اتنی روانی اور خوب صورتی سے لکھ پاؤ گی۔''

اُس نے حامی بھری اور بکھری ہوئی کتابوں کو سمیٹنے میں رُجھ گئی۔ ایسے ہی وقت میں کمرے کا دروازہ کھلا اور میں بُری طرح چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اَدھ کھلے دروازے میں صدف بی بی کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ ثبت تھی۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ کمرے میں داخل ہوئی، مجھ پر، پھر ملکہ پر ایک نگاہ ڈال کر آہستہ روی سے چلتی ہوئی میرے مقابل آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بولی، ''شہرے! کیسے ہو؟''

میں نے قدرے مؤدبانہ انداز میں کہا، ''ٹھیک ہوں بی بی جی!''

اُس نے ملکہ کو کن اکھیوں سے دیکھا۔ شاید اُن کے درمیان کچھ پہلے سے طے شدہ تھا، وہ کتابیں وہیں چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

صدف کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ پُر اشتیاق نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ''شہرے! تُوں میکوں بہوں سوھنا لگدیں۔''

(شہرے! تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو)

میں دَم بخود رہ گیا۔ اُس نے کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ میں جواباً کچھ نہ کہہ سکا تو وہ بولی، ''ہُنیں ملکہ آ ویسی؛ میکوں چھیتی نال ڈسا جوتوں میکوں کتھاں کجھ دیر کیتے مل سگدیں جو میں تیڈے نال بہوں ساریاں گلاں کرنیاں ہن؟''

(ابھی ملکہ آ جائے گی۔ تم مجھے جلدی سے بتا دو کہ تم مجھے کہاں مل سکتے ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ بہت سی باتیں کرنی ہیں۔)

وہ خوب صورت تھی، اُس کی آواز اور لہجہ اُس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت تھا مگر اُس کے لبوں سے نکلنے والی باتیں بہت خطرناک تھیں۔ میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں بی بی جی! بڑے خان کو پتہ چلے گا تو وہ میری کھال کھینچ لے گا۔''

''بابا کو پتہ نہیں چلے گا۔'' وہ بدستور سرائیکی میں بات کر رہی تھی۔

میں نے کہا، ''آپ وہ باتیں مجھے رقعے میں لکھ کر بھیج دیجئے گا۔''

''نہیں.....'' وہ قطعیت سے بولی، ''تم مجھے جگہ بتاؤ، بابا کی نظر بچا کر وہاں پہنچنا میرا کام ہے۔ ہمارا ملنا بہت ضروری ہے۔''

میری حالت دگرگوں تھی۔ کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ میرے تذبذب کو اپنی سوجھ کے مطابق مفہوم دیتے ہوئے بولی، ''میں کل دَس بجے تمہارے گھر آ جاؤں گی۔ اوکے؟''

میں نے کہا، ''آپ کا وہاں آنا مناسب نہیں ہے بی بی جی!''

''میں جانتی ہوں کہ کیا مناسب ہے اور کیا نہیں ہے۔ صبح کے وقت تمہارے گھر والے ڈیرے پر چلے جاتے ہیں۔ تم کوئی سا بہانہ کر کے گھر میں رہ جانا۔ میں ضرور آؤں گی۔ ٹھیک ہے ناں؟''

میں نے نیم وَا دروازے کی طرف دیکھا۔ اَبھی تک کوئی بھی اِدھر نہیں آیا تھا۔ شاید ملکہ نے راہ مسدود کر رکھی تھی وگرنہ تو مجھے اور صدف کو حویلی میں ایسی تنہائی میسر نہیں آ سکتی تھی۔ میں اُسے گھر میں آنے سے منع کرنا چاہتا تھا مگر اُس کے اَٹل رویے کے سامنے شکست خوردہ ہو گیا اور خاصی کمزور آواز میں بولا، ''اچھا بی بی!''

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ایک پَل کو رُکی، پلٹی، ادا سے زندہ مسکراہٹ اُچھالی اور ہاتھ لہرا کر بولی، ''وَلا ملسوں سوھنا!''

میرا دِل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اُس کا انداز بڑا والہانہ اور عجیب تھا۔ اُس نے چند لمحوں کو ٹھہر کر میرے جواب کا انتظار کیا اور پھر جواب نہ پا کر دروازہ کھول کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اُس کے جانے کے چند ہی پل بعد ملکہ کمرے میں داخل ہوئی اور معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی، ''سر! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

میں اُس کی شرارت بھری آنکھوں میں جھانک کر شرمسار سا ہوا، بولا، ''مجھے تمہارا اِس طرح کمرے سے باہر جانا اچھا نہیں لگا۔''

''باجی صدف کو تو اچھا لگا ہے۔''

''میں اپنی بات کر رہا ہوں۔'' میرے لہجے سے شکوہ عیاں تھا۔

اُس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی شرارت کی پرچھائیں مزید گہری ہوگئی۔ منہ سے کچھ نہ بولی مگر ادا سے سمجھا گئی کہ اُس نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا بلکہ اُس گلنار چہرے پر لکھی ہوئی تحریر کو سچ مانا تھا جو کمرے سے نکلتے ہوئے صدف کے چہرے پر رقم تھا۔

ملکہ کی شوخیاں ایک نئے محاذ کی خبر آرائیاں کرنے لگیں۔ اُس کا سامنا کرنا مشکل محسوس ہوا تو حویلی سے باہر نکل آیا۔ کھالے کا پتہ کیا مگر وہ ہنوز غائب تھا۔ اُس کے گھر والوں کو بھی اَب اُس کا غیر معمولی غیاب پریشان کرنے لگا تھا۔ صدف سے ہونے والی پُر ہیجان ملاقات اگر عام حالات میں ہوئی ہوتی تو میرے رَگ و پے میں سرمستی اور سرشاری بھر جاتی مگر اَب کیفیت خاصی مختلف تھی۔ میرا ذہن پوری طرح کھالے کی ذات میں رُجھا ہوا تھا۔ ڈھارس دینے کو ابھی تک کوئی موہوم سی خبر بھی تو نہیں ملی تھی۔ اسما سے ملاقات ممکن نہیں تھی اور نہ ہی میں اُس سے رابطے کی کوئی سبیل نکال سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میری طرح کھالے کی موجودہ پوزیشن سے لاعلم ہی ہوتی۔

امیر نواز اپنی حویلی کے مین گیٹ پر کھڑا ملا۔ رازداری سے پوچھنے لگا، ''شہرے! سچ سچ بتا، کھالا کہاں ہے؟''

چونکہ ہمارے ساتھ درپیش آنے والے حالات میں اسما کا مرکزی کردار متحرک تھا، اِس لیے میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کیا۔ خدا جانے اُس نے دل سے میری بات تسلیم کر لی یا نہیں، بظاہر مطمئن ہوگیا، بولا، ''اُس بے غیرت کو اپنے گھر والوں کی پریشانی اور بابا کی وگین کی ذرا بھر پروا نہیں ہے۔ بابا خاصا گرم ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے، کہا، ''آج نہیں تو کل آ جائے گا۔ کہہ رہا تھا کہ گاؤں میں رہ رہ کر دِل اوب گیا ہے۔ دو تین دِنوں کی آوارگی سے اُس کی طبیعت کو قرار آ جائے گا۔''

اُس نے بُرا سا منہ بنایا پھر موضوع بدل دیا۔ بولا، ''چاچے بخت خان کے حکم پر میں اور مراد بخش دیوانہ جیت شاہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں لگتا، سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ اُس کی حرکات مشکوک ہیں۔''

''پھر کیا سوچا؟''

''اُس کا محاسبہ ضروری ہے۔'' اُس نے پُر ارادہ لہجے میں کہا، ''دیوانے کا خیال ہے کہ جیت شاہ کے پیچھے چاچے وریام خان اور حیدر خان کا ہاتھ ہے۔''

''اِس شک کی وجہ؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ کہتا ہے کہ اگر جیت شاہ کا دونوں خانوں سے کوئی گہرا تعلق نہ ہوتا تو وہ گاہے بگاہے دونوں حویلیوں کا چکر ضرور لگاتا مگر وہ یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وریام خان اور بابا کو سرے سے جانتا ہی نہیں۔ یہی بات دیوانے کے نزدیک مشکوک ہے۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

وہ بولا، ''ہم نے آج رات کو 'آپریشن نائٹ' قرار دیا ہے۔ دو تین بدھ راتیں تمہاری وجہ سے ضائع ہو چکی ہیں۔ مزید انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تم اَب پوری طرح فٹ ہو؟''

میں نے کہا، ''ہاں! میں تو فٹ ہوں مگر کھالا.....''

''تب تک وہ آ جائے گا ناں! فرض کیا، نہیں آتا، تب بھی ہم اپنا کام کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں؟''

''کیا تیاری مکمل ہے؟''

''ہاں تو..... دیوانے نے اُنہیں گھیرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔'' امیر نواز نے کہا، ''چاچا بخت خان اور ڈاکٹر شاہ جی بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔'' میں نے حامی بھر لی۔ ڈاکٹر شاہ جی کی اِس آپریشن میں شرکت میرے لیے باعثِ استعجاب تھی کیونکہ اُس نے مجھے دُور رہنے کا مشورہ دیا تھا اور خود آگ کی اِن نادیدہ لپٹوں کو ہاتھ میں لینے پر تیار تھا۔

گھر پہنچا تو سبھی کو کھانے میں مشغول پایا۔ حسبِ معمول پروین نے میرے سامنے کھانا

چُن دیا۔ اُسے میں نے نسبتاً مضمحل اور قدرے نڈھال پایا۔ اُس کا رویہ بھی بدلا بدلا سا تھا۔ مجھے گمان گزرا کہ وہ میرے بے طرح کے غیاب کے باعث مجھ سے خفا تھی۔ میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اُس کے بے تحاشا رونے کا خدشہ تھا۔ رات گئے تک میں بخت خان اور امیر نواز کی طرف سے بلاوے کا انتظار کرتا رہا مگر مایوس رہا۔ اُنہوں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا تھا یا شاید اُنہیں کسی ذریعے سے خبر ہوگئی تھی کہ آج اُن کی مچان بے میلِ مرام ثابت ہونے والی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ اُنہوں نے اپنے پروگرام کے تغیر کے بارے میں مجھے یکسر اندھیرے میں رکھا تھا۔ مقررہ وقت کے ایک گھنٹہ بعد تک میں نے جاگ کر انتظار کیا، پھر گہری نیند سو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ نیند میں خواب ملتے ہیں، حقیقتیں روٹھنے لگتی ہیں۔ وہ رات بھی ایسی ہی خواب گیں تھی جس کا نشہ دروازے پر ہونے والی تیز اور سماعت شکن دستک پر ٹوٹ گیا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھا۔ قدرے سراسیمہ نگاہوں سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ میرے گھر میں اتنی زوردار دستک دینے کا رواج نہیں تھا۔ میں اَبھی بستر سے اُٹھ ہی رہا تھا کہ پھر دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ ساتھ ہی چاچی کی چیختی آواز کانوں میں پڑی، ''اوئے بد بخت! اُٹھ ونج..... ڈیکھ تیڈے لیکھ کتھ ونج ستے ڈِسن!''

(بد بخت! بیدار ہو جا اور دیکھ کہ تیرے نصیب سو گئے ہیں)

اس کے ساتھ ہی چاچی کی چیخیں بتدریج بلند ہونے لگیں۔ دروازہ کھولا تو وہ گرنے کے سے انداز میں اندر داخل ہوئی اور میرے سینے پر دو ہتھڑ مار کر بین کرنے کے سے انداز میں چلانے لگی۔ میں ہونقوں کی طرح ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اُس کے منہ سے ابلنے والے ہولناک الفاظ کی سرے سے سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر یہ سمجھائی دے رہا تھا کہ میری خوابیدگی کے دوران ایسا کوئی واقعہ رونما پذیر ہو گیا تھا، جسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے چاچی کو بانہوں میں بھر لیا، اُس کے کندھوں کے اوپر سے کھلے صحن میں دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آیا۔ سورج نکلنے کو تھا۔ اِس وقت تو گھر میں ریل پیل ہوا کرتی تھی۔

''چاچی! ہوش کر.....''

''اب ہوش کرنے کا کیا فائدہ..... عزت کی چادر تار تار ہو گئی ہے پتر!''

اُس نے پھر میرے سینے پر پوری قوت سے دو ہتھڑ مارا۔ میں لڑکھڑا کر پسپا ہوا، پھر خود کو

سنبھال کر چاچی کو سنبھالنے لگا جو دم بہ دم بکھرتی جاتی تھی۔ میں نے اُسے چارپائی پر دھکیلا۔ دِلاسا دینے کی ناکام کوشش کی پھر قدرے غصے سے پوچھا، ''کچھ بتاؤ بھی سہی چاچی! میرا دماغ گھومنے لگا ہے۔''

چاچی نے عجیب نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھٹی پھٹی آنکھیں لیے کمر کے بل چارپائی پر گر گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چاچی کی بے ہوشی نے سمجھا دیا کہ گھر میں خیر نہیں ہے۔ میں اُسے وہیں چھوڑ کر دوڑتے قدموں سے صحن میں آیا۔ اردگرد دیکھا۔ یوں لگا جیسے گھر میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میں نے پروین کو آوازیں دیں، چاچے چراغ کو پکارا مگر جواب ندارد..... میں پانی کا کٹورا اُٹھائے واپس کمرے میں آیا۔ چاچی کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ کسمسا کر اُٹھ بیٹھی۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر چیخ مار کر مجھ سے دیوانوں کی طرح لپٹ گئی۔

❖❖○❖❖

میرے شدید اصرار پر اُس کے لبوں سے بدقت برآمد ہوا، ''شہرے پتر! ہم برباد ہو گئے، ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ پینو، اوئے تیری لاڈلی بہن، پروین، گھر سے بھاگ گئی ہے..... اپنا اور ہمارا منہ کالا کر گئی ہے..... ہائے وے میرے ربّا! یہ دن دکھانے سے پہلے مجھے مار کیوں نہ دیا تو نے؟''

یوں لگا جیسے چاچی نے یک بارگی پگھلا ہوا گرم سیسہ میرے کانوں میں ڈال دیا تھا۔ دماغ پھٹنے کو آ گیا۔ آنکھیں بے یقینی کے مارے پھیل سی گئیں اور کمرے میں موجود ہر چیز گھومنے لگی۔ میں نے اپنی پوری قوت سے چاچی کو جھنجوڑ ڈالا، ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو چاچی! جانتی ہو..... نہیں..... میری پروین ایسا نہیں کر سکتی..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔''

چاچی کی حالت پھر غیر ہو گئی۔ اَٹک اَٹک کر بولی، ''نہیں..... اللہ سوہنا جانتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ ہائے میری بچی! یہ تم نے کیا کر دیا؟''

بجا طور پر اُس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ میں نے چاچے چراغ اور دوسرے گھر والوں کے بارے میں دریافت کیا تو اُس نے سر کو پوری قوت سے دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے کہا، ''مجھے نہیں پتا..... کون کدھر گیا ہے، میں نہیں جانتی۔ مجھے تو یہ پتا ہے کہ میرا اِس جہان سے دانہ پانی اُٹھ گیا ہے.....''

میں نے اُسے چارپائی پر لٹایا اور کمرے سے نکل آیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر میں نے پوری

قوت سے چلا کر پروین کو پکارا مگر چاچی نے درست کہا تھا۔ وہ میری آواز کی پہنچ سے کہیں دور جا چکی تھی۔ دوڑتے ہوئے گھر سے باہر نکلا۔ کہاں جانا تھا، کہاں جا رہا تھا، کچھ خبر نہیں تھی۔ جب میں کھالے کے باپ کی دکان پر پہنچا تو چاچا چراغ کو دیکھا جو ہسپتال کی جانب سے تیز تیز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر اُس کے قریب پہنچا، پوچھا، ''چاچا! یہ چاچی کیا کہہ رہی ہے؟''

تبھی مجھے چاچا چراغ کی بوڑھی آنکھوں کی غیر معمولی سرخی اور اشکوں سے تر سفید داڑھی وہ سب کچھ بتلا گئی جو شاید وہ زبان سے کبھی نہ کہہ پاتا۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ کئی ساعتیں عجیب سی خالی الذہنی کی کیفیت میں گزر گئیں۔ چاچے نے میرے کندھوں پر اپنا استخوانی ہاتھ رکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا، ''پتر! ہوش کر..... یہ وقت ہوش کرنے کا ہے۔''

میں نے گردن اُٹھائی، چاچے کا دلاسہ دیتا ہاتھ دیکھا جو واضح طور پر کپکپا رہا تھا، پھر مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے چہار سو نظر ڈالی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھرے بازار میں ننگا ہو گیا تھا۔ ایک خیال اچانک کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور میں چاچے کی روکتی آوازوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ڈیرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اپنے بھانے پر پہنچنے تک میں بُری طرح ہانپنے لگا تھا مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ میں بیٹھے ہوئے مویشیوں کو پھلانگتے ہوئے ڈیرے میں داخل ہوا۔ ایک ایک کمرہ دیکھا، اپنی فصلوں کو بہ نظرِ غور دیکھا مگر مجھے کہیں بھی پروین دکھائی نہیں دی۔ میری اُمید دَم توڑ گئی تو میں چارہ کاٹنے والی مشین کا بڑا وہیل دونوں ہاتھوں سے تھام کر جھک گیا۔ اپنے ہاتھوں کی پشت پر سر ٹکا کر بلند آواز میں رونے لگا۔ انہونی ہو گئی تھی۔ نور پور میں کسی بھی وقت خوف ناک آواز والا دھماکہ ہونے والا تھا۔ پروین نے وہ کیا تھا جو آج تک نور پور میں کسی نے نہیں کیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی۔ میرے ہاتھ بھیگ گئے۔ آنکھیں چبھنے لگیں مگر دل میں لگی ہوئی آگ کسی طور بجھتی دکھائی نہیں دی۔ جب میں نے ڈیرے سے نکل کر نور پور کو جانے والی پگ ڈنڈی پر قدم رکھا، بے اختیار میرے حلق سے چیخ برآمد ہو گئی، ''نہیں..... پروین ایسا نہیں کر سکتی..... وہ بھاگی نہیں، اُسے کسی نے اغوا کیا ہے..... وہ مر تو سکتی ہے مگر اپنے بھائی کو جیتے جی مار نہیں سکتی..... نہیں..... وہ ایسا نہیں کر سکتی!''

مجھے بخوبی یاد ہے کہ افسر علی اور بدر دین، جو اپنی زمینوں میں کام کر رہے تھے، کے مجھ تک

پہنچنے تک میں اپنے حواس میں تھا۔ پھر یاد نہیں، کیا ہوا، میں نے کیا کہا اور اُنہوں نے مجھے کس طرح سنبھالا دیا..... جب مجھے اپنی دہلیز دکھائی دی تو میں نے ایک جھٹکے سے اپنی بانہیں اُن کی مضبوط گرفت سے چھڑا لیں۔ میرے دروازے کے سامنے گلی میں جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مختلف انواع کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اِن دل گیر آوازوں کے پسِ منظر میں اپنے گھر کی فضا سے اُٹھنے والے بین سینے میں خنجروں کی طرح پیوست ہو رہے تھے۔ کسی نے کہا، ''وہ آ گیا ہے شہرا! اِس سے پوچھو..... شاید اِسے کچھ پتہ ہو.....''

وہ سبھی میرے اردگرد کھڑے ہو کر مجھ سے پروین کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں باری باری سبھی چہروں کو دیکھ رہا تھا مگر لب بستہ تھا کیونکہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے میں دیوانہ بھیڑ کو چیرتا ہوا مجھ تک پہنچا اور میرے بے جان وجود کو دھکیلتا ہوا گھر میں لے آیا۔ اندرونِ خانہ کا ماحول باہر سے کسی طور پر بھی کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ نور پور کی کم و بیش تمام عورتیں وہاں موجود تھیں جو ایک ہی وقت میں چاچی اور میری چچازاد بہنوں کو دِلاسہ دے رہی تھیں اور اپنے اپنے انداز میں اِس انہونے واقعے پر رائے زنی بھی کر رہی تھیں۔ دیوانہ مجھے گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لایا، دروازہ بند کر کے مجھے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا، ''شہرے! حوصلہ کر..... مصیبت آنی تھی، سو آ چکی۔ اَب دانش مندی اور دلیری سے اِس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ رونے دھونے اور چیخنے چلانے سے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

میں نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔ اُس قیامت آگیں گھڑی میں میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اپنے کپڑے پھاڑ دوں، ہر دکھائی دینے والی شے کو آگ لگا کر خاکستر کر دوں اور پاگلوں کی طرح دھاڑیں مارتا ہوا نور پور کی گلیوں میں نکل جاؤں۔ دیوانے نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے سہارا دینے کی پوری کوشش کی مگر ہیجان کسی طور کم نہ ہوا تو وہ میرے لیے پانی کا گلاس بھر لایا۔ زبردستی پلاتے ہوئے بولا، ''عقل کے ناخن لو یار! تمہیں کیوں سمجھ نہیں آتی کہ پروین کسی کے ساتھ بھاگنے والی نہیں تھی۔ اُسے کسی بے غیرت انسان نے اغوا کیا ہے یا وہ کسی مصیبت کا شکار ہو گئی ہے۔ تم سبھی لوگ یوں روتے دھوتے رہو گے تو کیا ہوگا؟ اُس کے ملنے کے امکانات سرے سے ختم ہو جائیں گے۔''

اُس کے لہجے میں پریشانی کے ساتھ ساتھ گھمبیرتا کی غیر معمولی آمیزش تھی جس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بولا، ''شہرے! میں بالکل ٹھیک کہتا

ہوں۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اتنا بڑا اور انتہائی قدم اُٹھاتی اور نہ ہی اُس کا کسی کے ساتھ افیئر تھا۔ یہ بات نور پور کا ہر شخص جانتا ہے اور اظہار بھی کرتا ہے۔ اول تو وہ اَب تک زندہ نہیں بچی ہوگی، اگر خدا کی رحمت سے اُس کے بدن میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہوئی بھی تو وہ تم لوگوں کی بے وقوفی اور جہالت کی وجہ سے ختم ہو جائے گی۔''

میں نے بے بسی کے عالم میں کہا، ''تو بتاناں! میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' مجھے اپنی آواز بجا طور پر اجنبی لگی تھی۔

وہ بولا، ''پانی پیو..... اپنے آپ کو یقین دلاؤ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ ہے۔''

میں نے پانی کا ایک اور گلاس حلق میں انڈیلا۔ دیوانے کی باتوں نے مجھے دُکھ کی پہلی نیج سے کھینچ نکالا تھا۔ میں نے اُمید بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا، ''دیوانے! کیا میری پروین مل جائے گی ناں؟''

اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، تھوڑا دبایا اور پُر یقین لہجے میں بولا، ''ہاں شہرے! مجھے اپنے رب سوہنے پر پورا بھروسہ ہے۔ کوئی اُس کا بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔''

وہ کھڑا ہوا، مجھے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے کے دروازے تک گیا اور پوری قوت سے چلایا، ''چاچی! پروین اَبھی مری نہیں ہے مگر مرنے والی ہے۔ رونے دھونے اور بین کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ اِس لیے آپ سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کی بجائے اُسے آس پاس تلاش کریں۔''

دیوانے کی تیز چنگھاڑتی ہوئی آواز نے صحن میں ایک دم سناٹا طاری کر دیا۔ میں اِس دوران اُس کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں بولا، ''ہوسکتا ہے کہ وہ ہر صبح کی طرح کھیتوں کی طرف گئی ہو اور کسی سانپ یا زہریلے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ بعض سانپوں کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا اور بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ آپ سب لوگ اُسے نور پور کے آس پاس تلاش کریں۔ وہ گھر سے بھاگی نہیں ہے؛ اتنی بات کی آپ لوگوں کو سمجھ کیوں نہیں آتی؟''

دیوانے کی باتوں سے عورتوں میں غیر معمولی تحریک پیدا ہوئی۔ سبھی اپنی اپنی چادریں اور دوپٹے سنبھالتی ہوئی وہاں سے کھسکنے لگیں جبکہ میں اور دیوانہ مسجد میں جا کر اعلان کرانے کی غرض سے گھر سے نکل آئے۔ امام مسجد نے فوری طور پر لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا اور نور پور کے سب باسیوں کو حکم دیا کہ وہ سارے کام چھوڑ کر پروین کو تلاش کریں۔ ایسے ہی وقت میں وریام خان

اور حیات خان کا میرے نام بلاوا آ گیا۔ میں نے بے اختیار حیات خان کی حویلی کی طرف قدم بڑھائے۔ دیوانے نے میرے کان میں سرگوشی کی، ''یار شہرے! خان سے جلد جان چھڑا لینا۔ وہ کچھ کرے گا نہ کرنے دے گا..... ہمیں ابھی تھانے جا کر رپٹ لکھوانی ہے۔''

میں چونکا، ''تھانے؟''

''ہاں تو..... تمہاری بہن اغوا ہوئی ہے۔ اغوا کی رپٹ لکھوانی پڑتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پولیس اُسے ڈھونڈ نکالے۔'' وہ مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

انہی باتوں کے دوران ہم حیات خان کے دارے پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں نے چاچا چراغ کو حیات خان کے پہلو میں بیٹھ کر سسکتا ہوا دیکھا تو میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ حیات خان اُس کی گردن میں بازو حائل کئے تسلی دے رہا تھا اور حوصلے کی تلقین کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے پیچھے چلے آنے کے لیے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے چاچا چراغ کو ساتھ لے کر اپنے دارے کے خصوصی کمرے کی طرف چل پڑا۔ عیاں تھا کہ وہ تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔

دیوانہ برآمدے میں ہی رُک گیا۔ میں اندر چلا گیا۔ حیات خان متفکر انداز میں پوچھ رہا تھا، ''چراغ خان! جتنا کچھ جانتے ہو، بلاکم وکاست مجھے بتاؤ۔ ہوسکتا ہے کوئی راہ نکل آئے۔''

چاچے نے اپنے تہبند کے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا، ''خان! ساری عمر کی کمائی کھوہ کھاتے چلی گئی ہے۔ بتانے کو کیا باقی رہ گیا ہے۔ بھرا (بھائی) اور بھرجائی (بھابی) کا دُکھ قسمت میں دیکھنا لکھا تھا، دیکھ لیا۔ دو یتیموں کا بھار (وزن) خدا نے مجھ پر لادا، اُٹھا لیا۔ یہ بھار میری حیثیت سے بھاری ہے جو قدرت نے میرے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ چار دن کی زندگی اَب گزرتی دکھائی نہیں دیتی..... سر جھک گیا ہے۔ دعا کرو کہ زمین جگہ دے دے اور میں لوگوں کی نظروں کے تیروں سے بچ جاؤں۔''

چاچے کی حالت غیر تھی۔ مجھے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا وہاں موجود ہونا یا نہ ہونا چاچے کے نزدیک بے معانی تھا۔ حیات خان نے اُسے شفقت آمیز انداز میں ڈانٹا، ''انسان بن بھرا! یوں سوانیوں (عورتوں) کی طرح وین (بین) کرنے سے دِھی نہیں ملے گی۔ مرد کا بچہ بن اور بتا..... تجھے کس بے غیرت پر شبہ ہے؟''

چاچے کے ساتھ ہی میرا سر بھی ایک جھٹکے سے بلند ہوا۔ چاچا بولا، ''نہیں خان! مجھے کسی پر

شبہ نہیں ہے۔"

"کڑی اپنے ہاتھ سے خاندان کا منہ کالا کرتی نہیں، کسی سے کرواتی ہے۔ کلنک بھرا ہاتھ منہ پر پھیرنے والا زمین پر دندناتا پھرے؛ یہ کہاں لکھا ہوا ہے۔"

اُس کے سوال کا ہم دونوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس کے استفسار پر چاچا چراغ نے بتایا کہ ہم سب لوگ رات کو دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ سوئے تو ہوش تک نہیں رہا۔ صبح جب چاچی کی آنکھ کھلی تو اُس نے پروین کی چارپائی خالی دیکھی۔ سوچا کہ معمول کے مطابق اُٹھتے ہی کھیتوں کی طرف چلی گئی ہوگی۔ دل کو ایک کھٹکا سا لگ گیا کہ وہ سدا اپنی بہنوں کے ساتھ باہر جاتی تھی۔ آج اکیلی کیسے چلی گئی؟ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ ممکن ہے کہ اُس نے دونوں کو جگانے کی کوشش کی ہو مگر وہ نیند سے بیدار نہ ہوئی ہوں۔ جب نصف گھنٹہ گزر گیا اور وہ پلٹی نہیں تو چاچی بے چین ہوگئی۔ دونوں بیٹیوں کو جگایا اور اُنہیں پروین کا پتہ کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ کہیں نہ ملی تو چاچی بُری طرح گھبرا گئی۔ ننگے پیروں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ معمول کے مطابق جہاں پروین کو جانا چاہیے تھا، وہاں موجود نہیں تھی۔ اُس نے چراغ دین کو جگایا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اِس قضیے میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ شانو نے پروین کا سامان چیک کیا۔ سوائے پہنے ہوئے لباس اور زیور کے، سب کچھ موجود تھا۔ پروین گھر میں عمومی طور پر پہنی جانے والی نائیلون کی چپل پہن کر گئی تھی۔ گھر میں کوئی کھٹ بٹ بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی گزشتہ ہفتہ بھر سے اُسے کسی نے ڈانٹا تھا۔

ساری تفصیل جاننے کے بعد حیات خان نے باری باری ہم دونوں کو گھورا، ایک ہنکارا بھرا اور کہا، "پھر تم لوگوں نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے؟"

ہم دونوں سر جھکائے خاموش رہے تو وہ دوبارہ گویا ہوا، "وہ بچی ہے۔ نادان ہے۔ اُس کا کسی سے کوئی عشق وشق کا معاملہ بھی نہیں ہے؛ پھر وہ کیسے کسی کے ساتھ رات کی تاریکی میں نور پور سے باہر جا سکتی ہے؟"

میں نے شکست خوردہ سے انداز میں کہا، "دیوانہ بھی یہی کہتا ہے کہ اُسے کسی نے اغوا کیا ہے یا اُسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔"

"پہلی بات دل کو لگتی ہے، دوسری نہیں کیونکہ اگر وہ کہیں گری ہوتی تو اب تک اُس کا سراغ مل چکا ہوتا۔ نور پور والوں نے فصلوں کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔"

ایسے ہی وقت میں خاص کمرے کے باہر ہلچل ہوئی۔ ایک دارے دار نے جھانکا اور مؤدبانہ انداز میں کہا، ''خان جی! باہر پولیس آئی ہے۔''

''نکا تھانیدار آیا ہے یا بڑا؟''

''کریماں پاولی آیا ہے جی! اُس کے ساتھ دو چار سپاہتے (سپاہی) بھی ہیں۔''

''تم کریے کو اندر بھیج دو؛ باقی لوگوں کو ساتھ والے کمرے میں بٹھا کر چاء پانی کا بندوبست کرو۔ فٹافٹ!''

چاچے چراغ کی پیشانی عرق آلود تھی۔ حالت بہتر نہیں تھی۔ وہ پولیس والوں کی وردی دیکھ کر ہی سہم جایا کرتا تھا جبکہ آج سامنا ہونے چلا تھا۔ اُٹھنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ چوڑے چکلے سینے والا وردی پوش اندر داخل ہوا۔ سیدھا حیات خان کے پاس پہنچا، مؤدبانہ انداز میں مصافحہ کیا اور بولا، ''خان جی! تہاڈے پنڈ کوں کہیں دُشمن دی نظر لگ گئی اے سئیں!''

(خان جی! آپ کے گاؤں کو کسی دشمن کی نظر لگ گئی ہے)

حیات خان کے ماتھے پر بل پڑ گئے، بولا ''ہا..... ہا..... جڈن وی آسیں، بھونکدا آسیں..... کوئی جادو منتر پڑھ، منٹ مارتے ساڈی وِھی رانی کوں گول کڈھ نی تاں اَساں مردے ہَیں.....''

(ہاں ہاں! جب بھی آتے ہو، بھونکتے ہوئے آتے ہو۔ چاہے جادو منتر پھونکو، بہ جلد ہماری بیٹی کو ڈھونڈ نکالو نہیں تو ہم مر جائیں گے)

کریے پاولی کا اصل نام کریم بخش تھا۔ وہ بہت تیز طرار اور شاطر دماغ شخص تھا۔ دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹتا تھا اور پلو بھی نہیں پکڑنے دیتا تھا۔ اِس وقت بھیگی بلی بنا حیات خان کے سامنے بیٹھا 'جی، جی' کر رہا تھا۔ رسمی چائے پانی کے بعد حیات خان اور چاچا چراغ پولیس والوں کی معیت میں موقع ملاحظہ کے لیے روانہ ہو گئے جبکہ میں اور دیوانہ حویلی سے نکل کر کھالے کے ویگن اسٹینڈ میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ دیوانہ بولا، ''شہرے! تم نے ناشتہ کیا ہے؟''

''کیا ناشتے کی کسر باقی ہے؟''

وہ بولا، ''آؤ، چل کر روٹی کھائیں۔ آتما میں کچھ پڑے تو پرماتما کی سوجھتی ہے۔''

میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا، ''مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم چاہو تو جا کر کھا آؤ۔''

وہ مصر نہیں ہوا بلکہ موضوع بدل کر بولا، ''کھالا اور امیر نواز دکھائی نہیں دیتے۔ کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟''

کھالے کے غائب ہونے کا علم تھا۔ امیر نواز مجھے گزشتہ شام ملا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا؟ میں نے نفی میں سر ہلایا، بولا، ''مجھے معلوم نہیں۔ کل تو اِدھر ہی تھا۔''

''وہ نور پور میں نہیں ہے۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

''اگر وہ یہاں ہوتا تو اُسے یقینی طور پر اِس حادثے کا علم ہو جاتا۔ پھر یہ ممکن ہی کس طرح تھا کہ وہ اَب تک تمہیں نہ ملتا۔'' دیوانے نے پورے وثوق سے کہا۔

''شاید شہر چلا گیا ہو؛ کھاد یا سپرے لینے کے لیے۔''

اُس نے کندھے اُچکائے، بولا، ''اِس صورت میں بھی اُسے اَب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔''

میری عدم رغبتی کے باوجود دیوانہ حیات خان کی حویلی میں گیا۔ کار پورچ میں جھانک کر واپس آیا، بولا، ''شہرے! خان کی دونوں کاریں، ڈالا، ٹریکٹر اور موٹر سائیکل موجود ہیں۔ امیر نواز نور پور سے باہر نہیں گیا۔''

میں نے بیزاری سے کہا، ''تو پھر کیا ہوا؟''

دیوانہ منہ سے کچھ نہیں بولا مگر اُس کے چہرے کے تاثرات نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ امیر نواز کی طرف سے مشکوک ہو چکا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے تشکیک کے پَرتو مترشح تھے۔ اپنی کم میثیت کے سبب منہ سے نہیں بولا تھا، آنکھوں سے بول پڑا تھا۔ اُس کی خاموش انگشت نمائی سے میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ امیر نواز، خواہ میرا دوست تھا، خواہ امیر زادہ تھا، جوان مرد تو تھا ہی..... عمر کے اُس حصے میں تھا جہاں کسی بھی گھر کی عصمت کو نقب لگا سکتا تھا۔ ایسے میں کئی مختلف اوقات میں امیر نواز کے منہ سے برآمد ہونے والے جملے میرے ذہن میں سانپوں کی طرح کلبلانے لگے۔

''دیکھ شہرے! اپنی بہن کو پڑھاتے رہنا۔ اگر پیسوں کا مسئلہ آڑے آئے تو بے دریغ مجھے کہنا۔''

ایک مرتبہ اُس نے کہا تھا، ''یار! اَن پڑھ عورت بھی کوئی عورت ہوتی ہے؛ اُسے نہ بیٹھنے کا

ڈھنگ، نہ چلنے کا سلیقہ..... اُس کو دیکھ کر دیکھتے رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ تم لوگ اچھا کر رہے ہو، اپنی لڑکیوں کو پڑھا رہے ہو۔''

مجھے یاد آیا؛ ایک مرتبہ اُس نے پروین کی موجودگی میں کہا تھا، ''پروین! پڑھائی کے بغیر انسان جاہل ہوتا ہے، بالکل گدھے کی طرح.....''

پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ وہ ہر عید کے موقع پر پروین کے لیے کچھ نہ کچھ بازار سے خرید لاتا تھا اور کہتا تھا، ''اگر سکول جاتی رہو گی تو ہر عید پر اسی طرح ملنے کے لیے آؤں گا ورنہ کبھی شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔''

ایک مرتبہ اُس نے کھال کے پختہ نکے پر بیٹھ کر مجھے مخاطب کیا تھا، ''شہرے! جب تمہاری بہن میٹرک کر لے گی تو اُسے ہماری ملتان والی کوٹھی میں چھوڑ دینا تاکہ وہ اپنے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھا سکے۔ میں نے بات کر لی ہے، اُس کی پڑھائی اور رہائش پر جتنا خرچ بھی ہوگا، بابا کرے گا، تم فکر نہ کرنا۔''

جو باتیں آج تک امیر نواز کو میری نظر میں سربلند کرتی تھیں، آج وہ سیم زدہ بڈھی حویلی کی طرح منہدم ہونے لگی تھیں۔ دیوانے کی نظروں کی تیر زنی جاری تھی اور میں سر تھام کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے مجھے امیر نواز کا محبت بھرا رویہ یاد آتا جا رہا تھا، ویسے ویسے ہی میں تشکیک اور نفرت کی بھیانک اور اتھاہ کھائی میں گرتا جا رہا تھا۔ میں دیوانے کی پروا کیے بغیر حیات خان کی حویلی میں چلا گیا۔ دارے کے سبھی کمروں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ اپنے لئے مختص کیے گئے کمرے میں بھی موجود نہیں تھا۔ جھجک کو بالائے طاق رکھ کر زنان خانے میں چلا گیا۔ اُس کی ماں سے اُس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی، ''صبح کا گیا ہوا ہے، لوٹ کر نہیں آیا۔ تم بتاؤ، دھی پروین کا کچھ پتہ چلا؟''

میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کر کے کریدنے کی کوشش کی، ''چاچی! بتا کر گیا تھا؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا، بولی، ''نہیں..... میں اُس وقت سو رہی تھی۔ میں نے رات کو نیند والی گولی کھائی تھی۔''

''گھر میں کسی کو اُس نے بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟''

''شاید کسی کو بتایا ہو.....'' وہ بولتے بولتے چونکی، ''مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ خیر تو ہے؟''

میں نے جلدی سے بات بنائی، ''خیر ہی تو نہیں ہے چاچی! ہم پر قیامت آن ٹوٹی ہے؛ اگر

وہ نور پور میں ہوتا تو ہمارے لیے کچھ نہ کچھ کرتا.....''

یہ وہ وقت تھا جب میرے قلب و دماغ میں دُکھ، یاس یا دہشت نہیں تھی بلکہ عجیب نوع کی نفرت اور چبھن میرے دل میں بھرنے لگی تھی۔ زنان خانے سے نکل کر دیوانے کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ گھر میں کسی کو بھی امیر نواز کا علم نہیں ہے کہ وہ کہاں گیا ہے۔ یہ علم ہوا ہے کہ وہ علی الصبح سے گھر سے نکل چکا ہے۔

''میں نہ کہتا.....'' دیوانہ بولتے بولتے رُک گیا، بات بنا گیا، بولا، ''میں نہ کہتا تھا کہ وہ نور پور میں ہوتا تو اِس وقت تمہارے ساتھ ہوتا.....''

'میرے لہجے میں سانپ کا زہر گھل گیا،'' دیوانے! تم جو کہنا چاہتے ہو، کہہ دو۔ میرے اندر ایسی آگ دہک رہی ہے جس کے سامنے کوئی شعلہ، کوئی چنگاری حیثیت نہیں رکھتی۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پروین کے اغوا میں امیر نواز کا ہاتھ ہے۔ ہیں؟''

دیوانے کا رنگ فق ہو گیا۔ ہکلا کر بولا، ''نن.....نہیں.....مم.....میں نے یہ تو.....نہیں کہا تم سے!''

میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اور دانت بھنچے ہوئے تھے۔ میرے چہار سمت آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بھی پَل میں جل کر خاکستر ہو جاؤں گا۔ میں بے ارادہ سر جھکائے چلتے ہوئے بخشو لوہار کی دکان کے چھپر تلے آن کھڑا ہوا۔ آج پورا نور پور گم صم اور سنسان دکھائی دیتا تھا۔ یوں کہ جیسے کسی آسیب نے ڈیرہ ڈال دیا ہو۔ تمام دکانوں کی طرح بخشو لوہار کی دکان بھی آج بند تھی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں اور دیوانہ چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، فضا میں تیز نسوانی چیخ گونج اُٹھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میں اِس آواز کو لاکھوں انسانوں کے شور میں پہچان سکتا تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت اپنی گلی کی طرف دیکھا۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس ننگے سر کوئی عورت بجلی کی سی رفتار سے میری گلی سے نکل کر بخت خان کی حویلی کی طرف دوڑ گئی۔ وہ ہمیں محض ایک یا دو پَل کے لیے دکھائی دی تھی۔ میں اور دیوانہ بھی بے ساختہ اُچھل کر اُس کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔ میں نے اپنی زندگی کی تمام تر توانائیاں اُس چند سو فٹ کی دوڑ پر صرف کر دیں۔

وہ غزالہ تھی جسے میں نے بخت خان کی حویلی میں داخل ہونے سے پہلے تھام لیا۔ وہ سخت

خوف اور عجلت کے حصار میں تھی۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی، ''شہرے! پروین کوں خان دا پتر امیر نواز گھن گیا ہے..... میں سچ آدھی ہاں پر کوئی منن کیتے راضی اِی نئیں.....''

(شہرے! پروین کو خان زادہ امیر نواز کہیں لے گیا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں مگر کوئی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔)

میں بھونچکارہ گیا۔ قدرے نیچی آواز میں پوچھا، ''تمہیں کیسے پتہ چلا ہے اِس بات کا؟''

وہ اردگرد دیکھتے ہوئے بولی، ''وہ گھر کے پچھواڑے جنگل کے پار امیر نواز سے ملنے جایا کرتی تھی۔ کبھی دِن میں، کبھی رات کو..... میں نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو ملتے دیکھا ہے۔''

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدرے درشت لہجے میں کہا، ''کیا تم یہ بات بتا نہیں سکتی تھیں؟''

وہ جلدی سے بولی، ''یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ تم اُس نگوڑی کو تلاش کرو ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔ خدا جانے وہ اِس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگی۔''

کچھ فاصلے پر دیوانہ کھڑا ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس پر ایک نظر ڈالی اور غزالہ سے پوچھا، ''تم پاگلوں کی طرح گلیوں میں کیوں دوڑتی پھرتی ہو؟''

''میں نے چاچے سے کہا تھا کہ پروین کو امیر نواز کہیں لے گیا ہے، اُسے تلاش کرو۔ پولیس والے نے بھی یہ بات سن لی۔ اُس نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ وہ مجھے تھانے لے جائے گا۔ میں ڈر کے مارے بھاگ کر اِدھر چاچے بخت خان کی حویلی میں جا رہی تھی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم حویلی میں جاؤ اور چاچے بخت خان سے بات کرو۔ میں گھر جاتا ہوں۔''

میں نے اُسے حویلی کی طرف دھکیلا اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ دیوانہ میرے ہم قدم ہو کر بولا، ''کیا بات تھی؟''

اُس کے کانوں میں بھنک پڑ چکی تھی اِس لیے میں نے اُسے مختصراً بتایا اور اُسے گلی میں روک کر گھر میں گھس گیا۔ گھر کا منظر ویسا ہی تھا، جیسا چھوڑ کر گیا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے اور اُن کی ملی جلی آوازوں کا شور..... شانو نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے کمرے میں جانے کا کہا۔ کمرے میں کریما پاولی، حیات خان اور چاچا چراغ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ میں سلام کر کے چاچے کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کریما پاولی اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہہ رہا تھا، ''دیکھ

چاچا! تجھے میں نے تصویر کے دونوں رُخ دکھا دیے ہیں۔ اَب تو جیسا چاہے، میں ویسا ہی کروں گا۔ کیوں جی سردار صاحب؟''

حیات خان گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ پیشانی بل زدہ تھی۔ ایک ذرا توقف کے بعد گلا کھنکار کر بولا، ''سیدھی پدھری بات تو یہ ہے کہ میرا پتر ایسی گھٹیا حرکت نہیں کرسکتا۔ غزالہ دِھی کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔''

میں نے چونک کر حیات خان کو دیکھا۔ اُس کی پریشانی کی وجہ سامنے آ گئی تھی۔ اُس کی سفید چادر پر دھبہ لگ چکا تھا تبھی اُس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ چاچے چراغ کا جھکا ہوا سر اُٹھا نہیں، بھنچے ہوئے لب وَا نہیں ہوئے بلکہ ایک گہری آہ سینے سے خارج ہوئی اور اُس نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

کریمے نے بے صبری سے پوچھا، ''تم نے کوئی جواب نہیں دیا چاچا؟''

غیر معمولی تاخیر کے بعد چاچے کی آواز کمرے میں سسکی کی طرح گونجی، ''حیات خان اِس گھر کا رکھوالا ہے۔ رکھوالے کا پتر ہی سیندھ لگالے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ میں حیات خان کے پتر کے خلاف پرچہ نہیں کٹواتا۔ تم سب لوگ چلے جاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔''

حیات خان تڑپ کر بولا، ''نہیں خان! اگر تمہیں یقین ہے کہ امیر نواز تیرا مجرم ہے تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں مگر تم یہ نہ کہو کہ رکھوالے کے بیٹے نے گھر میں نقب لگائی ہے۔ اُس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے جو میری اور تمہاری رگوں میں ہے۔ وہ کسی کو قتل تو کرسکتا ہے، کسی کے ہاتھ پیر توڑ سکتا ہے مگر..... نہیں چراغ دِینا..... نہیں! وہ کسی کی بانہہ کا چور نہیں بن سکتا۔''

چاچے کا جھکا ہوا سر اُٹھا۔ نم مگر دہکتی ہوئی آنکھیں حیات خان کے چہرے پر ٹھہر گئیں، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں لفظ لفظ چبا کر بولا، ''خان! تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ میرے تن پر ماس نہیں رہا مگر کیا ہوا..... پچکی ہوئی رگوں میں خون اور خون میں غیرت تو موجود ہے ناں! اگر رب سوہنے نے توفیق دی تو میں اپنے مجرم سے نمٹ لوں گا۔ تم میرے مجرم نہیں ہو..... جاؤ! اپنے پتر کو جتنا بھی چھپانا چاہو، میری نظروں سے چھپالو۔ جاؤ..... مجھے کوئی پرچہ ورچہ نہیں کٹوانا۔''

حیات خان اور کریما پاولی تادیر چاچے کو نرم اور لچھے دار گفتگو کے بل پر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے پھر 'اللہ بیلی' کہہ کر رخصت ہوگئے۔ میں نے چاچے کے دونوں لرزیدہ

ہاتھ تھام لیے، کہا، ''چاچا! حوصلہ کرو۔ اَبھی یہ طے نہیں ہوا کہ ہماری بانہہ امیر نواز کے پاس ہے۔ اگر یہ فیصلہ ہو گیا تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

چاچے نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ مجھ سے لپٹ کر سسکنے لگا۔ اچھا تھا کیونکہ رونے سے اندر کا غبار کم ہو رہا تھا۔ میرے اندر بھی حبس بھرا ہوا تھا جس میں زار و قطار رونے سے کچھ کمی واقع ہوئی تو میں گھر سے نکل آیا۔ دیوانے کو گلی میں ٹھہرا کر گیا تھا مگر اَب وہ گلی میں کہیں دکھائی نہیں دیا۔ شاید مایوس ہو کر چلا گیا تھا۔

گھر میں ویرانیاں اپنا تسلط جما چکی تھیں۔ کسی کے حلق سے ایک نوالہ تک نہیں اُترا تھا۔ اگر وہ کسی بیماری یا حادثے میں مر جاتی تو گھر پر صرف دکھ کے سائے چھاتے، ندامت اور پریشانی کی آگ ہر ذہن میں دہک نہ اُٹھتی۔ نور پور کی قدیم روایتی بستی میں بیٹی یا بہن کا یوں گھر سے جانا خاندان کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دینے کا سبب بنتا تھا۔ چونکہ آج تک اتنا بڑا واقعہ رو پذیر نہیں ہوا تھا اِس لیے میرے گھر سے اٹھنے والے پہلے شعلے نے آن کی آن میں پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ میری اکلوتی اور لاڈلی بہن تھی۔ اُس کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ اُسے چھونے والی ہوا غیرت کی سانسوں کو ناگوار گزرتی تھی۔ اب نجانے کس حال میں تھی؟ یہی خیال اپنی سنگین لپیٹ میں ذہن کو دبوچے رہا اور میں شب بھر جاگتا رہا۔ کبھی کمرے میں اُس کے استعمال کی چیزوں کو کھنگالتے، کبھی کھوجیوں کی طرح صحن میں ثبت پیروں کے ہزاروں نشانات میں سے اُس کا نقشِ پا کھوجتے اور کبھی دیوانوں کی طرح نور پور کی گلیوں میں اُس کی ناکام تلاش میں گھومتے..... دن چڑھ گیا مگر میری غیرت کا ڈوبا ہوا سورج طلوع نہیں ہوا۔ گھر کی تینوں عورتوں نے اپنے دوپٹے اپنے سروں پر کس کر باندھے ہوئے تھے اور دس بجنے تک چولھے میں آگ نہیں جلائی گئی۔ ہمسایہ گھروں سے ناشتہ پہنچایا گیا جسے اُن کے بے حد اصرار پر زہر مار کیا گیا۔ مجھ سے تو ایک روٹی بھی معدے میں اتاری نہیں جا سکی۔ کم و بیش سب کا حال ایسا ہی تھا۔

دس بجے کے قریب میں گھر سے نکلا۔ کھالے اور امیر نواز کا پتہ کیا۔ دونوں غائب تھے۔ دیوانے کے گھروندے پر جا کر کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا، اُس کی ہمدردی آمیز باتوں کا 'ہوں، ہاں' میں جواب دیتے ہوئے من میں جلتی ہوئی آگ کو چھیڑتا رہا جو دم بہ دم بجھنے کی بجائے بھڑکتی جا رہی تھی۔ دوپہر تک میں دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پروین یا تو اپنی رضامندی

کے ساتھ امیر نواز کے ساتھ چلی گئی تھی یا پھر امیر نواز نے اُسے کسی طریقے سے اغوا کر لیا تھا۔ مجھے کچھ تحفظات کا سامنا بھی تھا۔ بھرے پُرے گھر میں اتنی خاموشی اور دیدہ دلیری سے جوان لڑکی کو اغوا کیا جانا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ وہ یقینی طور پر کمرے سے یا گھر سے اپنے پیروں پر چل کر نکلی تھی۔ صحن میں یا گلی میں اُس کے ساتھ غیر متوقع حالات پیش آئے تھے۔

کوئی بھی ایسے حالات رونما نہیں ہوئے تھے جن کے پیشِ نظر وہ گھر سے چوری، رات کی تاریکی میں، ہمیشہ کے لیے جانے کا فیصلہ کرتی۔ میں اُسے بے پناہ چاہتا تھا۔ اُس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔ چاچا اور چاچی بھی اُس کی بات کو رد نہیں کیا کرتے تھے۔ اُسے اتنا اعتماد حاصل تھا کہ اگر وہ امیر نواز سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو کہہ دیتی اور ہم سب مان جاتے۔ امیر نواز نہ تو غیر برادری سے تعلق رکھتا تھا، نہ ہی اوباش فطرت اور مفلس تھا اور نہ ہی ہمارے درمیان دشمنی کی خلیج حائل تھی۔ اگر دیانت داری کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ حقیقت تھی کہ اگر سردار حیات خان اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگتا تو ہم بخوشی اُسے بانہہ تھما دیتے۔

ہزار دوستی اور تعلقات کے باوجود امیر نواز بخوبی سمجھتا تھا کہ پروین پر میلے ہاتھ تو کجا، میلی نظر بھی ڈالے گا تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اُسے بھی چوری چھپے پروین کو بھگا لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب اُس کی پوزیشن اور کردار کو ذہن میں کھنگالا جاتا تو دل اُس کی طرف سے تشکیک زدہ ہو جاتا۔ اگر اُس کا پروین کے اغوا سے کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ غائب کیوں تھا؟ کہاں چلا گیا تھا؟

بہر حال یہ طے تھا کہ طویل عرصے سے دونوں چوری چھپے ملتے چلے آ رہے تھے۔ غزالہ اُن کی ہم راز تھی۔ پروین اُسے اپنے دل کی بات بتا دیا کرتی تھی۔ غزالہ کی حالتِ زار بہت ابتر تھی۔ گھر میں ہر کوئی اُسے موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا اور لعن طعن کر رہا تھا۔ میں نے بدقت تمام اُس سے پروین اور امیر نواز کے مابین تعلقات کی نوعیت دریافت کی تھی۔ اُس کی سنائی ہوئی روئیداد کے مطابق دو سال پہلے امیر نواز نے اُسے پہلی مرتبہ دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ پروین نے اُس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی جس سے شہہ پا کر امیر نواز نے ایک خط اُسے لکھا۔ پروین نے یہ خط غزالہ کو پڑھایا تھا۔ پھر دونوں اطراف سے خطوط کا سلسلہ چل نکلا۔ امیر نواز ہر صبح اسکول کے راستے میں اُسے دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے سے موجود ہوا کرتا تھا۔ خطوں کے تبادلے کے نتیجے میں دونوں چوری چھپے ملنے لگے مگر ان کے درمیان دیوانگی آمیز دیدنیوں اور بے سروپا

باتوں کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اُن کی چاہت زبانی اظہار تک محدود تھی اور غزالہ کے بقول دونوں نے اپنی اخلاقی حدود کو کبھی بھی عبور نہیں کیا تھا۔

میں نے پروین کو ہمیشہ بچی سمجھا تھا۔ وہ پوری قامت کے ساتھ اِس طرح میری نظروں کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی کہ میری نظر میں دنیا کی تمام قامتیں بے اعتبار ہو کر رہ گئی تھیں۔ امیر نواز کے بارے میں میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ اُس کی عیاشیاں دیکھی تھیں مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنا ماس کھانے پر آمادہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شاہ جی اور سردار بخت خان کی سوئیاں پروین کے اغوا پر اٹکی ہوئی تھیں۔ وہ امیر نواز کو اتنا گھٹیا اور بدقماش فطرت سمجھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ خود شش و پنج کا شکار تھے اور میری رہنمائی کرنے سے معذور دکھائی دیتے تھے۔ پولیس والے بے نیلِ مرام گئے تھے۔ کریماں پاولی یا کوئی بھی اہل کار دوبارہ نور پور میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ چونکہ سردار حیات خان کے بیٹے کا نام اِس واقعے سے منسلک ہو چکا تھا، اِس لیے جو بھی ہوتا، وہ ہمارا ساتھ نہ دیتے۔ اب تو انہیں بڑا مضبوط جواز مل گیا تھا کہ ہم نے پرچہ کٹوانے اور قانونی کارروائی کروانے سے بالکل انکار کر دیا تھا البتہ سردار حیات متفکر تھا۔ وہ اس آگ کی تپش اور طاقت کو بخوبی جانتا تھا کہ اُس کے بیٹے کی زندگی شدید خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ اگر گھر پہنچنے سے قبل مجھے یا چاچے چراغ کو دکھائی دے جاتا تو اُس کا زندہ بچنا محال تھا۔

مرگ کی چٹائی دو تین دنوں بعد سمیٹ لی جاتی ہے۔ غیرت کے جنازے پر کبھی بھی مٹی نہیں ڈالی جاتی بلکہ کرید کرید کر شعلوں کو ہوا دی جاتی ہے اور اپنے تن بدن کو اُس آگ کے سینک پر کباب کیے رکھا جاتا ہے۔ میرے گھر کی صورت حال بالکل ایسی ہی تھی۔ اس عزت پاش واقعے کو گزرے تین روز ہو گئے مگر نہ تو پروین اور امیر نواز کا کوئی سراغ ملا اور نہ ہی آہ و بکا اور سسکیوں کو قرار آیا۔ بات نور پور سے نکل کر اطراف کے دیہاتوں میں پھیل گئی تھی اور چاچے اور چاچی کے ملنے والوں کی آمد کا ناگوار سلسلہ چل نکلا۔ لوگوں کی ہمدردی بھرے جملے تیز نشتر بن کر دل و دماغ کو چھلنی کر کے رکھ دیتے مگر زبان دانتوں میں رکھ کر سینکڑوں سننا پڑتیں اور یقین دلانا پڑتا کہ وہ گھر سے بھاگی نہیں بلکہ کسی بے غیرت دشمن نے اُسے اغوا کیا ہے۔ سردار حیات اور ہمارے گھر میں دشمنی کے واضح اثرات نمودار ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ بات چیت کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا۔ سردار بخت خان، امان اللہ قریشی اور سائیں دل جیت شاہ افسوس

کرنے کے لیے آئے تھے مگر وریام خان اور حیات خان نے دوبارہ ہمارے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

جمعہ کے روز، جب سبھی دکانیں بند تھیں اور میں بخشو لوہار کی دکان کے باہر دھرے ہوئے ہما چے پر پہلو کے بل نیم دراز تھا، میری نظروں کے عین سامنے سفید رنگ کی ہنڈا اِکارڈ آن رکی۔ میں بے اختیار اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں کار سے شناسائی کی ایک موہوم سی رمق جاگی مگر جونہی پچھلا گیٹ کھلا اور میر وشاہ کی شکل دکھائی دی، فوراً یاد آ گیا کہ میں اس کار میں بیٹھ کر میڈم شکیلہ کی کوٹھی سے نکلا تھا اور لاری اڈے پر گیا تھا۔

چونکہ گزشتہ ایام میں میرے ذہن پر ہمہ وقت پروین چھائی رہی تھی، اس لیے مجھے میڈم ایک پل کو بھی یاد نہیں آئی تھی۔ میڈم کی دی ہوئی خطیر رقم میرے ٹرنک میں جوں کی توں پڑی ہوئی تھی۔ جونہی میر وشاہ کی شکل دکھائی دی، مجھے ملتان میں بیتے ہوئے پُر عذاب لمحات یاد آ گئے۔ میں چارپائی سے اُترا اور بانہیں کھولے اپنی جانب آتے میر وشاہ سے لپٹ گیا۔ اب تک شاید کوئی غمگسار نہیں ملا تھا، اِس لیے اُس سے گلے ملتے ہی آنسو چھلک پڑے اور میں بلک بلک کر رونے لگا۔ میر وشاہ گھبرا گیا۔ مجھے خود سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر میری گرفت سے نکلنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ قدرے بلند آواز میں بولا، ''اڑے غنچے! بولے بھی تو..... کس نے تیرے پر ہاتھ ڈالا، جیادتی (زیادتی) کی..... قسم ماڑے کو اپنی ماں کی، خون کر دیوے ہے اُس کم جات (کم ذات) کا..... پَر تو بولے بھی تو سہی ناں!''

میرے پاس بولنے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ نہ میرا رونا تھمتا ہے، نہ ہی میں کچھ بتاتا ہوں تو اُس نے ڈرائیور کو بلا لیا۔ دونوں نے مل کر مجھے کار کی پچھلی سیٹ پر دھکیلا اور غیر معمولی مستعدی سے کار موڑ لی۔ مجھے پروا نہیں تھی کہ وہ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں، مجھے کیا کرنا چاہیے، جانا چاہیے یا نہیں..... میں تو بس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گرد و پیش سے لاتعلق تھا۔ قریشی موڑ سے نکلتے ہی کار کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ مظفر گڑھ کے قریب ایک جگہ پر میر وشاہ نے قدرے بلند آواز میں کہا، ''ماڑے مٹھو! ادھر ایک جانب کو اُڑن کھٹولا روک دیوے ہے۔ یہاں سگنلز آ رہے ہیں ماڑے فون پر..... ہاں اِدھر ہی روک ناں!''

میں چونکا۔ شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ ہم مظفر گڑھ شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور مضافاتی آبادی کے بکھرے بکھرے گھر دکھائی دے رہے تھے۔ کار رُک گئی۔ میر وشاہ نے

میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، بولا، ''اڑے لاڈے میاں! اب بول بھی دیوے کہ یوں جنانیوں (زنانیوں) کی طرح کیوں ٹسوے بہاوے ہے؟ کیا تکلیف ہووے ہے تیرے کو؟''

میں ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان کی طرف سے قطعی طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ پروین کی تلاش میں دونوں اپنے تمام تر خلوص اور طاقت کے میرے کسی کام نہیں آ سکے تھے۔ وہ میری طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ ایسے میں میر وشاہ کی آمد میرے لیے بہت بڑا امکانی سہارا ثابت ہوئی تھی۔ میں نے ڈرائیور کی پروا کیے بغیر اُسے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ امیر نواز اور پروین کے بارے میں، جو کچھ سن رکھا تھا، بلا کم وکاست بتا دیا۔ وہ بڑی خاموشی سے سنتا رہا، پھر بولا، ''ہائے غنچے! یہ تیرے کو کن مصیبتوں نے دیکھ لیا ہووے۔ ایک سے بھاگے تو دوجی تیار ملت ہے۔ ہائے ہائے! کر ماں والا کسی کو بھی ایسی بے عجتی (بے عزتی) کا منہ نہ دکھاوے تو بھلا ہے۔''

اس دوران اس نے اپنے ننھے سے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔ چونکہ وہ میرے بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا، اِس لیے سپیکر سے پھوٹنے والی میڈم کی آواز پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پھر میر وشاہ نے مختصر الفاظ میں اپنے مخصوص انداز میں، میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بیان کیا۔ میڈم نے کچھ پوچھا، کچھ باتیں کیں پھر میر وشاہ نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ موبائل فون پکڑا اور کان سے لگایا۔ میڈم کی مترنم اور پُر اعتماد آواز سماعت میں اُتری، ''شہریار! مجھے بہت دُکھ ہوا۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اَب جبکہ ہو چکا ہے تو اِس کے ہونے کے دکھ سے نکل کر اس کے ازالے کے لیے توانائیاں صرف کرنا چاہئیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فوراً ہی حماقت کا احساس ہو گیا۔ وہ مجھے سن رہی تھی، دیکھ نہیں رہی تھی کہ میرا اوپر نیچے حرکت کرتا ہوا سر اُسے نظر آتا۔ میں نے کہا، ''جی میڈم!''

''میرے خیال میں تمہاری بہن کو اغوا کیا گیا ہے اور یہ کام سائیں بھی کر سکتا ہے۔ کیا تم نے اِس رخ سے سوچا ہے اب تک؟''

میں چونکا، ''سائیں؟ یعنی سائیں دل جیت شاہ؟''

''ہاں وہی۔ لیکن اگر اس نے اغوا کیا ہے تو پھر امیر نواز کہاں گیا؟'' میڈم رائے دینے کے بعد خود ہی متضاد سوچ میں اُلجھ گئی، ''میں چند وجوہات کی بنا پر نور پور میں نہیں آ سکتی وگرنہ وہاں

آ کر تمہاری مدد کرتی۔ تم ایسا کرو کہ دل جیت پر پکا ہاتھ ڈالو اور اُس سے اگلوانے کی کوشش کرو کہ اُس نے تمہاری بہن کو اغوا کرنے کے بعد کس کے حوالے کیا۔ اگر تم اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر تمہاری بہن جانے اور میں جانوں، ایک دن میں ہی بازیافت کروا کر تمہارے حوالے کر دوں گی۔''

''مگر میں دل جیت سے کس طرح یہ پوچھ سکتا ہوں؟ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔'' میں نے نیم دلی سے کہا۔

''تم نے یہ کام کس طرح کرنا ہے، یہ تم پر ہی موقوف ہے۔ میں مدد نہیں کر سکتی۔'' وہ قدرے لاپروائی سے بولی، ''یہ بتا دیتی ہوں کہ تمہارے خانزادے بھی اُس کے پارٹنر ہیں۔ اس کی پشت پناہی سردار حیدر خان کرتا ہے۔ جو بھی کرنا نہایت راز داری سے کرنا۔''

''میڈم! کیا آپ کو یقین ہے کہ دل جیت نے ہی.....''

''ہاں! میں اُسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت کمینہ انسان ہے۔'' میڈم کے لہجے میں غیر معمولی نفرت کی آمیزش تھی، ''نہ ہی آسانی سے زبان کھولنے والا ہے وہ۔ تم پکا ہاتھ ڈالو گے۔ اپنا کام کرنے کے بعد فوراً میرے پاس چلے آنا ورنہ اُس کے اندھے مرید اور حصہ دار خانزادے تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے۔''

''مگر میڈم! وہ کیوں میری بہن کو اغوا کرے گا؟''

''اس بات کا تجھے جلد علم ہو جائے گا۔'' میڈم کے لہجے میں قدرے مختلف نوعیت کا چیلنج چھپا ہوا تھا، بولی، ''شہریار! وہ اُلو کا پٹھا آسانی سے کچھ نہیں بتائے گا۔ تمہیں دھوکہ دینے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔''

''مجھے سچ جھوٹ کا کیسے پتہ چلے گا؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تم نے اُس سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ اُس نے تمہاری بہن کو کس کے حوالے کیا ہے۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ انگلیاں ٹیڑھی کرنے کے ساتھ ساتھ تم اپنے دماغ کے گھوڑوں کو سیدھی راہ پر دوڑا دو گے۔ وہ صرف تین آدمیوں کو سپلائی دیتا ہے۔ سردار حیدر خان، فقیر و مگسی اور جی ایم کو..... اگر ان تینوں کے علاوہ کسی کا نام اُس کی زبان پر آئے تو سمجھو کہ جھوٹ بکتا ہے.....''

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی، اچنبھے سے بولا، ''سردار حیدر خان؟''

''فضول حیرانی مت دکھاؤ، تم سب کو جانتے ہو مگر حقیقت میں کسی کو بھی نہیں جانتے ہو۔ یہ دعا کرو کہ اُس نے تمہاری بہن کو سردار حیدر خان کے حوالے نہ کیا ہو ورنہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ دوسرے دونوں میری مٹھی میں ہیں۔'' میڈم نے قدرے سخت لہجے میں کہا، ''اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ جو باتیں کہہ چکی ہوں، ان پر عمل کرو اور وقت ضائع نہ کرو ورنہ تمہاری بہن بہت دور چلی جائے گی۔ ممکن ہے دیر ہونے کی صورت میں وہ میری دسترس سے نکل جائے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ بائے!''

میڈم نے فون بند کر دیا اور میں چند لمحوں تک موبائل فون کو کان لگائے بیٹھا رہا پھر میر وشاہ کو تھماتے ہوئے بولا، ''میڈم کہتی ہے کہ.....''

اُس نے میری بات کاٹ دی، بولا، ''ماڑے کانوں نے سب کچھ سن لیوت ہے۔ وہ جو کہتی ہے، ٹھیک کہتی ہے۔ اس کے حکم پر عمل کرو۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر میر وشاہ نے ڈرائیور کو گاڑی موڑنے کا حکم دیا۔ چوک قریشی پہنچ کر میر وشاہ نے کار رُکوائی اور میرے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، ''لے بھئی غنچے! ویگن پر بیٹھ کر نور پور چلا جاوے ہے اور ہاں! تیرے کو اتنا بتا دیوت ہے میر وشاہ کہ جب تک تیرے کو سوچنا ہے، تب تک تیری بہن اس دنیا سے چلی جاوت ہے۔ جو کرنا ہے، ان باجوؤں (بازوؤں) سے کرو۔ تیرے کو میڈم شکیلہ پیار کرے ہے تو اس کا مطلب یہ ہووت کہ تم سے جیادہ (زیادہ) طاقت ور خان جادے (خانزادے) نہ ہووے ہیں۔ میڈم میدان میں نکل آوے تو ان لونڈوں کی ایسی کی تیسی ہو جاوے گی۔ ڈر کا ہے کا، رب کی جات (ذات) کا، بندہ تو ایک سات رُپے کی گولی کو بھی نہ روکنے کا ہووے..... آجما (آزما) کر دیکھ لیوے ہے۔''

میں کار سے اُترنے لگا تو اس نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ بولا، ''ارے جالم (ظالم)! تیرے پاس کوئی ٹھاکا شاکا ہووت ہے؟''

ساتھ ہی اُس نے داہنی شہادت انگلی کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے پستول کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا، ''نہیں تو.....''

اُس نے جلدی سے قمیص کا اگلا پلو اُٹھایا، نیچے پہنے ہوئے سلوکا نما چولے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ننھا سا پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔ دوسری جیب میں سے بیس کے قریب گولیاں بھی نکال

کر میری جھولی میں ڈال دیں۔ بولا، ''اڑے لاڈے! یہ میگ جین (میگزین) والا اصلی ولائتی پستول ہووے ہے، سو گولیاں چلاویں تب بھی گرم نہ ہووے ہے..... لے اَب جا! آگ بن جا۔ جو تیرے راستے میں آن کھڑا ہووے، اُسے آگ لگا دیوت..... جا ماڑے لاڈے جا!''

میں نے عجیب سے احساسات سے ملغوب ہو کر اُسے دیکھا اور پھر احتیاط سے پستول اور گولیوں کو اپنے لباس میں چھپا لیا۔ دونوں سے ہاتھ ملا کر ویگن اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ ویگن نور پور سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کی واپسی میں خاصی دیر تھی۔ میں ویگن اڈے والے ہوٹل میں جا بیٹھا۔ چائے کا آرڈر دے کر میر وشاہ اور میڈم کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اتنا اہم نہیں تھا جتنا ان دونوں نے مجھے اہم بنا دیا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اپنی بغلی جیب کو ٹٹولا۔ پستول کی موجودگی کا احساس بڑا جاندار تھا۔ ایک آگ میرے دل میں جل اُٹھی تھی۔ دوسری آگ فولادی پرزے کے اندر بھڑک نکلنے کو بے تاب تھی۔ چائے سے پہلے عزت خان اور شیدو پہنچ گئے۔ میرا اُترا ہوا چہرہ اور ناگفتہ بہ حلیے کی بدولت وہ فی الفور سنجیدہ ہو گئے اور انہوں نے روایتی جملہ بازی نہیں کی۔ عزت خان نے اپنے لیے چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر مستفسر ہوا، ''استاد کھالے کا کچھ پتہ چلا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شیدو نے کہا، ''استاد شہرے! منظور درزی کے پاس جاؤ گے؟''

وہ مجھ سے بالواسطہ طور پر عاشی کو دیکھنے کیلئے جانے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے منہ بنایا، ''نہیں یار! میں نور پور جاؤں گا، تمہارے ساتھ۔''

ویگن کی روانگی کا وقت ہو گیا اور عزت خان نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا جھکا ہوا سر اور ڈھلکا ہوا بدن متحرک ہو گیا۔ طویل سانس حلق میں اُتارتے ہوئے ہماچے سے اُترا اور ویگن کے پائیدان پر آن کھڑا ہوا۔ شیدو نے میرے لیے ویگن میں بیٹھنے کی جگہ بنانے کی کوشش کی تو میں نے اُسے روک دیا۔ میں کھلی ہوا میں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔

میں نے پستول اور گولیاں اپنے ٹرنک میں چھپا دیں۔ سبھی گھر والے ڈیرے پر گئے ہوئے تھے۔ گزشتہ چند دنوں سے مال مویشیوں کی چنتا بھی عنقا تھی۔ اُنہیں سنبھالنا ضروری تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہمسائیوں نے دو تین دن تک پانی اور چارے کا انتظام کیے رکھا تھا۔ زیادہ دنوں تک اپنا معمول کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ڈیرے کا کام کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ویسے بھی زندگی کی گاڑی کو، جس بھی حال میں ہو، دھکیلنا پڑتا ہے۔ [illegible]

آیا، صدف بی بی نے آنے کا کہا تھا مگر نہیں آئی تھی۔ پھر خیال آیا کہ اس کے آنے سے پہلے ہی یہاں کے حالات بدل گئے تھے۔ وہ آنا چاہتی بھی تو کس طرح آ سکتی تھی۔ صدف بی بی کی طرف میرا دھیان زیادہ دیر تک نہیں رہ پایا، میں اپنی آگ میں لوٹ آیا۔ میڈم اور میر وشاہ کی ہدایات کے بارے میں سوچنے لگا۔ میڈم اتنی بڑی بات بغیر کسی ثبوت کے کیسے کہہ سکتی تھی کہ پروین کے اغوا کے پیچھے دل جیت شاہ کی کمینگی جاگزین تھی۔ کیا دل جیت اُس کا دشمن تھا؟ اور وہ میرے ذریعے سے اپنے دشمن کو زِک پہنچانا چاہتی تھی؟

میں نے چاچی وغیرہ کے آنے تک بہت سوچا مگر کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میں نہ تو میڈم کو شکیلہ اچھی طرح جانتا تھا، نہ دل جیت کو اور نہ ہی خانزادوں کو۔ کھانا زہر مار کیا اور لیٹ گیا۔ نیند حسبِ سابق آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آنکھیں بند کرتا تو پروین کی شبیہہ ابھر کر سامنے آ جاتی۔ کبھی روتی پیٹتی دکھائی دیتی، کبھی آنسو بہاتی تو کبھی ایک دم ساکت اور سپاٹ..... وہ بولتی نہیں تھی۔ مجھے بتاتی نہیں تھی کہ وہ کہاں تھی۔ بس ایک ٹک مجھے دیکھتی رہتی تھی۔

ایسے میں کھالے کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ ہوتا تو ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اکیلا نہ چھوڑتا۔ اپنی عقل کے مطابق مشورے اور دلاسا دیتا۔ کوئی راہ نکالنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا..... مگر وہ کہیں جا کر غائب ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ موبی کے غیر متوقع قتل پر خوف زدہ ہو کر کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ لاہور یا کراچی کی طرف نکل گیا ہو۔ چونکہ وہ ماہر ڈرائیور تھا، اِس لیے اُسے با آسانی کہیں بھی نوکری مل سکتی تھی۔ ڈرائیوری کے وسیع و عریض فیلڈ میں رہائش اور طعام کی سہولتیں با آسانی حاصل ہو جاتی تھیں۔

میں فطرتاً بزدل نہیں تھا۔ میں نے کالج کے ایام میں اپنی تنظیم کے کارندوں کے ساتھ مل کر خوفناک مشن انجام دیے تھے۔ بہت کچھ سیکھا تھا۔ نور پور میں آتے ہی میں ہر اُس کام سے تائب ہو گیا تھا جو میرے لیے یا پروین کے لیے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ میری احتیاط روی کام نہیں آئی تھی۔ میری جان سے پیاری پروین اِس وقت ناکردہ گناہوں کی پاداش میں نجانے کس عذاب سے گزر رہی تھی اور میں اُس کے لئے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ دل جیت شاہ کی سرگرمیاں بھلے میری نظر میں مشکوک تھیں مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ لڑکیوں کو اغوا کرتا بھی تھا تو نور پور سے دور واردات کرتا ہو گا۔ میڈم کی سوچ اس کے

برعکس تھی۔ وہ مصر تھی کہ دل جیت نے ہی پروین کو اغوا کیا ہے۔ نصف شب کا عمل تھا جب کوئی بھی فیصلہ نہ کر پاتے ہوئے میرا دماغ پھٹنے کو آ گیا۔ بے اختیار خود کو لعن طعن کرنے لگا۔ میری جوانی لاحاصل، میری طاقت نامراد..... جو مرد اپنی بیٹی یا بہن کو تحفظ نہ دے سکے، اس کا جینا اور مرنا ایک برابر ہوتا ہے۔ میں نے بے رحمی سے سوچا، ''تو کیا مجھے مر جانا چاہیے؟''

کھالا کہتا تھا کہ پڑھا لکھا بندہ کچھ بھی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ بزدل ہوتا ہے۔ سوچنے میں قیمتی وقت ضائع کر دیتا ہے۔ جب پانی سے سر سے اونچا ہو جاتا ہے، تب اُس کے ہڈ پیر ہلتے ہیں اور پھر وہ منہ کی کھا کر اپنی جھلی (بستر) میں چھپ جاتا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں، ''کیا میں واقعی ایسا ہوں؟ پڑھ لکھ کر میں نے اپنے خاندان کو بٹہ لگا دیا۔''

میں نے خود کو ٹٹولا۔ دل جیت آسان شکار نہیں تھا۔ سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالنا تو کجا، اُس تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ میں کیا کروں؟ اِسی ادھیر بن میں غرقاں تھا کہ صحن میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں ایک جھٹکے سے اُٹھا اور جست بھرنے کے سے انداز میں باہر کی طرف بھاگا۔ صحن کے شمالی گوشے میں پانی کے گھڑے رکھنے والی گھڑونچی (چوبی سٹینڈ) پر کسی کو جھکے دیکھا۔ آدھے چاند کی روشنی میں پہلی نظر کو ہی باور ہو گیا کہ وہ شانو تھی۔ وہ ایک گھڑے پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے چند ثانیے انتظار کیا مگر وہ جوں کی توں کھڑی رہی۔ پانی بھر رہی ہوتی تو پانی کٹورے میں ڈال کر سیدھی ہو جاتی..... میں جلدی سے اُس کے عقب میں پہنچا۔ پتہ چلا کہ وہ گھڑے پر ماتھا ٹکائے ہچکیاں لے رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، کہا، ''کملی تھی گئی ہیں شانو! میڈے وَل ویکھ.....''

(شانو! پگلی ہو گئی ہو کیا، میری طرف دیکھو۔)

اُس نے چونک کر ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا، سیدھی ہوئی اور پیروں پر پلٹ کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے کہا، ''کیا بات ہے شانو! کیوں رو رہی ہو؟''

یوں، جیسے اُس نے میری بات سنی ہی نہ ہو، مجھے ایک ٹک دیکھے گئی۔ میرے جھنجوڑنے پر اُس نے سرد آہ سینے میں اُتاری اور بولی، ''تیڈے مان تے اَساں ڈوہیں بھیناں آ کڑتے ٹردیاں ہاسے..... پَر توں تاں اپنی پروین جو گاوِی نویں نکتا.....''

(ہم دونوں بہنیں تمہارے بھروسے پر اکڑ کر چلا کرتی تھیں۔ آج پتہ چلا کہ تم اپنی بہن کو

بچانے کے قابل بھی نہیں ہو۔)

اُس کی شعلے اگلتے جملے نے مجھے زمین میں گاڑ دیا۔ مجھ پر ایک نگاہِ عجب ڈال کر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس کی ہنسی نے میرے رُوئیں رُوئیں میں وہ زہر اُتار دیا تھا جس نے آن کی آن میں مجھے خاکستر کر دیا تھا۔

میں جو فیصلہ نصف شب تک نہیں کر پایا تھا، اُس کے ایک جملے اور خون آشام ہنسی نے کر دیا۔ چاچا چراغ بوڑھا تھا۔ زیادہ زور لگاتا تھا تو کھانسنے لگتا تھا۔ انجر پنجر ہل کر رہ جاتا تھا مگر اُس کے کانوں میں پروین کے ساتھ جونہی امیر نواز کا نام پڑا تھا، اُس نے حیات خان سے کہہ دیا تھا کہ میں پرچہ نہیں کٹواؤں گا بلکہ اپنے مجرم سے خود نمٹوں گا۔ اُس کے بوڑھے دل نے غیرت کی آنچ پر جوانی کا پلو تھام لیا تھا۔ میرے جوان دل ابھی اندیشوں میں مبتلا تھا..... مجھے اپنے وجود سے ایک لمحے کو گھن آئی اور میں دانت پیس کر اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ میرے انگ انگ میں غیر معمولی مستعدی بھر گئی تھی۔

ملتان کالج کے ہوسٹل میں لی گئی تربیت آج کام آنے والی تھی۔ میں نے میر وشاہ کا دیا ہوا پستول نکالا، اُسے بہ نظرِ احتیاط چیک کیا اور میگزین لوڈ کر کے بغلی جیب میں ڈال لیا۔ ننھا سا جرمن ساختہ پستول دیکھتے ہی اِس کی موت آگینی کی خبر ہوتی تھی۔ یہ آٹو میٹک تھا۔ پہلی گولی چڑھانے کے لیے بولٹ کھینچنا پڑتا تھا۔ پھر خود کار انداز میں گولیاں میگزین سے نکل کر اسٹروک پن کے سامنے آتی جاتی تھیں اور ٹریگر دبانے پر موت بانٹنے لگتی تھیں۔ میں نے اضافی گولیاں بھی اُٹھالیں۔ آنے والے وقت میں کس طرح کے حالات سے دوچار گی ہو سکتی تھی، اِس خیال کے پیشِ نظر میں نے میر وشاہ کی دی ہوئی نوٹوں کی گڈی نکالی، پن نکال کر آدھی جیب میں اور آدھی ٹرنک میں رکھ چھوڑی۔ کھالے کا تحفہ نظر آیا تو میں نے خنجر بھی اُٹھالیا۔ وہ تقریباً نو انچ پھل والا دو دھاری خنجر تھا جس کا دستہ کلپ لاک والا تھا۔ ہاتھ میں پکڑ کر کلپ چڑھا دیا جاتا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر نہیں سکتا تھا اور نہ ہی چھینا جا سکتا تھا۔ وہ خوبصورت اور نفیس چرمی کور میں لپٹا ہوا تھا اور اُسے باآسانی پنڈلی کے ساتھ تسموں کی مدد سے باندھا جا سکتا تھا۔ میں نے کھالے کو کئی مرتبہ پنڈلی پر باندھتے ہوئے دیکھ رکھا تھا۔ کرکٹ کھیلنے والے جاگر بوٹ پہنے، منہ پر ڈھاٹا باندھنے کے لیے سیاہ پھولدار رصافہ اُٹھایا اور ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لیتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

چاند اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا جب میں دل جیت کی حویلی نما رہائش گاہ کے عقب میں کھڑا ڈھاٹا باندھ رہا تھا۔ اُس سمے میں بھول گیا تھا کہ امیر نواز کون تھا؟ پروین کے ساتھ ہی کیوں غائب ہوا تھا؟ دل جیت کے اثر و رسوخ کی طاقت کیا تھی؟ میں تو بس یہی جانتا تھا کہ مجھے مرنا ہے یا دل جیت سے دریافت کرنا ہے کہ اُس نے پروین کو کس بے غیرت کے حوالے کیا تھا۔ مجھے اِس سے بھی سروکار نہیں تھی کہ میڈم شکیلہ نے سچ کہا تھا یا اُس نے کس برتے پر اتنا بڑا الزام دل جیت پر لگایا تھا۔

میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں تھام لیا، بولٹ کھینچ کر گولی چڑھائی اور حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے پارکنگ کی دیوار سے جھانک کر مزار کے صحن اور ہال کی کھلی ہوئی کھڑکی کا جائزہ لیا۔ نہ کوئی شخص دکھائی دیا اور نہ ہی ہال کی بتیاں روشن تھیں۔ میں ایک مرتبہ پہلے بھی اِس چھت پر چوروں کی طرح چڑھ چکا تھا۔ پہلے ننگے پیر تھا۔ باآسانی چڑھ گیا تھا۔ اب میں نے سپورٹس جوگرز پہن رکھے تھے۔ کچھ دقت ہوئی مگر چڑھ گیا۔ احتیاط سے جھانک کر دیکھا۔ سوئے ہوئے محل میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں کمروں اور برآمدوں کی سانجھی منڈیروں پر چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اِن ہی سیڑھیوں کے نیچے دل جیت کا کمرہ تھا جس میں اس وقت وہ اپنی کسی بیوی کے ساتھ محوِ استراحت تھا۔ اُس کے کمرے کی بتی گل تھی یا زیرو کا بلب روشن تھا جس کی روشنی باہر تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ میں دبے پاؤں سیڑھیاں اُتر کر برآمدے میں آ گیا۔ حویلی تین طرف سے کمروں اور چوتھی جانب سے بڑے ہال سے گھری ہوئی تھی۔ ہال کے ساتھ ہی حویلی سے نکلنے کے لیے بڑا آہنی گیٹ نصب تھا۔

میں اوکھلی میں سر دے چکا تھا۔ سر کو بچانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا اور بجا طور پر میں اِس وقت سوچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ آگ اندھی ہوتی ہے۔ میرے اندر بسیرا کرنے کے بعد اس نے میرے ادراک کی آنکھیں بھی بند کر دی تھیں۔ میں پستول ہاتھ میں لئے دروازے تک پہنچا۔ دھکیل کر دیکھا، میری خوش بختی عروج پر تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑا سا دھکیل کر اندر جھانکا۔ زیرو واٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں جہازی سائز کے بڑے سے بیڈ کے عین وسط میں سائیں دل جیت پہلو کے بل لیٹا دکھائی دیا۔ اُس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ میں بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں سائیں دل جیت کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور ہلکی آواز میں گونجنے والے خراٹے اُس کی گہری نیند کی خبر دے

رہے تھے۔

کمرے کی تعمیر دیہاتی طرز کی تھی جبکہ تزئین جدید خطوط پر کی گئی تھی۔ فرش بہت نرم قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا، چٹخنی چڑھائی اور بیڈ کا چکر کاٹ کر سائیں کے چہرے کے رُخ آن کھڑا ہوا۔ وہ گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ میں تیزی سے بیڈ کے دوسری جانب پہنچا۔ چونکہ میں نے ربر کے سول والے سپورٹس جوگرز پہن رکھے تھے اور فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا، اِس لیے میرے چلنے پھرنے سے مطلق آواز نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے جگانے سے پیشتر اُس کے کمرے کی طائرانہ تلاشی لینا مناسب جانا۔ بیڈ کے برابر دیوار کے ساتھ قالین کے ہم رنگ صوفے پڑے تھے۔ ایک صوفے پر چھوٹے سائز کی سیاہ چمکدار گن پڑی تھی جس میں میگزین چڑھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی ایک ڈائری اور جیبی رومال دھرا تھا۔ شیشے کی چھوٹی سی تپائی پر بوتل اور نقرئی گلاس پڑا تھا۔ بوتل پر غیر ملکی شراب کا لیبل دیکھ کر لمحہ بھر کو میرے دل میں دل جیت شاہ کے لیے کراہت کا جذبہ نمودار ہوا مگر میں نے اپنی توجہ بٹنے نہیں دی۔ گن اُٹھا کر بیڈ کے نیچے رکھ دی تا کہ کسی بھی ناگہانی صورت میں وہ مجھ پر غلبہ پا کر اپنی گن تلاش نہ کر سکے۔

کمرے میں، بیڈ کے عین سامنے والے گوشے میں خوب صورت ٹی وی ٹرالی میں سجا ہوا اکیس انچ کا ٹی وی اور وی سی آر پڑا تھا۔ ٹی وی ٹرالی پر دونوں کے ریموٹ اور اَن گنت وڈیو کیسٹ رکھی تھیں۔ میرے لیے دل جیت کا کا پینا پلانا اور وڈیو دیکھنے کا شوق حیرت کا سبب تھا۔ اُس کا کردار میری نظر میں پہلے ہی مشکوک تھا، آج کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ وہ مذہب اور عقیدے کے نام پر لوگوں کو نہ صرف بے وقوف بناتا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتا تھا۔ ایسے بے ضمیر انسان سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔

لگ بھگ پانچ منٹ کی پُر احتیاط جستجو کے بعد میں دل جیت کے بھاری وجود سے نمٹنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ سانڈ کی طرح پلا ہوا انسان تھا۔ اس کا انگوٹھیوں سے آراستہ دایاں ہاتھ کولھے پر دھرا ہوا تھا جبکہ بایاں ہاتھ سر سیاہ اور چمکدار داڑھی والے چہرے کے نیچے تھا۔ سرہانے کے قریب عمامے دار پگڑی اور تسبیح پڑی تھی۔ نہایت آہستگی سے بیڈ پر چڑھ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ جاگتے ہی مجھے دیکھ کر چیخے گا، اِس لیے میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہی منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ شاید وہ کھینچ لیے جانے پر نہ جاگتا مگر منہ پر ہاتھ کی

موجودگی کے باعث اسے ایک جھٹکا لگا۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں پھرتی سے اُس کے سینے پر چڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے غرغر کی آواز برآمد ہوئی اور مجھے دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں۔ جونہی اُس نے حیرت اور دہشت کا پہلا مرحلہ عبور کیا، میں نے اُس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور ریوالور کی نال اُس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ اس سے پہلے اُس نے میرا ریوالوار والا ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔ خوفناک ہتھیار دیکھ کر اُس کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھٹنے کو آ گئیں۔ اُس نے بولنے کی کوشش کی تو میں نے اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا اور غرا کر کہا، ''ہاتھ اور زبان کو حرکت دو گے تو گولی مار دوں گا۔''

وہ محض گھر گھرا کر رہ گیا۔ وہ بہت بری طرح میرے شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔ اس کی دونوں بانہیں میرے گھٹنوں تلے دبی ہوئی تھیں اور منہ میں پستول کا ایک چوتھائی حصہ دبا ہوا تھا۔ اُس کی زبان بند تھیں، آنکھیں چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھیں کہ میں کون تھا جو رات کے اِس پہر میں اچانک موت بن کر اُس کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے کہا، ''دل جیت! تم مجھے نہیں جانتے ہو، میں جانتا ہوں۔ چالاکی دکھاؤ گے، جھوٹ بولو گے تو گولی چلانے میں دریغ نہیں کروں گا۔ سچ بولو گے تو سانسیں لیتے رہو گے۔''

اس کی گھگھیاہٹ بے معانی تھی۔ میں اُسے اچھی طرح خوف زدہ کر کے اپنے مطلب کی بات کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ جھوٹ نہ بول سکے مگر میری تاخیر نے اُسے سنبھلنے کا موقع دے دیا۔ اچانک ہی وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور اس کے دونوں بازو میرے گھٹنوں تلے سے نکل گئے۔ اس کا ردِعمل میرے لیے غیر متوقع اور اُس کے لیے نہایت خطرناک تھا۔ اس کی اس حرکت سے پستول کا ٹریگر دب سکتا تھا جس کا مطلب اس کی فوری ہلاکت تھی۔ میں نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ اُس کے منہ پر مارا اور پستول والے ہاتھ پر پورا وزن ڈال دیا۔ مارے تکلیف کے اُس کی حالت غیر ہونے لگی۔ گھٹنوں کے نیچے سے نکلنے والے دونوں ہاتھ بے جان سے انداز میں میرے ہاتھ پر آن گرے مگر اُن میں اتنی تاب نہیں تھی کہ میرے ہاتھ کو پکڑ کر باہر کھینچ لیتے۔ میں نے اپنے ہاتھ کی شہادت انگلی اُس کی دائیں آنکھ میں چبھو دی۔ اُس کے پورے بدن کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ میں نے غرا کر کہا، ''اگر تم کوئی بھی حرکت کرو گے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی مار دوں گا.....''

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور اشارے سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس کے

ساتھ ہی اُس کا ہاتھ اپنی چبھی ہوئی آنکھ پر جا ٹکا جس سے پانی نکلنے لگا تھا۔

میں اپنی تمام تر توجہ اُس پر مرکوز رکھتے ہوئے اس کی چھاتی پر سے اُترا اور اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر اُٹھایا تو میں نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن کو عقب سے پکڑ لیا اور کھینچ کر بیڈ میں بٹھا دیا۔ اِسی اثنا میں بجلی کی سی مستعدی سے میں نے اُس کے منہ میں سے پستول نکالا اور کنپٹی پر رکھ دیا۔

میں اُسے حویلی سے باہر لے کر جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اُس پر بے تحاشا تشدد کرنا تھا۔ میڈم کے بقول اُس نے آسانی سے مجھے پروین کے بارے میں نہیں بتانا تھا۔ تشدد کے نتیجے میں اُس کے حلق سے چیخوں کا برآمد ہونا ناگزیر تھا اور اس کی چیخ و پکار سن کر حویلی کے سبھی مکین کمرے کے باہر اکٹھے ہو جاتے۔ نشئی مجاوروں اور گھر والوں کی آمد پر میں بُری طرح پھنس سکتا تھا۔ میں نے شعلہ بار لہجے میں کہا، ''دل جیت! میں تجھے قتل نہیں کرنا چاہتا، کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم بتا دو گے تو زندہ بچ جاؤ گے، نہیں بتاؤ گے تو تیری کھوپڑی میں سوراخ کر کے چلا جاؤں گا۔''

پستول حلق سے نکلنے کے بعد بھی وہ کئی ثانیوں تک اس قابل نہیں ہو پایا تھا کہ بول سکتا۔ وہ کچھ دیر تک 'اوغ، اوغ' کی آوازیں نکالتا رہا، پھر نیم مردہ آواز میں بولا، ''تم کون ہو؟''

میں نے گردن چھوڑ دی اور اپنا بازو اُس کی بغل سے نکال کر چھاتی پر پھیلا لیا۔ اب وہ پوری طرح میرے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔ اس کے آرام طلب اور غیر ورزشی وجود پر چھایا ہوا نیم خوابیدگی اور خوف کا اثر میری معاونت کر رہا تھا۔ میں نے کہا، ''چلو! حویلی سے باہر چلو۔ تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔ چلو!''

میں نے دانستہ اپنی آواز خاصی پست رکھی ہوئی تھی تاکہ میری آواز کمرے سے باہر نہ نکل سکے اور کسی سوئے ہوئے کو بیدار کر سکے۔

وہ میری توقع کے برعکس بزدل ثابت ہوا تھا۔ ہتھیلیوں کے بل گھسٹ کر بیڈ سے اُترا اور میرے دھکیلنے پر نڈھال قدموں سے دروازے کی طرف چل دیا۔ اُس نے ایک لمحے کو صوفے کی طرف دیکھا تھا۔ میرے خیال میں صوفے پر گن کی عدم موجودگی نے اُس کی رہی سہی سکت بھی ختم کر دی تھی۔ ''چٹخنی کھولو..... اور ہاں! اگر کسی کو جگانے کی کوشش کی، منہ سے آواز نکالی تو پھر پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''اچھا!'' اُس کے حلق سے کراہ سی برآمد ہوئی اور اس نے بلا چوں چرا میری ہدایت پر عمل کیا۔ چند لمحوں کے بعد ہم برآمدے سے گزر کر صحن میں پہنچ گئے۔ میں اُس پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اطراف پر بھی تیکھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ کسی پل کچھ بھی ہوسکتا تھا اور میں اپنی کامیابی کو موت آ گیں ناکامی میں تبدیل ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے میری توقع کے مطابق کوئی مزاحمت نہیں کی اور ننگے پاؤں آہستہ آہستہ چلتا ہوا گیٹ تک پہنچا۔ میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا، ''کوئی آواز پیدا کیے بغیر گیٹ کھولو.....''

اُس نے کانپتے ہاتھوں سے چٹخنی کھولی۔ گیٹ کے کنڈے میں گریس یا تیل ڈالا ہوا تھا کیونکہ بہت ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اُس کے کندھوں کے اوپر سے مزار کی طرف دیکھا۔ کوئی مجاور دکھائی نہیں دیا۔ سب کسی کونے کھدرے میں پڑے خراٹے مار رہے ہوں گے۔ صحن خالی تھا۔ آہستگی سے مین گیٹ بند کرنے کے بعد میں اُسے لیے ہال کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پارکنگ کی طرف بڑھا۔ پارکنگ میں داخل ہونے کی بجائے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اِس وقت میرا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اِس جنگلی بلے کو کہاں لے جا کر پوچھ گچھ کی جائے۔ فوری طور پر اپنے ڈیرے کا خیال آیا۔ وہ رات کو خالی ہوتا تھا۔ اریب قریب کوئی اور ڈیرہ نہیں تھا۔ میں بڑی آسانی کے ساتھ اپنا کام مکمل کر سکتا تھا۔ اُسے اپنے ڈیرے پر لے جانے میں محض یہی قباحت تھی کہ ڈیرہ یہاں سے خاصا دور تھا۔ وہاں جانے کے سوا کوئی چارہ نہ پا کر میں نے اُسے مزار کے بیرونی اَدھ کھلے گیٹ سے دھکیل کر نکالا اور جنوبی سمت میں پگڈنڈی پر ہانکنا شروع کر دیا۔

اُس کی کمر اپنے سینے سے چمٹائے پیدل چلنے کی وجہ سے میں اب تھکنے لگا تھا۔ میں نے اُسے روک کر اپنا بازو کھینچ لیا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال اُس کی کمر سے لگا دی۔ میں اپنے مشن میں آدھی کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ آدھی کے حصول کے لیے میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اُسے ہانکتے ہوئے اپنے ڈیرے پر پہنچا۔ اندھیرے میں، پگڈنڈی پر چلتے، گرتے پڑتے سائیں دل جیت کی حالت مزید دگرگوں ہوگئی تھی اور وہ ہانپنے لگا تھا۔ اُس نے راستے میں ایک دو مرتبہ کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر میں نے جھڑک کر خاموش کرا دیا تھا۔

ڈیرے پر رات کو سوائے مال مویشیوں اور اپنے پالتو کتوں کے، کوئی نہیں ہوتا تھا۔ بھانے

میں اندھیرے کا راج تھا۔ وہاں دیوار کے جالے میں لالٹین اور ماچس پڑی تھی مگر میں دل جیت کی موجودگی میں لالٹین جلانے کی مہلت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ بکریوں کے لیے تیار کیے گئے چھپر پر نظر جا ٹھہری۔ وہاں بھی اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے دل جیت کو اس سمت چلنے کا حکم دیا۔ وہ چند قدم چلا، پھر نہایت غیر متوقع طور پر رُکا اور میرے سمجھنے سوچنے سے پیشتر ساعت بھر میں لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اُس کا دایاں پیر سیدھا پستول کو لگا اور پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ناہموار جگہ پر گر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اُس نے میری غفلت سے بھرپور فائدہ اُٹھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اور اُس کی اگلی حرکت پر نظریں جماتا، ایک زوردار مکا میری کنپٹی پر پڑا۔ میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکا ہوا اور میں لڑکھڑا کر پہلے آگے کی سمت بڑھا پھر کمر کے بل زمین پر جا گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ میری طرف بڑھنے کی بجائے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی مگر میرا سر بُری طرح چکرا گیا اور میں پھر گرا۔ دوسری مرتبہ بھی میں نے اپنی تمام تر توانائی بروئے کار لائی اور کھڑا ہو گیا۔ وہ ناپختہ زمین پر اندھیرے میں اپنی بانہیں پھیلائے پستول تلاش کر رہا تھا۔

میری قسمت میرا ساتھ دے گئی تھی وگرنہ اُس کا وار بڑا خطرناک تھا۔ میں فضا میں اُچھلا اور پورے وزن کے ساتھ اُس پر جا گرا۔ وہ میرے نیچے دب کر زمین پر لم لیٹ ہو گیا۔ میں نے پستول کی پروا کیے بغیر اُس پر مکوں کی بوچھاڑ کر دی۔ منہ، سر، کنپٹی..... مجھے کوئی امتیاز نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کے منہ سے ہلکی چیخیں برآمد ہونے لگیں تو میں نے ہاتھ روک لیا اور کسی خونخوار درندے کی طرح اُس کی بائیں آنکھ میں دونوں انگلیاں گھسیڑ دیں۔ اُس کے منہ سے چیخ نکلی، پھر دوسری چیخ..... پھر وہ بُری طرح سر جھٹکنے لگا۔ اس کی آنکھ کا ڈیلا میری ٹیڑھی انگلیوں میں پوری قوت سے جکڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا تو وہ تڑپ کر اُٹھا۔ میں کمر کے بل زمین پر گرا۔ اُس کی بائیں آنکھ کا ڈیلا میری ہاتھ میں تھا جسے میں نے ایک جھٹکے سے پرے پھینک دیا۔ اُسے دیکھا تو وہ دونوں ہاتھ اپنی آنکھ پر سختی سے رکھے بُری طرح تڑپ رہا تھا اور اُس کے منہ سے مسلسل کراہیں اور گالیاں نکل رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی اردگرد دیکھا۔ مجھے اندھیرے کی وجہ سے پستول دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اُس پر چار حرف بھیجے اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر کھینچ لیا۔ وہ بڑا خطرناک انسان تھا۔ میں

نے اُس کی موقع فہمی اور چالاکی کو بزدلی قرار دیا تھا۔ اگر قسمت میرا ساتھ نہ دیتی تو اِس وقت بازی پلٹ چکی ہوتی اور میں اُس کے رحم وکرم پر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔

خنجر ہاتھ میں آتے ہی میں نے دستے کی پن لاک لگا دی تاکہ وہ میرے ہاتھ سے پستول کی طرح چھوٹ کر اندھیرے کی نذر نہ ہو جائے۔ اُس کے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے وجود کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے پالتو کتے جاگ کر ہمارے قریب آ کر بھونکنے لگے تھے۔ میں نے اُنہیں پچکار کر بھگا دیا۔ وہ میری آواز پہچان کر دم ہلاتے ہوئے دور جانے کی بجائے میرے قریب ہو گئے۔ میں نے دل جیت کو دو تین ٹھڈے مارے پھر بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بکریوں کے چھپر کی طرف بڑھا۔ کتے تجسس بھرے انداز میں اُس کے دائیں بائیں سونگھتے ہوئے چھپر تک چلے آئے۔ چھپر تلے اندھیرا تھا مگر اتنا گہرا نہیں تھا کہ سرے سے کچھ دکھائی نہ دیتا۔

سائیں دل جیت خاصا وزنی تھا۔ میں نے اُسے بدقت تمام اُسے دیوار کی جڑ میں لا پھینکا۔ اپنی سانسیں برابر کرتے ہوئے اُس کے آنکھوں پر دھرے ہوئے ہاتھوں پر لات ماری تو وہ بلبلا اُٹھا۔ قدرے چیختی ہوئی آواز میں بولا، ''تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا.....''

اُس کے منہ سے غلیظ مغلظات کی قے برآمد ہوئی تو میں خود پر قابو نہیں رکھ پایا اور میں نے آن کی آن میں خنجر کے چرکوں سے اُسے لہو میں نہلا کر رکھ دیا۔ کتے خون کی بُو پر بھڑک اُٹھے۔ ایک نے دل جیت پر چھلانگ لگائی تو میں نے اُسے لات مار کر پرے پھینکا اور گھٹنوں کے بل دل جیت کے سامنے بیٹھ گیا۔ خنجر کا چمکدار پھل دل جیت کی دائیں آنکھ کے قریب لہرا کر کہا، ''دل جیت! میں نے تمہیں کہا تھا کہ چالاکی کرو گے تو رعایت نہیں کروں گا۔ تم نے میری بات نہیں مانی اور ایک آنکھ گنوا لی۔''

میں سانس لینے کو رُکا، پھر غرایا، ''تم بے غیرت اور کمینے انسان ہو۔ اپنی دوسری اور اکلوتی آنکھ بھی گنوا بیٹھو گے۔''

اُس کا جسم مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔ اُس کے چہرے کے خطوط دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اُن پر طاری دہشت اُس کے بدن اور آواز کی غیر معمولی لرزش سے عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر تکلیف کی شدت سے 'ہائے' نکل گئی۔ میں نے اپنے

لہجے میں بے تحاشا سنگینی پروتے ہوئے کہا، ''دل جیت! پروین کہاں ہے؟''

یکبارگی اُس کا سر اُٹھا۔ چیخا، ''کون پروین..... تم کون ہو؟ تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے، کیوں میری جان کے دشمن بنے ہو؟''

میں نے جواب دینے کی بجائے خنجر اُس کی ران میں گھونپ دیا۔ اُس کے منہ سے تیز چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے خنجر والا ہاتھ اُس کی اکلوتی آنکھ کے سامنے ہوا میں معلق کر دیا، کہا، ''دل جیت! کوئی دوسری بات نہ کرو، جو پوچھ رہا ہوں، اُس کا جواب دو۔ پروین کہاں ہے؟''

''میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔'' اُس نے ہچکیوں کے درمیان دانت پیس کر کہا، ''تم موت کو آواز دے چکے ہو۔ تم مجھے نہیں.....''

میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور خنجر بجلی کی طرح کوند کر اس کی دوسری ران میں کھب گیا۔ اس کے حلق سے بڑی دردناک مگر پھٹی پھٹی آواز نکلی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کم بخت دیکھنے میں بہت نازک بدن تھا مگر حقیقت میں بہت سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس نے بے ہوش ہونے میں خاصی دیر کی تھی وگرنہ جونہی اُس کی آنکھ سے خون کی دھار پھوٹی تھی، بے ہوش ہو کر گر گیا ہوتا۔

بکریوں میں اضطراب پھیل گیا تھا۔ آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگی تھیں اور نیچی آواز میں احتجاج کرنے لگی تھیں۔

میں نے اس کی زخمی آنکھ میں انگلی ماری۔ انگلی خون سے لتھڑ گئی مگر اُس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ مجھے اس کی بے ہوشی کا یقین ہو گیا۔ کتے اُس جگہ پر سر جھکائے کھڑے تھے جہاں میں نے دل جیت کی آنکھ زخمی کی تھی۔ مجھے دیکھے بغیر علم ہو گیا تھا کہ وہ زمین پر پڑے ہوئے اُس کے خون کو چاٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں اُٹھا اور بھانے میں گیا۔ جالے میں رکھی ہوئی کیروسین آئل (مٹی کے تیل) والی لالٹین اور ماچس، مخصوص گوشے میں رکھی ہوئی پانی کی بالٹی اُٹھا لایا۔ بکریوں والے چھپر میں پہنچ کر لالٹین روشن کی اور چھپر کی چھت میں لٹکا دی۔ اب دل جیت کا چہرا دکھائی دینے لگا تھا۔ اُس کا آدھا چہرہ اور سیاہ داڑھی خون میں تر تھی جبکہ آدھے چہرے پر پیلاہٹ ثبت تھی۔ میں نے بالٹی کے پانی سے اُس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ میں تادیر یہی ورزش کرتا رہا۔ بالآخر اُسے ہوش آ گیا اور وہ اپنی اکلوتی آنکھ میں حیرت اور خوف کی پرچھائیاں سمیٹے مجھے دیکھنے لگا۔ میرا چہرہ ڈھاٹے میں

چھپا ہوا تھا۔ اگر نہ بھی چھپا ہوتا تب بھی اُسے دکھائی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ لالٹین میرے عقب میں روشن تھی۔

''تم کون ہو؟'' اُس کی مریل سی آواز سنائی دی۔

''میں تمہاری موت ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا، ''بتاؤ، پروین کہاں ہے؟''

ہوش میں آتے ہی تکلیف کی شدت سے اُس کا چہرہ مسخ ہونے لگا تھا۔ میرا سوال سن کر جیسے اُسے ہوش آ گیا ہو، سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا، ''میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔''

میڈم نے بالکل درست کہا تھا۔ وہ ٹیڑھی انگلیوں سے نکلنے والی کھیر تھی۔ میں اپنی انگلیاں ٹیڑھی کر چکا تھا مگر وہ نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے قصائیوں کے سے انداز میں خنجر والا ہاتھ جھٹکا اور اُس کا بایاں کان اُڑا دیا۔ وہ بلبلا اُٹھا اور کان پر ہاتھ رکھ کر پھر جھٹکے لینے لگا۔ ایسے میں اُس کے دریدہ جسم میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت عود کر آئی کہ اُس نے مجھ پر بجلی کی سی سرعت سے حملہ کر دیا۔ اُس کا دو ہتھڑ میرے سینے پر پڑا اور میں پیچھے جا گرا۔ اگر میں نے خنجر کی پن لاک نہ لگائی ہوتی تو خنجر میرے ہاتھ سے یقیناً چھوٹ گیا ہوتا۔ وہ کسی سانڈ کی طرح اینڈتا ہوا میری چھاتی پر آن بیٹھا اور اس نے میرے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ اُس کی گرفت میں بلا کی طاقت تھی اور مجھے ایک لمحے میں ہی اندازہ ہو گیا کہ میں اپنی تمام تر طاقت بروئے کار لا کر بھی اُس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا نہیں سکتا تھا۔

میں نے اُس کے پہلو میں، چھاتی اور چہرے پر ان گنت مکے مارے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ پوری قوت سے میرے ہاتھ سے خنجر چھیننے کی تگ و دو میں مصروف رہا۔ میری لاپروائی اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بدولت وہ مجھ پر بھاری پڑ گیا تھا۔ میں اپنے جوش و جنوں اور جلد بازی میں مات کھا چکا تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے پوری قوت مکے میں سموتے ہوئے اُس کی زخمی آنکھ پر وار کیا۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی۔ اس کا دایاں ہاتھ آنکھ پر جا ٹکا، میں نے دوسرا مکا ہاتھ کی پشت پر جڑ دیا۔ وہ بلبلا کر میرے چہرے پر آن گرا۔ میں نے دونوں گھٹنے اُس کی پشت کے نیچے زور سے مارے۔ وہ میرے سر سے ہوتا ہوا زمین پر جا گرا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور میں نے اُسے اُٹھنے کا موقع دیے بغیر ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ زیادہ دیر تک اڑا نہیں رہ سکا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی بے ہوشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں لالٹین اُٹھا کر کتوں کے پاس پہنچا۔ کچھ فاصلے پر گوبر کی پاتھیوں کے بیچ پستول پڑا مل گیا۔ میں نے اُٹھا

کر جیب میں ڈال لیا اور کتوں پر نظر ڈالتا ہوا چھپر میں آ گیا۔ وہ ہنوز ساکت پڑا تھا۔

وہ جسیم، قوی الاعضاء اور اَدھیڑ عمر انسان تھا۔ بگڑتا تھا تو بڑی مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ میں نے ایک بکری کے گلے سے رسی نکالی اور اُس کے دونوں ہاتھ اُس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ سیدھا کیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اب کے اُس نے ہوش میں آنے میں زیادہ دیر نہیں کی بلکہ ہوش میں آتے ہی نان اسٹاپ گالیاں دینا شروع کر دیں۔ میں نے اُسے ڈرانے کے لیے آنکھ کے سامنے خنجر لہرایا، وہ بڑی مکروہ چیخ حلق سے نکال کر بولا، ''کتے کے بچے! میں کسی پروین کو نہیں جانتا۔''

ایک لمحے کو میرا یقین متزلزل ہوا۔ اس کے لہجے نے چغلی کھائی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے وگرنہ اِس حالت میں پہنچ کر جان بچانے پر پروین کے اخفا کو ترجیح نہ دیتا۔ پھر میڈم کی بات یاد آ گئی۔ میں نے دانت پیس کر کہا، ''اب بھی تمہاری جان بخش سکتا ہوں اگر تم بتا دو کہ پروین کہاں ہے؟''

میری آواز میں آگ کی تمام تر لپٹیں سمٹ آئی تھیں۔ اس نے کچھ کہے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اُس کا دوسرا کان کاٹ دیا۔ اس کے حلق سے نہایت ہلکی سی چیخ نکلی۔ جسم نے کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے ناک کی پھنگنی کاٹ دی، پھر خنجر کی خون آلود نوک اُس کی زندہ آنکھ کے ابرو پر رکھ دی، سپاٹ لہجے میں کہا، ''دل جیت! آخری موقع دے رہا ہوں، پھر تم ہمیشہ کے لیے دنیا کو دیکھنے سے محروم ہو جاؤ گے۔''

اس کے کندھے ہلے۔ شاید ہاتھوں کو حرکت دینا چاہتا تھا مگر بندھے ہونے کی وجہ سے بے بسی سے کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ جونہی میں نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا، وہ کراہا، ''بتاتا ہوں..... مم..... مگر تم کون ہو؟''

میرا اُٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ساکت ہو گیا۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا، ''بتاؤ ورنہ.....''

''مم..... مم جان..... تم شہرے ہو..... پروین کے بھائی..... ہاں!'' اس کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ بولا، ''پروین کے بھائی ہو..... میں جان گیا..... مگر پروین کا مجھے پتہ نہیں..... مجھے مت مارو..... میں کچھ نہیں جانتا.....''

میں ٹھٹھک گیا۔ وہ اگر کچھ نہیں جانتا تھا تو میں بہت بڑا جرم کر چکا تھا۔ میں اپنی واپسی کی راہ مسدود کر چکا تھا۔ وہ نور پور میں جاتے ہی میرا خاندان سولی پر لٹکا دیتا۔ بھیانک سوچوں کی

لحاتی یلغار نے مجھے سمجھا دیا کہ دل جیت کی زندگی میری موت تھی۔ ایک قبر کا منہ کھل گیا تھا۔ میں اُس میں دفن ہوتا یا دل جیت.....

فرطِ غیظ سے میری آواز لرز اُٹھی، ''تو ٹھیک ہے دل جیت..... تم اگر پروین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو تو اوپر جاؤ۔ خدا حافظ! میں پروین کو زمین پر ڈھونڈتا ہوں۔''

میں نے اُس کی کٹی ہوئی ناک پر ہاتھ رکھا اور اوپر کی طرف کھینچا۔ گردن کھنچ گئی اور میرا خنجر اُس کی گردن پر ٹک گیا۔ وہ چیخا، ''خدا کے لیے..... مجھے مت مارو..... میں بتاتا ہوں۔''

''اب تم بتاؤ یا نہ بتاؤ..... مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔''

وہ چیخا، ''تم پروین تک کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے۔''

میرا خنجر پر دباؤ بڑھا اور دانتوں کی کڑکڑاہٹ گونجی۔ ایسے ہی وقت میں دل جیت کی اکڑے ہوئے منہ سے خرخراہٹ برآمد ہوئی، ''وہ حیدر خان کے پاس ہے.....''

جونہی اُس کے منہ سے حیدر خان کا نام برآمد ہوا، میری دھڑکن جیسے پسلیوں میں ہی کہیں دب کر رہ گئی تھی۔ میڈم نے سب سے پہلا نام اُسی کا لیا تھا۔ اِس کا مطلب ہے وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔

''امیر نواز؟''

اس کی اکلوتی آنکھ میں بے بسی رچ گئی۔ نفی میں سر ہلایا۔

''تم نے پروین کو کیسے اغوا کیا؟''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے خنجر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا مگر اُس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی نبض چیک کی۔ بہت کمزور تھی۔ میں اُس سے اور بھی باتیں پوچھنا چاہتا تھا مگر میڈم شکیلہ نے کہا تھا کہ میرا کام اُس کے حلق سے اُس شخص کا نام اگلوانا تھا جس کے حوالے اُس نے پروین کو کیا تھا۔ وہ پتہ چل گیا تھا۔

میں نے ہاتھ اُٹھا لیا۔ اَب اُسے ٹھکانے لگانے کا کام باقی تھا۔ میں جذباتی کیفیت میں بلا سوچے سمجھے اُس پر جا پڑا تھا۔ آگے کیا کرنا ہے؟ یہ سوچا نہیں تھا۔ اب جب وہ بے حس و حرکت میرے سامنے پڑا تھا، میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میرے پاس ابھی دو گھنٹوں کی مہلت باقی تھی۔ میں نے تنکے کی ٹونٹی سے

منہ لگا کر پانی پیا اور چھپر کے باہر ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ایک بار جی میں آئی کہ میں دل جیت کو گھسیٹتا ہوا بخت خان کے پاس لے جاؤں اور چیخ چیخ کر پورے نور پور کو جگا دوں۔ سب کو بتاؤں کہ جس شخص کو انہوں نے دیوتا بنا رکھا تھا وہ کتنا ذلیل اور بے غیرت تھا۔ بخت خان کو ساتھ لے کر اُسے تھانے دے آتا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔

شاید میں ایسا ہی کرتا مگر ایک زہر خند خیال نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ اگر یہ سانپ نور پور میں داخل ہوتے ہی اپنی کینچلی میں لوٹ جاتا اور میری باتوں کو جھٹلا دیتا تو میرا کیا بنتا؟ میری بات پر سوائے ڈاکٹر شاہ جی کے کوئی اعتبار تک نہ کرتا۔ میں نہ صرف تھانے کی سیر کرتا بلکہ میرے پچھلے دل جیت کے عتاب کا شکار ہو کر کہیں کے نہ رہتے۔ میں پروین کو حاصل کرنے کی بجائے سالوں دور ہو جاتا۔ جب تک میں جیل سے رہائی پا کر آتا، وہ مٹی میں مل چکی ہوتی یا اپنی موت آپ مر گئی ہوتی۔

میں اپنی لگائی ہوئی آگ میں گھر گیا تھا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ دل جیت سے پروین کے بارے معلومات لینے کے بعد اُس کا کیا کروں گا؟

میرے اردگرد میرے کتے اچھل کود رہے تھے۔ دل جیت کو اگر زمین میں دباتا تو کتوں نے صبح دم میرا راز فاش کر دینا تھا۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں اچھل پڑا۔ میرے ڈیرے کے پچھواڑے میں بالن (لکڑیوں کا ایندھن) کا بہت بڑا ڈھیر پڑا تھا۔ چھ ماہ قبل اپنے رقبے کے درختوں کی چھنگائی کر کے یہاں لکڑیاں ڈھیر کر دی گئی تھیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ تین چار ٹرکوں کا مال تھا۔ میرے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے دل جیت کو ٹھکانے لگانے کا محفوظ ترین طریقہ سوچ لیا تھا۔

مجھے خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا تھا۔ میں نے بے ہوش دل جیت کو اپنی پوری قوت صرف کر کے کمر پر اُٹھایا اور نپے تلے انداز میں چلتا ہوا پچھواڑے پہنچا۔ اُسے ڈھیر کے وسط میں پہنچانا بہت مشکل تھا۔ اُسے ڈھیر پر ایک طرف ڈال کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کھینچ کر وہاں تک لے گیا جہاں تک لکڑیوں کے ڈھیر کے اوپر لے جا سکتا تھا۔ اُس کے بعد میں نے خنجر سے اُس کی شہ رگ کاٹ دی۔ اس کی گردن سے خون کا فوارا اُبلا اور فضا میں خوفناک خرخراہٹ گونجی۔ میں نے فی الفور ڈھیر پر سے چھلانگ لگا دی تھی وگرنہ میرا منہ سر خون سے لتھڑ جاتے۔ وہ تین چار منٹ تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ اِس دوران میں نے بہت سی لکڑیاں اُس پر ڈال

دیں۔ آنے والے دس پندرہ منٹوں میں میں نے اُس کے مردہ بدن پر کم وبیش سات آٹھ من بالن ڈال دیا۔

بھانے میں سے کسی اُٹھائی۔ زمین پر جہاں جہاں اُس کا خون گرا تھا، اُٹھایا اور لکڑیوں کے ڈھیر پر لا پھینکا۔ اُس کی آنکھ کے ڈیلے کو تلاش کیا۔ وہ وہاں نہیں تھا، جہاں میں نے پھینکا تھا۔ اردگرد دیکھا۔ دکھائی نہیں دیا تو اندازہ کیا کہ اُسے کتے نگل گئے ہوں گے۔ سائیں دل جیت کو گھسیٹنے کے نشانات پھاوڑے کی مدد سے منہدم کیے۔ لالٹین اور بھانے میں رکھا ہوا چاچے چراغ کا حقہ اٹھایا اور پچھواڑے آ گیا۔ لکڑیوں کے ڈھیر کے اطراف میں خاصا دور دور تک سوکھے پتوں کا قالین بچھا ہوا تھا۔ میں نے دیوار کی جڑ کے ساتھ حقہ اِس طرح زمین پر لٹایا کہ اُس کی چلم زمین پر گر گئی۔ اُس میں بجھے ہوئے کوئلے پتوں کے فرش پر پھیل گئے۔ میں نے لالٹین کی تیل والی ٹینکی کا سالخوردہ ڈھکن کھولا، مٹی کے تیل کی ایک دھار چلم سے نکلے ہوئے کوئلوں سے شروع کی اور دل جیت کے لکڑیوں میں دبے ہوئے جسم تک لے گیا۔ لالٹین کی ٹینکی خالی ہوگئی۔ میں جلدی سے بھانے میں رکھی ہوئی مٹی کے تیل والی چھوٹی کین اُٹھا لایا۔ بغیر کوئی وقت ضائع کیے بڑی چابکدستی اور مہارت سے لکڑیوں کے ڈھیر پر اِس طرح تیل چھڑکا کہ دل جیت کا نام ونشان تک باقی نہ رہے۔

میرا خنجر، لباس اور سپورٹس جوگرز خون سے تر تھے۔ بھانے میں پڑا ہوا اپنا کام کاج والا لباس اور سوفٹی چپل پہنی اور خون سے لتھڑی ہوئی تمام اشیاء کو لکڑیوں کے ڈھیر پر اُچھال دیا۔ دیوار کی جڑ میں بیٹھے ہوئے کتے میری حرکات وسکنات کو بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اُن کا مالک رات کی تاریکی میں کیا کارنامہ سرانجام دینے جا رہا ہے۔

جب مجھے پوری طرح تسلی ہوئی کہ میں نے دل جیت کے قتل کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تو میں نے حقے کی چلم کے پاس دیا سلائی کا ننھا سا شعلہ چھوڑ دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کے ڈھیر کی طرف لپکا۔ میں تیل کی کین، لالٹین اور ماچس اُٹھائے بھانے میں لوٹ آیا۔ ہر چیز کو اُس کی جگہ پر رکھنے سے پیشتر میں نے تنقیدی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ سب کچھ اوکے تھا۔ دل مطمئن ہوا تو میں نے پچھواڑے میں جھانکا۔ آگ بڑی تیزی سے پھیل چکی تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ آن کی آن میں شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ ممکن تھا کہ نور پور جاگ جاتا اور ادھر متوجہ ہو جاتا اِس لیے فوراً یہاں سے نکل جانا مناسب جانا۔

میں ابھی گھر جانے والی پگڈنڈی پر ہی پہنچا تھا کہ میرے عقب میں تڑتڑاہٹ کی ڈراؤنی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو عجیب منظر دکھائی دیا۔ آسمان کی طرف لپکتے ہوئے بڑے بڑے شعلوں نے پورے ماحول کو منور کر دیا تھا۔ دل کی تیز دھڑکن کو قدرے تقویت ملی اور میرے قدموں کی حرکت تیز ہوگئی۔ ابھی میں نور پور میں داخل نہیں ہوا تھا کہ گھروں کی بتیاں روشن ہونے لگ گئی تھیں۔ یعنی لوگ جاگ رہے تھے۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔ میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں میں شور وغوغا بلند ہوگیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں بھاگوں تو بھی لوگوں کے نور پور سے نکلنے سے پیشتر اپنے گھر تک نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کچھ سوچ کر میں ایک گھنے درخت پر بندر کی سی پھرتی سے چڑھ کر چھپ گیا۔ عافیت کی ایک صورت ہی بچی تھی کہ جب لوگ دوڑتے ہوئے ڈیرے کی طرف آئیں تو میں ان میں کسی طرح شامل ہو جاؤں۔

لوگوں نے نور پور سے نکلنے میں میرے اندازے سے کہیں زیادہ دیر لگائی تھی۔ مجھے سائیں کے مزار کی طرف سے آتی ہوئی پہلی ٹولی دکھائی دی، تب تک مجھے درخت کے پتوں میں چھپے ہوئے نصف گھنٹہ بیت چکا تھا۔ مجھے افسوس ہوا۔ اگر میں نہ رکتا تو پانچ سات منٹ میں اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ انتظار کے اِس طویل وقت میں میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحتیں عود کر آئی تھیں اور سینے میں جلتی ہوئی آگ پر اندیشوں اور تفکرات کی اوس پڑنے لگی تھی۔ میں بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اگر کسی صورت دل جیت کے قتل کا انکشاف ہو جائے تو کیا میں بچ جاؤں گا؟ کیا آگ دل جیت کے وجود کے ساتھ ساتھ اُس کے نام و مقام کو بھی نگل لے گی؟

جونہی چاچا چراغ اور اس کے پیچھے دس بارہ آدمیوں پر مشتمل ٹولی درخت کے نیچے سے گزری، پیچھے راستہ صاف دکھائی دیا تو میں فوراً درخت سے اُتر آیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کی عقبی کھڑکی والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔ سائیں دل جیت کا مزار اور حویلی خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دی۔ کچھ عرصہ قبل اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ حویلی کے مکین دن چڑھنے سے پیشتر جاگنے کے عادی نہیں تھے۔ آج بھی اُسی معمول کے مطابق جاگیں گے اور جب تک دل جیت کی راکھ ہوا میں اُڑ چکی ہوگی، تب تک اُس کی عدم موجودگی کا علم نہیں ہو پائے گا۔

اپنے پچھواڑے کے جوہڑ پر پہنچا تو مسجد کی جانب سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ دوسری ٹولی میرے ڈیرے کی طرف جانے کے لیے تیار تھی۔ مجھے یہ بھروسہ تھا کہ نور پور کے لوگ بالن کو لگی ہوئی آگ بجھانے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ وہ اردگرد سے پتے ہٹا کر آگ کو بھانے کی طرف جانے سے روکنے پر اپنی توجہ دیں گے۔ بالن گاؤں والوں کے نزدیک قیمتی نہیں تھا۔ بارہا خشک بالن کی آتش زدگی کے واقعات نور پور میں رونما ہوئے تھے۔ لوگ آگ بجھانے کی بجائے آگ کے پھیلاؤ کو روک کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ خاص تکنیک سے کھڑکی کی اندر کنڈی میں پھنسی ہوئی سلاخ نکالتے ہوئے میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ لوگ بھانے، چھپر اور ڈیرے کے ناہموار صحن میں خوب چلیں پھریں تاکہ اگر دل جیت اور میری وہاں موجودگی کا کوئی مظاہر میری نظروں سے چھپا رہ گیا ہو تو وہ بھی روندا جائے۔

گھر والے جاگ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر اُنہیں حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میرا اُن سے پہلے جاگنا، باہر جانا اور کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہونا معمول کی بات تھی۔ شانو نے مجھے دیکھ کر ارادتاً نظر انداز کر دیا۔ چاچی کا رویہ بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں ان کے پاس رُکے بغیر سیدھا اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ چاچی کی قدرے پریشان آواز سنائی دی، ''شہرے! آگ اپنے ڈیرے پر لگی ہے ناں؟''

میں نے عقبی چار دیواری کے اوپر دھوئیں کے بڑے مرغولوں اور شعلوں کو دیکھ کر کہا، ''ہاں چاچی! میں ادھر جانے ہی لگا تھا کہ چاچے کو افسر علی وغیرہ کے ساتھ جاتا ہوا دیکھ کر پلٹ آیا۔''

شانو نے سر جھکا کر ہولے سے کہا، ''ماں! اسے آگ سے کیا، اس کا تو اندر ہی بجھا ہوا ہے۔''

میں نے ایک نگہ شکایت اُس پر ڈالی۔ پژمردگی کے عالم میں میں نے انہیں بتایا کہ میں پروین کی تلاش میں مظفر گڑھ جا رہا ہوں۔ اُنہوں نے مجھ سے یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ مجھے مظفر گڑھ میں پروین کی موجودگی کا شک کیوں گزرا تھا یا کون سا کلیو ہاتھ لگا تھا کہ صبح دم ڈیرے پر بھڑک اُٹھنے والی آگ پر قابو پائے بنا نور پور سے نکلنا چاہ رہا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر پستول نکالا اور اسے چھت میں موجود ایک خفیہ جگہ پر ٹھکانے لگایا۔ چوبی شہتیر کے اوپر کی جانب قدرتی طور پر ایک بڑی سی کھوہ بنی ہوئی تھی۔ ایک خاص انداز سے ہاتھ ڈال کر وہاں چیز رکھی اور اُٹھائی جا سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے علاوہ نہ تو

کسی کو اُس کھوہ کی موجودگی کا علم ہو سکتا تھا اور نہ ہی کوئی اُس میں رکھی ہوئی شئے کو نکال سکتا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ اور چہرہ اپنے اُتار کر بالن پر پھینکے ہوئے لباس سے پونچھا تھا۔ ہلکے ہلکے داغ باقی تھے جو صبح کے ملگجے اندھیرے میں واضح دکھائی دینے لگے تھے۔ میں تولیہ اُٹھائے غسل خانے میں گھس گیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ناشتہ کئے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں جلد از جلد ملتان پہنچنا چاہتا تھا تاکہ میڈم شکیلہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اُس کو فی الفور اپنی کارگزاری سے مطلع کروں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کیا تھا، یہ بے چینی اور اضطراب بھی نور پور کی حدود سے جلد از جلد نکل جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ چونکہ کھالا موجود نہیں تھا، اِس لیے ویگن عزت خان ڈرائیور شام کو قریشی موڑ لے گیا ہوگا۔ اُس کی آمد میں ابھی کافی دیر تھی۔ اتنی صبح سوائے گوالوں کی سائیکلوں کے کوئی سواری دستیاب نہیں ہو سکتی تھی اور میں اِسی لالچ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نور پور کی حدود سے نکل آیا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ انور دودھی کا ریہڑا آتے دیکھا۔ اس کے پاس چونکہ زیادہ مقدار میں دودھ اکٹھا ہوتا تھا، اِس لیے وہ سائیکل کی بجائے اپنے دبلے پتلے گھوڑے والے ریہڑے پر نور پور اور نواحی بستیوں میں سے دودھ اکٹھا کیا کرتا تھا۔ میں اچھل کر ریہڑے پر چڑھ گیا۔ وہ بولا، ''شہرے خان! دھمی ویلے کتھ نکتا ویندیں؟''

(شہرے خان! صبح صبح کہاں نکل کھڑے ہوئے؟)

میں نے جھوٹ بول دیا کہ میں قریشی موڑ پر ویگن کے ڈرائیور عزت خان کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ گھوڑا ریہڑا اپنی مخصوص اسپیڈ سے چلتا ہوا نوری چوک پہنچا۔ انور دودھی نے کہا، ''مجھے یہاں کچھ دیر لگے گی۔ اگر چاہو تو بیٹھے رہو، چاہو تو کسی ویگن پر بیٹھ جاؤ۔''

محمود کوٹ اور کوٹ ادو سے آنے والی ویگنیں نوری چوک سے سواریاں اُٹھا لیتی تھیں۔ میں ریہڑے سے اُتر گیا۔ کچھ دیر کا انتظار سود مند رہا۔ انور دودھی کا ریہڑا ہوٹل پر کھڑا رہا اور میں ایک ویگن کے پائیدان پر چڑھ کر قریشی موڑ سدھار گیا۔ اپنے تئیں میں خطرات کی لپک سے محفوظ ہو گیا تھا۔

میں چاہتا تو قریشی موڑ کے کسی پبلک کال آفس سے میڈم کو فون کر سکتا تھا مگر میں نے بس میں بیٹھ کر وقت بچانے کو ترجیح دی۔ نو بجے کے قریب ملتان کے ڈیرہ اڈہ سے میں نے میڈم کو فون کیا۔ اُس نے مجھے اڈے کے سامنے والے ہوٹل پر بیٹھ کر میرو شاہ کا انتظار کرنے کا حکم

صادر کیا۔ اُس کی آواز میں نیند کا خمار جھلکتا تھا۔ وہ یا تو میری فون بیل پر بیدار ہوئی تھی یا کچھ ہی دیر پہلے جاگی تھی۔

میں نے مذکورہ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کا کپ حلق سے اُتارا۔ نصف گھنٹہ بعد سفید ہنڈا اکارڈ کار اور میر وشاہ کی شکل دکھائی دی۔ وہ جماہیاں لیتے ہوئے اپنی بدمست چال چل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر تیر کی طرح میری طرف آیا۔ بانہیں کھول کر بولا، ''اڑے او غنچے! کچھ کمالاوت یا خالی ہاتھ آوت ہے؟''

میں اُس کی بات سمجھ نہ پایا مگر کھلی بانہوں کی دعوت سمجھ میں آ گئی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے سینے لگا اور بولا، ''ماڑے کو بتاوے ناں کہ کوئی کامیابی ہووے یا نہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ الگ ہو کر بولا، ''اڑے جندہ باد (زندہ باد) لاڈے میاں! کمال کر دیوے ہے تم نے۔ چلو! میڈم کو خوش خبری دیوے.....''

میں چائے کا بل ادا کر کے ہنڈا اکارڈ کی پچھلی نشست پر میر وشاہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آج ڈرائیور بدلا ہوا تھا۔ پہلا ڈرائیور اسمارٹ اور کم گو تھا، یہ فربہی مائل اور خاصا باتونی تھا۔ ڈیرے اڈے سے میڈم کی کوٹھی تک اُس کی زبان مسلسل چلتی رہی تھی۔

دس بجے ہم دونوں اُسی گیسٹ روم میں تھے۔ میں جلد از جلد میڈم سے ملنا چاہتا تھا۔ اُسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے دل جیت کے منہ سے سردار حیدر خان کا نام اگلوا لیا تھا۔ اُس فرعون کے شکنجے سے پروین کو نکالنا اُس کا کام تھا۔ میر وشاہ گیا، تھوڑی دیر میں ہی پلٹ آیا، بولا، ''ماڑے غنچے! کوئی گڑبڑ ہووے ہے، میڈم ماڑا انتجار (انتظار) کئے بنا کہیں چلی جاوت ہے۔''

مجھے تھوڑا سا دُکھ ہوا۔ اُسے جانا ہی تھا تو مجھ سے مل کر چلی جاتی۔ میں نے میر وشاہ کے استفسار پر بلا کم و کاست تمام کارروائی کہہ سنائی۔ وہ بڑے انہماک اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو وہ میری ران پر زوردار دھپ رسید کر کے چہکا، ''اڑے جالم غنچے! تیرے کو تو تمغہ دیا جاوے، تیرے کو جھوم کے چوما جاوے..... پہلی واردات اور وہ بھی اتنی جور دار (زوردار)..... ماڑی میڈم سن لیوت تو جھوم جھوم جاوت لاڈے!''

اُس کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اُٹھا، قالین پر دھمال کے سے انداز میں رقص کرنے لگا، ایک دیوار سے دوسری دیوار تک جھومتا ہوا گیا، رُک کر بولا، ''لاڈے میاں جندہ باد..... تیرے کو بڑا ثواب، تیرے پہ دوخ (دوزخ) حرام.....'' پھر ہاتھ لہرا کر گانے لگا، ''نہ کوئی آرجو (آرزو) نہ

کوئی آس ہے، میرے دل یہ بتا کیسا احساس ہے.....''

اُس نے مجھے تسلی دی، اپنے مخصوص اسلوب میں سمجھایا کہ جو ہو گیا، اچھا ہو گیا ہے، پچھتانا بے سود ہے۔ میں نے حماقت کے دوران کئی دانش مندی کے پھول بھی کھلائے تھے، جن کی بنا پر پولیس مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اگر پولیس کو یہ پتہ چل بھی جائے کہ سائیں دل جیت کا قتل میرے ہاتھوں ہوا ہے، تو بھی میڈم سنبھال لے گی اور مجھ پر آنچ نہیں آنے دے گی۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے تک میرے ساتھ رہا، پھر کہیں فون نہ کرنے اور کمرے میں رہ کر میڈم کا انتظار کرنے کی تاکید کر کے رخصت ہو گیا۔

چار بجے کے قریب، جب میں چائے پی رہا تھا، اُس کا فون آیا۔ کہہ رہا تھا، ''ماڑے غنچے! فکر نہ کرے، ماڑی میڈم سے بات ہووت ہے۔ اُسے ساری رام کہانی بول سناوت ہے۔''

اُس نے میری جلد بازی پر پانی ڈالتے ہوئے مزید کہا، ''بولے تو ہے ناں کہ فکر نہ کرت ہے، میڈم جمہ داری (ذمہ داری) لیوت ہے تو جانو کہ تیری بہن تیرے پاس ہووے ہے۔ ماڑے کو جلدی ہووت، پھر بات کرت.....خوش رہوے لاڈے، خوش!''

دن ڈھل گیا۔ شام میڈم شکیلہ کی محل نما کوٹھی میں دبے پاؤں اُتر آئی۔ میں کئی مرتبہ واچ مین سے دریافت کر چکا تھا مگر میڈم اَبھی تک پلٹی نہیں تھی۔ نجانے کس مصروفیت میں غرقاں تھی۔ اگر مجھے میر وشاہ نے یہیں رہنے کی تاکید نہ کی ہوتی تو بعید نہ تھا کہ میں کوٹھی سے نکل کر سردار حیدر خان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اگر میں پروین تک رسائی حاصل نہ ہوتی تو یقینی طور پر دل جیت کو قتل کرنا بے سود ثابت ہونا تھا۔

کھانا بڑا پُر تکلف تھا مگر حلق سے اُترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ نور پور کے حالات کس نہج پر تھے؟ کھالا کہاں تھا؟ کیا دل جیت کے قتل کا پتہ چلا تھا یا نہیں؟ اگر اُس کی لاش شعلوں کے بیچ نظر آ گئی تھی تو چاچا چراغ اور گھر والوں کے ساتھ پولیس اور لوگوں نے کیا سلوک کیا تھا؟ بہت سارے سوالات زہریلے کیڑوں کی طرح میرے ذہن میں مسلسل رینگ رہے تھے اور بے چین کر رہے تھے۔

ایک اور خیال نے میرے رُوئیں رُوئیں میں اضطراب کی گہری لہر دوڑا دی۔ دل جیت کے قتل یا غیاب کا سنتے ہی کہیں سردار حیدر خان میری بہن کو ٹھکانے نہ لگا دے.....میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ جبڑے کڑکڑانے لگے۔ میں بیڈ سے اُتر کر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک گیا، پھر

پلٹا، کھڑکی کا پردہ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ سوائے ظاہر شاہ کے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کوٹھی پرسکون تھی، میں پرسکون نہیں تھا۔ میں نے ایک مرتبہ میر وشاہ سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر دو تین مرتبہ بیل جانے کے باوجود اُس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔

میڈم رات کو ڈیڑھ کے قریب کوٹھی میں پہنچی۔ میں گاڑی کے انجن اور مین گیٹ کے کھلنے کی آواز سن کر اچھلا اور کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھنے لگا۔ سیاہ رنگ کی بڑی لینڈ کروزر گیٹ عبور کر رہی تھی۔ نصف رات کا عمل، اندھیرا اور فرنٹ اسکرین پر پڑتی ہوئی بڑے بلب کی دودھیائی روشنی کے سبب جیپ کے اندر بیٹھے ہوؤں کی شکل دکھائی نہیں دی۔ جیپ چند ہی لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ جو بھی آیا تھا، اُسے گزرتے ہوئے میری نظر میں آنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ چند منٹ پہلے سی خاموشی فضا پر طاری ہوگئی۔ جیپ اور جیپ سے اُترنے والوں نے نہ جانے کون سا راستہ اپنایا تھا کہ میری نظروں میں آئے بغیر کوٹھی میں داخل ہوگئے تھے۔ چند منٹوں کے بعد سیڑھیاں اُتر کر آتے ہوئے میر وشاہ پر نگاہ پڑی تو قدرے طمانیت ہوئی۔ اُس نے آہستگی سے مجھے دھکیل کر دروازے سے ہٹایا اور کمرے میں داخل ہوا۔

میں نے بے صبری سے پوچھا، ''میڈم آئی ہے؟''

اُس نے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے کہا، ''ماڑے کو سانس تو لینے دیوے ہے غنچے!''

وہ دیکھنے میں تھکا ہوا لگتا تھا۔ شاید کسی مشکل 'مشن' پر سے لوٹا تھا۔ وہ کچھ دیر صوفے پر آنکھیں موندے نیم دراز رہا، پھر اُٹھ کر بیڈ پر آ گیا۔ بولا، ''غنچے! آرام سے سو جاوت ہے، سمجھ لیوے ہے کہ تیرے کام کا آدھا حصہ مکمل ہو جاوے ہے.....''

میں نے پوچھا، ''کچھ بتاؤ تو سہی، میں بڑا پریشان ہوں۔''

اُس نے میری تھوڑی پر ہلکی سی چٹکی بھری، بولا، ''کہانا لاڈے میاں! سو جاوت ہے۔''

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دل مضطر تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں خاموش نہیں رہ پاؤں گا، تو اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے سمجھایا کہ میں آرام سے سو جاؤں۔ چونکہ میڈم شکیلہ سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالنے سے گریزاں تھی، میری مدد کرنا بھی چاہتی تھی اِس لیے اُس نے ایک نئے طریقے سے میری بہن کی بازیابی کی کامیاب کوشش کی تھی۔

میر وشاہ نے بتایا کہ میڈم نے کبھی بھی کسی کام میں اتنی لگن اور پھرتی نہیں دکھائی تھی جتنی وہ

آج متحرک رہی تھی۔ میں نے اُسے کریدنے کی بہتیری کوشش کی، مگر اُس نے کچھ پھوٹ کر نہیں دیا۔ جب زِچ ہو گیا تو بولا، ''کیا ماڑا سر کھاوت ہے، تیرے کو بہن چاہوے یا میرا سر چاہوے، آرام کرو اور ماڑے کو بھی گھڑی دو گھڑی آنکھ میٹھی کرنے دیوے۔''

کچھ دیر لیٹا، پھر کچھ سوچ کر اُٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ میں نے پوچھا، ''اب کہاں کی تیاری ہے؟''

وہ قدرے بھنا کر بولا، ''ہم ساتھ والے کمرے میں جاوت ہیں، تم اِدھر سووے ہے۔''

وہ میرے روکنے اور ڈسٹرب نہ کرنے کی تاکید کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید یہ اُن کے طریق کار کا بنیادی حصہ تھا۔

وہ چند ہی منٹوں میں اٹنا غفیل ہو گیا۔ اُس کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔ چونکہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، اِس لیے میں بے آرامی سے بیڈ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ آنکھیں میچ کر زبردستی سونے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔ اِس کارِ بے سود سے تھکا تو دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ آہستہ روی سے چلتا ہوا گیلری کے آخری سرے پر واقع دروازے تک آیا، کھولا اور باہر لان میں ٹہلنے لگا۔ بے دھیانی میں لان عبور کر کے کوٹھی کی بیرونی دیوار تک چلا گیا۔ چار دیواری سے پشت ٹکا کر کھڑا ہوا تو اپنے سامنے کوٹھی کے فرسٹ فلور پر سرخ روشنی سے معمور کمرے کی اَدھ کھلی کھڑکی دکھائی دی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ بغور دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ کوئی عورت تھی جو کھڑکی کے پَٹ سے کندھا ٹکائے کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ اندھیرے کا حصہ بنا ہوا تھا جبکہ بال ہوا میں اُڑ کر اُس کی نسوانیت پر دلیلیں لا رہے تھے۔ اُس نے مجھے نہیں دیکھا تھا یا میری موجودگی اُس کے نزدیک لائقِ توجہ نہیں تھی، جبھی تو اُس کے ساکت وجود میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

وہ کون تھی؟ فوری طور پر میرا ذہن میڈم کی طرف گیا۔ پھر سوچا کہ اُسے رات کے اِس سمے میں یوں کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اُس کے علاوہ اِس حیرت کدے میں اور کون رہتا ہے۔ اُس کے خاندان کے افراد یا ملازمین؟

میں ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھنے لگا۔ اچانک اُسے میری موجودگی کی خبر ہو گئی۔ فضا میں ایک نہایت باریک آواز گونجی، ''اے! کون ہو تم؟''

اُس کا مخاطب میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ آواز نے تائید کر دی تھی کہ وہ میڈم نہیں، کوئی اور تھی۔

میرے جواب دینے سے پیشتر کوٹھی کے بیرونی لان سے ظاہر خان کی آواز سنائی دی،

''اوئے نامراد کا بچہ! کون ہے تُو؟''

میں جلدی سے بولا، ''میں..... میں شہریار ہوں۔''

وہ اچانک ڈیورانٹا کے بڑے سے پودے کے عقب سے نکل کر میرے سامنے آ گیا، مجھے دیکھ کر بیزار انداز میں بولا، ''اَم سمجھا کہ کوئی چور آ گئی ہے۔ تم اِدھر کیا کرتے ہو؟''

اُس نے فرسٹ فلور کی اَدھ کھلی کھڑکی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ شاید اُس کے کانوں میں عورت کی آواز نہیں پڑی تھی۔

''نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا تھوڑی چہل قدمی کر لوں۔''

''اَچھا، اچھا..... دوبارہ چہل قدمی کرنی ہو تو مجھ کو گیٹ پر بتا کر ادھر آنا۔ ٹھیک ہے؟''

''ٹھیک ہے!'' میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ وہ اپنی گن کندھے پر ڈالتے ہوئے پلٹ کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے دیوار کی ٹیک چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر گھاس پر چلنے لگا۔ ایسے میں پھر فرسٹ فلور کی کھلی کھڑکی بول پڑی، ''اے! تم کون ہو؟''

میں نے سر اُٹھایا۔ وہ دکھائی نہیں دی۔ اُس کا ہیولا دکھائی دیا۔ میں نے قدرے نیچی آواز میں جواب دیا، ''میں شہریار ہوں۔''

''وہ تو میں سن چکی ہوں۔'' اُس کی مترنم آواز کانوں میں رَس گھول گئی، ''کیا تمہیں میڈم نے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا رکھا ہے؟''

میں نے عادتاً اثبات میں سر ہلایا۔ اُس نے اپنا سوال دہرایا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اتنے فاصلے پر موجود ہونے کے باعث وہ میرا ہلتا ہوا سر دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میں نے کہا، ''جی!''

اُس کی آواز میں بلاشبہ بڑی کشش تھی۔ کسی بھی شخص کو اپنے پاس کھینچ لینے کی مکمل صلاحیت موجود تھی۔ آسمان کی ڈھلانوں پر پھسلتی رات کے اُس پہر میں میرا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ بولتی رہے، میں جواب دیتا رہوں اور زندگی کا سفر تمام ہو جائے۔ مگر ایسی خواہشیں ہمیشہ اَدھوری رہتی ہیں۔ میں گھاس کی خنکی جذب کرتا ہوا کسی بت کی طرح وہیں ایستادہ تھا، وہ اپنی جگہ پر سرخ

روشنی مائل اندھیرے کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

چند گھڑیاں یوں ہی بیت گئیں۔ پھر اُس کی آواز سنائی دی، ''کس کمرے میں رہائش پذیر ہو؟''

میں نے بتایا، ''لائبریری کے سامنے والے کمرے میں۔''

''اکیلے ہو؟''

''ہاں! مگر تم کون ہو؟''

''اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ دروازہ کھلا چھوڑ دینا۔ میں آ کر بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔'' اُس کی قدرے مدھم سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا، اپنی حیرت کا اظہار کرنا چاہتا تھا مگر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ سرخ روشنی رہ گئی، روشنی والی اوجھل ہو گئی۔

اُس کے کہے ہوئے جملے کی معنویت کو سمجھتے ہی میری سانس رُکنے لگی۔ وہ کون تھی؟ میرے کمرے میں کیوں آنا چاہتی تھی؟ اگر میڈم کو پتہ چل گیا تو میرا کیا حشر ہوگا؟ ان گنت سوالات نے ایک دم میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ میں گیسٹ روم کے بیڈ میں دھنس کر دھڑکتے دل سے اُس کا انتظار کرنے لگا۔

گھبراہٹ کے عالم میں، میں نے گیلری میں جھانک کر دیکھا۔ لمبی گیلری کے عین وسط میں ایک انرجی سیور روشن تھا جس کی خوابیدہ سی روشنی میں کوئی وجود متحرک نہیں تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار خطرے کا احساس دِلا رہی تھی۔ اُس عورت کی گیسٹ روم میں آمد میرے لیے کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھی۔ میں دودھ کا جلا تھا، چھاچھ سے ڈرتا تھا۔ بے عنوان خوف میرے رُوئیں رُوئیں میں سرایت کر چکا تھا اور میں دل ہی دل میں اُس کے نہ آنے کی دعائیں کرنے لگا تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا اور بیڈ میں لیٹ گیا۔ نیند پہلے ہی روٹھی ہوئی تھی، اَب تو کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ مترنم آواز نے آنے کا کہا تھا، وقت کا تعین نہیں کیا تھا مگر ہر پل اُس کے چلے آنے کے خوف میں جاگ رہا تھا۔ میں اُس کے لیے اور وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔ ایک دوجے کو دیکھ نہیں پائے تھے۔ محض ہیولے دیکھے تھے۔ کسی ہیولے کی طرف یوں متوجہ ہونا اور بڑھنا غیر فطری اور غیر دانش مندانہ فعل تھا۔ اُسے کیا مجبوری لاحق تھی کہ وہ خطرات مول لے

کر میرے پاس آنا چاہتی تھی۔ سیڑھیاں چڑھنا آسان ہوتا ہے۔ سیڑھیاں اُترنا بڑا تکلیف دہ اور اندھا اقدام ہوتا ہے۔ میں جتنا سوچتا جاتا، اتنا ہی اُلجھتا جاتا تھا کیونکہ میں جن حالات سے گزر رہا تھا اُن کا تقاضا یہی تھا کہ میں احتیاط کا بھاری بھرکم کمبل اوڑھے دُبکا رہوں۔ وہ مجھے کمبل سے باہر کھینچنے جا رہی تھی۔

کافی دیر گزر گئی۔ وہ نہیں آئی تو مجھے عافیت کا احساس ہوا اور مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ یہ غنودگی عارضی ثابت ہوئی اور دروازے پر ہونے والی بہت مدھم دستک نے مجھے اُچھل کر بیڈ سے اُترنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری دستک نے غلط فہمی کے شائبے کو دور کر دیا اور میں غیر معتدل سانسوں کو سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔ آواز پیدا ہونے کے خوف سے میں نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے قفل کھولا۔ لیور گھمایا۔ دروازہ کھلتے ہوئے چرچراتا تھا اِس لیے اُسے نہایت احتیاط سے کھولنا ضروری تھا۔ دروازہ کھلا، ایک اور حیرت کدہ میری نظروں کے سامنے سجا ہوا تھا۔ کھڑکی میں دکھائی دینے والا نسوانی ہیولا بھری پُری اور خوب صورت جوانی کی چولی اوڑھے مجھے دم بخود کرنے لگا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔

اُس نے چوروں کی طرح اردگرد دیکھا پھر مجھے دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ کر اُسی حالت میں ایستادہ ہو گیا جبکہ وہ دروازہ لاک کر کے پلٹی، مجھ پر نگاہ ڈال کر بولی، ''تنہی لان میں کھڑے تھے ناں؟''

اُس کی آواز نے یقین دلایا کہ کھڑکی میں وہی کھڑی تھی۔ میں نے تھوک نگلا، ''ہاں..... آں..... مگر کون ہو؛ یہاں کیوں آئی ہو؟ کسی نے دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے گی۔ پلیز! تم واپس چلی جاؤ۔''

اُس نے شاکی نگاہ سے مجھے گھورا۔ جواب دینے کی بجائے بیڈ کے کونے پر ٹِک گئی۔ مجھے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی، ''کیا میرا آنا تجھے اچھا نہیں لگا؟''

میں اُسے کیا جواب دیتا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اُس کا نائٹ سوٹ، بکھری ہوئی زُلفیں اور کھلی بانہیں مجھے مدعو کر کے مبہوت کیے دے رہی تھیں۔ ملیح جلد، تیکھے نقوش اور میک اَپ سے بے نیاز خمار آلود چہرہ کسی بھی زندہ آفت سے کم نہیں تھا۔ اُس کے حسن کی تاب میڈم کی آب و چمک سے کم تھی مگر خیرہ کن تھی۔ عام حالات میں مجھے ملی ہوتی تو میرے قلب و جگر کی کیفیت اور ہوتی۔

میں نے نظریں چُراتے ہوئے کہا، ''تم میڈم کی کیا لگتی ہو؟''

وہ مجھے سرتاپا دیکھ رہی تھی۔ دلچسپی ہویدا کر رہی تھی۔ خود کھلی کتاب تھی، مجھے کھولنے کا ارادہ آشکار کر رہی تھی۔ ایک اَدا سے بولی، ''یہاں کوئی بھی میڈم کا کچھ نہیں لگتا۔ جیسے تم یہاں لائے گئے ہو، ایسے ہی مجھے بھی ایک سال پہلے یہاں لایا گیا تھا۔''

میں اُس کی بات میں پنہاں مفہوم کو بھانپ نہیں پایا تھا۔ بولا، ''مگر میں تو ازخود یہاں آیا ہوں۔''

''بظاہر میں بھی اپنے پیروں پر چل کر یہاں آئی تھی۔'' وہ بولی۔ پھر میری اضطرابی کیفیت کو دیکھ کر مسکرائی، ''فکر نہ کرو۔ یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ سبھی سور ہے ہیں۔ ظاہر خان جاگتا ہے جس کا جاگنا یا سونا ایک برابر ہوتا ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کھل کر بات کرو۔''

''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا، ''تم اَب چلی جاؤ۔ اگر میڈم کو پتہ چل گیا تو مجھے گھر سے نکال دے گی۔''

''تم میڈم کی فکر نہ کرو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔''

''کہاں گئی ہے؟''

''وہ بتا کر نہیں جاتی کہ کہاں جا رہی ہے۔ صبح ہوتی ہے تو سونے کے لیے آ جاتی ہے۔ اب تک اگر آ گئی ہے تو اپنے کمرے میں ہوگی۔ وہ ٹوہ لینے کی عادی نہیں ہے۔''

اُس کے لہجے میں چھپی ہوئی کاٹ عیاں ہونے لگی، ''یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اتنا کہ ہمارا ملنا کوئی معانی نہیں رکھتا۔''

وہ غیر محسوس انداز میں کھسک کر میرے بہت قریب ہوگئی۔ اُس کی موجودگی اور مابعد کی غیر معمولی قربت مجھ پر اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ ایک عجیب سی سرشاری ہولے ہولے بدن میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں کمرے سے نکل کر دُور بھاگ جاؤں مگر شاید یہ اختیار بھی میرے ہاتھوں نکل چکا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ سہلاتے ہوئے بولی، ''تم کتنے اچھے ہو شہریار! یہی نام بتایا تھا ناں تم نے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لبوں پر زُبان پھیری۔ جتنا کھسک سکتا تھا، کھسکا مگر ہمارے بیچ فاصلہ پیدا نہ ہو سکا۔ ایک کراہ نما آواز میرے حلق سے برآمد ہوئی، ''مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پَرے ہٹو۔''

وہ چند لمحوں تک ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر کھسک کر چند بالشت کی دوری پر چلی گئی۔ بولی، ''میں شاید تمہیں اچھی نہیں لگی۔ یہ تو دِلوں کا سودا ہوتا ہے۔ طے پا گیا تو ٹھیک ورنہ..... خیر کوئی بات نہیں۔ ہم کچھ دیر بیٹھ کر باتیں تو کر سکتے ہیں ناں؟''

میں نے بہ عجلت کہا، ''ہاں! مگر تم وہیں بیٹھی رہو گی۔''

اُس نے ایک ذرا مسکرا کر مجھے دیکھا۔ پھر باتیں کرنے لگی۔ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگی۔ کوئی نصف گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ مجھے اُس کی آمد کی غرض و غایت کا پتہ نہ چلا۔ وہ محض باتیں کرنے کے ارادے سے اُس کا آنا بعید از یقین تھا۔

''تم نے مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا۔''

''اَب پوچھ لیتا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام سونیا ہے۔''

میں نے یہ نام پہلی مرتبہ سنا تھا۔ کہا، ''خوب صورت نام ہے۔''

''کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟'' وہ اِٹھلائی۔

میں نے آنکھیں چُرا لیں۔ پوچھا، ''تم یہاں کیا کام کرتی ہو؟''

وہ بولی، ''میں میڈم کا حکم بجالاتی ہوں۔''

''وہ تجھ سے کیا کام لیتی ہے؟''

وہ مسکرائی، بولی، ''تجھے پتہ چل جائے گا۔''

''میرے پاس کیا کرنے آئی ہو؟''

''تمہیں ملنے کے لیے آئی ہوں۔ اگر تم چاہو گے تو آئندہ بھی آتی رہوں گی۔ بُرا مناؤ گے تو کبھی نہیں آؤں گی۔'' اُس نے براہِ راست میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

میں کوئی بھی جواب نہ دے پایا۔ وہ بولی، ''کیا تمہارے دِل میں نیکی کرنے کا جذبہ موجود ہے؟''

میں نے خالی الذہنی کی کیفیت میں اُسے دیکھا، بولا، ''میں سمجھا نہیں؛ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''میں کچھ کہنا نہیں، تمہیں اپنے کمرے میں لے کر جانا چاہتی ہوں۔'' وہ اُمید بھرے لہجے میں بولی۔

''مگر کیوں؟'' میں گھبرا سا گیا۔

''یہ تو تمہیں وہیں جا کر ہی پتہ چلے گا۔''

''اگر کسی نے دیکھ لیا تو.....؟''

''کیا یہاں کسی نے دیکھا ہے؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''یہ تو گیسٹ ہاؤس ہے۔''

''یہ ساری کوٹھی ہی گیسٹ ہاؤس ہے۔ ڈرو مت، چلو میرے ساتھ۔ تجھے کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔''

میں اُس کے ساتھ کہیں نہیں جانا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ میں اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ گیلری میں پہنچ کر اُس نے میری کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیا۔ اپنا آدھا وزن مجھ پر ڈال کر اٹھلائی، بولی، ''دیکھو! عورت کیسے مرد کو اپنے پیچھے چلانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔''

میں ایک جھٹکے کے ساتھ اُس سے علیحدہ ہو گیا۔ اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے بولا، ''اگر تمہارا رویہ یہی رہا تو میں لوٹ جاؤں گا۔''

اُس نے ایک ذرا مسکرا کر میری بات مان لی۔ گیلری کے آخری سرے پر کشادہ سیڑھیاں اوپر جاتی نظر آئیں۔ ہم دونوں دبے پاؤں چلتے ہوئے فرسٹ فلور پر آئے۔ بڑا ہال کمرہ خالی تھا۔ اُسے عبور کر کے ہم ایک کارپٹڈ گیلری میں داخل ہوئے۔ یہ گیلری بھی آخری سرے تک خالی تھی۔ شاید رات کے اِس پہر میں کسی کے بیدار ہونے کا احتمال نہیں تھا، اِس لیے وہ کمال اطمینان سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کا کمرہ گیلری کے آخر پر واقع تھا۔

اُس کے کمرے کی آرائش بعینہٖ ویسی ہی تھی، جیسی میرے گیسٹ روم کی تھی۔ اندر سرخ رنگ کا نائٹ بلب روشن تھا جس کی مدھم روشنی میں، پہلی نظر میں کچھ واضح دکھائی نہیں دیا۔ آنکھیں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو پتہ چلا کہ سونیا کے بیڈ پر کوئی لڑکی سو رہی تھی۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کمرے میں اکیلی نہیں رہتی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

اُس نے سرگوشی کی، ''یہ میری نئی روم میٹ ہے۔ میڈم نے اِسے ایک گھنٹہ قبل میری تحویل میں دیا ہے۔''

شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ سونے والی ہماری آوازوں کے سبب بیدار ہو جائے، تبھی رازدارانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔ میں اَبھی تک یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھے کیا دکھانے کے لیے یہاں لائی تھی۔ میں نے پوچھا، ''ہاں! تم مجھے کیا دکھانا چاہتی تھیں؟''

اُس نے میرا ہاتھ تھاما اور کھینچتی ہوئی بیڈ کی دوسری طرف لے گئی۔ اَب سوّنے والی لڑکی کا چہرہ میری جانب تھا۔ روشنی کم تھی۔ میں نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا، ''اِسے دیکھ لیا، اَب کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟''

اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پلٹ کر دروازے کے دائیں جانب دیوار میں نصب سوئچ بورڈ تک گئی۔ ایک بٹن پش کیا۔ کمرہ یک بارگی روشنی سے معمور ہوگیا اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے فوراً آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے ہاتھ ہٹائے۔ ناگاہ، نظر خوابیدہ چہرے پر پڑی تو میں بُری طرح چونک اُٹھا۔ میرے پورے بدن کا خون میری آنکھوں میں سمٹنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگوں نے اچانک میرے جسم کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔

میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے پہلو کے بل لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ میں اُسے لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ سردار حیدر خان کی بیٹی اسما تھی جس پر کھالا جی جان سے فریفتہ تھا۔ میں نے گردن موڑ کر سونیا کو دیکھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، بولی، ''یہ کون ہے، میں نہیں جانتی۔ یہاں تک کیسے پہنچی، میں نہیں جانتی۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ شکل سے معصوم اور اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔''

میں نے خوابیدہ اسما کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ نیند کے گہرے استغراق میں تھی۔ تابندہ چہرے پر زُلفیں بکھر کر سایہ کر رہی تھیں۔ میں نے چند لمحوں میں بہت سوچا مگر اُس کی یہاں موجودگی کا سبب سمجھائی نہ دیا۔ اُس کا میڈم سے کیا تعلق تھا؟ یہ بھی نہ کھلنے والا عقدہ تھا۔ ایسے میں میرے کندھے پر لمس آن ٹھہرا۔ گردن موڑ کر دیکھا۔ سونیا نے اپنا چہرہ میرے کندھے پر ٹکا دیا تھا اور آنکھیں موند کر مسکرا رہی تھی۔ میں آہستگی سے ہٹ گیا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی، بولی، ''قریب آتی ہوں تو دور چلے جاتے ہو۔ دور ہو جاؤں گی تو قریب آنے کے لیے ترسو گے۔''

میں نے اُس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا، ''کیا یہ سو رہی ہے؟''

اُس نے ایک ادا سے سر ہلایا، ''نہیں؛ بے ہوش ہے۔ پھولوں کی سیج پر سوئی تھی، ہوش میں آئے گی تو خود کو غلاظت کے ڈھیر پر دیکھ کر آدھی مر جائے گی۔''

سونیا اپنے لہجے سے بہت پڑھی لکھی لگتی تھی۔ باتیں بھی الجھی الجھی کرتی تھی۔ میں نے

پوچھا، ''یہ کون ہے؟''

''بتایا تو ہے.....'' وہ اِٹھلائی۔

اُس کے انگ انگ میں شوخی اور شباب کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ سنبھلنے کا موقع دیے بغیر قریب ہو کر حواس پر چھانے لگتی تھی۔ وہ خوب صورتی میں کسی طور بھی اسما سے کم نہیں تھی مگر میری تمام تر توجہ اسما کی جانب مبذول تھی۔ میں نے کہا، ''اگر تم اِسے جانتی نہیں ہو تو پھر یہ بے ہوشی کی حالت میں تمہارے کمرے میں کیوں لیٹی ہوئی ہے؟''

''میڈم نے اِسے میری تحویل میں دیا ہے اور کہا ہے کہ اِس کا خیال رکھوں۔ اِسے کمرے سے ایک پل کے لیے بھی باہر نہ جانے دوں۔''

''تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟'' میں مخمصے میں پڑ گیا، ''میرا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

میرے سوال پر اُس کے چہرے پر اداسی کی ایک پرچھائیں لہرائی، بولی، ''بڑے سال پہلے، میں ایسے ہی شبانہ نام کی ایک لڑکی کی تحویل میں آئی تھی۔ سفید چادر والے بیڈ پر سوئی تھی، دھبوں سے اَٹے ہوئے بیڈ پر بیدار ہوئی۔ تب سے آج تک واپسی کی راہ نہیں ملی۔''

''تو؟'' میں کچھ نہ سمجھ پایا۔

''میں تمہیں نہیں جانتی۔ اسے نہیں جانتی۔ مگر تم دونوں کی شکلیں بتاتی ہیں کہ تم اچھے اور شریف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہو۔ بھٹک کر ادھر آ نکلے ہو یا بھٹکائے گئے ہو۔ آج واپس چلے جاؤ گے تو زندگی گزارنے کے قابل ہو جاؤ گے، یہیں کے ہو جاؤ گے تو تمام عمر کانٹوں سے الجھتے رہو گے۔''

میں چند قدم پیچھے ہٹ کر آرام دہ کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے میرے پیروں میں فرش پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ بولی، ''سچ کہتی ہوں۔ یہاں جو بھی لایا جاتا ہے، اُسے یہی سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کوئی سمجھ جاتا ہے، کوئی مجھے احمق سمجھ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ بنگلہ میڈم کا ہے۔ میڈم کا حکم چلتا ہے۔ وہ ہماری سانسیں اپنی مٹھی میں دبائے رکھتی ہے۔''

میں عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ میڈم شکیلہ میری محسنہ تھی۔ سونیا کے چہرے پر سجی عبارت پڑھنے کے باوجود بھی دل میڈم کی طرف سے میلا نہیں ہو رہا تھا۔ اُس پر یقین کرنا محال تھا تو اُس کی بات کو رد کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''تم میڈم کے ساتھ رہتی ہو،

میڈم کا کھاتی پہنتی ہو، اُسی کو ڈستی ہو، یہ کیا ہے؟''

اُس نے جلدی سے کہا، ''میں اُس کا نہیں، وہ میرا کمایا ہوا مال کھاتی ہے۔ رہی بات ڈسنے کی، تو میرے ڈسنے سے ایک معصوم لڑکی اپنی دنیا میں پلٹ جائے، کیا بُری بات ہے؟''

''کیا پہلے بھی تم نے ایسا کیا ہے؟''

''ہاں! میں دو تین لڑکیوں کو اِس جہنم کدے سے نکال چکی ہوں۔''

''یہاں ایسا کیا ہے جس کی بنا پر تم اتنی خوب صورت کوٹھی کو جہنم کدہ قرار دے رہی ہو؟''

وہ قدرے زِچ ہو کر بولی، ''تم اتنی تفتیش کیوں کر رہے ہو؟ سیدھی سی بات ہے، یہاں ہر وقت جسم کی آگ دہکتی رہتی ہے جس پر میڈم کی دیگچی چڑھی رہتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے، کیا تم اِس لڑکی کی مدد کرنا چاہتے ہو؟''

''میں اِس کی مدد کیوں کرنا چاہوں گا؟'' میں اَب بھی شدید الجھن میں تھا۔

''نیکی اور برائی کی فلاسفی کو مانتے نہیں ہو، کیا تم مسلمان نہیں ہو؟'' وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولی، ''میں بتا رہی ہوں کہ یہ گناہ کی دلدل ہے۔ میرا جسم لاکھوں ہزاروں میں بکتا ہے جس میں سے مجھے بھی راتب ملتا ہے۔ اِس کا بدن بھی شوکیس میں لگا دیا جائے گا۔ لاکھوں کمائے گی مگر صرف میڈم کے لیے۔ ہر رات مرے گی، ہر صبح جیے گی۔ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے گی مگر کٹے پروں والے کبوتر کی طرح یہیں چکراتی رہے گی۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا۔ تمھارا جسم، خون اور تمام طاقتیں میڈم کے ہاتھ گروی رکھی جائیں گی۔ وہ تمہارے ہاتھوں میں گن پکڑا کر اپنے دشمنوں کو گولی مارے گی۔ تمہارے ہاتھوں منشیات کی سپلائی دے کر ہزاروں گھروں کے چراغ بجھائے گی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے، کیا تم نے خدا کے سامنے پیش نہیں ہونا حشر کے دن؟''

میرے بدن کا خون چہرے میں سمٹ آیا۔ وہ بڑی روانی سے اتنی بڑی بڑی باتیں کہہ گئی تھی جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میڈم اتنے قبیح کام کرتی تھی، حیرت کی بات تھی۔ اگر میں نے اُسے معصوم اور کاروباری خاتون سمجھا تھا تو یہ میری فاش غلطی تھی کیونکہ میں اُس کا رسوخ دیکھ چکا تھا۔ یہ دبدبہ، یہ دولت، عام اور صاف ستھرے کاروبار سے حاصل نہیں ہوتی۔ کسی بھی تاجر کے سامنے شہر کا ایک تھانیدار اِس طرح سر نہیں جھکاتا جس طرح میڈم کے سامنے میں نے تھانیدار کا جھکا ہوا سر دیکھا تھا۔ مجھے سونیا کے کمرے میں آئے کافی دیر گزر گئی تھی۔ کسی نے

بھی دخل نہیں دیا تھا۔ کوٹھی کے سبھی مکین خوابِ غفلت کے مزے لے رہے تھے۔ یہ وہ لمحے تھے جب مجھے جان سے پیاری پروین کا اغوا، سائیں دل جیت کا قتل اور کھالے کا غیاب مضطرب نہیں کر رہا تھا بلکہ میں نئی پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اسما بدستور بے ہوش تھی۔ میں کرسی سے اُٹھا، سونیا سے بچ کر بیڈ کے پاس آیا اور اسما کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ تیکھے نقوش، گھنگھرائی ہوئی سیاہ اور دراز زلفیں، ملیح جلد اور گلاب کی طرح کھلا کھلا رنگ..... میں نے پلٹ کر سونیا کو دیکھا۔ اُس کا حسن چودھویں کے دھلے ہوئے چاند کی طرح آنکھوں میں کھب رہا تھا۔ وہ بولی، ''یہ دیکھ رہے ہو کہ ہم دونوں میں سے زیادہ خوب صورت کون ہے؟''

اُس کے لہجے میں استہزاء اور شرارت کے عناصر غالب تھے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی، ''سچ کہتی ہوں، آج یہ خوب صورت ہے کیونکہ اِس کا دامن اجلا ہے۔ کل میں خوب صورت قرار پاؤں گی کیونکہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کی سوار ہوں گی۔ میری مانو، اسے لے کر کوٹھی سے نکل جاؤ۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں پناہ مل جائے گی۔ زندگی گزارنے کا راستہ مل جائے گا۔ اِس کے ساتھ شادی کر لینا۔ چونکہ اِسے میڈم یہاں لائی ہے، اور جسے میڈم گھر سے اُٹھا لائے، اُس کی واپسی کے تمام راستے بند ہوتے ہیں۔ یہ واپس اپنے گھر گئی تو اِسے کاٹ کر پھینک دیا جائے گا۔''

اُس کے لہجے میں خوفناک سنگینی اُتر آئی۔ میرے مقابل آن کھڑی ہوئی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''خاموش کیوں ہو؟ کیا مرد نہیں ہو؟ زندگی میں ایسا موقع ایک مرتبہ ملتا ہے۔ آدمی ادھر ہو جائے تو دنیا چمن زار دکھائی دیتی ہے۔ اُدھر ہو جائے تو آگ کی لپٹوں سے عمر بھر کا واسطہ پڑ جاتا ہے۔''

میں نے اپنا رُخ سوئی ہوئی اسما کی طرف کر لیا۔ خوابیدگی کے عالم میں وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں سونیا کی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو رہا تھا، میرے ذہن میں سائیں دل جیت کے منہ سے آخری ساعتوں میں نکلا ہوا لفظ گونج اُٹھا ''حیدر خان.....''

وہ سردار حیدر خان کی بیٹی تھی جس نے میری بہن کو سائیں دل جیت کے ذریعے اغوا کر لیا تھا۔ نفرت کی ایک آتش فشانی لہر میرے تن بدن میں اُتر گئی۔ ایسی لہروں کے مقابل میں کوئی اور جذباتی کیفیت یا ہمدردی کا جذبہ ٹھہر نہیں سکتا۔ ایک بند عقدہ وا ہونے لگا۔ ممکن تھا، میڈم

نے اسماء کو پروین کی بازیابی کے لیے اغوا کیا ہو؟ وہ سردار حیدر خان سے اسما کے بدلے میں پروین کو مانگنا چاہتی ہو؟..... یہ سوچ آتے ہی میرے ذہن میں سونیا کا بیان کیا ہوا تمام تر فلسفہ ہوا ہو گیا۔ میرے جبڑے کے اعصاب تن گئے، سرتفہیمی انداز میں ہل گیا، پلٹ کر بولا، ''سونیا! میں اِس لڑکی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میڈم میری محسنہ ہے، احسان کا بدلہ احسان سے دینا ہماری روایات میں شامل ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اُس کا منہ حیرت سے کھل گیا، ''کیا میں نے اب تک جو بکواس کی ہے، وہ سب فضول رہی؟''

''نہیں.....'' میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا، ''تم بہت اچھی لڑکی ہو مگر میں تمہارے اچھے خیالات پر 'شاباش' کہنے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''کیا تم میڈم کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو؟''

''ہاں! میں اُسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔''

''خواہ اِس لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے؟''

''تمہاری زندگی تباہ ہو گئی، بقول تمہارے، تو یہ کیا آسمان سے اُتری ہوئی ہے؟'' میرے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔

''ایک نہ ایک دن تو تم میڈم کو چھوڑ ہی جاؤ گے، تب؟''

''چھوڑ کر جانے سے پہلے میڈم کو بتا دوں گا۔''

''وہ تمہیں گولی مار کر سڑک پر پھینکوا دے گی، جانے نہیں دے گی۔'' وہ پورے یقین سے بولی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا، ''کیا مطلب؟''

''یہاں کی دنیا کے راز تمہارے سینے میں ہیں جو کسی وقت ثبوت بن کر میڈم کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیں گے۔ میڈم بانس کو جلا دیتی ہے تاکہ اُس کے نام کی بانسری بجنے کا خطرہ نہ رہے۔'' وہ مجھے ڈرانے کے سے انداز میں بولی۔

خوف کی ایک لہر میرے بدن میں اُتر گئی مگر میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنی اِس کمزوری کو آشکار نہیں ہونے دیا۔ بولا، ''پروا نہیں..... میں مرنا قبول کر لوں گا مگر منافقت کی سانس پھیپھڑوں میں نہیں اُتاروں گا۔ کیا اَب میں جا سکتا ہوں؟''

وہ برق کی سی تیزی سے میرے پہلو سے نکل کر میرے اور دروازے کے بیچ حائل ہو گئی۔
میں نے کہا، ''اب کیا ہے؟''
وہ ادا سے بولی، ''نیکی نہیں کرنا چاہتے، نہ سہی، گناہ ہی کر لو۔''
''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔
اُس نے میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دھکیلا۔ پسپا نہیں کر پائی تو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی، ''طاقت ہے مگر فتح کا جذبہ نہیں، تم کیسے مرد ہو؟''
میں نے کہا، ''مجھے جانے دو، اگر میر وشاہ جاگ گیا تو مجھے موجود نہ پا کر پریشان ہو جائے گا۔''
اُس نے ہونٹ سکیڑے، بولی، ''اُس کا فکر نہ کرو، وہ سکڑا عاشق گھوڑے گدھے بیچ کر سوتا ہے۔ سر پر بم پھٹے، تب بھی نہیں جاگے گا۔''
وہ مجھے پسپائی پر مجبور نہیں کر پائی تھی۔ ناکامی کی خفت مٹانے کے لیے میرے سینے میں سر چھپانے کی کوشش میں مجھ سے چمٹ گئی۔ کھالے کی بہن بلو نے مجھے اپنی جوانی سے روشناس کرایا تھا، سمجھایا تھا کہ جوانی کی آگ کی اپنی تمازت ہوتی ہے، جلاتی ہے تو خاکستر نہیں کرتی بلکہ شعلہ بنا دیتی ہے۔ خالدہ عرف بلو کی تمازت اور تھی۔ سونیا کی لپک بہت تند رو تھی کہ لمحوں میں پورے بدن میں اُتر گئی۔ میری سانس غیر معتدل ہونے لگی۔ میں نے سنبھل کر دامن چھڑانا چاہا مگر اُس کی گرفت کو وارفتگی نے مضبوط کر دیا تھا۔ میں نے جب کہا کہ 'چھوڑو مجھے، جانے دو' تو میری آواز میری سماعت کو بھی کمزور لگی۔
وہ اپنا چہرہ میری چھاتی پر رگڑ رہی تھی اور مجھے جہانِ حسن کی آوارگی پر اُکسا رہی تھی۔ شاید وہ میرے اندر جلتے بجھتے کرب کے شعلوں سے آگاہ نہیں تھی جن کی آنچ مجھے کسی اور طرف مائل نہیں ہونے دیتی تھی۔ ایسے میں اچانک میرے اندر کا سلگتا ہوا انسان جاگ اُٹھا اور میں نے اُس کی بانہیں کھول کر پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے جا لگی اور تشنہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ سانسیں ہموار کرتے ہوئے بولی، ''تم نے اچھا نہیں کیا۔''
میں نے کہا، ''تم نے غلط کہا، میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔''
ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں تالی کی آواز گونجی۔ میں بڑی تیزی سے پلٹا۔ پہلے گمان گزرا تھا کہ اسما جاگ گئی تھی مگر آنکھوں کے سامنے میڈم کو کھڑا دیکھ کر میری اوپر کی سانس

اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اُس کے لبوں پر رقص کرتی ہوئی مسکراہٹ نے جیسے میرے قدموں کو قالین سے چپکا دیا تھا۔ اُس کے اجلے اور آراستہ وجود کے پیچھے دو کمروں کے درمیانی دروازے پر لٹکا ہوا دبیز پردہ لہرا رہا تھا اور وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر تالیاں بجا رہی تھی۔ ہاتھ تھمے تو زبان نے حرکت کی، ''ویل ڈن شہریار! تم خوب صورت ہو، اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور مخلص بھی ہو۔''

اُس کے ایک ہی جملے نے مجھ پر آشکار کر دیا کہ نصف شب تک چلنے والا رومانوی تحرک اور نیکی کا پرچار محض ڈراما تھا۔ یہ ایک طرح کا امتحان تھا جس میں میں کامیاب ٹھہرا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری۔ میڈم کی سرخ آنکھوں والا چہرہ دیکھا۔ پھر گردن موڑ کر چوکھٹ سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے ساکت بدن کھڑی سونیا کو دیکھا۔ اُس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ چند لمحے پیشتر نظر آنے والے تاثرات عدم تھے۔ وہ اَب نہ تو فریفتہ دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی آتشِ شباب سے ہاری ہوئی دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔

میں نے میڈم کو مخاطب کیا، ''میڈم! یہ سب کیا ہے؟''

وہ بولی، ''تمھارا اشارہ اسما کی طرف ہے یا سونیا کی طرف؟''

میں چونکا، ''میرا مطلب، آپ کی یہاں موجودگی سے ہے۔''

اُس کے گلابی لبوں سے جلترنگ پھوٹی، پھر مترنم گھنٹیاں تھم گئیں، بولی، ''سونیا! تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔''

سونیا نے جانے میں دیر نہیں کی۔ میڈم نے اشارے سے اپنے قریب بلایا اور کرسی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود صوفے پر ٹک گئی۔ بولی، ''شہریار! اسے جانتے ہو؟''

اُس کا اشارہ بیڈ پر بے حس و حرکت پڑی اسما کی طرف تھا۔

میں نے کہا، ''جی! یہ سردار حیدر خان کی بیٹی اسما ہے۔ اسی سے ملنے کے لیے تو میں اور کھالا ملتان آئے تھے۔''

''میں نے اِسے اغوا کروایا ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ کچھ دیر تک گھورتی رہی، پھر ہونٹوں پر اندازِ عجب سے زبان پھیرنے لگی۔ میں نے کہا، ''جی!''

وہ چونکی، ''ہاں تو شہریار! میں نے اسے اغوا کرایا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں سردار حیدر خان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ اُس کے چنگل میں پھنسی ہوئی تمہاری بہن تک رسائی حاصل

نہیں کر سکتی۔ جاؤں گی تو اُس کے خونخوار کارندے گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ اگر وہاں سے بچ کر آ گئی تو میرے بڑے مجھے الٹا لٹکا دیں گے۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہر بڑے کے پیچھے ایک اور بڑا موجود ہوتا ہے جو اپنے ہاتھ میں لگامیں تھامے کھڑا ہوتا ہے۔ میرے پیچھے بھی ایسی طاقتیں موجود ہیں۔ وہی طاقتیں سردار حیدر خان کی رسی کو دراز کرتی ہیں۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی، ساتھ انگلیوں سے کھیل رہی تھی، ''ایک تیسری پارٹی کو بیچ میں ڈال کر میں نے اسما کو حیدر خان کی ملتان والی کوٹھی سے اغوا کرا لیا ہے۔ وہ پارٹی اغوا برائے تاوان کے لیے کام کرتی ہے۔ وہ حیدر خان سے رابطہ کر رہی ہے۔ رابطہ ہونے پر اسما کے بدلے تمہاری بہن کو مانگے گی۔ ملنے پر مجھے پہنچا دے گی اور اسما کو اپنی تحویل میں لے لے گی۔ اسما کے ساتھ پندرہ لاکھ روپے بھی اِس کوٹھی سے جائیں گے۔''

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ میڈم نے میری خاطر اوکھلی میں سر ڈال دیا تھا۔ میری آنکھوں سے ممنونیت کے پرتو جھلک اُٹھے۔ بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا، ''میڈم! میں آپ کے احسانات کا بدلہ شاید کبھی نہیں چکا پاؤں گا۔''

''اگر احسان کا بدلہ محبت میں طلب کیا جائے تو؟''

میرا جھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اُٹھا، میڈم کو دیکھا، دلچسپی آمیز مسکراہٹ چہرے پر ناچ رہی تھی اور وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں قدرے گھبرا گیا، بولا، ''جی میڈم! میں سمجھا نہیں۔''

وہ بولی، ''انسان جس سے محبت کرتا ہے، اُسے دھوکہ نہیں دیتا۔ اُسے چھوڑ کر نہیں جاتا۔ کیا تم ہمیشہ میرے ساتھ رہ سکتے ہو؟''

اُس کی فرمائش پوری کرنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا، ''جی میڈم! میں کوشش کروں گا کہ آپ کو ناراض نہ کروں۔ ویسے میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔''

وہ بولی، ''تم کس قابل ہو، یہ میں جانتی ہوں۔ تمہیں کس قابل کرنا ہے، یہ میرے ساتھی جانتے ہیں۔ اَب تم جاؤ، آرام کرو، اور ہاں! کسی سے، حتیٰ کہ اپنے دوست کھالے سے اسما کا تذکرہ نہیں کرو گے۔ اگر سردار حیدر خان کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ اسما یہاں ہے تو اُس کے غنڈے بھیڑیوں کی طرح یہاں دوڑے چلے آئیں گے۔ منزل ہاتھ میں آ کر دور ہو جائے گی۔''

میں نے 'یس میڈم' کہا اور گراؤنڈ فلور پر واقع اپنے گیسٹ روم میں جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔ میڈم کی آواز سنائی دی، ''اب تم اس کمرے میں بھی نہیں آؤ گے۔ اگر اسما نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر تم پر نور پور کی فضا تنگ ہو جائے گی۔''

مجھے اس بات کا خیال نہیں تھا، میڈم شکیلہ کی تاکید پر مجھے جھٹکا سا لگا۔ اسما بے ہوش پڑی تھی۔ اگر جاگ رہی ہوتی تو مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیتی اور پھر سردار حیدر خان کو میرے گھر تک پہنچنے میں مطلق دیر نہ لگتی۔

میں نے جاتے ہوئے ممنونانہ نظر سے میڈم کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ اسما کے چہرے سے کھیلنے لگا تھا اور نظریں اُس کے گلابیں چہرے کا طواف کرنے لگی تھیں۔

گراؤنڈ فلور کے گیسٹ روم میں پہنچ کر میں گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر لیٹا۔ جب سے پروین نظروں سے اوجھل ہوئی تھی، پہلی مرتبہ اطمینان کی سانس سینے میں اُتری تھی۔ دل کو تسلی ہوئی تھی کہ اسما کے اغوا کا سنتے ہی سردار حیدر خان کی اونچے شملے والی پگ زمین بوس ہو جائے گی اور وہ اپنی بانہہ لینے کے لیے پروین کو بلاتردد بالواسطہ طور پر میڈم کے حوالے کر دے گا۔ میرے دل میں بے اختیار میڈم کے لیے احترام اور عقیدت کے جذبات ہلکورے لینے لگے۔ سونیا نے اُس کے بارے میں جو بتایا، وہ درست بھی تھا تو بھی وہ میرے لیے قابلِ احترام تھی، میری محسنہ تھی۔ اُس نے نہ صرف مجھے قتل کے متوقع مقدمے میں مکھن سے بال کی طرح نکال لیا تھا۔ مجھے سائیں دل جیت والا مضبوط کلیو دیا تھا وگرنہ میں اگر تمام عمر بھی سر پٹختا رہتا، اپنی پروین تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ طے تھا کہ میں سردار حیدر خان تو کجا، سردار حیات خان پر بھی ہاتھ اُٹھانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے میری خاطر اتنے بڑے اور طاقتور آدمی سے ٹکر لے لی تھی۔ وہ دیکھنے میں بہت نازک اندام تھی، عملی طور پر وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اتنی طاقت رکھتی تھی کہ سردار حیدر خان کی مونچھ پکڑ کر اپنی ہیل کے نیچے دَبا سکتی تھی۔ یہ تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔ شکر تھا کہ میں اُس کی آزمائش کے کڑے امتحان میں سرخرو ہوا تھا۔ اُس کی ذہانت اور چالاکی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے بجا طور پر علم تھا کہ میرا دیہاتی پن مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا گیا تھا۔ اگر میں چالاک بننے کی کوشش کرتا تو اِس وقت میں یہاں نہ ہوتا بلکہ دھتکار دیا گیا ہوتا یا کہیں پڑا زندگی کی بھیک مانگ رہا ہوتا۔ یہ طے تھا کہ میڈم جیسی دکھائی دیتی تھی، ویسی تھی نہیں۔ اُس کے کارنامے عیاں کرتے تھے کہ وہ بہت زیرک، تیز فہم اور سفاک

عورت تھی۔ اگر وہ میری خاطر سردار حیدر خان کی غیرت کو چرکہ لگا سکتی تھی تو مجھ سے بدگمان ہو کر میرا پتہ بھی کاٹ سکتی تھی۔

میں اب بھی خطرات کی زد میں تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ دل جیت کی نعش راکھ بن کر دنیا سے غائب ہوگئی تھی یا نشانِ عبرت بن کر اپنے قاتل کو تلاش کرتی پھرتی تھی۔ مجھے اُس کی بیویوں اور کم سن بیٹوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا، مجھے وریام خان، حیدر خان اور دل جیت کے بدقماش اور چہیتے بدمعاشوں کا خوف لاحق تھا جو رات کے اندھیرے میں کسی بھی وقت موت کے ہرکارے بن کر میرے گھر میں اُتر سکتے تھے۔ چونکہ میرے علاوہ گھر میں کوئی بھی ایسا فرد نہیں تھا جو ظلم کی ایسی تند ہوا کے سامنے چند سیکنڈ بھی ٹھہر سکے، اِس لیے میرا دل اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اگر اُس کی لاش بالن کے ساتھ جل کر راکھ بن گئی تھی تو پھر اُس کے غیاب کا مسئلہ نور پور میں پورے شدومد سے کھڑا ہوگا۔ چہ مگوئیوں کا بازار گرم ہوگا اور پولیس کا آنا جانا لگا ہوگا۔ ایک دھڑکا یہ بھی تھا کہ میری عدم موجودگی میری ذات کو مشکوک نہ بنا چکی ہو۔ میں گیسٹ روم میں پڑے ہوئے فون پر بخت خان سے رابطہ کر کے نور پور کے حالات کے بارے میں پوچھ سکتا تھا مگر میر وشاہ اور میڈم نے مجھے کہیں فون کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ بعید از احتمال نہ تھا کہ میرے کمرے کی کسی طریقے سے نگرانی کی جارہی ہو اور ابھی میرا آزمائشی مرحلہ ختم نہ ہوا ہو۔

اسما کو دیکھ کر دل میں جاگنے والا پہلا احساس ہمدردی کا تھا۔ تب میں نے اُسے کھالے کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جونہی مجھے اُس کے وجود کے تاوان میں ملتی ہوئی پروین کی شکل دکھائی دی، میرے دل میں اُس کے لئے کدورت اور نفرت کے جذبات اُمڈ آئے تھے۔ وہ فرعون کی بیٹی تھی۔ وہ زہریلے سانپ کی بیٹی تھی۔ انسانی لبادے میں خطرناک ناگن تھی جو کسی پل ڈس کر زندگی کی ڈور کاٹ سکتی تھی۔

ذہنی رَو بدلی اور اس نے مجھے آنِ واحد میں میڈم، سونیا اور اسما کے گل گوں چہروں کے تسلط سے نکال کر نور پور کی تازہ دَم گلیوں میں پہنچا دیا جہاں شانو، صدف بی بی اور غزالہ کے معصوم چہروں کی راجواڑیاں قائم تھیں۔ صدف بی بی یاد آئی تو اُس کا ملتف ہونا پہلو میں کچوکے لگانے لگا۔ کھالے کے گھر میں پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے کے بعد جب میں ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میں نے غزالہ کو چھیڑنے کی غرض سے مصنوعی تفاخر کے ساتھ کہا تھا کہ صدف بی بی بہت اچھی ہیں اور مجھے بہت غور سے دیکھتی ہیں تو اُس کا منہ بن گیا تھا۔ پھر اُس

نے تنہائی پاتے ہی کہہ دیا، ''شہریار! سکول کی کڑیاں تمہاری تعریفیں کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ کسی 'نمازن پرہیزن' ماں نے تمہیں جنا ہے۔''

''اور تم کیا کہتی ہو؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

اُس نے میری طرف بے ساختگی سے دیکھا۔ فخر کا جذبہ انگ انگ سے عیاں ہو گیا۔ بولی،

''میرا شہرا تو جگ سے وکھرا (جداگانہ) ہے۔ کڑیاں ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔''

''اور اگر میں بلو کے خطرناک حملے میں ہار جاتا تو؟''

وہ وثوق سے بولی، ''تو بھی میرا سوہنا رَب میری محبت کی لاج رکھتا اور تمہیں اُس کل موُنھی کے چنگل سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیتا۔''

محبت کی سفر یقین کی راہ پر جاری رہتا ہے۔ جونہی بھروسہ اُٹھ جاتا ہے، پیرشل ہونے لگتے ہیں۔ اُس کا پُر یقین لہجہ اور ستائش بھری نگاہ سے مجھے نئی توانائی مل رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی،

''مجھے صدف بی بی نے بلوایا تھا۔ مجھ سے نکی نکی (چھوٹی چھوٹی) باتیں پوچھتی رہی۔ میں نے سارا واقعہ کھول سنایا تو پتہ ہے اُس نے کیا کہا تھا؟''

میں نے جلدی سے پوچھا، ''کیا کہا تھا؟''

''اُس نے کہا تھا کہ شالا میں شہرے کی 'منگ' ہوتی۔'' غزالہ کی آنکھوں میں شرارت بھر گئی۔

سارا نور پور جانتا تھا کہ غزالہ میری منگ (منگیتر) تھی۔ مجھے اُس کی یہ بات سن کر تعجب ہوا۔ کہاں میں، کہاں صدف بی بی۔ سوائے ایک ننھے سے رقعے کے کوئی تعلق استوار نہیں ہوا تھا۔ غزالہ میرے کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ پروین نے جھانکا۔ غزالہ کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولی، ''میں جانتی ہوں کہ تم کھالے سے ملے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مگر یہ تو کر سکتے ہو کہ اُسے باہر مل لیا کرو، اُس کے گھر نہ جایا کرو۔ سچی شہرے! میرا دل اَب بھی کانپ اُٹھتا ہے جب میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آتا ہے۔ تمہیں چارپائی پر بے ہوش پڑے دیکھ کر میری جان نکل گئی تھی۔''

میری بند آنکھوں کے عقب میں پروین، غزالہ اور کھالے کی صورتیں گڈمڈ ہونے لگیں، نجانے کس وقت نیند آئی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ صبح آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے۔ میں جلدی سے میر وشاہ کے کمرے کی طرف لپکا۔ خالی کمرہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میر وشاہ

نجانے کس وقت چلا گیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ میر وشاہ تو دکھائی نہیں دیا البتہ انسپکٹر اظہر سفید لٹھے کے کلف شدہ سوٹ میں ملبوس ظاہر خان کی معیت میں مین گیٹ میں داخل ہوتا نظر آیا۔ میں چونکا۔ اُس کی یہاں آمد بلا جواز نہیں تھی۔ وہ اکیلا تھا، سرکاری گاڑی میں نہیں تھا، یا اگر ایسا نہیں تھا تو گاڑی اور اُس کے ساتھی گیٹ کے باہر ہی رک گئے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے مرکزی گیٹ کے سامنے بنے ہوئے آرائشی برآمدے میں داخل ہوتے ہی دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کمرے کے دروازے میں ظاہر شاہ کی شکل دکھائی دی۔ اُس نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا، ''خان! وہ میر وشاہ دکھائی نہیں دیتا۔''

اُس نے منہ بنا کر کہا، ''وہ چڑی مار کا بچہ اُباسیاں (جماہیاں) لیتا ہوا دَپان (دفعان) ہو گیا اے.....''

وہ کہاں چلا گیا تھا؟ کم بخت کے آنے جانے کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ مجھے بے عنوان اضطراب نے آن گھیرا۔ میں نے پوچھا، ''وہ تھانیدار کیوں آیا ہے؟''

''امارے کو کیا پتہ..... میڈم صاب سے ملنے آئی اے۔''

اس نے جاتے ہوئے کہا۔ آدھی بات سنائی دی، آدھی گیلری میں ہی تحلیل ہو گئی۔ میں ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ کھڑکی کے راستے ظاہر خان اور انسپکٹر اظہر کی باتوں کی ملی جلی آوازیں کانوں میں پڑیں، جن سے معلوم ہوا کہ انسپکٹر اظہر میڈم شکیلہ سے ملنے کے بعد رخصت ہو رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اتنی مختصر ملاقات میں اس نے میڈم سے کیا کہا ہو گا؟ پھر سر جھٹکا اور ناشتے میں مشغول ہو گیا۔ وہ کیوں ملے، یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ ظاہر خان برتن سمیٹ کر اوجھل ہوا تو میڈم کا بلاوا آ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں مخصوص صوفے پر بڑی آسان تن ہو کر بیٹھی تھی۔ میں نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔ اُس نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں صوفے پر ٹک سا گیا اور اُس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر کے بعد گویا ہوئی، ''شہریار! میں بہت بُری طرح پھنس گئی ہوں۔''

''جی؟'' میں چونکا، میڈم کو دیکھا، بولا، ''میں سمجھا نہیں۔''

اُس کے دل افزاء چہرے پر فکر و تردد کی پرچھائیں رقصاں دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا تھا۔

مجھے چند لمحوں تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولی، ''میں نے افضل نیازی کے

گروپ کو اسما کے اغوا کا ٹاسک دیا تھا۔ پندرہ لاکھ میں سودا ہوا تھا۔ افضل وعدہ نبھانے والا آدمی ہے۔ اُس نے ہتھیلی پر سرسوں جما کر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ یہاں تک تو معاملہ بالکل درست تھا۔ اَبھی انسپکٹر اظہر نے آ کر اطلاع دی ہے کہ افضل نیازی کو بھرے بازار میں اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا کاروں کا طریقِ کار اور دیدہ دلیری چغلی کھاتی ہے کہ وہ سردار حیدر خان کے تربیت یافتہ لوگ تھے۔''

میری پیشانی بھی شکن آلود ہوگئی۔ میڈم شکیلہ کی پریشانی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اگر سردار حیدر خان اتنے مختصر وقت میں میڈم کی ہائر کی ہوئی پارٹی کے سربراہ تک پہنچ گیا تھا تو وہ میڈم تک پہنچنے میں دیر نہیں کرے گا۔ میں نے گھبرا کر کہا، ''اب کیا ہوگا میڈم؟''

میڈم نے فی الفور میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ اپنی گداز اور گل فام انگلیوں سے کھیلتی رہی، سوچتی رہی، توقف کے بعد بولی، ''افضل نیازی معمولی آدمی نہیں ہے مگر وہ حیدر خان کے غیظ وغضب کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر پائے گا اور میرا نام بتا دے گا۔ حیدر خان کا گرگا، استاد ببلو، پہلے ہی مجھ سے خار رکھتا ہے۔ اپنے مالک کی شہہ پر بھوکے کتے کی طرح میری طرف دوڑ پڑے گا۔''

میں نے تفکر و استعجاب آمیز انداز میں کہا، ''کیا حیدر خان اتنا ہی طاقت ور ہے؟''

''ہاں! وہ بہت بڑا فرعون ہے۔ ایک طرف تو اُس نے بیلے میں اپنے گرگوں کی فوج پال رکھی ہے، دوسری طرف سیکڑوں سیاست دان اُس کی مٹھی میں ہیں۔''

وہ بیک وقت متفکر بھی تھی، پریشان بھی اور خوفزدہ بھی..... میرا دیہاتی پن عود کر آیا، کہا، ''میڈم! آپ خوفزدہ نہ ہوں، میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ پر آنے والی آنچ اپنے بدن پر روکوں گا۔''

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا، یقین نہیں آیا تو آنکھوں ہی آنکھوں سے کریدنے لگی، بولی، ''میں خوفزدہ نہیں ہوں، پریشان ہوں۔ حیدر خان اور اُس کا گرگا مجھ سے ذاتی پرخاش رکھتے ہیں۔ چونکہ کچھ مفادات کے معاملے ہیں کہ ہم نے آج تک ایک دوسرے پر اسلحہ نہیں تانا۔ مگر شہر یار! یہ زندگی، عام دنیا کی زندگی سے بہت مختلف ہے۔ یہاں اپنے ہاتھ سے اپنے وفاداروں کو گولی مارنا پڑتی ہے، تو اپنی جان دے کر ان کی حفاظت بھی کرنا پڑتی ہے۔ میرا گروپ بڑا مضبوط ہے۔ مجھ پر میرے جانثار انگلی نہیں اُٹھنے دیں گے، کوئی گن اُٹھانے کی

جرأت کیسے کرے گا مگر یہ لوگ بہت قیمتی ہیں۔ ایک بھی مارا گیا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔''

میں نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ دیکھنے میں معصوم تھی، حقیقت میں بہت گھاگ تھی۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُس کے دائیں پہلو میں صوفے پر پڑا ہوا موبائل فون بج اُٹھا۔ اُس نے کال ریسیو کی۔ ننھے اسپیکر سے ابھرنے والی آواز سنتی رہی، پھر ٹھہر ٹھہرے انداز میں بولی، ''کیا تم لوگوں نے اپنے باس کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کیا اَب تک؟''

دوسری طرف کی بات سن کر طعنہ زن لہجے میں بولی، ''تم لوگوں پر آنچ آئے تو نیازی بھڑک اُٹھتا ہے۔ خون کا بازار گرم کر دیتا ہے۔ تم ہو کہ وہ بھرے بازار میں اغوا ہو گیا اور تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو۔''

موبائل فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی توجیہہ سننے کے بعد قدرے استہزائیہ انداز میں بولی، ''ارے واہ! پولیس ڈیپارٹمنٹ کو پتہ چل گیا ہے کہ افضل نیازی کو سردار حیدر خان نے اغوا کرایا ہے اور تمہیں پتہ نہیں چل رہا..... کیا خوب! تم لوگ میرا فکر نہ کرو، اپنا فکر کرو اور اگر نمک حلال ہو تو شام ڈھلنے سے پیشتر اپنے باس کو ڈھونڈ نکالو ورنہ تم سب لوگ بے موت مارے جاؤ گے۔''

اُس نے مخاطب کا مکمل جملہ سنے بغیر فون کان سے ہٹا لیا اور سکرین کو گھورنے لگی۔ ایسے میں خود کلامی کے سے انداز میں بولی، ''افضل خان کا چہیتا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ باس کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ابھی پوچھتے پھرتے ہیں، جب کبھی اُس تک پہنچ پائے تو گلی سڑی لاش کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

میں چونکہ میڈم کے مقابلے میں خود کو نہایت بونا تصور کرتا تھا، ان معاملات میں تجربہ نہ ہونے کے برابر تھا، اِس لیے اس کی مدد کرنے یا کوئی اچھا مشورہ دینے سے قاصر تھا۔ اُس نے مجھ پر توجہ دیے بغیر کئی لوگوں سے فون پر رابطہ کیا اور مختلف ہدایات دیں۔ اس کی باتوں سے میں صرف یہی اندازہ لگا سکا تھا کہ اُس نے تمام لوگوں کو پوزیشنیں بدلنے، اپنے دفاع میں قلعہ بند ہونے اور اسلحہ سنبھال لینے کے ہنگامی احکامات صادر کیے تھے۔ اُس نے میر وشاہ کو فون کیا، کہا، ''میر وشاہ! تم کسی نہ کسی طرح استاد ببلو کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ محتاط انداز میں نگرانی کرو۔ وہ جب بھی اپنے غنڈے لے کر اڈے سے نکلے، مجھے بتا دینا۔ میں سی ٹو میں جا رہی ہوں۔ سبھی لوگوں کو میں نے سی ون اور سی تھری میں جانے کا حکم دے دیا ہے۔ او کے؟''

میر وشاہ نے اپنے مخصوص انداز میں کچھ کہا جسے سن کر میڈم کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ بولی، ''تم کبھی بھی انسان نہیں بن سکتے ہو۔ جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو ورنہ ہم اپنا نقصان کر بیٹھیں گے۔''

فون بند کر کے مجھ سے مخاطب ہوئی، ''ہاہ! میڈم کی آنکھ کے ایک اشارے پر میر وشاہ استاد ببلو اور حیدر خان کی ایسی کی تیسی کر دے گا..... کم بخت سنجیدہ بات کرے تب بھی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ یہ بھی درست تھا کہ وہ میر وشاہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ اس کا تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔

میڈم ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ سرسری انداز میں چہار سُو دیکھتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ ایسے میں رُک گئی۔ کھالا میرے ساتھ ہوتا تو یہی کہتا کہ یوں جیسے دُنیا ایک نقطے پر رُک گئی ہو..... میری طرف بغور دیکھتے ہوئے بولی، ''شہریار! تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ اگر چاہو تو واپسی کا راستہ ابھی بھی کھلا ہے۔ چاہو تو میرا ساتھ دو۔''

اس نے میری وجہ سے دردِ سر مول لیا تھا۔ جس سے ٹکرانا نہیں چاہتی تھی، اُسی سے ٹکراؤ میری وجہ سے ہونے چلا تھا۔ کیسے لوٹ جاتا۔ کھڑا ہو کر مضبوط لہجے میں بولا، ''میڈم! مجھے آپ کی دنیا اچھی نہیں لگی مگر آپ سے اچھا تو دُنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کے احسانات کے بار تلے دبا ہوں۔ جان دے سکتا ہوں، چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

وہ بڑے جاندار انداز میں مسکرائی، ایک ذرا لہرائی، بولی، ''دیکھ لو..... گولیوں کے شور میں اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ خون بہنے لگے تو جسم ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے۔ جذبات کی دستکیں بجھنے لگتی ہیں۔ پھر انسان پچھتاووں کی لپیٹ میں آ جاتا تھا۔ اکثر پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملتی ہماری دُنیا میں۔''

اُس کی آنکھوں سے ہویدا تاثرات نے میرا دل یکبارگی دھڑکا دیا۔ وہ جتنی خوب صورت تھی، اتنی ہی خوب صورت باتیں کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی، یونیورسٹی لیول کی لڑکی تھی۔ ہر رنگ میں پیاری لگتی تھی۔ خدا جانے کن حالات کے تحت وہ اس مقام پر پہنچی تھی کہ آنکھوں کے اشاروں سے قتل کے احکامات صادر کرتی تھی۔ اس کی گفتگو اور رکھ رکھاؤ کے پیشِ نظر اُس کے کردار اور افعال کی مظاہر کہانیوں پر یقین نہیں آتا تھا۔

میں نے پورے اعتماد سے کہا، ''میڈم! میرے ماں باپ کسی ظالم بھیڑیے نے برسوں پہلے قتل کر دیے تھے۔ مجھے نہ تو قتل کی وجہ معلوم ہو سکی، نہ میرا ہاتھ قاتل کی گردن تک پہنچ پایا۔ والدین کے بعد میرا دُنیا میں ایک ہی رشتہ بچا تھا، وہ تھا بہن کا۔ بہن سائیں دل جیت کے ہاتھوں سے گزر کر سردار حیدر تک پہنچ گئی ہے۔ خدا جانے کس حال میں ہے، زندہ ہے، مردہ ہے یا مردوں سے بھی بدتر ہے۔ اگر وہ مل گئی تو اس کے بارے میں سوچوں گا۔ نہیں ملی تو پھر سردار حیدر خان کی گردن ماپوں گا۔ کہیں زندگی میں ماں باپ کا قاتل مل گیا تو اس سے حساب کتاب کروں گا۔ بس..... یہی میری زندگی ہے..... یہی زندگی کا مقصد..... رہی بات جذبات کی، تو کل تک کھالا تھا، ڈاکٹر شاہ جی تھا اور میری منگیتر تھی۔ آج آپ ہیں، میر و شاہ ہے اور میں..... کل کیا ہوگا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں! ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ جب مجھ پر اعتماد نہ رہے، مجھے کہہ دیجئے گا۔ میں ہمیشہ کے لیے آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گا۔ جانے کے بعد آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے قتل نہ کروایئے گا، بلکہ مجھے اپنی زندگی کے مقصد پورے کرنے کی مہلت دیجئے گا۔''

میری گفتگو لہجے کی سختی سے شروع ہوئی تھی، نادیدہ آنسوؤں کی رُندھگی پر منتج ہوئی۔ وہ مجھے بغور دیکھتی رہی، قریب آئی اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی، ''شہریار! تم بہت مختلف انسان ہو، سمجھ گئی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ آئی لو یو شہر!''

میرے ہاتھوں پر اُس کے گداز ہاتھوں کا لمس..... کانوں میں اُترا ہوا جملہ 'آئی لو یو شہر!'..... میرے لیے نہایت غیر متوقع تھے۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ زبان تھم گئی۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کہہ رہی تھی، ''تمہاری بہن تمہیں ضرور ملے گی مگر تم اُسے نور پور میں نہیں رکھ سکو گے۔ کیونکہ سردار حیدر خان ناکامی پر تلملا کر، اپنے کالے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے تمہیں اور تمہاری بہن کو مروا دے گا۔ وہ ایسا کر سکتا ہے۔ تم اُس کے گرگوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو۔ دعا کرو، تمہاری بہن جلد ہاتھ لگ جائے اور میں تمہیں انسانوں کے اِس جنگل میں، اس شہر میں، کہیں چھپا دوں۔''

اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو ہلکا سا دبا کر چھوڑ دیا اور مسکرا کر بولی، ''کم آن..... ہمیں قلعہ بند ہونا ہے کیونکہ کسی وقت بھی میر و شاہ کی کال آ سکتی ہے۔''

میں اُس کے عقب میں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ گیلری خالی تھی۔ چند لمحوں بعد پتہ چلا

کہ فرسٹ فلور بھی خالی تھا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر آئے۔ گیسٹ ہاؤس کی مشرقی گیلری میں آخری کمرے کے دروازے تک چلے گئے۔ اس کمرے کے بالمقابل باتھ روم تھا جس کا واش بیسن گیلری میں نصب تھا۔ وہ جھکی اور واش بیسن کے پانی والے زیریں پائپ کے سامنے پیروں کے بل فرش پر بیٹھ گئی۔ پائپ اور دیوار کے بیچ میں ہاتھ ڈالا، کلائی موڑی اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ مجھے اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے میں گھس گئی۔ یہ بالکل اُسی نوع کا کمرہ تھا، جس طرح کے کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ جہازی سائز کے بیڈ کا چکر کاٹ کر باتھ روم کی طرف بڑھی۔ میں بیڈ کے پاس ہی رُک گیا۔

وہ باتھ روم میں چند لمحوں تک مصروف رہی، پھر اُس کی آواز سنائی دی، ''شہر یار! کم آن.....''

میں باتھ روم میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ فلش کے پار، دو فٹ چوڑائی کی حامل سیڑھیاں موجود تھیں۔ میڈم دوسرے زینے پر کھڑی پلٹ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اُس کے نقشِ پا پر چلتا ہوا سیڑھیوں تک آیا۔ اُس نے دیوار کے ساتھ کمر ٹکا کر مجھے نیچے جانے کا اشارہ کیا۔ دونوں دیواروں کے مابین محض دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں گزر سکتا۔ میری ہچکچاہٹ پر بولی، ''گزر جاؤ ناں..... میں نے یہ راستہ بند کرنا ہے۔''

میں نے بچ کر گزرنا چاہا مگر اُس کے دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے بدن سے رگڑ کھاتا ہوا بمشکل گزر پایا۔ یہ مرحلہ بڑا جان گسل تھا۔ جب میں تین چار سیڑھیاں اُتر کر رُکا اور پلٹ کر دیکھا تو وہ بیٹھی، دیوار کی جڑ میں 'کچھ' کر رہی تھی۔ میری حیرت دو چند ہوئی جب میں نے دائیں ہاتھ والی دیوار کو آہستہ سے سرکتے ہوئے سیڑھیوں اور باتھ روم کے درمیان حائل ہوتے دیکھا۔ چند لمحوں بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے سیڑھیوں کے سامنے آف وائٹ کلر کی دیوار چن دی گئی ہو۔ زیرو واٹ کا بلب روشن نہ ہوتا تو کچھ دکھائی نہ دیتا۔

وہ راستہ مسدود ہونے کے بعد بھی چند لمحے دیوار کی جڑ میں بیٹھی رہی، پھر کھڑی ہو کر زینے اُترنے لگی۔ زینوں کا اختتام ایک کشادہ کمرے میں ہوا جو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ہموار چھت میں تین ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ پہلی نظر میں 'اسٹور' محسوس ہوا کیونکہ کئی کریٹ سائز کی چوبی پیٹیاں، عام استعمال کا گھریلو سامان اور پولی پراپلین کے تھیلے ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے

نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میڈم نے موبائل فون پر کسی سے رابطہ کیا اور کہا، ''اسٹور کا دروازہ کھولو۔''

میں نے چونک کر چہار سُو دیکھا۔ سوائے سیڑھیوں کے خلا کے کوئی دروازہ نہیں تھا۔ تب مبہوت رہ گیا، جب چوبی پیٹیوں کے عقب میں پندرہ سولہ فٹ لمبی دیوار آہستگی سے دائیں ہاتھ کھسکنے لگی اور نکڑ میں ایک خلا نمودار ہو گیا۔ دو ضرب تیرہ فٹ چوڑے خلا کے پار ایک طویل گیلری دکھائی دی۔ میڈم نے گیلری میں قدم رکھا ہی تھا کہ فائر کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ وہ چونک کر پلٹی، بولی، ''ہری اَپ شہریار! اٹیک ہو گیا ہے۔''

فائر کی آواز تیز نہیں تھی مگر پہچان لی جانے والی تھی۔ میں نے گیلری میں داخل ہونے میں دیر نہیں کی اور بھاگنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی میڈم شکیلہ کے عقب میں پہنچ گیا۔ گردن موڑ کر دیکھا تو دیوار سرک کر خلا کو بند کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں فائرنگ کی ہلکی مگر مسلسل آوازیں ہمارے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میڈم نے ٹھیک کہا تھا کہ کوٹھی پر سردار حیدر خان کے گرگوں کا حملہ ہو گیا تھا۔

تقریباً تین سو فٹ لمبی گیلری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دودھیا بلب روشن تھے۔ گیلری کا دوسرا سرا بند تھا۔ ہم اَبھی نصف فاصلہ طے کر پائے تھے کہ گیلری کو بند کرنے والی دیوار بھی بائیں ہاتھ سرکنے لگی۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک اُس نے جتنا ہٹنا تھا، ہٹ گئی اور ہمارے گزرنے کی جگہ بن گئی۔ گیلری ایک بارہ ضرب چودہ فٹ کے کمرے میں کھلی تھی جو عجیب ساخت کی گتے کی پیٹیوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں ابھی اپنی حیرت میں گم تھا، بھول بھلیوں کا ایک اور مرحلہ درپیش ہو گیا۔

ہمارا سفر ایک فلیٹ نما عمارت میں اختتام پذیر ہوا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں گیسٹ ہاؤس سے کم و بیش آٹھ سو فٹ دور اور سطح زمین سے بیس بائیس فٹ کی گہرائی میں کھڑا تھا۔ پہلے کمرے اور گیلری میں فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تھے، فائرنگ کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ شاید فائرنگ کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ گیلری میں گھٹن کا احساس ہوتا تھا مگر یہاں کی فضا حبس آلود نہیں تھی۔ یہاں چار کمرے تھے جن کے نیم وا دروازوں سے ملی جلی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ دس پندرہ یا اس سے بھی زیادہ تعداد میں لوگ یہاں موجود تھے۔

میڈم شکیلہ نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ دس ضرب آٹھ سائز کی ٹی وی لاؤنج نما گیلری میں کھلنے والے چاروں میں سے آخری دروازہ عبور کر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں نے تقلید کی۔ کمرہ اتنا بڑا نہیں تھا۔ مجھے داہنی دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دوسری دیوار تک گئی۔ چوبی میز پر کمپیوٹر رکھا تھا۔ وہ سوئچ بورڈ پر کئی بٹن پش کرنے کے بعد کمپیوٹر کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایسے میں اُس کی پشت میری جانب تھی۔

میڈم نے فون پر کسی سے رابطہ کیا، سخت لہجے میں بولی، ''تم استاد ببلو کو ٹریس کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہو، ڈینگیں مارنے کے علاوہ تمہاری تمام صلاحیتیں زنگ پکڑنے لگی ہیں۔''

وہ یقیناً میر وشاہ سے بات کر رہی تھی۔

''ہاں تو! کوٹھی پر حملہ ہو چکا ہے۔ فائرنگ کی آواز میں نے سنی ہے۔''

میر وشاہ کی بات سن کر بولی، ''میرا فکر نہ کرو، میں سی ٹو میں پہنچ چکی ہوں۔ سبھی لوگ محفوظ ہیں۔ تم حملہ آوروں سے دور رہو۔ جو کرتے ہیں، کرنے دو۔''

ایسے ہی وقت میں کمپیوٹر آن ہو گیا۔ میڈم کا ہاتھ ماؤس پر متحرک ہو گیا۔ وہ میر وشاہ کو ہدایات بھی دے رہی تھی اور کمپیوٹر پر مختلف ونڈوز بھی کھولتی جاتی تھی۔ چند ہی لمحوں میں مانیٹر کی اسکرین پر چار چوکھٹوں میں چار مختلف مناظر بیدار ہو گئے۔ ایک منظر میرا دیکھا ہوا تھا۔ کوٹھی کا کھلا ہوا مین گیٹ دکھائی دے رہا تھا جس کے پار تین گاڑیاں سڑک پر کھڑی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی کرولا کار تھی جبکہ دو سفید رنگ کے فورویل ڈبل کیبن ڈالے تھے۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ سبھی گاڑیاں، مین گیٹ کا واچ مین کیبن اور برآمدے کی طرف آتی ہوئی چوڑی روش خالی تھی۔ کوئی ذی نفس سکرین پر متحرک نہیں تھا۔ دوسرے مناظر میرے نزدیک اجنبی تھے۔

میڈم فون پر میر وشاہ سے مخاطب تھی، ''میر وشاہ! سبھی لوگ کوٹھی میں داخل ہو چکے ہیں۔ تم پٹرولنگ اور ایلیٹ فورسز کو فون پر اطلاع دو۔ ان میں سے کوئی بھی بچ کر نہ جائے۔ ایک آدمی کو ایسی پوزیشن پر تعینات کرو جہاں سے وہ کسی کی نگاہ میں نہ آئے اور آسانی سے کسی پولیس آفیسر کا نشانہ لے سکے۔''

پھر بولی، ''ہاں ہاں! جب تک کوئی پولیس والا نہیں گرے گا، مقابلے میں جان نہیں پڑے گی۔''

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ کسی اور کا نمبر ملا لیا۔ وہ اِس وقت پوری طرح متحرک تھی۔

فون کان سے لگائے میری طرف پلٹی اور ہاتھ کے اشارے سے پانی طلب کیا۔ میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کمرے کے ایک کونے میں پورٹیبل فریج موجود تھی۔ اُسے مؤدبانہ انداز میں پانی کا گلاس پیش کیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ وہ کسی پولیس آفیسر سے محوِ کلام تھی۔

کمپیوٹر اسکرین پر پھیلے ہوئے مناظر قریب سے اور اُجاگر ہو گئے۔ چاروں چوکھٹوں میں ماہرانہ انداز میں نقل و حرکت کرتے ہوئے گن بردار نظر آئے۔ چونکہ میڈم فون پر باتیں کر رہی تھی، اِس لیے میں اُس سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔ خاموش رہنا بھی مشکل تھا۔ گن برداروں کی تعداد پانچ سے زیادہ تھی۔ اُن کی حرکات سے عیاں مشاقی اُن کے عزائم کو آشکار کرتی تھی۔ وہ میڈم کو تلاش کر رہے تھے مگر خالی کمرے اُن کا منہ چڑا رہے تھے۔ ایسے میں میڈم نے فون پر بجھی ہوئی بساط لپیٹ لی۔ مجھے دیکھ کر بولی، ''کوٹھی میں نصب شدہ کیمروں نے اَب تک دس آدمیوں کو ٹریس کر لیا ہے۔ اِن میں استاد ببلو شامل نہیں ہے۔ اگر بروقت پولیس پہنچ جائے تو مزہ آ جائے.....''

میں نے پوچھا، ''کیا یہ لوگ یہاں تک نہیں پہنچ سکتے؟''

وہ قدرے تفاخر سے بولی، ''نہیں شہر! وہ اگلے جنم میں بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ جگہ 'سی ٹو' کہلاتی ہے۔ ایسی ہی دو محفوظ پناہ گاہیں اور بھی ہیں جنہیں 'سی ون' اور 'سی تھری' کہا جاتا ہے۔ یہ کوڈ ورڈز ہیں تاکہ کسی سننے والے کو لوکیشن کا پتہ نہ چل سکے۔''

میری نظر مانیٹر کی اسکرین پر مرکوز تھی۔ مین گیٹ والی 'ونڈو' پر مجھے پولیس کی موبائل وین رُکتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے فوراً میڈم کی توجہ اُس جانب دلائی۔ اُس نے دیکھا تو لبوں پر ایک دل فریب مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ماؤس کی مدد سے 'ونڈو' کو مانیٹر کی پوری اسکرین پر پھیلاتے ہوئے چہکی، ''اَب مزہ آئے گا شہریار!''

مانیٹر کے پہلوؤں میں نصب اسپیکرز میں سے پولیس وین کے ہوٹر کی ہلکی ہلکی آواز اُبھرنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میدانِ کارزار سج گیا۔ دوطرفہ فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا اور جو سین بھی کوٹھی میں نصب شدہ کیمروں کی نظر میں محفوظ ہوتا، ہم تک پہنچ جاتا۔

میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ میڈم سکرین میں مستغرق تھی۔ چونکہ میں سکرین پر متحرک لوگوں کی سرگرمیوں سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے قابل نہیں تھا، اِس لیے جلد ہی اکتا گیا۔

میں نے آہستگی سے پوچھا، ''میڈم! میں گھوم پھر کر 'سی ٹو' دیکھ لوں؟''

وہ چونک کر بولی، ''ہاں! کیوں نہیں..... یہاں تمہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔''

اُس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ میری وہاں موجودگی اُس کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ میں کمرے سے نکلا، لاؤنج نما ہال میں ادھر اُدھر دیکھ کر ساتھ والے کمرے کے دروازے پر جا رُکا۔ کان لگائے مگر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ کمرہ خالی تھا یا کمرے میں موجود لوگ قطعی طور پر خاموش تھے۔ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو دروازے کے عین سامنے ڈریسنگ چیئر پر بیٹھی ہوئی عورت کی پشت دکھائی دی۔ آئینے میں چہرہ سجا ہوا تھا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ سونیا تھی۔ میں نے انگلی کی ضرب سے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھنے کی بجائے آئینے میں دیکھا، مسکرا کر بولی، ''یس کم آن.....''

کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ سنگل بیڈ پڑا تھا جس پر سیدھے رُخ اسما پڑی تھی۔ گزشتہ رات کی طرح وہ گہری نیند میں تھی۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا سونیا کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا چہرہ سنوار رہی تھی۔ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ''تمہیں میری کشش یہاں لائی ہے یا اِس بے ہوش لڑکی کی؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بولی، ''تمہارے پاس دینے کے لیے جواب نہیں ہے یا جواب دینا نہیں چاہتے ہو؟''

میں نے کہا، ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

وہ بولی، ''میڈم کیا کر رہی ہیں؟''

''کمپیوٹر پر بیٹھی ہے۔''

''اچھا!'' اس نے یوں کہا جیسے وہ سمجھ گئی ہو کہ میڈم کمپیوٹر پر کیا کر رہی تھی، بولی، ''تم کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے کہا، ''گاؤں سے!''

اُس کا بالوں میں برش پھیرتا ہاتھ رُک گیا، مسکرائی، ''گاؤں کا کوئی نہ کوئی نام بھی ہوگا؟''

میں نے کہا، ''نہیں.....اس کا کوئی نام نہیں ہے۔''

اُس کی آنکھوں میں شرارت اُتر آئی مگر اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ آنکھوں سے سمجھا دیا کہ جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ بالوں کو کاندھے پر پھیلاتے ہوئے بولی، ''کیا اِس لڑکی کا چہرہ دیکھ کر تمہارے دل کی دنیا زیروزبر نہیں ہوتی؟''

میں نے کہا، ''اس میں ایسی کیا بات ہے؟''

وہ مسکرائی، ''یہ تو کوئی مرد ہی بتا سکتا ہے۔''

''تمھارا تجربہ بھی تو کچھ کہتا ہوگا؟''

''نہیں..... میں اپنے سوا کسی کے بارے نہیں سوچتی۔''

''پھر اپنے سوا کسی کی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''بس! ویسے ہی۔'' وہ کھسیا کر بولی، ''کیا تم ہمیشہ یہیں رہو گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' میں نے کندھے اُچکائے، ''میں اپنے حال کو نہیں جانتا، مستقبل کے بارے میں کیا رائے قائم کر سکتا ہوں۔''

''ہوں.....'' اُس نے ہنکارا بھرا، پھر ہاتھ روک کر کریدتی ہوئی نگاہوں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا، بولی، ''تم بڑے ہینڈسم ہو۔''

میں نے کہا، ''تم بھی کم نہیں ہو۔''

''تبھی مجھے اپنے قریب نہیں آنے دیتے ہو؟'' اُس کے لہجے میں شرارت اور استہزا عیاں تھی۔ میں نے آنکھیں چُرالیں۔ پوچھا، ''کیا میڈم کا اصل نام 'شکیلہ' ہی ہے؟''

وہ بولی، ''کیا یہ سوال میری طرف دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا؟''

میں نے بے اختیار اُسے دیکھا۔ اُس کا کھلا کھلا چہرہ جوانی کا شرارت آمیز دعوت نامہ بنا ہوا تھا۔ میں نے سنجیدہ رہتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولی، ''اُس کا نام 'میڈم شکیلہ' ہی ہے۔''

صاف عیاں تھا کہ وہ مجھے ٹرخا رہی تھی۔ میں مصر نہیں ہوا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اجنبی مگر جلیے سے ملازم دکھائی دینے والا شخص کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ مؤدبانہ انداز میں بولا، ''آپ کو میڈم بلا رہی ہیں۔''

میں سونیا کے کمرے سے نکل کر میڈم کے پاس پہنچا۔ وہ بدستور کمپیوٹر کے سامنے براجمان تھی۔ مجھے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کی بورڈ کے پاس پڑا ہوا موبائل فون بجا۔ اُس نے سکرین کو دیکھتے ہوئے کال ریسیو کی، بولی، ''ہاں میر وشاہ! کیا رپورٹ ہے؟''

دوسری طرف کی آواز سن کر میڈم کا چہرہ کھل اُٹھا۔ 'اوکے' کہہ کر فون بند کر دیا اور بولی، ''خس کم جہاں پاک، کوٹھی پر حملہ کرنے والوں میں سے دو آدمی پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے ہیں جبکہ باقی دم دبا کر فرار ہو گئے ہیں۔ گڈ نیوز!''

اُس نے جلدی جلدی ماؤس کو حرکت دی۔ کسی اور کیمرے کا 'آئی کون' کلک کیا۔ ایک اور منظر کھل گیا۔ کیمرے کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہوا گٹھے ہوئے جسم والا ایک شخص کاندھے پر گن لٹکائے کھڑا تھا اور چوکس انداز میں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔

میڈم نے فون پر کسی سے رابطہ کیا اور نفرت آمیز انداز میں بولی، ''ایک مفرور حملہ آور کوٹھی کی عقبی گلی میں کھڑا ہے۔ تم لوگ گلی کے دہانے پر پہنچ جاؤ۔ گلی سے نکلتے ہی اُسے غائب کر دیا جائے۔''

کال منقطع کر کے خود کلامی کے سے انداز میں بولی، ''کاش! اس کیمرے کے ساتھ آٹو گن بھی نصب ہوتی جو ایک بٹن دبانے پر اِس حرام زادے کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیتی۔''

ایسا ممکن تھا، نہیں تھا، میں نہیں جانتا تھا۔ میری نظریں اُس چاق و چوبند مفرور کی پشت پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اُسے کہیں دیکھ رکھا تھا۔ ایک تو وِنڈو میں نظر آنے والی تصویر کافی حد تک دھندلائی ہوئی تھی، دوسرا میں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اچانک وہ کیمرے کی طرف پلٹا۔ اَب اُس کا چہرہ سامنے تھا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے تمام تر بدن کا خون سمٹ کر میری آنکھوں میں آ گیا ہو۔ میری سانس رُکنے کو آ گئی اور میں بے اختیار چیخ پڑا۔

''میڈم! یہ تو کھالا ہے، میرا جانی یار..... ہاں، ہاں!''

مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری آواز جذبات سے ملغوب ہو کر کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی۔ میڈم چونکی، مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھ کر بولی، ''کون کھالا؟''

میں جلدی سے اسکرین کے بہت زیادہ قریب ہو گیا۔ سکرین پر کھالے کا سائیڈ پوز نظر آ رہا تھا۔ میڈم نے ماؤس کی مدد سے 'وِنڈو' کا سائز بڑا کر دیا۔ اَب کھالے کا چہرہ مانیٹر کی پوری اسکرین پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی، وہ میرا یار خالد لوہار عرف کھالا ہی تھا جو اِس وقت کتوں میں گھرے ہوئے بھیڑیے کی طرح گھبرائے ہوئے انداز میں اردگرد دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ننھا سا پستول بھی دَبا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میں نے میڈم کو دیکھے بغیر کہا، ''بالکل وہی، جس کے ساتھ میں نور پور سے ملتان آیا تھا۔ وہ، جس نے موبی کو پارک کے باہر گولی مار دی تھی..... مگر یہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں یہاں آیا؟''

میری بات ختم ہوئی۔ میڈم کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ پا کر میں نے اُسے دیکھا۔ وہ بڑے

اشتیاق سے مجھے گھور رہی تھی۔ مسکرائی اور بولی، ''واٹ آ نیچرل ری ایکشن..... سچ کہتے ہیں، دیہاتی لوگوں کے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔''

میں نے جھینپ کر نظریں چُرالیں۔ میرے من میں کھوٹ تھا نہیں تھا، مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرا ذہن تو برق رفتاری سے کھالے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عافیت یہ تھی کہ وہ زندہ اور بخیریت تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ خطرناک کریمنل گینگ میں شامل ہو کر میڈم پر حملہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ اس کے سر پر منڈلاتے ہوئے موت کے آسیب مجھے آنِ واحد میں دکھائی دے گئے جبکہ اپنی جانب آتی ہوئی کربناک موت نظر نہیں آ رہی تھی۔

میڈم نے میری اُدھیڑ بن میں ہی کسی وقت کیمرہ بدل دیا۔ منظر بدل گیا۔ کھالا اوجھل ہو گیا۔ اُسے ہمیشہ کے لیے اوجھل نہیں ہونا چاہیے، یہ سوچ کر میں نے مؤدبانہ لہجے میں میڈم سے کہا، ''میڈم! کھالے کو مت روکیں۔ اُسے زندہ واپس جانے دیں۔ رابطہ ہونے پر اُسے سمجھا دوں گا، وہ آئندہ آپ کے سامنے نہیں آئے گا۔''

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر فون پر کسی کو ہدایات دینے لگی، ''کیا تم لوگوں نے اُسے ٹریس کر لیا ہے؟''

دوسری جانب سے رپورٹ ملی تو خوش ہو کر بولی، ''ویری گڈ! اسے اس طرح ٹریپ کریں کہ وہ زخمی نہ ہو۔ 'سی ون' پر پہنچا کر مجھے مطلع کرنا۔ اوکے؟''

میری سانس میں سانس آئی۔ بدقسمتی سے کھالا جان بچانے کے لیے بھاگتا ہوا اُس گلی میں آن پہنچا تھا جو اُس کے لیے چوہے دان ثابت ہونے والی تھی۔ میں نے ابھی تک میڈم کے تربیت یافتہ لوگ نہیں دیکھے تھے مگر اُس کے اعتماد اور چٹکی بجانے کی سی دیر میں سرانجام ہونے والے کارنامے دیکھ کر بآسانی اس کے کارندوں کی مشاقی اور غیر معمولی مستعدی کو تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ اب میڈم بالکل نارمل تھی۔ تفکرات کی پرچھائیاں عنقا تھیں اور اس کے خوب صورت چہرے کی فطری معصومیت لوٹ آئی تھی۔

اُس نے ٹیبل سائیڈ پر لگے سوئچ بورڈ میں نصب شدہ ایک بٹن کو پش کیا۔ چند لمحوں کے بعد، جو ملازم مجھے بلا کر یہاں لایا تھا، نے دروازے میں جھانکا اور مؤدبانہ انداز میں 'جی میڈم' کہا۔

میڈم نے اُسے قریب بلایا اور کہا، ''اِسے ریٹائرنگ روم میں چھوڑ آؤ۔'' پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی، ''تم تھوڑی دیر کے لیے آرام کرو۔ کچھ لوگوں کی آمد کی بدولت میں بہت

مصروف ہونے والی ہوں۔ فارغ ہو کر ریٹائرنگ روم میں آ جاؤں گی۔''

میں نے سرِ تسلیم خم کیا اور ملازم کے پیچھے چلتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔ گیلری کے اختتام پر واقع آخری کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ فرنیچر سے عاری تھا اور نہایت دبیز قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔ آٹھ دس جوان العمر لوگ قالین پر براجمان تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ تین لڑکیاں ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ میں نے طائرانہ نظر سے سبھی افراد کو دیکھا۔ ہر کوئی اپنی موج میں تھا۔ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، کوئی اخبار..... تو ایک ٹولی تاش کے پتوں سے دل بہلا رہی تھی۔

میں نے بہ آواز بلند 'السلام علیکم' کہا تو مجھے دیکھ کر چونک جانے والوں کے استعجاب گیں چہروں پر مسکراہٹیں تیر گئیں۔ شاید اس محفل میں سلام لینے کا رواج نہیں تھا۔

ایک سانولی سلونی سی لڑکی نے شوخی سے کہا، ''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!''

دو تین دبی دبی ہنسیاں گونجیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے میرے بارے میں مستفسر ہوتے، ملازم مجھے لیے کمرے کے اندر کھلنے والے ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ یہ آٹھ ضرب دس فٹ سائز کا بکس نما کمرہ تھا جس میں آرام کرنے کے جملہ لوازمات موجود تھے۔ میں سنگل بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ملازم نے دروازے کے قریب نصب شدہ سوئچ بورڈ پر چند بٹن پش کیے۔ روشنی پھیل گئی۔ پھر اُس نے مؤدبانہ انداز میں کہا، ''یہاں کوئی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا، آرام کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دیجئے گا۔''

اُس نے انگلی کے اشارے سے سوئچ بورڈ میں نصب ایک سوئچ کی نشاندہی کی اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی متصلہ بڑے کمرے سے آتی ہوئی ملی جلی آوازیں ایک دم معدوم ہو گئیں۔ یہ بکس نما کمرہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا۔

میں نے کمرے کا بنظرِ غائر جائزہ لیا۔ چھوٹا سا کمرہ اپنے اندر تمام تر جاذبیت رکھتا تھا۔ ٹی وی، پورٹیبل فریج، آرام دہ کرسی، چھوٹی سی نفیس میز اور اٹیچڈ باتھ..... سمجھ میں آنے والی بیسیوں چیزوں کے درمیان ایک نہ سمجھ میں آنے والی چیز بھی دکھائی دی۔ کمرے کی عقبی دیوار پر بڑا سا سوئچ پینل نصب تھا۔ اِس قدم آدم جسیم پینل پر اَن گنت سوئچ، لیور اور ایک چودہ انچ کی روشن سکرین موجود تھی۔ سکرین پر ایک گیلری کا خاموش اور ٹھہرا ہوا منظر روشن تھا۔

میں تھکا ہوا نہیں تھا مگر فراغت کے سبب موٹے فوم والے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ میری آنکھیں بند ٹی وی کی سیاہ اسکرین کے عین وسط میں نظر آنے والے روشن بلب کے چمکدار عکس پر مرتکز

ہوگئی اور سوچوں کی وسیع بساط سج گئی۔

میڈم، عورت کا نہیں، کسی نہ سمجھ میں آنے والے گورکھ دھندے کا نام تھا۔ کسی لمبی اور محتاط منصوبہ بندی کے بغیر میں سائیں دل جیت شاہ کو اُس کے انجام تک پہنچا کر نور پور سے نکلا تو اپنی جنم بھومی سے کٹ کر رہ گیا۔ خبر نہیں تھی کہ میرے بعد وہاں کیا حالات جنم پذیر ہوئے تھے۔ قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرنے کے بعد بھی پروین تا حال میری دسترس سے دور تھی۔ ابھی یہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے پاس تھی، یا دل جیت نے مجھے چکمہ دیا تھا۔ ابھی یہ یقین نہیں تھا کہ میڈم سردار حیدر خان کے چنگل سے میری پروین کو نکال لینے میں کامیاب ہو پائے گی یا نہیں.....

کھالے کے بارے دل فکر مند رہتا تھا، اب کچھ دلاسا ملا تھا۔ شکر تھا کہ وہ بخیریت نظر آ گیا۔ میڈم نے بظاہر میری درخواست مان لی تھی، خدا جانے اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی۔ ایک اور سوال میرے ذہن میں سانپ کی طرح پھن پھیلائے بیٹھا تھا کہ امیر نواز کہاں گیا تھا؟ اگر پروین کے ساتھ آنے والے حالات و واقعات کے پیچھے اُس کی ذات کارفرما نہیں تھی تو پھر اس کی نور پور سے عین موقع پر عدم موجودگی کو کیا نام دیا جا سکتا تھا؟ میرے بعد ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان کن حالات سے گزر رہے تھے؟ بیک وقت پانچ افراد، سائیں دل جیت شاہ، امیر نواز، کھالا، میں اور میری بہن پروین، کے نور پور کے منظر نامے سے اوجھل ہونے پر لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

میڈم کے بقول، کوٹھی پر حملہ آور ہونے والا جتھہ کسی استاد بلو نامی بدمعاش کا بھیجا ہوا تھا، تو سوچنے کی بات یہ تھی کہ کھالے کی رسائی استاد بلو تک کیسے ہوئی؟ موبی کو قتل کرنے کے بعد کون سے واقعات رونما ہوئے تھے جو اُسے ہانک کر جرائم کی دُنیا میں لے گئے تھے؟ کیا وہ میری طرح جان بچانے کے تردّد میں تھا؟ یا کوئی اور بات تھی..... مجھے ایک لمحے کو شک گزرا، کہیں وہ پہلے سے ہی اِس گینگ میں شامل تو نہیں تھا کیونکہ اُس کی دیدہ دلیریاں اور پھرتیاں معمولی نوعیت کی نہیں ہوا کرتی تھیں۔

کچھ دیر پہلے میڈم نے عجیب انداز کی دفاعی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ گنیں کاندھوں پر اُٹھا کر آنے والوں کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ ڈنکے کی چوٹ پر آنے والے قانون کے ہاتھوں میں دو لاشیں، میڈم کے حوالے ایک جیتا جاگتا ہرکارہ گروی رکھنے کے بعد شرمناک انداز میں

پسپائی اختیار کرنے کے بعد دُم دبا کر بھاگ چکے تھے۔ میڈم نے 'ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، رنگ بھی چوکھا آئے' کا کامیاب طریقہ اپنایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس کبھی بھی مخالف گروپ پر فائر نہیں داغے گی جب تک پولیس کا کوئی آفیسر زخمی یا ہلاک نہیں ہوگا۔ تبھی اُس نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے پولیس پر فائر داغ دیا تھا جس کے بعد پولیس کے مفادات پس پشت چلے گئے تھے اور کاغذی جنگ کی دستاویز پر جذباتی رنگ غالب آیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کھالے کی نسبت کسی بڑے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ میڈم چہرے مہرے سے بڑی نرم، عام مزاج کی خوب صورت اور معصوم سیرت لڑکی دکھائی دیتی تھی مگر حقیقت میں وہ ایسی نہیں تھی۔ اتنا نرم خو انسان کس طرح اتنی بڑی اور خون خوار فورس کو قابو میں رکھ سکتا ہے؟

میں اپنے تئیں عام شکل وصورت والا شخص تھا۔ میرے پاس کوئی اضافی خوبی نہیں تھی۔ نہ جانے کیا وصف تھا، جس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا، مگر وہ میڈم کے نزدیک بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ جتنی اہمیت وہ مجھے دینے لگی تھی، وہ میرے نزدیک نا قابلِ یقین نہیں تھی۔ میرو شاہ کے بقول وہ مجھ پر ریشہ خطمی ہوگئی تھی۔ دل نہیں مانتا تھا کیونکہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود سے کہیں زیادہ خوبرو اور اسمارٹ مردوں کو قالین پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ویسے بھی، جتنی دولت اُس کے پاس موجود تھی، جتنے اختیارات اس کی شخصیت کا خاصہ بن چکے تھے، وہ دنیا کے خوب سے خوب رو جوان کو زیرِ دام لا سکتی تھی۔ کہیں وہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی تھی؟ کہیں وہ مجھ سے کوئی ایسا خطرناک کام لینے والی تو نہیں تھی جس میں کسی اور کو جھونکنا نہ چاہتی ہو؟.....

انسانی ذہن بھی عجیب امتزاجی رویوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ میرے چاروں طرف تفکرات، اندیشے اور دہشت کے پھن پھیلائے ناگ پھنکار رہے تھے۔ میرا مستقبل داؤ پر لگا ہوا تھا۔ زندگی کا واحد خونی رشتہ جان کنی کے عالم میں کہیں تڑپ رہا تھا اور میں اُس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں مجھے کھالے، امیر نواز اور مراد بخش دیوانے کی یادیں ستانے لگی تھیں۔ ہم نے زندگی کے بھرپور لمحات باہم گزارے تھے۔ میرے نیم سوختہ لبوں پر ایک عجیب طمانیت آمیز مسکراہٹ تیر گئی۔ زندگی کی ایک یاد نے اچانک مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

یہ کوئی دو سال پہلے کی بات تھی کہ ایک شام مراد بخش دیوانہ تیز تیز چلتا ہوا ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم پانچ چھ لڑکے اس وقت نور پور کی اکلوتی کرکٹ کی پچ پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف

تھے۔ دیوانے کی غیر متوقع آمد پر چونک کر متوجہ ہوئے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا اشتہار اور سفید رنگ کا لفافہ پکڑا ہوا تھا۔

کھالے نے دبے دبے لفظوں میں کہا، ''آج خیر نہیں لگتی، لگتا ہے کسی نے دنگل پر مدعو کیا ہے دیوانے کو!''

چونکہ دیوانہ لاغر پن کی حد تک دُبلا پتلا اور کمزور تھا، اِس لیے سبھی لڑکے کھالے کی بات سن کر ایک دم ہنس پڑے۔

دیوانے نے تاڑ لیا، دور سے ہی ہاتھ لہرا کر بولا، ''میں کھیلنے کے لیے گراؤنڈ میں نہیں آیا بلکہ ایک خاص کام سے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔''

ہم خاموش ہو گئے۔ اُس نے ہمارے دائرہ نما حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ہم سب استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔ اُس نے گردن اکڑا اکر سبھی کو باری باری ایک نظر دیکھا، اشتہار کو پھیلا کر بچ پر بچھایا اور بولا، ''محمود کوٹ میں کل شام کو بہت بڑا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ ملتان، میانوالی، بھکر، جھنگ..... پتہ نہیں کہاں کہاں سے شاعر منگوائے جا رہے ہیں۔ یہ اشتہار دیکھو؛ چار پائی کے جتنا تو ہے۔''

ہم نے اشتہار پر ایک نظر ڈالی۔ کھالا اُکتا کر بولا، ''وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم کیا کریں؟''

''آپ لوگ میرے ساتھ وہاں چلیں۔'' مراد بخش دیوانہ کی گردن پھر اکڑ گئی۔

ایک لڑکا بولا، ''ہم وہاں جھک ماریں گے، کیا کریں گے؟ بول ناں!''

دوسرا منہ بنا کر بولا، ''پچھلے سال تمہارے ساتھ گیا تھا۔ ساری رات پاگلوں کی طرح بیٹھا رہا۔ نہ چائے، نہ پانی..... اور تو اور..... کہیں سے ایک ڈبیا کے ٹو فلٹر سگرٹ کی نہیں ملی تھی۔ ہمیں معاف ہی رکھو شاعر صاحب!''

''دھت تیرے کی!'' دیوانے نے آنکھیں دکھائیں، ''سب کھلایا پلایا حرام کر دیا تو نے کم بخت انسان!''

'کم بخت' قرار پانے والا لڑکا بپھر گیا۔ ضد کرنے لگا کہ محفل میں کھل کر بتایا جائے کہ اُسے کیا کچھ کھلایا پلایا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور دیوانے کی جان چھوٹی۔

میں نے دیوانے سے پوچھا، ''وہاں کیا خاص بات ہو گی؟''

مراد بخش دیوانہ نے بڑی لے دے کے بعد قدرے شرماتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا،

''دراصل وہاں بڑے اعلیٰ پائے کے استاد شاعر اپنا اپنا کلام پڑھیں گے۔ مجھے بھی دعوتِ کلام دی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ میرے ساتھ جائیں اور جب میں اپنے دو ہڑے سناؤں، آپ لوگ خوب کھل کر داد دیں۔ آپ لوگوں کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی تالیاں بجانے لگیں گے۔'' ساتھ ہی اس نے مؤقف کے پھیکے پن پر روایت کا شہد انڈیلا، ''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سبھی شاعر ایسا ہی کرتے ہیں۔ خاص کر، استاد شاعروں کے ساتھ تو شاگردوں کی فوج ظفر موج ہوتی ہے جو اچھل اچھل کر داد و تحسین کے جھوٹے ڈھول پیٹ دیتی ہے۔''

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سمجھ میں آنے لگا کہ اپنے نور پور کے شاعر کی عزت کا سوال ہے۔ کافی بحث کے بعد دیوانے کے حق میں فیصلہ سنا دیا گیا اور گفت و شنید کے بعد یہ بھی طے پا گیا کہ دیوانہ بطور رشوت، محمود کوٹ پہنچتے ہی ہمیں مٹھائی اور دودھ پتی پلائے گا۔ جولڑ کے سگرٹ نوش تھے، اُنہیں سگرٹ خرید کر دے گا۔ دیوانے نے ہماری تمام جائز و ناجائز شرائط پر سرِ تسلیم خم کیا۔

کھالے نے اپنی شرط پیش کی، ''لیکن پیارے دیوانے مستانے! یہ دھیان رکھنا کہ اسٹیج پر چڑھ کر گردن نہ اکڑانا ورنہ ہم دید لحاظ رکھے بغیر جوتے کھینچ ماریں گے۔''

محفل گل و گلزار بن گئی۔

دیوانہ جھینپ کر بولا، ''یار! میں کوئی جان بوجھ کے تھوڑا اکڑاتا ہوں۔ خدا نے کوئی ایسا سریا فٹ کر رکھا ہے کہ جونہی کوئی مزے کی بات ہوتی ہے، گردن خود بخود اکڑ جاتی ہے۔''

''اصل بات یہ ہے ہمارے شاعر کی ہڈیوں پر ماس کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔ ہڈیاں قابو میں نہیں رہتیں اور موقع بے موقع اینٹھ جاتی ہیں۔'' کسی نے توجیہہ پیش کی۔

اُس شام دیوانے سے ہم نے بہت سے قیمتی دو ہڑے اور غمگین اشعار سنے۔ سینکڑوں مرتبہ کے سنائے ہوئے 'تازہ دو ہڑوں' کو بھی سنا اور دیوانے کا دل رکھنے کو داد سے نوازا۔

دیوانے کے کرایے خرچے پر ہم سب مقررہ شام کو سات بجے محمود کوٹ میں قدم رنجہ ہوئے۔ میرے اور کھالے کے علاوہ کسی کو بھی اس مشاعرے سے غرض نہیں تھی۔ ہم صرف نور پور کے اکلوتے شاعر کی شان و شوکت بڑھانے اور کھانے پینے کی غرض سے یہاں آئے تھے۔

اُس نے ہماری شرائط پوری کیں اور ہوٹل پر بٹھا کر خوب عیاشی کرائی۔ سگرٹ کے کئی پیکٹ

خرید کر بلا امتیاز بانٹے اور زریں ہدایات سے نوازا، ''تم لوگوں نے پنڈال میں الگ الگ جگہوں پر بیٹھنا ہے۔ میرا دو ہڑا ختم ہوتے ہی کھڑے ہو کر، ہاتھ لہرا لہرا کر' مکرر، مکرر' کے نعرے لگانے ہیں اور خبردار! کوئی آدمی ہنسے گا نہیں ورنہ میرا موشن ٹوٹ جائے گا۔''

مشاعرہ کے لیے سجائی سنواری گئی جگہ پر جاتے ہوئے بھی وہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا رہا اور ہم ہر ہدایت پر سرِ خم کرتے رہے۔ وہاں پہنچنے پر انسانوں کا ہجوم دیکھنے کو ملا۔ بہت اچھے انتظامات کیے گئے تھے۔ ہمیں بمشکل بیٹھنے کی جگہ میسر آئی۔ عید ملن مشاعرے کے منتظمین نے جنوبی پنجاب بھر کے شعراء کو اکٹھا کر رکھا تھا۔ باقاعدہ آغاز ہونے پر شعراء اسٹیج پر باری باری آنے لگے اور اپنا کلام پیش کرنے لگے۔ چونکہ حاضرین کی غالب اکثریت سرائیکی تھی، اس لیے سرائیکی کلام پیش کرنے والوں کو داد مل رہی تھی۔ دیوانے نے بھی عوامی رجحان کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ صادر کیا، ''میں بھی بس سرائیکی شاعری ہی پیش کروں گا۔ اُردو کا ماحول نہیں بن رہا۔''

ہم نے تائید کی۔ رات کا ایک بج گیا، پھر دو..... پھر چار بج گئے مگر اسٹیج سیکرٹری نے مراد بخش دیوانے کا نام نہیں پکارا۔ ہم بری طرح تھک چکے تھے اور جماہیاں لے رہے تھے۔ وہ ہمیں مطمئن اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے بار بار یہ نقطہ سمجھا رہا تھا کہ بڑے شعراء کو سب سے آخر میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کے مشاعروں کا بنیادی اصول ہے، وغیرہ وغیرہ۔ سب سے آخری شاعر بھی اپنا کلام سنا کر اسٹیج سے اُتر گیا اور مقامی ایم پی اے، جو مشاعرے کی صدارت کر رہا تھا، الوداعی خطاب کرنے لگا۔ پھر وہ بھی ڈائس سے اُتر گیا اور سامعین پنڈال چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

ہم سبھی بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ دیوانے کا بُرا حال تھا۔ ہمیں یا اپنے دل کو سمجھانے کے لیے کہہ رہا تھا، ''میرا خیال ہے کہ اسٹیج سیکرٹری میرا نام لسٹ میں لکھنا ہی بھول گیا تھا۔''

اس تاویل کو کارگر خیال نہ کرتے ہوئے اس نے پانسہ پلٹا، بولا، ''قریشی چوک والا مجید احقر تو ایک نمبر کا دشمن ہے میرا۔ وہ مجھ سے پہلے یہاں پہنچا ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اُسی نے حرامزدگی کر کے میرا نام کٹوا دیا ہے۔''

کھالا اور فریدن بڑے مشتعل تھے۔ پنڈال خالی ہو گیا تو دونوں نے دیوانے کو بازوؤں

سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ راستہ چکنی مٹی کی دھول سے بری طرح اَٹا ہوا تھا۔ ہم سب نے دیوانے کو اُس دھول میں دور تک گھسیٹا، ہنسی مذاق میں اُس کی خاصی درگت بنائی اور ''الو کا پٹھا'' بنا کر نور پور لائے۔ اُس دن کے بعد وہ کسی بھی مشاعرے میں ہمیں یا نور پور کے کسی بھی آدمی کو اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ گاؤں میں ہمارے تبصروں اور چغلیوں نے اُس کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا کر رکھ دی تھی۔

اُس نے کھالے کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہتا، گھروندے پر آ کر دوہڑے ماہیے سن سکتا تھا۔ کھالے کی پسند کا دوہڑا کاغذ پر لکھ کر پیش بھی کر دیتا تھا۔ اِس کے بدلے میں کھالا بغیر کرایہ لئے اسے قریشی موڑ تک لے جاتا تھا اور مفت واپس بھی لے آتا تھا۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ مراد بخش دیوانہ کالر، بکرم اور بٹن وغیرہ خریدنے کے لیے قریشی موڑ جایا کرتا تھا۔

دیوانے نے سود و زیاں کا حساب کئے بغیر مشاعرے سے لوٹتے ہی کھالے کو اپنی دکان پر بلا کر کہہ دیا، ''دیکھ بھئی کھالے اُستاد! آج سے تیری میری یاری ختم۔ آئندہ تم میرے پاس دوہڑے ماہیے سننے کے لیے نہیں آؤ گے۔''

کھالے نے جل بھن کر کہا، ''ٹھیک ہے۔ تم بھی کرایہ جیب میں ڈال کر ویگن پر چڑھو گے۔ اور ہاں! آئندہ میرے ہاتھ یہ پٹی کالر وغیرہ منگوانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔''

دیوانے کی گردن اکڑ گئی اور کان سرخ ہو گئے۔

کھالا اُس کی دکان سے نکلا تو بھڑکا ہوا تھا۔ اُس کی شیطانی کھوپڑی نے فوراً ہی پلان بنا لیا۔ دو چار دِنوں کے بعد، ایک شام علم دِین پٹواری سردار حیات خان کے دارے پر فریاد کناں تھا۔ اُس نے تین عدد کاغذ خان کی جھولی میں پٹخ دیے، ''یہ دیکھیں خان جی! وہ منحوس شاعر، وہ کانگڑی عاشق، میرے گھر میں رقعے پھینکتا ہے۔ دیکھیں! آپ نے ڈھیل دے رکھی ہے اُسے ورنہ اُس کمینے کی اتنی جرأت کہاں کہ وہ میری بیٹی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔''

خان بھونچکا رہ گیا۔ فوری طور پر تحقیقات کا حکم صادر کر دیا۔ پھر مجھے بلایا گیا اور کاغذ دکھا کر پوچھا گیا کہ یہ کس کی تحریر ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ دیوانہ کھالے کو اپنے دوہڑے لکھ کر دیا کرتا تھا اور دونوں کے تعلقات اِن دنوں کشیدہ ہیں، وگرنہ میں کچھ نہ کچھ 'ڈنڈی' ضرور مار لیتا۔

لیکر دار کاپی کے تینوں اوراق پر ہجر و ناامیدی کے جذبات سے پُر سرائیکی دوہڑے لکھے ہوئے تھے۔ آخری مصرعوں میں دیوانہ کے لفظ کے اوپر 'تخلص والی لڑھکی' بالخصوص موجود تھی۔

میں نے فیصلہ سنایا کہ یہ مراد بخش دیوانے درزی کے ہاتھ کی ہی لکھائی ہے۔

نور پور میں ہاہا کار مچ گئی۔ دیوانے کو مجرموں کی طرح پنچایت میں پیش کیا گیا اور اُس پر فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ اُس نے لاکھ منت سماجت کی، قسمیں کھائیں اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے صفائیاں پیش کیں مگر اُس کی ایک نہیں سنی گئی۔ جب خاصی درگت بن چکی، تب اُس کے چودہ طبق روشن ہوئے اور وہ پھوٹ پڑا، ''یہ دوہڑے تو میں نے کھالے اُستاد کو لکھ کر دیے تھے۔ مجھے نہیں پتہ کہ چاچے علم دین کے گھر کیسے پہنچے؟''

کھالے کو بھی طلب کر لیا گیا۔ مجھے اُس کی شکل دیکھتے ہی پتہ چل گیا کہ یہ حرامزدگی اُسی نے کی تھی۔ کھالے نے دیوانے کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے اپنی جان تو چھڑا ہی لی مگر میری طرح حیات خان نے بھی تاڑ لیا تھا۔ اُس نے سخت سست کہہ کر دیوانے کو بھگا دیا۔ کوئی ایک مہینہ بعد امیر نواز کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں دونوں کی 'صلح' ہوئی اور تعلقات معمول پر آئے۔

میں ریٹائرنگ روم کے بیڈ پر، دونوں ہاتھ گردن تلے رکھے، ٹی وی اسکرین میں بلب کے روشن عکس کو گھور رہا تھا اور کھالے اور امیر نواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کے کردار کا تعین کرنا بہت مشکل تھا۔ کیا وہ سردار حیدر خان کا مہرہ تھا؟ کیا پروین کے ساتھ پیش آنے والے اِس غیرت پاش واقعے کی تمام تر ڈوریں اُس کے ہاتھ میں تھیں؟ یہ بعید نہیں تھا کہ اُس کی خواہش پر سردار حیدر خان اور سائیں دل جیت شاہ نے میرے گھر میں نقب لگائی ہو۔ امیر نواز اور ہمارے گھرانے میں بہت بڑی معاشی خلیج حائل تھی۔ اس نے اپنے گھر میں پروین سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہو اور اُس کا باپ حیات خان اُس کی فرمائش پوری کرنے پر تیار نہ ہو، یہ بھی ممکن تھا کہ پروین نے کسی موقع پر اُس کی حوصلہ شکنی کی ہو..... میرا سر پھٹنے کو آ گیا۔ ریشم الجھ کر کانٹوں کی شکل اختیار کر گیا تھا اور میری انگلیوں کو زخمانے لگا تھا۔

عجیب طرح کی تھکن رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اضطرابی کیفیت کو مندمل کرنے کے لئے ریٹائرنگ روم سے نکلا۔ بڑا کمرہ خالی تھا۔ سبھی رخصت ہو چکے تھے۔ شاید کوٹھی کے حالات ٹھیک ہو گئے تھے۔ میڈم کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی غائب تھی۔ سونیا کا کمرہ آباد تھا۔ وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے براجمان تھی۔ گود میں بڑے سائز کا فیشن میگزین کھلا ہوا تھا اور وہ پورے انہماک سے مطالعے میں غرقاں تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر مسکرائی اور میگزین صوفے پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے کمرے کے اکلوتے بیڈ پر ہنوز دنیا و مافیہا سے

غافل لیٹی اسما کو دیکھا اور قدم بڑھا کر سونیا کے قریب آ گیا، ''سونیا! یہ جب سے یہاں آئی ہے، بے ہوش پڑی ہے۔ کوئی انجکشن دے رکھا ہے اِسے کیا؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا، ''کس نے؟''

وہ بولی، ''میں نے؛ میں یہاں آنے سے پہلے ہسپتال میں نرسنگ کیا کرتی تھی۔''

''اِسے کچھ کھلایا پلایا بھی ہے؟''

''ہاں..... جب ہوش میں آتی ہے تو گلوکوز پلاتی ہوں۔ اِس کے الٹے سیدھے سوالوں کے جواب دیتی ہوں اور پھر ٹیکا لگا دیتی ہوں۔'' وہ میرے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی، ''تمہیں اِس کا فکر کیوں ہے؟''

میں نے فوراً کہا، ''مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اُسے جب بھی دیکھا، زندگی اور موت کے درمیان معلق دیکھا۔ تبھی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھ لیا۔''

وہ کھسک کر میرے قریب آ گئی۔ اُس کے وجود اور لباس سے پھوٹتی ہوئی مسحور کن خوشبو میرے قلب و دماغ کے گرد اپنا حصار کھینچنے لگی۔ وہ آنکھوں میں عجیب سا تاثر مترشح کرتے ہوئے بولی، ''یہ سردار حیدر خان کی بیٹی ہے۔ گزشتہ دو برسوں سے میڈم اِس پر ہاتھ ڈالنا چاہ رہی تھی مگر حیدر خان کے گرگے استاد بلو کی وجہ سے ہاتھ نہ ڈال سکی۔ اَب نہ جانے کون سی طاقت میڈم کو مل گئی کہ اُس نے بغیر کسی پیش بندی کے اِسے اغوا کروالیا۔''

میں نے کندھے اُچکائے، اُس کی کریدتی نظروں کی لپک سے پہلو تہی برت لی اور کہا، ''مگر میرا اِس قصے سے کیا تعلق؟''

وہ مسکرائی، ''میں یہ تو نہیں جانتی، مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ اِسے میڈم نے تمہاری وجہ سے کڈنیپ کروایا ہے۔''

''میری وجہ سے؟'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا، ''مگر میں تو اِسے جانتا تک نہیں ہوں۔ تم نے بتایا کہ یہ کسی سردار حیدر خان کی بیٹی ہے، یہ نام بھی میرے لئے نیا ہے۔''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ معنی خیز انداز میں مسکرانے پر اکتفا کیا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے میرے پُر یقین اندازِ اظہار کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا، ''تم یہاں کیا کام کرتی ہو؟''

''میں نے بتایا تو تھا۔''

''کیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''میں میڈم کے اشاروں پر ناچتی ہوں۔''

''ناچنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟''

''مجھے ڈھیر سارا روپیہ ملتا ہے جس سے میرے گھر والے عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ سوسائٹی میں ناک اونچی رکھ کے معزز زندگی گزارتے ہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی، ''بظاہر میں اُن کے لیے مر چکی ہوں، اُن سے میل وربط استوار نہیں کر سکتی مگر میرے گناہوں سے لتھڑے ہوئے نوٹ اُنہیں بہت مرغوب ہیں۔''

''میڈم کو کیا ملتا ہے؟'' میں نے دلچسپی لی۔

''سرکاری افسر اور عوامی لیڈر اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ اُسے تحفظ دیتے ہیں۔ جو کہتی ہے، بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس پر عمل کرتے ہیں۔'' اُس کے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ گھل گئی، ''یہاں جنسی بھیڑیوں کا شکم بھرنے کے لیے میڈم نے کئی دسترخوان سجا رکھے ہیں۔ یہاں ہر ذائقہ موجود ہے۔ میٹھا بھی ہے، ترش اور نمکین بھی..... بائی دی وے! تمہیں کون سی ڈش پسند ہے؟''

میں بڑی توجہ سے اُس کی باتیں سن رہا تھا، اُس کے چہرے کی ملیح جلد پر نظریں گاڑے گلاب گوں لبوں کی خوب صورت ارتعاش ملاحظہ کر رہا تھا، بے ساختگی میں کیے گئے سوال پر چونک گیا۔ بولا، ''جو مل جائے، کھا لیتا ہوں۔''

وہ ہنسی اور گھور کر بولی، ''اتنے ندیدے ہو؟''

تب تک مجھے اُس کے سوال کی سمجھ آ چکی تھی۔ جلدی سے شرمسار ہو کر میں اپنی تصحیح کی، ''نہیں، نہیں! جس بھوک کی تم بات کر رہی ہو، وہ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگی۔ پھر میری ران پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''سچ کہہ رہے ہو؟''

اُس کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو، ''نہیں! تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔''

جذبات اور پانی اپنا راستہ خود بنا لیتے ہیں۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا راستہ بنا رہی تھی۔ میں نے غزالہ سے محبت کی تھی مگر اُس محبت نے بدن کی طرف پیش قدمی کرنے کا اشارہ نہیں کیا تھا۔ بلو نے مجھے ایک نئی سلطنت کی فتح یابی پر اُکسایا تھا۔ مگر ان تحریکوں میں اتنی جان نہیں تھی یا میرے اندر تلاش اور انتقام کی آگ اتنی زیادہ تھی کہ وہ ہر جذبے کو نمو کے ابتدائی

لمحات میں ہی نگل لیتی تھی کہ میں بدن شناس نہیں ہوا تھا۔ اُس کا ہاتھ بڑی آہستگی سے میری ران پر پھسل رہا تھا اور آنکھیں میرے چہرے پر لکھی کوئی نادیدہ عبارت پڑھنے اور مفہوم اخذ کرنے میں مشغول تھیں۔ میں نے کہا، ''کیا تمہیں اپنے کام سے گھن نہیں آتی؟''

وہ چونکی، بولی، ''گھن آئے بھی تو نوٹوں کی مہک میں کہیں دب کر سو جاتی ہے۔ جانتی ہوں کہ میڈم کی کوٹھی سے نکلوں گی تو کہیں شب بھر کی پناہ میسر نہیں آئے گی۔ اس دنیا میں لاکھوں یار ملتے ہیں، ایک یار نہیں ملتا۔ اُس کی تلاش بے سود ہے، اِس لیے ہر شب ایک نئے دوست کا انتظار کرتی ہوں۔''

میں نے کھسک کر فاصلہ کرنا چاہا مگر نا کام رہا۔ میں پہلے ہی صوفے کے بازو کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ میں نے کہا، ''کیا تم نے کسی سے محبت کی، زندگی میں؟''

ایک طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر طلوع ہوئی، بجھ بھی گئی، بولی، ''ہاں! میں نے نشتر ہسپتال میں نرسنگ کا کورس کیا۔ ڈیوٹی کے پہلے دن ہی مجھے ایک ہاؤس جاب کرنے والا ڈاکٹر نظر آیا، بڑا وجیہہ، اتنا کہ میں نے اپنا دل اُس کے قدموں پر دھر دیا۔ اُس نے میری وارفتگی کو زبان دی اور مجھے محبت کے سنگھاسن پر براجمان کر دیا۔ میں نشے میں تھی۔ جب خمار اُترا تو دیکھا کہ بھونرا رَس چوس کر نئی چنبیلی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔''

ایسے ہی وقت میں ہم دونوں، بیک وقت، چونک گئے۔ کمرے میں ایک مخصوص آواز اُبھری تھی۔ اکلوتے بیڈ کی طرف دیکھا، بجلی کی سی تیزی سے اُٹھی اور بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوئی اسما کی طرف بڑھی۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

سونیا بولی، ''تم کب بیدار ہوئیں؟''

اسما کی خمار آلود آواز میرے کانوں میں پڑی، ''پتہ نہیں..... تم لوگ مجھے کیوں اُٹھا کر لائے ہو؟''

سونیا نے نرم لہجے میں کہا، ''کہا تو ہے، میں نہیں جانتی۔''

مجھے فوری طور پر کمرے سے نکل جانا چاہیے تھا مگر اُس گھڑی دھیان نہیں رہا اور میں کامل انہماک سے اُسے دیکھنے لگا تھا۔ اُس کا چہرہ اور آنکھیں سوجن زدہ تھیں۔ بال بکھر کر چہرے پر پھیلے ہوئے تھے اور دائیں رخسار پر گہرے سرخ رنگ کی ڈیڑھ انچ چوڑی پٹی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ غالباً کافی دیر تک کلائی پر گال ٹکائے پڑی رہی تھی۔ ایک ہی وقت میں وہ رنجیدہ،

خوابیدہ اور گم گم دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے گھورتی رہی پھر ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات سمٹ آئے۔ دو تین مرتبہ آنکھیں جھپکانے کے بعد بے اختیار بولی، ''شہریار تم؟ تم نے مجھے اغوا کرایا ہے؟''

کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، کے مصداق میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی تو خیر تھی۔ ہوش میں آنے پر خیر نہیں گزری تھی۔ اُس نے بلا تامل مجھے پہچان لیا تھا۔ میری طرف بڑھی تو سونیا نے کلائی تھام لی۔ پیار سے بولی، ''نہیں جانم! ادھر بیڈ پر ہی بیٹھی رہو۔ اُس کے قریب نہ جاؤ، یہیں بیٹھ کر باتیں کرو۔''

اُسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی، ''تم بولتے کیوں نہیں ہو؟''

میرے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ میں اپنی بے وقوفی میں خود پر نور پور کے دروازے بند کر بیٹھا تھا۔ وہ اگر یہاں سے آزاد ہو کر اپنے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی، جو اک نہ اک دن ہونا ہی تھا، تو مجھ پر زمین تنگ کر دیتی۔

میں نے کہا، ''کون شہریار؟ میرا نام شہریار نہیں ہے۔''

میرے مضبوط انکار اور آنکھوں میں چھائی مصنوعی بے گانگی نے اُس کے ماتھے پر تشکیک کی سلوٹوں کا جال بن دیا مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ وہ بولی، ''اگر تم شہریار نہیں ہو تو پھر تم کون ہو؟''

سونیا نے جھٹ کہا، ''اِس کا نام اکبر عدیل ہے، تھانہ حرم گیٹ میں انسپکٹر ہے۔''

''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' اسما کے لہجے میں خوف سمٹ گیا اور میری جانب انگلی کا اشارہ کر کے بولی، ''مگر اِس کی شکل خالد کے دوست شہریار سے کیوں ملتی جلتی ہے؟''

میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے سونیا سے مخاطب ہو کر کہا، ''میں نے گشت پر نکلنا ہے، پھر کسی وقت چکر لگاؤں گا۔ کیا یہ لڑکی ایب نارمل ہے؟''

میں نے اپنی آواز میں ہمدردی کی دبیز چادر پھیلا دی۔ سونیا نے کہا، ''نہیں۔ ہے تو نارمل ہی، مگر کافی دیر تک بے ہوش پڑی رہی ہے۔ حواس بحال ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔''

میں اسما پر ایک نگاہِ اجنبیت ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ میں نے ایک بھیانک غلطی کا

ارتکاب کیا تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اردگرد دیکھے بغیر تیر کی طرح ریٹائرنگ روم میں آیا۔ یہ دیکھ کر بھونچکارہ گیا کہ میڈم اُسی بیڈ پر نیم دراز تھی جس پر تھوڑی دیر پہلے میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دروازے میں دیکھ کر وہ ایڑیوں کے بل تھوڑا اوپر کھسکی اور بیڈ کے عقبی تختے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، ''میڈم! ڈسٹرب کرنے پر معذرت چاہوں گا، وہ دراصل.....''

''کہاں گئے تھے؟'' اُس نے میرا ملتجیانہ جملہ نظرانداز کر دیا۔

''مم..... میں سونیا کے کمرے میں گیا تھا۔ اکیلا بور ہو گیا تھا۔''

اُس کے لبوں پر بڑی تازہ اور معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ بولی، ''کسے دیکھا، اسما کو یا سونیا کو؟''

مجھے خاموش پا کر مستفسر ہوئی، ''کیا بات ہے؟''

''وہاں اسما بے ہوش پڑی تھی جبکہ سونیا جاگ رہی تھی۔ میں سونیا کے پاس چند لمحے ٹھہر گیا۔ اسی دوران اسما ہوش میں آ گئی اور اُس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔'' میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

وہ بولی، ''تو پھر کیا ہوا؟''

لاپروائی سے سکڑے ہوئے ہونٹ اچانک وا ہو گئے، چونک کر تیز لہجے میں بولی، ''یہ تم نے کیا حماقت کر ڈالی؟''

''جب میں کمرے میں گیا، وہ بے ہوش تھی۔'' میں نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

''کیوں اور کیسے ہوا، مت بتاؤ، یہ سوچو کہ اب کیا ہو گا؟'' وہ متفکر ہو گئی۔ توجہ پوری طرح میری طرف مبذول ہو گئی، ''چونکہ ہم نے اسما کے بدلے میں تمہاری بہن کو حاصل کرنا ہے۔ اسما اُس کے باپ کے حوالے کرنی ہے، یہ مصیبت تو جاتے ہی تمہارا نام بک دے گی اور حیدر خان تمہارے خاندان کو سیخوں پر پرو کر بھون ڈالے گا جبکہ پروین کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ یہ تم نے کیا کر دیا شہریار!''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میرا دل واہموں اور اندیشوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ابھی تک اسما کے اغوا کے سلسلے میں میرا ذکر کہیں بھی نہیں آیا تھا۔ اسما کے گھر پہنچتے ہی میرے خاندان پر سردار حیدر خان بھوکے بھیڑیے کی طرح چڑھ دوڑے گا۔ عین ممکن تھا کہ اِس لے دے میں سائیں دل

جیت کے قتل کا معمہ بھی حل ہو جاتا اور میں سلاخوں پیچھے چلا جاتا۔ میری ایک چھوٹی سی احمقانہ حرکت کی وجہ سے میری اور میڈم کی ساری ریاضت اکارت جانے والی تھی۔

مجھے دروازے میں متفکر تھما ہوا دیکھ کر بولی، ''اِدھر آؤ، یہاں بیٹھو.....''

اُس نے بیڈ کی نکڑ پر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ میں بیٹھ گیا تو اُس نے کہا، ''پریشانی کو چہرے تک آنے سے روکو، ہمارے فیلڈ میں یہ اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی۔ دل کی دنیا زیروزبر ہو، دماغ میں ایک سے بڑھ کر ایک بھونچال اُٹھے مگر چہرے پر سکون اور شانتی رقص کرتی نظر آئے۔ کیا ہوا؟ تمہیں اسما نے دیکھ لیا۔ وہ جا کر اپنے گھر بتا دے گی کہ اُس کے اغوا میں شہریار کا ہاتھ بھی تھا۔ یہی پرابلم ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُسے مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑے طمانیت آمیز انداز میں ہنس پڑی۔ پھر پاؤں سمیٹ کر بولی، ''تو کیا سردار حیدر خان کو، جس نے اتنے قلیل عرصے میں نہ صرف یہ جان لیا کہ اسما کو نیازی نے اغوا کیا ہے بلکہ وہ اُسے اُٹھا کر اپنے اڈے پر لے گیا اور اُس کے منہ سے میرا نام اگلوانے میں کامیاب ہو گیا، اِس نکتے تک نہیں پہنچ سکے گا کہ اس سارے ڈرامے کا مرکزی کردار کون ہے؟ جب اُس سے اسما کے بدلے میں پروین مانگی جائے گی، تب اُسے نہیں پتہ چلے گا؟ تب کیا وہ راضی ہوتا؟.....نہیں شہریار! تمہاری دشمنی سردار حیدر خان پر عیاں ہو چکی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اُس کا دستِ راست سائیں دل جیت شاہ قتل ہو چکا ہے اور وہ بھی تمہارے ہاتھوں.....اسما خانزادی ہے۔ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ مگر تب، جب وہ یہاں سے جائے گی جبکہ حیدر خان کا گرگا استاد ببلو اَب بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔''

وہ مجھ سے کہیں زیادہ ذہین اور زیرک تھی۔ میں نے واقعتاً اِس رخ سے نہیں سوچا تھا وگرنہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میں نے کہا، ''میڈم! کیا میری پروین مل جائے گی؟''

مجھے خود احساس ہوا کہ میرے لہجے میں کتنی بڑی التجا چھپی ہوئی تھی۔

وہ بولی، ''تمہیں کہا نا کہ وہ تمہیں ضرور ملے گی۔ میں جس کام کا تہیہ کر لیتی ہوں، سرانجام دے کر ہی سکون کی سانس لیتی ہوں۔ اَب ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔ سردار اگر تمہاری بہن پر کسی ظلم کا بوجھ لادے گا تو اُس کی بیٹی بھی اتنے ہی بڑے پتھر تلے دب جائے گی۔ وہ نادان نہیں ہے کہ اتنی سامنے کی بات پر دھیان نہ دے۔''

میں نے کہا، ''میڈم! آپ میری سوچ سے بھی زیادہ ذہین اور اثر ورسوخ والی ہیں۔''

وہ بولی، ''ہاں! ایسا ہی ہے۔ تم مجھ سے بھی زیادہ خوش قسمت ہو۔ میں زمانے کو اپنی مٹھی میں رکھتی ہوں۔ تم نے میرا دل اپنی مٹھی میں جکڑا ہوا ہے۔''

میں نے چونک کر میڈم کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے رنگ ثبت تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا، ''جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

وہ مجھ پر آنکھیں چپکائے بولی، ''کیا کوئی یونہی اتنی بڑی مصیبت کسی کے لیے مول لیتا ہے؟''

اُس نے درست کہا تھا۔ وہ جس حد تک مجھ پر مہربان تھی، اس حد پر کوئی بنا ضرورت کے نہیں پہنچتا تھا۔

میں نے کہا، ''آپ بہت اچھی ہیں۔''

وہ بولی، ''یہ جگہ جہاں ہم بیٹھے ہیں، سی ٹو کہلاتی ہے۔ یہ ایسا محفوظ قلعہ ہے جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، پہنچ بھی جائے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ استاد ببلو بھی نہیں، قانون بھی نہیں..... میری کوٹھی، پوری کالونی بھی اگر تباہ ہو جائے تب بھی یہاں موت کے ہرکارے نہیں پہنچ سکتے۔ سی ٹو کے سبھی دروازے اندر سے، خاص میکنزم کو آن کرنے سے ہی کھلتے ہیں۔ باہر سے کوئی اِن چور دروازوں کا سراغ لگا بھی لے تو کھول نہیں سکتا۔ سمجھے؟'' اُس کے لہجے میں کڑا یقین اور احساسِ تفاخر رچا ہوا تھا، ''میں استاد ببلو کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ جب تک سردار یارن خان یہاں رہا، یہ اس کے آگے پیچھے دُم ہلاتا رہتا تھا، اَب سردار حیدر خان کے ٹخنوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ اب اُسے منہ کی کھانا پڑی ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی آسانی سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جانتا ہو کہ میں مورچہ زن ہوگئی ہوں۔ مجھے نکالنے کے لیے اُس نے اپنے چند غنڈوں کو بھیجا ہوتا کہ انہیں بھگانے کے بعد میں جونہی مطمئن ہو کر کھجار سے باہر نکلوں، وہ خود حملہ آور ہو جائے۔ اِسی لیے میں نے سبھی لوگوں کو کوٹھی پر بھیج دیا ہے۔ اس وقت ہم پانچ سات لوگ یہاں ہیں.....''

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ بلاشبہ وہ عورت نہیں، شیطانی کھوپڑی رکھنے والی جان دار قیامت تھی۔ وہ ایسا پُر پیچ عقدہ تھا جس کی نظر میں آنے کے بعد ہر عقدہ خود بخود کھلنے کے لیے بے تاب ہو جاتا تھا۔

میرے استعجاب سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی، ''شہریار! تھوڑا قریب آؤ۔''

میں ہچکچاتے ہوئے بیڈ پر اُس کی سمت تھوڑا سا کھسکا۔

وہ بولی، ''تم سردار حیدر خان کی زندگی میں نور پور جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ہو۔ کیا میں نے درست کہا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نہ ہی تمہاری بہن وہاں جا سکتی ہے۔ ہوں؟''

''جی!'' میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ بولی، ''تھوڑا اور قریب آؤ.....''

میں گھبرا گیا۔ اُس کی آنکھیں مجھے پکارنے لگیں۔ قریب آنے پر اکسانے لگیں۔ میں نے بے بسی سے دیکھا۔ وہ مسکرائی، ''کہا نا! قریب آؤ.....''

ناچار مجھے اُس کی جانب کھسکنا پڑا۔ وہ شرارت آمیز نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اُس کے داہنے پاؤں کی انگلیاں میرے پہلوؤں میں رینگنے لگیں۔ بولی، ''اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ تم اپنی بہن کو بازیابی کے بعد اسے ملتان میں ہی رکھنے کا پروگرام ترتیب دو۔ میں تمہارے لیے ایک گھر کا بندوبست کر دوں گی۔ کیا تم اپنے تمام اہل خانہ کو گاؤں سے ملتان شفٹ کر سکتے ہو؟''

میں نے کچھ سوچا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ چاچا چراغ کبھی بھی میرے کہنے پر نور پور سے ملتان نقل مکانی کرنے پر رضامند نہیں ہوگا۔

وہ بولی، ''تو کیا تم ان لوگوں کو حیدر خان کے رحم و کرم پر وہیں چھوڑ دو گے؟''

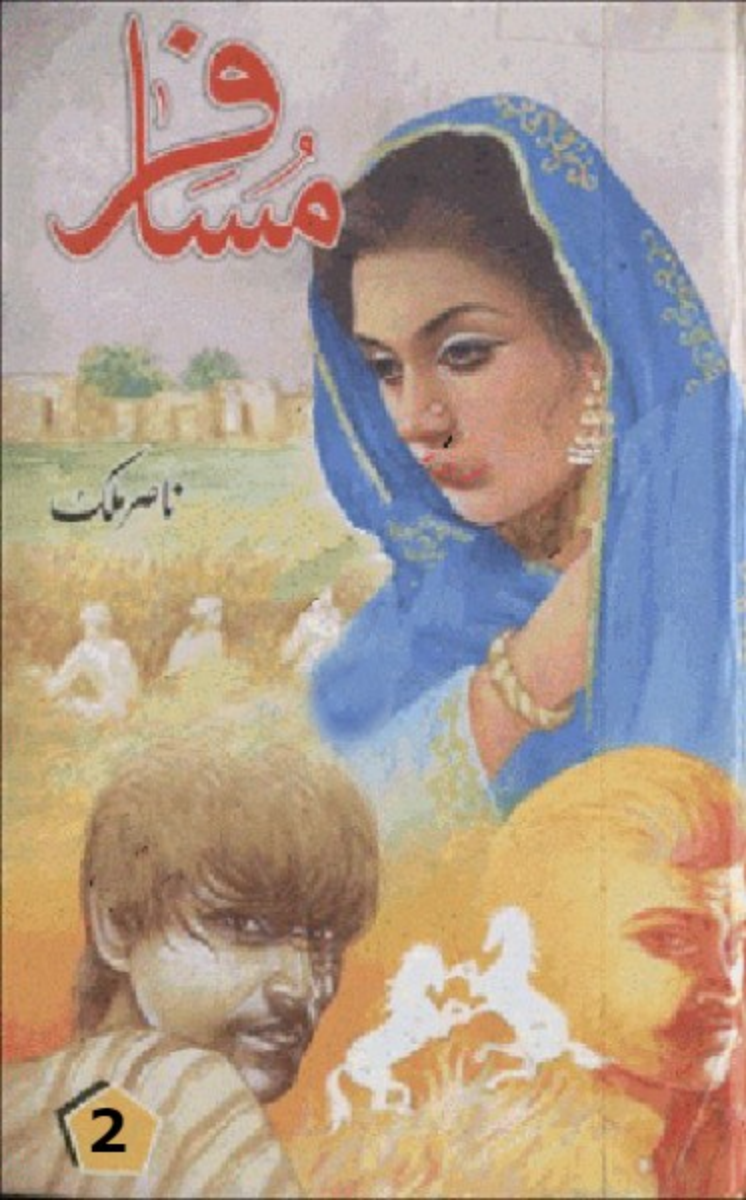
میں نے کندھے اُچکائے، کہا، ''اور کوئی چارہ کار بھی تو نہیں.....''

اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، تحکم آمیز لہجے میں بولی، ''ہاتھ پکڑو اور اِسے سہلاؤ؛ کی بورڈ نے تھکا دیا ہے۔''

❀❀❀

دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والی ایڈونچرس داستان کے مسافر کے ساتھ سفر کرنے کے لئے جلد دوم کا مطالعہ کریں۔

مسافر



ناصر ملک

2

میں نے شکوہ کناں نظروں سے اُسے دیکھا مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں ناچار اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر ہولے ہولے سہلانے لگا۔ ہاتھ کی تھکن عجیب برقی لہر بن کر میرے وجود میں سرایت ہونے لگی۔ اُس نے آنکھیں موند لیں، بولی، ''میر وشاہ سردار حیدر خان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رابطہ ہونے پر سودے بازی کا مرحلہ آئے گا۔ جونہی میر وشاہ اُس سے تمھاری بہن کا مطالبہ کرے گا، وہ ٹھٹک جائے گا۔ نور پور اُس کی مونچھ تلے ہے۔ مونچھ کو بل دے گا تو تمہارا خاندان زیرِ عتاب آجائے گا۔ تب کیا کرو گے، کیا بے بسی سے سبھی اپنوں کو بے موت مرتا ہوا دیکھتے رہو گے؟''

میرا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ گردن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ چاچا، چاچی اور اُس کی اولاد کے چہرے آنکھوں میں ابھرنے لگے۔ کسی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ انہیں تو اپنی جانب بڑھتی ہوئی موت کی پرچھائیاں تک نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا، ''تو کیا میں نور پور چلا جاؤں؟''

''وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

''سردار حیدر خان کے گرگوں کا مقابلہ کروں گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زیادہ ہوگا تو میں بھی اُن کے ساتھ مارا جاؤں گا۔ موت آئے تو آئے، مگر میری ذات پر نمک حرامی کا الزام نہ آئے۔'' میرے لہجے میں پتھر کی سی سختی تھی۔

''اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گے۔ پھر میرا کیا بنے گا؟''

میں نے چونک کر کہا، ''کیا مطلب؟''

''سیدھی سی بات ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔ تمہاری دوری برداشت نہیں کر پاؤں گی۔'' اس کے لہجے میں گہری یکسوئی اور کڑی سچائی پنہاں تھی۔ انہونی سی بات اپنی تمام تر سنگینی سمیت میرے سامنے کھل رہی تھی۔ میرے لیے یہ بات بھی نئی تھی کہ کوئی لڑکی اتنی دیدہ دلیری اور غیر رواجی عمومیت سے اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔

Pakistanipoint.com
Waqar Azeem

میں نے کہا، ''میڈم! آپ اپنے رتبے اور مقام کا خیال کریں۔ مجھے آپ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی، ہاتھ کھینچ کر بولی، ''کیا میں کسی ایسے عہدے پر فائز ہوگئی ہوں جہاں کسی کو پسند کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے؟''

میں نے لاچارگی سے اُسے دیکھا۔ میرے پاس لاحاصل مباحثے کے لیے کائیاں مواد نہیں تھا، اس لیے ماسوائے خاموشی کے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔

وہ بولی، ''شہریار! محبت کبھی، کہیں اور کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔ تمہیں میری نظر نے منتخب کیا ہے، دل نے پسندیدگی کی مہر ثبت کی ہے اور میرے ہاتھ نے یقین دلایا ہے کہ تم میری دسترس میں ہو۔''

وہ بااختیار تھی، میں رہینِ حالات اور اُس کے تابع تھا۔ وہ جو چاہتی کہہ لیتی، میں جو چاہتا تھا کہہ نہیں سکتا تھا۔ موہوم سی ندائے مزاحمت بلند کی، ''میڈم! میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔''

''کیا تم میری آنکھوں پر شک کر رہے ہو جنہوں نے تمہیں اپنے قابل جانا ہے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں میڈم! میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں تو اپنی حیثیت اور مقام کو مدنظر رکھ کر سچ بیان کر رہا ہوں۔''

وہ آلتی پالتی مار کر بیڈ میں بیٹھ گئی۔ اچانک ہی موضوع بدل کر بولی، ''کیا تمہارا یار، کیا نام بتایا تھا تم نے اُس کا، ہاں..... کھالا..... کیا وہ تمہارے کہنے پر تمہارے گھر کے تمام افراد کو رازداری سے نور پور سے نکال کر یہاں لاسکتا ہے؟''

میرے ذہن میں ایک برق بلا کوندی، اُمید اور یقین کا ستارہ جگمگایا اور میں مسرت آمیز انداز میں بولا، ''اوہ کیوں نہیں میڈم؟..... کھالا آسانی سے یہ کام کرسکتا ہے۔ وہ کہاں ہے اِس وقت؟''

''میرے آدمیوں نے اُسے زندہ وسلامت پکڑنے کے بعد رسیوں میں جکڑ کر سی ون میں رکھا ہے۔ بڑا مچل رہا ہے، آزاد ہونے کے لیے اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔'' وہ قدرے تفاخر سے بولی، ''تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں ملنے اور آزادی پانے کے بعد کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا؟''

میں نے پریقین لہجے میں کہا، ''ہاں میڈم! وہ بڑا یار پال انسان ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔''

''سوچ لو، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔'' اُس کے لہجے میں تشکیک کا عنصر نمایاں تھا۔ کھالا کیسا تھا؟ یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ میں نے میڈم کو یقین دلایا اور اُس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسے ہی وقت میں اُس کے موبائل فون کا بزر بجا۔ اُس نے کال ریسیو کی۔ چونکہ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا، کوئی شور نہیں تھا، اِس لیے میں سپیکر سے پھوٹنے والی نحیف سی آواز بھی سن سکتا تھا۔ دوسری طرف میر وشاہ تھا جو میڈم سے کہہ رہا تھا، ''میڈم! ماڑا پیر حیدر خان کی دُم پر جا پڑے ہے، اپنے بال نوچے ہے اور چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھاوے ہے باؤلا..... ماڑے کو یقین دلاوے ہے کہ اس کے پنجرے میں پروین نام کی کوئی چڑیا نجر (نظر) نہ آوے ہے۔''

میڈم نے قدرے سخت انداز اختیار کیا، بولی، ''سیدھی سیدھی بات کرو، کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو میر وشاہ؟''

اُس کے کانوں پر جیسے جوں تک نہیں رینگی تھی، بولا، ''ماڑے کو بولنے تو دیوے ہے ملکہ رانی! کیا کھا جاوے دنیا کو یہ میر وشاہ؟..... ماڑے کو پتہ ہے کہ ماڑی میڈم اِس وقت سی ٹو کے پنجرے میں قید ہووے ہے، اُڑنے کو پر تولے ہے۔ ٹھیک ہے، اپنی جبان (زبان) کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ لیوے ہے میر وشاہ..... اب پوچھ لیوے ماڑے سے جو پوچھنا مانگے ہے.....''

''اچھا بھئی..... بتاؤ، کیا بات چیت ہوئی؟'' میڈم نے ہار مانتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''ماڑے کو چکر دے گیا حرام جادہ (زادہ)۔'' میر وشاہ نے بپھر کر کہا، ''ماڑے کو جگاڑی لاوے کہ ایسی کوئی لڑکی نہ ہووے ہے اس کے پاس.....''

''پھر؟''

''پھر کیا..... ماڑے نے صاف صاف کہہ دیوت ہے کہ نہیں ہے تو پیدا کرے..... لڑکی پیدا نہ ہووے تو سمجھے کہ اُس کی پلی پوسی بیٹی خون میں نہا جاوت ہے۔'' میر وشاہ کے لہجے میں غیظ کی کٹیلی لہر چھپی ہوئی تھی، کہہ رہا تھا، ''میڈم! او ماڑی ملکہ رانی! وہ ماڑے سے پوچھے ہے کہ تیرے کو اُس چھوہر (لڑکی) سے کیا غرج (غرض) ہووے..... ماڑے کو چکر دیوے، پر آپ ماڑے چکر میں آ جاوے ہے۔ ماڑے نے سمجھا دیوت ہے کہ بڑی پارٹی لگی ہووے، تگڑی رقم کا معاملہ ہووے.....''

''گڈ.....'' میڈم کے لبوں سے تحسین انگیز لفظ نکلا، تھوڑے توقف سے بولی، ''تم اِس وقت کہاں ہو؟''

''ماڑاڈیرہ ملتان میں ہی ہووے ہے میڈم! حکم دیوے ہے، کیا بات ہووے؟''

''کیا یہ بات کھل چکی ہے کہ اسما میرے پاس ہے؟''

''ہاں میڈم! وہ حرام جادہ غلیج (غلیظ) گالیاں، ماں، بہن کی، دیوے تھا..... ماڑے سامنے ہوتا تو اُس کا منہ توڑ دیوت ہے پَر جور (زور) نہ چلت ہے۔''

میڈم کے ہونٹ سکڑے، پیشانی پر برہمی کے مظاہر بل نمودار ہوئے پھر پل بھر کے بعد غائب ہو گئے۔ بولی، ''تم کسی کو سردار حیدر خان کے ڈیرے پر بھیجو۔ اُس کے بیلے والے ٹھکانے کی ٹوہ لگاؤ۔ نقشہ بناؤ اور سکیورٹی کی تفصیلات اکٹھی کرو تا کہ ضرورت پڑنے پر ائیک کر کے مال برآمد کرایا جا سکے۔ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلتا تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کرنا ہوں گی۔ اور ہاں! وہ استاد ببلو کہاں غائب ہے؟''

''وہ بھوتنی کا بچہ..... سالا..... ایک دم باؤلا ہوا پھرت ہے۔ اپنے لونڈوں لپاڑوں کی فوجیں لے کر شہر میں مارا مارا پھرت ہے، تمہیں تلاش کرت ہے۔''

''نور پور کی کوئی خبر؟''

''ناں میڈم! جاہد (زاہد) کو بھیجا ہووے..... وہ گنجا جاہد، جو میڈم کے دیدار کو روے تھا، تمہارا عاشق..... پَر وہ ابھی واپس نہ آوے ہے۔ خبر ماڑے تک پہنچے تو میڈم تک پہنچے ناں۔''

میر وشاہ بڑی بے باکی سے میڈم سے بات چیت کرتا تھا۔ گنجے زاہد اور اس کی عاشقی کا حوالہ سن کر میڈم کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھری، ''اچھا! ٹھیک ہے میر وشاہ!'' میڈم نے کہا، ''تم جو مناسب سمجھو، کر گزرو۔ مجھے شہریار کی بہن زندہ و سلامت چاہیے، ہر قیمت پر۔ حیدر خان سے جنگ چھڑ گئی ہے۔ جانتی ہوں کہ یہ کئی خون پی جائے گی۔ بھلے پی جائے، شکست قبول نہیں ہو گی۔ او کے؟''

''جندہ (زندہ) رہوے میڈم..... جندہ باد..... ماڑے کو ہلا شیری دیتی رہو، ماڑا کام شیر کے منہ سے نوالا کھینچنا ہووے.....''

اُس نے اپنے مخصوص انداز میں نعرہ لگایا تو میڈم نے فرطِ طمانیت سے مسکرا کر کال منقطع کر دی۔ فون بیڈ کے سرہانے چوبی تختے پر رکھ دیا اور کھسک کر نیم دراز ہو گئی۔ آنکھیں موند کر کچھ

سوچتی رہی پھر بولی، ''میر وشاہ بڑے کام کا بندہ ہے۔''

''جی میڈم!'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''وہ تمہیں 'مارا غنچہ' کہتا ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے وہ!'' میڈم کے لہجے میں عمومیت کا عنصر غالب تھا۔

''جی.....'' میں نے کہا، ''کیا آپ کو یقین ہے کہ پروین سردار حیدر کے پاس ہی ہے؟''

اُس نے چونک کر سر اُٹھایا، آنکھ کے اشارے سے قریب آنے کا حکم صادر کیا اور بولی، ''ہاں!''

میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ اُس نے میری ہچکچاہٹ بھانپ لی۔ بولی، ''تم مجھ سے کتراتے کیوں ہو؟''

میں نے گھبرا کر جلدی سے کہا، ''نہیں میڈم! دراصل مجھے اپنی اوقات نظر آتی ہے۔''

''کیا میرے پہلو میں بیٹھنے کے بعد بھی تمہیں اپنی اوقات کا شکوہ رہتا ہے؟'' اُس کی چبھتی ہوئی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں، ''کہاں ناں! میرے قریب آؤ.....''

میں بادلِ نخواستہ اُس کے پہلو تک کھسک گیا۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرا رُخ بدل دیا۔ ماقبل اُس کا ہاتھ گلاب کی طرح میرے ہاتھ میں آیا تھا اور میرے پورے بدن میں سرسرا گیا تھا۔ اب میری آنکھیں حسن کی تمازت برداشت کرنے سے منکر ہونے لگیں اور میڈم کا گل آفریں چہرہ دھندلانے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور نہایت آہستگی سے کھینچ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ زندگی کو آتشیں شباب کا پہلا لمس عطا ہوا تھا۔ دل زور سے دھڑکنے لگا۔

اُس نے آنکھیں موند لیں اور میرے نیم جان ہاتھ میں روح پھونکنے کا عمل شروع کر دیا۔ میرا ہاتھ اُس کی گرفت میں حرکت کر رہا تھا اور سانسوں کی حدت سے لحہ بہ لحہ دہکتا جاتا تھا۔ میں نے آہستگی سے ہاتھ کھینچنا چاہا تو اُس نے اپنے سر کو دائیں بائیں مخصوص انداز میں حرکت دے کر مجھے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور اپنی ترنگ میں بدستور بھٹکتی رہی۔ میں نے ہمت کی اور اُس کے چہرے کو دیکھا۔ پہلے گلابی تھا، اب دہک کر سرخ ہو گیا تھا۔ گالوں پر سرخ لکیریں تن گئی تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے بھاری پن کا شکار ہو گئے تھے۔ اُس نے چند منٹوں میں ہی میرے بدن سے تمام تر خون نچوڑ کر میرے داہنے ہاتھ میں سمیٹ دیا تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اُس کا بدن شیشے کا وہ پیکر تھا جسے چھونے

سے اس کے ٹوٹنے کا احتمال ہوتا تھا۔ آنکھیں سمندر کی تمام تر گہرائی سمیٹے ہوئے تھیں اور ہونٹوں پر عمودی مہین لکیروں کا جال اور دو ننھے ننھے چمک دار ابھار مردوں میں روح پھونکنے کا سا اعجاز رکھتے تھے۔ وہ اچانک پہلو کے بدل کروٹ لے گئی۔ اَب اُس کا وسطی بدن میری کمر سے جڑ گیا اور اُس نے میرا ہاتھ لبوں سے ہٹا کر اپنے بائیں گال پر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ پر اُس کی گرفت لرزنے لگی اور سانسوں کی چال غیر معتدل ہوگئی۔ آنکھیں موندے قدرے بھاری آواز میں بولی، ''شہریار! آئی لو یو..... تمہیں پہلی نظر دیکھ کر تمہیں پسند کرنے لگی تھی۔ اَب وہ پسندیدگی کا جذبہ انتہائی حدوں کو چھو کر محبت بن گیا ہے۔ میں نے کیا کہا ہے شہریار؟''

''جی..... جی میڈم..... میں سن رہا ہوں۔'' مجھے اپنی آواز کی لرزش نے حیران کر دیا۔

''ہاں..... تم سننے پر مجبور ہو۔ تم اپنی بہن کی وجہ سے میری باتیں سننے پر مجبور ہو۔ میرا ہر حکم ماننے پر مجبور ہو۔ جب تمہاری بہن تمہیں مل جائے گی، پھر تم کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرو گے مگر میں تب تک تمہارے حواس پر چھا چکی ہوں گی۔ تم جانا چاہو گے مگر تمہارا بدن ساتھ نہیں دے گا۔ تم مجھے انکار کرنا چاہو گے مگر زبان تمہیں چھوڑ کر میرے راگ الاپنے لگے گی۔''

وہ جواب سے بے نیاز اپنی ہی رو میں بہکتی جا رہی تھی، ''سنو! میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ محبت کسے کہتے ہیں؟ جانتے ہو؟..... ہائے! دنیا میں ایسا کون ہے جو نہ جانتا ہو کہ محبت کس جذبے کا نام ہے۔ جہاں یہ ہوتا ہے، وہاں کوئی نہیں ہوتا..... اب یہاں عشق کا راج ہے، سمجھو! یہاں کوئی اور نہیں ہے..... ہُوم! تم نے مجھ پر ایسا کیا جادو کر دیا ہے کہ میں عاشق اور تم معشوق بن گئے ہو۔''

وہ سنا رہی تھی، سننا نہیں چاہتی تھی۔ اپنا دایاں ہاتھ میری گود میں رکھ کر ٹوٹتے لہجے میں بولی، ''شہریار! یہ ہاتھ ٹھنڈا ہے، اِس کو آگ اچھی لگتی ہے، جلا دو۔ اپنے ہونٹوں سے لگا لو۔''

میرا ایک ہاتھ مفتوح تھا۔ دوسرا خود پر فاتح کا لیبل لگا کر میڈم کی دسترس میں جانے والا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے اُس کا لرزتا ہوا ننھا سا گداز ہاتھ تھاما اور لبوں سے لگایا۔

ایسے ہی وقت میں میرے مقابل غزالہ آن کھڑی ہوئی۔ میرے سینے پر انگلی تان کر کراہی، ''بس شہرے خان! تمہاری محبت دم توڑ گئی ناں!''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ آنکھیں جھپکائیں، دیکھا، وہ سامنے آ کر دھندلانے لگی تھی۔ پھر جیسے تصور کے پردے پر ابھری تھی ویسے ہی ایک ساعت میں تحلیل ہونے لگی۔

'میں نے سر جھٹکا اور میڈم کے ہاتھ کے ساتھ کھیلنے لگا۔ میں اُس سے دور ہونا چاہتا تھا یا میں اُس کے قرب کا خواہاں تھا، یہ سوال پہیلی بن کر رہ گیا۔ گلاب کے پھول نے ہونٹوں کو لمس عطا کر کے ساری تاب اپنے اندر سمو لی تھی۔ میں جن دنوں ملتان کے کالج میں پڑھا کرتا تھا، کئی لڑکیاں فریفتگی کی دیوار سے سر نکال کر مجھے اپنے پاس بلایا کرتی تھیں مگر میں اُنہیں نظر انداز کر کے کتاب کو سینے سے لگا لیتا تھا۔ عورت ذات کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھتا گیا۔ میں نے آج تک غزالہ کے علاوہ کسی شبیہہ کو اپنی چشمِ تصور میں براجمان ہونے کا موقع نہ دیا تھا۔ آج غزالہ کے عشق کی وہ تاب، وہ تمکنت بے بسی کی عجیب نشہ آور کیفیت میں مصلوب ہو گئی تھی۔ میں یہ تعین کبھی نہیں کر پایا کہ اگر میڈم اتنی بااختیار نہ ہوتی، میں اس کے احسانات کے زیرِ بار نہ ہوتا تو کیا محض اپنے حسن کی جولانیوں سے وہ مجھے بے بس کرنے میں کامیاب ہو جاتی؟.....

ایسے ہی وقت میں غیر متوقع مدد آن پہنچی۔ اُس کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی اور وہ چونک گئی۔ پھر ایک نظر مجھے فاتحانہ اطوار سے دیکھتے ہوئے، میرا ہاتھ چھوڑ کر، اپنا چھڑا کر، فون سیٹ کی طرف متوجہ ہوئی اور سکرین پر نظر ڈال کر بڑبڑائی، ''یہ کس کا نمبر ہے؟''

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بیڈ چھوڑ دیا۔ پانی پینے کے بہانے فریج کی طرف بڑھا۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا تو اس کی شرارت بھری آواز کانوں میں پڑی، ''ہر آگ پانی سے نہیں بجھتی شہر یار!''

میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تو ماہ رُخ کی آفتابی کشش دل میں کھب گئی۔ دیکھتے رہنے کی خواہش نے سر اُٹھایا جسے میں بمشکل کچل کر پانی حلق میں اتارنے لگا۔ فون کی بیل بجتے رہنے کے بعد خاموش ہو گئی۔ پھر بول پڑی تو میڈم نے کال ریسیو کر لی اور سپاٹ لہجے میں پوچھا، ''یس! ہو از آن دی لائن؟''

فون میں ابھرنے والی کوئی شناسا سی آواز سن کر ایک دم ہنس پڑی۔ ہنستے ہنستے نخوت سے بولی، ''ارے استاد! میرا نمبر کہاں سے مل گیا تمہیں؟''

کمرے میں سپیکر سے پھوٹنے والی جھنجھناہٹ پھیل گئی۔ ایسے میں میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے پانی طلب کیا۔ میرے ہاتھوں سے پانی کا گلاس تھام کر اُس نے مسکراتے ہوئے فون میں کہا، ''تمہیں استاد کہتی ہوں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری

عزت کرتی ہوں۔ تم بھی میری عزت کرو۔ ایسی باتیں کرو گے تو میری طرف سے بھی طعنے سننے کو ملیں گے۔''

وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہی تھی۔ آنکھوں سے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُس نے موبائل فون سیٹ کے کسی بٹن کو دبایا۔ فون کالاؤڈر آن ہوگیا۔ ایک مردانہ آواز میری سماعت میں اُتری، ''میں جان چکا ہوں کہ تم اپنے مورچے 'سی ٹو' میں چھپی بیٹھی ہو۔ اب صرف یہ جاننا باقی ہے کہ 'سی ٹو' کہاں ہے۔ تم جتنی دیر کرو گی، اتنا ہی قرض کے بار تلے آؤ گی۔''

میڈم بولی، ''تم نے یہ سوچ کر فون کیا ہے کہ میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے تمہارے اڈے پر حاضری دینے چلی آؤں گی؟''

''ہاں! کیونکہ اسی صورت میں تم زندہ رہ سکتی ہو۔'' سپیکر سے برآمد ہونے والی آواز میں موت کی سی سردی پنہاں تھی۔

''استاد! بہتر یہی ہے کہ تم اپنے سردار کو سودے بازی پر رضامند کرلو۔ مفاہمت کی راہ اختیار کرلو۔ سچ کہتی ہوں کہ یہ تمہارے لیے گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔''

''تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ سردار کی بیٹی میرے حوالے کردو۔ اونچا اڑنے کی کوشش میں پر کٹوا بیٹھو گی۔''

میڈم نے میری طرف دیکھا، مسکرائی اور فون میں بولی، ''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اتنی کمزور نہیں ہوں کہ شکست تسلیم کرلوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایسا موقع آیا کہ مجھے اپنی جان جاتی ہوئی محسوس ہوئی تو تمہارے سردار کی بیٹی کی بھی چھٹی کرادوں گی۔ میری مطلوبہ لڑکی اتنی قیمتی نہیں ہے جتنی تمہاری..... اس لیے سوچ سمجھ کر بات کرو ورنہ میں ڈیلنگ کی بساط سمیٹ دوں گی۔ جس پارٹی کو وہ لڑکی دینی ہے، اُسے خانزادی تھما کر اپنی جان چھڑالوں گی۔''

''میڈم! اپنا بنا بنایا گروپ ختم نہ کرواؤ، سیدھی طرح.....''

''ٹھیک ہے اُستاد! جب ضروری سمجھوں گی، تمہاری ہدایات پر عمل کرلوں گی۔ کچھ اور کہنا ہے تو کہہ لو، میں بہت مصروف ہوں۔''

'استاد' کی آواز مزید سرد ہوگئی، بولا، ''یعنی تم مرنا چاہتی ہو؟''

''ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے ناں!'' میڈم کے لہجے سے جھلکتی لاپروائی میرے لیے حیرت انگیز تھی، ''اگر تمہاری یادداشت کام کرتی ہے تو سبق سیکھو اُس دن سے جب تم طاقت

کے گھمنڈ میں میری طرف آئے تھے، ہمارے گروپ آپس میں ٹکرائے تھے..... کیا ہوا تھا؟ تمہاری ایک بے وقوفی نے تمہیں جان کے لالے ڈال دیے تھے۔"

"وقت ایک سا نہیں رہتا میڈم! تم نے سردار کی بیٹی پر سپاری لگا کر اچھا نہیں کیا۔ ہماری دنیا کا یہ اصول کبھی نہیں رہا۔ ہم دوسروں کو پر ہاتھ اُٹھاتے ہیں مگر ایک دوسرے کی عزت پر میلی نگاہ نہیں ڈالتے۔ اگر تمہارا کوئی گھر بار ہوتا تو تمہیں اب تک اس حماقت کی سزا مل چکی ہوتی۔ خیر! اب بھی تم کہاں تک چھپی رہ سکتی ہو۔"

میڈم پر اُس کی خنک آواز اور خطرناک دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، تمکنت سے بولی، "میرو شاہ کے عذاب سے بچ جاؤ تو بہتر ہے استاد ببلو! وہ ایک حد تک تمہاری گستاخیاں برداشت کرے گا پھر تمہارا جینا دوبھر کر دے گا۔ تم عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پروین نامی لڑکی میرے حوالے کر دو، اپنی اسما لے جاؤ..... اپنے سردار کو سمجھا دو کہ پروین اپنے چہرے پر جتنے تھپڑ سجا کر آئے گی، اسما اتنی چیخیں اپنے پلو سے باندھ کر رخصت ہوگی۔"

استاد ببلو بہت سنجیدہ مزاج آدمی تھا۔ وہ میڈم کو خطرناک دھمکیاں بھی کمال سنجیدگی سے سپاٹ لہجے میں دے رہا تھا۔ میڈم کی بات سن کر اُس نے 'اچھا تو پھر انتظار کرو' کہا اور فون بند کر دیا۔ میڈم چند لمحے تک فون کی اسکرین کو گھورتی رہی پھر میرو شاہ کو کال کر کے اُستاد ببلو سے ہونے والی بات چیت دہرانے لگی۔ میرو شاہ نے بتایا کہ کوٹھی میں موجود افراد بھی پوری طرح چوکس ہیں اور کوٹھی کے باہر سپیشل فورس تعینات ہے جو استاد ببلو کے استقبال کے لیے پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہے۔ اُس نے میڈم کو بے فکر رہنے کا مشورہ دیا اور فون بند کر دیا۔

دَس پندرہ منٹ تک میڈم آنکھیں موندیں ساکت پڑی رہی، میں کرسی میں بیٹھا ایک ٹک اُس کے ماہتاب چہرے کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ کہ اتنی نازک اندام عورت کس طرح اتنے بڑے نیٹ ورک کو کامیابی سے چلا سکتی ہے۔ اُس کے سر پر موت کی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں مگر وہ دسمبر کی جھیل کے ٹھہرے ہوئے خنک پانی کی طرح پرسکون تھی۔ کوئی تلاطم، کوئی بھنور، کوئی شور..... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اُس کے نزدیک معمول کے حالات ہوں جو اپنی روائتی چال سے آگے کی طرف بڑھتے جا رہے ہوں۔

میں نے ابھی تک اُسے چیختا، چلاتا، رعب جماتا یا جھنجلاتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ اُس کا رویہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بڑا مشفقانہ تھا۔ وہ اپنی گفتگو، رکھ رکھاؤ اور حرکات وسکنات

سے کسی طور پر بھی جرائم پیشہ گروہ کی سرغنہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ابھی تک جن لوگوں کو سی ٹو میں دیکھا تھا، وہ بھی شکل وصورت سے نہ تو غنڈے دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی بدقماش..... یونیورسٹی لیول تک پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کا گروہ میڈم کی مٹھی میں تھا۔ میں نے جن بدمعاشوں کی کہانیاں پڑھ سن رکھی تھیں، اخبارات میں جن پولیس مقابلوں کی روئیدادیں پڑھ رکھی تھیں، ان کے کردار ان کرداروں سے یکسر مختلف تھے۔

میر وشاہ اور میڈم شکیلہ کی باہمی گفتگو سے پتہ چلا تھا کہ وہ منشیات کی سپلائی کا کاروبار کرتی تھی۔ سونیا نے ایک نئے رُخ سے پردہ کشائی کی تھی کہ میڈم لڑکیوں کو بڑے سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کے بستروں کی زینت بناتی تھی۔ وہ اور کیا کرتی تھی؟ یہ تو آنے والا وقت ہی مجھ پر عیاں کر سکتا تھا۔ سردار حیدر خان اور اُس کے خونخوار گرگے استاد ببلو سے ٹکر لینے کی جرأت کوئی عام عورت نہیں لے سکتی تھی، یہ میں نے حالات کی کروٹیں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔ وہ بڑے دھڑلے سے حیدر خان کی مونچھیں اپنے پاؤں تلے دبائے بیٹھی تھی۔

اچانک اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چونکہ میں بڑی محویت سے اُسے دیکھ رہا تھا، اِس لیے جھینپ گیا۔ وہ مسکرا کر بولی، ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، میں نے تمہیں یہ حق دے رکھا ہے۔''

''جی میڈم.....'' میں نے سر جھکا لیا۔

وہ بولی، ''جب تم نے سائیں دل جیت کو قتل کیا، تب تمہیں کوئی ڈر نہیں لگا؟''

''نہیں میڈم.....تب میرا خون کھول رہا تھا۔ بعد میں، جب میں نور پور سے نکل رہا تھا، تب میرا دل خوف سے دھڑک رہا تھا۔''

''یقین نہیں آتا کہ تم نے اتنی آسانی سے سائیں جیسے طاقت ور شخص کو بے بسی کی موت مار دیا۔'' اس کے الفاظ استعجاب آمیز تھے مگر لہجہ قطعی سپاٹ تھا ''کیا واقعی سائیں نے اپنی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کر رکھا تھا؟''

''جی میڈم.....اگر اُس کا کوئی شخص پہرے پر تھا بھی تو میرے سامنے نہیں آیا۔''

''تم اسلحہ استعمال کر سکتے ہو؟''

''جی.....کالج کے دور میں عرفان مرزا نے مجھے تربیت دی تھی۔''

''عرفان مرزا.....وہ کون؟''

''وہ ایک سٹوڈنٹ تنظیم کا لیڈر تھا۔ میں اُس کا نائب تھا۔''

''اوہ یس! وہ عرفان مرزا..... لمبے قد والا۔ تو تم ملتان میں ہی پڑھتے رہے ہو۔ یہ زیادہ پرانی بات تو نہیں..... عرفان مرزا تو بڑا چالاک اور موقع پرست آدمی ہے۔'' اُس کے ہونٹ سکڑ گئے، بولی، ''ایک دو مرتبہ اس سے واسطہ پڑا ہے، جھکائی دے کر نکل گیا۔ یہ بتاؤ! تم نے اس سے کیا کچھ سیکھا؟''

میں نے تفصیل سے آگاہ کیا تو خوش ہو کر بولی، ''ویری گڈ! وہی تربیت تمہارے کام آ گئی اور تم نے سائیں دل جیت جیسے سانڈ کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ ویسے بھی دل جیت کی زبان چلتی تھی، شراب نوشی اور زنا کی کثرت نے اُس کے ہاتھ پیر سہل کر دیے تھے۔ اُسے یہ گھمنڈ تھا کہ کوئی اُس کی سلطنت پر حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ یہی غرور اور لاپروائی اُسے لے ڈوبی اور تمہارا وار چل گیا۔ کیا سائیں جیسے کسی اور ہاتھی کو گرانا پڑے تو تمہارے بازو کام کریں گے؟''

میں نے کہا، ''مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ میری واپسی کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ لوٹوں گا تو بے موت مارا جاؤں گا۔ آگے بڑھوں گا تو مجھے راستے کے کانٹے صاف کرنا ہوں گے۔''

اُس نے میرے جملے سے اپنے مطلب کی بات اخذ کر لی اور کہا، ''او کے! اب تم جاؤ اور اسما کو میرے پاس لے آؤ۔''

'کیوں' کا لفظ میرے لبوں سے پھسلتے پھسلتے اٹک گیا اور میں اٹھ کر ریٹائرنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد میں سونیا کے کمرے میں بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز اسما کے سامنے کھڑا تھا۔ سونیا صوفے میں بیٹھی تھی، بولی، ''کیا بات ہے؟ میڈم نے کچھ کہا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''ہاں! میڈم نے حکم دیا ہے کہ میں اسما کو اس کے کمرے میں لے جاؤں۔''

وہ کندھے اُچکا کر نیم لاپروائی سے بولی، ''تو لے جاؤ.....''

میں نے اسما کو دیکھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا، ''اٹھو! تمہیں میڈم نے بلایا ہے۔''

اگر وہ کہیں اور ملی ہوتی تو میں اُسے اپنی خاندانی روایات کے مطابق 'اُٹھو بی بی جی!' کہتا۔ یہاں نہ تو وہ 'بی بی جی' تھی اور نہ ہی میں نور پور کا دیہاتی نوجوان تھا۔

وہ چونکی، دھیرے سے بولی، ''کون میڈم؟''

میں نے کہا، ''میرے ساتھ چل کر دیکھ لو۔''

وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولی، ''میں کہیں نہیں جاؤں گی، خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو مجھے.....''

سونیا اُٹھ کر میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی، ''باتوں میں وقت ضائع نہ کرو ورنہ میڈم کا موڈ خراب ہو جائے گا۔''

''تو کیا کروں؟ وہ اُٹھے تو تب ناں؟'' میں سونیا کی طرف پلٹا۔

ایک طنزیہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر مچل گئی۔ بولی، ''کیا تمہیں خدا نے ہڈ پیر نہیں دے رکھے؟''

اُس کے انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ اسما اگر نہیں جانا نہیں چاہتی تو مجھے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اُسے میڈم کے قدموں میں لے جا پھینکنا ہوگا۔

میں نے قدرے درشت لہجے میں اسما سے کہا، ''اُٹھو، مجھے اُٹھانے پر مجبور کرو گی تو پچھتاؤ گی۔''

اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرزیں اور وہ ایک جھٹکے سے، پیچھے، دیوار کی طرف کھسک گئی۔ دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر چیخی، ''خدا کے لیے شہریار! تم تو ایسا نہ کرو..... مجھے اِس جہنم سے نکالو۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہی۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میرا اور سونیا کا سوانگ ناکام ہو گیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ میں شہریار ہوں۔ میں نے ایک پاؤں بیڈ کے فوم پر رکھا اور اُسے کلائی سے پکڑ کر بے دردی سے کھینچ لیا۔ اس نے تڑپ کر میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئی اور قالین پر آن گری۔ چند لمحے قالین پر پڑی رہی پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہو گئی۔ اُس کے بائیں ہاتھ کے ناخن میرے رخسار میں گڑ گئے۔ اُس کی غیر متوقع حرکت اور تیز چبھن نے مجھے اُس کی کلائی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چیخ کر پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھی۔ اس کے ردعمل نے مجھے بے حد برانگیختہ کر دیا اور میں نے اپنی پوری قوت سے تھپڑ اُس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ پیروں پر گھومی اور لڑکھڑا کر بیڈ پر پیٹ کے بل جا گری۔ بے اختیار میرا ہاتھ میرے رخسار تک گیا، پلٹا تو ہتھیلی پر خون کا بڑا سا داغ نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے ناخن جلد میں خاصی گہرائی تک کھب گئے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے دانت پیس کر آدھی بیڈ پر، آدھی بیڈ سے نیچے، اوندھی پڑی اسما کو دیکھا۔ پیر کی زوردار ٹھوکر رسید کی اور کمر پر لہراتی ہوئی زلفوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکا دیا۔ اُس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی اور وہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر پلٹی۔ اس کا حملہ کارگر نہیں ہوا کیونکہ اب میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ سنبھل نہ سکی اور کمر کے بل زمین پر گر گئی۔ اس کے منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ نازوں پلی ہوئی لڑکی پر میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا۔

میں نے دو تین ٹھوکریں اُس کے پہلو میں ماریں اور گھسیٹنا چاہا۔ وہ کراہی اور میرے پیروں سے لپٹ گئی، ''خدا کے لیے شہریار! مجھ پر رحم کرو..... مجھے مت مارو.....''

اُس کی آواز میں بیک وقت شدید رنج اور شکوہ غالب تھا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا، ''اُٹھو.....''

اُس نے میرا وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبوچ لیا جس میں اُس کے بال جکڑے ہوئے تھے۔ آہستہ سے اُٹھی اور کراہتے ہوئے بولی، ''میں نے کیا بگاڑا.....''

''بکواس نہ کرو.....'' میں نے اپنا ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے لہرایا۔ اس نے ڈر کر سر پیچھے کیا۔ ایسے میں اُس کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھٹنے کو آ رہی تھیں۔ میں نے بال چھوڑ دیے اور کلائی تھام لی۔ اسے کھینچتے ہوئے سونیا کے کمرے سے نکالا اور ریٹائرنگ روم میں لے آیا۔ بیڈ پر نیم دراز میڈم کے سامنے پیش کر دیا۔ اُس نے بغور اسما کو دیکھا۔ ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر مسکرائی اور مستفسر ہوئی، ''یہ خون کیسا ہے؟''

میں نے کہا، ''یہ آپ کے پاس آنا نہیں چاہ رہی تھی۔''

اسما چیخی، ''مجھے کیوں یہاں رکھا ہوا ہے تم لوگوں نے، کیا قصور کیا ہے میں نے؟ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کس کی بیٹی ہوں؟ میرا باپ تم لوگوں کو الٹا لٹکا دے گا۔''

میڈم کی آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کی دھمکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے مخاطب ہوئی، ''میں اِس کے باپ کا نمبر ملاتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی چیخ و پکار اپنے کانوں سے سن لے۔''

میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ وہ فون ہاتھ میں پکڑ کر اسما سے مخاطب ہوئی، ''تمہارے باپ کا موبائل فون نمبر کیا ہے؟''

اسما جلدی سے بولی، ''گاؤں میں موبائل فون نہیں چلتا۔''

''گھر کا نمبر؟''

اسما بولی، ''زیرو سکس.....''

وہ اٹک اٹک کر بولتی گئی، میڈم بٹن پش کرتی گئی۔ کال مل گئی۔ اسما کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سسک کر چپ ہوگئی۔ میڈم کا فون پر رابطہ ہوگیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، ''سردار صاحب سے بات کروائیں۔ فوراً!''

ایسے ہی وقت میں اسما نے قدم بڑھایا۔ میڈم کی توجہ اُسی پر مرکوز تھی، فوراً بولی، ''اِسے روکو، جب کہوں، تب اُس کے حلق سے چیخیں برآمد کرانا.....او کے؟''

میں نے اسما کے بال مٹھی میں بھر لئے۔ وہ سسک کر پلٹی اور مجھے گھورتے ہوئے، دانت کچکچاتے ہوئے بولی، ''چھوڑو میرے بال.....کمینے.....''

میں نے ہاتھ اُٹھایا۔ وہ سہم کر بولی، ''نہیں.....خدا کے لیے نہیں.....''

اُس کی آواز کی تندی سسکیوں میں ڈھل گئی اور وہ بے دم سی ہوکر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میڈم کی آواز سنائی دی، ''سردار حیدر خان! کیسے ہو؟ ملتان سے میڈم شکیلہ بات کر رہی ہوں۔''

سردار حیدر خان کی بات سن کر ایک زہر خند مسکراہٹ میڈم کے لبوں پر ثبت ہوگئی۔ بولی، ''انسانوں کی طرح میری بات سنو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ تمہیں شاید یہ بات کہتے ہوئے یاد نہیں رہا کہ اوپر والوں کے سر میرے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے تمہیں فون اِس لیے کیا ہے کہ تم نے سینکڑوں معصوم لڑکیوں کی درد بھری چیخیں سن رکھی ہیں۔ ہزاروں فریادیں تمہارے کانوں کے پردوں پر ثبت ہیں۔ آج ایک نئی آواز سنو اور محسوس کرو.....''

اسی وقت اُس نے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں پھیلائیں اور مخصوص انداز میں ہاتھ کو نچا کر مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اسما کے بالوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ اسما کے ہونٹوں سے ایک سسکاری نکلی۔ میڈم نے مایوسی سے سر ہلایا۔ میں نے اُس کا چہرہ اپنی جانب کیا اور الٹے ہاتھ کا تھپڑ اُس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ اُس کے حلق سے دردناک چیخ نکلی۔ میں نے پھر ہاتھ اُٹھایا۔ دوسری چیخ پہلی سے کہیں زیادہ المناک تھی۔

میڈم نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا اور فون میں بولی، ''کیسی خوب صورت آواز ہے سردار

صاحب! پہچانی؟''

سردار حیدر خان نے کیا کہا، علم نہیں مگر اُس کی بات سن کر میڈم کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ سرد لہجے میں بولی، ''ان دھمکیوں پر عمل کرنے کے لیے تمہارے پاس طویل وقت پڑا ہے سردار حیدر! لیکن اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے ملنے والی مہلت بہت کم ہے۔ فوراً میری مطلوبہ لڑکی میرے حوالے کرواور اپنی بیٹی وصول کرو ورنہ تمہاری بیٹی بھی اُنہی کوٹھیوں کی دلہن بنے گی جن حویلیوں کے آنگن تم نے آج تک آباد کیے ہیں۔ آج رات بارہ بجے..... اُس کے بعد اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی سودے بازی نہیں ہوگی۔''

جملہ مکمل ہوتے ہی اُس نے ہونٹ بھینچ کر کال منقطع کر دی۔ کچھ سوچ کر فون 'پاور ڈ آف' کر دیا۔ اسما کو مخاطب کرتے ہوئے بولی، ''خانزادی! اب گیند تمہارے باپ کے کورٹ میں ہے۔ چاہے تو نمبر حاصل کرلے، چاہے تو فاؤل کھیل کر پوائنٹ گنوالے۔''

اسما کا سر جھکا ہوا تھا۔ سسکیوں کی تال پر جسم جھٹکے لے رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ نڈھال انداز میں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ وہ ہوش میں تھی مگر اس کے بدن میں طاقت نہیں رہی تھی۔ میں نے اُسے کھینچ کر اُٹھانا چاہا تو میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا، بولی، ''اسے اُٹھا کر سونیا کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ خوبصورت چہروں کو اتنا بگاڑنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تھوڑا سہلا دینا.....''

اس کے لہجے سے جھلکتا ہوا طنز بڑا شریر تھا۔ میں نے اسما کو اُٹھنے کا حکم دیا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی، ''تم ظالم لوگ ہو، تم انسان بھی نہیں ہو۔ ذلیل کرنے سے بہتر ہے تم مجھے مار ڈالو..... مجھے زندہ مت چھوڑو۔''

میں نے کہا، ''زیادہ باتیں نہ کرو، اُٹھو..... جب مارنے کا وقت آئے گا، رعایت نہیں کی جائے گی۔''

وہ بدستور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''میں اُٹھ نہیں سکتی۔''

میں نے جھک کر اُسے بانہوں میں بھر کر اُٹھا لیا۔ اس کے بدن میں حسن کی تمام تر تابناکیاں موجود تھیں مگر وزن نام کی کوئی شئے نہیں تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں اُس کے بازوؤں کو چھوا تھا۔ کھالے کے ردِعمل نے مجھے دنیا کا خوش قسمت مرد قرار دیا تھا۔ آج وہ میری بانہوں کے حصار میں، میری دسترس میں تھی مگر میرے پہلو میں دھڑکنے والا دل پہلے سے جذبات سے

عاری تھا۔ اُسے بانہوں میں بھرے ریٹائرنگ روم سے نکلا۔ بڑے کمرے میں آیا۔ پاؤں قالین پر پڑے تکیے میں الجھا اور توازن برقرار نہ رکھ پاتے ہوئے اُسے لیے قالین پر جا گرا۔ وہ میرے نیچے دب گئی۔ اُس کے حلق سے چیخ نکلی، کراہی، ''ہائے! مرگئی.....''

میں جلدی سے اُٹھا اور اسے گھسیٹ کر سونیا کے کمرے میں لے گیا۔ اس دوران اسما کی کراہیں میری سمع خراشی کرتی رہیں کیونکہ میں اتنا ظالم فطرت کبھی نہیں رہا تھا۔ میں نے کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا، نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ندامت، تکلیف یا رحم دلی کا کوئی جذبہ میرے سینے میں نمو پذیر نہیں ہوا تھا۔

میں نے اسما بیڈ کے پاس لا کر پھر بانہوں میں بھرا اور اُٹھا کر بیڈ پر پٹخ دیا۔ وہ پہلو کے بل بیڈ پر گری اور بے جان انداز میں لم لیٹ ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں کے دونوں گوشوں سے خون رس رہا تھا اور رخساروں پر پھیل رہا تھا۔ آنکھیں مجھ پر ساکت انداز میں ثبت تھیں۔ اپنی بے توقیر فریاد زبان کی بجائے آنکھوں سے عیاں کر رہی تھی جسے نظر انداز کرنا میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

سونیا کے نزدیک جیسے اِس واقعے کی کوئی اہمیت نہیں تھی، وہ صوفے میں پسر کر بیٹھی میگزین پڑھ رہی تھی۔ نظریں اُٹھائے بغیر بولی، ''گڈ شو مسٹر ہینڈسم! مارتے ہو، بانہوں میں بھر کر اُٹھاتے ہو اور جوانی کی شراب پینے سے کتراتے ہو، کیا تضاد ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی، ''اَب اس خونخوار بلی کا نقشہ بھی درست کر دو۔ الماری میں کاٹن، سپرٹ اور ٹنکچر وغیرہ پڑے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''میڈم کو بدصورت لوگ اچھے نہیں لگتے ناں! فرسٹ ایڈ بکس نکالو اور اس کے زخموں پر سپرٹ لگا کر کاٹن سو یب رکھ دو۔'' وہ پہلی سی لاپروائی سے بولی، ''کیا تمہیں میڈم نے کہا نہیں؟''

مجھے میڈم کا طنزیہ انداز میں کہا گیا جملہ 'ذرا سہلا دینا' یاد آیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری میں جدید نوع کی میڈیکل کٹ پڑی تھی۔ اس میں موجود سامان کا سرسری جائزہ لیا۔ اس سے پہلے نور پور کے سرکاری ہسپتال کی کٹ دیکھ رکھی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی سے ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانے کے بہت سے قاعدے ضابطے سیکھ رکھے تھے۔ سیکھا ہوا ہنر کام آنے والا تھا۔ کٹ اُٹھائے بیڈ پر آیا۔ اُسے پکارا تو جواب ندارد..... جھنجوڑا تو اس نے

بیزاری سے مجھے اور میرے ہاتھوں میں دبی میڈیکل کٹ کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

میں نے کہا، ''چہرہ ادھر کرو، زخم کی صفائی کر دوں۔''

میرے عقب میں سونیا کی آواز اُبھری، ''تم اس کی بینڈ یج کرنے کے ساتھ ساتھ نگرانی بھی کرو۔ میں آپریشن روم میں جا رہی ہوں۔''

لگتا تھا کہ وہ اسما کی نگرانی کے نام پر قید میں رہتے ہوئے بور ہو گئی تھی اور کمرے سے نکل کر چلنا پھرنا چاہتی تھی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جونہی کمرے سے نکلی، اسما ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی، ''یہ ڈراما بازی بعد میں کرنا، پہلے میرے سوالوں کا جواب دو؟''

میں نے اپنے لہجے میں درشتی سموتے ہوئے کہا، ''کیا مطلب؟ کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''تم شہریار ہی ہو نا..... نور پور والے؟'' اُس کے لہجے میں دُکھ آمیز اُمید کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ تن پر اتنا کچھ بیتنے کے بعد بھی اُس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے دانت پیس کر کہا، ''میں نہ تو کسی شہریار کو جانتا ہوں اور نہ ہی نور پور سے کچھ واسطہ رکھتا ہوں..... کچھ اور پوچھنا ہے؟''

اسے میری بے گانگی اور بدتمیزی سے دکھ پہنچا۔ مایوس ہو کر بولی، ''مانو یا نہ مانو، تم شہریار ہی ہو۔ پہلی مرتبہ میں نے تمہیں چاچے وریام کی دھی (بیٹی) کی شادی پر بڑے غور سے دیکھا تھا۔ دوسری مرتبہ تب دیکھا تھا جب تم خالد کے ساتھ چمن زار میں آئے تھے..... جب موبی اور اُس کے غنڈے میرا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے اور.....''

میں نے اپنے چہرے کو اسپاٹ رکھا اور قدرے غصے سے کہا، ''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''نہیں.....'' اُس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، آنکھیں موند لیں اور بولی، ''میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ میری نظر کمزور نہیں ہے۔ میں تمہیں پہچان چکی ہوں کہ تم شہرے خان ہو۔ نور پور کے رہنے والے ہو۔ خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دو کہ تم لوگوں نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟ کیا تم لوگ مجھے قتل کر دو گے؟''

اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں باتھ روم میں نصب شدہ واش بیسن کی ٹونٹی سے پانی بھر لایا۔ پھر میڈیکل کٹ کھول کر سپرٹ، آئنٹمنٹ اور کاٹن رول نکالا۔ سیزر اور دوسرے ضروری آلات نکال کر کٹ کے کھلے ہوئے ڈھکن پر رکھے اور چاہا کہ اس کے چہرے اور گردن

پر چپکنے والے خون کو صاف کر دوں مگر اس نے میرے ہاتھ کو جھٹک کر جھلائے ہوئے انداز میں کہا، ''میں نے کیا پوچھا ہے؟''

میں نے آنکھیں دکھائیں، ''کیا تم مجھے سختی پر مجبور کر رہی ہو؟ میں نہیں چاہتا کہ تم پر ہاتھ اُٹھاؤں مگر تم نجانے کس مٹی کی بنی ہو کہ تم پر اثر نہیں ہوتا۔''

میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ میرے جارحانہ رویے کو بھانپ کر خوف زدہ ہوگئی اور سسکتے ہوئے قریب ہوگئی۔ میں نے پانی میں بھیگی ہوئی روئی سے اُس کے رخسار اور گردن کی جلد کو صاف کیا۔ تازہ خون کے نیچے جما ہوا خون ذرا مشکل سے صاف ہوا۔ اُس کے ہونٹوں کو صاف کیا اور منہ کھولنے کا حکم دیا۔ ماؤتھ جیک کی مدد سے منہ کھولا اور رخساروں کی اندرونی جلد جو تھپڑ کے زور پر دانتوں سے ٹکرا کر کٹ گئی تھی، صاف کی اور کاٹن کے ننھے ننھے سویب بنا کر جلد پر چپکائے۔ اُس کی خاموش آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ایک انٹی بائیوٹک کیپسول اور پونسٹان کی گولی کھلائی اور پانی سے بھرا گلاس لبوں سے لگا دیا۔

وہ بولی، ''جب مارنا ہی ہے تو پھر مرہم لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ بتاؤ، تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا، ''میں کچھ نہیں چاہتا۔ میری میڈم چاہتی ہے کہ تم اس کے ساتھ تعاون کرو۔ جو کہا جائے، بلا چوں چرا اس پر عمل کرو۔ یہ مار ماری میڈم کو پسند نہیں ہے مگر.....''

''مگر میں نے کیا بگاڑا ہے تمہاری میڈم کا؟'' وہ کراہی۔ منہ میں کاٹن سویب رکھے جانے کی وجہ سے اُس کی قوتِ گویائی متاثر ہوئی تھی۔

''تم نے نہیں، تمہارے باپ نے پنگا لیا ہے۔'' میں نے کہا، ''میری میڈم کا کچھ لین دین ہے، نمٹ جانے پر تمہیں گھر پہنچا دیا جائے گا۔''

''کیا وسیب میں میرے اغوا کا پتہ چل گیا ہے؟'' اُس نے اپنی نم آنکھیں مجھ پر مرتکز کر دیں۔

''مجھے تمہارے وسیب کے بارے کچھ علم نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم شہریار ہی ہو ناں؟'' اس نے اچانک بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔

میں نے چہرے پر بیزاری کے آثار ثبت کیے، کہا، ''یہ شہریار کون ہے جس کا تم بار بار نام لیتی ہو۔ کہہ چکا ہوں کہ میرا نام شہریار نہیں ہے۔''

''پھر تمہاری شکل اُس سے کیوں ملتی ہے؟''

''یہ سوال تم اُس سے کرنا۔''

''کیا وہ مجھے ملے گا؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

ایسے ہی وقت کمرے میں ٹیلی فون کی بیل بجی۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ کوئی فون سیٹ نظر نہیں آیا۔ بیل بدستور بج رہی تھی۔ میری سراسیمگی دیکھ کر اسما سنگھار میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی، ''وہ..... انٹرکام بج رہا ہے.....''

سنگھار میز اور صوفے کے درمیان دیوار پر نصب چوبی اسٹینڈ پر انٹرکام دھرا تھا۔ میں نے ریسیور اُٹھا کر کانوں سے لگایا۔ میڈم کی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''شہریار! تمہارا چھپنا بے محل ہے۔ اسما سے سیدھی سیدھی بات کرو۔ میں نے اُس کی آنکھیں پڑھ لی ہیں۔ وہ تمہارے کسی جھوٹ پر یقین نہیں کر رہی۔ اس لیے فضول کوششوں سے بہتر ہے کہ تم اُسے سردار حیدر کے کالے کرتوتوں سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے لیے ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

''جج..... جی میڈم.....!'' فرطِ استعجاب سے میرے منہ سے لفظ برآمد نہ ہو پائے۔ یہ عجب گورکھ دھندا تھا، عجائب خانۂ انسان تھا۔ وہ دور بیٹھی نہ صرف ہمارے مکالمے سن رہی تھی بلکہ اُس نے اسما کی آنکھوں میں موجزن قلبی یقین کی وارداتوں کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔

میں نے کہا، ''جی میڈم..... آپ بہت ذہین ہیں۔''

''تم نے میری ذہانت دیکھ لی، اچھی بات ہے۔ اَب تم مجھے اپنی اہلیت دکھاؤ۔ میں بھی دیکھوں کہ تم بگڑی ہوئی خانزادی کو کیسے اپنے دام میں لاتے ہو۔'' اس کی نقرئی ہنسی میں ترغیب، چیلنج اور آزادی کی بخشش شامل تھی۔

میں نے انٹرکام کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ پلٹ کر بیڈ پر سراگندہ براجمان اسما کے پاس آیا۔ قربت نے آگاہ کیا کہ وہ گھٹنوں پر سر رکھے سسک رہی تھی۔ میں نے کہا، ''کیا رونے دھونے سے تمہیں نجات مل جائے گی؟''

اُس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ آنکھیں اشکوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ بولی، ''تم کیوں نہیں مانتے کہ تم شہریار ہو؟''

مجھے اُس کی ذہنی حالت پر ترس آیا۔ وہ سوچتی کچھ تھی، بولتی کچھ تھی۔ شاید وہ ڈوبتے ہوئے اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ میں اُسے سہارا دے کر پتن پر لے جا سکتا ہوں۔

میں نے مسکرا کر کہا، ''اور تم کیوں اپنی بات منوانے پر بضد ہو؟''

''تم شہر یار ہی ہو..... مگر ڈر کے مارے مکر رہے ہو۔ تمہیں میرے بابا کا ڈر ہے۔ کوئی اور جانے، نہ جانے، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ بابا تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''مجھے تمہارے باپ کا کوئی ڈر نہیں ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا، ''فرض کیا، میں ہی شہر یار ہوں، پھر؟''

''پھر..... پھر.....'' وہ بولتے بولتے الجھ گئی۔ اس نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر میں واقعتاً شہر یار ہوں تو مجھے کیا کہنا چاہے گی؟ میرے لبوں پر ابھرتی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر ایک ذرا تلملائی، پھر سنبھل کر بولی، ''خالد کہاں ہے؟''

مجھے اس سوال کی توقع تھی، کہا، ''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم چمن زار کے گیٹ پر بچھڑے تھے، پھر آج تک ہم مل نہیں پائے۔''

اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ابھری اور اس نے آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں تک بیٹھی الفاظ مجتمع کرتی رہی، پھر بولی، ''میں ناں کہتی تھی کہ تم وہی ہو..... ہاں! مجھے 'بی بی جی' کہتے تھے ناں تم؟ پھر اسی بی بی کو بھری دنیا میں بے عزت اور ننگا کر دیا..... ہیں؟ اب بتاؤ، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیا تکلیف دی تھی؟''

میں نے سر جھکا لیا۔ اُس پر جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑا۔ اُس نے بغیر سانس لیے کئی سوال کیے، کئی طعنے دیے اور اپنے طور پر ہی ان کے جوابات سے سرفراز کیا۔

جب وہ بول بول کر تھک گئی تو میں نے سر اُٹھایا اور کہا، ''اسما! احترام ہمیشہ دوطرفہ ہوتا ہے۔ محبت کی شاہراہ بھی دو رویہ ہوتی ہے۔ تمہیں 'بی بی جی' کہا کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ میری بہن کو بھی احتراماً 'بی بی جی' ہی کہہ کر پکارا جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ ایک ہی خون..... ایک ہی جاتی..... کیا ہوا جو تمہارے بابا کے پاس جاگیر اور روپیہ پیسہ آ گیا اور ہم تہی دست رہ گئے۔''

میں نے بیڈ چھوڑ دیا۔ پشت پر ہاتھ باندھ کر مقابل کی دیوار تک گیا، پلٹا، کامل سنجیدگی سے بولا، ''سردار حیدر خان، تمہارا بابا، بیسا کھیاں مانگنے نور پور آیا کرتا ہے۔ اُسے اسمبلی تک پہنچنے کے لیے ہم دیہاتیوں اور غریب لوگوں کے ووٹ درکار ہوتے تھے۔ تب بھی ہم نے کبھی اُسے مانگنے کی اذیت سے دوچار نہیں کیا بلکہ اس کی آؤ بھگت کرتے ہوئے یقین دلایا کہ ہمارے ووٹ اُس کے انتخابی نشان سے چپکے ہوئے ہیں۔ بھلے وہ ہمیں کوئی گلی، نالی، پلی یا سولنگ

دے، نہ دے، ووٹ اُسے ہی ملیں گے۔ ملتے بھی رہے..... نور پور کے کسی لڑکے کو تمہارے بابا نے آج تک نوکر نہیں لگوایا۔ کسی بیٹی کے لیے جہیز فنڈ سے رقم نکلوا کر نہیں دی، پھر بھی نور پور والے اُس کے جوتے سیدھے کرتے ہیں۔''

وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی اور میرے لبوں سے برآمد ہونے والے زہر خند الفاظ انہماک سے سن رہی تھی۔ میں نے گلا کھنکار کر سلسلہ کلام جوڑا، ''اسما! تمہیں بی بی کہا کرتا تھا، مگر آج نہیں کہوں گا کیونکہ آج تم عام سی لڑکی ہو جس کا نام 'اسما' ہے۔ میری نظر میں تم خانزادی نہیں رہی ہو بلکہ کمین زادیوں سے بھی بدتر لڑکی ہو۔ تمہارے باپ نے میری بہن کو اغوا کرایا ہے۔ کیوں؟ جانتی ہو کیوں؟..... اس نے اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لیے اپنی برادری کی غریب بیٹی کو، اپنی ہی بیٹی کو لقمہ بنایا ہے۔ وہ اَب بھی اُس کی تحویل میں ہے۔ میں شاید کبھی بھی یہ حرکت نہ کرتا، مگر تمہارے بابا کی کمینگی کی وجہ سے تمہیں یہ دن دیکھنا پڑا۔ تجھے اسی طرح اغوا کرنا پڑا جس طرح تمہارے بے غیرت باپ نے میری بہن کو جیتے جی بے غیرتی کی دلدل میں اُتار دیا ہے۔ وہ اگر زندہ بچ بھی گئی تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔ ہر انگلی، ہر نگاہ..... تیر بن کر اُس کا بدن چھیدیں گی۔ جبکہ تم یہاں سے جانے کے بعد بالکل ویسی ہی ہو گی، جیسی یہاں لائے جانے سے پہلے تھیں کیونکہ کسی کو تمہارے بارے میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہو گی۔''

اُس کے منہ سے ایک کلمۂ حیرت تک نہیں نکلا۔ ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اُس کی جانب پشت کر لی اور درشت لہجے میں کہا، ''تمہارا باپ، مربعوں رقبے پر پھیلی ہوئی جاگیر کا مالک، مل مالک، منہ کالا کرتا ہے تو اُسے کوئی نہیں پوچھتا کیونکہ وہ ہر محتسب کے بازوؤں کو آستین سمیت خرید لیتا ہے۔ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے۔ بجائے شکست تسلیم کرنے کے اُس نے اپنے پالتو غنڈے یہاں بھیج کر اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ پروین کو لوٹائے بغیر اپنی بیٹی کو حاصل کر لے گا مگر یہ اُس کی بھول ہے..... تم تب تک یہاں ہو، تب تک عذاب میں ہو جب تک میری بہن اُس کتے کی قید میں ہے۔''

میں اچانک پلٹا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا اُس کے پاس آیا، بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا، ''مجھے تم سے، تمہارے بابا سے، خاندان بھر سے کوئی ہمدردی نہیں۔ میری بہن قدم قدم موت کی طرف دھکیلی جا رہی ہے۔ تم بھی لمحہ لمحہ اذیت ناک اور عزت پاش انجام کی طرف لے

جائی جارہی ہو۔ کیا سمجھیں؟''

مارے تکلیف سے اُس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، گردن اکڑی ہوئی تھی مگر آنکھیں بول رہی تھیں۔ اُس نے اپنے بال چھڑانے کی مطلق کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے غرا کر کہا، ''بولتی کیوں نہیں ہو؟ میں نے مان لیا ہے کہ میں شہریار ہوں..... نور پور والا شہریار..... یہ بھی بتا دیا ہے کہ میں نے تمہیں کیوں اغوا کر کے یہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔''

اُس نے بدقت تمام کہا، ''اب کہنے کے لیے میرے پاس کیا بچا ہے شہرے خان! میرے بال چھوڑ دو، تکلیف ہو رہی ہے۔''

میں نے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا، وہ درد سے کراہی تو میں نے بالوں میں پھنسی ہوئی مٹھی کھول دی۔ وہ اپنے بالوں میں نقاہت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر سر جھکا لیا اور اگلی پیش قدمی کے بارے میں سوچنے لگا۔

ایسے میں اُس کی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''شہرے! کیا میری زندگی تمہاری بہن کی زندگی کے ساتھ مشروط ہو گئی ہے؟''

میں نے کہا، ''ہاں اسما! تمہارا بابا جو فصل بیجے گا، تمہیں کاٹنی پڑے گی۔''

''یعنی مجھے ناکردہ جرم کی سزا دی جائے گی؟'' اُس کے لہجے کی غیر معمولی کاٹ نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ پڑھی لکھی اور بڑے گھر کی لاڈلی بیٹی تھی۔ جونہی میں نے اپنی حیثیت کو تسلیم کیا، وہ پل بھر میں بل کھا کر مستحکم ہو گئی۔ بولی، ''جو کچھ تمہاری بہن کے ساتھ کیا جائے گا، میرے ساتھ بھی کیا جائے گا، یہ طے کر لیا گیا ہے۔ ہے نا؟''

میرے اعصاب تن گئے۔ ہونٹ بھنچ گئے۔ ہم دونوں ایک ہی محاذ پر مقابل آن ٹھہرے تھے۔ وہ مجھے، میں اُسے پسپا کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے کہا، ''ظاہر ہے..... بہن سے بڑھ کر تو کوئی پیارا نہیں ہوتا۔''

''تم پڑھے لکھے ہو شہرے خان! کچھ سوچ کر بولو۔''

''تمہارا بابا بھی پڑھا لکھا ہے۔ وہ سوچے سمجھے بنا قدم اُٹھاتا ہے۔''

''مجھے بابا کا طعنہ نہ دو، میری بات کرو۔''

''تمہارا باپ غنڈہ ہے، بے غیرت ہے۔''

''ٹھیک ہے، ایسا ہی ہو گا۔ تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

دوم

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بولی، ''اُس نے تمہاری بہن کی عزت پامال کرنے کیلئے اپنے اختیارات کو استعمال کیا۔ تم نے اُس کی بیٹی کو قوتِ بازو کے زور پر اُٹھالیا۔ کوئی فرق؟''

''میں نے جواباً ایسا کیا ہے۔ مجھے میری بہن چاہیے۔ جونہی ملی، تمہیں یہاں سے نکالنے میں دیر نہیں کروں گا۔''

''جرم سوالاً ہو یا جواباً، اُس کی حیثیت ایک سی رہتی ہے۔''

''تم کہہ سکتی ہو کیونکہ اس وقت تمہاری اور میری قلبی کیفیت جدا ہے۔''

''ہاں! میں اور تمہاری بہن ایک ترازو میں تل رہی ہیں۔ تم نہیں۔''

مجھے میڈم کا فکر تھا۔ وہ نظر آئے بغیر میری اور اسما کی بات چیت سن رہی تھی۔ میں شکست کا بوجھ کاندھوں پر لاد کر اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اسما دم بدم میرے پیروں تلے سے ریت کھسکائے جا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی، ''شہرے خان! میں جانتی ہوں کہ میرا بابا بظاہر بہت اچھا آدمی ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ ہر وہ جرم دھڑلے سے کرتا ہے جو ہمارے معاشرے کے فیوڈلز کرتے ہیں۔ میں نے کبھی بھی بابا کی ان ایکٹویٹیز کو پسند نہیں کیا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ صدف نے تمہیں ڈاکٹر شاہ جی پر حملے کی پیشگی اطلاع دی تھی۔ یاد ہے نا؟ وہ خبر صدف کو کس نے دی تھی؟ تم نہیں جانتے۔ بتائے دیتی ہوں۔ میں نے ہی صدف کو تم تک یہ اطلاع پہنچانے کے لیے دی تھی۔ تم تک پہنچنے والا رقعہ صدف نے نہیں، میں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور بخت خان آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ وہ رقعہ، جس سے غلط فہمی کی ڈور تھام کر بلو میرے سر پر سوار ہو گئی تھی اور مجھے کھالے کے ہاتھوں زخمی ہو کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس داخل ہونا پڑا تھا۔ تب میں نے سمجھا تھا کہ وہ صدف کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔ اب اسما بیٹھی سمجھا رہی تھی کہ ان لفظوں کے تخلیق کار اُس کے ہاتھ تھے۔

میں نے تشکیک آمیز انداز میں پوچھا، ''کیا یہ سچ ہے؟''

اُس نے قدرے آزردہ لہجے میں کہا، ''اگر یہ سچ نہیں ہے تو پھر سوچو، صدف کو بابا کے منصوبے کی خبر کیسے ہوئی؟''

اس کی بات جھٹلائے جانے کے لائق نہیں تھی۔

میں نے کہا، ''مگر.....''

''اگر مگر کچھ نہیں شہرے خان!'' وہ تھک سی گئی، ''میں رہائی کی بھیک نہیں مانگتی کیونکہ میرے

خون میں میرا خاندانی وقار اور میری اَنا رچی بسی ہے۔ میں صرف اتنی سی درخواست کروں گی کہ جب یہ طے کر لیا گیا ہے کہ مجھے ناکردہ گناہوں کی سزا دی جائے گی تو اتنی رعایت ضرور دی جائے کہ مجھے قتل کر دیا جائے، میری لاش کو کسی ویرانے میں پھینک دیا جائے مگر میری عصمت دری نہ کی جائے۔ مجھے میری نظروں سے گرایا نہ جائے۔ شاید میرا بابا پروین کے ساتھ یہی کچھ کرے گا، مگر چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ ایسا کچھ نہ کیا جائے۔''

اُس کے چہرے پر عجیب سا کرب اپنی تمام تر خنکی سمیت ابھرا تھا۔ مجھے دکھ ہوا، اُس کی درخواست پر ترس آیا مگر میں پروین کے ملنے تک اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

وہ مجھ پر نظریں مرتکز رکھتے ہوئے بولی، ''شہرے! میں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں نے تو خالد سے بھی نفرت نہیں کی۔ یہ جانتے ہوئے کہ میری اور اس کی راہیں متضاد ہیں، کبھی اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ کسی دل کو ویران کرنا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔ مجھے دیوی مان کر میری پوجا کرتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بابا کو جونہی ہماری ملاقاتوں کا علم ہوگا، وہ خالد کو زندہ درگور کر دے گا مگر میں پھر بھی اپنی سرشت پر قابو پانے میں ناکام رہتی ہوں..... کیا میرا کوئی عمل بھی لائقِ تحسین نہیں ہے؟ اگر ہے تو مجھے اُسی کا ثمر دیا جائے اور میری عزت پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔''

میری خاموشی کو اُس نے انکار تصور کیا اور میری جانب کھسک کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ تھکے تھکے لہجے میں بولی، ''کیا میری اتنی سی بات بھی نہیں مانی جا سکتی؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ سوجن زدہ، روئی روئی سی..... نڈھال تاثرات لئے درخواست گزار آنکھیں مجھے بے بس کرنے لگیں۔ میں نے آہستگی سے کہا، ''اسما! مجھے اس وقت دنیا میں سوائے پروین کے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ جا کر اپنی میڈم سے بات کرتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ تمہاری حیدر خان سے فون پر بات ہو جائے اور تم اُسے مجبور کرو کہ وہ پروین کو فوراً رہا کر دے۔ میں تمہاری باتوں کو حق مانتا ہوں، تم بھی میری مجبوری کو ناگزیر مانو۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی، بولی، ''شہرے! تمہیں پروین کی بے بسی دکھائی دیتی ہے، میری نہیں۔ کیا اس سے پہلے تمہارے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوا؟ کیا تمہیں اپنے ماں باپ کا قاتل ملا ہے؟ کیا تمہیں اُس سبب کا پتہ چلا ہے جس نے تمہارے جوان العمر والدین کو نگل لیا؟..... نہیں نا! اگر تمہیں پتہ نہ چلتا کہ پروین کہاں ہے تو تم کیا کر لیتے؟ کیا پوری دنیا کی لڑکیاں یرغمال بنا

لیتے؟.....انصاف کرو، خدا انصاف کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔''

''کیا تم اُسے جانتی ہو؟''

''کسے؟'' وہ چونکی۔

''میرے ماں باپ کے قاتل کو؟''

''نہیں تو.....'' وہ بولی۔

''پھر تم نے یہ کیوں کہا؟''

''میں نے تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے کہا ہے۔''

اُس نے میری دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔ میں جلتے ہوئے روم میں نیرو کی بانسری تھامے زندگی گزارتا آیا تھا۔ آج تک کسی نے یہ طعنہ نہیں دیا تھا۔ اُس نے دیا تو میں بلبلا اُٹھا۔ تڑپ کر، اپنے ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا اور سرد لہجے میں بولا، ''مجھے زندگی نے جو کچھ دیا ہے، وہی لوٹاؤں گا۔''

اس کا ہاتھ کا لمس کندھے پر محسوس ہوا تو پتہ چلا کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ چونکہ مجھے اُس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا، اِس لیے میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کہا، ''اسما! یہ سلطنت میری نہیں ہے۔ یہ میڈم کی ہے۔ میڈم کون ہے؟ میڈم میری محسنہ ہے۔ جس دنیا میں مجھے کسک پر کسک عطاء ہوئی، اُسی دنیا میں اُس کے لب و لہجے کے مرہم اور احسانات نے زندہ رہنے کی تقویت دی۔ وہ جو چاہے گی، میں کروں گا۔ اگر وہ کہے گی کہ میں تمہیں کتوں کے آگے ڈال دوں گا، دیر نہیں کروں گا۔ اگر کہے گی کہ تمہیں پھولوں میں سجا دوں، ایک پل کو بھی نہیں سوچوں گا۔''

اس کی گلوگیر آواز میری سماعت میں پڑی، ''میں میڈم کے نہیں، ایک خانزادے کے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔''

''میں خانزادہ نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو میرے ماں باپ کو یوں بے دردی سے قتل نہ کیا جاتا۔ میری بہن کو بھرے گاؤں سے یوں اُٹھا نہ لیا جاتا۔''

میری بات سن کر وہ بجلی کی سی تیزی سے لپک کر میرے مقابل آ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان تھام کر جھٹکے دینے لگی، وفورِ جذبات سے چیختے ہوئے بولی، ''کیا میں نے یہ سب کچھ کیا ہے؟ سردار حیدر خان نے کیا ہے تو جا کر اُس کی گردن پکڑو.....اس کی عزت وسیب میں

اچھالو۔ اگر تمہیں خاندانی غیرت کا کوئی پاس ہے تو مجھے چھوڑ دو اور اپنے مجرم کو پکڑو۔ پھر کہوں گی کہ شہریار غیرت مند انسان ہے، انصاف پسند ہے..... وگرنہ تم میں، تمہاری میڈم میں اور میرے بابا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کتے ہیں، سب خونی بھیڑیے ہیں جنہیں کھانے کو کچھ نہ ملے تو اپنی ماؤں بہنوں کا ماس کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ آئی ہیٹ یو..... آئی ہیٹ یو.....''

میں نے بدقت اپنا گریبان چھڑایا۔ ایک آدھ بٹن بھی ٹوٹ گیا۔ مجھے اُس کی حالتِ زار پر ترس آیا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ آگے پیچھے ڈول رہی تھی۔ کسی پل بھی زمین بوس ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا تو وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی کمر کے بل فوم پر گر گئی۔ آنکھوں پر بازو رکھ کر رونے لگی۔ ایسے میں اُس کا بدن ہچکیوں کے دم پر اوپر نیچے ہونے لگا۔ مجھے دل ہی دل میں شرمندگی کا احساس ہوا۔ کمرے سے نکلنا چاہا تو انٹر کام کی جلترنگ نے قدم تھام لیے۔ ریسیور کانوں سے لگایا تو میڈم کی شوخ آواز سنائی دی، ''شہریار! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور میری طرف چلے آؤ۔''

میں نے انٹر کام کا چونگا کریڈل پر رکھا اور روتی ہوئی اسما پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ ریٹائرنگ روم میں میڈم کو بیڈ پر آلتی پالتی مارے ٹی وی سکرین کو گھورتے پایا۔ ٹی وی پر سونیا کے کمرے کا پورا منظر روشن تھا۔ اسما بدستور بیڈ پر، آنکھوں پر بازو رکھے روتی نظر آ رہی تھی۔ میڈم نے استہزائیہ انداز میں کہا، ''تم ہار گئے، بُری طرح ہار گئے۔ خانزادوں کے بعد خانزادی بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے تمہیں شکست دینے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ کیا اپنی شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کے لیے کچھ اور وقت چاہیے؟''

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا، ''نہیں میڈم! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔''

وہ ہنسی، ''یہ تو ہونا ہی تھا..... ہو گیا۔ اس کا مؤقف مضبوط تھا، تمہارا کمزور..... تمہاری شکست یقینی تھی۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اجازت حاصل کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی، ''خالد عرف کھالا تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ بقول تمہارے، وہ تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''جی میڈم!''

''میں اُسے 'سی ون' سے یہاں بلوالوں؟''

''آپ بہتر جانتی ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''شہر میں میرے اور استاد ببلو کے آدمیوں کے درمیان خونیں آنکھ مچولی جاری ہے۔ سی تھری پر استاد نے حملہ کیا ہے اور میرے تین آدمی گرادیے ہیں۔ شہر کے حالات بگڑتے دیکھ کر آئی بی اور پولیس متحرک ہوگئی ہے۔ جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے ہیں اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ ایسے میں میں کوئی خطرہ مول لینے پر تیار نہیں ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کھالا یہاں آکر کوئی گڑبڑ پیدا کردے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

میں نے کہا، ''میڈم! مجھے یقین ہے کہ کھالا کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ پھر بھی، آپ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر جانتی ہیں۔ اپنی سوچ سمجھ کے مطابق فیصلہ کریں۔''

وہ مجھے کریدتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی، ''سردار حیدر خان ضد پر ڈٹ گیا ہے۔ وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ سودے بازی پر نہیں آرہا بلکہ اُس نے خونیں محاذ آرائی چھیڑ دی ہے۔ یہ جنگ ہم جیت بھی گئے تو پروین ہمارے ہاتھ نہیں آئے گی۔ کیا اس صورت حال میں خالد کوئی مدد کرسکتا ہے؟''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ کھالا میری کیا مدد کرسکتا تھا؟ اس نے چند دن قبل ہی سردار حیدر خان کے گینگ کو جائن کیا تھا۔ کیا اتنے مختصر سے دورانیے میں وہ کوئی کارآمد معلومات دینے کے قابل ہوگیا تھا۔ شاید نہیں.....

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا، ''میڈم! میرا خیال ہے کہ وہ میری کوئی مدد نہیں کرپائے گا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر موبائل فون کی بیل نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اُس نے کال اٹینڈ کی۔ پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیریں اُبھر آئیں۔ ابھی فون رکھنا ہی چاہتی تھی کہ دوسری کال آگئی۔ وہ دوٹوک اور مختصر الفاظ گفتگو کررہی تھی۔ اوپر تلے آنے والی چار پانچ فون کالز نے اسے متفکر کردیا۔ میں نے اس کی گفتگو سے اندازہ کیا کہ سی تھری کی صورتِ حال مخدوش ہوگئی تھی۔ اُس کا فائٹر گروپ استاد ببلو کے مقابلے میں پسپا ہورہا تھا۔ میرو شاہ ملتان میں نہیں تھا کیونکہ اُس سے فون پر رابطہ نہیں ہوسکا تھا۔ سوائے ملتان اور مظفر گڑھ کے شہروں کے علاقے میں سیلولر سگنلز موصول نہیں ہوتے تھے۔

میں نے میڈم کی سوچوں کے ارتکاز کو چھیڑنا مناسب نہیں جانا اور خاموشی سے اُسے دیکھنے

لگا۔

وہ مجھے مخاطب کئے بغیر بولی، ''پولیس کو جہاں بلایا جاتا ہے، وہاں پہنچتی نہیں ہے اور جہاں اس کی ضرورت نہ ہو، وہاں ٹپک پڑتی ہے۔ شہریار! تم ایسا کرو.....''

موبائل فون کے بزر نے اس کی بات کاٹ دی۔ اُس نے جلدی سے سکرین پر دیکھا اور فوراً کال ریسیو کر لی، ''مجھے آپ کی ہی کال کا انتظار تھا۔''

چونکہ میں کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے موبائل فون کے اسپیکر سے پھوٹنے والی بھنبھناہٹ سے کوئی مفہوم کشید نہیں کر سکتا تھا۔ یہ پتہ چلتا تھا کہ بولنے والا مرد تھا۔ اس کی بات خاصی لمبی تھی جسے میڈم شکیلہ نے انہماک سے سنا۔ اس کے خاموش ہونے پر قدرے سخت لہجے میں بولی، ''میں آپ کی مجبوریوں کو سمجھتی ہوں مگر آپ بقا کے فلسفے کو مدنظر نہیں رکھتے۔ جو باتیں آپ نے مجھے کہی ہیں، یہی آپ سردار حیدر خان سے کہیں۔ اُس نے پہل کی ہے۔ اب بھی اسی نے ہی یکے بعد دیگرے میری دو کوٹھیوں پر حملے کیے ہیں۔ یہ خون اور آگ کا کھیل ہے۔ یہاں جس نے بھی پسپائی اختیار کی، وہ مارا جائے گا۔ میں اگر اپنے آدمیوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیتی ہوں تو وہ سبھی مارے جائیں گے۔''

لمحاتی توقف ایک مرتبہ پھر درپیش ہوا۔ میڈم جب بولی تو اُس کا لہجہ بے حد درشت تھا، ''مجھے ایک ہی وقت میں آئی بی، ایلیٹ اور سردار حیدر کے غنڈوں سے نمٹنا پڑ رہا ہے۔ آپ اپنی فورسز پیچھے ہٹالیں۔ میں دیکھتی ہوں کہ استاد بلوکس کھیت کی مولی کا نام ہے۔''

فون کے اسپیکر سے برآمد ہونے والی آواز سننے کے بعد بولی، ''اگر آپ کو اُوپر سے احکامات موصول ہوئے ہیں تو کیا ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے؟ چند ہی منٹوں میں آپ کو دوسرے احکامات بھی موصول ہو جائیں گے۔ پلیز! چند منٹ انتظار کیجئے۔''

اس کے ساتھ ہی اُس نے کال منقطع کر دی۔ اس کے چہرے پر برہمی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے فون کی میموری میں محفوظ شدہ کسی نمبر پر کال کی۔ فون کانوں سے لگائے بیٹھی رہی۔ جونہی کال ریسیو کی گئی، نہایت مؤدبانہ انداز میں بولی، ''سر! ملتان سے شکیلہ بات کر رہی ہوں۔ ایمرجنسی کی بدولت آپ کو اس وقت ڈسٹرب کر رہی ہوں۔''

اُس کے حد سے بڑھے ہوئے مؤدبانہ انداز نے چغلی کی تھی کہ فون پر اس کا مخاطب کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ اس نے نہایت مختصر اور محتاط الفاظ میں مدعا بیان کیا۔ پتہ چلا کہ چند لمحے پیشتر

موصول ہونے والی کال پولیس کے سینئر سپرنٹنڈنٹ کی تھی۔ اب اس کے کسی بڑے سے اس کی زیادتی کا گلہ کر رہی تھی اور باور کرا رہی تھی کہ سردار حیدر خان نے اُسے اوپر سے سخت کارروائی کرنے کے لیے دباؤ ڈلوایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ انتظامیہ اس معاملے میں دخل نہ دے اور خاموشی سے تماشا دیکھے۔ یہ ممکن نہیں تھا مگر ممکن ہونے والا تھا کیونکہ اُس کے ہاتھ میں 'کچھ لو' اور 'کچھ دو' کی چابی دبی ہوئی تھی جس سے ہر قفل کھل جاتا ہے۔

میڈم پانچ سات منٹ کی طویل گفتگو کے بعد آواز کی لہروں کی بدولت منسلک 'بڑے آدمی' کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اس نے 'تھینک یوسر' کہہ کر فون بند کر دیا۔ بڑبڑائی، ''اب دیکھتی ہوں استاد بلو کی پھرتیوں کو.....''

اس نے جلدی جلدی کئی لوگوں سے رابطہ کیا اور احکامات صادر کیے۔ بظاہر نرم اور خوش دل دکھائی دینے والی میڈم رفتہ رفتہ مجھ پر کھل رہی تھی۔ وہ بہت زیرک اور سفاک عورت تھی۔ اس نے نصف گھنٹے میں ہی ہاتھ سے نکلی ہوئی بازی کی تمام تر ڈوریں اپنی ہتھیلی پر لپیٹ لیں اور حملہ آوروں کو منہ کی کھانا پڑی۔ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا تھا، کیا کیا جا رہا تھا اور کیا کیا جانے والا تھا مگر موبائل فون پر ہونے والی میڈم کی گفتگو سے اندازہ کر رہا تھا کہ جونہی پولیس فورس نے اپنے تیر و ترکش سمیٹے، اُس نے استاد بلو کے گرگوں پر فیصلہ کن وار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اپنی ہدایات کی روشنی میں اُس نے استاد بلو کی یلغار کو اُس کی گردن کی رسی بنا کر پھندے میں جکڑ لیا تھا۔ اپنا بہت سا نقصان کروانے کے بعد استاد بلو نہ صرف پیچھے ہٹ گیا تھا بلکہ کہیں چھپنے پر بھی مجبور ہو گیا تھا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ اپنی بچھائی ہوئی بساط کے مہروں کی اٹھک پٹخ سے فارغ ہوئی تو تھکے تھکے سے انداز میں بولی، ''اب وہ الو کا پٹھا کسی ماں کی گود میں چہرہ چھپائے جان کی امان مانگ رہا ہوگا..... حرامزادہ.....''

میں نے تحسین انگیز نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا، ''آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔''

''تم پر کھلنا چاہتی ہوں، تاکہ تم مجھے سمجھ جاؤ۔''

''مگر میں ہی اتنا خوش بخت کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ پورے دل سے مسکرائی اور اُٹھ کر کمرے کی عقبی دیوار میں نصب بڑے سے کنٹرول پینل کے سامنے جا کھڑی ہوئی، بولی ''تمہارے اس سوال کا جواب وقت آنے پر دوں گی۔ اَب میں

تمہارے دوست خالد کو یہاں طلب کرنے لگی ہوں۔ تم اسما کے کمرے میں جاؤ۔ سونیا کو میرے پاس بھیج دو۔ دس پندرہ منٹوں تک خالد تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ اس کے ساتھ بات چیت کرو۔ تمہارے بقول، اُسے تمہاری بہن پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر نہیں ہے۔ اسے خبر دو، پھر اسما اور خالد کی ہمدردیاں حاصل کرو۔ دیکھو کہ زندگی کتنا بڑا سچ ہے۔ اسے گزارنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خالد کے دل میں جاگزیں عشق کی گرمی کو ماپو۔ دیکھو کہ یہ کتنا بڑا فریب ہے۔''

میں چونکا کیونکہ وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ کھالا اسما کو دیوانوں کی طرح چاہتا ہے، پھر دل نے تقویت دی کہ وہ کبھی بھی عشق کی آبیاری کے لیے دوستی کا خون نہیں کرے گا۔

میڈم مجھے متذبذب دیکھ کر بولی، ''جاؤ..... گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سی ٹو کی طنابیں میرے ہاتھ میں ہیں۔''

میں سونیا کے کمرے میں آ گیا۔ سونیا کو میڈم کے پاس بھیجا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسما آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

میں نے پکارا، ''اسما! کیا جاگ رہی ہو؟''

اُس نے آنکھیں کھول دیں، بولی، ''ہاں..... مگر میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔''

میں نے میڈیکل کٹ میں سے ایک ٹیبلٹ نکال کر اُسے تھمائی۔ پانی اس کے بیڈ کے قریب تپائی پر رکھا تھا۔ اُس نے گولی حلق سے اُتاری، پانی پیا اور بولی، ''کیا بنا؟''

اُس کا اشارہ پروین کی طرف تھا۔ میں نے مایوسی سے سر ہلایا، ''تمہارا باپ اپنی انا کے مقابلے میں تمہیں داؤ پر لگا چکا ہے۔''

''کیا میری واپسی کی راہ کھلی ہوئی ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''کیا مطلب؟''

''مجھے علم نہیں ہے کہ میرے بعد کیا ہوا؟ کیا میں وسیب میں بدنام ہو چکی ہوں؟''

میں نے کہا، ''میں نہیں جانتا کیونکہ میرا رابطہ نور پور سے کٹ چکا ہے۔''

''ہمیشہ کے لیے؟''

''یہ میں نہیں جانتا۔''

''تمہاری پھوپھی زاد، غزالہ، کیا وہ اس آگ کی لپیٹ میں نہیں آئے گی؟''

اس نے عام سے لہجے میں بہت بڑی دھمکی دی تھی۔ میں تڑپ کر اُٹھا، اُس کے سینے کی طرف انگلی تان کر غرایا، ''اس پر اٹھنے والا ہاتھ کاٹ دوں گا۔ اگر سردار حیدر خان نے یہ حرکت کی تو میں اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دوں گا۔''

اس پر میری برہمی کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ طنز سے بھرپور ہنسی اچھال کر بولی، ''کیا وہ پروین سے زیادہ مقدس ہے؟''

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ ایک جملے میں آگ لگا دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ میں دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ میری حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی، ''شہرے خان! تم نے نور پور کو اپنے لیے جہنم کدہ بنا لیا ہے۔ کس کس آگ کو بجھاؤ گے؟''

میں نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا، ''مجھے کسی آگ کی پروا نہیں ہے۔''

''تم اگر چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔'' اُس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں ہنسا، ''تم کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو خانزادی..... یہ آگ اور خون کا کھیل ہے۔ نہ کھیلنے والا بچتا ہے اور نہ ہی کھلانے والا زندہ رہتا ہے۔''

''تو کیا اب میں زندہ ہوں؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی، ''کیا یہاں سے جانے کے بعد میں ویسی ہی رہوں گی جیسے یہاں لائے جانے سے پہلے تھی؟ نہیں شہرے خان! میرے دامن پر دھبے لگ چکے ہیں۔ دھونے میں عمر بیت جائے گی مگر داغ نہیں جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ طلوع ہونے والے آفتاب کے ساتھ ہی مجھے بھی بوجھ سمجھ کر کہیں پستی میں اتار پھینکا جائے۔ کوئی شاہ زور اپنی کمزوری کو سینے سے لگا کر نہیں رکھتا۔ میرا بابا بھی شاہ زور ہے۔ ایک مرتبہ کی پسپائی کے بعد مجھ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانا چاہے گا۔''

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے عقب میں آہٹ ہوئی۔ گھوما تو دروازے میں کھالے کو کھڑے دیکھا۔ اُسے ایک آدمی دروازے پر چھوڑ کر پلٹ رہا تھا۔ کھالے نے جونہی مجھے دیکھا، آنکھیں حیرت سے پھٹنے کی حد تک پھیل گئیں۔ لکنت زدہ لہجے میں بولا، ''شش..... شہرے..... تت..... تم؟ اِہ میں کیا ڈیدھا کھڑاں مولا؟''

(مولا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں)

میں نے قدم بڑھایا۔ اُسے والہانہ انداز میں بانہوں میں بھرتے ہوئے فرطِ مسرت سے

چیخ کر کہا، ''تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو، میں شہر یار ہوں..... تمہارا یار..... تم مجھے چھوڑ کر کہاں غائب ہوئے تھے؟''

ہم دونوں کا معانقہ طویل ہو گیا۔ یہ ملاقات بڑی یادگار تھی۔ علیحدہ ہوئے تو اس کی نظر اسما پر پڑی۔ صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے ناگاہ ٹھٹک کر رُک گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسما کو گھورنے لگا، پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا، ''شہرے! یہ تو بی بی جی ہیں..... اوہ میرے خدا! آج کیسا دن چڑھا ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں..... بی بی جی! السلام علیکم!''

اسے سلام کا جواب نہ ملا۔ اسے قلق نہیں ہوا بلکہ جذبات سے لرزتا ہوا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر صوفے تک آیا۔ ہم دونوں جڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ بولا، ''شہرے! تم یہاں کیسے آئے؟''

وہ مجھے اور اسما کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر اپنی حیثیت اور یہاں موجودگی کے جملہ اسباب کو بھول گیا تھا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا، ''مجھے یقین تھا کہ میں بی بی جی تک ضرور پہنچ جاؤں گا اور اسے آزاد کروالوں گا۔ مجھے بتاؤ، کس نے بی بی جی کو ہاتھ لگایا ہے، کس نے اسے یہاں قید کر رکھا ہے؟''

ایسے میں اسما کی آواز کمرے میں گونجی، ''کیا کرلو گے اُس کا؟''

وہ چونکا، اسما کی طرف دیکھ کر ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور دانت پیس کر بولا، ''اُس حرامزادے کی گردن مروڑ دوں گا جس نے آپ کو میلی نظر سے دیکھا ہے؟''

اسما معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی، ''تم یہاں تک کیسے پہنچے ہو؟''

کھالا اپنی عادت کے مطابق گریبان کے بٹن کھول کر کالر پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا، ''میں غفار خان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ مجھے اُس نے بتایا تھا کہ یہاں میری 'بی بی جی' کو قید کیا گیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اُس کا سو والٹ کے بلب کی طرح روشن چہرہ بجھ گیا۔ پرجوش زبان کو گرہ لگ گئی۔ رُک کر استعجاب بھری نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اسما کو دیکھنے لگا۔ وہ بہت چالاک تھا۔ زود فہم تھا۔ فوراً اپنی اور میری حیثیت بھانپ گیا تھا۔ ٹھہری ٹھہری آواز میں بولا، ''کیا تم نے بی بی جی کو اغوا کر رکھا ہے؟''

اُس کی مخصوص انداز میں اُٹھی ہوئی انگلی کا نشانہ میں تھا۔

میں نے آہستگی سے سر ہلایا اور کہا، ''ہاں کھالے! بی بی میڈم کی تحویل میں ہے۔''

''کون میڈم! اُس کی تو ایسی کی.....'' وہ بپھر گیا۔

میں نے کہا، ''میری میڈم.....اس جگہ کی مالکن جہاں اِس وقت ہم تینوں بیٹھے ہیں۔''

''تو کیا میں بھی اُس کی قید میں ہوں؟''

میرا جواب اثبات میں تھا، ''ہاں! اگر میری نظر تم پر نہ پڑی ہوتی تو اِس وقت تک تمہیں گولی چاٹ چکی ہوتی۔''

وہ ہونقوں کی طرح عجیب اُلجھے اُلجھے انداز سے مجھے اور اسما کو باری باری گھورنے لگا۔

اسما جھٹ سے بولی، ''تو تمہیں ابھی تک اتنی سی بات کا پتہ بھی نہیں چلا، بہت بے وقوف آدمی ہو۔''

کھالے نے ایک نظر اسما کو دیکھا، پھر مجھ پر انگلی اُٹھا کر بولا، ''تم لوگوں نے یہ ذلیل حرکت کیوں کی؟''

اس کا لہجہ بہت درشت تھا۔ میں نے کہا، ''بیٹھ کر، تمیز سے بات کرو کھالے..... میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔''

وہ دانت پیس کر بولا، ''تمہیں علم ہے کہ بی بی جی مجھے کتنی پیاری ہے، پھر تم نے یہ حرکت کیوں کی؟''

میں بچپن سے کھالے کو دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ مجھے اُس کی ہر ادا کا علم تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی مخصوص چمک دیکھ کر فی الفور اندازہ کر لیا کہ عشق نے دوستی کو اپنے سرخ پنجے میں جکڑ لیا تھا۔ اس نے دوست اور محبوبہ میں سے محبوبہ کا انتخاب کر لیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا، ''کھالے! ہوش کے ناخن لو۔ ادھر آؤ، بیٹھ کر میری بات سنو۔''

اس نے میری بات پر دھیان نہیں دیا بلکہ اسما کی طرف مڑا، ''بی بی جی! سیدھی سیدھی طرح بتا میں، کیا شہرے نے یہ حرکت کی ہے؟''

وہ بولی، ''تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے، یہی سچ ہے۔ جو کچھ تمہارا یار تمہیں اپنے پاس بٹھا کر سمجھانا چاہتا ہے، وہ جھوٹ ہے۔''

کھالے کے آگ بگولہ ہونے کے لیے اسما کا یہی جملہ کافی تھا۔ حسبِ عادت سب کچھ بھول کر، کالر پیچھے کی طرف ڈال کر، سرخ آنکھیں لیے میری جانب بڑھا اور بولا، ''شہرے! ہٹ، اسے ابھی چھوڑو..... اسے گھر پہنچاؤ ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا، ''یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر تم میری کوئی بات سننے کے

لیے تیار نہیں ہو تو اِس بات کو یہیں ٹھپ دو۔''

وہ بُری طرح سیخ پا ہو چکا تھا۔ میں چونکہ اس کی رگ رگ پہچانتا تھا، اِس لیے اس کے برق رفتار تھپڑ سے پہلو کے بل سرک کر بچ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھا اور صوفے سے ٹکرا کر قالین پر جا گرا۔

میں اچھل کر چند قدم دور ہو گیا۔ چیخ کر کہا، ''کھالے! عقل کے ناخن لو، میری بات سن لو، پھر جی میں جو آئے، کرنا۔''

اس نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی تھی اور نہ ہی مجھ پر حملہ آور ہونے میں تاخیر کی تھی۔ وہ ایک پیر پر گھوما اور اس کا پوری قوت سے گھوم کر آتا ہوا پاؤں میرے بائیں بازو پر پڑا۔ میں لڑکھڑا کر دیوار تک لڑھک گیا۔ اگر دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو زمین بوس ہو چکا ہوتا۔ جونہی پلٹا، اُس کا مکا پوری قوت سے میری پیشانی پر پڑا۔ میری نظروں کے سامنے سورج آن چمکا اور پورا کمرہ گھومتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے اُسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر اُس نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر چند ہی لمحوں میں مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میں قالین پر دیوار کی جڑ میں آڑا ترچھا لیٹا 'کھالا، کھالا' کرتا رہ گیا۔ اس کے طوفانی مکے نے میرے بدن کے تمام اعصاب شل کر دیے تھے۔

وہ میرے سینے پر اپنا پاؤں رکھ کر غرایا، ''تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ کھالا اپنی بی بی جی کے لئے جان بھی قربان کر سکتا ہے۔ ہاں! کھالا تیرے جیسے یار مار کی جان لے بھی سکتا ہے؟''

کوشش کے باوجود میرے منہ سے کوئی کلمہ برآمد نہیں ہوا۔ اسی لمحے اسما کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے، تالی بجاتے ہوئے فاتحانہ انداز میں بولی، ''شہرے! اب تم بھی اسی انداز میں زندگی کی بھیک مانگو جس طرح کچھ دیر پہلے میں نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔''

وہ آگ لگا رہی تھی۔ کھالا دم بدم شعلے کی طرح بھڑک رہا تھا۔ میری چھاتی پر سے پاؤں ہٹائے بغیر پلٹا اور بولا، ''کیا کہا بی بی جی؟ اس نے آپ پر ہاتھ بھی اُٹھایا ہے؟''

اس نے اپنے سر کو اوپر نیچے حرکت دی۔ لبوں سے کچھ نہ کہا۔ کھالا جھکا اور میرے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے چیخا، ''تم نے مجھ پر ظلم کیا ہے خانزادے! تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس نے مجھے کالر سے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ سوچیں گڈمڈ ہونے لگیں مگر یہ احساس پوری توانائی سے بیدار ہو گیا کہ کھالا اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ جو کہہ رہا تھا، کر گزر سکتا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور پوری قوت سے مکا اُس کے منہ پر دے مارا۔ میرے ہاتھ کو کرنٹ سا لگا۔ ہاتھ غلط پڑ گیا تھا۔ کھالا مجھے چھوڑ کر ڈگمگاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا۔ جب اس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا، تب مجھے پتہ چلا کہ میرا وار بڑا کارگر ثابت ہوا تھا۔ اس کے منہ پر رکھے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں کے بیچ میں سے خون جھلکنے لگا تھا۔ اس نے آگ برساتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں سانڈ کی طرح مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔

میں اس کے غصے کی تاب دیکھ چکا تھا۔ اس پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ جونہی وہ قریب آیا، میں جھکائی دے کر ایک طرف نکل گیا۔ وہ اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے اپنے ہاتھ بروقت بڑھا لیے تھے ورنہ اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر پھٹ جاتا۔ اُس کے پلٹتے ہی میں نے پیچھے سے کک رسید کی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور دیوار کی جڑ میں بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت میرا دوست نہیں تھا، اسما کا عاشق تھا جو اُس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا اس لیے اُسے زیر کرنا ضروری تھا۔ میں نے پاؤں جوڑ کر چھلانگ لگائی اور دونوں پیروں کی زوردار ضرب اُس کے کاندھوں پر لگائی۔ وہ 'اوغ' کی آواز حلق سے نکال کر ایک طرف گر گیا جبکہ میں پشت کے بل قالین پر گر کر فوراً مستعدی سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا مگر جونہی میں نے اُسے ٹھوکر مارنے کی کوشش کی، اُس نے میرا پیر پکڑ کر مروڑ ڈالا۔ میں سانپ کی طرح بل کھا کر قالین پر جا گرا۔ ٹخنے میں ٹیس جاگی مگر یہ وقت درد کی پروا کا نہیں تھا۔ میں نے فوراً کروٹ بدلی اور دوسرے پاؤں کی نپی تلی ضرب اُس کی کنپٹی پر لگائی۔ اس کے ہاتھ سے میرا پاؤں چھوٹ گیا اور میں سینے کے بل پھر زمین پر گر گیا مگر اچھل کر کھڑا ہونے میں ایک لمحہ لگایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اکڑوں بیٹھا دکھائی دیا۔ میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر کمرے کے وسط میں گھسیٹ لیا اور پٹخ دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔

وہ رعایت کے لائق نہیں تھا کیونکہ موقع ملتے ہی اس نے میرا ستیاناس کر دینا تھا۔ میں اسے فٹ بال کھیلنے کے سے انداز میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں اچانک وہ سپرنگ کی طرح اچھلا اور میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ کی پشت سے خون میں لتھڑا ہوا چہرا صاف کرتے ہوئے غرایا، ''خانزادے! میں تمہیں زندہ نہیں

چھوڑوں گا۔''

میں نے جواب دینے کی بجائے اچھل کر زوردار فلائنگ کک اس کے سینے پر رسید کی۔ میں کمر کے بل گرا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اسما پر گرے دیکھا تو لمحہ بھر کی مہلت ضائع کیے بغیر اس کی جانب بڑھا۔ اس نے میرے جارحانہ طور سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دونوں پیر اُٹھا کر بیچ میں حائل کر دیے۔ جونہی میری چھاتی اس کے دونوں پیروں پر ایک لمحے کو ٹکی، اس نے پوری قوت سے مجھے اچھال دیا۔ 'دھپ' کی زوردار آواز کے ساتھ میں کمر کے بل قالین پر جا گرا۔ میں نے اُٹھنے میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا مگر وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ مجھ پر آن گرا۔ اس کے گھٹنے میرے پیٹ میں آن لگے۔ درد کی ایک لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ میں نے اسے خود سے اتار پھینکنے میں پوری توانائی صرف کر دی مگر کامیاب نہیں ہو پایا۔ اس نے اپنی کہنی کی ضرب میرے سر پر ماری جس نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ایک پل میں سلب کر لیں۔

پھر اس نے بغیر تعطل کے مجھے کہنی کی ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ ہر چوٹ پر ذہن بری طرح جھنجھنا اُٹھتا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ خطرناک چوٹیں میری موت کا سبب بن سکتی تھیں۔ میں نے اپنی تمام تر طاقت مجتمع کر کے اس کے پہلو میں گھونسا مارا، پھر دوسرا، پھر میرے دونوں ہاتھ مشینی انداز میں حرکت کرنے لگے۔ کوئی ایک چوٹ کارگر رہی اور وہ 'ہائے' کی دردناک آواز نکال کر پہلو کے بل الٹ گیا اور بے آب ماہی کی طرح تڑپنے لگا۔

اس نے اپنا ہاتھ پشت کی جانب پہلو پر سختی سے جما رکھا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے مکے کا شر اس کے گردے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کھالا مہلت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، میں فوری طور پر بدقت کھڑا ہوا مگر لڑکھڑا کر نشست کے بل قالین پر گر گیا۔ پھر اُٹھا اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ کم بخت کی کہنی کی ضربوں نے میرے حواس مختل کر دیے تھے۔ کوئی شئے نظروں میں ٹھہرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ اسما پر پڑی۔ وہ دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

کھالا دونوں ہتھیلیاں قالین پر ٹکا کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا جب میں نے پوری قوت سے لات اس کی پسلیوں کے نیچے پہلو میں ماری۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی دردناک تھی۔ میری اگلی ٹھوکر کا نشانہ بھی وہی جگہ تھی۔ وہ لڑھکتا ہوا صوفے سے جا ٹکا اور سر

جھٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ ابھی اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر زوردار تھپڑ جبڑے پر رسید کیا۔ اس نے منہ پھیرا۔ ادھر میرا الٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کا منتظر تھا۔ اوپر تلے لگنے والے سات آٹھ تھپڑوں نے کھالے کی مت ماردی۔ میرے دونوں ہاتھ دکھنے لگے تو میں نے اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے بیچ پاؤں کی زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کر اُچھلا اور تڑپ کر صوفے پر گر گیا۔ اس کا جسم تیزی سے جھٹکے لینے لگا۔ وہ بڑی قابلِ ترس حالت میں اپنے دونوں ہاتھ ٹانگوں میں دبائے اوندھے منہ پڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔

میں نے اچھل کر زوردار کہنی اُس کی کمر کے درمیان، عین ریڑھ کی ہڈی پر ماری۔ وہ سیدھا ہوا پھر کمر کے بل صوفے پر گر کر چت لیٹ گیا۔ میری کہنی کا اگلا وار اس کی پسلیوں کے نیچے پیٹ کے بالائی حصے پر لگا۔ اس نے ایک جھٹکا لیا اور 'ہاہ' کی لمبی آواز نکال کر ساکت ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ پیر نہیں روکے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے، تو دانت پیس کر کھڑا ہو گیا اور پیچھے ہٹتا ہوا دیوار تک الٹے قدموں چلا گیا۔ دیوار سے پشت ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

کھالا لوہار میرے ہاتھوں پٹ کر چت پڑا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُس سانڈ کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور خون چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری فاتح نظریں اس کے بے حس و حرکت وجود پر سے پھسل کر سامنے والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی اسما کی طرف اُٹھیں۔ اس کا چہرہ خوف سے سپید ہو گیا تھا۔ میری نظروں کی غضب ناکی کو دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور بے جان انداز میں دیوار کی جڑ میں ڈھے گئی۔

میں اُس کی طرف بڑھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ کھالے کی آہنی چوٹوں نے میرے بھی کس بل نکال کر رکھ دیے تھے۔ کم بخت کا جسم اور اعصاب فولادی تھے۔ اگر مجھے اپنی بقا خطرے میں پڑی محسوس نہ ہوتی تو شاید اس پر قابو نہ پا سکتا اور اس کی بجائے زمین پر پڑا اپنا خون چاٹ رہا ہوتا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو اچھی طرح جکڑا اور دائیں بائیں جھٹکے دیے مگر صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ مجبوراً مجھے میڈیکل کٹ سے دو پین کلر گولیاں نکال کر حلق سے اتارنا پڑیں۔ کئی منٹوں تک صوفے پر بیٹھا رہا جبکہ کھالا بدستور قالین پر بے ہوش اور اسما دیوار کے ساتھ ساکت و جامد پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں آدھی کھلی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ پلکیں

جھپک کر سدھ مندی ظاہر کر رہی تھیں مگر اس کا بدن بے جان انداز میں قالین پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ وہ اس وقت شدید ترین فرسٹریشن کی زد میں تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کھالا کسی وقت بھی ہوش میں آ کر مجھ پر حملہ آور ہو سکتا تھا، اسے باندھنا ضروری تھا۔ اردگرد نظر دوڑائی۔ الماری کھنگالی مگر رسی نہ ملی۔ اسما کے گلے میں ہلکے نارنجی رنگ کا دوپٹہ دکھائی دیا۔ میں نے دوپٹہ کھینچ لیا۔ تب بھی اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ مزاحمت کے لیے دم خم نہیں رہا تھا۔

کھالے کو الٹایا اور اس کی دونوں کلائیاں جوڑ کر پشت پر دوپٹے سے کس کر باندھ دیں۔ اس کی ٹانگیں باندھنے کے لیے کچھ نہ ملا تو میں نے میڈیکل کٹ میں پڑی ہوئی کریپ بینڈیج کا منی رول کھول لیا۔ اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد میں نے کھالے کو سیدھا کیا اور اس کا خون سے لتھڑا ہوا چہرہ گیلی روئی کی مدد سے صاف کیا۔ اس کی فرسٹ ایڈ سے فارغ ہو کر اسما کے عین سامنے قالین پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔

وہ آنکھیں جھپک کر مجھے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں گھورنے لگی۔ میں نے کہا، ''کیا تم ہوش میں ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اپنے عاشق کا انجام دیکھ لیا تم نے؟'' میرے لہجے میں از حد تلخی رچی ہوئی تھی۔

وہ آہستگی سے بولی، ''وہ ہار کر دل کو اچھا لگا، تم جیت کر پہلے سے بھی برے لگنے لگے ہو۔''

میرے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ تیر گئی۔ کھالے کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ عشق کی بارگاہ میں سرخرو ہو چکا تھا۔

میں نے کہا، ''تم دونوں احمق ہو۔ اگر میں مر بھی جاؤں تب بھی تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ عجیب فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا بازو ہوا میں بلند کیا، چھوڑ دیا۔ اُس نے اپنا بازو سنبھال لیا اور گرنے نہیں دیا۔ بولی، ''میں ٹھیک ہوں۔''

میں اس کی طرف سے بے فکر ہو کر اٹیچڈ باتھ سے پانی کا مگ بھر لایا۔ کھالے کے منہ پر چھینٹے مارے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہوش میں آ گیا اور بھینس کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ جونہی اُس کا ذہن پوری طرح بیدار ہوا، اس نے ایک جھٹکے سے اُٹھنا چاہا مگر اُٹھ نہ پایا۔ ایسے ہی وقت میں اسے اپنے بندھے جانے کا احساس ہوا۔ اس نے فطری انداز میں ہاتھ

پاؤں چلائے مگر ناکام ہو کر ہانپنے لگا۔ کراہ کر بولا، ''تم نے مجھے مارا، باندھ دیا..... تم اتنے طاقتور ہو گئے ہو شہرے خان؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور طنزیہ لہجے میں کہا، ''تم آج تک یار بن کر زور آزمائی کرتے رہتے تھے۔ میں ہار جاتا تھا۔ آج مجھ پر میرے یار کھالے نے نہیں، خانزادی کے بے وقوف عاشق نے ہاتھ اُٹھایا تھا، اسے اوقات دکھانی ضروری تھی۔''

اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ بولا، ''پانی..... میرا حلق سوکھ رہا ہے۔''

میں نے تپائی پر پڑی ہوئی بوتل سے پانی بھرا اور گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ پانی حلق سے اُترا تو حلق سے کراہ برآمد ہوئی۔ بولا، ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے مجھے مار مار کر بے ہوش کر دیا ہے۔''

میں نے بیزاری سے کہا، ''یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کیا اَب تم میری بات سنو گے؟''

اس کے لبوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ ابھر آئی، بولا، ''اب تمہاری بکواس سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا، ''کھالے! تو میرا یار ہے۔ تجھ سے پیارا کوئی نہیں، میری نظر میں..... مگر تم نے یہ تو سنا ہی نہیں کہ مجھے کون سا گھاؤ لگا ہے؟'' میں نے اسما کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور بات جاری رکھی، ''اسما کو میں نے نہیں، میری میڈم نے قید کر رکھا ہے۔ بڑی مشکل سے اسما کو بچانے اور تم سے ملنے کی مہلت میڈم سے ملی ہے مجھے وگرنہ وہ ان جھمیلوں میں پڑنے والی نہیں ہے۔ وہ گولیوں سے راستہ بناتی ہے اور سینہ تان کر دشمن کا گریبان پکڑتی ہے۔''

وہ بولا، ''میں نے تمہاری میڈم کو دیکھا نہیں ہے مگر اُس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ اپنی بات کرو۔''

میں نے گھٹنے کا زور اس کی چھاتی پر بڑھایا، کہا، ''انسانوں کی طرح میری بات سنو.....''

میری زبان ٹیپ پلیئر کی طرح چل پڑی۔ وہ آنکھیں موندے، بے تاثر چہرہ لیے میری کہانی سنتا رہا۔ میں نے اسما کی موجودگی کی وجہ سے سائیں دل جیت شاہ والا قصہ سرے سے گول کر دیا تھا۔ جونہی میں اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا، اس نے آنکھیں کھول دیں اور بولا، ''تمہیں کس نے کہا ہے کہ پروین کو سردار حیدر خان نے اغوا کرایا ہے؟''

میں نے کہا، ''میڈم نے۔''

اس نے ایک استہزائیہ مسکراہٹ میری طرف اچھالی، بولا، ''بھولے خان زادے! کیا تمہاری میڈم کو الہام ہوا تھا؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے پروین پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت پر کوئی دکھ نہیں ہوا تھا۔ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا، ''تمہیں میری بہن کا کوئی دکھ نہیں ہے؟''

وہ جلدی سے بولا، ''مجھے چند دن پہلے خبر ملی تھی۔ میں اس دکھ کو جھیل چکا ہوں۔ وہ نہیں، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری بلو (خالدہ) یا پھوری (غفوراں) نے یہ قیامت جھیلی ہے۔ مگر میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں کہ کسی پَرلے (غیر متعلق) آدمی کے کہنے پر سردار حیدر خان کو اپنا مجرم مان لوں۔''

''مجھے یقین ہے کہ یہ کام حیدر خان نے ہی کیا ہے۔'' میرے لہجے کا یقین کامل تھا۔

''کوئی ثبوت؟''

میں اس پر اسما کی موجودگی میں سائیں دل جیت سے نبرد آزمائی کا خونریز مرحلہ آشکار نہیں کر سکتا تھا۔ کہا، ''میرے پاس ثبوت ہے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ ایسے ہی وقت میں اسما کی آواز کمرے میں اُبھری، ''شہرے خان کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے مگر میں مان لیتی ہوں کہ پروین میرے بابا کے پاس ہی ہے۔ مگر کھالے! تم اپنے دوست سے میرا قصور پوچھو..... ان لوگوں نے مجھے کیوں یہاں قید کر رکھا ہے؟''

میں نے جھٹ سے کہا، ''تم جانتی ہو۔ کھالا بھی نادان نہیں ہے۔''

کھالا ادھ کھلی آنکھوں سے ایک ٹک مجھے دیکھے گیا۔ عجیب بے تاثر، پژمردہ اور مضمحل آنکھیں..... کافی دیر تک ہم تینوں میں سے کوئی نہ بولا۔ یوں کہ جیسے ہمارے پاس کہنے کو کچھ رہا ہی نہ ہو۔ کھالے نے اس سکوت کو توڑا، نقاہت آمیز لہجے میں گویا ہوا، ''میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟..... بی بی جی پر جان قربان کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ پروین میری بھین (بہن) ہے۔ اس کی چنی (دوپٹہ) پر لگے ہوئے دھبے کو اپنی شاہ رگ کے خون سے دھونا فرض سمجھتا ہوں۔ مگر کیا کروں؟... شہرے! تم ہی بتاؤ.....''

مجھ سے پہلے اسما بول پڑی، ''کھالے! شہرے کی بہن کو بابا کی تحویل سے نکالو، میری فکر نہ کرو۔ میں شہرے کے پاس ہوں اور جانتی ہوں کہ شہرا بے غیرت نہیں ہے۔ اس کی رگوں میں

سوہنے خان کا غیرت مند خون دوڑ رہا ہے۔ یہ مجھے قتل تو کر سکتا ہے مگر میری عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا اور نہ کسی کو میرے قریب پھٹکنے دے گا، مجھے یقین ہے۔ پروین کی جان اور عزت دونوں خطرے میں ہیں.....''

میں نے ٹھٹک کر اسما کو دیکھا۔ کہیں اُس کا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تھا؟.....وہ عجیب لڑکی تھی۔ میرے ہاتھوں پٹ کر، اپنے عاشق کی درگت بنوا کر سچ بول رہی تھی۔ پھر اپنا مدعا بیان کر کے گھٹنوں میں سر ڈال کر رونے لگی تھی۔ مجھے اس پر اس گھڑی ٹوٹ کر پیار آیا، ترس بھی اور جی چاہا کہ اُسے اسی وقت آزاد کر دوں مگر یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔

کھالا بولا، ''یار! میرے ہاتھ پیر تو کھول دو.....''

میں نے تشکیک آمیز لہجے میں کہا، ''تم بڑے کمینے انسان ہو، ہاتھ پیر آزاد ہوتے ہی مجھ پر کتے کی طرح جھپٹ پڑو گے۔''

اس نے کہا، ''مجھے بی بی جی کی قسم..... جو کہو گے، وہی کروں گا۔ ویسے بھی اَب تمہیں لڑنا بھڑنا آ گیا ہے۔ ڈرو نہیں۔''

اس کے ملتجیانہ انداز نے مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا اور میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول دیے۔ وہ دونوں ہتھیلیوں کے بل بدقت تمام اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسما کا دوپٹہ ایک کلائی سے بندھا رہ گیا تھا۔ میں نے کھولنا چاہا تو اس نے کراہتے ہوئے پوچھا، ''یہ بی بی جی کا دوپٹہ ہے؟''

میں نے نہ سمجھتے ہوئے کہا، ''ہاں!''

وہ بولا، ''تو پھر نہ کھولو یار..... کچھ دیر تو مجھے اس چنی (دوپٹے) سے بندھا رہنے دو۔''

میں نے مسکرا کر ایک نظر اسما کی طرف دیکھا جو ہماری گفتگو سے بے نیاز گھٹنوں میں سر ڈالے سسک رہی تھی۔ میں نے کھالے کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اسے قدم قدم چلاتے ہوئے صوفے تک لے گیا۔ اس نے پوچھا، ''کیا وقت ہو گا؟''

میں نے کہا، ''علم نہیں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، سورج نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ اندازہ تک نہیں کہ اس وقت رات ہے یا دن.....''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، لجائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، ''یار شہرے! مجھے معاف کر دے.....اصل میں نے جب بی بی جی کو دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے پوری دنیا میری دشمن ہے اور.....''

میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا، کہا، ''میں جانا ہوں۔

کن اکھیوں سے اسما کو دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ رہی تھی۔ ہماری باتیں سن رہی تھی۔ کھالے کی بات سن کر اس کے چہرے پر فخر کا رنگ جگمگایا۔ کھالے نے کہا، ''کیا تم مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ مجھ پر کیا بیتی؟''

میں نے چونک کر کہا، ''کیوں نہیں..... بتاؤ ناں!''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ ایسے ہی وقت میں انٹر کام کا بزر بجا۔ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ریسیور اُٹھایا۔ حسبِ توقع میڈم کی دل فریب آواز پردۂ سماعت پر اُتری، ''ویری گڈ..... اَب دونوں کو اپنے دل کی باتیں کرنے دو اور تم میرے پاس چلے آؤ۔''

میں کھالے کی آپ بیتی سننا چاہتا تھا مگر میڈم کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ کھالے اور اسما سے معذرت کر کے میڈم کے پاس پہنچا۔ وہ بیڈ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی جبکہ سونیا آپریشنل پینل کے سامنے، میری طرف پشت کیے کھڑی تھی۔

میڈم نے تالی بجائی، خوش ہو کر بولی، ''آئی لو یو سہریار..... تم نرے خوب صورت ہی نہیں ہو، دلیر اور طاقت ور بھی ہو۔''

میرا سینہ پھیل گیا۔

سونیا بولی، ''میڈم! میں جاؤں؟''

''ہاں! جاؤ مگر مین آپریشن روم میں مداخلت کیے بغیر دونوں قیدیوں کی مانیٹرنگ کرو۔ ان کی گفتگو سنو۔ کوئی کارآمد بات ہو تو نوٹ کر لینا۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش میں تم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔''

میں نے جلدی سے پوچھا، ''تو کیا وہ یہاں سے نکل سکتے ہیں؟''

سونیا نے کہا، ''وہ تو رہے ایک طرف، تم بھی میڈم کی اجازت کے بغیر 'سی ٹو' سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔''

اس کے جانے کے بعد میڈم نے ستائشی نظروں سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ اپنی کلائی میری جانب بڑھا کر کہا، ''پکڑو.....''

میں نے جھجکتے ہوئے کلائی تھامی۔ وہ بولی، ''زور سے.....''

میں نے اپنی انگلیوں کا دباؤ بڑھایا۔ نرم سی کلائی میں انگلیاں پیوست ہو گئیں۔ وہ بولی،

''اور زور سے..... پوری طاقت سے پکڑو۔''

میں نے اپنی پوری قوت صرف کی۔ ایک بار اپنی جان سے پیاری غزالہ کی کلائی تھامی تھی۔ زور لگانے پر بلبلا اُٹھی تھی۔ شانو کا بازو تھاما تھا، وہ روپڑی تھی۔ میڈم شکیلہ کے چہرے پر بجائے تکلیف کے، عجیب ستائش انگیز اثرات ثبت دیکھ کر حیران ہوا۔

وہ بولی، ''میرا اندازہ تھا کہ تم خالد کے ہاتھوں بُری طرح پٹ جاؤ گے۔ وہ دیکھنے میں تم سے زیادہ جسیم اور قوی نظر آتا ہے، مگر تم نے کمال کر دیا۔ میں بہت خوش ہوئی ہوں تمہارا فائٹنگ سپرٹ دیکھ کر۔''

''تھینک یو میڈم! میں ناکام ہونا نہیں چاہتا تھا۔''

''کھالا اسما سے بہت محبت کرتا ہے۔ ہے ناں؟'' اس نے 'کھالا' لفظ پر خصوصاً زور دیتے ہوئے کہا، ''اسے طیش میں یاد تک نہیں رہا کہ یہاں پر اس کی اپنی حیثیت ایک قیدی کی سی ہے۔''

میں نے کہا، ''جی میڈم! آپ کا کہنا بجا تھا کہ عشق کے سامنے کوئی اور جذبہ سر نہیں اٹھا سکتا۔''

وہ دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی، ''تمہارے گاؤں، نور پور کی تفصیلی رپورٹ موصول ہوگئی ہے۔ تم بڑے لکی ہو۔ تمہاری لگائی ہوئی آگ جہنم کی آگ ثابت ہوئی اور اس نے دل جیت کی ہڈیاں تک جلا کر بھسم کر ڈالی ہیں۔ سبھی کے نزدیک سائیں دل جیت دنیا والوں سے اوجھل ہو کر کوئی چلہ کاٹ رہا ہے۔ جلد یا بدیر نئی روحانی طاقتوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا۔''

میں نے حیرت سے پوچھا، ''کیا اس کے گھر والوں کا بھی یہی خیال ہے؟''

اس نے مزہ لیا، ''ہاں تو..... یہ بات گھر سے ہی تو نکلی ہے۔''

''پروین کے بارے میں کیا چہ مگوئیاں ہیں؟''

''گاؤں والے متفق ہیں کہ امیر نواز اُسے بھگا کر لے گیا ہے اور اب تک اس نے پروین کے ساتھ عدالتی شادی رچا لی ہوگی۔''

یہ فکرمندی کی بات تھی کہ امیر نواز ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ نور پور میں پھیلی ہوئی اس افواہ میں بھرپور صداقت ہو اور میری ٹامک ٹوئیاں رائیگاں جانے والی ہوں۔ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میڈم بولی، ''یہ درست ہے کہ تمہاری بہن کے اغوا میں امیر نواز کا کوئی کردار نہیں ہے مگر اس کا تعلق اِس واردات سے ضرور ہے۔ کیا؟ یہ وقت آنے پر

ہی عیاں ہوگا۔''

میں نے سوچ کر کہا،'' کہیں ایسا تو نہیں کہ امیر نواز کو اس ٹھکانے کا پتہ ہو جہاں پروین کو رکھا گیا ہو، وہ اُسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا ہو اور اسے بھی روک لیا گیا ہو؟''

وہ بولی،'' ایسا ہو تو سکتا ہے مگر اس اندازے کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

''اور میرے گھر والوں کا کیا حال ہے؟''

''وہ ٹھیک ہیں مگر پریشان ہیں کہ شہریار کہاں گیا؟'' وہ عام سے لہجے میں بولی،'' البتہ سردار حیدر خان کی لڑکی کے اغوا کی خبر پورے وسیب میں پھیل چکی ہے۔ تمہارے گاؤں کے بھی بڑے سردار حیدر خان کی کوٹھی پر پہنچ چکے ہیں، اپنے باس کا دکھ بانٹنے کے لیے۔'' بات کرتے ہوئے پل بھر کو ٹھہری، اکتائے اکتائے سے انداز میں بولی،'' اچھا..... چھوڑو ان باتوں کو..... ادھر آؤ، پینل پر وہ بٹن پش کرو جس پر اسپیکر کا مونو بنا ہوا ہے۔ سنوں تو سہی، دونوں عاشق کیسی مایوس رومانوی گفتگو کرتے ہیں۔''

اس کا اشارہ کھالے اور اسما کی طرف تھا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ سوئچ پینل پر مطلوبہ بٹن تلاش کر کے پش کر دیا۔ تین چار مرتبہ 'ٹوں' کی آواز کمرے میں گونجی، پھر اسما کی آواز سنائی دی،'' مجھے شہرے خان سے خوف آنے لگا ہے۔ وہ بالکل باؤلا ہوا جا رہا ہے۔ اس سے کوئی بعید نہیں کہ وہ پروین کو نہ پا کر مجھے مار ڈالے۔''

کھالے کی آواز سنائی دی،'' بی بی جی! آپ کیسے یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ پروین آپ کے بابا کے پاس ہے۔''

وہ وثوق سے بولی،'' یہ کوئی پہلی واردات تو ہے نہیں کہ شبہ کیا جائے۔ بابا نے نجانے کتنی لڑکیوں کو برباد کر کے بیچا ہے۔ ویسے بھی یہ میڈم نے اپنے طور پر یقین کرنے کے بعد ہی مجھ پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' کھالے کی حیرت سے معمور آواز ریٹائرنگ روم میں گونجی۔

''میں سچ کہتی ہوں۔ ہم جہاں موجود ہیں، یہ بھی بابا کے قماش کے لوگوں کی پناہ گاہ ہے بلکہ یہ بابا سے بھی زیادہ خطرناک لوگ ہیں۔'' کچھ دیر خاموشی حائل رہی، پھر اسما کی آواز سنائی دی،'' کھالے! بابا کے پاس اشتہاری مجرموں کی بڑی کھیپ موجود ہے جو نہ صرف اس کے لیے دولت اکٹھی کرتے ہیں بلکہ اس کے سیاسی دشمنوں کو بھی مختلف محاذوں پر الجھائے رکھتے ہیں

تا کہ وہ سیاسی میدان میں بابا کی ہم سری نہ کر پائیں۔ استاد ببلو نام کا ایک بدنام اور خطرناک غنڈہ بابا کے تلوے چاٹتا ہے، اشارے پر حرکت میں آتا ہے اور آگ لگاتا جاتا ہے۔''

میڈم نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا، بولی، ''سن رہے ہو شہریار؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''جی میڈم! شاید اسما کی ذہنی حالت درست نہیں رہی ورنہ کوئی بھی ایسی باتیں اپنے باپ کے بارے میں نہیں کرتی۔''

وہ بولی، ''اسما پڑھی لکھی ہے۔ حقیقت پسند ہے۔ جانتی ہے کہ اس وقت باپ کے کرتوتوں کی پردہ پوشی محض اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔''

کنٹرول پینل پر لگے ہوئے سپیکر سے دونوں کی آواز پھوٹتی رہی۔ اسما حیرت بھرے انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اس کے پیچھے کس طرح یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ ٹال رہا تھا مگر صاف عیاں تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں کر پائے گا اور اسما کے سامنے ریت کا محل ثابت ہوگا۔

میں ہمہ تن گوش تھا مگر میڈم جلد ہی بور ہوگئی، بولی، ''شہریار! اسی بٹن کو جا کر پش کر دو۔ یہ الو کے پٹھے وہ باتیں تو کر ہی نہیں رہے، جو میں سننا چاہتی ہوں۔''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ بٹن پش کرنے کے بعد پلٹا۔ ایسے میں وہ بیڈ سے اُتری۔ میرے قابل چند لمحوں کو ٹھہری، بغور دیکھتی رہی پھر اپنا داہنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی، ''لو شکریہ ادا کرو، پھر میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گی۔''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی۔ ہونٹ پر ہونٹ چڑھا کر آنکھیں آدھی میچ کر، شرارت آمیز لہجے میں بولی، ''کس می.....''

میں دم بخود رہ گیا۔ میرے لیے اس کی غیر معمولی وارفتگی اور محبت پاش اجازتیں ناقابلِ یقین تھیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے ہاتھ تھاما، گلاب کی طرح نازک اور خوب صورت ہاتھ کو لبوں سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس گھڑی میں مسرت اور طمانیت کے اُس جھولے پر سوار تھا جس پر جھولنے والا اپنے حواس میں نہیں رہتا۔ اچانک اس کا ہاتھ پھسل کر دور ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو میڈم کو پینل کے سامنے کھڑا دیکھا۔ ایک ادا سے پلٹ کر بولی، ''میں تھک گئی ہوں، سونا چاہتی ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانا آ جائے گا، کھا کر لیٹ جانا، نیند پوری کر لینا۔''

میں نے کہا، ''میڈم! وہ کھا لے اور اسما.....''

وہ بولی، ''ان کا فکر نہ کرو۔ ان کے لیے بھی کھانا آ رہا ہے۔''

اس نے کنٹرول پینل پر یکے بعد دیگرے تین بٹن پش کیے۔ پورے کا پورا پینل کسی دروازے کی طرح کھلا اور چار ضرب اڑھائی فٹ کا خلا نمودار ہوگیا۔ پینل کے عقبی حصے میں سیاہ اور سرخ تاروں کا جال سا تنا ہوا تھا۔ کئی تاریں لٹک رہی تھیں۔ میڈم شکیلہ اُن تاروں سے بچ کر خلا میں سے گزری اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ چند لمحوں بعد پینل خود کار انداز میں بند ہوگیا جبکہ میں پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتا رہ گیا۔ اس عمارت نما عجائب کدے کو کسی بہت ذہین اور ماہر انجینئر نے اپنے تمام تر ہنر کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیق کیا تھا۔ میں نے تو آج تک دروازوں کو آپوں آپ کھلتے نہیں دیکھا تھا، یہاں تو دیواریں بھی ایک بٹن دبانے پر کھل جاتی تھیں۔ میڈم شکیلہ کو 'سی ٹو' میں تحفظ کا یقین تھا تو بے جا نہیں تھا۔ یہاں قدم قدم پر غیر متوقع صورت حال اور نہ سمجھ میں آنے والے میکنزم موجود تھے جو کسی بھی شخص کو آنِ واحد میں ورطہ حیرت میں مبتلا کر کے مفلوج کر سکتے تھے۔

میں نے سوچا، 'ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں یہ معمول کی باتیں ہوں جو مجھ جیسے دیہاتی کو بہت بڑی اور غیر یقینی لگ رہی ہیں۔'

کچھ دیر بعد سونیا گتے کا ایک سرخ ڈبہ تھامے ریٹائرنگ روم میں داخل ہوئی۔ مخصوص سائز کا ڈبہ بیڈ پر رکھ کر بولی، ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹر کام پر رابطہ کر لینا۔ میڈم کا حکم ہے کہ دو چار گھنٹوں کی نیند لے لو۔ پھر نجانے کیسے حالات سے واسطہ پڑ جائے۔''

میں نے کہا، ''خطرہ ہے؟''

وہ بولی، ''ہے تو نہیں مگر کیا ہونے والا ہے، یہ علم بھی نہیں۔''

وہ 'گڈ بائی' کہہ کر رخصت ہوگئی۔ میں نے بیڈ پر بیٹھ کر ڈبہ اپنی جانب کھینچ لیا جس پر شہر کے ایک بڑے ہوٹل کا مونوگرام اور نام چھپا ہوا تھا۔ اس میں بریڈ کے چار قتلے، چکن لیگ پیس اور کولڈ ڈرنک سمیت کئی لوازمات ترتیب کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ عرصہ پہلے جب میں عرفان مرزا کے ساتھ تنظیمی کاموں میں متحرک رہا کرتا تھا، ایسے ہی لنچ بکس ملتے رہتے تھے۔

میں نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور بیڈ پر دراز ہوگیا۔ کھالا کس طرح میڈم کی کوٹھی تک پہنچا تھا؟ وہ موبی کو قتل کر کے بھاگنے کے بعد کن حالات سے گزرا تھا؟ آگے کیا ہوگا؟ انہیں سوچوں کی گنجلک ادھیڑ بن میں، لیل و نہار کے گرداب میں میرا ذہن تھک گیا، چکرا گیا۔ تبھی آرام چاہتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میری آنکھ لگ گئی اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہوگیا۔

نہ جانے کس وقت میری آنکھ کھلی۔ میری بیداری کا سبب کوئی کھٹکا نہیں تھا بلکہ نیند پوری ہو جانے پر آپوں آپ بیدار ہوا تھا۔ میں نے فی الفور بیڈ چھوڑ دیا۔ بھرپور انگڑائی لی، ریٹائرنگ روم کا طائرانہ جائزہ لیا، اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دیا تو وال کلاک تلاش کرنے کے لیے نظریں دوڑائیں۔ کمرے میں کلاک نہیں تھا۔ اگر کلاک نصب ہوتا بھی تو میں یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں کتنی دیر تک سویا رہا تھا کیونکہ میں نے سونے سے پیشتر وقت نہیں دیکھا تھا۔ زیرِ زمین ہونے کی بنا پر 'سی ٹو' میں شب و روز کا فرق معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر بڑے کمرے میں جھانکا۔ وہ بھی خالی تھا۔ میرے پاس سوائے باتھ لینے کے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

تازہ دم ہو کر انٹر کام کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔ علم نہیں تھا کہ کون سا بٹن پش کرنا ہے۔ اندازے سے 'ایک' کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد سونیا کی آواز سنائی دی، ''کیا بات ہے؟''

میں نے پوچھا، ''میڈم کہاں ہیں؟''

وہ بولی، ''میڈم تو چلی گئیں۔''

''کہاں؟'' میں نے متعجب ہو کر استفسار کیا۔

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ سی ٹو سے چلی گئی ہیں۔ کہاں؟ یہ انہوں نے بتایا نہیں، میں نے پوچھا نہیں۔ کیا تم نے باتھ لے لیا؟''

''ہاں..... اب مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، انتظار کرو۔'' وہ بولی، ''میں کھانا بھجواتی ہوں۔''

میں نے جلدی سے پوچھا، ''کیا وقت ہوا ہے؟''

وہ بولی، ''گیارہ بجے ہیں..... تم آٹھ گھنٹے سوئے رہے ہو۔''

''گیارہ دن کے، یا رات کے؟''

وہ بولی، ''رات گزر چکی ہے۔''

مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے پوچھا، ''اسما اور خالد موجود ہیں؟''

''ہاں!'' وہ بولی، ''مگر تمہیں ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میڈم نے کہا ہے؟''

''ہاں! تمہارے لیے میڈم کا حکم ہے کہ تم ریٹائرنگ روم تک محدود رہو گے۔'' وہ ہنسی، ''ایک قیدی کی طرح!''

''اچھا..... تو پھر ایک کرم کرو، آ کر پینل کو آپریٹ کرنا سکھا دو۔ اور نہیں تو میں وقت گزاری کے لیے ان دونوں کو دیکھتا رہوں۔'' میرا اشارہ اسما اور کھالے کی طرف تھا۔

''سوری!'' اس نے کہا، ''اجازت نہیں ہے۔''

میں نے منہ بنا کر ریسیور رکھ دیا۔ چونکہ میں میڈم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، اس لیے سوائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دل کو یہ تقویت بھی میسر آئی کہ وہ سی ٹو سے نکل کر میری بہن کی بازیابی کے سلسلے میں ہی مصروف ہوگی۔ سونیا آئی اور کھانا میرے سامنے بیڈ پر رکھ کر چلی گئی۔ کم و بیش پہلے سا ہی لنچ بکس تھا۔ میں نے شکم سیر کیا۔ چائے کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ انٹر کام پر سونیا سے چائے کا مطالبہ کیا۔ وہ دس منٹ بعد چائے سمیت ریٹائرنگ روم میں داخل ہوئی۔ میں نے چاہا کہ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھے، ہم باتیں کریں مگر اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، ''نہیں شہریار! میں بہت مصروف ہوں۔ پھر کبھی سہی۔''

میں نے اصرار نہیں کیا اور چائے کی لطیف کشیدگی میں محو ہو گیا۔ کافی دیر، میرے اندازے کے مطابق چار ساڑھے چار گھنٹے گزر گئے مگر کوئی تغیر واقع نہ ہوا۔ میں ریٹائرنگ روم میں لیٹا رہا، نہایت محدود جگہ پر چہل قدمی کی، کنٹرول پینل پر موجود تمام بٹن دیکھے اور ان پر لکھے ہوئے ہر لفظ کو کئی کئی بار پڑھا مگر بوریت کا احساس فزوں تر ہوتا گیا۔ سونیا نے میری فرمائش پر دو تین مرتبہ چائے پلائی۔ جب میں نے انٹر کام پر اس سے وقت کے بارے دریافت کیا تو اس نے کہا، ''پانچ بجنے کو ہیں..... خیریت؟''

میں نے زچ ہو کر کہا، ''اب تو مجھ سے ریٹائرنگ روم میں بیٹھا ہی نہیں جا رہا۔''

''بیٹھا نہیں جاتا تو لیٹ جاؤ، لیٹا نہیں جاتا تو نہانے لگ جاؤ.....''

اس نے ہنستے ہنستے رابطہ منقطع کر دیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑا سا سیاہ رنگ کا شاپنگ بیگ دکھائی دیا جسے کرسی میں رکھتے ہوئے بولی، ''شہر یار! تمہاری قید ختم ہو گئی ہے۔ اس بیگ سے سوٹ نکالو، چینج لو اور پوری طرح تیار ہو کر ریٹائرنگ روم سے باہر آ جاؤ۔ ایک دھیان رکھنا، اس لباس کے اوپر اپنا یہی ڈھیلا ڈھالا لباس پہن لینا۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولی، ''میں کچھ نہیں جانتی۔ جو حکم ملا، تم تک پہنچا دیا۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے بیگ کو بیڈ پر الٹا دیا۔ سوٹ کے نام پر برآمد ہونے والے سامان کو دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس میں ڈارک گرے کلر کا باڈی ٹائٹ سوٹ، سیاہ شیشوں والی عجیب ساخت کا گلز، لیزر سرچ لائٹ، جرمن ساختہ ریوالور اور بازو پر باندھنے والا بلٹ بیلٹ..... ایسی ہی کچھ اور چیزیں بھی بیڈ میٹرس پر پڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں تامل نہیں ہوا کہ مجھے کسی خاص موقع کے لیے تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔

چونکہ مجھے جلد تیار ہونے کا حکم صادر ہوا تھا، اِس لیے میں پانچ سات منٹ میں پوری طرح تیار ہو گیا۔ تسلی کی خاطر میں نے باتھ روم میں نصب شدہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ لیدر کی چست پینٹ شرٹ، بڑے بڑے گاگلز، ایک بازو پر بندھے ہوئے چرمی بلٹ بیلٹ سے جھانکتی ہوئی کوئی درجن بھر گولیاں، پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا سامان..... سیاہ جوتے نئے اور سائز میں کچھ چھوٹے تھے جس کی وجہ سے پیروں پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ مجھے اپنی کمانڈوز جیسی نئی وضع قطع عجیب لگی۔ ہم دیہاتیوں میں پینٹ شرٹ پہننا بھی معیوب خیال کیا جاتا ہے اور بے نام سی جھجک آڑے آتی ہے مگر چونکہ میں نے کالج کے زمانے میں پینٹ شرٹ پر مشتمل یونیفارم پہن رکھی تھی، اس لئے مجھے یہ لباس پہننا عجیب نہیں لگا تھا۔

میں نے بخوبی جائزہ لیا۔ مبادا کہ کوئی سامان جسم سے چپکانا بھول گیا ہوں، پھر اپنی اتاری ہوئی شلوار قمیص پہن لی۔ سوائے گاگلز اور جوتوں کے، سب کچھ میرے ڈھیلے ڈھالے لباس کے نیچے چھپ گیا۔ میں نے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے نوٹوں کی تقریباً آدھی گڈی جیب میں درپیش آنے والے ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر رکھ چھوڑی تھی۔ تھوڑی سی رقم کرایہ کی مد میں خرچ ہوئی تھی۔ باقی محفوظ رہی تھی اور ابھی میری جیب میں ہی تھی۔

ریٹائرنگ روم سے نکلا تو بڑے کمرے میں سونیا کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بولی، ''بہت دیر لگا دی تم نے..... میڈم دو مرتبہ پوچھ چکی ہیں۔''

میں کوئی جواب دیے بغیر اُس کے پیچھے چلتا ہوا لاؤنج نما گیلری میں آیا۔ جس کمرے میں کھالے اور اسما کو رکھا گیا تھا، وہ بند تھا۔ وہ مجھے گیلری کے آخری سرے پر ایک مخصوص جگہ پر ٹھہرا کر پلٹی، بولی، ''میں آپریشن روم میں جا رہی ہوں تاکہ تمہیں 'سی ٹو' سے باہر نکالنے کے لیے راستے کھولوں۔ تم یہیں کھڑے رہو۔ جونہی راستہ کھلے، ناک کی سیدھ میں چلتے جانا۔ میڈم کے ساتھ یہاں تک آتے ہوئے تم نے راستہ دیکھ لیا تھا۔ اوکے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ مجھ پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے ایک کمرے میں گھس گئی۔ ایک آدھ منٹ بعد میرے سامنے والی دیوار نہایت بے آواز طریقے سے ہٹنا شروع ہو گئی۔ جونہی خلا بڑا ہوا، میں نمودار ہونے والی گیلری میں داخل ہو گیا۔ یہ وہی کم روشنی والی گیلری تھی جس میں سے گزر کر میڈم شکیلہ کی معیت میں 'سی ٹو' پہنچا تھا۔ پانچ سات منٹ کے بعد میں میڈم کی کوٹھی کے گیسٹ روم میں تھا۔ میری توقع کے خلاف میر وشاہ کی شکل دکھائی دی۔ کمرے میں اس کے علاوہ کھالا اور دو توانا، جسیم اور کسرتی جسموں والے افراد موجود تھے۔ میر وشاہ نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''ماڑے غنچے! جندگی (زندگی) اور موت کا کھیل شروع ہو جاوت ہے۔ اب تم اپنی جان ہتھیلی پر رکھے اور نجر (نظر) اپنے شکار پر.....''

''شکار؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مستفسرانہ انداز میں اُسے دیکھا۔

وہ بولا، ''شکار، وہی سالا حیدر خان..... ماڑی میڈم بولے کہ شہر یار کے جسم میں آگ ہووے ہے آگ..... ریچھ کی طاقت اور بجلی کی پھرتی ہووے ہے تیرے پٹھوں میں۔ وہ بے غیرت..... کا بچہ! وہ حیدر خان..... تمہاری بہنا کو دینے سے انکاری ہووے ہے غنچے! سمجھ میں آوے؟..... ہاں! اس مردود کے اڈے پر آج کی رات حملہ کرے اور سب کو تہس نہس کر کے رکھ دیوے ہے تم۔ یہ لونڈے تیرے ساتھ جاوے ہیں۔ کیا سمجھے ہے؟''

میں نے چونک کر پہلے میر وشاہ کو، پھر کھالے کو دیکھا، دونوں کے چہرے سپاٹ تھے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ امتحان کی گھڑی سوالیہ نشان بن کر سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ میرے مختلف سوالوں کے جواب میں میر وشاہ نے بتایا کہ سردار حیدر شاہ نے اسما کے بدلے پروین کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے پروین کی اپنے ہاں موجودگی کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا تھا اور بہت خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی تھیں۔ میر وشاہ نے اپنے طور پر یہ کھوج لگایا تھا کہ وہ اپنے 'شکار' کو دریائے سندھ کے کنارے پر واقع بیلے والی حویلی میں رکھتا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ پروین کو بھی وہیں رکھا گیا تھا۔ چونکہ میڈم زیادہ دیر تک اسما کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتی تھی، اس لیے اس نے میری خوابیدگی کے دورانیے میں ہی کھالے اور میر وشاہ سے مشاورت کے بعد ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میڈم نے کھالے سے کیا باتیں کی تھیں؟ کھالا کیونکر میرے ساتھ جانے پر تیار ہوا تھا؟ ان باتوں کا سر دست کوئی علم نہیں تھا۔

میروشاہ نے بیڈ پر ایک بڑا سا ایوری کارڈ پھیلا دیا جس پر مارکر سے ایک نقشہ بنایا گیا تھا۔ ہم چاروں بیڈ کے پائنتی والے تختے کے ساتھ جُڑ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ نقشے کی مدد سے ٹارگٹ تک پہنچنے کی ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران ظاہر خان چائے، غیر ملکی شراب کی سربہ مہر بوتل اور نقرئی گلاس ٹرے میں رکھے گیسٹ روم میں داخل ہوا۔ جسے جو درکار تھا، اُسے سرو کرنے کے بعد خاموشی سے واپس چلا گیا۔

کھالا پی رہا تھا۔ زندگی بھر 'کپی' پر عیاشی کرتا آیا تھا۔ 'ولائتی' دیکھ کر اوقات سے نکلنے لگا تو میروشاہ نے ہاتھ تھام لیا۔ بولا، ''ابے ندیدے! یہ سمے ہوش میں رہنے کا ہے، لہرا کر پھوکٹ میں جندگی (زندگی) حرام کرنے کا نہیں ہووت ہے..... بس کر..... جیت کر آوے تو ڈرموں پر بٹھا دیوے ہے لاڈے کو.....''

کھالا کھسیا گیا۔ میروشاہ نے از حد سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم چاروں میں سے ایک آدمی کو گینگ لیڈر نامزد کیا۔ وہ کسرتی بدن والا لحیم انسان تھا۔ چہرے مہرے سے پڑھا لکھا اور معصوم فطرت دکھائی دیتا تھا مگر میں اس کے اندر چھپی بربریت اور خون ریز فطرت کو باآسانی محسوس کر سکتا تھا۔ میروشاہ نے اسے 'پیا' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اصل نام نجانے کیا تھا۔ میروشاہ اسے آپریشن کے بارے میں سنہری ہدایات سے سرفراز کرنے کے بعد ہم سب سے مخاطب ہو کر بولا، ''یہ دونوں جانت ہیں کہ ماڑی میڈم کیا چیج (چیز) ہووے ہے۔ تم دونوں غنچے نہیں جانت ہو۔ جان لیوے ہے کہ میڈم ہار کر آنے والے غنچوں کو اپنے ہاتھوں توڑ پھینکے ہے، نہ دیکھے کہ کون کتنا گھبرو ہووے ہے..... جیت کر آوے تو راستے کھلے ہوویں، ہار کر آوے تو صرف موت کا روٹ سواری مانگے ہے..... سمجھ گئے ناں غنچے؟''

میروشاہ کی سرد آواز سن کر میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگیں۔ یہی حال کم و بیش کھالے کا تھا۔

''کیا ان دونوں کو اسلحہ چلانا آتا ہے؟'' پیا نے استفسار کیا۔

میروشاہ نے جواب دینے کی بجائے مجھے اور کھالے کو باری باری دیکھا۔ پوچھا، ''ہاں بھئی غنچے؟''

ہلکے پھلکے ہتھیاروں سے شناسائی کی حد تک تعلق رہا تھا۔ یہاں نجانے کس قسم کا اسلحہ زیرِ استعمال تھا، علم نہیں تھا۔ پھر میری درخواست پر میروشاہ اور پیا دونوں کمرے سے باہر گئے، واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں ایک ایک گن دبی ہوئی تھی۔ پیا نے مشاقانہ انداز میں ہمیں

ان گنوں سے روشناس کرایا۔ کلیدی ہدایات دینے اور ہماری طرف سے 'اوکے' رپورٹ ملنے کے بعد عقیل کے ہاتھ گنیں باہر گاڑی میں رکھوادی گئیں۔

میر وشاہ 'پیا' سے مخاطب ہو کر بولا، ''ماڑے پیا جی! یہ غنچے ہوویں، ابھی گلاب نہ بنت ہیں..... پَر تم بنا دیوے، انعام پالیوے..... گاڑی اور مورکھ پستول وستول باہر ہووے ہے، تم سب بارود اُٹھا کے جاوے اور پیچھے مڑ کر مت دیکھے ہے..... گاڑی چوری کی ہووے ہے، جہاں مصیبت بنت، وہیں پھینک دیوے ہے۔ اوکے؟''

اس نے نقشہ اُٹھا کر پیا کے حوالے کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ یوں جیسے اس نے محفل برخاست کرنے کا اعلان کیا ہو۔ اچانک تھم کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا، ''اڑے لاڈے! گاڑی میں مرہم پٹی والا ڈبہ رکھا ہووت ہے، کوئی گولی شولی لگ جاوے، کوئی زخم (زخم) لگ جاوے تو ڈاکٹری کر دیوے ہے۔ میڈم بولت ہے کہ تم نے ڈاکٹری سیکھ رکھی ہووت ہے۔''

میں نے حامی بھری۔ پھر وہ ہم چاروں کو باری باری گھورتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد پیا نے کہا، ''شہر یار! میرا نام سراج الدین ہے، یہاں مجھے سبھی پیا کہتے ہیں۔ یہ عقیل ہے۔ قدرت نے پیدا کرتے ہی اس کی زبان پر قفل لگا دیا۔ جوان ہوا تو اس نے اپنے ہاتھوں کو بولنا سکھا دیا۔ اور عقیل! یہ خالد عرف کھالا ہے، زبردست ڈرائیور ہے۔ یہ شہر یار ہے..... ان دونوں کے بازوؤں میں کتنا دم ہے، نہیں معلوم مگر آج معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم چلیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے باہر آئے۔ اس وقت شام گہری ہو رہی تھی۔ لمبے دورانیے کے بعد کھلے میں آنا عجیب سا لگا۔ ظاہر شاہ نے گیٹ پر کھڑے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کی نشاندہی کی۔ کوٹھی کی احاطی دیوار کے ساتھ سرو کے پودوں کے قریب گرے کلر کا چوڑے ٹائرز والا ڈبل کیبن ڈالا کھڑا نظر آیا۔ سائیڈ پر بڑا سا اسٹکر چسپاں تھا۔ انگریزی حروف میں لکھا ہوا 'سرف' دور سے پڑھا جاتا تھا۔

پیا خوش ہو کر بولا، ''میڈم زندہ باد..... آج مزہ آئے گا۔''

پیا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اس نے مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو پیا نے مجھے مخاطب کیا، ''شہر یار! گاگلز اتار کر جیب میں رکھ لو۔ اور ہاں! تم نے نقشے پر ٹارگٹ لوکیشن اچھی طرح سمجھ لی ہے ناں؟''

میں نے کہا، ''ہاں! مجھے یقین ہے کہ میں تمہیں وہاں تک لے جا سکتا ہوں۔''

کھالے نے جھٹ سے کہا، ''میں نے سردار حیدر خان کی وہ حویلی دیکھ رکھی ہے جس پر ہم نے حملہ کرنا ہے۔''

''ویری گڈ..... ہم کتنی دیر میں وہاں پہنچ سکتے ہیں؟'' پیا نے پوچھا۔

''زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں.....''

''ابھی تو بمشکل آٹھ بجے ہیں۔ دو گھنٹوں بعد دس بجیں گے..... نہیں..... ہمیں ایک اور دو بجے کے درمیان وہاں پہنچنا چاہیے۔ کیوں عقیل؟''

اس نے بیک مرر میں جھانکا۔ عقیل کا سر اثبات میں ہلا۔ پیا نے کہا، ''ہم دو تین گھنٹے مظفر گڑھ کے ہوٹل میں گزاریں گے۔''

کھالے نے تائید کی۔ پیا نے سیٹی بجاتے ہوئے ڈالے کو ریورس کیا، ٹرن لیا اور گیٹ عبور کر لیا۔ ڈالا بالکل نیا تھا اور پیا کو ڈرائیونگ پر غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ ملتان کی رش والی سڑکوں پر، جہاں کھوئے سے کھویا چھلتا تھا، ڈالا مچھلی کی طرح سڑک پر پھسلتا جا رہا تھا۔ دریائے چناب کے پل پر گاڑیوں کی لمبی قطار دیکھ کر پیا بولا، ''افوہ! پھر وہی مصیبت..... پل بلاک ہے، نجانے کس وقت کھلتا ہے۔''

اس نے ٹرکوں اور بسوں کی طویل قطار میں جگہ بنائی اور ڈالے کو بریک لگا دیے۔ اس کی دیکھا دیکھی میں بھی ڈالے سے اُتر کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ روشنیوں کی طویل قطار..... کوئی ڈیڑھ میل لمبی لائن..... پیا لمبی سانس پھیپھڑوں میں اتار کر بولا، ''گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ وقت یہاں ضائع ہو گا۔''

میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ڈالے کا گھوم پھر کر جائزہ لینے لگا جبکہ میں کھلی ہوا میں، ٹھنڈی، نم اور شوخ ہوا کو سینے میں اتارنے لگا۔ کھالا بھی اُتر کر میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''شہرے خان! اَساں ٹھیک کریندے پئے ہائیں؟''

(شہرے خان! کیا ہم درست کر رہے ہیں؟)

میں چونکا، کھالے کا چہرہ سنولائی ہوئی فضا کا حصہ محسوس ہوا۔ میں نے کہا، ''خدا جانے.....''

وہ بولا، ''ہم جس راستے پر چل نکلے ہیں، اس میں واپسی نہیں ہوتی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ایک قدم آگے بڑھ کر سڑک کے ڈھلوانی کنارے پر رُک گیا، بولا، ''کھالے! تم کہاں رہے اتنے دن؟ تم نے میری خبر تک نہیں لی کہ میں کس حال میں ہوں۔''

وہ بولا، ''نہیں شہرے! میں ایک رات چوروں کی طرح نور پور گیا تھا۔ وہاں تمہیں بخیریت دیکھ کر لوٹ آیا۔ موبی کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے گینگ لیڈر تھا۔ مجھے علم ہوتا تو میں اس سے پنگا نہ لیتا۔ جب پتہ چلا تب میرے پاس سوائے موبی سے بڑے گینگ لیڈر کی چھتری تلے جانے کے، کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے پیچھے پولیس اور موبی کے کتے لگے ہوئے تھے۔ استاد ببلو نے مجھے ان سے بچالیا ورنہ وہ میری تکا بوٹی کر دیتے، زندگی ملتی بھی تو سلاخوں کے پیچھے گزر جاتی۔''

میں چونکا، ''استاد ببلو نے؟''

وہ بولا، ''ہاں یار..... وہ تمہاری میڈم سے بھی بڑا خبیث ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''مگر میری میڈم تو خبیث نہیں ہے۔''

''تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ وگرنہ دنیا اسے بہت شاطر اور ظالم عورت قرار دیتی ہے۔'' اس نے کہا، ''اس مشن سے فارغ ہو جاؤں، پھر تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔ میں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ تم وہ سب کچھ شاید تمام عمر بھی نہ دیکھ سکو گے۔''

پیا کی آمد پر ہماری گفتگو کا سلسلہ رک گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد کہیں جا کر رستہ کھلا اور رنگ برنگ روشنیاں چیونٹی کی سی چال سے پل کے اوپر رینگنے لگیں۔ یہ پل اپنی نوعیت کا منفرد پل تھا۔ ایک ڈیڑھ کلومیٹر لمبائی والا یہ پل دوہرا تھا۔ نیچے والے پل پر ریلوے ٹریک بچھا ہوا تھا۔ اس کے اوپر، ہوا میں معلق، دو رویہ سڑک تھی جس پر چھوٹی بڑی ٹریفک کا غیر معمولی رش ہر وقت دکھائی دیتا تھا۔ شاید اپنی میعاد پوری کر چکا تھا تبھی لرزتا رہتا تھا، ڈراوا دے کر سمجھاتا تھا کہ ٹریفک کا دباؤ بڑھنے پر نیا پل تعمیر کرنا ضروری ہے۔

پیا نے ہمیں آواز دے کر گاڑی میں بٹھایا اور سست روی سے دو ٹرکوں کے بیچ سرکنے کا عمل شروع ہو گیا۔ تلیری موڑ پر پہنچ کر پیا نے ڈالے کو علی پور بائی پاس والی سڑک پر ڈال دیا۔ شاید وہ شہر میں داخل ہونے والی سڑک پر بیریر لگائے کھڑے پولیس کے سست الوجود اہلکاروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا یا اس نے وقت گزاری کو مدنظر رکھا تھا۔

پل پر ہمارا کافی وقت ضائع ہوا تھا۔ ایک گھنٹہ ہم نے مظفر گڑھ کے ایک معیاری ہوٹل میں چائے اور سینڈوچ حلق سے اُتارنے میں صرف کیا۔ خوش گپیاں لگائیں۔ پیا بہت زندہ دل اور مزاحیہ طبیعت کا مالک شخص تھا۔ ہوٹل کے روشن ماحول میں مجھے احساس ہوا کہ سبھی میری طرح دوہرے لباس میں تھے اور کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ کھالا اور پیا بہت جلد ایک دوسرے سے فری ہو گئے۔

کھالے نے قدرے نیچی آواز میں کہا، ''میرا خیال ہے کہ نقشے میں بتائے ہوئے راستے کی بجائے ہمیں غازی گھاٹ والا راستہ اپنانا چاہیے۔ وہ کچھ طویل تو ہے مگر بالکل محفوظ ہے۔ دریائی علاقہ رات کو سنسان ہو جاتا ہے۔ ہم کسی کی نظر میں آئے بغیر خان کی حویلی تک پہنچ سکتے ہیں۔''

پیا نے پوچھا، ''کیا تم نے وہ راستہ دیکھا ہوا ہے؟''

نور پور سے دریا کے پتن تک سارا علاقہ کھالے کا دیکھا بھالا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''مجھ سے کیا چھپا ہے اس علاقے کا؟ چپہ چپہ چھانا ہوا ہے میں نے۔''

ہم کھالے کی ایما پر پونے بارہ بجے ہوٹل سے اُٹھے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ چوک قریشی سے آٹھ دس کلومیٹر آگے جا کر اُس نے دائیں ہاتھ مڑنے والی ایک ناپختہ سڑک پر مڑنے کا اشارہ کیا۔ پیا نے فوراً ڈالا کچے راستے پر ڈال دیا۔ تھوڑی دور جا کر رُک گیا۔ مجھے پیچھے جانے اور کھالے کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''ٹارگٹ سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ہم گاڑی چھوڑ دیں گے۔ اب تم لوگ گاگلز لگا لو۔''

ہم نے نشستوں کا تبادلہ کیا۔ میں نے جونہی گاگلز آنکھوں پر لگائے، مناظر کی دیدگی میں واضح تغیر پیدا ہو گیا۔ پہلے اندھیرے میں صرف وہی کچھ دکھائی دیتا تھا جو ڈالے کی طاقت ور ہیڈ لائٹس کی زد میں آتا تھا۔ اب اطراف کی جھاڑ جھنکار اور فصلوں کا سلسلہ بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ یہ اس مخصوص ساخت گاگلز کے شیشوں کا کمال تھا۔

جھٹکوں کی تال پر سفر آغاز ہو گیا تھا۔ ایک فرلانگ تک راستہ قدرے ہموار تھا جبکہ آگے اونچا نیچا اور تنگ تھا۔ فصلوں کے بیچ موڑ پر موڑ کاٹتے ہوئے ہم بلند قامت کوندر اور جنگلی گھاس پھوس میں آدھے چھپے آدھے عیاں راستے پر آن پہنچے۔ یہ علاقہ چکنی مٹی کا تھا۔ جہاں بھی زمین نم ہوتی تھی، وہیں چپک جانے والا کیچڑ بن جاتا تھا۔ اگر ڈالا فور وہیکل نہ ہوتا تو شاید اس راستے پر ہمارا سفر جاری نہ رہ پاتا۔ یہ دریائے سندھ کے بیلے کا سنسان اور ویران علاقہ تھا جہاں دن کو

بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ دریا کے اس کنارے پر کوندر اور جنگلی گھاس کے وسیع علاقے میں جنگلی جانوروں کی بہتات تھی جن کے خوف سے لوگ ادھر کو کم نکلتے تھے۔ تین چار میل کے بعد راستہ مزید دشوار ہو گیا۔ آخر ایک ڈھلانی جگہ پر ڈالا پھسل کر گھاس میں پھنس گیا۔ ہم تینوں کو اُتر کر دھکا لگانا پڑا۔ بدقت تمام ڈالا اپنے ٹریک پر چڑھا اور ہمارا سفر شروع ہوا۔

خدا خدا کر کے کھالے نے رُکنے کا اشارہ کیا، بولا، ''خان کی حویلی دائیں طرف کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ یہ راستہ ہمیں چھوڑنا ہوگا کیونکہ یہ حویلی کی طرف نہیں جاتا۔''

کھالے کی مشاورت سے پیا نے راستہ چھوڑ دیا اور نسبتاً زیادہ گنجان گھاس کی طرف گاڑی بڑھائی۔ مشاقانہ انداز سے ٹرن لیا اور ڈالے کو واپسی کے سفر کے لیے بالکل تیار حالت میں کھڑا کر کے ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ اندر والی بتی روشن رہنے دی۔ ہم نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس اُتار کر گاڑی میں رکھ دیے اور مستعدی سے نیچے اُتر آئے۔

پیا نے ڈالے کی عقبی نشست اُٹھائی۔ جدید طرز کی ایک دس بائیس کی رگرگن اور اضافی میگزین نکال کر مجھے تھمائی۔ مجھے گیسٹ روم میں اس گن کو چلانے کی سرسری ٹریننگ دی گئی تھی۔ اس کا وجود مختصر تھا مگر وزن کافی تھا۔ کھالے کو کرنکو منی اسالٹ رائفل دی جبکہ اس نے اپنے اور عقیل کے لیے روسی ساختہ کلاشن کوف گنیں نکالیں۔ گاڑی کی اندر والی بتی گل کی اور ہمیں دھیمی آواز میں سمجھایا، ''ہماری گنیں اور پسٹل گولیاں اگلنے کے لیے بالکل تیار ہونے چاہئیں مگر گولی انتہائی ناگزیر حالت میں چلائی جائے گی۔''

اس نے چند اور مفید ہدایات دیں۔ پھر کھالے کی سربراہی میں ہم چاروں پر مشتمل قافلہ گھنی گھاس کے بیچ ناہموار اور کیچڑ آلود زمین پر چل پڑا۔ رات کے دبیز اندھیرے میں گھنی گھاس کے اندر سست کا اندازہ نہیں ہوتا تھا مگر گاگلز اور ننھی منھی سرچ لائٹس کی مدد سے ہم باآسانی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم دریا کے کنارے سے خان کی حویلی کی طرف یعنی مشرق کی جانب سفر کر رہے تھے۔

کوندر اور جنگلی جھاڑیوں کی سرسراہٹ، کہیں جانوروں کے اُٹھ بھاگنے سے پیدا ہونے والی آوازیں، دل کی دھڑکنوں کو لمحہ بہ لمحہ تیز کیے دے رہی تھیں۔ ہم ایک قطار میں چل رہے تھے۔ اچانک جھاڑیوں کے بیچ ایک بڑی قامت والا کتا اُلٹے قدموں زور لگا کر کچھ کھینچتا ہوا دکھائی دیا۔ کھالا رُک گیا۔ اُس نے کتے پر لائٹ ڈالی پھر سرگوشی کی، ''پیا جی! اِہ کتا نئیں، اِہ تاں

ناہر ہے۔"

(پیا جی! یہ کتا نہیں، یہ بھیڑیا ہے۔)

بگھیاڑی نسل کا کتا اور اس علاقے میں پایا جانے والا بھیڑیا ایک جیسی قامت اور شکل و صورت کے مالک ہوتے ہیں۔ عام نظر میں بھیڑیا بگھیاڑی کتا ہی دکھائی دیتا ہے۔ کتے کی دُم چھوٹی جبکہ بھیڑیے کی خاصی موٹی اور لمبی ہوتی ہے۔ آوازوں کی نوع سے بھی دونوں میں تمیز کی جاتی ہے۔

وہ بھیڑیا ہی تھا جو کسی چیز کو کھینچ کر جھاڑیوں سے باہر لانے میں مصروف تھا۔ ہماری موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ پلٹ کر ہماری جانب متوجہ ہوا۔ کھالے نے گن کی نالی کا رُخ اُس کی جانب کیا۔ پیا نے فوراً نالی پر ہاتھ رکھ کر گن کو نیچے جھکا دیا اور سرگوشی کی، "گولی چلانے کی حماقت نہ کرنا۔"

وہ اِس دوران چاقو نکال چکا تھا مگر بھیڑیا ہم میں سے کسی پر حملہ آور ہونے کی بجائے دانت نکوستا ہوا جست لگا کر ایک طرف بھاگ گیا اور لمحوں میں ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کھالا اُس گھنی جھاڑی کی طرف بڑھا جہاں چند لمحے پیشتر بھیڑیا دکھائی دیا تھا۔ وہ جونہی جھک کر جھاڑی کے نیچے گھسا، اُس کے لبوں سے دَبی دَبی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے لمبی زقند بھری اور کھالے کے پیچھے پہنچا۔ پوچھا، "کیا بات ہے؟"

وہ پلٹا اور بولا، "لاش پڑی ہے شہرے!"

"کس کی؟"

میں نے جھک کر اُس کے کندھوں کے اوپر سے جھاڑی کی جڑوں میں دیکھا۔ اوندھی پڑی ہوئی لاش کا نچلا آدھا دھڑ نظر آ رہا تھا۔ کھالا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں پیا کی سرگوشی اُبھری، "لاش کو کھینچ کر باہر نکالو۔"

کھالا تب تک ابتدائی ذہنی جھٹکے کی ٹرانس سے نکل کر کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ اُس نے پیٹ کے بل پڑی ہوئی انسانی لاش کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ اِسی اثنا میں پیا اور عقیل بھی ہمارے قریب آ گئے۔ کھالے نے جونہی لاش کو سیدھا کیا، پیا نے سرچ لائٹ کی روشنی سے لاش کا چہرہ روشن کر دیا۔ میں لاش کے پیروں کی سمت زمین پر بیٹھا تھا۔ دیکھنے کے لیے کہ وہ کون بدقسمت تھا، تھوڑا سا اوپر اُٹھا۔ جونہی میں نے لاش کا چہرہ دیکھا تو مجھے یوں محسوس

ہوا جیسے میرے دل نے اچانک دھڑکنا بند کر دیا ہو۔

کھالے کی گھبرائی ہوئی آواز میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑی، ''اوئے شہرے! اہ تاں عاشی دا بھرا، سجاول کریانے آلے دا پتر وحید ہے.....''

(اوئے شہرے! یہ تو عاشی کا بھائی اور سجاول کریانہ مرچنٹ کا بیٹا وحید ہے)

میں وحید کو پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ پیا نے کھالے سے پوچھا، ''یہ کون ہے؟''

کھالا اُسے سجاول اور وحید کی ماں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں اس دوران کھالے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹا کر اُس کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ وحید کا سرخ و سپید چہرہ اس وقت پیلا پڑ چکا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے اور مٹی میں اَٹے تھے جبکہ بال بری طرح کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اگر میں نے اُسے کئی مرتبہ پہلے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو شاید پہچاننے میں تامل ہوتا۔ میں نے اُس کے گال کو چھوا۔ سرد اور بے جان..... فوراً یہ خیال ذہن میں اُبھرا کہ وہ زندہ نہیں تھا مگر میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ میرے ہاتھوں کی باریک لوؤں نے سانسوں کی بہت خفیف آمد و رفت کو محسوس کر لیا تھا۔ میں نے جلدی سے اُس کی کلائی تھامی۔ کمزور سی نبض چل رہی تھی۔ اُس کے سینے پر ہاتھ رکھا، دل دھڑک رہا تھا۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی۔

میں نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا، ''یہ زندہ ہے، اِسے گاڑی میں لے چلو۔''

کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

ایسے ہی وقت میں پیا کی آواز سنائی دی، ''اِسے یہیں چھوڑ دو اور اپنے مشن کا فکر کرو۔ اگر ہم اِسے گاڑی میں لے کر گئے تو بہت سارا وقت ضائع ہو جائے گا۔''

وہ درست کہہ رہا تھا مگر میں نے کھالے کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا، کہا، ''کھالے! زیادہ دیر تو نہیں لگے گی۔''

پیا نے جلدی جلدی لاش کی طرح ساکت پڑے وحید کا ماہرانہ انداز میں معائنہ کیا۔ اُس کی بائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ گردن اور چھاتی پر کئی زخم لگے تھے جن سے خون رِس کر جم گیا تھا۔ دائیں کندھے کا جوڑ بھی اکھڑا ہوا تھا۔ پیا نے قدرے تیز آواز میں کہا، ''یہ مرنے والا ہے۔ اِسے یہیں پڑا رہنے دو ورنہ یہ قتل مفت میں ہمارے کھاتے میں پڑ جائے گا۔ یہ تو سوچو، اس حالت میں اِسے لے کر کہاں جائیں گے؟''

کھالے نے کہا، ''اِسے کسی ہسپتال میں ڈال آتے ہیں۔''

''تاکہ جاتے ہی دھر لیے جائیں..... ہیں؟'' پیا نے تلخی سے کہا۔

پیا نے درست کہا تھا۔ وحید کی سانس کی رفتار اُس کی طرف بڑھتی ہوئی اندوہ ناک موت کی خبر دے رہی تھی۔ میں نے ایک پل کو سوچا۔ وحید کی ہمدردی میں ہاتھ سے نکلنے والا ہر لمحہ مجھے ہٹلر سے دور کر رہا تھا۔ یہ بھی سوچا، اگر میں وحید کو ایسے ہی پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہوں تو وہ وہیں پر اِسے جانور نوچ چکے ہوں گے۔

اچانک دل میں ہمدردی کا جذبہ پوری شدت سے بیدار ہو گیا۔ میں نے سر جھٹک کر کہا، ''نہیں پیا جی! اِسے لے جا کر فرسٹ ایڈ دیتے ہیں اور گاڑی میں لٹا دیتے ہیں۔ واپسی پر اگر یہ زندہ ہوا تو ملتان لیے چلیں گے۔ اگر مر گیا تو اِس کی قسمت..... بیلے میں کہیں پھینک کر اپنی راہ لگ دیں گے۔ پلیز!''

پیا نے بیزاری سے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں نے جلدی سے وحید کے نیم جان وجود کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔ کھالے نے میرا ساتھ دیا۔

پیا عقب سے بولا، ''ہم اِدھر ہی کھڑے ہیں، جلد آ جانا۔''

چونکہ اُس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا تھا، اِس لیے میں نے اُسے چھیڑنا اور ساتھ چلنے پر اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور وحید کو کاندھے پر ڈالے گاڑی تک آیا۔ ڈالے کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر میں نے برق رفتاری سے میڈیکل کٹ کھول لی۔ مجھے ایک ٹیکے کی تلاش تھی جو خوش بختی سے مل گیا۔

پیا جی نے جب اُس کا طبی معائنہ کیا تھا، تب مجھ پر باور ہوا تھا کہ وحید پر زخموں کی وجہ سے گہری بے ہوشی نہیں طاری تھی۔ وہ یا تو خوف کی شدت سے کوما میں چلا گیا تھا یا اُسے کوئی تیز اثر دوا دی گئی تھی۔ دوا کی مقدار میں زیادتی سے بھی اس کی یہ حالت ہو سکتی تھی۔ گردن، پیشانی اور ٹانگ پر لگنے والے زخم گہرے تو تھے مگر عام نوعیت کے تھے۔

گاڑی کی چھت والی بتی روشن کی، انجکشن تیار کیا اور اُس کے بازو کی وین تلاش کر کے دوا داخل کر دی۔ زود اثر دوا نے چند لمحوں میں ہی اپنا کام کر دکھایا اور وحید کی ماند پڑتی ہوئی سانس اور نبض میں جان پڑ گئی۔

میں نے فوری طور پر پٹی کا رول کھولا، اِسی دوران کھالے نے میری ہدایات پر عمل کرتے

ہوئے کاٹن رول سے روئی کے ٹکڑے نکال کر سپرٹ اور ٹنکچر میں بھگو لیے۔ پھر میں نے ماہرانہ انداز میں اُس کے زخموں کی صفائی کی اور بینڈ یج کرنے کے بعد نبض اور دھڑکن چیک کی، پتہ چلا کہ وہ بے ہوشی کی حالت میں کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو توانائی دینے اور انفیکشنز پر قابو پانے کے لیے دو ٹیکے لگائے اور کھالے سے کہا، ''میرا خیال ہے کہ اَب یہ ہماری واپسی تک زندہ رہے گا۔''

وہ بولا، ''اگر یہ ہوش میں آ گیا تو گاڑی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرے گا اور جنگلی جانوروں کے کام آ جائے گا۔''

''تو پھر کیا کریں؟'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''اگر اِس ڈبے میں کوئی بے ہوشی کا ٹیکہ ہے تو لگا دو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا، ''ہے تو سہی پر اِس حالت میں اسے لگایا نہیں جا سکتا۔ فوری موت واقع ہو سکتی ہے۔''

اُس نے کندھے اُچکائے، بتی گل کی، دوا نچ کے قریب عقبی دروازے کا شیشہ اُتارا اور بولا، ''اللہ سائیں اِیندھے تے کرم کریسی..... جُل نی تاں پیا لڑن وات آویسی۔''

(اس پر اللہ کرم کرے گا۔ چلو ورنہ پیا لڑنے مرنے پر تل جائے گا)

آگے پیچھے دوڑنے کے سے انداز میں چلتے ہوئے ہم پیا اور عقیل کے پاس پہنچے۔ وہ وہیں پیروں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔

پیا بولا، ''یار! تم لوگوں نے بہت سارا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ کیا بنا اُس کا؟''

کھالے نے بتایا، ''امید ہے کہ زندہ بچ جائے گا۔''

میرے دل سے دعا نکلی، ''یا اللہ! اُسے زندگی دے دے ورنہ اُس کی ماں اور بہن جیتے جی مر جائیں گی۔''

پیا نے درست کہا تھا۔ ہم نے وحید کے چکر میں نصف گھنٹے کے قریب وقت وحید کی امداد پر صرف کر دیا تھا۔

میں اپنی توجہ کا ارتکاز اپنے مشن پر ثبت رکھنا چاہتا تھا مگر بار بار وحید کا پیلا چہرہ آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا۔ اُسے کس نے یہاں لا پھینکا تھا؟ اس معصوم بچے سے کسی کو کیا دشمنی تھی؟ وہ کن حالات سے گزر کر اِس بیلے میں پہنچا تھا؟ وہ بھی اس حالت میں کہ نہ جی رہا تھا اور نہ ہی مر

تھا۔ اُسے ایک خونخوار بھیڑیے نے دیکھ لیا تھا اور اُسے کھینچ کر اپنی کہیں قریب واقع کچھار کی طرف گھسیٹ رہا تھا جہاں اُس کے خاندان کے کئی درندے موجود تھے۔ اگر ہم اس طرف نہ آتے تو یقینی طور پر اُسے بھیڑیوں کا غول کھا چکا ہوتا۔

میں سر جھٹک کر ان سوالات سے پہلوتہی برتنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہاں راستہ نہیں تھا، بس جھاڑیاں، کیچڑ اور قدم آدم کوندر تھی جس کو چیر کر کھالا آگے بڑھتا جا رہا تھا اور ہم تینوں اُس کی تقلید میں چلے جا رہے تھے۔ بڑی سڑک سے اُترنے کے بعد اب تک ہم نے جتنا بھی سفر طے کیا تھا، سب ویرانی اور بیابانی کا تھا۔ سوائے چھوٹے بڑے سوؤروں، گیدڑوں اور سیہہ کے کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا تھا۔ اگر سردار حیدر خان نے اپنے خفیہ اڈے کے لیے اِس علاقے کا انتخاب کیا تھا تو بے وجہ نہیں تھا۔

کوئی دس منٹ کے بعد کھالا رُک گیا۔ اس نے پلٹ کر سرگوشی کی، ''ہم اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ اِس جھنگی سے نکلیں گے تو سامنے حویلی کا پچھواڑا نظر آئے گا۔''

پیا کی ہدایت پر ہم سبھی نے ہتھیار سنبھالے، اپنی سانسیں معتدل کیں اور جھنگی سے نکل آئے۔ کھالے کی بات درست تھی۔ تقریباً سو قدموں کے فاصلے پر کیکر اور شہتوت کے درختوں میں گھری ہوئی حویلی کے آثار دکھائی دیے۔ گاگلز کی مدد سے کافی دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پیا بولا، ''یہاں تو کوئی آدمی نظر نہیں دیتا۔''

کھالے نے کہا، ''جب باہر کی دنیا سوتی ہے، تب حویلی کا اندر جاگتا ہے۔ چونکہ یہاں بجلی نہیں ہے، اِس لیے روشنی دکھائی نہیں دیتی۔''

پیا نے سرگوشی کی، ''ٹاسک کے لیے یہ موزوں ترین وقت ہے۔ ہمیں کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا کام کر کے یہاں سے نکلنا ہے۔ میں اور عقیل گیٹ کی طرف سے حویلی میں داخل ہوتے ہیں، تم دونوں پچھواڑے کی دیوار سے اوپر چڑھو گے اور چھت پر پہنچ کر انٹیک کر دو گے۔ یہ یاد رکھنا، ہم نے صرف حویلی میں موجود لوگوں کو الجھانا ہے، تم نے ٹارگٹ پر پہنچ کر لڑکی کو باہر نکالنا ہے۔ سمجھ گئے ناں؟''

اس کے ساتھ ہی اُس نے ہمیں مزید ہدایات دیں۔ طے پایا کہ ہم دونوں اپنے طور پر پروین کو تلاش کریں گے۔ وہ اپنے طور پر آگے بڑھیں گے اور حویلی کے محافظوں پر فائر کر کے انہیں الجھا دیں گے جس سے ان کا دھیان حویلی کی طرف سے ہٹ جائے گا۔ اکٹھے نہ ہو پانے

کی صورت میں حویلی سے نکلنے کے بعد ہر کوئی اپنے اپنے طور پر ڈالے تک پہنچے گا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم سبھی اکٹھے جائیں مگر پیا نے میری رائے کو سختی سے رَد کر دیا۔ بولا، ''جیسے میں کہہ رہا ہوں، ویسے ہی کرو۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''تمہیں کس طرح خبر ہوگی کہ ہم نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے؟''

وہ بولا، ''کھالے کے پاس بیلٹ میں اسٹیل کی ایک وِسل لٹک رہی ہے۔ اُسے پوری قوت سے بجا کر اور ڈالے کی طرف نکل جانا۔ کھالے! مجھے ذرا گیٹ کی صورت حال کے بارے میں بتاؤ؟''

کھالے نے بتایا، ''اس ہاتھ سیدھے چلے جاؤ۔ پانچ سات سو فٹ کی دوری پر حویلی کی نکڑ واقع ہے جس کے ساتھ ہی بڑا سا لکڑی کا گیٹ نصب ہے۔ گیٹ کے سامنے کچا راستہ چند قدموں کے فاصلے پر بل کھا کر بلوچ نگر والی سڑک کی طرف جاتا ہے۔ اس وقت حویلی کا دروازہ اندر سے بند ہوگا۔ یہ دھیان رکھنا کہ تمہاری مڈبھیڑ بل ٹیر رکتوں سے ہو سکتی ہے۔ ویسے تو یہ خطرہ ہمارے لیے بھی موجود ہے۔''

''فکر نہ کرو۔ کتوں کا علاج میرے پاس موجود ہے۔ اب جاؤ، تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔''

میں نے کھالے کی طرف دیکھا۔ اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ہم دونوں حویلی کے پچھواڑے کی طرف بڑھ گئے۔ کھالے نے کتوں کی موجودگی کی خطرناک خبر دی تھی۔ چونکہ ہم دونوں دیہاتی تھے، اِس لیے کتوں سے بخوبی نمٹنا جانتے تھے مگر پیا اور عقیل کی طرف سے پریشانی لاحق تھی۔ بل ٹیرر، جسے مقامی زبان میں بگاڑ کر 'گل ٹریے' کہا جاتا ہے، بڑے خونخوار اور ضدی کتے سمجھے جاتے ہیں اور لڑائی بھڑائی میں طاق اور شکست تسلیم نہ کرنا ان کے امتیازی اوصاف ہیں۔

ہم دونوں چوکس انداز میں برابر چلتے ہوئے، درختوں کے بیچ سے گزر کر حویلی کی بلند دیوار تک پہنچے۔ ایسے ہی وقت میں ایک درخت کے عقب سے سفید رنگ کے بڑے قد والے کتے نے جست لگائی۔ اس کا نشانہ کھالا تھا۔ چونکہ ہم دونوں بہت محتاط تھے، اِس لیے کھالے نے جسیم کتے کے عزائم کو بھانپنے اور خود کو بچانے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ وہ اُچھل کر ایک طرف ہوا، جونہی کتا اپنی جھونک میں آگے جا کر پلٹا، کھالے نے گن نیچے پھینک کر اس پر چھلانگ

لگائی اور آنِ واحد میں دبوچ لیا۔ کتا سنبھلنے سے قبل ہی اُس کے مخصوص داؤ میں آ گیا تھا۔ میں نے اُس کی جانب سے توجہ ہٹائی اور چاروں جانب بغور دیکھا۔ کوئی اور کتا دکھائی نہیں دیا۔

کھالا کتے کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ہاتھ میں ہاتھ پھنسا کر کتے کا نرخرہ دبا رکھا تھا۔ ڈیڑھ دو منٹ میں ہی کتے کے حلق سے خارج ہونے والی موہوم سی خرخراہٹ دم توڑ گئی اور کتا بے جان انداز میں زمین پر گر گیا۔ وہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا مر چکا تھا۔ کھالا اپنے اِس داؤ سے نور پور میں اَن گنت کتوں کی جان لے چکا تھا۔

اپنا کام نمٹا کر وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی گن اُٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے دیوار کی طرف بڑھا۔ میں نے تقلید کی۔ پختہ اینٹوں کی دیوار پر پلستر نہیں کیا گیا تھا۔ بارشوں نے اینٹوں کے بیچ کی چکنی مٹی نکال لی تھی جس کی وجہ سے دیوار میں بڑی بڑی درزیں بن چکی تھیں۔

کھالے نے سرگوشی کی، ''شہرے! ایں دِوار تے چڑھن تاں بہوں سکھا ہے۔''

(شہرے! اس دیوار پر چڑھنا تو بہت آسان کام ہے)

اس نے درست کہا تھا۔ میں نے جلدی سے گن کندھے پر لٹکائی اور اپنی انگلیاں دیوار کی اینٹوں میں پھنسا دیں۔ جوتے اُتارے بغیر میں بڑی آسانی سے بلند دیوار پر چڑھتا گیا۔ میرے متوازی کھالا بھی چھپکلی کی طرح دیوار سے چپک کر بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے منڈیر سے سر نکال کر احتیاط سے چھت پر دیکھا۔ کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میدان صاف پا کر میں چھت پر چڑھ گیا اور کھالے کو اوپر آنے کا اشارہ کر دیا۔ کچھ دیر تک ہم محتاط نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتے رہے۔ اسی دوران ہم نے اپنی گنوں کو فائرنگ پوزیشن دی، پستول نکال کر ہاتھوں میں تھام لیے اور خود کو کسی بھی ناگہانی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ پھر چھت پر دھمک پیدا کیے بغیر دبے پاؤں چلتے ہوئے صحن کی جانب والی منڈیر تک آئے۔ میں نے کھالے کو اپنے پیچھے رُکنے کا اشارہ کیا اور آہستگی سے جھانک کر صحن میں دیکھا۔ غیر متوقع طور پر صحن خالی تھا۔

میرا اشارہ پا کر کھالا بھی آگے بڑھ آیا۔ سرگوشی میں بولا، ''کچھ نظر آیا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میرے سامنے طویل و عریض صحن واقع تھا جس میں کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حویلی کی اگلی داہنی نکڑ پر بڑا سا چوبی گیٹ نظر آ رہا تھا جو اِس وقت چوپٹ کھلا تھا۔ اسے کھالے کے بقول اس وقت بند ہونا چاہیے تھا۔ بائیں ہاتھ پر اگلی دیوار تک

قطار میں کمرے واقع تھے۔ کسی کمرے میں بتی روشن نہیں تھی۔ سبھی سوئے ہوئے تھے یا حویلی میں اِس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔

کھالے نے سرگوشی کی، ''شہرے! جو بھی ہے، اسی چھت کے نیچے ہے جس پر ہم کھڑے ہیں۔ چلو، نیچے اُترتے ہیں۔''

اُس نے بائیں ہاتھ چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں اس طرف بڑھا۔ چھت کے اختتامی حصے میں سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ گاگلز کی مدد سے میں یہ دیکھ پانے میں کامیاب رہا کہ سیڑھیوں کی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ تبھی پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا۔ کھالا میرے عقب میں چلا آ رہا تھا۔ سیڑھیاں کشادہ برآمدے میں ختم ہوئیں۔ اس دس فٹ چوڑے برآمدے میں تین پرانی طرز کے چوبی دروازے دکھائی دے رہے تھے مگر ان میں بھی کوئی بتی نہیں جل رہی تھی۔

کھالے نے تشویش ناک لہجے میں سرگوشی کی، ''شہرے! کوئی گڑبڑ ہے یار!''

اس کی آواز میں چھپی ہوئی خنکی مجھے وجود میں اُترتی محسوس ہوئی۔ میں نے کان لگائے، کچھ سننے کی کوشش کی مگر سوائے درختوں کی مخصوص سرسراہٹ کے فضا بالکل صاف تھی۔ پہلے دروازے کے پاس پہنچ کر کھالے نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور خود دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ کھالے نے اندر جھانکا۔ مطلق اندھیرے میں اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا ہوگا۔ وہ بلی کی طرح دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے کمرے میں ہلکی سی روشنی پھیلی۔ میں خود پر اختیار نہ رکھتے ہوئے کمرے میں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔ کھالا ایک ہاتھ میں ننھی سی ٹارچ لئے کمرے کے صحن میں کھڑا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کمرہ بالکل خالی تھا۔

کوئی وقت ضائع کئے بغیر ہم دونوں نے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ اُس کمرے میں بھی سوائے چارپائیوں، ٹرنکوں اور روائتی بندوقوں کے کچھ نہ ملا۔

کھالے نے سرگوشی کی، ''شہرے! کام خراب ہے۔ لگتا ہے کہ حیدر خان کے کارندوں کو ہماری آمد کی خبر مل گئی ہے۔ وہ یا تو یہاں سے کسی اور ٹھکانے میں منتقل ہو گئے ہیں یا پھر چھپ کر ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے کے چکر میں ہیں۔ جلدی کرو..... ہمیں جلد از جلد تلاشی لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

ہم دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے تیسرے کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہ کمرہ بھی بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میرے رگ و پے میں آگ بھر گئی۔ میں نے دانت پیس کر کہا، ''کھالے! میں حیدر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا.....''

اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور ٹارچ کی روشنی اردگرد مارنے لگا۔ کمرے میں موجود سامان کو دیکھنے پر با آسانی احساس اجاگر ہوتا تھا کہ کمرے میں رہنے والے فوری طور پر کمرے سے نکل گئے تھے۔ انہیں اتنی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ وہ اپنا سامان سمیٹ لیتے۔ کونے والے کمرے کے آگے سٹور بنا ہوا تھا۔ میں نے جونہی سٹور کی کنڈی کھولی اور ٹارچ کی روشنی میں سیلن زدہ اسٹور کے اندر جھانکا، میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ٹارچ کی ناکافی روشنی میں دکھائی دینے والے ملگجے منظر نے چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ میرے بدن میں اُتار دیا تھا۔

کمرے کی داہنی دیوار کی جڑ میں چار لاشیں آڑی ترچھی فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے زمین بوس ہونے کا انداز چغلی کھاتا تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی سانس بَر نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر کھالے کو دیکھا جو میری جانب پشت کئے چوکس انداز میں کھڑا اِردگرد دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے کھڑا رہنے دیا اور خود محتاط انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔ چاروں چہروں پر باری باری ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ وہ سبھی میرے لئے اجنبی تھے۔

میں نے پیروں کے بل بیٹھ کر پہلے شخص، جس کے بدن پر بڑا سا جانگیہ اور سفید رنگ کی عام سی بنیان تھی، کی کلائی تھامی۔ نبض تھامنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اُس کے بدن میں موت کی خنکی اُتر چکی تھی۔ سرد کلائی نے بجھا دیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے سرد ہو چکا تھا۔ میں نے اُس کے سینے پر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ کوئی زخم دکھائی نہیں دیا۔ چہرے کو غور سے دیکھا تو پتہ چل گیا کہ اُس کی موت سانس گھٹنے سے واقع ہوئی تھی کیونکہ اُس کے موٹے ہونٹ نیلگوں ہو چکے تھے۔ بند آنکھوں کے پپوٹوں پر نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اُس کی گردن میں رسی کا پھندا دکھائی دیا تو میں اک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر اُٹھا اور دوسری لاش کے پاس جا بیٹھا۔ وہ زندگی میں دبلے پتلے جسم کا مالک رہا تھا۔ اِس وقت ویل کی سفید قمیص اور شلوار میں ملبوس تھا اور اُس کی گردن میں نائیلون کی باریک مگر بہت مضبوط رسی پھنسی ہوئی تھی۔ چہرہ نیلاہٹ پکڑ چکا تھا۔ آنکھیں وحشت ناک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔

تیسرا شخص کافی فربہی مائل تھا۔ اُس نے تہ بند اور سفید رنگ کا میلا سا سلوکا پہن رکھا تھا۔

اُس کا کسرتی بدن بھی موت کا پیرہن اوڑھ چکا تھا۔ اُسے قتل کرنے کا طریقہ بھی وہی تھا یعنی گلے میں رسی باندھ کر پھانسی دی گئی تھی۔ چوتھا شخص خاصا لمبا تڑنگا تھا۔ اُس کا چہرہ گھنی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں میں چھپا ہوا تھا۔ سر کے بال بھی خاصے بڑے بڑے تھے۔ اِس وقت وہ کمرے کی نکڑ میں گردن کے بل یوں ڈھیر ہوا پڑا تھا جیسے اُس کا منکا ٹوٹ چکا ہوا۔ گلے کی رسی بڑے کالروں والی قمیص کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر مجھے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ اس کے گلے میں بھی موت کی رسی تن چکی تھی۔

اِس کے باوجود کہ میں یہاں مرنے مارنے کی نیت سے ہی آیا تھا، چار مردہ بدن دیکھ کر میرے تن بدن میں خوف کی لہریں سرسرانے لگیں۔ میرے سامنے ایک قطار میں چار انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کاٹھ کباڑ کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیا۔

اس ہولناک کمرے سے نکل کر کھالے کے پاس پہنچا، اُسے ہولے سے پکارا۔ وہ میری جانب پلٹا، ''ہاں! کیا ہے وہاں؟''

میں نے کہا، ''کھالے! کمرے میں چار لاشیں پڑی ہیں۔''

وہ چونکا، میرے پہلو سے نکل کر کمرے میں گیا، پلٹا تو اُس کے تن بدن میں غیر معمولی پھرتی بھری ہوئی تھی۔ بولا، ''جلدی کر شہرے..... اُن کمرے کی تلاشی لیتے ہیں۔''

وہ مجھے دیکھے بغیر تیزی سے صحن کو چیرتے ہوئے قطار میں بنے ہوئے کمروں کی طرف بڑھا۔ اَب اُس نے احتیاط پسِ پشت ڈال دی تھی۔ میں ہیجان آمیز انداز میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ پہلے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں تین جھلنگا سی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ایک چارپائی پر کٹی ہوئی رسیوں کے ٹکڑے اور سرخ رنگ کا دوپٹہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھپٹ کر دوپٹہ اُٹھا لیا اور دانت پیس کر بولا، ''کھالے! اِہ تاں پینوں دی چنی اے.....''

(کھالے! یہ تو پروین کا دوپٹہ ہے)

کھالے نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ اس کے ساتھ والی چارپائی کے نیچے ٹارچ کی روشنی پھینک کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر عجیب سی دیوانگی طاری ہوگئی۔ میں نے دوپٹہ کو اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور چارپائی کے گرد برق رفتاری سے چکر لگایا۔ فرش پر جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں

دکھائی دے رہی تھیں اور بلاشبہ یہ پروین کی کلائیوں سے ٹوٹ کر گری تھیں۔

کھالے نے میری کیفیت بھانپتے ہوئے سخت لہجے میں کہا، ''باؤلا ہو گیا ہے کیا؟ عقل کے ناخن لے، ہماری تھوڑی سی حماقت ہماری جان لے لے گی۔''

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ کھالے نے اچانک میرے سامنے آ کر مجھے بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ وہ شاید ایسا نہ کرتا تو میں اپنے حواس میں نہ رہتا اور واقعتاً کوئی حماقت کر بیٹھتا۔ یوں لگا جیسے میں یکا یک ہوش میں آ گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہمیں پروین کا ایک جوتا، ٹوٹا ہوا نقرئی کنگن اور مردانہ کھیڑی چپل کی جوڑی نظر آ گئی۔ کمرے میں دوبارہ بور کی بندوقیں، ایک پستول اور استعمال کی کئی اشیاء موجود تھیں۔ فرش پر جگہ جگہ سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔

کھالا بولا، ''یہ تو طے ہو گیا کہ پروین کو یہیں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اِس چارپائی پر کسے باندھا گیا تھا؟ یہ سوچنے والی بات ہے۔''

''مگر پروین کہاں ہے اِس وقت؟'' میں تیز لہجے میں بولا۔

کھالا مجھے کھینچ کر کمرے سے باہر لے آیا۔ کمرے کے باہر پیا اور عقیل ہمارے منتظر تھے۔ پیا نے پوچھا، ''اس کمرے میں کیا ہے؟''

میں نے تفصیل سے آگاہ کیا۔ وہ پریشان انداز میں بولا، ''پوری حویلی خالی پڑی ہے۔ نکڑ والے چھوٹے کمرے میں چار لاشیں پڑی ہیں جو یقیناً اس حویلی میں رہنے والے حیدر خان کے گنڈوں کی ہیں جنہیں کسی نے بے دردی سے قتل کیا ہے۔ قاتل نے انہیں مزاحمت کرنے کی مہلت بھی نہیں دی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم سے پہلے یہاں آنے والے یا آنے والوں نے آتے میں ہی ان کا قلع قمع کر دیا ہے۔''

''کیا تم نے یہ کمرے دیکھے ہیں؟'' کھالے نے پوچھا۔

''ہاں.....'' پیا بولا۔ ہم اس دوران چلتے ہوئے صحن کے بیچ آن کھڑے ہوئے تھے، ''ایک کمرے میں ایسے آثار دکھائی دیے ہیں جیسے وہاں کسی لڑکی کو باندھ کر رکھا گیا ہو۔ رسیوں اور چادروں کے ٹکڑے فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ حویلی کا بڑا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔''

ہم چاروں متفکر انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا، ''مگر اِس کمرے میں، جس کمرے کی ہم نے تلاشی لی ہے، ایسا سب کچھ ہم نے بھی دیکھا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ پروین کے علاوہ بھی کسی لڑکی کو یہاں باندھ کر رکھا گیا ہے؟''

پیا نے کندھے اُچکائے۔ ہمیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کھالا تیز تیز قدموں سے پہ کے بتائے ہوئے کمرے میں گھسا۔ چند لمحوں کے بعد اس کمرے سے نکل کر حویلی کے آخری کمرے میں گھس گیا۔

میں مایوس انداز میں اردگرد دیکھ رہا تھا۔ میری تمام تر ریاضت اکارت گئی تھی۔ حویلی کی چھت پر کھڑے ہو کر میں نے جن امیدوں کا دامن تھاما تھا وہ بے جان انداز میں میرے گلے سے لپٹ گئی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ میری سانسیں تنگ کرنے لگی تھیں۔ کھالے نے واپسی پر بتایا، ''پہ نے ٹھیک کہا ہے۔ اس کمرے میں بھی کسی لڑکی کو رکھا گیا ہے۔''

میں نے پوچھا، ''اور آخری کمرے میں؟''

''وہ تو خان کا عشرت کدہ ہے۔'' اس کے لہجے میں غیر معمولی نفرت گھل گئی۔ پھر پیا کے کہنے پر ہم سب نے پوری حویلی چھان ماری۔ یہ تو حتمی تھا کہ ہم سے پہلے یہاں کوئی آیا تھا اور خان کے شاہ زوروں کی خوابیدگی کو موت کی اتھاہ گہرائی میں بدلتے ہوئے پروین سمیت دو یا تین لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گیا تھا۔ کھالے کا خیال تھا کہ حملہ آور دو لڑکیوں اور ایک مرد کو حیدر خان کے چنگل سے نکال کر کہیں لے گیا تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت کون تھے؟ یہ علم نہیں ہو سکا تھا۔ کوئی کلیو ہمارے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی آسمان سے سیدھا حویلی میں اُترا تھا اور چار زور آوروں کو ہلاک کرنے اور تین مغویوں کو کاندھوں پر لاد کر واپس آسمان کی طرف پرواز کر گیا تھا۔

پیا کا ذہن جاگ رہا تھا۔ اُس پر مایوسی کی تھکن طاری نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک کمرے سے ایک چھوٹا سا چوبی صندوق کھینچ کر باہر نکال لایا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے مسکرا کر بتایا، ''اس میں جدید اسلحہ ہے، ایسا کہ میڈم دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ہمارے ناکام دورے کا مالِ غنیمت ہے.....''

ہمیں حویلی میں دندناتے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کسی نے دخل نہیں دیا تھا۔ جہاں دن کے اُجالے میں کوئی آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، وہاں رات کے اس پہر، کس نے آنا تھا۔ حویلی کا اندر مردہ ہو چکا تھا۔ حویلی کا باہر زندہ تھا مگر گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ مایوسی میرے رگ و پے میں سرایت ہو چکی تھی۔

جب پیا نے واپسی کا حکم دیا، یوں لگا جیسے میری ٹانگیں شل ہو گئی ہوں اور واپسی کی راہیں

تاریک..... میں نے کھالے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور گلوگیر ہو گیا، ''کھالے! پروین نہیں ملی۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی؟''

کھالے نے مجھے سینے سے لگایا، تسلی دی اور کمر میں ہاتھ ڈال کر حویلی کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اسلحے والا صندوق عقیل نے اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ اُس کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ صندوق خاصا وزنی تھا۔ ہم جس راستے سے آئے تھے، اُسی پر چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچے۔ ابھی تک چہار سو دبیز اندھیرا طاری تھا۔ گاڑی میں وحید کو دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس حلق میں اُتاری۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا یا گہری نیند میں تھا۔ پیا کی مدد سے عقیل نے صندوق گاڑی کے عقبی حصے میں رکھا اور ہاتھ جھاڑ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہم چاروں نے لباس بدلا، غیر ضروری اسلحہ چھپا دیا اور واپسی سفر آغاز کیا۔ پروین کا سرخ دوپٹہ میں نے اپنی جھولی میں رکھ چھوڑا تھا اور عجیب یاس بھری سرد نگاہیں اُس پر جما دی تھیں۔

پیا نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی بیک مرر میں میرے اور کھالے کے درمیان گردن ڈھلکائے پڑے ہوئے وحید کو دیکھا اور پوچھا، ''کیا بچ جائے گا؟''

میں نے غیر ارادی طور پر وحید کی نبض ٹٹولی اور مطمئن انداز میں کہا، ''ہاں..... یہ خطرے سے باہر ہے۔''

کھالے نے وحید کی کمر میں بازو حائل کیا اور اُسے بڑی نرمی سے اپنی جھولی میں لڑھکا لیا۔ میں نے کہا، ''کھالے! وہ کون ہو سکتا ہے جس نے موت کے منہ میں چھلانگ لگا کر پروین کو حیدر خان کی حویلی سے نکال لے جانے کی جرأت کی؟''

کھالے نے کندھے اُچکائے، بولا، ''ہمارا کوئی نہیں..... جو بھی ہے، وہ یا تو حیدر خان سے پرخاش رکھتا ہے یا اُس دوسری لڑکی کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ شہرے! اگر ہماری قسمت جاگ رہی ہے تو پھر میرا اندازہ درست بھی ہو سکتا ہے۔''

''مگر پھر وہ پروین کو اپنے ساتھ کیوں لے گیا؟''

''بچوں جیسی باتیں کرتے ہو یار!'' کھالا حسبِ عادت جھنجلا گیا، ماتھے پر بل ڈال کر بولا، ''اگر ہم پروین کے ساتھ کسی اور قسمت ماری کو قید میں پڑا دیکھتے تو کیا اُسے یہیں چھوڑ جاتے؟''

مجھے اپنے احمقانہ سوال پر ایک ذرا خفت ہوئی۔ میں نے کہا، ''اِس کا کیا قصہ ہے؟''

میرا اشارہ اُس کی گود میں پڑے وحید کی طرف تھا۔

پیا کی آواز گاڑی میں گونجی، ''میر وشاہ کے غنچے کا خیال ہے کہ یہ سارا اسٹیج پلے تم نے سجایا ہے۔ کیوں خالد؟''

یہ کہہ کر اُس نے دِل کھول کر قہقہہ لگایا۔ کھالے نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ میں نے خشمگیں نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا اور کہا، ''مجھے تم دونوں کا یوں ہنسنا بہت برا لگ رہا ہے۔''

کھالے نے جلدی سے کہا، ''تو کیا تمہاری یہ بے معانی تفتیش ہمیں اچھی لگ رہی ہے؟ تم نرے گاؤدی ہو۔ پیا جی نے سچ کہا ہے۔ کیا میں نے یہ سارا ناٹک رچا رکھا ہے جو تم مجھ سے سوال پر سوال کئے جا رہے ہو؟ جو کچھ تم نے دیکھا، وہی کچھ ہم سب نے دیکھا ہے۔ جو اندازہ ہم لگا سکتے ہیں، تم بھی لگا سکتے ہو۔''

میں نے ایک نگاہِ شکایت کھالے کو دیکھا۔ وہ بدل گیا تھا یا پھر میری نظر بدل گئی تھی۔ میں نے کہا، ''کھالے یار! میں بہت پریشان ہوں۔ دیکھو! ہمارے ساتھ قسمت نے کیا کھیل کھیلا ہے۔ وحید کی نیم مردہ حالت، چار لاشوں والی خالی حویلی، ہمارا ناکام سفر..... کیا یہ سب کچھ پریشان کن نہیں ہے؟''

کھالے کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری، بولا، ''سامنے کی بات ہے، سمجھنے کی کوشش کرو تو سمجھ جاؤ گے۔ وحید کی یہاں موجودگی ہم پر یہ واضح کرتی ہے کہ پروین کے ساتھ یہاں قید میں رکھی گئی لڑکی عاشی کے سوا کوئی دوسری نہیں تھی۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ خان کے غنڈوں نے وحید کو مردہ تصور کر کے یہاں بیلے میں پھینک دیا تھا کہ اِس کی لاشیں جنگلی جانور نوچ کھائیں۔ اس کی قسمت بھلی تھی کہ ہم غیر متوقع طور پر عین اُس وقت یہاں پہنچ گئے جس وقت یہ ایک ناہر (بھیڑیے) کا نوالہ بننے والا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تیسرا قیدی امیر نواز تھا جسے پروین کے ساتھ یہاں باندھ کر رکھا گیا تھا۔ اب یہاں ہم سے پہلے کون پہنچا، اُسے کس کی تلاش تھی، پروین، عاشی یا امیر نواز کی..... یہ تو اللہ سوہنا ہی جانتا ہے۔ یہ بھی علم نہیں کہ باہر سے کوئی آیا، یا اندر موجود مغوی جو امیر نواز بھی ہو سکتا ہے، کوئی اور بھی، خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا ہو اور اس نے یہ کارروائی کی ہو..... بہر حال ان باتوں کا وقت آنے پر پتہ چلے گا۔''

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ شرمندگی ہوئی۔ خواہ غلط ہی ثابت ہوتی، اس کے ذہن نے اندازوں کی بنیاد پر ایک کہانی تیار تو کر ہی لی تھی جبکہ میرے ذہن نے اَب تک کچھ بھی نہیں

کیا تھا۔

اس کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ تیسرا قیدی امیر نواز ہو سکتا تھا کیونکہ وہ بھی نور پور سے غائب تھا۔ اُس کے پراسرار غیاب نے اُس کی ذات مشکوک کر دی تھی۔ اغوا کاروں نے عاشی کو جب اغوا کیا ہوگا، تب وحید بھی اُس کے ساتھ ہوگا۔ انہوں نے وحید کو بھی عاشی کے ساتھ اغوا کر لیا ہوگا تا کہ ان کی کارروائی کا عینی شاہد کسی کو کچھ بتا نہ پائے۔ حیدر خان کے پالتو غنڈے حد درجہ ظالم فطرت اور سفاک تھے۔ زندگی، عزت اور رحم ان کے قرب کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ علاقے کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ حیدر خان کے پاس اشتہاریوں اور قاتلوں کا ایک گروہ ہے جو اُس کے ہلکے سے اشارے پر خون کی ندیاں بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اگر حیدر خان ان کی سرپرستی نہ کرے تو قانون کے رکھوالے اُنہیں ایک سانس بھی سینے میں اُتارنے کا موقع نہ دیں۔ ان اشتہاریوں میں سے آج چار دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔

ہچکولوں کی تال پر نئی اور آرام دہ گاڑی عازم سفر تھی جبکہ میرے ذہن میں خان کی سالخوردہ مگر محفوظ اور بھیانک حویلی کے مناظر جاگ رہے تھے۔ چاروں مردہ نیلگوں چہرے، ان کی گردنوں میں دھنسی ہوئی نائیلوں کی سرخ ڈوری اور سکوت اور اندھیرے کا ڈراؤنا راج..... چشمِ تصور میں ایک بہت ہی جسیم اور طاقت ور وجود اُبھرا جس نے آن کی آن میں چاروں شہ زوروں کا زندگی سے ناتا کاٹ دیا اور تین قیدیوں کو اُٹھا کر چلتا بنا۔ کیا کوئی شخص اتنا طاقتور ہو سکتا تھا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چاروں پر ٹوٹ پڑنے والا کوئی ایک شخص نہ ہو بلکہ کوئی مضبوط اور ان سے بھی زیادہ ظالم فطرت گینگ ہو..... سردار حیدر خان کا کوئی دشمن بھی یہ وار کر سکتا تھا۔ اس صورت میں میری پروین ایک بھیڑیے کے چنگل سے نکل کر دوسرے کے بھیانک جبڑوں میں جا پھنسی تھی۔ میں نے جب اپنے اس خدشے کو کھالے پر اظہار کیا تو وہ بولا، ''یہ بعید از قیاس بھی نہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کوئی ایک شخص ہی تھا، دل جلا، یا کوئی من جلا..... رہی بات تین قیدیوں کو اُٹھا کر لے جانے کی، تو ممکن ہے کہ تینوں اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوں اور اس کے ساتھ روانہ ہو گئے ہوں۔''

اچانک میری توجہ وحید کی طرف مبذول ہوئی۔ میں نے کہا، ''اس کا کیا کرنا ہے؟''

پیا نے ہنس کر کہا، ''یہ تو تمہارا کیس ہے، جہاں کہو گے، وہیں پھینک کر ملتان چلے جائیں گے۔''

میں نے گاڑی کے باہر قد آدم پھیلے ہوئے سرکنڈوں سے الجھتے ہوئے رات کے آخری پہر کو دیکھا، کچھ سوچا پھر پوچھا، ''ہم اسے کہاں اُتار سکتے ہیں؟''

''چوک قریشی کے آس پاس.....'' کھالے نے جلدی سے کہا۔

''کیا ہم اسے اپنے ساتھ ملتان نہیں لے جاسکتے؟'' میں نے پوچھا، ''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ پوچھ سکتے ہیں۔''

پیا نے کہا، ''نہیں شہریار! یہ صرف یہی بتا سکتا ہے کہ اسے اور اس کی بہن کو کس طرح اغوا کیا گیا۔ ہمیں اس منظر کشی کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو.....پھر کیا چوک قریشی میں اتار دیں؟''

''بہتر تو یہی ہے.....مگر.....''

''کیا مگر.....؟''

''میرا خیال ہے کہ.....کہ.....'' پیا سوچ میں پڑ گیا، ''اسے ساتھ لے جانا ہی بہتر ہوگا، کہیں یہ نہ ہو کہ اسے پھر اغوا کر لیا جائے۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا اندیشہ بے محل نہیں تھا۔ پھر کچھ سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ وحید کو اپنے ساتھ ملتان لے جانا چاہیے۔

ڈیرہ روڈ پر چڑھتے ہی گاڑی کا میٹر سو کا ہندسہ عبور کر گیا۔ چوک قریشی، بصیرہ اور مظفر گڑھ کے باسی ابھی گہری نیند میں ہی تھے جب ہم گزر کر دریائے چناب کے پل پر پہنچے۔ ٹول پلازے اور دریا کے پل کے درمیان پولیس نے ناکہ لگا رکھا تھا۔ پیا نے گردن موڑے بغیر دھیمے لہجے میں کہا، ''شہریار! یہ تمہارا بیٹا ہے اور سخت بیمار ہے، اِسے ہم ڈیرہ غازی خان سے نشتر ہسپتال میں داخل کروانے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ ہم بہت جلدی میں ہیں۔ او کے؟''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اسی دوران ہماری گاڑی لین میں رُک چکی تھی۔ ہم سے آگے چار پانچ کاریں کھڑی تھیں۔ ایک ویگن بھی لین میں لگی ہوئی تھی۔ پیا بولا، ''یار! یہ تو بڑا سخت چیکنگ کر رہے ہیں اور کاروں کی ڈگیاں بھی کھول کر دیکھ رہے ہیں۔ لگتا ہے ہمارے کسی بھائی بند نے کوئی بڑا ہاتھ مارا ہے کہیں پر.....''

پندرہ بیس منٹ کے بعد ہماری باری آئی۔ دونوں جانب سے وردی پوشوں نے گاڑی کو گھیرے میں لے لیا۔ پیا کی طرف آنے والے اہلکار نے اُسے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔

نے شیشہ اُتار کر نہایت سنجیدگی سے کہا، ''بھائی! ہم ایمرجنسی میں ہیں۔ ہمارا بچہ بیمار ہے۔ اسے فوری طور پر نشتر ہسپتال میں پہنچانا ہے۔''

ساتھ ہی اُس نے ہماری سمت ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اہلکار نے عقبی دروازے کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھنا چاہا مگر اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پیا نے فوراً لائٹ آن کی، شیشہ اُتارا اور کہا، ''دیکھ لیجئے..... ہم ڈیرہ غازیخان سے آ رہے ہیں۔ اپنی تسلی کر لیجئے اور خدارا ہمیں جلد فارغ کر دیجئے۔''

اہلکار کو بے ہوش بچہ دکھائی دیا۔ بچے کی بینڈ تیج بھی نظر آ گئی۔ بولا، ''یہ تمہارا کیا لگتا ہے؟''

پیا نے کہا، ''یہ میرا کچھ نہیں لگتا۔ یہ سردار احمد بخش کھوسہ کا نواسہ ہے، میں اس کا ڈرائیور ہوں۔''

سردار احمد بخش کھوسہ ڈیرہ غازی خان کا معروف سیاست دان تھا۔ جونہی اُس کا نام کانسٹیبل کے کانوں میں پڑا، اُس کی تمام حسیں یکا یک بیدار ہو گئیں۔ بولا، ''ٹھیک ہے سائیں..... تم جا سکتے ہو۔''

ساتھ ہی اُس نے اپنے ساتھیوں کو مخصوص انداز میں بیریئر ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔ پیا نے دونوں شیشے چڑھائے اور گاڑی نکال لی۔ طویل سانس لے کر بولا، ''نئی اور بڑی گاڑی کا یہی فائدہ ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے افسر پر اس کی چمک کا دبدبہ پڑ جاتا ہے۔''

میں نے کہا، ''اگر وہ سردار سے کنفرم کر لیتا تو.....''

ہم اس وقت چناب کے پل کے وسط میں پہنچ چکے تھے۔ وہ فلک شگاف قہقہہ لگا کر بولا، ''یہ کانسٹیبل تھا۔ اگر ایس ایچ او بھی ہوتا تو کنفرمیشن کی جرأت نہ کرتا۔ ایک بات ہے..... یہ منڈا ہمارے کام آ گیا ورنہ انہوں نے تلاشی لیے بغیر ہمیں گزرنے نہیں دینا تھا۔ ہمارے پاس گاڑی میں اتنا اسلحہ رکھ کر گھومنے کا کوئی جواز نہیں ہے، اس لیے فوراً دھر لیے جاتے۔''

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ ہمارے پاس جدید طرز کے اسلحے کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ حیدر خان کی حویلی سے اٹھایا گیا اسلحہ میں نے دیکھا تو نہیں تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس کی نوعیت بہت خطرناک تھی۔ پیا جی نے عام نوعیت کی بارہ بور رائفلوں اور سیمی آٹو میٹک گنوں کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ اگر ان گنوں کی اُس کے نزدیک کوئی اہمیت ہوتی تو حویلی میں موجود گنوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انہیں گاڑی میں رکھنے کی گنجائش بھی نہ نکل پاتی۔

ابھی رات کا اندھیرا ملتان کے در و دیوار سے لپٹا ہوا تھا جب ہم اپنی کوٹھی پر پہنچے۔ ظاہر شاہ نے چیک کرنے کے بعد گیٹ کھولا۔ پورچ میں گاڑی روکنے کے بعد پیا نے کہا، ''شہر یار! تم اس بچے کو اُٹھا کر گیسٹ روم میں لے جاؤ۔ ہم اسلحے کو اسٹور کر کے چلے جائیں گے۔ میر و شاہ سے رابطہ کر کے اُسے رپورٹ دے دینا۔ او کے؟''

میں نے 'او کے' کہا اور گاڑی سے اُتر کر بچے کو کھینچ کر کندھے پر ڈال لیا۔ کھالا میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ گیسٹ ہاؤس کے مین لاؤنج میں کرسی پر براجمان گن مین سے میں نے میڈم اور میر و شاہ کے بارے استفسار کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے وحید کو رَسان سے بیڈ پر لٹا دیا اور خود صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ کھالا بیڈ پر بیٹھ کر وحید کو دیکھنے لگا۔

میں نے کہا، ''کھالے! اب کیا ہوگا؟''

کھالے کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اُس نے چونک کر مجھے دیکھا، ایک نظر وحید پر ڈالی اور کہا، ''میں کیا کہہ سکتا ہوں یار؟ ایک کوشش ناکام ہوگئی ہے، دوسری کوشش بھی ناکام ہوسکتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم شکست تسلیم کر کے بیٹھ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم کسی بھی وقت پروین تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اللہ ہماری مدد کرے گا۔''

تھوڑی سی تاخیر نے میری بہن کو مجھ سے نجانے کتنا دور کر دیا تھا۔ اگر ہم گھنٹہ بھر پہلے پہنچ جاتے تو وہ ہمیں مل جاتی۔

مجھے افسردہ اور متأسف دیکھ کر کھالے نے ہمدردی سے کہا، ''غم نہ کرو شہرے خان! مجھے یقین ہے کہ پروین کے ساتھ امیر نواز ہے، وہ مر تو جائے گا مگر اُس پر آنچ نہیں آنے دے گا۔''

میں نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا۔ اس یقین کا پس منظر کوئی نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''کھالے! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سردار حیدر خان کے کسی دشمن نے یہ کارروائی کی ہو اور وہ بھی اِسی قماش کا آدمی ہو، پھر؟''

کھالے کے لبوں پر آزردہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا، ''شہرے! تم نے پڑھ لکھ کر گنوا دیا ہے۔ بھلے آدمی! یہ کارروائی اکیلے آدمی کی ہے۔ اگر وہ بھی خان کے قبیل کا کوئی فرد تھا تو اُسے لڑکیوں کے ساتھ ساتھ امیر نواز کو لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ جہاں چار آدمیوں کو قتل کر چکا تھا، وہیں ایک اور قتل بھی کر دیتا۔ وہ ہمارا خیر خواہ تھا یا نہیں، وہ اغوا ہونے والوں کا ہمدرد ضرور تھا۔''

میں نے فون پر میر وشاہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کئی مرتبہ بیل بجنے کے بعد بھی فون اٹینڈ نہیں کیا گیا۔ وہ شاید سو رہا تھا۔ میرے پاس میڈم کا نمبر نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو میں اس سے اس وقت رابطہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ چونکہ ہم اپنے مشن میں ناکام رہے تھے، اِس لیے کسل مندی اور نقاہت بدنوں پر طاری تھی۔ میں نے جماہی لی، پانی کا ایک گلاس حلق سے اُتارا اور وحید کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک غلطی ہوگئی تھی۔ گاڑی سے اُترتے ہوئے میں میڈیکل کٹ اُٹھانا بھول گیا تھا۔ وحید کے لیے کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

وحید کی نبض کی رفتار نارمل تھی۔ دھڑکن بھی ٹھیک تھی۔ وہ ٹیکوں کے گہرے اثر میں تھا اور اسے جگانا مناسب نہیں تھا۔ تبھی میں اُس کے برابر لیٹ گیا۔ کھالے نے بھی میری تقلید کی۔ تھکے تھکے انداز میں بولا، ''شہرے خان! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری نیکی ہمارے گلے کا پھندا بن جائے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''اس کی آنکھ کھلے تو اسے پچھلے منظر بھول جائیں اور ہمارے چہرے یاد رہ جائیں۔ یہ ہمیں اس افواکار سمجھنے لگے۔''

میں نے کہا، ''نہیں یار! یہ اتنا بھی بچہ نہیں ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں تشکیک ڈورے بدستور لہراتے دیکھے۔ میں نے کہا، ''تم نے ابھی تک اپنے بارے کچھ نہیں بتایا۔''

اس نے کشن سے ٹیک لگالی، سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر تک ایسی ہی حالت میں پڑا رہا، پھر دھیمے لہجے میں بولا، ''میرے پاس بتانے کے لئے لمبی کہانی نہیں ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ میں چمن زار سے بھاگا تو میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ ایسا کوئی ٹھکانہ ذہن میں نہیں تھا جہاں پہنچ کر خود کو محفوظ خیال کر لیتا۔ بس ناک کی سیدھ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ اب میں نے سوچا کہ میں آخر کب تک بھاگ سکتا ہوں، تو رُک گیا اور ایک رکشا میں بیٹھ گیا۔ اُسے میں نے لاری اڈے چلنے کا کہا۔ جونہی اُس نے رکشا سڑک پر ڈالا، پولیس کے ہارن چاروں طرف بجنا شروع ہوگئے۔ اُس نے بیک مرر میں مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اُس نے عجیب حرکت کی اور رکشے کو گھما کر ایک کشادہ گلی میں ڈال لیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟ تو اُس نے کہا، وہاں، جہاں پہنچ کر تم پولیس والوں سے محفوظ رہ سکتے

ہو۔''

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور تعجب بھری داستان کو غور سے سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا، ''شہرے خان! وہ استاد ببلو کا کارندہ تھا۔ وہ مجھے گلیوں میں گھما پھرا کر ایک کوٹھی میں لے گیا جہاں استاد ببلو کا نائب میرا استقبال کرنے کے لیے موجود تھا۔ اس نے مجھے پناہ دی اور کئی روز تک چھپائے رکھا۔ پولیس میری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ زور آور نامی غنڈہ اپنے جگری یار موبی کے قاتل کی تلاش میں اپنے گروہ کے ساتھ ملتان شہر میں دندناتا پھرتا ہے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میں نے عام آدمی کو نہیں، ملتان کے ایک معروف غنڈے کو قتل کر دیا تھا۔ پھر مجھے استاد ببلو کے نائب ریاض ملغانی نے اپنے گروہ میں شامل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اب میرے پاس واپسی کا راستہ نہیں ہے، میں اگر نور پور جاؤں گا بھی تو پکڑا جاؤں گا کیونکہ پولیس نے اسما کا سراغ لگا لیا تھا۔ اس کے بقول پولیس کو میرا نام و پتہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔''

میں نے اس کی بات میں دخل نہیں دیا تھا۔ ہمہ تن گوش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سانس لی اور کہا، ''میں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس کے گروہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہ کر حالات کا جائزہ لوں گا۔ جونہی خطرہ ٹلا، نور پور سدھار جاؤں گا۔ پھر مجھے پروین کے اغوا کا پتہ چلا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسی دوران مجھے استاد ببلو سے ملنے کا موقع ملا۔ تب پتہ چلا کہ اس سارے گورکھ دھندے کا ماسٹر مائنڈ اور سرپرست سردار حیدر خان تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا گینگسٹر ہے۔ مجھے تحفظ کا احساس ہوا کہ اب مجھ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ پھر کچھ دن گزر گئے۔ ایک مرتبہ مجھے نور پور جانے کا موقع ملا۔ وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی کہ وہاں تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میرے گھر والے تو جو پریشان تھے، سو تھے، تمہارا گھر برباد ہو چکا تھا۔ میں چاچی اور چاچے سے ملا۔ تمہارے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہر کوئی یہی کہہ رہا تھا کہ شہرا بدنامی سے ڈر کر کہیں بھاگ گیا، کہیں منہ چھپا کر نکل گیا۔ سائیں دل جیت کا پتہ چلا کہ وہ کسی نامعلوم جگہ پر چلہ کاٹنے کے لیے چلا گیا تھا۔ میں ڈاکٹر شاہ جی سے بھی ملا تھا۔ وہ تمہارے اور تمہاری بہن کے لیے بہت متفکر تھا۔ اس نے مجھے راز رکھنے کا وعدہ لے کر بتایا تھا کہ شہرے، امیر نواز، پروین اور سائیں دل جیت کا غیاب ایک

اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں سردار حیدر خان کی ٹوہ لگاؤں، کہیں اس نے اسما بھی کو اغوا کر کے نہیں رکھا ہوا۔''

وہ دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ وہ جب بھی اپنا کوئی واقعہ مجھے سنایا کرتا تھا، ایسے ہی ٹھہر ٹھہر کر، ہاتھ لہرا لہرا کر بولا کرتا تھا۔ میں نے کہا، ''پھر؟''

اس نے پانی پیا، بھرپور انگڑائی لی اور بولا، ''شہرے! جب میں بہت سارے پیسے گھر والوں کو دے کر ملتان پہنچا تو اپنے پورے گروپ کو مضطرب اور برانگیختہ پایا۔ معلوم ہوا کہ سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ یہ خبر میرے لیے بھی بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ نہ صرف میری محبوبہ تھی بلکہ میرے چیف باس کی بیٹی تھی۔ استاد ببلو اور اس کا نائب ریاض ملغانی اسما کے بھیڑیوں کی طرح شہر بھر میں پھیل کر اسما کے اغوا کار کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ پھر پتہ چل گیا کہ اسما کو میڈم شکیلہ نامی گینگسٹر نے اغوا کیا تھا۔ میڈم بڑا دبدبہ تھا۔ استاد ببلو سمیت سبھی لوگ اُس سے خائف رہتے تھے۔ سردار حیدر خان نے استاد ببلو اور ریاض ملغانی کو اپنی کوٹھی پر بلا لیا۔ انہیں فی الفور اسما کو بازیاب کرانے کا حکم دیا۔ تمہاری غنڈوں کا ایک خونخوار گروہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ پورے شہر میں میڈم کے ٹھکانوں کی تلاش جاری ہو گئی۔ بالآخر اس کی کوٹھی پر ہمیں حملے کا حکم صادر ہوا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم میڈم کے پاس ہو، وگرنہ میں کبھی بھی گروہ کے ساتھ نہ جاتا۔ چونکہ مجھے اسما کی سلامتی عزیز تھی، اس کی والہانہ میرے نزدیک دنیا کا سب سے اہم کام تھا، اِس لیے میں نے سود و زیاں کا شمار نہیں کیا اور اسلحہ اُٹھائے میڈم کی کوٹھی پر ہلا بول دیا۔ آگے کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔''

کھالے کی کہانی انجام کو پہنچ چکی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا، ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

وہ بولا، ''میں اپنے گروہ میں لوٹ جاؤں، میں تمہارے ساتھ میڈم کے گینگ میں شامل ہو جاؤں، یہ فیصلہ مجھ سے نہیں ہو پا رہا۔ چونکہ اسما میڈم کے قبضے میں ہے اور میں جان چکا ہوں کہ میڈم نے محض تمہاری وجہ سے سردار حیدر خان پر ہاتھ ڈالا ہے، اِس لیے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں اسما کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں۔ نہ ہی یہ میرے بس کی بات ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ تم اس صورتِ حال میں میرا ساتھ دو۔''

میں نے کہا، ''ہاں! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میڈم نے مجھ پر بڑے احسانات کیے ہیں۔

میں اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اگر میں چاہوں بھی تو تمہاری اس معاملے میں مدد نہیں کر سکتا۔''

''ہاں شہرے! میں سمجھتا ہوں۔ اگر تم نے اس موقع پر میڈم کو دھوکہ دیا تو وہ تمہارا خون پی جائے گی۔ ویسے بھی تمہاری رگوں میں غیرت مند خون دوڑ رہا ہے۔ یہ نچڑ سکتا ہے، جل سکتا ہے مگر بے وفائی نہیں کر سکتا۔ مگر شہرے! اب جبکہ پروین سردار حیدر خان کی جیل سے نکل چکی ہے، کیا اسما کو آزاد کر دیا جانا بہتر نہیں ہوگا؟''

''میں اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میڈم کو رپورٹ کر دوں گا۔ وہ کیا فیصلہ کرتی ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ تمہیں سردار حیدر خان پر کیوں شک گزرا؟''

اس نے یکا یک سوال داغا تھا۔ میں چونک سا گیا، بولا، ''کیا مطلب؟ کیسا شک؟''

اُس نے سگریٹ نکالا، سلگایا اور لمبا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرانے لگا۔ کمرے کی فضا بڑی صاف ستھری تھی۔ سگریٹ کا تیز دھواں آنِ واحد میں پورے کمرے میں پھیل گیا اور سانسوں پر ناگوار بوجھ محسوس ہونے لگا۔ میں نے اُٹھ کر ایگزاسٹ فین کا بٹن پش کر دیا۔

''یہی کہ پروین کو اُس نے اغوا کرایا ہے۔'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے بہ عجلت آنکھیں موند لیں۔ سائیں دل جیت میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ میں نے سوچا، کھالے کو سائیں کے بارے بتاؤں، یا نہ بتاؤں، کیا مناسب رہے گا؟ پھر میں نے اپنے تئیں اس معاملے کو آئندہ کسی وقت پر موقوف کیا اور کہا، ''ہمارے علاقے میں اتنی بڑی حرکت کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، سیدھی طرح بتاؤ۔ کیا تمہیں ڈاکٹر شاہ جی نے کہا تھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''سردار بخت خان نے؟''

میں نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ بولا، ''تو کیا میڈم نے؟''

میں نے کہا، ''کوئی اور بات کرو یار..... یہ فضول سا موضوع پکڑ بیٹھے ہو۔''

وہ بولا، ''یہ فضول موضوع نہیں ہے مگر خیر..... تم اس وقت کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں ہو تو پھر سہی۔ یہ تو بتا دو کہ تمہاری میڈم کو تجھ میں کیا نظر آ گیا ہے جو اتنا تعاون کر رہی ہے؟''

میرے پاس اس کے اس سوال کا جواب بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''کھالے! یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ میں عام سا آدمی ہوں۔ وہ اتنی امیر، بارسوخ اور خوب صورت ہے کہ مجھ جیسے کئی جوان خرید سکتی ہے۔ پتہ نہیں اُسے مجھ میں ایسا کیا نظر آ گیا جو آج تک مجھے یا تجھے بھی دکھائی نہیں دیا۔''

وہ قدرے شرارت آمیز لہجے میں بولا، ''یار شہرے! اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ تم جیسا خوب صورت اور سڈول شخص لاکھوں میں ایک ہی ہو سکتا ہے۔ گوری رنگت، شفاف اور معصوم آنکھیں، چست اور متوازن جسم..... مگر..... یہ ایسی خوبیاں نہیں ہیں جو میڈم جیسی عورت کو متاثر کریں۔''

میں ہنسا، ''نہ تم میڈم جیسے ہو، نہ میں، اس لیے ہم اس کی ترجیحات کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ مجھ پر مہربان ہے، میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔ رہی بات سونہپ (خوب صورتی) کی، تو کیا اسماری شکل وصورت سے متاثر ہوئی تھی؟''

وہ قدرے شرمسار ہو کر بولا، ''بڑے لوگوں کی باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔''

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ کھالے کو آرام کرنے کا مشورہ دیا، وحید کا بنظر غائر جائزہ لیا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ چونکہ میڈم کی کوٹھی میں صبح خاصی دیر سے اُترتی تھی، اس لیے میں باآسانی دو چار گھنٹے کی نیند حاصل کر سکتا تھا۔

میں نے سونا چاہا مگر یہ میرے سہل نہیں رہا تھا۔ ذہن ان گنت ہولناک اندیشوں اور واہموں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں ایک ایسی ہشت پہلوی کہانی کا مرکزی کردار بن کر رہ گیا تھا جس کا کہیں انت ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان زندگی کے ناگفتہ بہ تر حالات میں بھی اپنی محبت کو ایک لمحے کے لیے فراموش نہیں کر سکتا مگر میرے ساتھ حالات ایسا کھیل کھیلتے چلے آ رہے تھے کہ میں نے کسی پل بھول کر بھی غزالہ کو یاد نہیں کیا تھا۔ کجا وہ فراغت بھری زندگی کہ ہر لمحہ اُسی کی طرف دھیان رہتا تھا، کجا یہ مصروف لمحات کہ اس کی یاد بھی بھولے سے نہیں آتی تھی۔ میں پروین کی تلاش میں اس سے یکسر بے گانہ ہو گیا تھا۔ مجھے چاچا چراغ اور چاچازاد بہنوں کی یاد نے بھی کسی پل نہیں ستایا تھا۔ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی یاد نے بے چین نہیں کیا

تھا۔ایک وقت تھا جب میں عاشی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چوک قریشی تک کھنچا چلا جاتا تھا۔ان دنوں مجھے اس کی شکل بھی بھول چلی تھی۔اگر یاد تھا تو بس پروین کا چہرہ جس سے میں دن بہ دن دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔مجھے اپنی ذات اس گھڑی خودغرض محسوس ہوئی۔

کھالے کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔وہ گہری نیند میں مستغرق ہو گیا تھا۔میں کوشش کے باوجود سو نہیں پایا تو پہلو بدلا اور وحید کے گرد آلود بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔وہ بہت معصوم صورت اور خوب رو بچہ تھا مگر اِس وقت اُس کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔اس کی گردن اور چھاتی پر ننھے ننھے کئی زخم تھے۔ٹانگ بھی زخمی تھی۔میں نے اُس کی بینڈیج بڑے اچھے انداز میں کی تھی۔شکر یہ تھا کہ کسی بھی زخم کی اسٹچنگ نہیں کرنا پڑی تھی۔میں نے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔جسم نے از حد حدت پکڑ لی تھی۔گردن پر چپکی ہوئی پٹیوں کو چھیڑا۔شاید میں چاہتا تھا کہ وہ ہوش میں آ جائے۔پھر میرے چھیڑنے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ ہلکا سا کسمسایا۔ایسے میں اُس کے ہونٹ تھوڑے سے سکڑے، ننھی سی آہ خارج ہوئی اور وہ پھر غیر متحرک ہو گیا۔یہ یقین ہو گیا کہ اَب وہ بے ہوش نہیں تھا، محض نیند اور انجکشن کی وجہ سے غنودگی میں تھا۔میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔اُس کے پھٹے کپڑوں کو جائزہ لیا۔یہ بھیڑیے کے نوکیلے دانتوں کا کمال تھا۔یہ بھی عیاں تھا کہ اُس کے جسم پر لگنے والے زخم بھی بھیڑیے کی کارستانی تھی۔کوئی بھی زخم ایسا نہیں تھا جو انسانی ہاتھوں سے اُس کے بدن پر لگا ہو۔پھر..... اُسے مردہ کیوں کر تصور کر لیا گیا؟

میں نے اُس کی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی کو چھوا۔اس نے فی الفور ٹانگ کھینچ کر دوہری کر لی۔وہ کسی پل میں جاگنے والا تھا۔میں نے اپنا منہ اُس کے کان کے قریب کر کے آواز دی،

''وحید..... وحید..... جاگو.....''

وہ بیدار نہیں ہوا تو ناچار مجھے اُس کی ناک دبانا پڑی۔سانسوں کے تسلسل میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔میں نے ناک چھوڑ دی۔اُس نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں اور آنکھیں کھول دیں۔چند لمحوں تک پھٹی پھٹی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا۔پھر اردگرد دیکھنے لگا۔ایسے میں مجھ پر نگاہ پڑی اور ٹھہر گئی۔وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔کئی لمحوں کے بعد اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی لہر موجزن ہوئی جو رفتہ رفتہ توانا ہو گئی۔وہ نہایت دھیمے انداز میں بولا، ''باجی..... امی..... آپ کہاں ہیں؟''

میں نے پھر پکار کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ کچھ دیر تک پلکیں جھپکاتا رہا، پھر بے یقینی کے عالم میں بولا، ''بھائی جان آپ؟ شہریار؟''

میں نے کہا، ''ہاں وحید! میں شہریار ہوں۔ تجھے موت کے منہ سے نکال لایا ہوں۔ ہوش میں آؤ اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

وہ کافی دیر تک خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ساکت لیٹا رہا۔ پھر اس نے اپنی گردن اور چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔ منہ سے سسکاری نکلی اور وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عجیب سی نظروں سے اپنی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹیوں کو دیکھنے لگا۔ بولا، ''میں زندہ ہوں ناں؟''

وہ ابھی تک نارمل نہیں تھا۔ اُسے پوری طرح سنبھلنے کے لئے کچھ وقت چاہیے تھا۔ میں نے اُس کی دل جوئی کی، پیار کیا اور یقین دلایا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔ پھر اُس کی یادداشت پوری طرح لوٹ آئی۔ وہ بولا، ''باجی کہاں ہے؟''

میں نے کہا، ''میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے، مگر یہ جانتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہے، خیریت سے ہے۔''

''نہیں بھائی جان!'' اس کی آواز مزید مدھم ہوگئی، ''وہ خیریت سے نہیں ہے۔ وہ لوگ اُسے ماردیں گے۔ وہ بہت ظالم ہیں۔''

میں نے پچکارا، پوچھا، ''تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟''

وہ بولا، ''وہی..... جنہوں نے ہمیں باندھ کر کمرے میں رکھا ہوا تھا۔''

''وہ کون تھے؟''

''بھائی جان.....'' وہ جواب دینے کی بجائے رونے لگا۔ اس کا ننھا سا بدن ہچکیوں کے بل پر ننھے ننھے جھٹکے لینے لگا۔ میں نے کھالے کی طرف دیکھا جو سوتے میں کروٹ بدل کر نئی ٹیون میں خراٹے لینے لگا تھا۔ میں نے وحید کو سینے سے لگا لیا اور اُس کی پشت کو سہلانے لگا۔ وہ کئی منٹوں تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا پھر اچانک مجھ سے علیحدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھ کر بولا، ''وہ بڑا کتا کہاں ہے؟''

میں چونکا، ''بڑا کتا؟''

اُس کی آنکھیں فرطِ دہشت سے پھیلنے کو آ گئیں۔ جھرجھری لے کر بولا، ''وہی..... جس نے میری گردن پر.....''

ساتھ ہی اُس کے دونوں ہاتھ گردن سے چپک گئے۔ میں سمجھ گیا۔ وہ اُس بھیڑیے کی بات کر رہا تھا جس کے پنجوں سے اسے ہم نے چھڑایا تھا۔ چونکہ بھیڑیے کی شکل بگھیاڑی کتے سے ملتی جلتی ہوتی ہے اور اس نے زندگی میں پہلے کبھی بھیڑیا نہیں دیکھا ہوگا، اِس لیے اُسے کتا سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا ہوگا۔ میں نے اُسے دِلاسا دیا کہ اس کتے کو میں نے مار بھگایا ہے۔ اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ میں نے اُس پر کچھ وقت صرف کیا۔ وہ جب سنبھل گیا، اسے قید سے نکلنے کا یقین ہو گیا تو اُس نے مجھے کچھ یوں اپنی روئیداد سنائی۔

اُس کا باپ، سجاول، عشرت عرف عاشی کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتا تھا۔ عاشی کی ماں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اُس کے دل سے اپنے خاندان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت محو نہیں ہوئی تھی۔ عاشی اپنے کسی کزن سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ حقیقت میں کوئی اُس کے ہم پلہ نہیں تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور نفیس مزاج کی لڑکی تھی جبکہ اُس کے باپ کے خاندان میں تعلیم کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ سبھی کا شتکاری کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔ عاشی کی ماں چاہتی تھی کہ اُس کی شادی کسی پڑھے لکھے خاندان میں ہو۔ عاشی نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مظفر گڑھ کے ایس پی سلیم شہزاد کے بیٹے شاہد سلیم میں دلچسپی لیتی ہے۔ دونوں بار ہا مل چکے تھے اور ایک دوسرے پر اپنی پسندیدگی عیاں کر چکے تھے۔ وہ فوج میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ اس نے عاشی کو یقین دلایا تھا کہ جونہی اُسے کمیشن ملا، وہ اپنے گھر والوں کو عاشی کے بارے بتا دے گا اور اس کے گھر شادی کا پیغام بھجوا دے گا۔ عاشی اپنی ماں کو ایک مرتبہ ساتھ لے کر مظفر گڑھ گئی تھی جہاں اس نے بہانے سے شاہد سلیم کو بلا کر ماں سے ملوا بھی دیا تھا۔ عاشی کی ماں کو بیٹی کا انتخاب اچھا لگا تھا۔

یہی گھر میں فساد کا بنیادی سبب تھا۔ عمومی طور پر ناکامی اور مایوسی کی کیفیت میں دیہاتی لوگ پیروں کی درگاہیں اور تعویذ دھاگوں کا سہارا لیتے ہیں۔ عشرت کی ماں پڑھی لکھی ہونے کے باوجود مایوسی کے عالم میں اپنی بیٹی کو سائیں جگ جیت کے مزار پر بھیجنے لگی۔

سائیں جگ جیت نیک آدمی تھا مگر منوں مٹی تلے دبا ہوا تھا۔ جو مٹی کے اوپر تھا، وہ اُس کا بیٹا سائیں دل جیت تھا جو دل جیتنے کا ہنر جانتا تھا۔ اُس نے عاشی کا دکھڑا سنا اور اُس کی مدد کا وعدہ کیا۔ تعویذ دیے جنہیں گھول کر سجاول کو اکیس دنوں تک پلایا جانا تھا۔ عاشی تعویذ گھول گھول کر اپنے باپ کو پلاتی رہی مگر وہ بدستور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ سائیں دل جیت نے دوسرا پتہ

پھینکا۔عشرت سے کہا کہ وہ اُس کی خاطر چلہ کاٹے گا۔اسی امید پر وہ اپنی ماں سے رقم لاتی رہی اور دل جیت کے ہاتھ پر رکھتی رہی۔اس نے کبھی تو کالے بکرے کا تقاضا پورا کیا، کبھی سیاہ مرغوں کی جوڑی پہنچائی اور کبھی نذر نیاز کے نام پر سینکڑوں روپوں کی قربانی دی مگر معاملہ جوں کا توں رہا۔اسی دوران سجاول نے اپنے بھانجے کے حق میں حتمی فیصلہ سناتے ہوئے منگنی کے دن کا اعلان کر دیا۔

عشرت موقع پا کر اپنے بھائی وحید کے ساتھ موٹر سائیکل پر بھاگی بھاگی سائیں دل جیت کے پاس پہنچی۔یہ وقت مریدوں کی آمد و رفت کا نہیں تھا۔شام کو مزار پر کوئی نہیں جاتا تھا۔وہ پہنچ گئی۔سائیں دل جیت نے اُسے دیکھا تو دونوں کو اپنے حجرے میں لے گیا اور عاشی سے پوچھا، ''کیا تم کسی کو بتا کر آئی ہو کہ یہاں آ رہی ہو؟''

عاشی نے کہا، ''نہیں..... سائیں جی! میں بہت پریشان ہوں۔صرف دو دن باقی ہیں۔کچھ کیا جا سکتا ہے تو کریں ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سائیں سے مدد مانگنے لگی۔سائیں نے پوچھا، ''تم فکر نہ کرو۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔میں ابھی تک بہت رعائت سے کام لے رہا تھا کہ کہیں اُس بدبخت کو نقصان نہ پہنچے ورنہ وہ کیا، اُس کی اوقات کیا، ایک ہی وار میں پچھاڑ اجائے گا۔تم فکر نہ کرو۔کیا تم نے اپنی ماں کو بتایا ہے؟''

عاشی نے کہا، ''نہیں۔وہ گھر میں نہیں تھی۔مجھے بڑی مشکل سے یہاں آنے کا موقع ملا ہے۔شاید دوبارہ نہیں آ سکوں گی۔''

وہ اُٹھ کر اندرونی کمرے میں گیا اور وحید سے بھی یہی سوال پوچھا۔جب تسلی ہو گئی تو اُس نے عاشی اور وحید کو حجرے میں بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور کچھ دیر کے لیے اندر چلا گیا۔جب واپس آیا تو اُس نے ہاتھوں میں ایک نفیس ٹرے تھام رکھی تھی۔ٹرے میں تین بڑے بڑے گلاس بھرے ہوئے تھے۔پیار سے بولا، ''لو..... شربت پیو۔پھر بیٹھ کر تمہیں ایسا تعویذ لکھ کر دیتا ہوں جو فوری طور پر اپنا کام شروع کر دے گا۔دیکھنا، وہ تمہارے احمق باپ کو کیسے چند منٹوں میں سیدھا کرتا ہے۔''

اُس نے عاشی اور وحید کو گلاس تھمائے اور خود بھی بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔شربت بڑا خوش ذائقہ تھا۔تینوں نے پی لیا تو اُس نے برتن سمیٹ لیے اور اپنی مخصوص نشست

پر بیٹھ کر تعویذ تیار کرنے لگا۔ عاشی اُس کے سامنے بیٹھی تھی جبکہ وحید سائیں کا اشارہ پا کر اندرونی کمرے میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اُسے نیند آنے لگی۔ بے اختیار اُس نے صوفے پر سر ڈال دیا۔ یہی حال عاشی کا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھی رہی، پھر جماہیاں لینے لگی۔ چند ہی منٹوں میں نیند کی یلغار سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اُس کے حواس نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اُس کے بعد کیا ہوا، کون آیا، کس نے اٹھایا، ان باتوں کا نہ تو وحید کو علم تھا، نہ عاشی کو معلوم ہوا تھا۔ دونوں کو بے ہوشی کے عالم میں حجرے سے اُٹھا کر بڑے خان کی بیلے والی حویلی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وحید کو علم نہیں تھا کہ اُنہیں کہاں رکھا گیا تھا۔ وہ محض اُس کمرے کے بارے میں جانتا تھا جہاں دونوں بہن بھائیوں کو قید رکھا گیا تھا۔ کمرے کے باہر کا ماحول کیسا تھا، اُس نے نہیں دیکھا تھا۔

وحید کی آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو کمرے میں بان کی چارپائی پر لیٹے پایا۔ اُٹھ کر چیخنے چلانے لگا۔ کم سن تھا، یہ بھائی نہیں دیتا تھا کہ اُسے اور اس کی جوان بہن کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ باہر سے بند تھا۔ چیخ و پکار سے تھکا تو چارپائی پر بیٹھ کر رونے لگا۔ اسی اثناء میں اس کی نظر برابر والی چارپائی پر آڑی ترچھی لیٹی عشرت پر پڑی۔ اس نے جھنجوڑ کر باجی کو جگانے کی کوشش کی۔ وہ بیدار ہو گئی۔ پاگلوں کی طرح کمرے میں دیکھتی رہی پھر چیخ اُٹھی۔ وہ جوان تھی، عورت ذات تھی، فوراً سمجھ گئی کہ اُس کے ساتھ بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی۔ دونوں نے بہت شور کیا، چیخ چیخ کر مدد طلب کی مگر قرب میں کوئی ہوتا تو ان کی مدد کو آتا۔

انہوں نے کمرے کا دروازہ کھولنے اور توڑنے کی کوشش کی مگر اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔ دروازے کی درزوں سے باہر جھانکنے پر سوائے اندھیرے کے کچھ معلوم نہ پڑا۔ کمرے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ پا کر دونوں تھک کر چارپائیوں پر گر گئے۔ زندگی کی طرح طویل رات بڑی مشکل سے گزری۔ صبح جب انہیں ناشتہ دیا گیا، تب اجنبی اور خوفناک چہرے دیکھ کر ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ عاشی نے ان لوگوں کی بہت منت سماجت کی، روئی پیٹی اور خدا رسول کے واسطے دیے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب اس نے مزاحمت کا فیصلہ کیا اور ناشتہ لانے والے پر حملہ کر دیا۔ ناخنوں اور دانتوں سے اُسے اچھا خاصا زخمی کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بلانے پر اس کے دو ساتھی کمرے میں آ گئے جنہوں نے دونوں کو چارپائیوں پر نائیلون کی رسیوں سے باندھ دیا۔

انہوں نے پھر یہ معمول بنالیا تھا کہ رفع حاجت اور کھانے پینے کے اوقات میں ان کے ہاتھ پاؤں کھول دیتے۔ پھر باندھ کر باہر سے کنڈی لگا کر چلے جاتے۔ دو راتیں ایسے ہی گزر گئیں۔ عاشی ہر مرتبہ کھانا لانے والے سے اپنا قصور اور مستقبل کے بارے میں پوچھتی تو اُسے یہی جواب ملتا کہ جلد ہی پتہ چل جائے گا۔

تیسری رات کے پچھلے پہر میں دروازے کی کنڈی کھلی۔ ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے کندھوں پر ایک لڑکی لدی ہوئی تھی جسے اُس نے وحید کے برابر والی چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش تھی اور صبح تک مردوں کی طرح پڑی رہی۔ دن چڑھے وحید کو اُس کمرے سے نکال کر ساتھ والے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ حویلی میں آنے والے لوگوں کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ مستقل طور پر حویلی میں رہائش پذیر رہنے والے چھ افراد تھے جن میں سے چار کو میں اسٹور میں مردہ حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وحید نے بھی ان سب کے حلیے مجھے بتائے تھے۔ وہ جن ناموں سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے، وحید کو وہ سبھی نام یاد تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان ناموں کو ازبر کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چار تو اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے جبکہ باقی لوگوں سے ہمارا ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔

وحید ان کے نزدیک فالتو پرزہ تھا۔ شاید سردار حیدر خان کے حکم کا انتظار تھا یا کوئی اور مصلحت کارفرما تھی کہ انہوں نے وحید کو آتے ہی موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا بلکہ اسے لڑکیوں کے ساتھ قید میں زندہ رکھا گیا تھا۔ پھر ایک دن کمرے میں ہل چل پیدا ہوئی۔ شور اُٹھا کہ بڑا خان آ گیا ہے۔ سبھی ایک دم کمرے سے بھاگ نکلے۔ بڑا خان اس کمرے میں نہیں آیا تھا جس میں وحید کو باندھ رکھا گیا تھا اس لیے وہ بڑے خان کو دیکھنے سے محروم رہا تھا۔ بڑا خان وحید کے اندازے کے مطابق عاشی کے کمرے میں گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حویلی میں رہنے والے بدمعاشوں کا رویہ یک لخت وحید سے بدل گیا۔ انہوں نے نہ صرف اسے نہلایا بلکہ اچھا کھانا بھی کھلایا۔ کھانے کے بعد اسے سلور کے گلاس میں ایک شربت پینے کو دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گلاس میں پانی نہیں، آگ بھری ہوئی تھی جس نے اُس کے حلق سے شکم تک آگ لگا دی۔ ذائقہ بھی اُسے پسند نہیں آیا تھا مگر اُسے پینا پڑا۔ کچھ ہی دیر میں شراب نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور وحید خود کو فضاؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ ایسے حالات میں سے زندگی میں کبھی نہیں گزرا تھا۔ ماں باپ نے ہمیشہ پیروں تلے اپنی ہتھیلیاں رکھی تھیں اور زمانے کے سرد

وگرم سے محفوظ رکھا تھا۔ تبھی نہیں سمجھ پایا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

وحید کی سنائی ہوئی کہانی کے پیش نظر مجھے یقین تھا کہ بڑے خان نے اسے مار کر پھینک دینے کا حکم صادر کیا تھا۔ تبھی اس کے کارندوں کی ہوس کے گھوڑے اچانک بے لگام ہو گئے تھے۔ جب ایک وجود کو ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا ہی دینا تھا تو پھر اس سے کچھ عرصہ سفلی آتش کدہ دہکائے رکھنے میں حرج ہی کیا تھا۔ آنے والے کئی دنوں تک چاروں نے اس کی خوب صورتی کو اس کی بدقسمتی بنا کر اپنی اپنی بھوک غیر فطری انداز میں مٹائی اور انسانیت کی دھجیاں کسی خوف واندیشے کے بغیر اُڑائیں۔ وہ پینا نہیں چاہتا تھا، کھلونا بن کر چارپائیاں بدلنا نہیں چاہتا تھا مگر برسوں عورت کے سائے تک کو ترسنے والے بھیڑیے اُس کی ایک نہیں سنتے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہونے والا تھا۔ وہ کبھی ہوش میں ہوتا تو کبھی لڑھک رہا ہوتا۔ اس کی یادداشت بھی رفتہ رفتہ اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بے حس ہو کر رہ گیا اور اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔

پھر ایک دن اسے بھنبھوڑنے والوں کی بھوک مٹ گئی یا انہیں کوئی اور مشکل درپیش آ گئی تھی کہ اسے مار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس نے منت سماجت نہیں کی، زندگی کے لیے واویلا نہیں کیا بلکہ بڑی خاموشی اور لاپروائی سے بیٹھا ان کے درمیان اپنے بارے میں ہونے والی گفتگو سنتا رہا۔ یوں جیسے اُسے مارنے کا نہیں، کسی اور کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہو۔ بڑی مونچھوں والے لمبے تڑنگے شخص نے اُسے اُٹھا کر چارپائی پر پھینکا۔ اس کی گردن پر دونوں ہاتھ جمائے اور جبڑا بھینچ لیا۔ وحید کو یہی یاد تھا کہ اس سے اُس کا سینہ پھٹنے کو آ گیا تھا۔ وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ بے ہوش ہو گیا اور اسے مردہ تصور کر کے بیلے میں پھینک دیا گیا۔ اس کی جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو بھیڑیے کے رحم وکرم پر پایا۔ شاید اسی کے نوکیلے دانتوں کی بدولت ہونے والے تیز درد نے اُسے موت جیسی اندھی بے ہوشی سے نکالا تھا۔ اس نے اپنے طور پر بھیڑیے کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اس کی چھاتی اور گردن پر بھیڑیے نے دانت گاڑے اور خون بہہ نکلا۔ جب وہ چیختے چلاتے اور مزاحمت کرتے تھک گیا تو نڈھال اور بے جان انداز میں سرکنڈے میں گر گیا۔ بھیڑیے نے اُس کی ٹانگ اپنے جبڑے میں دبوچی اور جھاڑیوں سے کھینچ باہر نکالا۔ وہ اُسے اپنی کھجار تک لے جانا چاہتا تھا۔ یہ وحید کی خوش بختی تھی کہ عین اُسی لمحے ہم پیا کی سربراہی میں وہاں سے گزرے اور ہماری نگاہ اُس پر جا

پڑی وگرنہ اس کا نازک اور کم سن وجود اب تک جنگلی درندوں کے پیٹ کی آگ بجھا چکا ہوتا۔

چونکہ وہ پوری طرح نارمل نہیں تھا، اس لیے بے ربط انداز میں اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا۔ میں اپنی سوچ کے مطابق اس کی کہانی کے خالی حصوں کو پُر کرتا جاتا تھا۔ میرے کریدنے پر اس نے بتایا کہ اس نے نئی لانے والی لڑکی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے سامنے اوندھے منہ چارپائی پر ڈالی گئی تھی۔ علیحدہ کمرے میں لے جائے جانے کے بعد اس نے اپنی بہن کو ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنی تھی۔ میں نے جب وہاں کسی مرد قیدی کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس نے کسی مرد قیدی کو وہاں لائے جاتے یا رکھے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس نے ایسا کچھ سنا تھا۔

وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ عاشی یا عاشی کے بعد لائی جانے والی لڑکی کو اغوا کرنے کا کیا مقصد تھا اور وہ اس کے حویلی سے نکلنے تک وہیں موجود تھیں۔ وہ مزید کوئی کارآمد بات نہ بتا سکا اور گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے بار بار اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آتے تھے۔ چونکہ میرے پاس میڈیکل کٹ نہیں تھی، اس لیے میں نے اس کے زخموں پر بندھی ہوئی پٹیوں کو چھیڑنے یا کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی سوچ کر خاموش رہا کہ دن چڑھے میڈیکل باکس منگوا کر اُس کی از سرِ نو بینڈیج کر دوں گا اور اگر ضروری ہوا تو میڈم سے کہہ کر اسے کسی ڈاکٹر کے پاس بھجوا دوں گا۔

کھالا اس رام کہانی کے دوران مسلسل خراٹے لیتا رہا۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اچھا تھا کہ اس پر سوار سلسلہ اور تھکاوٹ دور ہو جاتی اور وہ بیدار ہونے پر ہشاش بشاش ہوتا۔ میں نے پانی پیا، حمید کو پلایا پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اس وقت نور پور مکمل طور پر جاگ چکا ہوتا تھا۔ کھیت آباد ہو چکے ہوتے تھے۔ یہ چونکہ بڑا شہر تھا۔ یہاں تصنع اپنے آکٹوپس پوری طرح پھیلا چکی تھی، اس لیے لوگ آدھی رات کے بعد بستر پر گرتے تھے اور دن چڑھے جاگتے تھے۔

حمید نے میرے استفسار پر بتایا کہ اسے بھوک لگی ہوئی ہے۔ بھوک مجھے بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کمرے سے نکلا۔ ظاہر خان کا پتہ کیا۔ وہ سونے کے لیے جا چکا تھا۔ وہ بڑا کارآمد بندہ تھا۔ ایک ہی وقت میں گن مین، گیٹ کیپر اور کک کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے بھی خوش حال اور چاق چوبند رہتا تھا۔ اس کی جگہ پر زوار سکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا۔ اس سے

ابھی تک میری علیک سلیک اس مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ اسے چائے پانی کا کہہ سکتا۔ اس لئے میں گیسٹ ہاؤس کے کچن میں گیا۔ وہاں شبو کو موجود نہ پا کر اپنی مدد آپ کے تحت میں نے چائے کے تین کپ تیار کئے۔ کچن کیبنٹ میں پڑے ہوئے بسکٹ پیک اور کریم رول اُٹھائے اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

لدی پھندی ٹرے بیڈ پر رکھی اور کھالے کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ چائے کے پیالوں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھ کر خوشی سے بولا، ''واہ خانزادے! ایک دم فرسٹ کلاس..... تمہاری یہی مہربانیاں تو مرتے دم تک مجھے یاد رہیں گی۔ اوہ! تو یہ بھی جاگ گیا۔ کیسے ہو بھئی؟''

اس کی اچانک وحید پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ وحید اسے نہیں جانتا تھا مگر اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بھی میری طرح اس کا ہمدرد تھا۔ اس نے پھیکے رُو کہا، ''ٹھیک ہوں بھائی!''

کھالے نے بغیر منہ ہاتھ دھوئے چائے کا کپ اور ایک کریم رول اُٹھا لیا۔ میں نے بسکٹ کا پیکٹ کھول کر وحید کو تھما دیا اور خود بھی کپ اٹھا لیا۔ کھالے نے وحید کا انٹرویو لینا چاہا تو میں نے اُسے ٹوک دیا، ''اسے ڈسٹرب نہ کرو۔ میں اس سے تمام باتیں معلوم کر چکا ہوں۔''

وحید نے کہا، ''مگر آپ نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں اور باجی کہاں ہے؟''

میں نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا، ''تم دھیان سے ناشتہ کرو۔ پھر میں کچھ دیر سوؤں گا۔ تم بھی سونا چاہو تو سو لینا وگرنہ یہ ساری کہانی تمہیں کھالا سنائے گا۔''

اس نے بے چارگی کے عالم میں پہلے مجھے پھر کھالے کو دیکھا اور چائے پینے میں رُجھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے تفکر اور اضطراب کی پرچھائیاں لرزنے لگی تھیں۔ اس کے اعصاب پر سوار شراب کا نشہ بتدریج اپنا تسلط ختم کرتا جاتا تھا اور اس کی گم شدہ حسیں جاگنے لگی تھیں۔ یہ اچھی بات تھی وگرنہ اس کا پاگل یا نفسیاتی مریض ہو جانا بعید از قیاس نہیں تھا۔ وہ بدقت تمام بسکٹ نگل رہا تھا۔ حلق سے گزارتے ہوئے اسے شدید نوعیت کے درد کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر میرے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے وہ جیسے تیسے بسکٹوں کو نگل رہا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کی صحبت نے مجھے آدھا ڈاکٹر بنا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ابھی کافی دیر تک اس کے جسم میں اینٹھن ہوتی رہے گی۔ اس کا خون شراب طلب کرتا رہے گا اور دم بہ دم اس کی رگوں میں کشیدگی اور اضطراب کی

لہریں دوڑا تا رہے گا۔ اسے انا لجائسک میڈیسن کی ضرورت تھی جو فی وقت نا موجود تھی۔

پیٹ کی آگ بجھی تو مجھ پر غنودگی نے حملہ کر دیا۔ میں نے دونوں کو باتیں کرتے چھوڑا اور لیٹ گیا۔ میرا نہ صرف بدن بلکہ ذہن بھی طویل مشقت کے بعد تھک گیا تھا اور آرام چاہتا تھا۔

مجھے کسی نے جگایا نہیں تھا بلکہ میں از خود نیند پوری ہونے کے سبب بیدار ہوا تھا۔ گھڑی دیکھی تو دو بجنے والے تھے۔ کھالا صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا جبکہ وحید میرے داہنے ہاتھ بیڈ پر برابر میں سویا ہوا تھا۔

کھالے نے کہا، ''تمہیں میڈم نے بلایا ہے۔ تیار ہو کر اُس سے مل لو۔''

میں نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ تیار ہو کر کھالے سے پوچھا، ''کیا تم نے کھانا کھالیا ہے؟''

وہ تلخی سے بولا، ''کسی نے پوچھا تک نہیں۔''

مجھے اُس کے انداز سے پتہ چل گیا کہ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ وہ چائے کا رسیا تھا۔ دوپہر تک وہ پانچ سات پیالے چائے کے پیٹ میں اُتار لیا کرتا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا، ''اچھا! میں میڈم سے مل لوں، پھر کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔''

وہ مجھے کمرے سے نکلتا ہوا دیکھ کر جلدی سے بولا، ''کھانا تو آتا رہے گا، بھلے آدمی! چائے کا کچھ کرو ورنہ میرے سر دھماکے کے ساتھ پھٹ جائے گا۔''

میں مسکرا کر کمرے سے نکل آیا۔ کچن میں گیسٹ روم کا اکلوتا چست وجود والا کک شبو کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اسے چائے تیار کر کے کھالے کو دینے کا کہا اور بالائی منزل پر واقع میڈم کے کمرے کا رُخ کیا۔ دستک کے جواب میں اس کی مترنم مگر تحکمانہ آواز میرے کانوں میں پڑی، ''کم اِن!''

میں نے آہستگی سے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ میڈم اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ اس کے ہاتھ میں نفیس شیشے کا گلاس دبا ہوا تھا جس میں ہلکے اورنج کلر کا مشروب دکھائی دے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اعلیٰ قسم کی ولائتی شراب سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک ذرا مسکرائی اور بولی، ''شہریار! مجھے پتہ چلا ہے کہ تم لوگوں کو جزوی طور پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیا میں نے ٹھیک سنا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''جی میڈم!''

''تفصیلی رپورٹ دو۔''

اس نے کہا اور ایک ادائے دل کشا سے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ننھا سا گھونٹ بھرا۔ میں لمحاتی طور پر اُس کے حسن کی جولانی میں کھو کر اس کا حکم بھول گیا۔ یاد آیا تو جھٹ سے ٹیپ پلیئر کی طرح بول پڑا۔ الف سے یے تک تمام شب بیتی کہہ سنائی۔ وہ انہماک سے سنتی رہی، شراب سے کھیلتی رہی، پھر میرے خاموش ہونے پر بولی، ''یہ تو نہ سمجھ میں آنے والی سچوئیشن ہے۔''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کا سیل فون بج اُٹھا تھا۔ اس نے سکرین پر نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر لی، ''بول رہی ہوں۔''

دوسری طرف کی بات سن کر ہنس پڑی، ''تم کبھی بھی سدھر نہیں سکتے میر وشاہ..... گڈ مارننگ صبح کے سلام کو کہتے ہیں، اب دوپہر ڈھلنے لگی ہے۔ تم نے یہ لفظ کس سے سنا ہے؟''

میرے لبوں پر بھی مسکراہٹ تیر گئی۔ میر وشاہ فون پر میڈم کو گڈ مارننگ کہہ رہا تھا۔ میڈم اس کی بات بڑی توجہ سے سننے لگی۔ بیچ بیچ میں ٹوک کر کچھ پوچھ بھی لیتی پھر قدرے اکتائے ہوئے انداز میں بولی، ''میر وشاہ! تم بے دھڑک جا کر خان باز وخیل سے ملو۔ اس سے فیئر ڈیلنگ کرو۔ مخدوم جی نے تمہاری ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے، اس کا احسان ہے مگر ہمیں اپنے بزنس سیکریسی کا خیال رکھنا ہے اور باز وخیل پر بھی واضح کر دینا کہ مخدوم جی کا کردار بس لنکر تک محدود ہے۔ اسے کوئی بھی بزنس سیکرٹ نہیں دینا۔ او کے؟''

اس نے فون بند کر دیا۔ مجھ سے مخاطب ہوئی، ''میں کیا کہہ رہی تھی؟''

''آپ نے ہماری کارگزاری کو عجیب سچوئیشن قرار دیا تھا۔'' میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

وہ مسکرائی اور بولی، ''ہاں! پیا واپس چلا گیا؟''

''جی میڈم!'' میں نے کہا، ''اس نے کہا تھا کہ میں ہی آپ کو یا میر وشاہ کو رپورٹ دے دوں۔''

''وہاں سے جو اسلحہ ہاتھ لگا تھا، تم نے دیکھا تھا؟''

''نہیں میڈم.....''

''کیوں؟ کیا تم میں تجسس کا مادہ نہیں ہے؟''

''ہے تو سہی پر اُس وقت میں بہت نروس تھا۔''

''کیا تم یہ طے کر کے گئے تھے کہ اپنی بہن کو باز یاب کرا کر ہی لوٹو گے؟'' اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی۔

میں نے سر جھکا لیا۔ وہ بولی، ''شہر یار! جب بھی کسی کو جلانے کا ارادہ کرو تو یہ بھی دھیان میں رکھو کہ تم خود بھی جل سکتے ہو۔ خیر..... کیا وہ بچہ، جو تمہیں بیلے سے ملا، اب ٹھیک ہے؟ اس نے کیا کہانی سنائی؟''

میں نے وحید کی سنائی ہوئی داستان کو من وعن بیان کر دیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ اوپر والے پر چڑھایا، سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور کہا، ''کوئی فائدہ نہیں۔ اس کہانی میں کوئی کلیو نہیں ہے۔''

میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ بولی، ''تمہارے خیال میں تمہاری بہن کو وہاں سے کون نکالنے کی جرأت کر سکتا ہے؟''

میں اپنے تئیں اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ بولا، ''میرے خاندان میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔''

''کوئی دوست؟''

''کھالا میری خاطر اوکھلی میں سر دے سکتا ہے، وہ میرے ساتھ ہے۔''

''تم نے مجھے بخت خان اور ڈاکٹر منور شاہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ تمہیں بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں؟''

میں نے سوچا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیا امیر نواز کا باپ اس کی تلاش میں وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟''

میری نظروں کے سامنے سردار حیات خان کا بوڑھا چہرہ گھوم گیا۔ وہ دلیر تو تھا مگر اس کے بھریوں بھرے بازوؤں میں اتنا دم نہیں رہا تھا۔ میں نے کہا، ''میڈم! میں نے اس بارے بہت سوچا ہے مگر یہ معاملہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ پھر اس نے مجھے اپنے خالی گلاس میں شراب ڈالنے کا حکم دیا۔ میں شراب کو پسند نہیں کرتا تھا مگر وہاں انکار کی تاب نہیں تھی۔ میں نے شیشے کی خوب صورت سی تپائی پر پڑی ہوئی بوتل کھولی، گلاس میں آگ بھری اور اسے تھما دی۔ وہ فریج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی، ''اس میں تھوڑا پانی ڈالو..... ٹھنڈا.....''

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے سامنے گلاس رکھ دیا۔ اس نے ایک گھونٹ حلق میں انڈیلا، مجھے اَدھ کھلی مدھ بھری آنکھوں سے دیکھا اور مسکرائی۔ بولی، ''شہر یار! تم نے کبھی

شراب نہیں پی؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کہا، ''نہیں میڈم! مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

وہ ایک ادا سے بولی، ''بن پیے یہ رائے کیونکر قائم کی جا سکتی ہے؟''

میں نے کہا، ''پڑھا سنا ہے کہ یہ اچھی چیز نہیں۔ انسان کے حواس کو مختل کر دیتی ہے۔''

''کیا اس دنیا میں کسی کے حواس اس کے اختیار میں ہیں؟''

وہ شاید بہکنے لگی تھی یا مجھے چھیڑنے کے لیے نیم پختہ باتیں کر رہی تھی۔ میں نے سر جھکا لیا۔

اس نے شاید بھانپ لیا کہ مجھے اس موضوع سے دلچسپی نہیں ہے، تبھی بولی، ''شہر یار! تمہاری راہوں میں کانٹے پھینکے جا چکے ہیں۔ تم اس وقت سخت امتحان میں ہو۔ کیا تم میری بات کو سمجھ رہے ہو؟''

میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔ وہ میری نظروں کے تعجب خیز تاثر کو بھانپ کر بولی، ''ہاں! تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ تمہیں اپنی طرف بڑھتے ہوئے خطرات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں بتاتی ہوں..... ایک ذرا ٹھہرو.....''

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور تین چار گھونٹ ایک ہی سانس میں پی گئی۔ میں مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ نہ تو اس نے مجھے بیٹھنے کی اجازت دی تھی اور نہ ہی میں نے بیٹھنا چاہا تھا۔

وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی، آنکھیں موندے سوچتی رہی، پھر اَدھ کھلی آنکھیں مجھ پر مرتکز کر کے بولی، ''شہر یار! وہ حرام زادہ..... حیدر خان..... اس وقت باؤلے کتے کی طرح اپنی بانہیں کاٹ رہا ہوگا۔ وہ یقیناً یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں نے اس کی حویلی پر حملہ کیا اور اس کے چار قیمتی بندوں کو ہلاک کر کے مغوی لوگوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ چونکہ اس کی بیٹی میری تحویل میں ہے اور اسے احساس ہو چکا ہے کہ وہ مجھ تک اور اپنی بیٹی تک طاقت کے بل پر نہیں پہنچ سکتا۔ وہ کوئی اور کھیل کھیلے گا۔ کوئی چکر چلائے گا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے معاملات طے پا چکے ہیں۔ پہلے کی طرح یہاں اپنے غنڈوں کو نہیں بھیجے گا۔ اگر بھیجے گا تو سبھی کی لاشیں وصول کرے گا۔''

وہ بڑی روانی سے بول رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لکھی ہوئی عبارت کو پڑھ رہی ہو۔

میں نے 'جی میڈم' کہنے پر اکتفا کیا۔

وہ سانس لے کر بولی، ''وہ سمجھ رہا ہے کہ اسے مات ہو چکی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو حاصل نہ کر سکا اور نہ ہی تمہاری بہن کو اپنی حراست میں رکھ سکا۔ مجھ پر بھی حملہ نہیں کر سکتا۔ تم اس کی نظروں سے اوجھل ہو۔ اب سوچو، وہ کیا کر سکتا ہے؟''

میں نے کہا، ''میڈم! جو آپ سوچ سکتی ہیں، میں نہیں سوچ سکتا۔''

وہ احساسِ تفاخر سے مسکرائی۔ تعریف پر کھل اُٹھی۔ بولی، ''تمہیں اپنے دماغ کو وسعت دینا ہوگی ڈیئر! ہاں..... وہ نور پور میں جائے گا۔ وہ تمہارے خاندان کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ وہ تمہاری کمزوریوں پر ہاتھ ڈالے گا۔ اب تم سوچو، تمہاری ذات کے کون سے پہلو کمزور ہیں جن پر دشمن ہاتھ ڈالنا چاہے گا؟''

میرا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سانس رکنے کو آ گئی۔ وہ اتنا کمینہ تھا کہ میرے خاندان پر چڑھ دوڑتا۔ مجھے اب تک یہ خیال نہیں آیا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا، ''تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

اس نے گلاس اُٹھایا۔ ایک دو گھونٹ بچے تھے، حلق میں اُتارے اور سر جھکا کر خالی گلاس سے کھیلنے لگی۔ میں نے اس کی سوچ کے ارتکاز کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کافی دیر کے بعد سر اُٹھائے بغیر بولی، ''تم نور پور جاؤ، اپنے گھر والوں کو وہاں سے فوری طور پر نکال لاؤ اور محفوظ جگہ پر پہنچا دو۔''

''اکیلا؟'' مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

''نہیں..... اپنے دوست خالد، پیا اور عقیل کو لے جاؤ۔ سبھی انتظامات میر وشاہ کر دے گا۔ آج ہی رات یہ کام کر لو ورنہ تمام عمر پچھتاؤ گے۔ اور ہاں! نور پور میں کوئی ایسا سنسر بھی فٹ کر دینا جو وہاں کی خبریں تم تک پہنچاتا رہے۔''

''میں سمجھا نہیں میڈم؟''

''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ نور پور میں کسی آدمی کو اس کام پر مامور کر دو۔ وہ گاہے بگاہے ملتان آئے، کسی مقررہ مقام پر تم سے ملاقات کرے اور وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ تمہیں نور پور سے باخبر رہنا چاہیے۔ اگر وہاں سیلولر سگنلز موصول ہوتے ہیں تو کسی کو موبائل فون لے کر دے دینا۔ اگر کوئی دوست اس کام پر راضی نہ ہو تو کسی کو خرید لینا۔'' اس نے مجھے سمجھایا۔ ''یارن خان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنا۔ کیا وہاں تمہارا کوئی ایسا دوست نہیں ہے جو تمہارے کام آئے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''جی میڈم! میرا ایک دوست ہے..... بڑے کام کا آدمی ہے.....مرادبخش دیوانہ.....''

''ٹھیک ہے، اس سے بھی مل لینا۔''

''وحید کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وحید؟''

''وہی جسے ہم بیلے میں سے اُٹھا کر لائے ہیں۔''

''اچھا.....ہاں! میں اسے زرمینا کی تحویل میں دے دیتی ہوں۔''

میں نے زرمینا کو ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ سونیا نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اس کے گھر پہنچا دیں۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا، بولی، ''نہیں.....ابھی اسے اس کے گھر پہنچانا مناسب نہیں ہوگا۔''

''اس کی ماں بہت پریشان ہوگی میڈم!'' میں نے سہارا لیا۔

''مجھے اندازہ ہے۔ مگر تمہیں ایسے حالات سے روشناسی نہیں ہے۔'' اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا، ''ہر الجھن سیدھے طریقے سے حل نہیں کی جا سکتی۔ اگر اس کی ماں نے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی پولیس کو بلا لیا، آس پاس کے لوگوں کو اکٹھا کر لیا اور تم سے پوچھا کہ اس کے ساتھ اس کی بہن بھی تھی، وہ کہاں ہے، تو تم کیا جواب دو گے؟ تمہارے پاس تو اس سوال کا جواب بھی نہیں ہے کہ تمہیں یہ بچہ کہاں سے ملا؟ کیا بیلے کا کہو گے؟..... پولیس نے پوچھا کہ تم بیلے میں کیا کرنے گئے تھے، تو کون سی کہانی سناؤ گے..... کہا ناں کہ ابھی اسے گھر پہنچانے کا مناسب وقت نہیں آیا، جب آئے گا، تب کوئی وقت ضائع کیے بغیر اسے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ وہ یہاں محفوظ ہے، یہاں سے نکل کر محفوظ نہیں رہے گا۔ سمجھ گئے ہو؟''

اس کی باتیں سیدھی میرے دل میں اُتر گئیں۔ وہ بہت چالاک تھی۔ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ میں وحید کی ہمدردی میں پھنے خان بن کر چوک قریشی جاتا اور مفت میں دھر لیا جاتا۔ میں نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا اور تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

''اگر تم اپنے اردگرد سچائیوں اور ہمدردیوں کے گلاب اگانے لگو گے تو شک اور بے یقینی کے چھتوں سے اٹھنے والی مکھیاں اپنے زہریلے ڈنک تمہارے بدن میں اتار دیں گی۔ ان کا ڈسا

پانی نہیں مانگتا۔ اور ہاں! میں آج رات، ساڑھے نو بجے دوبئی کے لیے فلائی کر جاؤں گی۔ بہت ضروری معاملات ہیں جنہیں نمٹانے میں ہفتہ لگ جائے گا۔ میرے بعد میر وشاہ تمہیں کمانڈ کرے گا۔ نہ صرف اس سے رابطے میں رہنا، بلکہ اس کا حکم بھی ماننا۔ وہ مجھے بہت پیارا ہے۔ تمہیں یہ تو یاد ہے ناں کہ تمہیں یہاں لانے والا وہی تھا؟''

میں اسے روکنا چاہتا تھا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی یہاں موجودگی میرے لئے بڑی طمانیت بخش تھی۔ میں نے قدرے مایوسی سے کہا، ''میڈم! آپ فکر نہ کریں۔ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

اس نے جو کہنا تھا، کہہ چکی تھی اور اب آنکھیں موندے، سر صوفے پر ٹکائے، لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ شراب نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ اس کے بھرے بھرے گال تمتما رہے تھے۔ گردن پر سرخ سرخ لہریں نمودار ہوگئی تھیں۔ اس کے حسنِ تاب ناک پر سے میری نگاہیں ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ بہت متوازن الاعضا عورت تھی۔ نہ صرف اس کی ہر ادا یکتا تھی بلکہ اس کے پاس اعتماد اور دلیری جیسے اوصاف بھی موجود تھے جو عمومی عورتوں کے پاس نہیں ہوتے۔

اس وقت اس نے گہرے سبز رنگ کا کڑھائی دار کرتا اور پیرٹ کلر کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ لانبے لانبے بلیک اور براؤن کلر کے امتزاجی بال بکھر کر دونوں شانوں سے آبشاروں کی طرح بہہ کر چھاتی پر پھیلے ہوئے تھے۔ میک اَپ سے یکسر بے نیاز گلابی چہرہ، سوجھے پپوٹوں اور پلکوں والی بڑی بڑی آنکھیں، اَن چھدی ستواں ناک..... میں آنکھیں پھاڑے اس نیم خوابیدہ حسن کی زیارت میں مشغول تھا جب اچانک اس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ میں شرمسار سا ہوگیا۔

اس کی ناراضی کا احتمال ہوا مگر وہ ناراض نہیں ہوئی بلکہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر بولی، ''تم نے خیال کیا کہ پینے کے بعد میرے حواس مختل ہوگئے اور میں سوگئی..... ہاں؟ تبھی بے خوفی سے دیدے پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔''

میں نے کہا، ''جی میڈم! آپ بہت خوب صورت ہیں۔ میں نے آپ جیسا دنیا میں کوئی اور نہیں دیکھا۔''

''مرد جب بھی عورت کی تعریف کرتا ہے تو عورت کا دل گدگدانے لگتا ہے۔'' وہ ہاتھ لہرا کر

بولی، ''وہ قریب آتی ہے تو مرد کی آنکھیں بے وفا ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی اور کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ سکندرِ اعظم بھی ایسا ہی تھا۔ ایک سلطنت کو فتح کرنے کے بعد دوسری کی جانب کھنچنے لگتا تھا۔ سبھی مرد سکندرِ اعظم ہوتے ہیں؟..... ہاں، شاید نہیں..... کیا سبھی لوگ اپنی جستجو اور فتوحات سے ایک دن تھک جاتے ہیں اور اپنی رکسونا کی طرف لوٹ جاتے ہیں؟''

اس کا لہجہ ٹوٹنے لگا تھا۔ آواز بھی کچھ بھاری ہو گئی تھی۔ میں نے کہا، ''میڈم! میں سکندرِ اعظم نہیں، ایک معمولی سا انسان ہوں۔''

''تم شہر یار ہو..... شہر یار بادشاہوں کا نام ہے۔ بادشاہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔'' وہ بولی، ''مگر تم یہ سن لو، سبھی عورتیں رکسونا جیسی نہیں ہوتیں، میرے جیسی بھی ہوتی ہیں جو منہ پھیرنے والے کو ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیتی ہیں۔ آنکھوں میں سلاخیں پھیر دیتی ہیں۔ ان کا ماس کتوں کے آگے ڈال دیتی ہیں۔ تم جب بھی مجھ سے بے وفائی کر کے جانے لگو، یہ دھیان میں ضرور رکھنا..... میری ڈکشنری میں معافی کا لفظ شامل نہیں ہے۔''

میں اس کی بلاغت دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی بڑی گہری اور عالمانہ باتیں کرتا تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا تھا مگر کبھی میڈم جیسی ہستی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ کبھی بھی دھوکہ دے کر، بے وفائی جیسے جرم کا ارتکاب کر کے نہیں جاؤں گا۔ ویسے بھی میں ایسے گرداب میں پھنسا تھا کہ میرے پاس کہیں جانے کا راستہ بھی نہیں بچا تھا۔ یہاں سے نکل کر کہاں جاتا؟

وہ میرے چہرے کے مدوجزر کو بنظرِ غائر پڑھتی رہی، پھر بولی، ''تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو، پتہ نہیں کیوں؟ ادھر آؤ، مجھے اُٹھا کر بیڈ پر ڈال دو..... آرام سے اُٹھانا..... جیسے کوئی پھول کو بڑی نرمی سے اُٹھاتا ہے..... آؤ ناں.....''

میں سن ہو گیا۔ قدم بڑھانے کی سکت نہ رہی۔ اس قتالہ جان کو چھونا دل گردے کا کام تھا، کجا اُسے یوں بکھرے ہوئے وجود سمیت بانہوں میں بھر کر اُٹھانا اور بیڈ پر لٹانا..... میں نے ہچکچا کر کہا، ''میڈم! یہ بہت مشکل ہے؟''

وہ ہنسی تو پھر ہنستی چلی گئی۔ کمرے میں کافی دیر تک جلترنگ بجتی رہی۔ پھر اپنی بانہوں میں اپنے سیاہ بال چھاتی پر بھینچتے ہوئے شرارت سے بولی، ''بہت مشکل ہے..... مگر..... میرا وزن اتنا زیادہ بھی نہیں ہے، اوئلی فورٹی ایٹ کے جی..... اُٹھا لو مجھے..... میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔''

میں گھبرا رہا تھا۔ اس افتاد سے بچنے کی میرے پاس کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ شرارت اور دعوت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری ہچکچاہٹ پر تلملانے کی بجائے لطیف کش انداز میں مسکرائی اور بولی، ''شہریار! تم کیسے مرد ہو؟ دعوت دیتی ہوں تو گھبرا جاتے ہو۔ قریب کرتی ہوں تو دور بھاگنے کے لئے پر تولنے لگتے ہو، کیا تم جستجو اور فتح کے جذبوں سے ناواقف ہو؟''

میں نے کہا، ''میڈم! میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی گستاخی سرزد نہ ہو جائے۔''

وہ تھوڑا اوپر اُٹھی، ''ہوم..... میں اگر چاہوں کہ تم کوئی گستاخی کرو..... تو؟''

''میں آپ کو گنوانا نہیں چاہتا۔'' میرے لہجے میں بے بسی نہاں تھی۔

''اوہ نو.....'' وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی، ''ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا آگے چلتی رہتی ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا آتا ہے۔ میں نہ رہوں گی تو میری جگہ پر کوئی دوسری آ جائے گی۔ جیسے تم سے پہلے کوئی اور شہریار یہاں کھڑا تھا۔ تمہارے انداز میں ہی باور کرا رہا تھا کہ وہ مجھے گنوانا نہیں چاہتا۔ مجھے گنوانے کے بعد کسی اور وجود کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تم اس کی فکر نہ کرو..... آؤ اور مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر اُٹھاؤ۔''

اس کی حکم عدولی کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ اسے ناراض کرنے کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں بھری دنیا میں بے چھت اور بے سہارا ہو جاتا۔ میں نے کندھے اچکائے اور قدم بڑھا دیے۔ وہ فاتحانہ انداز میں ہنسی اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اسے احتیاط سے اپنی بانہوں پر اُٹھا لیا۔ اس نے سچ کہا تھا کہ اسے اٹھانا مشکل کام نہیں تھا۔ ایک تو اس کا وزن زیادہ نہیں تھا دوسرا اس نے اپنی بانہیں میری گردن میں حائل کر لیں۔ اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی خوشبو نے مجھے مسحور کر دیا اور میری بانہیں لرزنے لگیں۔ وہ بولی، ''ابھی یہیں رُکو.....''

میں تھم گیا۔ اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے کے قریب کیا۔ میری آنکھوں میں بغور جھانکا، ایک نئی ادا سے میرے ہونٹوں پر پھونک ماری اور کہا، ''شہریار! آئی لو یو..... تم بہت مختلف انسان ہو۔''

میری سانسیں غیر معتدل ہو چکی تھیں۔ بہ دقت تمام میرے ہونٹوں سے نکلا، ''مم..... مگر یہ

امتحان مجھ پر بھاری ہے۔''

اس نے میری بات پر توجہ نہیں دی تھی بلکہ غیر معمولی آہستگی سے اپنے سرخ تر ہونٹ میرے ہونٹوں سے مس کر دیے۔ میں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ یوں لگا جیسے میرے بدن کا تمام تر خون نچڑ کر میرے ہونٹوں میں سمٹ آیا ہو۔ میں کوشش کے باوجود اپنا سر پیچھے نہ کر سکا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اچانک اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر بے جان کر لیا۔ میرے جسم میں پہلے ہی جان نہیں رہی تھی، اوپر سے یہ افتاد پڑی تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ پایا اور اسے لیے صوفے کی آرم ٹیک اور شیشے کی تپائی پر گر پڑا۔ میری داہنی کہنی کی ضرب سے تپائی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ چھناکے کی زوردار آواز میں میڈم کی تیز ہنسی کی آواز بھی شامل ہو گئی۔ وہ آدھی صوفے پر، آدھی تپائی کے فریم پر اور میں اُس کے ہنسی کی تال پر ہچکولے لیتے وجود پر گرا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

اچانک جلترنگ تھم گئی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''بس؟''

مجھے جیسے ہوش آ گیا۔ میں نے اپنے بازوؤں کے سوختہ اعصاب میں اپنی تمام تر توانائیاں انڈیلیں اور اُس کے ڈھیلے مگر آتشیں بدن کو ہوا میں بلند کر لیا۔ اس کا سر، زلفیں اور پنڈلیاں فرش کی طرف ڈھلکی ہوئی تھیں جب میں الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر بیڈ کی طرف بڑھا۔ اُسے بڑی آہستگی سے لٹایا، بازو اس کے مرمریں وجود کے نیچے سے کھینچے اور چاہا کہ اس دہکتی ہوئی آگ سے دور ہٹ جاؤں مگر اس نے ناگاہ میرا ہاتھ تھام لیا۔ وفورِ شوق سے مجھے دیکھتی رہی، دبی دبی مسکراہٹ میں لپٹی ہوئی دعوت اچھالتی رہی، پھر کروٹ بدل گئی۔ بیڈ پر جوانی کے پوٹھوہار کے مقابل حسن کا ہمالیہ استوار ہو گیا۔ پہلو کے بل لیٹی ہوئی میڈم کے سڈول بدن کے اتار چڑھاؤ سے نظر ہٹانا دل گردے کا کام تھا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم کی بہکی بہکی مگر مترنم گنگناہٹ کمرے میں پھیل گئی، ''سو بار جنم لیں گے، سو بار فنا ہوں گے..... اے جانِ وفا پھر بھی ہم تم نہ جدا ہوں گے.....''

وہ گنگنا رہی تھی۔ ہولے ہولے تھرک رہی تھی۔ میں نے رُخ پھیر لیا۔ ایسے ہی پل میری چشمِ تصور میں غزالہ کا وجود آن ابھرا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہونٹ سکیڑ کر شکوہ کناں ہوئی، ''بس..... یہی تھا تمہارا پیار؟ کہتے تھے کہ جنم جنم سے تمہارا ہوں۔ یہی کہتے تھے ناں کہ حسن دیہات میں ملتا ہے، شہروں میں میک اپ زدہ چہرے اور کھوکھلے وجود نظر آتے ہیں۔ پھر ایک

شہرن نے تمہاری آنکھوں میں اپنی شباہت نقش کر ہی دی ناں؟''

میں نے سر جھکا لیا۔ وہ سچ کہتی تھی۔ میں اپنی کہی پر قائم نہیں رہ پایا تھا۔ میڈم کے حسن کا جادو مجھ پر پوری طرح چل گیا تھا۔ سانس سانس میں اُس کی خوشبو رچ گئی تھی۔ میں نے سر ہلکا۔ جواب نہیں تھا، تبھی اپنی آنکھوں کی سلطنت سے اس شکوہ گو کو بھگا دیا۔ یہی کر سکتا تھا۔ میرے عقب میں بیڈ پر شعلے اگلتا ہوا مرمریں وجود تھا۔ نظر کے سامنے شیلف میں رقص کرتی ہوئی، رنگ برنگ ملبوس میں لپٹی ہوئی پتھر کی ننھی سی مورتی رقص کی حالت میں کھڑی مجھ پر ہنس رہی تھی۔ یکبارگی جی چاہا کہ پلٹ کر اسے دیکھوں جسے دیکھنا عشق کی ریاضت میں شمار ہوتا تھا مگر جرأت نہ ہوئی۔ اجازت لئے بغیر کمرے سے نکلنا آداب کے منافی تھا، اجازت لینے کے لیے میڈم کو مخاطب کرنا قیامت تھا، تبھی شش و پنج میں پڑ کر تھم گیا۔ سانسوں کی مالا میں چھپے ہوئے انتشار کو صبر کی ہوا سے دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ عقب میں میڈم کی گنگناہٹ تھم گئی، پھر بھری آواز ابھری، ''شہریار! میرا موبائل فون میرے پاس رکھ کر اپنے کمرے میں جاؤ۔ فون پر مہروشاہ سے رابطہ کرو اور نور پور جانے کا پروگرام تشکیل دو۔ میں کچھ دیر آرام کروں گی۔''

''جی میڈم!''

صوفے پر پڑے ہوئے موبائل فون کو اٹھایا۔ پہلی سی حالت میں لیٹی ہوئی میڈم کے عقب میں رکھ دیا۔ ٹوٹے ہوئے بدن کے ساتھ میڈم کے آراستہ و پیراستہ بیڈ روم کم آفس سے باہر نکلا اور سر جھکائے گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ بے دھیانی میں اپنے ہونٹوں کو کاٹ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ننھی ننھی چنگاریاں چپک گئی ہوں۔ میڈم نے جس وارفتگی اور شدتِ جذبات سے مجھے لمس کا اعزاز دیا تھا، وہ میرے لیے ناقابلِ بیان اور قلب کی پہلی شدید واردات تھی تبھی میں میڈم کے کمرے سے نکلنے کے بعد بھی اس کے حصار سے نہیں نکل پایا تھا۔

کھالا اور وحید کھانا کھا چکے تھے۔ کھالے کی اشتہا کسی انتظار کو تسلیم کرنے والی نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شرارت مچل گئی۔ بولا، ''کیا بات ہے خان زادے؟ چہرے پر لالی نور برس رہا ہے۔''

میں نے کہا، ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میڈم نے آئندہ کا پروگرام دیا ہے۔''

میرے پہلو میں میرا دل کچوکا لگا کر بولا، 'کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج تم بے وفائی کا ارتکاب کر آئے ہو۔ یہ ثابت کر آئے ہو کہ مرد ہمیشہ خوب سے خوب تر کی

تلاش میں عورت عورت گھومتا ہے، من مندر کے لئے نئی سے نئی مورتی تلاش کرتا ہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ تم غزالہ کے دیوانے تھے، مگر تب تک، جب تک تم نے اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ میڈم کو دیکھ کر تمہارے عشق نے پگڈنڈی بدل لی ہے..... تف ہے تم پر!''

شاید میرے اندر کی جنگ میرے چہرے سے ہویدا ہونے لگی تھی، تبھی کھالا صوفے سے اُٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ میری آنکھوں میں براہِ راست جھانک کر بولا، ''تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو شہرے خان! سچ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟''

میں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، ''میں چائے کا کہہ دوں، پھر تمہیں میڈم کی پلاننگ سے آگاہ کرتا ہوں۔ پلیز ویٹ!''

وہ منہ بنا کر بولا، ''پلیز ویٹ..... واہ بھئی واہ..... آ گئی ناں انگریزی بولنی، اور چند دنوں تک تمہیں اپنی ماں بولی بھول جائے گی۔ پھر تم آدھے تیتر اور آدھے بٹیر بن جاؤ گے۔ نہ گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے.....''

چائے پینے کے دوران میں نے کھالے کو میڈم کے تحفظات اور پیش بندی کے بارے میں بتایا۔ اس نے تائید کی اور وقت ضائع کیے بغیر میڈم کی ہدایات پر عمل کرنا ضروری قرار دیا۔ میں نے میر وشاہ کا نمبر ٹرائی کیا مگر اس نے 'بزی' کر دیا۔ وہ مصروف تھا۔ میرے پاس پیا کا نمبر نہیں تھا وگرنہ میں اس سے بھی رابطہ کرتا۔ ایسے وقت میں وحید نے معصومانہ انداز میں گھر جانے کی ضد شروع کر دی۔ وہ اپنی ماں سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنی بہن کے بارے میں ماں باپ کو بتانا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ماں باپ اس کی بہن کو بہت جلد بازیاب کرا لیں گے۔ یہ غیر فطری بات نہیں تھی۔ بچے اپنے والد کو دنیا کا طاقت ور انسان سمجھتے ہیں جس کے پاس ان کی ہر مشکل کی دوا موجود ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسا ہی سمجھ رہا تھا۔ جو کچھ جانتا تھا، بہت جلد اپنی ماں کو بتانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی، اپنی مجبوری بتائی اور وعدہ کیا کہ اگلے دن اسے گھر پہنچا دوں گا۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ ناچار سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے کچھ نتائج میرے اور کھالے کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اخذ کر لیے تھے، کچھ میری بات سمجھ لی تھی، تبھی خاموش ہو گیا۔

میں نے احتیاط سے اس کا منہ ہاتھ اور سر دھلوایا۔ میڈیکل کٹ منگوا کر اس کی پٹیاں

کھولیں اور زخموں کی معائنہ کاری کے بعد ٹنکچر لگا کر نئی بینڈ یج کر دی۔ اس کے زخم گہرے تو تھے مگر خطرناک نہیں تھے۔ دو چار مرتبہ پٹی کرنے کی ضرورت تھی، پھر کھرنڈ آ جانے پر اس کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ اس کے لباس کی حالت بہت خراب تھی مگر یہاں اس کے سائز کا سوٹ ملنا محال تھا، اس لیے اسی پر گزارا کرنا پڑا۔ اسے سکون ملا تو پھر سو گیا۔ نہ جانے اس کے بدن کو کتنی نیند درکار تھی۔

آدھا گھنٹہ کے بعد میر وشاہ کا فون آ گیا۔ میں نے ریسیو کیا۔ اس کی آواز کانوں میں پڑی، ''اڑے او غنچے! یہ نیا فساد پھوکٹ میں میری جان پر ڈال دیوے ہے، اب کے نور پور میں ریڈ کرنا ہووت۔ اڑے مروا دیاناں لاڈے..... ادھر نفری شارٹ ہووے، ادھر ملکہ رانی کو تیرے لاڈ سوجھیں۔''

''میڈم نے کہا.....''

''اڑے ناں کر غنچے!'' وہ میری بات کاٹ کر بولا، ''ماڑی میڈم ساری بات بتا دیوت ہے۔ وہ دبئی پرواج (پرواز) کرنے کو تیار ہے، ماڑے کو سولی پر ٹانگ دیوت ہے، ایک بات کر کے..... اپنے لاڈے کاکے کو جرمینا (زرمینا) کے حوالے کر کے تیاری کرت..... اس کالے گلاب کے پھول کھالے کو بھی تیار کر لیوت ہے۔ ماڑے کو جرا (ذرا) مصروفیت ہووے، فارغ ہو کر تیرے پاس آوت ہے۔ پھر مل بیٹھ کر پلاننگ کرت ہیں۔ اوکے؟''

''اوکے۔'' میں نے جلدی سے کہا، ''زرمینا کہاں ہے؟''

''وہ سالی جرورت (ضرورت) سے جیادہ (زیادہ) سوہے ہے بالا خانے میں..... پر تیرے کو فکر کی جرورت نہیں ہے۔ میں سالی جرمینا کو فون کر کے تیرے کمرے میں بھیج دیوت ہے، اس کے حوالے کر دیوے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ کھلا کان نزدیک کر کے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ بولا، ''یہ کوئی خاص چیز ہے؟''

میں نے کہا، ''ہاں! سمجھ لو کہ میڈم کے بعد اس سارے نیٹ ورک کا انچارج ہے۔''

''لگتا تو نہیں.....'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''مگر ہے بڑی چیز.....'' میں بولا، ''میڈم اس کی ہر بات مانتی ہے۔ اس کا ہر نخرہ اٹھاتی ہے۔ وہ جس طرح میرے ساتھ باتیں کرتا ہے، بالکل اسی طرح میڈم کے سامنے بولتا ہے۔

کھالے! میڈم بڑی دھانسو قسم کی عورت ہے۔ اس کے سامنے بڑا دیکھ سوچ کے بولنا پڑتا ہے۔''

وہ مسکرایا، ''کیا بندے کھاتی ہے؟''

''ہاں..... بندے کو ایسے نگل لیتی ہے، جیسے بندہ نہ ہو، ببل گم ہو۔''

''تمہیں نگلا؟''

''میں کیا، میری اوقات کیا؟''

''زبان کچھ اور کہتی ہے، آنکھیں کچھ اور..... جھوٹ بولنے کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔''

''یار کھالے! ان باتوں کو چھوڑو، یہ سوچو، ہمیں کرنا کیا ہے؟'' میں نے موضوع بدلا کیونکہ اس کی بے مقصد طوفانی گفتگو چھڑ گئی تھی جسے روکنا ضروری تھا، ''کیا چاچا چراغ اور چاچی ہمارے ساتھ آنے پر تیار ہو جائیں گے؟''

وہ بولا، ''یہ بعد کی بات ہے، یہ دعا کرو کہ وہ خیری سلامتی (بخیر و عافیت) ہوں۔''

میرے دل سے دعا نکلی، ''یا اللہ! انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔'' میں نے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اتاری اور کہا، ''سچ پوچھو تو میں نور پور سے اداس ہو گیا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے کئی سال ہو گئے ہوں نور پور سے نکلے ہوئے۔ وہ گلیاں، وہ حویلیاں، وہ کھیت..... سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ تم یہاں آ کر غزالہ کو بھول گئے ہو۔ کیا وہ تمہارے دل سے اتر گئی ہے؟'' کھالے نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''او نہیں یار! وہ میرا عشق ہے اور عشق ہمیشہ غیرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میری غیرت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ جب تک پروین زندہ سلامت مجھے نہیں مل جاتی، تب تک میرے دل میں غزالہ تو کیا، کوئی اور خیال بھی نہیں آ سکتا۔''

''میڈم کا خیال بھی نہیں آ سکتا؟''

میں کہنے لگا کہ ہرگز نہیں، پھر یاد آ گیا کہ میں اس وقت میڈم کی کوٹھی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ طلسم کدہ تھا۔ خبر نہیں تھی کہ یہاں ہونے والی گفتگو میڈم کے کانوں تک پہنچ رہی ہو۔ میں نے کہا، ''میڈم کی بات اور ہے، وہ نہ صرف میری محسنہ ہے بلکہ وہ مجھے اہمیت دیتی ہے۔''

''کیا تم اس سے محبت کرنے لگے ہو؟'' کھالے نے براہِ راست میری آنکھوں میں

جھانکا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ہر آن کوئی حساس موضوع چھیڑنے پر آمادہ تھا۔ اس نے ٹہوکا دیا، ''بولتے کیوں نہیں؟''

''میں اس قابل نہیں ہوں کہ میڈم سے محبت کا دعویٰ کروں۔ وہ آسمان ہے، میں زمین ہوں۔ ہمارا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ مگر میں اس کو دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔''

''کب تک؟'' اس نے مزہ لیا۔

''تمام عمر۔''

''کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟''

''ہاں!'' میں نے تیقن سے کہا۔

''اسما سے زیادہ؟''

''ہاں! اسما اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔''

اس نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا، ''خیر یہ تو نہیں ہوسکتا مگر چلو تمہارا دل رکھنے کو مان لیتا ہوں۔''

وہ اسما کا عاشق تھا۔ کیسے میری بات مان لیتا۔ میں نے کہا، ''تمہیں اسما کی یاد ستانے لگی ہے؟''

وہ جل کر بولا، ''یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ تمہاری میڈم نے اسے قید کر رکھا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے.....''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔ اس کی زبان کو بریک لگ گئے۔ مجھے احتمال تھا کہ وہ غصے میں کوئی اول فول نہ بک دے، تبھی میں نے فوراً کہا، ''نور پور میں موبائل فون کی سہولت نہیں ہے۔ کارڈلیس فون بھی چند لوگوں کے پاس ہیں جن سے رابطہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان سے کچھ پوچھا نہیں جاسکتا۔ اگر ہم وہاں دیوانے سے مل لیں، اسے ملتان آکر رپورٹ دینے پر آمادہ کرلیں تو اسے کس جگہ پر بلائیں گے؟''

وہ بولا، ''اسی کوٹھی میں بلائیں گے، اور کہاں؟''

''میڈم کو یہ گوارا نہیں ہوگا۔''

''تو اسے شاہ شمس کے دربار پر با آسانی ملا جاسکتا ہے۔'' اس نے راہ سجھائی۔

''ڈاکٹر شاہ جی سے بھی ملیں گے۔''

''تم پاگل ہوئے ہو، کیا آدھی رات کو ہم لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتے پھریں گے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا، ''ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حیدر خان کا بڑا چچا، وریام خان ہمارا شاندار سواگت کرنے کے لیے جاگ رہا ہو اور ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''وہ ہمیں کیا کہے گا؟'' میں چونکا۔

''وہ اسما بی بی کو اپنی نونہہ (بہو) بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی غیرت پر تم نے چوٹ ماری ہے، وہ تمہارا خون پی جائے گا۔''

''میں نے؟''

''ہاں تم نے.....'' اس کے لہجے میں بہت خنکی تھی، ''جو بات حیدر خان تک پہنچ جاتی ہے، سمجھو وریام خان کے کانوں میں پڑ جاتی ہے۔ حیدر خان کی وفاداری میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ پروین اور اسما کے اغوا کی کڑیاں ملائی جا چکی تھیں۔ اب تک نور پور کی فضا مجھ پر تنگ کی جا چکی ہوگی۔ غنیمت تھا کہ سائیں دل جیت کی لاش جل کر خاک ہوگئی تھی اور اس کے قتل پر ہمیشہ کے لیے مٹی پڑ گئی تھی وگرنہ اس کے گرگے اور بہی خواہ میری تکہ بوٹی کرنے کے لیے تڑپ رہے ہوتے۔

میرا رُخ اَدھ کھلے دروازے کی طرف تھا۔ چست جامنی لباس والی ایک سرو قامت لڑکی گیلری میں رُکی، کمرے میں جھانک کر بولی، ''مسٹر شہریار؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اندر آ گئی۔ سونیا نے کہا تھا کہ زرمینا بہت حسین و جمیل ہے۔ جو بھی اسے دیکھتا ہے، دیکھتا ہی رہتا ہے۔ آنے والی کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ زرمینا ہی ہو سکتی تھی کیونکہ وہ حسن کا مکمل شاہکار تھی۔ جدید وضع کا گہرا جامنی لباس، کھلے اور کولھوں تک کمر کا احاطہ کیے ہوئے جھرنے جیسے ہلکے براؤن بال اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں..... اسے دیکھنے کے بعد واقعتاً کچھ اور دیکھنے کی طلب نہیں رہتی تھی۔ میں نے کہا، ''تم زرمینا ہو ناں؟''

وہ مسکرائی، ''جی..... میر وشاہ نے کسی بچے کو لے جانے کا حکم دیا ہے۔ کیا وہ یہی ہے؟''

اس کا اشارہ بیڈ پر پائنتی کے رُخ لیٹے ہوئے وحید کی طرف تھا۔ میں نے 'ہاں' کہا تو وہ

بولی، ''اسے جگائیں، میں اسے اوپر لے جاتی ہوں۔''

ایسے میں کھالے کی نظر اُس پر پڑی۔ یوں لگا جیسے وہ نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس کی ندیدی آنکھیں اپنی پوری وسعت میں پھیل گئیں۔ منہ بھی کھل گیا۔ زرمینا وحید کی طرف متوجہ تھی اس لیے کھالے کا گستاخ انہماک دیکھ نہ پائی۔ بولی، ''اس کے کپڑے بہت گندے ہیں، کیا بازار سے دو تین سوٹ منگوالوں؟''

شاید وہ یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ اتنا اہم تھا کہ اس کے لیے کپڑے خریدنے کا تردد کیا جائے، میں نے جواب دیا، ''اگر ممکن ہو تو ضرور منگوالینا۔''

میں نے وحید کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اسے زرمینا کے ساتھ جانے کا کہا تو اس کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ میری موجودگی میں اسے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ میں اس کی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجبوری تھی، اس لیے اسے بہلا پھسلا کر زرمینا کے ساتھ بھیج دیا۔ قیامت کی طرح ٹوٹ پڑنے والی ایک ادائے بے نیازی سے وحید کا ہاتھ تھامے لہراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو میں نے کھالے کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا، ''ابے او نظر باز کی اولاد! اب جاگ جاؤ، جانے والی جا چکی ہے۔ تم نے شاید یہ سمجھ رکھا تھا کہ اسمابی بی سے زیادہ دنیا میں کوئی بھی خوب صورت نہیں ہے۔''

وہ چونکا اور لمبی آہ بھر کر بولا، ''یار یہ تو نری پُری (بالکل) نیلم پری تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا.....''

میں نے حسبِ روایت اس کی بات کاٹ دی، ''کہ جیسے دنیا اس کے پیروں میں سمٹ آئی ہو، جیسے اس کے سامنے اسما جیسی سینکڑوں لڑکیاں پانی بھرنے پر لگ گئی ہوں.....''

اگر میں فوراً پیچھے نہ ہٹ جاتا تو اس کا طوفانی مکا میرے کاندھے پر پڑتا۔ کم بخت کا ہاتھ بہت بھاری تھا۔ گرز کی طرح پڑتا تھا۔ وہ جھنجھلا کر بولا، ''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی لڑکیوں پر..... اسمابی بی کو ایسی پرکٹی لڑکیوں کے ساتھ نہ جوڑا کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے۔''

میرا قہقہہ اس کے غصے کو پنکھ لگانے لگا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے دروازے میں میر وشاہ کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے بانہیں کھول کر پرتپاک انداز میں نعرہ لگایا، ''او ماڑے غنچے..... او ماڑے لاڈے..... بڑا نکھر جاوت ہے میڈم کے محل میں گھس کر.....''

❖❖○❖❖

میروشاہ کی ہدایت پر جب میں، کھالا اور پیا مظفر گڑھ کی نواحی بستی بصیرہ میں میڈم کے خاص کارندے سردار انصر حیات کے ڈیرے پر پہنچے، تب سات بج چکے تھے۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ شام جلد ڈھلنے لگی تھی۔ سات بجے دیہاتی فضا پر اندھیرے کے تسلط کی ابتدا ہو چکی تھی۔ سردار انصر کا ڈیرہ بستی سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہاں اس کا پندرہ ایکڑ زرعی رقبہ تھا جس کے عین وسط میں اس نے شاندار وضع کا ڈیرہ تعمیر کر رکھا تھا۔ اس کی رہائش بصیرہ بستی کے قلب میں واقع تھی۔ پیا نے بتایا کہ اس کی تین مربع زرعی اراضی جنوب میں گودر کے موضع میں ہے۔ سردار انصر کا یہ جدید طرز کا ڈیرہ مکمل گیسٹ ہاؤس کا درجہ رکھتا تھا۔ پتہ چلا کہ میروشاہ نے اسے ہماری آمد کی خبر کر دی تھی۔ تبھی وہ ہمارا منتظر تھا۔ ڈیرے پر دو دیہاتی ٹائپ نوکر موجود تھے جنہیں اس نے مہمانوں کی خاطر تواضع کا حکم صادر کیا اور ہمیں ایک نسبتاً بڑے اور محفوظ کمرے میں پہنچا دیا۔ ہمیں یہاں سے بارہ بجے کے بعد کسی وقت نکلنا تھا۔ چونکہ نور پور یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور ہمارے پاس بھی نئے ماڈل کی اسوزو ٹرو پر گاڑی تھی جو ہمیں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹوں میں یہاں سے نور پور پہنچا سکتی تھی۔ اس لیے بجائے ملتان میں بیٹھ کر انتظار کرنے کے، میروشاہ نے یہاں آرام سے بیٹھنے کا حکم صادر کیا تھا۔

سردار انصر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''سائیں! یہاں سب کچھ موجود ہے۔ ان پانی (کھانے) کا انتظام میں نے کر رکھا ہے۔ پینے پلانے کا اہتمام بھی ہے۔ ادھر فوٹو شوٹو بھی دیکھ سکتے ہو.....''

اس نے کمرے کے کارنر میں رکھی ٹی وی ٹرالی کی طرف ہنس کر اشارہ کیا، پھر بولا، ''سائیں! یہ شہر تو نہیں ہے مگر یہاں میں نے شہر کی ہر شئے اکٹھی کر رکھی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ صرف پی ٹی وی نظر آئے گا، ہر چینل دیکھا جا سکتا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ اس نے ٹی وی پر ڈش ریسیور لگا رکھا تھا۔ اس نے ہمیں ڈیرے کے بارے میں معلومات دیں، سینے پر ہاتھ رکھا اور اجازت چاہی۔ اس کے جانے کے بعد پیا نے کہا، ''یہ بڑا من موجی آدمی ہے۔ اس نے سچ کہا ہے، یہاں سب کچھ ملتا ہے۔''

ابھی وہ ہمیں اس کے بارے میں بتا رہا تھا جب نوکروں نے کمرے کے وسط میں دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ کھانا واقعتاً پر تکلف اور مزیدار تھا۔ اصیل مرغ کا بھنا ہوا گوشت، تندوری روٹیاں، دیہاتی انداز سے تیار کیا ہوا دیسی سلاد، مکھن اور ابلے ہوئے انڈے..... کھانے کی

مقدار اتنی تھی کہ اس سے باآسانی چھ سات آدمی سیر شکم ہو سکتے تھے۔ پیا نے نوکر کو آنکھ دبا کر مخصوص اشارہ کیا۔ نوکر نے روائتی انداز میں جھک کر سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا، ''حکم دی تعمیل تھیسی میڈا سائیں.....''

(حکم کی تعمیل ہوگی میرا سائیں!)

کھالے کی آنکھیں جل اُٹھیں جب اس نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اسکاچ کی میڈیم پیک بوتل اور شیشے کے تین گلاس دسترخوان پر رکھ دیے۔ پیا نے برف کی فرمائش کی۔ نوکر فریج سے برف کے ننھے ننھے ٹکڑے، اسٹیل کی چمٹی اور پانی کی یخ بستہ بوتل بھی حاضر کردی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ان کی محفل چھوڑ دی اور چارپائی پر نیم دراز ہوگیا۔ کھالا اور پیا بدستور وہیں بیٹھے رہے۔ مجھے ایک نیا کھیل دیکھنے کو ملا۔ پیا نے اسکاچ کی بوتل کھولی۔ دو گلاس آدھے آدھے بھرے، چمٹی کی مدد سے ان میں برف کے ننھے ننھے چوکور ٹکڑے بڑی نفاست سے ڈالے اور تھوڑا سا پانی ڈال دیا۔ جام تیار ہو چکا تھا۔ دونوں نے گلاس ٹکرائے، لبوں سے لگائے اور مزہ لینے لگے۔

انہوں نے اس عمل کو اس وقت تک دہرائے رکھا جب تک بوتل خالی نہیں ہوگئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بوتل چڑھا لینے کے باوجود دونوں پوری طرح اپنے حواس میں تھے۔ وہ بہکے ہوئے ہرگز نہیں تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ان کی مے نوشی کی وجہ سے آج کا مشن التوا میں نہ پڑ جائے، مگر خیر گزری کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر چارپائیوں تک آئے اور پھیل کر بیٹھ گئے۔ کھالا بولا، ''خانزادے! تھوڑا او کھا تھی تے ایں ڈبے کوں کھلا بجا کر.....''

(خانزادے! تکلیف کرو اور اس ڈبے پر لعنت بھیج دو)

اس نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں اُٹھا اور میں نے ٹی وی اور ڈش ریسیور آن کردیا۔ دونوں ریموٹ اُٹھائے چارپائی پر آن بیٹھا۔ عادتاً چینل بدلنے لگا۔ کھالے کو موج مستی والا چینل درکار تھا تبھی 'آ گئے' کا نعرہ بار بار بلند کررہا تھا۔ ایسے میں ایک مقامی نیوز چینل پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ بریکنگ نیوز نشر کی جارہی تھی۔ نیوز کاسٹر کی پر ہیجان آواز ٹی وی کے اسپیکروں سے نکل کر کمرے میں پھیلنے لگی۔ وہ بتا رہی تھی کہ غازی گھاٹ کے قریب سندھ کے بیلے میں پولیس کا اشتہاریوں کی خفیہ پناہ گاہ پر چھاپہ، چار ڈاکو ہلاک دو سپاہی اور ایس ایچ او زخمی.....تقریباً یہ الفاظ سکرین کے نچلے حصے میں بطور سلائیڈ چل رہے تھے۔ سکرین پر تھانے کی

حدود میں چار پائیوں پر رکھی ہوئی ڈاکوؤں کی لاشیں دکھائی جارہی تھیں۔ میرے ساتھ ساتھ کھالا اور پیا بھی چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ جونہی سکرین پر ڈاکوؤں کے چہرے دکھائے گئے اور ان کے سروں کی مقررہ قیمتیں بتائی گئیں، ہم بری طرح چونک گئے۔ وہ چاروں وہی تھے جنہیں ہم نے حیدر خان کی خفیہ حویلی کے اسٹور میں مردہ حالت میں دیکھا تھا۔ میرے لبوں سے نکلا، ''یہ کیا کھالے! یہ تو وہی ہیں جنہیں کسی نامعلوم آدمی نے رسی کا پھندا دے کر قتل کیا تھا۔''

کھالے نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور توجہ سے دیکھنے لگا۔ سکرین پر زخمی ایس ایچ او اٹک اٹک کر بتا رہا تھا، ''ہمیں ان ڈاکوؤں کی موجودگی کی مخبری ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے بہت بڑا کریمنل گینگ بنا رکھا تھا اور بڑی وارداتیں کرتے تھے۔ ان پر ان گنت مقدمات تھے اور حکومت نے ان چاروں کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر اٹھارہ لاکھ روپے انعام مقرر کر رکھا تھا۔ ان سے کئی مرتبہ ہماری مڈبھیڑ ہوئی مگر یہ ہر مرتبہ جل دے کر نکل گئے۔ اس مرتبہ ہم نے مخبری کے بعد اپنے ریڈ کو بالکل خفیہ رکھا۔ میرے ساتھ تھانہ چوک قریشی کے سات دلیر اور محب وطن اہل کاروں نے ریڈ میں حصہ لیا اور بڑی دلیری اور بہادری سے ان کا مقابلہ کیا۔ ہم نے جب ان کا گھیراؤ کیا تو انہیں ہتھیار پھینک کر خود کو قانون کے حوالے کرنے کی پیش کش کی۔ بار بار مائیکروفون پر اعلان کیا مگر انہوں نے مورچے سنبھال کر ہم پر فائر کھول دیا.....''

وہ اپنی بہادری کی داستان بڑے جوش و خروش سے سنا کر سکرین سے اوجھل ہو گیا۔ دوسرا زخمی اہلکار سکرین پر نظر آیا۔ ایک مرتبہ پھر کیمرہ مین نے کیمرہ مردہ ڈاکوؤں پر فوکس کیا۔ اپنی اینکر کو رپورٹ دیتے ہوئے کہا کہ چاروں ڈاکو پولیس کی گولیاں لگنے سے ہلاک ہوئے ہیں۔ میں نے آنکھیں مزید کھولیں، غور سے دیکھا تو ڈاکوؤں کی بنیانوں اور کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے دکھائی دیے۔ کھالا بولا، ''لگتا ہے کوئی تین چار کلو کا کگڑ (مرغا) حلال کر کے خون چھڑکا گیا ہے۔''

وہ خون مرغے کا تھا، یا کسی جانور کا، بہرحال ان کا نہیں تھا کیونکہ مردوں کے بدن میں گولیاں تو اتر سکتی ہیں مگر خون نہیں نکل سکتا۔ پیا بولا، ''یار یہ لوگ کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے پوری سروس میں محض جھوٹ بولنا ہی سیکھا ہے۔''

کھالا بولا، ''ان لوگوں کو مفت میں اٹھارہ لاکھ روپے کا انعام مل گیا ہے، دیکھو تو..... اللہ کی توبہ ہے بھئی.....''

نوکر نے میرے سامنے چائے کا بڑا پیالہ اور دونوں عیش کوشوں کے سامنے آم کے اچار سے بھری چھوٹی سی پلیٹ رکھ دی۔ کھالے کی سنگت نے یہ سمجھا رکھا تھا کہ اچار کھانے سے شراب کے نشے میں کمی واقع ہو جاتی ہے، اس لیے مجھے ان دونوں کو اچار کی ڈلیاں چوستے دیکھ کر مطلق حیرانی نہیں ہوئی۔ میری توجہ ٹی وی سکرین پر جمی ہوئی تھی جہاں ڈی ایس پی کے بعد مظفر گڑھ کا ایس پی اپنے بہادر اہلکاروں کی تعریف کر رہا تھا اور محکمانہ انعامات و اعزازات کا اعلان کر رہا تھا۔

کیمرے نے زوم ان کیا۔ اب جو شخصیت سکرین پر نظر آئی، اسے دیکھ کر یکبارگی میرا خون کھول اُٹھا۔ وہ سردار حیدر خان تھا جو عادتاً اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کڑک دار آواز میں کہہ رہا تھا، ''ان ظالم درندوں نے میرے حلقے کے لوگوں کا جینا محال کر رکھا تھا۔ ان کی وارداتوں کی شکایت میرے حلقے کے لوگ بارہا مجھے کر چکے تھے۔ میں نے ذاتی طور پر ایس پی صاحب اور ڈی آئی جی صاحب کو درخواست کی کہ ان لوگوں کا قلع قمع کیا جائے۔ آج جب مجھے پتہ چلا کہ ایس ایچ او نے کمال دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گینگ کو تہس نہس کر دیا ہے، تو میں نے اور میرے حلقے کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ہے اور پولیس پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ میں اپنی طرف سے ان سرکاری اہل کاروں کو جنہوں نے اس ریڈ میں حصہ لیا، بیس بیس ہزار روپے بطور انعام دینے کا اعلان کرتا ہوں۔''

میرا جی چاہا کہ میں ٹی وی سکرین توڑ دوں۔ وہ بہت بڑا جھوٹا اور کمینہ صفت انسان تھا۔ اس نے اپنے اتنے بڑے نقصان سے بھی سیاسی فائدہ کشید کر لیا تھا۔ اس کے کارندے اس کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر عوامی حلقوں میں پیش کرنے لگے ہوں گے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے نہ صرف ان لاشوں کو ٹھکانے لگا لیا تھا بلکہ قانون اور علاقے کی نظروں میں اپنا قد بھی بڑا کر لیا تھا۔ کھالا بولا، ''یہ ہوتی ہے سیاست..... دیکھو..... کیسا پانسہ پلٹا ہے شیر کے بچے نے! پر اندر کا حال اس کی روح کو جلا رہا ہوگا۔''

میں نے دانش مندانہ انداز میں کہا، ''نہیں کھالے! اسے کارندوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ دو اور اشتہاری بھرتی کر لے گا۔ ان اشتہاری ڈاکوؤں کی زندگی کی قیمت بہت کم ہوتی ہے۔ یہ بھی مرتے ہیں، کتے کی موت مرتے ہیں۔''

''کیا تم بھی اشتہاری ہو؟'' کھالے نے اسے دیکھا۔

''تو اور کیا..... جب میں ڈاکو ہوا کرتا تھا تو میں نے بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ جب میڈم کے پاس آیا تو اس نے مجھے جنگلی سے شہری بنا دیا۔ میڈم نے مجھ پر احسان کیا، میری شکل میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کرا دی۔ میرا نیا شناختی کارڈ بنوایا۔ اب میری پہلی پہچان ختم ہو چکی ہے۔ نیا نام، نیا کارڈ اور نئی زندگی جو میڈم کی دین ہے۔''

میں نے پلٹ کر ایک ذرا غور سے اسے دیکھا۔ شکل میں تھوڑی بہت تبدیلی کیسے ممکن تھی؟ پھر نگاہوں میں میڈم گھوم گئی۔ سوچا، اس کی دنیا میں یہ بھی ممکن ہوگا۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز بدل گئی۔ کسی اور علاقے کے خبر چل نکلی۔ وہ بھی پولیس مقابلے کی تھی۔ پیا نے کہا، ''اور دیکھو..... یہاں بھی سردار حیدر خان کا کوئی بھائی بند موجود ہے۔''

میں نے گہری انداز میں سر ہلا دیا۔ چونکہ اس پولیس مقابلے کے پس منظر سے میں پوری طرح واقف تھا، اس پر جھوٹ کی اتنی بڑی عمارت کی تعمیر دیکھی تو اب تک سنے اور ٹی وی پر دیکھے جانے والے سبھی پولیس مقابلے میری نظر میں مشکوک ہو گئے تھے۔ لوگ سچ کہتے تھے کہ بڑے لوگوں کی باتیں غریب عوام کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ وہ ایک تیر سے دو نہیں، کئی کئی شکار کرتے ہیں اور پھر چہرے پر معصوم تبسم لیے ہیرو بن جاتے ہیں۔ مجھے حیدر خان کے نام سے گھن آنے لگی۔ نفرت سے ہونٹ سکیڑے اور چینل بدل دیا۔ اب کسی انڈین چینل پر ہیجان خیز رنگوں میں لپٹی جوانی تھرکنے لگی۔ کھالے نے نعرہ لگایا، ''بس بابا بس..... یہیں دو گھڑی سکھ کا سانس لینے دو ہمیں۔ کیوں پیا جی؟''

پیا جی نے بھی اس کی بے طرح کی حمایت کر دی تو میں نے ریموٹ کنٹرول چارپائی پر رکھ دیا اور سرھانے پر سر ڈال دیا۔ سردار حیدر خان کو پسِ نظر ڈال کر اپنے درپیش مشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہم تینوں اس وقت جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ عقیل میروشاہ کے کسی اور مشن میں مصروف تھا اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ بڑی گاڑی میں آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہم واپسی پر تمام لوگوں کو ساتھ لا سکیں۔ میروشاہ نے گل گشت کالونی میں ایک کرائے کے بنگلے کا انتظام کر دیا تھا اور اس کا پتہ پیا جی کو سمجھا دیا تھا۔ اس نے بڑی سختی سے حکم دیا تھا کہ اگر میرے گھر والے نرمی سے آنے پر رضامند نہ ہوں تو انہیں زبردستی گاڑی میں لاد لیا جائے۔ ان کا وہاں رہنا اب کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔ انہیں پہلے سردار انصر کے ڈیرے پر پہنچایا جائے، پھر موقع ملتے ہی ملتان شفٹ کیا جائے۔ اس نے اور بھی بہت سی ہدایات سے ہمیں

نوازا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ خالہ کبریٰ اور غزالہ کو بھی نور پور سے نکال لاؤں یا انہیں وہیں رہنے دوں۔ بظاہر تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا مگر سردار حیدر خان کی سفاک فطرت سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ چونکہ حیات خان اور وریام خان اس کے بہت قریبی ساتھی تھے جن کے توسط سے اسے میرے اور غزالہ کے باہمی تعلق کی نوعیت کا پتہ چل سکتا تھا اور اس کے تمام تر غصے کا بہاؤ اس طرف ہو سکتا تھا، اس لیے میں شش و پنج میں مبتلا تھا۔ ایک وقت تھا، جب میں سمجھتا تھا کہ ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والا ایک عنصر لاقانونیت کا ہے مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ آج جب میں نے نیوز چینل کی ڈاکومنٹری دیکھی تو یقین ہو گیا کہ اس معاشرے میں سب کچھ ممکن ہے اور لاقانونیت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کچھ بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ یہاں پیسے والے، اختیارات والا رات کو دن اور دن کو رات بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ قانون اس کے چونچلوں کو تحفظ دیتا ہے۔ اس کے لیے انسانوں کے خون کو بھی پانی بنا کر گلاسوں میں بھر دیتا ہے۔

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ میرے ماں باپ کے بہیمانہ اور اندھے قتل پر پردہ کیسے پڑ گیا۔ بھری دنیا میں کسی کو بھی نہیں پتہ چلا کہ انہیں کس نے اور کیوں قتل کیا، تو میں پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ آج سمجھ میں آ گیا تھا کہ ان دونوں کو بھی کسی ایسے ہی شاہ زور نے مروایا تھا جس کا قانون کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ دیہاتیوں کو اکثر یہ کہتے سن رکھا تھا کہ خون کبھی چپ نہیں رہتا۔ ناحق قتل چھپا نہیں رہتا۔ میرے والدین کا قتل زمانے کی گرد کے نیچے دب کر اوجھل ہو گیا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے اپنے علاقے کے تمام بڑے زمینداروں اور سیاست دانوں پر شک کی نگاہ ڈالی اور سوچا کہ ان میں سے کوئی ان کا قاتل ہو سکتا ہے جس نے یتیمی میری قسمت کر دی تھی۔ وہ سردار حیدر خان بھی ہو سکتا تھا، وریام خان بھی اور..... وسیب کا کوئی اور وڈیرہ.....

بارہ بجے کے قریب پیا جی کے موبائل پر میر وشاہ کی کال ریسیو ہوئی۔ پیا جی 'یس باس' کہہ کر ہمہ تن گوش ہو گیا اور میر وشاہ کی آواز بھنبھناہٹ کی صورت میں ہمارے کانوں تک پہنچنے لگی۔ وہ اپنی دی ہوئی ہدایات کو دہرا رہا تھا اور بار بار میرے بارے میں تاکید کر رہا تھا کہ میرا خیال رکھا جائے۔ میں نے کہا، ''پیا جی! پوچھو تو کیا میڈم چلی گئی ہیں؟''

میری آواز میروشاہ نے سن اور سمجھ لی۔ فوراً کہا، ''ہاں ماڑے غنچے..... میڈم جہاج (جہاز) میں سوار ہو جاوے ہے۔ پَر تم فکر کاہے کو کرت ہے، ماڑے کو اپنے اپنے ساتھ سمجھے ہووت.....''

میرے لبوں پر تازہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرے لئے تسلی کی بات تھی کہ وہ مجھ پر مہربان تھا۔ میرا خیال رکھتا تھا۔ پیا جی فون بند کر کے بولا، ''میروشاہ کا حکم ہے کہ ہم یہاں سے ایک بجے نکلیں اور دو بجے تک اپنا کام نمٹا کر واپس یہیں پر آ جائیں۔''

میں اور کھالے نے سر تسلیم خم کیا۔ میں نے کہا، ''پیا جی! میرا خیال ہے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے ہم اپنا کام کر کے لوٹ آئیں گے۔''

کھالا بولا، ''لگتا تو ایسے ہی ہے مگر..... مگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ براویلا (وقت) بتا کر نہیں آتا۔ میروشاہ نے ٹھیک کہا ہے کہ ہمیں ہر لحظہ کسی بھی افتاد کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔''

پیا نے مسکرا کر کہا، ''میں نے اپنی بارہ سالہ سروس میں ایک یہ سبق سیکھا ہے اور ایک سبق یہ سیکھا ہے کہ کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔''

''بارہ سالہ سروس.....'' کھالے نے قہقہہ لگایا، ''کہہ تو ایسے رہے ہو جیسے تم نے کسی سکول یا کالج میں نوکری کی ہو۔''

وہ نادم ہوئے بغیر بولا، ''سروس تو سروس ہی ہوتی ہے۔ کوئی لفظ لکھنا سکھاتا ہے، کوئی لکھے کو مٹاتا ہے اور کوئی لکھنے والا ہاتھ ہی کاٹ دیتا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سجاول کریانے والے اور اس کی بیوی نے تمام عمر میں ایک بیٹے اور بیٹی کو پروان چڑھایا تھا۔ یہی ان کا مستقبل اور بڑھاپے کا سہارا تھا۔ سائیں دل جیت نے ایک ہی لمحے میں ان پھولوں کو ٹہنی سے جدا کر دیا اور پیروں تلے روندنے کے لیے سردار حیدر خان کی تحویل میں دے دیا۔ کسی کی فصل اجاڑتے ہوئے اسے دکھ نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ چار اشتہاری ڈاکو جنہیں ان کے والدین نے نہ جانے کتنی کٹھنائیوں کے روبرو سینہ سپر ہو کر پالا پوسا ہوگا، معاشرے نے فراری ڈاکو اور حیدر خان نے شعلہ جوالا بنا دیا۔ قانون کے ہرکاروں نے ان کی لاشوں پر کاروبار کی شطرنج بچھا دیا اور لاکھوں روپے کے انعامات اور تمغے حاصل کر لیے۔

سردار انصر نہ جانے کس قماش کا آدمی تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ بھی کوئی نیک پاک آدمی نہیں تھا

کیونکہ وہ میڈم کے لیے کام کرتا تھا۔ کیا کام کرتا تھا؟ یہ آنے والے وقت میں ہی پتہ چل سکتا تھا۔ اس کا ڈیرہ مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہاں سب کچھ تھا اور سب سے بڑی سہولت تو رازداری کی حاصل تھی۔ یہاں کسی کی آمد و رفت نہیں تھی۔ یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ یہ بات میر وشاہ نے بھی ہمیں بتائی تھی۔

اس ڈیرہ نما ریسٹ ہاؤس میں تین بڑے بڑے کمرے تھے۔ ایک یہ، جس میں ہم تینوں بیٹھے تھے، ایک میں نوکر مستقلاً رہائش پذیر تھے جبکہ تیسرا کمرہ خاص کمرہ کہلاتا تھا۔ اس میں شاید ہم سے بھی زیادہ اہم لوگوں کو ٹھہرانے کا انتظام ہوگا۔ تینوں کمرے اٹیچڈ تھے۔ ایک سٹور، کچن اور بڑا سا برآمدہ جو کمروں کے آگے واقع تھا۔ برآمدے کے ستونوں میں آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ ایک بڑا ریلنگ گیٹ بند کرنے سے سارا ریسٹ ہاؤس بند ہو جاتا تھا۔ شاید یہاں پر اور بھی کچھ ہو..... سی ٹو کی طرح..... مگر فی الحال یہی کچھ نظر آ رہا تھا۔

ایک بجنے والا تھا۔ ہم نے رخت سفر باندھا۔ پیا کی ہدایت کے مطابق چھوٹا اسلحہ لوڈ کر کے لباس میں چھپا لیا۔ گنیں پسنجر سیٹ کے نیچے بنے ہوئے مخصوص خانے میں پڑی تھیں۔ انہیں نکال کر لوڈ کیا اور دوبارہ وہیں رکھ دیں۔ اسی اثناء میں ہماری آؤ بھگت پر مامور نوکر ہمارے پاس چلا آیا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ لہجے میں بولا، ''سائیں جی! ڈوو جے توڑیں تساں پروہنیاں کوں گھن آسو؟''

(کیا آپ دو بجے تک مہمانوں کو لے کر پہنچ جائیں گے؟)

میں نے کہا، ''ہاں! تم ہمارا انتظار کرنا۔ کچھ دیر سویر بھی ہو سکتی ہے۔''

''جی! میں سائیں دا نوکر ہاں..... جیں ویلے وِی آسو، ہتھ بدھی ملساں۔'' وہ بولا۔

(جی ہاں! میں آپ کا نوکر ہوں۔ جب بھی آپ واپس آئیں گے، میں ہاتھ باندھے استقبال کے لیے موجود ہوں گا)

ہم تینوں اس وقت جست لیدر سوٹ میں ملبوس تھے۔ آج فلک پر چاند نہیں سجا تھا۔ گہرے اندھیرے کا راج تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کھالا ڈرائیونگ کرنا چاہتا تھا مگر پیا نے روک دیا اور خود ڈرائیونگ سنبھال لی۔ گاڑی رینگتی ہوئی ڈیرے کا مین گیٹ عبور کر کے کچی سڑک پر آ گئی۔ پیا جی نے ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں بلکہ چھوٹی بیم لائٹس روشن کی تھیں جن کا رُخ زمین کی طرف تھا۔ یہ احتیاط اس لیے بروئے کار لائی گئی تھی کہ گاڑی دور سے دکھائی نہ

دے۔

مین روڈ پر چڑھنے کے بعد اس نے ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ اس سڑک پر دن میں بہت رش ہوتا ہے۔ رات کو ٹرک، ٹرالر اور لمبے روٹ والی بسیں ہی چلتی ہیں۔ کھالا فرنٹ سیٹ پر جبکہ میں عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر بولا، ''شہرے! پنوار والا کچا راستہ ٹھیک رہے گا، کیا خیال ہے؟''

وہ سڑک کی نسبت زیادہ محفوظ تھا۔ مگر ایک قباحت تھی کہ وہ راستہ نور پور سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر میرے بھانے کے برابر میں ختم ہو جاتا تھا۔ اتنی رات گئے اندھیرے میں پیدل اتنا سفر طے کر کے جانا اور آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''ہم گاڑی کہاں کھڑی کریں گے؟''

اس نے کچھ دیر سوچا، پھر بولا، ''نہیں یار! گڑبڑ ہے۔ ہم نوری چوک والی سڑک سے جائیں گے اور اگر کوئی خطرہ ہوا تو ہسپتال والی سیدھی سڑک پر سیدھا نکل جائیں گے۔ چکر کاٹ کر لال پیر سے محمود کوٹ والی سڑک پر چڑھ کر بھٹہ پور کی طرف نکل جائیں گے۔ ٹھیک؟''

میں نے اس کی شیطانی کھوپڑی کی دل ہی دل میں داد دی۔ چوک قریشی پہنچ کر جونہی موڑ کاٹا، سامنے سڑک پر پولیس والوں کا چوبی بیریئر دکھائی دیا۔ میں چونکا، ''یہاں تو کبھی ناکہ بندی نہیں ہوئی۔''

پیا ہنسا، ''آج تمہارے استقبال کے لیے محکمے نے یہ شاندار بندوبست کیا ہے۔ کیا یاد کرو گے۔''

پیا نے بیریئر کے سامنے گاڑی روک دی۔ ہارن بجانے پر ایک سپاہی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈھابے سے نکل کر گاڑی کے پاس پہنچا۔ پیا نے شیشہ اُتار دیا۔

ادھیڑ عمر کانسٹیبل قدرے مؤدبانہ لہجے میں بولا، ''کہاں سے آ رہے ہیں صاحب جی؟''

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے کیا چیکنگ کرنا تھی جو اَپ ماڈل کی سوزوکی ٹرو پر دیکھ کر بھیگی بلی بن گیا تھا۔ پیا نے دبنگ لہجے میں کہا، ''کہاں سے آ رہے ہیں، یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ہم سردار حیدر خان کے مہمان ہیں۔''

سپاہی اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی تھا بھی تو وہ کہیں چھپ کر نیند کے مزے لے رہا تھا۔ سردار حیدر خان کا نام سنتے ہی بھیگی بلی کا قد مزید چھوٹا ہو گیا۔ گاڑی کے اندر اندھیرا تھا۔ باہر

بلبوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے سپاہی ہمیں دیکھ نہیں پایا تھا۔ اس نے عاجزانہ انداز میں اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھا، سلام کیا اور بیریئر کی رسی کھول دی۔ بھاری پتھر نے لمبے ڈنڈے کو اچانک اوپر اُٹھا دیا۔ پیا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ شیشہ چڑھاتے ہوئے بولا، ''الو کے پٹھے! ٹرو پر دیکھ کر بچھ جاتے ہیں۔ پیدل چلتے ہوئے شخص کو 'اوئے' کہہ کر بلاتے ہیں اور کپڑے اتروا کر تلاشی لیتے ہیں۔''

کھالے نے کہا، ''شکر ہے اس کم بخت نے گاڑی کے اندر نہیں جھانکا ورنہ وہ مجھے ضرور پہچان جاتا۔''

''کیا وہ تمہیں جانتا ہے؟ کون ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا کیونکہ میں نے اس کی شکل پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔

کھالا بولا، ''یہ اس ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا سالا ہے، وہ، جس سے میں کپی خریدا کرتا تھا۔''

''اچھا.....'' میں نے زیرلب کہا اور شیشے کے باہر پھیلے بسیط اندھیرے میں نظریں پیوست کر دیں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا کچھ یہاں موجود بھی نہیں تھا جسے دیکھا جاتا، بس عادتاً ہی جھانک رہا تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ معمول کی بات تھی۔ پیا بڑے مدبرانہ انداز میں کھالے کو سمجھا رہا تھا، ''دیکھ بھئی کھالے! پولیس والوں کو دیکھ کر گھبرانا خود کو پھنسانے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ کوئی اپسرائی مخلوق نہیں ہے بلکہ فطری طور پر ہم لوگوں سے بہت کمزور ہیں۔ انہیں جان پیاری ہوتی ہے۔ ہم جان کی بازی لگا کر روڈ پر آتے ہیں۔ اگر ہم انہیں بتا بھی دیں کہ ہم کریمنل لوگ ہیں تو پھر بھی یہ فوراً ہی راستے سے ہٹ جائیں گے..... بلکہ بھاگ کر چھپ جائیں گے۔ کسی کو بتائیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے ہمیں دیکھا ہے۔ سمجھے؟''

کھالے نے فرماں بردار طالب علم کی طرح 'اچھا جی' کہا۔ کھالے کی طرح میں بھی وردی پوشوں سے ڈرتا تھا۔ ان سے دور بھاگتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک سرکاری سانڈوں کو دیکھ کر میری سٹی گم ہو جاتی تھی۔ چونکہ پیا کی بارہ سالہ 'سروس' تھی، اس لیے وہ انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

ہمیں نور پور تک کسی رکاوٹ یا غیر متوقع صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کھالے نے حیات خان کی حویلی کے سامنے پہنچ کر پیا سے کہا، ''میں نے اس راستے کی بات کی تھی۔ ہم اس

راستے سے واپس جائیں گے۔''

پیا نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا پھر کھالے کا اشارہ پا کر دائیں جانب اسٹیئرنگ گھما دیا۔ نور پور کے در و دیوار پر خامشی کا راج تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، نہ ہی کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا مگر ہم جونہی اپنی گلی میں گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی روک کر اُترے، میرا دل بری طرح گھبرا گیا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا خاموش سائرن بجا دیا۔ میں نے اپنے کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ کان لگایا۔ مجھے اندر سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ آواز بہت مدھم تھی مگر اتنا ضرور پتہ چلتا تھا کہ ایک سے زیادہ لوگ بول رہے ہیں۔ رات کے اس پہر میں میرے گھر میں جاگنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت سبھی گہری نیند میں ہوا کرتے تھے۔

میں نے مڑ کر عقب میں کھڑے ہوئے کھالے اور پیا سے سرگوشی کی، ''میرے گھر میں کوئی جاگ رہا ہے۔ کون؟ یہ علم نہیں ہے۔ لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہے۔''

کھالے نے بھی میری طرح دیوار سے کان لگایا۔ اس نے کچھ مختلف سنا اور ایک جھٹکے سے ساتھ سیدھا ہوا اور برقی مستعدی سے گاڑی کی طرف لپکا۔ پیا نے اس کی تقلید کی۔ دونوں نے چند لمحوں میں ہی تین گنیں اور اضافی میگزین نکال کر دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ ایسے ہی وقت میں جب پیا مجھے گن تھما رہا تھا، میرے عقب میں حویلی کے بند دروازے کے عقب سے تیز سرگوشی کی آواز ابھری، ''شیت..... شیت..... گاڑی ادھر کیوں لائے ہو؟''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس سرگوشی نے واضح کر دیا تھا کہ اندر کوئی موجود تھا، یا موجود تھے جن کا ساتھی آس پاس گاڑی لئے چھپا ہوا تھا۔ سرگوشی کی آواز پیا نے بھی سن لی اور ایک دم دروازے کے سامنے سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ کھالا دروازے کے آگے نکل کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اندر سے سرگوشی میں پوچھنے والے کو جواب نہیں ملا تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔ پیا نے جواباً سرگوشی کی، ''کیا واپس چلا جاؤں؟''

''نہیں..... اب یہیں رُکو..... تھوڑی سی دیر ہے۔''

پیا دروازے کی طرف جھکا۔ کان لگا کر کچھ سنتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا، ''وہ اندر چلا گیا ہے۔ گڑبڑ ہے، جلدی کرو.....''

ایک دم میرے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میرا خاندان خطرے میں تھا۔ پیا بلی کی سی پھرتی سے دروازے کے افقی ڈنڈوں پر پیر رکھ کر دیوار پر چڑھا اور آن واحد میں اندر کود گیا۔ بہت

ہلکی سی 'دھم' کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ جونہی میں دروازے کے سامنے پہنچا، اس نے اندر سے کنڈی کھول دی۔ مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ یہ کنڈی میں ہاتھ ڈال کر بھی کھول سکتا تھا، اسے ناحق اتنی تکلیف کرنا پڑی تھی۔

میں اور کھالا اندر داخل ہوئے اور اس کی تقلید میں صحن میں داخل ہو کر رُک گئے۔ وہ اچانک پلٹا اور نہائت دھیمی سرگوشی میں بولا، ''کھالے! تم باہر جاؤ۔ گاڑی تلاش کرو اور اس کے ڈرائیور کو قابو کرو۔ شور شرابا بالکل نہ ہو۔ ہری اَپ!''

کھالا پلٹ گیا۔ حکم کی فوری تعمیل اس کی سرشت کے منافی تھی مگر وقت کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ بلا چوں و چرا پیا کی بات مانتا۔ میر وشاہ نے پیا کو ہماری ٹیم کا ماسٹر مقرر کیا تھا اور ہم دونوں کو پیا کی اطاعت کا سختی سے حکم دیا تھا۔

پیا کمرے کی دیوار سے چپکا، سر باہر نکال کر چند لمحوں تک جائزہ لیتا رہا، پھر دبے پاؤں سرعت سے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ سے ہاتھ کو اوجھل کرنے والے اندھیرے میں میرے کمرے میں نہائت کم روشنی دور سے نظر آ رہی تھی۔ فضا میں مٹی کے تیل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے اگلا کمرہ چاچی کا تھا۔ اس میں بھی کوئی ٹارچ روشن تھی۔ میں پیا کے نقشِ پا پہ برق رفتاری سے چل رہے تھے۔ مجھے اس کے اعتماد نے حیران کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے میرے گھر کو بخوبی دیکھ رکھا تھا حالانکہ یہ حقیقت تھی وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس گھر میں قدم رنجہ ہوا تھا۔

صحن میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اندر جو بھی تھا، یا جو بھی تھے، انہیں شاید کوئی ڈر خوف نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے آنے کا اندیشہ..... تبھی نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ میرا دل میرے قابو سے ہر پل نکلتا جا رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ مجھ پر گراں گزر رہا تھا مگر میں اس وقت پیا کی معاملہ فہمی اور مہارت پر بھروسہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم جوں جوں دروازے کے قریب ہوتے جاتے تھے، مٹی کے تیل کی بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر پیا گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور چہرہ زمین سے ٹکا کر اندر جھانکنے لگا۔ اس نے چند لمحے اندر کی صورت حال کو سمجھنے میں لگائے اور پھر اچھل کر دروازے کے بیچ کھڑا ہو گیا۔ فضا میں اُس کی گھٹی گھٹی مگر دہشت انگیز آواز اُبھری، ''ہاتھ اُٹھا دو ورنہ گولی مار دوں گا۔''

میں نے دیوار کے ساتھ پشت ٹکا دی اور گن کو مضبوطی سے تھام کر فائر پوزیشن سنبھال لی۔

اس وقت مجھے پیا کو کور دینا تھا تا کہ کوئی اس پر عقب سے حملہ نہ کر سکے۔ پیا نپے تلے انداز میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کے اشارے سے دروازے میں رُکنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ میں بجلی کی سرعت سے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میرا رُخ چاچی کے کمرے کی طرف تھا جس میں کسی کی موجودگی ممکن تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے گردن موڑ کر اپنے کمرے میں جھانکا۔ مٹی کے تیل کا تیز اور ناگوار بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ سامان والی پیٹی اور چارپائی کے درمیان دو آدمی ہاتھ اپنے سروں سے بلند کئے کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ننھی سی ٹارچ تھی جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگر وہ اچانک ٹارچ آف کر دیتا تو کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا اور وہ چند لمحوں میں ہی پوزیشن لے کر پیا کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ شاید غیر متوقع طور پر پڑنے والی افتاد نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت قبض کر لی تھی۔

میں نے بیلٹ میں اُڑسی ہوئی پنسل ٹارچ نکالی اور روشن کر دی۔ ٹارچ کی تیز روشنی نے کمرے کا اندرونی ماحول اجال دیا۔ اب اگر وہ اپنی ٹارچ بند بھی کر لیتا تو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ پیا دونوں چارپائیوں کے بیچ کھڑا تھا۔ اس کی گن کا رُخ دونوں کی طرف تھا۔

''کون ہو تم؟'' پیا کی درشت آواز سنائی دی۔

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ ناکافی روشنی میں ان کے خال وخد دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے اپنی توجہ صحن کی طرف مبذول کی۔

پیا نے کہا، ''میں نے پوچھا ہے کہ تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟''

کوئی جواب نہیں ملا۔ یوں لگا جیسے دونوں بہرے یا گونگے تھے۔ پیا غرایا، ''گھر والے کہاں ہیں؟''

ایک نے دھمکی آمیز انداز میں کہا، ''اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

بھاری آواز میں دھمکی دینے والے کا لہجہ مقامی تھا مگر آواز یکسر ناشناسا تھی۔ اس وقت میرے قلب وذہن کی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ تبھی حکم کا غلام بن کر دروازے میں چوبند ایستادہ تھا۔ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں مبتلا تھا جب پیا کی آواز سنائی دی، ''میں تین تک گنوں گا..... اگر مجھے جواب نہ ملا تو ایک کو گرا دوں گا۔''

پیا کا لہجہ یک لخت سرد ہو گیا تھا۔ بولا، ''ون.....ٹو.....'' اس نے تھوڑا توقف کیا، پھر الٹے ہاتھ سے ہولسٹر سے پسٹل کھینچ لیا، ''تھری.....''

دونوں بڑے دل گردے والے تھے یا شاید انہیں یقین تھا کہ پیا محض دھمکی دے رہا ہے۔ مگر پیا کے سائیلنسر لگے پسٹل سے 'ٹھش' کی آواز برآمد ہوئی اور بائیں جانب کھڑے ہوئے طویل قامت ٹارچ بردار شخص کی پیشانی میں گولی پیوست ہو گئی۔ وہ پیچھے کی جانب گرا پھر دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتا ہوا فرش پر گر گیا۔ چند لمحوں تک ٹارچ کی روشنی کمرے میں تیزی سے چکراتی رہی پھر دیوار پر ایک ننھا سا دائرہ بنا کر تھم گئی۔ وہ مردہ ہوتے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی۔ پیا نے پسٹل کا رُخ دوسرے شخص کی جانب کر لیا، ''اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں بھی زندگی کا ایک موقع دیتا ہوں۔ ون.....ٹو.....''

وہ جلدی سے بول پڑا، ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

پیا بولا، ''مجھے اسی سوال کا جواب چاہیے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ بولا، ''میرا نام نذیر ہے۔''

''یہاں کیا کر رہے تھے؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے قدموں میں دیکھا۔ وہاں شاید اس نے کچھ رکھا ہوا تھا جو چارپائی کی وجہ سے مجھے اور پیا کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ پیا غرایا، ''جلدی بولو ورنہ.....''

''آ.....آگ.....'' وہ ہکلایا اور بولتے بولتے رُک گیا۔

''گھر والے کہاں ہیں؟''

''وہ.....وہ.....دوسرے کمرے میں ہیں۔''

''زندہ ہیں؟'' پیا کی آواز میں موت کی سردی گھل گئی۔

''ہا.....ہاں.....'' اس پر پیا کی بربریت بھری آواز کی دہشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے دائیں پہلو میں فرش پر گر کر تڑپتے ہوئے طویل قامت شخص کو دیکھ رہا تھا۔ پیا نے کہا، ''کیا کمرے کو آگ لگانا چاہتے تھے؟''

''ہاں.....مگر تمہارا کیا تعلق ہے؟'' اس نے بدقت تمام کہا۔

''پتہ چل جائے گا۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''کسی نے نہیں.....ہم ڈاکو ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ڈاکو لوٹتے ہیں، آگ نہیں لگاتے۔'' پیا نے دانت پیس کر کہا۔ ساتھ ہی اس کے ہاتھ نے حرکت کی اور اس کے پسٹل سے نکلنے والی دوسری خاموش گولی اس کی ران میں پیوست ہو گئی۔ وہ کراہ کر ایک ٹانگ پر ناچنے لگا۔ پیا بولا، ''دوسری گولی دل میں اترے گی، جلدی بولو، تمہیں کس نے بھیجا ہے؟''

''وہ.....وہ..... بڑے خان نے.....'' وہ درد کی شدت سے چند لمحوں میں ہی بے حال ہو گیا تھا، ''سردار حیدر خان نے.....''

''باہر کتنے آدمی ہیں؟'' پیا نے پوچھا۔

''دو.....''

''دوسرے کمرے میں کتنے شیطان ہیں؟''

''کوئی نہیں.....''

''وہاں بھی مٹی کا تیل چھڑک چکے ہو؟''

''ہاں.....'' اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ پیا نے قدم بڑھایا اور ٹارچ بردار شخص کے سینے پر پاؤں رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ ایسے ہی وقت میں اسے گویا کرنٹ لگا اور وہ غیر معمولی تیزی سے پیچھے ہٹا۔ کوئی چیز لمحہ بھر کو چمکی تھی۔ سمجھ میں آیا کہ اس نے کسی تیز دھار آلے کا وار پیا پر کیا تھا جو کارگر ثابت نہیں ہوا تھا۔ پیا کے پسٹل سے گولی نکلی اور وہ ایک دم کھڑا ہو کر ہاتھ جھٹکنے لگا۔ پیا نے قدم بڑھا کر اسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی کے اوپر سے باہر گھسیٹ لیا۔ اب مجھے ایک پل کو اس ڈاکو کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی شاید تمام تر بدمعاشیاں اس کے چہرے پر نقش ہو گئی تھیں، تبھی بہت خوف ناک دکھائی دیتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور لمبی قلمیں، وہ شکل سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔

اس نے چارپائی پر گرتے ہی اپنا گھٹنا پیا کے پیٹ میں مارا۔ پیا پچھلی چارپائی پر گرا مگر اس نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی بلکہ سانڈ کی طرح اس پر پل پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے درگت بنا کر رکھ دی۔ وہ پہلے ہی زخمی تھا، لاتوں اور مکوں کی تاب نہ لا کر زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ پیا نے اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر ماری اور غرایا، ''جلدی بولو، یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

''مم.....مم..... میں بتاتا ہوں..... پپ..... پانی.....'' اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''پانی نہیں ملے گا، گولی مل سکتی ہے۔ کہو، دوں؟'' پیا کی آواز بہت ڈراؤنی تھی۔

''وہ بڑے.....خان جی نے بھیجا تھا۔ دو.....دو لڑکیوں کو اغ.....اغوا..... باقی کو فنش.....'' اس نے بمشکل اپنی بات پوری کی پھر ایک جانب گردن لڑھکا گیا۔ پیا نے اس کی پیشانی میں عین آنکھوں کے بیچ گولی ماردی۔ وہ بالشت بھر اونچا اچھلا پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے منہ سے چیخ تک برآمد نہیں ہوئی تھی۔ دماغ یا دل میں لگنے والی گولی سسکی کو بھی بدن سے باہر نہیں نکلنے دیتی۔ پیا نے گن کندھے پر ڈالی، اپنی ٹارچ نکال کر روشن کی اور میری طرف دیکھے بغیر کہا، ''شہریار! دوسرے کمرے کو دیکھو، احتیاط سے جانا، اس کا کوئی ساتھی وہاں موجود ہوسکتا ہے۔''

میں نے دوسرے کمرے کا رُخ کیا۔ آہستہ آہستہ پورے صحن میں کیروسین آئل کی بو پھیل گئی تھی۔ میں دروازے کے پاس رُکا، پیا کے سے انداز میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور زمین سے چہرہ ٹکا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی جو ٹرنک پر پڑی ہوئی کسی ٹارچ سے پھوٹ رہی تھی۔ کمرے میں کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ میرے نتھنوں میں مٹی کے تیل کی تیز بو گھس گئی اور میرا سر چکرانے لگا۔

میں نے ٹارچ کی روشنی پہلی چارپائی پر ڈالی۔ میرے دل پر گھونسا پڑا۔ چارپائی خالی تھی۔ دوسری چارپائی کی رضائی بھی پائنتی کی جانب سمٹی ہوئی تھی۔ تیسری چارپائی پر نھا موج دین عرف موجو لحاف میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے لحاف ہٹایا، چہرہ کھلا تو پتہ چلا کہ اس کے لبوں پر سفید رنگ کی چوڑی ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بے ہوش تھا۔ مٹی کے تیل کی بو اس کے دماغ کو چڑھ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے ٹیپ کھینچ کر اُتاری۔ مڑ کر آخری چارپائی دیکھی، اوپر نیچے نظر دوڑائی، کسی کو نہ پا کر وقت ضائع کیے بغیر موجو کو کندھے پر ڈال کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر سردی تھی۔ اسے کھلی ہوا میں رکھنا ضروری تھا۔ کھلے صحن میں زمین پر لٹا کر بھاگ کر کمرے میں گیا۔ اس کی رضائی اٹھالایا اور زمین پر رکھ کر موجو کو اس پر لٹا دیا۔ رضائی کو دوہرا کر کے اس کے سینے تک کھینچ دیا اور الٹے قدموں دوڑ کر کمرے میں گھس گیا۔

مٹی کے تیل کی زہریلی بو میرے دماغ میں گھس کر ہوش وحواس پر اثر انداز ہونے لگی تھی مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ فرزانہ، شبانہ، چاچی اور چاچا تک پہنچنا بہت ضروری تھا۔ میں نے چند لمحوں میں کمرے کا سامان ادھیڑ کر رکھ دیا مگر کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں بھاگ کر پیا کی

طرف دوڑا۔ ایسے ہی وقت میں فضا میں فائر کی تیز آواز گونجی، ساتھ ہی ایک تیز چیخ سنائی دی۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ چیخ کھالے کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

پھر دوسرا فائر ہوا۔ اس مرتبہ کوئی چیخ نہیں گونجی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ کھالا مجھ پر اپنا خون نچھاور کر چکا تھا۔ فائر کی آواز سائیں دل جیت کے مزار کی طرف سے سنائی دی تھی۔ میں نے گن کندھے سے لٹکائی، پسٹل نکال کر ہاتھ میں تھاما اور بھاگ کر اپنے گھر کی عقبی کھڑکی کی طرف دوڑا۔ عقب میں پیا کی آواز سنائی دی، ''بھاگ کر جاؤ اور کھالے کی مدد کرو، میں ادھر ہی موجود رہوں گا۔''

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کی اور کھڑکی کھول کر جوہڑ اور گھنی جنگل کی درمیانی پگڈنڈی پر سرپٹ دوڑ پڑا۔ یہ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ٹارچ کی روشنی کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے اسے دوڑتے میں آف کیا اور بیلٹ میں اڑس لیا۔

میرے گھر پر حملہ کرنے والوں کی گاڑی لامحالہ طور پر سائیں کے احاطے میں پارک کی گئی تھی کیونکہ اگر نور پور کے اس جانب کی پانچوں گلیوں میں کہیں بھی کھڑی کی جاتی تو وہ آتے ہوئے ہماری نظروں میں ضرور آتی۔ میں نے جونہی جنگل کا موڑ کاٹا اور مزار کی دیوار کی طرف بڑھا، نور پور کی حویلیوں کے بیرونی بلب روشن ہو گئے۔ فائر کی آواز نے خاموش اور پرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کر کے خوابیدہ لوگوں کو جگا دیا تھا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی مگر مجھے اس وقت کھالے اور چاچے چاچی کے علاوہ کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر اچھل کر مزار کی دیوار پھاندی اور پارکنگ کی جانب والی احاطی دیوار کے قریب کھڑی ہوئی سفید رنگ کی لینڈ کروزر کی طرف بگٹٹ دوڑ لگا دی۔ یہ گاڑی پہلے نور پور کے علاقے میں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ ابھی میں سائیں دل جیت کے حجرے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ فائر کی ہولناک آواز فضا میں گونجی۔ میرے بائیں بازو کو انگارا سا چھو گیا۔ ایسے ہی وقت مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل پختہ اینٹوں کے فرش پر گر گیا۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ فائر کی تیز اور خوف ناک آوازوں سے میں یہ اندازہ نہیں کر پایا کہ مجھ پر کس سمت سے فائرنگ ہو رہی ہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے چاروں جانب سے آواز پھوٹ پڑی ہو۔

شانے اور کہنی کے بیچ ماس پر جلن کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی جنگ میں لپٹی ہوئی موت کی

ہولنا کی کا اندازہ ہوا اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پہلو کے بل کروٹ لے گیا۔ زندگی ساتھ دے گئی۔ ایک فائر ہوا اور عین اسی جگہ سے اینٹوں کا چورا اُڑا جہاں ایک لمحہ قبل میں موجود تھا۔ میں دائیں جانب لڑھک کر ہال کے دروازے تک پہنچا۔ تب تک مجھ پر ایک اور فائر داغا گیا۔ میری خوش بختی تھی کہ سوائے ایک گولی کے کوئی مجھے چھونے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اچانک اُٹھ کر جست بھری اور ہال کی نکڑ عبور کر کے سائیں دل جیت کی کھڑی سرخ ٹویوٹا کرولا کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میرے پاس گن بردار کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

فائرنگ رُک گئی۔ عارضی طور پر میں محفوظ ہو گیا تھا مگر مجھے یہیں دبک کر بیٹھنا نہیں تھا۔ بھاری گن کے ساتھ نقل و حرکت میں مشکل پیش آ رہی تھی مگر میں اسے پھینک نہیں سکتا تھا۔ تنگ جگہ میں بمشکل گھسٹ کر پارکنگ کی عقبی دیوار کی طرف بڑھا، کار کے بونٹ کے اوپر سے جھانک کر سفید لینڈ کروزر کی طرف دیکھا۔ اندھیرے میں سوائے گاڑی کے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہاں تک پہنچنا ناممکن حد تک مشکل تھا۔ چھپا ہوا دشمن با آسانی میرے سینے میں گولی اتار سکتا تھا۔ ہر بار قسمت ساتھ نہیں دیتی، یہی سوچ کر میں نے نئی راہ اختیار کی اور کھسک کر پارکنگ کی عقبی دیوار تک پہنچا۔ قسمت اسی راہ پر لے آئی تھی جہاں سے پہلے بھی میرا گزر ہو چکا تھا۔

میں نے کوئی آواز پیدا کیے بغیر دیوار پھاندی اور مشرق کی سمت جھکے جھکے انداز میں دوڑ پڑا۔ یہ جگہیں میرے بچپن کی آنکھ میں نقش تھیں، تبھی مجھے اندھیرے میں بھی ٹھوکر نہیں لگی اور میں دیوار کی نکڑ عبور کر کے شمالی جانب لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔ اندازے کے مطابق اس جگہ پر پہنچا جہاں اندرونی سمت میں گاڑی کھڑی تھی۔ پنجوں کے بل اُٹھ کر دیوار کی منڈیر سے جھانکا۔ میرا اندازہ بڑا لاجواب اور کائیاں تھا۔ میں نے عین اسی جگہ سے سر نکالا تھا، جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا۔

میرے سامنے لینڈ کروزر کی چھت تھی۔ میں کچھ اور اوپر اُٹھا۔ اب مجھے لینڈ کروزر کے اگلے ویل کی آڑ میں دیوار کی جانب پشت کر کے پیروں کے بل بیٹھا ہوا شخص نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گن دبی ہوئی تھی اور وہ بونٹ سے سر نکال کر پارکنگ میں کھڑی سرخ کرولا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری موجودگی کے مقام کو تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پسٹل دیوار کے اوپر سے گزارا اور اس کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ سائیلنسر لگے ہوئے پسٹل کی مخصوص آواز

کے ساتھ ہی اس کا سر ٹائر کور سے ٹکرایا اور اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر گر گئی۔ میں نے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کا نشانہ لیا تھا۔ مجھے یہ تو پتہ نہیں چل سکا کہ میرا نشانہ درست تھا، یا تھوڑا بہت اوپر نیچے ہو گیا تھا، یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ کام آ چکا تھا۔ وہ 'غرر غرر' کی بھیانک آوازیں حلق سے خارج کرتے ہوئے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے تڑپنے کا انداز چغلی کھاتا تھا کہ وہ نزع کے عالم میں ہے اور چند لمحوں میں ہی اوپر پرواز کر جائے گا۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ اس کا ساتھی دکھائی نہیں دیا۔

پیا کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے دوسرے ڈاکو نے بتایا تھا کہ گاڑی میں دو آدمی ہیں۔ دوسرا کہاں چھپا ہوا تھا؟ ابھی مجھے کھالا بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کی چیخ بڑی کربناک تھی۔ کہیں وہ بھی دنیا سے رخصت تو نہیں ہو گیا تھا؟ یہ خیال بڑا سوہانِ روح تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب میں دیدے پھاڑے صحن میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا، میری کمر سے کوئی نوکیلی چیز آن ٹکرائی اور ٹھہر گئی۔ ساتھ ہی ایک کرخت اور بھاری آواز میرے کانوں میں پڑی، ''خبردار! ذرا سی بھی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔''

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میں برا پھنسا تھا۔ بندر کی طرح دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا، پاؤں زمین سے اُٹھے ہوئے تھے اور میں جوتوں کی ٹو دیوار کی فاؤنڈیشن کی باہر کو نکلی ہوئی ننھی سی کگر پر ٹکا کر بدقت تمام کھڑا تھا۔ میری گن کندھے پر تھی جبکہ پسٹل والا ہاتھ فائر کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے نیچے اُترنا چاہا تو میرے عقب میں کھڑے ہوئے شخص نے نوکیلی چیز، غالباً گن کی نال، پر دباؤ بڑھا دیا، ساتھ میں غرایا، ''کہا ناں، حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ یہیں کھڑے رہو۔''

میں ساکت ہو گیا۔ میری نظروں کے سامنے لینڈ کروزر کھڑی تھی جس کے بند شیشوں کے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عقب میں کھڑا ہوا شخص اناڑی نہیں تھا۔ وہ میری ذرا سی حرکت پر برانگیختہ ہو کر فائر کر سکتا تھا۔ اتنے قریب سے نکلی ہوئی گولی کا خطا جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

وہ غرایا، ''بکو مت..... خاموش رہو۔''

''میں تھک گیا ہوں۔ اب تب میں گر جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ میرے گرنے کے انداز کو مشکوک حرکت قرار دے کر گن کی لبلبی دبا نہ دے۔ وہ بولا، ''آہستہ

سے نیچے اُتر آؤ، منہ دیوار کی طرف ہی رکھنا..... ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں رہو گے۔''

میں گھر سے اتر کر زمین پر کھڑا ہو گیا۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا اور اس پر غلبہ پانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ مگر کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اس کی غراہٹ گونجی، ''کیا تم نے بابر خان کو قتل کر دیا ہے؟''

میں چونکا، ''کون..... بابر خان کون ہے؟''

''وہی جو جیپ کے پاس کھڑا تھا۔'' اس نے میری ریڑھ کی ہڈی پر گن کی نال کا دباؤ بڑھایا۔

''ہاں..... اس نے مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ فائر کا جواب فائر سے ہی دیا جا سکتا ہے، گل پاشی سے نہیں۔'' میں نے کہا، ''کیا وہ تمہارا ساتھی تھا؟''

''اوہ شٹ!'' اس کے منہ سے نکلا پھر اس کے حلق سے ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے اُسے شدید قلق پہنچا ہو اور وہ برداشت نہ کر پا رہا ہو۔ اس کے ردِعمل نے مجھے باور کرا دیا کہ مجھے ملی ہوئی مہلت تمام ہو چکی ہے۔ مجھے اسی ایک لمحے میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ سو میں نے رسک لے لیا اور چیتے کی سی پھرتی سے پلٹ پڑا۔ وہ فوری طور پر سنبھل نہیں پایا اور پسٹل والا ہاتھ دائرے میں گھومتا ہوا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ 'ٹخ' کی آواز ابھری اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے اس کی گن پر ہاتھ ڈال کر نال کا رُخ دائیں ہاتھ پر فصلوں کی جانب کر دیا۔ اس نے فائر نہیں کیا بلکہ زوردار کک میری دونوں ٹانگوں کے بیچ ماری۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ اُٹھے۔ میں توازن برقرار نہ رکھ پایا اور پشت کے بل زمین پر گر گیا۔ اچھا ہوا کہ میری گرفت گن پر سے کمزور نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وہ بھی کھنچ کر مجھ پر آن گرا۔

اس کی گن میری پسلیوں پر لگی۔ درد کی تیز لہر میرے بدن میں پھر گئی۔ میں نے اسے خود پر سے جھٹکنے کی کوشش کی مگر وہ خاصا بھاری تھا۔ اس نے مجھ پر پورا وزن ڈالا اور اپنے سر کی زوردار ٹکر میری پیشانی پر رسید کی۔ میرا سر چکرا گیا۔ ایک..... دو..... وہ جنونی انداز میں ٹکریں مارنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں میری مزاحمت دم توڑنے لگی اور میرے حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ بہت خطرناک داؤ کھیل رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پھنسے ہوئے تھے۔ اس کی گن کی نال کے رُخ کا مجھے اندازہ تھا، اپنے پسٹل کے رخ کا علم نہیں تھا۔ میں اس ڈر سے ٹریگر نہیں دبا رہا تھا

کہ کہیں اس سے نکلنے والی گولی میرے جسم میں ہی داخل نہ ہو جائے۔ آخری چارۂ کار سمجھ کر میں نے 'اوغ' کی دردناک آواز حلق سے خارج کی اور آنکھیں بند کر کے سر ایک جانب لڑھکا دیا۔ میرا داؤ کامیاب رہا۔ اس نے ٹکریں مارنے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ میرے اوپر سے اُٹھنے کی کوشش میں جونہی پیروں کے بل تھوڑا بلند ہوا، میں نے اپنا گھٹنا موڑا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ پوری قوت سے دے مارا۔

میں نے اس ضرب میں اپنی تمام تر توانائی سمیٹ دی تھی۔ زندگی اور موت کے کھیل میں جان کی بازی لگائی جائے تو بساط پلٹی جا سکتی ہے۔ وہ 'ہائے' کی تیز آواز نکال کر میرے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور پیٹ کے بل میرے چہرے پر گر گیا۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ چکی تھی۔ میری گرفت بھی برقرار نہ رہ سکی اور گن زمین پر لڑھک گئی۔ وہ پرانا کھلاڑی تھا۔ سر اور ناف کے نیچے کی، اوپر تلے دو چوٹیں کھا کر بھی سرعت سے اُٹھ بیٹھا مگر تب تک میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے پسٹل اس کی پسلیوں پر رکھا اور دانت کچکچا کر کہا، ''ذرا سی حرکت سے میری انگلی ٹریگر دبا دے گی۔''

وہ چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح ایک دم ساکت ہو گیا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات دکھائی نہیں دیتے تھے مگر مجھے علم تھا کہ وہ میرا تسلط ختم کرنے کیلئے کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ میں نے پسٹل کی نال پر دباؤ بڑھایا، مضبوط لہجے میں کہا، ''کوئی چالاکی دکھائے بغیر نیچے اُترو.....''

وہ اٹھنے لگا۔ میں نے فوراً کہا، ''خبردار! کھڑا نہیں ہونا۔''

''پھر میں نیچے کیسے اُتروں؟'' اس نے بھڑک کر کہا۔

''کوئی بات نہیں..... یہیں بیٹھے رہو۔'' میں بولا۔

وہ جس طرح بھی نیچے اُترتا، میرے نشانے سے ہٹتا تھا۔ اس لیے اس کا میرے پیٹ پر بیٹھے رہنا ہی بہتر تھا۔ جس لمحے میں نے اسے گولی مارنا چاہی، اُسی لمحے میرے دل میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ چاروں ڈاکوؤں میں آخری زندہ شخص تھا۔ ممکن تھا کہ ہمیں اس سے کوئی بات معلوم کرنا پڑے، کچھ پوچھنا پڑے، تب اسے مارنے کا افسوس ہوگا۔ میں نے پوچھا، ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اسے تقویت ملی کہ میں اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بولا، ''نام میں کیا رکھا ہے، جو اچھا

لگے، وہی رکھ لو۔''

میں نے کہا، ''بکواس نہ کرو۔''

''ٹھیک ہے، نہیں کرتا۔ تم کر لو۔'' اس نے اتنی لاپروائی سے کہا کہ میرا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔ میں نے غرا کر کہا، ''یہ تم کس انداز میں بات کر رہے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے کانوں میں مسجد کے سپیکر سے پھوٹنے والی امام مسجد کی آواز پڑی۔ وہ نور پور کے مکینوں کو گاؤں میں ڈاکوؤں کی موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ نور پور والو! جاگ جاؤ ورنہ لیکھ ہمیشہ کے لیے سو جائیں گے۔ اپنا اپنا اسلحہ اٹھا کر باہر نکل آؤ، کوئی بھی بچ کر نہ جائے۔ یہ سردار بخت خان کا حکم ہے۔

نور پور جاگنے والا تھا۔ مجھے بخوبی احساس ہو گیا کہ ہم بری طرح پھنس چکے تھے۔ اس وقت ہماری پوزیشن بھی ابتر تھی۔ ہم بھی ڈاکوؤں کے سے حلیے میں تھے۔ سردار بخت خان نے اپنے کارڈلیس فون پر پولیس کو بھی مطلع کر دیا ہوگا اور وہ نیلی بتی گھماتے ہوئے کسی پل پہنچ سکتے تھے۔ ابھی نہ تو کھالے کی خبر تھی، نہ ہی موجو کے علاوہ کوئی گھر والا ہمارے ہاتھ لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سرخی پھیلنے لگی۔ میں نے کڑا فیصلہ کیا اور پسٹل کا ٹریگر دبا دیا۔

اسے سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں ملی اور وہ بھیانک چیخ مار کر تڑپا اور پہلو کے رُخ زمین پر گر گیا۔ میں بجلی کی سی سرعت سے اُٹھا، اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور تڑپنے کی رفتار دگنی ہو گئی۔ میں نے ٹھوکر مار کر اس کی گن اس سے دور کر دی اور دیوار پر چڑھنا چاہا مگر تیورا کر زمین پر گر گیا۔ اس کی پے در پے ٹکروں نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا، سر کو دائیں بائیں جھٹکا اور پھر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ کامیاب ہوا اور لینڈ کروزر اور دیوار کی درمیانی جگہ پر کود گیا۔ بابر خان دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر بیٹھنے کے انداز میں گرا ہوا تھا۔ میں نے اس پر توجہ نہ دی اور فوراً گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ سیٹ پر دو وجود ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔ میں نے بیلٹ سے ٹارچ کھینچی اور آن کر دی۔ ننھے سے بلب کی تیز روشنی لینڈ کروزر کے اندرونی ماحول کو منور کر گئی۔ میرے حلق سے طویل سانس برآمد ہوئی۔ وہ فرزانہ اور شانو تھیں جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئی پڑی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بے ہوش تھیں۔ میں نے انہیں ہلایا جلایا، چہروں پر روشنی ڈالی، پتہ چلا کہ ان کے ہونٹوں پر بھی چوڑی ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ میں نے ٹیپ کھینچ دی۔ نبضیں چیک کیں،

سانسوں کی آمدورفت کا معائنہ کیا اور اطمینان کی سانس لی کہ دونوں بخیریت تھیں۔

میں نے ٹارچ کی روشنی جیب کے عقبی حصے میں ڈالی۔ کھالا اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے اسے لباس اور گھنگریالے سیاہ بالوں کی وجہ سے پہچانا گیا تھا۔ اسے لٹایا نہیں گیا تھا بلکہ ٹھونسا گیا تھا کیونکہ عقبی حصے میں جگہ کم تھی۔ میں جلدی سے لینڈ کروزر کے عقب میں آیا، بیک ڈور کھولا اور بالوں سے پکڑ کر کھالے کا سر اوپر اُٹھایا۔ چہرہ دیکھا۔ چہرہ مٹی میں اَٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کی نبض محسوس کی۔ وہ زندہ تھا۔ میں جیپ میں گھس گیا اور چند ہی لمحوں میں اس کے جسم کو ٹٹولنے کے بعد بھانپ گیا کہ اسے کہیں چوٹ نہیں لگی تھی۔ اگر کوئی چوٹ آئی بھی تھی تو اس سے خون نہیں رسا تھا۔ اس کی گن اور پسٹل دکھائی نہیں دیا۔ بیلٹ سوائے ایک پسٹل کی میگزین کے کچھ بھی نہیں تھا۔ سردست اس کا سامان تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا، اس کے زندہ مل جانے پر اللہ کا شکر بجالایا جا سکتا تھا۔

میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر مجھے کامیابی نہیں ملی۔ میں نے بیک ڈور بند کیا اور برقی مستعدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ حملہ آوروں اور ڈاکوؤں کی گاڑیاں ممکنہ فراری ضرورت کے تحت بھگانے کے لیے تیار رکھی جاتی ہیں۔ ایسے ہی وقت میں نور پور میں شور مچ گیا۔ لوگ نعرہ زنی کرنے لگے تھے۔ میں ان دیہاتیوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ڈاکوؤں اور چوروں کے نام پر یہ ہر موجود اسلحہ تھام کر گھروں سے نکل آتے تھے اور سینہ سپر ہو جاتے تھے۔ میں نے مزار کے گنبد کی طرف دیکھا اور آوازوں کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ یہ تو علم نہ ہو سکا کہ لوگ کس جانب مجتمع ہوئے ہیں، مگر گنبد کے پار پیلی روشنی اور دھوئیں کا مرغولہ فضا میں اُڑتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے سمجھنے میں ذرا تاخیر نہیں ہوئی کہ میرے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ کمروں کے اندر انڈیلا ہوا مٹی کا تیل ایک دیا سلائی کا منتظر تھا۔ دیا سلائی جلانے والا کوئی زندہ نہیں بچا تھا مگر دیا سلائی جل کر میرے گھر کو خاکستر کرنے لگی تھی۔

میرا ذہن بری طرح جھنجھنا اُٹھا۔ یہ کیسے ہو گیا تھا؟ دو حملہ آور پیا جی کے پسٹل کا لقمہ بن گئے تھے۔ دو کو میں نے راہِ عدم دکھائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ پیا کے شکار نے غلط بیانی کی تھی اور اس کے ساتھیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ باقی بچ جانے والوں نے پیا پر قابو پالیا ہو اور گھر کو آگ لگا دی ہو..... پیا، موجو، چاچا اور چاچی آگ کا نوالہ بن گئے ہوں..... میری سانس

رُکنے کو آ گئی۔ میں نے گیئر لگایا۔ گاڑی آگے بڑھانا چاہی تو وہ جھٹکا لے کر بند ہو گئی۔ میں نے آج تک ایسی گاڑی نہیں چلائی تھی۔ میں نے پھر چابی گھمائی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور گیئر لگانے کے بعد بڑی احتیاط سے کلچ چھوڑا۔ اس مرتبہ گاڑی بند نہیں ہوئی اور اچھل کر آگے بڑھی۔ میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے یوٹرن لیا اور گیٹ عبور کر کے ناپختہ راستے پر موڑ لی۔ میرا رُخ نور پور کی طرف تھا۔ جونہی میں اپنی گلی میں پہنچا، اپنے دروازے پر کھڑی ہوئی اسوزوٹرو پر کو غائب پایا۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں۔ مجھے ناب کا علم نہیں تھا اور نہ میرے پاس ٹٹول کر اسے تلاش کرنے کا وقت تھا۔ میرے گھر کو لگی ہوئی آگ لمبے اور بھڑکیلے شعلے اگل رہی تھی اور گلی کے چوک میں اکٹھے ہونے والے لوگ آگ کی پر ہیبت روشنی میں بہت پراسرار معلوم ہو رہے تھے۔ کئی لوگ پانی کی بھری بالٹیاں اُٹھائے میرے گھر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ انہیں میری گاڑی کو دیکھنے اور سمجھنے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

پیا نکل چکا تھا۔ امید جاگی کہ وہ میرے بقیہ گھر والوں کو نکال کر، اسوزوٹرو پر میں ڈال کر نور پور سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے گھر کے برابر گاڑی نہیں روکی بلکہ لوگوں کی طرف بڑھا۔ نور پور سے نکلنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں کم وبیش پندرہ بیس افراد اکٹھے تھے۔ شور وغوغا فضا میں بپا تھا۔ میرے گھر کا سامان جلنے کی تیز آوازیں، لوگوں کی چیخ وپکار، مسجد کے اسپیکر سے پھوٹنے والی اطلاع..... آوازوں کے ہجوم میں کسی آواز کو پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں جونہی چوک میں پہنچا، لوگوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ میں نے دیکھا کہ سبھی کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار موجود تھا۔ بندوقیں، پستول، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں..... لینڈ کروزر کو دیکھ کر دو تین بندوقیں سروں سے بلند ہوئیں، ہوائی فائرنگ کی خوف ناک آواز گونجی پھر لوگوں نے گاڑی کا رُخ کیا۔

میں نے جلدی سے گردن باہر نکالی اور چیخ کر کہا، ''میں شہرا ہوں..... چاچے چراغ کا بھتیجا..... پرے ہٹ جاؤ، ایمرجنسی ہے.....''

میرا یہ اقدام ناگزیر تھا کیونکہ میں ہوائی فائر کر کے ان لوگوں کو پرے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ قریب آنے والوں نے میری آواز سن لی۔ ایک بڑی ٹارچ نے میرا احاطہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے پہچاننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جب تسلی ہو گئی تو آگے کھڑا ہوا کالا بزدار چیخ کر بولا، ''اوئے شہرے! توں اِتھ کیا کریندیں تے اِہ کیا ڈراما ہے؟''

(تم یہاں کیا کر رہے ہو اور یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے؟)

میں نے چیخ کر غصے سے کہا، ''مجھے فوراً نکلنے دو، ایمرجنسی ہے۔ میری بہنیں مر رہی ہیں، انہیں ہسپتال پہنچانا ہے۔''

ساتھ ہی میں نے ایکسی لیٹر دبا دیا۔ اب مجھے اطمینان تھا کہ وہاں کھڑے ہوئے لوگ مجھ پر گولی نہیں چلائیں گے۔ ان سب کو علم ہو گیا تھا کہ گاڑی میں چراغ دین کا بھتیجا شہریار موجود تھا۔ سبھی پرے ہٹ گئے۔ مجھے راستہ مل گیا۔ گاڑی ایک جھٹکا لے کر پکی سڑک پر چڑھی اور میں نے نوری چوک کی طرف جانے کی بجائے ناک کی سیدھ میں جانا مناسب خیال کیا۔ ایک تو ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ واپسی پر لال پیر والا راستہ لیا جائے گا۔ دوسرا یہ خوف لاحق تھا کہ پولیس اب تب میں پہنچنے والی ہوگی۔ نوری چوک والے راستے پر جانے کی صورت میں پولیس موبائل وین سے مڈبھیڑ ہونے کا احتمال تھا۔ میں نے ایک نظر دائیں ہاتھ واقع سرکاری ہسپتال کی خوابیدہ عمارت پر ڈالی، ایک نظر یارن خان کی حویلی کو دیکھا، پھر گیئر بدل کر نہایت تیزی سے نور پور سے نکلتا چلا گیا۔ نور پور کی خونیں جنگ سے محفوظ نکل آنے کے باوجود ابھی تک میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دو چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پیا کہیں رک کر میرا انتظار کرے گا، اس لیے میں اردگرد دیکھتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

میری ساری تگ و دو اسی اندازے پر استوار تھی کہ پیا میرے گھر والوں کو لے کر نور پور سے کامیاب نکل گیا ہوگا۔ میری سانس گھٹنے لگی جب اس خوف ناک سوچ نے دماغ میں بسیرا کیا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو..... اگر پیا عجلت میں بھاگا ہوا اور وہ کسی کو بھی ساتھ نہ لے سکا ہو، یا وہ کسی بھی وجہ سے چاچا اور چاچی کو کمرے سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو..... اس کے آگے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہو گئیں اور ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے اپنا ماتھا اسٹیئرنگ ویل پر مارا، پھر سر جھٹک کر اس ہولناک سوچ سے چھٹکارا پانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے فوراً بریک لگائے۔ اس ویرانے میں مجھے کون آواز دے سکتا تھا؟ حیرانی سے سر باہر نکال کر عقب میں دیکھنے لگا۔ اتنے دبیز اندھیرے میں کیا نظر آنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر آواز سنائی دی، ''شہریار.....''

میرے کان بجے نہیں تھے۔ میں پیا کی آواز پہچان چکا تھا۔ بجلی کی سی سرعت سے دروازہ کھولا اور پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔ کوئی تیس گز کے فاصلے پر، جہاں میرے اندازے کے مطابق پیا

کو موجود ہونا چاہیے تھا، پہنچ کر رُک گیا۔ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر کماد کی فصل لہلہا رہی تھی، چند قدموں کی دوری پر سکول کی عمارت اندھیرے کا حصہ بنی کھڑی تھی۔ میں نے پیا کی آواز پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ کہیں چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہلکی سی آواز دی، ''پیا جی!''

کوئی جواب موصول نہیں ہوا تو میں نے پہلے سے بلند آواز میں پکارا۔ جواب نہیں ملا مگر کماد میں مخصوص سرسراہٹ ہوئی۔ کوئی وہاں موجود تھا۔ میں نے پھر پکارا۔ اسی اثنا میں ایک ہیولا برآمد ہوا اور تیر کی طرح میری جانب بڑھا۔ وہ پیا تھا۔ قریب پہنچ کر بولا، ''شکر ہے، تمہیں زندہ دیکھ رہا ہوں۔ ورنہ میں نے تو سمجھا تھا کہ تمہاری بتی گل ہو گئی ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''تم یہاں کیسے؟ گاڑی کہاں ہے؟''

وہ بولا، ''گاڑی کو میں نے ادھر سکول کے قریب چھپا رکھا ہے۔'' وہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا۔

''مگر تم یہاں کیوں چھپے تھے؟''

''میں کچھ وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ لوگ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں تو تم دونوں کو تلاش کرنے کے لیے دوبارہ نور پور جاؤں گا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گاڑی اس جانب آ رہی ہے۔'' وہ مجھے پکڑ کر سکول کی جانب بڑھتے ہوئے بولا، ''میں جلدی سے کماد میں چھپ گیا۔ میں نے سوچا تھا، اگر یہ تم ہوئے تو روک لوں گا۔ تم نہ ہوئے تو چھپا رہوں گا۔''

''پھر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ گاڑی میں میں ہوں؟'' میں نے پوچھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی کیونکہ میں نے لینڈ کروزر کی روف لائٹ آف کر رکھی تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی آف تھیں۔ کوئی انڈیکیٹر بھی آن نہیں تھا۔ پھر اس نے مجھے کیسے پہچان لیا، یہ معمہ اسی نے حل کر دیا، ''میں نے آواز دی تھی۔ تم نے سن لی اور اُتر آئے۔ کوئی اور ہوتا تو گاڑی نہ روکتا اور آگے گزر جاتا۔''

وہ واقعی بہت زیرک اور معاملہ فہم انسان تھا۔ اس دوران ہم دونوں اپنی اسوزوکی ٹرو پر کے قریب پہنچ گئے تھے جسے اس نے سکول کی دیوار کے ساتھ، بیر کے گھنے اور کم قامت درخت کے عقب میں کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ بولا، ''ہیڈ لائٹس کے بغیر اتنے اندھیرے میں گاڑی چلانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔''

''یہ راستے میرے دیکھے بھالے ہیں، ازبر ہیں۔'' میں نے کہا، ''باقی لوگ گاڑی میں ہیں؟''

وہ چونک کر رُک گیا، تأسف سے بولا، ''باقی لوگ.....'' پھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ پیاسی کو بھی نکال لانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا جو بذاتِ خود اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہوتا تھا۔

پیا نے مجھے دونوں شانوں سے تھام کر اپنی چھاتی سے لگا لیا اور ہمدردانہ انداز میں بولا، ''میں تمہارے دُکھ سے آشنا ہوں مگر اوپر والا جیسے بن مانگے دیتا ہے، ویسے ہی بن پوچھے واپس لے لیتا ہے۔ یہی سچائی ہے جسے بہادر لوگ حوصلے کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔''

بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا، ''یا اللہ! رحم.....رحم.....''

مجھے اپنے ادا کیے ہوئے الفاظ بھی ناشناسا لگے۔ وہ بولا، ''تمہیں تفصیلی رپورٹ بعد میں دوں گا۔ اب ہمیں یہاں سے فوری طور پر نکلنا ہے ورنہ ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔ چلو.....''

وہ میرا کندھا تھپتھپا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے شکست خوردہ انداز میں گیٹ کھولا اور سر جھٹک کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً ہی انجن اسٹارٹ کیا اور بیرکی اوٹ سے گاڑی نکال کر سڑک پر لے آیا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے لینڈ کروزر کے پیچھے بریک لگائے اور بولا، ''تم اس گاڑی کو روڈ سائیڈ پر کرو۔ میں جب گاڑی نکال لوں تو اسے ایسی پوزیشن میں کھڑی کر دینا کہ روڈ بلاک ہو جائے۔ ہری اَپ!''

میں خالی الذہنی کی سی کیفیت میں ٹرو پر سے اُترا اور لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت لوٹ جاؤں اور نور پور کے دونوں خانزادوں کو خاک میں ملا دوں اور سبھی بلند و بالا حویلیوں کو جلا کر خاکستر کر دوں۔ پھر سردار حیدر خان کا ستیاناس کرنے کے لیے بلوچ نگر میں اس کے محل میں پہنچ جاؤں۔ اس ظالم نے میرا ہنستا بستا گھر اُجاڑ کر میرے سینے میں کبھی نہ بجھنے والی آگ بھر دی تھی۔

میں جونہی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ آنکھوں میں اُتری ہوئی نمی اور دھند کی گہری تہہ اُتر گئی۔ مجھے یاد آ گیا کہ گاڑی میں میری چچازاد بہنیں اور کھالا زندہ و سلامت حالت میں موجود تھے جنہیں میں یک لخت بھول گیا تھا۔ میں نے گاڑی

کو اسٹارٹ کیا اور کچی روڈ سائیڈ پر اُتار دیا۔ ہاتھ بڑھا کر سیلنگ لائٹ آن کی اور پلٹ کر فرزانہ اور شبانہ کی طرف دیکھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ دونوں سیٹ پر موجود نہیں تھیں۔ میں آنکھیں پھاڑے سیٹ پر پڑے ہوئے پیپر رول کو دیکھنے لگا۔

میں چیتے کی سی پھرتی سے گاڑی سے اُترا اور گھوم کر عقبی سائیڈ گیٹ تک آیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور گاڑی کی طرف پیٹھ کر کے تاحد نگاہ پھیلی ہوئی کماد کی اونچی فصل کو دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً میری عدم موجودگی میں ہوش میں آ گئی تھیں۔ چونکہ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ میری تحویل میں تھیں اس لیے موقع سے فائدہ اُٹھا کر گاڑی سے نکل گئی تھیں۔ انہیں فصل میں ہی کہیں چھپا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں دونوں کا نام لے کر پکارا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری آواز پہچان کر باہر آ جائیں گی۔ ان تک میری آواز نہیں پہنچی تو میں بتدریج اپنی آواز بلند کر کے آوازیں دینے لگا۔ اسی اثنا میں پیا بھی ٹرو پر سے اُتر کر میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میری آواز پہچان لی گئی تھی تبھی شانو کی آواز رات کی پرسکوت فضا میں اُبھری، ''بھائی!''

اس کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ کھیت میں کافی اندر تک گھس گئی تھیں۔ میں نے پھر آواز دی اور کہا، ''ہاں! میں شہریار ہوں..... جلدی سے فرو کو لے کر باہر آ جاؤ، وقت کم ہے۔''

کوئی دو سو فٹ کے فاصلے پر کھیت میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔

پیا تعجب سے بولا، ''کیا یہ تمہاری بہنیں ہیں؟''

میں نے کہا، ''ہاں! وہ حرامزادے انہیں گھر سے اُٹھا کر گاڑی میں ڈال چکے تھے۔''

وہ بولا، ''کھالا کام آ گیا؟''

اس کا لہجہ بڑا سپاٹ تھا۔ میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں..... وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں پڑا ہے۔ اُٹھا کر ٹرو پر میں ڈال دو۔''

اس نے سوال جواب میں ایک پل ضائع کئے بغیر لینڈ کروزر کا بیک ڈور کھولا اور ماہرانہ انداز میں کھالے کو باہر نکال کر کندھے پر ڈال لیا۔ جونہی اس نے ٹرو پر کا بیک ڈور کھولا، فرزانہ اور شبانہ کھیت سے برآمد ہوئیں۔ قریب آ کر دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئیں اور سسکنے لگیں۔ دونوں موجو کا پوچھ رہی تھیں۔ میرے پاس ان کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ انہیں بمشکل خود

سے علیحدہ کیا، جلدی سے ٹرو پر میں بیٹھنے کا حکم دیا اور تلاشی لینے کی غرض سے لینڈ کروزر میں آ گیا۔ ٹارچ اور چھت میں لگی دھندلی بتی کی روشنی میں میں نے چند ہی لمحوں میں گاڑی کنگھال ڈالی۔ سوائے پیپر رول کے کوئی بھی کارآمد چیز نہیں ملی۔ میں نے بغیر کسی وجہ کے پیپر رول اُٹھایا اور پیا کے گزرنے کے بعد گاڑی کو سڑک پر ترچھا کھڑا کرنے کے بعد انجن بند کر کے اُتر گیا۔ اپنی گاڑی میں بمشکل گھسا ہی تھا میرے کانوں میں پولیس کے ہوٹر کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ پولیس کی نفری اب نور پور میں پہنچی تھی جب چڑیاں کھیت کو چگ کر اُڑ چکی تھیں۔ میں نے پیا کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا دی۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا وگرنہ نور پور والے پولیس کو بتا دیتے کہ میں اس جانب روانہ ہوا ہوں اور وہ اپنی گاڑیوں کا رُخ اس جانب کر لیتے۔

اس نے ہیڈ لائٹس آن کر لیں۔ میں نے چھت والی بتی روشن کی اور گردن موڑ کر چچا زاد بہنوں کی طرف دیکھا۔ خوشی کی ایک توانا لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی۔ ان دونوں کی جھولی میں موجو لیٹا ہوا تھا جسے وہ دیوانہ وار چوم رہی تھیں اور ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے استعجاب آمیز لہجے میں پیا سے کہا، ''اسے تم اُٹھا لائے تھے؟''

وہ بولا، ''ہاں تو..... کیا وہیں چھوڑ آتا؟ اس کے کپڑے مٹی کے تیل میں لتھڑے ہوئے تھے، اگر مجھے تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو اسے آگ لگ جاتی۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا، ''یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر گردن موڑ کر تینوں کو ایک نظر دیکھا۔ کچھ دیر پہلے جب میں ٹرو پر میں بیٹھا تھا تو میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی وگرنہ موجو نظر آ جاتا۔

پیا بولا، ''خیال رکھنا کہ ہم بھٹک کر کسی اور جانب نہ نکل جائیں۔''

میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگے دیکھا اور کہا، ''اس میں سے کوئی سڑک نہیں نکلتی۔ سیدھا چلتے جاؤ۔ کچھ ہی آگے جا کر یہ پکی سڑک ختم ہو جائے گی، سولنگ شروع ہو جائے گا۔ وہ بھی ڈیڑھ دو میل کے بعد کچے اور اونچے نیچے راستے میں تبدیل ہو جائے گا۔''

اس نے پوچھا، ''کھالے کو کیا ہوا ہے؟''

''کوئی زخم تو ہے نہیں..... ہوش میں آئے گا تو بتائے گا کہ اس پر کیا گزری ہے۔'' میں نے کہا، ''کیا تم نے چاچا اور چاچی کو نہیں دیکھا وہاں؟''

وہ بولا، ''دیکھا تھا مگر.....''

آج دل کی دنیا زیروزبر ہونے کا دن قیامت ڈھا رہا تھا۔ دھڑکتے دل سے پوچھا، ''کیا مگر.....کیا ہوا؟''

اس نے تأسف سے سر ہلایا، بیک مرر میں لڑکیوں کو دیکھا، وہ بدستور موجو کی طرف متوجہ تھیں، دھیرے سے بولا، ''ان حرام زادوں نے انہیں باندھ کر اوپر نیچے رکھی ہوئی چارپائیوں پر لحافوں کے پیچھے پھینک دیا تھا۔ انہیں تلاش کرنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ جب میں ان تک پہنچا، وہ دونوں زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ میں انہیں کمرے سے باہر نکالنا چاہتا تھا کہ ایک حرامزادے نے لائٹر جلا دیا۔ میں دھوکے میں مارا گیا تھا۔ میں نے اسے مردہ سمجھ لیا تھا۔ اس خبیث انسان میں زندگی کی کوئی پلیدرمق ابھی باقی تھی۔''

''پھر؟'' میرے لبوں سے لرزتا ہوا لفظ برآمد ہوا۔

''پھر کیا؟ میں بمشکل آگ سے بچ کر باہر نکلا۔ آگ تو ایسے بھڑکی تھی جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔ میں نے دوڑ کر دوسرے کمرے دیکھے۔ کوئی نظر نہ آیا تو صحن میں پڑے ہوئے بچے کو اُٹھا کر گھر سے نکل آیا۔ اسی وقت مسجد میں اعلان ہونے لگا۔ میں اگر کچھ دیر اور وہاں رُکتا تو لوگ مجھے گھیرے میں لے کر مار دیتے۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ میری حالت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ میں موجو، فرزانہ اور شانو کے زندہ بچنے پر اطمینان کی سانس پھیپھڑوں میں اُتارتا یا چاچے چراغ اور چاچی کی بے بسی کی موت کا ماتم کرتا.....

پیا نے ہاتھ اٹھا کر بتی آف کر دی اور سپاٹ لہجے میں بتانے لگا، ''میں نے گاڑی بڑی حویلی کے قریب روک کر کچھ دیر تمہارا انتظار کیا۔ تم نہیں آئے تو میں سمجھ گیا کہ تم پھنس گئے ہو یا..... شوں ہو گئے ہو.....اور کھالا بھی فنش ہو گیا ہے۔ اور پھر وہاں بے مقصد ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا، اس لیے گاؤں سے نکل آیا۔''

میں نے دونوں ہاتھ ڈیش بورڈ پر رکھے اور اپنا چکراتا ہوا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ اس غیر متوقع طور پر درپیش آنے والی صورت حال نے میرا ذہن بھک سے اُڑا دیا تھا۔ دونوں بہنیں موجو کو ہوش میں لے آئی تھیں اور خوشی اور شکر کا اظہار کر رہی تھیں۔ ابھی انہیں ٹوٹ پڑنے والی قیامت کا علم نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر، ان کو دکھ سہنے کے لیے تیار کرنے

کے بعد یہ اندوہ ناک خبر سناؤں گا۔ انہیں ابھی پتہ چل جاتا تو وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا لیتیں۔ شانو نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا اور خوشی سے بولی، ''موجو ہوش میں آ گیا ہے بھائی!''

میں نے بمشکل اپنے اُمڈ آنے کو بے چین آنسوؤں کو روکا، دونوں سیٹوں کے درمیان رکھی ہوئی پانی کی بوتل اسے تھمائی اور کہا، ''اسے پانی پلاؤ، خود بھی پی لو۔''

وہ بولی، ''بھائی! تم کب پہنچے تھے؟''

میں نے جواب دیا، ''آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے، ابھی جو کہا ہے، وہی کرو۔''

فرزانہ نے پوچھا، ''امی ابا کدھر ہیں؟ نظر نہیں آ رہے..... کیا گھر میں ہیں؟''

''ہاں.....'' میں اس دوران خود پر قابو پانے میں قدرے کامیاب ہو چکا تھا۔

''ٹھیک تو ہیں ناں؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہیں۔ انہیں بھی کل لے آؤں گا۔''

''کہاں؟ کیا ہم.....'' شانو بے چینی سے بولی، ''کیا ہم گھر کی بجائے کسی اور جگہ پر جا رہے ہیں؟''

''یہی سمجھ لو۔ یہاں رہنا اب مناسب نہیں رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں بھائی؟ کچھ تو بتاؤ، میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''میرے گھر.....'' میں نے کہا، ''تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں جو ہوں۔''

''تم ہمیں کہیں لے کر نہ جاؤ، واپس نور پور چھوڑ پہنچا دو۔ امی ابا کے پاس۔''

''یہاں ہم سب کی جانوں کو خطرہ لاحق ہے۔''

فرزانہ بولی، ''بھائی! یہ کون لوگ تھے؟ ہماری جان کو کیوں خطرہ ہے، ہماری تو کسی سے دشمنی بھی نہیں ہے۔''

مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کن حالات سے گزری تھیں، انہیں حالات کی نزاکت کا کس حد تک علم تھا، اس لیے انہیں کچھ بتانے سے پہلے ان واقعات کے بارے میں جاننا ضروری تھی جو ان کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہو چکے تھے۔ ممکن تھا کہ انہوں نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو اور نیند کے عالم میں ہی بے ہوش کر دی گئی ہوں۔

''کہا تو ہے، آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' میں نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔ پیار سے انگریزی میں کہا، ''تم انہیں راستے میں نہیں بتاؤ گے کہ ان کے ماں باپ مر چکے ہیں ورنہ

ہمارے لیے بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔''

میں نے کہا، ''فکر نہ کرو، میں سمجھتا ہوں۔''

پکی سڑک ختم ہو گئی تھی۔ سولنگ کی اونچی نیچی اینٹوں پر گاڑی اچھلنے لگی تو پیا نے رفتار کم کر لی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سولنگ بھی ختم ہو گیا اور گاڑی کو بڑے جمپ لگنے لگے۔ فصلوں اور سیم زدہ خالی رقبوں کے درمیان اس سڑک پر دن میں خاصی چہل پہل ہوتی تھی۔ رات کو یہ علاقہ لمبی تان کر سوتا تھا۔ کہیں کہیں کتوں، گیدڑوں اور ناہروں (بھیڑیوں) کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ میں نے گاڑی میں لگی ہوئی ڈیجیٹل واچ پر ٹائم دیکھا۔ چونک گیا۔ ہم نے دو بجے سردار انصر کے ڈیرے پر پہنچنا تھا۔ سوا تین بج چکے تھے۔ بھٹہ پور اور مظفر گڑھ کا چکر کاٹ کر بصیرہ تک پہنچنے میں مزید ایک گھنٹے کا سفر حائل تھا۔ تب تک صبح کی سپیدی نمودار ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے نئی الجھنیں سر اُٹھانے لگیں گی۔ میں نے اپنے خدشات کا اظہار دبے لفظوں میں پیا سے کیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا، بولا، ''تو کیوں نہ ہم بصیرہ جانے کی بجائے ملتان کا رُخ کریں۔''

میں نے کہا، ''بات تو ایک ہی ہے، صبح ہو جائے گی۔''

وہ زہریلے انداز میں مسکرایا، بولا، ''صبح تو ہو کر ہی رہتی ہے پیارے..... ہم ایسا کرتے ہیں کہ بجائے مظفر گڑھ شہر میں سے گزرنے کے، شارٹ کٹ راستہ اختیار کر کے ملتان چلے جاتے ہیں۔ ہم ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں منزل پر پہنچ جائیں گے۔''

''کیا تم نے وہ گل گشت والی کوٹھی دیکھ رکھی ہے؟''

''نہیں..... مگر میر وشاہ نے اس کا پتہ سمجھا دیا تھا۔ اگر ضرورت پڑی تو ملتان پہنچ کر اس سے فون پر رابطہ کر لوں گا۔'' وہ بولا۔

اس نے اپنا موبائل فون نکالا۔ بٹن دبا کر سکرین روشن کی پھر نفی میں سر ہلا کر بولا، ''یہاں بھی سگنل نہیں ہیں۔ دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے، ہمارے یہاں ابھی موبائل کا نیٹ ورک مکمل نہیں ہوا۔''

ہم اس دوران لال پیر والا ریلوے کا کچا پھاٹک عبور کر چکے تھے۔ یہ بس نام کا پھاٹک مشہور تھا۔ عملی طور پر یہاں پھاٹک نہیں تھا، بس ریڑھیوں اور کاروں وغیرہ کے لیے از خود ریلوے ائن کراس کرنے کی جگہ بنا دی گئی تھی۔ میں نے ایک دوراہے پر اسے دائیں ہاتھ ٹرن لینے کا

کہا۔ یہ راستہ کوٹلہ لغاری کے مقام پر جا کر مین روڈ پر چڑھتا تھا۔ چونکہ لال پیر موڑ کے قریب ہی پولیس کی چوکی بنی ہوئی تھی، اس لیے میں نے مناسب جانا کہ پولیس کی ممکنہ چیکنگ کے نتیجے میں ہونے والی تاخیر سے بچنے کے لیے نسبتاً لمبا راستہ لے لیا جائے۔

یہ راستہ مین روڈ تک کچا تھا اور ناہموار تھا۔ ایک بڑے جمپ پر گاڑی کے عقبی حصے سے کھالے کی کراہ برآمد ہوئی۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ دونوں لڑکیاں اور موجو آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ وہ یقیناً سوئے ہوئے نہیں تھے مگر میری موجودگی میں خود کو محفوظ تصور کرتے ہوئے اپنی اپنی سوچوں میں گم گئے۔ کھالے کی دوسری کراہ نسبتاً بلند تھی۔ لڑکیاں چونک کر عقب میں دیکھنے لگیں۔

شانو نے گھبرا کر پوچھا، ''بھائی! یہ پیچھے کون لیٹا ہوا ہے؟''

میں نے کہا، ''کھالا ہے، بے چارہ گر گیا تھا۔''

پیا نے گاڑی روک کر کہا، ''شہریار! تم پیچھے چلے جاؤ اور کھالے کو سنبھالو۔''

میں عقبی حصے میں آ گیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی دو سیٹیں موجود تھیں۔ میں نے ایک پر بیٹھ کر بیک ڈور بند کر دیا۔ گاڑی چل پڑی تو میں کھالے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا مگر اس کے منہ سے مسلسل کراہیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض خاصی سست تھی مگر خطرے کی بات نہیں تھی۔ اسے تھوڑا ہلایا جلایا، آوازیں دیں اور چہرہ تھپتھپا کر ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ شانو نے مجھے پانی والی بوتل تھما دی۔ میں نے چلو میں پانی لے کر اس کے منہ پر چند چھینٹے مارے تو اس نے جھرجھری لی اور آنکھیں کھول دیں۔ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں مجھے گھورتا رہا، پھر پہچان کر بولا، ''شہرے! میں کہاں ہوں؟''

میں نے کہا، ''اپنی ٹرو پر میں ہو، اور کہاں ہونا چاہیے تھا تمہیں۔ چلو اُٹھو، سیٹ پر بیٹھو۔''

اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے دردناک کراہ نکل گئی۔ وہ بولا، ''نہیں شہرے..... میں نہیں اُٹھ سکتا۔''

''کیوں؟ کیا ہوا تجھے؟'' میں متفکر ہوا، ''کوئی چوٹ لگی ہے کیا؟''

اس نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔ بولنا چاہا مگر کچھ کہا نہیں۔ میں نے سہارا دے کر اُٹھانے کی کوشش کی تو اس نے زوردار انداز میں سر ادھر اُدھر پٹخا، بولا، ''نہیں شہرے..... مجھے مت ہلاؤ، درد ہوتا ہے۔ جب کم ہو گیا، تب خود اُٹھ بیٹھوں گا۔''

میں نے اسے بااحتیاط دیکھا تھا۔ کوئی زخم دکھائی نہیں دیا تو تعجب سے پوچھا، ''کہاں درد ہوتا ہے؟''

وہ نقاہت سے بولا، ''میکوں چھوڑ، ڈسا بھیناں کوں گھن آیا ہیں؟''

(مجھے چھوڑو، یہ بتاؤ کہ بہنوں کو لے آئے ہو؟)

اس کا اشارہ فرزانہ اور شانو کی طرف تھا۔ میں نے کہا، ''تم ان کا فکر نہ کرو، وہ ہمارے ساتھ ہیں اور بالکل ٹھیک ہیں۔ موجو اور باقی سب لوگ بھی اللہ کے فضل سے زندہ سلامت ہیں۔''

اس نے سر اُٹھایا، میری آنکھوں میں جھانکا پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔ وہ نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا اس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے نہایت دقت کے ساتھ پہلو بدلا، ہاتھ پاؤں ہلائے اور گھسٹ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس دوران اس کے حلق سے متواتر کراہیں خارج ہوتی رہیں۔ بولا، ''کم بختوں نے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا تھا۔''

میں نے کہا، ''میں نے تمہاری خوفناک چیخ سنی تھی، ساتھ میں فائر کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ سمجھا، شاید تمہیں گولی لگ گئی ہے۔''

اس نے میرے ہاتھ سے پانی کی بوتل پکڑ کر منہ سے لگائی۔ کچھ پانی حلق میں، کچھ منہ سے باہر بہہ نکلا۔ اس نے چند گھونٹ لیے اور بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے بولا، ''ہاں! میں ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ جب ان کی نظر میں آیا، تب قریب میں کوئی آڑ لینے یا چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ ایک آدمی نے گن سیدھی کی اور مجھ پر فائر کر دیا۔ شکر ہوا کہ گولی میرے کان کے قریب سے گزری اور میں بچ گیا۔ یہ کان.....'' اس نے بے اختیار اپنے دائیں کان کو چھوا، سسکی لی اور بولا، ''کان جل گیا ہے شاید..... میں نے زوردار چیخ ماری، زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔ پھر ساکت ہو کر ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قریب نہیں آئے۔ میں چونکہ زیادہ دیر بھی اسی حالت میں پڑا نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے اٹھ کر ان کی طرف بڑھا۔ ایک جیپ کے قریب موجود تھا، دوسرا غائب تھا۔ میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ میں اس پر حاوی تھا مگر اس کا ساتھی بھی کہیں سے نکل کر پہنچ گیا۔''

بولنا اس کے لئے محال ہو رہا تھا۔ تبھی رُک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ کچھ توقف کے بعد بولا، ''میں نے دونوں لڑکیوں کو گاڑی میں دیکھ لیا تھا اور لڑائی میں کوئی غلطی نہیں کی تھی مگر ایک کا

داؤ چل گیا اور اس نے گن کا بٹ پوری قوت سے میرے سر میں دے مارا۔ میں چکرا کر گرا تو پھر دونوں نے مجھے اُٹھنے نہیں دیا۔ اب کیا بتاؤں، کیا کیا، کہاں کہاں مارا ان مردودوں نے..... آہ! ہوش آیا تو تجھے اپنے سامنے پایا.....''

اس نے کوشش کی کہ اُٹھ کر سیٹ پر بیٹھ جائے مگر کامیاب نہ ہو پایا اور فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ پیا نے کہا، ''اگر کھالا بہتر حالت میں ہے تو فرنٹ سیٹ پر آ جاؤ۔''

میں نے اسے بتایا کہ کھالا بیٹھا ہوا ہے اور خطرے سے باہر ہے۔ اس نے گاڑی روک دی۔ میں پھر فرنٹ سیٹ پر چلا گیا۔ اس نے پوچھا، ''کوئی فائر شائر تو نہیں لگا اسے؟''

میں نے بتایا، ''نہیں بلکہ زخم بھی نہیں ہے۔ ہڈیاں بھی سلامت ہیں البتہ میرے بازو میں جلن ہو رہی ہے۔ ایک گولی چھو کر گزری تھی۔''

کوٹلہ لغاری کے قریب سے ہم مین روڈ پر چڑھے۔ یہ سڑک دائیں جانب مظفر گڑھ اور بائیں ہاتھ پر محمود کوٹ جاتی تھی۔ اس سڑک پر بہت بڑا تھرمل پاور سٹیشن موجود تھا جو تمام علاقے کو بجلی بنا کر سپلائی کرتا تھا۔ محمود کوٹ میں آئل ڈپو تھا جس کی وجہ سے دن رات بڑے بڑے آئل ٹینکر سینکڑوں کی تعداد میں نہ صرف تھرمل اسٹیشن کے اطراف میں موجود رہا کرتے تھے بلکہ دن رات آئل ٹینکروں کی مکمل طور پر اس سڑک پر اجارہ داری قائم رہتی تھی۔ یہ سڑک ریلوے پھاٹک کے قریب جھنگ روڈ پر جا چڑھتی تھی۔ جونہی پیا جی نے مظفر گڑھ داخل ہونے کے بعد پھاٹک اور جھنگ روڈ کو دیکھا تو جھٹ سے پوچھا، ''کیا ہمیں ملتان جانا ہے؟''

میں نے کہا، ''تم بہتر سمجھتے ہو۔''

''ہمارا مشن مکمل ہو چکا ہے؟''

میں نے آزردہ لہجے میں کہا، ''ہاں!''

''تو پھر ہمیں بصیرہ جا کر ایک دن چھپے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' اس نے کہا اور جھنگ روڈ پر چڑھتے ہی بائیں جانب گاڑی موڑ لی۔ میں نے تشویش آمیز انداز میں جھٹ سے کہا، ''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ یہ سڑک ملتان نہیں، جھنگ اور میانوالی کی طرف جاتی ہے۔''

اس سڑک پر کافی زیادہ ٹریفک رواں دواں تھی۔ وہ اپنی توجہ کراسنگ پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا، ''میں جانتا ہوں، اب مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ ٹرو پر کے اندر کی فضا عجیب سوگوار تھی۔ سبھی اپنی اپنی دنیاؤں میں سمٹے

ہوئے تھے۔ دونوں لڑکیاں، موجو اور کھالا..... سبھی خاموش تھے۔ پیا جی خان پور موڑ سے جھنگ روڈ پر کوئی ایک کلومیٹر تک گیا، پھر دائیں ہاتھ نکلتی ہوئی لنک روڈ پر اُتر گیا۔ میں اس طرف کبھی نہیں آیا تھا۔ لنک روڈ پر موڑ پر موڑ کاٹتے ہوئے وہ بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لنک روڈ سے اُتر کر دریائی سپر بند پر چڑھ گیا۔ بند کے اوپر بنی ہوئی ناپختہ سڑک میں جا بجا کھڈے بنے ہوئے تھے جن کی وجہ سے گاڑی بے طرح اچھل رہی تھی۔ میں نے بیزاری سے کہا، ''یہ تو بڑا گندا راستہ چنا ہے تم نے پیا جی! پسلیاں بجنے لگی ہیں اب تو۔''

اس نے کہا، ''شہر میں اس وقت دو تین جگہوں پر پولیس نے ناکہ لگا رکھا ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے چوک قریشی کے تھانے سے شہر میں وائرلیس پر ہماری آمد کی خبر نشر کر دی گئی ہو۔ ویسے بھی شہر سے نکلتے نکلتے پون گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ اب ہم پندرہ منٹ میں چناب کے پل کے قریب جا نکلیں گے۔''

ہیڈ لائٹ کے ساتھ ساتھ دل بھی تھل پتھل ہو رہا تھا۔ چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دریائی بند سے اُتر کر ایک اور خستہ حال لنک روڈ پر چڑھ گیا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ہم بمشکل پندرہ منٹ میں پون گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد محمود ٹیکسٹائل ملز کے قریب ملتان روڈ پر چڑھ گئے۔ مظفر گڑھ شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے موبائل فون نکالا اور میر وشاہ کا نمبر ملایا تو فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔

پیا مختصراً رپورٹ دینے کے بعد بولا، ''اب ہم چناب پل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ کیا حکم ہے؟ ہم گل گشت کالونی والے مکان کی طرف جائیں یا میڈم کی کوٹھی کی طرف؟''

میر وشاہ کی بات سن کر بولا، ''شاہ جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ہمارے لیے بصیرہ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ تبھی میں نے منصوبے میں تبدیلی.....''

اس کی بات میر وشاہ نے کاٹ دی اور نئی ہدایات دینے لگا۔ پیا غور سے سنتا رہا، پھر 'یس سر' کہہ کر فون بند کرتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے بولا، ''ہم گل گشت کالونی والی کوٹھی پر جا رہے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ اس میں فرنیچر وغیرہ نہیں ہوگا۔ رات کا بقیہ حصہ تم لوگوں کو فرش پر گزارنا پڑے گا۔''

میں نے متفکر ہو کر پوچھا، ''کیا وہاں کوئی موجود ہوگا؟ میرا مطلب ہے کہ اگر وہاں کوئی موجود نہیں ہے تو پھر تالا لگا ہوگا اور ہمارے پاس چابیاں بھی نہیں ہیں۔''

''میر وشاہ نے کہا ہے کہ جب ہم نو نمبر چونگی پر پہنچیں، اسے مس کال دے دیں۔ وہ وہاں پہنچ جائے گا۔'' اس نے یہ بتایا تو مجھے تسلی ہوئی کہ میر وشاہ نہ صرف مکان کھول دے گا بلکہ وہ ہمارے لئے سونے کا بندوبست بھی کر دے گا۔ اس سے بعید نہیں تھا کہ اس نے پہلے سے ہی تمام بندوبست کر رکھا ہو۔

کھالے کے کھانسنے اور موجو کے خراٹوں کی آوازیں گاڑی میں گونجنے لگیں۔ اس وقت ہم چناب کا پل عبور کر رہے تھے۔ بھاری گاڑیوں کی دوطرفہ لائن ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دو ٹرکوں کے بیچ میں ہم چیونٹی کی سی رفتار سے ملتان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ شیر شاہ بائی پاس تک ہمیں اسی صورتِ حال سے نبرد آزما رہنا تھا۔ وہاں جا کر ٹریفک دو راستوں میں بٹ جاتی تھی۔ سیدھی سڑک لاری اڈہ کی طرف جبکہ بائیں ہاتھ نکلنے والی شاہراہ مظفر آباد اور کینٹ سے ہو کر ڈیرہ اڈہ پہنچتی تھی۔ ہم نے اس سڑک پر جانا تھا۔ اس طرف بھاری ٹریفک کی آمد و رفت نسبتاً کم ہوا کرتی تھی۔ شیر شاہ آئل ڈپو تک آئل ٹینکر جاتے رہتے تھے۔

میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا اور درپیش آنے والے غیر متوقع حالات کی بھٹی میں جل رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر چاچا اور چاچی کی بے بسی اور بے گناہی کی موت کا خیال آنے لگتا تھا اور یکبارگی میرا دل دھڑکنا بند کر دیتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر، چیخ چیخ کر روؤں اور دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہو میں نہا جاؤں۔ میرے ماں باپ کا پیار میرے بچپن کی دھند میں گم ہوا تھا۔ چاچی اور چاچے کے پیار کی بیساکھی پر زندگی رواں دواں تھی۔ وہ اس جنگ کا ایندھن بن گئے تھے جو پروین کے اغوا سے شروع ہوئی تھی اور میری بغاوت پر بھڑک کر قیامت کا روپ دھار گئی تھی۔ میں سبھی کو نور پور سے نکال کر محفوظ کرنے کے ارادے سے ملتان سے نکلا تھا اور آدھی کامیابی، آدھی ناکامی ماتھے پر سجائے لوٹا تھا۔

ڈاکٹر شاہ جی کہا کرتا تھا کہ زندگی سمسٹر سسٹم کے تحت چلتی ہے۔ ایک سمسٹر میں چند مضمون، چند باب ایک ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ سمسٹر ختم، سمسٹر کا نصاب ختم..... نیا شروع..... کیا میری زندگی کا ایک سمسٹر ختم ہو گیا تھا؟ کیا نور پور سے میں ہمیشہ کے لیے کٹ چکا تھا؟..... ابھی ایک آس، ایک وجود، ایک بندھن باقی تھا۔ وہ غزالہ کا وجود تھا جو ابھی بھی نور پور میں تھی۔ میں نے نور پور پہنچنے سے پہلے سوچا تھا کہ ان دونوں ماں بیٹی کو بھی ساتھ لاؤں گا۔ نور پور کے حالات اتنے غیر متوقع اور جوالا مکھی کی طرح تیز رو تھے کہ مجھے ان کا خیال تک نہیں رہا تھا۔

میں شدید خواہش کے باوجود نہ تو مراد بخش دیوانے سے مل سکا، نہ ڈاکٹر شاہ جی سے اور نہ ہی کھالا اپنے گھر کا چکر لگا سکا۔ میرے حلق سے ایک آہ خارج ہوئی اور میں نے سر پیچھے ٹکاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا، ''یا مالک تیری مرضی! میں تیرے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ اگر مجھے نور پور پہنچنے میں دس پندرہ منٹ کی معمولی سی تاخیر بھی ہو جاتی تو اس وقت میرے ہاتھ بالکل خالی ہوتے۔ چاچے چراغ دین اور چاچی کے ساتھ ساتھ موجو بھی راکھ کے ڈھیر میں دب جاتا اور میری دونوں چچازاد بہنیں پروین کی طرح میری نظروں سے اوجھل ہو جاتیں۔ ان کے غیاب کا تو مجھے پتہ بھی نہ چلتا..... یا مالک! مجھے اتنی طاقت دے کہ میں اپنے خاندان کو سکیور کر سکوں.....''

بڑے خان کے چاروں خونخوار غنڈے ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے لیکن ان لوگوں کا حیدر خان سے خون کا ناتا نہیں تھا کہ اس کے دل پر چوٹ لگتی، اس کی آنکھیں خون کے آنسو روتیں اور اس کے گھر سے بین کی آوازیں اُٹھتیں جبکہ مرنے والی دو بوڑھی جانوں سے ہمارا خون کا ناتا تھا۔ محبت اور مامتا کا اٹوٹ بندھن تھا جو بکھر چکا تھا۔ سردار حیدر خان نے دوسری مرتبہ میرے آنگن میں بین اور دل دہلا دینے والی چیخ و پکار اُتار دی تھی۔

وہ خانزادہ تھا، اپنی معمولی سی حکم عدولی پر برانگیختہ ہو کر آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ یہاں تو اسے پے در پے شکست اور بیٹی کے اغوا جیسی غیرت پاش صورتِ حال کا سامنا تھا۔ اس کا یوں مشتعل ہو کر قتل و غارت اور کھلی بربریت پر اُتر آنا میرے لیے حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس کی سرشت ہی ایسی تھی۔

رات کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ اندھیرا اپنی بساط سمیٹنے کو تھا جب ہم ایک چھوٹی سی کوٹھی کے گیٹ پر رُکے۔ گیٹ کا بغلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے ہارن بجایا۔ چند لمحوں کے بعد ایک اجنبی چہرے نے دروازے سے جھانکا۔ پیا نے گاڑی سے اُتر کر پوچھا، ''میر و شاہ اندر ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا، ''ہاں! تم لوگ اندر آ جاؤ، گاڑی یہیں کھڑی رہنے دو۔''

ہم سب نیچے اُترے۔ میں نے سوئے ہوئے موجو کو اُٹھایا جبکہ پیا نے کھالے کو سہارا دے کر چلایا اور ہم سب اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھی صاف ستھری اور جدید وضع کی تعمیر کا شاہکار تھی۔ فرزانہ اور شبانہ میرے پہلو سے جڑ کر چل رہی تھیں۔ جونہی پارکنگ عبور کر کے ہم بڑے سے چوبی دروازے کے سامنے پہنچے، مجھے احساس ہوا کہ موجو اور دونوں لڑکیاں ننگے پیر تھیں۔ فوری

طور پر ان کی برہنہ پائی کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ انہیں بستروں میں ہی بے ہوش کر کے اُٹھالیا گیا تھا۔ موجو کو میں نے بستر سے نکالا تھا۔

ادھیڑ عمر شخص کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ دو کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ گھر مکمل طور پر فرنیچر سے آراستہ تھا۔ پیا کا خدشہ کہ ہمیں فرش پر سونا پڑے گا، تحلیل ہو گیا۔

ایک بارہ ضرب چودہ کے خوب صورت کمرے میں داخل ہوئے تو میر وشاہ کی شکل دکھائی دی۔ وہ قدرے بیزار اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا، ''اڑے او غنچے! عرصے بعد ماڑے کو مجے (مزے) کی نیند آوے تھی..... آ..... ہا!''

اس نے لمبی جماہی لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ پھر سبھی لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر بولا، ''ماڑے کو ابھی یہ بتاوے کہ فیملی کے نگ پورے ہووت ہیں؟''

میں نے اسے شکست خوردہ انداز میں دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ادھیڑ عمر شخص کو مخاطب کر کے کہا، ''اوئے گھوڑے..... نجر (نظر) سے ککرے اُتر جاویں نیند کے تو رانیوں کو، اس ننھے راجے کو دو جے کمرے کی شکل دکھا دیوے۔''

میں موجو کو اُٹھائے، شبانہ اور فرزانہ کو ساتھ لئے دوسرے کمرے میں آیا۔ یہ کمرہ نسبتاً بڑا تھا۔ جہازی سائز کے بیڈ، صوفے، ڈریسنگ ٹیبل سمیت تمام فرنیچر غیر استعمال شدہ تھا۔ عیاں تھا کہ آج ہی خرید کر یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ میں نے موجو کو بیڈ پر لٹا دیا۔ پانچ بلانکٹ بیگ بیڈ کے ساتھ فرش پر پڑے تھے۔ میں نے شانو سے کہا، ''یہ کمبل نکال لو اور آرام سے سو جاؤ۔ صبح ہو گئی ہے۔ دو تین گھنٹے کی نیند لے لو۔''

دونوں بہنیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے کمرے کے در و دیوار کو دیکھ رہی تھیں۔ شانو نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا، ''بھائی! یہ تمہارا گھر ہے؟''

میں نے کہا، ''ہاں! اب یہ ہم سب لوگوں کا گھر ہے۔''

وہ ایک جاں گسل رات کے خونیں کھیل سے گزر کر یہاں پہنچی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ابھی تک خوف اور دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ میں نے دونوں کو سینے سے لگا کر پیار کیا، دلاسا دیا اور کہا، ''تم اپنے دلوں سے ہر خوف کو نکال پھینکو۔ یہاں کوئی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھنے والا نہیں ہے۔''

فرزانہ نے تشکیک آمیز نظروں سے مجھے دیکھا، بولی، ''ابا کہاں ہے؟ کیا اماں اور ابا یہاں نہیں آئیں گے؟''

میں نے کہا، ''میں انہیں جا کر لے آؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

میر وشاہ کی تیز آواز سنائی دی، ''اڑے غنچے! او لاڈے! جلدی سے آوے ناں..... ماڑے کو یہاں سے جانا بھی ہووت.....''

میں نے دونوں کو خود سے علیحدہ کیا اور میر وشاہ کے پاس آ گیا۔ پیا اور کھالا بیڈ پر بیٹھے تھے جبکہ میر وشاہ صوفہ کم بیڈ پر ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا، ''ماڑے لاڈے کو اپنا گھر پسند آوت ہے کہ نہیں؟''

میں نے آزردہ لہجے میں 'ہاں' کہا تو وہ ایک ٹک مجھے دیکھنے لگا۔ بولا، ''غنچہ کملایا ہووت ہے پیا! خیر نہیں لاگت پَر خیر! ساری رپورٹ راستے میں تم دیوے گا۔'' پھر میری جانب رُخ کر کے بولا، ''غنچے! کتنے پیسے مٹھی میں ہوویں تیری؟''

میرے پاس میڈم کی دی ہوئی جو رقم تھی، وہ آدھی کمرے میں رکھی تھی جو چاچا اور چاچی کے ساتھ جل چکی تھی جبکہ آدھی سی ٹو میں میڈم کے ریٹائرنگ روم میں پڑی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور تفصیل بتا دی۔ وہ بولا، ''کوئی بات نہ ہووت غنچے! دل چھوٹا کیوں کرت ہے..... ادھر کو آوے، تھامے..... نوٹ ہی نوٹ..... ننھے محل میں جس شئے کی بھی جرورت (ضرورت) ہووے، خرید لیوے ہے۔''

اس نے چغہ نما قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سرخ نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دی۔ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے بولا، ''غنچے! دکھ بندے کو مجبوط (مضبوط) کرنے کے لیے آوت ہے، جو ڈر جاوے، وہ مر جاوے..... سمجھے ناں؟ تیرا چہرہ بولت ہے کہ فیملی کے نگ شارٹ ہوویں..... ہیں؟..... جانے والوں کا غم لاجم (لازم) ہووے پَر بچ جانے والوں کی حفاجت (حفاظت) اس سے بھی جیادہ (زیادہ) جروری ہووے ہے غنچے.....''

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں میں جہاں آج تک میں نے شرارت اور ذہانت ہی دیکھی تھی، اس وقت گہری سنجیدگی اور کرب کی لہریں موجزن تھیں۔ وہ مجھے سینے سے لگا کر بولا، ''یہ گھوڑا..... فوجی اختر..... ایک دم تھارو بریڈ گھوڑا ہووے

کیونکہ یہ فوج سے بگٹٹ بھاگ کر میرے پاس آوت تھا۔ اب یہ ماڑے غنچے کا نوکر بھی ہے اور اس گھر کا راکھا بھی..... چل اب ماڑے کو اجاجت (اجازت) دیوے ہے لاڈے میاں..... چل بے پیا..... چل بے کالے ٹیٹ بدمعاش..... لاڈے میاں کو اللہ بیلی بولے ہیں۔''

کھالے نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پیا نے کہا، ''تم میرے ساتھ چلو۔ تمہیں کوئی ٹیکہ ویکہ لگواتا ہوں۔''

میر وشاہ دونوں کو ساتھ لے کر رخصت ہو گیا۔ میر وشاہ کے گھوڑے نے مین گیٹ بند کیا۔ واپس آ کر مؤدبانہ انداز میں پیپر رول میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا، ''شاہ جی نے دیا ہے، گاڑی میں رہ گیا تھا۔ آپ کے لیے چائے لاؤں؟''

میں نے دوسرے کمرے میں جا کر لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ دونوں جاگ رہی تھیں۔ میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر فوجی اختر عرف گھوڑے کو چائے کے تین کپ اور بسکٹ لانے کا حکم دیا اور پیپر رول الماری میں رکھ کر بیڈ پر سرافگندہ بیٹھ گیا۔ فوجی نے دس منٹ بعد چائے اور بسکٹ لا تھمائے اور کہا، ''کیا اب میں جاؤں؟''

میں نے پوچھا، ''کہاں جاؤ گے اس وقت؟''

وہ بولا، ''میرا کمرہ اوپر ہے۔ آپ آرام کریں۔ جب ناشتہ کرنا ہو، مجھے بلا لیجئے گا۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے بعد ہم تینوں باتیں کرنے لگے۔ میں خوابیدہ موج دین عرف موجو کے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے چائے پیتا رہا اور ان کی باتوں کے گول مول جواب دیتا رہا۔ وہ دونوں میرا گھر دیکھ کر حیران تھیں۔ انہوں نے سردار بخت خان کی کوٹھی کے اُجلے اُجلے کمرے دیکھے تھے، سردار حیات خان کی حویلی دیکھی تھی مگر انہوں نے کبھی خواب میں بھی ایسے صاف ستھرے کمروں پر مشتمل اپنا گھر نہیں دیکھا تھا۔

چائے پی لینے کے بعد میں نے انہیں سو جانے کا حکم دیا اور اس کمرے میں آ گیا جس میں کچھ دیر پہلے میر وشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کیا، بیڈ تک آیا اور دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھول کر اوندھے منہ گر گیا۔ میرا دل ضبط کے مرحلوں سے نبرد آزمائی کی پاداش میں پھٹنے کو آ گیا تھا۔ شانو اور فرزانہ کی موجودگی میں بہنے والا میرا ایک آنسو دکھ کی ساری داستان کو عیاں کر سکتا تھا۔

میں اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا اور تنہائی پاتے ہی مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور دل کھول کر رویا..... اتنا، جتنا زندگی بھر نہیں رویا تھا۔ اپنا غبارِ دل اچھی طرح نکال دینا چاہتا تھا اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ کافی دیر گزر گئی مگر آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اور پھر ایسے ہی وقت میں جب میں دیواروں سے ٹکریں مارنا چاہتا تھا، مجھ پر قدرت مہربان ہوگئی اور نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خدا معلوم یہ نیند تھی، نقاہت یا بے ہوشی تھی..... مجھے زندہ رکھنے کا توانا سبب بن گئی ورنہ میرا دل خون کے آنسو رونے میں پگھلنے لگا تھا۔

مجھے شانو نے تین بجے کے قریب ہلا جلا کر جگایا۔ اسے کافی حد تک بہتر حالت میں دیکھ کر میرے دل کو گھونسا لگا۔ مجھے علم تھا کہ میں جونہی انہیں نور پور میں کھیلی جانے والی ہولناک جنگ اور اس کے بھیانک انجام کے بارے میں بتاؤں گا، ان کا تمام تر سنبھلاؤ ریت کی دیوار ثابت ہوگا۔ میں نے تینوں کو غسل کرنے کا حکم دیا۔ فوجی اختر قریبی ہوٹل سے کھانا خرید لایا تھا۔ ہم نے سیر ہو کر کھایا اور پھر گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لیا۔ ایسے میں فوجی اختر نے ہاتھ میں نوٹ پیڈ اور پنسل پکڑی لی اور ضروری سامان کی خریداری کی فہرست مرتب کرنے لگا۔ شانو اور فرزانہ نے اس کام میں ہماری معاونت کی۔

یہ چار مرلہ اراضی پر مشتمل چھوٹا سا مگر جدید طرز تعمیر کا ماڈل بنگلہ تھا۔ اس میں نیچے ایک ڈرائینگ روم، دو بیڈ روم، چھوٹا سا کچن اور آٹھ ضرب دس کا ٹی وی لاؤنج بنا ہوا تھا۔ سبھی کمرے اٹیچڈ باتھ تھے۔ ریلنگ والی چار فٹ چوڑی سیڑھیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر دو کمرے اور ایک نسبتاً بڑا کچن بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں فوجی اختر رہائش پذیر تھا جبکہ دوسرا خالی تھا۔ اس نے فہرست میں اپنا مطلوبہ سامان بھی شامل کر لیا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ مرتبہ لسٹ کے مطابق سامان کی خریداری پر کم و بیش تیس ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے۔ میں نے اسے میر وشاہ سے رابطہ کرنے کو کہا تو اس نے اپنے موبائل فون پر اسے کال کی۔ ریسیو ہونے پر اس نے مؤدبانہ لہجے میں میر وشاہ سے مجھے اٹینڈ کرنے کو کہا اور فون مجھے تھما دیا۔ میں نے 'ہیلو' کہا تو میر وشاہ کی آواز سنائی دی، ''ہاں ماڑے اڈے! کیا بات ہووے ہے؟''

میں نے اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ وہ بولا، ''اڑے پھوکٹ میں فکرمند ہووت ہے؟

چٹکی بجاؤ، معاملہ ختم ہووت..... بس..... ابھی پیا تیرے پاس پہنچ جاوت ہے، روکڑا بھی..... جو جی میں آئے، خریدو..... لوٹو..... یہ ماڑی میڈم کے سوہنے سوہنے ہاتھوں کا میل ہووت ہے..... کوئی سونا چاندی ناں ہووت.....''

اس کی برق رفتار زبان چل پڑی تھی، ''او ہاں بھئی غنچے! ایک موبیل فون اور دو چار نمبر بھی خرید لیوے..... سمجھے؟''

میں نے کہا، ''ٹھیک ہے۔ میں پیا کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے فوجی اختر کو مخاطب کیا، ''کچن کا سامان بھی فہرست میں شامل کر لیا ہے ناں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی مرتب کردہ فہرست کو بہ غور پڑھنے لگا۔ مبادا کہ کوئی شئے کم نہ ہو۔ چار بجے پیا پہنچ گیا۔ وہ چائنا ٹرک لے کر آیا تھا۔ اس قسم کے منی ٹرک کو ہم دیہاتیوں نے یہ نام دے رکھا تھا۔ یہ ہائی لکس ڈالے سے کچھ ہی بڑا تھا۔ شکل چاپانی ٹرکوں کے جیسی تھی۔ چونکہ اس کے لوکل مینوفیکچررز نے اسے چائنا ٹیکنالوجی کا شاہکار کہہ کر متعارف کرایا تھا، اس لیے یار لوگوں نے اس کا نام ہی چائنا ٹرک رکھ چھوڑا تھا۔

میں اور فوجی اختر منی ٹرک کے کیبن میں پیا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہماری شاپنگ کا آغاز حسین آگاہی روڈ سے ہونا تھا۔ جب ہم آٹھ بجے کے لگ بھگ لوٹے تو منی ٹرک آدھا بھرا ہوا تھا۔ اس سامان کو اتارنا اور گھر میں سیٹ کرنا بذات خود ایک اہم کام تھا جس کی سرانجام دہی میں گیارہ بج گئے۔ کھانا حسب سابق ہوٹل سے منگوایا، کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میری دانست میں اب یہ مکان بھرے پرے اور مکمل گھر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں موجو اور دونوں لڑکیوں کی ضرورت کا تمام سامان بھی خرید لایا تھا۔ چونکہ میڈم کھلے دل کی مالک تھی اور اس کا قائم مقام میر وشاہ بھی کسی طور پر کم نہیں تھا اس لیے تیس چالیس ہزار روپے کی شاپنگ پھیل کر ستر بہتر ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ پیا کے پاس ابھی بھی تگڑی رقم موجود تھی۔ میر وشاہ مجھے دس ہزار روپے دے کر گیا تھا، وہ ابھی تک بالکل محفوظ تھے۔

بارہ کے قریب، جب مجھے یقین ہو گیا کہ موجو اور دونوں لڑکیاں سو گئی ہیں، میں نے فوجی اختر سے میر وشاہ کے لئے ہوئے نمبر پر اپنے نئے خرید کردہ موبائل فون سے رابطہ کیا۔ میر وشاہ کی اکتائی ہوئی آواز سنائی دی، ''ابے کون ہووت ہے اس سمے..... کیا دنیا کو جگانے پر قدرت

نے تیری ڈِوٹی (ڈیوٹی) لگا چھوڑت ہے؟''

میں نے کہا، ''میں شہریار بول رہا ہوں۔ کچھ باتیں کرنا تھیں، اس لیے تکلیف دی۔''

اس کی بیزاری ہوا ہو گئی، بولا، ''تو یوں بولے ہے ناں کہ تم میروشاہ کے لاڈے ہووت..... کیا بات ہووے ہے؟''

میں نے کہا، ''پیا نے مشن کی رپورٹ دے دی ہے؟''

''ہاں تو.....''

''پھر اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے کہا، ''میری بہن ابھی تک نہیں ملی۔ نور پور کے حالات کی بھی کچھ خبر نہیں کیونکہ میں وہاں کسی آدمی سے نہ تو مل سکا ہوں اور نہ ہی اس کے رابطے کی کوئی سبیل نکال پایا ہوں۔''

وہ بولا، ''ابھی تیرے کو سکون سے سو جانا ہووت..... ماڑا کوئی کارندہ کل نور پور جاوے گا اور خبر شبر لے آوے گا۔ کل شام کو مل بیٹھک کرت اور آگے کی پلاننگ کرت ہیں ہم..... اب ماڑا لاڈا، ماڑا غنچہ لمبی تان کے سو جاوے.....''

اس نے مجھے پچکارا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر پیا سے رابطہ کیا۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر باتیں کیں پھر کھالے کو فون تھما دیا۔ میں نے پوچھا، ''کھالے! طبیعت کیسی ہے؟''

وہ بولا، ''میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، کیا تم نے انہیں بتا دیا ہے؟''

اس کا اشارہ موجو اور لڑکیوں کی طرف تھا۔ میں نے کہا، ''نہیں کھالے! ابھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ انہیں اتنی بڑی خبر دینے کے بعد انہیں سنبھال بھی لوں۔''

''آخر بتانا تو پڑے گا ہی۔'' وہ بولا، ''پیا سے کہہ دو، وہ مجھے کل تمہارے پاس پہنچا دے۔ مل کر کوئی صورت نکالیں گے۔''

''ٹھیک ہے، اسے فون دو۔''

میں نے اسے کھالے کو یہاں پہنچانے کی درخواست کی۔ وہ بولا، ''حکم کی تعمیل ہوگی۔ ابھی ہم ایک نیوز چینل پر تمہاری کارگزاری کے بارے سن رہے ہیں۔ تم تو یار بڑے خوف ناک مجرم ہو۔ اپنے چار ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر، اپنے چاچا اور چاچی کو قتل کر کے نور پور سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ پولیس والے تمہارے سر پر سہرا سجانے کے چکر میں پڑے ہوئے

ہیں۔''

میں دنگ رہ گیا۔ حیرت سے بولا، ''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

اس نے کہا، ''صبح کا اخبار منگوا کر پڑھنا اور ہاں..... کسی الیکٹریشن کو بلوا کر ٹی وی اور کیبل کا کنکشن چالو کروالینا۔ آدمی کا جنرل نالج بہتر ہو جاتا ہے۔ او کے، ناؤ گڈ نائٹ ڈیئر!''

فون بند کر کے میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک تو میرے چاچا چاچی کو قتل کر دیا گیا تھا، مستزاد یہ کہ ان کے قتل کا الزام مجھ پر ہی عائد کیا جا چکا تھا۔ میرے خونیں دشمنوں کو میرا ہی ساتھی قرار دے کر مجھے اشتہاری مجرم بنایا جا رہا تھا اور میں سوائے کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے میڈم کی عدم موجودگی کا قلق ہوا۔ اگر وہ اس وقت یہاں موجود ہوتی تو شاید ایسا نہ ہونے دیتی اور کوئی نہ کوئی توڑ کر دیتی۔

میں چشمِ تصور میں ٹی وی کی اسکرین روشن کئے لیٹ گیا۔ ٹی وی اینکر کی پُر ہیجان رپورٹنگ، ایس ایچ او، ڈی پی او اور وہ حرام زادہ سردار حیدر خان..... کیسے بن بن کر جھوٹ بول رہے ہوں گے، کیسے چار اشتہاریوں کو سخت مقابلے کے بعد ہلاک کرنے پر پولیس والے اعزاز سمیٹ رہے ہوں گے؟ میرا دماغ پھٹنے کو آ گیا اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

ڈاکٹر شاہ جی ٹھیک کہتا تھا کہ یہ دنیا دولت والوں کی ہے، طاقت والوں کی ہے..... سچ کو جھوٹ..... جھوٹ کو سچ..... رات کو دن اور دن کو رات بنانے والے کمزوروں اور غریبوں کی قسمتوں سے کھیلتے ہیں اور ان کے خون سے شراب کشید کر کے اپنے بھیڑیے جیسے مونہوں میں انڈیل لیتے ہیں۔ رہ رہ کر چاچا اور چاچی کی یاد نے دل کا گھیراؤ کیا۔ میں جانتا تھا کہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا مگر اندوہ ناک موت ان کا مقدر بن گئی۔ شاید ایسے ہی میرے والدین کا بھی کوئی قصور نہیں رہا ہوگا اور کسی ناکردہ جرم کی پاداش میں موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے ہوں۔

رات ڈھل گئی، صبح ہو گئی۔ پیا نے کہا تھا کہ صبح ہو کر ہی رہتی ہے۔ صبح کی دہلیز پر جا کر انسان ہی ٹھہر جائے تو کیا ہوتا ہے؟ یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں تھا۔ میں بیدار ہو کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔ دونوں لڑکیوں نے جاگ کر کچن اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ چونکہ نور پور میں سوئی گیس نہیں تھی اور دونوں کے لئے نئی چیز تھی، اس لیے دونوں غیر معمولی انہماک فوجی اختر سے چولھا اور مینٹل جلانا سیکھ رہی تھیں۔ میں دروازے میں کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ ان دونوں نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ پیروں میں چپلیں بھی پہن رکھی تھیں۔ میں نے کہا، ''ناشتہ بازار سے منگوا لیتیں؟''

شانو بولی، ''نہیں بھائی! مجھے بازاری کھانا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی اب یہیں رہنا ہے، آج نہیں تو کل کام کرنا ہی ہے۔''

میں چونکا۔ اس کا لہجہ غم ناک تھا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔

فوجی اختر انڈے لینے کے لئے چلا گیا تو میں نے شانو سے پوچھا، ''کیا تم روتی رہی ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ الماری کے سامنے کھڑی فرزانہ نے پلٹ کر رنجیدہ لہجے میں کہا ''ہاں! ہم دونوں ساری رات روتی رہی ہیں۔''

''مگر کیوں؟ کیا نور پور کی یاد آ رہی تھی؟''

''نہیں..... نور پور کو نہیں، ہم اپنے لیکھوں کو روتی رہی ہیں۔''

''کیا ہوا تمہارے لیکھوں کو؟'' میں نے جلدی سے کہا تو وہ جلدی سے میرے روبرو آن کھڑی ہوئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''سچ سچ بتاؤ بھائی! میری اماں ابا کہاں ہیں؟''

اس نے اتنی اچانک مجھ پر سوال کیا تھا کہ میں گڑبڑا گیا۔ اس کی آنکھوں کی تپش کی تاب نہ لا کر شانو کی طرف دیکھنے لگا۔ فرزانہ نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا، ''بھائی! تم لاکھ چھپاؤ پر ہمارا دل بجھ گیا ہے۔ ہمارا دل کہتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نہیں رہے.....''

وہ بمشکل یہی کہہ پائی اور مجھ سے لپٹ کر سسکنے لگی۔ اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ شانو آٹا گوندھ رہی تھی، اس کے ہاتھ تھم گئے اور اس نے وہیں گھٹنوں پر سر ڈال دیا۔ میں نے فرزانہ کو بانہوں میں بھینچ لیا، ایسے میں مجھے خود پر اختیار نہیں رہا اور میری آنکھیں بھی ابل پڑیں۔ فرزانہ کا یوں کٹ کر رونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا مگر میرے پاس دلاسے کو ایک لفظ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ جس دکھ سے نبرد آزما تھی، میں خود اس کے حصار سے ابھی تک نکل نہیں پایا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ وہ تمام رات روتی رہی تھی مگر آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ میرے کندھے سے چہرہ ٹکائے پھر رو رہی تھی۔ میں نے کہا، ''فرو! مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی تھی۔''

شانو نے سر اُٹھایا، بڑی بڑی ڈھلی ہوئی آنکھوں کا تاثر بڑا عجیب تھا۔ بولی، ''تم ہمیں چھوڑ کر گئے ہی کیوں تھے؟''

''میں پروین کو ڈھونڈنے نکلا تھا، وہ بھی نہیں ملی، سر کی چھت بھی اُڑ گئی۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔'' میں نے تأسف بھرے انداز میں کہا۔

میں جس خبر کو ان کے گوش گزار نے کے طریقے ڈھونڈ رہا تھا، کسی مناسب وقت کی تلاش میں اپنے آپ سے آنکھیں چُرا رہا تھا، وہ آپوں آپ ہی ان کے دلوں تک پہنچ گئی تھی۔ فرزانہ مجھ سے علیحدہ ہو کر زمین پر دوزانو بیٹھ گئی، رانیں پیٹ کر پھٹی پھٹی آواز میں بولی، ''مجھے ماں کا آخری منہ ہی دکھا دیتے، مجھے بابا کو دیکھ لینے دیتے..... یہ سب کیا ہو گیا بھائی! ہم تو جیتے جی مر گئے۔ سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔''

میں الٹے قدموں کچن سے نکل آیا۔ ان سے کچھ کہنا بے سود تھا۔ وہ اس وقت دکھ کی اس نہج پر کھڑی تھیں جہاں پر کوئی صدا کانوں میں نہیں پڑتی، کوئی سمجھاوا یا بہلاوا ذہن کی پرتوں پر نہیں ٹھہرتا۔ میں نے ڈرائنگ روم کے باہر رکھے مٹی کے بڑے بڑے گملوں میں سر اُٹھائے صبح کو خوش آمدید کہتے ہوئے پودوں میں خود کو الجھایا۔ پودے روشنی کو اپنی منزل بنا کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ ایسے ہی انسان زندگی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ کچھ دیر تک کچن سے رونے کی آوازیں پھوٹتی رہیں پھر شاید انہیں قرار آ گیا یا آنسوؤں کی دولت نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

ایک عرصہ کے بعد میں نے اپنی چچازاد بہنوں کے ہاتھ کا پکا ہوا پراٹھا کھایا۔ ذائقہ پہلا سا نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ نہ وہ گندم، نہ دیسی گھی اور نہ ہی لکڑیوں کی آگ کا سینک..... ہاتھ ذائقہ نہیں، اپنائیت کا احساس چھوڑتے ہیں۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد موجو کو ایک کھلونے میں الجھا کر میں دونوں کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ تینوں بیڈ پر بیٹھ گئے۔ شانو نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ سبھی پچھلے کئی دنوں سے میرے لئے بہت پریشان تھے۔ چاچے چراغ نے اردگرد سے، جہاں تک اس کی رسائی تھی، مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اسے ڈیرے پر راکھ کے ڈھیر میں پڑا ہوا سائیں دل جیت کا ہڈیوں کا اُدھ جلا ڈھانچا بھی مل گیا تھا۔ اس پر یا مجھ پر قتل نہ پڑ جائے، اس ڈر سے اس نے ہڈیوں کو سمیٹ کر ایک گہرے کھڈے میں دبا دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ پریشان رہنے لگا تھا۔ ایک طرف پروین کا معاملہ جوں کا توں لٹکا ہوا تھا تو دوسری طرف سردار حیات خان نے اس پر اپنے بیٹے کی بازیابی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا واحد سہارا میں تھا، میں بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ گھر میں کہتا رہتا تھا کہ شہرے کے ساتھ بخشو لوہار کا پتر بھی ہے۔ جہاں بھی گئے ہیں، دونوں اکٹھے گئے ہیں۔

وہ رات کو کھانا کھا کر بڑی دیر تک میرے کمرے میں بیٹھے جاگتے رہے اور باتیں کرتے

رہے پھر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ نصف شب کا عمل تھا جب صحن میں کھٹکا ہوا۔ وہ جاگی، لالٹین کی مدھم روشنی میں بابا کی چارپائی دیکھی، خالی تھی۔ شاید پانی پینے یا رفع حاجت کے لیے باہر نکلا تھا، یہ سوچ کر پھر لیٹ گئی۔ چند لمحوں بعد دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر چارپائی میں اُٹھ بیٹھی۔ آنے والا بابا نہیں تھا، کوئی اور تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دکھائی دیا۔ وہ ڈر کے مارے چیخنا ہی چاہتی تھی کہ پہلے داخل ہونے والے شخص نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی چیخ سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

دوسرے آدمی نے ٹارچ روشن کی۔ سبھی چارپائیوں پر گیا۔ پھر 'چرر' کی آواز سنائی دی۔ اس نے اماں کے منہ پر ٹیپ چپکائی تھی۔ پھر اس کے سر میں کوئی شئے ماری، وہ تڑپی اور ساکت ہو گئی۔ اس نے اماں کو اُٹھایا اور باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا اور اس نے یہی عمل فرزانہ کے ساتھ کیا۔ جب اس نے موجو کو بے ہوش کیا، تب پتہ چلا کہ وہ ایک بڑے سے خنجر کا دستہ کنپٹی کے قریب کسی خاص جگہ پر مارتا تھا۔ شانو دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ خونیں ماجرا دیکھتی رہی۔ اس نے دو افراد کو ہی دیکھا تھا۔

اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے والے نے خونخوار لہجے میں کہا، ''میں ہاتھ ہٹانے لگا ہوں، اگر تم نے کوئی آواز نکالی تو تمہاری گردن کاٹ دوں گا۔''

شانو نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اس کے ہاتھ کو دیکھا جس میں بڑا سا چمکدار خنجر دبا ہوا تھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی اور وہ روائتی انداز میں خدا اور رسول کے واسطے دے کر منت سماجت کرنے لگی۔ وہ جھڑک کر بولا، ''خاموش رہو ورنہ.....''

وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق یہ وہی شخص تھا جسے میں نے لینڈ کروزر کے فرنٹ ویل کے پاس چھپا ہوا دیکھا تھا اور اس کی کھوپڑی میں اپنے خاموش پستول کی گولی اُتاری تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس شخص نے اس سے میرے بارے میں، پھر پروین کے بارے میں پوچھا تھا۔ چونکہ شانو کو علم نہیں تھا، اس لیے اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس کے منہ پر زوردار تھپڑ پڑا۔ وہ ایک طرف الٹ گئی۔ تھپڑ مارنے والے نے یہی سوال بار ہا گھما پھرا کر کیا۔ وہ کچھ نہ بتا سکی تو اس کے منہ پر بھی وہی ٹیپ چپکا دی گئی۔ اس خبیث نے اس کا اوپر والا دھڑ اپنی جھولی میں بڑے عجیب انداز میں رکھ لیا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا جبکہ بایاں ہاتھ بڑے مکروہ انداز میں اس سے کھیلنے لگا۔ شانو نے چیخنا چاہا مگر ٹیپ کی غیر معمولی چپک

نے اس کی آواز برآمد نہیں ہونے دی۔ تڑپ کر اس کی گود سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی تو اس کا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند ہو گیا۔

اس کا ساتھی کچھ دیر کے لیے باہر گیا۔ لوٹا تو شانو کو قابو کیے بیٹھے شخص نے پوچھا، ''بڈھے نے انگوٹھے لگا دیے ہیں؟''

اس نے جواب دیا، ''ہاں! اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اب وہ دونوں کو باندھ کر تیل چھڑک رہے ہیں۔''

شانو کو ایک جھٹکا لگا۔ اس نے خود کو اس جسیم شخص کی گرفت سے آزاد کرانے اور منہ پر لگی ہوئی ٹیپ کو اتارنے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو پائی۔ اس کمینے کا ساتھی باہر سے ایک بڑا سا کین اُٹھا لایا۔ ہنس کر بولا، ''ایک فلم ختم ہو گئی ہے۔ دوسری فلم کو بھی ختم کرتے ہیں۔ تم اس چڑیا کے ساتھ تھوڑا اور کھیل لو، میں اس دوران کمرے میں تیل چھڑک لوں۔''

''اس لونڈے کو بھی آخری غسل دے دو۔ لڑکی پر تیل نہ ڈالنا۔''

شانو کے حواس نے بس یہیں تک اس کا ساتھ دیا تھا۔ پھر ذہن تاریک ہو گیا۔ وہ فرزانہ کو پہلے ہی یہ کہانی تفصیل سے سنا چکی تھی۔ وہ سسک کر بولی، ''میں نے جب گاڑی میں موجو کو اپنی گود میں لیا تھا، اس کے کپڑوں سے تیل کی بو آ رہی تھی۔ تمہارا چہرہ دیکھا تو سمجھ گئی تھی کہ اماں اور ابا دُنیا میں نہیں رہے۔ اگر تم ہم تینوں کو اُٹھا کر وہاں سے نکال سکتے ہو تو انہیں کیوں نہیں.....''

میں نے افسردہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ کہا، ''وہ میرے پہنچنے سے قبل اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ہم نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی، نہیں ملے۔ جب مردہ حالت میں ملے، تب وقت نہیں تھا۔ اگر انہیں نکالنے کی کوشش میں مصروف رہتے تو پھر تم لوگوں تک نہ تو پہنچ سکتے تھے اور نہ ہی تمہیں بچا سکتے تھے۔''

فرزانہ نے بیڈ شیٹ پر انگلی سے لکیریں کھینچتے ہوئے پوچھا، ''پروین کہاں ہے؟ نہیں ملی؟''

میں نے ضروری خیال کیا کہ اب تک پیش آنے والے تمام واقعات ان کے گوش گزار دوں تاکہ ان کے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی نہ رہے۔ وہ سنتی رہیں پھر ایک دوسرے کے گلے لگ کر سسکنے لگیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ انہوں نے ٹوٹ پڑنے والی سنگین قیامت کو پوری حقیقت سمیت ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا۔ رہی رونے والی بات، تو یہ رونا تو عمر بھر کا تھا۔ ویسا ہی، جیسا میرے والدین کے اندوہ ناک قتل نے تمام عمر کے لیے لہو کے اشک بہانا میری

قسمت کر دیا تھا۔

دونوں دُنیا شناس نہیں تھیں۔ ان کی عقل کی بساط مختصر تھی، تبھی آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھنے لگیں۔ پھر شانو کے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''بھائی! اب کیا ہوگا؟ کیا پروین مل جائے گی؟''

میرے پاس اس کے دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا مگر اسے دلاسا دینا بھی ضروری تھا۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا، ''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم دونوں سکول میں داخلہ لو گی، پڑھو گی، موجو بھی..... اب یہی ہماری دنیا ہے۔ رہی بات پروین کی، تو مجھے یقین ہے کہ میں اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

فرزانہ نے پوچھا، ''بھائی! تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ کیا تم نے کوئی نوکری کر لی ہے؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کی حیرانی بجا تھی۔ ہم نے زندگی میں کبھی اتنے پیسے نہیں دیکھے تھے جتنے گزشتہ مختصر سے دورانیے میں ہم نے خرچ کر دیے تھے۔ دونوں بہنوں کو جہاں ماں باپ کی ناوقت اور غیر متوقع موت کا دکھ لاحق تھا، وہاں یہ قلق بھی ان کا خون چوس رہا تھا کہ جوان اولاد کے ہوتے ہوئے ان کے والدین بے گور و کفن دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ پتہ نہیں ان کی نماز جنازہ اور تدفین کی گئی تھی یا کمرے میں بھڑک اٹھنے والی آگ نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔

ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ غزالہ اور پھوپھی کبریٰ کس حال میں ہوں گی، کیا ان پر کوئی افتاد تو نہیں آن پڑی تھی؟..... ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ موجو دوڑتا ہوا کمرے میں آن گھسا اور ہمیں خاموش ہونا پڑا۔ موجو کو یہ گھر بڑا پسند آیا تھا اور اس نے ماحول کی تبدیلی کا منفی اثر نہیں لیا تھا۔ خدا جانے شانو اور فرزانہ نے اسے کس طرح مطمئن کیا تھا، ماں باپ کی فوتیدگی کے بارے میں آگاہ کیا تھا یا نہیں بہرحال وہ اپنی طفلانہ مستی میں پوری طرح گم تھا۔

میں نے فون پر میر وشاہ سے رابطہ کیا۔ سجاول کے بیٹے وحید کا حال دریافت کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک کارندہ وحید کو لاری اڈے پر بس میں بٹھا کر کنڈیکٹر کے ذمہ لگا آیا تھا کہ اسے چوک قریشی اُتار دے۔ اس نے یہ احتیاط بروئے کار رکھی تھی کہ وحید کوٹھی کی لوکیشن اور راستوں کے بارے میں کچھ نہ جان سکے۔

کھالے اور پیا نے آنا تھا مگر کسی بنا پر نہیں آئے۔ فوجی اختر میری ہدایت پر اخبار لے آیا

تھا۔لڑکیاں اپنے کام میں مشغول ہوگئیں تو میں نے ایک مرتبہ پھر فوجی اختر کو بازار روانہ کیا۔ اسے الیکٹریشن کو پکڑ لانے اور کیبل کنکشن چالو کروانے کا ٹاسک دیا تھا۔اس کے جانے کے بعد میں نے اخبار اپنے سامنے بیڈ پر پھیلا دیا۔کافی عرصہ بعد اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے جس خبر کی تلاش تھی، وہ بیک پیج پر مل گئی۔ چار کالمی خبر کا متن بعینہٖ وہی تھا۔نور پور گاؤں پر ڈاکوؤں کا حملہ.....جائیداد کے تنازع میں بھتیجے نے اپنے بدنام زمانہ اشتہاری ساتھیوں کی مدد سے حقیقی چچا اور چچی کو آگ لگا کر زندہ جلا دیا۔دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کو اغوا کر لیا۔نور پور کے باسیوں اور پولیس نے مل کر انہیں پکڑنا چاہا تو ڈاکوؤں نے فائر کھول دیا۔فائرنگ کے تبادلے میں چار انتہائی مطلوب اشتہاری ڈاکو ہلاک جبکہ ان کا سرغنہ مغویان کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

خبر کے 'بقیہ' میں اسی بات کو موڑ توڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اتاری اور اخبار لپیٹ دیا۔شکر تھا کہ اخبار والوں کو میری کوئی تصویر دستیاب نہیں ہوئی تھی وگرنہ وہ بھی چھپ چکی ہوتی اور میرے لئے نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔میرے تمام تر ڈاکومنٹس اسی کمرے میں تھے جس میں قیامت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔میرے فوٹو البم بھی جل چکے ہوں گے۔اگر کچھ بچا بھی تھا تو اس راکھ کے ڈھیر میں سے تلاش کر کے نکال لینا ہر کس و ناقص کے لیے ممکن نہیں تھا۔

پولیس نے جائیداد کے تنازعے کی نہایت فضول اور بے ہودہ کہانی گھڑی تھی۔میری اور پروین کی وراثت ایک کھنڈر نما مکان تھا جس میں سوائے پرانے سامان اور سوراخ والے بھڑولے کے کچھ بھی نہیں تھا۔زرعی اراضی نہیں تھی۔میرا باپ اپنی موت سے چھ سات سال قبل فریدن خان نامی شخص کے ہاتھ اپنی جائیداد فروخت کر چکا تھا۔اسی زمین کو بعد میں ٹھیکے پر لے کر کاشت کرتا رہا تھا۔میرے باپ، سوہنے بلوچ کے مرنے کے بعد زمین پر اس کے مالک فریدن نے کسی اور کو مزارعہ بٹھا دیا تھا۔چاچے چراغ دین کی جائیداد سے میرا اور پروین کا کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔چاچے کا وارث موجود تھا، اس کی دو بیٹیاں فرزانہ اور شبانہ تھیں، جو بھی زندہ اور سلامت تھے۔

کیبل نیٹ ورک کمپنی کے الیکٹریشن نے آ کر کیبل کنکشن لگا دیا اور ٹی وی کی گوناں گوں سکرین روشن ہوگئی۔میں کچھ دیر تک مقامی نیوز چینل چلا کر بیٹھا رہا مگر شاید میری مطلوبہ خبر اَب پرانی ہو جانے کی وجہ سے پس منظر میں چلی گئی تھی۔سہ پہر کو موجو کو ساتھ لے کر گل گشت کی

آوارہ گردی پر نکلا۔ میں اس علاقے سے اجنبی نہیں تھا۔ اس کالونی سے ملحقہ، شہر کے ایک معروف کالج میں پڑھتا رہا تھا۔ ان دنوں ہاسٹل سے نکل کر اسی کالونی میں گھومنے پھرنے کے لیے شام کو نکلنا میرے معمول کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ یہ ایجوکیشنل ایریا تھا۔ یہاں نہ صرف بہت سے اسکول اور کالج واقع تھے بلکہ تعلیمی بورڈ اور بڑے بڑے بک سنٹر بھی موجود تھے۔ یہاں رہائش پذیر لوگوں کی اکثریت شعبہ تعلیم سے وابستہ تھی۔ کالجوں کے ہاسٹلز میں ایڈمشن نہ پانے والے اسٹوڈنٹ مل کر اسی کالونی میں کوئی مکان کرایہ پر لے لیتے تھے۔

میں نے گلی اور محلے کا ازسراحتیاط جائزہ لیا۔ یہ خاصی کشادہ گلی تھی۔ پوری گلی میں کوئی خالی پلاٹ موجود نہیں تھا۔ مین روڈ، جسے عرفِ عام میں بوسن روڈ کا نام دیا جاتا تھا، یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سو ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر گول چوک تھا جہاں ضروریات زندگی کی تمام دکانیں موجود تھیں۔ میں بڑے عرصہ کے بعد اس چوک اور اس سے ملحقہ دیوان باغ کو دیکھ رہا تھا۔ موجو نے دنیا کی یہ گہما گہمی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اس لیے وہ بڑا ایکسائٹڈ ہو رہا تھا۔ میں نے فراغت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک بک سنٹر سے کچھ کتابیں خریدیں اور اس سے قریب ترین واقع سکولوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر لیں۔

مین روڈ پر جا کر کچھ دیر اس عظیم الشان کالج کی درختوں میں چھپی ہوئی عمارت کو عجیب یاس آمیز نظروں سے دیکھتا رہا جہاں میں زیرِ تعلیم رہا تھا۔ یہاں سے وہ ہوسٹل دکھائی نہیں دیتا تھا کہ جس میں عرفان مرزا کی سلطنت قائم تھی۔ بعید نہیں تھا کہ وہ ابھی تک یہیں مقیم ہو کیونکہ اس کا مقصد تعلیم کا حصول نہیں تھا بلکہ اس کی ترجیحات قطعی مختلف اور منفی تھیں۔

یہ شاہراہ بڑی مصروف تھی۔ ہمہ قسم ٹریفک رواں دواں رہتی تھی۔ صبح اور دوپہر کو سکول ٹائمز پر تو رش میں بے تحاشا اضافہ ہو جاتا تھا۔ مجھے اس علاقے کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا کیونکہ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ کوئی واضح اور غیر معمولی تغیر دیکھنے میں نہیں آیا۔

توقع سے زیادہ تاخیر ہو گئی تھی اور شام ڈھلنے لگی تھی۔ گھر پہنچا تو پارکنگ میں سوزوکی ایف ایکس کھڑی دیکھی۔ ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ موجو کو گھر میں بھیج کر میں ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔ پیا جی کو صوفے پر بیٹھا دیکھا۔ اس کے پہلو میں سرخ رنگ کی لمبی داڑھی والا پٹھان خاصا پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ پیا جی کے ساتھ اس کی آمد میرے لیے حیرانی کا باعث تھی۔

وہ حلیے سے الیکٹرونکس کا دو نمبر گھریلو سامان بیچنے والا لگ رہا تھا۔ یہ لوگ گلی گلی گاؤں گاؤں گھوم پھر کر اشیاء بیچتے تھے۔ ان کا ٹریڈ مارک ان کی موبائل دکان اور تین گنا نرخ تھا جو لین دین کے دوران کم ہو جاتا تھا۔ اس کی دو جزوی موبائل دکان فرش پر ڈھیر تھی۔ میں نے تعجب سے اُسے دیکھا، خیال آیا کہ شاید لڑکیوں نے کچھ خریدنا ہو اور پیسے نہ ہونے کے سبب پٹھان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہو یا پیا نے کچھ خریدنا ہو اور اسے یہاں گھیر لایا ہو۔

میں اندرونی دروازے کی طرف بڑھا تو اس نے مجھے مخاطب کیا، ''اوئے خوچے کا بچہ..... ایدھر آ ؤ.....''

مخصوصی ٹوپی اور اس میں باہر نکلی ہوئی سرخ لٹیں، سرخ داڑھی مونچھیں اور ڈھیلا ڈھالا افغانی لباس جس پر آٹھ گز کی چونوں والی پگڑی چھائی ہوئی تھی..... پٹھانوں کا روائتی ٹوٹا پھوٹا لہجہ..... مگر اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں پلٹا اور اس کے قریب آ گیا۔ جیسے اس کی آواز مجھے آشنا لگی تھی، ایسے ہی اس کی شکل بھی آشنا محسوس ہوئی۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ افغانی گیٹ اَپ میں کھالا تھا جو ایک آنکھ مخصوص انداز میں دبا کر مسکرا رہا تھا۔ وہ سوانگ بھرنے میں کامیاب رہا تھا کیونکہ اس کے بہروپ نے مجھ جیسے قریبی شخص کی نظر کو بھی دھوکہ دے دیا تھا۔

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''ابے بخشو لوہار کے پتر! یہ تم کیا بنے بیٹھے ہو؟''

وہ بولا، ''نور پور میں سارا دن اسی حلیے میں گزار کر آیا ہوں۔ کوئی مائی کا لال پہچان نہیں پایا۔''

اس نے سچ کہا تھا۔ میں نے توصیفی نظروں سے اُسے پھر پیا جی کو دیکھا اور کہا، ''یہ پیا کا کمال ہوگا۔ ہیں؟''

پیا مسکرایا، ''ہاں! اس جیسے اور بھی کئی ہنر میں نے سیکھ رکھے ہیں۔ میر و شاہ نے تمہاری ٹریننگ بھی میرے ذمہ لگا رکھی ہے۔ گھر کے بکھیڑوں سے نکلو گے تو میری شاگردی میں آ ؤ گے۔ ایک دم فرسٹ کلاس ماسٹر بنا دوں گا تمہیں، فکر نہ کرو۔''

اسی دوران فوجی اختر نے چائے سرو کر دی۔ پیا جی سے کچھ تبادلۂ احوال کیا پھر ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ میں حیرانی سے بار ہا کھالے کو دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود کہ اس کا رنگ گورا نہیں تھا، وہ پٹھان ہی لگ رہا تھا۔ داڑھی بالکل اصلی معلوم ہو رہی تھی۔

کھالا بولا، ''اب کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟''

میں فرطِ استعجاب سے بولا، ''یار تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا.....''

''جب میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تھا تو مجھے بھی حیرانی ہوئی تھی۔''

وہ تمام دن نور پور میں گزار کر آیا تھا۔ مجھے یہ بہروپ غیر ضروری محسوس ہوا کیونکہ وہ تو بلا روک ٹوک نور پور جا سکتا تھا۔ اسے کسی نے نہ تو دیکھا تھا اور نہ اس پر کسی نے اس رات کی واردات میں شمولیت کا الزام عائد کیا تھا۔ میں نے اپنے اس استعجاب کا اظہار کیا تو کھالے نے کہا، ''واہ شہرے خان! تو بھی ہمیشہ آدھی بات سوچتا ہے۔ بھلے آدمی! تمہارے اور میرے تعلق کو کون نہیں جانتا؟ نور پور تو رہا ایک طرف، پورے وسیب کو ہماری یاری کا علم ہے۔ ہم نے ٹی وی چینل پر پولیس کی کارروائی دیکھی تھی۔ تمہیں نامزد کیا جا چکا ہے اور خطرناک قاتل کے روپ میں میڈیا کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے۔ مجھے نور پور میں دیکھتے ہی جھٹ سے دھر لیا جاتا، حیات خان اور وریام خان پکڑ کر میری دستی آتھر پریڈ (فوری مرمت) کر دیتے کہ بتا! وہ خطرناک قاتل شہریار عرف شہرا کہاں ہے۔ پھر؟''

میں نے لمبی سانس لی اور کہا، ''اچھا! معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ خیر! جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم بتاؤ، تمہارا دورہ کیسا رہا؟''

اس نے سگریٹ نکالی، سلگائی اور لمبا کش لے کر بولا، ''میں صبح نو بجے کے لگ بھگ نور پور میں پہنچ چکا تھا اور.....''

اس نے تفصیل سے اپنی کارگزاری بیان کرنا شروع کر دی۔ اسے عقیل نے نور پور والی پلی پر کار سے اُتار کر واپسی کی راہ پکڑ لی تھی۔ میر وشاہ کسی اور کو بھی بھیج سکتا تھا مگر جو معلومات کھالا مجتمع کر سکتا تھا، کوئی اور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کھالا گھر کا بھیدی تھا اور بڑی آسانی سے لنکا ڈھا سکتا تھا۔ اس نے پٹھانوں کے سے انداز میں گلیوں کا راؤنڈ لگایا پھر مراد بخش دیوانے کے 'گھروندے' میں اپنا سامان فرش پر رکھ کر پڑاؤ کیا۔ وہ بھی دوسرے تمام لوگوں کی طرح کھالے کو پہچاننے سے قاصر رہا تھا۔ کھالے نے تنہائی میں اس پر اپنا بھید آشکار کیا اور تسلی سے نور پور کے حالات پر گفتگو کی۔ پھر وہ سامان بیچتے ہوئے اپنے گھر گیا۔ وہاں سے بھی اسے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ اپنے گھر والوں کو اس نے سبق رَٹایا جو انہوں نے نور پور کے لوگوں کے سامنے بار ہا پڑھنا تھا۔ کھالے کو اپنے گھر کے بعد بھی کئی جگہوں پر جانا تھا، گیا اور اپنا کام نمٹا کر لوٹا۔

اس سے حاصل ہونے والی معلومات نے جہاں مجھے گہری سوچوں میں غرقاں کر دیا، وہاں کچھ حوصلہ افزا کلیو بھی دیے۔ نور پور کے لوگ مجھے مظلوم سمجھتے تھے۔ تقریباً سبھی کو علم ہو چکا تھا کہ میرے گھر پر حملہ کرنے والے وہی چاروں اشتہاری ڈاکو تھے جن میں سے دو کی لاشیں مزار کے احاطے سے ملی تھیں جبکہ دو کے جلے ہوئے ڈھانچے کمرے میں سے پولیس کو دستیاب ہوئے تھے۔ لوگوں نے ازخود یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ میں عین وقت میں وہاں پہنچ گیا تھا اور اپنی بہنوں اور بھائی کو نکال کر لے گیا تھا۔ انہیں یہ بھی شبہ تھا کہ میرے ساتھ کھالا بھی جیپ میں موجود تھا جب میں نے کالے بزدار کو بلا کر راستہ چھوڑنے کا کہا تھا مگر کسی نے بھی یہ بات پولیس کے کانوں میں نہیں پہنچائی تھی۔ چونکہ سردار حیات خان اور وریام خان پولیس پارٹی کے ساتھ ساتھ تھے، اس لیے چند خاص لوگوں کے سوا کسی کو بھی پولیس تک رسائی نہیں لینے دیتے تھے۔ بخت خان نے اس تمام کارروائی میں کوئی دخل نہیں دیا تھا۔ سردار حیات خان کے دارے پر دو پولیس کانسٹیبل تمام دن موجود رہتے تھے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ شہریار نظر آئے تو وہ اسے دبوچ لیں۔ چچا کی جائیداد حاصل کرنے کے لیے دو افراد کے قتل اور تین افراد کے اغوا کا مقدمہ تھانہ چوک قریشی میں درج کیا گیا تھا اور مجھے اس میں نامزد مجرم ٹھہرایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسی تھانے کی سفارش پر مجھے اشتہاری مجرم قرار دیا جانا تھا جبکہ قانون پولیس فائل پڑھنے کے بعد یک طرفہ طور پر میرے سر کی قیمت مقرر کر دیتا۔

یہ خبر بھی ملی تھی کہ شیخوپورہ سے سائیں دل جیت کا خاص مرید نورن آغا مزار پر آ گیا تھا اور اس نے سائیں دل جیت کے حکم سے گدی سنبھال لی تھی۔ ایک نیا سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس نے آتے ہی مشہور کر دیا تھا کہ سائیں کو شیخوپورہ کے چند مریدوں نے جو حج کی سعادت حاصل کرنے گئے تھے، حرمین شریفین میں مناسک حج کی ادائیگی میں مشغول دیکھا تھا۔ انہوں نے وہاں سائیں دل جیت کی قدم بوسی کی تھی اور یہ پیغام لائے تھے کہ سائیں جی طویل عرصہ کے بعد وطن لوٹیں گے۔ تب تک نورن آغا اس کی گدی سنبھالے گا۔ کھالے کے منہ سے یہ کہانی سن کر میرے لبوں پر نفریں مسکراہٹ تیر گئی۔ معصوم دیہاتیوں کے معتقدانہ مزاج سے کھیلنے والے بہت چالاک اور زیرک لوگ تھے جنہوں نے یہ عجیب شوشہ چھوڑا تھا۔ سادہ لوح اس جھوٹی کہانی پر ایمان لا کر مزار پر جانے لگے تھے اور مزار کی آمدنی میں پہلے سے بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

بخت خان آتش زدگی کے اگلے دن ہی غزالہ اور اس کی ماں کو اپنی حویلی میں لے گیا تھا۔

اس کے خیال میں ان کا اب اس گھر میں رہنا کسی نئی لرزہ خیز واردات کا سبب بن سکتا تھا۔ بخت خان ملنے جلنے والوں سے بے دھڑک کہتا تھا کہ یہ سارا کیا دھرا سردار حیدر خان کے گرگوں کا ہے۔ اس کی یہ طرف داری محض زبانی کلامی تھی۔ عملی طور پر اس نے میری عدم موجودگی میں نہ تو مجھے قانونی طور پر کوئی تحفظ فراہم کیا اور نہ ہی میری کوئی ٹھوس اعانت کی تھی۔

یہ خبر افسوس ناک تھی کہ ڈاکٹر شاہ جی کا نور پور سے کسی اور سنٹر میں تبادلہ ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ پر ابھی کوئی میڈیکل آفیسر نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر کی کوٹھی خالی پڑی تھی۔ دیوانے کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر شاہ جی نے اپنا تبادلہ خود کروایا تھا اور اس کا تبادلہ انٹر ڈسٹرکٹ ہوا تھا۔ وہ اب کسی اور ضلع میں تھا۔ کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ جاننا کوئی مشکل نہیں تھا۔ مظفر گڑھ کے ڈی ایچ او آفس کے کسی اہلکار کو چار نوٹ دے کر پوچھا جا سکتا تھا کہ اب وہ کس ضلع کے کس بنیادی مرکز صحت میں ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہے۔ اس نے وہاں سے نکلنا کیوں بہتر خیال کیا؟ اس پر محض قیاس آرائیاں ہی کی جا سکتی تھیں۔ غالب اندازہ یہی تھا کہ اس نے نور پور میں پیش آنے والے حالات کو دیکھ کر یہاں سے رخصت ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی ہوگی۔

امیر نواز ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ سردار حیات خان سمیت پورے گاؤں نے اپنے تئیں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اور پروین دونوں ملی بھگت سے گاؤں سے فرار ہوئے تھے اور انہوں نے شہر جا کر شادی کر لی تھی۔ اب والدین کے ڈر سے دونوں نے واپس نہ آنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ حیات خان کو اپنی ویگن کے لیے ڈرائیور مل گیا تھا مگر شہر یار تک پہنچنے کے لیے اسے کھالے کی تلاش تھی۔ اس نے بخشو لوہار سے سختی سے کھالے کے بارے میں پوچھا تھا مگر بخشو نے نیاں (حلف) دے کر گلو خلاصی کروالی تھی۔

ایک اور خانزادہ، سردار یار خان بھی نور پور پہنچ گیا تھا۔ وہ اس مرتبہ تین ماہ تک گاؤں میں رہنے کے ارادے سے آیا تھا۔ حسبِ معمول اس کے ساتھ گھر کا کوئی فرد نہیں آیا تھا۔ دو گن مین اور ایک خدمت گار اس کے ساتھ تھے۔ ہر مرتبہ یہی لوگ ہی ہوتے تھے جو یہاں موجود دو نوکروں کے ساتھ مل کر اپنے خان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ کھالے نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ پہلے کی طرح چاق چوبند اور پرکشش تھا۔ اس پر ماہ و سال کی گرد نہیں پڑی تھی۔ یہ امر کھالے کے لیے باعث حیرت تھا۔

کھالے نے بڑی محنت کی تھی۔ خطرہ مول لے کر بہت کارآمد معلومات اکٹھی کی تھیں۔

جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا، ''دیوانے نے میرے بارے پوچھا تھا؟''

''تو کیا وہ تمہیں بھول سکتا ہے؟ جونہی اس نے مجھے پہچانا، سب سے پہلا سوال ہی یہی کیا تھا اس نے۔'' کھالے نے کہا، ''وہ بڑا دکھی ہو رہا تھا۔ اس نے جمعہ کے دن ملتان آنے کا وعدہ کیا تو میں نے اسے قلعہ کہنہ پر تین بجے کا ٹائم دیا۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ شہرے کو بولنا، میری یا میرے خون کی ضرورت ہو تو بتانا، جان ہتھیلی پر رکھ کر آؤں گا اور یار کے قدموں میں نچوڑ کر رکھ دوں گا۔''

میری چھاتی پھیل گئی۔ دل کو عجیب طمانیت اور احساسِ تفاخر کا احساس ہوا۔ میں نے کہا، ''اللہ اسے سلامت رکھے۔ میری قسمت میں تو اب شاید نور پور میں رہنا لکھا ہی نہیں، دانہ پانی وہاں سے اُٹھ گیا مگر کھالے! میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔''

اس نے میرے کندھے پر عادتاً ہاتھ مارا، بولا، ''مرد کبھی ایسی مشکلوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں ملنے والا دکھ بہت بڑا ہے، مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ رونے اور افسوس کرنے سے حالات نہیں بدلتے۔ کیوں پیا جی؟''

''ہاں بھئی! سچ ہے کہ یہاں تو رات کے پنجے سے دن کا اجالا چھیننا پڑتا ہے۔''

کھانا تیار ہونے کی اطلاع فوجی اختر نے دے دی تھی۔ ہم نے کھانا سیر ہو کر کھایا۔ کھالے نے شانو اور فرزانہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے اسے گھر میں لے جا کر تینوں سے ملوایا۔ کھالے نے انہیں تسلی دی۔

شانو نے پوچھا، ''اماں اور بابا کی نماز جنازہ ہوئی تھی؟''

کھالے کی آنکھیں بھر آئیں، بولا، ''ہاں میڈی بھین! ہڈیاں کوں دھوایا وِی ہا اَتے دفنایا وِی ہا..... ہن تساں کلام پڑھ تے انہاں تے ختم درود کیتا کرو جو ہور کوئی واہ نہیں.....''

(ہاں میری بہن! ان کی ہڈیوں کو غسل بھی دیا گیا اور دفن بھی کر دیا گیا۔ اب تم لوگ کلام پڑھ کر ان کی روح کو ایصال کیا کرو کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں)

دونوں اشک بہاتی رہیں۔ انہوں نے غزالہ اور پھوپھی کبریٰ کے بارے بھی پوچھا۔ پھر اپنی سہیلیوں کی خیریت دریافت کی اور فرمائش کی کہ جب دوبارہ نور پور جانا ہو تو ان سب کو سلام دینا۔ رات کے نو بج چکے تھے جب دونوں نے رخصت چاہی۔

پیا نے جاتے ہوئے میرا کندھا تھپتھپایا، ''جب مناسب سمجھنا، فون کر کے مجھے بلا لینا۔ میں

تمہیں لینے کے لیے آ جاؤں گا۔ کچھ سیکھ لو گے تو زندگی بھر کام آئے گا۔ اور ہاں..... میر وشاہ کا حکم ہے کہ اپنی حفاظت کیا کرو۔ اس کے کہنے پر میں تمہارے لیے 'ٹھاکے شاکے' لے آیا ہوں، کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور اس گھر کو دشمن کی نظر سے ہمیشہ کے لیے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنا۔ ہم جیسے لوگوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا کیونکہ گھر بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے، کمزوری پر دشمن ہاتھ ڈالنے کو بے تاب رہتا ہے۔ اگر خدا گھر سے نواز دے تو خون دے کر اس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ سمجھے؟''

میرے جبڑے بھنچ گئے۔ زندگی میں دو نشیمن اجڑتے دیکھے تھے، تیسرے کو جلتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر آنے والے وقت کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میرا دھیان پہلے ایک مرتبہ اس طرف گیا تھا مگر میرے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ سوچا تھا کہ میر وشاہ سے رابطہ ہونے پر کہوں گا مگر پھر یاد نہیں رہا تھا۔ پیا نے ایف ایکس کی پچھلی سیٹ کے نیچے سے ایک شارٹ گن، ایک ولائتی ریوالور اور کافی مقدار میں گولیاں نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ شارٹ گن کی مزل (Muzzle) پر سائیلنسر کی مخصوص فٹنگ دکھائی دے رہی تھی۔

گھر کے ماحول پر مسلط موت کی سنگینی میں کافی حد تک کمی واقع ہو چکی تھی مگر ابھی تک فضا بڑی سوگوار تھی۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے اور وہ زیادہ وقت جائے نماز پر گزارتی تھیں۔ ممکن تھا کہ ان کے دلوں میں ابھی تک خوف بھی جاگزیں ہو اور ماحول سے ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ بھی درپیش ہو کیونکہ اتنے قلیل وقت میں نہ تو وہ کوئی دوست بنا سکی تھیں اور نہ ہی کسی ہمسائے گھر سے رسم وراہ پیدا کر سکی تھیں۔

رات..... رات کی طویل اور خنک خاموشی..... اور سوچوں کے مہیب تانے بانے جن کا نہ تو کوئی انت تھا اور نہ ہی کوئی نصب العین..... میں ہموار چھت پر نظریں جمائے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور وخوض کرتا رہا۔ چونکہ میں ابھی تک نہ تو خود مختیار تھا اور نہ ہی میری کوئی حیثیت تھی، اس لیے از خود کچھ بھی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اگر مجھے میر وشاہ اور میڈم کا ساتھ میسر نہ ہوتا تو اب تک میں یا تو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہوتا یا جیل کی سنگلاخیوں کا شکار ہو چکا ہوتا۔ میں سردار حیدر خان اور اس کے غنڈوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ میں تو سردار حیات خان اور وریام خان کا سامنا بھی نہیں کر سکتا تھا، حیدر خان تو پھر بہت بڑا فرعون تھا جو انسانی زندگیوں کی ڈوریوں سے کھیلنے کا عادی تھا اور جو سوچتا، کر گزرتا تھا۔

نور پور میں میرا سب سے بڑا ہمدرد اور مخلص دوست ڈاکٹر منور علی شاہ تھا جو وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ میرے اور کھالے کی عدم موجودگی میں، نور پور کے بدلتے ہوئے حالات نے شاید اُسے مایوس کر دیا تھا اور یہ انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ میں جہاں بھی جاؤں گا، ایسی ہی ایک کوٹھی اور عملہ میرا منتظر ہوگا۔ کبھی نہ تو تنخواہ میں کمی ہوگی اور نہ ہی عہدے میں تنزلی ہوگی۔ وہ درست کہتا تھا۔ اگر یہی بات ہر آفیسر دل سے مان لے تو اسے کوئی بھی جھکانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور اس کے ایمان کی بولی لگانے کی جرأت کوئی بھی نہیں کرسکتا۔

شب و روز پر ایک عجیب سا جمود طاری ہو گیا۔ میر وشاہ کسی بڑی سپلائی میں مصروف تھا۔ میڈم دوبئی میں تھی۔ ان دونوں کی عدم موجودگی میں میں سوائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے کچھ نہیں کرسکتا۔ پیا از خود کسی بھی مشن پر کام کرنے کی اجازت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اور میڈم کے گینگ کا ہر فرد میڈم کے بعد میر وشاہ کے حکم کا غلام تھا۔

میرے ہاتھ میں ڈور کا کوئی سرا نہیں تھا۔ میر وشاہ سے رابطہ کیا تو اس نے دو ہفتے انتظار کا حکم دیا تو فراغت کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے پیا کی شاگردی اختیار کر لی۔

ملتان کے نواح میں، بند بوسن کے پار، میڈم کا ایک بڑا فارم ہاؤس تھا۔ اس فارم ہاؤس کے قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ عام گزرگاہ بھی نہیں تھی۔ میں ہر صبح کالج اسٹاپ پر کھڑا ہو جاتا۔ پیا اپنی ایف ایکس کار میں بٹھا کر فارم ہاؤس پر لے جاتا جہاں میں تمام دن کسرت کرتا۔ وہ گینگ کا اہم رکن تھا اور میں نے اسے بہت دلیر اور مشاق پایا تھا مگر فارم ہاؤس میں اس کے جوہر کھل کر میرے سامنے آئے۔ وہ نہ صرف ہر فن مولا شخص تھا بلکہ پڑھا لکھا اور نہایت ذہین آدمی تھا۔ فارم ہاؤس پر چند نوکر چاکر رہتے تھے جو نہ صرف فارم ہاؤس کی ملحقہ گیارہ ایکڑ زمین کاشت کرتے تھے بلکہ مرکزی عمارت جو خاصی وسیع تھی، کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔

پیا کی تفویض کردہ مخصوص مشقوں نے میرے جسم کو مختصر وقت میں فولادی بنا دیا تھا۔ دوڑ، مختلف نوع کے اسلحے کا استعمال اور نشانہ بازی، گھڑ سواری، لڑائی بھڑائی بالخصوص چاقو زنی اور چھوٹے چھوٹے کئی ہنر اس نے بڑی مہارت سے میری ذات میں بھر دیے۔ وہ لڑائی بھڑائی میں بہت ماہر تھا۔ اس نے ایک بات کئی موقعوں پر مجھے ازبر کرائی کہ زندگی کی ہر بساط پر فیصلہ

کن ہتھیار سرعتِ فیصلہ قرار پاتا ہے۔ ایک موقع پر جب اس نے اچانک مجھے فارم ہاؤس کی دومنزلہ عمارت سے چھلانگ لگانے کا حکم دیا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا تو اس نے مجھے سمجھایا، ''شہر یار! انسان کو کڑے سے کڑا وقت دو آپشنز دیتا ہے۔ زندگی یا موت۔ فوراً فیصلہ کرنے والا پہلے آپشن کا چناؤ کر لیتا ہے۔ تذبذب کا شکار ہونے والا دوسری طرف لڑھک جاتا ہے۔''

''ذرا کھل کر بتاؤ پیا جی! میں سمجھا نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ایک ذرا مسکرایا، مجھے بازو سے پکڑ کر منڈیر تک لے گیا اور بولا، ''تصور کرو کہ اس عمارت کو خوفناک آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے یا دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر تمہارا دشمن گن تانے کھڑا ہے۔ وہ تجھے گولی مارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ موت اس کی انگلی کے دباؤ کے فاصلے پر کھڑی تمہیں دیکھ رہی ہے اور تم یہاں منڈیر پر کھڑے ہو۔ یہ کڑا وقت ہے۔ اس نے تمہارے سامنے دو آپشن رکھ دیے ہیں۔ کون سے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''زندگی یا موت.....''

وہ مسکرایا، ''ہاں..... زندگی بہت پیاری ہوتی ہے جبکہ موت بڑی کریہہ اور ڈراؤنی ہوتی ہے..... ایسا ہی ہے ناں؟..... پہلا آپشن زندگی کا ہے۔ اگر تم فی الفور اپنے بچاؤ کا فیصلہ کر لیتے ہو اور یہ طے کر لیتے ہو کہ تمہارے پاس صرف منڈیر سے نیچے چھلانگ لگانے کی مہلت ہے۔ فیصلہ کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایک لمحہ ہے۔ چھلانگ لگانے کی صورت میں دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تم بجلی کے کسی تار پر، کسی گہرے گڑھے میں یا کسی بھی ناہموار جگہ پر گر کر ہلاک ہو سکتے ہو۔ دوسری یہ کہ تمہیں ہلکی پھلکی چوٹ آئے گی اور تم اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ گے۔ یعنی تمہارے پاس منڈیر پر سے کودنے کے بعد زندہ رہنے کے پچاس فیصد چانس ہوں گے۔ کڑا وقت تمہیں دوسرا آپشن بھی دیتا ہے۔ کیا؟..... اگر تم متذبذب ہو کر وہیں کھڑے رہو گے، کشمکش میں فیصلہ نہیں کر پاؤ گے تو دشمن تم پر فائر کر دے گا۔ گولی تمہارے سینے یا سر میں لگے گی اور تم مر جاؤ گے۔''

اس کا لہجہ بہت سرد تھا۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے فارم ہاؤس کے باہر ایک نوکر کو چارے کی گٹھڑی اُٹھا کر مویشیوں کی طرف اشارہ کیا، بولا، ''شہر یار! یہ شخص مرنے والا ہے، آج، کل، کسی بھی آنے والے دن..... مہینے..... یا کسی بھی سال..... میں، تم، میر و شاہ اور میڈم..... سبھی نے ایک دن مر جانا ہے۔ سکول سے نکلنے والا معصوم بچہ تیز رفتار کار کے نیچے

آ سکتا ہے۔ تیس سال واپڈا کی نوکری کرنے والے ماہر لائن مین کو کسی آن کرنٹ لگ سکتا ہے۔ نشتر ہسپتال کے گیٹ سے ہر روز سینکڑوں لاشیں نکلتی ہیں۔ سینکڑوں جاں بہ لب نئے آ جاتے ہیں۔ موت قصور نہیں دیکھتی۔ موت کوتاہی کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتی ہے۔ جس سے ایک پل کی کوتاہی سرزد ہوئی، وہ موت کا ہدف بن گیا۔''

اس نے ایک ذرا توقف کیا، ''تمہارے چاچا چاچی مر گئے۔ ہمارے ہاتھوں چار قاتل بھی جہنم واصل ہو گئے۔ بیلے میں کسی اکیلے شخص نے چار شہ زوروں کی سانسوں کی مالائیں توڑ دی تھیں۔ یاد ہے نا؟ ہاں شہریار! سچ کہتا ہوں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کی بانہوں میں رقص کیا جا سکتا ہے۔ موت..... جس نے جلد یا بدیر آنا ہے، اس کی آمد پر خوف زدہ ہونا خود کو قبل از وقت مارنے کے مترادف ہوتا ہے۔''

وہ بہت قوی الاعضاب شخص تھا۔ اس کی سوچ پختہ اور نظریہ اٹل تھا۔ میں نے اس کی سربراہی میں دو مشن سرانجام دیے تھے۔ دونوں مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے سینے میں دل نہیں، پتھر دھڑکتا تھا۔ جذبات اور احساسِ ہمدردی اسے چھو کر نہیں گزرے تھے۔ اس نے مجھے بھی یہی بریفنگ دی تھی، ''شہریار! سرجن کے سامنے آپریشن ٹیبل پر ایک زندہ شخص لٹایا جاتا ہے اور اسے ٹارگٹ دیا جاتا ہے کہ اس کی چھوٹی آنت کا متاثرہ حصہ کاٹ کر پھینک دو۔ وہ نشتر اُٹھاتا ہے تو ہمدردی اور ترس جیسے جذبات کو ٹرے میں رکھ دیتا ہے۔ پھر بڑی بے دردی سے جلد کی تہیں کاٹنے لگتا ہے۔ خون اس کی نظروں کو سرخی نہیں دیتا اور نہ ہی اس کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اگر اس کے دل میں خوف اور ترس جیسے جذبات امڈ آئیں تو اس کا تختۂ مشق سانسوں کی بازی ہار جائے۔ مر جائے۔ کیا میں نے غلط کہا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا، ''اگر میڈم یا میر و شاہ مجھے ٹارگٹ دیں کہ فلاں شخص کا صبح کے سورج سے ناتا ختم کر دو تو میرے دل میں پیدا ہونے والا ہمدردی کا مادہ یا موت اور قانون کا ڈر مجھے کمزور کر دے گا۔ میں اسے قتل نہیں کر پاؤں گا۔ میں محاذ پر ہلاک کر دیا جاؤں گا یا ٹارگٹ دینے والے کی نظروں میں گر جاؤں گا۔''

پیا نے مجھے میک اپ کی تربیت دینے کے بعد جیب تراشی کے فن میں بھی تاک کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے دھندے میں اس کام کی اہمیت بنیادی ہے۔ جیب کاٹنے کی ضرورت

کسی بھی وقت پیش آ سکتی ہے۔

پیا کا اصل نام سراج الدین تھا۔ چھ فٹ کے قریب قد، کسرتی اور گٹھا ہوا بدن، بیک وقت نہایت مزاحیہ اور سرد مزاج اور بے تحاشا پھرتی اس کی شخصیت کا امتیازی خاصہ تھے۔ اس کے بقول، اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا جبکہ وہ میڈم اور میر وشاہ کا معتمد خاص تھا۔

ایک دن مجھے کھالے کا خیال آیا تو میں نے پیا سے کہا، ''پیا جی! کھالے کو بھی ساتھ میں لے آیا کرو، وہ بھی کچھ سیکھ لے گا، کچھ گپ شپ بھی ہو جایا کرے گی۔''

وہ سپاٹ لہجے میں بولا، ''مجھے حکم دیا گیا کہ شہر یار کی تربیت کرو، میں نے حکم کی تعمیل کر دی، جب میڈم یا شاہ جی کہیں گے کہ اس منہ زور مشکی گھوڑے کو بھی سدھا دو تو اسے بھی پکڑ کر یہاں لے آؤں گا۔''

''میرا خیال ہے کہ کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

''مگر میرا خیال ہے کہ میر وشاہ اس میں انٹرسٹڈ نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں چونکا۔

''میر وشاہ سے پوچھ لینا۔ وہی کچھ بتا سکے گا۔''

''کیا تم اپنے طور پر.....''

''نہیں دوست! جس شخص کو گینگ میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے، یہاں صرف اسے لایا جاتا ہے۔''

''کیا میں گینگ کا باقاعدہ ممبر بن گیا ہوں؟''

''ہاں! اب تمہارا جینا مرنا ہمارے ساتھ ہے۔''

''اور کھالا؟''

''ظاہر ہے، وہ ممبر نہیں ہے۔ جب بنے گا، تب دیکھا جائے گا۔''

''اگر میں گینگ میں نہ رہنا چاہوں تو؟''

''یہاں آنے کا راستہ مل جاتا ہے، جانے کا نہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا، ''تم جو بھی چاہو گے، تمہیں یہاں مل جائے گا۔ میڈم کا دل بڑا کشادہ ہے۔ لاکھ مانگو تو دو دیتی ہے۔ دو مانگو تو چار دیتی ہے۔ اگر کچھ عرصہ انڈر گراؤنڈ رہنے کو جی چاہے تو چھٹیاں دیتی ہے۔ ملک سے باہر بھیج دیتی ہے۔ سیر و سیاحت پر روانہ کر دیتی ہے مگر گروپ چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں دیتی۔''

''تم نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو دھوکہ دے گیا ہو؟''

''ایک آدمی کو دیکھا تھا..... مگر دھوکہ دینے سے پہلے، بعد میں کبھی نظر نہیں آیا کیونکہ اس کے فوری قتل کے احکامات میر وشاہ نے جاری کر دیے تھے۔''

''کیا تمہیں اپنے کسی ساتھی کو قتل کرنے کا حکم ملا؟''

وہ مسکرایا، ''ابھی تک تو نہیں ملا۔''

''اگر تمہیں مجھ کو مارنے کا حکم ملے تو کیا کرو گے؟''

''کرنا کیا ہے؟ ایک ٹھاہ..... اور بس!'' اس نے اپنے داہنے ہاتھ کو پستول بنا کر ہوا میں لہرایا اور مڑی ہوئی انگلی کا ٹریگر دبا دیا۔ میری گردن پر چیونٹی رینگی اور جھرجھری سی آ گئی۔

وہ بولا، ''شہریار! کبھی میڈم یا میر وشاہ کو دھوکہ مت دینا۔ یہاں اس کی اجازت نہیں ہے۔''

شاید اس دنیا کا یہی رواج تھا۔ میں چونکہ اس دنیا کا آدمی نہیں تھا اس لیے مجھے پیا جی کی باتیں بڑی عجیب لگیں۔

دل نے کہا، 'نہیں شہریار! تم نے اپنی آنکھوں سے میڈم کو دیکھ رکھا ہے۔ وہ اتنی ظالم اور سفاک نہیں ہے۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ محبت کرنے والے کبھی خون نہیں کرتے۔'

دماغ نے ٹھوکا دیا، 'ارے واہ! اگر وہ اتنی ہی نرم خو ہوتی تو اتنا بڑا نیٹ ورک کیسے سنبھالتی۔ اتنی دولت کیسے اکٹھی کر لیتی۔ وہ جیسی دکھائی دیتی ہے، ویسی ہرگز نہیں ہے۔ جو کچھ پیا کہہ رہا ہے، یہی سچ ہے۔'

مجھے اسی کی زبانی پتہ چلا کہ اسے بھی میری طرح میر وشاہ نے دریافت کیا تھا اور گینگ کے ایک ماسٹر مائنڈ نصر حیات نے اس کی تربیت کی تھی۔ نصر حیات پچھلے ماہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا ورنہ پیا جی کی جگہ پر وہ فارم ہاؤس کا انچارج ہوتا اور مجھے تربیت دے رہا ہوتا۔ چونکہ وہ گینگ کا اہم ستون تھا اور آدھے سے زیادہ ارکان کا استاد تھا اور بہت سے فنون میں یکتا تھا، اس لیے اس کے بیوی بچوں کی کفالت کی ذمہ داری میڈم نے از خود لے لی تھی۔

میر وشاہ نے مجھے دو ہفتے کا فری ٹائم دیا تھا۔ بیس دن گزرنے کو آ گئے تھے مگر اس نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی تھی۔ میں نے جب بھی اسے کال کی، اس نے کال 'بزی' کر دی۔ بعض اوقات تو میں اس کی بے رُخی پر جھنجھلا جاتا اور پیا سے شکوہ کرتا۔ وہ کندھے اُچکا کر بڑی معصومیت سے جواب دیتا، ''میں میر وشاہ سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ تم کر سکتے ہو تو ملنے پر کر لینا۔''

پیا نے ایک دن مجھے بتایا کہ میڈم شکیلہ دوبئی سے واپس آ گئی ہیں۔ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں اس کی عدم موجودگی میں اداس ہو گیا تھا بلکہ میں اتنے دنوں تک سوائے الٹی سیدھی ورزشوں کے کچھ بھی نہیں کر پایا تھا اور اب شدید نوعیت کی بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے پروین کی تلاش میں نکلنا تھا۔ دنیا بہت بڑی تھی، میں کسی کلیو کے بغیر اس تک پہنچنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میڈم میری مدد کر کے مجھے اس تک پہنچا سکتی تھی اور اس سے ملنے کی بے تابی کے پیچھے یہی حقیقت تھی۔ میں چونکہ اس کی کوٹھی سے نکل آیا تھا، اس لیے اب اس کے بلانے پر ہی وہاں جا سکتا تھا۔ وہ کب مجھ سے ملنا چاہے گی، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میر وشاہ مجھے اس سے ملوا سکتا تھا مگر ان دنوں تو خود میر وشاہ سے ملنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔

میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میڈم کی سرگرمیوں، شخصیت اور خاندان کے بارے میں کئی سوال کیے مگر پیا نے ہمیشہ مجھے ٹال دیا۔ ایک مرتبہ جب میں نے میڈم کے پس منظر کے بارے میں اس سے استفسار کیا تو وہ مسکرا کر بولا، ''شہریار! ہماری میڈم جتنی خوب صورت ہیں، یقیناً ان کا بیک گراؤنڈ بھی اتنا ہی دل کش ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

❖❖○❖❖

مجھے زندگی نے بیٹھے بٹھائے سب کچھ دے دیا تھا۔ خوب صورت گھر، ڈھیر سارا پیسہ اور طاقت..... مگر میں کسی بھی تعیش کے لمحے سے حظ کشید نہیں کر پایا تھا۔ تب پتہ چلا کہ ائر کنڈیشنڈ کمرے میں، مخملیں بستر پر، جوانی کی رات کی آنکھوں میں نیند نہیں اُترتی اگر دل میں مسلسل کوئی کسک جاگتی رہے۔ والدین کے اندوہ ناک قتل کی چبھن پہلو میں کبھی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی پروین کی عدم موجودگی اور چچا چچی کی اندوہ ناک موت مجھے کھلتی تھی۔ کبھی مجھے اپنی طاقت بھری جوانی پر ندامت محسوس ہوتی، کبھی اپنی بے بسی پر رونا آتا اور کبھی جی چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں اپنا ہوش بھی چھن جائے مگر جب میں شانو، فروا اور موجو کی طرف دیکھتا تو بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ لیتا اور سوچتا کہ ان کا اَب دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں رہا۔ وہ تینوں مجھ پر انحصار کرنے پر مجبور تھے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے ماضی میں پروین اور میں ان لوگوں کے دستِ نگر ہو کر رہ گئے تھے۔ میرا کوئی غلط اقدام ان کی زندگیوں کو چاٹ سکتا تھا۔

ایک دن میں فارم ہاؤس نہیں گیا تھا۔ تینوں کو لے کر شہر کی سیر پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ شاپنگ

کرانے اور گھمانے پھرانے میں آدھا دن صرف کر کے جب شام کو گھر پہنچے تو ڈرائنگ روم میں میر وشاہ کو اپنا منتظر پایا۔ وہ بہت دنوں بعد مجھے ملا تھا۔

میں نے اسے رابطہ توڑ لینے کا شکوہ کیا تو وہ ہنس کر بولا، ''اڑے غنچے! کیا بولے ہے ملتے سے؟ ماڑی جندگی (زندگی) ہی ایسی ہووت ہے کہ نہ رات کی خبر، نہ دن کا پتہ..... بس چل سو چل.....''

میں نے کہا، ''مگر تمہیں علم ہے کہ میں تمہاری عدم موجودگی میں بہت کمزوری اور بے چینی محسوس کرتا ہوں۔''

وہ بولا، ''نہیں غنچے! غلط بولے ہے تم..... مرد کا بچہ کمجور (کمزور) نہیں ہووت ہے۔ لوہے کے مافق ایک دم سخت..... کوئی پریشانی ہووے تو بولے، ابھی چٹکی بجانے میں حل ہووے ہے۔''

''نہیں..... پریشانی تو کوئی نہیں ہوئی۔''

''اس حرام جادے پیاجی نے ماڑے غنچے پر کچھ محنت کی ہووت ہے کہ نہیں؟''

''ہاں! اس نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔''

''تم اپنا آگے کا پروگرام بتاوے مجھے۔''

میں نے چونک کر کہا، ''میں کیا بتاؤں، تم بتاؤ۔''

اس نے کہا، ''وہ سالا حیدر خان..... چڑی کا بچہ..... بڑا جاگیردار بنت ہے سالا..... ایک دم بھڑک اُٹھے ہے۔ اپنی چنریا مانگت ہے، آگ لگانے کی دھمکیاں دیوت ہے اور اوپر سے ماڑی میڈم پر پریشر ڈالے ہووت پر وہ سالا نہیں جانت کہ میڈم نے جندگی (زندگی) میں کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوویں.....''

میں مداخلت کئے بغیر ہمہ تن گوش رہا، وہ بولا، ''اڑے غنچے! سالی دو کروڑ میں بکے ہے..... وہ سردار حیدر خان کی چنریا ہووت ہے..... ہاں! کوئی معمولی چھوکری تو نہ ہووت ہے بابا۔''

میری آنکھیں پھیل گئیں، ''دو کروڑ؟..... یعنی دو سو لاکھ روپے؟''

وہ بولا، ''تو کیا پچاس رُپے میں رکھ دیویں کسی لاڈے کی تلی (ہتھیلی) پر..... اور تو اور..... جو سالا حیدر خان کو پارٹی کا ٹکٹ دیوے ہے ناں، ہر الیکشن میں..... وہی دو کروڑ لگاوے ہے۔ بولے کہ تھوڑے ہوویں تو اور بولے..... اور بولے..... پَر چھوکریا کی بندیا پر میرا نام لکھ دیوت ہے میڈم جی!''

''کیا تم میاں دلبر حسین کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں تو..... وہی سالا میاں دلبر..... حیدر خان بولے کہ وہ میرا دلبر یار ہووے، میرا جانی سجن ہووے..... اور دیکھت ہے کہ اس کا جانی سجن ہی اس کی جان کی قیمت لگاوے ہے.....''

میں حیرت کے مارے گنگ بیٹھا تھا۔ میاں دلبر حسین لاہور کے نواحی علاقے کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔ پارٹی کے بڑوں کا خاص آدمی تھا اور ہمارے علاقے میں تمام پارٹی ٹکٹ وہی فروخت کیا کرتا تھا۔ حیدر خان کی یاری کا دم بھرتا تھا اور بارہا حویلی میں آ کے مہمان ٹھہرا تھا۔ سونے کی اینٹوں پر پیر رکھتا تھا، سونے کے برتنوں سے نوالہ اٹھا کر منہ میں ڈالتا تھا تبھی کروڑوں کی بولی لگاتا تھا۔ حیدر خان اس کا چمچہ تھا۔ اس کے لئے سیاسی راگ الاپتے ہوئے تھکتا نہیں تھا۔

میں نے کہا، ''کیا حیدر خان کو اس بات کا علم ہے؟''

وہ بولا، ''نہیں..... لیکن ایک نہ ایک دن تو اس کے کانوں میں یہ بات پڑ جاوت ہے ناں پر پھر کیا کر لیوت ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ کپڑا ایک بار پہن لیا جاوے، سیب چکھ لیا جاوے یا چھوکری کے انگ انگ کو چھو لیا جاوے..... قیمت ایک دم ختم..... وہ سالا میاں دلبر حیدر خان سے بھی بڑا حرام جادہ (حرام زادہ) ہووے۔ اس جیسے کئی پلے اس جالم (ظالم) کے ڈیرے پر بھونکنے کی ورجش (ورزش) کرت ہیں۔''

بڑوں کی دنیا کا چلن میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ میاں دلبر حسین بظاہر تو حیدر خان کا یار تھا، مگر اس کا باطن شیطان کی آماجگاہ تھا۔ پہلو گرم کرنے کے لئے وہ اس نمک کو بھی حرام کرنے میں عار نہیں سمجھتا تھا جو اس نے حیدر خان کی حویلی میں آ کر کئی مرتبہ چاٹا تھا۔

مجھے کھالے کا خیال آیا۔ جب اسے علم ہوگا کہ اس کی 'بی بی جی' کو میڈم نے کسی مستانے طلب گار کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، تو اس کا ردِ عمل بڑا خوف ناک ہوگا۔ وہ بلاشبہ خان زادی اسما پر جان چھڑکتا تھا۔ شاید اس کی سلامتی کی خاطر ہی وہ اب تک خاموشی سے میر وشاہ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا چلا آ رہا تھا۔

میں نے کھالے کے بارے اپنے خیالات کو میر وشاہ کے ساتھ شیئر کیا تو ہاتھ پر ہاتھ مار کر ایک دم ہنس پڑا۔ بولا، ''اڑے غنچے! تم کو اس کالے ٹیٹ کا فکر نہ ہووت ہے..... سالا چڑی مار کا بچہ..... ایک دم پاگل ہووت ہے۔ اگر اس لونڈیا کے عشق میں وہ کوئی بینکی پھینکی مارت ہے تو

پھر اس کا ویجا (ویزا) لگ جاوت ہے.....اوپر کا.....''

''وہ میرا دوست ہے شاہ جی.....'' میں نے ہونٹ کاٹے۔

''تو پھر اُس کو بول دیوت ہے کہ ماڑے رستے میں کبھی نہ آوت ہے۔ ٹھیک؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، دل ہی دل میں کبھی پر چار چار حرف بھیجے اور میر وشاہ سے دریافت کیا، ''شاہ جی! ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ میری بہن کا کیا ہوا؟ کیا تم نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی؟''

وہ بولا، ''ماڑے لاڈے! ماڑے مخبروں نے بول دیوت ہے کہ تمہاری بہنا حیدر خان کے پاس نہ ہووت ہے..... وہ سالا خود بھی آگ بھبھوکا ہو کے چھوکری کو کھوجت ہے پر.....'' اس نے نفی میں سر ہلایا، پھر کہا، ''ماڑی سمجھ میں نہیں آوے ہے کہ اس کو جمین (زمین) نگل جاوت ہے کہ آسمان اٹھالیوت ہے۔ ملکہ رانی سے بھی میں نے بول دیوت ہے کہ یہ کام میر وشاہ کے بس کا نہ ہووت ہے، اگر تم تلاش کر لیوے تو کر لیوے.....''

''پھر؟'' میں نے آس بھری نظروں سے اُسے دیکھا، ''پھر کیا کہا میڈم نے؟''

''مہارانی نے کچھ نہ بول کر دیوت ہے ماڑے کو..... بلکہ ماڑے غنچے! تم آج کی رات فارم ہاؤس میں جا کر سووت ہے، میڈم نے یہ حکم دیوت ہے.....''

''مگر کیوں؟'' میں نے اچنبھے سے کہا۔

''یہ تو ماڑے کو علم نہ ہووت ہے، یہ ضرور جانت ہے کہ ملکہ رانی کوئی بھی حکم ایسے ہی نہ دے دیوت ہے۔''

مجھ پر مایوسی کا حملہ ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ میری اب تک کی تمام ریاضت اکارت چلی گئی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ''شاہ جی! اگر مجھے میری بہن نہ ملی تو میں کسی کام کا نہیں رہوں گا۔''

وہ جھٹ سے بولا، ''نہیں ماڑے غنچے! اگر تم کسی کام کا نہ رہوے تو پھر بہنا بھی کبھی ملنے کی نہ ہووے ہے۔ یہ اپنے بھیجے میں سنبھال رکھ، میری نصیحت۔''

میں نے مٹھیاں بھینچ لیں اور سر جھکا لیا۔ جی چاہا کہ اڑ کر حیدر خان تک پہنچوں اور اس فرعون کا گلا دبا دوں۔ اس کی بے غیرتی نے جگ ہنسائی اور دوسری یتیمی کا بوجھ میرے کندھوں پر لادا تھا۔ میں نے دانت پیس کر کہا، ''میں حیدر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عیاری سے بولا، ''اگر تم ایسے ہی جذباتی ہووت اور الا تلّا سوچت..... تو پھر یاد رکھ لیوت کہ وہ تمہارے کو زندہ نہیں چھوڑت ہے۔''

وہ اپنے مخصوص انداز میں کچھ دیر تک وہ میرا ذہن ٹھنڈا کرتا رہا، اونچ نیچ سمجھاتا رہا، پھر اُٹھتے ہوئے بولا، ''دیکھ ماڑے غنیچے! تیاری کر لیوے، عقیل، وہ حرام جادہ بے جبان (بے زبان) مینڈھا، تمہیں لینے کو آجاوے ہے، گھنٹہ بھر کے بعد..... اور فارم ہاؤس پر لے جانے کو۔ تم گھر کی فکر نہ کرت، یہاں ماڑا گھوڑا فوجی رات کو دھیان کرت ہے گھر کا..... ٹھیک ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے گیٹ پر جا کر رخصت کر دیا۔ وہ پیدل تھا تبھی اسے مین روڈ پر جا کر رکشا پکڑنا تھا۔

عقیل مجھے نو بجے کے قریب فارم ہاؤس کی بیرونی پارکنگ میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ فارم ہاؤس پر کئی نوکر کام کرتے تھے اور پیا جی سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ان میں سے صرف دو ملازم یہاں مستقلاً رہائش پذیر تھے۔ وہ نہ صرف اس عمارت کی دیکھ بھال کرتے تھے بلکہ فارم کی ملحقہ زرعی زمین پر کام بھی کرتے تھے۔

میں چونکہ گزشتہ کئی دنوں سے یہاں متواتر آ رہا تھا اور تمام دن یہیں گزارتا تھا، اس لئے وہ مجھ سے بخوبی شناسا تھے۔ انہوں نے مجھے فارم ہاؤس کے ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا جہاں میری شب بسری کا اہتمام پہلے سے کر دیا گیا تھا۔ ایک دیہاتی طرز کی بڑی چارپائی، روئی کا گدا اور بھاری لحاف دیکھ کر مجھے نور پور یاد آ گیا جہاں رات گزارنے کا صدیوں سے یہی انتظام کیا جاتا تھا۔ اس غیر معمولی بڑے کمرے میں سوائے اس ایک چارپائی کے کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ دیوار گیر الماریاں بھی خالی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں اڑھائی فٹ چوڑائی والا چوبی دروازہ اٹیچڈ باتھ روم کی سہولت کا اعلان کر رہا تھا۔ ایک دبلا پتلا مگر طویل قامت نوکر میرے لیے چائے کا بڑا پیالہ تیار کر لایا۔ نہ اُس نے کوئی بات کی، نہ ہی میں نے کچھ کہا۔ جب وہ پیالہ اُٹھانے کے لیے دوبارہ کمرے میں آیا تو مؤدبانہ لہجے میں بولا، ''بابو جی! اگر کسی چیز کی لوڑ (ضرور) ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔ میں اسی قطار کے آخری کمرے میں سوتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے دروازے کی چٹخنی چڑھائی، سرخ رنگ کا نائٹ بلب آن کیا اور لیٹ گیا۔ ذہن عجیب مخمصے میں الجھا ہوا تھا۔ اپنے یہاں بلائے جانے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ قریب ترین قیاس یہی تھا کہ میڈم کسی وقت یہاں آ کر مجھ سے ملنے کی خواہاں تھی۔ پھر

خیال آیا کہ مجھ سے ملاقات کے لئے اُسے اتنے تردد کی کیا ضرورت تھی؟ وہ مجھے اپنی کوٹھی میں بھی بلوا سکتی تھی۔ چاہتی تو میرے گھر میں بھی آ سکتی تھی۔ شہر سے دور، ویرانے میں مجھے شب بھر انتظار کرانے اور اسے تکلیف اُٹھانے کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی مگر میر وشاہ شاید ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اس کی باتوں کو سمجھنے کے لیے اس کے جیسے شیطانی دماغ کا کھوپڑی میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔

''اچھا بھئی..... جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ فضول میں دماغ کھپانا خود کو تھکانے کا سبب ہے۔'' میں بڑبڑایا اور لحاف میں دبک گیا۔ اچانک مجھے ایک غلطی کے سرزد ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے گھر سے چلتے ہوئے کوئی ہتھیار نہیں لیا تھا۔ گن نہ سہی، میں پسٹل تو اپنے لباس میں چھپا سکتا تھا۔

یہاں شہر کی نسبت زیادہ سردی تھی۔ ہوا خاصی خنک تھی۔ دس بجے کے لگ بھگ مجھے نیند نے آن دبوچا اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہوگیا۔ جب سے میں پیا کی عمل داری میں آیا تھا، بھرپور نیند لینے لگا تھا۔ وہ مجھے دن بھر میں اتنا تھکا دیتا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جایا کرتی تھیں۔

نجانے کیا وقت ہوا تھا، رات کس پہر میں تھی جب اچانک میرا دم گھٹنے لگا۔ میں ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور بے ساختہ چارپائی میں اُٹھنے کی کوشش کی مگر مجھ سے اُٹھا نہ جا سکا۔ فوری طور پر مجھے احساس ہوگیا کہ میرے منہ پر کوئی ہاتھ جما ہوا تھا جس کی گرفت غیر معمولی حد تک مضبوط تھی۔ میں نے اپنا سر ادھر اُدھر مارنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نائٹ بلب آن کر کے سویا تھا۔ اب وہ بجھا ہوا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔

مجھ پر اپنا وزن ڈالنے والا جو کوئی بھی تھا، قوی الاعصاب تھا۔ میں نے اسے گھٹنوں کی ضرب پہنچانا چاہی تو لحاف آڑے آیا۔ میں نے بے ساختہ اپنے منہ پر جمے ہوئے ہاتھ کو ہٹانا چاہا۔ حملہ آور کی کلائی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا ہاتھ میرے منہ سے ہٹ گیا مگر اس کی دوسری کہنی پوری قوت سے میری پیشانی سے ٹکرائی۔ یہ ضرب بہت شدید تھی۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ دوسری ضرب اس سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اس کی کلائی میری گرفت سے چھوٹ گئی اور میرے منہ سے درد کے مارے آہ خارج ہوگئی۔

حملہ آور کا محض سایہ سا دکھائی دے رہا تھا جس سے اس کی پوزیشن اور جسامت کا علم نہیں

ہوتا تھا۔ میرے پاس مہلت کم تھی اِس لیے اپنی تمام تر توانائیاں مجتمع کیں اور اس کی ٹانگوں کے بیچ ہاتھ ڈال کر اپنے اوپر سے دوسری جانب دھکیل دیا۔ اپنی کوشش کو بارآور کرنے کے لیے میں نے پوری قوت سے کروٹ بھی بدل لی تھی۔ وہ میری توقع کے عین مطابق میرے اوپر سے ہوتا ہوا دیوار کی جانب زمین پر جا گرا۔ مجھے سنبھلنے اور لحاف سے نکلنے کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔

چارپائی کے دونوں اطراف میں ہم ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ میں نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا، ''کون ہو تم؟''

اس نے جواب دینے کی بجائے اپنا ایک پاؤں چارپائی کی بانہہ پر رکھا اور مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اس کے وار سے بچنا چاہا مگر اس کی دونوں پیر کسی پتھر کی طرح میری چھاتی پر پڑے۔ میں چیخ کر کمر کے بل فرش پر جا گرا۔ وہ بھی گرا تھا مگر فوراً ہی سنبھل گیا اور اُٹھ کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ اس کے پیروں میں سخت قسم کے جوتے تھے جن کی ٹھوکریں میری پسلیوں میں آہنی راڈ کی طرح پڑیں۔ میں اپنی چیخوں پر قابو پانے میں ناکام رہا۔ پے در پے ٹھوکروں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

اچانک میں نے اس کی ایک پنڈلی پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ شاید پہلے سے تیار تھا، کیونکہ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسری ٹانگ بھی ہوا میں بلند کی اور آن واحد میں اپنے پورے وزن کے ساتھ مجھ پر آن گرا۔ میرا پیٹ بری طرح پچک کر رہ گیا۔ یوں لگا جیسے سارا کھایا پیا حلق میں آ گیا ہو۔ میں نے اس کی ٹانگ چھوڑ دی اور اس کی گردن پکڑ کر بھینچنے کی کوشش کی مگر وہ اسپرنگ کی طرح اُچھلا اور اس کی ایک کہنی میرے پیٹ اور چھاتی کے درمیان جبکہ دوسری میری ناف پر لگی۔ تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی اور میں حواس باختہ ہو کر رہ گیا۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتیلا اور چالاک واقع ہوا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اپنے بائیں ہاتھ کا مکا اس کے سر کے عقبی حصے میں مارا۔ میرا ہاتھ نشانے پر لگا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے سر کے پیچھے کوئی حفاظتی پیڈ باندھ رکھا تھا کیونکہ میرے ہاتھ کو ہڈی کی سختی کی بجائے کسی نرم سی شئے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ ایک دم دونوں ہاتھوں اور پیروں کے بل ہوا میں اُچھلا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس پر بدقت نظریں مرتکز کیں اور ایک دم ساکت ہو کر اس کے وار کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اسپرنگ کی طرح ہوا میں اُچھلا۔ مجھے ایک لمحے میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل مجھ پر گرنا چاہتا

تھا۔ میں بجلی کی سی سرعت سے کروٹ بدل گیا مگر پوری طرح اس کے وار سے محفوظ نہ ہو سکا۔ اس کا ایک گھٹنا میری کولھے پر، ایک کہنی میرے کندھے پر جبکہ دوسرا گھٹنا اور کہنی فرش پر لگیں اور اس کے حلق سے مدھم سی آہ خارج ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر ہم بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو گئے۔

زندگی اور موت کا کھیل یا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی بازی..... یہ تعین کرنا محال تھا۔ وہ اگر چاہتا تو مجھے سوتے میں خنجر یا پستول سے ہلاک کر سکتا تھا۔ کسی رسی کی مدد سے میرا گلا گھونٹ سکتا تھا۔ مگر شاید مجھے قتل کرنا اس کا مقصد نہیں رہا تھا۔ وہ مجھے شکست دے کر اغوا کرنا چاہتا تھا یا زندہ رکھ کر کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کسی بھی حالت میں اس کے ارادے نیک نہیں تھے اور مجھ پر اپنا بچاؤ لازم تھا۔ میں نے سر جھٹکا، اس پر اپنی نظریں مرکوز کیں اور سوچ بچار کا عمل کسی فارغ وقت پر اُٹھا دیا۔

میری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ ناف پر لگنے والی کہنی کی چوٹ شدید تھی مگر یہ وقت درد کے احاطے کا نہیں تھا۔ وہ ایک ذرا پیچھے ہٹا اور ایک پیر پر گھوم کر مجھے زوردار لات رسید کی جو میرے بازو پر لگی۔ عین اسی جگہ پر سائیں دل جیت کے مزار کے احاطے میں ایک گولی ماس کو چھو کر گزری تھی۔ زخم ٹھیک ہو گیا تھا مگر اس میں درد باقی تھا جو اس وقت ٹھوکر سے جاگ گیا تھا۔ میں نے مستعدی سے اس کا پاؤں پکڑا اور مروڑنا چاہا۔ میں اس کے وار کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ نہیں پایا تھا اس لیے میں نے جونہی اس کا پیر پکڑا، وہ ہتھیلیوں کے بل نیچے گرا اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپا۔ اس کی موونگ کک میرے کان کے نیچے گردن پر لگی۔ اچانک جیسے سو واٹ کا بلب میری آنکھوں کے عین سامنے جل اُٹھا ہو اور میں تیورا کر نیچے گرا مگر میں نے یہ دھیان رکھ لیا تھا کہ اس کا پاؤں میری گرفت سے نکل نہ پائے۔ میرے جسم تلے اس کی ٹانگ کا مڑا ہوا گھٹنا دب گیا۔ اس کے حلق سے 'اوغ' کی تیز آواز نکلی اور اس کا اوپر والا دھڑ فرش پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ وہ بری طرح میرے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔

وہ دبلے پتلے اور نہایت لچکدار جسم کا مالک تھا۔ اس کا لباس خاصا موٹا اور چست تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ پہلو کے بل کمان کی طرح مڑا اور اس کا دوہتھڑ میری کمر پر لگا۔ اس کے وار میں زیادہ جان نہیں تھی تبھی میری گرفت کمزور نہیں ہوئی۔ میں نے دانت پیس کر اس کی ٹانگ پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ تڑپا اور اس نے اپنے جسم کو گیلی شاخ

کی طرح میری جانب جھکا دیا۔ میں فی الفور سمجھ نہیں پایا اور خطا کھائی۔ اس نے میرے سر کے بال اپنی دونوں مٹھیوں میں جکڑ کر اپنی جانب کھینچ لئے۔ میرے منہ سے تیز سسکاری نکلی اور میں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے اس کی ٹانگ سے کھسک کر اس کی پشت پر جا گرا۔

وہ ایسی ٹیڑھی کھیر تھی جو انگلیوں کو ٹیڑھا کرنے کی مہلت نہیں دیتی۔ میرے نیچے دبے ہونے کے باوجود اس نے پلٹا کھایا اور مجھے اپنے برابر میں فرش پر پٹخ دیا۔ میرا سر فرش سے ٹکرایا اور یوں لگا جیسے میرے ذہن نے یک بارگی کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ میں نے دو تین مرتبہ سر جھٹکا۔ کچھ اوسان بحال ہوئے مگر تب تک وہ میری پشت پر سوار ہو کر میری تھوڑی کے نیچے دونوں ہاتھوں کی کنگھی بنا چکا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے دونوں ہاتھوں پر چمڑے یا سخت کپڑے کے دستانے چڑھا رکھے تھے۔ اس نے جب مخصوص انداز میں مجھے پیچھے کی طرف کھینچا، تب مجھے خطرے کا جانکاہ احساس ہوا۔ کسی بھی لمحے میری ریڑھ کی ہڈی کا کوئی مہرہ کھسک سکتا تھا یا 'کٹاک' کی خوف ناک آواز کے ساتھ ٹوٹ سکتا تھا۔ میں اور کھالا نور پور میں یہی داؤ خونخوار کتوں پر آزما کر ان کی ہڈی توڑ دیا کرتے تھے۔

میں نے سانپ کی طرح اپنی ٹانگوں کو لہرایا اور دونوں گھٹنے جوڑ کر اس کی کمر پر دے مارے۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے منہ کے بل گرا۔ اس کی چھاتی میرے سر سے ٹکرائی۔ ایسے ہی وقت میں میں بجلی کی سی تیزی سے گھٹنوں کے بل اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سر کے بل زمین پر گرا اور قلابازی کھا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں کھینچ لیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر زمین پر گرا۔ اگر اس نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر بروقت ٹکا نہ لی ہوتیں تو اس کا چہرہ فرش سے ٹکرا کر لہولہان ہو جاتا۔ میں نے اسے اپنی جانب کھینچنا چاہا مگر اس نے کچھ اتنی پھرتی سے بل کھا کر مجھے چارپائی کی طرف گرا دیا تھا کہ میں سنبھل ہی نہ پایا۔ میرا کندھا چارپائی کے موٹے سے پائے سے ٹکرایا۔ چوٹ خاصی شدید تھا۔ جلدی سے اُٹھنا چاہا مگر ڈگمگا گیا۔ دوسری کوشش میں پیروں پر کھڑا ہوا تو اس کی فلائنگ کک میرے دوسرے کندھے پر پڑی اور میں چارپائی پر سے ہوتا ہوا دیوار کی جڑ میں جا گرا۔ شکر ہوا کہ میرا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا تھا وگرنہ یہ وار فیصلہ کن ہوتا۔ میرے حلق سے نکلنے والی چیخ خاصی بلند تھی۔

حیرت کی بات تھی کہ اس ویرانے میں میرے حلق سے نکلنے والی کراہیں، چیخیں اور ہمارے لڑنے بھڑنے کی آوازیں بہت دور تک جا رہی تھیں مگر کوئی بھی میری مدد کو نہیں پہنچا تھا۔ شاید

اس حملہ آور نے پہلے ان دونوں نوکروں کا کام تمام کیا تھا جو فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں سوئے ہوئے تھے، پھر میری جانب آیا تھا۔

میں دیوار کے ساتھ پشت ٹکائے بیٹھنے کے سے انداز میں گرا تھا۔ ایسے ہی وقت میں میری داہنی آنکھ پر کوئی دبیز چادر سی گری۔ میں نے آنکھ پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ بے اختیار کھسکتا ہوا پیشانی تک گیا۔ انگلیاں چپچپا گئیں۔ میری پیشانی سے خون بہہ رہا تھا جو آنکھوں کے آگے آ کر اندھیرا کرنے لگا تھا۔ میں نے بازو رگڑ کر بہتا ہوا خون صاف کیا تو میرے دشمن کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ شاید وہ کمرے سے نکل بھاگنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ وہ دیوار تک گیا، پھر دوڑتے ہوئے میری طرف بڑھا۔ میں سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے کیونکہ میرے اور اس کے بیچ چارپائی حائل تھی اور وہ مجھ تک براہِ راست نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے کمرے کے وسط میں پہنچ کر ہوا میں جست لگائی اور دونوں ٹانگیں جوڑ کر چارپائی کی بانہہ پر فلائنگ کک جڑی۔ فرش پر چارپائی گولی کی سی تیزی سے پھسل کر دیوار کی طرف آئی اور میں بری طرح پس کر رہ گیا۔ چارپائی کی چوبی بانہہ میری چھاتی سے ٹکرائی تھی۔ ایک لمحے کو شاید میرا دل رک گیا تھا یا پھٹنے کو آ گیا تھا اور میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئیں۔ حلق سے آواز تک نہ نکل سکی اور میں ایک طرف ڈھلک گیا۔ چارپائی میرے وزن سے پیچھے کھسکی اور میں فرش پر بے جان انداز میں گر گیا۔ زیرک دشمن نے میری جان لینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی مگر شاید زندگی نے ابھی مجھے مہلت دے رکھی تھی اور میں بچ گیا تھا۔

وہ خود بھی کمر کے بل فرش پر گرا تھا اور شاید اسے بھی کوئی چوٹ آ گئی تھی کیونکہ کافی دیر بعد مجھے چارپائی پر پڑے ہوئے لحاف کے اوپر سے اُس کا سر دکھائی دیا تھا۔ تب تک میں لمبی لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اُتار کر، سر کو دائیں بائیں جھٹک کر اور سینے کو سہلا کر خود کو از حد سنبھال چکا تھا۔ مجھے باور ہو گیا تھا کہ میرا پالا کسی خطرناک لڑاکے سے پڑا تھا جو کسی بھی وقت میرا زندگی سے ناتا توڑ سکتا تھا۔ میں نے اپنی تمام تر ہمت یکجا کی اور چارپائی کی بانہہ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور بار بار آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تھا۔

اس نے شاید میری کمزوری بھانپ لی تھی، اس لیے الٹے قدموں عقبی دیوار کی طرف پہلے سے انداز میں گیا اور دوڑ کر میری طرف آیا۔ جونہی اس نے اپنے جسم کو ہوا میں اچھالا، میں نے چارپائی کو پوری قوت سے اس کی طرف دھکیل دیا۔ اس کے دونوں پیروں کے بالائی حصے

چارپائی سے ٹکرائے اور وہ منہ کے بل لحاف پر آن گرا۔ مجھ پر جھنجھلاہٹ اور وحشت سوار تھی اس لیے میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اسے بانہوں میں بھر کر اس طرح ہوا میں بلند کر لیا کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوا میں لہرانے لگیں۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھ پر پہلی مرتبہ یہ راز منکشف ہوا کہ انتہائی سفاک اور خون ریز نبرد آزما وجود کسی مرد کا نہیں تھا بلکہ وہ کوئی عورت تھی جو سرتاپا تر پال جیسے کھردرے اور سخت کپڑے میں ملفوف تھی۔

میں نے اپنی بانہوں کو کسنے میں پوری قوت صرف کر دی۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ منہ سے عجیب سی خرخراہٹ برآمد ہوئی اور اس نے اپنی ٹانگیں ہوا میں لہرا کر مجھے ضرب لگانی چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ میں نے اپنا سر بڑی ہوشیاری سے اس کی رانوں کے بیچ گھسیڑ دیا تھا۔ میں نے بانہوں کو ایک جھٹکا دیا اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے درشت لہجے میں کہا، ''کون ہو تم؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے پھر جھٹکا دیا۔ اس کا جسم یکبارگی تڑپا اور اچانک ساکت ہو گیا۔ وہ غالباً بے ہوش ہو چکی تھی۔ چند لمحے انتظار کے بعد میں نے اپنی بانہیں کھول دیں۔ وہ لحاف پر سر کے بل گری اور فرش پر لڑھک گئی۔ تب میں چارپائی کا چکر کاٹ کر اس کے قریب پہنچا اور چاہا کہ اس کے دل کی دھڑکن چیک کروں، اچانک میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کم بخت کا فولادی مکا میری ناک پر پڑا تھا اور میں کمر کے بل فرش پر گر کر چت ہو چکا تھا۔ میں اس کے چکر میں آ گیا تھا۔

میری ناک سے خون بہہ نکلا تھا جس کا مجھے اس وقت ادراک نہیں ہوا تھا۔ بارہا سر جھٹکا، خود کو سنبھال کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر سر چکرا گیا۔ اسے سنبھلنے کے لئے مہلت مل چکی تھی۔ تبھی اس نے مجھے اٹھنے سے پیشتر ہی پے در پے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ہارڈ سول شوز کی ہر ضرب پر میں جھنجھنا اُٹھتا اور میرے حلق سے چیخ نکل جاتی۔ میں نے اس کا پیر گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ مجھ پر غالب آ چکی تھی۔

میں نے ایک دھوکہ کھایا تھا اور بھیانک سزا پائی تھی۔ اپنی بقا کی فیصلہ کن جنگ لڑنے کا تہیہ کرتے ہوئے اپنی بچی کھچی ہمت مجتمع کی اور اچانک کھڑا ہو گیا اور کسی دیوانے کی طرح اس پر حملہ آور ہو گیا۔ وہ غافل نہیں تھی جس کی وجہ سے اس نے نہایت معقول جواب دیتے ہوئے میری کنپٹی پر زوردار پنچ مارا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں نے اسے مکوں، تھپڑوں اور برہنہ

پیروں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اسے شاید اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی یا اس نوع کی دیہاتی لڑائی سے اُس کا واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے وہ چند ہی لمحوں میں پسپائی اختیار کرتے ہوئے دیوار سے جا لگی اور گھسٹ کر زمین پر گر گئی۔ اس نے مدافعانہ انداز میں اپنا چہرہ اور سر بانہوں میں چھپا لیا تھا۔

مجھے ایک مرتبہ پھر محسوس ہوا کہ اس کی مزاحمت دم توڑ چکی ہے مگر میں کوئی رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑیں اور پوری قوت سے مروڑ دیں۔ وہ تڑپ کر آگے ہوئی تو میں نے اسے گھمایا اور مڑی ہوئی بانہیں اس کی کمر سے لگا کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ اس خطرناک داؤ سے نہ تو نکل سکتی تھی اور نہ ہی کوشش کر سکتی تھی کیونکہ اس کی معمولی سی حرکت سے اس کے کندھوں کے جوڑ اپنی جگہ سے ہل کر ناکارہ ہو جاتے۔

اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور ہار کر تھم گئی۔ اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ آہنی شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ میں نے مخصوص انداز میں کلائیوں کو تھوڑا اور مروڑا تو اس کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔ میں نے کئی مرتبہ یہی حرکت کی اور سنگدلانہ انداز میں کہا، ''میں نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ تم نے نہیں بتایا تھا۔ اب تم بتانا چاہو گی مگر میں پوچھوں گا نہیں.....''

وہ بہت ڈھیٹ تھی۔ منہ سے کچھ نہ بولی بلکہ اپنے طور پر میرے 'ڈیڈ لاک' سے نکلنے کی کوشش کرتی رہی۔ ناکام ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ ایسے ہی وقت میں میں نے پھر اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ اس کے حلق سے سسکاری نکلی اور وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی، ''مجھے چھوڑ دو ورنہ میرے بازو ٹوٹ جائیں گے۔''

میں اسے جکڑے ہوئے، اندازے کے مطابق دیوار پر سوئچ بورڈ تک گیا۔ ٹٹول کر ایک ہی لائن میں لگے ہوئے کئی بٹن پش کر دیے۔ نائٹ بلب، ٹیوب لائٹ اور سیلنگ فین آن ہو گئے۔ جلدی سے سیلنگ فین کا بٹن آف کیا۔ اس دوران میں نے اس پر سے ایک لمحے کو بھی اپنی توجہ نہیں ہٹائی تھی۔ وہ بہت چالاک تھی اور موقع سے فائدہ اٹھانے کے ہنر پر دسترس رکھتی تھی۔ کمرہ روشن ہو گیا لیکن کئی ثانیوں تک آنکھیں چندھیائی رہیں جس کے باعث مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ جب منظر کھلا تو میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ وہ گہرے سیاہ رنگ کے موٹے اور چست لباس میں پوری طرح سر تا پا چھپی ہوئی تھی۔ لباس ایسا تھا کہ آنکھوں کے علاوہ سارا

بدن چھپا ہوا تھا۔ اس نے پاؤں میں سخت سول والے سیاہ لانگ شوز پہن رکھے تھے۔ روشنی میں اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز چیخ چیخ کر اس کے پُر شباب اور بڑی بھرپور عورت ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

میں اسے دھکیلتا ہوا چارپائی تک لے گیا اور نہایت سرد لہجے میں بولا، ''اگر زندگی درکار ہے تو کوئی مستی نہ کرنا ورنہ اپنا ہاتھ تب تک نہیں روکوں گا جب تک تمہاری سانس چلتی رہے گی۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اسے دھکا دے کر لحاف پر اوندھے منہ گرا دیا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے مگر اس نے ہاتھ سیدھے نہیں کیے بلکہ کمر پر رکھے بے حس و حرکت ہو گئی۔

میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میری قمیص خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ پیشانی اور ناک سے بہنے والا خون شاید رُک گیا تھا مگر تکلیف کا شدید احساس رگ و پے پر مسلط تھا۔ دیوار پر نظر دوڑائی۔ کہیں آئینہ نظر نہیں آیا۔ باتھ روم میں جا کر آئینہ دیکھنے اور منہ ہاتھ دھونے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ حرافہ ہوش و حواس میں تھی اور میری غفلت سے فائدہ اُٹھا کر پھر بھوکی بلی کی طرح مجھ پر حملہ کر سکتی تھی۔ میں نے اپنی ناک اور پیشانی کو قمیص کے پلو سے صاف کر دیا۔

اس کا نہایت اسمارٹ وجود سانسوں کی تال پر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ شاید ہار مان چکی تھی یا اس وقت کو غنیمت جان کر خود کو سنبھالنے میں مصروف تھی۔ میں چارپائی کی بانہہ سے گھٹنے ٹکا کر اس پر جھک گیا۔ لباس میں آنکھوں کی جگہ پر موجود دو گول سوراخوں میں جھانکا تو پتہ چلا کہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کے سر کے عقبی حصے میں دکھائی دینے والے ابھار کو پکڑا۔ اس نے بالوں کو اکٹھا کر کے جوڑے کی شکل میں یہیں باندھ رکھا تھا۔ میں نے جوڑے کو مٹھی میں لے کر اس کا سر اُٹھایا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکلی۔ آنکھیں بدستور بند رہیں۔ میں نے اس کے لباس کا جوڑ دیکھنے کی کوشش کی تا کہ اس کا چہرہ ننگا کر سکوں مگر کامیاب نہیں ہوا۔ یہ عجیب الوضع لباس میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے اس میں گھسی کس طرح تھی..... میں نے اُسے سیدھا کیا۔ ٹٹول کر دیکھا تب پتہ چلا کہ ایک زِپ ناف سے شروع ہو کر نرخرے تک چلی گئی تھی، پھر دائیں ہاتھ مڑ کر گردن کا چکر کاٹتی ہوئی عقب میں جا کر ختم ہو گئی تھی۔ میں نے بکل کو کھینچ کر زِپ کو نرخرے تک کھول دیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ گردن پر رکھ دیا اور آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غیر معمولی حد تک شفاف تھیں۔ ایک جانی پہچانی آواز میرے کانوں میں اُتری، ''بس کرو ناں.....''

میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا، ذہن بھک سے اُڑتا ہوا محسوس ہوا اور میرے ہاتھ جہاں کے تہاں تھم گئے۔ مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا تو میں نے دانت پیس کر اس کے سر سے کنٹوپ نما کیپ کھینچ لی۔ موٹے سیاہ لباس میں کوئی اور نہیں، میڈم شکیلہ تھی جو اس وقت ستائشی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔

''میڈم! آپ؟''

میری حالت غیر ہوگئی۔ یوں لگا جیسے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

وہ تھوڑا سا پرے کھسکی اور کنٹوپ کو سر کے پیچھے دھکیل کر بولی، ''ویل ڈن! آئی فیل میکنگ لو ٹو یو شہریار!''

میں بے ساختہ چارپائی سے اُترا اور دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ میری حیران آنکھیں اسی پر جمی ہوئی تھیں اور میں سوچ میں غلطاں تھا کہ یہ اس نے کیا حرکت کی تھی؟ کیا اس نے محض میرا امتحان لیا تھا یا..... وہ کچھ اور چاہتی تھی؟

میں نے آہستگی سے کہا، ''میڈم! آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اگر آپ کو کوئی چوٹ لگ جاتی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔''

وہ اپنے بازو سہلانے لگی۔ ایسے میں وقتاً فوقتاً وارفتگیٔ شوق سے کن انکھیوں سے مجھے بھی دیکھ لیتی پھر ایک دم اُچھل کر چارپائی سے اُتری اور میرے مقابل آن کھڑی ہوگئی۔ میرے بازوؤں کو پکڑا، تھوڑا دبایا اور سہلانے کے سے انداز میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر پوری وسعت میں دیوار کے ساتھ پھیلا دیے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ مجھ سے چپک سی گئی تھی۔ اس کا سیاہ لباس میں پوشیدہ بدن مجھ پر اپنا پورا وزن ڈال چکا تو اس کی آواز میرے کانوں میں اُتری، ''پیا نے سونے کو کندن بنا دیا ہے۔''

میں بے جان انداز میں دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا اور وہ سرسراتی ہوا کی طرح مجھ سے اٹکھیلیاں کرنے میں مشغول تھی۔ اس کے قرب نے میری سانسوں کو غیر معتدل کر دیا۔ میں نے کہا، ''میرے کپڑوں پر خون لگا ہے، آپ کے کپڑے خراب ہو رہے ہیں.....''

وہ بولی، ''کوئی بات نہیں۔ مجھے ایسے ہی پرجوش اور توانا خون کی ضرورت ہے۔''

''آپ کچھ دیر آرام کر لیں، میں منہ ہاتھ دھونا کر آتا ہوں۔''

اس نے مجھے آزاد کر دیا اور گھوم گئی۔ بولی، ''جاؤ! منہ ہاتھ دھو لو۔''

میں باتھ روم میں گیا۔ واش بیسن کے اوپر دیوار میں نصب بڑے سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میڈم کی دی ہوئی چوٹوں نے میری ڈرائنگ خاصی بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ ماتھے پر دو بڑے بڑے گومڑ دکھائی دیے۔ ایک جگہ جلد پھٹ گئی تھیں جہاں سے خون رس رہا تھا۔ میری مونچھیں اور آدھا چہرہ ناک سے بہنے والے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ ناک سوج کر موٹی ہو گئی تھیں جس کے باعث شکل عجیب مضحکہ خیز انداز اختیار کر گئی تھی۔ ایک کان بھی سرخ تھا۔ کان پر اس کا پنچ گرز کی طرح لگا تھا۔ خون تو نہیں نکلا تھا مگر کان کی رنگت بتا رہی تھی کہ بدن کا شاید آدھا خون کان میں اکٹھا ہو گیا تھا۔

میں نے خون میں بھیگی ہوئی قمیص اُتار دی۔ شکر کیا کہ بنیان صاف تھی۔ ہاتھ منہ دھویا، بازو صاف کیا اور شلوار کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ کمرے کا فرش گرد آلود نہیں تھا ورنہ شلوار کا بھی ستیاناس ہو چکا ہوتا۔ بالوں میں کنگھی پھیری تو ہر بال کی جڑ دکھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے بڑی بے رحمی سے میرے بالوں کو نوچا تھا۔ اپنی ممکنہ حد تک نوک پلک سنوار کر جب میں کمرے میں آیا تو اسے کمرے کی عقبی کھڑکی میں کھڑے دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے اندھیرے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

میں نے سونے سے پیشتر چارپائی کے ساتھ جوتے اُتارے تھے جو اس وقت مختلف پوزیشنز میں مختلف جگہوں پر پڑے تھے۔ جوتے پہن کر اس کے پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی، ''شہریار! زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟''

میں بولا، ''نہیں..... ہاں..... آئی تو ہیں مگر سیریس نہیں ہیں۔''

وہ بولی، ''کیا ایک اور فائٹ ہو جائے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں میڈم!''

''کیوں؟'' وہ شوخی سے بولی، ''کیا ڈر گئے ہو؟''

''جی! مجھے اگر اندازہ بھی ہو جاتا کہ یہ آپ ہیں تو میں آپ پر ہاتھ نہ اُٹھاتا۔''

''وہ کیوں؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔

میں نے جواباً کچھ نہیں کہا تو وہ پلٹ کر میرے قریب آئی، شوخ انداز میں بولی، ''زپ کھولنا چاہتے تھے ناں؟ لو..... اب کھول دو.....''

اس نے سیاہ لباس کے نیچے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ جونہی مجھے اس کے حکم اور اپنی

خواہش کے انجام کا اندازہ ہوا، بری طرح نروس ہو کر بولا، ''وہ..... جی وہ تو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ مجھ پر اتنی رات گئے کس نے حملہ کیا ہے.....''

''اب تو دیکھ لیا ہے..... اور دیکھ لو.....''

اس نے جونہی زپ کا بکل پکڑا، میں ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ وہ پس پشت ہو کر اوجھل ہو گئی۔

میں نے پوچھا، ''کیا آپ اس کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئی تھیں؟''

''ہاں! میں اسے باہر سے کھول سکتی ہوں۔''

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟ نقصان بھی تو ہو سکتا تھا۔''

''کیا تم مجھے مار ڈالتے؟''

''نہیں..... میں آپ کے ہاتھوں مر سکتا تھا۔''

''تو کیا ہوا؟ کیا تم دنیا کے پہلے انسان ہوتے جو قتل ہوتا؟''

''نن..... نہیں مگر.....'' میں گڑبڑا گیا۔

''تم نے بڑی مہارت سے اپنا دفاع کیا ہے، میں خوش ہوئی ہوں۔'' اس کا لہجہ توصیف سے لبریز تھا، ''تم نے ایک غلطی کی تھی۔ کسی بھی حالت میں تمہیں اسلحے کے بغیر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہماری دنیا کا ایک عام اصول یہ بھی ہے کہ کسی بھی شخص پر، خواہ وہ کتنا ہی ہمدرد اور بہی خواہ کیوں نہ ہو، اعتماد نہ کیا جائے۔ آئندہ ایسی کوتاہی نہ کرنا ورنہ بہت بڑا نقصان اُٹھاؤ گے۔''

''میڈم! کیا آپ واقعی میرا امتحان لے رہی تھیں؟''

وہ بولی، ''ہاں! دیکھ رہی تھی کہ تمہارے خوب صورت بدن میں کتنی بجلی بھری ہوئی ہے۔ یہ بھی دیکھنا تھا کہ پیانے تم پر کتنی محنت کی۔''

''وہ تو آپ نے تب بھی دیکھ لیا تھا جب میں اور کھالا دست و گریباں ہوئے تھے۔''

''ہاں مگر وہ کوئی فائٹر تو نہیں تھا۔ عام سا لڑاکا تھا۔'' وہ میرے عقب میں آ گئی اور اس نے میرے بازوؤں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر مجھے بانہوں کے شکنجے میں لے لیا۔ میرے شانے پر چہرہ ٹکا کر سرگوشی کرنے لگی، ''میں جوانی سمیت دنیا کی ہر شئے خرید سکتی ہوں۔ مگر آج تک ایسا دوست ڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہی ہوں جس کا وجود پھول سی نرمی اور گداز رکھتا ہو، آگ کی تپش اور گولی کی سی تیزی بھی رکھتا ہو، وہ شہ سوار ما ہو مگر باوفا بھی ہو..... جان لینا اور دینا جانتا

ہو..... وہ سب کچھ ہو..... مجھے جو ملتا تھا وہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ جو سب کچھ ہوتا تھا وہ میری دسترس میں نہیں آتا تھا۔''

میں کان لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، ''تم کیسے ہو؟ کیا تم بالکل ویسے ہو، جیسے کی مجھے تلاش ہے یا مختلف ہو؟..... یہ امتحان اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔''

اس کا جسم مجھے چھو نہیں رہا تھا۔ ترپال جیسے مضبوط اور موٹے کپڑے کی تہہ ہمارے بدنوں کے بیچ میں حائل تھی مگر میرا احساس اس کے لمس سے مل کر جسم کو دہکانے لگا تھا۔ دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے؟' میں نے سوچا اور گھبرا کر اس کے ملفوف ہاتھوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہا تو وہ جلدی سے بولی، ''نہیں ناں.....''

وہ، خالدہ عرف بلو نہیں تھی، جسے میں بے دردی سے جھٹک دیتا اور وہ سہم کر پرے ہٹ جاتی۔ وہ غزالہ نہیں تھی، جس سے لپٹ جاتا اور وہ دامن چھڑا کر بھاگ جاتی۔ وہ میڈم تھی۔ وہ مالکن تھی جبکہ میں عمومی نوعیت کا ایک زیرِ بار شخص..... وہ چاہتی تو مجھے تمام رات ایک ٹانگ پر کھڑا ہونے کا حکم دے سکتی تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل کرتا..... میں نے کہا، ''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے میڈم! اگر آپ مجھے تھوڑا''

اس نے بات کاٹ کر کہا، ''جھوٹ نہ بولو۔''

میں چپ ہو گیا۔ میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا مگر مجھ میں تردید کی تاب نہیں تھی۔ میں نے پوچھا، ''کیا نوکروں کو آپ نے کہیں بھیج دیا ہے؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' وہ چونکی۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی ذہنی رو بدل دی تھی۔

''انہوں نے ہماری چیخوں پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا، تبھی حیرت ہو رہی ہے۔''

''وہ میرے حکم پر خاموش ہیں۔'' وہ بولی، ''تالی بجاؤں گی تو دروازے پر آ جائیں گے۔ کیا انہیں بلاؤں؟''

میں نے 'جی' کہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھولے، تالی بجائی مگر آواز برآمد نہیں ہوئی۔ اس کے ہاتھ عجیب وضع کے لباس میں چھپے ہونے کی وجہ سے بس 'دھپ، دھپ' کی مدھم سی آواز پیدا ہوئی۔ وہ ہنسی اور اپنی جلترنگ کے بیچ بولی، ''مجھے خیال ہی نہیں رہا..... اچھا! تم تالی بجاؤ۔''

میں نے تالی بجائی۔ چند لمحوں بعد دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میڈم نے اپنا وزن سنبھال کر مجھے آزاد کر دیا۔ میں دروازے تک گیا، آنکھوں ہی آنکھوں میں میڈم کی اجازت حاصل کی اور چٹخنی اُتار دی۔ دروازے پر طویل قامت نوکر کھڑا تھا۔ مؤدبانہ لہجے میں بولا، ''میڈم جی کتھاں ہن؟''

(میڈم کہاں ہیں؟)

میں نے ہاتھ کا اشارہ میڈم کی طرف کیا۔ میڈم تحکمانہ لہجے میں بولی، ''شہریار کے لیے نیا لباس اور چائے لاؤ اور میرے لئے کافی۔''

وہ پلٹ کر اوجھل ہو گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس نے ایک ڈارک بلیو کلر کی جینز کا ٹراؤزر اور سکائی بلیو ٹی شرٹ لا کر چارپائی پر رکھ دی۔ میڈم سے دریافت کناں ہوا، ''میڈم جی! آپ کا لباس بھی لے آؤں؟''

میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے حکم کی تعمیل کر دی۔ میڈم نے باتھ روم کا رُخ کیا۔ باہر آئی تو سراپا قیامت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا سفید چمکدار پستول بھی نظر آیا جو اس نے گریبان میں ڈال لیا۔ اس پر اورنج کلر کی کڑھائی دار تنگ قمیص، میچنگ ریڈ پاجامہ اور دوپٹہ، پاؤں میں سلم ٹو لیدر بوٹ..... لباس دیدہ زیب تھا یا اُس پر آ کر سج گیا تھا، میں یہ طے نہ کر پایا۔ نرم و گداز ہاتھوں پر تحیر آلود نگاہ ڈالی۔ دیکھنے میں گلابوں سی نزاکت رکھنے والے ہاتھوں کی حشر سامانیاں کچھ دیر قبل دیکھ چکا تھا۔ اگر اس فائٹ کے پیچھے کم و بیش بیس دنوں کی پیا جی کی مشاقانہ تربیت نہ ہوتی تو میں اس وقت اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ سرتاپا سراپائے حیرت تھی۔ اگر ایک زمانہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا تھا تو یہ اُسی کا کمال تھا۔

وہ میری غیر معمولی محویت پر فاخرانہ انداز میں مسکرائی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے باتھ روم کی راہ دکھائی۔ میں شرمسار ہو کر باتھ روم میں گھس گیا۔ لباس دیکھنے میں نیا تھا۔ ممکن تھا کہ پیا جی نے اپنے لیے خرید رکھا ہو۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ میڈم نے بازار سے میرے لیے منگوایا ہو یا آتے ہوئے خرید لائی ہو۔ بہرحال ٹراؤزر اور ٹی شرٹ مجھ پر فٹ آئے۔ اس دوران میں نوکر کمرے میں آیا تھا اور ایک عمومی نوعیت کی کرسی کمرے میں رکھ گیا تھا کیونکہ جب میں باتھ روم سے نکلا، میڈم اپنے کروفر کے ساتھ کرسی میں براجمان تھی۔ اس نے عام سے انداز میں

مجھے دیکھا اور آنکھوں سے 'اوکے' کا سگنل دے دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ملازم ٹرے میں دو بڑے سائز کے مگ رکھ کر لے آیا۔ ایک میں چائے تھی، دوسرے میں میڈم کی فرمائش کے مطابق بلیک کافی تھی۔

میں نے چائے کا گھونٹ حلق میں اُتارا اور ادب سے کہا، ''میڈم! مجھے آپ کی عدم موجودگی بہت فیل ہوئی۔''

وہ مسکرائی، ''کیوں؟''

''ویسے ہی۔''

''تم اپنی بہن کے لیے پریشان ہو گے۔ ہے نا؟''

''جی میڈم! مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔''

وہ تمکنت سے بولی، ''میر وشاہ نے مجھے رپورٹ دے دی ہے۔ ہم سبھی پریشان ہیں کہ اسے کون کہاں لے کر غائب ہو گیا ہے۔''

مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ میڈم جادوئی انداز میں ہاتھ ہلائے گی اور اس کے کارندے آن کی آن میں پروین کو میرے سامنے لا کھڑا کریں گے۔ اس نے میرے چہرے پر ہویدا ہونے والے تاثرات کو بھانپ لیا اور بولی، ''میرا خیال ہے کہ حیات خان کے بیٹے کا داؤ چل گیا تھا اور وہ تمہاری بہن اور عشرت کو لے کر کہیں رفو چکر ہو گیا۔ کیا تم اس کے دوستوں کے بارے میں جانتے ہو؟ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ کوئی ایسا دوست جس کے ہاں پہنچ کر وہ خود کو بالکل محفوظ خیال کرے؟''

میں نے اپنا ذہن دوڑایا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولی، ''عشرت کا کوئی دیوانہ.....؟''

میں نے کہا، ''ایک فوجی ہے..... مظفر گڑھ کے ایس پی کا بیٹا..... شاہد سلیم۔ عشرت اس میں دلچسپی لیتی ہے۔''

''سلیم شہزاد کا بیٹا؟'' وہ تعجب سے بولی۔

میں نے کہا، ''جی میڈم! آپ اسے جانتی ہیں؟''

اس نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''مگر وہ اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ خان کی بیلے والی حویلی تک پہنچنا ہی بڑا دل گردے کا کام ہے۔''

وہ ایک ذرا مسکرائی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''تم کہتے ہو کہ وہ عشرت کا دیوانہ ہے۔ وہ اگر عشق کرتا ہے تو پھر بیلے اور بندوق سے کہاں ڈرتا ہوگا۔'' کچھ دیر تک متوقف رہی، پھر گویا ہوئی، ''ہاں شہریار! اس کا باپ سپرنٹنڈنٹ ہے..... وہ خود آرمی آفیسر ہے..... جوان ہے اور سب سے بڑی بات کہ بقول تمہارے، عشرت اس میں دلچسپی لیتی ہے..... تو پھر وہ یقیناً اس اوکھلی میں سر دے سکتا ہے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، کہا، ''آپ سلیم شہزاد کو جانتی ہیں، با آسانی تسلی کر سکتی ہیں۔''

وہ حتمی انداز میں بولی، ''نہیں..... یہ کام تمہی کو کرنا ہوگا۔''

اس نے درست کہا تھا۔ وہ بہت مصروف زندگی گزار رہی تھی اور اپنے معاملات کو بخوبی سمجھتی تھی۔ وہ بولی، ''دیکھو ڈیئر! اب تم میری ٹیم کا حصہ ہو۔ میری ٹیم میری حفاظت کرتی ہے ناں کہ میں اپنے کارکنوں کی باڈی گارڈ بن کر محدود ہو جاؤں۔ جس طرح دوسرے لوگ میرے حکم پر دنیا کو تہس نہس کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں، اسی طرح تمہیں بھی میرے حکم کا انتظار کرنا ہوگا۔ اور ہاں! گھر پسند آیا؟''

میں نے متشکرانہ انداز میں کہا، ''جی میڈم! میں آپ کا احسان مند ہوں۔''

''یہ خاصا محفوظ مکان ہے۔ یہاں تمہارا خاندان شاد باد رہے گا۔ کسی چیز کی کمی محسوس کرو تو میر وشاہ سے کہہ دینا۔ وہ تمہاری بہت فیور کرتا ہے۔ رہا معاملہ تمہاری بہن والا..... تو تم اب خود طاقت ور ہو۔ شہ زور ہو۔ جسے چاہو، اپنے ساتھ ملا لو اور اُسے تلاش کرو۔ میں پیسہ، اسلحہ اور بازو تمہارے حوالے کر سکتی ہوں..... بیک بون ڈیفنس بھی..... او کے؟''

میں نے کہا، ''او کے میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔''

''یو مین آئی ایم نائس لیڈی؟''

''یس میڈم!''

وہ ایک ذرا مسکرائی، موتیوں جیسے خوب صورت دانتوں کو نچلے ہونٹ پر دائیں بائیں رگڑا اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا کر بولی، ''اِف آئی ایم نائس، دین کس می ڈیئر..... کم آن!''

اب تک میری جھجک خاصی کم ہو چکی تھی۔ میں نے قدم بڑھایا، قریب پہنچ کر جھکا اور ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ عقیدت کا بوسہ نسبتاً طویل ہو گیا۔ اس نے بھی ہاتھ نہیں کھینچا۔

میں نے سر اُٹھایا مگر اس کا گداز ہاتھ نہیں چھوڑا اور اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ بھانپ لیا کہ اس نے میری گستاخی کا بُرا نہیں منایا تھا۔ میں نے پھر ہاتھ چوم لیا۔ اس کی مترنم ہنسی کمرے میں گھنٹیوں کی طرح بج اُٹھی۔

میں جونہی ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹا، وہ بولی، ''انسان کمپیوٹر نہیں ہوتا۔ یہ وہ آؤٹ پٹ بھی دیتا ہے جو اسے ان پٹ کی صورت میں نہیں ملی ہوتی۔ تم نے ایک بوسہ میرے حکم کی تعمیل میں لیا، دوسرا بوسہ اپنے ہونٹوں کی طلب پر..... کیا میں نے درست کہا ہے؟''

میں نے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا، ''جی میڈم! مجھے اندیشہ تھا کہ تاخیر کو گستاخی شمار نہ کیا جائے ورنہ سر اُٹھانے کی تاب نہیں رہی تھی۔''

وہ منہ سے کچھ نہ بولی مگر اس کی آنکھوں نے سمجھا دیا کہ اس نے میری جسارت کو قبول کر لیا تھا۔

وہ بولی، ''اگر تمہیں نیند آئی ہے تو جا کر سو جاؤ۔ مجھے بھی واپس جانا ہے۔''

''اس وقت؟'' میرے منہ سے تعجب بھرا کلمہ نکلا۔

''ہاں..... ابھی تو بمشکل ایک بجا ہوگا۔ خیر! کسی کو بلاؤ۔''

میں دروازے تک گیا۔ برآمدے میں جھانکا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ نوکر کو آواز دی۔ وہ فوراً کمرے سے نکل کر میری طرف آیا اور دروازے پر رُک گیا۔ سینے پر مخصوص انداز میں ہاتھ رکھ کر بولا، ''جی سائیں! میڈے لائق کوئی خدمت ہووے تاں ڈساوو.....''

وہ میرے عین مقابل کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں، برآمدے کی روشنی کے پار گھپ اندھیرے میں، کوئی سوفٹ کے فاصلے پر ایک شعلہ سا چمکا۔ عین اُسی لمحے میرے سامنے کھڑا ہوا نوکر لڑکھڑا کر مجھ سے ٹکرایا اور رات کے سناٹے کا راج فائر کی خوف ناک آواز نے توڑ دیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہیں ہوئی کہ شعلہ کسی گن کی نال نے گولی کے ساتھ اگلا تھا اور گولی مجھ سے ٹکرانے والے ملازم کی پشت میں گھس گئی تھی۔ اسے چیخنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ میں نے اسے جلدی سے کمرے میں گھسیٹ لیا۔ وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا اور اس کی پشت پر عین دل کے مقام پر خون کا فوارا سا اُبل کر کپڑوں کو تر کرنے لگا تھا۔

برآمدے کے کچھ باہر تک روشنی تھی۔ اس کے پار گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے گولی چلانے والا دکھائی نہیں دیا تھا، نہ ہی وہ دکھائی دے سکتا تھا۔ میڈم اس دوران اُٹھ کر میرے

قریب پہنچ آئی تھی۔ تیز لہجے میں بولی، ''اسے چھوڑو، اپنا فکر کرو۔ گولی کس طرف سے آئی ہے؟''

میں نے تیز لہجے میں کہا، ''لان کے پار سے، غالباً چار دیواری کے اوپر سے چلائی گئی ہے۔''

وہ 'کم آن' کہہ کر چھلاوے کی طرح اُچھلی، عقبی کھڑکی میں جا کر ایک لمحے کو رُکی پھر باہر کود گئی۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی۔ کھڑکی کے باہر فارم ہاؤس کا پچھواڑا تھا۔ دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر پانچ چھ فٹ بلند دیوار تھی۔ کمرے اور دیوار کے بیچ اونچی نیچی، گھاس والی سخت زمین تھی۔ ایسے ہی وقت میں دوسرا فائر ہوا۔ ایک تیز چیخ فضا میں بلند ہوئی اور کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی میڈم رُک گئی۔ مدھم مگر تحکمانہ آواز میں بولی، ''دیوار کے پار چلو.....اس طرف خطرہ ہے۔''

میں نے جست بھری اور چار دیواری کی طرف بڑھا۔ وہ میرے عقب میں تھی۔ دیوار پر سے چھلانگ لگانے کے بعد ہم دونوں دیوار کی جڑ میں دبک گئے۔ رات کے اس سناٹے میں بھاگتے قدموں اور نہ سمجھ میں آنے والی آوازوں نے اپنا تسلط جما لیا۔ تیسرے فائر کی آواز نسبتاً قریب سے سنائی دی۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا، ''یہ کون ہو سکتے ہیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ہمہ تن گوش بیٹھی رہی۔ میں نے پنجوں کے بل اُٹھ کر بڑی احتیاط سے دیوار کی منڈیر سے کھلی کھڑکی والے کمرے میں دیکھا۔ مجھے ایک شخص عین کھڑکی میں کھڑا دکھائی دیا۔ چونکہ ٹیوب لائٹ اس کے عقب میں روشن تھی، اس لیے اس کا چہرہ تاریک تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی گن نظر آ گئی۔ میں چونکہ اندھیرے میں تھا، اس لیے میرا اُبھرتا ہوا سر اُسے دکھائی نہیں دیا تھا ورنہ وہ مجھے با آسانی شوٹ کر سکتا تھا۔

پھر اس کے عقب میں ایک اور شخص نمودار ہوا۔ دونوں کھڑکی میں رُک کر باہر جھانکنے لگے۔ میں نے اپنے تئیں نتیجہ اخذ کیا کہ ان پر ہمارا اس طرف سے کود نکلنا باور ہو چکا تھا۔ میں جھکا اور میڈم کو ہاتھ کا اشارہ کر کے دیوار کے ساتھ ساتھ مغربی جانب بڑھا۔ اس نے میری تقلید کی۔ کوئی سو فٹ کے فاصلے پر مویشیوں کا بھانہ تھا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے بھانے تک آئے۔ بڑی سی برآمدہ نما عمارت میں گائیں اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں جو اس وقت اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اندھیرے میں ان کے محض ہیولے سے دکھائی دیتے تھے۔

فارم ہاؤس کے اطراف سے بخوبی واقف تھا۔ بھانے کے عقب میں ایک بلند کمرہ تعمیر کیا گیا تھا جس میں بھوسہ اسٹاک کیا جاتا تھا۔ میری منزل وہی ٹاور نما کمرہ تھا جس کے عین نصف میں ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ اس کھڑکی کے ذریعے بھوسہ کمرے میں ڈالا جاتا تھا۔ میڈم نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا، بولی، ''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

میں نے کہا، ''بھوسے والے کمرے میں.....''

اسی لمحے ہمارے عقب میں ملی جلی آوازوں کا شور سنائی دیا۔ میرے اندازے کے مطابق آنے والے چار پانچ یا کم وبیش آدمی تھے۔ وہ بھانے اور فارم ہاؤس کی سانجھی دیوار کے اس پار کھڑے تھے۔ میں اور میڈم بھینسوں کے بیچ سے گزر کر دیوار تک گئے اور پھر اس کے ساتھ چمٹ کر چلتے ہوئے آخری سرے تک چلے گئے۔ جونہی ہم چکر کاٹ کر بھانے سے نکلے، بھوسے والا کمرہ ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے اس کے اوپر سے چکر کاٹا تو کھڑکی سے لگی ہوئی دیسی طرز کی چوبی سیڑھی دکھائی دی جو اس وقت اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہورہی تھی۔ میں نے میڈم کو اس پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بندر کی سی پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ جب اس کے پیچھے پیچھے میں کھڑکی عبور کر کے کمرے میں پہنچا، اس کو بھوسے پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ بھوسے پر چلنا مشکل ہوتا ہے مگر میں رکے بغیر کمرے کی مخالف دیوار تک چلا گیا۔

پیا جی نے فارم ہاؤس میں مختلف جگہوں پر اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ یہ اس کی احتیاط پسندی تھی جو اس وقت میرے کام آسکتی تھی۔ میں نے اندازے کے مطابق جگہ کا انتخاب کیا اور برق رفتاری سے ہاتھوں سے بھوسے کو ہٹایا۔ چند ہی لمحوں میں مجھے مطلوبہ ہدف حاصل ہوگیا۔ مجھے وہاں چھپی ہوئی آٹو میٹک گن مل گئی جس کے ساتھ ایک اضافی میگزین بھی موجود تھی۔ میں نے گن اور میگزین کو جھاڑا اور سرگوشی کی، ''میڈم! ادھر آئیں۔''

وہ میرے عقب میں ہی کھڑی تھی، بولی، ''کیا ہے؟''

میں نے اسے دیوار کی مخصوص انداز میں نکلی ہوئی اینٹوں کی سیڑھی تک پہنچایا اور کہا، ''اوپر چھت پر چلیں، میں آپ کے پیچھے آرہا ہوں۔''

کھڑکی تک بھوسے سے بھرے ہوئے اس مخصوص ساختہ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھی کی نشاندہی کرنا ضروری تھا۔ چند ثانیے انتظار کے بعد میں نے بھی اینٹوں پر پیر رکھ دیا۔ سیڑھیاں سات آٹھ فٹ کے بعد چھت

میں واقع ایک چوکور سوراخ پر جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ اس سوراخ سے نکل کر جب میں چھت پر پہنچا تو میڈم کو کہنیوں کے بل لیٹے پایا۔ میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا منڈیر تک آ گیا۔ جھانک کر نیچے دیکھا، سوائے اندھیرے اور دو کمروں کی کھڑکیوں اور روشن دانوں کے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

میڈم دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر وہ میرے بہت قریب چلی آئی تھی۔ اس کی سانسوں کی مدھم سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے یہاں خود کو محفوظ تصور کیا اور خود پر قابو پاتے ہوئے گن کی نال منڈیر کے اوپر رکھ کر لاک پن ہٹا دی۔ اب میں یہاں سے کسی بھی نظر آنے والے دشمن کا با آسانی نشانہ لے سکتا تھا۔

میڈم نے سرگوشی کی، ''گن ایک ہی ہے؟''

میں نے کہا، ''جی میڈم! آپ فکر نہ کیجئے، میں کسی کو یہاں تک نہیں پہنچنے دوں گا۔ ویسے آپ اپنا پسٹل نکال کر ہاتھ میں لے سکتی ہیں۔''

میری آنکھیں کسی شکاری جانور کی طرح اندھیرے کے سینے میں پیوست تھیں۔ حملہ آور فارم ہاؤس کے اندر تھے اور ان میں سے کوئی بھی مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ پانچ سات منٹ گزر گئے تو مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت میں جب میں میڈم کو یہاں ٹھہرا کر نیچے اُترنے اور فارم ہاؤس میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا، مجھے اس کمرے کی کھڑکی میں ایک ہیولا دکھائی دیا جس سے کچھ دیر پہلے ہم کود کر باہر آئے تھے۔ میں نے گن سیدھی کی، نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

فضا میں فائر اور چیخ کی تیز آواز گونجی اور پرسکوت ماحول میں یک لخت ہلچل پیدا ہو گئی۔ میں نے کھڑکی میں کھڑے شخص کو گرتے نہیں دیکھا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ گولی کھا کر ناکارہ ہو چکا تھا اور کھڑکی خالی ہو گئی تھی۔ کوئی اور ہیولا دکھائی نہیں دیا۔

میڈم بولی، ''ویل ڈن..... نہ صرف یہ مورچہ بڑا کارآمد ہے بلکہ تم بھی اچھے نشانچی بن چکے ہو۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں کسی اور دشمن کو تاڑنے لگا۔ میری چلائی ہوئی گولی اعلان جنگ ثابت ہوئی تھی کیونکہ دوڑتے قدموں کی آوازیں معدوم ہو گئیں اور ایک دم ہی ماحول پر خطرناک خاموشی طاری ہو گئی۔ حملہ آوروں نے سمجھ لیا تھا کہ ہم سنبھل چکے ہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی پوزیشن لے چکے ہیں، اس لیے وہ

پوری طرح محتاط ہو چکے تھے۔

چونکہ ہم پر جوابی فائر نہیں داغا گیا تھا، اس لئے مجھے اطمینان ہوا کہ ان لوگوں کو ہماری لوکیشن کا پتہ نہیں چلا تھا۔ میں نے زیر استعمال گن جیسی ایک گن پیا کی زیر نگرانی استعمال کر رکھی تھی، اس لیے میں اس کے تمام فنکشنز کے بارے میں جانتا تھا۔ یہ دو فٹ لمبی جرمن ساختہ دور مار گن بہت خطرناک اور ڈیول سسٹم تھی۔ اس کے میگزین میں ستائیس گولیوں کی گنجائش تھی جنہیں سنگل فائر اور برسٹ فائر دونوں صورتوں میں نال سے نکالا جا سکتا تھا اور چار سو میٹر تک با آسانی ٹارگٹ کلنگ کی جا سکتی تھی۔ اس کی مزل پر سائیلنسر فٹ کیا جا سکتا تھا۔

اچانک میں چونکا۔ فارم ہاؤس کی چار دیواری کے اندر انتہائی بائیں ہاتھ پر میں نے ناہموار زمین پر روشنی کا دائرہ متحرک دیکھا۔ کوشش کے باوجود مجھے روشنی کا منبع دکھائی نہیں دیا۔ کوئی چھپا ہوا شخص ٹارچ کی مدد سے ہمیں تلاش کر رہا تھا۔ میرے پاس سوائے انتظار کے کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ جونہی روشن دائرہ دیوار کی سمت بڑھا، مجھے پتہ چل گیا کہ ٹارچ بردار شخص کمرے کی نکڑ کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ جب تک اس کا وجود نکڑ سے باہر نہیں نکل آتا تھا، میں اس کا نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔

میرا انتظار بے سود گیا۔ وہ نمودار نہیں ہوا بلکہ روشنی کا ہالہ بھی اوجھل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے عین سامنے فارم ہاؤس کی چھت پر ٹارچ روشن ہو گئی۔ ٹارچ بردار میری نظروں میں آ چکا تھا۔ وہ نکڑ والے کمرے کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا اور بڑے محتاط انداز سے چار دیواری کے باہر ہمیں کھوج رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی حرکت سے اس کی پوزیشن کا اندازہ لگایا اور نشانہ لے لیا۔ میں نے ٹارچ سے فٹ اوپر اور اتنا ہی دائیں جانب فائر کیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار 'شاوا بھئی' نکلا کیونکہ دردناک اور کٹیلی چیخ نے میری کامیابی کا اعلان کر دیا تھا۔

بھوسے والے ٹاور نما کمرے کی منڈیر کی ساخت جدید طرز کے بینکر جیسی تھی۔ شاید اسی ممکنہ ضرورت کے تحت اسے اتنا مضبوط کیا گیا تھا۔ میرے نشانے کی داد دینے والے ٹارچ بردار کی ٹارچ چھت پر گر گئی تھی اور اس سے نکلنے والی روشنی نے چھت کے مخصوص حصے کو روشن کر دیا تھا مگر مجھے کوشش کے باوجود بھی ٹارچ بردار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک میرے برابر میں لیٹی ہوئی میڈم نے تیز سرگوشی کی، ''ادھر..... وہ رہا ایک.....

دائیں طرف دیکھوناں!'

میں نے دائیں جانب غور سے دیکھا۔ ایک سایہ سا لپکا تھا جس کا میں نے نشانہ لینا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ بھانے کے پختہ ستون کے پیچھے غائب ہو گیا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور آنکھیں شکاریوں کی طرح ارد گرد لپک رہی تھیں۔ ایسے میں میرے بائیں ہاتھ پر چارے کے کھیت میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے پہلو بدلا، گن سیدھی کی مگر مجھے وہ جگہ دکھائی نہیں دی جہاں سے سرسراہٹ کی آواز ابھری تھی۔ اچانک روشنی کے سفید دائرے نے چارے کا وہ حصہ روشن کر دیا جہاں کوئی چھپا ہوا تھا۔ میں ابھی صورت حال کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ فضا تڑتڑاہٹ کی خوف ناک آواز سے گونج اُٹھی۔ چونکہ میں فصل کے گول روشن حصے پر نظریں مرتکز کیے بیٹھا تھا، اس لئے مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ کسی نے عین اسی جگہ پر برسٹ مارا تھا جہاں کسی کی موجودگی کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔

میڈم کی تیز مگر دبی دبی آواز سنائی دی، ''ادھر دیکھو..... وہ چھت پر.....''

میں نے فارم ہاؤس کی چھت پر دیکھا تو بری طرح چونک گیا۔ کچھ دیر پہلے جس دشمن کو ناک آؤٹ کیا تھا، وہی ٹارچ لئے چارے کے کھیت کو روشن کر رہا تھا۔ مجھے دھوکہ ہوا تھا۔ وہ یا تو میرے فائر پر معمولی زخمی ہوا تھا یا اس نے چیخ کر مجھے دھوکہ دیا تھا۔

میڈم بولی، ''برسٹ ادھر سے مارا گیا ہے.....''

اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا، اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ٹارچ بردار کو نشانے پر لے چکا تھا۔ میڈم بولی، ''نہیں..... ڈونٹ فائر..... ہم پوائنٹ آؤٹ ہو جائیں گے..... ابھی کچھ نہ کرو۔''

طاقت ور ٹارچ کی تیز روشنی ابھی تک چارے پر اسی جگہ پر مرکوز تھی جہاں برسٹ مارا گیا تھا۔ وہاں سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک برسٹ اور مارا گیا۔ اب مجھے پتہ چل گیا کہ فارم ہاؤس کے بالکل میرے مقابل والے کمرے کی چھت پر کوئی گن بردار لیٹا ہوا تھا جو ٹارچ کی رہنمائی میں فائر کر رہا تھا۔

میں نے گردن موڑ کر کہا، ''میڈم! کیا اس پر فائر کروں؟''

وہ بولی، ''ابھی نہیں.....''

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ مجھ میں حکم عدولی کی تاب نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ ان معاملات

میں مجھ سے کہیں زیادہ طاق اور مشاق تھی۔ ٹارچ بردار نے اب اس جگہ کی احاطہ بندی ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا، اس لیے وہ اردگرد روشنی پھینکنے لگا تھا۔ فارم ہاؤس کی چاردیواری سے کوئی دوسوفٹ کے فاصلے پر متوازاً کچا کھال تھا جس پر گھنے درختوں کی قطار تھی۔ اسے شاید ان درختوں پر ہماری موجودگی کا شبہ ہوگیا تھا اس لیے ٹارچ کا رُخ درختوں کی طرف ہوگیا۔ پھر اس نے ٹارچ کو بھانے کی طرف گھمایا، دومرتبہ آف اور آن کیا اور اپنے کسی ساتھی کو درختوں کی طرف ٹارچ کا اشارہ کیا۔

ایسے ہی وقت میں مجھے فارم ہاؤس کی چاردیواری کے ساتھ ساتھ دائیں سے بائیں نکل کر جاتا ہوا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ جھکے جھکے انداز میں تیزی سے مشرقی سمت میں بڑھ رہا تھا، اس لئے اندھیرے میں وہ انسان کی بجائے کوئی بچھڑا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے نشانے پر تھا مگر میڈم کی ہدایت کے پیش نظر میں نے اس پر فائر نہیں کیا۔ وہ ٹارچ بردار کے عین نیچے پہنچ کر مڑا اور دو فٹ بلند چارے میں گھس کر غائب ہوگیا۔ شاید کرولنگ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، اس لیے میری نگاہوں سے یکسر اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ یا تو برسٹ والی جگہ پر جارہا تھا یا درختوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ عین اُس جگہ پر دکھائی دیا جہاں کچھ دیر پہلے برسٹ مارا گیا تھا۔ اس نے اپنی ٹارچ روشن کرلی اور وہ جگہ کنگھالی۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی آوارہ کتا یا سیہہ وغیرہ ہوگی جو کسی بل میں گھس گئی ہوگی۔ اس نے ٹارچ آف کردی اور میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ کمرے پر کھڑے شخص نے ٹارچ کی مدد سے ہمیں کھوجنے کا سلسلہ جاری رکھا مگر وہ پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا کہ اس کے ساتھی پر روشنی نہ پڑے اور کوئی ہماری نظروں میں نہ آنے پائے۔

چارے میں چھپ کر تلاش کرنے والا درختوں کی قطار تک پہنچ گیا تھا۔ اچانک مجھے کھال میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سامنے والی منڈیر چھوڑ دی اور چھت کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ جونہی میں نے اس کا نشانہ لیا، میڈم گھٹنوں کے بل اُٹھ کر گن کی نال پر جھک گئی۔ بولی، ''فائر.....''

میں نے لبلبی دبادی۔ میرا نشانہ خطا گیا تھا یا وہ اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ میں نے اندازے کے مطابق کھال میں چندفٹ آگے دو درختوں کے موٹے تنوں کے بیچ کھال میں دوسرا فائر کردیا۔

وہ مجھے دکھائی نہیں دیا تھا مگر گن سے نکلنے والی اندھی گولی نے اسے چاٹ لیا تھا۔ وہ اچانک ہوا میں بلند ہوا اور کھال کے باہر لڑھک کر نکلا۔ اُٹھ کر چند قدم دوڑا پھر گر گیا۔ اس پر ٹارچ بردار نے روشنی کا گولا پھینکا۔ وہ زیادہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا مگر چارے کی مخصوص انداز کی حرکت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔

میڈم کی سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ نال کے دہانے کا اس طرح گھیراؤ کر کے بیٹھی تھی کہ نال سے نکلنے والے مخصوص بارودی شعلے کو فارم ہاؤس کی جانب سے دیکھا نہ جا سکے۔ اس کی یہ پالیسی کامیاب رہی تھی، ہم پر کوئی فائر نہیں کیا گیا بلکہ درختوں پر یکے بعد دیگرے تین برسٹ مارے گئے جو یقیناً اکارت گئے تھے۔ البتہ ان تیز اور ڈراؤنی آوازوں نے بھانے میں کھلبلی مچا دی تھی۔ مویشی جاگ کر اچھلنے کودنے، رسیاں تڑانے اور شور مچانے لگے تھے۔

بھانے میں چھپا ہوا دشمن ہماری تلاش میں درختوں تک پہنچ کر مردہ یا زخمی ہو چکا تھا۔ اس سے سردست گلوخلاصی پانے کے بعد ہم بہ عجلت پہلی والی پوزیشن پر آ گئے۔ نکڑ والے کمرے کی چھت پر ٹارچ بدستور روشن تھی۔ میں نے کہا، ''بہت ڈھیٹ انسان ہے یہ تو..... میڈم! برسٹ فائر کروں؟''

وہ بولی، ''کتنی گولیاں ہیں تمہارے پاس؟''

میں نے کہا، ''دو میگزین ہیں..... لوڈڈ۔''

وہ بولی، ''صرف دو..... نہیں! تم برسٹ مارنے کی سنگین غلطی نہیں کرو گے ورنہ ہم نہتے ہو جائیں گے۔''

میں نے جذباتی رو میں بہہ کر یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اندھیرے میں میڈم کے ہیولے کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا اور اپنے کینوس پر آنکھیں جما دیں۔ میرے کینوس، یعنی فارم ہاؤس کے پچھواڑے کی وسعت بمشکل تیس میٹر اور بلندی تین چار میٹر تھی۔ ماسوائے ٹارچ، چار عدد کھڑکیوں اور اتنے ہی روشن دانوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چار دیواری، نکڑ اور چھت کا تعین دن کے اجالے میں دیکھے ہوئے منظر کو چشم تصور میں سجا کر کیا جا سکتا تھا۔ اچانک مجھے اپنے کینوس پر نقل و حمل کا احساس ہوا۔ دائیں جانب والے آخری کمرے، جس میں فارم ہاؤس کے نوکر رہائش پذیر تھے، کی چھت پر مجھے فائر کرنے والے شخص کی پوزیشن کا علم ہو گیا۔

وہ کرولنگ کرتا ہوا دوسرے کمرے کی چھت پر آ رہا تھا۔ میں نے اسے نشانے پر لیا اور فائر کر دیا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی اس کی کھوپڑی کو پاش پاش کر گئی تھی کیونکہ اس کے اچھلنے اور پھر چھت پر گرنے کا انداز چغلی کھا گیا تھا۔

میں ایک اور دشمن کو داغنے میں کامیاب تو ہو گیا مگر فضا تڑتڑاہٹ کی مخصوص آواز سے لرز اُٹھی۔ اگر ہم فوراً چھت پر لیٹ نہ گئے ہوتے تو شاید کوئی گولی ہمارا کام تمام کرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ کئی گولیاں منڈیر پر لگیں اور اینٹوں اور سیمنٹ کے ننھے ننھے ٹکڑے اڑ کر ہم پر گرے۔

میڈم نے ڈانٹا، ''تم نے غلطی کر ہی لی ناں.....''

مجھے خفت ہوئی۔ برسٹ کے بعد اکا دکا گولیاں منڈیر کو توڑنے لگیں۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں فائرنگ بلاتخصیص ساری منڈیر پر ہو رہی تھی۔ اب ہم پہلی سی آزادی کے ساتھ فارم ہاؤس میں چھپے ہوئے دشمنوں کو تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر منڈیر کے اوپر سے دیکھنا چاہا تو میڈم نے میرا سر نیچے کر دیا، بولی، ''پاگل ہوئے ہو کیا؟ خاموشی سے لیٹے رہو۔''

میں نے زچ ہو کر کہا، ''کب تک میڈم؟''

وہ بولی، ''ابھی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو.....''

میں نے بے بسی سے سر ڈال دیا۔ ایسے ہی وقت میں دماغ میں ایک چھناکا سا ہوا۔ ایک کارگر ترکیب سوجھ گئی جس سے میں فائرنگ کرنے والوں کو نہ صرف دھوکہ دے سکتا تھا بلکہ انہیں ان کی مچانوں سے نکالنے میں کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے گن میڈم کو تھمائی اور کچھ بتائے بغیر اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہنیوں کے بل تیزی سے کھسکتا ہوا چھت کے چوکور سوراخ تک آیا اور نچلے دھڑ کے بل سوراخ میں اتر کر لٹک گیا۔ میں نے اینٹوں کی سیڑھی کے ذریعے اترنے کی بجائے کودنا مناسب جانا کیونکہ بھوسے کی وجہ سے چوٹ لگنے کا احتمال نہیں تھا۔

میں نے دن کے وقت یہاں بہت سے پولی تھین کے بیگ پڑے دیکھے تھے۔ دیہاتی زبان میں، عرف عام میں انہیں گٹو کہا جاتا تھا۔ ان میں کھاد اور کھل وغیرہ لائی جاتی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر دو گٹو تلاش کر لیے۔ جلدی جلدی ان میں بھوسہ بھرا۔ اس جیسے تمام زمیندارانہ کاموں پر مجھے مہارت حاصل تھی، اس لیے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ان گٹوؤں کے

دھاگوں سے ان کے منہ باندھے اور باری باری چھت پر منتقل کیا۔ میڈم ہنوز چھت پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی۔

فائرنگ رُک چکی تھی۔ میں نے گٹوؤں کو اندازے سے چھت کے اس حصے تک دھکیلا جہاں کمرے کے نیچے بڑا سا گڑھا موجود تھا۔ میرے اس منصوبے کا دارومدار اَب قسمت پر تھا۔

میں نے میڈم سے گن لی اور مؤدبانہ انداز میں کہا، ''آپ ایسے ہی لیٹی رہیں میڈم!''

اس نے تیزی سے پوچھا، ''کیا کرنے لگے ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گن سر سے بلند کر کے پہلو کے بل کروٹیں لیتا ہوا بھوسے بھرے گٹوؤں کے پاس پہنچا۔ محتاط انداز میں ٹارچ والے کو دیکھا۔ ٹارچ ابھی تک روشن تھی اور اس کی تیز روشنی ہماری منڈیر پر پڑ رہی تھی۔ میں نے گن کی نال منڈیر سے باہر نکالی اور اپنی پوری مہارت بروئے کار لا کر ٹارچ پر فائر کر دیا۔ اتنی دور سے ٹارچ کا صحیح نشانہ لینا آسان کام نہیں تھا مگر میری پہلی کوشش ہی کامیاب ہو گئی۔ ٹارچ بجھ گئی۔ میں نے ہاتھ کو حرکت دی اور سر نیچے کر کے دو تین فائر فارم ہاؤس کی چھت پر مختلف جگہوں پر کر دیے۔ بجلی کی سی تیزی سے میں نے گٹو کو ہوا میں بلند کیا۔ میرا منصوبہ کامیاب ہوا اور گٹو پر گولیوں کا برسٹ مارا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک ہی وقت میں دو مختلف سمتوں سے گٹو پر فائرنگ کی گئی تھی۔ میں نے حلق سے تیز چیخ نکالی اور گٹو کو منڈیر پر سے نیچے دھکیل دیا۔ ایک بار پھر تڑتڑاہٹ کی تیز آواز نے فضا کا سینہ چیر کر رکھ دیا۔ کسی گولی نے منڈیر کو نہیں چھوا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ زیرک دشمن نے اندھیرے میں گرتے ہوئے گٹو کو ہدف سمجھ کر اس پر اندھا دھند گولیاں چلا دی تھیں۔

اسی اثنا میں مجھے اپنے جسم پر میڈم کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا، ساتھ ہی اس کی متفکر آواز میرے کانوں میں پڑی، ''شہریار..... شہر..... کیا تم ٹھیک ہو؟ کیا ہوا؟''

میں نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا، وہ اندھیرے کا ہی حصہ معلوم ہو رہی تھی، کہا، ''جی میڈم! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ فکر نہ کیجیے۔''

وہ بولی، ''یہ چیخ تمہاری تھی ناں؟''

میں نے کہا، ''ہاں مگر مجھے کوئی گولی نہیں لگی۔''

اس کے حلق سے لمبی سانس برآمد ہوئی اور بولی، ''تھینکس گاڈ..... میں غلط سمجھی تھی۔''

میرے اندازے کے مطابق گٹو بھوسے والے کمرے کی بنیاد میں کھدے ہوئے گڑھے

میں جا گرا تھا۔ اگر کوئی اس پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھنا چاہتا تو آسانی سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں چند قدم اور آگے گھسٹا۔ پوزیشن بدلی اور میڈم کو اپنی جانب بلایا۔ وہ بولی، ''تم کر کیا رہے ہو؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔''

میں نے سر نکالے بغیر دو تین فائر کئے اور دوسرے گٹو کو منڈیر سے نکالتے ہوئے کہا، ''میڈم! اب آپ بلند آواز میں چیخیں گی۔''

میری توقع بر آئی۔ جونہی گٹو منڈیر سے باہر نکلا، ان گنت گولیاں اس میں پیوست ہو گئیں۔ میڈم کے حلق سے تیز اور دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے میری ہدایت پر اپنا بھرپور کردار ادا کر دیا تھا۔ میں نے گٹو کو دھکا دیا اور منڈیر پر سے نیچے گرا دیا۔ اس کے ساتھ بھی پہلا سا سلوک کیا گیا۔ زمین پر گرنے تک گٹو میں اور بھی کئی گولیاں گھس گئی ہوں گی۔

تب تک میڈم میرا منصوبہ سمجھ کر فرطِ مسرت سے مجھ پر لد چکی تھیں۔ بولی، ''ویل ڈن مسٹر شہریار..... آئی واز جسٹ تھنکنگ اباؤٹ دِس ڈارلنگ.....''

میری چھاتی فخر سے پھیل گئی۔ اس کا بالائی نصف وجود میری پشت پر لد کر روح کو راحت افزا انداز میں گدگدا رہا تھا اور کانوں کے پاس ہی اس کی سانسوں کی مالا کھنک رہی تھی۔ اتنا قرب اور لمس پا کر میں سن ہو گیا۔ میں نے جلدی سے کہا، ''ابھی میرا کام مکمل نہیں ہوا، پلیز نیچے اُتریں اور مجھے پوزیشن لینے دیں۔''

اس نے اُترنے میں دیر نہیں کی۔ میں نے کھسک کر منڈیر پر نئی اور مختلف پوزیشن سنبھال لی۔ فارم ہاؤس کی چھت پر ایک ہیولا دکھائی دیا۔ چار دیواری کی دیوار کے پاس ایک گن بردار کھڑا دکھائی دیا جو بھوسے والے ٹاور نما کمرے کی بنیاد پر ٹارچ کی روشنی پھینک رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ہم پر حملہ کرنے والوں کی تعداد کتنی تھی۔ کتنے ناکارہ ہو چکے تھے اور کتنے ابھی باقی تھے۔ ہمارے پاس ایک لیڈیز پسٹل اور گن تھی۔ میڈم کے پسٹل کی رینج کم تھی، اس لیے اس سے فائدہ اُٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔ گن سے ایک وقت میں ایک نشانہ ہی لیا جا سکتا تھا۔

میں نے فی الفور فیصلہ کیا اور چھت پر کھڑے شخص پر اوپر تلے تین فائر کئے۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ چھت پر گر گیا۔ میں نے گن کی نال کا رُخ نیچے کیا۔ چار دیواری کے ساتھ لگا ہوا شخص جھک کر بھاگنے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میرا ایک فائر خطا گیا جبکہ دوسرا اس کے بدن کو چھونے میں کامیاب رہا۔ وہ زمین پر گر گیا اور اس نے اندھا دھند جوابی برسٹ فائر کیا۔

اسے میری لوکیشن کا علم نہیں تھا اس لیے اس کی گن سے تواتر کے ساتھ نکلنے والی گولیاں بھوسے والے کمرے کی دیوار پر لگیں۔ فضا خوف ناک آوازوں سے گونج اُٹھی۔ میری گن سے نکلنے والی اوپر تلے کی پانچ سات گولیوں میں سے کسی نے کام دکھا دیا تھا اور اس کی گن خاموش ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں محض جانوروں کے ڈکرانے اور ان کے اچھلنے کودنے کے سبب پیدا ہونے والے آہنی زنجیروں اور کنڈوں کی کھنک دار آوازیں رہ گئیں۔ میں نے مشاق نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم پر یلغار کرنے والے سبھی مارے گئے تھے۔

میں شدید اعصابی تناؤ کا شکار تھا۔ جونہی کچھ اطمینان ملا، میں نے گن چھت پر رکھ کر اس پر ماتھا ٹکا دیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ میڈم گھٹنوں کے بل میرے پاس آئی۔ میرے بال مٹھی میں بھر کر اوپر کھینچتے ہوئے بولی، ''یو آر وِنر آف دِس ڈیتھ فائٹ..... آئی لو یو.....''

میں گھٹنوں کے بل اُٹھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر ہیولائے ہوئے بدن کے محلِ وقوع نے سمجھا دیا کہ وہ میرے بہت قریب ہو چکی تھی۔ اس نے میرے بال چھوڑ دیے، میرے رخساروں پر ہاتھ رکھے اور سرگوشی کی، ''آئی سے..... آئی لو یو.....''

میں خاموش رہا، وہ پھر بولی، ''کہو ناں..... آئی لو یو ٹو.....''

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ''نہیں میڈم! میں اس قابل نہیں ہوں۔''

اس نے پھر سرگوشی کی، ''تم اس قابل یقیناً ہو کہ مجھے کچھ کہہ سکو۔''

''میڈم! ابھی خطرہ موجود ہے، آپ یہاں رہیں، میں نیچے جاتا ہوں اور فارم ہاؤس کی خبر لیتا ہوں۔ کوئی بچ گیا ہے تو اسے تلاش کرتا ہوں۔''

وہ ہنسی، ''ٹھیک ہے..... مگر ہم دونوں چلتے ہیں۔''

میں اسے ساتھ لے جانے کے حق میں نہیں تھا مگر وہ بضد تھی۔ ہم دونوں اسی راستے سے نیچے اُترے۔ بھوسے کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر اُس نے کہا، ''شکر کرو کہ بھوسے کو آگ نہیں لگی ورنہ ہمیں اتنی بلند چھت سے چھلانگ لگانا پڑتی۔''

اس نے درست کہا تھا۔ بھوسے کا ڈھیر پٹرول کی طرح آگ پکڑ سکتا تھا۔ میں نے زمین سے کم و بیش دس بارہ فٹ بلند کھڑکی میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ جھانک کر کسی غیر متوقع خطرے کو بھانپنے کی کوشش کی مگر اندھیرا مطلق خاموش تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر چوبی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ میرے پیچھے پیچھے میڈم بھی نیچے اُتر آئی۔ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ

ڈال کر پسٹل نکال لیا اور مشاقانہ انداز میں بولٹ کھینچ کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے بھانے کے عقب میں آئے۔ راستہ بدل کر فارم ہاؤس کے مغربی پچھواڑے کی سمت آگے کی طرف بڑھے۔

اس نے سرگوشی کی: ''لگتا ہے کہ میدان صاف ہے۔''

مجھے اس کی بات سے اختلاف نہیں تھا مگر میرے نزدیک احتیاط لازم تھی۔ ہم کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ ستر اسی فٹ تک بڑھنے کے بعد اس نے میری ٹی شرٹ پکڑ کر رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا تو اس نے کہا، ''ہم یہاں سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوں گے۔''

وہاں دیوار کا دس بارہ فٹ لمبا حصہ قدرے کم بلند تھا اور کسی دقت کے بغیر دیوار کو عبور کیا جا سکتا تھا۔ میں نے گن کندھے پر لٹکائی اور ہاتھوں کے بل ہوا میں بلند ہو کر دیوار پھلانگ لی۔ چند لمحوں بعد میڈم بھی اندر تھی۔

اس کی رہنمائی میں ہم چند قدم واپس شمال کی جانب آئے، ایک کھڑکی کے قریب رک کر سن گن لی اور پھر میڈم نے مخصوص انداز میں انگلیوں کو حرکت دے کر بند کھڑکی کھول دی۔ محتاط انداز میں اندر جھانکا پھر اُچھل کر کھڑکی کے راستے اندر اُتر گئی۔ میں نے اس کی تقلید کی اور گن کو فائر پوزیشن میں لے کر اسے کور فراہم کر دیا۔

کمرے میں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر فارم ہاؤس کا چوڑے چکلے سینے والا سیاہ فام ملازم چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر پڑنے والی ٹیوب لائٹ کی روشنی اس کے مردہ ہونے کی خبر دے رہی تھی۔ اس کا لحاف چارپائی سے نیچے فرش پر گرا ہوا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر اس کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس کے دل میں گولی لگی تھی۔ چھاتی اور ارد گرد تمام بستر خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے کافی دیر گزر گئی تھی کیونکہ جما ہوا خون اپنی رنگت تبدیل کر چکا تھا۔

میڈم کے ہونٹ سکڑے، پیشانی پر برہمی کی غماز لکیروں کا جال سا تنا اور پھر وہ کندھے اُچکا کر، لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے پستول والا ہاتھ نکالا اور محتاط انداز میں باہر جھانکا۔ پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ ہم نے آنے والے چند منٹوں میں سبھی کمرے دیکھ لیے۔ کھلی کھڑکی والے

کمرے میں، جہاں میں سونے کے لیے لیٹا تھا، کھڑکی کے قریب فرش پر ایک جسیم شخص آڑے ترچھے انداز میں ڈھیر ہوا پڑا تھا۔ میڈم نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے مجھے اس کا معائنہ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے نرخرے میں گولی لگی تھی جو گردن کے پار گزر گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف اور موت کی دہشت سے پھٹنے کو آئی ہوئی تھیں۔

وہ چھ فٹ قامت والا خاصا تگڑا شخص تھا جس میں اس وقت زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ شکل سے چھٹا ہوا بدمعاش نظر آ رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، بڑھی ہوئی شیو اور الجھے الجھے بال..... اس سے چند فٹ کے فاصلے پر گن اور ٹارچ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دیسی ساخت کی کاربین ابھی بھی دبی ہوئی تھی جسے شاید چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس کی نبض یا دھڑکن محسوس کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ گردن سے پار ہونے والی گولی نے اسے دوسری سانس کی مہلت تک نہیں دی ہوگی۔ گردن کے عقب میں نظام زندگی کو رواں دواں رکھنے والا احرام مغز اُڑ چکا تھا اور آدھے کمرے میں اس کے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے اس کے مرنے کی اطلاع نشر کی۔ اس دوران میڈم باتھ روم کا جائزہ لے کر کمرے کے وسط میں آ چکی تھی۔ نفرت بھرے انداز میں اس پر نگاہ ڈال کر بولی، ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید میر وشاہ اسے پہچانتا ہو۔''

آخری کمرے میں پہنچ کر اس نے ایک الماری سے اپنا موبائل فون نکالا۔ نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر بولی، ''میر وشاہ! اپنے چند لوگوں کو لے کر فارم ہاؤس پر فوراً پہنچ جاؤ۔ میں رات کو فارم ہاؤس پر تھی اور کسی گروہ نے ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر حملہ کر دیا۔ اب ان کی لاشیں یہاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''

میر وشاہ کی خمار آلود آواز بھنبھناہٹ کی صورت میں میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے کچھ کہا، جو میرے پلے نہیں پڑا۔ میڈم بولی، ''نہیں..... میرے ساتھ شہریار ہے۔ میں اسے لے کر یہاں سے ابھی نکل رہی ہوں۔ راستے میں ملاقات ہوگی۔''

دوسری جانب کی بات سن کر بولی، ''بکواس مت کرو۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کرو اور آ کر دیکھو کہ مجھ پر کن لوگوں نے چڑھائی کرنے کی کوشش کی ہے اور پولیس کے آنے سے پہلے یہاں کے معاملات اپنے ہاتھ میں کر لو۔''

میں نے دیکھا تھا کہ اس کا چہرہ میر وشاہ کی کسی بات پر سرخ ہو گیا تھا۔ فون بند کر کے میری

طرف مڑی اور ایک ننھی سی ٹارچ مجھے تھماتے ہوئے بولی، ''ہمیں یہاں سے ابھی نکلنا ہے۔''

میں کمرے سے نکلا۔ کھلے صحن کا بلب پہلے ہی میڈم نے برآمدے میں نصب سوئچ بورڈ پر سے آن کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں رُکی، میں دوڑ کر سیڑھیوں تک گیا۔ دو دو زینے پھلانگ کر چھت پر پہنچا۔ سیڑھیوں کے بالکل قریب ہی ایک شخص کو اوندھے منہ لیٹے پایا۔ میں نے نکڑ والے کمرے پر روشنی پھینکی۔ ایک وجود وہاں بھی ڈھیر تھا۔ میں نے باری باری دونوں کا جائزہ لیا۔ ایک مر چکا تھا۔ اس کی پیشانی میں گولی لگی تھی جب کہ آخری کمرے کی چھت پر پڑا ہوا ٹارچ بردار پیٹ پر ہاتھ رکھے لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے پکارا، کوئی جواب نہ پا کر پھر پکارا مگر وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پایا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی۔ پتہ چلا کہ وہ مرنے والا تھا۔

اس سے دس بارہ فٹ کے فاصلے پر اگلی منڈیر کے پاس کوئی فٹ بھر لمبی ٹارچ پڑی تھی۔ اس کے پاس ایک ماؤزر تھا جو چند قدم دور گرا پڑا تھا۔ اس کا چہرہ میرے لئے اجنبی تھا۔ میں نے دانت پیسے اور اس کی گردن پر پیر رکھ کر سر کو ایک جانب مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ 'کٹاک' کی زوردار آواز میرے کانوں میں پڑی اور اس نے حلق سے 'اوغ' کی آواز نکال کر گردن ایک جانب ڈال دی۔ زندگی سے اس کا ناتا کٹ گیا تھا۔

فارم ہاؤس کی وسیع و عریض چھت پر کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر نیچے اُترا۔ میڈم کو برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑا دیکھا۔ انگلیوں میں کی رنگ گھماتے ہوئے مستفسر ہوئی، ''ہاں! کیا رہا؟''

میں نے رپورٹ دی۔ وہ بولی، ''ٹھیک ہے، اب ہمیں یہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ اچھلی اور کھلے صحن کے پار مین گیٹ کی طرف دوڑی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ بڑے گیٹ کے بغلی دروازے سے ہم دونوں نے ایک ہی وقت میں باہر جھانکا۔ باہر دو گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ میں نے کہا، ''دونوں خالی ہیں۔''

وہ بولی، ''ایک میری ہے جبکہ دوسری حملہ آوروں کی ہے۔''

''آپ کی گاڑی کون سی ہے؟''

''وہ والی، ٹویوٹا سیلون.....''

میں نے اس کے ٹائروں پر نگاہ ڈالی۔ پھر حملہ آوروں کی پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر کا سرسری جائزہ لیا۔ مبادا کہ کوئی اس میں چھپا نہ ہو۔ ازراہ احتیاط میڈم کو وہیں ٹھہرا کر میں لینڈ کروزر کے پاس گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کے اندر بغور جھانکا، خالی پا کر میڈم کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گیٹ سے نکل کر اپنی ٹویوٹا سیلون کی طرف بڑھتے ہوئے بولی، ''او کے! ہیئر وِی گو ناؤ.....''

اس نے چابی کی مدد سے گیٹ کھولا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میرے لیے اگلا دروازہ ان لاک کیا۔ میرے بیٹھنے تک وہ انجن کو اسٹارٹ کر چکی تھی۔

گاڑی نئی نہیں تھی مگر بہت اچھی حالت میں تھی۔ انجن کی آواز بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ ستائش بھرے انداز میں بولی، ''آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم بہت کارآمد انسان ہو۔''

میرا سینہ تفاخر کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ میں نے قدرے اعتماد سے پوچھا، ''آپ کا اشارہ پہلی فائٹ کی طرف ہے یا دوسری کی طرف؟''

وہ مسکرائی، ''میں نے دونوں جھڑپوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔''

اس دوران وہ یوٹرن لے کر گاڑی کو بڑی سڑک کی طرف جانے والے کچے راستے پر ڈال چکی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اچانک کوئی نہایت سرد چیز میری گردن پر آن ٹکی۔ میں چونکا، گردن موڑ کر عقب میں دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ بھاری اور سرد آواز گاڑی میں گونج اُٹھی، ''خبردار! تم دونوں نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ میری گردن کو چھونے والی سرد شئے کسی گن یا پسٹل کی نال تھی۔ میرے اور میری میڈم کے لیے کار موت کا پنجرہ بن گئی تھی اور ہمیں اپنی کار کی عقبی سیٹ کی طرف نہ دیکھنے کی بھیانک سزا مل چکی تھی۔

میں نے کن اکھیوں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بیک مرر میں دیکھ رہی تھی جبکہ اس کا نچلا ہونٹ اوپر والے پر چڑھ کر ساکت ہو چکا تھا۔ میں اس ناگہانی صورتِ حال میں بُری طرح نروس ہو گیا تھا مگر میں نے دیکھا کہ میڈم کا چہرہ بالکل اسپاٹ تھا۔ جیسے یہ اس کے لیے معمول کی ہی کوئی کارروائی ہو۔

میں نے طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور پوچھا، ''تم کون ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟''

وہی بھاری آواز گونجی، ''ہم کون ہیں، تمہیں جلد پتہ چل جائے گا۔ فی الحال یہی چاہتے ہیں کہ بغیر کوئی چالاکی دکھائے خاموش بیٹھے رہو۔''

ایک اور کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی، ''شہزادی! دائیں طرف نہیں، بائیں طرف گاڑی موڑ لو.....''

میڈم نے کن اکھیوں سے میری طرف دیکھا اور بے بسی سے اسٹیئرنگ ویل بائیں جانب گھما دیا۔ گاڑی پختہ سڑک پر چڑھ کر شہر کی مخالف سمت میں کسی انجان منزل کی طرف رواں ہوگئی۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے اس نئی افتاد سے نمٹنے کے لیے سوچ رہا تھا۔ ابھی ہم نے بمشکل دو اڑھائی کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ میڈم نے مجھے مخاطب کیا، ''کیا تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''

میں نے حیرت سے جواب دیا، ''نہیں تو.....''

ساتھ ہی میں نے میڈم کی طرف دیکھا۔ حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ وہ بالکل نارمل دکھائی دینے لگی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پکنک اسپاٹ کی طرف اپنی مرضی سے ڈرائیو کر رہی ہو۔

اس نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی، پھر بیک مرر میں جھانک کر کہا، ''اوئے مونچھوں والے! تمہارے پاس سگریٹ تو ہوگی، مجھ سلگا کر دو۔''

اس کے عقب میں آگے کی سمت جھک کر بیٹھے ہوئے شخص نے ڈپٹ کر کہا، ''بکواس نہ کرو ورنہ.....''

میڈم پر اس کی ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ منہ بنا کر بولی، ''کیا ورنہ؟ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو تمہیں پسند نہ ہو، پھر، دھمکیاں کیوں دیتے ہو، سگریٹ سلگا کر دو۔''

وہ غرایا، ''میں سگریٹ نہیں پیتا۔''

''پھر تمہارے ہونٹ سیاہ کیوں ہیں؟'' میڈم نے عقب نما میں دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

وہ تلملا کر بولا، ''خاموش رہو ورنہ تجھے گولی مار دوں گا۔''

''سگریٹ مانگنے کے جرم پر؟'' میڈم کا لہجہ خاصا استہزائیہ تھا، ''اس سے بڑی کمینگی دنیا میں شاید کوئی نہیں ہوگی۔ اپنے ساتھی سے مانگ لو، اس کے پاس تو ہوگی ناں!''

میں حیرت سے میڈم کو دیکھ رہا تھا جو لحہ بہ لحہ اپنے عقب میں بیٹھے ہوئے شخص کو تاؤ دلاتی جا

رہی تھی۔

''مم..... میں کہہ رہا ہوں کہ خاموش رہو۔ ہمارے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ اب اگر تم نے سگریٹ کا نام لیا تو میں.....''

''گولی مار دوں گا..... واہ.....'' میڈم نے اس کی بات کاٹ کر تمسخرانہ انداز میں اس کی نقل اُتاری، ''کیا تمہارے پاس ہے؟''

اس نے گردن موڑ کر میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص سے سوال کیا تھا۔

وہ کیا کرنا چاہتی تھی، میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ میرے عقب میں بیٹھے ہوئے شخص نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے قدرے بلند اور غصیلی آواز میں کہا، ''میں نے ایک سگریٹ مانگی ہے، وائن کا سوال تو نہیں کر دیا جو تم لوگ یوں نخرے دکھانے لگے ہو۔''

بھاری آواز والا بیزاری سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ اس کے ساتھی نے سرد لہجے میں کہا، ''اگر تم کوئی ڈراما کرنے کے بارے سوچ رہی ہو تو یاد رکھو، میں ٹرائیگر دبانے میں لحظہ بھر کی دیر بھی نہیں کروں گا۔''

میڈم نے اچانک بریک لگا دیے۔ کار چالیس پچاس کی اسپیڈ سے خستہ حال سنگل سڑک پر جا رہی تھی۔ بریک لگانے سے ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے دیکھا۔ گڑھوں والی سڑک بائیں ہاتھ نوے درجے کے زاوے پر مڑ رہی تھی۔

میڈم نے اسٹیئرنگ پر سے ہاتھ اُٹھا لیے اور بولی، ''سگریٹ کے بغیر مجھ سے ڈرائیونگ نہیں کی جا سکتی۔ اگر تم لوگ کار چلا سکتے ہو تو آ کر چلاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

بھاری آواز والا دانت پیس کر بولا، ''میں کہتا ہوں، شرافت سے گاڑی چلاؤ.....''

''میں کہتی ہوں، نہیں چلاؤں گی۔'' میڈم نے قطعی لہجے میں کہا۔

اس کو کور کرنے والے نے پسٹل کی نال کا دباؤ گردن پر بڑھاتے ہوئے دانت کچکچائے، ظاہر کیا کہ وہ گولی چلانے والا ہے، پھر سرد لہجے میں بولا، ''میں تمہارے ساتھ کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا مگر تم مجھے مجبور کر رہی ہو..... میں تین تک گنوں گا، اگر تم نے گاڑی نہ چلائی تو شوٹ کر دوں گا۔''

میڈم کے لبوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ تیر گئی۔ جونہی دھمکی دینے والے نے 'ایک' کہا، وہ فوراً بول پڑی، ''دو..... اور تین..... اب گولی چلا دو۔ میں نے تمہاری مشکل حل کر دی ہے۔''

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ کن اکھیوں سے میڈم پر تنے ہوئے پسٹل والے ہاتھ کو

دیکھ رہا تھا، میڈم کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ پر نگاہ ڈال رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میڈم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟ وہ ایسی طفلانہ حرکتیں کیوں کرنے لگی تھی؟ میں نے یہ بھی سوچا کہ کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا تھا مگر پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ بہت قوی اعصاب کی مالک تھی، ایسی سچویشن میں کوئی بھی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہیں کر سکتی تھی۔

اس پر گولی نہیں چلائی گئی بلکہ دھمکانے والے نے گویا شکست تسلیم کر لی۔ بولا، ''مجھے مجبور نہ کرو کہ میں.....''

میڈم نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ ویل پر اکتائے ہوئے انداز میں مارے اور کہا، ''بار بار گولی مارنے کا ڈراوا نہ دو، ہمت ہے تو مار دو۔ جس زندگی میں سگریٹ جیسی سستی شئے بھی نہ ملے، اس کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہوتا ہے۔''

مجھے اس کے پیچھے بیٹھا ہوا پستول بردار شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے گرے کلر کا دوہری تہہ والا اونی مفلر گلے میں ڈال رکھا تھا۔ خاصا جسیم اور گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا اور چہرے بشرے سے بہت سفاک اور عادی مجرم معلوم پڑتا تھا۔ وہ دانت کچکچا رہا تھا، اس کے جبڑوں کے اعصاب تیزی سے تھرک رہے تھے اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گولی مارنا چاہتا ہو مگر فائر نہ کرنے پر مجبور ہو۔ اچانک مجھے میڈم کی چالاکی سمجھ میں آ گئی۔ وہ یہی کچھ بھانپ کر اسے زِچ کر رہی تھی۔ پیاجی نے مجھے سمجھایا تھا کہ دشمن کو بوکھلاہٹ کا شکار کرو، اسے زِچ کرو اور مجبور کر دو کہ وہ اشتعال میں آ کر احمقانہ حرکت کر ڈالے۔ ایسے میں خود کو فائدہ اُٹھانے کیلئے تیار رکھو۔ شاید میڈم اسی کھیل میں مشغول تھی۔

مفلر والے کے ساتھی نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال کر میڈم کی طرف اچھالی اور ایک غلیظ گالی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے مجھے ماں بہن کی گالی دی ہو، میرا دورانِ خون یک لخت تیز تر ہو گیا اور آنکھیں جل اُٹھیں۔ میں نے اپنی جھولی میں رکھی ہوئی گن کے دستے پر ہاتھ رکھا اور شعلہ بار لہجے میں کہا، ''تیری تو.....''

میڈم کو گالی دینے والا چوکس تھا۔ لمحہ بھر میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کر مجھ پر جھک گیا اور اس نے پستول کی نال میری گردن میں بے دردی سے چبھو دی۔ مجھے اشتعال میں اُس کی پروا نہیں تھی مگر میڈم کے اشارے نے مجھے ساکت کر دیا۔ وہ مسکرا کر بولی، ''نہیں ڈیئر! مجھے سگریٹ پینے دو۔ بڑی مشکل سے ملی ہے۔ یہ اناڑی لوگ شاید اغوا کرنے کے آداب سے واقف نہیں

ہیں۔''

میں نے شکوہ کناں نظروں سے میڈم کو دیکھا جو سگریٹ منہ میں دبا کر دیا سلائی جلا رہی تھی۔اس نے جونہی دھواں حلق میں اُتارا، اسے کھانسی آ گئی۔اس نے پھر کش لیا، پھر کھانسنے لگی۔

عقب میں درشت آواز ابھری، ''گاڑی بڑھاؤ، یہ اداکاری بعد میں کر لینا۔ہم تمہیں بہت سے ایسے مواقع دیں گے۔''

میڈم نے گیئر لیور دبایا اور گاڑی بڑھا دی۔موڑ کاٹنے کے بعد بمشکل ایک کلومیٹر ہی آگے گئے تھے کہ اس نے پھر بریک لگا دیے۔

کار میں غراہٹ گونجی، ''اب کیا مصیبت ہے؟''

وہ کھانستے ہوئے بولی، ''میں نے کبھی کار میں بیٹھ کر سگریٹ نہیں پی، تم لوگ ادھر رکو، میں باہر کھڑی ہو کر دو چار لمبے لمبے کش لے لوں۔پھر آگے چلیں گے۔''

یہ کہتے ہی اس نے بڑی بے خوفی سے دروازہ کھول دیا۔ہمیں گن پوائنٹ پر رکھنے والے شاید اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ اچانک گھبرا سے گئے اور فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ایسی حالت میں انہیں کیا کرنا چاہیے تھا۔

مجھے کور کرنے والے نے دبی دبی آواز میں اپنے ساتھی سے کہا، ''نیچے اُترو، فوراً..... بھاگے تو بے دریغ شوٹ کر دینا.....''

مفلر والے نے بھی میڈم کے پیچھے گاڑی سے اُترنے میں دیر نہیں لگائی مگر میڈم، جو بظاہر اپنا گیٹ کھول کر لاپروا انداز میں کھڑی تھی، ہاتھ دکھانے میں کامیاب ہو گئی۔مفلر والے جسیم شخص کے پیر جونہی زمین پر پڑے، میڈم نے اس کے دروازے کو پوری قوت سے واپس دھکیل دیا۔نتیجتاً وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر گیا۔اس کا سر کار کے اندر جبکہ نچلا بدن زمین پر جا گرا۔میڈم نے دوسرے لمحے دروازہ اپنی جانب کھینچا اور ایک مرتبہ پھر پوری قوت سے دھکیل دیا۔مفلر والے کی تیز کراہ بلند ہوئی اور اس کے منہ سے مغلظات کا سیلاب اُمڈ آیا۔میڈم نے یہ سب کچھ اتنی اچانک اور ناقابلِ بیاں پھرتی سے سرانجام دیا تھا کہ مجھے کور کرنے والے کو اپنے ساتھی کی مدد کرنے کا موقع تک نہ ملا۔

چونکہ گاڑی کے اندر لائٹ کی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اور باہر گہری اور سیاہ رات طاری

تھی اس لیے مجھے میڈم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھ پر مسلط شخص ایک لمحے کے لیے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا جبکہ میں کن انکھیوں سے اپنی گردن میں چبھی ہوئی پستول کی نال کو دیکھ رہا تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے موقع ڈھونڈ رہا تھا۔

شاید اُن دونوں کے درمیان خاموش کمٹمنٹ ہو چکی تھی کہ ایک میڈم کو کور کرے گا جبکہ دوسرا مجھے گن پوائنٹ پر رکھے گا، تبھی مجھے کور کرنے والے نے اپنے ساتھی کی مدد کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایسے ہی وقت میں پرسکوت ماحول فائر کی تیز آواز سے لرز اُٹھا۔ ساتھ ہی ایک ہولناک چیخ سناٹے کا قلب چیر گئی۔ مفلر والے شخص کو میڈم نے موقع پاتے ہی گولی مار دی تھی۔ چند لمحوں کے بعد دوسرا فائر ہوا اور گاڑی کو ایک جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی عقبی دروازہ 'ٹھک' کی زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

''امجد..... امجد..... کیا ہوا؟'' میرے عقب نشین کی تیز اور قدرے گھبرائی ہوئی آواز اُبھری مگر اُسے جواب نہیں ملا۔ اس نے دو تین مرتبہ اپنے ساتھی کو پکارا اور پھر شاید اپنے تئیں طے کر لیا کہ اُسے اَب کسی مدد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

چند لمحوں بعد میڈم کا ہیولا فرنٹ گیٹ میں لہرایا اور وہ دائیں ہاتھ میں پسٹل لئے ڈرائیونگ سیٹ پر آن گری۔ گرتے ہی مچھلی کی طرح تڑپی اور پہلو بدل گئی۔ اب اس کے پستول کا رُخ دونوں سیٹوں کے درمیانی خالی جگہ کی طرف تھا۔ اسپاٹ لہجے میں بولی، ''تم نے مجھے سگریٹ دی تھی..... دی تھی ناں؟..... اس لیے تمہیں زندہ چھوڑ دیتی ہوں، کیا یاد کرو گے۔''

گاڑی کے اندر کی سچویشن یکسر بدل کر رہ گئی تھی۔ میں دم بخود میڈم کو دیکھ رہا تھا جس نے چند ہی لمحوں میں کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ میری گردن پر نال کا دباؤ بدستور موجود تھا جبکہ میڈم اکیلے بچ جانے والے اغوا کار پر پستول تانے بیٹھی تھی۔

''پستول نیچے کر لو ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔'' وہ دھاڑا۔ اس کی آواز نے اس کی گھبراہٹ کو مجھ پر آشکار کر دیا تھا۔

''بھلے مار دو، میں تجھے مار دوں گی۔ معاملہ برابر رہے گا۔'' میڈم نے عام سے انداز میں کہا، ''اگر تم چاہو تو میں گاڑی وہاں تک لے جا سکتی ہوں جہاں تم ہمیں لے جانا چاہتے تھے۔ کیا خیال ہے؟''

اسے یقین نہیں آیا۔ آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ تبھی اُلجھ کر بولا، ''چلو، گاڑی چلاؤ۔''

''پستول اس کی گردن سے ہٹالو۔ میں بھی تمہارا نشانہ چھوڑ دیتی ہوں۔ ہم دشمن ہی سہی، مگر یہ مختصر سا سفر اچھے دوستوں کی طرح طے کر سکتے ہیں۔''

وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بازی ہار چکا تھا۔ اگر وہ مجھ پر گولی چلا بھی دیتا تو میڈم کے پستول سے نکلنے والی گولی سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پستول کی نال میری گردن پر سے ہٹالی۔ میڈم نے آنکھوں سے دونوں سیٹوں کے درمیان خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''اس پستول کو یہاں رکھ دو.....''

اس نے پستول رکھ دیا جو میڈم کے پیروں کی طرف لڑھک گیا۔

میں نے گن سنبھالی، میڈم کا اشارہ پا کر گیٹ کھولا اور کار سے اُتر گیا۔ گاڑی کے پیچھے سے گھوم کر ڈرائیور سائیڈ کے پچھلے دروازے کی طرف آیا۔ کار سے دو تین فٹ کے فاصلے پر مفلر والا اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کا سر روڈ سائیڈ پر پڑا تھا جبکہ دونوں ٹانگیں ڈھلوانی جھاڑیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اس کا پستول والا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے بطور احتیاط پاؤں کی ٹھوکر اس کے ہاتھ پر رسید کی۔ پستول اس کی مردہ گرفت سے نکل کر جھاڑیوں میں جا گرا۔

میں نے دروازہ کھولا، سیٹ پر سر ٹکائے، آنکھیں موندے شکست خوردہ انداز میں بیٹھے ہوئے شاہ زور پر نظر ڈالی اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے گن کی نال اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ میڈم نے اطمینان بھرے انداز میں مجھے دیکھا اور پستول اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ عقب نما میں دیکھ کر بولی، ''انہیں ہماری زندگی کی ضرورت تھی، ہمیں نہیں ہے۔ یہ کوئی بھی حرکت کرے تو گولی مار دینا۔''

''جی میڈم!'' میں نے سخت مگر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ میڈم نے ہونٹ سکیڑے، سیٹی بجائی اور گاڑی چلا دی۔ اس نے رفتار کم رکھی تھی اور صاف عیاں تھا کہ وہ ٹرن لینے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں تھی۔ سڑک تنگ تھی۔ جھاڑیاں، سرکنڈے اور مختلف قسموں کے درخت سڑک کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھے۔ ایک کلومیٹر کے بعد تھوڑی سی کھلی جگہ میسر آئی۔ میڈم نے بڑی مہارت سے ٹرن لیا اور بولی، ''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ ابھی تک آنکھیں موندے پڑا تھا۔ اس کے تازہ شیو یافتہ سانولے چہرے پر جا بجا زخموں کے نشانات تھے۔ کنڈل دار مونچھیں، گھنگھریالے بال اور موٹے سیاہ ہونٹ.....اس کا

صورتی تاثر ہی کسی بدقماش شخصیت کا سا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر گن کا دباؤ بڑھایا اور درشت لہجے میں کہا، ''جواب دو، کیا نام ہے تمہارا؟''

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے گھورا۔ یوں کہ مجھے سمجھ آ گئی کہ وہ خوفزدہ نہیں تھا، محض شکست خوردہ تھا اور کسی بھی وقت اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ارادہ کر سکتا تھا۔ میرا لہجہ مزید کرخت ہو گیا، ''کیا تم نے سنا نہیں؟''

اس نے مجھ پر نگاہیں مرتکز رکھیں، ایک گہری سانس خارج کی اور بے تاثر لہجے میں کہا، ''ماں باپ نے پیدائشی رجسٹر میں ظفر اقبال لکھوایا تھا مگر قانون کے رجسٹروں میں ظفری ڈکیت لکھا گیا۔''

اس کی آواز اور شکل گواہی دیتی تھی کہ وہ نامی گرامی ڈکیت تھا اور سچ بول رہا تھا۔

میڈم نے گاڑی روک دی۔ پلٹ کر اُسے بغور دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا، ''کیا بات ہے میڈم؟ کیا آپ اسے جانتی ہیں؟''

وہ بدستور اُسے دیکھتے ہوئے بولی، ''ہاں! اس کا نام تو بہت سن رکھا تھا، آج اس سے ملاقات بھی ہو گئی۔''

ظفری ڈکیت نے پھر اپنی آنکھیں بند اور چہرہ سپاٹ کر لیا۔ میڈم نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر کڑی نظر رکھنے کا حکم دیا اور گاڑی چلا دی۔ کچھ ہی دیر میں ہم ایک مرتبہ پھر فارم ہاؤس پر تھے۔ میڈم نے فارم ہاؤس پر حملہ آور ہونے والوں، جن میں سے ایک اس وقت میری تحویل میں تھا، کی پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر کے برابر میں کار روکی اور اُتر کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ چونکہ اُس نے مجھے اُترنے کا حکم یا اشارہ نہیں دیا تھا، اِس لیے میں ظفری ڈکیت کو گن پوائنٹ پر رکھے گاڑی میں بیٹھا رہا۔

اس نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں اور سپاٹ لہجے میں پوچھا، ''تم کون ہو؟''

میں نے میڈم کے انداز کی نقل کرنے کی کوشش کی، ''میں..... میں اُس سگریٹ پینے والی کا باڈی گارڈ ہوں۔''

اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ اُبھری، ''اچھا! میں سمجھا کہ شاید وہ تمہاری باڈی گارڈ ہے۔''

اس نے 'اچھا' پر خصوصی زور دیا تھا۔ میں اس کا طنز سمجھ گیا تھا۔ ایک ذرا غصہ بھی آیا مگر

برداشت کر کے بولا، ''وہ کون تھا جو میڈم کی گولی کا شکار ہو گیا؟''

''وہ میرا ساتھی تھا.....''

''الو کے پٹھے! یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے ڈانٹا۔

''ڈکیت کا ساتھی ڈکیت ہی ہو سکتا ہے، کوئی امام مسجد تو نہیں..... یہ علم تو تمہیں ہونا چاہیے۔''

''مجھے کیا علم ہونا چاہیے، اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس دوران میں نے میڈم کو موبائل فون پر کسی سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ گیٹ پر لگے ہوئے سوواٹ کے بلب کی روشنی میں ہماری جانب پشت کئے کھڑی تھی۔

''امجد خانیوالیا..... بڑا نام تھا اُس کا علاقے میں، آج پتہ چلا کہ وہ مٹی کا مادھو تھا۔ ایک رَن (عورت) نے اُسے احمق بنا کر اُوپر روانہ کر دیا۔'' اس کے لہجے میں اپنے ساتھی کی موت کا دُکھ نہیں، بلکہ گہرا طنز چھپا ہوا تھا۔ مجھے ایک ذرا حیرت ہوئی۔ اُسے علم نہیں تھا کہ وہ جسے محض ایک رَن سمجھ رہا تھا، وہ ایک وقت میں کئی مردوں پر بھاری ثابت ہونے والی میڈم شکیلہ تھی جس کے آگے بڑے بڑوں کی اکڑ خاک میں مل جاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اپنے ساتھی کی بجائے وہ میڈم کے مقابلے میں اُترنے کی غلطی کر بیٹھتا تو اس کا انجام بھی اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا۔ گزرنے والی طویل اور سرد رات میں مجھے یہ کڑا اور جاں گسل تجربہ ہو چکا تھا کہ اگر قسمت میرا ساتھ نہ دیتی تو وہ میری ہڈی پسلی ایک کر چکی ہوتی۔

میں نے کہا، ''تمہارے ساتھ کتنے آدمی تھے؟''

''کس وقت؟'' وہ چونکا۔

''جس وقت تم لوگوں نے اس فارم ہاؤس پر حملہ کیا تھا؟''

''ہم سات آدمی تھے۔''

میں نے دل ہی دل میں حساب کیا۔ مرنے والوں کا شمار کیا تو پتہ چلا کہ اُس نے تقریباً درست تعداد بتائی تھی۔

''تمہیں یہاں پر حملہ کرنے کے لیے کس نے بھیجا تھا؟'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں نے بتایا تو ہے کہ میرا نام ظفری ڈکیت ہے، ڈکیت کیوں حملہ کرتے ہیں؟ یہ علم تو

تمہیں ہونا چاہیے۔'' وہ شاطرانہ انداز میں نچہ دیتے ہوئے بولا، ''میں اگر تم سے پوچھوں کہ تم دونوں یہاں کیا کر رہے تھے تو تم یہی کہو گے ناں کہ جوان عورت اور مرد تنہائی میں کیا کرتے ہیں؟ یہ علم تو تمہیں ہونا چاہیے۔ ہے ناں؟''

یکبارگی میرا جی چاہا کہ میں اس کا منہ توڑ دوں، اُسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں مگر میں نے بڑی ہمت سے خود پر قابو پالیا۔ پھر بظاہر مسکرایا اور پوچھا، ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

وہ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ میڈم کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے ظفری سمیت باہر آنے کا حکم دے رہی تھی۔ میں نے اُسے گن کی نال سے ٹہوکا دیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے کار سے اتر آیا۔ اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی اُس پر سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ وہ خطرناک آدمی تھا اور کسی بھی لمحے مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی عیاری، سفاکی اور بربریت دیکھ لی تھی۔ اس نے وقتی طور پر شکست قبول کرتے ہوئے خود کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑا تھا۔ اس مزاج کے لوگ موقع شناس ہوتے ہیں۔ جونہی مقابل سے کوتاہی سرزد ہوئی، ان لوگوں نے اپنا ہاتھ دکھا دیا۔

میڈم گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں ظفری کی تلاشی لی۔ ایک خنجر اور بیس کے قریب گولیاں برآمد ہوئیں۔ اس کا بڑے سائز کا سیاہ پستول میڈم کی کار کے فرش پر پڑا تھا۔ تسلی کرنے کے بعد میڈم نے اُسے دیوار کے ساتھ بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ وہ پژمردہ انداز میں بولا، ''کیا تم لوگ مجھے شوٹ کرنا چاہتے ہو؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو زندہ بچ جاؤ گے اور جو شخص خرمستی کرتا ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ تو تمہیں علم ہونا چاہیے۔''

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پشت پر ہاتھ رکھ کر ٹہلنے کے سے انداز میں دیوار کی طرف چل پڑا۔ چند لمحے کھڑا رہا، پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر پیروں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ میڈم میرے قریب آ گئی۔ میرے ننگے بازو پر پستول کی مزل پھیرتے ہوئے بولی، ''میرو شاہ آ رہا ہے۔ اس کے پہنچتے ہی میں شہر چلی جاؤں گی۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

''کیوں؟'' وہ چونکی۔

''ان حالات میں آپ کو اکیلے نہیں جانا چاہیے۔''

''ایسے حالات تو ہر وقت ہماری اور ہم ان کی راہ تکتے رہتے ہیں ڈیئر!''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر میرا دل آپ کو تنہا بھیجنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اَب خاصا تھک چکا تھا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ پیشانی اور چھاتی پر آنے والی چوٹیں دکھنے لگی تھیں۔ ناک میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں انالجیسک گولیاں پھانک کر دو چار گھنٹے آرام کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھے میر وشاہ کے پاس چھوڑ کر واپس چلی جاتی تو مجھے مزید کئی گھنٹے بے آرام رہنا پڑتا۔

وہ چند لمحوں تک مجھے بغور دیکھتی رہی۔ میں ظفری ڈکیت پر گن تانے کھڑا تھا۔

''میں تمہیں ایک شرط پر اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں۔'' اس کے لہجے میں شرارت عود کر آئی۔

''شرط؟ میں آپ کے حکم کی تعمیل کو اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں، حکم کیجئے۔'' میں نے بصد احترام کہا۔

''تم ایک گھنٹہ میرے ساتھ رہو گے۔ جیسا کہوں گی، ویسا کرو گے۔ نو 'اگر'..... نو 'مگر'..... آر یو ایگری؟''

میں نے بے ساختہ اُسے دیکھا مگر اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا کیونکہ اُس کے عقب میں بلب روشن تھا۔ وہ سنجیدہ تھی، شرارت پہ آمادہ تھی، یہ اندازہ نہ ہو سکا۔ میں نے کہا، ''مگر میں اپنے گھر جاؤں گا، آپ اپنی کوٹھی پر.....''

اُس کی گھنٹیوں جیسی مترنم ہنسی نے میری بات اُچک لی۔ میں کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ وہ ہنستی رہی، اپنی بانہیں پوری وسعت میں کھول کر چکراتی رہی، پھر بولی، ''بس؟..... بہت جلد ڈر جاتے ہو۔''

میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ ایسے ہی وقت میں درختوں پر روشنی رقص کرنے لگی۔ ہم دونوں نے بیک وقت راستے کی طرف دیکھا۔ میڈم بولی، ''لگتا ہے کہ میر وشاہ آن پہنچا ہے۔''

ساتھ ہی اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ پر واضح کر دیا کہ میری توجہ ظفری ڈکیت سے ہٹ گئی ہے۔ میں خفت زدہ سا ہو گیا۔ منٹ بھر کے بعد اُس اسوزو ٹرو پر، جس پر ہم نور پور گئے تھے، اور سنہرے کلر کی ایک ہائی روف ٹویوٹا ویگن ہمارے قریب آن رکیں۔ ٹرو پر کی اگلی سیٹ پر سے میر وشاہ اُتر کر ہمارے پاس آیا، میرے کندھے پر ہاتھ مارنے کے بعد میڈم کے سامنے

تعظیماً سر جھکا کر بولا، ''ماڑی مہارانی کیا حکم دیوے ہے اِس سے..... میروشاہ حاجر (حاضر) ہووت رانی جی!''

میڈم نے تحکمانہ لہجے میں کہا، ''اُسے جانتے ہو؟ وہ اپنے آپ کو ظفری ڈکیت کہتا ہے..... اُسے اپنی کسٹڈی میں لو، فارم ہاؤس میں اس کے چار پانچ ساتھی مردہ حالت میں پڑے ہیں، انہیں ٹھکانے لگاؤ، ایک ساتھی ادھر کوئی دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر سڑک پر کتے کی طرح مرا پڑا ہے، اس کے دفن شفن کا انتظام کرواؤ..... اور ہاں! ظفری ڈکیت آخری دشمن ہے۔ اسے مرنے سے پہلے بہت کچھ بتانا ہے۔ اس نے کس کے کہنے پر اور کیوں فارم ہاؤس پر حملہ کیا؟ یہ بھی یاد رکھنا کہ یہ لوگ مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے۔''

میڈم حسبِ عادت غیر معمولی روانی کے ساتھ، یوں جیسے کوئی لکھی ہوئی سٹیٹ منٹ پڑھ رہی ہو، بولتی چلی گئی۔ میروشاہ کا ایک ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور ایک مخصوص اشارہ نشر ہو گیا جس کے نتیجے میں اسوزوٹرو پر اور ہائی روف کے دروازے کھلے اور کم و بیش دس افراد نے چھلانگیں لگائیں اور آن کی آن میں سبھی ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ سب مختلف نوع کے اسلحہ سے لیس تھے۔ مجھے توقع رہی تھی کہ ان میں پیاجی اور عقیل بھی ہوں گے مگر دونوں دکھائی نہیں دیے۔ میروشاہ کی تازہ فوج کے سبھی لوگ میرے لئے اجنبی تھے۔

میروشاہ نے ظفری ڈکیت کی طرف اشارہ کیا، ''او ماڑا مشہور ڈکیت..... تو جفری باچھا (ظفری بادشاہ) ہووت ہے..... اوئے لونڈو! جرا (ذرا) پیار سے رکھت ہے سالے ڈکیت کو.....''

اس نے مختلف لوگوں کے ذمہ مختلف کام لگائے اور فارغ ہو کر میڈم سے بولا، ''میڈم رانی! ناڑے غنچے کو لے کر شہر جاوت ہے..... اب ماڑی فوجاں جانے اور یہ فارم ہاؤس جانے..... پَر یہ بول دیوت ہے ماڑے کو کہ اس غنچے نے پیٹھ تو نہ دکھائی ہووت ناں؟''

میڈم نے ظفری ڈکیت کی طرف دیکھا جس کے سر پر دو جوان جا کھڑے ہوئے تھے، پھر مجھے دیکھا اور فخر سے بولی، ''نہیں میروشاہ! تمہارا غنچہ بڑا لاجواب ہے۔ سمجھو! تحفہ قبول کر لیا گیا ہے۔''

''ایک دم گھوڑا ہووت ہے..... ہے ناں؟'' میروشاہ کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''ہاں.....اب بکواس بند کرو اور توجہ اپنے کام پر مرکوز کرو۔'' میڈم نے اُسے ڈانٹ دیا۔ وہ دانت نکالتا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ گیا۔

ایسے ہی وقت مجھے سردار نصر حیات کے ڈیرے پر دیکھی ہوئی نیوز رپورٹ یاد آئی جس میں پولیس اور سردار حیدر خان نے ملی بھگت کے ذریعے اپنے کارندوں کے قتل کو، اپنی تضحیک آمیز شکست کو اپنی خوبی بنا کر میڈیا اور سرکار کے سامنے پیش کرتے ہوئے انعام و کرام وصول کر لیے تھے۔ میں نے میڈم اور میر وشاہ کو اس کارنامے کے بارے مختصراً بتایا۔ شاید انہیں یہ سب کچھ بتانے کا مقصد میرے نزدیک یہ رہا تھا کہ میڈم بھی فارم ہاؤس پر زندگی ہارنے والے دشمنوں کے سینوں پر اپنے چہیتے اہلکاروں کے نام کے تمغے سجا دے۔ میڈم نے بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ سنا، پھر سر جھٹک کر قدرے نخوت سے بولی، ''میر وشاہ! کیا جو کچھ شہریار نے کہا ہے، قابلِ عمل ہے؟''

وہ بولا، ''ہتھیلی پر سرسوں جمانی کیا مشکل ہووت ہے مہارانی.....اپنا تھانیدار ہے ناں، انسپکٹر اجہر (اظہر).....ایک دم حرام جادہ ہووے، پَر ماڑا جیا اس کو پھول پتری لگانے کو مانگت ہے۔ اگر رانی کی اجاجت (اجازت) ہووے تو.....''

اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ اُس سے فون پر رابطہ کرو۔ اگر اُس کا عملہ اُس کا ساتھ دیتا ہے تو یہ گیم کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔'' میڈم نے کہا، ''فارم ہاؤس کے دو ملازم بھی مارے گئے ہیں۔ ایک کا تو آگے پیچھے کوئی نہیں ہے، دوجے کی بیوی اور تین بیٹیاں رنگ پور میں رہتی ہیں۔ لاش کے ساتھ دو آدمی رنگ پور روانہ کر دو۔ بیوہ کو دو تین لاکھ روپے دے آنا۔ او کے؟''

میر وشاہ نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور ہنس کر کہا، ''میڈم! ایک دم بے فکر ہو کر کوٹھی میں جا کر سو جاوے ہے، میر وشاہ سب کچھ سنبھال لیوے گا۔ اے غنچے! تم ماڑی مہارانی کے ساتھ میں جاوت ہے۔ کان کھول کر سن لیوت ہے کہ ماڑے کو تمہاری موت تو قبول ہووے ہے پَر رانی کی تکلیف برداشت نہ ہووے ہے.....سمجھ میں آوے میری بات کہ ناں؟''

میں نے کہا، ''تم فکر نہ کرو شاہ جی! جب تک میں زندہ ہوں، میڈم کو کوئی ہاتھ تک نہیں لگا سکتا۔''

میڈم ہنسی، ''اگر کسی نے ہاتھ لگائے بغیر گولی مار دی تو؟''

میں نے دل ہی دل میں کہا، ''اللہ نہ کرے!''

میر وشاہ نے اپنے چغے کی جیب سے موبائل نکال لیا، کوئی بٹن دبا کر ایل سی ڈی روشن کی اور میموری میں محفوظ شدہ نمبر دیکھنے لگا۔ وہ شاید انسپکٹر اظہر کا نمبر تلاش کر رہا تھا، ایسے میں بڑبڑایا، ''کم بخت کا نمبر اوپر نیچے ہو جاوے ہے کیا؟ نجر (نظر) ہی نہ آنے کا سالا.....''

تھوڑی تگ و دو کے بعد اس کا نمبر مل گیا تو میر وشاہ میڈم کی طرف دیکھ کر بولا، ''وہ سالا بڑا چالاک ہووے ہے، پکی پکائی کھیر ہڑپ کرنے کو سر کے بل بھاگت ہے..... پر تم تو جاوے، میر وشاہ کو اپنا کام کرنے دیوے ناں!''

میڈم نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ میرے عقب میں میر وشاہ کی آواز سنائی دی، ''اڑے جالم تھانیدار..... تیرے کو خواب دیکھنے کی پڑی ہووے، خواب میں میر وشاہ کو حوالات میں کھڑا کر کے خوش ہووت..... ہے ناں؟ پر دیکھ لے یہ سالا میر وشاہ اپنے یار انسپکٹر اجہر (اظہر) کو پھر بھی ڈی ایس پی بنانے کو اس سے بھی جاگت ہے۔ رجائی (رضائی) سے نکل کر ماڑی بات سن لیوے، جیا مانے تو عمل بھی کر لیوے.....''

میں گاڑی میں بیٹھ گیا اور اپنی گن ٹانگوں کے بیچ کھڑی کر لی۔ میڈم نے گاڑی اسٹارٹ کی، ائر ہیٹر آن کیا اور بولی، ''آج قدرے زیادہ سردی تھی۔''

جب تک ہمارے وجود حرکت میں رہے، تب تک سردی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ فراغت پاتے ہی رات کے پچھلے پہر کی خنکی نے ہمارے تھکن زدہ بدنوں پر اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیے تھے۔ چونکہ فارم ہاؤس کے اطراف میں آم کے باغات، سبز چارہ اور ملی جلی فصلوں کی بہتات تھی، دریا قریب سے گزرتا تھا اس لیے نمی کا تناسب بھی کچھ زیادہ تھا۔ ائر ہیٹر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تو میرے تھکے ہوئے جسم کو حدت میسر آنے لگی۔

واپسی کا راستہ بخیریت کٹا۔ میڈم تمام راستے سنجیدہ رہی، خاموش اور کسی گہری سوچ میں غرقاں رہی اور اس کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رہی۔ کوٹھی کا گیٹ ظاہر خان نے کھولا۔ کار کے عقب میں بھاگتا ہوا پارکنگ تک چلا آیا۔ کار رکی تو اس نے بڑے احترام سے میڈم کا دروازہ کھولا اور سلام کیا۔ میڈم نے اسے کچھ ہدایات دیں اور کسی کی آمد پر ڈسٹرب نہ کرنے کا حکم دیا۔ ظاہر خان نے مجھے بھی کار سے اُترتے دیکھا تھا مگر میڈم کی موجودگی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا۔ میڈم کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس کے کمرے تک آیا اور دروازے پر رُک گیا۔

اس کی آواز سنائی دی، ''کم ان!''

میں میڈم کی قربت سے گریز کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ وہ کسی بات کا برا نہ مان جائے مگر یہ بھی عجیب تضاد تھا کہ اس کے قریب رہنا بھی چاہتا تھا۔ اس کی موجودگی میں عجیب طرح کی طمانیت محسوس کرتا تھا۔ اس نے مجھے صوفے میں بیٹھنے کا حکم دیا، بیڈ پر اوپر تلے دو کشن رکھے اور ان کی ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ عیاں تھا کہ وہ کسی نہایت عمیق سوچ میں مستغرق تھی۔ شاید شبِ رواں کی طویل اور تھکا دینے والی ریاضت کے شمار میں مصروف تھی اور دل ہی دل میں نتائج اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں گزشتہ شام کو ملتان سے نکلا تھا، صبح ہونے سے پہلے لوٹ آیا تھا مگر اس دوران ایک لمحے کو بھی چین نہ آنے کی وجہ سے بُری طرح تھکا ہوا تھا۔ میڈم کو مجھ سے زیادہ تھکا ہونا چاہیے تھا مگر اس کے چہرے پر نقاہت یا بے آرامی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بظاہر بہت نازک مگر حقیقت میں وہ بہت سخت جان لڑکی تھی۔ اس سے ہونے والی فائٹ کی فلم میرے ذہن میں چل پڑی۔ اس کی طاقت، پھرتی اور وار کرنے کی غیر معمولی مہارت نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس تند و تیز مقابلے میں مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا تھا۔ باوجود کہ اس نے میری برتری تسلیم کر لی تھی مگر میں اپنے تئیں اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا کہ میں نے اسے نیچا دکھا دیا تھا۔ تبھی میں اپنی فتح کو محض حسنِ اتفاق کا شاخسانہ قرار دے رہا تھا۔ ایسے میں بے ساختہ میرا ہاتھ سینے کو سہلانے لگا۔ چارپائی کی بانہہ کی سینے پر لگنے والی چوٹ بہت درد ناک تھی۔

چند دن قبل پیا جی نے مجھے فارم ہاؤس میں جنگی بنیادوں پر کیے گئے انتظامات دکھائے تھے جن میں سے ایک ہمارے کام آ گیا تھا۔ اس نے مختلف جگہوں پر ایسی ہی کسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اسلحہ چھپا کر رکھا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور سوچا، 'اگر مجھے بھوسے والے کمرے میں چھپائی گئی گن اور گولیوں کا اور اس کی چھت پر بنائے گئے ایمرجنسی بنکر کا پتہ نہ ہوتا تو بے رحم دشمن ہمیں اغوا یا قتل کرنے میں کتنی آسانی سے کامیاب ہو جاتا.....'

میں نے بیڈ پر لیٹی ہوئی شکیلہ عرف میڈم نامی نازک اندام اور نہایت خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ یقین نہیں آیا کہ یہ وہی تھی جس کے حسنِ مہارت کے ثبوت میری پیشانی اور ناک پر

شہت تھے اور جس نے بے حد بے باکی اور سفاکی سے امجد خانیوالیے جیسے بدنام زمانہ ڈکیت کو ٹھکی بجاتے میں عالمِ ارواح روانہ کر دیا تھا۔ میں نے جب چشمِ تصور میں کار کے اندر کا منظر جایا، مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا سگریٹ مانگنے کا انداز، حد سے بڑھی ہوئی لاپروائی اور بے خوفی..... مجھے سب کچھ عجیب اور غیر یقینی سا لگا تھا۔ اگر یہ سب کچھ میں نے اپنی زندہ اور بیدار آنکھوں سے دیکھ نہ رکھا ہوتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔

میں امجد خانیوالیے اور ظفری ڈکیت سمیت فارم ہاؤس میں مردہ حالت میں پڑے ہوئے کسی بھی حملہ آور کو جانتا تھا اور نہ مجھے ان کے جرائم کی تفصیل کا علم تھا مگر یہ یقین تھا کہ میڈم اور میر وشاہ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت معمولی سطح کے ڈاکو یا جرائم پیشہ لوگ نہیں کر سکتے۔ یقیناً ان ڈاکوؤں کے عقب میں کوئی بڑا آدمی چھپا بیٹھا تھا جو ڈوریں ہلا کر کٹھ پتلی تماشا دیکھ رہا تھا۔ چونکہ ان دنوں سردار حیدر خان سیخ پا ہو کر میدان میں اُترا ہوا تھا، اِس لیے پہلا شک اُسی کی ذات پر جاتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی بازیابی کے لیے انتہائی خطرناک قدم اُٹھا سکتا تھا۔ میری دانست میں بڑے خان کے علاوہ اتنا طاقت ور اور باخبر دشمن کوئی اور نہیں تھا۔

میڈم نے اچانک موبائل نکال لیا۔ چند لمحوں تک اُس سے بے طرح کھیلتی رہی، پھر بولی، ''شہریار! کیا ہم پر کیے جانے والے حملے کو اتفاقیہ قرار دیا جا سکتا ہے؟''

میں چونکا، ''میرا خیال کہ ایسا نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

میں نے چند ثانیے سوچا، پھر کہا، ''جہاں تک مجھے علم ہے، آپ کا وہاں پہنچنا آپ کے معمول کا حصہ نہیں تھا۔ میری پوزیشن بھی بالکل ایسی ہی ہے کہ میں پہلے کبھی فارم ہاؤس میں جا کر نہیں سویا۔ اگر مجھے قتل یا اغوا کیا جانا مقصود ہوتا تو پھر اتنی دیر گئے حملہ نہ کیا جاتا، پہلے بھی کیا جا سکتا تھا۔'' میں نے الفاظ مجتمع کیے اور سلسلہ کلام جوڑا، ''آپ کے آنے کے بعد ہی وہ لوگ فارم ہاؤس پہنچے اور انہوں نے بڑی دیدہ دلیری اور مشاقی سے فارم ہاؤس کو گھیرے میں لیا تھا۔ اگر ہم جاگ نہ رہے ہوتے یا غافل ہوتے تو اس وقت سچویشن مختلف ہوتی۔''

''رزلٹ؟'' اس کی آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔

''سچ کہوں تو بُرا نہیں مانیں گی؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں..... تم مجھے اچھے لگتے ہو، یقیناً تمہاری کہی ہوئی بات بھی اچھی ہوگی۔''

''ان لوگوں کو آپ کے یہاں سے نکلنے اور رات گئے فارم ہاؤس پر پہنچنے کا علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کے ساتھ گروہ کے دوسرے لوگ نہیں ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''ڈرو مت، جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔'' میڈم نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا، ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری ٹیم میں کوئی غدار موجود ہے، دشمن کا آلہ کار یا مخبر؟ جس نے یہ خبر اپنے ہیڈ کوارٹر تک فی الفور پہنچائی۔''

میں سوچ یہی رہا تھا مگر اتنی بڑی بات، وہ بھی بغیر کسی ثبوت کے، کہنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اس نے پوچھا تو میں نے سر جھکا لیا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا، ''سچ کیا ہے، میں نہیں جانتا۔ جو بات دل میں آئی وہ میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ کسی گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھایا ہے۔ اب وہ بھیدی کون ہے، یہ نتیجہ اخذ کرنا آپ کا کام ہے۔''

وہ ایک ٹک مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس نے نفی کے انداز میں سر ہلایا اور بولی، ''نہیں شہریار! ایسا کوئی شخص میرے اردگرد موجود نہیں ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے، ''یہ آپ بہتر جانتی ہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ فارم ہاؤس میں آپ کے سوا کوئی قیمتی چیز موجود نہیں تھی جس کو حاصل کرنے کے لیے اتنا سج سنور کر دھاوا بولا جاتا۔''

وہ ایک ذرا مسکرائی، بولی، ''میرا خیال ہے کہ یہ سردار حیدر خان کے گرگے نہیں تھے۔ حیدر خان استاد بلو پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی سے کام لیتا ہے۔ بلو کے سارے کارندوں کو میں جانتی ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی اس کا کارندہ نہیں تھا۔'' میں خاموش رہا تو وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی، ''ظفری ڈکیت اور امجد خانیوالیہ..... دونوں خاصے بدنام وارداتیے ہیں مگر ان کا عمل دخل چناب کے اوپر والے علاقے تک ہے۔ انہوں نے اس سے پہلے ملتان کی حدود میں کوئی واردات نہیں کی..... نہ مجھ سے ٹکراؤ ہوا ان کا..... بظاہر یہ خانزادی اسما کا چکر نہیں، بلکہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ کس بڑے کے لیے کام کرتے ہیں اور انہیں کس نے مجھے اغوا کرنے کا حکم دیا۔''

اس میدان میں میری معلومات صفر تھیں۔ کوئی رائے نہیں دے سکتا تھا۔ خاموش رہا تو وہ بولی، ''شہریار! میرا ایک نہیں، کئی دشمن ہیں جو مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ہر وقت میری تاک میں رہتے ہیں اس لیے مجھے بڑی احتیاط برتنا پڑتی ہے۔''

میں نے از راہِ گفتگو کہا، ''تو آپ کو تنہا آدھی رات کو کوٹھی سے نکل کر فارم ہاؤس پر نہیں جانا چاہیے تھا۔''

اس نے ہنکارا بھرا، کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولی، ''شاید تم ٹھیک کہتے ہو مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔ میں تمہیں کسی مشن پر تب تک نہیں بھیج سکتی تھی جب تک تمہاری صلاحیتوں سے خود واقف نہ ہو جاتی۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم میری ٹیم میں بہت اچھا اضافہ ثابت ہوئے ہو۔''

پھر اُس نے مجھے فریج سے ٹھنڈا پانی اور الماری سے بوتل نکال لانے کا حکم دیا۔ میں نے دونوں چیزیں پیش کر دیں۔ وہ بیڈ میں اُٹھ بیٹھی اور اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی، ''شہر یار! سردی ہے۔ ہے ناں؟ تبھی تو بدن تپش مانگنے لگتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یخ بستہ پانی معدے میں اُتر کر تن بدن میں آگ لگا دیتا ہے۔''

اس کی آنکھیں بڑا جاندار مگر عجیب اور بے عنوان تاثر لئے ہوئے مجھ پر مرتکز رہیں پھر پھسل کر بلوریں گلاس پر ٹھہر گئیں۔ اس نے جام تیار کیا، ایک ننھا سا گھونٹ بھرا اور مجھے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیڈ کے کنارے پر ٹک سا گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹھنڈا گلاس میرے رُخسار سے مس کیا اور بولی، ''دیکھو! کتنا ٹھنڈا پانی ہے۔ ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دانستہ آنکھیں چُرا لیں۔ وہ بولی، ''مگر تمہیں یہ تجربہ نہیں ہوا کہ اس کی یخ بستگی میں کتنی حرارت پوشیدہ ہے۔ یہ انسان کی طرح ہوتا ہے۔ اوپر سے ٹھنڈا، اندر سے گرم..... یعنی دھوکے باز ہوتا ہے۔''

شاید وہ ٹھیک کہتی تھی۔ ابھی اُس نے پینا شروع کیا تھا۔ اتنی جلدی نشہ اعصاب پر سوار نہیں ہوتا مگر اس کی آواز اگر بھاری ہونے لگی تھی، لہجہ ایب نارمل ہوا جاتا تھا۔ عیاں تھا کہ اس تغیر کا سبب کچھ اور تھا۔

میں نے آہستگی سے احساس دلانا چاہا، ''آپ تھکی ہوئی ہیں، کچھ دیر آرام کر لیں۔''

اس نے گلاس لبوں سے ہٹایا، اپنے گالوں پر نرمی سے پھیرا اور تکیے سے پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ گلاس میں شراب کا آخری گھونٹ لرزنے لگا اور ادھ کھلے ہونٹ آبِ سوختہ کا انتظار کرنے لگے۔

وہ میک اَپ کی عادی نہیں تھی۔ اگر کرتی بھی تھی تو خاص مواقع پر کرتی ہو گی۔ میں نے اُسے جب بھی دیکھا تھا، ایسے ہی دیکھا تھا۔ اس کے اَبرو بنے ہوئے نہیں تھے، اُس کی ناک

اور دونوں کان چھدے ہوئے نہیں تھے اور نہ ہی میں نے اُسے اب تک کسی نوع کا زیور پہنے دیکھا تھا۔ اُس کے ناخن بڑھے ہوئے نہیں تھے اور نہ وہ نیل کور اور نیل پالش لگاتی تھی۔ اس کا لباس بہت سادہ اور عمومی نوعیت کا ہوتا تھا جس میں برہنگی کا عنصر شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا یہ درویشانہ رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ وہ جتنی امیر تھی یا اُس کا اُٹھنا بیٹھنا جس سوسائٹی میں تھا، وہاں اس حقیقت پسندی کو قدامت پرستی کا نام دیا جاتا تھا۔ شاید اُسے یہ طعنہ بھی سننے کو ملتا ہوگا اور وہ نظر انداز کر دیتی ہوگی۔

اس کے باوجود وہ لاکھوں میں ایک تھی۔ اس کے حسن کی تاب و تمکنت آنکھوں کو خیرہ کرنے کی بھرپور استعداد رکھتی تھی۔ اس وقت وہ اپنی دُنیا میں گم تھی اور میں اپنے شوقِ دید سے نبرد آزما، مگر اُس نے اچانک آنکھیں کھول دیں اور کہا، ''جب میں دیکھتی ہوں، تم آنکھیں پھیر لیتے ہو۔ جب میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو تمہاری نظریں مجھ پر ثبت ہو جاتی ہیں۔ یعنی تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو مگر مجھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے ڈرتے ہو۔ میں نے ٹھیک کہا ہے؟''

میں نے 'جی' کہا اور سر جھکا لیا۔

وہ بولی، ''تمہاری منگیتر کا نام کیا تھا؟''

سوال بڑا بے ساختہ تھا۔ میں گڑبڑا سا گیا، ''جی! وہ..... غزالہ نام ہے اُس کا..... میری پھوپھی زاد ہے۔''

''کیا تم دونوں کبھی تنہائی میں ملے ہو؟''

''جج..... جی ہاں..... جی نہیں.....''

وہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی، ''کیا مطلب؟''

''کئی بار ملے ہیں جی!''

''تم نے اُس کا بوسہ بھی لیا؟''

میرا لہو میرے چہرے میں سمٹ آیا۔

''ہوں!'' اس نے میری خاموشی کو اقرار جانا، تبھی ہنکارا بھر کر بولی، ''تم نے کبھی اُسے سینے سے لگایا؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں میڈم! گاؤں میں اتنی آزادی نہیں ہوتی۔''

''واقعی؟'' وہ یقین نہ کرنے کے انداز میں بولی، ''پھر..... پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم دونوں

ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے؟''

مجھے اچنبھا ہوا۔ بے ساختہ پوچھا، ''کیا محبت کرنے کے لیے یہ باتیں ضروری ہیں؟''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی، لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر بولی، ''محبت کرنے والے یقین دہانی اور اظہار کا سیرپ ایک دوسرے کے حلق میں ٹپکاتے رہتے ہیں۔ دونوں اپنے طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسرے پر اپنی لگن ظاہر کر رہے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی قلبی اور روحانی تسکین کر رہے ہوتے ہیں۔''

اس کا لہجہ دم بہ دم بوجھل ہو رہا تھا۔ پوچھ رہی تھی، ''کیا اَب وہ تمہیں یاد آتی ہے؟''

میں نے صدقِ دل سے کہا، ''نہیں..... میں اُسے اتنا یاد نہیں کرتا، جتنا مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

''کیوں؟'' اُس کے ہونٹ نیم دائرہ دی شکل میں سکڑ گئے۔

''مجھے جب تک اپنی بہن نہیں ملتی، میں تب تک اس کے بارے میں تو کجا، اپنے بارے میں بھی کچھ سوچ نہیں پاؤں گا۔''

''یعنی محبت آسودگی اور بے فکری کے ماحول میں زندہ رہتی ہے؟''

میں چونکا، ''جی..... شاید!''

''تم غلط کہتے ہو۔'' اس نے یک لخت تکیے کی ٹیک چھوڑ دی اور گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا، ''ایسا نہیں ہے۔ محبت ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتی ہے۔ کبھی طاقت دیتی ہے، کبھی سہارا..... تو کبھی بے حد کمزور کر دیتی ہے۔''

''جج..... جی میڈم!'' تذبذب نے مجھے ہکلانے پر مجبور کر دیا۔

''اگر تمہیں تمہاری بہن..... کیا نام بتایا تھا تم نے اُس کا؛ ہاں! پروین..... کیا تم پروین کے مل جانے کے بعد اپنی منگیتر غزالہ کو مس کرو گے، پہلے نہیں..... ہیں؟''

''نہیں میڈم!'' میں نے اچانک سنبھل کر مضبوط لہجے میں کہا، ''اب میرے سامنے زندگی کے تین مقاصد کا حصول اہم ہے۔ پروین کو تلاش کرنا، اپنے والدین اور چاچا چاچی کے قاتلوں سے انتقام لینا..... اور.....''

''ہاں! رُک کیوں گئے؟ کہو ناں!'' اس نے دلچسپی لی۔

''اور اپنی بہنوں کے ہاتھ پیلے کرنا۔''

اس کا چہرہ اسپاٹ ہو گیا۔ بولی، ''اور غزالہ کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟''

''اگر قسمت میں ہوئی تو وہ میری ہم سفر بن جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک اور جام تیار کیا۔ اب کے اس نے شراب کی مقدار کم اور پانی کی زیادہ رکھی تھی۔ کچھ دیر تک گلاس سے کھیلتی رہی، پھر بولی، ''حیدر خان کو قتل کرنا چاہتے ہو؟''

''جی..... نہ صرف اُس کو قتل بلکہ اس کے محل کو اپنے ہاتھوں آگ بھی لگانا چاہتا ہوں۔'' میں نے عہدِ مصمم کا اظہار کیا۔

''وہ بڑا با اختیار اور شیطان صفت آدمی ہے۔ کیا تم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟''

''جی! اگر آپ اِسی طرح مجھ پر توجہ دیتی رہیں تو میں اس قابل ہو جاؤں گا۔''

''دیکھ لو..... وہ اِس وقت بپھرا ہوا زخمی شیر ہے۔''

میری آنکھوں کے سامنے سائیں دل جیت کا لہو سے تر چہرہ گھوم گیا جسے میں نے اپنے ہاتھوں عالمِ بالا روانہ کیا تھا۔ میں نے جبڑے بھینچ کر کہا، ''پروا نہیں ہے۔''

''سردار یارن خان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

میرے پاس جتنی معلومات تھیں، اُسے بہم پہنچا دیں تو وہ بولی، ''یعنی تم اُسے نہیں جانتے ہو۔''

''آپ اُسے جانتی ہیں؟''

''ہاں! وہ ان سب سے بڑا شیطان ہے۔''

میں چونکا، ''اچھا! آپ کیسے جانتی ہیں اُسے؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ بولی، ''تم یہ تو جانتے ہی ہو گے کہ وہ نور پور سے لاہور کیوں منتقل ہو گیا؟''

''سنا تھا کہ اُس کا دل یہاں سے بھر گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا، ''لاہور تو لاہور ہی ہے ناں میڈم! جس کے پاس پیسہ ہو، جائیداد ہو، وہ گاؤں سے نکل کر شہر جانے کے خواب تو دیکھتا ہی ہے۔''

''پیسہ تو دوسرے خانزادوں کے پاس بھی ہے، وہ لاہور کیوں چلے نہیں گئے اَب تک؟''

''بڑے کہتے ہیں کہ سردار یارن خان کے پاس ان سب خانزادوں سے کہیں زیادہ دولت ہے۔''

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''اچھا! چھوڑو اِسے، یہ بتاؤ کہ تمہارے جگری

یار خالد عرف کھالے کا کیا حال ہے؟ کیا اُسے اسما کی یاد اَب نہیں ستاتی؟''

اس کا اشارہ کھالے کی طرف تھا۔

''کافی دن ہوئے، ملاقات نہیں ہوئی۔ ویسے وہ اسما کو بھلانے والا نہیں ہے۔''

''اُسے خود سے علیحدہ کر دو۔ اگر ممکن ہو تو اُسے نور پور بھیج دو۔ وہ وہاں رہ کر تمہیں معلومات پہنچا کر بہتر اعانت کر سکتا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ میرا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔''

''یہ تمہاری بھول ہے کیونکہ تم بھول چکے ہو کہ وہ اسما کا دیوانہ ہے۔ اس کی خاطر وہ تم پر ہاتھ اُٹھا چکا ہے۔ وہ اس کی رہائی سے مایوس ہو کر تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ بالواسطہ طور پر مجھے نقصان ہوگا۔''

میں نے سختی سے میڈم کے اندیشے کی نفی کی اور کہا، ''نہیں میڈم! وہ ایسا شخص نہیں ہے۔''

وہ ہنسی اور بولی، ''میں ضد نہیں کرتی مگر ایک دن تمہیں میرا ہم خیال ہونا پڑے گا۔''

میں نے کہا، ''کیا اب اسما کو روکے رکھنا ضروری ہے؟''

وہ بولی، ''ہاں! کیونکہ اس کی وجہ سے سردار حیدر خان اور میرے درمیان دشمنی کا سانپ جنم لے چکا ہے۔ اگر میں اُسے لوٹا دوں، تب بھی وہ میرا بہی خواہ نہیں بنے گا۔ اسے جب بھی موقع ملے گا، مجھ پر وار کرے گا اور مجھے ڈس لے گا۔''

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے اس کے بارے؟''

اس نے عادتاً نچلا ہونٹ اوپر والے ہونٹ پر چڑھایا اور بچوں کی طرح آنکھیں چندھیا کر بولی، ''وہ سونے کی چڑیا ہے۔ اُسے وقت آنے پر کسی جوہر شناس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے عام سے لہجے میں کتنی کڑواہٹ اور بربریت چھپی ہوئی تھی۔ میں اسما کی حمایت میں کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس کے اٹل انداز کے سبب جرأت نہ کر پایا۔

وہ بولی، ''تمہیں اسما سے ہمدردی ہے؟''

میں نے صدقِ دل سے اپنا من ٹٹولا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ میرے دشمن کی بیٹی تھی۔ دشمن بھی وہ جس کے پاس ظرف اور اصول نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اس نے میری بہن کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کی گندی سوچ پر عمل کرتے ہوئے یہ تک نہیں سوچا تھا کہ میں اس کی برادری کا آدمی تھا۔ اس کا سپورٹر تھا۔ پھر اس نے میرے چاچا کے خاندان کو نیست و نابود

کرتے ہوئے ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ اس جنگ کا حصہ نہیں تھے جو اس نے مجھ پر مسلط کی تھی۔

میڈم شکیلہ بڑے غور سے میرے چہرے کے لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد گویا ہوئی، ''شہریار! تم اب دنیا کو سمجھنے لگے ہو۔ یہ تبدیلی بہت اچھی ہے۔ مجھے پسند آئی ہے۔''

میں نے لمبی سانس سینے میں اُتاری اور کہا، ''میڈم! میرے دل میں آگ دہک رہی ہے۔ یہ تب بجھے گی جب میں اپنے ہاتھوں سے اسما کے باپ کے وجود کو جلتی ہوئی آگ میں پھینکوں گا۔ خون کا بدلہ خون سے لوں گا تب مجھے چین آئے گا۔''

اس نے میرا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگایا پھر گلاس تھما کر اُسے تپائی پر رکھنے کا اشارہ کیا اور کہا، ''مجھے اسی آگ کی ضرورت ہے..... تمہیں ایک نہ ایک دن موقع دوں گی، اس شیطان کی سرکوبی کا..... پھر دیکھوں گی کہ تمہارے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔''

میں نے احساسِ ممنونیت سے سرشار ہو کر اُسے دیکھا اور کہا، ''آپ بہت اچھی ہیں میڈم!''

باتوں کے دوران گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ نیند سے اُس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔ میں نے اجازت چاہی تو اس نے بڑے دل ربا انداز میں مسکرا کر مجھے جانے کی اجازت دے دی اور کہا، ''ظاہر خان سے کہو، وہ تمہیں گلگشت میں پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔ اور ہاں..... تیار رہنا، میں تمہیں کسی بھی وقت خصوصی مشن پر روانہ کر سکتی ہوں۔''

میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔ وہ بجائے دراز ہونے کے، بیڈ سے اُتری اور کمرے کی عقبی دیوار کی سمت بڑھی۔ دیوار گیر الماری کو کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ ایسے ہی وقت میں الماری خود کار انداز میں بغیر کوئی آواز پیدا کیے دائیں طرف کھسک گئی۔ دیوار میں دو فٹ چوڑا خلا پیدا ہو گیا جس کے پار سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ میں سی ٹو کا جادوئی ماحول دیکھ چکا تھا، اس لیے اس میکنزم کو دیکھ کر زیادہ حیران نہیں ہوا۔

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا، ہاتھ لہرا کر 'بائے' کہا اور خلا میں داخل ہو گئی۔ چند ہی لمحوں بعد الماری اپنی پہلی جگہ پر پہنچ گئی اور خلا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ طلسمی اپسرا بھی چھپ گئی۔

میں غیر ارادی طور پر اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کمرے سے نکل کر گراؤنڈ فلور پر آیا۔

ظاہر شاہ نے میرے کہنے پر انٹر کام پر کسی ڈرائیور کو بلایا جس نے مجھے کار میں بٹھا کر گھر پہنچا دیا۔ شہر بیدار ہو چکا تھا اور علی الصبح کھلنے والی دکانیں کھلنے لگی تھیں۔ سڑکیں خاموش تھیں مگر کچھ ہی دیر بعد بے ہنگام ٹریفک سے پُر ہونے کی خبریں دے رہی تھیں۔

چونکہ میں خاصا تھکا ہوا تھا، اس لیے بیڈ پر گرتے ہی نیند میں مستغرق ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ میں نے غسل کیا، لباس بدلا اور ٹی وی آن کر دیا۔ نیوز چینل پر فارم ہاؤس، ڈاکوؤں کی لاشیں، ان کے سابقہ کارناموں کی تفصیل اور پولیس رپورٹ ڈاکومنٹری پیش کی جا رہی تھی۔ وقفے وقفے سے مخصوص انداز میں ٹیلی کاسٹ کی جانے والی نیوز رپورٹ کو ملاحظہ کرتے ہوئے میرا دل فاتحانہ جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ مجھے اپنی دلیری اور مہارت سے حاصل کی جانے والی فتح پر ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنی طاقت اور ذہانت کے بل پر نہ صرف میڈم کو موت کے منہ سے زندہ نکال لیا تھا بلکہ قانون کو کئی انتہائی مطلوب اشتہاری ڈاکوؤں کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے عملی طور پر اس سے پہلے سردار حیدر خان کی حویلی اور نور پور پر دو مشن سرانجام دیے تھے جن میں جزوی ناکامی میرا مقدر بنی تھی۔ یہ ایک ہی رات میں سرانجام دیے جانے والے دو مشن تھے جن میں دو مرتبہ کامیابی نے میرے قدم چومے تھے اور مجھے میڈم کی نظروں میں معتبر کر دیا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ میر و شاہ نے حیدر خان کے مقابلے میں جاندار اسکرپٹ اور مضبوط اسٹیج پلے پیش کیا۔ انسپکٹر اظہر کو نپے تلے انداز میں ترقی کی جانب دھکیلتے ہوئے اس نے اپنی اور دشمنوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے اور فارم ہاؤس کی صفائی ستھرائی کے فضول کام سے نجات حاصل کر لی تھی۔ چونکہ وقت کم تھا اس لیے میر و شاہ اور انسپکٹر اظہر کے تیار کردہ ڈرامے میں ایک دو جگہوں پر سقم موجود تھے مگر وہ اتنے خفیف تھے کہ اُن پر صرف میری توجہ ہی مرکوز ہو سکتی تھی، کسی اور ناظر کی نہیں۔

❖❖○❖❖

فوجی اختر بہت کارآمد شخص تھا۔ وہ چند دنوں میں ہی بچوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہماری ہی فیملی کا فرد ہو۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہمہ قسم اسلحے کے استعمال پر دسترس رکھتا تھا۔ میر و شاہ نے مجھے اُس کے بارے میں بتا رکھا تھا کہ وہ عام نوعیت کا ملازم نہیں تھا بلکہ اسے بطور خاص میرے گھر کی حفاظت اور میری اعانت پر مامور کیا گیا تھا۔

دونوں لڑکیاں اور موجو اُس سے مانوس ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں رات بھر گھر سے باہر رہا تھا اور کسی نے بھی میری عدم موجودگی میں خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نے اس صورت حال پر اطمینان کی سانس لی کیونکہ مجھے اپنے چشمِ تصور میں نظر آتے ہوئے تاریک مستقبل کی ان گنت راتوں کا فکر لاحق تھا جن میں مجھے گھر سے باہر رہنا تھا۔

میڈم شکیلہ نے مجھے کہا تھا کہ عشق دوستی کی انتہائی شکل ہوتی ہے۔ دوستی اپنے خون سے اس کی پرورش کرتی ہے اور عشق اپنی بڑھوتری کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دوستی کے حقوق اور مطالبات کو ملحوظ نہیں رکھتا اور بے دردی سے پیروں تلے مسلتا جاتا ہے۔

پیا جی نے مجھے کہا تھا کہ ہماری لائن میں عشق و محبت کو نہایت فضول جذبہ قرار دیا جاتا ہے۔ میرے سامنے ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ جب بھی کوئی ماسٹر مائنڈ ہلاک ہوا، اس کے پیچھے کسی نہ کسی عورت سے عشق کا جذبہ کارفرما تھا۔

میں نے دونوں کی مختلف آرائیں سنی تھیں۔ ایسی باتیں ذہن نشین کرنے کی ہوتی ہیں۔ میں نے انہیں دل نشین کرنا چاہا تو دل نے مزاحمت کر دی۔ وہ اپنے معاملات میں ایسی کوئی بھی پرہیز کو ملحوظ رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ آج جب میرے سامنے میرا جگری یار کھالا بیٹھ کر اپنے یک طرفہ عشق کا راگ الاپ رہا تھا تو مجھے یکے بعد دیگرے میڈم شکیلہ اور پیا جی کی باتیں یاد آئیں۔ میں نے کھالے کے سنولائے ہوئے برہم چہرے کو ایک نظر غور سے دیکھا اور کہا، ''کھالے! تمہارا کہنا بجا ہے، مگر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں یہاں کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ میری حیثیت محض ایک نو وارد ملازم کی سی ہے۔''

اس کے جبڑے بھنچ گئے، لہجے میں از حد درشتی گھل گئی، بولا، ''شہرے! مجھے چکر نہ دو، سیدھی بات کرو۔ بتاؤ، کیا یہ ممکن ہے کہ تم کہو اور تمہاری میڈم یا میر وشاہ نہ مانیں؟ نہیں میرے یار! ایسا نہیں ہے بلکہ تمہارے اپنے دل میں چور ہے۔''

میں ایک ٹک اُس احمق کھالے کو دیکھ رہا تھا جو گزشتہ نصف گھنٹے سے میری بات ماننے سے گریزاں تھا۔ میں نے کہا، ''وہ میری محسنہ ہے، میر وشاہ نے مجھے پناہ دی ہے اور میری خاطر سردار حیدر خان جیسے اڑیل سیاست دان سے پنگا لیا ہے جو میری سمجھ کے مطابق اب ہمارے گلے پڑ چکا ہے۔ تم خود سوچو! میں نے میڈم یا میر وشاہ کے لیے کیا ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ وہ میری نامعقول بات کو ماننے پر تیار ہو جائیں؟''

وہ زچ ہو کر بولا، ''یہ نامعقول بات نہیں ہوگی۔ دیکھو شہرے! جب یہ طے ہو گیا ہے کہ پروین اَب سردار حیدر خان کے پاس نہیں ہے، نہ امیر نواز یا وہ تمہاری عاشی..... تو پھر تمہارے پاس یا میڈم کے پاس اسما کو چھپا کر رکھنے کا کیا جواز بنتا ہے؟''

''کیا حیدر خان نے جذبہ خیر سگالی کے طور پر پروین کو رہا کیا ہے؟'' میرا پارہ چڑھنے لگا۔

''نہیں مگر اہمیت اس بات کی ہے کہ اب پروین اس کی قید میں نہیں ہے۔'' اس نے اپنے مؤقف پر زور دیا۔

''کیا اس نے میرے چاچا چراغ اور چاچی کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے؟'' میرے لہجے میں نفرت گھل گئی۔

اس کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولا، ''ہو سکتا ہے کہ تمہارے گھر کو آگ بڑے خان نے نہ لگوائی ہو؟''

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، ''میرے کانوں نے سنا تھا اور میں نے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی کہ خان کے پلے نے مرنے سے پہلے اُسی کا نام لیا تھا۔ یقین نہیں آتا تو جا کر پیا جی سے پوچھ لو۔''

شانو نے اس دوران ہمارے لیے چائے سرو کر دی۔ کھالے نے حسبِ روایت اس کے سر پر ہاتھ رکھا، خیریت دریافت کی اور کپ اُٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

اس کے جانے کے بعد سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا، ''مگر کیا بڑے خان کے جرم کی سزا اس کی بیٹی کو دی جا سکتی ہے؟ اس نے تو نہیں چاہا تھا کہ اس کا باپ تمہاری بہن کو اغوا کرے یا اس کے اغوا کا بدلہ لینے کے لیے وہ تمہارے گھر کو آگ لگائے۔ تبھی نے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکٹر منور شاہ جی پر ہونے والے حملے کی پیشگی اطلاع دینے والی اصل ہستی وہی تھی.....''

میں نے کہا، ''کھالے! تم بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے ہو تو میں تمہیں کیسے سمجھا سکتا ہوں۔ بھلے آدمی! میڈم میرے کہنے پر اُسے آزاد نہیں کرے گی۔ میری معلومات کے مطابق اُسے.....''

میں روانی میں وہ کچھ کہنے والا تھا جو مجھے کھالے کے سامنے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ عین وقت پر مجھے خیال آ گیا اور میری روانی سے چلتی ہوئی سوئی رُک گئی۔ میں کہنے چلا تھا کہ 'اُسے دو کروڑ روپے کی خطیر رقم کی آفر ہو چکی ہے۔' شکر ہوا کہ کہا نہیں۔ وہ تشکیک آمیز انداز میں مجھے گھورنے لگا۔ میں نے فوراً بات بنائی، ''میری معلومات کے مطابق میڈم نے اُسے سی ٹو سے

نکال کر اپنے کسی اور خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے۔ وہ اس سے کیا مفاد حاصل کرنا چاہتی ہے، میں نہیں جانتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ اپنی مرضی کرتی ہے۔ نہ ماننے پر آئے تو میر و شاہ کی بات کو بھی رَد کر دیتی ہے۔''

اس نے ایک طویل سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔ میں اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ بھانپ رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھا۔ کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا، ''کیا تم اب ہمیشہ میڈم کی چاپلوسی کرو گے؟''

مجھے اس کے سوال پر تاؤ آیا، بمشکل خود کو سنبھال کر بولا، ''فی الحال تو یہی ارادہ ہے۔ کل کیا ہوگا، یہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''ٹھیک ہے شہرے خان!'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا، ''میں سمجھ چکا ہوں کہ تم پر اس حرافہ کا رنگ چڑھنے لگا ہے۔ تم وہ نہیں رہے جو نور پور میں ہوا کرتے تھے۔ تمہارے اندر کا غیرت مند شخص مر چکا ہے۔ بس! میں اَب تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں واپس نور پور جا رہا ہوں۔ جو ہوگا، دیکھا جائے گا، یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

مجھے اس کی گفتگو کے آغاز سے ہی اِس اختتامیے کا اندازہ ہو چکا تھا، تبھی زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

''سنا تم نے، جو میں نے کہا ہے؟'' وہ تلخی سے بولا۔

میں نے کندھے اُچکائے، ''یہ اگر تمہارا فیصلہ ہے تو میں بسر و چشم تسلیم کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ قیامت مجھ پر ٹوٹی ہے اور مجھے ہی اِس کا اَیاہ کرنا ہے۔ رہی بات نور پور جانے کی، تو میرا مشورہ ہے کہ دیکھ بھال کر جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ میری وجہ سے کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔''

وہ شاکی لہجے میں بولا، ''مصیبت میں تو پڑ ہی چکا ہوں۔''

''میری وجہ سے نہیں، اپنی وجہ سے۔'' میں نے جلدی سے اُس کی تصحیح کی، ''یہ سارا گورکھ دھندا موبی کے قتل کی وجہ سے پیدا ہوا اور وہ پنگا تم نے لیا تھا۔ نہ خان زادی سے ملنے کے لیے ملتان آتے، نہ یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا۔''

وہ تپ کر بولا، ''میں نے تمہیں ساتھ آنے سے روکا تھا۔ نہ آتے.....''

اس نے واقعی مجھے روکا تھا مگر میں دوستی کے جنوں میں اُس کے ساتھ یہاں چلا آیا۔

میں نے کہا، ''پولیس اور خان کے گرگے مجھے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ تمہیں نور پور میں

دیکھیں گے تو پکڑ لیں گے اور میرا پتہ ٹھکانہ پوچھیں گے۔ پھر؟''

وہ بولا، ''یہ میرا دردِ سر ہے، تمہارا نہیں۔ تم بے فکر رہو۔ میں کسی کو بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' اس کے لہجے سے پختہ تیقن آشکار تھا، ''شہرے! مجھے میڈم اور میر و شاہ سے کوئی دلچسپی ہے، نہ کبھی تھی..... میں تو پروین کی وجہ سے تم لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ ہماری بدقسمتی تھی کہ جتن کے باوجود بھی نہیں ملی۔ اب میرے نزدیک ٹامک ٹوئیاں مارنے اور اپنے گھر والوں کو خان کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میں کسی دن منظرِ عام پر آ گیا تو بڑا خان میرے گھر والوں سے وہی سلوک کرے گا جو اس نے تمہارے خاندان کے ساتھ کیا ہے۔ دل میلا نہ کرنا شہرے! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ میں اب تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

میں اسے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ اس کی سوئی اسما کی رہائی پر اٹکی ہوئی تھی۔ اسما کو میڈم کسی بھی صورت میں رہا نہیں کرے گی، یہ مجھے علم تھا۔ میں نے کہا، ''کیا تم مجھ سے رابطہ رکھو گے؟''

وہ بولا، ''اگر ضروری ہوا تو اپنے یار کی مدد کروں گا۔''

میرے لیے یہی بہت تھا۔ وہ اُٹھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے اجازت لے کر گھر کے اندر گیا اور چند منٹوں کے بعد واپس آ کر، بانہیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا، ''شہرے! سینے سے تو لگ جاؤ یار..... پھر پتہ نہیں زندگی ہمیں اتنی سی مہلت بھی دے گی یا نہیں..... آؤ ناں!''

ہم دونوں بغل گیر ہوئے، ایک دوسرے کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے اور پھر میں نے اُسے دروازے پر آ کر رخصت کر دیا۔ میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر رہی تھی۔ اس کی جدائی بہرحال میرے لئے کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔

مجھے یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ نور پور میں اُس کے لیے فضا سازگار نہیں ہوگی۔ اسے گھر پہنچتے ہی سردار حیات خان، دریام خان اور پھر بڑے خان کی عدالتوں میں پیشیاں بھگتنا پڑیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ اسے سرکاری مہمان بنا کر خوب آؤ بھگت کی جائے.....

وہ چلا گیا تو شانو نے مجھ سے اُس کی ناراضی کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ شاید کان لگا کر ہماری باتیں سنتی رہی تھی۔ میں نے اُسے ٹرخانا چاہا تو وہ بولی، ''نہیں بھائی! میں نے سن لیا ہے کہ وہ آئندہ یہاں نہیں آئے گا۔''

''ہاں شاید! مگر تم فکر نہ کرو۔ یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے۔''

''اچھا چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ کہ اسکول میں داخلے کا بندوبست ہوا؟'' اس نے اچانک موضوع بدل دیا۔

''میں نے ابھی تک کسی سکول سے رجوع نہیں کیا۔''

''تو کرو ناں.....'' وہ سنجیدگی سے بولی، ''ہماری تو خیر ہے مگر موجو کو اب سکول میں جانا چاہیے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ موجو کو با آسانی داخلہ مل سکتا تھا مگر شانو اور فرزانہ کے سرٹیفکیٹ نہیں تھے جو داخلے کے لیے ضروری تھے۔ ان کے حصول کے لیے نور پور میں جانا پڑتا تھا جو خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ میر و شاہ یا پیا جی سے اِس موضوع پر بات کروں گا اور ان کی مدد سے کوئی راستہ نکالوں گا۔

میں نے کھالے سے ہونے والی گفتگو موبائل فون پر میر و شاہ کے گوش گزار دی۔ اس نے بڑی لاپروائی سے کہا، ''کچھ بھی نہیں بگڑت بابا! تم فکر نہ کرت ہے..... ایسے لونڈے جانے کے لیے ہی تو آوت ہیں ملتان شریف میں.....''

میں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا، ''وہ کوئی گڑبڑ نہ کردے جا کر؟''

''کیسے کوئی گڑبڑی کر سکت ہے وہ؟'' اس کا لہجہ استعجاب سے معمور ہو گیا۔

''اُس نے میڈم کی کوٹھی ہی ٹو اور پیا کا کوارٹر دیکھ رکھا ہے۔''

''اوئے غنچے! کاہے کو فکر کرت ہے پھوکٹ میں..... یہ مہارانی کی راجواڑی ہوت، میر و شاہ کا شہر ہووت، یہاں وہ سالا کالا ٹیٹ مخبری کر کے ماڑا کیا بگاڑ لیوت ہے..... ہیں؟'' میر و شاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا، ''ایک دنیا جانے ہے ماڑے کو، وہ بھی آخر کو ماڑے ہاتھوں کو جان لیوت ہے۔ ماڑے کو پتہ ہووے کہ وہ استاد بلو کے چرنوں میں جا کر بیٹھنے کو باندر پھرتیاں دکھاوت ہے، بس! لاڈے میاں..... وہ چلا جاوت ہے، جان چھوٹ جاوت ہے ماڑی بھی۔''

مجھے تسلی ہوئی۔ ماقبل مجھے یہ ڈر بھی لاحق تھا کہ کہیں میر و شاہ خالد کے یوں اچانک یہاں سے جانے پر خفا نہ ہو یا اس کا دل میری طرف سے میلا نہ ہو، اس لیے میں نے رپورٹ پیش کر دی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اُس کے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔

اس نے مجھ سے پوچھا، ''ماڑے غنچے کو کوئی پریشان ہووت ہے تو بول دیوت ہے۔''

میں نے اسکول کے داخلے میں درپیش ممکنہ پریشانیاں ظاہر کیں۔ وہ ان جھمیلوں سے کبھی

نہیں گزرا تھا، تبھی سمجھ نہیں پایا اور جھٹ سے بولا، ''ماڑی رانیوں کو، ننھے گلگلے سے راجہ جی کو کان سے پکڑے اور سکول لے جا کر چھوڑ دیوت ہے..... اس میں گھبرانے کی کیا بات ہووے لاڈے میاں؟''

میں نے اُسے سمجھایا کہ سکول میں داخلے کے لیے پیدائشی اور مدرسہ چھوڑنے کے تصدیقی سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر جل چکا ہے۔ اس میں موجود تمام کاغذات، بشمول میری اسناد و دستاویزات جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔ نئے بنوانے کے لئے نور پور کے نواحی گرلز سکول میں میرا جانا ضروری تھا اور میں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں نے بڑی مشکل سے اُسے معاملے کی نوعیت اور سنگینی سے آگاہ کیا۔ وہ بولا، ''اڑے ماڑے غنچے! یہاں تو سب کچھ مل جاوت ہے، بنا بنایا بندہ بھی ہاتھ لگ جاوے ہے..... پھر کاغج (کاغذ) کیوں نہ ملت ہیں۔ ناڑا مورکھ پیا کس دن کام آوت ہے، تم اُس پیدا گیر کو ماڑا نام لے کر بول دیوے ناں..... اور ہاں لاڈے میاں! مہارانی کو کھالے کی واپسی کی خبر بھی دیوت ہے..... اِسی ٹائم.....''

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور رابطہ منقطع کر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میڈم شکیلہ سے فون پر رابطہ کیا اور چاہا کہ اُسے کھالے کے بارے میں مطلع کر دوں۔ اس نے میری بات آغاز ہی میں اُچک لی اور اسپاٹ لہجے میں بولی، ''شہریار! تم اپنی توانائیاں اس کے بارے میں سوچنے اور مجھے رپورٹ دینے پر ضائع نہ کرو۔ اسے جانا تھا، چلا گیا۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں مصروف ہوں ورنہ تمہیں زیادہ وقت دیتی مگر..... او کے! سی یو!''

اس نے میرا جملہ 'جی میڈم' سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ میں نے عافیت کی سانس سینے میں اُتاری اور بے دھیانی کے عالم میں فون کی ڈسپلے سکرین کو گھورنے لگا۔ اپنی یادداشت کو کنگھالنے لگا مبادا کہ میں نے کھالے سے ہونے والی گفتگو کے دوران میڈم کے مفاد کے خلاف کوئی بات نہ کر دی ہو؛ تسلی ہوئی کہ مجھ سے یہ کوتاہی سرزد نہیں ہوئی تھی۔

میں نے پیا جی کو کال کی۔ اُسے سمجھانے میں زیادہ وقت نہیں ہوئی۔ اس نے نام، ولدیت اور عمروں سمیت کئی معلومات حاصل کیں، انہیں کسی کاغذ پر لکھا اور دو چار دنوں میں ہی یہ کام نمٹا دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھانے میں کامیاب ہو جائے گا اور میرا مسئلہ حل کر دے گا۔

کھالے کے ردِعمل اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کی سنگینی کا فکر لاحق تھا، نہیں رہا۔ وہ نور پور سدھار گیا تھا۔ ایک امید بندھ چلی تھی کہ وہ نور پور میں رہ کر پروین کا کوئی سراغ نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

مجھے بچوں کے داخلے کا فکر دامن گیر تھا، نہیں رہا مگر نئے مسائل جنم لے چکے تھے۔ مجھے قسمت نے قانون کی نظروں میں مجرم بنا دیا تھا اور مجھ پر نور پور کے راستے بند کر دیے تھے۔ پروین کی کوئی خبر نہیں تھی اور سردار حیدر خان میرے خون کا پیاسا بن چکا تھا۔ میرے والدین کے قاتل مجھے نہیں ملے تھے بلکہ چاچا اور چاچی بھی نہایت بے بسی کی موت کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے قاتل میرے اور پیاجی کے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے مگر ان کے ڈوریں ہلانے والا اصل قاتل زندہ و سلامت میری نظروں کے سامنے تھا جس سے انتقام لینا میری ترجیحی خواہش بن چکی تھی۔ میں گھر سے نکل کر بظاہر تعیش کی زندگی بسر کرنے لگا تھا مگر مجھے ایک پل کو بھی چین نصیب ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میڈم شکیلہ کے سجائے ہوئے کمرہ امتحان سے سرخرو نکلا تھا مگر اس نے مجھے نئے مشن پر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کر کے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ اب مجھے اس کے احسانات کے عوض میں اپنی خدمات پیش کرنا تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عادی اور مفرور مجرم بننا تھا۔ میں نے خود کو اس بھیانک گرداب سے دور رکھنے کی اَن گنت ترکیبیں سوچیں مگر سبھی کو ناقابلِ عمل قرار دے کر جھٹلا دیا۔ میں میڈم کے آہنی شکنجے میں بری طرح جکڑا جا چکا تھا اور اس کی مرضی کے مطابق مستقبل کی راہیں متعین کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں مشن پر جانے سے انکار کر دوں..... پھر خیال آیا کہ انکار کے بعد کیا کروں گا؟ میں بزدل نہیں تھا کہ اُس سے یا اُس کے کارندوں سے ڈر جاتا مگر میرے پاس مستقبل کا کوئی لائحہ عمل بھی تو نہیں تھا۔ میڈم کی سلطنت کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ کہاں چھت میسر آتی جس کے نیچے اپنے باقی ماندہ خاندان کو زمانے کے گرم و سرد سے چھپا کر رکھتا..... کہاں اتنی طاقت اور اسلحہ میسر آتا جس کے بل پر حیدر خان کے محل کو خاکستر کرنے کا خواب دیکھتا..... کہاں سے اتنی دولت ہاتھ لگتی کہ میں جو چاہتا، کر لیتا اور قانون ہاتھ میں لے کر دندناتا پھرتا.....

ذہن نے فوراً ہی اصلاح کر دی کہ محض بازوؤں کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے، میڈم شکیلہ کو انکار کرنے کے بعد، میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں اس کے

ماہر لڑاکوں اور جانباز غنڈوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جو انکار کے بعد میری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے کسی کو اغوا کرنے، کہیں منشیات کی کھیپ اور اسلحہ پہنچانے یا لینے کے لئے بھیجنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہی اُس کا بزنس تھا جس کا ہن اُس پر شب و روز برستا تھا اور میں اس کی بچھائی ہوئی بساط پر محض ایک مہرہ تھا۔

میں نے جب دیانتداری سے سوچا کہ کیا میرے پاس واپسی کا راستہ ہے؟ تو مجھے ذہن کے نہاں خانوں سے یہی جواب موصول ہوا، ''نہیں شہریار! تم آگے بڑھ سکتے ہو مگر پیچھے دیکھ کر عبرت پکڑنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ابھی تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو اور میڈم کے احکامات کی تعمیل میں عافیت کی راہیں تلاش کرو..... کسی مناسب وقت پر ایسا دلیرانہ فیصلہ کرنا۔''

مجھے میڈم نے اپنے قریب کیا تھا مگر ایک حد تک..... کہ ابھی تک میں اُس کے گروپ کی ہیت اور انتظام و انصرام سے واقف نہیں ہوا تھا۔ مجھے گروپ کے چند ایک لوگوں سے ہی متعارف ہونے کا موقع میسر آیا تھا۔ صحیح معنوں میں سوائے میر وشاہ، پیاجی اور عقیل کے، میں نے کسی کو ایکشن میں نہیں دیکھا تھا۔ میر وشاہ نے مجھے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ پیاجی سے کہیں بڑے پیداگیر انسان میڈم کے تلوے چاٹتے ہیں۔ پیاجی کو دیکھ رکھا تھا، وہ بہت دلیر اور کائیاں انسان تھا۔ اس سے بھی تیز طرار اور پیداگیر لوگ اگر میر وشاہ اور میڈم کی مٹھیوں میں بند تھے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے یہاں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ میری بے احتیاطی بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

پیاجی سے پتہ چلا تھا کہ میر وشاہ لڑائی بھڑائی کا بندہ نہیں تھا۔ وہ اس گینگ کا ماسٹر مائنڈ پلانر تھا، پلان بنا کر کارندوں کو روانہ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے میڈم کے ہاں اس کا مقام 'کمانڈر' کا سا تھا۔ پیاجی کے لیے 'پیداگیر' کی اصطلاح میر وشاہ سے ہی سن رکھی تھی۔

اسما کی طرف میرا دل کھنچتا تھا۔ اس کا انجام بہت برا ہونے والا تھا مگر میں چاہتے ہوئے بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ زندگی کے کسی بھی لمحے میں کھلے کو شریک حیات بنانے کا سوچے گی، تو بھی شاید میڈم کے مقابلے میں اس کی اعانت کرنا حماقت ہوتا۔

دو تین دن فراغت کے جھولے میں جھولتے ہوئے گزر گئے۔ پیاجی کی طرف سے ہنوز کوئی رپورٹ نہیں ملی تھی مگر میں متفکر نہیں تھا۔ شام ڈھلی تو میر وشاہ کا فون موصول ہو گیا۔ اُس نے میڈم کی کوٹھی پر فوراً پہنچنے کا حکم صادر کیا۔ میں نے فوجی اختر کو گھر کا خیال رکھنے کا حکم دیتے

ہوئے یہ باور کرا دیا کہ میری واپسی میں غیر معمولی تاخیر ہو سکتی تھی۔ اس نے مضبوط لہجے میں ڈھارس دی، ''فکر نہ کرو شہریار! یہ میرا گھر ہے اور میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ میلی نظر دیکھنے والے کی آنکھیں نکال پھینکوں۔ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ موجو میرا بیٹا ہے۔ جب تک جی چاہے، باہر رہو، جب فارغ ہو جاؤ، تب واپس آ جاؤ۔''

میر و شاہ نے بتایا نہیں تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ مجھے کسی مشن پر روانہ کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔

میں رکشا میں میڈم کی کوٹھی پر پہنچا۔ ظاہر شاہ کو میرے آنے کی پیشگی خبر مل چکی تھی۔ اس نے رسمی علیک کے بعد مجھے گیسٹ روم میں پہنچا دیا جہاں ایک ناٹے قد کا نیم گنجا شخص صوفہ نشین تھا۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا تو اُس نے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا، ''شہریار؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بولا، ''میرا نام سخی محمد ہے۔ ہم دونوں مال پہنچانے کے لیے یہاں سے تھوڑی دیر بعد نکلنے والے ہیں۔''

اس کے لہجے میں عجیب سی سرسراہٹ تھی جسے کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا تھا۔ چونکہ میں نے آنے والا غیر معینہ وقت اُس کے ساتھ گزارنا تھا اور حسبِ سابق اس کی رہنمائی میں مشن سرانجام دینا تھا، اِس لیے اُسے دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ فربہی مائل کسرتی بدن اور سنولائی ہوئی رنگت والا شخص تھا۔ سامنے کا آدھا سر خالی تھا اِس لیے ماتھا بہت کشادہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں عیاری کا بھرپور تاثر لئے ہوئے تھیں۔

شبو چائے سرو کر کے چلا گیا تو میں نے سخی محمد سے دریافت کیا، ''ہم یہاں کسی کا انتظار کر رہے ہیں؟''

وہ بولا، ''جی ہاں!''

''کس کا؟''

''شاہ جی، یعنی میر و شاہ کا.....'' وہ بہت اختصار پسند فطرت کا مالک محسوس ہوا۔

''وہ کب تک آ جائے گا؟''

''میں نہیں جانتا.....''

''مال کس قسم کا ہے؟''

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا، کچھ سوچا اور ہلکی سی بیزاری سے بولا، ''میں نہیں

جانتا.....''

اس کی اختصار پسندی درحقیقت محتاط روی بھی ہوسکتی تھی اِس لیے میں ہنکارا بھر کر خاموشی سے چائے پینے لگا۔ میں نے ازخود محسوس کیا کہ میرے سوالات غیرضروری تھے۔

ایسے ہی وقت میں میروشاہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنی عادت کے برعکس بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہم دونوں سے غیرمعمولی سردمہری سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا۔ بولا، ''ماڑے غنچے! سمجھ لیوت ہے کہ تم پائلٹ ہووے اور یہ تمہاری اجمائشی (آزمائشی) فلائٹ ہووے ہے..... اگر ماڑا غنچہ، میروشاہ کالا ڈاجیت کرآوت ہے تو گلے میں مالا دیکھت ہے، ہار کرآوت ہے تو پھر اس کو جگ میں کوئی بھی نہ دیکھت ہے..... جرا (ذرا) غور سے ماڑی بات سن لیوت ہے..... ماڑے سخی جانی! تیرے کانوں میں بھی ڈالت ہوں..... نئے مشن کے بارے میں چند جروری (ضروری) باتیں کرنا ہووت ہیں.....''

میروشاہ نے اپنے مخصوص انداز میں مشن کی تفصیل بتانا شروع کردی۔ میں اور سخی محمد غور سے سن رہے تھے۔

میری توقع کے برعکس مجھے منشیات یا اسلحہ کی ترسیل نہیں کرنا تھی بلکہ خانزادی اسما کو دوآبہ کے خطرناک علاقے میں موجود میاں دلبر حسین کے فارم ہاؤس پر پہنچانا تھا۔ میاں دلبر حسین کو میں غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ وہ بہت بڑا جاگیردار تھا۔ لاہور کے کسی مضافاتی علاقے سے سردار حیدر خان کے پاس آیا کرتا تھا۔ بڑی سیاسی پارٹی کا اہم ستون ہونے کی وجہ سے سیاسی گٹھ جوڑ کے تمام امور اُس کے ذمہ تھے اس لیے یہاں کے سبھی سیاسی کھلاڑی اس کے آگے سرِتسلیم خم کرتے تھے۔ چونکہ مجھے میروشاہ نے پہلے بتا رکھا تھا کہ وہ اسما کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس نے بہت بڑی رقم کی آفر بھی کر رکھی ہے، اس لیے مجھے حیرت نہیں ہوئی۔

میں نے خانزادی کو دوآبے میں موجود میاں دلبر حسین کے ایک خاص کارندے رنگ علی عرف رنگو قصائی تک پہنچانا تھا جس نے دو کروڑ روپے کی خطیر رقم میرے حوالے کرنا تھی۔ میڈم شکیلہ اور میاں دلبر حسین کے درمیان سودا طے پا چکا تھا۔ اس نے میڈم پر واضح کیا تھا کہ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے خاص سیاسی مہرے سردار حیدر خان کے لیے اس ڈیل کا تردد کر رہا تھا۔ چونکہ میڈم کو سردار حیدر خان پر اعتماد نہیں تھا اور نہ حیدر خان کو اُس پر بھروسہ تھا، اِس لیے خان کی طرف سے میاں دلبر حسین کو بیچ میں ڈالا گیا تھا۔ میڈم نے میاں دلبر حسین پر واضح کردیا تھا کہ

گڑبڑ کرنے کی صورت میں وہ اور حیدر خان اسما سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور میاں دلبر نے اُسے گارنٹی بھی دے دی تھی مگر آنکھیں بند کر کے دوآبے میں جانا بہت بڑی حماقت تھی۔

میں نے تشویش ظاہر کی، ''کیا تبادلے کا یہ طریقہ نامناسب نہیں ہے؟''

''ماڑے کو سمجھ نہ آوت ہے لاڈے میاں؟ تم کیا کہوے ہے؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے بہتر تھا کہ پہلے رقم لی جاتی، پھر خانزادی کو کسی مقررہ جگہ پر پہنچا دیا جاتا۔'' میں نے کہا، ''اس طرح تو گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ جونہی اسمار نگو قصائی کی تحویل میں چلی جائے گی، رنگو قصائی اور اس کے ساتھی مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے۔ وہ مجھ سے دو کروڑ روپے کی رقم چھیننے کے لیے سامنے آ جائیں گے۔ علاقہ ان کا ہے اور وہ لوکیشن کو ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ اس لئے وہ ہم دونوں کو باآسانی دوآبے میں کسی بھی جگہ پر گھیر لیں گے اور گولی مار کر دی ہوئی رقم واپس لے لیں گے۔ میڈم دو کروڑ روپوں سے جائے گی؛ ہم جان سے جائیں گے۔''

میری بات سن کر میر وشاہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا، ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

وہ بولا، ''اڑے واہ لاڈے میاں! تم تو غجب (غضب) کے عقل ور ہووت ہو..... بڑے بولت ہیں کہ کاگا جی نے ایک دفعہ اپنے پوت (بیٹے) کو نصیحت کرت کہ جونہی مورکھ انسان پتھر اُٹھانے کو جھکت، تم اُڑ جاوت..... کاگے کا پوت بولت کہ باپو! اگر اُس مورکھ نے پہلے ہی پتھر ہاتھ میں رکھا ہووت تو..... کاگا جھوم کر اپنے پوت کا ماتھا چوم لیوت اور کہوت: کہ جا میرے سیانے پوت! تیرے کو کوئی بھی نشانہ نہ مار سکت ہے..... تو اب آپ سیانا ہو جاوت ہے..... جا، اُڑ جا..... ماڑے لاڈے! تو بھی اُڑ جا!''

میر وشاہ قہقہہ مار کے ہنسا اور میرا کندھا تھپتھپا کر بولا، ''ماڑے غنچے! ماڑی دنیا میں رِسک لینا پڑت..... جندگی کا، نقصان کا، بھول کا..... تیرے کو معلوم ہووت کہ وہ بغدے مار کا بچہ رنگو قصائی تیرے کو دوآبے میں گھیرنا مانگت ہے تو پھر تو کاہے کو اُس کے گھیرے میں آوت ہے؟ کوئی توڑ کر لیوت ناں..... ماڑی مہارانی جی اُس خان زادی کو وہاں پہنچانے کا پرامس کر

لیوت ہے، بس! اب تم اس کا پرامس پورا کرت ہے لاڈے میاں!''

''کیا یہ بھی میرے امتحان کی کڑی ہے؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

اس نے کندھے اُچکائے، بولا، ''یہ تو مہارانی ہی جانت ہے، ماڑے کو علم نہ ہووت ہے.....''

بظاہر آسان دکھائی دینے والا مشن درحقیقت آسان نہیں تھا۔ یہ تو صریحاً شامت کو دعوت دینے کی بات تھی۔ میرے چہرے پر تشویش اور کشمکش کے آثار دیکھ کر میر وشاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا، ''ماڑی ٹیم مہارانی کے حکم پر کچھ بھی نہ سوچے ہووت..... بس فوجیوں کی طرح 'ٹھاہ' کر دیوت ہے جبکہ میں دیکھت ہوں کہ تو سوچ میں پڑ جاوت ہے۔ ہے ناں غنچے؟''

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ پیا جی نے بھی مجھے یہی کہا تھا۔ سامنے کھڑی موت کی آنکھوں سے زندگی کی مہلت چرانا آسان نہیں ہوتا مگر میڈم کے گروپ کا ہر فرد ایسا ہی جی دار واقع ہوا تھا۔ میں نے خودکشی کے پروانے پر دستخط کرتے ہوئے سر جھکا دیا۔ حامی بھر لی۔

حیدر خان کے گرگے استاد ببلو کی طرف سے تمام متوقع خطرات سے آگاہ کرنے کے بعد اس نے غیر متوقع طور پر مجھے اِس مشن کا انچارج مقرر کر دیا۔ میں نے پس وپیش کیا تو اُس نے درشتی سے ڈانٹ دیا۔ اپنی زنبیل نما جیب سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا اور اسے میز پر پھیلا دیا۔ وہ ہاتھ کا بنا ہوا ایک تفصیلی نقشہ تھا جس پر دوآبے کے وسیع اور خطرناک علاقے کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اس نے ٹارگٹ لوکیشن کو نشانزدہ کیا اور کھڑا ہو گیا۔ بولا، ''لاڈے میاں! یہ بہت بڑا مشن ہووت ہے..... ہے ناں؟ دو کروڑ کے نوٹوں کی گنتی میں شام سے فجر ہو جاوت ہے..... اور غلطی..... ناں بابا ناں..... غلطی کی گنجائش؟ نشتہ..... اب تم اپنے موبائل شوبائل اِدھر ڈال دیوت اور تیاری کر لیوت.....''

اس کا لہجہ خوفناک حد تک سرد ہو گیا۔ میرے رگ وپے میں سنسنی دوڑنے لگی۔ خانزادی کو وہاں تک پہنچانا بہت مشکل کام تھا۔ اس سے کہیں زیادہ جان لیوا کام دو کروڑ روپے کی خطیر رقم بحفاظت کوٹھی تک لانا تھا۔ میر وشاہ کے ہاتھ کے مخصوص اشارے پر ہم دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے پارکنگ میں آئے جہاں ایک ڈارک گرے کلر کی نسان ڈبل ڈور ہائی لکس ہماری منتظر تھی۔ اس کا عقبی کھلا حصہ پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ میر وشاہ نے ہائی لکس کے بمپر پر پاؤں رکھا اور خنک لہجے میں کہا، ''لاڈے میاں! پودوں سے لدے پھندے ڈالے دوآبے میں آوت جاوت ہیں۔ ماڑے کو پتہ ہووت ہے اس لیے ہریالی لادرکھی ہووے۔ پچھلی سیٹ کے

نیچے کھلونے چھپا رکھے ہوتے ہیں..... جرورت کے سمے نکال لیوت..... ٹھیک؟ تم ادھر گڈی (گاڑی) کو دیکھت، ماڑا سخی جانی مال اندر سے اُٹھالاوت ہے.....''

اس نے پہلو کی جیب سے ہائی لکس کی چابی نکالی، میری ہتھیلی پر رکھی اور سخی محمد کا بازو پکڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوٹھی میں گھس گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد سخی محمد خانزادی کے بے ہوش وجود کو کاندھے پر لادے کوٹھی سے برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ میر و شاہ نہیں تھا۔ میں اس دوران ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ہائی لکس کا بہ نظرِ احتیاط جائزہ لے چکا تھا۔ وہ نئے ماڈل کی گاڑی تھی جسے یقینی طور پر کہیں سے ایسے ہی موقع کے لیے چرایا گیا تھا۔ پیا جی نے فارم ہاؤس میں مجھے بتایا تھا کہ ہمارے زیرِ استعمال آنے والی گاڑیاں عمومی طور پر چوری شدہ ہوتی ہیں جنہیں ایک دو موقعوں پر استعمال کر کے علاقہ غیر روانہ کر دیا جاتا تھا جہاں وہ اونے پونے میں فروخت کر دی جاتی تھیں۔ یہ بھی ایک طرح کا میڈم کے کاروبار کا حصہ تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ہائی لکس کا عقبی دروازہ غیر مقفل کیا۔ سخی محمد نے دروازہ کھول کر اسما کو سیٹوں کے درمیان فرش پر لٹا دیا اور کہا، ''یہ بے ہوش ہے اور کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتی ہے۔''

میں نے لاپروائی سے کہا، ''کوئی بات نہیں۔''

اس نے پوچھا، ''کیا تم ڈرائیونگ کرو گے؟''

میں نے کہا، ''میں نے راستہ نہیں دیکھ رکھا۔ اگر تم نے دیکھ رکھا ہے تو تم اِدھر آ جاؤ۔''

''میں کئی مرتبہ دو آبہ جا چکا ہوں۔ میاں دلبر کا اڈہ تو نہیں دیکھا مگر لوکیشن سے آگاہ ہوں۔''

''تو پھر تم ہی ڈرائیونگ کرو۔''

اس نے کندھے اُچکائے اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گیا۔ بیٹھنا چاہتا تھا کہ اسلحے کا خیال آ گیا۔ بولا، ''ایک نظر اسلحے پر ڈال لو۔''

میں نے پائیدان پر پاؤں ٹکا کر سیٹ اُٹھائی اور موجود اسلحے کا جائزہ لیا۔ جدید طرز کی شارٹ گنیں، ایک سلور کلر کا جرمن ساختہ ماؤزر، دو پسٹل اور کئی لوڈڈ میگزین دیکھ کر مجھے تقویت ملی۔ میں نے سخی محمد سے پوچھا، ''کیا تم کوئی ہتھیار لو گے؟''

اس نے کہا، ''پسٹل یا ریوالور ہے تو نکال دو۔ سنگل میگزین..... ویسے تو دریا کے پار تک کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

''لیکن ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔'' میں نے ایک پسٹل نکال کر اُسے تھمایا، دوسرا اپنے لیے اُٹھا

یا اور سیٹ کو اپنی جگہ پر ایڈجسٹ کر دیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے اگنیشن میں چابی گھما دی۔ انجن گھر گھرا کر بیدار ہوا اور ہائی لکس ایک جھٹکے سے کوٹھی کے جہازی سائز گیٹ کی طرف بڑھی۔ میں نے ڈیش بورڈ میں روشن سبز ہندسوں والی گھڑی پر وقت دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ ابھی شہر جاگ رہا تھا مگر ہم جہاں جا رہے تھے، وہاں کی زندگی اس وقت تک آدھی نیند کا خمار اوڑھ چکی ہوتی تھی۔ دیہاتوں میں صبح اور شام بہت جلد کچے منڈیروں پر اُتر آتی ہے۔

میں نے پوچھا، ''سخی محمد! ہمارا سفر کتنی دیر کا ہے؟''

''اگر شہر سے نکلنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو صرف ایک گھنٹے کا.....''

''یعنی ہم ساڑھے بارہ بجے ٹارگٹ پر ہوں گے؟''

''ہاں!'' اس نے ہائی لکس کار پنڈ روڈ پر چڑھا کر بریک پر پاؤں رکھے بغیر دائیں ہاتھ ٹرن لیتے ہوئے کہا۔

''ہم موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔'' میں نے ازراہِ کلام کہا۔

''کیا تم ڈر رہے ہو؟'' اس نے عقب نما کا رُخ بدلا۔ اَب اس کی آنکھیں مجھے دکھائی دینے لگی تھیں۔

''ڈر میری سرشت میں شامل نہیں ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا، ''میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''احتیاط ہر کام میں لازم ہے، خواہ موت کا خطرہ ہو یا نہ ہو۔'' وہ سرد لہجے میں بولا، ''تم اس مشن کے ماسٹر ہو، جیسا کہو گے، ویسا کروں گا۔ اگر چاہو گے تو ضرورت پڑنے پر مشورہ دوں گا، نہیں چاہو گے تو ہر حکم مانتا جاؤں گا۔ میں نے یہی اصول پڑھ رکھا ہے۔''

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک نوے درجے کا موڑ تیزی سے کاٹا۔ ایک سائیڈ کے دونوں ٹائر بیک وقت چرچرائے۔ میں پہلو کے بل سیٹ پر گرا مگر فوراً ہی سنبھل کر اُٹھ بیٹھا۔

وہ بولا، ''لڑکی کو رنگو قصائی کے حوالے کرنا ہمارا مشن نہیں ہے بلکہ رنگو سے پیسے وصول کرنے کے بعد دوآبے سے زندہ سلامت نکلنا ہمارا مشن ہے۔ رہی بات موت کی؛ تو وہ کہاں منتظر نہیں ہے؟'' اس نے سامنے سے آنے والے ایک ٹرک کی طرف اشارہ کیا جو اپنی ہیڈ لائٹس ڈم کر کے کراسنگ کے عمل کو آسان بنا رہا تھا، ''دیکھو! وہ سامنے سے آنے والے منی ٹرک کا اسٹیئرنگ محض ایک انچ دائیں جانب کھسک جائے تو ہم کٹ پھٹ کر مر جائیں گے..... تمہیں

دوم

اور مجھے کسی بھی لمحے دل کا دورہ پڑ سکتا ہے، موت کا تو کوئی بھی بہانہ بن سکتا ہے..... موت میدانِ جنگ میں بھی منہ کھولے کھڑی ہے، بیڈروم میں بھی..... پھر کاہے کو ڈرنا؟''

میں نے ایک طویل سانس لی اور خاموشی اختیار کر لی۔ یہ اور موت کے بارے ایسی کئی فلسفیانہ باتیں میں نے پیا جی کے منہ سے سن رکھی تھیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میڈم کے گینگ کے ہر رکن کے ذہنوں کی تیاری پیا جی اور اس کے مرحوم استاد نے کی تھی اور انہوں نے سب کو موت کے خوف سے آزاد کرنے کے لیے یہی نادر ڈاکٹرائن اذہان پر نقش کر دی تھی۔

میرے پیروں تلے خانزادی اسما کا بے حس و حرکت وجود پڑا تھا جو سخی محمد کے بقول کسی بھی وقت متحرک ہو سکتا تھا۔ وقت بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ وہ نازوں پلی خان زادی جس کے ابروؤں کے اشاروں پر نوکروں کی فوج حرکت میں آ جاتی تھی، اس وقت نہایت کسمپرسی کی حالت میں میرے پیروں تلے پڑی تھی۔ یہی شہر تھا جب پولیس مجھے گرفتار کر کے تھانے لے جا رہی تھی اور میرا بدن ملک ارشد اور بڑی مونچھوں والے فرید خان کے سرکاری بوٹوں تلے پڑا تھا جبکہ آج میرے پیروں تلے ایک فرعون صفت وڈیرے کی بیٹی لاوارثوں کی طرح پڑی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ میرے پاؤں اس کے بدن کو نہ چھوئیں مگر محدود جگہ میں اس احتیاط کی گنجائش نہیں تھی۔ ناچار مجھے ایک پاؤں اس کے گھٹنے پر رکھنا پڑا جبکہ میں نے دوسری ٹانگ دوہری کرتے ہوئے سیٹ پر رکھ لی۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے میر و شاہ اور میڈم پر غصہ بھی آیا کہ انہوں نے خواہ مخواہ مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ پہلے رقم حاصل کرتے، پھر اسما کو کسی جگہ پر پہنچا کر فون پر رنگو قصائی کو پیغام دے دیتے کہ فلاں جگہ پر جا کر اسما کو اُٹھا لے۔ یہ بہت محفوظ طریقہ تھا۔ اب جو طریقہ اپنایا جا رہا تھا، یہ نہایت سنگین اور احمقانہ تھا۔ اس سے قبل میڈم نے فارم ہاؤس میں مجھ پر حملہ کرتے ہوئے بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ تب قسمت نے ساتھ دیا تھا ورنہ ہم دونوں بن موت مارے جاتے اور آزمائش کی خونیں قیمت چکانا پڑتی۔

اچانک، میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ مجھ پر میڈم شکیلہ کی سفاک اور بے رحم فطرت آشکار ہو گئی۔ وہ مجھے موت کے مقابل میں کھڑا کر کے میری صلاحیتوں کا مشاہدہ کرنا چاہتی تھی۔ جیت گیا تو الیگزینڈر دی گریٹ کی طرح رکسونا کے پاس زندہ و سلامت پہنچ جاؤں گا ورنہ ہزیمت سے دوچار ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی بازی بھی ہار جاؤں گا۔ میرے ہونٹ

بھنچ گئے۔

میری فرمائش پر سخی محمد ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ مجھے علاقے کے بارے میں بھی بتاتا جاتا تھا۔ یہ فلاں روڈ ہے، یہ فلاں چوک ہے، وغیرہ۔ جونہی ہم شہر سے نکل کر مضافات کے اندھیرے میں پہنچے، وہ بولا، ''کچھ دیر بعد ہم چناب کا سپر بند عبور کر کے دریائی علاقے میں داخل ہو جائیں گے۔ جہاں ملتان کی حد ختم ہوگی اور ضلع مظفر گڑھ کا علاقہ شروع ہو جائے گا، سمجھنا کہ دوآبہ شروع ہو گیا ہے۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب، جدھر سے پانی آ رہا ہے، چند کلومیٹر جائیں گے۔ پھر دریا عبور کر کے منزل کی طرف بڑھ جائیں گے۔''

ہائی لکس ایک مل دار لنک روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے پوچھا، ''میں نے تو سنا ہے کہ اس علاقے میں دریا پر ایک ہی پل بنا ہوا ہے؟''

''ہاں!'' وہ بولا، ''پل تو ایک ہی ہے..... وہ شیر شاہ بائی پاس والا..... مگر اس طرف کشتیوں کا ایک پل بنا ہوا ہے جس پر سے بھتہ دے کر گزرا جا سکتا ہے۔''

جن دنوں میں امیر نواز کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا، ان دنوں میں نے دریائے سندھ پر غازی گھاٹ کے قریب پتن پر کشتیوں کا بنا ہوا ایک پل دیکھا تھا۔ سوچا کہ ویسا ہی پل یہاں بھی ہوگا۔

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور شیشے کے پار دیکھنے کی کوشش کی مگر اندھیرے کی وجہ سے کچھ واضح دکھائی نہیں دیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک اور اس کے اطراف کا مختصر علاقہ دکھائی دیتا تھا۔

سخی محمد سے ملنے والی معلومات کو میں ذہن نشین کرتا جاتا تھا۔ دو دریاؤں کے بیچ حائل خشکی کے ٹکڑے کے لیے دوآبہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے مگر یہاں دریائے چناب کے متصلہ علاقے کو لوگوں نے دوآبہ کا نام دے رکھا تھا۔ چونکہ یہاں سے بہنے والے دریائے چناب میں اوپر کی جانب تریموں ہیڈ پر دریائے جہلم کا پانی بھی شامل ہو جاتا تھا، یعنی اس مقام پر دونوں دریاؤں کا پانی بہتا تھا، اس لیے دو دریاؤں کی وجہ سے دوآبہ کا نام دیا جاتا تھا یا دریا کئی نالوں کی صورت میں بہتے ہیں۔ ہر نالے کو دریا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دو نالوں کے درمیان خشک جگہ کو بھی دوآبہ کہا جا سکتا ہے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو، یہ طے تھا کہ یہ علاقہ بہت خطرناک اور کم آبادی پر مشتمل تھا۔

فصلوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آدھے چاند نے بدلیوں کی اوٹ سے طلوع ہو کر اندھیرے کا تسلط توڑ دیا۔ دھندلی چاندنی میں تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا سرکنڈوں، جھاڑیوں، اونچے نیچے ٹیلوں اور جھیل نما گڑھوں پر مشتمل ویران اور غیر آباد علاقہ دکھائی دینے لگا۔ دریا سے چند میل دور پختہ سڑک ختم ہو گئی اور ناہموار کچا راستہ سرکنڈوں میں بل کھا کر گم ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ چونکہ اَب تک کسی بھی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اس لیے نصف گھنٹے میں ہم دریا پر پہنچ گئے تھے۔ سخی محمد نے ایک جگہ ہائی لکس روک کر پوچھا، ''ماسٹر! کیا میں کچھ کہوں؟''

میں نے کہا، ''یار سخی محمد! اِس تکلف میں نہ پڑو، میں کوئی ماسٹر واسٹر نہیں ہوں تمہارا..... ہم دونوں ساتھی ہیں اور بس..... جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔ ہمیں مل کر اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔''

وہ بولا، ''میں ان خیالات پر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر اصول تو اصول ہی ہوتا ہے۔ بہر حال! میرا خیال ہے کہ ہمیں ساڑھے بارہ بجے ٹارگٹ پر نہیں پہنچنا چاہیے۔ ڈیڑھ تا دو بجے کا وقت زیادہ مناسب رہے گا۔ تم کیا کہتے ہو؟''

میں نے کہا، ''تم درست سوچ رہے ہو۔ جہاں بھی ممکن ہو، وہاں ہم کچھ دیر کے لیے رک جائیں گے۔''

وہ بولا، ''یہاں رکا جا سکتا ہے یا پھر کشتیوں کا پل کراس کرنے کے بعد ایک جگہ پر قیام کیا جا سکتا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، چلو، دریا پار کرتے ہیں۔'' میں نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے گاڑی بڑھا لی۔ کچھ دیر بعد سرکنڈوں اور جھاڑیوں کا خودرو جنگل ختم ہو گیا اور دریائی ریت پر بل کھاتا ہوا راستہ شروع ہو گیا۔ چاندی کی ایک زگ زیگ لائن کچھ فاصلے پر زمین کے سینے پر کھنچی دکھائی دی۔ یہ دریائے چناب تھا جس کا دامن محض ایک رابطہ نہر کے پانی کا محتاج تھا۔ یہ رابطہ نہر دریائے سندھ سے چاندی کی لکیر کھینچنے کو پانی سمیٹ کر لاتی تھی اور دریائے چناب کی چھاتی کو چند سانسیں فراہم کرتی تھی۔ یہی پانی ہیڈ پنجند پر جا کر پھر اپنے اصل میں ضم ہو جاتا تھا۔ ہچکولے لیتی ہوئی ہائی لکس میں خاموشی طاری تھی۔ سخی محمد فطرتاً کم گو تھا۔ میں ذہنی اُدھیڑ بن میں غرقاں تھا جبکہ اسما میرے پیروں تلے بے ہوش پڑی تھی۔

پانچ منٹ کے بعد ہم کشتیوں کے دو اڑھائی سو فٹ لمبے پل کو عبور کر رہے تھے۔ گاڑی کے

وزن سے پل کے تختوں سے عجیب قسم کی آوازیں برآمد ہوئیں۔ دیہاتی طرز کے ٹول پلازے کی سالخوردہ میز کے عقب میں پڑی خالی کرسی کو دیکھ کر میں نے کہا، ''یہاں تو کوئی موجود نہیں ہے۔''

''رات کو ادھر کوئی نہیں آتا، اس لیے ٹیکس کلرک بھی گہری نیند سوتا ہے۔'' سخی محمد نے کہا۔ رات کو پل پر سے گزرنے والوں سے پیسے وصول کرنے اور پرچی دینے والا موجود ہی نہیں تھا، اگر کوئی تھا بھی تو وہ اِس وقت ترپال والے کیمپ نما ٹول پلازے میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ریتلے راستے پر سفر جاری ہو گیا۔ کچھ آگے جا کر ایک ٹیلے کے دامن میں، سرکنڈوں کے بیچ محفوظ جگہ پر گاڑی روک کر سخی محمد نے مجھے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ میں اُتر آیا اور ہائی لکس کی باڈی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سخی محمد گھوم کر میری طرف آیا اور دونوں بانہیں فضا میں پھیلا کر بولا، ''سردی کے باوجود فضا خوشگوار ہے۔ نہ جانے کیوں لوگ ایسی پرفضا جگہوں کو چھوڑ کر شہروں کا رُخ کرتے ہیں اور باقی زندگی کھانس کھانس کر گزارتے ہیں۔''

میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور پوچھا، ''کیا ہم دوآبے میں کھڑے ہیں؟''

وہ بولا، ''ہاں! ہم ملتان کے شمال میں کھڑے ہیں۔ کچھ ہی دوری پر میاں دلبر حسین کا فارم ہاؤس واقع ہے جہاں ہم نے پہنچنا ہے۔'' اس نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور کہا، ''اس سیدھ میں جائیں تو محمد والا ہیڈ کے مقام پر رابطہ نہر پر پہنچ جائیں گے۔ اس کی داہنی پٹڑی پر پختہ سڑک بنی ہوئی ہے جو دس بیس کلومیٹر دور واقع پشاور کراچی روڈ پر جا چڑھتی ہے۔'' وہ اس علاقے کے بارے مجھے معلومات بہم پہنچا رہا تھا، ''یہ تمام علاقہ پہلے ریگستانی تھا۔ اس نہر کے آنے پر اطراف کا میلوں رقبہ سیم ہو گیا۔''

میں نے پوچھا، ''میاں دلبر حسین کا یہاں کتنا رقبہ ہے؟''

''ایگزیکٹ فگرز تو میرے پاس نہیں ہیں البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی بہت بڑی جاگیر یہاں واقع ہے۔ شکار کھیلنے کے لیے ادھر آیا کرتا ہے، کبھی کبھار۔ جاگیر کے تمام معاملات رنگو قصائی سنبھالتا ہے۔ وہ اس کا خاص کارندہ ہے۔ ایک نمبر کا بدمعاش اور ڈھیٹ انسان ہے۔ سنا ہے کہ اس نے اَپر پنجاب میں وارداتوں سے اَت مچا رکھا تھا۔ قانون کو مطلوب تھا۔ گھیرا تنگ

ہوا تو میاں دلبر حسین نے اُسے ادھر نکال دیا۔ یعنی وہ ڈپوٹیشن پر ادھر آیا ہوا ہے۔''

میں نے خاموش اور خنک ماحول میں سرسراتی ہوئی دریائی ہوا کے تھپیڑوں کو اپنے رگ و پے میں اُترتے ہوئے محسوس کیا۔ ایڑیوں پر گھوم کر چہار جانب نظر دوڑائی۔ ارد گرد کہیں بھی آبادی کے آثار دکھائی نہیں دیے اور نہ ہی فلک پر چاندنی کے سوا کہیں روشنی کا احساس پایا۔ سخی محمد سے استفسار کیا، ''یہاں، قریب میں کوئی گاؤں نہیں ہے؟''

وہ بولا، ''ایک نہیں؛ کئی دیہات ہیں، مگر خاصے فاصلے پر واقع ہیں۔ اس علاقے پر چھوٹی سطح کے جرائم پیشہ لوگوں کی ان گنت پناہ گاہیں ہیں جن کے ڈر سے عام لوگ دن میں بھی کم اس طرف نکلتے ہیں۔'' سنجیدگی اُس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، بولتے بولتے ایک ذرا ٹھہرا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا، ''ماسٹر! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

میں نے کہا، ''نور پور سے آیا ہوں۔''

وہ بولا، ''وہ کہاں ہے؟''

میں نے اُسے نور پور کے محل وقوع کے بارے میں بتایا۔ وہ بولا، ''میرا گاؤں بورے والا میں ہے، دریائے ستلج کے کنارے پر..... سالدیرا ہیٹر، ہیٹر کا مطلب ہے نیچے والا۔ کچھ فاصلے پر سالدیرا اُتر بھی واقع ہے؛ یعنی اوپر والا..... میرے باپ دادا ستلج کو دریا کا نام دیتے تھے۔ مگر ہم نے ستلج کو دیکھا مگر دریا کو نہیں دیکھا۔ اس کی جگہ پر بس ویرانہ دیکھ رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ دریا رو کے سے نہیں رکتا، مگر سرحد پار والوں نے اُسے روک کر بتا دیا کہ انسان دریاؤں کا رُخ موڑ سکتا ہے۔ اب یہ دریا بھی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ کل کلاں تمہارا دریا، دریائے سندھ، بھی اپنا پانی پی جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ کیا یہ ساری زمینیں بنجر نہیں ہو جائیں گی؟''

وہ اپنی گفتگو سے خاصا پڑھا لکھا دکھائی دیا، میں نے حیرت سے پوچھا، ''تم پڑھے لکھے ہو؟''

وہ بولا، ''میں گریجویٹ ہوں۔ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے آیا تھا۔ ماں باپ مجھے بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے، میں بڑا آدمی تو نہیں بنا، بڑا شیطان بن گیا۔'' اس کے لہجے میں عجیب نوع کی نفرت گھل گئی، ''مگر مجھے کسی سے، حتیٰ کہ اپنے حالات سے بھی گلہ نہیں کیونکہ میں نے اس راہ کا انتخاب کا خود کیا ہے۔''

میرا جی چاہا کہ میں ریت کے ٹیلے پر چڑھ کر کچھ دیر بیٹھوں تو میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور سرکنڈوں کے بیچ سے گزر کر ٹیلے پر آ گیا۔ یہاں ہوا کی رفتار تیز تھی۔ کپڑے پھڑ پھڑانے

لگے۔ خیال آیا کہ اس مشن پر مجھے خصوصی لباس پہننے کو نہیں دیا گیا تھا۔ عام لباس میں میں خود کو کافی سہل پا رہا تھا۔ بار بار عجیب سی ذہنی بے کلی میرا خیال میڈم کی طرف مبذول کر دیتی تھی کہ اُس شاطر عورت نے میرے لئے کتنا احمقانہ مشن ترتیب دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ میاں دلبر حسین کے ساتھ اُس کی ڈیل ہوئی تھی، مجھے میاں دلبر حسین پر اعتماد نہیں تھا۔ ہولناک خدشہ میرا دل دہلا رہا تھا کہ اسما کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد میں اور سخی محمد چوہوں کی طرح گھیر لئے جائیں گے۔ ہم نہ صرف میڈم کی خطیر رقم بلکہ زندگی بھی گنوا بیٹھیں گے۔ میں نے غیر اختیاری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالا اور چاہا کہ موبائل فون پر میر وشاہ سے رابطہ کر کے اپنے خدشے کا ایک مرتبہ پھر اظہار کر دوں مگر مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ میں اپنا موبائل ریسٹ ہاؤس میں رکھ آیا تھا۔ سخی محمد کا فون بھی میر وشاہ نے کمرے میں رکھوا دیا تھا۔

میں کافی دیر، کم و بیش نصف گھنٹہ تک ٹیلے پر ٹانگیں پسارے بیٹھا رہا اور اپنے دفاع کی حکمت عملی تیار کرتا رہا پھر سر جھٹک کر ہائی لکس کے پاس آ گیا۔ سخی محمد سگریٹ سے دل بہلانے میں مشغول تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا، ''چلیں؟''

''ابھی؟''

''ہاں!''

''کیا دو بج گئے ہیں؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''نہیں..... ہم ڈیڑھ بجے ٹارگٹ پر پہنچیں گے۔'' وہ بولا، ''اب ہمیں اسلحہ نکال لینا چاہیے۔ کسی بھی وقت ضرورت پیش آ سکتی ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے، میگزینیں اور گنیں نکالیں اور سرسری انداز میں ان کا جائزہ لیا۔ پھر ایک اپنے پاس رکھ لی جبکہ دوسری گن سخی محمد کو تھما دی۔ دو لوڈڈ میگزینیں بھی تھما دیں اور ہائی لکس میں بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ کو زمین پر پھینک کر، پاؤں سے مسل کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

سفر ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اَب بے حد چوکنا ہو گیا تھا۔ میرے اپنے اعصاب بھی خود کار انداز میں تن گئے تھے اور میں اپنے آپ کو نامساعد واقعات کے لئے ذہنی تیار کرنے لگا تھا۔

اس نے عقابی نظروں سے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا، ''بظاہر تو سارا علاقہ خالی ہے۔ کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا مگر مجھے توقع ہے کہ واپسی پر یہاں بہت بڑا دنگل ہوگا۔''

''کیا ہم واپسی پر کوئی اور راستہ نہیں لے سکتے؟''

وہ چونکا، ''ایک نہیں دو ایسے راستے ہیں جن پر گاڑی ڈالی جا سکتی ہے۔ مغربی سمت والا راستہ ہمیں لنگر سرائے پہنچائے گا۔ راستہ بہتر حالت میں ہے۔ جنوبی سمت نکلیں تو کھنگن اور مراد آباد سے ہوتے ہوئے جھنگ روڈ پر چڑھ سکتے ہیں۔ وہاں سے مظفر گڑھ بمشکل نصف گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ راستہ طویل اور دشوار ہے۔''

''محفوظ راستہ کونسا ہے؟''

''ہونہہ..... محفوظ راستہ!'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا، ''آج کی رات ہمارے لئے کوئی راستہ بھی محفوظ نہیں ہوگا۔''

میں نے اس کا جملہ لوٹایا، ''کیا ڈر رہے ہو؟''

اس کی زہریلی آواز گاڑی میں گونجی، ''ڈر؟ نہیں تو..... موت کا کھیل ہے، جو جیتا، سانسیں اُسی کی اور جس کی رات آج قبر کے اندر لکھی گئی ہے، وہ باہر نہیں گزار سکتا۔''

پونے دو کا عمل تھا جب اُس نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس اور سیلنگ لائٹ آف کرتے ہوئے اسپاٹ لہجے میں خبردار کیا، ''ماسٹر! اسلحہ سنبھال لو، ہم چند منٹوں بعد میاں دلبر کے ڈیرے پر ہوں گے۔''

میں نے سیٹ پر رکھی ہوئی گن تھامی، پیروں تلی پڑی ہوئی اسما کا سرسری جائزہ لیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ناہموار راستہ دکھائی دے رہا تھا جس کے اطراف میں سرکنڈوں کی قدِ آدم دیواریں ایستادہ تھیں۔ نصف میل کے بعد سخی محمد نے دائیں ہاتھ ٹرن لیا تو میرے اعصاب ایک دم تن گئے۔ لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر، عین نظروں کے سامنے، دیہاتی طرز کا ایک ڈیرہ دکھائی دیا۔ شاید یہاں بجلی کی سہولت میسر نہیں تھی، اس لئے کوئی بلب دکھائی نہیں دیا۔

گوبر کے دو بڑے ڈھیروں کے درمیان سے گزر کر ہم ڈیرے کی حدود میں پہنچ کر رُک گئے۔ ہمارے دائیں ہاتھ ایک پرانے ماڈل کا فورڈ ٹریکٹر کھڑا تھا جس کے عقب میں ٹرالی نتھی تھی۔ بائیں ہاتھ کھیت میں بھوسے کے دو گول پلے تھے جن کا چاند کی جانب والا پہلو روشن تھا۔

سخی محمد نے اطراف کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند منٹوں کے بعد ڈیرے کے بڑے سے چوبی پھاٹک میں سفید کپڑوں والا ایک غیر معمولی لانبے قد کا شخص

دکھائی دیا۔ وہ بجائے قریب آنے کے، وہیں رُک گیا اور بلند آواز میں بولا، ''کون ہو؟''

سخی محمد نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا۔ میں اُس کا مقصد بھانپ گیا اور شیشہ اُتار کر بولا، ''رنگو قصائی سے ملنے آیا ہوں۔''

''میں رنگو قصائی ہوں۔ تم کون ہو؟'' اس کی آواز خاصی بھاری اور دہشت انگیز تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اس آواز کو پہلے کہیں سن رکھا تھا۔ میں نے یادداشت پر زور دیا مگر یاد نہ آیا کہ کہاں سنا تھا۔

''مجھے میڈم نے بھیجا ہے۔ میرا مال مجھے دو اور اپنا وصول کرو۔'' میں نے بھی اپنی آواز میں درشتی اور استحکام کو شامل کر لیا۔

''ملتان سے آئے ہو؟''

''ہاں.....''

وہ بولا، ''میرا مال کہاں ہے؟''

''تم بتاؤ، میرا مال کہاں ہے؟''

وہ پلٹا اور پھاٹک میں گھس کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ سخی محمد نے ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ رنگو قصائی روشنی میں نہا گیا اور اس نے فوراً اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر چھجا بنا کر رکھ لیا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گہرے رنگ کا بریف کیس نظر آ گیا تھا۔ میں نے کہا، ''رقم پوری ہے؟''

وہ بولا، ''ہاں..... تسلی کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے..... میرا ساتھی تمہاری طرف آ رہا ہے، اسے دے دو۔ میں چیک کر لیتا ہوں۔ پھر تمہارا مال نیچے اُتار دوں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا، ''کوئی چالاکی کرو گے تو یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکو گے۔ یہ ذہن میں رکھ کر اپنے آدمی کو میری طرف بھیج دو۔''

اس کا دعویٰ بجا تھا۔ وہ جس اعتماد سے ہمارے مقابل تنہا کھڑا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ہمارے استقبال اور درپیش آنے والی کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کا اپنی دانست میں معقول بندوبست کر رکھا تھا۔

سخی محمد میرا اشارہ پا کر گاڑی سے اُترا اور ایک ہاتھ میں گن جبکہ دوسرے میں پسٹل تھامے

رنگو قصائی کی طرف بڑھا۔ اس کی چال میں چیتے کی سی مستعدی اور لپک تھی۔ میری آنکھیں گرد و پیش کا تواتر سے جائزہ لے رہی تھیں اور انگلی گن کے ٹرائیگر پر لرز رہی تھی۔ سخی محمد رنگو قصائی سے چند قدموں کے فاصلے پر رُک گیا۔ رنگو نے بریف کیس اچھال دیا جو اس کے پیروں کے قریب زمین پر 'دھپ' کی آواز کے ساتھ گرا۔ سخی محمد نے بریف کیس اُٹھالیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہائی لکس میں آ گیا۔ اس نے سیلنگ لائٹ آن کی اور بریف کیس جھولی میں رکھ کر کھول دیا۔ وہ ترتیب وار رکھی گئی بڑے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے دو تین جگہوں سے نچلی گڈیاں نکالیں، ٹارچ کی مدد سے نوٹ چیک کیے، پھر گڈیوں کا عددی شمار کیا..... بڑبڑا کر حساب کیا، ''پنج پانجے پنجی..... تے پنجی آٹھے دوسو..... دوسو لاکھ یعنی دو کروڑ.....''

سچ کہتے ہیں کہ انسان کسی کو گالی دیتے ہوئے اور گنتی کرتے ہوئے لاشعوری طور پر مادری زبان میں بولتا ہے۔ اس نے بھی گنتی پنجابی زبان میں کی تھی پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر بولا، ''ماسٹر! نوٹ اصلی ہیں، رقم بھی پوری ہے..... اب کیا حکم ہے؟''

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پیا جی نے کہا تھا کہ فیصلہ کرنے میں تاخیر موت کا سبب بنتی ہے۔ میں دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فوراً طے کر لیا کہ اسما کو یہاں اُتارنا خود کو رنگو قصائی کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے مترادف ہوگا۔

میں نے بلند آواز میں کہا، ''اپنا ایک آدمی بھیج دو، ہم اُسے کچھ دور تک اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ جہاں خود کو محفوظ سمجھیں گے، اُسے مال سمیت اُتار دیں گے۔''

ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی اور مدھم چاندنی کے باوجود اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے اس کا ردِعمل بھی دکھائی نہیں دیا مگر اس کی آواز نے اُس کی گھبراہٹ کو مجھ پر آشکار کر دیا، ''کیا مطلب؟ ہمارے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ ہم یہیں مال کا تبادلہ کریں گے۔''

''اپنی حفاظت کے خیال سے ہم نے طے شدہ پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔ اگر تمہیں قبول نہیں ہے تو تمہارا مال نیچے پھینک کر ہم واپس چلے جاتے ہیں۔'' میں نے دھمکی دی، ''جلدی فیصلہ کرو، ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

اپنی پوزیشن کو مستحکم ظاہر کرنے کے لیے میں نے اس پر ایک اور پہلو سے وار کیا تھا۔

وہ بولا، ''میرے پاس ایسا کوئی آدمی نہیں جسے تمہارے ساتھ بھیج سکوں۔ مال یہیں اُتار دو۔''

میں نے کہا، ''یہ نہیں ہو سکتا..... جیسا کہا جا رہا ہے، ویسا کرو ورنہ میں سودا منسوخ کر کے

واپس چلا جاؤں گا۔ مجھ پر حملہ کرو گے تو خان زادی کو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔''

اس نے رُخ پھیر لیا۔ اندازہ ہوا کہ پھاٹک کے اندر کوئی موجود تھا جس سے وہ دھیمے لہجے میں مشاورت کرنے لگا تھا۔ چند لمحوں بعد پھاٹک میں دکھائی دینے والے ایک عام جسامت والے شخص نے میرے اندازے کی تائید کر دی۔

وہ وہیں تھم گیا جبکہ رنگو قصائی نپے تلے انداز میں چلتا ہوا، ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی سے بچ کر چلتا ہوا ہماری جانب آیا۔ نزدیک آیا تو پتہ چلا کہ اس نے ہاتھ میں ایک بڑے سائز کا پستول اور ٹارچ تھام رکھی تھی۔

سخی محمد کے پاس رُک کر بولا، ''تم نے مال چیک کر لیا، اب میں اپنا مال چیک کروں گا۔''

میں نے اُس کی زود فہم سرشت کو دل ہی دل میں سراہا۔ اگر میں اُس پر اعتماد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تو اُسے بھی حق تھا کہ وہ اپنا مطلوبہ مال جانچنے یعنی اسما کو دیکھنے کے لیے چلا آتا۔ سخی محمد نے میری طرف دیکھا، اجازت پا کر اُس نے گاڑی کی اندر والی بتی روشن کی اور رنگو کو مخاطب کر کے کہا، ''پچھلا دروازہ کھول کر دیکھ لو۔''

میں نے اسما کے پیٹ پر گن کی نال اور ٹرائیگر پر انگلی رکھ دی۔ رنگو قصائی نے دروازہ کھولا اور جھک کر اندر دیکھنے لگا۔ میری نگاہ اُس پر پڑی۔ ایسے میں میرے وجود کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اچانک جیسے میری آنکھوں کے سامنے پانچ سو واٹ کا بلب روشن ہو گیا تھا۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے رنگو قصائی کو دیکھے جا رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے بدن کی تمام تر توانائی جیسے آنکھوں میں مجتمع ہو گئی تھی۔

برس ہا برس سے آنکھوں کے پردوں پر ٹھہرے ہوئے اس انسانی چہرے نے مجھے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہا تھا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے لانبے قد والے رنگو قصائی کا جھکا ہوا، مگر سخی محمد کی طرف تھوڑا سا اُٹھا ہوا بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ، غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی دہشت ناک آنکھیں اور چہرے کے تاریک پسِ منظر میں خون کی سرخ آمیزش..... اِسے تو میں گزشتہ دس بارہ سالوں سے بلا ناغہ دیکھتا چلا آیا تھا۔ میں نے پوری سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ دانتوں کی کڑکڑاہٹ ذہن کے پردوں پر دھمکنے لگی۔ یاد آیا کہ اس کی کھردری اور پاٹ دار آواز میرے لیے ناشناسا کیوں نہیں تھی۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے کھڑولے کے اندر کھڑے ہو کر انگوٹھے بھر کے سوراخ میں سے دیکھا تھا جب وہ چارپائی

پر جھولتے ہوئے میرے زخمی باپ، سوہنے خان پر جھک کر غرّا رہا تھا۔

قسمت نے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کر دی تھی۔ وہ میری زیروزبر ہوتی ہوئی دنیا سے بے خبر ٹارچ کی تیز روشنی اسما کے چہرے پر ڈال رہا تھا اور مجھ سے پوچھ رہا تھا، ''یہ زندہ تو ہے ناں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو سخی محمد بولا، ''زندہ ہے مگر بے ہوش پڑی ہے۔ اچھی طرح دیکھ بھال لو۔''

سخی محمد کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ رنگو نے اپنی سینے والی جیب سے ایک تصویر نکالی، ٹارچ کی روشنی اُس پر ڈالی، پھر ایک نظر اسما کو دیکھا اور سر ہلا کر بولا، ''مال تو ایک نمبر ہے مگر.....''

اُس سے مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ میں کہاں سے چلا تھا، یہاں کیوں آیا تھا، کیا ارادہ رکھتا تھا اور میری ترجیحات کیا تھیں۔ یکبارگی میرا جی چاہا کہ میں اُس کا گریبان پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر پوری دُنیا کو بتا دوں کہ یہی ظالم شخص میرے ماں باپ کا قاتل ہے..... اُسے مار مار کر لہولہان کر دوں اور اپنا بدلہ چکا کر حساب بے باق کر دوں۔ میرے اعصاب میں برق سی کوندی مگر اچانک ہی میں نے خود کو سنبھال لیا اور گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لینے لگا مبادا کہ میں غلطی پر نہ ہوں مگر میں نے اُسے پہچاننے میں یقیناً کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

اس دوران اس نے قدرے جھک کر اسما کا ایک بازو نکال لیا تھا اور کلائی تھام کر نبض محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُسے میں نے زندگی میں دوسری مرتبہ دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے میں کچھ تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں۔ رنگ نکھر گیا تھا مگر بڑی بڑی مونچھیں، آنکھوں کی سرخی اور ناک پر تل کی موجودگی اُس کی شناخت کا مضبوط جواز تھے۔ اُس نے بااہتمام ہیئر ڈائی کر رکھا تھا جس کی وجہ سے شیو زدہ گالوں پر سفید ذرات کے علاوہ کہیں سے بھی بالوں کی سپیدی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ خود کو یقین دلایا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے مگر قسمت مہربان ہو کر انسان کو کسی نہ کسی موڑ پر اپنے مقصود سے ملا دیتی ہے۔ وہ سخی محمد سے محوِ کلام تھا۔ شاید یہیں پر ہی اپنا مال وصول کرنے کی ضد کر رہا تھا مگر سخی محمد نے اس کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔ وہ مال کی تسلی و تشفی کر کے لوٹ گیا اور جاتے ہی اس نے اپنے ساتھی کو ہماری جانب بھیج دیا۔

اس کا ساتھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ قریب آنے پر اُس کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بڑی مونچھوں والا نہایت سیاہ فام شخص تھا۔ اس کے دانت خاصے بڑے اور باہر کو نکلے ہوئے تھے جو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بڑے عجیب اور خوف ناک لگ رہے تھے۔ میری ٹھہری ہوئی پتلیاں حرکت میں آ گئیں۔ خود کو سنبھالنے میں میں نے چند لمحے صرف کئے اور اپنی لرزتی ہوئی گن کا رُخ پھر اسما کی طرف کر دیا۔ سخت لہجے میں کہا، ''فرنٹ سیٹ پر آ جاؤ.....''

وہ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنائے قریب آیا اور فرنٹ گیٹ کھول کر بیٹھ گیا۔ سخی محمد کے پسٹل کا رُخ اس کی طرف تھا۔ وہ مقامی زبان میں درشت لہجے میں بولا، ''کھلونا ہٹاؤ، میری زندگی انہی سے کھیلنے میں گزری ہے۔''

وہ نہتا تھا۔ اگر اس کے پاس کچھ تھا بھی تو لباس میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے کہا، ''میں تمہیں زیادہ دور نہیں لے جاؤں گا۔ اگر کوئی چالاکی دکھاؤ گے تو پھر رعایت نہیں کروں گا۔''

اس نے سیٹوں کے درمیان سے مجھے دیکھا، پھر گن کے رُخ کو بھانپ کر فرش پر لیٹی ہوئی اسما کو دیکھا اور بولا، ''تم اتنا ڈر کیوں رہے ہو؟ میاں صاحب اور تمہاری میڈم کے درمیان ہونے والی ڈیلنگ کے بعد مال کا عام سا تبادلہ ہو رہا ہے۔ تم ایسے ظاہر کر رہے ہو جیسے تم کسی بہت بڑی واردات پر نکلے ہو۔''

میں نے غرا کر کہا، ''بکو مت..... خاموشی سے بیٹھے رہو۔''

اس نے ہنکارا بھرا اور گردن موڑ کر سامنے دیکھنے لگا۔ سخی محمد نے گاڑی ریورس کی، موزوں جگہ دیکھ کر ٹرن لیا اور ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میں نے بے ساختہ ڈیرے کے پھاٹک کو دیکھا۔ میری توقع کے برعکس رنگو قصائی وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے حلق سے ایک طویل سانس نکلی اور میں اپنے دل کی غیر معتدل دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

سخی محمد نے ڈیرے کی حدود سے نکلتے ہی بجائے بائیں ہاتھ مڑنے کے، دائیں ہاتھ گاڑی ڈال دی۔

سیاہ فام شخص نے بے ساختہ چلا کر کہا، ''یہ تم کہاں جا رہے ہو؟ ملتان تو اُس طرف ہے۔''

میں نے کہا، ''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ خاموش بیٹھے رہو۔''

وہ گردن موڑ کر غرایا، ''تم جہنم میں جاؤ مگر مجھے اور خان زادی کو یہیں اُتار دو۔ میں کہہ رہا.....''

میں نے ڈانٹا، ''خاموش..... ورنہ.....''

وہ دانت پیس کر خاموش ہو گیا۔ اس کی گھبراہٹ نے میرے اندیشوں کی تصدیق کر دی تھی۔ وہ پہلو بدل بدل کر مجھے، سخی شاہ کو اور سکرین کے پار دیکھنے لگا۔ سخی محمد نے گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھائی تو ہچکولوں اور جھٹکوں نے چند ہی لمحوں میں ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ ہم نے بمشکل ایک کلومیٹر یا اس سے بھی کم فاصلہ طے کیا تھا کہ ناپختہ راستہ مسدود ہو گیا۔ سخی محمد اگر اچانک بریک نہ لگا لیتا تو ہائی لکس کے ٹائر دو فٹ چوڑے اور چھ سات فٹ لمبے گڑھے میں جا گرتے جو سڑک میں بنایا گیا تھا۔ اس نے گاڑی روکنے سے قبل بجلی کی سی تیزی سے اپنا پسٹل سیاہ فام کی پسلیوں سے لگا دیا تھا۔ سنگین لہجے میں بولا، ''یہ کیا ڈراما ہے؟''

اس نے کندھے اُچکائے اور مصنوعی بے نیازی سے بولا، ''تمہیں دکھائی دے تو رہا ہے کہ یہ گڑھا ہے۔''

میں نے ڈانٹا، ''بکواس نہ کرو، یہ بتاؤ کہ یہ گڑھا کس نے کھود رکھا ہے؟''

''میں نے نہیں کھودا۔'' وہ بدستور بے خوف بیٹھا تھا۔

میرا یکبارگی جی چاہا کہ اس کی بتیسی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دوں مگر حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنے غصے پر بدقت تمام قابو پایا اور تیز نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ سرکنڈوں کی دیوار کے پار اگر کوئی موجود تھا تو وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سخی محمد نے ریورس گیئر لگا کر ہائی لکس کو پیچھے لے جانا چاہا تو میں نے روک دیا، ''نہیں سخی محمد! ہم آگے جائیں گے۔''

اس نے اپنا ارادہ موقوف کر دیا اور عقب نما میں سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اعصاب شکن انتظار کا مرحلہ درپیش تھا۔ کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا اور ہم میں سے بھی کوئی نیچے اُترنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے سیاہ فام کو مخاطب کیا، ''نیچے اُتر کر دیکھو کہ ہمارا راستہ کن لوگوں نے روکا ہے؟''

وہ ہچکچایا، ''یہ میرا مسئلہ نہیں، تمہارا ہے۔ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ معاہدے کے مطابق لڑکی میرے حوالے کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔''

''تم لوگوں نے مال کی وصولی کے بعد ہماری آؤ بھگت کا کیا انتظام کر رکھا ہے۔ جلدی بتاؤ ورنہ تم دونوں کو گولی مار کر ٹھنڈا ٹھار کر دوں گا۔ سمجھے؟'' میرے لہجے میں موت کی سنگینی

شامل ہوگئی۔

مجھے خان زادی کی زندگی کی قیمت کا علم تھا۔ وہ دو کروڑ روپے کے عوض حاصل کی گئی تھی۔ میاں دلبر حسین، جس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے ایما پر یہ سودا کر رہا تھا، وہ کبھی بھی اس کی موت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے حکم کے غلام لوگ تھے، اس کے اشاروں پر ناچنے والے موت کے ہرکارے تھے، کبھی بھی اُس کے مفاد کے خلاف کام نہیں کر سکتے تھے۔

''میرا نام ظہور ہے۔ قانون مجھے جورالادی کے نام سے یاد کر کے کانپ اٹھتا ہے۔'' وہ جواباً اپنی چھاتی تھپتھپاتے ہوئے دبنگ انداز میں بولا، ''میں نے کچھ کیا ہے اور نہ میں کچھ جانتا ہوں۔ تمہیں رقم مل گئی ہے۔ اب خان زادی میرے حوالے کرو اور چلتے بنو۔ یہ علاقہ ہمارا ہے۔ یہاں چڑیا بھی استاد رنگو کی اجازت کے بغیر پر نہیں مارتی مگر ہمیں تم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ہم تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتے کیونکہ ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے۔ ہاں! زیادہ طرے خان بنو گے تو.....''

وہ رنگو قصائی کا خاص کارندہ تھا۔ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر یا موت کا ڈراوا دے کر کام نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ میں نے اس پر ایک غصیلی نگاہ ڈالی اور اپنی توجہ ہائی لکس کے باہر ہوا میں لہلہاتے ہوئے گھنے سرکنڈوں پر مرکوز کر دی۔ کوئی موہوم سی نقل و حرکت بھی محسوس نہیں ہوئی تو میں نے سخی محمد سے کہا، ''گاڑی ریورس کرو۔ کھیل شروع ہو چکا ہے۔ جو بھی سامنے آئے، اُسے موقع دیے بغیر گولی مار دینا۔ یہ لادی ہمارے ساتھ ملتان تک جائے گا۔''

میرا لہجہ بے حد سرد تھا۔ پہلا موقع تھا جب سیاہ فام کی بے چینی عیاں ہوئی۔ بولا، ''تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا، ''دیکھ بے لونڈے! کیا نام تم نے بتایا تھا، ہاں! ظہور لادی..... ہمارے دھندے میں معاہدے میں خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔ میں گاڑی میں لڑکی لاد کر ملتان سے یہاں تک آ گیا ہوں تو تمہیں میری طاقت کا اندازہ بھی ہو جانا چاہیے۔ ایک فائر کی آواز پر تمہارا علاقہ میرے آدمیوں کو یوں اگلنا شروع کر دے گا جیسے بارش کے بعد یہاں کھمبیاں اگنے لگتی ہیں۔ خان زادی اور بریف کیس کو تم لوگ بھول جاؤ گے، تمہیں جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ سخی محمد! پسٹل ہٹا لو، میں نے ظہور لادی کو کور کر رکھا ہے۔ تم اپنی توجہ ڈرائیونگ اور راستہ روکنے والوں پر مرکوز رکھو۔''

ظہور لادی جلدی سے بولا، ''گاڑی روکو، میں نیچے اُتر کر دیکھتا ہوں۔''

وہ مفاہمت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ سخی محمد نے گاڑی روک دی۔ وہ نیچے اُتر کر گڑھے کی جانب تیز قدموں سے بڑھ گیا۔

سخی محمد بولا، ''ماسٹر! تم بڑے کام کے آدمی ہو۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ظہور لادی گڑھے کے پاس پہنچ کر مغرب کی سمت منہ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ نہایت دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ گڑھا اور گڑھے سے نکالی جانے والی مٹی کے ڈھیر نے راستہ اس طرح مسدود کر دیا تھا کہ گاڑی گزرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ سخی محمد نے تشویش آمیز انداز میں کہا، ''ماسٹر! یہ آخری چنگل نہیں بلکہ اسے پہلا خونی پھاٹک سمجھو۔ یہ سوچو کہ ہم ظہور لادی کو کہاں تک اپنے ساتھ لے جائیں گے؟''

میں نے کہا، ''یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔''

وہ بولا، ''میرا ارادہ تھا کہ میں لنگر سرائے سے براستہ خان پور، مظفر گڑھ نکل جاؤں گا۔ اب سوچ رہا ہوں خان پور تک کا راستہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لیے ہمیں ایک لمبا چکر کاٹنا ہوگا۔ لنگر سرائے سے عین مغرب کی سمت نکلنے والا لنک روڈ سلطان کالونی کی طرف جاتا ہے جو بڑی سڑک پر چڑھ جاتا ہے۔ یہ سفر لمبا تو ہے مگر نسبتاً محفوظ ہے۔''

میں نے کہا، ''لنگر سرائے یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''یہی کوئی آٹھ دس کلومیٹر.....''

ایسے ہی وقت میں دو آدمی سرکنڈوں سے نکل کر ظہور لادی کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ان کے کندھوں سے دیسی ساخت کی رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ تینوں کچھ دیر تک محوِ گفتگو رہے۔ ایک شخص سرکنڈوں میں گھسا اور چند لمحوں بعد دو عدد مقامی طرز کے بیلچے تھامے برآمد ہوا۔ یہ خاص قسم کا اوزار دیہاتوں میں بکثرت ملتا تھا۔ اس کا پھل کسّی سے قدرے چھوٹا جبکہ دستہ خاصا لمبا ہوتا ہے۔ اسے مقامی زبان میں 'وہولا' کہا جاتا ہے۔ دونوں اشخاص وہولوں کی مدد سے گڑھا بھرنے لگے جبکہ ظہور لادی ہائی لکس میں آ بیٹھا اور از خود بولا، ''یہاں پلی نہیں ہے، اس لیے فصلوں کا پانی گزارنے کے لیے راستہ کاٹنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ پانی لگا رہے تھے۔''

وہ جھوٹ بول رہا تھا مگر میں نے بظاہر اُس کی بات پر یقین کر لیا۔ پانچ سات منٹوں میں

ہائی لکس کے گزرنے کی جگہ بن گئی اور دونوں وہولا بردار بائیں ہاتھ سرکنڈوں میں گھس کر غائب ہو گئے۔ ظہور لادی نے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔

گڑھا عبور کرتے ہوئے میں نے شیشے کے پار سرکنڈوں میں دونوں چھپے ہوئے افراد کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ظہور لادی نے سخت لہجے میں کہا، ''او بھئی مجھے تو اُتار دو۔ میں نے پیدل واپس جانا ہے۔''

سخی محمد نے کہا، ''تمہارے پاس موبائل فون ہے؟''

''ہے تو سہی مگر یہاں سگنلز نہیں ہیں۔'' اس کا لہجہ سچ کا غمازی تھا۔

سخی محمد نے کندھے اُچکائے، ''ہم تمہیں لنگر سرائے کے قرب و جوار میں اُتار دیں گے۔ واپسی کا کوئی بندوبست کر لینا۔''

وہ غصے سے پھٹ پڑا اور گالی دے کر بولا، ''تمہاری ایسی کی تیسی..... تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا کہیں..... میں اتنی سردی میں آٹھ میل پیدل چلوں گا؟ وہ بھی اس مردے کو اُٹھا کر.....''

اس نے ہاتھ کا اشارہ اسما کی طرف کیا، ''گاڑی روکو ورنہ.....''

سخی محمد نے جھڑکا، ''کیا ورنہ؟ زیادہ بک بک کرو گے تو گولی مار کر یہیں پھینک دوں گا۔''

میں ظہور عرف جورے لادی کے مزاج کو سمجھ رہا تھا۔ وہ مار دھاڑ والا بندہ تھا۔ اسما کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے ورنہ وہ نچلا نہ بیٹھتا اور ہم پر ہاتھ ڈال دیتا۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا، ''دیکھو یار! تم میری پریشانی کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ میں اتنا لمبا سفر پیدل کس طرح کر سکوں گا۔ پولیس گشت پر نکلی ہو گی۔ میں پولیس والوں کی نظر میں آ گیا تو مارا جاؤں گا۔ نہیں..... مجھے یہیں اُتار دو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ہم لوگ تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔''

سخی محمد نے اچانک گاڑی روک دی۔ جلدی سے دروازہ کھول کر اُتر گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا، ''ماسٹر! ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔''

میں اور جورا لادی یکبارگی چونکے۔ میں نے پوچھا، ''کیا مطلب؟ پیچھے کوئی گاڑی آ رہی ہے؟''

وہ بولا، ''ہاں..... مگر نظر نہیں آ رہی۔ ہیڈ لائٹس آف ہیں۔ محض آواز سنائی دے رہی ہے۔''

جورا لادی جھٹ سے بولا، ''کسی ٹریکٹر کی آواز ہو گی۔''

سخی محمد نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں..... ٹریکٹر اور کار یا جیپ کی آوازوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

میرے اندیشے اپنی حتمی شکل اختیار کرنے لگے تھے۔ میں نے طنزیہ لہجے میں جورے کو مخاطب کیا، ''اوئے لادی! اب تم کیا کہتے ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ گہری نظروں سے بیک مرر کو گھورنے لگا جس میں سوائے اندھیرے کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عقب میں آتی ہوئی گاڑی نظر نہیں آئی مگر ہیڈ لائٹس کی روشنی میں لنگر سرائے کی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ زگ زیگ کچے راستے کی غیر معمولی دشواری مسلسل سخی محمد کی ماہرانہ ڈرائیونگ سے ہزیمت بار ہو رہی تھی۔

ہم جونہی پکی سڑک پر چڑھے، سخی محمد نے گاڑی روک دی اور اسپاٹ لہجے میں کہا، ''ماسٹر! ان دونوں کو یہیں اُتار پھینکو۔ ہم سیدھا مظفر گڑھ جائیں گے۔ پیچھے سے آنے والی گاڑی ہم تک نہیں پہنچ پائے گی۔ ہری اَپ پلیز!''

میں اس لمحے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے گیٹ کھولا اور برق رفتاری سے ہائی لکس سے چند قدم دور جا کھڑا ہوا۔ ظہور لادی کو اپنے نشانے کی زد پر رکھتے ہوئے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ وہ اُترا تو میں نے اُسے سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹی ہوئی اسما کو اُٹھانے کا اشارہ کیا۔ اس نے اردگرد دیکھا اور بے حد برہمی سے کہا، ''خدادی مار پوے تہا کوں..... پالے وِچ مار گھتا ہوے میکوں.....''

(تم لوگوں پر خدا کی مار ہو، تم نے مجھے سردی میں مار ڈالا ہے)

اس کے فطری ردِعمل پر میرے لبوں پر مسکراہٹ اُبھری جسے اندھیرے کے سبب وہ غالباً دیکھ نہیں پایا تھا۔ اس نے جھک کر خان زادی کو احتیاط سے باہر کھینچا، زمین پر لٹایا اور پھر بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اُٹھا لیا۔ وہ جرائم کے سفر کا پرانا مسافر تھا۔ اس نے اپنے طور پر اسما کو زمین پر لٹانے کے دوران یہ جائزہ لے لیا تھا کہ وہ زندہ تھی یا مردہ.....

اچانک سخی محمد نے گاڑی چلا دی اور مجھے بھاگ کر سوار ہونا پڑا۔ میں نے جونہی دروازہ بند کیا، اس نے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ مزید بڑھا دیا جس کی وجہ سے چند ہی لمحوں میں طاقت ور انجن والی ہائی لکس ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بولا، ''اگلی سیٹ پر آ جاؤ ماسٹر! موت کا کھیل شروع ہونے والا ہے۔''

اس کے لہجے سے ہویدا ہونے والی سنگینی نے میرے وجود میں بجلی بھر دی۔ میں فوراً اگلی سیٹ پر آ گیا۔ ایسے میں ہم لنگر سرائے کی خوابیدہ آبادی میں داخل ہوئے۔ سخی محمد نے بریک لگائے بغیر دائیں ہاتھ گاڑی موڑ دی۔ ٹائر چرچرائے مگر شکر ہوا کہ ہائی لکس الٹنے سے بچ گئی۔ میں نے کہا، ''ہم کس سمت جا رہے ہیں؟''

''ہم سلطان کالونی جا کر مین روڈ پر چڑھ جائیں گے۔ میں نے ڈاج دینے کے لیے ظہور لادی کو سیدھا مظفر گڑھ جانے کا کہا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''ہم کب تک ملتان پہنچیں گے؟''

اس نے ڈیش بورڈ کے کلاک میں وقت دیکھا۔ تین بجنے والے تھے، ''چار تو بج ہی جائیں گے۔''

اس دوران بار بار رنگو قصائی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا اور میں اپنا سر جھٹک کر بمشکل اس کے تصور سے چھٹکارا حاصل کرتا۔ اس وقت میرا خیالات میں کھو جانا ہم دونوں کی بھیانک موت کا سبب بن سکتا تھا۔ سخی محمد بار بار بیک مرر میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر ونڈ سکرین کے پار دیکھنا چاہا مگر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ہائی لکس کی عقبی کھلی باڈی پودوں سے بھری ہوئی تھی جن کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ بیک مرر میں بھی کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

سڑک کے دونوں اطراف میں تا حد نگاہ ریگستانی ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں درخت اور جنگلی جھاڑیاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ سڑک شاید نئی بنائی گئی تھی اس لیے بہت اچھی حالت میں تھی۔ ہائی لکس کے رفتار ظاہر کرنے والے میٹر کی سوئی ایک سو دس اور بیس کے درمیان تھرک رہی تھی جبکہ رفتار بتدریج بڑھ رہی تھی۔

میں سخی محمد سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اچانک فضا ایک خوفناک دھماکے سے گونج اُٹھی۔ ساتھ ہی ہائی لکس بری طرح لہرا گئی۔ سخی محمد نے اسے سنبھالنے میں کسی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کیا تھا مگر وہ آنکھ جھپکنے کی دیر میں پختہ سڑک سے اُتر کر ٹیلے پر چڑھ گئی۔ ٹیلہ زیادہ بلند نہیں تھا مگر عین وسط میں جا کر وہ کسی چٹان کی طرح فضا میں بلند ہو گیا تھا۔ ہائی لکس دھماکے کی خوف ناک آواز کے ساتھ اس ابھرے ہوئے حصے سے جا ٹکرائی۔ میرا سر ڈیش بورڈ پر لگا۔ چند لمحوں تک مجھے کچھ بجھائی نہیں دیا۔ خوف کی حادثاتی دھند چھٹی تو میں نے سخی محمد کو سر جھٹکتے اور دونوں ہاتھوں سے چھاتی کو دیوانہ وار مسلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسٹیئرنگ ویل سے ٹکرایا تھا اور اُسے شدید چوٹ

آئی تھی۔

ہائی لکس کا آدھے سے زیادہ بونٹ ریت میں دھنس چکا تھا۔ میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو پتہ چلا کہ وہ ٹکراؤ کے نتیجے میں چوپٹ کھل چکا تھا۔ میری دائیں آنکھ پر بوجھ سا پڑا۔ میں نے غیر اختیاری طور پر پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ خون بہنے کا انکشاف ہوا۔ ڈیش بورڈ سے ٹکرانے پر میری پیشانی کی جلد پھٹ گئی تھی۔ میں نیچے اُترا۔ پچھلے ٹائر پر نظر پڑی تو ہائی لکس کے لہرانے اور ٹیلے سے ٹکرانے کا سبب معلوم ہو گیا۔ ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ میں ٹائر پر جھکنے ہی لگا تھا کہ میرے کانوں میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز پڑی۔

ایسے ہی وقت میں سخی محمد کی تیز آواز سنائی دی، ''ماسٹر! ہوشیار..... ٹائر میں فائر لگا ہے۔''

میں نے فوری طور پر کندھے پر سے گن اُتاری، ماؤزر سنبھالا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے درست کہا تھا۔ مجھے پہلی نظر میں ہی گہرے رنگ کی ایک پک اَپ سڑک پر دکھائی دی۔ اس کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں زمین پر گرا اور کروٹیں لیتا ہوا اپنی ہائی لکس سے دور ہٹ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں ننھے سے قدرتی گڑھے میں جا گرا تھا اور وقتی طور پر محفوظ ہو گیا تھا۔ ریت بہت ٹھنڈی تھی۔ بدن کے ننگے حصوں پر برف کی طرح یخ بستہ محسوس ہوئی مگر میں خود کو فوری طور پر حملہ آوروں کی نظر سے چھپانے کے لیے ریتلی زمین سے چپک گیا اور محتاط نظروں سے سڑک پر رُکنے والی پک اَپ کو دیکھنے لگا۔ سخی محمد چونکہ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا، اِس لیے اب اسے ہائی لکس کی اوٹ میسر تھی۔

پک اَپ کا اگلا دروازہ کھلا۔ ایک پستہ قامت شخص نیچے اُترا۔ اندھیرے کے سبب معلوم نہ ہو سکا کہ وہ نہتا تھا یا اسلحے سے لیس تھا۔ وہ ہائی لکس کی جانب بڑھنے کی بجائے وہیں رک کر دیکھنے لگا۔ میرے کانوں میں اس کی آواز پڑی، ''کوئی ہے؟ کیا ہوا گاڑی کو؟''

کوئی جواب نہ پا کر اُس نے اپنے ساتھی یا ساتھیوں سے مخاطب کیا، ''لگتا ہے ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔''

وہ شاید ہمیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ ریت میں دھنسی ہوئی ہائی لکس کو دیکھ کر رُکے تھے۔ اگر ہم نامساعد حالات کی زَد پر نہ ہوتے تو شاید اُس کے چکر میں آ جاتے۔ میں نے بہ احتیاط اُسے اور پک اَپ کو دیکھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پھر پکارا۔ کوئی ردِعمل نہ پا کر اس کے دو ساتھی بھی گاڑی سے اُتر آئے۔ ہمارے درمیان محض دس پندرہ قدموں کا فاصلہ تھا مگر چاند کی ناکافی

روشنی کے سبب وہ ہیولوں کی صورت دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کوشش کے باوجود ان کے مسلح یا غیر مسلح ہونے کا پتہ نہ چل سکا۔

ایک بیٹھی بیٹھی آواز سنائی دی، ''میرا خیال ہے کہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔''

دوسرے نے کہا، ''ہاں! ورنہ کوئی سن رہا ہوتا تو جواب ضرور دیتا۔''

ایک آدمی وہیں ٹھہر گیا جبکہ دو افراد نے ہائی لکس کی طرف قدم بڑھائے۔ اس وقت وہ تینوں میرے نشانے کی زد میں تھے مگر جب تک ان کی حیثیت کا تعین نہ ہوتا، میں اُن پر فائر نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ واقعتاً غیر متعلق لوگ ہوں اور کسی وجہ سے ہیڈ لائٹس بجھا کر گاڑی چلا رہے تھے۔ ممکن تھا کہ ان کی ہیڈ لائٹس خراب ہو گئی ہوں، وہ رنگو قصائی کے بھیجے ہوئے غنڈے نہ ہوں بلکہ محض جرائم پیشہ لوگ ہوں جو کسی واردات پر نکلے تھے۔ یہی سوچ کر میں نے ان پر فائر نہیں کیا۔

اپنی ہائی لکس کے سڑک پر لہرانے سے پیشتر میں نے دھماکے کی خوفناک آواز سنی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹائر پھٹنے کی آواز میں فائر کی آواز بھی شامل تھی یا نہیں۔ سخی محمد کو غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔

وہ دونوں برابر چلتے ہوئے ہائی لکس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میری جانب والے پستہ قامت شخص کے کاندھے پر رائفل لٹک رہی تھی جبکہ دوسرے نے ہاتھ میں پستول تھام رکھا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ ان میں سے کسی کی نگاہ کسی وقت مجھ پر یا سخی محمد پر پڑ سکتی تھی جو بہت خطرناک نتیجہ کشید کرتی۔ ان دونوں نے عقبی حصے میں جھانکا، پھر کھلے دروازے کی طرف بڑھے۔ ایک کی مدھم سی آواز سنائی دی، ''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے..... لگتا ہے، گاڑی سے نکل کر چھپ گئے ہیں۔''

''تم بریف کیس اُٹھاؤ، میں انہیں دیکھتا ہوں۔'' دوسری آواز میرے کانوں میں پڑی تو رہی سہی گنجائش بھی پوری ہو گئی۔ وہ ہمدرد مزاج مسافر نہیں تھے بلکہ ہمارے خون کے پیاسے اور نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس کے متمنی تھے۔

مزید صبر کا یارا نہ تھا۔ میں نے آنِ واحد میں اپنی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ وہ دونوں مجھے شوٹ کر سکتے تھے جبکہ ان کا ساتھی جو اپنی گاڑی کے قریب کھڑا تھا، مجھے نشانے پر نہیں لے سکتا تھا۔ ان خطرناک لوگوں کی طرف سے مجھے کوئی خوش فہمی لاحق نہیں تھی۔ انہوں نے چلتی ہوئی

ہائی لکس کے ٹائر کو ایک فائر سے برسٹ کیا تھا جو نشانہ بازی کی غیر معمولی مہارت کا ثبوت تھا۔

میری رائی بھر کوتاہی میری موت کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے بڑی احتیاط سے پستہ قد والے شخص، جو اس وقت کندھے سے گن اُتارنے میں مصروف تھا، کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا بلکہ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ ہی وہ ہائی لکس کی باڈی سے ٹکرایا اور گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے چیخ تک نہیں نکلی تھی۔

میں نے اس کے پستول بردار ساتھی کو سنبھلنے کی مہلت نہیں دی اور اس پر فائر کر دیا۔ میرا نشانہ خطا گیا جس کا خمیازہ مجھے جوابی فائر کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ پستول کی نال سے نکلنے والی گولی نے میرے کندھے سے بالشت بھر کے فاصلے پر ریت اُڑا دی۔ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ ایک گولی نے اُسے زمین بوس کر دیا جب وہ ہائی لکس کے ڈالے کی اوٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

پک اَپ کے پاس کھڑا ہوا شخص میری نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس کے پاس بھی رائفل تھی۔ اس نے مجھ پر کئی گولیاں برسائیں جو میرے اوپر سے گزر گئیں۔ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ کوشش کے باوجود میرا نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے پستول بردار کے جسم میں دو گولیاں اُتاریں تاکہ وہ کسی قسم کی کارروائی نہ کر سکے۔ نہیں معلوم کہ اُس کے جسم کے کس حصے میں لگیں مگر وہ چند لمحوں میں ہی ساکت ہو گیا۔ اس کے پستہ قامت ساتھی کی روح تو شاید سر میں لگنے والی اکلوتی گولی سے ہی جسدِ عنصری سے نکل کر عالمِ بالا کی طرف پرواز کر گئی تھی کیونکہ وہ کھلے ہوئے دروازے کے قریب اوندھے منہ ریت پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

ان دونوں کی طرف سے تسلی ہونے کے بعد میں نے پک اَپ کی طرف توجہ دی۔ ادھر موجود دشمن نے مجھ پر اندھا دھند فائر داغے تھے جو رائیگاں گئے تھے۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں چھپا تھا۔ یہ اندازہ تھا کہ وہ گاڑی کے اندر بیٹھنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی کے نیچے اندھیرا تھا۔ شاید وہاں مورچہ زن تھا۔ میں نے پوزیشن بدلی اور اندازے کے مطابق گاڑی کے نیچے دو فائر کیے مگر متوقع نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ وہ گاڑی کے نیچے نہیں تھا۔

سخی محمد کی طرف سے اب تک کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ وہ دُبکا بیٹھا تھا یا پھر تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ بعید نہیں تھا کہ اسٹیئرنگ ویل سے ٹکرانے پر اُس کی ایک یا زیادہ

پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں۔

میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اپنی طرف آتی ہوئی گولیوں کے دہانے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کوشش میں کوئی گولی میرے دماغ میں گھس سکتی تھی۔ میں نے اپنا سر تھوڑا سا اُٹھایا مگر فوراً ہی نیچے کر لیا۔ ایک گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ میرا تمام بدن اکڑ گیا۔ میں نے چھ سات گولیاں اوپر تلے نشانہ لیے بغیر چلائیں۔ میگزین خالی ہوگئی۔ میں نے پہلو کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ شکر تھا کہ میں نے ایک فالتو میگزین جیب میں رکھ چھوڑی تھی ورنہ اس وقت نہتا ہو چکا ہوتا۔

میگزین بدلنے تک میرے اوپر سے تین گولیاں ریت اُڑاتے ہوئے گزریں۔ میری مجبوری یہ تھی میں اس چھوٹے سے گڑھے سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ چھپے ہوئے دشمن کو میری لوکیشن کا اچھی طرح علم ہو چکا تھا۔ جونہی میں باہر نکلتا، وہ مجھے موقع دیے بغیر شوٹ کر دیتا۔ میرے پاس اندھا دھند فائرنگ کی سہولت نہیں رہی تھی۔ آخری میگزین لوڈ ہو چکی تھی۔

پانچ منٹ کی ناکام جدوجہد نے مجھ پر شدید نوعیت کی جھنجھلاہٹ طاری کر دی۔ عین ممکن تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی، مگر اچانک سخی محمد کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سناٹے کا سینہ چھلنی کر گئی، ''خبردار! تم میرے نشانے پر ہو۔ ہتھیار پھینک دو، ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔''

سخی محمد کی آواز کس سمت سے آئی تھی، یہ اندازہ نہ ہو سکا مگر چند لمحوں بعد جب اس نے اپنی دھمکی کا اعادہ کیا، تب 'دھپ' کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ رائفل بردار نے اپنی رائفل زمین پر پھینک دی تھی۔

''ہاتھ سر سے بلند کر لو۔'' سخی محمد کی آواز پھر سنائی دی۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی طرح سڑک عبور کر کے مجھ پر فائر کرنے والے دشمن کے عین عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

سخی محمد نے درشت لہجے میں کہا، ''سڑک کے درمیان کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ جونہی سڑک پر آیا، مجھے دکھائی دے گیا۔ میں اَب تک یکسر غلط سمت میں فائرنگ کرتا رہا تھا۔ وہ پک اَپ سے چند قدم آگے سڑک پر کھڑا تھا اور سڑک کی دوسری طرف قدِ آدم سرکنڈوں سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے گڑھے سے نکل کر لمبی زقند بھری اور پک اَپ کے بالکل

قریب پہنچ گیا۔ میں نے چند لمحوں میں ہی اُس کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے جائزہ لے لیا۔ گاڑی میں ان تینوں کے علاوہ کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ اسی اثناء میں سخی محمد اس چاق چوبند شخص کے عقب میں پہنچ چکا تھا اور پھر اسے گن کی نال سے دھکیلتا ہوا میرے پاس لے آیا۔

میں نے کرخت لہجے میں کہا، ''اسے اُڑا دو! اچار ڈالنا ہے کیا اِس کا؟''

وہ شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اس نے جونہی میرا جملہ سنا، وہ گھگھیا کر بولا، ''مجھے کچھ نہ کہو..... خدا کے لئے.....''

سخی محمد نے سرد لہجے میں کہا، ''اگر زندگی چاہتے ہو تو جو پوچھتا جاؤں، سچ سچ بتاتے جاؤ۔ جہاں جھوٹ بولو گے یا خاموش ہو جاؤ گے، گولی مار دوں گا۔''

''مم..... میں بتاتا ہوں مگر..... گگ..... گولی نہ مارو مجھے۔'' اس کی آواز خوف کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''راجہ اسلم.....''

''کیا تم بریف کیس چھیننے کے لیے ہمارے پیچھے آئے تھے؟'' سخی محمد کی آواز میں موت کی خنکی شامل تھی۔

''ہاں..... مم..... مگر.....''

''کس نے بھیجا تھا؟''

''استاد رنگو نے بھیجا تھا۔''

میں نے سخی محمد کو باور کرایا، ''جلدی کرو، فائرنگ کی آواز بہت دور تک گئی ہوگی۔''

سخی محمد نے پوچھا، ''رنگو کا پورا منصوبہ بتاؤ۔ جلدی جلدی!''

''اسے میاں صاحب نے کہا تھا کہ لڑکی وصول کر کے اپنی رقم چھین لینا۔ اس نے کشتیوں والے پل کے اِدھر اور اُدھر دونوں طرف اپنے بندے چھپا رکھے تھے جبکہ اس طرف ہمیں تعینات کیا تھا اور رقم چھیننے کا حکم دیا تھا۔'' اس کی زبان ٹیپ پلیئر کی طرح چل پڑی، ''اگر تم جورے لادی کو ساتھ لے کر نہ آتے تو لنگر سرائے سے اُدھر ہی ہم تم پر حملہ کر دیتے۔''

''اِس طرف کوئی اور پارٹی موجود ہے؟''

''نہیں..... ہمارا اندازہ تھا کہ تم دریا کی طرف سے واپس جاؤ گے۔'' اس کی آواز میں

شکست خوردگی کا عنصر غالب تھا، ''مجھے چھوڑ دو، میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

میں نے پوچھا، ''رنگو قصائی اسی ڈیرے پر رہتا ہے؟ مستقل طور پر، یا آتا جاتا رہتا ہے؟''

وہ بولا، ''یہیں رہتا ہے۔''

''میاں دلبر اس وقت کہاں ہے؟ کیا ڈیرے پر موجود ہے؟''

''نہیں..... وہ لاہور والی کوٹھی پر ہے۔''

''میاں دلبر حسین نے اس لڑکی کو کہاں پہنچانے کا حکم دے رکھا ہے رنگو قصائی کو؟'' سخی محمد نے پوچھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اندھیرے کے سبب نہیں بھانپے جا سکتے تھے مگر اس کے لہجے کے تغیر نے مجھ پر عیاں کر دیا تھا کہ وہ راجہ اسلم کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

''لاہور میں..... میاں صاحب کی کوٹھی پر۔''

''کیا مطلب؟ کیا اس لڑکی کو حیدر خان کے حوالے نہیں کیا جانا تھا۔'' میں چونکا۔

اس نے کندھے اُچکائے اور نیم مردہ آواز میں کہا، ''مجھے اس بات کا علم نہیں ہے۔''

''ڈیرے پر کتنے آدمی رہتے ہیں؟''

''چار..... استاد رنگو، جورا لادی، مرید حسین اور میں.....''

''باقی لوگ کہاں سے منگوائے گئے ہیں؟''

''عمر پور سے۔''

''عمر پور؟ یہ عمر پور کہاں واقع ہے؟''

''عمر پور، بورے والا میں ہے۔'' وہ گھگھیایا۔

شاید سخی محمد کو کچھ اور نہیں پوچھنا تھا اس لیے اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ''ماسٹر! کچھ پوچھنا ہے یا.....''

میں نے اُس سے رنگو قصائی کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا تھا مگر موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا، ''نہیں..... جانے دو۔''

راجہ اسلم میرے جملے کی معنویت کو بھانپ گیا اور ایک جھٹکے سے میرے پیروں میں گر گیا اور بڑی مضبوطی سے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ ایسے ہی وقت میں سخی محمد نے اس کی کمر پر، عین دل کے عقبی مقام پر نال رکھی اور گن کی لبلبی دبا دی۔ فائر کے ساتھ ہی راجہ اسلم کی دلدوز چیخ فضا میں گونجی اور وہ میرے پیروں میں اوندھے منہ گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے منہ سے خرخراہٹ برآمد ہو

رہی تھی۔

میں اچھل کر پیچھے ہٹا تا کہ میرا لباس اس کے خون کے ابلتے فوارے سے محفوظ ہو جائے۔ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔

''ماسٹر! اسے گھسیٹ کر سرکنڈوں میں ڈال دو۔ ہری اَپ!'' سخی محمد نے کہا اور ریت میں دھنسی ہوئی ہائی لکس کی طرف بھاگ پڑا۔ اس نے کھلے گیٹ میں جھک کر نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس اُٹھایا، اپنا اسلحہ نکالا اور بھاگتے ہوئے واپس آیا۔ قدرے پھولی ہوئی سانس میں بولا، ''ہری اَپ! اب ہمیں اس گاڑی میں سفر کرنا ہوگا۔ ہائی لکس کو چیک کرنے کا وقت نہیں ہے۔''

ہم دونوں بجلی کی سی تیزی سے رنگو قصائی کے گینگ کی پک اَپ میں سوار ہوئے۔ چابی ایگنیشن میں موجود تھی۔ سخی محمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی انجن اسٹارٹ کیا، لائٹس آن کیں اور جھٹکے سے ایکسیلریٹر دبا دیا۔ میں نے سیلنگ بلب کی دودھیا روشنی میں ایک مرتبہ پھر پک اپ کی عقبی نشست کا تنقیدی جائزہ لیا۔ گاڑی خالی تھی۔ راجہ اسلم اور اس کے ساتھیوں کے پاس اگر زیرِ استعمال اسلحے کے علاوہ کچھ اور تھا بھی تو وہ پچھلی سیٹ کے نیچے چھپا کر رکھا گیا ہوگا، سامنے کچھ نہیں تھا جو دکھائی دیتا۔

راجہ اسلم کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کے مطابق اب میدان صاف تھا۔ میں نے عقب نما کا رُخ اپنی جانب کیا۔ پیشانی کا جائزہ لیا۔ ہاتھ اور چہرے کا کچھ حصہ خون سے سرخ تھا۔ پیشانی کے زخم سے خون رسنا بند ہو چکا تھا۔ میں نے دونوں سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا تولیہ نما کپڑا جسے عمومی طور پر ڈرائیور 'سابر' کا نام دیتے ہیں، اُٹھایا اور اس کے صاف حصے سے اپنا بہتا ہوا خون صاف کیا۔ پھر اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ چند ننھے ننھے دھبے لگے تھے جو سرسری طور پر دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے۔

سخی محمد نے اپنی چھاتی سہلاتے ہوئے کہا، ''میرا سینہ بہت دکھ رہا ہے۔ شکر ہے کہ پسلیاں بچ گئی ہیں۔''

اس کی پیشانی پر ایک بڑا سا گومڑ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا، ''یار تم نے بڑی ہمت کی جو راجہ اسلم کی پشت پر پہنچ گئے اور اسے ہینڈز اَپ کرا لیا۔ ورنہ وہ میرے قابو آنے والا نہیں تھا کیونکہ مجھے اُس کی لوکیشن کی سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔''

وہ بولا، ''مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا، تبھی میں نے ٹیلے کا چکر کاٹا اور اس کے عین عقب میں جا پہنچا۔ اور ہاں ماسٹر! تم نے دیکھا، ان لوگوں نے کیسا عمدہ نشانہ لیا تھا ٹائر کا..... تینوں میں سے کوئی ایک بڑا غضب کا نشانچی تھا۔ چلتی گاڑی کے عقبی ٹائر کو سنگل فائر میں برسٹ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''کیا تم راجہ اسلم کو غائبانہ جانتے تھے؟''

''نہیں..... آج پہلی مرتبہ اس خبیث کا نام سنا اور اُس کی مکروہ شکل دیکھی۔'' وہ بولا۔

میں نے تناؤ کم کرنے کی غرض سے کہا، ''سخی محمد! آج تو غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔''

وہ بولا، ''سردی تو معمول کے مطابق ہی ہے۔ دراصل آج کی رات ہم نے دریائی اور کھلے علاقے میں گزاری ہے، اس لیے سردی کا احساس زیادہ ہو رہا ہے۔ ویسے بھی شہر کی نسبت یہاں شدید سردی ہوتی ہے۔''

پھر، یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے رنگو قصائی کا دہشت ناک چہرہ ابھر آیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت لوٹ جاؤں اور اس کی گردن دبوچ لوں۔ اسی خواہش کے تابع بے اختیار میرے منہ سے نکلا، ''یار سخی محمد! رنگو قصائی نے ہمیں مارنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ فیئر ڈیلنگ کے باوجود..... کیا خیال ہے، واپس جا کر اُس سے دو ہاتھ کر نہ لیے جائیں۔''

وہ مسکرایا، ''کیا تم اپنی جیت کو ہار میں بدلنا چاہتے ہو؟''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''ماسٹر! آج قسمت نے تمہارے ماتھے پر فتح کا سہرا باندھا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، تم نے پہلی کامیابی حاصل کی ہے۔'' اس نے کہا، ''ہمارے دھندے میں جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ فرض کیا، ہم واپس جا کر رنگو قصائی پر دھاوا بول دیتے ہیں اور اس پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وہ پہلے ہی اپنا لہو چاٹ رہا ہے، اس لیے ہمیں سامنے پا کر آپے سے باہر ہو جائے گا اور ہماری تکہ بوٹی کر دے گا۔ ہم نہ صرف جان سے جائیں گے بلکہ دو کروڑ روپے کی رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ تم نے اس پہلو کو مدنظر رکھا ہے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''مگر.....''

اس نے میری بات کاٹ دی، بولا، ''ماسٹر! میں تمہارا حکم ماننے پر مجبور ہوں کیونکہ تم اس وقت میرے لیڈر رہو۔ اگر واپس چلنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر جذباتی ہونا غلط ہے

کیونکہ ہم نے رنگو کو اس کی وعدہ خلافی کی سزا دے دی ہے۔ تین بندوں کو خون میں نہلا دیا ہے۔ کوئی اور سامنے آئے گا تو اس سے بھی رعائت نہیں برتی جائے گی۔ کیا یہ کم ہے؟''

چونکہ وہ میری قلبی حالت سے آگاہ نہیں تھا، اس لیے اس نے بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دے چکے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ رنگو قصائی کے ذمے کچھ اور حساب بھی نکل آیا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور دل میں کہا، 'ہاں سخی محمد! یہ میڈم کا نہیں، میرا معاملہ ہے۔ مجھے ایک بار نہیں، نجانے کتنی مرتبہ اس علاقے میں آنا پڑے گا۔ شاید تب تک، جب تک میرا رنگو قصائی سے حساب چکتا نہیں ہو جاتا۔'

مین روڈ پر خلافِ معمول ٹریفک کم تھی۔ اکا دکا گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید سردی اور دبیز دھند کے سبب ڈرائیور حضرات نے گاڑیاں لائن کے ہوٹلوں پر کھڑی کر دی تھیں اور صبح کا انتظار کرنے لگے تھے۔ تمام راستے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ رات جب اپنی زلفوں کو سمیٹ کر صبح کے قدموں تلے بچھانے میں مصروف تھی، ہم میڈم کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ ظاہر خان نے رسمی چیکنگ کے بعد ہمیں داخلے کی اجازت دے دی۔

سخی محمد نے پارکنگ کے باہر ہی گاڑی روک دی اور مجھے مخاطب کر کے کہا، ''ماسٹر! سامان نکال کر اندر لے جاؤ، میں گاڑی کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پک اَپ سے سامان نکالنے لگا۔ اپنے اسلحے کے علاوہ عقبی سیٹ کے نیچے پڑی ہوئی ایک گن اور خاصی مقدار میں گولیاں بھی نکال لیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ گاڑی میں اور کوئی بھی کارآمد شئے نہیں رہی تھی، میں نے ہاتھ لہرا کر سخی محمد کو جانے کا اشارہ کر دیا۔

ایسے میں طویل قامت ظاہر خان بھی کاندھے پر مخصوص انداز میں گن لٹکائے ہمارے پاس آ گیا اور بولا، ''تم نے بڑا دیر لگا دیا اے شیرا خان! میڈم صاب نے دو بار انٹر کام پر اَم سے تمہارا پوچا (پوچھا) اے۔''

وہ مجھے عمومی طور پر 'شیرا خان' کہہ کر پکارتا تھا اور اس کے پشتو لب و لہجے کے پیشِ نظر مجھے اعتراض نہیں ہوتا تھا۔

''دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے ظاہر خان!'' میں نے کہا، ''میرو شاہ یہیں ہے؟''

''آہا! وہ چڑی مار کہ بدمعاش..... وہ بڑا چالاک بندہ اے۔ آج اُس کا بڑا بے عزتی کیا

میڈم صاب نے۔ ایک دم مزا آ گیا اَم کو.....'' اس نے ہنستے ہوئے انگلی اور انگوٹھے کو خاص ترتیب دے کر دکھائے ہوئے کہا، ''اتنا سا منہ بنا ہوا تھا چڑی مار کے بچے میر وشاہ کا جب وہ اوپر سے اُتر کر نیچے آیا تھا.....''

میر وشاہ کی پذیرائی پر اُس کا دل باغ باغ ہوا تھا۔ تبھی مزہ لے رہا تھا۔ میں نے پوچھا، ''مگر میڈم نے اُس کے بے عزتی کیوں کی؟''

''یہ اَم کو پتا نئیں اے۔ پَر بڑا مزا آیا اے۔ اِدھر ہاتھ نکالو.....''

میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ پر زوردار ہاتھ مارا اور فرطِ مسرت سے جھومنے لگا۔ اسی دوران اُس کی نگاہ میری پیشانی پر پڑی۔ ہنستے ہنستے رُک کر مستفسر ہوا، ''اِدھر کیا ہوا؟''

میں نے بتایا، ''چوٹ آ گئی ہے۔''

اس دوران سخی محمد گاڑی کو ریورس کرنے لگا تو ظاہر خان نے اُسے روک دیا۔ بولا، ''اے تم کدھر جاتا اے؟ میڈم صاب کا حکم اے کہ تم اپنا پون (فون) لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ لو اپنا پون اور اب اِدھر واپس نہ آنا۔''

اس نے موبائل فون اپنے کوٹ کی بڑی سی جیب سے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کا اب یہاں کوئی کام نہیں تھا۔ میڈم کو مشن کی رپورٹ میں نے دینا تھی کیونکہ میر وشاہ نے مجھے مشن لیڈر مقرر کیا تھا۔ سخی محمد نے 'بائی' کیا اور گیٹ سے نکلتا چلا گیا۔

ظاہر خان نے سامان اندر پہنچانے میں میری اعانت کی پھر شبو کو آوازیں دیتا ہوا اس کچن کی طرف چلا گیا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا، زخم کی عمومی ڈریسنگ کی اور بال سنوار کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ میرے پہلو میں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس پڑا تھا جبکہ اسلحہ ظاہر خان نے گیسٹ ہاؤس کے لاؤنج میں رکھ چھوڑا تھا تاکہ اُسے اسٹور میں محفوظ کر سکے۔

میری توقع کے مطابق وہ اسٹور سے نکل کر شبو کی طرف گیا تھا کیونکہ جب تھوڑی دیر بعد اُس کی واپسی ہوئی تو اُس کے ہاتھ میں چائے کا بڑا سا مگ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے انٹر کام پر سیکنڈ فلور پر میرے آنے کی اطلاع کر دی تھی۔ پھر مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر اپنے کیبن میں چلا گیا تو میں چائے سے لطف اندوز ہونے لگا۔

شبِ گزشتہ کی خنکی میرے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ میں نے چائے پی کر گرم کمبل بدن پر لپیٹا اور بیڈ پر پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں اپنے مشکل ترین مشن میں کامیابی حاصل کر کے لوٹا تھا۔

قسمت نے میری یاوری کی تھی اور میری زندگی کی بہت بڑی خواہش پوری کرتے ہوئے مجھے رنگو قصائی سے بھی ملا دیا تھا۔ چونکہ دونوں ملاقاتوں کے درمیان بہت طویل عرصہ حائل تھا، اِس لیے مجھے ایک طرح سے نا اُمیدی ہو چکی تھی مگر میں سوچا کرتا تھا کہ وہ زندگی میں جب کبھی ملے گا، میں اُس کا کام تمام کر دوں گا۔ رات کو وہ غیر متوقع طور پر نظر آیا تو میرے حواس مختل سے ہو کر گئے تھے۔ ویسے بھی مشن سے ہٹ کر کچھ نہ کر پانے کی پوزیشن میں تھا۔ اگر میں اُس پر ہاتھ ڈالتا تو مشن میرے ہاتھوں سے نکل جاتا جو نہایت اہم تھا۔

ایسے میں میرے دل نے مجھے بزدلی کا طعنہ دیا مگر دماغ نے ڈھارس دی اور سمجھایا، 'شہر یار! تم نے کوئی بزدلی نہیں کی۔ حماقت کرتے تو نہ صرف اپنی جان گنوا بیٹھتے بلکہ میڈم کے اعتماد کو بھی ٹھیس پہنچاتے۔ زندگی باقی، صحبتِ یاراں..... پہلے تم اُس سے آشنا نہیں تھے۔ آج تمہیں آشنائی کی دولت مل گئی ہے۔ اِسی پر اکتفا کرو اور اس پر مضبوط ہاتھ ڈالنے کا فکر کرو۔'

میری مضطرب سوچوں کا ارتکاز رنگو کی خونیں شخصیت تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اُس چہرے کو دوسری مرتبہ دیکھنے کی شدید خواہش کی تھی۔ دُنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اتنی بڑی دُنیا میں کسی بھی اجنبی شخص کا یوں مل جانا قسمت کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔

یہ طے تھا کہ میں نے اپنے والدین کے بہیمانہ قتل کا بدلہ اس سے لینا تھا۔ اس انتقام کی ہر قیمت ادا کرنے کیلئے میں تیار تھا۔ پولیس، جیل، قانون اور خون آلود ردِعمل کی مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ بھڑولے کے سوراخ سے جھانکنے والی میری بچپنے کی آنکھ میں ایک رنگو قصائی کا چہرہ ہی محفوظ تھا جسے میں نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اُس کے ساتھیوں کے چہرے دکھائی نہیں دیے تھے کیونکہ وہ ڈھاٹوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس ظالم کا چہرہ بھی چند لمحوں کے لیے برہنہ ہوا تھا جسے میری آنکھوں نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ محض اُسے قتل کرنے سے میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ بجھنے والی نہیں تھی۔ مجھے اُس سے اُس کے ساتھیوں اور اُسے بھیجنے والے کے بارے میں پوچھنا تھا۔ یہ بھی پوچھنا تھا کہ میرے ماں باپ کو کس گناہ یا جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔ میں نے بہت سوچا مگر اپنے باپ سوہنے خان سے، اِس علاقے سے رنگو قصائی کا تعلق میری فہم سے بالاتر رہا۔ جس حد تک مجھے علم تھا، رنگو نور پور سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی اُس کی میرے خاندان سے کوئی دُشمنی تھی۔

مجھے ہی کیا، نور پور کے کسی بھی شخص کو، بشمول پھوپھی اور چاچا چراغ کے، اِس دوہرے قتل

کی خون آشام وارداتِ کے پسِ منظر سے آگہی نہیں تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میرے والدین کو کیوں اور کس نے قتل کیا تھا۔ پھوپھی کبریٰ کہتی تھی کہ اُس کے بھائی کا کسی سے زمین، رقم کے لین دین یا کاروباری تنازع نہیں تھا۔ چاچا چراغ کہتا تھا کہ میرا بڑا بھائی روتوں کو ہنسانے والا شخص تھا مگر جاتے ہوئے مجھے اشکوں کے سمندر میں پھینک گیا۔ حیات خان کہتا تھا کہ اگر سوہنے خان کے قاتلوں کا پتہ چل جاتا تو پورا نور پور اسلحہ اُٹھا کر کھڑا ہو جاتا اور اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ ایسے اَن گنت سوالات تھے جن کے جواب ایک وہی..... رنگو قصائی کا..... ناک پر دور سے دکھائی دینے والے سیاہ تل اور بڑی بڑی مونچھوں والا چہرہ ہی دے سکتا تھا جسے میں نے اتفاقاً دوسری مرتبہ بھی دیکھ لیا تھا۔ آگے کیا کرنا تھا، یہ طے کرنا باقی تھا۔ ایسے وقت میں مجھے کھالے کی عدم موجودگی بُری طرح کھلنے لگی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہوتا تو چٹکی بجاتے میں منصوبہ سازی کر لیتا۔

میں نے دانت کچکچائے، بیڈ کے فوم پر مکے مارے اور بڑبڑایا، ''دشمن! میرا انتظار کر..... میں تجھ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں کروں گا۔ تیرے بدن کو خون میں نہلا کر سرخرو ہوں گا۔''

مجھے علم تھا کہ اس تک پہنچنا، اُسے جواب دہی پر مجبور کرنا یا اسے ٹھکانے سے نکال لانا آسان نہیں تھا مگر میں جوئے شیر لانے کیلئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکا تھا۔ مجھے میر وشاہ اور میڈم کی اعانت کی ضرورت تھی اور یقین تھا کہ وہ میری مدد ضرور کریں گے۔ کھالے کی کمی پیا جی اور سخی محمد پوری کر سکتے تھے کیونکہ دونوں اُس سے کہیں زیادہ طاقتور اور خونخوار شکاری تھے۔

مجھے باور تھا کہ میڈم اور میر وشاہ کے عدم تعاون کی صورت میں بھی میں رنگو قصائی کے سر سے ٹلنے والا نہیں تھا۔

میں نے بے دھیانی میں بریف کیس گھسیٹ کر اپنے سامنے رکھا اور کھول دیا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں ترتیب وار پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں نوٹوں کی مانوس سی خوشبو پھیل گئی جس نے مجھے رنگو قصائی کے تصور سے نکال لیا۔ میڈم نجانے کتنے عرصے سے نوٹوں میں کھیل رہی تھی۔ اُس گھڑی میں نوٹوں سے کھیلتے ہوئے اُس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے بدن سے پھوٹنے والی بھینی بھینی مہک نوٹوں کی خوشبو سے کہیں زیادہ دل کشا تھی۔ نوٹ سامنے تھے تو ذہن میڈم شکیلہ کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ جب وہ نظروں کے سامنے ہوتی تھی تب ذہن میں کوئی اور خیال نہیں ہوتا تھا۔ یہی اُس کے حسنِ کرشمہ ساز کا دل فریب حصار تھا جو ایک پل کو باہر نکلنے

کی مہلت نہیں دیتا تھا۔

نوٹوں کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا کیونکہ میں نے کبھی اتنے نوٹ ایک جگہ پر نہیں دیکھے تھے۔ چوک قریشی والے بینک میں بھی شاید اتنی رقم نہیں ہوتی ہوگی جتنی میرے سامنے پڑی ہوئی تھی۔

دس بجے کے قریب مجھے انٹر کام پر سونیا نے میڈم کا حکم سنایا۔ اس نے مجھے 'مال' سمیت اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ میں نے بریف کیس اُٹھایا اور زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحوں بعد میں میڈم کے سامنے کھڑا تھا جبکہ وہ صوفے پر اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی جینز پینٹ، سرخ شرٹ اور پینٹ کا ہم رنگ لیدر کوٹ پہن رکھا تھا۔ پیشانی پر جھک کر پیچھے ہٹتے ہوئے بال سنہرے رنگ کے ہیئر کلپ میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں اُسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ ہر لباس اس کے وجود پر آ کر سجنے لگتا تھا۔

اس نے سنجیدگی سے پوچھا، ''رپورٹ دو؛ مشن کیسا رہا؟''

مجھے میڈم کو رپورٹ دینے کا سلیقہ پیا جی نے سکھایا تھا۔ کوٹھی چھوڑنے سے لے کر واپس پہنچنے تک میں نے شب کہانی تمام تر جزئیات سمیت اُس کے گوش گزاری۔ وہ ہمہ تن گوش سنتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے تالی بجائی اور مسکرا کر کہا، ''ویل ڈن مسٹر شہریار! تمہاری پہلی کامیابی نے میرا دعویٰ سچ ثابت کر دیا کہ تم لاکھوں میں ایک ہو..... ایک ہو جس پر شکیلہ کی آنکھیں مطمئن ہوئی ہیں..... آئی لو یو!''

اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں اور لبوں پر بڑی دل آویز ستائشی مسکراہٹ چسپاں تھی۔

میں نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا، ''اِسے کہاں رکھوں میڈم!''

اس نے کہا، ''اُدھر..... ٹیبل پر رکھ کر کھول دو۔''

میں نے بریف کیس کو شیشے کی میز پر رکھا اور کھول کر اُس کی طرف گھما دیا۔ اس نے ایک نظر بے نیاز اُس کی طرف دیکھا، پھر بولی، ''رقم پوری ہے؟''

''جی میڈم..... سخی محمد نے گنی تھی۔''

''نوٹ اصلی ہیں؟''

''یس میڈم!'' میں نے یقین سے کہا۔

''تم موت کے منہ سے مایا نکال کر لائے ہو۔ اس میں سے اپنا حصہ نکال لو۔ اپنے حصے کا تعین بھی تم کرو گے؛ جتنا جی چاہے.....''

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں نے کہا، ''میں سمجھا نہیں!''

''میں کہہ رہی ہوں کہ تم جتنے چاہو، پیکٹ اُٹھالو۔ یہی تمہارا انعام ہے۔''

میں نے ایک نظر میڈم کو دیکھا۔ پھر نوٹوں پر نگاہ دوڑائی۔ میں کتنے نوٹ اُٹھا سکتا تھا؟ دو، تین، پانچ پیکٹ..... اس نے مجھے پورا اختیار دیا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر بریف کیس بند کر دیا۔ وہ تعجب سے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا، ''مجھے انعام چاہیے، خیرات نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ ٹھٹکی، ''میں تمہیں انعام دے رہی ہوں، خیرات تو نہیں..... کہا تو ہے کہ جتنی رقم چاہو، اُٹھالو..... کیا میں اپنے ہاتھ سے دوں؟''

میں نے کہا، ''نہیں..... مجھے رقم کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو پھر کس چیز کی ضرورت ہے تمہیں؟'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ حیرت اور ناگواری کے ملے جلے تاثرات اُس کی آنکھوں سے مترشح ہونے لگے تھے۔

میں نے سر جھکا لیا۔ جو کہنا چاہتا تھا، کہنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ فارم ہاؤس پر ہونے والی ملاقات کے بعد میرے اور اس کے درمیان تکلفات کی فضا میں تبدیلی رونما ہوئی تھی مگر ابھی تکلف باقی تھا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ جواب نہ پا کر اُٹھی اور میرے سامنے آن کھڑی ہوئی، بولی، ''کیا بات ہے؟ تمہارے دل میں ایسا کیا ہے جس کو لبوں پر لاتے ہوئے گھبرانے لگے ہو؟''

میں نے نظر اُٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ایسے میں دل کی دنیا زیروزبر ہو گئی۔ اس کی شخصیت کے مضبوط تاثر میں رخنہ ڈالنے کی ہمت کرتے ہوئے میں نے بدقت تمام ہونٹوں کو مخصوص انداز میں ایک دوسرے سے مس کرتے ہوئے مانگ لیا..... جو دل مانگ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب چمک پیدا ہوئی اور لب تھوڑا کھل گئے، بولی، ''بس؟''

''بس!'' میرے دل کی دھڑکن غیر معتدل ہو گئی۔

وہ چند لمحے ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی پھر دل آویز انداز میں مسکرائی، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسا کر ٹھوڑی تلے رکھیں اور بازو کھول کر لہرائی۔ بولی، ''سچ کہو..... کیا دل سے یہ انعام مانگ رہے ہو؟''

''جی..... میں نے کہا ناں کہ مجھے انعام چاہیے۔ نوٹوں کی ضرورت ہوتی تو واپس نہ آتا۔

بہترین زندگی گزارنے کے لیے یہ بریف کیس کافی ہوتا۔'' میں نے کہا۔

اس نے اچانک دونوں بانہیں کھول کر میری گردن میں ڈال دیں اور میرے بدن میں انعام کی تمام تر حدت اُتار دی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے اُس کے ہاتھ کا بوسہ چاہا تھا اور اس نے جواب میں میری عقیدت کے ننھے سے چراغ کو محبت کا سورج بنا میری ہستی کے آسمان پر سجا دیا تھا۔ اور پھر شاید اُس کے پاس باقی کچھ نہیں رہا تھا اِس لیے چند ہی لمحوں میں تھک کر میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ ایک دم ساکت اور بے حس و حرکت مجھ سے لپٹی کھڑی تھی جبکہ اس کی دھڑکن مجھے اپنی روح میں اُترتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایسے میں اس کی مدھم سی آواز سنائی دی، ''کم آن..... مجھے بانہوں میں لے لوناں.....''

میں وہاں تھا اور میرا وجود کسی اور دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ یا شاید اِس کے برعکس تھا۔ میں نے اُس کے وجود کو اپنی ذات کے حصار میں لیا تو میرا پورا جسم لرزنے لگا تھا۔ اُس گھڑی میں نے انجام سے بے خطر ہو کر کہہ دیا، ''میڈم! مجھے آپ کی محبت چاہیے..... میں جانتا ہوں کہ مجھ میں اور آپ میں زمین و آسمان کا سا فرق حائل ہے مگر میرے سینے میں بھی جیتا جاگتا ایک دل ہے..... ویسا ہی؛ جیسا آپ کے پاس ہے۔ میں آپ کو دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔''

وہ بولی، ''کچھ نہ بولو..... تم جو کچھ نہیں کہہ سکتے، میں وہ کچھ سن رہی ہوں۔''

اس کے بالوں کا ملائم لمس میرے لبوں کو تابِ زندگی، زندہ مہک ذہن کو احساسِ فرحت اور چمک آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ میرے شانے سے رگڑتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اور اس کا بولتا ہوا غیر متحرک بدن مجھے بے جان کیے جا رہا تھا۔ وہ اچانک سر اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی، ''کہا تھا ناں کہ تم دوسروں سے مختلف ہو..... ہو ناں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی، ''تھوڑا کس دو مجھے..... تھوڑا سا!''

میں نے اُسے تھوڑا سا بھینچا۔ وہ بولی، ''تھوڑا اور.....''

میں نے فرمائش پوری کی۔ میں شاید اپنے حواس میں نہیں تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اس کے بدن کو کچھ زیادہ ہی بھینچ لیا تھا۔ وہ عجیب تھی۔ وہ بجلی کی طرح مجھ پر گر کی تھی تو آنِ واحد میں میرے اوسان خطا کر گئی تھی۔ اَب گلاب کے گداز میں سرایت کر کے جذبات کے آسمان پر جلوہ افروز ہوئی تھی تو سانسوں پر سے اختیار چھیننے لگی تھی۔ میں نے اُس کی بانہہ کو سہلایا تو وہ تعجب

سے بولی، ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''یقین نہیں آتا کہ یہی وہ بازو ہے جنہوں نے مجھے پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔''

''وہی ہیں۔ ہے ناں؟'' اس نے ایڑیاں اُٹھائیں، میرے لبوں پر یکبارگی جام لگایا پھر تڑپ کر علیحدہ ہوگئی۔

وہ لہرا کر میری طرف آئی تھی۔ بل کھا کر دور ہوگئی۔ صوفے کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔ اس کی ہر ادا یکتا تھی۔ میں سنسناتے ہوئے وجود کو سنبھالتے ہوئے اُسے وفورِ شوق سے دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک میری طرف پشت کئے کھڑی رہی، پھر پلٹ کر شرارت آمیز لہجے میں بولی، ''ہر مرتبہ ایسا ہی انعام مانگو گے تو پیٹ کی آگ کیسے بجھاؤ گے؟''

میں نے کہا، ''پیسہ کمانے سے مل جاتا ہے، محبت نہیں.....''

''پیسہ محبت کو خرید لیتا ہے۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولی، ''شہریار! دیکھو، ہمارے بزنس کی بنیاد عین سائنسی خطوط پر استوار ہے، یہاں جذبات کی آنکھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہاں دل کی نہیں، دماغ کی بات سنی جاتی ہے۔'' اس نے اچانک اپنا انداز بدل لیا تھا۔ جیسی چند لمحے قبل دکھائی دی تھی، ویسی نہیں رہی تھی۔ بولی، ''مجھے خوشی ہوئی کہ تم میں اعتماد پیدا ہوگیا ہے۔ یہ بھی میرے لئے مسرت کی بات ہے کہ پیسہ تمہاری کمزوری نہیں ہے مگر ایک بات دماغ میں نقش کر لو۔ ہونٹوں کا لمس زندگی بھر کا ساتھی نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسا نامکمل کیف ہے جس کی عمر محض ایک لمحہ ہوتی ہے اور بدن کے لمس کی عمر فقط چند لمحات..... میں خوب صورت ہوں، جوان ہوں اور تمہیں قریب آنے کا موقع دیتی ہوں۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم اگر چاہو تو میں سونیا، زرمینا یا اپنی کسی بھی لڑکی کو تمہارے پاس بھیج دیتی ہوں؛ رات بھر یا ہمیشہ کے لیے۔ وہ پہلو سے لگ کر پہلو کے اندر کسک بن کر چھپی ہوئی شکیلہ یا غزالہ یا ان کی یاد تک کو نوچ پھینکے گی۔ اگر زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو زندگی بھر عورت کو اپنے حواس پر سوار نہ ہونے دینا۔ جوانی سراب ہے۔ اسے دیکھو مگر ایسے، جیسے میں تمہیں قریب لاتی ہوں، دور کرتی ہوں مگر ایک حد سے آگے نہیں جانے دیتی۔''

میں اس کی باتوں کو بغور سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے بیان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ تمتماتے ہوئے گال، آنکھوں کی شکست خوردگی اور ہونٹوں پر رقص کرتی غیر معمولی چمک اس کے اندرونی انتشار اور جذباتی بہکاؤ کو ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے کہا، ''میڈم! میں آپ کے

بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کر سکتا۔ مگر آپ جو کہہ رہی ہیں، یہ سب پروفیشنل ازم ہے۔ میں جو کچھ سن رہا ہوں، اُس کا تعلق دل سے ہے اور دل جھوٹ نہیں بولتا۔''

وہ ایک ذرا مسکرائی، پھر کندھے اُچکا کر بولی، ''ابھی تم نے زندگی کے حقیقی رنگوں کو نہیں دیکھا۔ تھوڑے عرصے میں دیکھ لو گے۔''

اس نے انٹر کام پر سونیا کو طلب کیا۔ میں گھبرا گیا۔ خدشہ جاگا کہ کچھ دیر پہلے اُس نے جو دعویٰ کیا تھا، کہیں اُسے آزمانے پر کمر بستہ نہ ہو گئی ہو۔ میں نے جلدی سے کہا، ''آپ اُسے کیوں بلا رہی ہیں؟''

اس نے میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا، ''فکر نہ کرو۔ تمہیں امتحان میں نہیں ڈالوں گی۔''

سونیا کے دستک دینے تک ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ سونیا کی مدھم سی آواز سنائی دی، ''مے آئی کم اِن میڈم؟''

میڈم نے 'یس' کہا پھر سونیا کو دیکھ کر بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی، ''اِسے لے جاؤ۔''

وہ میرے قریب سے گزری۔ خوشبو کا ایک جھونکا میرے اطراف میں چکرایا۔ میں نے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ بھول گیا کہ میڈم کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

سونیا بریف کیس اُٹھا کر چلی گئی تو وہ بولی، ''شہریار! سونیا خوب صورت ہے۔ ہے ناں؟''

میں نے کہا، ''جی میڈم! خدا نے اپنی تخلیق کو ہمیشہ خوب صورت نقش و نگار دیے ہیں۔''

وہ مسکرائی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی، ''تمہیں اور کچھ کہنا ہے؟''

میں چونکا، پھر سوچ کر بولا، ''میڈم! مجھے ایک بات کہنی تھی۔''

''کہو!''

''میں نے آپ کو اپنے والدین کے بارے میں بتایا تھا کہ انہیں کسی جرم کے بغیر کسی ظالم درندے نے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ یاد ہے ناں؟'' میں نے کہا، ''قسمت نے مجھے رات کو اس کی شکل دوسری مرتبہ دکھا دی ہے۔ میرے ماں باپ کو مارنے والا رنگو قصائی ہے۔''

وہ ایک ذرا ٹھٹکی اور حیرت سے بولی، ''واقعی؟ تم پہچاننے میں غلطی بھی کر سکتے ہو۔''

میں نے سختی سے تردید کی، ''نہیں میڈم! میں نے اس ظالم شخص کی صورت کو آج تک ذہن

سے محو نہیں ہونے دیا۔ یوں سمجھ لیں کہ رنگو قصائی کی شکل میرے ذہن کے پردوں پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔''

اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے پھر سر ہلاتے ہوئے بولی، ''ہوں..... مجھے تمہاری سنائی ہوئی کہانی یاد تو ہے مگر ایک مرتبہ دہرا دو۔''

میرے پاس بتانے کے لیے محض وہی منظر تھا جو میں نے مٹی کے بھڑولے کے اندر کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ وہ خوفناک منظر مجھے لحظہ بہ لحظہ یاد تھا۔ میں نے میڈم کے گوش گزارا۔ وہ ستائش بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر بولی، ''تم واقعی مختلف ہو، سبھی سے..... تم نے اتنی پرانی بات کو یوں جزئیات سمیت یاد رکھا، حیران کن ہے۔ اب کہو؛ کیا کہنا چاہتے تھے؟''

''میں اُس سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے..... جاؤ اور اُسے گولی مار دو۔'' وہ قدرے لاپروائی سے بولی۔

''مگر میڈم!'' میں نے اپنا مدعا بیان کیا، ''میں اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بارے میں معلومات لینا چاہتا ہوں جس نے اُسے بھیجا تھا اور اس کے ساتھیوں کے نام پتے بھی پوچھنا چاہتا ہوں..... اس کام کی تکمیل کے لیے مجھے محفوظ تنہائی درکار ہے۔ میں اُسے دوآبے سے اغوا کر کے کسی محفوظ جگہ پر لے جانا چاہتا ہوں جہاں اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کر سکوں۔ وہ مجھے آسانی سے بتانے والا نہیں لگتا۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے براہِ راست سوال کیا۔

''مدد!'' میرا لہجہ از خود ملتجیانہ ہو گیا، ''ساتھی، اسلحہ اور محفوظ جگہ..... میں آپ کی مدد کے بغیر اسے اغوا نہیں کر سکتا۔''

اس کی پیشانی پر لکیروں کا باریک جال تن گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ کچھ توقف کے بعد بولی، ''وہ بڑا حرامی شخص ہے۔ آسانی سے پلو نہیں پکڑائے گا مگر میں تمہیں اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع دوں گی۔ ابھی حالات خراب ہیں۔ وہ چوٹ کھا کر زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا ہو گا۔ ایسے میں اُس پر ہاتھ ڈالنا خطرناک ہو گا۔ تم چند دن صبر کرو۔ جونہی حیدر خان اور میاں دلبر حسین کا معاملہ ٹھنڈا پڑے گا، تمہیں نفری دے کر دوآبے روانہ کر دوں گی۔ از اِٹ او کے مائی ڈیئر؟''

میں نے ممنون نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا، ''یس میڈم! آپ بہتر جانتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... اَب تم اپنے گھر جاؤ اور آرام کرو۔'' اس نے کہا اور صوفے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ میں نے اس پر الوداعی نظر ڈالی اور سلام کر کے اس دریچۂ حسن سے نکل آیا۔

میں نے ظاہر خان سے کہا کہ وہ مجھے گلگشت پہنچانے کا بندوبست کر دے۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، ''ایدھر گاڑی تو اے پَر ڈرائیور نہیں اے۔ تم اس طرف کو سیدھا جاؤ اور مین چوک پر جا کر آٹو رکشا پکڑ لو۔''

میری جیب خالی تھی مگر یہ سوچ کر رکشا والے کو گھر سے پیسے اُٹھا دوں گا، میں نے کوٹھی سے کوئی سو گز کے فاصلے پر واقع بڑے چوک کا رُخ کیا۔ وہاں سے رکشا پکڑا، ڈرائیور کو اپنے گھر کا پتہ سمجھایا اور تن آسان ہو کر بیٹھ گیا۔

اس نے وقت اور پٹرول بچانے کی غرض سے شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا اور گھنٹہ گھر چوک کی طرف چل دیا۔ میں نے یہ راستہ دیکھ رکھا تھا اس لیے متفکر نہ ہوا۔ اس نے رکشا گھنٹہ گھر چوک سے نکالا اور نو نمبر چونگی والی سڑک پر ڈال دیا۔ شہر کے اس علاقے میں رش قدرے زیادہ ہوتا تھا۔ میں چونکہ اپنے خیالات میں گم تھا، اِس لیے اس ڈارک بلو کلر کی نئی کار کو نہیں دیکھ سکا تھا جو گھنٹہ گھر چوک سے رکشا کے برابر چلتی آئی تھی اور اس نے ڈریم لینڈ سینما کے عین سامنے سائیڈ دبا کر رکشا ڈرائیور کو ہنگامی طور پر رکشا روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رکشا ڈرائیور نے زوردار گالی دی، ''ابے تیری..... سالا اندھا ہو گیا ہے کیا؟''

میں نے چونک کر جھک کر رکشا کی فرنٹ سکرین کے پار عجیب انداز میں راستے روکے کھڑی کار کو دیکھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجا دیا۔ مجھے فوری طور پر یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ کیا ہونے والا ہے مگر میں نے رکشا سے اُترنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر دیر ہو گئی تھی۔ رکشا کا ریگزین کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا، ایک سفید کپڑوں والے شخص نے رکشا میں جھانکا اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کی دوہری نال میری پسلیوں سے آ لگی۔ میں نے گن کی طرف دیکھا۔ ایسی عجیب الوضع گن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بمشکل ایک فٹ لمبی جسامت، دو نالوں اور چوڑی پٹی کی میگزین والی گن دیکھنے میں ہی بڑی خطرناک لگ رہی تھی۔

میں نے استعجاب اور خوف کے ملے جلے احساس سے مغلوب ہو کر پوچھا، ''کون ہو تم اور یہ کیا حرکت ہے؟''

وہ سرد لہجے میں بولا، ''کوئی خرمستی کیے بغیر نیچے اُتر آؤ۔''

میں نے کن اکھیوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ ایک جانب وہ کھڑا تھا جبکہ رکشا کی دوسری جانب دکان کا تھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اُس طرف سے فوری طور پر نکل نہیں سکتا تھا۔ سفید پوش نے گن کی نال میری پسلیوں میں چبھوئی اور غرا کر کہا، ''جلدی کرو ورنہ یہیں کام تمام کر دوں گا۔''

میرے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ کار نہیں تھا۔ رکشا ڈرائیور سہمی ہوئی نظروں سے غیر متوقع طور پر پیش آنے والی صورت حال کو دیکھ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میری مدد کر کے جان کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں کھسک کر رکشا سے نکلا تو اُس نے گن کی نال سے گاڑی کی طرف چلنے کا اشارہ کیا جو محض تین چار قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کا رکشا کی سمت والا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔

قوی الجثہ شخص مجھ سے تقریباً چمٹ کر کھڑا تھا اور اس کی گن مجھ سمیت کسی بھی گزرتے ہوئے شخص کو دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر میرے پہلو میں اپنی موجودگی کا مکمل احساس دے رہی تھی۔ آنے جانے والے لوگوں کو مطلق خبر نہیں ہوئی تھی کہ دن دیہاڑے سڑک پر مجھے اغوا کیا جا رہا تھا۔ میں نے طویل سانس خارج کی اور ڈارک بلو کلر کی کار کی طرف قدم بڑھا دیا۔ اس نے دھیمے مگر درشت لہجے میں کہا، ''گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

میں نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ اطراف کا یک نظری جائزہ لیا کہ میرے نکل بھاگنے کا کوئی امکان موجود تھا یا نہیں۔ مگر اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے شوٹ کر سکتا تھا۔ بادلِ نخواستہ میں عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیٹ پر مقابل دروازے کی جانب سیٹ پر گرے کلر کا ٹریک سوٹ پہنے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جو بڑی محویت سے شیشے کے پار دیکھ رہا تھا۔ مجھے فوری طور اس کے گھٹنوں کے بیچ سیاہ رنگ کا پستول دکھائی دے گیا جس کا بولٹ چڑھا ہوا اور لاک پن ہٹی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک منحنی سے وجود والا شخص بیٹھا ہوا تھا جو اس ساری مار ماری سے قطعی طور پر بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

میرے بیٹھتے ہی مجھے گن کی نال چبھونے والا قوی الجثہ شخص بھی کار میں بیٹھ گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا، ''ہمارا کام ہو گیا ہے، اب فوراً یہاں سے نکل چلو۔''

کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں عقبی سیٹ پر دونوں اسلحہ برداروں کے درمیان میں پھنسا بیٹھا تھا جبکہ میرے بائیں پہلو میں عجیب ساخت کی گن کی نال چبھ رہی تھی۔ نو نمبر چونگی

والے مین چوک پر پہنچ کر ڈرائیور نے بائیں ہاتھ ٹرن لیا اور آٹھ نمبر چونگی کی طرف تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں میری داہنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنا رُخ میری جانب کیا اور طنزیہ لہجے میں کہا، ''کیا حال ہے مسٹر شہریار؟ امید ہے تمہیں یہ پروٹوکول پسند آیا ہوگا۔''

یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ یکبارگی مجھے جھٹکا سا لگا اور میرے بدن کا خون میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔

''کیوں؟ کیا اپنی بہن کے یار کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے سالے؟'' میرے کانوں میں اس کی زہریلی آواز پڑی۔ یوں لگا جیسے اس نے پگھلا ہوا سیسہ میرے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔

اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہو سکتی تھی۔ کھالے کے ہاتھوں حادثاتی طور پر قتل ہونے والے محبوب الحسن عرف موبی کا جگری یار اور دستِ راست، زور آور تھا۔ پہلی مرتبہ وہ جھیل کے گیٹ پر مجھ سے ٹکرایا تھا جب میں اور کھالا خانزادی اسما سے ملنے کے لیے ملتان آئے تھے۔ میں نے اُسی کی خاصی ٹھکائی کی تھی۔ دوسری مرتبہ وہ مجھ سے ابتدائے شب کے اندھیرے میں ڈیرہ اڈہ کی ایک مارکیٹ کے باہر ملا تھا۔ اس کے ساتھ ڈرائیور اور ایک جرسی والا شخص بھی تھا۔ دونوں مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے مگر میں انہیں زخمی کرنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تیسری مرتبہ اس سے میری ملاقات تھانیدار اظہر کی دفتری عدالت میں ہوئی تھی جہاں سے مجھے میڈم شکیلہ اور میر وشاہ نے رہائی دلوائی تھی۔ اس نے میر وشاہ کی موجودگی میں یخنی فروش کے قریب گاڑی روک کر دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے دیکھ لے گا۔ آج اس نے اپنی دھمکی پر عمل کر لیا تھا۔

وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی گالی نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ میں نے دانت پیسے اور سرد لہجے میں کہا، ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو زور آور! میں نے سوچا تھا کہ تمہارے اور میرے بیچ معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ مگر آج تم نے یہ حرکت کر کے ثابت کر دیا ہے کہ تم نہایت کینہ پرور اور ناقابل معافی شخص ہو۔''

اس کا بلند قہقہہ گاڑی میں گونج اُٹھا۔ اپنی ران پر زوردار ہاتھ مار کر بولا، ''یعنی اَبھی عقل نہیں آئی تمہیں..... مجھے دھمکانے لگے ہو..... یعنی زور آور کو..... واہ سالے واہ! مگر خیر..... یہ تو ہوتا ہی ہے۔ موت سامنے آتی ہے تو بڑے بڑوں کے حواس ٹھکانے نہیں رہتے اور اُول فول

بکنے لگتے ہیں۔ میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔''

خوف اور پریشانی کا ابتدائی مرحلہ بیت گیا تھا اور میں اس کی تحویل سے نکلنے کے لیے موقع کے انتظار میں ذہن دوڑانے لگا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ میں قطعاً خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ زور آور کے بازوؤں کا زور میں نے دیکھ رکھا تھا۔ اس کی منتقم مزاجی کو بھی آزما چکا تھا۔ اس نے موبی کے قتل کو ابھی تک بھلایا نہیں تھا۔ وہ خطرناک شخص تھا اور میرا جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے بے خوفی سے پوچھا، ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

وہ تین مرتبہ دانتوں پر دانت مار کر 'ٹک ٹک' کی آواز پیدا کرنے کے بعد گنگنایا، ''تجھے قتل کیا جائے، یا کہ معاف کیا جائے..... تو ہی بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے..... تجھے قتل کیا جائے.....''

اس کی تضحیک آمیز گنگناہٹ اور فاخرانہ مسکراہٹ پر میرا خون کھول اُٹھا۔ جی چاہا کہ زور دار مکا مار کر اُس کا واہیات منہ توڑ دوں مگر بدقت تمام خود کو سنبھالا اور کہا، ''میرے سوال کا جواب دو؛ خان صاحب بننے کی کوشش نہ کرو۔''

اس نے ٹھٹک کر مجھے دیکھا۔ میرا جملہ اُسے برا لگا تھا۔ مسکراہٹ غائب ہوگئی اور آنکھوں سے خشونت ٹپکنے لگی۔ بولا، ''بھتنی کے! ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد پھر زہریلی مسکراہٹ کے جلو میں بولا، ''نہیں یار! ڈرنا نہیں، زیادہ فکرمند نہیں ہونا..... میں تجھے قتل نہیں کروں گا۔ بھلا کوئی اپنے مہمانوں سے ایسا سلوک بھی کرتا ہے..... یار! بس تھوڑا سا موج میلہ کریں گے، گزرا زمانہ بچپن کا یاد کریں گے پھر تم جہاں کہو گے، وہاں پہنچا دیں گے..... بس!''

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے کہیں محفوظ جگہ پر لے جا کر تشدد کا نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بہ حکایتِ دیگر، وہ ان چوٹوں کا حساب لینا چاہتا تھا جو اُسے میرے ہاتھوں پہنچی تھیں۔ اپنے یار کے قاتل تک پہنچنے کے لیے بے چین تھا اور اپنی بے چینی کو دور کرنے کے لیے کھالے کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے اپنے بائیں ہاتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا۔ وہ پوری طرح چوکس تھا۔ ایسے ہی وقت میں میرے موبائل فون کا بزر بجا۔ زور آور چونکا اور اُس نے ہاتھ بڑھا کر

میری جیب سے فون سیٹ نکال لیا۔ چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا پھر اس نے 'پاور ڈ آف' کر کے فرنٹ سیٹ کی طرف اُچھال دیا۔

اس نے بڑی مضبوطی سے پستول کو پکڑ کر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ میں اگر اُس سے پستول چھیننا چاہتا تو نہیں چھین سکتا تھا۔ اس کوشش میں میرے پہلو سے لگی ہوئی خوف ناک گن کی نال گولی اگل کر مجھے ہمیشہ کے لیے خاموش کرا سکتی تھی۔ میں نے فی الحال مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اگلی سیٹوں کے درمیان سے فرنٹ سکرین کے پار رواں دواں ٹریفک کو دیکھنے لگا۔

آٹھ نمبر چونگی کے مین چوک پر پہنچ کر ڈرائیور نے دائیں ہاتھ نواب پور روڈ کی جانب ٹرن لیا اور کار کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد کھیڑا آباد کی گنجان آبادی ختم ہو گئی اور قدرے کھلا علاقہ شروع ہو گیا۔ سڑک کے اطراف میں لکڑی کے ٹال، اینٹوں کے بھٹے اور آرے دکھائی دینے لگے۔ پھر کم گنجان آبادی بھی ختم ہو گئی۔ اِکا دُکا دکانوں اور مکانوں کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ مجھے شہر سے باہر، مضافات میں واقع اپنے کسی خفیہ ٹھکانے پر لے جا رہے تھے۔

گاڑی میں خاموشی طاری تھی۔ وہ تینوں میری مفاہمانہ خاموشی کو غنیمت جان کر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی پانچ سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور نے بائیں ہاتھ نکلنے والی لنک روڈ پکڑ لی۔ میل بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے یہ پکی سڑک بھی چھوڑ دی اور دو بھٹوں کے درمیان واقع کچے اور زگ زیک راستے پر کار ڈال دی۔ راستہ مٹی اور دھول سے اَٹا ہوا تھا۔

میں نے گردن موڑ کر ونڈ سکرین کے پار دیکھنے کی کوشش کی تو اُڑتی ہوئی دھول کے دبیز بادل کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے زور آور کو دیکھا جو بے فکری سے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ اس وقت وہ حلیے اور چہرے کے تاثرات سے ایکشن فلموں کا وِلن معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اپنی نوک پلک سنوارتا اور حلیہ درست رکھتا تو ہینڈسم قرار دیا جا سکتا تھا۔

میرا ذہن بڑی برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور درپیش آنے والے نامساعد حالات سے نبرد آزمائی کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مصروف تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ زور آور خطرناک ارادے رکھتا تھا۔ اگر اُسے معمولی پوچھ گچھ اور مار پیٹ کا شوق چراتا تو وہ مجھے شہر سے دور اِس ویرانے میں نہ لاتا بلکہ وہیں دو چار ہاتھ رسید کر کے چھوڑ دیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دو مرتبہ

شکست سے دوچار ہونے کے بعد بہت محتاط ہو گیا تھا اور مجھے سبق سکھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں میڈم شکیلہ کی کوٹھی اور اپنے گھر کے بیچ اس طرح اغوا کیا گیا تھا کہ نہ میڈم کو میرے بارے میں کچھ علم ہوا ہوگا اور نہ میرے گھر والوں کو میری خبر ہوگی۔ مجھ تک کسی امداد کا پہنچنا محض خام خیالی تھا۔ میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں مستغرق تھا کہ کار ایک دیہاتی طرز کے تعمیر شدہ مکان کے بڑے سے دروازے پر رُک گئی۔ دھول کا گہرا بادل جو چلتی کار کے تعاقب میں دوڑا آ رہا تھا، چند لمحوں میں ہی کار کے گرد پھیل گیا۔ بصد کوشش بھی آس پاس کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ جب دھول ہوا میں تحلیل ہوئی، زمین پر گر گئی، تب زور آور نے اپنے ساتھی کو نیچے اُترنے کا حکم دیا اور کہا، ''صفی! اس الو کے پٹھے کا دھیان رکھنا۔ معمولی سی حرکت بھی کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔''

مجھے گن پوائنٹ پر رکھنے والے کا نام غالباً صفدر تھا جسے مختصر کر کے یا بگاڑ کر 'صفی' کر دیا گیا تھا۔ زور آور کے اُترنے کے بعد اُس نے مجھے اسی دروازے سے اُترنے کا حکم دیا۔ زور آور چند قدموں کے فاصلے پر مجھ پر پستول تانے کھڑا تھا۔

میرے اُترنے کے بعد صفی بھی کار سے نکل آیا اور گن کی نال میری ریڑھ کی ہڈی سے ٹکائے دھکیلتا ہوا مکان کے دیسی ساخت کے چوبی دروازے کی طرف بڑھا۔ زور آور میری داہنی جانب چند قدموں کے فاصلے پر محتاط انداز میں چل رہا تھا۔ میں نے مکان پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ سبھی دیواریں پختہ اور بے رنگ تھیں۔ سیمنٹ کا سیاہی مائل رنگ دھول کی تہوں نے چھپا رکھا تھا۔ مکان کے قرب و جوار میں کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس علاقے میں اینٹیں بنانے والے بھٹوں کی بہتات تھی مگر اس مکان کے قریبی بھٹے کا فاصلہ بھی کم و بیش چار سو گز تھا۔

میں دروازے کے سامنے پہنچ کر رُکا تو صفی نے سخت لہجے میں کہا، ''دروازہ کھلا ہے۔ اندر چلو۔''

میں نے کن اکھیوں سے زور آور کو دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ دونوں کی بے حد محتاط روی نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ وسیع صحن کچا تھا۔ دو بڑے اور ایک چھوٹے کمرے، غسل خانے اور نلکے پر مشتمل اس مکان کی تعمیر کا انداز مقامی اور خالصتاً دیہاتی تھا۔

صفی نے حکم دیا، ''اُس کمرے میں چلو۔''

تینوں کمروں کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ درمیانی کمرے میں کسی کے موجود

ہونے کا احساس ہو رہا تھا جبکہ کسی مشین کے چلنے کی مدھم سی آواز بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ مجھے جس کمرے کی طرف دھکیلا جا رہا تھا، میرے اندازے کے مطابق وہ خالی تھا۔ غیر معمولی بھاری چوکھٹ والا دروازہ عبور کرتے ہی میرا اندازہ یقین میں بدل گیا۔ کمرہ میں نہ تو کوئی شخص موجود تھا اور نہ ساز و سامان۔ کمرے کے عین وسط میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک میری کنپٹی پر زور دار دھماکہ ہوا۔ آنکھوں کے آگے ایک لمحے کو سورج چمکا پھر دبیز اندھیرا چھا گیا۔ کم بخت صفی نے شاید پوری قوت سے گن میری کن پٹی پر دے ماری تھی۔

میں نے بے اختیار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں سختی سے بھینچ لیا۔ بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے میں نے سر جھٹکنے کی پوری کوشش کی تھی مگر یوں محسوس ہوا تھا جیسے میرا سر منوں بھاری ہو گیا ہو اور آنکھوں کی بینائی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ شاید بقیہ دن اور پوری رات گزر گئی تھی کیونکہ جب میری آنکھ کھلی، میرے سامنے کھلے ہوئے دروازے کے باہر دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں اسی کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے بدن پر ایک میلی کچیلی، مختلف رنگوں سے لتھڑی اور بدبودار رضائی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رات کے گزرنے کا اندازہ اسی رضائی سے کیا تھا۔ ہوش میں آنے کے کافی وقت بعد تک میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی، میں نے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہو گئی اور داہنی کنپٹی پر جاگنے والی درد کی تیز لہر نے میری آنکھوں میں نمی اُتار دی۔ میں نے کنپٹی کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو پتہ چلا کہ میرے دونوں ہاتھ میری پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کوشش کے باوجود ہاتھ کو آزاد نہ کروا پایا تو میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ یہ احساس بڑا تکلیف دہ تھا کہ میرے دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ گھٹنوں کو مسلسل ہلاتے ہوئے رضائی کو ایک طرف سرکایا۔ پیروں کو دیکھا۔ جوتے غائب تھے جبکہ ٹخنوں پر انگلی کے برابر موٹی سوتی رسی کے کئی بل پڑے ہوئے تھے۔ رسی کی گانٹھ عقبی سمت میں تھی جو دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر غیر معمولی بڑے ابھار کی بدولت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پیروں کو حرکت دیتے ہوئے رسی کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ کم بختوں نے بڑے ماہرانہ انداز سے مجھے رسی میں جکڑا تھا۔

میں نے گھٹنے اکٹھے کیے، پھر پیروں کے بل اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو سر میں دھمک پڑنے

لگی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا۔ تھک کر دیوار کے ساتھ سر ٹکا کر، بے بسی سے آنکھیں موند کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ درد کی شدت سے عیاں تھا کہ کنپٹی پر آنے والی چوٹ خاصی گہری اور خطرناک تھی۔

میں وقفے وقفے سے اُٹھنے کی کوششیں کرنے لگا۔ کوئی نصف گھنٹے کی اِس تکلیف دہ کسرت کے بعد پیروں کے بل بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ سر کا درد بھی کچھ کم ہو کر قابلِ برداشت ہوگیا تھا۔

کھلے دروازے میں سے دکھائی دینے والے صحن کے حصے میں کوئی شخص اب تک آتا جاتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ کسی مشین کے چلنے کی مخصوص اور مسلسل آواز کے علاوہ کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے مکان میں میرے سوا کوئی ذی نفس موجود نہ ہو۔ پیروں کے بل بیٹھنے میں کامیابی کے بعد میں نے گھٹنے کچے فرش پر ٹکائے اور پیچھے کی طرف جھک کر بندھے ہوئے ہاتھوں کو پیروں میں بندھی ہوئی رسی کی گانٹھ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ جونہی میری انگلیوں نے گانٹھ کو محسوس کیا، میری جان میں جان آئی۔ میں نے رسی کو ٹٹول ٹٹول کر گانٹھ کی نوعیت کو سمجھا اور کھولنے پر تمام قوت صرف کر دی۔ عمر بھر کی کاشتکارانہ ریاضت کام آئی اور میں تھوڑی دیر میں ہی اپنے پیروں کو آزاد کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

پھر میں نے پیروں کو جھٹک کر رسی کے الجھاووں سے نجات حاصل کی اور کھڑا ہوگیا۔ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے ایک قدم بڑھایا مگر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ خود کو سنبھال کر آہستگی سے چند قدم چلا۔ تیورا کر گرنے لگا تھا مگر دیوار سے کندھا ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ مجھے اس تکلیف دہ کیفیت سے نکلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ کتنا؟ یہ اندازہ مجھے نہیں تھا۔

پیاس کا جانکاہ احساس ہوا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ ناگاہ نظر داہنے کندھے پر پڑی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میرا کندھا، بازو اور قمیص کا اگلا حصہ خون سے رنگا ہوا تھا۔ خون کافی مقدار میں بہا تھا جو زیادہ وقت گزرنے پر جم کر سیاہی مائل ہوگیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا وگرنہ کنپٹی پر اس شدت سے لگنے والی چوٹ کے نتیجے میں انسان کا زندہ رہنا محال ہوتا ہے۔ زور آور کے ساتھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کی ساخت اُس کے غیر معمولی وزنی ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ اس نے مجھے گن کا دستہ مارتے ہوئے شاید اپنی تمام تر توانائی صرف کر دی تھی۔

چند قدموں کی محتاط مسافت نے ہی مجھے نڈھال کر دیا اور میں دیوار کی جڑ میں بیٹھ کر بُری طرح ہانپنے لگا۔ سانسیں معتدل ہوئیں تو میں پھر اُٹھ کر چند قدم چلا اور تھک کر بیٹھ گیا۔ باری باری دونوں ہاتھوں کو رسی سے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی۔ پھر چلنے کی کوشش کی۔ میں نے یہ عمل نہ جانے کتنی مرتبہ کیا۔ جسم سے کافی مقدار میں خون بہہ گیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق میں کم و بیش چوبیس گھنٹے بے ہوش رہا تھا جس کی وجہ سے جسم پر نقاہت طاری تھی۔ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا ورنہ میں اس حالت میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

جب میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلنے کے قابل ہو گیا، تب میں نے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ صحن خالی تھا۔ حویلی کا چوبی دروازہ بند تھا مگر غیر مقفل تھا اور اندر والی چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔ یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ باہر سے بند تھا یا کھلا۔

میں نے ایک قدم باہر رکھا اور طائرانہ جائزہ لیا۔ اس حالت میں صحن عبور کر کے حویلی کے دروازے تک جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ کمرے میں موجود شخص کی نظروں میں آ کر میں کسی وقت پکڑا جا سکتا تھا۔ بعید نہ تھا کہ دیکھتے ہی گولی مار دی جاتی۔ مجھے جسم پر طاری غیر معمولی نقاہت نے خبردار کر دیا تھا کہ میں ایسی حالت میں زور آوریا صفی سے دو بدو لڑائی میں غلبہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنی تھی۔

میرے بائیں ہاتھ پر چھ سات فٹ اونچی پختہ چار دیواری تھی۔ میں اگر اس دیوار کو پھاند کر باہر نکلتا تو کمرے میں موجود لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ دیوار پر چڑھنا اور دوسری طرف کودنا میرے لئے مسئلہ نہیں تھا مگر بدقسمتی یہ تھی کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی مدد کے بغیر دیوار پر چڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔

یک لخت ایک خیال سوجھا۔ جلدی سے کمرے میں آیا اور دیوار میں بنی ہوئی کنکریٹ کی الماری کے ایک تیز دھار کونے پر کلائیوں میں بندھی ہوئی رسیوں کو رگڑنے لگا۔ میں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ رگڑ کا یہ عمل ایک رسی کے ایک ہی مقام پر کیا جائے۔ سوتی رسی جلد گھس جاتی ہے۔ میری کوشش بار آور ثابت ہوئی اور سفید رنگ کی سوتی رسی ایک جگہ سے گھس کر ٹوٹ گئی۔ چند جھٹکوں کے بعد میرا ایک ہاتھ آزاد ہو گیا۔ دوسرا ہاتھ چھڑانے میں محض چند سیکنڈ لگے۔ کمرے کی سرسری تلاشی لی۔ مجھے نہ تو اپنے جوتے ملے اور نہ ہی موبائل فون۔

میں نے دونوں بانہیں پھیلائیں، ہاتھوں کو جھٹک کر دورانِ خون بحال کیا اور بغیر کوئی وقت

ضائع کیے دروازے سے نکل کر دبے پاؤں چلتا ہوا حویلی کی چار دیواری تک پہنچ گیا۔ سر میں بدستور درد ہو رہا تھا اور مسلسل باور کرا رہا تھا کہ میں نارمل نہیں ہوں۔ کسی بھی وقت گر سکتا ہوں۔ یہ میری قوتِ ارادی کا امتحان تھا اور زندگی کی خواہش قوتِ ارادی کے حلق میں طاقت بخش سیرپ ٹپکا رہی تھی۔

زور آور مجھے بے ہوشی کی حالت میں باندھ کر کچھ زیادہ ہی لاپروا ہو گیا تھا اس لیے اُس نے نہ تو کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا تھا اور نہ کسی کو مجھ پر پہرے دار مقرر کیا تھا۔ اس کی حماقت اور بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے مجھے فرار کی راہ مہیا کر دی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ دیوار کی منڈیر پر ٹکائے۔ ایسے ہی وقت میں سر میں تیز دھماکہ ہوا۔ یوں لگا جیسے میرا سر شیشے کا بنا ہو اور ٹھوکر سے پھٹ گیا ہو..... میں نے منڈیر چھوڑ دی اور سر تھام لیا۔ دائیں کان کے انچ بھر اوپر پٹی بندھی ہوئی تھی اور پٹی کے نیچے بڑا سا اُبھار محسوس ہو رہا تھا۔ شاید میرے خون کا تیز بہاؤ دیکھ کر زور آور اور صفی کو مجھ پر ترس آ گیا تھا یا وہ مجھے مارنا نہیں چاہتے تھے، اِس لئے انہوں نے بے ڈھنگے سے انداز میں پٹی کر دی تھی۔ یہی بہت تھا۔

چند لمحوں بعد میرے اوسان بحال ہو گئے تو میں نے جبڑے بھینچ کر منڈیر تھام لی۔ غیر معمولی نقاہت کی وجہ سے مجھے دیوار پر چڑھنے کے لیے اپنی باقی تمام تر توانائی بروئے کار لانا پڑی تھی۔ اس جدوجہد میں میری سانس پھول گئی تھی۔ اگر میں زخمی نہ ہوتا تو لمحہ بھر میں ایسی دیوار پر چڑھ سکتا تھا کیونکہ یہ میرا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

دیوار پر کتے کی طرح ہاتھوں پیروں کے بل بیٹھ کر میں نے دونوں اطراف کا جائزہ لیا۔ تین چار سو گز کے فاصلے پر اینٹوں کے بھٹے پر مزدور کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ دور سڑک پر اِکا دُکا گاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں مگر فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بہت چھوٹی چھوٹی نظر آتی تھیں۔ جس راستے سے مجھے یہاں لایا گیا تھا، وہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کہیں پر ہی زور آور سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ مجھے بھٹے کی طرف سے سڑک پر پہنچنا تھا۔ میری دانست میں یہ راستہ نسبتاً محفوظ اور مختصر تھا۔ میں نے خود کو سنبھال کر نا ہموار زمین پر چھلانگ لگا دی۔ جونہی میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے، یوں محسوس ہوا جیسے میرے سر پر بم پھٹ گیا ہو۔ درد کی کٹیلی لہر نے آنِ واحد میں میرا ذہن ماؤف کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنا سر تھامنے کی کوشش کی مگر میرے بازوؤں کی سکت جواب دے گئی اور میں تیزی سے نیم ڈھلوانی جگہ پر لڑھکتا گیا۔

ایک چھوٹے سے گڑھے میں جا گرا۔ کوئی پانچ منٹوں تک میں خالی الذہنی کی کیفیت میں چاروں شانے چت پڑا رہا۔

اس مایوس کن کیفیت میں کافی دیر گزر گئی۔ سر درد میں کمی ہوئی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارد گرد دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ میری خوش بختی عروج پر تھی ورنہ عمومی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ اغوا کرنے والے ایسی لاپروائی کا مظاہرہ نہیں کرتے جس طرح کی احمقانہ لاپروائی کا مظاہرہ زور آور اور صفی نے کیا تھا۔ اس کی کار کی ڈگی کا کچھ حصہ بڑے دروازے کے پَرے دیوار سے جھانکتا ہوا نظر آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مکان کے اندر موجود تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں ڈرائیور شہر میں یا کہیں اور جگہ پر چھوڑ کر واپس چلا آیا ہو۔

میں شکار پر نکلنے والی بلی کی طرح آہٹ پیدا کئے بغیر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا مکان کے پچھواڑے کی طرف آیا۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی اینٹوں کے لیے بنائے گئے بڑے چھوٹے گڑھوں کے بیچ بھٹے تک جاتی ہوئی دکھائی دی۔ میں اس پر چل پڑا۔ ہر قدم پر سر میں دھمک پڑتی تھی اس لیے میری رفتار خاصی سست تھی۔ تقریباً سو فٹ دور جا کر میں نے مڑ کر مکان کی طرف دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ یعنی کسی کو بھی میرے نکل بھاگنے کا علم نہیں ہوا تھا۔

جوں جوں میں اس مکان سے دور ہوتا جا رہا تھا، میرے سر کا درد کم ہوتا جا رہا تھا۔ شدید سردی میں زمین پر گزاری گئی رات نے میرے جسم کو اکڑا کر رکھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دھوپ میں چلنے سے دورانِ خون بہتر ہو رہا تھا اور بدن کی ٹکور ہو رہی تھی۔ بھٹے کے برابر میں پہنچ کر میں بائیں ہاتھ مڑ گیا کیونکہ بھٹے کے قریب ایک قدرے بلند جگہ پر کئی تھپیرے اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھے۔ میرا حلیہ ایسا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی مشکوک ہو جاتے اور شور مچا دیتے۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ مجھے پکڑ کر بھٹہ کی انتظامیہ کے پاس لے جاتے جو مجھے پولیس کی تحویل میں دے آتی۔ میں ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا، اِس لئے میں نے ایک لمبا چکر کاٹا اور ڈیڑھ دو سو فٹ لمبے اور پانچ فٹ کے لگ بھگ گہرے گڑھے میں سے گزر کر سڑک کی طرف بڑھا۔ بھٹوں کی وجہ سے چہار سُو سطحِ زمین میں چھ سات فٹ تک کی ناہمواری موجود تھی۔ کوئی خطہ چار فٹ گہرا تھا، کوئی چھ فٹ تو کوئی دو تین فٹ بلند..... پندرہ منٹ بعد میں رابطہ سڑک پر پہنچ گیا۔ اب مجھے کسی سے شہر کے لیے لفٹ لینا تھی۔ یہ گر مشکل نہیں تو آسان کام

بھی نہیں تھا۔ لوگ تو بے ضرر دکھائی دینے والے اجنبیوں کو لفٹ دینے سے ڈرتے ہیں جبکہ میں اجنبی ہونے کے ساتھ ساتھ شدید زخمی بھی تھا۔

میں نے یکے بعد دیگرے شہر کی مخالف سمت میں جانے والے دو موٹر سائیکل سواروں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ارادہ تھا کہ انہیں شہر جانے والی سڑک پر پہنچانے کی درخواست کروں گا۔ وہ آہستہ ہوئے، قریب پہنچ کر مجھے دیکھا اور پھر ریس گھما کر آگے نکل گئے۔

شہر کی طرف جانے والے ایک اونٹ ریڑھے والے نے دور سے پوچھا، ''خیر تاں ہے جوان..... کیوں رَت نال رنگیا کھڑا ہیں؟''

(خیریت تو ہے جوان! کیوں خون سے رنگے کھڑے ہو؟)

میں نے سرائیکی میں اُسے بتایا کہ مجھے اینٹوں پر گرنے سے سر میں سخت چوٹ آ گئی ہے اور شہر کے ہسپتال جانا چاہتا ہوں مگر کوئی سواری نہیں مل رہی۔

اسی اثناء میں اس نے میرے سامنے ریڑھا روک دیا۔ پھر ہمدردی سے بولا، ''آ بیہہ تھی سوہنا..... شہر آلی سڑک تائیں میڈے کٹھے جل پیا، اُتھوں لاری تے بیہہ وَنجیں۔''

(سوہنا! آ کر بیٹھ جاؤ۔ شہر والی سڑک تک میرے ساتھ چلو؛ وہاں سے بس میں سوار ہو جانا۔)

اس نے چار ٹائروں والے ریڑھے پر کچی اینٹیں لاد رکھی تھیں جنہیں کسی بھٹے پر اتارنے جا رہا تھا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر ریڑھے پر سوار کرایا اور اپنے ساتھ اینٹوں پر بٹھا لیا۔ وہ پیدائشی مزدور تھا اور محض چالیس کی عمر میں پہنچ کر بوڑھا ہو گیا تھا۔ مزدوروں کی زندگیاں جلد تھک کر اپنی چادر جھریوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔

اس نے مجھ سے چوٹ آنے کا ماجرا دریافت کیا تو میں نے ایک من گھڑت کہانی سنا دی جسے سن کر وہ بڑے دکھ سے بولا، ''مزدوری بھی اس دور میں مشکل سے ملتی ہے۔ پسینے کے ساتھ خون بھی بہانا پڑتا ہے۔ مالک کو کام سے غرض ہوتی ہے۔ اسے ذرا ترس نہیں آتا۔ کیا تھا جو تمہیں کار میں بٹھا کر شہر لے جاتا اور پٹی کروا دیتا۔ سچا سائیں بھی ایسے بے رحم لوگوں کی جھولیاں بھرتا رہتا ہے۔''

میری کہانی نے اُس کا کوئی زخم کرید کر ننگا کر دیا تھا۔ وہ تأسف بھرے لہجے میں بول رہا تھا، ''میں صبح سے شام تک اینٹیں ڈھوتا ہوں تب کہیں جا کر دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی ہے۔ پر

اللہ کا شکر ہے۔ وہ کھانے کو دے رہا ہے۔ یہی بڑی بات ہے۔ پتہ نہیں ہماری اتنی نیکیاں بھی ہیں یا نہیں۔''

میں بولنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کا خلوص اور ہمدردرویہ مجھے جواب دینے پر مجبور کر دیتا تھا اور 'ہاں'، 'ہوں' میں جواب دیتا رہا۔ بھٹوں کے بیچ والی کچی سڑک کو دیکھ کر مجھے زور آور یاد آ گیا جو مجھے باندھ کر، میری طویل بے ہوشی سے مطمئن ہو کر شہر چلا گیا تھا۔ دل کو دھڑکا سا لگا کہ اس سے راستے میں کہیں مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔

اگر میرے فرار کے وقت وہ مکان کے اندر تھا تو اسے کسی نہ کسی وقت میرے تعاقب میں نکلنا تھا۔ یہ طے تھا کہ جونہی اُسے میرے فرار کا علم ہوگا، وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح میرے پیچھے بھاگے گا اور نظر آنے پر مجھے دبوچ لے گا۔ میں اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے بھاگ نکلنے پر وہ بُری طرح مشتعل ہو چکا ہوگا اور مجھ پر بدترین تشدد کرے گا۔

زمین زیادہ ٹھنڈی نہیں تھی مگر میرے ننگے پیروں کو یخ بستہ محسوس ہو رہی تھی۔ محسوس ہوا کہ میرا جسم بخار پکڑ چکا تھا۔ پیاس اور بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی مگر میں اِس وقت سوائے انتظار کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ زور آور نے میرا موبائل فون چھین لیا تھا ورنہ میں میر و شاہ یا پیاجی کو فون کر کے بلوا سکتا تھا۔

بطور احتیاط میں اینٹوں پر اس انداز میں لیٹ گیا کہ کراسنگ کرنے والی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہ میں نہ آ سکوں۔ لیٹنے کی وجہ سے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد ریڑھے بان نے کہا، ''اتر جاؤ جوان! شہر والی سڑک آ گئی ہے۔ جا کر اس طرف کھڑے ہو جاؤ۔ لاری یا ویگن آئے تو اس پر چڑھ جانا۔''

ساتھ ہی اُس نے ریڑھا روک کر مجھے کمال محبت سے سہارا دے کر نیچے اُتارا اور اونٹ کو ہانک کر بلند آواز میں بولا، ''اللہ دی امان ہووی سوہنا! غریب داوَس اِیہو جتنا ہا.....''

(غریب کی استطاعت یہی تھی۔)

میں سڑک عبور کر کے دوسرے کنارے پر آن کھڑا ہوا۔ گزشتہ دن زور آور نے یہیں سے ٹرن لیا تھا۔ خیال آیا کہ مجھے وہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ زور آور یا اس کا کوئی ساتھی کسی بھی وقت یہاں سے گزرتا تو میں نظروں میں آ سکتا تھا۔ احتیاط کے پیشِ نظر میں سڑک سے کوئی پانچ سات قدم دور ایستادہ ایک غیر معمولی لپیٹ والے پرانے کیکر کے تنے کے عقب میں چھپ کر

بیٹھ گیا۔ وہاں سے مجھے شہر کی مخالف سمت سے آنے والی ٹریفک دکھائی دیتی تھی مگر شہر سے آنے والا شخص مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں اس وقت دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ زور آور کے آنے اور مجھے دیکھ کر رُکنے سے پہلے ہی کوئی بس آ جائے جس میں بیٹھ کر میں شہر سدھار جاؤں۔ ہر انسان اپنے تحفظ اور فائدے کی دعا مانگتا ہے۔ کبھی دعا قبولیت کی سند حاصل کر لیتی ہے اور کبھی عرش سے ناکام لوٹ آتی ہے۔ دینے والا قدرت کے ساتھ ساتھ حکمت رکھتا ہے۔ جانتا ہے کہ کس کو کیا دینا ہے اور کیا نہیں دینا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میری دعا کے قبول نہ ہونے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی مگر میں نہیں جانتا تھا۔ تب میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اندھیرا چھا گیا جب ڈارک بلو کلر کی کار مکان کی طرف سے آئی، ٹرن لے کر شہر کی طرف جاتے جاتے رُک گئی اور اس میں سے زور آور نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میری جانب بڑھتا چلا آیا۔ میری ساری خوش گمانی مٹی کا ڈھیر ثابت ہوئی تھی اور اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ اسی ٹریک سوٹ میں ملبوس تھا جو اُس نے کل پہن رکھا تھا۔

اسے دیکھ کر میں بے اختیار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دہشت زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی تھا کہ اُس نے مجھے کیسے دیکھ لیا تھا؟

اگر اس کے ہاتھ میں وہ منحوس گن نہ بھی ہوتی، جو صفی نے میری کنپٹی پر ماری تھی، میں تب بھی بھاگنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا اس لئے کیکر کے تنے کے ساتھ چمٹ کر کھڑا رہا۔ وہ بے خوفی سے میرے بالکل قریب آ گیا اور خلاف توقع مسکرا کر بولا، ''شکر ہوا کہ تم مجھے اُس خلا میں سے نظر آ گئے ورنہ مجھے تمہاری تلاش میں سارا شہر کنگھالنا پڑتا۔'' اس نے سڑک کی جانب ایک ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مکان کی طرف سے آنے والی سڑک اور بڑی سڑک کے کنارے اُگی ہوئی بے ترتیب جھاڑیوں میں قدرتی طور پر ایک خلا بنا ہوا تھا جس کے سبب لنک روڈ پر آنے والے شخص کی نگاہ چند ثانیے کو کیکر کے تنے پر پڑتی تھی۔ اس نے مجھے وہیں سے دیکھ لیا تھا۔

وہ بولا، ''چلو شاباش! میری کار کی طرف..... میں تمہاری جدائی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا پیارے.....''

میں نے مدھم آواز میں کہا، ''زور آور! تمہاری مجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جاؤ! مجھے چھوڑ

دو۔ میرا شہر میں پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

اس نے مخصوص انداز میں دانت بجائے اور زہریلے لہجے میں کہا، ''دشمنی نہیں ہے..... ہیں؟ پھر یہ مارا ماری کیوں ہو رہی ہے؟'' اس نے گن کی نال کا رُخ میرے سینے کی طرف کیا اور اچانک دانت پیس کر درشت لہجے میں کہا، ''کتے کے بچے! اگر تم میرے ساتھ نہیں چلتے تو پھر اُوپر جاؤ..... جنت میں یا جہنم میں.....''

میں نے زِچ ہو کر کہا، ''آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے گن کی لاک پن ہٹائی اور غرایا، ''چل رہے ہو یا.....؟''

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور ناچار چل پڑا۔ وہ گھوم کر میرے عقب میں آیا اور میری کمر سے گن کی نال ٹکا کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چکنی مٹی میں دھنسی ہوئی ایک اینٹ کی نکلی ہوئی نوکیلی نکڑ سے زور آور کو ٹھوکر لگی۔ وہ 'اوہ' کی آواز نکال کر بُری طرح لڑکھڑایا۔ مجھے اس کے گرنے کا فوراً اندازہ ہو گیا تھا اس لئے جھٹ سے پلٹ پڑا۔ دیکھا کہ وہ ہاتھوں کے بل زمین سے اُٹھ رہا تھا۔ میرے لئے مزاحمت کا سنہرا موقع یہی تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر پوری قوت سے اُس کے منہ پر لات دے ماری۔ میرے برہنہ پاؤں کا بالائی حصہ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ فٹ بھر اونچا اُچھلا اور پہلو کے بل ڈھلوان پر گرا اور لڑھک گیا۔ چوٹ تو مجھے بھی آئی تھی اور یوں لگا تھا جیسے پورے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی ہو مگر قابلِ برداشت تھی۔ میں نے سرعت سے اُٹھنے کی کوشش میں مگن زور آور پر چھلانگ لگا دی۔ میرے دونوں گھٹنے اُس کی کمر پر لگے۔ وہ کراہ کر پیٹ کے بل دوبارہ زمین پر گر گیا۔ کیکر کے کانٹوں کی ایک سوکھی شاخ زمین پر پڑی تھی جس کے نوکیلے کانٹے اُس کے پیٹ اور چھاتی میں چبھ گئے۔ وہ دھاڑا اور پہلو کے بل کروٹ لے کر اپنی گن سنبھالنے لگا۔

وہ میرا نشانہ لینا چاہتا تھا مگر مجھ پر دیوانگی طاری تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے دونوں ٹانگیں ہوا میں بلند کیں اور اُس کی ٹانگوں کے بیچ دونوں ایڑیاں دے ماریں۔ وہ بلبلا کر اُٹھ بیٹھا اور کراہنے لگا۔ میں نے اس کی لمحاتی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گن پر ہاتھ ڈال دیا۔

مجھے کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے صفی کی طرف سے بھی خطرہ لاحق تھا جو اَبھی تک میدان میں نہیں اُترا تھا مگر وہ کسی بھی وقت میرے عقب میں آ کر مجھے بے بس کر سکتا تھا۔

زور آور نے جھٹکا دے کر گن چھڑانا چاہی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کا

مکا اُس کی چھاتی پر مارا اور عین اُسی لمحے گن کو جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا۔ وہ غافل نہیں تھا اس لئے گن اُس کی گرفت سے نہ نکل پائی۔ میں نے جھنجھلا کر اُس پر دیوانہ وار چڑھائی کرتے ہوئے مکوں سے اندھا دھند یلغار کر دی۔ قریب تھا کہ میں اُس سے گن چھیننے میں کامیاب ہو جاتا مگر اُس کا ہوا میں لہراتا ہوا ہاتھ اچانک میری کنپٹی کے عین زخم پر آن لگا۔ یہ میری بدقسمتی تھی وگرنہ میں اسے مدافعانہ رویہ اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جونہی اُس کا ہاتھ میرے زخم پر پڑا، درد کی کٹیلی لہر میرے رگ و پے میں پھیل گئی۔ لمحہ بھر میں میرا وجود بے جان ہو گیا اور میں کولھوں کے بل زمین پر گر گیا۔

زورآور کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی گن پر میری گرفت ختم ہو گئی اور میں بُری طرح تڑپنے لگا۔ زورآور کو سنبھلنے کیلئے یہ مہلت کافی تھی۔ اس نے میری رانوں اور پسلیوں میں گن کے بٹ کی کئی ٹھوکریں ماریں جن کی تکلیف سر کے زخم کی دکھن میں دَب کر رہ گئی۔ اشتعال کم ہوا تو اُس نے کپڑے جھاڑے اور مجھے گریبان سے پکڑ کر گاڑی کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ میں بلند آواز میں کراہ رہا تھا اور اُس سے اپنا گریبان چھڑانے کی بے جان کوشش کر رہا تھا۔

میری بدقسمتی تھی کہ اس دوران وہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوا تھا۔ یہ میری خام خیالی تھی کہ ادھر آن نکلنے والا میری مدد کرے گا وگرنہ لوگ پرائے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑاتے بلکہ آنکھیں پھیر کر بھاگ جاتے ہیں۔

زورآور مجھے گھسیٹتا ہوا سڑک تک لایا۔ اس دوران کار ریورس ہو کر موڑ کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ جونہی عقبی دروازہ کھول کر زورآور نے مجھے گاڑی میں ٹھونسا، صفی استہزائیہ قہقہہ اُچھال کر بولا، ''بڑے ڈھیٹ انسان ہو۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ دس پندرہ دنوں تک حرکت کے قابل نہیں رہو گے مگر تم نے مکان سے بھاگ کر کمال کر دکھایا ہے۔ چلوں زورآور؟''

''چلو ڈیئر! دیر ہو رہی ہے۔'' زورآور نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

میری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے دائرے بن رہے تھے اور سمٹ کر نقطے کی شکل اختیار کر کے غائب ہو رہے تھے۔ درد کم ہو گیا تو پسلیاں دکھنے لگیں۔ میں نے دانت بھینچ لئے۔ گاڑی چل پڑی۔ میں نے زورآور کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر لاپروا دکھائی دے رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ میری طرف سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں تھا۔ اس کی گن کی نال کا رُخ میری جانب تھا اور اس کی انگلی ٹرائیگر پر دباؤ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر محنت کے بعد بھی اس کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دکھ ہوا کہ میری دوسری محنت بھی اکارت چلی گئی تھی۔ تبھی سیٹ پر سر ٹکایا اور آنکھیں موند لیں۔ مجھ پر یک لخت نقاہت اور مایوسی نے شدید حملہ کیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں میرے فرار کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور میں سنی ان سنی کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے موبائل فون کا بزر بجا۔ صفی نے ہاتھ بڑھا کر سیٹ اُٹھایا، کال ریسیو کی اور بولا، ''ہاں استاد! بتایا تو تھا کہ کام ہو گیا ہے۔ پھر کیوں فکر مند ہو؟''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا، ''یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ آج آؤ، کل یا ہفتہ بعد..... اگر تم چاہو تو ابھی شہر سے نکل پڑو۔ مال تیار ہے۔ تمہیں یہاں رُکنا نہیں پڑے گا۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا پھر فون بند کر دیا گیا۔ صفی نے منہ بنا کر فون سیٹ ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔

زور آور نے پوچھا، ''استاد کا فون تھا؟''

''ہاں! اسی کی زبان کھجلا رہی ہے۔ خود تو آج تک کچھ کر نہیں پایا، مجھے سمجھا رہا تھا کہ یہ بڑا خطرناک شخص ہے..... ہاہ! وہ نہیں جانتا کہ جسے خطرناک شخص قرار دے رہا ہے وہ اس وقت زور آور کے قدموں میں بدنسل کتے کی طرح دُم دبائے بیٹھا ہے۔''

زور آور نے تضحیک آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا، ''شاید تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے۔ موبی کے قاتل کے بارے میں..... ہیں؟ سنو! تمہارے پاس ایٹم بم بنانے کا نسخہ نہیں ہے جس کی مجھے ضرورت ہو۔''

میں نے تعجب سے پوچھا، ''تو پھر مجھے اغوا کیوں کیا ہے تم نے؟''

وہ زہر خند انداز میں مسکرایا اور بولا، ''شہریار! مجھے علم نہیں تھا کہ تم اتنے قیمتی شخص ہو۔ تمہارا ایک چاہنے والا بڑا بے تاب ہو رہا ہے تمہیں دیکھنے اور اپنا مہمان بنانے کے لیے۔ اس کا زور نہیں چلا تو اُس نے تمہیں مجھ سے خرید لیا۔ جانتے ہو کتنے میں؟''

مجھے ذہنی جھٹکا سا لگا۔ حیرت سے دریافت کیا، ''کتنے میں؟''

''دس پیٹیوں میں..... میرا مطلب ہے کہ پورے دس لاکھ میں سودا ہوا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، ''دس پیٹیاں اِدھر، تم اُدھر..... کہو! کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے۔''

''کون ہے وہ؟ میرا مطلب ہے میرا سودا کرنے والا کون ہے؟''

وہ بولا، ''جلد پتہ چل جائے گا۔''

وہ فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور میری استعجاب انگیز صورت سے حظ کشید کر رہا تھا۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا، ''زورآور! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے اب میرے الفاظ کی تائید کر دی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کون مجھے اتنی بڑی رقم کے عوض مجھے حاصل کرنا چاہتا ہے مگر یہ واضح ہے کہ وہ میرا بہی خواہ نہیں ہے۔ میرا دوست نہیں ہے۔ وہ میرا دشمن ہے اور اچھا سلوک نہیں کرنا چاہتا۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، دیکھا جائے گا مگر تم کان کھول کر سن لو۔ تم نے اپنے لئے بہت بڑی مصیبت خرید لی ہے۔ میں کون ہوں، میرے پیچھے کون لوگ ہیں، یہ تمہیں بخوبی علم ہے۔''

اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولا، ''ارے واہ بھئی واہ! زورآور کو دھمکی دیتے ہو، اسے، جسے دیکھ کر ہوا اپنا رُخ بدل لیتی ہے۔ میری خواہش ہوگی کہ تم ایک مرتبہ پھر میرے سامنے آؤ اور میں تمہاری سپاری پکڑوں..... رہی بات میرو شاہ کی، تو تم بھی کان کھول کر سن لو۔ اس حرام زادی شکیلہ کی وجہ سے میں اُسے رعایت دیتا آیا ہوں۔ وہ مجھے..... ہائے..... بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک دن میری بانہوں میں جھولے گی، اِسی امید پر اس کتے کے پلے پر ہاتھ نہیں ڈالتا ورنہ وہ کیا اور اُس کی اوقات کیا.....''

میں نے اُسے تاؤ دلایا، ''اگر یہی بات ہے تو پھر مجھے میرا یا اپنا موبائل فون دو، میں اُسے کال کرتا ہوں اور تمہارے بارے میں بتاتا ہوں۔''

وہ بہت مکار ذہن کا مالک تھا۔ دانتوں کو مخصوص انداز میں بجانے کے بعد گویا ہوا، ''تمہاری خواہش ضرور پوری کروں گا مگر وقت آنے پر..... ابھی نہیں۔''

کار نے اینٹوں کے بھٹوں کے درمیانی راستے پر ٹرن لیا۔ مجھے قسمت وہاں لے کر جا رہی تھی جہاں سے میں اپنی قوتِ ارادی کے بل پر نکل آیا تھا۔ زورآور کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور لاپروائی کے سبب مجھے نکلنے کا موقع ملا تھا۔ وہ دوبارہ مجھے موقع دینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُسے سمجھانے اور دھمکانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی آنکھوں پر دس لاکھ روپے کی پٹی بندھی تھی۔

دُھول اُڑاتے راستے پر کار ہچکولے لے رہی تھی اور میں اُس تاجر دشمن کے بارے میں

سوچ رہا تھا جس نے زور آور کو میرے اغوا کے لئے دس لاکھ روپے کی خطیر رقم دی تھی۔ ظاہر تھا کہ میاں دلبر حسین اور اس کے غنڈے رنگو قصائی کے علاوہ کون ہو سکتا تھا؟ میری وجہ سے انہیں نہ صرف دو کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ انہیں اپنے تین قیمتی بندوں اور نئی سرف پک اَپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ جو شخص اپنی جنسی تسکین کی خاطر کروڑوں روپے لٹا سکتا تھا وہ اپنی اَنا کی تسکین پر دس لاکھ خرچ کرتے ہوئے کیوں تذبذب کا شکار ہوگا۔

کار دھول سے اَٹے ہوئے مکان کے چوبی دروازے پر رُک گئی۔ زور آور نے مجھے کار سے اُترنے کا اشارہ کیا اور گن پوائنٹ پر رکھ کر مکان کے اندر لے آیا۔ صحن میں کھڑا ہو کر زور سے چلایا، ''دو چارپائیاں نکال دو؛ ادھر صحن میں۔''

جس کمرے میں سے مشین کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، اس سے ایک پینتیس چالیس سالہ شخص برآمد ہوا۔ اس کا لباس نہ صرف میلا تھا بلکہ مختلف رنگوں سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص حلیے سے پرنٹنگ مشین پر کام کرنے والا کاریگر لگتا تھا۔ اس نے نسبتاً چھوٹے کمرے سے باری باری دو چارپائیاں نکالیں، دیوار کے قریب متوازی بچھائیں اور زور آور سے مؤدبانہ انداز میں مزید کسی خدمت کا حکم چاہا۔

زور آور میری طرف اشارہ کر کے بولا، ''اسے پانی پلاؤ۔''

وہ نلکے سے میرے لئے سلور کے ایک رنگ زدہ گلاس میں پانی بھر لایا۔ مجھے زور کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں نے گلاس لبوں سے لگایا اور چاہا کہ ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتار دوں مگر خشک حلق نے مزاحمت کر دی۔ زبردست اُچھو لگ گیا۔ کھانسی کا دورہ سا پڑا۔ کھانستے ہوئے سر میں شدید اور نہایت تکلیف دہ ٹیسیں اُٹھیں۔ گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پانی زمین پر بہہ گیا۔

زور آور بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا، نفرت آمیز لہجے میں بولا، ''سکون سے نہیں پی سکتے تھے کیا؟ اوئے جاؤ! ایک گلاس اور بھر لاؤ اِس جانور کے لیے۔''

وہ پھر گلاس بھر لایا۔ میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرے۔ معدے میں عجیب سی اینٹھن ہوئی۔ غیر معمولی طویل دورانیہ بھوک اور پیاس کے عالم میں گزرا تھا جس کی وجہ سے شاید جسم کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔

زور آور طنزیہ مسکراہٹ اُچھال کر بولا، ''تمہاری شکل بتاتی ہے کہ تم خاصی تکلیف میں ہو۔''

میں نے اُسے دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میرے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر پڑی ہوئی دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایسے میں صفی اُس کے پیچھے سکیورٹی گارڈ کی طرح چوکس کھڑا تھا۔

''کیا سر کا زخم درد کر رہا ہے؟''

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔

وہ بولا، ''لگتا ہے کہ تمہیں بخار ہو گیا ہے۔ ہیں؟''

''ہاں! ٹمپریچر بھی ہے۔''

اس نے گلاس تھامے کمرے کی طرف جاتے ہوئے شخص کو آواز دی۔ وہ قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہوا تو زورآور نے کہا، ''ہمارے لئے چائے بنالاؤ۔ کیا تمہارے پاس بسکٹ ہیں؟''

وہ بولا، ''بسکٹ تو نہیں ہیں البتہ ہم نے ناشتہ کے لیے پاپے رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں تو وہ لے آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، لے آؤ۔ کوئی گولی شولی بھی لیتے آنا، درد بخار کی۔''

وہ چلا گیا تو زورآور نے کہا، ''اگر چاہو تو چارپائی پر لیٹ جاؤ۔''

اس کی آواز سے طنز کے ساتھ ساتھ ترحم کا موہوم سا جذبہ بھی جھانک رہا تھا۔ میں نے اُس کی پیشکش سے فائدہ نہیں اُٹھایا اور بیزاری سے آنکھیں موند لیں۔

وہ اور صفی آپس میں محوِ گفتگو ہو گئے۔ مشین مین چائے تیار کر لایا۔ اس نے دیہاتی طرز کا پیالہ اور چند 'پاپے' میرے پہلو میں چارپائی کے بان پر رکھ دیے۔ دوسرے چکر میں پانی اور پیراسیٹامول کی گولیاں لے آیا۔ میں نے دو گولیاں حلق میں پانی کے ساتھ اُتار لیں۔ میرے جسم کو اس وقت ان کی اشد ضرورت تھی۔ پھر میں نے ایک 'پاپا' اُٹھایا، چائے میں ڈبویا اور پچھلے تجربے کے پیشِ نظر تھوڑا سا منہ میں ڈالا۔ منہ کا ذائقہ عجیب تھا اِس لیے پاپا بھی بدمزہ لگا۔ چائے کا گھونٹ بھرا، وہ بھی بے مزہ لگا۔ میں نے اوپر تلے تین چار پاپے پیٹ میں اُتار لیے اور چائے کا پیالہ خالی کر دیا۔

زورآور بڑے انہماک سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں صفی کے موبائل پر کال آئی۔ اس نے سکرین کو دیکھا، پھر زورآور سے مخاطب ہوا، ''استاد کا فون ہے، کیا کہوں اُسے؟''

زور آور بولا، ''اسے کہہ دو کہ مال تیار ہے۔ کسی بھی وقت آ کر وصول کر لے۔ اُسے سمجھا دو کہ بہتر یہی ہے کہ وہ اَبھی آ جائے تا کہ ہم اَبھی فارغ ہو جائیں۔''

صفی نے کال ریسیو کی۔ کان میں بولنے والے کو سن کر بولا، ''استاد! کام ہو گیا ہے۔ زور آور جس کام کا تہیہ کرتا ہے، اسے مکمل کر کے ہی دم لیتا ہے۔ تم مال لینے کے لیے آ جاؤ۔ اور ہاں! یاد سے باقی کی آدھی رقم بھی ساتھ لے آنا۔ پوری پانچ پیٹی مال.....''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر وہ کھل کر ہنسا اور اوباشانہ انداز میں بولا، ''ایسے طعنے نہ دیا کرو بڑے استاد! ہم سب لوگوں کا دین دھرم پیسہ ہے۔''

ساتھ ہی اُس نے کال منقطع کر دی اور زور آور سے مخاطب ہوا، ''وہ سالا یوں خوش ہو رہا ہے جیسے خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔''

''کب آ رہا ہے؟''

''آدھے گھنٹے میں پہنچنے کا کہہ رہا ہے۔''

زور آور نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا حلیہ پہلے سے تبدیل ہو کر موبی جیسا ہو گیا تھا۔ لمبے سیاہ بال جنہیں گردن کے پیچھے پونی یا کلپ میں باندھ رکھا تھا، لمبی قلمیں اور کلین شیو چہرہ..... کھلی شرٹ سے جھانکتا ہوا کسرتی بدن، گلے میں جھولتا ہوا سنہرا لاکٹ جو سونے کا معلوم ہوتا تھا جبکہ داہنی کلائی میں غیر معمولی موٹائی والا کڑا..... دو تین مرتبہ اُس سے پنجہ آزمائی کر مرحلہ درپیش آیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ نام کا ہی زور آور نہیں تھا بلکہ اس کے فولادی اعصاب میں غضب کا زور چھپا ہوا تھا۔

پیٹ میں کچھ پڑے تو پرماتما کی سوجھتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جسم میں کچھ توانائی آئی تو ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ سر کا درد بدستور بے چین کر رہا تھا۔ میں نے زور آور اور صفی کو باری باری دیکھا۔ دونوں نے مختلف انداز میں مجھے کور کر رکھا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں دونوں کو ایک ہی وقت میں ڈاج دے کر بچ نکلتا۔ زور آور نے شاید میری قلبی کیفیت بھانپ لی تھی، تبھی زہریلی ہنسی ہنسا، ''شہریار! شراب بڑی ظالم چیز ہے۔ تمہاری طرف سے بے فکر ہونے کے بعد ہم نے کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ گہری نیند سو گئے تھے۔ تبھی تمہیں بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ مگر اب ہم جاگ رہے ہیں۔ اگر تم بہادری دکھانے کا ارادہ رکھتے ہوئے تو شوق سے کر گزرو، جو کرنا چاہتے ہو۔ ایسی صورت میں میں تمہیں زندگی کی

ضمانت نہیں دوں گا۔''

میں نے کہا، ''شکریہ! میں اپنے خریدار کو زندہ آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری میڈم کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اختصار سے جواب دیا۔

''کیا تم نے اُس کا گروپ جائن کر لیا ہے؟''

میں نے اُسے سرد نگاہوں سے گھورا، کہا، ''میں اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''ہوں.....'' اس نے ہنکارا بھرا، بولا، ''کسی دن وہ ایسے ہی شکل پر بے بسی سجائے میرے قدموں میں بیٹھی ہوگی، جیسے تم بیٹھے ہو۔ وہ بھی زندگی کی بھیک مانگے گی۔ کیوں صفی؟''

صفی نے جھٹ سے کہا، ''وہ دن زیادہ دور نہیں ہے زورآور!''

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری، ''خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

وہ مسکرایا، ''اگر تم اس وقت تک زندہ رہے تو ضرور دیکھ لو گے کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا اپنا پختہ ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ویسے بھی زورآور کے آگے اُس حرافہ کی.....''

میرا دماغ سلگ اُٹھا۔ میں نے تنبیہی انداز میں انگلی اُٹھائی اور کرخت لہجے میں کہا، ''اس کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی گندی زبان پر نہ لانا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

اس نے ٹھٹک کر مجھے بے یقینی بھری نظروں سے دیکھا پھر بلند قہقہہ لگایا۔ ہنستے ہنستے بولا، ''ابے دیکھ صفی! یہ..... ہاہا..... یہ بھتنی کا، سالا..... یہ مجھے کیا کہہ رہا ہے..... ہاہا..... سنو! میں نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ حرافہ نہیں ہے..... بڑی نیکوکار اور پارسا خاتون ہے۔ فلاحی کام کرتی ہے وہ..... اس جیسے ان گنت یتیموں کو بھی پالتی ہے..... ہاہا!''

میرے تن بدن میں آگ بھڑکی۔ جی چاہا کہ سو دوزیاں کے شمار کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس کی تکہ بوٹی کر دوں۔ بہ دقت خود پر قابو پاتے ہوئے درشت انداز میں کہا، ''دیکھو زورآور! وہ کیا کرتی ہے؟ وہ کیسی ہے؟ یہ فضول باتیں ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ میری باس ہے۔ یہ بھی جان لو کہ میں اس کے خلاف کوئی لفظ سننا گوارا نہیں کرتا۔''

وہ مزہ لے کر بولا، ''صرف باس؟ بھئی وہ تو خوب صورت جوانی دیکھ کر للچانے والی عورت ہے۔ ہوسکتا ہے اُس نے تمہیں بھی ایک آدھ بوسہ دے کر شباب کی لولی پاپ چوسنے پر لگا دیا ہو..... کیوں صفی! ایسا ہی کرتی ہے ناں وہ..... تبھی تو اُس کے کتے اس کے پیروں کو چاٹتے رہتے

ہیں۔ ایک دن موت کا ذائقہ چاٹ کر ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جاتے ہیں مگر اسے چھوڑتے نہیں۔ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا تیس مار خان..... دیکھ لینا..... زور آور جھوٹ نہیں بولتا۔''

میڈم کوئی پارسا عورت نہیں تھی۔ ایک بہت بڑے گینگ کی چیف باس تھی۔ اس کے اشارے پر بیسیوں افراد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آتے تھے۔ اس کی مٹھی میں ان گنت ہوس کے پجاری سرکاری افسر دبے ہوئے تھے جن کی ہوس کے جبڑوں میں وہ مختلف ذائقوں کا جنسی راتب ڈالتی تھی اور ہتھیلی پر سرسوں جما لیتی تھی مگر زور آور کے منہ سے اُس کا یوں تذکرہ میرے تن بدن میں آگ لگا چکا تھا۔

میں نے سر میں مسلسل دھڑکنے والے ہولناک درد کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برقی مستعدی سے زور آور پر چھلانگ لگا دی۔ اُسے میری طرف سے ایسی دلیرانہ حرکت کی توقع نہیں تھی تبھی اس کی گن سے گولی نہیں نکل سکی اور میں اُس پر جا پڑا۔ میرا گھٹنا اُس کی چھاتی پر لگا اور وہ چارپائی میں کمر کے بل گر گیا۔ اس کا سر چارپائی کی بانہہ پر لگا۔ چوٹ خاصی شدید تھی جس کی وجہ سے اُس کے حلق سے کراہ کے ساتھ مغلظات ابل پڑیں۔

میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر مکوں اور گھٹنوں کی مسلسل ضربوں پر رکھ دیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ نہ صرف چت ہو گیا بلکہ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی جسے میں نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی تحویل میں لے لیا۔ صفی مجھ پر بہ آسانی فائر کر سکتا تھا مگر شاید اس نے اس ڈر سے گولی نہیں چلائی تھی کہ زور آور کو نہ لگ جائے۔

زور آور کو بے بس دیکھ کر وہ پسٹل لہراتا ہوا چارپائی کے قریب آیا اور مجھے گالی دے کر غرایا، ''نیچے اُترو ورنہ گولی مار دوں گا۔''

میں اس دوران نہ صرف زور آور کی چھاتی پر بیٹھ چکا تھا بلکہ میں نے عجیب ساخت کی گن کی نال اس کی پیشانی پر عین دونوں آنکھوں کے درمیان رکھ دی تھی۔ میں نے بے حد سرد لہجے میں کہا، ''پسٹل پھینک دو ورنہ.....''

صفی اور زور آور کے چہرے ایک دم متغیر ہو گئے۔ صفی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے پلٹی ہوئی بساط کو دیکھنے لگا۔ میں غرایا، ''میں نے کہا ہے کہ پسٹل پھینک دو ورنہ زور آور کی کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔''

زور آور نے شکست خوردہ انداز میں کہا، ''صفی! اس کی بات مان لو۔''

میری تمام تر توجہ زور آور پر مرکوز تھی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا اور مجھ پر نظریں ثبت کئے بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ مجھے یہ خوش گمانی نہیں تھی کہ وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ وہ موقع کے انتظار میں تھا جبکہ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

جونہی صفی نے پسٹل اپنے پیروں میں زمین پر پھینکا، میں نے کہا، ''دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ ایسے ہی وقت میں مکان کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ یہ سوچ کر کہ میرے خریدار پہنچ آئے ہیں، میرے جبڑے بھنچ گئے۔ میرے پاس وقت کم رہ گیا تھا۔ میں نے زور آور کی چھاتی سے اُترنا چاہا مگر عین اسی وقت صفی اپنے پسٹل کی طرف لپکا اور اس نے بے خوفی سے اُٹھا لیا۔ اس کی یہ احمقانہ حرکت میری سمجھ میں تب آئی، جب میں نے اپنے آپ کو بری طرح پھنسا ہوا پایا۔ میں اگر اس پر فائر کرتا تو زور آور میری گرفت سے نہ صرف نکل جاتا بلکہ گن پر ہاتھ بھی ڈال دیتا۔ اگر اسی پوزیشن میں بیٹھا رہتا تو پھر باہر سے آنے والے میرے سر پر پہنچ جاتے۔

زور آور میری ذہنی کشمکش کو بھانپ کر زہریلے انداز میں مسکرایا، ''اب کیا ہو گا شہریار! تم مجھے گولی مار کر بھی یہاں سے زندہ نہیں نکل سکتے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ گن پھینک دو۔''

مجھے فیصلہ کرنے میں محض ایک لمحہ لگا اور میں نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ کو حرکت دی اور صفی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ساتھ ہی میں بائیں ہاتھ لڑھک گیا۔ بیک وقت دو چیخیں فضا میں بلند ہوئیں اور میں سپرنگ کی طرح اُچھل کر چارپائی سے اتر گیا۔ میری چلائی ہوئی گولی صفی کے پیٹ میں اتر گئی تھی اور وہ پسٹل پھینک کر دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے دوہرا ہو گیا تھا۔ دوسری چیخ زور آور کے حلق سے نکلی تھی۔ صفی کی چلائی ہوئی گولی اُس کی ران میں سوراخ کر گئی تھی اور وہ چارپائی پر گھٹنے سے دو تین انچ اوپر ران کو دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر تڑپ رہا تھا۔

میں نے صفی کے جھکے ہوئے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے منہ سے دردناک کراہ خارج ہوئی اور وہ اوندھے منہ زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے زور آور کی طرف گن کا رُخ کیا۔ وہ اس دوران چارپائی پر میری جانب منہ کر کے دوزانو بیٹھ گیا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا، ''نیچے اُتر آؤ جانِ من! یہ نہ ہو کہ مجھے مجبوراً تمہارے سر میں بھی

سوراخ کرنا پڑے۔''

اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور دانت بھنچے ہوئے تھے۔ وہ درد کی شدت کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آہستہ سے نیچے اُترا۔ کھڑا ہوا پھر بے ساختہ جھک گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ ران پر رکھا ہوا تھا۔

مجھے وقت کے ضیاع کا احساس بے کل کر رہا تھا، تبھی غرا کر کہا، ''یہ ڈرامہ بازی بند کرو زور آور..... سیدھا کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ کھڑا ہوا۔ چند قدم دائیں ہاتھ چلا۔ پھر رُک گیا۔ صفی کو چند لمحوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک پیدا ہوئی۔ وہ مجھے خاطر میں لائے بغیر آنِ واحد میں آخری سانسیں لیتے ہوئے صفی پر جھکتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

مجھے اس کی چالاکی کی تب سمجھ آئی، جب وہ اچانک پلٹا اور مجھ پر پسٹل تان کر بولا، ''بس بابا! ہاتھ سر سے بلند کر لو۔''

میں نے دانت پیس کر ٹرائیگر دبانا چاہا مگر انگلی کی پوری قوت صرف کرنے کے باوجود ٹرائیگر نہ دبا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ زور آور کی طنزیہ آواز میرے کانوں میں پڑی، ''یہ گن صرف دو گولیاں چلاتی ہے جو تم چلا چکے ہو۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل میں اس وقت پانچ گولیاں ہیں جو تمہیں چھلنی کر سکتی ہیں۔ شاباش! ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔''

اس دوران میں نے دو تین مرتبہ ٹرائیگر دبانے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ ایک تو مجھے اِس منحوس گن کے بارے میں معلومات نہیں تھیں کہ اس میں کتنی گولیاں تھیں۔ دوسرا مجھے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ صفی کے ہاتھ میں پسٹل تھا جو میری نادانی کے سبب زور آور کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

مجھ پر ہونے والا مایوسی کا اچانک اور غیر معمولی شدید حملہ بڑا اعصاب شکن تھا۔ میں نے جھنجھلا کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی وزنی گن اُسے کھینچ ماری۔ اس نے میرا وار جھکائی دے کر خطا کیا اور صفی کے آخری جھٹکے لیتے ہوئے وجود کے پاس پہلو کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے ایک لمحے کو بھی مجھ پر سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ اس کے چہرے پر غم، برہمی اور تکلیف کے ملے جلے تاثرات تھے جن کی بدولت اس کی شکل خاصی خوف ناک ہو گئی تھی۔

میں اگر پسٹل کی پروا نہ کرتے ہوئے اُس پر چھلانگ لگا بھی دیتا تو فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ ناچار مجھے اپنے ہاتھ سر سے بلند کرنا پڑے۔

ایسے ہی وقت میں حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی صفی کی جیب میں پڑا ہوا موبائل بجنے لگا۔ زورآور نے چیخ کر کہا، ''دیوار پھاند کر اندر آجاؤ استاد.....''

میں نے بے ساختہ دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر دیوار کی منڈیر پر ایک چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے صحن میں ہونے والے بھیانک ڈرامے کو دیکھا، شاید کوئی نتیجہ اخذ نہ کر پایا اور بولا، ''زورآور! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

زورآور نے بلند آواز میں کہا، ''استاد کو بتاؤ کہ سب ٹھیک ہے۔ کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ اس لونڈے نے خرمستی دکھائی تھی۔ مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ اب یہ ہینڈز اَپ ہے.....فوراً اندر آجاؤ۔''

دیوار پر سے جھانکنے والے نے معاملے کی نوعیت اور سنگینی کو بھانپا اور غائب ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ پھر دیوار پر نظر آیا۔ اس مرتبہ اس نے دیوار پھاندی اور بھاگ کر دروازے کی چٹخنی اُتار دی۔ دروازہ کھلتے ہی تین آدمی اندر گھس آئے۔ تینوں نے ہاتھوں میں شارٹ گنیں تھام رکھی تھیں جن کا رُخ ہماری جانب تھا۔

میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ چٹخنی کھولنے والے سمیت مکان میں آنے والوں کی تعداد چار تھی۔ ان میں سے کوئی بھی میرا واقف نہیں تھا۔ قیمتی سفید سوٹ میں ملبوس لمبا تڑنگا شخص سب سے آگے چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑی میگزین والی رشین ساختہ ایس کے کے گن تھی۔ اس کی رینج کم تھی مگر نہایت خطرناک تھی۔ وہ نپے تُلے قدموں سے چلتا ہوا میرے قریب آن رکا۔ اس کی گن کی نال کا رُخ زمین کی جانب تھا جبکہ اُس کے ساتھیوں نے اپنی گنیں مجھ پر تان رکھی تھیں۔ ایک منحنی وجود کے مالک شخص کے ہاتھ میں گن کے علاوہ سیاہ رنگ کا ہینڈ بیگ لٹک رہا تھا۔

زورآور بولا، ''استاد! میری حالت خراب ہے۔ میرا ساتھی اِس مردود کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ اچھا ہوا تم وقت پر آ گئے ہو۔ اسے اپنی تحویل میں لے لو، یہ بہت خطرناک ہے اور اس کی معصوم صورت پر بھروسہ نہ کرنا۔''

استاد بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولا، ''زورآور! میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اس کی بے حد سنجیدہ آواز سن کر مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے موت کی سی

سنگینی رکھنے والی یہ آواز پہلے سن رکھی تھی۔ کہاں اور کب؟ یہ یاد نہ آیا۔ اس کے ساتھیوں نے مجھے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے گھیرے میں لے لیا جبکہ وہ نپے تلے انداز میں چلتا ہوا زور آور کی طرف گیا۔ اس کے قریب پیروں کے بل بیٹھ گیا اور صفی کی نبض چیک کرنے کے بعد مایوسی سے سر نفی میں ہلا کر بولا، ''یہ تو ٹھنڈا ہو گیا ہے زور آور! تم سناؤ، تم ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''

''مجھے ٹانگ میں گولی لگی ہے استاد! اسی کم بخت نے ماری ہے۔'' وہ جبڑا بھینچ کر درد کو برداشت کرتے ہوئے بولا، ''بس ایک لمحے کو اس پر سے توجہ ہٹی تھی اور اس نے اپنا کام دکھا دیا۔ چونکہ اسے زندہ سلامت تمہارے حوالے کرنا تھا، اِس لیے میرے ہاتھوں سے بچ گیا ورنہ صفی سے پہلے اس کی روح پرواز کرتی۔''

''کیا تم چل سکتے ہو؟'' استاد نے پوچھا۔

زور آور ہتھیلیوں کے بل زمین سے تھوڑا اوپر اُٹھا اور بولا، ''میری گاڑی اور ڈرائیور یہاں موجود ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو اور مال کی قیمت چکا کر لے جاؤ۔ آہ! بڑا جگری یار تھا میرا..... صفدر..... میرا صفی..... پَر زندگی بڑی بے وفا چیز ہے۔ کبھی تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ کبھی اچانک بجھ جاتی ہے..... موم بتی کی طرح..... پَر استاد! جس وقت یہ لونڈا تیرے کام کا نہ رہے، اس وقت میرے کو بول دینا۔ میں اسے اپنے پاس لے آؤں گا۔ بہت حساب کتاب ہیں اس کی جانب میرے..... لے جاؤ اسے!''

استاد نے گردن موڑ کر میرے دائیں ہاتھ کھڑے شخص کو مخاطب کیا، ''ملغانی! اسے سہارا دے کر چارپائی پر بٹھاؤ اور پانچ لاکھ روپے اسے دے دو۔ ادھر مشین والے کمرے میں اس کے آدمی ڈر کر دبکے بیٹھے ہیں، انہیں جا کر کہہ دو کہ اِسے فوراً شہر لے جائیں ورنہ گولی کا زخم خراب ہو جائے گا۔''

'ملغانی' کا لفظ سنتے ہی میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ استاد کی آواز میں نے پہلے کہاں سن رکھی تھی اور وہ کون تھا؟ میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکا تھا۔ وہ استاد ببلو تھا۔ جب وہ فون پر میڈم شکیلہ کو دھمکیاں دے رہا تھا اور خانزادی کا مطالبہ کر رہا تھا، میں میڈم کے پاس موجود تھا۔ تب اُس کی آواز میں نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔ کھالے نے مجھے اس کے دستِ راست ملغانی کے بارے بتایا تھا جس کے توسط سے وہ استاد ببلو کے گروپ میں شامل ہوا تھا کہ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ کھالے، پیاجی اور میر و شاہ، تینوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ استاد

ببلو بہت ظالم اور سخت اعصاب کا مالک شخص تھا۔ آج اُسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تینوں کی رائے غیر حقیقی نہیں تھی۔ اس کی شخصیت میں موت کا سا ٹھہراؤ تھا جو بہت کم لوگوں کا وصف ہوتا ہے۔

اس کی شخصیت کسی بھی لحاظ سے اُس کے پیشے سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ سیاہ اور سفید بال جنہیں اُس نے بڑے سلیقے سے بغیر مانگ نکالے پیچھے کی جانب ڈال رکھا تھا، سفید و سیاہ مونچھیں اور شیو زدہ ابھرے ابھرے گال..... وہ دیکھنے میں بڑا سیاست دان یا سرکاری آفیسر لگتا تھا۔ میں نے اگر اس کے کرتوتوں کے بارے میں سن نہ رکھا ہوتا تو مجھے پہلا گمان یہی گزرتا کہ وہ پولیس کا اعلیٰ آفیسر ہے۔

ملغانی نے سہارا دے کر زورآور کو کھڑا کیا اور بغلوں میں ہاتھ دے کر پاؤں پاؤں چلاتا ہوا اس چارپائی تک لے گیا جس پر کچھ دیر پہلے میرا اور اُس کا دنگل ہوا تھا۔ آرام سے بٹھانے کے بعد اپنے ساتھی کے پاس آیا، اس سے ہینڈ بیگ پکڑا اور پلٹ کر زورآور کے پاس گیا۔ ہینڈ بیگ اُس کی جھولی میں رکھتے ہوئے بولا، ''پیارے! اس میں تمہاری مطلوبہ پانچ پیٹیاں موجود ہیں۔ پانچ پہلے آ چکی ہیں۔ چاہو تو گن لو، چاہو تو مجھ پر اعتماد کر لو۔ تمہاری مرضی ہے۔''

زورآور نے اُس پر اعتماد نہیں کیا۔ جان جوکھوں میں ڈال دی جائے تو کسی پر بھروسہ کرنے کو دل نہیں مانتا۔ اس نے بیگ کی زِپ کھولی۔ نوٹوں کی گڈیاں نکالیں، پرکھیں اور واپس بیگ میں رکھ کر زِپ بند کر دی پھر اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا کر بولا، ''ناراض نہ ہونا یار ملغانی! اس دھندے میں پڑنے کے بعد اپنے باپ پر اعتبار کرنے کو بھی جی نہیں مانتا۔''

اس دوران استاد ببلو میرے مقابل آ کھڑا ہوا۔ اس کی سرد نگاہیں میرے وجود کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ نظروں ہی نظروں میں مجھے تول لینے کے بعد بولا، ''تمہارا نام شہریار ہے؟''

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا، ''ہاں! مگر تم لوگوں کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

اس نے کہا، ''تم جانتے ہو۔'' پھر اپنے ایک ساتھی سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوا، ''گاڑی سے کلپ نکال لاؤ۔ ہری اَپ.....''

زورآور مشین روم کی طرف منہ کر کے کسی کو بلا رہا تھا۔ وہی مشین مین جس نے مجھے پانی اور چائے پلائی تھی، باہر نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آ گیا۔ خوف زدہ نظروں سے صفی کی لاش کو دیکھتے ہوئے زورآور کے سامنے سہمے سہمے انداز میں کھڑا ہو کر ہدایات سننے لگا۔

استاد بہلو نے مجھے دہشت زدہ کرنے کے لئے سخت لہجے میں کہا، ''شہریار! اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو زندہ رہو گے وگرنہ میں رُو رعایت کا قائل نہیں ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے پہلے زور آور نے بھی مجھے یہی دھمکی دی تھی۔ اسی اثنا میں اس کا ماتحت دو عدد بڑے سائز کے آہنی کلپ لے آیا۔ یہ ہتھکڑی کی جدید شکل کے آہنی آلات تھے جنہیں میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پیچھے کھینچے اور کلپ میں ڈال کر کوئی بٹن دبا دیا۔ 'کلک' کی آواز کے ساتھ ہی میری آزادی سلب ہوگئی۔ میں نے ہاتھوں کو حرکت دے کر اس کلپ کی گرفت کی پختگی کا اندازہ کر لیا۔ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور تھا۔ کلپ لگانے والے نے بڑے ماہرانہ انداز میں میرے لباس کی تلاشی لی۔ پھر قدرے بلند آواز میں بولا، ''استاد جی! مال ایک دم اوکے ہے، پیک کر دیا ہے، اب کیا حکم ہے؟''

استاد کے بجائے ملغانی بولا، ''اسے باہر لے چلو۔ پیچھے ڈال دو۔ ایک آدمی اس کے ساتھ بیٹھ جائے گا۔''

''پیروں میں کلپ ڈالنا ہے؟''

''ڈال دو.....'' ملغانی نے نخوت سے کہا۔ پھر وہ اور استاد بہلو زور آور کے پاس جا کھڑے ہوئے جب کہ بقیہ دونوں افراد نے مجھے باہر کی سمت دھکیلنا شروع کر دیا۔ دروازے کے عین سامنے سفید رنگ کی بڑی متسوبشی پجارو کھڑی تھی۔ اس کے فرنٹ بمپر پر سبز رنگ کی تختی نصب تھی جس پر 'ممبر صوبائی اسمبلی' کے سنہرے الفاظ چمک رہے تھے۔

ایک نے بیک ڈور کھولا۔ دوسرے نے مجھے دھکا دیا اور مجھے چھاتی کے بل بمپر پر گرا دیا۔ میرے جسم کا بالائی حصہ گاڑی کے فرش پر جبکہ ٹانگیں زمین پر تھیں جب دونوں میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے کلپ میرے پیروں میں ڈال کر لاک کر دیا۔ پھرتی اور بڑی بے دردی سے مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر فرش پر دھکیل دیا۔ شکر ہوا کہ پجارو کے فرش پر دبیز قالین موجود تھا ورنہ میری چھاتی اور منہ چھل جاتے۔

انہوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایک چھوٹے سائز کی ترپال میرے وجود پر ڈال دی۔ یوں لگا جیسے میرا دنیا سے یکسر رابطہ کٹ گیا ہو۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ عقبی حصے میں فرش پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرے نے دروازہ بند کر دیا۔

میری چھٹی حس نے سمجھا دیا کہ میں شدید خطرات سے دوچار ہو چکا تھا۔ استاد ببلو اور ملغانی سردار حیدر خان کے پالتو غنڈے تھے۔ اسی کے حکم پر مجھے زور آور کے ذریعے اغوا کرا کر کہیں لے جا رہے تھے۔ دونوں بہت خطرناک تھے۔ جو گینگ میڈم شکیلہ پر اندھا دھند حملہ آور ہونے کی جرأت رکھتا ہو، اس کے دائرۂ عمل کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی لاحق نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ وہ مجھے سردار حیدر خان کے سامنے پیش کرنے والے تھے۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر منور علی شاہ کے پاس رات کے اندھیرے میں غنڈوں اور پولیس کے ہمراہ بھیجی جانے والی عورت سے لے کر سی ٹو میں اسما سے ہونے والی ملاقات اور مابعد بیلے والی حویلی پر شب خون اور نور پور میں سردار حیدر خان کے بھیجے ہوئے غنڈوں کی بربریت یاد آئی۔ وہ غنڈے جنہوں نے نہ صرف میرے چاچا اور چاچی کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا بلکہ میرے سجے بسے گھر کو آنِ واحد میں تیل چھڑک کر جلا دیا تھا، آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اسما کو میں اپنے ہاتھوں میاں دلبر حسین کے ڈیرے پر چھوڑ آیا تھا۔ سردار حیدر خان کے نزدیک اس عظیم جرم سمیت میرے جرائم کی فہرست بہت طویل تھی۔ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ اس کا مجھے اندازہ تھا اور کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ تبھی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

میرے ہاتھ پشت پر کلپ میں جکڑے ہوئے تھے۔ پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ ایک مردود میرے سر پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوڈڈ گن تھی جس کی نال میری چھاتی پر موت کی آخری تحریر لکھنے کو بے تاب تھی۔ اس لئے میں مزاحمت اور خود کو آزاد کرانے کی کوئی کوشش کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔

ہلتے جلتے ہوئے میں نے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے کلپ کی مضبوطی کا اندازہ کر لیا تھا۔ چونکہ مجھے اُس کے فنکشن کا علم نہیں تھا، اس لیے اسے کھولنے کی کوشش بے سود تھی۔ وہ نہ جانے چابی سے کھلتا تھا یا کسی خفیہ بٹن سے؛ معلوم نہیں تھا۔ میں اس انداز سے لیٹا ہوا تھا کہ مجھے اپنے پیر اور پیروں میں کلپ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک طرح سے مایوس ہو کر میں نے طویل سانس لی اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا کہ میں سوائے سوچنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد استاد ببلو اور ریاض ملغانی مکان سے باہر آئے۔ دروازے کھلنے، پھر بند ہونے اور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور مجھے بھیانک انجام کی طرف لے جانے

والا سفر شروع ہو گیا۔

میں میڈم شکیلہ کی کوٹھی سے نکل کر عجیب حالات سے دوچار ہوا تھا۔ کسی کو مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت در قیامت کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ جب مجھے خود علم نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا اور میرے ساتھ کیا کیا جانے والا تھا، تو کسی اور کو کیا علم ہو سکے گا، یہ صورت حال بڑی مایوس کن تھی۔ میں گھر میں بتا کر آیا تھا کہ مجھے دیر سویر ہو سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ میڈم نے مجھے آرام کرنے کے لیے چھٹیوں سے نوازا تھا۔ وہ تب میرا پتہ کرتی، جب مجھے کسی مشن پر بھیجنا مقصود ہوتا۔ تب تک حیدر خان نے میرے بدن کے ریشے ادھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔

مجھ پر ڈالی گئی ترپال خاصی موٹی تھی۔ جہاں اس نے میرے جسم کو بے حد گرمی دے کر حدت آمیز سکون بخشا تھا، وہیں اُس نے مجھے ہر نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا۔ مجھے گاڑی کے پختہ سڑک پر چڑھنے، شہر کی طرف ٹرن لینے اور پھر بڑی سڑک پر چڑھنے کا احساس تو ہوا مگر بعد میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ استاد بلو مجھے کہاں لے جا رہا تھا۔

مہنگی گاڑیوں کو کسی ناکے پر نہیں روکا جاتا۔ اس متسوبشی پجارو کے آگے تو 'ممبر صوبائی اسمبلی' کی سبز نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی جسے رُکنے کا اشارہ کرنے کے جرم میں وردی پوشوں کی پٹیاں اُتار لی جاتی ہیں۔ مجھے چیکنگ کے نام پر تلاشی اور مدد کا سہارا بھی میسر آنے والا نہیں تھا۔

سفر میں گھنٹہ گزر گیا یا شاید دو گھنٹے گزر گئے تھے، جب گاڑی نے پختہ سڑک چھوڑ دی اور ناہموار کچے راستے پر چل پڑی۔ چونکہ وقت کا اندازہ نہیں تھا اِس لیے میں سفر کی طوالت کا اندازہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ پھر اچانک گاڑی رُک گئی اور دروازے کھلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اپنے قاتلوں کی بارات کے ساتھ منزل پر پہنچ چکا تھا۔

کچھ دیر بعد پجارو کا بیک ڈور کھلا اور مجھے پیروں سے پکڑ کر ترپال سمیت نیچے گھسیٹ لیا گیا۔ پھر اِسی حالت میں گھسیٹتے ہوئے کہیں لے جایا گیا۔ میری کمر میں کئی چھوٹے بڑے کنکر اور کانٹے چبھے مگر میری آہ و بکا شاید کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ مرحلہ بھی آخر کار عبور ہو گیا۔ جونہی میری ٹانگیں چھوڑی گئیں، دھڑام سے زمین پر گر گئیں۔

چند لمحوں بعد چوبی دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ میں کسی

کمرے میں لا پھینکا گیا ہوں۔ ترپال میں لپٹا ہوا زمین پر پڑا تھا اور میرے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ترپال سے نکل جاتا یا اسے ایک طرف سرکا دیتا۔ میرے ہاتھ میرے اپنے وجود کے وزن سے دُکھ رہے تھے۔ کلپ کی کوئی نوک کلائی میں چبھ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کلائی پر سے ماس اُتر گیا تھا۔

اس جان کنی کی کیفیت میں کافی دیر گزر گئی۔ پھر دروازہ کھلا، قدموں کی آہٹ مجھ تک آئی اور چند لمحوں بعد میرے اوپر سے ترپال کھینچ لی گئی۔ میں نے کم روشنی کے باوجود استاد ببلو کو پہچان لیا۔ کھلے دروازے میں اس کے دو ماتحت گنیں اُٹھائے چوکس کھڑے تھے۔

استاد ببلو چند لمحوں تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر بھاری اور دل دہلانے والی سنجیدہ آواز میں بولا، ''شہریار! تم موت کی ایسی کال کوٹھڑی میں پہنچ گئے ہو جہاں سے ضدی اور احمق کبھی زندہ نہیں نکل سکتے۔ عقل مند موقع کی نزاکت کو دیکھ کر مفاہمت کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی بچا لیتے ہیں۔ مجھے چند سوالوں کے جواب چاہئیں۔ درست جواب دو گے تو زندہ چھوڑ دوں گا۔ جھوٹ بولو گے تو زمین میں زندہ گاڑ دوں گا۔ میں نے بتانا تھا، بتا دیا، آگے تمہاری مرضی؛ کہ تم اپنے لئے کس راہ کا انتخاب کرتے ہو۔''

میرا دماغ تشویش اور خوف ناک اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں مجھے دوپٹے سمیت پروین کو یہاں پر رکھے جانے کے ثبوت ملے تھے۔ چوڑیوں کے چند ٹکڑے بھی ہاتھ لگے تھے۔ یعنی استاد ببلو جسے موت کی کوٹھڑی کا نام دے رہا تھا، یہ بیلے کے قلب میں واقع سردار حیدر خان کی وہی حویلی تھی جس پر میں ایک ناکام حملہ کر چکا تھا۔

میں دو چارپائیوں کے بیچ میں فرش پر اپنے اغوا کاروں کے رحم و کرم پر پڑا تھا۔ آنکھیں جھپکے بغیر اُستاد ببلو کو کئی ثانیوں تک دیکھا پھر اپنی آواز کو مستحکم بنانے کی اپنی سی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

وہ بولا، ''دنیا مجھے استاد ببلو کے نام سے جانتی ہے، تمہاری میڈم بھی۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی مجھے جانتے ہو گے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

میں نے کہا، ''ہاں! میں تمہیں جانتا ہوں مگر صرف نام کی حد تک۔ آج پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا ہے۔ حیران ہوں کہ ایسا کیا پوچھنا ہے تمہیں مجھ سے جس کے لیے تم نے اتنا تردد کیا ہے.....''

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا، بولا، ''کیا تم میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو؟''

اس کی سنجیدہ آواز سماعت میں اُتر کر دل تک گھستی جاتی تھی۔ یہ خوبی معدودے چند لوگوں کو قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

میں نے کہا، ''میں کوشش کروں گا کہ تمہیں شکایت کا موقع نہ دوں۔''

وہ میرے قریب آیا اور چارپائی کی بانہہ پر ٹک گیا۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، ''چھوٹی خانزادی کہاں ہے؟''

''چھوٹی خانزادی؟'' میں تعجب سے بولا، ''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔''

''سردار حیدر خان کی بیٹی..... جسے تمہاری میڈم نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔'' اس کے چٹان جیسے بے تاثر چہرے کی درشتی میں اضافہ ہو گیا، بولا، ''یہ پہلا سوال ہے۔ دوسرا سوال یہ ہوگا کہ تمہاری بہن کہاں ہے؟ تیسرا سوال؛ سائیں دل جیت شاہ کو کس نے اور کیوں اغوا کر رکھا ہے جبکہ میرا تم سے چوتھا سوال یہ ہوگا کہ تم کہاں رہتے ہو؟''

اس نے تھوڑا سا توقف کیا، پھر بولا، ''اگر تم مجھے ان سوالوں کے ٹھیک جواب دے دو تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں ورنہ تم خان صاحب کے غصے کا شکار ہو جاؤ گے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے انہی سوالوں کی توقع تھی جو میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح انڈیل دیے گئے تھے۔ قدرے بے بسی سے کہا، ''مجھے کچھ وقت دو۔ پھر جو کچھ جانتا ہوں، بتا دوں گا۔ سچ سمجھنا یا جھوٹ..... یہ تم لوگوں کی دانست پر موقوف ہوگا۔ اور ہاں استاد بلو! مجھے زندگی کا لالچ نہ دو۔ میں سردار حیدر خان کو جانتا ہوں۔ اسے میری ایک سانس بھی ناگوار گزرے گی۔''

اس نے کندھے اُچکائے اور بولا، ''ٹھیک ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ میں شہر جا رہا ہوں۔ رات کو لوٹوں گا۔'' پھر چارپائی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف گیا اور کسی کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے آہستگی سے بولا، ''اِسے چارپائی پر ڈال کر لحاف میں لپیٹ دو۔ سردی سے کانپ رہا ہے۔ ہو سکے تو اِسے چائے پانی بھی پلاؤ اور میرے آنے تک اس کا دھیان رکھو۔''

وہ چلا گیا۔ اس کے ماتحت ساتھیوں نے مجھے بے دردی سے اُٹھایا اور چارپائی پر پٹخ دیا۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی پر کوئی گدا یا چادر نہیں بچھایا گیا تھا۔ یعنی اُترنے والی رات کی تمام خنکی مجھے اپنے بدن میں اُتارنا تھی۔ پچھلی رات میں نے سر میں آنے والی چوٹ کی وجہ سے بے ہوشی

میں گزاری تھی۔ تبھی رگ و پے میں داخل ہونے والی سردی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ آج ہوش میں تھا۔ سردی کا جان لیوا احساس سردی اُترنے سے پہلے ہی بیدار ہو چکا تھا اس لئے متفکر ہو رہا تھا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد دونوں کمرے میں آئے۔ ایک نے گن تھام رکھی تھی جبکہ دوسرے نے اپنے ہاتھ میں چائے کا پیالہ اٹھا رکھا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے ہاتھ سے ملغانی نے ہینڈ بیگ لے کر زورآور کی جھولی میں رکھا تھا۔

اس نے پیالہ چارپائی کی بانہہ پر ٹکایا اور میرے عقب میں آ کر کلپ کھول دیا۔ ہاتھ آزاد ہونے کے بعد بھی کئی ثانیوں تک کوشش کے باوجود حرکت نہ کر پائے۔ جب شریانوں میں دورانِ خون بحال ہوا تو میں نے چائے کا پیالہ اٹھا لیا۔ گرم گرم دودھ پتی اور میلے کچیلے مگر خاصے بھاری لحاف نے میرے بدن میں کچھ حرارت پیدا کی اور توانائی دی۔ مجھے واش روم جانے کی حاجت ہوئی۔ انہوں نے اجازت تو دے دی مگر پیروں کا کلپ کھولنے سے انکار کر دیا۔ ناچار مجھے ان کا سہارا لے کر چڑے کی طرح پھدکنا پڑا۔ وہ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر پھدکاتے ہوئے صحن کی بیرونی دیوار سے ملحقہ واش روم میں لے گئے۔

شام کے سائے رختِ سفر لپیٹ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا چھانے والا تھا۔ میں نے کمرے کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی کیونکہ یہ وہی حویلی تھی۔ غیر اضطراری طور پر میری نگاہ برآمدے میں واقع کچن کم اسٹور کی طرف اُٹھی جس میں مجھ سے پہلے یہاں پہنچنے والے کسی سفاک شخص نے چار جیتے جاگتے انسانوں کو رسیوں کے پھندے دے کر ہلاک کر دیا تھا اور سب کو اسٹور میں اوپر نیچے رکھ دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں قتل کئے گئے جسموں کو یوں اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور اوپر نیچے ترتیب کے ساتھ رکھنا بڑا دل گردے کا کام تھا جو اُس نے میرے اور پیا جی کے اندازے کے مطابق تن تنہا سرانجام دیا تھا۔ میں جس دنیا میں جی رہا تھا، وہاں کی سنگدل فضا میں بھی ایسا کرنا محال تھا۔

میں نے واش روم تک جاتے ہوئے حویلی کا جائزہ لے لیا تھا۔ کوئی بھی قابلِ ذکر تغیر دکھائی نہیں دیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا اُس رات میں نے اور کھالے نے چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ سکوت کو بھانپ کر لگائے گئے اندازے کے مطابق اس وقت حویلی میں سوائے استاد ببلو کے، وہی افراد یہاں موجود تھے جو مجھے زورآور سے وصول کر کے یہاں لائے تھے۔ اگر کوئی اور موجود تھا بھی تو وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی اُس کی آواز میرے کانوں میں پڑی تھی۔

حویلی کے باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو میرے کانوں کے پردوں پر ہتھوڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ بندھے ہوئے پیروں کی وجہ سے مجھے واش روم میں نہایت تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا مگر مجبوری تھی۔ میں نے اس دوران آہنی کلپ پر موجود کسی خفیہ بٹن کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ جیسے تیسے حاجت پوری کر کے نکلا تو دونوں کو دروازے چوکس کھڑے پایا۔ دبلے پتلے شخص نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ کمرے میں پہنچا کر اُس نے ہاتھوں کو پھر کلپ میں جکڑ دیا۔

رفتہ رفتہ میرے جسم کی توانائی بحال ہو رہی تھی۔ سر میں نبض کے ساتھ ساتھ پڑنے والی دھمک میں از خود کمی واقع ہونے لگی تھی۔ اس مسلسل تکلیف نے میرا رہا سہا خون بھی چوس لیا تھا۔

چونکہ زور آور نے مجھے ان کی تحویل میں دیتے ہوئے بہت خطرناک شخص قرار دیا تھا اس لئے دونوں پہرے دار بہت چوکنے تھے۔ مونچھوں والا کمرے سے چلا گیا تھا جبکہ ضرورت سے کہیں زیادہ سمارٹ پہرے دار ایک چارپائی چھوڑ کر دوسری چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ باوجود اِس کے کہ میں زخمی اور بندھا ہوا تھا، اس نے مجھے مسلسل گن پوائنٹ پر رکھا تھا۔

شام کا دھندلکا رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا۔ چاند فلک پر جگمگا رہا تھا جس کی روشنی اندھیرے کو بھرپور تسلط جمانے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ میرے پہرے دار نے دیا سلائی جلائی اور الماری میں پڑی ہوئی میلے شیشے والی لالٹین روشن کر دی۔ لالٹین کی پیلی روشنی کمرے میں پھیل گئی اور ماحول بڑا عجیب، سوگوار اور پُر اضطراب بن گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے یہاں سے کسی نہ کسی طرح نکلنا تھا ورنہ بھیانک تشدد اور بے بسی کی موت کا شکار ہونا تھا۔ پیا جی نے ٹریننگ دیتے ہوئے، فارم ہاؤس پر، مجھے سمجھایا تھا کہ کبھی تذبذب، پریشانی اور خوف کو اپنے اعصاب پر سوار مت ہونے دینا ورنہ زندہ رہنے کے چانس گنوا کر موت سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ میں اپنے تئیں ذہن پر دہشت اور مایوسی کی یلغار کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

کافی دیر گزر چکی تھی جب حویلی کے باہر کوئی گاڑی آن رُکی۔ پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد سردار حیدر خان دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ میں نے اُسے اُس کے مخصوص حلیے کی وجہ سے پہچانا تھا ورنہ اندھیرے کی وجہ سے اُس کے چہرے کے خطوط دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ عمومی طور پر آف وائٹ بوسکی یا کرنڈی میں ملبوس رہتا تھا۔ گہرے کلیجی یا

کالے رنگ کی واسکٹ اور ایرانی شال بھی اس کے روزمرہ کے لباس کا حصہ تھیں۔ اس وقت بھی وہ اسی لباس میں تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد سیدھے چلتا ہوا میرے دائیں پہلو میں آن کھڑا ہوا جبکہ استاد دبلو اور ملغانی چارپائی کی پائنتی کی جانب ٹھہر گئے۔

میری تمام تر بربادیوں کا ذمہ دار یہی شخص تھا جو اِس وقت سینہ تانے میرے سامنے فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اُسے خون میں نہلانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ خواہش اپنے ہی خون میں نہا گئی اور میرے ہونٹ بے بسی سے بھنچ گئے۔ میں جو اُسے چشمِ تصور میں زندگی کی بھیک مانگتا ہوا دیکھا کرتا تھا، اِس وقت اسی کے رحم و کرم پر بے بس پڑا تھا۔ کھالا سچ کہا کرتا تھا کہ یہ دنیا پیسے والوں کی ہے۔ یہاں وہی جیت جاتا ہے جو پانی کی طرح پیسہ بہانے کا ہنر جانتا ہے۔ بڑا خان جیت گیا تھا۔ اور میں..... اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہا تھا..... ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا تھا.....

چونکہ لالٹین اور میرے درمیان سردار حیدر خان کا وجود حائل تھا، اِس لیے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ اُس کی آنکھیں اِس وقت شعلے اگل رہی تھیں۔ جبڑوں کے اعصاب بڑی تیزی سے تھرک رہے تھے۔ کئی ثانیے ایسے ہی گزر گئے کہ وہ مجھے اور میں اُسے گھورتا رہا۔ اچانک اُس نے اپنی بھاری اور کڑک دار آواز میں غلیظ گالی دیتے ہوئے ٹھیٹھ سرائیکی میں کہا، ''بڑا لاٹ خان بنتا تھا..... ہوں..... اچھی نسل کا کتا پیروں میں دم ہلاتا رہتا ہے تبھی اچھا لگتا ہے۔ گندی نسل اپنے مالک پر بھونکنے سے باز نہیں آتی، تبھی مٹ جاتی ہے۔ ہمارے کتے ہماری طرف بوتھی اُٹھائیں تو انہیں فائر مار دیا جاتا ہے یا کچلا ڈال کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ تم بھی گندی نسل کے کتے ہو۔''

میں نے بدقت تمام اپنے کھولتے ہوئے خون کو زہر اگلنے سے روکا اور جواب نہیں دیا۔

وہ چند لمحوں کے توقف سے بولا، ''بتا اوئے بھتنی کے بچے! خانزادی کہاں ہے؟''

میں نے اپنے ذہن میں گزشتہ حالات کی تجزیاتی فلم چلا کر فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے کیا بتانا تھا اور کیا چھپانا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا، ''اسما.....''

وہ ایک دم تڑپا اور غرایا، ''اپنی گندی زبان سے خانزادی کا نام مت لو ورنہ اَبھی زبان کاٹ دوں گا۔''

میرا دماغ گھوما مگر کچھ نہ کر پانے کی حالت میں پڑا ہونے وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بولا، ''وہ میاں دلبر کے پاس ہے۔''

''کیہڑا (کون) میاں دلبر؟'' اس نے سانپ کی طرح بل کھایا۔

''میاں دلبر حسین..... میں اس کے بارے میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ لاہور کے علاقے کا کوئی مشہور سیاست دان ہے۔'' میں نے اُس کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے لبوں پر قفل لگ گیا۔ ایک ٹک مجھے پھر استاد ببلو کو دیکھنے لگا پھر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولا، ''ببلو! ایہہ میں کیا سنداں پیا ہاں؟''

(ببلو! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟)

ببلو کی سرد آواز میرے کانوں میں پڑی، ''آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیں۔ آپ کے بعد اس کے بیان کی پرکھ کرنا اور سچ جانچنا میرا کام ہے۔''

حیدر خان میری جانب مڑا اور دھاڑا، ''اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میاں صاحب کا خانزادی والے معاملے سے کیا تعلق ہے؟''

میرے اندر آگ دہک رہی تھی مگر لہجے کو مؤدبانہ رنگ دیتے ہوئے بولا، ''اس نے خانزادی کو دو کروڑ روپے میں خریدا تھا۔''

''کیوں؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہ سردار حیدر خان کے ایما پر یہ سودا بازی کر رہا ہے۔''

حیدر خان کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ آیا۔ اس نے میڈم، میاں دلبر حسین اور مجھے بے نقط سنائیں۔ اس دوران مجھے چار پانچ لاتیں بھی رسید کیں جو لحاف کی وجہ سے زیادہ مؤثر ثابت نہ ہوئیں۔ استاد ببلو نے اپنے منہ پھٹ فرعون کا غصہ ٹھنڈا کیا اور سرد لہجے میں مجھے مخاطب کیا، ''شہریار! اگر تمہاری کوئی بات بھی غلط ثابت ہوئی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ سوچ کر بولو۔ تمہاری کہی ہوئی بات کو میں پرکھوں گا اور اس کے بعد تمہاری زندگی کا فیصلہ کروں گا۔''

میں نے کہا، ''میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ جانتا ہوں، بتا رہا ہوں۔''

اسے میری بے خوفی نے مضطرب کیا مگر وہ فوری طور پر اپنے آپ پر قابو پا گیا۔ میر وشاہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اپنی قلبی کیفیت کو چہرے تک نہیں آنے دیتا۔ یہ اس کی بہت بڑی خوبی تھی جس کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں دیکھ چکا تھا۔

''خانزادی کو کون میاں دلبر کے پاس چھوڑنے گیا تھا؟''

میں نے کہا، ''میں.....''

''کہاں؟''

''بورے والا میں۔'' مجھے سخی محمد کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات یاد تھیں اور میں نے اپنی کہانی میں صداقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہی معلومات کا سہارا لیا۔

''بورے والا شہر میں؟'' اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بدقت تمام اپنے آپ پر قابو پا رہا تھا۔

''نہیں..... کسی مضافاتی گاؤں میں۔''

''بدنسل کتے! اس گاؤں کا کچھ نام بھی تو ہوگا ناں..... کیا بورے والا شہر کے قریب واقع ہے؟'' خان نے پھاڑ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

''نہیں..... بورے والا سے دور، دریائے ستلج کے کنارے پر واقع تھا۔'' میں نے کہا، ''مجھے گاؤں کے نام کا علم نہیں ہے۔''

''میاں صاحب نے خانزادی کو خود وصول کیا تھا؟''

''نہیں۔ میں نے میاں دلبر حسین کے حکم پر وہاں کسی ڈیرے پر اس کے کارندے تک خانزادی کو پہنچایا تھا۔''

''اُس کتے کا نام جانتے ہو؟''

''نہیں!''

''پھر تم کیسے پتہ چلا کہ خانزادی کو اُسی کے حوالے کرنا ہے؟''

''ہمارے درمیان کوڈ ورڈز طے کئے گئے تھے۔'' میں نے پوری کوشش کی کہ میرا چہرہ میرے جھوٹ کی چغلی نہ کرے۔

''اس ڈیرے کا محل وقوع بتاؤ۔''

میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، ''میں پہلی مرتبہ وہاں گیا تھا۔ ڈرائیور کو راستے کا علم

تھا۔''

''کیا تمہیں راستہ یاد ہے؟'' وہ مجھ پر تھوڑا جھکا اور سانپ کی طرح پھنکارا۔ اس کے منہ سے شراب کی ناگوار بُو آ رہی تھی۔

''ہاں..... میں وہاں جا تو سکتا ہوں مگر لوکیشن کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتا۔'' میرا جھوٹ اپنا اثر دکھا رہا تھا اور میرے سر پر مسلط فوری موت کو ٹالنے لگا تھا۔ میری دانست میں اَب وہ اسما تک رہنمائی اور اس کی بازیابی تک مجھے قتل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

''خانزادی کو تمہاری کنجری مالکن نے اغوا کیوں کیا تھا؟'' حیدر خان پھنکارا۔

میں نے کہا، ''اس بات کا آپ کو علم ہے خان صاحب.....''

اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا، ''کھوتی دا پتر! میکوں ہر گالھ دا پتا ہے پَر میں تیڈے مونھوں سنن منگداں۔''

(گدھی کے بچے! مجھے ہر بات کا علم ہے مگر میں تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔)

تھپڑ زوردار تھا مگر میرے منہ سے نکلنے والی تیز چیخ کی اصل محرک وہ تکلیف تھی جو زخم دُکھنے سے پہنچی تھی۔ میرا بدن جھٹکے لینے لگا اور منہ سے کراہیں خارج ہونے لگیں۔ اس نے اِسے میری اداکاری سمجھا اور دانت پیس کر غرایا، ''ہک چاٹ نال اِی تڑفن پے گیا ہے نامرادا..... اوئے اِیندھی موت سڈاڈیندی پئی ہے ببلو..... اِیں کو سمجھا گھن نی تاں کل دا مردا اَج مر پوسی.....''

(نامرادا ایک تھپڑ لگنے سے ہی تڑپنے لگا ہے۔ اس کی موت آوازیں دے رہی ہے ببلو! اسے سمجھا دو ورنہ کل کا مرتا آج ہی مر جائے گا۔)

اس نے فوراً بڑھ کر میری اُتری ہوئی پٹی کھینچ کر اپنی جگہ پر دوبارہ ایڈجسٹ کی اور مجھے دھمکانے کے بجائے برانگیختہ حیدر خان سے مخاطب ہوا، ''خان صاحب! اس کے سر میں گہرا زخم ہے۔ وہ دکھ گیا ہوگا۔ آپ ذرا ہاتھ ہلکا رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ مردود گزر جائے اور ہماری محنت ضائع ہو جائے۔''

''اوئے! اَب چپ کرو..... بتاؤ! تم نے اپنی بہن کو کہاں چھپا کر رکھا ہے؟'' اس نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا۔ ایسا زخم کریدا جس پر میں ابھی تک کوئی مرہم نہیں رکھ پایا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر میری بدنی سکت جواب دے گئی۔ آنکھوں کے

سامنے ایک سورج چمکا اور میں ہوش وخرد کی سرحدیں عبور کر گیا۔

میری بے ہوشی نے وقتی طور پر اس بپھرے ہوئے فرعون سے میری جان چھڑا دی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں دھواں پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ساتھ والی چارپائی پر گزشتہ دن والے پہرے دار ایک پھول دار رضائی میں لپٹے بیٹھے تھے۔ کمرے کی ایک نکڑ سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ شاید پہرے داروں نے سردی سے بچاؤ کے لیے لکڑیوں کی آگ جلا رکھی تھی۔

میرے بدن پر لحاف موجود تھا۔ اس کے باوجود میں سردی سے کپکپا رہا تھا۔ مجھے اپنے سر کے بال گیلے محسوس ہوئے۔ میرا گریبان اور کالر بھی بھیگا ہوا تھا جس کی وجہ سے سردی کا احساس فزوں تر تھا۔ شاید وہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے پانی چھڑکتے رہے تھے پھر ناکام ہو کر آج کا کام کل پر ٹال کر چلے گئے تھے۔

میرے جسم میں پیدا ہونے والی حرکت نے دونوں اونگھتے ہوئے پہرے داروں کو چوکنا کر دیا۔

میں نے کہا، ''مجھے واش روم جانا ہے۔''

بڑی مونچھوں والے نے برہمی سے کہا، ''اِس وقت؟ آرام سے پڑا رہ۔ باہر بڑی سردی ہے۔''

میں نے کہا، ''مجھے بھی سردی لگتی ہے مگر واش روم میں جانا ضروری ہے ورنہ.....''

میری آواز میرے بدن کی طرح کانپ رہی تھی۔

اس نے میری ادھوری بات کو دھمکی سمجھا، تبھی غرا کر بولا، ''کیا ورنہ..... کیا کرے گا تو؟''

میں نے بے بسی سے کہا، ''میں تو کچھ نہیں کروں گا مگر وہ کچھ ہو جائے گا کہ تم لوگوں کا یہاں بیٹھنا محال ہو جائے گا۔''

وہ میری بات میں مضمر 'دھمکی' کو سمجھ گیا تبھی بُرا سا منہ بنا کر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا، ''چل اوئے جیدیا! اس کھوتے کے بچے نے تو مرنا ہی ہے، ہمیں بھی سردی میں مار کر دم لے گا۔''

جیدا مجھے گالی دیتے ہوئے رضائی سے نکل کر چارپائی سے اُترا اور سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے بیزاری سے بولا، ''تمہیں بھی اِس وقت ہی جاگنا تھا۔''

مارے سردی کے میرے دونوں گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ میں نے بے بسی سے کہا، ''یار! ناراض کیوں ہوتے ہو؟ مجھے بھی اتنی سردی میں باہر نکلنے کا کوئی شوق نہیں ہے؛ وہ بھی چڑے کی طرح بے ہودہ انداز میں پھدکتے ہوئے.....''

اس نے کلپ کھولا۔ پھر دونوں نے مجھے پکڑ کر کمرے سے نکالا۔ باہر واقعی سردی حد سے زیادہ تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا تھپیڑا بدن کو چیر گیا۔ زمین ٹھنڈی تھی۔ یوں لگا جیسے میرے ننگے پیر زمین کے بجائے برف پر پڑ رہے تھے۔ میرے دانت بجنے لگے۔ وہ دونوں واش روم کے باہر رُک گئے جبکہ میں اندر چلا گیا۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اندر اندھیرے کا راج تھا۔ ایک بار پھر وہ تکلیف دہ مرحلہ درپیش تھا جس سے میں ایک مرتبہ پہلے گزرا تھا۔ مضحکہ خیز انداز میں بیٹھ کر بھی میں نے کلپ کو ٹٹولنے کا عمل جاری رکھا۔ کم بخت عجیب ساخت کا تھا۔ اس کا میکنزم سمجھ میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ واش روم سے نکلا تو اپنی کپکپاہٹ پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔

مختصر الوجود جیدے نے میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف کھینچا۔ ایک امید کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکی اور میں نے بڑی سرعت سے اسے جھٹکا دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مڑنے لگا تھا، تبھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر مجھ سے آن ٹکرایا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کیا، اُسے کھینچ کر پہلو سے لگایا اور پلک جھپکنے کی سی دیر میں اپنا دایاں ہاتھ اُس کی گن پر ڈال دیا۔ وہ جب تک سنبھلتا، تب تک نہ صرف وہ میرے فولادی شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا بلکہ اس کی گن بھی میری دسترس میں آ چکی تھی۔

میرے غیر متوقع ردِّعمل کو بھانپنے اور خود کو سنبھالنے میں اس کے ساتھی کو کچھ وقت لگا۔ اس دوران بساط پلٹی جا چکی تھی۔ میں غرایا، ''گن نیچے پھینک دو ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔''

میری گرفت میں مچلنے والا جیدا جسمانی طور پر مجھ سے خاصا کمزور واقع ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود خود کو چھڑانے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی کہنیاں میرے پیٹ اور کمر پر ماریں۔ تھک کر تھم گیا۔ اَب اسے سانس لینے میں بھی دقت پیش آنے لگی تھی۔ پھر ہولے ہولے کھانسنے لگا تھا۔ اس کا ساتھی کارِ مزاحمت کا فیصلہ کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔ میں نے اُسے پہلے سے زیادہ درشت لہجے میں گن پھینکنے کا حکم دیا۔ اس نے بے بسی سے جیدے کو دیکھا اور کندھے اُچکا کر گن اپنے قدموں میں زمین پر رکھ دی۔ میں نے اپنے بازو کو زور

دار جھٹکا دیا اور کہا، ''یہاں کتنے لوگ موجود ہیں؟''

اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ لمبی مونچھوں والے نے کہا، ''ہم دو آدمی ہیں۔''

مجھے ایک ذرا تعجب ہوا کیونکہ میرے اندازے کے مطابق دونوں کو یہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ان کے علاوہ حویلی میں پہلے سے رہائش پذیر لوگوں کی یہاں موجودگی بھی ضروری تھی۔ میں نے پوچھا، ''ببلو اور ملغانی کہاں ہیں؟''

وہ بولا، ''دونوں بلوچ نگر گئے ہیں۔ بڑے خان کے ساتھ۔''

بلوچ نگر میں سردار حیدر خان کا محل واقع تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے آقا کے ساتھ محل کے پرآسائش ماحول میں شب بسری کی غرض سے چلے گئے تھے۔

مجھے ان کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر کوئی اور حویلی میں موجود ہوتا یا گہری نیند سو رہا ہوتا تو میری آواز سن کر اب تک کھجار سے نکل کر سامنے آ چکا ہوتا۔ میں چاہتا تو دونوں کو شوٹ کر سکتا تھا مگر اس احتیاط کے پیش نظر کہ فائر کی آواز مجھے کسی پریشانی سے دوچار نہ کر دے، میں نے گن پھینکنے والے کو چند قدم پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ وہ نہ سمجھتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ میں نے جیدے کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا اور چاہا کہ اس کی گردن کی ہڈی توڑ دوں مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی ہڈی تو بچ گئی مگر میرا کام ہو گیا۔ اس کے حلق سے نہایت ڈراؤنی خرخراہٹ نکلی اور بدن اچانک ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ جونہی میں نے اس کی گردن چھوڑی، وہ زمین پر بے جان انداز میں ڈھیر ہو گیا۔

اس خطرے کے پیش نظر کہ وہ بے ہوشی کی اداکاری نہ کر رہا ہو، میں نے گن کی نال کا کندہ پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ وہ گہری بے ہوشی میں تھا یا زندگی کی بازی ہار چکا تھا؛ میں نے اطمینان محسوس کیا اور گن کا رُخ چند قدم دور کھڑے ہوئے مونچھ بردار شخص کی طرف کر دیا جو حیرت پاش نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

اس نے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا رُخ اپنی جانب ہوتے دیکھا تو خوف کے مارے ہاتھ سر سے بلند کر لیے اور گھگھیانے لگا۔

میں نے کہا، ''یہ کلپ کیسے کھلتا ہے؟''

''پتہ نہیں..... جیدا ہی کھولتا تھا۔'' وہ منمنایا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر جھوٹ بولنا بھی بڑا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ میں نے ڈپٹ کر کہا،

''ٹھیک ہے۔ مجھے مردوں کو بلانے کا ہنر آتا ہے۔ تم اپنا رُخ دوسری جانب کرلو۔''

وہ پیروں پر گھوم گیا۔ میں پھدکتا ہوا اس کے عقب میں پہنچا اور گن کو نال سے پکڑ کر پوری قوت سے اُس کے سر پر دے مارا۔ اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ وہ پلٹنا چاہتا تھا مگر دوسری ضرب نے اُسے موقع نہیں دیا۔ سر پھٹنے سے خون کا فوارا چھوٹ پڑا اور وہ لہراتے ہوئے زمین بوس ہوگیا۔

میں زمین پر بیٹھ گیا اور کلپ کو ٹٹول کر اس کا 'چور سوئچ' تلاش کرنے لگا۔ بصد کوشش بھی کہیں نہ ملا تو میں پریشان ہوگیا۔ دھیان کیا تو پتہ چلا کہ اس منحوس کلپ کی ساخت ایسی تھی کہ میں اسے گولی مار کر توڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ گولی میرے کسی ٹخنے پر لگ سکتی تھی۔ اس سے نجات حاصل کرنا بھی ضروری تھی ورنہ میں سو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ قسمت نے ساتھ دیا اور انگلیوں کو ایک ننھا سا ابھار محسوس ہوگیا۔ اُسے دبایا، دائیں بائیں کھسکایا، مگر کلپ نے نہ کھلنا تھا، نہیں کھلا۔ پھر میں نے گن اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر زمین پر کھڑی کی اور جلدی جلدی الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگا۔ ایسے میں اچانک کوئی بٹن دَب گیا اور 'کلک' کی آواز کے ساتھ ہی کلپ کھل گیا۔ میرے رگ و پے میں بجلی بھر گئی۔ گن اُٹھا کر اُچھلا اور حویلی کے دروازے کی طرف دوڑا۔

زندگی کی قوی امید نے میرے تن بدن میں نئی حرارت زاء روح پھونک دی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ زندگی چیز ہی ایسی ہے۔ اپنے پاس بلاتی ہے تو مردہ قدموں میں بھی جان پڑ جاتی ہے۔ جھٹک کر پھینک دیتی ہے تو شعلہ بداماں وجود میں گردش کرنے والا دہکتا ہوا لاوا آنِ واحد میں جم جاتا ہے۔ برف بن جاتا ہے۔ برف بھی ایسی کہ جس پر کوئی دنیا کی کوئی حرارت، کوئی موسم اثر انداز نہیں ہوسکتا۔

میں پھاٹک نما بڑے چوبی دروازے پر پہنچ کر ایک ذرا ٹھہرا۔ باہر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آوازیں بتا رہی تھیں کہ کتوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔ دو یا تین..... مجھے کتوں سے نمٹنا آتا تھا مگر اِس وقت میرے جسم پر جما ہوا خون چپکا ہوا تھا۔ سر کا زخم بھی موجود تھا۔ کتوں کو خون کی بو نے دیوانہ کر دینا تھا۔ ایسی حالت میں کتوں پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔ میں پلٹا اور برآمدے میں موجود سالخوردہ سیڑھی کی طرف بڑھا۔

ایسے میں مجھے بے ہوش پہرے داروں کا خیال آیا۔ وہ ہوش میں آکر میرا تعاقب کرسکتے

تھے۔ بعید نہ تھا کہ مڈبھیڑ ہونے پر وہ مجھے گولی مار دیتے۔ میں پلٹا اور تیزی سے جیدے کے قریب پہنچا۔ اس کی نبض چیک کی۔ اس کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ بڑی مونچھوں والا زندہ تھا۔ میں نے اُسے اوندھا کیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا، گن ایک طرف رکھی اور دونوں ہاتھوں کی کنگھی اُس کی تھوڑی کے نیچے رکھ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ 'کٹاک' کی زوردار آواز کے ساتھ ہی میرے حلق سے بھی دبی دبی چیخ نکل گئی۔ پوری قوت سے جھٹکا دینے کی وجہ سے میرے سر کا زخم پھر دُکھ گیا تھا۔

میں نے بہ دقت تمام خود کو منہ کے بل گرنے سے بچایا۔ اپنی برہنہ پائی کا خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا۔ میں نے اس کی بھاری بھرکم نوروزی کھیڑی اُتار کر پہن لی۔ میری جیبیں خالی تھیں۔ اس امید پر کہ اس کے پاس رقم ہوگی، میں نے اس کی جیبیں کنگھالیں۔ چند نوٹ ہاتھ لگ گئے۔ یہی بہت تھے۔ انہیں گنے بغیر جیب میں ڈالا۔ خون آلود کپڑوں پر نگاہ پڑی۔ خیال آیا کہ کمروں کی سرسری تلاشی لوں۔ کوئی سوٹ مل جائے تو پہن لوں؛ پھر ذہن میں تشویش دوڑ گئی۔ میں فضولیات کے چکر میں پڑ کر اپنے لئے خطرات مول لے رہا تھا۔

میں شارٹ گن اُٹھا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور کھالا پہلی مرتبہ انہی سیڑھیوں کے ذریعے چھت سے اُتر کر صحن میں آئے تھے۔ بے خوفی سے جانی پہچانی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ یقین ہو گیا تھا کہ دو مردہ پہرے داروں والی خونیں حویلی خالی تھی اور مجھے روکنے والا کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔ چاروں جانب پھیلی ہوئی چاندنی میں دیکھا بھالا منظر جگمگا رہا تھا۔ چونکہ میں نے بیلے والا راستہ دیکھ رکھا تھا، اِس لیے میں نے ادھر کا رُخ کرنا مناسب سمجھا۔ بلوچ نگر والے راستے پر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

میں نے گن اپنی قمیص کے پلو سے باندھی اور نیچے اُتر آیا۔ مجھے کتوں کے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا۔ ان کے بھونکنے کی آوازیں حویلی کے اگلے حصے کی طرف سے بلند ہو رہی تھیں مگر میں متفکر تھا کیونکہ کتوں کی سونگھنے کی حس بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ناہموار زمین پر درختوں کے بیچ سے گزرتا ہوا میں کھیت میں آ گیا۔ سامنے جھنگی تھی جہاں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ چڑھے چاند کی دودھیا روشنی میں چلنا مشکل نہیں تھا مگر میرے بخار زدہ جسم پر نقاہت طاری تھی جبکہ مجھے سڑک تک پیدل چلنا تھا۔ سفر زیادہ اور پُرخطر تھا۔ بھیڑیوں اور آوارہ کتوں کا سامنا بھی ہو سکتا تھا۔

میں احتیاط سے چلتا ہوا جھنگی تک پہنچ گیا۔ کتوں کا خطرہ ٹل گیا اور میری رفتار قدرے تیز

ہوگئی۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے مجھے غلطی کا احساس دلایا۔ میں نے مردہ پہرے دار کے جوتے اُتار کر پہنے تھے مگر اُس کا کوٹ اُتارنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں سرکنڈوں، کوندر اور جنگلی گھاس میں چھپے ہوئے پر پیچ راستے پر جنوب کی طرف سفر کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ڈیڑھ سے کچھ اوپر کا عمل تھا۔ رات بہت سرد تھی۔ دریا کے قرب کی وجہ سے فضا نم اور مرطوب تھی۔ سردی کے مارے میرے ہاتھ پیر سن ہو رہے تھے مگر میں رکنا نہیں چاہتا تھا تبھی مسلسل چل رہا تھا۔ خان کی حویلی سے دور آ گیا تھا مگر پوری طرح چوکس تھا۔

اندازے کے مطابق میں نے نصف راستہ طے کر لیا تھا جب مجھ پر نقاہت اور یخ بستگی طاری ہونے لگی تھی۔ یلغار کی شدت غیر معمولی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کے بعد اب میرا دماغ بھی شل ہونے لگا تھا اور عجیب سی خالی الذہنی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ یہ بہت خطرناک بات تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں بارہا انتہائی سرد راتوں میں فصلوں کی آبیاری کی تھی۔ نہر کے پانی کو کھال کھال چلا کر فصلوں تک پہنچایا تھا۔ تب کبھی ایسی کیفیت سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ میں پکی سڑک تک پہنچنے میں شاید کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ یہ بے سروساماں سفر میری قوتِ ارادی اور جسمانی استعداد سے زیادہ تھا۔ میں نے ایک موہوم سی اُمید کے سہارا لیا اور شیشم کے ایک قدرے بلند قامت درخت پر چڑھ کر اردگرد دیکھا۔ کسی گھر یا ڈیرے کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ مغربی جانب کوئی دو میل دور دریا دکھائی دے رہا تھا۔ دریا کے کنارے کوئی بستی آباد نہیں تھی۔ میرے چاروں طرف کوندر اور جنگلی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ میں درخت پر ایک کرسی نما جگہ پر تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ کر ہاتھ مسلنے لگا۔ کاش! میرے پاس ماچس ہوتی تو میں گھاس پھونس کو آگ لگا کر اپنے منجمد ہوتے ہوئے جسم کو حرارت دے لیتا۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ حویلی سے نکلتے ہوئے میں کھیس یا کمبل اور دیا سلائی اپنے پاس رکھ سکتا تھا جس کا مجھے اس وقت ہرگز خیال نہیں سوجھا تھا۔ اس وقت تو مجھ پر محض حویلی سے جلد از جلد بھاگ نکلنے کی دھن سوار تھی۔

میں نے درخت پر بیٹھ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ جلد ہی مجھے اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا۔ گھنے سرکنڈوں اور کوندر میں گھرے ہوئے راستے میں ہوا نہیں لگتی تھی۔ درخت پر بیٹھا تو یخ

بستہ ہوا بدن سے پار ہونے لگی۔ میں زیادہ دیر تک یہاں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اپنے ذہن پر چھائی ہوئی مایوسی کی دبیز دھند کو نوچ پھینکنے کی کوشش کی اور زندگی کے آخری لمحے تک بقا کی جنگ لڑنے کا فی الفور فیصلہ کر لیا۔ قمیص کا عقبی پلو پھاڑا اور سر پر باندھ لیا۔ کچھ سکون محسوس ہوا اور میں درخت سے اُتر آیا۔ ایک مرتبہ پھر اپنی قوتِ ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے چل پڑا۔

میں بیٹ والے موڑ پر آ کر ایک ذرا رُکا۔ سامنے وہ راستہ تھا جو ڈیرہ روڈ پر جا چڑھتا تھا۔ بائیں ہاتھ پر وہ تنگ اور دشوار گزار راستہ تھا جو نہر کی پٹڑی سے جا ملتا تھا۔ یہ نہر چوک قریشی سے قصبہ گجرات اور محمود کوٹ جانے والی سڑک کو کراس کرتی ہوئی اس طرف آتی تھی اور بل کھا کر ڈیرہ روڈ کو بیٹ کے مقام پر عبور کرتی تھی۔ یہ معلومات مجھے کھالے نے بہم پہنچائی تھیں۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اگر میں اس وقت بیلے سے نکل کر بڑی سڑک کے ویران مقام پر جا کھڑا ہوا تو کوئی ڈرائیور مجھے دیکھ کر گاڑی روکنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ بیلے کا خطرناک بیابانی مقام، میرا ناگفتہ بہ اور مشکوک حلیہ، ہاتھ میں پکڑی ہوئی شارٹ گن اور سر پر بندھی ہوئی خون آلود پٹی..... رات کے اِس پہر میں کوئی فاتر العقل شخص ہی اتنا بڑا خطرہ مول لینے کا روادار ہو سکتا تھا۔ اگر میں بیٹ والی بستی کی طرف جا نکلتا تو کسی نہ کسی گھر سے مدد ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس میں خطرہ یہ تھا کہ مدد دینے والا پولیس کو مطلع کر سکتا تھا اور مجھے بے خبری میں سرکاری پنجرے میں پھنسا سکتا تھا۔

دونوں اطراف خطرہ موجود تھا۔ اگر میری حالت درست ہوتی اور حلیہ مشکوک نہ ہوتا تو میں یقیناً بستی کا رُخ نہ کرتا۔ اپنے دم بہ دم ناتواں ہوتے ہوئے وجود کو سنبھالا دینے کی خاطر میں نے نہ چاہتے ہوئے نہر کی پٹڑی کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ بستی کے کسی دروازے پر دستک دیے بغیر میں آگ جلا کر سینک سکتا تھا۔ لائن کے ہوٹل پر جا کر کھانا کھا سکتا تھا، چائے پی سکتا تھا اور کسی ٹرک ڈرائیور کی منت سماجت کر کے ملتان کی طرف عازمِ سفر ہو سکتا تھا۔ یہ راستہ بہت دشوار گزار اور ناہموار تھا۔ اگر آسمان پر چاند جلوہ گر نہ ہوتا تو شاید میں نہر کی پٹڑی تک پہنچ ہی نہ پاتا۔ ٹھوکر کھا کر گرنے کے بعد اُٹھنے کا یارا نہ تھا۔

جب میں بیٹ والی خوابیدہ بستی میں پہنچا تو میرے قدم بُری طرح ڈگمگا رہے تھے۔ وزنی نوروزی کھیڑی میرے پیروں کو بُری طرح کاٹ رہی تھی مگر میں اُسے اتار پھینکنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں کوئی گھنٹہ بھر پیدل چلا تھا۔ عام حالات میں میرے نزدیک یہ کوئی بڑی مسافت

نہیں تھی مگر رات کے اِس پہر کی جان کن سردی میں چند قدم چلنا دوبھر تھا جبکہ میں نے کم وبیش آٹھ دس کلومیٹر کا سفر طے کر لیا تھا۔ توقع کے برعکس بستی کے کتوں نے میرا استقبال نہیں کیا تھا اور میں خاموشی سے گلیوں میں سے گزرتا ہوا پکی سڑک پر آ گیا۔ اندازہ تو تھا کہ اس وقت سڑک پر ٹریفک بہت کم ہوگی مگر ٹریفک کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

یہ چھوٹا سا عام نوعیت کا اڈہ تھا۔ بمشکل بیس تیس دکانیں تھیں جو اِس وقت بند تھیں۔ پھلوں کی ریڑھیاں اور سبزیوں کے پھٹے ترپالوں میں لپٹے ہوئے تھے جبکہ اڈے کے اکلوتے چھپر ہوٹل کے باہر بھی سرکنڈوں کی بنی ہوئی چک دکھائی دے رہی تھی۔ آگ سینکنے کی خواہش آمیز توقع دم توڑ گئی۔ میں چند لمحوں تک نہر کے پل پر بنی ہوئی چھوٹی سی کنکریٹ کی دیوار پر بیٹھا رہا پھر پھلوں کی ایک ملفوف ریڑھی کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی سی تگ ودو کے بعد میں دو تین کیلے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ انہیں ندیدوں کی طرح حلق سے اُتارا۔ نلکے کی ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پیا، شارٹ گن کی نال کو چوما اور پل کے قریب پڑے ہوئے بند چوبی کھوکھے کے نیچے پھینک دیا۔ ایک ہتھ ریڑھی پر سے قدرے بہتر حالت کی ترپال اُتار کر چادر کی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لی۔ اب میں پہلی نظر میں مشکوک دکھائی نہیں دیتا تھا اور سرد ہوا سے بھی محفوظ ہو گیا تھا۔ اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے سڑک کے کنارے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ گزرنے والے دو تین ٹرکوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ایک لانگ روٹ کی بس بھی ہارن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ مجھے ڈر لاحق ہوا کہ کوئی پولیس کی گاڑی ادھر نہ آ نکلے۔

رنگ برنگ بتیوں کے جلو میں آتی ہوئی ایک بس دکھائی دی تو میں نے دونوں بانہیں لہرا کر ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہیں رُکی مگر اُس کے عین پیچھے آنے والی کالٹس کار رُک گئی۔ ایک شوخ آواز سنائی دی، ''اوئے جہاز..... کتھ ویسیں؟''

(اوئے جہاز! کہاں جاؤ گے؟)

میں جلدی سے قریب ہوا۔ کار کی اندرونی لائٹ آن تھی۔ دھمک دار آواز میں ٹیپ پلیئر پر لتا منگیشکر کا کوئی گیت چل رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نہایت وجیہہ اور خوش لباس جوان بیٹھا ہوا تھا جو پہلی نظر میں کھلنڈری طبیعت کا مالک معلوم ہوا۔

میں نے کہا، ''مجھے مظفر گڑھ جانا ہے۔''

وہ بڑی معصومیت سے بولا، ''تو جاؤ؛ میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہے۔''

میں نے دروازے پر جھک کر ملتجیانہ انداز میں کہا، ''کوئی سواری نہیں مل رہی ہے اس لیے براہِ کرم مجھے لفٹ دے دیں۔''

وہ حیرت اور دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا، ''حلیے سے جہاز لگتے ہو۔ لہجے سے پائلٹ افسر جبکہ شکل سے زخمی مزدور..... کمال کے آدمی ہو یار تم..... چلو آ ؤ، بیٹھ جاؤ۔ کیا یاد کرو گے۔''

میں نے عقبی دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے بولا، ''نہیں یار..... اگلی سیٹ پر آ ؤ۔''

میں اس کے برابر بیٹھ گیا تو اس نے شیشہ چڑھا دیا اور گیئر لگاتے ہوئے بولا، ''تم نے سر پر خلجی دور کی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے۔ ایک پٹی جھانک رہی ہے جس پر خون لگا ہوا ہے۔ کیا ہوا؟ کہیں یہ جہاز غلطی سے بجلی کے کھمبے پر لینڈ تو نہیں کر گیا؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''میں نشئی نہیں ہوں۔''

اس نے مصنوعی تعجب سے کہا، ''اچھا! تم نشئی نہیں ہو..... تو پھر یقیناً میں نشئی ہوں۔ نشہ کرتا ہوں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔''

''کہہ بھی لو تو کیا فرق پڑ جائے گا۔'' اس نے ایک قہقہہ لگایا اور سٹیئرنگ پر انگلیاں بجاتے ہوئے گنگنانے لگا، ''یارو! مجھے معاف کرو، میں نشے میں ہوں..... یارو!''

وہ دیکھنے میں نہ صرف بہت ہینڈسم، پڑھا لکھا اور نفیس مزاج تھا بلکہ خاصا خوش ذوق اور خوش گفتار بھی واقع ہوا تھا۔ گاڑی اَپ ماڈل کی تھی۔ اچھی کنڈیشن میں موجود تھی۔ اس نے بڑا شاندار سوٹ پہن رکھا تھا۔ بال نسبتاً چھوٹے اور فوجیوں کے انداز میں تراشیدہ تھے۔ چونکہ گاڑی کا ہیٹر چل رہا تھا، اِس لیے اس کی سیٹ پر کوٹ لٹک رہا تھا۔

اس کی گنگناہٹ تھم گئی۔ ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے، بولا، ''یار! تم نے میرا ایکس رے کر لیا ہے۔ اپنی الٹرا ساؤنڈ رپورٹ بھی دکھا دو۔ میرا مطلب ہے کہ تم کچھ اپنے بارے کہو، خاموشی مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

میں نے کہا، ''میں مصیبت کا مارا ہوا شخص ہوں؛ اس کے سوا میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے دوست.....''

خود پر قابو پانے کے باوجود میرے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ وہ بولا، ''ہوں..... یہ دنیا، دنیا نہیں، مصیبت گاہ ہے..... ٹارچر سیل۔ یہاں ہر کوئی مصیبت میں ہے۔ کوئی نئی بات کرو؛ بتاؤ..... اپنی اس امپورٹڈ شال پر روشنی ڈالو۔ ایسی خوبصورت شالیں بے قدرے لوگ اپنی گاڑیوں پر ڈال دیتے ہیں۔ ہے نا؟''

اس کی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ میں نے شرمسار ہو کر کہا، ''ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔''

''اور ایجاد کی ماں کے ہوتے ہوئے بھی تم سردی سے کانپ رہے ہو۔'' وہ ہنسا، ''زخم کا خون جما ہوا ہے۔ لگتا ہے، کافی پرانا ہے۔ یقیناً تمہیں پٹی بدلوانے کا وقت نہیں ملا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''اسلم علی۔'' میں نے جھوٹ بولا اور سر جھکا لیا۔

میں اس کی نظروں میں مشکوک ہو گیا تھا۔ وہ مجھے نشئی سمجھ رہا تھا اور میں اپنے دفاع میں خود پر ڈھائی جانے والی قیامت کو اس پر آشکار نہیں کر سکتا تھا، اس لیے خاموش ہو گیا۔

وہ بولا، ''کہاں سے آ رہے ہو؟ اب یہ نہ کہنا کہ میں وہاں سے آیا ہوں، جہاں سے ہر آدمی آتا ہے۔''

''میں بیلے سے آ رہا ہوں۔''

''کیا مظفر گڑھ میں رہتے ہو؟''

''نہیں..... ملتان میں رہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ادھر کیا کرنے آئے تھے؟'' وہ بولا، ''صبح کی سیر کا سن رکھا ہے، رات کی سیر کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اس لئے یہ جواب نہ دینا۔''

''میں رشتہ داروں سے ملنے آیا تھا۔''

''اور انہوں نے پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے ذرا ٹھکائی شکائی کر دی..... چچ..... چچ..... کہا ناں کہ یہ دنیا ٹارچر روم ہے..... نہیں بلکہ ٹارچر کمپلیکس ہے۔'' وہ ہنسا۔ وہ ہنستا ہوا بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ہم چوک قریشی سے گزرے۔ پورا قصبہ گہری نیند میں مستغرق تھا۔ اڈے پر کوئی دکان کھلی ہوئی نہیں تھی۔

وہ کہہ رہا تھا، ''ڈیئر! میں اگر چاہتا تو چوک قریشی کے تھانے کے سامنے گاڑی روک دیتا اور

تمہیں گیسٹ ہاؤس میں پہنچا کر مصیبتوں سے نجات دلا دیتا مگر میں اَب تک تمہیں پہچان نہیں سکا۔ تم واقعتاً کسی مصیبت میں ہو یا پیشہ ور ڈاکو ہو.....''

میں نے مضبوط لہجے میں کہا، ''میں چور ڈاکو نہیں ہوں۔''

''تو کیا پٹواری ہو؟'' وہ ہنسا، ''اگر تمہارا جواب 'ہاں' میں ہوا تو یہ بھی بتا دینا کہ تمہارا بستہ کہاں ہے۔''

''نہیں.....'' میں نے کہا، ''میں پٹواری نہیں ہوں۔ مزدور ہوں۔ تم بتاؤ! تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام.....میرا نام یہ لکھا ہوا ہے۔ پڑھ لو۔''

اس نے ڈیش بورڈ پر ننھے ننھے الفابیٹیکل اسٹکرز کی مدد سے لکھے ہوئے نام کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے زیرلب پڑھا، ''شاہد.....''

''ہوں..... یار تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ لفٹ مانگنے کے علاوہ کیا کام کرتے ہو؟'' میری سمجھ میں آ گیا کہ اُس نے نام بتانے کے بجائے انگریزی میں لکھے ہوئے نام کی طرف اشارہ کیوں کیا تھا۔

''کہا تو ہے کہ مزدوری کرتا ہوں۔''

''ریس کورس گراؤنڈ میں گھوڑوں کو نہلاتے ہو؟'' اس نے کمال سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں تو.....!'' میں چونکا، ''میں زمیندارہ کرتا ہوں۔''

''ملتان شہر میں؟'' وہ ہنسا۔

''نہیں.....ملتان کے قریب، گاؤں میں۔''

''جھوٹ.....تمہاری آواز بتا رہی ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے تمہارا انٹرویو بند کر دینا چاہیے۔'' اس نے کہا اور آٹو ریورس ٹیپ پلیئر کا بٹن پش کر کے کیسٹ کی سائیڈ بدل دی۔ لتا کے ہم آواز گنگنانے لگا، ''ہم نے صنم کو خط لکھا، خط میں لکھا.....اے دل رہا، دل کی گلی.....''

اس کی گنگناہٹ اچانک تھم گئی۔ مجھے دیکھے بغیر سنجیدہ لہجے میں مخاطب کر کے بولا، ''مسٹر! اگر تم خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہو اور تمہیں کسی دشمن کا خوف ہے تو گلوو کمپارٹمنٹ میں سے میرا پسٹل نکال لو۔ فلی لوڈڈ ہے، کام آئے گا۔''

میں نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اُسے سنجیدہ پا کر میں نے کہا، ''شکریہ! مجھے ضرورت نہیں ہے۔''

وہ قدرے تحکمانہ لہجے میں بولا، ''کھولو تو سہی۔''

میں نے بے دلی سے گلوو کھولا۔ اس نے درست کہا تھا۔ ایک چھوٹے سائز کا سلور کلر کا پسٹل پڑا ہوا تھا۔ میں نے پسٹل کو چھوئے بغیر شاہد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا، ''چیک کرو؛ ایک دم جینوئن اور ولائتی مال ہے۔''

میں نے پسٹل اُٹھایا۔ اس کا سرسری جائزہ لیا اور واپس رکھ دیا۔ وہ بولا، ''چاہیے تو رکھ لو..... میں اور لے لوں گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور گلوو بند کر دیا۔ وہ منہ بنا کر بولا، ''میرا یہ اندازہ بھی غلط ہوا۔ سوچا تھا کہ تم کوئی ڈاکو ہو۔ رات گئے شکار کی تلاش میں بھٹک رہے ہو مگر اسلحے سے عاری ہو؛ تبھی یہ سہولت دے دی مگر جب تم نے پستول مجھ پر تان کر نہیں کہا کہ 'نکال دو جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے' تو مجھے مایوسی ہوئی۔''

''مگر تم کیوں لٹنا چاہتے تھے؟'' مجھے اس کی شخصیت دم بہ دم حیرت کے سمندر میں غرقاب کیے دے رہی تھی۔

''تاکہ تم اپنا کام کر کے چلتے بنو اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا، ''چھوڑو اس تذکرے کو؛ اگر مناسب سمجھو تو اپنی مصیبت پر روشنی ڈال ہی دو۔ دیکھتے ہیں کہ اِس پٹاری سے کون سا سانپ نکلتا ہے۔ بائی داوے! میں تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ چاہو تو فائدہ اُٹھالو۔''

میں نے کہا، ''نہیں۔ تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ تمہاری یہی مدد میرے لئے بہت ہے کہ تم نے اجنبی ہونے کے باوجود مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ دے دی ورنہ اَب تک میں وہاں سردی میں ٹھٹھر کر مر گیا ہوتا۔''

وہ مسکرایا، ''تم آسانی سے مرنے والے لگتے تو نہیں ہو۔''

اس کی توجہ کا مرکز میری ذات تھی۔ میں نے اُس کا دھیان ہٹانے کے لیے پوچھا، ''تم اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو؟''

''یعنی مجھے اِس وقت ڈرائیونگ نہیں کرنی چاہیے۔'' اس نے رَسان سے کہا۔

''ہاں! نقصان کا اندیشہ ہے۔''

''کیسا نقصان؟'' وہ عام سے انداز میں مستفسر ہوا، ''جانی یا مالی؟''

''کوئی سا بھی.....'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرا نقصان ہو چکا ہے۔ میری زندگی کی سب سے قیمتی شئے چھین لی گئی ہے۔ اب کسی بھی واردات کا خطرہ نہیں رہا۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''تم سمجھو گے بھی نہیں۔'' وہ بولا، ''یہ دنیا خوب صورت عذاب کدہ ہے۔ تم سردی میں ٹھٹھر کر مرنے جا رہے تھے جبکہ میں جلتی ہوئی آگ میں کھڑا ہوں اور موت کو آوازیں دے رہا ہوں۔ ہے ناں عجیب بات کہ تم بھی ناخوش؛ میں بھی دکھی۔''

میں نے کہا، ''تم شکل سے تو دکھی نہیں لگتے ہو۔''

''ہاں! خون نچڑ جائے تو بھی چہرہ سفید ہو جاتا ہے۔''

وہ بہت باتونی اور چالاک تھا۔ بات سے بات نکالتا تھا۔ میں نے کہا، ''تم ڈیرہ غازی خان سے آ رہے ہو؟''

''نہیں..... میں پل غازی گھاٹ تک گیا تھا۔''

''اس وقت؟''

''لوگ وقت کے محتاج ہیں۔ سورج نکلتا ہے تو وہ گھر سے نکلتے ہیں۔ سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شام کو گھر پہنچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں سورج کی پروا کیے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ اُسے جب نکلنا ہو، نکل آئے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔'' وہ بولا، ''وہاں بہت ضروری کام تھا۔''

''ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں..... شاید کبھی ہو گا بھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں غیر متوقع طور پر مایوسی گھل گئی، بولا، ''پل پر سے دریا میں کودنے کا ارادہ تھا۔ یعنی خودکشی کا..... پھر دل نے ساتھ نہیں دیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ مرنے سے پہلے میں سردی کی اذیت برداشت کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے اِس اہم ترین کام کو کسی مناسب وقت پر ٹال کر واپس آ گیا ہوں۔''

''خودکشی؟ مگر کیوں؟'' مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ خودکشی

کا مرحلہ بہت گہرے دکھ کے بعد درپیش ہوتا ہے جبکہ اس کا چہرہ طمانیت اور آسودگی کو ظاہر کر رہا تھا۔ میں نے کہا، ''شاید تم مذاق کر رہے ہو۔''

''شاید.....'' اس نے کندھے اُچکائے اور سیٹی بجانے لگا۔

مجھے اچنبھا سا ہوا۔ اس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ میں نے اُس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ بہروپیا معلوم ہوا۔ کبھی ہنسنے والا؛ کبھی رونے والا اور کبھی ایک دم سنجیدہ مزاج..... میں نے چوٹ کی، ''اگر تم چاہو تو اپنی سٹوری کا سکرپٹ سنا دو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔''

وہ ہنسنے لگا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ پھر اچانک خاموش ہو گیا اور بولا، ''ہاں! انسان انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ شاید اسی لیے خدا نے ایک سے زیادہ انسان پیدا کئے ہیں۔ تم میرا دُکھ سن لو، یہی بہت بڑی مدد ہو گی تمہاری۔''

میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اُسے اپنے انٹرویو سے ہٹا کر جواب دہ کر لیا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور کہا، ''میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟ اوہ نو..... تم تو خود نشئی ہو..... پتہ نہیں چرس پیتے ہو، ہیروئن پھیپھڑوں میں اُتارتے ہو یا رگوں میں ٹیکے لگواتے ہو..... پر مجھے کیا؟ میں تو اپنا دکھ بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ کیا سننے کے لئے تیار ہو؟''

میں نے کہا، ''ہاں! میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

وہ بولا، ''میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ افوہ! میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ کرتا تھا..... کیا مطلب؟..... کرتا ہوں..... ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ محبت کیا ہوتی ہے، جانتے ہو؟ کبھی تم نے کسی سے محبت کی ہے؟''

میں نے کہا، ''محبت کے بغیر کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم اپنی بات جاری رکھو۔''

''یہ بھی بکواس ہے میرے دوست..... کیا نام بتایا تھا تم نے..... ہاں! اسلم علی..... یہ جتنے سرمایہ دار لوگ ہیں، مل اونرز اور سیاست دان ہیں..... ان پر محبت کا دورہ نہیں پڑتا۔ ان پر دولت کی ہوس کا دورہ پڑتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اور وہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہم نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں، چوری چوری ملاقاتیں کیں..... پھر پھڈا ہو گیا۔ یہ ہیر رانجھا اور سسی مہینوال کی سٹوری میں ولن موجود ہے۔ ہے ناں؟ بس سمجھو ویسا ہی ایک ولن ہماری محبت کی کہانی میں آن وارد ہوا اور 'لو کرائسیس' شروع ہو گیا۔''

ہم اس دوران مظفر گڑھ شہر میں داخل ہو گئے تھے۔ اس نے سلسلہ کلام جوڑا، ''شہر آ گیا ہے۔ ابھی تم کہو گے کہ میں تمہیں اُتار دوں۔ اس طرح میری محبت کی طرح میری کہانی بھی ادھوری رہ جائے گی۔ اگر برا نہ مانو تو میں گاڑی ایک طرف روک دوں اور اپنی بات پوری کرلوں؟''

اس کے لہجے کی معصومیت نے مجھے مضطرب کر دیا۔ وہ جتنا کھلنڈرا اور شوخ طبع دکھائی دیا تھا، اس سے کہیں زیادہ پریشان اور ملول نظر آنے لگا تھا۔ میں نے کہا، ''شاہد! میرا حلیہ ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس دیکھ کر دھر لے گی اور میں ایک نئی مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔''

اس نے گاڑی روڈ سائیڈ پر روک دی اور بولا، ''پولیس کا فکر نہ کرو۔ میرا دکھ سن لو۔ میں کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتا۔ اگر یہی حالت رہی تو میرا دل پھٹ جائے گا یا کوئی دماغی رگ پھٹ جائے گی۔''

اس نے امید بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، 'جو ہو گا دیکھا جائے گا' اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سگریٹ کار لائٹر سے سلگائی اور بولا، ''تھینکس گاڈ!'' پھر شیشہ اُتار کر دھواں باہر اُچھالتے ہوئے بولا، ''یار! وہ بڑی خوب صورت تھی۔ اتنی کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہونے لگتی تھی۔ وہ بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتی تھی۔ ہم دونوں نے شادی کا تہیہ کر رکھا تھا مگر اس کا باپ ولن کے روپ میں ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ اُسے اپنے کسی بھانجے بھتیجے سے بیاہنا چاہتا تھا۔ پھر جانتے ہو، کیا ہوا؟''

میں نے لقمہ دیا، ''اس کی وہاں شادی ہو گئی جہاں اس کا باپ چاہتا تھا اور تمہارا کھیل ختم.....''

''نہیں یار..... یہ تو سیدھا سادا 'اینڈ' ہے۔ میری کہانی کا اینڈ بڑا ایڈونچرس ہے۔ میری محبوبہ ایک شام گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئی۔ کسی نے کہا کہ وہ اپنے یار کے ساتھ کہیں منہ کالا کر گئی ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ بہت خوب صورت تھی، اس لئے اُسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ پہلی بات غلط تھی۔ اس کے چہرے پر تقدس کا اتنا طاقتور نور ثبت تھا کہ دنیا بھر کی سیاہیاں اسے کالا نہیں کر سکتی تھیں۔ یعنی اُسے اغوا کیا گیا تھا۔ ہائے! محبت انسان کو طاقت دیتی ہے مگر اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ میں جو اس کے لیے آسمان سے تارے توڑ لانے کا دعویٰ رکھتا تھا، اُسے بازیافت نہیں کرا سکا۔ تف ہے میری مردانگی پر..... میرے اختیارات پر.....''

اس نے سگریٹ کا لمبا کش پھیپھڑوں میں اُتارا اور شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا، ''وہ نہیں ملی مگر میں زندہ ہوں جبکہ میں نے کئی مرتبہ اس کی گہری آنکھوں کو چوم کر وعدہ کیا تھا کہ اُس کے بغیر ایک دن بھی زندہ نہیں رہوں گا؛ مر جاؤں گا۔ جس دن میں نے یہ کہا تھا، اس دن نہ تو میری آنکھوں کے سامنے میری ماں کا چہرہ ابھرا تھا، نہ اکلوتی بہن کا، نہ باپ کا..... آج جب اس عہد کو نبھانے کا وقت آیا ہے تو سبھی چہروں نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ میں نے یہ سائنس بھی پڑھ لی ہے کہ ایک کی محبت میں زندگی گنوا کر مجھے تین سچی محبتوں کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیے۔ ہے ناں سائنس..... امریکہ اس سائنس کا پیروکار ہے۔ کہتا ہے کہ میں پاکستان کی محبت میں اتنا آگے نہیں جانا چاہتا کہ بھارت کی تجارتی منڈی میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ سچ کہتا ہوں کہ یہ دنیا مصیبت گاہ ہے ڈیئر!''

بات کرتے کرتے اس کا گلا رُندھ گیا تھا اور چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا تھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ میرے استعجاب سے لاتعلق تھا، بولا، ''آج میں گھر سے چور کی طرح چپکے سے نکلا تھا۔ ارادہ تھا کہ غازی گھاٹ کے پل پر کھڑے ہو کر اپنی محبوبہ کو پکاروں گا۔ خدا سے پوچھوں گا کہ اگر اس نے مجھ مہینوال کی قسمت میں سوہنی کا ملاپ کرانا لکھا ہی نہیں تھا تو پھر ہمیں ملانے کی کیا ضرورت تھی؟..... کروڑوں اربوں کی دنیا میں میرے سوا اُس نے کسی اور دل میں سوہنی کی محبت کیوں پیدا نہیں کی تھی؟..... ہے ناں پرابلم؟..... اگر میں اسے من مندر کی رانی بنانے کے قابل نہیں تھا تو پھر اُس وقت پھٹ کیوں نہیں گیا جب میں نے اُس کے خوب صورت ہونٹوں کا پہلا بوسہ لیا تھا؟..... مجھے آگ کیوں نہیں لگی تھی اُس وقت، جب میں نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر کر خدا کو ہی اپنی محبت کا ضامن بنایا تھا؟..... ہائے دوست! میں خدا سے یہی پوچھنے کے لیے گیا تھا کہ اگر اس کی اتنی بڑی دنیا میں ہم دو محبت کرنے والے شادی کر لیتے تو اس کے فول پروف سسٹم میں کیا گڑبڑ رونما ہو جاتی؟''

اس کی آواز پھٹنے لگی۔ میرا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ میں نے اُس کا شانہ تھپتھپایا اور ورطۂ حیرت میں ڈوب کر استفسار کیا، ''پھر؟''

''پھر کیا؟ اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ جواب دہ ہونا پسند نہیں کرتا۔ میں نے کئی مرتبہ بلند آواز میں پکارا۔ وہ نہیں بولا۔ مگر پکٹ پر ڈیوٹی دینے والے سپاہیوں نے سن لیا اور للکارتے ہوئے میرے سر پر پہنچ گئے۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے۔ اگر میری جگہ پر کوئی اور ہوتا تو اُسے پکڑ

کر اندر کر دیتے اور کہتے کہ تم قانون کی اجازت کے بغیر مرنے کا اختیار نہیں بھی رکھتے..... میں نے انہیں گالیاں دے کر بھگا دیا اور خدا کو مخاطب کر کے کہا کہ میں احتجاجاً تمہاری دی ہوئی زندگی تمہیں لوٹانے آیا ہوں۔ یہ بہت بڑا دریا ہے، اسے بندے نگلنا آتا ہے، میں جانتا ہوں۔ مجھے تیرنا نہیں آتا، یہ بات دریا جانتا ہے۔''

وہ ایک پل کو رُکا پھر بولا، ''ایسے میں ماں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کیا ایک لڑکی اس قابل ہوگئی ہے کہ وہ مجھ سے میری مامتا چھین کر دریا کے سپرد کرنے چل پڑی ہے؟ چشم تصور میں کالج جاتی ہوئی بہن نظر آنے لگی۔ اس نے کہا کہ بھائی! انتظار کرو، میں بھی تمہارے پیچھے آ رہی ہوں کیونکہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ باپ کے چہرے کی جھریاں گہری ہونے لگیں۔ وہ بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا..... یار! وہاں سردی بھی بہت تھی۔ دریائی ہوا نے میرے ارادے کی دیوار میں ان گنت سوراخ کر دیے..... میری روح کے سبھی جذبوں کو منجمد کر دیا اور پھر سائنس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے سمجھایا کہ تمہارے مرنے سے اغوا ہونے والی کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ تمہاری بہن کو اغوا ہونے سے کون بچائے گا؟ تمہارے باپ کا سہارا کون بنے گا؟ ہے ناں بزدلی کی بات؟.....اور ڈیئر! میں نے اس ڈاکٹرائن کے آگے سر جھکا دیا کیونکہ در پردہ میں بھی مرنا نہیں چاہتا تھا..... زندگی ایک بار ملتی ہے۔ لڑکیاں بار بار ملتی ہیں۔ ہے نا؟ پر میں پاگل ہوں۔ یہ جانتا ہوں، پھر بھی اسی لڑکی کو ہی سوچتا رہتا ہوں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ ہے تو جہاں ہے، وہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسا دوسروں کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ یقیناً!''

میں نے کہا، ''یہ ڈاکٹرائن منطقی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ اس سے انکار کرنے والا جاہل اور بزدل قرار پاتا ہے؛ اس پر عمل کرنے والا دانش مند ہوتا ہے۔ تم نے دریا میں نہ کود کر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایسے ہی وقت میں مجھے سامنے سے آتی ہوئی گھومتی ہوئی نیلی بتی والی پولیس موبائل وین دکھائی دی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے گھبرا کر وین کی طرف اشارہ کیا، ''وہ..... وہ پولیس کی گاڑی آ رہی ہے..... پلیز! یہاں سے نکل چلو ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔''

وہ اپنی پیدا کردہ سوگوار ٹرانس سے نکل آیا اور بولا، ''کہاں کہ فکر نہ کرو۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''تم نہیں جانتے کہ میں کن ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ پولیس والے مجھے دیکھتے ہی پکڑ لیں گے۔''

''کیوں؟ کیا تم نے پولیس والوں کے پیسے دینے ہیں، یا کوئی خطرناک شہناری مجرم ہو؟'' اس نے طویل سانس حلق سے خارج کی، ''اگر ہو بھی تب بھی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا تم کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں نہیں!'' میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ایسے میں موبائل وین قریب آ گئی تھی۔ شاہد نے گاڑی کی لائٹس سے رکنے کا مخصوص اشارہ کر کے موبائل وین کو روکا۔ نیلے رنگ کی موبائل وین، جس کے بونٹ پر سفید رنگ سے بڑے حروف میں پولیس لکھا ہوا تھا، سوزوکی کے عین سامنے، چند قدموں کے فاصلے پر آن رکی۔ میں نے شاکی نظروں سے شاہد کو دیکھا جو لاپروا بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔ بیٹھا رہتا تو حراست میں لے لیا جاتا اور بھاگنے کی کوشش کرتا تو میری کمر چھلنی ہو جاتی۔

میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا، ''تم نے اچھا نہیں کیا۔''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں خوف زدہ نظروں سے وین کے ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے پولیس اہلکار کو دیکھنے لگا جو دروازہ کھول کر شاہد کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے شاہد کو سلام کیا اور قدرے مؤدبانہ لہجے میں کہا، ''خیر تو ہے فوجی صاحب! آج ہماری جگہ ڈیوٹی دینے لگے ہیں۔''

شاہد نے ہنس کر کہا، ''اوئے نکے تھانیدار! یہ ڈیوٹیاں شیوٹیاں تمہیں مبارک ہوں، میں تو دیکھ رہا تھا کہ تم لوگ اپنے بڑے صاحب کو چکر دیتے ہو یا واقعی رات کو گشت پر نکلتے ہو۔''

''کوٹھی پر جا کر انہیں بتا دیجئے گا کہ ان کے ماتحت کس جانفشانی سے سرکاری فرائض سرانجام دیتے ہیں۔'' اس نے جواباً دانت نکالے، ''یہ کون صاحب ہیں آپ کے ساتھ؟''

''یہ میرا رقیب ہے..... ہاہا..... رقیب! پر تم کیا جانو، یہ رقیب کس بلا کا نام ہے۔'' شاہد پر سوار غم واندوہ کا تاثر چند لمحوں میں ہی زائل ہو گیا تھا، بولا، ''اوئے نکے تھانیدار! سچ بول، تیرے قانون کے پاس کوئی ایسی دفعہ ہے، جس کے لگانے سے میرا رقیب ساری عمر حوالات میں پڑا رہے اور میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ موجاں شوجاں کرتا رہوں؟''

''فوجی صاحب! ہمارے قانون میں ہر دفعہ موجود ہے۔ آپ حکم کر کے دیکھیں۔ نگینے کی

طرح قانون کی انگوٹھی میں ایسے جڑوں گا کہ قیامت تک نکل نہ پائے گا.....'' نکا تھانیدار چھاتی پھلا کر بولا، ''ایک بس بابا جی کو سنبھالنا آپ کے ذمہ رہا۔ اسے ساری عمر چکروں میں ڈالے رکھنا میرا کام.....''

میری سانس حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔ مجھے دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن کر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شاہد کوئی معمولی حیثیت کا شخص نہیں تھا بلکہ کسی بڑے آفیسر یا سیاست دان کا من چلا بیٹا تھا اور اس سب انسپکٹر عرف نکے تھانیدار سے خاصا بے تکلف بھی تھا۔

سب انسپکٹر سوزوکی کالٹس کی چھت پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور اجازت طلب انداز میں بولا، ''کوئی خدمت ہمارے لائق؟''

''یار! اُدھر جھنگ موڑ سے دو چار نمکین ککڑ پکڑ لاؤ..... زور کی بھوک لگی ہے۔ یہ کم بخت گاڑی چلتی کم اور اچھلتی زیادہ ہے۔ کھایا پیا سب ہضم کرا دیتی ہے، منٹوں میں..... یہ پکڑو پیسے اور اس کے سر پر کھڑے ہو کر روسٹ کرانا..... زیادہ نہیں، بس دو چکن چیسٹ پیس!''

اس نے جیب میں سے ایک بڑا نوٹ کھینچا اور سب انسپکٹر کو تھما دیا۔ اس نے مروتاً دو تین مرتبہ نوٹ لوٹانا چاہا مگر شاہد نے سختی سے روک دیا اور کہا، ''تم مجھے دو پیس کھلا کر عوام سے بیس اصیل ککڑ اینٹھ لو گے۔ ناں یار! مجھے بددعاؤں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ تم لوگوں کو تو خیر توپ سے بھی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ اوئے ہاں! پانی کی بوتلیں بھی پکڑ لانا۔''

وہ ہنستا ہوا پلٹ گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر واپس جھنگ موڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے دم میں دم آیا۔

شاہد شگفتہ لہجے میں بولا، ''میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم نے مجھ پر ڈاکہ نہیں مارا؛ بھلے دنیا کو تگنی کا ناچ نچاؤ، انگلیوں پر تھرکاؤ، مجھے کیا۔ ویسے دنیا میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

میں نے مرعوب ہو کر پوچھا، ''تم کیا کام کرتے ہو؟''

وہ بولا، ''بتایا تو ہے کہ زندگی میں ایک ہی کام چھیڑ رکھا تھا۔ وہ بھی مکمل نہیں ہوا۔ میں اپنے عشق کی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے کہا، ''اس کے علاوہ؟''

''فوج میں ہوں..... ورزش کرنے کے پیسے سرکار سے اینٹھتا ہوں۔ اچھا کھاتا

ہوں۔ٹھنڈا گرم، سب پیتا ہوں۔مگر جب سے میری معشوقہ اغوا ہوئی ہے، میں ڈیوٹی پر نہیں گیا۔اُدھر، فوج میں، اپنا ایک یار بیٹھا ہوا ہے۔وہ کبھی میری حاضری لگا دیتا ہے، کبھی چھٹی..... اور محسوس نہ کرنا؛ پولیس والے سے مذاق کیا ہے میں نے.....تم میرے رقیب نہیں ہو۔ویسے تو اِس وقت پوری دنیا میری رقیب ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہر چیز کو آگ لگا دوں۔''

وہ بڑی روانی سے گفتگو کرتا تھا۔خوبروئی کے بعد یہ اُس کی دوسری بڑی خوبی تھی۔تھوڑے توقف کے بعد گویا ہوا، ''ہم کیا بات کر رہے تھے؟''

''تم اپنی ناکام محبت کی کہانی سنا رہے تھے۔''میں نے یاد دلایا۔

''ہاں یار.....بہت غلط ہوا۔میری محبوبہ غائب ہوگئی۔میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اُس کا ننھا منا سا بھائی بھی اغوا ہوا تھا۔وہ کچھ عرصہ کے بعد اچانک گھر پہنچ گیا۔تب تک میں، میرا باپ اور لڑکی کے ماں باپ ان دونوں کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔جب بچے نے بتایا کہ اس کی بہن بھی زندہ ہے، تب کارِ جستجو کے لیے ہمارے جسموں میں نئی جان پڑ گئی مگر بازیاب ہونے والا بچہ ایسا کوئی کلیو نہ دے سکا جس پر چلتے ہوئے میں، اس کے والدین یا پولیس مغویہ تک پہنچ جاتے۔میں نے اُسے بہت کریدا مگر اس نے عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والی کہانی سنا کر میرے ذہن کو مزید الجھا دیا۔''

میں ہونقوں کی طرح اُسے دیکھ رہا تھا۔اچانک میرے ذہن میں جھپاکا سا ہوا اور آگہی کا نیا جہان مجھ پر کھلتا چلا گیا۔میری نظروں کے سامنے ایک پل کو وحید کا چہرہ جھلملایا۔وہ اپنی بہن عاشی کے ساتھ اغوا ہوا تھا اور مجھے بیلے میں جان بہ لب ملا تھا۔پھر اُسے ملتان سے گاڑی پر بٹھا کر گھر اکیلے روانہ کر دیا گیا تھا۔عاشی کا غم زدہ دیوانہ، جس سے ملنے کے لئے وہ مظفر گڑھ آیا کرتی تھی، یقیناً یہی تھا۔شاہد سلیم.....

میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا، ''ڈیش بورڈ پر تمہارا نام شاہد لکھا ہے۔تمہارا پورا نام شاہد سلیم ہے؟''

وہ چونکا، ''ہاں.....میرا نام شاہد سلیم ہے۔مجھے تخلیق کرنے والے سلیم شہزاد ایس ایس پی نے اپنا نام میرے نام کے ساتھ اس لیے چپکا رکھا ہے کہ میں کبھی اُسے فراموش نہ کر سکوں۔مگر تم کیسے جانتے ہو؟''

مجھ سے غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ معاملے کو سنبھالنے کے لیے میں نے بات بنائی، ''میں نے تمہارا نام سن رکھا تھا۔ سب انسپکٹر کا مؤدبانہ رویہ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ تم سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بیٹے شاہد سلیم ہو۔ میرا اندازہ ٹھیک ثابت ہوا۔''

وہ سر ہلا کر بولا، ''چکن پیس آ رہے ہیں۔ وہ کھالیں، پھر بات کریں گے۔''

پولیس کی موبائل وین دکھائی دی۔ چند لمحوں بعد سب انسپکٹر نے موبائل وین سے اُتر کر شاہد کو فوڈ پیک، منرل واٹر کی دو چھوٹی بوتلیں اور بقایا رقم تھمائی اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔ شاہد نے فوڈ پیک کھول کر درمیان میں رکھ دیا۔ گاڑی میں اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی۔ وہ ایک ٹماٹو کیچ اَپ کے ساشے کو ناخنوں کی مدد سے کھولتے ہوئے بولا، ''موجاں شوجاں اُڑاؤ ڈیئر! اسے میری کہانی کو اچھے سامع کی طرح سننے کا انعام سمجھو۔''

میں نے ایک چکن پیس اُٹھالیا۔ پوچھا ''تمہاری محبوبہ کے بھائی نے واپس آ کر کیا بتایا؟''

''ننھا بڑا اَپ سیٹ تھا۔ نارمل نہیں تھا۔ اس پر میں نے بڑی محنت کی اور پولیس کے روایتی ہتھکنڈوں سے بچا کر معلومات حاصل کیں۔''

''پھر؟ کیا بتایا اُس نے؟'' میں نے دلچسپی لی۔

''ہاہ! جو بتایا، وہ بھی کارآمد نہ ہوا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اور اس کی بڑی بہن سائیں دل جیت سے ملنے کے لیے نور پور نامی گاؤں میں گئے تھے۔ انہیں سائیں نے شربت پلا کر بے ہوش کیا اور کسی نامعلوم مکان میں شفٹ کر دیا۔ میں نے پولیس کو لے کر سائیں دل جیت پر ریڈ کیا تو پتہ چلا کہ وہ اُسی دورانیے میں نور پور سے فرار ہوگیا تھا۔ کسی کو بھی اُس کے بارے میں علم نہیں تھا۔''

''وہ کیسے رہا ہوا؟ یہ اُس نے نہیں بتایا؟'' میں نے کریدا۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا؛ پھر تادیر ہنستا رہا۔ میں نے تعجب سے پوچھا، ''کیا ہوا؟ کیا اُس نے تمہیں کوئی لطیفہ سنایا تھا؟''

اس نے عجیب سے انداز میں آنکھیں پھیلائیں اور مجھے بغور دیکھا۔ بولا، ''دیکھا! ہمارے باپ دادا کتنے چالاک لوگ تھے۔ انہوں نے لکھ رکھا ہے کہ عورت کے دل کا راستہ اولاد ہے جبکہ مرد کے دل کا راستہ پیٹ سے نکلتا ہے۔ چکن پیس ہاتھ میں آتے ہی تمہاری دلچسپی میری کہانی میں زیادہ ہوگئی ہے۔''

مجھے ایک ذرا شرمندگی ہوئی۔ وہ میرے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا، ''چٹنی بھی لوناں..... شرمندہ کیوں ہوتے ہو بھئی! زندگی کھانے پینے کے علاوہ ہے ہی کیا؟..... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ننھے مغوی نے واپسی پر ان دو اشخاص کے نام بھی بتائے تھے، جو اُسے کسی جنگل سے نیم مردہ حالت میں اُٹھا کر اپنے ساتھ ملتان لے گئے تھے۔ ایک کا نام شہریار جبکہ دوسرے کا نام خالد عرف کھالا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ شہریار کا گھر نور پور میں واقع سائیں جگ جیت کے مزار کے قریب ہے۔ ہمیں وہاں جا کر پتہ چلا کہ کھالے کا گھر بھی اسی گاؤں میں واقع تھا۔ دونوں آپس میں بڑے جگری یار تھے اور دونوں ہی گاؤں سے غائب تھے..... نہ سائیں ملا، نہ وہ دونوں ہاتھ لگے..... تفتیش جہاں سے شروع ہوئی تھی، بدقسمتی سے وہیں پر ختم ہوگئی!''

وہ خاموش ہوگیا۔ پھر سپیڈو میٹر کی تھمی ہوئی سوئی پر نظریں مرتکز کر کے خاموشی سے پیس کھانے لگا۔ یوں لگا جیسے میری موجودگی اچانک ہی اُس کے نزدیک بے معنی ہوگئی تھی۔

میرے پیٹ کی بھڑکی ہوئی آگ بجھ گئی تھی۔ منرل واٹر کی آدھی بوتل حلق سے اتاری اور بکس میں پڑے ہوئے ٹشو پیپر کھینچ کر ہاتھ منہ صاف کیا۔ کہا، ''یار! تم تو واقعی بہت دکھی انسان ہو۔''

وہ زہر خند انداز میں مسکرایا، پھر چیلنج بھری نظروں سے مجھے گھورتا ہوا بولا، ''تم میری مدد کر سکتے ہو، اگر چاہو تو.....''

''وہ کیسے؟'' میں چونکے بنا نہ رہ پایا۔

''تم ملتان میں رہتے ہو۔ شکل سے اعلیٰ درجے کے آوارہ لگتے ہو۔ کوشش کرو تو ان دونوں کا کھوج لگا سکتے ہو جنہوں نے ننھے وحید کی جان بچائی تھی۔ ہیں؟''

میرا ماتھا ٹھنکا، پوچھا، ''تم انہیں کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''یار! وہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے وحید کو کہاں سے اُٹھایا تھا۔''

''اگر انہوں نے تمہیں کچھ نہ بتایا تو؟''

وہ بڑے یقین سے بولا، ''وہ دنیا کے سب سے بڑے کمینے انسان ہوں گے جو میری دکھ بھری داستان سن کر بھی تعاون پر آمادہ نہ ہوں گے۔ اگر انہیں کوئی مجبوری لاحق ہوئی تو میں کمپرومائزنگ تھیوری پر عمل کروں گا۔ اگر پھر بھی نہ مانے تو..... انہیں سلیوٹ کروں گا اور اپنی قسمت کو روتا دھوتا لوٹ آؤں گا کیونکہ انہوں نے ایک انسان کی جان بچانے کا اعزاز حاصل کر رکھا ہے۔''

اس کا لہجہ بڑا پختہ مگر کرب سے لبریز تھا۔ اس کی نیم بھرائی ہوئی جذبات سے مغلوب آواز نے مجھ پر اداسی اور شکست خوردگی طاری کر دی۔ میں نے کچھ دیر سوچا، پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''ممکن ہے؛ وہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے منظرِ عام پر نہ آنا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں تم کیا کرو گے؟''

''میں انہیں کسی کے سامنے لے کر جانا بھی کیوں چاہوں گا۔ مجھے وہ نہیں، اپنے چند سوالوں کے جواب درکار ہیں۔'' وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا، ''کیا تم انہیں تلاش کر سکتے ہو؟''

میں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ دل اُس کی مدد کا ارادہ رکھتا تھا مگر ذہن الجھن زدہ تھا۔ چونکہ وہ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کا بیٹا تھا، اس لئے مجھے کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا۔ وہ میری خاموشی کو انکار سمجھ کر بولا، ''یار! تم کوشش تو کر سکتے ہو۔ دیکھو! اگر تمہیں پیسوں کی پرابلم ہے تو سمجھو اِٹ از نو پرابلم..... جتنے مانگو گے، اتنے دوں گا۔ ہوں؟ اگر تم انہیں ڈھونڈ نکالو گے تو تگڑا انعام بھی دوں گا۔''

میں نے کہا، ''شاہد! تم بہت اچھے انسان ہو۔ ایک لڑکی کے لئے اتنی سنجیدگی سے سوچتے ہو، یہ تمہاری عظمت کی دلیل ہے مگر.....''

''کہا نا! میری مدد کرو۔ میں تمہارا منہ نوٹوں سے بھر دوں گا۔'' وہ اسٹیئرنگ پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

میں اس دوران دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اس پر اپنا آپ آشکار کر دینا چاہیے۔ میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور کہا، ''او کے مسٹر شاہد سلیم! میں تمہاری الجھنیں دور کر دیتا ہوں۔ مگر بدلے میں تم مجھے کیا دو گے؟''

وہ ایک دم میری جانب پلٹا اور میرا بازو تھام کر سنجیدگی سے بولا، ''مجھے تمہاری ہر ڈیمانڈ منظور ہے؛ بولو..... کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا، ''میں تمہاری مدد کرتا ہوں، تم میری مدد کرو..... بس! مجھے پیسے نہیں، یہ وعدہ چاہیے کہ تم مجھے پولیس کے حوالے نہیں کرو گے اور نہ ہی منظرِ عام پر لاؤ گے۔''

اس کے چہرے پر غیر معمولی استعجاب رقم ہو گیا، ''کیا مطلب؟ میں تمہیں کیوں پولیس کے حوالے کروں گا؟ کیا تم نے کوئی جرم کر رکھا ہے؟..... اگر ایسا ہے تو بھی، تو مجھے کیا..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ تم بس کسی طرح ان دونوں کو تلاش کر دکھاؤ..... میں

احسان فراموش شخص نہیں ہوں۔ میں تو محبت کرنے والا انسان ہوں۔ اور..... اور..... میں کسی کو گزند پہنچانے کا خواہش مند ذہن نہیں رکھتا۔ صرف اُسے الٹا لٹکاؤں گا جس نے میری جانِ من کو میری نظروں سے دور کر رکھا ہے۔''

اس کے رویے نے اُس کے اخلاص کو مجھ پر عیاں کر دیا۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا اور کہا، ''تو پھر وعدہ کرو؛ اپنی محبوبہ کی قسم کھاؤ کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھو گے۔''

اس نے بڑے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا، کچھ سوچا اور کہا، ''میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔''

میں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور ٹھہر ٹھہر کر کہا، ''شاہد! میں نے تمہیں اپنا نام اسلم بتایا تھا۔ میں اسلم نہیں ہوں بلکہ شہریار ہوں۔ وہی، جس نے وحید کی زندگی بچائی تھی۔ میں تمہاری اور عاشی کی محبت سے بھی واقف ہوں۔ لو! میں نے تمہاری بہت بڑی الجھن دور کر دی ہے، تم اپنا وعدہ نبھانے کا فکر کرو۔''

میری آواز سے چیلنج جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ کھلنڈرا پن عنقا ہو گیا اور وہ مجھے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ شاید اُسے یقین نہیں آ رہا تھا حالانکہ میں نے اُسے یقین دلانے کے لئے عاشی کا حوالہ دیا تھا جبکہ اس نے مجھے اپنی محبوبہ کا نام نہیں بتایا تھا۔

وہ بولا، ''تم شہریار ہو؛ وہی جس نے وحید کو بچایا تھا اور تم نے میری محبوب ترین ہستی کا نام بھی لیا ہے..... عاشی..... کیا تم نے یہی کہا ہے؟''

میں نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، ''ہاں! میں نے یہی کہا ہے۔ اب تم جو چاہو، دریافت کر لو۔ میں بتانے کو تیار ہوں۔''

اس کی لمبی زبان شاید دانتوں تلے دب گئی تھی۔ کافی دیر بعد اس کی تھکی تھکی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''مگر تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟''

''کہانا تو ہے کہ مصیبت میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کس مصیبت میں؟''

''یہ لمبی اور غیر متعلقہ کہانی ہے۔ تم اپنی بات کرو۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

اس نے ایک ذرا مجھے دیکھا اور ہنسا۔ پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا، ''ہم گھر چل رہے ہیں۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں شاہد! جو پوچھنا ہے، یہیں پوچھ لو پھر جھنگ موڑ اُتار کر گھر چلے جانا۔ وہاں سے مجھے ملتان کے لیے بس یا ویگن آسانی سے مل جائے گی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور حتمی انداز میں بولا، ''یہ نہیں ہوسکتا۔ تمہاری حالت درست نہیں ہے۔ جو بھی دیکھے گا مشکوک ہو جائے گا۔ صبح ہونے والی ہے۔ نہا کر چینج لینا اور ناشتہ ہڑپ کر کے ملتان چلے جانا۔ مجھ پر شک نہ کرنا۔ میں نے تمہیں دوست کہا ہے اور کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرے خلوص پر حرف آئے۔ کہاں ناں!''

''تمہارا باپ.....''

''تم نے اگر پچاس قتل کر رکھے ہیں اور کروڑوں روپے تمہارے زندہ یا مردہ سر کی قیمت مقرر ہے، تب بھی میں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں نے وعدہ کیا ہے یار!''

میں نے اس کے پختہ ارادے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور سر جھکا لیا۔ لذیز چکن پیس نے جسم کو توانائی دی تھی، کار کے چلتے ہوئے ائر ہیٹر نے رگوں میں اُتری ہوئی سردی کو نوچ پھینکا تھا مگر میں مکمل طور پر فٹ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے سر کے زخم کی نوعیت کیا تھی مگر یہ محسوس ہوتا تھا کہ زخم علاج طلب تھا۔ آرام کی بھی ضرورت تھی۔ سخی محمد کے ساتھ دو آبے کی طرف جانے کے لئے میڈم کی کوٹھی پر پہنچنے کے بعد سے اَب تک ایک لمحہ کو بھی چین نہیں آیا تھا۔ شاہد دیکھنے میں بے ضرر اور یار باش انسان تھا، اس پر یقین کیا جا سکتا تھا، تبھی میں نے خود کو اُس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

جھنگ موڑ پر پولیس وین کھڑی تھی۔ چکن پیس لا کر دینے والا سب انسپکٹر پانچ چھ سپاہیوں کے نرغے میں ہوٹل کے باہر کھڑا تھا۔ سبھی نے ہاتھوں میں ربڑی دودھ کے پیالے تھام رکھے رہے تھے۔ شاہد نے ان کے قریب جا کر گاڑی آہستہ کی، شیشہ اُتارا اور نعرہ لگایا، ''شاوا بھئی سرکاری جوانو.....''

سبھی نے بیک آواز جواب دیا، ''شاہد صاحب زندہ باد!''

وہ پیچھے رہ گئے۔ شاہد نے ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجائی اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد اس نے مین روڈ پر واقع سرکاری رہائش گاہ کے نیلے اور سرخ رنگ کے بڑے آہنی گیٹ پر بریک لگائے۔ ہارن کی آواز سن کر گیٹ کے ملحقہ سکیورٹی روم میں سے ایک سپاہی برآمد ہوا۔ اس نے شاہد کو سلام کرنے کے بعد گیٹ کھول دیا۔ سرکاری کوٹھی کی عمارت گیٹ سے کوئی تین سو

فٹ کے فاصلے پر اپنے کروفر سمیت موجود تھی۔ پارکنگ میں نیلے کلر کی نیلی بتی والی ایک لینڈ کروزر اور ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی۔ شاہد نے پارکنگ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی گیٹ وے پر کھڑی کر دی اور مجھے اُترنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر اتر گیا۔ میں نے اُس کی تقلید کی۔ باہر قدم رکھتے ہی سرد ہوا کا جھونکا بدن سے ٹکرایا اور مجھے یاد آیا کہ میں زندگی جیسی طویل اور موت جیسی سرد رات کا مسافر تھا۔

کوٹھی کے اگلے حصے میں دو سنتری گیس ہیٹر آن کئے سٹولوں پر بیٹھ کر ہاتھ سینک رہے تھے۔ انہوں نے اُٹھ کر شاہد کو سلیوٹ کیا۔

شاہد نے تحکمانہ لہجے میں کہا، ''انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ۔ گیزر آن کر دو تا کہ ہم منہ ہاتھ دھولیں۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

وہ کوٹھی کے اندر چلا گیا جبکہ ایک سنتری نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں پہنچا دیا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا تو اس نے گیس ہیٹر آن کر دیا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے تشکیک آمیز لہجے میں بولا، ''صاحب! میں گیزر چلانے جا رہا ہوں۔''

وہ چلا گیا تو میں نے سرسری نظروں سے گیسٹ ہاؤس کا جائزہ لیا۔ کافی پُر آسائش جگہ تھی۔ آرائش کا انداز بھی سادگی مگر جاذبیت لئے ہوئے تھا۔ تھوڑی دیر بعد شاہد کی آواز سنائی دی۔ وہ سنتریوں سے باتیں کرتا ہوا گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔ سیدھا میری طرف آیا اور کھڑے کھڑے بولا، ''کچھ دیر میں پانی گرم ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم نہالو اور فریش ہو جاؤ۔''

میں نے حیرت سے کہا، ''اس وقت؟''

''پانی گرم ہو تو پھر دن کیا اور رات کیا؟'' وہ آنکھیں نچا کر بولا، ''تمہاری حالت خاصی رَف ہے۔ پہلی نظر میں اجڈ اور پیشہ ور چور ڈاکو معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے بدن پر لپٹی ہوئی ترپال، کیچڑ اور دھول میں اَٹی ہوئی نوروزی چپل اور میلے چیکٹ لباس پر نظر ڈالی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس نے قدرے تحکم آمیز آواز میں کہا، ''تمہیں یقیناً میرا لباس فٹ آئے گا۔ پہن کر اس خرقے سے نجات حاصل کر لو۔''

میں نے اپنی کنپٹی پر ہاتھ رکھا، ''مگر میرے سر میں زخم ہے۔ گیلا ہو کر خراب ہو جائے گا۔''

''اس کا بھی کچھ کرتے ہیں۔ ویٹ فار اے مومنٹ ڈیئر!''

وہ ایڑیوں کے بل گھوما اور واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہینگر میں لٹکتا ہوا سوٹ اور میڈیکل

کٹ اُٹھالایا۔ اس نے مجھے ٹیوب لائٹ کے نیچے قالین پر بٹھایا اور پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لینے لگا۔ بولا، ''زخم تو خاصا گہرا ہے۔ شاید خراب بھی ہو گیا ہے..... نہیں..... ابھی پیپ نہیں پڑی۔ اس کی صفائی کر کے واٹر پروف جیل لگا دیتا ہوں۔ نہاتے ہوئے احتیاط سے کام لینا۔ پٹی بعد میں کر دوں گا۔''

جدید طرز کی میڈیکل کٹ میں حادثاتی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ضروری سامان موجود تھا۔ اس نے زخم کی اطرافی جلد صاف کی، بال کاٹے اور اسپرٹ اور ہائیڈروجن پر اکسائیڈ کی مدد سے صفائی کرنے لگا۔ محسوس ہوا کہ تکلیف میں پہلی سی شدت نہیں رہی تھی۔

میں نے پوچھا، ''کیا ٹانکے لگانا پڑیں گے؟''

''نہیں۔ زخم گہرا ہے، بڑا نہیں ہے۔ جس گدھے ڈاکٹر نے پٹی کی تھی، اگر وہ سویب صحیح جگہ پر رکھتا تو اب تک زخم ٹھیک ہو چکا ہوتا۔ خیر..... فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے دلاسا دیا، ''مظفر گڑھ آنے سے پہلے پاپا کی اپائنٹ منٹ ڈسٹرکٹ وہاڑی میں تھی۔ وہاں پاپا کا ایک دوست ہوا کرتا تھا..... ڈاکٹر اکمل مجید..... میں اُسے انکل 'بالکل جدید' کہا کرتا تھا..... وہ نہ صرف پاپا کا بلکہ میرا بھی اچھا دوست تھا۔ وہ مجھے میتھ کی ٹیوشن بھی دیا کرتا تھا اور میں نے اس سے میتھ پڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی سیکھ لیا۔ ہے ناں مزے کی بات؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ غصے سے بولا، ''زبان ہلاؤ، سر کو حرکت نہ دو پینڈو پیشنٹ!''

اس کے ہاتھوں کی حرکت ماہرانہ تھی۔ زخم پر جیل کا لیپ کرنے کے بعد اس نے مجھے سوٹ تھمایا اور باتھ روم کی طرف دھکیل دیا، ''شیونگ کا سامان الماری میں پڑا ہے۔ یہ جھاڑ جھنکار بھی کاٹ پھینکنا۔ بہت برا لگ رہا ہے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ مجھے فریش ہونے کے لئے باتھ لینا چاہئے تھا۔ گرم پانی نے نہ صرف میری تھکن اُتار دی بلکہ میں خود کو نہایت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ یوں لگا جیسے مجھے نئی زندگی میسر آ گئی ہو۔ چینج لینے کے بعد قدِ آدم آئینے نے تائید کی کہ میں واقعی چینج ہو گیا تھا۔ بالوں کو احتیاط سے سنوارتے ہوئے باتھ روم سے باہر آیا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو کر بولا، ''اب ہوئی ناں بات..... تم تو اچھے خاصے انسان نکلے ہو ڈیئر!''

میں کھسیا کر، اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر قالین پر بیٹھ گیا۔ وہ کاٹن سویب کی مدد سے جیل

صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا، ''نہایت بدتمیز انسان ہو یار تم تو..... کہا بھی تھا کہ احتیاط سے کام لینا۔ تین سو روپے کی امپورٹڈ جیل لگائی تھی تاکہ زخم گیلا نہ ہو۔ تم نے پھر بھی زخم گیلا کر دیا۔ افوہ! جاہل شخص کی یاری بھی کسی امتحان سے کم نہیں ہوتی۔ پر ایک بات ہے مسٹر پینڈو! تمہارے بال بڑے ملائم اور شائنی ہیں؛ ایک دم کسی ینگ فرنچ گرل کی طرح..... واو!''

نیٹو ٹیپ کی مدد سے اس نے سمارٹ بینڈ تیج کی، اینٹی بیاٹک اور پین کلر گولیاں کھلائیں اور اُٹھ کر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے فارغ کر دیا۔

میں نے اُسے بے حد ممنون نگاہوں سے دیکھا تو وہ بڑی لاپروائی سے بولا، ''میں جوتے لینے جا رہا ہوں۔ ڈرو مت، ماروں گا نہیں..... پہناؤں گا۔''

پھر قالین پر میرے اُتارے ہوئے لباس اور ترپال پر پڑی ہوئی نوروزی کھیڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دل کھول کر ہنسا، ''یہ لکڑی مار کہ کھڑاؤں تو میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں، پیروں میں ڈال کر ان کی بے حرمتی نہیں کرنی چاہیے۔ اِسے دیکھو! کیسی عجیب ٹوپی ہے۔ شاید ظہیر الدین بابر کے کسی مشیر وزیر کی ہے۔ اور ہاں! چائے کا موڈ ہے؟''

میں نے شرمسار ہو کر کہا، ''شاہد! میں اتنا اہم نہیں ہوں۔''

''مجھے مطلب بھی تو ہے تم سے۔'' وہ ہنس کر بولا اور گیسٹ ہاؤس سے نکل گیا۔ کوئی دس منٹ بعد جوتوں کا ڈبہ، جس پر ایک مہنگی کمپنی کا مونوگرام چھپا ہوا تھا، اُٹھائے لوٹا اور میرے پیروں کے قریب فرش پر رکھتے ہوئے بولا، ''اس میں جرابیں بھی ہیں..... پہن لینا۔ تھوڑی دیر میں سنتری بادشاہ چائے لے آئے گا۔ پینا اور اُدھر جا کر سو جانا۔ میں بھی تھکا ہوا ہوں، جا کر آرام کروں گا۔ صبح بات ہوگی۔ ٹھیک ہے ناں؟''

میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی، ''صبح تو ہونے والی ہے۔''

وہ بولا، ''میں نے کہا تھا ناں کہ میں سورج کی حکمرانی کو قبول نہیں کرتا ہوں۔ جب جاگوں گا، تب میری صبح ہوگی۔ او کے ڈیئر! ٹیک کیئر..... اینڈ سی یو اِن کمنگ مارننگ۔''

اس نے ہاتھ لہرایا، دل آویز خوب صورت مسکراہٹ میری جانب اُچھالی اور پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سنتری نے چائے کا کپ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ چائے پینے کے بعد میں جوتے اور جرابیں اُٹھائے ملحقہ بیڈ روم میں گھس گیا۔ نہایت آرام دہ بیڈ پر گرتے ہی موٹے اور ملائم کمبل نے مجھے آغوش میں لے کر گہری نیند سلا دیا۔ ذہن کی غلام

گردشوں میں چکرانے والا آخری رقصاں خیال یہی تھا کہ میں موت کا لمبا سفر طے کر کے زندگی کی پُرحدت آغوش میں سر رکھ چکا تھا اور قسمت نے مجھے اُس شخص سے اتفاقاً ملا دیا تھا جس سے ملنے کی خواہش میرے دل میں چپکے چپکے پلتی رہی تھی۔

نصف دن گزر گیا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ پرسکون اور بھرپور نیند لینے کے وجہ سے میری حالت بہتر ہو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہونے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ کمرے کی صفائی کی جا چکی تھی اور میرا نامعقول اور میلا کچیلا لباس غائب تھا۔ گیس ہیٹر اب بھی چل رہا تھا جس کی وجہ سے سردی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ میں نے اپنی کنپٹی کو ٹٹولا۔ معمولی نوعیت کا درد محسوس ہوا۔ ایک آدھ دن میں زخم ٹھیک ہونے والا تھا۔ جب ایک وردی پوش نے جھانکا، میں دیوار گیر پینٹنگز دیکھنے میں مصروف تھا۔ مجھے بیدار دیکھ کر اُس نے دریافت کیا، ''سر! کھانا تیار ہے، لے آؤں؟''

''شاہد کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ خیال آنے پر فوراً ہی تصحیح کی، ''میرا مطلب ہے شاہد صاحب دکھائی دیں تو انہیں بتا دینا کہ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''یس سر! میں نے کھانے کے بارے پوچھا ہے۔'' اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔

''یس.....''

پانچ منٹ بعد اس نے ڈائننگ ٹیبل پر پرتکلف کھانا چن دیا۔ مجھے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ میں نے کھانے سے انصاف کیا، ڈرنک لیا اور شاہد کا انتظار کرنے لگا۔ وہ نصف گھنٹے بعد آیا۔ ٹراؤزر اور برہنہ کندھوں والی شرٹ پہنے ہوئے تھا اور کالج بوائے لگ رہا تھا۔ مجھے ہشاش بشاش دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا اور بولا، ''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟''

میں نے کہا، ''نہیں۔ شکریہ!''

''میں نے پاپا سے بات کی تھی۔ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی تو آفس میں ہیں۔ جلد آنے کا کہہ گئے تھے۔''

''یار مروانہ دینا۔'' میرے ذہن میں تشویش کا کیڑا رینگ گیا، ''میں عام آدمی نہیں ہوں.....''

''یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ تم عام نہیں، خاص آدمی ہو۔'' وہ میری بات کاٹ کر شوخی سے

بولا۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا، ''میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں پولیس کا سامنا نہیں کرسکتا۔''

''اشتہاری ہو؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔''

''تمہیں اتنی سی بات کی سمجھ بھی نہیں آتی کہ سپرنٹنڈنٹ کی کوٹھی پر سے تمہیں کون گرفتار کرنے کی جرأت کرسکتا ہے؟''

''سپرنٹنڈنٹ آف پولیس.....'' میں نے برجستہ کہا۔

''سپرنٹنڈنٹ صاحب کا آفیسر بھی میری مٹھی میں ہے۔ تم جانتے ہو، وہ کون ہے؟'' وہ مسکرایا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا، ''میری ماما اُن کی آفیسر ہیں۔''

میں نے مسکرا کر خاموشی اختیار کرلی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ٹھٹک گیا۔ کان لگا کر کچھ سنتا رہا پھر بولا، ''لگتا ہے، پاپا آ گئے۔''

اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ چند لمحوں بعد ایس ایس پی سلیم شہزاد کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے سفید لٹھے کا کلف شدہ لباس پہن رکھا تھا۔ شاہد وجاہت اور نین ونقوش میں اپنے باپ پر گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور جب وہ صوفے پر بیٹھ گیا، میں بھی مؤدبانہ انداز میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گہری نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور بڑے شائستہ لہجے میں خیریت دریافت کی، پھر شاہد کو مخاطب کیا، ''میرا خیال ہے کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں اپنے موضوع پر گفتگو کرنی چاہئے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

شاہد نے اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز میں عاشی اور وحید کے اغوا کی کہانی اور اب تک اپنی اور محکمہ پولیس کی کارگزاری بیان کی۔ کم وبیش یہی باتیں اُس کے منہ سے میں نے پہلے ہی سن لی تھیں۔ اس نے تھوڑے توقف کے بعد مجھ سے ہونے والی اتفاقیہ ملاقات کا ماجرا سنایا اور بولا، ''پاپا! شہریار اور اس کے ساتھی خالد نے وحید کو نیم مردہ حالت میں اُٹھایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ جب وہ ٹھیک ہوا تو انہوں نے اُسے بس میں بٹھا کر گھر روانہ کردیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی انکوائری..... میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے عشرت تک پہنچنا ہے۔''

سلیم شہزاد نے اُس کا کندھا تھپتھپایا اور پیار سے کہا، ''اگر میں نے محبت نہ کی ہوتی تو شاید تمہیں نصیحت کرتا کہ اس کا خیال دل سے نکال دو۔ اب یہ کہتا ہوں کہ فکر نہ کرو، تمہارا خلوص تمہیں اُس تک پہنچا دے گا۔'' پھر میری طرف مڑے، ''ہاں تو بیٹا! مجھے یہ بتاؤ، کیا تم وحید کو پہلے سے جانتے تھے؟''

''جی سر!'' میں نے کہا۔

''سر نہیں..... انکل کہو یار! یہ میرے پاپا ہیں، پولیس آفیسر نہیں ہیں۔ جب کبھی ان سے دفتر میں ملنے کا اتفاق ہو، تب شوق سے 'سر' کہنا۔'' شاہد نے بے تکلفی سے کہا۔

''جی انکل!'' میں نے فوراً تصحیح کر لی۔

سلیم شہزاد مسکرایا اور مصنوعی غصہ بھری آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا، ''وحید تمہیں کہاں ملا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ تم نے اُسے نیم مردہ حالت میں کہاں سے اُٹھایا تھا؟''

میں نے حیدر خان کی حویلی، بیلے، بھیڑیے اور وحید کے بارے تفصیل سے بتا دیا۔

وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر نرمی سے مستفسر ہوا، ''تم اُس حویلی میں کیا لینے گئے تھے؟''

میں نے اُسے پروین کے اغوا کا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ بہت ذہین آدمی تھا۔ سننے کے ساتھ ساتھ گہری نظروں سے میرے بیان کی صداقت میری آنکھوں سے کھوجتا جاتا تھا۔ بولا، ''تمہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ تمہاری بہن کو سردار حیدر خان نے اغوا کر کے اپنی اُس خفیہ حویلی میں رکھا ہوا ہے؟''

میں نے سر جھکا لیا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو میں نے ہمت کر کے کہا، ''نہیں انکل! ان باتوں کا تعلق عشرت کے اغوا سے نہیں ہے، اس لئے مجھے جواب دینے پر مجبور نہ کیجئے۔''

''او کے..... او کے..... کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی بہن کے اغوا کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی تھی؟''

''نہیں..... اگر تھانے جا کر ایف آئی آر درج کرانے کی درخواست دیتا تو نئی مصیبت میں پڑ جاتا۔ پولیس والے بڑے خان کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ ہوتے۔ دادرسی کیا کرتے، الٹا مجھے حوالات میں ڈال دیتے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ عشرت کو اُسی حویلی میں رکھا گیا تھا اور تمہارے جانے سے پہلے کسی اور نے اُسے وہاں سے نکال لیا؟''

''جی انکل!''

''تمہارے بتائی ہوئی کہانی سے میں یہ نتیجہ اخذ کروں تو غلط نہیں ہوگا کہ سردار حیدر خان، چوک قریشی کے تھانے دار اور ڈی ایس پی نے مل کر بیلے میں پولیس مقابلے کا جو کھیل کھیلا تھا، وہ اِسی بساط پر سجایا گیا تھا جس کا تم تذکرہ کر رہے ہو۔ کیا تم میرے خیال سے متفق ہو؟'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

میں نے پورے وثوق سے کہا، ''جی انکل! اسی واقعے سے ملک کے تمام پولیس مقابلوں کی صداقت میری نظروں میں مشکوک ہوگئی ہے۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا پھر قدرے توقف سے پوچھا، ''سائیں دل جیت شاہ کا سردار حیدر خان سے کیا تعلق ہے؟..... اس نے عشرت اور وحید کو اغوا کر کے اُس حویلی میں کیوں پہنچایا تھا؟''

میں نے کہا، ''دونوں کے مفادات سانجھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سائیں دل جیت حیدر خان کا کارندہ ہے۔ اس کی پشت پناہی پر جرائم کے آسمان پر پروازیں کرتا ہے۔''

''تمہارے خیال میں اِس وقت عشرت کہاں ہوگی؟''

''میں اُسے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر تعجب سے پوچھا، ''تمہارا اُس سے کیا تعلق ہے؟''

''میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جہاں وہ ہوگی، وہیں میری بہن بھی ہوگی۔''

''اوہ.....'' اس کے لب سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے، ''کیا دونوں لڑکیاں محفوظ ہوں گی اب تک؟''

میرا دل مٹھی میں آ گیا۔ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیر کر بولا، ''دعا کرتا ہوں کہ وہ جہاں ہوں، خیری سلامتی ہوں۔''

''تمہارے خیال کے مطابق مجھے کیا کرنا چاہیے؟..... ایز بیئنگ آ پولیس آفیسر.....''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل؟'' میں نے چونک کر کہا، ''اگر ممکن ہے تو آپ سردار حیدر خان

کو اَریسٹ کرلیں۔ اُس پر مقدمہ بنائیں اور اسے اغوا کے جرم میں سزا دلوائیں۔''

اس کی ہنسی بڑی زہر خند تھی، ''وہ ثبوت کہاں سے لاؤں جنہیں دیکھ سن کر عدالت اس الزام کو مان جائے؟''

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا، اس لئے خاموش رہا۔ شاہد نے گفتگو میں حصہ لیا، ''ہم وحید کو اُس کمرے میں لے جاسکتے ہیں پاپا جہاں اُسے اغوا کے بعد رکھا گیا تھا۔ اس کی نشاندہی ثبوت کا درجہ نہیں رکھتی کیا؟''

''رکھتی تو ہے مگر اس کی حیثیت کمزور ہے۔'' ایس ایس پی سلیم شہزاد نے کہا پھر مجھے مخاطب کر کے پوچھا، ''تم آج کل کیا کرتے ہو؟''

''بتایا تو ہے آپ کو..... میں اپنی بہن کو تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ جب وہ ملے گی، تب کوئی کام دھندا چھیڑوں گا۔''

''نور پور میں تمہارے گھر پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ دو آدمیوں کو گھر کے ساتھ زندہ جلا دیا تھا۔ تم نے ان لوگوں کو قتل کر دیا اور موقع سے فرار ہو گئے۔ وہ کیا کہانی تھی؟'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے مدد طلب نظروں سے شاہد کو دیکھا۔ وہ جھٹ سے بولا، ''پاپا! فاؤل نہ کھیلیں پلیز!''

سلیم شہزاد کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ اپنے بیٹے کو دیکھ کر بولا، ''تمہارے جیسے ریفری کی موجودگی میں بھلا میں کیا فاؤل کھیلوں گا۔ او کے..... اب میں چلتا ہوں، تم اپنے نئے دوست کو کمپنی دو۔ یہ تھانہ چوک قریشی کو مطلوب ہے۔ تھوڑا دھیان رکھنا۔ اگر ممکن ہو تو اِسے کسی محفوظ ذریعے سے ملتان پہنچا دینا۔ فون نمبروں کا تبادلہ کر لینا۔ رابطہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔''

وہ اُٹھا، شاہد کے گال پر چپت لگانے کے بعد مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا، ''بیٹا! ڈرو مت۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ شاہد کے کلاس فیلو ظفر یاب کا باپ، سردار بخت خان، بڑا معقول آدمی ہے۔ میرا دوست بھی ہے۔ اس نے مجھے تمام رام کہانی سنا کر تمہاری مدد کی درخواست کی تھی۔ اگر کبھی میری ذات پر بھروسہ کرنے کی جرأت اپنے اندر پانا تو مجھے رازدار بنا لینا۔ مگر اَبھی نہیں..... پھر کبھی سہی..... گڈ بائی!''

وہ چلا گیا تو شاہد میرے قریب کھسک آیا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑے ملتجیانہ انداز میں کہا، ''دوست..... مجھے تم نے دوست کہا ہے ناں..... اور مجھ پر اعتماد کیا ہے ناں تم

نے؟..... دیکھو! سچ کہتا ہوں کہ میں اپنی عشرت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے پاپا نے بتایا ہے کہ تم بڑے دل گردے والے انسان ہو۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

میں نے اُس کے غیر معمولی سرخ چہرے کو، آنکھوں میں اُتری ہوئی نمی کو دیکھا اور تہہ دل سے ڈھارس دی، ''میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں؛ خدا نے چاہا تو عاشی جلد ہی تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔''

''شہریار! تم غیرت کی جنگ لڑ رہے ہو جبکہ میں عشق کی بازی ہار رہا ہوں۔ تمہاری اور میری قلبی کیفیات میں زمین و آسمان کا فرق حائل ہے۔ میرے اندر نا کامی کی برف جم رہی ہے۔ تمہارے اندر الاؤ روشن ہے، وہ شعلے بھڑک رہے ہیں جو پوری دنیا کو جلانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ تم کہیں سے میری عشرت کو ڈھونڈ لاؤ ورنہ میں مر جاؤں گا..... رات کو دریائے سندھ پر سے لوٹ آیا تھا۔ دوبارہ جاؤں گا تو شاید لوٹنے کا یارانہ بھی نہ رہے۔''

''تمہارے پاپا.....''

''نہیں یار!'' اس نے میری بات کاٹ دی، ''وہ ہر جنگ کو قانونی ہتھیاروں سے لڑنے کے عادی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اُبھی اُڑ کر حیدر خان کے سر پر پہنچ جاؤں اور اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کو کھلا دوں۔ پاپا ثبوت مانگتے ہیں۔ اب انہیں کون بتائے کہ یہ شیطان جاگیردار اپنے جرائم کے ثبوت نہیں چھوڑا کرتے۔''

''تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تم ہی کچھ کر سکتے ہو شہریار! الہ دین کا چراغ رگڑو، کوئی جامِ جمشید ڈھونڈ لاؤ..... کچھ بھی کرو..... مجھے میری عشرت لا دو۔ فار گاڈ سیک ڈیئر!''

وہ اُٹھا اور پلک جھپکتے میں میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے بولا، ''انکار نہ کرنا یار! تم مسیحا بن کر میری زندگی میں آئے ہو۔ مسیحا کون ہوتا ہے، جانتے ہو؟ وہ جو خدا کی تخلیق کی ہوئی زندگی کو بچاتا ہے۔ تم نے وحید کی زندگی بچائی۔ میری بھی بچا لو۔ زندگی میں کبھی تمہارے کام آ جاؤں گا۔''

میں نے اُس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اپنے ساتھ اُسے بھی کھڑا کر دیا، پھر سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ایک ہی مسافت سے برسرِ پیکار بے سروساماں، خانماں خراب مسافر تھے۔ تبھی قدرت کی طرف سے مجھے اُس کی اور اُسے میری

محبت کا قیمتی جذبہ سونپ دیا گیا تھا۔

وہ چائے نہیں پیتا تھا مگر مجھے الوداعی چائے پلانا چاہتا تھا۔ چائے پینے کے دوران اس نے عاشی کی بہت سی یادیں میرے ساتھ شیئر کیں۔ اس نے بتایا کہ وحید بات بات پر میرا تذکرہ کرتا ہے اور تعریفیں کرتا نہیں تھکتا۔ وہ میرے بارے جتنا جانتا تھا، اُس نے سخنے درمے شاہد کو بتا دیا تھا۔ میری دلچسپی پر شاہد نے مجھے عاشی کے گھریلو حالات سے آگاہ کیا۔ عاشی کی ماں وحید کے آنے سے قبل اپنے حواس میں نہیں تھی۔ پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکراتی تھی اور تمام دن روتی اور چیختی تھی۔ اس کا باپ سجاول بھی ایب نارمل ہو گیا تھا۔ دکان مسلسل بند رہتی تھی اور وہ تھانے کی چار دیواری سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا تھا۔ پہلے تو عشرت کی ماں نے شاہد سلیم کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا مگر جب اُس نے بمشکل یقین دلا کر اپنی پوزیشن واضح کر دی تو وہ بالکل مایوس ہو گئی۔ اس کی دنیا لٹ گئی تھی۔ بیٹے اور بیٹی کے علاوہ دیکھنے کو بھری دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

مستزاد یہ ہوا کہ ہر کسی نے، بشمول سجاول اور اس کے خاندان کے، اُس پر انگلیاں اُٹھائیں اور لعن طعن کیا۔ بیٹی کے اغوا میں اُسے ملوث قرار دیا۔ یہ تک کہا گیا کہ وہ خود بھی گندی تھی، اس کی بیٹی بھی گندی نکلی۔ جو لوگ عاشی کا ہاتھ مانگنے کے لئے اُس کے پیروں کو چھوتے تھے، وہ تھو تھو کرنے لگے۔ ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ اس پر زوال کی گھڑی آ گئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر بیٹی کی زندگی کی دعا مانگنے کے ساتھ ساتھ دیواروں کو مخاطب کر کے کہتی تھی کہ اُس نے کوئی جرم نہیں کیا..... اس کی بیٹی نے کوئی جرم نہیں کیا..... دیواروں کے کان ہوتے ہیں مگر آنکھیں اور زبان نہیں ہوتی؛ اِس لئے مان جاتی ہیں مگر انسان نہیں مانتا۔

وحید اچانک گھر پہنچا تو ماں باپ کو جینے کا سہارا مل گیا۔ اکلوتے بیٹے کو زندہ و سلامت دیکھ کر دل کی دھڑکن چل پڑی۔ بیٹی کے مل جانے کی آس لگ گئی۔ پولیس نے بہت چاہا کہ عاشی کے اغوا میں نامزد ملزم کے طور پر میرا نام ایف آئی آر میں درج کیا جائے مگر عاشی کی ماں میری حمایت میں سینہ سپر ہو گئی۔ اسے وحید نے میرے بارے میں بتایا تھا اس لئے کس طرح بیٹے کی زندگی بچانے والی پر مقدمہ کرتی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر دعویٰ کرتی تھی کہ اس کی مامتائی آنکھوں نے مجھے دیکھنے کے بعد مجھے اچھا انسان سمجھا تھا۔ چونکہ تفتیشی آفیسر کے پاس میری ذات پر شک کا نہ جھٹلایا جانے والا جواز نہیں تھا، اس لئے وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ 'اگر آپ نہیں مانتی تو نہ سہی.....'

چار بجے کے قریب وہ اپنی سوزوکی میں بٹھا کر مجھے ٹیکسی اسٹینڈ پر لے آیا۔ ایک نئے ماڈل کی کار کے قریب تاش کھیلتے ہوئے ڈرائیور کو بلا کر تحکمانہ لہجے میں بولا، ''دن میں بیس مرتبہ حکم کا یکہ تمہارے ہاتھ لگتا ہے مگر جیب خالی رہتی ہے۔ پھر بھی پتوں پر تکیہ کئے رکھتے ہو بے وقوف آدمی! روزی روٹی کیا کرو؛ یہ احمقانہ گیم نہ کھیلا کرو۔ یہ میرا مہمان ہے۔ اِسے ملتان چھوڑ آؤ۔ بولو! کتنے پیسے لو گے؟''

اس نے رسماً کہا کہ 'صاحب! جتنے مرضی دے دو' پھر شاہد کے اصرار پر اس نے کرایہ بتایا۔ شاہد نے جیب سے پیسے نکالے اور گن کر اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولا، ''جاؤ، ڈیزل ڈلوا آؤ.....''

اس نے گاڑی نکالنے میں دیر نہیں کی۔ شاہد نے سگریٹ سلگائی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''شہریار! تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو مگر دوستی میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ اس لئے میرے رویے پر خفا نہ ہونا۔ تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؛ چونکہ میں نے وعدہ کیا تھا، اِس لئے مصر نہیں ہوا لیکن یہ تم پر قرض رہا۔ آئندہ ملاقات پر تفصیل سے سننا چاہوں گا کہ تم پر کیا بیتی ہے۔ تمہاری قانونی الجھنوں کو سلجھانے میں بھرپور مدد کروں گا۔''

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا، ''چلیں! دیکھیں گے کہ تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو۔''

اس نے ایک لمبا کش چھاتی میں اُتارا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا، ''تم نے پاپا سے کہا تھا کہ تجھے یقین ہے کہ تمہاری بہن اور عاشی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی ہیں۔ تمہیں اس بات پر یقین محض اِس لئے ہے کہ ان کے ساتھ تمہارا دوست موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس کی حیثیت بھی محض مغوی کی ہے۔ تمہیں یہ توقع ہے کہ اُسی نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دونوں کو اس خوف ناک حویلی سے نکالا ہو۔ ایسا ہی ہے ناں؟''

میں نے اس کا مدعا نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا، ''جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں ایک پھندے سے نکال کر دوسرے میں پھنسا دیا گیا ہے۔ پنجرے کا مالک بدلا ہے، پنجرہ نہیں۔''

اس کے خوب صورت چہرے پر فکر و تردد کی پرچھائیں لرزاں تھیں۔ میں بولا، ''میں تمہاری طرح منفی نہیں، مثبت انداز میں سوچنے کا عادی ہوں۔''

''حالات مایوس کن ہیں۔ اُمید کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔'' اس کی آنکھیں ایک دم بجھی بجھی سی لگنے لگیں، ''دیکھو شہریار! اگر تمہاری بہن حیدر خان کی قید سے نکل کر کسی اور قید میں نہیں گئی تو پھر اُس نے اَب تک تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بڑی پتے کی بات کی تھی۔ ایسے ہی وقت مجھے خیال آیا کہ پروین کو میرے موجودہ پتے ٹھکانے کا علم ہی نہیں تھا، رابطہ کیسے کرتی؟..... بعید نہیں تھا کہ وہ میری تلاش میں سرگرداں ہو۔ میں نے یہی بات شاہد سے کہی تو وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولا، ''تمہاری بہن کی حد تک تو اِس خوش گمانی میں رہا جا سکتا ہے مگر میرا گھر اور فون نمبر تو وہی ہے جسے عاشی مرتے دم تک بھول نہیں سکتی۔ اس نے کیوں مجھ سے رابطہ نہیں کیا؟ تم نے امیر نواز کا تذکرہ کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ بھی دونوں کے ساتھ ہے۔ اس کا گھر تو جل نہیں گیا اور نہ اس کے ماں باپ نے ٹھکانہ تبدیل کیا۔ اس نے اپنے گھر زندہ اور بخیریت ہونے کی خبر کیوں نہیں دی؟..... شہریار! میرا دل کہتا ہے کہ میری عاشی شاید مجھے کبھی نہ مل سکے گی۔''

اس کی شکست کے بوجھ تلے دبی ہوئی نیم مردہ آواز اور پختہ دلیل نے مجھے لحظہ بھر میں مضطرب کر دیا۔ میں نے جی کڑا کر کے اُسے تسلی دی، ''کم آن ڈیئر! یوں مایوس نہیں ہوتے۔ خدا پر اپنے یقین کو کامل اور ایمان کو پختہ رکھو۔ اس نے وحید کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں پہنچنے کا زندگی بھر میں نے ارادہ تک نہیں کیا تھا۔ ایسی ہی کوئی اچھی صورت عاشی اور پروین کے لئے بھی قسمت تشکیل دے دے گی۔ مجھے یقین ہے؛ تم بھی خود کو مضبوط رکھو ورنہ ہم ان کی مدد کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسے ہی وقت میں ڈرائیور نے فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی روکی اور ہارن بجایا۔ میں نے شاہد سے ہاتھ ملایا اور 'ٹیک کیئر' کہہ کر گاڑی کا رُخ کیا۔ جب میں سیٹ پر بیٹھ گیا، تب شاہد نے چیخ کر کہا، ''اوئے شہریار! تم نے کبھی عشق نہیں کیا..... تمہیں کسی نے محبت نہیں کی..... اس لئے فلسفہ بگھارتے ہو۔ کبھی جان شکنجے میں آ گئی تو پوچھوں گا..... پھر یہی نصیحت کروں گا، بڑے دانشوروں کی طرح..... ناؤ گڈ بائے ڈیئر!''

اس کی فطرت ہی ایسی تھی۔ پل میں ماشہ، پل میں تولہ..... میرے لبوں پر بے عنوان سی مسکراہٹ چپک گئی۔ ٹیکسی کی رفتار تیز ہو گئی۔ خوب صورت میزبان میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ملاقات کا آخری منظر..... اُس کا طعنہ بار ہنستا ہوا چہرہ میری آنکھوں میں کافی دیر کے لئے ثبت ہو کر رہ گیا۔

میں چار بجے کے لگ بھگ اپنے گھر پہنچ گیا۔ شانو نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ میری طویل غیر حاضری پر برہم تھی۔ فرزانہ اور موجو نے میری حمایت کرتے ہوئے اس چڑیل سے

میری جان چھڑائی۔ میرے سر پر بندھی ہوئی سمارٹ بینڈیج دیکھ کر بھی متفکر ہوئے۔ میں نے 'معمولی چوٹ ہے' کہہ کر انہیں مطمئن کیا۔ فوجی اختر نے مجھے بتایا کہ پیا جی نے سکول کے کاغذات نہ صرف مکمل کروا دیے ہیں بلکہ موجو کا قریبی انگلش میڈیم سکول میں ایڈمشن بھی کروا دیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی۔

اپنے کمرے میں آیا، بیڈ پر نیم دراز ہو کر ساتھ نتھی ہوئی شانو سے مخاطب ہوا، ''تم بھی سکول میں داخلہ لے لو۔''

وہ جھٹ سے بولی، ''بھائی! کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم بہت بدل گئے ہو۔ تم پہلے والے شہرے نہیں رہے ہو۔''

''کیا ہوا؟'' میں پریشان ہو گیا۔

''تمہیں یاد ہی نہیں کہ میں میٹرک کر چکی ہوں۔''

مجھے شرمندگی ہوئی۔ جلدی سے کہا، ''میرا مطلب ہے کہ کالج میں داخلہ لے لو۔''

وہ بولی، ''انکل کہتے ہیں کہ داخلے کے لئے بورڈ کی سند ضروری ہے۔ سند ہو تب بھی میٹرک کا نیا رزلٹ آنے کے بعد کالجوں کے ایڈمشن کھلیں گے۔''

''پرائیویٹ کالجز میں سارا سال داخلہ ہوتا رہتا ہے۔ میں پتہ کروں گا۔ ادھر قریب ہی بورڈ کا دفتر واقع ہے۔ کسی وقت چلے جانا اور ڈپلی کیٹ سرٹیفکیٹ نکلوانے کا پراسس معلوم کرنا۔ او کے؟''

وہ بولی، ''میں نے موجو کے ساتھ جا کر بورڈ کی عمارت دیکھ لی ہے۔ حکم کی تعمیل ہو گی بھائی!''

وہ بڑی ادا سے مجھے بھائی کہا کرتی تھی۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میرے سامنے بیٹھی بے تکلفی سے اپنے مخصوص انداز میں بے ربط باتیں کر رہی تھی۔ وہ بچپن ہی سے شرارتی طبع واقع ہوئی تھی اور لاڈ پیار نے اُسے منہ پھٹ بھی بنا دیا تھا۔ جو بات فرزانہ اور پروین نہیں کہہ پاتی تھیں، وہ بلا دھڑک کہہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے بولی، ''بھائی! کیا تمہیں غزالہ کی یاد نہیں آتی؟''

میں نے اُسے دیکھا۔ دونوں گال تمتما رہے تھے۔ آنکھوں سے شرارت امڈ رہی تھی۔ میں بولا، ''نہیں شانو! مجھے سوائے پروین کے، کوئی یاد نہیں آتا۔''

اس کی آنکھوں کی مشعلیں اچانک ہی بجھ گئیں۔ مجھے افسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے کہا، ''جب وہ ہمارے درمیان موجود ہوگی، تب ہم مل کر غزالہ کو یہاں لانے کا منصوبہ بنائیں گے۔''

اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ گئی۔ دروازے میں رُک کر پلٹے بغیر بولی، ''چائے پیو گے؟''

میں نے کہا، ''اپنے ہاتھ سے تیار کرو تو ضرور پیوں گا۔''

میں چاہتا تھا کہ میں نے بے دھیانی میں اُسے جس اندوہ بھری کیفیت میں دھکیل دیا تھا، وہ مصروف ہو کر اُس سے نکل آئے ورنہ مجھے چائے کی طلب نہیں تھی۔ اُس کا بجھا بجھا چہرہ مجھے دُکھ دیتا تھا۔ اُس سمیت میں سبھی کو خوش اور ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ جذبہ میرے اندر تب پیدا ہوا جب ان کا میرے علاوہ دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا۔ شاید اِسی جذبے کو 'مامتا' کا نام دیا جاتا ہے یا دنیا کے اس قیمتی ترین جذبے کا ابتدائی مرحلہ..... احساسِ سرپرستی.....

چند منٹوں بعد وہ چائے کا بڑا سا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر پیالے کو دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی، ''یہ دودھ پتی ہے، چائے تھوڑی ہے۔''

''کیا ساری رات بیٹھا پیتا رہوں گا؟'' میں نے مصنوعی غصے سے کہا، ''اور یہ کیا ہے؟''

اس نے ہاتھ میں ایک پیپر رول پکڑ رکھا تھا۔

وہ بولی، ''دکھانے کے لئے لائی ہوں کہ یہ کاغذات تمہارے کام کے تو نہیں..... الماری کی صفائی کرنے پر ملے ہیں۔''

''اوہ یس.....'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے یاد آیا کہ مجھے یہ پیپر رول مجھے کہاں سے ملا تھا۔ یہ مجھے اُس لینڈ کروزر کی سیٹ پر سے ملا تھا جس میں میرے گھر پر حملہ کرنے والے نور پور آئے تھے اور انہوں نے اسے سائیں جگ جیت کے مزار کے احاطے میں پارک کیا تھا۔ پھر جب میں نے شانو، فرزانہ اور کھالے کو اپنی اسوزوکی وین میں منتقل کیا تھا، تب اس رول کو بھی اُٹھا لیا تھا۔ سوچا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر ان کا مطالعہ کروں گا۔ مجھے یہ توقع رہی تھی کہ ان کاغذات میں کوئی کارآمد اور مجھ سے متعلقہ تحریر ہی ہوگی۔ بعد میں اسے بھول گیا۔

میں اُٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ سے پیپر رول لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ شانو نے کہا، ''تم چائے پیو، میں اسے کھولتی ہوں۔''

اس نے میرے ہاتھ سے رول اچک لیا اور ربڑ بینڈ کھینچ کر اُتار دیا۔ سفید رنگ کے فوٹو

اسٹیٹ پیپر میں اسٹامپ پیپرز لپٹے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سیدھا کر کے دیکھتی رہی پھر بولی، ''بھائی! ان پر تو بابا کا نام لکھا ہوا ہے..... یہ دیکھو!''

میں نے پیپر تھامے اور بیڈ پر پھیلایا۔ وہ چونکہ کافی دیر تک مڑے رہے تھے، اِس لئے سپرنگ کی طرح فوراً رول ہو گئے۔ میں نے چائے کا پیالہ رکھا اور انہیں کھول کر بغور پڑھنے لگا۔

وہ تین مختلف مالیت کے اسٹامپ پیپرز پر مخصوص اندازِ تحریر میں رقم کیا گیا رجسٹرڈ بیعہ نامہ تھا جو عمومی طور پر زمینوں کی خرید و فروخت کے لئے استعمال لایا جاتا تھا۔ پہلے پرت پر زمین کا تتمہ اور کیفیت نامہ درج تھا۔ میرے دل کی دھڑکن اپنے چاچے چراغ دین کا نام، ولدیت اور سکونت وغیرہ دیکھ کر تیز ہونے لگی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس دستاویز کی رُو سے چاچے نے اپنی وراثتی جائیداد فروخت کی تھی۔ اس پر چار سال قبل کی تاریخ ڈالی گئی تھی۔ میں نے تینوں اسٹامپ پیپرز الٹ پلٹ کر دیکھے۔ چاچے چراغ کے انگوٹھے لگے ہوئے تھے۔ شناختی کارڈ کا نمبر بھی درج تھا۔ زمین کو بیچنے کے اِس معاہدے پر گواہان کے نام اور دستخط بھی موجود تھے۔ میں نے دونوں نام پڑھے۔ وہ میرے نزدیک اجنبی تھے۔

بیع نامہ مکمل تھا۔ اس پر کئے گئے دستخط، ثبت شدہ انگوٹھوں کے نشان اور شہادتیں اصلی تھیں۔ ریونیو آفیسر کی تصدیق اور مہر بھی ثبت تھی۔ اس دستاویز کو ریونیو ریکارڈ میں شامل کرنے کے لئے صرف پٹواری کی جانب سے انتقال کا پیشہ وارانہ عمل باقی تھا۔

میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ سمجھ میں آ گیا کہ میرے گھر پر حملہ آور ہونے والے اس دستاویز پر چاچے کے انگوٹھے ثبت کرانے آئے تھے۔ انہوں نے چاچے کی موت سے پہلے یا بعد میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا مگر ان کی موت ان کا پیچھا کرتی ہوئی عین موقع پر پہنچ گئی۔ اگر یہ رجسٹری ریونیو آفس تک پہنچ جاتی تو میرے چاچے کی تمام تر زرعی و سکنی جائیداد کسی اور کے نام منتقل ہو جاتی۔

شانو میرے چہرے کے دم بدم بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہی تھی، پریشان ہو کر مستفسر ہوئی، ''بھائی! اس میں کیا لکھا ہے؟''

میں نے کہا، ''بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تم جاؤ اور مجھے توجہ سے پڑھنے دو۔''

وہ بولی، ''چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ کیا گرم کر دوں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کاغذات میں کھو گیا۔ ایسے ہی وقت میں میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ میں نے کریدتی ہوئی نظروں سے جائیداد خریدنے والے کا نام تلاش کرنا

شروع کر دیا۔ وثیقہ نویس بڑے ٹیڑھے اور الجھے ہوئے طرزِ تحریر میں لکھتے ہیں، الفاظ اور جملے بھی خالصتاً اصطلاحی ہوتے ہیں، اس لئے مجھے تھوڑی دقت ہوئی مگر میں پڑھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جونہی اپنے مطلوبہ نام پر نظر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا اور یوں لگا جیسے مجھے کسی نے انگاروں سے دہکتے ہوئے کنویں میں دھکا دے دیا ہو۔ یہ نام تو میرے دل پر کندہ تھا۔

میں بڑبڑایا، ''جمعہ خان ولد فریدن خان قوم لشاری سکنہ.....''

ماضی میں میری سماعت سے ٹکرانے والا حیات خان کا ایک جملہ گونجا، ''چراغ دین! مجھے بتا، میں کیا کر سکتا ہوں۔ تیرے بھرا (بھائی) نے کئی سال پہلے اپنی زمین فریدن خان کے ہاتھ بیچ دی تھی۔ اپنی مونچھ اونچی رکھنے کے لیے اُس نے یہ بات نور پور میں کسی کو نہیں بتائی تو فریدن کا کیا قصور؟..... اس نے تو سوہنے خان کو اپنی زمین کئی سال ٹھیکے پر دیے رکھی تا کہ وہ بھوکا نہ مرے۔ اب سوہنا اِس دنیا میں نہیں رہا تو کیا فریدن خان اپنا ترکہ چھوڑ دے؟''

جب چاچے چراغ نے حیات خان کے پاس جا کر فریاد کی تھی کہ اس کے بھائی کے رقبے پر قبضہ کر لیا گیا ہے تو حیات خان نے اُسے یہی جواب دیا تھا۔ میں چاچے کے ہمراہ خان کے دارے پر گیا تھا۔ پھر اس نے پٹواری کو دارے پر بلوا کر چاچے کی تسلی کرائی تھی۔ پٹواری نے بستے میں سے خسرہ کھتونی نکال کر حیات خان کے سامنے رکھ دی تھی جس کا ایک ایک لفظ حیات خان نے پڑھ کر سنایا۔ بعد میں یہی رقبہ سردار حیدر خان نے خرید لیا اور وریام خان سے باہمی تبادلہ کر لیا۔ وریام خان کی بیوی کا وراثتی رقبہ بلوچ نگر میں پڑا تھا۔ حیدر خان نے وہ اپنے نام کروالیا جبکہ میری زمین وریام خان نے اپنے کھاتے میں ڈال لی۔

میں جن دنوں میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد نتیجے کا انتظار کر رہا تھا، انہی دنوں میں اور کھالا فریدن کو تلاش کرتے کرتے موضع گودر میں پہنچ گئے۔ وہ کوئی بڑی بستی نہیں تھی مگر ہمیں فریدن خان نہ ملا۔ وہ چند سال قبل یہ علاقہ چھوڑ گیا تھا۔ یہاں اس کا رقبہ نہیں تھا بلکہ پرائی زمینوں پر مزدوری کر کے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ پھر ایک دن اپنے خاندان کو لے کر کہیں چلا گیا۔ کہاں؟ یہ کسی کو علم نہیں تھا۔

وہ پٹواری مر چکا تھا جس نے زمین کا انتقال درج کیا تھا۔ پھر جب میں اور کھالا حلقے کے موجودہ پٹواری کے پاس پہنچے تو اُس نے بتایا کہ گزشتہ سالوں میں تین پٹواری اس حلقے میں تعینات ہوئے۔ چونکہ وہ زمین کی ہسٹری سے آگاہ نہیں تھا اور محض کاغذات کی زبان بول سکتا

تھا، بولتا رہا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں فریدن خان کو تلاش کرنا چاہتا ہوں تو مجھے ریونیو ریکارڈ میں موجود رجسٹریوں کی فائلیں چیک کرنا ہوں گی۔ فریدن خان نے جس دستاویز کی رُو سے زمین سردار حیدر خان کے نام منتقل کی تھی، اُس میں شناختی کارڈ کی نقل موجود تھی۔ اس نقل کو دیکھ کر اسے تلاش کیا جا سکتا تھا۔ ہم ریونیو آفس بھی پہنچے تھے مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ ریونیو آفس میں اپنا نام بتانے کیلئے بھی پیسے لٹانا پڑتے ہیں۔ خالی ہاتھ یہاں آنے والوں کو سلام کا جواب تک نہیں دیا جاتا۔ مایوس ہو کر ہم گھر لوٹ آئے تھے۔

میرے باپ کی زمین فریدن خان کے نام منتقل ہوئی تھی۔ میرے سامنے پڑی ہوئی دستاویز کی رُو سے چاچے چراغ کی جائیداد فریدن خان کے بیٹے کے نام منتقل ہونے والی تھی۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ سوہنے خان کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ طریقہ واردات بھی وہی تھا۔ سوہنے خان نے مرنے سے چھ سات سال قبل فریدن کے ہاتھ زمین بیچی تھی جبکہ چاچا مرنے سے چار سال قبل ان اسٹامپ پیپرز پر انگوٹھے لگا رہا تھا۔ اگر یہ پیپرز میرے ہاتھ نہ لگتے اور اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتے تو میرا خاندان بقیہ نصف جائیداد سے بھی محروم ہو جاتا۔ جس طرح فریدن خان ڈھونڈے سے نہیں ملا تھا اور رقبہ حیدر خان کو مل گیا، اسی طرح فریدن کا بیٹا زمین حیدر خان کو بیچ کر غائب ہو جاتا اور میری طرح میرا چچازاد بھائی موج دین عرف موجو بھی تہی دست ہو جاتا۔

میں نے پوری احتیاط سے ماضی بعید اور قریب کی دونوں کہانیوں کی مماثلت کا تنقیدی جائزہ لیا۔ سرمو کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ طے تھا کہ میرے چچا سے زمین ہتھیانے کی کوشش کرنے والا اور اُسے موت کے گھاٹ اُتارنے والا وہی تھا جس نے میری ماں رضیہ عرف رجو اور باپ سوہنے خان کا خون کیا تھا۔ یعنی سردار حیدر خان.....

میرے ذہن میں تند و گرم ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کبھی نظروں کے سامنے رنگو قصائی کا چہرہ گھوم جاتا تو کبھی ایرانی شال اوڑھے، فرعون کی طرح چھاتی پھیلائے کھڑے حیدر خان کا..... جنہوں نے محض چند بیگھے زمین کی خاطر میرے خاندان کو آگ میں جھونک دیا تھا۔ خون میں نہلا دیا تھا۔

شانو چائے گرم کر لائی۔ مجھے منہمک دیکھ کر بولی، ''بھائی! کیا ہوا؟ کچھ مجھے بھی بتاؤ ناں!''

میں چونکا۔ اسٹامپ پیپرز رول کر کے بیڈ کے ملحقہ دراز میں ڈالے اور چائے کا پیالہ تھام

لیا۔ وہ میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی، بولی، ''بھائی! کیا ہم کبھی نور پور نہیں جائیں گے؟''

میں نے اُسے بغور دیکھا۔ آنکھوں میں اُمید کی پرچھائیاں تھرک رہی تھیں۔ جن گلیوں میں بچپن اور لڑکپن گزرا ہو، انہیں انسان مرتے دم تک بھول نہیں سکتا۔ جہاں بھی رہتا ہے، لوٹ کر انہی گلیوں میں جانا چاہتا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی نور پور کی گلیاں خواہش بن کر نقش ہو گئی تھیں۔

میں نے کہا، ''کیا تم یہاں خوش نہیں ہو؟''

اس نے سر جھکا لیا۔ ناخنوں سے کھیلتے ہوئے بولی، ''ایسی بات نہیں ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے بعد گھر کی دیکھ بھال کون کرتا ہوگا؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''گھر کو دیکھ بھال کی ضرورت نہیں رہی۔ بتایا تو تھا کہ وہ جل کر بھسم ہو گیا۔''

وہ بولی، ''کچھ تو بچا ہوگا؛ ہمارا ڈیرہ، مال ڈنگر اور کھیتوں کے ہتھیار وغیرہ..... چاچے سوہنے خان کا سامان تو سارے کا سارا اس کے گھر میں موجود ہے۔''

اس کا اشارہ میرے کھنڈر گھر کی طرف تھا۔

میں نے کہا، ''شانو! مجھے نور پور یاد آتا ہے۔ مال ڈنگر کا پتہ کروں گا کہ وہ کس کے پاس ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ ابھی اُٹھوں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ خانزادے ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ کاغذات تم نے دیکھے ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہیں، جیسے میری زمین ہتھیانے کے لیے تیار کیے گئے تھے اور میری وراثت دن دیہاڑے لوٹ لی گئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے بھائی موجو کی وراثت ان کمینوں کے ہاتھ لگنے سے بچ گئی۔ جب تک ہم میں سے کوئی شخص بھی زندہ ہے، وہ زمین، ڈیرہ اور گھر کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں ہم تب تک نور پور نہیں جا سکتے جب تک ہمارے دشمن موجود ہیں۔ یہ میرا نہیں، ہمارے لیکھوں کا فیصلہ ہے۔''

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے دلاسا دیا۔ اچھے وقت کی جلد آمد کی امید دلائی۔ وہ میرے کرب کو بھانپ گئی۔ بولی، ''بھائی! کیا ہم قانون کی مدد بھی نہیں لے سکتے؟''

میں نے کہا، ''پولیس بعد میں پہنچتی ہے، جان لینے والے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے چاچا اور چاچی کو جلایا تھا، میں نے انہیں مار دیا مگر انہیں بھیجنے والا خانزادہ ابھی زندہ ہے۔

قانون اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ثبوت مانگتا ہے اور میرے پاس ثبوت نہیں ہے۔''

''یعنی جب تک حیدر خان زندہ ہے، ہم نور پور نہیں جا سکتے؟ یہی کہنا چاہتے ہو؟'' وہ قدرے مایوسی سے بولی۔

''ہاں شانو! فی الحال ایسا ہی ہے۔''

''وہ تو بہت بڑا آدمی ہے۔''

''ہاں! لیکن موت چھوٹے بڑے کا فرق نہیں دیکھتی۔'' میں نے پُر یقین لہجے میں کہا، ''وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتے گا۔''

باتوں کے دوران میں چائے پی چکا تھا۔ اُس نے پیالہ اُٹھایا اور اُداس چہرہ لیے کمرے سے چلی گئی۔

جب تک مجھے اپنے والدین کے قاتلوں تک پہنچنے کا کلیو نہیں ملا تھا، تب تک مجھ پر مایوسی طاری تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں شاید کبھی ان تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ قسمت نے پردوں کو یکے بعد دیگرے چاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے رنگو قصائی نظر آ گیا۔ پھر فریدن خان اور سردار حیدر خان کا کردار سامنے آ گیا۔ میں ان دونوں سے باآسانی نمٹ سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کمزور تھے یا میں ان سے زیادہ طاقت ور ہو گیا تھا، بلکہ مجھے اپنے دشمنوں کا پتہ چل گیا تھا۔ آج نہیں تو کل، میں ان کی گردنیں ماپ سکتا تھا۔ اسی طرح فریدن خان اور اس کے بیٹے کو تلاش کرنا بھی اَب مشکل نہیں رہا تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں ریونیو آفس جا کر مطلوبہ معلومات خرید لیتا۔

شام کو بازار کی طرف نکلا۔ ایک ڈاکٹر سے اپنے زخم کا معائنہ کروایا۔ اس نے پٹی تبدیل کی، اینٹی بیاٹک گولیاں تجویز کیں اور تسلی دی کہ زخم ٹھیک ہونے والا ہے۔ چونکہ درد نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا، اِس لیے میں اُس کی رائے سے متفق تھا۔ شانو نے شامی تکے اور کباب لانے کی فرمائش کی تھی۔ انہیں پیک کرایا، پھر ایک موبائل فون سیٹ اور نیا سیلولر میڈیول خریدا اور گھر آ گیا۔ زور آور نے میرا موبائل میڈیول (سم) سمیت چھین لیا تھا۔ چونکہ وہ سم میرے نام رجسٹرڈ نہیں تھی، نہ اُس کی میموری میں کوئی نمبر محفوظ تھے، اِس لیے مجھے فون کے چھننے پر کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ میر وشاہ کی ہدایت کے مطابق گروپ کے سبھی لوگوں نے ایک دوسرے کے نمبر یاد کر رکھے تھے۔ فون کرنے کے بعد اُس نمبر کو میموری سے مٹا دیا جاتا تھا۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تک ہم سبھی نے بیٹھ کر خوش گپیاں ہانکیں۔ ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھا پھر سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں کا رُخ کیا۔ میں نے لحاف میں دبک کر میر وشاہ کو فون کیا۔ اس نے کال ریسیو کی اور میری آواز سن کر بولا، ''اڑے غنچے! سائنسی بٹیرے کا نمبر کیوں بدل لیوت ہے؟''

میں نے کہا، ''یہی بتانے کے لیے تو فون کر رہا ہوں۔ میرا فون زور آور نے چھین کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔''

''جور آور نے؟ وہ سالا کباڑیہ کہاں مل جاوت ہے تمہیں؟'' وہ استعجاب آمیز لہجے میں بولا۔

''اس نے حیدر خان کی سپاری پر مجھے اغوا کر لیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا ہوں.....'' میں نے اسے اپنی بات کے بیچ میں کہیں ٹپکنے کا موقع دیے بغیر مختصر الفاظ میں اپنی رام کہانی گوش گزار دی۔

وہ بولا، ''اڑے واہ لاڈے میاں! کمال کر دیوت ہے بھئی..... مہارانی تیرے کو کوہِ نور ہیرا بولت ہے تو کیا غلط بولت ہے؟''

میں نے کہا، ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں شاہ جی!''

''ماڑے پاس کیا رکھا ہووت ہے؟'' اس کی آواز شوخ ہو گئی، ''غنچے! تیرے تن کی رگ رگ میں جوان جہان خون دوڑے پھرت ہے؛ ایسا لہو تو جوانی مانگت ہے، جام مانگت ہے.....''

میں نے ٹوکا، ''میری بات تو سنو۔ میں کئی باتیں تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہووت..... کل شام کو میڈم نے ہم سب کو بلا رکھا ہووت؛ غنچے کو بھی بلا لیا جاوے ہے۔ وہاں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع دیوت ہے ماڑے لاڈے کو..... مہارانی سننے کو بیٹھے، جوانی سنانے کو بیٹھے، تب مجا (مزہ) آوت ہے لاڈے میاں! پَر ایک بات سن لیوت ہے۔ وہاں اپنا دکھڑا نہیں رونے کا، صرف اتنی بات کرنے کا جتنی کا تعلق ہمارے دھندے سے ہووت۔ وہ حرام جادے حیدر خان کی رشتہ داری مت پھول بیٹھے ہے، وہاں پر، ماڑا غنچہ..... سمجھ میں آوت کہ ناں آوت؟''

''میں سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ بولا، ''پان کی گلوری ماڑے ہاتھ میں ہووت اور انتجار (انتظار) کرت کہ لاڈے کا فون

بند ہووت اور ماڑی داڑھ گرم ہووت.....بس یادر کھ لیوت کہ پیا کی گڈی آ جاوے گی تیرے کو لینے کے لیے کل شام کو.....ٹھیک اے ناں ماڑے غنچے؟ اَب جرا مسکا دیوت ہے ناں.....''

میں نے جلدی سے پوچھا،''خیر تو ہے؟ کل شام کو کیوں سب اکٹھے ہو رہے ہیں؟''

''ناں بابا.....فکر نہ کرت.....مہارانی جرا (ذرا) پڑھی لکھی ہووت تو نخرے دکھاوت..... ہر مہینے میں ایک بار جرور (ضرور) سب کو اکٹھا کرے ہے اور رپورٹ شپورٹ لیوے ہے۔ جرا (ذرا) کھسکی ہوئی کھوپڑی ہووت ہے ناں اُس جنانی جات (زنانی ذات) کی.....''

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ فون پر میری اغوا کی کہانی سننے سے گریزاں تھا ورنہ اپنی عادت کے مطابق کرید کرید کر پوچھتا۔ بیچ بیچ میں فلسفیانہ انداز میں سوچنے کی اداکاری بھی کرتا۔

اپنے نئے موبائل سیٹ کے آپریٹنگ سسٹم کو سمجھنے کے لیے میں چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا جب اچانک مجھے یاد آیا کہ مظفر گڑھ سے چلتے ہوئے شاہد سلیم سے فون نمبر لینا مجھے یاد نہیں رہا تھا حالانکہ اس کے باپ نے ہم دونوں کو تاکید کی تھی۔ اَب اس سے رابطہ ماسوائے ملاقات کے، نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ یاد آیا تو اُس کی من بھاونی شبیہہ نظروں میں گھوم گئی۔ وہ واقعی بہت خوب صورت لڑکا تھا۔ عاشی کے ساتھ جچتا تھا۔ اس کے پہلو میں کھڑی عاشی بھی جچتی تھی۔ اب یہ قسمت پر موقوف تھا کہ ان دونوں کو زندگی کے کسی موڑ پر ایک ساتھ کھڑا کرتی تھی یا نہیں.....اس کی باتیں میرے ذہن میں چکرانے لگیں،''شہریار! اگر تمہاری بہن حیدر خان کی قید سے نکل کر کسی اور قید میں نہیں گئی تو پھر اُس نے اَب تک تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

پھر اس نے میری تاویل سن کر بڑی مایوسی سے کہا تھا،''تمہاری بہن کی حد تک تو اِس خوش گمانی میں رہا جا سکتا ہے مگر میرا گھر اور فون نمبر تو وہی ہے جسے عاشی مرتے دم تک بھول نہیں سکتی۔ اس نے کیوں مجھ سے رابطہ نہیں کیا؟''

زندگی ایسا ہی طویل سفر ہے۔ کبھی یادوں کے اُجالے، کبھی مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے.....تو کبھی سرسراتے ہوئے جان لیوا واہمے اور اندیشے.....

❖❖○❖❖

میں پوری طرح تیار ہو چکا تھا جب مجھے سراج الدین عرف پیا جی لینے کے لیے پہنچ گیا۔ اسے میر وشاہ نے مجھے پک کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی پوٹھوہار جیپ پر تھا۔ ہم دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے عقیل کی خیریت دریافت کی۔ جب میری پیا سے پہلی

ملاقات ہوئی تھی، وہ اُس کے ساتھ تھا۔ گونگا تھا مگر غضب کا دلیر اور چاق چوبند تھا۔ پیا نے بتایا کہ اسے جاوید کے ساتھ میڈم نے کسی مشن کے سلسلے میں بلوچستان کے پہاڑی شہر 'زیارت' میں بھیج رکھا ہے۔

میں نے کہا، ''زیارت میں تو ان دنوں سخت سردی پڑتی ہے۔ سنا ہے کہ وہاں برف باری بھی ہوتی ہے۔ ایسے میں وہ وہاں کیا کریں گے؟''

اس نے کندھے اُچکائے، ''میڈم جانتی ہیں یا وہ دونوں..... میں نے پوچھا، نہ انہوں نے بتایا۔''

میں نے دیکھا کہ اس کا رُخ میڈم کی کوٹھی کی طرف نہیں تھا۔ تبھی پوچھا، ''پیا جی! ہم کہاں جا رہے ہیں اِس وقت؟''

اس نے مسکرا کر کہا، ''فکر نہ کرو۔ کسی غلط جگہ پر نہیں لے جاؤں گا۔ بائی دی وے! ہم جلیل آباد کی طرف جا رہے ہیں۔ کیوں؟ یہ وہاں جا کر تم دیکھ لو گے۔''

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اس نے چند دن قبل یہ پرانے ماڈل کی پٹھو ہار جیپ خریدی تھی۔ اس کی ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام ہونا باقی تھا اور ٹائر بھی بدلے جانے تھے۔ وقت نہ ملنے کے باعث ابھی تک کھٹارا معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے بوہڑ گیٹ سے دائیں ہاتھ ٹرن لیا۔ چند منٹوں بعد بائیں ہاتھ مڑ کر ایک ہاؤسنگ کالونی میں گھس گیا۔ اس کے بتانے پر پتہ چلا کہ ہم جلیل آباد میں داخل ہو چکے تھے۔ چند موڑ کاٹنے کے بعد اُس نے ایک چھوٹی مگر جدید طرز کی نو تعمیر شدہ کوٹھی کے گیٹ پر جیپ روکی اور مجھے اُترنے کا اشارہ کیا۔ میں اُتر گیا تو وہ جیپ آگے لے گیا۔ کچھ فاصلے پر خالی پلاٹ میں تین چار کاریں کھڑی تھیں۔ اس نے وہیں جیپ پارک کی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس پہنچ آیا۔

اس نو تعمیر شدہ کوٹھی کے گیٹ پر زُوم اِن کمپیوٹر کالج کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ چار دیواری پر ایڈمشن کے لئے ترغیبی کلمے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے تعجب سے پوچھا، ''یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟''

''یہ کمپیوٹر کالج میڈم کا ہے مگر اِسے مس شائلہ خانم چلاتی ہے۔ اس کے علاوہ شہر میں دو انگلش میڈیم اسکولز بھی ہیں میڈم کے۔'' پیا بولا، ''دھندے کے ساتھ ساتھ میڈم بزنس بھی کرتی ہے۔ کوئی پوچھے تو بتا سکتی ہے کہ اس نے اسکولز کی چین بنا رکھی ہے۔''

''کیا ہر مرتبہ یہیں میٹنگ ہوتی ہے؟''

''نہیں..... یہاں پہلی مرتبہ اکٹھ ہو رہا ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں گیٹ کا بغلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ سیاہ رنگ کی ایک بڑی لینڈ کروزر کو دیکھ کر پیا بولا، ''میڈم آ چکی ہیں۔ جلدی چلو!''

گاڑی سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں بھولی بھالی شکل والا ایک گن مین بیٹھا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر دوسرا قوی الجثہ گن مین ٹہل رہا تھا۔ دونوں پیا جی کو جانتے تھے۔ علیک سلیک اور میرا تعارف حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نہ صرف ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی بلکہ ٹہلنے والے سکیورٹی گارڈ نے از خود کار رہبری سنبھالی اور ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کی تقلید میں ہم جہازی سائز کے چوبی گیٹ کو عبور کر کے بڑے سے ہال میں داخل ہوئے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ چوبی تختے ڈیسک کی صورت نصب تھے جن پر ترتیب وار کمپیوٹر پڑے ہوئے تھے۔ مخصوص ساخت کے ریوالونگ اسٹولز بھی قطار میں رکھے گئے تھے جن پر بیٹھ کر سٹوڈنٹس کمپیوٹر چلاتے تھے۔ ایک دیوار پر وائٹ بورڈ آویزاں تھا جس پر ایک ٹیڑھی میڑھی ڈرائنگ نظر آ رہی تھی۔

ہال میں تین دروازے نظر آئے۔ ایک سے ہم داخل ہوئے تھے۔ دو سامنے تھے۔ گن مین نے ایک دروازے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور پلٹ گیا۔ پیا اُلٹے ہاتھ کی دیوار کے آخری دروازے میں داخل ہوا۔ سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر ایک باوردی سکیورٹی گارڈ اسٹول پر ڈبل میگزین شارٹ گن تھامے چوکس بیٹھا تھا۔

اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میری سکیننگ کی، پھر میرے بارے میں پیا جی سے کئی سوال کئے اور جیب سے موبائل فون نکال کر کسی سے رابطہ کیا۔ میرے بارے میں بتا کر ہدایات لیں تب اندر جانے کی اجازت دی۔

یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں تین دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ پیا نے داہنے ہاتھ والا دروازہ کھولا اور جھانک کر اندر داخل ہو گیا۔ میں اُس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ سوچا تھا کہ وہاں تیس چالیس افراد موجود ہوں گے مگر اس بارہ ضرب اٹھارہ کے طویل کمرے میں محض پانچ آدمی بیٹھے ہوئے تھے جبکہ میڈم شکیلہ طویل اور چمکدار کانفرنس ٹیبل کی صدارتی کرسی پر براجمان تھی۔ اس کے پہلو میں میر وشاہ اور اس کے بائیں ہاتھ ایک گھنگھریالے بالوں والا لمبا تڑنگا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی چمکدار تھیں۔ سامنے دو خواتین اور ایک فربہی مائل

مرد بیٹھا ہوا تھا۔

پھول ہر ماحول میں جچتا ہے۔ میڈم یہاں بھی جچ رہی تھی۔ سیاہ پینٹ شرٹ اور کوٹ، ہلکا اور تر و تازہ میک اَپ، بال جوڑے میں بندھے ہوئے..... اس پر سے نظر ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ پُر وقار انداز میں، کرسی پر شاہانہ تمکنت سے بیٹھی ہوئی، میڈم شکیلہ کسی اور ہی جہان کی مخلوق لگ رہی تھی۔ میرے انہماک کو تاڑ گئی۔ ایک ذرا مسکرائی۔ آنکھوں سے بولی، 'دیوانگی سے دیکھنے کی اجازت تنہائی میں دے رکھی ہے ناں کہ سرِ بزمِ عاشقاں..... آنکھیں نیچی کرو اور مجھے بات کرنے دو۔'

میں نے جھینپ کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی سخت آواز میرے کانوں میں پڑی، ''کیا تمہیں وقت کا احساس نہیں ہے پیا؟ پچھلی مرتبہ بھی تمہی سب سے آخر میں آئے تھے۔''

''سوری میڈم! آئندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔'' پیا جی نے ندامت سے کہا۔

میڈم نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چمکدار میز پر گلدان، ٹشو پیپرز اور منرل واٹر کی بوتلیں پڑی تھیں۔ ہر ایک کے سامنے ایک نوٹ پیڈ اور پنسل بھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ یہاں موجود سبھی لوگ خطرناک جرائم پیشہ افراد تھے۔ اغوا، مار دھاڑ، قتل و غارت، اسلحہ و منشیات کی ترسیل اس گروہ کا بزنس تھا مگر وہ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے کسی بھی طرح غنڈے، ڈاکو یا مجرم دکھائی نہیں دیتے تھے بلکہ پڑھے لکھے، سنجیدہ مزاج اور باوقار تاجر معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کانفرنس کا منظر بارہا ٹی وی ڈراموں، خبروں اور فلموں میں دیکھا تھا۔ آج بہ نفسِ نفیس اس فلمی منظر کا حصہ بن گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ دیر بعد کوئی اعلیٰ سطح کی کاروباری میٹنگ ہونے والی تھی۔ فول پروف انتظامات کو دیکھ کر میرے دل پر میڈم کی دھاک بیٹھ گئی۔

ہم بیٹھ گئے تو میڈم نے کانفرنس کے آغاز کا اعلان کیا اور میرا تعارف کرایا۔ تھری پیس سوٹ میں جکڑے ہوئے شخص، جس کا نام بعد میں وارث علی معلوم ہوا، نے پوچھا، ''میڈم! سینئرز کی میٹنگ میں اس کی موجودگی کیوں ضروری سمجھی گئی؟''

میڈم مسکرائی، ''آپ لوگوں کی حیرانی بجا ہے مگر نہ صرف شہریار کا تعارف آپ سے کرانا مقصود تھا بلکہ یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ میں نے سابقہ دو میٹنگز میں زیرِ بحث آنے والا ایکشن گروپ تشکیل دے دیا ہے۔ جو کام مختلف ممبران سے مختلف اوقات میں لیا جاتا تھا، اب وہ کام صرف ایکشن گروپ سے لیا جائے گا۔ میں نے مسٹر شہریار کو اس گروپ کا لیڈر بنانے کا فیصلہ کیا

ہے۔ سخی محمد، عقیل، عمیر اور طاہرہ اس گروپ میں شامل ہوں گے۔ کیا میں نے درست قدم اُٹھایا ہے؟''

سبھی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بھٹکتی ہوئی نظریں مجھ پر آن ٹھہریں۔ نظروں کی کسوٹی پر لٹکتے ہوئے میرے احساسات بہت عجیب اور بے عنوان تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں اور کسی پل اس ماورائی اور غیر یقینی دنیا سے میرا ناتا ٹوٹ جائے گا۔ مجھے نظروں ہی نظروں میں جانچنے کے بعد میڈم کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر لیا گیا۔ پھر ایکشن گروپ پر تفصیلی بحث کو اگلی میٹنگ پر موقوف کر دیا گیا اور معمول کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے میڈم نے گھنگھریالے بالوں والے طویل قامت شخص کو مخاطب کیا، ''جمال! تمہارے پاس گزشتہ ماہ ایک مشن تھا۔ خواجہ ظفر الحق کو صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیتنے کے لیے ساری فنڈنگ ہماری تھی۔ وہ تین ماہ پہلے تک ہماری پسِ پردہ اعانت کرتا رہا پھر اُس نے آنکھیں پھیر لیں۔ سوچا کہ وہ ممبر بن کر کوئی توپ قسم کی چیز بن گیا ہے۔ اسے نیچا دکھانا اور اس کا ڈنک نکالنا ضروری تھا جو تمہارے ذمہ لگایا گیا تھا۔ تم نے اسے کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسے استعفا دینے پر مجبور کرنا، مجھ سے معافی کا طلب گار ہونا اور اپنا رویہ بدلنا تمہارے مشن کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ویل ڈن! تم بہت ذمہ دار اور ایکٹو ہو۔''

میں حیرت پاش نظروں سے حاضرین کے بے حد سنجیدہ چہروں کو دیکھ رہا تھا جو میری دانست میں اداکاری کر رہے تھے، ناٹک کر کے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میڈم خاموش ہوئی تو سبھی نے جمال کو کامیابی کی مبارک باد دی۔ میں نے بھی شرکائے محفل کی دیکھا دیکھی اجنبیت کے باوجود اسے جملۂ تحسین سے نوازا۔ پھر میڈم کے مطالبے پر اُس نے اپنے مشن پر تفصیلی گفتگو کی۔ پتہ چلا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ کاغذ کی ہتھیلی بناتا تھا اور اس ہتھیلی پر سرسوں جما کر دیکھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

میڈم بولی، ''وارث نے گزشتہ ماہ مال کی سپلائی حسبِ معمول بروقت اور بنا رکاوٹ کی ہے۔ اس ماہ اس کے پاس کرنسی کی وصولی اور ترسیل کا اضافی کام سونپا گیا تھا جس کا بونس اسے دے دیا گیا ہے۔ چونکہ وارث کا کام سب سے مشکل اور حساس ہے، اِس لیے میں نے وارث کو زیادہ بونس دیا ہے کیونکہ اس کے ساتھ زیادہ نفری کام کرتی ہے۔ میں وارث کو ان گنت کامیابیوں کی مبارک باد دیتی ہوں اور اس پر فخر کرتی ہوں۔ وارث! دوستوں کو اپنی کارکردگی

کے بارے میں بتاؤ۔"

وارث گلا کھنکار کر تقریر کرنے کے سے انداز میں بتانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے پر میڈم نے ایک ادا سے مسکرا کر تالی بجائی۔ سبھی نے اُس کی تقلید کی اور تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد میڈم نے میر وشاہ سمیت سبھی شرکاء کی کارکردگی پر گفتگو کی۔

میر وشاہ نے اپنے مخصوص انداز میں کرسی پر اُچھلتے اُچھلتے، میڈم کی ڈانٹ ڈپٹ اور بار بار ٹوکنے کے باوجود، اپنی تقریر کی۔ وہ اپنے مخصوص حلیے میں تھا۔ لمبے بال، پان کی گلوری اور سرخ باچھیں، بڑھی ہوئی کالی اور سفید رنگ کی امتزاجی شیو، چھوٹے اور مہین بدن پر کھلا چولا اور نسواری رنگ کی ڈھیلی ڈھالی جیکٹ، جس کے بارے میں پیا جی کا اندازہ تھا کہ وہ عمر وعیار کی زنبیل تھی اور مسز میر وشاہ کے جہیز میں آئی تھی..... میر وشاہ طنز و تشنیع کے باوجود ہر وقت ایسا ہی رہتا تھا۔ جب سے ملا تھا، بدلا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مگر سرمے سے لبریز آنکھوں سے ہمیشہ کی طرح شرارت مترشح تھی۔

اس دوران میڈم سمیت سبھی لوگ کبھی مسکرائے، کبھی حیران ہوئے تو کبھی کھلکھلا کر ہنسے۔ امیر شاہ عرف میر وشاہ مضحکہ خیز دکھائی دیتا تھا مگر میں نے ایک بات محسوس کی کہ وہ جیسا بھی تھا، سب لوگوں کے نزدیک اہم تھا اور وہ اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس سے دب کر بات کرتے تھے۔ انتظامی تقسیم کی بدولت اُس کے ذمہ پولیس کے معاملات، پارٹیوں سے ڈیلنگ اور منصوبہ سازی تھی۔

اس کانفرنس میں دو خواتین بھی شریک تھیں۔ شائلہ خانم قدرے فربہ مگر خوب صورت خال و خد والی تیس بتیس سالہ خاتون تھی۔ ابھی اس کی ڈھلتی ہوئی جوانی میں تڑپ اور کسک موجود تھی۔ اس نے میک اَپ بڑے قرینے سے کر رکھا تھا اور لباس کا انتخاب عمدہ تھا۔ اس کے ذمہ نوعمر اور ضرورت مند جوانیوں کی کھوج اور تعاون پر آمادہ نہ ہونے والیوں کے اغوا کا کام سونپا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے میڈم کے سکواڈ میں ایک لڑکی کا اضافہ کیا تھا۔ دوسری خاتون ادھیڑ عمر تھی۔ وہ اغوا شدہ لڑکیوں کے معاملات کو سنبھالتی تھی اور میڈم کے حکم پر انہیں تیار کر کے مقررہ مقامات پر بھجواتی تھی۔ لین دین بھی اُسی کے ذمہ تھا۔ اس نے کرخت اور بے سری آواز میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

پانچواں شریک ڈاکٹر ظہور اختر تھا۔ وہ میڈم کے جدید طرز کے ہسپتال 'میڈی کمپلیکس' کو

چلاتا تھا۔ یہ ہسپتال شہر کی مصروف شاہراہ پر واقع تھا۔ دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں تھا مگر یہاں جدید آلات اور سرجری کی قابلِ ذکر سہولیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر ظہور اختر کی زیرِ نگرانی چار ڈاکٹر اور چھ نرسوں کے علاوہ پانچ دفتری اہلکار وہاں کام کرتے تھے۔ ویسے تو یہاں عام مریض بھی خاصی تعداد میں آتے تھے مگر اس کمپلیکس کے قیام کا بنیادی مقصد میڈم کے گروپ کے زخمی ہونے والے ارکان کا روایتی رکاوٹوں اور قانونی پیچیدگیوں میں پڑے بغیر بروقت علاج معالجہ تھا۔ اس نے سب سے آخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد میڈم نے فرداً فرداً سب سے پوچھا کہ وہ اپنی مشکلات اور مسائل بیان کریں۔ سبھی آسودہ تھے۔ کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کے بعد آنے والے مہینے کے ٹارگٹ زیرِ موضوع آئے۔ میڈم نے سبھی کے ذمہ نئے پراجیکٹ لگائے۔

میر وشاہ کی ترغیب پر میں نے پہلے رنگو قصائی کی وعدہ خلافی کا ماجرا پھر زورآور کی دیدہ دلیری کا مقدمہ پیش کیا۔ غیر متعلقہ ہونے کی وجہ سے میں نے شاہد سلیم سے اتفاقیہ طور پر ہونے والی ملاقات کو گول کر دیا۔

میڈم نے میرے سنائی ہوئی کہانیوں کو بڑے انہماک سے سنا۔ سن کر خاموش رہی۔ دوسرے بھی لب بستہ رہے۔ جمال نے بھڑک کر کہا، ''اس نالی کے کیڑے کی یہ جرأت! نو.....نو..... یہ قابلِ برداشت نہیں ہے۔ میڈم! زورآور کو اس کے کیے کی سزا دینا ہوگی ورنہ وہ حد سے بڑھ جائے گا۔''

میڈم نے ہاتھ کے اِشارے سے اُسے خاموش کرایا۔ بولی، ''ایسے نہیں.....ہمیں جو بھی قدم اُٹھانا ہے، دیکھ سوچ کر اُٹھانا ہے۔ فیصلے جذبات سے نہیں کیے جاتے۔''

میر وشاہ نے کہا، ''ماڑی میڈم! یہ سن لیوت ہے کہ اگر ہم مجبور (کمزور) ہووت تو پھر پورا جمانہ (زمانہ) ماڑے پر گند بلا (کوڑا کرکٹ) لاددیوت ہے۔ ماڑی دنیا میں ایسا نہ ہونے کا، جیسا رنگو اور جورآور (زورآور) نے کر دکھاوے ہے۔''

میر وشاہ کی تائید میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ میڈم نے یکے بعد دیگرے ہر چہرے پر نظر دوڑائی، کچھ سوچا پھر تمکنت سے بولی، ''یہ درست ہے کہ ان دونوں نے اپنی شامت کو آواز دی ہے۔ اگر ہم لوگ ایک دوسرے پر ایسے وار کرنے لگیں گے تو کوئی بھی سروائیو نہیں کر سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان دونوں سے رابطہ کرنا چاہیے اور یہی بات باور کرانی چاہیے۔''

''وہ اِسے ہماری بزدلی قرار دیں گے میڈم!'' شمائلہ خانم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

جمال نے زوردار انداز میں تائید کی، ''بالکل ٹھیک کہا خانم نے۔ میڈم! یہ لاتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔''

''مگر کیا ہم جواباً وہی کچھ کریں گے، جو انہوں نے کیا؟'' میڈم نے سمجھانے کے سے انداز میں سوال کیا، ''میرا خیال ہے کہ محاذ آرائی کے بجائے ہمیں مفاہمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔''

میر وشاہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے، باچھیں کھنچ گئیں اور استہزائیہ انداز میں بولا، ''اڑے واہ مہارانی جی! محاج اَرائی..... کیا خوب کہوت ہے۔ پھر کاہے کو یہ بھاجا دوڑی (بھاگ دوڑ) کرت؛ کالی وردی سے بھی مفاہمت کر لیوت ناں..... میر وشاہ کیوں ماراماری کرتا پھرت ہے تیرے نام پر!''

''یو شٹ اَپ.....'' میڈم کا پارہ ایک لخت چڑھ گیا۔ آنکھیں شعلے اگلنے لگیں، ''میر وشاہ! تم حد سے بڑھ جاتے ہو۔ تمہیں یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ تم کس کو مخاطب کر رہے ہو۔ یہاں ہم نے مل بیٹھ کر یہی کچھ طے کرنا ہے۔ دیکھو! اگر ہم زورآور اور رنگو قصائی کو بیک وقت چھیڑ دیتے ہیں تو ان دونوں کی جوابی کارروائیاں ہمیں نقصان پہنچائیں گی۔ رنگو کے پیچھے میاں دلبر حسین ہے۔ زورآور کے پیچھے مرغوب گیلانی ہے۔ دونوں بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ان کے مالکوں کو بتایا جائے، انہیں باور کرایا جائے کہ ان کے بے وقوف کتوں کی احمقانہ چھیڑ چھاڑ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگی؛ اور وہ ان کی گردنوں میں پٹے ڈال دیں۔''

ہال میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس کی آواز میں شامل برہمی بتدریج کم ہونے لگی، بولی، ''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ان کی گردنوں میں پٹہ ڈالا جائے یا کچلا پھینک کر ہلاک کر دیا جائے اور انہیں بھونکنے کا موقع نہ دیا جائے مگر جارحانہ انداز میں نہیں، بلکہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں۔ دیکھو! زورآور اپنے یارموبی کی وجہ سے شاکی ہے۔ رنگو قصائی کے ہم نے تین جوان مار دیے ہیں۔ وہ بھی آگ بگولا ہے۔ سردار حیدر خان اور استاد بلو اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہے ہیں۔ ایسے میں ہماری طرف سے کیا گیا حملہ اعلانِ جنگ تصور ہوگا اور ہم تین مختلف

دشمنوں کے نرغے میں آ جائیں گے۔''

جمال بولا، ''پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''ہاں جمال! یہ ہوئی ناں بات!'' میڈم نے سر ہلا کر کہا، ''ہمیں اپنی توجہ دفاع پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ اور پھر جونہی حالات موافق ہوں، زور آور اور استاد بہلو کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کر کے بیچ میں آگ لگا دی جائے۔ دونوں میں سے جو جیتے گا، وہی سکندر قرار پائے گا۔ جو ہارے گا، وہ آگ میں جل مرے گا۔ رہی بات رنگو قصائی کی، تو وہ اس علاقے میں نووارد ہے۔ اُسے پیر جمانے کا موقع نہ دیا جائے اور ہاتھ پاؤں بچا کر اس کا قلع قمع کر دیا جائے۔ یعنی میں ایک طرح سے فی الحال انتظار کرنے کی پالیسی کو ترجیح دیتی ہوں۔''

میر وشاہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ میڈم کی طرف سے پہلو پھیر کر بیٹھ گیا اور منہ بنانے لگا۔ میڈم نے اُسے دیکھا اور نظر انداز کر کے جمال اور شائلہ سے باتیں کرنے لگی۔

اس میٹنگ کا آخری سیشن پر تکلف طعام پر منتج ہوا۔ یہ کھانا شہر کے ایک مہنگے فائیو اسٹار ہوٹل سے پیک ہو کر آیا تھا۔

میٹنگ برخاست ہو گئی۔ میں پیا جی کے ساتھ جانے کے ارادے سے اُٹھا۔ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا حکم دیا۔ پیا سے مخاطب ہوئی، ''تم جاؤ، میر وشاہ اور شہریار میرے ساتھ جائیں گے۔''

میر وشاہ بولا، ''مہارانی جی! اتنا بھی ماڑے غنچے کو سر پر نہ چاڑھت کہ یہ سالا ماڑے کو ہی آنکھیں دکھانے لگ جاوت.....''

میڈم نے اُسے غصے سے دیکھا۔ ڈاکٹر ظہور اختر مسکرایا، بولا، ''میڈم! شاہ جی کی بات پر غور کیجئے گا۔''

میڈم نے میرا ہاتھ تھاما اور باہر کھینچتے ہوئے بولی، ''میر وشاہ! تم نہ صرف خود بکواس کرتے ہو بلکہ دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہو۔ لگتا ہے پھر دو چار دن حوالات کی سیر کرنے کا دل کر رہا ہے تمہارا۔''

اس نے مضحکہ خیز انداز میں ہاتھ باندھ دیے اور گڑگڑایا، ''ناں مہارانی! یہ غجب (غضب) نہ کیجو سالے میر وشاہ پر..... وہ جالم انسپکٹر، اجہر (اظہر) دھمکی دیوت ہے کہ اب کے میر وشاہ ماڑے شکنجے میں آوے تو اس کی بانسری بجا دیوے، ٹینٹوا دبا دیوے..... سالا بڑا تپا ہوا ہے

ماڑے پر چاندرانی جی.....''

''تو پھر انسان بن کر رہا کرو۔ چلو باہر چلو! دیر ہو رہی ہے۔ کم بخت! تجھے تو باتوں کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔'' میڈم کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

ایک ایک کر کے سبھی لوگ رخصت ہو گئے۔ میں نے خالی پلاٹ میں جن کاروں کو کھڑا دیکھا تھا، وہ میٹنگ میں شامل ہونے والے میڈم کے ساتھیوں کی تھیں کیونکہ جب ہم کوٹھی سے باہر نکلے، پلاٹ خالی ہو چکا تھا۔ نئی سیاہ لینڈ کروزر میں، میں ڈرائیور کے برابر جبکہ میڈم میرو شاہ کے ساتھ عقبی سیٹ پر بیٹھی شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔

میں نے استفسار کیا، ''میڈم! کیا یہ اجلاس ہر ماہ ہوتا ہے؟''

''ہاں!'' وہ سنجیدگی سے بولی، ''میں چاہتی ہوں کہ میرا گروپ کسی انٹرنیشنل فرم کی طرح کام کرے۔ ہم ہر ماہ اپنی کارکردگی کا جائزہ لے کر اپنے بزنس کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہاں کام کرنے والے سبھی گروپوں پر برتری حاصل ہے۔ تمہیں یہ گروپ لیڈرز کی میٹنگ کیسی لگی؟''

میں نے کہا، ''بالکل ایسے ہی، جیسے کسی بہت بڑی انڈسٹری کا بورڈ آف ڈائریکٹرز سالانہ بجٹ ترتیب دیتا ہے۔''

اس کے چہرے پر احساسِ تفاخر مترشح ہوا جبکہ میرو شاہ کے لبوں سے 'ہونہہ' کی طنزیہ آواز برآمد ہوئی۔

میڈم کے حلق سے قہقہہ برآمد ہوا۔ بولی، ''تمہاری صحت کا راز تمہاری انہی عادات میں پوشیدہ ہے میرو شاہ! تم جلتے بھنتے بہت ہو مگر سوچتے اور کرتے کم ہو۔''

''بس کرو مہارانی جی..... میرو شاہ کی عجت (عزت) کا خیال جرا (ذرا) بھر نہ کرت ہے تم..... کبھی نہ سوچت ہے کہ آج میری میڈم رانی جس مقام پر ہووت ہے؛ یہ میرو شاہ کی جبردست (زبردست) محنت کا نتیجہ ہووے ہے۔ پَر دنیا بڑی جالم (ظالم) ہے۔ تو دنیا سے بھی جیادہ جالم ہے۔'' وہ جز بز ہو کر بولا، ''اور یہ سالا لونڈا! جس کو ماڑے دل نے اپنا غنچہ بنا رکھت ہے، یہ بھی ایک دن ایسے ہی چپڑ چپڑ بولت اور لوگوں کو بتاوت کہ میرو شاہ جلت بھنت بہت، پَر کام ایک ٹکے کا نہ کرت..... ہونہہ!''

اس کی روٹھی روٹھی آواز سن کر میں نے بدقت تمام اپنا قہقہہ روکا۔ کیونکہ میڈم کی موجودگی

میں میرا منہ پھاڑ کر ہنسنا مناسب نہیں تھا۔

میڈم کھلکھلا کر ہنسی۔ گاڑی میں مدھر سی جلترنگ بج اُٹھی۔ بولی، ''میرو! تمہیں علم ہے کہ تم مجھے بہت پیارے ہو اس لیے بلیک میل کرتے رہتے ہو۔ اب اپنا موڈ ٹھیک کرو تا کہ ہم کوئی کام کی بات کر لیں۔''

میرو شاہ بدستور بگڑا رہا۔ میں نے اپنی توجہ پُر ہجوم سڑک پر مرکوز کر دی جبکہ وہ دونوں محوِ کلام ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں میرو شاہ نارمل ہو گیا۔ اس کا غصہ عمومی طور پر صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔ اب بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کبھی ناراض ہوا ہی نہ ہو۔ دونوں اپنے گروپ کے مختلف لوگوں کی کارکردگی پر بات چیت کر رہے تھے۔ میرو شاہ جرائم کی دنیا کا انسائیکلو پیڈیا تھا۔ میڈم جس کے بارے میں پوچھتی، وہ جھٹ سے اُس کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتا۔

باتیں ختم نہ ہوئیں، سفر تمام ہو گیا اور گاڑی میڈم کی کوٹھی کی پارکنگ میں رُک گئی۔ ڈرائیور نے میڈم کا دروازہ کھولا، میں نے مسکراتے ہوئے میرو شاہ کو پروٹوکول دیا۔ وہ ہنستے ہوئے، پان کی پچکاری سے ایک گملے کو سرخ کرتے ہوئے بولا، ''ایک دم ڈرامے باج (باز) آدمی ہووت ہے تو..... پَر نکلت تو میرو شاہ نئے کا گا کو دیکھت..... آہ! کوے ہیں سب دیکھے بھالے، چونچ بھی کالی پَر بھی کالے..... وہ سالا سراج؛ بڑا پیا جی بنا پھرت..... جندگی کی خیرات مانگت تھا، جب ماڑے پاس آوت تھا..... آج بولے؛ میرو شاہ پر میڈم خواہ مخواہ ریجھ جاوت ہے..... ہیں؟''

میں نے کہا، ''وہ تمہاری بہت عزت کرتا ہے۔''

''ماڑے کو علم ہووت اُس لونڈے کی چکر باجیوں (بازیوں) کی..... ماڑے کو پیا کا وکیل بن کر مکھن نہیں لگانے کالا ڈے میاں.....''

میڈم تیز تیز قدموں سے کوٹھی میں گھس گئی تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے گیسٹ ہاؤس میں آئے۔ وہ فرسٹ فلور پر اپنے کمرے کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی۔ میرو شاہ نے سرگوشی کی، ''بڑی جالم جوانی ہے ماڑی چندارانی کی..... ہے ناں؟''

میں نے چونک کر اُسے بے یقینی سے دیکھا۔ کہا، ''تمہاری عمر اس حساب کتاب سے گزر گئی ہے۔''

اس نے ہاتھ لہرایا، پھر چھاتی بجاتے ہوئے اکڑ کر بولا، ''اڑے واہ غنچے! ماڑے کو بڈھا

سمجھت ہے۔ اڑے دل تو جوان ہے ناں اپنا..... سوہنی مورت کو دیکھ کر ایک دم پٹڑی سے اُتر جاوت ہے۔''

میں نے چھیڑا، ''تو کیا میڈم کو دیکھ کر تمہیں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے؟''

وہ ریلنگ تھام کر ایک ذرا رُکا، مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر بولا، ''ہائے! کیا جالم عمریا ہے ماڑی۔ دیکھت ہے، آہیں بھرت ہے پَر ہاتھ مار کر جوانی کو سینے سے نہ لگا سکت ہے۔ دیکھ لاڈے میاں! جوانی جوانی ہووت ہے۔ جوانی کی نجر (نظر) سے آگ بھی اچھی لگت، برف بھی دل کو بھاوت..... مہارانی شہر کے لونڈوں کو برا مکر کہوت ہے، تجھے اصیل بانگا کُکڑ جان کر تجھ پر ریجھ جاوت ہے۔ ماڑے کو پتہ ہووے۔''

میں نے کندھے اُچکائے، کہا، ''تم مجھے سبز باغ دکھا رہے ہو۔ میں بھی ساون کا اندھا ہوں۔ ہر طرف ہریالی دیکھ رہا ہوں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرو شاہ کی سجائی ہوئی اس دنیا میں چاند نہیں چڑھتا، پھول نہیں کھلتے، اوس نہیں پڑی۔''

وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پوری وسعت میں کھول کر استعجاب سے مجھے گھورنے لگا، بولا، ''اڑے! تو تو غجب (غضب) کا پیدا گیر بن جاوت ہے۔ سالا شاعر بن جاوت..... جرا ہٹ کے!''

میں نے ہنس کر سیڑھیوں پر قدم رکھا اور دو دو زینے ایک قدم میں عبور کرتا ہوا فرسٹ فلور پر آ گیا۔ رُک کر پلٹا، دیکھا، وہ ابھی تک گراؤنڈ فلور پر سیڑھیوں کی ریلنگ تھامے کھڑا تھا اور مجھے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ دیکھ کر قدرے اونچی آواز میں بولا، ''شالا جوانی سلامت رہوے ماڑے غنچے کی!''

میرے عقب میں 'ٹک ٹک' کی مخصوص آواز گونجی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میڈم کے کمرے سے نکل کر زرینا کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ دراز قد تھی۔ اونچی ہیل والے جوتے پہن کر کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ اس نے بڑا جاندار میک اَپ کر رکھا تھا۔ قریب آ کر رُک گئی۔ میری سانسوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کمال نفاست سے لپیٹتے ہوئے مسکرائی اور بولی، ''یہاں کیوں کھڑے ہیں؟''

میں جواب دیے بغیر اُسے دیکھے گیا۔ اس نے ایک ادا سے مجھے، پھر سیڑھیاں چڑھتے میرو شاہ کو دیکھا، اور دھیمی آواز میں بولی، ''کیا پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں؟''

میں نے اُسے اتنے قریب سے پہلی مرتبہ تب دیکھا تھا جب وہ گیسٹ روم میں وحید کو لینے کے لیے آئی تھی۔ کھلا بھی میرے ساتھ کمرے میں موجود تھا۔ میں نے کہا، ''حسن کا وصف ہے کہ جب بھی نظر آتا ہے، آنکھوں کو پہلے سے بہتر اور نیا لگتا ہے۔''

''ابے! آنکھوں کو نہیں؛ دل کو نیا لگت ہے.....'' میر وشاہ نے میری بات سن لی تھی تبھی پیچھے سے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا، ''اڑے واہ غنچے! چھپا رستم نکلا ہے تو..... اے بانکی چھوکریا! آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھت ہے لاڈے خان کو۔ کیا نجر (نظر) لگانے کا..... جرا (ذرا) حیا کو ہاتھ مار لے تو چار دن حیاتی کے بڑھ جاویں..... یہ سالا میر وشاہ سچ بولت ہے، جرمینا بی بی!''

وہ پچھلے قدموں ہٹ کر دیوار گیر ونڈو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ادائے قاتلانہ سے دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''شاہ جی! میں بھی سچ بولتی ہوں کہ آنکھیں جلیں کہ آپ کی موجودگی میں کچھ اور دیکھیں۔ آپ اپنے لاڈے خان کو سنبھال کر لے جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کسی کام کاج کا ہی نہ رہے۔''

اس کے چہرے پر بڑی ہوش ربا مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ میں نے شکوہ کناں نظروں سے میر وشاہ کو دیکھا جو آنکھیں نچا رہا تھا اور زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر میڈم کے کمرے کی طرف کھینچتا ہوا زرمینا سے مخاطب ہوا، ''ابھی تیری سسری مالکن کے پاس جاوت ہوں اور تیرے تن کی آگ پر گھڑا ساون کا ڈالت ہوں.....''

ہمارے عقب میں اس کے حلق سے نکلی مندر کی گھنٹیوں کی مترنم صدا گونجی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ہنستے ہوئے ہاتھ لہرا رہی تھی۔

ہم آگے پیچھے میڈم کے کمرے میں داخل ہوئے۔ میڈم جوتے اُتارے بیڈ پر دوزانو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے جام وصبو کی بساط سجی ہوئی تھی۔ ہم اس سے کچھ فاصلے پر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میر وشاہ نے ناصحانہ انداز میں کہا، ''رانی! یہ شراباں نہ پیوت، یہ جھوم جھوم مستی سے دور رہوت، نہیں تو کسی کام کی نہ رہوت..... جوانی کو آگ لگانے میں مجا (مزا) تو آنے کا، پَر جوانی دروا جا (دروازہ) کھول کر جانے کا.....''

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میرو کی بات سن کر سر اُٹھ گیا۔ جوڑے سے نکل کر سوختہ جاں جھولتی ہوئی لٹ کو بے نیازی سے جھٹک کر بولی، ''میں زیادہ نہیں پیتی۔ کم پیتی ہوں۔ ویسے بھی آگ

پر آگ کا کچھ اثر نہیں ہوتا میرو شاہ۔ یہ تم زرمینا سے کیا کہہ رہے تھے؟''

''ماڑے کو کوئی بات نہ کرنا ہووے جرمینا سے، وہ میرے غنچے پر لائن مارت ہے۔''

میڈم نے مجھے دیکھا۔ چند ثانیے اسپاٹ چہرہ لیے دیکھتی رہی پھر بولی، ''لائن مارنے دیتے، تمہارا کیا جاتا تھا؟''

''وہ سالی، ایک دم حرام جادی، ہر روج (روز) نیا عاشق دیکھت پر اُس کا دِل نہ بھرت.....''

''تمہاری باچھیں بھی تو پھیل جاتی ہیں، سونیا کو دیکھ کر.....''

''گدی پر فائر نہ مارت مہارانی! وہ اور بات ہووت ہے۔'' میرو شاہ تڑپ کر بولا، ''ماڑا موڈ ایک دم خراب ہونے کا..... جو کہنا ہے کہہ دیوت، پھر ماڑے کو گھر پہنچاوت..... بس!''

میڈم نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ بڑی آہستگی سے جام تیار کیا۔ لبوں سے لگایا اور بولی، ''میرو شاہ! میں ایک مرتبہ پھر شہریار پر گزرنے والے واقعات کو بہ تفصیل سننا چاہتی ہوں۔''

میں نے بلا کم و کاست تمام واقعات بیان کئے۔ میڈم بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ میرے خاموش ہونے پر بولی، ''ایس ایس پی کا بیٹا، شاہد سلیم، بڑا ہینڈسم ہے..... ہے ناں! پر بے چارہ..... ابتدائے عشق میں ہی خاک ہو گیا۔''

میرو شاہ بولا، ''غنچہ بن کھلے مرجھا جاوت..... وہ کیا شعر ہے لاڈے میاں..... یہ پھول اپنی.....''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، میں نے مسکرا کر کہا، ''یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا..... کھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکا.....''

مجھ سے میڈم نے چند متعلقہ سوال کئے۔ میں نے جواب دے کر مطمئن کیا۔ بولی، ''الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مگر خیر! اس پر بعد میں کام کیا جائے گا۔ میرو! میں نے تمہارے ذمہ ایک کام لگایا تھا۔ تمہیں اُس آدمی کو تلاش کرنے کا حکم دیا تھا جو میری تھالی سے کھاتا ہے اور اُسی میں سوراخ کرتا ہے۔ کیا تم نے اس کا کھوج نکالا؟''

وہ بولا، ''ہاں مہارانی..... میرو شاہ کی نجر سے کیسے بچ سکت تھی..... وہ حرام جادی سونیا ہووت ہے۔ دل کو بھاوت ہے پر اس نے منکا تڑوانے کا کام کر دکھاوت ہے..... سالی پر بلو کی محبت کا بھوت سوار ہووت ہے؛ اس کے گن گاوت ہے۔''

میڈم کی آنکھوں میں حیرت اور برہمی کے تاثرات مترشح ہوئے، بولی، ''یعنی تم یہ کہنا

چاہتے ہو کہ سونیا نے میرے کوٹھی سے نکلنے کے بعد استاد ببلو کو بتایا کہ میں کوٹھی سے فارم ہاؤس کے لیے نکل چکی ہوں۔ اور تم یہ بھی کہنا چاہتے ہو کہ مجھے اور شہریار کو فارم ہاؤس سے اُٹھانے کی کوشش ببلو نے کی تھی؟''

میر وشاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی، ''مگر تمہیں کیسے پتہ چلا اس رام کہانی کا؟''

وہ بولا، ''مہارانی! آم کھاوت، پیڑ نہ گنت..... تم نے جفری ڈکیت (ظفری ڈکیت) ماڑے حوالے کرت تھا۔ ہم نے اُس کنے کی چمڑی ادھیڑ کر راج (راز) کھوج نکالت تھا کہ اُسے ببلو نے تیرے اغوا کی بیس لاکھ میں سپاری پکڑاوت تھی۔ ببلو مردود سالے حیدر خان کے حکم کا غلام ہووت ہے۔ ایک بات..... دو جی بات سونیا بی بی کی..... ملغانی؛ وہ حرام جادہ ریاج (ریاض) ملغانی..... اس کی معشوقہ اپنے پیا جی پر جان وارت ہے۔ اس سے رپورٹ لیوت ہے میر وشاہ نے.....''

میں ان کے درمیان اچانک چھڑ جانے والی گفتگو بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ میں نے اسی دن میڈم سے کہہ دیا تھا کہ گھر کے کسی بھیدی نے لنکا ڈھایا ہے۔ تب میڈم نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا تھا کہ اس کے گروپ میں کوئی غدار نہیں ہے۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی نہ صرف یہ نتیجہ اخذ کر چکی تھی بلکہ میر وشاہ کے ذمے اس گھر کے بھیدی کی سراغ رسانی بھی لگا چکی تھی۔

وہ بولی، ''کوئی غلط فہمی؟''

''نہیں رانی جی..... تیرا ایک ایک بندہ ماڑے کو اپنی آنکھ سے بھی پیارا ہووت ہے۔ کاہے کو بے قصور مروانے کا.....''

''فیصلہ؟'' میڈم نے اُس پر آنکھیں ثبت کر دیں۔

میر وشاہ نے بازو پھیلایا۔ ہتھیلی کو اکڑایا اور گردن پر پھیر کر منہ سے 'شیت' کی آواز نکالی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے جس سنگدلی سے سونیا کے قتل کا فیصلہ سنایا تھا، اس کی شخصیت سے لگا نہیں کھاتی تھی۔

میڈم کچھ دیر تک بیٹھی ہونٹ کاٹتی رہی، پھر بولی، ''دیکھ لو؛ اس نے میری بہت خدمت کی ہے۔''

میر وشاہ کے پان کی سرخی میں رنگے ہوئے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا،

''ماڑے دھندے میں غداری کی سجا (سزا) موت ہووت۔ بس!''

''اسے کون قتل کرے گا؟'' میڈم نے ایک بڑا گھونٹ حلق سے اُتارا اور پوچھا۔

''تم!'' میرو شاہ نے اس پر انگلی تانی۔

''میں؟'' وہ ٹھٹکی۔

''اس حرام جادی نے تجھ سے غداری کرت ہے، تم ہی اس کا ٹکٹ کاٹے ناں۔''

میڈم شکیلہ کے چہرے پر ایک ذرا تناؤ دکھائی دیا پھر ایک دم چہرہ اسپاٹ ہو گیا۔ تحکمانہ لہجے میں بولی، ''یہ کام شہریار کرے گا۔ اس کے گرم وجود کو کسی ویرانے میں لے جا کر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دے گا۔ اوکے؟''

میرو شاہ نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں مہارانی! وہ کیا جانت کہ اسے کس حرام جدگی (حرام زدگی) کی سجا (سزا) ملت ہے..... تیرے کو گولی مارنے کا، اس کے سینے میں، پَر پہلے بتانے کا.....''

میڈم نے آنکھیں بند کر لیں۔ آدھے گلاس میں ہوا، آدھے میں مائع آگ بچی تھی۔ اس نے گلاس لبوں سے لگا کر خالی کر دیا پھر ٹھہر ٹھہر کر بولی، ''میں نے کہہ دیا ناں کہ یہ کام شہریار کرے گا۔ لیکن ابھی نہیں..... چند دن بعد..... جب میں کہوں گی۔ اب تم جانا چاہو تو نیچے جاؤ اور ڈرائیور سے کہو۔ وہ تمہیں گھر چھوڑ آئے۔''

میرو شاہ نے جیب سے پان کا پیک نکالا۔ کھول کر پان منہ میں ٹھونسا، سگریٹ کا رٹن پیک کا خاکی رنگ کا موٹا کاغذ تہہ کر کے ڈسٹ بن میں پھینکا اور کھڑا ہو گیا۔ ایک اچٹتی نظر مجھے، پھر میڈم کو دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ نکلتے نکلتے ایک ذرا رُکا، پلٹا اور انگلی تان کر بولا، ''مہارانی! ماڑے ساتھ غصہ نہ کیا کرت ورنہ ماڑے کو جندگی (زندگی) بھر نہ دیکھ سکت.....''

میڈم نے نہ اُس کی طرف دیکھا اور نہ کوئی جواب دیا۔ وہ ایک نگاہِ برہم ڈال کر چلا گیا۔

میں نے پوچھا، ''میرے لیے کیا حکم ہے؟''

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور بولی، ''ادھر آ وَا!''

میں سمجھ گیا۔ وہ کچھ دیر کھیلنا چاہتی تھی۔ اپنے جذبات کے منہ زور گھوڑے کو چارہ دکھانا چاہتی تھی۔

میں نے بہ عجلت مگر مؤدبانہ انداز میں کہا، ''اگر آپ مجھے اجازت دے دیں تو میرو شاہ کے

ساتھ چلا جاتا ہوں۔ڈرائیور کو دو مرتبہ.....''

''کہاں ناں.....ادھر آ ؤ!'' وہ قدرے غصے سے بولی۔

میں بیڈ کے قریب جا کر تھم گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ گلاس کو دیوار کی طرف اچھالتے ہوئے تھوڑا جھومی، لہرائی اور بانہیں کھول کر مجھے دعوت کناں نظروں سے دیکھنے لگی۔ آنکھیں بولتی ہیں تو کبھی نہ سمجھنے والوں کو بھی سمجھانے لگتی ہیں۔ میں نے اس کی مخمور اور بدن میں اُترنے کی الگ خوبی رکھنے والی آنکھوں میں لکھے ہوئے جذبات خیز لفظوں کو پڑھا، اپنے قلب و ذہن میں ابھرنے والی سرسراہٹوں کو محسوس کیا اور چاہا کہ اس کی ناراضی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دروازہ کھولوں اور یہاں سے بھاگ جاؤں.....مگر سیاہ پینٹ شرٹ سے جھانکتا گلاب گوں حسن خیرہ کن چمک سے آنکھوں پر کامیاب حملہ کر چکا تھا۔ جان کے قلعے کی فصیلوں میں شگاف ڈال چکا تھا۔

مجھے ایک دم ساکت کھڑا دیکھ کر اس نے آنکھوں سے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بے بسی سے کہا، ''میڈم! میں آپ کے جتنا مضبوط نہیں ہوں۔''

اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا، پھر مسکرائی اور بولی، ''کم آن! مضبوطی آزمانے پر اپنا آپ ظاہر کرتی ہے۔ تم اپنی منگیتر سے محبت کرتے ہو۔ اس محبت کی طاقت کو میرے قریب آ کر آزماؤ.....ڈرتے کیوں ہو؟ آ ؤ ناں.....''

ناچار ایک قدم بڑھا۔ گھٹنے مخملیں بیڈ شیٹ میں چھپے فوم سے ٹکا کر کھڑا ہو گیا اور مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل پر چلتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر، میرے عین مقابل آ کر تھم گئی۔

وہ جب بھی میرے قریب آتی تھی، میری سانسیں تھمنے لگتی تھیں۔ اب بھی مجھ پر عجیب سی بے خودی طاری ہونے لگی۔ میں چاہنے کے باوجود پیچھے نہ ہٹ سکا۔ اس نے سر اُٹھایا، میری آنکھوں میں جھانکا اور ہونٹوں کو دائروی شکل میں نیم وا کرتے ہوئے میرے چہرے پر پھونک ماری۔ نامانوس مہک نے میرے حواس کا احاطہ کر لیا۔ اس کے منہ سے شراب کی ناگوار بو کے بجائے خوشبو پھوٹتی دیکھی تو تعجب ہوا۔

اس نے کانفرنس میں یہی پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ تب فاصلے پر بیٹھی تھی۔ دل قابو میں رہا تھا۔ اب قریب از جان تھی۔ دل کو مٹھی میں لے چکی تھی۔ میں نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر اندر کہیں

مزاحمت جنم لے چکی تھی اس لئے تھما رہا۔ اس نے اپنی بانہیں پھیلائیں، مزید قریب نہیں ہو سکتی تھی مگر ہو گئی اور اپنا وزن مجھ پر ڈال کر بولی، ''عمومی طور پر لڑکیاں قریب آنے کی خواہش دل میں پالتی ہیں اور عین موقع پر ان کے قدم بے اختیار پیچھے ہٹنے لگتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ مرد ہو کر بھی مجھ سے دور بھاگتے ہو۔ مجھ میں کوئی کمی ہے یا.....''

اس نے اپنی بانہیں میرے گرد پھیلاتے ہوئے جان بوجھ کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر میرے ذہن کو چیلنج کے حصار میں دے دیا تھا۔ بعض ادھورے جملے اپنے تئیں پورا متن دیتے ہیں۔

میں نے جلدی سے کہا، ''ایسی بات نہیں ہے میڈم! میں اپنی اوقات کو دیکھتا ہوں تو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔''

''میری بانہوں میں کھڑے ہو، میری سانسوں سے سانسیں چُرا رہے ہو، پھر بھی اوقات کا گلہ کرتے ہو۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت اور عشق کی بساط پر پیادے بڑھانے کی کھلی دعوت عیاں تھی، بولی، ''میرے بزنس نیٹ ورک میں سب سے اہم فرد میرو شاہ ہے۔ وہ مجھے انکار کر سکتا ہے، ڈانٹ لیتا ہے اور روٹھنے کی اداکاری بھی کر دکھاتا ہے۔ اس کی اوقات تم نے دیکھ ہی رکھی ہے۔''

اس کی سانسوں کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ اچانک علیحدہ ہو کر بیڈ سے اُتری۔ میرے عقب میں آئی۔ میں بے اختیار جلدی سے پلٹا۔ دیکھنا چاہا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ تب تک اُس نے میری چھاتی پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور کا دھکا دے دیا۔ میں کمر کے بل بیڈ پر گرا۔ جلدی سے اُٹھنا چاہا مگر اس کے کوٹ سے چھلکتے بدن کی لپک میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ وہ مجھ پر لیٹ گئی اور اپنا چہرہ میری چھاتی پر رکھ کر ایک دم ساکت ہو گئی۔ اس کی سانسوں کا گرم لمس میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر سرسرانے لگا۔

میں نے اُٹھنا چاہا۔ نہ اُٹھ سکا۔ مدافعانہ لہجے میں بولا، ''میڈم!''

اس نے میرے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے خاموش ہونے پر کھیلنے لگی۔ قدرے بھاری آواز میں ہولے سے بولی، ''میرا جوڑا کھول دو۔''

میں نے اپنی زندگی میں کسی کو جوڑا باندھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ نہ کبھی کھولا ہی تھا۔ کیسے کھلتا تھا؟..... پتہ چلا مگر اس کی ریشمی زلفوں نے تب تک مجھ سے تمام منظر چھین لیے کیونکہ اس کے بال کھل کر میرے چہرے پر پھیل گئے تھے۔ بالوں سے پھوٹنے والی بھینی بھینی خوشبو نے

میرے ذہن کو اپنی مسحور کن گرفت میں لے لیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی تاب نہ رہی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے مضطرب ہاتھ نے میرے لبوں کو آزاد کر دیا۔ گریبان کے بٹن کھول دیے۔ جونہی اپنے سینے پر اُس کے ہاتھ کا گداز اور پُر حدت لمس جاگا، میری سانسیں تھمنے لگیں۔ میں نے مزاحمت کی مگر اس میں جان نہیں تھی۔ میں نے بدقت تمام کہا، ''میں زرخرید کھلونا ہوں مگر آپ یہ خیال کیوں نہیں رکھتیں کہ اس کھلونے میں ایک دل بھی موجود ہے۔''

چونکی، سر اُٹھایا اور میرے چہرے پر اپنی زلفوں کی آبشار کو سرسراتے ہوئے مخمور لہجے میں بولی، ''تم کھلونے نہیں، میرے دوست ہو۔ دوست کا دل ڈھونڈ رہی ہوں۔''

''میں دوست نہیں؛ ملازم ہوں۔ آپ مجھے اپنے کمرے میں لا کر کچھ دیر کھیلتی ہیں۔ پھر دور جانے کا حکم دیتی ہیں۔ میں آتا ہوں، چلا جاتا ہوں، بے جان انداز میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہوں مگر اپنی مرضی سے آپ کو چھو نہیں سکتا۔ آپ کو دیکھ نہیں سکتا..... کیا میں دوست ہوں؟'' میرے لہجے کی بے بسی نے موہوم طنز کی صورت اختیار کر لی۔

''تم غلط کہتے ہو۔''

''ٹھیک کیا ہے؟''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ کچھ فاصلے پر بوتل پڑی تھی۔ بوتل کے ساتھ اس کا موبائل فون پڑا تھا۔ اس نے فون تھاما، میرے سینے پر رکھ کر سر ڈال دیا۔ زلفوں نے پھر میرا احاطہ کر لیا۔ وہ مجھ پر لیٹے لیٹے فون سے کھیلتی رہی، پھر فون میرے سینے پر رکھتے ہوئے مترنم آواز میں گنگنائی،

''تجھ میں رب دکھتا ہے، یارا میں کیا کروں.....''

وہ خاموش ہوئی تو فون بول پڑا۔ مدھم موسیقی کی لَے کے ساتھ کمرے میں مردانہ آواز گونج گئی، ''تو ہی تو جنت میری، تو ہی میرا جنوں..... تو ہی تو منت میری، تو ہی روح کا سکوں..... اور کچھ نہ جانوں، میں بس اتنا ہی جانوں؛ تجھ میں رب دکھتا ہے، یارا میں کیا کروں.....''

گیت چل رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے سن رہے تھے۔ گیت تھم گیا۔ یوں لگا جیسے دنیا تھم گئی ہو۔ کارِ جنوں میں مبتلا، اپنے ہاتھ کی پیدا کردہ سرسراہٹوں سے بے خبر، جذبات سے مغلوب لہجے میں بولنے لگی، ''شہریار! میں امیر ہوں۔ پڑھی لکھی ہوں۔ جو چاہتی ہوں، خرید لیتی ہوں۔ انسان بھی..... مگر میرا دل بھی چاہتا ہے کہ کوئی ایسا شخص ہو جو میری ان خوبیوں سے

ماورا ہو کر مجھ سے پیار کرے۔ تم تازہ دل شخص ہو۔ دیہات کی تازہ فضا سے نکل کر سیدھے یہاں آئے ہو۔ تبھی ڈرتے ہو۔ دل کی بات کرنے سے بھی گھبرا جاتے ہو۔ میں جس دم چاہوں کہ تم ہاتھ بڑھا کر مجھے توڑنے کی کوشش کرو، تم اپنے ہاتھوں کی رگوں سے خون کھینچ لیتے ہو کہ کہیں وہ اپنی گرمی سے مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچا دیں۔''

میں نے کہا، ''میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔''

''کیا عزت کرنے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے؟'' وہ سر اُٹھا کر تھوڑا اوپر کھسکی، جان لبوں تک آ گئی تو وہ تھم گئی، بولی، ''شہریار! میرو شاہ نے دھن کی دنیا میرے لیے پلیٹ میں سجا کر رکھ دی۔ میری دولت اور طاقت نے تن کی دھونکنیاں میرے سامنے پیش کر دیں۔ جیسے تم! نہ چاہتے ہوئے بھی میرے نیچے پڑے رہنے پر مجبور ہو۔ دل غزالہ، غزالہ کرتا ہے۔ زبان میرے احترام کا کلمہ پڑھتی ہے۔ مگر مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے۔''

''تو کیا چاہیے آپ کو؟'' بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔

''مجھے شیلف میں جھاڑ پونچھ کر رکھی گئی وہ کتاب نہیں بننا جس کو پڑھنے کے بجائے شوق بھری نظروں سے دیکھ کر شیشے میں قید کر دیا جاتا ہے۔ مجھے کھولو، پڑھو..... کیا لکھا ہوا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ تحریر مجھ سے زیادہ خوبصورت ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس تحریر میں بلاخیزی ہو، جنوں ہو یا ورق ورق خالی ہو اور کسی حقیقی شبد کار کا منتظر ہو.....''

میں نے سوچا؛ وہ تشنہ تھی۔ اپنے پڑھے جانے کی آرزو میں گھل رہی تھی۔ تبھی میں نے آہستہ سے کہا، ''آپ شادی کیوں نہیں کر لیتی ہیں؟''

اس کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ فون میرے سینے سے پھسل کر پہلو کی طرف گر گیا۔ اس نے چہرہ میری آنکھوں کے مقابل لا کر گہری اور مستفسر آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں اور ایک ذرا توقف کے بعد پوچھا، ''کس سے؟''

میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر گڑبڑا گیا۔ اس نے سر جھٹکا۔ اپنی زلفوں کے احاطے میں رکھتے ہوئے مجھ پر جھک گئی۔ دونوں آنکھوں کو چومنے کے بعد ہونٹوں کو آگ لگانے لگی۔ پھر چابی والے کھلونے کی طرح رُک گئی، بولی، ''تمہاری آنکھیں سچ بولتی ہیں۔ زبان جھوٹ کا سہارا لیتی ہے۔ آنکھوں سے بتاؤ کہ مجھے کس سے شادی کرنی چاہیے؟''

میری آنکھوں میں سوائے اس کے حسن بلائے جاں کی توصیف کے کچھ نہیں تھا۔ مگر وہ

اپنے مطلب کی ہی کوئی تحریر کھوج رہی تھی۔ میں نے کہا، ''مجھے چھوڑ دیں ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔''

وقت جانتا تھا کہ ایسے موقع پر دم نہیں گھٹتا، سانسیں گھٹنے لگتی ہیں، تبھی میرا جھوٹ سن کر روٹھ گیا اور میڈم کی انگلی تھام کر چلنے لگا۔ وہ مسکرائی، پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی، بولی، ''میں جس سے چاہوں، شادی کر سکتی ہوں۔ کس سے شادی کرنی ہے؟ یہ فیصلہ بھی وقت آنے پر کر لوں گی۔ ابھی تم خاموش ہو جاؤ۔ میرے دل کو چند نئی دھڑکنیں لینے دو۔''

ناگن کی طرح بل کھا کر سیدھی ہوئی، پھر نیچے کھسک گئی اور میرے وجود پر رہتے ہوئے کروٹ بدل کر سینے پر سر رکھ کر خاموش ہو گئی۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ جسم ہلکی آنچ پر دہک کر الاؤ گیر ہو گیا۔ سانسیں غیر معتدل ہو گئیں۔ جی چاہا کہ اُسے پرے پھینک کر اس دشتِ جنوں سے نکل جاؤں۔ شاہد سلیم نے کہا تھا کہ یہ دنیا ٹارچر سیل ہے۔ مصیبت گاہ ہے۔ ایک زندہ، گرم اور تڑپتی ہوئی مصیبت میرے سینے پر چڑھی میری جوانی کی سرد سل پر مونگ دل رہی تھی اور پُر حدت سانسوں کی ضربوں سے میرے وجود کو چکنا چور کرنے پر کمربستہ تھی۔

میں نے زِچ ہو کر کہا، ''مجھے جانے دیں۔''

اس نے سر دائیں بائیں ہلایا۔ بولی، ''نہیں..... خاموشی سے لیٹے رہو اور میرے بال سمیٹ دو۔''

میرا ایک بازو آزاد تھا جس سے آدھے بال سمیٹ دیے۔ آدھے بکھرے رہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے نرم اور سرکتے ہوئے بالوں سے کھیلتا رہوں۔ بس اتنی سی دیر..... جتنی دیر تک میرا دل دھڑک رہا تھا..... وہ سرتاپا حسن کا مکمل شہکار تھی اور شہکار کبھی کبھار تخلیق پاتے ہیں۔

اس نے پھر کروٹ بدلی، گردن تلے دونوں ہاتھ ڈالے اور بالوں کو جھٹک کر مجھ پر پھیلا دیا۔ میری بے بسی سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسی اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر اس نے اپنے سینے پر اوپر تلے رکھ کر اپنے ہاتھوں تلے بھینچ لئے۔ میرے تنے ہوئے اعصاب بے جان ہو گئے۔

کافی دیر گزر گئی۔ اس کی سانسوں کے مخصوص تسلسل نے مجھ پر باور کرایا کہ وہ سو چکی تھی۔ عجیب اور نہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ وہ بھرپور جوان لڑکی تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں تنہائی میں بے فکری کی نیند نہیں لے پاتیں۔ خوابوں کی چھڑ چھاڑ کی زد میں آدھی سوتی، آدھی جاگتی ہیں۔ مستزاد یہ کہ وہ جس دنیا میں سانسیں لیتی تھی، اس دنیا میں اپنے سائے پر بھی شک کرنے کا

رواج تھا۔ بظاہر یہ اُس کا بیڈ روم تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ یہاں سویا نہیں کرتی تھی۔ سونے کے لیے وہ اس کمرے سے گزر کر کسی اور جہان میں جایا کرتی تھی جہاں اس نے اپنی حفاظت کے لیے بہت سے انتظامات کر رکھے تھے۔ آج سبھی احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ کر میرے سینے پر لیٹی سو گئی تھی۔ یوں کہ اُسے مجھ سمیت کسی سے بھی کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

اس کا وجود بھلے موٹے کوٹ اور پینٹ میں چھپا ہوا تھا اور سوائے ہاتھوں اور چہرے کے کچھ بھی ننگا نہیں تھا مگر میرا احساس برہنہ پا تھا۔ میری عمر بھی آتش گیر تھی۔ ایسے میں اس کا شعلے کی نوک پر گہری نیند سو جانا حقیقت کا پرتو نہیں تھا۔ وہ یقیناً بن رہی تھی۔ مجھے بنا رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی، بدن ڈھیلا چھوڑا اور اپنا دھیان بدلنے کے لیے کمرے کے دکھائی دینے والے گوشے پر نظریں جما دیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، جیسا میں نے اس سے پیشتر ملاقاتوں میں دیکھا تھا۔ اگر کچھ بدلا تھا تو وہ میرا مقام تھا، میری حیثیت تھی جو اس وقت شدید ہیجان اور جذباتی بھونچال کا شکار تھی۔

ہاتھ حرکت کے قابل نہیں رہے تھے اور نہ ہی میں انہیں ہلا کر نئے فتنے کو جگا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے ہونٹوں سے اُس کے بالوں کو چھیڑا، کوٹ کے کالر کو دانتوں میں لے کر ننھے ننھے جھٹکے دیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کافی دیر گزر گئی۔ اس کے استغراق اور سکوت میں کوئی تغیر وقوع پذیر نہ ہوا تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں کب تک اپنا دامن بچائے یوں بے جان انداز میں اس کے خوب صورت بدن تلے دبا رہ سکتا تھا؟..... مجھے شبہ تھا کہ وہ جاگتے ہوئے سونے کی اداکاری کر رہی تھی مگر پھر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کوئی شخص اتنی دیر تک ڈھیٹ بن کر خاموش رہ نہیں سکتا تھا۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ سو گئی تھی۔

ہم ابتدائے شب میں کمپیوٹر کالج کے کانفرنس روم سے نکلے تھے۔ بیڈ کے عین اوپر آویزاں دیوار گیر گھڑی پر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات کے دس بجنے لگے تھے۔ اُس کی خوابیدگی کا دورانیہ ایک گھنٹے سے متجاوز ہو گیا تھا۔ اتنی دیر سے میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا، کبھی ہار کی طرف مائل، کبھی جیت پر استوار..... لڑکھڑاتے ہوئے ذہن کو قابو میں رکھنا مشکل تھا مگر اس کی شخصیت کی ٹرانس، حاکمانہ مزاج اور اپنی حیثیت کا حقیقت پسندانہ احساس میری فتح میں بنیادی کردار ادا کرتا رہا اور میں کوئی حرکت کیے بغیر پڑا رہا۔

پھر ساڑھے دس بج گئے۔ دل میں خوف جاگا کہ کہیں اس دار پر لٹکتے ہوئے پوری رات

آنکھوں میں نہ کاٹنی پڑ جائے۔ ایسے ہی وقت میں اس کے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ میں نے چہرے پر پھیلے بالوں کو سر ہلا کر ایک طرف ڈھلکایا، دیکھنے کی جگہ بنائی اور موبائل فون کی روشن سکرین پر جلتے بجھتے ہندسوں کو دیکھنے لگا۔ میڈم کے بدن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تو میں نے کہا، ''میڈم! آپ کا فون بج رہا ہے۔''

میں نے اپنے ہاتھوں کو ہلایا۔ میرے یرغمال من میں نیا فتنہ جاگ پڑا۔ لحظہ بھر میں پورے بدن میں بجلی کی رو دوڑی۔ بہ دقت تمام، ہونٹ بھینچ کر، آنکھیں سختی سے میچ کر، میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ کسمسا کر بیدار ہو گئی تھی تو میں نے اپنی بات دہرائی۔

وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔ ''بجنے دو!''

''کوئی ضروری کال ہو سکتی ہے۔''

''نمبر دیکھ رہے تو بتاؤ..... صرف آخری تین ہندسے۔'' اس کی آواز مرتعش تھی۔

میں نے سکرین پر دیکھا، پھر کہا، ''زیرو ڈبل نائن.....''

وہ بیزاری سے بولی، ''اَن نون نمبر ہے۔ کسی کے ہاتھوں میں کھجلی ہو رہی ہے۔''

بزر ایک مرتبہ بج کر خاموش ہو گیا۔ پھر بجنے لگا۔ وہی نمبر جگمگا رہا تھا۔ وہ بولی، ''وہی ہے ناں؟''

''جی!'' میں نے کہا۔ مجھے اپنی آواز کی شکستگی کا از خود احساس ہوا۔ کمزور سی صدائے احتجاج بلند کی، ''میڈم! خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔''

اس نے رحم کرنا نہیں سیکھا تھا، نہیں کیا تو میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے ہاتھ کھینچنے چاہے۔ وہ بظاہر بے جان، درحقیقت چوکس تھی۔ میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے ہنسی، بولی، ''اوں ہوں..... کچھ دیر ایسے ہی پڑا رہنے دو۔''

''مجھے خود پر ترس آنے لگا ہے۔''

''مجھے بھی..... تبھی کہہ رہی ہوں کہ مجھے کچھ دیر تک زندگی کا احساس حاصل کرنے دو۔ پھر تمہیں گھر جانے کی اجازت دے دوں گی۔''

موبائل فون کا بزر تیسری مرتبہ بجنے لگا۔ اس نے میرا دایاں ہاتھ چھوڑ دیا، بولی، ''کال ریسیو کرو اور وائڈ سپیکر آن کر دو۔''

میں نے بتایا کہ مجھے اس کے موبائل سیٹ کے آپریٹنگ پینل کا علم نہیں تھا۔ اس نے میرا

دوسرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا اور ناگن کی طرح تڑپ کر اوندھی ہوگئی۔ ہاتھ بڑھا کر فون قریب کیا مگر بیڈ پر پڑا رہنے دیا۔ کال ریسیو کرتے ہی کوئی بٹن دبایا۔ وائڈ سپیکر سے پھوٹنے والی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ کسی نے 'ہیلو' نہیں کہا تھا بلکہ چند لمحوں تک سائیں سائیں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر ایک چیختی ہوئی نسوانی آواز گونجی، ''تیکوں آدھی ہاں پئی جو میکوں اوندھا کئی پتہ کائی.....خدا کیتے ساڈی جان چھوڑ ڈیو.....''

(تجھے کہہ رہی ہوں کہ مجھے اُس کا علم نہیں ہے۔ خدا کے لیے ہماری جان چھوڑ دو۔)

نسوانی لہجے سے عیاں تھا کہ وہ کوئی بوڑھی اور ان پڑھ خاتون تھی جو بڑے درد میں ڈوب کر چیخی تھی۔ وہ آواز اپنی تمام تر ناتوانی کے باوجود کسی شعلے کی طرح بھڑکی تھی؛ کسی کوندے کی طرح لپکی تھی کیونکہ مجھ پر ڈھیر ہوئے پڑے میڈم شکیلہ کے سست وجود کو اچانک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ تڑپ کر اُٹھی۔ اس کے ہٹتے ہی میں بھی اُٹھ گیا۔ اس نے فون اُٹھایا، زور سے 'ہیلو' کہا مگر اسے جواب نہ ملا۔ ایسی آواز سنائی دی جس سے صاف پتہ چلا تھا کہ بولنے والی بوڑھی خاتون کو کسی نے زوردار تھپڑ دے مارا تھا۔ اس کی چیخ بڑی دردناک تھی۔

''اللہ داناں ہوے.....میکوں ناں مارو.....نانہہ جوڑ ساسگدی جو اُہ موئی کتھ وَدی ہے تاں کیوں نوے منیندے.....ہائے وے میڈے ربا!''

(اللہ کا نام مانو، مجھے نہ مارو، میں نہیں بتا سکتی کہ وہ کہاں ہے تو تم لوگ کیوں نہیں مانتے۔ ہائے میرے ربا!)

وہ میری طرف پشت کیے گھٹنوں کے بل بیٹھی فون کو گھور رہی تھی۔ میں جلدی سے بیڈ کی پائنتی کی جانب آیا۔ اسے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کا چہرہ بے حد سرخ، آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیلی ہوئیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ فون کے وائڈ سپیکر میں سے اُسی خاتون کی منت سماجت کی نقاہت سے معمور آواز برآمد ہو رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آواز ایک کم سن بچے کے رونے کی آواز میں دب گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میڈم کو مامیں چلی گئی تھی کیونکہ اس کا زندگی سے بھرپور چہرہ موت کی طرح سنگینی ہو گیا تھا۔ چہرے کی سرخی پیلی چادر اوڑھنے لگی تھی۔

کوئی تیسری آواز سنائے بغیر کال منقطع کر دی گئی۔ کمرے میں روتے ہوئے بچے اور بوڑھی خاتون کی آوازیں چکرانے لگیں۔ میڈم پہلو کے بل کھلی ہتھیلی پر گر گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

میں نے پوچھا، ''میڈم! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟''

اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فون سے پھوٹنے والی دل شگاف آوازیں سن کر مجھ سے بے خبر ہوگئی تھی۔ میں نے ہمت کی اور اس کے مقابل میں بیڈ پر ٹک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا پھر فون اُٹھالیا۔ جس نمبر سے کال آئی تھی، اُس نمبر پر کال 'او کے' کی۔ دوسری طرف گھنٹی بجی پھر کسی نے کال منقطع کرتے ہوئے سمجھا دیا کہ اسے جتنا سنانا ضروری تھا، سنا دیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ اُسے کچھ نہیں دیا جائے گا۔ اس نے جھنجھلا کر نمبر ری ڈائل کیا۔ اس مرتبہ فون کے سپیکر میں 'آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے.....' کا ریکارڈ شدہ وائس کلپ چلنے لگا۔ میڈم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے فون بیڈ پر ڈال دیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اُس کے چہرے پر ایسی مردنی چھائی ہوئی دیکھی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگی تھی کہ اس کے کانوں میں پڑنے والی دونوں آوازوں کا تعلق براہِ راست اس کی ذات سے تھا۔

میں نے کہا، ''میڈم! آپ کی حالت درست نہیں ہے۔''

میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود پر طاری ہونے والی اس جانکاہ کیفیت سے نکل آئے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بدستور پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھے گئی۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا، ''بتائیں ناں، کیا ہوا ہے؟''

میرے جھنجھوڑنے کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی لہر دوڑی۔ اس نے طویل سانس لے کر، مجھے ایک شناسائی بھری نظر دیکھ کر اپنا موبائل فون اُٹھایا۔ ایک مرتبہ پھر کال ملانے کی کوشش کی۔ ناکام ہوئی تو کوئی اور نمبر ملانے کے لیے بٹن پش کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر بولی، ''ہیلو..... پیا! تم اس وقت کہاں ہو؟''

کمرے میں غیر معمولی سکوت تھا۔ تبھی پیا کی آواز بغیر وائڈ سپیکر کے میرے کانوں میں پہنچی۔ وہ مؤدبانہ انداز میں بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کسی ہوٹل میں بیٹھا کھانا سرو کیے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

میڈم نے تحکمانہ لہجے میں کہا، ''کھانا چھوڑ دو۔ میں ایک نمبر تمہیں ایس ایم ایس کے ذریعے بھیج رہی ہوں۔ اس کا پتہ کرو؛ کس کا ہے اور کہاں چل رہا ہے۔ او کے؟''

پیا نے جواب دیا، ''جی میڈم! آپ کو ایک گھنٹے میں رپورٹ مل جائے گی۔''

میڈم نے سختی سے تاکید کی، ''نہیں..... میرے پاس وقت کم ہے۔ پندرہ بیس منٹوں میں رپورٹ دو۔''

اس نے پیا کی بات سنے بغیر رابطہ منقطع کیا، 'پاور ڈ آف' ہونے والے فون کا نمبر پیا کے سیل فون پر 'سینڈ' کیا اور دونوں رانوں پر ہتھیلیاں ٹکا کر بیڈ پر جھکتی چلی گئی۔ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ بے حد مضطرب تھی۔ اسے میرے دلاسے اور تقویت کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی اور سر اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی۔

میں نے کہا، ''میڈم! مجھے پوری طرح تو علم نہیں کہ آپ اس وقت کس الجھن میں گرفتار ہیں مگر یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ شدید تکلیف میں ہیں۔ آپ خود کو سنبھالیے۔ منتشر ذہن انسان کی مدد نہیں کرتا بلکہ رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔''

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتی رہی پھر لمبی سانس حلق میں اُتار کر مسکرائی۔ آزردگی میں گندھی ہوئی یہ مسکراہٹ بہت دل فگار تھی۔ ہونٹوں پر عمودی سرخ لائنیں واضح ہو گئیں۔ غور کیا تو اس کی آنکھوں کے گوشے نم دکھائی دیے۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ سارے تکلفات اُس ایک لمحے کی نذر ہو گئے اور میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ تقویت خیز لہجے میں کہا، ''میڈم! آپ رو رہی ہیں۔ نہیں..... میڈم! میں بہت چھوٹا ہوں۔ اتنا کہ آپ کے دکھ کو سمجھنے کی قدرت بھی شاید نہیں رکھتا مگر..... مگر میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ انہیں پونچھنے کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ میری گستاخی پر درگزر کیجیے گا۔''

اس کا چہرہ بہت گرم تھا۔ آنسو اس سے بھی زیادہ گرم تھے۔ میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے دکھ کے ڈھلتے دریاؤں کو پونچھ لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی، پھر ڈھلکتے ہوئے میرے زانوؤں پر اوندھے منہ گر گئی۔ میں نے اس کے آبشار بالوں میں اپنی انگلیاں پیوست کر دیں اور کہا، ''اگر مناسب سمجھیں تو مجھے حکم دیجیے..... کس نے آپ کا دل دکھایا ہے؟ میں اس پر قہر بن کر ٹوٹ پڑوں گا اور ان دو آنسوؤں کا خراج منوں خون کی صورت میں وصول کر کے پلٹوں گا۔''

وہ چند آنسو رو کر تھم گئی تھی۔ اب رو نہیں رہی تھی کیونکہ اُس کا بدن ساکت تھا۔ کچھ دیر ایسے

ہی گزر گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات مجھ سے چھپا رہی تھی، تیزی سے کچھ سوچ رہی تھی اور فیصلہ کرنے کی مہلت لے رہی تھی۔ میرا اندازہ سچ ثابت ہوا۔ دو چار منٹ..... یا..... کچھ زیادہ وقت لینے کے بعد وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی، اچھل کر بیڈ پر کھڑی ہوئی اور بولی، ''شہریار! تیاری کرو، تمہیں اپنے گھر اور مجھے کہیں دور جانا ہے۔''

میں نے جلدی سے پوچھا، ''کہاں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ فون اُٹھا کر بیڈ سے اُتری اور جلدی جلدی شوز پہننے لگی۔ اس کے خوابیدہ اور جذباتی آسودگی کے پرزم پر تھرکنے کے بعد نڈھال ہونے والے اعصاب میں یک لخت بجلی سی بھر گئی تھی۔ بیڈ کے دراز میں سے ایک سلور کلر کا اسمارٹ سا پسٹل نکالا۔ میگزین نکال کر چیک کی۔ مٹھی بھر فالتو گولیاں نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیں۔ ایک اڑھائی تین انچ چوڑا سنہرے رنگ کا ہیئر بینڈ نکال کر اُس نے اپنے بالوں پر چڑھا دیا۔ اگر جوڑا کھل بھی جاتا تو اس کے لمبے بال اُس کے لیے کوئی فوری پریشانی پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ صوفے اور بیڈ کے عین بیچ میں ترچھے پڑے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رُکی، بالوں کو ہاتھوں میں بھر کر جوڑے کی شکل میں سمیٹا اور تیزی سے بولی، ''چلیں..... میں تمہیں شہر میں کہیں اُتار دوں گی۔ رکشا پکڑ کر گھر چلے جانا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اچانک خیال آیا کہ وہ بہت زیادہ پریشان تھی۔ اس کا کہیں اکیلے جانا اس وقت کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں تھا۔ کچھ غلط ہو جاتا تو میر وشاہ میرا جینا دوبھر کر دیتا۔ میں نے کہا، ''میڈم! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

''کہاں؟'' وہ بے رُخی سے بولی۔

''جہاں آپ جا رہی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر..... نہیں..... میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں جا رہی۔ میرا وقت نہ ضائع کرو اور چلو.....''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور سخت لہجے میں کہا، ''میں آپ کو اس حالت میں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ ساتھ جاؤں گا۔''

وہ ٹھٹکی اور مجھے گہری نظروں سے دیکھنے لگی، بولی، ''مگر کیوں؟''

''بھلے ناراض ہوں مگر میں نے آپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' میرے انداز سے میرا تیقن اور اس کی ذات سے خلوص ہویدا تھا، ''میڈم! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت طاقتور

ہیں، کسی بھی صورتِ حال سے باآسانی نمٹ سکتی ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا؛ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

اس نے کچھ دیر سوچا پھر میرے اصرار کے آگے ہار مان لی، بولی، ''او کے! آر یو فٹ فار دی ریشنگ ایکشن؟''

میں نے خلوصِ دل سے کہا، ''یس، آئی ایم فٹ میڈم!''

''ایک اور بات.....'' اس نے بے حد درشتی سے کہا، ''تم کچھ پوچھو گے نہیں؛ بس دیکھنے پر اکتفا کرو گے۔''

میں نے کہا، ''مجھے قبول ہے میڈم!''

اس نے مجھ پر ایک نگاہِ عجب ڈالی، انٹر کام پر سونیا کو اپنی روانگی سے مطلع کرتے ہوئے کنٹرول پینل پر بیٹھنے کا حکم دیا اور ریسیور کو بے دردی سے کریڈل پر پٹخ کر میری طرف دیکھے بغیر بولی، ''کم آن! ہری اَپ!''

چند منٹ قبل دکھائی دینے والی ملول لڑکی چاق چوبند، زیرک اور سفاک آنکھوں والی میڈم شکیلہ کا روپ دھار کر میری نظروں کے سامنے سج گئی۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پارکنگ میں آئے۔ اس نے بلند آواز میں ظاہر خان کو گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔ جلدی میں گاڑی کی چابی اُٹھانا بھول گئی تھی۔ احساس ہونے پر، تیز تیز قدموں سے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی، ''شہریار! ٹیبل پر گاڑی کی چابی پڑی ہے۔ اُٹھالاؤ۔''

میں دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں گیا۔ چابی اُٹھائی اور پارکنگ میں آیا۔ اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں چابی پکڑی، گیٹ کھولا اور اچھل کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے بٹن دبا کر برابر والا گیٹ بھی کھول دیا۔ اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے تک میں اگلی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

اس نے کھلے ہوئے گیٹ میں گاڑی روکی، ہاتھ کے اشارے سے ظاہر خان کو بلایا اور کہا، ''اپنی گن اور فالتو راؤنڈز شہریار کو دے دو۔ اپنے لیے اندر سے گن نکال لاؤ۔''

ظاہر خان نے گن اور فالتو میگزین میرے حوالے کر دی۔ وہ شاید کوٹ کی بڑی جیب سے اور گولیاں نکال کر مجھے دینے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر میڈم نے ایک جھٹکے سے گاڑی بڑھا دی۔

میں نے گن اپنی ٹانگوں کے بیچ کھڑی کی، میگزین سائیڈ پاکٹ میں ڈالی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ہونٹ بھنچے ہوئے، آنکھیں سلگتی ہوئیں اور پیشانی پر فکر و تردد کی غماز

لکیروں کا جال تنا ہوا..... وہ سخت برہم تھی، افسردہ بھی۔ میں نے دل ہی دل میں 'یا اللہ خیر!' کہا اور ڈیش بورڈ میں نصب ڈیجیٹل کلاک پر وقت دیکھا۔ پونے گیارہ کا عمل تھا۔ شہر جاگ رہا تھا۔ اس وقت تک دیہاتوں میں رہنے والے اپنی آدھی نیند پوری کر چکے ہوتے ہیں۔

وہ خطرناک ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی کو بچا نہیں رہی تھی، لوگ اپنا بچاؤ خود کر رہے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ ٹوکا۔ اس پر اثر نہ ہوا۔ دوسری مرتبہ اسے احتیاط سے چلانے کا مشورہ دینے کی جرأت مجھ میں پیدا نہ ہوئی۔ ہم عزیز ہوٹل کی طرف گئے، پھر اوور ہیڈ برج عبور کر کے شجاع آباد روڈ پر چڑھ گئے۔ یہاں دن میں تنگ سڑک پر انسانوں کا کھوئے سے کھویا چھلتا ہے۔ رات کو بھی سڑک ویران نہیں ہوتی۔ اسٹیئرنگ ویل پر اس کی بانہیں بڑی تیزی سے اوپر نیچے ہو رہی تھی اور بڑی جسامت والی نئے ماڈل کی گاڑی شارک مچھلی کی طرح بل کھاتی لہراتی سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ میں نے پیا جی اور سخی محمد کی ڈرائیونگ کو باکمال ڈرائیونگ کا درجہ دیا تھا۔ اس کی ڈرائیونگ کو دیکھا تو جو کلمے پڑھ رکھے تھے، سبھی دل ہی دل میں ان گنت مرتبہ دہرا لئے۔ اسے بارہا شاباش بھی دی کیونکہ میرے اندازے کے مطابق جہاں سے گاڑی گزر نہیں سکتی تھی، اُس نے رفتار کم کئے بغیر گزار دکھائی تھی۔ اس کی ٹھہری ہوئی آنکھیں اور اسپاٹ چہرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے حواس میں نہیں تھی اور اس کا یہ جذباتی روپ پہلی مرتبہ مجھ پر آشکار ہوا تھا۔

بیس منٹ بعد ہم ناگ شاہ چوک پر پہنچ کر شاہراہ عبور کر رہے تھے۔ میں اس طرف پہلی مرتبہ آیا تھا۔ جس مکان میں زور آور مجھے لے گیا تھا، اس کے چاروں اطراف اینٹوں کے بھٹے پھیلے ہوئے تھے۔ اس طرف بھی سڑک کے دونوں اطراف بھٹوں کی اونچی اور مخصوص ساخت کی چمنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سن رکھا تھا کہ یہ علاقہ زرخیزی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا جبکہ آنکھوں کو بے آباد اور قدرے ویران علاقہ دکھائی دے رہا تھا۔ شاید سڑک کے قرب و جوار میں فصلیں نہیں تھیں۔

سڑک کے کنارے پر ایستادہ سفید رنگ کے سنگِ میل دیکھ کر اندازہ کر چکا تھا ہم وہ شجاع آباد کی طرف جا رہے تھے۔ بلیل، ڈابر اور آدھی باغ..... چند اور چھوٹے چھوٹے اسٹاپ..... ورنہ بے رغبتی گام گام چھلکتی رہی۔ آدھی باغ کے قریب آم کے باغات دکھائی دیے تھے۔ کچھ دور تک باغات کا سلسلہ ہمارے دائیں بائیں چلتا رہا، پھر ختم گیا۔ میڈم کے فون کا بزر بجا۔ اس

نے کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔کال اٹینڈ کی، بولی، ''ہاں پیا! جلدی بولو؛ کچھ پتہ چلا؟''

سپیڈو میٹر کی سوئی ایک سو بیس پر تھرک رہی تھی۔ رات کو کراسنگ کا مرحلہ مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹی سی غلطی بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے مگر میڈم نے اسپیڈ کم نہیں کی تھی۔ میں نے میڈم کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا کہ پیا کی رپورٹ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ وہ بولی، ''نہیں.....تم فکر نہ کرو۔کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔موبائل جیب میں ڈالنے کے بجائے ہاتھ میں پکڑ کر اسٹیئرنگ ویل تھام لیا۔میں نے پوچھا، ''کچھ پتہ چلا؟''

اس نے اوپر والے ہونٹ پر نچلا ہونٹ چڑھایا، سر کو نفی کے انداز میں دائیں بائیں جھٹکا اور بولی، ''کم بخت فون کمپنیوں نے بوگس ماڈیولز جاری کر رکھے ہیں۔ پیا نے کمپنی کے فرنچائز آفس کے کلرک کے ذریعے کسٹمر سنٹر سے معلومات حاصل کی ہیں۔سیریل نمبر ضلع فیصل آباد کا تھا اور کسی اکبر علی کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔''

ہمارے زیر استعمال تمام نمبروں کی حیثیت بھی بعینہٖ ایسی ہی تھی۔ بہ فرضِ محال اکبر علی کو ٹریس کر بھی لیا جاتا، تب بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔زیادہ امید یہ تھی کہ اکبر علی کو اس نمبر کے اجرا کا علم ہی نہ ہوتا۔

بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار کم کی۔سامنے نہر کی پلی دکھائی دے رہی تھی۔اس نے دائیں طرف گاڑی موڑ لی۔نہر کی پٹڑی پر بنی ہوئی سڑک پر گاڑی مچھلی کی طرح پھسل رہی تھی۔میں نے اَز حد احتیاط سے کہا، ''میڈم! آپ اپنے غصے پر قابو پائیں ورنہ آپ وہ کچھ نہیں کر پائیں گی جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔''

اس نے کہا، ''تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں۔میں سگریٹ نہیں پیتا۔''

اس نے ہنکارا بھرا۔بولی، ''ہم تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد اس نے نہر کی پختہ پٹڑی چھوڑ دی۔کوئی فرلانگ بھر کا کچا اور ناہموار راستہ حائل ہوا پھر ہم دریا کے سپر بند پر تعمیر کی گئی پختہ سڑک پر چڑھ گئے۔بائیں ہاتھ پر سپر کے ساتھ ساتھ نہر بہہ رہی تھی۔ڈرائیونگ کی تھوڑی سی غلطی ہمیں گاڑی سمیت نہر میں غوطہ زن کر سکتی تھی۔ میں نے میڈم کی بلا جھجک ڈرائیونگ سے اندازہ کیا کہ یہ علاقہ اُس کا بخوبی دیکھا بھالا تھا۔

دیہاتوں کو ملانے والی رابطہ سڑکیں نصف رات کو ویران ہو جاتی ہیں۔ یہ ویرانی ہمارا وقت بچا رہی تھی۔ سپر بند کے اوپر سنگل سڑک موجود تھی جس نے نہر کے ایک پل پر دوسری سڑک کو کراس کیا۔ سڑک کے کنارے پر دو آدمی آگ جلا کر بیٹھے سینک رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بدنوں پر چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ یہیں سے میڈم نے دائیں ہاتھ ٹرن لیا۔ ایک لمحے کو وہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں نہائے پھر دکان کے سائے میں اندھیرے کا حصہ بن گئے۔

اس سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت دکھائی دے رہی تھی اور سڑک کی حالت بھی خراب تھی۔ جگہ جگہ کھڈے پڑے ہوئے تھے۔ کوئی تین چار منٹ بعد اُس نے پھر دائیں ہاتھ ٹرن لیا۔ کوئی دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے پر ایک سرکاری سکول کی مخصوص وضع کی عمارت دکھائی دی۔ میں نے گیٹ پر لگے ہوئے بورڈ کو پڑھنے کی کوشش کی مگر تیز رفتاری کے سبب گاؤں کا نام نہیں پڑھ سکا۔ سطح زمین سے کم و بیش دس فٹ بلند تھڑے پر گھروں کا ایک جھرمٹ دکھائی دیا۔ سڑک بل کھا کر اُس جھرمٹ میں داخل ہوئی پھر 'ایس' کی شکل میں گھومتی ہوئی اس گاؤں سے باہر نکل گئی۔

میڈم نے گاڑی کو اس مہارت سے خوابیدہ گاؤں کے بیچ میں سے گزرتی ہوئی 'S' شکل کی سڑک پر گھمایا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ شکر ہوا کہ اس نے کسی مکان کی نکلی ہوئی نکڑ میں لینڈ کروزر گھونپ نہیں دی۔

سڑک پر جا بجا سپیڈ بریکر بنے ہوئے تھے جن کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ برلب سڑک تعمیر شدہ گھروں نے اپنے بچوں کو تیز رفتار ڈرائیوروں سے محفوظ کرنے کے لیے از خود بنا رکھے تھے۔ میڈم نے کسی بھی بریکر پر سپیڈ آہستہ کی نہ بریک لگائے۔ گاڑی اُچھلتی، میرا سر چھت سے جا لگتا اور یوں محسوس ہوتا کہ دل جسم کے ساتھ بلند نہیں ہوا بلکہ کہیں نیچے رہ گیا ہو۔ پھر چند لمحوں بعد رُکی ہوئی سانس بحال ہوتی۔

گاؤں سے نکلنے کے بعد، ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر بائیں ہاتھ ایک سرکاری ہسپتال دکھائی دیا۔ نیلے رنگ کے بورڈ پر محکمہ صحت کا مونوگرام اور گاؤں کا نام لکھا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ ابھی جس گاؤں سے ہم گزرے تھے، اس کا نام پونٹا تھا۔ ہسپتال بند تھا۔ سرکاری کالونی میں روشنیاں جل رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ اس علاقے میں بجلی کی سہولت موجود تھی۔

چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میڈم نے دائیں ہاتھ گاڑی موڑ دی۔ پکی سڑک کی جگہ ایک ناہموار اور کیچڑ زدہ راستے نے لے لی۔ یہ تکلیف دہ سفر ایک کچے مکان پر منتج ہوا۔ اس

نے گاڑی آم کے پرانے درخت کے نیچے روکی اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے نیچے اُتر گئی۔

میں نے گن سنبھالی، اس کے آپریٹنگ سسٹم کا سرسری جائزہ لیا اور نیچے اُتر آیا۔ گاڑی کے اندر گرمی تھی، باہر سردی..... آدھے چاند کی روشنی نے ماحول کو منور کر رکھا تھا۔ گاڑی کے عین سامنے چند قدموں کے فاصلے پر کچا کھال گزر رہا تھا۔ کھال میں پانی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ میڈم گاڑی کے بونٹ ہڈ کے ساتھ ٹیک لگائے میرے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں قریب پہنچ کر حکم کا منتظر ہوا۔ اس نے پسٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ بولی، ''ہم اس گھر میں داخل ہوں گے۔''

میں نے 'یس میڈم' کہا۔ وہ نپے تلے انداز میں کھال پر سے کود گئی۔ اس کے اعضاء میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ میرے آگے آگے دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی چھوٹے سے کچے مکان کے پہلو میں پہنچی۔ مکان کی چار دیواری نہیں تھی۔ سامنے کی طرف ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی لکڑیوں کی دیوار بنی ہوئی تھی۔ لکڑیوں کے ڈھیر اور مکان کے درمیان خلا تھا جس میں سے ہم گزر کر صحن میں پہنچے۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ کانہہ کی باریک ٹہنیوں کے گٹھوں اور چند ٹوکروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ایسے ہی وقت میں دو کچے اور خستہ حال کمروں والے گھر کے نسبتاً چھوٹے اور نیچی چھت والے کمرے میں بکریوں کے منمنانے کی آواز گونجی۔ ان کی آواز سن کر سردی میں کانپتے ہوئے دو کتوں کے منہ کھل گئے۔ وہ بھونکتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے علم ہو گیا کہ وہ لڑنے بھڑنے والے کتے نہیں تھے بلکہ عام نسل کے تھے جو محض بھونک کر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔ میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ میڈم نے بھی کتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وگرنہ میرے دیکھنے میں آیا تھا کہ شہری لوگ کتوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ نہیں ڈری بلکہ صحن اور کمروں کے بیچ میں بنے ہوئے فٹ ڈیڑھ فٹ بلند تھڑے پر کھڑی ہو کر چوکنی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسا کسی عسرت زدہ مزدور یا سپی کا گھر دکھائی دیتا ہے۔

کتوں کی پرجوش آوازیں احتجاج میں بدل گئیں پھر ان پر نالہ و فغاں کا احساس ہونے لگا۔ میں نے انہیں دبکا کر بھگا دیا۔ وہ بکریوں والے کمرے میں گھس کر 'کوں کوں' کرنے لگے۔

میڈم بولی، ''تم یہیں رکو، میں اندر جاتی ہوں۔''

اس نے دو کواڑوں والا سالخوردہ دروازہ دھکیلا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ ہولے سے

بولی، ''اماں.....سیمو.....''

جواب میں ایک لاغر مردانہ کھانسی کی آواز ابھری۔ وہ بولی، ''بابا.....بابا!''

''کیہڑا ایں.....؟'' (کون ہو؟) کھانسنے والے نے بیزار لہجے میں استفسار کیا۔

وہ اندھیرے کمرے میں گھس گئی۔ میں دم بخود کھڑا کمرے کے اَدھ کھلے دروازے کو گھورنے لگا۔ یہ ماجرا میری فہم وفراست سے بالاتر تھا۔ تجسّس کے مارے میں تھڑے پر چڑھ گیا۔ دروازے کے قریب جا کر صحن کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میرے عقب میں میڈم کی مدھم سی آواز سنائی دی، ''بابا! تیرے پاس ماچس ہے؟''

میں نے اسے پہلی مرتبہ سرائیکی بولتے سنا تھا ورنہ جب بھی دیکھا، اُسے شائستہ اور رواں اُردو بولتے دیکھا تھا۔ اس کے ایک ہی جملے نے مجھ پر آشکار کر دیا کہ اس کی مادری زبان سرائیکی تھی۔

چند لمحوں بعد دیا سلائی جلانے کی آواز سنائی دی پھر میرے پیروں تلے کی زمین پیلی ہو گئی۔ کمرے میں لالٹین روشن ہو گئی تھی جس کی روشنی کھلے کواڑ سے چھن کر تھڑے پر روشنی کی لکیر کھینچنے لگی تھی۔ بوڑھی کھانسی بدستور سمع خراشی کر رہی تھی۔

میڈم بولی، ''بابا! اماں اور سیمو کہاں ہیں؟''

''تو؟'' کھانسی تھم گئی، ''تو چندو ہے ناں؟''

وہ بولی، ''ہاں بابا! میں چندو ہوں۔ یہ بول، وہ دونوں کدھر ہیں؟''

''تو یہاں کیوں آئی ہے؟'' بوڑھی آواز میں بلا کی نفرت گھل گئی، ''وہ مریں یا جئیں، تجھے کیا.....جا.....جیسے آئی ہے، ویسے ہی پلٹ جا۔ یہاں نہ تو کوئی تیری اماں رہتی ہے اور نہ ہی سیمو.....چل! میری نظروں سے دور ہو جا.....''

دریا کی خنکی ماحول میں رچی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں شل کرنے والی سردی بوڑھے کے چند بول سن کر ذہن سے محو ہو گئی اور میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میڈم منت سماجت کر رہی تھی۔ اماں اور سیمو کے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر بڈھا اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ پھر میڈم کی جھلائی ہوئی آواز آئی، ''بابا! مجھے سیدھی طرح بتا کہ وہ کہاں ہیں، اچھا.....یہی بتا دے کہ تجھے کون باندھ گیا ہے؟''

''پرے دفع ہو جا کلموہی.....مجھے ہاتھ نہ لگا۔''

میڈم کی بھرائی ہوئی شکست خوردہ آواز ابھری، ''خدا کے لیے بابا! ان کی جان پر بنی ہے۔ اگر تو نے مجھے کچھ نہ بتایا تو وہ مر جائیں گے۔''

''اگر ان کے دن پورے ہو گئے ہیں تو کون مائی کا لعل انہیں بچا سکتا ہے؟ کھوں، کھوں.....نہ ہاتھ لگا، نہ کھول مجھے.....بندھا رہنے دے.....نی پراں دفع تھی ونج.....!''

(اے! پرے دفع ہو جا!)

میں دروازے کے مزید قریب ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم نے مجھے بلایا۔ میں جھٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر میرے لیے بڑا حیرت ناک تھا۔ تین چارپائیوں میں سے دو خالی تھیں۔ ان پر بستر کھلے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان پر سونے والوں کو بستر سمیٹنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ تیسری چارپائی پر ایک بوڑھا رضائی میں لپٹا پڑا تھا۔ اس کے سر پر میڈم کھڑی تھی۔ سرہالیں دیوار کے ساتھ ایک پرانی، چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی بیساکھی نظر آ رہی تھی۔

میں قریب ہوا تو میڈم بولی، ''اس کے ہاتھ کھولو۔ مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیتا۔''

میں نے رضائی کھینچ کر ایک طرف کی۔ بڈھا ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ جونہی میری نظر اُس کے نچلے دھڑ پر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی بالشت بھر لمبی داہنی ران کے نیچے بستر خالی تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ میڈم کو غلیظ گالیاں دے رہا تھا اور مجھے بھی بار بار 'پراں دفع تھی ونج' کہہ کر جھٹک رہا تھا۔ میں نے اس کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے الٹا دیا۔ وہ تڑپا، میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا۔ میں نے اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولے اور قدرے سخت لہجے میں کہا، ''بتاؤ! تمہیں کس نے باندھا ہے اور کیوں؟''

وہ سیدھا ہوا۔ لالٹین کی پیلی روشنی میں اس کے چہرے پر نظر پڑی تو دل عجیب سے تأسف اور دکھ سے معمور ہو گیا۔ وہ بہت نحیف اور معمر تھا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر بے حد درشتی کے آثار مترشح تھے۔ غصے کی شدت سے سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور رہ رہ کر کھانسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ ٹھیٹھ سرائیکی میں بولا، ''بدمعاشی نہ دکھا اور مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلا جا۔ اس بے حیا کو بھی لے جا۔ اسے سمجھا دے کہ اس کا یہاں کوئی نہیں رہتا۔ ہم سب مر بھی جائیں، تب بھی اس کی یہاں کوئی جگہ نہیں ہے..... سمجھا تا کیوں نہیں ہے تو اِسے..... لے جاناں.....''

میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے اور بڑی نرمی سے کہا، ''بابا! ہم ابھی چلے جائیں گے۔ بس اتنا بتا دو کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟''

''مم..... میں.....'' اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ چند لمحوں میں بدحال ہو کر ایک طرف گر گیا، بولا، ''ہائے! میری بکریاں بھوکی پیاسی ہیں..... ہائے! اس کلموہی کو باہر بھیج دے..... میں بتاتا ہوں.....''

میں نے پلٹ کر میڈم کو دیکھا جس کا چہرہ اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ طویل سانس حلق میں اُتار کر بولی، ''ٹھیک ہے بابا! میں باہر جا رہی ہوں۔ اسے ساری بات بتا دے ورنہ بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

''نی وَنج پراں کالے مونھ آلی..... جیہڑا زان تھیونا ہائی، تیڈے ہتھوں تھی گیا ہا..... بس توں چنے تھی وَنج..... مگروں لہہ ونج!''

(اے جاپَرے کالے منہ والی..... جو نقصان ہونا تھا، وہ تیرے ہاتھوں سے ہو گیا تھا۔ بس تو دفعان ہو جا۔ پیچھا چھوڑ دے۔)

بابا بپھر گیا۔ اس کے منہ سے بلغم آمیز رال نکل کر داڑھی کو بھگونے لگی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی بالشت بھر کی رانیں پیٹنے لگا۔

میرے اشارے پر میڈم میرے عقب سے گزر کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے بڈھے کی کمر تھپتھپائی، اردگرد دیکھا، پانی دکھائی نہیں دیا۔ پوچھا، ''بابا! پانی کہاں رکھا ہے؟''

''ہا..... مجھے پپ..... پانی..... ادھر گھڑا پڑا ہو گا۔ ادھر دیکھ.....'' اس نے اپنے سر بالیں دیوار کی جڑ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے گھڑا جھکایا اور مٹی کا پیالہ جسے مقامی زبان میں 'ٹھوٹھا' کہا جاتا ہے، بھرا اور اس کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر سے بندھا پڑا تھا۔ پیاسا تھا۔ پورا ٹھوٹھا خالی کر گیا۔ یخ بستہ پانی رگوں میں سردی اتار گیا۔ وہ چھاتی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگا۔ کچھ افاقہ ہوا تو میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ تھک گیا تھا۔ شکست خوردہ انداز میں سر ہلا کر بولا، ''تو کون ہے؟ پَر جو کوئی بھی ہے، مجھے کیا۔ وہ ظالم مجھے باندھ کر میری ذال (بیوی) اور میرے سیمو کو اُٹھا کر لے گئے۔''

اس نے اٹک اٹک کر کہا تھا۔ اس کی بات مان لی گئی تھی اور میڈم بادل نخواستہ کمرے سے چلی گئی تھی مگر اس کے باوجود اس کی عسرت و افلاس میں بجھنے والی آنکھیں ابھی تک شعلہ بار تھیں۔ میں نے جلدی سے پوچھا، ''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''دھمی ویلا ہا! ہائے..... بھک توں آندراں ترنڈیاں کھڑیاں ہِن..... کجھ کھاون کیتے

چاتی وداہیں؟''

(صبح کا وقت تھا۔ ہائے! بھوک سے آنتیں ٹوٹ رہی ہیں۔ کچھ کھانے کو لیے پھرتے ہو؟)

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا، ''کون لوگ تھے وہ؟''

''بیٹ سے آئے تھے۔ بیٹ خیر پور سے۔ ایک کو دیکھا تھا۔ ہائے! ہائے! وہ کمینہ پیرو ماچھی تھا۔'' اس نے ہانپتے ہوئے بتایا، پھر کھانسنے لگا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی، ''یہ بیساکھی مجھے دو۔ میری بکریاں بھوکی پیاسی ہیں۔''

''پیرو ماچھی تمہاری بیوی اور بیٹے کو کیوں اُٹھا کر لے گیا؟ اس نے بتایا تو ہوگا۔'' میں نے بیساکھی پر ہاتھ رکھا۔

''اس بے حیا نے مجھے مارا پیٹا مگر بتایا نہیں کہ وہ کیوں میرے بوڑھے چہرے پر کلنک ملنا چاہتا تھا۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق اِس کل موہی نے نہیں چھوڑا تھا۔ اب وہ میری جھولی میں زہر کی پڑیا رکھ گیا ہے۔ پتہ نہیں، خدا ہم جیسے لولے لنگڑے غریبوں کو کیوں زندہ رکھتا ہے، اُٹھا کیوں نہیں لیتا۔ بس! اب تو جا..... چلا جا، اس بے حیا کو بھی ساتھ لے جا۔''

اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ چھوڑی تھی جو اس وقت اس کے منہ سے نکلنے والی رطوبت سے تر ہوگئی تھی۔ اس کا جسم زندگی کی ٹہنی سے جڑے ہوئے پیلے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

میں نے پوچھا، ''اتنا بتا دے کہ یہ بیٹ خیر پور کس طرف ہے؟''

''تو کہاں سے آیا ہے؟ کیا تجھے بیٹ کا بھی پتہ نہیں۔ دریا کے پاس ہے..... وہ کمینی جانتی ہے۔ اس سے جا کر پوچھ لے.....'' اس نے ہاتھ لہرا کر کہا اور پھر اپنی بیساکھی تھام لی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بیٹھا رہے، میں اس کی بکریوں کو دیکھتا ہوں۔ اس نے مجھ پر ایک عصیلی نظر ڈالی اور نفرت سے زمین پر تھوکتا ہوا بیساکھی کے سہارے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بدن کی غیر معمولی لرزش خدشہ پیدا کر رہی تھی کہ وہ رات کی اس سردی میں کمرے سے نکلے گا تو ٹھٹھر کر مر جائے گا۔ میں نے اسے یہی بات سمجھانا چاہی مگر اس نے میری بات پر کان نہ دھرا۔ میں اس سے پہلے کمرے سے نکلا۔ میڈم کو مضطربانہ انداز میں دروازے کے سامنے تھڑے پر ٹہلتے پایا۔ مجھے دیکھ کر فوراً میرے قریب آئی، بولی، ''ہاں! کچھ بتایا بابا نے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''بتا دیا ہے مگر..... وہ غضب کی سردی باہر نکل کر اپنی بکریوں کو چارہ ڈالنا چاہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ سردی سے مر جائے گا۔ اسے سخت بھوک بھی لگی ہوئی ہے۔''

وہ بولی، ''اسے کمرے میں روکو، لالٹین اور کوئی برتن مجھے لا دو؛ میں اس کے کھانے پینے کے لیے کچھ کرتی ہوں۔''

میں نے حیرت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیا کر لے گی؛ مگر اس نے مجھے ڈانٹا، ''جلدی کرو شہریار! ہمارے پاس سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔''

میں الٹے قدموں بڈھے کے پاس آیا۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا جسم اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بیساکھی چھین کر دوسری چارپائی پر ڈالی، اسے چارپائی پر دھکیل کر لحاف میں لپیٹا اور کہا، ''یہیں پڑے رہو۔ میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ کرتا ہوں۔ تمہاری بکریوں کو بھی چارہ ڈال دیتا ہوں۔ ایسی حالت میں باہر نکلتے ہی گر جاؤ گے۔''

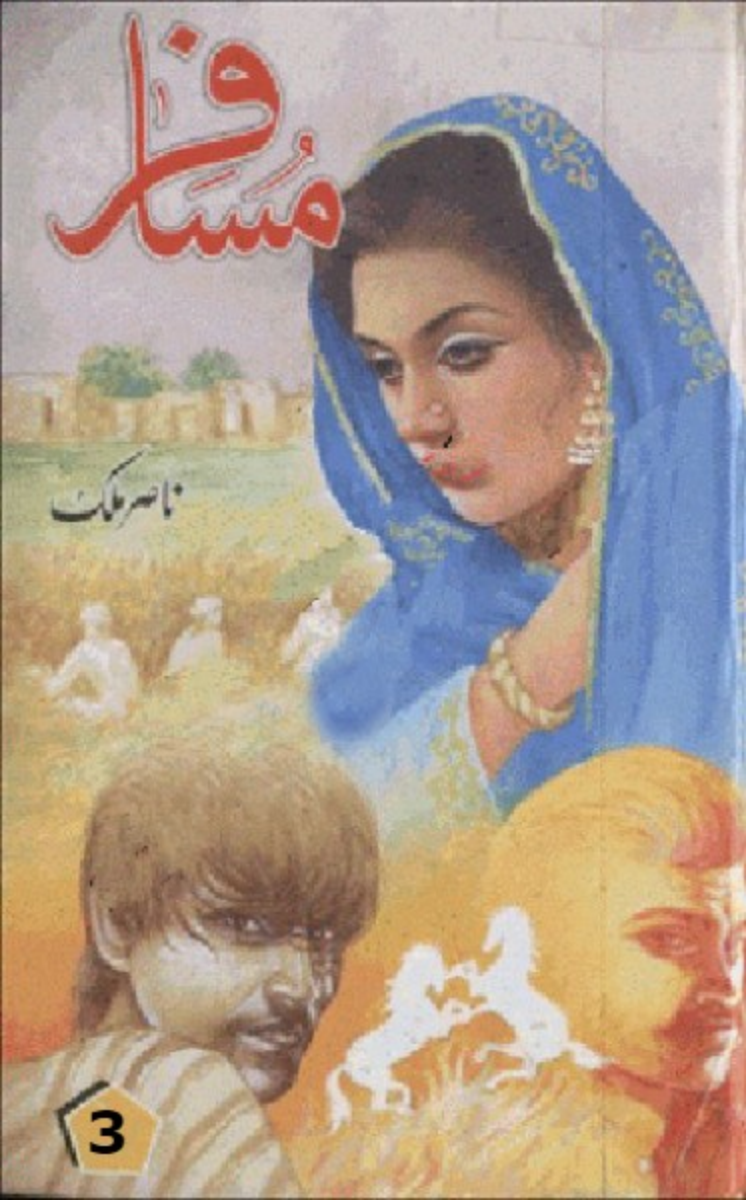
اس کے من میں نفرت کا اتنا بڑا الاؤ جل رہا تھا کہ اسے میرے ہمدردی آمیز رویے نے بھی نرم نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے لحاف سے نکلنے لگا۔ میں نے اسے پھر لحاف میں لپیٹا اور سخت لہجے میں کہا، ''جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو..... نجانے کس ڈھیٹ مٹی سے بنے ہوئے ہو کہ اپنے فائدے کی بات بھی نہیں سمجھتے۔ یہاں کچھ کھانے کو پڑا ہے؟''

اس نے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کمرے کے اس گوشے میں دیوار پر لکڑی کا ایک تختہ دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے چند میلے اور پرانے برتن پڑے تھے۔ میں نے لالٹین اُٹھائی اور برتنوں کی تلاشی لی۔ ایک ٹوٹے ہوئے کناروں والی بالٹی اُٹھا لی۔ کنڈوری میں لپٹی ہوئی اَدھ کھائی روٹی بھی مل بھی گئی۔ اسے بڈھے کے پاس رکھا اور بالٹی اور لالٹین لے کر باہر آ گیا۔ میڈم نے میرے ہاتھوں سے بالٹی اور لالٹین چھینی، مجھے بڈھے کے پاس رکنے کا حکم دیا اور بکریوں والے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ وہ بڈھے کو پلانے کے لیے بکریوں کا دودھ دوہنے کے لیے گئی تھی۔

۞۞۞

دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والی ایڈونچرس داستان
کے مسافر کے ساتھ سفر کرنے کے لئے جلد سوم کا مطالعہ کریں۔

مسافر



ناصر ملک

3

پیرو ماچھی اپنا کام پایہ تکمیل تک پہنچا کر رخصت ہو گیا تھا۔ اس ویرانے میں اسے یہ معمولی سا کام سرانجام دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی ہوگی کیونکہ یہاں عملی طور پر قانون بے دست و پا تھا۔ دریا کے دونوں اطراف بیٹ کا وسیع و عریض علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کی محفوظ کمین گاہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں رہنے والے لوگ انہی کے رحم و کرم پر زندگی گزارا کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کے خلاف پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا تو یہ لوگ فوری طور پر بیٹ میں چھپ جاتے تھے۔ جونہی پولیس ناکام ہو کر واپس جاتی، یہ مورچوں سے نکل کر اس پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ پولیس کے دوبارہ آنے تک میدان صاف ہو چکا ہوتا تھا۔ ان گنت تجربوں کے بعد ان غریب کاشتکاروں اور مزدوروں نے کارِ مفاہمت سیکھ لیا تھا۔

مجھے پونٹا کے سرکاری ہسپتال سے لے کر اس کچے مکان تک کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا تھا۔ مکان کے اطراف دور دور تک کوئی گھر آباد نہیں تھا۔ سکوت میں حشرات الارض کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے میں مجھے یا میڈم کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا مگر محتاط رہنا ہمارے دھندے کا بنیادی تقاضا تھا۔ میں نے چوکنے انداز میں صحن کا جائزہ لیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، کوئی حرکت دیکھنے کو نہیں ملی تو مطمئن ہو کر اندھیرے میں احتیاط سے چلتا ہوا بڈھے کے پاس پہنچا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا، ''ادھر دیا پڑا ہے، وہ جلا دو۔''

میں نے اس کی نشاندہی پر دیا سلائی کی مدد سے ٹین کا بنا ہوا ننھا سا دیا جلا دیا۔ مٹی کے تیل کی بو کمرے میں پھیل گئی مگر مجھے بڈھے کے نقوش دکھائی دینے لگے۔ وہ رضائی کی بکل مار کر چارپائی کے وسط میں بیٹھا ہوا کھانس رہا تھا۔ سینے کو سہلا کر اپنی کھانسی پر قابو پانے کی ناکام کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نفرت کے غیر معمولی تاثرات مستقل طور پر ثبت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس دور اُفتادہ اور ناخواندہ شخص کو میڈم کے وجود سے اتنی نفرت کیوں تھی؟

PakistaniPoint.com
Waqar Azeem

میرے حصے میں بھی بڈھے کا وہی رویہ آیا تھا۔ میں نے نرم لہجے میں پوچھا، ''بابا! پیرو ماچھی کے ساتھ کتنے آدمی تھے؟''

اس نے بولنا چاہا مگر کھانسی نے بولنے کی مہلت نہ دی۔ اس نے اپنی انگلیاں پھیلا کر مجھے حملہ آوروں کی تعداد بتائی..... چار..... میں نے پوچھا، ''ان لوگوں سے تمہاری دشمنی کیا ہے؟''

اس نے پانی کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹھوٹھا تھمایا، چند گھونٹ پینے کے بعد وہ بے بسی آمیز بیزاری سے بولا، ''میری کیا مجال کہ میں پیرو ماچھی سے دشمنی مول لوں..... وہ اس علاقے کا بادشاہ ہے۔ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ کوئی اس کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بڑا ہو یا چھوٹا۔ میں ایک ٹانگ پر پھدک پھدک کر زندگی گزار رہا ہوں۔ جینا چاہتا ہوں تو جی نہیں سکتا۔ مرنے کی دعا کرتا ہوں تو دعا پوری نہیں ہوتی۔ خدا جانے مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔''

میں نے پوچھا، ''تم نے پیرو سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ ان معصوموں کو کیوں اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟''

''پوچھا تھا۔ جواب میں اس کے ساتھی نے میرے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ پھر کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔'' اس کا چہرہ بے بسی کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کی حالتِ زار ہی ایسی تھی۔ بھلا ٹانگ سے معذور شخص، جو زندگی کی آخری کیاری کو پانی لگانے جا رہا ہو، ضعیف اور بے حد ناتوں ہو، وہ کس طرح چار ہٹے کٹے اور اسلحے سے لیس ڈاکوؤں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میرے دل میں ہلکورے لیتا ہوا تجسس میری زبان پر آ گیا۔ پوچھا، ''بابا! تم میری میڈم سے کیوں اتنی نفرت کرتے ہو؟''

اسے میری بات کی سمجھ نہ آئی۔ حیرانی سے بولا، ''کون میڈم؟ میں تو کسی میڈم کو نہیں جانتا۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''یہی لڑکی جسے تم نے گالیاں دے کر کمرے سے نکال دیا ہے۔''

اس کا مدقوق چہرہ مزید بجھ گیا۔ فرطِ نفرت سے غلیظ گالی دے کر بولا، ''اس حرامزادی کی تو..... میں اس کا نام لینے سے میری زبان پلید ہو جاتی ہے۔ تم کوئی اور بات کرو.....''

ایسے ہی وقت میں میڈم نے مجھے پکارا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ میں مستعدی سے باہر آیا۔ اس نے بالٹی اور لالٹین مجھے تھمائی اور سرگوشی کی، ''شہریار! اسے مت کریدو؛ تم اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، مجھ سے پوچھ لینا۔ میں تمہیں بتا دوں گی۔''

اس کے لہجے کی تلخی نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ بالٹی پکڑ کر بے ترتیب

پڑے ہوئے برتنوں کے پاس گیا۔ ایک پیالے میں دودھ انڈیلا، بڈھے کو تھمایا اور پینے کا حکم دیا۔ وہ بھوکا تھا۔ بھوک انسان کو توڑ دیتی ہے۔ وہ جس سے نفرت کرتا تھا، جس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، اسی کے ہاتھ کا دوہا ہوا دودھ بغیر سانس لیے حلق میں اتار گیا۔ میں پلٹ کر دروازے میں آیا۔ وہ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر بولی، ''بابا نے دودھ پی لیا؟''

میں نے کہا، ''جی میڈم! مزید کچھ پوچھنا ہے یا بس؟''

وہ بولی، ''نہیں۔ وہ کچھ اور نہیں بتا سکتا۔ آ جاؤ۔''

میں نے الوداعی نظر بڈھے پر ڈالی جو اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میڈم لکڑیوں اور کمرے کے بیچ کے خلا سے گزر کر باہر جاتی دکھائی دی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر پہنچا، پھولی ہوئی سانسوں میں بولا، ''میڈم! وہ اکیلا پڑا رہے گا؟''

میرا اشارہ بڈھے کی طرف تھا۔

وہ اختصار سے بولی، ''پہلے بھی تو پڑا تھا۔ اب بھی پڑا رہے گا۔ اس نے کچھ مزید بتایا؟''

اس نے باقی باتیں سنی تھیں۔ جس دوران وہ دودھ دوہ رہی تھی، اس دوران ہونے والی باتیں میں نے جلدی جلدی اُس کے گوش گزار دیں۔ پھر ہم دونوں خشک گوبر پر چلتے ہوئے اپنی لینڈ کروزر کی طرف بڑھے۔ ایسے میں میڈم ٹھٹک کر رک گئی۔ ایڑیوں کے بل گھومی۔ چہار جانب دیکھ کر رُک گئی۔ بولی، ''خطرہ.....''

اس کے ساتھ ہی اُس نے چھلانگ لگائی اور مجھے ساتھ لیتی ہوئی زمین پر گر گئی۔ ایسے ہی وقت میں فائر کی ہولناک آواز سے فضا گونج اُٹھی۔ میری اوپر کی سانس اوپر اٹک گئی۔ چند لمحے پہلے میڈم جہاں کھڑی تھی، وہیں اچٹتی ہوئی گولی زمین پر لگی تھی۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اب تک گولی اس کی ٹانگوں میں سوراخ کر چکی ہوتی۔

میں پہلو کے بل اپنی گن پر گرا تھا۔ اس کی حرل میری پسلیوں میں چبھی۔ میڈم مجھ پر لمحہ بھر کو گری تھی پھر لڑھک کر ایک طرف ہو گئی۔ میں مخالف سمت میں کھسک کر دور ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ پہلی مرتبہ پتہ نہیں چل سکا تھا فائرنگ کرنے والا کہاں موجود تھا۔ اب پتہ چل گیا تھا کہ جو کوئی بھی تھا، وہ لینڈ کروزر پر سایہ فگن آم کے بڑے درخت میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے دوسرا برسٹ مارا مگر تب تک میں کچی اینٹوں کے ڈھیر کے عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بارشوں میں اَدھ گلی اینٹوں کے تین فٹ بلند ڈھیر اور میرے

سوم

عقب میں کمرے کی کچی دیوار میں گولیاں لگ کر ٹھنڈی ہو گئیں۔ فضا میں بارود کی بو پھیل گئی اور تڑتڑاہٹ کی خوفناک آواز بازگشت کی صورت چاروں طرف گونجنے لگی۔

میں نے سر نکال کر میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ کہیں دکھائی نہیں دی جس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں چھپ کر ٹارگٹ فائرنگ سے محفوظ ہو گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے اچانک خطرے کی نشاندہی کرتے ہوئے ہم دونوں کی جان بچا دی تھی۔ باوجود کہ وہ فوری طور پر خطرے کی نوعیت کو بھانپ نہیں سکی تھی مگر اس نے جو ردِعمل ظاہر کیا، وہی بہت تھا۔

میں نے اپنی گن سیدھی کی، لاک پن ہٹائی اور کرولنگ کرتا ہوا اینٹوں کے ڈھیر کی داہنی اخیر تک پہنچ گیا۔ آم کے درخت کی طرف نال کا رُخ کیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دبیز سیاہی میں چھپے ہوئے کو کھوجنے لگا۔ فاصلہ زیادہ تھا۔ چاند کی ناکافی روشنی اور درخت کا غیر معمولی گھنیرا پن..... وہ تب تک میری نظروں میں نہیں آ سکتا تھا جب تک شاخیں ہل کر اس کی موجودگی کی نشاندہی ہی نہ کر دیتیں یا اس کی گن کا شعلہ اگلتا دہانہ نظر نہ آتا۔

ایسے ہی وقت میں مکان کے اگلوتے راستے کی مخالف جانب سے کسی ٹریکٹر کے گھر گھرانے کی آواز سنائی دی۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ مجھ پر آشکار ہو گیا کہ ہم دونوں طرف سے گھیرے میں لیے جا چکے تھے۔ یہ چھوٹا سا مکان ہماری مقتل گاہ بننے والا تھا۔ میڈم کے پاس گن نہیں تھی، ایک چھوٹا سا پسٹل تھا جس کی رینج کم تھی۔ وہ صرف قریب آنے والے کو نشانے میں لے سکتی تھی۔ میرے پاس گن تھی مگر گولیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ایک میگزین گن میں لوڈڈ تھی۔ دوسری میرے پہلو کی جیب میں تھی۔ یہ امونیشن بھرپور مدافعت کے لیے ناکافی تھا۔ حملہ آوروں کے پاس یقینی طور پر اسلحہ زیادہ مقدار میں موجود تھا۔ مجھے نہ صرف اپنی جان بچانی تھی بلکہ اپنی میڈم کو بھی بحفاظت اجنبی دشمنوں کے خونیں حصار سے باہر نکالنا تھا۔

ٹریکٹر کی گھر گھراہٹ بکریوں والے کمرے کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت یہاں کسی دوست یا غیر متعلق شخص کی آمد متوقع نہیں تھی۔ جو بھی آیا تھا، وہ ہمارے خون کا پیاسا تھا۔

ٹریکٹر کے کمزور بریک لیدر چیخے؛ پتہ چلا کہ ٹریکٹر رُک گیا تھا۔ ایسے ہی وقت میں اس جانب سے فائر کی آواز گونجی۔ فائر پسٹل سے کیا گیا تھا۔ شاید میڈم نے کیا تھا..... یہ قیاس تھا کیونکہ پسٹل تو ٹریکٹر پر آنے والوں کے پاس بھی ہو سکتا تھا۔ آم پر مچان بنا کر بیٹھنے والے

شکاری کو باور ہو چکا تھا کہ وہ مجھے اپنا نشانہ تب تک نہیں بنا سکتا جب تک میں اینٹوں کے ڈھیر کی اوٹ میں دبکا ہوا تھا۔ تبھی اس نے دوبارہ فائر نہیں کیا بلکہ مائل بہ انتظار ہو گیا۔ میری حالت بھی بعینہٖ یہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ شب بھر انتظار کر سکتا تھا جبکہ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے اینٹ کا بڑا ٹکڑا اُٹھایا، لیٹے لیٹے لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف اچھال دیا۔ کھٹکا ہوا۔ شکاری میرے دام میں آ گیا۔ اس نے فوراً ہی اس طرف فائر کر دیا۔ میں اسی تاک میں تھا۔ جونہی مجھے گن سے نکلنے والے شعلے نے اس کی لوکیشن کی خبر دی، میں نے نشانہ لینے اور فائر کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ فضا ایک دلدوز چیخ سے تھرا گئی اور وہ ٹہنیوں پر سے پھسلتا ہوا لینڈ کروزر کے موٹے پائپ والے بمپر پر زوردار آواز کے ساتھ گرا، پھر زمین پر ڈھلک گیا۔ کھال کے پار گرنے کی وجہ سے وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ٹھنڈا ہو گیا تھا، زخمی ہو کر تڑپ رہا تھا یا سنبھل کر میرے خلاف پوزیشن سنبھال چکا تھا؛ معلوم نہ ہو سکا۔

مکان کی دوسری جانب پسٹل کے فائر کے بعد دو طرفہ فائرنگ ہونے لگی۔ پسٹل کے فائر کے جواب میں دو گنیں آگ اور دھماکے اگلنے لگی تھیں۔ میرا اُس طرف پہنچنا خطرناک اور مشکل ہونے کے باوجود نہایت ضروری تھا۔ اپنے عقب میں کمرے کی بلندی کا اندازہ کیا۔ بمشکل نو دس فٹ بلند تھا۔ سرکنڈوں کی مدد سے بنائی گئی چھت ایک ڈیڑھ فٹ باہر نکل کر جھکی ہوئی دکھائی دی۔ دیوار پر مٹی کا لیپ کیا ہوا تھا۔ ایسی دیوار پر چڑھ کر چھت پر سرعت سے پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ مجھے اندازہ تک نہ تھا کہ میری گولی کا شکار بننے والے شخص کے علاوہ کوئی میری تاک میں چھپا ہوا تھا یا میدان صاف ہو چکا تھا۔ میں صحن عبور کر کے محاذ تک ایک دم پہنچنے کے بجائے میڈم اور دشمنوں کی پوزیشنوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا تاکہ میرے ہاتھوں میڈم کو نقصان نہ پہنچے۔

بجلی کی سی مستعدی سے پہلو کے بل کروٹیں لیتا ہوا لکڑیوں تک پہنچا۔ مجھ پر کوئی فائر نہ ہوا تو حوصلہ پکڑا اور اچھل کر کمرے کی لکڑیوں کی جانب والی دیوار سے چمٹ گیا۔ یقین ہو گیا کہ میرا شکاری میری گن سے نکلنے والی گولی کا شکار ہو چکا تھا۔

میں دوڑتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ فائرنگ کی آواز سے اندازہ ہوا کہ میڈم مکان کی دوسری جانب نرغے میں آئی ہوئی تھی۔ میں نے کھانستے ہوئے بڈھے کو نظر انداز کرتے ہوئے بجلی دروازے کی کنڈی لگائی، افقی بلیوں پر پیر رکھ کر بندر کی سی پھرتی سے اُچھلتا ہوا چھت پر

پہنچ کر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ چھت پر لیپ کی ہوئی چکنی مٹی رات کی تمام تر خنکی سمیٹ چکی تھی جس کی وجہ سے میرے ہاتھ یک لخت سرد ہو گئے۔ کھڑے ہونے میں قباحت تھی کہ کوئی آوارہ گولی میرا سینہ چھلنی نہ کر دے۔ کہنیوں اور چھاتی کے بل پر آگے کھسکتا ہوا چھت کے کنارے پر پہنچا۔ منڈیر نہیں تھی۔ سرکنڈے بکریوں والے کمرے کی چھت پر جھکے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں فائرنگ تھم گئی۔

میں آہستگی سے نچلی چھت پر اُترا اور کرولنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ جہاں چھت کی ڈھلان شروع ہوئی، وہیں رُک کر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کھیت کو دیکھنے لگا۔ چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی تاہم درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ کھیت میں برابر ایستادہ آم کے دو درختوں کے عین بیچ میں ٹریکٹر کھڑا دکھائی دیا۔ قرب و جوار میں کوئی موجود نہ تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ کہیں چھپا ہوا تھا۔

مجھے میڈم کہیں چھپی دکھائی نہیں دی۔ میرے اندازے کے مطابق اسے مکان کے قریب کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ اس خستہ حال کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک مٹی کی دس بارہ فٹ لمبی کھرلی بنی ہوئی تھی جس میں غالباً بکریاں چارہ کھاتی تھیں۔ کھرلی کے اردگرد خاردار ٹہنیوں کی مدد سے دس ضرب پندرہ فٹ کا جنگلا نما کمرہ بنا ہوا تھا۔ اس کی دائیں جانب پانچ سات قدموں کے فاصلے پر گوبر اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر دکھائی دیا۔ اس ڈھیر کے پار ایک کھال واقع تھا جو اس کھال سے نکلتا تھا جس پر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

میرے بائیں ہاتھ پر تا حد نگاہ کھلا کھیت واقع تھا جس میں شاید گندم کاشت کی گئی تھی۔ اس کو درمیان سے چیرتا ہوا کھال نظر آ رہا تھا جو تا حد نگاہ خالی تھا۔ یعنی میڈم اور اس پر حملہ کرنے والے میرے سامنے یا دائیں جانب کہیں چھپے ہوئے تھے۔ ایسے ہی وقت میں جب میں مایوس ہونے لگا تھا، مجھے گوبر کے ڈھیر پر ایک ابھرتا ہوا سر دکھائی دیا۔ میں نے گن سیدھی کی اور نشانہ لیا۔ میرے فائر کرنے سے لحہ بھر پیشتر فائر کی آواز گونجی۔ ڈھیر کے اوپر والے حصے میں لگنے والی گولی یقینی طور پر کسی گن کے دہانے سے نکلی تھی۔ میں لبلبی دباتے دباتے رہ گیا۔

ڈھیر کے عقب سے ایک فائر ہوا۔ فائر اس چھت کے جھکے ہوئے کنارے پر لگا جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ یہ فائر پسٹل کا تھا۔ اندازہ ہوا کہ ڈھیر کے پیچھے میڈم چھپی ہوئی تھی اور دشمن میرے نیچے، کہیں آس پاس مورچہ زن تھے۔ میں نے بطور احتیاط اپنی گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میری گولی کا نشانہ بننے والا کام آ چکا تھا۔ میں مزید آگے کھسکا۔ کافی قریب

تک دیکھنے کا قابل تو ہو گیا مگر کوئی شخص چھپا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے فوری طور پر چھت سے اترنے کا فیصلہ کیا اور بائیں طرف کروٹیں لیتا ہوا کنارے پر آیا۔ جونہی میں نے اُترنا چاہا، مجھے ٹہنیوں کے خاردار جنگلے کی بائیں نکڑ میں ایستادہ کیکر کے تنے سے چمٹا ہوا شخص دکھائی دے گیا۔ اس نے گہرے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میری نظر اچانک ہی اُس پر پڑ گئی تھی۔ میں نے اُس کا نشانہ لیا مگر فائر نہ کیا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ میڈم نہیں تھی، دشمن تھا۔ محض پسٹل کے فائر کی بنیاد پر میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ گوبر کے ڈھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ ممکن تھا کہ اس نے کسی ایک دشمن پر قابو پا کر اس سے گن چھین لی ہو، اس لئے جب تک اس کی پوزیشن کا حتمی علم نہ ہو جاتا، میں کسی پر بھی فائر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

دکھائی دینے والے کو نشانے میں رکھتے ہوئے میں نے الجھ کر گوبر کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ چھپا ہوا سر تھوڑا بلند ہوا۔ چاند کی روشنی میں اس کے سر پر کوئی چیز چمکی؛ بس ایک لمحے کے لئے.....اور میں نے گردن موڑ کر اپنا نشانہ درست کرتے ہوئے فائر کر دیا۔ فائر کیکر کے تنے میں لگا۔ چھپے ہوئے شخص کو اندازہ نہ ہو سکا کہ فائر کس طرف سے کیا گیا تھا، اس لیے وہ گھوم کر میری سمت کی دوسری جانب نہ گیا بلکہ وہیں کھڑا رہا۔ میں نے دوسرا فائر کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ گولی اس کی چھاتی اور ٹانگوں کے درمیان پیٹ میں کہیں لگی تھی۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی اور وہ تنے کے ساتھ گھوم کر اوجھل ہو گیا۔ میں آنکھیں جھپکے بغیر تنے کو گھورتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح بائیں جانب گر کر گیا۔ وہ یقیناً تڑپ رہا ہو گا، اس منظر کی دید کا شرف حاصل نہ ہو سکا کیونکہ فاصلہ اور اندھیرا حائل تھا۔ میں نے بطور احتیاط اس کے بدن میں ایک اور گولی اُتار دی۔ محسوس ہوا تھا کہ وہ کوئی بالشت بھر اچھلا تھا۔

اس کے ساتھی نے ڈھیر پر اوپر تلے چار پانچ گولیاں پھونکیں پھر دبک گیا۔ شاید اُسے گمان ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی کو لگنے والی گولیاں پسٹل کی نہیں بلکہ گن کی تھیں۔ اس نے خود کو محفوظ خیال کرتے ہوئے فائرنگ روک کر پوزیشن بدلنے کا فیصلہ کیا اور اسی کوشش میں مجھ پر آشکار ہو گیا۔ نظر تو نہیں آیا مگر مجھے احساس ہو گیا کہ وہ دیوار کے نہایت قریب، چھت کے اس طرف نکلے ہوئے سرکنڈوں کی نیچے، کسی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ میں اُسے دیکھ سکتا تھا نہ وہ پیچھے چھپی ہوئی میڈم اُسے ٹارگٹ بنا سکتی تھی۔

یہ تو شکر ہوا تھا کہ میڈم کے سر پر بندھا ہوا سنہرے رنگ کا ہیئر بینڈ چاندنی میں چمک کر میرا مشکل آسان کر گیا تھا اور میں ایک سور ماچت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میڈم شاید مجھے دیکھ چکی تھی، اس لیے چیخی: ''وہ اسی دیوار کے ساتھ چھپا ہوا ہے۔ فائر!''

اس کی باریک اور تیز آواز سناٹے میں گونج گئی۔ شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ دشمن گھبرا جائے اور اپنے مورچے سے نکل کھڑا ہوا۔ وہ کامیاب رہی تھی۔ مورچہ زن اپنی پوزیشن بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا اور ڈھیر پر اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا میرے دائیں طرف بڑھا۔ پھر مجھے اس کی موجودگی کا اندازہ ہو گیا۔ وہ کمرے کی نکڑ پر پہنچ کر دوسرا رُخ لے چکا تھا۔ چونکہ ابھی تک کسی چوتھے شخص کی موجودگی کا شبہ نہیں ہوا تھا، اِس لیے میں خطرہ مول لیتا ہوا کھڑا ہو گیا اور بھاگ کر کمرے کی نکڑ پر پہنچا۔ میڈم کی آواز گونجی: ''اسی دیوار کے پاس..... اسی سیدھ میں بھاگ رہا ہے..... فائر کرو!''

میں نے اندازے کی بنیاد پر فائر کیا جو خطا گیا۔ میڈم پھر چیخی: ''لکڑیوں کی طرف.....''

میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ نظر نہ آیا۔ میں اونچے کمرے کی چھت پر چڑھ کر بھاگا۔ نکڑ میں گیا تو اُسے لکڑیوں کے ڈھیر کی اوٹ میں دوڑتے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کو دکھائی دیا، پھر لکڑیوں کے پَرے کسی گڑھے میں کود کر اوجھل ہو گیا۔ مجھے ناچار پھر یخ بستہ چھت پر چھاتی کے بل لیٹنا پڑا۔ کھڑا رہتا تو اس کے نشانے کی زَد میں آ جاتا۔ میرے حق میں میرا فوری فیصلہ سودمند ثابت ہوا کیونکہ اس نے گولی چلانے میں لحظہ بھر کی دیر نہیں کی تھی۔ گولی میرے اوپر سے گزر گئی۔

جہاں وہ کودا تھا، میں نے اندازے کی بنا پر وہاں دو فائر کیے۔ اگر میرے پاس گولیاں وافر مقدار میں ہوتیں تو میں برسٹ مارتا۔ اسی مجبوری کی بنا پر میں سنگل شوٹ پر اکتفا کر رہا تھا۔

دشمنوں کی تعداد کے بارے میں قائم کیا گیا میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میرے عقب میں پھر پسٹل اور گن کی فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ میڈم کو کسی اور شخص سے نبرد آزمائی کا مرحلہ درپیش تھا۔ میرا ایکبارگی جی چاہا کہ فوراً میڈم کی مدد کے لیے جاؤں، پھر یہ سوچ کر رُک گیا کہ اس حماقت کی نتیجے میں میرے مقابل چھپا ہوا شخص میرے عقب میں پہنچ کر زِک پہنچا سکتا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے لکڑیوں کے پار جھانک رہا تھا کہ اچانک موہوم سی ہلچل محسوس ہوئی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ تیسرا فائر ثمر بار ثابت ہوا اور گھٹی گھٹی سی چیخ ابھری۔ اُسے گولی لگی تھی مگر شاید پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی۔

میں جلد بازی میں کوئی الٹا سیدھا قدم اُٹھانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ہمارے مابین حائل غیر

معمولی فاصلہ صبر آزمائی کا درس دیتا تھا۔ جو بھی خود پر قابو پانے میں ناکام رہتا اور جھنجھلا کر باہر نکلتا، وہی کام آجاتا؛ اس لیے میں دم سادھے لیٹا رہا۔

شاید اسے گولی کی تکلیف نے بے چین کر دیا تھا یا وہ از خود مطمئن ہو گیا تھا کہ میں میدان صاف دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ہوں؛ وہ اچانک کھڑا ہوا اور لنگڑاتے ہوئے کھلے کھیت کی طرف دوڑا۔ یہ اُس کی احمقانہ حرکت تھی جس کی کم از کم مجھے اُس سے توقع نہیں تھی۔ شاید وہ تکلیف کی شدت کو برداشت نہیں کر پایا تھا اور دیوانہ وار بھاگ اُٹھنے پر کمر بستہ ہو گیا تھا۔ جو بھی تھا، میرے لئے بڑا فائدہ مند تھا اور میں نے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوڑتے ہوئے دشمن کا نشانہ لیا، فائر کیا جو خطا گیا۔ دوسرا فائر بھی خطا گیا۔ وہ زگ زیگ کے انداز میں بھاگ رہا تھا۔ یہاں برسٹ کی ضرورت تھی۔ مجبوراً میں نے برسٹ آپریشن آن کیا اور نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ٹریٹ..... ریٹ..... ریٹ..... کی فضا شگاف آواز اُسے چاٹ گئی اور گن کے خاموش ہونے پر وہ چھلنی ہو کر بالشت بھر اونچی فصل میں گر گیا۔ ایک ہی رات میں اس نے ہماری سانسیں ضبط کرنا چاہیں، پھر اپنی سانسیں بحال رکھنے کے لیے نبرد آزما ہوا اور پھر اس کی زندگی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ جان لینے والے کو بھی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ دنیا ایسی ہی ہے، نہ سمجھ میں آنے والی.....

میں نے جلدی سے میگزین نکال پھینکی اور دوسری چڑھا لی۔ اب ایک دشمن باقی تھا۔ میں لرولنگ کرتا ہوا سابقہ جگہ پر پہنچا۔ اس دوران فائرنگ تھم چکی تھی۔ میں نے گوبر کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ میڈم وہاں نہیں تھی۔ شاید اپنی جگہ بدل چکی تھی۔

میں نے آواز دی، ''میڈم!..... میڈم!''

میری توقع کے برعکس مجھے گاڑی کی طرف سے جواب ملا، ''میں ادھر ہوں..... گاڑی کے پاس..... اگر میدان صاف ہے تو چلے آؤ۔''

میری دانست میں میدان صاف تھا۔ میں کھڑا ہوا، چھت سے نیچے کودا اور بھاگ کر کیکر کے درخت کے پاس پہنچا۔ یہاں میرا ایک شکار پڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں روسی ساخت کی کے ۔ گن دبی ہوئی تھی اور وہ چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ میں اُس پر جھکا۔ نبض چیک کی۔ وہ مر چکا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں تلاشی لی۔ اس نے پنڈلی پر ایک تیز دھار خنجر اور کمر پر سیاہ رنگ کی جرسی کے اوپر لیدر کا بلٹ بیلٹ باندھ رکھا تھا۔ چند نوٹ بھی ہاتھ لگے۔ میں نے نہ

صرف تمام سامان کو اپنی تحویل میں لے لیا بلکہ اس کی گن کو بھی اس کی مردہ گرفت سے کھینچ لیا۔

وہ لحیم شحیم اور خاصی خوف ناک شکل کا مالک تھا۔ گھنی سیاہ مونچھیں اور داڑھی اس کی ظاہری دہشت میں اضافہ کرتی تھی۔ اس نے سر پر اُونی مفلر باندھ رکھا تھا۔ دیہاتی غنڈے اور نچلی سطح کے ڈاکو اسی قسم کا حلیہ بنا کر رکھتے ہیں تاکہ لوگوں پر ان کی شخصیت کا دبدبہ قائم ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ بدمعاش اپنا آدھا مقصد ظاہری 'ٹوہر ٹپے' اور بدنامی سے حاصل کرتے ہیں جبکہ باقی کا آدھا کام اپنی رعب دار اور اوباشانہ آواز سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھی اَتا تھا، عمر بھر اَت مچاتا رہا اور ساتھ چھوڑ کر جاتی ہوئی زندگی نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ اَت خدا کا بیر ہوتا ہے۔ اس بیر کی قیمت ہمیشہ انسان کو دینا پڑی ہے۔

دوسرا آدمی کافی فاصلے پر کھیت میں گرا تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کا ارادہ منسوخ کیا اور مال غنیمت اُٹھائے ہوئے میڈم کی طرف بڑھا۔ کچھ فاصلے پر رُک کر بولا، ''میڈم! آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟''

وہ بولی، ''ہاں! جلدی آؤ۔''

اس کی آواز سنائی دی تھی، خود دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید گاڑی کی دوسری طرف کھڑی تھی۔ میں نے کھال پھلانگا تو کھال اور گاڑی کے درمیان پہلو کے بل پڑا ہوا لمبا تڑنگا شخص دکھائی دیا۔ اس کی گن اس کے جسم تلے دبی ہوئی تھی جس کی نال کا تھوڑا سا حصہ باہر تھا۔ میں نے اُسے ٹھوکر ماری۔ وہ گاڑی کی جانب الٹ کر سیدھا ہو گیا۔

میڈم کی آواز سنائی دی، ''کوئی فائدہ نہیں..... ادھر آؤ۔''

وہ آم کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا جس کا رُخ زمین کی طرف تھا۔ تبھی میری نظر اُس کے پیروں تلے گھاس میں پڑے ہوئے شخص پر پڑی جو چاروں شانے چت لیٹا ہوا تھا۔ میں میڈم کے قریب پہنچا۔

میڈم بولی، ''دِس از لاسٹ ون!''

میں نے مالِ غنیمت والی کے کے گن میڈم کو پکڑائی۔ اپنی گن آخری شکار پر تان لی اور سفاک لہجے میں کہا، ''تم کون ہو؟''

وہ بولا ''مم..... میں دِتہ ماچھی ہوں..... اللہ دتہ!'' اس نے مقامی لب و لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

اس کی آواز نے اس کے خوف کا پول کھول دیا۔ وہ موت کو سامنے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ میں نے کہا، ''تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

''پپ..... پتہ نہیں.....'' وہ منمنایا۔

میں نے اس کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر رسید کی اور درشت لہجے میں کہا، '' بکواس نہ کرو ورنہ چھلنی کر دوں گا؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتہ۔ بب..... بشیرے کو ہی پپ..... پتہ ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اب کہاں ہے، کوئی پتہ نہیں۔'' اس کی لرزتی ہوئی آواز نے مجھ پر اس کی قلبی کیفیت کو آشکار کر دیا۔ ایسی حالت میں انسان جھوٹ نہیں بولتا۔

میں نے پوچھا، ''تمہیں کس نے بھیجا تھا یہاں؟''

''استاد پیرو نے..... پیرو ماچھی نے.....'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

''کیا کہہ کر؟''

''اس نے کہا تھا کہ ملتان کی طرف سے جو بھی مکان پر آئیں، انہیں باندھ کر ڈیرے پر پہنچا دینا۔''

''کس ڈیرے پر؟''

''استاد پیرو کے ڈیرے پر..... بیٹ خیر پور میں۔''

''اُسے ہم سے کیا دشمنی ہے؟''

''مم..... مجھے نہیں پتہ..... میں تو حکم کا غلام ہوں۔ استاد پیرو نے حکم دیا، میں بشیرے کے ساتھ یہاں آ گیا۔''

میرے استفسار پر اس نے اپنے تین ساتھیوں کے نام بتائے۔ وہ عمومی سطح کے بدمعاش تھے اور میرے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ میں نے پوچھا، ''تمہیں کیوں یقین تھا کہ ہم لوگ آج رات کو یہاں ضرور آئیں گے؟''

''استاد پیرو نے کہا تھا۔''

''جس عورت اور بچے کو تم لوگ صبح یہاں سے اُٹھا کر لے گئے ہو، انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟'' میرا لہجہ بے حد ڈراؤنا ہو گیا۔

اس نے جلدی سے کہا، ''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں صبح ادھر نہیں آیا تھا۔''

''کون آیا تھا؟''

''استاد..... اس کے ساتھ تین بندے تھے۔ یہی تینوں میرے ساتھ آئے تھے۔'' وہ بولا۔

''تم اس وقت کہاں تھے؟''

''میں دریا کے پار، روہیلانوالی بستی میں گیا تھا۔ وہاں سے کچھ سامان لانا تھا۔''

''واپسی پر کیا تم نے ان لوگوں کو ڈیرے پر نہیں دیکھا؟'' میں نے اُسے لات رسید کرتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

وہ بلبلایا، ''نہیں۔ انہیں استاد نے کہیں بھیج دیا ہوگا۔''

میں نے اس کے ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پوچھا، ''یہ ٹریکٹر، جس پر تم لوگ یہاں آئے تھے، کس کا ہے؟''

''یہ زبیر خان کا ہے۔ لین دین کے چکر میں استاد پیرو کے ہاتھ لگا ہے۔'' اس کی آواز بتدریج کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

''اس آم پر چھپنے والا..... وہ جو گاڑی کے بمپر کے پاس انتا غفیل ہوا پڑا ہے، کیا تم لوگ پہلے یہاں موجود تھا؟''

''ہاں! سردی بہت تھی۔ اس لیے ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ وہ درخت پر چھپ جائے گا۔ تم لوگوں کے پہنچتے ہی ٹارچ سے ہمیں مطلع کرے گا۔ ہم فوری طور پر یہاں پہنچ جائیں گے اور تم لوگوں کو پکڑ لیں گے۔''

وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے انہیں یقین تھا کہ ہم یہاں چوڑیاں پہن کر آئیں گے اور انہیں دیکھتے ہی ہینڈز اَپ ہو کر اپنی گرفتاری پیش کر دیں گے۔

''پیرو ماچھی کے گینگ میں کتنے آدمی ہیں؟'' میں غرایا۔

''مجھ سمیت پانچ..... ایک ڈیرے پر موجود ہے۔''

''کیا وہ جانتا ہے کہ پیرو ماچھی نے اس عورت اور بچے کو کہاں رکھا ہوا ہے؟'' میں نے اپنے لہجے کو از حد کرخت بناتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! مگر شاید نہیں.....'' وہ گڑبڑا گیا۔

میں نے دانت پیس کر کچھ کہنا چاہا کہ میڈم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کرا دیا۔

سوم

اس نے آم کے تنے کی ٹیک چھوڑ دی۔ قریب آئی اور اس کے دل پر پسٹل کی نال رکھ کر بولی،
''آخری سوال..... پیرو ماچھی اِس وقت کہاں ہے، کیا اپنے ڈیرے پر ہے؟''

وہ خاصا توانا اور طویل قامت انسان تھا مگر موت نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں فرطِ دہشت سے پھٹنے کو آ گئیں اور ہکلا کر بولا، ''نہیں..... وہ..... وہ..... جھوک لوری میں..... پار والے پتن کے پاس۔ مم..... مجھے مت مارو..... میں معافی مانگتا ہوں.....''

''وہ کمینہ جھوک لوری میں کس کے پاس گیا ہے؟'' میڈم کے لہجے میں موت کی سی خنکی چھپی ہوئی تھی۔

''جمیل دستی کے پاس..... وہاں کوئی پروگرام تھا۔ کہہ گیا تھا کہ صبح تک لوٹ آئے گا۔'' اس کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ اگر کچھ دیر اور پوچھ گچھ چلتی رہتی تو وہ مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتا مگر میڈم نے اسے خوف سے نجات دلاتے ہوئے ٹرائیگر دبا دیا۔ گولی اس کے دل میں گھس گئی اور وہ لمبی اور دردناک 'آہ' کی آواز نکال کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ میڈم نے اس کی کھوپڑی میں بھی سوراخ کر دیا۔ اس کے جھٹکے لیتے ہوئے وجود کو پھلانگ کر گاڑی کی طرف بڑھی۔ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آئی اور گیٹ کھول کر بیٹھ گئی۔ میرے بیٹھنے تک اُس نے نہ صرف لینڈ کروزر کا انجن بیدار کر دیا تھا بلکہ ہیڈ لائٹس بھی روشن کر دی تھیں۔

میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا، ''کیا ان لوگوں کی لاشیں ایسے ہی پڑی رہیں گی؟''

وہ چونکی، ''کیا مطلب؟''

''لاشوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ معذور بڈھا مصیبت میں پڑ جائے گا۔ پولیس اُس کا جینا حرام کر دے گی۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو ہے..... مگر انہیں فوری طور پر کیسے ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے؟'' میڈم نے میری طرف دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

میری چشمِ تصور میں سائیں دل جیت شاہ کی خون میں لت پت لاش گھوم گئی جسے میں نے اپنے ڈیرے پر آگ کے بھڑکتے ہوئے بلند و بالا شعلوں کی نذر کر دیا تھا۔ آگ بانس کو نگل گئی تھی اور بانسری آج تک بچ نہیں پائی تھی۔ اپنا آزمودہ نسخہ بتایا، ''انہیں لکڑیوں کے ڈھیر پر ڈال کر آگ لگا دیتے ہیں۔ ان کی چتا جل جائے گی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا، سوچ کر بولی، ''نہیں شہریار! یہ اچھا طریقہ نہیں ہے۔ ایک تو ان کی

ہڈیاں جلنے سے بچ جائیں گی.....''

میں نے بات کاٹی، ''وہ راکھ تلے دب جائیں گی اور فوری طور کسی کو نظر نہیں آئیں گی۔''

اسے میری جلد بازی بُری لگی جس کا اظہار اس کے متفکر چہرے پر لمحہ بھر کو نقش ہوا، پھر مٹ گیا، بولی، ''دوسری بات یہ ہے کہ اس منحوس ٹریکٹر کا کیا کیا جائے گا جو مکان کے اُس طرف درختوں تلے کھڑا ہے؟''

میں نے اس کا حل بھی پیش کر دیا، ''اُسے میں سڑک پر چھوڑ آتا ہوں۔''

وہ مطمئن نہیں ہوئی، ''اور اس کے ٹائروں کے نشان؟ انہیں اتنے کم وقت میں مٹائے نہیں جا سکتے۔ بس! انہیں ایسے ہی پڑا رہنے دو۔ پولیس اٹھا کر لے جائے گی۔ مجھے اندازہ ہے کہ پولیس والے بابا کو تنگ نہیں کریں گے۔ روائتی پوچھ گچھ کریں گے اور پھر چھوڑ دیں گے۔ بابا کو جب کسی بات کا علم ہی نہیں تو وہ پولیس کو کیا بتائے گا۔ رہی بات اسے حوالات میں یا جیل بھیجنے کی، تو وہ پہلے کون سا جنت میں رہ رہا ہے۔ جیل کے قیدیوں سے کہیں بدتر زندگی گزار رہا ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے اور خاموش ہو گیا۔ اس نے گاڑی ریورس کی۔ مناسب جگہ دیکھ کر ٹرن لیا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ میں نے پوچھا، ''کیا ہم اب ملتان جائیں گے؟''

وہ قدرے تلخی سے بولی، ''کیا ہم نے اپنا مشن مکمل کر لیا ہے؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ہم اس عورت اور بچے کو اغوا کاروں سے تحویل سے نکالنے کے لیے ادھر آئے تھے۔ ان تک ابھی پہنچ نہیں پائے تھے، بازیابی کا مرحلہ تو بعد کا تھا۔ میں نے شرمندگی سے کہا، ''سوری میڈم! مجھے خیال نہیں رہا تھا۔''

وہ بولی، ''شہریار! تم بہت اچھے ہو۔ مگر مجھے سہارے کی نہیں، کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔ تم اس کمی کو پورا کرو، مجھے ماتحتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

وہ اُس دکھ کی گہری ٹرانس سے نکل چکی تھی جس نے ملتان سے نکلنے سے پہلے اس کے قلب و ذہن پر اپنا غمناک حصار کھینچا تھا۔ اگرچہ وہ ابھی تک بالکل نارمل نہیں ہوئی تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کچھ ہی دیر میں پوری طرح سنبھلنے والی تھی۔ یہ ہم دونوں کے لیے اچھی بات تھی۔

میں نے آہستگی سے کہا، ''جی شکریہ! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے پائے۔''

گاڑی میں چلنے والے ہیٹر نے ہمارے بدن کو خاصی حرارت پہنچائی۔ میڈم نے سڑک

سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک دی اور سر سیٹ سے ٹکا کر، آنکھیں موند کر، سوچتے ہوئے بولی،
''شہریار! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے یاد دلایا، ''ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ کو سہارے کی نہیں، ساتھی کی ضرورت ہے۔ ساتھی سے کچھ مانگا نہیں جاتا، لے لیا جاتا ہے۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی کے اندر جلتی ہوئی دودھیا لائٹ اس کے آدھے چہرے کو منور کر رہی تھی۔ آدھے چہرے پر سایہ تھا جبکہ سر پر بندھا ہوا سنہرا ہیئر بینڈ چمک رہا تھا۔ بولی،
''بولنے دو ناں! ہم اِس وقت بیٹ خیر پور کے ویران علاقے میں کھڑے ہیں۔ یہاں سے بہت تھوڑے فاصلے پر، شاید ایک کلومیٹر دور، دریائے چناب مختلف نالوں کی صورت میں بہہ رہا ہے۔ سردیوں میں پانی کم ہوتا ہے۔ ایک آدھا نالہ چلتا ہے؛ باقی خشک ہو جاتے ہیں۔ چاروں طرف جنگلات کے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہے۔''

میں ہمہ تن گوش اسے سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے آئندہ درپیش آنے والے متوقع حالات کی سنگینی سے آگاہ کرنے چلی تھی۔ بولی، ''دریا کے اسی کنارے پر، جنگل کے بیچ، پیرو ماچھی کا ڈیرہ واقع ہے۔ وہاں ہماری مڈبھیڑ کئی خطرناک لوگوں سے ہو سکتی ہے۔ مگر وہ اس وقت جمیل دستی کے ہاں جھوک لوری پہنچا ہوا ہے۔ کسی غریب کی عزت پر موج میلہ کر رہا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں نفرت گھل گئی، بولی، ''جھوک لوری دریا کے پار واقع چند ملاحوں کے گھروں پر مشتمل چھوٹی سی بستی ہے۔ جمیل دستی کا گھر بستی سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی جانب واقع ہے۔ ہم وہاں جائیں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی، ''یہاں سے بالکل سامنے دریا کے پار جھوک اللہ یار کا پتن ہے۔ اگر کشتہ (بڑی کشتی) اس پار کھڑا ہوا تو ہم دریا پار کر سکیں گے۔ اگر پار کھڑا ہوا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ دریا پار نہیں کیا جا سکے گا۔ میری معلومات کے مطابق یہاں صرف ایک ہی کشتہ ہے۔ لوگ اپنے ٹریکٹر اس پر لاد کر آر پار منتقل کرتے ہیں۔ یعنی اس پر لوڈ کر کے ہم اپنی لینڈ کروزر پار لے جا سکتے ہیں۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے کہا، ''جی میڈم! میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ بات کیجئے۔''

''ہم جھوک اللہ یار جانے کے بجائے اوپر کی جانب، جدھر سے پانی آتا ہے، ایک کچے راستے پر کشتے سے اُتریں گے۔ وہاں سے جمیل دستی کا ڈیرہ بمشکل پندرہ منٹوں کی مسافت پر

ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم یہاں سے ناگ شاہ چوک جائیں، پھر مظفر گڑھ اور خان گڑھ سے ہوتے ہوئے براستہ پل عمر پور ہم جھوک اللہ یار کی طرف واپس آئیں۔ ہم وہاں تک پہنچنے کے لیے تلیری نہر کی پختہ پٹڑی پر بھی ڈرائیو لے سکتے ہیں۔ مگر اس روٹ سے وہاں جانے میں ہمیں کم از کم دو گھنٹے یا کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا۔'' وہ مجھے تفصیل سے بتا رہی تھی، ''تب تک سورج طلوع ہونے والا ہوگا اور ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

میں سمجھا کہ شاید وہ واپس جانے کا تہیہ کرنے لگی تھی، تبھی بولا، ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہاں سے لوٹ جاتے ہیں۔ صبح دم میں اور سخی محمد یا پیا جی اس مشن پر نکلیں گے اور مغویان کو برآمد کر کے آپ کے پاس لے آئیں گے۔''

اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا، بولی، ''نہیں شہریار! تم نہیں جانتے کہ وہ دونوں کون ہیں؟ میں چاہتی ہوں کہ کسی کو بھی یہ علم نہ ہو کہ وہ دونوں کون ہیں..... اور جب تک میں انہیں کمینے پیرو ماچھی کے چنگل سے رہا نہیں کروا لیتی، چین سے بیٹھ نہیں سکتی۔''

مجھے اندازہ تھا کہ وہ دونوں اس کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ بڈھے نے اُسے 'چندو' قرار دیا تھا۔ میڈم نے اُسے 'بابا' اور اس کی بیوی کو 'اماں' کہا تھا۔ زیادہ قیاس یہی تھا کہ بڈھا میڈم کا باپ تھا جبکہ اغوا کی جانے والی بڑھیا اور بچہ، اس کی ماں اور بھائی تھے۔ چونکہ ہمارے ہاں خالہ، پھوپھی وغیرہ کو بھی 'اماں' کہا جاتا تھا، اِس لئے میں ابھی تک کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کے کون تھے؟..... یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ میڈم کو بہت پیارے تھے، تبھی وہ رات کے اِس پہر میں اس خوفناک علاقے کی خاک چھاننے پر کمر بستہ تھی۔

میں نے کہا، ''او کے میڈم! آپ بہتر جانتی ہیں۔''

''تم یہ سوچو کہ پیرو ماچھی کی ان دونوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ان دونوں کی خاطر بھری دنیا میں کوئی بیس تیس ہزار روپے بھی تاوان میں دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ پھر..... اس بے غیرت نے انہیں کیوں اغوا کیا؟''

میں نے غلط سمجھا تھا کہ اس کا ارادہ متزلزل ہو گیا تھا؛ اصل بات یہ تھی کہ اس سے یہ الجھن سلجھائی نہیں جا رہی تھی۔

میں نے پوچھا، ''کوئی زمین جائیداد کا تنازع تو نہیں ہے؟''

وہ بولی، ''نہیں..... یہ زمین بھی بابا کی نہیں ہے۔ وہ مزارعہ ہے۔ آدھ پر فصل کاشت کرتا

ہے اور بکریاں چرا کر پیٹ پالتا ہے۔'' اس نے ایک طویل سانس سینے میں اُتاری اور بولی، ''سگریٹ بھی نہیں ہے؛ پی لیتی تو ذرا دماغ کی رگیں کھل جاتیں..... تم میں یہی خامی ہے شہر یار! سگریٹ پیا کرو..... ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ اس بوڑھی عورت اور بچے کو پیرو ماچھی نے کیوں اغوا کیا ہوگا؟..... مجھے ان کی آوازیں کیوں سنائی گئی تھیں؟..... یعنی میرے کسی دشمن نے پیرو ماچھی کو ٹوکن دیا ہے۔ ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے۔''

اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا موبائل فون اُٹھایا۔ کوئی بٹن دبا کر سکرین روشن کی۔ دیکھا، پھر مایوسی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''سوچا تھا کہ اس منحوس نمبر پر کال بیک کروں؛ شاید رابطہ ہو جائے مگر افسوس! یہاں سگنلز ہی نہیں ہیں.....''

میں نے اس کے آدھے روشن چہرے پر نگاہ ڈالی اور کہا، ''میرا خیال ہے کہ ہمیں پیرو ماچھی کے ڈیرے پر دھاوا بولنا چاہیے۔ وہاں کوئی ایسا شخص مل سکتا ہے جو ہماری الجھن دور کر دے اور بتا دے کہ پیرو ماچھی نے کس کے کہنے پر یہ قدم اُٹھایا ہے۔ یوں ہم دریا پار کرنے کے عذاب میں پڑے بغیر اس کے پیچھے جائیں جس نے اماں اور سیمو کو اغوا کرایا ہے۔ کیا خیال ہے؟''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا، زیرِ لب کہا، ''اماں اور سیمو'' پھر ایک طویل سانس کھینچی، اُسے ننھے ننھے جھٹکوں سے خارج کرتے ہوئے بولی، ''قسمت کو آزمانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

اس نے فوراً فیصلہ کیا، فوراً ہی اس پر عمل کرتے ہوئے گیئر لگا کر ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ میری توقع کے عین مطابق اب وہ نارمل ہو چکی تھی۔ سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑ کر بیٹھی ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ ذہن کو دوڑا رہی تھی۔ کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک بولی، ''تمہارے پاس کتنی گولیاں ہیں؟''

میں نے کہا، ''چند ایک..... مجھے برسٹ مارنا پڑا تھا۔''

''دوسری گن میں..... میرا اشارہ لوٹی ہوئی گن کی طرف ہے۔''

''وہ فل ہے۔ فالتو راؤنڈز بھی ہیں۔'' میں نے بتایا، ''آپ پیرو ماچھی کے ڈیرے سے پرے فاصلے پر کسی محفوظ جگہ پر گاڑی چھپا کر رُک جائیں۔ آگے میں اکیلا جاؤں گا اور معلومات حاصل کر لاؤں گا۔''

''کیوں؟'' اس نے چونک کر میری طرف رُخ کیا۔ ایسے ہی وقت میں گاڑی کو ایک زور

دار جھٹکا لگا۔ اس نے جلدی سے سامنے دیکھا اور اسٹیئرنگ ویل کو دائیں جانب گھما دیا۔ اگر اُسے لمحہ بھر کی تاخیر ہو جاتی تو گاڑی کیچڑ بھرے گڑھے میں دھنس چکی ہوتی۔

دوسری مرتبہ اس نے میری طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی اور کہا، ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ ڈیرے پر نہ جاؤں؟''

''جی میڈم! یہ اکیلے آدمی کا کام ہے۔''

''یعنی میں آگ کے اس دہکتے ہوئے دریا میں تمہیں جھونک دوں اور خود بالکل محفوظ رہوں۔ ہیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''گولی تو تمہیں بھی لگ سکتی ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو اس طریقے سے محفوظ رکھنا نہیں چاہو گے جو طریقہ تم نے میرے لیے تجویز کیا ہے؟'' اس کے لہجے کی کاٹ نے مجھے چونکا دیا، ''یعنی ہم دونوں گولی کے ڈر سے یہیں گاڑی روک کر بیٹھے رہیں۔''

''میڈم! سردی بہت ہے۔ دریائی علاقے میں ہوا نم ہوتی ہے جس کی وجہ سے سردی بعض اوقات خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ یہ تجربہ آپ کو کچھ دیر پہلے ہوا تھا۔ آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں دیہاتی ہوں۔ سردی کو برداشت کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے آپ کو گاڑی میں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔''

راستہ بہت پر پیچ اور دشوار ہو گیا تھا۔ ٹریکٹروں اور ریڑھیوں کی آمد و رفت کی وجہ سے چکنی زمین پر نالیوں کی سی دو لائنیں جھاڑیوں کے بیچ سے گزر رہی تھیں جن پر ہم چل رہے تھے۔ کانہہ اور لائی کی ٹہنیاں گاڑی کی باڈی سے ٹکرا کر عجیب آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ کیچڑ اور پھسلن کی وجہ سے میڈم نے گاڑی کی رفتار خاصی کم رکھی ہوئی تھی۔ پھر فوروہیل لیور دبا کر کیچڑ سے گاڑی نکالتے ہوئے بولی، ''شہریار! انسان کبھی باہر کی سردی سے نہیں مرتا۔ جب بھی مرتا ہے، اپنے اندر اترنے والی سردی یا گرمی سے مرتا ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا، ''جس طرح مرغی کو لپ اسٹک لگانا یا ہاتھی کو گود میں بٹھانا مشکل ہوتا ہے، ایسے ہی دل کی دنیا کو آباد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ دل کبھی چاند تو کبھی سورج مانگتا ہے۔ فلک کے شہزادوں کو اس کی مٹھی میں اُتارنا پڑتا ہے یا بہلا پھسلا کر دھیان بدلنا پڑتا ہے ورنہ جینے نہیں دیتا۔''

وہ شاید راستہ بھول گئی تھی۔ تبھی چونک کر، بریک لگا کر ارد گرد دیکھنے لگی۔ اس راستے سے کئی راستے نکلتے تھے۔ اس نے باتوں میں دھیان نہیں رکھا تھا اور بھٹک گئی تھی۔ بڑبڑائی، ''اب کیا کروں؟''

گاڑی اس وقت بلند ٹیلہ نما جگہ پر رکی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور نیچے اُتر گئی۔ چند قدم دور جا کر رُک گئی۔ میں نے بھی سیٹ چھوڑ دی اور گن سنبھالتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے چند لمحوں میں ہی بدن کو سن کر دیا تھا۔ یہ علاقہ چھوٹی بڑی مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہوا تھا۔ کہیں پانی کا جوہڑ، کہیں جھنگی، کہیں اونچے درختوں پر مشتمل گھنے جنگل کا ٹیلہ نما خطہ تو کہیں چٹیل ریتلا میدان..... ہم ایک پہاڑی نما ٹیلے پر کھڑے تھے جس کے درمیان میں سے راستہ گزرتا تھا اور اسے دو برابر گنبدوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ ہوا کم و بیش بیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گزر رہی تھی۔ دریا کی طرف سے آنے کی بدولت بے حد ٹھنڈی تھی۔

میڈم ٹیلے کے اوپر کھڑی تھی۔ ایک طرف ہاتھ اُٹھا کر بولی، ''وہاں، دریا کے پار، جھوک اللہ یار کا پتن ہے۔ اس سیدھ میں آگے روہیلا نوالی بستی ہے۔ اس طرف بمشکل پانچ سات کلومیٹر کے فاصلے پر خان گڑھ واقع ہے۔ ہم نے اسی طرف جانا ہے۔ مگر پہلے پیرو ماچھی کے ایرے پر جانا ضروری ہے۔ مجھے اَب سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ اِدھر ہے یا اُدھر..... بھول گئی۔''

میں نے دریا کی جانب نظر دوڑائی۔ اندھیرے کی گود میں ایک بل کھاتی سفید لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ ٹیڑے میڑھے کناروں والا، گھنے جنگل پر مشتمل ایک جزیرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اور جنگل کے بیچ ایک بڑی سی جھیل حائل تھی۔ اسے مقامی زبان میں 'ڈھنڈ' کہا جاتا تھا۔ شکاری ایسی جگہوں پر جال لگا کر مچھلیاں پکڑتے تھے۔

میرے جسم پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ میں نے کہا، ''میڈم! گاڑی میں چلیں۔ سردی بہت ہے۔''

''تھوڑی دیر پہلے تو تمہیں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ تب تم چھتیں پھلانگتے پھرتے تھے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''تب میں ایکشن میں تھا۔'' میں نے خفت سے کہا۔

''ہم تو اَب بھی حالتِ جنگ میں ہیں۔'' وہ میری طرف پشت کر کے کھڑی ہو گئی اور ادھر ٹہلنے لگی، جدھر سے ہم آئے تھے۔ پھر ایڑیوں کے بل گھومی اور تیزی سے گاڑی کی طرف

بڑھی۔ شاید اسے منزل کا کوئی کلیومل گیا تھا۔ ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔ ہم دریا کے بہاؤ کے الٹے رُخ چل رہے تھے۔ نصف کلومیٹر چلنے کے بعد میڈم نے دائیں ہاتھ ٹرن لیا۔ اِس طرف راستہ نہیں تھا۔ وہ بڑی مہارت سے ایک ننھے سے ڈھنڈ کے کنارے پر ڈرائیو کر رہی تھی۔ کیچڑ کی وجہ سے گاڑی متعدد بار پھسل کر ڈھنڈ کے پانی کی طرف لپکی مگر اُس نے کمال مستعدی سے سنبھل کر گاڑی کو پانی میں گرنے سے بچالیا۔ میں نے تحسین آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور کہا، ''میڈم! یوں لگتا ہے جیسے آپ نے اس علاقے کی گرداوری کر رکھی ہو۔''

وہ مسکرائی، پھر ہنسنے لگی۔ بولی، ''واہ شہریار! کیا تشبیہ دی ہے تم نے..... میں نے واقعی اس علاقے کو اچھی طرح کنگھال رکھا ہے۔''

مجھے تعجب ہوا۔ پوچھا، ''سیر کی غرض سے.....''

اس نے مبہم جواب دیا، ''یہی سمجھ لو۔''

''ان جنگلوں میں جانور بھی ہوتے ہیں؟''

''ہاں..... ڈاکوؤں کے علاوہ بھیڑیے، سؤر، گیدڑ اور جنگلی بلے..... سنا ہے کہ ہرن بھی ہوتے ہیں مگر میں نے آج تک اس علاقے میں کوئی ہرن دیکھا نہیں ہے۔''

''کیا یہ آپ کا آبائی علاقہ ہے؟''

وہ مسکرائی۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ بولی، ''تم جو پوچھنا چاہتے ہو، مناسب وقت آنے پر از خود بتادوں گی۔''

میں خفت سے بولا، ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس ایسے ہی پوچھ بیٹھا۔''

ڈھنڈ ختم ہوگیا۔ جنگل شروع ہوگیا۔ دس پندرہ میٹر کے بعد لینڈ کروزر کے گزرنے کیلئے جگہ بھی معدوم ہوگئی۔ گھنے درختوں اور بیچ میں اگی ہوئی خار دار جھاڑیوں میں انسان کے گزرنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا، گاڑی کہاں سے گزرتی۔ میڈم نے بتیاں گل کیں، ہینڈ بریک کا لیور کھینچا اور نیچے اُترتے ہوئے مجھے دونوں گنیں اُٹھالانے کا حکم دیا۔ میرے نکلنے اور دروازہ بند کرنے تک وہ چند قدم دور جنگلی کیکر (Mosquite) کے گھنے جھنڈ تک پہنچ چکی تھی۔ باہر تیز یخ بستہ ہوا بدن کو چیر رہی تھی۔ جھنڈ کے اندر ہوا نہیں تھی مگر خون کو منجمد کرنے والی خنکی استقبال کرنے کو موجود تھی۔

''میری یادداشت کے مطابق یہاں تنگ اور دشوار گزار راستہ ہونا چاہیے تھا جس پر سے

گاڑی گزر جاتی جبکہ یہاں تو پیدل چلنا مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ میں بھول گئی ہوں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولی، ''تھوڑا آگے تک جاتے ہیں۔ شاید کچھ یاد آ جائے۔''

جنگلی کیکر کی آکٹوپس کی طرح پھیلی ہوئی خاردار ٹہنیوں سے بچ کر چلتے ہوئے ہم بمشکل چند قدم ہی بڑھے تھے کہ اچانک کانوں میں گاڑی کے انجن کے گھرگھرانے کی آواز پڑی۔ پلٹ کر دیکھا۔ دریا کی جانب بلند قامت درختوں پر ہیڈ لائٹس کی روشنی تھرک رہی تھی۔ میڈم کے لبوں سے بے ساختہ پھوٹا، ''اس وقت یہاں کون آ سکتا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ پونٹے والی سڑک پر کوئی گاڑی اس طرف آ رہی ہے۔''

''ہوں.....'' میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ہم دونوں ٹھہر گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہیڈ لائٹس کی لہراتی ہوئی روشنی ڈھنڈ پر پڑی۔ میڈم بولی، ''جو بھی، ادھر آ رہا ہے۔ ہمیں کہیں چھپنا ہوگا۔''

میں نے چہار اطراف نگاہ دوڑائی۔ بائیں جانب بیس قدم دور گھنی جھاڑیاں دکھائی دیں۔ چھپنے کے لیے نہایت موزوں جگہ تھی۔ میں نے میڈم کو بتایا۔ اس نے جست بھری اور ننھے سے گڑھے کو عبور کرتی ہوئی اس طرف بھاگی۔ میں نے تقلید کی۔ کانٹوں کی بدولت جھاڑیوں تک پہنچنا محال تھا۔ جیسے تیسے پہنچے، میں نے میڈم کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا، کہا، ''مجھے پہلے جانے دیجیے۔ ہوسکتا ہے، جھاڑیوں میں کوئی سانپ یا جنگلی جانور چھپا ہو۔''

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور سخت لہجے میں کہا، ''فضول باتیں مت کرو؛ میرے پیچھے آؤ۔ یہ بات یاد رکھا کرو کہ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ سمجھ میں آیا کہ میں نے کچھ زیادہ ہی مہر و خلوص کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ اس کا کہنا بجا تھا کہ وہ بچی نہیں تھی اور نہ کوئی گھریلو عورت ہی تھی کہ میں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا۔ اس نے ٹہنیوں کو ہٹا کر راستہ بنایا اور سر جھکا کر گھس گئی۔ میں اُس کے عقب میں تھا۔ دل ہی دل میں شکر کیا کہ وہ جھاڑیاں خاردار نہیں تھیں ورنہ بہت مشکل پیش آتی۔ ایسے ہی وقت میں فضا گھرگھراہٹ کی آوازوں سے گونج اُٹھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ گاڑیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شاید تین یا چار..... اتنی رات گئے اس طرف کوئی نہیں آتا تھا۔ جو بھی آیا تھا، وہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا تھا۔ ہم جھاڑیوں کے قلب میں دس بارہ فٹ تک گھس کر رُک گئے۔ کان لگائے۔ میرے اندازے کے مطابق آنے والی گاڑیاں لینڈ کروزر کے قریب آن رکی تھیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس کی روشنی عین اُس جگہ پر پڑ رہی تھی جہاں کچھ دیر پہلے ہم موجود تھے۔ چند

دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے ایک سے زیادہ لوگ لینڈ کروزر کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گئے ہوں۔

جھاڑیاں بہت گھنی تھیں۔ کوشش کے باوجود ہم کچھ نہ دیکھ پائے۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں دبیز اندھیرا تھا۔ باہر روشنی تھی۔ ہم تک صرف روشنی کا احساس پہنچ رہا تھا۔ میں نیچے بیٹھ کر جھاڑیوں کے بیچ سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ میڈم میرے عقب میں مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئی، سرگوشی میں بولی، ''کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ہمارے تعاقب میں یہاں آئے ہیں۔''

''نہیں.....'' وہ پورے وثوق سے بولی، ''ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ فائرنگ کی آواز سن کر کسی نے پولیس کو مطلع کر دیا ہو اور پولیس ادھر آ نکلی ہو۔''

''نہیں میڈم!'' میں نے دھیمی آواز میں کہا، ''اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ بڈھے کے مکان تک آتے؛ ادھر تک ہمارا پیچھا نہ کرتے کیونکہ انہوں نے ہمیں اس طرف آتے نہیں دیکھا ہوگا۔ ہم فائرنگ کے بعد کچھ دیر تک دِتے ماچھی سے پوچھ گچھ کرتے رہے تھے اور سڑک پر آنے تک ہم نے کسی گاڑی کی آواز نہیں سنی تھی۔ پھر کس طرح ان لوگوں نے اتنے کم وقت میں مکان کا جائزہ لے لیا، یہ بھی طے کر لیا کہ ہم اِس طرف آئے ہیں اور ہمارے یہاں رُکنے کے چند ہی لمحوں بعد یہاں پہنچ گئے..... نہیں، ایسا عملی طور پر ناممکن ہے۔''

وہ بولی، ''ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو مگر یہ ہماری پولیس ہے۔ واردات کے دوسرے دن موقع ملاحظہ کرنے پہنچتی ہے۔ مجرموں تک کبھی نہیں پہنچتی، مجرم اس تک پہنچتے ہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔''

''پیرو ماچھی بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ دریا پار گیا ہوا ہے۔ ویسے بھی اس کی آدھی سے زیادہ نفری ہلاک ہو گئی ہے۔ دِتے ماچھی کے بعد اس کے بعد دو آدمی بچے ہیں جبکہ یہ زیادہ لوگ معلوم ہوتے ہیں۔''

''تو پھر یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟'' وہ متردد ہو گئی۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا جب میرے کانوں میں ایک پاٹ دار آواز پڑی، ''اوئے اِدھر دیکھ..... کوئی جھنگی میں چھپا ہوا نہ ہو۔''

ایک اور بھاری بھرکم آواز گونجی، ''گاڑی تو ایک دم فرسٹ کلاس ہے چوہدری..... لگتا ہے کوئی امیر جوڑا ہنی مون پر نکلا ہے۔''

اسے جواب میں ایک شاندار گالی سے نوازا گیا، ''اوئے بھوتنی کے! یہ تیرے باپ کی سیر گاہ ہے کیا؟ دیکھو..... کسی کو زبردستی یہاں نہ لایا گیا ہو۔''

وہ شخص بولا جسے گاڑی کی تلاشی لینے کا حکم صادر ہوا تھا، ''چوہدری صاحب..... گاڑی بالکل خالی ہے۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ کوئی ابھی یہاں سے نکلا ہے۔''

''کیا یہ بات گاڑی کے میٹر پر لکھی ہوئی ہے؟'' چوہدری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں چوہدری صاحب! گاڑی کا انجن گرم ہے اور اندر گرمی ہے۔ کسی نے تھوڑی دیر پہلے انجن اور ہیٹر کو بند کیا ہے۔ شاید ہمارے ڈر سے نکل بھاگا ہے۔''

''ہاں بھئی..... اوئے غضنفر! سن رہے ہو ناں کالو خان کی بات..... اس کے ڈر سے کوئی اپنی نئی نکور فورویل جیپ جنگل میں چھوڑ بھاگا ہے۔ ہشکے بھئی ہشکے!''

چند آدمیوں کا ملا جلا قہقہہ گونجا۔ جدھر ہم چھپنے سے پیشتر کھڑے تھے، اُدھر ایک غیر معمولی ریکونسی والی تیز آواز ابھری، ''سر! ادھر تو کوئی نہیں ہے۔ میں نے سارا جھنڈ کھنگال مارا ہے۔''

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ کوئی بھی اتنے مختصر وقت میں جھنڈ کے ایک چوتھائی حصے کا جائزہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ شاید نہ دکھائی دینے والے جنگلی جانوروں سے ڈر گیا تھا یا کانٹوں کے خوف میں مبتلا ہو کر جھوٹ بول گیا تھا۔ اپنی جان چھڑا گیا تھا۔ پھر اسے ان گھنی جھاڑیوں کو ٹٹولنے کا حکم صادر ہوا جس میں ہم چھپے ہوئے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ قریب آئی۔ اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر ارد گرد دیکھا۔ کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ اگر جھاڑیوں کے اندر بھی گھس آتا تب بھی اُسے ہم نظر نہ آتے۔ اس نے حکم دہندہ چوہدری کو مطمئن کرنا تھا، کر دیا اور لینڈ کروزر والوں کو کوستا ہوا لوٹ گیا۔

اُسے چوہدری نے ڈانٹا ڈپٹا اور سخت سست کہا۔ پھر اس نے چند اور لوگوں کو ہماری تلاش پر مامور کیا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ تلاش کرنے والے اس جھنگی کے قریب بھی آئے، جس میں ہم چھپے ہوئے تھے اور ٹارچوں کی مدد سے جھاڑیوں کے بیچ جھانکتے رہے۔ ٹارچ کی تیز روشنی بے ترتیب ٹہنیوں کے بیچ سے چھنتی ہوئی ہم تک پہنچی مگر میری توقع کے مطابق وہ ہماری موجودگی کو بھانپ لینے میں ناکام رہے۔

پھر قدرے بلند آواز میں ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی، ''کوئی ہے..... یہ گاڑی کس کی ہے؟ اگر اس گاڑی کا مالک سن رہا ہے تو فوراً اپنی گاڑی کے پاس آ جائے.....''

مجھے میڈم کی سانسوں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے جسم کا آدھا بوجھ بھی مجھ پر ڈال رکھا تھا۔ بولی، ''مجھے تو یہ پولیس والے لگتے ہیں۔''

میں نے جواباً سرگوشی کی، ''شاید!''

ایسے میں ایک دروازہ کھلا، بند ہوا اور ہماری لینڈ کروزر کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ چونکہ آنے والوں نے اپنی گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ رکھے تھے، اِس لیے ہمیں فوراً پتہ چل گیا کہ انہوں نے ہماری لینڈ کروزر ہی اسٹارٹ کی تھی۔

میڈم گھبرا کر بولی، ''یہ کیا؟ ان لوگوں نے ہماری گاڑی کیوں اسٹارٹ کر دی ہے؟''

میں نے حیرت سے کہا، ''تو کیا آپ گاڑی کی چابی اگنیشن میں ہی چھوڑ آئی تھیں؟''

''ہاں! یہ غلطی مجھ سے ہوگئی ہے۔''

ایک بھرائی ہوئی کرخت آواز سنائی دی، ''امانت! تم اِسی گاڑی میں ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ..... نہیں، بلکہ ہمارے درمیان میں چلو۔ واپسی پر اِسے تھانے لے چلیں گے۔ جس کی ہوگی، آ کر لے جائے گا۔''

امانت بولا، ''صاحب! یہ جیپ کسی بڑے آدمی کی لگتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''بکواس نہ کرو۔ بڑا آدمی اس وقت جنگل میں اپنی زوجہ محترمہ کو ڈانس کی ٹریننگ دلانے لائے گا..... ابے بھوتنے کے! مجھے لگتا ہے کہ پیرو گینگ اسے شہر سے چوری کرلایا ہے۔ یاد رکھو کہ ہم نے اس گاڑی کو بڑی مشکل سے خطرناک ڈاکوؤں سے چھینا ہے اِسے.....''

''پَر چوہدری صاحب.....''

''زیادہ ٹاں ٹاں نہ کر..... جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔ وقت کم ہے۔ یہ نہ ہو کہ پیرو گینگ فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے اور ڈی ایس پی صاحب ہماری کھال کھنچوا دیں۔'' چوہدری نے اُسے بری طرح ڈانٹ دیا۔

ایک ساتھ کئی دروازے بند ہوئے اور آن کی آن میں کسی سخت مزاج ڈی ایس پی صاحب کے اختیاراتی پلاس سے اپنی کھال بچانے والے ہماری گاڑی لے کر چلتے بنے۔

میڈم۔ زگھبرائے ہوئے انداز میں کہا، ''اب کیا ہوگا؟''

میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے جھنگی سے باہر

نکلے۔ جھنگی میں سردی زیادہ تھی۔ تبھی ہم دونوں ہاتھ رگڑ کر ہاتھوں کو حرارت پہنچا رہے تھے۔ دیکھا؛ میدان صاف ہو چکا تھا۔ وہ ڈھلوان خالی تھی جس پر میڈم نے لینڈ کروزر کھڑی کی تھی۔ کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر، ڈھنڈ کی دوسری جانب گاڑیوں کی ایک قطار جاتی ہوئی دکھائی دی۔ ان کی ٹیل لائٹس کو دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ ہماری لینڈ کروزر سمیت ان کی تعداد چھ تھی۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے آگے جانے والی گاڑیاں پچھلی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں چند لمحوں کے لیے نہائیں۔ پتہ چلا کہ وہ سبھی پولیس کی موبائل وین تھیں۔ ان کی گفتگو سے ہمیں علم ہوا تھا کہ وہ پیرو گینگ پر ریڈ کرنے جا رہے تھے۔ ریڈ کا انجام کیا ہونا تھا؛ یہ پولیس کی پیشہ ورانہ کارکردگی کو دیکھ کر قبل از وقت طے کیا جا سکتا تھا۔

میڈم نے زمین پر زور سے پاؤں مارا اور بے حد غصے سے بولی، ''شٹ..... ان کمینوں کو بھی اِس وقت ادھر آنا تھا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی برسٹ میں ڈھیر کر دوں۔''

گاڑیوں کی قطار کچھ فاصلے پر دریا کی مخالف سمت میں جنگل میں گھس کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میڈم نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے اور برہمی سے بولی، ''میں اگر راستہ بھول نہ جاتی تو ہم ان لوگوں سے پہلے پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جاتے اور اپنا کام کر کے ہم لوگ وہاں سے نکل جاتے۔ مگر افسوس! سارا کیا کرایا کھوہ کھاتے پڑ گیا۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا، 'اور پولیس کے نرغے میں آ کر پیرو ماچھی کے ساتھی قرار پا کر بھون دیے جاتے.....'

ہم دونوں ڈھنڈ کے کنارے گاڑیوں کے ٹائروں سے بننے والی لکیروں پر متوازاً چل رہے تھے۔ ہمارا رُخ اسی جنگل کی طرف تھا جس میں گاڑیاں داخل ہوئی تھیں۔

میں نے کہا، ''میڈم! میرا خیال ہے کہ ہم کچھ ہی دیر میں ڈیرے پر پہنچ جائیں گے۔''

اس نے میرے ہاتھ سے ایک گن پکڑتے ہوئے کہا، ''دس پندرہ منٹ لگ جائیں گے.....''

اس نے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے جس کی وجہ سے وہ گرم تھے۔ گن ٹھنڈی تھی۔ تبھی اُس کے منہ سے کلمۂ حیرت نکل گیا، ''اف!..... یہ تو برف کے مانند ٹھنڈی ہے۔''

ڈھنڈ کے ٹھنڈے پانی سے ٹکرا کر اُٹھنے والی ہوا یخ بستہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم باقاعدہ طور پر کپکپانے لگے۔ ہماری آوازیں بھی لرزنے لگیں۔ میڈم بولی، ''تم نے ٹھیک کہا تھا۔ یہاں بہت سردی ہے۔''

یخ بستہ ہوا بدن کے پار ہو رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ جب ہم بڈھے کے کچے گھر میں اچھل کود کر رہے تھے، ہمیں سردی کا مطلق احساس نہیں ہوا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے برابر چلتی ہوئی میڈم کو دیکھا۔ مجھے سردار حیدر خان کی بیلے والی حویلی یاد آ گئی جہاں سے رات گئے نکلا تھا اور جلدی میں کوئی گرم کپڑا، دیا سلائی یا سردی سے بچاؤ کے لیے کچھ بھی اُٹھا نہیں پایا تھا۔ حویلی سے نہر کے پل تک، طے کی جانے والی مسافت کو میں شاید عمر بھر نہیں بھول پاؤں گا۔ وہی غلطی میں نے دہرائی تھی۔ ملتان سے چلتے ہوئے میں نے سردی کا کوئی اَپاہ نہیں کیا تھا۔ میڈم نے چونکہ خاصا گرم سوٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا، اِس لیے سردی کے اِس جانکاہ محاذ پر اس کی حالت مجھ سے بہتر تھی۔ اسے بھی اِس بات کا احساس ہو گیا تھا، تبھی اس نے میرے ہاتھ سے گن پکڑ لی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں اپنا ایک ہاتھ سائیڈ والی جیب میں ڈال کر گرم کرنے کے قابل ہو گیا۔

چاند ایک سیاہ بدلی کی اوٹ میں چھپنے لگا تھا۔ ماحول پر چھائی ہوئی چاندنی ماند پڑنے لگی تھی اور اندھیرا بتدریج گہرا ہونے لگا تھا۔ ہماری رفتار کم نہیں تھی مگر راستے کی ناہمواری، پھسلن کا احتمال اور راستے سے لاعلمی کے باعث ہمیں چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ دائیں جانب چکنی مٹی تھی۔ بائیں ہاتھ ریتلا میدان تھا۔ ہم دونوں سرحدی پٹی پر چل رہے تھے جب میڈم نے مجھے کہا، ''شہریار! چکنی مٹی اگر گیلی ہو تو اس پر چلنا محال ہو جاتا ہے۔ ایک لمحے کیلئے توجہ بٹنے سے چلنے والا سر کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم خاصی لاپروائی سے چل رہے ہو۔ مجھے خدشہ ہے کہ گر جاؤ گے۔''

اچانک اس کا پاؤں کیچڑ پر پڑا اور وہ پھسل کر 'دھپ' کی آواز کے ساتھ زمین پر گر گئی۔ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ پھسل کر گرنا بڑا عجیب حادثہ ہوتا ہے۔ بجائے ہمدردی کے اظہار کے، دیکھنے والوں کے لبوں پر قہقہہ مچل جاتا ہے۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ مجھے اس کی ناراضی کا اندیشہ تھا مگر اسے کوئی جھجک نہیں تھی۔ اسی لئے وہ بجائے برہم یا شرمندہ ہونے کے، ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس پر گزشتہ طویل دورانیے سے گہری سوگوار کیفیت طاری تھی جس سے اس نے آخر کار نجات حاصل کر لی تھی۔ میں اُسے اُٹھانے کے لیے بڑھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا اور جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

میں نے پوچھا، ''میڈم! چوٹ تو نہیں لگی؟''

وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

میں نے تعجب کے پوچھا، ''آپ کیوں ہنس رہی ہیں؟''

وہ بولی، ''اصولاً تمہیں ایسا کرنا چاہیے تھا۔ تم نے نہیں کیا، میں نے سوچا؛ میں کرلو۔ کسی ایک کو تو ہنسنا چاہیے ناں۔''

اپنے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھنے لگی۔ کولھوں کے بل گرنے کی وجہ سے پینٹ کا عقبی حصہ بھی کیچڑ زدہ ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کا جائزہ لینے کے بعد بولی، ''سوٹ کا ستیا ناس ہو گیا ہے۔'' پھر کندھے اُچکا کر بولی، ''خیر! تمہیں تنبیہ کر رہی تھی، خود ہی گر گئی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ چلو!''

میں نے اس کی گن اُٹھا کر کندھے سے لٹکا لی اور چل پڑا۔ وہ جوگنگ کے سے انداز میں دوڑتی ہوئی میرے برابر پہنچی اور بولی، ''شہریار! ہم تھوڑی دیر میں پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جائیں گے جہاں پولیس کی بڑی نفری ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوگی۔ کیا تم نے یہ سوچا کہ ہم ان سے اپنی گاڑی کس طرح حاصل کریں گے؟''

میں نے کہا، ''آپ بہتر جانتی ہیں۔''

اس نے منہ بنا کر مجھے دیکھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد تفکر آمیز لہجے میں بولی، ''ہمارے پاس یہاں موجودگی کا جواز نہیں ہے۔ کوئی معقول سا جھوٹ تراشو ورنہ وہ ہمیں گاڑی نہیں دیں گے۔ یہ بھی بڑی مصیبت ہے کہ یہاں سگنلز بھی نہیں ہیں جس کی وجہ سے فون پر کسی سے رابطہ نہیں کیا جا سکتا۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ دِتے ماچھی کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کے مطابق ڈیرے پر صرف ایک آدمی موجود تھا۔ اب اس تک رسائی ممکن نہیں رہی تھی کیونکہ پولیس ہمیں اپنے حصار سے اندر نہیں جانے دے گی۔ اگر ہم چھپ چھپا کر ڈیرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو پھر ہمیں پولیس کی اندھا دھند فائرنگ میں باہر نکلنے کا موقع نہیں ملنا تھا۔ ایسی حالت میں بہتر یہی تھا کہ ہم اپنی گاڑی کا فکر کرتے۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مالِ غنیمت کے علاوہ بھی چند نوٹ موجود تھے مگر کم تھے۔ ان نوٹوں سے کسی وردی پوش کو خریدنا محال تھا۔ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ مجھے پولیس سے مک مکاؤ

کا عملی تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ بہت سوچا مگر کوئی معقول بہانہ سجھائی نہیں دیا تو میں نے مایوسانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ''میرا خیال ہے کہ ہم پولیس کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔''

اسی اثناء میں ہم سطح زمین سے آٹھ دس فٹ بلند واقع خودرو جنگل میں داخل ہو گئے۔ دو متوازی نالیوں والا راستہ جنگل میں بل کھا کر یوں غائب ہو رہا تھا جیسے سانپ لہرا کر بل میں گھس جاتا ہے۔ میڈم نے بے ساختگی سے کہا، ''ہاں! یہی راستہ پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جاتا ہے۔ میں نے اس جھنڈ کی طرف جانے کی غلطی کی تھی.....''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک تیز چیختی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ کوئی اہلکار مائیکروفون پر مقامی زبان میں اعلان کر رہا تھا، ''پولیس نے ڈیرے کا گھیراؤ کر لیا ہے۔ چاروں طرف نفری تعینات ہو چکی ہے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ بھی ڈیرے کے اندر موجود ہیں، وہ اپنے ہاتھ سروں پر رکھ کر باہر آ جائیں ورنہ انہیں برے انجام تک پہنچا دیا جائے گا۔''

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور رُک گئے۔ آگے جانا بے سود تھا۔ خطرے سے خالی بھی نہیں تھا کیونکہ پیرو ماچھی اور پولیس کے مابین خوف ناک میچ کھیلا جانے والا تھا۔ میں نے آواز سے اندازہ کیا کہ مائیکروفون والا مجھ سے کم و بیش ایک فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا بول رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے الفاظ بدل کر اعلان کر رہا تھا۔ متن ایک ہی تھا کہ پیرو گینگ کے تمام ارکان ہتھیار ڈال کر گرفتاری دے دیں ورنہ انہیں گولی مار دی جائے گی۔

میڈم نے موبائل فون نکالا۔ سکرین روشن کی اور وقت دیکھ کر بڑبڑائی، ''دو چالیس..... شہریار! ہم کس وقت ملتان سے نکلے تھے؟''

میں نے کہا، ''پونے گیارہ بجے تھے۔ یعنی ہمیں شہر سے نکلے تین گھنٹے ہونے والے ہیں۔''

وہ بولی، ''کیا ہمیں ڈیرے کی طرف جانا چاہیے؟''

''وہاں جا کر کیا کریں گے؟'' میں چونکا۔

''صورتِ حال کا جائزہ لیں گے۔ اگر موقع ملا تو اپنی گاڑی نکال لائیں گے۔''

''میڈم! وہاں ہمارا دکھائی دینا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔'' میں نے تشویش آمیز لہجے میں باور کرایا۔

''تو پھر ان کے لوٹنے کا انتظار کیا جائے؟''

''بہتر تو یہی ہے.....'' میں نے اپنی دانست میں بہتر مشورہ دیا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور راستے سے ہٹا کر درختوں کی طرف چل دی۔ اس کا نہ اور لائی کے غیر معمولی گھنے جنگل میں کیکر کے بلند قامت درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم جنگل کے کنارے پر چلتے ہوئے چند گز دور پہنچ کر رُک گئے۔ ایک طرف جنگل تھا۔ دوسری طرف کٹاؤ یافتہ گڑھا..... وہ ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی اور مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بولی، ''شہریار! ایک آئیڈیا سوجھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں پولیس والوں کو الو بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔''

میں نے جلدی سے پوچھا، ''وہ کیسے میڈم؟''

میرے اور اس کے بیچ دو تین فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ وہ میری جانب کھسک آئی۔ انہی ساعتوں میں چاند سیاہ بدلی سے دامن چھڑا کر دنیا کو دیکھنے لگا۔ پہلے سے قدرے شوخ چاندنی پھیل گئی۔ دریا کی سفید لکیر، دلہن کے پاؤں میں بندھی ہوئی چاندی کی پازیب سی، نظروں کو بھلی لگنے لگی۔ میڈم شکیلہ دریا پر نظریں جمائے شوخ انداز میں گویا ہوئی، ''تم نے سنا تھا؛ پولیس والا کیا کہہ رہا تھا؟''

پولیس والوں کی بہت سی باتیں ہم نے سنی تھیں جب ہم ڈھنڈ کے پاس گھنی جھنگی میں دبکے بیٹھے تھے۔ وہ نہ جانے کس بات کا تذکرہ کر رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بولی، ''چوہدری کو کسی اہلکار نے رپورٹ دینے کے بعد کہا تھا کہ 'لگتا ہے کوئی امیر جوڑا ہنی مون پر نکلا ہے'..... یاد کرو!''

میں جھینپ کر بولا، ''میڈم! وہ تو بکواس کر رہا تھا، ایسی باتیں یاد رکھنے کی کہاں ہوتی ہیں۔''

رات کے سناٹے میں جلترنگ سی بج اُٹھی۔ اس کی ہنسی زندگی سے بھرپور تھی۔ اس نے ایک لخت مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑ لیا، بمشکل گھنٹیوں کی کھنک دباتے ہوئے بولی ''ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کانسٹیبل بکواس نہیں کر رہا تھا، سچ کہہ رہا تھا۔ ہم جس کمیونٹی کے لوگ ہیں، وہاں ایسی خرمستیاں روا ہیں۔ ہم بھی جوانی کی آگ پر دریا کی برف ڈالنے ادھر آ نکلے تھے۔ کئی گاڑیوں کو ادھر آتا دیکھ کر ڈر گئے تھے اور گاڑی چھوڑ کر چھپ گئے تھے..... بس!''

میرت ہوئی کہ اس نے کتنی بڑی بات کو کتنے عام سے انداز میں لیا تھا۔ مایوسی ہوئی کہ اس عام کہانی پر کسی کو یقین دلانا بہت محال تھا۔ اس نے میرا ردِ عمل بھانپ لیا اور چیلنج کرنے کے

سے انداز میں بولی، ''دعا کرو؛ پولیس جلد آپریشن سے فارغ ہو جائے تاکہ ہمارا وقت بچ جائے۔تم بھی دیکھ لوگے کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔''

اس کے انداز نے مجھے باور کرا دیا کہ اس نے دل ہی دل میں اس احمقانہ سوچ پر عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے اُسے مؤدبانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی یہ بہت بھونڈی کہانی ثابت ہوگئی اور ہمیں بقیہ رات تھانے کی حوالات میں گزارنا پڑے گی مگر وہ مجھ سے متفق نہ ہوئی۔

مائیکروفون سے متواتر پھوٹنے والی آواز خاموش ہوگئی۔ ہمیں یہاں بیٹھے دس منٹ کے لگ بھگ وقت ہو گیا تھا جب پیرو ماچھی کے ڈیرے کی طرف سے پہلے فائر کی گونج دار آواز سنائی دی۔اس کے ساتھ ہی پولیس والوں نے 'نعرۂ تکبیر؛ اللہ اکبر' کی یک آواز صدائے پُر جوش بلند کی۔ پھر فائرنگ کا لگاتار سلسلہ چل نکلا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فائرنگ یک طرفہ تھی یا دو طرفہ.....

میڈم بڑے انہماک سے دریا کو دیکھ رہی تھی۔اس کے چہرے پر چاندنی سمٹ رہی تھی اور اس کے خال وخد کو مجھ پر آشکار کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا؛ یوں لگا جیسے اس نے بڈھے کی بیوی اور بچے کے اغوا کو وقتی طور پر فراموش کر دیا تھا۔ وہ قطعاً مغموم، افسردہ یا متفکر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے کہا، ''میڈم! ایک بات پوچھوں؟''

اس نے اپنا رُخ بدلے بغیر کہا، ''ہاں ہاں! پوچھو۔''

''آپ کا مزاج بڑا عجیب سا ہے۔ کسی پل پریشان، کسی ساعت برہم تو کسی لمحے بچوں کی طرح شوخ.....ایسا کیوں ہے؟''

وہ تھوڑی نخوت سے بولی، ''میں ڈیفرنٹ ہوں۔''

''کیوں؟''

''تم بتاؤ، تم اتنے پیچیدہ کیوں ہو؟ کسی وقت بہت چالاک، دلیر اور فتنہ پرداز دکھائی دیتے ہو تو کسی وقت سادہ لوح، دیہاتی اور بزدل.....ایسا کیوں ہے؟'' اس نے میری نقل اتاری۔

میں نے بات بنانی چاہی مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ بولی، ''اس لیے کہ تم بھی ڈیفرنٹ ہو۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب تمہارے پاس نہیں ہے۔ ہے نا؟.....میرے پاس بھی نہیں ہے۔''

اسی لمحے فائرنگ رُک گئی۔ میڈم نے چونک کر بڑی تیزی سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ یہ اُس کی غیر اختیاری حرکت تھی ورنہ ہمارے عقب میں سوائے گھنے جنگل کے کچھ نہیں تھا۔ کوئی

پانچ سات منٹ بعد گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ریڈ مشن مکمل ہو چکا تھا اور پولیس کی فاتحانہ واپسی عمل میں آ رہی تھی۔

میڈم تیزی سے بولی، ''گنیں اس جھاڑی کے پیچھے رکھ کر میرے پیچھے آؤ۔ ہم دونوں نے چند دن پہلے شادی کی ہے..... یاد رکھنا!''

اس کے ساتھ ہی اُس نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر بلٹ بیلٹ اور دونوں بندوقیں جھاڑی کے پیچھے پھینکیں اور اس کے تعاقب میں تھڑے سے نیچے ریتلی جگہ پر چھلانگ لگا دی۔ وہ آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ میں اس کے نقشِ قدم پر دوڑ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ریتلے میدان میں چکرانے لگی۔ پولیس کی گاڑیاں تیزی سے چلی آ رہی تھیں۔ میڈم مجھ سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر دوڑ رہی تھی۔ دوڑتے دوڑتے منہ سے 'ہاؤ، ہاؤ' کی تیز آوازیں نکال رہی تھی۔ اچانک رُکی، پلٹ کر چیخی، ''ہم زندگی کو انجوائے کر رہے ہیں، ڈو یو نو ڈارلنگ..... کم آن..... زندگی پھر کبھی دریا پر اس طرح کھیلنے کا موقع دے گی یا نہیں..... آج دے رہی ہے۔ انجوائے اِٹ.....''

وہ پارک میں کھیلتی ہوئی دس سالہ بچی کی طرح اچھل کود رہی تھی۔ میں نے پھولی ہوئی سانس میں قدرے برہمی سے کہا، ''میڈم! یہ کیا حماقت ہے؟''

میں رُکا تو وہ کچھ دور ہو گئی۔ اسی لمحے جنگل میں پولیس کی پہلی گاڑی نمودار ہوئی۔ میڈم اس کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں نہا گئی۔ ہاتھ لہرا کر دوڑتے ہوئے چیخی، ''کم آن ڈارلنگ..... اس حماقت پر عقل نثار..... اس لمحے پر ہزاروں تنہا صدیاں قربان.....''

اس کی آواز سناٹے میں بہت دور تک سنائی دے رہی تھی اور وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ مجھے ناچار اُس کی طرف دوڑنا پڑا۔ وہ پولیس کی گاڑی کی طرف بھاگ رہی تھی۔ جونہی گاڑی کے قریب پہنچی، ایک ذرا رُکی پھر پلٹ کر میری جانب دوڑی۔ میرے سنبھلنے سے پیشتر اچھل کر مجھ پر لد گئی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اسے لیے زمین پر آن گرا۔ وہ تڑپ کر پہلو کے بل لیٹ گئی اور اپنا چہرہ میرے چہرے پر رگڑنے لگی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس ناٹک سے پولیس کو کیا دکھانا چاہتی تھی؟ تب سمجھ میں آیا : ب پولیس کی اگلی گاڑی ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر رُک گئی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں اماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پچھلی گاڑیاں بھی رک گئیں اور ان کے ڈرائیور ہارن بجانے

لگے۔ چند لمحوں بعد، جب گاڑی کے اندر بیٹھے ہوؤں کو ہمارے خالی ہاتھ ہونے کا یقین ہو گیا، گاڑی کا دروازہ کھلا اور بھاری رعب دار آواز گونجی، ''اوئے! تم کون ہو..... یہ فحاشی بند کرو اور ہاتھ سروں سے بلند کر کے کھڑے ہو جاؤ۔''

میڈم نے سرگوشی کی، ''یہ تو وہی چوہدری ہے۔ تم نے کچھ نہیں بولنا۔ میں اس سے نمٹتی ہوں۔''

ہم دونوں بیک وقت کھڑے ہوئے۔ میڈم نے میری کمر میں ہاتھ حائل کیا، میرا بازو پکڑ کر اپنے کندھوں پر ٹکایا اور چیخ کر کہا، ''تم ہماری پرائیویسی، جسے تم نے فحاشی کا نام دیا ہے، دیکھنے کے لیے یہاں کیوں آئے ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہیے تھی ناں.....''

چوہدری کے عقب میں کئی قہقہے گونجے اور ایک شوخ آواز سنائی دی، ''ڈوجا پاسا کرو چوہدری صاحب! آپ کو شرم آنی چاہیے تھی ناں!''

چوہدری نے گردن موڑ کر کسی کو ڈانٹا، ''اوئے اپنی گندی چونچ بند کر بھتنی کے.....''

پھر گن ہاتھ میں پکڑ کر تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔ چونکہ اس کے عقب میں وین کی تیز ہیڈ لائٹس روشن تھیں، اِس لیے ہمیں اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قریب آ کر رُک گیا۔ بولا، ''تم کون ہو؟''

میڈم نے میری کمر سے ہاتھ نکال لیا اور تحکمانہ لہجے میں بولی، ''ہم وہ ہیں جن کی لینڈ کروزر تم لوگ پوچھے بغیر لے کر چلتے بنے۔ پولیس اگر چوری چکاری کا کام سنبھال لے تو پھر چور بے چارے بھوکے مرنے لگیں گے۔ اپنے آدمیوں کو بولو، وہ میری گاڑی اِدھر لا کھڑی کرے۔''

وہ جواں سال اور خوب صورت لڑکی تھی۔ قیمتی لباس میں ملبوس تھی۔ شکر تھا کہ لباس کا اگلا حصہ کیچڑ سے محفوظ رہا تھا۔ مضبوط اور حاکمانہ انداز میں، چوہدری کے رعب و دبدبے کو خاطر میں لائے بغیر اپنی لینڈ کروزر مانگ رہی تھی۔ چوہدری ٹھٹک گیا۔ نادان نہیں تھا۔ سمجھ گیا کہ اس پراعتماد انداز میں پیش آنے والی لڑکی عام نہیں ہوتی۔ خاص ہوتی ہے۔ خاص لوگوں سے خاص برتاؤ کیا جاتا ہے؛ جانتا تھا۔ تبھی قدرے نرم لہجے میں بولا، ''اچھا! تو وہ گاڑی آپ کی ہے۔ ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ پیرو گینگ شہر سے چرا لایا ہے۔''

''اگر تم لوگ واپس نہ آتے تو ہمیں ساری رات ادھر ہی گزارنا پڑتی۔'' میڈم نے منہ بنا کر کہا، ''تم نے پوچھا تھا کہ ہم کون ہیں۔ سنو! میں ملک عظمت اللہ خان کی بھتیجی ہوں۔ ملک عظمت اللہ کون ہیں؟ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے۔ نہیں جانتے تو بتا دیتی ہوں۔ ایڈیشنل آئی جی

پولیس ہیں۔ کہو تو فون پر بات کرا دیتی ہوں..... اور یہ میرا ہز بینڈ ہے۔'' پھر ہنس کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی، ''بتاؤ ناں اِسے کہ تم 'زوں' کر کے جہاز اُڑاتے ہو اور ملک دشمنوں پر بڑے بڑے بم گراتے ہو.....''

وہ اتنی روانی سے بول رہی تھی کہ چوہدری کو کچھ بولنے اور پوچھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتے ہوئے بولی، ''بتاؤ ناں..... تم نے جہاز کے جو کرتب مجھے ائر بیس پر دکھائے تھے، ان کا خلاصہ انسپکٹر کو سناؤ ناں.....''

ساتھ ہی اُس نے جھپٹ کر میرے دونوں کان پکڑے اور کھینچ کر اچھلتی ہوئی، خوشی سے چیختی ہوئی ایک طرف کو دوڑ پڑی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ میں 'ٹھہرو، ٹھہرو' کے نعرے بلند کرتا ہوا اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ وہ کچھ فاصلے پر پہنچ کر ایک ذرا رُکی اور چیخ کر بولی، ''انسپکٹر! میری گاڑی ادھر ہی کھڑی کر جانا..... میں بزی ہوں، پھر ملاقات ہوگی۔ انکل سے بات کراؤں گی تمہاری۔ بائی بائی!''

اس کی ہنسی فضا میں گونجی۔ ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کر گئے۔ ایک بڑی ٹارچ کی تیز روشنی کا ہالا ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ میں نے اُسے دبوچ لیا۔ وہ بولی، ''مجھے پکڑ کر کھینچو.....''

میں نے اس کی بانہیں پکڑ کر ایک جانب کو کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ بلند آواز میں چیخی، ''پولیس..... ہیلپ می..... پولیس..... مجھے میرے شوہر سے بچاؤ..... بچاؤ..... ہیلپ می.....''

اس کی آواز سناٹے میں بازگشت پیدا کرنے لگی۔ عجیب ماحول بنا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ٹارچ کی تھرکتی ہوئی روشنی نے ہمیں آزاد کرتے ہوئے کھل کھیلنے کا موقع عنایت کر دیا۔ چوہدری کی شوخ آواز سنائی دی، ''جہاز اُڑانے والے شوہر سے خدا بچا سکتا ہے، پولیس نہیں۔ ہم آپ کی گاڑی چھوڑے جا رہے ہیں۔ سنبھال لیں۔ گڈ بائی!''

ایک اور آواز سنائی دی، ''یہ خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں سے فوراً نکل جائیں ورنہ.....''

میں نے میڈم کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ دریائی ریت پر گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ چیختی ہوئی آواز میں بولی، ''تمہیں ہمارا اتنا ہی فکر ہے تو دو چار سپاہی بھی بندوقوں سمیت یہاں چھوڑے جاؤ۔ ہم انہیں علی الصبح تھانے پہنچا دیں گے۔''

اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ قطار کی صورت میں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں حرکت پیدا

ہوئی۔ لینڈ کروزر سب سے پیچھے تھی۔ اس میں سے دو سپاہی نکل کر اگلے ڈالے میں سوار ہوئے اور سبھی گاڑیاں رینگنے لگیں پھر غراتی ہوئی ڈھنڈ کی طرف مڑ گئیں۔

میں آہستگی سے میڈم کے سامنے جا کھڑا ہوا پھر اُس کے مقابل گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ میں نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور تحسین آمیز انداز میں بولا، ''میڈم! آپ کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ آپ واقعی ڈیفرنٹ ہیں۔''

اس نے چہرہ اُٹھایا، آسودگی سے آنکھیں بند کیں اور کمان کی طرح پیچھے کی طرف دہری ہو گئی۔ اگر میں اس کے ہاتھوں پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر لیتا تو وہ گر گئی ہوتی۔ اُسے سنبھالا اور کھینچ کر سیدھا کرنا چاہا تو وہ ایک جھٹکے سے میرے سینے سے آن ٹکرائی۔ اپنے ہاتھ چھڑا کر مجھ سے لپٹ گئی اور میرے سینے پر آہستگی سے گال رگڑتے ہوئے بولی، ''میں نے کتنے نمبر حاصل کیے ہیں؟''

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا، 'سو بٹا سو' اور پھر غیر متوقع جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر زور سے بھینچ لیا۔ اس کی بھنچی بھنچی آواز ابھری، ''تھوڑا اور.....''

میرے بازوؤں کے اعصاب کھنچے۔ وہ بولی، ''اور کس دوناں!''

اس نے اپنا بند آنکھوں والا چہرہ اوپر اُٹھایا اور ہولے سے کھانسی۔ میں نے اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ چند لمحے ایسے ہی گزر گئے۔ اچانک وہ تڑپی اور میری گرفت سے نکل کر کھڑی ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ بولی، ''تھک گئی ہوں۔ چلو؛ سردی لگ رہی ہے۔''

وہ تھکی نہیں تھی مگر تھکاوٹ کے پردے میں چھپ کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں نے حد سے نکل کر شاید خود کو اس کی نظروں سے گرا دیا تھا۔ میں اُٹھا اور گاڑی کی طرف جاتے ہوئے بولا، ''سوری میڈم! دراصل مجھے اختیار.....''

اس نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا، ''نہیں ڈیئر! ایکسکیوز نہ کرو۔ انسان اور کمپیوٹر میں یہی بنیادی فرق ہے۔ وہ صرف فیڈ کیا گیا مواد لوٹاتا ہے۔ انسان ہر بار نیا ردِعمل ظاہر کرتا ہے۔ دریا پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔''

اس نے بڑی لاجواب اداکاری کی تھی۔ چند ہی لمحوں میں چوہدری نامی انسپکٹر مطمئن ہو گیا تھا تو یہ میڈم کے غیر معمولی اعتماد، بچگانہ طور اور بے خوف رویے کا کمال تھا۔ میڈم نے اسے نہ تو پوچھ گچھ کیلئے وقت دیا تھا، نہ اُسے تشکیک کا کوئی موقع فراہم کیا تھا۔ انسپکٹر چوہدری اس کے

سامنے بُری طرح 'یرک' گیا تھا۔

وہ مسرور کن انداز میں مجھ سے چمٹ کر چل رہی تھی۔ دھیمی آواز میں کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔ میں نے کہا، ''اگر وہ آپ کے کہنے پر ملک عظمت اللہ کو فون کر لیتا تو؟''

وہ ہنسی، ''کیسے؟ یہاں تو سگنلز ہی نہیں آتے۔''

''وہ ہمیں تھانے لے جاتا اور وہاں سے فون.....''

''اوہ یار! بھلا ایک انسپکٹر میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ ایڈیشنل آئی جی کو فون کرے۔ وہ بھی اتنی رات گئے۔''

ہم گاڑی کے پاس پہنچے۔ اس نے سرسری انداز میں گاڑی کا جائزہ لیا۔ سب کچھ 'او کے' تھا۔ پھر کچھ فاصلے پر چاندنی میں چمکتی ہوئی ریت پر ٹانگیں پسار کر جا بیٹھی۔ بولی، ''اپنا اسلحہ اُٹھا لاؤ۔ میں تب تک ٹھنڈی ریت سے کھیلتی ہوں۔''

میں تیز تیز قدموں سے جنگل تک پہنچا۔ ٹیلے پر چڑھا۔ جھاڑی کے پیچھے پڑی ہوئی گنیں اور بلٹ بیلٹ اُٹھائیں۔ ابھی بلٹ بیلٹ کمر پر باندھ ہی رہا تھا کہ اچانک میڈم کی تیز چیخ سناٹے کا سینہ چیر گئی۔ میں نے جھٹکے سے پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ میرا خون میری آنکھوں میں سمٹ آیا اور یوں لگا جیسے چار سو گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔

وقت بدلنے کی کئی وارداتیں سن رکھی تھیں۔ دیکھ بھی رکھی تھیں۔ امیر کو غریب اور غریب کو امیر ہوتے سن رکھا تھا۔ ہنستے کھیلتے انسان کو خون میں لت پت دیکھنے والی آنکھوں کو اتنا تعجب کبھی نہیں ہوا تھا جتنا چند لمحوں میں بدل جانے والے منظر کو دیکھ کر ہوا تھا۔

میں نے اپنا سر جھٹکا اور ریت پر بچھی ہوئی استعجاب انگیز بساط کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں چمکتی ہوئی سیاہ لینڈ کروزر سے چند قدموں کے فاصلے پر، جہاں چند لمحے پیشتر میڈم فرحت انگیز انداز میں ریت کے ٹیلے پر کھیل رہی تھی، وہاں موجود نہیں تھی بلکہ چند گز دور ریت پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی اور ایک دیو ہیکل شخص اُسے ڈنڈوں سے پیٹ رہا تھا۔ میڈم کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ سن کر میں گویا ہوش میں آ گیا اور ریت پر کود کر گالیاں دیتا ہوا بگٹٹ دوڑا۔ میری آواز سن کر اس نے اپنا ہاتھ روک لیا، پلٹ کر مجھے دیکھا اور حلق کے بل چیخا، ''قریب نہ آنا ورنہ تمہیں بھی جان سے مار دوں گا۔''

میڈم کو تڑپتا ہوا دیکھ کر میں موت کے خوف سے رُک نہیں سکتا تھا۔ آن کی آن میں گاڑی

تک پہنچ گیا۔اس مختصر وقت میں میڈم اس کی ٹانگوں کے بیچ ریت پر تڑپتے تڑپتے ساکت ہو گئی تھی اور وہ خاصا موٹا اور لمبا چوبی ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے گن سیدھی کی، اس کے سینے کا نشانہ لیا اور غرایا، ''ڈنڈا پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کر لو ورنہ گولی مار دوں گا۔''

گن کو دیکھ کر اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔اسے شاید میرے پاس گن کی موجودگی کا اندازہ نہیں تھا۔اس نے اپنا رُخ بدلا اور بغیر کچھ کہے چوبی ڈنڈا ایک طرف پھینک کر میڈم کے پیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں اس کی اس حرکت کو ہرگز سمجھ نہ پایا تھا۔تبھی میں نے اُسے ڈانٹا، ''گدھے کے بچے! کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ اُٹھا لو۔''

اس کی پشت میری جانب تھی۔وہ اُٹھتے اُٹھتے رُک گیا، پھر قدرے آگے کی جانب کھسک کر بیٹھ گیا۔اس کے حلق سے ایک قہقہہ برآمد ہوا جو میرے لئے نہایت غیر متوقع تھا۔ساتھ ہی اُس کی بھاری آواز گونجی، ''اب تم اپنی گن پھینک دو ورنہ میں اسے ذبح کر دوں گا۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔میڈم سخت خطرے میں تھی۔نہ جانے اسے کہاں اور کتنی گہری چوٹ آئی تھی کہ وہ بے سرت پڑی تھی۔اس پر سوار وحشی شخص کی دھمکی سے عیاں تھا کہ اس کے پاس ڈنڈے کے علاوہ کوئی چاقو یا خنجر بھی موجود تھا جسے وہ میڈم کے نرخرے پر رکھ کر مجھے پسپائی پر مجبور کر رہا تھا۔

اب وہ گردن موڑ کر میری طرف خون آشام نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ناکافی روشنی کے باوجود اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے جھلکتی درندگی عیاں ہو رہی تھی۔

میں بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔وہ مجھ سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔گولی چلاتا تو وہ مرنے سے قبل میڈم کی شہ رگ کاٹ دیتا۔کھڑے رہ کر وقت ضائع کر رہا تھا۔میں نے گن تانے رکھی اور سخت لہجے میں پوچھا، ''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ جواب دینے کے بجائے بھیڑیے کی طرح غرایا، ''گن پھینک دو ورنہ.....''

میں نے محسوس کیا کہ اس کے دیوانگی آمیز قہقہے اور غراہٹ کے پیچھے درشتی اور دلیری کارفرما نہیں تھی بلکہ آواز کی لرزش سے آشکار ہوتا تھا کہ وہ موت کے خوف اور دہشت سے دوچار تھا اور زندگی کی آخری تگ و دو میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ایسی حالت میں انسان، انسان نہیں رہتا،

درندہ بن جاتا ہے۔ وہ ہر ایسا کام بھی کر گزرتا ہے جس کی عام حالات میں اس سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ تبھی مجھے بڑی احتیاط سے کام لینا تھا۔

میں جواباً غرایا، ''تم کھڑے ہو جاؤ ورنہ.....''

اسے سمجھ آ گئی کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ نہ وہ میڈم پر ہاتھ چلا کر زندہ رہ سکتا تھا نہ میں اُسے گولی مار کر میڈم کو بچا سکتا تھا۔ نسبتاً کم سخت انداز میں بولا، ''کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری ساتھی کی گردن کاٹ دوں؟''

''اور کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارے بدن کو گولیوں سے چھلنی کر دوں؟''

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں دھمکی دی، ''تم مجھے جانتے نہیں ہو؛ میں پیرو ماچھی کا آدمی ہوں۔ یہ علاقہ ہمارا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر تم پیرو کے آدمی ہوتے تو ہم پر ہاتھ نہ اُٹھاتے اور تمہیں یہ علم بھی ہوتا کہ میں کون ہوں۔''

''کون ہو تم؟'' میری توقع کے مطابق وہ تشویش اور تردد کی لپیٹ میں آ گیا۔

''تم مجھے نہیں جانتے، اس لئے بتاتا ہوں کہ میں سردار حیدر خان کا بیٹا ہوں۔ پیرو ماچھی جیسے کئی فراری ہمارے ڈیرے پر پناہ لینے آتے ہیں۔'' میری آواز میں بے پناہ سختی تھی۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرا انداز بالکل ویسا ہی ہو، جیسا سردار حیدر خان کا ہوا کرتا تھا۔ چونکہ چوک قریشی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لئے مجھے یقین تھا کہ اس نے حیدر خان کا نام ضرور سن رکھا ہوگا۔

ہم دونوں کی پوزیشنیں کمزور تھیں۔ میں پلک جھپکے بغیر اُسے دیکھ رہا تھا۔ میں برق رفتاری سے اس وحشی انسان کو میڈم سے دور ہٹانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ وہ بھی چند لمحوں تک مجھے ایک ٹک دیکھتا رہا، آنکھیں گھما کر میری دونوں گنوں کو گھورتا رہا پھر بولا، ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں استاد پیرو کو بابا کا پیغام اور تحفہ دینے آیا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر اپنی ساتھی سمیت گاڑی چھوڑ کر چھپ گیا۔ وہ حرام زادے میری گاڑی لے کر چلتے بنے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا، ''ریڈ سے واپسی پر ان سے گاڑی حاصل کی۔ پتہ نہیں ریڈ کا کیا بنا؟ پیرو ماچھی بچ گیا یا 'کیں' ہو گیا۔ تم بتاؤ؛ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟..... یہ ذہن میں رکھو کہ میں تمہیں پیرو ماچھی کے پاس لے کر جاؤں گا اور تمہارا جھوٹ ثابت ہونے پر تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''وہ کسی سے 'کیں' نہیں ہوتا۔'' وہ غصے سے بولا، ''ڈیرے پر ریڈ کے وقت میں اکیلا تھا۔ پولیس کو چکر دے کر اس جیپ میں بیٹھ گیا اور اب تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

میرے حلق سے طویل سانس خارج ہوگئی۔ ہم نے پولیس کے جانے کے بعد اپنی گاڑی چیک کی تھی مگر صرف اگلی نشستیں دیکھی تھیں۔ وہ عقبی حصے میں کہیں دبکا بیٹھا تھا، تبھی نظر نہ آیا۔ میں نے گن کی نال جھکالی اور تنبیہی انداز میں کہا، ''اگر تم نے جھوٹ بولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ بتاؤ؛ استاد کہاں ہے؟''

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ مجھ پر بھروسہ کرے، نہ کرے۔ پھر بولا، ''وہ پار گیا ہے۔ یہ لڑکی کون ہے؟''

'پار' سے اس کی مراد دریا کی دوسری جانب کا علاقہ تھی۔

میں نے ہنس کر کہا، ''بھولے بادشاہ! اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو؛ پھر کہتے ہو کہ تم پیرو کے آدمی ہو۔ یہ آج کی رات میری ہے۔ کل کسی اور کی ہوگی۔ آج اس کا نام شرمین ہے۔ کل ماریہ ہوگا۔''

وہ میری باتوں میں آ گیا اور آہستگی سے کھڑا ہو گیا۔ پھر میری طرف مڑا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں لمبے پھل والا چمکدار خنجر دبا ہوا تھا۔ چاروں شانے چت پڑی ہوئی میڈم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''اگر اس کی ضرورت ہے تو ہوش میں لانے کی تدبیر کرو ورنہ اُٹھا کر ڈھنڈ میں پھینک دو۔''

میں نے کندھے اُچکا کر کہا، ''زندہ ہے تو ٹھیک ورنہ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''مراد بخش.....'' وہ میڈم کی ٹانگ کو ٹھڈا مار کر میری طرف بڑھا۔ میرے قریب آیا۔ شاید وہ ابھی تک میری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ خنجر میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر بولا، ''غلطی میری نہیں، اِس لڑکی کی تھی۔ میں تو اس گاڑی میں پولیس کے ڈر سے چھپا تھا۔ سوچا تھا کہ کہیں موقع پا کر نکل جاؤں گا۔ میں نے پولیس والوں کو جاتے ہوئے دیکھا تو نہیں تھا، مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ جب میں نے جیپ کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا تو میدان صاف تھا۔ میں پچھلا دروازہ کھول کر بھاگنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی نے دیکھ لیا اور میرے پیچھے دوڑی۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ میں اس کا دشمن نہیں ہوں مگر اُس نے میری گردن پر مکا دے مارا۔ میرے پاس ڈنڈا تھا۔ میں نے اُس کے سر میں دے مارا۔ مجھے علم ہوتا کہ تم لوگ استاد کے مہمان ہو تو میں اُسے ہرگز نہ مارتا۔''

اس کے لہجے میں شرمندگی کا عنصر شامل تھا۔ وہ اپنے لب و لہجے سے ان پڑھ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ گھاگ اور زیرک نہیں تھا اور ہمیں مزید نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں نے پوچھا، ''تمہارے پاس اسلحہ ہے؟''

''نہیں..... کیونکہ مجھے ڈیرے سے جلدی میں بھاگنا پڑا تھا۔''

میں نے اسپاٹ لہجے میں کہا، ''تم اُدھر گاڑی کے پاس جا کر بیٹھو۔ میں اِسے دیکھتا ہوں؛ پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر گاڑی کی طرف چل دیا۔ سرِ دست اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے میں نے گن کندھے سے لٹکائی اور میڈم پر جھک گیا۔ وہ بے ہوش تھی مگر اس کی نبض اور سانسیں معمول کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ خطرے کی بات نہیں تھی۔ زخم کی نوعیت دیکھنے کے لئے اُسے سیدھا کیا اور بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا گاڑی کے سامنے لایا۔ گاڑی کے قریب کھڑے مراد بخش کو مخاطب کیا، ''گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کر دو۔''

اس نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے ناب گھما کر ہیڈ لائٹس آن کر دیں۔ میں اور میڈم ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں نہا گئے۔ میں جھکا اور میڈم کو بغور دیکھنے لگا۔

اس کا سنہرا ہیئر بینڈ کہیں گر گیا تھا۔ میں نے غیر اضطراری طور پر اردگرد زمین پر نظر دوڑائی۔ چند قدموں کے فاصلے پر بینڈ کے تین چار ٹکڑے بکھرے دکھائی دیے۔ ہیئر بینڈ پر لگی والی ڈنڈے کی ضرب نے نہ صرف اُسے توڑ پھوڑ دیا تھا بلکہ میڈم کے سر کی جلد بھی پھاڑ دی تھی جہاں سے خون رس کر بالوں میں پھیل چکا تھا۔ سر کو ٹٹولنے سے ایک بڑا سا گومڑ بھی محسوس ہوا۔ میں نے سرسری طور پر تمام جسم کو اور خصوصی طور پر گردن کو بھی دیکھ لیا۔ اسے کوئی اور چوٹ نہیں آئی تھی اور سر کا زخم بھی زیادہ خطرناک نہیں تھا۔

قدرے مطمئن ہو کر میں نے میڈم کو جھنجوڑا۔ اس کے گالوں پر ہولے ہولے چپتیں ماریں، آوازیں دیں مگر وہ ہوش و خرد سے بیگانہ رہی۔ گردن موڑ کر ڈھنڈ کی طرف دیکھا۔ میڈم کو ہوش میں لانے کے لئے پانی کے چھینٹے مارے جا سکتے تھے۔ خیال آیا کہ خنک رات میں ٹھنڈا پانی بے حد سرد ہو گا مگر اس کے سوا دیگر چارہ کار نہیں تھا۔ کندھے اُچکا کر کھڑا ہوا۔ مراد علی نے گاڑی کو ریس دی تو میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ وہ عادتاً پاؤں دبا رہا

تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے ڈھنڈ کی طرف بڑھا۔

جونہی میں نے ڈھنڈ کے ٹھہرے ہوئے سرد پانی میں ہاتھ ڈالے، مجھے عقب میں گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ مراد بخش کی موقع پرست فطرت نے میرے سبھی اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔ وہ گاڑی کو ریورس کر رہا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی۔ اس نے گاڑی روکنے کے بجائے اچانک پہلے گیئر میں ڈال کر میڈم کے قریب سے گزار کر دریا کی جانب دوڑا دی۔

میں بنا سوچے سمجھے مراد بخش کی شان میں رطب اللسانی کے جوہر بکھیرتا ہوا گاڑی کے پیچھے دوڑ پڑا مگر چند ہی لمحوں میں مجھے باور ہو گیا کہ میں لاحاصل جستجو میں تھا۔ لینڈ کروزر کا طاقت ور انجن لحظہ بہ لحظہ اُسے میری دسترس سے دور کرتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی دونوں گنیں زمین پر گرا دیں اور آخری کوشش کے طور پر فل سپیڈ دوڑ کی لگائی مگر ایک منٹ کے لگ بھگ دوڑ کر رُک گیا اور ہانپنے لگا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جاتی ہوئی لینڈ کروزر کی ٹیل لائٹس دکھائی دے رہی تھیں اور میں احمقانہ انداز میں پہلوؤں پر ہاتھ رکھے اُسے آنکھوں سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا۔

میں نے حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا تھا اور مراد بخش کو کمزور اور شکست خوردہ سمجھنے کی بھیانک غلطی کا ارتکاب کیا تھا جس کی سزا فی الفور مل گئی تھی۔ پیچ و تاب کھاتا ہوا، خود کو کوستا ہوا پلٹا اور سر جھکائے میڈم کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ میں نے ڈھنڈ کا ٹھنڈا پانی چلو میں بھرا اور میڈم کے چہرے پر چھڑکا۔ میری دوسری تیسری کوشش رنگ لائی اور میڈم نے جھرجھری لی۔ چند ثانیوں بعد آنکھیں کھولیں اور ارد گرد دیکھ کر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔

اس کے حلق سے سسکی برآمد ہوئی پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر ریت پر گرنے کے سے انداز میں لیٹ گئی۔ اس کے سر میں لگنے والی چوٹ خاصی تکلیف دہ تھی۔

میں نے ہمدردی سے پوچھا، ''میڈم! درد بہت زیادہ ہے؟''

اس نے سر اُٹھایا۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئی اور کئی لمحوں تک مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی پھر ہولے سے بولی، ''گاڑی کہاں ہے؟''

میں نے کہا، ''وہ بے غیرت گاڑی لے کر رفو چکر ہو گیا ہے۔''

''کون؟'' میڈم کے منہ سے استعجاب آمیز لفظ برآمد ہوا، ''وہ؛ جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا؟''

میں نے 'جی' کہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ ریت پر ٹکا کر آہستہ سے کھڑا ہونے کی کوشش

کی مگر کراہ کر رہ گئی۔ میں نے دیکھا کہ فرطِ تکلیف سے اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ میں نے سہارا دے کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔ وہ بدقت تمام بیٹھنے کے قابل ہوئی تھی۔ اس نے بڑی سختی سے میرا بازو تھام رکھا تھا۔

پھر اپنے سر کو انگلیوں سے ٹٹول کر بولی، ''خون رِس رہا ہے۔ کم بخت نے پوری قوت سے ڈنڈا دے مارا تھا۔ پَر خیر! بچ گئی ہوں، یہی کافی ہے۔ مگر وہ گاڑی لے کر بھاگ کیسے گیا؟''

میں نے اُسے اپنی حماقت سے آگاہ کیا تو غصے سے بولی، ''شہریار! تمہارے پاس دو لوڈڈ گنیں موجود تھیں۔ تم گاڑی کا ٹائر برسٹ کر دیتے۔ اوہ مائی گاڈ! مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔''

میں نے ندامت سے کہا، ''دراصل آپ کو بے ہوش دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا اور درست فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔''

وہ چند لمحوں تک خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ چاندنی میں جگمگا رہا تھا جس پر تکلیف کو ضبط کرنے کے واضح اثرات ثبت تھے۔ البتہ آنکھیں بے تاثر تھیں۔ پھر اچانک مسکرا کر بولی، ''تمہیں پیا جی نے یہ سبق نہیں دیا تھا کہ ہماری زندگی میں کسی پر بھروسہ کرنا ناقابلِ معافی جرم ہے؟''

میرا سر جھک گیا، ''جی میڈم! اس نے بتایا تھا مگر.....''

''اگر مگر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ وہ حرامزادہ کس طرف گیا ہے؟'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی، ''کیا پیرو ماچھی کے ڈیرے کی طرف گیا ہے؟''

میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا، ''نہیں..... وہ اس سیدھ میں جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔''

میں نے اُسے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور میری بانہوں میں لڑھک گئی۔ سردی سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی، ''مجھے تھوڑی دیر یہیں پڑا رہنے دو۔''

ریت بہت ٹھنڈی تھی۔ شکر تھا کہ اس کا لباس خاصا موٹا اور گرم تھا ورنہ اتنی دیر ریت پر پڑا رہنے کی وجہ سے اُسے اب تک نمونیا ہو چکا ہوتا۔ وہ سرتھام کر زمین پر بیٹھ گئی پھر میری گود میں گر گئی۔ میں نے اُسے سنبھالا دیا پھر اپنی قمیص کا اگلا پلو کھینچ کر گولا سا بنایا اور اس کے سر کے زخم پر رکھ دیا۔ کپڑے کے اُس ننھے سے گولے پر منہ رکھ کر پھونکیں مارنے لگا۔ اس عمل سے ہلکی سی حرارت پیدا ہوئی۔ وہ بولی، ''سکون آ رہا ہے، لگے رہو.....''

میں نے پھونک مارنے کا عمل مسلسل جاری رکھا۔ وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی۔ بولی،

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

ہوا بہت ٹھنڈی تھی اور بدن سے آر پار گزرتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا، ''کیا میں آپ کو اُس جھنگی میں لے جاؤں جہاں ہم پولیس کے آنے پر کچھ دیر کے لئے چھپے تھے؟ وہاں یقیناً ہوا نہیں لگے گی۔''

''ہاں! تم مجھے وہاں چھوڑ کر اُس خبیث کے پیچھے جاؤ اور اس سے گاڑی چھین لاؤ۔'' وہ کراہی۔

میں نے پریشان ہو کر کہا، ''میڈم! میں اس تک کیسے پہنچوں گا؟ وہ اتنی دیر میں کئی میل دور جا چکا ہوگا۔''

''تو کیا ہم رات یہیں بیٹھ کر گزار دیں گے؟'' وہ قدرے غصے سے بولی، ''اگر اس تک پہنچنا ممکن نہیں ہے تو پھر پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی گاڑی کھڑی ہو یا موٹر سائیکل..... جس پر ہم آگے یا پیچھے کا سفر طے کر سکیں۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور پوچھا، ''کیا آپ اَب چل سکتی ہیں؟''

وہ بولی، ''نہیں..... مجھے اُٹھا کر لے جاؤ۔ میرے سر میں نبض کے ساتھ ساتھ شدید دھمک پڑ رہی ہے۔''

اس نے میری گود سے اپنا سر اُٹھا کر مجھے آزاد کیا تو میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے دونوں گنیں اپنے دونوں کاندھوں پر لٹکا کر کمر کے رُخ دھکیل دیں اور میڈم کو اُٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔ اس کے منہ سے سسکاریاں برآمد ہونے لگیں۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ میرے کندھے پر پڑا تھا جبکہ زیریں حصہ میری بانہوں کے حصار میں تھا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں ڈھنڈ کے کنارے چلتا ہوا جھنگی کی طرف بڑھ رہا تھا، میرے من میں میڈم کے خوب صورت بدن میں چھپی ہوئی قیامت کے لمس کا احساس بیدار ہو گیا۔ زندگی تب قیمتی اور ہیجان آمیز محسوس ہونے لگتی ہے جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم زندہ ہیں۔ موت بھی تبھی بھیانک لگنے لگتی ہے جب انسان بامِ اجل پر کھڑا ہو کر زندگی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے۔ میرے ہاتھ کپکپانے لگے۔ میڈم نے یہ لرزش محسوس کر لی، مستفسر ہوئی، ''کیا تم سردی کے مارے کانپنے لگے ہو؟''

ایسا نہیں تھا مگر ایسا ظاہر کرنے میں ہی عافیت تھی۔ میں نے کہا، ''جی میڈم! سردی بہت

زیادہ ہے۔''

وہ بولی، ''مگر جب سے تم نے مجھے اٹھایا ہے، مجھے سردی کا احساس نہیں ہو رہا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اپنی رفتار بڑھا لی۔ شاید اس لیے کہ میں جلد از جلد جھنگی میں پہنچ کر اس کے بولنے والے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے کاندھے پر ادے جھنگی میں داخل ہونا مشکل مرحلہ تھا جسے میں نے جیسے تیسے عبور کیا اور اُسے جھاڑیوں کے بیچ قدرے صاف جگہ پر اُتار کر لٹا دیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ محض بن رہی تھی وگرنہ اتنی لاغر اور زخمی نہیں تھی کہ اپنے پیروں پر چل کر یہاں تک نہ آ سکتی۔ اس نے زمین پر لیٹتے ہی ہنس کر میری گردن کے گرد بازو حمائل کر دیے۔ چونکہ مجھے توقع نہیں تھی، اِس لئے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اُس پر گر گیا۔ میں جن لمحوں سے بچ کر گزرنا چاہتا تھا، وہ اپنی تمام تر تابناکی سمیت میرے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے۔ تڑپ کر اُس کی گرفت سے نکلنا چاہا مگر اس نے مجھے پوری قوت سے بھینچ لیا۔ بولی، ''تم قریب ہوتے ہو تو سردی نہیں لگتی۔ دور جاؤ گے تو کانپنے لگوں گی۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''مجھے جانے دیجئے تاکہ میں گاڑی کا بندوبست کر سکوں۔''

وہ بولی، ''چند منٹ رکو؛ پھر چلے جانا۔ مجھے یقین دلاؤ کہ میں زندہ ہوں۔ تم زندہ ہو۔ کیا خبر کہ تمہارے لوٹنے تک مجھے کوئی سانپ بچھو کاٹ کر ٹھنڈا کر دے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''اللہ نہ کرے میڈم! ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔''

''کیوں؟'' وہ میری گال پر اپنے ہونٹ رگڑتے ہوئے بولی، ''کیا مجھے موت نہیں آئے گی؟ کیا میں اسی طرح ہمیشہ جوان اور زندہ رہوں گی؟ نہیں..... یہاں کوئی بھی مستقل نہیں ہے۔ کوئی بھی تاحشر ٹھہرنے کا اہل نہیں ہے۔ میں، تم، سبھی..... جانے کے لئے ہی تو آئے ہیں۔''

اس کی آواز بتدریج مدھم اور خمار آلود ہوتی جاتی تھی۔ میں نے کہا، ''آپ کا زخم.....''

اس نے میری بات کاٹی، ''میرا زخم معمولی نوعیت کا ہے۔ تمہارے قرب کے شوق نے اسے بڑھا دیا تھا وگرنہ میں اپنے پیروں پر چل کر بھی یہاں آ سکتی تھی۔ سچ! بہت مزہ آ رہا تھا اب تم مجھے اٹھا کر یہاں لا رہے تھے۔ جی چاہتا ہے کہ تم ایسے ہی اُٹھا کر واپس ریت کے ٹیلے لے جاؤ..... پھر یہاں لوٹو..... بس! رات کا بقیہ پہر اسی طرح تمام ہو جائے۔''

وہ میڈم شکیلہ بن کر میرے حواس پر چھائی رہی تھی۔ چندو کے روپ میں آشکار ہو کر آسان اور اجنبی لگنے لگی تھی۔ بیساکھی کے سہارے زندگی کی تھکی ہوئی سانسیں حلق سے اُتارنے والے

معذور بڈھے نے مجھے بتا دیا تھا کہ میری میڈم کوئی اپسرائی اور ماورائی مخلوق نہیں تھی بلکہ اس کی ذات کا خمیر میری ہی طرح کچی مٹی سے اُٹھا تھا۔ وہ جھونپڑی سے نکل کر محل اور راج تک پہنچی تھی۔ وہ چندو تھی جس سے وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔ جس سے نفرت کی جا سکتی ہو، اس سے محبت کا تعلق بھی استوار کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اُسے چندو سمجھ کر ہمت کا مظاہرہ کیا اور سر اُٹھا کر اس کے ہیولائے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔ چاندنی جھاڑیوں میں سے چھن کر آ رہی تھی اور اس کے چہرے پر چند سفید دائرے بنا رہی تھی۔ میں چند ثانیوں تک اُسے یکٹک رہا پھر اس کے جلتے بجھتے ہونٹوں پر جھک گیا۔ پہلے وہ آگ لگا کر لطف اندوز ہوتی تھی۔ سانسیں لیتے ہوئے کھلونے سے کھیلتی تھی اور آسودگی جذب کرتی تھی۔ کھلونے نے اس کے ساتھ کھیلنے کی جرأت کرتے ہوئے آگ کا ننھا سا الاؤ دہکایا تو وہ دھک سے رہ گئی۔ ہاتھوں کی گرفت آنِ واحد میں دم توڑ گئی اور میرے نیچے سے نکلنے کے لئے تڑپی۔ پھر میری طرف پشت کر کے بیٹھی لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے بولی، ''ایک گن مجھے دے کر پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جاؤ۔''

میں نے کہا، ''آپ چل سکتی ہیں۔ بہتر ہے کہ میرے ساتھ چلیں ورنہ میں آپ کی طرف سے پریشان رہوں گا۔''

اس نے گھٹنوں پر سر رکھ دیا، ''نہیں..... میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تم میرا فکر نہ کرو۔ جو کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کرو۔ ہری اَپ..... صبح ہوتے ہی ہمارے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اور ہاں! میرا اسٹول وہیں کہیں گر گیا ہے۔ اُسے بھی ڈھونڈنا۔''

میں نے ایک گن اس کے پہلو میں گھاس پر رکھ دی اور دوسری گن سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہا، ''اپنا خیال رکھیے گا۔ یہاں کیڑے مکوڑے پریشان کر سکتے ہیں۔''

''او کے!''

میں نے اُس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور جھک کر جھاڑیوں کی اس گھنی جھنگی سے باہر آ گیا۔ میری دھڑکن میڈم کے غیر معمولی قرب کے باعث غیر معتدل تھی اور سردی کا احساس بھی کم ہو گیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پھر سردی لگنے لگے گی۔ شاید اسی خوف کے پیشِ نظر میری رفتار خاصی تیز تھی اور میں جلد از جلد پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں کچھ دیر پہلے مراد بخش میڈم شکیلہ سے نبرد آزما تھا، وہاں

تھوڑی سی تلاش بسیار پر مجھے میڈم کا پسٹل دکھائی دے گیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر پہلو والی جیب میں ڈال دیا اور جس راستے پر پولیس والوں کو جاتے دیکھا تھا، اُسی راستے پر چل پڑا۔ جنگل کے بیچ سے گزرتے ہوئے دونوں اطراف پر نگاہ رکھے ہوئے چل رہا تھا۔ بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا مگر احتیاط لازم تھی۔

میں دشوار گزار راستے پر کانٹوں سے بچ کر چلتے ہوئے مراد بخش کے بارے سوچ رہا تھا جس نے ہمیں ایک مصیبت سے نکلتے ہی دھر لیا تھا اور نئے مسئلے سے دوچار کر دیا تھا۔ میں نے اس پر بے وجہ اعتماد کیا تھا ورنہ مجھے چاہیے تھا کہ میڈم کو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دیکھنے بھالنے کے بجائے گاڑی کی سیٹ پر لٹاتا اور سیلنگ بلب کی روشنی میں اس کے زخم کا جائزہ لیتا۔ میں عقل مندی سے کام لیتا تو بغیر کسی مشکل کے مراد بخش کو اٹاغفیل بھی کر سکتا تھا۔ اُسے وہاں سے بھگا بھی سکتا تھا اور گولی مار کر ہمیشہ کے لئے چھٹکارا بھی حاصل کر سکتا تھا مگر میں نے اُسے زندہ و سلامت رکھنے کے ساتھ ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دے کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی دے ماری تھی جس کی سزا مجھے ملنی بھی چاہیے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے جاتے ہوئے میڈم پر گاڑی نہیں چڑھا دی تھی ورنہ وہ شدید زخمی ہو جاتی یا بری طرح کچلی جاتی۔

پولیس کے نامراد لوٹنے اور مراد بخش کی دی ہوئی معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں پُر یقین تھا کہ پیرو ماچھی کا ڈیرہ اِس وقت خالی ہوگا۔ وہاں مجھے کسی کی مڈبھیڑ کا خطرہ نہیں تھا۔ دس منٹ کی تھکا دینے والی مسافت کے بعد جب میں ڈیرے کے سامنے پہنچا تو میرے اِس خیال کو تقویت ملی۔ دو بڑے ناپختہ دیہاتی کمروں والے اس ڈیرے میں کسی ذی نفس کی موجودگی کا شائبہ نہیں ہو رہا تھا۔ کمروں کے سامنے خاصا بڑا تھڑا بنا ہوا تھا۔ چار دیواری نہیں تھی جبکہ ڈیرے کو چاروں طرف سے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ میں درختوں کی اوٹ لیتا ہوا محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ پولیس والوں نے شاید امونیشن کا مہینے بھر کا کوٹہ یہاں انڈیل دیا تھا کیونکہ فضا میں ابھی تک بارود کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔

راستہ ایک ناہموار جگہ پر کمروں کے پچھواڑے میں جا کر ختم ہو گیا۔ چونکہ یہاں پر خونخوار دشمن کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اِس لئے میں کچھ زیادہ ہی محتاط اور چوکس تھا۔ پچھواڑے سے نکل کر کمرے کے پہلو میں پہنچا۔ کم روشنی میں بھی خالی صحن نما تھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی لینڈ کروزر کی یہاں موجودگی کی ذرہ بھر توقع نہیں رہی تھی مگر ڈیرے کی دوسری

جانب آم کے قد آور اور گھنے درخت تلے کھڑی ہوئی میڈم کی لینڈ کروزر نظر آ رہی تھی۔ میرے حلق سے اطمینان بھری سانس برآمد ہوئی۔ مراد بخش نے مجھے ڈاج دیا تھا اور کسی دوسرے راستے سے یہاں پہنچ کر چھپ گیا تھا۔ بظاہر بے وقوف اور اجڈ دکھائی دینے والا مراد بخش بہت کائیاں اور زیرک انسان تھا۔

مراد بخش کی موجودگی کے احساس نے میرے تن بدن میں بجلی اور آگ بھر دی۔ میرے رگ و پے میں سرایت کرنے والے احساسِ ندامت نے شدید نوعیت کی برہمی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ میں نے پسٹل نکالا، چیک کیا تو پتہ چلا کہ وہ خالی تھا۔ میں نے منہ بنا کر اُسے دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور گن کاندھے سے اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا گلی نکڑ تک آیا۔ جھانک کر دیکھا۔ کسی دروازے سے روشنی برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ ایک ہی سیدھ میں بنے ہوئے دونوں کمروں کے علاوہ ایک چھوٹا سا چھپر نما کمرہ میرے عین مقابل میں ایستادہ تھا جو اپنی وضع قطع کے اعتبار سے باورچی خانہ محسوس ہو رہا تھا۔ مراد بخش انہی بڑے کمروں میں سے کسی ایک میں موجود تھا۔

ڈھنڈ کے کنارے پر مراد بخش نہتا ملا تھا تبھی میں نے با آسانی غلبہ پا لیا تھا۔ یہاں وہ نہ صرف اپنے مورچے میں محفوظ تھا بلکہ اس کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ وہ آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ میں نے اردگرد چوکنی نگاہوں سے دیکھا، پھر کوئی اور چارہ کار نہ پاتے ہوئے دیوار کے ساتھ بلی کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا ایک دروازے کے قریب پہنچا۔ کچھ دیر کان لگائے کھڑا رہا۔ رات کے سناٹے میں سانسوں کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مایوسی ہوئی۔ وہ اس کمرے میں نہیں تھا۔ میں دروازے کے آگے سے گزرنے سے گریزاں تھا۔ اندیشہ تھا کہ اگر وہ اسی کمرے میں ہوا تو مجھے دیکھ کر نہ صرف ہوشیار ہو جائے گا بلکہ میرے عقب میں پہنچ کر گزند پہنچانے کی پوزیشن سنبھال لے گا۔ ڈیرے کے پچھواڑے کا چکر کاٹ کر دوسرے دروازے پر پہنچنا بھی مشکل دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا اور گن تانے ایک دم دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا جس کی وجہ سے چند لمحوں تک مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی تھوڑی عادی ہوئیں تو پتہ چلا کہ مراد بخش کمرے میں نہیں تھا اور کمرے میں سامان، چارپائیاں اور بستر ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ پولیس والوں کے ہنر مند ہاتھوں کا اعجاز تھا۔ پیشہ ورانہ تلاشی کے نتیجے میں کمرے میں زلزلے کا سا سماں برپا ہو چکا تھا۔

بجا طور پر مراد بخش دوسرے کمرے میں تھا۔ میں دبے پاؤں اس طرف بڑھا۔ حسبِ سابق دیوار کے ساتھ چپک کر سن گن لی۔ کچھ سنائی نہ دیا۔ یوں لگا جیسے مراد بخش اس کمرے میں بھی نہیں تھا۔ اچانک میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں جل اُٹھیں کہ وہ اس طرف آنے کے بجائے گاڑی میں ہی بیٹھ کر سورج کے طلوع ہونے کا انتظار بھی کر سکتا تھا۔

میں نے اتمامِ حجت کے طور پر کمرے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور گن تانے بجلی کی سی مستعدی سے کمرے میں گھس گیا۔ اس کمرے کا نقشہ بھی پہلے کمرے سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے خالی چارپائیوں اور بکھرے ہوئے سامان کو دیکھ رہا تھا جب اچانک میری کمر میں کسی گن کی نال آن لگی۔ میرے تنے ہوئے اعصاب نے ایک جھٹکا لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، میرے کانوں میں مراد بخش کی بھاری اور درشت آواز پڑی، ''خبردار! اگر کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔ چلو! گن نیچے پھینک دو..... شاباش..... تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔''

مجھے اس کی آمد پر حیرانی ہوئی۔ میں کمرے میں چند گھڑیاں رکا تھا، اس دوران وہ نہ صرف کہیں سے نکل کر میرے عقب میں پہنچ آیا تھا بلکہ اس نے مجھے بھی کور کر لیا تھا۔ ذہن نے توجیہہ دی کہ وہ باورچی خانے میں چھپا ہوا تھا اور میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی دبے پاؤں یہاں پہنچ گیا تھا۔

میں نے اپنی آواز کو بہ سعی توانا اور سخت کرتے ہوئے کہا، ''مراد بخش! تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟''

اس نے گن کی نال پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا، ''میں نے کہا ہے کہ گن نیچے پھینک دو۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہ کیا تو فائر کر دوں گا۔ ایک..... دو.....''

میں نے آہستگی سے گن اپنے پیروں میں کچے فرش پر پھینک دی اور کہا، ''جب یہ طے ہو چکا ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں تو پھر تم یہ ڈراما بازی کیوں کر رہے ہو؟''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بولا، ''الٹے قدموں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلو۔''

سوم

میرے پاس سوائے حکم کی تعمیل کے چارہ نہیں تھا۔ جونہی میں کمرے سے نکلا، وہ غرایا، ''دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

اس کے تحکمانہ انداز نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی مگر اپنی کمر سے بار بار ٹکرانے والی گن کی نال مجھے اس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا تو اس نے پوچھا، ''تمہاری پالتو بلی کہاں ہے؟''

اس کا اشارہ میڈم شکیلہ کی طرف تھا۔ میں نے کہا، ''وہ ابھی تک ڈھنڈ پر بے ہوش پڑی ہے۔''

''مجھے اندازہ تھا کہ تم یہاں آؤ گے۔ اس لئے میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' اس کے لہجے میں گہرا طنز اور فاتحانہ مسرت پنہاں تھی، بولا، ''اب تم شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا نام اور یہاں آنے کا مقصد بیان کر دو۔ وہ کہانی نہ سنانا جو تم نے مجھے ڈھنڈ پر سنائی تھی۔''

میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہزیمت اور تضحیک کے احساس سے دوچار تھا۔ قدرے پر اعتماد انداز میں بولا، ''میں نے کوئی جھوٹی کہانی نہیں سنائی تھی۔ میں سردار حیدر خان کا بیٹا ہوں اور استاد پیرو سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔''

اس نے نال کا دباؤ بڑھایا اور غرایا، ''حرامزادے! کہا تو ہے کہ میں اس کہانی پر یقین نہیں کرتا۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ سچ بولو گے تو شاید تمہیں زندہ چھوڑ دوں تاکہ تم جا کر اپنی پرکٹی لونڈیا سے دو چار گھڑیاں عیش کی گزار سکو۔ ورنہ تمہارا یہ کام بھی مجھے سرانجام دینا پڑے گا۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

میں نے دانت پیسے، ''سردار.....''

اس نے ایک جھٹکے سے نال میرے دائیں پہلو میں چبھوئی۔ تیز ٹیس جاگی۔

میں نے کہا، ''بتا تو رہا ہوں ذلیل آدمی.....''

''میں سردار حیدر خان کے سارے خاندان کو جانتا ہوں، اس لئے بکواس کر کے میرا وقت ضائع نہ کرو۔ ٹھیک ٹھیک بولو.....''

میرا دماغ بڑی برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور اس کے چنگل سے نکلنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ میرے پاس غلطی کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس پر باور تھا کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں بلکہ اس کے قبیل کا شخص ہوں۔ وہ میری معمولی سی حرکت پر برانگیختہ ہو کر گن کی لبلبی دبا سکتا تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا، ''میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سچ کہتا ہوں۔ مجھے پیرو ماچھی کے پاس

لے چلو۔ بے شک مجھے تب تک گن پوائنٹ پر رکھو۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں اور میرا پیرو ماچھی سے کیا تعلق ہے۔''

اس کا لہجہ بڑا سفاک تھا، ''ٹھیک ہے.....'' اس نے ایک ناقابلِ اشاعت گالی دیتے ہوئے کہا، ''پیرو ماچھی کو تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خدا حافظ!''

اس کے لہجے میں نہاں سنگینی نے آنِ واحد میں اس کے خوفناک ارادے کی چغلی کر دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ گن کا ٹرائیگر دباتا، میں ایڑی کے بل گھوم گیا اور میں نے اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی آٹومیٹک شارٹ گن کو پکڑ کر اس کا رُخ آسمان کی طرف کر دیا۔ اس دوران اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ ہم دونوں کے بازوؤں کو جھٹکا لگا۔ اس نے گن کو اپنی جانب کھینچا، میں نے اپنی گرفت مضبوط کی مگر کوئی اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہوا۔ اس نے مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اپنا داہنا گھٹنا پوری قوت سے میری ٹانگوں کے بیچ دے مارا۔ میرے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ درد کی کٹیلی لہر نے پورے بدن کا احاطہ کر لیا۔

شکر ہوا کہ گن میری گرفت سے نہ نکل سکی ورنہ اسے فائر کرنے کی مہلت مل چکی تھی۔ میں نے دانت پیسے اور کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کیا۔ میرا نشانہ اس کی ناک تھی۔ وہ چہرے کا رُخ بدل کر میرا وار خطا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے زوردار تھپڑ مجھے رسید کیا جو سیدھا میرے جبڑے پر لگا اور دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ اس کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ میں نے یکبارگی گن کو اپنی جانب جھٹکا دیا۔ اس کی توجہ بٹی تو میں نے اس کا وار لوٹاتے ہوئے اپنا گھٹنا پوری قوت سے زیرِ ناف جڑ دیا۔ وہ بلبلا کر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر رکوع کے انداز میں جھک گیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر گن کو زوردار جھٹکا دیا۔ گن کو نہ چھوڑنے کی پاداش میں وہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اس کے بازو پر زوردار ٹھوکر رسید کی۔ پھر دونوں پیروں پر اُچھل کر اس کے بازو کی مچھلی پر کود گیا۔ وہ بہت سخت جان تھا۔ میری دونوں کوششیں بے کار گئیں اور گن اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔

وہ اُٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے گن کو ایک جھٹکے سے زمین کی طرف موڑا اور اسے چھوڑ کر ہوا میں اچھلا پھر دونوں پیروں کے بل گن پر گرا۔ بھاری آہنی گن اور زمین کے درمیان اس کا ہاتھ بری طرح کچلا گیا جس کے نتیجے میں اس کے منہ سے بھیانک چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر اس کی گردن پر دھپ رسید کی۔ اس کے

منہ سے مغلظات کا فوارہ ابل پڑا۔ اس نے پوری قوت صرف کر کے اُٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کے بال مٹھیوں میں جکڑے اور سر اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کی ناک زمین سے ٹکرائی اور پورے بدن کو جھٹکا لگا۔ میں نے تب تک اپنے ہاتھوں کو نہیں روکا جب تک اس کی بولتی بند نہیں ہوگئی اور تڑپتا ہوا بدن ساکت نہیں ہوگیا۔

میں پیروں کے بل پیچھے ہٹا۔ اس کی نیم مردہ گرفت سے گن کھینچی اور اُٹھنا چاہا۔ ایسے میں وہ چھلاوے کی طرح اچھلا اور مجھ پر آن گرا۔ اس کا سر زوردار آواز سے میرے سر سے ٹکرایا اور میری آنکھوں کے سامنے پانچ سو والٹ کا بلب روشن ہوگیا۔ میرے لئے اس کا یوں اوندھے منہ لیٹ کر اسپرنگ کی طرح اچھلنا باعثِ استعجاب تھا مگر اس پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے کا قطعی موقع نہیں تھا۔ گن میرے ہاتھوں سے نکل گئی اور میرا وجود اس کے گرانڈیل جسم کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے گھٹنوں کی مشینی ٹھوکریں میری رانوں اور گھٹنوں پر آہنی گرزوں کی طرح لگنے لگیں۔ چند ہی لمحوں میں اس نے میرا بھرکس نکال کر رکھ دیا۔ اس کے چاروں ہاتھ پیر چل رہے تھے اور مجھے مسلسل زدوکوب کر رہے تھے۔ میں نے اپنے اوسان ٹھکانے رکھنے کی کوشش کی، سر جھٹکا، پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے چہرے پر جمائے۔ میری انگلیاں اس کی آنکھوں پر جا ٹکیں۔ میں نے ساعت بھر تاخیر نہیں کی اور پوری قوت سے اس کی آنکھوں میں انگلیاں پیوست کر دیں۔ اس نے چیخ کر اپنا سر ادھر اُدھر پٹخا۔ ایک آنکھ پر سے میری انگلیاں پھسل گئیں۔ دوسری آنکھ میں دو انگلیاں کھب گئیں اور آنکھ کا ڈیلا میری گرفت میں آ گیا۔

عرصہ پہلے سائیں دل جیت کے ساتھ ہونے والی معرکہ آرائی میں میرا یہی وار فیصلہ کن ثابت ہوا تھا۔ میں نے جب اس کی آنکھ کا ڈیلا باہر نکالا تھا، تب اس کی دل دوز چیخوں نے میری سماعت کو دہلا کر رکھ دیا تھا اور مجھے اس تکلیف سے آشنائی ہوئی تھی جو اس ظالمانہ ہتھکنڈے سے بدن کی تمام تر مدافعاتی فصیلیں چیر دیتی ہے۔

مجھ پر خون سوار ہوگیا۔ میں نے اپنے بدن کی تمام تر طاقت کو انگلیوں میں مرتکز کرتے ہوئے اس کی آنکھ کا ڈیلا نوچ لیا۔ میرا ہاتھ لیس دار رطوبت اور خون سے لجلجا گیا۔ ڈیلا میری انگلیوں میں دبا ہوا تھا جبکہ دھاگہ نما عصبی ریشے میرے ہاتھ سے لپٹ گئے تھے۔ اس کی دل دہلا دینے والی چیخ سے فضا کانپ اُٹھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی بھیانک آواز میڈم کے کانوں

تک ضرور پہنچی ہوگی۔

اس کا جسم بری طرح کپکپانے لگا۔ میں نے اسے بہ دقت تمام اپنے وجود پر سے جھٹکا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گر کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے اچھل کر اس کے سر کے عقبی حصے میں پیروں کی پرقوت ضرب لگائی۔ 'کٹک' کی ننھی سی آواز میرے کانوں مین پڑی۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور نرخرہ بجنے لگا تھا۔ میں نے بے ساختہ اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ مراد بخش کی آنکھ کا ڈھیلا دکھائی نہیں دیا البتہ خون اور ریشے ہاتھ سے چپکے ہوئے تھے۔ میں نے کراہت کے مارے پوری قوت سے ہاتھ جھٹکا مگر ان سے گلوخلاصی نہ ہوئی۔

ایسے میں مراد بخش اچانک اُٹھا اور چیختا ہوا کھڑا ہو کر میری جانب لہرایا۔ میں نے اس کے پیٹ میں زوردار مکا مارا۔ وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے، مجھ سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح مجھے نوچنے لگا۔ اس کی دیوانگی آشکار کرنے لگی تھی کہ وہ میری آنکھ کا ڈیلا نکالنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اچھل کر اس کی زخمی ناک پر سر کی ٹکر ماری۔ وہ ڈکرا کر کمر کے بل دروازے کے بیچوں بیچ گرا اور اس کا سر میری گن سے زوردار آواز کے ساتھ ٹکرایا۔ چوٹ خاصی خطرناک تھی۔ وہ چند لمحوں تک تڑپا پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی بانہیں پوری وسعت میں پھیل گئیں اور بدن تادیر جھٹکے لیتا رہا پھر ایک دم ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر بیٹھ کر اس کی قمیص سے اپنا ہاتھ پونچھا۔ پھر اس کے دل کی دھڑکن اور نبض چیک کی۔ وہ زندہ تھا مگر اس کا زندہ رہنا کارِعبث تھا۔ لحظہ بہ لحظہ ڈوبتی ہوئی دھڑکن چغلی کرتی تھی کہ وہ مر رہا تھا۔ دم بہ دم نبض تھم رہی تھی۔ میں نے چند گھڑیاں انتظار کیا۔ مبادا کہ سنبھل جائے، مگر ایسا نہیں ہوا اور اس کا دل رُک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آنکھ کے زخم کی وجہ سے نہیں، کھوپڑی کے عقبی حصے میں آنے والی چوٹ کے سبب جان کی بازی ہار گیا تھا۔

میں نے اپنی گن اس کے سر کے نیچے سے کھسکائی۔ اس پر خون لگا ہوتا تھا۔ اسے چارپائی پر پڑی ہوئی میلی سی چادر کیساتھ پونچھا اور کاندھے پر ڈال لیا۔ مراد بخش کے مردہ وجود پر ایک نگاہِ تنفر ڈالی اور صحن میں آ گیا۔ اس کی گن اُٹھا کر چیک کی۔ وہ جدید طرز کی گن تھی۔ سنگل شوٹ اور برسٹ شوٹ کے آپشن رکھتی تھی۔ اپنی مختصر جسامت کے سبب بہت آئیڈیل گن تھی۔ میں نے اُسے بھی اپنی تحویل میں لے لیا اور اردگرد دیکھتا ہوا لینڈ کروزر کی طرف بڑھا۔

میرے روئیں روئیں سے نیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اس نے گھنٹوں اور مکوں کی جو دیوانہ وار

سوم

ضربیں مجھے پہنچائی تھیں، وہ بہت تکلیف رساں تھیں۔ گاڑی کا دروازہ مقفل تھا۔ مجھے لوٹ کر مرادبخش کے پاس آنا پڑا۔ اس کی جامہ تلاشی لینے پر گاڑی کی چابیاں مل گئیں۔

گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور بڑی مشکل سے صحن سے گزار کر دریا کی طرف جانے والے راستے پر ڈالنے میں کامیاب ہوا۔ چونکہ میں لینڈ کروزر کو پہلی مرتبہ ڈرائیو کر رہا تھا، اس لئے وقت محسوس کر رہا تھا۔ کھالے کی ویگن اور میڈم کی لینڈ کروزر میں زمین و آسمان کا فرق تھا مگر میں نے غیر معمولی کم وقت میں گاڑی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ ڈھنڈ کے پار جھنگی کے قریب گاڑی روک کر میں نے شیشہ اُتارا اور آواز دی، ''میڈم! باہر آ جائیں؛ میں گاڑی لے آیا ہوں۔''

کوئی جواب نہ پا کر میں گاڑی سے اُترا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا جھنگی میں داخل ہوا۔ وہ اسی جگہ پر پہلو کے بل لیٹی ہوئی تھی جہاں میں نے اُسے لٹایا تھا۔ آواز دینے پر اس نے ایک ذرا سر اُٹھایا پھر گردن ڈال دی۔ میں اس کے پاس زمین پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ دیکھا کہ اس کے دانت بج رہے تھے اور جسم بری طرح کپکپا رہا تھا۔ یہ سردی کا اعجاز تھا۔ چونکہ میں اپنی حماقت پر مشن میں کامیابی کا پردہ ڈال کر لوٹا تھا، اس لئے اسے یوں کانپتے دیکھ کر قدرے شوخی سے بولا، ''یہ آپ کو کس نے وائبریشن پر لگا دیا ہے؟''

اس نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا پھر سر اُٹھا کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''مم..... مجھے سس..... سردی لگ رہی ہے۔''

میں نے اس کی بانہہ تھامی۔ پتہ چلا کہ وہ تیز بخار میں بھنک رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق بخار کی شدت ایک سو تین چار تک پہنچ چکی تھی۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''اوہ میرے خدا!''

اُسے اُٹھانے کی کوشش کی مگر اس کے بدن نے میری کوشش کا ساتھ نہیں دیا۔ نتیجتاً وہ ایک جانب لڑھک گئی۔ تیز تیز سانسوں کے درمیان بولی، ''مم..... مجھے اُٹھا کر گگ..... گاڑی میں لے جاؤ..... گاڑی لے آئے ہو ناں؟''

میں نے اُسے پہلے کی طرح اُٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور بھاگنے کے سے انداز میں جھنگی سے نکل کر گاڑی کے پاس گیا۔ اُسے اگلی سیٹ پر بٹھایا اور سرعت سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پوچھا، ''میڈم! کہاں چلوں؟''

وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ بڑبڑائی، ''چلو.....''

میں نے پریشانی کے عالم میں اُسے دیکھا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کہاں چلوں کیونکہ وہ شاید یہ بتانے کی حالت میں نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بے حد سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ ڈاکٹر منور علی شاہ کی صحبت نے مجھے یہ سمجھا رکھا تھا کہ وہ بخار کی خطرناک اسٹیج پر پہنچ چکی تھی۔ ایک چار پر دماغی صلاحیت متاثر ہونے لگتی ہے۔ ایک ہندسہ عبور کرتے ہی انسان زندگی کی آخری سرحد پر پہنچ جاتا ہے۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ کلائی تپ رہی تھی۔ نبض بہت تیز چل رہی تھی۔ سانسیں بھی گرم تھیں۔ میری دانست کے مطابق اُسے فوری طور پر کسی ہسپتال یا کلینک پہنچانا ضروری تھا۔

اس کا سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ جونہی میں نے گاڑی بڑھائی، وہ کراہی، ''پپ..... پانی..... شہریار! پانی لاؤ..... مجھے گیلا کرو.....''

میں نے فوراً گاڑی روک دی۔ جلدی سے اُترا اور ڈھنڈ کی طرف بھاگا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اتنی سخت سردی میں اُسے گیلا کرنا چاہیے تھا یا نہیں..... مگر اس کا حکم ماننا ضروری تھا۔ میں نے پلاسٹک کا لوٹا پانی سے بھرا اور بھاگتا ہوا واپس آیا۔ ایسی حالت میں گیٹ نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ میری موکل بھانپ گئی اور اس نے گیٹ کھول دیا۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی۔ میں نے ہاتھوں کا پیالہ اُس کے لبوں سے لگا دیا۔ اس نے چند گھونٹ پیے پھر اپنا ایک ہاتھ پانی میں ڈال دیا۔ کچھ پانی بہہ گیا۔ باقی پانی میں اُس نے باری باری دونوں ہاتھوں کو بھگویا اور ماتھے اور گالوں کو گیلا کیا، ''گاڑی میں کوئی بوتل نہیں پڑی؟''

میں نے عجلت میں گاڑی کے اندر دیکھا۔ بوتل دکھائی نہیں دی۔ نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی، ''اور لاؤ..... پانی اور لاؤ.....''

میں نے اگلی سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا 'سابر' اُٹھایا اور ڈھنڈ کی طرف بھاگا۔ کپڑا بھگویا اور لوٹا میں پانی بھرا۔ واپس آیا تو وہ سیٹ پر نڈھال پڑی تھی۔ میری آواز پر اُس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔ میں کوئی نتیجہ اخذ نہ کرتے ہوئے گومگو کی حالت میں کھڑا رہا۔ اس نے کپڑا میرے بازو پر سے اُٹھایا اور دیوانہ وار اپنے چہرے پر رگڑنا شروع کر دیا۔ لوٹے میں اس کے حلق سے تیز تیز کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کی بانہہ پکڑی۔ یخ پانی نے اس کا ٹمپریچر کسی حد تک کم کر دیا تھا مگر بخار کا زور ٹوٹا نہیں تھا۔

اس نے لیور کھینچ کر سیٹ کو پیچھے کیا اور نیم دراز ہو گئی۔ پھر کپڑے کو ماتھے پر رکھ کر سیٹ پر سر

ٹکاتے ہوئے بولی، ''شہریار! جلدی چلو..... میرا جسم سن ہونے لگا ہے۔''

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور واپسی کی راہ اختیار کی۔ چند لمحوں بعد اُس نے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنے کوٹ کی جیبیں ٹٹول کر بولی، ''میرا موبائل فون گر گیا ہے۔''

''کہاں؟'' میں نے بریک لگا دیے۔

''وہیں..... جہاں سے مجھے اُٹھا کر لائے ہو۔'' اس کی آواز شدید کپکپاہٹ کا شکار تھی۔

میں نے ٹرن لیا اور چند لمحوں بعد جھنگی کے سامنے رُک کر اُتر گیا۔ کسی تگ و دو کے بغیر مجھے اس کا موبائل فون جھنگی کے باہر ریتلی زمین پر گرا ہوا مل گیا۔ میں جب اُسے کندھے پر ڈال کر جھنگی سے باہر لا رہا تھا، اس وقت ہی اس کے کوٹ کی جیب سے نکل کر گر گیا تھا۔ شکر ہوا کہ جلد مل گیا، دوڑتا ہوا واپس آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ راستہ ناہموار اور مشکل تھا۔ میں جتنی تیزی رفتاری کا مظاہرہ کر سکتا تھا، کر رہا تھا اور جلد از جلد اس پُرعذاب علاقے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب میں اس جگہ پر پہنچا جہاں سے مڑ کر ہم سیمو اور اس کی بوڑھی مغویہ ماں کی تلاش میں بڈھے معذور شخص کے خستہ حال گھر میں گئے تھے اور خون میں لت پت کئی لاشیں بچھا کر آگے بڑھ گئے تھے۔ قرائن بتاتے تھے کہ پولیس کو وہاں کھیلے جانے خونیں کھیل کی خبر نہیں ہوئی تھی وگرنہ وہ پیرو ماچھی پر ریڈ سے پہلے یہاں پہنچتی اور حسبِ ضابطہ کارروائی عمل میں لاتی۔ یہ بھی بعید نہ تھا کہ پولیس اہلکار واپسی پر یہاں سے ہو کر گئے ہوں۔ یہ بات زیادہ دل کو نہیں لگتی تھی کیونکہ اس صورت میں یہاں ہلچل کے آثار دکھائی دیتے۔ میری نظروں کے سامنے زبوں حال بڈھا گھوم گیا جس سے میں نے سر جھٹک کر نجات حاصل کی اور اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کی۔

ادھر آتے ہوئے میں نے راستے میں ایک سرکاری ہسپتال دیکھا تھا۔ دیہاتوں کے ہسپتال، جنہیں محکمانہ اصطلاح میں بنیادی مرکز صحت کہا جاتا ہے، شبانہ نہیں ہوتے۔ بہت کم تعداد میں اسٹاف کام کرتا ہے جو بمشکل دو بجے تک ہسپتال میں ٹھہرتا ہے، پھر گھر سدھار جاتا ہے۔ رات کو ہسپتال میں کسی کی ڈیوٹی نہیں ہوتی۔ نور پور کا سرکاری ہسپتال بھی اسی نوع کا تھا۔ چونکہ وہاں ڈاکٹر منور علی شاہ رہائش پذیر تھا، اِس لئے رات کو لائے جانے والے مریضوں کو علاج معالجے کی سہولت مل جاتی تھی۔

میں اپنی غیر ماہرانہ ڈرائیونگ کے باوجود لینڈ کروزر کو اِس لئے تیز چلا رہا تھا کہ میڈم کو پونٹا کے سرکاری ہسپتال تک جلد از جلد پہنچ جاؤں۔ اس موہوم سی امید کے سہارے کہ ہسپتال کی

رہائشی کالونی میں شاید کوئی ڈاکٹر یا ڈسپنسر رہائش پذیر ہو جو ان نامساعد حالات میں ہماری مدد کر دے اور میڈم کا بخار ٹوٹ جائے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ شجاع آباد یا ملتان کے ہسپتال تک پہنچتے پہنچتے میڈم کی حالت خطرے کی حدود میں پہنچ سکتی تھی۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نہ صرف میڈم کے پھیلے ہوئے بازو کے لمس سے بخار کی حدت کا اندازہ کر لیتا تھا بلکہ اس کے سرخ اور بے قرار چہرے کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ کے بعد میں ہسپتال پہنچ گیا۔ بند گیٹ پر گاڑی روک دی۔ اترا تو دیکھا کہ گیٹ مقفل تھا۔ آدمی کے گزرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر ہارن بجایا۔ پھر میں اُس وقت تک ہارن بجائے چلا گیا جب تک مین روڈ کی جانب والے پہلے کوارٹر کے بیرونی برآمدے کا سوواٹ کا بلب روشن نہیں ہوا۔ پھر برآمدے میں ایک شخص دکھائی دیا جس نے اپنے جسم کو سیاہ چادر یا کھیس میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ وہیں رک کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں گاڑی سے اُتر کر سلاخوں والے آہنی گیٹ سے چپک کر کھڑا ہو گیا اور قدرے تیز آواز میں بولا، ''گیٹ کھولو..... مریض کی حالت خراب ہے۔''

اس نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا، ''تم کون ہو؟''

میں نے کہا، ''سوال جواب میں وقت ضائع نہ کرو۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم گیٹ کا تالا تو کھولو اور مجھے مریض کو اندر تو لانے دو۔''

''مگر یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولا، ''تم جیپ پر ہو، وقت ضائع نہ کرو اور اپنے مریض کو شجاع آباد لے جاؤ۔''

میں نے جھنجھلا کر کہا، ''یار! تم ادھر تو آؤ۔''

وہ بادل نخواستہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا گیٹ کے پاس آیا۔ گیٹ کا مقفل زنجیر کھولتے ہوئے بولا، ''میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ یہاں ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ نو بجے کے بعد آتا ہے۔''

''تم ڈسپنسر ہو؟'' مجھے اُس کی سست روی پر غصہ آ رہا تھا۔

''نہیں۔ میں واپڈا میں لائن مین ہوں۔'' اس نے گیٹ کھول دیا اور مجھے پھر گاڑی میں آنکھیں موندے لیٹی ہوئی میڈم شکیلہ کو بہ غور دیکھتے ہوئے بولا، ''تم اس علاقے کے نہیں لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو اور مریضہ کو کیا ہوا ہے؟''

میں نے اس کے سوالوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا، ''کوارٹروں میں کوئی ڈسپنسر یا ایل

ایچ وی رہائش پذیر نہیں ہے؟''

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالی، سلگائی اور بڑے اطمینان سے جواب دیا، ''میرے ساتھ والے کوارٹر میں ایل ایچ وی رہتی ہے۔ مس عالیہ..... کیا اُسے جگادوں؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''ہاں! تم اُسے جگاؤ، میں گاڑی اندر لاتا ہوں۔''

وہ چالیس کے پیٹے میں تھا۔ اس عمر میں رات کا پچھلا پہر بڑا اکسل مند ہوتا ہے۔ وہ ٹہلنے کے سے انداز میں پلٹ گیا جبکہ میں گاڑی کو ٹرن کر کے ہسپتال کے احاطے میں لے آیا۔ ٹی شکل کے سولنگ پر دائیں سرے پر ہسپتال کی مرکزی عمارت واقع تھی جبکہ بائیں ہاتھ پر ایک قطار میں کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ میں جب تک گاڑی کو دوسرے برآمدے تک لایا، وہ تب تک برآمدے میں کھلنے والے دروازے کو دھڑ دھڑا چکا تھا۔

میں نے اس دوران میڈم کا جائزہ لیا۔ وہ غنودگی کی یورش کا شکار ہو چکی تھی اور گیٹ کے شیشے سے سر ٹکائے گہری نیند میں یا بے ہوشی میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کا تنفس بہت تیز ہو چکا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر کی جانب اُمڈتی ہوئے میڈم شکیلہ کے بخار میں پھنکتے ہوئے بدن کو سنبھال لیا۔ میرے عقب میں لائن مین کی آواز گونجی، ''اپنے مریض کو ادھر ہی لے آؤ بھئی!''

میں نے گردن موڑ کر برآمدے میں دیکھا۔ بلب کی روشنی میں لائن مین کے ساتھ ایک اور ٹھگنے قد کا شخص کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے میڈم کو اُٹھایا اور برآمدے میں آ گیا۔ لائن مین بولا، ''ادھر کمرے میں لے جاؤ اپنی بیوی کو..... مس صاحبہ اسے چیک کرتی ہیں۔''

میں میڈم کو اُٹھائے کوارٹر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ مس عالیہ نام کی ایل ایچ وی نے اپنے ڈرائنگ روم کو کلینک میں بدل رکھا تھا۔ ایک چوبی الماری دوائیوں سے بھری ہوئی تھی جبکہ ہسپتال کا ایک سرکاری بیڈ بھی کمرے کے وسط میں پڑا تھا جس کے پہلو میں ڈرپ اسٹینڈ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے میڈم کو آہستگی سے بیڈ پر لٹا دیا۔ ٹھگنے قد اور سیاہ رنگت والے شخص نے میڈم کو بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنی کوے جیسی آواز میں دریافت کیا، ''یہ تمہاری بیوی ہے جوان؟''

میں نے اس کے مزید سوالوں سے بچنے کے لئے کہہ دیا، ''ہاں! ہم ادھر اپنے رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو بخار نے انہیں آن لیا۔ یہ پتہ نہیں تھا کہ بخار اتنا تیز ہو جائے گا

کہ صبح سے پہلے ہسپتال کا منہ دیکھنا پڑ جائے گا۔ مس صاحبہ جاگ رہی ہیں؟''

اس کوے نما انسان نے مجھے سرتاپا گھورا پھر کمرے کے اندر کھلنے والے دوسرے دروازے میں گھس گیا۔ لائن مین برآمدے میں رک گیا تھا۔ شاید وہ بھی میڈم کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا اور دید بطور بونس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میڈم کراہی، کروٹ بدل کر بڑبڑائی۔ اس نے کچھ کہا تھا مگر میری سمجھ نہ آیا تھا۔ میں اس پر جھکا۔ اچانک اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے ایک ٹک دیکھتی رہی پھر بڑبڑائی، ''میرا جسم شل ہو رہا ہے.....''

میں نے اس کا ہاتھ تھاما، سہلایا اور کہا، ''فکر نہ کریں میڈم! آپ تھوڑی دیر میں ہی تندرست ہو جائیں گی۔''

میرے عقب میں مترنم نسوانی آواز ابھری، ''بھائی! کیا ہوا ہے آپ کی مریضہ کو؟''

میں نے چونک کر شیریں اور شائستہ انداز میں بولنے والی کو دیکھا۔ اس کی آواز بہت خوب صورت تھی اور شکل آواز سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت تھی۔ میں نے جلدی سے کہا، ''انہیں بخار ہوا ہے۔''

ساتھ ہی میں نے بیڈ چھوڑ دیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میڈم کا بآسانی چیک اَپ کر لے۔ اس نے نبض دیکھی، تھرمامیٹر لگا کا درجہ حرارت چیک کیا پھر اسٹیتھو سکوپ لگا کر دل کی دھڑکن اور چھاتی سے ابھرنے والی مخصوص آوازوں کو سنتی رہی؛ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی، ''بخار تو اتنا زیادہ نہیں ہے، جتنی زیادہ غنودگی طاری ہے۔ کوئی اور مرض تو نہیں ہے انہیں؟''

میں نے اردگرد دیکھا۔ وہ کالا کوا کمرے سے برآمد نہیں ہوا تھا جبکہ لائن مین برآمدے میں کھڑا ہو کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ میں نے آواز قدرے دھیمی رکھتے ہوئے کہا، ''ان کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ وہ بھی دیکھ لیجئے۔''

اس نے میری نشاندہی پر سر کا زخم دیکھا۔ بولی، ''یہ تو خاصا بڑا زخم ہے۔ یہ کیسے آیا؟''

میں نے بات بنائی، ''پھسل کر کھاڈے میں گر گئی تھیں۔''

'کھاڈا' مقامی زبان میں اُس چھوٹی سی حوض نما جگہ کو کہتے ہیں جس میں نلکا ایستادہ ہوتا ہے۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''کھاڈے میں گرنے سے پیشانی پر چوٹ لگتی ہے۔ خیر!

مجھے کیا.....''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے میڈم پر جھک کر بال ہٹانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر بعد زخم ننگا ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک دیکھتی رہی پھر اپنی دوائیوں والی چوبی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے پانچ سو ملی لیٹر والی گلوکوز ڈرپ تیار کی، اسٹینڈ پر لگائی اور میڈم کے بازو میں سوئی پرک کرنے کے بعد آہستہ رفتار سے چالو کر دی۔ دو چار منٹ کے انتظار کے بعد اس نے دو انجکشن تیار کیے۔ ایک ورید میں لگایا، ایک کندھے پر، پھر میڈم کے سر کے زخم کی صفائی کرنے میں مصروف ہو گئی۔

مجھے متنبہ کرتے ہوئے بولی، ''رات کو میرے پاس آنے والے مریضوں کے لئے فیس ڈبل ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''آپ فیس کا فکر نہ کریں۔ جتنی کہیں گی، اس سے بھی ڈبل ادا کروں گا۔ آپ انہیں ٹھیک کر دیں۔''

وہ مسکرائی، ''کیا یہ آپ کی وائف ہیں؟''

میں نے کہا، ''جی!''

''آپ کہاں رہتے ہیں؟'' اس نے کاٹن گاز بناتے ہوئے کہا، ''میرا مطلب ہے کہ آپ کو پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا میں نے..... دو سال پورے ہو گئے ہیں مجھے یہاں ڈیوٹی دیتے ہوئے۔''

''جی! ہم ملتان سے آئے ہیں۔''

''کس کے ہاں ٹھہرے ہیں؟'' ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی مسلسل چل رہی تھی۔

''ادھر بیٹ میں..... دریا کے پاس، احمد علی کے گھر.....'' میں نے ایک فرضی نام بتا دیا۔

وہ حیرت سے بولی، ''احمد علی؟ وہ کون ہے؟''

میڈم کے کراہنے کے سبب اس کی توجہ مجھ پر سے ہٹ گئی اور میں دوسرا جھوٹ بولنے سے بچ گیا۔ میں نے میڈم کی کلائی تھامی۔ بخار اُتر گیا تھا۔ مجھے ایک ذرا طمانیت ہوئی۔ میں نے خوب زوایل ایچ دی کو مخاطب کر کے کہا، ''مس! بخار اُتر گیا ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ میڈم شکیلہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ تھوڑی دیر بعد، جونہی وہ اس کی حالت زار سے کچھ مطمئن ہوئی، اس نے ڈرپ نیڈل نکال دی اور کہا، ''یہ اب خطرے

سے باہر ہیں۔ سر کے زخم کی وجہ سے معمولی ٹمپریچر ہے۔ گھنٹے بھر میں اُتر جائے گا۔''

اس نے درست کہا تھا۔ میڈم کی حالت سنبھل چکی تھی۔ رات بھر کی اچھل کود اور بے آرامی کے بعد اب گہری نیند میں تھی۔ اس کی شیورنگ (کپکپاہٹ) بھی رُک گئی تھی اور چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ میں نے پوچھا، ''کیا انہیں ملتان لے جاؤں؟''

ایل ایچ وی چونکی، بولی، ''میرا خیال ہے کہ انہیں کچھ دیر آرام کرنے دیجیے۔''

وہ مجھے اسٹول پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے میں گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھگنے قد والا شخص رضائی اُٹھائے وارد ہوا۔ میں نے اس سے رضائی لے کر میڈم پر اوڑھا دی۔ وہ بولا، ''دوسری رضائی نہیں ہے۔ چاہو تو اِدھر گھس جاؤ۔''

اس نے میڈم کی پاکٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ چونکہ میں نے خود کو میڈم کا شوہر ظاہر کیا تھا، اس لئے اس کا یہ کہنا عجیب نہیں تھا۔ اندرونی کمرے سے ایل ایچ وی کی آواز سنائی دی، ''صدیق! باہر والا دروازہ بند کر دینا۔''

''اچھا.....'' اس نے بلند آواز میں کہا۔ مجھے علم ہو گیا کہ اس بدوضع اور کرخت آواز والے شخص کا نام 'صدیق' تھا۔ میں نے از راہ گفتگو دریافت کیا، ''کیا مس صاحبہ آپ کی بیوی ہیں؟''

''ہاں! میری بیوی ہے۔ یہ ہسپتال میں لیڈی ہیلتھ وزیٹر ہے۔ میں پرائمری سکول میں ٹیچر ہوں۔''

''تو پھر انہیں آپ لوگ مس کیوں کہتے ہیں؟'' مجھے تعجب ہوا۔

وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ پیلے اور بدنما دانتوں کے سبب خاصی بدصورت تھی۔ بولا، ''یہ دیہاتی علاقہ ہے۔ یہاں لیڈی ٹیچر اور ایل ایچ وی کو 'مس' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے خواہ وہ چار بچوں کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔'' اس نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا، پھر برآمدے میں کھڑے ہوئے لائن مین سے مخاطب ہوا، ''تیری مہربانی بھائی! اَب تم جا کر آرام کرو۔ خیر سلا ہے۔''

لائن مین بنا کوئی جواب دیے برآمدے کی سیڑھیاں اُتر گیا۔ صدیق نے دروازہ بند کیا، چٹخنی چڑھائی اور اندرونی دروازے کی طرف جاتے جاتے رُک کر پوچھا، ''تم کیا کام کرتے ہو؟''

میں نے کہا، ''اِدھر ملتان میں اپنا بزنس ہے میرا۔''

''لگتا ہے کہ تمہاری مریضہ اب بالکل ٹھیک ہے۔''

''جی!'' میں نے اس کا اور مس عالیہ کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا، ''اس میں شکریے کی کیا بات

سوم

ہے۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔ بیماری میں رات دن کی بات کیا، کوئی کسی بھی وقت بیمار ہو سکتا ہے۔ عالیہ اپنے مریضوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔'' تھوڑے توقف کے بعد بولا، ''کسی چیز کی طلب ہو تو بتاؤ، پھر ہم سو جائیں گے۔''

مجھے کسی شئے کی طلب نہیں تھی۔ وہ بھی مس عالیہ کے پیچھے دوسرے کمرے میں گھس گیا تو میں میڈم کے پہلو میں بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دیدار کی عبادت کرنے لگا۔

دنیا دم بہ دم بدلتی ہے۔ زندگی ہر بدلتے ہوئے لمحے کے بل پر کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ وہ کتنی بااختیار اور دولت مند تھی۔ اس کی آنکھ کے اشارے پر بیسیوں لوگ مرنے کٹنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ کسی کی سانسوں کی ڈوری کو کاٹنے کا اس بے دردی سے حکم دیتی تھی کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے مگر اس سرد رات کے دامن میں وہ کتنی بے بسی سے پناہ گزیں تھی۔ وہ بوڑھی عورت اور بچے کی فون پر سنائی دینے والی آواز سے بندھی یہاں بھاگی چلی آئی تھی۔ اگر میں اتفاق سے اس کے پاس موجود نہ ہوتا تو بعید نہ ہوتا کہ وہ اکیلی ہی ادھر کا رُخ کر بیٹھتی اور عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رات کی سردی کا حصہ بن جاتی۔ میں اس کے ساتھ اس ویران اور خطرناک علاقے میں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ قدم قدم پر موت منہ کھولے ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھی۔ مراد بخش کے ڈنڈے نے میڈم شکیلہ کا تمام کروفر ریت میں ملا دیا تھا۔ اب وہ اپنے ہی بدن کی گرمی کے ہاتھوں چور ہو کر ایل ایچ وی عالیہ کے رحم و کرم پر پڑی تھی۔

اس کا چہرہ شانت تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور سانسیں معتدل تھیں۔ قیامت آ گئیں رات کی کوئی تحریر اس کے چہرے پر نقش نہیں تھی مگر میں جانتا تھا کہ اس خوب صورت اور دل افزا چہرے کی معصومیت محض دکھاوا تھی۔ باوجود کہ میں اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی بربریت کو دیکھ چکا تھا، مگر اس کے دل آویز بہروپ کا شکار ہو چکا تھا۔

سچ کہا جاتا ہے کہ عورت ایک پہیلی ہے۔ اسے سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ میرے سامنے لیٹی ہوئی بارسوخ عورت حسن پرست تھی۔ اسے زندگی کی طرف لوٹانے والی عالیہ بھی حسن کا شہکار تھی مگر اس نے جسے اپنا جیون ساتھی چنا تھا، وہ نہایت بدصورت اور پستہ قامت تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ماں باپ کے آمرانہ فیصلے کی بھینٹ چڑھی ہو۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں تھا کہ اس نے برضا و رغبت کوّے جیسی آواز اور صورت والے پرائمری ٹیچر کا انتخاب کیا ہو۔ وہ کالا کوا کہہ رہا تھا کہ عالیہ اپنے مریضوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ رات کو ڈبل فیس وصول کرتی ہے۔

دونوں کے بیانات میں تضاد تھا۔ اس غریب اور دور اُفتادہ علاقے میں چہار سو غربت برہنہ پا ناچتی تھی۔ یہاں کوئی سنگل فیس دینے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا، ڈبل فیس کیونکر بخوشی دیتا ہوگا۔ وہ اپنے آرام کے وقت میں خلل ڈالنے والے سے اپنے وقت کی دوگنی قیمت وصول کرتی تھی۔

کمرہ بند تھا مگر سردی کا احساس دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ میں خود کو میڈم شکیلہ کا شوہر ظاہر کر کے پھنس گیا تھا۔ اب نہ تو میں میڈم کے بستر میں گھس سکتا تھا اور نہ ہی دوسری رضائی اور چارپائی کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ کمرے میں گھڑی نہیں تھی۔ وقت کا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم نے کروٹ بدلی اور اس کے حلق سے 'آہ' کی مدھم سی آواز برآمد ہوئی۔ میں جلدی سے چارپائی پر سے اُتر کر قریب ہو گیا۔ پوچھا، ''میڈم! کیا بات ہے؟''

میری آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے مجھے گھورتی رہی، پھر شناسائی کا احساس پا کر ہولے سے بولی، ''ایسے کیوں جھکے کھڑے ہو؟''

میں نے بتایا، ''آپ کے منہ سے آہ نکلی تھی۔''

''ہاں!'' اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ بولی، ''میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ تھوڑا دبا دو۔''

میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے دبانے لگا۔ وہ بولی، ''صبح نہیں ہوئی؟''

''نہیں میڈم! ابھی تو کسی طرف سے اذان کی آواز بھی کانوں میں نہیں پڑی۔''

''ادھر بیٹھ جاؤ، لحاف میں، کم آن!'' اسے شاید غیر معمولی سردی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں تو وہ قدرے سخت لہجے میں بولی، ''کہا ناں..... ادھر آ جاؤ.....'' ساتھ ہی اُس نے تھوڑا پرے ہٹ کر میرے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور بولی، ''تم بہت اچھے ہو شہریار! آئی لو یو..... تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں یقیناً سردی میں کانپ کانپ کر مر چکی ہوتی۔ تھینکس آ لاٹ.....''

اسے شکریہ ادا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں اُس کا تنخواہ دار تھا۔ اس کے احکامات بجا لانے کا معاوضہ لے رہا تھا۔ میں نے احساسِ ممنونیت سے مغلوب ہو کر کہا، ''میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ آپ جو نتیجہ بھی اخذ کرنا چاہیں، کر سکتی ہیں۔''

میں نے جوتے اُتارے اور اس کے بالکل قریب ہو کر رضائی میں پاؤں ڈال کر، عقب میں بیڈ کے گول پائپ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا ماتھا سہلانے لگا۔ وہ اپنی گہری آنکھیں مجھ پر مرتکز کیے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ میں نے اس کا زخم بچاتے ہوئے سر کو دبایا تو اس نے

جھٹ کہا، ''نہیں..... ایسے نہیں؛ بالوں میں انگلیاں پھیرو۔ جانتے ہو؛ بالوں میں انگلیاں پھیرنے اور سر دبانے میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

میں نے بلاوجہ نفی میں سر ہلایا۔ وہ ایک ذرا مسکرائی اور آنکھوں کو تھوڑا سا میچ کر بولی، ''مریض کا سر دبایا جاتا ہے۔ محبوبہ کے بالوں میں انگلیاں پھیری جاتی ہیں۔ میں مریض نہیں بننا چاہتی کیونکہ مجھے ہمدردی کے اظہار سے بیزاری ہوتی ہے۔''

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ میری حیثیت کو پسِ پشت ڈال کر بڑی بات کہہ رہی تھی۔ میرے پیر اس کے بدن کو چھو رہے تھے۔ ایک ہی رضائی میں وہ ٹھوڑی تک جبکہ میں کمر تک دبکا ہوا تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرا دل گدگدانے لگا۔ اس کے بدن کی حرارت مجھ پر یورش کرنے لگی تھی۔ میں نے اپنی توجہ ہٹانے کی غرض سے کہا، ''میڈم! آپ کی طبیعت خاصی سنبھل گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔''

ایسے ہی وقت میں میرے کانوں میں دور کسی مسجد کے اسپیکرز سے پھوٹنے والی آواز پڑی۔ صبح ہو گئی تھی۔ تھکا دینے والی طویل اور خون منجمد کر دینے والی سرد رات رخصت ہونے کو تھی۔ میڈم میرے داہنے پہلو میں لیٹی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اور شاید جی ہی جی میں شب بھر کی ریاضت اور سود و زیاں کا شمار کر رہی تھی۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا اور میں نے اپنا سوال دہرا کر اسے کے انہماک کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک اُس نے طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور گویا ہوئی، ''شہریار! ہمیں ملتان جانا چاہیے یا پیرو ماچھی کے تعاقب میں نکلنا چاہیے؟''

میں نے کہا، ''آپ بہتر سمجھتی ہیں۔''

''تمہیں گاڑی کہاں سے ملی؟''

میں نے اُسے دھیمے لہجے میں پوری رپورٹ دی۔ وہ انہماک سے سنتی رہی پھر بولی، ''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس مردود سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ اس کے پاس بتانے کے لئے ایسا کچھ نہیں تھا جو ہمیں فائدہ دیتا۔ کم بخت اس وقت حملہ آور ہوا جب میں بالکل غیر محتاط تھی۔ پیرو کے ڈیرے کے بارے میں بتاؤ۔''

میں نے اُسے پیرو ماچھی کے ویران حال ڈیرے کے بارے میں بتایا۔ میرے خاموش ہونے پر ستائش بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا، ''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟''

''تم لمحہ بہ لمحہ اپنی پوزیشن بہتر کرتے جاتے ہو۔''

''میری قسمت میرا ساتھ دیتی ہے وگرنہ میں اتنا مضبوط نہیں ہوں۔''

اس نے بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بولی، 'یہ میں جانتی ہوں کہ تم کتنے مضبوط ہو۔' اس کی نظروں کی تاب بڑی جاندار تھی۔ اتنی کہ ایک پل میں انسان کسی نئے جہان کی سیر کر گزرتا تھا۔

''میں کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' وہ سوچتے ہوئے انداز میں بولی، ''میرا خیال ہے کہ ہمیں پیرو ماچھی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہیے اور اس کا تعاقب کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے دیر کی تو وہ چھپ جائے گا۔ یقیناً اس نے کسی اور کے لئے اماں اور سیمو کو اغوا کیا ہے اور انہیں فوری طور پر کہیں پہنچا دیا ہے۔ ہمیں پیرو ماچھی سے اُس کی خدمات حاصل کرنے والے شخص کا نام دریافت کرنا ہے۔'' وہ تھوڑے توقف کے بعد بولی، ''شہریار! یہ شروعات ہے۔ اصل معرکہ آگے ہے۔ ہم نے دونوں مغویوں کو بحفاظت بازیاب کرانا ہے۔''

میں نے ایک ذرا جھجک کر کہا، ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم ملتان لوٹ جاتے ہیں۔ آپ تندرست ہونے تک آرام کریں اور میں کسی کو ساتھ لے کر پیرو ماچھی کی گردن ناپنے نکل جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کے مطلوبہ افراد کو دشمنوں کے چنگل سے نکال لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''مجھے تم پر بھروسہ ہے مگر.....'' وہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔

''مگر کیا؟'' میں نے چونک کر کہا، ''شاید آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ میں اس معاملے کو اس سنجیدگی سے نہیں لوں گا، جس سنجیدگی سے آپ لیں گی تو یہ آپ کی غلطی ہو گی۔''

''نہیں شہریار! تم بہت اچھے ہو..... تم میرے دکھ کو اپنا دکھ سمجھو گے مگر میں چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ میرے بعد تم تک محدود رہے۔''

''ٹھیک ہے؛ میں اکیلا چلا جاؤں گا۔''

''نہیں..... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم یہاں سے پیرو ماچھی کے پیچھے جائیں گے۔ اس پر کوئی دو رائے نہیں ہیں۔'' اس نے نتیجہ خیز انداز میں حکم صادر کیا۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر لیا۔ اس کے بعد درمیان پھر طویل سوچ گیر خاموشی حائل ہو گئی۔ میں اس کے مخملیں بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا، اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ عجیب لڑکی تھی۔ پل میں ماشہ، پل میں تولہ..... کسی

لحظہ بہت سخت گیر اور ماورائی مخلوق دکھائی دینے لگتی تھی تو کسی پل بہت نرم، معصوم اور بچوں کی طرح شرارتی..... بظاہر نہایت آسان دکھائی دینے والی میڈم شکیلہ اپنے اندر اتھاہ گیرائیاں رکھتی تھی اور ذات کی بھول بھلیوں میں دیکھنے والے کو گم کر دیتی تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے شہر کے بیوروکریٹس اور نامی گرامی سیاست دان بے تاب رہتے تھے، وہ نہ صرف شب بھر میرے ساتھ رہی تھی بلکہ اس وقت بھی میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی اور اپنے حسنِ قیامت انگیز کا گداز لمس عنایت کر رہی تھی۔

بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا، ''میں بہت خوش بخت ہوں..... بہت زیادہ..... اتنا کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔''

میرا جملہ اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے مہمل تھا۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور پوچھا، ''کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

میں جھینپ گیا۔ اپنے خیالات میں بہکتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ وہ تاڑ گئی کہ مجھ سے بات بنائے سے نہیں بن رہی تھی تبھی مستفسر ہوئی، ''کیا سوچ رہے تھے؟''

ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے آنکھیں موند کر جواب دیا، ''میں آپ کے قرب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ میرا بضد ہو کر آپ کے ساتھ آنا آپ کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ اس لئے خود کو خوش بخت قرار دے رہا تھا۔''

بعض اظہار ایسے ہوتے ہیں جو مقابل کی آنکھوں سے اوجھل رہ کر کئے جاتے ہیں۔ اس نے بھی اپنی آنکھوں پر میرا ہاتھ رکھا اور کہا، ''شہریار! میں کتنی طاقت ور ہوں، تم نہیں جانتے۔ میرا اندر کتنا کمزور ہے، تم یہ بھی نہیں جانتے۔ تم سادہ فطرت دیہاتی انسان ہو۔ دیہاتوں کی فضائیں کیسی ہوتی ہیں، میں جانتی ہوں۔ دیکھنے میں بڑی فراخ، تازہ اور دہریت سے پاک مگر درحقیقت چھوٹی چھوٹی خوشیوں کیلئے انسان کو ترسانے والی..... میں نے برسوں قبل انہی فضاؤں میں جنم لیا تھا۔ جہاں میں اِس وقت پڑی ہوں، تم بھی، یہ علاقہ مجھ سے میرا بچپن اور لڑکپن چھیننے والا ہے۔ سنا تھا؛ وہ بڈھا مجھے چندو کہہ رہا تھا..... دیکھا تھا وہ مجھے کتنی نفرت کرتا تھا..... ہے نا؟ کتنی حیرت کی بات ہوگی تمہارے لئے کہ وہ میرا رشتہ دار نہیں؛ سگا نہیں۔ تم شاید اس کے رویے کو دیکھ کر اسے میرا باپ سمجھ رہے ہو..... نہیں..... وہ میرا باپ تو کجا، کچھ بھی نہیں لگتا مگر میں اُسے بابا کہتی ہیں۔ اس کی بیوی کو ماں اور اس کے بیٹے کو اپنا سگا بھائی سمجھتی ہوں۔

اسی لئے اس خاندان پر آنے والی مصیبت کو اپنے تن کی آگ سمجھ رہی ہوں۔''

میں اُسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اسپاٹ تھا اور آنکھوں پر میرا اور اس کا اپنا ہاتھ دھرا ہوا تھا۔ وہ عجیب عالمِ جذب میں بول رہی تھی، ''شہریار! یہ بڈھا جوانی میں مچھیرا ہوا کرتا تھا۔ دریا اور ڈھنڈ سے مچھلیاں پکڑ کر شجاع آباد میں بیچنے جایا کرتا تھا۔ تم نے کبھی سسی پنوں کی کہانی سنی ہے؟''

اس نے اچانک سوال داغا تو میں گڑبڑا کر بولا، ''جی میڈم! مگر سسی پنوں کے بارے میں آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''اس لئے کہ میں اسی سسی کی طرح دریا میں بہتی ہوئی دریا میں آئی تھی۔ بابا مجھے پانی سے اُٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ اس نے، اس کی بیوی اور بڑی بیٹی نے مجھے پالا پوسا۔ پڑھایا لکھایا۔ یہ بڈھا تب ادھیڑ عمر ہوا کرتا تھا۔ یہ مجھے کندھوں پر بٹھا کر بیٹ کے پرائمری سکول میں چھوڑ آیا کرتا تھا۔ تب میں اسے بہت پیاری ہوا کرتی تھی۔''

میں حیرت پاش نظروں سے میڈم کے نیم خوابیدہ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی بڑی بات کتنے عام سے انداز میں بتا رہی تھی۔ بولی، ''ہاں شہریار! دنیا ایسی ہی تو ہے۔ دینے پر آتی ہے تو اپنی رگوں سے خون نچوڑ کر حلق میں ٹپکا دیتی ہے۔ چھیننے پر آتی ہے تو سانسوں پر ہاتھ ڈالنے سے بھی نہیں چوکتی۔ اس بڈھے کا نام غلام محمد ہے جسے لوگوں نے بگاڑ کر گانموں بنا رکھا ہے۔ اس کی بیوی کا نام تاجاں ہے۔ بیٹے کا نام وسیم عرف سیمو ہے۔ اس کی بڑی بیٹی کا نام سرداراں ہے۔ وہ صرف نام کی سرداراں ہے ورنہ تو شاید کہیں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ رہی ہوگی۔ اس کوڑی کوڑی کو محتاج گھرانے نے محبت کے وہ خزانے مجھ پر لٹائے جن کے دہانے دولت والوں کی دنیا میں کہیں نہیں کھلتے۔''

وہ رک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ ایسے ہی وقت میں، جب اس نے بولنے کے لئے منہ کھولا تھا، ڈرائنگ روم کم کلینک کا اندرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میڈم نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے دروازے کی سمت دیکھا۔ صدیق دروازے میں کھڑا اشتیاق بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے متوجہ پا کر بولا، ''کیوں بھئی جوان! کیا تمہاری بیوی ٹھیک ہوگئی ہے؟''

میں نے میڈم کی طرف شرمسار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''ہاں! افاقہ لگتا ہے۔''

''تم لوگ ناشتہ کس چیز کے ساتھ کرتے ہو؟''

مجھے سمجھ نہ آئی کہ اس نے یہ بے موقع سوال کیوں کیا تھا، کہا، ''میں سمجھا نہیں!''

''میں دودھ اور دہی لینے کے لئے جا رہا ہوں۔ اگر تم ان کے علاوہ کچھ منگوانا چاہو تو بتا دو۔'' وہ بیرونی دروازے کی چٹخنی اُتارتے ہوئے بولا۔

میڈم نے جلدی سے کہا، ''آپ تکلف نہ کریں، ہم نکل رہے ہیں۔''

''کیا مس عالیہ کے جاگنے تک یہاں نہیں رہیں گے؟'' وہ استعجاب آمیز انداز میں بولا، ''بہتر ہے کہ چیک اَپ کروا کر جائیں۔''

میڈم خاموش ہوگئی۔ میں نے کالے کلوٹے اور فرماں بردار قسم کے شوہر صدیق کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے۔ ہم بس چائے پئیں گے۔''

وہ باہر چلا گیا۔ میڈم بولی، ''یہ مجھے تمہارا شوہر کیوں قرار دے رہا تھا؟''

میں نے کہا، ''وہ دراصل..... ان دونوں نے ہمیں میاں بیوی سمجھنے کی غلطی کی اور میں نے ان کی تصحیح کرنی مناسب نہیں سمجھی ورنہ وہ ہمیں مشکوک خیال کرتے ہوئے باہر سے ہی ٹرخا دیتے۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورا اور ایک دم دل آویز انداز میں مسکرانے لگی۔ بولی، ''کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں جوان اور خوب صورت ہیں۔ دیکھنے میں شاید نو بیاہتا میاں بیوی محسوس ہوتے ہوں گے۔ ہے ناں؟''

میرے پاس اس کے طفلانہ سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں نے یاد دلایا، ''آپ غلام محمد عرف گانموں کے بارے میں بتا رہی تھیں۔''

''ہاں! گانموں بڑا جفاکش انسان تھا۔ معذور ہونے سے قبل ایک من یعنی چالیس کلوگرام مچھلی کاندھے پر اُٹھا کر بیچنے کی غرض سے ہر صبح شہر جایا کرتا تھا۔ ایک کاندھے پر اس نے مجھے بٹھا رکھا ہوتا تھا۔ میرا اسکول راستے میں پڑتا تھا۔ واپسی پر مجھے سکول سے لے لیا کرتا تھا۔''

میں اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے لفظ لفظ کو سینت کر دماغ میں نقش کر رہا تھا کیونکہ وہ ان واقعات کے ابتدائی مدارج کا تذکرہ کر رہی تھی جن سے گزر کر وہ اس شان و شوکت بھری زندگی میں جلوہ افروز ہوئی تھی۔ ایک ذرا طنزیہ لہجے میں بولی، ''بابا نے میرا نام چاند ماہی رکھا تھا۔ ماہی مچھلی کو کہتے ہیں۔ مچھیرے کو مچھلی سے زیادہ کون سی چیز پیاری ہو سکتی ہے..... ہے ناں؟ پھر سب مجھے 'چندو' کہنے لگے۔ پانچویں کلاس کے بعد مجھے اس نے اپنے ساتھ گدھا ریڑھی پر شہر لے جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ مچھلی بیچنے کے بعد شہر میں ریڑھی پر مزدوری کرتا اور جب مجھے سکول

سے چھٹی ہوتی تو لینے کے لئے پہنچ جاتا۔ ہم دونوں ریڑھی پر بیٹھ کر گھر لوٹ آتے۔ یہ ہماری زندگی کے سنہرے دن تھے کیونکہ ان دنوں گھر میں بابا کی دوہری مزدوری کی وجہ سے پیسے کی ریل پیل تھی۔ اور پھر.....''

اس کی مدھم لہجے میں رواں دواں زبان کو بریک لگ گئے کیونکہ ہم دونوں کو بیک وقت دروازے میں کھڑی انگڑائی لیتی مس عالیہ دکھائی دے گئی تھی۔ اس نے شاید ایک آدھ جملہ سن بھی لیا تھا۔ جماہیاں لیتی ہوئے بیڈ کے پاس آ کر رُک گئی۔ بولی، ''آپ کی طبیعت کیسی ہے اَب؟''

اس نے میڈم کو مخاطب کیا تھا۔ میڈم نے ہی جواب دیا، ''میرے سر میں نبض کے ساتھ ساتھ دھمک پڑ رہی ہے۔ بخار اُتر گیا ہے مگر جسم دکھ رہا ہے۔''

عالیہ نے اس کی نبض چیک کی۔ پھر سر کا زخم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بیڈ سے اُتر کر کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا اور وہ پیشہ ورانہ انداز میں اس کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔ میں سر کے زخم کا عذاب بھگت چکا تھا۔ باجود اس کے کہ اس کے زخم کی نوعیت خطرناک نہیں تھی، درد سے بے حال ہو گئی تھی۔ محض جلد پھٹی تھی۔ ممکن تھا کہ کھوپڑی کی ہڈی تک بھی ضرب کا اثر پہنچا ہو مگر ٹانکے لگانے یا گاز رکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مس عالیہ کی چھیڑ چھاڑ سے اس کے لبوں سے سسکیاں برآمد ہو رہی تھیں۔ میں نے بیرونی دروازہ کھول کر دیکھا۔ صبح ہو چکی تھی اور دیہاتی زندگی اپنے معمول کے مطابق ہڑبڑا کر نہ صرف بیدار ہو چکی تھی بلکہ متحرک ہو چکی تھی۔ برآمدے سے کچھ فاصلے پر اینٹوں کے سالخوردہ سولنگ پر کھڑی ہوئی گاڑی کا کیچڑ سے برا حال ہو چکا تھا اور اس کی تاب و تمکنت رخصت ہو چکی تھی۔ ہسپتال کی چار دیواری کے باہر سے گزرتی ہوئی پکی سڑک پر گوالوں کی سائیکلیں، موٹر سائیکلیں اور ریڑھیاں رواں دواں تھیں۔ سلاخوں والے گیٹ کے عین سامنے کریانے کی ایک دکان کھل چکی تھی اور ایک دیہاتی عورت اور چند بچے شاپنگ میں مشغول تھے۔ صدیق بھی اسی دکان پر کھڑا تھا۔ دکان سے ملحقہ بڑا سا کمرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے آٹا پیسنے والی چکی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی چھت پر عمودی حالت میں دو تین فٹ لمبا سیاہ پائپ نظر آ رہا تھا جو چکی کے پیٹرانجن کا سائلنسر تھا۔

ہمسایہ کوارٹر میں، جہاں لائن مین اور اس کی فیملی رہائش پذیر تھی، برتنوں کی کھنکار سنائی دے رہی تھی۔ لائن مین کی بیوی اپنے سرتاج کو کھلا پلا کر گھر سے رخصت کرنے میں مشغول تھی۔ اطراف کا یک نظری جائزے نے ہی یہ باور کر دیا کہ یہ جگہ رہائش کے لئے نہایت موزوں

تھی۔ بے بہا قدرتی حسن جلوہ افروز تھا۔ گھنیرے درخت، ہسپتال کے گراسی پلاٹوں میں پھول بردار پودے، چہار اطراف فصلوں کی ہریالی اور بلند قامت درختوں میں گھرے دیہاتی بود وباش والے مکانات..... دیہاتوں کے سرکاری ہسپتالوں میں رہائش پذیر ہونا بڑا خوش آئند ہوتا ہے مگر نہیں معلوم کیوں ڈاکٹر اور ہسپتالوں کا عملہ یہاں رہنے سے گریزاں ہوتا ہے۔ شاید انسانوں کے جنگل میں رہنے کو ان ویرانوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ نور پور کا سرکاری ہسپتال بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ وہاں بھی غیر معمولی ہریالی دل کو اپنی جانب کھینچتی تھی مگر ڈاکٹر منور علی شاہ کے علاوہ کوئی بھی ڈاکٹر وہاں قیام پذیر نہیں ہوا تھا۔ اب جبکہ اس نے اپنا تبادلہ کسی اور ضلع میں کرالیا تھا، ہسپتال کی بڑی سی ڈاکٹر والی کوٹھی بھائیں بھائیں کر رہی ہوگی اور مریض اپنے مسیحا کی جھلک دیکھنے کو ترستے ہوں گے۔ ڈاکٹر منور علی شاہ کہا کرتا تھا کہ وہ جہاں بھی جائے گا، ایسی ہی کوٹھی اور ہسپتال اس کا منتظر ہوگا مگر نور پور کے لوگوں کے آنے والا ڈاکٹر ان چیزوں میں دلچسپی نہیں رکھتا ہوگا۔ اس نے بجا کہا تھا۔ وہ جہاں پہنچا ہوگا، اس نے اپنی دنیا بسالی ہوگی۔ اسے شہر یار اور خالد عرف کھالا جیسے بے غرض دوست مل گئے ہوں گے۔ اس سے سر پھوڑنے والے نئے سیاسی پتھر اس کی راہوں میں ایستادہ ہو گئے ہوں گے جن سے وہ اپنی فطری بے باکی اور لاپروائی سے نبرد آزما ہو چکا ہوگا۔

سورج نکلتے ہی ایک خاکروب نے ہسپتال کے سولنگ پر بڑا سا جھاڑو مارنا شروع کر دیا تھا۔ مرکزی عمارت کا دروازہ کھول کر اس نے فرش بھی صاف کر دیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے چند عورتیں اپنے بچوں کے ہمراہ ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوئیں اور مشینی انداز میں چلتی ہوئی ہسپتال اور رہائشی کوارٹروں کے تقریباً درمیان میں درختوں تلے رکھے ہوئے چوبی بنچوں پر بیٹھ گئیں۔ وہ اس ہسپتال کی معمول کی مریضائیں تھیں جو پہلے نمبروں پر چیک اَپ کے ارادے سے تڑکے ہی یہاں چلی آئی تھیں۔ شاید وہ دن بچوں کی ویکسی نیشن کے لئے مختص ہو گا۔ اس مخصوص دن میں سرکاری ہسپتال میں حفاظتی ٹیکے لگوانے والوں کا غیر معمولی ہجوم دیکھنے کو ملتا ہے۔

میرے عقب میں میڈم اور مس عالیہ محوِ کلام تھیں۔ میں ان کے مابین ہونے والی گفتگو سے بے نیاز ماحول کا مشاہدہ کرنے میں مصروف تھا اور بغیر کسی وجہ کے اس ہسپتال کا نور پور کے ہسپتال سے موازنہ کرنے میں محو تھا۔ اسی بہانے اپنے گاؤں کو یاد کر رہا تھا جس سے میرا ناتا

ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے بچپن سے رشتہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ آئندہ میں کبھی وہاں جاؤں گا، کبھی نہیں جاؤں گا، یہ طے نہیں کرسکتا تھا۔ میرے لئے یہی خوش آئند بات تھی کہ میرا یار کھالا نور پور پہنچ گیا تھا۔ اس کے خلوص پر مجھے کبھی شک نہیں رہا تھا۔ وہ میری عدم موجودگی میں میری پھوپھی اور غزالہ کا خیال رکھ سکتا تھا۔ ان کو کسی غیر متوقع مصیبت سے بچا سکتا تھا۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے گا تو وہ مجھے مطلع کردے گا۔

اس ہسپتال کی مخصوص ساخت کی عمارت نے میرے دکھتے ہوئے زخموں کو کرید دیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر شاہ جی، اپنا گاؤں، گاؤں میں رہنے والا خوش وخرم اپنا خاندان یاد آ گیا تھا۔ چاچا چراغ، چاچی، ماں اور باپ..... میں نے چند ہی لمحوں میں ان تمام لوگوں کو یکے بعد دیگرے چشمِ تصور میں سجایا جن کی یادیں میری زندگی کا سرمایہ تھیں۔ مجھے ملکہ، صدف بی بی اور بخت خان کے ساتھ ساتھ مراد بخش دیوانے کی یاد نے بے چین کیا۔ مجھے غزالہ کے ساتھ ساتھ چنچل سی خالدہ عرف بلو کی تصوراتی شبیہوں نے بے چین کیا۔ میری دھڑکنیں ماسٹر جی اور زیناں کی یاد کے ساتھ ایک مرتبہ غیر معتدل ہوئیں۔ بھرا پُرا نور پور اُجڑ گیا تھا۔ کم بخت سائیں دل جیت شاہ کی غیرت پاش حرکت نے ساری رونقیں پامال کردی تھیں۔ میں کتنی عسرت اور بے بسی سے اپنے خاندان کے تین زندہ چراغوں کو بغل میں دبا کر نور پور سے نکلا تھا اور ملتان میں پناہ گزین ہوا تھا۔ اگر مجھے میڈم شکیلہ کے دستِ راست میر وشاہ کی صورت میں غیبی امداد میسر نہ آتی تو میں شاید سر چھپانے کی جگہ بھی حاصل نہ کرسکتا اور دنیا کی ٹھوکروں کی زد میں نیست ونابود ہو چکا ہوتا۔

اس کے باوجود کہ مجھے پروین کے اغوا کے بعد سے اَب تک اس کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی اور نہ ہی کوئی مضبوط کلیو ملا تھا، میرے والدین کے قاتل دنیا میں دندناتے پھرتے تھے، میرے چاچا اور چاچی کے قاتلوں کو اسلحے سے لیس کر کے روانہ کرنے والا سردار حیدر خان اپنی مونچھوں کو بل دیتا پھرتا تھا، میں قدرے پرسکون تھا۔ شاید یہ فرزانہ، شبانہ اور موجو کی زندہ و سلامت موجودگی کے احساس کے باعث تھا یا میڈم شکیلہ کے فرحت آگیں قرب کا اعجاز تھا، میں اتنا بے کل اور پریشان نہیں رہا تھا جتنا تباہی کے اولین دورانیے میں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میں نے زندگی کے قاعدوں اور اصولوں سے مفاہمت کرلی تھی اور مجھ میں انتظار اور برداشت کی سکت پیدا ہوگئی تھی۔

صدیق ناشتے کے لوازمات سے لدا پھندا میرے قریب سے گزر کر کوارٹر کے اندر چلا گیا

تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس نے پکارا۔ وہ مجھے ناشتہ کرنے کے لئے بلا رہا تھا۔ میں میڈم کے پاس آ گیا۔ صدیق نے بیڈ پر ہی بڑی سی اسٹیل کی ٹرے رکھ چھوڑی تھی جس میں پراٹھے، دہی اور انڈوں کے آملیٹ رکھے ہوئے تھے۔ میڈم بولی، ''تم لوگوں نے تکلف کیا ہے۔''

صدیق کا لہجہ مؤدبانہ تھا، ''نہیں جی! آپ کو قدرت نے مصیبت میں ہمارے پاس پہنچایا ہے مگر ہم نے آپ کو اپنا مہمان سمجھا ہے۔''

صدیق کے رویے میں اس قدر جاگزیں ہونے والا تغیر میرے لئے باعثِ حیرت تھا۔ ہم ابھی ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ مس عالیہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے آ گئی۔ اس نے ٹرے بیڈ پر رکھی اور خود ایک اسٹول گھسیٹ کر میڈم کے قریب بیٹھ گئی۔ بولی، ''آپ تکلف کریں گی تو مجھے دکھ ہوگا۔''

وہ بہت نرم خو عورت تھی۔ ہمارے ساتھ اس کا برتاؤ شروع سے ہی محبت آمیز تھا مگر مجھے اس کے لہجے میں خوشامد کی آمیزش کھٹکی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میڈم نے اُسے اپنی امارت اور شخصیت کے رعب میں مبتلا کر دیا تھا۔ حالات کیسے بھی ہوں، نئے ماڈل کی لینڈ کروزر میں ہسپتال لائی جانے والی، قیمتی اور جدید وضع کے سوٹ میں ملبوس میڈم شکیلہ اپنی وجاہت اور خوبروئی میں بھی یکتا تھی۔ دیکھنے والا اس کی شخصیت کے دبدبے میں آ جاتا تھا۔ مس عالیہ بینا تھی، دانا تھی، جان گئی تھی کہ وہ کوئی معمولی حیثیت کی عورت نہیں ہے۔ تبھی اس کا لہجہ مزید نرم اور شائستہ ہو گیا تھا۔

میڈم شکیلہ نے چائے کا کپ اُٹھاتے ہوئے پوچھا، ''عالیہ! کیا تم نے لو میرج کی ہے؟''

عالیہ اس غیر متوقع سوال پر ٹھٹکی، پھر شرما کر صدیق کی طرف دیکھنے لگی جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا، بولی، ''جی! ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔''

میڈم کے ساتھ ساتھ میں بھی بری طرح چونکا۔ مجھے مس عالیہ کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔ صدیق حور کے پہلو میں لنگور جیسا لگتا تھا۔ وہ جتنی خوب صورت اور نرم و نازک عورت تھی، صدیق اتنا ہی بدصورت، کالا اور کھردرے نین ونقوش والا مرد تھا۔ دونوں کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ میڈم نے ایک نظر صدیق کو دیکھا، پھر اپنی حیرت کو دباتے ہوئے بولی، ''تم دونوں کے خاندانوں نے تمہاری اس دلیری کو برداشت کر لیا؟''

عالیہ بولی، ''صدیق کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ میرے گھر والوں نے قبول نہ کیا اور مجھ پر

دروازے بند کر دیے۔ پانچ سالوں سے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی شکل نہیں دیکھی۔ جانے وہ کس حال میں ہیں۔'' عالیہ کی آواز مرتعش ہوگئی۔ گہرے دکھ کی دبیز نمی اس کے حلق میں اُتر آئی، بولی، ''سبھی نے صدیق کی شکل دیکھی۔ سبھی نے اس کا فیملی بیک گراؤنڈ دیکھا مگر کسی نے بھی اس کے اندر کی اجلی اور شفاف دنیا کو ایک نظر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اگر میں نے اپنے جیون ساتھی کے طور پر اسے پسند کر ہی لیا تو کیا قیامت آ گئی..... کیا دنیا میں صورت و شکل ہی سب کچھ ہوتی ہے؟ کیوں مجھے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ میں نے ایک کالے کلوٹے شخص کو اپنا شریکِ حیات منتخب کر کے بہت بڑی حماقت کی ہے؟..... نہیں..... آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کی نہیں، اس سارے زمانے کی بات کر رہی ہوں۔ ان مردوں اور عورتوں کو کوس رہی ہوں جو ہمیں دیکھتے ہیں طنزیہ انداز میں مسکرانے لگتے ہیں۔''

وہ روہانسی ہوگئی۔ صدیق نے موقع غنیمت جانا اور اس کے کاندھے پر تھپکی دے کر باہر چلا گیا۔ میڈم نے عالیہ کا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے بولی، ''عالیہ! میرا پوچھنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ تم نے اپنے دل کا کہنا مانا، بڑی بات ہے۔ لوگوں کا تعجب اپنی جگہ بجا ہے، دل میلا نہ کیا کرو۔''

وہ بولی، ''آپ دونوں بھی میاں بیوی ہیں۔ دونوں بلاشبہ ایک دوسرے سے بڑھ کر خوب صورت ہیں مگر کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جونہی رات کو بیڈ روم کی بتی بجھ جاتی ہے، تمام رنگ و روپ دھندلا جاتے ہیں۔ کالے گورے اندھیرے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میں نے دنیا کو ناراض کیا۔ شاید اللہ کو بھی ناراض کر دیا ہے۔ پانچ سال ہو گئے، اس نے میری گود بھری نہیں۔ میرے پاس ہر دوسرے روز کوئی نہ کوئی عورت آتی ہے اور بچہ جن کر لے جاتی ہے۔ میں دیکھتی رہتی ہوں۔ سب کی مدد کرتی ہوں مگر میرے دکھ کا درماں کوئی نہیں کرتا۔ اللہ بھی نہیں..... وہ لوگوں کو دس دس بچے دیتا ہے، مجھے ایک بچہ دینے سے ہچکچاتا ہے۔ پانچ سال..... بڑا عرصہ ہے بیگم صاحبہ! اب تو زندگی ویران لگنے لگی ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ آپ میرے لئے دعا کریں۔ شاید آپ کی دعا رنگ لائے اور میرا سوہنا رب مجھ پر راضی ہو جائے۔''

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز بھرا گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میڈم کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ اس کی حالتِ زار دیکھ کر میڈم کے منہ سے ہمدردی کا ایک کلمہ بھی برآمد نہیں ہو سکا۔ بدقت تمام بولی، ''تم دونوں اپنا چیک اَپ کراؤ۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی معمولی رکاوٹ حائل ہو۔''

عالیہ نے اپنا سر گھٹنوں پر ڈال دیا۔ سسکتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی، ''الماری بھری پڑی ہے

مختلف ہسپتالوں کی رپورٹوں سے۔ رپورٹیں کہتی ہیں کہ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں۔ کسی اللہ والے کی راہ دکھاتے ہیں۔ سمجھاتے ہیں کہ مایوس نہ ہو، اللہ کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ اللہ والے کی تلاش میں نکلی تو مجھ بختوں جلی کو ہر جگہ پر بھیڑیے جیسی آنکھوں والے پیر فقیر ملے۔ کوئی ایسا نہیں ملا جو بدن کو للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھے بغیر دل کی دنیا آباد کرتا ہو۔ ہائے بیگم صاحبہ! ہر کوئی کہتا ہے کہ میں نے ماں باپ کی بات نہ مان کر ان کا دل دکھایا ہے۔ ان کی نافرمانی کا ارتکاب کیا ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کو دکھ دیا ہے۔ ان کی بددعائیں میرا سہاگ چاٹنے لگی ہیں۔'' وہ اب ہچکیاں لینے لگی تھی اور اس کی آواز بھی ٹوٹنے لگی تھی، کہہ رہی تھی، ''بیگم صاحبہ! میں پچھلے ماہ میکے گئی تھی۔ ماں اور باپ کے پیروں میں سر رکھ کر روئی تھی اور ان سے معافی مانگی تھی۔ باپ نے منہ پھیر لیا۔ ماں نے چہرہ چھپا لیا۔ ایک بھائی ملا تھا۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو اس نے سنگدلی سے کہہ دیا کہ آئندہ یہاں نہ آیا کرو؛ ہم اگر ان جوتوں کو بھول گئے جو لوگوں نے بہن کے منہ کالا کر جانے پر ہمیں مارے تھے تو ہم تمہارے لئے دعا کر دیں گے۔ بہنوں کو زبردستی سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئی مگر ان کی آنکھوں سے ایک قطرہ تک نہیں چھلکا۔''

میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میڈم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے میڈم کو امید طلب نظروں سے دیکھا اور کہا، ''آپ اِسے چپ کرائیں ناں!''

اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بولی، ''میرے پاس اسے دینے کے لئے ایک بھی تقویت بھرا لفظ نہیں ہے؛ کیا دوں؟''

میں ہمت کر کے اُٹھا۔ اسٹول پر گھٹنوں میں سر ڈال کر ٹوٹ کر روتی ہوئی مس عالیہ کے بالوں میں چھپے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر سر اُٹھایا اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ 'کیا بات ہے؟'..... میں نے ہمدردی آمیز انداز میں کہا، ''مس عالیہ! غم نہ کرو۔ ابھی تمہاری شادی کو محض پانچ سال ہوئے ہیں۔ خدا جب راضی ہوتا ہے تو سارے گلے شکوے دور کر دیتا ہے۔ رہی بات ماں باپ کی ناراضی کی؛ تو وہ بھی ایک نہ ایک دن مہربان ہو جائیں گے اور تمہیں گلے سے لگا لیں گے۔ تم مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ میں تمہیں بھائی کا پیار دوں گا۔ تمہیں بھائی کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔ میڈم صاحبہ کو تم اپنی بہن سمجھو۔ وِی لو یو..... وِی کیئر اباؤٹ یو.....''

اس کی آنکھوں میں موہوم سی چمک پیدا ہوئی۔ کھڑی ہوگئی اور اپنی مخروطی انگلیوں سے زیرِ چشم جلد کو پونچھتے ہوئے بولی، ''کسی عورت کو بہن کہنا بہت آسان ہے مگر نبھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیا آپ یہ سوچ کر کہہ رہے ہیں؟''

میڈم بولی، ''ہاں..... یہ بھی اور میں بھی.....''

اس نے ایک نظر میڈم کو دیکھا پھر مجھے؛ اور ایک جھٹکے سے بڑھی اور مجھ سے دیوانہ وار چمٹ گئی۔ ایسے میں وہ کچھ کہہ بھی رہی تھی مگر مجھے اس کی بے ربط باتوں کی سرے سے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنا والا ایک لفظ 'بھائی' اس کے من میں پیدا ہونے والی ہلچل کو عیاں کرنے کے لئے کافی تھا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا۔ وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر میڈم کی طرف گئی۔ میڈم نے اُسے اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ سینے سے پھسل کر جھولی میں گر گئی اور رونے لگی۔ میڈم نے اس کی پیٹھ تھپکی، بالوں کو سہلایا اور بولی، ''تم نے ڈاکٹر بن کر ڈبل فیس مانگی تھی۔ میں بہن بن کر دس گنا فیس دے کر جاؤں گی۔ بتاؤ، تمہاری فیس کتنی ہے۔''

اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا، بولی، ''نہیں بیگم صاحبہ! میری کوئی فیس نہیں ہے۔ وہ تو میں نے ایسے ہی کہا تھا۔''

میڈم مسکرائی۔ وہ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی غم واندوہ کی دھند کو ایک لمحے میں ہٹانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ مس عالیہ نے سر اُٹھایا، بولی، ''مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت امیر اور بڑے گھر کے لوگ ہیں۔ میں بہت کمزور اور چھوٹی ہوں۔ اتنی کہ محض چند روپوں کی نوکری پر اترانے لگتی ہوں۔ آپ بڑی ہیں۔ کروڑوں پتی ہو کر بھی خاموش رہتی ہیں۔ میں اس وقت بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ آپ میری مدد کریں۔''

نہ صرف اس کے آنسو تھم گئے تھے بلکہ وہ پوری طرح سنبھل گئی تھی۔ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جھٹ میں خوش؛ پل بھر میں ناخوش..... ان کی دنیا خوشی اور غمی کے جذبوں پر گھومتی رہتی ہے۔ بے تحاشا رونے والی تسلی اور دلاسے کے چند جملوں پر مطمئن ہوگئی تھی۔

میڈم نے پُر یقین لہجے میں کہا، ''ہاں بولو! مجھ سے جو بھی ہو سکا، تمہارے لئے کروں گی۔ کیا نوکری کے معاملے میں کوئی پرابلم ہے؟''

وہ بولی، ''نہیں..... میں نوکری کو نوکری سمجھ کر کرتی ہوں اور میرا میڈیکل آفیسر بھی بہت شریف انسان ہے۔ وہ افسروں کو خود ہی مطمئن کر دیتا ہے اور مجھ تک کسی کو پہنچنے نہیں دیتا۔''

''پھر؟'' میڈم نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا، ''پھر ایسی کیا مشکل ہے جس میں تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا پیسے چاہئیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بیڈ سے اُتر کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس نے صدیق کو آواز دی اور بہت دھیمی آواز میں اس سے کوئی بات کی۔ پلٹ کر آئی اور بولی، ''صدیق نے آج سکول سے چھٹی کی ہے۔ میں نے اُسے باہر رکنے اور کسی کو ادھر نہ آنے کا کہا ہے۔ بات ہی کچھ ایسی ہے بیگم صاحبہ! جس کے لئے رازداری بہت ضروری ہے۔''

میں اس کے جملے اور چہرے پر ثبت ہونے والی گھمبیرتا کو دیکھ کر چونک گیا۔ حزن وملال کی جگہ عجیب سی سنجیدگی اور کشمکش اُس کے چہرے پر تحریر ہوگئی تھی۔ میڈم نے کہا، ''اب جبکہ میں نے تمہیں اپنی بہن بنالیا ہے، تم مجھے بیگم صاحبہ کہہ کر مت پکارو۔''

اس نے ممنون انداز میں سر ہلایا اور دونوں دروازے بند کر کے اسٹول میڈم کے بہت قریب کھینچ کر بیٹھ گئی اور بولی، ''بیگم صاحبہ.....''

''کہاناں کہ مجھے بیگم صاحبہ مت کہو۔'' میڈم نے پیار سے ڈانٹا، ''تم مجھے 'باجی' کہہ سکتی ہو۔ میرا نام شکیلہ ہے؛ یعنی تمہارے لئے باجی شکیلہ۔ کوئی بھی عورت عمر میں بڑی کہلانا پسند نہیں کرتی۔ میں عمر میں تجھ سے چھوٹی ہونے کے باوجود تمہاری بڑی بہن بننے کو تیار ہوں۔''

مجھے اس گھڑی میڈم شکیلہ بہت بھلی لگی۔ وہ کسی نہ کسی انداز میں اپنی برتری ثابت کر لیتی تھی۔ مس عالیہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگئی۔ شاید اس کا دماغ گومگو کی کیفیت میں تھا کہ بولے یا نہ بولے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جی ہی جی میں یہ تعین کر رہی ہو کہ وہ میڈم شکیلہ نامی اجنبی خاتون پر اعتماد کر سکتی ہے مبادا کہ یہ بھروسہ کسی اتھاہ گہرائی میں دھکیل دے جہاں سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ میڈم کے انکار کا بھی اندیشہ تھا۔ ہر انکار اذیت انگیز ہوتا ہے۔

''میں ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔'' کچھ دیر بعد مس عالیہ نے سر اُٹھایا اور فیصلہ کن انداز اختیار کیا، ''میرا شوہر آپ کی بڑی سی جیپ دیکھ کر ڈر گیا تھا کیونکہ ایسی گاڑیاں یہاں وڈیروں اور بڑے سیاست دانوں کے پاس ہوتی ہیں۔ کوئی بڑا جب ہم چھوٹوں کی دہلیز پر آتا ہے تو خیر نہیں ہوتی۔ پھر جب ہمسائے لائن مین نے بتایا کہ گاڑی میں ایک مریض ہے تو ہماری ہمت بندھی۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ ہم میاں بیوی کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ جس کا کوئی نہ ہو، اس کا ہر کوئی دشمن ہوتا ہے اور بات بے بات اُس پر چڑھ دوڑتا ہے۔ میرے

ساتھ ایسا نہیں ہوا مگر ہونے والا ہے۔ اَب یا کچھ دیر بعد یا پھر کچھ دنوں بعد..... مجھ سے ایک جرم سرزد ہو گیا ہے۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے یقیناً کوئی بہت بڑی بات اَب تک چھپا رکھی تھی جو اُسے نہ صرف بے چین کر رہی تھی بلکہ اندر ہی اندر اُسے کاٹ رہی تھی۔ مجھے یہ حیرت بھی ہوئی کہ بظاہر بہت مطمئن اور آسودہ دکھائی دینے والی عالیہ کسی بہت بڑے حادثے یا واقعے سے نبرد آزما تھی۔

میں نے جلدی سے کہا، ''تم غیر ضروری تمہید کو چھوڑ کر اپنی پریشانی کا تذکرہ کرو۔ اگر ہم کوئی مدد کر سکے تو ضرور کریں گے۔''

عورتیں عمومی طور پر باتونی ہوتی ہیں۔ مستزاد یہ تھا کہ اس کا واسطہ تمام دن مریض عورتوں سے پڑتا تھا۔ تبھی میں نے اُسے ٹوکنا مناسب سمجھا تا کہ ہمارا وقت بچ جائے۔ وہ ایک نگاہِ شکایت مجھ پر ڈال کر بولی، ''وہی تو بتانے لگی ہوں۔ یہاں سے چار پانچ کلومیٹر دور دریا کے کنارے پر ایک بستی سومن واقع ہے۔ دریائی بستیوں کی طرح یہ بھی کچے پکے مکانوں اور اونچی نیچی ڈھلانوں پر مشتمل ہے۔ وہاں ایک شخص سجن خان رہتا تھا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی بارہ ایکڑ کی وراثتی زمین میں اسے نصف حصہ چھ ایکڑ ملا۔ چھوٹا بھائی نوروز خان اوباش فطرت انسان تھا۔ اس نے باپ کے مرنے کے بعد اپنی جائیداد اللوں تللوں کی نذر کر دی اور علاقے بھر کے لئے وبالِ جان بن گیا مگر اس نے بڑے بھائی کے خوف سے اُس کے لئے زندگی میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی۔ چھ ایکڑ اراضی کافی نہیں ہوتی۔ سجن خان نے محنت مزدوریاں کیں، بہت پر مارے اور بالآخر اپنی بیوی کو لے کر کینیڈا سدھار گیا جہاں اس نے عروج دیکھا۔ بہت دولت کمائی۔ اس نے اپنے بھائی کو بھی دولت سے نہلا دیا مگر وہ عیاش روی کے سبب بغیر کسی محنت کے ہاتھ لگنے والی دولت کو دونوں ہاتھوں لٹاتا رہا۔''

وہ اپنی پریشانی کو آشکار کرنے کے لئے تفصیل سے کہانی سنا رہی تھی۔ اس کے شوہر نے ہمیں بہترین تخلیہ فراہم کر دیا تھا اور کسی نے بھی دخل نہیں دیا تھا۔ مس عالیہ کی زباں پھر رواں ہو گئی۔ اس کی سنائی ہوئی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔

''باجی! نوروز خان نے ایک اچھا کام کیا۔ اس نے بڑے بھائی کی بھیجی ہوئی رقم کو ہمیشہ ایمانداری سے دو حصوں میں بانٹا اور آدھی رقم سے بھائی کے نام پر رقبہ خرید کیا۔ یوں آج سے سال بھر پہلے سجن خان کے نام بستی میں بیالیس ایکڑ اراضی منتقل ہو گئی جبکہ نوروز خان اپنے لئے

فقط اپنی بچی ہوئی چھ ایکڑ اراضی ہی واگزار کرا سکا۔ سجن خان کینیڈا میں مقیم رہا۔ اس کی ایک بیٹی اور بیٹا وہیں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دو چار سالوں بعد سومن آتے اور چند دن بستی میں گزار کر واپس چلے جاتے۔ یہ سلسلہ گزشتہ ماہ تک چلتا رہا۔

نوروز خان کی فیملی کو بیٹھے بٹھائے ہزاروں ڈالر ملتے رہتے تھے اس لئے وہ اپنے چچا اور اس کے خاندان کو آنکھوں پر بٹھاتے اور روتی ہوئی آنکھوں سے الوداع کہتے۔ یہ پیار بھری کہانی شاید کسی اچھے انجام تک پہنچ جاتی مگر قسمت کے ایک وار نے ساری بساط ہی الٹ کر رکھ دی۔ نگینہ اور سلامت خان پچھلے مہینے کی تیرہ تاریخ کو پاکستان آئے اور نوروز خان اپنے دونوں بیٹوں سمیت بھتیجی اور بھتیجے کو لاہور ائرپورٹ سے سیدھا اپنے گھر لے آئے۔ ہر بار ایسے ہی ہوتا تھا۔ دونوں بہن بھائی خوش خوش اپنے چچا اور عم زادوں کے ہمراہ سومن میں آئے اور حسبِ سابق ناز برداریوں میں اپنی آبائی بستی کی کھلی فضاؤں میں کھیلنے کودنے لگے۔ یہاں انہیں پیار ہی پیار ملتا تھا جس کی وجہ سے وہ دو تین سالوں بعد یہاں کھنچے چلے آتے تھے ورنہ ان کے لئے یہ جائیداد کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

قسمت نے اپنا کھیل کھیلا اور اس ماہ کی تین تاریخ کو سجن خان اور اس کی اہلیہ کینیڈا میں ایک روڈ ایکسیڈنٹ کی نذر ہو گئے۔ جونہی ان دونوں کی ناگہانی موت کی اطلاع بستی سومن پہنچی، ایک کہرام مچ گیا۔ دونوں بہن بھائی خبر سنتے ہی کینیڈا جانا چاہتے تھے مگر نوروز خان کے خاندان نے انہیں پیار کی زنجیروں میں باندھ دیا اور کینیڈا نہ جانے دیا۔ پھر نگینہ اور سلامت خان کے والدین کے تابوت بستی پہنچ گئے۔

ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کے بعد جونہی دونوں بہن بھائیوں نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا، نوروز خان اور اس کے دونوں بیٹے ان کی راہ میں حائل ہو گئے۔ ان کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ ان کی جوان بیٹی کینیڈا کے اخلاق سوز ماحول میں رہے۔ پہلے اور بات تھی۔ اَب اور بات تھی۔ نگینہ اور سلامت خان جب واپسی پر بضد ہوئے تو نوروز خان کے خاندان نے آنکھیں پھیر لیں اور درشت رویہ اپنا لیا۔ وہ کسی بھی قیمت پر دونوں کو کینیڈا روانہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بات بڑھتے بڑھتے لڑائی جھگڑے تک پہنچی۔ پیروں تلے ہتھیلیاں بچھانے والوں کے جھوٹے رنگ اُتر گئے اور نوروز خان کے خاندان کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ گئی۔

ایک رات، آج سے پانچ دن قبل، نوروز خان کے دونوں بیٹوں نے سلامت خان کو قتل کر

دیا۔ نگینہ نے بھائی کو قتل ہوتے دیکھا تو مارے خوف اور رنج کے بے ہوش ہوگئی۔ ہوش میں آئی تو اسے پتہ چلا کہ اس کے چچا نے گھر میں ڈاکوؤں کی آمد کی کہانی سنا کر قانون کو مطمئن کر دیا تھا۔ اپنی کہانی پر نوٹوں کی تصدیق بھی چپکا دی تھی تبھی ناحق بہنے والے خون کی پکار گلیوں میں چکراتی رہ گئی اور سلامت خان منوں مٹی تلے دب گیا۔

نگینہ کی دنیا اُجڑ گئی تھی۔ ماں باپ حادثے کی نذر ہو گئے۔ چار سال چھوٹے بھائی کو، جس کی عمر محض پندرہ سال تھی، جائیداد کے لالچ میں انسان سے بھیڑیا بننے والے رشتہ داروں نے قتل کر دیا تھا۔ نگینہ ہوش میں آتی تھی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے قاتل رشتہ داروں کے چہرے دیکھتی تھی اور پھر بے ہوش ہو جاتی تھی۔ اس کی حالت ہفتہ بھر تک یہی رہی پھر اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ نوروز خان نے اس سے پوچھے بنا اس کا نکاح اپنے بڑے بیٹے رفاقت خان سے پڑھوا دیا۔ وہ چیختی چلاتی رہی مگر کوئی مدد کرنے والا قریب ہوتا تو اس کی مدد کو آتا.....

خون میں تر سہاگ رات اس نے بے ہوشی کے عالم میں گزار دی۔ اگلی رات کو دس بجے کے قریب وہ خطرات مول لیتی ہوئی گھر سے چوری نکل بھاگی۔ اسے نہ تو رستوں کا علم تھا اور نہ ہی اس کے ذہن میں کوئی منزل متعین تھی۔ وہ تو بس بھاگ رہی تھی اور بھیانک چہروں والے رشتہ داروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح بھاگتی ہوئی وہ ڈیڑھ بجے کے قریب میرے کوارٹر کے عقبی دروازے اور ہسپتال کی باؤنڈری کے درمیان آن چھپی۔ وہاں ہم گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکتے ہیں۔ اُسے بے چاری کو کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا تو اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ میں اس وقت ایک ڈلیوری کیس کر رہی تھی۔ میں نے صدیق کو اس طرف بھیجا۔ وہ اُسے سہارا دے کر چلاتا ہوا میرے پاس لے آیا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ننگے پیر کانٹوں اور کانچ کے ٹکڑوں سے چھلنی تھے جبکہ عروسی لباس بھی کئی جگہوں سے ادھڑ گیا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ میں نے اس کی ٹریٹ منٹ کی۔ وہ سنبھلی تو اس نے مجھے اپنی رام کہانی سنا کر مدد طلب کی۔ میں نے اُسے اپنے کوارٹر میں چھپا دیا۔

اس کے خاندان نے پورا علاقہ چھان مارا مگر وہ اس کا سراغ پانے میں ناکام رہے۔ میں اور میرے شوہر صدیق نے ہمسائے لائن مین کے کانوں میں اس واقعے کی بھنک تک نہیں پڑنے دی ورنہ علاقے بھر میں پھیل جاتی اور وہ خونخوار درندوں کی طرح ہم پر پل پڑتے۔ نگینہ کئی راتوں سے یہاں بحفاظت چھپی ہوئی ہے۔''

مس عالیہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوگئی اور باری باری ہم دونوں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ میرا دورانِ خون تیز تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اِسی وقت اس ظالم بستی میں جاؤں اور نوروز خان کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجادوں جنہوں نے جائیداد کے لالچ میں اپنے ہی خاندان کا چراغ گل کر دیا تھا۔ سجن خان کی دولت کینیڈا میں محفوظ تھی جس کے وارث سلامت خان اور نگینہ تھے۔ ظالموں نے سلامت خان کو مٹی تلے سلا دیا تھا اور نگینہ کو نکاح کی زنجیر میں باندھ کر ساری جائیداد ہڑپ کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔

میڈم کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری، ''عالیہ! یہ تو بہت بڑی ٹریجڈی ہے؛ نگینہ کے ساتھ..... کیا نوروز خان اس سونے کی چڑیا کا پتہ کرنے یہاں نہیں آئے؟''

''نہیں باجی!'' عالیہ پورے وثوق سے بولی، ''ابھی تک کسی کو سوائے میرے اور صدیق کے، نگینہ کی یہاں موجودگی کی خبر نہیں ہے مگر ہم اتنے بڑے راز کو کب تک چھپا سکتے ہیں۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور کان سے کان ملا ہوا ہوتا ہے۔ نوروز خان کو میں نہیں جانتی، اس کے بیٹوں کو میں نے نہیں دیکھا مگر صدیق اور لائن مین بتاتے ہیں وہ بہت ظالم اور بدمعاش فطرت لوگ ہیں۔ ہم دونوں کا آگے پیچھے کوئی نہیں، وہ ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹ پھینکیں گے اور نگینہ کو چھین لے جائیں گے۔ باجی! ڈر کے مارے مجھے ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔ نگینہ کے آنسو دیکھتی ہوں تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسے دھکا بھی نہیں دے سکتی۔ وہ جوان ہے۔ خوب صورت ہے۔ امیر زادی ہے۔ باہر نکلے گی تو اسے ہر شخص لالچ بھری خونیں نظروں سے دیکھے گا اور وہ دربدر بھٹکتی ہوئی کسی اندوہ ناک موت کا شکار ہو جائے گی۔ اگر اپنے چچازاد اوباشوں کے ہاتھ لگ گئی تو اپنے نوعمر بھائی کی طرح گمنام موت ماردی جائے گی۔ پلیز باجی! آپ میری مدد کریں اور نگینہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس کی مدد کریں۔''

عالیہ رونے لگ گئی۔ میڈم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور پیار سے بولی، ''تم فکر نہ کرو عالیہ! آج کے بعد تم یہ سمجھنا چھوڑ دو کہ تمہارا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ میں ہوں ناں..... کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ دیکھے گا تو میں نکال دوں گی۔ رہی بات نگینہ کی، تو میں نے تم سے مدد کا وعدہ کیا ہے۔ وہ دربدر نہیں ہوگی۔ وہ لاوارثوں کی طرح لالچیوں کی بھینٹ نہیں چڑھے گی۔ مگر یہ بتاؤ؛ وہ کیا چاہتی ہے؟''

''وہ؟ اچھا..... آپ نگینہ کی بات کر رہی ہیں۔'' عالیہ نے چونک کر کہا، ''وہ کیا چاہے گی؟ وہ

تو کہتی ہے کہ وہ کسی طرح کینیڈا پہنچ جائے۔ وہاں جا کر وہ ان کے شر سے محفوظ ہو جائے گی۔''

''ہوں..... کیا وہ اپنے ساتھ سفری کاغذات لائی ہے؟'' میڈم نے پوچھا۔

''پاسپورٹ؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''ہاں..... شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور ریٹرن ٹکٹ وغیرہ؟''

''نہیں..... میرا خیال ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بے چاری بمشکل اپنی جان بچا لائی ہے وہاں سے۔'' عالیہ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

میڈم نے مجھے دیکھا، ''شہریار! تم کیا کہتے ہو؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؛ آپ مرضی کی مالک ہیں۔'' میں نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا، ''میرا خیال ہے کہ نگینہ کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ عالیہ اتنی مضبوط نہیں ہے کہ زیادہ عرصہ تک اُسے پناہ دے سکے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ ساتھ عالیہ کا کانٹا بھی نکال دیا جائے۔''

میڈم بولی، ''میں نے نگینہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تو پھر مجھ سے کیا پوچھتی ہیں؟''

''تم میرے ساتھی ہو۔'' میڈم نے 'ساتھی' لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، ''ساتھی کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے۔''

میری زبان خاموش رہی مگر میری آنکھوں نے اُسے بتا دیا کہ 'آپ کے فیصلے تقویت دینے کے لئے میری جان بھی حاضر ہے'..... وہ بولی، ''او کے! ہم آگے کے بجائے، ملتان واپس جائیں گے۔'' پھر عالیہ سے مخاطب ہوئی، ''عالیہ! جاؤ؛ نگینہ سے بات کرو۔ اُسے اعتماد میں لو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ میرے ساتھ ملتان جانے پر رضامند ہی نہ ہو۔''

''نہیں باجی! اس نے دروازے کی جھری سے آپ کو دیکھا ہے۔ ونڈو کی جالی سے آپ کی گاڑی کو دیکھا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ اسے اس علاقے سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر لے جا سکتی ہیں اور پھر میں نے اسی کے کہنے پر آپ سے بات کی۔''

میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اَبھی پوری طرح فٹ نہیں تھی مگر پہلے سے کہیں بہتر حالت میں تھی۔ اس نے بھرپور انگڑائی لی، سردی سے تھمے ہوئے اعضا کو حرکت دی اور بولی، ''شہریار! تم گاڑی اسٹارٹ کرو؛ میں نگینہ کو لے کر آتی ہوں۔ چلو عالیہ! اپنی مظلوم پناہ گزین سے ملواؤ۔''

عالیہ کے چہرے پر خوشی کے عکس لرزنے لگے۔ نگینہ کے چھپے ہوئے جوان وجود نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون لوٹ رکھا تھا۔ اس امتحان سے سرخرو ہونے والی تھی۔ میں ڈرائنگ روم کم کلینک سے باہر نکلا۔ لینڈ کروزر سے کچھ فاصلے پر نوخیز دھوپ میں کرسی بچھائے بیٹھے صدیق کو پاس بلایا۔ اس نے دیر نہیں کی۔ قریب آ کر بولا، ''کیا وہ بھی جا رہی ہے؟''

اس کا اشارہ نگینہ کی طرف تھا۔ میں نے کہا، ''ہاں! اب ہم جانیں اور وہ کمینہ نوروز خان جانے، تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے ممنون نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا، اسٹارٹ کی اور برآمدے کے نہایت قریب لے گیا تاکہ نگینہ کم سے کم وقت کے لئے کوارٹر کے باہر کھڑی ہو۔ ہسپتال میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ بعید نہ تھا کہ کوئی نگینہ کو جانتا ہو اور ہمارے جانے کے بعد عالیہ اور صدیق کی شامت آ جاتی۔ صدیق گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا آیا۔ میں نیچے اُترا تو صدیق کو پھٹی پھٹی نظروں سے گاڑی کے اندر جھانکتے دیکھا۔ اس کی نظروں کے ارتکاز کو بھانپتے ہوئے میں نے جب گاڑی کے فرش پر نظر ڈالی تو مجھے اس کے غیر معمولی خوف کی سمجھ آ گئی۔ اس کی نظر گاڑی کے فرش پر پڑی ہوئی خوف ناک گنوں پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا، ''ڈرو مت دوست! یہ دوستوں کے لئے نہیں، دشمنوں کے لئے رکھی ہیں۔''

وہ ہکلایا، ''جج..... جی.....''

اس کی آنکھوں میں خوف کے ساتھ ساتھ تشویش کے ڈورے تیرنے لگے۔ شاید وہ اس اندیشے میں مبتلا ہو گیا تھا کہ نگینہ ایک مصیبت سے نکل کر دوسری کے رحم و کرم پر جانے والی تھی۔ سہمی سہمی آواز میں بولا، ''نن..... نگینہ یتیم مسکین لڑکی ہے۔ اس کی بددعا سیدھی عرش پر جائے گی۔''

میں نے مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپایا، ''صدیق! کہا نا، فکر نہ کرو۔ وہ اب ہماری ذمہ داری ہے۔ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

وہ بظاہر مطمئن ہو گیا۔ ایسے ہی وقت میں میڈم اور عالیہ برآمدے میں دکھائی دیں۔ ان کے ساتھ ایک اور قیامت بھی جلوہ افروز تھی۔ میں نے اُسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ کسی بھی طور سے میڈم اور عالیہ سے کم نہیں تھی۔ اس نے میری پہلی نظر کو ہی سلگا کر رکھ دیا تھا۔ میڈم نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا اور عالیہ سے مخاطب ہوئی، ''میں نے تمہیں اپنا نمبر دے دیا ہے۔ اگر کوئی پرابلم ہو، کچھ کہنا ہو تو فون کر لینا۔''

عالیہ ممنونانہ وارفتگی سے میڈم سے لپٹ گئی اور کلمۂ تشکر دہرانے لگی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نگینہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سبز اور زرد رنگوں کا امتزاجی لباس اس کی شخصیت پر جچ رہا تھا مگر بہ غور دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ وہ سوٹ اس کا نہیں تھا۔ قدرے چھوٹا اور تنگ تھا۔ میں نے ایک نظر عالیہ کو دیکھا۔ سمجھ میں آ گیا کہ عالیہ نے نگینہ کو اپنا سوٹ پہنا رکھا تھا۔ وہ نگینہ سے قد میں کچھ چھوٹی تھی۔

میں نے عقب نما میں سر جھکائے بیٹھی نگینہ کو دیکھا۔ سنہرے بال، شوخ گلابی اور چمکتی ہوئی جلد، قدرے موٹے مگر سرخ تر ہونٹ..... اس کا نام دیسی تھا مگر وہ پوری کی پوری انگریز دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کہا، ''نگینہ! جب تک میں نہ کہوں، تم اپنا چہرہ نیچے رکھو گی تاکہ کوئی تمہیں دیکھ نہ پائے۔ مس عالیہ کے لئے ہمیں یہ احتیاط برتنا ہوگی۔ او کے؟''

اس کی باریک اور مترنم آواز گاڑی میں گونجی، ''یا..... سر! آئی شیل کیئر اباؤٹ اِٹ.....''

وہ نہ صرف خوب رُو تھی بلکہ خوش گلو بھی تھی۔ ایسے ہی وقت میں میڈم میرے برابر آن بیٹھی اور ہاتھ کے اشارے سے چلنے کا حکم دیتے ہوئے ہاتھ لہرا کر عالیہ اور صدیق کو 'بائے بائے' کرنے لگی۔ میں نے گاڑی ریورس کی۔ ہسپتال کے برآمدے کے قریب روکی اور ٹرن لے کر سلاخوں والا دروازہ عبور کر لیا۔ میرا رُخ شجاع آباد کی اسپیڈ بریکروں والی رابطہ سڑک کی طرف تھا۔ میڈم نے آہ بھر کر کہا، ''دنیا بڑی ظالم ہے شہریار! یہ محض چھیننا جانتی ہے۔ عطا کرنا اس کی سرشت میں نہیں ہے۔''

''جی میڈم!'' میں نے تائید آمیز انداز میں کہا۔

وہ پہلو بدل کر نگینہ سے باتیں کرنے لگی۔ نگینہ جھکی جھکی بیٹھی جواب دینے لگی۔ نگینہ کئی مرتبہ پاکستان آ چکی تھی مگر اس کے لب و لہجے پر انگریزی غالب تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتی تھی مگر اپنا مدعا سمجھانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ میں نے عقب نما میں اسے دیکھا۔ زیر لب مسکرایا۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

مجھے راستہ یاد تھا۔ جونہی لینڈ کروزر مین روڈ پر چڑھی، میڈم نے کہا، ''ہم کوٹھی پر جا رہے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کی رفتار بڑھا لی۔ میڈم بولی، ''نگینہ! اب تم سر اُٹھا کر بھاگتی دوڑتی ہوئی دنیا کو دیکھ سکتی ہو۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب اگر کسی نے تمہیں دیکھ بھی لیا تو وہ تمہارے غیاب کا تعلق عالیہ سے نہیں جوڑ سکے گا۔''

''تھینکس آ لاٹ میڈم!'' نگینہ نے متشکر انداز میں کہا اور پیچھے ہٹ کر، سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ چونکہ اس نے مجھے 'میڈم' کہتے ہوئے سنا تھا، اس لئے آپوں آپ ہی 'میڈم' کہنے لگی تھی۔

میں نے رواں دواں ٹریفک پر توجہ مرکوز رکھی جبکہ میڈم پہلو کے بل بیٹھ کر نگینہ سے باتیں کرنے لگی۔ وہ نوروز خان اور اس کے خاندان کے بارے میں کریدرہی تھی۔ نگینہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتا رہی تھی۔ جونہی اُس کے لبوں پر اس کے بھائی سلامت خان کا تذکرہ آیا، وہ آبدیدہ ہوگئی اور ہچکیاں لینے لگی۔ میڈم نے کہا، ''غم نہ کرو نگینہ..... بجا کہ جانے والے کبھی واپس نہیں آتے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسی بے بسی کی موت مار دیے جانے والوں کا بھرپور انتقام لے لیا جائے تو دکھ کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں اپنا دکھ کم کرنے کا موقع ضرور دوں گی۔ ان بے غیرتوں کی آخری ہچکیاں تمہارے کانوں میں ضرور گونجیں گی۔''

وہ روتے روتے تھم گئی۔ دانت پیس کر بولی، ''میڈم! میں اتنی کمزور نہیں تھی مگر اُس ماحول میں، والدین کی اچانک موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ پھر مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں تھا کہ وہ اتنا انتہائی قدم اُٹھائیں گے اور میرے بھائی کو خون میں نہلا دیں گے ورنہ میں اپنے بھائی کو مرنے نہ دیتی۔ انہیں سمجھنے کی غلطی کر بیٹھی ورنہ..... ہائے میڈم! میں اتنی کمزور بھی نہیں تھی.....''

وہ انگریزی اور اردو کے ملے جلے لہجے میں اپنا غبارِ خاطر تحلیل کر رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ نازوں پلی ہوئی نازک اندام لڑکی تھی جو نوروز خان کے دیہاتی بود و باش والے خطرناک گھرانے کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کی تعلیم، دولت، خود اعتمادی..... اس ماحول میں اس کے کسی کام آنے والی نہیں تھی۔ میڈم بولی، ''کیا اَب تم کینیڈا واپس جانا چاہتی ہو؟''

وہ متذبذب ہوگئی۔ بولی، ''آں..... شاید..... یا شاید یہاں رہنا چاہتی ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت میرے بھائی کی آخری شبیہ لہراتی رہتی ہے۔ میں نارمل نہیں رہی۔ ابھی میں کوئی صحت مند فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوں۔''

میڈم تھوڑی بے رحمی سے مسکرائی، ''تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک واپسی کا؛ دوسرا انتقام کا..... کس راستے کو اپنانا ہے؛ یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ میں دونوں صورتوں میں تمہاری مدد کروں گی۔ اس مدد کی قیمت بھی وصول کروں گی۔''

وہ چونکی، ''قیمت؟''

''ہاں نگینہ.....'' میڈم نے بے حد سنجیدگی سے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا، ''دنیا میں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ ہر چیز کی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ بعض اوقات کوئی شخص مفت میں سب کچھ دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر وہ بنا طے کیے زیادہ معاوضہ حاصل کرنے کے چکر میں ہوتا ہے۔ میں لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے کی عادی ہوں۔ تمہاری مدد کروں گی اور معاوضہ لوں گی۔ کیا؟ یہ وقت آنے پر بتاؤں گی۔ تمہیں قبول ہوگا تو ساتھ دوں گی۔ نامنظور کرو گی تو ذرہ بھر دباؤ نہیں ڈالوں گی بلکہ ایسے 'سی آف' کروں گی جیسے کسی پیارے سے مہمان کو کیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟''

مجھے میڈم کی سمجھ نہیں آئی۔ وہ اُس سے کیا معاوضہ لینا چاہتی تھی؟ میرے دیکھنے میں تو یہ آیا تھا کہ وہ اس کینیڈین نیشنلٹی ہولڈر حسینہ سے کہیں زیادہ امیر تھی۔ بااختیار تھی۔ دو چار لاکھ..... کروڑ..... کتنی رقم وصول کر لیتی اور اگر کر بھی لیتی تو کیا یہ اس کے لئے معقول بات ہوتی..... میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بے نیازانہ باتیں کرتی رہی۔

اچانک میڈم نے مجھے مخاطب کر لیا، ''میرا موبائل تمہارے پاس ہے؟''

''جی میڈم!'' میں نے موبائل نکال کر اُسے تھما دیا۔ اس نے مایوسی کے عالم میں سر ہلایا اور بولی، ''بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے بند ہو گیا ہے۔''

''میں اپنا موبائل دوں؟''

''نہیں.....'' اس نے اپنا فون ڈیش بورڈ پر لاپروائی سے ڈال دیا اور بولی، ''جہاں سگنلز نہیں تھے، وہاں چلتا تھا۔ جہاں سگنلز موجود ہیں، وہاں بیٹری جواب دے گئی ہے۔ زندگی اسی طرح اتفاقات کے سہارے گزرتی رہتی ہے۔ خیر.....''

دس بجنے والے تھے جب میں نے میڈم شکیلہ کی محل نما کوٹھی کی پارکنگ میں گاڑی روکی۔ میڈم نے مؤدبانہ انداز میں گیٹ کھولنے والے گن مین کو تحکمانہ انداز میں کہا، ''ڈرائیور کہاں ہے؟''

''جی! وہ سرونٹ کوارٹر میں ہے۔''

''اُسے کہو کہ وہ میرو شاہ کو فوراً اُٹھا لائے۔''

''جی میڈم..... میں ابھی اُسے روانہ کرتا ہوں۔''

میڈم نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کینیڈا پلٹ حسینہ کا ہاتھ تھامے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر گھس گئی جبکہ میں کچھ دیر تک برآمدے میں ٹھہرا رہا، پھر بے دھیانی کے عالم میں گیسٹ

روم میں چلا گیا۔ زوار نے گیٹ کھولا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ظاہر خان شبانہ پہرے داری کے بعد چلا گیا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد گیسٹ ہاؤس کے باورچی نے ناشتہ میرے سامنے میز پر چن دیا۔ ساتھ ہی اُس نے میڈم کا پیغام دیا، ''میڈم جی نے کہا ہے کہ آپ تیاری کر لیں۔ گھنٹہ بھر کے بعد یہاں سے نکلنا ہے۔''

مجھے اچنبھا ہوا۔ میڈم نے حسبِ روایت کوٹھی میں پہنچتے ہی مجھ سے روایتی نوعیت کا صرفِ نظر برت دکھایا تھا۔ مجھے اس کا یوں نظر انداز کرنا بُرا لگا مگر میں نے خاموشی میں ناشتہ کرنے اور باتھ روم میں گھس کر تر و تازہ ہونے میں عافیت سمجھی۔ ٹوتھ برش اور شیو کرنے پھر بھرپور انداز میں شاور لینے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ اپنے مخصوص دیہاتی انداز میں سر میں سرسوں کا تیل جھستا ہوا باتھ روم سے نکلا تو بیڈ پر نیا سوٹ دکھائی دیا۔ دل ہی دل میں میڈم شکیلہ کے حسنِ انتظام کو سراہتا ہوا میں جدید وضع کے نفیس اور دیدہ زیب لباس کا جائزہ لینے لگا۔ میڈم شکیلہ کے ہاں ایسے چھوٹے چھوٹے کام مشینی انداز میں سرانجام دیے جاتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے انٹر کام پر محض 'شہریار کی تیاری میں مدد کرو' کا جملہ کہا ہوگا اور متعلقہ شخص نے ہتھیلی پر سرسوں جما دکھائی تھی۔

میں نے چینج لینے کے بعد باتھ روم میں نصب قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ قدرت نے میری شخصیت سازی میں فیاضانہ رغبت سے کام لیا تھا۔ میر وشاہ اگر مجھے چھیڑنے کے لئے کہا کرتا تھا کہ میڈم میری وجاہت پر مرمٹی ہے، تو شاید غلط نہیں کہتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں کوٹھی کی پارکنگ میں کوئی گاڑی داخل ہوئی۔ چند لمحوں بعد میر وشاہ کی آواز میرے کانوں پڑی۔ وہ میڈم کے دربار حاضری دینے آن پہنچا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے سیدھا میڈم کے کمرے کا رُخ کیا تھا۔

بیڈ میں نیم دراز ہونے اور چائے سے لطف اندوز ہونے کے دوران میں نے درپیش آنے والے حالات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ میڈم جن حالات سے گزر رہی تھی، ان حالات کا تقاضا بخوبی نبھاتے ہوئے بجلی کی مستعدی سے آگے بڑھ رہی تھی مگر غیر معمولی خنک رات کے گزرنے پر یہ احساس بڑا مایوس کن تھا کہ ہم کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پائے تھے۔ پیرو ماچھی کا خطرناک گینگ ہمارے ہاتھوں تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے بہادر اور جنگجو ساتھی موت سے ہمکنار ہو گئے تھے۔ آخری شخص بھی اپنی حماقت کی بدولت لقمہ اجل بن گیا تھا۔ اس

سے ملنے والی ناکافی معلومات کے مطابق پیرو ماچھی اِس وقت تنہا تھا اور دریا کے پار محفلِ یاراں میں مدہوش پڑا تھا۔

بعید نہ تھا کہ اُسے اب تک اپنے گینگ پر پڑنے والے شب خون کا علم ہی نہ ہوا ہو اور وہ موج و مستی میں غرقاں ہو۔ دریائی علاقے میں موبائل فون کا نیٹ ورک نہیں تھا اس لئے خبر رسانی کا وہ معیار قائم نہیں ہو سکا تھا جو بڑے شہروں یا قدرے موڈریٹ علاقوں میں قائم ہو گیا تھا۔ پیرو ماچھی کو پولیس کے چھاپے کی خبر بھی نہیں ملی ہو گی۔

پیرو ماچھی کے بارے میں یہ رائے بھی قائم کی جا سکتی تھی کہ وہ علی الصبح دریا کے اس پار آ گیا ہو اور اسے نہ صرف اپنے ڈیرے کی بربادی بلکہ اپنے تمام کارندوں کی ہلاکت کا بھی علم ہو گیا ہو۔ ایسی حالت میں وہ اپنا منہ نوچ رہا ہو گا اور اس کے دونوں پیر ہر آن انگاروں پر پڑ رہے ہوں گے۔ نہ صرف ہم نے بلکہ پولیس اہلکاروں نے بھی اپنی آمد کا کوئی ثبوت ڈیرے پر نہیں چھوڑا تھا۔ میں اس قضیے پر اس لیے زیادہ غور و خوض کر رہا تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے میڈم کے ساتھ پیرو ماچھی کو ٹریس کرنے کے مشن پر نکلنا تھا۔ تجربے سے پتہ چلا تھا کہ میڈم اپنے پیاروں کی تلاش میں جذباتی انداز میں سوچتی تھی اور اُڑ کر اپنی اماں اور سیمو تک پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ کسی بھی رکاوٹ یا الجھن کو خاطر میں لانے پر تیار نہیں تھی جبکہ ان حالات میں بڑی صبر آزمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔ نہ صرف پیرو ماچھی کے کامیاب تعاقب کا پلان مرتب کرنا تھا بلکہ میڈم شکیلہ کے جذباتی رویے اور اندھے اقدامات کا بھی خیال رکھنا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان مالک اور ملازم کی فطری رکاوٹ حائل تھی۔ میں اُسے ترغیب دے سکتا تھا؛ حکم نہیں۔ شکر کی بات یہ تھی کہ وہ میری بات مان لیتی تھی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو چکا تھا مگر میڈم نیچے نہیں آئی تھی۔ میں انتظار کی کوفت میں مبتلا تھا جب گیسٹ ہاؤس میں میر وشاہ کی مخصوص آواز ابھری۔ وہ زوار سے الجھتا ہوا میرے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ پان خوری کی وجہ سے سرخ باچھیں کانوں تک پھیل گئیں اور شوخ آواز کمرے میں گونج گئی، ''اڑے لاڈے میاں! اونچی پرواجاں (پروازیں) پر اڑے جاوت ہے..... کیا بات ہووت غنچے کی..... ہیں! ماڑا غنچا ایک دم فسٹ کلاس روج (روز) بن جاوت اور مہارانی کو خوشبو کی لپیٹ میں لے لیوت ہے.....''

اس کے منحنی وجود میں بلا کی مستعدی بھری ہوئی تھی۔ چہرہ بھلے جھریوں سے بھرا ہوا تھا مگر میں نے اس پر کبھی تھکن یا نقاہت کو ثبت نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے رسمی انداز میں خوش آمدید کہا۔ وہ بولا، ''جندہ باد ماڑے لاڈے خان! ماڑی مہارانی جی تیرے پر جی جان سے صدقے واری جاوت ہے..... وہ کیا بولت ہیں کہ فریفتہ..... ہیں؟ وہ لاڈی ماڑے غنچے پر فریفتہ ہو جاوت ہے..... بولت ہووے کہ شہریار سے بہادر تو جالم دنیا میں کوئی نہ ہووت ہے.....''

اس کی بچوں جیسی گول گول آنکھوں میں شرارت بھری ستائش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میرے بازوؤں کی مچھلیوں کو چھیڑتے ہوئے بولا، ''اڑے غنچے! ماڑی جگہ رکھ لیوت..... یہ نہ ہووت کہ تم مہارانی کو آنکھ مٹکے میں چت کر لیوت اور ماڑی روٹی رو جی (روزی) بند ہو جاوت.....''

میں نے تڑپ کر کہا، ''کیسی باتیں کرتے ہو شاہ جی! میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں جتنی اونچی پرواز بھی کر لوں، جہاں تم ہو، وہاں کبھی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ میڈم تمہاری بہت زیادہ قدر کرتی ہے۔''

''وہ سالی قدر خاک کرت ہے!'' میر و شاہ نے مصنوعی نخوت اور خفگی سے کہا، ''جرورتیں (ضرورتیں) ایک دوسرے کے پاس کھینچ لاوت ہیں..... ماڑی شکل سوہنی؛ ماڑا پنڈا لوہے مافق؛ ماڑی دولت سات سمندر پار تک پھیلی ہووت..... کچھ بھی تو نہ ہووت ہے ماڑے پاس..... لاڈے خان! یہ جرورت ہووت جو میڈم میرا دم بھرت ہے..... اس غلط فہمی کو دل میں جگہ نہ دیوت ہے کہ تیرے کو قدرت نے بہت سوہنی شکل دے رکھت ہے..... نہیں لاڈے نہیں! یہ جالم دنیا جرورتوں کی ماری ہووت..... بس!''

وہ دانشوروں کے انداز میں ہاتھ لہرا لہرا کر مجھے سمجھا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس گھڑی اس کی آنکھوں میں عجیب یاسیت اور شکست خوردگی کے پرتو جھلملا رہے تھے۔ شاید وہ اپنے کسی دکھ کی دہلیز پر شکستہ جان کھڑا تھا اور قوتِ بیان نہیں رکھتا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا، ''ہاں شاہ جی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ دنیا اپنی اپنی ضرورتوں کو مدنظر رکھتی ہے۔ میڈم کو مجھ سے یا تم سے پیار نہیں ہے بلکہ اسے اپنی دولت کے جن کو فیڈ کرنے کے لئے ہماری ضرورت ہے۔''

''گھوڑا یا کتا..... دونوں جوان اور طاقتور ہوویں تو مالک کو بھاویں۔ جرا کمجور (ذرا کمزور) یا لنگڑے لولے ہوویں تو گولی سے ٹھنڈے ہو جاویں..... میر و شاہ بڈھا تھارو پریڈ گھوڑا

ہووت؛ شہریار چھریرا گل ٹیریا (بل ٹیرر)..... میدان کے شاہ جور (زور)؛ مالک کے وفادار۔ تم باجی (بازی) ہار جاوے؛ میرو شاہ ریس ہار جاوے..... نہ آگے کے نہ پیچھے کے..... ھشوں.....'' اس نے دائیں ہاتھ سے پستول کا مخصوص نشان بنایا اور منہ سے فائر کی آواز نکالی، بولا، ''ماڑی رانی بڑا پیار کرت ہے تیں لاڈے سے..... ہائے! تیرا ناج (ناز) نخرہ اُٹھاوت پَر کب تک؟ جب تک رگوں میں جوانی دوڑت ہے۔ پہلے کہوت تھی کہ جور آور (زور آور) بڑا جور آور ہووت ہے۔ بھرے ملتان میں کوئی اُس سا کہاں..... اَب بولت ہے کہ شہریار تو جور آور کا توڑ ہووت ہے..... اَب سالی گنا چوپے ہے؛ ایک دن پھوگ پھینکے گی۔ ہائے! شالا جگ میں عورت کا رنگ روپ نہ اُجڑت..... شالا گبھرو کی جوانی نہ روٹھت.....''

میں میرو شاہ کی شخصیت کے بارے میں بہت متجسس تھا۔ بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا مگر کبھی اتنی مہلت نہیں ملی تھی۔ اگر کبھی مل بیٹھے بھی تو اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آئیں۔ وہ بہت باتونی تھا۔ وہ بولتا تھا تو سننے والا آپوں آپ اس کی طرف متوجہ رہتا تھا کیونکہ وہ خاصا بے ربط بولتا تھا۔ اس کا اندازِ گویائی ایسا تھا کہ اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں کے بطن سے متن اخذ کرنا بسا اوقات مشکل تر ہو جاتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس حلق میں اُتاری اور کہا، ''تمہیں میڈم نے بلایا تھا۔ کیا کہا؟''

''کیا بولت ہے..... پریشان بوتھی بنا کے بولت ہے کہ اس کی اماں اور بھائی کو پیرو ماچھی نے اغوا کرت ہے۔ چھڑانے جاوت ہے؛ ماڑے لاڈے کو ساتھ لے جا کر۔ ماڑی کھوپڑی بولت کہ جس انگنے سے واسطہ تعلق نہ رہوت؛ اس راہ پر کیوں جاوت پَر سالی کی کھوپڑی کے سوراخ بند ہو جاوت ہیں..... بولے ہے کہ جاوت ہے۔ نہ رکت ہے۔ میرو شاہ غصے سے بولت کہ جاوے..... موت کے منہ میں ہاتھ ڈالت.....''

میرو شاہ کے ناتواں وجود پر برہمی آ سوار ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ میڈم نے اس کی بات نہیں مانی تھی بلکہ پیرو ماچھی کے تعاقب میں جانے پر کمر بستہ تھی۔ تبھی میرو شاہ برہم ہو گیا تھا۔ میں نے کہا، ''تمہارے خیال میں میڈم کو اپنے خاندان کو پیرو ماچھی یا حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہیے؟''

''تو اور کیا..... وہ سالے کیا لاگت ہیں رانی کے؟'' میرو شاہ نے تڑپ کر کہا۔

''وہ میڈم کے رشتہ دار ہیں اور میرے دیکھنے میں آیا ہے کہ انہیں میڈم سے رشتہ داری کی

پاداش میں اغوا کیا گیا ہے۔''

''لاڈے میاں! جس کنے کو اپنی کم جوری بناوت؛ دشمن اُس کے پیچھے لگ جاوت ہیں۔''

''شاہ جی! کمزوریوں سے جان چھڑائی جاسکتی ہے مگر اپنے پیاروں کو کیسے اپنی زندگی سے نکالا جاسکتا ہے؟'' مجھے اچنبھا ہوا۔

''اڑے کیا بولت ہے یار؟'' وہ بھنا کر بولا، ''کون سالا رشتہ دار ہووت؛ کون یار ہووت؟ سب اپنی اپنی حیاتی گجارت (گزارت) ہیں۔ ہر جان کا وارث سوہنا رب ہووت ناں کہ میرو شاہ ٹھیکیدار ہووت.....''

میں نے کندھے اُچکائے اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولا، ''چھوڑ دیوت لاڈے میاں ان موئی باتوں کو اور کان کھول کر سن لیوت..... ماڑی مہارانی مجفر گڑھ (مظفر گڑھ) جانے کو پر تولت ہے۔ تیرے کو بھی ساتھ میں جانے پر جد (ضد) کرت ہے۔ تم جاوے پر یہ دھیان رکھ لیوت ہے کہ میرو شاہ کی جان اس کملی رانی میں اَٹکی ہووت ہے۔ اسے کچھ ہووت تو پھر نہ تم جندہ رہوت؛ نہ میرو شاہ اور نہ یہ جالم دنیا..... میرو شاہ سب کچھ برباد کر دیوت ہے رانی کے نام پر..... سمجھ میں آوت ناں؟''

میں زیر لب مسکرایا اور اثبات میں سر ہلا کر بولا، ''تم فکر نہ کرو شاہ جی! میرے مرنے کے بعد کوئی اُس پر ہاتھ اُٹھائے تو اُٹھائے ورنہ میرے جیتے جی یہ جرأت کوئی نہیں کرسکتا۔''

اس نے میرا کندھا تھپتھپایا اور کمال فخر و محبت سے بولا، ''جندہ باد ماڑے لاڈے..... جندہ رہو اور ماڑی رانی کو بھی جندہ رکھو..... اللہ حافج (حافظ)..... ماڑے کو جانے کا ہووت..... اللہ حافج!''

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا اور مجھے تنبیہی نظروں سے دیکھ کر پھر ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ وہ اب تک کئی مرتبہ یہ تنبیہ کر چکا تھا اور مجھ پر باور کر چکا تھا کہ میڈم شکیلہ کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اس پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔ اگر کچھ ہوا تو اس کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر عائد کی جائے گی۔ میرو شاہ کے نزدیک اس جرم کی سزا موت سے کم نہیں تھی۔ میں کہنا تو چاہتا تھا کہ اگر میڈم کی زندگی اتنی ہی قیمتی ہے تو پھر اُسے کوٹھی سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہیے، مگر اس نے مجھے مہلت ہی نہ دی تھی۔ گھر کے باہر عام آدمی کے لئے بھی قدم قدم پر موت اپنا خوف ناک دہانہ کھولے کھڑی ہے جبکہ ہم تو صبح تا شام گولیوں کے سائے میں چلتے تھے۔ کسی بھی وقت زندگی کی ڈور کٹ سکتی تھی۔ کسی بھی لمحے سانس کا رواں سلسلہ ٹوٹ سکتا تھا۔

سیمو اور اس کی بوڑھی ماں کو تلاش کرنے کے مشن میں میرے ساتھ میڈم کے بجائے عقیل، پیا جی یا سخی محمد بھی جا سکتے تھے جن کی زندگیاں میر و شاہ کے نزدیک میڈم جتنی قیمتی نہیں تھیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ مجھے ایک وقت میں دو محاذوں پر لڑنا نہ پڑتا اور میری یکسوئی مشن کی تکمیل کو حاصل رہتی مگر میر و شاہ سے یہ باتیں نہ کر پایا۔ یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ میڈم نے جذباتی انداز میں میر و شاہ کو بھی انکار کر دیا تھا اور اس کے اشتعال کو اہمیت نہیں دی تھی۔

میں ہاتھ کمر پر باندھے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ دل میں ننھی سی چبھن جاگ اُٹھی تھی۔ ذہن میں خیالات گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ مجھے اپنی بے بسی اور میڈم کی جذباتی کیفیت کے احساس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سیمو اور اس کی ماں؛ بقول میڈم کے، اس کے کچھ بھی نہیں لگتے تھے مگر ان کے اغوا کی بھنک ملتے ہی وہ مسلسل بے چین اور مضطرب تھی اور ہر آن اغوا کاروں تک پہنچنا چاہتی تھی۔ جونہی اُسے پتہ چلتا کہ وہ دونوں کس کی تحویل میں ہیں، وہ بجلی کی طرح کڑکے گی اور آنِ واحد میں اغوا کار کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ ایک میں تھا جو ابھی تک اپنی بہن کے اغوا کار کی تلاش میں کشتیاں جلا کر نہیں نکلا تھا۔ میری پروین نہ جانے کس حال میں تھی۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ زندہ تھی یا زندگی کی بساط پر اپنا خون بہا کر دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ رنگو قصائی اور سردار حیدر خان دھرتی کے سینے پر دندناتے پھرتے تھے مگر میں نے ابھی تک ان پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ میری طرح میرا یار کھالا خانزادی اسما کی دید کو ترس رہا تھا اور ایس پی کا بیٹا شاہد سلیم اپنی محبوبہ عشرت عرف عاشی کے لئے ٹھنڈی آہیں بھرتا پھرتا تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ میڈم شکیلہ خود مختار تھی جبکہ میں اس کے دست نگر تھا۔

کافی وقت گزر گیا تھا۔ میڈم نے تیار ہونے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔ اس کی مصروفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے فوجی اختر سے فون پر رابطہ کیا۔ گھر کے حالات کے بارے میں آگہی حاصل کی۔ فوجی اختر نے بتایا کہ مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ میں اپنی توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھوں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میرے گھر والے بخیریت تھے۔

گیلری میں قدموں کی چاپ اُبھری۔ زندگی دلہن کی طرح گھونگھٹ اُٹھاتی ہے تو اپنی خیر گی کو دیکھنے والے کی فہم و فراست کا تحفہ دیتی ہے۔ میں عجیب خالی الذہنی کی سی کیفیت میں کھڑا پھٹی پھٹی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں میڈم اپنے حسن کی تمام تر جلوہ سامانیوں سمیت سر بلند کھڑی تھی۔ وہ آف وائیٹ کلر کے شاندار سوٹ میں ملبوس تھی۔ اسی رنگ

کے بکل والے بند جوتے، دستانے، فرکا دبیز کوٹ اور ہیٹ نما جالی دار اونی ٹوپی اس کی شخصیت کو اپسرائی بنا رہے تھے۔ کوٹ کے کالر کھڑے تھے جنہوں نے اس کے چہرے کو تھوڑی تک چھپا لیا تھا۔ دکھائی دینے والا آدھا چہرہ چاند کی طرح جگمگا رہا تھا۔ گزشتہ شب کی تمام تر تھکن چہرے کی تروتازگی اور تاب وتمکنت میں دم توڑ گئی تھی۔ وہ میرے غیر معمولی انہماک کو تاڑ گئی، بولی، ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے جھینپ کر کہا، ''آپ بہت خوب صورت ہیں۔ تبھی نظر ہٹائے سے نہیں ہٹتی۔''

اس کے لبوں پر فاخرانہ مسکراہٹ ابھری، ''ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں واقعی خوب صورت ہوں۔''

یہی بات اگر میں نے غزالہ سے کہی ہوتی تو کئی منٹوں تک شرماتی اور منہ چھپاتی رہتی۔

وہ دروازے میں ٹھہر گئی تھی۔ بولی، ''کافی سارا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ اگر تمہارا شوقِ دید پورا ہو گیا ہے تو ہمیں مزید وقت ضائع کئے بغیر نکل پڑنا چاہیے۔''

اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا مگر میں شرمسار ہو گیا، ''میں تیار ہوں میڈم! چلیں۔''

وہ ایڑیوں کے بل گھوم گئی اور تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کو باندھ کر کوٹ کے اندر ڈال رکھا تھا تبھی ایک لٹ بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم گیٹ وے میں آ کر رُک گئے۔ ڈرائیور پارکنگ میں سے لینڈ کروزر نکال لایا اور حکم کا منتظر ہوا۔ میڈم نے اُسے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے کا اشارہ کیا اور بولی، ''تم نے گاڑی کو اچھی طرح چیک کر لیا ناں؟''

''جی میڈم!'' ڈرائیور نے مؤدبانہ انداز میں کہا، ''فیول کم ہے۔ راستے سے ڈلوا لیجئے گا۔''

میڈم نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا اور تنقیدی نظروں سے لینڈ کروزر کے عقبی حصے میں رکھے گئے ایمرجنسی سامان کا جائزہ لینے لگی۔ مطمئن ہو کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری جھولی میں پھینکتے ہوئے بولی، ''فیول ٹینک فل کروا لینا۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''کیا ہم اسلحہ نہیں لیں گے؟''

وہ مسکرائی، ''ایک شارٹ گن، ایک کے کے گن اور دو عدد جرمن پسٹل فل امونیشن کے ساتھ ڈگی میں پڑے ہیں۔ چاہو تو ابھی اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لو۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں میڈم! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو محض یاد دلانا چاہتا تھا۔

تا کہ بھول جانے کی صورت میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے۔''

اس نے بہ غور میری آنکھوں میں جھانکا اور بڑے دلفریب انداز میں مسکرائی، ''تم نے اپنی منگیتر کے سوا کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تبھی مجھے دیکھ کر حیران ہو جاتے ہو اور کہتے ہو کہ 'آپ بہت خوب صورت ہیں'..... ہیں؟ مگر میں نے بہت سے مردوں کو دیکھا ہے۔ یہ شہر حسن سے معمور ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر یہاں نظر آتا ہے۔ میں پھر بھی تمہیں دیکھ کر دیکھتے رہنا چاہتی ہوں اور کہتی ہوں کہ 'یو آر ویری ہینڈسم.....!''

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گیٹ سے نکال کر روڈ پر ڈال دی۔ کہا، ''میڈم! میں دیہاتی ہوں۔ دیہاتی ہینڈسم نہیں ہوتے؛ مضبوط اور فولادی جسم کے مالک ہوتے ہیں۔ میری شخصیت میں دکھائی دینے والی خوب صورتی آپ کی دَین ہے۔ اپنی چیزیں مانوس اور اچھی لگتی ہیں۔''

اس کی ہنسی جلترنگ کی طرح گاڑی میں گونج گئی، بدقت ہنسی روک کر بولی، ''لباس کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ یہ نہ خوب صورت ہوتا ہے اور نہ بدصورت..... اس کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ جو پہنتا ہے، اس کے جیسا دکھائی دینے لگتا ہے۔''

میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہ کھلی کھلی اور شوخ دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنی توجہ اس کے حسنِ حشر ساماں سے ہٹانے کے لئے موضوع بدلا، پوچھا، ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیں۔''

''ہوں.....'' اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے، کچھ سوچ کر بولی، ''میں نے کینیڈا اپلٹ لڑکی کا کیس میر و شاہ کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ اس کے چچا اور چچا زاد بھائیوں، جن میں سے ایک اس کا شوہر بن چکا ہے، کے بارے میں معلومات اکٹھی کرے گا۔ واپسی پر مجھے رپورٹ دے گا۔''

''میں نے آپ کے لائحہ عمل کے بارے میں پوچھا تھا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں سمجھتی ہوں۔'' وہ بولی، ''میرا خیال تھا کہ ان دونوں کو اپنی تحویل میں رکھنے والا دوبارہ فون پر رابطہ کرے گا مگر ابھی تک اس کی کال نہیں آئی۔ میں نے دو تین مرتبہ اس کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر فون 'پاور ڈ آف' ملا۔ ہو سکتا ہے کہ اَب تب میں کسی وقت اس کی کال آ جائے۔'' اس نے تھوڑا توقف کیا، پھر بولی، ''میں نے نجی محمد کو بیٹ میں بھیج دیا ہے۔ وہ بابا کے گھر کی صفائی کرے گا اگر اس کے جانے تک پولیس وہاں نہ پہنچ گئی۔ وہاں سے جنگ و جدل کے

ثبوت اور لاشوں کو ہٹا دے گا۔ رہی بات ہماری..... ہم کیا کریں گے؟ یہ ابھی طے کر لیتے ہیں۔ تم گاڑی ناگ شاہ چوک کی طرف ڈال دو۔ اگر ہم مظفر گڑھ جانا ہوا تو دائیں مڑ جائیں گے۔ اگر بیٹ میں پیرو ماچھی کے ڈیرے پر جانے کا پروگرام بنا تو سیدھا نکل چلیں گے۔ او کے؟''

''او کے میڈم!'' میں نے تائید کی اور عزیز ہوٹل کی طرف جانے والی سڑک پر ٹرن لیا۔ کہا، ''میرا خیال ہے کہ ہمیں بیٹ خیر پور کی طرف جانا چاہیے۔ پیرو ماچھی کو اب تک اپنے گینگ کے حشر نشر کی خبر مل گئی ہوگی اور وہ اپنی باقیات سنبھالنے کے لئے ڈیرے پر آ چکا ہوگا۔ بفرض محال ایسا نہ بھی ہوا تو ہم دریا پار کر کے اس تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔''

بابا کے ڈیرے پر آخری سانسوں کے درمیان پیرو ماچھی کے دستِ راست اللہ دتہ عرف دتے ماچھی نے بتایا تھا کہ وہ روہیلا نوالی بستی کے قریب واقع جھوک لوری میں اپنے یار رجن جمیل دستی کے پاس گیا تھا۔ اس قماش کے لوگ کوئی بڑا ہاتھ مار کر دیسی شراب کے مزے لوٹنے کے لئے محفل جماتے ہیں اور ٹن ہو کر بڑھکیں مارتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی جشن منانے کے لئے دریا کے پار جمیل دستی کے ڈیرے پر گیا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کا بنا بنایا گروہ تہس نہس ہو جائے گا۔

میڈم بولی، ''تمہاری بات میرے دل کو لگی ہے۔ ٹھیک ہے؛ ہم بیٹ خیر پور جا رہے ہیں۔''

''میڈم! کیا آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ پیرو ماچھی کے ڈیرے پر پولیس نے کیوں ریڈ کیا؟''

اس نے کندھے اُچکائے، ''نہیں معلوم..... یہ چھوٹے کریمنل گینگ اس وقت پولیس کا تختہ مشق بنتے ہیں جب وہ اپنے مربی جاگیردار کو ناراض کر بیٹھتے ہیں یا پولیس حکام کی فرمائش پوری نہیں کر پاتے۔''

''کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ پولیس نے کسی درخواست گزار کی استدعا پر کارروائی کی ہو؟''

اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر سر کو دائیں بائیں حرکت دی، ''نہیں ڈیئر! پولیس اہلکاروں کے نزدیک حکام بالا، جاگیردار اور پٹے دار بدمعاش پہلی ترجیح ہوتے ہیں۔ عوام الناس کی حیثیت محض پولیس کو کھلانے پلانے اور جی حضوری کی ہوتی ہے۔''

میں نے پرانا شجاع آباد روڈ پر رواں دواں ہجوم میں گاڑی شامل کی اور حیرت سے کہا، ''پھر لاء اینڈ آرڈر کا نظام کیسے چلتا ہے؟''

وہ ہنسی اور تمسخرانہ لہجے میں بولی، ''لاء اینڈ آرڈر کیا ہوتا ہے؟ نہ تو یہاں کی عوام جانتی ہے

اور نہ ہی حکام بالا..... رہی بات نظام کی..... یہاں کوئی نظم نہیں ہے، کوئی نظام نہیں ہے۔ کیا تم نے کوئی قتل نہیں کیا؟ کیا تم نے کوئی جرم نہیں کیا؟..... تم دندناتے پھرتے ہو۔ گلی میں گالی گلوچ کرنے والے، ریڑھی سے فروٹ چوری کرنے والے اور معمولی جرائم کرنے والے آئے روز موالات کی سیر کرتے ہیں جبکہ تم لینڈ کروزر میں گھوم رہے ہو۔ کوئی وردی پوش تمہیں روکنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اپنی چھوڑو، حیدر خان کی زندگی کو دیکھو۔ اس نے ظلم و بربریت کا جل تھل کر رکھا ہے۔ کوئی ہے جو اُس پر ہاتھ ڈالے؟ اگر کوئی نظام چل رہا ہوتا تو اس کے نتھنوں میں نکیل ڈال دی جاتی..... یہاں اسے پھانسی کی سزا ملتی ہے جس کے گلے میں پھندا فٹ آجاتا ہے۔ اسے جیل بھیجا جاتا ہے جس کے سر پر چھت نہیں ہوتی۔ شہریار! جہاں ایک چپڑاسی سے لے کر آخری عہدے دار تک، سب رشوت خور اور لالچی ہوں، خواہشوں کے غلام ہوں، وہاں کوئی نظام نہیں چلتا؛ نوٹ چلتے ہیں۔''

وہ بڑے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی۔ میں نے کہا، ''میڈم! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ معاشرہ اپنی قدریں کھو چکا ہے۔''

''نہیں..... یہ معاشرہ نہیں..... سبھی معاشرے آخری سانسیں شمار کرنے پر مامور ہو چکے ہیں۔ یہ تاجرانہ اور سرمایہ دارانہ نظام قدرتی اور فطری رویوں کو نگلتا جا رہا ہے۔ انسان کو بڑی تگ و دو کے بعد مشین بنا دیا گیا ہے۔ ریشم کے کیڑے کی طرح ترقی کے نام پر اپنے گرد دنیا ریشم بن رہی ہے۔ ایک دن آئے گا جب سانس کی آخری درز بھی بند ہو جائے گی اور یہ دنیا..... ایک لمحے میں..... ٹائیں ٹائیں فش!''

میڈم نے بڑی بے رحمی سے اپنا تجزیہ پیش کر دیا اور سر جھٹک کر شیشے کے باہر زندگی کے متحرک مہروں کو دیکھنے لگی۔ اس تنگ سڑک پر بہت زیادہ ہجوم تھا۔ سڑک کی تنگی داماں میں خوانچہ فروشوں اور ہتھ ریڑھیوں نے خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔ پیدل چلنے والوں کا جم غفیر، سستی سبزیوں اور پھلوں کی تیز آواز میں دی جانے والی مسلسل ترغیب نے ماحول کو خاصا پیچیدہ کر رکھا تھا۔ مجھے ڈرائیونگ میں خاصی دقت پیش آ رہی تھی۔ علی الصبح، جب میں اس سڑک پر سے گزرا تھا، یہاں اتنا ہجوم نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے میں اس سبزی منڈی جیسے علاقے سے نکلا تو ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھتے ہوئے بولا، ''میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

میڈم چونکی، ''ہاں! کہو، کیا بات ہے؟''

میں نے چند لمحے سوچا، پھر کہا، ''میڈم! مجھے یقین ہے کہ جب ہم اس مشن سے لوٹیں گے تو سیمو اور اماں ہمارے ساتھ ہوں گے.....''

''تمہید کو چھوڑو، کام کی بات کرو۔'' میڈم نے میری بات کاٹ دی۔

''وہ..... میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ اس مشن کے بعد میں اپنی بہن کی تلاش میں نکلنا چاہتا ہوں۔ میڈم! جب بھی مجھے پروین کی یاد آتی ہے، میں ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھ پر عجیب طرح کی مایوسی سوار ہو جاتی ہے۔'' میں نے امید بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔

وہ بولی، ''شہریار! تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری بہن والا معاملہ فراموش ہو گیا ہے؟ نہیں..... ایسا نہیں ہے۔ اگر میں اتنی ہی پھلکڑ ہوتی تو اتنا بڑا نیٹ ورک نہ چلا رہی ہوتی بلکہ کسی جاگیردار کا پہلوگر مار رہی ہوتی، اس کی خوشامدیں کر رہی ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ تم حالات کی کس ڈگر پر مجھے ملے تھے۔ مجھے بہ شدت یاد ہے کہ تمہیں ماں باپ کے اندوہ ناک قتل کا انتقام لینا ہے۔ تمہیں اپنے چچا اور چچی کے قاتل تک پہنچنا ہے۔ تمہیں اپنی بہن اور اسے اغوا کرنے والے تک پہنچنا ہے..... مگر شہریار! تمہارے سامنے سردار حیدر خان کے سوا کوئی چہرہ نہیں ہے۔ تمہارا دوست امیر نواز گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہے۔ خالد نور پور جا کر تمہیں بھول بیٹھا ہے۔ سوائے انتظار کے، کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ بہر حال! تم فکر نہ کرو۔ واپسی پر تمہیں بھرپور موقع دوں گی۔''

میں نے احساسِ تشکر سے مغلوب ہو کر کہا، ''شکریہ میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔''

کوئی دس منٹ بعد ہم ناگ شاہ چوک پہنچ گئے۔ میں نے ایک پٹرول پمپ سے فیول ٹینک فل کرایا۔ ادائیگی کی اور مستفسر نگاہوں سے میڈم کو دیکھا۔ وہ بولی، ''سیدھا چلو..... ہمیں بیٹ خیر پور جانا چاہیے۔''

''کیا سخی محمد بیٹ روانہ ہو چکا ہے؟''

''ہاں! وہ ہم سے آدھا گھنٹہ پہلے نکلا تھا۔ اب وہاں پہنچ چکا ہوگا۔''

''کیا اس نے ڈیرہ دیکھ رکھا ہے؟''

''نہیں..... مگر چالاک آدمی ہے۔ پہنچ جائے گا۔''

''کیا وہ اکیلا گیا ہے؟'' مجھے تشویش ہوئی۔

''نہیں..... میر وشاہ نے اس کے ساتھ دو آدمیوں کو تیار کیا تھا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے اپنی داہنی شہادت انگلی کی اگلی پور نچلے ہونٹ کے داہنے گوشے پر رکھی اور سلوموشن کے انداز میں بڑھاتے ہوئے بائیں گوشے تک لے گئی پھر واپس دونوں ابھاروں کے درمیان تک لائی اور انگلی کی پور کو چوم کر مسکرانے لگی۔ اپنی ہی ادا میں وارفتگی سے کھوئی ہوئی میڈم شکیلہ نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے لیا۔ دل نے تڑپ کر کہا، 'میڈم زمانے سے مختلف ہے'..... دماغ نے کچوکا دیا، 'نہیں..... زمانہ ہر نئی ادا سیکھنے کے لئے اس کے پاس آن ٹھہرتا ہے'.....

ہم ڈابر پہنچے تھے کہ میڈم کے فون کا بزر بجنے لگا۔ میڈم نے فون نکالا، سکرین پر بلنک کرنے والا نمبر دیکھا اور تیزی سے بولی، ''شہریار! گاڑی روڈ سائیڈ پر روک دو۔''

میں نے گاڑی روک دی۔ اس نے کال ریسیو کرنے والا بٹن پش کیا اور فون کان سے لگا کر خاموشی سے کال کرنے والے کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بولی، ''ہاں! بول رہی ہوں۔''

میں نے دیکھا کہ میڈم کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے۔ وہ اب نٹ کھٹ حسینہ دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ عجیب موت انگیز سختی اس کے اعصاب میں رچا بس کر چکی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میڈم کو جس شخص کی کال کا انتظار تھا، شعلہ بار آنکھوں سے ڈیش بورڈ کو گھورتے ہوئے اسی کی آواز سن رہی تھی۔ کوئی منٹ بھر کے بعد بولی، ''نہیں..... میں تمہارا مطالبہ نہیں پوچھوں گی کیونکہ میں تمہاری کوئی بھی ڈیمانڈ پوری کرنے کی روادار نہیں ہوں۔ رہی بات ان لوگوں کی، جنہیں تم نے اغوا کر رکھا ہے، ان سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چاہو تو انہیں گولی مار کر پھینک دو، چاہو تو انہیں ان کے گھر پہنچا دو۔''

دوسری طرف سے ایسا کچھ کہا گیا کہ میڈم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، دانت پیس کر بولی، ''کہا ناں کہ مجھے تمہاری یا ان لوگوں کی کوئی پروا نہیں۔ تم دلیر دشمن نہیں ہو۔ بزدل شخص ہو ورنہ آواز بدل کر باتیں نہ کرتے۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم ہمیشہ میری نظروں سے چھپے رہو گے؟ نہیں..... اگر چاہوں تو تمہیں آدھے گھنٹے میں پاتال سے کھینچ نکالوں مگر میرے نزدیک تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

میں کوشش کے باوجود فون سے پھوٹنے والی بھنبھناہٹ کو سمجھنے میں قاصر تھا۔ میڈم نے فون سیٹ کے عقب میں نصب ننھے سے اسپیکر پر اپنی ہتھیلی رکھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے آواز محض اس کے کان تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ میں خواہش کے باوجود اسے لاؤڈر آن کرنے کا مشورہ

نہ دے پایا۔ وہ اپنی آواز سے بیزاری مترشح کرتے ہوئے بولی، ''دیکھو! میں اس وقت ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے جا رہی ہوں۔ تم پھر کسی وقت فون کرنا اور اپنا مطالبہ بیان کرنا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے فون کان سے ہٹایا اور کال منقطع کر دی۔ مجھے گاڑی چلانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی، ''میرا انتظار کرو؛ میں خود ہی تمہاری ڈیمانڈ شیٹ لینے کے لئے آ رہی ہوں..... ویٹ فار داڈیٹھ.....''

میں نے پوچھا، ''کون تھا میڈم؟''

''پہچان نہیں پائی۔ وہ کم بخت آواز بدل کر بول رہا تھا۔'' وہ برہمی سے بولی۔

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ناگاہ میری نگاہ عقب نما میں پڑی۔ میں چونک گیا۔ میرے عقب میں گہرے نیلے رنگ کی ٹویوٹا کرولا چلی آ رہی تھی۔ گاڑی کو پہچانتے ہی میری رگوں کا خون میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ میں اس گاڑی اور اس کے مالک کو کبھی بھی بھول نہیں سکتا تھا۔ یہ زورآور کی کار تھی۔ میں نے میڈم سے کہا، ''زورآور کی گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔''

میڈم نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ بولی، ''اِسے اوورٹیک نہ کرنے دینا ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔ ہم فائٹنگ پوزیشن میں نہیں ہیں کیونکہ ہمارا اسلحہ ڈگی میں پڑا ہے۔''

میں نے تیزی سے کہا، ''وہ ہمارا ٹائر برسٹ کر سکتا ہے۔''

ہم سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ ہمیں چاہیے تھا کہ گنیں اور پسٹل اپنی دسترس میں رکھتے تاکہ کسی بھی ناگہانی صورتِ حال میں پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں لینڈ کروزر کی رفتار بڑھا دی کیونکہ میں یا میڈم فی الفور ڈگی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

ڈارک بلو کار کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ میں نے بیک مرر میں کار میں بیٹھے ہوؤں کی شکلیں دیکھنے کی کوشش کی مگر کار کی فرنٹ سکرین پر پڑنے والی روشنی کے انعکاس کے باعث کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ زورآور کی کار اچانک کس طرف سے نکل کر ہمارے عین عقب میں آن پہنچی تھی۔ میں ناگ شاہ پہنچنے تک خاصا محتاط رہا تھا اور اپنے پیچھے آنے والی ٹریفک کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تب تک یہ کار مجھے دکھائی نہیں دی تھی۔ زورآور خطرناک شخص تھا اور اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ اس سے بچنا ضروری تھا۔

سڑک خالی تھی جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں اسپیڈومیٹر کی سوئی کو ایک سو تیس کے

ہند سے پر تھرکانے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر عقب نما میں دکھائی دیتی ہوئی ڈارک بلو کار مسلسل خطرے کی گھنٹی بجاتی چلی آ رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں میڈم کے فون کا بزر بجا۔ اس نے سکرین پر جگمگانے والے ہندسوں کو بہ غور دیکھا اور بڑبڑائی، ''زورآور فون کر رہا ہے۔''

ساتھ ہی اس نے کال ریسیو کر لی، بولی، ''ہیلو ینگ مین! کیسے میری یاد آ گئی؟''

زورآور کی بات سنتی رہی، پھر مجھے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی روکنے کا حکم دیتے ہوئے بولی، ''اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔ لو! میں نے گاڑی رکوا دی ہے۔''

لینڈ کروزر رک گئی۔ ڈارک بلو کار ہمارے عقب میں آن رکی اور زورآور ڈرائیونگ گیٹ کھول کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میڈم کے طرف بڑھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میڈم نے شیشہ اُتارا اور اپنا دستانے میں ملفوف ہاتھ باہر نکالا، ''ہیلو ینگ مین! کیسے ہو؟''

زورآور نے ہاتھ تھاما، شوخی سے بولا، ''آپ اپنا ہاتھ بھی دیتی ہیں تو دستانے میں چھپا کر..... چلیں! اسی پر گزارا کر لیتے ہیں۔ سنائیں! کدھر جا رہی ہیں؟''

اس نے اپنے دونوں ہاتھ دروازے پر رکھے اور قدرے جھک گیا۔ وہ دانستہ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ میڈم بولی، ''ایک شادی میں شرکت کی غرض سے شجاع آباد جا رہی ہوں۔''

وہ زیرلب ہنسا، ''آپ جیسی عظیم ہستی کے پاس اتنا وقت کہاں کہ ایسے فضول فنکشن اٹینڈ کرتی پھریں۔ میرے لائق کوئی حکم ہو تو صادر کیجئے۔ بندہ حاضر ہے۔''

میڈم ہنسی، ''نہیں ینگ مین! تم بہت اچھے ہو۔ آئی لو یو..... رہی بات تمہارے لائق کسی کام کی، تو یقین مانو کہ جب بھی مجھے تم سے کوئی کام پڑا، میں رائی بھر تکلف نہیں برتوں گی کیونکہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔''

زورآور نے نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا، ''میڈم! آپ نے کہا تھا کہ استاد موبی کا قاتل آپ تک پہنچا تو آپ اسے میرے حوالے کر دیں گی کیونکہ آپ کو بھی موبی اتنا ہی پیارا تھا جتنا مجھے..... پھر آپ نے مجھے اور موبی کی روح کو دھوکہ کیوں دیا؟ اس کے قاتل کو اپنے پہلو میں کیوں جگہ دی؟''

بے چینی کی ایک لہر میرے تن بدن میں پھر گئی۔ میڈم سنجیدہ ہو گئی، بولی، ''زورآور! میں نے کل جھوٹ بولا تھا نہ آج بولتی ہوں۔ شہریار موبی کا قاتل نہیں ہے۔ اس کے قاتل کا معاون بھی نہیں ہے۔''

''خالد اس کا لنگوٹیا یار ہے میڈم!'' زور آور کے لہجے میں غیر معمولی کاٹ پنہاں تھی۔

''دوست ہونا بڑی بات نہیں ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ تمہارے دوست کے قتل میں شریک نہیں تھا۔ تم نے خود بتایا تھا کہ موبی اس کا خون کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک ہی موبی پر وار کر دیا۔ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس کا وار چل جاتا ہے، وہی الیگزینڈر قرار پاتا ہے۔ تم اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ شہریار نے موبی پر فائر نہیں کیا تھا اور خالد کے ساتھ اس کی موجودگی محض اتفاق تھی۔ دوبارہ یہ خالد سے کبھی نہیں ملا اور نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ تمہارے خوف سے کہیں روپوش ہے۔ جب دکھائی دیا، تمہیں انفارم کر دوں گی۔'' میڈم نے قدرے سخت اور بااعتماد انداز میں کہا۔

''یہ کئی بار میرے ہاتھوں مرنے سے بچ گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ اگلی مرتبہ جب میں اس کے سر پہنچوں تو اسے زندہ چھوڑ دوں۔ اسے بھی خالد کے ساتھ ہی کہیں روپوش کر دیں تو بہتر ہے۔'' زور آور کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔

میں کچھ کہنے چلا تھا کہ میڈم نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا حکم صادر کیا اور زور آور سے مخاطب ہوئی، ''دھمکی دے رہے ہو؟''

''نہیں..... اپنے اندر جلتی ہوئی آگ کی شدت سے آگاہ کر رہا ہوں۔''

''اس آگ کو اپنی طاقت بناؤ۔ کمزوری بناؤ گے تو کہیں کے نہیں رہو گے۔'' میڈم کا لہجہ خشک ہو گیا، ''شہریار کی اس حیثیت کو مدنظر رکھو کہ یہ میرا دوست ہے۔''

زور آور نے معنی خیز انداز میں ایک زہریلی مسکراہٹ اُچھالی اور بولا، ''میڈم! شہریار کی طرف میرے بڑے حساب نکلتے ہیں۔ خیر..... آپ کی موجودگی میں آپ کے شاہ زور پر ہاتھ ڈالنے کو دل نہیں مانتا۔ دل آپ کا دیدار مانگتا تھا، وہ مل گیا۔ اب میں چلتا ہوں۔''

میڈم بڑی فرحت سے مسکرائی، بولی، ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں بھی ایک دوست کی شادی میں شرکت کی غرض سے شجاع آباد جا رہا ہوں۔''

''چوٹ نہ کرو، سیدھی طرح بتاؤ۔''

''شجاع آباد سے آگے ایک بستی ہے سومن..... وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ رفاقت خان۔ وہ کسی مصیبت میں ہے اور اس نے مجھے فون کر کے بلایا ہے۔ اس کی مدد کے ارادے سے اس کے ڈیرے پر جا رہا ہوں۔ گڈ بائے میڈم شکیلہ جی! سی یو اگین وین ہارٹ دل جمپ ٹو یو.....''

اس نے عاشقانہ انداز میں میڈم کا دستانے میں چھپا ہوا ہاتھ تھاما، لبوں اور آنکھوں سے لگایا اور ہاتھ لہراتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے عقب نما میں دیکھا۔ زاویے کی تبدیلی کی وجہ سے اس کی گاڑی کی فرنٹ سکرین کے پار دکھائی دے رہا تھا۔ زورآور اکیلا ہی اپنے دوست رفاقت خان کی اعانت کی غرض سے بستی سومن جا رہا تھا۔

میں نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا، ''میڈم! رفاقت خان وہی ہے جس نے کینیڈا اپلٹ نگینہ سے نکاح پڑھوایا ہے۔ نوروز خان کا بیٹا.....''

''اوہ یس..... مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔'' میڈم کے ہونٹ سکڑ گئے، ''اس کا مطلب ہے کہ رفاقت خان ہمارے لئے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا، ''بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ زورآور کا دوست عام خصوصیات کا مالک نہیں ہو سکتا۔''

''میرا خیال ہے کہ زورآور اور رفاقت خان نگینہ کو تلاش کرتے ہوئے ہم تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ ہم نے اپنے پیچھے کوئی ایسا کلیو نہیں چھوڑا۔''

''جی میڈم! بشرطیکہ یہ لوگ ایل ایچ ڈی مس عالیہ تک نہ پہنچ جائیں۔'' میں نے اپنے اندیشے کا مبہم اظہار کیا۔

اس نے کندھے اُچکائے اور لاپروائی سے بولی، ''جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ فی الحال ہمیں اپنی توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ زورآور کو آگے نکلنے دو۔''

میں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ زورآور ہارن بجاتا ہوا آگے نکل گیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی شجاع آباد کی طرف عازمِ سفر تھیں۔ شہر کے مضافات میں پہنچ کر میں نے سوالیہ نظروں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ بولی، ''زورآور شہر میں سے گزر کر سومن کی طرف جائے گا جبکہ ہم اسی راستے پر جائیں گے، جس راستے پر پہلے گئے تھے۔ مین روڈ چھوڑتے ہی رفتار بڑھا لینا۔''

اس نے مجھے سمجھایا کہ زورآور شہر کے بیچ سے گزر کر سومن جانے والی سڑک پر جائے گا۔ ہم بھی اُسی سڑک پر شہر میں داخل ہوئے بغیر سپر بند، نہر اور سڑکوں کے اتصال پر جا چڑھیں گے۔ چونکہ زورآور کے راستے میں شہر کا بے پناہ ہجوم حائل تھا، اِس لئے ہم اس سے کہیں پہلے سومن والی سڑک پر پہنچ کر پونے والی سڑک پر اُتر جائیں گے۔ تیز رفتار رکھنے کی وجہ سے ہمارے ٹکراؤ

کے چانس مزید کم ہو جائیں گے۔ میں نے میڈم کی ہدایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مین روڈ سے اُترتے ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

بیٹ خیر پور اور پونٹا جانے والی سڑک پر اترنے تک ہمیں زور آور کی گاڑی دکھائی نہیں دی اور یوں ہم اس کی نظروں میں آئے بغیر تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ہسپتال کے پاس سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر ہماری نظریں چار دیواری کے اوپر سے رہائشی کالونی پر جمی رہیں۔ شکر ہوا کہ مس عالیہ یا اس کا شوہر ہمیں دکھائی نہیں دیا۔

''میڈم! کیا آپ نخی محمد کے کام کا جائزہ لینا چاہیں گی؟''

''نہیں..... پیرو ماچھی کے ڈیرے پر چلو۔ مبادا کہ وہ جھوک لوری سے واپس آ گیا ہو اور دل پر ہاتھ رکھ کر اپنی اجڑی ہوئی دنیا ملاحظہ کر رہا ہو۔''

اس کا لہجہ بڑا طنزیہ تھا۔ پختہ سڑک ختم ہو گئی اور ناہموار زِگ زیگ راستہ شروع ہو گیا۔ دریائی فضا میں رچی ہوئی مخصوص مہک نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ میں نے پوچھا، ''میڈم! آپ نے سوچا تو ہوگا کہ آپ کے کمزور پہلو پر ہاتھ ڈالنے والا کون ہو سکتا ہے؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر قدرے متردد انداز میں بولی، ''میرا خیال ہے کہ سردار حیدر خان اور اس کا دستِ راست استاد ببلو متحرک ہیں۔ خان اپنی بیٹی کو بازیاب کرانے کے چکر میں لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ اس نے زندگی بھر اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی، یہاں تو ناک کٹنے کا معاملہ درپیش ہے۔''

''پیرو ماچھی کے پیچھے یہاں آنے سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا اگر ہم ڈائریکٹ ایکشن کرتے ہوئے سردار حیدر خان پر حملہ کرتے۔''

''کہاں؟'' وہ کڑی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ''اس نے اماں اور سیمو کو کہاں چھپا رکھا ہے، یہ کیسے علم ہوگا؟''

مجھے تھوڑی شرمندگی ہوئی، ''سوری میڈم! میں نے رائے پیش کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''پیرو ماچھی جانتا ہے کہ اُس نے دونوں کو کس کے کہنے پر اغوا کیا اور انہیں کہاں پہنچایا۔ یقیناً وہ اب تک وہاں موجود نہیں ہوں گے، جہاں پیرو ماچھی انہیں چھوڑ آیا ہوگا مگر وہاں سے ہمیں کلیو مل سکتا ہے۔'' میڈم بولی، ''یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حرامزدگی سردار حیدر خان کے بجائے

کسی اور نے کی ہو اور ہم حیدر خان پر اپنا وقت ضائع کرتے رہیں۔''

''آپ اگر اغوا کار کا مطالبہ سن لیتیں تو یقیناً یہ واضح ہو جاتا کہ ہمارا دشمن کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... میں اپنی کمزوری اس پر عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اب مخمصے میں پڑ گیا ہے۔ اس صورتِ حال پر غور کر رہا ہوگا۔ اسے پینترہ بدلنے میں کچھ دیر لگے گی۔ مجھے یقین ہے کہ میں تب تک اس کی گردن دبوچ لوں گی۔''

میڈم کے لہجے میں غیر معمولی اعتماد اور خنکی سمٹی ہوئی تھی۔ دریا کی چمکتی ہوئی لکیر دکھائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اُس ڈھنڈ پر پہنچ گئے جس کے کنارے پر رات کو میڈم کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ میں نے پوچھا، ''میڈم! زخم کی حالت کیسی ہے؟''

''کون سے زخم کی؟'' میڈم چونکی پھر مسکرا کر بولی، ''اچھا..... وہ ڈنڈے کا زخم..... کم بخت نے زور کا وار کیا تھا۔ اب ٹھیک ہے۔ چھیڑنے سے دکھتا ہے، ویسے نہیں۔''

میں نے ڈھنڈ کے پاس ریتلی جگہ پر گاڑی روک دی۔ میڈم گنگنائی، ''لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے..... یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے.....''

اس کی نظریں اُس ننھے سے ٹیلے پر جمی ہوئی تھیں جہاں اسے بے ہوش کرنے کے بعد چت لٹا کر مراد بخش اس پر چڑھ بیٹھا تھا۔ میں نے گاڑی سے اُتر کر ڈگی کھولی۔ وہاں ایک کمبل، پانی، رسی کے دو تین گچھے اور ایک بیگ پڑا تھا۔ میڈم نے قدرے بلند آواز میں کہا، ''گنیں کمبل کے نیچے پڑی ہوں گی۔''

میں نے کمبل کھینچا۔ نیچے پڑی ہوئی دونوں گنیں اور پسٹل نکالے۔ میگزینیں چیک کر کے چڑھائیں اور اضافی راؤنڈ اُٹھا کر میڈم کے پاس آ گیا۔ میڈم نے اپنے لئے کے کے گن اور پسٹل لے لیا۔ پسٹل روایتی جسامت کے تھے۔ اسلحہ با اہتمام سنبھالنے کے بعد میں نے پیرو ماچھی کے ڈیرے کا رُخ کیا۔

وہاں پہنچ کر ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈیرے کا منظر جوں کا توں تھا۔ تین قد آور کتے مراد بخش کی لاش کے قریب صحن میں اداس اور پریشان حال بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بھونکتے ہوئے دور چلے گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے مراد بخش کی لاش کو منہ تک نہیں لگایا تھا۔ انہوں نے مراد بخش کی آنکھ کے ڈیلے اور چھچھڑوں کو بھی نہیں کھایا تھا۔ میرے منہ سے ب

ساختہ نکلا، ''میڈم! کتا گوشت خور جانور ہے۔ گوشت سامنے پڑا ہے مگر کتوں نے اسے اپنی سرشت کے برعکس سونگھا تک نہیں..... ہے نا عجیب بات!''

میڈم نے مراد بخش کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا، ''پالتو کتے اپنے مالک کا ماس کیسے کھا سکتے ہیں شہریار! مراد بخش انہیں آج تک کھلاتا پلاتا آیا تھا، کیسے اس کے ہاتھ پیران کی خوراک بن جاتے.....''

میں نے دیکھا کہ صحن کے پار بلند قامت درخت کے نیچے کھڑے تینوں کتے ہماری جانب منہ کئے کھڑے تھے۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے ان کی فطری بے چینی اور اضطراب عیاں تھا۔

ڈیرے کے سرسری جائزے سے صاف عیاں تھا کہ وہاں کسی نے میرے بعد قدم نہیں رکھا تھا۔ اگر پیرو ماچھی نے اس علاقے کو اپنی کمین گاہ بنایا تھا تو بلاوجہ نہیں بنایا تھا۔ کئی گھنٹے گزرنے کے بعد بھی پیرو ماچھی کے ڈیرے پر ہونے والے قتل اور پولیس ریڈ کی خبر نہیں پھوٹی تھی۔ کسی نے ادھر آنے کی زحمت نہیں کی تھی حالانکہ فائرنگ کی آواز اطراف میں کافی دور تک سنی گئی ہوگی۔ یقیناً پیرو ماچھی کی دہشت نے کسی کو ادھر نہیں آنے دیا تھا۔ سردار حیدر خان نے دریائے سندھ کے بیلے کو اپنی بدمعاشیوں کی آبیاری کے لئے مختص کر رکھا تھا۔ چناب کے بیٹ پر ان گنت شاہ زوروں کا قبضہ تھا۔ دریاؤں میں پانی کم ہونے کی وجہ سے بیلے کا علاقہ خاصا سمٹ گیا تھا مگر اپنی خون ریزی سمیت ابھی تک موجود تھا۔ ان جنگلی اور دریائی علاقوں میں قانون کی عملی طور پر مداخلت بہت کمزور تھی۔ یہاں وہی کچھ ہوتا تھا جو جانوروں کی دنیا میں روا ہوتا ہے۔ طاقت کا استعمال اور فتح بہ زورِ جنگ وجدل!

میڈم فیصلہ کن انداز میں بولی، ''ہمیں یہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ طے ہے کہ پیرو ماچھی یہاں نہیں آیا۔ وہ ابھی تک جھوک لوری میں اپنے دوست کے پاس مقیم ہے۔ اسے اپنے گروہ پر بیتنے والے واقعات کی خبر نہیں ہوئی۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے پتہ چل گیا ہو اور وہ روپوش ہو گیا ہو۔'' میں نے عندیہ دیا۔

وہ بولی، ''ہاں..... چلو..... دریا پار کرتے ہیں۔''

اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ مراد بخش کی لاش پر ڈالی اور پلٹ کر گاڑی کی طرف چل دی۔ میں نے قدم ملائے۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر دریا پر موجود تھے۔ میڈم نے مجھے اس طرف چلنے کا حکم دیا

جس طرف سے پانی آ رہا تھا۔ دریا کے عمومی کٹاؤ نے سطح زمین کو غیر معمولی طور پر ناہموار کر رکھا تھا۔ کہیں اچانک دس بارہ فٹ اونچی ریتلی زمین کا تخت بچھ جاتا تو کہیں قدِ آدم گڑھا اچانک نمودار ہو جاتا۔ بیل ریڑھیوں اور ٹریکٹروں کی آمد و رفت کے باعث زگ زیگ انداز میں دو متوازی لکیروں پر مشتمل راستہ دور تک جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ میڈم نے مجھے خبردار کیا تھا کہ ان لکیروں سے ہٹنے کی صورت میں گاڑی کچی جگہ پر پھنس جائے گی۔ چونکہ دریا کی چھوڑی ہوئی جگہ پر چکنی مٹی کی تہہ جمی نظر آ رہی تھی جس کے نیچے موٹی ریت والی زمین تھی، اس لئے ایسی جگہوں پر گاڑی کا اچانک پھنس جانا بعید از امکان نہیں تھا۔ کوئی ڈیڑھ فرلانگ کا سفر طے کرنے کے بعد ایک دوراہا دکھائی دیا۔ میڈم بولی، ''یہاں سے بائیں ہاتھ ٹرن لو۔''

میں نے گاڑی موڑی۔ ہمارا رُخ رواں دریا کی طرف ہو گیا۔ دو تین منٹ بعد ہم ایک چبوترا نما جگہ پر پہنچ کر رُک گئے۔ ہمارے عین سامنے کوئی ڈیڑھ سو فٹ چوڑے پاٹ والا دریا بہہ رہا تھا۔ موسم سرما کی وجہ سے پانی گدلا نہیں تھا بلکہ اس کی رنگت سبزی مائل تھی۔ ہم نیچے اترے اور پیدل چلتے ہوئے کنارے تک چلے گئے۔ میڈم نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنایا اور چڑھتے رُخ دیکھتے ہوئے بولی، ''وہ رہا بیڑا..... ہم اس بیڑے کے ذریعے اپنی گاڑی کو دریا کے پار لے جا سکتے ہیں۔ بیڑے والے کو آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کرو۔''

میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں بیڑے کو دیکھ لیا۔ زیادہ فاصلے کی وجہ سے بیڑے کی جسامت عام کشتی کے برابر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنایا اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت بروئے کار لاتے ہوئے آواز دی، ''اوئے!''

یکے بعد دیگرے میں نے کئی آوازیں دیں مگر بیڑے پر کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بیڑے کا ملاح بیڑہ لانگر کر کے کہیں دور گیا ہوا تھا۔ میڈم بولی، ''تم اُس طرف جاؤ، بیڑے کے قریب ترین مقام پر کھڑے ہو کر اپنا لاؤڈ سپیکر چلاؤ۔''

میں چڑھتے رُخ پیدل چل پڑا کیونکہ گاڑی کو ادھر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ چند قدم چلا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جو میں نے ڈھنڈ پر دیکھا تھا جب میں جھنگی میں سے اسلحہ اُٹھانے کے لئے گیا تھا۔ مراد بخش نے میری عدم موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈنڈے کے زوردار وار سے میڈم کو زمین پر بچھا دیا تھا۔ میں پلٹ کر کھڑا ہو گیا، بولا، ''میڈم! گاڑی کو کوئی خطرہ نہیں، آپ میرے ساتھ آ جائیں۔''

میڈم نے کچھ سوچا پھر ہنس پڑی۔ بولی، ''ارد گرد کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم جاؤ۔''

میں رکا رہا۔ وہ بولی، ''جاؤ ناں!''

میں نے کہا، ''پلیز میڈم! آپ میرے ساتھ آ جائیں۔ دیکھیں، دریا کی فضا کتنی جاندار ہے۔''

''میں دریا کی فضا میں سانسیں لے رہی ہوں۔'' وہ بولی مگر اس نے میری بات مان لی۔ قریب آئی اور اپنا ہاتھ تھماتے ہوئے بولی، ''میں مراد بخش پر قابو پا سکتی تھی اگر میں تن آسان نہ ہو جاتی۔''

''میرا کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں نے آپ کی فائٹنگ دیکھ رکھی ہے..... بلکہ بھگت رکھی ہے۔ آپ بہت مضبوط ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ حادثہ کسی بھی لمحے رونما ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں گیلی زمین پر چلتے ہوئے بیڑے کے عین مقابل مقام کی طرف جا رہے تھے۔

میڈم بولی، ''مجھے تمہارے ساتھ اس تنہائی میں چلنا بڑا اچھا لگ رہا ہے۔''

''یہ میری خوش بختی ہے۔'' میں مختصراً اپنی قلبی کیفیت آشکار کی۔

''ہوم..... کیا تم اپنی منگیتر کو کسی ایسی رومانوی جگہ پر لے کر گئے ہو؟''

میں چونکا۔ وہ بڑے رسان سے چٹکی لیتی تھی۔ کہا، ''نہیں میڈم! دریائے سندھ نور پور سے خاصے فاصلے پر بہتا ہے۔''

''میں نے دریا کی بات نہیں کی، رومانوی جگہ کی بات کی ہے۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''ویسے تو نور پور بذات خود رومانوی گاؤں ہے۔'' میں نے جواب دیا، ''لیکن غزالہ کو بالخصوص میں کسی بھی جگہ پر لے کر نہیں گیا۔''

''کبھی موقع ملا تو لے جاؤ گے؟''

''میرا نہیں خیال کہ میں اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانے کے قابل کبھی ہو پاؤں گا۔'' میں نے اسپاٹ انداز اختیار کیا، ''میرا سفر مجھے روز بروز میرے آبائی گاؤں سے دور لے جا رہا ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ میں کبھی لوٹ کر نور پور نہیں جاؤں گا۔''

''تم چاہو تو اُسے اپنے پاس بلا سکتے ہو۔''

''ہاں اگر وہ اپنا گاؤں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگی۔''

''کیوں؟ وہاں ایسا کیا رکھا ہے جسے وہ دیکھتے رہنا چاہتی ہے؟'' وہ رک کر مجھے دیکھنے لگی۔
میں نے نظریں چُرالیں۔ کہا، ''شاید ایسا کچھ بھی نہیں ہے مگر ہم دیہاتی لوگ بڑے روایت پسند ہوتے ہیں۔ اپنی روایات اور اقدار سے ہٹنا ہمارے لئے ممکن نہیں رہتا۔''

''تم بھی تو اسی روایت کا حصہ ہو۔''

''جی میڈم!'' میں نے لاجواب ہو کر کہا، ''مگر شاید میرا اور غزالہ کا ملن قسمت میں نہیں لکھا۔''

''قسمت؟'' وہ ٹھٹک کر بولی، ''واٹ ڈو یو مین؟ کیا تم اپنے پیدا کردہ فاصلوں کو قسمت سے موسوم کرنے لگے ہو؟''

''جی میڈم! انسانوں کی زندگی کے فیصلے اوپر ہوتے ہیں۔ نیچے صرف بساط بچھی ہے جس پر ہم مہروں کی طرح متحرک رہتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے، مگر نہیں.....'' اس کی آنکھیں جلنے بجھنے لگیں، ''شہریار! اپنی حماقتوں پر قسمت کی ترپال نہیں ڈالنی چاہیے۔ ہم وہی فصل کاٹیں گے، جو ہم بوئیں گے۔ اگر میں اور تم یہاں، اس وقت، اس حالت میں موجود ہیں تو یہ ہمارا کیا دھرا ہے۔ تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم جس فضا میں اُڑ رہے ہو، وہاں تمہاری منگیتر، غزالہ، ہرگز فٹ نہیں ہوتی۔''

میں نے سر جھکا لیا۔ اس کی باتوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ بولی، ''تمہاری ترجیحات بدل گئی ہیں۔ تم بے وفائی کا ارتکاب کرنے پر مائل ہو۔ کیا میں نے غلط کہا ہے؟''

میں نے جلدی سے اس کی تصحیح کرنا چاہی، ''نہیں میڈم! آپ نے یہ رائے قائم کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جب سے میری بہن پر قیامت ٹوٹی، تب سے اَب تک میں نے غزالہ یا کسی بھی شخص کے بارے میں نہیں سوچا۔ جب وہ مل جائے، تب میں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سوچ پاؤں گا۔''

میڈم نے قدم بڑھائے۔ سر جھٹکا اور بولی، ''شاید تم غلط کہہ رہے ہو۔ محبت حالات کے تابع نہیں ہوتی۔ عشق پر پیچ راستوں پر عافیت کے گوشے نہیں تلاشتا۔ پروین کا دُکھ اپنی جگہ، غزالہ کی یاد کا تناؤ اپنی جگہ..... تم شاید سوچوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے یہ اسٹوپا اپنے سامنے کھڑا کرتے ہو۔''

میں نے مبہم انداز میں کہا، ''شاید ایسا ہی ہو۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میری وجہ سے ڈبل مائنڈڈ ہو گئے ہو؟''

''جی!'' میں چونکا، ''نہیں میڈم! میں آپ کو اس تناظر میں دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟ کیا میں عورت نہیں ہوں؟'' اس کی آواز میں خفگی کا ہلکا سا تاثر موجود تھا۔

''آپ کیا ہیں؟ یہ میرا دل جانتا ہے۔ زبان تک وہ احساسات رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ ہاں! یہ ضرور کہوں گا کہ آسمان اور زمین کا قسمت نے کہیں ملن نہیں لکھا، کہیں جوڑ نہیں بنتا۔''

''یعنی تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟''

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ سچ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔ جھوٹ بولنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ وہ بولی، ''سچ کہو..... دلیر اور بہادر انسان کے لبوں پر جھوٹ نہایت بدصورت لگتا ہے۔''

میں رُک گیا۔ اس کا ہاتھ میری گرفت میں تھا، اسے ناچار رُکنا پڑا۔ میں نے کہا، ''میڈم! کوئی اور بات کریں۔''

''میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

میں گڑبڑا گیا۔ سچ کیا تھا؟ کیا بتاتا، کہ میں نے ابھی تک خود بھی اپنی حیثیت اور مقام کا تعین نہیں کیا تھا۔ کہا، ''میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔''

''وقت ضائع نہ کرو، سیدھی بات کرو۔'' وہ گھٹنوں کے بل ریت پر بیٹھ گئی۔ میں بھی دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا، دونوں بانہیں پوری وسعت میں فضا میں لہرائیں اور بولی، ''قدرت کے حسن کو دیکھو۔ کتنی خوبصورتی رچی بسی ہے۔ یہ ریت کتنی پیاری ہے، یہ پانی، وہ درخت، وہ جھاڑیاں..... ہر چیز میں ندرت ہے۔ جانتے ہو، کیوں؟..... میں بتاتی ہوں۔ اس زمین تک بناوٹ اور انسانی توڑ پھوڑ کا عمل نہیں پہنچا۔ اس زمین کے ان گنت گوشے کنوارے ہیں۔ درخت ان چھوئے ہیں، پانی میلا نہیں ہے.....؟ ہاں! جب ان کی اصلیت داغ دار ہو جائے گی اور جھوٹ کی فصل اس زمین پر بوئی جانے لگے گی، پھر اس کا حسن ماند پڑ جائے گا۔ ہے ناں؟''

اس کی آواز مخصوص ترنم کے بہاؤ پر لرزاں تھی اور آنکھوں میں زندگی کروٹیں لیتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی زندگی میں دکھ یا تکلف نام کی کوئی شئے نہیں تھی۔ وہ بس وہی کچھ تھی، جو دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کہا، ''میڈم! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''

وہ بولی، ''میں جانتی ہوں۔ تم میرے سوال کا دوٹوک جواب دو؛ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ یا نہیں؟''

میں نے سر جھکا لیا، کہا، ''میڈم! اگر میں کہوں کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتا تو پھر میری ذات زیرِ عتاب آ جائے گی۔ آپ نے مجھے اپنے التفات اور توجہ کا عادی کر دیا ہے۔ جب نظر انداز کیا جاؤں گا تو بہت تکلیف محسوس کروں گا۔ اس لئے میں اپنے منہ سے کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں آپ سے محبت نہیں کرتا۔''

وہ بڑی توجہ سے مجھے سننے لگی۔ میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا اور بات بڑھائی، ''آپ کیا ہیں؟ یہ میرا دل جانتا ہے۔ آپ سے بڑھ کر دنیا کا کوئی حسین وجود میری نظر میں نہیں ہے۔ آپ یکتا ہیں۔ منفرد ہیں۔ ہزاروں کیا، لاکھوں آپ کی دید کو ترستے ہیں اور میرا بخت مجھے آپ کے قرب کی لازوال گھڑیاں بخشتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں تو یہ عجیب اور مضحکہ خیز صورتِ حال ہوگی۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ..... میں آپ کے قابل ہی کہاں ہوں کہ اتنی بڑی بات اپنے چھوٹے منہ سے نکال کر خود کو بے وقعت کر لوں۔ نہیں میڈم! آپ مجھ سے یہ سوال نہ پوچھیں تو میرے لئے بہتر ہے۔''

''تم نے مجھے چکر دینا سیکھ لیا ہے۔'' اس کے چہرے پر تناؤ ہویدا ہو گیا، ''میں پوچھتی ہوں، کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں..... ہاں یا نہ میں جواب دو۔''

میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخائیں، اپنی زیر و زبر ہوتی دنیا کا یک لمحاتی جائزہ لیا اور سود و زیاں کا شمار ذہن سے محو کرتے ہوئے کہا، ''میڈم! اگر آپ بضد ہیں تو میں لب کشائی کرتا ہوں۔ نہیں جانتا کہ مجھے اپنے ان لفظوں کی کیا قیمت چکانا پڑے گی۔ مگر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آئی لو یو..... مجھے علم ہے کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ آپ کے وصل کی خواہش طفلانہ ہوگی اور آپ کو چھو کر میلا کرنے کا شوق میرا جرم ہوگا، مگر میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ کے قرب کی خواہش میرے دل میں جاگزیں رہتی ہے اور جب آپ میرے ساتھ ہوتی ہیں، تب میری سوچ کی دنیا میں کوئی دوسرا موجود نہیں ہوتا۔''

اس کی آنکھیں جل اُٹھیں۔ ہونٹ نیم وا ہو گئے۔ گال تمتمانے لگے۔ بولی، ''کیا واقعی؟''

اس کا ردِ عمل دیکھ کر میری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار خطرناک حد تک مہمیز ہو گئی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اپنے تمام تر جذبات کو آواز میں گوندھ کر اس کے سامنے پیش کر دیا، ''میڈم! میں نے جھوٹ نہیں کہا۔ مزید کہنا چاہوں گا کہ مجھے اپنی کم مائیگی کا پورا احساس ہے۔ میں کبھی بھی آپ کے لئے دردِ سر نہیں بنوں گا۔ آپ مجھے اپنی ذات سے

دور مت کیجئے گا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایک ٹک میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ شاید وہ میرے الفاظ کی سچائی کو پرکھ رہی تھی۔ پھر مطمئن ہو کر گھٹنوں کے بل آگے بڑھی اور مجھے سوچنے کا موقع دیے بغیر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اُسے سہار نہ سکا اور کمر کے بل ریتلی زمین پر گر گیا۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ مجھ پر لد گئی اور چہکنے لگی، ''میں تمہیں اپنے آپ سے دور نہیں کروں گی کیونکہ تمہاری موجودگی مجھے تقویت دیتی ہے۔ تمہاری محبت مجھے تحفظ کا احساس دیتی ہے۔ تم میرے باڈی گارڈ نہیں ہو، تم میرے نوکر نہیں ہو، تم میرے دوست ہو..... آئی لو یو مائی فرینڈ..... بوائے فرینڈ!''

وہ رات میں کئی مرتبہ میرے حواس کے ساتھ ساتھ میرے بدن پر سوار ہوئی تھی مگر تب میری قلبی کیفیت یہ نہیں تھی۔ میرا دل اتنی تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اَب تب میں کسی وقت پسلیوں کا جنگلا توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ میں نے اس کے نرم و گداز کوٹ میں چھپے ہوئے وجود کو اپنی بانہوں کے شکنجے میں کس لیا۔ اپنی خوش نصیبی پر دل بلیوں اچھلا..... ایسے میں غزالہ کی پرچھائیں سطحِ آب پر پاؤں پاؤں چلتی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ میں چونکا۔ دیکھا، چشمِ تصور نے بڑا بھرپور عکس سینچا تھا۔ وہ قریب آ کر بولی، ''شہرے! کیا یہی تمہاری محبت تھی جو ایک شہرن نے اپنی مٹھی میں جکڑ کر ہوا میں اچھال دی ہے؟''

میں نے بے بسی سے ہونٹ کاٹے اور دل ہی دل میں اُسے جواب دیا، ''ہاں میری جان! میں ہار گیا، تمہاری محبت ہار گئی اور ایک شہرن مجھے فتح کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ آئی ایم ویری ساری!''

وہ لب بستہ چند قدموں کے فاصلے پر آ کر رُک گئی اور یاس بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد ایک آہ بھر کر پلٹ گئی۔ کچھ کہا، نہ سنا..... شاید باقی کچھ نہیں رہا تھا۔

میرے نیچے سے اپنے دونوں ہاتھ نکال کر میڈم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور بولی، ''رومانٹک پیریڈ ختم، مشن کی پیش رفت شروع..... کم آن! اپنا لاؤڈ اسپیکر آن کرو اور بیڑے والے کو آواز دو۔''

اس کے لجاتی لمس نے میرے جسم میں بے عنوان شکست و ریخت کر دی تھی۔ یوں لگا جیسے میں نے اُٹھنے کی کوشش میں اپنے بدن کی تمام تر توانائیوں کو صرف کر دیا تھا۔ کئی ثانیوں تک اپنے

حواس بحال کرتا رہا پھر ہاتھوں کا بھونپو بنا کر پوری قوت سے چیخ اُٹھا، ''اوئے..... کوئی ہے.....''

بیڑے میں نصب شدہ ننھے سے خیمے سے کوئی نکلا اور جواباً چلایا۔ میں نے ہاتھ سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور اسے ہاتھ لہرا کر سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں گاڑی کو دریا کے پار لے جانے کے لئے اس کے بیڑے کی ضرورت تھی۔ وہ سمجھ گیا۔ چند منٹوں بعد وہ بیڑے سے اُتر کر خشکی کی طرف بڑھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بیڑے کی لانہہ کھولنے جا رہا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ کچھ ہی دیر بعد اس نے بیڑے کا انجن جو غالباً چوبیس ہارس پاور پیٹر انجن پر مشتمل تھا، اسٹارٹ کر دیا اور فضا 'پٹ پٹ' کی مخصوص آواز سے گونج اُٹھی۔

کوئی پانچ سات منٹ کے بعد بیڑا اس ابھرے ہوئے کنارے پر آن لگا جس پر لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ تب تک ہم بھی اپنی گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ بیڑے کا سیلر انتہائی کالے اور چمکدار بدن والا توانا شخص تھا۔ مقامی لہجے میں بولا، ''آپ کون ہیں اور دریا کے پار کس کے پاس جانا چاہتے ہیں؟''

میں نے بتایا، ''ہم روہیلانوالی جانا چاہتے ہیں۔''

''کس کے پاس؟''

''انور خان دشتی کے ہاں.....'' میڈم نے جلدی سے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھے اس سوال کا جواب دینے میں تامل تھا۔

''پانچ سو روپے لگیں گے۔ یہ بڑی گاڑی ہے۔'' اس نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے دریا پار کرنے کی فیس بتائی۔ میڈم بولی، ''ٹھیک ہے۔ بیڑا لانہہ کرو۔''

''گاڑی پیچھے ہٹا کر بیڑے پر لے آؤ۔'' اس نے پانی میں اُترتے ہوئے کہا اور بڑی چابکدستی اور مہارت سے بیڑے کے دونوں رسے خشکی پر پھینک دیے۔ تب میں نے دیکھا کہ لینڈ کروزر کے دونوں طرف کچھ فاصلے پر دو بڑے سے چوبے کلے زمین میں گاڑے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں رسوں کو ان کھونٹوں پر اس طریقے سے باندھا کہ بیڑا ایک انچ بھی ادھر اُدھر حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے آج تک گاڑی کو بیڑے پر نہیں چڑھایا تھا۔ میرے تذبذب کو دیکھ کر میڈم جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی کو دس پندرہ فٹ پیچھے لے گئی۔

میں یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ بیڑے کا سیاہ فام سیلر بیڑے کے عین وسط میں کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر لئے۔ اپنی پاٹ دار آواز میں بولا، ''بی بی!

اِیں ہتھ تے..... اُڈے..... اِڈے..... ہاہا..... اِیں سیدھے تے گھدی آ.....''

میڈم اس کے ہاتھوں کے اشاروں اور زبانی جاری کردہ ہدایات کے مطابق گاڑی کو آہستہ آہستہ کنارے تک لے آئی پھر سیاہ فام سیلر کی او کے رپورٹ ملتے ہی اس نے بیڑے پر گاڑی کے اگلے ٹائر گرا دیے۔ بیڑے کو ایک جھٹکا لگا اور وہ خطرناک انداز میں اوپر نیچے ہونے لگا۔ گاڑی بھی ہچکولے کھانے لگی۔ میں دم سادھے اِس خطرناک کام کو دیکھ رہا تھا۔

چند لمحوں میں گاڑی کے پچھلے ٹائر بھی زمین کو چھوڑ کر بیڑے کے چوڑے تختے پر گر گئے۔ اس مرتبہ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک انداز میں بیڑا اوپر نیچے ہوا مگر خیر گزری کہ چند ہچکولوں کے بعد اس کی حرکت تھم گئی۔ گاڑی بخیر و عافیت بیڑے کے وسط میں جا کھڑی ہوئی۔ میڈم بیڑے سے نکلی اور مجھے بیڑے میں اترنے کا حکم صادر کرتے ہوئے بولی، ''واٹ اے رومانس ڈارلنگ..... میں نے پہلی مرتبہ بیڑے پر گاڑی چڑھائی ہے۔ ہائے! کیا ایڈونچر ہے یہ!''

میں آہستگی سے بیڑے میں اُترا۔ سیاہ فام ہنسا، بولا، ''بے شک چھلانگ لگا دیتے؛ بیڑا ڈوبنے والا نہیں ہے تمہارے وزن سے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ میری احتیاط فضول تھی کیونکہ میری نظروں کے سامنے منوں وزنی گاڑی بیڑے پر اُتری تھی۔ وہ تب نہیں ڈوبا تھا تو میرا وزن کیا معنی رکھتا تھا۔ میڈم گاڑی سے چند قدم ہٹ کر بیڑے کے کنارے پر نصب چوڑے چوبی تختے پر کھڑی تھی جبکہ سیاہ فام ملاح بیڑے میں پڑے ہوئے موٹے رسے کی مدد سے گاڑی کو بیڑے کے آہنی کنڈوں کے ساتھ باندھ رہا تھا۔ میں میڈم کے پاس آن کھڑا ہوا۔ ہچکولے لیتے ہوئے بیڑے پر کھڑا ہونا بذات خود بڑا ایڈونچر تھا۔ میں نے کہا، ''میڈم! تھوڑا پیچھے ہٹ جائیں۔ یہ نہ ہو کہ مزے لیتے لیتے پانی میں ڈبکیاں لینے لگیں۔ پانی بہت ٹھنڈا ہے۔''

وہ پانی کی طرف جھکی۔ اس نے چاہا کہ اپنے ہاتھ پانی میں ڈالے مگر اپنے دستانوں کو دیکھ کر رُک گئی اور عجیب سے نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا، ''کیا بات ہے میڈم؟''

''دیکھ رہی ہوں کہ انسان کے سینے سے بھاری سل ہٹ جائے تو اس کا چہرہ کیسا نظر آتا ہے۔''

میں اس کے الفاظ میں چھپی ہوئی معنویت کو سمجھ کر جھینپ گیا اور بولا، ''میں نے آپ کے مجبور کرنے پر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔''

چند منٹوں میں ہی سیاہ فام ملاح حفاظتی اقدامات سے فارغ ہو کر بیڑے کے انجن سے نبرد

آزما ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ بیڑے کے عین وسط میں دو چوڑے متوازی تختے نصب تھے جن پر لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ تختے اسی مقصد کے لئے نصب کئے گئے تھے۔ جونہی انجن اسٹارٹ ہوا، میڈم گاڑی سے بندھے ہوئے موٹے رسے کو پکڑ کر دوسرے تختے پر چلی گئی اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ میں بھی چکر کاٹ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

''شہر یار! اتنا بڑا بیڑا مین میڈ (انسان ساختہ) ہے۔ دیکھو..... انسان کتنا طاقتور ہے۔ لکڑیوں کو جوڑ کر پانی کے سینے پر رکھتا ہے اور پھسلتا جاتا ہے۔'' میڈم کے لہجے میں کسی ان پڑھ بیڑہ ساز کاریگر کے لئے ستائش پنہاں تھی، ''یہ ایک ناخواندہ مستری کی انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔ ہے سیلر! تم نے یہ کشتہ کب بنوایا تھا؟''

اس نے پیٹر کی ٹس کھینچ کر فکس کرتے ہوئے کہا، ''بی بی جی! ایں کو چھینواں سال ویندا ایے۔''

(بی بی جی! اس کا چھٹا سال گزر رہا ہے۔)

میڈم نے حیرت سے مجھے دیکھا، بولی، ''چھ سال بڑا عرصہ ہوتا ہے۔ ہے ناں؟''

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ہم دونوں گاڑی سے کچھ فاصلے پر تختے پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے جب کوئی لیور کھینچ کر سیلر نے کشتہ رواں کر دیا۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ میڈم مجھ سے ٹکرائی۔ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بولی، ''شہر یار! ہوا کتنی خوش گوار ہے۔ یاد ہے، رات کو بدن کے آر پار ہوتی محسوس ہوتی تھی۔''

مجھے گزشتہ رات کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ میں نے کہا، ''جی میڈم! آپ کو بخار کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہوئی ہوگی۔''

''ہاں یار! میں کوشش کے باوجود اپنی کپکپاہٹ پر قابو نہیں پا رہی تھی۔''

بیڑا اپنی مخصوص چال سے پار والے پتن کی طرف رواں دواں تھا۔ پیٹر انجن کی پھٹی پھٹی آواز فضا میں گونج رہی تھی جبکہ سیاہ فام سیلر پیٹر کے قریب نصب چھوٹے سے چوبی بنچ پر بیٹھا اپنے کام میں مگن تھا۔ آدھا سفر طے ہو چکا تھا۔ آدھا باقی تھا جب اچانک ایک تیز، قدرے باریک مگر نہایت سرد آواز ہمارے عقب میں گونجی، ''اوئے! تساں کون لوک ہوے؟''

(اوئے! تم کون لوگ ہو؟)

ہم دونوں یکبارگی مڑے۔ ہمارے عین عقب میں گاڑی کے سامنے تختے پر پاؤں جمائے کھڑا گٹھے ہوئے توانا جسم والا شخص ہاتھ میں سیمی آٹومیٹک گن تھامے کھڑا تھا۔ اس کی شعلے اگلتی

آنکھوں اور گن کی نال ہماری جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے کن اکھیوں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ میڈم کے چہرے پر خوف کے واضح آثار دیکھ کر میری دھڑکن تیز ہوگئی۔

میرے کانوں میں گن بردار کی چیختی ہوئی آواز پڑی، ''بک ڈو جے کوں وَل ڈیکھ گھنا ہے؛ پہلے اپنے ایں پیو کو جواب ڈیوو، نی تاں رَت نال رنگ چھڑیساں..... منٹ مارو تے اپنے ہتھ سر تیں رکھو!''

(ایک دوسرے کو بعد میں دیکھ لینا۔ پہلے اپنے اس باپ کو جواب دو۔ نہیں تو میں خون میں نہلا دوں گا۔ جلدی کرو اور اپنے ہاتھ سر پر رکھ لو)

ہمارے پسٹل ہماری جیبوں میں تھے اور اتنے مختصر وقت میں انہیں نکال کر عقب میں کھڑے گن بردار پر فائر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ناچار ہم دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ہاتھ سروں پر رکھ لئے۔ میں اس حیرت سے دوچار تھا کہ وہ کہاں سے نکل کر ہمارے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے ڈھنڈ پر میڈم کے سر پر مراد بخش ایسے وقت میں نکل کر سامنے آیا تھا جب کسی کی موجودگی کا واہمہ ہمارے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں نہیں تھا۔ جس وقت میڈم اپنی گاڑی کو پتن سے اُتار کر بیڑے میں سوار کر رہی تھی، اس وقت میں نے بڑی احتیاط سے بیڑے کا جائزہ لیا تھا۔ تب سوائے سیاہ فام سیلر کے کوئی بھی شخص بیڑے میں موجود نہیں تھا۔ ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ میں نے بیڑے میں سیلر کے خیمے میں نہیں جھانکا تھا۔ خیمہ مختصر تھا مگر اس میں اتنی گنجائش تھی کہ ایک کے بجائے دو آدمی اس میں لیٹ سکتے۔ مجھے از خود یقین ہوگیا کہ وہ خیمے کے اندر موجود تھا، جس وقت ہم بیڑے میں سوار ہوئے تھے۔

میڈم نے سرگوشی کی، ''یہی پیرو ماچھی ہے؟''

پیرو ماچھی نے ڈانٹا، ''کھسر پھسر نہ کرو؛ بتاؤ! تم کون ہو اور اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟''

میں نے اپنی آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے کہا، ''یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم کون ہو اور بدمعاشوں کی طرح ہم پر گن تانے کیوں کھڑے ہو؟''

یہ کہنے کے ساتھ ہی میں نے تھوڑا پہلو بدلا اور کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہ ہم سے پانچ سات فٹ کی دوری پر کنارے والے چوبی تختے پر کھڑا خشمگیں نظروں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ اس کی نگاہیں میڈم پر مرتکز تھیں اور ندیدا پن صاف عیاں تھا۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ ایسے ہی وقت میں سیلر نے سہمے سہمے انداز میں کہا، ''سائیں! یہ مسافر ہیں۔ انہیں کچھ نہ

کہو..... مجھ سے غلطی ہوگئی کہ بھاڑے (کرائے) کے لالچ میں تمہیں بھول گیا۔''

اس نے ڈانٹا،'' بکواس نہ کر اور بیڑا واپس موڑ۔ بھاڑے کا فکر نہ کر۔ دوگنا مل جائے گا۔''

''سائیں! ان بے چاروں پر رحم کرو۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' سیاہ فام ملاح گھگھیایا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''اوئے مردود کا بچہ! مار مار کر بھرکس نکال دوں گا تیرا..... جو کہہ رہا ہوں، وہ کر ورنہ.....''

میں نے دیکھا کہ سیلر کو ڈانٹتے ہوئے بھی اس کی نظریں ایک لمحے کو بھی ہم پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ میں حیرت کے حصار سے نکل آیا تو اور اس پر قابو پانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ میں نے کہا،'' تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تم کون ہو اور یہ بدمعاشی کیوں کر رہے ہو؟''

اس نے غراتی ہوئی آواز میں مجھے گالی دی اور کہا،'' لگتا ہے کہ بندوق دیکھ کر تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام اجمل ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام سنو گے تو پتہ پانی ہو جائے گا جوان! میں پیر بخش ہوں۔ دنیا مجھے پیرو ماچھی کے نام سے جانتی ہے۔'' اس نے روایتی بدمعاشوں کے انداز میں اسٹائل مارتے ہوئے کہا، ''کیوں؟ بولتی بند ہوگئی ناں تمہاری..... یہ پینٹو شرٹو ناری تمہاری کیا لگتی ہے؟''

میڈم نے درست کہا تھا۔ وہ بدنام علاقہ اشتہاری ڈاکو پیرو ماچھی ہی تھا جس کی تلاش میں ہم بھٹک رہے تھے۔ وہ ہمیں بغیر کسی ردوکد کے مل گیا تھا مگر اس کی پوزیشن ہمارے لئے خاصی خطرناک تھی۔ اس نے اپنا سوال دُہرایا تو مجھ سے پہلے میڈم بول پڑی،'' ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔''

مجھے اس کے منہ سے نکلنے والا جملہ عجیب لگا۔ دیہاتوں کی عورتیں کئی ازدواجی سال گزارنے کے بعد بھی اتنی خوداعتمادی سے اپنا اور اپنے شوہر کا تعارف نہیں کرواتیں جتنے اعتماد سے میڈم نے جھوٹ بولا تھا۔

پیرو ماچھی نے معنی خیز انداز میں لمبا ہنکارا بھرا،'' ہوں..... میاں بیوی..... ادھر ہنی مون منانے نکلے تھے کیا؟'' نہ صرف اس کی آواز خاصی خوفناک تھی بلکہ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بھی خاصے تضحیک انگیز تھے۔ اس سطح کے بدمعاش اپنی مضحکہ خیز مگر ڈراؤنی آواز کے بل پر لوگوں کو ایسے ہی ڈرا کر اپنی مطلب برآری کرتے ہیں،'' اوئے برائیلر کٹڑ! بولو ناں..... یہاں

کیا کرتے پھرتے ہو؟''

اس نے میرے عمدہ اور نفیس لباس، گوری رنگت اور شہری بود و باش کی بدولت مجھے برائیلر مرغ کی تشبیہ سے نوازا تھا۔ میں پنجہ آزمائی کے بعد اس کا خیال بدل سکتا تھا مگر ابھی اس کی ہرزہ سرائیوں کو سن کر برداشت کرنا مجبوری تھی۔ میں نے کن اکھیوں سے میڈم کو دیکھا اور کہا، ''پیر بخش عرف پیرو ماچھی! اگر تم میں ہمت ہے تو گن عرشے پر رکھ دو اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھو۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ میں برائیلر ککڑ ہوں یا اصلی اصیل..... لمبی اور مضبوط خاروں والا ککڑ.....''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا، اکڑ کر بولا، ''ذات دی کوڑھ کرلی تے شہتیراں نوں جپھے..... واہ جوان! فکر نہ کرو، تمہاری یہ حسرت ضرور پوری کروں گا۔ اے ناری! ذرا ادھر جلوہ دکھا اپنے حسن کا.....''

مارے غصے کے میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ میڈم نے آنکھوں ہی آنکھوں سے مجھے برداشت کرنے کا حکم دیا اور ٹانگیں اُٹھا کر اس کی سمت گھوم گئی، بولی، ''لو! جی بھر کر جلوہ دیکھ لو میرے حسن کا۔ جی بھر جائے تو بتا دینا، میں رُخ پھیر لوں گی۔''

میڈم کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ پیرو ماچھی کو شاید اس رویے کی توقع نہیں تھی، اس لئے چونک گیا۔ میڈم کو دیکھ کر ایک ذرا ٹھٹکا اور اپنی خفت چھپانے کو بولا، ''بکواس نہ کرو..... تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ ہنسی، ''میرا نام بہن جی ہے۔ کیا تم اس نام سے مجھے پکارو گے؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے آزمودہ حربے سے اُسے زِچ کرنے چلی تھی۔ فارم ہاؤس کے باہر اس نے اپنے اغوا کار کو ذہنی دباؤ کا شکار کر کے زیر دام کر لیا تھا۔ بولی، ''ہاں پیرو ماچھی! تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چلو شاباش! اپنی گن نیچے کر لو ورنہ بہت برا پیش آؤں گی۔''

اس کے ساتھ ہی میڈم نے اپنے دونوں ہاتھ نیچے کر لئے۔ میں نے اس کی تقلید کی تو وہ مجھے جھڑک کر بولی، ''کیا تمہیں اس اوچھے بدمعاش نے ہاتھ نیچے کرنے کی اجازت دی ہے؟ نہیں ناں..... چلو! اپنے ہاتھ سر پر رکھو.....''

میں نے جلدی سے ہاتھ سر پر رکھ لئے اور کن اکھیوں سے پیرو کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ اس نے میڈم کو گھورا اور غرایا، ''میں

تمہیں گولی مار دوں گا۔ ہاتھ سر پر رکھو.....''

میڈم نے اپنے ہاتھ گود میں پھیلائے، ناخنوں کو دیکھتے ہوئے منہ بنایا اور بے نیازانہ بولی، ''نہیں رکھتی..... کرلو جو کرنا ہے تمہیں..... بڑے آئے بدمعاش کہیں کے۔''

پیرو ماچھی کا حال برا ہو گیا۔ وہ گولی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ محض ڈرانا چاہتا تھا مگر میڈم نے اس کی حکم عدولی کر کے للکار دیا تھا۔

اس نے دانت پیس کر گن کا رُخ میڈم کے سینے کی طرف کیا اور چہرے کے تاثرات یوں بدلے جیسا گولی چلانے لگا ہو۔ میڈم ہنسی، ''چلو اَب ٹرائیگر دبا ہی دو۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری..... اس بندوق میں کتنی گولیاں ہوتی ہیں؟''

وہ بے خیالی میں بولا، ''سات.....''

''یہ برسٹ مارتی ہے ناں؟''

''نہیں۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''بولٹ تو چڑھا لو۔ کیا ایسے ہی گولی مارو گے؟'' میڈم نے مسکرا کر کہا۔

اس نے جلدی سے گن کو دیکھا اور بے اختیارانہ بولٹ لیور پر ہاتھ رکھا۔ میڈم کا قہقہہ فضا میں گونج گیا۔ پیرو ماچھی کی ندامت آمیز غصے سے بگڑی ہوئی شکل دیکھ کر میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ میڈم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی اور اس نے پیرو ماچھی کو الجھا دیا تھا۔ بولی، ''دتہ ماچھی تمہارا کیا لگتا ہے؟''

پیرو کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ متردد انداز میں کبھی میڈم کو اور کبھی مجھے دیکھنے لگا، ''تم دِتے کو کیسے جانتی ہو؟ کون ہو تم؟''

''میں تو مراد بخش اور جمیل دستی کو بھی جانتی ہوں۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ میں انہیں کیسے جانتی ہوں۔'' میڈم نے مزہ لیتے ہوئے کہا، ''کہو تو تمہارا سارا کچا چٹھہ کھول کر رکھ دوں.....''

ایسے ہی وقت میں بیڑا اس پتن پر جا لگا جس سے تھوڑی دیر پہلے روانہ ہوا تھا۔ میڈم اچھل کر کھڑی ہو گئی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی، ''پیرو ماچھی اپنا آدمی ہے۔ ہاتھ نیچے کرو اور بیڑے سے اُترو۔ کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر پیرو سے باتیں کرتے ہیں۔ کیوں پیر بخش؟''

پیرو ماچھی کے ذہن و قلب میں پیدا ہونے والی کشمکش چہرے پر رقم ہو گئی۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر خیمے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چیخ کر بولا، ''اوئے برائیلر! تم اِدھر ہی کھڑے رہو۔ ناری گاڑی

میں بیٹھ کر اِسے اسٹارٹ کرتی ہے۔ اوئے دِینے..... ماں کے دِینے..... چل گاڑی کے رسے کھول اور پتن کو لانہہ کر..... چل فٹافٹ کر.....''

میڈم نے مجھے اس کا حکم ماننے کا اشارہ کیا اور خود رسہ تھام کر جھولتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ پیرو ماچھی کا دماغ واقعی فیوز ہو گیا تھا۔ اس نے میڈم کو ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچنے کی مہلت دے کر اپنے تابوت میں کیل ٹھونک دی تھی۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ گاڑی کے فرش پر موت اگلنے والی خطرناک گن پڑی تھی جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی میڈم کے ہاتھ لگ جانی تھی۔ وہ باآسانی کھلے دروازے کی اوٹ لے کر یا سیٹ پر بیٹھ کر اپنا پسٹل کوٹ سے نکال سکتی تھی۔

میڈم شکیلہ نے بڑی چالاکی سے چھیڑ چھاڑ کر کے اس کا دم خم ٹھکانے لگا دیا تھا اور ڈنک نکال لیا تھا۔ وہ میرے مقابل میں چند فٹ اونچائی پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بہ غور دیکھتے پا کر جبڑوں کے اعصاب کھینچے اور درشت لہجے میں کہا، ''اپنی لونڈی کو سمجھا دو۔ اگر اس نے کوئی حرکت کی تو میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہیں گولی مار دوں گا۔''

میں نے کہا، ''وہ دیکھ رہی ہے۔ کوئی حماقت نہیں کرے گی۔''

ملاح کا نام دِینا تھا۔ ماں باپ نے دین محمد یا اللہ دین رکھا تھا مگر زمانے نے بگاڑ کر مختصر کر دیا تھا۔ دِینا ڈری ڈری نظروں سے پیرو ماچھی کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی کو مضبوطی سے باندھے گئے رسے کھولنے لگا۔ اس کی شکل سے عیاں تھا کہ اُس پر نہ صرف خوف طاری تھا بلکہ اُسے ہماری پریشانی بھی لاحق تھی۔ بھاڑا ضائع ہونے کا دکھ الگ سے تھا۔

پیرو نے مجھے تختے پر بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں بیٹھ گیا تو وہ اونچی آواز میں میڈم سے مخاطب ہو کر بولا، ''گاڑی پتن پر اُتارو۔ جلدی کرو۔''

میڈم جواباً چلائی، ''کیا جلدی ہے؟ کیا تم نے کالج میں لیکچر دینے کے لئے جانا ہے؟''

پیرو ماچھی کی آنکھیں سکڑیں، احساسِ خفگی پیشانی پر مچلا اور پھاڑ کھانے کے انداز میں گالی دے کر بولا، ''بہتر ہے کہ میرے غصے سے بچ جاؤ ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گی۔''

میں نے کہا، ''تمیز سے بات کرو ورنہ.....''

''ورنہ کیا؟'' وہ شعلے کی طرح بھڑکا، ''ورنہ کیا کرو گے حرام زادے..... میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

میڈم نے پسٹل نکالنے یا گن اُٹھانے کے بجائے سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

بیڑا تھرتھرانے لگا۔ پیرو ماجھی کا مارے اشتعال کے برا حال تھا۔ بعید نہ تھا کہ مجھے گولی مار دیتا۔ میں نے جلدی سے کہا، ''ابھی بیڑے سے اُتر کر تمہیں بتائیں گے کہ ہم کون ہیں۔ پھر تمہیں ہم سے روا رکھے گئے اپنے رویے پر شرمندگی ہوگی۔ سمجھے تم؟''

میرے پراعتماد لہجے نے اُسے مزید الجھا دیا۔ بولا، ''آخر تم ہو کون؟ بتاتے کیوں نہیں ہو؟''

میں نے سنجیدگی سے کہا، ''ابھی بتاتے ہیں؛ ذرا صبر سے کام لو۔''

دِینے ملاح نے اپنا کام مکمل کر لیا اور میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ اپنے مخصوص انداز میں میڈم کو گاڑی ریورس کرنے کیلئے کاشن جاری کرنے لگا۔ چند منٹ کی تگ و دو کے بعد گاڑی پتن پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئی۔ میڈم گاڑی کو پتن سے چند گز دور لے گئی۔ روک کر بلند آواز میں بولی، ''شہریار! ملاح کو پانچ سو روپے دے دو۔ پیرو ماجھی نے چھیننا سیکھا ہے۔ دینا نہیں۔''

''شہریار؟'' پیرو ماجھی تعجب اور خفگی سے بولا، ''مگر تم نے مجھے اپنا نام اجمل بتایا تھا۔ مجھ سے جھوٹ بولا تھا..... تمہاری تو.....''

اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔ آنکھوں کا تاثر ایک دم بدل گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے مجھے گولی مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میڈم چلائی، ''پیر بخش! اِسے لے کر پتن پر آ جاؤ۔''

وہ اس کی توجہ مجھ پر سے ہٹانا چاہتی تھی مگر پیرو کی خون آشام نظریں مجھ پر گڑی رہیں۔ ٹریگر پر جمی انگلی لرزنے لگی۔ میں فوری طور پر حرکت میں آیا اور پیروں کے بل اُچھل کر بیڑے کے احاطی تختے پر کود گیا۔ بیڑے کو زوردار جھٹکا لگا جس کی وجہ سے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پشت کے بل بیڑے کے گیلے فرش پر جا گرا۔ شکر تھا کہ پھسل کر دریا کے یخ بستہ پانی میں نہیں گرا تھا۔ میں نے اُٹھنے میں غیر معمولی سرعت کا مظاہرہ کیا اور اچھل کر تختے پر چڑھ گیا۔ عرشے پر دیکھا۔ پیرو منہ کے بل چوڑے تختے پر پیٹرانجن کے قریب پڑا تھا۔ اس کی گن اس کے جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ وہ مجھے گالیاں دیتا ہوا اُٹھنے لگا۔ ابھی اُس نے گن اُٹھائی ہی تھی کہ فضا فائر کی خوفناک آواز سے گونج اُٹھی۔ پیرو تڑپ کر سیدھا ہوا پھر پہلو کے بل پیٹرانجن پر گر کر دوسری جانب الٹ گیا۔ اس کی گن میری جانب پھسل کر بیڑے کے فرش پر گر گئی۔ میں نے پلٹ کر میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ پتن پر پسٹل ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی۔

اس نے دوسرا فائر کیا۔ پیرو ماجھی کھڑے ہونے کی کوشش میں [illegible] شے پر گر کر لوٹ پوٹ

ہونے لگا۔ میں نے دوسرے تختے پر چھلانگ لگائی۔ رُک کر پیرو کو بغور دیکھا۔ وہ عرشے پر اپنی دونوں پنڈلیوں کو سختی سے پکڑے بیٹھا کراہ رہا تھا۔ میڈم کی دونوں گولیاں اس کی پنڈلیوں میں پیوست ہوگئی تھیں اور وہ عملی طور پر ناکارہ ہوگیا تھا۔ میڈم کی سرد آواز میرے کانوں میں پڑی، ''شہریار! اِسے سنبھال کر پتن پر لے آؤ۔ اسے مناسب الفاظ میں اپنا تعارف کراتے ہیں۔''

میں تختے پھلانگتا ہوا عرشے پر پہنچا۔ اُس کے پہلو میں بھرپور ٹھوکر رسید کی۔ اس نے سر اُٹھایا۔ مجھے گھورا۔ پھر برق رفتاری سے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی کندھے پر بوٹ کی زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کر کمر کے بل گرا۔ چیخ کر اُٹھنے لگا تو میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل پر نظر پڑ گئی۔ ٹھٹک کر رُک گیا اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا، ''اُٹھو..... تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے اور ہمارا شروع۔ چلو شاباش! بیڑے سے اُترو۔''

اس نے ہتھیلیاں عرشے پر جمائیں اور اُٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں پائنچے خون سے تر ہو چکے تھے اور عرشے پر بھی خون گرنے لگا تھا۔ میں نے اپنا حکم دہرایا تو وہ غصے اور بے بسی کے امتزاجی لہجے میں مجھے گالی سے نواز کر غرایا، ''اندھے ہو، دیکھ نہیں رہے ہو کہ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ بس! تم لوگ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ، مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ جاؤ!''

''اوئے بھولے بادشاہو! چلو اُٹھو..... تم سے تو بہت حساب کتاب کرنے ہیں ہمیں۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ساتھ ہی مجھے احساس ہوگیا کہ وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑا اور دو چار جھٹکے دیے۔ اس کی گردن میں پسٹل کی نال چبھوتے ہوئے آگے کی طرف دھکیلا۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔

میڈم نے دینے ملاح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''اس بدمعاش کو سہارا دے کر میرے پاس لاؤ۔''

دِینا سیلر سمجھ گیا تھا کہ ہم پیرو سے بھی کہیں بڑے بدمعاش ہیں، اس لئے آمادہ بہ تعاون نظر آیا۔ بیڑے میں اُترا اور بھاگ کر ہمارے پاس پہنچا۔ میں نے کہا، ''اس کی تلاشی لو۔ جو کچھ بھی ملے، نکال لو۔''

اس نے چند ہی لمحوں میں ایک چھوٹا ماؤزر، چند گولیاں، ایک گراری دار چاقو اور بھاری بٹوا نکال کر عرشے پر رکھ دیا۔ میں نے کہا، ''ماؤزر اور گولیاں پانی میں پھینک دو۔ پرس اپنے پاس رکھ لو اور چاقو مجھے تھما دو۔''

دِینے نے بلا چوں چرا کانپتے ہاتھوں سے میرے حکم کی تعمیل کی۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولا، ''سائیں! ایں کوں چھوڑ ڈیو؛ اِہ بہوں ڈاڈھا ہے۔''

(سائیں! اسے چھوڑ دو۔ یہ بہت ظالم ہے۔)

میں نے اس کی گزارش نظر انداز کرتے ہوئے کہا، ''اِسے گھسیٹ کر پتن پر لے جاؤ۔ جلدی کرو۔''

اس نے پیرو کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور کھینچتا ہوا پتن پر لے گیا۔ بیڑے کے بڑے تختے پر خون کی دو لکیریں پتن تک کھنچتی چلی گئیں۔ پیرو ماچھی کے منہ سے نکلنے والی طوفانی چیخیں، گالیاں اور دھمکیاں بڑی دردناک تھیں۔

میڈم نخوت سے بولی، ''پیر بخش! بولو، کہاں جانا پسند کرو گے؟ کیا تمہیں تمہارے ڈیرے پر لے جا کر اپنا تعارف کراؤں؟''

''میں تم لوگوں سے نبٹ لوں گا۔ تمہاری تو.....'' اس نے پھر اپنی عادت سے مجبور ہو کر میڈم کو غلیظ گالی دی۔ میں نے پھر کر اُسے لات مارنی چاہی تو میڈم نے روک دیا۔ مسکرائی۔ بولی، ''نہیں شہریار! گالی پر مسکرانا اور گولی سے بچنا جوان مردی کہلاتی ہے۔ اسے بکنے دو۔ اس غریب کو فارغ کرو جس کا روزی کا اڈہ ہم نے اس بے غیرت کے گندے خون سے داغدار کر دیا ہے۔ زیادہ پیسے دو بے چارے کو۔''

میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ تین نوٹ کھینچے۔ میڈم بولی، ''اوں ہوں! دو چار اور نکال لو۔ غریبوں کو دیے ہوئے نوٹ دو گنے چوگنے ہو کر واپس آتے ہیں۔''

میں نے گنے بغیر چند نوٹ کھینچ کر دِینے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس نے ممنون نظروں سے میڈم کی طرف دیکھا۔ وہ بولی، ''ڈرو نہیں۔ یہ سب تمہارے ہیں۔ اس مردود کی طرف سے بھی فکرمند نہ ہونا۔ یہ آئندہ تمہیں دکھائی نہیں دے گا۔ کیا یہ تمہارے خیمے میں چھپا ہوا تھا؟''

میڈم نے پیرو ماچھی کی طرف اشارہ کیا۔

''جی بی بی سائین!'' دِینے ملاح نے سہمی ہوئی نظروں سے پیرو کی جانب دیکھا اور

آنکھیں چرالیں۔ سرائیکی میں بولا، ''یہ جھوک سے نشے میں لڑھکتا ہوا آیا تھا اور مجھے اِس پار پہنچانے کی ضد کرنے لگا۔ میں نے اِسے خیمے میں سلا دیا اور کہا کہ پھیرا بن جائے، تب ادھر آؤں گا۔ ایک آدھ سواری سے تو اِس موئے پیٹر کا پیٹ نہیں بھرتا ناں۔''

''ہوں!'' میڈم نے تفہیمی انداز میں ہنکارا بھرا، بولی، ''ٹھیک ہے۔ تم اَب جاؤ اور اپنا بیڑا دھو پونچھ لو۔''

وہ الٹے قدموں چوبی کھونٹے کی طرف بڑھا اور میڈم پر آنکھیں ثبت کئے لانہہ کی گرہ ٹٹول کر کھولنے لگا۔ اسے شاید یہ واہمہ تھا کہ کہیں میڈم اسے گولی نہ مار دے۔ ایسے ہی انداز میں اُس نے دوسری لانہہ کھولی اور الٹے قدموں چلتا ہوا بیڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے پیٹر انجن اسٹارٹ کرنے کے بجائے پتن کو پوری قوت سے پاؤں کی مدد سے دھکیلا۔ بیڑا پانی میں تیزی سے بہاؤ کے رُخ پھسلا۔ دِینا ملاح بیڑے کے وسط میں کھڑا میڈم کو دیکھے گیا۔ جب سو پچاس گز دور پہنچ کر اُسے اپنے زندہ سلامت بچ جانے کا یقین ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ فضا میں لہرائے اور حلق کے بل چیخا، ''بی بی سائین! اللہ تیکوں بہوں ڈیوے، توں رَج وَج کے سوہنی جوانی مانڑیں!'' (بی بی مالکن! اللہ تجھے بہت دے۔ تو جی بھر کر اپنی خوب صورت جوانی سے لطف اندوز ہو۔)

میڈم نے جواباً ہاتھ لہرایا پھر میری طرف متوجہ ہوئی، ''اِسے گاڑی میں ڈالو۔''

''کیا اِسے ڈیرے پر لے جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں!'' میڈم نے کہا اور گاڑی کی طرف پلٹی۔

''مگر اس فضول محنت کی کیا ضرورت ہے میڈم!'' میں نے جلدی سے کہا، ''جو پوچھنا ہے، یہیں پوچھ لیتے ہیں اور اپنی راہ پکڑتے ہیں۔''

میڈم پلٹی۔ چند لمحوں تک مجھے ایک ذرا خفگی سے دیکھتی رہی، پھر تحکمانہ انداز میں بولی، ''میں جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو اور فضول مشورے نہ دو۔''

میں نے مسکرا کر کہا، ''میں آپ کا نوکر نہیں ہوں، باڈی گارڈ بھی نہیں ہوں بلکہ آپ کا دوست ہوں۔ دوستوں پر حکم نہیں چلایا جاتا۔''

مجھے توقع تھی کہ وہ بھڑک اُٹھے گی اور مجھے بے نقط سنائے گی مگر اس کے برعکس وہ تھم گئی۔ اسپاٹ نظروں سے مجھے چند لمحوں تک گھورتی رہی پھر مسکرا کر بولی، ''اوہ میں یہ تو بھول ہی گئی تھی

کہ تم میرے نوکر نہیں ہو۔ اچھا! کرو، جو کرنا چاہتے ہو۔''

مجھے اُس پر فخر ہوا۔ وہ گاڑی کے بونٹ پر اچھل کر بیٹھ گئی اور پسٹل سے کھیلتے ہوئے ہمیں دیکھنے لگی۔ میں نے اپنے پیروں میں پہلو کے بل لیٹ کر کراہتے ہوئے پیرو ماچھی کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر رسید کی اور غرا کر کہا، ''اوئے حرام زادے! سیدھا ہو کر بیٹھو۔ یہ کیا عورتوں کی طرح 'ہاں ہاں' کر رہے ہو۔ ٹانگوں میں گولیاں لگی ہیں، کوئی سینے میں تو لگی نہیں کہ چیخنے چلانے لگے ہو۔''

اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے بگڑ چکا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے بغور دیکھا۔ وہ درمیانے قد کا گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ اس نے بڑی، نوک دار اور غیر تراشیدہ مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں جو اس کی دہشت میں اضافہ کرتی تھیں۔ چوڑی رسمی مارکہ قلمیں، گھنگھریالے لانبے سیاہ بال اور سرخ ڈوروں والی موٹی موٹی آنکھیں اس کی شکل کو خاصا خوفناک بناتی تھیں۔ میں نے اُسے دو چار ٹھڈے مارے۔ وہ بلبلا کر بولا، ''کیا مصیبت ہے تمہیں؟ بلاوجہ کھوتے کی طرح دولتیاں مار رہے ہو۔''

میڈم کھلکھلا کر ہنسی۔ یوں لگا جیسے مندر کی ڈھلتی ہوئی شام مترنم گھنٹیوں کی آواز میں دیوانہ وار نہانے لگی ہو، جھوم کر رقص کرنے لگی ہو۔ اس کی ہنسی ندامت انگیز تھی مگر مجھے اچھی لگی۔ ایسے ہی وقت میں دِینے ملاح نے اپنا پیٹرانجن اسٹارٹ کر دیا۔ باوجود کہ وہ ہم سے بہت دور تھا، اس کے انجن کی پھٹ پھٹ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا اور میں میڈم شکیلہ پر ایک نگاہِ شکایت ڈال کر پیرو ماچھی کی طرف متوجہ ہوا جو ایک ٹانگ پکڑے کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کی دوسری ٹانگ پر عین زخم والی جگہ پر بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ وہ چیخ مارتے ہوئے دوسری جانب الٹ گیا۔ چلایا، ''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اسے ایک ذرا نظر انداز کرتے ہوئے میں نے طائرانہ نگاہ چہار سُو ڈالی۔ سوائے دوسرے کنارے کے قریب پہنچنے والے چوبی کشتے پر کھڑے دِینے ملاح کے، کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا۔ عجیب ویرانی سی ویرانی تھی۔ میڈم شوخی سے بولی، ''یہاں ہیرو، ہیروئن اور ایک عدد زخمی ولن کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بے فکری سے اپنا کام کرو۔''

میں نے ولن کی طرف دیکھا۔ وہ سرخ آنکھوں سے مجھے کچا چبانا چاہتا تھا مگر مجبور پڑا تھا۔ دیکھنے میں وہ خاصے مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دیتا تھا مگر وہ نہایت بھونڈے طریقے سے

اپنی غالب پوزیشن سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اَب اپنے زخموں کا لہو چاٹ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پیروں کے بل بیٹھ گیا اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا، ''پیرو! مجھے تجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ تجھے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے چند سوالوں کے جواب درکار ہیں۔ اگر صحیح بتاؤ گے تو تمہیں زندہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا وگرنہ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے والے تم پہلے شخص نہیں ہو گے۔''

اس نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا، ''تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اپنے لہجے میں بے پناہ درشتی اتارتے ہوئے کہا، ''سوال نہیں؛ جواب..... تم اُس پارکس کے پاس گئے تھے؟''

اس نے مجھے گہری نظر سے دیکھا اور تکلیف دباتے ہوئے کہا، ''اپنے ایک دوست کے ہاں گیا تھا۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

اس کی آنکھوں نے چغلی کر دی تھی کہ وہ مشکل پسند انسان تھا۔ میں نے پسٹل کوٹ کی جیب میں ڈالا اور گراری دار چاقو نکال لیا۔ وہ شاید کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا، جونہی میں نے چاقو کھولنا چاہا، اُس نے پوری قوت سے اپنا آہنی مکا میرے جبڑے پر دے مارا۔ چونکہ مجھے اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی، اس لئے میں سنبھل نہ پایا اور پہلو کے بل زمین پر گر گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرا جبڑا ٹوٹ گیا ہو۔ درد کی کٹیلی لہر میرے تن بدن میں پھر گئی۔ میں نے اُٹھنے میں دیر نہیں کی مگر تب تک وہ بھی گھٹنوں کے بل کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ جبڑے پر رکھا ہوا تھا۔

میڈم نے تالی بجائی اور چہکی، ''پیر بخش! ایک دم مزہ آ گیا۔ ونس مور.....!''

میرا بدن سلگ اُٹھا۔ ایک نظر میڈم کو دیکھا جو بچوں کی طرح خوشی سے مچل رہی تھی۔ پیرو ماچھی مجھ پر سرخ ڈوروں والی آنکھیں جمائے زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ میں نے چاقو کھولا۔ 'کڑکڑ' کی مخصوص آواز سنائی دی۔ تھوڑی مایوسی ہوئی کہ چاقو کا پھل تیز دھار نہیں تھا مگر کام چلتا تھا۔ مخصوص انداز میں لہرایا۔ پیرو اشتعال انگیز انداز میں بولا، ''مجھے دو گولیاں لگی ہیں جن کی وجہ سے میں پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ تم ٹھیک ٹھاک ہو پھر بھی ہتھیار کا سہارا لیتے ہو۔ ہمت ہے تو چاقو پرے پھینک کر میرے قریب آؤ۔ تمہاری بانسری نہ بجا دوں تو میرا نام پیرو ماچھی نہیں ہے۔ ہاں.....!'' اس نے اپنی عادت کے مطابق مجھے دو تین ناقابلِ اشاعت

گالیوں سے بھی نواز دیا۔

میں نے ایک لمحے کیلئے سوچا پھر اس کا چیلنج قبول کرتے ہوئے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور قدم بڑھایا۔ قریب پا کر اُس نے پوری قوت سے میری ناف کے نیچے مکا مارا۔ میں آگے کی جانب جھک گیا جس سے میرے جسم کا درمیانی حصہ پیچھے ہو گیا اور اس کا وار خطا گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں میری جانب گرنے لگا تو میں نے اُچھل کر اپنی داہنی کہنی اس کے سر میں رسید کر دی۔ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی اور دھڑام سے میرے ٹانگوں کے بیچ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میں نے اچھل کر ہٹنا چاہا مگر اس نے اچانک الٹے ہاتھوں میرے پیر تھام لئے۔ میں اس کے پیروں کے قریب منہ کے بل جا گرا۔ شکر ہوا کہ میں نے اپنا منہ زمین پر لگنے سے بچا لیا تھا وگرنہ میں جس تیزی سے گرا تھا، میری ناک کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میں نے تڑپ کر کروٹ بدلی۔ میرا بایاں پیر اس کی گرفت سے نکلا مگر دایاں پیر اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے مڑ گیا۔ میرے منہ سے سسکاری برآمد ہوئی۔ میں نے ٹانگ جھٹکی مگر کم بخت کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ میں نے الٹی کروٹ لی اور اس کے اوپر جا گرا۔ اس کی ٹانگ کے زخم پر کہنی ماری۔ وہ بلبلا اٹھا مگر اس نے میرا پیر نہ چھوڑا۔

میں نے اس کی دوسری ٹانگ پر مکا مارا اور اُٹھنا چاہا مگر اچانک میرے پورے جسم میں تکلیف دہ برقی لہر دوڑ گئی۔ وہ میرے سنبھلنے سے پیشتر وہ پھر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے میرا پیر پکڑ کر مروڑ دیا تھا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے گھٹنے کے عقبی حصے میں کھڑی ہتھیلی کا وار کر دیا۔ میرے منہ سے سسکی نکل گئی۔ میں نے اُٹھنا چاہا مگر زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔ اس کی گرفت میں بلا کی سختی تھی۔ خود کو آزاد کرانے کے لئے تھوڑا اوپر اُٹھا مگر اس نے زوردار چیخ ماری اور میرے نیچے سے اپنی زخمی ٹانگ کھینچ کر آنِ واحد میں میرے گھٹنے کے عقبی حصے میں رکھ دی اور میرا تھاما ہوا پیر پوری قوت سے نیچے کی طرف دبا دیا۔ یہ بہت خطرناک داؤ تھا۔ مجھے یکبارگی یوں محسوس ہوا جیسے میری ٹانگ اَب تب میں ٹوٹنے والی ہو۔ وہ لگاتار چیختا جاتا تھا اور اپنا پورا وزن میرے پیر پر ڈالتا جاتا تھا۔

دباؤ کی ایک حد تک جا کر میری برداشت جواب دے گئی اور میرے حلق سے بلند چیخ نکل گئی۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں بار بار جھٹکے دینے لگا جس کے نتیجے میں میرے حلق سے چیخیں برآمد ہوتی گئیں۔ اس نے حلق پھاڑ کر مجھے ماں کی گالی دی اور اشتعال انگیز انداز میں کہا،

''اوئے برائکر! اَب بول..... تیری تو..... تو اگر اپنے باپ کی اولاد ہے تو اُٹھ کر وار کر..... اپنے باپ، پیرو ماچھی پر..... اوئے لومڑی کی بچی! تو اب بھی تالیاں بجاناں..... اپنے یار کی حالت دیکھ کر سیٹیاں مار.....''

اس کی چنگھاڑتی ہوئی آواز میری سماعت میں انگارے اُتار رہی تھی اور میں بے بسی سے اوندھے منہ پڑا اس کے خونیں شکنجے سے نکلنے کی فوری ترکیب سوچنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ میڈم ایک لمحے کو بھی پریشان نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے تالی بجا کر کہا، ''میں داد دینے میں کنجوسی نہیں کرتی پیر بخش! تم نے بہت عمدہ داؤ کھیلا ہے۔''

''اسلحہ تھام کر لڑنا تو ہر کسی کو آتا ہے کھوتے کی اولاد.....'' پیرو ماچھی نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور میرے شجرہ نسب میں نامناسب تبدیلیاں کیں۔

میرے پاس چاقو نکالنے کے سوا چارہ نہیں رہا تو میں نے جبڑے بھینچے اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی جیب سے چاقو نکالا۔ کھولنے کے لئے سر سے بلند کیا تو میڈم کی طنزیہ آواز میرے کانوں میں پڑی، ''نہیں شہریار! یہ مردانگی نہیں۔ تم نے اپنی مرضی سے چاقو فولڈ کر کے جیب میں ڈالا تھا۔ اِٹ از ناٹ فیئر گیم!''

میڈم کی آواز سن کر پیرو ماچھی کو میرے ہاتھ میں چاقو کی موجودگی کا علم ہو گیا اور وہ خبردار ہو گیا تبھی عین اسی لمحے اس نے ایک جھٹکے سے اپنے بدن کا پورا وزن میرے پاؤں پر ڈال دیا۔ میرے حلق سے نکلنے والی چیخ میرے دماغ کے نہاں خانوں میں اِس شدت سے گونجی کہ چند ثانیے تک میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی۔ یوں لگا جیسے میری ٹانگ گھٹنے سے علیحدہ ہو گئی ہو۔ چاقو میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر میں نے فیصلہ کن انداز میں نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی دوسری ٹانگ کو ہوا میں اُٹھایا اور کوشش کی کہ اس کی کمر پر جما سکوں مگر کامیاب نہ ہو سکا اور ٹانگ ہوا میں لہرا کر دھڑام سے پیرو کی ٹانگ پر گری۔ اس نے حلق سے خرخراہٹ اُگلی اور میرے پاؤں کو زوردار جھٹکا دیا۔

مجھ پر مایوسی حملہ آور ہونے لگی تھی۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے کوئی مضبوط داؤ پیچ میری دانست میں نہیں تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کی سمت بڑھایا۔ اپنی چھاتی کو تھوڑا بلند کیا۔ میرا ہاتھ بدقت پیرو کے پاؤں تک پہنچا۔ اس کے پیر کو ٹٹولتے ہوئے میں نے زخم تلاش کیا۔ تب تک وہ چوکنا ہو گیا تھا۔ اس نے چاہا کہ اپنی ٹانگ میرے نیچے سے کھینچ لے

مگر میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ جونہی مجھے انگلیوں پر خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی، میں نے کھڑی انگلی اندھا دھند اس کی پنڈلی پر مارنی شروع کر دی۔ دوسرا یا تیسرا وار کارگر ثابت ہوا اور میری انگلی کی ضرب عین گولی کے زخم پر لگی۔ اس کے منہ سے غراہٹ نکلی اور اس نے میرا پاؤں چھوڑ دیا۔ بے ساختہ تڑپ کر مڑ گیا اور اس کی پنڈلی میری ٹانگ کے نیچے سے نکل گئی۔ یہ مرحلہ اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھا مگر زندگی کی بازی کھیلتے ہوئے ایسی ٹیسوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ وہ آزاد ہو گیا۔ میں بھی چند لمحوں کے لئے اس کی گرفت سے نکلا تھا مگر میں کوئی حرکت نہیں کر پایا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری ٹانگ ابھی تک اس کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔

وہ اپنے تمام تر وزن کے ساتھ میری پیٹھ پر آن گرا۔ میرا سینہ یک لخت پچکا۔ سانس غیر معمولی رفتار سے نتھنوں سے خارج ہوئی۔ دوسری اُفتاد یہ پڑی کہ اُس نے میری گردن پر زور دار مکا رسید کر دیا۔ دوہری تکلیف ہوئی۔ ایک گردن کے پیچھے، دوسری ناک زمین پر لگنے کی۔ میری آنکھوں کے سامنے یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ ابھی میری ٹانگ حرکت کے قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس نے میرے بازو کی مچھلی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا اور حلق کے بل چیخا، ''اُٹھ مائی کے لعل..... باپ پر ہاتھ ڈال؛ اپنی جوانی دکھا ذرا..... نہیں تو زمین پر ناک رگڑ اور پیرو ماچھی سے معافی مانگ.....''

وہ میری توقع سے کہیں زیادہ خطرناک اور سخت جان واقع ہوا تھا وگرنہ دونوں ٹانگوں میں گولیاں لگنے کے بعد اتنی سریع حرکت کی توقع کسی گوشت پوست کے انسان سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ زمین پر ٹکائے، سانس روکی اور دانت کچکچا کر اوپر اُٹھنے کی کوشش کی۔ گھٹنے کے عقب میں تیز ٹیس اُٹھی اور سر چکرا گیا۔ اس نے مجھے متحرک دیکھ کر میری گدی پر دوسرا مکا جڑ دیا۔ یہ پہلے سے کم جاندار تھا۔ شاید اِس وجہ سے کہ میں اوپر اُٹھ کر اس کے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ میڈم کی حوصلہ افزائی میرے کانوں میں اُتری، ''گڈ..... ویل ڈن..... لیو دالینڈ وِد نیو کرنٹ ڈارلنگ!''

اس کے مکوں کا دائرہ کار گردن سے بڑھ کر کھوپڑی کے عقبی حصے تک پہنچ گیا تو میرا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔ میں دیوانہ وار اُٹھا اور پیٹھ پر لدے ہوئے اُس زخمی ریچھ کو جھٹک پھینکنے میں کامیاب ہو گیا مگر اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا اور تیورا کر پھر منہ کے بل جا گرا۔ میری آنکھوں کے سامنے دبیز اندھیرا چھا گیا مگر لاشعور میں پیرو ماچھی کا ہولناک قرب خطرے کی گھنٹی بجا رہا

تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے گرتے ہی دائیں پہلو کے بل دو چار کروٹیں لیں اور پیرو سے دور گاڑی کے عقبی ٹائر کے قریب پہنچ گیا۔ میرے کانوں میں پیرو کی آواز گونجی، ''کتے کا بچہ! دور کیوں بھاگتا ہے؟ نر کا بچہ ہے تو میرے قریب آ، تیری.....''

اس کے منہ سے نکلنے والی غلیظ گالی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں پڑی اور میں بھڑک کر اُٹھا۔ زور کا چکر آیا اور سر تھام کر ٹائر کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پیرو ماچھی کا عکس میری آنکھوں کے سامنے رقصاں تھا۔ میں نے اُس پر نظریں جمانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ہاتھوں کے تضحیک آمیز اشاروں سے مجھے اپنی جانب بلا رہا تھا۔

میں نے اپنے گھٹنے کو دونوں ہاتھوں میں سختی سے تھاما اور ہلا جلا کر دیکھا۔ شکر تھا کہ ٹوٹنے سے بچ گیا تھا مگر وقتی طور پر فعال نہیں رہا تھا۔ کئی مرتبہ سر جھٹکا، تب جا کر اس کی تھرتھراتی ہوئی تصویر ساکت ہوئی۔ وہ گھٹنوں کے بل جنگلی ریچھ کی طرح چھاتی پھیلا کر چند قدموں کے فاصلے کھڑا مجھے خشمگیں آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں اور گاڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے فوری طور پر احساس ہو گیا کہ میری ٹانگ میرا بھرپور ساتھ دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔ تبھی اپنے جسم کا زیادہ وزن دوسری ٹانگ پر ڈالا اور لنگڑاتا ہوا پیرو کی طرف بڑھا۔

دو قدم چلا تو پیرو کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چاقو پر نظر پڑ گئی۔ وہ چاقو والا ہاتھ ہوا میں بلند کئے میرے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں تھم گیا۔ میڈم کی آواز سنائی دی، ''پیر بخش کو زخمی ہونے کی وجہ سے چاقو رکھنے کی رعایت دی جا سکتی ہے شہریار!''

میں نے میڈم کی چھیڑ چھاڑ کو نظر انداز کیا اور اپنی نظریں چاقو پر جماتے ہوئے قدم بڑھایا۔ جونہی پیرو کے قریب پہنچا، اُس نے مجھ پر بجلی کی سی مستعدی سے وار کر دیا۔ میں ایک پاؤں پر اُچھلا اور اس کا وار خطا کرتے ہوئے پہلو میں پہنچ گیا۔ میرا زوردار گھونسا اس کے بائیں جبڑے پر پڑا۔ وہ لہرایا مگر سنبھل کر گرنے سے بچ گیا اور اس کا چاقو والا ہاتھ کوندے کی طرح میری جانب لپکا۔ میں جھپٹ کر پیچھے ہٹا اور ایڑی پر گھوم گیا۔ میری نیم مفلوج ٹانگ اس کی پسلیوں میں لگی۔ اس کے حلق سے 'اوغ' کی کریہہ آواز نکلی اور پہلو میں گرتے گرتے ہتھیلی کے بل زمین پر ٹک گیا۔ میں نے اپنی ٹانگ پھر گھمائی۔ وہ میرے وار سے بچنے کے لئے زمین سے چپک گیا۔ میں بروقت اس کی چالاکی کو بھانپ گیا تھا اِس لئے اچھل کر اس پر جا گرا۔ میرے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ میں دھنس گئے اور میں نے اسے مہلت نہ دیتے ہوئے چاقو والا ہاتھ

کلائی سے تھام لیا۔ یہ سارا عمل پلک جھپکنے میں انجام پایا تھا اس لئے اسے چاقو سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے کلائی مروڑی تو اس کی گرفت چاقو پر کمزور پڑ گئی۔ نتیجتاً چاقو اس کے پیٹ پر گر گیا۔

مجھے اس کی سخت جانی کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے اس سے رعایت برتنے کے حق میں نہیں تھا۔ میرے تابڑ توڑ مکوں نے اُسے چند ہی لمحوں میں نڈھال کر دیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخیں ماند پڑنے لگیں تو میں چاقو اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میری ٹانگ کافی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی اور درد کا احساس بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے چاقو اس کی ران میں گھونپ دیا۔ اس کے حلق سے لمبی 'آہ' کے ساتھ گالیوں کا فوارہ ابل پڑا۔ میں نے پے در پے اس کی دونوں رانوں پر کئی چیرے لگائے۔

میڈم بولی، ''شاہ مدار بننے کے بجائے مرنے والے سے کام کی بات پوچھ لو۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا، ''ہاں پیر بخش! کیا ابھی اور مار ماری کرنی ہے یا شوق پورا ہو گیا ہے؟''

وہ بدقت تمام بولا، ''کھوتے کے بچے! یاد رکھ، ایک ایک زخم کا بدلہ لوں گا تجھ سے۔ تو کتے کی طرح میرے تلوے چاٹے گا اور زندگی کی بھیک مانگے گا۔''

میں نے اس کا ایک پائنچہ اوپر چڑھا دیا۔ وہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ ہاتھ بڑھایا تو میں نے بجلی کی سی سرعت سے چاقو گھما دیا۔ کند چاقو کی نوک اس کی ہتھیلی میں لگی۔ وہ ہاتھ جھٹک کر چیخا، ''آخر تجھے مجھ سے دشمنی کیا ہے کتے کے بچے؟ جا، دفع ہو جا۔''

وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اسے سیمی آٹو میٹک گن تان کر ہینڈز اَپ کرانے کے جرم کی سزا دے رہا تھا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ ہم اس کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اور اس کی بدبختی اُسے کھینچ کر ہمارے پاس لے آئی تھی۔ میں نے چاقو اس کے چہرے کی طرف لہرایا۔ میری توقع کے مطابق وہ وار سے بچنے کیلئے پیچھے گر گیا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے اس کی ننگی پنڈلی کی طرف دیکھا۔ گھٹنے سے بمشکل دو انچ نیچے گولی کا ننھا سا سوراخ دکھائی دے رہا تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ اس نے جرابوں کے علاوہ بوٹ پہن رکھے تھے جن میں کافی سارا خون جمع ہو گیا تھا۔ میں نے چاقو کی نوک گولی کے زخم پر رکھی اور سرد لہجے میں پوچھا، ''پیرو! تم دریا پار کیا کرنے گئے تھے؟''

وہ جواب دینے کے بجائے پھر اُٹھ بیٹھا۔ جونہی اسے میرے خطرناک ارادے کا اندازہ ہوا، اس کی آنکھیں مارے دہشت کے پھیل گئیں۔ بولا، ''کک..... کیا کرنے لگا ہے تو؟..... کک..... کیا تکلیف ہے تجھے؛ پاگل ہوگیا ہے؟''

میں نے چاقو کی نوک پنڈلی کی ہڈی میں بنے ہوئے گولی کے سوراخ میں ڈالی۔ اس کے حلق سے دردناک کراہ خارج ہوئی۔ میں بولا، ''اگر تم میرے ساتھ تعاون نہیں کرو گے تو میں ہڈی کے سوراخ میں چاقو کسی کلے کی طرح ٹھونک دوں گا۔ تمہیں اندازہ تو ہوگا ہی کہ زخمی ہڈی میں چاقو کا پھل کتنا شدید درد اُتار سکتا ہے..... ہیں؟''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے چاقو پر تھوڑا سا دباؤ بڑھا دیا۔ درد کا ابتدائی مرحلہ خاصا خوف ناک تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ دریا پار تک، دِینے ملاح کے کانوں تک ضرور پہنچی ہوگی۔ بری طرح سر جھٹکتے ہوئے بولا، ''خدا داناں من؛ ایں کوں کڈھ گھن.....''

(خدا کا نام مان اور اِسے باہر نکال لے۔)

اس کا اشارہ سوراخ میں پھنسے ہوئے چاقو کی طرف تھا۔ میں نے چابی دبائی۔ اس کی رہی سہی قوتِ مدافعت بھی دم توڑ گئی اور وہ زمین پر کمر کے بل گر گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ چند لمحوں بعد بولا، ''پپ..... پانی..... پَر تجھے کیا؛ میں جس کے پاس بھی جاؤں، جو بھی کروں، تیرا اِس سے کیا واسطہ؟''

میں نے چاقو دبایا۔ وہ کراہا، ''اوئے نامراد دا بچہ! میں اپنے سنگتی جمیل کے پاس گیا تھا۔ جمیل دستی کے پاس؛ جھوک میں۔ بس..... اب تو تیری ضد پوری ہوگئی ہے۔ جا، میری جان چھوڑ جا.....''

اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ میں نے پوچھا، ''شاباش! اب یہ بھی بتا دو کہ تم نے بابے گامن کی بیوی اور بچے کو کس کی ڈیمانڈ پر اغوا کیا ہے؟''

''کون گامن؟ میں کسی گامن کو نہیں جانتا۔'' اس نے چیخ کر کہا، ''اور نہ کسی کی ڈیمانڈ شیمانڈ پر کام کرتا ہوں۔ میں پیرو ماچھی ہوں؛ کرائے کا بدمعاش نہیں ہوں۔''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے چاقو کو تھوڑا اور دبایا اور چابی کی طرح تھوڑا دائیں جانب گھمایا۔ اس کے حلق سے دلدوز چیخ نکلی اور جھٹکے لینے لگا۔ ایک مرتبہ اُٹھ کر بیٹھا، پھر ہاتھ لہراتا ہوا پشت کے بل گر گیا۔ میں نے کہا، ''جواب دو؛ کس کے کہنے پر ان ماں بیٹے کو تم نے

اُٹھایا ہے؟''

''تو کون ہے؟''

''میں تمہاری موت ہوں..... موت..... جو پوچھتا ہوں، وہ بتاؤ ورنہ.....'' میرا لہجہ بہت سنگلاخ تھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ آنکھیں زور سے میچ کر بولا، ''میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا۔''

میں نے پینترا بدلا۔ کہا، ''کیا تمہیں علم ہے کہ تمہارے ڈیرے پر رات کو پولیس نے ریڈ کیا تھا اور تمہارے سبھی ساتھی پولیس مقابلے میں مارے گئے۔''

اس کا کانپتا ہوا سر تھم گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ پھٹی پھٹی آواز میں بولا، ''کک..... کیا کہہ رہا ہے تو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

میں نے کہا، ''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔ میں بتائے دیتا ہوں۔ آدھی رات کو بہت سی نفری کے ساتھ ایس ایچ او نے تمہارے ڈیرے پر ریڈ کیا۔ چاروں طرف گھیرا ڈال لیا۔ تمہارا ایک آدمی، مراد بخش، ان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے بتایا کہ تمہارے دوسرے ساتھی گامن کے ڈیرے پر کوئی کارروائی ڈالنے گئے ہیں۔ پولیس نے مراد بخش کو گولی ماری اور گامن کے ڈیرے کا رُخ کیا۔ وہاں تمہارے باقی ساتھی بھی پولیس کی فائرنگ میں کام آ گئے۔ سمجھے؟''

اسے اپنی تکلیف بھول گئی۔ دیدے پھیل گئے۔ زبان مفلوج ہو گئی۔ مجھے ایک ٹک دیکھتا رہا پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولا، ''فائرنگ کی آواز تو سنی تھی مگر.....!''

میں نے دیکھا کہ اس پر مایوسی کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ شاک سے نکلا تو شکست خوردہ انداز میں سر موڑ کر میڈم کو دیکھنے لگا، پھر مجھے اور بولا، ''کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟''

میں نے کندھے اُچکائے اور قدرے لاپروائی سے کہا، ''ہاں! تمہاری مرضی، یقین کرو یا نہ کرو۔''

وہ چند لمحوں تک آنکھیں موندے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا پھر اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا، ''مجھے جانے دے؛ دیکھوں، کچھ بچا ہے یا سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکا، ''پیر بخش! تمہارا دل مانے، نہ مانے، پر سچ یہی ہے کہ تمہاری سلطنت اجڑ گئی ہے اور اب وہاں کچھ بھی باقی نہیں۔ تمہارے جان نثار ساتھی مردہ کتوں کی طرح تھانے میں پڑے ہیں جبکہ خون کی ندیاں بہانے والا اسلحہ پولیس کے اسٹور

میں رکھا جا چکا ہے۔ کیا کرو گے وہاں جا کر؟''

اس نے ایک طرف گردن ڈال دی۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا پھر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پانی کی بوتل نکال کر پلٹا اور چھینٹے مار کر ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے دو چار منٹ بعد کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُٹھ بیٹھا۔ چاقو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ زخم دکھ گیا۔ ہڈی میں پھنسے ہوئے چاقو نے درد کی خنک ٹیس پورے بدن میں اُتار دی تو بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا، ''پپ..... پانی دے مجھے..... ہائے!''

وہ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والا نہیں تھا مگر اپنے گروہ کے ختم ہونے کی اطلاع سنتے ہی اس نے ذہنی طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میں نے بوتل منہ سے لگائی۔ چند گھونٹ پینے کے بعد ہچکیاں لینے لگا۔ ہر ہچکی کے بعد اس کے حلق سے دردناک آہ خارج ہو جاتی تھی۔ میں نے کہا، ''پیر بخش! میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم نے گانمن کی بیوی اور بچے کو کس کے کہنے پر اغوا کیا اور انہیں کہاں پہنچایا۔ یہ بتا دو گے تو زندہ بچ جاؤ گے وگرنہ اپنے ساتھیوں کے پاس اگلے جہان پہنچا دیے جاؤ گے۔ جلد فیصلہ کر لو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔''

اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے لعاب آلود پانی رسنے لگا۔ عجیب بے بسی بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا، ''تو اس لنگڑے منحوس کا کیا لگتا ہے؟''

میں پھنکارا، ''یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔''

میرے عقب میں میڈم کی آواز گونجی، ''میں بتاتی ہوں پیر بخش! اس کا بابے گانمن سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر میرا ہے۔ میں اس کی بیٹی ہوں۔ چندو ماہی..... کیا تمہیں میرا نام یاد ہے؟''

وہ زیر لب بڑبڑایا، ''چندو ماہی..... لنگڑے کی دھی..... اوہ! تو یہ تو ہے..... مگر یہ سب کیا ہے؟''

وفورِ حیرت سے وہ اپنا مدعا پوری طرح ظاہر نہیں کر پایا اور گردن موڑ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے میڈم کو دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی پرانی پوزیشن سنبھال لی اور چاقو کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے حلق سے سسکاری نکلی اور بولا، ''اسے ہاتھ نہ لگا؛ میری جان نکلتی ہے۔ اے چندو! اسے بول کہ یہ چاقو نکال لے ورنہ میں درد سے مر جاؤں گا۔ دیکھ چندو..... تو واقعی چندو ہے..... ہائے! تو کتنی بدل گئی ہے۔ میں نے تو پہچانا ہی نہیں۔''

میں نے مستفسر نگاہوں سے اُسے گھورا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنا سوال دہرایا۔ وہ

گردن جھکا کر بولا، ''میں جانتا ہوں کہ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مگر ٹھیک ہے۔ میرے بعد کیا ہوتا ہے، کیا نہیں ہوتا؛ مجھے کیا؟ ان دونوں کو میں نے دس لاکھ روپے اور دو ولائتی گنوں کی قیمت پر بیچ دیا ہے۔ وہ اِس وقت بہت دور پہنچ چکے ہوں گے۔ تم ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ پہنچ بھی گئے تو تمہارے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔ اب موت ہی انہیں اس شکنجے سے نکالے تو نکالے، بندے کے بس کی بات نہیں۔''

مجھے اس کے رویے پر غصہ آیا مگر میں نے ٹوکا نہیں بلکہ آنکھوں سے اُسے اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بولا، ''تو انہیں خریدنے والے پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ ہائے! یہ چاقو نکال لے۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔ آہ! بہت شدید درد ہو رہا ہے۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا، کہا، ''پیر بخش! وہ بڑا آدمی کون ہے؟''

''وہ..... وہ..... تم اُسے نہیں جانتے۔ وہ اس ناری کا عاشق ہے۔ یہ اسے اپنی شکل دکھا دے تو وہ دونوں کو آزاد کر دے گا ورنہ کبھی نہیں..... ہائے! وہ ادھر..... مظفر گڑھ ضلعے میں رہتا ہے۔''

وہ پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھا اس لئے نہایت بے ربط انداز میں بول رہا تھا۔ میں نے کہا، ''میں نے اُس کا نام پوچھا ہے۔''

''اس کا نام یارن خان ہے؛ سردار یارن خان..... ادھر نور پور میں رہتا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔''

یارن خان کا نام سنتے ہی میرا ذہن ایک لمحے میں بھک سے اُڑ گیا۔ میں نے بے یقینی سے کہا، ''کیا کہا تم نے؛ یارن خان..... سردار یارن خان بلوچ..... نور پور والا؟''

''ہاں..... ہاں..... کیا تو اسے جانتا ہے؟ اسے ہر کوئی جانتا ہے۔ تو اس کا خیال چھوڑ دے ورنہ مارا جائے گا۔ خان بہت ظالم ہے۔'' اس نے ہاتھ لہرایا۔ اس دوران اس کی آنکھوں سے وفورِ تکلیف سے آنسو نکلنے لگے تھے۔ وہ بڑی جوان مردی سے کافی دیر سے غیر معمولی تکلیف برداشت کرتا چلا آ رہا تھا۔

اس کی بات ماننے کی نہیں تھی۔ میری دانست میں یارن خان ایسا شخص نہیں تھا۔ باوجود کہ میں اس کے کبھی قریب نہیں رہا تھا، اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا مگر وہ اتنا 'پہنچا' ہوا شخص ہوگا، یہ ماننا میرے لئے دشوار تھا۔

میں نے پیر بخش کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ زبان بھلے جھوٹ کی بکل مار کر دبک

جائے، آنکھیں سچ بولتی ہیں اور دل کی دنیا کو دیکھنے والے پر لحظہ بھر میں آشکار کر دیتی ہیں۔ اس کی آنکھیں اس کے کہے کی لاج رکھتی محسوس ہوئیں تو میرے حلق سے طویل سانس خارج ہوگئی اور میں نے زہر خند لہجے میں کہا، ''کیا تم نے اس بڑھیا اور بچے کو نور پور پہنچایا ہے؟''

''نن..... نہیں..... اس کے بندوں نے پتن پر مال وصول کیا تھا..... اب نہیں معلوم یارن خان نے انہیں کہاں رکھا ہوا ہے۔ خدا کی قسم! میں نہیں جانتا۔'' وہ گھگھیایا اور ہاتھ جوڑ کر بولا، ''یار! میں نے سب کچھ تجھے بتا دیا۔ اب تو میری جان چھوڑ دے؛ یہ چاقو نکال لے۔''

میں نے پوچھا، ''یارن خان نے کتنے بندے بھیجے تھے؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟''

''وہ تعداد میں تین تھے۔ میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔''

''پھر تم نے مال اُن کے حوالے کیوں کر دیا؟ وہ کسی اور کے بھیجے ہوئے بھی تو ہو سکتے تھے؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں..... وہ یارن خان کے آدمی ہی تھے کیونکہ انہوں نے بقایا رقم میرے حوالے کی تھی۔''

''کتنی؟''

''آدھی..... آدھی رقم بیعانے میں دی تھی۔''

''وہ رقم کہاں ہے؟''

''وہ جمیل دستی کے پاس پڑی ہے۔''

''اس کا تمہارے دھندے سے کیا تعلق ہے؟''

''وہ تھرڈ مین ہے۔ دلالی کرتا ہے۔'' اس نے ہاتھ اُٹھا کر بدقت کہا، ''اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔''

میں نے ہاتھ کا دباؤ بڑھایا، وہ چیخ اُٹھا، بولا، ''اسے باہر نکال..... ہائے! اسے باہر نکال ورنہ میں مر جاؤں گا۔ اوئے چندو! اس سے بول دے ناں!''

''ایک بات اور..... تم نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ ان دونوں غریبوں کو کیوں اتنی بھاری قیمت میں خرید رہا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ معلوم ہوا کہ اس نے سچ بولا تھا۔ میں اس سے کچھ اور دریافت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چاقو کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ میڈم کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس نے یارن خان کے بارے میں سن لیا تھا۔ اس کے ہونٹ

بھنچ گئے تھے اور چند لمحے پیشتر دکھائی دینے والا کھلنڈرا پن مفقود ہو چکا تھا۔ سنجیدگی سے بولی، ''میں نے سب سن لیا ہے۔ ہمیں اس کمینے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

اس نے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے مجھے سمجھا دیا کہ اس کی چھٹی کرا دوں۔ پیرو ماچھی بھی سمجھ گیا تھا تبھی بھرائی ہوئی آواز میں کراہا، ''ہائے! مجھے مار کر تجھے کیا ملے گا چندو..... دیکھ..... میں کسی نہ کسی دن تیرے کام آ جاؤں گا۔ کتا بھی کام آ جاتا ہے۔ بلاوجہ مجھے مت مار۔''

میڈم اُچھل کر بونٹ سے اُتری اور آہستگی سے چلتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی۔ اس پر نگاہِ تنفر ڈال کر سرد لہجے میں بولی، ''یہ نہ سوچنا کہ میں تمہیں اُس جرم کی سزا دے رہی ہوں، جو تم نے آج سے کئی سال قبل کیا تھا۔ تب تم اتنے بڑے بدمعاش نہیں تھے؛ بس معمولی سے چور اُچکے ہوا کرتے تھے۔ یاد ہے ناں؟ ہاں..... وہ جرم میں نے معاف کر دیا تھا مگر تمہاری اس ظالمانہ حرکت کو معاف نہیں کر سکتی۔ تم نے ایک بوڑھی عورت اور لاغر بچے پر ظلم کا پہاڑ توڑا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرے سگے ہیں۔ نہیں پیر بخش..... مجھ میں اتنی برداشت نہیں ہے۔''

میڈم کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ مجھے بے اختیار جھرجھری آ گئی۔ وہ میری طرف مڑی اور تحکمانہ انداز میں بولی، ''شہریار! ڈو اٹ ناٹ..... ناٹ مین زیرو.....''

پیرو ماچھی نے ایک زوردار جھٹکا لیا اور میڈم کے پیروں کی طرف لپکا۔ میڈم مستعدی سے پیچھے ہٹ گئی اور پلٹ کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ پیرو بلند آواز میں زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ زندگی روٹھ کر جانے لگے تو انسان سبھی کروفر بھول جاتا ہے۔ سب جاہ و حشم مٹی میں مل جاتا ہے۔ پاؤں میں گری ہوئی پگڑی اور پھٹے ہوئے دوپٹے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ پیرو ماچھی اس سے نامی گرامی بدمعاش نہیں رہا تھا بلکہ زندگی کی دہلیز پر تھوڑی سی مہلت مانگنے کے لئے آن کھڑا بھکاری تھا۔ مجھے اس پر ترس آیا مگر میڈم کے حکم سے سرتابی کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے چاقو کے لہو سے تر پھل کو دیکھا اور اُسے پانی میں اُچھال دیا۔ پیرو ماچھی کی طرح اَب اس کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ جیب سے پسٹل نکالا، بولٹ چڑھایا اور پیرو ماچھی کی پیشانی کا نشانہ لیا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی، ہاتھ جڑ گئے اور زبان لکنت زدہ ہو گئی، ''میکوں ناں مار سائیاں! میکوں ناں مار..... عمراں تیڈی جوتیاں دا بھیساں۔''

(مجھے مت مار سائیں! مجھے مت مار۔ میں تمام عمر تمہاری جوتیاں صاف کروں گا۔)

اس دوران میڈم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ میں نے کن

اکھیوں سے ادھر دیکھا۔ وہ گاڑی کو ریورس کر رہی تھی تا کہ ٹرن لے کر واپسی کی راہ پر ڈال سکے۔ میں نے زیرِ لب کہا، ''گڈ بائے پیرو!'' اور پسٹل کی لبلبی دبا دی۔ 'ٹھائیں' کی خوف ناک آواز کے ساتھ ہی پیرو ماچھی کی دونوں آنکھوں کے بیچ سوراخ ہو گیا۔ آنکھیں موت کی دہشت سے گولی لگنے سے پہلے ہی پھیل گئی تھیں۔ وہ ایک فٹ کے لگ بھگ ہوا میں اچھلا اور گر کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی زندگی کے ساتھ ہی اس کے گینگ کی رقم کردہ بربریت بھری کتاب بھی تمام ہو گئی تھی۔

میرے ہاتھوں پر اُس کا خون لگا ہوا تھا؛ لباس پر بھی۔ پینٹ کے ایک پائنچے پر بڑا سا سرخ دھبہ نظر آیا۔ میں دریا کی طرف بڑھا تا کہ ہاتھ اور پائنچہ دھو سکوں۔ عقب میں میڈم کی آواز ابھری، ''شہریار! اس کتے کا کفن دفن کسی نے نہیں کرنا۔ بہتر ہے کہ اِسے غسل دے دو۔ دریا میں پھینک دو۔ زندگی میں کسی کے کام نہیں آیا، مرنے کے بعد تو مخلوقِ خدا کی دو چار وقت کی بھوک مٹا دے۔''

میں رُک کر پلٹا۔ پیرو ماچھی کے جھٹکے لیتے ہوئے وجود کو بانہوں سے پکڑ کر دریا کی طرف کھینچا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے مائل بہ پرواز تھی جب میں نے اُسے پتن سے لڑھکا کر پانی کی نذر کر دیا۔ وہ تہہ کی طرف گیا۔ پانی میں سرخ ڈورے مچلے جنہوں نے چند لمحوں میں ہی پیرو کے مردہ وجود کے اطراف کا پانی گدلا کر دیا۔ وہ چند لمحے زیرِ آب رہا پھر اس کا کھوکھلا وجود مجھ سے خاصے فاصلے پر پانی پر نمودار ہوا اور بہتا ہوا لحہ بہ لحہ دور ہوتا گیا۔ میں نے پائنچہ دھویا، گیلے ہاتھ سے لباس پر لگنے والے خون کے دھبے صاف کئے اور ہاتھ دھو کر پلٹا۔ سوڈیڑھ سو فٹ کی دوری پر میڈم گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی بڑی محویت سے میری کارگزاری کا مشاہدہ کر رہی تھی۔

میں گھوم کر اگلی سیٹ پر آیا۔ وہ متفکر انداز میں گویا ہوئی، ''شہریار! معاملہ خاصا بگڑ چکا ہے۔ مجھے رائی بھر توقع نہ تھی کہ سیمو اور اماں کے اغوا کے پیچھے سردار یار خان کا ہاتھ ہو گا۔''

میں نے حیرت سے کہا، ''مجھے یقین نہیں آتا میڈم! یار خان میرا دور پار کا رشتہ دار ہے۔ میرے گاؤں میں اس کی شاندار دو منزلہ حویلی ہے جہاں وہ سال میں بمشکل دو تین ماہ کے لئے آتا ہے۔ کسی بھی خان کے ساتھ اس کا یارانہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ یہاں کوئی ایسی ویسی حرکت کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے سردار حیدر خان نے بھڑکایا ہو اور مدد مانگی ہو۔''

میڈم نے آنکھیں موند کر نفی میں سر ہلایا اور سوچ میں کچھ لمحے گزار کر بولی، ''نہیں.....وہ حیدر خان کی ایک نہیں سنتا۔ اس کی مدد کیوں کرے گا۔ وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے تبھی میرے بالوں کو پیروں تلے دبا کر بیٹھ گیا ہے۔''

''آپ سے اُس کا کیا تعلق واسطہ؟'' میں نے استعجاب سے پوچھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں، مجھے بغور دیکھا اور بولی، ''کیا تمہارے پاس سگریٹ ہے؟..... ایک تو یہ بھی بڑی مصیبت ہے کہ تم سگریٹ نہیں پیتے ہو۔'' پھر گیئر لیور کو دباتے ہوئے سر جھٹک کر بولی، ''خیر! اَب کیا کرنا چاہیے؟.....نور پور جانے کے لئے لمبا چکر کاٹنا پڑے گا۔ یہ ممکن نہیں رہا کہ بیڑے کے ذریعے دریا پار کریں کیونکہ دِینا ملاح خوف کے مارے اَب ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔''

میں نے غیر اضطراری طور پر دریا کے پار پتن کی طرف دیکھا۔ دِینے ملاح کا بیڑا نظر آ رہا تھا مگر وہ خود دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ وہ بیڑے کو لانہہ کر کے وہاں سے رفو چکر ہو گیا تھا۔ جو منظر اُس نے دیکھا تھا، وہ اُسے مرتے دم تک بھولنے والا نہیں تھا۔ اگر وہ بیڑے کے خیمے میں گھسا ہو گا تب بھی میرے بلانے پر ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ میں نے دل ہی دل میں میڈم کی بات سے اتفاق کیا اور کہا، ''کیا یارن خان بھی حیدر خان کی طرح لمبے ہاتھوں والا ہے؟''

شاید میرا دل ابھی اس نئی صورتِ حال کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بولی، ''ہاں! بلکہ وہ اس سے کہیں بڑا خبیث ہے۔''

ایک مرتبہ دیوانے شاعر کے 'گھروندے' پر ماسٹر ولی جی نے مجھے کہا تھا، ''شہرے! سوہنے کریم کا کرم ہے کہ یارن خان کا دِل نور پور سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ لاہور چلا گیا۔ ورنہ اَب تک نور پور کی گلیاں ویران اور گھر کھنڈر ہو چکے ہوتے۔'' اور تب میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی اور سمجھا تھا کہ وہ اپنا غصہ فرو کر رہا ہے کیونکہ میں یارن خان کو اپنی دنیا میں مگن سمجھنے والا انسان سمجھتا تھا۔ جن دنوں میں ڈاکٹر شاہ جی کے ایما پر اپنے والدین کے قاتلوں کی کھوج میں مصروف تھا، ان دونوں افسر علی نے بھی کم و بیش انہی الفاظ میں یارن خان کی شخصیت کا احاطہ کیا تھا جبکہ شریف چکی والا اور دیوانہ اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔

میڈم شکیلہ نے ایک مرتبہ مجھ سے یارن خان کے بارے میں دریافت کیا تھا اور میرے

استعجاب پر اس نے یارن خان کو دوسرے خانزادوں سے بڑا شیطان قرار دیا تھا۔ آج بھی وہ انہی الفاظ میں اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔ دونوں کے درمیان کہیں سنگین تنازع، خونیں ربط یا کاروباری پرخاش کارفرما تھی۔ میڈم نے دانستہ طور پر اپنے اور سردار یارن خان کے مابین تعلق والا معاملہ گول کر دیا اور میں خواہش کے باوجود دوبارہ نہ پوچھ سکا۔ مستفسر ہوا، ''کیا ہم واپس جا رہے ہیں؟''

وہ کچھ دیر تک ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجاتی رہی پھر بولی، ''ہاں! میں ڈبل مائنڈڈ ہو رہی ہوں۔ میں تمہیں نور پور بھیجنے کے بارے سوچ رہی ہوں۔''

میں ٹھٹکا، ''مجھے؟ کیا میرا نور پور جانا مناسب ہوگا؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' وہ بولی، ''تم نے رانتے، خان کی حویلی اور گاؤں اچھی طرح دیکھ بھال رکھا ہے۔ کون شخص تم سے زیادہ مناسب ہوگا، ان حالات میں۔ ہیں؟''

اس نے درست کہا تھا مگر نور پور جانے کے بارے میں سوچ کر میری سانسیں غیر معتدل ہونے لگی تھیں۔ میں نے سہارا لیا، ''میڈم! وہاں سبھی مجھے پہچانتے ہیں۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔''

''کوشش کرنا کہ تم کسی کی نظروں میں نہ آؤ۔ اگر ایسا ہو بھی گیا تو کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ ڈونٹ وَری ڈارلنگ..... تمہیں مزید کچھ سیکھنے کا موقع مل جائے گا۔'' وہ سنجیدگی سے بولی، ''رہی تمہارے پہچان لئے جانے کی بات؛ تو فکر مت کرو۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یقیناً نور پور میں تمہارا اب کوئی نہیں رہا۔''

اس نے درست کہا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ میرا دل اس کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ غزالہ کے لئے بے چین رہتا تھا۔ وہ نور پور میں رہتی تھی۔ ہمیشہ دھڑکن کی تال پر رقص کرتی تھی، سانسوں کے نشیب و فراز میں نغمہ سرا ہوتی تھی اور روح تک بکھرتی جاتی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو نور پور جانے کے لئے آمادہ کرنے لگا۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ پیا جی سے کہہ کر اپنا میک اَپ کروالوں گا تاکہ مجھے فوری طور پر کوئی پہچان نہ پائے۔

میڈم نے گاڑی کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم پکی سڑک پر تھے۔ میں نے کہا، ''میڈم! کیا آپ کو پیرو ماچھی کی بات پر یقین آ گیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے اُس نے جھوٹ بولا ہو، سردار یارن خان کا نام ہمیں الجھانے کے لئے لیا ہو اور ہم آنکھیں بند

کئے بھاگتے ہوئے نئی مصیبت کو گلے لگا بیٹھیں۔''

میڈم بولی، ''میرا نہیں خیال کہ اس نے جھوٹ بولا ہو۔''

''اس خیال کی کوئی وجہ؟''

''وجہ تو کوئی خاص نہیں..... مگر وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟''

''وہ ہمارا دشمن تھا میڈم! دوست نہیں تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا، ''اس کینگری کے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔''

''جھوٹ ہی بولنا تھا تو پھر کسی اور شخص کا نام لے دیتا۔ اس نے ایسے شخص کا نام کیوں لیا جس تک ہم پہنچ سکتے ہیں۔''

''اس کی دانست میں ہم یارن خان تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی باتیں آپ نے سنی تو تھیں، بھول گئیں کیا؟''

''ہوں..... تم اپنی جگہ درست کہتے ہو۔ میں اپنی جگہ۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ یارن خان ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہے۔''

''یعنی آپ کی خاطر.....'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ بولی، ''ہاں! وہ ایسا ہی ہے۔''

''کیوں؟'' میرے دل کی آواز سوال بن کر لبوں پر آ ہی گئی۔

''تو یوں کہو کہ تمہیں تجسس نے گھیر رکھا ہے۔ تم گھما پھرا کر مجھ سے میرا اور یارن خان کا باہمی تعلق پوچھ رہے ہو۔ ہوں؟'' میڈم نے کہا، ''ایک مرتبہ اس نے مجھے لاہور ائرپورٹ پر دیکھا تھا۔ میں دوبئی سے لوٹی تھی۔ وہ دوبئی جا رہا تھا۔ لاؤنج میں چند منٹوں کے لئے آمنا سامنا ہوا تھا۔ تب سے وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''کیا آپ دونوں متعارف ہوئے تھے؟''

''ہاں! اس نے عجیب سے انداز میں کہا تھا کہ ہم دوبارہ ملیں گے۔ میں نے اس کی دھمکی کو ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ جب میں نے اُس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ وہ نہایت خطرناک انسان ہے۔ اس نے تھرڈ مین کے ذریعے مجھے بلوایا۔ میں نہ گئی تو دھمکایا۔ میں نے پروانہ کی تو عرصے بعد اس نے یہ قدم اُٹھالیا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں میڈم! یہ کہانی دل کو نہیں لگتی۔ کوئی اتنی سی بات پر اتنا بڑا قدم

نہیں اُٹھاتا۔''

''تم نے درست تجزیہ کیا ہے مگر میری جان! ہماری دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ معمولی تنازعے کو اَنا کا مسئلہ بنا کر تمام تر داؤ پیچ کھیل لئے جاتے ہیں۔ اگر ہم لوگ آپس میں جھگڑ کر توانائیاں ضائع نہ کریں تو قانون ہم تک کبھی نہ پہنچ پائے۔''

''دنیا خواہ کوئی بھی ہو، انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے اور انسان ہمیشہ فطری احساسات کے زور پر تھرکتے ہیں۔ وہ امیر آدمی ہے۔ جس طلب کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، وہ نوٹوں کے عوض کہیں بھی پوری کی جاسکتی ہے۔ پھر آپ ہی کیوں؟'' میں نے دبے دبے لفظوں میں اُسے باور کرایا کہ دنیا میں اس کے علاوہ بھی خوب صورت عورتیں رہتی ہیں۔

وہ طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر، کن اَکھیوں سے مجھے دیکھ کر بولی، ''شہریار! کیا تمہاری بہن نور پور کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی؟ کیا تمہاری منگیتر غزالہ کے بعد دنیا میں نسوانی حسن ختم ہو گیا ہے؟.....نہیں۔ ان دونوں سے، مجھ سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں یہاں سانسیں لیتی ہیں۔ پھر کیا دماغی خلل ہے کہ حیدر خان نے تمہاری بہن کو اغوا کرایا، تم نے اپنی زندگی کے فری ویل کو غزالہ کی دہلیز پر جوانی بھر روک دیا۔ ہر چہرہ کسی نہ کسی کے دماغ میں نقش ہو جاتا ہے۔ ہر صورت کسی کے دل میں کھب جاتی ہے۔ بھلے اُس نے شفاف آنکھ سے دیکھا ہو، ہوس بھری گدلی آنکھ سے یا اُس نے آنکھوں کے بجائے دل سے دیکھا ہو اور خام تصور میں سجایا ہو۔''

اس نے درست کہا تھا۔ مجھے اتفاق ہوا۔ کہا، ''میڈم! مجھے اعتراف ہے کہ آپ کو ایک نظر دیکھنے والا کسی اور منظر دیکھنے کا روادار نہیں رہتا مگر یارن خان.....اس نے تو بہت کچھ دیکھ رکھا ہے۔ بوڑھا بھی ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں تو اَب تب میں بجھنے والی ہیں۔''

''مرد کی آنکھ کبھی نہیں بجھتی شہریار! بھلے ہاتھ کی گرفت کپکپانے لگے۔'' اس نے قدرے شوخی سے کہا، ''یارن خان کا بڑھاپا بھی تو کہتا ہے کہ گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے؛ تبھی ساغر و مینا اپنے سامنے میز پر سجانا چاہتا ہے تاکہ مرتے دم تک دیکھتا رہے، آنکھوں کے رستے دل کو جوانی کی دید سے سیراب کرتا رہے۔''

میں نے دبے لفظوں میں کہا، ''مجھے آپ کی تمام باتوں سے اتفاق ہے مگر دل کہتا ہے کہ کہانی کوئی اور ہے۔ آپ فی الحال بتانا نہیں چاہتیں تو آپ کی مرضی۔''

وہ اپنی انگلی کی اگلی پور کو نچلے ہونٹ تک لائی۔ انگلی پھسلتی ہوئی ہونٹوں کے گوشے تک گئی،

پھر پلٹ کر ہونٹ کی وسطی ڈھلان پر آ کر رک گئی۔ ایک ادا سے آنکھیں چندھیا کر مسکرائی اور بولی، ''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا، یا غلط..... اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ ابھی اپنا ذہن اس فضول سوچ میں مت رُجھاؤ اور سوچو کہ آئندہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔''

''او کے میڈم! میں سوچتا ہوں کہ مجھے نور پور جا کر کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے ہتھیار ڈالے، ''آپ رہنمائی کریں؛ کیا میں نے یارن خان کی حویلی میں داخل ہونا ہے اور خان کے نوکروں سے پوچھ گچھ کرنی ہے کہ سردار نے سیمو اور اماں کو کہاں چھپا رکھا ہے؟ یا خان کو حویلی سے نکال کر آپ کی کوٹھی پر لانا ہے؟''

میڈم نے اسپیڈ بریکر پر گاڑی کی سپیڈ کم کرتے ہوئے کہا، ''یہ ہوئی نا بات! ہم نے اپنے مغویوں کو اس شیطان کی کھجار سے نکالنا ہے۔ کیسے؟ یہی سوچنے کی بات ہے۔ میرا نہیں خیال کہ خان کی نور پور والی حویلی پر مامور کوئی شخص اس کے خفیہ اڈوں کے بارے جانتا ہو۔ تم نے ہی بتایا تھا کہ وہاں بے ضرر اور مزدور قسم کے لوگ رہتے ہیں۔''

''جی! وہاں کام کرنے والے مزدوروں کے بارے میری یہی رائے ہے۔'' میں نے چشمِ تصور میں یارن خان کی حویلی کے باغیچے سنوارنے والے دونوں مزدوروں کو دیکھا اور کہا، ''مجھے یہ بھی یقین ہے کہ خان نے پیرو ماچھی سے دونوں مغویوں کو وصول کرنے کے بعد اس حویلی میں نہیں رکھا ہوگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس حویلی میں کسی غیر متعلق شخص کو آتے جاتے نہیں دیکھا گیا تبھی تو میں اسے تارکِ دنیا یا درویش قسم کا انسان سمجھتا آیا ہوں۔''

''پھر؟'' میڈم مستفسر ہوئی۔

''مجھے وہاں سے کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا میڈم!'' میں نے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا، ''ہاں! اس پر ہاتھ ڈالنا ہے، اسے مارنا ہے یا اغوا کرنا ہے تو نور پور کا قصد کیا جا سکتا ہے؛ وگرنہ نہیں۔ اگر میں اس سے وہیں پوچھ گچھ کروں گا اور اسے زندہ چھوڑ کر نور پور سے نکل آؤں گا تو وہ فوری طور پر ان دونوں کا ٹھکانہ بدل دے گا یا ٹھکانے لگا دے گا۔ اگر اس کے کسی آدمی کو چھیڑوں گا، یرغمال بناؤں گا اور تشدد کر کے معلومات حاصل کروں گا یا مار دوں گا تو وہ چونک جائے گا۔ ہوشیار ہو جائے گا۔ یوں نہ صرف میری محنت اکارت چلی جائے گی بلکہ میرا نور پور سے نکلنا بھی محال ہو جائے گا۔''

''تمہیں اس کے کسی خفیہ اڈے کا علم نہیں ہے؟'' میڈم نے پوچھا، ''یا تمہارے کسی

دوست کو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''میرے دوستوں میں اس کے زیادہ قریب رہنے والا مراد بخش دیوانہ ہے۔ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''چونکہ پیرو ماچھی اور اس کا گینگ ختم ہو گیا ہے اور اس کی خبر جلد یا بدیر سردار یارن خان کو مل جائے گی، اس لئے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''تو ٹھیک ہے میڈم! میں ڈائریکٹ ایکشن کرتے ہوئے خان کی بانسری بجانے کے بعد اس کی طاقت کے بانس کو بھی جلا دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میری بات میڈم کے دل کو نہیں لگی۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ہنکارہ بھر کر بولی، ''نہیں شہر یار! میں اسے مارنا نہیں چاہتی۔''

''مگر کیوں میڈم؟'' مجھے اچنبھا ہوا۔

''وہ ترنوالہ نہیں ہے۔ اسے قتل کیا تو میرے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔'' میڈم نے بے حد سنجیدگی سے کہا، ''کوئی ایسی ترکیب سوچو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایسی کوئی ترکیب سجھائی نہیں دیتی تھی۔ جونہی ہم مین روڈ پر چڑھے، میڈم نے پوچھا، ''کچھ سوچا؟''

میں نے جواب دیا، ''جی! مگر مجھے ایسی کوئی ترکیب نہیں سوجھی کہ خان کو چھیڑے بغیر ہم ٹارگٹ تک پہنچ جائیں۔''

وہ ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجانے لگی۔ میں نے اس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تنے دیکھا تو خاموش رہ کر اسے سوچنے کا موقع دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یارن خان سے دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ اس سے گریزاں رہنا چاہتی تھی اور اپنی اماں اور بھائی کو اس کی قید سے چھڑانا بھی چاہتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ بیٹ خیر پور سے لوٹ آئی تھی۔ اگر یارن خان کے بجائے کسی اور نے یہ کارروائی کی ہوتی تو وہ جوالہ مکھی بن کر اس کا پیچھا کرتی، پلٹتی ناں..... کافی دیر گزر گئی۔ اچانک اُس کا موبائل فون بج اُٹھا۔ وہ چونک گئی۔ فون نکال کر دیکھا۔ بڑبڑائی، ''وہی کمینہ اپنی ڈیمانڈ بتانے کے لئے کال کر رہا ہے۔''

میں سمجھ گیا۔ بولا، ''کال اٹینڈ کر کے لاؤڈر آن کر لیجئے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی روڈ سائیڈ پر کھڑی کر دی۔ کال ریسیو کی، لاؤڈر آن

کیا اور بولی، ''ہیلو.....''

اسپیکر سے بھنچی بھنچی آواز پھوٹی، ''یہ تمہارا فون 'ناٹ رسپانڈنگ' کیوں ہو جاتا ہے؟''

''میں اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی۔'' میڈم نے خشک لہجے میں کہا، ''کام کی بات کرو؛ میں بہت بزی ہوں۔''

''میں تمہاری مصروفیات کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اسپیکر سے پھوٹنے والی آواز صوتی اتار چڑھاؤ سے مبرا تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انسان کے بجائے کوئی مشین بول رہی ہو، ''کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تمہیں اپنی ماں اور بھائی کی کوئی ضرورت نہیں رہی؟''

میڈم نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بلا تردد جواب دیا، ''میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ جن لوگوں کو تم نے اغوا کیا ہے، میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر تم بضد ہو کہ وہ میری ماں اور بھائی ہیں، تو بولو، میں کیا کروں؟ کیا تمہیں پانچ دس لاکھ روپے بھیجوں یا منت سماجت سے کام چل جائے گا؟''

مجھے میڈم کے لہجے سے عیاں بے خوفی اور لاپروائی بڑی عجیب اور غیر فطری لگی۔

اسپیکر سے طنزیہ قہقہہ پھوٹا، ''تم بڑی چالاک بنتی ہو مگر یہاں تمہاری کوئی چالاکی کام نہ دے گی۔ تم بزی ہو۔ میں تم سے زیادہ مصروف ہوں۔ آخری بار کال کر رہا ہوں۔ یہ بتانے کے لئے کہ اگر تم نے کل شام پانچ بجے مجھے کال کر کے مجھ سے ان دونوں کی جان کی قیمت نہ پوچھی تو میں ان کی چھٹی کرا دوں گا۔ او کے؟''

میڈم کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی، بولی، ''کیا تم پوچھے بنا اپنی ڈیمانڈ نہیں بتاؤ گے؟''

''ہرگز نہیں..... میں مال کو بے وقعت نہیں کرنا چاہتا۔''

''او کے! مجھے یاد رہا تو ضرور رابطہ کروں گی۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم بھولو گی نہیں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

میڈم چند لمحوں تک سکرین کو گھورتی رہی پھر طویل سانس لے کر بڑبڑائی، ''مجھے یقین ہے کہ یہ یارن خان کی آواز نہیں ہے۔ پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟''

چند لمحوں تک اسٹیئرنگ ویل پر پیشانی ٹکائے بیٹھی رہی، کچھ سوچتی رہی یا دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتی رہی، پھر سر اُٹھا کر گاڑی روڈ پر ڈالتے ہوئے بولی، ''شہریار! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم نور پور جا کر یارن خان کی حویلی کی تلاشی لو گے۔ اس کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں

معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو گے مگر یارن خان پر بالکل ہاتھ نہیں ڈالو گے۔ میں میرو شاہ اور پیاجی کو الگ الگ روانہ کروں گی۔ وہ اپنے اپنے طور پر کام کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان دونوں کا سراغ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔''

میں نے سر تسلیم خم کیا، ''جی بہتر! مجھے آپ کے اعتماد پر پورا اُتر کے دلی خوشی ہوگی۔''

میڈم کی کوٹھی میں پہنچنے تک ہم دونوں خاموشی سے اپنی سوچوں میں غرقاں رہے۔ اس نے ڈرائیور کو بلا کر مجھے گھر پہنچانے کا حکم صادر کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی، ''تم آج کی رات نور پور میں گزارو تو بہتر ہوگا۔ اِز اِٹ اوکے؟''

''یس میڈم!''

وہ گاڑی سے اُتری اور میری طرف دیکھے بغیر تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیسٹ ہاؤس کے بڑے چوبی دروازے کو عبور کر کے میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

❖❖○❖❖

گھر میں سوائے شانو کے کوئی نہیں تھا۔ فوجی اختر، فرزانہ اور موجو بازار کی طرف نکلے تھے۔ میں نہا کر تازہ دم ہوا تو شانو میرے لئے چائے بنا لائی۔ رسمی باتوں کے بعد گویا ہوئی، ''پھوپھو کبریٰ اور غزالہ کی کوئی خبر ملی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں! کھالا پلٹتا تو کسی بات کا علم ہوتا۔ اس کے علاوہ نور پور کی خبر کون لا سکتا ہے۔''

''کیا ایسا ممکن نہیں کہ تم چلے جاؤ اور انہیں ایک نظر دیکھ آؤ۔ چوری چھپے ہی سہی۔'' وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ''بھائی! جب نور پور کی یاد آتی ہے تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں ہمارے مال ڈنگر کا کیا بنا ہوگا، ہماری زمین کسی نے بیچی ہوگی یا نہیں؟..... پھوپھی کیا سوچتی ہوگی کہ ہم نے پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلایا، ''شانو! تم زیادہ سوچا نہ کرو۔ خود کو، اپنی باجی اور بھائی کو سنبھالا کرو۔ رب سوہنے نے ہماری ہمت سے کہیں بڑا امتحان لیا ہے۔ مصیبت ابھی ٹلی نہیں مگر یقین ہے کہ جلد ہی ہم سرخرو ہو جائیں گے اور سر اُٹھا کر نور پور جائیں گے۔''

''بھائی! پینو کا کیا بنا؟''

میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے اسی سوال کا خوف تھا۔ نظریں جھکا کر بولا، ''اللہ نے چاہا تو وہ جلد مل

جائے گی۔''

اس نے آہ بھری اور خاموش ہوگئی۔ میں نے اس کے چہرے پر حزن وملال کی پرچھائیں رقصاں دیکھی تو دِلاسا دیا، ''نہیں شانو! جہاں اتنا کچھ برداشت کرلیا ہے، وہاں چند دن اور انتظار کرلو۔ میں پروین کی طرف سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہوتا۔''

میں چائے پی چکا تھا۔ اس نے پیالہ اُٹھایا، میز پر رکھا اور میرے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگائے۔ میرے ہاتھوں پر اس کے آنسوؤں کا گرم لمس جاگا تو بے چین ہوگیا۔ اسے روتے دیکھنا تکلیف دہ تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ سر اُٹھا کر بول پڑی، ''بھائی! میں جانتی ہوں کہ تم بھی ہزاروں لاکھوں انسانوں جیسے انسان ہو۔ کوئی فرشتہ نہیں، جن بھوت نہیں یا بہت بڑے آدمی نہیں ہو۔ سمجھتی ہوں کہ ہمارے دشمن فرعون ہیں۔ لمبے ہاتھوں والے ہیں۔ تم ان سے نہیں لڑ سکتے۔ ان سے پروین بہن کو چھین کر نہیں لا سکتے مگر کیا کروں؟ بہنوں کے لئے بھائی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقتور اور بہادر نہیں ہوتا، خواہ وہ کتنا ہی کمزور اور ناتواں کیوں نہ ہو۔ میں کہتی ہوں کہ تم بہت کمزور ہو۔ میرے اندر بیٹھی ہوئی تمہاری بہن کہتی ہے کہ نہیں، تم سے زیادہ طاقتور دنیا میں کوئی نہیں۔ تم مجھے جھلی کہتے ہو۔ ٹھیک کہتے ہو۔ مانتی ہوں کہ جھلی ہوں، کملی ہوں اس لئے تم میری باتوں کا برا مت مانا کرو بھائی!''

اس کی آواز بھرّا گئی اور وہ میرے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے چہرے پر رکھ کر سسکنے لگی۔ میں اس کی قلبی کیفیت کو بخوبی سمجھتا تھا۔

ایک مرتبہ نور پور میں شریف چکی والے کی بہن کی مرگ پر جب سبھی عورتیں بین کر رہی تھی، زارو قطار رو رہی تھیں تو مجھے کھالے نے کہا تھا، ''شہرے! یہ لوگ ماسی جمال بی کو نہیں رو رہے، یہ سب اپنے اپنے دکھوں کو رو رہے ہیں۔ ہر کسی کو اس گھڑی اپنا اپنا بچھڑا ہوا، اپنا مرا ہوا یاد آ رہا ہے اور یہ ماسی جمال بی کے نام پر اُسے رو کر دل کا غبار نکال رہے ہیں۔''

اس نے درست کہا تھا۔ ہر کوئی اپنے دکھ پر روتا ہے۔ وہ پروین کے نام پر رو رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ پروین کے نام پر اپنے ماں باپ کا ماتم کر رہی تھی۔ اپنے جلے ہوئے گھر کو یاد کر کے اندر وہ سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھی اور نور پور کی گلیوں کا نوحہ آنسوؤں کی زبانی تحریر کر رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے ہاتھ چھڑائے، اسے اپنی جانب کھینچا اور گود میں سر رکھ کر پیار کرنے لگا۔ اسے سمجھانے لگا کہ مصیبت کا وقت رونے دھونے سے نہیں کٹتا بلکہ اس کا بہادرانہ وار مقابلہ

کر کے مات دی جاتی ہے۔

وہ بولی، ''بھائی! اماں اور ابا تو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ مانا کہ پروین کو ڈھونڈ لانا مشکل ہے مگر غزالہ اور پھوپھو کو تو آسانی سے اپنے پاس لایا جا سکتا ہے۔ نور پور میں اب ان کا کون ہے جس کے سہارے پر وہ باقی زندگی گزاریں گی۔''

میں نے کہا، ''ٹھیک ہے۔ میں ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم دعا کرنا کہ وہ میرے ساتھ آنے پر تیار ہو جائیں۔''

وہ ابھی بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر میرا فون بجنے لگا۔ پیا جی کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔ میں نے کال اٹینڈ کی۔ پیا بولا، ''شہریار! مین روڈ پر آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

میں نے حامی بھری اور کال منقطع کرتے ہوئے بیڈ سے اُتر آیا۔ شانو مایوسی سے بولی، ''بس؟''

''میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں۔ رات کو نہیں آؤں گا۔''

اس کی آنکھیں بجھ سی گئی اور چہرے پر مایوسی کی پرچھائیں لہرا گئی۔ بولی، ''بھائی! یہ کیسی نوکری ہے؟ نہ دن کو چین، نہ رات کی خبر..... کوئی آسان سا کام تلاش کر لو ناں۔''

میں نے مسکرا کر اس کے گال پر چپت لگائی اور گھر سے نکل آیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ پیا جی میڈم شکیلہ کے کہنے پر مجھے لینے کے لئے آیا تھا تاکہ مجھے تیار کر کے نور پور روانہ کر سکے۔ وہ کالج کی دیوار کے ساتھ گاڑی پارک کئے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس نے بتایا، ''میڈم جی نے حکم دیا ہے کہ تمہارا معقول میک اَپ کر کے تمہیں لاری اڈے پہنچا دوں جہاں سے تم نور پور سدھار جاؤ گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پیا جی مجھے اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گیا۔ وہ یہاں اکیلا رہتا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس نے چند دن قبل ہی رشید آباد میں رہائش اختیار کی تھی۔ میڈم نے سب کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک ایک جگہ پر مقیم نہ رہیں بلکہ وقتاً فوقتاً اپنی اقامت گاہ بدلتے رہیں۔ یہ تین مرلہ زمین پر مشتمل چھوٹا سا مکان تھا۔ دو کمرے، برآمدہ اور باتھ روم۔ صحن اور کچن نہیں تھا۔ پیا نے برآمدے کے ایک گوشے کو کچن بنا رکھا تھا۔ چولھے کے قریب پڑے ہوئے برتنوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یہاں محض چائے بناتا تھا۔ کھانا کسی قریبی

ریستوران سے کھاتا تھا۔

ایک کمرہ بیڈ روم تھا جبکہ دوسرا سٹنگ روم۔ اس نے مجھے سٹنگ روم میں بٹھایا اور کہا، ''یہاں سامان کم ہے۔ تمہیں صرف دو گیٹ اَپ دیے جاسکتے ہیں۔ ایک وہی، جو خالد کو دیا تھا، یعنی گھریلو سامان بیچنے والے پٹھان کا۔ دوسرا جوگی یا ملنگ ٹائپ گداگر کا..... ویسے تم چاہو تو پٹھان والے گیٹ اَپ میں لکڑیوں اور کھڑے درختوں کے سودے بھی کر سکتے ہو، سامان بھی بیچ سکتے ہو اور مردان یا پشاور کے کسی تصوراتی مدرسے کا چندہ بھی مانگ سکتے ہو۔''

میں نے خالد کے چہرے پر اس کے مشاق ہاتھوں کا جو ہنر دیکھ رکھا تھا، وہی پسند کیا۔ اس نے مجھے جستی ٹرنک سے ایک سفید رنگ کا چست لباس اور وہی سرحدی لباس پہننے کو دیا جو خالد نے پہنا تھا۔ میں نے چست لباس کے اوپر بھاری شلوار اور چونوں والی کھلی قمیص پہنی۔ کھیڑی چپل پاؤں میں ڈالی۔ اس نے ایک عجیب الوضع کوٹ مجھے پہنایا اور اپنے سامنے چوبی اسٹول پر بٹھا کر چھوٹا سا بریف کیس کھول لیا۔ اس میں نہ سمجھ میں آنے والا سامان بڑے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ پیانے مختصر الوجود سیفٹی ریزر میں بلیڈ ڈالا، میری شیو کی۔ مونچھیں مونڈنا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ وہ بولا، ''پتہ نہیں تم دیہاتی لوگوں کو اپنی مونچھوں سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے؟''

میں زیرِ لب مسکرایا، ''پیا جی! ہمارے ہاں ایک مقولہ زبان زدِ عام رہتا ہے کہ مُچھ نہیں تے کچھ نہیں۔ تم نے کلین شیو کر رکھی ہے۔ میرے گاؤں والے تمہیں دیکھ کر دبی دبی ہنسی میں ایک دوسرے کو اشاروں سے بتائیں گے کہ یہ ہیجڑا ہے۔''

اس نے کھل کر قہقہہ لگایا اور بولا، ''دیہاتی لوگ واقعی بہت بھولے ہوتے ہیں۔''

اس کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں حرکت کرنے لگے۔ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔ مجھے سمجھاتا جا رہا تھا کہ وہ کیا کرتا جاتا ہے۔ اس نے میرے سر کے بالوں پر تیز بو والا سپرے کیا۔ آئینہ دکھایا تو میں دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ میرے بال سرخی مائل بھورے ہو گئے تھے۔ اس نے پلاسٹک کے دو ننھے ننھے اسپرنگ میرے نتھنوں میں فٹ کیے۔ لمبی اور گھنی داڑھی میرے چہرے پر چسپاں کی، ٹرانسپیرنٹ گم کی مدد سے میری مونچھوں میں اضافی لمبے بال چپکائے، سر پر ٹوپی رکھی اور اوپر بڑی سی پلو دار پگڑی باندھ دی۔ اس نے نہ صرف میری آنکھوں میں سبز لینز فٹ کیے بلکہ مجھے ان کے اُتارنے اور دوبارہ لگانے کا طریقہ بھی سمجھایا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا، ناقدانہ نگاہوں سے جائزہ لے کر مطمئن ہو گیا تو مسکرا کر بولا، ''گلاب خان! ذرا

اس آئینے میں اپنا معائنہ کرو۔ دیکھو، کوئی کمی تو نہیں رہ گئی۔''

اس نے مجھے دیوار گیر آئینے کے طرف دھکیلا۔ میں آئینہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نہ صرف میری ہیئت، بلکہ میری شکل بھی بدل گئی تھی۔ اسپرنگ لگانے سے میری ناک خاصی بھدی اور بدوضع ہوگئی تھی اور میری غیر معمولی سیاہ آنکھیں سبزی مائل ہوگئی تھیں۔ میں حیرت سے اپنا بدلا ہوا روپ دیکھ رہا تھا جبکہ وہ میری انگلیوں میں مختلف پتھروں کی انگوٹھیاں پہنا رہا تھا۔

اس نے مجھے واقعتاً ایسا بنا دیا تھا کہ میں اپنی عمر سے کم وبیش بیس سال بڑا نظر آنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ نور پور والے کوشش کے باوجود مجھے پہچان نہیں سکتے تھے۔

اس نے مجھے ہدایات سے نوازا، ''شہریار! تم جب تک اس روپ میں رہو گے، منہ ہاتھ نہیں دھوؤ گے۔ ٹھیک؟ اور ہاں..... ایسے بولو۔'' اس نے اپنا منہ کھولا، نچلا جبڑے اور گردن کے اعصاب کو تھوڑا پیچھے کی طرف کھینچ کر آواز نکالی۔ اس کی آواز یک دم بدل گئی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ دو تین مرتبہ کوشش کے بعد میں آواز بدلنے میں کافی حد تک کامیاب ہوگیا۔ وہ سر ہلا کر بولا، ''تم نے ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنی ہے۔ مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر قرار دینا ہے۔ لہجہ اکھڑ اور جاہلانہ، ہنسی مذاق نہیں کرنا اور کسی پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا۔ تم اپنے آبائی گاؤں جا رہے ہو۔ وہاں تمہاری معمولی سی کوتاہی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی ہے۔''

میں نے اس کے مشوروں کو پلے باندھ لیا۔ جب ہم اپنا کام مکمل کر کے مکان سے نکلے، شام کے چار بجنے والے تھے۔ حسین آگاہی مارکیٹ کی ایک ہول سیل دکان سے اس نے سامان خریدا۔ میں نے اس کی مدد سے مختلف انواع کے برقی سامان کو مخصوص انداز میں باندھا۔ ایک گٹھڑی کمر پر ڈالی جبکہ دوسرا بنڈل ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے مجھے ہنسی مذاق میں گاہک سے مول تول کے سنہرے اصول بتائے اور ڈیرہ اڈہ کی طرف لے چلا۔ ڈیرہ غازیخان جانے والی ایک ویگن پر مجھے سیٹ مل گئی۔ میں نے چوک قریشی کا کرایہ ادا کیا۔ ٹکٹ کا رواج ان ویگنوں میں نہیں تھا۔ کنڈیکٹر نے چالاکی اور روایتی بے ایمانی کا سہارا لیتے ہوئے مجھ سے سامان کے لئے دوسری سیٹ کا فل کرایہ اینٹھ لیا۔

ویگن روانہ ہونے لگی تو پیا جی نے کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور سنجیدگی سے کہا، ''گلاب خان! ذرا دھیان سے سودے بازی کرنا۔ یہ نہ ہو کہ اپنی مُوڑی گل کر بیٹھو۔''

میں نے ہاتھ لہرایا، ''اوئے خوچا! کیا تو میرے کو بے وقوپ سمجھتی ہے۔ اللہ نگہبان!''

اس نے مسکرا کر اپنا داہنا انگوٹھا بلند کیا اور مین روڈ کے پار کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ کنڈیکٹر نے سائیڈ گیٹ بند کیا اور چیختی ہوئی آواز میں بولا، ''ڈبل استاد ڈبل..... سیٹیں فل ہیں۔ پہلی بریک تلیری موڑ پر لگے گی۔ اٹھ سو تیرہ ابھی نکلی ہے۔ اسے بائی پاس کراس نہ کرنے دینا..... چل اُستاد جھولے لال؛ کر مزدوری تے کما مال! سوہنے رب دیاں رکھاں.....''

ڈرائیور نے ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ یک لخت بڑھا دیا۔ اپنے گاؤں کی طرف سفر کا آغاز ایک جاندار جھٹکے سے ہوا۔ میں نے پیا جی کی دی ہوئی لکڑی کے موٹے منکوں والی تسبیح نکالی اور پڑھنے لگا۔ کچھ دیر تک بڑے خشوع سے ثنائے یزداں کرتا رہا، پھر انگلیاں تو میکانیکی انداز میں متحرک رہیں مگر ذہن میں مختلف سوچوں کی یلغار ہونے لگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے نور پور جانے کے لئے میک اَپ کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میں نور پور میں محفوظ نہیں تھا؟

میں نے اپنی طے کردہ مسافت کا باریک بینی سے احاطہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے کہیں فاش غلطی نہیں کی تھی۔ سائیں دل جیت شاہ میرے ہاتھوں نہ صرف قتل ہوا تھا بلکہ میں نے اسے جلا کر خاک ستر کر دیا تھا اور اپنے جرم کا نام ونشان تک مٹا دیا تھا۔ اس کے بعد میرے گھر پر دھاوا بولا گیا، تب اتفاق سے میں عین موقع پر پہنچ گیا اور پیا جی اور کھالے کی مدد سے میں نے حملہ آوروں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اپنی بہنوں اور چھوٹے بھائی کو نہ صرف زندہ نکال لیا بلکہ اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہو گیا۔ مگر چاچے اور چاچی کو آگ کے شعلوں سے نہیں نکال سکا۔ تب نور پور والوں نے مجھے بھاگتے دیکھ کر پہچان لیا تھا اور نکلنے کا موقع دیتے ہوئے اپنی ہمدردیوں کا خاموش اظہار کر دیا تھا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ بخت خان نے خانزادوں کی خواہش کے برعکس مجھے قانون کی نظروں میں مجرم بننے سے بچا لیا تھا۔ ان واقعات سے قبل میری بہن اغوا کر لی گئی تھی جس کے ساتھ ساتھ سردار حیات خان کا بیٹا امیر نواز بھی غائب تھا۔ حیات خان اپنے بیٹے کے غیاب کا ملبہ میرے سر پر ڈالنے لگا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے خطرہ تھا۔ حیدر خان کا چہیتا اور خاص کارندہ دریام خان مجھے دیکھتے ہی دھر لیتا اور باندھ کر سردار حیدر خان کے ڈیرے پر پہنچا دیتا۔ مجھے اس سے بھی بچنا تھا۔ یارن خان نے میڈم پر ہاتھ ڈالا تھا اور میں اس کو نقصان پہنچانے کی نیت سے جا رہا تھا۔ بعید نہ تھا کہ اسے بھنک مل چکی ہو کہ میں میڈم شکیلہ کے گینگ سے وابستہ ہوں اور وہ مجھے دیکھتے ہی پولیس کو بلوا لیتا۔ میں قانون کو مطلوب نہیں تھا مگر میرے لئے یقینی طور

پرنور پور میں قدم قدم پر خطرات منہ کھولے کھڑے تھے۔ مجھے ہر شخص سے بچتے ہوئے گام گام محتاط رہنا تھا۔ ذہن میں درپیش آنے والی ہر ممکنہ صورت حال کا سماں باندھ رہا تھا اور نبرد آزمائی کے لئے لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔

شام کا اندھیر چار سو پھیل چکا تھا جب ویگن نے مجھے چوک قریشی اُتارا۔ میں نے سامان اُٹھایا اور سڑک پار کر کے نور پور جانے والی حیات خان کی ویگن کے اسٹاپ کی طرف قدم بڑھائے۔ ہوٹل کے قریب پہنچا تو بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک دبلے پتلے سپاہی نے ہانک لگائی، ''اوئے دو نمبر پٹھان! اِدھر آ، کوئی حال حویلہ دے۔''

جب میں، کھالا اور پیاجی نور پور اپنی شاندار ٹرو پر میں نور پور جا رہے تھے تو اسی سپاہی نے بیریئر پر ہمیں روکا تھا۔ کھالے نے بتایا تھا کہ وہ اس کے کپی فروش ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا سالا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر اکھڑ انداز میں کہا، ''اوئے صاب لوک! اگر اَم دو نمبر پٹھان ہے تو بول کہ ایک نمبر کدھر ہے۔ اَم اس سے ابھی ملتی ہے۔''

میرے بے ساختہ جملے پر بنچ پر بیٹھے ہوئے دوسری لوگ ہنس پڑے۔ سپاہی کھسیا کر بولا، ''یہ اسمگلنگ کا مال ہے؟''

میں نے احمقوں کی طرح دیدے نچائے اور کہا، ''اَم ادھر حسین آگاہی سے خرید کر لایا ہے بیچنے کے واسطے۔ تم نے کچھ خریدنا ہے؟ ایک نمبر مال ہے۔ یہ دیکھو۔ اصلی جاپانی استری ہے۔ دو نمبر ہو تو اَم لاک روپیہ جرمانہ دے گا۔ بات کرو..... کتنے میں لیتا ہے؟''

اس نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا، ''رہنے دو پٹھان، رہنے دو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ جاؤ، اپنا کام کرو۔''

وہ محض اپنا رعب داب جمانا چاہتا تھا وگرنہ میں اس کی نظر میں مشکوک نہیں تھا۔ میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا، ''صاب لوگ کا جیب خالی ہے، بس..... اَمارے مال کو دو نمبر بولتا ہے۔ واہ بھئی واہ.....''

میں بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یکبارگی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میری نگاہ ہوٹل کے بڑے ہماچے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے استاد کھالے پر پڑ گئی تھی۔ اس کے اطراف یار لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا اور وہ اپنی عادت کے مطابق چھاتی پھلائے ڈینگیں مارنے میں مگن تھا۔ سانولا سلونا شیدو ہماچے کی بانہہ پر پیر ٹکائے کھڑا تھا۔ جی چاہا کہ دوڑ کر کھالے کو اپنی

بانہوں میں بھر لوں مگر میری نظر پاس کھڑی ویگن اور ویگن میں بیٹھ کر روانگی کا انتظار کرنے والے لوگوں پر پڑ گئی جو تقریباً سبھی نور پور کے رہنے والے تھے۔ میں ویگن کے قریب گیا۔ جھانک کر دیکھا۔ ویگن فل تھی۔ شیدو کی نٹ کھٹ آواز میرے عقب میں گونجی، ''اوئے خان! پَرے ہٹ ونج، ڈیدھا تاں پیا ہیں جو ویگن تُن پُر بونجا تھی لاتھی ہے۔''

(اوئے خان! پرے ہٹ جا۔ دیکھ تو رہا ہے کہ ویگن بالکل فل ہو چکی ہے۔)

'تن پر بونجا' شیدو کا مخصوص کلمہ تھا جس کا آسان الفاظ میں مطلب نکلتا تھا کہ ویگن فل ہے اور کسی سواری کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا اور ڈانٹا، ''اوئے کیا بولتا ہے پدی کا بچہ! ہمارا سیٹ بناؤ۔ اَم نے دور جانا ہے۔''

وہ ہاتھ نچا کر بولا، ''اس ویگن پر لاہور جاتا ہے کیا؟''

سواریاں ہنس پڑیں۔ میں نے مونچھیں پھڑکائیں اور اسے گردن سے پکڑ لیا، ''اوئے خوچے کا بچہ! اَم سے مذاق کرتا ہے۔ اَم گلاب خان ہے۔ گردن مروڑ کر نسوار کی ڈبی میں ڈالے گا اور اپنے وطن لے جائے گا۔''

وہ ہنسا اور سواریوں کی طرف منہ کر کے بولا، ''چاچا..... ڈیکھ! اِہ اوہ گلاب ہوی جیکوں بھیڈ سنگھ کے بے ہوش تھی ویندی اے۔''

(چاچا! دیکھ! یہ وہ گلاب ہے جسے سونگھتے ہی بھیڑ بے ہوش ہو جاتی ہے۔)

میں نے دل ہی دل میں اس کے نقد اور خوب صورت جواب پر داد دی اور پوچھا، ''تمہارا اُستاد کدھر ہے؟ اس ائرکنڈیشنڈ ویگن کا پائلٹ۔''

اس نے ہماچے کی طرف اشارہ کیا اور اپنی گردن میرے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا، ''جا خان! استاد کھالے سے بات کر۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں چھت یا بمپر پر وی آئی پی سیٹ الاٹ کر دے۔''

وہ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا میں نے آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ نٹ کھٹ، تیز طرار..... میں کھالے کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک ذرا چونکا۔ میں نے کہا، ''اوئے کالے استاد! اَم ادھر جائے گا۔''

یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں نے میرا ایکسرے کر لیا ہو، مسکرا کر بولا، ''کدھر جائے گا خان باوا؟''

اس کے انداز سے لگا کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا، ''ادھر..... جدھر تمہارا ائر کنڈیشنڈ گاڑی جائے گا۔''

ایک ڈرائیور مزہ لے کر بولا، ''یہ تو جہنم میں جائے گا۔''

سبھی ہمچہ نشینوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ کھالے نے بلند آواز میں کہا، ''اوئے چپ کرو بے غیرتو! یہ کوئی ہنسنے کی بات ہے۔ اوئے چل خان باوا! ادھر گاڑی کی چھت پر سامان رکھ دے۔ کسی سیٹ پر مت بیٹھنا۔ جب گاڑی چلنے لگے تو پیچھے بمپر پر کھڑے ہو جانا۔''

میں نے منت آمیز لہجے میں کہا، ''استاد رحم کر اُم پر..... سردی بوہت اے۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے کریدتی ہوئی نظروں سے گھورا اور اونچی آواز میں بولا، ''اوئے شیدے! اس ہیجڑے پٹھان کو فرنٹ سیٹ پر بٹھا دے؛ کیا یاد کرے گا۔ اوئے چل خان! ادھر سے بستر گول کر۔''

میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور فاتحانہ انداز میں چھاتی پھیلا کر ویگن کے قریب آیا۔ شیدے نے کندھے اُچکائے، آنکھیں نچائیں اور شوخی سے کہا، ''بڑی بات ہے چاچا گلاب خان! استاد کو تم پر رحم آ گیا۔ چل ادھر لا، سامان پکڑا۔ کوئی ٹوٹنے والی شئے تو نہیں ہے اس میں؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بندر کی طرح پلک جھپکتے میں ویگن کی چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے اپنی دونوں گٹھڑیاں اسے تھمائیں۔ اس نے ایک بدوضع رسی کی مدد سے انہیں ریلنگ سے باندھ دیا۔ میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر چائے کا ایک بڑا پیالہ حلق میں اُتارا۔ تب تک فلائٹ کے 'ٹیک اوور' کا ٹائم ہو گیا اور کھالا اپنی مخصوص شانِ بے نیازانہ چال چلتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا اور مونچھوں کو بل دیتا ہوا بولا، ''اوئے شیدے! دیکھ لے، کوئی سواری نیچے نہ ہو۔ آخری ٹائم ہے۔ جو رہ گیا، وہ سردی میں ٹھٹھر گیا۔''

ویگن کے ڈرائیونگ کیبن میں کھالے سمیت ہم چار آدمی گھسڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ گیٹ کے شیشے کا ربڑ پھٹا ہوا تھا۔ کئی درزوں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ کھالے نے رسی سے بندھے ہوئے عقب نما کا رُخ میری جانب کر دیا۔ میں نے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خود پر مرتکز دیکھیں۔ چونکہ میرے اور اس کے بیچ دو اور مسافر بیٹھے تھے، اس لئے وہ جو سوال پوچھنا چاہتا تھا، پوچھ نہیں سکتا تھا۔ دونوں مسافر مجھے بخوبی جانتے تھے۔ سیاہ پگڑی والا فیضو تھا۔ کالے

بزدار کا سالا، جبکہ دوسرا لعل دین عرف لالو تھا جو امان اللہ قریشی کے دارے پر مہمانوں کی آؤ بھگت کیا کرتا تھا۔ مجھے بڑی طمانیت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ انہوں نے مجھے بغور دیکھنے کے باوجود پہچانا نہیں تھا۔ فیضو نے پوچھا، ''خان صاب! کدھر سے آیا ہے؟''

میں نے احمقانہ انداز میں کہا، ''اوپر سے..... جدھر سے سارا لوگ آتا ہے۔ اَم کوئی اور مخلوق ہے جو کسی اور راستے سے آئے گا۔''

تینوں کے چہروں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ کھالا بولا، ''خان باوا! تمہیں کہاں جانا ہے؟''

''بولا تو تھا اَم نے، تم جدھر جائے، اَم ادھر جائے گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ بولا، ''میں تو نور پور جارہا ہوں۔ تم اس وقت وہاں جا کر کیا کرو گے؟''

''اَم اپنا سودا بیچے گا، اور کیا کرے گا۔'' میں نے کہا۔ تب مجھے سمجھ آئی کہ اس کا پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ رات کو مجھ سے گاؤں میں کون سودا خریدے گا۔ میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کی، پوچھا، ''ادھر کوئی اوٹل وٹل نہیں ہے؟''

وہ قہقہہ لگا کر مزاحیہ انداز میں بولا، ''فکر نہ کرو خان! ادھر نور پور کے مال روڈ پر بڑے بڑے ہوٹل کھلے ہوئے ہیں۔ ایک دم مفت سروس، کھلی فضا!''

میں نے بے بسی سے کہا، ''تو پھر اَم کو ایدھر اُتار دے استاد!''

ساتھ ہی میں نے سر نکال کر کھالے کا چہرہ دیکھا۔ وہ کن اَکھیوں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی معنی خیز چمک نے چغلی کر دی کہ وہ مجھے پہچان کر چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ چونکہ وہ اسی گیٹ اَپ میں نور پور آیا تھا، اس لئے وہ پیا جی کی مہارت کو تاڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے بولا، ''میں نے تجھے پہچان لیا ہے شہرے خان! زیادہ اداکار بننے کی کوشش نہ کرو۔''

میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی اور میں نے فیضو اور لالو کے درمیان چھڑے ہوئے تبصرے سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ویگن کے گدلے شیشے کے پار پیچھے کی طرف سرکتے ہوئے مانوس مناظر پر آنکھیں ثبت کر دیں۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں صدیوں بعد اس راستے کو، راستے کے اطراف کچے مکانات اور لہلہاتی فصلوں کو دیکھ رہا تھا۔ وطن کی مٹی سوندھی ہوتی ہے۔ وطن کی فضا پیار سے تھپکیاں دیتی ہے اور خوش آمدید کہتی ہے۔ یہ احساس بڑا جاں فزاء تھا کہ میں نور پور کی فضاؤں میں سانسیں لینے والا تھا۔

کھالے نے پھر مجھے مخاطب نہیں کیا بلکہ بلند آواز میں کوئی گیت گانے لگا تھا۔ میں نے

کہا، ''اوئے استاد! تو اپنی بانسری بند کر اور گاڑی کا ٹیپ چلا۔ کوئی پختو گانوں کا کیسٹ رکھا ہے تو نے؟''

اس نے اپنی صدا کا گلا گھونٹا اور قدرے غصے سے بولا، ''پختو گانا تیرا باپ سنے گا اس علاقے میں؟ چپ کر کے بیٹھا رہ ورنہ ایدھر اُتار دوں گا۔''

میں دبک بیٹھا۔ فیضو نے کندھا دبایا۔ کہا، ''خان صاب! دھیان سے بات کرو۔ استاد بڑا غصے والا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں کھالے کے شجرہ نسب میں نامناسب تبدیلیاں کیں اور کہا، 'میں اس کالے ٹیٹ ڈرائیور کے غصے کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔' اپنی پوزیشن کے پیشِ نظر دل کی آواز لبوں تک نہ لا سکا اور ہنکارا بھر کر خاموش ہو گیا۔

شام کے گہرے دھندلکے میں نور پور کی زمین پر قدم رکھا۔ چھت سے اپنا سامان اُتار کر کھالے کی دیوار کے جڑ میں رکھا۔ دل کو دھکا سا لگا کہ میں اپنے ہی گاؤں میں چوروں کی طرح روپ بدل کر آیا تھا۔ چند لمحوں میں تمام سواریاں تتر بتر ہو گئیں جبکہ میں، کھالا اور شیدو بخشو لوہار کے چھپر تلے کھڑے رہے۔

بخشو لوہار نے مجھے مخاطب کیا، ''اوئے کملے پٹھان! تیکوں پتہ کائے نا ہی جو منہ چاتے اِتھ آن کھڑیں۔ رات دیلے اِتھاں کون سامان گھنسی؟''

(اوئے بے وقوف پٹھان! تجھے علم نہیں تھا جو منہ اُٹھائے چلے آئے ہو۔ رات کو تم سے کون یہاں سامان خریدے گا۔)

میں نے انگلی آسمان کی طرف اُٹھائی اور جبڑا کھینچ کر کہا، ''خدا مالک ہے چاچا! وہ روزی دے گا۔''

کھالے نے مجھے جھلنگا چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔ شیدو دکان بڑھانے میں چاچے بخشو کی مدد کرنے لگا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے شیرے قصائی کا کچا مکان واقع تھا جو اُترتی رات کے اداس اندھیرے کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ چشمِ تصور میں کھالے پر جان وارنے والی الہڑ دوشیزہ شموں کا لہراتا بدن سمایا۔ دل سے ہوک نکلی، ''ہائے! کیا وقت تھا۔''

سڑک کے ساتھ ساتھ بجی نائی کے حمام تک دکانوں کا مختصر سا سلسلہ تھا۔ تمام دکانیں بند ہو

چکی تھیں جبکہ شریف چکی والے کا انجن اپنی مخصوص 'پھک پھک' کی آواز خارج کر رہا تھا۔ وہ لکڑی کی چرائی کر رہا تھا۔ گردن موڑ کر سردار حیات خان کے دارے کے اندر تک نظر دوڑائی۔ ڈیرہ آباد تھا۔ ہمیشہ کی طرح لوگوں کی ٹولیاں آمنے سامنے چارپائیوں پر براجمان تھیں۔

میں اپنے سامان کو بلاوجہ چھیڑ رہا تھا اور کھالے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب چاچا بخشو اور شیدو نے دروازہ اندر سے بند کر لیا، تب کھالا ویگن کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ میرے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا اور ارد گرد دیکھ کر رازدارانہ انداز میں بولا، ''شہرے! تم ادھر کیوں آئے ہو؟''

میں نے اس کی نظروں کو دل ہی دل میں سراہا اور کہا، ''لمبی بات ہے۔ میرا کوئی بندوبست کرو۔ کچھ کھلاؤ پلاؤ، پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔''

اس نے وفورِ محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ آواز بھرا گئی۔ بولا، ''یار! تم نے اچھا کیا جو سوانگ رچا کر ادھر آئے ہو ورنہ تمہیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ خان زادے سخت سیخ پا ہیں اور اپنے اپنے طور پر تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ خیر! یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، پہلے میں تمہاری شب بسری کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔''

اس نے میرا ہاتھ دبایا اور عجیب تشنہ نگاہیں لئے رخصت ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹا اور مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ اس نے اپنے اور میرے لئے ایک کمرا خالی کروالیا تھا۔ میں نے اپنا سامان ایک جانب رکھا اور پھیل کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دوسرے کمرے سے خالدہ عرف بلو کی تیز آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی بات پر ماں سے جھگڑ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ کھالے کو بھی کوس رہی تھی جس کے مہمان کی ناوقت آمد کے سبب اسے کمرے سے نکل کر ادھر جانا پڑا تھا۔ میرے لبوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔ میں بھلے جس رنگ میں یہاں آیا تھا، میرے لئے خوش کن اور طمانیت بخش تھا کہ میں اپنے آبائی گاؤں میں بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کھالا چنگیر میں روٹیاں اور سالن کی دو پلیٹیں رکھے نمودار ہوا۔ اس نے شیدو کو آواز دے کر پانی کا جگ منگوایا۔

میں نے سیر ہو کر روایتی انداز میں پکے ہوئے آلو مٹر کھائے اور ہاتھ کھینچ لئے۔ کھالا بڑا سا لقمہ چباتے ہوئے مجھے بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ بولا، ''یار شہرے! پیا کی انگلیوں کو خدا نے سونے کا بنا رکھا ہے۔ ایک دم بندے کی جون بدل کر رکھ دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں بھرے نور پور میں کوئی مائی کا لعل پہچان نہیں پائے گا۔''

''تم نے تو پہچان لیا۔'' میں مسکرایا۔

''میری بات اور ہے۔ میں نے تمہیں اس لباس کی بدولت پہچانا تھا۔ میں نے یہی پہنا تھا۔'' اس نے بتایا۔

چائے پینے کے بعد میں نے اپنی نور پور آمد کی غرض و غایت سے تفصیلاً آگاہ کیا۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ پھر متفکرانہ انداز میں بولا، ''یار ن خان کو چھیڑنا تو سوئے ہوئے شیش ناگ کی دم پر پاؤں رکھنے کے برابر ہے۔ میری مان تو رات گزار کر واپس چلا جا۔ کہہ دینا کہ کچھ ہاتھ نہیں لگا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں کھالے! میں میڈم کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔''

''کیوں؟'' اس نے قدرے برہمی سے کہا، ''کیا اس سالی پر عاشق ہو گئے ہو؟''

میں نے کہا، ''ہاں کھالے! ایسا ہی سمجھ لو۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ مجھ پر بھروسہ کرتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ شہریار جس چنگیر میں کھاتا ہے؛ اس میں چھید نہیں کرتا۔''

ہم دونوں رضائیوں میں گھس گئے اور کھسر پھسر کرنے لگے۔ پہلے اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ اس نے بڑی مشکل سے خانزادوں کو مطمئن کیا تھا اور قسمیں کھا کر یقین دلایا تھا کہ اس کا شہرے سے تعلق نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے نور پور کے ایک ایک گھر کی بابت مطلع کیا۔ میں حیرانی سے، کبھی پریشانی سے اور کبھی خوشی سے اس کی باتیں سنتا..... پل پل متغیر ہوتی کتھائیں..... پل پل بکھرتی ہوئی داستانیں.....جن کا نتیجہ محض یہی نکلتا تھا کہ میرے بعد گاؤں میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ غزالہ اور پھوپھو ہنوز بخت خان کی حویلی میں مقیم تھیں۔ ان کی خواہش پر میرے ڈیرے کا انتظام اور مال ڈنگر ان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ غزالہ پوری شدومد سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ سردار حیات خان کا بیٹا امیر نواز نہیں لوٹا تھا۔ اس کے باپ کو یقین ہو گیا تھا کہ میں نے اُسے اور اپنی بہن کو کہیں ٹھکانے لگا دیا تھا جبکہ سردار وریام خان کا زیادہ تر وقت بلوچ نگر میں سردار حیدر خان کی حویلی میں گزرنے لگا تھا۔ خانزادی اسما کا اغوا منظرِ عام پر آ چکا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود ابھی تک بازیاب نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے لوگ دبے دبے لفظوں میں کہنے لگے تھے کہ خانزادی اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ اُدھل گئی تھی۔ تینوں سردار مجھے اپنا جانی دشمن قرار دیتے تھے اور کھلے عام اظہار کرتے تھے کہ جونہی شہرا خان دکھائی دیا، اسے قتل کر دیں گے اور علاقے بھر کے لئے عبرت بنا دیں گے تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی خانزادی کی طرف میلی آنکھ دیکھنے کی جرأت نہ کرے۔

سائیں جگ جیت شاہ کے مزار پر معتقدین کی آمد و رفت کا سلسلہ پوری آب و تاب کے

ساتھ جاری تھا۔ شیخوپورے سے امپورٹ کیے گئے نئے خلیفے، سائیں نورن آغا نے دربار کا چارج سنبھالتے ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کرلیا تھا۔ سائیں دل جیت شاہ ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوکر چلہ کشی میں محو تھا۔ اس کے بارے میں بہت سی اوٹ پٹانگ باتیں نور پور میں گردش کرتی تھیں۔ بے جا عقیدت میں لپٹی ہوئی ان بے سروپا باتوں کا تمام تر ثمر خلیفہ نورن آغا کی ہتھیلی پر جمع ہورہا تھا۔ کھالے کے بقول؛ نورن آغا پینتالیس سینتالیس کے سن میں تھا۔ وجیہہ انسان تھا۔ عمدہ پوشاک زیب تن کرتا اور شیریں باتیں کرکے مریدوں کے دل موہ لیتا۔ اس کام میں چرب زبانی سے بڑا کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔

کھالے نے یہ بتا کر مجھے حیران کردیا کہ سردار حیدر خان کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی بیٹی میڈم شکیلہ کی تحویل سے نکل کر میاں دلبر حسین کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ وہ کئی بار میاں صاحب کے دربار میں حاضری دے چکا تھا مگر ہر بار مایوس لوٹا تھا۔ کھل کر میاں صاحب پر الزام عائد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور اس میں اپنے سے بڑے جاگیردار پر اپنے مخصوص جابرانہ انداز میں چڑھ دوڑنے کی جرأت نہیں تھی۔ البتہ اس نے اپنے ہرکاروں کو میاں صاحب کے اطراف چوکس کر رکھا تھا جو اسے پل پل کی خبر دے رہے تھے۔ کھالے کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں، اس نے میرے استفسار کے باوجود نہیں بتایا۔ مجھے بھی آم کھانے سے غرض تھی، پیڑ گننے سے نہیں۔

ہسپتال میں ایک نیا ڈاکٹر تعینات ہوگیا تھا جو فیروزی رنگ کی سوزوکی کار پر ہر صبح دس بجے کے قریب پہنچتا تھا اور ایک ڈیڑھ بجے واپسی کی راہ پکڑتا تھا۔ وہ خاصا کم عمر تھا۔ کھالے نے اس کی صورت کا نقشہ بھی کھینچا جس سے مجھے پتہ چل گیا کہ وہ بمشکل پانچ فٹ قد والا مختصر الوجود شخص تھا جس نے غالباً ہاؤس جاب کے بعد ادھر کا رُخ کیا تھا۔ یارن خان کے بارے میں بتایا کہ وہ کچھ عرصہ قبل لاہور سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ معمول کے نوکر چاکر تھے۔ حسبِ سابق اس نے کسی کو منہ نہیں لگایا تھا بلکہ حویلی میں ایک طرح سے مقید ہوکر رہ گیا۔ مراد بخش دیوانہ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارتا تھا۔ اسے اچھا سامع میسر آ گیا تھا۔

اس نے کہا، ''دیکھ شہرے! میں مانتا ہوں کہ تو بہت اونچی پروازیں کرنے لگا ہے۔ مجھ سے زیادہ پڑھا لکھا بھی ہے اور تیری مالکن کو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا ہنر بھی آتا ہے پر ایک بات کان کھول کر سن لے۔ تم نے اور تمہاری مالکن نے احمقانہ قدم اُٹھایا ہے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا، ''کیا مطلب؟''

''مطلب ظاہر ہے۔ یہ تو تمہیں اندازہ ہوگا ہی کہ یارن خان نے اپنی حویلی میں مال چھپا کر نہیں رکھا ہوگا۔ اس نے یقینی طور پر یہاں سے دور کسی اڈے پر ان ماں بیٹے کو رکھا ہوگا۔ خان کے کسی بھی اڈے کا کسی کو علم نہیں۔ اول تو وہ اس علاقے میں کوئی غلط کام کرتا نہیں، اگر کرتا ہے تو کسی کو راز دار نہیں بناتا۔'' کھالے نے سنجیدگی سے حالات کا تجزیہ کیا، ''یعنی تم اس کے کسی نوکر سے کوئی معلومات حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کا پیچھا کرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے جبکہ اس کے پاس فورویل گاڑی ہے۔ فرض کیا، تمہیں مطلوبہ معلومات حاصل ہو بھی جائیں تو بتاؤ، کیا کرو گے؟ کیا خان پر ہاتھ ڈالو گے یا ملتان جا کر اپنی مالکن کو رپورٹ دو گے؟''

میں نے کندھے اُچکائے، ''لامحالہ بات ہے کہ مجھے میڈم کو رپورٹ دینا ہوگی۔''

''تب تک وہ تمہارے مطلوبہ افراد کو کسی دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دے گا۔'' اس نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔

''تو پھر؟'' میں نے ہتھیار ڈالے، ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''تمہیں نور پور کی سیر کر کے لوٹ جانا چاہیے۔'' اس نے اپنے تجزیے کا نتیجہ اخذ کیا، ''وہاں سے تیار ہو کر آؤ اور یارن خان پر ڈائریکٹ ایکشن کرتے ہوئے اپنے مدعا تک پہنچو۔''

''مگر میڈم ایسا نہیں چاہتی۔'' میں نے بتایا۔

''کیوں؟ کیا وہ خان سے ڈرتی ہے؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا تمسخر نہاں تھا، ''یا تمہیں آگ میں جھونکنا چاہتی ہے؟''

میں نے بات ٹالی، ''ہاں شاید۔ اس نے میرے ذمہ لگایا ہے کہ میں خان کے ٹھکانوں کی ٹوہ لگاؤں۔''

وہ سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ میں وقت ضائع کئے بغیر رات کو ہی یارن خان کی حویلی میں جانا چاہتا تھا مگر کھالا اس حق میں نہیں تھا۔ اس کا مؤقف تھا کہ مجھے رات کو وہاں جا کر کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکتی۔ مجھے اگلے دن نور پور میں سامان بیچنے کے دوران حویلی کی سن گن لینی چاہیے اور دیکھ بھال کر کوئی قدم اُٹھانا چاہیے۔

مجھے ہتھیار ڈالنا پڑے اور نصف شب کے بعد سونا پڑا۔ البتہ یہ طے پا گیا کہ اگلے دن وہ اپنے معمول کے مطابق ویگن کو چوک قریشی لے جائے گا۔ ڈرائیور کا بندوبست کرے گا بقیہ

آدھا دن میری معاونت کرے گا۔ ہم دونوں مراد بخش دیوانے کے ہاں جائیں گے۔ وہ اسے کریدے گا۔ میں سنوں گا۔ امید تھی کہ اس سے کوئی کارآمد بات سننے کو مل جائے گی۔

نیند آنے لگی۔ تاہم میں تن آسان نہیں تھا کیونکہ مجھے پٹھانوں کے روایتی لباس میں بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ ناک کے اسپرنگ اور گالوں سے چپکی ہوئی داڑھی الگ سے پریشان کر رہی تھی مگر میں ان بہروپی معاونین سے گلوخلاصی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

علی الصبح ناشتہ کرنے کے بعد جب کھالا اور شیدو اپنی ویگن کی خاطر مدارت میں رُجھ گئے، میں سامان اُٹھا کر گلی میں آ گیا۔ خالدہ، پھوری اور ماسی صفو سے چند لمحوں کے لئے آمنا سامنا ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر مزید اعتماد حاصل ہوا کہ انہوں نے مجھے دیکھ کر یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے سردار حیات خان کے دارے کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز میں ہوکا لگایا، ''استری، ولائتی جوسر، ٹیپ ریکارڈر لے لو، چار بینڈ والا ریڈیو لے لو، ٹی سیٹ، واٹر سیٹ لے لو..... ایک نمبر گارنٹی والا مال.....''

اگر میں نے اپنا حلیہ بدل نہ رکھا ہوتا تو مارے جھجک کے میرے حلق سے ایک آئٹم کا نام بھی نہ نکل پاتا۔ اب یوں لگ رہا تھا جیسے میں ہر کسی کو دیکھ رہا تھا مگر کوئی مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ تبھی ہر دروازے پر رکا۔ ہر در پر صدا دی۔ کسی نے گلی میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت کی، کسی نے نہیں کی۔ پھر خانزادوں کی حویلیوں کے سامنے سے گزرتا ہوا گلی میں اپنے کھنڈر نما آبائی مکان کی دیوار کی جڑ میں جا کر بیٹھ گیا۔ سامان کو بلاوجہ کھول کر اوپر تلے کرنے لگا۔

مجھے یہاں قلبی سکون مل رہا تھا۔ چکنی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو نتھنوں سے گزر کر دماغ تک پہنچ رہی تھی اور عجیب آسودگی کا توانا احساس بخش رہی تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روؤں اور دل میں جمع ہونے والا غبارِ خاطر نکال دوں مگر آنکھوں میں کلر لینز لگے ہوئے تھے۔ میں نے بمشکل خود پر قابو پایا اور اپنے سودا ہائے دکان کی فہرست بلند آواز میں نادیدہ گاہکوں کے گوش گزار نے لگا۔

میرے سامنے نور پور کی اکلوتی مسجد تھی۔ مسجد کے میناروں پر چینی کی ٹائلوں سے کی جانے والی آرائش آج بھی نامکمل تھی۔ اسپیکروں پر کبوتر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ دلِ کم بخت میں غزالہ کی یاد نے سر اُٹھایا۔ میرا بخت عروج پر تھا۔ بخت خان کی حویلی سے غزالہ نکلی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ میں نے اس کا یہ سوٹ پہلے کبھی نہیں دیکھا

تھا۔ نیا سلوایا ہوگا۔ اپنا دوپٹہ سر پر درست کرتے ہوئے گلی عبور کرتے ہوئے کالے بزدار کے گھر کی طرف بڑھی۔ کالے کی سالی، جو غزالہ کی ہم عمر تھی، سے ملنے جارہی تھی۔

میں نے آواز دی، ''اے لڑکی! اَم کو پانی پلاؤ۔''

وہ چونک کر رُک گئی۔ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ دیہاتی رہن سہن میں وہ اتنی بااختیار اور بااعتماد نہیں تھی کہ ایک اجنبی پٹھان کو پانی پلاتی۔ حیرانی آمیز خفگی سے دیکھنے لگی۔ اس کا آدھا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ آدھا دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے آواز لگائی، ''اَمارے پاس استری ہے، ٹی سیٹ، واٹر سیٹ، سیکو فائیو گھڑی..... کوئی چیز لینی ہے تو آجاؤ، دیکھ لو..... سستا اور ایک نمبر ولائتی مال ہے۔''

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اُسے پکار رہا تھا مگر مجھے علم تھا کہ وہ میرے پاس نہیں آئے گی۔ دل نے اس کے قریب آنے کی دعا مانگی۔ قبولیت کی گھڑی تھی۔ کالے بزدار کی سالی دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کی بڑی بہن نے بھی جھانکا۔ پھر سامان دیکھنے کے لئے میری طرف چل پڑیں۔ غزالہ نے بھی ہمت کی اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ میرا دل فرطِ مسرت سے رقص کرنے لگا۔ کالے بزدار کی بیوی بولی، ''بھائی! استری کتنے کی ہے؟''

''اوئے بی بی! پہلے دیکھو تو سہی؛ پھر مول تول کرنا۔'' میں نے جلدی سے دو تین استریوں کے ڈبے نکال دیے۔ غزالہ اپنی سہیلی کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ کندھے پر سے جھانک کر میرے رنگ برنگ ڈبوں کو شوق سے دیکھ رہی تھی۔ میری نظرِ شوق بار بار اس پر اُٹھتی تھی اور جامِ دید نوش کر کے سامان کی طرف پلٹ آتی تھی۔ کالے کی سالی حمیداں عرف میدو میری نظروں کی تپش تاڑ گئی۔ اُسے کہنی مار کر شوخ نظروں سے دیکھنے لگی۔ غزالہ نہ سمجھتے ہوئے بولی، ''اسے کہو کہ چینی کاٹی سیٹ دکھائے۔''

میرے کان اس کی آواز سننے کو تر سے ہوئے تھے۔ یکبارگی جی چاہا کہ اپنے سوانگ کو دفع ماروں اور لپک کر اُسے بانہوں میں دبوچ لوں۔ فوراً ہی اپنی خواہش کا گلا گھونٹتے ہوئے ٹی سیٹ نکالنے لگا۔ ساتھ ساتھ اپنے مال کی تعریفیں کرنے لگا۔ غزالہ اور اس کی سہیلی میدو ٹی سیٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں جبکہ کالے بزدار کی بیوی نے استری والا ڈبہ اُٹھا لیا، بولی، ''میں اپنے سائیں کو دکھانے کے لئے گھر لے جارہی ہوں۔ وہ بجلی کے سامان کو سمجھتا ہے۔ تم اس کی قیمت بتاؤ۔''

عمومی طور پر پٹھان چیز کا کئی گنا زیادہ ریٹ مانگتے ہیں۔ خریداروں کو بھی ان کی اس پختہ عادت کا علم ہوتا ہے۔ وہ کئی گنا کم قیمت بتاتے ہیں۔ پھر مول تول کا مرحلہ آتا ہے۔ کئی بار سودا منسوخ ہوتا ہے۔ کئی بار نئے سرے سے نرخ بازی ہوتی ہے۔ میں نے منہ پھاڑ کر کہا، ''ایک نمبر جاپانی استری ہے..... اصل نیشنل..... دو ہزار سے کم نہیں ہوگا۔ اپنے گھر والے کو دکھا دو۔''

اس نے ڈبہ زمین پر رکھ دیا۔ منہ بنا کر بولی، ''اتنی مہنگی..... نہیں بابا؛ ہمارا سودا نہیں بن سکتا۔''

میں نے ڈبہ اُٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور اکھڑ انداز میں کہا، ''اے بی بی! جاؤ، اپنے سائیں کو دکھاؤ۔ سودا نہیں ہوگا تو کوئی بات نہیں۔ دیکھنا تو مفت کا ہے ناں!''

میدو نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ ڈبہ اُٹھا کر گھر میں گھس گئی۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے میدو کو مخاطب کیا، ''اے لڑکی! ایک گلاس پانی تو لاؤ۔ پیاس لگی ہے۔''

میں نے ایک ستائی سیٹ غزالہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ میرے چکر میں آ گئی اور میدو کے پیچھے جاتے جاتے رُک گئی۔ میں نے کہا، ''اے لڑکی! تمہارا شادی ہو گیا ہے؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اجنبی لہجے کا سوال ناگوار لگا۔ چہرہ متغیر ہوا۔ میں نے جلدی سے کہا، ''میرا مطبل (مطلب) ہے کہ.....''

وہ ناک چڑھا کر بولی، ''تمہارا جو کوئی بھی مطلب ہے، اپنے پاس رکھ۔ یہ بتا کہ اس کا ریٹ کیا ہے؟''

مجھے اپنے آپ کر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ غصے سے تنک گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کے چہرے کی تاب و تمکنت پہلی سی نہیں رہی تھی۔ وہ نہ صرف ایک ہی شب میں اپنے کئی پیارے گنوا چکی تھی بلکہ اپنا گھر بار ہونے کے باوجود دستِ نگر ہو کر بخت خان کی حویلی میں رہائش پذیر ہو گئی تھی۔ میں نے پیار سے کہا، ''لڑکی! تم نے ایسے ہی غصہ کیا۔ اَم کو مافی (معافی) دو اور یہ سیٹ دیکھو۔ یہ چار سو کا ہے۔ یہ ساڑھے سات سو کا ہے۔''

وہ دونوں ڈبے ہاتھ میں پکڑ کر کسی سوچ میں غرق ہو گئی۔ میں اس کی حالت سمجھتا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے کہا، ''کیا تیرے پاس پیسہ نہیں ہے؟''

اس نے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔ میرا دل دُکھا۔ میں نے کہا، ''تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟''

اس نے بتایا، ''وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔''

''ادھر، ہسپتال کے سامنے کس کا بڑا سا حویلی ہے؟''

''وہ..... اچھا! وہ تو سردار یارن خان کی حویلی ہے۔''

''کیا وہ ایدھر رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا، ''میرا مطبل ہے کہ وہ ایدھر زمیندارہ کرتا ہے؟''

''نہیں۔ وہ لاہور میں رہتا ہے مگران دنوں یہاں آیا ہوا ہے۔ کیا تم نے اس سے ملنا ہے؟''

''اَم اس سے کیا ملے گا؛ اَم تو غریب پھیری والا بندہ ہے۔ وہ امیر آدمی ہے۔'' میں نے عاجزی دکھائی، ''اَم تو ویسے ہی پوچھتا ہے۔''

جب تک میدو پانی بھرا گلاس لے کر نہیں آئی، میں نے اُسے بے سروپا باتوں میں الجھائے رکھا۔ پانی پینے کے بعد وہ دونوں زمین پر بیٹھ گئیں اور میرے سامان سے چھیڑ خانی کرنے لگیں۔ ان کی حرکات سے عیاں تھا کہ انہوں نے کچھ بھی خریدنا نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ بیچنا تھا، میں ان کی لاعلمی میں بیچ رہا تھا اور مدت کے بعد جی بھر کر اپنی محبوبہ کو دیکھ رہا تھا۔ میدو کی بہن استری اُٹھائے لوٹی۔ بولی، ''بھائی! یہ چار سو کی دو گے؟''

میں نے منہ بناتے ہوئے ڈبہ اس کے ہاتھ سے لیا اور غصے سے کہا، ''یہ چار سو کا استری ہے؛ تمہارا دماغ کام نہیں کرتا بی بی..... یہ جاپانی استری ہے۔''

مول تول کا روایتی مرحلہ درپیش ہو گیا۔ وہ سو پچاس کی سیڑھی پر اوپر چڑھ رہی تھی جبکہ میرا نرخ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے ڈبے پر ہاتھ مارتے ہوئے قدرے بلند آواز میں کہا، ''تم نے پٹھان کا ریٹ سنا ہے، رعایت نہیں دیکھا۔ چلو، نکالو ایک ہزار روپیہ اور استری پکڑو۔''

غزالہ بولی، ''خان! بس چھ سو.....''

''اَم نے نو سو کا خریدا ہے، کیسے چھ سو کا دے دے؟''

''کوئی بات نہیں..... دے دو ناں!'' وہ دوپٹا دانتوں میں دبا کر ہنستی ہوئی میدو سے چپک گئی۔ میرا دل گنگنایا، 'جب دباتے ہیں وہ دانتوں میں گلابی آنچل؛ کتنے پرکیف نظاروں کو سزا ملتی ہے۔' میں نے غزالہ کی شریر ادا پر قربان جاتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔ میدو دوڑتی ہوئی گھر گئی۔ نوٹ تھامے لوٹی۔ سو کے چھ نوٹ اپنے سلوکے کی جیب میں ڈالتے ہوئے میں نے جی بھر کر غزالہ کو دیکھا اور اپنا بکھرا ہوا سامان باندھنے لگا۔

وہ تینوں خوشی خوشی گھر میں گھس گئیں جبکہ میری آنکھوں کے سامنے غزالہ کی مسکراتی ہوئی صورت عکس بن کر ٹھہر گئی۔ یہ استری ہم نے حسین آگاہی سے نو سو روپے میں خریدی تھی۔ پہلے

سودے میں مجھے تین سو کا گھاٹا آیا تھا مگر ملنے والے نفع کا شمار ہندسوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے جھوم کر ہوکا لگایا، ''استری لے لو..... جاپانی.....''

سوچا تھا کہ اسے دیکھنے سے دل کو قرار آ جائے گا مگر اب سوچ رہا تھا کہ ایسے دیکھنے سے دل کا رہا سہا قرار بھی رخصت ہو گیا تھا۔ میں نے سامان اُٹھایا، اپنے مکان پر ایک حسرت کناں نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ میرے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک پگڈنڈی سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کی طرف جاتی تھی۔ راستے میں بائیں ہاتھ پر بڑا سا جوہڑ اور گھنا جنگل واقع تھا جن کے درمیان ایک پگڈنڈی چاچے چراغ کے مکان کی عقبی کھڑکی تک جاتی تھی۔ میں پگڈنڈی پر چلتا ہوا، آوازیں لگاتا ہوا جوہڑ کے کنارے آن رکا۔ چاچے چراغ کے سیاہ دیواروں والے گھر کی عقبی کھڑکی نظر آ رہی تھی جو بند تھی۔ وہ جلنے سے بچ گئی تھی۔ چاچے اور چاچی کی شکلیں نظروں میں گھومنے لگیں۔ ہائے! کیا بے بسی ان کی آنکھوں میں رچی ہوگی جب وہ آگ کے شعلوں کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہے ہوں گے اور اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پیر تک نہ ہلا سکے ہوں گے۔ میرے دل میں الاؤ بھڑک اُٹھا۔ آنکھیں سلگ اُٹھیں۔ جی چاہا کہ ابھی بلوچ نگر جاؤں اور حیدر خان کے محل کو آگ لگا دوں۔ ایک بھی شخص کو محل سے نکلنے نہ دوں۔ پاؤں من من کے ہونے لگے تو میں گھسٹتا ہوا مزار کی عقبی چار دیواری کے پاس چلا آیا۔ صحن میں چند لوگ موجود تھے جو قبر کی زیارت کے لئے آئے تھے۔ میں نے چکر کاٹا اور مزار کے احاطے میں آ گیا۔ سب کچھ ویسا تھا۔ اگر بدلا تھا تو اس سلطنت کے اقتدار کا سورج بدل گیا تھا۔ سائیں دل جیت کی جگہ نورن آغا نے لے لی تھی۔ وہ خانزادوں کا تعینات کردہ آدمی تھا اس لئے انہی کے مفادات کے تحفظ مین سائیں دل جیت کی طرح ظلم اور جرم کی بھٹی تپائے رکھتا ہوگا۔ عجیب سی بے بسی کا احساس ہوا۔ میں نے سائیں دل جیت کو تو ٹھکانے لگا دیا تھا مگر اس نظام کو تہس نہس کرنے میں ناکام ہو گیا تھا جو غریبوں کا خون چوسنے کے لئے رائج کیا گیا تھا۔ میری ساری محنت اکارت گئی تھی اور محض چہرہ بدلنے کی حد تک جزوی کامیابی حاصل کر پائی تھی۔ ایک جواں سال لڑکی کو اپنی ماں کے ساتھ مزار کے دائیں کونے میں ایستادہ درخت پر سرخ اور سبز کپڑے کی ٹاکیاں باندھتے دیکھ کر دل سے ہوک نکلی۔ ابھی اس سلطنت میں لڑکیوں کو 'پروین' اور 'عاشی' بنانے کی روایت پورے دم خم سے موجود تھی۔

میں نے اپنا سامان مزار کی دیوار کے ساتھ رکھا اور سائیں جگ جیت کی قبر پر آن کھڑا ہوا۔

فاتحہ پڑھی، ہاتھ اُٹھائے اور گڑگڑایا، ''اے مالک! اپنے اس نیک بندے کی آخری آرام گاہ پر رحم کرتے ہوئے یہاں سجا ہوا ظلم کا بازار بند کرا دے۔ معصوم لوگوں کو ان درندوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے سے بچالے.....''

میرا بار بار رونے کو جی چاہتا تھا مگر رہ رہ کر اپنے کلرلینز کا خیال آ جاتا تھا۔ مزار سے نکلا تو صحن میں نورن آغا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ شاید اُسے نہ پہچان پاتا مگر احاطے میں موجود معتقدین کی حرکات نے باور کرایا کہ وہی نورن آغا تھا۔ سادہ لوح اور لاعلم لوگ بڑی عقیدت سے اس سے سلام لیتے، اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں پر لگاتے اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر راستہ دیتے۔ کھالے نے درست کہا تھا۔ وہ طویل قامت اور گوری رنگت والا خاصا وجیہہ شخص تھا۔ اس نے بے داغ لٹھے کا کرتا اور پائجامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ شانوں پر لمبی اور بل دار زلفیں پھیلی ہوئی تھیں جبکہ داڑھی اور مونچھوں کو کلف لگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرمے کی فراوانی تھی۔ ہاتھ میں لمبی مگر خوب صورت تسبیح جھول رہی تھی۔ میں نے اس سے سلام کیا۔ وہ مربیانہ انداز میں مخاطب ہوا، ''خان! کیا حال ہے؟ لگتا ہے، دور سے آئے ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، کہا، ''اَم پنجاور سے آیا ہے۔ مزدوری کرتا ہے۔''

میں نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ایک نظر دیکھا، پھر بولا، ''کیا تمہارے پاس گھڑیاں بھی ہیں؟''

''اَمارے پاس اصل سیکو فائیو گھڑی ہے..... میڈ اِن جاپان۔ دکھاؤں شاہ صاحب؟''

میں نے پیشہ ورانہ مستعدی کا مظاہرہ کیا اور اس کے جواب دینے سے پیشتر اپنی گٹھڑی کھول لی۔ دو مختلف ڈیزائنوں کی گھڑیاں نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ اس نے ایک گھڑی پسند کی۔ نرخ پوچھا۔ میں نے کہا، ''اَم لوگوں کو تو دو ہزار بتاتا ہے۔ تم بڑا نیک آدمی ہے، اس لئے اَم تیرے کو پانچ سو کی دے گا۔''

وہ ٹھٹک گیا۔ شاید اسے یہ توقع تھی کہ میں اسے مفت گھڑی دے دوں گا۔ اردگرد دیکھا۔ دو مریدین لپک کر قریب آ گئے۔ خوشامدی لہجے میں بولے، ''آغا جی! بڑی خوب صورت گھڑی ہے۔ لینے کا ارادہ ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک مرید نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو کے نوٹ گن کر میری طرف بڑھا دیے۔ یوں میرا دوسرا سودا بھی بک گیا۔ ادھیڑ عمر مرید نے گھڑی

اپنے ہاتھ سے نورن آغا کی کلائی پر باندھی۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا۔ نورن آغا مزار کے اندر جاتے جاتے رُک گیا۔ بولا، ''سامان ادھر پڑا رہنے دو۔ اے بھائی! تھوڑی دیر کے لئے پٹھان کے سامان کا خیال رکھو۔''

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور ہال کی طرف بڑھا۔ ہال میں چند افراد موجود تھے۔ سائیں دل جیت کے دور کا منظر سجا ہوا دیکھ کر میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ نورن آغا میرے دل کی زیروزبر ہوتی دنیا سے بے خبر مجھے لئے حجرے میں گھس گیا۔ بیٹھنے کے بعد بولا، ''پٹھان! تمہارے پاس کون کون سا سودا ہوتا ہے بیچنے کے لئے؟''

میں اس کے انداز پر گڑبڑا گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب اور معنی خیز چمک دیکھ کر ہوشیار ہوگیا۔ پوچھا، ''شاہ صاب! حکم کرو، کیا چاہیے؟''

وہ بولا، ''جوان کرنے والا کوئی سودا ہے تمہارے پاس؟ یعنی ایک نمبر.....'' اس نے ایک بدنام زمانہ دوائی کا نام لیا اور میری طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز اختیار کرلیا، ''میرا مطلب ہے کہ وہ دوائی جو تھکاوٹ اور ضعف پر جوانی کی چادر ڈال دیتی ہے۔''

وہ بلاشبہ کمینہ صفت انسان تھا۔ میں نے چھاتی تھپتھپاتے ہوئے کہا، ''شاہ صاب! اَم کو کھل کر بتاؤ، تیرے کو کیا پریشانی ہے۔ ہر مرض کا علاج یہ دوا نہیں ہوتا۔ اَمارے پاس ایک نمبر مال ہوتا ہے، ہر قسم کا۔''

اخلاق کے دائرے میں رہ کر جتنا کھل کر بتایا جاسکتا ہے، وہ بتا چکا تھا۔ میرے اکسانے پر اس کی سرمہ بھری آنکھوں میں چمک کے ساتھ ساتھ بے شرمی گھل گئی اور زبان کا تمام تر فساد لفظوں میں تحلیل ہونے لگا۔ وہ جوانی کی دہلیز عبور کر چکا تھا۔ دبکتی ہوئی کچی کلائیوں پر اس کی نچڑے ہوئے اعصاب کانپنے لگتے تھے۔ وہ عمر کے لحاظ سے بوڑھا نہیں ہوا تھا مگر دشتِ گناہ میں دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا تھا۔ وہ عمرِ رفتہ کو آواز دیتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسا دائرہ وشکم میں بُنتر جائے جو آناً فاناً برف میں آگ لگا دے اور اس کی ہوس کے گھوڑے پر طاقت کی زین رکھ دے۔ میں جانتا تھا کہ رکابوں سے نکلا ہوا پیر کبھی منہ زور گھوڑے کو ایڑ نہیں لگا سکتا مگر اسے تسلی آمیز دعووں سے پرت در پرت کھولتا گیا۔

مجھے اس کے بہروپ میں چھپے ہوئے اصل روپ کو دیکھ کر گھن آرہی تھی۔ معصوم لوگوں کے عقائد سے کھیلنے کے ساتھ ساتھ ان کی عصمت سے بھی کھل کھیلنا چاہتا تھا۔ قدرت نے اس

سانپ کا زہر ختم کر دیا تھا اور وہ میری دہلیز پر گر کر نیاز ہر مانگ رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا، ''تم فکر نہ کرو شاہ صاب! اُمارے پاس بہت تیز دارو ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس..... مگر وہ اس وقت اُمارے پاس نہیں ہے۔ اگلے ہفتے آئے گا تو ساتھ میں لائے گا۔ خُو تھوڑا مہنگا ہوگا۔''

اس کا چہرہ کھل اُٹھا، بولا، ''پیسوں کا فکر نہ کرنا۔ زیادہ لانا مگر ہوا ایک نمبر؛ ورنہ کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے حامی بھری، دل ہی دل میں نورن آغا پر چار حروف بھیجے اور حجرے سے نکل آیا۔ یکبارگی جی چاہا کہ مزار کے احاطے میں موجود تمام مرد و زن کو مجتمع کروں اور انہیں بتاؤں کہ جس شخص کے پاس وہ اپنی جوان بہو بیٹیاں بغیر کسی جھجک کے بھیج دیتے ہیں، اس کی طلب کیا ہے؟ گلا پھاڑ پھاڑ کر بتاؤں کہ وہ جس شخص کو اللہ کا نیک اور برگزیدہ بندہ سمجھتے ہیں، وہ انسانیت کی ہر سطح سے گرا ہوا شخص ہے اور ان کی عصمتوں کو روندنے کے لئے دواؤں کا سہارا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ میں اسے بیچ چوراہے برہنہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ علم تھا کہ ایسی ہر کوشش رائیگاں جائے گی اور لوگوں کی آنکھوں پر بندھی ہوئی عقیدت کی دبیز پٹی انہیں کوئی حقیقی منظر نہیں دیکھنے دے گی۔

میں نے بارہ بجے کے قریب یارن خان کی حویلی سے سرمئی رنگ کی لینڈ کروزر نکلتے دیکھی۔ کالے شیشوں کی وجہ سے اندر بیٹھے ہوؤں کو نہ دیکھ پایا۔ گاڑی پرانے ماڈل کی تھی مگر کنڈیشن وائز بہت بہتر تھی۔ میں مسجد کے سامنے کھڑا تھا جب وہ موڑ مڑ کر نوری چوک کی طرف تیزی سے بڑھ گئی۔ مجھے اپنی سواری کے نہ ہونے کا قلق ہوا۔ اگر میرے پاس گاڑی ہوتی تو میں اس کے پیچھے لگا دیتا اور دیکھتا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ کھالے نے درست کہا تھا۔ میں بے دست و پا نور پور میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ امان اللہ قریشی کی حویلی کے سامنے پہنچا تو کھالا نظر آ گیا۔ وہ اپنے باپ کی دکان کے چھپر تلے کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے تحت میں اُسے اشارہ کرتے ہوئے پلٹ کر مراد بخش دیوانے کے گھروندے پر پہنچ گیا۔ وہ غیر متوقع طور پر اپنی دکان پر تھا۔ اس کے پاس افسر علی اور کالا بزدار بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوانہ بلند آواز میں کہہ رہا تھا، ''پھر کیا ہوا؟ بس..... سرگی ویلا، جنگل بیلا، جائے نماز پر بیٹھا ہی تھا کہ میرا دل بھر آیا۔ میں نے ہاتھ پھیلائے، چہرہ سوئے فلک بلند کیا اور ملتجیانہ انداز میں اپنے رب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے مالک! مجھ پر اپنا خاص کرم فرما۔ میں تیرے آگے جھولی پھیلائے بیٹھا ہوں جبکہ ساری دنیا سو رہی ہے..... ایسے ہی وقت میں

میرے عقب میں کم بخت بڈھے مردار شریف چکی والے کی غصیلی آواز گونجی، ''اوئے کیں اوتری ماءداپترا! اپنی دعا منگ؛ ساڈیاں چغلیاں تے نہ کر!''

(لاوارث ماں کے بچے! اپنی دعا مانگو، ہماری چغلیاں تو نہ کرو۔)

دیوانے کا مخصوص انداز بیاں سن کر میرے لئے اپنا قہقہہ دبانا مشکل ہو گیا۔ میری آواز سن کر تینوں چونک گئے۔ مجھے دیکھ کر کالے بزدار نے کہا، ''اوئے پٹھان! تم اس بھکے تت شاعر کے پاس کیا لینے آئے ہو؟ جاؤ، اپنی روٹی روزی کرو۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا مگر جان بوجھ کر ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا گویا میں اس کے جملے کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ دیوانے نے ہاتھ لہرا کر اپنے انداز میں کالے بزدار کی بات کا متن سلیس زبان میں سمجھایا۔ میں نے لاپروائی سے سر جھٹکا اور کہا، ''اَم تھوڑا دیر آرام کرنے کو ایدھر آیا ہے۔ تھوڑا دیر بیٹھنے دو اَم کو، اَم تھک گیا ہے۔''

دیوانے نے مجھے چوبی چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی بات، جہاں پر چھوڑی تھی، وہیں سے چھیڑ دی، ''سردار یارن خان اور اس کے پروہنے شکاریوں نے رضائی میں دبکے شریف چکی والے کی بات سن لی۔ پھر تو وہ قہقہہ پڑا کہ میرا خون جل گیا۔ جی چاہا کہ پوپلے منہ والے بڈھے شریف کو ایسا ہاتھ دوں، ایسا، کہ وہ مہینہ بھر پرہیزی دلیہ کھاتا رہے۔''

کھالا کھانستا ہوا گھروندے میں داخل ہوا۔ سلام لیکی کے بعد دیوانے کی روزی کے اڈے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کا انداز متردد تھا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے دیوانے کو پٹڑی پر چڑھا لیا اور یارن خان کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کی سرگرمیوں کو کریدر ہا تھا اور دیوانہ احساسِ تفاخر سے یارن خان کے بارے میں بڑھ چڑھ کر بتا رہا تھا۔ افسر علی اور کالا بزدار یارن خان کے ناوقت تذکرے پر بور ہو کر اُٹھ گئے۔ مجھے بھی مایوسی ہوئی۔ کھالا اس سے کوئی کارآمد بات، ماسوائے کے کہ یارن خان گزشتہ تین چار دنوں سے باہر نہیں نکلا تھا، اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ رات کو ہم دونوں نے اندازہ کیا تھا کہ دیوانہ بس اپنا عاجزانہ کلام سنانے، خوشامد کر کے چار پیسے اینٹھنے اور گلہری کی طرح آنیاں جانیاں دکھانے تک محدود رہتا تھا۔ اس نے یارن خان کا حقیقی رُخ کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی دلچسپی رکھتا تھا۔ کھالے نے تذکرہ بدل دیا، بولا، ''اپنے شہرے خان کی کوئی خیر خبر؟''

دیوانے نے ٹھٹک کر اُسے دیکھا پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولا، ''نہیں یار! اس بے چارے کا تو

نور پور میں نزی ڈٹہ (آ گا پیچھا) ہی ختم ہو گیا۔ نہ جانے کس حال میں ہو گا۔'' سانس لے کر بولا، ''تم نے مجھے اس کا پیغام دیا تھا کہ جمعہ کے روز قلعہ کہنہ قاسم باغ میں وہ میرا انتظار کرے گا۔ مجھ سے جایا نہ جا سکا۔ بعد میں رابطے کی کوئی سبیل ہی نہیں نکلی۔ سنا ہے کہ اس نے سردار حیدر خان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جس کا پرچہ چوک قریشی والے تھانے میں بڑے خان نے کٹوا رکھا ہے۔ کہتا ہے کہ جہاں بھی نظر آیا، پکڑ و کر ہڈیوں پسلیوں ں کا سرمہ بنوا دوں گا۔''

میرے جبڑوں کے اعصاب کھنچے، دانت کڑکڑائے مگر میں نے اُٹھ کر پانی پینے کے بہانے اپنے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو ان دونوں سے چھپایا۔ کھالا بولا، ''کبھی یارن خان نے شہرے کے بارے میں تم سے کچھ پوچھا؟''

''کوئی ایک بار..... اس نے کئی بار مجھ سے شہرے کے بارے پوچھا۔ بولتا تھا کہ وہ بڑا بیبا منڈا (لڑکا) تھا۔ پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی۔ اس نے میرے ذمہ لگایا تھا کہ جہاں بھی شہرا ملے، اس کے پاس پہنچا دوں۔ وہ اسے اپنی حویلی میں رکھے گا اور دیکھے گا کہ حیدر خان اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے کرتا ہے۔'' دیوانے نے کہا، ''مگر افسوس! اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لئے ہر روز ملتان بھی تو نہیں جا سکتا۔''

''اگر میں تمہیں اس کا نواں (نیا) پتہ دوں تو اس سے ملنے جاؤ گے؟'' کھالے نے ٹٹولا۔

''ہاں! مگر شاید نہیں۔ یار! میں اس قضیے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ پتہ نہیں یارن خان اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ یہ نہ ہو کہ شہرے خان کی وجہ سے مجھ سے بدگمان ہو جائے اور برسوں کی یاری پر حرف آئے۔'' دیوانے نے اپنی گردن کو مخصوص انداز میں اکڑایا تو میرے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ بولا، ''کھالے اُستاد! ایک بات ہے؛ شہرا وہ نہیں رہا، جو نور پور میں ہوا کرتا تھا۔ یارن خان کہہ رہا تھا کہ اس نے حیدر خان کو نتھ ڈال دی ہے۔ تم جانتے ہو کہ حیدر خان کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ جو اُسے نتھ ڈال دے، وہ کتنا طاقتور ہو گا۔ خانزادی کے اغوا میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔ یارن خان کی طرح مجھے یقین ہو گیا ہے کہ شہرے کی بہن کو حیدر خان نے امیر نواز کی مدد سے اُٹھایا تھا۔''

''کیا خبر، ایسا ہی ہو؟'' کھالے نے گول مول جواب دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا، بولا، ''اوئے پٹھان! تمہارا نام کیا ہے؟''

''گلاب خان!'' میں نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

دیوانہ میری طرف جھکا، مضحکہ خیز انداز میں مجھے سونگھنے کے بعد بولا، ''گلاب؟ تیرے پاس سے خوشبو تو آتی نہیں۔''

میں نے جھٹ سے کہا، ''خوا! تم نے کبھی گلاب جامن کھایا ہے؟''

''ہاں.....کھایا ہے۔ کیا ہے اُسے؟'' دیوانہ متجسس ہوا۔

''اس میں نہ گلاب ہوتا ہے، نہ گلابی رنگ.....اُم نے سونگھ کر دیکھا تھا۔ گلاب کا خوشبو بھی نہیں ہوتا۔ اس میں جامن بھی نہیں ہوتا۔ تم پنجاب کا رہنے والا اُسے گلاب جامن کیوں بولتا ہے؟'' میں نے دانش ورانہ انداز میں کہا تو دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

کھالا بولا، ''دیوانے! یہ پٹھان نہیں، پٹھانوں کا سائنس دان ہے۔ کیا سمجھے؟ اب کیسٹ کی دوسری سائیڈ لگاؤ اور نیا پشتو گیت سنو۔''

دیوانے نے ستائش آمیز نظروں سے مجھے گھورا۔ کھالا بولا، ''اوئے دیوانے! یہ تمہارے پاس بیٹھا کیا کر رہا ہے؟.....میری مانو تو اسے دو چار قاتلانہ قسم کے دو ہڑے مارو اور اسے بگٹٹ بھاگتا دیکھو۔''

دیوانے نے ایک ذرا غصے سے کھالے کو دیکھا، ''کوئی دو ہڑا سنا کر تمہارے کلیجے میں چھید کیوں نہ کر دوں؟''

کھالا تمسخرانہ انداز میں ہنسا تو دیوانے کو غصہ آ گیا۔ گردن اکڑ گئی۔ مونچھیں پھڑ پھڑانے لگیں اور شعلہ بار نظروں سے کھالے کو دیکھ کر اپنی سلائی مشین پر جھک گیا۔ کھالے نے مجھے گھروندے سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سامان اُٹھایا اور دیوانے کو مخاطب کیا، ''اوئے درزی! تم نے کچھ خریدنا ہے۔ ٹی سیٹ، واٹر.....''

میں نے سانس لئے بغیر اپنی چلتی پھرتی دکان کا جملہ سامان گنوا دیا۔ دیوانہ آنکھیں پھاڑے سنتا رہا پھر نتھنے پھلا کر بولا، ''غضب خدا کا، تو پھیری والا ہے، یا آٹو ریورس ٹیپ پلیئر.....کچھ نہیں لینا میں نے۔ جا، اپنا کام کرو۔ میرا دماغ چاٹنے کے لئے یہ منحوس ڈرائیور ہی کافی ہے۔''

گھروندے سے نکل کر میں اور کھالا آگے پیچھے چلتے ہوئے بخشو لوہار کی دکان پر پہنچے۔ کھالے کو دیکھتے ہی اس کے باپ نے اڈہ چھوڑ دیا اور تہبند سنبھالتے ہوئے بولا، ''پتر! میں ذرا حیات خان کے دارے پر جا رہا ہوں۔ تب تک تم ادھر بیٹھ جاؤ۔''

بخشو نے دکان سے نکلتے ہوئے اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور نظر انداز کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق برہنہ پا تھا۔ گاؤں کے اکثر بوڑھے، جو گاؤں تک محدود رہتے تھے، ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ کھالا اور میں چھپر تلے چارپائی پر بیٹھ گئے اور میں نے آتے جاتے لوگوں کی توجہ سے بچنے کے لئے اپنا سامان کھول کر پھیلا دیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ کھالا کچھ خریدنے کے لئے مجھے گھیرے بیٹھا تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا، ''کھالے! میں نے غزالہ کو دیکھ لیا ہے۔''

ساتھ ہی میں نے اس سے ہونے والی ادھوری ملاقات کا احوال حسرت بھرے لہجے میں کہہ سنایا۔ وہ بولا، ''بہتر یہی کہ اپنی پھوپھی اور غزالہ کو یہاں سے نکال لے جاؤ۔ ان کے حصے کی روٹی رب کی ذات دیتی رہے گی۔''

مجھے روٹی کا فکر نہیں تھا۔ یہ وہم لاحق تھا کہ وہ میرا ساتھ نہیں دیں گی اور نور پور کو خیرباد نہیں کہیں گی۔ تبھی میں نے انہیں لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے کہا، ''تم نے دیوانے کی بات سنی تھی؟ کہہ رہا تھا کہ بڑا خان کئی دنوں سے حویلی سے نہیں نکلا۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا مدعا حویلی میں موجود ہے۔''

کھالے نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں یار! خان ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔ بڑا سیانا کاں (کوا) ہے۔ جانتا ہے کہ اس نے کسی معمولی شخص پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ اسے یقیناً اندازہ ہوگا کہ میڈم شکیلہ زخمی ناگن کی طرح پھنکارتی پھر رہی۔ تبھی بچاؤ کی نیت سے حویلی تک محدود ہو گیا ہے۔''

''بس کھالے! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج رات کو یاژن خان کے نرخرے پر ہاتھ رکھوں گا۔'' میں نے اس کی تاویل کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا، ''میڈم کچی گولیاں نہیں کھیلتی۔ اسے علم تھا کہ مجھے نور پور سے کچھ ہاتھ لگنے والا نہیں ہے۔ تب بھی اس نے رسی کا سانپ بنا کر ڈرایا اور روانہ کر دیا۔ لامحالہ اس نے میرے سامنے چیلنج رکھا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ میں اسلحہ اور اس کے زیرک ساتھیوں کے بغیر بھی کچھ کر سکتا ہوں یا نہیں۔ اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لئے مجھے ہاتھ پیر ہلانا ہوں گے۔''

وہ اسپاٹ لہجے میں بولا، ''تم بضد ہو تو میں تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔''

مجھے اس کی بے نیازی بُری لگی۔ کہا، ''کھالے! اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے ناں!''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کافی دیر تک سر جھکائے ایک ٹی سیٹ سے کھیلتا رہا۔ توقف کے

بعد سر اُٹھا کر مستفسر ہوا، ''خانزادی کا کیا بنا؟''

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ حیدر خان کی بیٹی اسما کی طرف تھا۔ میں نے بتایا، ''اسے میڈم نے لمبے سفر پر روانہ کر دیا تھا۔ وہ میاں دلبر حسین کی تحویل میں ہے۔''

میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر کھالے کا رنگ پل بھر کو متغیر ہوا، مگر فوراً سنبھل گیا، بولا، ''شہرے! تمہاری مالکن نے اچھا نہیں کیا۔ خانزادی کا چہرہ جب بھی میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو دل کٹنے لگتا ہے۔ تمہیں معلوم تو ہوگا کہ وہ کہاں ہوگی اس وقت؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''مجھے نہیں پتہ؛ میرا خیال ہے کہ میڈم کو بھی علم نہیں ہوگا کہ میاں دلبر حسین نے اسے کہاں رکھا ہوگا۔''

''وہ بے غیرت میاں دلبر کوئی گیم کھیل رہا ہے یا بس وہی منہ کالا کرنے والا چکر ہے؟'' وہ اپنے اندیشوں کو زبان نہ دے سکا۔

میں نے پھر کندھے اُچکائے، ''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ چھوڑو اُسے! یہ بتاؤ؛ تمہارے پاس کوئی پستول ہے؟''

اس نے انکار کیا۔ کہا، ''شہرے! میں پھر کہتا ہوں کہ باز آ جاؤ اور ملتان لوٹ جاؤ۔''

''ڈاکٹر شاہ جی کا کچھ پتہ چلا؟'' میں نے اس کا مشورہ ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا۔ وہ ابھی تک مجھے نور پور کا بھولا بھالا شہریار سمجھ رہا تھا؛ نہیں جانتا تھا کہ پیا جی اور میڈم کی سنگت نے میری جون بدل ڈالی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ نہ اس نے ڈاکٹر منور علی شاہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور نہ اُس کا کچھ پتہ چلا۔ بولا، ''سمجھو، اس کی کہانی ختم ہوگئی۔ وہ جب تک یہاں تھا، ہمارا دوست تھا۔ کبھی پلٹ کر آئے گا، یہ خام خیالی ہے۔ سرکاری افسر اور کنجری دونوں پلٹ کر دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے۔''

میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا تیز دھار خنجر کھولا اور مجھے تھما دیا۔ بولا، ''شہرے! استاد عاشق ویگن کا پھیرا لے کر آتا ہی ہوگا۔ میں اس کے ساتھ قریشی موڑ چلا جاؤں گا کیونکہ ویگن کا آخری پھیرا مجھے ہی لانا ہوگا۔ اگر تم حویلی پر دھاوا بولنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ تم اپنا بندوبست کر لینا کیونکہ میں تمہیں رات کو اپنے گھر سلا نہیں سکوں گا۔ مجبوری ہے۔ اگر معاملہ بگڑ گیا تو یار ن خان میرے گھر والوں کو دیواروں میں چنوا دے گا۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

میں نے چونک کر اُسے دیکھا؛ پھر خنجر کو۔ کھالے کے چہرے پر ندامت کا عکس لہرا رہا تھا جبکہ خنجر کے چمکدار پھل پر خون کی پیاس چمک رہی تھی۔ یہ وہ خنجر نہیں تھا جس سے کھالے نے مجھے اپنے کمرے میں بلو کے ساتھ دیکھ لینے پر زخمی کیا تھا۔ ان حالات میں یہ خاموش اسلحہ میرے لئے بڑا فائدہ مند تھا۔

کھالے کی ندامت تحلیل کرنے کیلئے میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، ''فکر نہ کرو یار! میں اپنا بندوبست کرلوں گا۔''

ایسے میں ویگن کے ہارن کی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ اب تب میں پہنچنے والی تھی۔ میں نے کھالے سے ہاتھ ملایا، غزالہ کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور آزردہ لہجے میں الوداع کہا۔ مجھے گھر میں ٹھہرانے سے معذرت کے سبب وہ شرمسار دکھائی دے رہا تھا حالانکہ میں نور پور میں باآسانی نصف شب تک کا وقت گزار سکتا تھا۔

مجھے بھوک لگی تھی۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ سردار دریام خان کے دارے پر مسافروں کو کھانا دیا جاتا تھا، اس لئے وہاں پہنچ گیا۔ سرخ و سپید اور دراز قامت دریام خان دارے میں اپنے روایتی کروفر سمیت جلوہ افروز تھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کڑک دار آواز میں پوچھا، ''ہاں بھئی پٹھان! کیسے آئے ہو؟''

میں نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر احمقانہ انداز میں سلام کیا اور کہا، ''صاب! اَم کو بھوک لگا ہے۔ کھانا مانگتا ہے۔''

اس نے اپنے نوکر ملنگی کو ہاتھ کے اشارے سے مجھے کھانا کھلانے کا حکم دیا اور مہمانوں سے محوِ کلام ہوگیا۔ میں ایک طرف بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے حسبِ معمول بوسکی کا بے داغ سوٹ اور پیروں میں تلے دار کھسہ پہن رکھا تھا۔ باتیں کرنے کے دوران وقفے وقفے سے عادتاً مونچھوں کو بَل بھی دے رہا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب اس نے اپنی پوری فرعونیت سمیت اسی جگہ پر مجھے بے عزت کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی کی بے جا معاونت کے جرم میں سخت سست کہا تھا۔

ملنگی کھانا لے آیا، سٹیل کی ٹرے میرے سامنے رکھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے میرا نام پتہ پوچھنے لگا۔ کھانے کا معیار اتنا اچھا نہیں تھا مگر سائیں جگ جیت کے مزار پر بٹنے والے لنگر سے بدرجہا بہتر تھا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا اور پانی پی کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ دریام خان نے

اپنے ڈیرے کو آباد رکھنے اور اپنے جاگیردارانہ جاہ وجلال کو دوآتشہ کرنے کے لئے یہی اچھا کام کر رکھا تھا۔

سہ پہر کو میں دارے سے نکلا اور نور پور کی گلیوں میں گھومنے پھرنے لگا۔ نجانے میرے اندر کتنی تشنگی بھری ہوئی تھی کہ ایک گلی سے کئی کئی مرتبہ گزرنے کے بعد بھی دل بھرنے کو نہیں آتا تھا۔ میں نے یارن خان کی حویلی کے کئی چکر لگائے۔ کئی مرتبہ اس کی لینڈ کروزر کو حویلی سے نکلتے اور داخل ہوتے دیکھا۔ حویلی کا گوشہ گوشہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ اس کا کمرہ کمرہ میں نے دیکھ رکھا تھا۔ مگر آج تک اس نظر سے نہیں دیکھا تھا، جس نظر سے آج دیکھ رہا تھا۔ یارن خان کی آمد نے حویلی کے جاہ وجلال میں اضافہ کر دیا تھا ورنہ کچھ بھی بدلا ہوا نہیں تھا۔ دل بدقسمت رہا کہ اس کی تشنہ کامی کو غزالہ کا دوسرا دیدار نصیب نہیں ہوا تھا۔

شام تک میں نے کئی اشیاء اونے پونے بیچ کر اپنا وزن کم کر لیا۔ سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کے لنگر خانے میں بھوک کا درماں کیا اور اپنے ڈیرے کی طرف نکل گیا۔ میرا ڈیرہ بے آباد نہیں تھا۔ مال ڈنگر موجود تھے۔ جس جگہ پر میں نے سائیں دل جیت کی چتا جلائی تھی، وہ جگہ اب بھی سائیں کے کرتوتوں کی طرح سیاہ پڑی تھی۔ میں ڈیرے میں موجود جھلنگا سی چارپائی ٹوکے والے چھپر میں ڈال کر لیٹ گیا۔

چونکہ میں اپنا میک اَپ محفوظ رکھنے کے لئے علی الصبح نہایا نہیں تھا، اس لئے چاق چوبند نہیں تھا۔ سردی کافی تھی۔ تن پر اوڑھنے کے لئے رضائی یا کمبل نہیں تھا۔ میں نے چارے والی چادر کھینچ کر اپنے اوپر ڈال لی۔ اپنی پگڑی بھی کھول کر اوڑھ لی۔ کچھ سکون ہوا۔ پھر رات کے گہرے ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ چونکہ میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل تیار نہیں تھا، اس لئے میں نے انجام کے خوف سے جان چھڑا کر براہِ راست سردار یارن خان پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاید میڈم بھی یہی چاہتی تھی؟

نور پور میں اجنبیوں کی طرح طویل وقت گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ جدائی بہت بڑا خلا پیدا کر دیتی ہے۔ اتنا بڑا..... کہ شاید زندگی بھر نہیں بھرتا۔

❖❖○❖❖

میں نے اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس اور بچ جانے والا سامان سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کے پچھواڑے والے گھنے جنگل میں چھپایا تاکہ واپسی پر اگر مجھے اس سامان کو اُٹھانے کی

مہلت نہ بھی ملی تو یہ فوری طور پر کسی کی نگاہ میں نہیں آئے گا۔ کوئی ایک بجے کا عمل تھا جب میں جمی نائی اور اسلم مغل کے گھروں کا چکر کاٹ کر یارن خان کی وسیع و عریض دو منزلہ حویلی کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے کھالے کا دیا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑا اور پانچ چھ فٹ اونچی دیوار عبور کر کے حویلی کے عقبی لان میں کود گیا۔ اس جانب چنبیلی، مور پنکھ، سرو اور گلاب کے ان گنت پودے اور گھنے درخت موجود تھے جن سے بچ کر چلتا ہوا میں حویلی کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

مطلع صاف ہونے کی بدولت سرد رات کے دامن میں چاند کا شوخ اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں جھکے جھکے انداز میں قوس کی شکل کی وسطی کیاری میں سے گزر رہا تھا کہ میرے کانوں میں بل ٹیر رکتے کی غراہٹ پڑی۔ یک لخت میرے اعصاب تن گئے۔ دیوانے نے بتایا تھا حویلی میں چار خونخوار کتے شب بھر دندناتے رہتے تھے۔ ان کتوں کو وہ لاہور سے اپنے ہمراہ یہاں لایا تھا۔

مجھے ان کتوں کا خاطر خواہ انتظام کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ اب پچھتا رہا تھا۔ غراہٹ سے اندازہ ہوا تھا کہ ایک یا زیادہ کتے میرے کہیں قریب موجود تھے۔ میں سنتھے کی باڑ میں دبک گیا اور کھوجتی نظروں سے چہار سو دیکھنے لگا۔ اچانک مجھ پر افتاد آن پڑی۔ وہ خاصا قد آور اور صحت مند کتا تھا جو نجانے کہاں سے نکل کر مجھ پر کود گیا تھا۔ اس کے پنجے تو چست لباس کی وجہ سے مجھے زخمی نہ کر سکے مگر اس کے خونخوار دانت میرے بازو کی مچھلی میں پیوست ہو گئے۔ میں بمشکل دانت بھینچ کر چیخ کو دبانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ درد کی تیز اور کٹیلی لہر میرے تن بدن میں سرایت کر گئی۔

اس کے حلق سے نکلنے والی ڈراؤنی خرخراہٹ اس کی دہشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں نے اُسے ایک دو مرتبہ جھٹک کر اپنے اوپر سے اُتار پھینکنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے جبڑے کو جھٹکے دے رہا تھا اور اس کے نوکیلے دانت لحہ بہ لحہ میرے گوشت میں گھستے جاتے تھے۔ یہ صورت حال بہت خطرناک تھی۔ میں نے اچانک پینترہ بدلا اور اسے نیچے کی جانب جھکاتے ہوئے خنجر کی مدد سے اُس کا نرخرہ کاٹ دیا۔ خون کا فوارا نکلا جو میری احتیاط کی بدولت سیدھا زمین پر گرا۔ اگر میں نے اسے ایک طرف جھکا نہ دیا ہوتا تو میرا لباس خون سے تر ہو چکا ہوتا۔

اس کے دانت میرے بازو میں گڑے ہوئے تھے۔ جونہی نرخرہ کٹا، وہ بری طرح تڑپا اور میرا ماس بھنبھوڑتا ہوا زمین پر گر گیا اور زور زور کے جھٹکے لینے لگا۔ میں نے بے ساختہ کندھے

سے نیچے بازو کو زور سے تھاما۔ میرا ہاتھ چپچپا گیا۔ خون بہہ رہا تھا۔ جلن اور تکلیف نا قابلِ بیان تھی۔ میں نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلائیں، مٹھی بند کی اور اطمینان کی سانس لی کہ اعصاب کٹنے سے بچ گئے تھے۔

ابھی میں اپنے بازو پر پٹی باندھنے کے لئے کپڑے کی دستیابی کے بارے سوچ رہا تھا کہ حویلی والی جانب کی باڑ پھلانگ کر تین سفید جسیم کتے کیاری میں آن کودے۔ میں نے چشمِ زدن میں سنبل کے بڑے درخت کی طرف چھلانگ لگائی اور خاردار تنے کے ساتھ پشت ٹکا دی۔ چونکہ کتے تعداد میں تین تھے، اِس لئے کھلی جگہ پر ان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود کو عقب سے محفوظ کرتے ہی میں نے ان کے استقبال کے لئے خود کو تیار کر لیا۔ لڑاکے کتوں نے خون کی بو سونگھ لی تھی کیونکہ ان کا انداز نہایت جارحانہ تھا۔ وہ غرائے بغیر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ ایک اچھل کر میرے منہ تک آیا۔ دوسرا گولی کی طرح ٹانگوں کی طرف لپکا اور اس نے میری داہنی پنڈلی دانتوں میں جکڑ لی۔ دیوانہ وار بھنبھوڑنے لگا۔ تیسرا دکھائی نہیں دیا۔ میں نے چہرے پر لپکنے والے کی گردن پکڑی اور گھما کر دوسرے کی کمر پر دے مارا۔ پھر گردن چھوڑے بغیر میں نے اس کا نرخرہ بھی کاٹ دیا۔ اس کے حلق سے دردناک خرخراہٹ نکلی، ٹینس بال کی طرح اچھل کر زمین پر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے خون کا گرم لمس مجھے اپنے پیر پر محسوس ہوا۔

پنڈلی پر کاٹنے والا کتا پورا زور لگا کر ٹانگ کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا جس میرا ماس پھٹ رہا تھا اور نا قابلِ برداشت تکلیف ہو رہی تھی جبکہ چوتھا کتا درخت کے تنے کی دوسری سمت میں اچھل کود کر رہا تھا۔ وہ اپنی حرکات سے بوکھلایا ہوا لگتا تھا۔ پھر پہلو کی طرف سے آیا اور ہوا میں اُچھلا۔ اگر میں اس کی طرف سے ہوشیار نہ ہوتا تو وہ چند سیکنڈوں میں ہی میری گردن ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ میں نے اُسے جھکائی دی اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کی پچھلی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ مچلا اور میری گرفت سے نکل کر چند قدم دور جا گرا۔ اس کے آنے تک میں نے پنڈلی چبانے والا کا تیا پانچہ کر دیا۔ میرا ان تینوں کتوں کو مارنے کا طریقہ ایک سا تھا۔ آخری کتا چند لمحوں تک اپنے حواس میں نہیں رہا تھا کیونکہ وہ مخالف سمت میں چند قدم دوڑا پھر پلٹ کر میری طرف آیا۔ میرے قریب آ کر جھکائی دے کر دوسرے جانب نکل گیا۔

میں اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ شاید وہ اپنے ساتھیوں کا خون دیکھ کر بوکھلا ہو گیا تھا یا ڈر

گیا تھا۔ کھل کر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ چند لمحے اس کے قریب آنے کا انتظار کیا۔ وہ نہیں آیا تو میں سنبل کے تنے کی جڑ میں پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ پنڈلی میں تیز چبھن ہوئی جس نے مجھے آنِ واحد میں اَدھ موا کر دیا مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کتے نے فیصلہ کن انداز میں مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔ جواباً میں نے اپنا خنجر والا ہاتھ سامنے کر دیا۔ تیز پھل اس کے کھلے جبڑے میں سے گزر کر تالو میں کھب گیا۔ وہ دردناک آواز میں غرایا، پیچھے ہٹنے لگا تو میں نے اس کی اگلی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ وہ میری طرف گھسٹا اور میں نے اس کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار کیا جس سے وہ ڈھے گیا۔ تب تک میں نے اس کے حلق سے خنجر کھینچ لیا تھا اور گردن کو مخصوص انداز میں پکڑ لیا تھا۔ وہ تڑپنے لگا۔ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر میری گرفت سے نجات حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر ایک پاؤں گردن پر رکھا، دوسرا ٹانگ پر اور پوری قوت سے گردن مروڑ دی۔ 'کٹاک' کی آواز کے ساتھ ہی اس کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ کونکتے ہوئے مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔

میں نے اس کی چھوٹے بالوں والی سخت جلد پر رگڑ کر خنجر کو صاف کیا، رسماً کپڑے جھاڑے اور تیزی سے اگلی باڑ کی گھنی شاخوں میں گھس گیا۔ میری سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ دل بھی بڑی تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ کتوں نے بہت قلیل وقت میں نہ صرف مجھے تھکا دیا تھا بلکہ شدید زخمی بھی کر دیا تھا۔ چونکہ کتوں کے غرانے کی خوف ناک آوازیں خاصی دور تک سنی گئی ہوں گی، اس لئے مجھے کسی کی اس طرف آمد کی توقع تھی مگر پانچ سات منٹ گزرنے کے بعد بھی کسی نے ادھر کا رُخ نہیں کیا۔ شاید حویلی میں موجود خوش گمان لوگوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ کتے آپس میں لڑ رہے ہیں کیونکہ وہ ذہنی طور پر مطمئن ہوں گے کہ یارن خان کی حویلی میں کون جان کی امان پائے بغیر قدم رکھنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ یارن خان سردرات کے اس پہر میں حویلی کے کسی پُرحدت کمرے میں نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔

مجھے احساس تھا کہ میری پنڈلی اور بازو سے خون بہہ رہا تھا جو مجھے مسلسل کمزور کر رہا تھا مگر لہو کے بہاؤ کو روکنے کے لئے کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور باڑ سے نکل آیا۔ چہار سو محتاط نظروں سے دیکھتا ہوا کیاری سے نکلا اور اینٹوں کی روش پر دبے پاؤں چلنے لگا۔ میرا بے اختیارانہ ہاتھ بازو پر جما ہوا تھا۔ بظاہر میدان صاف تھا کیونکہ حویلی کی رکھوالی پر مامور چاروں کتے مر چکے تھے۔ پہرے دار کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دن کے اجالے میں نظر

آنے والے مزدور اپنے گھروں کو چلے گئے تھے یا حویلی میں سو رہے تھے۔ ہو کا عالم تھا۔ نقاہت کی وجہ سے سردی بدن چیرنے لگی تھی۔ حویلی کا عقبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ اسے توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ چکر کاٹ کر اگلے دروازے کی طرف جانا فضول تھا کیونکہ اس وقت اُسے بھی مقفل ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنا پرانا ہنر آزمانا تھا۔ میری تیز نظروں نے اس سفیدے کے اونچے درخت کو آنِ واحد میں تاڑ لیا جو مجھے بغیر کسی مشکل یا تاخیر کے اس دو منزلہ حویلی کی بالکونی پر پہنچا سکتا تھا۔ تیز قدموں سے سفیدے کی طرف بڑھا جس پر عام آدمی کے لئے چڑھنا غیر ممکن تھا۔

میں نے پشاوری چپل اُتار کر پائجامے میں اُڑسی، خنجر دانتوں میں دبایا اور بندر کی سی پھرتی سے سفیدے پر چڑھنے لگا۔ چونکہ سفیدے کا تنا ملائم ہوتا ہے اور اس پر شاخیں بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں، اس لئے اس پر چڑھنا عام درختوں کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میرا بازو بار بار دُکھ رہا تھا مگر تابِ ضبط آزماتا ہوا بالکونی کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک موٹی شاخ بالکونی کی طرف چلی گئی تھی جسے آری کی مدد سے کاٹ کر ٹنڈ بنا دیا گیا تھا۔ میں شاخ کے کٹے ہوئے حصے پر کھڑا ہوا اور مشاقانہ انداز میں اچھل کر بالکونی کے فرش پر کود گیا۔ اگر میں کودنے میں خفیف سی غلطی بھی کرتا تو میری کمر چوبی ریلنگ پر لگتی اور میں قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر آن گرتا۔ بعید نہ ہوتا کہ میرا ریڑھ کی ہڈی کا کوئی مہرہ ٹوٹ جاتا۔

بالکونی کا بلب بجھا ہوا تھا مگر متصلہ بڑے سے ہال میں قمقمے روشن تھے جن کی روشنی بڑے دروازے کے شیشوں سے چھن کر بالکونی میں پڑ رہی تھی۔ میں نے دروازے کی دھندلے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ منظر دھندلا تھا مگر اتنا پتہ چل گیا کہ ہال میں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ دروازہ حسبِ معمول غیر مقفل تھا۔ مجھے یاد تھا کہ وہ کھلتے وقت زور کی آواز نکالتا تھا۔ تبھی میں نے نہایت آہستگی سے اُسے اتنا دھکیلا کہ میرے داخل ہونے کا راستہ بن گیا۔ رات کے سناٹے میں اس کی نہایت کم بلند آواز بھی دور تک گئی تھی جو میرے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس کشادہ ہال کی تینوں دیواروں کے ساتھ قطار کی صورت میں صوفے پڑے تھے جن کے آگے شیشے کی نفیس میزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ عین درمیان میں ایک لمبی ڈائننگ ٹیبل موجود تھی جس کے چاروں اطراف کھڑی پشت والی کرسیاں پڑی تھیں۔ جب تک میں نے میڈم شکیلہ کی کوٹھی کا کچھ حصہ نہیں دیکھا تھا، تب تک مجھے یہ حویلی طلسم خانہ معلوم ہوا کرتی تھی۔

جدید وضع کے بڑے فانوس کے نیچے کھڑے ہو کر میں اپنا جائزہ لیا۔ میرا سفید لباس خون

کے بڑے چھوٹے دھبوں سے بھر گیا تھا۔ بازو اور پنڈلی سے چپکے ہوئے کپڑے میں کتوں کے دانتوں کے سوراخ بن گئے تھے جن سے خون ابھی تک رس رہا تھا۔ میں نے ایک جالی دار میز پوش کھینچا۔ لمبائی کے رُخ اس کے دو برابر حصوں میں پھاڑا۔ ایک پنڈلی پر، دوسرا بازو پر کس کے باندھ دیا جس سے خون بہنا بند ہو گیا اور درد میں بھی افاقہ ہو گیا۔

بل ٹیر رکتوں کے دانت بہت نوکیلے اور جبڑے طاقت ور ہوتے ہیں۔ چونکہ میرا اور کھالے کا اس نسل کے کتوں سے پرانا واسطہ تھا، اس لئے میں نہ صرف ان کو مارنے میں کامیاب ہو گیا تھا بلکہ متوقع زخموں سے بھی بچ گیا تھا مگر ویکسین لگوانے کا عذاب بھگتنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اگر سانپ اور کتے کے سامنے اپنے حواس بحال رکھ لئے جائیں تو ان کے حملے سے باآسانی بچا جا سکتا ہے۔ ان دونوں خطرناک جانوروں کا تعلق دیہات سے ہے، اس لئے شہریوں کی نسبت دیہاتی لوگ ان کا شایانِ شان طریقہ سے سواگت کر سکتے ہیں۔

از حد خنکی کے بہ جزو، حویلی پر چھایا ہوا غیر معمولی سکوت مجھے پریشان کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ مجھ سے اندازے کی غلطی ہو گئی تھی اور میں رائیگاں مسافتوں چل نکلا تھا۔ لگتا تھا کہ یارن خان سمیت یہاں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ میں کھالے کے ساتھ جب بھی اس حویلی میں داخل ہوا، اسی مخصوص سکوت اور سیلن سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ ایک طرح سے آسیبی محل معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ہال سے نکل کر یوشکل کے برآمدے کا کڑی نظروں سے جائزہ لیا۔ برآمدہ خالی تھے اور سبھی کمروں کے دروازے بند تھے۔ کمروں کی بتیاں بھی گل تھیں۔ میں دوسرے کونے تک چلا گیا۔ پھر سیڑھیاں اُتر کر گراؤنڈ فلور پر آیا اور ایک ایک دروازہ کھول کر دیکھنے لگا۔ تیسرا کمرہ آباد تھا۔ یہ سولہ ضرب پچیس کا جہازی سائز کا کمرہ تھا۔ تین چارپائیوں پر دیہاتی طرز کے بستروں میں ملازم دبک کر خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میں نے چارپائیوں کے نیچے پڑے جوتوں، دیواروں پر لٹکتے ہوئے کپڑوں اور دکھائی دینے والے سامان سے ان کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ نوکر تھے۔ چونکہ وہ تعداد میں تین تھے، اس لئے میں ان میں سے کسی ایک کو جگانے اور اس سے معلومات حاصل کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

چند منٹوں میں ہی میں نے پوری حویلی کھنگال ڈالی مگر یارن خان سمیت کوئی بھی نہ ملا۔ سخت حیرت اور مایوسی کے عالم میں بڑے دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے

شیشوں کے پار، گیٹ وے اور پارکنگ کے سنگم پر خان کی کالے شیشوں والی فوروہیل جیپ کے قریب گہرے رنگ کا لباس پہنے ایک گن مین کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے اپنی گن گھٹنے سے ٹکا رکھی تھی اور گولیوں کا پٹہ مخصوص دیہاتی انداز میں کمر اور کاندھے پر ڈال رکھا تھا۔ اس کے غیر معمولی اطمینان پر حیرت ہوئی۔ اُسے حویلی میں کسی گڑبڑ کا شبہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کتوں کی ہلاکت اس کے نوٹس میں آئی تھی۔

گومگو کی حالت میں پلٹ کر ایک بڑے کمرے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آرائش دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ یہ کمرہ یارن خان کے زیر استعمال تھا۔ باقی تمام کمروں کی حالت میں کوئی تغیر دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔

اس غیر معمولی بڑے اور قالین یافتہ کمرے کے عین وسط میں نہایت آرام دہ بیڈ پڑا تھا۔ دوسرے فرنیچر کی خوب صورتی پر بھی کوئی کلام نہیں تھا۔ دل ہی دل میں یارن خان کے ذوق کی داد دیتا ہوا دراز یں کھول کر دیکھنے لگا۔ ماسوائے چند ذاتی استعمال کی اشیاء اور وارڈ روب میں سلیقے سے ہینگروں میں لٹکتے ہوئے ملبوسات کے، کچھ ہاتھ نہ لگا۔ ایک الماری میں کاغذات کے پلندے اور فائلیں ترتیب سے رکھی گئی تھیں۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ایک اڑتالیس بور کا ولائتی پسٹل بھی پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں چمک اُٹھیں۔ جونہی میں نے اس کی میگزین دیکھی، منہ بسور کر رہ گیا۔ میگزین خالی تھی۔ میں نے پسٹل دراز میں رکھ دیا۔

مایوسانہ انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ میں نے یارن خان کی گاڑی تین چار مرتبہ آتی جاتی دیکھی تھی۔ میری دانست میں وہ حویلی کے اندر تھا۔ تلاشی کا ناکام عمل سمجھا چکا تھا کہ وہ یہاں نہیں تھا۔ کہیں اور شب بسری کر رہا تھا۔ فوری طور پر ذہن میں خیال اُبھرا کہ وہ اپنے اُسی نامعلوم ٹھکانے پر گیا ہوگا جہاں اس نے سیمو اور اماں کو رکھا ہوگا۔ از خود، سرنفی میں ہلا کر میں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ اسے بوڑھی عورت اور بچے کی رات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟..... کچھ بھی تو نہیں۔ پھر؟ وہ کہاں گیا ہوگا؟..... ذہن بری طرح الجھ گیا۔ وہ لاہور سے اپنے ہمراہ چار پانچ نوکر لایا کرتا تھا۔ یہاں کے مقامی ملازم بدستور حویلی کی دیکھ بھال پر فائز رہتے تھے۔ یعنی خان سمیت کم و بیش سات آٹھ افراد کو اس وقت یہاں موجود ہونا چاہیے تھا جن میں سے چار دکھائی دیے تھے۔ باقی کہاں تھے؟ تین خوابیدہ، ایک کاہل پہرے دار.....

میری چھٹی حس ذہن میں کچوکے لگانے لگی۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ اپنا غیر عنوان احساس جگانے لگی تھی۔ بے اختیار کمرے سے باہر نکلا۔ اچانک ذہن میں تہہ خانے کا خیال ابھرا۔ بعید نہ تھا کہ حویلی میں تہہ خانہ یا خفیہ کمرے واقع ہوں جن تک میری رسائی نہ ہوئی ہو۔ اس امکان کو مدنظر رکھ کر میں نے ایک مرتبہ پھر حویلی کا جائزہ لیا مگر کوئی کلیو نہ ملا۔ مایوس ہو کر فرسٹ فلور پر جانے کے ارادے سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے قدموں کی موہوم سی چاپ سنائی دی۔ کوئی تھا مگر کس طرف؟ یہ اندازہ نہ ہو سکا۔ میں لپک کر سیڑھیوں کے قریبی ستون کے ساتھ چپک گیا۔ کان لگا کر آہٹ کی سمت کا تعین کرنے کے بعد بائیں ہاتھ گیلری پر نظریں مرتکز کر دی۔ تعجب کی بات تھی کہ میں اس طرف والے سبھی کمروں کو خالی دیکھ چکا تھا۔

اچانک درمیان والے اسٹور ٹائپ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا۔ وہ سیاہ رنگ کی پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھا اور سیدھا میری جانب آ رہا تھا۔ میں جس ستون کے پیچھے چھپا تھا، وہ اتنا موٹا نہیں تھا کہ مجھے پوری طرح چھپا لیتا اس لئے میرا دیکھ لیا جانا حتمی تھا۔ تبھی وہ سیڑھیوں کی طرف مڑتے ہوئے رُک گیا کر میری جانب پلٹا۔ اسی وقت مجھے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا لمبی نال والا خوفناک پستول نظر آیا اور میری سانسیں رکنے لگیں۔

وہ ایک قدم بڑھ کر رُکا، پھر بجلی کی سی تیزی سے اچھل کر دیوار کی اوٹ میں چلا گیا۔ چونکہ میں اس کے نشانے کی زد میں نہیں تھا، اس لئے غراتی ہوئی آواز میں بولا، ''کون ہو تم؟''

میں نے اپنے وجود کو مزید سمیٹنے کی کوشش کی۔

جواب نہ پا کر اس کا لہجہ مزید درشت ہو گیا، ''ہاتھ اُٹھا کر سامنے آ جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔''

وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر مجھے اس کی جائے موجودگی کا علم تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ میں اس پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ خوف بھی لاحق تھا کہ وہ کسی کو آواز دے کر بلا نہ لے۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کرتے ہوئے دائیں ہاتھ جست بھری اور بجلی کی سی تیزی سے اگلے ستون کے پیچھے پہنچ گیا۔ اسے فائر کی مہلت نہ ملی۔ چیخ کر ٹھیٹھ پنجابی میں بولا، ''رک جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔''

ہم دونوں کی پوزیشن ایک سی تھی۔ اس کے پاس پسٹل تھا مگر میں نشانے کی زد میں نہیں تھا۔ اس خوف کی بدولت سامنے نہیں آتا تھا کہ میں اسے فائر نہ کر دوں۔ چوروں کی طرح حویلی میں آنے والے کا خالی ہاتھ ہونا بعید از قیاس تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے گیلری میں جھانکا۔ سیڑھیوں کے پرے چھت میں نصب بلب نے اس کے سر کا سایہ دیوار پر بنایا۔ میں نے دبی

آواز میں کہا، ''ہمت ہے تو سامنے آؤ، وار کرو۔ یوں چھپ کر دھمکیاں دینے والے بزدل ہوتے ہیں۔''

وہ نادان نہیں تھا کہ میرے جوش دلانے پر کمین گاہ سے نکل آتا۔ بولا، ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میں نے کہا، ''یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔''

اس نے جواباً گالی دی۔ وہ دیوار سے پشت ٹکائے کھڑا تھا۔ دیوار پر وقفے وقفے سے نظر آنے والا سایہ اس کی بے چینی کی خبر دے رہا تھا۔ جونہی سایہ اوجھل ہوا، میں نے اگلے ستون کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس نے بھی شاید اپنی پوزیشن بدلنے کی ٹھانی تھی کیونکہ اس نے پھر نہیں جھانکا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر نہ چلا جائے۔ وہاں سے وہ مجھے باآسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ یوشکل کی بالائی منزل کے برعکس فرشی منزل زیروشکل میں تعمیر کی گئی تھی۔ ایک دروازہ عقب میں کھلتا تھا جبکہ اگلی جانب مین گیٹ تھا جس کے باہر گن مین بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے یقیناً میرا اور لمبے تڑنگے نووارد کا باہمی مکالمہ سن لیا ہوگا اور چاق چوبند ہو بیٹھا ہوگا۔ میں ادھر کا رُخ کر کے اس کی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا جبکہ عقبی دروازے یا بالائی منزل پر جانے کے لئے اسی گیلری سے گزرنا پڑتا تھا جس میں پستول بردار دشمن چھپا ہوا تھا۔

ایک خیال برقی کوندے کی طرح ذہن میں لپکا کہ اس حویلی کے نیچے کوئی تہہ خانہ واقع تھا جس میں سے نکل کر وہ گیلری میں آیا تھا۔ وہ کسی ضرورت کے تحت نکلا تھا یا میری سن گن پر آیا تھا، سرِدست یہ تخصیص نہیں کی جا سکتی تھی۔

چند لمحوں میں تین چار ستون عبور کر کے برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ میری حالت اس پرندے کی سی تھی جو اپنی حماقت کی وجہ سے پنجرے میں پھنس جاتا ہے۔ میں نے ایک ذرا ٹھہر کر اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا، لمبی لمبی سانسیں لیں اور خود پر قابو پانے کی کامیاب کوشش کی۔ اس نامساعد کیفیت میں پاؤں گرم اور سر ٹھنڈا رکھنے میں زندگی کا راز مضمر تھا۔

پستول بردار کی تیز چیختی آواز بالائی منزل سے حویلی کے سناٹے کا قلب چیر گئی، ''اوئے گن مین! دروازہ کھول کر اندر آ..... کوئی چور اُچکا نیچے چھپا ہوا ہے۔''

میں نے اوپر دیکھا۔ وہ دکھائی نہیں دیا۔ بائیں ہاتھ گیلری سے گن مین نمودار ہونے والا تھا

جو اندر داخل ہوتے ہی مجھے دیکھ لیتا اور فائر کر دیتا۔ ستون سے ہٹ کر اس کے استقبال کے لئے نئی پوزیشن لیتا تو پستول بردار کی گولی کا شکار ہو جاتا۔ ایسے ہی وقت میں بیرونی دروازہ کھلنے سے پیدا ہونے والی تیز چرچراہٹ کانوں میں پڑی۔ میرے اعصاب یکبارگی تن گئے۔ میں نے گیٹ اور برآمدے کے فاصلے، قدموں کی چاپ اور گیٹ کھلنے کی آواز کو ذہن میں سجا کر اس کے نمودار ہونے کے لمحے کا تعین کیا، سانس روکی اور لمبی جست بھرنے کے لئے خود کو تیار کر لیا۔ میرا اندازہ قابلِ فخر تھا کہ جونہی اس نے برآمدے میں قدم رکھا، میں اس پر پل پڑا۔ اسے گن سیدھی کرنے اور فائر کرنے کی مہلت نہ ملی اور میرے بازو کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد حائل ہو گیا۔ خنجر کی نوک اس کے پہلو سے لگ گئی۔ غرایا، ''خبردار! کوئی حرکت کی تو گردن کی ہڈی توڑ دوں گا۔''

ساتھ ہی میں نے خنجر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور بھنچی آواز میں بولا، ''تم کون ہو؟''

وہ مجھے پہچان نہیں سکتا تھا مگر میں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ وہ مولا داد عرف داد و مہانہ تھا جس کا پورا خاندان سردار حیات خان کی حویلی اور ہسپتال کے درمیان کچے گھروں میں رہائش پذیر تھا۔ وہ لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کیوں بڑے خان نے اُسے گن مین بنا کر حویلی کے باہر تعینات کر رکھا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا، ''گن پھینک دو۔''

اس کی گرفت گن پر ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے فرش پر گرنے والی گن کو پاؤں کی مدد سے اپنی جانب کھینچا۔ ایسے ہی وقت میں حویلی کے در و دیوار فائر کی خوفناک آواز سے لرز اُٹھے۔ مجھے فی الفور سمجھ نہ آئی کہ فائر کس پر کیا گیا تھا مگر دوسری گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی پہلو سے نکل گئی۔ تیز جلن ہوئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ فائر کی آواز سے عیاں تھا کہ گولی پستول سے نہیں، کسی گن سے چلائی گئی تھی۔ گولی چلانے والے کے نزدیک شاید داد و مہانے کی کوئی اہمیت نہیں تھی تبھی اس نے فائر کرتے ہوئے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ میں نے گن اُٹھانے میں وقت ضائع نہ کیا اور داد و کو دھکیلتا ہوا ایک مرتبہ پھر ستون کی اوٹ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ سرگوشی کے سے انداز میں اسے دھمکی دی کہ اگر وہ ایسی ویسی حرکت کرے گا تو دونوں طرف سے آنے والی موت اسے گلے لگا لے گی۔ بالائی منزل سے ستون پر دو تین فائر ہوئے۔ خوش بختی سے ہم

دونوں محفوظ رہے وگرنہ ستون کی چوڑائی ناکافی ہونے کے سبب ہمارے جسموں کے کچھ حصے باہر جھلک رہے تھے۔

دادو میرے شکنجے میں بری طرح پھنسا ہوا تھا مگر جونہی میری توجہ فائرنگ پر مبذول ہوئی، اُس نے نہ صرف ناقابلِ بیاں پھرتی سے پینترا بدلا بلکہ میرا خنجر والا ہاتھ بھی کلائی سے تھام لیا۔ میرے سنبھلنے سے پیشتر اس نے کہنی پوری قوت سے میرے پہلو میں ماری۔ ضرب شدید تھی۔ میں 'اوہ' کی آواز نکال کر بے اختیار جھکا۔

دادو مہانہ حلق کے بل چیخا، ''گولی نہ چلاؤ صاحب! میں نے چور کو قابو کر لیا ہے۔''

میں نے جھکتے ہی بجلی کی سی سرعت سے مکا اس کی ٹانگوں کے بیچ مارا، ساتھ خنجر والے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی اور وہ کمر کے بل ستون سے ٹکرا کر فرش پر گر گیا۔ اس نے میری کلائی مکا لگتے ہی چھوڑ دی تھی۔ میں ستون کی اوٹ میں رہتا ہوا اچھل کر اُس پر کودا۔ میرے دونوں گھٹنے اس کے کندھوں پر لگے۔ جونہی میرے قدم زمین کو چھوئے، میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنا وار دہرانا چاہتا تھا مگر وہ بے آب ماہی کی طرح تڑپتا ہوا ستون سے کئی فٹ دور فرش پر پھسل گیا۔ میں نے خود کو بدقت اس کے پیچھے جانے سے روکا ورنہ گولی کا نشانہ بن جاتا۔ وہ تادیر نہیں اُٹھا، نہ ہلا جلا؛ یوں جیسے بے ہوش ہو گیا ہو۔ یہ بھی غنیمت تھا وگرنہ اس کی گن اس سے کچھ ہی فاصلے پر پڑی تھی جسے اُٹھا کر مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔

حویلی کا سکوت جیسے پھر لوٹ آیا تھا۔ فائرنگ کی آواز نور پور کے گھر گھر تک پہنچی تھی مگر حسبِ روایت کسی میں حویلی کی طرف آنے کی جرأت نہیں تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لمبا تڑنگا پستول والا اور نادیدہ گن بردار فائرنگ روک کر مجھ پر قابو پانے کی کس ترکیب پر عمل پیرا ہو گئے تھے۔ پیا جی نے مجھے سمجھایا تھا کہ یک لحاتی فیصلہ اور اس پر جان و تن سے فوری عمل زندگی کی طرف لوٹاتا ہے۔ کشمکش موت کی طرف دھکیلتی ہے۔ میں نے پیا کی نصیحت پر عمل کیا اور دیوانہ وار دوڑ پڑا۔ دادو مہانے کے بے حس و حرکت جسم کو پھلانگتا ہوا گیلری میں گھس گیا۔ مجھ پر خلاف توقع فائر نہیں ہوا۔ بھاگتے ہوئے جھک کر دادو مہانے کی ڈبل بیرل گن کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ ایک پل کو ہاتھ جما مگر فوراً پھسل گیا۔ میں نے رکنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور لمبی زقند بھر کر کھلا ہوا مین گیٹ عبور کر گیا۔

میں اس آسیبی جنگلے سے نکل آیا تھا جس میں اپنی حماقت کے سبب جا پھنسا تھا۔ سیڑھیاں

اُترتے ہی میں دائیں ہاتھ مڑا اور عمارت کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا گیا۔ نکڑ پر ایک لمحے کو رُک کر پلٹا، دیکھا، میدان صاف تھا مگر زیادہ دیر صاف رہنے والا نہیں تھا۔ عمارت کی جڑ میں بنے ہوئے کنکریٹ کے دو اڑھائی فٹ چوڑے راستے پر دوڑتا ہوا حویلی کے عقب میں آ گیا۔ اب میرے سامنے وہی کیاریاں تھیں جن میں سے ایک کیاری میں مجھ پر کتوں نے خوفناک حملہ کیا تھا۔ میں بوتل برش کے ایک کم بلند درخت کے نیچے سانس لینے کو رُکا۔ درخت کے نیچے دو جھاڑی دار مور پنکھ دیکھے تو ان کے بیچ دُبک گیا۔ اب میں فوری طور پر کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں نور پور کی مسجد کے اسپیکرز 'شوں، شوں' کی آواز نکالتے ہوئے بیدار ہو گئے۔ پھر بہ زبانِ ملّا ہنگامی اعلان ہونے لگا کہ سردار یارن خان کی حویلی کی جانب سے فائرنگ کی آواز سنی گئی ہے۔ لوگ اپنے ہتھیار سنبھال کر گھروں سے باہر نکل آئیں تاکہ ڈاکوؤں کو گھیرا جا سکے۔ میرے لئے ایک اور مصیبت کھڑی ہونے والی تھی۔ میں شہریار نظر آتا تو بپھرے ہوئے نور پوریوں سے بچ سکتا تھا مگر گلاب خان دکھائی دیتا تھا۔ اگر ہتھیاروں سے لیس لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ آناً فاناً میرا بھرکس نکال دیتے۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ فضا پر جوش نعروں اور ہوائی فائرنگ سے گونجنے لگی۔ میں حویلی کے اندر غیر محفوظ تھا تو باہر موت میری منتظر تھی۔

ایسے ہی وقت میں کنکریٹ کے پٹی نما راستے پر بھاری بوٹوں کی آواز ابھری۔ میرے پیچھے آنے والا اکیلا تھا۔ وہ حویلی کی نکڑ سے برآمد ہوا تو پتہ چلا کہ میرے تعاقب میں وہی لمبا تڑنگا پستول بردار تھا جو گیلری سے نکل کر میرے پیچھے لگا تھا۔ میرے اعصاب میں بجلی سی بھر گئی۔ جونہی وہ بوتل برش کے درخت تلے پہنچا، میں نے اس پر چھلانگ لگانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ وہ چوکس تو تھا مگر مار کھا گیا اور میرا قوی دھکا کھا کر بری طرح دیوار سے ٹکرایا۔

اس کے سنبھلنے سے قبل ہی میں نے خنجر والا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ چاہا کہ اس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دوں مگر وہ بلی کی سی تیزی سے دیوار کے ساتھ کروٹ بدل کر پَرے ہٹ گیا۔ خنجر ٹیپ دار دیوار سے ٹکرایا۔ ہاتھ کو چوٹ لگی۔ عین اسی لمحے مقابل نے منہ سے 'ہے' کی لمبی آواز نکالی، ایک ٹانگ پر اُچھلا اور اس کے ہوا میں اُڑتے ہوئے پیر کی زوردار ضرب میرے ہاتھ پر پڑی۔ یوں لگا جیسے میرے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ خنجر ہاتھ سے چھوٹ کر اُڑتا ہوا مور پنکھوں میں جا گرا۔ میں بے ساختہ ہاتھ تھام کر دوہرا ہوا۔ اس کا زوردار مکا میری کمر پر لگا۔ اس کا بدن

فولادی تھا؛ ضربیں کاری۔ وہ پستول میری کنپٹی پر مارنا چاہتا تھا جب میں اچانک اس کی جانب جھکا، اپنا کندھا اس کی دونوں ٹانگوں کے بیچ ڈالا اور بدن کی تمام تر طاقت بروئے کار لاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ میرے کندھے کی ضرب اور ہوا میں اُٹھ کر زمین پر گرنے کے غیر متوقع عمل نے اسے بوکھلاہٹ کا شکار کر دیا۔ اس کی انگلی کا دباؤ از خود ٹرائیگر پر بڑھ گیا اور گولی چل گئی۔ گولی دیوار پر لگی۔ اینٹ کے چند ننھے ننھے ٹکڑے اُڑ کر میرے چہرے پر لگے۔

وہ بہت طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ دلیر تھا۔ اسے مہلت دینا موت کو دعوت دینا تھی۔ اس لئے میں نے لمحہ بھر میں چھلانگ لگائی اور دونوں پیر جوڑ کر اس کے سینے پر مارے۔ 'آہ' کی بے ساختہ آواز اس کے حلق سے نکلی۔ میں نے اس کے سینے پر رہتے ہوئے پستول کی نال پر ہاتھ ڈال دیا۔ نال خاصی لمبی اور گرم تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ میری کمر کے نیچے رکھا اور زوردار دھکا دیا۔ میں توازن برقرار نہ رکھ پاتے ہوئے فرش پر گرا۔ اتفاق سے میرا گھٹنا پستول پر لگا۔ چوٹ آئی۔ زخمی پنڈلی دکھ گئی۔ اس کا ہاتھ بھی پستول اور فرش میں پس گیا تبھی سسکی لے کر مچلا اور اس نے اپنا ایک گھٹنا میری کمر میں رسید کیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا۔ چودہ طبق روشن ہو گئے مگر میں نے فوراً پہلو بدلا۔ پیروں کے بل دو تین فٹ اوپر اچھلا اور 'دھپ' سے پستول پر کود گیا۔ وہ پستول کھینچنا ہی چاہ رہا تھا کہ افتاد پڑ گئی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی تیز سسکی نے باور کرا دیا کہ اس کے ہاتھ کی دو چار ہڈیاں ضرور ٹوٹ گئی ہوں گی۔ تڑپ کر اُٹھا اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ پستول اس کی گرفت سے نکل گیا تھا۔

اس نے مجھے بانہوں میں جکڑ کر زور سے بھینچا۔ فولادی گرفت کی بدولت میری سانس گھٹنے لگی۔ میں اپنے دونوں مکے اس کے دونوں جبڑوں پر مارے مگر اس کی گرفت مزید سخت ہو گئی۔ یوں لگا جیسے وہ بانہوں میں بھینچ کر میرا دل پھاڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ہاتھ جمائے۔ جب تک وہ سنبھلتا، میرا وار چل چکا تھا اور میری انگلیاں اس کی دونوں آنکھوں میں چبھ گئی تھی۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھا، مجھے چھوڑ کر ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے گھوم کر اُس کی گردن پر لات جمائی۔ وہ پہلو کے بل گر گیا۔ اس کے ہاتھ بدستور سختی سے آنکھوں پر چپکے ہوئے تھے۔ میں نے فی الفور پستول کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ دیوار کی جڑ کے ساتھ پڑا تھا۔ میں نے لپک کر اُٹھا لیا۔ تیزی سے اس کے عقب میں آیا اور گردن میں نال چبھوتے ہوئے سرد لہجے میں کہا، ''تمہارا کھیل ختم ہو گیا ہے پیارے!

اب کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کراہتا رہا۔ شاید میرے ہاتھ کچھ زیادہ زور سے پڑ گئے تھے۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ وہ سنبھل گیا، اپنی پوزیشن سمجھ گیا تو شکست خوردہ انداز میں بولا، ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کائیاں انداز میں اردگرد دیکھا۔ حویلی کے اندر خاموشی تھی۔ سامنے، سڑک کی طرف سے لوگوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اپنے لہجے کو مزید سنگین بناتے ہوئے کہا، ''یارن خان کہاں چھپا ہے؟''

وہ بھنچے بھنچے انداز میں بولا، ''وہ تو یہاں نہیں ہے۔ کہیں گیا ہوا ہے۔''

''کہاں؟'' میں نے پستول پر دباؤ بڑھایا۔

''پتہ نہیں..... شام کو گیا تھا۔'' اس کی آواز سے ظاہر تھا کہ اس نے شکست تسلیم کر لی تھی مگر میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہ مجھے غچہ دینے کے لئے یہ انداز اختیار کر سکتا تھا۔

میں غرایا، ''بکو مت؛ سچ بولو۔ کہاں ہے وہ؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا، ''تین تک گنوں گا پھر گھوڑا دبا دوں گا۔ ایک..... دو.....!''

اس نے جلدی سے کہا، ''وہ نیچے ہے؛ بیسمنٹ میں..... مگر تم کون ہو؟''

''تہہ خانے کا راستہ کدھر ہے؟'' میری آواز میں موت کی آمیزش گھل گئی۔

''اسٹور روم میں..... مگر تم راستہ کھول نہیں سکتے۔ کھول بھی لو تو بیسمنٹ سے زندہ باہر نہیں آ سکتے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

ایسے میں حویلی سے کسی نے سڑک پر اکٹھے ہونے والے لوگوں کو پکارا اور تحکمانہ انداز میں یارن خان کا حکم سنایا، ''بڑا خان کہتا ہے کہ تم لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ یہاں خیر سلا ہے۔ جاؤ، شاباش!'' بولنے والے نے اس اعلان کو دو مرتبہ دہرایا جس کے نتیجے میں ایسی آوازیں سنائیں دیں جن سے عیاں تھا کہ ہتھیار سنبھال کر حویلی کی طرف آنے والے تبصرے کرتے ہوئے واپس ہونے لگے تھے۔

میں نے اپنے شکار کو کالر سے پکڑ کر اُٹھایا، اس کی کمر میں بازو حمائل کیا، پستول کی نال ریڑھ کی ہڈی پر ٹکائی اور سخت لہجے میں کہا، ''چلو! مجھے حویلی کے اندر لے چلو۔ دیکھوں تو سہی،

بیسمنٹ میں ایسا کیا ہے جس سے ڈر رہے ہو۔ ہری اَپ..... کوئی مستی کرو گے تو گولی سیدھی ریڑھ کی ہڈی میں گھس جائے گی۔''

اگر اس کے ذہن میں مزاحمت کا کوئی خیال تھا بھی تو ہوا ہو گیا۔ پژمردگی سے بولا، ''میں سچ کہتا ہوں کہ ادھر مت جاؤ بلکہ اپنی جان بچاؤ اور حویلی سے نکل جاؤ۔ میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گا۔''

میں نے دانت پیسے، ''جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔ مشورے نہ دو۔''

ساتھ ہی اُسے دھکیلا۔ وہ طوعاً و کرہاً سست روی سے چل پڑا۔ میں نے ارادتاً متضاد راستہ چنا۔ چند قدم چلے ہوں گے کہ ایک بھاری مگر بھنچی بھنچی آواز کانوں میں پڑی، ''پرویز! فکر نہ کر، میں آ گیا ہوں۔ اوئے بے غیرت! یہیں رک جاؤ ورنہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔''

آواز اوپر سے آئی تھی۔ میری نظریں اُٹھیں۔ میں سفیدے کے درخت پر چڑھ کر جس بالکونی میں کودا تھا، اس کی چوبی ریلنگ پر سفیدے کے سائے میں ایک ہیولا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے برقی مستعدی سے پستول اوپر کیا، اپنے یرغمالی جسے اس کے ساتھی نے پرویز کہہ کر اپنی آمد کی خوش خبری سنائی تھی، کے کندھے پر سے تھوڑا اوپر نکالا اور فی الفور فائر کر دیا۔ میرا نشانہ خطا گیا تاہم دوسرا فائر نشانے پر لگا۔ ایک تیز چیخ سناٹا چیرتی ہوئی نور پور کی فضا میں چکرا کر تحلیل ہو گئی اور ہیولا غائب ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی اس کے پیٹ یا چھاتی میں لگی تھی۔

موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے پرویز نے میری گرفت سے نکلنا چاہا مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ وہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اپنے ساتھی کے انجام نے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی توڑ دیا تھا۔ اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ کر چلنے لگا۔ میں بطور احتیاط دیوار کے ساتھ لگ کر چل رہا تھا اور وقفے وقفے سے گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں عقب سے کوئی نہ آ جائے۔

میں نے پوچھا، ''حویلی میں کتنے آدمی ہیں؟''

وہ نیم مردنی اور بیزاری سے بولا، ''نو..... دسواں بڑا خان ہے۔''

میں نے دل میں حساب لگایا، ''تین ملازم، ایک گن مین داد و مہانہ جو بے ہوشی کا مکر کر کے فرش پر پڑا تھا، ایک بالکونی میں مر گیا تھا یا زخمی ہو چکا تھا جبکہ پرویز نامی غنڈہ میری دسترس میں تھا..... باقی بچے تین۔ دسواں یار خان.....''

ہم نکڑ عبور کرنے کے بعد، بمشکل نصف مسافت طے کر پائے تھے کہ اچانک پرویز رُک گیا۔ اس نے بغل دبائی۔ میرے حلق سے سسکی نکلی۔ میں نے اپنا زخمی بازو اس کی بغل کے نیچے سے نکال کر اپنا ہاتھ اس کی چھاتی پر رکھا ہوا تھا، وہ دکھ گیا تھا۔ غصے سے پستول کو جھٹکا دیا، کہا، ''کیوں رک گئے ہو؟ چلتے رہو ورنہ.....''

وہ چلنے کے بجائے میرا بازو جکڑ کر اچانک نیچے بیٹھ گیا جس سے مجھے زور کا جھٹکا لگا۔ میری ٹھوڑی اس کے سر سے ٹکرائی۔ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے اس کے اوپر سے سرک کر آگے کی جانب لڑھک گیا۔ اس نے کھڑے ہونے میں دیر نہیں کی اور مجھے اُٹھا کر نیچے پٹخ دیا۔ اس کم بخت کے بازوؤں میں بلا کی جان تھی۔ میں نے سود و زیاں کی پروا نہ کرتے ہوئے آنِ واحد میں اس کا نشانہ لیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ 'ٹرچ' کی مخصوص آواز کے سنتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پستول میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں اور میں اچانک خالی ہاتھ ہو گیا تھا۔ تبھی اس کی بے خوفی کا عقدہ کھلا۔ اس نے سنبھلتے ہی دل ہی دل میں اپنے پستول کی فائر ہونے والی گولیوں کا شمار کیا تھا اور بھانپ چکا تھا کہ میگزین میں کوئی گولی باقی نہیں بچی تھی۔

میں کنکریٹ کی دو اڑھائی فٹ چوڑی یخ بستہ پٹی پر چت پڑا تھا جبکہ وہ میرے قریب پہلوؤں پر ہاتھ رکھے فاتحانہ انداز میں کھڑا تھا۔ بولا، ''بڑے سورمے بنتے تھے۔ اب تمہارا کیا حشر ہوگا، یہ تم دیکھو گے، دنیا دیکھے گی۔''

اس نے زوردار ٹھوکر میری پنڈلی پر ماری۔ اتفاق سے اس کا بھاری بوٹ اس جگہ پر پڑا جہاں پر کتے کے کاٹے کا زخم تھا۔ میں بلبلایا۔ اس نے پے در پے کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ ہر ضرب پر میرے حلق سے کراہ نکلی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا بھاری پستول پوری قوت سے اسے دے مارا۔ اس نے جھکائی دے کر خود کو بچا لیا اور وحشیانہ انداز میں چیختا ہوا مجھ پر پل پڑا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ اس کی ٹھوکروں سے میرے جسم کا شاید ہی کوئی حصہ محفوظ رہا تھا۔ تب، جب وہ تھک گیا اور ہانپنے لگا، دو قدم پیچھے ہٹا، جھکا، پائنچہ اُٹھایا اور پنڈلی سے بندھے چرمی پٹے سے پتلے پھل والا لمبا خنجر کھینچ لیا۔ میں نے پہلو کے بل کروٹ بدلی اور اس سے تھوڑا دور ہو گیا۔ وہ خنجر سونت کر چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا میری طرف بڑھا۔ میرے اُٹھنے سے پیشتر میرے سر پر پہنچ گیا اور پہلو میں پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ خنجر والا ہاتھ ہوا میں اُٹھایا۔ اس کی آنکھوں کا ارتکاز میرے سینے پر دل کا مقام تھا۔

چاند کی مدھم روشنی میں وہ کسی ریچھ کی طرح دکھائی دیا۔ کسی بھی لمحے وہ میرے دل میں تیز خنجر اُتار سکتا تھا۔ میری اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے اٹکی ہوئی تھی اور خوف سے دل کی دھڑکن کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ ایسے ہی وقت میں ایک کم بلند مگر دردناک نسوانی چیخ میرے کانوں میں پڑی۔ ابھی پہلی چیخ کی بازگشت کانوں میں چکرا رہی تھی کہ دوسری چیخ سنائی دی۔ ہم دونوں چونکے۔ یوں لگا جیسے آواز کسی کنویں سے نکلی تھی۔

''مار ڈالو مجھے! ہائے!'' چیخنے والی نے چیخوں کے درمیان حلق پھاڑ کر کہا تھا۔ یوں لگا جیسے یہ آواز میری شناسا تھی۔ پھر میرا دل یکبارگی پوری قوت سے دھڑک کر گویا رُک گیا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہوا میں معلق تیز دھار خنجر کو دیکھنے لگا۔ مجھے بھول گیا کہ اس خنجر کے چمکدار پھل پر میرے دل کا خون لگنے والا تھا بلکہ میرے ذہن کی غلام گردشوں میں چیخ کی آواز گونجنے لگی تھی۔ میں اس آواز کو جنم جنم میں پہچاننے کی قدرت رکھتا تھا۔

میرے دل کی ہوک لبوں پر لفظ بن کر تھرتھرائی، ''اسما!''

یہ سمجھ نہ آئی کہ آواز کس طرف سے آئی تھی۔ چونکہ پرویز بھی میری طرح کہیں دور سے آتی ہوئی نسوانی چیخوں کی طرف متوجہ تھا، اس لئے میرے بڑبڑانے پر چونکا۔

میرے ذہن میں جھپاکا ہوا۔ اس کا خنجر کسی بھی پل میرے سینے میں پیوست ہونے والا تھا۔ مجھے فی الفور اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کرنا تھا۔ میں نے اپنے دُکھتے ہوئے جسم کی توانائیوں کو مجتمع کیا اور دونوں پیر جوڑ کر ہوا میں بلند کئے۔ ایک ہی وقت میں میرے پاؤں پرویز کے چہرے کی طرف بڑھے، اس کا ہاتھ بجلی کی تیزی سے نیچے آیا۔ ہم دونوں کے مونہوں سے سسکیاں نکلیں۔ میری ران میں تیز خنجر کی اچٹتی ہوئی نوک چبھی، اس کے منہ یا ناک پر میرے پاؤں بھاری گرز کی طرح لگے۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا جب کہ میں ران پر سختی سے ایک ہاتھ رکھ کر، دوسرا ہاتھ دیوار پر جما کر کھڑا ہو گیا۔

خانزادی اسما کی آواز سن کر میرے رگ و پے میں بجلی بھر گئی۔ میں نے چشم زدن میں اُٹھنے کی کوشش میں مصروف پرویز کے خنجر والے ہاتھ پر ٹھوکر ماری۔ اس کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ میں ہوا میں اُچھلا، گھوما اور ایک زوردار کک اس کی کنپٹی پر ماری۔ وہ پہلو کے بل گرا۔ تب معلوم ہوا کہ میرے جڑے ہوئے پیروں کی زوردار ضرب سے اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں ایک بار پھر اُچھلا اور گھٹنوں کے بل اس پر گرا۔ وہ میرے نیچے دب گیا۔ میں نے چند

سیکنڈوں میں کہنی کی خطرناک ضربوں سے اُسے پچھاڑ دیا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگانے کے انداز میں بیٹھ کر جھولنے لگا۔

میں نے لپک کر اس کا خنجر اُٹھایا۔ چاہا کہ بل ٹیر رکتوں کی طرح اُس کا زخرہ بھی کاٹ دوں؛ مگر فوراً خیال آیا کہ مجھے تہہ خانے میں داخل ہونے کے لئے اسے ڈھال بنانا تھا اور اس سے خفیہ راستہ کھلوانا تھا۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ میں تہہ خانے کا راستہ نہیں کھول پاؤں گا۔ اس کا دعویٰ آزمانے کے بجائے مان لینے میں ہی بہتری تھی۔

میں خنجر مضبوطی سے تھامے اس کے عین مقابل گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُسے گھورنے لگا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا تھا مگر پوری طرح اپنے حواس میں بھی نہیں تھا۔ ایسے ہی وقت میری نگاہ دیوار کی جڑ پر پڑی تو چونک گیا۔ بالشت بھر اونچی اور کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی جالی دار گرل دکھائی دی۔ میں نے اس پر نظریں جمائیں۔ میری دانست میں اُس گرل کی یہاں تنصیب کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اطراف دیکھا۔ اس جیسی کئی جالیاں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ حویلی کے تہہ خانے کے وینٹی لیٹر تھے۔ میں نے دل ہی دل میں بلڈنگ انجینئر کی ذہانت کو سراہا کہ اس نے جالیوں کی تنصیب اس انداز سے کی تھی کہ جب تک دیوار کی جڑ میں بیٹھا نہ جاتا، دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اسما کی مدھم سی آواز انہی جالیوں میں سے گزر کر میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ وہ زیرِ زمین تہہ خانے میں قید تھی۔ یہ عقدہ حل ہوا تو میرے حلق سے لمبی سانس برآمد ہوئی۔

پرویز کی سکت جواب دے گئی تھی اور وہ پہلو کے بل گر گیا تھا۔ میں دیوار کے قریب آیا۔ جھک کر ایک جالی سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تیرہ انچ چوڑی دیوار کے عین وسط میں فٹ کی گئی جالی کے پار کچھ دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ کان لگائے۔ اسما کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ وہ چیختے چیختے نڈھال، مایوس یا بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ کہیں میں نے آواز کو پہچاننے میں غلطی تو نہیں کی تھی؟..... از خود یقین سا ہوا کہ نہیں..... وہ یقینی طور پر خانزادی اسما ہی تھی۔ حیدر خان کی بیٹی جسے میں دوآبہ کے ویران علاقے میں رنگو قصائی کے حوالے کر آیا تھا۔

سردی، نقاہت اور دکھن مجھ پر سوار ہونے لگی تھیں۔ ایک بار جی میں آیا کہ میں پرویز کا ٹنٹا نکال دوں اور حویلی سے نکل جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ آج موقع ہے، کل یارن خان چوکنا ہوگا اور مجھے وار کرنے کا موقع نہیں دے گا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی گولیوں سے اُڑا دے گا۔

اس لئے مجھے جو بھی کرنا تھا، آج ہی کرنا تھا۔ تبھی میں نے زوردار تھپڑ پرویز کے جبڑے پر جڑا۔ پھر دوسرا، تیسرا..... تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا اور سر جھٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے لگا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور کھڑا کر دیا۔ وہ اپنے پیروں پر بدقت کھڑا ہوا۔ میں اس کے عقب میں آیا۔ پہلے کی طرح زخمی بازو اس کی بغل تلے سے نکال کر چھاتی پر رکھا، دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اس کی شہ رگ پر رکھا اور دبی آواز میں غرایا، ''بلا چوں چرا مجھے تہہ خانے میں لے چلو۔ یاد رکھنا؛ جہاں بھی خرمستی کرو گے، وہیں ذبح کر کے پھینک دوں گا۔''

وہ اڑیل گھوڑا بمشکل قابو میں آیا تھا۔ جان گیا تھا کہ اس کا واسطہ عام چور اُچکے سے نہیں پڑا تھا بلکہ رات کی تاریکی میں حویلی میں قدم رکھنے والا سیر پر سوا سیر تھا۔ تبھی اس نے شکست تسلیم کر لی اور بغیر کچھ کہے ڈگمگاتے قدموں سے چل پڑا۔

ہماری رفتار خاصی سست تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم مین گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ میری آنکھیں اردگرد بھٹک رہی تھیں۔ کسی چھپے ہوئے دشمن کا امکان ذہن میں تھا مگر حویلی پہلے کی طرح سکوت کی چادر اوڑھ چکی تھی۔ بیرونی گیٹ کے پار سڑک پر کوئی موجود نہیں تھا۔ اعلان سن کر دوڑے چلے آنے والے یارن خان کا حکم سن کر لوٹ گئے تھے۔ حویلی کا بڑا دروازہ بدستور کھلا ہوا تھا۔ دادو مہانے کو فرش پر اسی انداز میں لیٹے دیکھا تو میں رُک گیا۔ ناچار پرویز بھی رک گیا۔ میں نے اس کی بے پناہ پھرتی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی بغل سے ہاتھ نکالا، پیر اور ہاتھ کی مدد سے، جھکے بغیر، دادو مہانے کی ڈبل بیرل گن اُٹھائی اور کندھے پر ڈال لی۔ ہاتھ دوبارہ پرویز کی چھاتی پر رکھ لیا اور اردگرد دیکھتے ہوئے پوچھا، ''تہہ خانے میں خان کیا کر رہا ہے؟''

وہ خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولا، ''علم نہیں۔''

''وہاں موجود دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' میرا لہجہ بے حد سفاک ہو گیا۔

''ہم سب خان کے باڈی گارڈ ہیں۔ وہ سوتا ہے، ہم جاگتے ہیں۔'' اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی، ''تم کون ہو؟ کیا یارن خان کے دشمن ہو؟''

اس کا سوال احمقانہ تھا۔ اگر میں خان کا دشمن نہیں تھا تو اتنی مارا ماری کیوں کر رہا تھا۔ میں اُسے دھکیلتا ہوا اسٹور روم کی طرف بڑھا۔

وہ بولا، ''تم تہہ خانے سے زندہ باہر نہیں نکل سکو گے۔ اس لیے وہاں جانے کا خیال دل سے نکال دو اور فوری طور پر یہاں سے جان بچا کر نکل جاؤ۔''

''یہ مشورہ تم پہلے بھی دے چکے ہو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا، ''تہہ خانے میں باڈی گارڈز کے علاوہ کتنے لوگ ہیں؟''

''میں نے ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔'' اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ اُسے سنبھال کر چلنا میرے لئے بتدریج مشکل ہوتا جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اسٹور روم میں پہنچنے سے پیشتر ہی بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ اس کی ناک سے خون بہت زیادہ مقدار میں بہہ گیا تھا۔ میری حالت اس سے کسی طرح بھی بہتر نہیں تھی مگر مجھ پر عجیب سا جنوں سوار تھا جو مجھے آگے کی طرف دھکیل رہا تھا۔

سوئے ہوئے ملازمین والا کمرہ بدستور بند تھا۔ وہ چونکہ عام گھریلو نوکر تھے، اس لئے انہوں نے ڈر کے مارے رضائیوں سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی ہوگی۔ وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے سر پر آنے والے خطرے کو ٹال چکے تھے۔

میں پرویز کو دھکیلتا ہوا اسٹور میں داخل ہوا۔ یہاں پہلے بھی آیا تھا۔ کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر مجھے پرویز کا پر اعتماد جواب یاد آ گیا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے حواس کھو رہا تھا۔ نقاہت کے مارے گردن اِدھر اُدھر ڈھلک رہی تھی۔ میں نے گردن پر خنجر کا معمولی سا دباؤ بڑھایا، کہا، ''تہہ خانے کا دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔''

وہ کاٹھ کباڑ سے گزر کر کمرے کے عین وسط میں رُکا۔ میز کے اوپر پڑی ہوئی پرانی میز کے پائے کو تھام کر خود کلامی کے سے انداز میں بولا، ''مجھے چکر آ رہے ہیں۔''

میں نے درشتی سے کہا، ''اوئے حرامزادے! چکر آ رہے ہیں یا مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ دروازہ کھولو ورنہ تمہاری گردن کاٹ کر پھینک دوں گا۔''

اس پر میری دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اچانک اس نے اپنا وزن مجھ پر ڈال دیا۔ میں چونکہ ہوشیار تھا، اس لئے اس کے بے جان وجود کو سنبھال گیا۔ اس کی گردن کندھے پر ڈھلک گئی اور نہایت کم بلند آواز میں بڑبڑانے لگا۔ کیا کہہ رہا تھا، یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنا بازو نکالا، اُسے گھما کر میز کے سہارے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ریت کی طرح فرش کی طرف سرک گیا۔ میں نے بروقت اس کی گردن پر سے خنجر ہٹا لیا ورنہ وہ جس طرح لڑھکا تھا، اس کی گردن یقینی طور پر کٹ جاتی۔

اس کی اَدھ کھلی آنکھیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ میں نے

ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا، ''ادھر..... وہ بورڈ.....''

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ہونٹ نیم وا ہو گئے۔ وہ چند لمحوں کیلئے سنبھلا تھا، پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے بازو میں چبھوئی۔ پھر ران میں دو تین چر کے لگائے مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ مجبوراً اُسے وہیں چھوڑا اور اُچھل کر عقبی دیوار میں نصب بجلی کے سوئچ بورڈ کی طرف گیا جس پر اس کی ادھ کھلی آنکھیں مرتکز ہوئی تھیں۔ وہ عام نوعیت کا بجلی کا سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے اس پر لگے ہوئے پانچوں بٹنوں کو یکے بعد دیگرے دبا کر دیکھا۔ کچھ نہ ہوا۔ پھر لکڑی اور فارمیکا کے بنے ہوئے بورڈ کو پکڑ کر ہلایا جلایا مگر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

میں نے غیر معمولی تیز رفتاری سے اسٹور کی تمام دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ کہیں کوئی درز، دراڑ یا چور سوئچ دکھائی نہیں دیا۔ وہ کم بخت مجھے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی ڈاج دے گیا تھا۔ مجھے سخت غصہ آیا اور جی چاہا کہ اس کے سینے میں خنجر کا پورا پھل اُتار دوں مگر خود پر قابو پاتے ہوئے اسے جگانے کے بارے سوچنے لگا۔ باہر سے کسی کے آنے کا راستہ روکنے کے لئے میں نے اسٹور کے اکلوتے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور فرش پر آڑے ترچھے پڑے ہوئے پرویز کے پاس پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ جونہی پنڈلی کے اعصاب کھنچے، درد کی تیز لہر پورے بدن میں پھر گئی۔ منہ سے ہلکی سی 'آہ' نکل گئی۔

اس بارہ بائی چودہ کے مختصر کمرے کی چاروں دیواریں اسپاٹ تھیں جنہیں میں نے تھپتھپا کر دیکھا تھا۔ کوئی دیوار کھوکھلی نہیں تھی۔ سبھی اینٹوں کی بنی ہوئی پلستر شدہ دیواریں تھی۔ فرش پر بکھرے ہوئے بے ترتیب سامان کے عین درمیان میں راستہ سا بنا ہوا تھا جس میں پرویز پڑا تھا۔ یہ راستہ سیدھا بورڈ تک جاتا تھا۔ میں نے ذہن دوڑایا۔ سوچا، بورڈ تک سامان کے بیچوں بیچ گزرگاہ بنانا بے مقصد نہیں تھا۔ پرویز نے درست کہا تھا۔ بورڈ ہی کلید تھی جس کا میکنزم میری فہم سے بالاتر ثابت ہوا تھا۔ میں اُٹھ کر دوبارہ سوئچ بورڈ سے زور آزمائی کرنے لگا۔ جونہی میں نے دونوں ہاتھوں سے بورڈ کو پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچا، وہ 'ٹک' کی آواز کے ساتھ دیوار پر آدھا انچ نیچے کھسک آیا۔ میں نے تینوں اطراف گردن گھمائی مگر کوئی تغیر دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے کئی مرتبہ بورڈ کو اوپر نیچے کیا مگر کام نہ بنا۔

میڈم کی حویلی میں 'سی ٹو' میں جانے کا طلسماتی نظام آنکھوں میں لہرا گیا۔ وہ اس سے کہیں

مشکل تھا مگر کھولنے والی میرے آگے آگے چل رہی تھی اور جادوئی دروازوں کو کھولتی جاتی تھی۔ یہاں 'کھل جا سم سم' کا منتر پھونکنے والا گہری بے ہوشی میں مبتلا تھا۔ ناکام ہونے کے بعد اُسے ہوش میں لانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ہر ممکنہ کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں جھنجھلا کر پرویز کے پیٹ میں گہرا چرکا لگانے چلا تھا، میری نظر فرش کے ایک حصے پر جا پڑی۔ حویلی کے دوسرے کمروں کی طرح یہ فرش بھی رگڑے ہوئے پتھروں سے بنا ہوا تھا اور اس میں ایک خاص ترتیب سے شیشے کی سلاخیں ڈالی گئی تھیں۔ بورڈ کے نیچے فرش پر سلاخ کے بجائے درز تھی جس پر میری نگاہ اتفاق سے جا اُٹکی تھی۔ درز کا بغور جائزہ لینے پر عقدہ کھلا کہ تہہ خانے کا دروازہ کسی دیوار میں نہیں تھا بلکہ فرش میں تھا۔ کمرے میں پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ کی بے ترتیبی میں بھی مہین سی ترتیب موجود تھی جس کا احساس ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ فرش کا دایاں حصہ بائیں جانب کھسکتا تھا۔ میں نے ایک دوجے میں پھنسا کر رکھی ہوئی کرسیوں کو بائیں جانب کھینچا۔ کرسیاں نہیں کھسکیں، فرش معمولی آواز پیدا کئے بغیر بائیں جانب کھسک گیا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں چمک اُٹھیں کہ دائیں دیوار کے ساتھ دو مربع فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا تھا جس میں سے لوہے کے پائپ کی بنی ہوئی سیڑھی نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ 'سی ٹو' کے برعکس یہ الیکٹرونک میکنزم نہیں تھا بلکہ سوئچ بورڈ محض سادہ سے سوئچ لیور کی طرح کام کرتا تھا اور گیٹ کو مقفل اور غیر مقفل کرتا تھا۔

اگر مجھے پرویز نے سوئچ بورڈ کا کلیو نہ دیا ہوتا تو یقینی طور پر میں تہہ خانے کا دہانہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکتا۔ خلا میں جھانک کر دیکھا۔ لوہے کے پتلے پائپ کی سیڑھی کے نچلے پائے عمودی حالت میں ایک ہشت پہلوی کمرے کے فرش میں نصب تھے۔ اس ہشت پہلوی کمرے میں بھی کاٹھ کباڑ اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر رکھا گیا تھا۔ میں نے محتاط انداز میں جھک کر دیکھا۔ نہ تو کوئی دروازہ دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی شخص..... میں نے مزید وقت سوچنے سمجھنے میں ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پلک جھپکتے میں خلا میں اُتر گیا۔ چند لمحوں بعد میں عجیب شکل کے تہہ خانے کے وسط میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور میزوں میں گھرا کھڑا تھا۔

ایڑیوں کے بل گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ دیوار کے ساتھ دو کرسیاں رکھیں تھی جن پر آف وائٹ کلر کی اونی چادریں پڑی تھیں۔ ان کی حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ان میں لپٹ کر بیٹھے ہوئے ابھی تبھی میں یہاں سے اُٹھے ہوں۔ ایک کرسی کے پہلو میں سیاہ رنگ کی چھوٹی

کے کے رائفل کھڑی کی گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پرویز اور بالکونی میں میرا نشانہ بننے والا شخص یہاں سے اُٹھ کر میری خیر خبر لینے اوپر گئے تھے۔ میں بامِ منزل تک پہنچ گیا تھا۔ منزل دو چار ہاتھ آگے تھی۔ میں نے دادو مہانے کی ڈبل بیرل گن ایک گرد آلود میز پر رکھی اور کے کے گن اُٹھالی۔ اپنے کم وزن اور مختصر جسامت کے باعث مجھے یہ رشین ساختہ گن بہت پسند آئی۔ اس کی میگزین چیک کی تو دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ وہ گولیوں سے فل تھی۔

میں نے خنجر احتیاط سے لباس میں چھپالیا اور گن تانے ایک ایک دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ کمرے کی آٹھوں دیواریں اسپاٹ تھیں۔ کوئی الماری یا کھڑکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی فریم آویزاں تھا۔ اسٹور میں سوئچ بورڈ تھا، یہاں وہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ دیواروں کے ہر اتصال پر فرش سے لے کر چھت تک جھری موجود تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک دیوار اپنی جگہ سے ہٹ کر دروازہ بناتی تھی۔ میں اس دیوار کو تلاش کر ہی رہا تھا کہ اچانک 'سرر' کی تیز آواز کمرے میں میرے دائیں ہاتھ ابھری۔ گردن گھما کر دیکھا تو آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ پوری کی پوری دیوار ٹرین کی بوگی کی طرح فرش پر پھسل رہی تھی اور نہایت 'سلوموشن' میں میرے سامنے دروازہ بنا رہی تھی۔ میرے اعصاب میں برق بھر گئی۔ جس طرف دیوار کھسک رہی تھی، میں نے اس طرف چھلانگ لگائی اور کباڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ اتفاق سے ٹی وی ٹرالی اور پہلو کے بل کھڑی کی گئی بھاری بھرکم میز کے بیچ سے کھلتے ہوئے دروازے کا منظر دکھائی دیتا تھا جس پر میری نگاہیں ثبت تھیں۔

ایک ایک لمحہ میرے اعصاب پر گراں گزر رہا تھا۔ دو فٹ کا خلا بننے میں کم و بیش پانچ منٹ لگے مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پیدا ہونے والے خلا میں کسی آدمی کے بجائے اسی رنگ کی دیوار دکھائی دی۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا مگر کوئی شخص برآمد نہیں ہوا۔ دس منٹ کے بعد مزید تابِ انتظار نہ رہی تو میں دبے پاؤں چلتا ہوا پہلو کی طرف سے خلا کے سامنے پہنچ گیا۔ جھانک کر دیکھا۔ وہ چار ضرب چھ کا باکس نما کمرہ تھا جس کی سبھی دیواریں اسپاٹ تھیں۔ عیاں ہوتا تھا کہ جس طرح یہ دروازہ کھلا تھا، اسی طرح باکس کی کسی اور دیوار میں سرکنے کا خودکار نظام نصب کیا گیا تھا۔

میں نے بے اختیار باکس میں داخل ہونا چاہا مگر عین وقت پر ایک خیال برقی کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور میرے قدم تھم گئے۔ میں تیزی سے پلٹا اور میز کے پیچھے دبک گیا۔

باکس کی دیوار ہٹانے والا سامنے نہیں تھا۔ کھولنے والے نے کہیں دور بیٹھ کر اسے آپریٹ کیا تھا۔ اگر میں باکس میں داخل ہو جاتا تو بعید نہ تھا کہ وہ سلوموشن کے بجائے چشمِ زدن میں اس دروازہ نما خلا پُر کر دیتی۔ میں آگے کا رہتا نہ پیچھے کا؛ اور چوہے کی طرح کڑکی میں پھنس جاتا۔ میری متذبذب نظریں باکس پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک خیال آیا اور میں نے شکستہ پائیوں والی ایک تپائی اُٹھائی۔ میز کے اوپر سے جھک کر فرش پر رکھی اور دھکیل کر باکس کے اندر پہنچا دی۔ چوبی تپائی باکس کے وسط تک پھسل کر تھم گئی۔ دو تین سیکنڈوں کے بعد میرے اندیشے کی توثیق ہو گئی کیونکہ 'کٹاک' کی آواز ابھری اور خلا آنِ واحد میں پُر ہو گیا۔

مجھے جھرجھری آئی۔ قسمت نے یاوری کرتے ہوئے مجھے اس قبر نما باکس میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ چند لمحے گزرے تھے جب اسی انداز میں دوسری دیوار سرکنے لگی۔ مجھے آنے والے کی نظروں سے چھپنے کے لئے جگہ بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ جونہی دروازہ بنا، عام قامت کا گن بردار دکھائی دیا۔ وہ کئی سیکنڈ تک خلا کے پار کھڑا چوکس انداز میں ہشت پہلوی کمرے میں نگاہ دوڑاتا رہا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا، سر جھالردار گنجا اور چہرہ زخموں کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی شرٹ اور سیاہ پینٹ پہن رکھی تھی جو اس پر ذرہ بھر جچ نہیں رہی تھی۔ اپنے ڈیل ڈول سے چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے دیکھتے ہی خطرناک شخص قرار دیا اور میرے اعصاب تن گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ چند ساعتیں سر اُٹھا کر چھت کے خلا کو گھورتا رہا پھر سیدھا اُس دیوار کی طرف بڑھا جس کے پار کال کوٹھڑی واقع تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے اُسے مارنے کا فیصلہ کیا، اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ بند کمرے میں فائر کی کان پھاڑ دینے والی آواز کان لمبی بازگشت اور خوفناک گونج چھوڑ گئی۔ گنجا شخص حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے دیوار پر ہاتھ جمانے کی کوشش کی مگر نامراد لہرایا اور زمین پر گر کر جھٹکے لینے لگا۔ میرے ذہن میں چسپاں اعداد و شمار کے چارٹ کے مطابق اب یارن خان اور خانزادی اسما کے علاوہ تہہ خانے میں دو آدمی بچے تھے جن پر قابو پانا ناگزیر تھا۔

میرے اندازے کے مطابق کے کے گن کی گولی کی کان پھاڑ آواز تہہ خانے کے گوشے گوشے تک پہنچی تھی۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں سنتے ہی میں ایک مرتبہ پھر مورچہ زن ہو گیا۔ خلا کے پار قدموں کی چاپ تھم گئی اور ایک باریک مگر تیز آواز میرے کانوں پڑی، ''اوئے

پرویز! فیقے!.....اوئے تم چپ کیوں ہو؟ یہ فائر کی آواز کیسی تھی؟''

پوچھنے والا سامنے آئے بغیر تفتیش کرنے لگا تھا۔ جواب نہ پا کر اس نے محتاط انداز میں جھانکا۔ اسے نہ میں اور نہ فرش پر آخری جھٹکے لیتا فیقا ہی دکھائی دیا۔ مجبوراً اسے سامنے آنا پڑا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھا اور میری خوش بختی کہ اس کے ہاتھ میں گن یا پسٹل نہیں تھا۔ جونہی اس کی نظریں فرش پر خون میں لت پت فیقے پر پڑیں، وہ بری طرح چونک گیا۔ بے اختیار پیروں کے بل بیٹھا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا، ''اوئے فیقے! اوئے.....تمہیں کس نے گولی ماری ہے؟ بتاؤ مجھے.....''

فیقا جواب دینے کی طاقت کھو چکا تھا۔ پوچھنے والے کو جواب میں تکلیف رساں خرخراہٹ سنائی دی تو وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اُٹھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد دیکھتا ہوا حلق کے بل چیخا، ''اوئے پرویز! کہاں مر گیا ہے تُو؟''

پرویز کی طرف سے جواب ندارد پا کر وہ پھر چلایا، ''علی شیر! تم سب لوگ کدھر گئے ہو؟ ادھر آؤ، فیقے کو کسی نے گولی ماردی ہے۔''

''کیوں چیخ رہے ہو؟ کیا ہوا؟'' اس کے عقب میں ایک بھاری آواز گونجی۔ چند لمحوں بعد ایک ناٹے قد اور بڑی توند والے شخص نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی نظر فیقے پر پڑی تو وہ تیزی سے جھکا۔ میرے لئے یہ سنہرا موقع تھا۔ میں نے اُٹھنے، ناٹے قد والے شخص کے سر کا نشانہ لینے اور فائر کرنے میں محض دو سیکنڈ کا وقت صرف کیا ہوگا۔ میرا نشانہ کارگر رہا، آٹھ دیواروں والا کمرہ فائر کی خوفناک آواز اور میرے شکار کی دلدوز چیخ سے تھرا اُٹھا۔ فیقے کے برابر میں لہو کا بازار گرم ہو گیا۔ میں نے زنانہ آواز والے شخص کو جو دہشت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا، ہاتھ سر پر رکھنے کا حکم دیا۔ وہ میرے ہاتھوں مرنے والوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھ چکا تھا، سمجھ چکا تھا کہ وہ موت کے دہانے پر کھڑا تھا، تبھی بلاچوں چراں ہاتھ سر پر رکھ کر بولا، ''کک.....کیا تت.....تم نے پرویز کو بھی قتل کر دیا ہے؟''

میں نے کہا، ''وہ مرا نہیں، اسٹور میں بے ہوش پڑا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو تم بھی زندہ رہو گے ورنہ ان کتوں کی طرح حرام موت مارے جاؤ گے۔''

میں نے فرش کو لہو سے تر کرتے ہوئے سورموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں اُسے دھمکایا تھا تاکہ وہ کسی قسم کی چالاکی کا خیال بھی دل سے نکال دے۔ چونکہ میرے لہجے

میں موت کی سی سنگینی پنہاں تھی، اس لئے وہ مارے خوف کے ہکلانے لگا۔ بولا، ''تم کون ہو؟ مم..... میں کیا تعاون کرسکتا ہوں؟''

میں میز پر سے ہوتا ہوا اس کے عین سامنے پہنچ گیا۔ سینے پر گن کی نال ٹکا کر غرایا، ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''بب..... برکت..... برکت مسیح۔''

ایسے میں بے اختیار میری نظر اُس کے کھلے گریبان پر پڑی۔ سنہرے رنگ کی چین میں ننھی سی صلیب جھول رہی تھی۔ تہہ خانے میں تمہارے علاوہ کتنے آدمی ہیں؟''

گن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیلنے کو آ گئیں۔ تھوک نگل کر بولا، ''کک..... وہ..... وہ علی شش..... شیر..... پپ..... پتہ نہیں وہ کدھر گیا۔''

میں نے گن کو جھٹکا دیا۔ وہ ڈگمگا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ بولا، ''شش..... شاید خان جی کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے یہاں.....''

اس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے پھر تیزی سے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ اگر بالکونی میں گرنے والے کا نام علی شیر تھا تو میدان صاف تھا۔ اگر وہ کوئی اور تھا تو یقینی طور پر علی شیر کہیں چھپا ہوا تھا اور مجھ پر کامیاب حملہ کرنے کیلئے موقع کی تاک میں تھا۔ ایسے میں مجھے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

''خان کہاں ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''وہ..... وہ اپنے کک..... کمرے میں ہیں۔'' اس کی آواز لرزنے لگی۔

میں مستعدی سے گھوم کر اُس کے عقب میں آ گیا۔ کمر سے گن کی نال لگا کر بولا۔

''چلو اندر.....''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چوکس انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا ہشت پہلوی کمرے سے نکل کر متصلہ چار فٹ چوڑی اور آٹھ دس فٹ لمبی گیلری میں قدم رنجہ ہوا۔ ٹی شکل کی اس گیلری میں ایک دروازہ کھلتا تھا جس کے سامنے رُکے بغیر ہم گیلری کے اختتام پر پہنچ گئے۔ میں نے اُسے روکا اور پوچھا، ''خان کا کمرہ کون سا ہے؟''

اس نے دائیں ہاتھ اشارہ کیا۔ میں اُسے دھکیلتا ہوا یارن خان کے دروازے پر پہنچا۔ میرے کہنے پر اُس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ آہستگی سے بولا، ''مم..... مجھے یہیں

رہنے دو۔''

میرے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سلگ اُٹھی۔ میں سمجھ گیا کہ کتا اپنے مالک کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ مگر میں اُسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا، اس لئے لگاتار دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ میری توقع کے برعکس کمرہ خالی تھا۔

میں نے دانت کچکچائے، ''اوئے کسی حرامی کی اولاد! یہاں تو کوئی نہیں۔ جلدی بکو؛ تمہارا باپ یارن خان کہاں ہے ورنہ تمہارا جسم چھلنی کر دوں گا۔''

اس کی گھگھی بندھ گئی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا، ''پپ..... پتہ نہیں۔ میں نے شام کو خان جی کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ اب پتہ نہیں وہ کہاں چلے گئے۔''

دل کو لگا کہ اُس نے سچ کہا تھا۔ میں نے اُسے دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور اس کا رُخ پھیر دیا پھر اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے اِس بے حد آراستہ کمرے کا جائزہ لیا۔ بیڈ کے نیچے، نفیس ملبوسات سے لبالب بھری وارڈ روب اور باتھ روم میں الغرض ہر ممکنہ جگہ پر یارن خان کو دیکھا مگر وہ دکھائی نہیں دیا۔ یہاں مزید رُکنا فضول تھا اس لئے میں اُسے دھکیلتا ہوا گیلری کے دوسرے سرے پر واقع کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے کہا، ''اسے کھولو..... جلدی کرو۔''

وہ بولا، ''میرے پاس اس کی چابی نہیں ہے۔''

میں غرایا، ''یہاں دو کمرے ہیں۔ ایک میں یارن خان سوتا ہے۔ دوسرا مقفل ہے جس کی چابی تمہارے پاس نہیں ہے۔ بتاؤ، تم لوگ کہاں سوتے ہو؟''

''میرا کمرہ اُس طرف ہے۔'' اس نے جلدی سے ہشت پہلوی کمرے کی طرف اشارہ کیا، ''پرویز اوپر سوتا ہے۔ رفیق میرے ساتھ ہوتا ہے جبکہ باقی لوگ دوسری گیلری میں ہوتے ہیں۔''

''چلو! مجھے اپنی کمین گاہ دکھاؤ۔'' میں نے گن کی نال اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چبھوئی۔ وہ چپ چاپ مڑ گیا۔ گیلری میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ گیا جسے میں نے گزرتے ہوئے بلاوجہ نظر انداز کیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ فرنیچر سے بے نیاز چھوٹے سے کمرے میں قالین پر ایک بڑا گدا اور دو لحاف پڑے تھے۔ ایک دیوار پر چھوٹا سا کنٹرول پینل نصب تھا جس پر تین لیور، دو بلب اور ایک بڑی سی ناب لگی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا، ''یہ کیا ہے؟''

''یہ کنٹرول پینل ہے۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا، ''بیسمنٹ کے دروازوں کو یہاں سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔''

''اچھا.....اسٹور والا دروازہ بند کردو۔'' میں نے پینل پر نظریں جمائیں اور کہا۔ اس نے ایک لیور دبایا۔ 'کٹاک' کی آواز سنائی دی۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا، ''باکس کا گیٹ تم نے کھولا تھا؟''

وہ سہمے انداز میں بولا، ''ہاں! میری ڈیوٹی یہاں پر ہوتی ہے۔ کیا اس میں تمہارا کوئی ساتھی پھنسا ہوا ہے؟''

''نہیں.....'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''تو پھر یہ ریڈ بلب کیوں جل رہا ہے؟'' وہ پریشان ہو کر بڑبڑایا۔

''کیا مطلب؟'' میں متفسر ہوا۔

''کوئی اس کمرے میں داخل ہو جائے، تب ریڈ بلب جلتا ہے۔ اس کے روشن ہوتے ہی میں نے چھوٹے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔'' اس کا خوف اور حیرت سے بُرا حال تھا، ''اگر تمہارا کوئی ساتھی ادھر نہیں گیا تو پھر وہاں کون قید ہے؟ علی شیر وہاں ہے؟''

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے اس چوہے دان میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اور میں نے اپنی جگہ پر ٹوٹی ہوئی تپائی ادھر دھکیل دی تھی۔

میں نے اسے کمرے سے نکالا اور بند دروازے کی طرف لے کر گیا۔ مجھے توقع تھی کہ اس میں یارن خان چھپا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب اُسے روک کر میں نے قفل کا جائزہ لیا۔ عام نوعیت کا گھومنے والا تالا تھا جسے میں نے گولی مار کر توڑ دیا۔ لاک ہینڈل ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا۔ سرسری نظر دیکھنے سے یہ کمرہ یارن خان کے آراستہ بیڈروم کا مکمل عکس معلوم ہوا۔

جونہی میں نے اندر قدم رکھا، مجھے کمرے کے وسط میں عقبی دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے جہازی سائز کے بیڈ پر مخملیں کمبل میں سر منہ لپیٹ کر پڑا ہوا وجود دکھائی دیا۔ وہ خوف سے دبکا تھا یا موقع کی تاک میں تھا کیونکہ فائر کی خوفناک آواز سننے کے بعد بھی اس کی آنکھ نہ کھل پائی تھی، یہ ماننے کی بات نہیں تھی۔ کمرے کے پہلو میں باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے

برکت مسیح کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور پہلو کے بل چلتا ہوا تیزی سے باتھ روم تک گیا۔ جھانک کر دیکھا۔ خالی تھا۔ میں نے بیک وقت برکت مسیح اور کمبل میں لپٹے ہوئے شخص کو نشانے پر رکھتے ہوئے بیڈ کے نیچے جھانکا، پردوں کو ہلایا جلایا مگر کچھ نہ ملا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی جس کا احساس مجھے بعد میں ہوا تھا۔ کمبل میں لپٹا ہوا شخص اگر مسلح ہوتا تو وہ کمبل کے اندر رہ کر مجھ پر آسانی سے فائر کرسکتا تھا۔

میں نے برکت مسیح کو مخاطب کیا، ''یہ کمبل کھینچ لو۔ ہری اَپ!''

برکت مسیح اپنی مسکین سی شکل کی بدولت بے ضرر لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ اس نے کبھی مار دھاڑ والے کاموں میں دخل نہیں لیا تھا کیونکہ گن کو خود پر اُٹھا دیکھ کر اس کی آنکھیں دہشت سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کمبل کا کونا تھاما اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ طلوع ہونے والا منظر ہوش ربا تھا۔ میری آنکھیں پہلے خیرہ ہوئیں، پھر ایک دم شرم سے جھک گئیں۔ جی چاہا کہ فوراً پلٹ جاؤں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ آنکھیں بند کرنا بس میں تھا، وہ لحظہ بھر کو بند ہوگئیں پھر کھل گئیں مگر میں دانستہ بیڈ کی طرف براہِ راست دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ بیڈ پر کوئی جواں سال عورت برہنہ بدن گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ اس کا آدھا بدن سیاہ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ باقی آدھا بدن ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمک رہا تھا جسے اس نے بانہوں میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رکھی تھی۔ چونکہ اس نے اپنا سر سینے میں اور دونوں ہاتھ ٹانگوں کے بیچ ڈال رکھے تھے، اس لئے چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ پورے ہوش و حواس میں تھی مگر شرم سے دوہری ہوگئی تھی۔

میں نے پوچھا، ''اے لڑکی! تم کون ہو؟''

وہ کچھ نہ بولی۔ بری طرح کانپتی رہی۔ میں نے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہم دور ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی گن نہیں تھی۔ کہا، ''برکت مسیح! اس پر کمبل ڈال دو۔''

برکت نے فوراً تعمیل کی۔ چند ہی لمحوں میں میری آنکھیں سلگنے لگی تھیں۔ یہ احساس بڑا برانگیختہ کن تھا کہ سردار یارن خان نے حویلی کے نیچے اتنا بڑا تہہ خانہ محض اپنی سفلی ہوس کی آبیاری کے لئے بنا رکھا تھا۔ اپنی تنہائی کو مکمل اور محفوظ بنانے کے لئے کئی خوں خوار پہرے دار بھی تعینات کر رکھے تھے جو اپنی کاہلی کے باعث مجھے اس کے عیش کدے تک پہنچنے سے نہ روک سکے تھے۔ مجھے فوری طور پر خیال آیا کہ یہ عورت کوئی عزت دار نہ تھی بلکہ اپنی سیاہ رات

کے چمکتے دام کھرے کرنے کے لئے یہاں پہنچی تھی۔

یارن خان گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ میں گھبرا سا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا تھا جسے فوری طور پر کھوج نکالنا بے حد ضروری تھا وگرنہ وہ میرے خون کی بو سونگھتا ہوا کسی بھی لمحے قیامت بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔

میں نے برکت مسیح کو ڈرانے کے لئے اپنے لہجے کو مزید خونخوار اور درشت بناتے ہوئے کہا، ''جلدی بولو! خان کہاں ہے ورنہ تمہاری چھٹی کروا کر اپنے طریقے سے اسے تلاش کروں گا۔''

وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ سر کو دائیں بائیں نفی میں ہلاتے ہوئے سودایانہ انداز میں گلے میں جھولتی ہوئی صلیب کو تھام کر ملتجیانہ لہجے میں بولا، ''قسم یسوع کی..... مجھے علم نہیں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھے جب باہر شور شرابہ ہوا۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''ابے کتے کے پلے! پھر اُسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی..... تم آپریشن پینل پر بیٹھتے ہو۔ تمہیں اس راستے یا خفیہ دڑبے کا علم ہے جس میں وہ چھپا بیٹھا ہے۔ میرے ساتھ ڈرامے بازی نہ کرو؛ سیدھی طرح بول پڑو ورنہ.....''

''شش..... شاید ایسا راستہ ہو۔ کوئی خفیہ جگہ بھی ہو۔ مم..... مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔'' اس کی آواز کپکپانے لگی اور آنکھیں تصدیق کرنے لگیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا، ''مم..... میرا خیال ہے کہ خان جی یہاں سے نکل گئے ہیں۔ ان کے کمرے میں کسی سرنگ کا دہانہ ہوگا۔ قسم یسوع کی.....''

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ اس تہہ خانے کو دیکھ لینے کے بعد یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس نے آخری بچاؤ کے لئے یہاں ایسی بھی کوئی سرنگ بنوا رکھی ہو جس کا ماسوائے اس کے، کسی کو پتہ نہ ہو۔ یہ خیال بڑا تکلیف دہ تھا کہ وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر تہہ خانے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ وہ نکلنے کے بعد مجھ پر قابو پانے اور اپنے قیمتی کارندوں کا بدلا لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوگا۔ اسے جتنی مہلت میسر آئے گی، اس کا وار اتنا زیادہ کاری ہوگا۔ میں نے خفیہ راستے کی تلاش میں کمرے کی دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ بیڈ کے اوپر چھت اور عقبی دیوار کے سنگم پر ڈیڑھ مکسر فٹ کی بیم نظر آئی۔ اس پر جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے پرویز سے زور آزمائی کے دوران اسما کی چیخ کی آواز سنی تھی۔ پھر دیوار کی جڑ میں عجیب ساخت کی جالیاں دیکھی تھیں۔ یہ اسی نوعیت کی

آہنی جالیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق میں اسی کمرے میں پہنچ گیا تھا جہاں سے اسما کی آواز گونجی تھی۔

میں نے کمبل میں لپٹی ہوئی عورت کو گن کی نال سے چھو کر متوجہ کیا اور پوچھا، ''اے لڑکی! کیا تم حیدر خان کی بیٹی اسما ہو؟''

کمبل میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس کی کمزور سی آواز سنائی دی، ''نہیں..... میں اسما نہیں ہوں۔ میرا کسی حیدر خان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''

میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ وہ شرم کے مارے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنے نام و نسب کو چھپا رہی تھی۔

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور برکت مسیح کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کی کنپٹی پر گن کی نال رکھی اور فیصلہ کن انداز میں کہا، ''دیکھو برکت مسیح! مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور تمہیں مار کر مجھے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لئے زندگی کا چانس دیتا ہوں۔ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو کچھ جانتے ہو، سچ سچ بتا دو ورنہ تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔''

''مم..... مجھے مت مارو۔ تم جو پوچھو گے، بتا دوں گا۔'' اس کی حالت غیر ہوگئی، ''میں نے پہلے بھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

''یہاں پر یارن خان کا قریبی آدمی کون ہے؟'' میں نے پوچھا، ''میرا مطلب ہے کہ کون زیادہ وقت خان کے ساتھ گزارتا ہے۔''

''مم..... میں!'' اس نے تھوک نگلا اور چھاتی پر ہاتھ رکھ کر ترحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''پھر تمہیں علم ہوگا کہ یارن خان نے بیٹ خیر پور سے ایک عورت اور بچے کو پیرو ماچھی کے ذریعے اُٹھوایا تھا۔'' میں غرایا، ''بتاؤ! خان نے انہیں کہاں رکھا ہوا ہے؟''

اس کی آنکھوں سے ایسا تاثر مترشح ہوا جیسے وہ سمجھ گیا ہو کہ اس ساری مار ماری کا محرک کیا ہے۔ بولا، ''اوہ..... اچھا! یہ تو میں جانتا ہوں۔ ان دونوں کو پرویز اور فیقا پتن سے وصول کر لائے تھے۔ خان کے حکم پر پرویز نے انہیں سائیں نورن آغا کے پاس پہنچا دیا تھا۔''

میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا، ''نورن آغا؟ کیا تم سائیں جگ جیت کے دربار کے گدی نشین کی بات کر رہے ہو؟''

اس نے تھوک نگلا، ''ہاں! مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک سائیں آغا کے پاس ہی ہیں۔ کہاں؟ میں نہیں جانتا۔''

''خان نے انہیں کیوں اغوا کرایا ہے؟''

''اس بڈھڑی کی بیٹی ملتان میں رہتی ہے۔ خان جی کا اس سے کوئی معاملہ چل رہا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''خان جی نے دو تین مرتبہ میرے سامنے فون پر اس سے بات کی تھی۔ اسے لاہور میں بلایا تھا مگر میرا خیال ہے کہ اُس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔''

''تم جانتے ہو کہ خان نے اُسے کیوں بلایا تھا؟''

''نہیں! شاید خان جی کا اس پر دل آیا ہوا ہے۔''

''تو اس پر ہاتھ ڈالتا۔'' میں نے پھنک کر کہا، ''ان معصوموں کو اُٹھانا کہاں کی مردانگی ہے؟''

''خان جی کہتے ہیں کہ وہ چکنی مچھلی ہے۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا، ''نہیں برکت مسیح! کوئی اتنی معمولی بات پر اتنا بڑا جرم نہیں کرتا۔''

''یہ خان جی کے لئے معمولی بات نہیں ہے کہ وہ کسی کو بلائیں اور وہ آنے سے انکار کر دے۔'' وہ بولا۔

''خان اس وقت کہاں ہوگا؟''

اس نے بے بسی سے کندھے اُچکائے، ''خداوند جانتے ہیں؛ مجھے نہیں علم۔ میرا یقین کرو۔''

''یہ کیسے خان کے ہاتھ لگ گئی؟'' میرا اشارہ اسما کی طرف تھا۔

''اسے خان نے لاہور کے ایک بڑے سیاست دان کے خفیہ اڈے سے اپنے آدمیوں کو بھیج کر نکلوایا تھا، بڑی مشکل سے۔ سنا تھا کہ بڑی مار ماری ہوئی تھی۔''

''مگر کیوں؟''

اس نے جواباً مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ 'احمق انسان! تہہ خانہ دیکھ چکے ہو، خان جی کی موجودگی کی خبر پا چکے ہو اور اس برق بدن حسینہ کو برہنہ حالت میں بھی دیکھ چکے ہو..... پھر بھی پوچھتے ہو کہ کیوں؟'..... منہ سے کچھ نہ بولا۔

میں نے طویل سانس حلق میں اُتاری اور پوچھا، ''کیا اس کے باپ کو علم ہے کہ یہ یہاں

ہے؟''

''سردار حیدر خان کو اس کا بالکل پتہ نہیں ہے۔'' اس نے باوثوق تائید میں سر ہلایا۔

''یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟'' میں نے روانی میں پوچھا۔

''ہے تو سہی؛ جس سے خان جی نکلے ہیں مگر مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''آخری سوال..... یارن خان کیا کرتا ہے؟ میرا پوچھنے کا مطلب ہے کہ زمیندارے کے علاوہ۔''

اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، ''وہ بادشاہ ہیں۔ ان کی زبان ہلتی ہے اور دنیا ادھر کی اُدھر ہو جاتی ہے۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ؛ کھل کر بات کرو۔'' میں نے درشت رویہ اختیار کیا۔

''وہ..... بہت تیز دماغ رکھتے ہیں۔ بادشاہ گر ہیں۔ بڑی سیاسی پارٹیاں ان کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ چاہیں تو کسی کو ہیرو بنا دیں، چاہیں تو زیرو۔'' اس کی آواز بتدریج مدھم ہونے لگی، ''وہ اسلحے کا کاروبار بھی کرتے ہیں، ممنوعہ ڈرگز کا بھی اور بہت سے ایسے کام جن کا مجھے علم نہیں ہے۔''

میں نے اُس سے یارن خان کے بارے چند مزید نوعیت کے سوال کئے۔ وہ سب کچھ بتانے کے بعد رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا، ''دیکھ لو؛ میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ جو تم نے پوچھا، ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔''

میرا کام ختم ہو گیا تھا اور مجھے یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے تھا۔ باہر کیسے حالات میرے منتظر تھے، اندازہ نہیں تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے سوچا کہ اسما کا کیا کروں؟ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں..... یا جنسی بھوکے یارن خان کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں؟..... پہلی سوچ دل کو لگی اور میں نے اُسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بلند آواز میں اسے مخاطب کیا،

''اے لڑکی! تمہارا لباس کہاں ہے؟''

اس کی مدھم سی آواز سنائی دی، ''پپ..... پتہ نہیں.....''

''کمبل میں لپٹے رہ کر اُٹھو اور کپڑے پہنو۔ جلدی کرو۔''

میری توقع کے برعکس وہ کرب آمیز انداز میں چیخی، ''نہیں..... مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں۔ اگر مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہو تو مجھے گولی مار دو۔''

PakistaniPoint.com
Waqar Azeem

تأسف اور دکھ سے میرا دل بھر گیا۔ میں نے کہا، ''ڈرو نہیں؛ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔''

''کہاں ناں! مجھے کہیں نہیں جانا۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' اس کی آواز میں ہسٹریائی تاثر شامل ہو گیا۔

ایسے ہی وقت میں وینٹی لیشن والی جالیوں کے راستے گزر کر آتی ہوئی تیز آواز کانوں پڑی، ''تم لوگوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ پولیس کی بھاری نفری نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اگر تم لوگ زندگی چاہتے ہو تو فی الفور ہتھیار پھینک کر، ہاتھ سروں پر رکھے حویلی کے مین گیٹ سے باہر آ جاؤ۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔''

میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ کم بخت یارن خان واقعتاً حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے پولیس کو بلوا لیا تھا۔ یارن خان اور پولیس والوں کو علم نہیں تھا کہ حویلی میں کشت و خون کا بازار گرمانے والا اکیلا تھا یا ایک سے زیادہ۔ انہوں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا ہو گا کہ کئی حملہ آور حویلی میں موجود تھے۔

میں چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ میں نے دانت پیسے اور چاہا کہ برکت مسیح کی چھاتی میں گولی اُتار دوں، وہ جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر بولا، ''نہیں نہیں! مجھے مت مارو۔ میں تمہیں پولیس کے گھیرے سے نکال سکتا ہوں۔ مجھے مت مارو۔''

میں ٹرائیگر دباتے دباتے رُک گیا۔ غیر معمولی عجلت میں بولا، ''او کے! اگر تم مجھے دھوکہ دو گے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ چلو! اِسے اُٹھاؤ۔''

میں نے اسما کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا اور جلدی سے وارڈ روب کی طرف بڑھا۔ وارڈ روب میں دو تین لباس دکھائی دیے۔ ایک ہینگر کھینچ لیا اور تیزی سے پلٹا۔ دیکھا کہ برکت مسیح نے اسما کو کمبل میں سے نکال کر کاندھے پر ڈال لیا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور اس کی گرفت سے نکلنا چاہ رہی تھی۔

چھپی ہوئی چیز پراسرار ہوتی ہے۔ اسرار چشمِ طلب کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ کھل کر جب آدھا چھپا رہتا ہے، آدھا دِکھتا ہے تو دل کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ حادثاتی طور پر، خود ستائشی کے جذبے سے معمور ہو کر از خود اپنے ہی خول سے باہر آتا ہے تو بے توقیر ہو جاتا ہے۔ لباس کا

خول انسان کو پراسرار بناتا ہے۔ بے لباسی بتاتی ہے کہ انسان اور جانور کی فزیبلٹی ایک سی ہے۔ اسما کی برہنگی اس کے شخصی تاثر اور اسرار و رموز کو آنِ واحد میں ننگل گئی۔ میں نے اُسے لمحہ بھر کو غیر اختیاری طور پر دیکھا پھر آنکھیں پھیر لیں اور درشت لہجے میں کہا، ''میرے لئے پریشانی کا سبب نہ بنو اسما..... میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری مرضی ہوگی تو اپنے گھر چلے جانا۔ اگر گھر نہ جانا چاہو تو جہاں بھی کہو گی پہنچا دوں گا۔''

اس نے سر اُٹھایا۔ مجھے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا اور چیخی، ''میرا کوئی خیر خواہ نہیں ہے۔ چھوڑ دو مجھے۔''

میں نے قدم بڑھایا۔ اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور غرا کر کہا، ''اپنی زبان بند رکھو اور موقع کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبو گی۔''

ایسے میں ہماری نظریں ایک پل کو ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں جاگزیں وحشت نہایت دلدوز تھی۔ ڈر نے اس کی قوتِ فیصلہ ختم کر دی اور کمزوری مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ یا شاید اس نے تغیر یافتہ حالات کے خوف کے مارے مفاہمت کر لی تھی۔

مجھے اُس پر بے تحاشا ترس آیا۔ اس کا گلاب چہرہ کملایا ہوا تھا۔ تاب و تمکنت، عشوہ و غمزہ کی کارستانیاں اور ناز و ادا کی اُٹھانیں، سب رخصت ہو چکی تھیں اور وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ شکاری ایک سے ہوتے ہیں۔ کوئی بڑا؛ کوئی چھوٹا مگر کوئی پانی نہیں پلاتا۔ کوئی خون رگوں میں انڈیل کر نئی زندگی نہیں دیتا۔ اس کی نظروں میں میں بھی شکاری تھا۔ میں اسے برہنہ حالت میں باہر نہیں لے جانا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث میں نے یہ تردد آنے والے وقت پر ڈالا اور برکت کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتا ہوا کمرے سے نکل کر گیلری میں آیا۔ چند لمحوں بعد ہم ہشت پہلوی کمرے میں تھے۔

برکت نے حسرت کناں نظروں سے اپنے مردہ ساتھیوں کو دیکھا اور خون آلود فرش پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے، لاشوں کو پھلانگ کر ایک دیوار کے سامنے جا رُکا۔ بولا، ''دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھ کر کرسی کو پیچھے دھکیلو۔''

میں اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یارن خان کے اس طلسم کدے میں کوئی بھی واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔ میں کرسی سمیت کسی اندھی گپھا میں گر سکتا تھا۔ مگر اس کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ تبھی میں نے اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے عمل کیا۔ میرے وزن سے

کرسی غیر روایتی انداز میں ایک انچ تک نیچے دَب گئی۔ اگر میں محتاط نہ ہوتا تو مجھے کرسی کی یہ حرکت بالکل محسوس نہ ہوتی۔ جونہی میں نے پیروں کی مدد سے کرسی کو پیچھے دھکیلا، میرے کانوں میں 'کٹک' کی ہلکی سی آواز گونجی۔ برکت مسیح نے اسما کو کاندھے سے اُتار کر کھڑا کیا اور دونوں ہاتھوں کو دیوار پر رکھ کر پوری قوت سے دھکیلا۔ مجھے حیرانی ہوئی جب پوری دیوار دروازے کی طرح اندر کی طرف کھلتی گئی۔ ہر دیوار کے کھلنے کا انداز جداگانہ تھا۔ یہ تہہ خانہ انجینئر کی دانشمندی اور انسانی نفسیات پر دسترس کا بلاشبہ بہترین اظہار تھا۔

اسما دیوار کے ساتھ لگ کر، آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی اور واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ برکت کے ہاتھ کے اشارے پر میں فوری طور پر لاشیں پھلانگتا ہوا ان کے قریب آیا۔ جب ہم تینوں نے خلا عبور کر لیا تو برکت مسیح نے دیوار کو دھکیل کر 'کٹاک' کی آواز کے ساتھ اپنی جگہ پر فٹ کر دیا۔ سرنگ میں یک لخت اندھیرا چھا گیا۔

برکت کی زنانہ آواز گونجی، ''جلدی چلو..... یہ سرنگ ہمیں یہاں سے کافی دور لے جائے گی۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے جوتے اُتار دیے۔ مجھے بھی جوتے اُتارنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاہتا تھا کہ ہم کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر یہ سرنگ نما راستہ طے کریں۔ موہوم سا خوف دل کو لاحق تھا کہ وہ مجھے کسی پنجرے میں پھنسا نہ دے مگر زندہ رہنے کے لئے اتنا خطرہ مول لینے میں ہرج نہیں تھا۔ میں نے جوتے اُتار دیے اور سفر آغاز کر دیا۔ اس تنگ سی سرنگ میں نہ صرف اندھیرا تھا بلکہ بہت زیادہ سردی، حبس اور سیلن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ لہرایا۔ اسما کا بازو میری گرفت میں آ گیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔

میں نے آگے چلتے ہوئے برکت کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت مدھم آواز میں پوچھا، ''برکت مسیح! یہ سرنگ کتنی لمبی ہے؟''

اس نے سرگوشی کی، ''مجھے علم نہیں کیونکہ پہلی مرتبہ اس میں داخل ہوا ہوں۔ کوئی آدھ میل لمبی تو ہو گی ہی۔''

''کیا یارن خان اسی سرنگ سے نکلا تھا؟''

''نہیں۔ وہ کسی اور سرنگ سے گئے ہوں گے۔ ادھر آتے تو میری نظروں میں ضرور آتے۔'' اس نے کہا۔ مجھے اس پر ایک ذرا بھروسہ ہوا کیونکہ سرنگ کے اندھیرے کا فائدہ اُٹھانے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ ہم بھاگنے کے سے انداز میں چل رہے تھے۔ سرنگ میں کوئی موڑ

نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم خان کی حویلی کی چار دیواری عبور کر چکے تھے۔

اچانک اسما رُک گئی۔ مجھے بھی ناچار رکنا پڑا۔ سپاٹ لہجے میں بولی، ''کپڑے مجھے دے دو۔ یہیں پہن لیتی ہوں۔''

میں نے اس کی بات ماننے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے ہوئے برکت کو آواز دے کر روک لیا۔ وہ بولا، ''جلدی نکلو۔ یہ نہ ہو کہ خان جی پولیس کو اس سرنگ کے بارے میں یا اس کے دہانے کے بارے میں بتا دیں۔ میری تو خیر ہے، تم مارے جاؤ گے۔''

میں نے کہا، ''چند لمحوں سے فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا اور ہینگر اسما کو تھما دیا۔ کہا، ''اسما! جلدی سے پہن لو۔''

چند لمحوں تک سرنگ میں کپڑوں کے سرسرانے کی آواز گونجتی رہی۔ پھر اسما کی آواز سنائی دی، ''چلو.....''

سفر ایک مرتبہ پھر جاری ہو گیا۔ اب ہم تینوں ایک قطار میں چل رہے تھے۔ اسما میرے اور برکت کے درمیان تھی۔ سرنگ میں حبس بتدریج بڑھتا جاتا تھا جس کی وجہ سے میرا سر درد کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے اَب تب میں قے آ جائے گی۔ کان لگانے کے باوجود کوئی آواز سنائی نہیں دی تو لگا کہ یہ سرنگ ساؤنڈ پروف تھی یا ہم دور آ گئے تھے۔ کوئی پانچ سات منٹ متواتر چلنے کے بعد برکت مسیح رُک گیا۔ اسما اُس سے ٹکرائی، میں اسما سے۔ میں نے پوچھا، ''کیا بات ہے؟''

وہ بولا، ''ہم سرنگ کے دہانے پر پہنچنے والے ہیں۔ میں ایک بار پھر تمہیں تمہارا وعدہ یاد دلاتا ہوں۔ سرنگ سے نکلتے ہی تم دونوں اپنی راہ پکڑو گے، میں اپنی۔ تم مجھے گولی نہیں مارو گے۔ کیا تم اس وعدے پر قائم ہو؟''

اس کی آواز میں خوف اور بداعتمادی کا عنصر غالب تھا۔ میں نے کہا، ''برکت! تم نے میری ڈیمانڈ پوری کی ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اپنے وعدہ پر قائم ہوں کہ تمہیں نہیں ماروں گا۔''

اس نے بڑبڑاتے ہوئے 'خداوند! میری مدد کر.....' کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند گھڑیاں خاموشی میں گزر گئیں۔ میں نے پریشانی سے پوچھا، ''کیا کر رہے ہو برکت مسیح؟''

''ڈھکن کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ بولا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اندھیرے میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ اُسے مطلوبہ ناب یا لیور نہیں مل رہا تھا۔ دیر ہو رہی تھی۔ لمحہ لمحہ میرے اعصاب پر گراں گزر رہا تھا۔ مجھ پر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت میں

اس کی آواز خاصے فاصلے سے ابھری، ''آ گے آ جاؤ..... اِدھر؛ میرے پیچھے پیچھے۔ اِدھر موڑ بھی ہے، خیال رکھنا۔''

میں نے اسما کو بانہیں آگے کی طرف پھیلا کر چلنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم موڑ مڑ کر نسبتاً تنگ جگہ پر پہنچ گئے۔ ہم سے چند قدموں کی دوری پر برکت کی آواز ابھری، ''چلتے آؤ۔ اِدھر چھوٹی سی سیڑھی ہے۔ سیڑھی چڑھ کر اوپر آ جانا اور سرنگ سے نکلنے کے بعد ڈھکن رکھ دینا۔''

جونہی میں نے اسما کے بعد سیڑھی پر پاؤں رکھا، اچانک اندھیرے کا تسلط ٹوٹ گیا مگر ہاتھ کو ہاتھ پھر بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ پانچ سات زینوں والی سیڑھی کا اختتام ایک گول ڈھکن دار دہانے پر ہوا جسے برکت مسیح نے ٹٹول کر کھولا تھا۔ جونہی میں اسما کو لئے باہر نکلا، مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ پھیپھڑے ایک دم پھول گئے۔ میں نے چند زور زور کی سانسیں لیں۔ یوں لگا جیسے موت کی گپھا سے نکال کر میں زندگی کے شاداب راستے پر اچانک گامزن ہو گیا تھا۔ سرنگ کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکلنے پر دھندلی چاندنی بھی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تھی۔

سرنگ کا دہانہ ایک چھوٹی سی گھنی اور خاردار جھنگی میں کھلا تھا۔ ایسی کئی جھنگیاں نور پور کے قریب سے گزرتی ہوئی نہر پر موجود تھیں۔ میں نے برکت کی ہدایت کے مطابق بھاری ڈھکن کو کھسکا کر دہانے پر رکھ دیا۔

ایسے ہی وقت میں حویلی کی جانب سے پکی رائفل کے فائر کی تیز اور گونج دار آواز کانوں پڑی۔ پولیس اپنے پیشہ وارانہ انداز میں مائیکروفون پر 'وارننگ' دینے کے بعد مایوس ہو گئی تھی اور اپنی دی ہوئی دھمکی پر عمل پیرا ہو گئی تھی۔

میں نے اِردگرد دیکھا اور اسما کا ہاتھ پکڑے جھنگی سے باہر آ گیا۔ پیروں میں کئی کانٹے اور سوکھی ٹہنیاں چبھی۔ اتفاق سے اسما محفوظ رہی تھی کیونکہ اس کے حلق سے کوئی سسکی نہیں نکلی تھی۔ جھنگی کے باہر کہیں برکت مسیح دکھائی نہیں دیا تو میں نے تیز سرگوشی میں پکارا، ''برکت مسیح! تم کہاں ہو؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے دو تین مرتبہ آواز دی مگر جواب ندارد۔ سمجھ میں آیا کہ اس نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، مجھ پر اعتماد نہ کرتے ہوئے بھاگ نکلنے یا چھپ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چونکہ میں نے اُسے نہ مارنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، اس لئے میرے لبوں پر بے معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور میں نے اسما کا بازو پکڑ لیا۔

وہ سہمے سہمے لہجے میں بولی، ''اب کیا ہوگا؟''

شاید برکت کے غائب ہونے پر اس کے دماغ میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اس کے بغیر ہم آگے نہیں جاسکیں گے۔

میں نے کہا، ''اسے جانا ہی تھا، سو چلا گیا۔ چلو! ہمیں جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا ہے۔''

وہ بولی، ''تم کون ہو اور مجھے وہاں سے کیوں نکال کر لائے ہو؟'' وہ اپنا بازو چھڑائے بغیر بولی۔

''بتا دوں گا..... سب کچھ بتا دوں گا۔ تھوڑا صبر کرو۔'' میں نے کہا۔ میں اس دوران ماحول کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ہم نور پور کی مغربی جانب سے گزرتی ہوئی نہر کی پٹڑی کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ اگر اسما میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ایک لمبا چکر کاٹ کر سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کی طرف بڑھ جاتا اور پولیس کے جاتے ہی سائیں نورن آغا پر دھاوا بول دیتا۔ اب وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا ضروری تھا ورنہ بعید نہ ہوتا کہ اُسے نور پور کے کتے اُدھیڑ دیتے یا وہ پھر سردار یار ن خان کے ہتھے چڑھ جاتی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔

میں نے کہا، ''اسما! کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم کہاں جاؤ گی؟''

اچانک فضا لگاتار فائرنگ کی خوف ناک آواز سے لرز اُٹھی۔ لگتا تھا کہ پولیس نے اپنا سارا زور نظر نہ آنے والے خطرناک ڈاکوؤں کو مار ڈالنے پر صرف کر دیا تھا۔ اسما نے شاید میری بات سنی ہی نہیں تھی کیونکہ اس نے اپنے دونوں کانوں پر سختی سے ہاتھ جما رکھے تھے۔

اس علاقے کا چپہ چپہ میرا اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو مجھے سوجھ گیا کہ نہر کی پٹڑی پر چلتے ہوئے فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر نوری چوک والی پکی سڑک کو عبور کر کے ہم دو چار ایکڑ کے فاصلے پر بنے ہوئے نور پور کے قدیمی قبرستان میں پہنچ سکتے تھے جہاں ہمارے چھپنے کی کافی جگہیں موجود تھیں۔ دو تین بوڑھے برگد، خانزادوں کے دو کشادہ مقبرے اور کئی گھنی جھنگیاں ہمیں باآسانی پولیس کی نظروں سے چھپا سکتی تھیں۔ میں نے ادھر کا قصد کیا۔ اسما تیز نہیں چل سکتی تھی مگر میرے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اس کی سانسیں بھی پھول گئی تھیں۔ جونہی میں نے دونوں اطراف، احتیاط سے دیکھ بھال کر سڑک عبور کی، حویلی سے گونجنے والی فائرنگ تھم گئی۔ پولیس والے مایوس ہو گئے تھے، سرکاری امونیشن کا خاتمہ بالخیر ہو گیا تھا یا برکت مسیح نے واپس پہنچ کر مطلع کر دیا تھا کہ میدان خالی ہو چکا تھا۔

اسما پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی، ''یہ کون سا علاقہ ہے؟''

میں چونکا۔ اس کے بے ساختہ سوال نے عقدہ کھولا کہ اسے علم ہی نہیں تھا کہ یارن خان نے اسے اپنی نور پور والی حویلی میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا، ''یہ تمہارا اپنا علاقہ ہے۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ بولی، ''کیا مطلب؟ کیا میں.....''

میں نے بات کاٹی، ''رُکے بغیر چلتی رہو۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر بتاتا ہوں۔''

وہ خاموشی سے چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ہم کانٹے دار جھاڑیوں اور قبروں سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے سردار حیات خان کے خاندانی مقبرے میں پہنچ گئے۔ باہر یخ بستہ ہوا بدن چیرتی تھی۔ اندر کا ماحول قدرے گرم تھا۔ سکھ کی سانس آئی۔ یہ چودہ فٹ کا مربعی کمرہ تھا جس میں اوپر کے ہاتھ تین جبکہ دروازے کی جانب دو پختہ قبریں تھیں۔ قبروں پر سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ اس گنبد والے مقبرے کی مغربی جانب والی کھڑکی سے چاندنی چھن کر اندر آ رہی تھی جس کی وجہ سے ہم نہ صرف قبروں کو بلکہ ایک دوسرے کے ہیولائے ہوئے جسموں بھی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے اُسے ایک قبر پر بٹھایا۔ مقابل میں دوسری قبر پر خود بیٹھ گیا۔ سنگ مرمر برف کی سل کی طرح سرد تھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں بولا، ''ہم اطمینان سے کچھ وقت یہاں گزار سکتے ہیں، باتیں کر سکتے ہیں۔''

وہ خوف اور سردی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''اِس قبرستان میں باہر کی چیزیں نہیں ہوتیں؟''

قبرستان کو مقامی لوگ 'قبرگستان' کہتے تھے۔ باہر کی چیزوں سے اسما کی مراد جن بھوت تھے۔ میں نے کہا، ''نہیں۔''

میرا جی تو چاہا کہ اُسے بتاؤں کہ اس قبرستان میں میرا، دیوانے اور کھالے کے بچپن اور لڑکپن 'لکن میٹی' اور 'چھپن چھپائی' کھیلتے گزرے ہیں۔ یہاں ہم رات گئے تک بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے، نوٹنہی اور بارہ ٹہنی کھیلا کرتے تھے اور ایک ایک درخت پر چڑھ کر نور پور کا فضائی نظارہ کیا کرتے تھے۔ لوگوں کا عام خیال تھا کہ اس قبرستان میں نادیدہ مخلوقات اور چھل پیریاں رہتی ہیں۔ چھل پیری کی اصطلاح الٹے پیروں والی چڑیل کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ ہم نے ہر اُس وقت، جب لوگوں کے خیال میں ادھر کا رُخ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا تھا، قبرستان میں چہل قدمی کی تھی اور پایا تھا کہ یہاں کوئی ایسی ویسی مخلوق مقیم نہیں تھی۔

لوگوں کا خوف بلا جواز اور سنی سنائی باتوں کا تخلیق یافتہ تھا۔

زمین نے اپنی تمام تر خنکی میرے ننگے پیروں میں اُتار دی تھی۔ شکر تھا کہ کوئی بڑا کانٹا یا کانچ کا ٹکڑا پیروں تلے نہیں آیا تھا ورنہ بہت گڑ بڑ ہو جاتی۔ البتہ میری پنڈلی اور بازو میں تیز درد ہو رہا تھا۔ کس کر باندھی ہوئی میز پوش کی پٹیوں کی وجہ سے بازو اور پیر کے دورانِ خون میں بھی گڑ بڑ پیدا ہو چکی تھی۔ حویلی میں گزرنے والے قیامت آگیں لمحات میں مجھے اپنے زخموں اور زیادہ کس کر بندھی ہوئی پٹی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اطمینان کی چند گھڑیاں نصیب ہوئیں تو میں نے جھک کر پنڈلی کی پٹی کھول دی۔ یک لخت پاؤں من بھر کا ہو گیا اور کتے کے دانتوں کے زخموں سے ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔

میری سسکی سن کر اسما بولی، ''کیا یہاں گولی لگی ہے؟''

اس کی آواز جذبات سے عاری تھی۔

''نہیں! خان کے راکھویں (پالتو) کتوں نے کاٹا ہے۔'' میں نے بتایا۔ چاند کی ناکافی روشنی میں زخموں کو دیکھنے کی کوشش عبث تھی۔ اس لئے میں نے محض ہاتھوں سے ٹٹول کر خون کے بہاؤ کا اندازہ کیا۔ تسلی ہوئی کہ جمے ہوئے خون نے تازہ خون کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ حوصلہ ہوا تو میں نے بازو کی پٹی بھی کھول دی۔

اسما بغور مگر نیم دلی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ چبھتی ہوئی آواز میں بولی، ''تم مجھے کیوں ادھر لائے ہو؟''

میں نے سر اُٹھایا۔ اُسے دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی اس کے نچلے دھڑ پر پڑ رہی تھی۔ اس نے پھول دار فیروزی کرتا اور میچنگ شلوار پہنی تھی۔ دوپٹہ نہیں تھا۔ اندھیرے میں اس کے خال و خد اور رنگت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں جواب دیا، ''اسما! مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں اپنے آدمیوں کی تلاش میں حویلی گیا تھا۔ وہ نہیں ملے، تم نظر آ گئیں۔ سوچا؛ تمہیں اس خبیث کی قید سے آزاد کرانے کا ثواب حاصل کر لوں۔ بھلا کیا، یا برا؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

اسے میرا بے پروا جواب عجیب لگا۔ الجھ کر مستفسر ہوئی، ''تم یہ کیوں نہیں بتاتے ہو کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟..... نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے تمہاری آواز پہلے بھی کہیں سن رکھی ہے۔''

میں ہنگامی حالت سے برسرِ پیکار ہونے کے سبب بھول گیا تھا کہ میں مسلسل اپنے اصل لب و لہجے میں بولتا چلا آ رہا تھا۔ میرا گیٹ اَپ اور تھا، میرا لہجہ اور۔ میں نے کہا، ''ہوسکتا ہے؛ تم نے مجھے کہیں بولتے سنا ہو۔ ویسے بھی دنیا میں ان گنت لوگوں کی آوازیں ملتی جلتی ہیں۔''

وہ بولی، ''نہیں..... میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم شکل سے پٹھان لگتے ہو جبکہ ٹھیٹھ سرائیکی بولتے ہو۔ تبھی مجھے عجیب سے لگتے ہو۔''

میں نے کہا، ''میں پٹھان نہیں ہوں۔ شاید داڑھی اور آنکھوں کی رنگت کی وجہ سے پٹھان لگتا ہوں۔ بہرحال میری چھوڑو، اپنی کہو..... تمہیں کہاں پہنچاؤں۔ گھر؟''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ سر جھک گیا۔ بڑبڑائی، ''گھر.....'' پھر تھوڑے توقف کے بعد میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال پوچھنے لگی، ''میں نے پوچھا تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے؟''

میں نے کہا، ''تمہیں جس حویلی میں یارن خان نے قید کر رکھا تھا، وہ نور پور کی مشہور حویلی تھی۔ اس حویلی کے سامنے سرکاری ہسپتال واقع ہے۔ شاید تم نے دیکھا ہو؟'' میں نے ارادتاً اسے یاد نہیں دلایا کہ وہ اس ہسپتال میں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس بیماری کی حالت میں لائی گئی تھی، ''اور جہاں ہم بیٹھے ہیں، یہ نور پور کا قدیمی قبرستان ہے۔ یہ خانزادوں کا چھوٹا مقبرہ ہے۔ بڑا اس کے عقب میں راستے کی سیدھ پر واقع ہے۔ بعید نہیں کہ یہ قبریں تمہارے باپ داداؤں کی ہوں۔''

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ بے چین ہوگئی۔ بولی، ''نور پور؟ اوہ..... یہ تو واقعی میرا اپنا علاقہ ہے۔ قریب میں میرا گھر ہے۔ بلوچ نگر میں۔''

''میں جانتا ہوں۔ تم سردار حیدر خان کی بیٹی ہو۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''حیدر خان کو کون نہیں جانتا۔ اسمبلی کا ممبر ہے۔ بہت بڑا زمیندار ہے۔'' میرے لہجے میں از خود زہر گھل گیا مگر میں نے اپنے اندر کا زہر اندر ہی روک لیا۔

''تم مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔'' وہ اچانک منت آمیز لہجے میں بولی، ''دیکھو! میں بابا سے کہہ کر تمہیں نہ صرف پولیس سے بچا دوں گی بلکہ منہ مانگا انعام بھی دلواؤں گی۔ پلیز!''

میرے لبوں پر نفرت آمیز مسکراہٹ ناچی۔ میں نے کہا، ''مجھے کوئی انعام شنام نہیں

چاہیے۔ فکر نہ کرو، تمہیں بلوچ نگر پہنچانے کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ میں تمہیں سردار دریام خان کی حویلی کے دروازے پر چھوڑ دوں۔ وہ تمہیں گاڑی میں بٹھا کر بلوچ نگر پہنچا دے گا یا کارڈلیس فون پر تمہارے باپ کو بلوا لے گا۔''

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، ''نن..... نہیں..... مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ سب دھوکے باز ہیں۔ سب بھوکے کتے ہیں۔ تم مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

میرے ہونٹ بھنچے۔ بات لبوں پر آئی، 'ان سب سے بڑا اور خونخوار کتا تو تمہارا باپ ہے'..... میں نے دل کی بات بدقت لبوں پر روک لی۔ کہا، ''نہیں اَسا! میرا کام ادھورا ہے۔ پولیس کے نکلتے ہی مجھے نور پور جانا ہے۔ بلوچ نگر جاؤں گا تو دیکھ لئے جانے کا خطرہ حد سے بڑھ جائے گا۔ پولیس مجھے تلاش کرتی پھرتی ہے۔ تمہیں نور پور میں کسی شخص پر تو بھروسہ ہوگا ناں؟''

اس نے سر اُٹھایا۔ بولی تو پتہ چلا کہ اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ نہ جانے کب سے رونا چاہ رہی تھی۔ رونے کا موقع نہیں پا رہی تھی۔ کچھ کہتے کہتے سسک پڑی اور گھٹنوں پر چہرہ رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے اسے غبار دل نکالنے کا بھرپور موقع دیا۔

کچھ دیر بعد از خود سنبھل گئی، بولی، ''نہیں..... سب کتے ہیں۔ ماں کا ماس کھاتے ہیں۔ بہن کو بھنبھوڑتے ہیں۔ بیٹی کے چیتھڑے اُڑاتے ہیں۔ سب بھوکے بھیڑیے ہیں۔ یارن خان رشتے میں میرا چاچا لگتا ہے۔ چاچا باپ جیسا ہوتا ہے مگر وہ ناہر (بھیڑیا) ہے جس نے انسانوں کی کھال اوڑھ رکھی ہے۔ اور..... اور اسی نور پور میں ایک بھولی اور معصوم صورت والا کتا بھی رہتا تھا۔ میں نے غلطی سے اُسے بھی انسان سمجھ لیا تھا مگر..... نہیں..... وہ بھی کتا نکلا۔ تم سے ہو سکے تو مجھے ہسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر چھوڑ آؤ۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھے ہی 'بھولی اور معصوم صورت والا کتا' قرار دیا تھا مگر میں نے اس کے ہسٹریائی بیان سے صرفِ نظر کیا اور اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد پاگلوں کے سے انداز میں دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی، ''مگر نہیں..... شاید وہ بھی..... ویسا نہ ہو جیسا دِکھتا ہے، تم مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ مگر نہیں..... بابا مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ وہ صبر کرے گا تو بھائی مار ڈالے گا۔ اگر کسی وجہ سے مجھے زندہ رکھنے کا فیصلہ کر بھی لیا گیا تو مجھے اگلا سورج طلوع سے پہلے پہلے کسی کے پلے باندھ دیا جائے گا..... ہائے میں کیا

کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں کہاں جاؤں؟..... بلوچ نگر والے منہ چھپا کر مجھ پر تھوکیں گے۔ خاموش آنکھوں کے تیروں سے میرا کلیجہ چھلنی کریں گے۔ ہائے! میں کیا تھی؛ مجھے قسمت نے کتنا گھٹیا اور سستا کر دیا۔''

اس کی ہمت جواب دے گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اُس کے گھٹنوں پر پڑے سر کو چھوا۔ زلفوں میں انگلیاں پھیریں۔ پیار سے سمجھایا، ''دیکھو اسا! تمہیں آخر اپنے گھر جانا ہے۔ آج نہیں تو کل؛ پرسوں؛ اپنے بابا اور بھائی کا سامنا تمہیں کرنا ہے۔ پھر آج ہی کیوں نہ یہ مرحلہ عبور کر لیا جائے۔ ہمت کرو؛ تم گھر سے بھاگی ہوئی نہیں ہو، اغوا کی گئی ہو، یہ بات سارا علاقہ جانتا ہے۔''

اس نے سختی سے سر کو ادھر اُدھر پٹخا، بولی، ''ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں تو کہیں کی نہیں رہی ناں۔ پَر جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ میں اپنی ماں کیلئے موتھی (اُداس) ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے بابا اور بھائی کو دیکھے صدیاں گزر گئی ہوں۔ بس تم مجھے میرے گھر پہنچا دو۔''

میں نے کہا، ''او کے! فکر نہ کرو؛ رو رو کر خود کو ہلکان نہ کرو اور اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ تمہیں کس نے اغوا کیا تھا اور اس حال تک کیسے پہنچیں؟''

اس کے بولنے سے پہلے نور پور کی جانب سے گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں سنائی دی۔ میں نے اُسے بولنے سے روک دیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئیں نور پور کی حدود سے نکل گئیں۔ قبرستان سڑک سے ذرا ہٹ کر واقع تھا۔ اس لئے میں نے مقبرے سے نکل کر سڑک کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ سوائے کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دیکھنے کے، کسی طرح بھی سڑک اور گاڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔ میرے اندازے کے مطابق گزرنے والی گاڑیوں کی تعداد تین تھی مگر یہ طے نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں یا غیر سرکاری۔

نور پور کی فضا شانت ہوگئی۔ روایتی سکوت ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تو اُسما بولی، ''میں کچھ نہیں بولوں گی، جب تک تم اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔ بولو! جس عورت اور بچے کو اس بڈھے کتے نے اغوا کرایا ہے، تمہارا اُن سے کیا تعلق ہے؟''

اس کا تجسس دیکھ کر میں عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ سچ بولتا تو میڈم شکیلہ کے ساتھ ساتھ میرے کردار پر پڑا ہوا دبیز پردہ فاش ہو جاتا۔ جھوٹ بولتا تو اسے مطمئن نہ کر پاتا۔ اگر میں اپنی زبان

پر قابو رکھتا تو وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ تہہ خانے کے عیش کدے کی روشنی میں پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔ اس مقبرے کے کمزور اندھیرے میں کیسے پہچان سکتی تھی۔ مجھے احتیاط سے کام لینا تھا کیونکہ وہ مجھ پر کسی حد تک اعتماد کرنے لگی تھی جبکہ 'شہریار' سے شدید نوعیت کی نفرت کرتی تھی اور اسے بھولی صورت والا کتا قرار دیتی تھی۔

اس سے زیادہ انتظار نہیں ہو پایا، بولی، ''سچ بولنے کے لئے سوچنا نہیں پڑتا۔ جھوٹ بولنے کے لئے دماغ میں کڑیاں جوڑنی پڑتی ہیں۔ میں مصیبت میں ہوں۔ عورت ذات ہوں۔ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر بھی تم سچ بولنے سے ڈرتے ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کیا بتاؤں؟ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ کریمنل لائف گزارتا ہوں۔ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا ہوں۔'' میں نے اپنے انداز میں بے ساختگی پیدا کرنے کی کوشش کی، ''تمہیں ایک دو مرتبہ ملتان میں دیکھا تھا۔ تب میں یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا۔ تم پہلی نظر میں مجھے اچھی لگی تھیں؛ اس لئے تمہاری کھوج میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ تم سے محبت کرنے لگا تھا مگر جب پتہ چلا تھا کہ تم بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہو تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا کیونکہ غریب آدمی دیکھنے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔ چاہنے کے جرم میں مارا جاتا ہے۔ اس علاقے میں اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔ اس لئے گلی کوچوں سے آگاہ ہوں۔ تمہارے باپ کے رعب اور دبدبے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا تبھی تمہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتا تھا اور اپنی محبت کو تھپکیاں دے کر سلا دیتا تھا۔''

وہ مزاحم ہوئی، ''ہونہہ..... محبت! یہ بکواس ہے۔ مگر میں نے یہ تو نہیں پوچھا تھا؟''

''ہاں! تم نے یہ پوچھا تھا کہ جن لوگوں کو یارن خان نے اپنی قید میں رکھا ہوا ہے، وہ کون ہیں؟ بتاتا ہوں۔ وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ میرے ایک بھائی بند کے سگے ہیں۔ ایک ماں ہے؛ دوسرا بھائی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور مایوسی آمیز لہجے میں بولی، ''نہیں..... یہ کہانی جھوٹ پر مبنی ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ کوئی اپنے کولیگ کے لئے اتنا تردد نہیں کرتا۔''

مجھے ایک ذرا شرمندگی ہوئی، کہا، ''وہ میرے کام آتا ہے اور میں اس کے۔ میں جس دنیا میں سانسیں لیتا ہوں، اس میں میوچل سسٹم کے تحت لین دین ہوتا ہے۔''

وہ مطمئن ہوئی یا نہیں، کندھے جھٹک کر بولی، ''ہوگا..... تمہارا نام کیا ہے؟''

مجھے اس سوال کی توقع تھی تبھی جلدی سے بولا، ''میرا نام ظفر ہے۔ ظفر اقبال۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد اپنے بارے میں بتاؤ تاکہ میں تعین کرلوں کہ مجھے تمہارے لئے کیا کرنا ہے اور کیسے تمہیں بلوچ نگر پہنچانا ہے۔''

وہ چند لمحوں تک لب بستہ مجھے تکتی رہی پھر لمبی سانس لے کر بولی، ''ظفر! تم بہت اچھے ہو۔ تمہیں کچا ماس ترغیب نہیں دیتا کیونکہ تم دوسروں کی طرح بھوکے نہیں ہو۔ میری کہانی مختصر سی ہے۔ مجھے ایک کتے نے اس لئے اغوا کیا کہ اُسے شبہ تھا کہ میرے بابا نے اس کی بہن کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے لئے قید کر رکھا تھا۔ تم اُس کتے کو دیکھو تو کبھی میری بات کا اعتبار ہی نہ کرو۔ دیکھنے میں بڑا معصوم ہے۔ اس کا نام شہریار ہے مگر لوگ اسے 'شہرا' کہہ کر پکارتے ہیں۔ ادھر نور پور میں اس کا گھر ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اس نے درست کہا تھا مگر اس کی بہن بابا کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔''

میں نے بے اختیار اس کی بات کاٹی، ''جب اُس نے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے تمہیں اغوا کیا یا کرایا تو تم اُسے کتا کس طرح کہہ سکتی ہو؟''

''کیا اُس کا انتقام مجھے بے عزت کر کے پورا ہو سکتا تھا؟ میں نے اُس کا کیا بگاڑا تھا؟ اگر وہ مرد تھا، غیرت مند انسان تھا تو میرے بابا کا گریبان پکڑتا۔ اُسے گلیوں میں گھسیٹتا۔ بھلے خون میں نہلا دیتا۔ میں اُسے کتا نہ کہتی۔'' اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ تازیانے کی طرح میرے دل و دماغ پر پڑ رہے تھے، ''ظفر! وہ بزدل کتا تھا۔ اس میں اور تجھ میں یہی فرق ہے کہ وہ کتا تھا، تم انسان ہو۔ اگر تم چاہو تو مجھے چند ٹکوں کے عوض کسی بڑے کتے کے ہاتھ بیچ سکتے ہو، جیسا کہ اُس نے کیا مگر تم مجھے گندا ہاتھ لگائے بغیر میرے گھر پہنچانے کے لئے فکر مند ہو۔ وہ ایسا نہیں تھا۔''

وہ روہانسی ہو گئی۔ کافی دیر سر جھکائے بیٹھی رہی، پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولی، ''اس نے اپنی مالکن کو خوش کرنے کے لئے مجھے آزاد کرنے کے بجائے ایک اور گندے کتے کے ہاتھ بیچ دیا۔ یوں میں بے ہوشی کی حالت میں ملتان سے لاہور کے کسی نواحی قصبے میں پہنچا دی گئی جہاں ہر شام کو ایک بدصورت نوکرانی مجھے نہلا دھلا کر، عروسی لباس پہنا کر دلہن بناتی اور رات کے اندھیرے میں میاں دلبر اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا شیطان کی طرح آن وارد ہوتا۔ وہ شیطان، وہ مردود، کتا..... میرے باپ کی دوستی کی مالا جپتا تھا، قہقہے لگاتا تھا اور رات بھر مجھے

باؤلے کتے کی طرح بھنبھوڑتا رہتا تھا۔''

اس کی آواز لرزنے لگی۔ ستم رسیدگی لبوں پر جم کر لفظوں کی راہ مسدود کرنے لگی۔ بے بسی نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ توقف کے بعد اپنی ہمت یکجا کر کے بولی، ''ظفر! سن رہے ہو ناں؟ میں مرنا چاہتی تھی مگر اس کمینے نے مجھے اس طرح بے بس کر رکھا تھا کہ میں زندہ رہنے پر مجبور تھی۔ مجھے اپنی سانسوں پر بھی اختیار نہیں تھا۔ پھر ایک رات اس محل نما کوٹھی پر بری بری شکلوں اور غنڈوں جیسے حلیوں والے ان گنت کتوں نے دھاوا بول دیا۔ اس رات میاں دلبر اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اُن غنڈوں نے کوٹھی میں موجود بدشکل نوکرانی اور تین پہرے داروں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ میں وہ منظر اپنی آنکھوں دیکھتی رہی جس میں چار لاشیں تڑپ تڑپ کر خون کے چھینٹے فرش پر مار رہی تھیں۔ ہائے! کتنا وحشت ناک منظر تھا۔ کاش مجھے قسمت نے یہ سب کچھ نہ دکھایا ہوتا۔''

وہ بتاتے بتاتے جھرجھری لے کر تھم گئی۔ چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے نفی میں سر ہلاتی رہی، پھر حوصلہ کر کے بولی، ''وہ غنڈے مجھے ایک بڑی ویگن میں ڈال کر لاہور شہر میں لے گئے۔ میں ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں پہنچ گئی۔ پھر ایک شام میری نس میں کوئی دوا انجیکٹ کی گئی۔ میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو اس بڈھے کتے کے کمرے میں تھی۔ اب تک یہی سمجھتی رہی ہوں کہ میں لاہور یا اس کے مضافات کے کسی آسیبی کمرے میں پڑی ہوں۔ آج پتہ چلا کہ مجھے میرے ہی علاقے میں رکھ کر بے آبرو کیا جاتا رہا ہے۔ جبڑوں کی تبدیلی میرے ماس کے لئے اہم نہ رہی۔ پہلے کتے نے میری مزاحمت کی دیواریں پاش پاش کر دی تھیں۔ دوسرا ہوس کا مارا ہوا بڈھا کتا تمام دن اور رات مجھے ننگا رکھتا تھا۔ لباس نہیں پہننے دیتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں کسی تہہ خانے میں ہوں۔ زندہ رہتے ہوئے زیرِ زمین تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ قبر میں مردے پر عذاب اُترتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ قبر اس تہہ خانے سے کم ڈراؤنی ہوتی ہے۔ نہ دن کا پتہ چلتا تھا، نہ رات کا۔ بے غیرت کہیں کا..... کبھی مجھے ہوس بھری نظروں سے دیکھتا رہتا، کبھی بھوکے درندوں کی طرح روندنے لگتا۔ جسم تو جسم رہا، ان دونوں کتوں نے تو میری روح بھی چھید چھید کر لہولہان کر دی ہے۔ ظفر! سچ کہتی ہوں؛ مجھے زندہ نہیں رہنا۔ میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا تھا جس کی مجھے اتنی بھیانک سزا ملی ہے۔ کاش! میں یوں بے عزت نہ ہوئی ہوتی اور مر گئی ہوتی۔ کسی ٹرک کے نیچے آ کر کچلی گئی ہوتی.....''

اس پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تو میں نے جلدی سے اس کی باہیں پکڑیں اور جھنجوڑ دیا۔ کہا، ''دیکھو اسا! جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ وقت کبھی ریورس نہیں ہوتا۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ امید ہے کہ سمجھانے سے سمجھ جاؤ گی۔ میں کہتا ہوں کہ انسان کی عزت کوئی صحن میں لگے بیری کے درخت جیسی نہیں ہوتی کہ کوئی آیا اور کاٹ کر لے گیا۔ نہ ہی یہ لباس اور بدن کے سہارے سانسیں لیتی ہے۔ عزت کا تعلق تو نیت اور روح سے ہوتا ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا اور یقیناً تمہارا منہ کالا نہیں ہوا۔ ہاں! میاں دلبر اور یارن خان نے اپنے چہرے ضرور کالے کئے ہیں۔ ان کی عزت ان کے اپنے ہاتھوں لٹی ہے ناں کہ تمہاری۔ کیونکہ جس بُرے عمل میں تمہاری مرضی شامل نہیں ہے، وہ تمہارے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ تم نے ظلم نہیں کیا اور خدا ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیتا ہے، کسی ظالم کا نہیں۔''

اس نے سر اُٹھایا اور عجیب نظروں سے گھورنے لگی، بولی، ''تم پڑھے لکھے ہو؟''

میں نے بغلوں میں ہاتھ دابے اور ٹھنڈی آہ بھری، ''ہاں! تبھی ایسی باتیں کر رہا ہوں جو عام آدمی نہیں کرتا۔ میرا مشورہ مانو، فضول تخفظات سے دامن چھڑاؤ اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ تم پر کوئی انگلی نہیں اُٹھائے گا۔ جب تک تم کسی کو نہیں بتاؤ گی کہ میاں دلبر اور یارن خان نے تمہارے ساتھ کیا کیا، تب تک کوئی تمہیں برا نہیں کہے گا۔ رُوح پر لگے چرکے بدن پر دکھائی نہیں دیتے۔ تمہارے باپ کا اس علاقے میں بڑا نام اور دبدبہ ہے۔ سادہ لوح دیہاتی لوگ اس بات پر یقین کریں گے جو تم کرو گی۔ اسی کہانی کو صدقِ دل سے مانیں گے جو تم اپنی زبان سے بیان کرو گی۔ او کے؟''

وہ اضطراب اور دکھ کے خطرناک مرحلے سے گزر چکی تھی اس لئے حقیقت کو تسلیم کر کے حالات سے مفاہمت کی راہ پر چل پڑی اور تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولی، ''ٹھیک ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ کہیں اور نہیں رہ سکتی سوائے اپنے گھر کے۔ گھر والے جو بھی سلوک کریں گے؛ مجھے بھگتنا ہوگا۔ چلو! مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ میں نے تمہاری بات مانی۔ تم میری مانو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں پورے یقین سے کہتی ہوں کہ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔''

رات بہت سرد تھی۔ مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اَب تب میں بخار ہونے والا ہو۔ مجھے اپنی بے بسی اور کسمپرسی کی وہ رات یاد آ گئی جو میں نے حیدر خان کی بیلے والی حویلی سے نکل کر مین روڈ تک گزاری تھی۔ بدن کو جھرجھری سی آ گئی۔ اسا کو بھی سردی لگنے لگی تھی کیونکہ

اس نے نہ صرف اپنے گھٹنے اکٹھے کر لئے تھے بلکہ دونوں ہاتھ بھی بغلوں میں دبا رکھے تھے۔

میں نے یاد دِلایا، ''میرا کام ادھورا ہے۔ اُسے نمٹائے بغیر واپس جا سکتا ہوں اور نہ تمہیں بلوچ نگر پہنچا سکتا ہوں۔ تم سوچ کر بتاؤ، میں تمہیں نور پور کے کس گھر میں پہنچا کر اپنی راہ لوں؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ چند منٹ سوچتی رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی، ''ادھر.....نور پور میں.....ایک آدمی رہتا ہے۔ خالد عرف کھالا۔ یارن خان کی حویلی کے پاس ہی اس کا چھوٹا سا گھر واقع ہے۔ بس تم مجھے اس تک پہنچا دو۔''

مجھے جھٹکا لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے نزدیک بھرے نور پور میں وہی ایک قابلِ اعتبار شخص تھا۔ بے ساختہ دریافت کیا، ''کیا تم بخشو لوہار کے پتر کی بات کر رہی ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر متردّد انداز میں بولی، ''وہ ملتان میں تھا۔ نہ جانے گھر آ گیا ہے یا نہیں۔''

میں نے اس کی بات مان لی اور کہا، ''ٹھیک ہے۔ میں اس کے گھر جاتا ہوں۔ اُسے کہتا ہوں کہ وہ کسی سواری کا انتظام کر لائے۔ تب تک تم ادھر ہی چھپی رہو۔''

وہ گھبرا گئی، جلدی سے بولی ''نہیں..... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ وہ اس وقت مجھے بلوچ نگر نہیں پہنچا سکے گا اس لئے میں باقی رات اس کے گھر گزار لوں گی۔''

میں اسے ساتھ لے کر نور پور نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس وقت پورا نور پور جاگ رہا ہوگا۔ لوگ خانزادوں کے داروں پر مجتمع ہوں گے اور قیاس کے گھوڑوں کو ایڑ لگا رہے ہوں گے۔ اگرچہ پولیس واپس جا چکی تھی مگر اس واقعے پر تبصروں کا بازار ابھی پورے جوبن پر ہوگا۔ میں نے اسے اپنے تحفظات سے آگاہ کیا۔ وہ میری پریشانیوں کو سمجھ گئی۔ بولی، ''مگر مجھے یہاں ڈر لگے گا۔ یہ قبرستان ہے۔''

میں نے نہ صرف اُسے بلکہ خود کو بھی آسان کرنے کے لئے ہنس کر کہا، ''ابھی تم مرنے کی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں۔ اب تم موت سے ڈرنے لگی ہو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر.....''

''تھوڑی دیر کی بات ہے۔ مانتا ہوں کہ تم خوب صورت ہو، جوان ہو مگر اس مُردوں کے شہر میں کسی میں اتنا دَم نہیں کہ قبر سے نکل کر تمہیں دیکھنے آئے۔''

اس پر میرے مذاق کا ذرا بھر اثر نہ ہوا۔ سمجھایا، ''دیکھو! میں اسے لے کر چند ہی منٹوں میں

یہاں پہنچ جاؤں گا۔ یہاں ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہے یعنی کوئی جن بھوت نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی من گھڑت باتیں ہیں۔''

میرے لہجے میں تیقن پنہاں تھا۔ اس کا کندھا تھپتھپایا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ بولی، ''میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم نے..... تم نے مجھے زندہ درگور ہونے سے بچایا ہے۔''

مجھے شرارت سوجھی، ''اس کی قیمت مجھے مل گئی ہے۔ اس لئے زیادہ احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

وہ چونکی، ''کیا مطلب؟ کیسی قیمت؟''

میں نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا اور کہا، ''جس انسان سے زندگی میں کبھی محبت کی ہو، اسے حادثاتی طور پر پورے کا پورا دیکھ لیا جائے تو ریاضت سے چوگنی قیمت ادا ہو جاتی ہے۔''

میرا مقصد محض اُس کا ذہن بدلنا تھا۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر ٹھٹکی، شرمسار ہوئی پھر میرے ہاتھوں کو سختی سے تھام کر بولی، ''اوہ! مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو تمہارا سامنا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ اف مائی گاڈ!'' اس کا لہجہ بڑا درد بھرا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیے اور ایک مجنونانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے کندھے سے لگی ہوئی گن اُسے چبھی۔ ہاتھ سے پرے ہٹا کر بولی، ''تم انسان نہیں ہو، فرشتہ ہو۔ فرشتہ۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔ آئی لو یو ظفر..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم کیا ہو؟ مجھے تو بس یہ یاد رہے گا کہ میری باقی زندگی تمہاری رہین ہے۔''

وہ پوری قوت سے مجھے بھینچ کر ممنونانہ جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ مجھے اس کی حالتِ زار پر ترس آیا۔ اگر وہ جان جاتی کہ میں ظفر نہیں، شہریار ہوں، وہی، جو اس کی دانست میں کتا تھا، تو اس کی حالت کیا ہوتی۔ نازوں پلی، پھولوں بڑھی خانزادی اس وقت کتنی عام لگ رہی تھی۔ اس کا شاہانہ رکھ رکھاؤ، ناز و نخرہ ہوا ہو گیا تھا۔ بناوٹ کی تہیں اُتر جائیں تو انسان بڑا خوب صورت دکھائی دینے لگتا ہے۔

میں نے بڑی آہستگی سے اُسے خود سے علیحدہ کیا اور لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر کہا، ''اسما! تم عام نہیں ہو۔ خاص ہو۔ خاص لوگوں کا رویہ عامیانہ نہیں ہوتا۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا

کہ تم مجھے فرشتہ کہو۔ میں عام اور گنہ گار انسان ہوں۔ بس!''

اس نے بڑے غور سے مجھے سنا۔ دیکھا بھی۔ پھر نفی میں سر ہلا کر بولی، ''نہیں! تم بہت عظیم ہو۔ مگر مجھے تمہاری آواز کیوں شناسا لگتی ہے۔ پر تم نے بتایا ہے کہ تم نے مجھے ملتان میں دیکھا تھا۔ شاید میں نے بھی تمہیں وہیں دیکھا ہو۔''

اس کا بیان خود کلامی میں بدل گیا تو میں مقبرے سے نکل آیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کے پاس بیٹھا رہوں، اسے سنتا رہوں، اپنی سناتا رہوں مگر مجھے دن چڑھنے اور اپنے مطلوبہ مغویوں کا ٹھکانہ بدل دیے جانے کا خوف لاحق تھا۔ تبھی تیز تیز قدموں سے پگڈنڈیاں عبور کرتا ہوا شیرے قصائی کے گھر کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ میں نے دانستہ اس راستے کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اس پر درختوں کی تعداد قدرے زیادہ تھی تاکہ میں دور سے دیکھا نہ جاسکوں۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میری مڈبھیڑ کتوں سے نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اُٹھا دیتے اور نور پور کے نیم خوابیدہ لوگوں کو خبردار کر دیتے۔

شیرے قصائی کے پچھواڑے کی زمین امان اللہ قریشی کی ملکیت تھی۔ اس نے یہاں کماد کاشت کر رکھا تھا۔ مشرقی آخری کھیت میں گڑ بنانے کا بیلنا اور کڑاہ وغیرہ لگا رکھا تھا۔ وہ ہر سیزن پر کافی سارا گڑ بنوایا کرتا تھا۔ سبھی لوگ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے گڑ خرید لیا کرتے تھے۔ گاؤں کے سبھی گھروں میں گڑ کا استعمال عمومی طور پر بہت زیادہ تھا۔ یہ نہ صرف روز دہکائی جانے والی حقے کی چلموں میں ڈالا جاتا تھا بلکہ مویشیوں کی خوراک کا لازمی جزو بھی تھا۔ کئی بیماریوں میں مال ڈنگر کو کھلانا پڑتا تھا۔ اکثر گھروں میں چائے میں چینی کی جگہ پر گڑ ڈالا جاتا تھا جس سے چائے زیادہ ذائقہ دار ہو جاتی تھی۔ میں کماد کی خشک کھوری پر چلتا ہوا بیلنے کے قریب پہنچا۔ کان لگائے۔ اندازہ ہوا کہ گاؤں جاگ رہا تھا۔ لوگوں کی ملی جلی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ طے تھا کہ اگر مجھ پر کسی کی نظر پڑ جاتی تو پھر میری خیر نہیں تھی۔

شیرے قصائی کے پچھواڑے کی نکڑ سے جھانک کر دیکھا۔ حیات خان کے دارے کی بتیاں روشن تھیں۔ میرے سامنے پکی سڑک تھی جس کے پار دکانوں کی قطار تھی۔ بخشو لوہار کا سنسان چھپر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نظر بچا کر کھالے کے دروازے تک پہنچ سکتا تھا مگر دستک دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ دستک کی آواز سے آس پاس کے تمام لوگ چونک جاتے اور

مجھے کھالے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر قیامت بپا کر دیتے۔ دیوار پھاندنے کے لئے بھی مجھے دروازے کی طرف ہی جانا تھا۔ اگر میں چھپر کے ذریعے دکان پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو چھپر کے زمیں بوس ہونے کا خدشہ تھا۔

تھوڑی دیر انتظار کے بعد میں نے موقع دیکھ کر کرگزرنے کا فیصلہ کیا اور دوڑتا ہوا سڑک عبور کر کے چھپر کے نیچے پہنچ گیا۔ یہاں سے حیات خان کے دارے کے اندر جھانکا جا سکتا تھا۔ دارے کے مہمان خانے کی ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ یقیناً یارن خان کی حویلی پر ہونے والا ڈاکوؤں کا حملہ اور پولیس کی اندھا دھند فائرنگ زیر بحث ہوگی۔ برآمدے اور لان میں کوئی نہیں تھا۔ موقع اچھا تھا۔ میں کھالے کی دیگن اور دیوار کے بیچ بلی کی پھرتی سے چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ دستک دینے میں احتمال تھا اس لئے میں چکنی مٹی کی بنی ہوئی نسبتاً کم بلند دیوار پھاند گیا۔ صحن حسبِ توقع خالی تھا جبکہ کھالے کے کمرے میں نیچی وٹ پر لالٹین جل رہی تھی جس کی پیلی روشنی دیسی طرز کے چوبی دروازے کی درزوں سے جھلک رہی تھی۔

میں دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے پر آیا۔ ایک بڑی درز سے جھانک کر دیکھا۔ کمرے میں کھالا اکیلا نہیں تھا۔ کوئی اور، شاید بلو یا غفوراں عرف پھوری، یا پھر شیدو برابر کی چارپائی پر لحاف میں دبکا ہوا تھا۔ میں نے انگلی سے دروازہ بجایا۔ دو تین مرتبہ مدھم دستک دی۔ کھالا بیدار ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے سرگوشی کی، ''کھالے! میں شہرا ہوں۔ دروازہ کھولو۔''

میری آواز اس کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ چھلانگ لگا کر بستر سے نکلا اور جھٹ سے دروازہ کھول کر متفکر انداز میں بولا، ''شہرے تم؟ اس وقت؟ خیر تو ہے؟''

میں نے اُسے بازو سے پکڑا اور دکان میں لے گیا۔ نہایت کم بلند آواز میں بتانے لگا، ''خیر ہے بھی، اور نہیں بھی۔ تم نے مجھے خانزادی کا گلہ دیا تھا۔ آج اُس تک میرا ہاتھ پہنچ گیا ہے اور میں یارن خان کی حویلی سے اُسے نکال لایا ہوں۔ وہ بہت بری حالت میں ہے۔''

'کک..... کیا..... تو ہوش میں تو ہے ناں؟'' وہ بوکھلا گیا، ''تم نے تو کہا تھا کہ وہ میاں دلبر حسین کے پاس ہے۔ اب یارن خان کا نام لے رہے ہو۔ یہ کیا قصہ ہے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں سناؤں گا۔ فی الحال تم اپنی بی بی جی کو سنبھالو اور اسے اُس کی حویلی پہنچاؤ۔ راستے میں تمام باتیں پوچھ لینا۔'' میں نے اُسے ہلکے سے ڈانٹا، ''میں اسے

قبرستان میں، خانزادوں کے خاندانی مقبرے میں جنوں بھوتوں سے ڈرتا چھوڑ آیا ہوں۔ اپنی ویگن نکالو اور اُسے فی الفور اس کے گھر پہنچاؤ۔''

''اور تم؟'' اس کی شکل مارے حیرت اور گھبراہٹ کے بگڑ گئی تھی۔

''میں سائیں نورن آغا کی خبر لینے جاؤں گا۔ یار کھالے! میں بڑی مشکلوں میں گھر گیا ہوں۔ دعا کرنا۔ یہ اپنا نور پور بڑا پراسرار ہو گیا ہے۔ کبھی مل بیٹھے تو بتاؤں گا۔''

''کیوں؟ یہاں ایسا کیا ہے؟'' وہ آنکھیں پھاڑے ہونق بنا پوچھنے لگا، پھر از خود جواب لئے بغیر بولا، ''چھوڑو اس بات کو؛ یہ بتاؤ کہ وہ مقبرے میں اکیلی بیٹھی ہے؟..... یا اُس کے پاس کوئی ہے؟''

''وہ اکیلی ہے یار!'' میں اکتا کر بولا۔

''کیا اسے ڈر نہیں لگتا؟''

میں نے کہا، ''پہلے میں اس کے ساتھ تھا۔ اب اکیلی ہے، ظاہر ہے ڈر کے مارے کانپ رہی ہوگی۔ تبھی کہتا ہوں کہ تم فوراً ویگن لے کر ادھر جاؤ۔ سوال جواب اس سے کر لینا۔ تم گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ تمہیں یہ تک خبر نہیں ہوئی کہ نور پور پر یہ رات کتنی بھاری ثابت ہوئی ہے۔ کئی بندے مارے گئے ہیں۔ یک طرفہ روایتی پولیس مقابلہ بھی ہوا ہے۔ یارن خان اس وقت اپنے بال نوچ رہا ہوگا یا آگ بگولا پھرتا ہوگا اپنے شیطانی محل کی راہ داریوں میں۔ پولیس مردے اُٹھا کر لے گئی ہوگی۔ وہ خون آلود فرش دھلوا رہا ہوگا۔''

وہ سر کھجا کر بولا، ''انسان کا بچہ بن یار! یہ خوفناک فلم چلا کر میرا دل نہ دہلاؤ۔ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی اور تم پر انا للہ بھی پڑھ لیا تھا مگر تم نیا رپھڑ (پھڈا) بنائے آن کھڑے ہو۔ خیر! یہ بتاؤ کہ پولیس یہاں کیا کرنے آئی تھی؟ کیا وہ تمہاری تلاش میں تھی؟''

میں نے اُسے مختصراً خود پر بیتنے والی شب کے واقعات سنائے اور فوراً چل پڑنے پر مصر ہوا۔

وہ بولا، ''یار شہرے! تم بہت اونچا اُڑنے لگے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ تم نے یہ سب کچھ کر لیا۔ ہیں؟''

''یہ باتیں پھر کسی وقت کریں گے۔ تم اپنی سیٹ پر بیٹھو۔''

''پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میری ویگن اسٹارٹ ہوتی ہے تو پورے گاؤں کو پتہ چلتا ہے۔ یارن خان ویگن کو میرے اور خانزادی سمیت آگ لگا دے گا۔ پھر..... پھر کیا کیا جائے؟'' وہ خود

کلامی کرتا ہوا، کنپٹی کھجاتا ہوا سوچ میں پڑ گیا، ''زیادہ سفر تو نہیں ہے۔ کیوں نہ میں اسے سائیکل پر چھوڑ آؤں؟'' اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا، پھر خود ہی اپنی بات کو مناسب قرار دیتے ہوئے بولا، ''ہاں! سائیکل پر جانا مناسب رہے گا۔ تم ادھر سے نکل کر قبرستان پہنچو۔ میں آبے کی سائیکل نکال لاتا ہوں۔''

''میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کیوں؟ کیا کوئی خطرہ ہے؟'' وہ ٹھٹکا۔

''نہیں۔ مجھ سے زیادہ چلا نہیں جاتا۔'' میں نے اپنی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا۔ کہا، ''تم بلو کا برقع بھی ساتھ لے جانا تاکہ اسما کو دیکھ کر کوئی پہچان نہ سکے۔''

اس نے مجھے گھورا، ''اتنی سردی میں آدھی رات کو کون سڑک پر کھڑا ہو کر ہمیں دیکھے گا اور پہچاننے کی کوشش کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی اوقات سے زیادہ پھرتیاں دکھائی ہیں اس لئے تمہارے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔''

میں نے کہا، ''نہیں کھالے! پولیس والے علاقے میں چکراتے پھرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یارن خان کے بچے کھچے کارندے بھی میری تلاش میں نکلے ہوں۔ وہ تمہیں اور اسما کو دیکھ کر پکڑ لیں گے اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ زیادہ عقل مند نہ بنو اور جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔ کھیس کی بکل مار لو اور اسما کے لئے بلو کے برقعے کے بجائے ماسی کا ٹوپی والا برقع لے جاؤ۔ اسے پہن کر اسما بوڑھی معلوم ہوگی۔''

ایسے وقت میں حیات خان کے دارے کے باہر لوگوں کی آوازیں ابھریں۔ کھالے نے اُٹھ کر دروازے کی درزوں سے جھانکا۔ طنزاً بولا، ''نور پور کے سبھی تیس مار خان فاتحانہ انداز میں ڈنڈے لہراتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔''

میری برہمی کو دیکھ کر وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد پلٹا تو اس کے ہاتھ میں نہ صرف برقع تھا بلکہ اس نے میری ہدایت کے مطابق سوتی کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ میرے مطالبے کے بغیر اس نے مجھے پانی کا بھرا ہوا گلاس اور پیراسیٹامول کی دو گولیاں تھمائیں، متفکر لہجے میں گویا ہوا ''یہ لو؛ شیر مارکہ گولیاں کھالو۔ درد میں کچھ اَفاقہ ہو جائے گا۔ دُھنی (پیٹ کے وسطی حصے) میں لگنے والے ٹیکے بڑا درد کرتے ہیں۔''

میں نے گولیاں پھانکیں، پانی پیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر سائیکل نکالی، اردگرد

دیکھ کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور بولا، ''شہرے! کوئی خطرے وطرے کی بات تو نہیں ناں؟''

میں نے شکوہ بار لہجے میں کہا، ''کھالے! کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا؟ اگر تم ڈر رہے ہو تو پلٹ جاؤ۔ میں جانوں اور میرا کام جانے۔ ہاں یار! ایک بات کا دھیان رکھنا۔ تمہاری بی بی جی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے اُسے اپنا نام ظفر اقبال بتایا ہے۔ یاد رکھنا، اسے مت بتانا کہ میں شہریار ہوں۔ پوچھے تو کوئی ہینکی پھینکی مار دینا (اول فول بک دینا)۔''

وہ لات گھما کر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے تشکیک آمیز انداز میں مجھے گھورنے لگا۔ بولا، ''کیا تم نے کوئی گل کھلایا ہے؟''

''نہیں تو.....'' میں جلدی سے بولا۔

''تو پھر تمہیں اپنا آپ چھپانے کی ضرورت کیوں پڑی؟'' اس کا انداز اچھا نہیں تھا۔

''ویسے ہی یار! تم تو بال کی کھال کھینچنا شروع کر دیتے ہو۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ.....''

''کہ وہ تمہیں اچھا سمجھنے لگے۔ فکر نہ کرو۔ وہ تم پر صبح دوپہر شام ڈاکٹری نسخے کے مطابق لعنتیں بھیجے گی۔ او کے یار جی! تم اپنی راہ لو، میں اپنی۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔'' اس نے اردگرد دیکھا اور داہنے پاؤں کا زور پیڈل پر ڈال کر سائیکل کو 'ایڑ' لگا دی۔

میں چھپر تلے لکڑی کے موٹے تھم (ستون) سے چمٹ کر کھڑا تھا تاکہ اچانک نمودار ہونے والے کسی شخص کی فوری نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ کھالے کی سائیکل کا ہر عضو ویگن کی طرح مختلف آوازیں نکالتا تھا مگر بخشو لوہار کی ٹھونکا ٹھانکی کی بدولت اسے قابلِ اعتماد سواری قرار دیا جا سکتا تھا۔ کھالا گھبراہٹ میں نکلا تھا کیونکہ اسے پوری طرح معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اگر میری سنائی ہوئی کہانی میں 'بی بی جی' کا کلائمکس شامل نہ ہوتا تو وہ کھری کھری سنا کر رضائی میں سر منہ لپیٹ لیتا اور ہرگز اتنی سردی میں قبرستان کا رُخ نہ کرتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اسما کو سامنے پا کر اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا اور تب اس پر کھلے گا کہ میں نے اُسے اسما کے قرب کا کتنا بڑا اور کھلا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ نہ صرف میرا ممنون ہوگا بلکہ اس کا قلبی شکوہ بھی آپوں آپ تحلیل ہو جائے گا۔ وہ باتوں باتوں میں اسما کی بربادی کا تمام تر ملبہ مجھ پر ڈالتا تھا اور سمجھتا تھا کہ میں نے میڈم کو مالی منفعت دیتے ہوئے اسما کے ساتھ سخت زیادتی کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ حق بجانب نہیں تھا مگر میرے مؤقف کو تسلیم کرنے کا روادار

بھی نہیں تھا۔

مجھے سوچنے کے لئے چند منٹوں کے لئے گوشہ عافیت کی تلاش تھی۔ ویگن پر نگاہ پڑی تو یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ویگن میں گھس گیا اور فرش پر ایک سیٹ کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گن جھولی میں رکھ کر آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگا۔ مجھے بغیر کسی ٹھوس وجہ کے یقین ہو چلا تھا کہ میڈم شکیلہ کی اماں اور چھوٹا بھائی سیمونور پور میں ہی کہیں موجود تھے۔ اگر وہ نورن آغا کی حراست میں تھے تو لامحالہ طور پر انہیں مزار کے احاطے میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی بعید از امکاں نہ تھا کہ نورن آغا نے انہیں کسی اور خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہو۔ یارن خان کو اگر برکت مسیح نے خبردار کر دیا کہ اس کی حویلی پر حملہ انہی دونوں مغویوں کی وجہ سے کیا گیا ہے تو اس کا فوری ردعمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پہلی فرصت میں ان کا ٹھکانہ بدل دیتا۔ یعنی ہر سہ صورتوں میں میرے پاس مہلت کم تھی۔ جو بھی کرنا تھا، اللہ کی آس پر فی الفور کر گزرنا چاہیے تھا۔ مجھے شکرے کی طرح سود و زیاں کو پسِ پشت ڈال کر اپنے شکار پر جھپٹنا تھا۔

پیر سردی کے مارے شل ہوئے جاتے تھے۔ اپنے برہنہ پائی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ یاد آیا کہ کھالے نے دکان کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں اس امید کے سہارے ویگن سے نکل کر دکان میں گھس گیا کہ مجھے بخشو لوہار کا 'ایمرجنسی جوتا' مل جائے گا جسے وہ کبھی کبھار پہنا کرتا تھا۔ میری امید بر لائی اور ٹائر کی بنی ہوئی مخصوص ساخت کی چپل مل گئی۔ پہن کر باہر نکلا اور چیتے کی سی سرعت سے دبے پاؤں دوڑتا ہوا شیرے قصائی کے عقبی کھیت میں کھوری پر پہنچ گیا۔ بیلنے کے قریب سے گزر کر کمادکی اوٹ لیتا ہوا مولا داد کے گھر کی طرف بڑھا۔ غیر متوقع طور پر میرا کتوں سے کہیں بھی ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ شاید فائرنگ اور مسجد میں ہونے والے اعلان کے بعد لوگوں کے گھروں سے نکلنے کی وجہ سے وہ ڈر کر ڈیروں کی جانب بھاگ گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں میں ماسٹر ولی محمد والی گلی عبور کر گیا۔ گلی سنسان تھی۔ اسی گلی کی سیدھ میں چاچے چراغ کا جلا ہوا گھر واقع تھا۔

مولا داد کے گھر اور مولوی کے حجرے کے عقب سے گزر کر، لمبا چکر کاٹ کر میں سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کے پچھواڑے والے جنگل میں پہنچ گیا۔ یہیں میں نے رات کو اپنا لباس اور سامان چھپایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں سائیں نورن آغا کی رہائش گاہ کے پچھواڑے کھڑا چپل اُتار رہا تھا۔ اسی دیوار کے ذریعے میں دو مرتبہ پہلے بھی اس گھر کی چھت پر چڑھا

تھا۔ ایک مرتبہ دن چڑھے دل جیت کو بیدار ہوتے دیکھ کر کر لوٹ آیا تھا۔ دوسری مرتبہ اُسے مکھن کے بال کی طرح نکال کر اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا جہاں وہ میرے ہاتھوں اپنے اعمال کی پاداش میں بدترین انجام کا شکار ہوا تھا۔ آج پھر مجھے یہی مسافت درپیش تھی۔

تھوڑی سی کوشش سے میں چھت پر کمروں کی درمیانی منڈیر پر پہنچ گیا۔ تین اطراف کمروں اور ایک طرف ہال کے درمیان صحن اور یوشکل کا برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ شمالی گوشے میں سیڑھیوں کے نیچے سائیں دل جیت کا کمرہ تھا جس میں اس وقت اس کے گدی نشین سائیں نورن آغا کو محوِ استراحت ہونا چاہیے تھا کیونکہ سائیں دل جیت کے بعد یہ بیڈ روم اسی کے زیرِ تصرف تھا۔ کھالے کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کے مطابق باقی کمروں میں سائیں دل جیت کی دو بیوائیں اور اولاد مقیم تھی۔ چونکہ نورن آغا کی یہاں رہائش خانزادوں کے مفاد میں جاتی تھی، اس لئے وہ غیر محرم ہونے کے باوجود سائیں دل جیت کے پس ماندگان کے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہائش پذیر تھا۔

میں نے گن کو فائر پوزیشن میں تھاما اور ذہن سے خوف و وسوسے جھٹک کر محتاط انداز میں سیڑھیاں اُتر گیا۔ سائیں دل جیت کا بیڈ روم غیر متوقع طور پر غیر مقفل تھا۔ اندر نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سرخ پھولدار بیڈ شیٹ والا جہازی سائز کا آرام دہ بیڈ خالی پڑا تھا۔ مجھے حیرت اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور اعصاب میں یک لخت تھکن عود کر آئی۔

ہونٹ کاٹتا ہوا پلٹا۔ دوسرے کمروں میں جھانکنا فضول تھا۔ وقت کا ضیاع تھا۔ چونکہ وہ نورن آغا اپنے کمرے میں نہیں تھا، ہال میں تھا یا مزار میں، اس لئے میں نے چھت کے راستے باہر جانے کے بجائے مین گیٹ کا رُخ کیا۔ میری توقع کے عین مطابق گیٹ کھلا تھا۔ گیٹ کھلنے سے کوئی آواز پیدا نہ ہو، اس خیال سے میں نے گیٹ کو نہایت آہستگی سے کھولا اور مزار کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ دائیں جانب ہال اور حجرے کی کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ نورن آغا ادھر نہیں تھا کیونکہ کھڑکیاں غیر روشن تھیں۔ میری دانست میں اُسے سائیں جگ جیت کے مقبرے میں ہونا چاہیے تھا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔

میں نے ایک ذرا پلٹ کر پارکنگ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ سائیں دل جیت کی سیاہ رنگ کے بونٹ والی سرخ ٹویوٹا کرولا اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی دکھائی دی۔ اس کے علاوہ پارکنگ میں کوئی اور گاڑی موجود نہیں تھی۔ مجھے ایک طرح سے اطمینان ہوا کہ یہاں نورن آغا

کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو میری راہ میں مزاحم ہوتا۔ مزار سے ملحقہ ملنگوں والے بڑے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ بتی بجھی ہوئی تھی۔ میں دَبے پاؤں چوبی بلیوں والے بڑے سے دروازے تک گیا۔ دھکیل کر دیکھا۔ اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ مزار کے عجیب الوضع ملنگ بابے زندگی کا بیشتر حصہ ایک نقطے پر ٹھہر کر دونوں جہانوں کی سیر کرنے میں گزار دیتے تھے۔ کوئی بھنگ کے گھوٹے کو دنیا کے ہر دکھ کی دوا مانتا تھا۔ کسی کے نزدیک چرس کا دم زندگی کے سینے میں خوابناک سانسوں کا صور پھونکتا تھا تو کسی ملنگ کے کام و دہن کا ماجرا 'کپی' سے شروع ہوتا تھا اور 'قے' پر ختم ہو جاتا تھا۔ انہی کے دم فیض سے مزار کی فضا سارا دن 'حق سائیں جگ جیت' اور 'سچا سخی دل جیت شاہ' کے نعروں سے گونجتی تھی۔

مزار کو خالی پا کر میرا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔ مایوسی کی کٹیلی لہر رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ نورن آغا یہاں بھی نہیں تھا تو کہاں گیا تھا؟ اُس کم بخت کو زمین نگل گئی، آسمان اُٹھا لے گیا.....

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا مگر کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے یارن خان کی حویلی کا تہہ خانہ گھوم گیا۔ میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس حویلی کے نیچے اتنا پراسرار اور خفیہ تہہ خانہ ہوگا جس کا میکنزم عام ذہن کی دسترس سے بالاتر تھا۔ اگر میں پرویز پر قابو نہ پالیتا اور وہ مجھے تہہ خانے میں داخلے کے راستے کی نشاندہی نہ کرتا تو میں ساری عمر چکراتا رہتا مگر تہہ خانے میں داخل نہ ہو پاتا۔ اسی طرح برکت مسیح نے مجھے محفوظ سرنگ کے راستے سے گزار کر پولیس کے گھیرے سے نکال دیا تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ مزار کے احاطے میں بھی کوئی ایسی خفیہ پناہ گاہ موجود تھی جہاں تک عام انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ اسی خیال سے تقویت پا کر میں مزار کی دیواروں کو، قبر اور چوبی کھڑکیوں کو ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا مگر دس پندرہ منٹ کی محنت کا انجام نہایت مایوس کن ناکامی پر ہوا۔

شدید نوع کے احساسِ ناکامی نے بدن میں ایک دم نقاہت بھر دی اور میں چند زور زور کی سانسیں لے کر اونچی ریلنگ دار قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سردی اور کتوں کے کاٹے کا اثر ہونے لگا۔ سر چکرانے لگا۔ میں نے شام کا کھانا کھایا تھا جو بھاگ دوڑ میں ہضم ہو گیا تھا۔ شکم خالی ہونے کی وجہ سے کمزوری بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ تاہم مجھے اپنی حالتِ زار کی زیادہ پروا نہیں تھی اور میرا ذہن اِس نکتے پر اٹکا ہوا تھا کہ مجھے نورن آغا کو کیسے اور کہاں تلاش کرنا چاہیے؟ بیڈروم سے نکلنے کے بعد وہ یہاں نہیں آیا تھا، ہال اور حجرے میں نہیں گیا تھا، پھر کہاں گیا تھا؟

ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کہیں وہ یارن خان کے ہاں نہ پہنچ گیا ہوتا کہ حویلی کی اچانک بدل جانے والی صورتِ حال کا جائزہ لے سکے۔ اس صورت میں اُسے کسی بھی وقت لوٹنا تھا۔ میں تھوڑا اوپر کی جانب کھسک گیا جہاں بیٹھنے سے مزار کے کھلے دروازے سے احاطے کا مین گیٹ دکھائی دینے لگا۔ اَب جو بھی باہر سے مزار کے احاطے میں داخل ہوتا، فوراً میری نگاہ میں آ جاتا۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ مزار کی دیواروں پر نگاہ دوڑائی۔ مبادا کہ وال کلاک نصب ہو مگر دیواروں پر سائیں جگ جیت کے قلمی پورٹریٹ، شیشہ لگی الماری میں اس کے ذاتی استعمال کی 'متبرک' اشیاء اور دیواروں پر چسپاں رنگ برنگ آرائشی ٹائلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ گھڑی نہیں تھی۔ چونکہ ان در و دیوار تلے وقت کو ہرگز جانچا نہیں جاتا تھا بلکہ عقیدت کو ترازو میں تول کر بولی لگائی جاتی تھی اس لئے مجھے کلاک کی عدم موجودگی پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

چاند کی ماند پڑتی چاندنی کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ تین سے اوپر کا وقت تھا۔ اگر یہ رات یونہی نامراد گزر جاتی تو مجھے اگلی رات کے آنے تک کہیں چھپ کر وقت گزارنا تھا جو نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ میرا اپٹھانوں والا روپ اب مجھے فائدہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ لمبے تڑنگے جنگجو پرویز، یارن خان کے دستِ راست برکت مسیح اور اسٹیچو قسم کے گن مین داد و مہانے نے مجھے اس حلیے میں دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھے دن کے اجالے میں باآسانی پہچان سکتے تھے۔

میں بے دھیانی میں اپنی زخمی پنڈلی پر ہاتھ پھیر رہا تھا جب اچانک میری تمام تر حسیں بیدار ہو گئیں۔ میرے کانوں میں 'کٹک' کی مخصوص مگر نہایت کمزور آواز پڑی تھی۔ میں نے بے ساختہ سانس روک لی۔ چند لمحوں بعد میرے بدن کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ یوں جیسے کم شدت والا زلزلہ آیا ہو۔ میں نے قبر کی ٹیک چھوڑ دی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قبر کو دیکھنے لگا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا تھا کہ قبر میں کوئی گڑبڑ تھی۔ ناکافی روشنی کے باعث دیر تو لگی مگر مجھے قبر میں پیدا ہونے والی نہایت خفیف سی حرکت کا اندازہ ہو گیا۔ پوری کی پوری قبر پیروں کی جانب نہایت آہستگی سے سرک رہی تھی۔ میرے اعصاب میں برق بھر گئی اور میں اچھل کر قبر کی پائنتی کی جانب جا کھڑا ہوا۔ میری گن کا رُخ قبر کے سرہانے کی جانب تھا کیونکہ میں فی الفور اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ قبر کے نیچے راستہ تھا جس سے کوئی برآمد ہونے والا تھا اور دہانہ یقینی طور پر قبر کے سرِ بالیں واقع تھا۔

میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ چند لمحوں بعد جب قبر ڈیڑھ فٹ کے قریب سرک کر ٹھہر گئی تو

ریلنگ پر سے ایک سر نمودار ہوا۔ جونہی وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے پہلو میں آیا، میں نے للکارا، ''خبردار! ایک قدم بھی بڑھایا تو گولی مار دوں گا۔''

وہ یوں اچھلا جیسے اس کے پیروں میں اچانک کوئی سانپ پھنکارا ہو۔ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا مگر گن پر نگاہ پڑتے ہی چابی والے کھلونے کی طرح ساکت ہو گیا۔ وہ نورن آغا تھا جسے میں نے پلک جھپکنے کی سی دیر میں مخصوص وضع قطع کے سبب پہچان لیا تھا۔ میں پھنکارا، ''نورن آغا! اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لو ورنہ.....''

اس نے میرے حکم کی فوراً تعمیل کی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا، ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا کیونکہ میں نسبتاً تاریک گوشے میں کھڑا تھا۔ میں نے کہا، ''آغا! میں موت کا دوسرا نام ہوں۔ جلدی بتاؤ، یارن خان کا مال کہاں ہے؟''

''کک..... کون سا مال..... میرا خان جی سے کیا تعلق ہے؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

مارے گھبراہٹ اور دہشت کے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی، ''تت..... تم نے حویلی پر حملہ کیا تھا؟''

''ہاں! اور اب میں تمہارے سر پہنچ گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یارن خان نے دو بندے تمہاری تحویل میں دے رکھے ہیں۔ اول فول مت بکو، سیدھی طرح بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟''

''مم..... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ خدا کی قسم!'' وہ گھگھیایا۔ میں اس کی دماغی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس کے سامنے درندوں بھرا جنگل تھا، عقب میں جلا کر خاکستر کرنے والی آگ..... میری گولی سے بچتا تو یارن خان کے ہاتھوں بدترین موت کا شکار ہو جاتا۔ گڑگڑایا، ''نن..... نہیں..... میں تو درویش سا بندہ.....''

میں نے قدم بڑھایا اور گن کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ خونخوار لہجے میں ایک ناقابلِ اشاعت گالی دے کر بولا، ''آغا! میں تمہاری درویشی کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ مجھے چکر نہ دو بلکہ سیدھی طرح بتاؤ کہ اس قبر کے نیچے کیا ہے؟''

اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ گئیں۔ ہکلا کر بولا، ''سس..... بڑے سائیں جی دفن ہیں یہاں۔''

''تم سائیں کی مالش کرنے گئے تھے نیچے؟'' میں نے طنزاً کہا۔ ساتھ ہی قبر کی طرف دیکھا۔ میری توجہ ہٹنے کے بعد وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے اوپر کی جانب کھسک گئی تھی جس سے تہہ خانے کا

دہانہ بند ہو گیا تھا۔ میں نے گن پر دباؤ بڑھایا اور غرا کر کہا، ''چلو! تہہ خانے کا دروازہ کھولو۔''

چونکہ اندھیرا تھا، اس لئے میں اس کے سرخ و سپید چہرے پر موت کے ہولناک سایوں کا رقص دیکھنے سے محروم تھا مگر اس کی آواز سے مترشح غیر معمولی ارتعاش سے اس کی زبوں حالی کا اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ لرزیدہ بولا، ''تم وہاں کیا کرو گے جا کر۔ وہاں کک..... کچھ نہیں۔ صرف چلہ کشی کا حجرہ ہے۔''

میں نے اُسے ایک ساعت شکن گالی سے نوازا اور دانت پیس کر اپنا حکم دہرایا۔ وہ زانی تھا۔ ایسا شخص دلیر نہیں ہوتا۔ بزدل ہوتا ہے۔ اس نے فوراً ہی سپر ڈال دی اور سر جھکا کر قبر کی طرف بڑھا۔ بڑی سی سبز چادر کے نیچے ہاتھ ڈالا کر کوئی لیور کھینچا۔ 'کٹاک' کی آواز سنائی دی۔ پھر قبر کے تکیے کی جانب کھڑا ہو کر دونوں ہاتھوں سے پائنتی کی طرف دھکیلنے لگا۔ میں جلدی سے اُس کے عقب میں پہنچا۔ اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔ قبر کے ہٹتے ہی کوئی ڈیڑھ سو افٹ کا گڑھا نمودار ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی کے پہلو کے بل اُترنے کی گنجائش تھی۔ میں نے اُسے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ اس نے قبر میں اُترنے میں غیر معمولی سرعت اور ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تو میں بُری طرح چونک گیا۔ ڈرا کہ وہ کوئی چال نہ کھیل دے۔ تبھی میں نے آنِ واحد میں گن ہوا میں بلند کی اور چشمِ زدن میں اس کے سر پر دے ماری۔ وہ 'اوغ' کی دردناک آواز نکال کر خلا کے عقبی کنارے سے ٹکرایا اور نیچے ڈھے گیا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نیچے گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا مگر میں نے اُترنے میں دیر نہیں کی۔ جونہی عمودی سیڑھیاں اُترا، میرے پاؤں چھ سات فٹ نیچے فرش پر پڑے نورن آغا کے جسم پر پڑے۔ وہ ضرب کی تاب سے بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی مگر تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے تیزی سے ہاتھ مارے اور نورن آغا کے لباس کی تلاشی لی۔ میری توقع بر آئی اور اس کے چغے کے پہلو والی جیب سے ایک پنسل ٹارچ برآمد ہو گئی۔ میں نے ٹٹول کر اس کا بٹن تلاش کیا۔ اندھیرے کا تسلط ایک ننھے سے ڈیڑھ والٹ کے بلب نے توڑ کر رکھ دیا اور چاروں خانے چت لیٹا نورن آغا نظر آنے لگا۔

میں نے اس کا سرسری معائنہ کیا۔ باوجود کہ گن کی ضرب شدید نہیں تھی، وہ واقعتاً بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے انثا غفیل ہونے میں سر کی چوٹ سے قبل اچانک طاری ہونے والی میری

دہشت اور موت کے ڈر کا مرکزی کردار تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں قبر کو آگے کھسکانے کا میکنزم تلاش کرنے کی کوشش کی مگر دیوار پر کوئی سوئچ بورڈ یا لیور نہیں ملا۔ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی برقی نظام کام نہیں کرتا تھا بلکہ اُسے کھولنے اور بند کرنے کے لئے ہاتھوں کی مدد سے دھکیلا جاتا تھا۔ اس میں کوئی ننھا سا لاک لگا ہوا تھا جو کھلتے وقت 'کٹاک' کی آواز پیدا کرتا تھا۔ باہر والا لاک سبز چادر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اندر والا لاک لیور ڈھونڈنے کے باوجود نہیں ملا تو میں نے قبر کو کھلا چھوڑ کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور پلٹ کر اس سرنگ کا جائزہ لیا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں سرنگ کی بلندی چھ سات فٹ تھی۔ جنوبی جانب تین چار فٹ کے بعد فرش بلند ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے سرنگ کی اونچائی کم ہو کر محض تین چار فٹ رہ جاتی تھی۔ سبھی دیواریں بے رنگ مگر پلستر شدہ تھیں۔ میں نے آغا کے بدن کو کھینچ کر تنگ راہداری میں ڈالا۔ کنپٹی پر زور سے گن کا کندا مارا۔ اس نے عالمِ بے ہوشی میں ایک زوردار جھٹکا لیا، 'ہائے اماں' کی صدائے بے اختیار بلند کی، سر کو دائیں بائیں پٹخا پھر ایک طرف گردن ڈال دی۔ اب میں اس کی طرف سے بے فکر اور مطمئن ہو کر اپنا کام سرانجام دے سکتا تھا۔

میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا سرنگ میں آگے بڑھا۔ دس بارہ فٹ کے بعد سرنگ میں نیچے کی جانب سیڑھیاں جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ سیڑھیاں اُترتے ہی میں نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ اب مجھے چوپائیوں کی طرح چلنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پندرہ فٹ طویل گیلری نما سرنگ کا اختتام ایک نہایت کھلے اور سرد کمرے میں ہوا۔ اس زیرِ زمین کمرے کی اونچائی محض آٹھ فٹ یا دو چار انچ کم رہی ہوگی۔ یہاں سردی از حد زیادہ جبکہ سیلن اور گھٹن کا معمولی سا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں گھمائی۔ یہ آٹھ ضرب پندرہ فٹ کا کمرہ تمام تر ضروری سہولیات سے مزین تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ پر سوئچ بورڈ دیکھ لیا جس پر قطار میں سات آٹھ بٹن لگے ہوئے تھے۔ باری باری بٹن دباتا گیا۔ کمرہ یکبارگی روشن ہو گیا۔ میری آنکھیں چند لمحوں کو چندھیائیں پھر روشنی کی عادی ہو گئیں۔ میرے عقب میں گیلری میں سیڑھیوں کے عین اوپر ایک دودھیا بلب جل اُٹھا۔ تنگ راہداری میں بے ہوش پڑا ہوا نورن آغا نظر آنے لگا۔ یہ کمرہ بھی چھوٹا سا عجائب کدہ معلوم ہوتا تھا۔ داہنی دیوار میں نصب شدہ چوبی دروازہ باتھ روم کی نشاندہی کر رہا تھا جبکہ الٹے ہاتھ والی دیوار کے ساتھ فرش سے چھت تک مختلف سائزوں کے گتے کے کارٹن اوپر نیچے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اسی دیوار کی اوپر والی نکڑ میں ایک گول

سوراخ تھا جس میں بے آواز ایگزاسٹ فین چل رہا تھا۔ اس کے مقابل میں داہنی دیوار پر بھی ایک ایگزاسٹ نصب تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ایک پنکھا ہوا کمرے میں کھینچ رہا تھا جبکہ دوسرا اندر کی ہوا کو باہر کہیں پھینک رہا تھا۔ یقینی طور پر ان پنکھوں کے اوپر لوہے یا پلاسٹک کے پائپ نصب ہوں گے۔

داہنی نکڑ میں ایک چھوٹی سی چوبی میز پڑی تھی جس پر ایک ٹیپ پلیئر دھرا تھا۔ ٹیپ پلیئر سے رنگ برنگی باریک تاریں نکل کر دیوار کے ایک گول سوراخ میں داخل ہو رہی تھیں۔

میرے سامنے لوہے کے پائپوں والی تین چارپائیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک پر کوئی لحاف میں دبکا پڑا تھا۔ دوسرا بستر خالی تھا جبکہ آخری چارپائی کا بستر مخصوص دیہاتی انداز میں ادوائن پر گول لپٹا پڑا تھا۔ میں نے بہ عجلت لحاف کھینچا۔ یہ دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ اس بستر میں ایک بوڑھی عورت اپنی چھاتی سے میلے چیکٹ سانولے سے بچے کو چمٹائے پڑی تھی۔ اپنے حلیے سے دونوں بھکاری معلوم ہوتے تھے۔ بوڑھی عورت، جو یقینی طور پر میڈم شکیلہ کی اماں تھی، جاگ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مردنی کا خوف ناک تاثر مترشح تھا۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا کہ وہ مر چکی ہے مگر پھر سانسوں کی تال پر اوپر نیچے ہوتی پسلیوں کی حرکت دکھائی دی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

''اماں! تم میڈم کی ماں ہو ناں؟ یہ سیمو ہے ناں؟'' میں نے ہیجانی انداز میں پوچھا۔

اس کی پتلیوں نے حرکت کی۔ مجھے عجیب بے تاثر آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر ناتواں آواز میں بولی، ''کے آدھیں؟''

(کیا کہتے ہو؟)

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور سرائیکی میں بولی، ''نہیں..... میں کسی میڈم ویڈم کو نہیں جانتی۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے پوچھا، ''کیا تم چندو ماہی کی اماں ہو؟''

اس کی آنکھوں میں بے یقینی مچلی۔ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے استخوانی وجود سے چمٹا ہوا بچہ بھی اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

میں نے کہا، ''اماں! جلدی سے اُٹھو۔ اپنے بیٹے کو بھی اُٹھاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ میں چندو ماہی کے کہنے پر تمہیں اس قید خانے سے نکالنے کے لئے آیا ہوں۔''

میں نے بوڑھی کے پنجر جیسے وجود کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ شاید اُٹھنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی مگر جونہی اس کے کانوں میں میری بات پڑی، وہ غیر معمولی پھرتی سے چارپائی سے اُتری۔ سیمو بھی حیران آنکھوں سے مجھے اور اپنی ماں کو دیکھتا ہوا چارپائی سے اُتر آیا۔

اماں بولی، ''چل پتر! متاں دیر تھی ونجے۔''

(چل بیٹا! مبادا کہ دیر ہو جائے۔)

میں نے دیکھا کہ ان دونوں کے جسموں پر باریک اور عمومی گھریلو نوعیت کے غریبانہ لباس تھے۔ دونوں کے پاؤں ننگے تھے جبکہ باہر سردی زوروں پر تھی۔ میں نے کھیس یا چادر کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ کمرے میں سرہانے، گدے اور رضائیاں تھیں، چادر نہیں تھی۔ مایوسی ہوئی۔ میں نے کندھے اُچکائے، جی ہی جی میں 'اللہ مالک ہے' کا نعرہ لگایا اور تہہ خانے سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ایسے میں ٹیپ پلیئر پر نظر پڑ گئی۔ چونکہ میں نے سوئچ بورڈ کے سبھی بٹن آن کر دیے تھے، اس لئے ٹیپ پلیئر کا ننھا سا سرخ بلب بھی روشن ہو گیا تھا۔ میں نے والیم کی ناب گھما کر آواز کم کی اور 'پلے' کا بٹن دبا دیا۔ ٹیپ پلیئر میں موجود کیسٹ چل پڑا اور 'زوں زوں' کی عجیب آوازیں ٹیپ کے اسپیکر سے برآمد ہونے لگیں۔ یوں لگا جیسے زوروں کی آندھی چل رہی ہو۔ پھر آوازیں بدل گئیں اور ایک بھیانک قہقہہ اسپیکر سے ابل پڑا۔ چند لمحوں میں ہی اس ٹیپ پلیئر کی یہاں موجودگی کا سبب معلوم ہو گیا۔ چاچے چراغ کے مکان کے پچھواڑے کے گھنے جنگل میں ایندھن کاٹنے کے بہانے قدم رکھنے والے یہی آوازیں سنتے تھے اور ڈر کے مارے دوڑ جاتے تھے۔ وہ گاؤں میں جا کر جنگل سے سنائی دینے والی آوازوں کا وہ خوفناک حصار کھینچتے کہ سننے والے کانوں کو ہاتھ لگا کر دل ہی دل میں تہیہ کر لیتے کہ وہ زندگی بھر اس جنگل کا رُخ نہیں کریں گے۔

یہ تہہ خانہ اس جنگل کے عین نیچے بنایا گیا تھا۔ چنداں حیرت ہوئی کہ سائیں دل جیت شاہ نے کس طرح میرے سمیت تمام گاؤں والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اتنا بڑا تہہ خانہ تعمیر کرا لیا تھا۔ نجانے درویش سائیں جگ جیت شاہ کی دفن شدہ میت اس نے کہاں نکال پھینکی تھی؟! تہہ خانے کو کھودنے کے دوران نکلنے والی مٹی کہاں پھینکی تھی؟

میں حیرانی سے تہہ خانے کے بے رنگ در و دیوار دیکھتا رہا پھر کندھے اُچکا کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔

اماں سیمو کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں پر ٹھہر گئی تھی۔ میں بھانپ گیا کہ وہ راہداری میں لم لیٹ پڑے نورن آغا کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میں پہلو بچا کر آگے نکلا اور انہیں اپنے پیچھے راہداری میں آنے کا اشارہ کیا۔ گھٹنوں کے بل آگے بڑھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے میری تقلید کی۔ راہداری عبور کر کے میں نے نورن آغا کو کھینچ کر فرش پر لڑھکا دیا۔ اس کی نبض اور دھڑکن چیک کی۔ کنپٹی دیکھی۔ گن کی دونوں ضربوں سے اس کی جلد دو جگہوں پر پھٹ گئی تھی اور خون نکل کر بالوں میں جم گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ کم و بیش چار پانچ گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ ہمیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے کے لئے اتنی مہلت کافی تھی۔ سیڑھیوں پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں مجھے چھت میں لگا ہوا ننھا سا آہنی کنڈا نظر آیا۔ اُسے کھینچ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ قبر نما ڈھکن کا قفل تھا۔ کونے میں ایک ننھا سا سوئچ بورڈ بھی آویزاں تھا جس پر صرف ایک بٹن نصب تھا۔ میں نے اُسے آن کیا، کچھ نہ ہوا، پھر آف کیا تو سرنگ کے پار جلنے والی سبھی بتیاں گل ہو گئیں۔ میں نے اُسے دوبارہ آن کیا مگر کوئی بتی روشن نہ ہوئی۔

اندھیرے اور جگہ کی تنگی کے سبب میں نے دونوں ماں بیٹے کو بڑی مشکل سے خلاسے گزار کر مقبرے کے فرش پر پہنچایا۔ آخر میں خود باہر نکلا۔ قبر کی پائنتی کی جانب کھڑے ہو کر قبر کو دھکا لگایا۔ وہ سرکی جانب کھسک گئی اور 'کٹاک' کی آواز کے ساتھ مقفل ہو گئی۔ اماں ششدر کھڑی قبر کو گھور رہی تھی۔ قبر میں اترنے والا کبھی باہر نہیں نکلتا۔ اس کے لئے یہ تصور بڑا خوفناک تھا کہ وہ چند لمحے پہلے قبر سے نکلی تھی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی جس کی مجھے سمجھ نہ آئی۔ میں نے دروازے کے باہر صحن میں جھانک کر دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ آج کی شب میری خوش بختی عروج پر تھی اور میری انگلی تھام کر چل رہی تھی۔

دونوں کو ساتھ لئے پرسکون چلتا ہوا مزار کے احاطے سے نکل آیا اور جنوبی سمت بڑھا۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر میرا ڈیرہ واقع تھا جہاں میں نے تقریباً آدھی رات گزاری تھی۔ کوئی اقدام عمل نہ ہونے کی بدولت سر دست میرا ارادہ ڈیرے پر جانے کا تھا۔

آدھا سفر طے کر لیا تو ایک خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور میں بے اختیار تھم گیا۔ اماں اور سیمو کو ایک کھال کے بنے پر درختوں کے بیچ بٹھایا اور دوڑنے کے سے انداز میں چلتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد میں مزار کے پچھواڑے جنگل میں تھا۔ میں نے اپنے چھپا کر رکھے ہوئے سامان سے اپنا لباس نکالا اور واپسی کا قصد کیا۔ اماں کے پاس پہنچ کر اپنے خون

آلود چست لباس کے اوپر کھلا لباس اور کوٹ پہن لیا۔ چادر اوڑھ لی۔ خون آشام رات کے تمام نقوش چھپ گئے۔ سردی کا احساس بھی کم ہو گیا۔ گن کو لباس میں چھپا لیا اور پگڈنڈی پر چل پڑا۔ اماں اور سیمو میرے پیچھے آ رہے تھے۔

میں نے ازراہِ ہمدردی کہا، ''اماں! دیکھ کر چلنا۔ پیروں میں کوئی کانٹا نہ چبھ جائے۔''

''ناں پتر! رب سوہنے اساں جیئے غریباں کوں کاٹھ دی تلیاں لا ڈتین۔ کنڈے کے آ کھدِن ساکوں!'' اماں کی آواز میں بلا کی کسمپرسی شامل تھی۔

(نہیں بیٹا! رب سوہنا ہم جیسے غریبوں کو لکڑی کی تلیاں لگا دیتا ہے۔ کانٹے کیا کہتے ہیں!)

اس نے ایک آہ بھری اور کہا، ''ساری عمر انہی کانٹوں پر ننگے پیروں چلتی رہی ہوں۔ کام کاج کرتی رہی ہوں۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میں نے اُس کا گھر اور رہن سہن دیکھا تھا۔ وہاں رہ کر زندگی کی ناؤ کھینے والی عمر رسیدہ عورت کا بدن کانٹوں کا عادی ہو جاتا ہے۔

ان دونوں کی بازیابی پر میرا دل فرطِ مسرت سے معمور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک انہونے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ پلٹ کر جنگل میں چھپا کر رکھا ہوا لباس میں نے اس لئے نکال کر پہنا تھا کہ میرا خون آلود چست لباس میرے لئے پریشانی کا باعث نہ بنے۔ اس لباس میں میری رقم بھی موجود تھی۔ میں نے فوراً ارادہ کیا کہ میں اپنے ڈیرے پر رکنے کے بجائے سیدھا چلتا رہوں گا۔ پانچ چھ کلومیٹر کا فاصلہ نصف گھنٹے میں طے کر کے میں طلوعِ فجر سے پہلے بڑی سڑک پر پہنچ سکتا تھا جہاں سے مجھے ملتان کے لئے بس یا ویگن مل سکتی تھی۔ علی الصبح نکلنے والی گاڑیوں میں سیٹ با آسانی مل جایا کرتی تھی۔ میں طویل سفر پیادہ کر سکتا تھا جبکہ اماں اور سیمو ناتواں تھے۔ تبھی میں نے پوچھا، ''اماں! کیا تم تین چار میل پیدل چل لو گی؟''

وہ دیکھنے میں ہڈیوں کا پنجر لگتی تھی؛ اَب تب میں گرتی محسوس ہوتی تھی مگر کمال اعتماد سے بولی، ''کیوں نہیں پتر! میں بھی چل لوں گی اور میرا پتر سیمو بھی۔''

اماں کا حوصلہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ اپنے ڈیرے کے سامنے پہنچ کر ایک ذرا رُکا۔ حسرت کناں نظروں سے دیکھا پھر ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے دل میں کہا، 'الوداع! میرے نو... یور..... الوداع! قسمت نے ساتھ دیا تو پھر کبھی آؤں گا، تمہیں دن کے اجالے میں کھلے عا

دیکھنے کے لئے۔ آج مجبور ہوں مگر کسی مجبوری کو ہمیشگی نہیں ملتی۔''

چشمِ تصور میں غزالہ کا سراپا لہرایا، ایک دل پرور آواز روح سے کھیلی، 'تیڈا رب راکھا میڈے شہریارا! سوہنا رب تیکوں اپنی امان وچ رکھے.....'

(تمہارا اللہ نگہبان ہو میرے شہریار! سوہنا رب تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔)

مجھے کھال کے نکے پر پڑا ہوا ایک ڈنڈا مل گیا۔ اُسے اُٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا تا کہ کتوں کے متوقع حملوں سے بچا جا سکے۔ مجھے علم تھا کہ یہ وقت کتوں کے جاگنے کا نہیں تھا مگر کہتے ہیں کہ کتوں سے نہیں، کتوں کی 'کتیائی' سے ڈرنا چاہیے۔ ہم تینوں آگے پیچھے فصلوں کے بیچ پگڈنڈیوں پر چل پڑے۔

آسمان پر چاند کا راج آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کسی بھی وقت داغِ مفارقت دے سکتا تھا مگر فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ جب تک وہ اوجھل ہوتا، صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو جاتا۔ سیمو نے ایک دو مرتبہ سردی کا واویلا کیا مگر اماں نے روایتی انداز میں ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔ چونکہ میرا بازو اور ٹانگ دکھتی تھی، سر میں درد بھی تھا، اس لئے میں اسے اُٹھا کر چلنے کی ہمت نہ کر پایا۔ اندازے کے مطابق ہم آدھے گھنٹے سے کچھ ہی زیادہ وقت میں مین روڈ پر پہنچ گئے۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ اماں کا حوصلہ قابلِ داد تھا۔ سیمو تھک گیا تھا تبھی سڑک کے کنارے پر اکھڑ کر پہلو کے بل پڑے ہوئے سنگِ میل پر بیٹھ گیا۔ میں نے سمجھایا، ''اماں! ہم بس یا ویگن میں خاموشی سے سفر کریں گے۔ باتیں نہیں کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں؟''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ رواں دواں ٹریفک کی ہیڈ لائٹس میں امید کی قندیلیں جلتی بجھتی رہیں پھر ایک بس ہمارے قریب آن رکی۔ کنڈیکٹر نے گیٹ کا شیشہ کھول کر سر باہر نکالا اور چیخ کر پوچھا، ''تو ڑ ملتان ویسیں جوان؟''

(جوان! ملتان جاؤ گے؟)

میں نے جلدی سے کہا، ''ہاں!''

اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے اماں اور سیمو کو بس پر چڑھایا۔ بس کا پچھلا آدھا حصہ خالی تھا۔ میں نے ایک تین والی سیٹ کا انتخاب کیا۔ سیمو اور اماں کو کھڑکی والی جانب بٹھایا اور خود گیلری والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کرایہ کی ادائیگی کر دی۔ بس مظفر گڑھ سے نکل آئی تھی جب میرے کانوں میں سڑک کے کنارے واقع کسی مسجد کے اسپیکر سے پھوٹنے والی اذانِ فجر کی

آواز پڑی۔ چھ بجے کے قریب بس نے ہمیں لاری اڈے پر اُتار دیا۔ میں نے دونوں ماں بیٹے کو ایک شیڈ کے نیچے کھڑا کیا اور پی سی او میں گھس گیا۔ باری باری میڈم شکیلہ، میر وشاہ اور پیا جی کے نمبر ڈائل کیے مگر تینوں 'پاور ڈ آف' ملے۔ مجھے ایک ذرا پریشانی ہوئی پھر میں نے خود کو یہ تاویل پیش کر کے مطمئن کر لیا کہ اس وقت وہ سو رہے ہوں گے۔

میری جسمانی حالت اگرچہ بہتر نہیں تھی مگر ذہنی طور پر میں بہت آسودہ اور خوش باش تھا۔ میں نے معرکہ مارا تھا۔ وہ کام کر دکھایا تھا جس کی فردِ واحد سے سرانجام پانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یقین تھا کہ میڈم میرے ساتھ اماں اور سیمو کو زندہ و تندرست حالت میں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائے گی۔ رکشے میں بیٹھ کر میڈم کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے میں انہی فرحت انگیز سوچوں کے جھولے میں جھول رہا تھا۔

رکشا کو کوٹھی سے چند قدموں کی دوری پر روک کر طے شدہ کرایہ ادا کیا اور دونوں کو ہانکنے کے سے انداز میں چلاتا ہوا کوٹھی کے مین گیٹ پر آیا۔ سورج طلوع ہوا ہی چاہتا تھا۔ ظاہر خان نے مجھے دیکھتے ہی ننھی سی کھڑکی سے سر نکالا، ''اوئے! چڑی مار کا بچہ! تم کون لوگ اے جو فجر ویلے اِی ادھر آ گیا اے؟''

اس کے لہجے سے سخت بیزاری جھلک رہی تھی۔ میں نے قریب ہو کر سرگوشی کی، ''ظاہر خان! میں شہریار ہوں۔''

وہ ایک جھٹکا لے کر پیچھے ہٹا، بغور دیکھ کر بولا، ''اے! تو جھوٹ بولتا اے مولوی..... تم کدھر کا شہریار اے؟ چل دُم دکھا ورنہ پکڑ کر تھانے پہنچا دوں گا۔''

اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں رعب جمایا۔ میں نے پانچ منٹ کی مشاقانہ محنت سے اسے یقین دلایا کہ میں شہریار ہوں۔ اس نے احمقانہ انداز میں ٹٹول کر میری داڑھی کے نقلی ہونے کا یقین کیا پھر مجھ سے کئی نشانیاں پوچھیں۔ میرے درست جوابات پر حیران نظروں سے گھورتے ہوئے گیٹ کا بغلی دروازہ کھول دیا اور اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس نے میری جامہ تلاشی لی اور لباس میں چھپی ہوئی گن اپنی تحویل میں لے لی۔

''خو! یہ اپنا بندوق تو نہیں لگتا۔ پَر ایک دم ڈنڈا مال اے۔ کدھر سے مارا اے؟''

ایک لمحے کو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے نور پور سے نکلتے ہوئے سوچا تھا کہ سڑک کے قریب پہنچ کر گن کو فصلوں میں کہیں پھینک دوں گا۔ جب سڑک پر پہنچا تو گن ے

گلوخلاصی کا خیال دل سے محو ہو گیا۔ حالتِ سفر میں گن کی وجہ سے میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ میں نے بتایا، ''یہ ادھر سڑک پر پڑی تھی۔ سوچا ظاہر خان کے کام آئے گی، اُٹھا لیا۔ تمہیں اچھی لگی ہے تو تم رکھ لو۔''

اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا اور سیمو اور اماں کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ یہ میرے گھر والے ہیں۔ وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر استہزائیہ انداز میں بولا، ''اوئے چڑی مار کا بچہ! تم گھر والوں کو ادھر لانے سے پہلے نہلا دھلا تو لیتا۔ قسم سے بڑا بدبو آتا ہے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ سیمو اور اماں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ انہیں نہائے دھوئے نجانے کتنے دن گزر چکے تھے جس کی وجہ سے ان کے جسموں سے ناگوار بو کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے۔ چونکہ میں فتح کے نشے میں چور تھا، اس لئے میں نے ان کی زبوں حالی پر دھیان نہیں دیا تھا۔ دیتا بھی تو کیا کرتا؛ ان کا حلیہ بہتر کرنے کا وقت اور موقع مجھے میسر نہیں تھا۔ ظاہر خان مجھے ساتھ لئے گیسٹ ہاؤس تک آیا۔ اس نے نیم خوابیدہ گن مین کو متوجہ کر کے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور خود پلٹ گیا۔

میں نے گن مین کی مدد سے گیلری کے آخری کمرے میں دونوں ماں بیٹے کے سونے کا بندوبست کیا۔ گن مین نے باورچی کو جگا کر ہمارے لئے ناشتے کا کہا جبکہ میں نے اپنے گیسٹ ہاؤس کی وارڈروب کھول لی۔ میرا اُتارا ہوا سوٹ ہینگر پر ٹنگا ہوا تھا۔ اسے لانڈری کا چکر لگوا دیا گیا تھا۔ میں ناشتے سے پہلے اپنے میک اَپ سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ باتھ روم میں جا کر میں نے بڑی احتیاط سے داڑھی اُتاری۔ باریک اور نہ دکھائی دینے والی جھلی پر خصوصی گم لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے داڑھی اتارنے کا مرحلہ خاصا اذیت ناک تھا۔ مونچھوں میں گم سے لگے ہوئے لمبے اضافی بال نیم گرم پانی کی مدد سے اُتارے۔ آنکھوں سے لینز نکال کر محفوظ کر لئے۔ زخموں کا معائنہ کیا۔ کتوں کے کاٹنے سے بننے والے ننھے ننھے گڑھوں میں جما ہوا خون بھرا ہوا تھا جسے میں نے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ بھرپور شاور لینے کے بعد جب میں باتھ روم سے نکلا تو بازو اور پنڈلی میں شدید درد ہو رہا تھا جبکہ جسم نسبتاً ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ زخموں کی نوعیت کو دیکھنے کے بعد مجھے ٹریٹ منٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گن مین کو بھیج کر بالائی منزل سے فرسٹ ایڈ کٹ منگوائی۔ اس کی معاونت سے زخموں کی بینڈیج کی۔ دو چار گولیاں پھانکیں اور

بیڈ پر دراز ہو گیا۔ باورچی کو میں نے ہدایت کی کہ جونہی میڈم جاگیں، انہیں میری آمد کی اطلاع دی جائے۔ سیمو اور اماں کا خصوصی طور پر خیال رکھنے کی تاکید بھی کر دی۔

ملتان سے نکلنے کے بعد مجھے اچھی اور گہری نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کھالے کے کمرے میں دیر گئے تک باتوں کا سلسلہ چھڑا رہنے اور ذہن میں سوچوں کی آماجگاہ کے سبب بھرپور طریقے سے سو نہیں پایا تھا۔ دوسری رات کا ابتدائی نصف حصہ اپنے ڈیرے پر چارے والی چادر میں کانپتے اور سوچتے گزارا تھا۔ بقیہ آدھا دورانیہ موت کے رقص کی نذر ہو گیا تھا جس میں ہر آن اعصاب تنے رہے، ہر آن دل کو دھڑکا لگا رہا۔

چونکہ خونیں تگ و دو کا انجام فتح تھا، اس لئے تھکن عذابِ جاں نہ تھی بلکہ فرحت زا تھی۔ میڈم نے مغویوں کا کھوج لگانے کا کام سونپا تھا جو درحقیقت کارِ بے کار تھا۔ میرے ہاتھ میں ایسی الجھی ہوئی ڈور تھمائی گئی تھی جس کے کسی سرے پر کامیابی کا سہرا نہیں سجا تھا مگر میں نے نہ صرف کھوج نکالا تھا بلکہ انہیں باسلامت اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میڈم شکیلہ نے میرے علاوہ اپنے تجربہ کار گینگ کو میرو شاہ کی سربراہی میں اماں اور سیمو کی بازیابی پر روانہ کیا تھا۔ چونکہ میں نے انہیں نور پور میں نہیں دیکھا تھا، اس لئے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ ابھی تک ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوں گے۔ ان کے موبائل فون بند تھے وگرنہ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر گیسٹ ہاؤس کے فون پر ان سے رابطہ کرتا اور ان کی کارگزاری کا استفسار کرتا۔

خانزادی اَسما بونس میں ہاتھ لگی تھی۔ میں جب بھی اُس کے بارے میں سوچتا تھا تو دل میں ایک ٹیس اُٹھتی تھی۔ میرا ضمیر بالواسطہ طور پر اس پر بیتنے والے غیر فطری واقعات کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتا تھا اور ملول کر دیتا تھا۔ اس کا دھندلا چہرہ چشمِ تصور پر طلوع ہو گیا۔ وہ بالترتیب میڈم شکیلہ، میاں دلبر اور یارن خان کے عقوبت خانوں کی یاترا سے قبل اتنی پژمردہ، مضمحل اور شکست خوردہ نہیں تھی۔ اس کا چہرہ گل گوں تھا۔ آنکھوں کی شوخی میں الگ سا حسن کارفرما تھا جبکہ تھل کے پدھرے ٹیلوں جیسے عارض دیکھنے والے کو مبہوت کرنے کی غیر معمولی تمکنت رکھتے تھے۔ اس کے حسن کو جس بے دردی سے پامال کیا گیا تھا، انسانیت سوز تھی۔ دکھ ہوا۔ دماغ نے بہلاوا دیا، 'غم نہ کرو۔ اسما اکیلی نہیں جس کی ذات کی غلام گردشوں میں ناپاک قدم رکھے گئے ہیں۔ چونکہ وہ امیر زادی تھی، اس لئے واویلا زیادہ ہوا وگرنہ غریب زادیوں کی عصمت دری کے واقعات احاطۂ شمار سے باہر ہیں۔'..... دل نے چرکا لگایا، 'نہیں شہرے! عورت عورت ہی ہوتی

ہے۔خواہ امیر ہو یا غریب۔اس نے درست کہا تھا کہ اُس نے تمہارا کچھ بھی تو بگاڑا نہیں تھا کہ تم اُس پر ہاتھ ڈالتے۔'

مجھے بخشو لوہار کی ضعف کے مارے چیختی چلاتی سائیکل پر سوار ہو کر اسما کی طرف جانے والے کھالے کا خیال آیا تو لبوں پر مسکراہٹ آن ٹھیری۔ بند آنکھوں کے پردوں پر کھالے کا سنولایا ہوا چہرہ فرطِ مسرت و جذبات سے سرخ ہوتا نظر آیا۔خوشی میں وہم کا ننھا سا کانٹا چبھ گیا۔کھالا شوق و جوش میں اُسما کو لے کر بلوچ نگر پہنچا ہوگا تو حیدر خان نے اس کا سواگت کس انداز میں کیا ہوگا؟ کہیں بیٹی کو اجڑے حالوں دیکھ کر برہم ہونے والے خانزادے کے تمام تر غصے کا شکار ہی نہ ہو گیا ہو؟.....اگر اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو وہ پھر مجھ پر آگ بگولا ہو کر چڑھ دوڑے گا۔ عافیت کی ایک ہی صورت باقی تھی کہ اسما فوری طور پر اپنے بابا کو خود پر بیتنے والے جملہ واقعات سے آگاہ کر دے اور کھالے کی پوزیشن خان کی نظروں میں بہتر ہو جائے۔اسی ذہنی ادھیڑ بن نے اپنی تمام تر شوریدہ سری نیند کی دیوی کی دہلیز پر ڈھیر کر دی اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

کوئی دو بجے کا عمل تھا جب میری آنکھ کھلی۔میں نے دو چار بھرپور انگڑائیاں لیں، منہ ہاتھ دھویا اور کچن کا رُخ کیا۔کک نے میرے استفسار پر بتایا کہ میڈم کو میرے آنے کی اطلاع دے دی گئی ہے جبکہ دونوں مہمانوں کو میڈم کے حکم پر سخی محمد کے سپرد کر دیا تھا۔میں یہ جان کر شدید متحیر ہوا اور میڈم کی بے اعتنائی غیر فطری لگی کہ میڈم نے ایک نظر سیمو اور اماں کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔وہ گراؤنڈ فلور پر آئی تھی نہ اس نے ان دونوں کو اوپر بلایا تھا۔کجا؛ اُن کے لئے ہلکان ہو رہی تھی اور کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر ویران بیلے میں جا پہنچی تھی۔کجا؛ اُنہیں قریب پا کر بھی ایک نظر دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔

میں تگڑے لنچ سے فارغ ہونے کے بعد میڈم کے بلاوے کے انتظار میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ رہا۔نصف گھنٹے بعد روم انٹر کام پر زرمینا نے میڈم کا پیغام دیا۔میں چند لمحوں بعد اس کے آراستہ کمرے میں تھا۔وہ بیڈ پر گاؤ تکیے کی ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔اس نے سر کی خفیف جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔میں بیٹھ گیا تو وہ بہ نظرِ غور مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا، ''میڈم! کیا بات ہے؟ آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔''

اس نے جواب دینے کے بجائے میٹرس پر پڑا ہوا موبائل فون اُٹھالیا اور کوئی نمبر ملانے لگی۔ میں اس کے غیر متوقع رویے کو دیکھ کر الجھ گیا۔

اس نے کریم کلر کا نفیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ دول کی جھالر والا کوٹ اس پر سج رہا تھا۔ چمک دار زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہلکے پھلکے میک اَپ نے اس کی وجاہت کو مہمیز کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی مگر اس کے چہرے پر طاری سنجیدگی اور تفکر و تردد کی پرچھائیاں دیکھ کر مجھے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز ہو کر فون کانوں سے لگائے بول رہی تھی، ''فضول باتیں نہ کرو، رپورٹ دو۔''

مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ پیش کی جانے والی رپورٹ کو کامل متانت سے سنتی رہی پھر قدرے طنزیہ لہجے میں بولی، ''نہیں شاہ جی! تم مان ہی لو کہ تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ تمہارے دماغ کو زنگ چاٹ چکا ہے۔ تمہاری ساری گفتگو میں کارآمد بات یہ ہے کہ ہمارا مطلوبہ مال نور پور میں ہے۔ کہاں؟ کس کے پاس؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہے ناں؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ میر و شاہ اور پیا جی کی کارکردگی سے ناخوش تھی۔ ان کے لتے لے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی، ''کیا ہمارے کام میں اتنی مہلت ملتی ہے، جتنی تاخیر تم لوگوں نے کر دی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ آر یا پار والا دھندا ہے۔ وہ چھوٹا سا گاؤں، جس میں بمشکل سو کے قریب گھر ہیں، وہاں سے میری تیز طرار ٹیم اپنا مال ڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہی ہے۔ شاہ جی! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یارن خان کیا چاہتا ہے؟ کیا میں شکست تسلیم کرتے ہوئے اس کے آگے سر جھکا دوں، اپنا بنا بنایا سیٹ اَپ اس کے حوالے کر دوں اور یرغمالوں سی زندگی گزاروں؟'' تھوڑے وقفے کے بعد بولی، ''نہیں! تم ملتان آ جاؤ۔ تمام ساتھیوں کو لے آؤ۔ شہریار اکیلا انہیں یارن خان کے پنجوں سے نکال لایا ہے۔''

اس نے منہ بنا کر فون بند کر دیا۔ پھر دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ نخوت سے بولی، ''سراج الدین! گولی چلا کر کسی کو زمین چٹانا بڑی بات نہیں ہوتی۔ بڑی بات یہ ہے کہ سینے کی طرف آتی ہوئی گولی کو جھکائی دے کر خطا کر دیا جائے۔ پھر کیا ہوا کہ تم لوگ ابھی تک ایک چھوٹے سے مشن میں الجھے ہوئے ہو؟''

وہ پیا جی کی کلاس لے رہی تھی۔ دور بیٹھ کر کان کھینچ کر واپسی کا حکم دے رہی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئی، بولی، ''شہریار! تمہارے پاس بتانے کے لئے کیا کچھ ہے؟''

میں نے پیا جی سے میک اَپ کرانے سے لے کر سیمو اور اماں کو گیسٹ ہاؤس کے آخری کمرے میں پہنچانے تک کی جملہ روئیداد بلا کم و کاست پیش کی۔ وہ انہماک سے سنتی رہی۔ اس دوران اس کے لبوں سے ایک کلمۂ تعریف تک نہ نکلا۔ مجھے تند نظروں سے گھورتے ہوئے بولی، ''تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں کیا مشن سونپا تھا؟''

''آپ نے مجھے نور پور میں اماں اور سیمو کا سراغ نکالنے بھیجا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر؟'' وہ اسپاٹ لہجے میں بولی۔

''میں نے اپنا کام مکمل کر دیا۔'' مجھے اس کا رویہ پسند نہیں آ رہا تھا۔

''یعنی؟''

''یعنی میں نے نہ صرف ان دونوں کو ڈھونڈ لیا بلکہ انہیں یارن خان کے عقوبت خانے سے بحفاظت نکال بھی کر لیا۔'' میرے لہجے میں تفاخر کی نمایاں آمیزش تھی۔

''کیا میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ تم یارن خان پر چڑھ دوڑو اور خون کی ندیاں بہا دو؟'' اس نے کاٹ دار انداز میں پوچھا۔

میرے حلق سے طویل سانس خارج ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ میں نے حکم کی تعمیل سے تجاوز کیا تھا جو اُسے ناگوار گزرا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ درشت لہجے میں بولی، ''شہریار! میں نے غنڈوں اور چور اُچکوں کا گروپ بنایا ہے نہ منتشر مزاج کے لوگوں کو ایک چھت تلے جمع کیا ہے۔ میں نے ایک منظم اور مربوط فرم بنائی ہے جس کا ہر فرد ایک معمول اور نظام کے مطابق کام کرتا ہے۔ تم نے حد سے تجاوز کیا، ایک طرح سے میری فرم کے قوانین سے بغاوت کی، جسے میں سخت ناپسند کرتی ہوں اور اس رویے کو اوورایکٹنگ قرار دیتی ہوں۔''

اس کا انداز بڑا تضحیک آمیز اور آمرانہ تھا۔ پہلی مرتبہ مجھے اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دینے کا فیصلہ بُرا لگا۔ میں نے اس کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی، شب بھر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور وہ ستائشی جذبات سے نوازنے کے بجائے میری انسلٹ کر رہی تھی۔ مجھے اپنی فرم کے اصول و ضوابط بتا رہی تھی۔ شدید ذہنی اذیت نے میری زبان گنگ کر دی۔ چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا، پھر کھڑا ہو گیا، بولا، ''یس میڈم! آپ نے بالکل درست کہا ہے۔ مجھے حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔''

دُکھ سے میرا لہجہ بھرا گیا اور میں نے اس سے نظریں ہٹاتے ہوئے دروازے کا رُخ کیا۔

وہ دھاڑی، ''تم کہاں جا رہے ہو؟ تم شاید بھول گئے ہو کہ بغیر اجازت جانا یہاں کے آداب کے منافی ہے۔''

میں پلٹے بغیر ایک ذرا رُکا، بولا، ''میں نہیں بھولا۔ آپ بھول گئی ہیں کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ میں فارمیلٹیز پر اتنا دھیان نہیں دیتا جتنا کام کی سرانجام دہی پر۔ آپ بھول گئی ہیں کہ آپ نے یہ کہہ کر کہ میں آپ کا دوست ہوں، نوکر نہیں، مجھے اوقات سے باہر کیا تھا۔ اسی ہوا میں اڑتا ہوا یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ میں نے احتیاط برتی تھی کہ میرے ہاتھوں کسی کی جان تلف نہ ہو مگر مجبوراً مارا ماری کرنا پڑی۔ میں نہ کرتا تو خان کے باڈی گارڈز مجھے پچھاڑ دیتے۔ خان پر ہاتھ ڈالنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ جب مجھے پتہ چل گیا کہ میرے مطلوبہ کہاں مقید تھے تو کیا میں آپ کے پاس رپورٹ دینے کے لئے بھاگ آتا؟ اس دوران بپھرا ہوا یارن خان ان دونوں کا ٹنٹا نکال دیتا یا انہیں کہیں اور لے جا کر پھینک دیتا۔ ایسا ہی ہوتا ناں؟ پھر کیا میں سر اُٹھا کر آپ کو رپورٹ دیتا اور کہتا کہ جو کام میرے ذمہ لگایا گیا تھا، میں نے کر دکھایا، حکم سے تجاوز نہیں کیا۔ میڈم! آپ ٹھیک کہتی ہیں کیونکہ آپ مالکن ہیں، اس فرم کی کارِ مختیار ہیں جس کا میں معمولی سا نوکر ہوں۔ کسی کا دوست نہیں ہوں۔ اس لئے جو کہتا ہوں، وہ غلط ہوتا ہے۔ جو کرتا ہوں، وہ غلط ہوتا ہے۔''

میری آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا، ''میڈم! مجھے کسی بھی زخم نے اتنا مضطرب نہیں کیا جتنا آپ کی زبان سے ملنے والے زخم نے کیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ جب آپ کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا، تب بلا لیجئے گا، میں آ جاؤں گا۔''

میرا رویہ نامعقول تھا مگر اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کیونکہ تضحیک نے میرے حواس مختل کر دیے تھے۔ میں توقع لے کر میڈم کمرے میں آیا تھا کہ وہ میرے کارنامے پر خوشی سے پھولے نہیں سمائے گی، وہ الٹا ناراض تھی اور میری دانست میں اُس کی خفگی بے محل تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر نکلنا چاہا تو میڈم کی تحکمانہ آواز سنائی دی، ''شہریار! کم بیک.....''

میں تھما، آزردگی سے بولا، ''نہیں پلیز! مجھے جانے دیں۔''

وہ بیڈ سے اُتر کر ننگے پاؤں قالین پر چلتی ہوئی میرے عقب میں پہنچ گئی۔ شانے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولی، ''جذبات انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔ ہر معاملے کو جذباتی نظر سے دیکھو گے تو دھوکے پر دھوکہ کھاؤ گے۔ تم نے ایک نہیں، دو بھیانک غلطیاں کی ہیں۔

سنو! تمہیں یارن خان کے قریب ہرگز نہیں جانا چاہیے تھا کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ کتنا موذی اور خطرناک ناگ ہے۔ ڈستا ہے تو پانی تک پہنچنے نہیں دیتا۔ مجھے علم تھا کہ اس کی حویلی کے نیچے ایک طلسماتی دنیا آباد ہے۔ میں نے اُس میکنزم سے متاثر ہو کر 'سی سیریز' تعمیر کرائی تھی۔ تم لاعلم تھے، اوپر سے خالی ہاتھ بھی۔ تم نے جو کامیابی حاصل کی ہے، یہ بہت بڑی ہے مگر ذرا یہ سوچو، کیا یہ اتفاقیہ کامیابی نہیں؟ کیا تم نے دانستہ طور پر احمقانہ قدم اُٹھا کر موت کے منہ میں ہاتھ نہیں ڈالا؟..... ذرا بتاؤ تو! اگر تم مارے جاتے تو میرا کتنا بڑا نقصان ہوتا؟''

اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں یخ بستہ جھیل کھل گئی۔ میں حیرت سے اُس پل بھر میں بدل جانے والی حسینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی، ''یارن خان اگر عام آدمی ہوتا یا دوسرے خانزادوں کی طرح بارکنگ ڈاگ ہوتا تو کب کا میرے ہاتھوں چلا گیا ہوتا۔''

اس نے شانے پر سے ہاتھ اُٹھایا، میرا ہاتھ تھاما اور کھینچ کر صوفے تک لے گئی۔ ایک ادا سے مسکرائی، پھر صوفے پر دھکیل کر بولی، ''دوسری غلطی تم نے یہ کی کہ زندگی کی قیمت پر ہاتھ لگنے والی اُسا کو تم نے کھالے کے ساتھ روانہ کر دیا۔ کیا تمہیں یاد نہیں تھا کہ میں نے اسا کو کتنی بڑی قیمت وصول کر کے میاں دلبر حسین کے حوالے کیا تھا؟ تم نے ہی وہ رقم رنگو قصائی سے وصول کی تھی۔ بھول گئے تھے کیا؟..... زندہ ہاتھی لاکھ کا ہوتا ہے۔ مرا سوا لاکھ کا۔ تم اگر اسا کو میرے پاس لے آتے تو وہ یقیناً پہلے سے دگنی قیمت دے جاتی۔ حیدر خان کو تم اتنا نہیں جانتے، جتنا میں جانتی ہوں۔ وہ اپنی بدنامی کے گواہ خالد عرف کھالے کو فوراً یا بدیر گولی مروا دے گا۔ کیا سمجھے؟''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے اس رُخ سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا، ''میڈم! مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ رہی بات اُسا کو یہاں لانے کی، تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ میرا ضمیر تب بھی میرے عمل کو قبول نہیں کر رہا تھا جب میں اسے بے ہوشی کی حالت میں رنگو قصائی کے حوالے کرنے گیا تھا مگر آپ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا، اپنے طور پر، کہ میاں دلبر حسین کے تعاقب میں جاؤں اور اسا کو اس کی دلدل سے نکال لاؤں۔ پھر جب وہ مجھے نظر آئی تو مجھے اپنے ضمیر پر پڑی ہوئی بھاری بھر کم سل ہٹانے کا موقع مل گیا۔''

''مالی نقصان تو کیا ناں؟'' وہ اپنی بات سے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔

''آپ کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''اگر ہر امیر آدمی یہی سوچ لے تو دنیا امن اور شانتی کا گہوارہ بن جائے اور ساری بھاگ دوڑ ہی ختم ہو جائے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا، ''تمہاری ناتجربہ کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تمہاری اس غلطی کو نظر انداز کرتی ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھے؟''

میں نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا، کہا، ''نہیں میڈم! آپ کو جب بھی تکلیف میں دیکھوں گا، ایسے ہی الٹے سیدھے کام کروں گا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی، مجھے گھور کر بولی، ''یعنی ہر مرتبہ ایسا ہی کرو گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے گال تمتما اُٹھے۔ آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ برہمی سے بولی، ''اوہ یو کریزی مین! کیوں اپنی غلطی پر ڈٹ گئے ہو۔ ایسی حماقت پھر کبھی نہ کرنا۔ کنویں میں گرے ہوئے آدمی کو نکالنے کے لئے کنویں میں اندھا دھند چھلانگ لگانے والا دُہرا نقصان کر بیٹھتا ہے، فائدہ نہیں۔ تم مجھے بہت پیارے ہو اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ کیا تمہیں اتنی سی بات کی سمجھ بھی نہیں آتی؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اب سمجھا تھا کہ وہ کیوں اتنی برانگیختہ تھی کہ اسے میری کامیابی پر ذرہ بھر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یہ عقدہ کھلتے ہی مجھے اس کا تمتمایا ہوا چہرہ بڑا بھلا لگا۔ میں نے کہا، ''کیا آپ جذباتی انداز میں نہیں سوچ رہی ہیں؟''

وہ ایک دم تھم گئی۔ صوفے پر سر ڈال کر، آنکھیں موند کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ سوچنے لگی۔ اس کے گالوں کی باریک باریک شریانیں چمکنے لگیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما، تھوڑا دبا کر متوجہ کیا اور کہا، ''میڈم! آپ کی فرم کے امور میں جذبات کا عمل دخل یقیناً قابلِ برداشت نہیں ہوگا۔ پھر آپ نے مجھے کامیابی پر مبارک باد دینے کے بجائے اس نقصان کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جو ہوا ہی نہیں۔''

اس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''شہریار! اماں، سیمو اور بابا تینوں میرے نزدیک دنیا کے سب سے قیمتی انسان ہیں۔ انہیں مصیبت میں دیکھ کر میں باؤلی ہو گئی تھی کیونکہ میرا ان سے رشتہ ہے۔ تعلق ہے۔ مگر تمہارا نہیں ہے۔ تمہیں اِموشنل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دیکھو! وہ دونوں تو آگ میں گر گئے تھے۔ تم انہیں آگ سے نکالنے کے لئے گئے تھے۔ اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر نکالتے، احمقوں کی طرح چھلانگ تو نہ لگا

دیتے۔ میں مانتی ہوں کہ تم نے میری خاطر یہ قدم اُٹھایا۔ تم شاید کبھی بھی نہیں مانو گے کہ تم مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنا کہ سیمو اور اماں مجھے پیارے ہیں۔ ہاں! جب مجھے پتہ چلا کہ تم ان دونوں کو نکال لائے ہو تو مجھے ذرہ بھر خوشی نہیں ہوئی بلکہ میں یہ تصور کر کے کانپ اُٹھی کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو..... نہیں شہریار! میں سچ کہتی ہوں کہ تم نے میرا دل دکھایا ہے۔''

اس کی آنکھیں اس کے بیان کی تصدیق میں نم ہو گئیں۔ میں مارے استعجاب و مسرت کے اُسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ وہ میری جانب کھسک کر میرے پہلو سے لگ گئی، بولی، ''جب میرو شاہ میری حکم عدولی کرتا ہے، اول فول بکتا ہے، تب میں دیکھتی ہوں کہ تمہاری آنکھوں سے حیرانی جھلکنے لگتی ہے۔ تم شاید سوچتے ہو گے کہ میں اس سے دبتی ہوں۔ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ میں اس کا احترام کرتی ہوں کیونکہ مجھے اتنی بڑی سلطنت کی رانی بنانے والا وہی مضحکہ خیز حال حلیے والا میرو شاہ ہے۔ میں اس میرو شاہ کو دیکھتی ہوں جس نے مجھے زمین سے اُٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔ اسی طرح میں اُس شہریار کو دیکھتی ہوں جسے دیکھ کر مجھے یقین ملتا ہے کہ دنیا میں خلوص نام کا جذبہ ابھی موجود ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ ایسا سوچ رکھا ہے، جیسا تمہارے وہم و گماں میں بھی نہیں۔''

اس کی خمار آلود آواز سماعت میں اُتر رہی تھی اور دل میں شگوفے چھوڑ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ لبوں سے لگایا اور ممنونانہ بولا، ''میڈم! آپ بہت گہری ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔''

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولی، ''ہاں! یہ ہوئی ناں بات..... مگر تم تو منہ پھلائے ہوئے بھی اچھے لگ رہے تھے۔ آدمی اگر برہم ہو تو فطری صداقت یہی ہوتی ہے کہ وہ ناراض دکھائی بھی دے۔ جو شخص غم چھپا کر مسکراتا ہے، خوشی چھپا کر لاپروا نظر آتا ہے اور غصے کو دبا کر مسکراتا ہے، سمجھو کہ وہ لوگوں کی مرضی کے مطابق نظر آنا چاہتا ہے۔ یعنی منافق ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم ایسے پن کا شکار نہیں ہو۔ آئی لو یو.....''

اس نے ایک جھٹکے سے میری گود میں اپنا سر رکھ دیا۔ بولی، ''بالوں میں انگلیاں پھیرو۔''

میرا ایک ہاتھ اس کے بدن کے نیچے تھا۔ دوسرا بالوں میں رُجھ گیا۔ اس کے مخملیں بال انگلیوں کی پوروں پر سرکنا جانتے تھے؛ دریا کی خشک ریت کی طرح۔ وہ کافی دیر تک ایسے ہی اوندھے منہ پڑی رہی۔ پھر بولی، ''کوئی بات کرو ناں!''

اس کے دل آویز رویے نے مجھ سے قوتِ گویائی چھین لی۔ میں نے دھڑکتے دل سے کہا،
''میڈم! آپ سب سے مختلف ہیں۔''
''یعنی ڈیفرنٹ؟''
''جی!''
''ہوم! یونو؛ داڈیفرنس اِز سمبل آف بیوٹی؟'' وہ چہکی۔
''یس آئی نو میڈم! ایک بات پوچھوں؟''
''پوچھو۔''
''کیا آپ واقعی میرے لئے پریشان تھیں؟''
''تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟'' وہ لاپروائی سے بولی۔
''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' میں جھینپ گیا۔
''تمہارا مطلب کچھ بھی ہو، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''
میں نے کہا، ''میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو وہی کہانی مکمل کر دیں جو آپ مجھے مس عالیہ کے کلینک میں سنانے لگی تھیں۔''
''چندو ماہی اور بابا گانمن والی؟'' وہ ہنسی۔
''جی وہی!'' میں نے کہا، ''انسان جس سے محبت کرے، اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا خواہش مند ہوتا ہے۔''
''ہاں! تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی مگر وقت آنے پر.....''
''بابا گانموں اور اس کے خاندان کے تحفظ کی پالیسی کیا ہے؟''
''ہوں.....'' اس نے میری گود سے سر اُٹھایا، پھر پَرے ہٹ گئی اور بولی، ''بتاتی ہوں۔ تم فریج سے بوتل، برف اور گلاس نکال لاؤ۔''
وہ پینا چاہتی تھی۔ میں نے شکوہ کناں نظروں سے اُسے دیکھا اور حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے ایما پر بیڈ پر تینوں چیزیں رکھ دیں۔ وہ صوفہ چھوڑ کر بیڈ پر آ گئی۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ گلاس میں آگ انڈیل کر، سفید انگارے ڈال کر گھونٹ گھونٹ حلق میں انڈیلنے لگی۔ بولی، ''شہریار! وہ تینوں اَب بیت خیر پور میں محفوظ نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ میرے حوالے سے منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ جب تک وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے، زندہ اور محفوظ تھے۔

انہیں زندہ رکھنے کیلئے میں ان کی غربت کا کڑوا گھونٹ حلق میں اتار لیا کرتی تھی۔'' اس نے ایک بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا، بولی، ''انسان کے پاس کروڑوں کا بینک بیلنس اور جائیداد ہو، تب بھی وہ اپنے پیاروں کو پائی پائی کو ترستا دیکھ کر صبر کرے، بہت صبر آزما ہے مگر میں نے اس عذاب سے صرف اس لئے مفاہمت کئے رکھی کہ میرا دشمن ان پر وار نہ کرے۔ اب وہ بات نہیں رہی اس لئے میں نے انہیں ملتان میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سخی محمد ان کے ساتھ ہے۔ چند دنوں میں ان کا معقول بندوبست کر دوں گی۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اس نے میرے پوچھے بنا میرے ذہن میں کلبلانے والے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اس نے ایک اور آتشیں جام تیار کیا۔ سر جھکا کر کچھ سوچا۔ ایسے میں اس کی انگلی نچلے ہونٹ سے کھیلتی رہی۔ سر اُٹھا کر بولی، ''اب تم گھر جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

میں نے اُس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حسبِ سابق اس نے آواز دے کر دروازے میں روک لیا۔ میں نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر بولی، ''تم نے میری توقع سے کہیں بڑا کام کر دکھایا۔ وہ، جسے میر و شاہ اور پیا جیسے گھاگ آدمی بھی کرنے میں ناکام رہے۔ تمہاری دل داری ضروری سمجھتی ہوں۔ تبھی پوچھتی ہوں کہ تمہیں کیا انعام دیا جائے؟''

پرانے وقتوں کے بادشاہ ایسے ہی پوچھا کرتے تھے کہ 'تو ہی بول، تجھے کیا انعام دیا جائے' یا پوچھا کرتے تھے کہ 'تو ہی بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے'..... پھر بولنے والے کا منہ موتیوں اور ہیروں سے بھر دیا جاتا تھا یا گردن تن سے جدا کر دی جاتی تھی۔ وہ بھی شاہانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ سوچا، آج انعام کا پوچھ رہی ہے، کل سلوک کا پوچھے گی، پھر بے ساختہ میری آنکھیں پھسلتی ہوئیں اُس کے سرخ اور رسیلے ہونٹوں پر جا کر رُک گئیں۔ بولنے لگیں۔ شاہِ وقت کے سوال کا جواب دینے لگیں۔

وہ میرا جواب بھانپ گئی۔ ایک ذرا مسکرائی اور شوخ نظروں سے اجازت نامہ ہوا میں اچھالتی ہوئی آنکھوں کی زباں سے بولی، 'ٹھیک ہے۔ تمہاری مراد تمہاری جھولی میں ڈال دی جائے گی۔'

مسکرا کر بولی ''ٹھیک ہے۔ اس بارے سوچوں گی۔ فی الحال تو میں نے تمہارے لئے ایسا

تحفہ سنبھال رکھا ہے جس کے بارے سن کر ہی تمہارا دل باغ باغ ہو جائے گا۔ بتاؤں؟''

میں نے کہا، ''مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

''پوچھو تو سہی.....'' وہ ایک ادا سے بولی۔

''بتا دیں۔ آپ کا تحفہ یقیناً نایاب ہوگا۔''

''جب تم رنگو قصائی سے نوٹوں بھرا ہوا بریف کیس لائے تھے تب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ماں باپ کو قتل کرنے والا رنگو قصائی ہے۔ تم نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی اور اس سے بدلہ لینے کی اجازت چاہی تھی۔ یاد ہے ناں؟'' اس کی آواز تجسس جگانے لگی۔

میں نے چونک کر کہا، ''جی میڈم! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پھر؟'' رنگو قصائی کا خوفناک چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔

''چونکہ تم اس کے پاس اپنے کام سے نہیں گئے تھے، میرے بھیجنے پر گئے تھے، اس لئے اسے میزبانی کے آداب ملحوظِ خاطر نہ رکھنے کی سزا دینا میرے لئے ضروری تھی۔ میرے حکم پر اس کی تلاش کا کام جاری تھا۔ کل شام اسے بورے والا کے علاقے عمر پور سے پکڑ کر 'سی ون' میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ رنگو قصائی تمہارے لئے میری طرف سے بہترین تحفہ ثابت ہو گا۔'' وہ تمکنت سے بولی، ''کیوں؟ کیا خیال ہے؟''

میرا دل بلیوں اچھلا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا، ''یو آر گریٹ میڈم! میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھلاؤں گا۔''

وہ فاخرانہ ادا سے دیکھ کر مسکرائی اور بولی، ''میں کسی وقت تم سے فون پر رابطہ کروں گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

میری بے اختیار نگاہیں اس پر ساکت ہو گئیں۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، گلاس دکھا کر بولی، ''پیو گے؟''

میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔

بولی، ''کیا تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''

میں نے پھر سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

وہ بے ساختگی آمیز مخمور لہجے میں بولی، ''تو پھر رُک کیوں گئے؟ جاؤ ناں.....''

❖❖○❖❖

شام کا کھانا تناول کرنے کے بعد میں اپنے چچازاد موج دین عرف موجو کے ہوم ورک والی کاپیاں چیک کر رہا تھا، میرے پہلو میں شانو بیٹھی چہک رہی تھی اور سخنے درمے فرزانہ پر چوٹیں کر رہی تھی جب کال بیل بجی۔ میں نے فوجی اختر کو بھیجا۔ توقع تھی کہ پیا جی یا میر وشاہ آیا ہوگا۔ مگر فوجی اختر نے واپس آ کر مجھ سمیت سبھی کو چونکا دیا، ''خالد آیا ہے۔''

وہ کیوں آیا تھا؟ میرے ذہن میں کئی وسوسے کلبلانے لگے۔ میں نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا حکم دیا۔ فوجی اختر چلا گیا تو شانو بولی، ''یہ مویا لوہار تمہاری جان زندگی بھر نہیں چھوڑے گا بھائی!''

اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد کھالا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا حلیہ دیکھ کر دل کو تسلی ہوئی کہ خیریت ہی تھی کیونکہ وہ بن سنور کر، بال چپڑ کر آیا تھا۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا، ''نہیں یار! کھانا کھا چکا ہوں۔ چائے پلوا دو۔ پھر تمہیں مزے کی بات سناتا ہوں۔''

میں نے بہ آواز بلند فوجی اختر کو چائے بنالانے کا حکم صادر کیا۔ دروازے میں شانو نے جھانکا۔ بولی، ''بھائی کھالے! ہمارا گاؤں کیسا ہے؟''

ہم دونوں چونکے۔ مجھے فرش پر پڑنے والے سایوں سے اندازہ ہو گیا کہ شانو کے ساتھ فرزانہ اور موجو بھی ہمہ تن گوش کھڑے تھے۔ کھالا اُٹھا، دروازے میں گیا اور تینوں کے سروں پر روایتی انداز میں ہاتھ رکھ کر پیار کرتے ہوئے نور پور کے بارے میں بتانے لگا۔ جب تینوں کی تشفی ہوئی، تب انہوں نے کھالے کی جان چھوڑی۔

چائے پینے کے بعد اس نے میرے استفسار پر بتایا، ''شہزے! میں نے کبھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ میں اور بی بی جی اس طرح سائیکل پر سفر کریں گے۔ وہ بہت دکھی تھی۔ بات بات پر رو رہی تھی۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اسے نئی زندگی دینے والا ظفر اقبال کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ میں اُسے ٹالتا رہا کیونکہ تم نے مجھے کہا تھا کہ میں اس پر تمہاری حقیقت نہ کھولوں۔ پورے راستے میرا دل حلق میں اٹکا رہا۔ ڈرتا رہا کہ کوئی ہمیں روک نہ لے۔ وہ دیسی برقعے کی وجہ سے دیکھنے میں بوڑھی لگتی تھی۔ بولتی تھی تو جوان آواز قلعی کھول دیتی تھی۔ جونہی ہم بلوچ نگر کے قریب پہنچے، وہ اچھل کر سائیکل سے اُتر گئی اور پوچھنے لگی، ''خالد! تمہیں میری قسم! سچ بتاؤ۔ ظفر اقبال کون ہے؟''

میں نے پوچھا، ''آپ کو کیا شک ہے؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ بولی، ''وہ دیکھنے میں پٹھان تھا۔ بولنے میں ٹھیٹھ سرائیکی جبکہ اس کی آواز میری سنی سنی لگتی تھی۔ چہرہ بھی دیکھا دیکھا لگتا تھا۔ وہ مجھے اور میرے خاندان کو جانتا تھا مگر میں اسے نہیں جانتی ہوں۔ تبھی پوچھ رہی ہوں۔''

اس نے مجھے اپنی قسم دی تھی تو میں خود کو سچ بولنے سے روک نہ پایا اور بول پڑا، ''بی بی جی! وہ کوئی اور نہیں تھا، میرا یار تھا؛ شہرا خان..... اس نے سوانگ رچایا ہوا تھا تبھی آپ کی نظریں دھوکہ کھا گئیں۔''

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ دل یقین کرتا تھا۔ دماغ منکر تھا۔ متردد انداز میں بولی، ''مگر اس نے مجھے یارن خان کے تہہ خانے سے کیوں نکالا؟''

میں نے اُسے تمہارے بارے میں صاف صاف بتا دیا۔ وہ رونے لگی۔ کہنے لگی، ''مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں برے بھلے کی پہچان کھو بیٹھی ہوں۔ کبھی اُسے کتا قرار دیتی ہوں۔ کبھی اسے فرشتہ سمجھتی ہوں۔ خالد! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا میں پاگل ہو گئی ہوں؟''

مجھے اس کی حالت پر ترس آتا تھا۔ میں نے اُسے سائیکل پر بٹھایا اور اس کے اصرار پر بلوچ نگر سے کچھ فاصلے پر واقع اس کے باپ کے ڈیری فارم پر چھوڑ کر بڑے خان کے دارے پر پہنچ گیا۔ وہ زنان خانے میں تھا۔ میں نے سوئے ہوئے نوکر کو جگا کر بڑی مشکل سے خان کو جگا لانے کیلئے اندر بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد خان آنکھیں ملتا ہوا دارے پر آ گیا۔ نا وقت جگائے جانے پر خاصا برہم تھا۔ پریشان بھی تھا۔ میں نے تخلیہ میں اسے بی بی جی کے بارے میں بتایا تو اس کی سستی ایک دم اُڑنچھو ہو گئی۔ عام حالات میں وہ اپنے گن مینوں کے علاوہ دارے سے نہیں نکلتا۔ بی بی جی کا سن کر میرے ساتھ ڈیری فارم پر دوڑا چلا آیا۔ دونوں باپ بیٹی کی ملاقات کا منظر بڑا دردناک تھا۔

سردار حیدر خان مجھے اور خانزادی کو ساتھ لئے زنان خانے میں اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس نے میری موجودگی میں ہی بی بی جی سے کرید کرید کر پوچھا۔ یارن خان اور میاں دلبر حسین کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ بی بی جی نے کہا، ''بابا! میں جانتی ہوں کہ شہرا اپنی بہن کی وجہ سے آپ کا دشمن بنا تھا۔ اس نے مجھے چھوا تک نہیں۔ میاں دلبر اور یارن خان آپ کے خیر خواہ تھے جنہوں نے مجھے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔''

باپ کو بیٹی کا چہرہ آئینہ بن کر شرما رہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ بیٹی بولتی رہی، ''میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کمینے میاں دلبر اور شیطان یار خان کو زندہ رہنے کے قابل نہ چھوڑیں۔ وہ سسک سسک کر مریں گے تو مجھے چین آئے گا۔''

سردار حیدر کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ دونوں مردودوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور شہرے کو چھیڑے گا نہیں۔ پھر دونوں باپ بیٹی مجھ سے تمہارے ٹھکانے کا اَتہ پتہ پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں ٹال دیا اور صبح ہونے سے قبل لوٹ آیا۔ آج سہ پہر کو جب میں چوک قریشی کے ہوٹل پر چائے پی رہا تھا، حیدر خان کا ایک ہرکارہ مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ کار میں آیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ حیدر خان کے ڈیرے پر لے جانے پر مصر تھا۔ چونکہ دیہاڑی دار ڈرائیور بکنگ پر تھا، اس لئے میں نے معذرت کر لی اور کہا کہ پھیرا لے کر نور پور جاؤں گا اور واپسی پر خان کے دارے کا چکر لگا لوں گا۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ تیار شیار ہو کر دارے پر پہنچ گیا۔

بڑا خان میرا منتظر تھا..... ہنسو مت! وہ کھالے لوہار کے انتظار میں دارے کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خاص مہمانوں والے کمرے میں لے گیا۔ تم سے ملنے کی ضد کرنے لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرا تم سے مسلسل رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تمہارے ٹھیے ٹھکانے کی خبر ہے۔ مجھے منانے میں ہر طرح سے ناکام ہونے کے بعد اُسے سمجھ آئی کہ میں کسی بھی صورت اسے تمہارے گھر کا پتہ نہیں بتاؤں گا۔ تب اس نے پینترا بدلا اور مجھے کہنے لگا، ''کھالے! تم میرے ساتھ ملتان چلو اور اُسے تلاش کرو۔ جہاں کہیں ملے، اُسے میرے پاس لے آؤ۔ اگر نہ ملا تو واپس آ جانا۔''

میں نے مجبوراً اس کی بات مان لی اور اس کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس نے مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ جس پر اس کا موبائل فون نمبر چھپا ہوا ہے اور دو ہزار کے کرارے نوٹ تھما کر تمہاری تلاش میں روانہ کر دیا۔ یوں میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔''

کھالے نے بات ختم کی اور صوفے سے پشت ٹکا دی۔ میں نے اُسے گھورا، ''تم تو نرے گنوار نکلے ہو۔ اس کے کارندے تمہارا پیچھا کرتے میرا دروازہ دیکھ گئے ہوں گے۔ مروا دیا ناں لوے کی اولاد!''

اس نے جواباً گھورا اور برہمی سے بولا، ''توں میکوں بدھو سمجھا ہے؟ واہ بھئی واہ..... مجھے یہ

ڈر تھا اس لئے میں آگے پیچھے دیکھ کر یہاں آیا ہوں۔ میں نے راستے میں کئی رکشے بدلے۔ جب یقین ہو گیا کہ خان نے میرے پیچھے کسی کو نہیں لگایا، تب میں نے ادھر کا رُخ کیا۔''

میں نے کہا، ''مگر وہ کمینہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟''

''وہ تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے، اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ یار! کمال کرتے ہو تم بھی۔ ہر بات میں شک کے کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے ہو۔ بُری بات ہے۔'' وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''نہیں یار! اس کی خصلت بری ہے۔ وہ کسی کا احسان مند نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ وہم بھی ہے کہ وہ تمہیں اور اُسما کو بھی 'پار' کروا دے گا۔ دیکھ لینا۔''

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔ بولا، ''ہونہہ! پار کروا رہے گا۔ جانتے ہو، وہ بی بی جی سے کتنا پیار کرتا ہے۔ ایک منٹ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور وہ مجھے کیوں 'پار' کروائے گا؟ میں نے اُس کا کیا بگاڑا ہے۔ ہیں؟''

میں نے اس کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خان سے ملنے سے ترت انکار کر دیا۔ میں حیدر خان یا اسما سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ برابر مجھے مناتا رہا۔ سمجھاتا رہا کہ حیدر خان کا دل موم ہو گیا ہے۔ اس سے بنا کر رکھنی چاہیے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ امیروں سے ٹکراؤ ہمارے بس کی بات نہیں تھی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اکتا کر پوچھا، ''یار کھالے! آخر مجھے اس سے ملنے کا کیا فائدہ ہوگا؟''

''آخر تمہیں نقصان بھی کیا پہنچے گا؟'' وہ زچ ہو کر بولا، ''بھلے آدمی! مل کر دیکھو تو سہی کہ وہ کیا کہتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اگر اس کی کوئی بات دل کو لگے تو ٹھیک ورنہ تم اپنے گھر خوش؛ وہ اپنے گھر۔''

میں اُسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ آیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ فون پر میڈم شکیلہ سے رابطہ کیا۔ شکر ہوا کہ اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ میں نے اُسے مختصر الفاظ میں کھالے کی آمد اور سردار حیدر خان کی خواہش کے بارے میں بتایا۔ وہ بولی، ''تمہارا دوست ٹھیک کہتا ہے کہ تمہیں اس سے مل لینا چاہیے۔ اُسے کہہ دو کہ تم حیدر خان سے کسی ہوٹل میں کل شام کو ملو گے۔ اپنے گھر، حیدر خان کی کوٹھی پر نہیں۔ ہوٹل اور جگہ کے بارے تمہیں بتا دوں گی اور تم کل سہ پہر میں حیدر خان یا خالد کو انفارم کر دو گے۔ او کے اینڈ بائے!''

میں تفصیلاً بات کرنا چاہتا تھا مگر اس نے اپنا فیصلہ سنا کر فون بند کر دیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ

روم میں آ کر کھالے سے کہا، ''ٹھیک ہے یار! اگر تم بضد ہو تو میں ہی ہتھیار ڈال دیتا ہوں۔ اسے جا کر کہہ دو کہ کل شام ملاقات ہوگی۔''

کھالے کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری، بولا، ''مجھے الو نہ بناؤ۔ تم میری ضد پر ہتھیار نہیں ڈال رہے بلکہ اپنی میڈم کی اجازت پر پھدک رہے ہو۔ خیر! مجھے آموں سے غرض ہے، پیڑوں سے نہیں۔ میں اُسے جا کر خوش خبری سنا دیتا ہوں۔''

''میں کل تین چار بجے تمہیں ہوٹل کا نام اور وقت بتا دوں گا۔ تم خان کو مطلع کر دینا۔'' میں اس کا طنز نظر انداز کر کے بولا، ''کیا تم ملتان میں رات گزارو گے؟''

''ہاں..... میں خان کی کوٹھی پر جاؤں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ رات میرے گھر میں رہے مگر وہ نہیں مانا اور چلا گیا۔

کھالا مجھے نئے مخمصے میں ڈال گیا۔ حیدر خان سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ اس کی سرشت میں بھلائی اور شکر گزاری کا مادہ شامل نہیں تھا۔

جب سے مجھے میڈم نے رنگو قصائی کے بارے میں بتایا تھا، طبیعت میں عجیب سا ہیجان اور اضطرار بھر گیا تھا۔ توقع تھی کہ اگلی صبح مجھے میڈم کے خفیہ اڈے 'سی ون' میں پہنچا دیا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک بجے کے قریب میڈم نے فون پر شہر کے ایک معروف ہوٹل کا نام بتایا اور کہا، ''شہریار! وہاں تمہارے لئے کمرہ نمبر تین سو پانچ ریزرو ہے۔ تم چار بجے پہنچ جانا۔ حیدر خان کو پانچ بجے فون کر کے وہاں بلا لینا۔ اور ہاں! یہ دھیان رکھنا کہ تمہاری پرسنالٹی ڈیشنگ ہونی چاہیے۔ حیدر خان دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔''

میں تیار ہو کر، نیا اور قیمتی سوٹ پہن کر چار بجے رکشا میں بیٹھ کر ہوٹل پہنچ گیا۔ پہلی مرتبہ اس ہوٹل میں آیا تھا جس کی جدید طرز کی بلند عمارت کو دیکھتے ہی دل پر دھاک بیٹھ جاتی تھی۔ اندر کا منظر آنکھوں کو خیرہ کرنے والا تھا۔ ہال سے گزر کر استقبالی کاؤنٹر پر پہنچا۔ تعارف اور اندراج کی عمومی کارروائی کے بعد روم کارڈ لئے گائیڈ کی رہنمائی میں لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں تھرڈ فلور پر واقع روم نمبر تین سو پانچ میں تھا۔ وال ٹو وال کارپٹڈ روم کے وسط میں اسپرنگ بیڈ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف صوفے اور ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ ان کے پیچھے وال ٹو وال پردہ لہرا رہا تھا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچا تھا۔ چونکہ میرے پاس ایک گھنٹہ فراغت تھی، اس لئے میں کمرے کو اپنے انداز میں ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔

پانچ بجے میں نے کھالے سے رابطہ کیا اور اسے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتا دیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد مجھے کال کی۔ بولا، ''خان جی سے بات ہوگئی ہے۔ وہ ٹھیک چھ بجے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ یارشہرے! دھیان رکھنا۔ کوئی الٹی سیدھی بات مت کر دینا۔''

میں نے ہنستے ہوئے دلاسہ دیا، ''فکر نہ کرو۔ میں تمہاری 'کتا عاشق بھیڑ معشوق' قسم کی محبت کو ذہن میں رکھوں گا۔''

اس نے حسبِ توقع شایانِ شان جذبۂ خیر سگالی پیش کیا۔ میں نے ہنستے ہوئے فون بند کیا اور میڈم سے رابطہ کیا۔ اسے رپورٹ دی۔ وہ بولی، ''شہریار! حیدر خان سیاسی گرگٹ ہے۔ بھروسے والا آدمی نہیں ہے۔ تم اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا۔ ملاقات کے دوران اپنا فون سائیلنٹ موڈ پر کر دینا۔ میں کال کروں گی، تم ریسیو کر کے خاموشی اختیار کر لینا تاکہ میں تم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو سنتی رہوں۔ میری مشاورت کی ضرورت محسوس کرو تو باتھ روم میں جا کر بات کر لینا۔ اور ہاں! تم نے برابری کی سطح پر اس سے بات چیت کرنی ہے۔''

فون بند ہوگیا۔ میں ننھی سی اسکرین کو گھورتا رہا۔ چھ بجے حیدر خان کو روم سرور نے میرے کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے میڈم کی ہدایات کے مطابق برابری کی سطح پر کھڑے ہو کر سردار حیدر خان کا استقبال کیا۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہوا صوفے پر آن بیٹھا۔ میں نے پوچھا، ''آپ اکیلے آئے ہیں؟''

وہ بولا، ''نہیں۔ گارڈز کو نیچے پارکنگ میں چھوڑ آیا ہوں۔'' اس کی بھاری اور کڑک دار آواز کمرے میں گونجی۔

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں اس فرعون کی بیلے والی حویلی کی ایک چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور وہ فرعونیت بھری آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا، ''بتا اوئے بھتنی کے بچے! خانزادی کہاں ہے؟''

تب میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ میاں دلبر حسین کے پاس ہے تو اس کی شکل بگڑ گئی تھی۔ شاید اس نے میری بات کا یقین بھی نہیں کیا تھا۔ مقام اور ملاقات کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اس کی شخصیت کا وہ دبدبہ جو ہم دیہاتیوں کی سرشت میں گھلا ہوا تھا، آج بہت کمزور ہو گیا تھا۔

میں نے انٹر کام پر فاسٹ فوڈ اور ڈرنکس کا آرڈر نوٹ کرایا اور اس کے قریب صوفے پر آن بیٹھا۔ اس نے حسبِ معمول آف وائٹ کرنڈی کا بہترین سوٹ اور کالے رنگ کی واسکٹ

زیب تن کی ہوئی تھی۔ گرم اونی شال کندھوں پر مخصوص انداز میں ڈال رکھی تھی۔

مجھے دیکھتے ہوئے سرائیکی زبان میں پیار سے بولا، ''شہرے پتر! وَڈا وَڈا اِی ہوندائے۔ نکا ہمیش کیتے نکا اِی رہندائے۔ وڈا معافی منگے تاں وَڈیائی، نکا من و نجے تاں وَڈیائی..... ڈیکھ! میں تیڈے کولوں معافی منگن آیاں۔''

(شہرے پتر! بڑا بڑا ہی ہوتا ہے۔ چھوٹا ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ بڑا اگر معافی مانگے تو یہ اس کی بڑائی اور چھوٹا مان جائے تو یہ اس کی بڑائی ہوتی ہے۔ دیکھو! میں تم سے معافی مانگنے کے لئے آیا ہوں۔)

مجھے ایک لمحے کو کانوں سنے پر یقین نہیں آیا۔ ایسے ہی وقت میڈم کی کال آ گئی۔ فون میرے ہاتھ میں تھا۔ سکرین کے بلنک کرنے پر میں نے غیر محسوس انداز میں کال ریسیو کر لی۔ کہا، ''خان جی! ان باتوں کو چھوڑیں۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ آگے کیا ہونا ہے، یہ سوچنے کی بات ہے۔''

وہ بولا، ''نہیں شہرے! دلوں میں میل ہو تو بیٹھنے اور باتیں کرنے کا فائدہ نہیں۔ جب مجھے خانزادی نے بتایا کہ تم نے اُسے کمینے یارن خان کی حویلی سے نکالا تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میرے خاندان کا جوان اپنے خاندان کی لج سنبھالنے جوگا ہو گیا ہے۔ میں نے اسی وقت تم سے ملنے اور تمہارا شکریہ ادا کرنے فیصلہ کر لیا۔''

وہ واقعی سیاست دان تھا۔ اس نے میری بہن کو اغوا کرایا تھا۔ اسے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ میرے چاچا اور چچی کو گھر سمیت جلا کر خاکستر کرنے والا مرکزی کردار وہی تھا جبکہ اس کے نزدیک میں نے اسما کو اغوا کیا تھا۔ ان سب باتوں پر پردہ ڈال کر میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میڈم نے سچ کہا تھا کہ وہ سیاسی گرگٹ تھا۔ رنگ بدل کر وار کرتا تھا۔

میں نے کہا، ''میں نے جو کچھ کیا، اسما کے لئے کیا، آپ کے لئے نہیں۔ چونکہ آپ اس کے والد ہیں، اس لئے میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔''

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے اس کی بیٹی کا نام لیا تھا۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اسما کا نام اس کے سامنے لیا تھا تو اس نے پھاڑ کھانے کے سے انداز میں تنبیہ کی تھی، ''اپنی گندی زبان سے خانزادی کا نام مت لو ورنہ اَبھی زبان کاٹ دوں گا۔''

آج اس نے یہ کڑوی گولی حلق میں اتار لی تھی۔ بولا، ''شہرے خان! مجھے تم پر فخر ہے۔ میں خانزادی کا بابا بن کر نہیں، بلوچ خانوادے کا بڑا بن کر تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے فخر ہے

کہ تمہاری رگوں میں اسی غیرت مند خاندان کا خون دوڑ رہا ہے، اس لئے چل کر آیا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔''

میں چونکا، ''کیسی مدد؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

وہ میری طرف جھک آیا، رازداری سے بولا، ''یارن خان نے خاندان سے باہر شادی کی تھی۔ تمہیں علم ہے اس بات کا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سلسلہ کلام جوڑا، ''وہ کسی گندے خاندان کی عورت تھی۔ یہی وجہ ہے یارن خان کی آنکھوں پر بھی بے غیرتی کی چربی چڑھ گئی ہے۔ خانزادی اسما رشتے میں اس کی بیٹی بھتیجی لگتی تھی۔ دشمنی کے بغیر اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا۔ کیا یہ بات قابلِ معافی ہے؟''

میں نے کہا، ''نہیں خان جی! خاندان کی بیٹی، سگی بیٹی جیسی ہوتی ہے۔ اس پر میلی نگاہ ڈالنا بے غیرتی ہے۔''

اس کے بدن کو جھٹکا لگا۔ یہ کڑوی گولی نگلنی مشکل تھی مگر نا چار نگل گیا۔ بولا، ''میں چاہتا ہوں کہ جو آگ اس نے خاندان میں لگائی ہے، وہ اس کے گھر میں بھی بھڑکے۔''

''یعنی آپ چاہتے ہیں کہ اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے جیسا آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں..... تاکہ اس کے پاؤں جلیں۔'' اس نے تھوک نگلا، چہرہ متغیر ہوا مگر غصہ دبا کر بولا، ''اسے پتہ چلے کہ کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔''

اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں اور سانسیں پھول گئیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد بولا، ''میں چاہتا ہوں کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ ہڈ پیر جواب دینے لگے ہیں جبکہ یہ جوانوں کا کام ہے۔ تم لاہور جاؤ اور اس کی بیٹی عافیہ خان کو اُٹھا لاؤ۔ اس طرح کہ پتہ یہی چلے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ اُدھل گئی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں اُس کے پل پل سرخ ہوتے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی امید بھری نظروں کے جواب میں میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا ''نہیں خان جی! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بھی وہ کام نہ کریں جو یارن خان نے کیا ہے۔''

اسے میرا مشورہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ منہ بنا کر بولا، ''میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری مدد چاہیے، نصیحت کی بارش میرے دل میں بھڑکنے والی آگ کو نہیں بجھا سکتی۔ اس کام پر جتنا بھی خرچ آئے، میں دینے کے لئے تیار ہوں۔ دس، بیس، پچاس..... جتنے لاکھ بھی لگیں، میں دینے کو تیار ہوں۔ بولو!''

اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔ میں نے استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا، ''آپ کا مجرم اکیلا یارن خان ہی نہیں، میاں دلبر بھی ہے جس نے یاری کی آڑ میں آپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔''

وہ تڑپ کر بولا، ''بے غیرت یارن کے بعد اس کی باری ہے۔ میں اس کتے کو کیسے بھول سکتا ہوں۔''

میں نے ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد واش روم کا قصد کیا۔ فون پر میڈم کی کال چل رہی تھی۔ میں نے کان سے لگایا اور نہایت مدھم آواز میں بولا، ''میڈم! آپ نے اس کتے کی باتیں سن لیں؟''

اس کی آواز کان میں گونجی، ''اس سے دو کروڑ میں سودا طے کر لو۔ آدھی ادائیگی پہلے، آدھی مال کی وصولی پر۔''

میں نے مزاحمت کی، ''مگر میڈم.....''

''فضول باتیں نہ کرو۔ جو کہتی ہوں، وہ کرو۔'' اس کا لہجہ سخت تھا۔

میں واش روم سے نکل کر خان کے پاس آیا۔ کہا، ''خان جی! میں آپ کی باتیں سن اور سمجھ چکا ہوں۔ میں آپ کی مشکل آسان کر سکتا ہوں۔ آپ کو انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع دے سکتا ہوں مگر اس کی قیمت آپ کو ادا کرنا ہوگی۔''

وہ خوش ہو گیا، ''ہاں ہاں بولو! مجھے منظور ہے۔''

میں نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائیں، ''دو کروڑ روپے.....''

اس نے دیدے پھیلائے، ''دو کروڑ! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ میں اتنی رقم کہاں سے دے سکتا ہوں۔''

میں نے کندھے اُچکائے، ''تو پھر اس معاملے پر مٹی ڈالیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

زوردار بحث کے بعد آخر اسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور دو کروڑ پر سودا 'ڈن' کرنا پڑا۔ میں نے اگلی شرط سنائی، ''آدھی رقم ایڈوانس، آدھی کام ہونے پر۔''

اس نے اس شرط پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور بولا، ''دس دن کے اندر تمہیں رقم پہنچا دوں گا۔ کام ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟''

میں نے کہا، ''دس دن یا ایک ماہ..... گولی مارنے سے عزت پر دھبہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔''

اس نے مجھے تاکید کی کہ میں اس ڈیلنگ کا تذکرہ خالد عرف کھالے لوہار سے ہرگز نہ کروں۔ میں نے حامی بھر لی۔ اس دوران تواضع کا سامان میز پر سرو کر دیا گیا۔ اس نے ایک سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک لیا۔ وہ سیاست دان تھا۔ سیاسی ہنڈیا میں جھوٹ کی ترکاری ابالنے کے ہنر میں یکتا تھا۔ اس نے خوشامدانہ باتوں سے میرا دل موہنے کی بھرپور کوشش کی۔ خاندانی غیرت ابھاری۔ کئی میٹھے اور سہانے خواب میری جاگتی آنکھوں کے حوالے کرنے کے بعد اس نے رخصت چاہی۔ میں اُسے گیلری تک 'سی آف' کرنے آیا۔ ایسے میں میرے لبوں پر بھی دکھاوے کی مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔

میں نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کیا۔ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ فون کان سے لگا کر بولا، ''میڈم! یہ آپ نے کیا کیا؟ کیا اب میں یارن خان کی بیٹی کو اغوا کرنے لاہور جاؤں گا؟''

اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی، بولی، ''نہیں جانم! تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہوگا۔ دیکھتے جاؤ؛ میں کیا کرتی ہوں۔''

''مگر.....''

''اگر مگر مت کرو۔ فوراً کمرہ چھوڑ دو اور فورتھ فلور پر روم نمبر فور فورون میں آ جاؤ۔''

''کیا مطلب؟ کیا آپ بھی اسی ہوٹل میں ہیں؟'' میں حیران رہ گیا۔

''تو کیا میں تمہیں اکیلا چھوڑ سکتی ہوں۔ کم آن!'' اس نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ میں کمرے سے نکلا۔ طویل راہداری کے آخر پر واقع سیڑھیاں چڑھ کر چوتھی منزل پر پہنچ گیا۔ کمرہ نمبر چار سو اکتالیس تلاش کرنے میں دقت پیش نہیں آئی۔ دستک کے جواب میں میڈم نے دروازہ کھولا۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ سرخ اور زرد رنگ کے نفیس امتزاجی سوٹ میں تھی۔ سیدھی دل میں اُتر گئی کیونکہ اپنے ثقافتی لباس میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ میں نے اُسے اکثر پینٹ شرٹ میں دیکھا تھا۔

وہ میرے انہماک کو تاڑ گئی، ایک ذرا مسکرا کر بولی، ''کیا باہر ہی کھڑے رہو گے۔ اندر آ جاؤ۔''

کمرے کی تزئین و آرائش ویسی ہی تھی جیسی نچلے فلور پر دیکھ آیا تھا۔ بے آواز چلتے ہوئے ٹی وی سے پھوٹتی ہوئی مختلف رنگوں کی کرنیں قالین اور دیوار و در پر تھرک رہی تھیں۔ نرم دودھیائی روشنی میں، میڈم کی ہوش ربا موجودگی میں کمرہ خواب ناک کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ وہ میرے آگے چلتی ہوئی انٹر کام تک آئی۔ مینو سلپ پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے ریسیور کان سے لگا کر روم سروس کو کھانے کی ہدایات دینے لگی۔ فارغ ہو کر میری طرف پلٹی۔ چند لمحے اپنے مخصوص شوخ انداز میں دیکھتی رہی پھر ہوا میں اُچھلی اور دونوں بانہیں پھیلا کر چاروں شانے چت بیڈ پر گری۔ بیڈ کے اسپرنگوں نے اُسے کم و بیش تین فٹ اوپر اچھال دیا۔ چند لمحوں تک اوپر نیچے ہوتی رہی، پھر بولی، ''شہریار! آج میں اپنے لئے سگریٹ لے آئی ہوں۔''

میں نے برا سا منہ بنایا۔ کہا، ''آپ سگریٹ پیتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔''

اس نے جواباً منہ بنایا، ''میں کب اچھی لگنا چاہتی ہوں۔''

اس نے اپنے بائیں ہاتھ پڑی تپائی پر ہاتھ مارا۔ سگریٹ کیس اور لائٹر اُٹھایا۔ ایک سگریٹ منتخب کر کے نکالی اور دانتوں میں داب کر سلگا لی۔ سگریٹ کے دھوئیں نے بند کمرے میں چکراتی ہوئی ائر فریشنر کی خوشبو کو آن واحد میں ہڑپ کر لیا۔ وہ میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ بھانپتی ہوئی ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے کھانسنے لگی۔ سگریٹ والا ہاتھ ہوا میں لہرا کر بولی، ''سگریٹ کے ایک سرے پر آگ جلتی ہے اور دوسرے سرے پر احمق کا دل سلگتا ہے۔ ہے ناں مزے کی بات؟''

میں خاموشی سے کھڑا رہا۔ وہ بولی، ''میں بچپن میں چوری چوری حقہ پیا کرتی تھی۔ جب چلم میں گڑ کم ہوتا تب شدید کھانسی آتی۔ نہ جانے پھر بھی کیوں حقہ پینے میں مزہ آتا تھا۔ تم دیہاتی ہو۔ جانتے ہی ہو گے کہ حقہ پینے والا سارا دن بھوکا تو رہ سکتا ہے مگر حقے کے بغیر ایک گھنٹہ نہیں گزار سکتا۔''

میں نے طویل سانس لی، ''پلیز! آپ سگریٹ نہ پیا کریں۔''

وہ بولی، ''تم ایسے کیوں منہ بنائے کھڑے ہو۔ ادھر آؤ ناں۔ اپنی برادری کے ایم پی اے کے بارے میں بتاؤ۔ آج وہ سانپ اپنی کنج اُتار کر آیا تھا۔ کیسا لگ رہا تھا؟''

میں بیڈ کی ایک نکڑ پر ٹک گیا۔ بولا، ''اس کی عیارانہ اداکاری کو دیکھ کر میرا جی چاہ رہا تھا میں اس کا منہ توڑ دوں۔ دانت نکال کر ہتھیلی پر رکھ دو۔ اسے ذرہ بھر یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے مجھ پر

ناقابلِ معافی ظلم توڑے تھے۔ وہ احسان مندی کی رسی تھام کر مجھ تک پہنچ گیا۔ تف ہے ایسے بے غیرت سیاست دان پر!''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس ملک کی سیاست اس رنڈی کی مانند ہے جو بھوکے دلالوں کے ہاتھ لگ کر گوشہ گوشہ دوڑتی ہے مگر کہیں پناہ نہیں پاتی۔ نہ صرف حیدر خان، بلکہ یہاں سبھی ایک جیسے ہیں۔ کھانے کے دانت اور، دکھانے کے اور۔ اس کمینے سے کوئی مزارعہ دو چار بوریاں گندم کی مانگنے چلا جائے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہوگی۔ آج اپنی بیٹی کی ہم عمر لڑکی جو بقول اس کے، اس کی بھی بیٹی بھتیجی لگتی ہے، کو نوچنے کیلئے دو کروڑ دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ دو کروڑ!.....اتنی بڑی رقم جس سے پورا ایک گاؤں نئے سرے سے بسایا جا سکتا ہے۔ مگر وہ بڑا کمینہ ہے۔ ایک طرف دو کروڑ خرچ کرے گا۔ دوسری طرف یارن خان کو نیچا دکھا کر تین کروڑ مانگے گا۔ یہی حربہ میاں دلبر پر آزمائے گا۔ اپنا انتقام بھی لے گا اور دام بھی کھرے کرے گا۔''

اس نے لمبا کش لیا اور دھواں میری طرف اچھال دیا۔ میں نے ہاتھ سے دھوئیں کے مرغولوں کو منتشر کیا، کہا، ''میڈم! میں اس کے گندے کھیل میں معاونت نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ بولی، ''کیا تمہیں یارن خان سے ہمدردی ہے؟''

میں نے جھٹ سے کہا، ''نہیں۔ مگر میں کسی لڑکی کو پامال کرنا بزدلی اور کمینگی سمجھتا ہوں۔''

وہ اُٹھ بیٹھی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، کیا وہ کمینگی نہیں؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے اُسے شکوہ بار نظروں سے دیکھا۔ کہا، ''میڈم! آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''مجھے سمجھانے کے بجائے تم دو کروڑ روپے کی طاقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ گنتے گنتے انگلیاں شل ہو جاتی ہیں۔'' اس نے مربیانہ انداز میں کہا، ''تم نے رات میں اسما کو دیکھا۔ نہ زندہ، نہ مردہ ہے۔ دو چار دنوں کے بعد اُسے پھر دیکھنا۔ وہی، جو تمہیں فرشتہ قرار دے رہی تھی، تمہیں انسان قرار دینے سے گریزاں ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح خوبصورت اور پاکیزہ دکھائی دینے لگے گی کیونکہ اس کی شخصیت کے عقب میں اس کے سیاست دان باپ کا کروفر چھپا ہوا ہے۔ فرعونیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ بھول جائے گی کہ اُس کے ساتھ کیا انسانیت سوز اور اخلاق

پاش سلوک کیا گیا تھا۔ ہاں! یارن خان کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا اور وہ وقت گزرنے پر بھول جائے گی۔ غریبوں کی لڑکیاں خود کشیاں کرتی ہیں۔ ان کا منہ کالا ہوتا ہے۔ ان کا نہیں۔ اور تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ خانزادیاں، اسما یا عافیہ خان، باکردار اور پارسا لڑکیاں ہیں؟ کیا ان کی راتوں میں انگارے پھینکنے والا کوئی مشتاق چاند طلوع نہیں ہوتا؟..... نہیں شہریار! کوئی ظلم نہیں ہوگا اگر ان کی دو چار راتیں بیچ کھالی جائیں گی۔''

میں اس کی باتوں میں چھپی سنگین معنویت سمجھ رہا تھا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میڈم میرے سمجھانے کے باوجود وہی کرے گی، جو وہ دل میں ٹھان چکی تھی۔ تبھی میں نے کندھے اُچکائے، کہا، ''میڈم! آپ بہتر فیصلہ کرسکتی ہیں۔''

وہ خوش ہوگئی، سگریٹ کو شیشے کی ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولی، ''گڈ! اب ہم اس موضوع کو وقت آنے پر ڈسکس کریں گے۔''

وہ میری جانب جھکی۔ قریب آتے آتے رُک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ عادتاً نچلے ہونٹ پر انگلی رکھی۔ دائیں گوشے تک دھیرے دھیرے پھسلائی، پھر گلاب کے پتوں پر پڑے اوس کے قطروں جیسے ننھے ننھے اُبھاروں کے بیچ لاکر روک دی۔ آنکھیں چندھیا کر انگلی کی پور چوم لی۔ پھر بیڈ سے اُتر کر باتھ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی۔ بولی، ''تمہیں سگریٹ کی بو اچھی نہیں لگتی اس لئے میں ماؤتھ واش لینے گئی تھی۔ وہ نہیں ملا تو برش کرنا پڑا۔''

میں نے نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بولی، ''تمہارا منہ مانگا انعام تمہارے شایانِ شان تو ہونا چاہیے ناں!''

وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ اَدھ کھلی آنکھوں سے دعوت انگیز انداز میں دیکھنے لگی۔ ہونٹ نیم وا کر کے بولی، ''آؤ مسٹر الیگزنڈر دی گریٹ..... اپنی فتح یابی کا جشن مناؤ..... اپنا انعام وصول کرو۔''

مجھے یوں لگا جیسے میرا بدن شل ہوگیا ہو۔ اپنا منہ مانگا انعام وصول کرنے کا حوصلہ دم ایک دم ٹوٹ گیا اور میں مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا جسے دیکھنا بھی دل گردے کا کام تھا۔

وہ مقتل سجائے نیم باز آنکھوں سے مجھے پکار رہی تھی۔ میرا خمیر دیہات کی سوندھی اور قدامت پسند روایات میں گندھی ہوئی مٹی سے اُٹھا تھا۔ میں نے آج تک جس بھی عورت کو چاہے جانے کے قابل دیکھا تھا، وہ پکارتی نہیں تھی، شہرِ عشق میں دیوانہ وار پکاری جاتی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر سر جھکاتی تھی، ایک ادا سے آنکھیں چراتی تھی مگر بولتی نہیں تھی۔ نہیں

نہیں' کے دل فہم پردے میں 'ہاں ہاں' کی تال پر بچکانہ دل کی طرح دھڑکتی تھی اور اپنے دیوانے مور کے پیروں میں رقص کی بجلیاں بھر دیتی تھی۔ یہاں معاملہ برعکس تھا۔ مجھ پر بجلیاں گرانے والی میرے خیالاتی پیچ وخم سے ناشناس، اپنی آتشیں دنیا میں دہک رہی تھی۔ سرخ ہو رہی تھی۔ تاخیر پر برہمی سے بلا رہی تھی، ''آ ؤ بھی.....''

تابِ پیش رفت کہاں؟ مجالِ انکار کہاں؟..... بلا پس وپیش قدموں نے اس کی دعوت پر سرِتسلیم خم کیا اور میں گویا ہوا میں تیرتا ہوا قریب پہنچ کر اُس پر جھک گیا۔ اُس نے اپنے مرمریں جمال کے دیوانے کو دونوں ہاتھوں تھام لیا پھر شعلۂ رُو نوک پر گرالیا۔

وہ عجیب ماس تھا جو جلنے کے بجائے جلا رہا تھا۔ یکبارگی یوں لگا جیسے میں برف میں لپٹی ہوئی کسی سنسان پہاڑی پر سیکڑوں میل دوڑتا ہوا اچانک آگ کے دریا میں آن گرا تھا۔ میڈم نے مجھے اپنی طرف کھینچا تھا یا وقت نے مجھے اس کی طرف دھکیل دیا تھا، یاد نہیں..... مگر اتنا یاد ہے کہ اس نے میری دیوانگی کو بڑی نرمی سے قبول کرلیا تھا۔ میں نے اُسے زور سے بھینچا؛ اتنا کہ اگر وہ عام لڑکی ہوتی تو اس کی پسلیاں کڑک جاتیں۔ اچانک اُس نے اپنے نخلِ جاں کی سطوتیں سمیٹ لیں اور مجھے بیڈ پر ایک جانب دھکیل دیا۔ بکھری ہوئی سانسوں میں بولی، ''تم تو نرے پاگل ہو یار!''

یوں لگا جیسے اُس نے کہا ہو، 'انعام لے رہے ہو یا لوٹنے کا ارادہ ہے؟'

مجھے شرمندگی ہوئی۔ بانہوں پر چہرہ رکھے اوندھے منہ لیٹ گیا اور اپنی منتشر سانسیں سنبھالنے لگا۔ وہ کروٹ بدل کر دور ہوئی، پھر قریب آ گئی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ بے ربط بولنے لگی، ''سوری شہریار! میں بھول گئی کہ تم بن بلائے نہیں آئے۔ تمہیں بلا کر دھکے دینے لگی۔ مگر کیا ہے کہ دل کے ہاتھوں مجبور کر ہو کر ایسا کرتی ہوں۔ بلاتی ہوں، پھر اپنے آپ کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر تمہیں پَرے دھکیل دیتی ہوں۔ محبت کرتی ہوں مگر محبت کرنے والے سے ڈر جاتی ہوں۔ شاید میں بہت خودغرض ہوں۔ ہے ناں؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی انگلیوں کی پوروں سے کیف وسرور کی الوہی لپٹیں نکل کر میرے پورے وجود میں سرایت کر رہی تھیں۔ دل کی سرمئی سلیٹ پر چاک سلیٹی گدگدا کر ہولے ہولے پھسل رہی تھی اور نئے نئے لفظ نقش کر رہی تھی جن کا مفہوم عمر تمام ہونے تک کھلتا رہتا ہے۔

جواب نہ پا کر اُس نے کہا، ''تم نہیں بولتے۔ نہ بولو۔ کیونکہ تم نے جو کچھ بولنا تھا، بول دیا۔ میں نے جو کچھ سننا تھا، سن لیا۔ دنیا میں اور کہنے سننے کے لئے ہے بھی کیا؟''

ایک طرف میں اپنی زیروزبر ہوتی ہوئی دنیا کو اُس کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف اس کے وجود کی مخصوص مہک مجھے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ میری انگلیاں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ ایسے میں دروازے پر دستک ابھری۔ یاد آیا کہ اُس نے کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ موقع غنیمت تھا۔ سو جلدی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کھانے کے لوازمات سے لدے پھندے دو باوردی روم بوائز گیلری میں کھڑے مؤدبانہ انداز میں اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ اجازت پا کر اندر آئے اور مشاقانہ انداز میں چند ہی لمحوں میں کھانے کی میز سجانے لگے۔

کھانے کے دوران میڈم بہت سنجیدہ تھی مگر چہرہ سرخی مائل تھا۔ میں نے پوچھا، ''آپ کبھی نور پور گئی ہیں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ مجھے حیرانی ہوئی، ''کب؟''

اس نے سوپ کا چمچ منہ میں ڈالا۔ بولی، ''مدت پہلے۔''

وہ کھانے میں منہمک تھی۔ میں نے چور آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ اس کے بدن کی نزاکتوں کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ کہاں بیٹ خیر پور کا جفاکش ماحول، کچا اور زبوں حال گھر؛ کہاں بابا گانمن، اس کی بیوی اور سیمو..... کہاں میرے سامنے بیٹھی طرح دار اور بے انتہا امیر لڑکی؟ ایک ہی ذات میں دکھائی دینے والا زمین و آسمان کا ملاپ نہ صرف مجھے حیران کر دیتا تھا بلکہ مشکل میں بھی ڈال دیتا تھا۔

اُس نے اٹالک 'وی' شکل کے گلے والی دو رنگی قمیص پہن ہوئی تھی۔ آدھی آتشیں سرخ، آدھی زرد۔ دونوں رنگوں کے ملاپ پر سنہری پتیوں والی بیل گلے سے نیچے تک چلی گئی تھی۔ سفید کروشیائی پٹی دائیں کندھے کی طرف جا کر بالوں کے نیچے غائب ہو جاتی تھی۔ سیاہ بالوں اور سرخ قمیص سے جھلکتی ہوئی گلابی سفید گردن پر نظریں بے اختیار پھسل پھسل جاتی تھیں۔ بے انتہا چمک دار، سیاہ اور متجسس آنکھوں پر لمبی پلکوں کی لرزیدہ جھالریں، کم ہوا والی پلاسٹک بال کی طرح ملائم اور ابھرے ہوئے گال، ننھی سی اَن چھدی ناک، باریک لکیروں والے بھرے بھرے اور چمکدار ہونٹ..... اُسے دیکھے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ دیکھتے رہنا بھی بس میں

نہیں رہتا تھا۔

میں کھانا بھول گیا۔ ہاتھ تھم گئے۔ آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ کہتے ہیں کہ خوب سے خوب صورت تر انسان بھی ہر نظر کو حسین نہیں لگتا۔ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ دنیا میں ایسی بھی کوئی نظر ہوگی جسے میڈم شکیلہ خوبصورت نہیں لگے گی؟..... غیر ارادی طور پر میرا سر نفی میں ہل گیا اور دل نے کہا، 'نہیں! ایسا کوئی بینا نہیں ہوگا جسے وہ اچھی نہیں لگے گی۔'

میرے وسیب کے لوگ کہتے تھے کہ عورت کے نین ونقوش کا تیکھا پن حسن ہوتا ہے۔ غزالہ کا حسن تیکھا تھا۔ اس کی ناک ستواں تھی۔ آنکھیں ہرنی جیسی۔ انگلیاں لمبی اور مخروطی جن کے سروں پر لمبے خم دار ناخن چسپاں تھے۔ باریک ہونٹ اور چھریری جلد والا چہرہ۔ اسما اُس سے دو چار گام آگے تھی۔ اس کے نقوش بھی قاتل تھے۔ خانزادوں کی ساری اولاد ایسی ہی تھی۔ مگر میڈم ایسی نہیں تھی۔ اس کی ناک لمبی اور ستواں نہیں تھی۔ ناخن لمبے نہیں تھے، ننھے منے اور گول گول جبکہ آنکھیں بھی بچوں کی طرح بڑی اور گول تھیں۔ ہونٹ نسبتاً موٹے تھے۔ میرے ذہن پر بچپن سے نقش حسن کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھی مگر وہ ہر معیار پر بھاری پڑ گئی تھی۔ کیوں اُسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا؟..... اُسے دیکھ کر میری سانسیں کیوں رکنے لگتی تھیں؟

تب سمجھ میں آیا کہ حسن کا کوئی معیار ہوتا ہے، نہ پیمانہ، نہ کسوٹی۔ نہ ہی توازن کو پرکھنے کا کوئی فارمولا ہوتا ہے۔ وہ اپنے حسن سے بے نیازانہ سلوک روا رکھنے کے باوجود گداز اور دل کش تھی۔

اس نے ٹشو پیپر کھینچا۔ مجھ پر نظر ڈالی۔ شرارت سے بولی، ''اب چھوڑو بھی! سب لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ اب کھانا کھالو۔''

میں ٹھٹکا۔ اپنی چوری پکڑے جانے پر تھوڑا سا گھبرایا۔ بولا، ''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں دل ہی دل میں آپ کا موازنہ دوسری لڑکیوں سے کر رہا ہوں؟''

وہ مسکرائی، ''مرد جب بھی کسی لڑکی کو دیکھتا ہے تو وہ غیر اختیاری طور پر اس کا تقابل پہلے دیکھی ہوئی لڑکیوں سے کرنے لگتا ہے۔ شاید لڑکیاں بھی ایسا ہی کرتی ہیں۔''

میں نے سر جھکا لیا۔ وہ اُٹھی اور پردہ ہٹا کر بالکونی میں چلی گئی۔ وہ میرے حواس پر بار بار یلغار کر رہی تھی اور میں اُسے ذہن سے جھٹکنے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھا۔ تبھی اچھی طرح کھانا بھی نہ کھا سکا۔

وہ بولی، ''کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو روم بوائے کو بلا لینا۔ وہ برتن لے جائے گا۔''

تھوڑی دیر بعد، میرے بلائے بغیر، روم بوائے جھوٹے برتن سمیٹنے کے لئے آ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میڈم نے مجھے بلایا، ''شہریار! ادھر آؤ، دیکھو تو یہ شہر کتنا خوب صورت ہے۔''

میں بالکونی میں آیا جو بیک وقت بالکونی بھی تھی اور چھوٹی سی لابی بھی۔ کمرے کی عقبی دیوار بڑی سی نصف دائروی کھڑکی پر مشتمل تھی جس کے پار، نیچے، روشنیوں کا جہان آراستہ تھا۔ وہ کھڑکی کھولے کھڑی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُس کے بالوں سے کھیل رہے تھے۔ نظریں آڑے رُخ متحرک روشنیوں سے سجی ہوئی شاہراہ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے قرب کو محسوس کر کے بولی، ''کتنا بڑا شہر ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے، بتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ گاڑیاں ہی گاڑیاں۔ یوں لگتا ہے جیسے اِس شہر کا ہر شخص کار میں بیٹھ کر شام کا منظر دیکھنے نکل پڑا ہو۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ شہر کا نظارہ بڑا روح پرور تھا۔ ایسے ہی وقت میں ہوا کے جھونکا شریر ہو گیا اور پہلو بدل کر ہم سے ٹکرایا۔ وہ بولی، ''کتنی خوش گوار ہوا ہے۔ اندر تک سرور اُتار دیتی ہے۔ ہے ناں؟ سائنس اسے آکسیجن کہتی ہے اور آکسیجن کو زندگی کی علامت۔ مگر اس کے روپ کتنے ہیں؟ کبھی سوچا تم نے؟ نہیں..... کوئی بھی نہیں سوچتا۔''

اس نے دو تین لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اُتاریں، بولی، ''خدا نے آکسیجن کو بڑے روپ دے رکھے ہیں۔ صحرا میں برہم اور سیخ پا ہوتی ہے، پہاڑوں پر سرسراتی، چکراتی اور ڈراتی ہوئی آوارہ پھرتی ہے، برف پر سے اُتر کر جامد کر دیتی ہے جبکہ ساحل کی دیوانی ہوا آنکھوں میں نمی اُتار دیتی ہے۔ سب ہوائیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ صبح اور، شام اور..... ہر موسم میں نیا ذائقہ..... ہر کیفیت میں نیا جذب اور ولولہ..... واہ..... شہریار! انسان بھی ہوا جیسا ہے۔ آتا ہوا نظر آتا ہے۔ جاتا ہوا دکھائی تک نہیں دیتا۔ جھونکے کی طرح من چلا..... ہے ناں؟''

میں اپنے ہاتھ ونڈو کی سرخ پٹی پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ بولا، ''عام شخص اتنی گہری اور پیاری باتیں نہیں کر سکتا۔ ایسے لفظوں کی ادائیگی کی آبیاری فنکارانہ آنکھ کرتی ہے۔ پشت حاصلِ مطالعہ سنبھالتا ہے۔ آپ کی ہر ادا شاعرانہ ہے، ہر چلن فنکارانہ..... اتنے نفیس خیالات کا مالک کیونکر جرم کرتا ہے؟ کیونکر گینگسٹر بن جاتا ہے؟..... بتائیں! آپ کی شخصیت میں اتنا بڑا تضاد کیوں ہے؟''

وہ ہنسی۔ فضا میں جلترنگ بج اُٹھی۔ نہ جانے کیا ہوا کہ ہنستے ہنستے بدحال ہو گئی۔ دوہری ہو کر سیدھی ہوئی تو اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ چہرہ بجھ سا گیا تھا اور لہجہ گلوگیر۔ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں

بولی، ''ہاں! فنکار معصوم ہوتا ہے۔ فطرت کو بدصورت نہیں کرتا مگر میں ایسی ہی ہوں۔ دنیا کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہوں مگر ظلم کرتی ہوں۔ زندگی سے پیار کرتی ہوں اور اسے قتل بھی کرتی رہتی ہوں۔ مجھ میں دولت کی ہوس نہیں ہے مگر میں دونوں ہاتھوں دولت سمیٹتی ہوں۔ میرا بینک بیلنس ایفل ٹاور کی طرح بلند ہو چکا ہے اور تم میری دولت کا اندازہ تک نہیں کر سکتے۔ مگر.....''

اس نے بچوں کی طرح اپنا بازو آنکھوں پر رکھ دیا اور سسکنے لگی۔ ہچکیاں لینے لگی۔ میں ایک دم بوکھلا گیا۔ بے سوچے سمجھے اُس کی بانہہ پکڑ کر آنکھوں سے ہٹائی اور اس کی تر آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا، ''پلیز میڈم! میرے سامنے مت روئیں۔ مجھے آپ کا رونا اچھا نہیں لگتا کیونکہ آپ کمزور نہیں ہیں۔ کمزور لوگ رویا کرتے ہیں۔''

اس کا رونا جیسے ایک لخت شروع ہوا تھا، ایسے ہی ایک دم تھم گیا۔ آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ بولی، ''تم نے ٹھیک کہا۔ میں کمزور نہیں ہوں۔ مگر کیا میں انسان بھی نہیں ہوں؟ کیا میرے سینے میں دل نہیں ہے جس میں بھرا ہوا غبار رونے سے ہلکا ہوتا ہے؟''

• وہ بہت معصوم اور ملول تھی۔ اُسے اس حالت میں دیکھنے والا یہ یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وہی میڈم شکیلہ تھی جس کے رعب و دبدبے سے پولیس گھبراتی تھی۔ جس کے نام پر حوالات کے آہنی دروازے چشمِ زدن میں کھل جایا کرتے تھے اور سرکاری روزنامچوں کے اوراق پھٹ جاتے تھے۔ زور آور اور استاد بلو سمیت علاقے کے تمام پیدا گیر اس کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے تھے۔ اس وقت وہ بجا طور پر کھلنڈری طبیعت کی مالک وہ کالج گرل معلوم ہو رہی تھی جسے اُس کا بوائے فرینڈ کسی اور لڑکی کے لئے چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

میں نے اس کا سوگوار چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا اور احترام آمیز محبت کے ساتھ کہا، ''میڈم! میں آپ سے محبت کرتا ہوں تبھی آپ کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ آپ اپنا دکھ مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ میرا وعدہ رہا کہ میں کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا اور آپ کے تمام کانٹے آنکھوں سے چن لوں گا۔ پلیز! مجھ پر بھروسہ کریں۔''

اس نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ چند لمحے ایک ٹک دیکھتی رہی پھر آزردہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر گلوگیر آواز میں بولی، ''شہریار! اگر مجھے تم پر بھروسہ نہیں تو میں کیوں تمہیں اتنا قریب کر لیتی ہوں؟ تم نے کبھی نہیں سوچا۔ اعتبارِ محبت کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ میں یہ مرحلہ تمہیں پہلی نظر دیکھتے ہی عبور کر گئی تھی ورنہ تم سے زیادہ بہادر اور خوب صورت اس شہر میں

موجود تھے۔ مگر..... مگر یہ دل ہر کسی پر نہیں کھلنا چاہتا تھا۔''

اس کا بولنے کا انداز میرے دل میں اُتر گیا۔ مجھے خود پر اختیار نہیں رہا۔ ہاتھ پھسلنے لگے۔ سینہ فرطِ انبساط سے پھیلنے لگا اور میں نے اُسے سینے میں چھپانے کی پوری کوشش کر ڈالی۔ وہ اپنا متورم چہرہ میرے سینے پر رگڑنے لگی، لمبی لمبی سانسیں لینے لگی، بولی، ''شہر یار! تم بہت اچھے ہو۔ اتنا، کہ کوئی بھی نہیں، دنیا بھر میں شاید..... ہاں! تبھی کہتی ہوں کہ میں مشین نہیں ہوں، روبوٹ نہیں ہوں۔ سوچتی اور سوچ سوچ کر کڑھتی بھی ہوں۔ آج تمہیں بتاتی ہوں کہ میں کن راستوں سے گزر کر اس مقام تک پہنچی تھی۔ کم آن..... آج کی رات صرف میری اور تمہاری ہے۔ اس میں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں ہے۔ میں نے ارادتاً اس پرسکون ہوٹل کا انتخاب کیا ہے کیونکہ کوٹھی میں اتنا لمبا تخلیہ میسر نہیں آتا۔''

وہ مجھ سے چپکی رہ کر بیڈ تک گئی۔ ایک جھٹکے سے علیحدہ ہوئی اور مجھے بیڈ پر دھکا دے کر کمرے کے دروازے کے قریب رکھی شیشے کے ڈور والی فریج کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پلٹی تو اس کے ہاتھ میں نارنجی اور سرخ رنگ کے لیبل والی 'اسکاچ' کی بوتل، گلاس اور ڈسپوزایبل پلیٹ میں رکھے ہوئے شفاف برف کے چند چوکور ٹکڑے نظر آئے۔ تب سمجھ آئی کہ میری اور اس کی ملاقات حادثاتی نہیں، اہتمام شدہ تھی۔ وہ خود کو بہلانے کے تمام ہتھکنڈے ساتھ لائی تھی۔

مجھے دیکھے بغیر اُس نے جام تیار کیا۔ آئس کیوب گلاس میں ڈالا، لبوں سے لگایا اور ننھی سی سپ لے کر مجھے دیکھنے لگی، ''آگ میں برف ملا کر پینا اچھا لگتا ہے۔''

میں نے کہا، ''آپ شراب نہ پیا کریں میڈم! یہ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو نگل جاتی ہے۔''

''نہیں..... یہ تم نے نہیں، ڈاکٹر منور شاہ نے کہا ہے۔ تم اس کی زبان بولتے ہو۔ اس کے رٹائے ہوئے سبق دہراتے ہو۔''

میں بری طرح چونکا، ''آپ ڈاکٹر شاہ جی کو جانتی ہیں؟''

وہ مسکرائی، ''ہاں! وہ بڑا آدمی ہے۔ بہت بڑا..... اتنا کہ میری نظریں اُس کے قد کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اُسے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ تم نے اُسے صرف مردم بیزار ڈاکٹر کے روپ میں دیکھا ہے جبکہ میں نے اُسے حقیقی رنگ میں دیکھا تھا۔ وہ بہت بڑا بہروپیا ہے۔ تمہارے خانزادوں سے بھی بڑا.....''

میں الجھی ہوئی نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔

وہ بولی، ''ہاں تو..... اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ وہ بے خوف ہے۔ ڈرتا نہیں ہے۔ گن، گولی، موت اور عورت..... وہ کسی سے ہارتا نہیں ہے۔''

اس کی بے خوف سرشت کا تو میں از خود قائل تھا۔ پھر بھی میڈم کے ہونٹوں پر یہ باتیں غیر یقینی اور عجیب لگیں۔ خاموش رہا۔ اس نے مجھے لیٹنے کا اشارہ کیا۔ میں تکیے کی ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا تو وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور پینے لگی؛ گھونٹ گھونٹ۔ پینے سے اُس کے ہونٹ بہت زیادہ سرخ ہو جایا کرتے تھے۔ آج نیلے پڑنے لگے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ شرابیں زہریلی بھی ہوتی ہیں۔ دل میں ڈرا کہ وہ شراب بھی زہریلی نہ ہو جو اس کے حلق میں اُتر رہی تھی۔ میں نے اپنے وہم کا اظہار کیا۔ وہ ہنسی، ''نہیں ڈیئر! زہر دیسی شرابوں میں ہوتا ہے، ولائتی میں نہیں۔ ڈرو مت، مجھے کچھ نہیں ہوتا۔''

اس نے ایک اور گلاس تیار کیا اور تھام کر میرے قریب کھسک آئی۔ بغیر کچھ کہے گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا تو وہ مسکرانے لگی۔ آنکھوں میں نمی، چہرہ متورم اور لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ..... قوس قزح کے تمام رنگ اُس کے چہرے پر رقص کر رہے تھے۔ میں نے گلاس لبوں سے نہیں لگایا۔ اس نے بھی پینے کا حکم نہیں دیا بلکہ میری ٹائی کی ناٹ کھولنے لگی۔ کوٹ اور شرٹ کے بٹن بھی کھول دیے۔ سینے پر باریک بنیان رہ گئی۔ وہ اُٹھ کر صوفوں کے بیچ رکھی میز کے پاس گئی۔ پھل کاٹنے کی ننھی سی کند چھری تھامے بیڈ پر چڑھ آئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری بنیان کاٹ کر سینہ عریاں کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے چند ہی لمحوں میں میرے اندازے کی توثیق کر دی۔

کھلونے کے ساتھ بے رحمی سے کھیلا جائے، مجنونانہ انداز میں توڑنے کی کوشش کی جائے، نرمی اور محبت کا سلوک کیا جائے، وہ خاموش رہتا ہے۔ میں بھی خاموشی سے اُس کی اضطراری حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے گلاس تھاما، ایک گھونٹ بھرا، ایک مٹھی میں میرے سینے کے بال بھرے..... بولی، ''شہریار! تم نے کہا تھا کہ تم میرا دکھ کسی پر عیاں نہیں کرو گے۔ ہیں؟ تھینک یو..... مگر کیوں؟''

میں متذبذب ہو گیا۔ کوئی جواب نہ دے پایا۔ وہ گویا ہوئی، ''تم اگر میری کہانی کو اشتہار بنا دو گے، زبان زدِ عام کر دو گے، تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' اس نے ایک ذرا توقف کیا،

گھونٹ بھرا، بولی، ''کیا میں اس شہر کی عزت اور عظمت کا ناور ہوں؟ کیا میں بہت نیک نام اور پردہ دار خاتون ہوں؟.....نہیں میری جان! میں ایک بدنام گینگسٹر ہوں۔ پولیس میرے نام سے کانپتی ہے۔ نام نہاد عزت دار سیاست دان میری دہلیز پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اپنا اپنا مطلوبہ مال مانگتے ہیں۔ کسی کو جوانی چاہیے۔ کسی کو جوانی قائم رکھنے والا جام چاہیے۔ کسی کو دشمن کی جوانی نگلنے والی بلٹ چاہیے تو کسی کو بلٹ پروف جیکٹ۔ میں سب کو دیتی ہوں۔ بیچتی ہوں۔ ایک کی عزت دوسرے کے ہاتھ پر رکھ کر دام کھرے کرتی ہوں۔ ایک کی جان لیتی ہوں۔ دوسرے کی خباثت میں جان ڈالتی ہوں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لوگ میری باتیں کریں۔ پہلے کیا کم کرتے ہیں؟ ہر کوئی سوچتا ہے کہ میں کون ہوں اور اچانک کہاں سے نمودار ہو کر اس شہر کو مٹھی میں لے بیٹھی ہوں۔ سنو! میرو شاہ کے سینے میں میرا ایک ایک راز چھپا ہے۔ وہ بولنے بھی لگ جائے تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں۔''

میں نے کہا، ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ اتنی بلندی پر پہنچ چکی ہیں کہ بدنامی کی گرد آپ تک نہیں پہنچ سکتی۔''

''شاید۔''

وہ سر جھکا کر گلاس سے کھیلنے لگی۔ کافی دیر گزر گئی۔ وہ مجھے ہمراز کرنے کا فیصلہ کر کے یہاں آئی تھی۔ لبِ بام پھر سوچنے لگی تھی۔ نال سے نکلی گولی، کمان سے نکلا تیر اور زبان سے نکلی بات پر اختیار نہیں رہتا۔ اپنی سوچ کو منطقی انجام دینے کے بعد سر اُٹھا کر بولی، ''جو محبت کرنا چاہتا ہے، وہ اعتماد کے اندھے کنویں میں چھلانگ لگاتا ہے۔ اگر کنواں پناہ دے دے تو محبت امر ہو جاتی ہے وگرنہ انسان اندوہ ناک حالات کا شکار ہو جاتا ہے۔ میرے من میں محبت کی طلب تھی۔ اتنی؛ جتنی عام آدمی میں نہیں ہوتی۔ مگر میں بھٹکنا نہیں چاہتی تھی مگر بھٹک گئی۔ کنواں مجھے سنبھال نہیں پایا اور میں چند و ماہی سے میڈم شکیلہ بن گئی۔ کہانی طویل؛ راز مختصر.....بس اِتنا سا!''

اس نے اپنے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے مجھے 'راز' کا چھوٹا سا سائز بنا کر دکھایا جیسے راز اپنا مختصر سا مادی وجود رکھتا ہو۔ میں نے بے اختیار پوچھا، ''راز کیا؟''

اس نے گلاس میرے لبوں پر رکھ دیا۔ گلاس کا ملائم پیندا میرے لبوں پر ہولے ہولے رگڑنے لگی پھر اُسے ہٹا کر مجھ پر گر گئی۔ اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا کر بولی، ''مرد کا سینہ کنواں ہوتا ہے۔ اندھا۔ پناہ دینے پر آئے تو دنیا کو سمیٹ لے۔ یوں جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں

تلے سمیٹ لیتی ہے۔ نگلنے پر آئے تو دنیا کے سب سے بڑے جذبے، جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے، کو نگل جاتا ہے۔ صرف بدن کا قلعہ فتح کرنے کے لئے..... چند گرم سانسوں کے حصول کے لئے..... اپنی تخلیق کے ابتدائی فطری لمحے کو دیکھنے کے لئے..... ہاں! میں تمہارے سینے پر لیٹ کر سکون لیتی ہوں۔ مزا آتا ہے۔ پناہ کا احساس ملتا ہے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم انسان ہو۔ پناہ دینے والے کی طرح اعلیٰ ظرف ہو۔ میں بولتے بولتے سو بھی گئی تو تم مجھے جگاؤ گے نہیں۔ مجھے کھیلنے دو گے مگر اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو گے۔ یہی اعتماد ہے جو محبت کی کلیدی نہج ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

اس کی آواز بتدریج مدھم ہو رہی تھی، ''شہریار! مجھے بولنے دینا۔ بھلے رات گزر جائے؛ بھلے دن ہو جائے..... مجھے نہ روکنا۔ میرو شاہ سمیت آج تک مجھے کسی نے نہیں سنا، نہ سننے کی آرزو کی..... تمہاری آرزو کو سلام؛ تمہاری محبت کو سلام.....''

اس نے میرے سینے پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھے، پھر گال، پھر ہولے ہولے بولنے لگی۔ ایک کہانی ترتیب دینے لگی جس کا مرکزی کردار وہ خود ہی تھی۔ چونکہ سنانے والی دنیا کی خوب صورت لڑکی تھی اور کہانی کا ہر ایک کردار مجھے حیران کر دینے والا تھا، اس لئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کمرے کے دیوار و در سمیت ہر چیز سے اُس کی خمار آلود سرگوشیاں پھوٹنے لگی تھیں اور میرا پورا وجود پردۂ سماعت بن کر اسے سننے لگا تھا۔

❖❖○❖❖

کہانی اچھی بھی ہوتی ہے، بری بھی۔ دیکھا گیا ہے کہ اچھی اور بری کہانیاں ایک ہی معاشرے میں جنم لیتی ہیں۔ جس طرح زندگی ایک ہی طریقے سے جنم لیتی ہے۔ مور جھومتا ہے۔ مورنی پکارتی ہے۔ انتشار کے انتہائی لمحات میں تخلیق کا بیج نمو پاتا ہے۔ انسان کی تخلیق کے لئے بھی قدرت نے یہی طریقہ وضع کر رکھا ہے مگر اس پر کھنچی ہوئی مذہب اور اخلاق کی حدیں اس پر جائز اور ناجائز کی پیشانیاں آویزاں کرتی ہیں۔ جنہیں مذہب اور معاشرہ تخلیق کی اجازت دیتا ہے، ان کے لمحہ ءِ جنوں کی کارستانیاں جائز تخلیق قرار پاتی ہیں اور جو پریمی جوڑا باغیانہ چوری کرتے ہوئے اپنے ہیجان کو تخلیق کی برف میں ضم کرتے ہیں، ان کی اولاد کی پیشانیوں پر ناجائز پیدائش کا لیبل لگ جاتا ہے۔ آنے والا اپنے لائے جانے کے طریقے سے لاعلم اور بے نیاز ہوتا ہے مگر اس کے چہرے پر کلنک کا بدنما دھبہ پیدا ہوتے ہی ثبت ہو جاتا ہے۔

اس کی زندگی اور کہانی کی پیشانی پر لکھی ہوئی تحریر میں اس کی منشا شامل نہیں تھی۔ اس کے گورے اور گداز چہرے پر سیاہ بدنما داغ دور سے دکھائی دیتا تھا۔ یہ کلنک کس پر یمی جوڑے کی تھی، یہ نہ تو اُسے علم تھا اور نہ دیکھنے والوں کو۔ وہ دریا میں بہتی ہوئی آئی تھی اور قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اس نے دریا میں بہت کم وقت گزارا تھا۔ کم سفر طے کیا تھا۔ نوزائیدہ بچی کا مختصر سا وزن لکڑی کی اُس چوکی نے باآسانی سہار رکھا تھا جس پر اُسے کمبل میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا تھا وگرنہ اس کی زندگی کی پہلی سانسیں ہی گھٹ جاتیں اور وہ آنے جانے کی حد تک زندگی کا سفر طے کر پاتی۔ اُسے کس ماں نے الوداع کیا تھا؟ معلوم نہیں تھا۔ وہ کس باپ کا لختِ جگر تھی؟ معلوم نہیں تھا۔ بس! یہ طے تھا کہ وہ اُسی علاقے کی جنونی کہانی کا انجام تھی۔

دریا جوبن پر تھا جب چاند والی شام حبس آلود فضا کو اپنی چادر میں چھپانے لگی۔ تاحدِ نگاہ بے چین لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ زمین کے کٹاؤ کی مہیب آوازیں گاہے بگاہے سنائی دیتی تھیں۔ غلام محمد عرف گامن دریا کے کنارے کنڈیاں ڈالے بیٹھا تھا۔ تب معاشرہ اتنا بے ایمان اور منافق نہیں ہوا تھا کہ یہ مزدوری بند ہو جاتی۔ علاقے میں کوئی مچھلی گھر نہیں بنا تھا جہاں مہینہ بھر میں مچھلیوں کا پور جوان ہو جاتا ہے۔ دریا سے پکڑی گئی مچھلیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھیں۔ ٹھیکیدار کم تھے، جال کم تھے، اس لئے پونگا (نوزائیدہ مچھلیاں) پکڑے جانے اور مرنے سے بچ جاتا تھا۔ گامن کی طرح کئی مچھیروں کی روزی بنی ہوئی تھی۔

دریا کا پانی تیز ہونے کی وجہ سے وہ خاصا مایوس تھا۔ جب بھی کنڈی جھٹکے لیتی، وہ ڈور کھینچتا، دیکھتا تو چہرہ بجھ جاتا۔ کوئی چھوٹا یا بڑا کچھوا اس کی محنت پر پانی پھیر دیتا۔ اُسے کنڈی پر ٹانکے گئے ملپ ضائع ہونے کا دکھ ہوتا۔ ایسے ہی وقت میں جب اس نے دو کنڈیاں سمیٹ لی تھیں، ایک کو مخصوص جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ بیزاری سے دیکھ رہا تھا، دریا کے گدلے پانی پر رنگ برنگ کپڑا تیر کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں پھیلائیں، غور سے دیکھا مگر سمجھ نہ پایا۔ طغیانی کے دنوں میں دریا میں بہت کچھ دیکھنے کو ملتا تھا۔

اُسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا چیز تھی جو تیرتی ہوئی چلی آ رہی تھی اور بہتی ہوئی اس کے برابر سے آگے گزر گئی۔ اُس کا فطری تجسس بیدار ہوا۔ ڈور کو ایک درخت کی باہر کو نکلی ہوئی جڑ سے باندھا، لنگوٹ کسا اور کٹاؤ دار کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا اس تیر کر آتی ہوئی رنگین شئے سے کافی آگے نکل گیا۔ پھر فاصلے کا اندازہ کر کے دریا میں کود گیا۔ زندگی انہی لہروں کے ساتھ کھیلتے

گزری تھی۔ اعصاب مہم پسند اور فولادی تھے۔ جسم میں جان تھی۔ چند لمحوں میں ہی بانہیں مارتا ہوا اس نہ سمجھ میں آنے والی کپڑوں کی پوٹلی تک پہنچ گیا۔ چھوٹی سی چوبی چوکی پر سمیٹ کر رکھا ہوا ننھا سا مخملیں کمبل اُس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کمبل میں سنبھالی ہوئی چیز سے نا آشنا نہیں تھا۔ چار سال قبل اس کی دبلی پتلی بیوی تاجاں نے ایسی ہی ایک گوشت پوست کی گڑیا کو جنم دیا تھا۔

ناف تک جسم پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باقی آدھا جسم ایک دم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ کافی دیر تک دونوں ہاتھوں میں چوکی اُٹھائے کھڑا رہا۔ سوچتا رہا۔ اُسے دریا میں ڈال کر پلٹ جائے یا دریا سے نکال کر زندگی کی طرف لے جائے۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ بچی تھی یا بچہ..... چونکہ اُسے دیکھتے ہی گانمن کے شعور میں اس کی چار سالہ بیٹی سرداراں کا چہرہ ابھر آیا تھا، اس لئے اس نے تصدیق کئے بغیر اُسے بچی قرار دیا۔ بچی کے نقوش دھندلے تھے مگر رنگ اتنا سفید تھا کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس کے منہ میں ننھی سی چوسنی دبی ہوئی تھی جسے وہ 'چپ چپ' کر کے چوس رہی تھی اور اس سے دودھ کے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا انتظار کبھی رنگ لانے والا نہیں تھا کیونکہ قسمت نے ماں کی چوسنی ہمیشہ کے لئے اس کے دہن سے جدا کر دی تھی۔

گانمن کے ہاتھ کانپنے لگے۔ نادان نہیں تھا۔ جان چکا تھا کہ بچی حادثاتی طور پر دریا کی نذر نہیں ہوئی بلکہ اُسے کسی نے اہتمام سے دریا میں ڈال کر الوداع کیا تھا۔ چوکی، کمبل، کمبل کی مخصوص گرہیں اور چمک دار چوسنی..... اس کی ماں کے دل میں بیٹی کو خالی ہاتھ موت کے سفر پر روانہ کرنے کا یارانہ نہیں تھا اس لئے اس نے جہیز بھی ساتھ روانہ کر دیا تھا۔

گانمن نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ بڑبڑایا، ''مولا سائیں! تیڈیاں رمزاں اُساں نمانیاں دے وَسوں باہر وَسن.....''

(مولا سائیں! تمہاری باتیں ہم بے کسوں سے بالاتر ہیں۔)

وہ اس بچی کی ماں کی طرح اُس کی چوکی کو سطحِ آب پر نہ رکھ سکا اور ہاتھوں میں بلند کئے پتن پر آ گیا۔ چوسنی بچی کے منہ سے نکل گئی اور وہ اپنی باریک آواز میں چلانے لگی۔ اس نے چوسنی اُس کے منہ میں ڈالی اور اپنی ڈور کھول کر کھینچنے لگا جو بدستور جھٹکے لے رہی تھی۔ پھر کوئی کچھوا اس کے ملپ (ٹیپ ورم) کو ہڑپ کرنے کے چکر میں پھنس گیا تھا۔

مگر اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی جب ایک بڑی سنگھاڑا مچھلی سطح آب پر ''شڑاپ'' کی زوردار آواز کے ساتھ تڑپی۔ پہلی نظر میں ہی گانمن کو اندازہ ہو گیا کہ وہ سات آٹھ کلو وزنی

تھی۔اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ڈور کھینچتے ہوئے دل ہی دل میں اس کو شہر میں بیچنے سے ملنے والی تگڑی رقم کا شمار کرنے لگا۔مچھلی ہاتھ میں آئی تب بھی حلق سے کنڈی نکالنے کے لئے مچل رہی تھی۔گانمن مچھیرے کے ہاتھ سے کئی مرتبہ پھسلی پھر اس کے گل پھڑے جواب دینے لگے۔ ایسے میں گانمن کی نظر آسمان پر اظہارِ تشکر کے لئے اُٹھی۔متشکر آنکھوں نے خلا میں جگمگاتے ہوئے چاند کو دیکھا۔کتنا اجلا اور پیارا لگ رہا تھا۔ایک نظر چاندنی میں چمکتی ہوئی مچھلی پر ڈالی۔ اوپر آسمان کا راجہ ناچ رہا تھا۔نیچے دریا کی رانی اپنی آخری تڑپ کا زور توڑ رہی تھی۔

گانمن کی بے اختیار نظریں کمبل میں لپٹی ہوئی چوسنی کو زور زور سے چوستی ہوئی بچی پر پڑیں۔اس کے منہ سے نکلا، ''چاند جیسا رنگ ہے، مچھلی جیسا وجود.....مولا سائیں! یہ تو نری چاند ماہی ہے۔''

چاند ماہی کا وجود مچھیروں کی چشمِ تصور پر جگمگاتا ہے۔ان کے نزدیک ہر دریا میں ایک مچھلی ایسی ہوتی ہے جس کا روپ چاند سے بھی اجلا ہوتا ہے۔قسمت سے ملتی ہے اور جس کو ملتی ہے، اس کی دنیا لمحوں میں بدل جاتی ہے۔تصوراتی مچھلی، چاند ماہی، جس کا بالائی آدھا دھڑ عورت کا، زیریں نصف سنہری مچھلی کا، کسی شوخ آرزو کا نام تھا۔تشنہ کام خواہش کا۔مگر گانمن کی آرزو برلائی تھی۔اس کی آنکھیں چمکیں۔سوچا، 'گانمن! تیری قسمت سوہنے رب نے چمکا دی ہے۔ دیکھ! یہی تو چاند ماہی ہے۔چل چندو ماہی.....میرے کچے گھر میں اپنی روشنی لے چل.....''

گانمن اور تاجاں نے کئی دن ڈرتے ڈرتے گزارے۔ہر آن دھڑکا لگا رہا کہ چندو ماہی کے وارث آ کر اُسے لے نہ جائیں لیکن دریا میں پھینکنے والے نے اُس کا تعاقب کرنا ہوتا تو پھر اپنی روح کے جزوِ معتبر کو موجوں کے حوالے کرتا ہی کیوں؟.....

دونوں میاں بیوی سادہ لوح تھے۔جھوٹ بولتے تھے تو ان کے چہروں پر تذبذب جھلکنے لگتا تھا۔ہزار چھپانے اور باتیں بنانے کے باوجود لوگوں نے بھانپ لیا کہ کالے بدنوں والے گانمن اور تاجاں کے گھر میں کسی امیر زادی کا لختِ جگر آن گرا ہے۔شہروں میں بندے بولتے ہیں مگر کوئی کسی کی نہیں سنتا۔دیہاتوں میں فضائیں بولنے لگتی ہیں اور ہر کان ہمہ تن ہو جاتا ہے۔ بدنامی کی بات راتوں رات میلوں کا سفر طے کر جاتی ہے۔چندو ماہی کی خوبصورتی کا قصہ بھی دنوں میں آدھے ضلعے میں گونجنے لگا۔دریا پار بھی ہلچل مچ گئی۔

ابھی وہ ڈیڑھ ماہ کی تھی کہ دریا پار کے جاگیردار رب نواز کے خصوصی کارندے امام بخش

عرف ماموں نے گانمن کو پتن پر آن گھیرا۔ گھما پھرا کر چندو ماہی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اس نے اپنا رٹا رٹایا جملہ دہرایا، ''اُہ میڈی دھی ہے، تساں لوک اوندا ناں کیوں چیندے ہوے؟''

(وہ میری بیٹی ہے۔ تم لوگ اس کا نام کیوں لیتے ہو؟)

ماموں نے آنکھیں دکھائیں۔ بات نہ بنتی دیکھی تو براہِ راست اور کھلم کھلا بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہا، ''دیکھ گانمن! تو غریب آدمی ہے۔ ساری عمر ایسے ہی مچھلیاں پکڑتا اور بیچتا رہے گا۔ کبھی آ گا ننگا تو کبھی پیچھا۔ میری مان! میرے بھاگ وند کا بانہہ بیلی بن جا۔ میرے بھاگ وند (مالک) کو تو جانتا ہے۔ شمال سے جنوب تک اس کی زمینیں پھیلی ہوئی ہیں۔ مٹی کو ہاتھ لگاتا ہے، مٹی سونا بن جاتی ہے۔ وہ تجھے بھی چھو کر سونا بنانا چاہتا ہے۔''

گانمن کچھ نہ سمجھا۔ ہونقوں کی طرح دیدے گھما کر بولا، ''پر ماموں بھرا! ڈسا..... ذرا کھل کے ڈساتاں میکوں کجھ پتہ لگسی۔''

(مگر ماموں بھائی! بتا، ذرا کھل کے بتا تو مجھے کچھ پتہ چلے گا۔)

ماموں کھل کر بتانے اور اپنی بات منوانے آیا تھا۔ بولنے لگا، ''دیکھ گانمن! بھاگ وند کو پتہ چلا ہے کہ تجھے دریا سے ایک بچی ملی ہے۔ اس کا نام تو نے چندو ماہی رکھا ہے۔ کیا تجھے پتہ ہے کہ اُسے میر کریم بخش جام کی کنواری بیٹی نے جنم دیا ہے۔ میر کریم کا بانہہ بیلی نورا رات دن اس کے گھر آتا جاتا ہے۔ میری بات سمجھ رہا ہے ناں؟''

اس کی سمجھ میں ماموں کی بات نہیں آئی۔ بولا، ''میں اس بارے کچھ نہیں جانتا۔''

ماموں رازدارانہ انداز میں سر جوڑ کر بولا، ''گانمن! یہ سچ ہے کہ یہ بچی میر کریم بخش کا ہی گندا خون ہے۔ میرا بھاگ وند چاہتا ہے کہ تو اور تیری ترمیت (بیوی) ہر پوچھنے والوں کو یہی بتایا کرے۔ دیکھ ناں! جس کا گند ہو، اس کے ویہڑے میں ہی ڈالا جائے تو اچھا ہوتا ہے۔''

گانمن نے پس و پیش سے کام لیا۔ وہ میر کریم بخش جام کو جانتا تھا۔ سردار رب نواز کے پائے کا زمیندار تھا۔ دونوں کے خاندان دریا پار کے بیٹ میں رہتے تھے۔

اس کے تامل پر ماموں نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی، زبردستی تھمائی اور کہا، ''سردار نے تیرے لئے اتنے سارے پیسے بھیجے ہیں۔ اور چاہئیں تو منہ سے پھوٹ۔ کل بھاگ وند سے لے آؤں گا۔ اور دیکھ گانمن! تو سردار رب نواز سے یاری گانٹھ لے گا تو ہڈ پیر ہلائے بغیر عیش کی زندگی گزارے گا۔''

اس کے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی چھوٹ کر ریت پر گر گئی۔ سختی سے نفی میں سر ہلا کر بولا، ''نہیں ماموں بھرا! میں اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتا۔ ادھر میرے منہ سے یہ بات نکلے، اُدھر میر صاب کی پگڑی زمین پر دھڑام سے گر جائے گی۔ مجھے اس بات کا پک ہوتا، تب بھی منہ پر نہ لاتا کیونکہ میر صاب مجھے زمین میں گاڑ کر چھتے کتے چھوڑ دے گا۔ نہیں نہیں! تو اپنے بھاگ وند کو جا کر بتا دے کہ چندو ماہی میری اپنی بیٹی ہے۔''

ماموں نے ہر حیلے سے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ میر کریم بخش جام کے خوف سے انکار کرتا رہا۔ اس نے سردار رب نواز کے غصے کی کہانیاں سنائیں اور ڈرایا دھمکایا تو گانمن نے گڈی پکڑ لی اور مردہ دلی سے حامی بھر لی۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ گانمن نے ڈر کر حامی تو بھر لی تھی مگر اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ سردار رب نواز کی فرمائش پوری نہیں کرے گا کیونکہ وہ میر کریم بخش جام کے ہاتھوں ذلیل و رسوا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اگلی شام کو میر کریم بخش اپنی کار میں بیٹھ کر اُس کے جھونپڑی جیسے گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا۔ وہ دونوں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میر صاحب نے کار سے اُتر کر اُسے بازو سے پکڑا اور ایک طرف درختوں تلے لے گیا، بولا، ''دیکھ گانمن! تیری قسمت جاگ گئی ہے کہ میر زادہ تیرے بوہے پر چل کر آ گیا ہے۔''

میر صاحب کو دیکھ کر گانمن کے منہ سے ادب کے مارے بات نہیں نکل رہی تھی۔ میر صاحب کہہ رہا تھا، ''میں جانتا ہوں کہ کسی کی دھی بھین کی بات کرنا ہم میر زادوں کی شان کے خلاف ہے۔ ہم ہر اک کو اپنی بیٹی بہو سمجھتے ہیں مگر بعض اوقات سچ بولنا مجبوری بن جاتی ہے۔ توں میڈی گالھ سمجھدا پیا ہیں؟''

(تو میری بات سمجھ رہا ہے؟)

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا مبادا کہ دیر ہو جائے اور میر صاحب کا پارہ چڑھ جائے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ میر کریم بخش غصے کا بڑا تیز تھا۔

میر صاحب نے اپنے مخصوص رعب دار انداز میں چند باتیں کرنے کے بعد اپنا مدعا بیان کیا، ''مجھے پتہ چلا ہے کہ تیرے گھر میں ایک حرام کی پھوئی پہنچ گئی ہے۔ سردار رب نواز کی بہن، جسے اُس نے بن بیاہے گھر میں بوڑھا کر دیا ہے، کی بچی دریا میں بہتی ہوئی تیرے ہاتھ لگ گئی ہے۔ سردار کی بہن بڑی خوب صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بچی بھی چاند کا ٹکڑا ہو گا۔ ہیں؟''

گانمن کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ بولا، ''میر صاب! اُہ میڈی دھی ہے۔ میں قسم.....''

(میر صاحب! وہ میری بیٹی ہے۔ میں قسم.....)

میرزادے نے گانمن کے بازو کی مچھلی میں اپنی انگلیاں پیوست کرنے کی کوشش کی، بولا، ''ناں سئیں! رہن ڈے..... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تیری بچی نہیں ہے۔ سکینہ اور سردار کے نکڑے (چھوٹے) سالے کے گناہوں کی شامت ہے۔ میں تجھے یہی بتانے کے لئے آیا ہوں۔''

اس نے سر ہلایا اور بولا، ''جی سائیں..... میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی مگر آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔''

اس نے اپنے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب سے چند بڑے نوٹ نکالے۔ اس کے سرد اور مفلوج ہاتھ پر رکھے اور بولا، ''بس بابا! یہ نوٹ تیرے ہوئے۔ فکر نہ کر، اور بھی دوں گا۔ معمولی سا کام ہے۔ بس تجھ سے کوئی پوچھے تو بول دینا کہ یہ سکینہ اور مراد خان کی فلم کا ڈراپ سین ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟''

اس نے چاہا کہ وہ نوٹ واپس کر دے مگر جرأت نہ ہوئی۔ تھوک نگل کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میر صاحب کو دیکھنے لگا۔ خاموشی کو اقرار جان کر میر کریم بخش نے اُس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا، ''گانمن! تو آج سے میرا یار ہوا۔ تجھے کوئی ضرورت پڑے، کسی پنچھی کے ہاتھ سنیہا (پیغام) بھیج دینا، ضرورت پوری ہو جائے گی۔ اس بے غیرت سردار رب نواز یا مراد خان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔ وہ تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ بندہ بندے کا دارُو ہوتا ہے ناں!''

سردار کے بعد میر کریم بخش بھی اس کی غربت کے ہاتھ پر خدمت کا عوضانہ رکھ کر چلا گیا تو وہ جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ اپنی بیوی کے پاس چولھے پر آ بیٹھا۔

وہ اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر بولی، ''کیا کہا میر صاب نے؟''

اس نے طویل آہ بھری اور کہا، ''میر صاب بھی وہی سودا مانگتا ہے جو سردار صاحب مانگتا ہے۔ یہ لو۔'' اس نے مٹھی میں دبے ہوئے نوٹ اس کی جانب اچھالے۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے چننے لگی۔ بولی، ''گانمن! ہم اس منحوس ماری کی وجہ سے مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ بڑے بیلوں کی لڑائی میں آن کودے ہیں۔ میری مانو تو اس سے چوک (دامن) چھڑا لو ورنہ ہم سب بن

موت مارے جائیں گے۔''

وہ متردد انداز میں بولا، ''تاجاں! یہ مدعا ہمارے گلے پڑ چکا ہے۔ چوک کیسے چھوٹے۔ اسے دریا میں پھینک بھی آؤں تو کیا ہوگا؟ سردار صاب اپنی بات منوانے کیلئے ماموں کو بھیجتا رہے گا۔ میر صاب اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے سر پر آن دھمکے گا۔ یہ رہے نہ رہے، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو اس کے نام پر دوسروں کی پگڑی اچھالنا چاہتے ہیں۔''

تاجاں کا منہ کھل گیا۔ سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب چندو ماہی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ دونوں بڑے اس غلاظت کی پوٹ کو دوسرے کے آنگن میں پھینکنا چاہتے تھے۔ اپنی دشمنی کو تسکین دینا چاہتے تھے۔

وہ ڈرتے ڈرتے مستفسر ہوئی، ''پھر اب کیا ہوگا؟''

گانمن کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ روٹی کے نوالے چباتے ہوئے چندو ماہی کے بارے سوچ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ نہ صرف کسی ایک خاندان پر قیامت بن کر ٹوٹے گا بلکہ اُس کے خاندان کی تباہی کا نوحہ بھی سنائے گا۔ دونوں بڑے خاندان تھے۔ مار ماری کرنا خوب جانتے تھے۔ کئی سالوں سے دونوں خاندان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے چلے آ رہے تھے۔ پانچ خون پی کر بھی دشمنی کے اس دیو کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ ایسے میں اگر وہ کسی ایک کے ماتھے پر کلنک کا داغ سجاتا، دوسرے کے گھر جشن بپا ہو جاتا اور سیاہ ماتھے والا رات ہونے سے قبل اس پر غیظ ناک بیل کی طرح ڈکراتا ہوا چڑھ دوڑتا۔ چٹکی بجانے کی سی دیر میں اس کے چھوٹے سے خاندان کو خون میں نہلا دیتا۔

سردار رب نواز اور میر کریم بخش کے خاندان جدی پشتی جاگیردار تھے۔ ان کی عورتیں گوری چٹی اور ہاتھ لگانے سے میلا ہونے والا حسن رکھتی تھیں۔ چندو ماہی کا رنگ بھی کچی لسی کی طرح سفید تھا جبکہ نقوش بچپنے کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ گانمن نے سردار رب نواز کی بن بیاہی بہن سکینہ کو، نہ میر کریم بخش جام کی بیٹی رضیہ کو دیکھ رکھا تھا مگر اسے یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ دونوں ایک دوجی سے بڑھ کر خوبصورت ہوں گی۔ اس کے لبوں پر کوئی بھی نام آتا، دیکھنے والوں نے چندو ماہی کے پوپلے چہرے پر اُسی کے نقوش سجا کر دیکھ لینے تھے۔

اس نے اپنے ایک مچھیرے یار کو ہم راز بنایا۔ اس پر اپنی پریشانی عیاں کرتے ہوئے مشورہ چاہا۔ وہ گانمن کی طرح غریب تھا۔ اپنی اوقات دیکھ کر چلتا تھا۔ اس نے فی الفور اُسے مشورہ

دیا، ''یار گامن! میری مان تو اسے دریا میں بہادے۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔''

وہ تشویش سے بولا، ''نہیں یار شیدیا! پہلی بات تو یہ ہے وہ مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سرداراں کے بعد مولا سائیں نے اُسے میری بیٹی بنا کر بھیجا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر میں چندو ماہی کو دریا میں پھینک دوں یا کسی بھی طریقے سے اوڈھر (اوجھل) کر بھی دوں تب بھی اس معاملے پر مٹی نہیں پڑے گی۔ دونوں پارٹیوں کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وہ تو اس کا تعلق اپنے دشمن سے جوڑ کر اُس کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔''

اپنے یار کو پریشان دیکھ کر شیدا سوچ میں پڑ گیا۔ کافی دیر بعد آہ بھر کر بولا، ''تو پھر اللہ کا نام لے کر بیٹ سے نکل جا۔ اگر تو چندو ماہی سے اتنا ہی پیار کرنے لگا ہے تو اُسے اتنی دور لے جا کہ بدنامی کی چھاپ اور ان فرعونوں کی طاقت اس کا پیچھا نہ کر سکے۔''

وہ بوکھلا گیا۔ بولا، ''مگر کہاں؟ میں نے تو آج تک شجاع آباد اور کبیر والا کے سوا کوئی شہر بھی نہیں دیکھا اور نہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں۔ تازہ مزدوری کرتا ہوں اور شام کو کھا پی کر ہاتھ جھاڑ لیتا ہوں۔''

شیدے مصر ہوا، ''میرا تو یہی مشورہ ہے۔ رہی بات پیسوں کی، دس ہزار تجھے سردار نے بھیجے تھے۔ دو ہزار میر کریم بخش نے دیے۔ بارہ ہزار کوئی تھوڑی رقم تو نہیں ہوتی ناں؟ ملتان چلا جا۔ ہڈ پیر سلامت ہیں۔ دو وقت کی روٹی تو کما ہی لے گا ناں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں شیدیا! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تو کوئی اور ترکیب سوچ۔ ایسی کہ دونوں شیش ناگ مر جائیں اور لاٹھی بھی بچ جائے۔''

شیدے نے کہا، ''اگر تو یہاں ہی رہنا چاہتا ہے تو پھر اسے اپنی بہن کے پاس چھوڑ آ۔ جب لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ وہ مر کھپ گئی ہے تو اسے بھول جائیں گے۔''

گامن کی بہن کا بیاہ کبیر والا میں ہوا تھا۔ گامن نے شیدے کی بات مانتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا اور چندو ماہی کو اپنی بہن کے پاس چھوڑ آیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ چندو کو ماں کا دودھ نصیب ہو گیا کیونکہ گامن کی بہن کے ہاں دو ماہ پہلے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام فاطمہ تھا۔ فاطمہ اُس کی صورت پر ریجھ گئی۔ جھٹ سے گود میں ڈالا، قمیص کا پلو اُٹھایا اور اس کا ننھا سا سر اپنی چھاتی میں چھپا لیا۔ بے فکری سے بولی، ''چل بھائی! تیرا کام تو ہو گیا۔ پر دیکھنا، تو زیادہ دیر صبر نہیں کر سکے گا۔ اسے لینے کے لئے دوڑا آئے گا۔''

چندو کو کبیر والا چھوڑ کر واپس آ گیا۔ شیدے نے اُسے ایک اور بات بھی رازدارانہ انداز میں سمجھائی تھی۔ اس پر عمل کرتے ہوئے تاجاں اور گانمن نے ایک رات رونا چیخنا شروع کر دیا۔ چند قریبی مرد و زن واویلا سن کر دوڑے آئے۔ اس وقت گانمن ہاتھوں میں ننھی سی سفید گٹھڑی اُٹھائے گھر سے نکلا۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ اس کی چندو ماہی تیز بخار میں مرگئی ہے۔ لوگوں نے دیکھنا چاہا تو اُس نے دیوانگی آمیز انداز میں چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیا کہ اس کی چندو ماہی کو کوئی نہ دیکھے۔ اس نے دھمکی بھی دی کہ جس نے چندو کا پردہ اُتارا، وہ اُسے مار دے گا۔ دیکھنے والوں نے اس کی حد سے بڑھی ہوئی دیوانگی کو بڑی آزردگی اور ہمدردی سے قبول کر لیا اور دیکھنے پر اصرار کرنے کے بجائے قبرستان لے گئے۔ جنازہ پڑھنے کے بعد گانمن نے اپنے ہاتھوں چندو ماہی کو قبر میں دفن کر دیا۔ مٹی کی اُس ڈھیری پر بیٹھ کر بین کرنے لگا۔ لوگوں نے دلاسا دیا، سمجھایا بجھایا مگر اس کی آشفتگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

وہ رات بھر قبر پر بیٹھا رہا۔ لوگ سمجھا سمجھا کر تھک گئے تو تاجاں اور اس کی کم سن بیٹی سرداراں کو گانمن کے پاس چھوڑ کر اپنے گھروں کو سدھار گئے۔

تاجاں نے اردگرد دیکھ کر کان میں کہا، ''گانمن! کیا تم ساری رات یہاں بیٹھے رہو گے؟''

وہ بولا، ''ہاں تاجاں! تو سرداراں کو لے کر گھر چلی جا۔ سو جا۔ صبح اُٹھ کر مجھے دو چپاتیاں اور اچار دے جانا۔ آس پاس والوں کو کہہ دینا کہ گانمن کا دماغ الٹ گیا ہے۔''

شیدے کی معاونت سے یہ ڈراما کوئی ڈیڑھ مہینہ چلا۔ سردار رب نواز کا خاص کارندہ ماموں اور میر کریم بخش اُس سے ملنے کے لئے کئی بار آئے۔ گانمن ان کی باتیں سن کر دیوانہ وار اُٹھتا، بلند آواز میں گالیاں دے کر ہنستا اور مٹی کے ڈھیلے اُٹھا کر مارتا۔ اس کی حالت دیکھ کر دونوں مایوس لوٹ جاتے۔ انہوں نے کوشش کی کہ ان کا ادھورا کام گانمن کی بیوی سرانجام دے دے مگر تاجاں نے پلو نہیں پکڑایا۔ پھر اس نے بغیر تقاضے کے ماموں اور میر صاحب کی رقم لوٹا دی اور ہاتھ باندھ کر جان کی امان مانگی۔ شیدو کا اندازہ درست ثابت ہوا اور گانمن کے پاگل پن کا تذکرہ ہوتا رہا مگر چندو ماہی کے کردار پر مٹی ڈال دی گئی۔ چندو ماہی کون تھی؟ کہاں سے بہتی ہوئی آئی تھی؟ یہ قصۂ پارینہ بن گیا۔

چار چھ ماہ کے بعد گانمن کا دماغ ٹھیک ہو گیا مگر اس نے بے پناہ سنجیدگی اور کم گوئی کا چغہ پہن لیا اور پھر سے مچھلیاں پکڑنے لگا۔ کوئی سال بھر بعد چندو ماہی کا قصہ پارینہ بھی ہوا میں

تحلیل ہو گیا۔ اس دوران دریا پار دونوں جانی دشمنوں کی مظفر گڑھ کی کچہری میں حادثاتی طور پر مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں طرف آگ بھڑک رہی تھی۔ شعلوں کو پیاس نے یرغمال بنالیا اور بندوقوں کے دہانے موت اگلنے لگے۔ سردار رب نواز اور ماموں موقع پر دم توڑ گئے جبکہ میر کریم بخش، اس کا منجھلا بیٹا اور ایک نوکر بھی کھیت رہے۔ دو طرفہ فائرنگ نے پانچ زندگیوں کے چراغ گل کر دیے جبکہ چھ متعلقہ اور تین غیر متعلقہ بندے ہسپتال پہنچ گئے۔ یوں قسمت نے گانمن کو ایک ہی دن میں سبھی دشمنوں سے نجات دلا دی۔

اس نے پھر شیدو کا دامن جا پکڑا، ''اوئے شیدیا! بول، کیا میں کبیر والا سے اپنی چندو ماہی کو لے آؤں ناں؟ یار! اب تو وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتی ہو گی۔''

شیدو نے آنکھیں نکالیں، ''پاگل ہو گیا ہے تو! لوگ پوچھیں گے کہ اسے تو تم نے اپنے ہاتھوں قبر میں اتار دیا تھا۔ پھر یہ کہاں سے نکل آئی؟ تو کیا جواب دے گا؟''

وہ بولا، ''میں کہہ دوں گا کہ یہ وہ نہیں ہے، کوئی اور ہے۔''

شیدا طنز آہنسا، ''واہ گانمن واہ! تو ایسے کہہ دے گا جیسے تم نے دِھی نہیں، کوئی بکری خرید کر کلے پر باندھ لی ہو۔ ناں یار! یہ ظلم نہ کر۔ وہ جہاں ہے، اسے وہیں رہنے دے۔''

اس نے بظاہر تو شیدے کی بات مان لی مگر دل ہی دل میں مضطرب رہنے لگا۔ سرداراں اس کی بیٹی تھی مگر وہ اس کے لئے کبھی اتنا بے چین نہیں ہوا تھا جتنا چندو ماہی کے لئے ہونے لگا۔ سال بھر بعد اُس پر پھر چندو ماہی کی محبت کا طوفانی دورہ پڑ گیا۔ تاجاں اور شیدے کے سمجھانے کے باوجود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبیر والا پہنچ گیا۔ واپس آیا تو چندو اس کے کندھے سے چپکی ہوئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ ایک سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ لوگ سال پرانی باتیں بھول جاتے ہیں مگر جونہی لوگوں نے چندو کو دیکھا، ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جس کے لئے انہوں نے ننھی سی قبر اپنے ہاتھوں کھودی تھی، آنکھوں کے سامنے دفن ہوتا دیکھا تھا، وہ اچانک زندہ ہو گئی تھی۔ فوراً تاڑ گئے کہ گانمن نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔ کیوں؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ کسی نے گانمن اور تاجاں کو لعن طعن کیا، کسی نے دبے دبے لفظوں میں جھوٹ پر شرمسار کیا تو کسی نے پیٹھ پیچھے خوب باتیں بنائیں۔ اس ساری لے دے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وسیب نے یہ کہہ کر چندو ماہی کو پھر قبول کر لیا کہ گانمن پاگل ہو گیا تھا اور اس نے پاگل پن میں کپڑوں کی خالی

گٹھڑی کو دفن کر دیا۔ تاجاں نے لوگوں کو یہ جھوٹ بول کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ چندو ماہی کو بخار ہو گیا تھا۔ گانمن اُسے لے کر شہر گیا تھا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں وہی گٹھڑی تھی جو اس نے سب کو دکھائی تھی اور کہا تھا کہ یہ چندو ماہی کی میت ہے۔ اسے میں اور شیدا غسل دے چکے ہیں۔ اب صرف دفن کرنا باقی ہے۔ تاجاں نے یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیا کہ گانمن نے اُسے بھی چندو ماہی کا آخری دیدار نہیں کرایا تھا۔ تبھی اس نے پاگل گانمن کی بات پر یقین کر لیا تھا۔

گانمن کے خاندان میں، آس پاس میں بچوں اور بالخصوص بچیوں کو سکول میں پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ بچوں کو مدرسے میں قرآن پڑھنے کیلئے بھیج دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی بڑی بیٹی سرداراں کو ناظرہ قرآن پڑھ لینے کے بعد مدرسے سے اُٹھا لیا تھا اور اسے سکول کا منہ تک نہیں دکھایا تھا۔ چندو ماہی کو بھی وہ پڑھانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا مگر جب وہ پانچ برس کی ہوئی، ایک رات، بارہ ایک بجے کے درمیان، اس کی جھونپڑی میں بڑے گھر کا ایک چاند طلوع ہو گیا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں ایک زرق برق لباس اور طلائی زیورات میں جگمگاتی امیر زادی کو دیکھا تو رنگ فق ہو گیا۔ بوکھلاہٹ میں اس کے منہ سے بے اختیار نکلا، ''مولا سائیں! خیر کریں.....''

تاجاں گھر میں نہیں تھی۔ وہ سرداراں کو لے کر ایک میل دور واقع شیدے کے گھر گئی ہوئی تھی۔ شیدے کی بڑی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ شادی کا جھنجھٹ اکیلی عورت کے بس کی بات نہیں تھا اس لیے شیدے کی بیوی کو تاجاں کی مدد کی ضرورت تھی۔

گھر میں گانمن اور چندو ماہی تھے جب سردار رب نواز کی بہن سکینہ خانم نے جھونپڑی میں اپنا قدم رکھا۔ گانمن اُسے پہچانتا نہیں تھا مگر اس کی ظاہری آن بان دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ پھر جب اس نے نہ صرف یہ بتایا کہ وہ مرحوم سردار رب نواز کی بہن اور سردار احمد نواز کی پھوپھی ہے بلکہ چندو ماہی کی ماں ہے تو گانمن کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ وہ اس کے پیروں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا، ''بی بی سائیں! غصب نہ کر اور پچھلے پیر لوٹ جا۔ کسی نے دیکھ لیا تو میری گردن کاٹ دے گا۔''

وہ بولی، ''نہیں گانمن! میں سب سے نظر بچا کر آئی ہوں۔ مجھے یہاں لانے والا میرا بھروسے والا ملازم ہے۔ تو فکر نہ کر، میں جس طرح رات کی چادر اوڑھ کر آئی ہوں، ایسے ہی رازداری سے لوٹ جاؤں گی۔ مجھے میری بیٹی دیکھنے دے۔''

وہ اُسے روکنے پر قادر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے بس میں تھا کہ وہ امیر زادی سے پوچھتا کہ تو اس کی ماں ہے تو بول! اس کا باپ کون ہے؟..... بن بیاہی ماں سے ایسی باتیں پوچھنی دل گردے کا کام ہوتا ہے اور وہ اتنا منہ پھٹ نہیں تھا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سکینہ خانم نے گھٹنے چھاتی سے لگا کر سوئی ہوئی چندو ماہی کو میلے چیکٹ بستر سے کھینچ لیا اور چھاتی سے لگا کر پوری قوت سے بھینچ لیا۔ چندو جاگ گئی اور بلکنے لگی۔ سکینہ خانم کو اس کے رونے چیخنے کی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ خود بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ دیوانہ وار اپنی بیٹی کا منہ ماتھا چوم کر اپنا سوختہ کلیجہ ٹھنڈا کر رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ گانمن نے کھانس کر اُسے ہیجانی کیفیت سے نکالا تو وہ سنبھل گئی اور چندو کو گود میں لے کر، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی، ''گانمن! تو مہینے میں کتنا کما لیتا ہے؟''

اس نے کہا، ''بی بی سائین! مجھے اللہ پاک دو ویلے کی روٹی دے دیتا ہے۔ یہی بہت ہے۔''

وہ بولی، ''تو نے میری دِھی رانی کو دریا سے نکال کر نئی زندگی دی ہے۔ میں نے اسی آس پر اس نصیبوں جلی کا گلا نہیں دبایا تھا اور اسے چوکی پر لٹا کر دریا کے حوالے کر دیا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اسے نکال کر بیٹی بنا لے گا۔ یہ بچ جائے گی۔ اللہ نے میری سن لی اور اس بدنصیب کو نئی زندگی مل گئی۔ تو نے مجھ گنہ گار پر بہت بڑا احسان کیا ہے گانمن! میں تیرا دین نہیں دے سکتی۔''

وہ شرمسار سا ہو گیا۔ اس نے کسی پر احسان نہیں کیا تھا۔ اس نے تو اپنے اندر کے جیتے جاگتے انسان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے تأسف سے بولا، ''تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی نے تجھے یہاں آتا جاتا دیکھ لیا تو یہ بات راز نہیں رہے گی۔ میری چندو ماری جائے گی۔ پہلے میں نے اِسے بڑی مشکل سے بچایا ہے۔''

سکینہ نے اپنی بڑی سی چادر کے پلو سے آنسو پونچھے، ڈبڈبائی آنکھوں سے گانمن کو دیکھا اور ملتجیانہ انداز میں بولی، ''گانمن! تو نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اجر دینے والی ذات سوہنے رب کی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے اور تجھے اجر دے گا۔ بہت بڑا اجر۔ پر تو مجھ پر ایک احسان اور کر۔ اس کرموں ماری کو سکول میں داخل کرا دے۔ اس کی پڑھائی پر جتنا بھی خرچ آئے گا، میں چوری چھپے تجھے پہنچاتی رہوں گی۔''

گانمن نے چند لمحے سوچا پھر انکار کر دیا کیونکہ یہ کام اس کی استطاعت سے بھاری تھا۔

وہ تڑپ کر بولی، ''دیکھ گانمن! تو میرا بھائی ہے مگر میرے سگے بھائیوں جیسا نہیں ہے۔ وہ

بہت ظالم ہیں۔ انہیں اگر پتہ چل گیا کہ میں اپنی جھولی پھیلا کر تمہارے پاس آئی ہوں تو وہ مجھے زمین میں زندہ گاڑ دیں گے۔ انہیں چندو ماہی اور میرے تعلق کا پتہ چل گیا تو وہ نہ اسے زندہ چھوڑیں گے اور نہ تجھے۔''

وہ ڈر کر بولا، ''تو پھر تجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا بی بی سائین! تو نے مجھ پر یہ ظلم کیوں کیا؟ کیا یہی احسان کا بدلا دینے آئی ہے؟''

''نہیں۔ خدا کے لئے ایسے نہ کہہ۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی ہوں۔ تو نہیں جانتا کہ مجھے اپنی رانی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنا پڑے ہیں۔'' اس کی آنکھوں کے جھرنے پھوٹ پڑے، ''پر اِن باتوں کو چھوڑ..... میں جس کام کے لئے آئی ہوں، اس کے بارے میں سوچ۔ میری بیٹی میری نظروں کے سامنے رہے، نہ رہے، مگر زندہ رہے، میں یہی چاہتی ہوں۔ آئندہ شاید اسے ملنے اور دیکھنے کی مہلت مجھے نہ مل سکے مگر مجھے یہ یقین تو ہو کہ یہ سکھی ہے۔ سکھی تبھی ہو گی، جب پڑھ لکھ کر کوئی نوکری کرنے لگے گی۔ کسی سکول میں استانی یا ہسپتال میں نرس لگ جائے گی۔ اپنا پیٹ پالتی رہے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمام عمر اس کے لئے تڑپتی رہوں گی اور دل ہی دل میں دکھتی رہوں گی کہ میں محلوں میں عیش کرتی ہوں جبکہ میری بیٹی غربت کی چکی پیستی ہے۔ خدا کے واسطے گانمن! میری بات مان لے۔ میری چادر کا مان رکھ لے۔''

اس نے اپنی چادر پھیلا کر کشکول کر دی۔

گانمن نے بھانپ لیا کہ سکینہ خانم کیوں اس کی دہلیز پر آئی تھی۔ نیم مائل ہو گیا۔ چندو کو سکول میں ڈالنے سے ڈرتا تھا۔ تاجاں سب سے پہلے مزاحم ہوتی اور کہتی کہ چندو کو سکول میں داخل کروانے چلے ہو تو سرداراں کی طرف بھی ایک نظر دیکھ لو۔ وہ بھی تمہاری بیٹی ہے۔ بیک وقت دونوں کی پڑھائی کا خرچ وہ اُٹھا نہیں سکتا تھا۔

اسی تذبذب کا شکار تھا مگر سکینہ خانم کی مامتا اُس سے یہ بات منوانے کے لئے آئی تھی۔ اس نے اپنی پھیلی ہوئی چادر سمیٹی۔ باریک دوپٹہ گردن سے نکال کر گانمن کے پیروں میں رکھ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ یہ وار خطا جانے والا نہیں تھا۔ وہ سن رہ گیا۔ دوپٹہ اُٹھایا، چوم کر آنکھوں سے لگایا اور چندو ماہی پر ڈال دیا۔ بولا، ''بی بی سائین! یہ خرچ پٹھے والا معاملہ رہنے دے؛ میں اگر اسے پال سکتا ہوں تو دو کتابیں خرید کر بھی دے سکتا ہوں۔ اب تو چلی جا اور اپنے ہونٹوں کو

سی لے۔ تیرے منہ سے سسکی بھی نکلی تو میری چندو کی گردن اُڑا دی جائے گی۔''

سکینہ خانم نے اپنی سی کوشش کی کہ وہ کچھ رقم رکھ لے مگر گانمن کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا۔ خواہش کے باوجود، ڈر کے مارے اسے باہر تک چھوڑنے نہ آیا کیونکہ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خانم کے نوکر کا سامنا کرتا۔

وہ چلی گئی تو اس نے بے اختیار چندو ماہی کو اُٹھا کر چوم لیا اور گلوگیر لہجے میں نیم خوابیدہ چندو سے دل کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں کہ اس کی چھاتی پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی چندو ننھے ننھے خراٹے لینے لگی۔ اس نے 'چل جھلی نہ ہووے تاں' کہہ کر اُسے اپنے پہلو میں لٹا دیا۔

لالٹین کی پیلی روشنی کی طرح غریب کی زندگی کا ہر رُخ پیلا ہوتا ہے۔ زرد۔ سوچیں بھی۔ وہ چندو اور چندو کی ماں سکینہ خانم کے چہروں کو چشمِ تصور پر باری باری سجا کر پرکھ رہا تھا۔ دونوں کی صورتوں میں مماثلت تلاش کر رہا تھا۔ ناکام ہو کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کوئی بھی چندو اور اس کی ماں کو دیکھ کر دونوں کو ماں بیٹی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ دونوں خوب صورت تھیں مگر دونوں کی شکلیں مختلف تھیں۔ ماں کے نقوش تیکھے تھے۔ بیٹی کے نقوش پوپلے تھے۔ اس نے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔ اگلے دن جب وہ چندو کو سکول داخل کرانے کے لئے نہلا دھلا کر تیار کر رہا تھا، تاجاں شکوہ آمیز نظروں سے اُسے دیکھتی رہی مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

گانمن دس بجے کے قریب سکول کی چار دیواری سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ بڑی ٹاہلی کے نیچے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے بیچ اس کی چندو ماہی ٹاٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور قاعدے پر آگے پیچھے جھول رہی تھی، ''الف انار.....ب بکری.....ت تختی.....''

اس کی باریک سی آواز ان گنت آوازوں میں چھپی ہوئی تھی۔ سنائی نہیں دیتی تھی مگر گانمن کا دل سن رہا تھا۔ 'الف انار' کا قاعدہ پڑھتے ہوئے جھوم رہا تھا۔

'الف انار، ب بکری' کی سیڑھی چڑھنے والا ایک دن آسمان کو چھونے کی طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ بھی علم کے زینے پر پاؤں پاؤں چلتی ہوئی منزل بہ منزل بڑھتی جا رہی تھی۔ سکول گھر سے کوئی ڈیڑھ میل دور واقع تھا۔ گانمن مچھلیوں کا تھیلا، جس میں کبھی ایک مچھلی ہوتی، کبھی دو تین، اُٹھائے گھر سے نکلتا تو اس کی انگلی تھامے چندو بھی کپڑے کا جھولا (بستہ) اُٹھائے گھر سے نکل کھڑی ہوتی۔ کچھ دور تک اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی پھر رُک کر بیٹھ جاتی۔ گانمن اُس کے

شرارت آمیز مکر کو جی جان سے قبول کرتا اور جھوٹی موٹی ڈانٹ کر کاندھے پر بٹھا لیتا۔ اسے سکول کے گیٹ پر اُتار کر شہر چلا جاتا۔ مچھلیاں بیچ کر واپس آتا اور سکول کے باہر بیٹھ کر یا چل پھر کر وقت پاس کرتا۔ اگر جلدی لوٹ آتا تو گھر چلا جاتا۔ اسے سکول سے اُٹھا کر گھر چھوڑتا اور نم مٹی سے کھود کر نکالے ہوئے ملپ (ٹیپ ورم) اور کنڈیاں اُٹھا کر کر دریا کا رُخ کرتا۔ دریا چڑھا ہوتا تو موج بن جاتی وگرنہ ڈھنڈ کے بطن سے مچھلیاں ڈھونڈتا رہتا۔ کبھی کوئی اچھی مچھلی ہاتھ لگ جاتی، کبھی ایک سے زیادہ اور کبھی ہاتھ جھاڑتا گھر لوٹتا۔

چندو کو پہلے پہل استانی کی تند باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ مگر جب وہ چوتھی کلاس میں پہنچی، تب اُسے استانی کے منہ سے نکلنے والی گالی 'حرام زادی' گولی کی طرح لگنے لگی۔ اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ حرام زادی کون ہوتی ہے مگر اُسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اچھا لقب نہیں تھا کیونکہ استانی کے ساتھ ساتھ کلاس کی لڑکیوں نے بھی دبی دبی ہنسی کے ساتھ اُسے حرام زادی کہنا شروع کر دیا تھا۔ پانچویں کلاس میں تھی جب اس نے اپنی ایک ہم جولی سے پوچھا، ''یہ حرام زادی کون ہوتی ہے؟''

اس نے اپنی بڑی بہن سے پوچھ کر اگلے دن بتایا، ''جس کے ماں باپ نہ ہوں، وہ حرام زادی ہوتی ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ بولی، ''یہ کیا بات ہوئی؟ بھلا دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جس کے ماں باپ نہ ہوں۔ ویسے بھی میری تو اماں بھی ہے، بابا بھی۔ پھر میں حرام زادی تو نہیں ہوں۔ پر استانی اور تم لوگ مجھے کیوں حرام زادی کہتے ہو؟''

اس کی سہیلی حساس دماغ تھی۔ دل رکھنے کو بات بنا گئی، ''تم کوئی حرام زادی تھوڑی ہو، وہ تو ہم یونہی غصے میں کہتے ہیں۔ استانی جی ہمیں 'کتی' اور 'گدھی' کہتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہم کتیاں اور گدھیاں ہیں۔''

اس نے سمجھنے کے سے انداز میں سر ہلا دیا مگر دل مطمئن نہ ہوا۔ استانی ہر ایک کو 'کتی' اور 'گدھی' کا لقب دیتی تھی۔ حرام زادی کا لقب صرف اس کے لئے مخصوص کیوں تھا۔ ہم جماعت لڑکیاں غصے میں اُسے دیکھ کر منہ بنایا کرتی تھیں مگر عام حالات میں اس کا چہرہ چھوتیں، ہاتھ اور پیر دیکھتیں اور اس کی صحت اور خوبصورتی کی دل کھول کر تعریفیں کرتیں۔ یہ تعریفیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ بیٹ کے سکول کی سب سے خوب صورت بچی تھی۔ اس کے میلے کپڑے، پھٹی

ایڑیاں اور گنجلک بال اس کے حسن کو چھپانے میں ناکام رہتے تھے۔

سکینہ خانم کی زندگی حویلی کی بلند و بالا چار دیواری میں چکرا رہی تھی اور بالوں میں متواتر چاندی اُتر رہی تھی۔ اس کی خوب صورت جوانی تسلیم کیے جانے کے بغیر ہی بوڑھی ہو رہی تھی۔ اس کے پاس سوچنے کے لئے دو ہی موضوع تھے۔ ایک چندو ماہی؛ جسے دیکھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ دوسرا چندو ماہی کا باپ جسے دو سال پہلے خاندانی دشمنی روایتی انداز میں چاٹ گئی تھی۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ دونوں چوری چھپے مل لیا کرتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی، وہ من کی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ تن کی بھڑکتی ہوئی آگ پر لوگوں کی نظریں بچا کر پانی کے چند چھینٹے ڈال لیا کرتے تھے۔ اسے میر کریم بخش کے بیٹے نے روہیلا نوالی کے ایک چھپر ہوٹل پر گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا کیونکہ اس کی بھائی کی سیون ایم ایم گن کی نال سے نکلنے والی گولی نے اُس کے بابا کو کچہری کے احاطے میں چاٹ لیا تھا۔ اس کی موت کے بعد سکینہ خانم کی زندگی کی آخری چاشنی بھی بجھ گئی کیونکہ وہ اس کے سوا کسی سے ملنے کا موقع نہیں پا سکتی تھی۔ وہ قریبی رشتہ دار تھا۔ بھابی کا بھائی تھا۔ بیوہ ہونے کے بعد بھابی اُسے کچھ زیادہ ہی مہلت دے دیا کرتی تھی۔ تبھی وہ دستک دیے بغیر اس کے کمرے تک پہنچ آتا تھا۔

بھابی کے علاوہ اس کی ماں اور بھائیوں کو سکینہ خانم کی محبت کا علم تھا مگر انہوں نے ہمیشہ صرفِ نظر برتا۔ حویلی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا حویلی کا ہی فرد تھا۔ اس پر ہاتھ اُٹھاتے تو زمانے بھر کی انگلیاں ان پر اُٹھنے لگتیں اور بعید نہ ہوتا کہ سکینہ خانم کو کہیں بیاہنا پڑ جاتا جوان کے لیے بہت بڑا نقصان ثابت ہوتا۔ کئی مربع اراضی ہاتھ سے نکل جاتی۔ یوں سکینہ خانم کا کام چلتا رہا مگر سوائے اس کی بوڑھی ماں اور بھابی کے، کسی کو چندو ماہی کی حیثیت کا علم نہیں ہوا۔

غیرت مند بھائی سکینہ خانم کی جذباتی لغزشوں کو پسِ پشت ڈال سکتے تھے مگر اس کی لغزشوں کے حیا پاش ثبوت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ تبھی سکینہ خانم نے سینے پر پتھر کی بھاری بھرکم سل رکھ دی اور سوتے میں بھی چندو کا نام لبوں پر نہیں آنے دیا۔ اس کی ایک معتمد نوکرانی بیٹ خیر پور سے بیاہ کر یہاں آئی تھی۔ وہ اپنے میکے جاتی، لوٹتی تو سکینہ خانم باتوں باتوں میں گانمن اور چندو ماہی کی خیریت دریافت کر لیتی۔ یہ جان کر مطمئن ہو جاتی کہ گانمن اس کے جگر کے ٹکڑے کو باقاعدگی سے سکول بھیجتا تھا۔ اسے تب بھی پتہ چل گیا جب گانمن نے چندو کو شجاع آباد کے سکول میں داخل کرا دیا۔ اس نے اپنے اسی رازدار نوکر کو، جس کے ساتھ وہ ایک مرتبہ دریا پار کر

کے گانمن کی جھونپڑی میں گئی تھی، کے ہاتھ پانچ ہزار روپے بھجوائے۔ سمجھایا کہ کسی ایسی جگہ پر پھینک دے جہاں سے کچھ دیر بعد گانمن نے گزرنا ہوگا۔ جب تک وہ اس رقم کو اُٹھا نہیں لے گا، تب تک نوکر کہیں چھپ کر نگرانی کرے گا تاکہ رقم گانمن کے علاوہ کسی اور شخص کے ہاتھ نہ لگ جائے۔

گانمن کو پانچ ہزار روپے ڈھنڈ کی طرف جاتے ہوئے رستے سے ملے۔ اس نے اردگرد دیکھا۔ اتنی بڑی رقم کا کوئی دعوے دار نظر نہیں آیا تو اس نے اپنے پھٹے پرانے لباس میں چھپا لی۔ آج کل وہ متفکر رہتا تھا۔ چندو ماہی کو شجاع آباد داخل کروانے کی وجہ سے اس کے کام میں ہرج ہو رہا تھا۔ اسے دن کا بیشتر وقت چندو کے سکول کے باہر چھاؤں میں بیٹھ کر ضائع کرنا پڑتا تھا۔ اس رقم نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔ اس نے ایک گدھا اور ریڑھی خریدی۔ علی الصبح چندو کو اُس پر بٹھایا اور شہر پہنچ گیا۔ چندو کو سکول پہنچا کر سڑک پر مال برداری کا کام تلاش کرنے لگا۔ کاروبار چلتے چلتے چلتا ہے۔ مزدوری گھر سے نکلتے ہی مل جاتی ہے۔ اس کی مزدوری چل نکلی۔ سکول کی چھٹی تک وہ مال برداری میں رُجھا رہتا۔ چھٹی کے وقت پر سکول کے گیٹ پر پہنچ جاتا۔ چندو ماہی کو اپنی نویں نکور گاڑی پر بٹھاتا اور گھر روانہ ہو جاتا۔ اس نے ریڑھی کے نچلے حصے میں، بموں کے بیچ، دوتہہ شدہ بوریاں رکھی ہوئی تھیں جن پر وہ اپنی پیاری کو بٹھایا کرتا تھا تاکہ سڑک پر لگنے والے جھٹکوں کی وجہ سے ریڑھی کے موٹے چوبی تختے اُسے نہ چبھیں۔

لگے بندھے معمول کے مطابق سہ پہر کو ڈھنڈ کی طرف نکل جاتا۔ جو مال ہاتھ لگتا، اگلی صبح اُسے شہر میں بیچنے کی غرض سے ریڑھی پر لاد لیتا۔ دوہری مزدوری کے سبب گھر میں کچھ خوش حالی آ گئی۔

تاجاں نے کبھی بھول کر بھی اُسے طعنہ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے بیچ انصاف نہیں کرتا۔ وہ بھی کوشش کرتا تھا کہ سوائے پڑھائی کے، دونوں بیٹیوں میں اس کا رویہ مختلف نہ ہو۔ وہ جو چیز بھی خریدتا، دونوں کے لئے خریدتا۔ سرداراں کے بعد تاجاں کے بطن سے دو مردہ بیٹوں اور ایک زندہ بیٹی نے جنم لیا جو ڈیڑھ ماہ زندہ رہنے کے بعد داغِ مفارقت دے گئی۔ تاجاں بیٹے کیلئے جھولی پھیلائے رکھتی تھی مگر شاید قدرت کو ابھی یہ منظور نہیں تھا۔

شہر کے بڑے سکول میں پہنچ کر چندو ماہی کا اعتماد بحال ہو گیا۔ اس کی ذات سے چپکا ہوا 'حرام زادی' کا لفظ یہاں تک نہیں پہنچا تھا کیونکہ بیٹ خیر پور سے اس سکول تک پہنچنے والی وہ

اکیلی لڑکی ہی تھی۔ اپنی بے پناہ ذہانت اور پر اعتماد تقریر کی اضافی خوبی سے لیس تھی، تبھی اسے ٹیچرز بے پناہ پیار کرتی تھیں۔ جب وہ آٹھویں میں تھی، تب ایک صبح اُسے ہیڈ مسٹریس نے اپنے کمرے میں طلب کیا۔

چونکہ وہ بے پناہ قدرتی صلاحیتوں کی مالک تھی، بہت ذہین اور قابل اسٹوڈنٹ تھی، اس لئے ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں طلب کیا جانا معمول کی بات تھی۔ بے حد فربہ ہیڈ مسٹریس مسز ریحانہ کے کمرے میں اس کی ملاقات دبلی پتلی اور مشفق سکینہ خانم سے ہوئی۔ چونکہ پہلی ملاقات اس کے لاشعور تک سے محو ہو چکی تھی، اس لئے سکینہ خانم کو پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُسے خانم نے بے پناہ پیار کیا۔ پاس بٹھایا اور جی بھر کر باتیں کیں۔ اسے تب پتہ چلا کہ وہ متمول گھرانے کی ہمدرد دل رکھنے والی خاتون تھی اور سکول کی دو چار بچیوں کو اسکالر دینے کا ارادہ لے کر آئی تھی۔ مسز ریحانہ نے اُسے جن تین بچیوں کے نام دیے تھے، ان میں چندو ماہی کا نام بھی شامل تھا۔

خانم نے شاہانہ انداز میں مسز ریحانہ سے کہا، ''میں اِس بچی کو دیکھ کر بڑی خوش ہوئی ہوں۔ لگتا ہے کہ اس کا تعلق کسی نہایت غریب فیملی سے ہے۔ باقی دونوں بچیوں کیلئے میں ماہانہ اتنی ہی رقم بھیجا کروں گی، جتنی میں نے آپ کو بتائی تھی مگر اس بچی کیلئے میں زیادہ وظیفہ بھیجا کروں گی تاکہ یہ آسانی سے اپنی تعلیم کا حصول جاری رکھے۔''

چندو ماہی کو وہ خاتون بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی پرسنالٹی آنکھوں میں ثبت ہو رہی تھی۔ اس نے شکریہ ادا کیا۔ مسز ریحانہ نے خانم کو گلے لگاتے ہوئے تاکید کی وہ سخنے درمے سکول کا چکر لگاتی رہے اور تینوں بچیوں سے ملتی رہے۔ سکینہ خانم کی دلی آرزو یہی تھی اس لئے اس نے فوراً حامی بھر لی۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ اس نے کتنی مشکل سے اپنے بڑے بھائی کو اس کارِ خیر کے لئے رضامند کیا تھا۔ اس کے دل میں انسان دوست دل نہیں دھڑکتا تھا مگر وہ اپنی بہن کو مصروف کرنے کے لئے مان گیا تھا۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی بہن نے صرف اپنی بیٹی کو دیکھنے کا سلسلہ چھیڑنے کیلئے یہ ناٹک کیا ہے۔

چندو بڑی بے تابی سے چھٹی کا انتظار کرنے لگی تاکہ وہ جلد از جلد اس اہم خبر کو گانمن کے گوش گزارے۔ وہ گانمن سے بہت پیار کرتی تھی۔ اسے کبھی بھی گانمن کے وجود سے پھوٹتی ہوئی مچھلیوں کی بساند بری نہیں لگی تھی۔ وہ بے پناہ صفائی پسند تھی مگر اسے گانمن کا میلا کچیلا وجود

کبھی ناگوار نہیں لگا تھا بلکہ وہ اس کے پسینے سے شرابور بڑھی شیو والے گال چوما کرتی تھی۔ تاجاں اپنے سائیں کو خوش رکھنے کے لئے چندو ماہی سے گھر کے کام کاج میں معاونت نہیں لیا کرتی تھی۔ سبھی کام سرداراں اور وہ دونوں مل کر سرانجام دیتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ چندو سے شاکی نہیں تھیں اور اسے جی بھر کے پیار کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ چندو کو کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے سگے ماں باپ نہیں ہیں۔

اس نے ریڑھی پر بیٹھ کر جب اپنے باپ گامن کو اس خوش رُو اور مشفق امیر زادی کے متعلق بتایا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ جلدی سے پوچھنے لگا، ''تمہیں اس کے نام کا پتہ ہے؟''

وہ فخر سے بولی، ''ہاں تو! اس کا نام سکینہ خانم ہے۔ پار کے سردار رب نواز کی بہن ہے۔ بڑی امیر ہے بابا!''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دل میں واہمہ سر اُٹھانے لگا کہ کہیں سکینہ خانم اس سے اس کی چندو ماہی چھین ہی نہ لے۔ حالات کے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بھلے وہ اسے بیٹی بنا کر اپنے ہاں نہ لے جا سکے، نوکرانی یا لے پالک بنا کر تو حویلی میں لے جا سکتی تھی۔ اس نے چندو ماہی کو منع کرنا چاہا کہ وہ سکینہ خانم سے آئندہ نہ ملے اور نہ ہی وظیفے کے نام پر دی جانے والے رقم قبول کرے مگر کہہ نہ سکا کیونکہ اُس نے اپنی عادت کے مطابق پے در پے سوال کر کے اُسے زِچ کر دینا تھا۔ وہ اکثر باتوں میں اس سے ہار جایا کرتا تھا اور سختی کر کے اپنی بات منوانا اس کے بس سے باہر تھا۔

وظیفے کی رقم اس کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق کچھ رقم اپنے پرانے سے ٹرنک میں رکھ لیتی جبکہ باقی رقم بابا کے حوالے کر دیتی۔ وہ رقم اتنی ہوا کرتی تھی کہ اس پر گامن کا پورا گھر بار آسانی مہینہ بھر چلتا تھا۔ ماہوار ملنے والی اس رقم نے چندو ماہی کی آن بان کو دوبالا کر دیا اور وہ چندو ماہی، جس کے حسن کا چرچا پہلے ہی بیٹ خیر پور میں زبان زدِ عام تھا، پیسوں کی نسبتاً فراوانی کے سبب آنے والی نزاکت اور نفاست سے چار چاند لگ گئے۔ وہ ہر گھر میں موضوعِ سخن بننے لگی۔ ایسی باتیں چھپائے سے چھپتی نہیں بلکہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ گامن اور تاجاں نے تو زندگی بھر اُسے چھپانے کی کوئی کوشش تک ہی نہیں کی تھی۔

جوان حسن کی شمع پر دل فگار دیوانوں کی والہانہ یورشیں معمول کی بات ہے۔ اس کی الہڑ اُٹھان بھی اس معمول کا شکار ہو گئی۔ گھر سے شہر تک، تمام راستے میں، اس کی ایک جھلک دیکھنے

کے مشتاق دل تھامے کھڑے ہونے لگے۔ وہ ان کی نظروں سے پھوٹنے والے پیغامات سے گھبرا کر اپنے بابا کی چھتری تلے گھس جاتی۔ گانمن چوڑے چکلے سینے والا توانا مرد تھا۔ اس کے بازوؤں میں دم تھا۔ تبھی کوئی گدھا ریڑھی کے سامنے سینہ سپر ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ گانمن کی تیز فہم نظریں بھانپنے لگیں کہ ہر آنے والا دن اس کے لئے مشکل ہوتا جاتا ہے۔ پھر جس دن میر ظفر حیات کے بڑے بیٹے عمر حیات نے اپنی موٹر سائیکل ریڑھی کے سامنے روکی، وہ بوکھلا گیا۔ اسے اپنی اور میر خاندان کی حیثیتوں میں حائل فرق کا بخوبی احساس تھا۔ عمر حیات نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے وفورِ شوق سے چندو کو دیکھا اور گانمن کو مخاطب کیا، ''اوئے گانمن! یہ وہی چندو ہے ناں جسے تم نے دریا میں بہتے ہوئے پکڑا تھا؟''

اس کا لہجہ نہ صرف استہزائیہ تھا بلکہ خاصا تضحیک آمیز بھی تھا۔ وہ کانوں تک سرخ ہو گئی۔ 'حرام زادی' کا لفظ اپنی خوف ناک معنویت کے ساتھ اُس کی نظروں کے سامنے پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

گانمن کے تن بدن میں آگ دہک اُٹھی تھی مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا، ''میر زادے! تو بڑے گھر کا پتر ہے۔ ہمارا خیال کر، اپنے خاندان کی بڑائی کا بھی خیال کر اور راستہ چھوڑ دے۔''

وہ منہ بنا کر بولا، ''راستہ تو خیر میں چھوڑ ہی دوں گا مگر چند گھڑیاں چندو ماہی کو تو دیکھ لینے دو۔''

گانمن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ریڑھی سے اُترا اور عمر حیات اور چندو ماہی کے بیچ حائل ہو گیا۔ گدھے کی لگام پکڑ کر کانپتی ہوئی آواز میں بولا، ''چن بس چا کر..... تو نے جو کہنا تھا، کہہ دیا۔ میں نے سن لیا کہ تجھ میں اپنے بڑے خاندان کا خون تو ہے مگر شرافت نہیں ورنہ تو ایک باپ کی موجودگی میں اس کی بیٹی کی طرف میلی آنکھ نہ دیکھتا۔ تیرے باپ نے ہمیشہ ہم غریبوں کی دھی بھین (بیٹی بہن) کو اپنی دھی بھین سمجھا ہے۔ اس کی آنکھ میں حیا ہے پر تیری ابھی سے آنکھ جلنے لگی ہے۔ بہت برا ہو گا، چل ہٹ! میرا راستہ چھوڑ دے ورنہ بہت برا ہو گا۔''

عمر حیات ہنسا۔ ایسے، جیسے سمجھا رہا ہوں کہ 'اپنی اوقات دیکھ کر دھمکیاں دے'..... بولا، 'ناں کرو گانمن بابا! یہ کون سا تمہاری بیٹی ہے جس کے لئے اتنی غیرت دکھا رہے ہو۔''

یہ جملہ گالی بن کر گانمن کا کلیجہ فگار کر گیا۔ تڑپ کر آگے بڑھا۔ بے اختیارانہ ایک گالی اس کے لبوں سے نکل گئی۔ عمر حیات نے اُس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھا اور موٹر سائیکل کو اسٹینڈ پر گھما

کر بھاگ جانے میں عافیت سمجھی۔ تھوڑے فاصلے پر رُکا اور گردن موڑ کر بولا، ''گانمن! تم نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اس گالی کا حساب بے باق کرنے آؤں گا۔ انتظار کرنا..... اور اس حرام کی پھوئی کو بھی دیکھ لوں گا کہ تم کب تک اسے بچا کر رکھتے ہو۔''

گانمن چند قدموں تک موٹر سائیکل کے پیچھے دوڑا پھر رُک گیا۔ چندو گدھے کو ہانک کر اس کے قریب پہنچی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''بابا! بس کر۔ زیادہ غصہ نہ کر۔ کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں ناں!''

بابا گانمن کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اس نے چندو کو ایک نظر دیکھا اور گدھے کی لگام تھام کر پیدل چلنے لگا۔ چندو نے اُسے آواز دے کر ریڑھی پر بیٹھنے کا کہا۔ وہ گویا بھول گیا تھا۔ اچھل کر ریڑھی پر بیٹھ گیا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

چندو ماہی نے پہلے بھی کئی مرتبہ میرزادے عمر حیات کو دیکھا تھا۔ دبلا پتلا، نفیس اور تیکھے نقوش والا کھلنڈرا سا لڑکا اسے اچھا لگتا تھا۔ کئی بار اس سے کوئی بات کرنے کو بھی جی مچلا تھا مگر آج اس نے اپنی اصلیت دکھا کر ذہن میں آگ بھر دی تھی۔ چندو ماہی کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ یکبارگی جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اُسے گالیاں دے جس نے اُسے 'حرام کی پھوئی' کہہ کر بھرے راستے پر تذلیل کی تھی۔

وہ رات گانمن نے کانٹوں اور انگاروں پر کروٹیں لیتے ہوئے گزاری۔ کئی مرتبہ چارپائی سے اُتر کر بکریوں کے باڑے میں گیا۔ کئی مرتبہ ایندھن والے ڈھیر کے گرد چکر لگا کر نلکے پر گیا۔ چندو کے برعکس وہ جانتا تھا کہ میرزادوں کا بیر بہت برا تھا۔ میر ظفر حیات کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بڑا وضع دار انسان تھا۔ اصول پسند ہونے کی وجہ سے سخت مزاج تھا مگر کسی کا بُرا نہیں مانگتا تھا۔ اس کے ڈیرے پر دو جے چوتھے دن بیٹھنے والی پرہیاں (پنچائت) منصفانہ فیصلے پر منتج ہوا کرتی تھی۔

گانمن کئی مرتبہ اس کی حویلی پر مچھلی دینے گیا تھا۔ وہ مچھلی کی قیمت سے دگنی رقم اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا کرتا تھا اور پیار سے تاجاں، سرداراں اور چندو کے نام لے کر خیریت دریافت کرتا تھا۔ وہ دل کا اچھا اور ہاتھ کا سخی تھا تبھی پورا علاقہ اس کی عزت کرتا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا؛ عمر حیات۔ اس نے شکل اور شاہانہ عادات اپنے باپ سے چرائی تھیں۔ گانمن کا راستہ روکنے تک

اس نے علاقے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کو مدنظر رکھ کر اُسے بُرا یا بگڑا ہوا امیر زادہ قرار دیا جاتا۔ گانمن کو طیش کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا، حیرت بھی کیونکہ اس نے آج تک میر ظفر حیات اور اس کے خاندان کی دل سے قدر کی تھی۔

اگلے دن اس نے چندو کو سکول سے چھٹی کرنے کا حکم دیا۔ نو بجے کے قریب اُسے ریڑھی پر بٹھا کر میر ظفر حیات کی حویلی پر پہنچ گیا۔ میر کا خاندان پونٹا سے کوئی دو کلومیٹر کے فاصلے پر مقیم تھا۔ جاہ وحشم والی حویلی کے زنان خانے کے دروازے پر ریڑھی روک کر اُس نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوکرانی نے جھانکا۔ اکھڑ لہجے میں بولی، ''تیکوں پتہ کائے نی جو اِہ زنان خانہ اے؟''

(تجھے علم نہیں کہ یہ زنان خانہ ہے۔)

وہ بولا، ''میں جانتا ہوں تبھی دارے پر جانے کے بجائے ادھر آیا ہوں۔ میر صاحب کو بتاؤ کہ گانمن آیا ہے۔ بڑا ضروری کام ہے۔''

وہ غصیلی نگاہ باپ بیٹی پر ڈال کر دروازے میں غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد میر ظفر حیات برآمد ہوا۔ وہ کیکر کی مسواک چباتے ہوئے باپ بیٹی کو مستفسرانہ نظروں سے گھورنے لگا۔ گانمن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا، ''میر صاب! آپ ہمارے مائی باپ ہیں اور آپ کی وجہ سے ہم غریب لوگ عزت سے اس علاقے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

میر ظفر حیات کی آنکھوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ گانمن کے مؤدبانہ لہجے سے شکوے کی بو سونگھ کر بولا، ''خیر تو ہے گانمن؟ کھل کر بات کر، کیا کہنا چاہتا ہے تُو؟''

گانمن کی کئی نسلیں میر زادوں کے قدم چومتے زمین بُرد ہوگئی تھیں۔ شکوہ کرنا محال تھا مگر چندو کی سلامتی پیش نظر تھی۔ ہمت کر کے بولا، ''میر صاب! میں اپنی نصیبوں جلی دِھی کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے آیا ہوں۔ جی چاہے تو اِسے نوکرانی بنا کر حویلی میں رکھ لیں۔ جی چاہے تو بہورانی بنا کر اس کے لیکھ سنوار دیں۔''

اس کی آواز آنسوؤں کی نمی میں ڈبڈبا گئی تھی۔ میر ظفر حیات کی آنکھیں فرطِ استعجاب سے پھیل گئیں۔ تیز تیز چلتا ہوا ہاتھ یک لخت رُک گیا۔ بولا، ''گانمن! یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ یہ چندو ماہی ہے۔ ہے ناں؟ پر تو اِسے میرے پاس لے کر کیوں آیا ہے؟ پہیلیاں نہ بجھوا، انسانوں کی طرح بات کر۔''

وہ میر ظفر حیات کو جانتا تھا۔ اس کے بارے لوگوں کی زبانی کافی کچھ سن رکھا تھا تبھی اس کے مزاج کو کسی حد تک سمجھتا تھا۔ اُس کے پیروں میں بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا، ''میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ نمک حرام نہیں ہوں۔ میری کئی نسلوں نے آپ کے اونچے شملے والے خاندان کی خدمت کی ہے اور آپ نے کبھی بھی ہمارا حق نہیں مارا۔ آپ میری ہمیشہ مدد کرتے رہے ہیں۔ یہی سوچ کر آج پھر آپ کے دروازے پر آ گیا ہوں، خیرات لینے۔ عزت کی بھیک مانگنے آیا ہوں میر صاب!''

میر ظفر حیات سمجھ گیا کہ وہ ادب اور خوف کی وجہ سے اپنا مدعا زبان پر نہیں لا رہا تھا اس لئے اس نے زمین پر بیٹھے ہوئے گامن کو نظر انداز کیا اور گدھا ریڑھی کے قریب آ گیا۔ چندو ماہی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''دھی رانی! تیرا کملا بابا ہمیشہ گھما پھرا کر بات کرتا ہے۔ سیدھی سی بات کو بھی الٹ پھیر کر پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ تو بتا! اسے کیا تکلیف ہے؟''

چندو نے سر اُٹھا کر وجیہہ اور بارعب میر ظفر حیات کو دیکھا پھر ادب سے سر جھکا کر بولی، ''بابا میر سائیں! تکلیف میرے بابا کو نہیں، مجھے ہے۔ کل میرا راستہ میر زادے نے روکا تھا۔ اس نے مجھے سرعام 'حرام کی پھوئی' کہا اور بابا کو دھمکی دی کہ میں دیکھ لوں گا تو کب تک چندو ماہی کو مجھ سے بچا کر رکھتا ہے۔''

وہ خود کو بہت دلیر سمجھتی تھی۔ تقریر کرتے ہوئے نجانے کہاں سے جملوں کے تانے بانے دماغ میں اُترتے چلے جاتے تھے۔ سوچ کر آئی تھی کہ بہت کچھ کہے گی مگر چند جملوں کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ زار و قطار رونے لگی۔ اس نے سر اُٹھا کر میر ظفر حیات کی حیرت اور فرطِ اشتعال سے پھٹی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ میر ظفر کے بڑھاپے کو ایک دھکا لگا تھا اور وہ ڈگمگاتا ہوا زنان خان کی دیوار تک چلا گیا تھا۔ پھر دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھنے لگا، ''دھی رانی! تیکوں پک ہے جو اُہ میر زادہ اِی ہا..... میڈا پتر عمر حیات؟''

(دھی رانی! تجھے یقین ہے کہ وہ میر زادہ ہی تھا، یعنی میرا بیٹا عمر حیات؟)

اس نے ہچکیوں کے درمیان، ایک ذرا سنبھل کر سر اُٹھایا اور کہا، ''جی بابا میر سائیں! میکوں کائی بھل کائے نی!''

(جی بابا سائیں! مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔)

گانمن ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا میر صاحب کے پاس پہنچا اور دونوں پیر تھام کر بولا، ''میر صاحب! یہ اپنی اوقات سے بڑی باتیں کر رہی ہے۔ میں تو صرف اتنا کہنے کے لئے آیا تھا کہ میری جان، مال اور عزت آپ کے گھرانے پر قربان ہے۔ اگر میر زادے کا دل میری دھی رانی پر آ گیا ہے تو کیا ہوا؟ خدا کے بعد یہ آپ ہی کا تو مال ہے۔ پر آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں اور سڑکوں پر میری عزت کی نیلامی نہ کریں۔''

اس نے بھرپور نفسیاتی وار کرتے ہوئے اپنا مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جھکے ہوئے تھے مگر اس کا زوردار طمانچہ میر صاحب کے چہرے پر اپنی سرخی چھوڑ گیا تھا۔

میر ظفر حیات بہت شریف النفس انسان تھا۔ اس کا بڑا نام تھا۔ اپنی عمر بھر کی نیک نامی داؤ پر لگی دیکھی تو بوکھلا گیا۔ زور سے دھاڑا، ''اوئے عمر حیات! ذرا اِدھر تو آ.....''

چند لمحوں بعد سرخ رنگ کی ٹی شرٹ پہنے عمر حیات باپ کی شعلہ رُو عدالت میں سر جھکائے کھڑا کن اکھیوں سے کبھی گانمن کو تو کبھی چندو ماہی کو دیکھ رہا تھا۔

باپ غرایا، ''میر زادے! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ تم نے گانمن کی دِھی رانی کا راستہ روکا ہے؟''

باپ کا غصے میں سرخ چہرہ دیکھ کر میر زادہ دہشت سے پیلا ہو گیا۔ ہکلا کر بولا، ''ب..... بابا! م..... میں نے کب ایسا.....''

باپ کی نظروں نے بیٹے کے چہرے پر مرقوم فردِ جرم پڑھ لی۔ تاڑ گیا کہ وہ مجرم تھا۔ تبھی اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا بلکہ فیصلہ کن انداز میں بولا، ''تو پھر ٹھیک ہے میر زادے! اُدھر ریڑھی پر وہ لڑکی بیٹھی ہے جس کا تم نے راستہ روکا تھا۔ جاؤ، اس کی بانہہ پکڑ لو۔ چاہو تو اُسے بیوی بنا لو۔ چاہو تو بہن بنا کر سر پر ہاتھ رکھ دو۔ جاؤ! شاباش..... میر خاندان غریبوں کو آج تک عزت دیتا آیا ہے۔ عزت پر ہاتھ ڈالنے کا رواج کم سے کم میرے جیتے جی نہیں پڑے گا۔''

میر زادے کی رگوں میں خون جم گیا۔ چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ ندامت سے بولا، ''بابا! مجھے معاف کر دو۔''

ساتھ ہی اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ میر ظفر حیات نے لال بھبھوکا ہو کر بیٹے کی طرف بڑھنا چاہا مگر اچانک اُس کا ماتھا پسینے میں تر ہو گیا۔ ہاتھ دل پر ٹک گیا اور چہرے پر سخت تکلیف کے آثار ثبت ہو گئے۔ عمر حیات دہشت کے مارے کانپتا ہوا ملتجیانہ نظروں سے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے کے ایک دم بدلتے ہوئے آثار دیکھ کر چونک گیا۔ اچھل کر باپ تک پہنچا

مگر تب تک باپ دیوار کا سہارا لینے کی کوشش کرتا ہوا زمین پر ڈھے چکا تھا۔ اس کے ہونٹ تکلیف کی شدت سے بھنچ گئے تھے اور لرزتا ہوا ہاتھ سینے کو سختی سے مسل رہا تھا۔

عمر حیات حلق کے بل چیخا، ''اوئے رمضو! اوئے وَلیے! بھاگ کے آؤ؛ جلدی کرو۔ میرے بابا کو کچھ ہو گیا ہے۔''

بابا کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ عمر حیات کی خوفناک چیخ کر سبھی نوکر دوڑے آئے۔ گھر کی پردہ دار خواتین بھی ننگے سروں زنان خانے سے نکل آئیں۔ چند لمحوں میں ہڑبونگ مچ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں تڑپتے ہوئے میر ظفر حیات کو کار میں ڈال کر عمر حیات شہر روانہ ہو گیا۔ آس پاس کے کئی لوگ بھی پہنچ گئے۔ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا؟ ہر کوئی میر صاحب کو پڑنے والا دل کے خطرناک دورے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ سے اس کی صحت یابی کی دعا کرتا مگر کسی کو علم نہیں تھا کہ اس حادثے کا سبب کیا تھا اور نہ ہی کسی نے گانمن یا چندو کی طرف توجہ دی۔

دونوں باپ بیٹی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ گانمن کو تب احساس ہوا کہ اُس نے ایک غیرت مند باپ کے منہ پر تازیانہ مار کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اس نے کیا سوچا تھا؟ کیا ہو گیا تھا؟..... اس نے گدھے کی لگام پکڑی اور پژمردہ انداز میں کندھے جھکائے حویلی سے نکل آیا۔ گھر پہنچنے تک دونوں کی زبانیں گنگ رہیں۔ کسی ناگہانی صورتِ حال کے پیشِ نظر دھڑکتے ہوئے دل غیرت مند میر ظفر حیات کی زندگی کی دعائیں مانگتے رہے مگر شام کو جب وسیب کی تمام مسجدوں کے اسپیکر چیخ چیخ کر میر ظفر حیات کی فوتیدگی کا اعلان کرنے لگے، دونوں کے دل مٹھیوں میں آ گئے۔

''اب کیا ہو گا؟'' گانمن نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔

اس نے قتل نہیں کیا تھا مگر میر ظفر حیات قتل ہو گیا تھا۔ ساری زندگی اپنی پگڑی کے لٹھے کو اپنے لہو کی قیمت پر بے داغ رکھنے والا کم عمر بیٹے کے کردار کا ایک سیاہ چھینٹا برداشت نہیں کر پایا تھا۔ بیٹے پر اُسے بڑا مان تھا۔ اکثر سینہ ٹھونک کر کہا کرتا تھا کہ اس کے بیٹے کی رگوں میں اس کا شریف اور غیرت مند خون دوڑتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی خاندانی نجابت کا جھنڈا بلند رہے گا۔ ناگاہ سینے پر زوردار چوٹ پڑی تو دل نے ساتھ چھوڑ دیا۔

گانمن خوفزدہ تھا۔ سمجھتا تھا کہ میر خاندان کی نظروں میں وہی میر صاحب کا قاتل قرار دیا جائے گا۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ بعید نہ تھا کہ اُسے علاقہ بدری کے احکامات سنا

دیے جاتے۔ وہ میر صاحب کی آخری رسومات میں شرکت کرنا چاہتا تھا مگر خوف کے مارے گھر میں دبکا رہا اور اس نے چندو ماہی کو سکول پہنچانا بھی ترک کر دیا تھا۔

یہ دورانیہ چندو ماہی کے لئے بڑا اعصاب شکن تھا۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی اور دل ہی دل میں خود کو میر ظفر حیات کا قاتل سمجھنے لگی۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں۔ اس کی موت وسیب پر قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔ تمام بڑے زمینداروں میں ایک وہی تو تھا جس کے دل میں غریبوں کی محبت جاگتی تھی۔ وہی تو تھا جس کے در پر سبھی لوگ بلا جھجک پہنچ جایا کرتے تھے۔ وہ جتنا رزق خلقِ خدا میں بانٹتا تھا، خدا اور اتنا زیادہ اُسے نواز دیتا تھا۔ اس کی اصول پسندی وسیب کے لئے نعمت تھی جو اس کی وجہ سے آسمان پر اُٹھ گئی تھی۔ زمین بانجھ ہو گئی تھی۔

تین چار دن گزر گئے۔ گانمن کو کسی نے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا تو اس کے دل کو ایک ذرا ڈھارس ہوئی۔ واضح تھا کہ عمر حیات نے کسی کو میر صاحب پر پڑنے والے جانکاہ دورے کا اصل محرک نہیں بتایا تھا۔ مگر پانچویں دن، ڈھلتی ہوئی شام میں، جب سفید رنگ کی پوٹھوہار جیپ ناہموار راستے پر اچھلتی کودتی گانمن کے گھر کے سامنے کھال پر آن رکی تو تاجاں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ چندو کی سانسیں رُک گئیں اور گانمن کی آنکھیں خوف سے پتھرا گئیں۔ سرداراں اس وقت ٹوٹے ہوئے کنڈے والی بالٹی سے بکریوں کو پانی پلا رہی تھی۔ جیپ پر نگاہ پڑتے ہی صحن کی طرف دوڑ پڑی۔

سبھی نے میر عمر حیات کو جیپ سے اُتر کر تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف آتے دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے۔ چند لمحوں بعد وہ صحن کے عین وسط میں مرغیوں کے ٹوکرے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا حال اچھا نہیں تھا۔ لباس سلوٹ زدہ، مٹی آلود سلیپر اور سوجن زدہ سرخ آنکھیں۔ وحشت بھری اور مجنونانہ۔

گانمن کے سینے پر انگلی تان کر پھٹی پھٹی آواز میں بولا، ''تم نے مجھے نہیں، اس پورے وسیب کو یتیم کیا ہے۔ جانتے ہو ناں؟''

اس نے تھوک نگلا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا، ''میر زادے! مجھے کیا پتہ تھا کہ میر صاب.....''

وہ دانت پیس کر بولا، ''نہیں نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں پتہ نہ ہو کہ میر ظفر حیات کون تھا۔ پورا علاقہ جانتا ہے کہ میر صاحب گولی سے مرنے والے نہیں تھے اس لئے تم نے گولی کی بجائے گالی سے کام لیا۔ تم نے، اور اس بے غیرت لڑکی نے مل کر میرے بابا کو مار ڈالا۔''

گانمن نے جھک کر اس کے پیر چھونا چاہے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ تاجاں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا، ''نہیں بی بی! میں جان کے بدلے جان لینے آیا ہوں۔ میرے بابا کی قاتل یہ حرام کی پھوئی ہے، میں اِسے لینے آیا ہوں۔''

اس کی شعلہ بار نگاہیں چندو ماہی پر آن ٹھہریں۔ گانمن نے یکبارگی سر اُٹھایا، بولا، ''نہ میر زادے! نہ یہ، نہ میں..... ہم میر صاحب کو مارنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو ہمارا سائیں تھا۔ بھاگ وند تھا۔ کاش! ہماری عمریں بھی اسے لگ جاتیں۔ مگر یہ ہونی تھی، ہوگئی۔ کون ٹال سکتا تھا اِسے۔ مرگ کا بہانہ بننا تھا، سو بن گیا۔ ہمیں معاف کردے۔ تو بڑا ہے۔ ہم چھوٹے ہیں۔ چھوٹوں پر رحم کرنا تیرے بابا کا وصف تھا۔ تو اپنے بابا کا وارث ہے۔ ہم پر رحم کر۔''

وہ رحم کرنے نہیں آیا تھا۔ سختی سے انکار کرتے ہوئے بولا، ''نہیں گانمن! میں بدلا لینے آیا ہوں۔ اگر تم شرافت سے بانہہ تھما دو تو ٹھیک ورنہ میں تمہارے پورے خاندان کو برباد کر کے بانہہ لے جاؤں گا۔ ایک ایک کو گولی مار دوں گا۔ اگر چاہوں تو تم سب کو تھانے لے جا سکتا ہوں۔ قتل کے کیس میں پھانسی چڑھوا سکتا ہوں مگر میں تم لوگوں کو کچھ نہیں کہتا۔ معاف کرتا ہوں۔ مگر اپنے دشمن کو معاف نہیں کر سکتا۔''

وہ بمشکل اُٹھارہویں بیسویں سن میں تھا مگر دل میں دہکتی ہوئی آگ کی حدت سے اس کا چہرہ پتھر ہو گیا تھا، آنکھیں بھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، کر گزرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

گانمن نے کہا، ''نہیں میر سائیں! ایسا نہ کر، ہم پر رحم کر۔''

چندو ماہی نے قدم بڑھایا اور میر زادے کے روبرو آ گئی۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں بولی، ''نہیں بابا! مجھے بچانے کے لئے زندگی کی بھیک مت مانگو۔ یہ میر زادہ ہے۔ میر نہیں ہے۔ اس کے سینے میں وہ دل نہیں ہے جو کسی غریب کیلئے دھڑکتا ہو۔ اسے جان کے بدلے جان چاہیے تو ٹھیک ہے، میں اس کے ساتھ جاتی ہوں۔ مجھے مار کر اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کر لے۔ میر زادے! لے چل مجھے، جہاں لے جانا چاہتا ہے۔ جہاں لے جا کر مارنا چاہتا ہے، وہاں لے چل اور میری گردن پر چھری چلا دے.....''

اس نے اپنی بانہہ بڑھا دی۔ میر زادے کی آنکھوں میں کئی سانپ کلبلا اُٹھے۔ بانہہ تھامی اور فاتحانہ نگاہ گانمن پر ڈال کر دو قدم چلا۔ وہ ساتھ گھسٹی۔ ایسے میں گانمن اچھل کر میر زادے کی راہ میں حائل ہو گیا۔ بولا، ''نہیں میر سائیں! یہ ظلم نہ کرو ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں

رہوں گا۔ جیتے جی مر جاؤں گا۔"

وہ درشتی سے بولا، "زیادہ ڈرامانہ کرو۔ میں نے تمہاری وِھی پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ تم اپنی غیرت اس کے لئے سنبھال رکھو۔ سب جانتے ہیں کہ یہ حرام کی پھوئی ہے۔ حرام موت ہی مرے گی۔ اس کے لئے زیادہ غیرت اور غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اے! تو تو چل، تو کیوں رُک گئی ہے؟"

اتنی بڑی گالی سن کر گانمن کی آنکھوں میں رَت پھر گئی۔ چہرہ پتھر ہو گیا۔ بے حد سرد لہجے میں بولا، "اسے چھوڑ دے ورنہ بہت برا ہوگا۔ میری برداشت کا زیادہ امتحان نہ لے۔ میں نے میر صاحب کو تیرے انہی کرتوتوں کا گلہ دیا تھا۔ وہ غیرت مند تھا اس لئے دل پر لے گیا۔ تو غیرت والا نہیں تبھی سر پر چادر تاننے کے بجائے چادر پھاڑنے کیلئے یہاں تک پہنچ آیا ہے۔"

یوں محسوس ہوا جیسے وہ یک لخت ہر خوف سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور حیران کھڑے میر زادے کی کلائی تھام لی۔ خونخوار لہجے میں بولا، "میرے بازوؤں میں اتنا دم ہے کہ تیرے جیسے لونڈے سے نمٹ سکوں۔ تیرے باپ کے احسانات میرا سر اور ہاتھ اُٹھنے نہیں دیتے تھے وگرنہ جب تو نے ریڑھی روکی تھی، تبھی تجھے سبق سکھا دیتا۔ چل چھوڑ اور بھاگ جا ورنہ مار مار کر باندر بنا دوں گا۔"

چندو حلق کے بل چیخی، "نہیں بابا! تم ہٹ جاؤ۔"

تاجاں اور سرداراں میر زادے کے پیروں سے لپٹ گئیں۔ اس نے چندو کی باہنہ چھوڑ دی، تاجاں اور سرداراں کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے دھکیل دیا، پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ننھا سا پسٹل نکال لیا۔ بلٹ چڑھائی اور گانمن کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر فائر کر دیا۔ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ گانمن کے حلق سے تیز چیخ نکلی۔ گولی اس کے گھٹنے میں سوراخ کر گئی تھی۔ آن کی آن میں تہبند کا ایک پلو سرخ ہو گیا اور وہ ایک پیر پر دیوانہ وار ناچتا ہوا عمر حیات کی طرف بڑھا جس نے دوسرا فائر کرنے کیلئے ہاتھ اُٹھا لیا تھا۔ چندو نے ہاتھ تھام لیا۔ بجلی کی سی تیزی سے پستول کی نال کا رُخ اپنے سینے کی جانب کر دیا اور چیخ کر بولی، "میں حرام کی پھوئی ہوں، زمانے کا بوجھ ہوں، تو مجھے گولی مار دے ناں، بابا کو کیوں مارتا ہے؟ اس نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

اس نے اپنی انگلی پر دباؤ بڑھایا۔ جان لینے سے پہلے دینا پڑتی تھی۔ سینے پر فائر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ فائر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایسے میں چڑے کی طرح پھدکتا ہوا گانمن اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پوری قوت سے مکا اس کی گردن پر مارا۔ عمر حیات ڈگمگاتا ہوا کمرے کی

دیوار تک گیا پھر رُک کر، ذرا سنبھل کر اُسے خشمگیں آنکھوں سے گھورنے لگا۔ گانمن کی زخمی ٹانگ سے نکلنے والا خون صحن کو تر کر رہا تھا۔ چونکہ عمر حیات عادی مجرم نہیں تھا، پیشہ ور لڑاکا نہیں تھا، اِس لئے خون دیکھ کر ڈر گیا۔ چند لمحوں تک پستول والا ہاتھ ہوا میں لہراتا رہا پھر دھمکیاں دیتا ہوا اپنی جیپ کی طرف بھاگ گیا۔ گانمن کے خون سے تر ہونے والا میدان صاف ہو گیا تو وہ اپنی ٹانگ پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا اور تکلیف سے کراہنے لگا۔ بلند آواز میں میرزادے کو گالیاں دینے لگا۔

گولی گھٹنے میں پھنس گئی تھی۔ تاجاں نے سرداراں کی مدد سے اُسے اُٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ باپ کی حالت دیکھ کر چندو ماہی کا دل حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ اس نے زخم دیکھا۔ چادر سے خون صاف کیا۔ گانمن کو تکلیف میں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ رو رہی تھی۔ رب سے گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی مگر بابا کو چین نہیں آ رہا تھا۔

دیہاتوں میں شام مختصر ہوتی ہے۔ شام کا دھندلکا رات میں تحلیل ہو چکا تھا۔ سبھی ہراساں تھے، متفکر تھے کہ گانمن کا کیا کیا جائے؟ تاجاں دوڑ کر حکیم صاحب کو بلا لائی۔ اس نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا اور بولا، ''بھین! ایں کوں وَڈے ہسپتال گھن ونج!''

(بہن! اسے بڑے ہسپتال لے جاؤ۔)

چندو چاہتی تھی کہ اسی وقت اُسے ریڑھی پر بٹھا کر شہر لے جائے مگر تاجاں نہ مانی۔ ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ علی الصبح چندو اور تاجاں گانمن کو شہر کے تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں لے گئیں۔ ڈاکٹر بھلے مانس آدمی تھا۔ اس نے پولیس کو انفارم کرنے کے ساتھ ساتھ علاج معالجہ شروع کر دیا۔ ابھی آپریشن شروع نہیں ہوا تھا کہ پولیس پہنچ گئی۔ چندو چاہتی تھی کہ میرزادے عمر حیات کو نامزد کر کے ایف آئی آر درج کرائے مگر گانمن نے سختی سے منع کر دیا اور اپنے بیان میں لکھوایا کہ وہ شام کو مچھلیاں پکڑنے ڈھنڈ پر گیا تھا۔ ناکام واپس آ رہا تھا کہ جنگل میں شکار کے پیچھے دوڑتے ہوئے نامعلوم شکاریوں کی فائرنگ کا شکار ہو گیا۔ سب انسپکٹر سمجھتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ کسی وڈیرے کو تحفظ دے رہا تھا۔ مگر اس علاقے میں یہ معمول کی بات تھی تبھی پولیس نے اُس کا بیان قلم بند کیا اور ضابطے کی کارروائی کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چلی گئی۔

وہ بابا سے جھگڑ پڑی۔ بابا نے سمجھایا، ''دیکھ چندو! ہم غریب لوگ ہیں۔ میرزادے کی ٹکر نہیں لے سکتے۔''

وہ زمانہ شناس نہیں تھی، بابا شناس ضرور تھی مگر بابا کی نہ سمجھ میں آنے والی بات کو ماننے میں تامل کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ پھر جب تاجاں کو بھی بابا کا ہم خیال پایا تو ناچار خاموش ہوگئی۔

گانمن کا آپریشن کامیاب رہا۔ گولی نکال لی گئی۔ ہفتہ بھر ہسپتال میں ایڈمٹ رہنے کی وجہ سے چندو کے پاس جتنی پس انداز کی ہوئی رقم موجود تھی، خرچ ہوگئی۔ گانمن ٹانگ پر پلستر اور بغل میں بیساکھی دبائے گھر پہنچ آیا۔ وہ پڑھائی سے بددل ہوگئی تھی مگر گانمن نے اُسے مجبور کر کے تاجاں کے ساتھ سکول بھیج دیا۔ وہ کافی دنوں بعد سکول آئی تھی اس لئے اپنی کلاس ٹیچر کے سامنے صفائی پیش کرنے کے بعد ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے اُسے دفتر بلا لیا، ''چندو ماہی! تم نے بغیر درخواست دیے اتنی چھٹیاں کیوں کی ہیں؟ بیمار رہی ہو؟''

اس کا دل بھر آیا۔ ہیڈ مسٹریس کے ہمدردانہ رویے پر وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہچکیوں میں بتانے لگی کہ اس پر بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت آن پڑی تھی۔

مسز ریحانہ نے اُسے دلاسہ دیا۔ عندیہ دیا، ''اگر تم چاہو تو میں سکینہ خانم سے بات کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس مشکل وقت میں تمہاری کچھ مدد کر دے۔''

اس کی نظروں میں خانم کا مشفق چہرہ گھوم گیا۔ اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔ مسز ریحانہ نے فون پر سکینہ خانم سے رابطہ کر کے چندو سے سنی ہوئی تمام باتیں دہرا دیں۔ سکینہ خانم کا جواب سننے کے بعد رابطہ منقطع کر کے چندو سے مخاطب ہوئی، ''خانم تمہیں ملتان شہر کے کسی بورڈنگ سکول میں داخل کروانے کا مشورہ دیتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ گھبرا کر بولی، ''پر میرے بابا کا کیا ہوگا؟ وہ تو میرے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا۔''

مسز ریحانہ اس کی پریشانی سمجھتی تھی۔ کچھ ہدایات دینے کے بعد اُسے ایک سفید لفافہ تھما کر بولیں، ''فی الحال تم اپنی توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھو۔ دو چار دنوں تک خانم یہاں آئیں گی۔ مل بیٹھ کر اس بارے مزید کچھ سوچیں گے۔''

خانم کی طرف سے بھیجے گئے وظیفے کی رقم پا کر اسے ایک ذرا تسلی ہوئی۔ امداد بروقت پہنچی تھی کیونکہ آج بابا کی دوائی بھی لے کر جانی تھی اور اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔

چھٹی کے وقت جب اس نے سکول کے سامنے تارا تارا چھاؤں والی ٹاہلی تلے کھڑی ریڑھی پر اپنی ماں تاجاں کو پہلو کے بل لیٹے دیکھا تو اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ گانمن اس کی پڑھائی کے دوران شہر میں مزدوری پر نکل جاتا تھا۔ تاجاں کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ تبھی اس نے

سارا دن وہیں بھوکے پیاسے گزار دیا تھا۔

تأسف بھرے دل کے ساتھ چندو نے گدھے کی لگام درخت کے تنے سے کھولی اور ماں کو جگائے بغیر ریڑھی بڑھا دی۔ نالی کے جمپ پر ریڑھی کو زوردار جھٹکا لگا تو تاجاں بیدار ہو گئی۔ بولی، ''چندو! کوئی نلکا دیکھ کر ریڑھی روکنا۔ تریہہ (پیاس) سے میرا ہاں ڈوبنے لگا ہے۔ سکول کے سامنے تو حکومت نے ایک نلکا تک نہیں لگایا کہ کوئی پیاسا دو چار گھونٹ پانی ہی پی لے۔''

اس نے ایک میڈیکل سٹور پر گدھا گاڑی روکی۔ سڑک کے کنارے ایستادہ نلکے کی طرف اشارہ کیا، ''اماں! وہ رہا نلکا؛ جی بھر کے پانی پی۔ میں اتنی دیر میں بابا کی دوائیں اور سبزی خرید لوں۔ چینی پتی تو نہیں لینی ناں؟''

''پیسے آ گئے؟''

''ہاں اماں!''

''تو پھر پتی کا ڈبا بھی پکڑ لینا۔ میں نے پرسوں سے چاء نہیں پی۔'' تاجاں بڑبڑاتی ہوئی نلکے کی طرف بڑھ گئی اور چندو میڈیکل سٹور کے کاؤنٹر کی طرف۔

عمر حیات شاید اس کے سکول جانے کی تاک میں تھا۔ واپسی پر اس نے ریڑھی روک لی۔ موٹر سائیکل سے اُتر کر چندو کے قریب آ گیا۔ درشتی سے بولا، ''میں آج شام کو تیرے گھر آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔''

تاجاں دہشت بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ چندو بولی، ''آخر تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے؟''

وہ بولا، ''یہ تو تو جانتی ہی ہے چندو! تیری وجہ سے میرے بابا نے تڑپ تڑپ کر جان دی ہے اور میں یتیم ہو گیا ہوں۔''

''یہ میرا جرم نہیں ہے مگر میں پھر بھی معافی مانگتی ہوں۔'' اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے، ''میری جان چھوڑ دو؛ معاف کر دو۔''

''نہیں۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

اس نے گدھے کی لگام ماں کی طرف اچھال دی اور چھلانگ لگا کر ریڑھی سے اُتر آئی۔ بڑی دلیری سے بولی، ''تو ٹھیک ہے؛ میں تمہاری مجرم سہی۔ جو سزا دینا چاہے ہو، دو۔ میں تیار ہوں۔''

دھوپ اور دکھ کی شدت سے اُس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ میر زادے نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولا، ''چل..... میرے ساتھ چل۔''

تاجاں کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی آئی اور عمر حیات سے لپٹ گئی۔ منت سماجت اور اللہ نبی کے واسطے دینے لگی۔ وہ بے ساختہ رُک گیا۔ اور بھی کئی لوگ رُک کر سرِعام دکھایا جانے والا تماشا دیکھنے لگے۔ عمر حیات نے اردگرد دیکھا۔ شرم آئی۔ چندو کا ہاتھ چھوڑ دیا اور تاجاں کو جھٹک کر بولا، ''چندو! تو میرے ساتھ آنا چاہتی ہے مگر لوگ تیری حمایت کرنے لگتے ہیں۔ میرے دل کی آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑک اُٹھتی ہے۔''

اس کے لہجے میں انتقام کی خواہش کے ساتھ ساتھ عجیب سی بے بسی رچی ہوئی تھی۔

چندو روتے ہوئے بولی، ''جب تم نے اپنے دل کی آگ بجھانی ہی ہے، ہم بے گناہوں کا خون پینا ہی ہے تو لوگوں کی نگاہوں سے ڈرتے کیوں ہو؟ میرا خون پیو؛ مجھے مارو..... اتنا کہ بھلے جان سے مار دو۔ تم نے بابا کو گولی ماری۔ کسی نے تمہیں کچھ کہا؟ نہیں..... کیونکہ تمہارا گھر بہت بڑا ہے۔ تمہارے پاس دولت ہے۔ ہے ناں؟ پھر مجھے مار دو گے تو تمہیں کون پوچھے گا۔''

وہ اُسے مارنا چاہتا تھا؛ نہیں مارنا چاہتا تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ چند لمحوں تک ہونٹ کاٹتا رہا، اُسے دیکھتا رہا پھر اپنی بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

تاجاں نے چندو کو بازو سے پکڑا اور ریڑھی پر لے آئی۔ عمر حیات کے جانے کے بعد کئی مرد ریڑھی کے آس پاس آن کھڑے ہوئے۔ ماجرا دریافت کرنے لگے۔ ہر آنکھ میں طنزیہ سوال مترشح تھا۔

تاجاں بولی، ''پَرے ہٹ جاؤ! جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت تھی، تب تم تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ اب وہ بے غیرت چلا گیا ہے تو ہمدردی جتانے کیلئے ہمارے سر پر آن دھمکے ہو۔ پتہ نہیں خدا تم جیسے منافقوں کو غارت کیوں نہیں کر دیتا۔''

لوگ چہ مگوئیاں کرتے ہوئے تتر بتر ہو گئے۔ کچھ دور نکل کر تاجاں نے کڑوے لہجے میں کہا، ''چندو! کیا تجھے میر زادہ اچھا لگتا ہے؟''

وہ چونکی، گڑبڑائی، بولی، ''کیا مطلب اماں؟ جس نے میرے بابا کو گولی ماری، مجھے سرِعام رسوا کیا، وہ مجھے کیوں اچھا لگے گا؟''

تاجاں اس کے چہرے پر نظریں گاڑے بولی، ''تو پھر کیوں تو بار بار اس کے ساتھ چلنے پر

تیار ہو جاتی ہے؟''

اس نے لمبی سانس لی اور شکست خوردہ انداز میں بولی، ''اماں! میں بری ہوں ناں، اس لئے..... حرام کی پھوئی ہوں ناں، اس لئے..... وہ مجرم سمجھتا ہے۔ میں اس کے ساتھ چل پڑتی ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم لوگوں پر کوئی اور مصیبت آئے۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو کر دے۔ آپ لوگوں کو تو کچھ نہ کہے ناں!''

اماں نے اُسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تجھ سے بڑا احمق دنیا میں نہیں ہے۔ بولی، ''تو نے یقین کر لیا ہے کہ وہ تجھے قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''تو اور کیا کرے گا میرا؟ اچار ڈالے گا؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

تاجاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گئی۔ کہنا چاہتی تھی کہ مرد اپنے دل کے مرتبان میں من چاہے آم کا اچار ڈالنا چاہتا ہے۔ اس مرتبان میں آم کا بدن گل جاتا ہے۔ تیز نمک رگوں تک سرایت کر جاتا ہے مگر ماں تھی؛ شرم کے مارے کہہ نہ سکی۔ گھر پہنچ کر گامن سے کہنے لگی، ''گامن! میری مان تو اِسے سکول سے اُٹھا لے اور اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔''

گامن نے آنکھیں دکھائیں، ''کیا کہا، سرداراں گھر میں بیٹھی رہے اور میں اس کے ہاتھ پیلے کر دوں؟ واہ تاجاں! لوگ کیا کہیں گے؟..... پَر ہوا کیا ہے؟ بول تو سہی ناں۔''

تاجاں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ بپھر گیا۔ بولا، ''میں چندو کو لے کر سکول جاؤں گا اور اس جاگیردار کے بچے کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ بڑا آیا میر زادہ! غیرت کی رَتی شامل نہیں ہے اُس کے خون میں۔ بے حیانہ ہووے تاں..... اور چندو! سن تو..... اب اگر تو نے دوڑ کر اُسے اپنی بانہہ تھمائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں غریب ہوں، مزدور ہوں، پَر بے غیرت تو نہیں ہوں کہ تو میری آنکھوں کے سامنے غیر محرم کو بانہہ پکڑا دیتی ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ پہلے ماں نے شک کیا تھا۔ اَب باپ نے زمین میں اُتار دیا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے اپنا رویہ غیر فطری سا لگا۔ وہ کوئی بھیڑ بکری تو نہیں تھی کہ اپنی کلائی ڈاکو بن کر آنے والے کے ہاتھ میں تھما دیتی تھی۔

باپ کے زخم پر دوائی کا لیپ کرتے ہوئے رونے لگ گئی۔ پیر تھام کر معافی مانگنے لگی۔ گامن نے اُسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور گلوگیر آواز میں بولا، ''اوئے چندو! جب کوئی تجھے حرام کی پھوئی کہتا ہے تو میرا اُسے آگ لگا دینے کو جی چاہتا ہے۔ تو حرام نہیں۔ حلال ہے۔

حلال سے بھی بڑھ کر حلال ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے تو بولوں کہ تجھ سے زیادہ پاک وجود تو شاید دنیا میں کوئی نہیں ہے پَر خدا جانے کیوں لوگ میرا دل دکھاتے ہیں۔''

تاجاں نے طنزاً کہا، ''ہاں ہاں! اب دونوں بیٹھ کر ٹسوے بہاؤ۔ اپنی لاڈلی کو سکول نہ بھیجتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ میں آج تک چپ رہی ہوں۔ آج بولتی ہوں۔ کہتی ہوں کہ تیری لاڈلی کا دل میرزادے کو مانگتا ہے۔ اس کی آنکھیں بولنے لگی ہیں۔ مجھے اس کی آنکھوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ یا تو اِس کی آنکھیں پھوڑ دے یا اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔ آگ پر پانی پڑے گا تو سب اَٹ وَٹ (کس بل) نکل جائیں گے۔''

وہ کراہی، ''نہیں اماں! میرے دل میں کوئی اَٹ وَٹ نہیں ہے۔''

گامن نے تشویش بھری نظروں سے اُسے دیکھا، ''دیکھ چندو! میں تیرا بابا ہوں۔ بابا سے جھوٹ بولنا سخت گناہ ہوتا ہے۔ اگر تیرا دل وہی کچھ مانگتا ہے، جو تیری اماں بتاتی ہے تو مجھے بول دے۔ میں میرزادے کو بول دوں گا۔''

اس نے بابا کی داڑھی پر ہاتھ رکھا، آنکھوں پر، پھر اپنے دل پر پھیلا ہوا ہاتھ رکھ کر بولی، ''بابا! تیری قسم کھاتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں کہ میرا دل صرف تیرے نام پر دھڑکتا ہے۔ کہے تو اَبھی روک دوں۔ ابھی اپنا گلا گھونٹ دوں۔ تو نے مجھے زندگی دی تھی۔ تو ہی میری زندگی کا مالک ہے۔ پَر تو میری بات کیوں نہیں سمجھتا؟''

پھر وہ ایسے ٹوٹ کے روئی کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ بابا نے بڑی مشکل سے اُسے چپ کرایا۔

چندو نے گامن کے اصرار کے باوجود سکول جانا ترک کر دیا۔ جس دن اس کی دہلیز پر مسز ریحانہ کے ساتھ سکینہ خانم نے دوسری مرتبہ قدم رکھا، وہ بری طرح نروس ہو گئی۔ گھر میں انہیں بٹھانے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی بیٹھتیں، لباس میلا ہوتا معلوم ہوتا۔ خانم نے اُسے پیار کیا۔ اس کا دکھ بانٹا اور بتایا کہ وہ ملتان کے ایک پرائیویٹ سکول میں اس کی تعلیم اور رہائش کا بندوبست کر آئی تھی۔ اس نے امید بھری نظروں سے گامن کی طرف دیکھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی چندو کو نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسز ریحانہ اور سکینہ خانم کا تمام تر اصرار بے معنی ثابت نہیں ہوا بلکہ چندو نے اگلے دن سکول جانے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ سکینہ خانم ہر حال میں اُسے پڑھانا چاہتی تھی۔ مسز ریحانہ نہیں جانتی تھی کہ امیرزادی خانم اس پر اتنی مہربان کیوں تھی، نہ گامن اور تاجاں نے اُسے بتانے کی غلطی کی تھی۔

وہ تیاری کے باوجود سکول نہ جا سکی کیونکہ شام کو جب گامن ڈھنڈ سے لوٹا تھا تو اُس کی پھولی ہوئی سانسیں اور دہشت سے پیلا پڑتا ہوا چہرہ کوئی اور داستان سنا رہا تھا۔ اس نے بیساکھی چارپائی پر رکھی اور ہانپتے ہوئے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد تاجاں کے استفسار پر بولا، ''تاجاں! آج حیاتی کی ڈور لمبی ہونے کی وجہ سے بچ گیا ہوں ورنہ اس وقت تو میرے حلق میں پانی ڈالنے کے بجائے میرے مردہ بدن پر پانی ڈال رہی ہوتی۔''

تاجاں کا کلیجہ منہ کو آ گیا، ''منہ سے خیر کی بات نکال گامن! کیا ہوا ہے؟''

اس نے بتایا کہ وہ ڈھنڈ کے کنارے ڈور ڈال کر بیٹھا تھا کہ جھنگی میں سے دو آدمی نکلے۔ انہوں نے ہاتھوں میں بندوقیں اُٹھا رکھی تھیں۔ زیادہ فاصلے کی وجہ سے وہ انہیں پہچان نہیں پایا۔ انہوں نے اس پر یکے بعد دیگرے کئی فائر کئے تھے۔ خوش بختی سے گولیاں اس کے آس پاس ریت پر لگیں۔ وہ محفوظ رہا مگر ڈر کے مارے زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہوتا رہا۔ گولیاں مارنے والوں نے شاید سمجھا کہ اُسے گولی لگ گئی ہے، وہ پلٹ کر جھنگی میں گھس گئے اور غائب ہو گئے۔ گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے وہ نہ تو ان کا پیچھا کر سکتا تھا اور نہ ہی دوڑ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ بیساکھی پر پھدکتا ہوا گھر پہنچ گیا تھا، عافیت تھی۔

چندو ماہی کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ اس سمیت سبھی متفق تھے کہ فائرنگ کرنے والوں کو عمر حیات نے بھیجا ہو گا کیونکہ اس کے علاوہ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔

چندو اپنے آپ کو اس تمام تر قضیے کی بنیاد سمجھتی تھی۔ افسردہ اور نادم ہو گئی۔ تب اُسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔ جس شخص نے اُسے برسوں کاندھوں پر بٹھا کر سکول پہنچایا تھا، اس کے لئے دنیا بھر کی ملامت سہی تھی اور نہ چین سے سوتا تھا، نہ کھاتا پیتا تھا۔ اس کی وجہ سے بے چارہ ایک ٹانگ پر پھدکتا پھرتا تھا۔ آج ڈھنڈ سے زندہ بچ آیا تھا۔ قسمت تھی۔ مگر قسمت ہر روز ساتھ نہیں دیتی۔ کسی دن وہ چارپائی پر اُٹھا کر لایا جاتا۔ یہ سوچ کر مزید ڈر گئی۔ اس نے کمرے میں بیٹھ کر سکول کی کاپی سے ایک ورق پھاڑا۔ رقعہ بنایا جس میں میر عمر حیات کو مخاطب کر کے لکھا کہ وہ اس کے پاس آنا چاہتی ہے۔ اس کا انتقام پورا کرنے کے لئے اپنا آپ پیش کرنا چاہتی ہے کیونکہ وہ اپنے بابا کو تختہ مشق بنتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ راستہ روکنے کے بجائے سکول کے اوقات میں گیٹ پر آ جائے۔ جہاں لے جائے گا، وہ چلی جائے گی۔ اگلے دن اس نے سکول کی ملحقہ کتابوں کی دکان سے لفافہ لیا، میر عمر حیات کا پتہ لکھا اور سرخ رنگ کے لیٹر بکس

میں ڈال دیا۔

وہ کتابوں سے پیار کرتی تھی۔ تبھی اس کا دل لفظوں میں خوش رہتا تھا مگر بدلے ہوئے حالات نے اُسے ہر چیز سے متنفر کر دیا تھا۔ مسز ریحانہ سمیت سبھی ٹیچرز کی ہمدردی بھی اُس پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈال رہی تھی۔ امید و بیم میں دو تین دن گزر گئے۔ اس کا انتظار رنگ لایا اور گیارہ بجے کے قریب چپڑاسی نے کلاس روم میں آ کر اعلان کیا، ''چندو بیٹی! تمہارا کوئی کزن تم سے ملنے آیا ہے۔ کہتا ہے کہ بڑا ضروری کام ہے۔ ادھر گیٹ پر کھڑا ہے۔''

اس کا کوئی کزن نہیں تھا جو گیٹ پر آ کر پکارتا۔ وہی ہو سکتا تھا جسے اُس نے خود تک پہنچنے کا راستہ دکھایا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے ٹیچر کی اجازت سے مین گیٹ کا رُخ کیا۔ سفید رنگ کی پوٹھوہار جیپ وہیں کھڑی تھی جہاں گانمن اپنی ریڑھی ٹھہرا کر چھٹی کا انتظار کیا کرتا تھا۔ وہ چادر درست کرتی ہوئی جیپ کے قریب آ کر رُک گئی۔ عمر حیات بھی گاڑی سے اُتر کر قریب آ گیا۔ اس کا حلیہ پہلا سا نہیں تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بری طرح اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ چندو کا چہرہ انگلی سے اوپر اُٹھا کر بولا، ''میں تمہارا خط پڑھ کر یہاں آیا ہوں۔''

چندو سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا یا سکول کے گیٹ پر آن پہنچنے کے جرم کی صفائی پیش کی تھی۔

وہ بولی، ''ہاں میرزادے! تمہارے بندوں نے بابا پر فائرنگ کی۔ قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا۔ اگلی بار شاید نہ بچ سکے؛ ڈر گئی۔ تم امیر آدمی ہو۔ تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑے گا مگر ہم اُجڑ جائیں گے۔ یہی سوچ کر میں نے اسے بتائے بغیر تمہیں خط لکھ دیا۔ میں آ گئی ہوں۔ چلو! جہاں بھی لے جانا چاہو، جو بھی سلوک کرنا چاہو، میں حاضر ہوں۔''

''بس..... اتنا ہی دم خم تھا تو میرے بابا کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار شامل تھی۔

''جو بھی کہہ لو، کہہ سکتے ہو۔ بادشاہ ہو۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

''او کے۔'' اس کا لہجہ بے عنوان تھا۔ چندو کوئی نتیجہ اخذ نہ کر پائی۔ اس نے جیپ کی طرف اشارہ کیا، ''بیٹھو.....''

وہ کشتیاں جلا کر سکول سے نکلی تھی۔ ایک اداس اور حسرت بھری نگاہ گیٹ پر ڈال کر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ سیٹ پر بیٹھ کر، سر گھٹنوں میں دیتے ہوئے دنیا سے چھپ کر، آنسو بہانے لگی۔

وہ آج تک کار یا جیپ میں نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ وسیب کی غریب لڑکیاں رخصتی کے وقت سجی ہوئی کار میں بیٹھتی تھیں یا جب دنیا سے رخصت ہونے سے قبل انہیں کار میں بٹھا کر ہسپتال لے جایا جاتا تھا۔ کوئی خوشی سے نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ بھی مقتل لے جائی جا رہی تھی۔ خوشی کیا؟ ہیجان کیا؟.....اس کا ذہن ایک دم خالی ہو گیا۔ جیسے دنیا کبھی کبھار بے معنی ہو جاتی ہے۔

شہر کے مضافاتی محلے کے ایک خالی مکان میں میر زادے نے اُسے اتارا۔ یہ اُس کے کسی دوست کا گھر تھا۔ دوست کے اہلِ خانہ سیر سپاٹے پر نکلے تھے یا کسی عزیز کی شادی پر گئے تھے۔ خالی صحن عبور کر کے عمر حیات نے اُسے کمرے میں لے جا کر بٹھایا اور پانی کا گلاس بھر کر تھما دیا۔ قدرے نرمی سے بولا، ''پانی پیو۔ تم بہت نروس ہو رہی ہو۔''

چندو نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس تھام لیا۔ پانی لرزنے لگا۔ اس کی نگاہیں پانی پر ایک ذرا جم گئیں۔

بچپن میں اُس نے بابا سے پوچھا تھا، ''بابا! قربانی کے جانور کو ذبح کرنے سے پہلے پانی کیوں پلایا جاتا ہے؟''

بابا نے ناصحانہ انداز میں سمجھایا تھا، ''قربانی والا جانور زمین سے سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ چونکہ سفر لمبا ہوتا ہے، اس لئے اُسے پانی پلایا جاتا ہے کہ لمبے سفر میں پیاسا نہ لگے۔''

ایک مرتبہ اُس نے تاجاں سے پوچھا تھا، ''امّاں! کنوار کوں ویندی وار لوک پانی کیوں پویندن؟''

(اماں! دلہن کو رخصتی کے وقت پانی کیوں پلایا جاتا ہے؟)

تب اُسے جواب ملا تھا، ''اسے سمجھایا جاتا ہے کہ تمہارا دانہ پانی اس گھر سے اُٹھ گیا ہے اور تم نے اپنے مقسوم کا آخری گھونٹ بھی پی لیا ہے۔ لوٹ کر نہ آنا ورنہ پانی تک نہیں ملے گا۔''

اُسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر سر پر کھڑے میر زادے نے سخت لہجے میں کہا، ''جلدی پانی پیو؛ کیا دیکھنے لگ گئی ہو؟ میں نے اس میں زہر تو نہیں ملا رکھا۔''

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور گلاس لبوں سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

ابھی گلاس اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ عمر حیات نے پوری قوت سے زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ 'ہائے بابا' کی دردناک آواز نکال کر پہلو کے بل گر گئی۔ زندگی کا پہلا

تھپڑ آنکھوں سے آنسوؤں کے بجائے خون نکال لایا۔

عمر حیات نے دوپٹے میں چھپے ہوئے بال مٹھی میں بھرے اور اُسے کھینچ کر بٹھا دیا۔ دوسرے گال پر پڑنے والا طمانچہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ اس کے بعد عمر حیات نے اُسے ٹھڈوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ ہر ضرب پر بلبلا اُٹھتی۔ ہر ٹھوکر پر اس کی آنکھوں میں تارے ناچ اُٹھتے مگر اس نے لبوں سے سوائے سسکیوں اور آہوں کے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے نہ تو اس سے پوچھا کہ وہ کیوں مار رہا تھا اور نہ ہی اُس کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تھک کر ہانپنے لگا پھر سر تھام کر چارپائی پر بیٹھ گیا جبکہ وہ فرش پر بے جان انداز میں پڑی بری طرح کراہ رہی تھی۔ عمر حیات نے درشت آواز میں دو تین مرتبہ اُسے اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھنے کا حکم دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

سانسیں بحال کر کے وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا۔ گلاس تھام کر نکڑ میں رکھے پانی کے جگ کی طرف گیا۔ گلاس حلق میں انڈیل کر پلٹا اور گلاس کو پوری قوت سے سامنے والی دیوار پر دے مارا۔ ننھا سا دھماکہ ہوا۔ چندو نے ڈر کر سر اُٹھایا۔ اتنی دیر میں وہ سر پر پہنچ گیا۔ بالوں سے پکڑ کر چارپائیوں کے بیچ گھسیٹتا ہوا صوفے تک لایا۔ بے دردی سے پٹخ کر بولا، ''تم نے..... ہاں تم نے میرے بابا کا خون کیا ہے۔ تم نے مجھے جیتے جی مار ڈالا۔ تم نری حرام کی پھوئی ہو..... سنا تم نے؟ میں کہہ رہا ہوں کہ تم حرام کی پھوئی ہو۔ تمہارا وجود گناہ کی مٹی سے گوندھا گیا تھا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا.....''

اس کے حلق سے غلیظ گالیاں ابل پڑیں۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی، سسکتی رہی۔ وہ کافی کچھ کہہ گیا تو اُس نے سر اُٹھایا اور پھولی ہوئی سانسوں میں بولی، ''تو مجھے مار کیوں نہیں دیتے؟ مار کر اپنی آگ بجھا لو ناں۔ میں گناہ کی پوٹ ہوں۔ میرا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ کوئی تمہارا گریبان پکڑ کر نہیں پوچھے گا کہ تم نے چندو کو کیوں مارا۔''

اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دونوں گال سوج کر سرخ ہو گئے تھے۔ سلیقے سے باندھے گئے بال کھل کر مجنونانہ انداز میں بکھر چکے تھے جبکہ ہونٹوں کے دائیں گوشے سے خون کی ننھی سی لکیر نکل کر تھوڑی تک پہنچی تھی اور جم گئی تھی۔ اسے اس کا احساس تک نہیں تھا۔ آنکھوں میں دہشت کی جگہ وحشت نے لے لی۔

عمر حیات اُسے سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر پلٹ کر دروازے کے پاس گیا۔

دروازہ بند کر کے دوڑنے کے سے انداز میں اُس کے قریب آیا۔ کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا، ''ہاں..... ایسا ہی ہوگا۔ میں تمہیں مارنے کے لئے ہی تو یہاں لایا ہوں۔ بولو! کیا میں دنیا کا پہلا لڑکا تھا جس نے کسی لڑکی کا راستہ روکا تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ غرایا، ''کیا قیامت آ گئی تھی کہ میں نے بے اختیار ہو کر تمہیں دیکھ لیا، بات کر لی؟ کھا جاتا تمہیں؟''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر تم نے میرے بابا سے میری شکایت کیوں کی؟''

اس نے عمر حیات کی وحشت بھری آنکھوں میں جھانکا، ''تم نے مجھے حرام کی پھوئی کہا تھا۔''

''تو کیا تم حرام کی پھوئی نہیں ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں! میں نہ کسی کے گناہ کا حصہ ہوں اور نہ کسی کے گناہوں کی پاداش۔''

''کیا مطلب؟''

''کیا تم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے باپ کی اولاد ہو؟'' اس کی ہمت دیدنی تھی۔

''تت..... تم..... تم..... میں تمہیں.....'' وہ حلق کے بل چیخا۔ فرطِ اشتعال سے کچھ بھی نہ کہہ پایا۔ ذرا سانس لے کر دانت پیستے ہوئے بولا، ''میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میں میر ظفر حیات کا بیٹا ہوں۔''

وہ بے دردی سے نفی میں سر کو جنبش دے کر بولی، ''نہیں میر زادے! کوئی بھی پورے یقین سے یہ بات نہیں کر سکتا۔ تم بھی۔''

وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے چندو کے شانے چھوڑ دیے اور اُسے دو تین زوردار تھپڑ رسید کیے۔ وہ بجائے رونے یا منت سماجت کرنے کے ہنسنے لگی۔ یوں جیسے کوئی فاتر العقل قہقہے لگاتا ہے۔ عمر حیات کے یکبارگی ہاتھ تھم گئے۔ گھبرا گیا۔ اُسے ہوش میں لانے کیلئے پھر جھنجھوڑنے لگا۔

وہ وحشیانہ انداز میں دیکھتے ہوئے بولی، ''فکر نہ کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ مارو! اور زور زور سے مارو تا کہ تمہارے اندر کے پاگل آدمی کو قرار آ جائے اور میری تم جیسے جنونی سے ہمیشہ کیلئے

جان چھوٹ جائے۔''

اس نے حلق سے ڈراؤنی آواز نکالی اور دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن دبوچ لی۔ بتدریج ہاتھوں پر دباؤ بڑھاتا گیا۔ چندو کی آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں۔ چہرے کی رگیں کھنچ گئیں پھر منہ بھی کھل گیا اور خرخراہٹ برآمد ہونے لگی۔ بے اختیار چندو کے ہاتھ عمر حیات کی پھولی ہوئی رگوں والے ہاتھوں پر ٹک گئے۔ چند لمحے اور گزر جاتے تو وہ دنیا سے گزر جاتی۔ موت اُس کے سامنے لہرائی ضرور مگر اُسے شکست نہ دے پائی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی طلب رمق نہیں جاگی تھی۔

معمولی بات کو جذباتی اور ہیجانی انداز میں بڑی بات بنانے والے من چلے عمر حیات کے گلا گھونٹنے والے ہاتھوں کی بجلیاں بھی ماند پڑ گئیں اور بے جان انداز میں نیچے گر گئے۔ چندو نے یک بارگی پورا منہ کھولا، تیز تیز سانسیں پھیپھڑوں میں اُتاریں اور کھانسنے لگی۔

عمر حیات کا ہیجان تھما نہیں تھا۔ اس نے چندو کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے قمیص پھاڑ دی۔ وہ جلدی سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی، پھر اپنی برہنگی کا خیال کرتے ہی صوفے پر گر کر سمٹتی ہوئی گٹھڑی سی بن گئی۔ اس نے ابھی تک عمر حیات کا ہاتھ نہیں روکا تھا۔ اب روکنا چاہ رہی تھی مگر اس کی دیوانگی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور چند ہی لمحوں میں آدھا بدن بے لباس ہو گیا۔ وہ شرم سے زمین میں گڑنے لگی۔ وہ اس کی حالتِ زار سے بے پروا تھا۔ باؤلے کتے کی طرح بھنبھوڑنے لگا اور چندو ماہی کی مزاحمتی سسکیوں اور سماجتوں پر دھیان دیے بغیر مارنے پیٹنے لگا۔ پانی کو دیکھ کر پیاس بڑھتی ہے۔ ماس کو دیکھ کر بھوک بڑھتی ہے مگر کچھ ایسا ہوا کہ میر عمر حیات کی بھوک اور پیاس یک لخت ختم ہو گئی۔ وہ فرعون بن کر ناکردہ جرم پر سزا دینے، اُسے مارنے یا گڑگڑا کر معافی مانگنے پر مجبور کرنے کیلئے لایا تھا۔ اس نے پھر دو چار ہاتھ جڑنے کی نیت لئے ہاتھ اُٹھایا مگر ہاتھ نیچے لانے سے پیشتر ہار گیا۔ انسانی ذہن کمپیوٹر نہیں ہوتا۔ کمپیوٹر کو جو فیڈنگ دی جاتی ہے، وہ ہزار بار طلب کرنے پر وہی فیڈنگ سکرین پر لا دکھاتا ہے مگر انسان ایک ہی سوال کا جواب ہر مرتبہ ایک سا نہیں دیتا۔ وہ دو جمع دو کا جواب 'چار' میں بھی دیتا ہے اور 'گالی' میں بھی۔ مانگنے پر دے بھی سکتا ہے اور چھین بھی۔

عمر حیات کی ذہنی رو بدل گئی۔ آنکھوں کی ندیدگی پر حیا کی چادر پھیل گئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا، اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں کو، پھر آنکھیں بند کر کے رُخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

کانپتی ہوئی آواز میں بولا، ''قمیص پہن لو۔''

اس کی جان میں جان آئی۔ خود کو دیکھا تو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ قمیص کو دیکھا جو پہننے کے قابل نہیں رہی تھی مگر وہ جلدی جلدی پہننے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ زیب تن کی، کچھ چیتھڑوں کی صورت میں بدن پر پھیلائی۔ چادر نے اُس کا بالائی تن ڈھانپ لیا تھا۔

عمر حیات نے اُس کی طرف پھر نہیں دیکھا بلکہ دور ہوگیا۔ پیٹھ کئے بولا، ''چندو! مجھے معاف کردو۔ میں یقیناً پاگل ہوگیا ہوں؛ شاید نفسیاتی مریض۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔''

خاموش ہوکر، تھوڑے توقف کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کئے، دیوار پر ٹکائے اور سر جھکا کر گویا ہوا، ''دیکھو چندو! میں اپنے بابا سے بہت پیار کرتا تھا۔ اتنا کہ دنیا میں کسی سے نہیں مگر تمہیں دیکھا تو مجھے کچھ کچھ ہونے لگا۔ تبھی خود پر اختیار نہ رکھتے ہوئے تمہارے سامنے آیا اور تم نے میری شکایت دے کر میرے پیارے سے بابا کو مار دیا۔ آہ..... تم نے میری نظروں کے سامنے میرے خاندان کو بے سائبان کر دیا۔ مگر..... مگر..... میں اسی غلطی پر تھا کہ یہ سب کچھ تم نے کیا۔ نہیں..... یہ تو میں نے خود کیا تھا۔ پر نہیں..... یہ میں نے بھی نہیں چاہا تھا۔ تو پھر یقیناً بابا کی عظمت ہی اُسے لے ڈوبی۔ ہے ناں؟''

چندو ماہی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بھانپ گئی کہ عمر حیات کا ذہن منتشر ہونے لگا تھا۔ جواب میں کچھ نہ بولی۔ سسکیاں روک کر سننے لگی، وہ کہہ رہا تھا ''کاش! بابا کو ہارٹ اٹیک نہ ہوتا اور میں اُس سے معافی مانگ لیتا مگر اتنی مہلت ہی نہیں ملی..... اور تم..... تم..... جسے میں نے کئی بار حرام کی پھوئی کہا، نہیں..... تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم کسی گناہ کا حصہ نہیں ہو۔ تم تو تم ہو..... چندو ماہی..... چاند کی طرح روشن، ماہی کی طرح خوب صورت۔ ہے ناں؟ میں تمہیں برباد کرنا چاہتا تھا۔ تمہیں بے آبرو کرنا چاہتا تھا۔ تبھی یہاں لایا تھا۔'' اس کی آواز شدتِ جذبات سے ٹوٹنے لگی، ''مگر اَب پتہ چلا کہ تم نہیں، بے آبرو تو میں ہونے چلا ہوں۔ نہیں؛ بلکہ بے آبرو ہو گیا ہوں۔ اپنی ہی نظروں سے گر گیا ہوں۔ کیا میں اتنا ہی نیچ ہوں کہ ایک بن ماں کی، بن باپ کی بچی کی بددعا کی بھینٹ چڑھ جاؤں؟ نہیں..... میں تو بہت اونچے شملے والے میر ظفر حیات کا بیٹا ہوں۔ اس کا، جس کا نام لے کر دنیا قسمیں کھاتی ہے۔ اوہ! میں نے بہت بڑا گناہ کیا، بہت بڑا ظلم کیا۔ تم چاہو تو مجھے معاف کردو۔ چاہو تو جوتا اُتار کر میری کھوپڑی پلپلی کردو۔ آؤ..... دیر نہ کرو۔ اِدھر مارو، ایسے.....''

اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا۔ ایک مرتبہ پھر بار ہا.....

چندو ماہی بے بسی اور نفرت کے ملے جلے احساس سے اُس کی اوٹ پٹانگ حرکات دیکھ رہی تھی۔ اس کا عضو عضو دکھ رہا تھا۔ دیوانے کی دیوانگی نے بدن کے جوڑ جوڑ میں درد بھر دیا تھا۔ ہونٹ زخما دیے تھے اور دانتوں کے ننھے ننھے زخموں سے خون رس رہا تھا۔ وہ ہاتھ کی پشت سے لہو پونچھنے لگی۔ کبھی اپنے لہو کو دیکھتی، کبھی دیوانے کی پشت کو۔ اُس نے بے آبرو نہیں کیا تھا مگر آبرو میں رہنے بھی نہیں دیا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا کہے؟ کیا نہ کہے؟

''چندو! مجھے گالیاں دو۔ جی بھر کے برا بھلا کہو۔ جو من میں آئے، کہو۔ پھر معاف بھی کر دو۔''

اسے جواب نہیں ملا تو کندھے کے اوپر سے گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے چلایا، ''تم بولتی کیوں نہیں ہو؟''

پھر خود ہی بڑبڑایا، ''پر میں نے اچھا کیا بھی کیا ہے کہ تم میرے ساتھ بولو۔''

دیوار کا سہارا چھوڑ کر لہراتا ہوا تیزی سے اس کی طرف آیا۔ وہ ڈر کر سکڑ گئی۔ وہ قریب آ کر ایک ذرا رُکا پھر پیروں میں بیٹھ گیا۔ دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''بھلے مجھے مارو، گالیاں دو مگر ایسے خاموش نہ رہو۔ خدا کے لئے مجھے مارو۔ میں کتا ہوں۔ کتے کو سبھی پتھر مارتے ہیں۔ جوتے مارتے ہیں۔ تم بھی مارو۔''

وہ سہمی سہمی نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے منہ پھیر گئی۔ عمر حیات نے اس کے سرد ہاتھ تھامے۔ دونوں ہاتھوں پر خون لگا ہوا دیکھ کر دیوانہ وار چومنے لگا۔ پھر اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کو زور زور سے اپنے گالوں پر مارنے لگا۔ ہوش میں نہیں تھا۔ وہ مزید ڈر گئی۔ پاگلوں سے ہر کوئی ڈرتا ہے۔ اپنا آپ بچاتا ہے۔ وہ اس پاگل سے اپنا آپ بچا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی گرفت سے نکل کر بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ اُس سے بڑی پاگل تھی جو احمقانہ انداز میں اُس کے ساتھ تنہائی میں چلی آئی۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اَب سر پیٹنے سے کچھ حاصل ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

عمر حیات نے ایک ایک زخم اور نیل کو چوما۔ چاہا کہ اپنی بربریت کے سبھی داغ مٹا ڈالے مگر تھک گیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ ایسے میں چندو کی غیر معمولی سرد مہری دل پر گراں گزرنے لگی۔ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ بچوں کی طرح ہچکیاں لینے لگا۔ بلند آواز میں خود کو بُرا بھلا کہہ کر اُسے بولنے پر اکسانے لگا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تبھی اُس نے سر اُٹھا کر چندو کو دیکھا اور

کہا، ''چندو! بابا نے مجھے آخری حکم یہ دیا تھا کہ میں تمہیں بیوی بنالوں یا بہن۔ کیا تمہیں بابا کا وہ فیصلہ یاد ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا، ''میں تمہیں بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ اپنے جنونی سلوک کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی، بولی، ''نہیں میر زادے! میں اس قابل نہیں ہوں۔ تم مجھے زندہ رہنے دو یا مار دو مگر میرے بابا کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہیں اگر گولیاں چلانے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے برابر کے زمیندار پر گولی چلاؤ۔ مرے کو مارنے سے کوئی لطف نہیں ملتا۔''

وہ جانتا تھا کہ چندو محض اپنے خاندان کو محفوظ رکھنے کے لئے اس کے پاس آئی تھی۔ پھر بھی یہ سن کر اس کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ بولا، ''تم نے خط میں لکھا تھا تم اپنے باپ کے لئے مجھے جان کے بدلے جان دینے پر تیار ہو۔ جان مانگ رہا ہوں تو اپنے قول سے پھرنے لگی ہو۔''

وہ الجھ گئی۔ پہلے وہ سمجھی تھی کہ عمر حیات اپنے باپ کی موت کا بدلہ اس کی موت کی صورت میں لینا چاہتا تھا۔ اب اسے بیوی بنانے کی بات کر رہا تھا۔ بولی، ''جان لینے اور بیوی بنانے میں فرق ہے۔ میں اپنی جان اپنی مرضی سے دے سکتی ہوں مگر کسی کی بیوی بننے کا فیصلہ بابا کی مرضی کے مطابق کروں گی۔''

''اگر تمہارا بابا مر جائے تو؟''

وہ تڑپ کر بولی، ''اگر تم اسے مارو گے تو میں تمہیں مار دوں گی۔''

''کیا تم میں اتنا دم خم ہے؟'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''ہاں! میں اگر اپنے بابا کی خاطر تم جیسے جانور نما انسان کی مار کھانے کے لئے یہاں تک آ سکتی ہوں تو بندوق بھی اُٹھا سکتی ہوں۔ بدنامی اور رسوائی سمیت دنیا کا ہر عذاب جھیل سکتی ہوں مگر بابا کو تکلیف پہنچے، برداشت نہیں کر سکتی۔''

وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا ''اوکے! میں نے تمہاری بات مان لی۔ اب تم بھی میری بات مان لو۔ میں اپنے رویے پر نادم ہوں۔ مجھے دل سے معاف کر دو اور میری محبت کو قبول کر لو۔ میرا وعدہ ہے کہ میں زندگی بھر تمہیں خوش رکھوں گا۔''

اس نے بیزاری سے انکار کر دیا تو وہ اُٹھا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک زنانہ سوٹ اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ سوٹ اس کی طرف اُچھال کر بولا، ''یہ پہن

لو؛ پھر تمہیں سکول پہنچا دیتا ہوں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔''

اس نے اسپاٹ نظروں سے بدلے ہوئے عمر حیات کو دیکھا اور اس کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ باہر گیا تو اس نے لباس بدل لیا۔ سکول کی نیلی قمیص اور سفید شلوار کی جگہ بھڑکیلے سرخ سوٹ نے لے لی۔ یہ لباس اُس پر ڈھیلا ڈھالا تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں سنگھار میز پڑی ہوئی تھی۔ بال سنوارنے کے لئے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنے سراپے پر نگاہ پڑی تو ٹھٹک گئی۔ اس کا چہرہ عمر حیات کی دیوانگی کا اشتہار بنا ہوا تھا۔ وہ اس حال میں باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ اپنی چادر میں چھپنے کی کوشش کی مگر وہ اتنی بڑی نہیں تھی۔ بے بسی سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ دروازے میں آئی اور جھانک کر دیکھا۔ عمر حیات پشت پر ہاتھ رکھے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے دیکھ کر قریب آیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ بولی، ''کوئی بڑی چادر مل جائے تو میں اپنا چہرہ چھپا لوں گی ورنہ ہر کوئی اس کتے کا نام پوچھے گا جس نے مجھے اتنی بے رحمی سے کاٹا۔''

اس نے برہمی آمیز نادم نگاہوں سے اُسے گھورا اور ملحقہ کمرے میں گھس گیا۔ چند ہی لمحوں میں سیاہ رنگ کی بڑی سی چادر اُٹھا لایا۔ اس نے چادر اوڑھ کر منہ لپیٹ لیا۔ اَب اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں جن سے سوائے نمی کے کچھ عیاں نہیں ہوتا تھا۔

شاید عمر حیات کے اندر جلتی ہوئی آگ سرد پڑ گئی تھی، اِس لئے اس کی آنکھوں سے جھلکتی وحشت ناپید ہو گئی تھی مگر وہ پوری طرح حواس میں نہیں تھی۔ تبھی اُسے دیر ہونے کا خیال تک نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ عمر حیات کی جیپ سے اُتری تو ایک دم ڈول گئی۔ قدم منوں وزنی ہو گئے۔ سکول بند تھا۔ سکول کے سامنے والی ٹاہلی کے نیچے بابا ٹانگیں پھیلائے ریڑھی پر بیٹھا تھا۔ اُسے عمر حیات کی پوٹھوہار جیپ سے اُترتا ہوا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ناگاہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عمر حیات پر پڑی تو اس کے ہاتھ سے بیساکھی چھوٹ گئی۔ جیپ آگے بڑھ گئی تو وہ سڑک عبور کر کے ریڑھی کے پاس آئی۔ ریڑھی پر بیٹھی تو چادر چہرے سے سرک گئی۔ کٹا پھٹا چہرہ ہویدا ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی، ''وہ بابا..... وہ میرزادہ.....''

یوں لگا جیسے گانمن نے اُس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ جوانی کی دہلیز پر کھڑی ہوئی بیٹی سکول گیٹ سے نکلنے کے بجائے میرزادے کی گاڑی سے اُتری تھی۔ یونیفارم کے بجائے سرخ سوٹ پہنے ہوئے تھی جو آج تک گانمن نے اس کے بدن پر نہیں دیکھا تھا۔ سیاہ چادر بھی

نامانوس تھی۔ پہلی مرتبہ نقاب کیے ہوئے تھی۔ کندھے پر سکول بیگ نہیں تھا۔ چہرے پر خراشیں اور ننھے ننھے زخموں کی کہانی عیاں تھی۔ یہ بھی عیاں تھا کہ جو بھی ہوا تھا، اس کی مرضی سے ہوا تھا، وہ جہاں بھی گئی تھی، اپنے پیروں پر چل کر گئی تھی، تبھی گانمن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کئی منٹوں تک گنگ بیٹھا اُسے گھورتا رہا پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بڑبڑایا، ''بس مولا سائیں! روگ لاء چھوڑئی ناں میڈی جندڑی کوں!''

(بس مولا سائیں! آخر میری زندگی کو روگ لگا دیا ناں تم نے!)

ٹانگیں گھسیٹ کر رُخ بدلا اور لگام کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ وہ بابا کو بتانا چاہتی تھی مگر بابا کا رویہ دیکھ کر اُس کی جرأت ماند پڑ گئی۔ بابا کی آنکھوں سے نکل کر داڑھی کو تر کرتے ہوئے آنسو اس سے اوجھل ہی رہے کیونکہ وہ اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔

تاجاں اور سرداراں نے اُسے دیکھا تو چیخ اُٹھیں۔ گانمن سے پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ اُسے تو بس اتنا ہی پتہ تھا کہ اس کی غیرت کا جنازہ اُٹھ گیا تھا۔ چندو بول پڑی۔ بابا پر فائرنگ کے واقعے سے لے کر عمر حیات کی پوٹھوہار سے اُترنے تک اُس نے سب کچھ بتا دیا۔ من وعن۔ کچھ بھی مخفی نہ رکھا۔ گانمن سنتے ہوئے بھی نہیں سن رہا تھا۔ تاجاں سنتے ہی بپھر گئی۔ گالیاں اور کوسنے دیتی ہوئی اس پر پل پڑی اور دو ہتھڑوں سے اُدھ موا کر دیا۔ چندو بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ جیسی تھی، ویسی ہی ہے۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ویسی نہیں رہی تھی، جیسی صبح سکول جاتے ہوئے تھی۔ گانمن نے اُسے تاجاں کی مار پیٹ سے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ وہ مدد طلب نظروں سے سرتھامے بیٹھے گانمن کی طرف دیکھتی رہی اور روتی رہی۔

اگر گانمن اس پر ہاتھ اُٹھا لیتا، اپنا کرب ہلکا کر لیتا تو شاید چارپائی پر نہ گرتا۔ وہ اپنے اندرونی دکھ کی لپیٹ میں آ کر ایسا گرا کہ کئی دنوں تک اُٹھ نہ سکا۔ گھر کا اکلوتا مزدور بیمار پڑ گیا تو پھر غربت کے مہیب سایوں نے جھونپڑی کو اپنے خونیں حصار میں لے لیا۔ چندو کا سکول جانا بند ہو گیا۔ اسے توقع تھی کہ مسز ریحانہ یا سکینہ خانم اس کا پتہ لینے آئیں گی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا سکول سے نکلنا اور چھٹی تک واپس نہ آنا اس کے ہمدردوں کو زندہ مار گیا تھا۔ مسز ریحانہ کے توسط سے عمر حیات کے ساتھ جانے کی خبر سکینہ خانم تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دل تھام کر بیٹھ گئی۔

مصیبت یہ پڑی کہ ناسپاس حالات میں بابا کی دوائی بھی ختم ہو گئی۔ زخم میں پس پڑ گئی۔ حکیم

صاحب گولیاں دے دیتے۔ وہ کھاتا تو درد میں کچھ افاقہ تو ہو جاتا مگر زخم بتدریج خراب ہوتا گیا۔ پانچ سات دنوں بعد جھونپڑی کے اندھیرے میں پھر چاند طلوع ہو گیا۔ میر ظفر حیات کی بیوہ اپنی نوکرانی کے ساتھ چندو کا ہاتھ مانگنے چلی آئی۔

وہ اپنے اکلوتے بیٹے اور لاکھوں کی جائیداد کے تنہا وارث کی ضد پر ہتھیار ڈال کر یہاں آئی تھی۔ اس کی نخوت اور بے بسی اس کے رشتہ مانگنے کے انداز سے آشکار تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اتمامِ حجت کے طور پر آئی تھی۔ گانمن اور تاجاں اَدب اور دُکھ سے لب بستہ رہے مگر چندو سے نہ رہا گیا۔ کمزور سی آواز میں بول ہی پڑی، ''بی بی سائین! مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔ اپنے بیٹے سے کہہ دیں کہ وہ اپنے خاندان کی کسی لڑکی کو پسند کر لے۔ میری جان چھوڑ دے۔''

بی بی کو اس کا انداز برا لگا۔ بولی، ''میں تو اپنے گھر کو پاک صاف رکھنا چاہتی ہوں مگر اس پر تمہارے عشق کا بھوت سوار ہے۔ وہ تمہاری جان کیا چھوڑے، تم ہی اس کی راہ سے ہٹ جاؤ تو بہتر ہے۔''

اس نے چند ہی جملوں میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے سمجھا دیا کہ وہ چندو ماہی کو اپنے بیٹے کے بگاڑ کا ذمہ دار ٹھہراتی تھی۔ ایک تیر میں دو شکار کرنا چاہتی تھی۔ ایک طرف بیٹے کو راضی کر رہی تھی کہ وہ اس کی ضد پوری کرنے کیلئے چندو کا رشتہ لینے گئی تھی۔ دوسری طرف وہ چندو کے گھر والوں کو سمجھا رہی تھی کہ ان کی دِھی میر خاندان میں نقب لگانے کی کوشش کر رہی ہے، اسے سنبھال کر رکھو۔ ایک گھنٹہ کے قریب گانمن کی جھونپڑی میں جلوہ افروز رہی، پھر تنبیہی نگاہ ڈال کر رخصت ہو گئی۔ گانمن اس دوران غیر فطری انداز میں تمام تر گفتگو سے لاتعلق بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا اور اپنی بیساکھی پر لحاف کی پھٹی ہوئی پٹی لپیٹتا رہا۔

رات نصف کے عمل میں تھی جب چندو چارپائی میں اُٹھ بیٹھی۔ بابا کی چارپائی خالی دیکھی تو متفکر ہو گئی۔ اسے تلاش کرتی ہوئی بکریوں کے بھانے میں پہنچ گئی۔ وہ ایک نوزائیدہ میمنے کو اپنی تندرست ٹانگ پر بٹھائے پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا۔ چندو دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کے عقب میں جا کھڑی ہوئی۔ سننے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا، ''ڈیکھ میمے! میکوں ڈیکھ..... میں کل تک جوان تھا۔ میرے بازو فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ آج بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کل میرے دل میں اتنی طاقت تھی کہ میں نے سردار رب نواز اور میر کریم بخش جام کے نوٹ لوٹا دیے تھے۔ میں میر ظفر حیات کے زنانے خانے پر جا کھڑا ہوا تھا۔ اپنی چندو ماہی کا راستہ روکنے والے سے ٹکرا گیا

تھا۔ مگر ڈیکھ میمے! آج میرا جسم بھی ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔ میری چندو ماہی نے میری غیرت کا جنازہ نکال کر مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔ اسی چندو نے، جس کے نام کی ہر سانس میرے پھیپھڑوں کو طاقت دیا کرتی تھی۔ ڈیکھ گھن میمے! اُوں میکوں جیندے جی مار گھتا ہے!''

(دیکھ لو میمنے! اس نے مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے۔)

چندو کے لبوں سے دلدوز سسکی نکلی۔ فضا سرسرا گئی مگر گانمن لاعلم رہا۔ بولتا رہا، ''ڈیکھ میمے! میری ٹانگ گل سڑ رہی ہے۔ میں چل پھر نہیں سکتا مگر کیا میری غیرت بھی لنگڑی ہو گئی تھی جو میری چنڑو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر اُس میرزادے کی بے حیائی کو سینے سے لگا آئی؟ اسے میری محبت کی پروا نہیں تھی ناں..... میری غیرت کا جنازہ کاندھوں پر اُٹھاتے ہوئے اس کے ہاتھ نہیں کانپے۔ آنکھ نہیں چھلکی۔ ہائے مولا! میں نے کیا برا کیا تھا؟ مار دیتا؛ یہ دن تو نہ دکھاتا۔ بھلا غیرت کے بغیر مرد، مرد رہتا ہے کوئی؟ نہیں مولا! میں نے تمہارے بنائے ہوئے وجود کو سینے سے لگایا، اس کی غلاظتوں کو ہونٹوں سے ہٹایا اور زبان سے چاٹ کر صاف کیا..... اس نے تو بھول ہی جانا تھا؛ تم کیوں بھول گئے۔ وہ گھڑی، جب میرے ہونٹوں پر پہلی بار مچلا تھا، 'چندو ماہی'..... وہ دن تم نے بھی بھلا دیا؟..... کیا چاند ایسا ہوتا ہے؟ کیا ماہی ایسی ہوتی ہے؟..... مولا! میکوں چاگھن..... میں نے اپنی جائی کو چھاتی پر نہیں سلایا تھا، تمہاری امانت کو آٹھ سال اپنی چھاتی پر سلاتا رہا۔ تمہیں بھی خیال نہیں رہا..... ہاں! نہیں رہا ناں..... تم بے پروا ہو۔ تمہاری بنائی ہوئی دنیا بھی لاپروا ہے۔''

گانمن کی شکست خوردہ آواز چندو کا دل چیر رہی تھی اور وہ لکڑی کے تھم (ستون) کو بھینچے بے جان انداز میں کھڑی سن رہی تھی، ''ہائے چندو! مجھے پتہ ہی نہیں چلا اور تیرے بدن میں کوئی آلائش چھپی رہ گئی۔ دیکھ لیتا تو اُسے بھی چاٹ کر صاف کر دیتا۔ پَر لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ اپنی جائی کی روح پر یقین کر لو، پَر اس کے جوان بدن کا بھروسہ نہ کرو۔ جوان بدن میں آگ لگتی ہے تو آس پاس کا دھیان نہیں رہتا۔ ہائے! میں نے کیا کیا؟ کیوں اُس لکڑی کی چوکی کو کسی اور منزل کی طرف جاتے ہوئے روک لیا..... نہ روکتا تو آج میرا دل نہ ٹوٹتا۔ میڈا سائیں! میکوں اپنے کول سڈ گھن نی تاں دنیا میکوں ننگا کر چھڑیسی..... میکوں چاگھن مولا!''

(میرے سائیں! مجھے دنیا سے اُٹھا لے ورنہ دنیا مجھے برہنہ کر دے گی۔ مجھے اٹھا لے مولا!)

اس کی سناٹے کا قلب چیرتی ہوئی آواز بھرا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تنہائی

میں روتا ہوا مرد بڑا دل فگار ہوتا ہے۔ اس کا آس پاس بھی اُس کے ساتھ بلکنے لگتا ہے۔

چند و تڑپی مگر سنبھل گئی۔ سوچا، 'غبارِ دل نکلنا چاہیے۔'

جب کافی دیر گزر جانے پر بھی اس فولادی مرد کی ہچکیاں نہ تھمیں تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس سے لپٹ گئی۔ اپنی عادت کے مطابق کے اس کا ماتھا اور منہ چومتی رہی۔ داڑھی سے کھیلتی رہی۔ وہ ایسے ہی ہر بات گانمن سے منوالیا کرتی تھی مگر گانمن ہوتا تو مان ہی جاتا، وہ تو کوئی اور تھا..... پتھر کی طرح سرد اور بے جان..... اس نے مینا اُٹھا کر بکری کی طرف دھکیل دیا، گانمن نے مزاحمت نہیں کی۔ اس نے جھنجھوڑا، وہ کچھ نہیں بولا بلکہ اندھیرے خلا میں گھورتا رہا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بتانے لگی کہ وہ اپنے بابا کو زندہ اور محفوظ دیکھنا چاہتی تھی، تبھی بدنامی اور بے حیائی کے دریا میں کودی تھی۔ سمجھانے لگی کہ میر زادے نے اُسے مارا پیٹا، مگر بے عزت نہیں کیا۔ بولتے بولتے اچانک تھم گئی۔ سوچ میں پڑ گئی، 'بے عزت کیسے کیا جاتا ہے؟'

'عزت کس احساس کا نام ہے؟'

اگر لباس عزت تھا تو اس کی عزت کو عمر حیات نے تار تار کر دیا تھا۔ اگر بدن عزت کا امین تھا تو وہ چھلنی چھلنی واپس آئی تھی۔ اپنے تئیں بجھ گئی۔ حساس تھی۔ ذہین تھی۔ دل پر گھونسا لگا۔ گانمن کا رویہ بجا محسوس ہوا۔ ایک باپ کے لئے اس منظر سے بڑا کوئی سانحہ نہیں تھا۔

اس نے پاؤں چومے، ہاتھ جوڑے اور خدا اور رسول کے واسطے دیے مگر گانمن کے نیم مردہ وجود میں کوئی ارتعاش پیدا نہ ہوا۔ وہ ہار گئی۔ اُسے اُٹھا کر چارپائی پر لائی۔ وہ ساتھ چلا آیا، یوں، جیسے اُس کی کوئی مرضی ہی نہ ہو، وہ جاندار ہی نہ ہو۔ چارپائی پر گر گیا۔ وہ اس کی چھاتی پر بڑی دیر چہرہ رگڑتی رہی پھر آہ بھر کر اپنی چارپائی پر چلی گئی۔

تاجاں اور سرداراں کی مزدوری نے چولھا سنبھال لیا۔ دونوں معمول کے کام کاج کے علاوہ سارا دن کھجور کے پتوں کی چنگیریں اور شہتوت کی باریک ٹہنیوں کے ٹوکرے بناتیں جنہیں بیچنے سے بہت کم اجرت ہاتھ لگتی مگر کارِ نان ونفقہ چل نکلا۔ چند و ماہی ان دونوں کے قریب جاتی تو وہ خاموش رہتے ہوئے اُسے پرے جھٹک دیتیں۔ چارپائی پر دیدے پھیلائے مردوں کی طرح لیٹے ہوئے گانمن کے قریب جاتی تو اس کی سرد مہری دیکھ کر دل مٹھی میں آ جاتا۔ وہ گونگا بہرا ہو گیا تھا اور چند و کے کان اُس کی آواز کو ترس گئے۔

عمر حیات کی ماں نامراد گئی تھی۔ اس کا بیٹا چند دنوں کے وقفے سے پھر آن پہنچا۔ دیہاتی

گھروں کے دروازے وسیب داروں کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ وہ جیپ کھال پر روکنے کے بعد، شہتوت کی ٹہنیاں کھال کے رُکے ہوئے پانی میں بھگوتی ہوئی سرداراں اور تاجاں کو نظر انداز کر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ گانمن چاروں شانے چت چارپائی پر دراز تھا۔ چارپائی کی بانہہ سے کمر ٹکا کر چندو ماہی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ وہ کھنکارا تو چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ اپنے بابا کے مرنے سے پہلے عمر حیات خوب رُو اور نفیس تھا۔ عمدہ لباس زیب تن کرتا تھا۔ کھلنڈرا تھا۔ اب دکھائی دینے والا عمر حیات مختلف تھا۔ حلیے سے نشئی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گانمن کو سلام کیا۔ جواب نہ پا کر مستفسرانہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

چندو کو اس کا آنا گراں گزرا، بولی، ''اب کیا لینے آئے ہو؟''

اس نے گانمن کی طرف دیکھا۔ فوراً بھانپ گیا کہ کھلی آنکھوں والا گانمن ہوش وحواس سے عاری تھا۔ انگلی تان کر بولا، ''تمہیں.....''

وہ چیخی، ''بابا! ڈیکھتاں سہی، کون آیا ہے؟ تو کہتا تھا کہ تیری بانہوں میں دم ہے۔ اب وہ دم دِکھا اور اس امیرزادے کو روک۔ ہائے بابا! اُٹھ ناں..... تو کہتا تھا کہ تیرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے جو بھی میرا نام لے گا، تو اس کی زبان کھینچ لے گا۔ اس کی زبان بھی گدی سے کھینچ دِکھا۔ بابا اُٹھ ناں!''

عمر حیات کی آنکھوں میں تشویش دوڑ گئی مگر گانمن ٹس سے مس نہ ہوا۔ چندو نے سینے پر دونوں ہاتھ مارے، چلائی، ''دارو، امّاں! میرزادہ میکوں چاون آیائے..... ایں کوں روک گھنو!''

(میرزادہ مجھے اُٹھانے آیا ہے، اسے روک لو۔)

وہ اتنے زور سے چیخی تھی کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ وہ سینہ کوبی کرتی جاتی تھی، سرداراں اور اماں کو پکارتی جاتی تھی، بابا کو جھنجھوڑتی جاتی تھی مگر کوئی بیدار نہ ہوا۔ گانمن کے گھٹنے کا زخم پس زدہ تھا۔ بہت دکھتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا گھٹنا پیٹ ڈالا۔ تب بھی گانمن کی ٹھہری ہوئی آنکھوں میں جنبش پیدا نہ ہوئی تو ہانپنے لگی۔ دنیا سو گئی تھی۔

عمر حیات بوکھلا گیا۔ کبھی چندو کو، کبھی گانمن کو تو کبھی دروازے کے باہر اچھلتی کودتی بکریوں کو دیکھتا۔ پھر گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ چندو کے دونوں ہاتھ تھام کر ملتجیانہ بولا، ''چندو! میری بات سنو، میں تمہیں اُٹھانے کے لئے نہیں آیا۔ لینے کے لئے آیا ہوں۔ خدا کیلئے چپ ہو جاؤ ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔''

وہ یوں رُک گئی جیسے عمر حیات کو کچھ نہ ہونے دینا چاہتی ہو۔

وہ چندو کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر بولا، ''چندو! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدا کے لئے اپنے بابا کو سمجھاؤ۔ میں کسی کا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسی کو دکھ نہیں دینا چاہتا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو پلیز!''

''تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتی۔ تمہاری وجہ سے میرا گھر برباد ہو گیا ہے۔ میرا بابا جیتے جی مر گیا ہے۔ ہائے بابا! اُٹھ ناں؛ اسے دھکے دے کر باہر نکال.....'' اس پر پھر ہسٹریائی کیفیت سوار ہو گئی اور اس نے 'ہائے! میرا بابا مر گیا' کی گردان الاپتے ہوئے عمر حیات کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ وہ اُسے تھامنے اور سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا پھر مایوس ہو کر کمرے سے نکل گیا۔

خلافِ توقع تینوں میں سے کسی نے بھی اُس سے عمر حیات کی آمد اور غرض و غایت کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔ تبھی اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کا وجود اس گھر کے لئے بے معنی ہو گیا تھا۔ کہاں وہ چندو، جس کے پیروں تلے ہتھیلیاں رکھی جاتی تھیں اور کہاں یہ چندو؛ کہ بھوکی ہے، پیاسی ہے، بیمار ہے..... دیکھنے والوں کو بھی خبر تک نہیں، پروا تک نہیں۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں بابا سے بات کرنا چاہی مگر ہر مرتبہ اُسے جواب میں خاموشی ملی۔

گانمن دن بہ دن موت کی طرف گامزن تھا۔ اس کا زخم ناسور بن گیا۔ وہ برداشت نہ کر پائی تو ریڑھی جوتنے لگی۔ سبھی نے دیکھا مگر پوچھا نہیں کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اُس کا دل اس اجنبیت اور غیریت کا عادی ہو گیا تھا تبھی اُسے بھی عجیب نہ لگا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ عمر حیات کی حویلی میں اس کے سامنے موجود تھی۔ عمر حیات نے اُسے دارے کے خاص کمرے میں بٹھایا اور پریشانی سے اس کی ہنگامی آمد کی وجہ دریافت کی۔ وہ پھٹ پڑی۔ اسے موردِ الزام ٹھہرا کر اپنے گھر کی بربادی کا نوحہ سنانے لگی۔ وہ کمال صبر سے سنتا رہا۔ اس کے خاموش ہونے پر بولا، ''میرے پاس تمہارے ہر الزام کا جواب موجود ہے مگر میں کوئی جواب دے کر تمہارا دل دکھانا نہیں چاہتا۔ بولو! میرے پاس کیوں آئی ہو؟''

وہ جی کڑا کر کے بولی، ''میرا بابا مر رہا ہے۔ اسے بچا لو۔''

وہ چونکا، ''کیا ہوا اُسے؟''

''اس کا زخم ناسور بن گیا ہے۔''

''تو میں کیا کر سکتا ہوں؟'' وہ گھبرا سا گیا، ''تم اُسے ہسپتال لے جاؤ۔ کہیں دیر نہ ہو جائے اور اس کی ٹانگ نہ کاٹنی پڑ جائے۔''

وہ تڑپ کر بولی، ''نہیں نہیں! مجھے یقین ہے کہ وہ علاج معالجے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ پر میں اُسے ہسپتال کیسے لے کر جاؤں؟''

''جیسے پہلے لے کر گئی تھیں۔'' وہ شاید اس کا مسئلہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''کیسے جاؤں؟ اَب میرے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔'' اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ جتنے پیسے لگیں گے، میں دوں گا۔ تم آج ہی اُسے لے کر شہر چلی جاؤ۔'' عمر حیات نے کہا، ''کتنے پیسے لگیں گے؟''

اسے اندازہ نہیں تھا۔ عمر حیات اُسے بٹھا کر گھر گیا۔ تھوڑی دیر بعد چند بڑے نوٹ لا کر تھماتے ہوئے بولا، ''چندو! میں تمہارا مجرم ہوں۔ شاید عمر بھر سزا بھگتتا رہوں گا۔ یہ تھوڑی سی رقم ہے۔ لے جاؤ۔ میں کل یا پرسوں ہسپتال میں اور رقم پہنچا دوں گا۔''

اس کے ہاتھوں میں نوٹ کانپنے لگے۔ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دیوانہ اُسے دارے کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر میں اماں اور سرداراں کو قائل کر رہی تھی کہ وہ اُسے بابا کو ہسپتال لے جانے کی اجازت دے دیں۔ انہوں نے کمال لاپروائی سے اجازت دے دی اور گانمن کو ریڑھی پر لٹانے میں مدد بھی کر دی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہسپتال میں تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے داخل کر لیا اور علاج شروع کر دیا۔ پہلے گانمن کو سرداراں کھانا کھلاتی تھی۔ اب اُسے موقع میسر تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے کھاتا تو تھا مگر یوں جیسے سزا کے عمل سے گزر رہا ہو۔ اس کی تکلیف میں افاقہ تو ہو گیا مگر ڈاکٹروں نے نشتر ہسپتال رجوع کرنے کا مشورہ دے کر اُسے نڈھال کر دیا۔

وہ جلد از جلد گانمن کو ملتان لے جانا چاہتی تھی مگر زادِ سفر نہیں تھا۔ بڑے ہسپتال کے اخراجات کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ ناچار دو دن عمر حیات کا انتظار کرنا پڑا۔ اسے دیکھ کر چندو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور بولی، ''میر زادے! میرے بابا کو بچا لو ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

اس نے دلاسا دیا۔ ڈاکٹرز سے رابطہ کر کے گانمن کی کیفیت دریافت کی تو اُسے پتہ چلا کہ چندو کیوں اتنی گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ وارڈ میں جانے کے بجائے گھر چلا گیا۔ چیک بک لے آیا۔ ڈاکٹرز کے بتائے گئے تخمینے کے مطابق بڑی رقم نکلوائی اور گانمن کو ایمبولینس میں ڈال کر ملتان کا

رُخ کیا۔اس کی کوششوں سے گانمن کو با آسانی ایڈمٹ کرلیا گیا وگرنہ چندو شاید یہ مرحلہ عبور نہ کر پاتی۔

وہ تین دن تک چندو اور گانمن کے ساتھ رہا پھر جب ان کی تمام تر محنت اکارت گئی اور ڈاکٹرز نے گانمن کی ٹانگ گھٹنے سے کچھ اوپر سے کاٹ پھینکی تو وہ رُک نہ پایا اور روتی ہوئی چندو کی جھولی میں کئی بڑے نوٹ پھینک کر ہسپتال سے رخصت ہو گیا۔ چندو ماہی کو اس کے جانے کے بعد احساس ہوا کہ اُسے عمر حیات کا بڑا سہارا تھا۔ مصیبت کے ان دنوں میں وہ اس کے کافی قریب بھی آ گیا تھا اور چندو پر باور کرانے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ فطرتاً برا نہیں تھا مگر جذبات کی اشتعال پرور رو میں بہک کر بُرا بن گیا تھا۔ وہ اَب بھی اس سے شادی کا خواہش مند تھا یا نہیں..... اس کی محبت کا دعویدار تھا، یا نہیں..... یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔ شاید اس نے ہسپتال کی مغموم فضا میں محبت اور خواہش کے شگوفے کھلانے معیوب سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔

جب ٹیکسی کھال پر آن رکی اور چندو بدلے ہوئے ڈیزائن کی چوبی بیساکھی تھامے اُتری، ڈرائیور کے سہارے پر ایک ٹانگ والا گانمن نظر آیا، تب سرداراں اور تاجاں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں اور وہ دوپٹوں سے بے نیاز کھال کی طرف دوڑ پڑیں۔

بڑے دنوں بعد چندو نے گانمن کی آواز سنی، ''تاجاں! رَج رَج وَین کر، تیڈا سائیں مر گیائے.....''

(تاجاں! خوب بین کرو، تمہارا سائیں مر گیا ہے۔)

عمر حیات کو اس کے گھر پہنچنے کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ گانمن کی عیادت کو پہنچ گیا۔ گانمن نے اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ چندو ماہی اس کی زیر بار تھی۔ اس سے منہ نہیں پھیر سکتی تھی مگر دل ہی دل دعا مانگ رہی تھی کہ وہ جلد چلا جائے۔ وہ کچھ دیر تک گانمن پر جھکا عیادت کرتا رہا۔ گانمن کی آنکھیں تک بھی خاموش رہیں تو ایک آہ بھر کر پلٹا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے سرگوشی میں بولا، ''چندو! مجھے کھال تک تو چھوڑ آؤ۔''

وہ اس کی بات ٹال نہ سکی۔ کھال پر پہنچ کر عمر حیات رُک گیا۔ بولا، ''دیکھو چندو! بابا کے انتقال کے بعد مجھ پر بھاری ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ تمہارا اور تمہارے گھر والوں کا رویہ بھی دل دکھاتا ہے۔ اس لئے میں بار بار نہیں آ سکتا۔ شاید دوبارہ یہاں نہ آؤں۔ تمہیں کوئی پرابلم

ہوتو پیر بخش کے ہاتھ پیغام بھیج دینا۔''

وہ ایک ذرا تردد سے بولی، ''پیر بخش.....علی بخش ماچھی کا بیٹا؟ پر وہ تو.....''

''ہاں! وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ مگر اس میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ تمہیں میلی نظر سے دیکھے یا بدنام کرے۔'' وہ وثوق سے بولا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاتھ بڑھائے۔ اسے کھینچ کر سینے سے لگالیا۔ پھر چہرہ تھام کر وارفتگی سے چوم لیا۔ اس نے پہلی بار چندو کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا اس لئے اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نہ اُس کے سایہ فگن جسم سے علیحدہ ہوئی۔

جب اسے 'بائی' کہہ کر پلٹی تو نلکے کے کھاڈے میں کولھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی تاجاں پر نظر پڑ گئی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ صحن میں پہنچی تو تاجاں نے اُسے دیکھ کر منہ بنایا، بولی، ''بس چندو! ایہا گالھ تاں میں کر یندی ہم۔''

(بس چندو! یہی تو میں کہتی تھی۔)

اس کے پاس تاجاں کے سوال نما فیصلے کا جواب نہیں تھا۔ سر جھکا کر کمرے میں چلی گئی۔ تاجاں اس کے پیچھے کمرے میں آ گئی اور طنزیہ لہجے میں گامن کو بتانے لگی۔ وہ خالی آنکھوں دیکھتا رہا جیسے کچھ بھی سن نہ رہا ہو۔ چندو چارپائی کی بانہہ سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی سنتی رہی۔ اس کا چہرہ اسپاٹ تھا۔ یوں؛ جیسے تاجاں اس کی نہیں، کسی غیر متعلق شخص کی بدخوئی کر رہی تھی۔

پہلا معمول لوٹ آیا۔ چندو ماہی صبح تا شام گامن کی چارپائی سے لگ کر بیٹھی رہتی اور کوشش کرتی رہتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح بول پڑے، مگر اس کی ہر کوشش حسبِ سابق ناکام رہی۔ تب اس کی چشمِ تصور پر چوری چھپے عمر حیات براجمان ہونے لگا۔ وہ اس کے بارے سوچنے لگی جسے سوچنا گناہ خیال کرتی تھی۔ دکھ اپنی جگہ بجا؛ کچی عمر کے سہانے سپنوں کو روکنا اس کے بس سے باہر تھا، تبھی کھلی آنکھوں دیکھتی رہی اور بند آنکھوں دیدارِ یار کرتی رہی۔

سرما کے ابتدائی دن تھے جب وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی۔ ایک سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلی۔ پیر بخش شریف والدین کا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔ گریبان کھول کر چلتا، سگریٹ کے مرغولے اُڑاتا اور کئی کئی دن گھر سے بن بتائے غائب رہتا تھا۔ اس لئے وہ اس کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی مگر میر زادے سے رابطے کی طلب میں قدم اُٹھا رہی تھی۔

پیر بخش کا ڈیرہ فرلانگ بھر کے فاصلے پر جنگل کے کنارے واقع تھا۔ قرب و جوار میں کوئی

اور گھر نہیں تھا۔ وہ دوپہر میں وہاں پہنچی۔ اُسے گھر میں اکیلا پا کر گھبرا گئی۔ اس کی ماں، تین بہنیں اور باپ نہ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔ پیر بخش نے اُسے دیکھا تو اپنے بڑے سے اصیل مرغے کو صحن میں اچھال دیا اور بھاگا آیا، ''آج میرے گھر میں یہ چاند کیسے طلوع ہو گیا؟''

وہ پھولی ہوئی سانسوں کے بیچ بولی، ''میر عمر حیات کیلئے تمہیں ایک پیغام دینے آئی ہوں۔ اسے کہنا کہ میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

وہ جلدی جلدی کہہ کر پلٹنا چاہتی تھی مگر پیر بخش لپک کر سامنے آ گیا۔ بولا، ''اوہو..... اب آ ہی گئی ہو تو کچھ دیر بیٹھو تو سہی۔ جلدی بھی کیا ہے۔''

اس کا عامیانہ انداز اُسے ایک آنکھ نہیں بھایا مگر رکنے پر مجبور ہو گئی۔ بولی، ''میر زادے کے کہنے پر تمہارے پاس آئی تھی، پیغام دے دیا، اَب جا رہی ہوں۔ اب پَرے ہٹو، جانے دو۔''

پیر بخش کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے زندگی بھر نہیں سوچا تھا کہ چندو ماہی یوں اُس کی تنہائی کے محل میں آن کھڑی ہو گی۔ اسے عمر حیات کی دوستی بھول گئی۔ اس کا دبدبہ اور اختیار فراموش ہو گیا۔ اس نے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ چیختی چلاتی ہوئی چندو کو کمرے میں کھینچ لے گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں اظہارِ محبت کرنے لگا۔ وہ اُسے دھکیلتی رہی۔ مدد کے لئے بلند آواز میں چیختی رہی مگر اس کی آواز کمرے میں چکرا کر دم توڑتی رہی۔ تبھی کوئی مدد کے لئے نہ آیا۔ عمر حیات بھی اُسے تنہائی میں لے گیا تھا مگر تب وہ اتنی خوفزدہ نہیں تھی۔ شاید تب اُسے علم نہیں تھا کہ مرد تنہائی میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔

پیر بخش توانا اور جوان مرد تھا۔ چندو کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ زیادہ دیر اُس کا مقابلہ نہیں کر پائے گی۔ اسے کسی اور طریقے سے اپنا دفاع کرنا ہو گا۔ یہ سوچتے ہی اچانک اُس نے مزاحمت ختم کر دی۔ رویہ بدل لیا اور پیر بخش کی باتوں کا حیرانی اور محبت کے ساتھ جواب دینے لگی۔ اس کی اوباشانہ چھیڑ چھاڑ سے ملنے والی مہلت میں اس ناگہانی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچنے لگی۔

وہ اسے باتوں میں لگا چکی تھی مگر قسمت کے وار سے بے خبر تھی۔ وہ جب پیر بخش کے گھر میں داخل ہو رہی تھی، اس وقت کچھ فاصلے پر کھیتوں میں کام کرنے والے چند مردوں اور عورتوں کی نظر میں آ گئی تھی۔ دیکھنے والوں میں پیر بخش کا ایک چچازاد بھائی بھی شامل تھا جو نہ صرف پیر بخش سے عناد رکھتا تھا بلکہ اُسے یہ بھی خبر تھی کہ گھر میں پیر بخش کے سوا کوئی فرد موجود

نہیں ہے۔ فاصلے کی وجہ سے وہ چندو ماہی کو پہچان تو نہیں پایا تھا مگر یہ پہچاننا ضروری نہیں تھا۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے اس نے آسمان سر پر اُٹھا دیا۔ شور سن کر دس بارہ لوگ اکٹھے ہو گئے جنہیں لے کر اس نے پیر بخش کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ جب دیہاتی چھاپہ ماروں کا وفد پیر بخش کے کمرے کے دروازے پر پہنچا، اس وقت چندو اور پیر بخش ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھے ہوئے میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔

صفائی کا موقع دیے بغیر عورتوں نے چندو کو جبکہ مردوں نے پیر بخش کو دبوچ لیا اور چند ہی لمحوں میں دونوں کو مار مار کر اَدھ موا کر دیا۔ پیر بخش کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا جبکہ چندو کو گھسیٹ کر گانمن کے سامنے لا پھینکا گیا۔ گانمن کی سرد آنکھوں میں گھر تک پہنچنے والے عزت کے جنازے کو دیکھ کر زندگی کی ہلکی سی رمق پیدا ہوئی، پھر چندو کی بنی ہوئی درگت دیکھ کر معدوم ہو گئی۔ گانمن اور تاجاں کو وسیب داروں نے بہت برا بھلا، بے غیرت بھی؛ جی کھول کر طعنے دیے اور ان کے سامنے چندو کو دو چار اور ہاتھ بھی جڑ دیے۔ گانمن سودایانہ انداز میں یہ ماجرا دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو جھرنوں کی صورت بہنے لگے۔

چونکہ اس بدنامی میں میر زادہ عمر حیات شامل نہیں تھا، اِس لئے اس خبر کو پر لگ گئے۔ شام سے پہلے آس پاس کے تمام علاقوں تک چندو کی رسوائی کا قصہ پھیل گیا۔ عمر حیات کی پوٹھوہار جیپ شام ڈھلے کھال پر آن رُکی۔ وہ جیپ سے اُتر کر دوڑتا ہوا چندو کے پاس پہنچا جو حسبِ معمول سر نیہوڑائے گانمن کی چارپائی کا پایہ تھامے ہچکیاں لے رہی تھی۔

عمر حیات نے رسمی علیک سلیک کے بغیر اُسے مخاطب کیا، ''چندو ماہی! یہ میں نے کیا سنا ہے؟'' فرطِ جوش سے اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور آواز کانپ رہی تھی۔

چندو نے سر نہیں اُٹھایا تو اس کا لہجہ مزید درشت ہو گیا۔ وہ پھٹ پڑی اور اس نے سانس لئے بغیر تمام رام کہانی کہہ سنائی۔ اسے شاید پروا نہیں رہی تھی کہ اس کی باتیں گانمن بھی سن رہا تھا۔ عمر حیات اُسے چند لمحوں تک دیکھتا رہا پھر کوئی دلاسا دیے بغیر جس طرح دندناتا ہوا آیا تھا، ویسے ہی ہوا میں اُڑتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ سیدھا پیر بخش کے گھر پہنچا۔ پیر بخش کا باپ ملا جس نے اُسے بتایا کہ لوگوں نے اس واقعے کے بعد اس کا حقہ پانی بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاہم پیر بخش کو گھر سے نکالنے پر اُسے رعایت مل سکتی تھی۔ اس لئے اس نے پیر بخش کو پیٹ کر گھر

سے نکال دیا تھا۔ وہ کہاں گیا تھا؟ اس بارے میں اُس سمیت گھر کے کسی فرد کو علم نہیں تھا۔

عمر حیات کے سینے میں یار کے دل شکن رویے پر آگ دہک رہی تھی۔ وہ گھر گیا۔ گن اُٹھائی اور ہر اُس جگہ پر گیا جہاں پیر بخش کے ملنے کا امکان تھا مگر وہ نہیں ملا۔ نصف رات کو ناکام ہو کر عمر حیات حویلی لوٹ آیا۔ اس کی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی۔ ایک مرتبہ پھر وہ چندو ماہی کے لئے باعثِ آزار ثابت ہوا تھا۔ یہی قلق اُسے مضطرب کر رہا تھا۔

وہ چندو ماہی کے عشق میں گرفتار تھا۔ اُسے بیاہنا چاہتا تھا مگر ماں آڑے آتی تھی۔ اس کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ کم عمری کی بدولت اس کے اصرار کو گھر میں سنجیدگی سے نہ لیا گیا۔ اس کی چاروں بہنوں اور ماں پر مشتمل گھرانہ ہم خیال تھا جبکہ وہ 'مس فٹ' تھا۔ بقیہ رات اُس نے جاگتے اور سوچتے گزاری۔ صبح تک وہ چندو ماہی کو بیاہ کر شہر والے مکان میں لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اس کا اپنا مکان خاصا بڑا تھا جسے اُس نے اپنے کزن کی معرفت کرایہ پر دے رکھا تھا۔ شہر پہنچ کر کزن سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ ہفتہ بھر پہلے کرایہ دار مکان چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کا ایک مسئلہ آپوں آپ حل ہو گیا۔ اس نے چابی لی اور واپسی کا قصد کیا۔ ماں کے پیر چھوئے، روایتی ادب سے مخاطب ہوا، ''اماں! اولاد گناہ کرتی ہے۔ ماں کی دعا اس کے گناہ پر پردہ ڈالتی ہے۔ میں کچھ ایسا کر گزرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ آپ کا دل دکھے گا۔ میں آپ کو بہت برا لگوں گا۔ مجھے مار لینا، برا بھلا کہہ لینا مگر کوئی بددعا نہ دینا۔''

اس کی ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ کریدتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے متفکرانہ بولی، ''تم ایسا کام کرتے ہی کیوں ہو جس پر تمہیں میری بددعا کا ڈر لاحق ہو؟''

وہ مزید جھک گیا، ''اماں! دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

''میرزادے! کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان دکھائی دیتے ہو؟''

وہ ماں کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ماں نے بہتیرا پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے مگر وہ لب بستہ رہا۔ ماں کا دل مٹھی میں آ گیا۔ آج تک بیٹا اس طرح سر جھکائے اس کے دربار میں نہیں آیا تھا۔ بولی، ''تمہارے بابا کے بعد میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے عمر..... یہ دھیان میں رکھنا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور حویلی سے نکل آیا۔ دو بجے کے قریب وہ گھنے درخت کے نیچے کھال پر کھڑا اپنے فیصلے کا از سرِ نو قلبی احاطہ کر رہا تھا۔ اپنے لانبے بال جھٹک کر پیچھے دھکیلے

اور چندو ماہی کی طرف قدم اُٹھا دیا۔ تاجاں اور سرداراں گھر میں نہیں تھیں۔ گانمن صحن میں چارپائی پر ایک ٹانگ لٹکائے بیٹھا تھا جبکہ چندو کمرے میں دبکی پڑی تھی۔ وہ سیدھا گانمن کے پاس آیا۔ چندو کا پوچھا۔ کوئی جواب نہ پا کر بولا، ''گانمن! مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تمہاری ہنستی بستی جنت کو تہس نہس کر دیا۔ میں اگر تمہاری گدھا گاڑی نہ روکتا تو میرا بابا نہ مرتا، تمہاری ٹانگ نہ کٹتی، چندو اس طرح مفت میں بدنام نہ ہوتی اور تمہارا گھر پہلے کی طرح شاد باد رہتا۔ مگر یہ سب تقدیر کا لکھا ہوا تھا، پکی سیاہی سے، جسے ہم سب سے ٹالا یا مٹایا نہیں جا سکا۔''

گانمن کا چہرہ بدستور اسپاٹ رہا۔

وہ توقف کے بعد بولا، ''جب میں مجرم ہوں تو پھر سزا مجھے ہی ملنی چاہیے، ناں کہ تمہیں یا تمہاری بیٹی کو۔ مگر مجھے دی جا سکنے والی کوئی بھی سزا ایسی نہیں جو تمہاری خوشیاں لوٹا دے۔ اس لئے میں سوچ بچار کے بعد ایک نیا ارادہ لے کر آیا ہوں۔ تمہیں، بی بی تاجاں اور دارو؛ سب کو چندو ماہی کے وجود سے نفرت ہو گئی ہے۔ ہے ناں؟ اسے دیکھنا تم لوگوں کے بس سے باہر ہے جبکہ وہ تمہیں دیکھ میں نہیں دیکھ سکتی اور نہ تمہارے بغیر زندگی کا تصور کر سکتی ہے۔ لوگوں کی نظریں اُسے زخماتی ہیں؛ بدنام جو ہو گئی ہے۔ اور میں اُس سے محبت کرتا ہوں، اس کے لئے دن رات پریشان رہتا ہوں۔ ان سب مسئلوں کو ایک ہی عمل سے حل کرنے آیا ہوں۔ چندو ماہی کو دلہن بنانے آیا ہوں۔''

گانمن کے سیاہ ہونٹ سکڑ گئے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ اُسے دیکھتا رہا جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ناقابلِ یقین دعویٰ کر رہا تھا۔

عمر حیات بولا، ''میری غلطی سے پیرو ماچھی جیسے کتے نے ماس کی بو سونگھ لی ہے۔ جب تک میرے ہاتھوں مارا نہیں جائے گا، وہ چندو کو سکھ سے نہیں رہنے دے گا۔ کوئی چندو کی طرف میلی نگاہ دیکھے، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔ اس لئے میں اُسے لینے آیا ہوں۔ اُسے بلاؤ اور میرے ساتھ روانہ کر دو..... مجھ پر احسان ہو گا تمہارا۔ بابا کی قسم! کسی دن اس احسان کا بدلا چکا دوں گا۔''

گانمن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ جانے کس وقت کمرے کے دروازے میں آن کھڑی ہونے والی چندو کی آزردہ آواز اس کے کانوں میں پڑی، ''میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ دو چار دن اور رہی تو میں بھی مر جاؤں گی، بابا کا بھی دم گھٹ جائے گا۔ بابا! لگی ونجاں؟''

(بابا! چلی جاؤں؟)

عمر حیات کا چہرہ کھل اُٹھا۔ گانمن کی گردن میں بل پڑا۔ چندو کو دیکھ کر پھنکارا، ''ہاہاوَنج..... جتھ وَنج کے اپنا مونھ کالا کر، میکوں کیا، میں تیڈا ہاں وی کون؟''

(ہاں ہاں جاؤ..... جہاں بھی جا کر اپنا منہ کالا کرو؛ مجھے کیا۔ میں تمہارا ہوں بھی کون؟)

وہ تیر کی طرح بابا کے پاس آئی۔ بڑے عرصے بعد وہ اُسے مخاطب کر کے بولا تھا۔ جھکی تو گانمن نے زوردار لات اس کے کندھے پر ماری۔ وہ پشت کے بل زمین پر گر گئی۔ سسک کر 'بابا' کہتی ہوئی اُٹھی۔ گانمن نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا، ''ناں چندو..... ہن ناں۔ بس چا کر؛ میکوں چار ڈینہہ جیون ڈے!''

(نہیں چندو! اب نہیں۔ بس کرو اور مجھے چار دن جینے دو۔)

وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ بابا کے لہجے میں اتنی نفرت گھلی ہوئی تھی کہ اس کی روح تک چھلنی ہو گئی۔ ایک ٹک دیکھتی رہی پھر ہاتھ جوڑ کر بولی، ''بابا! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں حرام کی پھوئی نہیں ہوں بابا..... تم میرے مالک ہو۔ چاہو تو روک لو۔ چاہو تو بھیج دو۔''

گانمن بولا، ''ناں چندو! میں تمہارا کوئی نہیں ہوں۔ تم جاؤ، جہاں بھی چاہو۔ خدا کے لئے لوٹ کر مت آنا۔ میرا جینا جینا نہیں، بے غیرتی کا جینا ہے اور ایسے جیون سے تو موت آ جائے، بہتر ہے۔ شالا خدا کسی غیرت والے کوں وِدھی نہ دے۔''

گانمن کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ آنکھوں سے لگاتار اشک اور ہونٹوں سے لعاب نکل کر داڑھی کو بھگونے لگا تھا۔ عمر حیات نے چندو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی جانب متوجہ کیا اور کہا، ''گانمن کو دکھی مت کرو۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ اسے چند دنوں میں قرار آ ہی جائے گا۔ چلو اب چلیں!''

یہ سب کچھ بڑا غیر فطری سا تھا کہ اس نے عمر حیات سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ اُسے کہاں لے جانا چاہتا ہے؟ جہاں لے کر جا رہا ہے وہاں اس کی حیثیت کیا ہو گی؟ اسے یوں اُدھل کر جانا چاہیے یا نہیں؟..... سب کچھ آپوں آپ، لحظہ بھر میں، طے ہو گیا اور وہ سر جھکائے گانمن کے گھر سے نکل آئی۔ پوٹھوہار جیپ میں بیٹھ کر ساکت نظروں سے اپنے گھر کو دیکھنے لگی جس میں اس کا نیم پاگل بابا رہتا تھا۔ بہت پیار کرنے والی ماں، تاجاں بی بی رہتی تھی۔ اسے شہزادی بنا کر رکھنے والی جواں سال بہن سرداراں رہتی تھی..... اس کی آنکھیں ایک دم پتھرا گئیں اور جیپ کے

اسٹارٹ ہوتے ہی اس نے سر گھٹنوں پر ڈال دیا۔

بے سامان گھر میں نیلوں بھرے چہرے والی دلہن میت کی طرح اُتری۔ چونکہ مکان میں ایک چارپائی تک نہیں تھی اور نہ ہی اس کا خیال عمر حیات کو پہلے آیا تھا گر نہ وہ بندوبست کرنے کے بعد چندو کو یہاں لاتا، اس لئے وہ اُسے کچن کی شیلف پر بٹھا کر الٹے قدموں شہر گیا۔ فوری ضرورت کا سامان اور چارپائیاں خرید کر منی ٹرک پر اُٹھالایا۔ دونوں نے مل کر ایک کمرہ اور کچن آباد کر دیا۔ عمر حیات امیر گھرانے کا اکلوتا وارث تھا۔ ماں اور بہنوں نے آج تک اُسے پانی بھی اُٹھ کر پینے نہ دیا تھا۔ تساہل پسند مزاج اور شدید ذہنی دباؤ کے باوجود آج خاصا کام کرنا پڑا تو بری طرح تھک گیا۔ چندو بھی کام کی عادی نہیں تھی۔ مستزاد کہ اُس کا جسم مضروبہ تھا۔ دل کے ساتھ ساتھ جسم کا عضو عضو دکھ رہا تھا۔ عمر حیات ہوٹل سے کھانا لانے نکلا تو وہ ہانپتی ہوئی چارپائی پر گر گئی۔

اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ گانمن کا نفرت بھرا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا اور وہ اپنے تئیں زمین میں گڑ جاتی۔ اسے کوئی مغالطہ نہیں تھا۔ کوئی شبہ نہیں تھا۔ اسے اپنے وجود کی گرانی اور گانمن کی محبتوں اور احسانات کا پوری طرح علم تھا۔ وہ باپ سے بڑھ کر باپ تھا اور دوست سے بڑھ کر دوست تھا۔ اس کے ذہن میں وہ تصویر ہمیشہ نقش رہی تھی جس میں گانمن ایک کاندھے پر مچھلیوں کا تھیلا لٹکائے، دوسرے کاندھے پر اُسے سکول بیگ سمیت اُٹھائے کھال عبور کرتے ہوئے یوں اٹک گیا تھا کہ اس کا ایک پاؤں کھال کے پچھلے بنے پر تھا تو دوسرا اگلے پر۔ کھال کی چوڑائی زیادہ تھی۔ وہ نہ آگے جا سکتا تھا، نہ اگلا قدم پیچھے ہٹا سکتا تھا۔ بجائے غصہ کرنے کے، ایک دم دل کھول کر اپنی حماقت پر ہنسنے لگا۔ اس نے جونہی سرکس کے کرتب باز کی طرح چندو کو اگلے بنے پر اُتارا، اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لہراتا ہوا مچھلیوں بھرے تھیلے سمیت کھال میں گر گیا۔ نومبر کی آخری ہفتے کی کہر زدہ رات نے کھال کے پانی کو برف کر رکھا تھا۔

وہ پانی میں گرا تو کافی دیر تک باہر ہی نہ نکل سکا اور چندو بنے پر کھڑی تالیاں بجاتی رہی، ہنستی رہی۔ اس کی کم سنی کو احساس نہیں تھا کہ اس کا باپ برفیلے پانی میں کس عذاب سے گزر رہا تھا۔

جب گانمن نے باہر نکل کر اپنے کپڑے نچوڑے اور دونوں بوجھ کندھوں پر دوبارہ لادے،

وہ تب بھی ہنس رہی تھی۔ اُسے گانمن کے بجتے ہوئے دانت اُس سے اچھے لگے تھے۔

اس نے بڑی مشکل سے سر جھٹک کر اس تصویر کو ذہن کے پردے سے ایک جانب سرکایا اور کھلے دروازے کے باہر صحن میں خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ مکان خاصا بڑا اور خوب صورت تھا۔ جھونپڑی میں بچپن اور لڑکپن گزارنے والی کے لئے کسی محل سے کم نہیں تھا مگر محل کو دیکھ کر دل میں کوئی خوشی نہیں پھوٹ رہی تھی۔ نئی منزل کا تجسس اور شوق کم تھا۔ پرانے رشتوں کے زیاں کا دُکھ کہیں زیادہ تھا۔ تبھی من ہی من میں سلگ رہی تھی۔

عمر حیات اُس کی زندگی میں اوباشانہ انداز میں داخل ہوا تھا مگر وہ بڑے باپ کا اعلیٰ ظرف بیٹا ثابت ہوا تھا۔ اس نے تمام رات اُس کی دل جوئی کی۔ اس کے جسم پر پڑے ہوئے سیاہی مائل نیلے دھبوں پر بام لگائی۔ سانجھے مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے اور دکھائے اور سب ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو چند ہی دنوں میں جوڑ دکھانے کے عزم کا اظہار کیا۔

وہ رفتہ رفتہ اس کی شخصیت کے سحر میں جکڑی گئی اور اس کا دل محبت کی لے پر دھڑکنے لگا، رقص کرنے لگا، جھومنے لگا۔ زندگی چیز ہی ایسی ہے۔ ایک کھلونا چھینتی ہے۔ دوسرا تھما دیتی ہے۔ بہلاووں کی سیڑھی پر چڑھا کر اوپر ہی اوپر کھینچتی جاتی ہے۔ عمر حیات نے اگلی صبح کورٹ میرج کرنے کا پروگرام بنایا۔ علی الصبح ناشتہ لینے نکلا تو اپنے ایک وکیل دوست کے گھر پہنچ گیا۔ اُسے مختصراً اپنے حالات سے آگاہ کر کے مشورہ طلب کیا۔

دوست متفکر ہو گیا۔ بولا، ''میر صاحب! آپ نے اس کام کو جتنا آسان سمجھا ہے، یہ اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ آپ کا تو شناختی کارڈ بن چکا ہے مگر آپ جس لڑکی سے شادی کے خواہاں ہیں، بقول آپ کے، وہ ابھی نویں کلاس میں پڑھتی ہے۔ اگر زیادہ بھی ہوئی، تب بھی اُس کی عمر سولہ سے اوپر نہیں ہوگی۔ کورٹ اسے بالغ تسلیم نہ کرتے ہوئے آپ کا کیس خارج کر دے گی۔''

وہ بری طرح گھبرا گیا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ بولا، ''پھر؟ پھر کیا کیا جائے؟ میں تو واپسی کے راستے بند کر چکا ہوں۔''

وکیل دوست سوچ میں پڑ گیا۔ کندھا تھپتھپا کر بولا، ''میں چونکہ فوجداری وکیل ہوں، اس لئے خاندانی معاملات کو زیادہ بہتر طور پر نہیں جانتا۔ فیملی کورٹ کے ایک سینئر وکیل سے آج رابطہ کروں گا۔ اس سے رہنمائی لوں گا۔ اگر کوئی صورت نکلتی دکھائی دی تو تمہیں بلا لوں گا۔ تم

گاؤں میں ہو گے یا یہیں شہر میں؟''

اس نے ملتجیانہ انداز میں بہر صورت مدد کی درخواست کی اور یہ بتا کر، کہ وہ شہر میں ہی ہے، اپنا فون نمبر نوٹ کرا دیا۔ گھر پہنچ کر چندو سے مخاطب ہوا، ''چندو ماہی! میں ایک وکیل کے پاس گیا تھا، تبھی ناشتہ لانے میں دیر ہو گئی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے وکیل سے ہونے والی بات چیت گوش گزاری۔ پھر کہا، ''مگر تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لوں گا۔''

چندو سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ساتھ پڑھنے والی کئی لڑکیوں کو والدین نے پیا گھر روانہ کر دیا تھا۔ وہ اس کی ہم عمر ہی تھیں۔ ان کی شادیاں کیسے ہو گئیں؟ اگر ان کا نکاح ہو سکتا تھا تو پھر اُس کا کیوں نہیں؟ کہیں عمر حیات اُسے چکر تو نہیں دے رہا؟..... جب اس نے اپنے تحفظات عمر حیات پر آشکار کیے تو اس نے سمجھایا، ''دیکھو چندو! ان لڑکیوں کا شرعی نکاح پڑھایا گیا تھا۔ ہم بھی شرعی نکاح کر سکتے ہیں مگر اس کے لئے تمہارے والدین کی اجازت ضروری ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ گامن کبھی بھی اجازت نہیں دے گا۔ اور کورٹ میرج کے لئے لڑکے اور لڑکی کا بالغ ہونا ضروری ہوتا ہے جبکہ قانون کی نظر میں تم بالغ نہیں ہو، خود مختار نہیں ہو۔''

''تو پھر کیا ہو گا؟'' وہ سہم گئی۔ ڈر لگنے لگا کہ عمر حیات اُسے واپس نہ بھیج دے۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی، مدد طلب مگر ڈبڈبائی آنکھوں دیکھتے ہوئے بولی، ''میرزادے! میں مر جاؤں گی مگر واپس نہیں جاؤں گی۔ وہاں میرا دل پھٹنے کو آ جاتا ہے۔ بابا کی نظریں مجھے زندہ درگور کر دیتی ہیں۔ میں اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔''

اس نے اپنے وکیل دوست کی کال کا انتظار نہیں کیا اور نئے عزم سے کچہری روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے دوست کو چیمبر سے پکڑ کر فیملی افیئرز کو ڈیل کرنے والے وکیل کے پاس لے گیا۔ براہِ راست ملنے اور بالواسطہ ملنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ خاندانی معاملات میں شہرت رکھنے والا وکیل اصغر گیلانی خاصا بوڑھا اور مہنگا تھا۔ اس نے پہلے فیس طے کی، دو ہزار بیعانہ جیب میں ڈالا پھر اُسے قانونی طور پر محفوظ راستہ دکھانے لگا۔ سیدھا راستہ لمبا اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ شارٹ کٹ آسان ہوتا ہے۔ دل کو لگتا ہے۔ تبھی اس کے دل کو اطمینان ہوا جب اصغر گیلانی نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، ''نوجوان! بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ دو چار دن لگیں گے مگر کام ہو جائے گا۔ بالکل جینوئن.....''

وہ کچہری سے نکل کر متصلہ بازار میں گھس گیا۔ اپنی چندو ماہی کے لئے جی بھر کے شاپنگ

کی۔ چار بہنوں کے بیچ زندگی گزری تھی۔ لڑکیوں کے استعمال کی ایک ایک چیز سے آگاہ تھا۔ اس نے نوع نوع کے پیکٹوں اور شاپروں سے لدی پھندی پوٹھوہار جیپ صحن میں کار پارکنگ کے لئے مخصوص فرش پر کھڑی کی، چندو کو آواز دی اور اُسے گدھے کی طرح لاد دیا۔ اس کی حیرت دیدنی تھی۔ کمرے میں لے جا کر سامان کھولتے ہوئے کبھی مسکرانے لگتی تو کبھی شرما کر آنکھیں چرانے لگتی۔ چارپائی کے پائے پر پاؤں رکھے، پورے قد کے ساتھ سر پر کھڑا عمر حیات اس کے گل نار چہرے کے لحظہ لحظہ بدلتے ہوئے تاثرات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے چند چیزیں ڈبوں کے نیچے چھپائیں تو وہ ہنس پڑا، ''چندو! اتنی جلدی تم بھول گئیں کہ یہ سامان میں خرید کر لایا ہوں؟''

وہ شرم سے لال ہو گئی۔ قوس قزح کے شوخ رنگوں نے عمر حیات کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس پر جھک گیا۔ قریب آ کر اجازت کا طلب گار ہوا۔ آنکھیں سوال کرنے لگیں تو آنکھوں کو ہی جواب دینا پڑتا تھا۔ چندو کی زبان نے انکار کیا مگر آنکھوں نے اپنے دیوانے کو مدعو کر لیا۔ محبت کا چلن ایسا ہی ہوتا ہے۔ محبت کے والہانہ اظہار کا لمحہ چرانا پڑتا ہے، کبھی چھیننا تو کبھی بھکاری بن کر مانگنا پڑتا ہے۔ شب بھر پر محیط رومانوی پیرایوں نے اتنا اعتماد نہیں دیا تھا، جتنا ایک خاموش لمحے نے سونپ دیا تھا۔

''تم اپنے لئے کچھ نہیں لائے؟''

عمر حیات بولا، ''ساری عمر اپنے لئے خریدتا رہا مگر اتنی خوشی نہ ہوئی جتنی آج ہوئی۔ میں شام کو گھر جاؤں گا۔ واپسی پر اپنا سامان اُٹھا لاؤں گا۔''

''میں اکیلی رہوں گی؟'' اس کی آنکھوں میں واہمے سرسرا گئے۔

''گھنٹہ بھر کے لئے جاؤں گا۔ جیسے کچہری میں گیا تھا۔''

''بی بی سائین کو میرے بارے بتاؤ گے؟''

''نہیں..... مگر مناسب وقت آنے پر ضرور بتاؤں گا۔''

''وہ وقت کب آئے گا؟''

عمر حیات نے کھلنڈرے انداز میں دونوں ہاتھ ہاتھ کنگھی بنا کر ایک دوجے میں پھنسائے، جھولے کی طرح دو تین بار جھلائے اور شرارت سے ہنسنے لگا۔

وہ چندو کو اس گھڑی بہت بھایا۔ ایک ٹک دیکھے گئی، پھر سر جھکا کر بولی، ''وقت ایک جیسا

نہیں رہتا مگر پھر بھی دل بعض اوقات کیوں چاہنے لگتا ہے کہ زندگی کا سارا وقت اِس جیسا ہو جائے یا یہیں ٹھہر جائے۔''

اس نے چندو کا ہاتھ تھام لیا۔ چوما۔ کہا، ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں دنیا بھر کی خوشیاں تمہاری جھولی میں لا کر ڈالتا رہوں گا۔ تمہیں اتنا پیار دوں گا کہ تم میرے سوا ہر کسی کو بھلا دو گی۔''

اس کے دل نے 'آمین' کہا۔ دماغ نے فوراً ہی پینترا بدل لیا، پوچھا، 'اے چندو! کیا تم اپنے بابا کو بھی بھلا دو گی؟'

اپنے اندر اُٹھنے والے سوال پر اس کا سر بے اختیار انہ نفی میں ہلا۔

عمر حیات نے سمجھا کہ انکار اُس کی بات پر ہوا، اس لئے جھٹ سے بولا، ''کیا مطلب؟ کیا تمہیں میری کہی ہوئی بات پر یقین نہیں ہے؟''

وہ جلدی سے بولی، ''نہیں، نہیں! یہ بات نہیں تھی۔ دراصل میں کچھ اور سوچنے لگ گئی تھی۔''

اس کا تذبذب، مدافعانہ عجلت اور بے ساختگی عمر حیات کے دل میں اُتر گئی۔ اس کی آنکھ نے انکھیلی کی، 'دیکھا! میں نہ کہتی تھی کہ چندو سے پیاری لڑکی دنیا میں کوئی نہیں۔'

دل نے بھی باغیانہ توثیق کر دی، 'ہاں! میں بے سبب 'چندو چندو' کا ورد تو نہیں کرتا تھا ناں! یہ دنیا سے مختلف ہے، تبھی!'

کوئی مختلف ہوتا ہے؟..... شاید دیکھنے والی نظر 'مختلف' کو مختلف زاویے سے دیکھتی ہے اور اسے دنیا کا مکمل حسن قرار دے کر جھومنے لگتی ہے۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر جھومنے لگے۔ دکھ کا دورانیہ طویل ہوتا ہے۔ خوشی کا مختصر۔ بڑی محنت اور باغیانہ جستجو کے بعد ان کی بچھائی ہوئی خوشی کی بساط اچانک سمٹ گئی۔ صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نہ وہ جانتا تھا، کہ آنے والا کون تھا، نہ ہی وہ جانتی تھی۔ آنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ پھر چاپ دروازے پر آن تھمی۔ دونوں کی نظریں پہلے ہی کھلے دروازے پر ثبت تھیں۔

دروازے میں آنے والے کا چہرے دیکھ کر چندو ماہی کے بدن کا تمام تر خون نچڑ کر آنکھوں میں آ گیا اور وہ ایک جھٹکے سے چارپائی سے اُتر گئی۔ اس کی گود میں پڑے ہوئے دو اَدھ کھلے پیکٹ فرش پر گر گئے۔

وہ چہرہ خوفناک تھا، نہ بدصورت؛ مگر اس کی دہشت سے چندو ماہی کا جسم لرزنے لگا تھا۔ عمر حیات کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا تھا۔ ہکلا کر بولا، ''ببب..... بی بی اماں آپ؟''

اس کی فربہی مائل ماں کولھوں پر ہاتھ رکھے، غیظ وغضب سے سرخ چہرہ لیے خشمگیں نظروں سے چندو ماہی کو گھور رہی تھی۔ اس کے عقب میں عمر حیات کی دو بڑی بہنیں جھانک رہی تھیں۔ ان کا انداز بھی خاصا جارحانہ تھا۔ ماں کے لب کشا ہوئے تو اس کے اندر کا دُکھ، افسوس اور غصہ چھلک گیا، بولی، ''عمر حیات! میں نے کہا تھا ناں کہ میں تمہارے بابا کے بعد کوئی دکھ دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم بددعا نہ دینے کا وعدہ لے کر خاندان کا منہ کالا کرنے نکل کھڑے ہوئے۔''

ماں نے کمرے کے اندر قدم رکھا۔ عمر حیات چارپائیوں کے بیچ سے گزر کر تیزی سے ماں اور چندو کے بیچ حائل ہو گیا۔ بولا، ''امّاں! آپ گھر چلیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔''

ماں کے عقب سے بڑی بہن طنز سے بھرپور لہجے میں بولی، ''ہاں بی بی امّاں! لاڈلے کی بات مان لیں۔ بے چارہ کتنی محنت سے چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔''

وہ جلدی سے بولا، ''نہیں باجی! میں چکر نہیں دے رہا۔ تم امّاں کو لے کر گھر جاؤ۔ میں شام کو حویلی آؤں گا۔''

ماں نے اُسے دھکا دے کر ایک جانب ہٹایا اور چندو تک پہنچ گئی۔ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچ کر دبی آواز میں چیخی، ''کم ذات! اس وقت تو تُو کہہ رہی تھی کہ 'بی بی سائین! اپنے بیٹے کو سمجھائیں، وہ خاندان کی کسی لڑکی سے شادی کر لے۔ ہیں؟ پھر اَب کیا لینے کیلئے یہاں آئی ہے؟''

چندو نے ہونٹ بھینچ کر درد برداشت کیا اور مدد طلب نظروں سے عمر حیات کو دیکھا۔ وہ جلدی سے قریب آ گیا۔ ماں کا ہاتھ تھام کر ملتجیانہ انداز میں بولا، ''بی بی امّاں! اِس بے چاری کو چھوڑ دیجئے۔ اس کا کوئی قصور نہیں، میں اِسے یہاں لایا ہوں۔''

بیٹے نے پہلی مرتبہ احتجاجاً ماں کا ہاتھ تھاما تھا۔ گرفت اجنبی سی لگی۔ حیرت بھری برہمی سے دیکھنے لگی، بولی، ''میرا ہاتھ چھوڑ دو ورنہ تم پر اُٹھ جائے گا۔''

وہ ماں کی نافرمانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی پناہ گزین کا استحصال بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ تبھی آنکھوں میں التجا بھر کر ماں کو ایک ٹک دیکھنے لگا۔ آنکھوں سے سمجھانے لگا کہ وہ مصیبت میں ہے۔ بیٹے کی مصیبت کو ماں کے علاوہ کون سمجھ سکتا تھا۔ سمجھ گئی۔ آہستہ آہستہ مٹھی کھولنے لگی۔ بیٹے کو شکست خوردہ انداز میں دیکھنے لگی۔ بولی، ''تم نے اچھا نہیں کیا۔''

بڑی بہن نے فرش پر تھوکا، ''ایک گندی لڑکی کی خاطر تم نے اپنی ماں کا ہاتھ تھاما۔ تف ہے تم پر!''

دوسری نے ہونٹ نفرت سے سکیڑے، ''اگر آج بابا زندہ ہوتے تو تمہیں زندہ نہ

چھوڑتے۔''

وہ آنکھیں جھپکے بغیر بولا، ''بی بی! میں نے واقعی اچھا نہیں کیا۔ مگر آپ نے بھی اچھا نہیں کیا جو یہاں تک چلی آئیں۔ بیٹے کے جرم کو دیکھے بغیر پردہ ڈال دیتیں تو آپ کا ہاتھ تھامنے کی گستاخی سے بچ جاتا۔''

ماں بیٹے کو جنتی ہے۔ پہلی نظر دیکھتی ہے تو پھر جیتنا بھول جاتی ہے۔ ہارنا سیکھ جاتی ہے۔ وہ بھی ہار گئی۔ بے جان انداز میں ہاتھ چھڑا کر ہانپتی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سر جھک گیا۔ عمر حیات کی دونوں بہنیں کولھوں پر ہاتھ رکھے نفرت سے عمر اور چندو کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ دونوں مجرم تھے۔ تبھی سر جھکائے کھڑے تھے۔ بی بی اماں بولی، ''میرزادے! آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ سلطنت ہاتھ سے نکل جاتی ہے جب سائیں رخصت ہو جاتا ہے۔ بیٹا بہت کچھ ہوتا ہے پر ماں کا مان نہیں ہوتا۔ تم بھی نہیں ہو۔ اب مجھے وہ پٹی پڑھاؤ جو اس حرام کی پھوئی کی خاطر پڑھانا چاہتے ہو تا کہ میں بے وقوف بن کر یہاں سے چلی جاؤں۔ خالی جھولی لیے۔''

چندو زمین میں گڑ گئی۔ عمر حیات کی طرف دیکھ کر بولی، ''اس سے بہتر تھا کہ آپ نے بی بی سائین کا ہاتھ نہ تھاما ہوتا۔''

اُس نے ترحم طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔ کن اکھیوں سے چندو کو دیکھا پھر ماں کے قدموں میں جھک گیا۔ دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ملتجیانہ انداز میں بولا، ''بی بی اماں! آپ اِسے دوبارہ یہ طعنہ نہیں دیں گی ورنہ میں آپ کی زندگی سے بہت دور چلا جاؤں گا۔''

ماں کو اچنبھا نہیں ہوا۔ نوخیز عشق یہی دھمکی دے سکتا تھا۔ آزردگی سے مسکرائی، بولی، ''ہاں بیٹا! ایک یہی دکھ باقی ہے جو تم نے آج نہیں دیا۔ کل دے دو گے۔ ٹھیک ہے۔ یہ بھی جھیل لوں گی۔''

اس نے ماں کے طعنے کو نظر انداز کیا، بولا، ''بی بی اماں! اگر آپ شام تک کا انتظار نہیں کر سکتیں تو ان دونوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیں۔ میں ابھی ساری بات بتا دیتا ہوں۔''

بی بی نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ وہ نفرت بھری نگاہ چندو پر ڈال کر صحن میں چلی گئیں۔ عمر حیات نے اپنا سر ماں کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور ٹیپ پلیئر کی طرح بولنے لگا۔ پہلی نظر سے آخری واردات تک اُس نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ خاموش ہونے سے پہلے بولا، ''بی بی! بابا کہتے تھے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ کے اوپر ہوتا ہے۔ ظرف والا کبھی کم ظرفوں کی قطار میں نہیں کھڑا ہوتا۔ میں اُسی بابا کا خون ہوں۔ میں نے نادانی میں ایک جرم کیا جس کی پاداش

میں گانمن کا گھر تباہ ہو گیا۔ میرا بابا روٹھ گیا۔ میں مجرم ہوں۔ مجرم کو اپنی سزا خود ہی تجویز کر لینی چاہیے اور قبول بھی۔ یہی بابا نے سمجھایا تھا مجھے..... میں چندو ماہی کا مجرم ہوں۔ یہ بولتی نہیں ہے۔ میں سچ کہنے ڈرتا نہیں ہوں۔ سچ کہتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کیلئے عمر قید کی سزا تجویز کر لی ہے۔ میں نے چندو ماہی کو اپنی دلھن بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ دیں گی، دعاؤں کا ساتھ دے دیں گی تو میں کبھی نہیں مروں گا۔ اگر ہاتھ کھینچ لیں گی تو نہ صرف زندگی بلکہ میری سزا کا دورانیہ بھی کم ہو جائے گا اور میں وقت سے پہلے مر جاؤں گا۔''

ماں تڑپ کر رہ گئی۔ چندو کو بہ نظرِ غور دیکھنے لگی۔ بیٹے کے بال مٹھی میں بھر کر جھٹکے دینے لگی۔ بولی، ''فیصلہ کرتے ہوئے تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ تم کتنے بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ اس چھوہر (لڑکی) کا آگا پیچھا خالی ہے۔ بیاہ کر حویلی میں جائے گی تو ہر کوئی ہم پر تھوتھو کرے گا۔ رشتہ دار حویلی میں قدم نہیں رکھیں گے۔ کیا زمانے سے کٹ کر زندگی گزاری جا سکتی ہے؟''

وہ عزم سے بولا، ''اگر میں اس لیے بڑا گنا جاتا ہوں کہ میرا باپ بڑا تھا تو کیا چندو میرے نام سے بڑی نہیں ہو جائے گی؟''

''نہیں بیٹا! نام و نسب اور شادی میں بڑا فرق ہے۔''

بیٹا اَڑ گیا، ''نسب تو نسبت کا عنوان ہے۔ جب چندو میری نسبت سے دیکھی جائے گی تو حویلی کی سائین قرار پائے گی۔ تب کون انگلی اُٹھائے گا۔''

''پورا وسیب جانتا ہے کہ چندو بن باپ کی چھوہر ہے۔ اس بات کو چھپایا نہیں جا سکتا۔''

''بی بی اماں! انصاف کرو۔ کیا چندو کو اس جرم کی سزا دی جا سکتی ہے جو اس نے کیا ہی نہیں؟''

''انصاف خدا کرتا ہے۔ کیا گونگا یا بہرہ پیدا ہونے والا بچہ از خود ادھورا ہوتا ہے؟..... تمام عمر معذوری کی سزا تو اُسے جھیلنا ہی پڑتی ہے۔ اِس کو بھی ساری عمر یہ طعنہ جھیلنا ہے۔''

''اگر یہ حویلی میں نہیں جا سکتی تو میں اِسے کہیں اور لے جاتا ہوں جہاں اس کے ماضی پر لاعلمی کا پردہ پڑ جائے گا۔ جہاں اِسے رہنے کی اجازت مل جائے گی، میں وہیں حویلی بنا لوں گا۔ تب تو آپ کو گلہ نہیں ہو گا ناں؟''

''کیا ماں اور چار بہنوں کو چھوڑ دو گے؟'' ماں کی آنکھیں استعجاب آمیز دکھ سے پھیل گئیں۔

''نہیں..... میں سب کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''ایک لڑکی کیلئے وسیب چھوڑ دو گے؟''

''وسیب تو کیا..... اماں! میں ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ کو میری بات کی سمجھ کیوں نہیں آ رہی۔'' اس کے لہجے میں عجیب عزم آمیز بے بسی رچ گئی۔ ماں کو اُمید بار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا، ''بی بی! کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ مجھے گھر سے نکال دیں، ماریں، پیٹیں، جو چاہیں، میرے ساتھ کریں؛ آپ کو حق ہے..... مگر خدا کیلئے! مجھ پر دعا کا دروازہ بند نہ کریں۔''

ماں کا دل پسیج گیا۔ اُسے کھینچ کر چھاتی میں چھپاتے ہوئے بولی، ''میرا دنیا میں تمھارے سوا کوئی نہیں ہے۔ میر صاحب زندہ ہوتے تو مجھے کوئی فکر نہ تھا۔ اب پتہ گرے تو دل خوف سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اگر تم نے چندو کو ہی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں اس فیصلے کو قبول کرنے کا اعلان کرتی ہوں مگر تم دونوں کو میری ایک بات ماننا ہوگی۔ بولو..... منظور ہے؟''

دونوں نے یکبارگی اثبات میں سر ہلایا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی، ''نہیں..... ایسے نہیں۔ منہ سے اقرار کرو۔''

دونوں نے بیک وقت کہا، ''منظور ہے۔''

ماں نے تین مرتبہ اقرار لیا۔ پھر کہا، ''میرا حکم یہ ہے کہ تمہاری شادی تین چار سال بعد ہوگی۔ میں چاہتی ہوں کہ میری بہو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ میچور ہو۔''

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ عمر بولا، ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''میں وہی کہہ رہی ہوں جو اس موقع پر موزوں ترین ہے۔ دیکھو بیٹا! سیانے کہتے ہیں کہ پھل موسم کا اور شادی جوانی کی اچھی لگتی ہے۔ تم دونوں کم عمر ہو۔ شادی کے قابل نہیں ہو۔ چندو ماہی گریجویشن کر لے، تب میں اپنے ہاتھوں بڑی دھوم دھام سے تمہاری شادی کروں گی۔''

عمر نے سوچا۔ چندو کے گریجویشن کرنے میں پانچ سال کا عرصہ حائل تھا۔ عشق کی سولی پر چڑھ کر اتنا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کن اکھیوں سے چندو کو دیکھا۔ اُس نے آنکھوں کے اشارے سے سمجھایا کہ بی بی کا کہنا مان لو۔ وہ بولا، ''آپ شاید بھول گئی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ چندو ماہی کو واپس نہیں بھیجا جا سکتا۔ گامن نے اس پر اپنا دروازہ بند کر دیا ہے۔''

بی بی اماں بولی، ''تو کیا ہوا؟ یہ واپس نہیں جائے گی۔ میں اسے اپنی حویلی میں لے جاؤں گی۔ میٹرک کے بعد کالج میں داخل کراؤں گی۔ اس کی خواہش ہوئی تو ملتان میں بھی رہ سکتی ہے۔ پڑھنے کے بعد پھر حویلی کی رانی بنا کر لے آؤں گی۔ تب تک لوگوں کی حیرانی بھی کمزور ہو چکی ہوگی۔''

عمر نے انکار کیا۔ لمبی سانس لے کر بولا، ''نہیں بی بی! آپ مجھے دھوکہ دے رہی ہیں۔ وقت لے رہی ہیں تاکہ میرے سر سے چندو کے عشق کا بھوت اُتار سکیں۔ یہاں آپ غلطی پر ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ایسا ہی سہی۔ محبت وقت کی محتاج نہیں ہوتی۔ تم مجھ پر اپنی محبت کی سچائی ثابت کرو۔ انتظار کی طاقت سے میرے دھوکے کا توڑ کرو۔''

''نہیں بی بی! یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔''

''تم نے میری بات منظور کرنے کا تین مرتبہ اقرار کیا ہے۔ پاؤں پر مکر گئے ہو۔ الٹا مجھے دھوکے باز کہہ رہے ہو۔'' ماں کے لہجے میں گہری کاٹ چھپی تھی۔

''دل کو آپ پر یقین نہیں آ رہا۔''

''نہ کرو۔ اپنی محبت پر یقین کر کے چندو کو حویلی میں لے چلو۔ اگر تم چار پانچ سال بعد بھی چندو سے محبت کا دعویٰ کرو گے تو تمہیں کوئی روک نہیں پائے گا۔ ہم بالکل ایسے ہی لاچار ہوں گے؛ جیسے آج ہم سب تمہارے فیصلے کے سامنے بے بس ہیں۔'' بی بی اماں نے اُس کی محبت کو للکارا اور کہا، ''دیکھو بیٹے! کیا تم نہیں چاہو گے کہ تمہاری بیوی پڑھی لکھی ہو۔ کچے سونے کے بجائے کندن ہو۔ یقیناً اپنی محبت کو ہر مرد خوبصورت اور معتبر دیکھنا چاہتا ہے۔ میرا بھی ارمان ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ لڑکی میری بہو بنے جسے زمانہ رُک کر دیکھنے پر مجبور ہو اور میر زادی کہہ کر پکارتے ہوئے کسی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نہ ہو۔''

چندو نے پہلی مرتبہ زبان کھولی، ''میکوں منظور ہے۔''

(مجھے منظور ہے۔)

بی بی نے اُسے خوشی اور مان سے دیکھا۔ بولی، ''یہ ہوئی ناں عقل مندی کی بات..... اَب اپنے دیوانے کو بھی سمجھاؤ کہ میری بات مان لے۔ تین قول دے کر مکرنے والے کو خدا بھی معاف نہیں کرتا۔''

چندو ماہی کی ملتمس نظریں اپنے دیوانے پر اُٹھیں۔ چند لمحے ایک ٹک دیکھتی رہی، پھر بولی، ''بی بی سائین کی بات مان جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔''

اُس کے چہرے پر تذبذب رقم ہو گیا۔ چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر بولا، ''جن پتوں پر تکیہ ہو، وہی ہوا دینے لگیں تو پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے بی بی اماں! میں آپ پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کی بات مان لیتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر

میری چندو ماہی کے ساتھ کوئی زیادتی کی گئی تو میں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہوں گا۔''

ماں نے ایک نظر اپنی سرخی مائل کلائی کو دیکھا جس پر بیٹے کی مضبوط گرفت ثبت ہو گئی تھی۔ اسی گرفت نے سمجھا دیا تھا کہ سختی کرو گی تو شیشے کو توڑ بیٹھو گی۔ تبھی وہ پینترا بدلنے پر مجبور ہوئی تھی۔ مسکرا کر بولی، ''وہ محبت نہیں، جرم ہے جو دو گھروں کو برباد اور بدنام کر دے۔ وہ بے حیائی ہوتی ہے۔ میر ظفر حیات کے خون میں ایسی محبت نہیں پل سکتی۔ یہ مجھے یقین تھا۔ اِسی یقین کی لاٹھی ٹیکتے ہوئے حویلی جا رہی ہوں۔ تم دونوں کو شام تک سوچنے کی مہلت دیتی ہوں۔ اکیلے بیٹھو گے تو میری بات سمجھ میں آ جائے گی۔ اگر تم لوگ خاندان کو بدنامی اور رسوائی سے بچانا چاہو تو حویلی آ جانا ورنہ جہاں جی چاہے، چلے جانا۔ میں چند دن رو دھو کر صبر کر لوں گی۔ عمر حیات! تمہاری بہنیں بھی سوچ لیں گی کہ اُن کا کوئی بھائی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اَب میں چلتی ہوں۔''

ماں بیٹے کو گنوانے نہیں، لینے کیلئے آئی تھی مگر چندو کی جھولی میں ڈال کر جانے لگی تھی۔ چندو اُس کے قدموں میں جھک گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی، ''بی بی سائین! آپ جو کہیں گی، ہم وہی کریں گے۔

بی بی نے پیروں میں بیٹھی ہوئی چندو کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ دیکھا۔ وہی تھی جو کبھی آنکھوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔ وہی تھی جس کی تعریفیں آپوں آپ ہی اس کے لبوں سے پھوٹنے لگتی تھیں۔ اُسے یاد آ گیا کہ ایک مرتبہ اُس نے میر ظفر حیات سے کہا تھا، ''میر صاحب! اگر ممکن ہو تو آپ گامن سے چندو ماہی گود لے لیں۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ جہاں میری چار بیٹیاں ہیں، وہیں اُسے پانچویں سمجھ لوں گی۔''

میر صاحب نے ہنس کر کہا تھا، ''تم نے گامن کی محبت کو محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ ایسی بات تمہارے لبوں پر نہ آتی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ کتنے لاڈ اور شوق سے اپنی چندو کو کاندھے پر بٹھائے سکول لے جا رہا تھا۔ پھر واپسی پر میں نے تمہیں دکھایا تھا کہ گامن کس طرح بے وقوفوں کی طرح ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر سکول کی چار دیواری کے اوپر سے اپنی چندو کو پڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہیں؟ کملی نہ بنو۔''

''میر صاحب! وہ وہاں رُل جائے گی۔ میں اُسے حویلی میں رانی بنا کر رکھوں گی۔ بہت پڑھاؤں گی۔''

میر صاحب نے سمجھایا تھا، ''نہیں! تم اُسے اچھا ماحول دے سکتی ہو، زمانے بھر کی نعمتیں

دے سکتی ہو مگر وہ پیار نہیں دے سکتیں جو گانمن اُس پر نچھاور کر رہا ہے۔''

وہی چندو ماہی اُس کے سامنے آنسوؤں سے دھلا ہوا چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اُس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ گالوں پر ہاتھ رکھے، پیشانی چومی اور بے اختیار سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے بالوں کو درشتی سے پکڑ کر کھینچنا چاہا تھا تو بیٹا حائل ہو گیا تھا۔ اَب پیار سے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی تو بیٹے کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ دنیا ایسے ہی پل پل بدلتی ہے۔ کبھی اُٹھا کر پستی میں پٹخ دیتی ہے۔ کبھی پلکوں پر بٹھا کر عرش نشین کر دیتی ہے۔ فلک کی بلندیاں چھونے والی چندو ماہی نے کہا، ''بی بی سائین! میری جان بھی آپ کیلئے حاضر ہے۔''

عمر حیات نے اپنا چہرہ ماں کے دوسرے شانے پر رکھ دیا، ''اماں! مجھے یقین تھا کہ ساری دنیا بھلے میری دشمن ہو جائے، آپ میرا ساتھ دیں گی۔''

بی بی نے دونوں کو پیار کر کے آہستگی سے علیحدہ کیا اور شام تک گھر پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے صحن کا رُخ کیا جہاں عمر کی بہنیں چہل قدمی کرتے تھک کر ایک جانب بیٹھ کر محوِ گفتگو ہو گئیں تھیں۔ ماں کمرے سے اکیلی نکلی تو دونوں کا دل ہول اُٹھا۔ بھاگ کر قریب آئیں۔ فکر سے پوچھنے لگیں۔ ماں کے چہرے پر شکست تحریر تھی مگر زبان 'سب ٹھیک ہے' کا راگ الاپ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ماں کے پیچھے چل پڑیں۔

عمر حیات نے سکھ کی سانس لی۔ چندو کو چارپائی پر بٹھا کر بولا، ''فکر نہ کرو۔ میں ہوں ناں!''

اس نے سر ہلایا۔ بیٹھ کر بے دھیانی میں ڈبوں سے کھیلنے لگی۔ وہ بولا، ''چندو ماہی! بی بی اماں دل کی بُری نہیں۔ وہ کیا ہے کہ اولاد بغاوت پر اُتر آئے تو سبھی والدین کو غصہ آتا ہے۔ اُتر بھی جاتا ہے۔ گانمن بھی ایک دن سب کچھ بھول کر تمہیں یاد کرنے بیٹھ جائے گا۔''

کسی کی نظروں میں گرنا اور بے توقیر ہونا چندو ماہی کیلئے نئی بات نہیں تھی۔ سر ہلا کر بولی، ''میں سمجھتی ہوں۔''

''تم میرے ساتھ حویلی میں رہو گی۔ پڑھنے کیلئے میری بہنوں کے ساتھ روزانہ شہر آیا کرو گی۔ میری ایک بہن ملتان میں پڑھتی ہے۔ میں دیکھوں گا، اگر میرے گھر والوں کا رویہ نامناسب ہوا تو تمہیں اس کے پاس ملتان بھیج دوں گا۔ اگر اس نے تعاون نہ کیا تو میں تمہاری علیحدہ رہائش اور تعلیم کا مناسب بندوبست کر دوں گا۔ ٹھیک ہے؟''

اس نے عمر حیات کو بھرپور انداز میں دیکھا۔ لفظ لفظ سچائی آمیز تھا۔ اس کی محبت پر فخر کا

حساس ہوا۔ بولی، ''تم میرے ساتھ ہو گے، جانتی ہوں مگر نہ جانے کیوں دل میں ڈر سا بیٹھا ہوا ہے۔ میں حویلی کو اپنا گھر سمجھوں گی۔ ویسے ہی، جیسے بابا کے گھر کو سمجھتی تھی مگر..... مگر کہیں یہ نہ ہو کہ مجھے پھر دھتکار کر نکال دیا جائے۔''

عمر حیات نے اُس کا ہاتھ تھاما۔ چوما۔ محبت پیش رفت کا سبق سکھاتی ہے۔ آگے بڑھا۔ اُس کے چہرے کو ہاتھوں میں بھر کر وارفتگی سے بولا، ''میری محبت پر بھلے یقین نہ رکھو مگر اپنے چاند جیسے چہرے پر بھروسہ رکھو۔ اپنی آنکھوں پر یقین رکھو۔ ان کا شکار ہونے والا عمر حیات کبھی آزاد نہیں ہو پائے گا۔ اپنی ہر پرواز کے اختتام پر ستانے کیلئے اسی تاج محل کا رُخ کرے گا۔''

وہ عمر حیات کی گرفت سے نکلنا چاہتی تھی۔ دل کم بخت اس کے لمس کو سراہنے لگا تھا۔ شش و پنج میں مبتلا ہو کر ساکت کھڑی اپنے وجیہہ دیوانے کو دیکھتی رہی۔ اس نے ماتھے پر بل کھا کر جھکی زلفوں کی لٹ کو چوما؛ بالوں میں جان پڑ گئی۔ دیوانے نے بند پلکوں پر اپنی دیوانگی بڑی نرمی سے ثبت کی؛ آنکھیں زندہ ہو گئیں۔ وہ ٹوٹ کر توڑنے والے کے سینے سے لگ گئی۔ لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ یوں جیسے بدن کی جان سانسوں کی سیڑھی چڑھ کر ایک دم بلند ہونے لگی ہو۔

عمر حیات نے جذبات سے مغلوب آواز میں سمجھایا، ''چندو! تمہیں دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے جدا نہیں کر سکتی.....''

اُس نے بات اُچک لی۔ شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی، ''خدا بھی نہیں؟''

وہ ٹھٹک کر سوچ میں پڑ گیا۔ بھلے چندو کا سوال شرارت پر مبنی تھا، مگر سوچ کے کئی در کھول رہا تھا۔ اس نے خدا کے بارے بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا۔ بن دیکھے یقین کی دولت حاصل کر چکا تھا۔ جانتا تھا کہ خدا کے حکم کے مقابل میں اُس کی ہستی بہت کمزور تھی مگر چندو ماہی کی شرارت بھری آنکھوں کے وار کو روکنا ضروری تھا۔ بولا، ''خدا سب کچھ کر سکتا ہے مگر تم نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اگر اُس نے مجھ سے میری چندو ماہی کو چھیننا ہوتا تو میرے دل میں عشق کی رمق کیوں پیدا کرتا؟''

جواب بڑا توانا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے ٹھوڑی کو انگلی کے سہارے پر اُٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا، ''بس؟..... مجھے یقین ہے کہ خدا نے میرے دل میں تمہاری محبت اِس لیے پیدا کی ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ تمہاری تعریف کو پسند کرتا ہے۔ بی بی اماں نے ٹھیک کہا ہے کہ ابھی ہماری شادی کی عمر نہیں ہے۔ بس! تھوڑا سا انتظار؛ میری جان! ادھر تم

گریجویشن کرو گی، ادھر حویلی میں تو تیاں بجنے لگیں گی۔''

توتی شادی پر بجتی ہے۔ خوابیدہ رات کے سناٹے میں جان ڈال دیتی ہے اور جہاں تک اس کی آواز جاتی ہے، رات بیدار ہوتی جاتی ہے۔ چندو کے دل کے تار بھی آنِ واحد میں بج اُٹھے۔ شرم سے چہرہ تمتما گیا۔ بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی مگر بول نہ پائی اور عجیب نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

وہ دل کے بل پر بولا، ''چندو! آئی لو یو!''

وہ خاموش رہی۔

''جب چاہنے والا 'آئی لو یو' کہے تو اس کے دل کو زندگی دینے کیلئے یہی جملہ دہرانا پڑتا ہے۔ کیا تمہیں اتنی سی بات کا بھی علم نہیں ہے؟''

وہ ہولے سے بولی، گویا گنگنائی، ''آئی لو یو!''

محبت کا یہ نامکمل اظہار کارِ عشق میں نئی توانائی ڈال دیتا ہے۔ ان کے جنوں پرداختہ بدنوں کو بھی ایک لحظہ میں قرار سا آ گیا۔ عمر حیات نے ہاتھ سے پیکٹ ادھر اُدھر کر کے جگہ بنائی، اُسے نرمی سے چارپائی پر لٹا دیا اور باہر والا دروازہ بند کرنے چلا گیا۔ ابھی شام ہونے میں کچھ گھڑیاں باقی تھیں۔ بھلے تشنگی زیادہ تھی، سیرابیِ جاں کیلئے مہلت کم تھی مگر جو ساعتیں میسر تھیں، انہیں چوم کر اَمر کرنا ضروری تھا۔ آنکھوں پر بازو رکھے مسکراتی ہوئی چندو ماہی کے پہلو میں آیا۔ آنکھوں پر رکھی ہوئی گداز بانہہ پر جھک کر چومتے ہوئے بولا، ''تمہیں پہلی نظر دیکھنے والا اوسان خطا کر بیٹھتا ہے اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ جب ہنگامی انتشار کا لمحہ بیت گیا، تب کفِ افسوس ملنے لگا۔ تب تک تمہارے حسن کا جادو اپنا کام دکھا چکا تھا۔ چندو! کیا تمہیں اِس بات کا احساس ہے؟''

اُس نے ہولے سے سر انکار میں ہلایا۔

وہ بولا، ''ہاں! قیامت کو کیا پتہ؛ وہ کس کس کو کیسے جلا دیتی ہے۔ ہے نا؟..... تمہیں کیا پتہ؛ تمہیں دیکھنے والے پر کیا گزرتی ہے۔ بی بی اماں پر میری منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا مگر وہ تمہاری شکل دیکھ کر اپنا غصہ بھول بیٹھیں۔''

وہ دل میں گھر کر جانے والے انداز میں چندو سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ بتا رہا تھا، ''بی بی اماں دل کی بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بھی دل سے

لگا کر رکھیں گی۔ تم شہزادی ہو؛ تمہیں شہزادیوں کی طرح رکھیں گی۔ تم پری ہو؛ تمہاری پریوں کی طرح پذیرائی کریں گی۔ ایک ذرا غصے کی تیز ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کریں تو ان کا حق سمجھ کر قبول کرنا۔''

وہ آہستگی سے بولی، ''ہاں! مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میری ماں بھی ایسی ہی ہے۔''

تاجاں کا خیال آتے ہی دل سے ہوک نکلی۔ گانمن کا غصے بھرا چہرہ چشمِ تصور پر سج گیا۔ بولی، ''کیا تم گانمن کو راضی کر لو گے؟ وہ بھی بی بی سائین جیسا بڑا دل رکھتا ہے۔''

''میں پیر بخش ماچھی والے حادثے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ سمجھاؤں گا کہ ایسا کچھ نہیں تھا جیسا لوگوں نے آ کر اُس کے کانوں میں ڈال دیا تھا۔ لوگ باتوں کی رائی اور رائی کا پہاڑ بنانے میں بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری کوششوں سے وہ ایک نہ ایک دن سب کچھ بھول کر تمہیں کلیجے سے لگا لے گا۔'' عمر حیات کے لب و لہجے میں تیقن کی مضبوط مالا جھنک رہی تھی۔

''میر زادے! تم نے شاید نہیں دیکھا تھا، میں نے دیکھا تھا کہ میر زادیاں بڑی نفرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مجھے حویلی میں قبول نہیں کریں گی۔'' وہ تردد آمیز لہجے میں گویا ہوئی۔

''نہیں چندو! وہ بھی دل کی بہت اچھی ہیں۔ دیکھنا! چند دنوں بعد وہ تمہیں ایک منٹ کیلئے بھی خود سے دور نہیں ہونے دیں گی۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں! بالکل ایسے ہی، جیسے مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے۔''

حسن کی عادت رہی ہے کہ وہ عشق کو چھیڑنے سے باز نہیں آتا۔ وہ بھی باز نہ آئی۔ ایک ذرا مسکرا کر بولی، ''سوچ لو! آدمی کے بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔''

وہ بنا سوچے بولا، ''سوچ لیا! تم بھی سن لو۔ آدمی کے مرنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔''

وہ ایک دم چونکی۔ آنکھوں سے بازو ہٹا کر ایک ذرا خفگی سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھنے کو بڑھی۔ ہاتھ آدھی مسافت طے کر کے رُک گیا۔ اپنی مسکراہٹ سمیٹ کر ہاتھ کی پشت کو دیکھنے لگی۔ عمر حیات نے پوچھا، ''کیا ہوا؟ رُک کیوں گئیں؟''

''کچھ نہیں..... ایسی باتیں نہ کرو۔ مرنے میں اتنی دیر ضرور لگا لینا کہ میری عمر پوری ہو جائے اور میں تمہیں مرتا ہوا نہ دیکھوں۔''

عمر حیات نے اُس کا ہاتھ تھام کر ساحل تک پہنچا دیا۔ پھر گالوں پر رگڑتے ہوئے بولا،

''چندو! کیا تم اُس سکول میں پڑھو گی جس میں پہلے پڑھتی تھیں؟''

اُس کی مستفسرانہ آنکھوں میں جھانک کر بولا، ''وہی؛ جس کے گیٹ پر سے میں نے تمہیں پک کیا تھا؟''

''اوہ ہاں!'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی، ''مگر میں اُس سکول میں جانا نہیں چاہتی کیونکہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ اور میری کلاس میٹ مجھے طعنے دیں گی۔''

''کیوں؟'' وہ چونکا، ''تم نے ایسا کیا کیا ہے؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے کچھ نہیں کیا تھا مگر وقت نے اُس کے گلے میں بدنامی کا طوق ڈال دیا تھا۔ اس سکول میں سکول بیگ اُٹھا کر داخل ہونے کا خیال بڑا روح فرسا تھا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی، ''کچھ کیا ہے یا نہیں، بدنام ہو گئی ہوں۔''

عمر حیات نے فوراً ہی دلاسہ دیا، ''او کے..... یہ کوئی پرابلم نہیں۔'' وہ اُس کی مجبوری سمجھ گیا تھا۔ بولا، ''شہر میں اور بھی کئی گرلز سکول موجود ہیں۔ پرائیویٹ ادارے بھی ہیں۔ جس سکول میں فائزہ پڑھتی تھی، اس سکول کا ماحول مجھے بہت پسند ہے۔ وہیں داخلہ لے دوں گا۔ ٹھیک ہے؟''

فائزہ اس کی تیسرے نمبر والی بہن تھی۔ اس نے نویں کلاس میں ہی بغیر کسی وجہ کے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اُسے حصولِ تعلیم سے بالکل رغبت نہیں تھی۔ چندو خوش ہو گئی۔

عمر حیات بولنے کے ساتھ ساتھ قصرِ حسن میں قدم قدم بڑھ رہا تھا۔ اس نے بال کھول کر آدھے اُس کے چاند چہرے پر، آدھے اپنے چہرے پر پھیلا دیے تھے۔ اس کے چہرے پر سرکتی ہوئی زلفوں کو کبھی ہاتھ سے گردن کی طرف دھکیل دیتا، کبھی اُس کی آنکھوں پر پٹی کی صورت اکٹھا کر دیتا۔ اس کھیل میں تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ شکست و ریخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ عمر حیات کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اس کی وارفتگی نے چندو ماہی کو توڑ پھوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا، ''چندو! آ جاؤں؟''

چندو چونکی۔ حیران نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ ایک مختصر سے توقف کے بعد بولی، ''کہاں؟''

وہ دل تک تو پہنچ چکا تھا۔ جان پر سایہ کشا ہو گیا تھا۔ پھر بھی آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ تجسس نے سر ابھارا۔ پوچھنے کی اجازت شرمگیں دل نے نہ دی۔ نہایت آہستگی سے آنکھیں موند کر اجازت دے دی۔ وہ جان کی دہلیز پر آنے کی اجازت پاتے ہی پہنچ گیا۔ تب چندو کی

سمجھ میں آیا کہ وہ جلتے ہوئے ہونٹوں پر انگارے رکھنے کیلئے اور قریب آنا چاہتا تھا۔ وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر تڑپی اور اس کی گرفت سے نکل گئی۔ دیوار تک گئی۔ ایک چارپائی دیوار کے ساتھ پہلو کے بل کھڑی کی گئی تھی۔ اُسے تھام کر لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''تمہیں تو ذرا شرم نہیں آتی۔ حویلی میں لے جا کر اور دلیر ہو جاؤ گے۔ ہائے اللہ! میں کیا کروں؟''

وہ اپنی فتح یاب شکست کو سینے سے لگائے چارپائی پر کروٹ بدل گیا۔ اوندھے منہ لیٹا تو دو چھوٹے ڈبے پسلیوں میں چبھے۔ اُسے مطلق پروا نہ ہوئی۔ گھٹتی بڑھتی سانسوں کے بیچ بولا، ''چندو! بس اتنا سا سہارا دیتی رہو گی تو دو چار سال کیا؛ عمر بھر انتظار کر لوں گا۔''

وہ ایک ادا سے بولی، ''نہیں۔ حویلی میں ایسا نہیں چلے گا۔''

''میں مرد ہوں۔ سیدھی طرح ہاتھ نہیں آؤ گی تو انگلیاں ٹیڑھی کر لوں گا۔ زبردستی بھی کرنا پڑی تو کر گزروں گا۔''

وہ جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ ابھی بھرپور مرد نہیں تھا مگر اپنی مردانگی کا بھرپور انداز میں اظہار کر رہا تھا۔ جتا رہا تھا کہ وہ اس کی ملکیت بن چکی ہے۔ ملکیت کے ساتھ کوئی بھی سلوک روا رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی آشفتگی چندو کے دل سے کھیل رہی تھی۔ فخر سے سر بلند ہو گئی۔ بولی، ''تنگ کرو گے تو بی بی سائین کو بتا دوں گی۔''

وہ اچھل کر چارپائی سے اُترا۔ بچکانہ انداز میں بولا، ''نہ بابا! یہ ظلم نہ کرنا۔ میں تمہیں بلاؤں گا بھی نہیں۔''

وہ ہنستی ہوئی پلٹی۔ ایسے میں دھوکہ کھا گئی۔ عمر حیات تب تک بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ چندو کے سنبھلنے تک اس کے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر جارحانہ انداز میں توڑنے لگا۔ اس کی باؤلی اور انجام سے بے خبر عمر اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ چندو کا بدن ریت کی دیوار ثابت ہو رہا تھا۔ دیوانے کی آشفتہ بے ساختگی اتنی جاندار مگر غیر متوقع تھی کہ چند ہی لمحوں میں چندو کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ جب عمر حیات نے ایک حد پر جا کر اپنی پیش قدمی روکی، اُسے خود سے علیحدہ کیا تو وہ ریت کی دیوار کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ بری طرح ہانپنے لگی۔

عمر حیات نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کئے۔ دہلیز تھامی اور خود پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف رہ کر بولا، ''بس! بڑی آئی دھمکیاں دینے والی..... بی بی سائین کو بتا دوں گی..... بتاؤ گی تو ہر بار ایسا ہی سلوک کروں گا۔''

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے کن اکھیوں سے اُس کی پشت کو گھور رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اُسے ایک دم کیا ہو گیا تھا؟..... عمر حیات نے اُسے مارا، پیٹا نہ ڈانٹا..... پھر وہ اُدھ موئی کیسے ہو گئی؟ جب وہ اسے سکول سے اپنے دوست کے خالی گھر میں لے گیا تھا، تب اس کی مار پیٹ نے بھی یوں بے حال نہیں کیا تھا۔ آنکھوں میں ایک دم پیار کی امرت جوت جاگ گئی اور وہ دل میں بولی، 'ہائے میر زادے! تم کتنے اچھے ہو۔ کاش! بی بی سائین ہمارے درمیان حائل نہ ہوتیں اور اس خوب صورت دن کی کبھی شام نہ ہوتی۔'

اس کی عمر ابھی اتنی پختہ نہیں ہوئی تھی کہ سمجھا دیتی کہ زندگی کے ہر دن پر شام اُترتی ہے۔ اس شام کے اُترتے ہی وہ عمر حیات کے پیچھے چلتی ہوئی ڈرتی ڈرتی حویلی میں داخل ہوئی۔ بی بی سائین نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عمر حیات کی بہنوں نے سرد نظروں سے گھورا۔ اُس کی حیثیت اُس پر عیاں کرنے کی کوشش کی۔ عمر حیات نے سمجھایا تھا کہ چند دنوں میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر اُس نے نظریں جھکا لیں۔ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل..... چبھنے والی نظریں ہٹ گئیں۔

بی بی نے باری باری سبھی بہنوں سے کہا کہ وہ چندو کو اپنے کمرے میں لے جائیں۔ وہ چندو کو بیٹیوں کی طرح علیحدہ کمرا دینے سے گریزاں تھیں کیونکہ گھر میں چور بیٹھا ہوا تھا۔ کائیاں چور جوان تنہائی کا فائدہ اُٹھا کر، سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر علیحدہ کمرے سے بہت کچھ چرا کر لے جا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر اُس نے سبھی پر زور دیا۔ بڑی بہن کا نام صفیہ تھا، ملتان کے کالج میں پڑھتی تھی، اُس نے منہ بنا کر کہا، ''بی بی اماں! آپ جانتی ہیں کہ میں کسی کی موجودگی میں سو نہیں سکتی۔ آپ اِسے نورین کے ہاں ٹھہرا دیں۔''

اُس سے چھوٹی نورین تھی۔ شجاع آباد کے کالج میں پڑھنے جایا کرتی تھی۔ تنک کر بولی، ''اماں! بہتر یہی ہوگا کہ اِس کیلئے ایک سرونٹ کوارٹر خالی کروالیں۔''

سب سے چھوٹی مصباح، جسے گھر میں صبا کہا جاتا تھا، نخوت سے بولی، ''میرے اگزامز سر پر ہیں۔ اگر مجھے ڈسٹرب کیا گیا تو میں فیل ہو جاؤں گی۔ پھر مجھے کوئی گلہ نہ دے۔ ہاں!''

چندو تضحیک اور اہانت کے بار تلے دبی باری باری کن اکھیوں سے عمر حیات کی بہنوں کو دیکھ رہی تھی۔

بی بی سائین نے فائزہ کی طرف دیکھا۔ وہ دلچسپی آمیز نظروں سے چندو کو دیکھ رہی تھی۔ بولی، ''میرا کمرہ سب سے چھوٹا ہے مگر میرا دل سب سے بڑا ہے۔ اس کا بیڈ میرے کمرے میں

لگا دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

بی بی نے اطمینان کی سانس لی۔ نوکرانی کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ فائزہ نے چندو کا ہاتھ تھاما۔ بولی، ''چلو! اپنے کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔ یہ ظالم سماج ہے۔ زیادہ پڑھ لکھ گیا ہے اس لیے ان پڑھ دل کے جذبات نہیں سمجھتا۔''

چندو نے بی بی سائین اور عمر حیات کو باری باری اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ اجازت مل گئی۔ فائزہ چہکی، ''چلو ناں! میں بھی تو دیکھوں کہ آخر بھائی کی آنکھوں نے ایسا کیا دیکھ لیا کہ بے ایمان ہوگئیں۔''

بی بی نے ملامت انگیز نظروں سے اُسے گھورا تو وہ دبی دبی ہنسی اچھالتی ہوئی، چندو کو کھینچتی ہوئی نوکرانی کے پیچھے چل دی۔ اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر سب بہنوں کے آخر میں واقع تھا۔ میر ظفر حیات نے چاروں بہنوں کے کمرے ایک ہی سیدھ میں تعمیر کرائے تھے۔ فائزہ کا کمرہ دس ضرب بارہ فٹ کا تھا۔ کمرے کے عقبی حصے میں ایک طرف باتھ روم جبکہ دوسری طرف ڈریسنگ باکس واقع تھا۔ دونوں کے بیچ ایک کم چوڑا دروازہ عقبی بالکونی میں کھلتا تھا۔ یہ بالکونی دوسری بہنوں کی بالکونیوں سے چھوٹی تھی جس کا آدھا حصہ آم کے بڑے پیڑ کی ایک صحت مند شاخ نے گھیر رکھا تھا۔

نوکرانی اور فائزہ نے مل کر بہتیری کوشش کی، ان گنت تراکیب آزمائیں مگر چندو کے بیڈ کی گنجائش نہ نکلی۔ چندو نے کہا، ''میں ادھر قالین پر سو جاؤں گی۔''

فائزہ نے کندھے اُچکائے۔ نوکرانی نے صوفہ ہٹانے اور دیوار اور بیڈ کے درمیان چندو کا بستر لگانے میں دیر نہیں کی۔ پھر دونوں کیلئے دودھ لینے چلی گئی۔ فائزہ نے پوچھا، ''میرا کمرہ پسند آیا؟''

چندو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ امیرانہ آرائش سے مرعوب ہو کر بولی، ''بہت خوب صورت ہے۔''

فائزہ بولی، ''تم بھی بہت خوب صورت ہو۔ میں اگر مرد ہوتی تو اب تک بتا چکی ہوتی کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔''

وہ جھینپ گئی۔ شام ڈھلنے سے قبل فائزہ کے بھائی کی مردانگی نے اس کے حسن کی قدر و

منزلت کو جس طرح تسلیم کیا تھا؛ وہ انداز بھولنے والا نہیں تھا۔ فائزہ کے لبوں سے تعریف اچھی لگی۔ سر جھکا کر بولی، ''تم بھی کسی سے کم تو نہیں ہو۔''

نوکرانی دودھ سے لبریز دو گلاس ٹرے میں رکھ لائی۔ اس کے پیچھے پیچھے عمر حیات بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ کر بولا، ''کیا گھر میں اور بیڈ نہیں تھا؟''

فائزہ نے جلدی سے کہا، ''ایسی بات نہیں بھائی! دراصل کمرہ چھوٹا ہے۔ دوسرے بیڈ کی جگہ نہیں بنی اس لیے قالین پر بستر لگانا پڑا۔ مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک رات چندو نیچے سوئے گی، دوسری رات میں..... کہتے ہیں کہ فرش پر سونے سے ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہوتی ہے۔ کیوں چندو؟''

اُس نے تنبیہی انداز میں سر ہلایا۔ بولا، ''فائزہ! اس کا خیال رکھنا۔ اسے تنگ نہ کرنا ورنہ میں تمہاری چٹیا کھینچ لوں گا۔''

وہ کن انکھیوں سے چندو ماہی کو دیکھ کر ہنسی، بولی، ''تنگ تو کروں گی۔ ضرور کروں گی۔ تم کر لو، جو کرنا ہے۔ ایک بات ہے جس کی خوشی ہو رہی ہے کہ چندو کے بہانے ہی سہی، تم نے میرے کمرے میں قدم تو رکھا۔ امید ہے آئندہ بھی بہانے بہانے سے آتے رہو گے۔''

اس کی آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عمر حیات چند لمحے کھڑا فائزہ کو بے بسی آمیز انداز میں دیکھتا رہا پھر پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

چندو بھوکی تھی۔ سونے کیلئے لیٹی تو آنکھوں سے نیند روٹھ گئی۔ فائزہ پہلو کے بل لیٹی اُسے بغور دیکھ رہی تھی۔ شاید اُس نے چندو کی بے چینی محسوس کر لی تھی، اس لیے کہنے لگی، ''لگتا ہے تم نے شام کا کھانا نہیں کھایا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ فائزہ بیڈ سے اُتری اور دروازہ کھول کر کچن کی طرف چلی گئی۔ دس پندرہ منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ وہ اس کے لیے کھانا گرم کر لائی تھی۔ چندو کے سامنے ٹرے رکھ کر اس کے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ باتیں کرنے لگی۔ اپنے بارے میں بتانے لگی کہ اُسے کیا پسند تھا؛ کیا ناپسند..... وہ خاصی چالاک اور زود فہم لڑکی تھی۔ ایسی لڑکیاں پڑھائی میں بہت اچھی ہوتی ہیں مگر اس نے نہ جانے کیوں پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ اس نے گفتگو میں احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ کوئی ایسا موضوع زیرِ بحث نہ آئے جو چندو کو دُکھی کر دے۔ وہ چندو کو ذہنی

کوفت یا شرمندگی دینے سے گریزاں دکھائی دیتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہوئی۔ باتھ روم میں گئی۔ باہر نکلی تو بالکونی کے کھلے دروازے نے متوجہ کرلیا۔ دیکھا تو فائزہ ریلنگ پر جھکی دکھائی دی۔ کمرے کی ٹیوب لائٹ کی روشنی آم کے پیڑ تک پھیلتی تھی۔ آگے اندھیرا تھا۔ فائزہ اجالے اور اندھیرے کی پیوستگی کے مقام پر دوپٹے سے بے نیاز کھڑی تھی۔ اس کے غیر تراشیدہ بال بہت گھنے اور چمکدار سیاہ تھے جو ہوا سے الجھ کر اس کی کمر پر ناگن کی طرح ادھر اُدھر بل کھا رہے تھے۔ چندو بے اختیار بالکونی میں آ گئی۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ دھیرے سے بولی، ''فائزہ! تمہارے بال بہت لمبے ہیں۔''

فائزہ چونکی۔ گردن کو تھوڑا موڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ بولی، ''ہاں! بی بی اماں جمعہ کے جمعہ میرے بال لسی اور ملتانی مٹی سے دھوتی ہیں۔''

''کیا سبھی بہنوں کا سر ایسے ہی دھوتی ہیں؟''

''نہیں! صرف میرے بال ہی۔'' اس نے بتایا، ''باقیوں کو بال بڑھانے کا شوق نہیں ہے۔ بڑی باجی بال کٹواتی ہے۔ چھوٹی کے بال دو مونھے ہو کر ٹوٹنے لگتے ہیں۔''

تاجاں ہمیشہ چندو کے بال لسی اور ملتانی مٹی سے دھویا کرتی تھی۔ کبھی کبھی جامن کے پتے چٹنی کی طرح کوٹ کر ملتانی مٹی میں ملا لیا کرتی تھی۔ اس سے بالوں کی چمک میں سونا پگھل کر شامل ہو جاتا تھا۔ وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی، ''میرے بالوں کو میری ماں ایسے ہی دھویا کرتی تھی۔''

فائزہ نے اس کا دوپٹہ کھینچ لیا۔ بال کھول کر ہاتھوں پر لیتے ہوئے پیار سے بولی، ''واو..... کتنے نرم ہیں یہ۔ ریشم کے سچے تار..... فکر نہ کرو۔ میں تمہارا سر دھو دیا کروں گی۔''

''نہیں نہیں..... یہ مناسب نہیں ہوگا۔ میں خود ہی دھو لیا کروں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

فائزہ نے بال چھوڑ دیے۔ ہوا نے اپنی گرفت میں لے کر اِدھر اُدھر بکھیر دیے۔ اس نے چندو کی کمر میں بازو حمائل کیا۔ ایک ہاتھ سے آم کے پتوں کو چھیڑتے ہوئے بولی، ''تم اور میں دوست بن جاتی ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟ دوست ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا کرتے ہیں۔ تم میرا اور میں تمہارا سر دھویا کروں گی۔ یہ تو مناسب رہے گا ناں؟''

اس نے ممنونانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ فائزہ فربہ وجود کی مالک تھی۔ صحت مند تھی۔ اس کے بھرے بھرے وجود نے چندو کو سکون بھرا لمس دیا تو دل اتھل پتھل ہونے لگا۔ فائزہ اچھی لگنے

لگی۔ اپنے پیٹ پر فائزہ کے گداز ہاتھ کی ہلکی سی کپکپاہٹ بھی اچھی لگنے لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھا تو سکون کا احساس بیدار ہو گیا۔

اچھی لگنے والی کہہ رہی تھی، ''چندو! بابا نے بڑے شوق سے ہم بہنوں کیلئے یہ کمرے بنوائے تھے۔ یہ بالکونی دیکھ رہی ہو ناں! یہ جنت کی کھڑکی ہے۔ ابھی اندھیرا ہے۔ صبح کے اجالے میں یہاں کھڑی ہو کر ان درختوں کو، تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی سبز فصلوں کو اور لان کے پھول پودوں کو دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ دل خوش ہو جائے گا۔ عام طور پر بڑی خوش گوار ہوا چھیڑتی رہتی ہے مگر جن دنوں فصلوں پر سپرے کا سیزن ہوتا ہے، تب یہاں کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ بہت بدبو آتی ہے۔ اور چندو! یہاں ایک بہت بڑی کمی ہے جس کی وجہ سے یہ سارا نظارہ ایک دم بے معنی سا لگنے لگتا ہے۔''

وہ حیرت سے مستفسر ہوئی، ''وہ کون سی کمی ہے؟''

اس نے لمبی سانس لی۔ اُسے مزید اپنے قریب کیا۔ پیٹ پر ہاتھ کے دباؤ میں خفیف سا اضافہ کیا۔ بولی، ''یہاں سارا دن کھڑی رہتی ہوں مگر کوئی آدم زاد دکھائی نہیں دیتا۔ دل ان گنت سوال کرتا ہے۔ جواب دینے کوئی نہیں آتا۔ بھلا درختوں سے کیا باتیں کی جا سکتی ہیں؟ بھلا گونگے بہرے پھولوں کے حسن کی کب تک تعریفیں کی جا سکتی ہیں؟''

چندو نے نہ سمجھنے کے باوجود خاموشی اختیار کی۔ اُسے دیکھا۔ وہ اپنی ترنگ میں کھڑی تھی۔ چہرہ اُٹھائے، آنکھیں موندے اور ہلکی سی لرزش پر بہکتے ہوئے وجود کو سنبھالے..... ایک ذرا توقف کے بعد بولی، ''تم نے کبھی سوچا ہے کہ ایک پھول دوسرے پھول کی کیسے تعریف کرتا ہو گا؟ نہیں سوچا ناں!..... کوئی بھی نہیں سوچتا مگر میں سوچتی ہوں۔ ہم تعریف کرتے ہیں۔ پھول ہماری بات سنتے سمجھتے نہیں۔ اپنی مستی میں جھومتے رہتے ہیں۔ شاید ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھتے۔ انہیں بھلا پروا ہی کب ہے کہ کوئی ان کے حسن اور خوشبو کو سراہے۔ ہے ناں؟''

فائزہ بہکے بہکے انداز میں بول رہی تھی اور چندو کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ تھوڑی عجیب بھی لگی۔ ایک شام کا تعلق تھا۔ جھجک آڑے آ رہی تھی اور چندو ماہی جو کہنا چاہتی تھی، کہنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ بلا سوچے سمجھے کہنے لگی، ''کیا تم چاہتی ہو کہ یہاں کوئی ایسا ہو جو پھول کی تعریف کرے؟''

فائزہ چونکی، ''ایں..... یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ تم کس پھول کی بات کر رہی ہو؟''

چندو نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ ہم عمر تھی۔ ایک دم پیاری لگنے لگی۔ چندو نے اس کی جانب اپنا رُخ کیا۔ گال کو انگلی سے چھوا اور نرمی سے بولی، ''یہ پھول!''

فائزہ شرما گئی۔ دل میں خوش بھی ہوئی۔ اس سے لپٹ کر بانہوں کو پوری قوت سے کسنے لگی۔ بہکے بہکے انداز میں بولنے لگی، ''تم کتنی اچھی ہو چندو..... چندو ماہی..... چاند جیسی روشن؛ مچھلی جیسی چمکدار..... دنیا جھوٹ بولتی ہے۔ بکواس کرتی ہے کہ تمہاری پیدائش کے پیچھے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا۔ نہیں۔ تم مقدس ہو۔ بہت پیاری ہو۔ آئی لو یو!''

ہوا آم کے پتوں سے چھیڑ خانی کرتی ہوئی مچل کر ان کی طرف آئی۔ فرحت کا جانفزا لمس عطا کر گئی۔ فائزہ نے سرشاری میں اس کے گال چومے پھر اس کے حسن کی سوختہ جانی تک آ گئی۔ اس کے پیار میں مرد کی سی آشفتہ سری شامل ہوئی تو چندو نے ہلکی سی مزاحمت کی۔ وہ جھینپ کر تھم گئی پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ پرسکون ماحول نقرئی گھنٹیوں کی آسودہ آوازوں سے گونج اُٹھا۔ جوانی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ دیوانی سی؛ جو آنِ واحد میں دیوانہ کر دیتی ہے۔ ہنس ہنس کر فائزہ کے پہلوؤں میں درد ہونے لگا تو جھک کر ہنسی دبانے کی کوشش کرنے لگی، بولنے لگی، ''چندو میں نے کہا تھا ناں!..... ہائے! میں اگر مرد ہوتی تو..... ہائے چندو!''

اس کا جملہ ادھورا تھا۔ ایسے جملے کبھی مکمل نہیں ہوتے۔ ادھورے جملے، ادھورے اظہار اور نامکمل پیار میں بڑا تجسس ہوتا ہے۔ بالکونی نے انہیں لمس آشنائی عطا کر دی تھی۔ چندو اپنے بستر میں لیٹنے لگی تو فائزہ نے کمر میں ہاتھ ڈال کر بیڈ پر کھینچ لیا۔ بولی، ''اِدھر ہی آ جاؤ ناں! جب ہم دونوں خوب صورت پھول ہیں، ایک دوسرے کی تعریف کر سکتے ہیں تو پھر علیحدہ کیاریوں میں مقید کیوں رہیں؟''

چندو اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اور لڑکھڑا کر اس پر گری پھر جھینپتی ہوئی اس کے برابر لیٹ گئی۔ فاصلے ہمیشہ بڑوں کے رویوں سے نمو پاتے ہیں وگرنہ بچپن اور جوانی کبھی بھی اونچ نیچ کے فلسفے کو قبول نہیں کرتی۔ چندو پہلی رات کی جھجک، حویلی والوں کے رویوں، خوف اور اپنے مستقبل کے اندیشوں میں گھری ہوئی تھی تبھی اس کی رات سوتے جاگتے گزری۔ فائزہ بڑی تن آسانی اور فراخ قلبی سے سونے کی عادی تھی۔ دونوں دن چڑھے بیدار ہوئیں۔ فائزہ گھبرا کر بولی، ''ہائے اللہ! آج تو نماز بھی رہ گئی۔''

چندو نماز نہیں پڑھا کرتی تھی۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر دل ہی دل میں شرمسار ہوئی۔ فائزہ

اس کے چہرے کے بدلاؤ سے قلبی کیفیت تاڑ گئی۔ بولی، ''کیا تم نماز نہیں پڑھتیں؟''

اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔ جھوٹ کا سہارا لے کر بولی، ''پڑھتی تو ہوں مگر کبھی کبھی!''

فائزہ مسکرا کر بولی، ''آئندہ پڑھا کرنا۔ ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا اور زمانے کی گندگی ہماری روح کو آلودہ کر دیتی ہے۔ نماز جسم اور روح کو پاکیزہ کر دیتی ہے۔ یہ بات ہم سے اکثر بابا کہا کرتے تھے۔ ہائے چندو! میرے بابا بہت اچھے تھے۔ ہر صبح ہم سب بہنوں کے کمروں میں آیا کرتے تھے۔ جگا کر نماز پڑھنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ مگر..... مگر ہر صبح یوں محسوس ہوتا ہے کہ بابا مجھے جگانے کیلئے میرے کمرے میں آئے ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ایسے ہی وقت میں دروازے پر دستک ہوئی۔ فائزہ نے دروازہ کھولا۔ عمر حیات کو دیکھ کر شرارت سے 'کھی کھی' کرنے لگی۔ عمر حیات نے آنکھیں دکھائیں۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی نان اسٹاپ ہنسی کو بدقت روکتے ہوئے بولی، ''بھائی! اداس ہو گئے ناں ایک ہی رات میں..... سچی بات تو یہ ہے کہ چندو چیز ہی ایسی ہے۔ میں نہ کہتی تھی کہ اب تم بہانے بہانے سے یہاں آیا کرو گے۔''

اس نے مصنوعی خفگی سے اُسے ہلکی سی چپت رسید کی۔ صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا، ''بکواس کرتی رہتی ہو۔ شرم کیا کرو۔ میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ چندو کا سامان میری پوٹھوہار میں پڑا ہے۔ رات کو یاد ہی نہیں رہا تھا ورنہ نکلوا کر کمرے میں بھجوا دیتا۔''

فائزہ اُس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ آنکھیں نچا کر بولی، 'بھائی! کیا یہ بتانا ضروری تھا؟ نوکر سے کہہ دیتے تو وہ سامان لا کر یہاں رکھ دیتا۔ اب کیا ہم آپ کی یاد دہانی پر دارے پر جائیں اور جیپ میں سے سامان نکال کر لائیں؟''

چندو نے فائزہ کے کندھوں کے اوپر سے عمر حیات کو دیکھا جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ فائزہ کی بات سن کر چندو کا دل فخر سے معمور ہو گیا۔ مسکرا کر اپنے دیوانے کو دیکھا اور پلٹ کر جلدی سے باتھ روم میں گھس گئی جبکہ عمر حیات کو فائزہ نے زِچ کر کے دروازے پر سے لوٹا دیا۔ بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ باتھ روم کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بولی، ''اے چندو! میں سب سمجھتی ہوں۔ تم نہیں بولتی ہو؛ تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔ وہ 'آئی لو یو' سننے کیلئے آیا تھا۔ تمہاری آنکھوں نے اُسے کہہ دیا ناں! دوبارہ یہاں آیا تو اُس کی ایسی کی تیسی کر دوں گی۔ ہائے چندو! سچی! تمہاری آنکھیں بولتی ہیں۔ کوئی تو سن کر دوڑا آئے گا ہی!''

چندو سن رہی تھی۔ وفورِ تفاخر سے مسکرا رہی تھی۔ ہولے سے بولی، ''میری صرف آنکھیں بولتی ہیں۔ تمہارا تو پورے کا پورا بدن بولتا ہے۔ جب سے کمرے میں آئی ہوں، سن رہی ہوں۔ آخر کسی کو تو سننا ہے۔!''

وہ باتھ روم سے نکلی۔ بوڑھا نوکر چارے والی پلی میں اُس کا جملہ سامان باندھ کر لے آیا۔ قالین پر رکھ کر پلی فارغ کرنے لگا۔ اس کے جانے کے بعد فائزہ نے بیڈ سے چھلانگ لگائی۔ جلدی جلدی ہاتھ مارنے کے بعد کچھ اُٹھا کر چندو کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولی، ''ہوم..... تو میر زادے نے اپنی چندو ماہی کو اتنی ڈھیر ساری شاپنگ کروا دی۔ واو! کیا بات ہے۔ پَر یہ تو مجھے پسند آ گیا ہے اس لیے یہ اَب میرا ہوا۔ تم اپنے دیوانے کے ہاتھ اور منگوا لینا۔''

چندو نے جھینپ کر رُخ پھیر لیا۔ آہستگی سے بولی، ''سب کچھ تمہارا ہے۔ جو جی میں آئے، اُٹھا لو۔''

رات سوچوں میں گزری تھی۔ پہلے دن کا اجالا کئی سہانی تعبیریں دکھا کر چھیڑنے لگا تھا۔ حویلی میں دسترخوان کی روایت کئی پشتوں سے بلا تعطل چلی آ رہی تھی۔ بڑے برآمدے کے ایک گوشے میں دبیز قالین پر دسترخوان سجایا جاتا تھا جہاں حویلی کے سبھی افراد دن میں تین وقت مجتمع ہوا کرتے تھے۔ فائزہ اور چندو کے نیچے اُترنے سے پیشتر ناشتے کی چوکی اُٹھ گئی تھی مگر نوکرانی نے دونوں کو ناشتہ دسترخوان پر دیا۔ ساتھ میں سمجھا بھی دیا کہ آئندہ دیر ہو گی تو دوپہر تک بھوکا رہنا پڑے گا۔

چندو کو دیکھ کر صفیہ بال سنوارتی ہوئی وہاں آ گئی۔ پوچھنے لگی کہ اس کے چہرے پر نیل کیوں پڑے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے ناشتے میں مشغول رہی۔ فائزہ نے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی تو صفیہ نے ڈانٹ دیا۔ ایسے ہی وقت میں جب وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اُٹھنا چاہتی تھی، بی بی کمرے سے نکل کر صحن کی طرف جاتے جاتے برآمدے میں رُک گئی۔ صفیہ کو مخاطب کر کے بولی، ''مجھے تمہارا رویہ اچھا نہیں لگا صفیہ! گھر آئے مہمان کو دل میں جگہ دینا ہماری خاندانی روایات کا حصہ ہے۔ بھول گئیں، میر صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر دشمن بھی چل کر گھر آ جائے تو اس کی دل شکنی نہ کی جائے۔''

صفیہ نے بالوں کو ایک جھٹکا دیا، منہ بنایا اور کہا، ''پَر اماں! گھر آئے مہمان کی بات اور ہے؛ بن بلائے مہمان کا مقام اور ہے۔ آخر آنے والے کی اوقات بھی تو دیکھنی پڑتی ہے۔''

چندو کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

بی بی نے سخت انداز اختیار کیا، ''صفیہ! توبہ کرو۔ لڑکیاں ایسے نہیں بولتیں۔''

چندو نے جی کڑا کیا، کہا، ''باجی! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا دل دکھانے کیلئے یہاں چلی آئی مگر میں خود سے تو نہیں آئی، مجھے قسمت آپ کے در پر لائی ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں تو میں حویلی سے چلی جاتی ہوں۔''

''ہونہہ! چلی جاتی ہوں.....'' صفیہ نے بہ اندازِ نفریں کہا اور اُٹھ کر پیر پٹختی ہوئی سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ بی بی نے چندو کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا۔ نرم لہجے میں کہا، ''دل میلا نہ کرو۔ یہ ذرا نک چڑھی ہے۔ بولنے سے پہلے سوچتی نہیں مگر دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔''

چندو کا دل بجھ سا گیا تھا۔ قدم قدم پر حیثیت کا طعنہ جان چیر جاتا تھا اور وہ برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ چائے پی کر فائزہ نے اُسے ساتھ لیا۔ دونوں عقبی دروازے سے گزر کر لان میں آئیں۔ پھولوں بھری کیاریوں میں چہل قدمی کرتی رہیں پھر حویلی سے نکل کھڑی ہوئیں۔ تاحدِ نگاہ سرسبز و شاداب فصلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ چونا زدہ موٹے تنے والے آم، کیکر اور بلند قامت شیشم کے درختوں کی بہتات نے فضا کو بڑا خوشگوار بنا رکھا تھا۔ کچھ فاصلے پر پیڑا انجن والا ٹیوب ویل نصب تھا جو اس وقت بند تھا۔ اس کے بڑے سے حوض میں گھٹنوں تک شفاف پانی کھڑا تھا۔ فائزہ چپل اُتار کر، شلوار کے پائنچے چڑھا کر پانی میں جا کھڑی ہوئی۔ اُسے بھی اپنے ساتھ کھڑا کر کے بولی، ''چندو! ٹھنڈا پانی کتنا مزہ دیتا ہے۔''

چندو نے لمبی سانس لی، کہا، ''ہاں! مگر شرط یہ ہے کہ جسم گرم ہو۔''

''ایں..... یہ کیا کہا تم نے؟'' فائزہ چونکی۔

''میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا من شانت ہو تو ہر شئے اچھی لگتی ہے۔'' چندو نے جلدی سے بات بنائی۔

''میں سمجھتی ہوں تمہارے دکھ کو چندو ماہی!'' فائزہ کے لہجے میں ہمدردی سی گھل گئی، ''دیکھو ناں! وقت کب ایک سا رہا ہے۔ مصیبت آخر ٹل جاتی ہے۔ تمہارا دُکھ اپنی جگہ؛ بھائی کی محبت اپنی جگہ۔ کوئی لڑکا اتنی شدت سے کسی لڑکی کو چاہے کہ اپنی زندگی، نام و نسب اور مستقبل تک کو داؤ پر لگا دے تو لڑکی ہر دکھ سے بے نیاز ہو جاتی ہے۔''

چندو نے تھم کر اُسے دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ اپنی عمر سے بہت آگے نکل کر بولنے لگی تھی۔

اپنے بھائی کی محبت کی تذکرہ کرتے ہوئے ایک تفاخر کا احساس اس کی آواز میں شامل ہو گیا تھا۔

چندو آہستگی سے بولی، ''میر زادہ تو پاگل ہے۔''

''پھر تمہیں اور کیا چاہیے؟''

''تم درست کہتی ہو۔ مجھے میر زادے کے بعد زندگی سے کچھ بھی مانگنا نہیں چاہیے مگر نہ جانے کیوں میرا دل ڈر سے دھڑکتا رہتا ہے۔ دنیا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگنے دیتی اس لیے اپنی اور میر زادے کی جان کی امان مانگتی رہتی ہوں۔''

فائزہ کے گداز چہرے پر لحظہ بھر کو نامانوس سی درشتی لہرائی پھر معدوم ہو گئی۔ موضوع بدل کر فصلوں کی باتیں کرنے لگی۔ آموں کی قسمیں گنوانے لگی۔ گھنٹہ بھر کی سیر کے بعد دونوں حویلی لوٹ آئیں۔

عمر حیات نے درست کہا تھا۔ پندرہ بیس دنوں میں سبھی گھر والوں کے رویوں میں خاصا تغیر رونما ہو گیا تھا۔ صفیہ کے علاوہ سبھی بہنیں اُس سے بے تکلف ہو گئی تھیں۔ اکٹھی بیٹھتیں تو ان میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عمر حیات نے شہر کے ایک نجی ادارے میں چندو کا ایڈمشن کروا دیا تھا۔ پہلے دن اپنی پوٹھوہار پر شہر لے گیا تھا۔ چھٹی کے وقت لینے بھی گیا تھا۔ تبھی بی بی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے فوری طور پر حکم صادر کیا، ''صفیہ کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ وہ ملتان چلی جائے گی۔ نواز کی ڈیوٹی لگا دو۔ وہ نورین کے ساتھ چندو کو بھی شہر لے جایا کرے گا جبکہ تم اپنے کام پر توجہ دو گے۔''

عمر حیات نے بی بی کا حکم ماننے میں کسی تامل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نورین کالج میں پڑھتی تھی۔ اُسے ہر صبح نواز ایف ایکس پر چھوڑنے جاتا تھا۔ وہ چندو کو بھی ساتھ لے جا سکتا تھا۔ اس سے نہ صرف عمر حیات کا وقت بچ جاتا بلکہ اضافی خرچ بھی نہ ہوتا۔ پھر یہی معمول بن گیا۔ چندو ماہی کو نیا اسکول اچھا لگا۔ یہاں طالبات کی تعداد سرکاری سکول سے بہت کم تھی مگر چندو کیلئے اچھی بات یہ تھی کہ یہاں کوئی بھی اُس کی واقف کار نہیں تھی۔ چونکہ بڑے گھر کی گاڑی پر آتی جاتی تھی، اس لیے اس کی حیثیت کا از خود تعین کر لیا گیا تھا۔

فائزہ اپنی عادات اور رویے سے کسی طور پر بھی انڈر ایسٹرک نہیں لگتی تھی۔ وہ عمر حیات کی سب سے لاڈلی بہن تھی۔ جو کہتی، عمر حیات کو ماننا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بی بی کی بے حد مخالفت کے باوجود اس کے کمرے میں رنگین ٹی وی کے علاوہ وی سی آر بھی موجود تھا۔ دوسری بہنوں کو

یہ سہولت میسر نہیں تھی۔ ان کا فلم دیکھنے کو جی چاہتا تو وہ فائزہ سے دو چار گھنٹوں کیلئے وی سی آر مستعار لے کر ایک آدھ فلم دیکھ لیا کرتی تھیں۔

فائزہ دن میں ایک آدھ فلم دیکھ لیتی تھی۔ ذوق اچھا تھا۔ نواز ڈرائیور کے ہاتھ دو جے چوتھے دن اپنی پرس منی سے نئی فلم منگوا لیتی تھی۔ جہاں فلم بینی نے اُس کی معلومات میں خاصا اضافہ کر دیا تھا وہاں اُس کے مزاج میں بے پناہ رومانس بھر دیا تھا۔ پہلے پہل تو چندو نے فلموں میں بالکل دلچسپی نہیں لی۔ فائزہ فلم دیکھتی رہتی جبکہ وہ سو جایا کرتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اُس نے ایک رومانی فلم شروع سے اختتام تک دیکھ لی۔ پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ اچھی فلم کس طرح انسان کو اپنے حصار میں لے کر گرد و پیش سے بے خبر کر دیتی ہے۔ اس کے کردار کئی دن تک چندو کے ذہن میں سرسراتے رہے۔ پیار کی نئی جہتیں اُسے گدگداتی رہیں۔ اس فلم کے بعد اُس نے ہر وہ فلم پوری دلچسپی کے ساتھ دیکھی جو فائزہ نے دیکھی۔ ہر فلم نے کوئی نئی بات سکھائی۔ کسی نئے غم سے آشنا کیا۔ اختتام پر دونوں فلم پر اپنے اپنے انداز میں رائے دیتیں پھر سو جاتیں۔ اس کارِ مصروفیت نے انھیں پہلے سے بھی زیادہ قریب کر دیا۔

کبھی کبھار کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے بہ جز وعمر حیات حویلی میں اُس سے قدرے لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ چونکہ زمین کے معاملات اُسے ہی دیکھنا پڑتے تھے اور دارے پر رات گئے تک ملنے جلنے والوں کو وقت دینا پڑتا تھا، اس لیے چندو کو کئی کئی دن اُس کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اگر اُسے فائزہ کی غیر معمولی توجہ اور دوستی میسر نہ آتی تو وہ شدید نوعیت کے احساسِ تنہائی کا شکار ہو جاتی۔ اُسے گامن کی بے طرح آ کر ستانے والی یاد سے فائزہ بڑے غیر محسوس طریقے سے بچا لیا کرتی تھی۔ تورین خاصی لیے دیے رہتی تھی۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک کے فاصلے میں بہر حال اچھی ہم سفر ثابت ہوتی تھی۔

سال گزرتے دیر نہ لگی۔ سال بعد اُسے پہلی مرتبہ شہر جاتے ہوئے گامن، گامن کی ریڑھی اور تاجاں دکھائی دیے۔ کار نے انہیں نہر اور سپر بند کے سنگم والی پل پر کراس کیا تھا۔ اس کا دل ایک دم تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے چاہا کہ کار کو رُکوا کر تاجاں اور گامن سے مل لے مگر جب تک وہ سنبھلتی، ریڑھی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ گردن موڑ کر تب تک ونڈ سکرین کے پار دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ ایک لمبی آہ سینے میں اُتار کر وہ اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔

ان دنوں وہ میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت سے لطف اندوز ہو رہی تھی جن دنوں عمر حیات نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ شمالی علاقوں کی سیاحت کا پروگرام بنا لیا۔ زمین کے بکھیڑوں کو دیکھنے کیلئے اس نے اپنے چھوٹے ماموں رضوان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ماموں رضوان پینتیس کے سن میں تھا۔ خاصا ہنس مکھ، وجیہہ اور باوقار شخص تھا؛ نیک منش بھی۔ فائزہ سے پتہ چلا کہ وہ چودہ پندرہ برسوں سے ملتان شہر کے کسی سرکاری سکول میں پڑھا رہا تھا۔ عمر حیات کے علاوہ خاندان بھر میں کسی کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عمر حیات کی درخواست پر سکول سے چھٹیاں لے کر حویلی آ گیا تھا۔

وہ ہر شام کو دارے پر بیٹھنے کے بجائے صحن میں چند دادر نوکروں سمیت سبھی افراد کو اکٹھا کر لیتا۔ بی بی بھی اپنا بڑا سا موڑھا نکلوا لیتی۔ رضوان سب کو مذہب پر بڑے دل آویز لیکچر دیتا۔ اس کی مذہبی معلومات پر چندو حیران ہو جاتی۔ ایسے میں وہ ایک ٹک اُس کے خوب صورت چہرے، سیاہ اور نفیس انداز میں تراشیدہ داڑھی اور محراب دار فراخ پیشانی کو دیکھے جاتی۔ اپنی تعلیمی استعداد کے مطابق کچھ پوچھ بھی لیتی جس کا جواب رضوان بڑے مشفقانہ انداز میں دیتا۔ وہ ابتدائی چند دنوں میں ہی چندو کے دل میں کسی اونچی مسند پر براجمان ہو گیا اور اس کی دھیمی دھیمی آواز سیدھی دل میں اُترنے لگتی تھی۔ چندو ہر روز بے چینی سے شام کے ڈھلنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ شاید اس کی تدریس کا اعجاز تھا کہ وہ پنج گانہ نماز ادا کرنے لگی تھی۔ فائزہ پہلے سے ہی اس معمول پر کاربند تھی۔

ایک شام فائزہ نے رضوان کو مخاطب کر کے کہا، ''ماموں! آپ تو پورے مولوی بن گئے ہیں۔''

وہ مسکرایا، ''تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ بھئی! ہر انسان کو پورا نہ سہی، کم سے کم آدھا مولوی تو ہونا چاہیے ناں۔ ہر کلمہ گو اس قابل تو ہو کہ اپنے مرنے والے باپ کی نمازِ جنازہ پڑھا سکے۔ اُسے کسی کا منہ تو دیکھنا نہ پڑے۔ میں سکول میں پڑھانے کے بعد محلے کی مسجد میں امامت اور ہفتہ وار خطابت کے فرائض سرانجام دیتا ہوں۔ صبح دم بیسیوں بچے میرے صحن میں چڑیوں کی طرح چہکتے ہیں۔ توتلی موتلی زبانوں سے قرآن پڑھتے ہیں تو ایک عظیم سا سکون میرے دل میں اُتر جاتا ہے۔''

فائزہ ہنسی، ''وہ تو ٹھیک ہے ماموں! مگر آپ اپنے لیے کوئی مولوائن بھی تلاش کر لیں ناں!''

وہ مسکرایا۔ سر جھکا کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ ایسے میں اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے

دانوں کے گرنے کی رفتار دگنی ہوگئی۔ پھر آسمان کی طرف چہرہ اُٹھا کر بولا، ''بیٹیوں کو ایسی باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔''

چندو بولی، ''ماموں! کیا آپ شادی نہیں کریں گے؟''

''ایں..... کہاناں.....''

نورین نے بات کاٹ دی، ''ماموں! کیا شادی فرض نہیں ہے؟''

''بیٹی! یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم جس موضوع پر بات کر رہے تھے، آپ اسی سے متعلقہ سوال پوچھیں۔'' رضوان نے بڑے پیار سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شادی کے موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چندو کے دل میں ایک بے عنوان سی ہمدردی پیدا ہوئی۔ رات کو فائزہ سے پوچھنے لگی، ''ماموں رضوان کی اب تک شادی کیوں نہیں ہوئی؟''

فائزہ نے کہا، ''گیس کرو تو!''

وہ کچھ سوچ کر بولی، ''میرا خیال ہے انہیں اپنے مطلب کی لڑکی نہیں ملی۔''

فائزہ نے سر ہلایا، ''نہیں چندو! ایسی بات نہیں ہے۔'' فائزہ کے لبوں پر آزردہ سی مسکراہٹ ابھری، ''ماموں شہر کے کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ ویسے تو اب بھی بڑے ہینڈسم ہیں مگر مولوی بننے سے قبل تو بہت زیادہ ہینڈسم، شوخ اور شرارتی ہوا کرتے تھے۔ خاندان بھر کی لڑکیاں انہیں دیکھ کر دل پر ہاتھ رکھ لیا کرتی تھیں۔ مگر پھر ایک ٹریجڈی ہوگئی۔''

''وہ کیا؟'' چندو بیڈ میں اُٹھ بیٹھی۔

''شہر کے ایک نہایت غریب خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی نے ماموں کے دل میں گھر کر لیا۔ وہ سیکنڈ ائر میں پڑھا کرتی تھی۔ دونوں میں بڑا طوفانی قسم کا رومانس چلا۔ میرے ننھیال کو پتہ چلا تو بھونچال آ گیا۔ جانتی ہو کیوں؟'' فائزہ نے اُس کے تجسس کو ہوا دی۔

''کیوں؟'' اس نے فائزہ کا ہاتھ تھام لیا، ''اس لیے کہ لڑکی غریب تھی۔''

''نہیں.....'' فائزہ بولی، ''بلکہ اس لیے کہ لڑکی کا باپ موچی تھا۔ عمر گیٹ میں تھڑے پر بیٹھ کر جوتے گانٹھتا تھا۔ چونکہ میرا ننھیال اونچے نام ونسب والا خاندان تھا، اس لیے وہ کمین کا رشتہ لینے پر موت کو ترجیح دیتا تھا۔ بی بی اماں سمیت سبھی افراد نے ماموں کے خلاف محاذ کھڑا کر لیا۔ نانا ابو نے جوان اولاد کا خیال کیے بغیر انہیں سارے خاندان کی موجودگی میں جوتوں سے پیٹا۔ گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ ماموں نے یہ تضحیک برداشت کی۔ لب پر کوئی شکوہ نہ رکھا

اور گھر سے چلے گئے۔ تعلیم چھوٹ گئی۔ ایک دم امارت سے غربت میں گر گئے۔ اپنی محبوبہ کے پاس گئے۔ تب تک میرے نانا جان نے غریب موچی کو بلا کر اُس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ اس نے ماموں کو انکار کر دیا۔ محبوبہ بھی رُخ پھیر گئی۔ تب ماموں مجنوں ہو گئے۔ پاگلوں کی طرح شہر کی گلیوں میں پھرنے لگے۔ اس دوران بوڑھے موچی نے بیٹی کو اپنے بھتیجے سے بیاہ کر علی پور بھیج دیا اور ماموں دلبرداشتہ ہو کر گھر لوٹنے کے بجائے ملتان چلے گئے۔''

چندو بے آواز سانسیں لے رہی تھی۔ جلدی سے بولی، ''پھر؟''

''پھر کیا؟'' فائزہ نے منہ بسورا، ''ماموں بہت دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ ملتان میں انہیں سرکاری نوکری مل گئی۔ بارہ سال غائب رہے۔ دو تین سال قبل انہیں نانی اماں تلاش کر کے گھر لے آئیں۔ وہ ایک رات گھر رہے، پھر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد سال چھ ماہ میں ایک چکر لگا لیتے ہیں گھر کا۔ ہمارے گھر بھی آ جایا کرتے ہیں۔ بابا سمیت خاندان کے ہر شخص نے بہت کوشش کی کہ وہ شادی کیلئے رضامند ہو جائیں مگر وہ نہیں مانے۔ شادی کا تذکرہ ہوتے ہی اُٹھ جاتے ہیں یا سختی سے روک دیتے ہیں۔''

''کیا تمام عمر ایسے ہی رہیں گے؟'' چندو حیرانی آمیز دکھ سے بولی۔

''لگتا تو ایسے ہی ہے۔''

''کیا خیال ہے؟ ہم کوشش کر دیکھیں۔ ہو سکتا ہے مان جائیں۔'' چندو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ویری گڈ آئیڈیا! اگر ہم انہیں منانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو بلاشبہ خاندان میں ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔''

''خیر..... یہ تو الگ بات ہے۔ مجھے وہ بہت پیارے انسان لگتے ہیں تبھی یہ خیال میرے دل میں آیا۔'' چندو نے کہا۔

''او کے ڈارلنگ!'' فائزہ نے ایک ادا سے آنکھیں چندھیا کر کہا اور ٹی وی کے ریموٹ کنٹرول سے کھیلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ بولی، ''چندو! پرسوں سے فلم آئی پڑی ہے۔ دیکھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ کیا خیال ہے، عیاشی کر لی جائے؟''

چندو فوراً ہی ہم خیال ہو گئی۔ اس نے قالین پر بیٹھ کر بیڈ کے نیچے سے وڈیو کیسٹ نکالی اور وی سی آر میں ڈال دی۔

علی الصبح دونوں لان میں بیٹھی تھیں۔ رات کی فلم زیرِ بحث تھیں۔ فائزہ کو ہیروئن کا لباس پسند آیا تھا۔ چندو کو ہیرو کے بولنے کا انداز اچھا لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں فائزہ کی نظر رضوان پر پڑ گئی۔ حلق کے بل چیخی، ''ماموں! کم آن پلیز!''

وہ حویلی سے نکل کر دارے کی طرف جا رہا تھا۔ کیکر کی مسواک سے دانت صاف کر رہا تھا۔ آواز سن کر پلٹا اور لان میں آ گیا۔ فائزہ نے گھاس پر اپنی چادر پھیلا دی۔ وہ چادر اکٹھی کر کے گھاس پر بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا، ''نہیں بیٹا! ایسا نہیں کرتے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔''

فائزہ مسکرائی، ''کیا بیٹی بھی یہ کہہ سکتی ہے کہ اُس کا باپ اس قابل نہیں ہے؟''

وہ لاجواب سا ہو گیا۔ بولا، ''مجھے بلایا تھا؛ خیریت تھی؟''

فائزہ نے کن انکھیوں سے چندو کو دیکھا۔ جھجکتی ہوئی بولی، ''چندو ماہی آپ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔''

اس کی استفہامیہ نظروں نے چندو کا احاطہ کیا۔ پوچھا، ''ہاں بیٹی! بتاؤ، کیا پرابلم ہے؟''

چندو گڑبڑا گئی۔ فائزہ کو غصہ بار نظروں سے گھورنے لگی۔ رضوان نے اپنا سوال دہرایا تو وہ سر جھکا کر بولی، ''ماموں! میں ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ آپ میری درخواست مان لیں گے تو میں کچھ کہنے کی جرأت کرتی ہوں ورنہ لب بستہ رہتی ہوں۔''

رضوان نے کہا، ''گھبراؤ نہیں بیٹا! بولو۔ میں تمہاری درخواست پر غور کروں گا۔''

''غور نہیں..... عمل!'' وہ امید بھرے لہجے میں بولی۔

''او کے! کوشش کروں گا۔''

''نہیں ماموں! ایسے نہیں..... میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں کہ آپ میری بات مانیں گے۔''

رضوان چونک گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ مسواک والا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ سر جھکا کر بولا، ''چندو! تم بہت پیاری ہو۔ اللہ تمہیں اور حسن دے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو مگر بیٹی! میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ بری طرح چونکی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر سننے والے نے سمجھ بھی لیا تھا۔ بولی، ''ماموں! کیا پہلے بھی کسی بیٹی نے آپ سے یہ مطالبہ کیا ہے؟''

اس نے کہا، ''ہاں! میرے خاندان کو شاید اس کے علاوہ مجھ سے کچھ درکار نہیں ہے۔''

''یعنی آپ نے کئی بیٹیوں کو انکار کر دیا ہے۔ مجھے بھی کر دیجئے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔'' چندو نے پینترا بدلا، ''آپ مانیں یا نہ مانیں، میں کہنا چاہتی ہوں کہ آپ شادی کر لیجئے۔''

اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔ کہا، ''نہیں!''

چندو اور فائزہ بحث پر کمر بستہ ہو گئیں۔ وہ گفتگو میں ان سے ہارنے والا نہیں تھا مگر دم بدم پسپائی اختیار کرتا جاتا تھا۔ گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت گزر گیا۔ دھوپ سر پر آ گئی۔ رضوان لڑکیوں کو مطمئن نہ کر سکا کہ ایک عورت کی بے وفائی یا حالات کی ایک مرتبہ کی بے رُخی کو پتھر پر کندہ کر کے تارکِ دنیا ہو جانا چاہیے۔ بے بس ہو گیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو ایک دم بگڑ کر منکر ہو گیا۔

چندو کا چہرہ دھوپ میں تمتمانے لگا تھا۔ عارض اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے اور لب بے حد سرخ..... ایسے میں اُس کا حسن قاتل بن جایا کرتا تھا۔ اُس نے تھک کر اپنے ہاتھ جوڑے اور شکست خوردہ انداز میں کہا، ''ماموں! اگر آپ میری بات مان لیتے تو مجھے نئی زندگی مل جاتی۔ اس خاندان میں مقام مل جاتا۔''

اُس نے کچھ اس بے بسی سے کہا کہ رضوان دل تھام کر رہ گیا۔ اُسے دیکھنا ہی قیامت ثابت ہوا۔ کئی لمحوں تک ایک ٹک دیکھتا رہا پھر لمبی سانس لے کر بولا، ''او کے! اگر تمہیں میری شادی سے اتنی ہی خوشی ہوتی ہے تو میں سر جھکا لیتا ہوں۔''

اچانک دھوپ میں بارش برسنے لگی۔ اُس کا چہرہ گل و نور کی آماجگاہ بن گیا۔ جوش سے فائزہ کے گلے لگ گئی، لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''دیکھا فائزہ! ماموں نے میری بات مان لی ناں!''

فائزہ کے روم روم سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ بولی، ''تم بڑی لکی ہو چندو!''

رضوان کی نظریں چندو کے خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے پر کچھ دیر جمی رہیں، پھر ہٹ گئیں۔ وہ بھی اُٹھ گیا۔ گراسی پلاٹ سے نکل کر روش پر جا کھڑا ہوا۔ پلٹ کر دیکھے بغیر بولا، ''زندگی میں پہلی بار مجھے ہارنے میں بھی لطف آیا۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ فائزہ بولی، ''مجھے یقین نہیں آتا کہ ماموں ضد کیے بغیر اتنی جلدی مان گئے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے ننھیال نے آج تک بھرپور کوشش ہی نہیں کی تھی۔''

''نہیں چندو! ایسی بات نہیں ہے۔ بابا نے بڑی کوشش کی تھی۔ دو دن یہاں رکھا۔ اس دوران یہی قصہ چھڑا رہا مگر ماموں لاتعلقی سے بیٹھے ہوں ہاں کرتے رہتے تھے۔ سچ کہتی

ہوں۔تمہاری آنکھیں بولتی ہیں اور مقابل کو بولنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔''

چندو نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈالیں اور پھر دونوں بی بی اماں کو خوشخبری سنانے کیلئے اُٹھ گئیں۔

رضوان کی شادی کیلئے رضامندی کی خبر حویلی میں آگ کی طرح پھیلی۔ رضوان کی دل سے تکریم کرنے والوں کو جہاں خوشی تھی وہاں حیرت بھی تھی کہ جو بات خاندان کے بڑے نہ منوا سکے، وہ چندو نے منوا دکھائی تھی۔ فائزہ نے چندو کو کریڈٹ دینے میں رائی بھر بخل سے کام نہ لیا۔ شام کو حسبِ معمول جمنے والی محفل میں ہمیشہ خاموش بیٹھ کر رضوان کی باتیں سننے والی بی بی اماں بچوں کی طرح خوشی سے چہک رہی تھیں۔ دل میں چھپے ہوئے اس کے ارمان لبوں پر مچل رہے تھے۔ اس نے چشمِ تصور میں چھوٹے بھائی کے سر پر سہرا باندھ لیا تھا۔ اب نوکروں اور بیٹیوں کو خیالی پلاؤ پکا کر پیش کر رہی تھی کہ کیسے حویلی سجائی جائے گی، کتنی دھوم دھام سے برات روانہ ہو گی اور کیا کچھ پکایا کھلایا جائے گا۔

صفیہ نے رنگ میں بھنگ ڈالا، ''اماں! آپ تو ایسے پروگرام ترتیب دیے بیٹھی ہیں جیسے ماموں کی شادی حویلی میں ہوگی۔''

بی بی نے ناک بھوں چڑھائی، ''کیا حویلی میں میرے ویر کی شادی نہیں ہوسکتی؟''

''ہوسکتی ہے مگر نانا جان اور بڑے ماموں آسمان سر پر اُٹھالیں گے۔''

بی بی کو ایک ذرا چپ لگی پھر ہاتھ نچا کر بولی، ''اُٹھاتے رہیں۔ پروا نہیں۔ میں اپنے ویر کو اپنے ہاتھوں سہرا باندھوں گی۔ برات لے کر جاؤں گی۔ یہ خوشی میری حویلی میں ہی منائی جائے گی۔ آج اگر میر صاحب زندہ ہوتے تو جشن کا سماں ہوتا۔ فخر سے ان کی چھاتی پھول گئی ہوتی۔''

نورین نے چٹکی بھری، ''فکر نہ کریں بی بی جی! اب آپ کی سانس پھول جائے گی۔ نانا جان کو آپ ہم سے بہتر جانتی ہیں۔ گالیاں دینے پر آتے ہیں تو صبح سے شام ہو جاتی ہے مگر مجال کہ ایک لمحے کو چپ ہوں۔''

فائزہ اور صبا نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تو بی بی بجھ سی گئی۔ اپنے پیٹ کی جائیوں سے جیت نہیں سکتی تھی۔ بھائی نے اپنی بہن کو مشکل میں دیکھا تو مدد کیلئے میدان میں کود پڑا، ''آپ سب لوگوں کا کہنا بجا مگر میں بھی چاہوں گا کہ میری شادی باجی کی حویلی میں سرانجام پائے۔''

سبھی رضوان کا منہ تکنے لگیں۔ چہرے پر عزم اور سچائی دکھائی دی تو حیران ہوئیں۔ فائزہ نے پوچھا، ''ماموں! آپ نے یہ فیصلہ کیا سوچ کر کیا ہے؟''

وہ متانت سے بولا، ''میں کوشش کے باوجود ابھی تک اماں اور بابا کی مہربانی کو بھول نہیں پایا اور اَب ان لوگوں کو زحمت نہیں دینا چاہتا۔''

چندو نے محسوس کیا کہ رضوان کے لہجے میں سنگین نفرت کے پرتو جھلملا رہے تھے۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا محبت اتنے ہی طاقتور جذبے کا نام ہے کہ برسوں بعد بھی اِس کا زہر بجھ نہیں پایا۔ ننھی منھی چھیڑ خانیوں کے بیچ نورین نے سب کو خاموش کرا کر تجسس مہمیز کرتے ہوئے کہا، ''خیالی پلاؤ پکانے سے پہلے یہ تو سوچ لیا جائے کہ دلہن کہاں ہے؟''

سبھی کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ شادی کی فلم میں ہیروئن کا کردار غائب تھا۔ بی بی نے کہا، ''میں نے دلہن کے بارے سوچ لیا ہے۔ چاند سی دلہن لاؤں گی اپنے ویر کیلئے۔ کئی لڑکیاں میری نظر میں ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک.....''

ایسے ہی وقت میں رضوان نے سر جھکا کر کہا، ''نہیں باجی! سب کام آپ کی مرضی سے ہوں گے مگر دلہن کون ہوگی؟ یہ فیصلہ میں کروں گا۔''

بی بی مارے خفت کے خاموش ہو گئیں۔

فائزہ نے پوچھا، ''کیا آپ کی نظر میں کوئی ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو سبھی لڑکیاں اپنے اپنے انداز میں کریدنے لگیں۔ جب مایوس ہو کر بیٹھ رہیں تو رضوان نے کہا، ''دو چار دنوں میں عمر حیات آ جائے گا۔ میرے ملتان جانے سے پہلے اسی جگہ پر آخری محفل سجے گی جس میں بتا دوں گا کہ میری نظر میں کون ہے۔ تب تک اِس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا، پھر لمبی سانس لے کر بولا، ''آج میں آپ کو دوستی کے آداب اور باہمی تعاون کے بارے کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ اسلام اخوت اور بھائی چارے کی تلقین کرتا ہے۔ امن اور سلامتی.....''

پھر اُس نے کسی کو بیچ میں ٹوکنے اور موضوع بدلنے کی مہلت نہ دی اور بڑے دل نشین انداز میں بات سے بات نکالتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ محفل دس بجے تک جمی رہی۔

چندو اور فائزہ نے عشا کی نماز پڑھی۔ فائزہ کو چائے کی طلب ہوئی۔ چندو کو کچن میں بھیج کر رضوان کا بتایا ہوا وظیفہ دہرانے لگی۔ چندو چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھ کر کچن سے نکلی۔

سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ ایسے وقت میں رضوان بی بی کے کمرے سے نکلا۔ اُسے دیکھ کر رُک گیا۔

اس نے دوپٹہ درست کیا اور پوچھا، ''ماموں! چائے پئیں گے؟''

رضوان نے جواب دینے کے بجائے ٹرے میں سے ایک کپ اُٹھالیا۔ پیار سے دیکھتے ہوئے بولا، ''چندو! سونے سے پہلے چائے مت پیا کرو۔ ٹھیک طرح نیند نہیں آتی اور صحت بگڑ جاتی ہے۔ دودھ پیا کرو۔''

''جی!'' اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے چندو کا نام لیا تھا ورنہ ہمیشہ 'بیٹی' یا 'بابا' کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ بولا، ''فائزہ بیٹی کیا کر رہی ہے؟''

''چائے کا انتظار کر رہی ہے۔''

''ٹرے مجھے دو اور تم اپنے لیے چائے بنا کر کمرے میں آ جاؤ۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔''

اس نے چندو کے ہاتھ سے ٹرے تھامی اور سیڑھیاں چڑھ گیا جبکہ چندو نے کچن کا رُخ کیا۔

اپنا کپ اُٹھائے کمرے میں آئی تو فائزہ کو بیڈ پر جبکہ رضوان کو صوفے پر براجمان پایا۔ دونوں چائے پی رہے تھے۔ وہ فائزہ کے پہلو سے لگ بیٹھی۔ رضوان دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا، ''ٹی وی، وی سی آر اور فلمی دنیا انسانی خواہشات کو بتدریج بڑھاتی جاتی ہیں۔ انسان خواہشات کی دلدل میں دھنستا جاتا ہے اور اپنے خالق سے دور ہوتا جاتا ہے۔''

چندو بولی، ''ماموں! کیا مخلوق کا اپنے خالق سے ناتا ٹوٹ بھی سکتا ہے؟''

رضوان بری طرح چونکا۔ اُسے کئی لمحے دیکھنے کے بعد بولا، ''یہ تم نے کیوں پوچھا؟''

''سوری ماموں! شاید میں غلط بول گئی۔''

''ہاں! تم نے واقعی غلط بات کہہ دی۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ انسان لاپروائی اور غفلت کا مرتکب ہوسکتا ہے مگر ربِ کائنات بڑا مہربان، سمیع اور بصیر ہے۔ وہ اپنے بندے کی پل پل کی خبر رکھتا ہے اور بار بار توبہ کی طرف راغب کرتا ہے۔''

''ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور..... ایک نہیں کئی ایک..... میں اپنی علمی استعداد کے مطابق ضرور جواب دوں گا۔''

''جس شخص کے ماں باپ اُس پر ناراض ہوں، شکل دیکھنے کے روادار نہ ہوں، کیا وہ خدا کا ناپسندیدہ شخص ہوتا ہے؟''

سوال آسان تھا۔ پوچھنے والی کے چہرے کے تاثرات مشکل تھے۔ سوچ میں پڑ گیا۔ دل

شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ چائے پیتا رہا۔ کپ خالی ہو گیا تو آہستہ سے میز پر رکھ کر منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ یکے بعد دیگرے دونوں کی طرف منہ کر کے پھونک ماری۔ وہ جواب کی منتظر تھیں مگر کافی دیر خاموشی رہی پھر ایک لمبی سانس لے کر رضوان نے کہا، ''چندو! والدین کو ناراض کرنے والا خدا کو یقیناً ناراض کر بیٹھتا ہے مگر تم دل میلا نہ کرو اور تھوڑا وقت گزرنے دو۔ خدا تمہیں ضرور موقع دے گا کہ تم اپنے ماں باپ کو منالو۔ ہاں! جب کبھی خدا ایسا چانس دے، تب بزدلی نہ کرنا اور اَنا کی بھینٹ بھی نہ چڑھنا۔ ماں باپ اور خدا؛ سبھی مان جائیں تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔''

چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار رضوان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سحر چھپا تھا کہ کوشش کے باوجود نظریں ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ اس نے مزید کہا، ''چندو! تمہیں بہت بہادر بننا ہوگا ورنہ تم زندگی سے ہار جاؤ گی۔ زندگی سے ہارنا اور مرنا ایک جیسے عمل نہیں ہیں۔ یاد رکھنا؛ تم پر جھپٹنے کیلئے کئی مصیبتیں منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ ایک کے بعد ایک..... مگر مجھے یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ آخر کار تم جیت جاؤ گی؛ ایک نہ ایک دن..... اور پھر تم بہت ظلم کرو گی۔ بہت سی نیکیاں بھی تمہارے کھاتے میں پڑیں گی..... اور ایک نیکی..... صرف ایک نیکی تمہیں زمین سے اُٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر لے جائے گی۔ کب؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔''

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے اختیار رضوان کی طرف کھنچ گئی۔ اس کے برابر صوفے میں بیٹھ گئی۔ رضوان نے اُس کا دوپٹہ بالوں کی طرف دھکیلا۔ پیشانی پر لکھی ہوئی کوئی نادیدہ تحریر لفظ لفظ پڑھتا رہا۔ ہاتھوں کو باری باری پکڑ کر دیکھتا رہا۔ انگلیوں اور انگوٹھوں کی پوروں کو ٹٹولتا رہا پھر تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا، ''چندو! محبت کے بارے کیا جانتی ہو؟''

وہ شرما گئی۔ سر جھکا کر بولی، ''سچی ہو تو عبادت؛ ورنہ گناہ۔''

''سچ اور جھوٹ کا تعین کیسے ہوگا؟'' رضوان کی باتیں سیدھی دل پر چوٹ لگانے لگی تھیں۔

''جس محبت میں لالچ اور ہوس نہ ہو، وہ سچی ہوتی ہے۔''

''لالچ؟..... ہوس؟..... یہ کیا ہیں؟''

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ بولی، ''میں آپ کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی ماموں!''

اس نے وفورِ شفقت سے کہا، ''چندو! محبت انہی دو جذبوں کا ہی تو نام ہے۔ لالچ کیا؟

دیکھنا، ملنا، سوچنا اور پانا..... بس۔ اور ہوس کیا؟ کھو دینے کی رغبت۔'' اس نے چندو کی آنکھوں میں جھانکا پھر از خود نفی میں سر ہلا کر بولا، ''نہیں! محبت اپنی ہستی کو تج دینے کا نام ہے؛ مگر کیا تمہاری ہستی تمہاری تخلیق ہے جسے تم اپنی مرضی سے کسی اُجلے نظر آنے والے چہرے پر قربان کر دو؟..... نہیں! محبت کسی ایک کیلئے ہر انسان کو نظر انداز کرنے کا نام ہے؛ مگر کیا حقوق العباد کا یہی فلسفہ ہے؟..... نہیں! محبت کچھ اور ہے۔ کیا ہے؟ میں لفظوں میں اس جذبے کا احاطہ تو نہیں کر سکتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت خدا تک، اپنے تخلیق کار تک پہنچنے کی پہلی سیڑھی ہے۔ اب تم سوچ رہی ہو گی کہ محبت انسان سے کی جاتی ہے؛ خدا کا اس سے کیا تعلق؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ فائزہ بھی اس دوران اُٹھ کر قریب آ گئی۔ کسی صوفے پر بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چندو کے گھٹنوں سے کمر ٹکا کر قالین پر بیٹھ گئی اور توجہ سے سننے لگی۔

رضوان کہہ رہا تھا، ''جب تم کسی بھی تخلیق کے حصار میں داخل ہو گی تو تم براہِ راست تخلیق کار سے جڑ جاؤ گے۔ یہیں کہیں فنا فی الذات اور فنا فی اللہ کی منزلیں ہیں۔ تم جس کسی پر بھی اپنی صلاحیتیں مرکوز کرو گی، تمہاری نظروں اور خالق کے بیچ تخلیق حائل نہیں رہے گی۔ وہ ٹرانسپرنسی بن جائے گی اور تمہیں چند قدم آگے دھکیل دے گی۔''

چندو اور فائزہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ رضوان نے کہا، ''خالق کی تخلیقات کا سلسلہ لامحدود ہے۔ یعنی تمہاری قوتوں کا ارتکاز ایک وقت آنے پر پوری دنیا کو ٹرانسپرنٹ کر دے گا۔ تب تمہیں وہ سب کچھ بھی نظر آنے لگے گا جو باقی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گا۔ یہی محبت کا ماحصل ہے۔''

چندو نے دھڑکتے دل سے پوچھا، ''کیا میں محبت کر سکتی ہوں؟''

فائزہ نے کہنی ماری۔ چندو نے نظر انداز کیا۔ رضوان نے فائزہ کی حرکت دیکھ لی۔ ایک ذرا مسکرا کر بولا، ''یہ لاینحل سوال ہے۔ محبت ایک لمحے کا ماحصل ہے۔ وہ لمحہ کس کو کب ملتا ہے، یہ اُوپر والا جانتا ہے۔''

''کیا آپ اس محبت کا تذکرہ کر رہے ہیں جو آپ نے موچی کی بیٹی سے کی تھی؟'' فائزہ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

رضوان کے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ چہرہ پل بھر کو متغیر ہوا۔ سنبھل کر بولا، ''ہاں! شاید وہی محبت تھی جو اُس نے کی تھی۔''

''مگر اُس نے تو آپ سے بے وفائی کی تھی۔''

''یہ تمہیں کس نے کہہ دیا؟ وہ کون ہوتی تھی بے وفائی کرنے والی؟'' رضوان کے جملے سخت تھے مگر لہجہ بے حد نرم اور ملائم تھا۔ بولا، ''کوئی اپنا کر بادشاہ بنتا ہے۔ کوئی چھوڑ کر بادشاہ بنتا ہے۔ یعنی یہ طے ہوا کہ محبت کرنے والے کا کردار بے معنی ہوتا ہے۔ اصل کردار محبت ہے اور محبت بادشاہ گر ہوتی ہے۔ سنو! بادشاہی کیا ہے؟ کیا امارت کا نام ہے؟ سخاوت کا؟ نہیں..... حقیقی بادشاہی اُوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ نیچے مجاز بٹتا ہے۔ مجاز کیا ہے؟ جھوٹ؟..... نہیں۔ حال اور مستقبل کا کسی بھی نقطے پر سنگم ہے۔ موچی کی بیٹی، جو اِس وقت ریں ریں کرتے ہوئے چار بچوں کی افلاس ماری ماں ہے، نے مجھے بادشاہ کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میری بھول ہو۔ میں ابھی تک ویسا ہی تہی داماں ہوں، جیسا پہلے تھا مگر کچھ تبدیلی رونما ضرور ہوئی ہے۔ مجھے کچھ نیا نظر آنے لگا ہے۔''

''کیا نظر آنے لگا ماموں؟'' چندو حیرت سے بولی۔

''میں اسے لفظوں میں نہیں ڈھال سکتا۔''

''آپ مجھے کچھ بتا رہے تھے۔'' اس نے یاد دِلایا۔

''ہاں! مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم چھوٹی مصیبتوں سے نکل کر بہت بڑی مصیبت میں گھرنے والی ہو۔ تم لاعلم ہو۔ میں لاعلم نہیں ہوں۔ تم رائی بھر مصیبت سے ڈر گئی ہو جبکہ آگے بڑے پہاڑ ایستادہ ہیں۔''

چندو کا دل دہشت سے دھڑکنے لگا۔ جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔

''چندو! تم پناہ میں نہیں، نباہ میں ہو۔ عنقریب مفاہمت کا یہ رشتہ بھی ٹوٹ جائے گا اور تم بے آسمان ہو جاؤ گی۔ بے زمینی کا شکار پہلے ہی ہو۔ محبت، جس کا دم بھرتی ہو، گالی بن کر دماغ کے پردے پھاڑنے لگے گی۔ ہاں! تمہیں اپنے حسن کی تاب و تمکنت بھی عذاب محسوس ہوگی۔ زندگی سے موت مانگو گی مگر..... یا خدا رحم! زندگی کے دامن میں موت بھی تو نہیں ہوتی ناں! یہ تو بہت کنگال ہوتی ہے۔'' رضوان کا لہجہ بھرا سا گیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

چندو کا حال 'کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' جیسا ہو گیا۔ بے اختیار کانپتی گرفت میں رضوان کا ہاتھ بھینچ کر بولی، ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے ڈر لگنے لگا ہے ماموں!''

رضوان کی آنکھوں میں ترحم جاگا۔ دھیرے سے بولا، ''کاش! میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا۔

ہاں! ایک نکتہ بتا سکتا ہوں۔ سن لو۔ کبھی سمجھ آ جائے گا۔ انسان زندگی سے ہارتے ہوئے خدا پر ایمان کی دولت گنوا بیٹھتا ہے۔ پھر آگے کا نہیں رہتا؛ پیچھے کا بھی نہیں۔ تم جس وقت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاؤ کہ خدا نہیں ہے؛ مشکل تو ہے مگر تب صدقِ دل سے خدا کی وحدانیت اور ہویت پر یقین کر لینا۔ پھر دیکھنا؛ وہ کیسے تمہارا ہاتھ تھامتا ہے۔ وہ تجھ پر کسی بھی شخص کو سائبان کر دے گا۔ ضروری نہیں کہ وہ شخص نیکوکار ہو۔ بہت برا بھی ہو سکتا ہے مگر وہ تمہیں بادشاہ کر دے گا اور تمہارے ہر دکھ کا مداوا ہو جائے گا۔ تمہیں اپنے والدین کو منانے کا موقع بھی مل جائے گا۔ یہ مت سوچنا کہ تمہارے والدین کون ہیں؟ وہی ہیں؛ جنہوں نے تمہیں پالا پوسا۔ بس! کوئی اور نہیں..... وہ راضی ہو گئے، سمجھو خدا راضی ہو گیا۔ تب محبت تمہارا دیدار کرنے آئے گی۔''

چندو نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا، ''عمر حیات؟''

رضوان کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ بولا، ''عمر حیات مجھے تمہاری زندگی میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تو بچھڑنے والا ہے؛ ہمیشہ کیلئے۔ میں جس کا تذکرہ کر رہا ہوں، وہ کوئی اور ہے۔''

چندو کا دل بیٹھ گیا۔ گلے میں کانٹے چبھنے لگے۔ بولی، ''ماموں! بددعا تو نہ دیں پلیز!''

رضوان کے لبوں پر بے رحم مسکراہٹ ابھری۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اُس نے 'تڑاخ' سے اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر زور سے مارے، بولا، ''میں کون ہوتا ہوں بددعا دینے والا..... یا خدا رحم!..... میں شاید غلط کہہ گیا۔ میں بہت گنہ گار ہوں۔ اپنے لیے دعائیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں مگر تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں فیصلہ کار نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو تمہاری کوئی مدد نہ کر پاتا۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب بھی وقت کی ہتھیلی پر لکھا ہے۔ کبھی پڑھ لینا۔ اور سنو! میں جس محبت کی بات کر رہا ہوں، وہ ابھی بہت دور ہے..... بہت دور۔ ابھی نظر نہیں آئے گی۔''

فائزہ نے ترحم آمیز نظروں سے چندو کی طرف دیکھا اور رضوان سے پوچھا، ''چندو اُسے کیسے پہچانے گی؟''

''عاشق اور بادشاہ کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔'' رضوان نے وثوق سے کہا، ''عشق تو ذات ہے۔ پہچان ہے۔ پہچان کے خال و خط نہیں ہوتے مگر کامل وجود ہوتا ہے جسے اپنا تعارف نہیں کرانا پڑتا۔''

''پھر بھی؟''

''وہ بھٹکتا ہوا آئے گا۔ اس کی حالت ایسی ہی ہوں گی جیسے کسی بھی ہارے ہوئے سپاہی کی

ہوتی ہے۔''

''کیا چندو کی اُس سے شادی ہوگی؟''

رضوان کے لبوں پر عجیب اور بے عنوان مسکراہٹ ابھری۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔

کوئی جواب نہ پا کر چندو نے کہا، ''فائزہ! خاموش ہو جاؤ۔ کیا میرے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ تمہارا بھائی مجھ سے بچھڑنے والا ہے۔''

رضوان نے آنکھیں موندے انکار میں سر ہلایا، کہا، ''نہیں بابا! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟''

فائزہ بولی، ''ماموں! میں سمجھ رہی ہوں کہ آپ کے نزدیک وہ بادشاہ ہے جس پر اللہ راضی ہو جاتا ہے۔ کیا چندو بھی بادشاہ ہوگی؟''

وہ ٹھٹک کر آزردگی سے بولا، ''ہاں! یہ بادشاہ ہوگی مگر اِسے عشق نہیں، وقت مسند پر بٹھائے گا۔ یہ خود پر ظلم کرنے والوں کی گردنوں پر پاؤں رکھے گی۔ اور ہاں! اسے ایک بادشاہ بھی زندگی کی کسی نہج پر ملے گا۔ گھڑی دو گھڑی کیلئے۔''

فائزہ نے دل پر ہاتھ رکھا۔ بولی، ''ماموں! ایک بات اور..... ذرا سا کھل کر بتا دیں کہ چندو کے ساتھ کس قسم کے حالات پیش آنے والے ہیں؟''

یہ سوال مشکل تھا۔ شاید جواب اُس سے بھی کہیں کٹھن تھا۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ چہرے پر اذیت کے آثار ابھرے۔ بے بسی آمیز بیزاری سے بولا، ''بیٹی! میں زبان نہیں دے سکتا ان مناظر کو جنہیں میری چشمِ تصور دیکھ رہی ہے۔ یا خدا رحم!..... بس! کچھ اور بتانے کیلئے میرے پاس کچھ نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ بولا، ''تم سو جاؤ۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ میں نے صبح کھاد لینے شہر جانا ہے۔''

''محبت، جو چندو کو ملے گی، اس کی کوئی نشانی؟ پلیز ماموں.....''

فائزہ نے پائنچہ تھام لیا۔

وہ چند لمحوں تک آنکھیں موندے کھڑا رہا۔ پھر باری باری دونوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ غم بار تھی۔ داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اُٹھا کر اپنی بند آنکھ پر رکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ پھر ایک لفظ ادا کر کے خاموش ہو گیا۔ وہی لفظ محبت کی نشانی تھی۔ چندو کے دل پر نقش ہو گئی۔

چندو مزید بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس کی زبان گنگ ہو گئی اور سر جھک گیا۔ سسکنے

گئی۔ فائزہ خاموشی سے اُٹھ کر بیڈ پر جالیٹی۔ چندو ماہی کچھ دیر تک اپنے نصیبوں کو روتی رہی۔ رضوان کی باتوں کو دل میں دہراتی رہی پھر نڈھال قدموں چلتی ہوئی بیڈ تک آئی۔ فائزہ کے پہلو میں بے جان انداز میں گر گئی۔ رضوان کی باتوں نے اُس کا دل دہلا دیا تھا۔ وہ جوتشیوں، پیروں فقیروں اور نجومیوں کی دنیا سے ناشناسا تھی۔ ان کی کہی ہوئی باتوں پر اعتقاد نہیں رکھتی تھی مگر دل بے اختیار رضوان کی باتوں کو پلو سے باندھ بیٹھا تھا۔ فکر دور کی باتوں کا زیادہ نہ تھا اور قریب کے دکھ سے جان سلگنے لگی تھی۔ عمر حیات کے بچھڑنے کی خبر خون چوس رہی تھی۔ وہ شب بھر ٹھیک طرح سے سو نہ پائی۔ علی الصبح جائے نماز پر گر گئی۔ گڑگڑا کر رحم کی استدعا کرنے لگی۔ جھولی پھیلا کر دینے والے سے محبت کی بھیک مانگنے لگی۔

فائزہ نے اُس کے ہچکیوں کی تال پر جھٹکے لیتے وجود کو بانہوں میں بھر لیا۔ پیار سے کہا، ''ماموں مذاق بھی کر لیا کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ میرا بھائی تمہیں چھوڑ دے؟ نہیں چندو! وہ تمہارے حسن کا دیوانہ ہے اور تمہارا حسن بجھنے والا تو نہیں ناں! بھائی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو واقعہ ابھی تک رونما نہیں ہوا، ہوتا نظر بھی نہیں آتا، اس پر دل کو دکھی کرنے کا کیا فائدہ؟''

وہ سسک کر بولی، ''ہائے فائزہ! اگر عمر حیات مجھ سے روٹھ گیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔''

فائزہ بنا کچھ بولے اُسے سینے سے لگا کر بہلاتی رہی۔

چندو عمر حیات کی واپسی تک کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتی رہی۔ برف پیروں سے انگاروں پر چلتی رہی۔ اس کی کوشش کے باوجود رضوان نے اُس رات کے بعد اُسے علیحدگی میں وقت نہ دیا۔ اس سے کھنچا کھنچا رہا۔ وہ جب بھی اُسے دیکھتی، دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ رضوان نے نہ تو اُس سے مذاق کیا تھا اور نہ جھوٹ ہی بولا تھا۔ جو بھی کہا تھا، اپنے علم اور کسی اندرونی طاقت کی بنا پر ہی کہا تھا۔

عمر حیات گھر پہنچا تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ عشا کے وقت گھر پہنچا تھا۔ بی بی کے کمرے میں سبھی گھر والے اُس کے گرد جمع ہو گئے اور وہ مزے مزے سے اپنے پندرہ روزہ ٹرپ کی دلچسپیوں کا احوال سنانے لگا۔ پھر تھک گیا اور جماہیاں لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی محفل برخاست ہو گئی۔

فائزہ نے پہلے سے دیکھی ہوئی ایک فلم وی سی آر میں ڈال دی۔ چندو کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی رہیں مگر ذہن کے پردوں پر عمر حیات ثبت تھا۔ وہ خاصا نکھر گیا تھا۔ رنگت بھی

دودھ کی طرح صاف ہوگئی تھی۔ دل اُس کی طرف کھنچ رہا تھا۔

ایک بجے فلم ختم ہوئی۔ فائزہ نے جماہی لی۔ کہا، ''سو جاؤ میری جان! فلم ختم ہوگئی ہے۔''

''فائزہ! کیا میں میرزادے سے ملنے چلی جاؤں؟''

''کیا مطلب؟'' فائزہ کی سستی ہوا ہوگئی، ''اگر بی بی کو پتہ چل گیا تو مار مار کر بھرکس نکال دیں گی۔''

''پلیز فائزہ! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ تم نے ماموں رضوان کی باتیں سنی تو تھیں۔'' اس کے لہجے میں التجا گھل گئی۔

''ایسی باتوں کو دل پر نہیں لیا جاتا بھئی! آرام سے سو جاؤ۔ کل دن میں اپنے دیوانے سے مل لینا۔ اُسے بھی قرار آ جائے گا، تمہیں بھی۔'' فائزہ نے کروٹ بدل لی۔

چند و تھوڑی دیر خاموش رہی، پھر بولی، ''فائزہ! چند منٹ کی اجازت مانگ رہی ہوں۔ پلیز! زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔''

وہ قدرے بیزاری سے بولی، ''اچھا ٹھیک ہے۔ جاؤ! مگر جلدی آ جانا۔ خیال رکھنا۔ بی بی اماں کے کان بہت تیز ہیں۔''

وہ اچھل کر بیڈ سے اُتری۔ قدموں کی آہٹ کے خوف سے ننگے پیروں چلتی ہوئی گراؤنڈ فلور پر بی بی کے ساتھ والے کمرے کے دروازے تک آئی۔ انگلی کی ضرب سے مدھم سی دستک دی۔ کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ تھکا ہوا دیوانہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے پھر دستک دی۔ وہ بیدار ہوگیا۔ آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر آیا۔

اُسے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ کمرے میں لا کر سرگوشی کے انداز میں پوچھنے لگا، ''خیر تو ہے؟ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

اس نے عمر حیات کے ہاتھ پکڑ لئے۔ وارفتگی سے چوم کر رونے لگی۔ وہ مزید گھبرا گیا۔ وہم ہوا کہ کسی نے اس کی عدم موجودگی میں کچھ ایسا ویسا تو نہیں کہہ دیا تھا۔ دروازہ بند کر کے اُسے بیڈ تک لایا۔ بٹھا کر ہولے ہولے پوچھنے لگا۔ وہ رضوان سے ہونے والے گفتگو سنانا چاہتی تھی مگر یوں لگا جیسے اُس کی قوتِ گویائی سلب کر لی گئی تھی۔ کچھ نہ بتا سکی تو بے چارگی سے بولی، ''تم مجھے چھوڑ دو گے؟''

اس کے لبوں پر جاندار تبسم ٹھہر گیا۔ بھانپ گیا کہ وہ اُس کی غیر موجودگی پر اداس ہوگئی تھی۔

بانہوں میں بھر کر پیار کرنے لگا۔ ایسے میں اچانک اُسے محسوس ہوا کہ چندو کا بدن غیر معمولی سرد تھا۔ وہ اس کی وارفتگی کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اندیشوں بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی، ''میر زادے! میں نے کیا پوچھا ہے؟''

وہ بولا، ''میں تمہیں چھوڑ کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

وہ نفی میں سر ہلا کر رونے لگی۔ عمر حیات ہر طور سے یقین دلانے میں ناکام رہا تو زچ ہو کر بولا، ''چندو! میں لمبے سفر سے آیا ہوں۔ تھکا ہوا ہوں۔ مجھے پریشان نہ کرو اور صاف صاف بتاؤ؛ کیا بات ہے؟''

وہ کھڑی ہو گئی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ ماموں رضوان نے جس لڑکی سے محبت کی تھی، وہ باپ کا نام رکھتی تھی مگر کمین زادی تھی۔ اسی بنا پر ٹھکرا دی گئی۔ میری پیشانی پر تو باپ کا نام تک لکھا ہوا نہیں ہے۔ مجھے حویلی کی دلہن نہیں بنایا جائے گا۔''

عمر حیات نے چندو کا چہرہ ہاتھوں میں لیا۔ سخت لہجے میں کہا، ''کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟''

''خدا کے بعد تمہی پر تو دل بھروسہ رکھتا ہے۔''

''پھر ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟''

''اپنی اوقات دیکھتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں۔''

''اگر تمہاری اوقات اتنی ہی پست ہوتی تو میں تمہیں اپنی پلکوں پر نہ بٹھاتا۔ اب جاؤ، سو جاؤ، اور مجھے بھی سونے دو۔ فضول نہ سوچا کرو۔'' اس نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔

وہ روہانسی ہو کر بولی، ''دھکے تو نہ دو۔''

اس نے چندو کے کان سے منہ لگایا، ''اپنی خیر مناؤ اور بھاگ جاؤ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر ضبط کیے کھڑا ہوں۔''

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ تڑخ کر جواب دیتی۔ نڈھال قدموں سے میر زادے کی تنہائی سے نکل آئی۔ فائزہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ جونہی دروازہ بند کر کے بیڈ پر لیٹی تو فائزہ نے اُسے دونوں ہاتھ لیا۔ لبوں کو چھو کر بولی، ''دیوانے نے یہاں محبت کا سجدہ کیا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ فائزہ نے سوال بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گال کو چھوا۔ اس کے انکار پر مسکرائی۔ شرارت سے بولی، ''پھر کیا کہا اس نے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

فائزہ اُسے گدگدانے لگی۔ چھیڑتے ہوئے پیش قدمی کرنے لگی۔ لب جان آ کر تھم گئی۔ چندو نے پیار سے ڈانٹا، ''ایسا کچھ نہیں کہا تیرے بھائی نے..... ہٹو! مجھے سونے دو۔''

اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ سوچنا چاہتی تھی۔ سوچنے کیلئے بھی کچھ نہیں تھا۔ اُسے ایک طرح سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ عمر حیات کو کھونے والی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں اور کیسے اُسے چھوڑے گا۔ کسی کے بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ یوں جیسے کسی کے مرنے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ مگر اسباب کو مدنظر رکھ کر آنی کو ٹالے جانے کی کوشش تو کی جا سکتی تھی۔ پھر اُس نے رضوان کے کردار اور عمر حیات کے ہیجان کو ترازو کے پلڑوں میں رکھا۔ دماغ کہتا تھا کہ عمر حیات کی بات مانی جائے۔ دل کہتا تھا کہ رضوان کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی، اس کی بات کو سچ سمجھا جائے۔ ترازو کے پلڑے برابر ہو گئے۔ کش مکش نے سانسیں دوبھر کر دیں۔ رات ایسے تیسے کٹ گئی۔

اگلے دن رضوان نے حساب کتاب عمر حیات کے حوالے کیا۔ شام تک جانے کی تیاری میں مصروف رہا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر چندو اور فائزہ بھی لگے بندھے معمول کے مطابق صحن میں آ گئیں۔ سبھی جمع تھے مگر وہ نہیں تھا جو رونقِ محفل ہوا کرتا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد اپنے کمرے سے نکلا۔ اس نے اپنا سیاہ رنگ کا بیگ اُٹھا رکھا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ صحن سے سیدھا اپنی منزل کی طرف چلا جائے گا۔

جب اپنے مخصوص موڑھے پر بیٹھ گیا تو بی بی نے گلہ کیا، ''ایسی بھی کیا جلدی ہے رضوان! دو چار دن تو ٹھہر جاتے۔''

''باجی! ہر آنے والے کو جانا ہے۔ جلد یا بدیر۔ پھر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی اُداسی رچی ہوئی تھی، ''عمر! گاڑی تیار ہے؟''

''جی ماموں! نواز آپ کو ملتان چھوڑ آئے گا۔''

''ناحق تکلیف کی۔ میں شہر سے ویگن پکڑ لیتا۔''

''اس وقت شہر سے کوئی ویگن نہیں ملتی۔'' عمر حیات نے کہا، ''ویسے بھی اس میں تکلیف کی

کوئی بات نہیں۔ اگر گھر میں گاڑی نہ ہوتی تو مجبوری تھی۔''

لڑکیاں کچھ اور سننا چاہتی تھی۔ صفیہ بولی، ''ماموں! آج آپ کا یہاں آخری دن ہے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جاتے ہوئے بتائیں گے کہ آپ نے کس لڑکی کو اپنے لیے پسند کیا ہے۔''

وہ بولا، ''میں تم لوگوں کی بے چینی دیکھ رہا ہوں۔''

عمر حیات سیاق وسباق سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کے استفسار پر بی بی نے چندو کے کارنامے کو تھوڑا بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ عمر حیات کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ چندو کو دیکھ کر فخر سے بولا، ''تم نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔''

رضوان نے اُس کی بات سنی ان سنی کی، بولا، ''ہاں! میں تھوڑی دیر بعد یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ لوگوں کی خوشی یا دُکھ کی مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی کیونکہ ان مرحلوں سے میری زندگی عرصہ پہلے گزر چکی ہے۔ شاید اپنے خاندان میں بہت کم آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہاں صرف ایک ہی سوال میری تاک میں رہتا ہے۔ 'شادی کب کرو گے؟' میں اگر شادی نہیں کرنا چاہتا تو کیوں سب لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ سمجھ نہیں آتی۔ سمجھنا چاہتا بھی نہیں۔ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ لوگ سمجھ جائیں تو آپ کا فائدہ ہوگا وگرنہ میرا کسی بھی صورت نقصان نہیں ہوگا۔''

چندو گڑبڑا سی گئی۔ کوئی خوشی کی خبر اس تمہید کے ساتھ نہیں دیا کرتا۔ یوں لگا جیسے اُس کی محنت اکارت گئی تھی۔ رضوان بدل گیا تھا۔ وعدہ خلافی پر مائل تھا۔ کہہ رہا تھا، ''چندو ماہی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ زرینہ، غریب موچی کی بیٹی، کے بعد یہ دنیا بانجھ نہیں ہوگئی۔ دنیا محبت سے خالی نہیں ہوگئی۔ اس نے بہت دلیلیں دیں۔ بہت اونچی باتیں کیں۔ یہ بھی کہا کہ کیا خدا نے انسان کو صرف ایک ہی انسان سے محبت کا حکم دیا ہے؟ کیا ایک انسان کیلئے اپنا تن من دھن تج دیا جائے تو تخلیقِ انسان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے یا ایک کے مرنے کے بعد دوسرے آنے والے کیلئے دل کے دروازے بند کر دیے جائیں؟..... مجھے اس کملی کی ہر بات ماننا پڑی کیونکہ میرے پاس اِسے قائل کرنے کیلئے اس وقت کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی۔''

فائزہ نے پوچھا، ''تو کیا آپ نے اب کوئی ٹھوس دلیل تلاش کر لی ہے؟''

رضوان نے اثبات میں سر ہلایا، کہا، ''بلاشبہ!''

اس کی آواز میں کچھ ایسا نیا پن تھا کہ سبھی متفکر ہو گئے مگر کسی نے اُس کی بات میں دخل دینا

مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بولتا رہا، ''زرینہ میری محبت تھی اور مجھے آج بھی اِس محبت پر کوئی ندامت نہیں۔ اِس پر بھی شرمندہ نہیں ہوں کہ اُس نے مجھے چھوڑ کر اپنا گھر بسالیا۔ بچے جن لیے۔ دنیا والوں کے نزدیک بچے جننا ہی تو محبت کا حاصل ہے۔ ہر باپ بچہ پیدا کر کے ہواؤں میں اُڑنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اُس نے کوئی تیر مارا ہو، کوئی نیا کام کیا ہو مگر وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا کے نوے فیصد مرد باپ بنتے ہیں اور مر جانے پر اپنا نام تک کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ نام، جس کیلئے انہوں نے نر بچے جنے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے تو نام کی ضرورت نہیں؛ اولاد کی احتیاج نہیں اور میں اپنے گھمنڈ پر زندگی گزار کر خاموشی سے مر جانا چاہتا ہوں۔ پھر تم لوگوں کو میری شادی کی فکر کیوں ہے۔''

ایک عجیب سا حزن اُس کے لہجے میں گھل گیا۔ توقف کے بعد سر اُٹھا کر بولا، ''یہاں رہ کر مجھے پتہ چلا کہ عمر حیات نے بے نام و نسب والی لڑکی کیلئے اپنے گھر بار کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ میں نے اپنی باجی کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ منافقوں کی دنیا ہے۔ بڑی بہن ماں کے رتبے پر فائز ہوتی ہے اور ماں..... ایک ماں کو بھی اولاد کی خوشیوں پر نام و نسب کو فوقیت دیتے دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے۔ میری ماں کو توہین کا احساس ہوا تھا جب میں نے اپنے لیے موچی زادی چنی تھی۔ باجی کو ملال ہے کہ اُس کے بیٹے نے ایک حرامزادی کو حویلی کی رانی بنانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔''

بی بی نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔ بولا، ''میں پوری ذمہ داری سے سچ بول رہا ہوں؛ کوئی دخل نہ دے۔ جب میں چلا جاؤں، تب سب لوگ اپنی بھڑاس نکال لیجئے گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ یہ دنیا منافقوں کی جنت ہے۔ بہنیں بھائی کو چاہتی ہیں مگر بھائی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتیں۔ اور بھائی! وہ ایک ہی وقت میں دو کشتیوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہے۔ ماں کی محبت کو بھی سمیٹنا چاہتا ہے۔ جائیداد کو مٹھی میں رکھ کر محبت کی دولت پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ چندو ماہی اور عمر حیات ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اُوپر طے پانے والے فیصلوں کے بارے کچھ نہیں جانتے۔ کون ہارتا ہے؟ کون جیتتا ہے؟ یہ اوپر والا ہی جانتا ہے۔ اپنی بساط پر انسانوں کو مہرے بنا کر کھیلتا ہے۔''

سبھی ایک ٹک اُسے دیکھ رہے تھے۔ چاند اُس پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ اُس کے خال و خد کو اجال کر بڑا پراسرار بنا رہا تھا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اُتار کر بولا، ''چندو بضد تھی کہ میں شادی کر لوں۔ گھر بسالوں۔ جب میں نے حامی بھر لی تو سبھی لوگوں کے چہرے خوشی سے دمکنے

لگے۔ ہر چہرہ منافقت کے رنگوں سے سج گیا۔ کسی کو میری خوشی سے کچھ لینا دینا نہیں؛ سبھی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ میری زندگی کیلئے بہترین فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے مشورے کو مان لیا جائے۔''

چندو نے فوراً مزاحمت کی، ''ماموں! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ ہم واقعی آپ کو خوش اور آسودہ دیکھنا چاہتے ہیں۔''

فائزہ نے تائید کی پھر سبھی نے اپنا دفاع کیا۔

وہ مسکرا کر بولا، ''میں ابھی ثابت کرنے والا ہوں کہ آپ لوگ میری خوشی کیلئے ہرگز سنجیدہ نہیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ میری خوشی کی خاطر کون اپنی جان دے سکتا ہے؟''

اُس کا سوال نہ صرف غیر دانش مندانہ تھا بلکہ غیر متوقع بھی تھا۔ عمر حیات متردد ہوا، ''ماموں! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میری خوشی کی قیمت ادا کرنی پڑے تو کیا آپ لوگ ادا کریں گے؟''

بی بی نے جھٹ کہا، ''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ حکم کرو میرے ویر! میری جان بھی حاضر ہے۔''

اس نے عمر حیات کی طرف دیکھا۔ وہ بولا، ''ماموں! سچ کہتا ہوں۔ مجھے سب کچھ لٹا کر آپ کو خوش دیکھنا پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گا۔''

اُس نے باری باری سبھی کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔ ہر کسی نے کم و بیش انہی الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ رضوان نے سب کچھ سن کر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ایسے میں اس کا ہاتھ بیگ کے چوڑے ربن سے کھیلتا رہا۔ فیصلہ کن انداز میں سر اُٹھا کر بولا، ''ٹھیک ہے۔ فرض کیا کہ مجھے یقین آ گیا ہے۔ آپ لوگوں نے یہ یقین بھی دے دیا ہے کہ نہ صرف انسان کیلئے ایک محبت پر اکتفا کرنا لازم نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ میں زرینہ کی محبت سے دست بردار ہو کر کہتا ہوں کہ میں چندو ماہی کو اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں اور آپ لوگوں کی قربانی کا منتظر ہوں۔''

چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ بم پھٹ جاتا تو شاید اتنی حیرت اور دکھ نہ ہوتا جتنا دکھ رضوان کی بات سن کر ہوا تھا۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخی، ''ماموں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

عمر حیات ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رضوان کو دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے کوئی بات تک نہیں نکل پائی تھی۔

''ہاں! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ زرینہ، چندو، عمر حیات..... کسی ایک پر اکتفا کرنا دانش مندی نہیں۔ دوسرے کی خوشی پر اپنی خوشی کو قربان کرنا قربِ الٰہی کا سبب بنتا ہے۔ آپ سب لوگ قربِ الٰہی کی تمنا میں یہ قدم اُٹھائیں اور مجھے سچی خوشی دے دیں۔ یہی مجھے چندو نے سمجھانے کی کوشش کی تھی؛ فائزہ نے بھی۔''

سبھی ہونقوں کی طرح رضوان کو دیکھ رہے تھے۔ اُس نے کتنی بے محل بات کہہ دی تھی!..... وہ ایک ایک چہرے کو دیکھ کر بولا، ''کیوں؟ کیا جان دینے والوں میں اتنا بھی حوصلہ نہیں کہ یہ چھوٹی سی قربانی دے دیں۔ جان دینا تو اعلیٰ ظرفوں کا کام ہوتا ہے۔ بادشاہوں کی شان ہوتی ہے۔''

عمر حیات کا سر جھک گیا۔ بولا، ''ماموں! یہ نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور مانگ لیں۔''

چندو کراہی، ''ماموں! میں آپ کو پوجنے لگی تھی۔ دیوتا سمجھ کر۔ آپ تو عام انسان سے بھی پست قامت نکلے۔''

بی بی نے کہا، ''رضوان! کیا تم اپنے ہوش میں ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے؟..... مجھے جیتے جی مارنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

وہ بہت ظالمانہ انداز میں مسکرایا، ''باجی! نشیمن اجڑنے والا ہے۔ تار ٹوٹنے والے ہیں۔ میں اس حویلی کی رونقیں ماند نہیں کرنا چاہتا۔ تم لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم لوگوں نے میری خاطر کیا قربانی دینی ہے۔ میں نے قربانی کا سبق پڑھا ہے۔ تبھی تم سب کیلئے اپنی جان کی قربانی دے رہا ہوں مگر تم لوگ قبول کرنے سے گریزاں ہو۔''

چندو اُسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ جتنا اچھا لگتا تھا، اتنا ہی برا لگنے لگا تھا۔ عمر حیات نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور کہا، ''ماموں! اس موضوع پر کوئی بات نہ کیجئے۔ مجھے آپ کی اصلیت جان کر دُکھ ہو رہا ہے۔ آپ کو یہ خیال بھی نہیں رہا کہ میں آپ کا بھانجا ہوں۔ چندو بھی آپ کو ماموں کہتی ہے۔ بیٹیوں جیسی ہے۔ کاش! آپ نے اس گری ہوئی خواہش کا اظہار نہ کیا ہوتا۔''

لفظ لفظ میں اہانت تھی مگر سننے والے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بیگ اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

بولا، ''چندو! کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟''

چندو نے غیظ بھرے انداز میں کہا، ''ماموں! میں آپ کی بہت عزت کرتی تھی۔''

وہ بے رحمی سے مسکرایا، بولا، ''مگر اب نہیں کرتی ہو۔ ٹھیک ہے۔ عمر حیات! تم میری خاطر اپنی محبت سے دستبردار ہو سکتے ہو؟''

عمر حیات نے اُسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ برآمدے میں رُک کر پلٹے بغیر بولا، ''بی بی اماں! میں سونے لگا ہوں۔ آپ اپنے بھائی کو روانہ کر دیجئے گا۔''

رضوان بیگ اُٹھائے کھڑا تھا۔ قدم بیرونی دروازے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، ''چندو! بس..... قربانی، محبت اور حقوق العباد..... بہت بلند آدرش ہیں مگر جو شخص اپنی جان پر نہ کھیل سکے، اُسے کسی کے جذبات سے کھیلنے کا بھی کوئی حق نہیں ہوتا۔ یا خدا رحم! یا خالق مدد!''

اس کا لہجہ بڑا عجیب یاس بھرا تھا۔ اس نے ہاتھ اُٹھایا، 'خدا حافظ' کہا اور اطمینان سے چلتا ہوا حویلی سے نکل گیا۔ جس وقت پوٹھوہار جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی، سبھی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ تب سمجھ میں آئی کہ تازیانہ مارنے والا چلا گیا تھا۔

شاید ہمیشہ کیلئے!.....

صفیہ نے لمبی سانس لی، کہا، ''ماموں کو اتنی بڑی بات کہتے ہوئے ذرا بھر حیا نہ آئی۔''

بی بی نے ڈانٹا، ''چپ رہو۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو گیا؟''

چندو کا دل ابھی بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

فائزہ بولی، ''بی بی اماں! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ماموں بہت بڑے انسان ہیں۔ ایسے شخص سے اتنی گھٹیا بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

نورین کچکچا کر بولی، ''میرا بس چلے.....''

فائزہ نے جھٹ لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہا، ''نہیں..... اس سے آگے کچھ بھی مت کہنا۔ آپ لوگوں نے سوچا نہیں ورنہ سمجھ جاتے کہ ماموں کتنی بڑی بات کہہ گئے ہیں۔ سمجھا گئے ہیں کہ اُنہیں شادی کیلئے کبھی مجبور نہ کیا جائے ورنہ وہ ایسا ہی تازیانہ ماریں گے۔''

چندو سے بیٹھا رہنا محال ہو رہا تھا۔ گھسٹتے قدموں اپنے کمرے میں آئی۔ بیڈ پر گر کر پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے رضوان کی بات سن کر شدید دھچکا لگا تھا۔ فائزہ بھی اُس کے پیچھے چلی آئی۔ اُسے روتا دیکھ کر بولی، ''چندو! ماموں کے بارے میں غلط مت سوچو ورنہ نقصان اُٹھاؤ گی۔ کیا تمہارا دل مانتا ہے کہ رضوان نے اتنی فضول بات دل سے کہی ہوگی؟''

اس نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا۔

فائزہ بولی، ''تو پھر روتی کیوں ہو؟ ماموں نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ محبت وحدانیت کی قائل ہے اور انسانی زندگی کیلئے ایک ہی محبت کافی ہوتی ہے اور بس..... نجانے تم لوگ اتنی سیدھی سی بات کو سمجھنے سے قاصر کیوں ہو۔''

فائزہ کی بات دل کو لگی۔ واقعی رضوان کی زبان پر اُس کا نام آیا تھا۔ آنکھوں نے اُسے نہیں مانگا تھا۔ کیا اُس نے صرف اپنا پلو چھڑانے کیلئے اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا؟..... اس بات پر یقین کرنے کو جی نہیں مان رہا تھا۔ پھر کیا تھا؟..... وہ کیا سمجھانا چاہتا تھا؟..... اس نے کس قربانی کا ذکر کیا تھا جو وہ حویلی کے مکینوں کی خاطر دینے کو تیار تھا؟..... ابھی ذہن کو اتنی پختگی حاصل نہیں تھی کہ سمجھ آتی۔ چندو سمجھنے کیلئے خاموش ہوئی تھی۔ نہ سمجھ کر پھر رونے لگی۔ لڑکیاں جوانی میں ایسی ہی جذباتی ہوا کرتی ہیں۔

❖❖○❖❖

عمر حیات پوٹھوہار کا انجن اسٹارٹ چھوڑ کر دوڑتا ہوا حویلی میں داخل ہوا۔ چندو ماہی کے کمرے میں پہنچا۔ فائزہ اور چندو اُس کی یوں آمد پر گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ فائزہ نے پوچھا، ''بھائی! خیر تو ہے؟''

وہ پھولی ہوئی سانسوں میں بولا، ''ہاں! چندو نے ملتان بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ پورے بورڈ میں..... میں گزٹ دیکھ کر آیا ہوں۔ اس کی تصویر بھی چھپی ہے۔''

چندو کا دل دھڑکنا بھول گیا، ''سچ؟''

اس نے جیب سے فوٹو کاپی نکالی۔ لہرائی اور جھومنے کے انداز میں پیروں کے بل لہرا گیا۔ بولا، ''تو کیا میں جھوٹی موٹی اتنا خوش ہو رہا ہوں۔ مبارک ہو چندو! پورے شہر میں تمہاری دھوم مچ گئی ہے۔''

اس نے جلدی سے فوٹو کاپی چھینی۔ دوسری پوزیشن دو لڑکیوں نے لی تھی۔ چوتھی تصویر اُس کی تھی۔ دھندلی تو تھی مگر پہچانی جاتی تھی۔ اپنا نام پڑھ کر یقین آ گیا۔ جی چاہا کہ ایک دم عمر

حیات سے لپٹ جائے مگر حیا مانع آئی۔ بے اختیار فائزہ سے چمٹ گئی۔ اُسے بانہوں میں بھینچ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ عمر حیات اُس پر فخر سے معمور نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا کیونکہ ابھی اُسے اتنی بڑی خبر بی بی اماں کو سنانی تھی۔

دیہات میں ایسی خبروں کو پر لگ جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دارے پر مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ عمر حیات نے نواز کو بھیج کر مٹھائی کے کئی ٹوکرے منگوا لیے تھے۔ ہر ایک کا منہ میٹھا کروا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چندو نے نہیں، اُس نے میدان مارا تھا۔

فائزہ اپنی بہنوں کے جھرمٹ میں آنے والیوں کی مبارک باد وصول کر رہی تھیں۔ باہر جشن تھا۔ چندو کے کمرے میں سسکیاں گونج رہی تھیں۔ اُسے گانمن، تاجاں اور سرداراں کا خیال آ گیا تھا۔ آج اگر وہ ان میں ہوتی تو وہ یہ خبر سن کر کتنے خوش ہوتے۔ خدا جانے یہ خبر ان تک پہنچی بھی تھی یا نہیں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نیچے آئی۔ ایک نوکرانی کو بلا کر عمر حیات کو بلا لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد کلف لگے کپڑوں میں عمر حیات اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ حیرانی سے سمجھا رہا تھا، ''اتنی بڑی خوشی پر رونا دھونا برا لگ رہا ہے۔''

وہ بولی، ''میر زادے! مجھے بابا کے پاس لے چلو۔ ایک بار..... اسے دیکھ لوں۔ اسے بتا دوں کہ اس کی چندو ماہی نے آج بورڈ میں تیسری پوزیشن لی ہے۔''

''چندو! خوشی کی روٹی میں کرک پڑ جائے گی۔''

''بھلے پڑ جائے؛ مجھے لے چلو..... ایک بار!'' اس نے التجا کی۔ عمر حیات رد نہ کر سکا۔ بولا، ''چادر پہن کر نیچے آؤ۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد پوٹھوہار جیپ بیٹ خیر پور کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پکی سڑک سے اُترتے ہی عمر حیات کو بریک لگانے پڑے۔ تنگ راستہ گانمن کی ریڑھی نے مسدود کر دیا تھا۔ جیپ کو دیکھ کر گانمن نے لگامیں کھینچ لیں۔ عمر حیات پر نگاہ پڑتے ہی آنکھوں میں برہمی عود کر آئی۔ تاجاں توت کا بنا ہوا ٹوکرا تھامے ریڑھی پر بیٹھی جیپ کو دیکھ رہی تھی۔

چندو جلدی سے نیچے اُتری۔ ریڑھی کے پاس گئی۔ خوشی سے چلائی، ''بابا! میں نے بورڈ میں تیسری پوزیشن لی ہے۔''

اچانک اُس کا پاؤں زمین پر پڑے ہوئے سرکنڈوں سے الجھا اور وہ منہ کے بل نیچے گر گئی۔ جلدی سے اُٹھی۔ گانمن کی طرف بڑھی۔ گانمن نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی لہرائی،

زور سے کہا، ''پراں دفع تھی وَنج نی تاں مار چھڑیساں!''

(پرے دفع ہو جاؤ ورنہ مار دوں گا۔)

وہ چابی کے کھلونے کی طرح رُک گئی۔ جسم میں خوشی سے بھر جانے والی چابی ختم ہو گئی۔ تڑپ کر بولی، ''بابا! مونجھی تھئی وڈی ہاں! کلیجے نال لاگھن..... نی تاں مر ویساں!''

(بابا! بہت اداس ہوں۔ سینے سے لگا لے ورنہ میں مر جاؤں گی۔)

گانمن کی آنکھوں میں نفرت بھر گئی اور عمر حیات کو مخاطب کر کے بولا، ''میر زادے! میرا امتحان نہ لے اور اسے یہاں سے لے جا۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔''

عمر حیات نے دروازہ کھول کر زمین پر قدم رکھا۔ کہا، ''گانمن! غصہ تھوک دے۔ چندو نے پورے علاقے میں دھوم مچا دی ہے۔ فخر سے تمہارا سر بلند کر دیا ہے۔''

''ہاں ہاں! میرا سر تو اُسی دن فخر سے بلند ہو گیا تھا جس دن یہ پیرو ماچھی کے ساتھ منہ کالا کر کے میرے بوہے (دروازے) پر نچ لائی تھی۔ پَر میرا اس سے کیا تعلق ہے؟'' گانمن کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی، ''اور تو اِسے یہاں کیوں لایا ہے؟''

اُس نے گدھے کو سرکنڈوں میں دھکیلنا چاہا مگر گدھا اَڑ گیا۔ اس نے لگام کو دو تین جھٹکے دیے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ریڑھی کو موڑنا چاہا مگر اتنی جگہ نہیں تھی۔ بے بسی آمیز نفرت سے بولا، ''میر زادہ! خدا کا واسطہ مان اور چلا جا۔ اس کمینی کو بھی لے جا۔ یہ میرے لیے مر گئی ہے اور مردے کبھی زندہ نہیں ہوا کرتے۔''

چندو ماہی کے بدن میں ایک ذرا جان آئی۔ جلدی سے ریڑھی کے پاس آئی۔ تاجاں کے پیر تھام کر ملتجیانہ انداز میں بولی، ''اماں! بابا کو سمجھا ناں! میں اِس کی چندو ماہی ہوں۔ کیا گھر آئی بیٹیوں کو اِس طرح دھتکارا جاتا ہے؟''

تاجاں نے پیر کھینچ لیے۔ منہ پھیر لیا۔ کہا، ''تم اُدھلی ہوئی ہو۔ اُدھلی ہوئی کی کوئی ماں نہیں ہوتی۔ کوئی پیکا نہیں ہوتا۔''

وہ کٹ کر رہ گئی۔ گانمن کے اکلوتے پاؤں کی طرف بڑھی۔ گانمن نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی بجلی کی سی مستعدی سے چندو کے ہاتھ پر دے ماری۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھی۔ ہاتھ کو اوپر تلے کئی جھٹکے دیے۔ زور سے چلائی، پھر بڑھی۔ گانمن کا ہاتھ برقی کوندے کی طرح نیچے آیا اور چندو کی کلائی جھنجھنا اُٹھی۔ درد اُسے پیچھے ہٹا نہیں سکتا تھا اور گانمن آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

چھڑی کی چار پانچ ضربوں نے نڈھال کر دیا۔ تھک کر زمین پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ عمر حیات دوڑ کر پاس آیا۔ کمر میں بازو حمائل کر کے اُٹھایا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں 'بابا' اور 'اماں' پکارتی ہوئی اس کی گرفت سے نکلنے کیلئے مچھلی کی طرح تڑپی مگر جیپ تک گھسٹتی گئی۔ عمر حیات نے اُسے سیٹ پر پھینکا تو بے جان انداز میں آدھی آنکھیں کھولے گانمن کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بولتی رہیں مگر گانمن کے کانوں کو نفرت کے پگھلے ہوئے سیسے نے بند کر رکھا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا۔ عمر حیات نے گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے پکی سڑک پر آنے میں چند لمحے لگائے۔ چاند کو گرہن لگ گیا۔ دل پر دکھ کا داغ لیے لوٹی تھی۔ شام کو پتہ چلا کہ گانمن کی چھڑی نے بڑی انگلی کا جوڑ ہلا دیا تھا۔ غنیمت رہا کہ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ شام کو علاقے کے معروف ہڈی جوڑ کو بلا لیا گیا۔ اُس نے مشاقانہ انداز میں ہاتھ کو سہلا کر ہڈی اپنی جگہ پر کھسکائی اور چوبی پیمانہ باندھ کر پٹی کر دی۔ درد تھم گیا مگر گانمن کا رویہ مضطرب کرتا رہا۔

ہفتہ بھر کے بعد رزلٹ کارڈ مل گیا۔ اسی رات فائزہ نے چند دِن پیشتر منگوائی جانے والی فلم نکال کر وی سی آر میں لگا دی۔ چندو کے پہلو میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ دبا کر بولی، ''چندو! یہ فلم میں نے خاص طور پر تمہیں دکھانے کیلئے منگوائی تھی۔ آج موقع ملا۔''

چندو خوش ہوئی۔ بولی، ''کوئی خاص بات؟''

''یہ ساری کی ساری خاص ہے۔ دیکھو گی تو جسم میں آگ لگ جائے گی۔''

چندو سمجھ نہ پائی۔ فلم کا انٹرو شروع ہوا تو وہ منہ بنا کر بولی، ''اوہ! یہ تو انگریزی فلم ہے۔ خاک سمجھ میں آئے گی۔''

فائزہ نے اُسے کھینچ کر مزید قریب کیا۔ ریموٹ کنٹرول تھام کر ٹی وی کو میوٹ موڈ پر کرتے ہوئے کہا، ''یہ سننے والی نہیں؛ دیکھنے والی فلم ہے۔''

چندو نے بے اختیار فائزہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ قربت نئی بات نہیں تھی مگر آنکھیں نئی نئی لگیں جو نہ سمجھ میں آنے والی شرارت سے لبریز تھیں۔ ایسے ہی وقت میں فلم پر سنہرے بالوں والا ایک نسوانی چہرہ نمودار ہوا۔ چندو بولی، ''ہیروئن سوہنی تو ہے۔''

فائزہ نے اُس کے گداز بدن کی قربت سے فائدہ اُٹھایا، چھیڑا اور کہا، ''ہیرو کو بھی دیکھنا۔''

''تم نے دیکھ رکھی ہے؟''

''کئی مرتبہ۔ ہر مرتبہ دیکھتے ہوئے نئی لگتی ہے۔''

چندو تھوڑا پیچھے کھسکی۔ فائزہ کے سینے پر سر رکھ کر ٹی وی سکرین کو گھورنے لگی۔ سنہرے بالوں والی ہیروئن کھڑکی میں کھڑی تھی۔ کھڑکی کے پار پہاڑی ڈھلان اور اونچے درخت نظر آ رہے تھے جن پر روئی کے گالوں کی طرح برف گر رہی تھی۔ لینڈ اسکیپ بڑا دل کش تھا۔ ہیروئن کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کسی کی منتظر تھی۔ اس کے منہ سے نکلنے والے بخارات کے مرغولوں سے بے پناہ سردی کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ دیر حسرت آمیز نظروں سے پہاڑی ڈھلوان کو دیکھنے کے بعد پلٹی۔ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر اپنا سراپا دیکھتی رہی۔ اپنے لانبے سونے کے تاروں جیسے بالوں سے الجھتی رہی۔ اس نے سفید رنگ کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ کسی خیال کے تحت اُس نے گاؤن کی ڈوری کھولی۔ ایسے ہی وقت میں کیمرہ اُس کے مچھلی جیسے پیروں پر فوکس ہوا۔ چند لمحوں بعد پیروں پر گاؤن گر گیا۔ پھر سکرٹ بھی نظر آیا اور کیمرہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔

بلندی پر بتدریج ہوا کا دباؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ پہاڑی چڑھتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینا پڑتی ہیں۔ چندو اور فائزہ ٹکٹکی باندھے سکرین کو دیکھ رہی تھیں۔ کیمرے کے سلوموشن میں اٹھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی سانسیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ پہاڑی پر پہنچ کر چندو نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔ تھکے تھکے انداز میں کہا، ''فائزہ! اسے نکال دو۔ یہ گندی فلم ہے۔''

فائزہ نے اُسے بانہوں میں بھرا۔ تھوڑا بھینچا۔ بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی، ''دیکھو تو سہی!''

ایسے ہی وقت میں ڈھلوان سے اُترتا ہوا گھڑ سوار دکھائی دیا۔ اس نے بڑا سا ہیٹ اور عجیب الوضع کوٹ پہن رکھا تھا۔ چندو کی سانسوں کو تھوڑا اعتدال ملا مگر جب وہ گھوڑا باندھ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا ہٹ کے اُس کمرے میں پہنچا جس میں ہیروئن ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے آپ کو دلاسے دے رہی تھی، چندو کی سانس رُکنے کو آ گئی۔ بے اختیار بولی،

''وہ..... وہ دیکھو فائزہ! ہیرو تو سیدھا اندر گھسا آ رہا ہے۔''

فائزہ کے ہاتھ میں مردانگی رَچنے لگی۔ وہ غیر محسوس انداز میں چندو کے حسن کی سلطنت میں پیش قدمی کرتے ہوئے بولی، ''تو کیا ہوا؟ بولو مت، دیکھتی جاؤ، کیا ہوتا ہے۔''

یہ کہہ کر اُس نے بایاں ہاتھ چندو کے لبوں پر رکھ دیا۔ ہیرو نے کمرے میں پہنچ کر ایک ذرا ہیروئن کو دیکھا، پھر ہیٹ اُتار کر ایک طرف پڑی ہوئی کرسیوں پر اُچھال دیا۔ اُس کے بعد چندو

زیادہ دیر تک نہ تو ٹی وی دیکھ سکی، نہ فائزہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن سکی بلکہ فائزہ کو بے دردی سے جھٹک کر بیڈ سے چھلانگ لگا کر اُتر گئی۔ کن اکھیوں سے ٹی وی کی جلتی ہوئی سکرین کو دیکھا اور تیزی سے بالکونی کی طرف دوڑی۔ چند لمحوں بعد وہ آم کے پتوں میں آدھی چھپ کر کھڑی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ آنکھوں میں ٹی وی اسکرین روشن تھی۔ اس نے سر جھٹکا۔ پیروں کو زور زور سے ریلنگ پر مارا۔ ایسے میں فائزہ نے پیچھے سے آ کر بانہوں میں بھر لیا۔ گردن اور کندھے کے بیچ اپنے جلتے ہوئے لب رکھے۔ مخمور لہجے میں سرگوشی کرنے لگی، ''اندر چلو ناں.....ابھی تو بہت کچھ دیکھنے کو باقی ہے۔''

وہ بہ دقت تمام بولی، ''نہیں فائزہ! تم دیکھو۔ میں یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہتی۔''

''ٹھیک ہے۔ اندر چلو۔ کوئی اور فلم لگا لیتے ہیں۔''

وہ نہیں مانی۔ فائزہ اُسے چھیڑنے کے بعد کمرے میں چلی گئی۔ بالکونی کے کھلے دروازے سے ٹی وی اسکرین سے پھوٹنے والی روشنی کا عکس نکل کر ریلنگ کے پائپ پر رقص کرتا رہا۔ چندو دیکھتی رہی۔ پھر آم کے ٹھنڈے پتوں کو ہیجانی انداز میں اپنے گالوں پر رگڑنے لگی۔ چند خراشیں بھی لگیں مگر اُسے تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ دہکتے ہوئے ماس پر پتے غیر معمولی ٹھنڈے لگ رہے تھے۔ عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ ریلنگ پر تھرکتی ہوئی روشنی کے معدوم ہونے تک وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ فائزہ رخسار کے نیچے کھلی ہتھیلی رکھے سو رہی تھی۔ اس کا بھولا بھالا چہرہ نظروں کو بھلا لگا۔ بے اختیار جھکی۔ گال چوما اور اُسے پھلانگ کر بیڈ پر دیوار کی طرف جا لیٹی۔ چور نظروں سے بند ٹی وی کو دیکھا۔ سکرین سیاہ تھی مگر اُس پر گویا وہی منظر ثبت تھا جسے دیکھ کر چندو کمرے سے بھاگ نکلی تھی۔ اُس نے بے اختیار آنکھیں موند لیں۔ غضب ہوا کہ بند آنکھوں میں پھر وہی فلم چلنے لگی۔

جوانی کی آگ بے قابو ہوتی ہے۔ جتنا پانی ڈالا جائے، اتنی بھڑک اُٹھتی ہے۔ وہ اپنی ذہنی رو کو بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی فلم کے بیچ کھڑی رہی۔ فائزہ نے کروٹ بدلی۔ قریب ہوئی۔ چندو دیوار کی طرف کھسک گئی۔ فائزہ چند منٹ بعد پھر اس کی طرف بڑھی۔ چندو کے پاس پیچھے ہٹنے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی، ناچار پہلو بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھ لگ گئی۔ انگریزی فلم کی ہیروئن بدل گئی۔ ہیرو بدل گیا۔ عمر حیات گھوڑا باندھ کر سیڑھیاں چڑھتا

دکھائی دیا۔ انسانی ذہن عجیب کرشمے دکھاتا رہتا ہے۔ جذبات سے کھیلتے ہوئے جسم کو توڑنے پھوڑنے لگتا ہے۔ وہ نیند میں ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔ شور کرتی سانسوں میں کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ فائزہ نے کہا تھا کہ ابھی دیکھنے کیلئے فلم میں بہت کچھ باقی ہے۔ اس 'بہت کچھ' کی تلاش میں عمر حیات کی بانہوں میں جھولتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

تجسس کا نشہ ابھی ٹوٹ نہیں پایا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک گونجی۔ اس کی نیند خواب کی جھولی میں پڑی ہمک رہی تھی۔ نہ ٹوٹ سکی۔ دروازے تک آنے والے نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ تیسری زوردار دستک نے اسے جگا دیا۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے دروازے کی سمت دیکھا۔ اپنے دونوں اطراف دیکھا۔ فائزہ نظر نہیں آئی۔ وہ کمرے میں بھی نہیں تھی۔ شاید باتھ روم میں گئی تھی۔

وہ اپنے بال درست کرتی ہوئی بیڈ سے اُتری۔ آج تک کوئی دروازے تک نہیں آیا تھا۔ بے اختیار لبوں سے نکلا، ''یا اللہ خیر!''

ایسے میں اُس کی نگاہ دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ اس وقت دروازے پر کوئی خیریت دستک کناں نہیں ہو سکتی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''کون؟''

''دروازہ کھولو!'' عمر حیات کی دھاڑتی ہوئی آواز سن کر وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اتنے غصے میں تو وہ اُس دن بھی نہیں تھا جس دن پہلی مرتبہ اُسے اپنے دوست کے مکان میں لے کر گیا تھا۔ اس نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لائٹ آف تھی۔ اُسے احساس ہو گیا کہ فائزہ باتھ روم میں نہیں تھی۔ کمرے میں بھی نہیں تھی۔

اس نے ہاتھ بلند کیا۔ چٹخنی اُتاری۔ پھر دروازے کا لاک ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ گھبرا کر بولی، ''خیر تو ہے؟''

دروازے کے عین سامنے عمر حیات کھڑا خون آشام نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔ اس کے عقب میں فائزہ اور صفیہ کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں پر بھی 'خیریت' درج نہیں تھی۔

عمر حیات نے قدم بڑھایا۔ چند و مارے گھبراہٹ کے راستہ دینا بھول گئی۔ عمر حیات نے اُسے زور کا دھکا دیا اور دندناتا ہوا بیڈ تک آیا۔ پلٹ کر دانت پیس کر بولا، ''تمہارے کمرے میں تھوڑی دیر پہلے کون تھا؟''

وہ سمجھ نہ پائی۔ بولی، ''فائزہ تھی۔ اور یہاں کس نے آنا تھا؟''

عمر حیات کی شعلہ بار نظریں فائزہ کی طرف اُٹھیں۔ غرایا، ''وہ تو صفیہ کے کمرے میں تھی۔ تمہارے کمرے میں کوئی مرد تھا جس کی آواز صفیہ اور فائزہ کو سنائی دی تھی۔ کون حرامزادہ یہاں تھا؟ تھوڑی دیر پہلے؟''

وہ بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ فائزہ سے پوچھ لو۔ وہ میرے ساتھ سوئی تھی۔''

فائزہ جھٹ سے بولی، ''مجھے کیا پتہ؟ میں تو باجی کے کمرے میں سو رہی تھی۔''

عمر حیات کے جبڑوں کے اعصاب کھنچ گئے۔ ہونٹ فرطِ اشتعال سے لرزنے لگے۔ ہاتھ بڑھایا۔ چندو کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر کھینچا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ پائی اور اس کے پیروں میں قالین پر گر گئی۔ جلدی سے اُٹھی اور کراہی، ''کیا ہوا ہے؟ خدا کیلئے مجھے کچھ بتاؤ تو سہی!''

عمر حیات اُسے پکڑے پیروں پر گھوما۔ بیڈ کی محرابی پشت کی طرف انگلی اُٹھا کر بولا، ''وہ قمیص کس کی ہے؟''

چندو نے دیکھا۔ جہاں وہ لیٹی تھی، وہیں بیڈ کے محرابی تختے پر آسمانی رنگ کی مردانہ قمیص لٹک رہی تھی۔ وہ بھونچکی رہ گئی۔ بولی، ''مم..... مگر مجھے تو نہیں پتہ..... یہ..... کس کی ہے؟''

اس نے فائزہ کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں عمر حیات کا زناٹے دار تھپڑ اُس کے رخسار پر پڑا۔ وہ تڑپ کر گری۔ بال آزاد ہو گئے مگر عمر حیات کے اوپر تلے کے تین چار ٹھڈوں نے اَدھ موا کر دیا۔ عمر حیات نے پھر بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ گھسیٹتا ہوا قمیص تک لایا۔ قمیص اُتار کر کانپتے ہاتھوں سے ٹٹولی۔ چندو کی پاسپورٹ سائز تصویر والا پرس، تین چار سو روپے اور ایک رقعہ برآمد ہوا۔ اس نے رقعہ کھولا۔ پڑھا۔ سرخ آنکھوں سے چندو کو دیکھا پھر اُسے گھسیٹتا ہوا کھلے دروازے سے گزر کر بالکونی میں لے گیا۔ ریلنگ پر جھکا اور نیچے دیکھا مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔

کمرے میں آ کر اُسے بیڈ پر پٹختے ہوئے بہنوں سے مخاطب ہوا، ''تم دونوں اپنے کمرے میں جاؤ۔''

اس کا لہجہ آتش بار تھا۔ دونوں بہنیں سہم کر دوڑ گئیں۔ وہ چند لمحوں تک کمرے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتا رہا پھر کمرے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ اپنے

کمرے سے سرچ لائٹ اٹھائی اور دوڑتا ہوا حویلی کے پچھواڑے میں آیا۔ آم کے پیڑ تلے جھک کر سرچ لائٹ کی روشنی میں کچھ دیکھنے لگا۔ جلد ہی اُسے پیڑ پر چڑھنے اور اُترنے والے کے مرد کے پیروں کے نشان مل گئے۔ بھاری کھیڑی کی ایڑی نرم زمین میں جابجا کھب گئی تھی۔ اس نے سر اُٹھا کر پیڑ کی طرف دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی پیڑ پر پھینکی۔ بالکونی کے پاس سے گزرتی ہوئی بڑی شاخ پر ایک مفلر اٹکا دکھائی دیا۔ یہ بالکونی سے نظر نہیں آیا تھا۔ پچھلے پہر کی خنکی کے باوجود اُس کا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

اس نے پھر اپنی توجہ کھرے پر مرکوز کی اور قدموں کے نشانات کے متوازی چلتا ہوا حویلی کی دیوار تک گیا۔ عزت کا نقب زن دیوار پھاند کر کہیں دور چلا گیا تھا۔ اس نے دیوار پھاندی۔ نقشِ پا پر چلتا ہوا حویلی سے کافی دور آ گیا۔ پھر کھرا پختہ سڑک پر چڑھ کر مٹ گیا۔ وہ حویلی میں جانے کے بجائے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اقامت پذیر امام بخش کھوجی کے ڈیرے پر پہنچا۔ اُسے جگا کر اپنے ساتھ لایا۔ اس نے ہنرمندانہ انداز میں کھرے کو پرکھا پھر متردد انداز میں بولا، ''نہیں میرزادے! میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس کا کھرا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ یہ بیٹ کے کسی چور ڈاکو کا کھرا نہیں ہے۔''

عمر حیات کے جبڑے بھنچ گئے، ''چاچا! پھر دیکھ، ہوسکتا ہے، کوئی نشانی مل جائے۔''

اس کے اصرار پر بوڑھا کھوجی پھر آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ایڑیوں اور پنجے کے دباؤ، قدموں کے باہمی فاصلے اور پَب کے رُخ کو جانچتا رہا، پھر مایوسی آمیز انداز میں سر ہلا کر بولا، ''میرزادے! یہ علاقے کے کسی بھی چور اُچکے کا کھرا نہیں ہے۔ یہ باہر سے آیا ہے یا پہلی واردات پر نکلا ہے۔ صبح آس پاس کے لونڈوں کو چلا کر دیکھنا پڑے گا۔''

عمر حیات نے بے بسی سے کہا، ''ٹھیک ہے۔ وہ میری نظروں سے چھپ نہیں سکے گا جس نے میری حویلی کی دیوار پھاندنے کی جرأت کی ہے۔ تم جا سکتے ہو۔''

کھوجی کے تجسس آمیز سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے جا کر نواز کو جگایا۔ کھوجی کو گھر پہنچانے کا حکم دیا اور خود چندو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی سسک رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر چونکی اور عمر حیات کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ عمر حیات نے اُس پر ایک سرد نگاہ ڈالی اور ٹی وی کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹی وی آن کیا پھر وی سی آر چلا کر 'پلے' کا سوفٹ ٹچ بٹن دبا دیا۔ چند لمحوں بعد سکرین پر ایک ہوش رُبا منظر روشن ہو گیا۔

وہ فلم نہیں تھی۔ قیامت تھی۔ قیامت کو سمجھنے کیلئے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے مگر وہ کافی دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ کانوں کی لویں تک دہکنے لگیں۔ زہر بار نظروں سے چندو کو دیکھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے ہچکیاں لے رہی تھی۔ اس نے وی سی آر بند کر کے کیسٹ نکالی۔ اُسے ایک نظر دیکھ کر چندو پر اُچھال کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ گیلری سے نکل کر ریلنگ پر جھک گیا۔ اسی وقت دارے پر روشنیاں دائروی شکل میں گھومیں اور سامنے والی دیوار پر ساکت ہو کر بجھ گئیں۔ نواز جیپ پر کھوجی کو گھر پہنچا کر واپس آ گیا تھا۔ عمر حیات حلق کے بل چیخا، ''نواز! جلدی سے میرے پاس آؤ۔''

اس کی درشت آواز رات کے سناٹے میں خطرے کا بگل بجا گئی۔ گیلری میں کمروں کے دروازے یکبارگی کھلے۔ چاروں بہنوں نے سراسیمہ انداز میں بھائی کی پشت کو دیکھا۔ وہ ریلنگ پر ہاتھ رکھے، ستون سے کندھا ٹکائے کھڑا تھا۔ لڑکیوں نے سر نکال کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر صفیہ نے ہمت کی، کہا، ''بھائی! ہوش سے کام لو۔ تمہاری آواز حویلی کے مینار گرا دے گی۔''

اس نے پلٹ کر بڑی بہن کو دیکھا۔ آنکھوں میں نہ دیکھی جا سکنے والی وحشت کا راج تھا۔ صفیہ نے فائزہ کو اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا اور بند دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔

نواز بھاگتے قدموں سے فرسٹ فلور پر آیا۔ اس کے پیچھے بی بی بھی چلی آئی۔ عمر حیات غرایا، ''نواز! تم انگریزی فلم لے کر آئے تھے؟''

نواز ان پڑھ آدمی تھا۔ سہم کر بولا، ''میں پرچی پر لکھی ہوئی فلم لاتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ فلم انگریزی ہے یا اردو۔''

''آخری مرتبہ تم پرچی لے کر کب شہر گئے تھے؟''

''تین چار دن پہلے جی!''

''تمہیں وہ پرچی کس نے دی تھی؟ فائزہ بی بی نے؟''

''نہیں جی..... چندو بی بی نے دی تھی۔''

''وہ پرچی تمہارے پاس محفوظ ہے یا تم نے ضائع کر دی؟'' عمر حیات زخمی سانپ کی طرح پھنکارا۔

نواز نے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔ جلدی جلدی جیبیں خالی کیں۔ کانپتے ہاتھوں سے پرچی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پرچی مل گئی۔ ڈرتے ڈرتے عمر حیات کی طرف بڑھائی۔ عمر

حیات نے پرچی دیکھی۔ آنکھوں میں انگارے بھر گئے۔ تصدیق طلب انداز میں بولا، ''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ پرچی تمہیں چندو نے ہی دی تھی؟''

نواز نے دل پر ہاتھ رکھا۔ مؤدبانہ انداز میں سر ہلایا۔ عمر حیات نے اسے دارے پر جانے کا حکم دیا۔ بی بی خاموش کھڑی بیٹے کے متغیر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ نواز کے جانے کے بعد مستفسر ہوئی، ''خیر تو ہے؟''

اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ بی بی پر ڈالی۔ بلند آواز میں فائزہ کو بلایا، پوچھا، ''تم آج اپنے کمرے میں کیوں نہیں سوئیں؟''

وہ سہم کر بی بی کے پیچھے چھپ گئی۔ بولی، ''باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئیں۔''

صفیہ نے دروازے سے جھانک کر تائید کی، ''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا اس لیے فائزہ کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔''

بی بی کے ماتھے پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تن گیا۔ اوپر تلے کئی سوال کیے۔ عمر حیات نے بی بی کو جواب دینے کے بجائے فائزہ سے پوچھا، ''کیا تم میں سے کسی نے بھی اُس بے غیرت کو نہیں دیکھا؟''

فائزہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اس کی آواز بھی نہیں پہچانی؟''

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، ''نہیں بھائی! وہ جو کوئی بھی تھا، بہت مدھم آواز میں بول رہا تھا۔''

اس نے ایک جھٹکے سے ریلنگ چھوڑ دی۔ بولا، ''بی بی اماں! ان سب کو اپنے کمرے میں لے جائیں اور وہیں سلا دیں۔ اوپر کوئی نہ آئے۔''

چاروں بہنوں نے کمروں سے نکلنے اور سیڑھیاں اُترنے میں دیر نہیں کی۔ بی بی نے عمر حیات کی کلائی تھام لی۔ پریشانی سے بولی، ''تجھے میری قسم عمر حیات! صاف صاف بتا؛ یہاں کیا تماشہ ہو رہا ہے۔''

وہ چند لمحوں تک پھنکارتا رہا۔ تیز تیز سانسیں لیتا رہا پھر دھیمی آواز میں بتانے لگا، ''چندو نے مجھے مار دیا ہے۔ آہ ہا! وہ حرام کی پھوئی ہی نکلی بی بی اماں!''

اس کی وحشت بھری آنکھوں میں موت کی خنکی پھیل گئی۔ بی بی کے اصرار پر بتانے لگا، ''فائزہ اور صفیہ نے مجھے بتایا کہ چندو کے کمرے سے کسی مرد کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں جلدی سے یہاں آیا۔ تین چار بار دستک دینے پر چندو نے دروازہ کھولا۔ اس دوران میری حویلی میں نقب لگانے والا بزدل چوہا اپنی قمیص بیڈ پر بھول کر بالکونی کے راستے بھاگ گیا۔ وہ پچھواڑے کی دیوار پھاند کر سڑک تک گیا۔ وہیں تک اُس کا کھرا ملا اور کھوجی نے اُس کا کھرا بھی نہیں پہچانا۔ چندو اس بے غیرت کے ساتھ حیا سوز فلم دیکھ رہی تھی اور اپنا منہ کالا کر رہی تھی۔''

بی بی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ فرطِ دکھ سے بولی، ''ہائے میر جی! آپ کے جانے کے بعد مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ اس پاک صاف حویلی میں گندگی کی پوٹ تعفن پھیلانے لگی ہے۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔''

ساتھ ہی عمر حیات کو کھینچا۔ وہ ڈگمگا گیا۔ بی بی کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا مگر وہ کھینچ کر نیچے لے گئی۔ اُسے کمرے میں دھکیلتے ہوئے بولی، ''عمر! یہ وقت جوش کا نہیں، ہوش کا ہے۔ اگر شور مچاؤ گے تو حویلی کی عزت نیلام ہو جائے گی۔ ہم پر انگلیاں اُٹھیں گی۔ دو چار دنوں میں اس گناہ کی پوٹ سے اس طرح جان چھڑا لینا تاکہ ہم پر کوئی حرف نہ آئے۔ ابھی سو جاؤ اور اس کے بارے زیادہ نہ سوچو کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھی۔''

وہ بے جان انداز میں بیڈ پر گر گیا اور وہ دس پندرہ منٹ لیٹا چھت کو گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ دراز کھولی۔ میر ظفر حیات کا جرمن ریوالور اُس کی دراز میں پڑا رہتا تھا۔ اُٹھایا، میگزین چیک کی اور دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ بی بی نے جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا تاکہ وہ جوش میں کوئی الٹا سیدھا قدم نہ اُٹھائے۔ وہ عقبی کھڑکی کھول کر گیلری میں آیا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا فرسٹ فلور پر چندو کے کمرے میں پہنچ گیا۔ چندو کو دیکھ کر اُس کے چہرے کی رگیں کھنچ گئیں۔ وہ سر نیہواڑے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ عمر حیات اُس کے سامنے پہنچ کر پہلو کے بل بیٹھ گیا۔ ہتھیلی فوم پر ٹکائی اور ریوالور کی نال سے چندو کا چہرہ اُٹھایا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ رو رو کر آنکھیں متورم ہو گئی تھیں۔ فرطِ خوف سے بولی، ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کیلئے میرا یقین کرو؛ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں آیا۔''

وہ پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔ خوف ناک پستول نے اُس کی رہی سہی سکت بھی چھین لی۔

عمر حیات نے بے حد سرد لہجے میں کہا، ''جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے چندو! تم نے فلم نہیں دیکھی۔ کوئی تمہارے کمرے میں نہیں آیا۔ کسی نے تمہیں چھوا نہیں اور تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔ ہیں؟''

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ہکلا کر بولی، ''مم..... میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں قسم.....''

عمر حیات نے نال کا دباؤ بڑھایا، بولا، ''نہیں چندو! کوئی قسم کھانے کے بجائے صرف اتنا بتا دو کہ یہ قمیص کس کی ہے؟''

اس نے خوف سے معمور نظریں صوفے پر پڑی ہوئی آسمانی رنگ کی قمیص پر گاڑ دیں اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی، ''مجھے نہیں معلوم۔''

''آم پر مفلر کس کا اٹکا ہوا ہے؟ قالین پر اور آم کے نیچے زمین پر کھیڑی کے نشان کس کے ہیں؟ تم نے فلم نہیں دیکھی تو منگوائی کس لیے تھی؟..... مگر تمہیں کسی بھی سوال کا علم نہیں ہے۔ ہے ناں؟'' عمر حیات کی آواز لرزش بار تھی، ''مگر مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمہارے جسم میں آگ لگتی ہے جسے بجھانے کیلئے کوئی اس کمرے میں آتا ہے۔ آج پتہ چلا کہ تمہارے جیسی لڑکیاں کس طرح انسانوں کی عزت اور جذبات سے کھیلتی ہیں۔ کھیل لیا ناں! ہاں..... اب میں بھی کھیلوں گا۔ تم سے محبت کرنے کی شرمساری کا قلق ختم کروں گا۔ چلو! قمیص اُتارو.....''

اس کی آنکھیں فرطِ دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ غرایا، ''کیا کہا ہے میں نے؟ دیر نہ کرو..... قمیص اُتارو۔''

وہ ایڑیوں کے بل پیچھے کھسکی۔ وہ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر آگے بڑھ آیا۔ نال کا رُخ سینے کی طرف کیا اور اپنا حکم دہرایا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑ دیے۔ بولی، ''نہیں نہیں..... تم تو میرا یقین کرلو۔''

اپنی آنکھوں جو دیکھ چکا تھا، سمجھنے کیلئے وہی کافی تھا۔ اس نے ریوالور ایک طرف رکھا۔ ہاتھ گریبان کے ربن پر ڈالے۔ ایک جھٹکا دیا۔ گریبان پھٹ گیا۔ چندو کی برداشت جواب دے گئی۔ تڑپ کر اُٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے اُسے پیچھے دھکیل کر بولی، ''آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ جب میں کہہ رہی ہوں کہ یہاں کوئی نہیں آیا، میں نے فلم نہیں منگوائی تو تم کیوں ماننے پر تیار نہیں ہو؟ تمہی بتاؤ، یہاں تمہاری اجازت کے بغیر کوئی آ سکتا ہے کیا؟''

اس کی آواز میں بتدریج دکھ کے ساتھ غصہ آمیزش کرنے لگا۔ عمر حیات بپھر گیا۔ اُٹھا اور وحشیانہ انداز میں اُس پر پل پڑا۔ دو چار تھپڑوں نے ادھ موا کر دیا۔ وہ چیخی۔ منت سماجت کی۔ چاہا کہ اُس کی بات سن لی جائے مگر عمر حیات پر جنون طاری تھا جس نے چندو کو بے دم کر دیا اور وہ لہراتی ہوئی بیڈ پر گر گئی۔ عمر حیات کی وحشت نے رُخ بدل لیا۔ چند ہی لمحوں میں اُس کا لباس تار تار ہو گیا۔ جب تک چندو سنبھلتی، اس کا بدن بے لباس ہو کر عمر حیات کی جنونی ہوس کی جھیل میں ٹراؤٹ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عمر حیات کی گرفت سے نکالنے کیلئے پھڑ پھڑائی مگر ہار گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح کہتا جاتا تھا، ''ہاں! تمہارے بدن میں آگ لگتی ہے۔ میں اسے بجھا دیتا ہوں تاکہ تم پھر کسی کی محبت کا گلا نہ گھونٹ سکو۔ تم حرام کی پھوئی ہو۔ تمہیں آنکھوں پر بٹھانے کے بجائے غلاظت کے ڈھیر پر پھینکا جانا چاہیے۔''

انگریزی فلم میں جب ہیرو اور ہیروئن جذبات کی پہاڑی پر چڑھے تھے، وہ بالکونی میں بھاگ گئی تھی۔ خواب میں جب عمر حیات لبِ جان آیا تھا اور آگ بھری جھیل کے کنارے اُسے لے گیا تھا تو وہ تھم گئی تھی کیونکہ وہ نہ تو پہاڑ کی بلندی سے پستی میں گرنا چاہتی تھی اور نہ آگ کی جھیل میں گر کر فنا ہونا چاہتی تھی۔ وہاں اُسے اختیار حاصل تھا۔ عمر حیات کی مردانگی کے آگے بے بس تھی۔ تبھی گر گئی۔ عمر حیات نے اُسے بار بار شکست دی۔ اُسے نظروں سے ہی نہیں، عزت کی مسند سے بھی بڑی بے رحمی سے گرا دیا۔ پھر اس کا یرغمالی جنوں تھم گیا۔ بیڈ سے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ سفاک لہجے میں بولا، ''وارڈ روب سے لباس نکال کر پہن لو۔''

وہ مردوں کی طرح پڑی تھی۔ جھنجھوڑنے پر کراہی، ''نہیں..... اب مجھے لباس کی ضرورت نہیں رہی۔ تم اپنے احسانات کی قیمت وصول کر چکے ہو؛ جاؤ..... میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔''

وہ غرایا، ''میں نے کسی احسان کی قیمت نہیں لی، تمہیں تمہارا نیچ پن دکھایا ہے۔ اُٹھو! جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔''

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو اُس نے بالوں سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے کھینچ لیا۔ وہ کولھوں کے بل دھپ سے گری۔ نفرت سے دانت بھینچ کر بولی، ''کیا مصیبت ہے؛ جاتے کیوں نہیں ہو؟ جاؤ..... میری جان چھوڑ دو۔''

وہ درشتی سے بولا، ''میں تمہارا وجود ایک لمحے کو بھی اس حویلی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں اسی وقت حویلی سے جانا ہے۔ اگر کپڑے پہن لوگی تو ٹھیک ورنہ ایسے ہی باہر پھینک آؤں گا۔''

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی پھر نڈھال انداز میں کھڑی ہوگئی۔ وارڈ روب تک گئی۔ تھوڑی دیر بعد اپنی چادر میں لپٹ کر دروازے میں آن کھڑی ہوئی۔ پرس سنبھالتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی، ''میں حرام کی پھوئی تھی مگر صرف تخلیق کے وقت..... تم زندگی بھر کے حرام کار ہو۔ مردار ہو۔ مردے نوچنے والے غلیظ گدھ ہو۔ تم اپنی عزت کو لوٹنے سے بھی باز نہ آنے والے شیطان ہو۔ میں تم پر تھوکتی ہوں۔ تمہاری اونچی حویلی پر لعنت بھیجتی ہوں۔ آخ تھو!''

اُس نے عمر حیات کے چہرے پر تھوک دیا۔ وہ دانت پیس کر اُس کی طرف بڑھا مگر اچانک تھم گیا کیونکہ اُسے چندو کے ہاتھ میں دَبا ہوا ریوالور نظر آ گیا تھا۔

وہ غرائی، ''تمہارا باپ عظیم انسان تھا مگر تم مکروہ اور گھٹیا انسان ہو۔ اب مجھ پر ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کرو گے تو گولی مار دوں گی۔''

عمر حیات پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ پسٹل لہرا کر اُسے دور رہنے کی تنبیہہ کی اور بولی، ''تم کیا برے؟ تمہاری بہنیں تم سے بھی گندی نکلیں۔ فائزہ..... اُسے بہن کی طرح پیار کیا میں نے..... ہر وقت سینے سے لگا کے رکھا۔ اُس نے ہی اتنا بڑا دھوکہ دیا مجھے..... ہائے اللہ! تم لوگ تو مجھ سے بھی گندے ہو..... شٹ..... ماموں رضوان نے درست کہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میرے ساتھ حویلی میں یہ سلوک ہونے والا ہے۔ کاش! انہوں نے مجھے بتا دیا ہوتا تو میں اپنی نظروں میں گرنے سے بچ جاتی یا میں ان کی بات سمجھ کر حویلی سے اُسی وقت رخصت ہوگئی ہوتی۔''

عمر حیات کے لبوں سے مغلظات کا فوارہ اُبل پڑا۔ ریوالور کی خوف ناک جھلک نے روکے رکھا ورنہ بعید نہیں تھا کہ وہ اُس کا خون کر دیتا۔ وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ نیچے برآمدے میں بی بی کھڑی اُلجھے اُلجھے انداز میں سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر جلدی سے قریب آئی، بولی، ''کیا ہوا چندو؟ تم اس وقت کہاں جا رہی ہو؟ اوہ..... تم نے یہ پستول کیوں اُٹھا رکھا ہے۔ ادھر لاؤ؛ گولی چل جائے گی۔''

اس نے نفرت سے کہا، ''مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔ تم ماں نہیں ہو۔''

ایسے ہی وقت میں عمر حیات سیڑھیاں اُتر کر عقب میں آ گیا۔ وہ بھانپ گئی۔ ناگن کی طرح تڑپ کر پلٹی تو عمر حیات کو ناچار رُکنا پڑا۔ بی بی کے دروازے میں فائزہ کی جھلک دکھائی دی۔ چندو چند قدم پیچھے ہٹی۔ برآمدے کے شیڈ کے نیچے کھڑی ہو کر بولی، ''ہاں بی بی! تم ماں

نہیں ہو کیونکہ تمہاری حویلی میں میری عزت لٹ گئی ہے۔ کس نے لوٹی؟ تمہارے میرزادے نے: اونچے شملے والے میر ظفر حیات کے اکلوتے بیٹے نے..... تف ہو تمہارے اونچے شملوں پر..... اور فائزہ! مجھے تو یہ تک علم نہیں تھا کہ فلمیں کیا ہوتی ہیں۔ تم نے ہی رنگین دنیا دکھائی تھی ناں! ہاں..... تم نے ہی مجھ سے اس گندی فلم کا نام لکھوایا تھا اور مجھے نواز کو دے آنے کا کہا تھا تاکہ وہ واپسی پر لیتا آئے گا۔ اور..... اور..... میں بالکونی میں کھڑی رہی، تم فلم دیکھتی رہیں۔ تم میرے کمرے سے کب نکلیں؟ تمہارے بعد وہاں کون آیا؟ کیسے آیا؟ قمیص بیڈ تک کیسے پہنچی؟ ان سوالوں کے جواب ذہن میں رکھنا۔ کبھی تمہارے بے غیرت بھائی کو ان جوابوں کی ضرورت پڑے گی۔ اور..... اور..... میں نادان نہیں ہوں مگر دنیا کی سب سے بڑی سزا بھگت چکی ہوں۔''

اس کی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں، چہرہ متورم تھا اور جسم ٹوٹا پھوٹا مگر لہجہ آتش بار تھا۔

بی بی نے الجھے ہوئے انداز میں بیٹے اور بیٹی کو دیکھا، چندو سے کہا، ''آدھی رات کا وقت ہے۔ اس وقت نہ جاؤ، صبح چلی جانا۔''

وہ سلگ کر بولی، ''کیوں؟ جو لٹنا تھا، لٹ گیا۔ زیادہ سے زیادہ پھر یہی ہوگا کہ کوئی اور شیطان مجھے پکڑ کر اپنے بستر پر لے جائے گا۔ اور بس؟''

وہ پلٹی۔ ایک نگاہ سبھی پر ڈال کر صحن سے گزر کر بیرونی دروازے تک آئی۔ اپنے تعاقب میں سر جھکا کر چلتے ہوئے عمر حیات کو دیکھا اور پستول اُس کی طرف اچھال دیا۔ وہ کسی اور سوچ میں تھا۔ پستول کو پکڑ نہ سکا جس کی وجہ سے وہ فرش پر گر کر چند قدم دور تک پھسلتا گیا۔

دروازے کے باہر اندھیرے کا راج تھا مگر چندو کے جلتے ہوئے ذہن کو اندھیرے کی پروا نہیں تھی۔ سبھی ملازمین جاگ رہے تھے اور دارے کے برآمدے کی بڑی چارپائیوں پر نواڑ سے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ وہ سیدھ میں چلتی گئی۔ باہر والی سڑک پر پہنچ کر ایک ذرا رکی، پلٹی، حویلی کے بام و در اور روشن قمقموں کو بے تاثر آنکھوں سے دیکھا پھر پکی سڑک پر چلتی گئی۔ بے زمین و آسماں زندگی نئی نہج مانگ رہی تھی مگر اُس کے پاس راستہ تو کجا، کوئی دلاسا تک نہیں تھا جو اُسے دے سکتی۔

سڑک کا موڑ مڑتے ہی عین سڑک کے بیچ کھڑے عمر حیات کو دیکھ کر چونکی۔ وہ شارٹ کٹ پگڈنڈی پر چل کر اس سے پہلے پہنچ آیا تھا۔ پہلو بچا کر نکلنے لگی تو عمر حیات نے بازو تھام لیا۔ وہ

گرفت کو بری طرح جھٹک کر آگے بڑھی۔ وہ پھر سامنے آ گیا۔ بولا، ''چندو! صبح چلی جانا۔ اِس وقت تم کہاں جاؤ گی؟''

اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ بولی، ''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔''

''پلیز!''

''کہا ناں! ہٹ جاؤ، میرے راستے سے۔ مجھے تم جیسے غلیظ انسان کو دیکھنا بھی برا لگ رہا ہے۔ شکر کرو کہ میں نے تمہیں گولی نہیں ماری۔ تمہارے چار احسان یاد آ گئے تھے ورنہ.....''

''میں غصے میں پاگل ہو گیا تھا۔ نہیں سمجھ پایا تھا کہ ہوا کیا ہے؟ اَب بھی سمجھ نہیں آ رہی؛ کچھ بھی۔ تم صبح تک رک جاؤ۔ بتا جاؤ کہ اصل چکر کیا تھا۔'' عمر حیات کے لہجے کی استدعا درشتی میں بدل گئی۔

اس نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ عمر حیات نے گرفت مضبوط کر لی۔ چندو کی بانہہ مڑ گئی۔ تڑپ کر پلٹی۔ دوسرے ہاتھ کا زوردار چانٹا عمر حیات کے منہ پر مارتے ہوئے گالیاں دینے لگی۔ چیخنے لگی۔ اُسے باور کرانے لگی کہ بھلے رات دم توڑ رہی ہو، راہ چلتی لڑکی پر ہاتھ اُٹھایا جائے تو وہ چیخ چیخ کر بدنام کر دیتی ہے۔ عمر حیات نے کلائی چھوڑ کر رخسار پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ ایسے ہی وقت میں عمر دراز کی غصے سے پھٹتی ہوئی آواز گونجی، ''رُک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔''

اس نے پروا نہیں کی۔ چلتی گئی۔ عمر حیات اُسے ڈرا کر روکنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب تک گولی چلانے کا فیصلہ کرتا، وہ شوٹنگ رینج سے باہر ہو گئی تھی۔ گولی چلی مگر اُسے نہیں لگی۔ لڑکیاں کمزور دل کی مالک ہوتی ہیں مگر اُسے جرمن ریوالور کی خوفناک آواز نے پلٹ کر دیکھنے پر بھی مجبور تک نہ کیا۔ گولی کے بعد اپنے عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز سن کر اُس نے اپنی رفتار تیز کر لی مگر وہ سر پر پہنچ گیا۔ چادر کا پلو تھام کر غرایا، ''تمہیں اپنی زندگی سے دشمنی ہے کیا؟''

وہ پلٹے بغیر رُک کر بولی، ''ہاں! پہلے اس زندگی سے پیار کرتی تھی کیونکہ اس پر ایک دیوتا مہربان تھا۔ اَب اس میں شیطان گھس آیا ہے۔ زندگی کے مرنے سے ہی اُس سے نجات حاصل ہو گی۔ کروں گی۔''

رات پچھلے پہر میں تھی۔ اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دیہات کی رات بہت کالی اور خاموش ہوتی ہے۔ اسی خاموشی میں بی بی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ عمر حیات کو پکار رہی تھی۔ پھر سڑک پر کئی لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں گونجیں۔ چند لمحوں بعد برآمدے میں سر جوڑ کر

بیٹھے ہوئے نوکر فائر کی تیز آواز سن کر ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ عمر حیات حلق کے بل چیخا، ''تم سب لوگ دفع ہو جاؤ..... چلو بھاگو!''

کسی نے اُس کے حکم پر کان نہیں دھرا بلکہ اُسے دبوچ لیا۔ وہ کسرت کے عادی اور جان مند لوگ تھے۔ عمر حیات کو بے بس کر کے نرغے میں لیے واپس چل پڑے۔ نواز گردن موڑ کر بولا، ''بی بی سائین نے کہا ہے کہ رات حویلی میں گزار لو۔ صبح، جہاں کہو گی، وہیں میں پہنچا آؤں گا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان سے دور ہوتی گئی۔ جہاں حویلی والی سڑک شہر جانے والی سڑک سے ملتی تھی، وہاں پہنچ کر رُک گئی۔ جسم ٹھنڈا ہو کر دُکھنے لگا تھا۔ سانسیں پھول گئیں۔ جی چاہا کہ سڑک کے بیچوں بیچ چاروں شانے چت لیٹ جائے۔ سو جائے۔ بھلے کوئی گاڑی کچل دے۔ اردگرد دیکھنے لگی۔ غصہ اُترا تو خوف سوار ہو گیا۔ اندھیرے اور خاموشی نے دل پر ہیبت طاری کر دی۔ دور دور تک کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شہر تک پیدل نہیں جا سکتی تھی۔ جاتی بھی کیوں؟ وہاں اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔ سوچا؛ گانمن کے گھر چلی جائے۔ گانمن کی نفرت بھری آنکھیں چشم تصور میں ابھر آئی تھیں۔ دل بھر آیا۔ از خود نفی میں سر ہل گیا۔

اس کی ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ عمر حیات کی درندگی نے نہ صرف اُس کا بدن تھکن سے چور کر دیا تھا بلکہ اُس کے ذہن کو بھی درماندہ کر دیا تھا۔ وہ تھک کر سڑک کے کنارے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس علاقے میں شام ڈھلنے کے بعد کوئی سواری نہیں ملتی تھی اس لیے اُسے صبح تک یہیں بیٹھ کر تانگے کا انتظار کرنا تھا۔

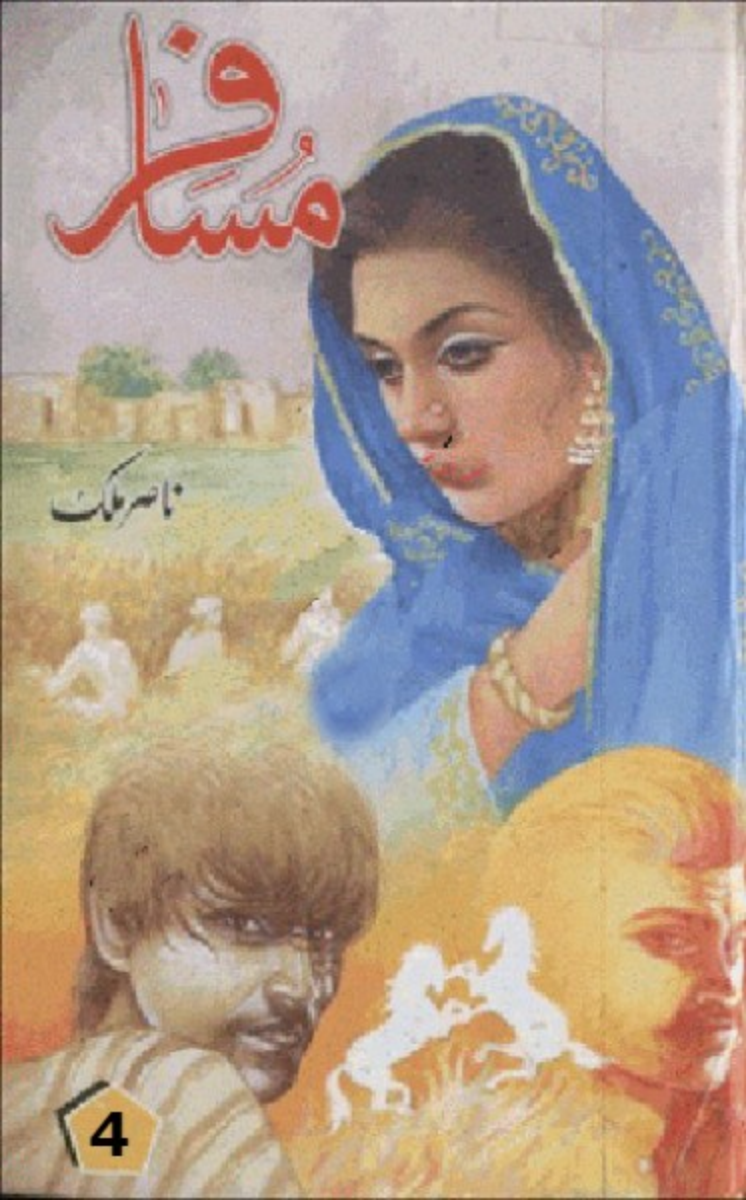
اچانک چونک گئی۔ حویلی کی جانب سے کوئی گاڑی آ رہی تھی۔ تھرکتی ہوئی لائٹس کی روشنی اس پر پڑی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ بے ساختہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کیکر کے تنے سے لگ گئی۔ چند لمحوں بعد عمر حیات کی پوٹھوہار جیپ موڑ مڑ کر رُک گئی۔ وہ نوکروں کی گرفت سے نکل کر ایک بار پھر اُس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی غلطی پر پچھتائی کہ اُسے پستول پھینکنا نہیں چاہیے تھا۔ اس نے کبھی چلایا نہیں تھا مگر اس کی دہشت قریب آنے والے کو روکنے کی طاقت رکھتی تھی۔

۞۞۞

دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والی ایڈونچرس داستان
کے مسافر کے ساتھ سفر کرنے کے لئے جلد چہارم کا مطالعہ کریں۔

مسافر

ناصر ملک



4

عمر حیات گاڑی سے اُترا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر تیزی سے اُس کی طرف بڑھا۔ وہ چلائی، ''میرے قریب مت آنا ورنہ جان سے ماردوں گی۔''

وہ ایک ذرا رُکا، پھر چل پڑا۔ قریب آ کر بولا، ''چندو! واپس چلو۔ مجھ سے غلطی ہوگئی جس کا ازالہ کردوں گا۔ چلو!''

چندو نیچے بیٹھی۔ ادھر اُدھر اندھیرے میں ہاتھ مارا۔ ایک پتھر مل گیا۔ اُٹھا کر چیخی، ''مجھے کسی ازالے کی ضرورت نہیں..... دفع ہو جاؤ ورنہ سر پھاڑ دوں گی۔''

عمر حیات نے سر سے بلند ہوتا ہوا ہاتھ دیکھا اور رُک گیا۔ اپنا پستول نکال کر اُس پر تان کر غرایا، ''بے وقوفی مت کرو؛ تماشا نہ بناؤ اور میرے ساتھ چلو ورنہ یہیں ڈھیر کردوں گا۔''

وہ عمر حیات سے ڈرتی تھی۔ آج نہیں ڈر رہی تھی۔ پوری قوت سے ہاتھ گھمایا اور عمر حیات کے سر کا نشانہ لے کر پتھر چھوڑ دیا۔ اُسے چندو کے اس اقدام کی توقع نہیں تھی۔ پتھر بھاری نہیں تھا مگر نوکیلا تھا۔ سیدھا پیشانی پر لگا۔ آنکھوں کے سامنے سورج طلوع ہوگیا۔ لہرایا اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ چندو نے ایک اور پتھر تلاش کرلیا۔ بپھری ہوئی بلی کی طرح غرائی، ''تم کمینے اور گھٹیا انسان ہو۔ تمہاری حویلی میں کوئی انسان نہیں رہتا۔ اس لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ جو تم نے اپنی مردانگی دکھالی، وہی میرے لیے کافی ہے۔''

عمر حیات بہت ضدی فطرت تھا۔ سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ پیچھے ہٹنے کے بجائے ایک ہاتھ ماتھے پر رکھے اپنا ولایتی ریوالور لہراتا ہوا آگے بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں بستی سمن سے آنے والی سڑک پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ چونک کر رُک گیا۔ اوپر نیچے ہوتی ہیڈ لائٹس کو دیکھ کر بولا، ''چندو! کوئی آ رہا ہے۔ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر مصیبت کھڑی کردے گا۔ چلو، جیپ میں بیٹھو۔ اگر تم حویلی میں جانے پر تیار نہ ہوئیں تو جہاں کہو گے، وہیں چھوڑ آؤں گا۔''

PakistaniPoint.com
Waqar Azeem

وہ دونوں ہاتھ فضا میں لہرا کر اُسے دور ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے چلائی۔ عمر حیات نے ڈپٹ کر کہا، ''خاموش رہو؛ ورنہ گولی مار دوں گا۔ چندو! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم بہت بڑی بات کہہ کر حویلی سے نکلی ہو۔ اگر تمہارا کسی شخص سے تعلق نہیں تھا تو پھر حویلی میں کسی اور کا کسی مرد سے تعلق ضرور تھا جس نے تمہیں بدنام کرنے کیلئے اتنا بڑا کھیل کھیلا۔ تم حویلی چل کر اپنا بیان ثابت کرو ورنہ میں سب کو بھون دوں گا۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں اپنا بیان ثابت کرنے کی۔ تم جسے بھوننا چاہتے ہو، جاؤ بھون ڈالو۔ مجھے کیا پروا؟''

''مگر مجھے ہے۔ دیکھو چندو! اگر تم نے کوئی گناہ نہیں کیا تو تمہیں گناہ گار ثابت کرنے والا حویلی میں موجود ہے۔ اس کی پردہ کشائی ضروری ہے جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی۔ دیکھنا، میں اُسے صبح ہونے سے پہلے گولی مار دوں گا خواہ وہ میری بہن ہی کیوں نہ ہوئی۔''

اس نے پوری شدت سے سر نفی میں ہلایا۔ بولی، ''مجھے کسی کو مروانا نہیں ہے۔ میں بے حیائی کی موت مر چکی ہوں۔''

''مگر میں اپنے دشمن کو پہچاننا چاہتا ہوں۔ ابھی تو مجھے اُس شخص کو تلاش کرنا ہے جس نے میری حویلی کی دیوار پھاندنے کی جرأت کی ہے۔''

اس کی برداشت جواب دے گئی۔ حلق کے بل چیخی، ''چخ تھی وَنج! کیوں میڈے پچھے پے گیا ایں.....''

(دفع ہو جاؤ! کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔)

عمر حیات خود پر قابو نہ رکھ پایا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی سیدھی چندو کی ران میں جا لگی۔ پورے تن میں آگ سی بھر گئی اور اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی دلدوز تھی۔ عمر حیات جیسے ہوش میں آ گیا۔ بے ساختہ پلٹا۔ بھاگ کر جیپ کی طرف جانا چاہتا تھا مگر دیر ہو گئی تھی۔ سمن کی طرف سے آنے والا ڈبل ڈور ڈالا جیپ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر رُک چکا تھا۔ عمر حیات نے برقی مستعدی سے پوٹھوہار میں بیٹھنا چاہا مگر ایک غراتی ہوئی آواز نے اُس کے قدم تھام لیے، ''اوئے خبردار! اگر حرکت کی تو گولیوں سے بھون دوں گا۔''

ہیڈ لائٹس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ دیکھ نہیں سکا کہ اُسے دھمکی دینے والا کون تھا اور اس کے پاس کس قسم کا اسلحہ تھا۔ بولا، ''تم کون ہو؟''

وہی غراتی ہوئی آواز سنائی دی، ''تمہیں پتہ چل جائے گا۔ پستول پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کرلو۔ جلدی کرو ورنہ میں جلدی کر دکھاؤں گا۔ اور یہ تم نے کس کو گولی ماری ہے؟''

''کسی کو نہیں..... تم جاؤ؛ یہ ہمارا گھر کا معاملہ ہے؟'' عمر حیات کو جان کے لالے پڑ گئے تھے اس لیے اس نے بلا تامل اپنا جرمن ریوالور سڑک پر گرا دیا۔

''گھر کے مسئلے سڑک پر حل نہیں کیے جاتے بیٹا۔ اوئے جانو! اُسے دیکھو..... وہ کیکر کے نیچے پڑی ہے۔ دیکھو! مر گئی ہے یا زندہ ہے؟''

ایک شخص پچھلا دروازہ کھول کر نکلا۔ پوٹھوہار کے قریب آیا۔ سڑک پر پڑا ہوا پستول اُٹھا کر بولا، ''حرکت کرو گے تو پورا برسٹ جسم میں اُتر جائے گا۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر جیپ کا دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا چندو کے پاس پہنچا۔ ہلا جلا کر دیکھا۔ زندگی کے سہارے پر نبض چل رہی تھی، وہ ہوش میں تھی مگر خوف کے مارے ساکت پڑی تھی۔ اس نے ٹارچ کی مدد سے اُسے دیکھا بھالا۔ گولی ران کو چھو کر نکل گئی تھی۔ ماس جل گیا تھا۔ بارود کے جلے ہوئے ماس میں شدید چبھن اور جلن ہوتی ہے۔ گولی کی دہشت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اُسے کندھے پر ڈال کر ڈالے کے عقبی کیبن کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا، ''یہ کون ہے؟''

''یہ پتہ نہیں کہ کون ہے مگر ہے ایک دم پٹاخہ!''

''اسے بعد میں دیکھ لوں گا۔ چل بے لاٹو! گھوم جا.....!''

ڈالا ریورس ہوا۔ عمر حیات کو مارنا ضروری نہیں تھا مگر نہ جانے ڈالے میں ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے شخص کے دل میں کیا خیال آیا کہ اُس نے گن کی نال کھڑکی سے نکالی، عمر حیات کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ 'ٹھائیں' کی زوردار آواز کے ساتھ ہی گولی پسلیاں توڑتی ہوئی عمر حیات کے دل میں دھنس گئی۔ اس نے چیخنے کیلئے منہ کھولا مگر دل نے ساتھ نہ دیا اور وہ چیخ سینے میں لیے لہرا کر جیپ سے ٹکرایا اور سڑک پر گر کر تڑپنے لگا۔

پچھلے کیبن میں فرش پر پڑی ہوئی چندو کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُٹھ بیٹھی۔ آنکھیں پھاڑے عمر حیات کے پستول کا جائزہ لینے والے جانو کو دیکھتے ہوئے بولی، ''یہ کیا ہوا؟''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں میری بلبل! جس نے تمہیں گولی ماری، اُسے صاحب نے گولی مار کر ہمیشہ کیلئے ٹھنڈا کر دیا ہے۔ چلو اُٹھو اور سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔''

اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا، ''ہائے اللہ! یہ کیا ہو گیا؟''

ران میں لگی ہوئی گولی کی تکلیف جھیلنا دل گردے کا کام تھا جو وہ کر رہی تھی مگر عمر حیات کو گولی لگنے کی خبر سن کر اپنے حواس برقرار نہ رکھ پائی اور اُٹھنے کی کوشش میں لہرا کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ جانو نے ٹارچ جلائی، اُسے دیکھا اور اپنے کندھوں پر لٹکتی ہوئی سندھی اجرک اُتار کر اوڑھا دی۔ گردن باہر نکال کر اونچی آواز میں بولا، ''صاحب! بے ہوش ہو گئی ہے۔''

ڈالا تیزی سے پوٹھوہار کے آگے سے گزرا اور شہر جانے والی سڑک پر رواں دواں ہو گیا۔ جو اپنے پیروں پر نہیں چل سکتے، انہیں وقت اپنی مرضی سے چلانے لگتا ہے۔ زندگی کے سفر کو تو جاری رہنا ہی ہوتا ہے۔

ران میں درد کی کٹیلی لہر نے اُسے بیدار کیا تھا۔ حیرت بھری آنکھوں سے در و دیوار کو دیکھنے لگی۔ نامانوس جگہ تھی اور کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چند لمحوں تک کراہتی رہی۔ پھر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ران میں تکلیف کا احساس بڑھ گیا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو زیریں دھڑ پر سندھی اجرک پھیلی ہوئی تھی۔ اُسے کھسکایا تو اپنی ٹانگ کو سفید رنگ کی بالشت بھر چوڑی پٹی میں جکڑے دیکھا۔ پٹی کے نیچے شلوار غائب تھی۔ دھیرے دھیرے سب کچھ یاد آ گیا۔ دل میں حبس سا بھر گیا۔ عمر حیات کی موت کا دل کو صدمہ تھا۔ باوجود کہ اُس نے مرنے سے پہلے اُس کی محبت کو مار دیا تھا۔ ایک ایک کر کے حویلی کے سبھی افراد یاد آئے۔ پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے حویلی میں بہت اچھا اور کبھی نہ بھولنے والا وقت گزارا تھا۔ دل سے ہوک نکلی، ''کاش! یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔''

ہر شکست بار واقعے کے بعد انسان ایسا ہی سوچتا ہے مگر ہونی کو ٹال نہیں سکتا۔

گولی کا درد جلد ہی بوجھل کر کے مٹ گیا مگر اپنی توہین اور بے عزتی کا احساس بدستور دامن گیر رہا۔ اس نے پہلی مرتبہ مردانگی دیکھی تھی۔ دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ رہی۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کے آگے تاحدِ نگاہ سمندر پھیلا ہوا تھا مگر وہ جس جنگل سے نکل کر آئی تھی، ابھی اس کے حصار سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔

اس کا ذہن تھک گیا۔ آنکھیں موند کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ وہ کس دنیا میں تھی؟ کس کی تحویل میں تھی؟ اندازہ نہ کر سکی مگر خوفزدہ تھی۔ جو لوگ عمر حیات کو سڑک پر بغیر کسی دشمنی کے اتنی دیدہ دلیری سے گولی مار سکتے تھے، وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ بدن کو ناگاہ جھرجھری آ گئی۔ دل میں اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں اُسے پھر اُس عذاب سے گزارا نہ جائے جس سے گزر کر وہ اپنی

نظروں سے گر گئی تھی۔ دل اندیشے کی تال پر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عمر حیات نے مرد بننے میں سال سے زیادہ وقت گزار لیا تھا کیونکہ وہ اُس سے محبت کرتا تھا۔ ان لوگوں کے دل میں اس کی محبت کا پیدا ہونا معجزے سے کم نہ تھا اور معجزے روز روز رونما نہیں ہوتے۔

دروازہ آہستگی سے کھلا۔ لانبے قد والا شخص اندر داخل ہوا۔ چندو کی چارپائی کے قریب آ کر رُک گیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ چندو اُس کا حلیہ دیکھ کر سہم گئی۔ لمبا قد، توانا کسرتی بدن، خون کی طرح سرخ آنکھیں اور ڈراؤنی مونچھیں..... وہ حلیے سے چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے اسے پہلے کہیں دیکھ رکھا تھا۔ یادداشت پر زور دیا تو یاد آیا کہ اُسے چندو نے بے ہوش ہونے سے قبل ڈالے کے عقبی حصے میں دیکھا تھا۔ وہ بولا تو اُس کی آواز میں عجیب طرح کا کھردرا پن شامل تھا، ''تم کون ہو؟''

''مم..... میں چندو ہوں.....''

''چندو؟..... ارے واہ! تمہیں دیکھ کر یہی نام ذہن میں آتا ہے۔ خیر! وہ کون تھا؟ تمہارا عاشق تھا یا تمہیں اغوا کرنا چاہتا تھا۔'' اس کی پاٹ دار آواز چندو کا دل دہلا رہی تھی۔

''وہ عمر حیات تھا۔'' اس کا لہجہ غم بار تھا۔

''تمہارا کیا لگتا تھا؟''

''وہ میرا.....'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کا عمر حیات سے کیا تعلق تھا؟..... اس تعلق کا کیا عنوان تھا جو بننے سے قبل ہی ٹوٹ گیا تھا؟..... جواب نہ بن پڑا تو خاموش ہو گئی۔ خوفناک چہرے والے نے اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی مگر وہ مسلسل لب بستہ رہی۔

وہ زِچ ہو کر بولا، ''کیا تم سن رہی ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا، کمزور سے لہجے میں بولی، ''مجھے بس یہی علم ہے کہ اُس کا نام عمر حیات تھا۔ بس! مجھے سونے دو۔''

''کیا درد ہو رہا ہے؟''

''ہاں! مگر..... میں کہاں ہوں اور تم کون ہو؟'' اس نے اپنی آنکھیں دانستہ طور پر بند رکھیں۔ اسے اُس خوفناک چہرے سے ڈر لگنے لگا تھا۔

''جہاں بھی ہو؛ خیریت سے ہو۔ گولی گوشت کو جلا کر نکل گئی تھی۔ اگر ماس میں اٹک جاتی تو زہر پھیل جاتا اور آپریشن کر کے گولی نکالنا پڑتی۔ اب خیر سلا ہے۔ تم ہفتہ بھر میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ بولی، ''تم کون ہو؟''

''میرا نام رمضان علی ہے۔ میں ہی تمہیں بے ہوش حالت میں اُٹھا کر یہاں لایا تھا۔''

چندو نے آنکھیں کھول دیں۔ اُسے اپنے بدن کو دلچسپی آمیز نظروں سے گھورتے پا کر گھبرا گئی۔ بولی، ''تم لوگوں نے عمر حیات کو گولی کیوں ماری؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟''

اس کے لہجے میں گلہ اور برہمی مترشح تھی۔

''اس نے تمہیں کیوں گولی ماری تھی، تم نے اُس کا کیا بگاڑا تھا؟'' رمضان علی نے جواب دینے کے بجائے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر استفسار کیا۔ وہ خاموش رہی۔ ایسے میں دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ چندو نے بے ساختہ دیکھا۔ رمضان علی سے بھی نکلتے ہوئے قد کا آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر رمضان علی مؤدبانہ انداز میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ گیا۔ نووارد چندو کے قریب آیا۔ بولا، ''جانو! ہوش میں آنے کے بعد اِس نے کچھ بتایا؟''

چندو نے اُسے آواز سے پہچان لیا۔ غراتی ہوئی دہشت ناک آواز..... وہ ڈالے کے کیبن میں اگلی نشست پر بیٹھا تھا اور اسی نے ہی عمر حیات کو گولی ماری تھی۔ رمضان علی عرف جانو مؤدبانہ انداز میں چندو سے ہونے والی گفتگو اُس کے گوش گزار رہا تھا جبکہ چندو سر جھٹک کر عمر حیات کی موت کے دکھ سے پیچھا چھڑانے اور نئی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ غراتی ہوئی آواز والا شخص دیکھنے میں خوف ناک نہیں تھا۔ بہت نفیس اور قیمتی سوٹ زیب تن کئے چارپائی پر پاؤں ٹکائے کھڑا شخص کوئی بڑا زمیندار معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے جانو کو ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا۔ گھٹنے پر کہنی، اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے چندو پر جھک گیا۔ بولا، ''ہوں..... تو تم چندو ہو۔ تمہارا نام رکھنے والا کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ ہوں؟''

وہ خاموش رہی۔ وہ اُس کے بدن کے نشیب و فراز کو دلچسپی آمیز نظروں سے ٹٹولتے ہوئے بولا، ''تمہیں گولی مارنے والا کون تھا؟''

اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کہا، ''وہ عمر حیات تھا۔ میر ظفر حیات کا اکلوتا بیٹا۔ آپ لوگوں نے بڑا ظلم کیا جو اُسے مار دیا۔''

''ہوں.....'' شاید ہر بات پر 'ہوں' کہنے کی اُس کی عادت رہی تھی، تبھی ہنکارا بھر کر بولا، ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے میر ظفر حیات کے وارث کو مارنا نہیں چاہیے تھا مگر میں اُسے جانتا نہیں تھا۔ اکلوتی شاخ کو کاٹنا بہت بڑا ظلم ہوتا ہے۔ خیر، جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اب میرا پچھتاوا اُس

میں روح نہیں پھونک سکتا۔''

اس کا لہجہ نرم ہو کر دہشت ناک نہیں رہا تھا۔ وہ بولی، ''تم کون ہو؟''

اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ بولا، ''مجھے دنیا میں 'تم' کہنے والا زیادہ سانسیں نہیں لے سکتا مگر اس سمیت میں تمہارے چار اور جرم بھی معاف کرتا ہوں کیونکہ تمہیں دیکھ کر میرا دل اتھل پتھل ہونے لگا ہے۔ تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔ تمہارے جیسی لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

چندو نے گھبرا کر منہ پھیر لیا۔ بولی، ''تم میرے بابا کی عمر کے ہو اور میں تمہارے بیٹی جیسی ہوں۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''ہوں..... پڑھی لکھی لگتی ہو۔''

''ہاں! میں نے میٹرک کیا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ اس ہوس مارے ادھیڑ عمر شخص کی موجودگی سے اُسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی، ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ ایسا محفوظ علاقہ ہے جہاں قاف سے اُترنے والی پریاں تمام عمر محفوظ رہتی ہیں۔''

وہ سمجھ نہ پائی۔ دوبارہ بتایا گیا، ''تم اس وقت ایسی جگہ پر ہو جس کے آس پاس چاروں طرف میلوں ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ تمہیں یہاں سے بھاگ کر شاید بیس میل سے بھی کہیں زیادہ لمبا سفر طے کرنا پڑے گا؛ کسی آبادی تک پہنچنے کیلئے۔''

وہ آنکھیں موند کر خدا سے مدد مانگنے لگی۔

وہ بولا، ''یہ تم منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑا رہی ہو؟''

اس نے ٹانگ ہلائی۔ ران میں درد نہیں ہوا۔ اس نے ہمت کی اور ٹانگ سمیٹ لی۔ درد کی ایک لہر لمحہ بھر میں پورے بدن کا احاطہ کر کے معدوم ہو گئی۔ اس نے دوسری ٹانگ بھی سمیٹ لی۔ بولی، ''تم مجھے یہاں کیوں اُٹھا لائے ہو؟''

وہ ایک ذرا مسکرایا۔ دروازے تک گیا۔ جھانک کر باہر دیکھا۔ جانو کو آواز دے کر اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، بولا، ''چندو! تمہیں گولی لگی تھی جس کا علاج ضروری تھا ورنہ تم خون بہنے کی وجہ سے وہیں مر جاتیں۔ تمہاری روح پر بھی کوئی بوجھ تھا جسے اُتارنا ضروری تھا ورنہ تمہاری جوانی قبل از وقت بوڑھی ہو جاتی۔ قسمت نے سڑک کنارے اتنا خوب صورت بدن مجھے انعام میں دیا، کیا وہیں چھوڑ آتا؟''

اُسے بخوبی احساس ہو گیا کہ وہ اچھے آدمی کی تحویل میں نہیں تھی۔ ڈرتے ڈرتے بولی،

''میں اب ٹھیک ہوں۔تمہاری مہربانی پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔اَب مجھے جانے دو۔''

اس کی زبان خاموش رہی۔آنکھیں بول پڑیں۔سمجھا گئیں کہ وہ اُس کے حصول کیلئے ایک قتل کر آیا تھا اس لیے خالی خولی شکریے سے کام چلنے والا نہیں تھا۔

جانو کمرے میں داخل ہوا۔مؤدبانہ لہجے میں بولا،''حکم صاحب!''

''اس کے کھانے پینے اور دوادارو کا خیال رکھنا۔شہر سے تین چار جوڑے کپڑوں کے بھی منگوالینا؛اس کیلئے.....اور اسے دن میں دو مرتبہ اس بہروپیے ڈاکٹر سے چیک کرواتے رہنا۔ اسے مکان میں چلنے پھرنے کی آزادی حاصل ہوگی تاکہ میری واپسی تک یہ پھول کملا نہ جائے۔ہاں!اگر یہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے یا شور مچا کر کسی کو متوجہ کرے تو بے شک گولی مار دینا۔'' اس کا نرم لہجہ عنقا ہوگیا۔غراہٹ عود کر آئی۔چندو کے بدن کو جھرجھری سی آ گئی۔اس کی منت سماجت کرتے ہوئے آزادی کیلئے پھڑپھڑانے لگی مگر وہ اُس پر تنبیہی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔اس کے پیچھے جانو بھی چلا گیا۔

چندو کی کھلی آنکھیں چھت کی چوبی کڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔نقاہت،سردرد اور خوف کے مارے ذہن اچانک خالی ہوگیا تھا۔اس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اُس کی ٹانگ اُس کا وزن سہارنے کے قابل تھی۔اس نے چارپائی پر پڑی ہوئی سندھی اجرک اپنے بدن کے زیریں حصے پر باندھ لی۔ننگ چھپ گیا۔ایک قدم چلی۔درد ہوا تو چارپائی پر ٹک گئی۔ پٹی خاصی کس کر بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے جلد کھنچ گئی تھی۔آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا۔بدقت تمام چارپائی کے سرہانے پڑی ہوئی چوبی تپائی تک پہنچی۔گلاس میں پانی بھر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔پانی پی کر سوچ میں پڑ گئی۔اُسے یہاں لانے والا کہیں جا رہا تھا۔ہمیشہ کیلئے جا رہا ہوتا تب بھی فکر کی بات تھی کیونکہ جلد واپس آنے کا ارادہ ظاہر کرنے والا اُسے خوفناک شکل والے نوکر کے حوالے کر کے جا رہا تھا۔عمر حیات نے اُسے حویلی چھوڑنے سے پہلے وہ کچھ دکھا دیا تھا جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ڈر رہی تھی کہ اس جیسی رات پھر لوٹ نہ آئے۔

وہ دس پندرہ منٹ تک بیٹھی رہی۔پھر اُٹھ کر دیوار تک گئی۔پسینے سے چہرہ تر ہوگیا۔فرطِ ضبط سے ہونٹوں پر دانتوں کے نشان ثبت ہوگئے۔پھر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی اور ہاتھ سے ران پر بندھی ہوئی پٹی کو سہلانے لگی۔ڈاکٹر نے گھٹنے سے کچھ اوپر

سے شلوار کاٹ پھینکی تھی۔ گھٹنے اور پنڈلی کی برہنگی عجیب محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں اپنی بے لباسی اور بے بسی کا احساس رُلانے لگا۔ توہین پیشانی پر ٹھہر گئی۔

نصف گھنٹے بعد جانو اُس کیلئے کھانا لایا۔ اُسے کرسی میں بیٹھا دیکھ کر بولا، ''اس کا مطلب ہے کہ تم چل پھر سکتی ہو۔ اچھی بات ہے۔''

اس نے اُس کے سامنے میز رکھی۔ کھانا سجا دیا۔ بولا، ''کھاؤ میری چندو رانی! زندگی کھانے کا ہی تو نام ہے۔''

وہ خوش دلی کا مظاہرہ کر رہا تھا جو اُس کے حلیے سے میل نہیں کھاتی تھی۔ کھانے کو دیکھ کر اُس کی بھوک جاگ گئی۔ وہ کن اکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے سر جھکا کر کھانے میں مشغول ہو گئی جبکہ وہ چارپائی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ بولا، ''تمہارا باپ کون ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ حیرت سے بولا، ''کیا مطلب؟ کیا تمہارا باپ مر چکا ہے؟''

اُس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ قدرے غصے سے بولا، ''پانچ سیر کا سر ہلاتی ہو، چھٹانک بھر کی زبان نہیں ہلاتیں۔ منہ سے بکو۔''

اس نے نوالہ چباتے ہوئے اُسے دیکھا۔ اپنا خوف چھپا کر بولی، ''نہیں بکتی۔ تمہیں کیا؛ میرا باپ کوئی بھی ہو؟''

اُسے تاؤ آ گیا۔ دانت پیس کر بولا، ''تم اِس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔''

اس نے ہنکارا بھرا اور سہم کر خاموش ہو گئی۔ جانو نے یکے بعد دیگرے کئی سوال کئے جن کا جواب اُسے نہ ملا تو زچ ہو کر بولا، ''تم نجانے کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہو۔''

اس نے کندھے اُچکائے، پانی پیا اور بولی، ''میں اگر تمہارے رحم و کرم پر ہوں تو گولی مار دو۔ ورنہ خاموشی سے چلے جاؤ۔''

وہ غصے میں اُٹھا۔ تھپڑ مارنا چاہتا تھا مگر ہاتھ اُٹھا کر رُک گیا۔

وہ بولی، ''مارو۔ رُک کیوں گئے؟ میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔''

وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ چندو سمجھ گئی کہ وہ اپنے صاحب کی وجہ سے اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہتا تھا۔ بولی، ''جاؤ ناں! تمہاری شکل بہت ڈراؤنی ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

اُس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ کوئی جواب دیے بغیر برتن سمیٹ کر کمرے سے نکل

کھانا کھاتے ہی چندو پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ سر جھٹک کر اُٹھی۔ دروازے تک آئی۔

جھانک کر دیکھنے لگی۔ ایک سیدھ میں واقع تین عدد کمرے، ان کے آگے دس فٹ چوڑا برآمدہ، برآمدے کے ایک گوشے میں کچن نما کمرہ جبکہ دوسرے کونے میں پختہ سیڑھیاں..... یہ طرزِ تعمیر خالصتاً دیہاتی تھا۔ صحن کچا تھا اور زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ بیر کا ایک گھنا درخت صحن کے عین وسط میں ایستادہ تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ماحول میں کوئی شور نہیں تھا جبکہ صحن کے پار کوئی منڈیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ آس پاس کوئی گھر واقع نہیں تھا۔ جانو کسی کمرے میں تھا۔ اُس کے علاوہ کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ سوچا کہ اس کے پہرے پر صرف رمضان علی عرف جانو ہی تعینات کیا گیا تھا۔ دل کو کچھ تسلی ہوئی کہ وہ ایک آدمی کو دھوکہ دے کر یہاں سے نکل سکتی تھی۔

اُسے رات کا انتظار تھا۔ تب تک شاید اُس کے زخم کی حالت بھی کچھ درست ہو جاتی اور وہ تیز چلنے کے قابل ہو جاتی۔ ہمت کر کے برآمدے میں، پھر صحن میں نکلی۔ اُس کا اندازہ درست تھا۔ اطراف میں دور دور تک کوئی گھر نہیں تھا۔ پانچ سات فٹ بلند چار دیواری کے پار کہیں کہیں درخت دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آہستہ رَوی سے چلتی ہوئی سامنے والی دیوار تک گئی۔ دیوار کے ساتھ چھوٹے سائز کا چکنی مٹی کا تنور بنا ہوا تھا۔ اُس پر چڑھ کر دیوار کے پار جھانکنا چاہتی تھی مگر ٹانگ کے زخم نے اجازت نہ دی۔ پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھا۔ برآمدے کے ہشت پہلوی سرخ ستون کے ساتھ جانو کندھا ٹکائے ایک ٹانگ پر کھڑا اُسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اپنی جانب متوجہ پا کر بولا، ''اگر تم چاہو تو تنور پر چڑھ سکتی ہو۔ چھت پر جا سکتی ہو۔ تمہیں اجازت حاصل ہے۔ ہاں! اگر باہر قدم رکھو گی تو گولی تمہارا سینہ چھلنی کر دے گی۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ رُخ بدل کر صحن کی نکڑ میں واقع باتھ روم کی طرف چل دی۔ تھوڑی سی چہل قدمی نے اُسے تھکا دیا تھا اس لیے وہ کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جانو اُس کیلئے چائے کا پیالہ اُٹھا لایا۔ اُس نے پیالہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ جانو بولا، ''عشاء کے وقت ڈاکٹر تمہیں دیکھنے آئے گا۔ اس وقت میں یہاں موجود ہوں گا۔ احتیاط سے کام لینا اور کوئی ایسی بات نہ کرنا جو ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا کرے۔ سن رہی ہو ناں؟''

اس نے سر ہلایا۔ وہ بولا، ''مجھے گونگوں کے حلق سے بھی آواز نکالنے کا ہنر آتا ہے مگر میں تم پر ترس کھاتے ہوئے سختی نہیں کرتا جس کا تم ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہو۔''

اس نے پھر سر ہلا دیا۔ جانو کا پارہ چڑھا۔ صاحب کا خیال آتے ہی فوراً اُتر بھی گیا۔ بولا،

''صاحب نے ہفتہ بھر کے بعد واپس آنا ہے۔''

وہ چائے کا خالی پیالہ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی، ''اور کچھ؟''

جانو نے سر کھجایا۔ اُٹھتے ہوئے بولا، ''تمہیں کچھ اور چاہیے؟''

''ہاں! مجھے یہاں سے نکلنے کی اجازت چاہیے۔''

''ناممکن! کچھ اور؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بولی، ''تو پھر مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

وہ پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ چندو نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ عشاء کے بعد کسی وقت ڈاکٹر آیا۔ وہ سو رہی تھی۔ دستک پر بیدار ہوئی۔ دروازہ کھولنے تک تین چار مرتبہ دستک دی جا چکی تھی۔ جانو کے عقب میں ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ وہ حلیے سے ڈاکٹر کے بجائے کوئی شعبدہ باز یا جادوگر دکھائی دیتا تھا۔ نہایت منحنی وجود کا مالک ڈاکٹر بمشکل اُٹھارہ بیس برس کا تھا۔ چغہ نما قمیص، جھانکتی ہوئی پیلی بنیان اور گہرے نیلے رنگ کا پائجامہ..... بغل میں بڑا سا بیگ دبا ہوا تھا جو لامحالہ طور پر میڈیکل کٹ کا کام کرتا تھا۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مضحکہ خیز انداز میں چندو کو سلام کیا اور جانو کے پیچھے چلتا ہوا کمرے میں آ گیا۔

اُس کی آواز اس کے حلیے کی طرح خاصی مضحکہ خیز تھی۔ ٹھیٹھ پنجابی زبان میں مخاطب ہوا، ''آپ ادھر چارپائی پر لیٹ جائیں۔''

وہ لیٹ گئی۔ ڈاکٹر گلہری کی طرح اُچھل کر چارپائی کی بانہہ پر چڑھ بیٹھا۔ اجرک ہٹا کر پٹی کھولنے لگا۔ پٹی خون آلود تھی۔ خون جم گیا تھا۔ پٹی اُترتے وقت درد ہونے لگا۔ اس کی سسکی نکلی۔ ڈاکٹر نے کھلی انگلیوں والا پنجہ لہرایا، ''بس جی بس! تھوڑا بہت درد تو ہونا ہی ہے ناں..... بس! چلو جی..... کھل بھی گئی پٹی اور پتہ بھی نہیں چلا۔''

اُس نے زخم کی صفائی کی۔ نئی پٹی باندھی۔ کندھے پر ٹیکہ لگایا اور چند گولیاں اور کیپسول نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ترکیب استعمال سمجھانے لگا۔ وہ دوا سے زیادہ دوا دینے والے کو توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے منحنی چہرے اور نوکیلے ناک تلے مونچھوں کی ہلکی لکیر بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ بولی، ''کیا تم نے ڈاکٹری کا کورس کر رکھا ہے؟''

وہ ہنس کر بولا، ''اونہیں جی! دو چار سال کمپوڈری کی۔ پھر اپنی دکان کھول لی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ میں بڑی شفا دے رکھی ہے۔ کیا آپ کو ٹیکے کا درد ہوا؟'' اس نے

دیدے گھما کر پوچھا؛ پھر جواب سنے بغیر بول پڑا، ''نہیں ہوا۔ یہی خدا کی دین ہے مجھے۔ جیسا بھی ٹیکہ ہو، ذرا بھر درد نہیں کرتا۔''

جانو نے پوچھا، ''اوئے کمپوڈر کی اولاد! یہ بتا کہ زخم کتنے دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا؟''

''ناں کر بادشاہ! میرا باپ تو ہل کوٹنے والا بندہ ہے۔ کمپوڈر تو میں ہوں۔'' پھر اپنا سامان سمیٹتے ہوئے بولا، ''نکالو میری فیس..... یہ دو چار دنوں میں ڈنڈا سروں ہو جائے گی۔''

جانو نے ہنس کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ اُسے چارپائی میں بیٹھے دیکھ کر بولا، ''کیا چائے پیو گی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولا، ''یہ ڈاکٹر بڑا سیانا ہے۔''

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ زیر لب اُسے گالی دیتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ مقفل کر گیا۔

وہ جاگتی رہی۔ اپنے پرس سے رزلٹ کارڈ نکال کر حسرت آمیز نظروں سے دیکھتی رہی۔ عمر حیات نے اُسے کالج میں داخل کرانے کی خوش خبری سنائی تھی۔ کہا تھا کہ اس نے 'اے پلس' گریڈ میں میٹرک پاس کیا ہے۔ وہ جہاں چاہے گی، وہاں آسانی سے ایڈمشن مل جائے گا۔ اس کی محنت نے ہر دروازہ کھول دیا تھا مگر قسمت نے ہر در بند کر دیا۔ زندگی کے دامن میں عصمت بچی تھی جو لٹا بیٹھی تھی اور بے آبرو ہو کر حویلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ قسمت کا وار خاموش اور کائیاں ہوتا ہے۔ چالاک سے چالاک شخص بھی اس وار کو خطا نہیں کر سکتا۔ چندو کیا تھی؟ اس نے تو ابھی زمانہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے پرس میں چند مڑے تڑے نوٹ بھی پڑے تھے جو اس نے اپنے جیب خرچ سے بچا رکھے تھے۔

کافی دیر تک سوچوں میں مستغرق رہی پھر دروازے پر آئی۔ اُس کا جائزہ لیا۔ دیسی ساخت کے بلیوں والے کواڑ بہت مضبوط تھے۔ اس کی کوئی کوشش بند دروازے کو کھول نہیں سکتی تھی۔ کمرے میں اس دروازے کے علاوہ کوئی کھڑکی یا روشن دان تک نہیں تھا۔ اسپاٹ دیوار پر مایوسی کے عالم میں ہاتھ پھیرتی ہوئی چکراتی رہی پھر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ مسلسل یہی سوچے جا رہی تھی کہ کس طرح اس قید خانے سے نجات حاصل کرے۔ اسے یہ خیال نہیں آ رہا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ کہاں جائے گی؟ دنیا بہت بڑی ہے۔ کروڑوں چھتوں سے چھتیں ملی ہوئی ہیں مگر ایک لاوارث، جوان اور خوب صورت لڑکی کو کہیں جائے پناہ نہیں مل سکتی

تھی۔ وہ جس طرف بھی ڈگمگا کر گرتی، ہوس بھری گود اُسے دبوچنے کیلئے موجود ہوتی۔

وہ پانی پینے کیلئے اُٹھی۔ دیوار سے پشت لگا کر کھڑی ہوگئی۔ ایسے میں صحن میں ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ اس نے دروازے سے چمٹ کر ایک عمودی درز پر آنکھ ٹکائی۔ صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی میں ایک پستہ قامت مگر فربہ تن والے شخص کو کرسی پر بیٹھا دیکھا۔ چند لمحوں بعد جانو دوسری کرسی اُٹھائے پہنچ گیا۔ اس نے کرسی رکھی تو ایک بار پھر ویسا ہی کھٹکا ہوا۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ یہ کون تھا؟..... اس موٹے شخص کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آواز سنائی دے رہی تھی، ''یار جانو! میں نے چھوری کو ایک نظر دیکھا تھا جب میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر کو لایا تھا۔ ہائے! کیا غضب کی چھوری ہے یہ۔ صاحب کی قسمت کے کیا کہنے۔ نوروز بھٹی کا مال پسند نہیں آیا اور خالی ہاتھ واپس آ رہے تھے کہ یہ سُچا سودا ہاتھ لگ گیا۔ بے دام، بے مول.....''

جانو نے آہ بھری، ''ہاں بھئی لاٹو! مال تو ایک دم کھرا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے آج تک کسی نے اُسے میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھا۔ صاحب کی موج ہوگئی۔ دو چار دن کھیلے گا۔ پھر باسی روٹی لاکھوں میں بیچ کرنئی تلاش کرنے لگے گا۔ آہ! ہماری قسمت..... ہم اسے دیکھ کر ہی من کا رانجھا راضی کر لیتے ہیں۔''

چندو کو ان کی باتیں زہر لگیں مگر خواہش کے باوجود چارپائی پر نہ جا سکی۔ درد کی وجہ سے مسلسل کھڑے رہنا محال تھا اس لیے گھٹنے ایک رُخ موڑ کر پہلو کے بل بیٹھ گئی۔ درز سے چپکی رہی۔ لاٹو کہہ رہا تھا، ''مجھے ایک آئیڈیا سوجھا ہے۔ صاحب کے پاس کام کرتے ہوئے مجھے پانچ اور تمہیں تین سال ہو گئے مگر ہمارا کچھ نہیں بنا۔ نہ جیب بھری، نہ پیٹ اور نہ ہی دو چار عیاشی کے دن ہاتھ آئے۔ جان کی بازی ہم لگاتے ہیں اور بینک صاحب کا بھرتا رہتا ہے۔ کیوں نہ ہم اپنے لیے بھی کچھ کر لیں۔''

جانو چونکا، ''کیا مطلب؟ کھل کر بات کرو، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

ان کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی مگر ماحول پر چھائی ہوئی غیر معمولی خاموشی کے سبب چندو کو صاف سنائی دے رہی تھی۔

''یار! صاحب لاہور رہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ بڑا چالاک اور ظالم شخص ہے مگر وہ ہمارا پیچھا کر سکتا ہے اور نہ ہی ہمارے بغیر اپنا کاروبار جاری رکھ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اُسے چھوڑ دیں اور کسی طرف منہ کر جائیں۔''

جانو استہزائیہ ہنسی ہنسا، ''واہ لاٹو واہ! صاحب نے ہمیں کوئی باندھ تھوڑا رکھا ہے۔ جب چاہے، چلے جائیں، اُسے کیا پروا؟ وہ اور بندے رکھ لے گا۔ ہم اپنی مرضی سے اُس کی نوکری کر رہے ہیں کیونکہ وہ ہمیں ڈبل تنخواہ دیتا ہے اور پولیس سے بھی بچاتا ہے۔''

''سنو تو سہی یار!'' لاٹو نے تھوڑی برہمی سے کہا، ''ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنہیں ہر وقت ہم جیسوں کی ضرورت رہتی ہے۔ تم نے کبھی نور پور کا نام سنا ہے؟ ادھر مظفر گڑھ ضلعے میں ہے۔''

''نور پور؟ نہیں تو..... تمہارے منہ سے ہی سن رہا ہوں۔ وہاں کیا ہے؟''

''میں وہاں رہنے والے ایک گاگرنیش کو جانتا ہوں۔ بہت بڑا آدمی ہے؛ ایک دم دھانسو! پورے ضلع کی پولیس اس کی مٹھی میں ہے۔ ادھر لاہور میں بھی اس کا کاروبار اور کوٹھی ہے۔ اس کا نام یارن خان ہے۔ ہاتھ کا بہت سخی ہے۔ ہمیں اس کے پاس چلے جانا چاہیے۔ ایک جگہ ٹک کر کام کرنے کا موقع ملے گا تو اپنے لیے بھی کچھ بنا لیں گے۔ ساری عمر ہمارے ہاتھوں میں بندوق اُٹھانے کی طاقت نہیں رہے گی۔ ہمیں بھی آرام کی ضرورت پڑے گی۔ اگر ہم ابھی سے کچھ سوچ لیں گے تو بڑھاپے میں کوئی کام دھندا اور بیوی بچے.....''

''بیوی بچے! واہ لاٹو واہ..... بڑی دور کی کڑیاں ملانے لگے ہو آج تو.....'' جانو نے پہلو کی جیب سے سگریٹ نکالی، سلگائی اور لمبا کش لے کر طنز سے بھرپور لہجے میں بولا، ''اپنی اوقات میں رہو، نہیں تو سیدھا جیل جاؤ گے۔''

''یار جانو! میں غلط نہیں کہتا۔ یارن خان بہت بڑا آدمی ہے۔ صاحب کی طرح دلالی نہیں کرتا بلکہ دلالوں کے منہ میں راتب ڈالتا ہے۔ وہ لمبے ہاتھ مارتا ہے۔''

جانو نے دلچسپی لی، کہا، ''اگر اس نے ہمیں نہ رکھا تو؟''

''کیوں نہیں رکھے گا؟'' لاٹو نے فخر سے کہا، ''تم حامی تو بھرو؛ اگلا کام میرا ہے۔''

جانو نے انکار میں سر ہلایا، ''میں صاحب کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ وہ پانچ سات دنوں بعد آئے گا تو ہم اُس سے اجازت لے کر یارن خان کے پاس چلے جائیں گے۔''

لاٹو کی ہنسی بڑی سفاک تھی، بولا، ''جانو! تم کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ساری عمر یہی مارا ماری کرتے رہو گے اور کسی دن پولیس مقابلے میں مارے جاؤ گے یا جیل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کھانس کھانس کر پھٹے (پھانسی) چڑھ جاؤ گے۔ او بھلے آدمی! یارن خان ہمیں زیادہ نہیں تو پانچ لاکھ روپے جاتے ہی تھما دے گا۔ کیا خیال ہے؟ یہ چھوری اتنے کی تو ہو گی ہی..... ہیں؟ اگر

تمہیں یارن خان کی نوکری پسند نہ آئی تو ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔ اندرونِ سندھ کے ایک وڈیرے سے بھی میرے تعلقات ہیں۔ کچھ سمجھ میں آیا؟''

''اوہ! تو یوں بول ناں باوے! ہم صاحب کو دھوکہ دے کر چندو کو یارن خان کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ہیں؟''

''چندو کون؟ کیا اس چھوری کا نام چندو ہے؟'' لاٹو نے کرسی چھوڑ دی۔

''ہاں! مگر اس طرح تو صاحب ہماری جان کا دشمن ہو جائے گا۔''

''نہیں ہوگا پیارے! ہم کوئی اناڑی تھوڑا ہیں۔ ہم یہ کام بھونڈے طریقے سے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں بچا کر کریں گے۔ سمجھے؟''

''سمجھ گیا؛ آگے بولو۔''

''میں یارن خان کے پاس جاؤں گا۔ اُس سے معاملہ ڈن کروں گا۔ پے منٹ کے بعد یعنی دو چار دن بعد وہ اپنے بندے بھیج کر مال یہیں سے وصول کر لے گا تو ہم یہاں ایسا ماحول بنا دیں گے کہ جب ہماری اطلاع پر صاحب یہاں آئے گا، اسے ہماری کہانی پر یقین آ جائے گا۔ دو چار ماہ بعد ہم یہ نوکری چھوڑ کر یارن خان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اس سے یہ ہوگا کہ صاحب ہمارا دشمن نہیں بنے گا۔''

''ہوں! اب تم نے سیانی بات کی ہے ناں! اور ہماری کہانی کیا ہوگی؟'' جانو نے پوچھا۔

''یہی کہ چندو کے پچھلے واہر (مسلح جتھا) لے کر آدھی رات کو یہاں پہنچ گئے اور ہمیں گن پوائنٹ پر بے بس کر کے اپنی چھوکری کو لے گئے۔ جاتے ہوئے ہماری موٹر سائیکل کے ٹائروں سے ہوا نکال گئے اور فیول پائپ کھول گئے تاکہ ہم ان کا تعاقب نہ کر سکیں۔ بس! اتنی سی کہانی ہے۔''

جانو کو پلاننگ پسند آئی۔ دونوں اس فرضی کہانی کو حقیقت کے پٹ دینے لگے۔ جھوٹ کی نوک پلک سنوارنا ہی تو اصل کام ہوتا ہے۔ پانچ لاکھ کی متوقع رقم معمولی نہیں تھی۔ دو حصوں میں بٹ کر بھی خطیر ہی رہتی۔

ان کے طویل قامت صاحب کا نام ملک افراسیاب تھا۔ لاہور میں خاصے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا تھا۔ جانو کو اُس نے اپنا باڈی گارڈ جبکہ بشیر علی عرف لاٹو کو اس نے اپنا ڈرائیور رکھا ہوا تھا۔ دونوں کو خاصی تگڑی تنخواہیں دیتا تھا۔ وہ دونوں پولیس کو ڈکیتی اور چوری کی وارداتوں میں

مطلوب تھے۔ انہیں پولیس سے تحفظ دے کر من چاہے غیر قانونی کام لیتا تھا۔ وہ چند بڑے صنعت کاروں اور شہر کے بڑوں تک رسائی رکھتا تھا۔ ان کی راتیں رنگین کرنے کیلئے صوبے کے دور افتادہ علاقوں سے حسن کی سوغاتیں خرید لایا کرتا تھا۔ کوڑیوں کے مول خریدا جانے والا مال پالش کر کے جوہریوں کے ہاتھ ہیروں کے مول بیچا کرتا تھا۔ اس کوٹلوں کی دلالی میں جہاں اُسے منہ پر ملنے کیلئے تازہ کلنک ملتی تھی وہاں مہینے میں دو چار دن تازہ کار شباب کی دل بستگی کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ رہتا تھا اور جنت بھی کھسک نہ پاتی تھی۔ اس ریگستانی مورچے کی طرح اس نے مختلف علاقوں میں اپنے بارہ چودہ ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ موضع سمن میں نوروز بھٹی اُسے سال میں ایک آدھ مرتبہ مال فراہم کرتا تھا۔ ملک افراسیاب لاٹو اور جانو کے ہمراہ اسی سلسلے میں سمن گیا تھا مگر مال اور مال کا بھاؤ دیکھ کر مایوس ہو گیا تھا۔ نوروز بھٹی نے بیٹ سے جس لڑکی کو اغوا کر رکھا تھا، وہ ان پڑھ اور نہایت بھدی آواز والی تھی۔ صرف خوبصورتی سے کام نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ منڈی میں خوش نما اداؤں اور خوش کلامی کو بھی میزان پر تولا جاتا تھا۔ واپسی پر اندھے کے ہاتھ بٹیرا لگ گیا۔ چونکہ بٹیرا زخمی تھا، اس لیے اُسے شوکیس میں سجانے سے قبل تندرست کرنا ضروری تھا اس لیے افراسیاب اُسے اس محفوظ ٹھکانے پر لایا تھا اور دونوں وفادار ساتھیوں کے سپرد کر کے لاہور چلا گیا تھا۔ چندو کو ان باتوں کا علم لاٹو اور جانو کے مابین چھڑی رہنے والی گفتگو سے ہوا تھا۔

ان دونوں نے ملک افراسیاب کے آنے سے قبل چندو کو یارن خان کے ہاتھ بیچنے کا منصوبہ بنا لیا۔ چندو دل پر ہاتھ رکھے اُٹھی اور پژمردگی سے لیٹ گئی۔ سمجھ گئی تھی کہ وہ شاخ پر بیٹھی ہوئی وہ فاختہ تھی جس کے سر پر عقاب بیٹھا ہوا تھا اور زمین پر مشاق شکاری کی نشانہ زن بندوق موت کا دہانہ کھولے اُس پر اُٹھ چکی تھی جبکہ مدد کرنے والا سانپ دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ نجانے کب تک صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہے مگر چندو اپنے تاریک مستقبل کے بارے سوچتے سوچتے تھک کر سو گئی۔

صبح ڈاکٹر کے آنے سے قبل وہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر چکی تھی۔ اس دور اُفتادہ جگہ پر جانو کے ہاتھ کے کھانے کو غنیمت جان کر پیٹ میں اتارا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے پٹی بدلی۔ زخم پر کوئی بام لگائی اور زخم بھرنے کی نوید سنائی۔ ٹیکہ لگایا اور سابق دوا جاری رکھنے کا حکم دے کر چلا گیا۔ دن چڑھے مکان کے باہر موٹر سائیکل رُکنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد کھلے دروازے

سے صحن میں لاٹو کی شکل دکھائی دی۔ اس کا رنگ خاصا سیاہ اور نقوش بھدے تھے۔ آنکھیں حلقوں سے ابلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ جسم خاصا فربہ تھا۔ وہ چلتا تھا تو اُس پر لٹو کا گمان ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اُس کا نام 'لاٹو' پڑ گیا تھا۔ اس نے کھانے کا سامان اور ریڈی میڈ ملبوسات کے پیکٹ اُٹھا رکھے تھے۔ چندو کے کمرے میں آیا۔ اُسے بہ نظرِ شوق دیکھا۔ ملبوسات چارپائی پر پھینک کر بولا، ''چندو! یہ کپڑے پہن لو اور جانو کی اجرک فارغ کر دو۔''

اس نے سر ہلایا۔ لاٹو کے جانے کے بعد اس نے ایک پیکٹ کھولا۔ سوٹ خاصا قیمتی اور مکمل تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے لباس تبدیل کر لیا۔ اس کے علاوہ دو اور سوٹ پیکٹوں میں بند تھے۔ اسے توقع تھی کہ رات کو بنائے گئے منصوبے کے تحت لاٹو یا رن خان کے پاس جائے گا مگر وہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے یا تو اپنا پلان منسوخ کر دیا تھا یا اس میں کوئی تبدیلی کر لی تھی۔

گولی کا زخم اب صرف چھیڑنے سے دکھتا تھا۔ وہ صحن میں کچھ دیر ٹہلتی رہی پھر سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئی۔ اُسے دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں ٹوکا۔ چھت پر کھڑے ہو کر ارد گرد دیکھتے ہی اس کے اندازے کی توثیق ہو گئی۔ مکان کے چاروں طرف تاحدِ نگاہ ویرانی کا راج قائم تھا۔ اونچی نیچی ریگستانی زمین پر کہیں کہیں چھوٹی بڑی جھاڑیاں اور درخت دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کتابوں میں ریگستانوں کے بارے پڑھ رکھا تھا۔ فائزہ کے کرم سے فلموں میں دو تین مرتبہ اس سے ملتے جلتے مناظر دیکھے تھے۔ اپنی آنکھوں سے ریگستان کی بیابانی کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ اسے یہ اندازہ تو تھا کہ مکان کے آس پاس کوئی دوسرا مکان نہیں ہے مگر اس قدر ویرانی کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اسے مکان میں چلنے پھرنے اور چھت پر جانے کی آزادی ملنے کی وجہ یہی تھی کہ وہ یہاں سے بھاگ کر کسی پناہ گاہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ گھنٹہ بھر چھت پر رہی تھی۔ اس دوران کوئی ذی نفس؛ انسان تو کجا، کوئی جانور تک دکھائی نہیں دیا۔ چھت سے اُتری تو دیوار کے سائے میں کرسی ڈال کر بیٹھے جانو پر نظر پڑی۔ اس کی گود میں ایک خوفناک بندوق پڑی تھی۔

چندو کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ مسلسل خوف اور دہشت میں رہتے ہوئے وہ ایک دم پرسکون ہو گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے حالات سے مفاہمت کر لی تھی اور بھاگ نکلنے کیلئے مناسب موقع کا انتظار کرنے لگی ہو۔ کم و بیش ایک ہفتے کی مہلت اُسے میسر تھی۔ یعنی

جب تک ملک افراسیاب نہ لوٹتا یا اس کے غدار نوکروں کا منصوبہ پروان نہ چڑھتا، وہ محفوظ تھی۔ زندگی انسان کو ایک کے بعد ایک خوش فہمی دیتی ہے۔ زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی خوش فہمی سونے تک برقرار رہی مگر آدھی رات کو ایک زوردار دھماکے سے ٹوٹ گئی۔ جانو دروازہ کھول کر اس کی چارپائی تک پہنچ آیا تھا۔ وہ خوف کے مارے منہ پر ہاتھ رکھے اُٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے بھیانک چہرے والے جانو کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے پنڈلی پکڑلی۔ پچکار کر بولا، ''ڈر کیوں گئی ہو میری جان! کھا تو نہیں جاؤں گا۔''

وہ کانپ اُٹھی۔ بولی، ''چھوڑ دو مجھے! تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟''

وہ مکروہ ہنسی ہنسا، ''نہیں میری بلبل! تم دو چار دن کی مہمان ہو۔ چلی جاؤ گی تو شاید عمر بھر تمہاری شکل نہیں دیکھ سکوں گا۔ اس لیے مجھے میزبانی کا تھوڑا سا موقع دے دو۔''

چندو کی آنکھوں میں عمر حیات کی جنونی گرفت گھوم گئی۔ تڑپ کر پیچھے ہٹی۔ بولی، ''میں تمہارے صاحب کو بتا دوں گی۔''

''ہا..... ہا..... اُسے بتانے تک تم یہاں نہیں رہو گی۔ بہت دور جا چکی ہو گی۔ اس لیے تو میں حسن کی تھوڑی سی خیرات لینے آیا ہوں۔'' جانو کے لہجے میں زہر بھرے سانپ کلبلا رہے تھے۔

چندو نے ایک جھٹکے سے اپنی پنڈلی چھڑائی۔ چارپائی سے اتر کر دروازے کی طرف بھاگی۔ دروازے کے باہر لاٹو کو بانہیں پھیلائے کھڑا دیکھا تو جہاں کی تہاں رہ گئی۔

وہ مکروہ انداز میں ہنسا، ''کوئی بات نہیں چھوری! جانو پسند نہیں تو یہ خادم حاضر ہے۔ آؤ میرے پاس..... آجاؤ۔''

وہ دہشت سے تھم گئی۔ تھر تھر کانپنے لگی۔ ایسے میں جانو نے عقب میں آ کر اُسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھر لیا اور کھینچ کر چارپائی پر لے گیا۔ وہ حلق کے بل چیخی، زخمی ناگن کی طرح تڑپ کر پھڑپھڑائی اور پھر ہار کر منت سماجت پر اُتر آئی۔ اس کی ہر کوشش ہوس کے بے لگام گھوڑے کے آگے دم توڑ گئی۔ ایک گھوڑا دم لینے کو ہٹ گیا، تازہ دم گھوڑا اُسے سموں تلے لتاڑنے کیلئے آگے بڑھ آیا۔ نایاب جوانی مالِ غنیمت بن کر ہاتھ لگی تھی۔ چوری کا تھان تھا جسے رات بھر ڈانگوں کے گز سے ماپا گیا۔ ان کے سفلی ہیجان نے اُسے بہت جلد بے ہوش کر دیا تھا۔ بے ہوشی میں آنکھیں بند ہو جاتی ہیں مگر اس کی آنکھیں مُردوں کی طرح کھلی تھیں۔ چھت کی کڑیوں پر ساکت تھیں۔ اُسے بری طرح پامال کرنے کا گھناؤنا کھیل شب بھر جاری رہا۔ اس جہنم کدے

جیسے صحرائی مکان تک صبح کی اذان شاید آج تک نہیں پہنچی تھی۔ دور افتادگی کے سبب فلاح اور نیکی کی پکار اندھوں بہروں تک اُس رات بھی نہیں پہنچ پائی۔

ہر رات کی طرح وہ رات بھی سورج تلے ماضی کا قصہ ہوگئی۔ دو بجے کے قریب چندو کی ساکت پتلیوں میں زندگی سرسرائی۔ کافی دیر تک خالی الذہنی کی کیفیت میں پڑی آنکھیں پٹپٹاتی رہی پھر اس کے لبوں سے بے ساختہ آہ نکل گئی۔ چند لمبی لمبی سانسیں لے کر چارپائی کی بانہوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اپنے بے لباس بدن کو سرد نظروں سے دیکھا پھر ادھ کھلے دروازے کے باہر چمکتی ہوئی دھوپ پر نظر ٹھہرا دی۔ عضو عضو دکھ رہا تھا۔ کسی احساس کے بغیر اس نے رانوں پر ہاتھ مارے اور سر نیہوڑا کر رونے لگی۔ زندگی اتنی بدصورت بھی ہوتی ہے؟ اس نے زندگی بھر یہ نہیں سوچا تھا۔

جانو دروازے میں آ کر زور سے ہنسا۔ چندو نے سر اُٹھا کر دھندلائی نظروں اُسے دیکھا۔ بکھرے بالوں میں اس کا روتا ہوا چہرہ کسی پتھر کی طرح بے جان تھا۔

جانو نے اُسے سرتاپا گھورا۔ ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا، ''اُٹھو! نہا کر کپڑے پہن لو۔ کھانا تیار ہے۔''

وہ خاموشی سے اُسے گھورتی رہی۔ بدن کے کسی ننگے عضو پر اپنی ہی نگاہ پڑا کرتی تھی تو پورا بدن گدگدانے لگتا تھا۔ آج بھیانک چہرے والا جانو دیدے پھاڑ پھاڑ کر پورے بدن کی برہنگی کو اپنی شیطانی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مگر چندو کے ذہن میں شرم کا رتی بھر احساس پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ بدقت تمام اپنے بکھرے ہوئے اعضا کو سمیٹ کر اُٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ قریب آئی تو جانو نے بانہوں میں بھر لیا۔ جھک کر زلفیں ہٹائیں اور چہرہ چوما، عامیانہ انداز میں چھیڑا، مگر وہ بے حس کھڑی رہی۔ آنکھوں میں مزاحمت کا کوئی تاثر پیدا نہ ہوا۔ جانو کی کمینگی کچھ دیر تک اُسے روکے رہی، پھر راستہ دے گئی۔ وہ روبوٹ کی سی مشینی چال چلتی ہوئی صحن سے گزر کر باتھ روم میں چلی گئی۔ بے جان ہاتھوں سے گھنٹہ بھر اپنے وجود پر پانی ڈالتی رہی مگر بدن تھا کہ زندگی کی لہروں کو پہچان ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی ران پر بندھی ہوئی پٹی بری طرح بھیگ گئی مگر اس نے پروانہ کی۔ جانو نے دروازے پر دستک دی۔ وہ گیلے بدن ہی باہر آ گئی۔ جانو بولا، ''ایک ہی رات میں بڑی بے شرم ہوگئی ہو۔''

دیکھا جائے تو ایک رات کا قصہ کئی سالوں پر محیط تھا۔ ایسی رات گزرتی نہیں، گزاری جاتی

ہے۔ چندو بے شرمی کے بارے سوچتی ہوئی کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں رُکی، وہاں چند ہی لمحوں میں فرش پر پانی کھڑا ہو گیا۔ بالوں سے ننھے ننھے دھارے گر رہے تھے۔ جانو نے ایک بڑے تولیے میں اُسے لپیٹ دیا اور چمکتے ہوئے آفتابی بدن پر نگاہیں سینکتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ جب وہ کھانا اُٹھائے کمرے میں آیا، چندو کپڑے پہن چکی تھی۔ اس نے بال سنوارنے کے بجائے تولیے میں لپیٹ رکھے تھے۔ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی جبکہ جانو اس سے فحش چھیڑ چھاڑ اور اخلاق باختہ باتیں کرتا رہا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی گیلی پٹی کھولی۔ نئی باندھی۔ زخم پر کھرنڈ آنے لگا تھا۔ شام تک کرسی پر بے جان انداز میں بیٹھی رہی۔ شام کو کھانے کے بعد جانو کی ہوس پھر بھڑک اُٹھی اور وہ تختۂ مشق بنی اپنے نصیبوں کو کوستی رہی۔ جانو کا ہاتھ بٹانے والا لاٹو کہیں گیا ہوا تھا، شاید یارن خان کے پاس؛ کیونکہ وہ بہتی ہوئی گنگا میں ہاتھ دھونے نہیں آیا تھا۔

جانو جلد ہی اکتا گیا۔ جواں بدن جتنا بھی خوب صورت ہو، اگر گرم اور زندہ نہ ہو تو مردانگی کو شہہ نہیں دیتا اور بیزار کر دیتا ہے۔ جانو نے اُسے سیخ پا ہو کر مارا پیٹا، گولی مارنے کی متعدد بار دھمکی دی اور غصے میں بے قابو ہو کر دو تین مرتبہ اُٹھا کر پٹخ بھی دیا بھی مگر چندو کا جسم برف کی طرح خاموش اور یخ بستہ رہا۔ آنکھیں مُردوں کی طرح ساکت رہیں جن میں جھانکنے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ رات کے گہرا ہونے تک جانو اس پر لعنت بھیج کر کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد چندو کو دروازے کے کھلا رہ جانے کا احساس ہوا۔ اٹھی، جلدی جلدی لباس پہن کر برہنہ پا باہر نکل آئی۔ جانو برابر والے کمرے میں سو رہا تھا۔ حویلی کا بڑا دروازہ بند تھا۔ شاید مقفل بھی تھا۔ وہ تنور پر چڑھ کر دیوار کے پار ریت پر کود گئی۔ تاحدِ نگاہ چاندنی میں چمکتے ہوئے ٹیلوں پر اُگے ہوئے جھاڑ جھنکار اور درختوں پر جانوروں اور دشمنوں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ سر جھکائے ریت پر ناک کی سیدھ میں چلتی گئی۔

اُسے خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں تھی اور اس کس طرف جانا چاہیے تھا۔ گانمن کے دھتکارنے کے بعد عمر حیات کی زندگی کا دروازہ اُس پر وَا ہوا تھا۔ وہ دروازہ بند ہوا تو دنیا بھر کے دروازے بند ہو گئے۔ ان دروازوں کو قسمت کھول سکتی تھی جو ابھی اس پر مہربان نہیں ہوئی تھی۔ وہ پلٹ کر دیکھے بغیر چلتی گئی۔ ریت میں پیر دھنس رہے تھے اور چلنا بتدریج دوبھر ہوا جاتا تھا۔ شاید ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر پائی تھی کہ اچانک سر میں زوردار دھماکہ ہوا۔ پھر اوپر تلے کئی نسبتاً کم

شدت والے کئی دھماکے ہوئے۔ یہ مسلسل بے آرامی اور نہ ختم ہونے والے اضطراب کا شاخسانہ تھا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ پائی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں بھینچ کر گھٹنوں کے بل ریت پر گر گئی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی بہتیری کوشش کی مگر ناکام رہی اور بے سدھ ہو گئی۔ بے جان اعضاء کی طرح بال ریت پر بکھر گئے اور وہ زندگی اور وقت کی خود کار چال سے بے خبر ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اُسے ہوش آیا اور اس نے خود کو قفس میں پایا تو یہ طے نہ کر پائی کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔ بے ہوشی میں اُس پر کیا بیتا؟ خبر نہ تھی۔

جانو نے احسان جتا کر اپنی موجودگی کا احساس دیا، ''میں چاہتا تو تمہیں گولی مار کر ہمیشہ کیلئے آزاد کر دیتا مگر مجھے تم پر ترس آ گیا۔ دوسری مرتبہ ترس نہیں آئے گا اس لیے تمہیں اپنے آپ پر رحم کرنا ہوگا۔''

اس نے ہنکارا بھرا۔ زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی۔ ایسے میں جانو کی دھمکی دل پر کیا اثر کرتی۔ شام کو لاٹو کامیاب سودے بازی کی خوشی چہرے پر سجائے نظر آیا۔ اس نے چندو کی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے جانو کو بتایا کہ وہ یارن خان سے چار لاکھ میں سودا طے کر کے آدھی رقم پیشگی وصول کر لایا تھا۔ یارن خان سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنا کر بولا، ''تم یارن خان کے آدمیوں کے ساتھ جاؤ گے کیونکہ یارن خان نے یہ شرط عائد کی ہے کہ ہم میں سے ایک آدمی اس کے کارندوں کے ساتھ نور پور تک جائے گا۔ دیکھو نا! ابھی اس سے تعلقات کی شروعات ہیں۔ وہ ہم پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس لیے اس نے یہ شرط عائد کی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ہمارے لیے بہتر ہوگا کیونکہ میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ تم حملہ آوروں کے تعاقب میں گئے ہو یا وہ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ٹھیک ہے؟''

جانو نے کچھ سوچا پھر تائید میں سر ہلا دیا۔ دونوں نے رقم بانٹ لی۔ بقیہ رقم آج رات کو مال کی ڈلیوری پر ملنی تھی۔ رنگو کو پانچ لاکھ کی توقع تھی۔ ایک لاکھ کم ہو گیا تھا مگر چوری کا مال بیچتے ہوئے دل کھلا کرنا پڑتا ہے۔ جھوم کر بولا، ''آؤ! اس کامیابی کا جشن مناتے ہیں؛ پھر اس چھوکری کو ذرا پونچا لگا دیتے ہیں۔ چار لاکھ کا مال دس لاکھ کا نظر آئے تو خریدار کا دل خوش ہو جاتا ہے۔''

لاٹو دوسرے کمرے سے سستی شراب کی بوتل اُٹھا لایا۔ دونوں نے چندو کے قید خانے میں بیٹھ کر جشن کا اہتمام کیا۔ جام سے جام ٹکرائے اور چندو کے غیر معمولی سرد جسم سے اپنی بپھری ہوئی جوانی کو تقویت دینے کی نامراد کوشش کی۔

لاٹو نے برا سا منہ بنا کر کہا، ''اگر رات کو اس کی رخصتی نہ ہوتی تو اس کے بدن میں بھی شراب کی آگ اُتار دیتا۔ مردے کو چومنے چاٹنے کا خاک مزہ ہے۔''

جانو نے چندو کے سینے پر الٹے ہاتھ کا چانٹا رسید کیا۔ نفرت سے تھوک دیا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا تھوک چاٹنے لگا۔ لاٹو نے بوتل میں بچ جانے والی چند گھونٹ شراب انڈیل دی۔ جانو مجنونانہ انداز میں شراب چاٹنے لگا۔ بدبودار شراب ہوا میں اُڑتے ہوئے چندو کے بدن میں خنکی اُتارنے لگی۔

دس بج گئے۔ دونوں چندو کو غلیظ گالیاں دیتے ہوئے ہٹ گئے۔ لاٹو نے کمرے میں کونے میں خالی بوتل اچھالی اور برہمی سے کہا، ''جانو! اِسے نہلاؤ اور تھوڑی بہت لیپا پوتی کر دو اس کتیا کے چہرے پر۔ یارن خان کے بیڈروم میں ایسے ٹھنڈی ٹھار پڑی رہی تو وہ گولی مار کر کتوں کے آگے ڈال دے گا حرامزادی کو۔''

جانو نے اُسے گالی دی اور بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باتھ روم میں لے گیا۔ صحرا کی رات سرد تھی مگر نہ تو نہلانے والے کو پروا تھی، نہ نہانے والی ہی کو احساس تھا۔ باتھ روم میں پانی گرنے کی آواز سنائی نہیں دی تو جانو پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ چندو نلکے کی ٹونٹی تلے خالی بالٹی لیے سر افگندہ بیٹھی تھی۔ جانو نے اُس کے پہلو میں ٹھڈا مارا۔ وہ الٹ گئی۔ بے حس پڑی رہی تو اُس نے بالوں سے پکڑ کر ٹونٹی تلے کھینچ لی اور نلکا چلانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے اُس نے جس بدن پر تھوکا تھا، زیرِ لب گالیاں دیتے ہوئے اسی بدن پر صابن ملنے لگا۔ مجبوری تھی۔ چار لاکھ دینے والا خریدار اندھا نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے محنت کر کے مال کو چمکانے لگا۔ اگر اُسے گھسیٹ کر کمرے تک لاتا تو وہ مٹی سے لتھڑ جاتی؛ اِس لیے اُس کے گیلے بدن کو کندھے پر ڈالے چارپائی تک لایا۔ پھر دونوں نے مل کر اُسے خوبصورت بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ تنقیدی نظر ڈال کر مطمئن ہو گئے تو جانو کھانا تیار کرنے کیلئے کچن میں جا گھسا۔

چولھے میں جنگلی کیکر کی خشک لکڑیاں جل رہی تھیں۔ شعلے باہر کو لپک رہے تھے اور ہر حد سے نکل کر جلانے کیلئے بے تاب تھے۔ آگ کی طرح طرح سرشت میں گھر کر جانے والی بے ایمانی کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ دونوں نے ملک افراسیاب کو دھوکہ دیتے ہوئے چار لاکھ کما لیے تھے۔ جانو دو لاکھ کا حصہ دار تھا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اتنی بڑی رقم تک زندگی میں پہلی بار ہاتھ پہنچا تھا۔ پھر کبھی ایسی مایا ہاتھ لگے، نہ لگے، مقدر کی بات تھی۔ لالچ جادو کی طرح سر چڑھ کر

بولنے لگا تو اس کی ذہنی رو پٹڑی بدل گئی۔ وہ کھانے کے ساتھ ساتھ لاٹو کی موت کا سامان اپنے لباس میں چھپا لایا۔ کھانا سے فارغ ہوتے ہی اُس نے پستول نکال کر لاٹو کے سر کا نشانہ لیا اور کہا، ''بشیر علی! تم میرے پرانے یار ہو۔ ہم نے ہر مصیبت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے مگر اَب جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔''

لاٹو ہنسا، ''مذاق مت کرو؛ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اتنا پیا کرو جتنی پچا سکو۔''

اس کی انگلی ٹرائیگر پر لرزنے لگی۔ لاٹو کو یکبارگی جانو کے چہرے پر چھا جانے والی سنگینی کا احساس ہوا۔ جلدی سے بولا، ''ناں کر دیار! اِسے پرے ہٹا لو؛ یہ چل بھی سکتا ہے۔''

اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی پستول چل گیا۔ گولی کی خوفناک آواز نے چندو کو ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ خالی خالی آنکھوں سے کرسی سے گر کر فرش پر تڑپتے ہوئے لاٹو کو دیکھنے لگی۔ گولی اس کی پیشانی پر عین آنکھوں کے درمیان لگی تھی۔ سرخ تر خون تیز فوارے کی طرح نکل رہا تھا اور اسے چیخنے کی مہلت تک نہیں ملی تھی۔

چندو نے کسی تاثر کے بغیر پوچھا، ''اسے کیوں مار دیا تم نے؟''

''یہ اپنے حصے کا کام کر چکا تھا۔ میرے حصے کا کام باقی تھا؛ سو میں نے کر دیا مگر تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں، تجھے نہیں ماروں گا۔'' جانو کا چہرہ موت کی طرح پتھریلا تھا جبکہ لہجے سے خون کی بُو مترشح ہو رہی تھی۔ چندو نے ایک نظر لاٹو کے آخری جھٹکوں پر تڑپتے ہوئے لاشے کو دیکھا اور رُخ پھیر لیا۔ اُس کا عمر حیات بھی ایسے ہی تڑپ کر چند لمحوں میں سڑک پر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

جانو نے چندو کو چارپائی سمیت ملحقہ کمرے میں منتقل کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یارن خان کے کارندے جب چندو کو لینے کیلئے مکان میں آئیں تو انہیں لاٹو کی لاش نظر آئے۔ چندو اُس کی حرکات و سکنات کو بے حس نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ اس درندہ صفت انسان نے لاٹو کے حصے کے دو لاکھ روپے ڈکارنے کیلئے اُسے گولی ماری تھی۔

اس لالچی رویے پر اُسے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ عشق کا دعویٰ کرنے والے ایک دیوانے کو دیکھ چکی تھی۔ عمر حیات کا دل اگر جانو کی طرح سیاہ نہ ہوتا تو وہ اُسے بُرا سمجھنے کے باوجود بھیانک شیطان نہ بنتا۔ غصے میں آپے سے باہر ہو کر اُسے حویلی سے نکال دیتا، مار مار کر ادھ موا کر دیتا یا حد کرتا تو گولی مار دیتا مگر بھیڑیے کی طرح بے رحمی اور سفاکی سے اُسے پامال کرتے ہوئے اپنی نامراد مردانگی کو سیراب نہ کرتا۔

جانو اُس کیلئے چائے کا پیالہ بھر لایا۔ وہ سر جھکائے پیتی رہی اور دانستہ طور پر اپنے بدن سے نظریں چراتی رہی۔ اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ اُس ظالم شخص پر دل دُکھا جو اُسے اپنی گناہ آلود محبت کی نشانی بنا کر کسی کوکھ میں ڈال کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اُس جوانی کے منہ زور جذبوں کی بھینٹ چڑھنے والی عورت پر گلہ ہوا جو اُسے پیدا کرنے کے بعد مارنے کے بجائے زندہ دریا میں پھینک گئی تھی۔ اُسے گامن بھی اُس گھڑی برا لگا۔ وہ اگر اُسے پانی کی منہ زور لہروں سے اُسے چھین نہ لیتا، بے نام وجود کو 'چندو ماہی' نہ بنا دیتا تو وہ ڈوب گئی ہوتی، مر کھپ گئی ہوتی اور زندگی کو آغاز میں موت کا ذائقہ کچھ زیادہ برا بھی نہ لگتا۔ اب وہ نہ تو مر سکتی تھی اور نہ ہی دنیا کی کمینگی نے اُسے زندہ رہنے کے قابل چھوڑا تھا۔

اس کے برابر چارپائی پر بیٹھا ہوا جانو دیکھ تو اُسے رہا تھا مگر اُس کی چشمِ تصور میں چار لاکھ روپے کے نوٹ چمک رہے تھے۔ نوٹوں کی مخصوص خوشبو اُس کے چہار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ اِس خوشبو میں اُس کے یار بشیر علی عرف لاٹو کی دیرینہ دوستی کی لاش سے اُٹھنے والا تعفن دب گیا تھا۔ ہوس آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ وہ بھی زیادہ کے چکر میں اندھا ہو گیا تھا اور قسمت اُسے دھوبی کا کتا بنا کر گھر اور گھاٹ میں چکرانے پر مجبور کرنے والی تھی مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ لاٹو نے اُس سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اُسے جگری یار سمجھ کر اپنی یاری کی لج پالتا چلا آیا تھا مگر کسی وجہ کے بغیر اُس نے یہ بات چھپالی تھی کہ یارن خان کے دستِ راست استاد رنگو سے اُس کا رسمی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ اُس کا لنگوٹیا یار تھا۔ دونوں کا بچپن ایک ہی گلی میں کھیلتے کودتے گزرا تھا۔

وہی استاد رنگو اپنے باس یارن خان کا پہلوگرمانے کیلئے دو لاکھ کے گرم گرم نوٹ اُٹھائے صحرا کے دل میں پہنچنے والا تھا۔ رات نصف سفر طے کر چکی تھی جب خوفناک سناٹے میں کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھراہٹ اُبھری۔ جانو جلدی سے اُٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے دروازہ باہر سے بند کر گیا۔ چندو جاگ رہی تھی مگر آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ آنے والا جانو اور لاٹو کا صاحب ملک افراسیاب تھا یا نور پور کے یارن خان کا کوئی پالتو غنڈہ۔ وہ بھاگنے کی کوشش کرتی بھی تو اُسے دروازہ بند ملتا۔ قفس سے نکل کر دیکھ چکی تھی کہ صحرا کے دامن میں اس کیلئے سائبانی نہیں تھی۔

آنے والے تعداد میں تین تھے جو جانو کے پیچھے چلتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں جانو نے چندو کو قید کر رکھا تھا۔ چندو نے آنکھیں کھولیں۔ سراسیمگی کے ساتھ تشویش

کے ڈورے آنکھوں میں تیرنے لگے۔ آنے والوں میں سے ایک نے سفید رنگ کا اوور آل پہن رکھا تھا۔ گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکا رکھی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ یہاں کسی ڈاکٹر کی آمد کا جواز نہیں تھا اور نہ ہی اس کا چہرہ کسی مسیحا کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اگر اُس نے سفید بے داغ لباس نہ پہن رکھا ہوتا تو جانو اور لاٹو کے قبیل کا ہی فرد نظر آتا۔ دوسرے دونوں اپنی وضع قطع سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ اوور آل والے نے چندو کو ایکسرے کرتی نظروں گھورا اور جانو سے مخاطب ہوا، ''کیا نام بتایا ہے تم نے اپنا؟ ہاں..... رمضان علی..... لاٹو کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آ رہا۔''

جانو نے کن اکھیوں سے چندو کو دیکھا۔ کہا، ''اُسے ملک صاحب نے ہنگامی طور پر لاہور بلایا تھا۔ چلا گیا۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے اُس نے تمہارے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ میں تیار ہوں۔''

''رمضان علی! ہمارے دھندے میں جھوٹ نہیں چلتا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھیں تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ سچ بتاؤ؛ کیا تم دونوں نے اس لڑکی کو ہاتھ لگایا ہے؟''

اس کے لہجے سے برہمی مترشح تھی۔

جانو اُس کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولا، ''نہیں استاد رنگو! ہم نے تو کیا، کسی نے بھی اِسے نہیں چھوا۔''

''پھر یہ میلی کیوں ہے؟'' اس نے اپنے گلے میں جھولتی ہوئی اسٹیتھو اسکوپ کو آہستگی سے گھماتے ہوئے درشتی سے کہا۔ جانو کے بولنے سے قبل ہی اس نے اوور آل کے نیچے سے لمبی نال والا پستول نکال کر تان لیا۔ غرایا، ''لگتا ہے کہ تم کچھ زیادہ ہی بگڑے ہوئے ہو۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اوئے جیدیا! پورے مکان کی تلاشی لو۔ میرا خیال ہے کہ اِس خبیث نے میرے یار کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔''

جانو گڑبڑا گیا، جلدی سے بولا، ''کیا مطلب؟ میں اپنے جگری یار کو کیوں ٹھکانے لگاؤں گا؟ کہا تو ہے کہ وہ لاہور گیا ہے۔ تم یہ تلاشی ولاشی کا چکر نہ چلاؤ، باقی رقم ادا کرو اور اپنا مال وصول کر کے چلتے بنو۔''

جیدا چوکس انداز میں پلٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جانو نے اُسے روکنے کیلئے سرعت سے پیچھے جانا چاہا مگر توانا جسم والے استاد رنگو نے اس کے سینے پر پستول کی نال ٹکا دی۔ پھنکارا، ''یہیں کھڑے رہو۔ زیادہ چالاک نہ بنو ورنہ گولی مار دوں گا۔ ہمارے خان نے زیرو میٹر مال کا

دام چکایا ہے۔ سیکنڈ ہینڈ مال کا نہیں۔ اگر لاٹو بتا دیتا کہ تمہارا مال دو نمبر ہے تو خان کبھی ہڈی نہ پھینکتا۔ تم میری آنکھوں میں دھول جھونک کر پیتل کو سونا بنا کر دکھا رہے ہو۔ واہ بھئی واہ! کیا تمہیں بشیر علی نے میرے بارے کچھ نہیں بتایا؟''

جانو کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ کھلے دروازے کو خوف بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا، ''یہ کافی دیر سے اِس کمرے میں قید ہے جس کی وجہ سے بیمار پڑ گئی ہے۔ کھلی ہوا میں جائے گی تو دو چار دن میں ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ تمہیں اگر مجھ پر یقین نہیں تو اِسی سے پوچھ لو۔''

استاد رنگو کے اشارے پر اس کا نوکیلی مونچھوں والا ساتھی چندو کے قریب آیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا، ''اے چھوری! کیا اس بے غیرت نے تیرے ساتھ منہ کالا کیا ہے؟''

چندو دہل کر رہ گئی۔ سوال شرمناک تھا۔ جواب اِس سے بھی زیادہ ذلت آمیز تھا۔ جھوٹ بول کر مقدس نہیں ہو سکتی تھی۔ سچ بولنے پر زیادہ سے زیادہ گولی مار دی جاتی۔ یہ بڑی بات نہیں تھی کیونکہ زندگی اُس کے نزدیک بے وقعت ہو گئی تھی۔ سوچا۔ اسی لمحے جانو اور لاٹو کی بربریت یاد آ گئی۔ جسم جھرجھرا گیا۔ دانت پیس کر بولی، ''ہاں! یہ دونوں بہت غلیظ ہیں؛ درندے ہیں۔''

جانو نے بھڑک کر گالی دی۔ استاد رنگو نے زہر خند لہجے میں کہا، ''نہیں چن! غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چھوری نہ بولے تب بھی اس کے منہ ماتھے سے ہی تمہارے کیے دھرے کا پتہ چلتا ہے۔ لاٹو ایڈوانس میں دو لاکھ روپے لایا تھا، وہ کہاں ہیں؟''

جانو سمجھ گیا کہ کھیل کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ اُسے توقع نہ تھی کہ آنے والا اتنی جلدی معاملے کی تہہ پر پہنچ جائے گا۔ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ جیدے نے کمرے میں آ کر سنسنی آمیز انداز میں کہا، ''استاد! تمہارا یار ساتھ والے کمرے میں مردہ پڑا ہے۔ ادھر گولی لگی ہے اُسے!'' جیدے نے پیشانی پر انگلی رکھی اور جانو کو خونخوار نظروں سے گھورا، ''دو لاکھ روپے بھی مل گیے ہیں جنہیں گاڑی میں رکھ آیا ہوں۔ اور کوئی خاص چیز نہیں ملی۔''

''اچھی طرح دیکھ لینا تھا۔ کوئی اور خبیث چھپا ہوا نہ ہو۔''

''نہیں اُستاد! میدان صاف ہے۔''

استاد رنگو نے سر ہلایا۔ جانو کی طرف متوجہ ہوا، ''ہاں اوئے بے غیرت آدمی! تم نے اپنے ساتھی کو مار دیا۔ میرے سنگی لاٹو کو مار دیا۔ ہیں؟ صرف دو لاکھ روپے کی خاطر..... لاٹو کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔ جس آدمی کو یار دشمن کی پہچان نہ ہو، اُسے اسی طرح کتے کی موت ہی مرنا چاہیے

تھا۔ مر گیا۔ اور تم؟..... تمہیں نوٹوں کی پہچان ہے۔ یار کی نہیں۔ تمہیں بھی اس کے پیچھے پہنچ جانا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟''

''لاٹو کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ لالچ میں.....''

''نہیں چن! اَب تم توے پر بیٹھ کر سچ کہو تب بھی نہیں مانوں گا۔ اگر وہ لالچی ہوتا تو اس کی جگہ پر تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ تم رحم کے لائق نہیں ہو۔'' استاد رنگو کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

جانو نے تھوک نگلا، ''مگر یہ ہمارا مسئلہ ہے اُستاد! تم اپنے کام سے کام رکھو اور ٹانگہ پکی پر چڑھاؤ۔''

استاد رنگو نے قہقہہ لگایا، سفاکی سے بولا، ''ٹانگہ پکی پر چڑھاؤ۔ واہ بھئی واہ! کیا ڈائیلاگ مارا ہے تم نے..... مگر میں نہیں، یہ کام تم کرو گے۔ گھوڑے کو شاٹا مارو اور ٹانگہ اسی پکی پر چڑھا دو جس پر لاٹو گیا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اُس نے لبلبی دبا دی۔ گولی خوفناک آواز کے ساتھ نکلی اور جانو کے سینے میں دھنس گئی۔ اس کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ ڈگمگایا۔ دیوار سے پشت ٹکا کر ایک ذرا سنبھلا۔ پستول نکالنے کیلئے ہاتھ مارنے لگا۔ استاد رنگو نے اس کا ارادہ بھانپ لیا اور نشانہ لے کر دوسرا فائر داغ دیا۔ گولی سیدھی جانو کی نرخرے میں لگی۔ خون کا فوارا پھوٹا اور وہ پھڑ پھڑا کر دیوار کی جڑ میں ڈھے گیا۔ تیسری گولی کھوپڑی میں سوراخ کر گئی۔ اس کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔

استاد رنگو اُس پر نفرت سے تھوکتا ہوا دوسرے کمرے میں پڑے ہوئے بشیر علی عرف لاٹو کا آخری سنگار کرنے کیلئے چلا گیا جبکہ جیدا تیزی سے چندو کی طرف بڑھا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نظروں سے لہو میں نہانے والے جانو کو دیکھ رہی تھی۔ جیدے نے اُسے بے دردی سے کھینچا اور حویلی کے دروازے تک گھسیٹتا گیا۔ دروازے کے باہر تھڑے پر سفید رنگ کی ہائی رُوف ایمبولینس کھڑی تھی۔ جیدے نے اُسے ایمبولینس کے بیڈ پر پھینکا۔ اس وقت استاد رنگو بھی حویلی سے نکل کر گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا جبکہ تیسرے شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

جیدے نے میڈیکل باکس سے دو بھری ہوئی سرنجیں نکالیں۔ ایک چندو کے بازو کی ورید میں لگائی۔ دوسرے کندھے کے ماس میں۔ ابھی نیڈل گوشت میں ہی تھی کہ چندو کی اَدھ کھلی آنکھیں ٹھہرنے لگیں۔ زود اثر دوا نے چند لمحوں میں ہی اُسے دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔

جیدے نے اُس کے ٹخنے پر فورسپز کی ضرب لگائی پھر مطمئن ہو کر بولا، ''چلو اُستاد! اُڑنے

والا گیئر لگا دو۔ چھوکری خوابوں کی بگھی میں سوار ہو گئی ہے۔''

رنگو نے ڈرائیور کو گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ گردن موڑ کر چندو پر نظر ڈالی۔ بولا:

''ڈرپ لگا کر اِس پر چادر ڈال دو۔ یہ مریض نظر آئے گی تو ہمیں نور پور تک کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

اُسے خبر نہیں تھی کہ ایمبولینس نے کتنا سفر کیا، کتنی دیر چلتی رہی مگر جب آنکھ کھلی، تب اپنے قفس کے بدلنے کا فوراً احساس ہو گیا۔ یہ کمرہ ملک افراسیاب کے صحرائی مکان والے کمرے سے بہت مختلف تھا۔ چارپائی کے بجائے یہاں وہ نہایت آرام دہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ اُسے بے ہوش رکھنے کیلئے دوا انجیکٹ کی گئی تھی جس کا تھوڑا بہت اثر ابھی سر درد کی صورت میں باقی تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے وال کلاک لگا ہوا تھا۔ ناگاہ نظر پڑی۔ چار بج چکے تھے۔ چونکہ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا، دروازے میں کوئی درز بھی نہیں تھی، اس لیے کوشش کے باوجود وہ اندازہ نہ کر سکی کہ صبح کے چار بجے ہیں یا سہ پہر کے۔ یہ بھی طے نہیں تھا کہ وال کلاک درست تھا یا نہیں۔

کم و بیش نصف گھنٹے بعد اُس نے پہلو کے بل کروٹ لی۔ مشکل سے اُٹھی۔ ننگے پیروں کو دبیز قالین کا لمس عجیب سا لگا۔ کمرہ وال ٹو وال کارپٹڈ تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے مقفل تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں باتھ روم دکھائی دیا۔ وہ باتھ روم میں گئی۔ لوٹی؛ ایڑیوں کے بل گھوم کر چاروں طرف پاگلوں کی طرح دیکھنے لگی۔ جانتی تھی کہ وہ اِس وقت یارن خان کی تحویل میں تھی۔ یارن خان کون تھا؟ یہ نہیں جانتی تھی مگر جاننے والی تھی۔

اپنی بے بسی پر دُکھ ہوا۔ رونا چاہا مگر آنسو روٹھ گئے۔ سوچا، 'کب تک روتی رہوں گی؟'.....

اتنی سمجھ بوجھ رکھتی تھی کہ رونے سے اُس پر آئی ہوئی مصیبت ٹلنے والی نہیں تھی۔ ایسے میں ماموں رضوان یاد آیا۔ اس کا خوب صورت چہرہ آنکھوں میں نور کی طرح سج گیا۔ اس کی ہر بات ذہن کی غلام گردشوں میں اپنی بازگشت پھیلانے لگی۔ اُس نے بتایا تھا کہ چندو کی محبت کی بساط پر اُسے عمر حیات نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بظاہر خاموش رہی تھی مگر دل سے نہیں مان رہی تھی۔ عمر حیات کی محبت پر یقین تھا مگر قسمت نے سمجھا دیا تھا کہ محبت کی آسودگی اس کی مرہونِ کرم ہوتی ہے۔ وہ چاہے تو ملا دے۔ چاہے تو تنکوں کی طرح بکھیر کر زندگی بھر کیلئے دور کر دے۔ وہ دور کر دی گئی تھی۔ ایسے؛ کہ نہ تو اب وہ سماں لوٹ سکتا تھا، نہ عمر حیات کی قبر میں جان پڑ سکتی تھی۔

ماموں رضوان نے کہا تھا کہ بڑی مصیبتیں بانہیں کھولے چندو کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ بے زمین و آسمان ہو کر مصیبتوں کے رحم و کرم پر چکرا رہی تھی۔ کوئی جائے پناہ نہیں مل رہی تھی نہ بھاگنے کی کوئی راہ۔ نجانے یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔

انسان ہر طرف سے مایوس ہو کر اُوپر دیکھتا ہے۔ اوپر والا دکھائی نہیں دیتا مگر اوپر دیکھنے والے کو یقین ہوتا ہے کہ وہ سن رہا ہے تبھی دل کی زبان سے پکارتا ہے۔ اس کے دل سے بھی ہوک اُٹھی۔ عرش تک پہنچی یا نہیں، اُسے فرش پر گرا گئی۔ اُس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا جو اُس کے پیچھے آتا۔ اُسے شیطانوں کی دسترس سے نکالتا۔ الف لیلوی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں مگر سمجھ میں آتا تھا کہ شہزادوں کا عہد اپنی پوٹلی باندھ کر رخصت ہو چکا تھا۔ اس کا شہزادہ پہلے ہی وار میں چاروں شانے چت ہو چکا تھا۔ اور کون تھا؟..... اور کوئی نہ تھا جو اُس کیلئے بھیانک چہرے والے بھوتوں اور جنوں سے آن ٹکراتا۔

دل گرفتہ سی باتھ روم میں گئی۔ وضو کر کے کمرے کی نکڑ میں کھڑی ہو گئی۔ کعبے کا رُخ معلوم نہیں تھا۔ ناچار دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ نماز کی نیت کی، ہاتھ اُٹھا کر کانوں کی طرف لے جانے چاہے مگر اچانک دل دھک سے رہ گیا۔ وہ خدا کے دربار میں کھڑی تھی جبکہ اُس کا بدن کتنا گندا تھا۔ وہ خود کتنی گندی تھی۔ کیا تعفن چھوڑتے ہوئے شخص کو اذنِ باریابی ملتا ہے؟..... از خود نفی میں سر ہل گیا۔ ہاتھ بے جان انداز میں رانوں پر گر گئے۔ سر جھکائے کھڑی سوچتی رہی پھر دوسرے گوشے میں ایستادہ چوبی وارڈ روب تک گئی۔ دونوں پٹ کھول کر ہینگروں میں لگے ہوئے قیمتی ملبوسات کو دیکھنے لگی۔ وہ شاید اُسی کیلئے رکھے گئے تھے۔ پھر باتھ روم میں گھس گئی۔

اس کے جسم کا کوئی حصہ کنوارا نہیں رہا تھا۔ عضو عضو پر ہوس آلود ہاتھوں کا میل چپکا ہوا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی سے اپنا عضو عضو دھو رہی تھی۔ دو تین مرتبہ صابن لگانے پر بھی دل مطمئن نہ ہوا تو شاور کے گرتے ہوئے پانی تلے آنکھوں کے شاور چلانے لگی۔ تب خیال آیا کہ من اپنا آپ بھی دھونا چاہتا تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ اُس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ خود کو اچھی طرح پونچھ کر کپڑے پہننے لگی تو ان کپڑوں سے کراہت آنے لگی۔ انہیں کئی گندے ہاتھوں نے چھوا تھا۔ اس نے تولیہ لپیٹا اور باتھ روم سے نکل کر وارڈ روب تک جانا چاہا مگر شرم سے اَدھ کھلے دروازے میں رُک گئی۔ وہ صحن چیر کر چمکتے دن کی شوخ دھوپ میں باتھ روم سے نکل کر لاٹو اور جانو کی حرام کار آنکھوں کے سامنے اپنے کمرے میں آ سکتی تھی مگر خالی کمرے میں پیر نہ رکھ سکی۔ تب سمجھ میں آیا

کہ اُس کا من دھل چکا تھا۔ اس نے اپنا اُترا ہوا لباس پہنا اور وارڈ روب تک گئی۔ ایک سوٹ نکال کر پھر باتھ روم میں گھس گئی۔

اَب بارگاہِ ایزدی میں کھڑی ہوئی تو دل اندیشوں سے پاک تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اُٹھائے، 'اللہ اکبر' کہا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ آنکھیں کھلی رکھنے کا حکم ہے، اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے لبوں پر مقدّس الفاظ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں تھیں۔ گیلا چہرہ نمکین ہوگیا۔ رکوع کرنے لگی تو ہمت جواب دے گئی۔ گھٹنوں کے بل گر گئی۔ ہاتھ گھٹنوں پر رکھے جھک گئی۔ دل سے ہوک نکلی، ''ربا! میکوں چا گھن..... ایں جہی حیاتی تاں نہی منگدی تینتھوں!''

(ربا! مجھے اُٹھالے۔ ایسی زندگی تو نہیں مانگتی تجھ سے۔)

ایسے میں ماموں رضوان کا ہر دم مسکراتا ہوا چہرہ دھند میں اُبھرا، اس کی کہی ہوئی باتوں نے لاشعور سے نکل کر اُس کے تخیل کو گویائی دے دی، 'انسان کو کبھی بھی خدا کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ کبھی زندگی جیسی عظیم نعمت کو پست اور گھٹیا قرار نہیں دینا چاہیے۔ زندگی کے خالق کو بُرا لگتا ہے اگر اس کی دی ہوئی عطا کو جھٹلایا جائے..... زندگی میں ہر آن اُس سے مدد اور فلاح کی دعا مانگنی چاہیے۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ پیٹ لیا۔ روتے روتے اونچی آواز میں بولی، ''نہیں ربا! تو مجھے جس حال میں بھی رکھے، میں خوش ہوں۔'

دل دُکھا ہوا تھا۔ بے اختیار لبوں پر آ کر بین کرنے لگا، 'مگر یہ کوئی حال بھی تو نہیں سوہنیا رَبا! کیا تو نے مجھے اتنا خوب صورت بدن اس لیے دیا تھا کہ اِسے کتے بھنبھوڑتے رہیں؟ اگر میرا بدن تیرے کسی نیک بندے کی امانت ہے تو اُسے فوراً بھیج دے تاکہ وہ آ کر سنبھال لے اور اگر میرے مقدر میں یہی کچھ لکھا ہے تو میرے بدن میں کیڑے ڈال دے؛ اس میں بدبو بھر دے تاکہ ہر کوئی مجھ سے دور رہنے پر مجبور ہو۔''

وہ کافی دیر عبادت اور خود کلامیوں میں مصروف رہی پھر بے دم سی ہو کر بیڈ کے پائنتی کے تختے سے کندھا ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ اس کیلئے کھانا لانے پر ایک غیر معمولی دبلا پتلا اور مدقوق بدن والا نوکر تعینات تھا۔ وہ اس کا ہر سوال خاموشی سے سنتا اور کھانے کی ٹرے رکھ کر واپس چلا جاتا۔ چند دنوں نے اُسے گونگا بہرا سمجھ لیا اور دو تین دن سوتے، نہاتے دھوتے اور عبادت کرتے گزار دیے۔ اس نے اس کمرے سے بھاگ نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ مسلسل خوف اور تکلیف رسانی کے اُس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے

''آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا فکر ہوسکتا ہے صاحب جی!'' مظہر علی نے چاپلوسی سے کہا۔

''بہت کمینے ہو۔ پَر خیر! لے جاؤ اِسے اور اپنی جورو بنالو۔ دلہن کے ساتھ ساتھ تمہیں ایک مہینہ کی چھٹی بھی دیتا ہوں۔ جاؤ، جا کر عیش کرو۔''

''میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔'' حاتم طائی کی لات کھا کر مظہر علی نے سر جھکا کر مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

چندو پھٹی پھٹی نظروں سے دونوں کو خاموشی دیکھ رہی تھی۔ میاں دلبر حسین نے اپنے ویلٹ سے کچھ نوٹ کھینچے اور مظہر علی کی طرف اُچھال دیے۔ وہ نوٹ جھپٹنے کیلئے اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔ میاں دلبر حسین اُس کی باؤلی حرکات کو دیکھ کر ہنستا ہوا رخصت ہوگیا۔ مظہر علی نے فرش پر گر جانے والے نوٹ اُٹھائے، ہونٹوں سے لگا کر جیب میں ڈالے اور خوشی سے جھوما، ''میاں صاحب! زندہ باد۔''

وفورِ مسرت سے اس نے بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی چندو کو بانہوں میں بھر کر اُٹھالیا۔ ایڑیوں پر گھوما اور بولا، ''اتنی خوب صورت چھوکری کو مارنے کا کیا فائدہ۔ میاں صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔''

چندو کیلئے زندہ بچ جانا اور مظہر علی جیسے سانڈ کے ہاتھوں میں پھسل جانا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بے حسی کے عالم میں مظہر علی کی بانہوں میں گٹھڑی بنی اپنے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھتی رہی جس میں نہ جانے کس اوباش کا گناہ نمو پا کر اُس کی تمام تر زندگی کو بنجس کر گیا تھا۔ نصف شب کا عمل تھا جب مظہر علی نے اپنے ایک ساتھی کی مدد سے اُسے میاں دلبر حسین کے فارم ہاؤس سے نکالا اور کار میں سوار کر کے تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ایک ویران ڈیرے پر منتقل کر دیا۔ یہ ڈیرہ بھی میاں دلبر حسین کی وسیع و عریض زمینوں کے بیچ میں تعمیر کیا گیا تھا اور مظہر علی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ یہاں مقیم تھا۔ مظہر علی کا ساتھی ان دونوں کو ڈیرے پر اُتار کر کار میں واپس چلا گیا تو مظہر علی اُسے کلائی سے تھام کر کھینچتا ہوا اپنی ماں کے پاس لے آیا۔ وہ بہت ضعیف تھی۔ دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اس کے بدن کی آخری کیاری میں زندگی کا پانی دوڑ رہا تھا۔ چندو کو خشمگیں نظروں دیکھ کر اپنے بیٹے سے کہنے لگی، ''اوئے موئے مردار! یہ تو کس گناہ کی پوٹ کو اُٹھالایا ہے؟''

چندو نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ تلخی سے بولی، ''میں گناہ کی پوٹ ہوں تو تیرا پتر کیا مسجد میں جھاڑو دینے پر لگا ہوا ہے؟''

مظہر نے اُسے تھپڑ مارنے کیلئے ہاتھ اُٹھایا، پھر اَز خود رُک گیا، بولا، ''یہ میری ماں ہے، اس کے ساتھ اَدب سے بات کرو ورنہ چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔''

وہ منہ بنا کر بولی، ''تیرے جیسے کتے کو جنم دینے والی کے ساتھ اتنے ہی ادب سے بات کر سکتی ہوں۔''

مظہر نے بہ دقت تمام اپنا غصہ دبایا اور ماں کو پھوکٹ میں ہاتھ آنے والی چندو کے بارے میں بتانے لگا۔ ماں سننے لگی۔ بیٹے کے خاموش ہونے پر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بین کرنے کے انداز میں کہنے لگی، ''تو کیا اب تو میاں صاحب کی چگلی ہوئی روٹی کھائے گا؟''

اس نے کندھے اُچکائے، ''تیری عقل میں کچھ نہیں آتا اماں! ساری عمر بھوکا رہنے سے چگلی ہوئی کھانی بہتر ہے یا نہیں؟ تجھ سے تو آج تک میرے لئے کوئی لنگڑی لولی لڑکی بھی ڈھونڈی نہ جا سکی۔ میں لے آیا ہوں تو نخرے دکھانے لگی ہے۔''

ماں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ بوڑھے بدن میں منہ اُٹھا کر تھوکنے کی سکت نہیں تھی وگرنہ وہ چندو کے پیٹ پر تھوک دیتی۔ رات کے دوپہر باقی تھے جو بڑھیا نے کھانستے، مظہر علی نے ہانپتے اور چندو نے حسبِ معمول کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتے گزارے۔ صبح دیر سے جاگی۔ کافی دنوں سے نہیں نہائی تھی۔ جن ہاتھوں میں کھلونا بن رہی تھی، ان کا میل صاف کرتے کرتے اُس کے ہاتھ تھک گئے تھے۔ پے در پے کی پامالی نے اُس کی رگوں سے خون نچوڑ ڈالا تھا۔ وہ تیز چلتی تو سانسیں اکھڑنے لگتی تھیں۔ زور کی سانس لیتی تو کھانسی چھڑ جاتی تھی۔ کئی مہینوں سے وہ بس موت کی دعا مانگتی چلی آ رہی تھی کیونکہ اُسے گناہ کی دلدل سے نکلنے کی ہر راہ مسدود دکھائی دے رہی تھی اور تجربات سے ثابت ہوا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے موت کو بھی گلے نہیں لگا سکتی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر بوڑھی کے قریب چولھے پر آ بیٹھی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں تجسس ہلکورے لیتا دکھائی دیتا تھا۔ پوچھنے لگی کہ مظہر علی اُسے کہاں سے اُٹھا کر لایا تھا۔ وہ بولی، ''تیرا پتر بے غیرت ہی نہیں، بے حیا بھی ہے۔ گند کھاونا کوا دسترخوان سے نہیں، کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے چچڑی ہوئی ہڈیاں اُٹھا کر گھونسلے میں لاتا ہے۔ کیا تو اتنی سی بات بھی نہیں جانتی؟''

اسے بیٹے کی بدخوئی بُری لگی۔ بولی، ''میرا پتر ایسا گیا گزرا بھی نہیں ہے۔ ضرور تم نے ہی کوئی جادو ٹونہ کیا ہوگا شودھے پر۔''

وہ زہریلے انداز میں ہنسی۔ بولی، ''میرے پیٹ میں کسی کی غلاظت بھری ہوئی ہے۔ اس

نے اپنے ہاتھوں میں مجھے ایک گندگی کے ڈھیر سے اُٹھا کر اپنے باپ میاں دلبر حسین کی غلیظ گود میں ڈالا۔ وہاں سے بیوی بنانے کی نیت سے مجھے اُٹھا کر یہاں لے آیا۔ نکاح سے پہلے ہی مجھے ناہر (بھیڑیے) کی طرح رات بھر نوچتا گھسیٹتا رہا۔ آج یا کل مجھے ہسپتال میں لے کر جائے گا۔ میرا پیٹ چھوٹا کروانے کے بعد نہلا دھلا کر دلہن بنا لے گا۔ تو پھر بھی کہتی ہے کہ تیرا پتر ایسا گیا گزرا نہیں ہے؟ تجھ پر اور تیرے مردار خور پتر پر خدا کی مار ہو۔''

مظہر کی ماں برداشت کرنے والی عورت نہیں تھی مگر بیٹے نے جاتے ہوئے اُسے درشت لہجے میں سمجھایا تھا کہ اس کے آنے تک کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ اس لیے خاموش تھی وگرنہ منہ توڑ جواب دیتی۔ چندو نے مہینوں بعد کھلا آسمان دیکھا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لینے کے درمیان اُس کے دل میں بھاگ نکلنے کی ایک مرتبہ پھر خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے محتاط نظروں سے چہار سو دیکھا۔ گھر چھوٹا اور خستہ حالت میں تھا۔ چونکہ یہاں مظہر علی کی ماں اکیلی رہتی تھی اس لیے گھریلو سامان برائے نام تھا۔ چار دیواری کے باہر کی دنیا کیسی تھی، اُسے معلوم نہیں تھا۔ وہ اُٹھنا چاہتی تھی کہ بوڑھی نے چائے کا پیالہ بڑی حقارت سے اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی توجہ بٹ گئی۔ چائے پیتے ہوئے پھر ڈیرے کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے کی کچی دیوار کے ساتھ پانچ دس بکریاں بندھی ہوئی تھیں جو رات سے اَب تک مسلسل منمنا رہی تھیں۔ ساخت اور نوعیت کے اعتبار سے یہ گھر بابا گامن کے گھر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ چندو کے دل سے دعا نکلی کہ یہ آسیب زدہ ڈیرہ کسی آبادی کے قریب ہوتا کہ اُسے یہاں سے نکلتے ہی کوئی جائے پناہ مل جائے۔ چونکہ اس کی حالت نا گفتہ بہ تھی، دل کمزور ہو چکا تھا؛ اِس لیے وہ زیادہ دور اور دیر تک بھاگ نہیں سکتی تھی۔

مظہر علی نظر نہیں آ رہا تھا۔ موقع اچھا تھا۔ اس نے چائے کا اَدھ پیا پیالہ زمین پر رکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بوڑھی نے کریدتی نظروں سے گھورا، ''اے! تو کہاں جا رہی ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور صحن سے گزر کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کی توقع کے برعکس بڈھی کا ہڈیوں بھرا ڈھانچہ بجلی کی سی مستعدی سے اُس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ کھڑکھڑاتی ہوئی آواز میں چیخی، ''نامرادے! رُک جا؛ میں تجھے بھاگنے نہیں دوں گی۔''

اس نے بوڑھی کی ناتواں گرفت کو جھٹکا دیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے زمین بوس ہو

گئی۔ بلند آواز میں چیخنے چلانے لگی۔ یوں لگا کہ اُس میں اُٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ چندو دھڑکتے دل کو سنبھالتی ہوئی حویلی سے نکلی۔ یہ دیکھ کر اُس کی جان ہوا ہوگئی کہ مظہر علی کے اِس بد شکل ڈیرے کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ دور دور تک کوئی گھر دکھائی نہیں دیتا تھا۔

دروازے کے سامنے فصلوں کے بیچ ایک پگڈنڈی تھی جو گھوم کر پچھواڑے میں غائب ہو رہی تھی۔ وہ دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی مکان کے پچھواڑے میں آئی۔ بوڑھی کی چیخ وپکار مسلسل اُس کا تعاقب کر رہی تھی مگر وہ پروا کیے بغیر بڑھتی گئی۔ چھوٹے قد کی فصلوں کے تاحدِ نگاہ سلسلے کے آخر میں اُسے سرخ اور سفید بلاکس والی چار دیواری اور سرکاری طرز کی سرخ ٹیپ شدہ عمارت دکھائی دی تو اس کے دل کو ایک ذرا تقویت ملی۔ فاصلہ زیادہ تھا مگر اُسے وہاں پہنچ کر پناہ مل سکتی تھی۔ اس کے دوڑنے کی رفتار تیز ہوگئی مگر ابھی اُس کی قسمت میں رہائی نہیں تھی۔ اس کے عقب میں دوڑتے قدموں کی چاپ اُبھری۔ وہ دہشت سے رُک کر پلٹی۔ اپنے عقب میں دیوانہ وار دوڑتے ہوئے مظہر علی کو دیکھ کر پگڈنڈی پر ڈھے گئی۔ وہ کسی اور رستے سے گھر پہنچا تھا اور اُسے نہ پا کر تلاش میں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس غیر معمولی ویرانی میں اُسے دیکھ لینا اور تعاقب کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

وہ چند لمحوں میں ہی چندو کے سر پر پہنچ گیا۔ اُسے درشتی سے گالیاں دیتے ہوئے گھسیٹ کر مکان کی طرف لے جانے لگا۔ وہ مدد کیلئے چیخی۔ مظہر علی نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ ہونٹوں کے گوشوں سے خون رِسنے لگا۔ رہی سہی سکت بھی دم توڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ڈراؤنی شکل والی بڑھیا کے سامنے لے جا کر پھینکی گئی تو اس کی سانس بری طرح اکھڑ رہی تھی۔

مظہر علی نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا، ''تو تم بھاگ رہی تھیں؟ ابھی تمہیں بتاتا ہوں۔''

اس نے چندو کو بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور چند ہی لمحوں میں اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ مظہر علی جسیم اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کی ضربوں کے مقابلے میں چندو زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بے ہوش ہوگئی۔ مظہر نے پانی چھڑکا۔ وہ ہوش میں آ گئی مگر بے دم پڑی رہی آنکھیں پٹپٹاتی رہی پھر ایک طرف گردن ڈال گئی۔ وہ اُسے گھسیٹ کر چارپائی تک لایا اور پٹخ کر ماں کے پاس چلا گیا۔

ماں ہاتھ اُٹھا کر بولی، ''پتر! اِس کم ذات کو جہاں سے اُٹھا کر لایا ہے، وہیں پھینک آ۔ یہ گھر میں ٹکنے والی نہیں ہے۔''

وہ پھولی ہوئی سانسوں میں بولا، ''تو دیکھتی جا ماں! میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ یہ زندگی بھر یہاں سے نکلنے کا سوچے گی بھی نہیں۔''

''تو کیا کرے گا؟ ہاں؟''

''میں اس کی ایک ٹانگ کاٹ پھینکوں گا۔ پھر دیکھوں گا، کیسے بھاگتی ہے۔''

''اوئے جھلیا! میں اپنے نک پانی سے عاجز ہوں۔ یہ چارپائی پر پڑ گئی تو میں اس موئی مردار کو کیسے کھلاؤں پلاؤں گی؟ میری مان تو اس گندی پوٹ کو دور پھینک آ۔'' بوڑھی کے سلوٹ زدہ ماتھے پر شکنوں میں اضافہ ہو گیا۔

دن چڑھے چندو کی سرت جاگی۔ اس نے سر اِدھر اُدھر پٹخا۔ چارپائی میں اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی مگر بدن کا عضو عضو دُکھ رہا تھا۔ منہ سے مسلسل کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ مظہر جلدی سے قریب پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چمکدار پھل والی کلہاڑی تھی۔ غرایا، ''میں تمہیں ترس کھا کر یہاں لایا تھا مگر تم اس قابل نہیں ہو۔ میاں صاحب نے تمہیں بڑی نہر میں پھینکنے کا حکم دیا تھا۔ اچھا کرتا جو میاں صاحب کا حکم مانتا۔ میں تمہیں بیوی بنا کر عزت کی زندگی دینا چاہتا تھا مگر تمہیں عزت راس نہیں ہے۔ بھاگ رہی تھیں ناں؟''

اس کی آنکھوں میں خوف بھر گیا۔ تھوک نگل کر بولی، ''مار دو..... میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔''

مظہر نے دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی تھامی اور سر سے بلند کر کے بولا، ''نہیں۔ تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ اس طرح زندہ رکھوں گا کہ تمام عمر سسکتی تڑپتی رہو مگر یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کر سکو۔ آج ایک ٹانگ کاٹ رہا ہوں۔ اگر تم ایک ٹانگ سے بھاگنے کی کوشش کرو گی تو دوسری بھی کاٹ دوں گا۔''

چندو کا چہرہ مارے دہشت کے سفید ہو گیا اور آنکھیں پوری وسعت میں پھیل گئیں۔ اس نے تمام تر قوت سے چیخنا چاہا مگر آواز سینے میں ہی پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ مظہر نے جبڑا بھینچا، ایک زوردار گالی دی اور کلہاڑی کو پشت کی طرف لہرایا۔ کسی دم بھی کلہاڑی کا تیز دھار پھل چندو کے گھٹنے کے جوڑ کو دولخت کر سکتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں چندو کی قسمت بیدار ہو گئی۔ مظہر کی بوڑھی ماں چیخ کر اُٹھی اور بیٹے کو اُس کے مکروہ ارادے سے باز رکھنے کیلئے دوڑی۔ چارپائی کی پائنتی کے قریب پہنچی تو پتھر کی بنی ہوئی اوری سے ٹھوکر کھا کر چارپائی پر آن گری۔ عین اسی لمحے مظہر کے ہاتھ پوری قوت سے نیچے

آئے اور چندو کے گھٹنوں پر اوندھے منہ گری بوڑھی کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں کلہاڑی کا پھل نصف تک دھنس گیا۔ بوڑھی کے حلق سے خرخراہٹ نکلی اور اس کا نچلا دھڑ تڑپنے لگا۔ بالائی دھڑ بالکل ساکت ہو کر رہ گیا۔ مظہر کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے کلہاڑی کو کھینچ کر نکالنا چاہا مگر آہنی پھل کھوپڑی کی ہڈی میں پھنس گیا تھا۔ اُس نے دو تین جھٹکے دیے مگر ناکام ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کے سر سے نکلتے، بھل بھل کرتے خون کو دیکھنے لگا۔

چندو نے جونہی کلہاڑی کے پھل کو اپنی ٹانگوں کی طرف آتے دیکھا تھا، اس نے آنکھیں غیر معمولی سختی سے بند کر لی تھیں۔ بوڑھی کی خرخراہٹ سننے کے بعد اُسے صورتِ حال کو سمجھنے اور خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر ٹانگیں کھینچ کر بوڑھی کے استخوانی وجود تلے سے نکلی اور برقی مستعدی سے چارپائی سے اُتر کر دیوار تک چلی گئی۔ وہ کمرے سے نکل نہیں سکتی تھی کیونکہ بوڑھی کا آدھا وجود چارپائی پر تھا جبکہ اس کی ٹانگیں دروازے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مظہر ابھی ہوش میں نہیں تھا مگر وہ جونہی دروازے کا رُخ کرتی، وہ اُسے دبوچ لیتا۔ ماں کے غیر متوقع اور غیر ارادی قتل کے بعد اس کی ذہنی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اُس سے کوئی بھی رحم آمیز عمل کی توقع عبث تھی۔

اچانک مظہر ہوش میں آ گیا۔ 'ہائے' کی پھٹی پھٹی آواز حلق سے برآمد کرتے ہوئے چارپائی پر اوندھی پڑی ماں پر گر گیا۔ اس نے نبض ٹٹولنے اور سانسیں محسوس کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ یا تو اُسے دھیان نہیں رہا تھا یا اُس نے از خود ماں کی موت کا یقین کر لیا تھا۔

چندو نے خوفزدہ نظروں سے اِردگرد دیکھا۔ وہ غیر اختیاری طور پر کسی ایسی چیز کو کھوج رہی تھی جسے اپنے بچاؤ کیلئے ہتھیار بنا سکے۔ اس کی کوشش اکارت نہیں گئی اور اسے اپنے داہنے ہاتھ پر دیوار کی جڑ کے ساتھ پڑا ہوا چوبی ڈنڈا نظر آ گیا۔ اس ڈنڈے کو مقامی زبان میں 'ملنا' کہا جاتا ہے اور کم و بیش ہر دیہاتی گھر میں موجود ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے چٹنی کوٹی جاتی ہے یا ہنڈیا میں ڈالنے کیلئے گرم مصالحہ اور سرخ مرچیں پیسی جاتی ہیں۔

اس نے چوبی ملنا اُٹھایا، دونوں ہاتھوں میں سختی سے پکڑ کر سر سے بلند کیا اور بغیر سوچے بجلی کی سی مستعدی سے قدم بڑھا کر مظہر کے سر پر دے مارا۔ دھماکے کی آواز کمرے میں گونجی۔ مظہر نے سر اُٹھایا۔ اُسے دہشت ناک نظروں سے دیکھا اور کھڑا ہونا چاہا مگر تب تک چندو مظہر کے تالو پر دوسرا کارگر وار کر چکی تھی۔ دوسرا دھماکہ پہلے سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ خون کا فوارا اُبلا اور مظہر چارپائی کی بانہہ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش میں لہراتا ہوا دیوار کی جڑ میں

ڈھے گیا۔ چندو کے پیروں اور بانہوں میں بجلی بھر گئی۔ چارپائی کا چکر کاٹ کر اس کے سر پر پہنچ گئی۔ چوبی ملنا ہوا میں بلند کیا تو مظہر نے مدافعانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ فوری طور پر سر پر رکھ لیے۔ ملنا ایک ہاتھ پر لگا۔ ہاتھ کی کئی ہڈیاں چٹخ گئیں۔ چندو نے پے در پے بیسیوں وار کر کے اُس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ اس پر وحشت سوار تھی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک جبڑے بھینچے وحشیانہ انداز اس کی کھوپڑی کوٹتی رہی پھر ڈنڈا ایک طرف پھینک کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ہانپتے ہانپتے سسکنے لگی۔ اس سے پہلے انسان کو قتل کرتے اور قتل ہوتے دیکھا تھا۔ آج اپنے ہاتھوں قتل کر کے رو رہی تھی۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا تھا۔ اگر اُسے ایک لمحے کو بھی خیال آ جاتا کہ وہ کیا کرنے لگی ہے تو شاید زندگی کا پہلا قتل سرانجام نہ دے پاتی۔

خوف اور ڈر انتہائی حد پر پہنچ کر انسان کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے دونوں لاشوں کو باری باری دیکھتی رہی۔ روتی رہی۔ پھر ڈرنے لگی۔ گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ اُٹھ کر کمرے سے یا ڈیرے سے نکل جاتی۔ اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا مگر قسمت اپنا کام کر رہی تھی۔ اُسے پژمردہ اور نڈھال بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا تو ڈیرے کی مہیب سکوت والی فضا میں موٹر سائیکل کے انجن کی پھٹ پھٹ گونجی۔ وہ بے حس بیٹھی سنتی رہی۔ موٹر سائیکل دروازے پر آن رکی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ کمرے کے دروازے تک آئی۔ چندو نے آنسوؤں سے تر چہرہ اُٹھایا۔ ایک اجنبی چہرہ نظر آیا۔ دروازے تک آن پہنچنے والا اپنی آنکھوں میں حیرت اور خوف کا ملا جلا تاثر لیے مظہر علی اور راضی کی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چندو کو نہیں دیکھا تھا یا دیکھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

وہ حلیے سے کسی بھی طور مظہر علی کے قبیل کا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے سادہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ گلے میں سیاہ نالی والی اسٹیتھو اسکوپ لٹکا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں بلڈ پریشر چیک کرنے والا آپریٹس جبکہ دوسرے میں ننھا سا ہینڈ بیگ تھاما ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ چندو خاموشی سے اُسے دیکھ رہی تھی کیونکہ اس جگہ پر کسی ڈاکٹر کی آمد نہایت غیر متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے تاسف بھری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ اُسے دیکھا اور کچھ پوچھے بغیر باری باری دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ پھر سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر کھڑا ہوا اور سخت لہجے میں بولا، ''اے لڑکی! تم ہو؟ اور ان دونوں کو کس نے قتل کیا ہے؟''

چندو نے کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ دیوار کا سہارا بھی لیا مگر ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا۔ بے بسی سے معمور نظروں سے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ تب بھی خاموش رہی تو وہ نپے تلے قدم اُٹھاتا اُس کے قریب آ کر پیروں کے بل کچے فرش پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں جھانک کر بولا، ''میں یہاں کبھی کبھی آیا کرتا ہوں۔ اِس بوڑھی کو، جو اِس وقت مردہ حالت میں چارپائی پر پڑی ہے، نیوروبیان (طاقت کا ٹیکہ) لگانے کیلئے..... تمہیں آج سے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔ جلدی بولو۔ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟''

اس نے منہ کھولا، ''مم..... میں چندو ماہی.....''

ڈاکٹر بھانپ گیا کہ خوف اور دہشت کی شدت سے اس کے حواس بحال نہیں تھے۔ پانی بھر لایا۔ پلانے کے بعد بولا، ''انہیں کس نے قتل کیا ہے؟''

''یہ کلہاڑی سے میری ٹانگ کاٹنا چاہتا تھا۔ بوڑھی مجھے بچانے کیلئے آئی تو اس کے سر میں کلہاڑی لگ گئی۔ پھر..... پھر میں نے اسے.....'' اس کی آواز پھر رُندھ گئی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

''تم مظہر کی کیا لگتی ہو؟''

''کک..... کچھ نہیں..... وہ مجھے اغوا کرلایا ہے۔''

''کہاں سے؟''

''مم..... مجھے بیٹ خیر پور سے.....'' وہ گڑبڑا گئی۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا مگر اس کی کہانی ایک جملے میں سمیٹی جانے والی نہیں تھی۔ ڈاکٹر چند لمحوں تک اُسے گھورتا رہا، پھر بولا، ''تم شادی شدہ ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر یہ کیا چکر ہے؟'' ڈاکٹر نے اُس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کٹ کر رہ گئی۔ ایک خشمگیں نظر آنکھیں پھیلائے مردہ پڑے مظہر علی کو دیکھا۔ ہونٹوں کو غیر معمولی سختی سے دانتوں میں کچلا۔ بولی، ''مجھے یہاں سے نکال لیں۔ میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گی مگر..... خدا کیلئے مجھے بچا لیں۔ یہ بہت ظالم ناہر (بھیڑیے) ہیں۔''

وہ جہاندیدہ آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ وہ ابھی کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اُٹھا۔ اُسے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے باہر جانے کا حکم دیا۔ کہا، ''خود کو سنبھال کر اُٹھو اور پورے گھر کی تلاشی

لو۔تمہاری کوئی نشانی یا سامان گھر میں نہیں ہونا چاہیے ورنہ تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ گی۔''

''جب یہ مجھے اُٹھا کر یہاں لایا، میں خالی ہاتھ تھی۔'' وہ اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

پولیس کا خیال آتے ہی اس کی حالت خاصی دگرگوں ہونے لگی تھی۔ بدقت تمام کھڑی ہوئی۔

ڈاکٹر اس دوران گہری سوچ میں مستغرق رہا۔ جونہی وہ خود کو رگیدتی ہوئی چارپائی کے پاس پہنچی، ڈاکٹر نے شانوں سے پکڑ کر بوڑھی کی لاش کے قریب چارپائی پر بٹھا دیا۔ جلدی سے اُس کے پیروں سے چپل کھینچ لی۔ چندو نہ سمجھتے ہوئے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے برق رفتاری سے چندو کی چپل بوڑھی کے پیروں میں ڈال دی اور اُس کی چپل اُٹھا کر چارپائی کے نیچے رکھ دی۔ اُس نے کمرے کے سامان میں کچھ اور تبدیلیاں کیں۔ مطمئن ہو کر بولا، ''اے لڑکی! میں تمہیں اُٹھا کر باہر لے جاؤں گا۔ تم یہ خیال رکھو گی کہ تمہارے پیر کہیں بھی زمین سے نہیں لگنے چاہئیں۔ او کے؟''

وہ ڈاکٹر کی بات سمجھ گئی مگر یہ نہ سمجھ پائی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ کسرتی بدن کا مضبوط اور گٹھے بدن کا مالک تنومند شخص تھا۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ اور آپریٹس چندو کو تھمایا اور اُسے ایسے اُٹھا لیا جیسے وہ سات آٹھ سال کی بچی رہی ہو۔ مکان سے باہر لا کر اُسے موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر بولا، ''زمین کو چھوئے بغیر اپنے پاؤں فٹ ریسٹ پر رکھ لو۔''

وہ ہدایت پر عمل کرتی ہوئی موٹر سائیکل پر احتیاط سے بیٹھ گئی۔ اس دوران ڈاکٹر نے ایک ہاتھ سے موٹر سائیکل کو سنبھالے رکھا پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ کک مارتے ہوئے بولا، ''میں نہیں چاہتا تمہارے پیروں کے نشان پولیس کو مجھ تک پہنچا دیں۔ ٹھیک سے بیٹھ گئی ہو ناں؟''

اس نے 'جی' کہا۔ موٹر سائیکل اُسی پگڈنڈی پر چل پڑی جس پر وہ صبح بھاگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل سرخ اور سفید بلاکوں والی چاردیواری کے متوازی کچے راستے پر پہنچ گئی۔ چاردیواری کے تقریباً وسط میں پہنچ کر ڈاکٹر نے دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل روکی۔ اپنا پاؤں دیوار کی باہر کو نکلی ہوئی بنیاد پر جمایا، تھوڑا پہلو بدلا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا، ''دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود جاؤ اور وہیں رُک کر میرا انتظار کرو۔ میں مین گیٹ کی طرف سے آتا ہوں۔''

چندو کا جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا مگر پولیس کے خوف سے اُس نے اپنی تمام تر توانائیوں کو یکجا کیا اور ڈاکٹر کی مدد سے دیوار پھاند لی جبکہ ڈاکٹر نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

کم بلند دیوار اور سرخ اینٹوں والی بلند عمارت کے درمیان اینٹوں کی روش پر گری تھی۔

ننگے پیروں میں اینٹوں کے کنکر چبھے اور وہ پروانہ کرتے ہوئے سہمے سہمے انداز میں اردگرد دیکھنے لگی۔ اطراف میں سوائے جنگلی گھاس، کنیر کے اُڑی رنگت والے پودوں اور بجری کے بلند ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ بے اوقات اور بے سہارا تھی۔ دور دور تک عافیت کا کوئی گوشہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تبھی اس سرکاری عمارت کو دیکھ کر مزید سہم گئی تھی کیونکہ ڈاکٹر سرکاری آدمی تھا اور مبادا اُسے پولیس کی تحویل میں دینے کیلئے یہاں لایا ہو..... دل دھک سے رہ گیا۔ چاہا کہ دیوار پھاند کر نکل بھاگے۔ سوچ آئی کہ اُسے تو یہ تک علم نہیں کہ وہ اس وقت کس علاقے میں تھی، یہاں سے کس طرف جاسکتی تھی اور اُسے کدھر کا رُخ کرنا چاہیے تھا۔

ایسے میں اُسے قتل گاہ سے نکال کر لانے والا ڈاکٹر بلند عمارت کی بائیں نکڑ سے نکلا اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنی جانب بلانے لگا۔ وہ میکانیکی انداز میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ اس نے ہاتھ تھاما اور کھینچتا ہوا عمارت کے اندر لے گیا۔ راہداری کے آخری کمرے کا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ بولا، ''تم اس کمرے سے تب تک باہر نہیں نکلو گی جب تک میں واپس نہیں آجاتا۔ کمرہ اٹیچڈ باتھ ہے اور فریج میں کھانے پینے کا سامان پڑا ہے۔''

وہ خاموش رہی مگر اُس کی آنکھوں میں کئی اندیشے سر سرا گئے۔ وہ اس کے چہرے پر رقصاں پرچھائیوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ درشت لہجے میں بولا، ''دو قتلوں کا معاملہ ہے۔ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کیلئے مجھے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا۔ ایسے میں اگر کوئی تمہیں یہاں دیکھ لے گا تو سارا معاملہ تلپٹ ہو جائے گا۔ اگر تم مجھ پر اعتماد نہ کرو تو بھلے باہر نکل جاؤ؛ مجھے پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہوگا۔''

وہ سہم گئی۔ جھٹ سے بولی، ''نن..... نہیں..... مجھ پر رحم کریں۔''

''میں رحم کرنے والا کون ہوتا ہوں؟ وقت ضائع نہ کرو؛ جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ اگر تم رحم کے کونسیپٹ کو سمجھتی ہو تو جاؤ، وضو کرو، ضرورت سمجھو تو غسل کرو اور رحم کرنے والے سے رحم کی اپیل کرو۔'' ڈاکٹر کے لہجے کی خنکی اپنی تمام تر سنگینی سمیت چندو کی سماعت میں اُتر گئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی سنجیدگی اور سختی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کمرے میں گھس گئی۔ اپنی ہوس کی آبیاری کرنے والے لوگ ہمیشہ انسان کو راہ سے گمراہ کرتے ہیں مگر وہ چندو کو بھٹکا نہیں رہا تھا۔ اُسے خدا کی طرف راغب کر رہا تھا۔

وہ زندگی کے پائپ میں دوڑتے دوڑتے چکرا گئی تھی۔ چکرائی ہوئی فہم سہاروں سے بھی

چہارم

ڈرنے لگتی ہے۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے اس بڑے سے کمرے اور بے ترتیب پڑے ہوئے سامانِ روزمرہ کو دیکھنے لگی۔ بڑی سی ونڈو، جس کے کئی شیشے ٹوٹ گئے تھے اور وہاں گتے چپکائے گئے تھے، کے قریب چوبی میز پڑی تھی جس پر مختلف ادویات بکھری ہوئی تھیں۔ ایک سالخوردہ کرسی بھی قریب پڑی تھی۔ مریضوں کا اسپرنگوں والا بیڈ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ برقی کوندے کی طرح ماموں رضوان کی بات یاد آئی، 'مطالعہ کرنے والا بے ایمان اور ظالم نہیں ہوتا' دل کو ایک ذرا ڈھارس ملی کہ اُسے یہاں لانے والا بے ایمان اور ظالم نہیں تھا بلکہ خدا کو یاد کرنے والا شخص ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں فریج پڑی تھی جو نئی معلوم ہو رہی تھی۔ ٹی وی بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر کی بھاری آواز دور کہیں سنائی دی۔ پتہ چل گیا کہ نہ صرف وہ اِس کوٹھی نما عمارت سے نکل گیا تھا بلکہ اس کے اردگرد اور لوگ بھی موجود تھے۔ فرار ہونے کا موزوں موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔ تبھی لپک کر دروازے میں آئی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دروازہ غیر مقفل تھا۔ وہ کھلے طاق کو تھام کر ایک ذرا رُکی۔ سوچا؛ میں کیوں بھاگ رہی ہوں؟..... قید خانہ مقفل ہوتا ہے۔ جائے امان غیر مقفل ہوتی ہے۔ اُسے یہاں لانے والے نے اُسے قید نہیں کیا تھا بلکہ پناہ دی تھی اور پناہ دینے والے سے بھاگنا دانش مندی نہیں ہوتی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر کسی نتیجے پر پہنچے بغیر گیلری میں دائیں ہاتھ چلتی گئی۔ بڑے دروازے میں رُک گئی۔ وہ بھی غیر مقفل تھا۔ اس نے طاق کو تھوڑا سا کھولا اور درز بنا کر باہر جھانکا۔ تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر بڑا سا برآمدہ دکھائی دے رہا تھا۔ برآمدے میں ڈاکٹر ایک عورت اور مرد کے ساتھ کھڑا محوِ گفتگو تھا۔ وہ ان دونوں کو کچھ سمجھا یا بتا رہا تھا۔ چندو کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ہسپتال کے احاطے میں بنی ہوئی رہائشی کوٹھی میں کھڑی تھی جبکہ اُس کے سامنے ہسپتال کی مرکزی عمارت ایستادہ تھی۔ اس نے درز بڑی کی۔ برآمدے میں پڑے ہوئے چوبی بنچوں پر کئی عورتیں اور مرد بیٹھے دکھائی دیے جو دوا دارو لینے کیلئے آئے تھے۔

وہ بے جان انداز میں دروازہ بند کر کے کمرے میں آ گئی۔ لوہے کے پائپ والی اکلوتی چارپائی پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر کا سراپا نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ دیکھنے میں اچھا لگا تھا۔ ملنے میں تو یار دل خان، میاں دلبر حسین اور حیدر خان بھی اچھے لگتے تھے۔ عمر حیات بھی بہت اچھا تھا۔ ان سب کی وضع قطع اجلی تھی مگر اصلیت بہت ڈراؤنی اور قبیح تھی۔ سر جھٹک کر بڑبڑائی، 'اچھا! اس کی اصلیت بھی سامنے آ ہی جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ وہی کچھ ہو گا جو اب

تک ہوتا آ رہا ہے۔''

ماحول میں مختلف آوازیں چکرا رہی تھیں۔ مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا۔ چہار دیواری کے منسلکہ کچے راستے پر موٹر سائیکل اور گاڑی کے دو تین مرتبہ گزرنے کی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ مظہر علی اور بوڑھی عورت کا مردہ خوف ناک چہرہ آنکھوں میں لہرا گیا۔ اُسے ایک جھرجھری آئی۔ اپنی کیفیت سے ایک ذرا استغنا ہوا تو اُسے بھوک اور نقاہت کا احساس ہوا۔ بدقت تمام فریج تک پہنچی۔ فریج میں انڈے، دودھ اور دواؤں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے ٹھنڈے دودھ کے دو چار گھونٹ بھرے۔ فریج کے اوپر اسٹیبلائزر رکھا ہوا تھا جس کے قریب خاصی تعداد میں بسکٹوں کے نکی پیک پڑے تھے۔ ایک پیک اور پانی کی بوتل اُٹھا کر چارپائی پر آ گئی۔ دودھ کی نسبت پانی کم ٹھنڈا تھا۔ بسکٹوں کو پانی کے ساتھ حلق سے اُتارا اور کراہتی ہوئی چارپائی پر دراز ہو گئی۔ بے چارگی سے اپنے اجنبی محسوس ہونے والے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے؛ آ گئی اور وہ بے خبری کے گہرے استغراق میں چلی گئی۔

بیدار ہوئی تو کمرا تاریک تھا۔ اپنی اتنی طویل نیند پر حیرانی ہوئی۔ وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے اینٹھے ہوئے بدن کو گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ گیلری کے بائیں دہانے پر بلب کی پیلی روشنی دیکھ کر اس طرف آ گئی۔ کھلے صحن میں چارپائی پر ڈاکٹر کو نیم دراز حالت میں مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ کر رُک گئی۔ وہ بغیر بازوؤں والی سفید بنیان اور کمر سے بندھی ہوئی خانوں والے تہہ بند میں بالکل دیہاتی لگ رہا تھا۔ سفید و سیاہ ملے جلے بال بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی قریب آئی۔ اس سے پہلے اُس کا سایہ مطالعے میں مستغرق ڈاکٹر تک پہنچ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا اور کتاب بند کر کے اسپاٹ لہجے میں بولا، ''جاگ گئی ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''اگر تم چاہو تو اس کمرے سے کرسی نکال کر یہاں بیٹھ سکتی ہو۔''

وہ روبوٹ کی طرح پلٹی، کمرے میں گئی اور ایک دفتری کرسی نکال لائی۔ کچھ فاصلے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ بلب کی روشنی میں نہا گیا۔

وہ کچھ دیر تک کریدتی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر مستفسر ہوا، ''تمہیں بھوک لگی ہو گی؟''

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا، ''فریج سے انڈہ نکال کر آملیٹ بنالو یا فرائی کرلو۔ کچن میں روٹیاں پڑی ہیں۔ اگر چاہو تو چائے بنا کر بھی پی سکتی ہو۔''

چندو کو اُس کا بے تاثر لہجہ غیر فطری سا معلوم ہوا۔ اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ چندو ماہی کی کوٹھی میں موجودگی اُس کے نزدیک کسی نئے واقعے کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کرسی چھوڑ دی۔ کچن تلاش کیا۔ کچن میں مٹی کے تیل والا چولھا اور ضرورت کے برتن دیکھ کر مشینی انداز میں اپنی بھوک کا سامان کرنے لگی۔ چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارا تو ذہن پر چھائی ہوئی بے حسی کی چادر چھٹنے لگی۔ عدم احتیاط کی بدولت چائے ایک پیالے سے زیادہ بن گئی تھی۔ اس نے کیتلی میں بچ جانے والی چائے دوسرے کپ میں ڈالی اور دونوں پیالے اُٹھائے صحن میں آ گئی۔ بغیر کچھ کہے ایک کپ ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چارپائی میں اُٹھ بیٹھا اور پیالہ تھام کر بولا، ''عورت کے ہاتھ کی چائے ٹاکسک (زہریلی) ہوتی ہے مگر تم چونکہ بنالائی ہو، اس لیے پی لیتا ہوں۔''

اس کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ چائے زہریلی تھی یا نہیں مگر ڈاکٹر کا لہجہ بڑا زہر بار تھا۔ سکوت بھرے ماحول میں چائے کے گھونٹوں کی مخصوص آواز اُبھرنے لگی۔

وہ اچانک بولا، ''چندو ماہی! تم نے یہی نام بتایا تھا ناں اپنا..... واہ! دور فلک میں تنہا کھڑا چاند..... پاکیزہ سا..... اور کبھی ہاتھ نہ آنے والی مچھلی؛ ماہی..... نام رکھنے والے پر قربان جاؤں۔ مگر انسان کتنا منافق ہوتا ہے۔ اپنے نام کے تقاضے بھی پورے نہیں کرتا۔ یقیناً تم نے بھی اپنی اداؤں سے کئی گھرانے تباہ کیے ہوں گے۔ اپنے جسم کی چقماق سے کئی خرمن خاکستر کیے ہوں گے۔ مگر میرے سامنے معصوم اور مظلوم بن کر کوئی دردناک کہانی سناؤ گی۔ مجھے باور کرو گی کہ تم پر مردوں کے معاشرے نے بڑے ظلم توڑے ہیں اور تمہیں کسی جرم کے بغیر سزا دی گئی ہے۔''

وہ چائے پینا بھول گئی۔ ایک ٹک اُسے دیکھنے لگی جو اپنی ہی رو میں بہک کر بڑے اپسرائی انداز میں بول رہا تھا۔ باوجود کہ اس کا لہجہ درشت اور جملے تکلیف دہ تھے، اس کا بولنے کا انداز اتنا دل نشیں تھا کہ وہ جملوں کی معنویت پر اپنا دھیان مرتکز نہ کر پائی۔

وہ اُس کی محویت کو دیکھ کر بولا، ''چائے پی لو، ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

اس نے چونک کر پیالہ لبوں سے لگایا۔ وہ کہنے لگا، ''زن، زر اور زمین..... تینوں قتل کے

سب سے بڑے محرک ہیں۔ زر اور زمین کے حصول کا محرک درحقیقت زَن تک رسائی ہوتا ہے۔ یعنی ہر رنگ میں عورت ہی قتل کا موجب بنتی ہے۔ تم نے آج ایک قتل کیا تھا مگر قانون کی نظر میں تم پر دو قتل ثابت ہوتے ہیں۔ میں نے نائب قاصد کو بھیج کر پولیس کو بلوایا تھا۔ پولیس والے بڑے بے ایمان اور ہڈ حرام ہوتے ہیں۔ انہوں نے موقع ملاحظہ کیا، نقشے اور تصویریں بنائیں مگر اپنی رپورٹ میں لکھا وہی، جو میں نے گیس کیا۔ انہیں یہ اندازہ تک نہیں ہوا کہ ان دونوں کے قتل کے پیچھے ایک جواں سال لڑکی کا ہاتھ تھا جسے میں مکھن سے بال کی طرح نکال کر اپنے گھر لے آیا ہوں۔ ہونہہ! مذرا (مظہر علی) پکا وارداتیا تھا۔ پولیس کو مطلوب تھا۔ انہوں نے ایک فرضی کہانی گھڑ لی کہ اس کے ساتھیوں نے لوٹی ہوئی دولت کی تقسیم پر برانگیختہ ہو کر اُسے بوڑھی ماں سمیت قتل کر دیا۔ اور ٹائیں ٹائیں فش!‘‘

اس نے بولنے کے دوران چائے پی لی تھی۔ پیالہ پھیلے ہوئے چار سوتی کھیس پر رکھا اور منہ پونچھتے ہوئے بولا، ’’میرا نام منور علی ہے۔ منور علی شاہ۔ اس ہسپتال میں میڈیکل آفیسر ہوں یعنی ڈاکٹر ہوں۔ میں نے ساری عمر بھاڑ ہی جھونکا ہے۔ اکیلا رہتا ہوں کیونکہ دنیا میں میرا کوئی ہے ہی نہیں۔ خود پکاتا ہوں اور مزے سے بیٹھ کر کھا لیتا ہوں۔ شادی نہیں ہوئی کیونکہ مجھے عورت کے وجود سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ کیوں؟ یہ بتانا ضروری نہیں۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، مذرے کی ماں کو نیوروبیان کا ٹیکہ لگانے جاتا ہوں۔ اس کا پتر وارداتیا اور جاگیرداروں کا منہ زور کارندہ ہے مگر میں اس بوڑھی عورت کو یہاں آنے کی تکلیف سے بچانے کیلئے تیسرے چوتھے دن چلا جاتا ہوں۔ ہسپتال کے اسٹاف میں سے کوئی آدمی مذرے کے گھر جانا پسند نہیں کرتا، اس لیے مجھے ہی ثواب کمانے کیلئے وہاں جانا پڑتا ہے۔ بائی داوے! مجھے ثواب کمانے کا بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ یہ تھا میرا مکمل تعارف اور مذرے کے گھر میں عین وقت پر پہنچنے کا سبب..... اَب تم اپنی دکھ بھری داستان جس میں مرد کو ظالم اور عورت کو مظلوم ثابت کیا گیا ہو، الف سے یے تک سنا ڈالو۔ جی چاہا تو تمہاری مدد کر دوں گا۔ جی چاہا تو تمہیں رات یہاں گزارنے اور صبح رخصت ہونے کا حکم صادر کر دوں گا۔‘‘

وہ آنکھیں جھپکے بغیر اُسے دیکھ رہی تھی اور اس کے لبوں سے ادا ہونے والا لفظ لفظ دل میں اُتار رہی تھی۔ ایسے میں اُسے اپنا مقام بھولنے لگا تھا۔ اس کے خاموش رہنے پر ڈاکٹر منور علی نے درشت لہجے میں اپنا حکم دہرایا۔ وہ کچھ دیر تک الفاظ مجتمع کرتی رہی، سوچتی رہی کہ کیا بتائے اور

کیا چھپائے؟ تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ نہ چھپانے کا فیصلہ کر کے سر اُٹھایا اور پس منظر اور سیاق وسباق سمیت اپنی زندگی کی کہانی دریائے چناب کی لہروں سے چھیڑ کر ڈاکٹر منور علی سے حادثاتی ملاقات تک بیان کر دی۔ ڈاکٹر منور شاہ کا حوصلۂ سماع دیدنی تھا۔ وہ جب تک بولتی رہی، وہ گود میں رکھی ہوئی کتاب سے کھیلتا رہا اور لب بستگی کے عالم میں پورے انہماک سے سنتا رہا۔

رات وقت کے بدن پر تاریخ کی چولی بدل رہی تھی جب وہ دونوں چاندنی کا غسل کرتے ہوئے لب بستہ بیٹھے اپنی اپنی سوچوں سے نبرد آزما تھے۔ خاموشی کا طویل دورانیہ ڈاکٹر منور کی بھاری اور قدرے بے تاثر آواز کے طلسم سے ٹوٹا، ''ہوں! تو تم واقعی دکھی ہو۔ عورت زمانے کو اور زمانہ مرد کو ڈستا ہے جبکہ تمہیں سانپ جیسے مردوں نے ڈس لیا۔ مگر خیر! یہ کوئی ایسی نئی کہانی بھی نہیں کہ اس پر ماتم کیا جائے۔ تم نے جو غلطیاں کیں، وہ اس عمر کی لڑکیاں عمومی طور پر کرتی رہتی ہیں اور خمیازے بھگتتی رہتی ہیں۔''

چندو نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھوں کی نمی پونچھی۔ امید بھرے انداز میں پوچھا، ''سر! کیا آپ میری مدد کریں گے؟''

وہ چونکا، ''آں..... ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ مگر مدد کا تعین تمہیں کرنا ہوگا۔''

''میں سمجھی نہیں سر!''

''یہی کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''مم..... مجھے بچالیں سر.....'' وہ گھگھیائی۔

''کس سے؟'' ڈاکٹر کی کڑی نظریں اُس پر جم گئیں۔

وہ گڑبڑا کر خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔

''مردوں سے۔ یہی کہنا چاہتی ہو ناں؟'' ڈاکٹر نے تائید طلب کی۔

اس نے سر ہلایا تو وہ بولا، ''سنبھلتے ہی مرد مرد کرنے لگو گی؛ پھر؟''

وہ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر نے منہ بنایا، کہا، ''مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں قدم قدم پر عورتیں اور مرد موجود ہیں۔ سانپوں، کتوں اور بھیڑیوں سے بچا جا سکتا ہے مگر انسانوں سے نہیں۔''

وہ مایوس سی ہوگئی۔ بولی، ''مگر جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے، ایسا دوسری سب عورتوں سے نہیں ہو رہا سر!''

''تم کیا یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہارے ساتھ لوگ اس لیے کھیلتے رہے کہ تم لاوارث تھیں؟''

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''یعنی تم کسی مرد کی پناہ چاہتی ہو؟''

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر کے لبوں پر سفاک سی مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا، ''جس سے ڈرتی ہو، اُسی سے تحفظ مانگی ہو؟''

وہ روہانسی ہوگئی، ''سر! میں مرنا نہیں چاہتی ہوں مگر جو زندگی گزشتہ چند مہینوں سے گزار رہی ہو، اس سے موت بدرجہا بہتر ہے۔ میں بابا گانمن کے پاس جانا چاہتی ہوں مگر جانتی ہوں کہ وہ مجھے ایک پل کیلئے گھر میں ٹکنے نہیں دے گا۔ وہ مجھ سے جتنی محبت کرتا تھا، اس سے کہیں زیادہ نفرت کرنے لگا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا گھر نہیں ہے جہاں مجھے پناہ مل سکتی ہو۔ میرا کوئی اپنا نہیں ؛ کوئی بھی نہیں۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں مگر میں پڑھ بھی نہیں سکتی۔ میں گندی نہیں، اچھی لڑکی بننا چاہتی ہوں مگر لگتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟''

ڈاکٹر منور علی کی سفاک مسکراہٹ اُسے بدن چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سر جھکا کر رونے لگی۔

ڈاکٹر نے غصے بھرے لہجے میں کہا، ''اے لڑکی! رونا بزدلی ہے۔ بزدل اپنی زندگی بھی گزارنے کے قابل نہیں ہوتے ؛ کسی کیلئے کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ ابھی بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ اِس کے بارے کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟''

اس نے چندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

وہ شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ کمزور سی آواز میں بولی، ''جس طرح میرا غلیظ وجود کسی عورت کے پیٹ میں ڈالا گیا تھا، ایسے ہی میرا پیٹ بھی کسی حرام زادے کے بدن سے بھر دیا گیا ہے۔ جو زندگی میں گزار رہی ہوں، چاہتی ہوں کہ ایسی زندگی کوئی نہ گزارے اور سانس لینے سے پہلے ہی مر جائے۔''

''یعنی اَبارشن کرانا چاہتی ہو؟'' ڈاکٹر کا لہجہ زہر خند ہو گیا۔

اس نے سر ہلایا، ''جی سر!''

''یہ تو قتل ہوگا۔'' ڈاکٹر نے 'قتل' لفظ پر خصوصاً زور دیا۔

''جی سر! مگر میں سوچتی ہوں کہ میرے جیسی زندگی سے موت بہتر ہے۔''

ڈاکٹر نے پوری شدت سے نفی میں سر ہلایا اور کہا، ''میرا اندازہ ہے کہ تمہاری پریگننسی کی عمر بمشکل چار پانچ ماہ ہے۔ اس موقع پر کیے جانے والے ڈی این سی سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض اوقات یہی پیچیدگیاں ہمیشہ کیلئے بانجھ کر دیتی ہیں۔ نہیں لڑکی! میں کسی بھی معروضی حالات میں اس قبیح عمل کے حق میں نہیں ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قتل ہے اور ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنے والا بچہ خطا کار نہیں ہے۔ خطا کار تم ہو یا تمہاری لاش پر موج اُڑانے والے گدھ ہیں جن کے جرم کی سزا بچے کو نہیں دی جا سکتی۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ طے نہیں کہ جو زندگی تم نے گزاری، وہ اس بچے کا مقدر بھی ہو۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

''جی سر! میں سمجھ رہی ہوں مگر لوگ نہیں سمجھتے۔ لوگوں نے قدم قدم پر مجھے 'حرام کی پھوئی' کہہ کر مذاق اور تضحیک اڑائی ہے۔ زمانہ اس پر بھی قہقہے لگائے گا۔ لفظ بدل بدل کر چرکے لگائے گا اور میں ایسا نہیں چاہتی۔''

''تم جو کرنا چاہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا مگر میں ظلم کو ظلم سے روکنے کا روادار نہیں ہوں۔'' اس کے لہجے کی خنکی میں بے حد اضافہ ہو گیا، ''اور تم جہاں جانا چاہو گی، میں بندوبست کر دوں گا۔''

وہ سہم گئی۔ چند ثانیوں میں وہ سبھی چہرے نظروں میں گھوم گئے جن سے پیچھا چھوٹ گیا تھا مگر ان کا خوف ابھی تک ذہن پر مسلط تھا۔

''اگر تم میری مدد چاہتی ہو تو تمہیں وہی کچھ کرنا ہوگا، جو میں چاہوں گا۔''

اس نے کانپتی آواز میں پوچھا، ''آپ کیا چاہتے ہیں سر؟''

ڈاکٹر منور علی کے لبوں پر پھر سفاک مسکراہٹ دکھائی دی۔ بولا، ''میں چاہتا ہوں کہ تم اس بچے کو جنم دو۔''

چندو کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا، ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟ میرا وجود مجھ پر بوجھ ہے۔ کوئی ٹھور ٹھکانہ بھی نہیں۔ میں کیسے.....''

''میری بات پوری ہونے دو۔ اگر تم میری مرضی پر چلنا چاہو تو میں مدد کروں گا۔ وگرنہ نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس بچے کو جنم دو۔ رہی بات کہ اسے معاشرہ حرام زادہ نہ کہے؛ تو میں اس کا بندوبست بھی کر سکتا ہوں۔ میں تم سے عقد کر لیتا ہوں۔ اس بچے کو اپنا نام دے دیتا

ہوں۔نہیں نہیں..... ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔تم عملی طور پر میری بیوی نہیں ہوگی۔ جب تک بچہ پیدا نہیں ہو جاتا، ہم یہی ظاہر کریں گے۔ ڈلیوری کے بعد میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کر دوں گا۔اس طرح بچے کو میرا نام مل جائے گا اور یہ راز میرے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ جانتا ہوں کہ تم اس اَن دیکھے بچے سے نفرت کرتی ہو اور ایسا ہونا غیر فطری بھی نہیں ہے مگر قتل غیر فطری اور غیر انسانی عمل ہے۔میری باتیں سمجھ رہی ہو ناں؟''

وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں اُسے دیکھ کر اثبات میں سر ہلانے لگی۔

وہ سلسلہ کلام جوڑتا ہوا بولا، ''اگر تمہاری نفرت قائم رہے گی تو میں بچہ کسی بانجھ گود میں ڈال کر تمہیں اس کے تردد سے نجات دلا دوں گا۔ میرا ایک دوست کئی سالوں سے بچہ اَیڈاپٹ کرنے کے چکر میں ہے مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی۔تمہیں طلاق دینے کے بعد کسی نرسنگ سکول میں داخلہ دلا دوں گا۔نرسنگ کے کورس کے دوران سرکاری وظیفہ ملتا ہے جس سے زندگی کی گاڑی بہ آسانی چلتی رہتی ہے۔ محفوظ رہائش اور چار سالہ کورس کی تکمیل کے بعد باآسانی نوکری بھی مل جاتی ہے۔تب تم کوئی مناسب سا لڑکا دیکھ کر شادی کر لینا۔ چونکہ تم اچھی زندگی کی خواہاں ہو، محفوظ رہنا چاہتی ہو اس لیے میں اس طریقے سے تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ چاہو تو ٹھیک؛ نہ چاہو تو تمہاری مرضی۔''

وہ بھونچکی رہ گئی۔اُسے ڈاکٹر منور علی کی معاملہ فہمی اور منصوبہ بندی پر حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ بولی، ''سر! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔''

ڈاکٹر نے جواباً آنکھیں موند لیں۔ ایسے میں چندو کی نگاہ اُس کی بند آنکھوں پر پڑی۔ بائیں آنکھ نے چونکا دیا۔جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ جو دیکھا تھا؛ وہی سچ تھا۔سچ کیا تھا؟ وہی؛ جو اُسے عمر حیات کی حویلی میں ماموں رضوان نے بند آنکھ پر انگلی رکھ کر بتایا تھا۔ یکبارگی چندو کا دل وفورِ اطمینان سے منور ہو گیا۔لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور دل میں سر اُٹھانے والی تشکیک کے ننھے ننھے کانٹوں نے دم توڑ دیا۔

ڈاکٹر منور علی شاہ نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا، ''تم میرے احسان کو یقیناً بھول جاؤ گی کیونکہ میری زندگی میں تم سے پہلے کئی لوگوں نے احسان فراموشی کی روایت قائم کر رکھی ہے۔ مگر مجھے یہ طلب نہیں ہے کہ تم تمام عمر مجھے جھک جھک کر ملتی رہو یا احسان مندی کے کھوکھلے اظہار میرے منہ پر مارتی رہو۔میں تمہیں نرسنگ سکول جائن کرنے تک اپنے گھر میں برداشت

کروں گا اور پھر کبھی تمہاری شکل تک دیکھنا نہیں چاہوں گا۔ اگر تم نے اپنا آپ سنبھال لیا تو ٹھیک ورنہ پلٹ کر یہاں آنے کی مہلت نہیں دوں گا۔ تمہارے ڈاکومنٹس کہاں ہیں؟''

وہ چونکی، ''وہ.....وہ.....رزلٹ کارڈ''

سوچ میں پڑ گئی۔ عمر حیات کی حویلی سے نکلتے ہوئے اس کا ہینڈ بیگ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ رزلٹ کارڈ اُسی ہینڈ بیگ میں تھا جو نجانے کہاں رہ گیا تھا۔ اُس نے فوری طور پر یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ بے چارگی سے بولی، ''میٹرک کا رزلٹ کارڈ تھا۔ وہ بھی کھو گیا۔''

وہ بولا، ''رول نمبر یاد ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا، ''جی سر! بائیس سو اکیانوے.....''

''میں کل ڈسپنسر کو بھیج کر بورڈ سے ڈپلیکیٹ کارڈ نکلوا لوں گا۔ اب کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ چھوٹے کمرے میں بستر پڑا ہے۔ نکال لو۔ رات کے پچھلے پہر میں خاصی سردی ہو جاتی ہے یہاں۔ جب تک نیند نہ آئے، تب تک میری پیشکش کے بارے سوچتے رہنا۔ اور ہاں! تم پڑھی لکھی ہو۔ اپنے فائدے اور نقصان کی سوچ رکھتی ہو اس لیے فیصلہ کر لو گی۔ اس خوف میں مبتلا نہ رہنا کہ میں ان مردوں جیسا ہوں جن سے اب تک تمہارا واسطہ پڑا ہے۔ آئی ایم ایلرنٹ کیس.....''

وہ اُٹھی۔ چند قدم چل کر رُکی۔ مستفسر ہوئی، ''سر! میں چائے بنا لوں؟''

''ہاں! مگر صرف اپنے لیے۔'' اس نے کہا اور پائنتی پر تہہ کر کے رکھا ہوا کھیس کھینچ کر تان لیا۔

وہ کچن میں آ کر چائے تیار کرنے لگی۔ اس کا ذہن گنبدِ بے روزن بنا ہوا تھا جس میں ڈاکٹر منور علی کی بھاری مگر دل میں اُترنے کا وصف رکھنے والی آواز چکرا رہی تھی۔ چونکہ اُس کے پاس اس پیشکش کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا؛ اس لیے اس نے صحن میں بیٹھے بیٹھے ہی دل میں اُس کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگرچہ وہ بچہ جننے کے حق میں قطعی طور پر نہیں تھی مگر ڈاکٹر منور علی کا اٹل رویہ دیکھ کر ناچار آمادہ ہو گئی تھی۔

اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں تشکیک سنپولیے کی طرح کلبلا رہی تھی کہ مبادا ڈاکٹر منور علی اُس سے شادی کا خواہش مند تو نہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر ایسا تھا بھی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ وہ وجیہہ، پرکشش اور امیر شخص تھا۔ بدبودار لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر چکرانے سے اس کا قرب بہتر اور محفوظ تھا۔ وہ بستر میں گر کر جب تک جاگتی رہی، آنے والے دنوں کی

پیش بندی کرنے کے بجائے گزرے ہوئے ایام کی تلخیوں پر کڑھتی رہی۔

اس کو جلد ہی اپنی تشکیک پر شرم آنے لگی۔ آنے والے چند ہی دنوں میں ڈاکٹر منور علی کی تہہ در تہہ چھپی شخصیت اُس پر آشکار ہونے لگی۔ وہ انتہائی روکھا، تلخ اور لاپروا انسان تھا۔ اس کے باوجود کہ چندو ماہی نے اُس کے ویران کوارٹر کا نقشہ بدل دیا، کچن سنبھال لیا اور زندگی کو نسوانی ترتیب سے آراستہ کر دیا، اس نے ایک بار بھی چندو کو بنظرِ غور دیکھا اور نہ ہی اس کے اندازِ آرائش پر بھی رائے دینے کی زحمت کی۔ وہ ہسپتال سے آ کر سو جاتا؛ بیدار ہو کر مطالعے میں مگن ہو جاتا پھر کھانا کھا کر لگے بندھے معمول کے مطابق سو جاتا۔

چندو جسمانی اور ذہنی طور پر زخمی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی مخدوش حالت کے پیشِ نظر چند قوت آور ٹیکے لگائے۔ تین وقت کھانے کی گولیاں دیں۔ اس کے استفسار پر بتایا کہ وہ چک ستاسی کے سرکاری ہسپتال میں مقیم تھی۔ یہاں سے دو اڑھائی کلومیٹر کے فاصلے پر بڑی سڑک اور ریلوے لائن گزرتی تھیں جو بورے والا سے پاکپتن کی طرف جاتی تھیں۔ بورے والا دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ چک ستاسی سمیت یہ تمام علاقہ زندگی کی کئی ضروریات کیلئے بورے والا سے ملحق تھا۔ ڈاکٹر منور علی اتوار کو چندو سے ذاتی استعمال کی اشیاء کی فہرست لے کر بورے والا گیا۔ واپسی پر اس کی موٹر سائیکل ریڈی میڈ ملبوسات سمیت مختلف انواع کے سامان سے لدی تھی۔ صحن میں موٹر سائیکل اسٹینڈ کرنے کی مخصوص جگہ پر رُک کر اس نے چندو کو دیکھے بغیر کہا، ''میں نکاح کا بندوبست کر آیا ہوں۔ صبح، ذرا جلد؛ یعنی پانچ بجے کے لگ بھگ، شہر جانے کیلئے تیار ہو جانا تاکہ ہمیں ہسپتال سے نکلتے ہوئے کوئی نہ دیکھے۔ اور ہاں! الٹے ہاتھ والا دوسرا کمرہ اپنے لیے مخصوص کر لو۔''

اس نے 'جی اچھا' کہہ کر موٹر سائیکل سے سامان اُتارنا شروع کر دیا۔ پھر گھنٹہ بھر حکم کی تعمیل میں جتی رہی۔ کمرے کی صفائی ستھرائی میں کچھ زیادہ دیر لگ گئی۔ فارغ ہو کر سامان چیک کرنے لگی۔ بالکل اسی انداز میں عمر حیات اُس کیلئے سامان خرید کر شہر کے مکان میں لایا تھا۔ ایسے ہی وہ کورٹ میرج کا بندوبست کرنے گیا تھا۔ وہ صدقِ نیت رکھتا تھا مگر اس کی ماں نے عین موقع پر پہنچ کر اس کی پلاننگ تہس نہس کر دی تھی۔ عمر حیات نے اُسے بڑے ظالمانہ انداز میں پامال کیا تھا مگر آنکھوں کی نمی نے آشکار کر دیا کہ وہ ابھی تک اُس کے دل میں جاگزیں تھا۔ اس کی ادائیں یاد آ کر دل میں حبس پیدا کرنے لگیں تو وہ سفید جھالر والے سرخ سوٹ کو سینے سے بھینچ

کر سسک پڑی۔ عمر حیات کو اپنی آنکھوں گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس کے زندہ بچ جانے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اُس وقت اس کی آنکھوں پر بے حسی طاری تھی مگر آج اس کی آنکھیں کوئی اور نوحہ خوانی کرنے لگی تھیں۔ اس نے بدقت تمام سر جھٹک کر عمر حیات کی یادوں سے پیچھا چھڑا کر سامان کو الماریوں میں رکھنا شروع کیا۔

اگلے دن وہ ڈاکٹر منور علی کی ہدایت پر علی الصبح غسل کر کے، نیا لباس زیب تن کر کے شہر جانے کیلئے تیار ہو گئی تھی۔ ابھی اندھیرا چھٹ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر اُسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر ہسپتال سے نکل کھڑا ہوا۔ دس پندرہ منٹ کے سفر کا اختتام ایک جدید وضع کے مکان پر ہوا۔ مکان کے باہر ڈاکٹر نور الامین کی سنہری نیم پلیٹ نصب تھی۔ کال بیل پر ایک پستہ قامت مگر فربہی مائل گنجے سر والے شخص نے مین گیٹ کا بغلی دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر اور چندو کو دیکھ کر بغیر کچھ پوچھے کہے پلٹ گیا۔ چند لمحوں بعد اُس نے مین گیٹ کا ایک طاق کھول کر موٹر سائیکل اندر لانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر منور علی اور چندو ماہی اُس کے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

میزبان دس پندرہ منٹ بعد چائے کی ٹرے اُٹھائے ڈرائنگ روم میں آیا۔ ٹرے میز پر رکھ کر سنجیدگی سے بولا، ''ڈاکٹر شاہ! تمہیں ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں نے ہاسپٹل جانا ہے۔ حاضری لگاؤں گا اور واپسی پر تمہارے مطلوبہ افراد کو اُٹھا لاؤں گا۔''

ڈاکٹر منور علی نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، کہا، ''اس بات کا دھیان رکھنا کہ نکاح آج کی تاریخ میں پڑھایا جائے گا مگر سرکاری ریکارڈ میں اندراج پانچ ماہ پہلے کی کسی تاریخ میں ہونا چاہیے۔''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے ڈاکٹر! تم فکر نہ کرو۔ میں نے نکاح خواں اور یونین کونسل کے سیکرٹری سے بات کر لی ہے۔ البتہ یہ سن کر تمہیں ضرور دکھ ہوگا کہ رشوت کی شرح ہماری توقع سے تین گنا زیادہ چل رہی ہے۔'' وہ اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے منہ بنا کر بولا۔

''کام ہونا چاہیے بس! اور ہاں! اس وقت میرے پاس رقم کم ہے کیونکہ تنخواہ ابھی نہیں ملی۔ یہ خیال رکھنا۔'' ڈاکٹر منور علی کی آواز میں ہلکی سی تشویش کا عنصر شامل تھا۔

وہ سر ہلاتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ ڈاکٹر منور علی نے چائے کا کپ اُٹھایا، کہا، ''یہ میرا کلاس فیلو ہے۔ ڈاکٹر نور الامین..... ہمارا اکلوتا واقفِ حال۔ ہسپتال سے واپسی پر نکاح رجسٹرار اور سیکرٹری کو اُٹھا لائے گا اور ہمیں میاں بیوی کے رشتے میں پرو دے گا۔''

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکٹر منور علی محض بچے کو دنیا میں جائز مقام دینے کیلئے شادی کا

سوانگ رچا رہا تھا، اس کا چہرہ گل گوں ہو گیا۔ جذبۂ تشکر سے معمور نظروں سے انسانی شکل میں بیٹھے ہوئے دیوتا کو دیکھنے لگی۔ وہ اسپاٹ لہجے میں بولا، ''کیا دیکھ رہی ہو؟ میں نے کہا تھا ناں کہ یہ محض ڈراما ہوگا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ دل میں کہا، 'سر! آپ بہت عجیب انسان ہیں۔ نبض دیکھ کر جسم کے سات پردوں میں چھپی ہوئی بیماری کو دیکھ لیتے ہیں مگر آنکھوں میں جھانک کر دل میں ہلکورے لینے والے جذبے کو پہچان نہیں سکتے۔'

نصف گھنٹے بعد مین گیٹ کھلنے اور گاڑی نکلنے کی آواز سنائی دی۔ ڈاکٹر نورالامین جا رہا تھا۔ ڈاکٹر منور علی نے باتوں باتوں واضح کیا تھا کہ یہ شادی محض کاغذی ہوگی، پھر بھی چندو کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ سامنے والی دیوار پر آویزاں لینڈ اسکیپ کی اُڑے اُڑے رنگوں والی پینٹنگ پر نظریں جمائے کسی سوچ میں مستغرق تھا۔ اس نے کہا، ''سر! ایک بات پوچھوں؟''

اس نے چندو کو دیکھا اور آنکھوں سے اجازت دی۔

وہ بولی، ''آپ کی شادی نہیں ہوئی؟''

اس نے عام سے انداز میں سر نفی میں ہلایا۔

''کیوں سر!'' اُسے حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر کی عمر خاصی تھی۔ چندو کے نقطۂ نظر سے اُس کی شادی کم و بیش پانچ دس سال پہلے ہو جانی چاہیے تھی۔

''اس لیے کہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر منور کا لہجہ کسی لچک سے عاری تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چندو کے اگلے ممکنہ سوال کی راہ مسدود کر دی، ''نو اَینی مور آن دِس ٹاپک!''

چندو مجبوراً خاموش ہو گئی۔ وہ ڈاکٹر منور علی کی شخصیت میں مسلسل دلچسپی لے رہی تھی اور اس کے ردِ عمل میں جا بجا دکھائی دینے والا تغیر اُسے حیران کر رہا تھا۔ وہ بیک وقت مہربان اور نہایت خشک طبع انسان تھا۔ چند لمحوں میں اُسے مدد کے لائق سمجھ کر پولیس سے بچانے کا فیصلہ کرنا اور فوراً عمل پیرا ہو جانا، بچے کی پیدائش پر مصر ہونا، دنیا میں آنے والے بچے کو اپنی شناخت دینے کا تہیہ کر لینا اور بے داغ منصوبہ تیار کر کے عمل پیرا ہو جانا..... یہ سارے فیصلے اُس کی مضبوط قوتِ ارادی کو ظاہر کرتے تھے جبکہ اس کا بے اعتنا رویہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کے نزدیک چندو ماہی کی اہمیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ تمام واقعات خواب کی طرح چندو کو اپنی تحویل میں لیے آگے کی

طرف سرک رہے تھے اور وہ بے اختیارانہ چلتی جارہی تھی۔ جن حالات سے دوچار ہو کر وہ ڈاکٹر منور علی تک پہنچی تھی، اُن حالات کا تقاضا تھا کہ ڈاکٹر منور اُس پر بھروسہ نہ کرتا مگر وہ اعتماد کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر منور کی باوقار اور سنجیدہ شخصیت کے حصار سے نکلنا اس کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر نورالامین کا انتظار خاصا اعصاب شکن واقع ہوا تھا جس کا اختتام مین گیٹ پر رُکنے والی گاڑی کی آواز پر ہوا۔ وقت چند و کو نکاح کی لڑی میں پرونے پر کمربستہ تھا اور وہ دھڑکتے دل اور خالی ذہن سے ڈاکٹر منور علی کو دیکھ رہی تھی جو آنکھیں موندے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا اور اس کے جبڑوں کے اعصاب جلد میں تھرک رہے تھے۔

❖❖○❖❖

بہت مصروف دن شہر میں گزارنے کے بعد جب وہ اپنے ہینڈ بیگ میں تصدیق شدہ نکاح نامہ سنبھالے ڈاکٹر منور علی کے ہمراہ کوارٹر میں داخل ہوئی تو اس کے ذہن میں ڈاکٹر نورالامین کے چند جملے مسلسل ضربیں لگا رہے تھے۔ اس نے ڈاکٹر منور علی کی عدم موجودگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا تھا، ''میں ڈاکٹر شاہ کا ہم راز ہونے کے ناتے جانتا ہوں کہ نکاح کے باوجود اُس کا تمہارے ساتھ کوئی رشتہ استوار نہیں ہوا۔ وہ عجیب شخص ہے۔ جونہی تم کرائسس سے نکلو گی، وہ طلاق دے کر تمہیں اپنی زندگی سے نکال دے گا۔ اس کی منکوحہ ہونے کے ناتے تم میری بھابی لگتی ہو مگر میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھ کر سمجھانا چاہتا ہوں کہ تمہیں ڈاکٹر منور سے اچھا انسان اور باوقار ساتھی دنیا میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ بھلے وہ ٹوٹا پھوٹا انسان ہے، انسانوں کا ڈسا ہوا ہے مگر وہ پانی بھی پینا نہیں چاہتا۔ اگر تم سے ممکن ہو تو اُسے پانی پلا دینا۔ اُسے انسانوں کی دنیا میں لوٹنے پر مجبور کر دینا۔ نہ صرف تمہاری زندگی خوب صورت ہو جائے گی بلکہ دنیا کے اس عظیم مسیحا کو بھی قرار آ جائے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

اس نے نہ سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ وہ مزید قریب ہو گیا۔ بولا، ''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ تم اس کاغذی شادی کو حقیقی شادی میں بدلنے کی کوشش کرنا۔ اگر وہ تمہیں اپنی بیوی کے طور پر قبول کر لیتا ہے تو سمجھو، تم دنیا کی خوش قسمت لڑکی ہو۔''

وہ شاید کچھ اور بھی کہتا مگر ڈاکٹر منور علی لوٹ آیا۔ ہنس کر بولا، ''تمہاری شکل چغلی کرتی ہے کہ تم میرے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہو؟''

ڈاکٹر نورالامین جھینپ کر مسکرایا اور کھانا لگانے کا کہہ کر صوفے سے اُٹھ گیا تھا۔

فوری طور پر چندو ماہی نے اُس کی باتوں کو دل پر نہیں لیا تھا مگر راستے بھر میں وہ مسلسل یہی سوچتی آئی تھی۔ اُسے ڈاکٹر نورالامین کا مشورہ اچھا لگا۔ ڈاکٹر منور علی جیسے خوش رو اور صاحبِ مقام شخص کے پاس تاعمر محفوظ اور مطمئن رہ سکتی تھی۔ اچھی زندگی گزار سکتی تھی۔ اس نے بے اختیار عمر حیات اور ڈاکٹر منور کی شخصیات میں موازنہ کیا۔ سوائے جوانی کی شوخیوں کے ڈاکٹر کی شخصیت کا پلا بھاری تھا۔ جنسی تشدد کے بحران سے نکلنے اور ڈاکٹر منور علی کے سنجیدہ رویے کی بدولت اُس کا اعتماد لوٹ رہا تھا اور وہ صحت مند انداز میں سوچنے لگی تھی۔ چونکہ وہ دنیا میں تنہا تھی، کوئی سہارا نہیں تھا، اس لیے اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ ڈاکٹر منور علی کی زندگی سے طلاق لے کر نہیں نکلے گی۔ مجبوراً کی گئی شادی کو ازدواجی خوشیوں میں تبدیل کرے گی۔ چونکہ وہ ڈاکٹر منور علی کے پس منظر اور عادات کی پختگی سے ناواقف تھی، اِس لیے اُسے یقین تھا کہ وہ ڈاکٹر کو شوہر بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

چونکہ وہ شام کا کھانا ڈاکٹر نورالامین کے ہاں کھا کر آئے تھے، اِس لیے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر لگاتے ہی ڈاکٹر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ چندو نے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ پھر چائے تیار کرنے کیلئے کچن میں آ گئی۔ ٹرے میں دو کپ رکھ کر دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالتی ہوئی ڈاکٹر کے پاس آئی۔ وہ اس کے چائے تیار کرنے تک اپنی چارپائی اور بستر صحن میں نکال چکا تھا اور اب بلب کی پیلی روشنی تلے اپنے مخصوص انداز میں تہہ بند اور بنیان پہنے چارپائی پر نیم دراز میٹریا میڈیکا کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ پر متوجہ ہو کر بولا، ''گڈ گرل! میں تمہیں چائے کا کہنے ہی والا تھا۔''

چندو کو اس کے رویے میں نرمی کا احساس ہوا۔ اس نے تپائی کھینچی، ٹرے رکھی اور ایک کپ اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے توقع تھی کہ وہ اُسے بیٹھنے کیلئے کہے گا مگر جب وہ اس پر توجہ دیے بغیر چائے پینے لگا تو مایوس ہو کر بولی، ''سر! بیٹھ جاؤں؟''

''اوہ ہاں! کیوں نہیں۔'' ڈاکٹر نے پائنتی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ بولی، ''سر! آپ بہت اچھے ہیں۔''

''ہوں!'' اس نے چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارا۔ نظریں بدستور میٹریا میڈیکا پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا، ''انسان اپنے لباس میں رہے تو ہر دیکھنے والے کو اچھا لگتا ہے۔ جانور بن

جائے تو غلیظ اور بدصورت دکھائی دیتا ہے۔''

''سر! آپ اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہیں؟'' وہ پوچھنا تو یہ چاہتی تھی کہ 'آپ ہر وقت اتنے جلے بھنے کیوں رہتے ہیں؟' مگر جرأت نہ کر پائی۔

وہ چونکا۔ خشک نظروں سے اُسے دیکھ کر بولا، ''کیا میں اس عمر میں بچوں کی طرح اچھل کود کروں؟ بات بے بات قہقہے لگاؤں؟''

وہ قدرے سہم گئی۔ اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اپنی جانب راغب کرنا چاہتی تھی مگر شرم سے اندر ہی اندر گھلنے لگی۔ باوجود کہ یارن خان اور حیدر خان کی فحش گفتگو نے اُسے خاصا منہ پھٹ بنا دیا تھا اور اس کے جو جی میں آتا، بغیر جھجکے بولتی رہی تھی مگر ڈاکٹر منور علی کے سامنے اُس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی، 'سر! اگر مجھے وقت نے آپ کی بیوی بنا ہی دیا ہے تو آپ مجھ پر احسان کریں اور قبول کر لیں۔ میں تمام عمر آپ کی خدمت کروں گی۔'

اس نے کئی مرتبہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی کوشش کی مگر لفظ ہونٹوں پر آ کر دم توڑ گئے اور وہ رُخ پھیر کر اپنے چہرے کی غیر معمولی سرخی کو چھپا گئی۔ ڈاکٹر چائے کی ننھے ننھے گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے اُس کی پل پل بدلتی ہوئی کیفیت کو تاڑ گیا۔ قدرے ترشی سے بولا، ''چندو! تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی، ''وہ دراصل..... میں جب سے یہاں آئی ہوں، آپ کو ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا اس لیے.....''

ڈاکٹر منور کا لہجہ بدستور ترش تھا، ''یہ بات تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کیونکہ میں نے بھی اَب تک تمہیں مسکراتے نہیں دیکھا۔''

وہ گڑبڑائی، ''مم..... میں ایسی نہیں تھی، جیسی اَب ہوں۔ مقدر نے مجھے بے گھر کر دیا ہے۔ بے گھر انسان بے وزن ہو جاتا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا ہر انسانی پیدائشی طور پر بے گھر ہوتا ہے۔''

''مگر آپ تو بے گھر نہیں ہیں۔'' چندو نے جتانے کے سے انداز میں کوٹھی پر طائرانہ نظر ڈالی۔

''یہ گورنمنٹ کی ملکیت ہے۔ جب میں گورنمنٹ کے کام کا نہیں رہوں گا، مجھے نکال باہر کر دیا جائے گا۔ جس طرح تمہیں ناکارہ ہو جانے پر پہلے تمہارے باپ گامن نے پھر دل پھینک میرزادے نے اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔'' ڈاکٹر منور کا لہجہ بتدریج بے رحم ہو گیا، ''مجھے چھوڑو، اپنا

فکر کرو۔ تم جب تک یہاں رہنا چاہو، نچنت رہو۔ اینٹوں کے اس ڈھیر کو اپنا گھر سمجھو۔ ہنسو، کھیلو اور موج کرو۔ بوجھ کم ہونے اور اگلا سفر آسان دکھائی دینے تک خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرو۔ ریس میں وہی گھوڑا حصہ لے سکتا ہے جو تازہ دم اور صحت مند ہو۔ مطالعہ کا شوق رکھتی ہو تو ناول پڑھا کرو، شاعری پڑھ لیا کرو۔ ڈاکٹری کی خشک کتابوں کے علاوہ بھی یہاں بہت کچھ موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں سے نکلتے ہی تمہیں وہی ماحول ملے گا جس سے میں تمہیں کچھ دنوں کیلئے نکال کر لایا تھا اور ایسے کبیدہ خاطر ماحول میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کیلئے تمہیں انسان بالخصوص مرد کی فلاسفی اور سائیکی کو سمجھنا ہوگا۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھو کہ اکیلا آدمی دنیا کو فتح کر سکتا ہے جبکہ سہاروں کے چکر میں پڑنے والا ہر موڑ پر اٹک جاتا ہے۔''

وہ بظاہر بڑے انہماک سے ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی مگر درحقیقت وہ نہ تو سن سمجھ رہی تھی اور نہ ہی ذہن نشین کر رہی تھی کیونکہ یہ مربیانہ گفتگو اس کے سوال کا جواب نہیں تھی۔ وہ اندر ہی اندر ڈاکٹر نورالامین کے مشوروں کو دہرا رہی تھی اور ڈاکٹر منور کے سامنے اپنا آپ پیش کرنے کیلئے مناسب الفاظ اور ہمتیں یک جا کر رہی تھی۔ خالی کپ ٹرے میں رکھ کر بولی، ''سر! کیا اس گھر میں مجھے ہمیشہ کیلئے پناہ مل سکتی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

وہ ڈر کر اٹھی اور چند قدم دور رک کر رخ پھیرتے ہوئے کانپتی آواز میں بولی، ''مم..... میں تھک گئی ہوں سر! میرا جی چاہتا ہے کہ..... کہ..... میں آپ کے پاس رہوں۔ ہمیشہ کیلئے..... مم..... میں جانتی ہوں کہ میں آپ کے قابل نہیں ہوں مگر..... آپ مجھے اپنے قابل کر سکتے ہیں۔''

''تم احسان کا بدلہ اس طرح چکانا چاہتی ہو؟''

''نہیں سر!'' ڈاکٹر کی غیر معمولی سرد آواز سن کر وہ بوکھلا گئی۔

''تو پھر اپنی اوقات سے نکل کیوں رہی ہو؟''

''مجھ پر رحم کریں سر!'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''رحم ہی تو کر رہا ہوں جو تمہیں سنبھلنے کا موقع دے رہا ہوں ورنہ اس وقت تم دوہرے قتل کے جرم میں قانون کے رکھوالوں کا پہلو گرما رہی ہوتیں۔ رحم کرتے ہوئے ہی تمہیں اپنے بچے کے قتل جیسے قبیح گناہ سے بچا رہا ہوں اور تمہارے بچے کو دنیا میں اپنا نام دے کر معتبر کر رہا ہوں۔

تمہیں محفوظ مستقبل دینے کا ارادہ رکھتا ہوں مگر شاید تم جس کلاس سے تعلق رکھتی ہو، اس کلاس کی عورتوں کا بدن زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا۔ وقت ناوقت بولنے لگتا ہے۔ عزت کی رات شاید تمہاری آنکھوں میں بھی چبھنے لگی ہے اس لیے مجھ سے وہ کچھ مانگنے چلی آئی ہو جو میں دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ جاؤ! جا کر سو جاؤ۔'' ڈاکٹر منور علی کے لفظ لفظ سے آگ کی لپٹیں برآمد ہو رہی تھیں اور وہ شرم کے مارے زمین میں گڑ رہی تھی۔

تڑپ کر بولی، ''سر! میں ایسی نہیں ہوں..... مم..... میں تو.....''

''تم جیسی بھی ہو؛ مجھے اس سے غرض نہیں۔ ہاں! اگر تم اچھی عورت بننا چاہتی ہو، عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہو تو اُس معاہدے پر عمل کرو جو میرے اور تمہارے درمیان طے پایا تھا۔ تم بظاہر میری بیوی ہو مگر حقیقت میں تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارے سر پر لٹکتی ہوئی ننگی تلوار کے ہٹتے ہی تمہیں طلاق دے کر نرسنگ کلاس میں داخل کرا دوں گا اور پھر زندگی بھر میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہوں گا۔'' ڈاکٹر نے نہایت زہر بار مگر فیصلہ کن انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔

چندو نے شکوہ بھری نگاہ ڈالی پھر احساسِ تضحیک میں ڈوب کر نڈھال قدموں سے صحن عبور کر کے برآمدے میں آ گئی۔ چند لمحے ستون کے ساتھ کندھا ٹکائے کھڑی ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھتی رہی پھر آہ بھر کر کمرے میں چلی گئی۔ جب تک جاگتی رہی، روتی رہی۔ اس دوران ڈاکٹر منور علی کی غیر معمولی سرد اور نفرت بھری آواز اُس کے ذہن میں چکراتی رہی اور اُسے شدید ندامت سے دوچار کرتی رہی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ اُس کی پیشکش کو بخوشی نہ سہی، مجبوراً ہی سہی، قبول کر ہی لے گا مگر اُس کی توقع شیشے کی طرح ٹوٹ کر آنکھیں زخما گئی۔ اس ناتوانی میں ایک کمزور سی ڈھارس اُسے سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی کیونکہ ڈاکٹر نورالامین نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آسانی سے ماننے والا شخص نہیں۔ پتھر دل ہے۔ اس لیے چندو کو بوند نہیں، پانی کی دھار بننا تھا جو رفتہ رفتہ پتھر کی سل میں سوراخ کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

زندگی 'رات گئی بات گئی' کے فارمولے پر چلتی ہے مگر اس کی زندگی اُس شام میں بے دردی سے ٹھکرائے جانے کے واقعے پر ٹھہر سی گئی۔ ڈاکٹر منور علی کی ادھیڑ عمری اور سنگ دلانہ گفتگو جذبات کی بہکی رو کے سامنے مزاحم تھی مگر وہ اپنی پیش قدمی روکنے کے حق میں بھی نہیں تھی۔ کاغذی دلہن بنتے ہی اُسے کوٹھی سے نکلنے اور ہسپتال کے احاطے میں گھومنے پھرنے کی اجازت

مل چکی تھی۔ ڈاکٹر منور نے اُس کا تعارف اپنے اسٹاف سے کروا دیا تھا اور پانچ چھ آدمیوں پر مشتمل ہسپتال کے عملے نے اُسے اپنے آفیسر کی بیوی کے طور پر قبول بھی کر لیا تھا۔

ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق اس نے بڑے نپے تلے انداز میں عمر رسیدہ ایل ایچ وی اور اس کے شوہر، جو ہسپتال کے مضافاتی حلقے میں ویکسی نیٹر کے فرائض سرانجام دیتا تھا، کو اپنے بارے میں بتا کر مطمئن کر دیا۔ وہ بدترین جنسی اور جسمانی تشدد سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی مگر ہفتہ بھر میں جسمانی طور پر فٹ ہو گئی مگر روح پر لگے چرکوں سے جان چھڑانے میں کچھ زیادہ وقت درکار تھا۔ ماہ بھر میں معروضی حالات کا تغیر اُس کی گم گشتہ قدرتی آب و تاب کو لوٹانے لگا اور آئینہ اُسے پھر سے خوبصورتی کی بھول بھلیوں میں ڈالنے لگا۔

اُس نے از خود ڈاکٹر کے تمام گھریلو معاملات کو سنبھال لیا اور اس کی لگن نے کوٹھی کو گھر بنا کر ایسا ماحول تخلیق کر دکھایا کہ کوئی بھی دیکھنے والا بغیر بتائے انہیں میاں بیوی قرار دے سکتا تھا۔ آدھا دن ہسپتال میں اسٹاف کے ساتھ گزارنے کے نتیجے میں ماتحتوں کے دلوں میں ڈاکٹر منور علی شاہ کے بارے پیدا ہونے والی بدگمانیاں بھی آپوں آپ رفع ہو گئیں مگر چندو کو ہر آنے والے دن میں اپنی ریاضت کے اکارت جانے کا احساس ستانے لگا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا تمام تر احساسِ ذمہ داری، محبت آمیز رویہ اور اپنی پرانی روش پر لوٹتا ہوا حسنِ دل کشا ڈاکٹر منور علی کی لاپروائی اور درشتی کے محاذ پر نہ صرف پسپا ہو رہا تھا بلکہ اُس کا حوصلہ رفتہ رفتہ مارے تضحیک کے دم توڑنے لگا تھا۔ وہ نہ جانے کس ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اُس پر نہ تو چندو کی جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا اثر ہوا اور نہ ہی اُس کے نہ رُکنے والے آنسوؤں نے اُسے نرم کیا۔ چندو نے اَن گنت مرتبہ پتھر میں جونک لگانے کی کوشش کی مگر کئی ذلت آمیز ناکامیوں پر دل برداشتہ ہو کر اُس نے ہتھیار ڈال دیے اور خود کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

موسم بدلتے ہی ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیشِ نظر اُسے ہسپتال کی عمر رسیدہ اور تجربہ کار ایل ایچ وی صفیہ پروین کی نگہداشت میں دے دیا۔ صفیہ پروین کی معاونت سے وہ اپنی ذات کے نئے داخلی تجربے سے باآسانی گزرتی چلی گئی۔ انہی دنوں شہر سے ڈاکٹر نورالامین وقت نکال کر ڈاکٹر منور علی سے ملنے آیا۔ چونکہ ڈاکٹر منور ڈیوٹی پر تھا، اِس لیے اس کو چندو سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔ اُسے دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔ ناکامی چہرے پر رقم ہو گئی۔

وہ بولا، ''تمہارا رونا بتا رہا ہے کہ تم ڈاکٹر شاہ کو رام کرنے میں ناکام رہی ہو۔ میں درست

کہہ رہا ہوں ناں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ نظریں جھکا کر بولی، ''ان کے سینے میں دل نہیں، پتھر رکھا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر نورالامین نے اپنے بے بال سر پر ہاتھ پھیرا، ''خیر! ایسی بھی بات نہیں مگر..... مگر مجھے حیرت ہے کہ اس پر تمہاری معصوم صورت کا جادو بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ بتاؤ، تم نے کیا کچھ کیا؟''

چندو نے اپنی کوششوں سے آگاہ کیا۔ وہ بولا، ''تم نے بہت محنت کی مگر یہی کافی نہیں۔ ابھی تم دو چار ماہ اِدھر ہی ہو۔ ڈاکٹر شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا دورانیہ بتیسویں ہفتے میں جا رہا ہے۔ ایک ماہ بعد تم زچگی کے مراحل طے کر چکی ہو گی۔ یعنی تم پھر لڑکی بن جاؤ گی۔ تب شاید تم زیادہ بہتر طور پر ڈاکٹر شاہ کو سنبھال سکو گی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں سر! مجھے اُن سے کوئی توقع نہیں ہے۔''

''مگر میری اُمید ابھی زندہ ہے۔ تم اگر ہمت سے کام لو گی تو مجھے یقین ہے کہ آخر کار کامیاب ہو جاؤ گی۔'' ڈاکٹر نورالامین نے اُسے دلاسا دیا اور ڈاکٹر شاہ پر زیادہ توجہ دینے کی ہدایت دی۔ اس کے جانے کے بعد چندو خواہش کے باوجود ڈاکٹر منور علی سے کچھ نہ کہہ پائی۔

ایک ماہ بعد اُسے قدرت نے ایک صحت منداور خوب صورت بیٹی کی ماں بنا دیا۔ تخلیق کے کرب سے نکل کر ایک ذرا سنبھلی تو پہلو میں لیٹی ہوئی گلابیں بیٹی کو دیکھ کر رونے لگی۔ صفیہ پروین اور ساتھ کے گاؤں سے بلائی گئی دائی (دایہ) نے اُسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔ بولی، ''بیٹی تو اللہ میاں کی رحمت ہوتی ہے۔ اسے مسکرا کر خوش آمدید کہو ورنہ اللہ میاں ناراض ہو جائے گا۔''

وہ آبدیدہ رہی۔ دایہ نے گال سہلائے، سمجھایا، ''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ اس بار اللہ نے رحمت کی ہے۔ اگلی بار بیٹے کی صورت میں انعام دے کر جوڑی بنا دے گا۔ دیکھو تو سہی! چاند کا ٹکڑا تمہارے پہلو میں پڑا ہے۔''

تب بھی اس کی آنکھوں میں پیار کی جوت نہ جاگی تو صفیہ پروین نے ہاتھ دھوتے ہوئے حیرت سے کہا، ''چندو بی بی! ڈاکٹر صاحب بڑے دل والے آدمی ہیں۔ وہ بیٹی کو دیکھ کر ہرگز ناراض نہیں ہوں گے بلکہ دیکھنا، وہ اتنے خوش ہوں گے کہ پھولے نہیں سمائیں گے۔ ویسے بھی مردوں کو بیٹی اچھی لگتی ہے۔ بے وقوف عورتیں جرم سمجھ کر بیٹیاں پیدا کرتی ہیں۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں چاندسی بیٹی؛ وہ بھی بے عیب، عطا کر دی ہے اور

ڈلیوری کے دوران کوئی بھی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔''

اس نے نم آنکھوں سے پہلو میں لیٹی ہوئی بیٹی کو دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں ڈاکٹر منور علی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نوزائیدہ بچی کو شہد چٹایا۔ کن اکھیوں سے دایہ اور ایل ایچ وی کو دیکھا۔ بولا، ''مبارک ہو چندو ماہی! ہماری بیٹی بہت پیاری ہے۔ اللہ اس کا نصیب بھی اِس کی صورت کی طرح روشن کرے۔''

وہ خالی خالی آنکھوں سے سفید و سیاہ بالوں والے اس وجیہہ انسان کو دیکھنے لگی جو اُس کا محسن تھا۔ بغیر تقاضے کے نئی زندگی دلانے والا شخص تھا۔ اس نے چندو کیلئے جو کچھ کر دکھایا تھا، شاید دنیا کا کوئی مرد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنی ساکھ، اعتبار اور شخصیت تک کو داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ اس کے بدلے میں اُس نے قدرت رکھنے کے باوجود کچھ بھی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ چندو اُسے اپنا آپ سونپنا چاہتی تھی۔ وہ بڑی محویت سے بچی کو چھو رہا تھا۔ چندو کے ہونٹ لرزے مگر دل کی بات دل میں ہی چکرا کر رہ گئی، 'سر! آپ کے سینے میں دل کی جگہ کالا پتھر رکھا ہوا ہے۔'

چندو تب تک ڈاکٹر شاہ کے پروقار اور دل کش چہرے کو پھیلی پھیلی نظروں سے دیکھتی رہی جب تک وہ دایہ اور صفیہ پروین کو دو چار دن تک چندو کا خصوصی خیال رکھنے کا حکم دے کر کمرے سے چلا نہیں گیا۔ دایہ نے اُسے تین دنوں تک سیدھا لیٹے رہنے کا مشورہ دے کر کہا، ''بی بی! تین دن اُوکھے سَوکھے نکال لو اور ایسے ہی لیٹی رہو۔ اگر اُٹھو گی، چلو پھرو گی تو پیٹ بڑھ جائے گا۔''

دونوں اپنے کام میں بہت تجربہ کار تھیں۔ ڈاکٹر منور علی کا دل سے احترام کرتی تھیں اِس لیے انہوں نے تین چار روز تک نہ صرف چندو کی خوراک، دوا اور آرام کا خیال رکھا بلکہ بچی کو بھی سنبھالا۔ چوتھے دن شام کو جب اپنے معمول کے مطابق ڈاکٹر شاہ چندو کے کمرے میں آیا۔ دایہ کو ہاتھ کے اشارے سے باہر بھیج دیا اور خود چندو کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نرمی سے بولا، ''چندو ماہی! مجھے صفیہ نے بتایا ہے کہ تم بچی سے پیار نہیں کرتی ہو۔ شکر ہے کہ وہ اندازہ نہیں کر سکی کہ تم اپنی بیٹی سے شدید نفرت کرتی ہو ورنہ گڑبڑ ہو جاتی۔ پیٹھ پیچھے باتیں بنائی جاتیں اور ہمارے لیے مشکل پیدا ہو جاتی۔ تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ تمہارا یہ رویہ اَن نیچرل ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ دل میں ایک کسک اُٹھی۔ ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر بیٹی کو دیکھا جو

برابر میں لیٹی ٹانگیں چلا رہی تھی۔ بولی، ''سر! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے، اِس سے کیا پیار کروں گی۔''

''یعنی تم اپنی کمزوری کی سزا اِسے دے رہی ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر نے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔ بولا، ''مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ تم بُری نہیں ہو؛ میں سمجھتا ہوں مگر مجھے تمہارا یہ رویہ بُرا لگ رہا ہے۔ اِسے اُٹھاؤ اور پیار کرو۔ یہی سوچ لو کہ یہ تمہارے پاس چند دِنوں کی مہمان ہے۔ آج نہیں تو کل چلی جائے گی۔''

وہ چند لمحوں تک بیٹھی ڈاکٹر کو دیکھتی رہی پھر ہاتھ چھڑا کر بچی کو اُٹھانے لگی۔ جھولی میں رکھ کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ اس کی وارفتگی دیوانگی میں بدلنے لگی تو ڈاکٹر نے دکھ بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور کہا، ''چندو! ہوش میں آؤ۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ بچی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔''

وہ ہوش میں آ گئی۔ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی اپنی بیٹی اور کبھی ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ کچھ توقف کے بعد بولی، ''سر! میری طرح اِس کی تمام عمر بھی روتے ہی گزرنی ہے۔ آج ہی رونا سیکھ لے تو اچھا ہے۔''

ڈاکٹر نے بلکتی ہوئی بچی کو اُس سے چھیننے کے انداز میں لیا اور پیار کرتے ہوئے بولا، ''یہ ضروری نہیں کہ تمہیں جن حالات سے گزرنا پڑا، وہی حالات اِس گڑیا کو بھی درپیش ہوں۔ بہرحال! میں نے تخلیہ اِس لیے حاصل کیا ہے کہ ہم دونوں آئندہ کے بارے میں کچھ بات چیت کر لیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک بے اولاد جوڑا ایک بچے کو گود لینا چاہتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ میڈیکل کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ اللہ نے اُس کی شدید خواہش کے باوجود اولاد کی دولت سے محروم رکھا۔ چونکہ وہ خود ہی باپ بننے کے قابل نہیں تھا، اِس لیے دوسری شادی بھی اُس کے مسئلے کا حل نہیں تھا۔ دو ماہ پہلے اُس نے اپنا تبادلہ ملتان سے لاہور کروا لیا مگر میرے ساتھ اُس نے رابطہ بحال رکھا۔''

ڈاکٹر سانس لینے کیلئے رُکا۔ چندو کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھے اور اپنی بات بڑھائی، ''چندو! تم اس بچی کی ماں ہو۔ وارث ہو۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہو۔ اس لیے میں تمہارے فیصلے کا منتظر ہوں۔ تم میرے دوست کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر نہیں بلکہ اپنے آپ کو سامنے رکھ کر آزادانہ فیصلہ کرو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ ہاں! یہ بتانا ضروری

خیال کرتا ہوں کہ میں مزید دو تین ماہ تک تمہاری یہاں موجودگی کو برداشت کروں گا۔ تب تک نہ صرف تمہیں پوری طرح سنبھلنا ہے بلکہ نرسنگ سکول میں ایڈمشن بھی لینا ہے۔ چونکہ نرسنگ کلاس کے داخلے کیلئے شادی شدہ عورتیں یا مائیں کوالیفائی نہیں کرتیں؛ نہ ہی وہاں دودھ پیتی بچی کی گنجائش ہے، اس لیے اگر تم اچھی اور خودمختار زندگی بسر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں اس مامتا کی قربانی دینا پڑے گی جو ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی۔''

وہ ملتجیانہ انداز سے مخاطب ہوئی، ''سر! میں آپ پر بوجھ تو ہوں مگر.....''

ڈاکٹر نے بات کاٹ دی، ''ہاں چندو! تم مجھ پر بوجھ ہو، یہی سچ ہے کیونکہ مجھے تمہاری موجودگی میں الجھن ہونے لگتی ہے۔ میں اپنی محدود دنیا میں کسی وجود کو برداشت نہیں کرتا۔ پہلے کی طرح اکیلا رہنا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں یہاں سے جلد یا بدیر جانا ہی ہوگا مگر میں چاہتا ہوں کہ میرا تعاون رائیگاں نہ جائے اور تم ایک اچھی زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤ۔ تم چاہو تو کسی کالج میں بھی پڑھ سکتی ہو مگر کالج میں پڑھنے کیلئے معقول ماہانہ رقم درکار ہوتی ہے جو میرے بس سے باہر ہے۔ ویسے بھی کالج کے ہاسٹل میں رہائش کا مسئلہ حل تو ہو جائے گا مگر لمبی تعطیلات کے دنوں میں ہاسٹل بند ہوتے ہی تمہیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لے دے کے ہمارے پاس صرف نرسنگ کا شعبہ ہی بچتا ہے۔ ایک تو چار سالہ کورس کے دوران معقول ماہانہ وظیفہ ملتا ہے، ہوسٹل کی سہولت حاصل ہے اور کورس کی تکمیل پر سرکاری نوکری بغیر کسی تردد کے مل جاتی ہے۔ مریضوں کے درمیان زندگی کے چلن کو قریب سے دیکھو گی تو پراعتماد اور مضبوط ہو جاؤ گی۔ پھر اپنے لیے کوئی مخلص ساتھی تلاش کر لینا۔''

چندو آنکھوں میں مایوسی کی دبیز چادر سمیٹے ڈاکٹر منور علی کو ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ وہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے اُٹھا۔ کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہلتا گیا۔ پھر پشت پر ہاتھ باندھ کر رُکا اور بھاری آواز میں بولا، ''مجھے ایسے مت دیکھو۔ تم نے مجھے جتنا سخت مزاج پایا ہے؛ یقین کرو؛ میں اس سے کہیں زیادہ بدمزاج اور تلخ واقع ہوا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کاغذی رشتے میں حقیقی رنگ بھرنا چاہتی ہو۔ تم یہ بھی سوچتی ہو کہ میں تمہیں تمہاری گنہ گار زندگی اور اس معصوم بچی کی وجہ سے بیوی بنانے پر تیار نہیں ہوں مگر یہ سچ نہیں ہے۔ تمہاری جگہ پر کوئی بھی ہوتی تو مجھے ایسا ہی پاتی۔ چونکہ میرے نزدیک تمہارا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے، اس لیے مجھے ان بھیانک حالات سے بھی سروکار نہیں ہے جنہوں نے اس ننھی سی گڑیا کو جنم دیا۔

ہاں! یہی سچ ہے کہ میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ بس!''

وہ آہستہ سے بولی، ''اگر میں آپ سے کچھ نہ مانگوں اور آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں تو؟''

''کہاناں! یہ ممکن نہیں ہے۔ تم خاموش رہو گی تو تمہاری آنکھیں بولنے لگیں گی۔ تمہاری جوانی اپنی پذیرائی کا تقاضا کرنے لگے گی۔ نہیں چندو! میں سب یہ کچھ افورڈ نہیں کر سکتا۔''

ڈاکٹر منور علی کا لہجہ بے تاثر مگر قدرے اُکتایا ہوا تھا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے اُسے کچھ کہنے کی مہلت نہ دیتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑ لیا، ''اس موضوع پر ہم بہت ساری باتیں کر چکے ہیں؛ اِس لیے اب تم صرف یہ فیصلہ کرو کہ بچی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو یا گود دینے پر تیار ہو؟''

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، دُھندلائی ہوئی نظر سے اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی پھر دل پر ہاتھ رکھ کر سسکی، ''میرے ساتھ کیا ہوگا، میں کن حالات سے گزروں گی، علم نہیں۔ ایسے میں اس ننھی سی جان کی خاک پرورش اور تربیت کروں گی۔ ہم دونوں کیلئے یہی بہتر ہوگا کہ اسے کوئی معقول انسان ایڈاپٹ کر لے تاکہ کم سے کم یہ تو میرے جیسی زندگی گزارنے سے بچ جائے۔ میرا اللہ وارث ہے۔''

ڈاکٹر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ پلٹ کر چندو پر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ غم واندوہ کی تصویر بنی ساکت بیٹھی تھی۔ اس نے قریب آ کر چندو کا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اوپر اُٹھایا۔ آنکھوں میں جھانک کر پیار سے سمجھایا، ''چندو ماہی! زندگی کسی خوب صورت تخیل کا نہیں بلکہ تکلیف دہ عمل کا نام ہے۔ لمبا پریکٹیکل پیریڈ ہے جسے حوصلے سے گزارنا ہوتا ہے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو اور اپنے مستقبل کیلئے بہترین لائحہ عمل تیار کرو۔ دیکھو! میں تمام عمر کا ساتھ ہوں نہ اتنا امیر کہ تمہیں ہر غم سے آزاد کرنے کیلئے نوٹوں میں چھپا کر کہیں رکھ دوں۔ میں مدد تو کر سکتا ہوں مگر میدان میں تمہیں ہی نکلنا ہوگا۔ مجھے نہیں۔ کیا سمجھیں؟''

اس کی آنکھیں بولیں، 'آپ بہت ظالم اور پتھر دل ہیں۔'

لبوں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی، ''سر! مجھے آپ کی آدھی باتوں کی سمجھ آتی ہے، آدھی کی نہیں اور میں کبھی آپ کو عظیم انسان سمجھنے لگتی ہوں تو کبھی آپ بہت ظالم اور خشک مزاج لگنے لگتے ہیں۔''

ڈاکٹر کے لبوں پر مخصوص زہریلی مسکراہٹ ایک ذرا دیر کو اُبھری پھر معدوم ہوگئی اور وہ کچھ

کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ چندو نے سنا کہ وہ گیلری میں رُک کر دایہ سے کہہ رہا تھا، ''تم کل تک یہیں رہو گی۔ کل عائشہ کی پھوپھی اُسے لینے کیلئے آ جائے گی اور تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔''

دایہ کی حیرت بھری آواز سنائی دی، ''یہ عائشہ کون ہے؟''

''یہ میری بیٹی کا نام ہے۔ غلام عائشہ..... چونکہ چندو ناتجربہ کاری کی وجہ سے عائشہ کو سنبھال نہیں سکتی اِس لیے میں اپنی بڑی بہن کو بلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تاکہ وہ اِسے اپنے ہاں لے جائے۔ پانچ سات ماہ بعد میں واپس لے آؤں گا۔''

دایہ کی تفکر بھری آواز چندو کے کانوں پڑی، ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں صاحب جی؟..... پہلے بچے کی پیدائش پر ہر عورت ناتجربہ کار ہوتی ہے۔ اگر آج وہ بچی کو نہیں سنبھالے گی تو اگلے بچے کی باری پر پھر ناتجربہ کاری کے عذاب سے گزرے گی۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو مگر میں وہی کچھ کروں گا جو مجھے بہتر محسوس ہوگا۔'' ڈاکٹر کی آواز میں اس کی مخصوص درشتی عود کر آئی۔

''تو کیا بچی ڈبے والا دودھ پیے گی؟''

''ہاں! اور میرے خیال میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا پھر اُس کے قدموں کی چاپ نے چغلی کی کہ وہ گیلری سے نکل گیا تھا۔ انسان اپنے کہے سے پھرے تو عجیب لگتا ہے۔ وہ تمام دن عورتوں کو درس دیتا تھا کہ ماں کا دودھ پینا بچے کا بنیادی حق ہے۔ محروم کیا جائے تو خدا سخت ناراض ہوتا ہے۔ دایہ حیران تھی کہ اتنا سمجھ دار ہونے کے باوجود ڈاکٹر منور علی خدا کو ناراض کیوں کر رہا تھا؟ تھوڑا سوچا؛ سمجھ میں کچھ نہ آیا تو سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ بڑے لوگوں کی اکثر باتیں غریبوں کی سمجھ میں نہیں آیا کرتیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی عائشہ کیلئے دودھ گرم کرنے لگی۔

کمرے میں لیٹی ہوئی چندو ماہی نے چور نظروں سے اپنے لختِ وجود کو دیکھا۔ دل میں پیار کی توانا لہر بیدار ہوئی۔ لبوں سے بے ساختہ سرگوشی برآمد ہوئی، ''عائشہ..... غلام عائشہ..... کتنا پیارا نام ہے۔''

اس کی تخلیق کو یہ نام دینے والا خود بھی کتنا پیارا تھا مگر ایک چھت تلے رہتے ہوئے اُس سے کوسوں دور تھا۔ وہ اُسے قریب کرتے کرتے تھک کر دور ہو رہی تھی۔ یکبارگی جی چاہا کہ ڈاکٹر منور علی کو روک دے کہ وہ اس کی عائشہ کو کسی کی گود میں نہ ڈالے..... کوئی اپنے لختِ جگر کو یوں

پھینکتا بھی ہے؟..... پھر خیال آیا کہ اس کے لبوں سے نکلنے والا ایک جملہ ڈاکٹر منور علی کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دے گا اور وہ بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو جائے گی۔

ڈاکٹر منور علی اپنی موٹر سائیکل پر بورے والا گیا۔ ڈاکٹر نورالامین سے ملنے کے بعد اُس نے فون پر اپنے دوست سے رابطہ کیا اور اُسے خوش خبری سنائی۔ اس نے اگلے ہی دن پہنچنے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر منور علی نے مطمئن ہو کر غلام عائشہ کیلئے ڈھیر ساری شاپنگ کی اور لدا پھندا چندو ماہی کے کمرے میں داخل ہوا۔

اُس دن چندو نے عائشہ کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا اور بہت سی باتیں کیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ چند دن کی بچی اُس کی باتیں کیا سنے سمجھے گی؛ اس نے اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا اور اپنی سیاہ بختی پر آخری اشک بہائے۔ عائشہ کو اوپر تلے کئی لباس پہنائے، کئی اتارے اور اپنی آنکھوں میں اُس کی شبیہ کو تصویر کی صورت ہمیشہ کیلئے محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

جدائی فیصلہ نہیں، مرحلہ ہوتی ہے جس سے چندو ماہی دو مرتبہ گزر چکی تھی۔ گامن اور عمر دیات سے جدا ہونا اُس کیلئے نہایت تکلیف دہ تھا مگر وقت کی گرد نے اُن دونوں زخموں پر کھرنڈ جما دیے تھے۔ وہ دونوں یاد تو آتے تھے مگر اس کسک میں پہلی سی جان نہیں رہی تھی۔ عائشہ کی جدائی اُس کی زندگی کا تیسرا مرحلہ بن کر ڈاکٹر نفیس بخاری اور بیگم شگفتہ بخاری کی شکل میں دہلیز پر آ گیا۔ وہ عائشہ کو گود لینے کیلئے آئے تھے۔ ڈاکٹر منور اس معصوم شکل جوڑے کو لے کر چندو کے کمرے میں آ گیا۔ تعارف کے دوران ہی بیگم شگفتہ بخاری نے تجسس اور خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر عائشہ کو اُٹھا لیا۔ اُس کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمکنے لگیں۔

ڈاکٹر منور علی نے کہا، ''شگفتہ! یہ میری بیٹی ہے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ کس حوصلے سے تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ یاد رکھنا کہ میری چوکھٹ پر تم اسے ماں بن کر لینے آئی ہو۔ عائشہ کی نقیلی ماں بن کر دکھاؤ گی تو مجھے زندگی میں کبھی گلہ نہیں ہوگا۔ اگر رتی بھر لاپروائی کا مظاہرہ کرو گی تو معاف نہیں کروں گا۔''

بیگم شگفتہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر نفیس بخاری نے نہ صرف شکریہ ادا کیا بلکہ یقین دلایا کہ وہ دونوں ڈاکٹر منور علی کو زندگی بھر شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ چندو سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ باری باری سبھی چہروں کو دیکھ رہی تھی، ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

عائشہ کے نئے والدین اُسے بہت اچھے لگے تھے مگر اپنے حلیے سے خاصے امیر اور شگفتہ

مزاج دکھائی دینے والے مہمانوں سے ڈاکٹر منور علی کا رویہ واضح طور پر کھنچا کھنچا سا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیگم شگفتہ بخاری کو مخاطب کیا، ''شگفتہ! میں نے اِس کا نام غلام عائشہ رکھا ہے۔ اگر تمہیں پسند ہو تو ٹھیک ورنہ بدل لینا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

وہ بولی، ''یہ نام بہت پیارا ہے مگر میں نے اِس کا نام بہت پہلے سے ہی شائستہ رکھ دیا تھا..... شائستہ بخاری۔''

چندو کا دل مٹھی میں آ گیا۔ آنکھیں خشک رہیں۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی، ''عائشہ ہو یا شائستہ..... اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر بیگم صاحبہ! میری بیٹی محفوظ تو رہے گی ناں؟''

بیگم شگفتہ بخاری عائشہ کو ہاتھوں میں اُٹھائے اس کے پہلو میں آن بیٹھی۔ عائشہ کو گود میں رکھ کر اُسے پیار کرنے لگی۔ گال چوم کر بولی، ''لوگ تو دعا دینے سے کتراتے ہیں جبکہ تم نے مجھے وہ دوا دی ہے، جسے دینے کا حوصلہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ میں اِسے زمین پر نہیں، اپنی ہتھیلیوں پر چلاؤں گی۔ اِسے پنگھوڑے میں نہیں، اپنی چھاتی پر سلاؤں گی اور تم دیکھنا، میں اپنی ذات کے روم روم سے پیاسی مامتا نکال کر ان پیارے پیارے لبوں پر نچھاور کر دوں گی۔''

وہ احسان مندی کے جذبات سے مغلوب آواز میں بول رہی تھی۔ ڈاکٹر منور سے مخاطب ہو کر بولی، ''منور! تم بڑے انسان ہو۔ ہمیشہ کی طرح تم نے پھر مجھے مقروض کر دیا مگر اَب کے وہ قرض دیا جسے میں تو کیا، میری سات پشتیں بھی اتارنے کے قابل نہیں ہو سکیں گی۔ کیا اَب میں جاؤں؟''

چندو نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ملتجیانہ انداز میں عائشہ کو اُٹھا کر اپنی گود میں ڈالا۔ جی بھر کر پیار کیا۔ پیدا ہونے سے پہلے عائشہ کا وجود اُس کیلئے نہایت تکلیف دہ اور قابلِ نفرت تھا۔ اس نے پورا ایک دن اُسے دیکھنے سے گریز کیا تھا مگر چند دِنوں میں ہی عائشہ نے اس کے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ ذات بانٹ لی تھی۔ چندو نے بڑی سختی سے اپنی آنکھیں بند کیں اور بولی، ''آپ اپنی بیٹی کو اُٹھالیں۔ قسمت ہوئی تو زندگی میں اس کی ایک آدھ جھلک دیکھ لوں گی؛ وگرنہ اِسے یاد کر کے اپنی مامتا کو بے چین کیے رکھوں گی۔''

چاروں کچھ دیر تک عائشہ کے موضوع پر باتیں کرتے رہے؛ پھر عائشہ کو لینے کیلئے اتنا طویل سفر کرنے والے چندو کو تنہا کر کے لوٹ گئے۔

چندو ماہی کو ڈاکٹر منور علی کا رویہ بڑا عجیب لگا۔ اس نے نہ تو انہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہا تھا اور نہ ہی پھوٹے منہ رات رہنے یا کچھ وقت مزید بیٹھنے کا کہا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اُس نے

مہمانوں سے چائے پانی تک کا نہیں پوچھا تھا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر منور چندو کے کمرے میں آیا۔ اُس پر کریدتی ہوئی نگاہ ڈال کر بولا، ''چندو! میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا؟''

اس نے ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے دایہ کو اُس کے کمرے میں چھوڑا اور چلا گیا۔

چندو کو بیگم شگفتہ بخاری سے روا رکھے جانے والا ڈاکٹر کا رویہ اچنبھے سے دوچار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے بتایا تھا کہ ڈاکٹر نفیس بخاری اُس کا دوست اور کلاس فیلو تھا۔ اگر یہ درست تھا تو پھر اُس کی بیوی ڈاکٹر منور سے کیوں بے تکلف تھی؟..... ڈاکٹر دونوں سے خفا خفا کیوں تھا؟..... اگر ڈاکٹر کے دل میں کوئی رنجش تھی یا ان سے کسی معاملے میں اختلاف تھا تو اُس نے عائشہ کو ان کی تحویل میں کیوں دیا تھا؟ ان سوالوں کے جواب اُسے ڈاکٹر منور ہی دے سکتا تھا جس سے بعید نہ تھا کہ وہ جواب دینے کے بجائے درشتی سے جھٹک دیتا۔ عائشہ کی معصوم سی شکل اور رونے کی باریک آواز اسے بے چین کرتی رہی۔ رات کانٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتے گزری مگر جب پچھلے پہر سونے کے بعد دن چڑھے جاگی تو حیرت انگیز طور پر مطمئن اور پرسکون تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے دلی طور پر عائشہ کی جدائی کے دکھ سے مفاہمت کر لی تھی۔ آنے والے چند دنوں میں اس کے رویے سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ اپنی بیٹی کی حادثاتی جدائی کو ذہن سے محو کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

چاق چوبند ہوتے ہی اُس نے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر منور علی کو اُس کی خود ساختہ تنہائی سے نکالنے اور اپنی جانب راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ وہ صدقِ دل سے ڈاکٹر منور کے پاس رہنا چاہتی تھی کیونکہ گزشتہ دورانیہ میں ڈاکٹر کی پروقار شخصیت نے اُس کے ذہن پر بڑے گہرے اثرات مرتب کر دیے تھے۔ وہ سوتے جاگتے اُسے ہی سوچتی رہتی تھی۔ اُس کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ ڈاکٹر اُسے اپنی حقیقی بیوی کی حیثیت دے کر عدم تحفظ کی سلگتی ہوئی آگ سے نکال لے مگر وہ اُسے کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ دو تین ماہ میں چندو کا پہلا مسحور کن روپ لوٹ آیا اور سر چڑھ کر بولتا ہوا حسن ڈاکٹر کو سخنے درمے مضطرب کرنے لگا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر کی فصیلِ جاں میں دراڑیں نمودار ہونے لگی تھیں اور وہ چندو سے نظریں چرانے اور دور رہنے پر مجبور ہونے لگا تھا۔ کھینچا تانی کا یہ اعصاب شکن سلسلہ تین ماہ چلا مگر اچانک ڈاکٹر کی قلندری جیت گئی اور چندو احساسِ کم مائیگی میں مبتلا ہو کر ٹوٹ گئی۔

ڈاکٹر منور علی نے اپنے پلان کے تحت اخبار میں اشتہارات شائع ہوتے ہی تین مختلف

نرسنگ سکولوں میں چندو ماہی کی درخواستیں جمع کرادیں۔ چونکہ اُس نے میٹرک میں پوزیشن لی تھی؛ اِس لیے اُسے تینوں سکولوں میں ہی داخلہ باآسانی مل سکتا تھا۔ بغیر کسی تگ و دو کے ملتان کے نرسنگ سکول میں ایڈمشن مل گیا اور ڈاکٹر منور علی اُسے لے کر ملتان پہنچ گیا۔ چندو کو ہاسٹل چھوڑ کر اُس کیلئے ضروری سامان خریدنے کیلئے شہر چلا گیا۔ دو تین دن شہر میں رہتے ہوئے اُس نے چندو کا مکمل اقامتی بندوبست کیا اور ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد آخری ملاقات کیلئے ہاسٹل پہنچ گیا۔

ڈھلتی ہوئی شام میں دونوں نرسنگ سکول کے ملحقہ ہسپتال کے بڑے سے لان میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ چندو کا چہرہ حزن و ملال سے رقم تھا جبکہ ڈاکٹر مطمئن اور سرخرو دکھائی دے رہا تھا۔ یوں جیسے اُس کے سر سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔ بولا، ''چندو ماہی! میں تمہارے لیے یہی کر سکتا تھا، کر گزرا۔ کاش! میرے پاس دینے کیلئے اور بھی کچھ ہوتا تو دریغ نہ کرتا۔ تمہاری طلب پوری کرنے کے لائق ہوتا تو تمہیں مایوس نہ کرتا۔ بس! اب تم دل کو ہر قسمی شکووں اور میل سے پاک کر کے مجھے الوداع کہو۔ مجھے اپنی ڈگر کو دیکھتے ہوئے توقع ہے کہ ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔ اگر قسمت نے کہیں ملایا بھی تو دنیا ہمیں بس واقف کار ہی سمجھے گی۔ ٹھیک ہے ناں؟''

چندو کا گلا رُندھ گیا۔ بولی، ''سر! مجھے پتہ ہے کہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں مگر ایسا بھی کیا ہے کہ آپ مجھے ہمیشہ کیلئے چھوڑنے لگے ہیں۔ میں آپ سے ملتے رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اتنی سی اجازت تو آپ دے ہی سکتے ہیں ناں آپ کہ کبھی کبھی آ کر ایک نظر دیکھ لیا کروں؟''

ڈاکٹر کا چہرہ پتھرا گیا۔ آنکھیں بے تاثر ہو گئیں۔ بولا، ''نہیں لڑکی! تم نے میرے ساتھ لگ بھگ ایک سال کا عرصہ گزارا ہے۔ تمہیں یہ خوش فہمی ہے کہ تم مجھے سمجھتی ہو مگر حقیقت میں تم مجھے بالکل ہی سمجھ نہیں پائی ہو۔ تم اچھی لڑکی ہو مگر میں اچھا آدمی نہیں ہوں؛ شاید انسان بھی نہیں ہوں۔ تم میرے ساتھ نہ ہی چل سکتی ہو اور نہ کبھی خوش رہ سکتی ہو۔ تم بہت خوب صورت اور ذہین ہو۔ ایک تابناک مستقبل جس میں پھول، خوشبو، لہریں اور صبا شامل ہیں، تمہارا منتظر ہے جبکہ میرے پاس سوائے خشک مٹی اور تند ہوا کے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میں اگر یہ کہوں کہ مجھے تابناک مستقبل کی نہیں، آپ کی ضرورت ہے تو؟'' اُس نے ہمت کی اور ڈاکٹر کی آنکھوں میں براہِ راست جھانک کر پوچھا۔

ڈاکٹر نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر نفی میں سر ہلایا، ''نہیں چندو! میں تمہارا نہیں بن سکتا؛

کسی کا بھی نہیں..... شاید اپنا بھی نہیں..... کوئی اور بات کرو۔''

''سر! میں آپ سے بحث نہیں کر سکتی مگر التجا کرتی ہوں کہ آپ بھلے مجھے قبول نہ کریں مگر مجھ سے مل لیا کریں۔''

ڈاکٹر نے پھر نفی میں سر ہلایا، کہا، ''نہیں..... کہاں ناں کہ چھوڑو اِس تذکرے کو۔ یہ ایک لاکھ روپے کا چیک پکڑو۔ قرب و جوار میں کوئی بینک دیکھ کر اپنا اکاؤنٹ کھلوا لینا اور یہ چیک اُس میں جمع کروا دینا۔''

ہاتھ بڑھائے بغیر چندو نے تعجب سے پوچھا، ''یہ کیا سر! میں اتنی بڑی رقم کا کیا کروں گی؟''

ڈاکٹر نے چیک اُس کی جھولی میں رکھ دیا۔ کہا، ''رکھ لو، تمہارے کام آئے گی۔''

چندو کی آنکھیں ایک لحظہ کیلئے ویران ہوئیں پھر بول پڑیں، 'کیا یہ عائشہ کی قیمت ہے؟'

ڈاکٹر اُس کی آنکھوں سے پھوٹتا ہوا مدعا بھانپ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ سمجھانے لگا، ''چھوٹی باتوں سے صرفِ نظر کر کے بڑی باتوں پر توجہ دینا دانش مندی کہلاتی ہے۔ چونکہ میرا ذاتی خرچ نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے میری ہر تنخواہ سے اچھی خاصی رقم بچ جایا کرتی ہے۔ یہ شاید میرے کسی کام نہیں آئے گی۔ اس میں سے میں نے ایک لاکھ روپے تمہیں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''نہیں سر! میں جو مانگ رہی ہوں، وہ دے سکتے ہیں تو دیں ورنہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''کہا ناں! بے وقوف مت بنو اور وہی کچھ کرو، جو میں کہہ رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ڈانٹ کر کہا، ''کاغذی بیوی کا غذی حقوق بھی رکھتی ہے۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ اپنا حق سمجھ کر سنبھال لو۔ میں تمہیں کوئی لمبی چوڑی ہدایات نہیں دینا چاہتا۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ یہاں تمہارا قدم قدم پر مردوں سے واسطہ پڑے گا۔ یہ سبھی میرے یا ڈاکٹر نورالامین جیسے لوگ نہیں ہیں بلکہ ان میں اکثریت اُن کی ہے جن کے چنگل سے نکل کر تم میرے پاس پہنچی تھیں۔ وہ ڈاکٹروں کے روپ میں بھی ہیں، سکول انتظامیہ اور مریضوں کے روپ میں بھی ہو سکتے ہیں..... ان سے محتاط رہنا۔ تمہیں چند دن نئے سیٹ اَپ میں ایڈجسٹ ہونے میں لگیں گے پھر تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو کر ماضی کو بھول جاؤ گی۔ یہ دنیا تمہیں پھر سے اچھی لگنے لگے گی کیونکہ یہ خوبصورت چیز ہے۔ انسان کو لبھا کر اپنے پیچھے لگا لیتی ہے۔ اَب مجھے ہنستی آنکھوں گڈ بائے کہو.....''

ڈاکٹر ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ چندو کا دل دھک سے رہ گیا۔ سمجھ گئی کہ ڈاکٹر اُسے اپنی

زندگی سے ہمیشہ کیلئے نکالنے جا رہا تھا۔ لپک کر قریب آئی اور بے ساختہ ڈاکٹر کے چٹانی وجود سے چمٹ کر سسکنے لگی۔ وہ اتنا ٹوٹ کر روئی کہ اگر ڈاکٹر منور علی کی جگہ پر کوئی پہاڑ ایستادہ ہوتا تو پگھل جاتا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُسے خود سے علیحدہ کر کے، آنسو پونچھ کے 'بائے' کہتا ہوا تیزی سے لان سے نکلتا چلا گیا۔

وہ بدقت تمام اپنے کمرے میں آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنی روم میٹ زرینہ سے باتیں کرنے لگی۔ دل کو سنبھالنے لگی جو ڈاکٹر منور کی جدائی پر ٹوٹنے لگا تھا۔ ڈاکٹر منور علی نے بالکل درست کہا تھا۔ وہ ڈیڑھ ماہ میں اُس ماحول میں رچ بس گئی۔ اُسے دنیا اچھی لگنے لگی اور اپنا آپ بھی۔ ڈیڑھ ماہ بعد اُس نے اپنے اکاؤنٹ میں سے کچھ رقم نکالی اور ڈاکٹر منور علی سے ملنے کیلئے بورے والا عازمِ سفر ہوئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر جب چک ستاسی کے سرکاری ہسپتال میں پہنچی تو یہ روح فرسا خبر اُس کی منتظر تھی کہ ڈاکٹر منور علی شاہ اس ہسپتال سے اپنا بوریا بستر لپیٹ کر کسی اور ہسپتال سدھار چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے نئے ڈیوٹی اسٹیشن کا پتہ چلانے کی کوشش کی مگر عملے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ صفیہ پروین نے صرف اتنا بتایا کہ ڈاکٹر نے چھ ماہ کی چھٹی بھی لی ہے۔ ان چھ ماہ میں وہ کہاں ہوگا؟ یہ اُس سمیت کسی بھی شخص کو معلوم نہیں تھا۔

ڈاکٹر منور علی کی جگہ پر آنے والے میڈیکل آفیسر کی رہائش بورے والا شہر میں تھی اور وہ ڈیوٹی آف ہوتے ہی اپنی کار پر گھر لوٹ جاتا تھا، اس لیے وہ کوٹھی جس میں چندو نے ڈاکٹر کے ساتھ کم و بیش ایک سال کا عرصہ گزارا تھا، مقفل رہتی تھی۔ سرخ اینٹوں والی کوٹھی کے سامنے روش پر کھڑے ہو کر اُس نے حسرت بھری نظروں سے در و دیوار کو دیکھا اور آہ بھر کر ہسپتال سے نکل آئی۔ یہ صورتِ حال چندو کیلئے بڑی حوصلہ شکن اور مایوس کن تھی کیونکہ ڈاکٹر منور علی نے اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے اُس سے ہر قسمی ناتا توڑ لیا تھا۔

اس نے چندو سے ناتا جوڑا بھی کیا تھا؟

محض ایک جھوٹے کاغذ کا رشتہ..... دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوئی ایک فرضی دستاویز اور بس.....

اُسے دوسرا دھچکا لگا جب ڈاک کے ذریعے طلاق کا پہلا نوٹس ملا۔ ایک ایک ماہ کے وقفوں سے بقیہ نوٹس بھی مل گئے۔ ڈاکٹر منور علی نے اپنا نام اُس کی ذات کی سلیٹ سے مٹا کر سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی ڈاکٹر منور کو یاد نہ کیا کرے۔ یاد کرنے کا حق بھی کھو بیٹھی تھی۔ ڈاک کے لفافوں پر

واپسی پتہ درج نہیں تھا۔ یونین کونسل وہی تھی جس کے دائرہ کار میں چک ستاسی آتا تھا۔ چندو جانتی تھی کہ ڈاکٹر چک ستاسی سے رخصت ہو گیا تھا۔ اِس لیے وہ ڈاکٹر منور علی کے پیچھے اس یونین کونسل یا ہسپتال میں جانا ثمر آور نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اگر کسی طرح کھوج نکال کر ڈاکٹر تک پہنچ بھی جاتی تو کیا کرتی؟ وہ ڈاکٹر کو ایک نظر دیکھنے، چند روکھی باتیں سننے اور ناکام لوٹنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ پھر وہ بھی بابا گامن اور عمر حیات کی طرح خاص موقعوں پر یاد آنے والا کردار بن گیا اور چندو کا سفر نرسنگ کے مخصوص ماحول میں بغیر کسی رُکاوٹ کے چلنے لگا۔ اُس کی روم میٹ زرینہ اختر کی ترغیب پر اُس نے نرسنگ کے ساتھ ساتھ انٹرمیڈیٹ کی تیاری کی۔ میڈم جوزفین نے دونوں لڑکیوں کی مدد کی۔ پھر انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر امتحان دیا اور اچھے نمبروں میں پاس ہو گئیں۔ زرینہ ملتان کی ایک مضافاتی بستی سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت سادہ مزاج مگر پر اعتماد لڑکی تھی۔ وہ حق دوستی نبھاتے ہوئے اُسے چھٹیوں میں اپنے گھر لے جایا کرتی تھی جہاں اُس کا وقت کھلی فضاؤں اور سرسبز کھیتوں میں بہت اچھا گزرتا تھا۔

❖❖○❖❖

چالیس سالہ اسٹاف نرس مس جوزفین اپنی غیر معمولی سیاہ رنگت اور بے ڈیل ڈول جسامت کی وجہ سے ابھی تک کنواری تھی۔ اس کے بقول اُس کی ہتھیلیوں پر شادی کی ریکھا سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ وہ بظاہر خاصی اکھڑ مزاج تھی مگر فطرتاً انسان دوست واقع ہوئی تھی۔ چندو پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے دورانِ تربیت انٹرمیڈیٹ کی تیاری کرنے میں چندو اور زرینہ کی مدد کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دونوں لڑکیاں اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے نرسنگ کورس مکمل ہونے تک گریجویشن کی ڈگری بھی حاصل کر لیں۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ اسے سمجھانے والا پوری توانائیاں خرچ کر کے برسوں میں کوئی ایک نکتہ سمجھا پاتا ہے جبکہ بے وقوف بنانے والا چند لمحوں میں اُس نکتے کو مٹا کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر منور علی نے چندو کی ذہنی تربیت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ اُسے معاشرے میں پنپنے کی کئی باتیں سمجھائی تھیں مگر مس جوزفین کی چند میٹھی باتوں نے چندو کو آپے سے باہر کر دیا۔ اُس نے فاش غلطی کرتے ہوئے جوزفین پر اپنا ماضی آشکار کر دیا۔ ہمدردی پانے کی احمقانہ خواہش سے مغلوب ہو کر وہ سب کچھ بتا دیا جسے اپنے سائے تک سے چھپانے

کا حکم ڈاکٹر منور علی نے دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جوزفین نے اُسے اپنے بہت قریب کر لیا۔ گاہے بگاہے اپنی مہربانیاں دکھانے لگی۔ جوزفین نے کہا کہ گریجویشن کی تیاری کرو۔ نصاب کی کتب خرید لاؤ۔ چندو نے بلا چوں چرا حکم کی تعمیل کی اور کتابیں دکھانے کیلئے شام کو اس کے روم میں پہنچ گئی۔ حسبِ معمول جوزفین کمرے میں اکیلی نیم دراز تھی۔ اپنے پہلو میں بٹھا کر سرسری انداز میں کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔ پھر سر ہلا کر بولی، ''ہاں! یہی ہماری یونیورسٹی کا نصاب ہے۔ بی اے کی بیس انگریزی کے سبجیکٹ پر ہے۔ اگر تم اس مضمون پر قابو پا لو تو سمجھو ڈگری ہاتھ لگ گئی۔ زیادہ تر اسٹوڈنٹس اسی مضمون میں فیل ہو جاتے ہیں۔ باقی تمام کورس اتنا آسان ہے کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا ایک برابر ہے۔''

''مگر یہ آپشنل سبجیکٹ؟'' چندو نے ایک کتاب نکال کر دکھاتے ہوئے متفکرانہ انداز میں پوچھا۔

''عربی؟''

''جی میڈم! میں نے تو عربی پڑھی ہی نہیں ہے۔''

''تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مشکل مضمون نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی امیدوار فیل ہوتا ہے جو کمرہ امتحان میں غیر حاضر ہوتا ہے۔ سو میں سے پچانوے نمبر با آسانی مل جاتے ہیں۔'' جوزفین نے دلاسہ دیا۔ کچھ دیر اُسے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتی رہی، پھر قدرے آہستہ آواز میں بولی، ''شکر ہے کہ آج تمہارے ساتھ زرینہ نہیں آئی۔ تم نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بنا کچھ چھپائے بتایا تھا۔ تب سے میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن سمجھنے لگی ہوں۔ بہت سی باتیں تم سے کرنا چاہتی تھی مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج مل گیا ہے۔ ادھر قریب آ جاؤ۔''

وہ بیڈ پر تھوڑا اور قریب کھسک آئی۔ جوزفین سہلانے کے سے انداز میں اس کی پشت پر اپنا بھاری ہاتھ پھیرنے لگی۔ پیار بھری آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ کچھ بولے بنا اپنی بے لوث محبت کا یقین دلانے لگی۔ چندو یقین کر رہی تھی تبھی اُس کے بھدے ہاتھ کے لمس کو پسند کر رہی تھی۔

جوزفین نے دھیمی آواز میں کہا، ''چندو! تمہیں خداوند نے راج کرنے کیلئے بنایا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تمہیں اتنا خوبصورت نہ بناتا۔ یقین مانو؛ جب میں سوچتی ہوں کہ تمہاری ساری عمر دواؤں کی بُو میں نتھنے سکیڑتے، الائشیں دیکھتے، غلیظ اور خون سے لتھڑے ہوئے مریضوں کو سنبھالتے اور ڈاکٹر کی ہوس بھری نظروں کی سولی پر لٹکتے ہوئے گزرے گی تو میرے

دل سے ہوک نکلتی ہے۔ یہی زندگی میں گزار کر آئی ہوں۔ تھک گئی ہوں مگر پیٹ کی آگ کو بجھانے کیلئے ہر روز اس سلاٹر ہاؤس میں چلی آتی ہوں۔ یہاں کوئی رومانس نہیں ہے۔ بائیس سالوں میں لاکھوں خواب اجڑتے دیکھ چکی ہوں۔ یہاں آنے والا بوڑھا مریض بھی، جو ٹھیک سے سانس تک نہیں لے سکتا، معصوم آنکھوں کو سپنے دکھا کر بدن کی سیج پر سونے کی خواہش رکھتا ہے۔ لڑکیاں بھٹک جاتی ہیں۔ ٹوٹ کر مر بھی جاتی ہیں مگر ہاتھ خالی رہتے ہیں۔''

جوزفین نے نیا موضوع چھیڑا تھا۔ چندو دیدے پھاڑے اُسے دیکھ رہی تھی جو کل تک نرس اورنن کے کردار کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔ آج تصویر کا بھیانک رُخ بڑی بے دردی سے دکھا رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اُس کی زبان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ چندو نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا، ''میڈم! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ اگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں نرسنگ کا شعبہ چھوڑ دوں تو میرے لیے یہ ممکن ہی کس طرح ہوگا؟''

جوزفین کچھ دیر سوچتی رہی۔ کہے؛ نہ کہے؛ فیصلہ کرتی رہی پھر بولی، ''چندو ماہی! ہر ہاتھ ملانے والا دوست نہیں ہوتا اور جو دوست ہوتا ہے اُسے ہاتھ ملانے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ ایسا ہی ایک دوست مجھے بھی قسمت نے دے رکھا ہے۔ اجمل گیلانی۔ مجھ سے آٹھ دس سال چھوٹا ہے پر حیثیت میں بہت بڑا ہے۔ پارس ہے۔ جانتی ہو کہ پارس کیا ہوتا ہے؟ نہیں..... بتاتی ہوں۔ پارس اُس پتھر کو کہتے ہیں جسے چھونے والا ہر وجود سونا بن جاتا ہے۔ اجمل جس کو چھوتا ہے، وہ سونا بن جاتا ہے۔ میں کافی دنوں سے تمہیں اُس سے ملانا چاہتی ہوں۔''

چندو نے حیرت اور تشکیک بھری نظروں سے اُسے دیکھا اور خاموش رہ کر مزید بولنے کا موقع دیا۔

وہ بولی، ''قسمت انسان کو ایک ایسا سنہرا موقع ضرور دیتی ہے جو اُس کی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اگر انسان دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قسمت کا ہاتھ تھام لے تو ایک ہی جست میں وہ آکاش کو چھو لیتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اس جست سے لطف اندوز ہو کر راج محل پہنچ جاؤ۔'' جوزفین کے لہجے میں پیار بھرا ہوا تھا، ''چندو! تم غریب اور لاوارث لڑکی ہو۔ نامصورت بھی ہو مگر جس ماحول میں رہ رہی ہو، یہاں زندگی کو محض پریکٹیکل سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جذبات، احساسات اور عورت پن نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ تم ہزاروں روپے کما کر بھی تشنہ رہو گی۔ بظاہر صاف کپڑے پہنو گی مگر بدن تھکن اور میل سے اَٹا رہے گا۔ تمہارے

شوہر؛ کیا نام تھا اُس کا؟..... ہاں! ڈاکٹر منور علی شاہ..... اُس نے جس وقت تمہیں نرسنگ جائن کرنے کا فیصلہ کیا تھا؛ اُس وقت اس سے بہتر کوئی اور فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اَب تم ان حالات سے نکل آئی ہو اور اپنے لیے بہتر فیصلہ لینے کی پوزیشن میں ہو۔''

وہ جوزفین کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر چکی تھی کہ وہ اُسے نرسنگ چھوڑ کر کوئی اور شعبہ جائن کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ چونکہ اُس پر اعتماد کرتی تھی، اِس لیے پوری توجہ سے سن رہی تھی اور اُسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ میڈم جوزفین دل کی بات آشکار کرنے میں ہچکچا رہی تھی۔ کھل کر بتا نہیں رہی تھی۔ تبھی حوصلہ افزا لہجے میں گویا ہوئی، ''میڈم! آپ بہت اچھی ہیں۔ میں آپ کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہیں کرتی مگر آپ مجھے کھل کر کچھ بتا نہیں رہیں۔''

وہ مسکرائی۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ گرم لوہا چوٹ طلب کرنے لگا تھا۔ بولی، ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہیں پوری بات بتاتی ہوں۔ اس سے پہلے سمجھانا چاہتی ہوں کہ سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک ورنہ اسی کمرے میں دفن کر کے چلے جانا۔ قطعاً ضروری نہیں کہ میں جو کچھ کہوں، تم اُسی پر عمل کرو۔ نہیں..... بلکہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ ابھی پوری بات خاموشی سے سن لو، رات کو بستر میں لیٹ کر سمجھنے کی کوشش کرنا اور صبح مجھے اپنا فیصلہ سنا دینا۔ نفع ہو گا تو تمہیں ہو گا۔ نقصان ہو گا تو تمہارے مستقبل کا ہو گا۔ مجھے دونوں صورتوں میں کوئی ناراضی نہیں ہو گی۔''

جوزفین نے چندو کا ہاتھ تھاما۔ کھینچ کر پہلو سے لگایا۔ اپنی بات دیواروں سے بھی چھپانا چاہتی تھی تبھی رازداری سے بولنے لگی۔ چندو ماہی ایک ایک لفظ سنبھال کر ذہن میں محفوظ کرنے لگی۔ چند منٹوں کیلئے آئی تھی۔ سوا گھنٹہ گزار چکی تھی۔ ابھی کچھ دیر اور بیٹھنا تھا۔ جب مس جوزفین کی اجازت پا کر کمرے سے نکلی تو اُس کے پاؤں گیلری کے پھسلویں فرش پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی۔ اپنے روم میں پہنچی تو زرینہ کو برانگیختہ پایا۔ وہ برہمی سے پوچھنے لگی، ''کہاں چلی گئی تھیں تم؟ آج پھر ہم میس میں دیر سے پہنچیں گے اور ٹھنڈا کھانا زہر مار کریں گے۔''

وہ کتابیں الماری میں رکھتے ہوئے بولی، ''میں میڈم کے کمرے میں گئی تھی، کتابیں چیک کروانے۔''

''پھر کیا کہا اُس نے؟''

''سوائے ٹیسٹ پیپر کے، سب 'او کے' ہیں۔ ٹیسٹ پیپر بدلوانے کیلئے ہمیں پھر گھنٹہ گھ

بازار کا چکر لگانا پڑے گا۔'' چندو نے منہ بنا کر کہا۔

''نہیں..... ادھر قریب میں ایک بک سنٹر ہے۔ وہاں سے بدلوالیں گی۔'' زرینہ نے کہا، ''فی الحال مزید وقت ضائع کیے بغیر کمرے سے نکلو۔ برا حال ہے کیونکہ آج دوپہر کا کھانا بھی گول ہو گیا تھا۔ یقین کرو؛ بھوک کے مارے میرے سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔''

دونوں کمرہ لاک کر کے میس کی طرف چل پڑیں۔ کھانے کے دوران چندو عدم توجہی سے زرینہ کی باتیں سن رہی تھی اور 'ہوں' اور 'ہاں' میں جواب دینے پر اکتفا کر رہی تھی۔

اس کے ذہن میں جوزفین کی باتوں نے جو طوفان بپا کیا تھا؛ وہ اُسے پوری طرح اپنی تندی کے حصار میں جکڑ چکا تھا۔ اُسے سوچنے اور فیصلہ کرنے کیلئے ایک رات کی مہلت ملی تھی جو یقیناً بہت مختصر تھی۔ جوزفین نے سختی سے کہا تھا کہ اگر وہ علی الصبح اُسے کوئی جواب نہیں دے گی تو وہ انکار سمجھتے ہوئے اِس موضوع کو ہمیشہ کیلئے بغیر رشوت کی فائل کی طرح داخل دفتر کر دے گی۔ انسان کی سرشت میں لالچ اور آگے بڑھنے کی طلب کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے، من میں ہلکورے لیتی رہتی ہے۔ باوجود کہ چندو ماہی کو کوئی مالی پریشانی لاحق نہیں تھی، مستقبل بھی محفوظ دکھائی دے رہا تھا مگر جوزفین کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر وہ راج کماری بننے کیلئے پوری سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ وہ عدم تحفظ اور احساسِ کم تری کے حصار سے تو کب کی نکل چکی تھی مگر لالچ زندگی کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ نے اُسے سختی سے سمجھایا تھا کہ وہ ناک کی سیدھ میں چلتی رہے اور کبھی امیر ہونے کیلئے شارٹ کٹ راستہ اختیار نہ کرے مگر جوزفین کی پیشکش نے ڈاکٹر کی تمام پند و نصائح پر پانی پھیر دیا تھا۔

روم میں پہنچ کر اُس نے سر درد کا بہانہ کیا اور منہ سر لپیٹ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ دل ہی دل میں میڈم جوزفین کی سنائی ہوئی کہانی کو دہرانے لگی۔ کہانی کی جزئیات کو ذہن میں رکھ کر وہ اِس الجھن میں سر دینا چاہتی تھی کیونکہ جانتی تھی کہ اُسے ایسے پل پر سے گزرنا تھا جو اُس کے پار اترتے ہی دریا برد ہو جائے گا اور واپسی کا راستہ مسدود ہو جائے گا۔

گیلانی فلور مل کا مالک اکمل گیلانی سیلف میڈ انسان تھا۔ اندرونِ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے اپنی محنت اور دماغی صلاحیتوں کے بل بوتے پر نکلا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا شہر کے کاروباری حلقے میں اپنا اعتبار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز غلہ منڈی کے قریب اناج کی پھڑی لگا کر کیا۔ تول اور قیمت میں ڈنڈی مارتے ہوئے تھڑے سے اُٹھ کر ایک

چھوٹی سی دکان میں جا بیٹھا اور بروکر بن گیا۔ زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود خاصا چرب زبان واقع ہوا اور اس کا کاروبار زبانی جمع خرچ کی بنیاد پر روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ دولت کی برکھا برسنے لگی۔ چند ہی سالوں میں وہ نہ صرف غلہ منڈی کا معروف آڑھتی بن گیا بلکہ اُس نے ملتان کے ایک مضافاتی علاقے میں اپنی فلور مل بھی لگا لی اور آنے والے چند برسوں میں اس نے خاصی شہری جائیداد بھی بنالی اور پچاس ایکڑ زرعی اراضی کا مالک بھی بن گیا۔

اکمل گیلانی کی شادی اُس کی چچا زاد سے ہوئی تھی۔ دو سگے بھائیوں سمیت اُس کا پورا خاندان ابھی تک اندرونِ شہر کی عسرت زدہ گلیوں کی کوٹھڑیوں میں مقیم تھا اور محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی وارداتیں کر کے پیٹ پال رہا تھا۔ اپنی تمام تر بدقسمتی اور محرومی کو اکمل گیلانی سے نفرت اور انتقامی سوچ کی مالا میں پروتا رہتا تھا۔ اکمل کے سسرال کا بھی کم وبیش یہی حال تھا۔ اس نفرت کو مہمیز کرنے میں گیلانی کے کوتاہیوں بھرے مزاج کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ دولت کی ریل پیل میں وہ آگے بڑھتا گیا اور اس نے پلٹ کر اپنے خاندان اور بہن بھائیوں کی خبر تک نہ لی۔ اگر کوئی اُس سے ملنے کیلئے اُس کی تین کنال کی جہازی سائز کی کوٹھی میں پہنچا بھی تو اُس کے اہانت آمیز رویے کی بدولت اس کا دشمن بن کر نکلا۔ رفتہ رفتہ وہ نہ صرف اپنے خاندان سے کٹ گیا بلکہ اُس کا نام سنتے ہی رشتہ داروں کا خون یکبارگی کھول اُٹھتا اور وہ منہ بھر کر اُسے مغلظات سے نوازتے۔

اجمل اُس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ کی عدیم الفرصتی اور ماں کی بیماری نے اُسے بچپن میں ہی تنہائی پسند، مغرور اور منتقم مزاج بنا دیا تھا۔ جیب خرچ کے نام پر اُس کی جیبیں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔ نوٹوں کا نشہ سر پر سوار رہتا جس کی وجہ سے وہ دن بہ دن بگڑتا چلا گیا۔ میٹرک کے دوران ہی اُس نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور اوباش دوستوں کی صحبت میں شراب نوشی کا عادی ہو گیا۔ باپ نے چاہا کہ فلور ملز کے معاملات میں بیٹے کی معاونت حاصل کرے اور اُسے کاروباری رموز وقواعد سے روشناس کرے مگر اجمل نے چند دنوں میں ہی اُکتا کر ٹھینگا دکھا دیا اور اپنے من چاہے معمول میں چلا گیا۔

دولت اور جائیداد کی ہوس شر کا باعث بنتی ہے۔ شر کا سودا اکمل گیلانی کے بھائیوں اور پیدا گیر قسم کے سالوں کے سروں میں سما کر پروان چڑھ چکا تھا۔ اکمل گیلانی اور اس کی بیوی اور بیٹے کی موت سے وہ تینوں خاندان کروڑ پتی ہو سکتے تھے۔ موت اپنے وقت پر آتی ہے مگر

آنکھوں پر ہوس کی پٹی باندھ لینے والے فطرت کے قوانین سے ٹکرانے سے بھی باز نہیں آتے۔ ان تینوں نے اکمل گیلانی، جواں سال بیٹے اجمل گیلانی اور بستر نشین بیوی کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنالیا۔

وہ اپنے خونیں منصوبے پر عمل پیرا ہوئے اور چاندرات کو مسلح ہو کر گیلانی ہاؤس پر حملہ آور ہو گئے۔ چونکہ چاندرات کو گھر کے سبھی ملازمین اور چوکیدار چھٹی پر تھے؛ اِس لیے ان کے پیاسے ہتھیاروں کو خون مل گیا۔ اکمل گیلانی اور اس کی اہلیہ کو بے بسی کی موت مارنے کے بعد انہوں نے اجمل کی تلاش میں پوری کوٹھی چھان ماری مگر وہ نہ ملا۔ وہ اپنے اوباش دوستوں کے ہمراہ شاپنگ سنٹروں کی آوارہ گردی پر نکلا ہوا تھا۔ چاندرات میں اجمل جیسے بھونروں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ یہ چاندی اُس کی جان بچانے کا سبب بن گئی۔

اجمل زندہ تو بچ گیا مگر اپنے مشن میں جزوی طور پر ناکام ہونے والوں نے مدعی بن کر اُسے اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کے الزام میں حوالات بھجوادیا۔ پولیس کا پیٹ بھرا تو انہوں نے اجمل کی پولیس فائل پر قے کردی۔ چونکہ دوہرے قتل کی اس بھیانک واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا؛ اِس لیے اجمل کو ہی اپنے والدین کا قاتل قرار دیا گیا۔ دونوں چچاؤں اور ماموں نے محرک پیش کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ اجمل کا باپ اُسے ہر وقت برے کاموں سے روکتا ٹوکتا تھا اور ان دِنوں اُس نے اس کا جیب خرچ بند کردیا تھا جس پر اجمل نے مشتعل ہو کر دونوں کو ٹھکانے لگادیا۔

اس کے جیل جاتے ہی تینوں حصہ داروں نے تمام جائیداد اور کاروبار کے حصے بخرے بانٹ لیے۔ دور کا ٹیں دور ہو گئی تھیں۔ ایک رکاوٹ باقی تھی۔ اگر اجمل باہر ہوتا تو اُسے بھی ٹھکانے لگادیا جاتا مگر وہ قانون کی تحویل میں تھا اور اُسے قانون کے ہاتھوں مروانا ضروری تھا کیونکہ اجمل کی زندگی میں وہ لوٹی ہوئی دولت کے مالک نہیں بن سکتے تھے۔ اجمل کو سزائے موت دلوانے کیلئے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا اور قانون کو مٹھی میں لے کر اُسے تختہ دار کا مستحق ثابت کردیا۔ اجمل کے پاس نہ تو پیسہ تھا؛ نہ جائیداد اور نہ ہی اس کے کیس کی پیروی کرنے والا کوئی غم خوار تھا؛ اِس لیے وہ مقدمہ ہار گیا۔

وہ بچپن سے ہی منتقم مزاج تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں ملنے والی بدنامی اور موت کی سزا نے اُس کا خون کھولا دیا اور اس کے روم روم میں انتقام کی آگ بھر دی جو نکلنے کا راستہ تلاش

کرتی رہتی تھی۔ وہ جیل سے نکل کر اپنے ماں باپ کے قاتلوں کے گردنیں ماپنا چاہتا تھا مگر سمجھ رہا تھا کہ اُن تک پہنچنا ناممکن کی حد تک مشکل تھا۔ جانتا تھا کہ اُسے عنقریب تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ اچھے وقتوں کے دوست آڑے وقت میں کنارہ کر گئے تھے۔ سارا پیسہ مقتول باپ کے اکاؤنٹس میں جمع تھا۔ اس کسمپرسی کے سبب وہ ہائی کورٹ میں اپیل بھی دائر نہ کر سکا۔

ہر جانب سے مایوس ہو کر وہ سلاخوں سے سر ٹکرانے لگا تھا؛ چیخنے چلانے لگا تھا اور بعید نہ تھا کہ بلیک وارنٹ آنے سے قبل ہی پاگل ہو جاتا یا مر جاتا مگر انہی دنوں اس کی ملاقات جیل میں عمر قید کاٹنے والے ایک نامی گرامی ڈکیت سے ہوئی۔ وہ ہر قسم کے زنگ آلود قفل کھولنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے اجمل کی ملاقات جیلر سے کروادی۔ جیلر اُس گاؤں کا رہنے والا تھا جس گاؤں میں اجمل گیلانی کی پچاس ایکڑ اراضی واقع تھی۔ وہ بہت زرخیز اور مہنگی زمین تھی۔ ڈکیت سے ملنے والی معلومات نے جیلر کی آنکھیں چندھیا دیں۔ اسے اجمل کے معروضی حالات سے کوئی سروکار نہیں تھی بلکہ اُس کی ہوس بھری نگاہیں اُس کی زرعی اراضی پر جم گئیں۔

ڈکیت نے تھرڈ مین کا کردار ادا کیا اور ان کے درمیان رقبے کے عوض اجمل کو آزادی دلانے کا معاہدہ طے پا گیا۔ قانونی موشگافیوں کا دھیان رکھتے ہوئے پہلے تو اجمل کی سزائے موت کے خلاف اپیل ہائی کورٹ میں دائر کرائی گئی، جیلر کے کسی رشتہ دار کے نام اجمل نے زمین منتقل کرائی پھر اُسے بیمار ظاہر کر کے ڈی ایچ کیو ہسپتال میں ریفر کر دیا گیا۔ یہیں معاہدے کی دوسری شرط پوری کرتے ہوئے اجمل کو ہسپتال سے زندگی اور دشمنوں کے پیچھے بھاگنے کا موقع دے دیا گیا۔

وہ خطرناک اشتہاری مجرم تھا۔ موت کے منہ سے نکل کر کھلی فضا میں سانسیں لے رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے رشتہ داروں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا؛ 'ایک ذرا انتظار..... پھر ایک الو کا پٹھا بھی زندہ نہیں بچے گا۔'

اُسے پہلے شک تھا کہ اس کے ماں باپ کے قتل کے پیچھے اس کے چچاؤں اور ماموں کا ہاتھ تھا کیونکہ اس کے مقدمے میں وہی تینوں مدعی بنے تھے۔ پھر جب اسے پتہ چلا کہ اس کے باپ کے ترکے پر انہی لوگوں نے قبضہ کر لیا ہے تو اس کا شک پختہ یقین میں بدل گیا۔

چونکہ وہ مفرور مجرم تھا؛ قانون کو مطلوب تھا، اِس لیے چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اپنے دشمنوں پر شب خون مارنے کے لیے جرائم کی دلدل میں اُتر گیا۔ وہ غیر معمولی ذہانت

اور دلیر تھا۔ اس نے چند ہی دنوں میں اپنے اردگرد جرائم پیشہ لوگوں کا ایک گروہ مجتمع کر لیا جو کئی نوع کی وارداتیں کرنے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ان مختلف ہنر میں یکتا لوگوں کو ایک تنظیم کی شکل دے کر جدید طرز کا کرمنل گینگ بنایا پھر ایک ماہ کے قلیل عرصے میں ہی اُس نے تینوں رشتہ داروں کو ایسی منصوبہ بندی کے تحت زمین میں اُتارا کہ وہ قانون کے شکنجے میں آنے سے بچ گیا۔

اپنے خاندان کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اُس نے در پردہ رہتے ہوئے اپنا کاروبار، فلور مل اور تمام جائیداد کو اپنے منیجر کی تحویل میں دیتے ہوئے ایک طرف وارداتوں کا سلسلہ جاری رکھا جبکہ دوسری طرف اپنے کیس کی قانونی پیروی شروع کر دی۔ اَب وہ نہتا نہیں تھا؛ اس لیے جب دونوں ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈیاں اُٹھائے انصاف کے بازار میں نکلا تو اُسے ہر کوئی پرسانِ حال اور معاون ملا۔ ہر دفتر کا دروازہ اُس پر کھلتا گیا، ہر ماتھے کی تیوریاں کھلتی گئیں اور وہ چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد مکمل بریت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اجمل نے اپنے جن چچاؤں اور ماموں کو قتل کیا تھا، ان کی اولادیں شک کی بنا پر اُس کے خون کی پیاسی تھیں۔ وہ ڈرتا نہیں تھا مگر احتیاطاً ان سے بچ کر چلتا تھا کیونکہ ان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کے نام کی دھاک شہر میں بیٹھ گئی مگر تب تک مسلسل شراب نوشی کی عادت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اُسے گردوں کا ضعف لاحق ہو گیا تھا جس نے سال بھر میں ہی اُسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ابتدا میں اِس بیماری کو اہمیت نہیں دی تھی مگر جب گردوں کا جان لیوا درد اس کی برداشت سے باہر ہو گیا، کمزوری نے اعصاب میں شدید شکست و ریخت بھر دی تو وہ شہر کے جدید نجی ہسپتال منتقل ہونے پر مجبور ہو گیا۔

وہ دیکھنے میں تندرست، مضبوط قد کاٹھ اور پرکشش مرد تھا مگر شراب نوشی نے اُسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ دو تین مرتبہ ڈائیلاسز کے مرحلے سے گزرنے کے بعد مزید نحیف ہو گیا۔ اس کے متوالوں نے گردوں کے حصول کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر دال نہ گلی جس پر اجمل کا علاج کرنے والے ڈاکٹرز نے اس کی زندگی کے سوال پر نفی میں سر ہلا کر دعا کا مشورہ دے دیا۔ اِن دنوں وہ بسترِ مرگ پر اپنی آخری سانسیں شمار کرنے پر مامور تھا اور ڈاکٹرز کی رائے کے مطابق وہ ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ نکالنے والا نہیں تھا۔

جوزفین نے اجمل گیلانی کی رام کہانی تمام تر جزئیات سمیت سنانے کے بعد اُس کی طرف دیکھا اور کہا تھا، ''چندو ماہی! میں اُسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ شہزادوں کی طرح زندہ رہا۔

بہادروں کی طرح قانون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولتا رہا پھر جیل سے نکلنے کے بعد بجلی کی طرح اپنے دشمنوں پر ٹوٹا۔ وہ مر رہا ہے۔ اُسے بچایا نہیں جا سکتا۔ یہ بات وہ خود بھی جانتا ہے تبھی شان سے مرنا چاہتا ہے۔ موت کی دہلیز پر کھڑا ہے مگر تم جیسی کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ مرتا ہوا شخص ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر جائیداد، جو بلاشبہ اِس وقت کروڑوں میں ہے، دے کر زندگی سے بھرپور ایک رات خریدنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے خاندان کا کوئی شخص اس کی جائیداد سے ایک دھیلا بھی حاصل نہ کر سکے..... میں نے تمہیں بتایا ناں کہ وہ بہت منتقم مزاج اور ٹھوس بنیاد پر دشمنی یا دوستی رکھنے والا انسان ہے۔''

چندو نے جوزفین سے یہ بھی پوچھا تھا کہ اس کا جوزفین سے کیا تعلق تھا؟..... جوزفین نے بتایا کہ وہ اُس کے باپ اکمل گیلانی کی دوست تھی۔ چونکہ اس کی بیوی مستقل بیمار تھی؛ اِس لیے اُسے اپنی زندگی کو سیراب کرنے کیلئے جوزفین جیسے تھرڈ کریکٹر کی احتیاج تھی۔ وہ بھاری معاوضے پر بڑی راز داری سے محبت کے چند لمحات خرید کر گیلانی کی گود میں ڈال دیتی تھی۔ اجمل گیلانی سے تعلق کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی تھی۔

چندو کو اُس کے کردار پر گھن آ رہی تھی مگر اس کی پیشکش اور منصوبے کی طرف دل کھنچ رہا تھا۔ جوزفین نے اُسے کہا تھا، ''چندو! تم کتنے مردوں کی خواب گاہ میں جا چکی ہو؟ یاد کرو..... مگر تمہارا کیا بگڑ گیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اور تو اور..... تم بیوی اور ایک بچی کی ماں بھی بن چکی ہو مگر تمہاری معصوم شکل دیکھ کر کوئی بھی یہ بات سچ ماننے کو تیار نہیں ہوگا۔ پہلے کی طرح یہ شادی بھی محض کاغذی کارروائی ہے۔ وہ مرنے والا ہے اور تمہیں اپنی مرضی سے چھونے کی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ فرض کیا؛ وہ تمہاری ایک رات حاصل کر بھی لیتا ہے تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کوئی گناہ تو نہیں کرے گا؛ نہ تم۔ اور یوں یہ سودا گھاٹے کا نہیں ہوگا۔ بنا ہاتھ پیر ہلائے کروڑوں کی جائیداد تمہاری جھولی میں آن گرے گی..... ہے ناں؟''

جب اُس نے یہ باتیں سنی تھیں، تب اُسے بُری لگی تھیں مگر رات کے اِس پہر میں اُس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ جوزفین نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی قسمت ایسے سنہرے مواقع بار بار نہیں دیتی۔ اُس نے لحاف سے ہاتھ نکالا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں چمکتی ہوئی ساعدِ سیمیں اپنی آنکھوں کو بھی کنواری لگی۔ ماضی میں خود پر ہونے والا بدترین تشدد خواب کی طرح قصۂ پارینہ

بن چکا تھا۔ خواب جھوٹا ہوتا ہے۔ اُسے بھی اپنا ماضی جھوٹ لگنے لگا۔ عمر حیات کی حویلی خواب تھی۔ حویلی میں چند دن کا مہمان بن کر آنے والا ماموں رضوان خواب تھا، خواب گر تھا؛ چلا گیا۔ اس نے چندو کی دنیا میں تبدیلی لانے والے جس راج گر کا تذکرہ کیا تھا؛ وہ ڈاکٹر منور علی تھا۔ آیا اور آ کر چلا بھی گیا۔ جاتے ہوئے زندگی گزارنے کا ہنر دے گیا۔ وہ ہنر آزماتھی مگر اب سبز باغ دیکھتے ہوئے بھٹکنے لگی تھی اور جوزفین کے صاف و شفاف تعلق کو مدنظر رکھ کر مرتے ہوئے شخص کی انتقامی سوچ سے فائدہ اُٹھانے کا سوچ رہی تھی۔ ماموں رضوان نے جس شخص کا تذکرہ کیا تھا، شاید وہ اجمل گیلانی ہی تھا۔ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ خوابوں کا دل افزاء سلسلہ جاری تھا اور پھر اُس نے دولت کے حصول کیلئے شارٹ کٹ اختیار کرنے کا آدھا فیصلہ کرلیا۔ بقیہ آدھے فیصلے کا انحصار اجمل گیلانی سے ہونے والے ملاقات پر تھا۔

وہ دیر سے سوئی تھی۔ دیر سے جاگی۔ زرینہ یونیفارم پہن کر جا چکی تھی۔ اُس پر کسلمندی سوار تھی۔ انگڑائیاں لیتی ہوئی اسٹڈی چیئر پر آ بیٹھی۔ وارڈ میں جانے کو جی نہ چاہا۔ ایسے میں سوچ کی سوئی اجمل گیلانی پر جا اٹکی۔ وہ کیسا تھا؟ کیا وہ واقعی مرنے جا رہا تھا؟ ان سوالوں کا جواب اجمل سے ملنے پر مل سکتا تھا۔ جوزفین نے اُسے بتایا تھا کہ وہ آنے والے دو تین دن ڈیوٹی پر نہیں جائے گی بلکہ اجمل کو زیادہ سے زیادہ وقت دینے کی کوشش کرے گی۔ چندو نے اپنا کمرہ مقفل کیا اور جوزفین کی طرف چل دی۔

جوزفین نے دیکھا کہ سوجی ہوئی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ چندو کی تفکرات بھری شب کی کتھا سنا رہا تھا۔ اس کے استفسار پر چندو نے اجمل گیلانی سے شادی کی نیم رضامندی ظاہر کی تو اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ وفورِ مسرت سے چندو کو بانہوں میں بھر کر چومنے لگی۔ اس کی معاملہ فہمی اور قوتِ فیصلہ کو سراہتے ہوئے حوصلہ افزائی کرنے لگی۔ بولی، ''چندو جان! تم مقدر کی سکندر ہو۔ یقین کرو؛ اجمل دل کا بہت اچھا ہے۔ ہائے کاش! اس کی موت ٹل جائے، کسی دشمن کو آ جائے اور اُسے تمہارے حسن کی پذیرائی کی مہلت مل جائے۔ وہ زندہ رہے گا تو تمہیں دل کے سنگھاسن پر بٹھائے گا۔ مر جائے گا تو تمہیں ملکہ بنا کر اپنی راج دھانی سونپ جائے گا۔''

چندو ماہی سر تھام کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جوزفین کی شرارت بھری باتیں سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی، ''مگر میں اُسے دیکھنے کے بعد حتمی فیصلہ کروں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں ہمارا نکاح عدالت میں ہوگا اور اس سے پہلے اجمل کی جائیداد میرے نام منتقل ہوگی۔ یہ نہ ہو کہ اُس کے

مرنے کے بعد اُس کے رشتہ دار اور وراثت کے حقدار مجھ سے سب کچھ چھین لیں۔ میں کوئی بھی رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

جوزفین نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا پھر پرجوش انداز میں یقین دلایا کہ وہ جیسا چاہے گی، ویسا ہی ہوگا۔ کچھ دیر کی باتوں کے بعد جب چند و کمرے سے نکلنے لگی تو جوزفین نے پیار سے روکا، مسکرا کر کہا، ''ہم سہ پہر کو اجمل سے ملنے کیلئے جائیں گے۔ ویسے تو تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں مگر ہلکا پھلکا میک اَپ کر لینا۔ اور ہاں! تمہاری روم میٹ کو اس معاملے کی بھنک نہیں ملنی چاہیے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے کمرے میں آ کر بغیر ناشتہ کیے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس نے زندگی میں معمولی نوعیت کی غلطیاں کی تھیں جن کی بھیانک سزا پائی تھی۔ دودھ کی جلی تھی اور چھاچھ کو پھونک مارنے پر مجبور تھی۔ ایسے میں اس کے خوبصورت ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ بڑبڑانے لگی، ''میری ہر غلطی کی زیادہ سے زیادہ سزا وہی ہے جو مجھے پہلی مرتبہ عمر حیات نے دی تھی۔ میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ وہی ہوگا جو یارن، افراسیاب اور جانو جیسے بھیڑیوں نے کیا تھا۔ تب کیا ہوا تھا؟ اَب کیا ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں..... پہلے میں کمزور تھی۔ جس کا بس چلا، اس نے توڑ موڑ کر رکھ دیا۔ اَب میں نادان ہوں نہ کمزور ہی۔ اگر کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی تو اجمل اور میڈم جوزفین پر لعنت بھیج کر واپس آ جاؤں گی۔''

پہلی اُڑان بھرنے والا ہر بوٹ یہی سوچ کر چھلانگ لگاتا ہے مگر پھر زندگی بھر گھونسلے میں لوٹنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس نے بھی آنکھیں بند کیں اور گھونسلے سے چھلانگ لگا دی۔

پانچ بجے جوزفین کے ساتھ شہر کی مصروف شاہراہ پر آسمان کو چھوتی ہوئی نجی ہسپتال کی عمارت کے پارکنگ ایریا میں رکشا سے اُتری تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے زندگی میں دو سرکاری ہسپتال دیکھ رکھے تھے۔ سوچا کرتی تھی کہ دنیا کے سبھی ہسپتال ایسے ہی ہوتے ہیں مگر اس ہسپتال کے آؤٹ ڈور کاؤنٹر پر رک کر ارد گرد دیکھتے ہی اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ یہ ہسپتال ٹی وی اور فلموں میں دکھائے جانے والے فائیو اسٹار ہوٹلوں سے کسی طور پر کم نہیں تھا۔ یہاں صفائی اور آرائش کا معیار بہت اچھا تھا۔

اجمل گیلانی کا وی آئی پی کمرہ چوتھی منزل پر تھا۔ وہ لفٹ کے ذریعے فورتھ فلور پر پہنچیں۔

گیلری کے آخری کمرے میں آئیں۔ مردے کی طرح بیڈ پر لیٹے ہوئے پیلے چہرے والے مریض کے دونوں اطراف دو نرسیں اور ایک ڈاکٹر کھڑے تھے۔

وہ جوزفین سے جڑ کر چلتی ہوئی بیڈ کے قریب آ گئی۔ متذبذب انداز میں مریض کو دیکھنے لگی۔ وہ یقینی طور پر اجمل گیلانی ہی تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ ایک نظر دیکھتے ہی چندو کو جھرجھری آ گئی اور اس نے غیر ارادی طور پر رُخ پھیر لیا۔ ایسے میں جوزفین کی متفکر آواز کانوں میں پڑی، ''ڈاکٹر صاحب! کیا یہ ہوش میں ہے؟''

''یس! مگر اس کی حالت مسلسل بگڑ رہی ہے۔'' ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ بے تاثر لہجے میں کہا۔

زندگی اور موت کا کھیل چندو ماہی کیلئے نیا نہیں تھا۔ اس نے کئی انسانوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ نرسنگ کے شعبے میں آتے ہی اسی کھیل سے اُس کا مستقل واسطہ پڑا تھا۔ اس کے سامنے جیتا جاگتا انسان زندگی زندگی پکارتا ہوا موت کی اتھاہ گپھا میں چلا جاتا تھا۔ مرتا ہوا شخص اچانک سنبھل کر موت کے خونی پنجوں سے آزاد ہو جاتا تھا۔ مسیحائی کا پیشہ انسان کو غیر معمولی طور پر مضبوط اور سخت دل کر دیتا ہے۔ وہ بھی مضبوط بن کر آئی تھی مگر اس کمرے کے در و دیوار سے آسیب کی طرح چمٹی ہوئی موت نے اس کے اعصاب کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔

بدقتِ تمام اس نے اپنی ہمتیں یکجا کیں۔ کیمل کلر کے کمبل میں گردن تک چھپے ہوئے اجمل کو دیکھا۔ اس کی اَدھ کھلی آنکھیں جوزفین پر جمی ہوئی تھیں اور لبوں پر شکست خوردہ سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

ڈاکٹر نے نرسوں کی معاونت سے اپنا کام مکمل کیا اور جوزفین کو ہمدردی بھری نظر دیکھ کر چلا گیا۔ جوزفین نے نرسوں کو کچھ دیر کیلئے باہر بھیجا۔ پھر اجمل پر جھکی اور پیشانی پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے پیار سے بولی، ''کیسے ہو میری جان؟''

''تم آ گئی ہو تو دو چار گھڑیاں اچھی گزر جائیں گی۔''

''ہوں..... آج میں تمہارے لیے بہت بڑی خوشخبری لائی ہوں۔ تمہاری دلہن ڈھونڈ لائی ہوں۔ دیکھ لو۔ اسے چندے آفتاب کہو یا چندے ماہتاب..... دیکھنے سے میلی ہونے لگتی ہے۔ اس شہر میں تو کیا، پورے ملک میں اتنی خوبصورت لڑکی نہیں ہوگی۔''

یہ کہہ کر جوزفین نے چندو کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر اجمل کے سامنے کر دیا۔ اس کا دعویٰ بجا ثابت ہوا۔ اجمل کی آنکھیں یکبارگی کھل گئیں۔ ایک ٹک دیکھتے ہوئے اپنی دہلیزِ جاں تک

آنے والی موت کی صدا کو بھول گیا۔ کمزور سی آواز میں بولا، ''آں ہاں! تت..... تم ٹھیک کہتی ہو جوزی ڈیئر۔ مجھے ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی۔ دودھ کی طرح پاکیزہ..... پھول کی طرح تازہ..... مگر کیا یہ مجھ سے شادی پر تیار ہے؟''

''تو کیا ایسے ہی اُٹھا لائی ہوں اِسے؟'' جوزفین نے سینہ پھلایا، ''یہ بہت مغرور ہے۔ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ ڈاکٹر تو رہے ایک طرف؛ نرسیں بھی اس سے بات کرنے کو ترستی ہیں اور بڑی مشکل سے تمہارے لیے رام کر لائی ہوں۔''

چندو اور اجمل ایک دوسرے کو پلکیں جھپکے بغیر دیکھ رہے تھے۔ چندو اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے تھوڑا اور قریب ہوئی۔ بائیں آنکھ کو دیکھا۔ اجمل کی نیم باز آنکھیں ایک لحظے کو بند ہوئیں۔ اپنی آنکھ پر ماموں رضوان کی انگلی کا لمس جاگا اور دل اچانک تیزی سے پہلو میں دھڑکنے لگا۔ موت کی بانہوں میں جھولنے والے کی بائیں آنکھ پر ایک ننھا سا سیاہ تل جگمگا رہا تھا۔

ماموں رضوان نے کہا تھا کہ ایک بادشاہ اُس کی زندگی میں گھڑی دو گھڑی کیلئے آئے گا اور اُسے سہارا دے کر چلا جائے گا۔ مرنا اور جانا ایک برابر ہوتا ہے۔ یعنی ماموں رضوان کا کہا پورا ہونے والا تھا۔ اُس نے جو نشانی بتائی تھی؛ وہ موجود تھی۔ اس نے اپنی آنکھ پر انگلی رکھ کر سرگوشی کی طرح ایک لفظ 'تل' ادا کیا تھا۔ اُس لفظ کی بازگشت ذہن میں ہتھوڑے مارنے لگی۔ دل یقین کے ساتھ اُسے سمجھانے لگا کہ وہ جسے دیکھ رہی تھی، وہ اُس کو ہر فکر سے آزاد کرنے والا ہی تھا۔ اچانک اُس کی سوچ کی تابانی فرد ہوگئی۔ دل اندیشوں سے بھر گیا۔ ڈاکٹر منور علی کا چہرہ چشمِ تصور میں سج گیا۔ اس کی بند آنکھ پر ایسا ہی تل تھا۔ ماموں رضوان نے ایک شخص کا کہا تھا۔ اگر وہ ڈاکٹر منور تھا تو وہ اپنے حصے کا کام کر کے منظر سے ہٹ گیا تھا۔ اگر وہ مطلوبہ شخص نہیں تھا تو اس نے کیوں سہارا دیا تھا؟..... اگر وہی تھا تو پھر اجمل کی آنکھ پر تل کا نشان کیوں تھا؟..... شش و پنج میں بڑھے ہوئے قدم بے جان ہونے لگے۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر بغور اجمل کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا غیر معمولی پیلا پن دیکھ کر اُس پر ترس آیا۔ جوان عمر میں موت کو گلے لگانا دیکھنے والوں کیلئے تکلیف رساں ہوتا ہے۔

ایسے میں اجمل نے آنکھیں کھول دیں اور بے چارگی سے معمور لہجے میں چندو سے مخاطب ہوا، ''میں..... اجمل گیلانی ہوں۔''

''جی! میں جانتی ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں دو چار دنوں یا دو چار لمحوں کا مہمان ہوں؟''

''مجھے میڈم نے آپ کے بارے تفصیل سے بتا دیا ہے۔'' اس نے کہا۔ اجمل کے پیلے چہرے پر زیادہ دیر نظریں ثبت رکھنا دل گردے کا کام تھا، ''اخبار میں آئے روز گردوں کی غیر قانونی منتقلی اور چوری کی خبریں چھپتی ہیں۔ کئی گروہ یہ کام باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔ آپ اتنے امیر ہوتے ہوئے بھی ایک گردہ خرید نہیں پائے۔ حیرت کی بات ہے۔''

اجمل کے بجائے جوزفین نے جواب دیا، ''ہاں! اس معاملے میں میرا دوست بدقسمت ثابت ہوا ہے۔ اس کے ساتھی اور میں تمام تر کوشش کے باوجود کسی گردہ چور گروہ تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ عطیے والی فہرست میں ابھی اس کا نام بہت نیچے ہے اور باری آتے آتے چھ ماہ گزر جائیں گے۔''

کچھ دیر اجمل کے علاج اور کیفیت پر گفتگو ہوتی رہی پھر جوزفین دونوں کو تنہائی میں وقت دینے کیلئے کمرے سے نکل گئی۔ اجمل کے ہونٹ بھنچ گئے۔ چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے۔ چندو نے گھبرا کر پوچھا، ''کیا ہوا؟ کیا درد ہو رہا ہے؟''

اجمل نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ پھر کھول کر آزردگی سے مسکرایا اور بولا، ''جوزی نے تمہیں بتا دیا ہے ناں کہ میں مرنے سے پہلے کیوں شادی کرنا چاہتا ہوں؟''

چندو نے اپنا وزن دوسری ٹانگ پر منتقل کیا۔ اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا، ''کیا تم کچھ پوچھنا چاہتی ہو؟''

اس نے پھر اثبات میں سر کو جنبش دی، بولی، ''کیا آپ کے پاس اپنی دولت اور جائیداد کو اپنے دشمنوں یا رشتہ داروں سے بچانے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ شادی کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر یہ مقصد پورا کر سکتے ہیں۔''

''کیسے؟'' اجمل نے پوچھا۔

''آپ کسی فلاحی ادارے کو جائیداد منتقل کر سکتے ہیں۔ کسی ٹرسٹ کو ڈونیٹ کر سکتے ہیں۔ پراپرٹی بیچ کر رقم غریبوں اور مستحق لوگوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ اپنے نام پر کوئی خیراتی ہسپتال.....''

اجمل کے چہرے پر اذیت کے آثار دیکھ کر وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ سہم کر سوالیہ انداز

میں دیکھنے لگ گئی۔

وہ بولا تو اس کی آواز پہلے سے بھی نحیف تھی، ''تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ میں شادی سے پہلے اپنی زیادہ تر جائیداد تمہارے ہاتھ فروخت کروں گا۔ بقیہ حق مہر میں تفویض کر دوں گا تا کہ ہیرز لاء کے تحت کوئی بھی تم سے ایک اینٹ بھی نہ ہتھیا سکے۔ اپنی رقم تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دوں گا۔ رہی بات ٹرسٹ یا کسی رفاحی تنظیم کو وقف کرنے کی تو سن لو۔ میں ان خدائی فوجداروں سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ جیل میں رہتے ہوئے میں نے سبھی کو مدد کیلئے پکارا تھا۔ اپنی بے گناہی کا واویلا کیا تھا مگر کسی نے مجھ تک پہنچنے یا کچھ پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی تھی۔''

اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ کچھ دیر سنبھلنے میں لگی۔ پھر بولا، ''لڑکی! اس بے حس معاشرے نے مجھ سے میرے ماں باپ چھین لیے۔ قانون نے مجھے ہی اپنے والدین کا قاتل قرار دیا اور دنیا کی سب سے بڑی سزا سنا دی۔ سزائے موت۔ آہ! میں مجرم نہیں تھا اور میں نے دُہری سزا کاٹی۔ اور ہاں! میری چیخوں پر، فریاد اور پکار پر کسی ٹرسٹ نے، کسی این جی او یا سوشل ورکر نے کان تک نہ دھرا۔ جب میں دولت کے بل بوتے پر اس مقتل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو سبھی مجھے خوش آمدید کہنے لگے مگر میں نے پورے معاشرے کو اپنا مجرم سمجھا..... بلا تخصیص!''

وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا مگر پھر بھی تھک جاتا تھا۔ چند لمحے خود کو سنبھالتا، پھر بول پڑتا۔ ایسا ہی ایک وقفہ گزار کر گویا ہوا، ''اور میں نے سزا دینے کا ہنر بھی سیکھ لیا مگر لوگوں کی طرح زندگی بھی بے وفا نکلی۔ اب میں مرنے والا ہوں۔ میرے اردگرد گدھوں کی طرح میرے رشتہ دار آنکھیں پھاڑے جمع ہیں۔ صبح و شام یہاں مجمع لگتا ہے۔ ہر کوئی دیکھنے کیلئے آتا ہے کہ میں کب آنکھیں بند کروں گا تا کہ انہیں موج اُڑانے کیلئے کروڑوں روپے ملیں۔ مگر نہیں..... میں ان کتوں کے منہ میں چچوڑی ہوئی ہڈی بھی نہیں ڈالوں گا۔ ایک دھیلا بھی نہیں.....''

اس کے لہجے میں بے پناہ نفرت گھلی ہوئی تھی۔ سانسیں ہموار کرنے کے بعد شعلہ بار نظروں سے چھت کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا، ''میں کیسے بھول جاؤں کہ میرے باپ کی میت پر کوئی رونے والا نہیں تھا اور میری ماں کی لاش کو غیر محرم ہاتھ لگے تھے۔ انہیں کس نے کیسے دفن کیا؛ علم نہیں مگر بھولنے والا بھی نہیں۔ میں اُس وقت حوالات کی سلاخوں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ تھانیدار مجھ پر طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ مکر کرتا ہے، فراڈ کرتا ہے۔ اسے اگر ماں باپ کا دکھ ہوتا تو انہیں قتل ہی کیوں کرتا..... آہ! وہ وقت بھولے سے نہیں بھولتا۔ جن لوگوں نے مجھے وہ

دن دکھایا تھا؛ ان کی اولادوں نے بھی وہ دن دیکھ لیا ہے مگر نہیں..... بڑا فرق ہے۔ ان کتوں کی لاشوں پر بین کرنے والے تو موجود تھے ناں۔ وہی اَب میرے خون کے پیاسے ہیں، میری جائیداد کے طلب گار ہیں مگر میں ان کے ہاتھ پھوٹی کوڑی نہیں لگنے دوں گا..... کسی کو بھی نہیں.....''

''تو مجھے ہی کیوں دے رہے ہیں؟'' چندو اس کی مدھم آواز سننے کیلئے کافی قریب آ گئی تھی، ''آپ اپنی دوست میڈم جوزفین کو بھی دے سکتے ہیں۔''

''اسے اس کا حصہ دوں گا مگر تمہیں سب کچھ دوں گا۔ کیوں؟ اس کا جواب اگر تمہیں جوزی نے نہیں دیا تو میں دیتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ تم مجھے تمام جائیداد کے عوض میں اپنی زندگی کی ایک قیمتی رات دو گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ رات میری جھولی میں وارث کی خیرات ڈال دے اور مرنے کے بعد باپ بنا دے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کوئی بات نہیں۔ میں کم سے کم مایوسی کے عالم میں تو موت کو گلے نہیں لگاؤں گا۔''

جوزفین نے یہ بات نہیں کی تھی۔ چندو کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ اس نے پھر تشکیک آمیز نظروں سے اجمل کو دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ کو حرکت دینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا ہاتھ کیسے تھام سکتا تھا؟ کچھ توقف کے بعد بولی، ''اگر میں انکار کر دوں تو؟''

اجمل کا چہرہ مزید بجھ گیا۔ بولا، ''تمہاری مرضی! میں سوائے خاموش ہونے کے کیا کر لوں گا۔''

چندو کٹ کر رہ گئی۔ اپنی بیسری اور بدبختی کو دیکھ کر خود کو دنیا کی غمزدہ لڑکی سمجھتی تھی مگر جب دنیا کا غم دیکھا تو اپنا غم بھول گئی۔ سر جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی پھر سر اُٹھا کر بولی، ''سچ پوچھیں تو مجھے یہ سب کچھ خواب لگ رہا ہے جو کسی بھی جھٹکے پر ٹوٹ جائے گا اور میں دھوکے میں ماری جاؤں گی۔''

''کیا میں تمہیں دھوکہ دے رہا ہوں؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے؛ نہیں بھی..... میں.....'' وہ گڑبڑا کر تھم گئی۔

اجمل کے حلق سے آہ نکلی۔ تڑپ کر کچھ کہنا چاہ مگر کھانسی آ گئی۔ ایسے ہی وقت میں جوزفین کمرے میں داخل ہوئی۔ تیزی سے قریب آئی۔ کمبل میں ہاتھ ڈال کر اُس کی چھاتی سہلانے لگی۔

وہ سنبھل کر بولا، ''جوزی! یہ کہتی ہے کہ میں اسے دھوکہ دوں گا۔ میں! اسے بتاؤ کہ میں نے شیر کی زندگی گزاری ہے۔ خون کیے ہیں، ڈنکے کی چوٹ پر لوگوں کو لوٹا ہے مگر کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ اسے بتاؤ کہ میں نے ہمیشہ سینے میں گولی ماری ہے۔ کبھی پیٹھ پر وار نہیں کیا۔ مرتے ہوئے

کیا دھوکہ دوں گا۔ ہائے جوزی! درد..... جاؤ..... اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ اسے سمجھاؤ۔ مطمئن کرو۔ دل سے مان جائے تو فوری طور پر حق نواز ایڈووکیٹ کے پاس لے جانا۔ وہ دستاویز تیار کیے بیٹھا ہے۔ تم نے اُس کا گھر تو دیکھ رکھا ہے ناں؟''

جوزفین نے اثبات میں سر ہلایا۔ بیڈ سائیڈ میں نصب کال بیل کا بٹن پش کیا۔ نرس کی آمد پر اُسے اجمل کا خصوصی دھیان رکھنے کا حکم دے کر باہر نکل آئی۔ ہسپتال سے نکل کر ملحقہ باربی کیو میں چندو کو لے کر جا بیٹھی۔ سوپ کا آرڈر دے کر چندو سے مخاطب ہوئی، ''ہاں چندو جان! بتاؤ، تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' چندو نے ہچکچاتے ہوئے دل کی بات کی۔

''میں تمہاری کیفیت کو سمجھ رہی ہوں۔ یقین دلاتی ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکہ فراڈ نہیں ہونے دوں گی۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تمہارا مستقبل تاریک کر دوں؟..... میں نے اجمل گیلانی سے سب کچھ طے کر لیا ہے۔ دیکھ بھال لیا ہے۔ مزید ہم وکیل سے دستاویز کی کاپی حاصل کر کے اور کسی وکیل کو دکھا لیں گے تاکہ تمہیں بھی تسلی ہو جائے۔ کیا خیال ہے؟''

اس نے بھاپ اُڑاتے سوپ پر نظریں جمائیں اور سپر ڈال دی، ''اگر آپ میرے ساتھ رہنے اور رہنمائی کی ذمہ داری قبول کریں تو میں یہ رسک لینے پر تیار ہوں۔''

جوزفین نے مسکرا کر اس کے فیصلے کا خیر مقدم کیا اور حق نواز ایڈووکیٹ کے گھر جانے کیلئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

چندو اپنی قوتِ پرواز سے کہیں بلند پرواز کرنے جا رہی تھی اس لیے کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تبھی اس نے میڈم جوزفین کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا اور حق نواز ایڈووکیٹ کو بھی۔ پھر اُس نے کاغذات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیوں کو پہلے جوزفین کے منتخب کردہ وکیل کو دکھایا پھر جوزفین کی معیت میں ایک اجنبی وکیل سے ملی جس نے فیس طے کرنے کے بعد کاغذات کا اچھی طرح جائزہ لیا اور کہا، ''بیٹا! ان کاغذات کی رُو سے اجمل گیلانی نامی شخص نے گیلانی فلور ملز اور ایک تین کنال رقبے پر تعمیر شدہ کوٹھی فروخت کی ہے۔ ابھی یہ دستاویز ادھوری ہے کیونکہ اس میں خریدار کے نام کی جگہ خالی ہے۔ ریونیو آفیسر کی تصدیق اور ریکارڈ مال میں اندراج بھی باقی ہے۔ بالکل ان پیپرز کی طرح یہ بھی اَدھورے پیپرز ہیں جن کی رُو سے اجمل گیلانی کسی سے عقد

کرنے جا رہا ہے اور حق مہر میں اپنی تمام جائیداد تفویض کر رہا ہے۔ یہاں بھی دلہن کے نام اور کوائف والا خانہ خالی ہے۔''

چندو نے اُس سے کرید کرید کر بہت کچھ پوچھا۔ تسلی ہونے پر اُس نے فیس ادا کی اور جائیداد کی اس منتقلی کے عمل میں معاونت چاہی۔ وکیل نے عدیم الفرصتی کی بنا پر معذرت چاہی اور دیوانی مقدمات کے ایک وکیل کا وزٹنگ کارڈ تھما دیا، ''یہ بہت قابل وکیل ہیں۔ فیس معمول سے تھوڑی زیادہ لیتے ہیں مگر اپنے کلائنٹ کا نقصان نہیں ہونے دیتے۔ آپ ان سے ابھی جا کر مل لیں۔''

چیمبر سے نکل کر چندو نے جوزفین کے استفسار پر کہا، ''میڈم! میں چاہتی ہوں کہ اجمل صاحب کے وکیل کے ساتھ ساتھ اس معاملے میں میری طرف سے بھی ایک وکیل شامل ہو۔''

''مگر تم فیس کی مد میں اتنی رقم کیوں ضائع کرنا چاہتی ہو؟'' جوزفین کو اس کی احتیاط پسندی کچھ بُری لگی تھی جو اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔

وہ جوزفین کی ناراضی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سر جھٹک کر بولی، ''رقم کی کوئی بات نہیں میڈم! مجھے تسلی تو ہو جائے گی ناں!''

چندو کے پاس ابھی تک ڈاکٹر منور علی کی دی ہوئی رقم موجود تھی جس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔

❖❖○❖❖

'پیسہ پھینک تماشا دیکھ' کے مصداق حق نواز ایڈووکیٹ اور چندو ماہی کے وکیل ملک امیر محمد ایڈووکیٹ نے مل کر ہفتوں کا کام ایک ہی دن میں مکمل کر دکھایا۔ ہسپتال کے کمرے میں آ کر ریونیو آفیسر اور متعلقہ عملہ نے دستاویزات کو حتمی شکل دی اور ملک امیر محمد ایڈووکیٹ نے چندو ماہی کو علیحدگی میں خوش خبری سنا کر اپنی بقیہ فیس وصول کر لی کہ فلور ملز اور کوٹھی کی قانونی طور پر منتقلی کا عمل مکمل ہو گیا ہے۔

وہ فائل اُٹھائے چلا گیا تو چندو ماہی جوزفین کے پاس آ گئی۔ ہسپتال کے خصوصی کمرے میں ایک محفل برخاست ہو رہی تھی۔ دوسری بساط سجنے والی تھی۔ حق نواز ایڈووکیٹ کا منشی فیملی کورٹ کا نمائندہ لے کر پہنچ چکا تھا۔ فلور ملز اور وسیع و عریض کوٹھی پر مشتمل قیمتی جائیداد جسے ابھی تک چندو ماہی نے دیکھا ہی نہیں تھا، اس کی ملکیت بن چکی تھی اور اب وہ اجمل گیلانی کی ملکیت بننے والی تھی۔ اڈھائی بجے تک وہ کروڑوں پتی بن کر اجمل کی ہو گئی۔ وہ دوسری مرتبہ دلہن بنی

تھی مگر واقعات کا مزاج بتا رہا تھا کہ وہ پہلے کی طرح تشنہ اور ازدواجی آسودگی سے محروم سیج پر براجمان ہوئی تھی۔

جوزفین نے اُسے بیڈ پر پاکمتی کی جانب بٹھا دیا۔ کمرہ خالی ہونے پر چندو کو پیار کرتے ہوئے بولی، ''ہاسٹل کا فکر نہ کرو۔ میں تمہارا سامان محفوظ کرلوں گی اور ایک ماہ کی چھٹی بھی منظور کروالوں گی۔ تم شام کو اپنے مریض سمیت کوٹھی میں شفٹ ہو جاؤ گی۔ میں بھی گاہے بگاہے چکر لگا لیا کروں گی۔ اگر آنے والے دنوں میں کبھی تمہیں نرسنگ کا شوق چرایا تو کلاس جائن کر لینا۔ ویسے تو اَب تمہیں کورس یا ملازمت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ کل تک تمہارے اکاؤنٹ میں اتنی رقم منتقل ہو جائے گی کہ ساری زندگی بیٹھ کر کھاؤ تو ختم نہیں ہوگی۔ کوٹھی میں اجمل کے علاج اور دیکھ بھال کیلئے ڈاکٹر اور نرس کی خدمات میں نے حاصل کر لی ہیں۔ خداوند اس کے حال پر رحم کرے اور یہ تمہیں دو چار دن مزید دیکھنے کیلئے زندہ رہے۔ اب میں چلتی ہوں۔''

وہ چندو کو حیران و سراسیمہ چھوڑ کر چلی گئی۔ اجمل تھک کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کی تیز سانسوں کی آواز کمرے میں چکرا رہی تھی جبکہ چندو کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ زندگی کے عجیب و غریب اور نہ سمجھ میں آنے والے مرحلے سے خالی الذہنی کے عالم میں گزر گئی تھی۔ آگے کیا ہونے والا تھا؛ یہ اس کی دانست سے ماورا تھا۔ وقت ایسی ہی چالیں چلتا ہے۔ ایک خانماں خراب لڑکی کو اس نے غربت کی کوکھ سے نکال کر نرسنگ کورس کیلئے ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ وہاں سے اُٹھا کر ایک دن میں کروڑ پتی بنا دکھایا تھا۔ وقت کے نادیدہ اوراق پر لکھی ہوئی تحریر سے زندگی کے واقعات کھوجنے والا ماموں رضوان نہ جانے کہاں تھا مگر اُس کا کہا لفظ لفظ چندو ماہی کے ذہن میں تھا۔ اس نے غلطی کی تھی؛ درست راستہ اختیار کیا تھا..... یہ تعین بھی وقت نے ہی کرنا تھا اور وقت ابھی خاموش تھا۔

وہ دانستہ طور پر اجمل کے کھنڈر چہرے سے نظریں چرائے گانمن، ناراض تاجاں اور بچھڑی ہوئی بہن کو یاد کر رہی تھی۔ عمر حیات اور ڈاکٹر منور علی سے تصور میں باتیں کر رہی تھی۔ کل تک ان لوگوں کی یاد کے علاوہ اس کے پاس کل تک کچھ نہیں تھا۔ آج بہت کچھ تھا اور بہت کچھ سونپ دینے والا بھیانک موت سے نبرد آزما تھا۔ یہ جنگ کب تک چلنے والی تھی؟ علم نہیں تھا۔

گھنٹہ گزر گیا۔ نرسیں اور ڈاکٹرز اپنے معمول کے مطابق آتے جاتے رہے۔ اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے رسمی انداز میں چندو کو شادی کی مبارک باد بھی دی۔ کرید کر کچھ

پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر وہ لب بستہ رہی۔ ابھی اپنی سمجھ نہیں آ رہی تھی، لوگوں کو کیا سمجھاتی..... ایسے میں خاموشی ہر مسئلے کا بہترین حل تھا۔

شام ڈھلنے لگی۔ بھوک کا احساس ہوا۔ اُٹھ کر کینٹین تلاش کرنا چاہتی تھی مگر اچانک زوردار آواز سے دروازہ کھلا۔ اُس نے دروازہ کھولنے والے کو دیکھا تو ایک دم ٹھٹک گئی۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ہکلائی، ''آ.....آپ.....!''

چند دو ایک نہایت عجیب وضع قطع میں مہین جسم کا آدمی دروازے کی دونوں چوکھٹیں تھامے کھڑا دکھائی دیا جس کی سرمہ بھری آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ہکلائی، ''آ.....آپ کون ہیں؟''

''ماڑے کو جالم جمانہ جانت پَر اپنے ہی باچھا کی چاند مافق دُلھن ہی نہ جانت ہے۔ سالا کیا کیا گجب (غضب) نہیں ہوا ماڑی جان پر.....اڑے اورانی جی! ماڑے کو سالی دُنیا میرو شاہ بولت ہے.....'' اس کی آواز اور اندازِ تخاطب شخصیت کی طرح نہایت مضحکہ خیز تھا جبکہ آواز غیر معمولی طور پر تیکھی تھی۔ وہ پان کھا رہا تھا۔ بکری کی طرح تیز تیز منہ چلاتے ہوئے اجمل کو مخاطب کر کے بولا، ''ماڑے باچھا جی کو کیا ہووت؟ ماڑی عجت (عزت) بچانے کو بول دیوے ناں اپنی ناری کو ماڑے بارے۔ وہ کیا بولت ہیں..... ماڑا تارف شارف.....''

اجمل سو رہا تھا مگر جوکر نما نووارد کی آواز سن کر بیدار ہو گیا۔ بولا، ''میرو شاہ! اِدھر آؤ، میرے قریب۔''

''اڑے واہ اجمل باچھا! تو ماڑے سے چوری چوری اپنے پیڑاں میں قاف کی پری اُتار لیوت ہے اور ماڑے کو جرا (ذرا) خبر نہ ہوت۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولا اور پان چباتا ہوا کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی باسکٹ کی طرف بڑھ گیا۔ چندو دلچسپی سے اُس کی سامری عہد کے جادوگروں کی سی چال اور بہروپیوں جیسے ڈیل ڈول کو دیکھنے لگی۔

وہ اسٹول کھینچ کر اجمل گیلانی کے قریب بیٹھ گیا۔ منہ میں پان کی گلوری کا محلِ وقوع بدلتے ہوئے کبھی اجمل کو تو کبھی چندو کو دیکھتے ہوئے باتیں کرنے لگا۔ چندو مزید حیرت سے دوچار ہوئی جب دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو سے اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چندو کے نام جائیداد کی منتقلی اور شادی کا منصوبہ تیار کرنے والا اصل کردار وہی تھا جو دیکھنے میں نہایت احمق اور گاؤدی نظر آ رہا تھا۔ اس نے دس پندرہ منٹ میں یہ بھی دیکھ لیا کہ اجمل گیلانی کے کاروبار

میں اجمل کی حیثیت محض اداکار کی تھی جبکہ پسِ پردہ ہدایت کار میر وشاہ ہی تھا۔

اجمل گیلانی نے آنکھیں موند لیں۔ میر وشاہ اسٹول سے اُٹھ کر اُس کے مزید پاس آ گیا۔ اپنی متجسس آنکھیں اُس پر مرکوز کرتے ہوئے بولا، ''چندو ماہی! بڑا نام مارت۔ ہیں؟ رانی وِکھے رانی..... ماڑے کو پتہ ہووت کہ ایسی صورت جمانے (زمانہ) پہ راج کرنا مانگت..... پَر جمانہ بڑا جالم (ظالم) ہووے سالا۔ ہجاروں (ہزاروں) مہارانیوں کو ماٹی میں رول دیوت ہے۔ پَر نہیں۔ ماڑے اجمل میاں کی رانی کا راج میر وشاہ سلامت رکھ لیوت ہے۔ کوئی فکر نہیں کرنے کا۔ ایک دم۔ سالی جو جی نے ماڑے کو رام کہانی بول دیوت ہے اس لیے ماڑے سے جرا (ذرا) بھر نہ شرماوت رانی جی!''

زبان سمجھ میں آئے، نہ آئے، آنکھوں اور لفظوں سے پھوٹتی ہوئی صداقت اور خلوص سمجھ میں آ جاتا ہے۔ اس نے ممنون نظروں سے میر وشاہ کو دیکھا۔ دل کی دنیا بدلی تو اس کی مضحکہ خیز صورت اور حلیے کی طرف مطلق دھیان نہیں گیا، بولی، ''آپ اِن کے کیا لگتے ہیں؟''

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا، ''غلام..... ہاتھ باندھ کر جی حجوری (حضوری) کرنے والے ہووے تیرے ہج بینڈ (ہزبنڈ) کے..... بولے؛ ایک ٹانگ پر رات گجارو؛ ہم گجار (گزار) دیوت..... بولے؛ ماڑے کو جان کا نجرانہ (نذرانہ) دیو دو؛ ماڑی ہتھیلی پر جان آ جاوت..... میر و شاہ یار کی غلامی کرے ہے؛ یار کی آنکھ بند ہووت تو یار کی جورو کے آگے ہاتھ باندھ دیوت.....''

چندو کو اجمل کا کمبل ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں اُٹھا کر اجمل کا چہرہ دیکھا۔ کھلی آنکھیں اپنی جانب بلا رہی تھی۔ وہ آہستگی سے اُٹھی اور قریب پہنچ کر مستفسر ہوئی، ''جی!''

''چندو! میر وشاہ میرا خاص آدمی ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں؛ یہ جو کہتا، اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتی جاؤ۔ میرے بعد مرضی کرنا۔'' اس کی نحیف آواز میں التجا کا عنصر غالب تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا، ''جی!''

''یہ مخلص آدمی ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ دھوکہ نہیں دیتا۔ میں چاہوں گا کہ میرے بعد تم اِس پر بھروسہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تم پر آنچ نہیں آنے دے گا۔''

''جی! میں سمجھ چکی ہوں۔'' اس نے کن اکھیوں سے میر وشاہ کو دیکھ کر جواب دیا۔

ایسے میں میر وشاہ اُٹھ کر عقب میں آ گیا، بولا، ''رانی جی! ماڑے بندے نیچے ماڑا انتجار (انتظار) کرت..... اجمل میاں کو کوٹھی پر لے جاویں یا اِدھر ہی رکھ لیویں؟''

چندو یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے اجمل کو دیکھا۔ اجمل بولا، ''ہاں چندو! میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ میں اپنی باقی سانسیں اپنے گھر میں لینا چاہتا ہوں۔ میرو شاہ سے کہو، وہ مجھے کوٹھی لے جائے اور تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

وہ ہسپتال میں خود کو نسبتاً محفوظ خیال کر رہی تھی۔ اَن دیکھے ماحول میں جانے سے گریزاں تھی مگر اجمل کی حکم عدولی اس کے بس میں نہیں تھی اس لیے ناچار مان گئی۔ میرو شاہ اسے ساتھ لیے استقبالیہ کاؤنٹر پر آیا۔ وہاں اس کے دو آدمی موجود تھے۔ ایک نے کمپیوٹرائزڈ واؤچر اُس کے سامنے کیا۔ میرو شاہ سلپ کو دیکھتا رہا پھر چندو کی طرف بڑھا کر بولا، ''سالے کپوٹر (کمپیوٹر) کی لکھت ماڑی سمجھ میں کب آوت ہے رانی جی..... جرا دیکھ کر بل تو بتا دیوت۔''

چندو نے بل دیکھا تو آنکھیں پھیلنے کو آ گئیں۔ اتنے پیسوں میں بیس مریضوں کا علاج کیا جا سکتا تھا۔ اپنی حیرت پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اس نے رقم بتائی۔ میرو شاہ کا اشارہ پا کر اس کے لمبے تڑنگے ساتھی نے پرس نکالا، بل ادا کیا اور میرو شاہ اور چندو کو پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں چل کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ چند منٹوں بعد اجمل کو ہسپتال کی ایمبولینس میں منتقل کر دیا گیا۔ چندو گاڑی سے اُتری اور میرو شاہ کے روکنے کے باوجود ایمبولینس میں آ گئی۔ اس نے اپنے عقب میں ابھرنے والی میرو شاہ کی طنزیہ آواز سن لی تھی، ''سالی! نوٹوں کی خوشبو پر تتلی بن کر آوت اور مردے پر احسان چڑھاوت۔ واہ مولا..... تو بڑا بے نیاج (نیاز) ہووت؛ جرا سمجھ نہ آوت ہے میرو شاہ کو!''

خدا کے کاموں کی سمجھ نہیں آتی۔ وہ جسے چاہے اُسے جھولے پر سوار کر دے۔ پل میں زمین پر، پل میں آسمان پر..... ہواؤں کے دوش پر اُڑا دے، تند و تلخ لہروں کے سپرد کر دے؛ اُس کی مرضی۔ اس کے کاموں کی جس کو سمجھ آتی ہے وہ لب بستگی کی دبیز چادر اوڑھ کر لوگوں سے چھپ جاتا ہے۔

چندو جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے کے انداز میں جدید طرزِ تعمیر کی وسیع و عریض کوٹھی کو دیکھ رہی تھی جس کے فرسٹ فلور پر واقع آراستہ بیڈروم میں اس کا مجازی خدا سو رہا تھا۔ وہ بیڈروم سے کچھ فاصلے پر سرخ ریلنگ تھامے کھڑی گراؤنڈ فلور میں جھانک رہی تھی۔ اس نے ریلنگ کے گول پائپ کو اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ خنکی کے باوجود اس کی ہتھیلیوں نے پسینہ اگلنا شروع

کر دیا تھا۔ وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ خواب نہیں تھا۔

کبھی خواب اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ انسان سچ اور جھوٹ کی تمیز کھو بیٹھے مگر حقیقی منظر بھی اتنی جلد بدلتا نہیں جتنی جلد اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ اس نے گھوم پھر کر فرسٹ فلور کے سبھی کمرے دیکھے۔ بالکونی میں کچھ دیر ٹھہر کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ کو دیکھتی رہی جس کے باہر کئی افراد جمع تھے۔ ان کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوٹھی میں داخل ہونا چاہتے تھے جبکہ باوردی گیٹ کیپر انہیں داخل نہیں ہونے دے رہا تھا۔ ان کا اصرار بڑھا تو گیٹ کیپر اپنے کیبن میں جا گھسا۔ شیشے میں سے چندو کو نظر آ رہا تھا کہ گیٹ کیپر نے انٹر کام پر کسی سے رابطہ کیا تھا۔ کچھ کہا سنا تھا۔ چند لمحوں بعد اُسے میر وشاہ گراؤنڈ فلور کے بڑے چوبی دروازے سے نکل کر گیٹ کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی تیز رفتاری سے عیاں تھا کہ وہ غصے میں تھا۔ نصف راستے مین تھا جب چیخ کر بولا، ''ماڑے کو علم ہووت کہ ان حرام جادوں نے اجمل میاں کو کیوں دیکھنا ہوت۔ ندیدے کہیں کے۔ مار مار کر ان سالوں کی.....''

میر وشاہ نے فرطِ غیظ سے گیٹ پر مجتمع افراد کو اجتماعی گالیوں سے نوازنا شروع کیا تو چندو لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر اجمل گیلانی کی خواب گاہ کے ملحقہ کمرے میں گھس گئی۔ میر وشاہ کے حکم پر اِس کمرے کو ہنگامی بنیادوں پر چندو کیلئے سیٹ کیا گیا تھا۔ وہ بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں جوتوں سمیت لیٹ گئی۔

وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی مگر سوچوں کی یلغار نے ذہن کو شکست دے کر سلا دیا۔ تین بجے کا عمل تھا جب ایک نرس نے اُسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوئی، ''کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟''

نرس نے مؤدبانہ انداز میں کہا، ''میڈم! آپ کو گیلانی صاحب یاد کر رہے ہیں۔''

وہ خمار آلود لہجے میں حیرانی سے بولی، ''اِس وقت؟''

''جی! وہ تھوڑی دیر پہلے جاگے ہیں۔''

وہ نرس کی معیت میں اجمل کے پاس آ گئی۔ اجمل کو جہازی سائز کے بیڈ میں دھنسا دیکھ کر ایک لمحے کو بھول گئی کہ وہ بیمار تھا۔ ہسپتال کے اسپرنگ والے اونچے بیڈ پر لیٹا ہوا صحت مند شخص بھی بیمار معلوم ہوتا ہے۔ اجمل ہلکے نارنجی رنگ کے مخملیں کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے۔ سوجے ہوئے ہاتھوں کا رنگ بھی چہرے کی طرح پیلا تھا۔ آنکھوں کے نیچے والی جلد بھی خاصی ابھر آئی تھی۔ وہ اس کے پہلو میں بیڈ پر ٹک گئی۔ جھکتے

ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگی۔ اجمل کی آنکھوں میں وارفتگی بھری چمک پیدا ہوئی۔ خفیف انداز میں مسکرایا۔ بولا، ''چندو! یہ نرسیں نالیاں نہیں نکالتیں، نارمل انسان کی طرح مجھے ایک گھنٹہ گزارنے کی مہلت نہیں دیتیں..... کہتی ہیں کہ اگر انہوں نے نالیاں نکالیں تو میں دس منٹ میں ہی مر جاؤں گا۔''

وہ صدقِ دل سے بولی، ''نہیں! آپ ان کی بات مان لیں۔ وہ غلط تو نہیں کہتیں ناں۔''

''لیکن میں تمہیں دلہن کے رُوپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ چند منٹوں کیلئے ہی سہی..... پھر بھلے مر جاؤں۔''

چندو نے تڑپ کر اس کے لبوں پر ہاتھ رکھا۔ اجمل کے ہاتھوں کے برعکس اس کے ہونٹ ٹھنڈے تھے۔

بولی، ''میں کل آپ کو دلہن بن کر دکھا دوں گی۔ اَب آپ آرام سے سو جائیں۔''

اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور فوراً ہی مان گیا۔ بولا، ''تم واقعی بہت خوب صورت ہو۔ میں نے آج تک تمہارے جتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔''

وہ دل میں بولی، 'میرے جتنی بدقسمت لڑکی بھی شاید روئے زمین پر نہیں ہوگی۔'

دل رکھنے کو مسکرا کر بولی، ''آپ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔''

اجمل کے لبوں پر آزردگی بھری مسکراہٹ ابھری۔ آنکھوں سے نرس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جانے پر اس نے چندو کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتی ہوئی قریب آئی۔ بے دردی سے لوٹے جانے اور مرضی سے اپنا آپ لٹانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ اِس فرق کو محسوس کرنے لگی۔

اجمل نے کہا، ''چندو! اپنے بال کھول دو۔''

اس نے بال کھول دیے۔

''اِدھر پھیلا بھی دو ناں!''

چندو نے کھلے ہوئے آبشار بال اس کے چہرے پر پھیلا دیے۔ اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس نے بند آنکھ کے پردے پر چمکتا ہوا ستارہ چوم لیا۔ چاند اور ستارے دسترس میں نہیں آتے۔ دور فلک پر خواب بن کر چمکتے رہتے ہیں مگر اس کا ستارہ اس کے لبوں کو توانائیاں سرفراز کر رہا تھا۔ اس کے بوسوں میں چھپی دیوانگی کو اجمل نے بھی محسوس کر

لیا۔ بولا، ''میرے چہرے پر دوسری آنکھ بھی ہے جو حسد کی آگ میں جل رہی ہے۔''

اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دوسری بند آنکھ کو بھی چوم لیا۔ فوراً ہی بوسے کے بے ذائقہ ہونے کا احساس ہو گیا اور محبت کی دیوانگی سے معمور محل کی راہداری میں چندو کی پیش قدمی رُک گئی۔

اجمل بولا، ''کیا تمہیں میری بائیں آنکھ کا تل اچھا لگتا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ زلفیں اجمل کے چہرے پر سرسرا گئیں۔ کیف کا ناشناسا لمحہ اجمل کے پھیپھڑوں میں اُترا۔ عجیب سے لہجے میں بولا، ''لوگ کہتے ہیں کہ شراب، خون اور بارود سے بُو کے بھبکے اُڑتے ہیں۔ میں آج تک کہتا آیا ہوں کہ بدبُو نہیں، یہ تینوں چیزیں خوشبو پھیلاتی ہیں۔ آج سمجھ میں آ رہا ہے کہ لوگ ٹھیک کہتے تھے۔ شاید اصل مہک آج ہی پھیپھڑوں میں اُتری ہے۔ کاش! تم کچھ عرصہ پہلے میری زندگی میں آ جاتیں تو میں ان بدبودار چیزوں کو چھوڑ کر تمہارے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھنے میں رُجھ جاتا۔ بچ جاتا۔ میری زندگی بچ جاتی مگر اب بہت دیر ہو گئی ہے۔''

وہ اُس کی جسمانی حالت کو جانتی تھی اس لیے اُس پر وزن ڈالے بغیر پیار کر رہی تھی۔ جسے بیماری نے بدصورت کر رکھا تھا، اُسے چندو کی پیار بھری آنکھ دنیا کا خوب صورت مرد قرار دے رہی تھی۔ جن حرکتوں سے کل تک گھن آتی تھی، انہی حرکتوں میں عشق کی برکتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اجمل زیادہ نہ بولے مگر وہ بولے چلا جا رہا تھا۔ چندو اُسے دیکھنے سے روک سکتی تھی یا بولنے سے..... تبھی اس نے اپنے بالوں میں اجمل کے چھپے ہوئے گالوں کو سہلاتے ہوئے اُسے دیکھنے کی اجازت دے کر خاموش کرا دیا۔ چند لمحوں کی ریاضت نے آنکھیں نم کر دیں۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں سسکنے لگی۔ دل سے ہوک نکلی، ''کاش! آپ کو میری عمر لگ جائے اور آپ کے حصے کی موت مجھے آ جائے.....''

اجمل نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ ہچکیاں لیتی ہوئی کمرے سے بھاگ کر گیلری میں آئی۔ نرس دروازے کے پاس اسٹول پر بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ پوچھنے لگی، ''خیر تو ہے میڈم؟''

وہ جواب دیے بغیر دوڑتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ بیڈ پر بیٹھ کر دل کھول کر رونے لگی۔ قدرت کے کاموں کی طرح انسانی ذہن کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اس نے اجمل گیلانی کو اِس لیے قبول کیا تھا کہ وہ اُسے چھونے اور چھیڑنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا اور اَب تب میں مرنے

والا تھا۔ جب وہ مجازی خدا بن گیا تو دل یکبارگی اس کی بے چارگی اور کسمپرسی کے دُکھ سے بھر گیا۔ وہ اُسے بے بسی کی موت مرتے ہوئے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ کروڑوں کی جائیداد لے کر افسردہ ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اُس نے یہ ڈیلنگ کر کے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ یہاں آنے سے تو بہتر تھا کہ وہ نرسنگ ہاسٹل میں زرینہ کے ساتھ رہتی اور اپنا کورس مکمل کرتی۔ نرس بن کر اپنی آہستہ روزندگی گزارتی رہتی۔ وہ ایک ہی جست میں امیر تو ہو گئی تھی مگر اس کا دل اجمل کی متوقع موت کے خیال سے بنجر ہونے لگا تھا۔

وہ اتنی غمزدہ اور نڈھال تب بھی نہیں ہوئی تھی جب اُس پر میرزادے عمر حیات نے ہاتھ اُٹھایا، جب اس کی ذات پر پیرو ماچھی کا خبثِ دروں کلنک بن کر چپکا، جب گانمن کی ٹانگ کٹی، جب بابا گانمن نے اُسے گھر سے نکالا، جب فائزہ نے اُس پر تہمت لگائی، جب عمر حیات نے اُس کی عزت کا دامن تار تار کیا اور پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے بھیانک موت کو گلے لگایا، جب ملک افراسیاب کے غنڈوں نے اُس پر حیطۂ حیات تنگ کیا، جب وہ کھلونا بن کر بھیڑیوں کے ہاتھوں پامال ہوتی رہی اور جب ڈاکٹر منور علی نے اُسے ہسپتال کے لان میں ہمیشہ کیلئے الوداع کہا..... ہر دُکھ اپنی جگہ بہت بڑا تھا مگر وہ جیسے تیسے جھیلتی گئی تھی مگر یہ دکھ اتنے شدید انداز میں دماغ پر حملہ آور ہوا تھا کہ وہ بلبلا اُٹھی۔ سوئے آسماں منہ کر کے اونچی آواز میں رونے لگی۔

رانیں پیٹتے پیٹتے، کمزور انداز میں چیختے چیختے نڈھال ہو گئی۔ اُسے احساس تک نہیں ہوا تھا کہ اس کے دروازے پر میر وشاہ، ہسپتال کا بل ادا کرنے والا لمبا تڑنگا شخص اور نرس حیرت سے بھری آنکھوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ میر وشاہ نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا کر باقی لوگوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ وہ انہیں کہہ رہا تھا کہ چند وشدید ذہنی دباؤ میں ہے۔ چیخ و پکار کر رہی ہے؛ اچھا ہے؛ اِس طرح دل کا غبار نکل جائے گا اور تھوڑی ہی دیر میں نارمل ہو جائے گی۔

انسان کے دل کی دنیا بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ بھی بدل گئی۔ نہ صرف اس کی پھٹی پھٹی چیخیں تھم گئیں بلکہ آنکھیں بھی ایک دم خشک ہو گئیں۔ دل پتھرا سا گیا۔ سر جھکائے باتھ روم میں گھس گئی۔ وضو کر کے برہنہ پا قالین پر چلتی ہوئی کھڑکی تک آئی۔ یک بارگی دو طاق کھول دیے۔ باہر سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہوا کے دوش پر فجر کی اذان کی روح پرور آواز سفر کرتی ہوئی کمرے میں اُتر آئی۔ اس نے دیوار کی طرف منہ کیا، ہاتھ اُٹھائے اور بلند آواز میں کہا، ''اللہ اکبر!''

اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ اعتراف دل سے کیا جائے تو دنیا کی ہر شئے چھوٹی نظر آنے لگتی

ہے۔ ظالم کا ظلم اور اپنا دکھ تک بونے لگتے ہیں۔ اُس کی زبان سے ادا ہونے والے ''اللہ اکبر'' کے لفظوں کا مخرج دل تھا، تبھی ایک دم پوری دنیا سمٹ سی گئی۔ پستہ قامت ہوگئی۔ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا تو تینوں افراد کو صوفے پر براجمان دیکھا۔ وہ حیرت سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

وہ سنجیدگی سے بولی، ''میر وشاہ! مجھے اجمل صاحب کی زندگی چاہیے..... کسی بھی قیمت پر..... کسی بھی طریقے سے..... تم بتاؤ، تم کیا کر سکتے ہو؟''

وہ 'آپ' سے 'تم' پر آ گئی تھی۔ لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا۔ سانپ نے پھنکارنا اُز خود سیکھ لیا تھا۔

میر وشاہ چونک گیا۔ کھڑا ہوا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''میر وشاہ رانی جی کا ہر حکم بجا لاوے ہَر.....''

چندو کا لہجہ تھوڑا اور رُوکھا ہو گیا، ''پَر وَر کچھ نہیں۔ کیا اجمل صاحب کا علاج ملک سے باہر نہیں ہو سکتا؟''

میر وشاہ نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

نرس نے کہا، ''میڈم! گیلانی صاحب کے گردے بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اگر دو یا کم سے کم ایک ہی گردہ مل جائے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ زندہ رہیں گے وگرنہ نہیں۔ ملک کے اندر یا باہر، صورتِ حال ایک سی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میر وشاہ! میرا حکم بجالاؤ اور اپنے اجمل میاں کیلئے دو گردوں والا وجود اُٹھالاؤ۔''

میر وشاہ نے مدد طلب نظروں سے نرس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی، ''میڈم! یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ گردوں کی تبدیلی ہر ہسپتال میں ممکن نہیں ہے۔ کچھ ڈاکٹر یہ کام بڑی رازداری سے کرتے ہیں مگر وہ بہت پیسہ لیتے ہیں۔''

چندو نے دل پر ہاتھ رکھا۔ لمبی سانس لی اور کہا، ''کتنا پیسہ؟''

نرس نے اپنا اندازہ بتایا۔

رقم خاصی بڑی تھی۔ چندو نے اپنی موجودہ حیثیت پر غائبانہ نظر ڈالی۔ پھر بولی، ''یہ تو کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ کیا تم کسی ایسے ڈاکٹر کو جانتی ہو جو یہ کام کرتا ہے؟''

وہ گھبرا کر بولی، ''نہیں میڈم! مجھے علم نہیں ہے۔''

میر وشاہ پلٹا۔ دونوں کو کمرے سے باہر بھیج کر تیزی سے چندو کے قریب آیا۔ بولا، ''ماڑی

رانی جی! کیا غجب کرت ہو؟ بھلا ایسی باتیں کھلے میں کرنا دانش مندی کہلاوت؟''

وہ بولی، ''میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اجمل صاحب زندہ اور تندرست چاہئیں۔ تم کچھ کر سکتے ہو تو ٹھیک ورنہ میں خود کوئی راستہ نکالتی ہوں۔''

میر وشاہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا، ''ٹھاں ٹھاں کرنا آوت؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں مگر سیکھ لوں گی۔''

''آگ سے کھیلن مانگے ہے رانی جی؟''

''اجمل صاحب کیلئے آگ پھانکنے کو تیار ہوں۔''

''ماڑے کھیل میں نہ اباؤٹ ٹرن ہووے نہ یوٹرن رانی جی! سوچ سمجھ کے فیصلہ کر لیوے..... پھر میر وشاہ ساتھ دیوت ہے۔''

چندو ماہی کی آنکھوں میں ایک وحشت سی رقصاں ہوئی۔ چند لمحے سوچتی رہی پھر بولی، ''میر وشاہ! میں نادان نہیں ہوں۔ میڈم جوزفین، اجمل صاحب اور تمہاری باتیں سن کر اور کوٹھی کا ماحول دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ یہاں کون سی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ یا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نرسنگ ہاسٹل چلی جاؤں یا اس زندگی کو قبول کرتے ہوئے اپنی جون بدل لوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں واپس نہیں جاؤں گی۔ رہی بات گولی بارود کی؛ اگر تم میرا ساتھ دو تو میں یہ سب کچھ کر گزروں گی۔ ہم اجمل صاحب کو بچا سکتے ہیں اور اگر نہ بچا سکے تو میں اس گروپ کو جو اجمل صاحب نے بنا رکھا ہے، توڑنا نہیں چاہوں گی۔ یہ پہلے کی طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔ اگر یہ ٹوٹ گیا تو اجمل صاحب کے بھوکے ندیدے رشتہ دار مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

میر وشاہ نے اس کے اندیشوں کی تائید کی۔

وہ بولی، ''بس پھر ہمت کرو۔ کسی ایسے پرائیویٹ ہسپتال کا سراغ نکالو جو گردوں کے جائز و ناجائز ہر قسم کا آپریشن کرتا ہو۔ گردوں کی دستیابی کیلئے ایک طرف تم کسی کڈنی ایجنٹ سے رابطہ کرو جبکہ دوسری طرف تم اجمل صاحب کے رشتہ داروں میں سے کسی آسان شکار کو اُٹھا لاؤ۔ اب تم یہ بہتر جانتے ہو کہ ہمارے پاس کتنی مختصر مہلت ہے اور کام کتنا بڑا ہے۔ یقیناً ہمارے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں ہے۔''

میر وشاہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے نکلا۔ اجمل کی خواب گاہ میں جھانک کر خوشی بھری بلند آواز میں بولا، ''ماڑے اجمل میاں! مبارکاں ہووت..... ماڑی چندو رانی پھولن دیوی اپنے مجاجی خدا (مجازی خدا) کی جندگی (زندگی) کیلئے بن کر میدان میں کود جاوت۔''

چندو کے کانوں میں اُس کی مہین مگر تیز آواز پڑی۔ اس نے سر جھٹک کر زیرِ لب کہا، ''پھولن دیوی!''

اس کے اندر عجیب سی بے چینی اور درشتی بھر گئی تھی۔ اس کے رویے کو دیکھتے ہوئے میر وشاہ نے اپنے چاروں کارندوں کو ہنگامی طور پر بلا کر چندو کے سامنے پیش کر دیا۔ تعارف کے بعد چندو کی نظریں ایک قوی الجثہ شخص پر جم گئیں۔ وہ دیکھنے میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دیتا تھا۔

میر وشاہ نے چندو ماہی کی دلچسپی کو بھانپتے ہوئے بتایا، ''رانی جی! یہ اپنا اُستاد نصری ہووت..... نصر حیات..... ایک دَم بجلی کے مافق کڑک جاوت اور جالم (ظالم) سے جالم جور آور کی پگچی (گردن) کڑک جاوت ہے۔''

چندو دل ہی دل میں اُس کے ڈیل ڈول سے خوف زدہ ہوئی مگر بظاہر سخت لہجے میں بولی، ''نصر حیات! مجھے اجمل صاحب کیلئے گردہ چاہیے۔''

اس نے سینے پر ہاتھ رکھا، سر کو خفیف انداز میں جھکایا اور کہا، ''میں حکم کی تعمیل کروں گا۔ شام کو دو گردوں والا ایک بندہ کوٹھی پر پہنچا دیا جائے گا۔ اگلا انتظام کر رکھیں۔''

چندو نے میر وشاہ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا، ''اگلا انتظام تم کرو۔ آج رات میں ہی آپریشن ہو جانا چاہیے۔''

میر وشاہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ جو کام اس سے تین ماہ میں نہیں ہو سکا تھا وہ ایک دن میں کس طرح ہو جائے گا۔

اس کے پیچھے کھڑے ہوئے لمبے تڑنگے شخص نے کہا، ''شاہ جی! مولا کا نام لے کر یہاں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم کامیاب لوٹیں گے۔''

چندو نے سن رکھا تھا کہ دولت اور طاقت سے ہر کام پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسے نہ تو اپنی طاقت کا اندازہ تھا اور نہ ہی بینک میں پڑی ہوئی دولت کا؛ اُسے تو بس اجمل کے

آپریشن کا فکر لاحق تھا۔ اس نے اجمل گیلانی کے کرِمنل گینگ کو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے احکامات صادر کیے اور اجمل کے کمرے میں چلی گئی۔

اجمل گیلانی پر ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں تعینات تھیں۔ نرسیں باری باری ڈیوٹی دیتی تھیں جبکہ ڈاکٹر ہر تین گھنٹے کے بعد چکر لگا جاتا تھا۔ اجمل کا بدن سوجنے لگا تھا۔ پہلے صرف پیروں اور ہاتھوں پر سوجن تھی جو بڑھ کر اَب پورے بدن میں پھیلنے لگی تھی۔ نرس نے اُسے یہ بتا کر مزید فکر مند کر دیا کہ اجمل کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگئی تھی۔

تین بجے کے قریب میر وشاہ اور نصر حیات فتح سے دمکتے ہوئے چہروں کے ساتھ چندو کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ میر وشاہ نے پان کی تازہ گلوری منہ میں داب رکھی تھی۔ بولنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے اس نے نصری کو رپورٹ دینے کا اشارہ کیا۔

اُستاد نصری بولا، ''پچھتر ہزار میں ایک گردہ مل گیا ہے۔ پے منٹ کل کرنی ہے۔ ہسپتال کا بندوبست بھی ہوگیا۔ اتنی ہی رقم ہسپتال میں دینا پڑے گی۔ لیں! یہ رہا ہسپتال کا کارڈ۔''

اس نے سینے والی جیب سے ایک کارڈ نکال کر چندو کی طرف بڑھایا اور مزید کہا، ''آپریشن آج رات میں کسی وقت کیا جائے گا مگر اجمل صاحب کو پانچ بجے تک ہسپتال پہنچانا ہوگا کیونکہ آپریشن سے پہلے کچھ ضروری ٹیسٹ لینا ہوتے ہیں۔''

چندو ماہی خوش ہوگئی۔ تمتماتے ماتھے کو سہلاتے ہوئے بولی، ''یہ ہوئی نا بات۔ ہسپتال اگر دور ہے تو ابھی اجمل صاحب کو لے چلتے ہیں۔ قریب ہے تو کچھ دیر بعد یہاں سے نکلیں گے۔''

نصری نے بتایا کہ ہسپتال زیادہ دور نہیں تھا۔ چندو کے ایما پر دونوں اجمل گیلانی کو ہسپتال منتقل کرنے کی تیاری میں مصروف ہوگئے جبکہ چندو اجمل کے پاس آ گئی۔

وہ جاگ رہا تھا۔ اسے سامنے پا کر بولا، ''تم کہاں چلی جاتی ہو؟''

اس نے اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا۔

وہ مایوسی سے بولا، ''نہیں چندو! یہ بے فائدہ تکلیف ہے جو تم اُٹھا رہی ہو۔ اصولی طور پر تمہیں بھی دوسروں کی طرح میرے جلد مرنے کی دعا کرنی چاہیے۔''

چندو نے سر جھکا لیا۔ طنز بُرا لگا تھا۔ بولی، ''نہیں! میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی عمر آپ کے نام کر دیتی اور آپ کے حصے کی موت کو اپنے گلے لگا لیتی مگر خدا اپنی مرضی کرتا ہے۔''

اجمل کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے۔

چندو نے سوالیہ نظروں سے نرس کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی، ''آپ فکر نہ کریں میڈم! میں نے پین کلر دوا دے دی ہے۔ وہ دراصل آپ کا پیریورن بیگ سے ٹکرایا تھا، اس لیے نالی تھوڑی کھنچ گئی تھی۔ آپ تھوڑا اِدھر ہو کر بیٹھ جائیں۔''

چندو جلدی سے اجمل کی طرف کھسک گئی۔

وہ آزردگی سے بولا، ''مجھے زندہ رکھنا چاہتی ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''اور نقصان بھی کیا ہوگا؟'' وہ اجمل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''مرتے ہوئے جو کچھ تمہیں دے چکا ہوں، زندگی کی طرف لوٹتے ہی اُسے تم سے چھیننے کی کوشش کروں گا یا تمہیں یہاں سے باہر جانے ہی نہیں دوں گا۔''

''آپ کی موت ٹل جائے، میں اگر باہر نہ بھی گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

''کیا تم میری بیوی بن کر یہاں رہنا چاہو گی؟'' اجمل کے لہجے میں کھلی بے یقینی رچی ہوئی تھی۔

''اس میں حرج بھی کیا ہے؟''

''میں کوئی اچھا انسان تھوڑا ہوں۔''

''مگر اچھے بن تو سکتے ہیں ناں آپ!''

''نہیں..... مجھے اگر نئی زندگی بھی مل جائے، میں اچھا بننا نہیں چاہوں گا۔'' وہ منہ بنا کر مایوسی سے بولا۔

''کیوں؟'' وہ چونکی۔

اجمل کوئی جواب دینے چلا تھا کہ دو افراد اسٹریچر اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔ اجمل نے حیرانی سے انہیں دیکھا، پھر چندو کو، پھر پوچھا، ''یہ کیا ہے؟''

چندو نے ہسپتال کا نام بتاتے ہوئے کہا، ''آپ کو وہاں منتقل کیا جا رہا ہے تاکہ آج رات آپ کا آپریشن کیا جائے۔''

اجمل نے مزاحمت کی مگر چندو نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر گراؤنڈ فلور تک لانے کے بعد پارکنگ میں کھڑی ایمبولینس میں ڈال دیا گیا۔ اُستاد نصر حیات چندو کے ساتھ تھا جبکہ میر و شاہ ایمبولینس میں اجمل کے پاس بیٹھ گیا۔ چندو کی گاڑی ایمبولینس کے پیچھے پارکنگ سے نکلی۔ اُسے اطمینان تھا کہ سب کچھ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر جلد اور ٹھیک انداز میں ہو رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اجمل گیلانی آپریشن کے بعد تندرست ہو کر کوٹھی لوٹے گا۔ بعد میں کیا ہو گا؟ یہ اُس نے سرِ دست نہیں سوچا تھا۔

قسمت کچھ اور کرنے جا رہی تھی۔ جونہی گیٹ کیپر نے دروازہ کھولا، سفید بونٹ والی نیلی پولیس موبائل وین سڑک سے اُتر کر گیٹ کے عین سامنے آن رکی۔ ایمبولینس کی راہ مسدود ہو گئی اور وہ رُکی تو پچھلی گاڑی کو بھی رکنا پڑا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا نصر حیات اور ایمبولینس کا عقبی دروازہ کھول کر میر و شاہ دونوں ہنگامی طور پر باہر نکلے۔ گیٹ کے سامنے کھڑی پولیس وین کو دیکھ کر گیٹ کی طرف دوڑے۔ چندو نے ان کی تقلید کی۔ ان کے گیٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی پولیس موبائل سے کم و بیش چھ اہلکار برآمد ہو چکے تھے۔ ایک سپاہی نے گیٹ کیپر پر گن تان رکھی تھی جبکہ بلند قامت وردی پوش عین گیٹ کے درمیان کھڑا ہو کر چندو اور میر و شاہ کو گہری نظروں گھور رہا تھا۔

میر و شاہ نے قریب پہنچ کر کہا، ''اڑے بدرو باچھا! یہ کیا کرت ہے ماڑے ساتھ..... دیکھت ہے کہ ماڑا اجمل باچھا جندگی (زندگی) اور موت کی کشمکش میں پڑا ہووت اور ماڑے کو جلد ہسپتال پہنچنا ہووت..... یہ جالم قانون کی گڈی تو پاسے ہٹا چھوڑت!''

وہ انسپکٹر تھا۔ چندو کو بعد میں معلوم ہوا تھا کہ اس کا نام غلام عباس تھا۔ چونکہ اس کی ذات بدرو تھی، اس لیے شہر بھر میں عباس بدرو کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے اپنے ہولسٹر سے پستول کھینچا اور انگلی پر گھماتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا، ''میر و شاہ! تمہارا سائیں بڑا ڈھیٹ جان ہے۔ تین ماہ ہو گئے اسے مرتے مرتے پر ابھی تک مرا نہیں۔ شیطان بھی بھلا مرتا ہے کیا؟..... میں زندگی اور موت کے پنگھوڑے کو روکنے یا تمہیں پکڑنے نہیں آیا، میں تو ایک قاتل بلکہ خوف ناک قاتلہ کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔''

میر و شاہ بھونچکا رہ گیا۔ بولا، ''اڑے باچھا! یہ کیا بولت..... ماڑے پاس قانون کا مجرم کا ہے کو ہووت؟ بول تو سہی؛ کون جالم قاتلہ ہے ماڑے درمیان؟''

انسپکٹر بدرو نے کڑی نظروں سے چندو کو دیکھا اور کہا، ''ہتھیار سے نہیں، آنکھوں سے قتل کرنے والا قاتل..... اوئے جیرے بلیڈ! ذرا میڈم کو ادھر لاؤ۔ اپنی مجرم کی پہچان کر لیں۔ اس نے مجرمہ کا جو ہوش ربا حلیہ بیان کیا تھا، وہ تو اِسی عورت پر پورا بیٹھتا ہے۔''

چندو کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس کا دھیان فوری طور پر مظہر علی عرف مدرے پر گیا جس کے ہاتھوں اس کی بوڑھی ماں قتل ہوئی تھی اور وہ خود چندو کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترا تھا۔ چندو نے اپنی زندگی میں اس حرامی مدرے کے علاوہ کسی انسان کو قتل نہیں کیا تھا۔ سوچ میں پڑ گئی کہ اتنے سال گزرنے کے بعد پولیس کو کیسے پتہ چل گیا کہ وہ مظہر علی کی قاتلہ تھی۔

ایسے ہی وقت میں غیر معمولی گھنی مونچھوں والے ایک سپاہی کے ساتھ آنے والی عورت پر چندو کی نگاہ پڑی۔ اس نے بہت قیمتی اور جدید فیشن کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں چلتی ہوئی قریب آئی۔ اچانک چندو کی گردن پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ میک اَپ کی تہوں میں چھپے ہوئے خال وخد سے پہلی نظر کی اجنبیت دور ہوگئی اور یوں لگا جیسے اس نے اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا تھا۔ کہاں؟ یاد نہیں آیا۔ سوچ میں پڑ گئی۔

ایسے میں انسپکٹر بدرو نے اپنے بڑے سے ریوالور کی نال کا رُخ چندو کی طرف کیا اور پوچھا، ''میڈم! اسے غور سے دیکھیں اور پہچانیں۔ کیا اس نے ہی آپ کے بھائی کو قتل کیا تھا؟''

وہ اپنے انداز واطوار اور وضع قطع سے بہت امیر عورت دکھائی دے رہی تھی۔ چند لمحے انسپکٹر کے قریب رُکی پھر اعتماد بھری چال چلتی ہوئی چندو کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور چہرہ وفورِ غیظ سے تمتما رہا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک خاموش کھڑی چندو کو گھورتی رہی پھر بولی، ''چندو!''

چندو بے ساختہ بولی، ''جی! آپ کون ہیں؟''

مگر اُس کے بتانے سے پہلے ہی چندو کی آنکھیں مارے حیرت سے پھٹنے کو آ گئیں۔ وہ اسے پہچان چکی تھی۔ وہ میرزادے عمر حیات کی بڑی بہن صفیہ تھی۔ جن دنوں وہ حویلی میں رہا کرتی تھی، صفیہ ملتان میں پڑھا کرتی تھی۔ وہ پہلے سے فربہ ہوگئی تھی۔ میک اپ نے اُس کی رنگت میں بھی واضح فرق حائل کر دیا تھا۔

چندو کے منہ سے پھٹی پھٹی آواز نکلی، ''باجی صفیہ..... آپ! اوہ میرے خدا! آپ کتنی بدل

گئی ہیں۔''

وہ ایک لمحے کو بھول گئی کہ صفیہ اس سے ملنے کیلئے نہیں آئی تھی بلکہ اُسے گرفتار کرانے کیلئے پولیس کی بارات ساتھ لائی تھی۔ مگر جونہی اس نے صفیہ کے ہونٹ نفرت سے بھنچتے ہوئے دیکھے تو ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی، ''مگر میں نے تو میرزادے کو قتل نہیں کیا تھا۔ یہ آپ پولیس کو لے کر یہاں کیوں آئی ہیں؟ اُسے تو ملک افراسیاب نے گولی ماری تھی۔ میرے سامنے.....''

انسپکٹر بدرو کا زوردار قہقہہ فضا میں گونجا۔ اس نے مخصوص انداز میں اپنا دایاں ہاتھ لہرایا۔ دو سپاہی برقی مستعدی سے چندو کے دونوں اطراف آئے اور اس کے کچھ سمجھنے یا بولنے سے پیشتر ہی اس کی کلائیوں میں قانون کا زیور پہنانے لگے۔ میروشاہ اور نصر حیات حائل ہو گئے۔ انسپکٹر بدرو سے پہلے نرم لہجے میں پھر اونچا اونچا بولنے لگے مگر وہ کسی کی سننے اور ماننے پر تیار نہیں تھا۔

چندو نے سنا، وہ کہہ رہا تھا، ''میروشاہ! مجھے اجمل سے یا تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ تم جانتے ہو کہ میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ تعاون کیا۔ اب بھی ایسا ہی کرتا مگر اب میرے بس میں کچھ نہیں رہا۔ یہ تھانہ شجاع آباد کا کیس ہے۔ اس خاتون کا بھائی کافی عرصہ پہلے قتل ہوا تھا اور چندو ماہی نامی لڑکی کو ایف آئی آر میں نامزد کیا گیا تھا۔ بہت تلاش بسیار کے باوجود یہ قاتلہ ہاتھ نہیں آئی تھی۔ پچھلے دنوں میڈم صفیہ اپنی کسی کلاس فیلو سے ملنے کیلئے کسی پرائیویٹ ہسپتال میں گئیں۔ وہاں انہوں نے اپنے بھائی کی قاتلہ کو دیکھ کر پہچان لیا۔ پولیس لے کر ہسپتال پہنچی تو پتہ چلا کہ مذکورہ لڑکی اپنے مریض شوہر کو لے کر گھر چلی گئی ہے۔ میڈم صفیہ نے اپنی سہیلی کی اعانت اور ہسپتال کے ریکارڈ سے اس کوٹھی کا پتہ معلوم کر لیا۔''

میروشاہ نے کہا، ''تو یوں بولت ناں بدرو باچھا کہ کیس شجاع آباد کا ہووت اور تھانہ حرم گیٹ کا باچھا سلامت ہم پر چڑھ دوڑت..... نا بابا! ماڑے کو جرا (ذرا) تنگ نہ کرت اور راستہ ایک دم چھوڑ دیوت۔ ماڑی رانی تیرے تھانے کی مجرم نہ ہووت ہے..... اے میڈم! جا ناں..... اپنا تھانیدار باچھا ساتھ لاوت اور ماڑی رانی کو لے جاوت.....''

صفیہ نے غصے میں سڑک پر تھوک دیا۔

انسپکٹر بدرو استہزائیہ انداز میں ہنسا، ''اوئے جاپرے؛ چحے تھی وَنج مویا..... تجھے بتا رہا ہوں کہ میڈم صفیہ کے پیچھے کوئی بہت بڑا افسر بول رہا ہے کیونکہ مجھے اوپر سے حکم آیا ہے کہ میں میڈم کی مجرم کو فوری طور پر اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچا دوں۔ شجاع آباد کی پولیس آج ہی

اسے لینے کیلئے پہنچ رہی ہے۔''

چند و خاصی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ کچھ دیر سنبھلنے میں لگی۔ ایسے میں اجمل گیلانی کا خیال آیا۔ قدم بڑھا کر میر و شاہ کے عقب میں آئی۔ متوجہ کر کے بولی، ''ان سے بحث مت کرو اور فی الحال میرا فکر چھوڑ کر اجمل صاحب کو ہسپتال لے جاؤ۔ تم دونوں میں سے ایک آدمی وہاں رہے جبکہ دوسرا مجھے چھڑانے کی کوشش کرے۔ دیر نہ کرو ورنہ نقصان ہو جائے گا۔''

میر و شاہ کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی۔ اس نے نصر حیات کو حکم دیا کہ وہ اجمل صاحب کو لے کر ہسپتال کا رُخ کرے۔ انسپکٹر بدرو نے اپنے ڈرائیور کو راستہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ وین ریورس ہوگئی اور راستہ کھل گیا۔ ایمبولینس گیٹ تک آئی۔ ایسے ہی وقت میں زوردار آواز سے ٹائر چرچرائے اور مخالف سمت سے پولیس کی ایک موبائل وین ایمبولینس کے سامنے آن رکی۔ یہ تھانہ چہلیک کی موبائل وین تھی۔ اس کے عقب میں ایک کھلی چھت والا ہائی لکس ڈالا بھی آن رکا جس میں کم و بیش دس بارہ افراد کھڑے احتجاجی انداز میں ہاتھ لہرا رہے تھے۔

چند و اور میر و شاہ کے ساتھ ساتھ انسپکٹر بدرو نے حیرانی سے اس نئی کارگزاری کو دیکھا۔ ایک سب انسپکٹر موبائل وین سے نکل کر تیز قدموں چلتا ہوا گیٹ میں آیا۔ باری باری سبھی افراد کو کریدتی نظروں سے گھورنے کے بعد انسپکٹر بدرو سے مخاطب ہوا، ''سر! آپ یہاں؟ خیریت تو ہے؟''

انسپکٹر بدرو نے مختصراً اپنی یہاں موجودگی کا سبب بتایا اور اس کی آمد کی غرض و غائت دریافت کی۔

وہ بولا، ''سر! اٹھائیس آدمیوں نے ایف آئی آر درج کرائی ہے کہ ان کے قریبی عزیز اجمل گیلانی کو امیر حسین شاہ عرف میر و شاہ، نصر حیات عرف نصری، ایماندار علی عرف مانا اور ایک نامعلوم خاتون نے اغوا کے بعد حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ کروڑوں کی جائیداد ہتھیانے کیلئے۔ کورٹ نے اجمل گیلانی کی برآمدگی اور ملزموں کو گرفتار کر کے عدالت حاضر کرنے کا حکم دیا ہے اور بیلف بھیجا ہے جس کے پاس تحریری احکامات موجود ہیں۔''

میر و شاہ فوراً ہی معاملے کی سنگینی کو بھانپ گیا۔ سمجھانے لگا کہ انہوں نے اجمل گیلانی کو حبس بے جا میں نہیں رکھا بلکہ اس کے علاج کیلئے تگ و دو کر رہے ہیں۔ چونکہ انہوں نے ڈاکٹرز کی ہدایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اجمل گیلانی کے رشتہ داروں کو اس سے ملنے نہیں دیا تھا، اس لیے وہ تھانے کچہری کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ میر و شاہ درست کہہ رہا تھا مگر یہ زبانی کلامی

باتیں تھیں۔ قانون اور عدالت ان جذباتی مکالموں کو اہمیت نہیں دیا کرتی۔ سب انسپکٹر عدالت اور تھانے کے حکم کا پابند تھا۔ اس نے سبھی افراد کو اجمل گیلانی سمیت اپنی تحویل میں لیا اور چشم زدن میں اپنی وین میں بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔

انسپکٹر بدرو نے چندو ماہی کی ہتھکڑیاں تھامنے والے اہلکاروں کو وین میں بیٹھنے کا حکم دیا اور چندو کو دلچسپی آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا وین کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔

چندو کا دل اندیشوں اور خوف سے بھر گیا۔ اس کے جذبات پر سرمنڈاتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ موبائل وین کے عقبی حصے میں دو وردی پوشوں کے درمیان پھنسی بیٹھی تھی جبکہ میر زادی صفیہ وین کے پیچھے آنے والی سوزوکی کار کی عقبی نشست پر براجمان تھی۔ چندو اسے دیکھ نہیں سکتی تھی مگر دل ہی دل میں اس کی نفرت بھری آنکھوں سے دہشت زدہ ہو رہی تھی۔ وہ جن دنوں میر زادے عمر حیات کی حویلی میں مقیم تھی، صفیہ کا رویہ اس کے ساتھ تب بھی معاندانہ ہوا کرتا تھا۔ اب جبکہ وہ چندو کو اپنے اکلوتے اور جواں سال بھائی کا قاتل گردان رہی تھی، اس سے خیر کی توقع عبث تھی۔

چندو نے سپاہیوں کی غیر اخلاقی چھیڑ چھاڑ اور معنی خیز گفتگو سے بمشکل توجہ ہٹاتے ہوئے عمر حیات کے قتل اور اپنی پوزیشن کے بارے میں سوچا تو خوف دوچند ہو گیا۔ جن حالات میں عمر حیات کو ملک افراسیاب نے گولی ماری تھی، وہ حالات سنگین انداز میں چندو کو ہی اس قتل کا مرتکب قرار دیتے تھے۔ اس نے آج تک یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ میر زادے عمر حیات کی ماں اور بہنیں حتیٰ کہ وسیب کے لوگ اسے ہی میر زادے کا قاتل قرار دیتے ہوں گے کیونکہ علاقے کا کوئی شخص نہ تو ملک افراسیاب کو جانتا تھا اور نہ کسی نے اس کے ہاتھوں میر زادے کو مرتے دیکھا تھا اس لیے ہر نظر میں چندو ہی اپنے دیوانے عاشق کی قاتل تھی۔ چونکہ اس کا رابطہ مکمل طور پر اپنے ماضی سے کٹ گیا تھا، اس لیے اسے اپنے پیچھے ہونے والی کارروائیوں کی مطلق خبر نہیں ہوئی تھی۔ اسی بے خبری نے مروا دیا تھا۔

اُس نے زندگی میں تھانے کی اندرونی دنیا نہیں دیکھی تھی اس لیے تھانے کے نام سے ہی ڈرتی تھی۔ آج یہ ڈر بھی اُترنے والا تھا۔ اسے زنانہ حوالات میں ڈال دیا گیا۔ قسمت نے ایک مرتبہ پھر آسمان سے زمین پر کھینچ اُتارا تھا۔

میر زادی صفیہ سلاخیں تھام کر کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی، ''کم ذات نکلی

ناں.....تو میرے جوان جہان دیر کا خون کر کے بھاگ گئی اور سمجھا کہ کبھی ہمارے ہاتھ نہیں لگے گی۔ دیکھ لیا۔ ناحق خون چھپا نہیں رہتا۔ تجھے پھانسی کے پھٹے نہ چڑھایا تو میرا نام صفیہ نہیں.....میں میر ظفر حیات کی بیٹی اور عمر حیات کی بہن نہیں اگر تجھے سکا سکا کر نہ مارا۔''

وہ منت آمیز لہجے میں بولی، ''باجی! میں میرزادے کو کس طرح قتل کر سکتی تھی؟ حیران ہوں کہ آپ لوگوں نے یہ سوچ کیسے لیا۔ نہیں باجی نہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ملک افراسیاب نے اُسے گولی ماری تھی۔ وہی مردود مجھے اغوا کر کے اپنے اڈے پر لے گیا اور اس کے غنڈوں نے مجھے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا۔ خدا کیلئے میرا یقین کرو۔''

وہ سلاخوں سے ہاتھ نکال کر صفیہ کے ہاتھ پکڑنا چاہتی تھی مگر اس نے شدید نفرت کا اظہار کرتے ہوئے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ ہکا بکا کھڑی رہی۔ صفیہ پیر پٹختی ہوئی انسپکٹر کے آفس کی طرف بڑھ گئی تو اس نے بے جان انداز میں اپنا چہرہ صاف کیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ سمجھ میں آتا تھا کہ عمر حیات کی بہنوں اور ماں نے اتنا بڑا سانحہ دل پر جھیلا تھا کہ وہ کسی طرح بھی اس کی بات پر یقین نہیں کریں گی اور ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے اسے تختۂ دار تک لے جائیں گی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے تھانے کے بعد عدالت میں پیش کیا جائے گا اور پھر جیل بھیج دیا جائے گا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس ابتدائی مرحلے میں اس کے ساتھ تفتیش کے نام پر کیا کیا جانے والا تھا۔

سہ پہر کو اس کیلئے کھانے پینے کا سامان لے کر میر وشاہ کا ایک کارندہ تھانے پہنچ گیا۔ انسپکٹر بدرو آرام کرنے کی غرض سے اپنے مکان پر گیا ہوا تھا۔ کارندے نے میر وشاہ کے بارے میں بتایا کہ وہ بھی حوالات میں بند ہے۔ اس نے چندو کو بے فکر رہنے کا پیغام بھیجا تھا اور کہا تھا کہ وہ اگلے دن عدالت میں پیش ہو کر رہا ہو جائے گا اور چندو کو رہا کروانے کی کوشش کرے گا۔ کارندے نے اپنی جانب سے بھی چندو کو تسلی دی اور انسپکٹر کے پیچھے مکان پر چلا گیا۔ اُس کی واپسی میں دیر ہو گئی۔ شام ڈھل گئی۔

چندو کی مایوسی میں اضافہ ہو گیا۔ لالچ میں آ کر نرسنگ ہاسٹل سے نکلنے پر پچھتانے لگی۔ اگر وہ اجمل گیلانی والے قصے کا حصہ نہ بنتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ آدمی برے وقت میں ایسی ہی تاویلیں سوچنے لگتا ہے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ قسمت کا وار ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۔ وہ کسی اور انداز میں صفیہ کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ صفیہ کے علاوہ بھی کئی لوگ اسے اپنے معمول میں

مصروف رہ کر کھوجتے پھرتے تھے۔ وہ ہزاروں میں منفرد تھی۔ دور سے دکھائی دینے پر ہی پہچانی جاتی تھی۔ اگر وہ نقاب اوڑھنے کی عادت اپنا لیتی تو شاید زیادہ عرصہ تک چھپی رہ جاتی مگر اب سوائے پچھتانے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

اسے اُستاد نصری اور میر وشاہ سے توقعات وابستہ تھیں مگر وہ دونوں بھی پابندِ سلاسل تھے۔ وہ رہا ہونے کے بعد ہی اس کیلئے کچھ کر سکتے تھے۔ نہ جانے اجمل گیلانی کے ساتھ کیا گزری تھی؟ یہ پریشانی اپنی جگہ دل ہولا رہی تھی۔ آپریشن میں ہونے والی غیر معمولی تاخیر کے سبب اس کی زندگی کی موہوم اُمید دم توڑنے لگی تھی۔

تھانے کی حدود میں چلتے پھرتے وردی پوشوں اور حوالات کے سامنے کھڑے سنتریوں کی ہوس بھری نگاہوں سے وہ بری طرح نروس تھی۔ رات آٹھ بجے تک اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ ایسے ہی وقت میں اسے انسپکٹر بدرو دکھائی دیا۔ وہ سفید کلف دار لٹھے میں ملبوس شاہانہ چال چلتا ہوا اس کے سامنے سے گزر کر آفس کی طرف بڑھ گیا۔ ایک اجنبی شخص اس سے چپکا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ انسپکٹر اسے گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔ چند لمحوں بعد تھانے کے خاموش ماحول میں ہلچل کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر سلاخوں سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ جھانک کر ہلچل کے سبب کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پتہ چلا کہ انسپکٹر کے حکم پر اہلکاروں نے تھانیدار کے ساتھ آنے والے شخص کو پکڑ کر مردانہ حوالات میں ڈال دیا تھا۔

گھنٹہ بھر کے بعد انسپکٹر بدرو اسے سلاخوں کے پار دکھائی دیا۔ نوکیلی مونچھوں والا ایک سیاہ فام وردی پوش اس کے ساتھ تھا۔ انسپکٹر بدرو نے چندو کی طرف اشارہ کیا۔ کہا، ''یہ رہی تمہاری مجرم..... مسماۃ چندو ماہی!'' اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ ناچنے لگی۔ ایک ذرا توقف کے بعد بولا، ''یہ دیکھنے میں نرم و نازک ہے مگر بہت ڈھیٹ جان ہے۔ اس سے اقبالی بیان لینے پر خاصی محنت کرنا پڑے گی۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں کہا ہے کہ بجائے تفتیشی آفیسر کے، ہم خود اس کی تفتیش کر لیں۔ ادھر مکان پر لے جا کر۔ وہاں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہوگا۔ مان گئی تو ٹھیک؛ ورنہ تم اُدھر شجاع آباد لے جا کر اپنے طریقے سے اس سے اعترافِ جرم کروا لینا۔''

سیاہ فام اہلکار جو یقیناً انسپکٹر بدرو کا ہم منصب تھا، کی تمام تر خباثت چہرے پر ہویدا ہوئی، مسکرایا اور ایک آنکھ میچ کر بولا، ''یار بدرو! تم بڑے اُستاد آدمی ہو۔ ٹھیک ہے بھئی۔ جہاں کہتے ہو، وہیں لے چلتے ہیں۔ مکان پر کوئی دوا دارُو بھی رکھا ہے یا نہیں؟''

چندو کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ وہ دونوں کے درمیان ہونے والی معنی خیز گفتگو سن کر کانپنے لگی۔ کافی عرصہ یارن خان اور میاں دلبر حسین جیسے خونیں شکاریوں کے پنجوں میں رہنے کی وجہ سے ان مکالموں کی سنگینی کو سمجھتی تھی۔ چیخ کر بولی، ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ تم لوگ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، یہیں پوچھ لو۔ میں کسی مکان وکان پر نہیں جاؤں گی۔''

انسپکٹر عباس بدرو ہنسا۔ سیاہ فام کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مکارانہ انداز میں بولا، ''سوہنیو! ڈر کیوں گئے ہو؟ یہ بڑا بھلے مانس افسر ہے۔ اس سے تعاون کرو گی تو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ چکر دینے کی کوشش کرو گی تو تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر تمہاری سوہنی سوہنی آنکھوں میں ڈال دے گا۔ کیوں بھئی باجوے! میں نے غلط تو نہیں کہا ناں تمہارے بارے میں؟''

باجوے نے مکروہ انداز میں ہنس کر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور کہا، ''ان باتوں کو چھوڑو۔ خود ہی دیکھ لے گی کہ میں کیسا ہوں۔ فوراً نکل پڑو۔ صبح سے پہلے میرا تھانے پہنچنا بے حد ضروری ہے۔ دیر ہوگئی تو میرزادے شہر میں جلوس نکال دیں گے۔''

تقریباً ایک گھنٹے بعد چندو پرانا شجاع آباد روڈ پر واقع ایک مضافاتی بستی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک فارم ہاؤس میں انسپکٹر عباس بدرو اور انسپکٹر خلیل باجوہ کی مشترکہ تفتیش بھگت رہی تھی۔ ان کی اس شیطانی تفتیش میں کوئی سوال شامل نہیں تھا۔ فارم ہاؤس لائے جانے کے دوران چندو نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی چیخ و پکار سننے والا قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے وہی عذاب جھیل رہی تھی جس سے ڈاکٹر منور علی شاہ نے اُسے نکالا تھا اور دل ہی دل میں کوس رہی تھی میڈم جوزفین کے دَم کو جس کی لچھے دار باتوں میں الجھ کر اس نے اپنا پُرامن اور محفوظ مستقبل برباد کر لیا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں اور پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا۔

کمرے میں وال ٹو وال دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ریشمی کور والے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے باہر برآمدے میں ایک سپاہی کرسی میں بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ اسے کمرے کے اندر سے کسی کے بھاگ نکلنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ باہر کے کسی آدمی کی غیر متوقع آمد پر خبردار کرنے پر مامور تھا۔ رات کی سیاہی اور مضافات کے سکوت نے ماحول کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ایسی دبیز راتیں اپنے دامن میں بہت کچھ چھپا لیتی ہیں۔ کمرے کے اندر ہونے والے ظلم پر بھی رات قبائے لاعلمی اوڑھا رہی تھی۔

ولایتی شراب کے نشے میں چور دونوں ہٹے کٹے حرام زادوں کی جان لیوا تفتیش نے اُسے

ڈیڑھ دو گھنٹوں میں ہی توڑ کر رکھ دیا۔ بے جان انداز میں چاروں شانے چت پڑی آر سی سی کی تیار شدہ چھت کو گھور رہی تھی۔ قانون کے طاقتور ہرکارے بھی ہانپتے ہوئے ایک جانب مردہ کتوں کی طرح قالین پر پڑے تھے۔ انسپکٹر عباس بدرو کے ڈراؤنے خرائے اور خلیل باجوے کے منہ سے خارج ہوتی بدبودار رطوبت نے کمرے کی فضا کو بے حد کریہہ بنا رکھا تھا۔ چندو نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں۔ ہتھیلیوں کے بل طوعاً و کرہاً اُٹھی۔ اچانک نظروں میں مظہر علی عرف مذرے کا بدنما چہرہ گھوم گیا۔ وہ چوبی بلنا یاد آ گیا جس کی مدد سے اُس نے مذرے کا سر توڑا تھا۔ وہ اگر اس کے ناتواں ہاتھوں سے مر سکتا تھا تو یہ دونوں بھی خون میں لت پت ہو سکتے تھے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنا بکھرا ہوا وجود سمیٹ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لباس پہنا اور محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ کوئی بلنا یا اس سے ملتا جلتا ہتھیار نظر نہیں آیا تو ایک ذرا مایوسی ہوئی۔ یہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ دیواروں کے ساتھ بڑے بڑے ریشمی گاؤ تکیے پڑے تھے جن کی مدد سے وہ دو سانڈوں کو قتل نہیں کر سکتی تھی۔

اچانک اس کی آنکھوں میں زندگی اور پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ انسپکٹر خلیل باجوہ کی یونیفارم دیوار گیر کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ ایک کھونٹی پر پیٹی اور ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ اس کی نظر ہولسٹر سے جھانکتے ہوئے پستول پر پڑی تھی۔ وہ مردہ کتوں کی طرح آڑے ترچھے پڑے ہوؤں سے بچ کر ہولسٹر تک پہنچی۔ کانپتے ہاتھوں سے پستول نکالا۔ دیکھا۔ کبھی چلایا نہیں تھا۔ اب تک صرف فلموں میں ہیرو اور ولن کو پستول چلاتے دیکھ رکھا تھا۔ ملک افراسیاب کو گولی چلاتے دیکھا تھا۔ ہونٹ بھینچ کر سوچنے لگی، 'چلانے کی کوشش کروں گی تو گولی چل ہی جائے گی۔'

اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا اور بدرو کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ وہ پہلو کے بل پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ چندو نے پستول کی نال کا رُخ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے کی طرف کیا اور دانت کچکچاتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے کی زوردار آواز اور مخصوص جھٹکے نے اُسے ڈرا دیا۔ وہ ڈگمگا کر دیوار سے ٹکرائی۔ پھر تکیے پر گری۔ فوراً ہی سنبھل کر اس نے جب بدرو کی طرف دیکھا تو دل یکبارگی توانا ہو گیا۔ اس کا حملہ کامیاب رہا تھا اور عباس بدرو خون میں لت پت بری طرح تڑپ رہا تھا۔ نرسنگ کی دو سالہ تربیت نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بدرو پر دوسرا فائر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی۔ کھوپڑی کے مخصوص حصے میں لگنے والی ایک گولی ہی کافی تھی جس نے اپنے شکار کو چیخنے کی مہلت تک نہیں دی تھی۔

گولی کی زوردار آواز نے نہ صرف انسپکٹر خلیل باجوے کے کوے جیسے سیاہ بدن میں بیداری بھر دی تھی بلکہ کمرے کا اکلوتا دروازہ بھی مسلسل دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔ سنتری پریشانی کے عالم میں دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ بلند آواز میں 'کیا ہوا صاحب جی؟' کے فلک شگاف نعرے بھی لگا رہا تھا۔

خلیل باجوہ شراب کے نشے اور گہری نیند کے استغراق میں تھا۔ اُسے چند لمحے کمرے کی بدلی ہوئی کیفیت کو سمجھنے کیلئے درکار تھے۔ تبھی اس نے بے ساختہ آنکھیں ملیں اور بدرو کے اوپر نیچے جھٹکے لیتے ہوئے بدن کو غور سے دیکھا۔ اس کی مخمور نگاہیں کچھ نہ سمجھ پائیں مگر جونہی چندو اور چندو کے ہاتھوں میں دبا ہوا اپنا سرکاری پستول نظر آیا؛ اس کا نشہ آنِ واحد میں ہرن ہو گیا اور بجلی کی سی مستعدی سے اُٹھ کر چندو کی طرف بڑھا۔ اس کے ذہن نے فوری طور پر یہ کام نہیں کیا تھا کہ عباس بدرو کی کھوپڑی میں گولی اُتارنے والی اُس کی زندگی کا بھی قلع قمع کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

چندو نے اس کے سینے کا نشانہ لیا۔ گولی چلانا ہی چاہتی تھی کہ طوفانی رفتار سے چندو کی جانب بڑھنے والا انسپکٹر بدرو کے ٹھنڈے ہوتے جسم سے الجھ کر زمین بوس ہو گیا۔ وہ چندو کے نہایت قریب گرا تھا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور اس کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھ کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے بائیں کان سے کوئی انچ بھر اوپر لگی اور کھوپڑی چیرتی ہوئی بیچ میں ہی کہیں پھنس گئی۔ اس کا بھاری بدن دو فٹ کے قریب ہوا میں اچھلا اور بدرو کے بدن کے آخری جھٹکوں کی گود میں گر کر تڑپنے لگا۔ اس کی دونوں بانہیں بڑے خوفناک جھٹکوں کے ساتھ ساتھ لہرا رہی تھیں جبکہ منہ سے کم بلند خراٹوں سے ملتی جلتی آواز برآمد ہو رہی تھی۔

چندو کے ہاتھوں سے پستول چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ بائیں ہاتھ پڑے ہوئے تکیے پر گولیوں کی دونوں خول گرے تھے جن سے بارود کی دھوئیں کے مرغولے اُڑ رہے تھے۔ دونوں اُس کی عزت کا جنازہ کاندھوں پر اُٹھائے قبر کا رُخ کر چکے تھے۔

اس دوران دروازے پر دستک دینے والے ہاتھوں میں ہیجانی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ چندو نے خوفزدگی کے عالم میں لرزتے ہوئے دروازے کو دیکھا اور جلدی سے پستول اُٹھا لیا۔ ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے اور وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ دروازے کے علاوہ کمرے سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ خوف دامن گیر تھا کہ دروازے پر ایک پولیس والا پہرا دے رہ تھا جو اپنے آقاؤں کی لاشیں دیکھتے ہی اُسے گولی مار دے گا۔ ڈرتے ڈرتے دروازے تک آئی۔

اپنی زبوں حال کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اونچی آواز میں بولی، ''کیا بات ہے؟ کیوں دروازہ توڑ رہے ہو؟''

ایک چیختی ہوئی آواز، جس سے برہمی آشکار تھی، سنائی دی، ''دروازہ کھولو۔''

وہ گردن موڑ کر ایک نظر ساکت و جامد پڑے درندوں کو دیکھ کر جلدی سے بولی، ''دروازہ نہیں کھلے گا۔ تم آرام سے بیٹھے رہو۔''

''دروازہ کھولو ورنہ توڑ دوں گا۔'' چندو کے کانوں میں بھاری غراہٹ گونجی۔

وہ سہمی مگر فوراً ہی سنبھل کر بولی، ''ایسی حرکت کرو گے تو تمہارا صاحب تمہاری گردن توڑ دے گا۔ اگر کہتے ہو تو میں اسے جگا دیتی ہوں۔''

چند لمحے خاموشی حائل رہی۔ دروازہ توڑ دینے کی دھمکی دینے والا سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ایک ذرا توقف کے بعد قدرے نرم لہجے میں بولا، ''یہ فائر کس نے کیے ہیں؟''

''تمہارے صاحب نے تکیے کو اشتہاری مجرم سمجھ کر اس میں دو سوراخ کیے ہیں۔ اب پستول ایک طرف پھینک کر اطمینان سے پڑا خراٹے لے رہا ہے۔'' چندو نے چالاکی سے بات بنانے کی کوشش کی، ''دونوں صاحب نشے میں ہیں۔ اگر انہوں نے تمہیں اپنا دشمن سمجھ لیا تو مجھے گلہ نہ دینا۔''

سنتری کی نہ سمجھ میں آنے والی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا مگر شراب پینے والے ساتھیوں کی حرکات سے بخوبی واقف تھا۔ بولا، ''کیا تم دروازہ کھول کر مجھے ایک نظر دیکھنے نہیں دو گی؟''

چندو سمجھ گئی کہ اس کا وار خطا نہیں گیا تھا کیونکہ سنتری کا لہجہ نرم اور مفاہمانہ ہو گیا تھا۔ بولی، ''نہیں..... وہ ایسی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ تم انہیں ایک نظر دیکھو۔''

سنتری جانتا تھا کہ اندر تفتیش کے نام پر کون سا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اس لیے سر ہلاتے ہوئے دروازہ چھوڑ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

چندو دونوں لاشوں سے ذرا فاصلے پر تکیے پر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے انسپکٹر عباس ہدرو کی برہنہ پنڈلی کے پھڑکتے ہوئے ماس کو گھورنے لگی اور دروازے پر موجود پولیس والے کی نظروں سے بچ کر فارم ہاؤس سے نکلنے کے بارے سوچنے لگی۔ دو چار منٹ کی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اُسے ٹھکانے لگائے بغیر وہ نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک

پریشانی یہ بھی تھی کہ فارم ہاؤس کا راستہ بہت سنسان تھا۔ رات گہری تھی۔ وہ راستہ بھول سکتی تھی یا سمت کا تعین کرنے میں غلطی بھی کر سکتی تھی۔ دوسری پریشانی یہ تھی کہ فارم ہاؤس میں کہیں ایک سے زیادہ پولیس والے موجود نہ ہوں۔ ان خدشوں کے باوجود یہاں سے نکلنا بھی ضروری تھا ورنہ اُسے انتقاماً فی الفور گولی ماردی جاتی یا وہ ایک قتل کے بعد دوہرے قتل کے الزام میں گرفتار ہو جاتی۔ اس صورت میں اُسے تختہ دار سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔

اچانک اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ یاد آ گیا کہ برسوں پہلے مدرے کے مکان پر وہ اسی طرح دو لاشوں کے سرہانے بیٹھی اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔ اس دن ڈاکٹر منور علی اسے جہنم کدے سے نکالنے کیلئے آ گیا تھا۔ تب بھی کسی کے آن پہنچنے کا امکان نہیں تھا۔ آج بھی کوئی امید نہیں تھی۔ اگر اس دن قدرت کے نادیدہ ہاتھوں نے غیبی مدد بہم پہنچادی تھی تو آج بھی مدد مل سکتی تھی۔ کچھ دیر انتظار کیا۔ کوئی آس بر نہیں آئی۔ ایک نفرت بھری نگاہ عباس بدرو اور خلیل باجوے پر ڈال کر، اپنی ہمتیں یکجا کر کے اُٹھی اور دروازے تک آئی۔ کان لگا کر باہر کی سن گن لی۔ کچھ سنائی نہیں دیا تو اس نے بغیر آواز پیدا کیے چٹخنی کھول کر دروازے میں درز بنا کر باہر جھانکا۔ دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر ایک جانب گردن ڈھلکائے پہرے دار نیند کے جھولے میں جھول رہا تھا۔

وہ دبلا پتلا شخص تھا۔ وردی اُس کے استخوانی بدن پر خاصی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ اس کی کمزور بدنی دیکھ کر چندو کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ پستول کو فائرنگ پوزیشن میں رکھتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ٹرائیگر دبانا ہی چاہتی تھی کہ ایک خیال ذہن میں برقی کوندے کی طرح لپکا۔ رُک کر سوچ میں پڑ گئی۔ اسے سوتے میں قتل کرنا آسان تھا مگر اس کے بعد یہاں سے نکل کر شہر جانا مشکل تھا۔ یہی سوچ کر اُس نے بڑی آہستگی سے کرسی کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کی ہوئی گن اُٹھائی اور اپنے کندھے پر ڈال لی۔ اس کے سامنے کھڑی ہو کر کریدتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی کہ کہیں اس کے پاس پستول یا کوئی اور آلہ تو نہیں تھا۔ تسلی ہونے پر اس نے پستول کا رُخ اس کے سینے کی طرف کیا اور پاؤں کی زوردار ٹھوکر اس کے گھٹنے پر ماری۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ جونہی اس کے ذہن پر چھایا ہوا نیند کا خمار اُترا، چندو کے ہاتھوں میں پستول نظر آیا تو اس کی آنکھوں میں دہشت بھر گئی،

''کک..... کیا مطلب؟ یہ..... یہ تم کیا کر رہی ہو؟ اسے نیچے کرو۔ کہیں چل نہ جائے.....''

وہ دانت پیس کر بولی، ''خبردار! اُٹھنے کی کوشش کی تو گولی ماردوں گی۔''

وہ کرسی سے اُٹھتے اُٹھتے تھم گیا۔ وائرلیس سیٹ لڑھک کر فرش پر گر گیا۔ وہ وائرلیس سیٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے گردن موڑ کر کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھنے کے بعد ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔ چندو نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اپنے افسروں کی لاشیں دیکھتے ہی پیلا پڑ گیا تھا اور ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ ذرا دلیر ہو گئی۔ غرائی، ''اگر تم نے کوئی خرمستی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بھی ان کتوں جیسا ہوگا اور اگر میرے ساتھ تعاون کرو گے تو زندہ بچ جاؤ گے۔ کیا خیال ہے؟''

اس نے جلدی سے سر اوپر نیچے ہلایا۔ تھوک نگل کر سرائیکی میں بولا، ''تم جو کہو گی، مانوں گا مگر مجھے گولی نہ مارنا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''

چندو نے چند قدم پیچھے ہٹ کر اُسے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

وہ بولی، ''کیا اس فارم ہاؤس میں تمہارے علاوہ بھی کوئی پہرے دار موجود ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ کہا، ''نہیں! سبھی جوان رات کو ہی وین میں بیٹھ کر واپس چلے گئے تھے۔''

''یہاں کوئی سواری موجود ہے؟'' چندو بڑی کوشش سے اپنا لہجہ درشت بنا رہی تھی۔

''ایک موٹر سائیکل کھڑی ہے۔ پتہ نہیں وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔'' اس کے لہجے کے موہوم سے ارتعاش نے چندو کو حوصلہ دیا۔ بولی، ''تمہارے پاس اس کی چابی ہے؟''

''نہیں۔ وہ ڈائریکٹ ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، موٹر سائیکل کی طرف چلو۔''

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے صحن عبور کر کے لوہے کے شیڈ تلے آئے۔ سنتری نے درست کہا تھا۔ شیڈ تلے اجڑے رنگ والے ٹریکٹر کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے چندو کے حکم پر موٹر سائیکل کو شیڈ تلے سے نکالا اور اس پر بیٹھ کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا سالخوردہ انجن گھر گھرا کر بند ہو گیا۔ مہین وجود سنتری نے فیول ناب گھمائی، چوک اُٹھائی اور دو تین مرتبہ پوری قوت سے کک ماری۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ نہ ہوئی تو مایوسانہ نظروں سے چندو کو دیکھتے ہوئے نیچے اُتر آیا۔ بولا، ''لگتا ہے؛ یہ کام نہیں دے گا۔''

چندو پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ یہاں سے فی الفور نکلنا چاہتی تھی اور جانتی تھی کہ پیدل چل کر

شہر تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ سڑک پر بھی کسی سواری کا ملنا توقع سے باہر تھا۔ زیادہ سوچ بچار کا وقت بھی نہیں تھا اس لیے فیصلہ کن انداز میں پستول تان کر خود کلامی کے انداز میں بولی، ''لگتا ہے، تم بھی کام نہیں دو گے، اس لیے تمہاری بھی چھٹی کرانا ہوگی۔''

اس کا نام امام دین تھا مگر یار دوستوں اور ہم منصب اہلکاروں کی تضحیک آمیز بے تکلفی نے اُسے مامے خان بنا دیا تھا۔ قانون نے اُسے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کیلئے پال رکھا تھا۔ جب بندوق اُٹھا کر نہتے اور قانون کا احترام کرنے والوں کے سامنے جاتا تھا تو اس میں چنگیزی روح حلول کر جایا کرتی تھی۔ یہاں معاملہ مختلف تھا۔ اگر اس نے اپنے دو ہٹے کٹے افسروں کو کمرے میں مردہ حالت میں نہ دیکھا ہوتا تو شاید اکڑ جاتا مگر اس وقت خوب رُو لڑکی کی صورت میں موت آنکھوں کے سامنے آن کھڑی ہوئی تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔ ہاتھ جوڑ کر زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ زندگی کے عوض میں ہر قسمی تعاون کی پیشکش کرنے لگا۔

اس کی کانپتی ہوئی آواز اور بدن پر طاری واضح کپکپی نے چندو کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ سرد لہجے میں بولی، ''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں چانس دیے بغیر تمہیں گولی مار دوں گی۔''

''مم..... میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کروں گا۔ خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو اور میرے بچوں کو یتیم نہ کرو۔'' اس نے اپنے ہاتھ بدستور جوڑ رکھے تھے۔

چندو کے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔ ضرورت انسان کو مفاہمت کا راستہ دکھا دیتی ہے۔ اسے یہاں سے نکلنے کیلئے اس مامے خان کی ضرورت تھی۔ بولی، ''مجھے فوری طور پر شہر پہنچاؤ۔''

مامے خان نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ٹریکٹر پر نظر پڑی۔ اُسے جا کر ٹھونک بجا کر دیکھا اور اس کے صحت مند ہونے کا اعلان کر دیا۔ کہا، ''ہم اس پر شہر جا سکتے ہیں۔''

رات پر صبح کی سپیدی حملے کرنے لگی تھی۔ کوئی اور چارہ نہ پا کر چندو نے آمادگی ظاہر کی تو مامے خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی جبکہ چندو ٹریکٹر کے ہائیڈرالک لیور پر پیر جما کر ڈرائیونگ سیٹ کے عقب میں لگے ہوئے چوبی تختے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پستول اس طرح سے مامے خان کی پشت سے لگا دیا کہ وہ اس کے گھٹنوں میں چھپ گیا۔ قریب سے دیکھنے پر بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس نے مامے خان کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد ٹریکٹر کا انجن بیدار ہو گیا۔ مامے خان کو ٹریکٹر کی ڈرائیونگ پر عبور نہیں تھا مگر وہ گزارا کر لیتا

تھا۔اس نے ایک جانکاہ جھٹکے کے ساتھ ٹریکٹر کو شیڈ تلے سے نکالا اور تھوڑی تگ و دو کے بعد کچے راستے پر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔سڑک کے کنارے فصل کی اونچائی قدرے زیادہ تھی۔ چندو نے کندھے سے گن اُتاری اور مامے خان کی بے خبری میں ایک طرف اچھال دی۔

رات کے اس پہر میں سڑکیں سنسان تھیں۔ٹریکٹر کا اسٹیرنگ ویل کسی اتھرے گھوڑے کی لگام کی طرح بار بار مامے خان کے ہاتھوں پھسل رہا تھا۔ یہ اعجاز کچھ تو اس کی ناتجربہ کار ڈرائیونگ کا تھا اور کچھ کمال کمر میں چبھنے والی پستول کی نال کا تھا۔سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی جس کی وجہ سے ٹریکٹر بے تحاشا اچھل کود کر رہا تھا۔شہر پہنچنے تک چندو کا برا حال ہو گیا۔اوور ہیڈ برج سے اُترتے ہی اس نے مامے خان کو رکنے کا حکم دیا۔وہ ٹریکٹر روک کر مستفسر ہوا،''کیا بات ہے؟ کیا یہیں اُترو گی؟''

چندو اس پر قدرے جھک آئی۔کندھے پر سے ہاتھ کھسکا کر اس کی جیب تک لائی اور جو کچھ اس کی جیب میں موجود تھا، نکال لیا۔بولی،''میں یہیں اُترنے لگی ہوں۔آگے جانے کیلئے رکشا پکڑلوں گی۔میں چاہوں تو تمہیں یہیں گولی مار کر پھینک سکتی ہوں مگر میں نے تمہاری جان بخشی کا وعدہ کر رکھا ہے۔تم ٹریکٹر موڑو اور واپسی کی راہ لو۔اگر کوئی گڑبڑ کرو گے تو سینے میں گولی ماردوں گی۔''

وہ گھگھیا گیا۔منت آمیز لہجے میں بولا،''خدا کیلئے مجھ پر یقین کرو؛ میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا۔''

چندو ٹریکٹر سے اُتر کر سڑک کی سائیڈ پر کھڑی ہو گئی۔امام دین عرف مامے خان سنتری نے برق رفتاری سے ٹریکٹر آگے بڑھایا، یوٹرن لیا اور اوور ہیڈ برج پر چڑھتا چلا گیا۔برج سیدھی نہیں تھی۔درمیان سے خم کھا جاتی تھی۔اس خم تک ٹریکٹر دکھائی دیتا رہا پھر چندو کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔تب اس نے پستول اپنے لباس میں چھپایا اور چند قدموں کے فاصلے پر واقع چوک کی طرف بڑھ گئی۔وہاں تین چار آٹو رکشا ایک قطار میں کھڑے تھے۔روڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے امام دین کے سامان کو ایک نظر دیکھا۔تسلی ہوئی کہ کاغذوں کے پلندے میں سے کچھ نوٹ جھانک رہے تھے۔اسے بروقت پیسوں کا خیال آ گیا تھا ورنہ وہ رکشا میں سفر کرنے کے قابل نہ ہوتی۔

وہ بظاہر مطمئن اور لاپروا دکھائی دے رہی تھی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔پولیس کے

ہاتھوں پکڑے جانے کا خوف اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ مامے خان کی طرف سے کارروائی کیے جانے کا خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ چندو کو یقین کی حد تک شبہ تھا کہ وہ اودر ہیڈ برج اُتر کر واپسی راہ کا، یعنی پرانا شجاع آباد روڈ کا رُخ نہیں کرے گا بلکہ کسی قریبی تھانے پہنچ کر اپنے افسران کے قتل کی رپورٹ دے گا۔ دو تھانیداروں کے قتل کی خبر سنتے ہی شہر بھر کی پولیس اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہونے والی تھی۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا اور وہ طے کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُسے اس وقت کہاں جانا چاہیے تھا جہاں پہنچ کر وہ کچھ دیر کیلئے پولیس کی نظروں سے چھپ جاتی۔ وہ اپنی کوٹھی پر نہیں جا سکتی تھی کیونکہ کوٹھی کا راستہ پولیس نے دیکھ رکھا تھا۔ آجا کے اس کے پاس میڈم جوزفین کا سہارا باقی تھا۔ اس کا خیال آتے ہی چندو نے رکشا میں بیٹھتے ہی اسے اس ہسپتال چلنے کا کہا جس کے ملحقہ نرسنگ ہاسٹل میں وہ دو سال تک مقیم رہی تھی۔

میڈم جوزفین ابھی سو رہی تھی۔ چندو کی دستک پر میڈم جوزفین نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ چندو کو دیکھتے ہی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ ہاتھ تھم گئے۔ تعجب سے گویا ہوئی،

''چندو تم! خیر تو ہے ناں؟''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی، ''خیر نہیں میڈم! مجھے اندر آنے دیں؛ میں آپ کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیتی ہوں۔''

میڈم اُسے اندر لے آئی۔ دروازہ بند کر کے، چندو کو بیڈ پر اپنے ساتھ بٹھا کر سوالیہ نظروں سے گھورنے لگی۔ چندو نے بلا کم و کاست تمام ماجرا کہہ سنایا اور سرکاری پستول لباس سے نکال کر بیڈ پر رکھ دیا۔

دو انسپکٹروں کے قتل کا سن کر اور پستول دیکھ کر میڈم جوزفین کی آنکھیں فرطِ خوف سے پھٹنے کو آ گئیں۔ ہکلا کر بولی، ''یہ..... یہ تم نے کیا کر دیا بے وقوف لڑکی؟ اب تک تو شہر بھر کی پولیس ہوٹر بجاتی ہوئی تمہاری تلاش میں نکل چکی ہو گی۔''

جوزفین نے اجمل گیلانی اور اس کے باپ کی صحبت میں زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے مگر اتنی سنگین نوعیت سے اس کا واسطہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ تبھی گھبرا گئی تھی۔ تشویش آمیز انداز میں پیشانی پر ہتھیلی رگڑتے ہوئے بولی، ''چندو! میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔ سب کچھ بتایا تھا مگر تم نے پھر بھی حماقت کر دکھائی۔ اگر تمہاری کہانی میں عمر حیات کے قتل کا واقعہ شامل تھا تو تم

نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟.....اوہ مائی گاڈ! اب کیا ہوگا؟''

وہ بڑبڑاتی جاتی تھی۔ ساتھ میں سوچتی بھی جاتی تھی۔ جانتی تھی کہ پریشانی کبھی پریشان ہونے سے تحلیل نہیں ہوتی۔ بند راہوں کے بیچ کوئی درز کھوجنا پڑتی ہے۔

چند و سر جھکائے متفکر انداز میں بیٹھی ناخن کھرچتی رہی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک مصیبت سے نکل آئی تھی۔ دوسری منہ پھاڑے اُسے نگلنے کیلئے دہلیزِ جاں تک آ گئی تھی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔

اس دوران میڈم جوزفین شاک سے نکل آئی۔ پستول اُٹھا کر اُسے تھمایا اور لباس میں چھپانے کا اشارہ کیا پھر فیصلہ کن انداز میں اُٹھتے ہوئے بولی، ''اُٹھو چندو ماہی! تمہیں فوری طور پر کسی خفیہ ٹھکانے پر پہنچانا ضروری ہو گیا ہے ورنہ تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ پولیس میرے اور اجمل گیلانی کے تعلقات کی نوعیت سے واقف ہے۔ بعید نہیں کہ کچھ ہی دیر بعد یہاں پہنچ جائے۔ اُٹھو! دیر نہ کرو۔''

چندو اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ہوسٹل سے باہر آئی۔ میڈم نے سڑک پر جاتے ہوئے رکشا کو روکا۔ مول تول میں وقت ضائع کیے بغیر دونوں رکشا میں بیٹھ گئیں۔ میڈم نے اُسے اندرون شہر کے ایک محلّہ میں پہنچانے کا حکم دیا اور آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔ چندو نے کچھ کہنا چاہا تو جوزفین نے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ رکشا ڈرائیور کی موجودگی میں اس سنگین موضوع پر کوئی بات کی جائے اور نئی مشکل اپنے لیے پیدا کر لی جائے۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ اندرونِ شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک دو اڑھائی مرلہ کے تنگ سے مکان میں بیٹھی تھیں۔ اس افلاس زدہ گھر میں مدقوق بشرے والی ایک پینتالیس سالہ عورت جسے جوزفین نے 'نجمہ' کے نام سے مخاطب کیا تھا، نے بظاہر ان دونوں کی آمد پر کسی بھی استعجاب بھرے ردعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ چندو کو یوں محسوس ہوا جیسے جوزفین کی یہاں آمد اس کے نزدیک نہ ہی حیرت کا محرک تھی اور نہ ہی چندو کا اجنبی چہرہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت رکھتا تھا۔ گھر میں اوپر تلے دو کمرے تھے۔ اس نے صحن میں رُک کر جوزفین کو بالائی کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور خود ان کے لئے چائے یا ناشتہ تیار کرنے کیلئے رسوئی میں گھس گئی۔

دیوار کے ساتھ نصب کی گئی سالخوردہ چوبی سیڑھی جوزفین کے وزن سے خطرناک انداز میں چرچرائی۔ چندو نے از خود احتیاط کی اور جب جوزفین سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں داخل

ہوگئی، تب اس نے تنگ سے زینے پر پاؤں رکھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی فرنیچر سے یکسر عاری کمرے کے پرانے قالین پر جوزفین کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھی تشویش آمیز نظروں سے اِردگرد دیکھ رہی تھی۔ جوزفین کی کشادہ پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیروں کا جال تنا ہوا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دو پولیس افسروں کا قتل کسی بھی طرح ہضم نہیں ہو سکے گا اور اجمل گیلانی، چندو ماہی اور خود اس کے گلے کی ہڈی بن جائے گا۔ وہ تھوڑی برہمی سے بولی، ''تمہیں کیا ضرورت تھی اپنے پیچھے عینی شاہد کو زندہ چھوڑنے کی..... جہاں دو تھانیداروں کو تم نے قتل کر دیا تھا، وہاں ایک سپاہی تم سے مارا نہ جا سکا۔ تم نے حماقت کے بعد پھر حماقت کی۔''

''اُسے مار دیتی تو میں شہر کیسے آتی؟ وہ علاقہ بڑا ویران اور.....''

''شِٹ! دو شیروں کو مارنے کے بعد بھی ڈر تمہارے اندر سے نہیں نکلا!'' اس نے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور خاموش ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد نجمہ نے خاموشی سے ان کے سامنے سادہ سا ناشتہ اور چائے کے دو بڑے پیالے رکھ دیے۔ جوزفین نے دریافت کیا، ''نجمہ! میر وشاہ واپس نہیں آیا؟''

''رات کو ڈیڑھ بجے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ اُسے فوری طور پر ہسپتال پہنچنا ہے۔ بتا رہا تھا کہ صاحب کا آپریشن ہے۔'' نجمہ نے بتایا اور ان کے قریب ہی قالین پر ہتھیلی کی ٹیک پر بیٹھ گئی۔

''مم..... مگر اُسے تو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔'' چندو نے حیرت سے کہا۔

''میر وشاہ کے نزدیک گرفتار ہونا اور چھوٹ آنا بڑا کام نہیں ہے۔'' جوزفین نے قدرے لاپروائی سے کہا۔

نجمہ نے جوزفین سے پوچھا، ''تم ہسپتال سے آ رہی ہو؟''

''نہیں.....'' جوزفین نے پراٹھا توڑ کر منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا، ''میر وشاہ نے تمہیں بتایا تھا کہ صاحب کا آپریشن کب ہونا ہے؟''

نجمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

ناشتہ کرنے کے بعد جوزفین اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نجمہ کو سمجھانے لگی، ''نجمہ! یہ صاحب کی بیوی ہے۔ اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ خیال کرنا۔''

اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ حیرانی کی لہر نمودار ہوئی۔ چندو کو کریدتی ہوئی نظروں دیکھ کر بولی، ''تم فکر نہ کرو۔ یہ صاحب کی بیوی ہے تو میری مالکن ہوئی اور صاحب کیلئے تو میری جان

بھی حاضر ہے۔ یہ کب تک یہاں رہے گی؟''

''اسے یہاں تک پہنچانا میرا کام تھا؛ وہ میں نے کر دیا۔ آگے میر وشاہ جانے اور اس کا کام..... میں چلتی ہوں اور چندو! تم یہاں بے خوف ہو کر رہو۔ میر وشاہ ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی یہاں آ جائے گا۔ یہ اس کا گھر ہے۔ نجمہ تمہارا خیال رکھے گی۔ چاہو تو نہا دھو کر فریش ہو جاؤ اور دو چار گھڑیاں آرام کر لو۔'' جوزفین نے پیار سے چندو کے گال تھپتھپائے اور چوبی سیڑھیاں اُتر گئی۔ نجمہ بیرونی دروازہ بند کر کے اس کے پاس آ بیٹھی۔

چندو کی توقع کے برعکس نجمہ نے اس سے کچھ بھی پوچھنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ اس کا لہجہ مؤدبانہ اور اسپاٹ تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھی۔ جوزفین نے اس کے ذمہ یہی کام لگایا تھا کہ چندو کا خیال رکھے اور اس نے میر وشاہ کے آنے تک چندو ماہی کا ہر طرح سے خیال رکھا۔

میر وشاہ طویل اور جانکاہ انتظار کرانے کے بعد چندو کو ابتدائے شب میں نظر آیا۔ خاصا تھکا ہوا اور نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ چندو نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور بولا، ''ماڑا جانی یار..... ماڑا ابا چھا ماڑے کو چھوڑ جاوت ہے رانی جی! ہاہ ہا..... کیا جلم (ظلم) ہووت ماڑی جان پر کہ جندگی (زندگی) ہی بے کار نجر (نظر) آوت ہے.....''

وفورِ کرب سے چندو کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ زبان ہکلا گئی۔ بولی، ''کک..... کیا مطلب؟ اجمل صاحب مر گئے؟ اوہ میرے خدا! اب کیا ہوگا؟''

میر وشاہ گھٹنوں میں سر ڈال کر ہولے ہولے سسکنے لگا۔ بڑبڑاتے ہوئے رانوں پر ہاتھ مار مار کر بین کرنے لگا۔ اجمل کے ساتھ گزرنے والی گھڑیوں کو یاد کرتے ہوئے واویلا کرنے لگا۔ اس کی بڑبڑاہٹوں سے چندو نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اجمل نے آپریشن کے دوران اپنی جان خالقِ حقیقی کے سپرد کر دی تھی۔ چونکہ طویل بیماری نے اس کے بدن کی قوتِ مزاحمت کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا اس لیے وہ ڈاکٹروں کی چیر پھاڑ کے مقابلے میں خود کو زندہ نہ رکھ سکا۔

چندو کا ہاتھ تھام کر میر وشاہ سسکا، ''یہ کس مقام پہ سوجھت تیرے کو بچھڑن کی..... اب تو آ جا کہ دن سنورن کو آوت تھے.....''

(یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی؛ کہ اب تو آ جا کے دن سنورنے والے تھے)

اجمل گیلانی ایک مختصر کردار لے کر چندو کی زندگی میں وارد ہوا تھا۔ بعض مختصر کردار پوری

زندگی پر محیط ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی تھا۔ مر گیا مگر چندو کے دل سے دُکھ کو محسوس کرنے والا حصہ ہی نکال کر لے گیا۔ بجا کہ اس کی موت حادثاتی نہیں تھی اور اس کی موت چندو کے مستقبل کیلئے خوش آئند تھی مگر وہ اس کیلئے اس شدت سے ٹوٹ کر روئی کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ اپنی زندگی میں لوٹ پوٹ ہوتے تمام تر دکھ اور اضطراب شاید ایک ہی نقطے میں آن سمائے تھے۔ کافی دیر رونے کے بعد از خود سنبھلی۔ پانی پیا اور میر وشاہ سے محوِ کلام ہو گئی۔ اس نے اجمل کے آپریشن کی تفصیلات سنیں۔ میر وشاہ اور نصر حیات نے بغیر وقت ضائع کیے اس کی موزوں انداز میں تدفین کر دی تھی۔

وہ اجمل گیلانی کی موت کے دکھ سے ایک ذرا نکلا تو اُسے چندو کی یہاں موجودگی پر تعجب ہوا۔ اس کے استفسار پر چندو نے پھر اپنی رام کہانی سنائی۔ میڈم جوزفین کے برعکس میر وشاہ نے لاپروائی سے کندھے اُچکائے اور بولا، ''تو کیا ہووت؟ ماڑے دھندے میں جندگی ایسے ہی گجرت ہے رانی جی! ایک دم فکر نئیں کرت؛ سوچ لیوت کہ باچھا کی جاہ رانی جی لیوت؟..... ماڑے کو معلوم ہووت کہ کیا کرنا ہووے، کیا نہیں کرنا ہووے..... تم ادھر آرام سے سو جاوت۔ بس!''

وہ دِلاسہ دے کر نچلے کمرے میں چلا گیا۔ علی الصبح جب وہ چندو کے پاس آیا تو اس کے عقب میں استاد نصر حیات بھی دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں نے مؤدبانہ انداز میں اُسے سلام کیا اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر قالین پر بیٹھ گئے۔

میر وشاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''چندو رانی! ماڑے کو اتنا بتا دیوے کہ ماڑے باچھا (بادشاہ) کی راج واڑی کا تاج سر پر رکھت یا جورو مافق رسوئی پر راج مانگت؟''

وہ فوری طور پر میر وشاہ کی بات سمجھ نہ پائی۔ اکثر میر وشاہ کی مافوق الفطرت باتیں اس کے سر سے گزر جاتی تھیں۔ نصر حیات اس کے چہرے سے دلی حالت بھانپ گیا۔ مؤدبانہ انداز میں سمجھانے لگا۔ پوچھنے لگا کہ وہ اجمل گیلانی کا کاروبار سنبھالنے کا ارادہ رکھتی تھی یا عموی عورتوں کی طرح گھر بسانے کا خواب دیکھتی تھی۔ اس کے سامنے دونوں راستے کھلے تھے۔ اس نے گڑبڑا کر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ اُسے ڈر تھا کہ پولیس اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی اور تین افراد کے قتل کے الزام میں پھانسی کے تختے تک پہنچا دے گی۔ وہ عزت کی زندگی گزارنے کے واقعتاً خواب دیکھتی تھی مگر ماضی کی کرچیاں آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔ اس نے سر جھکا کر بہت کچھ سوچا۔ خود کو بھیڑیوں کے غول میں پا کر ایک ذرا گھبرائی پھر مستفسر ہوئی، ''میرا مستقبل

کیا ہے؟''

میر و شاہ اپنے مخصوص استہزائیہ انداز میں ہاتھ اُٹھا کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نصر حیات نے جلدی سے کہا، ''مستقبل کے بارے خدا بہتر جانتا ہے۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم آپ کی حفاظت میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ رہی بات پولیس کی..... تو یہ فکر دل سے نکال دیں۔ قانون کی آنکھوں میں مرچیں ڈالنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ آپ صاحب کے انداز میں کاروبار اور گروپ سنبھالنا چاہیں یا اپنی جائیداد بیچ کر کسی اور شہر جا بسنا چاہیں، پولیس آپ کی گرد کو بھی چھو نہیں سکے گی۔ ذہن کو مستقبل کی پریشانیوں سے پرے رکھ کر فیصلہ کیجئے۔''

وہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ میر و شاہ اُسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے لگا۔ چندو نے جونہی گروپ کو سنبھالنے کی خواہش ظاہر کی، نصر حیات اس کے آئندہ کے کردار کا نقشہ کھینچنے لگا۔ چندو کو اس کا منصوبہ اچھا لگا۔

چندو ماہی پر عمر حیات اور دو انسپکٹروں کے بہیمانہ قتل کے مقدمے درج ہو چکے تھے۔ ایف آئی آر خاموش تو رہتی ہے مگر مٹنے کا نام نہیں لیتی۔ نصر حیات نے کہا تھا کہ اب جس بھی حکمتِ عملی کے مطابق چلا جائے، پولیس والوں سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ ان تینوں مقدمات کے چالان عدالت میں منتقل کرنا پولیس کی مجبوری تھی۔ عدالتی کارروائی بہت طویل تھی جبکہ اس دوران چندو ماہی کو بہر صورت جیل میں رہنا تھا۔ اس نے جیل نہیں دیکھی تھی مگر تھانیدار کے رویے کو مدنظر رکھتے ہوئے اُسے جھرجھری سی آ گئی۔ سن رکھا تھا کہ جیل تھانے سے کہیں بڑا صعوبت خانہ تھا۔ تبھی پریشان ہو گئی۔

نصر حیات بولا، ''نہیں میڈم! میں نے کہا ناں کہ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ذرا غور سے سنیں۔''

وہ بتانے لگا کہ اس کی سگی بھانجی ایک ماہ پہلے گردن توڑ بخار کی لپیٹ میں آ کر مر گئی تھی۔ اس کا نام شکیلہ رانی تھا۔ نصر حیات کی بہن اور بہنوئی ملتان کے ایک مضافاتی قصبے عباس پور میں رہتے تھے۔ غریب لوگ تھے۔ گزر بسر بمشکل ہوتی تھی مگر انہوں نے اپنی بیٹی کو جیسے تیسے کر کے کالج تک پہنچا دیا تھا۔ جونہی اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا، بیماری کے بھیس میں چھپی ہوئی موت نے آن دبوچا۔ ماں باپ کی کمر ٹوٹ گئی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی اکلوتی بیٹی کو تینوں بیٹوں پر فوقیت دی تھی۔ غریبوں کے ہاں شہری چونچلے کم ہوتے ہیں۔ انہوں نے بیٹی کی مرگ کو

سرکاری رجسٹر پر درج نہیں کرایا تھا۔ یعنی وہ دنیا کی نظروں سے اُٹھ گئی تھی مگر سرکاری کھاتے میں زندہ تھی۔ نصر حیات کے اندازے کے مطابق وہ چندو کی ہم عمر واقع ہوئی تھی اس لیے باآسانی قانونی طور پر اس کی جگہ لے کر قانون کی نظروں سے چھپ سکتی تھی۔

چندو نے حیرت سے سنا اور نصر حیات کے خاموش ہونے پر حیرت سے پوچھا، ''کیا شکیلہ رانی کے ماں باپ مان جائیں گے؟''

وہ بولا، ''پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے سگے رشتہ دار ہیں۔ بہن اور بہنوئی ہیں۔ نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیسہ دنیا کے ہر مرض کا علاج ہے۔ اُنہیں ہم عباس پور سے نکال کر کسی اور دیہات میں دو چار ایکڑ جگہ لے دیں گے یا یہیں شہر میں لا بٹھائیں گے۔ روٹی کا وسیلہ بنا دیں گے اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے بھی ساتھ دے دیں گے تو وہ ہمیشہ یہی کہیں گے کہ ان کی بیٹی شکیلہ رانی ابھی زندہ ہے۔ جب آپ شکیلہ کے ڈاکومنٹس پر یونیورسٹی جائن کر لیں گی، اپنا حقیقی نام تک بھول جائیں گی تو آپ کو چندو ماہی قرار دے کر پولیس کبھی گرفتار نہیں کر سکے گی۔ کیوں شاہ جی؟ کیا خیال ہے؟''

میر وشاہ نے توصیف بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا، ''ماڑا جیا خوش کر دیوت نصری اُستاد! ایک دم جبردست (زبردست) وار کر دیوت ہے ماڑے یار نے قانون کی پچکی ہوئی چھاتی پر.....''

چندو نے چند لمحے سوچا۔ پہلی سی نادانی نہیں رہی تھی مگر ابھی پختہ کار بھی نہیں ہوئی تھی۔ پوچھنے لگی، ''مگر میری جائیداد کا بنے گا؟ وہ تو میرے، یعنی چندو ماہی کے نام ہے۔''

نصر حیات نے مسکرا کر کہا، ''چونکہ پولیس اور ریونیو دو مختلف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے کہ پولیس میں آپ کے خلاف ایف آئی آر کٹنے سے ریونیو آفس کا دروازہ آپ پر بند ہو جائے۔ آپ وہاں جائیں گی اور اپنی جائیداد شکیلہ رانی کے نام بائعہ کر دیں گی۔ بس! اتنی سی بات ہے۔''

چندو کے دل میں خوف آمیز تشکیک ہلکورے لے رہی تھی۔ نصر حیات نے جس سہل انداز میں ہتھیلی پر سرسوں جما کر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی تھی، چندو کی سمجھ سے بالاتر تھا مگر اس کے پاس سوائے اس پر اور میر وشاہ پر اعتماد کرنے کے چارہ نہیں تھا۔ اجمل نے مرنے سے پیشتر اُسے سمجھایا تھا کہ میر وشاہ قابلِ اعتماد آدمی تھا۔ اپنے بعد میر وشاہ پر بھروسہ کرنے کا مشورہ دیا

تھا۔اس کے سر میں درد ہونے لگا تو اس نے اپنی آنکھیں پوری سختی سے بھینچ لیں اور لمبی سانس لے کر بولی، ''میں کچھ نہیں جانتی..... میں کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے اجمل صاحب نے کہا تھا کہ میرو شاہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔ان کے کہنے پر میں تم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرتی ہوں۔ میرے لیے جو بہتر ہے، وہی کرو۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ مجھے جیل نہیں جانا۔ مجھے تھانے نہیں جانا۔اور بس!''

میرو شاہ نے آگے کھسک کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بے یقینی سے بولا، ''ماڑے بارے باچھانے ایسا بولت..... سچ؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا، ''تو پھر ماڑی رانی اپنی آنکھیں بند ہی رکھ چھوڑت..... میرو شاہ جانت؛ میرو شاہ کا کام جانت..... چل ماسٹر نصری! اب جو بھی کرنا ہووت، ماڑے کو ہی کرنا ہووت۔''

دونوں نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اُسے بے فکر رہنے کا مشورہ دے کر چلے گئے۔

آنے والے بائیس دن چندو نے اُسی گھر میں نجمہ کے ساتھ گزارے۔ پہلے اُس نے یہی سمجھا تھا کہ نجمہ میرو شاہ کی بیوی ہے مگر اُسے بعد میں پتہ چلا کہ وہ اُس کی بیوی تو رہی ایک طرف، رشتے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ حالات کی ماری ہوئی بے چھت عورت تھی۔ اپنے خاندان کی دھتکاری ہوئی تھی۔اجمل گیلانی کے پاس سر چھپانے کی جگہ مانگنے گئی تھی۔اس نے میرو شاہ کے حوالے کر دیا۔میرو شاہ نے اُسے قبول کرتے ہوئے اپنی چھت اور چولھا فراہم کر دیا جبکہ اس نے میرو شاہ کی بیوی کا کردار سنبھال لیا تھا۔وہ مشینی انداز میں نہ صرف اپنا اور میرو شاہ کا کام کاج کرتی تھی بلکہ چندو ماہی کا خیال بھی رکھتی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے اس کے بدن اور ذہن میں کوئی خواہش یا ردِ عمل سمیت کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ نہ ہنستی تھی، نہ روتی اور نہ ہی اُسے کسی بات پر غصہ آتا تھا۔بعض اوقات چندو کو اس کے غیر فطری رویے پر الجھن سی ہونے لگتی تھی مگر وہ مجبوری کے عالم میں دن پر دن گزارتی چلی گئی۔

وہ زندگی کے خونی پنجوں میں چاروں طرف سے جکڑی ہوئی تھی۔اُسے اپنی دانست میں سانس لینے کیلئے ننھی سی روزن دکھائی نہیں دیتی تھی مگر نصر حیات اور میرو شاہ نے اُسے مکھن کے بال کی طرح قانون اور اجمل کے رشتہ داروں کے غیظ و غضب سے نکال کر شکیلہ رانی بنا دیا۔وہ دنیا سے رخصت ہو جانے والی شکیلہ رانی کے ماں باپ کو عباس پور سے نکال کر شہر لے آئے

تھے۔ چوک رشید آباد کے قریب انہیں ایک چھوٹا مگر خوبصورت سا مکان خرید کر دینے کے بعد نصری کے دل گرفتہ بہنوئی کی خواہش پر شاہین مارکیٹ میں نئے سائیکلوں کی دکان بنا دی گئی جس سے ان کی گزر بسر کا بہترین بندوبست ہو گیا۔ وہ جن کی طنابیں غربت نے کھینچ کر گردن اکڑا رکھی تھی، وہ راتوں رات لکھ پتی ہو گئے۔ چونکہ یہ پلان نصر حیات کا تیار کردہ تھا، اس لیے انہوں نے اپنی مرحوم بیٹی کی اس طریقے سے پر ہونے والی جگہ کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

ہم عمر ہونے کی وجہ سے چندو ماہی نے باآسانی شکیلہ رانی کا رُوپ دھار لیا اور نصر حیات کے ساتھ ریونیو آفس جا کر اپنی جائیداد شکیلہ رانی کے نام منتقل کرا دی۔ اس دوران میر وشاہ کی زبانی اُسے اپنی تلاش میں سرگرداں پولیس کی ناکام و نامراد چھاپہ مار کارروائیوں کا علم ہوتا رہا اور دل موہوم سے خدشات کی تال پر دھڑکتا رہا۔

میر وشاہ نے اُسے رانی کا خطاب دے رکھا تھا جبکہ نصر حیات بڑے مؤدبانہ لہجے میں اُسے 'میڈم' کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ پہلے پہل اُسے یہ خطاب ناشناسا اور عجیب سا لگا تھا مگر دو چار دِنوں میں ہی اُسے عادت سی ہو گئی۔ وہ اور اُس کی ہم جماعت نرسیں جو زفین کو میڈم کہا کرتی تھیں۔ وہ پردۂ سیمیں سے ہٹ گئی تھیں۔ چندو ماہی شکیلہ رانی اور پھر میڈم شکیلہ بن کر پردے پر جگمگانے لگی تھی۔

میر وشاہ نے اُس کیلئے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اجمل گیلانی کے رشتہ داروں نے واویلا کھڑا کیا۔ جائیداد کی وراثتی تقسیم کے عدالتی کیسوں نے اُسے بہت الجھا دیا۔ حقیقی وارثان کی راہ میں مفرور مجرمہ چندو ماہی آڑے تھی کیونکہ وہ اجمل گیلانی کی بیوی ہونے کے ناتے اس کی جائیداد کی قانونی لحاظ سے اہم وارث تھی۔ میر وشاہ نے ان سب الجھنوں سمیت جائیداد کا بڑا حصہ اجمل گیلانی کے ندیدے رشتہ داروں سے بچا لیا۔ جب قانونی موشگافیوں سے عہدہ برآ ہو گیا تو اُس نے چندو پر توجہ دی۔ شہر کے مضافات میں، بند بوسن کے پار، قدرے ویران ماحول میں اجمل گیلانی کا زرعی رقبہ اور ڈیرہ موجود تھا۔ میر وشاہ کی تجویز پر نصر حیات چندو کو اُس ڈیرے پر لے گیا اور مخصوص انداز میں اُس کی تربیت شروع کرنے لگا۔ میر وشاہ چاہتا تھا کہ اجمل گیلانی کا نیٹ ورک سنبھالنے کیلئے چندو کو غیر معمولی طور پر سخت جان، چاق چوبند اور بہادر ہونا چاہیے تھا۔ وہ خود لڑائی بھڑائی اور اسلحہ استعمال کرنے میں مہارت نہیں رکھتا تھا، اس لیے یہ کام اُس نے نصر حیات عرف ماسٹر نصری کے سپرد کر دیا۔ ماسٹر نصری نہ صرف غضب کا فائٹر، چالاک

منصوبہ ساز بلکہ ہر قسم کے اسلحے کے استعمال میں بھی خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ ایک طرف جہاں اُس نے چندو ماہی کو کسرت اور اسلحہ چلانے میں طاق کرنا شروع کر دیا، وہیں میر وشاہ نے اُسے ہر روز یونیورسٹی پہنچانا اور دوپہر میں واپس لانا شروع کر دیا۔

میر وشاہ اُسے مضبوط کرنا چاہتا تھا مگر اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ نہایت عسرت گیر اور پس ماندہ علاقے میں پرورش پانے والی، اپنے سائے سے لرزہ براندام کم عمر لڑکی دو تین سالوں میں اتنی بڑی شاطر بن جائے گی کہ بڑے بڑے سورمے اس کا نام سن کر کانپنے لگیں گے..... انسانی زندگی طرفہ تماشوں کی آماجگاہ ہے۔ مموں شہباز، تو شہباز مموں بنتا دیکھا گیا ہے..... وہ فاختہ تھی..... اپنے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے چونکنے اور ڈرنے والی؛ مگر ماسٹر نصری کی چھ ماہ کی غیر معمولی تربیت نے اُسے شہباز بنا کر جرائم کی فضا میں چھوڑ دیا۔ میرزادے عمر حیات کی بہن صفیہ، اجمل گیلانی کے رشتہ دار اور پولیس اہلکار بہت پیچھے رہ گئے۔ جب تعلیم مکمل ہونے پر وہ شہر کی نوخرید کردہ سی ٹو والی کوٹھی میں منتقل ہوئی، تب تک وہ شعلہ جوالہ بن چکی تھی۔ گامن کی چندو ماہی نہ رہی، سائیکلوں والے محمد علی کی شکیلہ رانی بھی نہ رہی۔ میڈم شکیلہ بن کر آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ کیا ہوگا؟ کیا ہوا تھا؟ یہ اندیشے اور ملول بہت پیچھے رہ گئے..... اور کیا کرنا ہے؟ بس یہی لگن اس کی زندگی کا عنوان بن گئی۔

دریا کی برہم لہروں سے شروع ہونے والی المناک کہانی اس کی بکھری ہوئی جوانی کی دھڑکتی ہوئی سانسوں پر منتج ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے بچپن کی ہر کہانی کو 'کہانی گئی مُک، تے کلی گئی ٹھک' کے جملے پر ختم ہوتے دیکھا تھا۔ شاید کہانی سنانے والے کو کہانی کے اختتام کا اعلان کرنا پڑتا ہے مگر اُس نے کوئی خبر نہیں دی تھی۔ بس بولتے بولتے اس کی آواز کمزور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ میرے سینے پر اپنا گال رکھ کر ننھے ننھے خراٹے لینے لگی۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے اس لگژری روم کے مدھم نائٹ بلب کی روشنی میں تاریخ کے بدلنے کا پتہ نہیں چلا تھا۔

وہ جاگتے میں، جب بہت زیادہ خوش ہوتی تھی، اپنے پہلی انگلی کی آخری پور نچلے ہونٹ پر محبوبانہ ادا کے ساتھ پھیرتی تھی، چوم کر شرارت سے روک دیتی تھی، گویا زمانے کو روک رہی ہو..... میں نے تھوڑا سا سر اُٹھایا۔ اُسے دیکھا۔ سوتے میں بھی اس کی انگلی اسی آتش کدے پر ٹھہری ہوئی تھی۔ اُس نے اٹالک 'وی' شکل کے گلے والی دو رنگوں والی قمیص پہنی ہوئی تھی جو آدھی آتشیں سرخ اور آدھی زرد تھی۔ سیاہ بالوں اور سرخ قمیص سے جھلکتی ہوئی گلابی سفید گردن

پر نظریں بے اختیار پھسل جاتی تھیں۔ ننھی سی اَن چھدی ناک، باریک لکیروں والے بھرے بھرے اور چمکدار ہونٹ..... اُسے دیکھے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ دیکھتے رہنا بھی محال تھا، باوجود کہ اس کی سانسوں سے پھوٹتی ہوئی شراب کی بُو مجھے ناگوار لگ رہی تھی۔

میں عمومی طور پر اپنی قسمت کے پیدا کردہ ہیر پھیر پر حیرت زدہ رہا کرتا تھا۔ چندو کے سفر کی روئیداد سن کر میں ششدر رہ گیا۔ نور پور سے بھی زیادہ پسماندہ بیٹ کے علاقے میں آنکھ کھولنے والی کتنی بدل گئی تھی اور بصد کوشش اس کے اُجلے بدن پر تضحیک آمیز مسافتوں کی ایک ذرا سی گرد بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اُسے دیکھ کر رائی بھر گمان نہیں ہوتا تھا کہ اس کا تن بیٹ کی مٹی سے اور من بے پناہ ظلم سے سینچا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی بے پناہ معصومیت اس کے دُکھوں اور موجودہ گھناؤنے کردار کو چھپائے رکھتی تھی۔ وہ بیسیوں افراد کی قاتلہ اور جرائم کی دنیا کی مہارانی قرار پانے کے باوجود الھڑ سی یونیورسٹی گرل دکھائی دیتی تھی۔

میں نے بیڈ کے فوم پر پھیلی ہوئی بانہیں اُٹھائیں اور اُس کے سوئے بکھرے وجود کو بے اختیار بانہوں میں بھر لیا۔ وہ ایک ذرا کسمسائی پھر شانت ہوگئی۔ دل سے غبارِ خاطر جو تحلیل ہو گیا تھا۔ میں گھنٹہ بھر اپنے چہرے پر پھیلے ہوئے اس کے ریشمی بالوں اور شیمپو کی بھینی بھینی خوشبو کے سحر میں گرفتار رہا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کا پسِ منظر جان لینے کے بعد میں اس کی شخصیت کے جادوئی حصار سے نکل آتا یا وہ میری نظروں میں پست ہو جاتی مگر اس کے برعکس وہ میری رگِ جاں سے بھی قریب ہوگئی۔ خاص سے عام ہو کر دل کے چور خانوں میں براجمان ہوگئی تھی۔

میں نے کئی مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا تھا، 'کیا میں میڈم سے محبت کرنے لگا ہوں؟'

ہر مرتبہ میرے اور میرے لبوں تک آنے والے جواب کے درمیان غزالہ کا بھرپور وجود حائل ہو گیا اور میں میڈم کی محبت کا دم بھرتے بھرتے آہیں بھرنے لگا۔ آج پھر بے ساختہ جب ذہن میں یہی سوال اُبھرا اور میں نے جواب دینے کیلئے لب کھولے تو غزالہ عدم موجود تھی۔ اس کی یاد کی کسک سے ماورا ہو کر میں بڑبڑایا، ''ہاں! میں میڈم سے محبت کرتا ہوں؛ دل و جان سے۔''

دل پہلو میں گنگنانے لگا۔ وہ ہے تو جہان ہے۔ وہ نہیں ہے تو بھری دنیا کھوکھلی ہے۔ خالی ہے۔ اس کے گداز بدن کے ہر زیر و بم پر میری زندگی حسین سانسیں لیتی تھیں۔

کسی کو ٹوٹ کر چاہنے والا اُسے بھی توڑ دینا چاہتا ہو تو صورتِ حال خاصی بدل جاتی ہے۔

میں اپنے جذبات کی منہ زور رو میں بہہ گیا۔ بانہوں کے کھنچاؤ میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ میڈم

پر نیند کی گہری غنودگی اور شراب کا نشہ سوار تھا۔ سانس بھنچ گئی تو کسمسا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی، ''نہیں ناں..... سونے دو؛ نہ کرو.....''

وہ سو رہی تھی؛ ہر خوف اور تردد سے بے نیاز۔ میری آنکھیں بھی نیند کے بوجھ تلے دَب رہی تھیں مگر میں خود پر جبر کر کے جاگ رہا تھا اور اس کی سنائی ہوئی طویل کہانی کے بے ربط اقتباسات کو جی ہی جی میں دہرا رہا تھا۔ ایسے میں ہی نیند کی گہری وادی میں اُتر گیا۔

❖❖○❖❖

سہ پہر کے چار بج چکے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ اِرد گرد دیکھا۔ میڈم نظر نہیں آئی۔ آئینے میں باتھ روم کا کھلا ہوا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ مجھے سوتا چھوڑ کر ہوٹل سے یقیناً جا چکی تھی۔ اس پُر آسائش ہوٹل کے تھرڈ فلور پر واقع اس کمرہ نمبر تین سو پانچ میں کھلنے والی عشق کی جنت سمیٹی جا چکی تھی۔ بھرپور نیند لینے کے باوجود مجھ پر کسلمندی سوار تھی۔ انگڑائی لے کر بیڈ سے اُترا۔ میڈم شکیلہ کا سگریٹ کیس اور لائٹر بیڈ کے وسط میں پڑا تھا۔ میری نگاہ اس سے پھسل کر میز پر پیپر ویٹ کے نیچے پڑے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ یہ ہوٹل کے لیٹر پیڈ کا ورق تھا۔ اس پر میڈم نے لکھ چھوڑا تھا؛ 'بیدار ہوتے ہی سی ون پہنچ جانا'

اچانک میری تمام تر سستی کافور ہو گئی۔ اس مختصر سے جملے نے مجھے یاد دِلا دیا کہ میرے والدین کا سفاک قاتل رنگو قصائی سی ون میں مقید تھا اور میڈم شکیلہ نے اُسے گولی مارنے کے بجائے مجھے بطور تحفہ عنایت کیا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش یک لخت تیز ہو گئی اور میں جبڑوں کے اعصاب تھرتھراتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ تیار ہو کر ہال میں آیا۔ جب میں ایک رکشا کو اپنی جانب آتے دیکھ کر رُک گیا تھا، مجھے خیال آیا کہ میں نے تو ابھی تک سی ون دیکھ ہی نہیں رکھا اور نہ مجھے اس کے محل وقوع کا اندازہ تھا۔ میں نے فون پر میڈم سے رابطہ کیا۔ اس سے دریافت کیا تو اس نے عجلت بھرے انداز میں زوم ان کمپیوٹر کالج میں پہنچ کر پیا جی سے ملنے کا حکم صادر کیا اور فون بند کر دیا۔

چھ بجے کے لگ بھگ میں زوم ان کالج کے گیٹ پر رکشا سے اُترا۔ پیا جی کی گاڑی پارکنگ میں موجود تھی۔ میں پہلے یہاں آ چکا تھا اور میڈم کی صدارت میں ہونے والی گینگ کے ماسٹرز کی اہم میٹنگ میں شامل ہو چکا تھا۔ خیال آیا کہ اس کمپیوٹر کالج کے تہہ خانے کو ہی سی ون کا نام دیا جاتا ہو گا مگر گن مین کی رہنمائی میں جب میں پیا جی کے پاس پہنچا تو اُسے اپنے

ساتھ چلنے کیلئے تیار پایا۔ اس نے بتایا، ''میڈم نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں سی ون لے جاؤں اور جب تک تم وہاں رہو، تمہارے ساتھ رہوں۔ چلو! میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔''

ہم دونوں جلیل آباد سے نکلے۔ مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ میں نے کسی ہوٹل میں چلنے کا کہا۔ ڈیرہ اُڈا کے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد ہم نے سی ون کا رُخ کیا۔ رنگیل پور میں واقع ایک بڑے سے پولٹری فارم کی پارکنگ لاٹ میں گاڑی روک کر پیا جی نے مجھے اُترنے کا اشارہ کیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی پولٹری فیڈز کی مخصوص بدبو نے آڑے ہاتھوں استقبال کیا۔ بے اختیار میں نے نتھنے بند کر لیے۔ پیا ہنس کر بولا، ''ناک سے ہاتھ ہٹالو۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ سمیل ختم ہو جائے گی۔''

میں نے حیرت سے کہا، ''کیا مطلب؟ یہ کہاں ختم ہونے والی ہے؟''

وہ پھر ہنسا۔ بولا، ''تم نے وہ کہاوت نہیں سنی؟''

''کون سی؟''

''ایک لڑکی کا کسی قصائی سے بیاہ ہو گیا۔ قصائی کے گھر میں اُس کا استقبال کھالوں کی تیز بو نے کیا۔ اس نے بھی تمہاری طرح ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔ چند دن اسی تکلیف دہ عالم میں گزرے پھر بُو ختم ہو گئی۔ وہ اپنی ساس سے کہنے لگی کہ میں نے تمہارے گھر میں آ کر کھالوں کی بدبو ختم کر دی ہے۔''

میں نے بے ساختہ پوچھا، ''کیا مطلب؟ اس نے کس طرح بدبو ختم کی؟ کیا اپنے میاں کو کاروبار بدلنے پر مجبور کر دیا؟''

پیا نے میرا ہاتھ تھاما۔ متوازی بنے ہوئے تین پولٹری شیڈز کی طرف بڑھتے ہوئے ہنسا۔ بولا، ''شہریار! تم بھی تھوڑی دیر بعد یہ کہنے کے قابل ہو جاؤ گے کہ تم نے فارم کی بدبو ختم کر دی ہے۔ بھلا کیوں؟ اس لیے کہ تم اس بدبو کے عادی ہو جاؤ گے اور تمہیں بُری نہیں لگے گی۔ اسی طرح قصائیوں کی بہو بھی چند دنوں میں اس بو کی عادی ہو گئی تھی۔''

اس نے درست کہا تھا۔ انسان جس ماحول میں تھوڑا وقت گزار لے، وہاں کا عادی ہو جاتا ہے۔

چند لمحوں بعد ہم برابر چلتے ہوئے پولٹری شیڈز کے قریب پہنچ گئے۔ برآمدے کی شکل کی لمبی لمبی عمارتیں جن کے پہلو ترپال کی بنی ہوئی چقوں سے ڈھکے ہوئے تھے، سے کچھ فاصلے پر چھ سات کرسیاں پڑی تھیں۔ میز کے پیچھے بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر شخص حلیے اور طور انداز سے فارم کا منیجر

لگ رہا تھا جبکہ اس کے سامنے ایک باوردی سکیورٹی گارڈ اور ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر تپاک سے پیا جی کا استقبال کیا۔ پیا نے ان کی مستفسرانہ نظروں کے جواب میں میرا تعارف کرایا، ''یہ ماسٹر شہریار ہے..... میڈم اس پر بہت بھروسہ کرتی ہیں۔''

پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا، ''شہریار! یہ عمیر پولٹری فارم ہے۔ اس کے نیچے ایک بہت بڑا تہہ خانہ ہے جس کو ہم نے سی ٹو کا نام دے رکھا ہے۔''

میں نے توصیفی انداز میں سر ہلایا۔ بلاشبہ یہ بہت پرسکون جگہ تھی۔ اطراف میں دور دور تک کوئی رہائش گاہ نہیں تھی۔ پولٹری فارم کے وسیع و عریض رقبہ کے چہار اطراف آر سی سی پلرز کے ذریعے خاردار تار لگائی گئی تھی۔ ایک ہی سیدھ میں تین شیڈ جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر تعمیر شدہ دو نسبتاً کم طویل شیڈ دکھائی دے رہے تھے۔ خالی جگہ پر چارہ کاشت کیا گیا تھا۔ مین گیٹ کے ملحقہ دفتر کے پیچھے بڑا سا چھپر دکھائی دے رہا تھا جس میں دو بھینسوں سمیت پانچ چھ مویشی کھڑے تھے۔ یہ موقع محل خالصتاً دیہاتی عمومیت کی حامل اور پیشہ ورانہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ سی ون کا یہاں تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تعارفی گفتگو کے بعد مجھے پیا نے بتایا کہ یہاں تین گن مین ہر وقت ڈیوٹی پر موجود رہتے ہیں۔ منیجر اور سیاہ فام محی الدین عرف میو کے علاوہ دس کے قریب ملازم چوزوں کی دیکھ بھال، خوراک کی ترسیل اور صفائی ستھرائی پر مامور تھے۔ چونکہ وہ گینگ کے لوگ نہیں تھے بلکہ سیدھے سادے مزدور طبع افراد تھے، اس لیے وہ سی ٹو کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور شکر بجالاتے تھے کیونکہ اس فارم پر مزدوروں کی تنخواہ دیسیب کے دوسرے فارمز کی نسبت سے دوگنا تھی۔ گاہے بگاہے میڈم ٹپ بھی دے جایا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سبھی مزدور دل ہی دل میں میڈم کی آمد کی دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

رسمی گفتگو کے دوران میو ہمارے لیے دیسی ساخت کے پیالوں میں چائے بھر لایا۔ بولا، ''ماسٹر! یہ خالص دودھ پتی ہے۔ پیو گے تو جی خوش ہو جائے گا۔ شہری طوطے اس خالص چوری کو پچا (ہضم) بھی نہیں سکتے۔''

میں نے پیالہ لبوں سے لگایا۔ اس نے درست کہا تھا۔ چائے کی مہک اور پہلے گھونٹ نے ہی پروین کے ہاتھ کی چائے کی یاد تازہ کر دی تھی۔ وہ میری چائے میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ملایا کرتی تھی۔ پینے میں چند لمحے دیر ہو جاتی تو بالائی کی موٹی تہہ جم جایا کرتی تھی۔ ذائقے

اور خوشبو کے لحاظ سے نور پور اور ملتان شہر کی چائے میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پروین کی یاد آئی تو پہلو میں درد سا اُٹھا اور میں گرد و پیش سے کٹ گیا۔ یہ کیفیت کافی دیر تک مجھ پر حاوی رہی جس سے سر جھٹک کر میں نے نجات حاصل کی اور جس کام کی غرض سے یہاں آیا تھا، اُس کے بارے سوچنے لگا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ پیا نے چائے کا پیالہ کرسی کے پائے کے ساتھ زمین پر رکھا اور مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے شیڈ کے طویل برآمدے کے پچھواڑے میں آئے۔ چارے کے کھیت کے وسط میں ایک پتلی سی پگڈنڈی خاردار تار تک جاتی دکھائی دی۔ چند قدم پگڈنڈی پر چلنے کے بعد پیا دائیں ہاتھ مڑ گیا۔ چارے کے کھیت میں دو چار قدم چلا پھر رُک گیا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر بولا، ''یہ ٹارچ اور ریوالور پکڑو اور اللہ کا نام لے کر اِس ڈھکن کو اُٹھا کر نیچے اُتر جاؤ۔ راستہ اور شکار تلاش کرنا تمہارا کام ہے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رنگو قصائی بندھا ہوا ہے۔ اس سے جو بھی سلوک کرنا چاہو، کرو، وہ حرامی جان سے جاتا ہے تو بھلے چلا جائے، پروا نہیں کیونکہ ہم نے اُس کا اچار نہیں ڈالنا۔ کچھ چاہیے ہو تو ہال کے بڑے سوئچ بورڈ پر نچلے کونے والا بٹن پش کر دینا۔ فوراً رابطہ ہو جائے گا۔''

میں نے لہلہاتے ہوئے پودوں کے بیچ میں مذکورہ ڈھکن دیکھا۔ بمشکل ڈیڑھ فٹ قطر کا تھا جس کی کناری لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک ہک لگی ہوئی تھی جس کی مدد سے ڈھکن اُٹھایا جا سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں میڈم کی ذہانت کی داد دی۔ رہنمائی کے بغیر سی ون کے دہانے کو تلاش کرنا بعید از فہم تھا۔ اس نے ایسے معاملات میں انسانی نفسیات کو بڑی عمدگی کے ساتھ مدِ نظر رکھا تھا۔ میں نے ممنونانہ نظروں سے پیا کو دیکھا، ٹارچ اور ریوالور تھاما اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بے تکلف انداز میں میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا، ''شہریار! مجھے اُستاد نصری نے ایک مرتبہ نصیحت کی تھی کہ دشمن کو اس وقت نہیں مارنا چاہیے جب وہ موت مانگ رہا ہو بلکہ اس وقت اس کا سر تن سے جدا کیا جانا چاہیے جب اس کے دل میں زندگی کی امنگ ہلکورے لینے لگے۔ میں یہی نصیحت تمہیں عین اُس وقت کرتا ہوں جب تم اپنے دیرینہ دشمن کو مار کر اپنے اندر جلتے ہوئے الاؤ کو بجھانے جا رہے ہو۔ محبت کی طرح انتقام بھی مکمل ہونا چاہیے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ ڈھکن اُٹھا کر ایک طرف رکھا اور

گھپ اندھیرے میں اُتر گیا۔ جونہی پیا جی نے ڈھکن اپنی جگہ پر رکھا، اندھیرے میں ایک دم اضافہ ہو گیا اور ہاتھ کو ہاتھ بھجائی دینا موقوف ہو گیا۔ میں نے ٹارچ روشن کی۔ روشنی کے ننھے سے مگر خاصے تیز دائرے نے مجھ پر آشکار کیا کہ میں دو فٹ کے لگ بھگ قطر اور چھ سات فٹ اونچائی والے گول پائپ میں کھڑا تھا جس کے سر پر ڈھکن نصب تھا۔ میرے پیروں تلے پختہ فرش تھا۔ اس پائپ نما جگہ کا جائزہ لینے پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے پیروں کے قریب ایک سرنگ کا دہانہ موجود تھا جس کا رُخ پولٹری شیڈز کی طرف تھا۔ میں فرش پر بیٹھ کر اس سرنگ میں داخل ہو گیا جو بمشکل اتنی ہی چوڑی اور بلند تھی کہ ایک آدمی گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے اس میں سے گزر سکتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اتنا ہی فاصلہ طے کیا جتنا شیڈ کے پچھواڑے سے سرنگ کے دہانے تک چارے کے کھیت میں طے کیا تھا کہ اس سرنگ کا ایک قدرے کھلے باکس میں اختتام ہو گیا۔ اس باکس میں خاصی خنکی تھی۔ ہوا کا دباؤ بھی کم تھا۔ عجیب طرح کی سیلن محسوس ہو رہی تھی جبکہ فرش پر جوتوں کے سول کے برابر پانی کھڑا تھا۔

میں ابھی باکس کی ساخت پر غور کر رہا تھا کیونکہ مجھے پہلی نظر میں باکس سے کہیں جانے کا راستہ دکھائی نہیں دیا تھا، کہ اچانک سامنے والی دیوار دروازے کی طرح کھل گئی۔ یوں لگا جیسے اندر سے کسی نے دروازہ کھولا تھا مگر میں نے ٹارچ کی روشنی میں کسی شخص کو دیوار ہٹنے سے پیدا ہونے والے خلا میں کھڑے نہیں دیکھا۔ یقیناً پیا جی نے اوپر سے کسی میکانزم کے تحت اِسے کھولا تھا۔ میں اس دس فٹ طویل مگر کشادہ گیلری میں چلتا ہوا بڑے سے آہنی دروازے تک آیا۔ وہ غیر مقفل تھا اس لیے میرے دھکیلنے پر کھل گیا۔ ایک بہت بڑا کمرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں کمرے کے وسط میں پہنچ کر رُک گیا۔ گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ لکڑی اور گتے کی بنی ہوئی اَن گنت پیٹیاں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی اور ان میں اسلحہ یا منشیات بھری ہوئی تھیں۔

میں ان کے بیچ چلتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ میری آنکھوں میں جہاں تجسس کی پرچھائیاں رقصاں تھیں وہاں میرے اندر کی تمام تر نفرت بھی رَچی ہوئی تھی۔ میں جلد از جلد رنگو قصائی تک پہنچ کر اپنے سینے کی برسوں سے جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ پیا جی نے مجھے فارم ہاؤس پر ٹریننگ دیتے ہوئے اپنے غصے اور اشتعال پر قابو پانے کا نہ صرف حکم دیا تھا بلکہ کئی ترکیبیں بھی بتائی تھیں۔ میں نے ایک ترکیب پر عمل کرتے ہوئے ایک پیٹی کو اُٹھا کر دوسری رو

میں رکھ دیا۔ پیٹی خاصی بھاری ہونے کی وجہ سے میرے ہاتھوں چھوٹے چھوٹے بچی۔ اُسے سنبھالنے اور اُٹھا کر دوسری رو کی پیٹیوں پر رکھنے کے دوران میری توجہ بٹ گئی جس سے فائدہ یہ پہنچا کہ وقتی طور پر رنگو قصائی کی طرف سے دھیان ہٹ گیا۔ یہی پیا جی نے سمجھایا تھا۔

محبت کی طرح نفرت کے جذبے میں بھی غضب کا ہیجان اور قوت مضمر ہوتی ہے۔ برسوں پہلے رنگو قصائی کا دہشت ناک چہرہ میں نے اپنے گھر کے غلے والے بھڑولے کے سوراخ میں سے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ تب مجھے یہ چہرہ پہلی مرتبہ دکھائی دیا تھا۔ میں اس وقت بہت کم عمر تھا۔ بچہ تھا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ سے نابلد تھا۔ مستزاد یہ تھا کہ والدین کی فوتگی کے بعد میں اپنی بہن کے ساتھ چاچا چراغ کی کفالت میں آ گیا تھا جس کے اپنے معاشی حالات کمزور تھے۔ کم عمری اور غربت کی وجہ سے میں اس درندے کی تلاش میں نہ نکل سکا۔ لڑکپن اور اوائل جوانی میں دگرگوں معاشی حالات کے باوجود میں نے کھالے کی معیت میں اُسے تلاش کرنے کی اوپر تلے کئی کمزور اور ناکام کوششیں کی تھیں۔ چند ایکڑ زمیندارے کے بل پر اس بھری پری دنیا میں آنکھ اوجھل ہونے والا پہاڑ نہیں ملتا، ایک عام خال وخط والا انسان کیسے تلاش کیا جا سکتا تھا۔

ہاں! میں ایک کام کر سکتا تھا۔ وہ کرتا رہا۔ اس چہرے کو بار بار چشمِ تصور میں لا کر زندہ کرتا رہا اور میں نے اسے فراموش نہیں ہونے دیا تھا۔ لانبے قد والے شخص کا جھکا ہوا مگر تھوڑا سا اُٹھا ہوا بڑی مونچھوں والا خونخوار چہرہ، غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی دہشت ناک آنکھیں اور چہرے کے تاریک پسِ منظر میں خون کی سرخ آمیزش..... میری دنیا کے ہزاروں مناظر سے ناآشنا نگاہوں نے کیمرے کی طرح بھڑولے سے نظر آنے والے اس چہرے کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا تھا اور میری خاموش ریاضت نے آج تک اس چہرے پر وقت کی گرد نہیں پڑنے دی تھی۔

پھر حالات کے گھن چکر میں پس کر میں چاچے چراغ کے گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔ ایسے میں قسمت نے یاوری کی اور مجھے میڈم شکیلہ سے ملا دیا۔ وہ زندگی کی کٹھنائیوں سے روشناسی کا جانکاہ سفر مجھ سے پہلے طے کر چکی تھی اور پختہ کار ہو کر زمانے سے چابکدستی کے ساتھ نبرد آزما تھی۔ اس کے طاقت ور گروپ میں حادثاتی طور پر شامل ہونے کے بعد پہلے مشن کی تکمیل کیلئے دوآبے میں میاں دلبر حسین کی حویلی میں پہنچا تو وہاں غیر متوقع طور پر مجھے اپنے والدین کا قاتل چہرہ دکھائی دے گیا۔ تب مجھے اس کا نام معلوم ہوا۔ میں سخی محمد کو ساتھ لے کر خانزادی اسما کو اس کے حوالے کرنے اور اس کے دام کھرے کرنے کیلئے سنسان اور دہشت بھرے ماحول میں

میاں دلبر حسین کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچا تھا۔ دو کروڑ روپوں کی وصولی اور اسما کی ترسیل کے دوران مجھے اس کا خوفناک چہرہ زندگی میں دوسری مرتبہ دکھائی دیا تھا۔ وہاں بھی مجھے اپنے اندر دہکتے ہوئے لاوے پر صبر کے چھینٹے مارنا پڑے تھے کیونکہ نہ صرف وہ میرا پہلا مشن تھا جسے میں ہر صورت پایہ تکمیل تک پہنچا کر میڈم کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتا تھا بلکہ میاں دلبر حسین کی کمین گاہ میری معمولی سی غلطی کے سبب میرے لیے خوف ناک مقتل ثابت ہو سکتی تھی۔ تبھی میں اس پرخواہش کے باوجود ہاتھ نہ ڈال سکا۔ آج تیسری مرتبہ اس نے مڈبھیڑ ہونے والی تھی اور اُسے میرے انتقام کی بھینٹ چڑھنے سے روکنے والی کوئی قوت حائل نہیں تھی۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور عمر بھر کی سنبھال کر رکھی ہوئی نفرت آنکھوں میں آ کر لاوہ بننا چاہتی تھی۔

میں کچھ دیر تک ریوالور انگلی پر گھماتے ہوئے اس سٹور کی طرز کے بڑے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ آنکھوں کے سامنے بار بار بڑے بڑے سرخ دائرے ناچنے لگتے تھے جن سے میں سر جھٹک کر نجات حاصل کرتا تھا۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے وہی دریدہ جذبات منظر ابھر آیا۔ میں مٹی کے بھڑولے کے اندر گیہوں پر کھڑا تھا جبکہ پروین کا لرزتا ہوا وجود مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ فرطِ خوف سے ہماری زبانیں گنگ اور حواس مختل تھے اور تیز دھڑکنیں کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

میرے مقتول باپ کا نام امام دین تھا۔ بہت گھبرو اور خوب صورت جوان تھا۔ اس کی خوبصورت جوانی کو وسیب والوں نے ''سوہنا خان'' کا عنوان دے رکھا تھا۔ میری ماں کا نام رضیہ تھا۔ دیہاتوں میں عمومی طور پر نام کو بگاڑ کر سہل اور مختصر کر لیا جاتا ہے۔ اسے بھی 'رجو' کہا جانے لگا۔ ان دونوں کو میری آنکھوں کے سامنے رنگو قصائی نے خون میں نہلا دیا تھا۔ اس کے ساتھ دو ڈھاٹا پوش بدمعاش بھی تھے۔ اس نے بھی ڈھاٹا اوڑھ رکھا تھا مگر اتفاق سے ڈھاٹا کھسک گیا اور میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔

میں اور کھالے نے پیشہ ور جاسوسوں کی طرح سوہنا خان اور رجو کی زندگی کے واقعات کھوج ڈالے تھے۔ رشتہ داروں اور دونوں کے ملنے جلنے والوں کو کئی کئی مرتبہ کرید کر پوچھا تھا مگر نہ تو ان کا کوئی جرم ہم پر آشکار ہوا اور نہ ہی ان کے کسی جانی دشمن کا نام سامنے آیا۔ آجا کے ایک زمین کے ٹکڑے کی توجیہہ سامنے آئی جس کا مرکزی کردار فریدن خان تھا۔ کاغذات کی دیکھ پرکھ کے نتیجے میں پتہ چلا تھا کہ میرے باپ نے اپنی موت سے چھ سات سال قبل فریدن

خان نامی شخص کے ہاتھ اپنی اراضی بیچ دی تھی۔ چونکہ فریدن خان خود کاشت پر ٹھیکے داری کو ترجیح دیتا تھا، اس لیے اس نے خریدنے کے بعد یہ زمین میرے باپ کو ٹھیکے پر دے رکھی تھی اور میرے باپ نے بوجوہ اپنے خاندان کو ان معاملات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ میرے والدین کے اندوہ ناک قتل کے بعد فریدن خان نے کسی اور کو زمین پر مزارعہ بٹھا دیا۔ مجھے بصد کوشش کے فریدن خان نہیں ملا تھا۔ اس کا نام دوسری مرتبہ میری نظروں کے سامنے اُس وقت آیا جب حیدر خان کے بھیجے ہوئے غنڈوں نے چاچا چراغ سے زمین کی دستاویز پر انگوٹھے لگوا کر چاچی سمیت زندہ جلا دیا تھا۔ اگر میں اُس وقت موقع پر نہ پہنچ جاتا تو میرے خاندان کا کوئی فرد بھی زندہ نہ بچتا اور ہماری تمام تر اراضی اُسی فریدن خان کے نام منتقل ہو جاتی۔ جس طرح چاچے چراغ دین سے انگوٹھے ثبت کروائے گئے تھے، یعنہ میرے باپ سوہنا خان سے بھی چھ سات سالہ پرانی دستاویز پر انگوٹھے لگوائے گئے تھے۔

مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ میرے باپ کی کسی سے بالخصوص رنگو قصائی سے کوئی دشمنی تھی نہ لین دین ہی کا تنازع تھا۔ رنگو قصائی آج کی طرح ان دنوں بھی کسی بڑے کا مہرہ تھا۔ اس نے کسی کے حکم پر اتنا بڑا قدم اُٹھایا تھا۔ اب اصل آدمی تک مجھے یہی بدبخت پہنچا سکتا تھا اور اسے مرنے سے پیشتر یہی کام کرنا تھا۔ بعید نہیں تھا کہ یہ اس واقعے کے پسِ منظر سے بھی آگاہ ہوتا جس نے سوہنا خان کو خاک و خون میں نہلا دیا تھا۔ یہی سوچ کر کہ مجھے اس سے بہت کچھ اگلوانا تھا، میں نے اپنے اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کی اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس کا سامنا کرنے کیلئے خود کو تیار کیا۔ جب میں اپنی کیفیت سے قدرے مطمئن ہو گیا تو میں نے طائرانہ نظروں سے اس بڑے کمرے میں کھلنے والے ہال کے دروازے کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ سی ٹو اور نور پور میں واقع سردار یار خان کی حویلی کے تہہ خانوں کے میکانزم کو دیکھ لینے کے بعد 'سی ون' کا جادوئی ماحول میرے نزدیک زیادہ پیچیدہ اور حیران کن نہیں تھا۔ میں نے جلد ہی سامنے والی اسپاٹ دیوار کے ایک حصے میں دروازے کی موجودگی بھانپ لی۔ اسے کھولنے کی کوشش میں جلد ہی مجھے پلستر شدہ دیوار پر ایک ہلکا سا ابھار مل گیا۔ اسے دبایا، تھپتھپایا پھر زور سے پیچھے دھکیلا، کچھ نہ ہوا تو میں نے جھنجھلا کر کھڑی ہتھیلی کی زوردار ضرب رسید کر دی۔ دیوار کا تین ضرب چھ کا چوکور ٹکڑا خودکار انداز میں پیچھے ہٹنے لگا تو میں ایک طویل سانس لے کر رُک گیا۔ دیوار ہٹنے سے پیدا ہونے والے خلا سے تیز روشنی جھلک رہی تھی۔ چند لمحوں بعد میں اس وسیع و

عریض ہال میں کھڑا تھا جس کی داہنی دیوار کی جڑ میں مردہ چھپکلی کے سے انداز میں رنگو پڑا ہوا تھا۔ یہاں اس کے علاوہ کسی اور کی موجودگی کی توقع نہیں تھی، اس لیے میں نے اسے فوری طور پر رنگو قصائی ہی قرار دیا۔ ایک ذرا رُک کر میں نے نو انچ موٹی دیوار کے اتنے ہی موٹے دروازے کو بند کرنے کی کوشش کی مگر فوری طور پر مجھے اس کے آپریشن کی سمجھ نہ آئی جس کی وجہ سے میں مجبوراً اسے کھلا چھوڑ کر نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا رنگو کی طرف بڑھ گیا۔

قریب پہنچنے پر مجھے احساس ہوا کہ وہ گہری نیند میں تھا یا بے ہوش تھا۔ اسے ہوش میں لانے سے پیشتر میں نے ہال کا سرسری انداز میں جائزہ لیا۔ مشرقی دیوار میں دو چوبی دروازے دکھائی دیے۔ جھانک کر دیکھنے پر پتہ چلا کہ ایک دروازہ نہایت آرام دہ بیڈروم کا تھا جس میں ہال کی جانب والی دیوار پر ایک قدِ آدم کنٹرول پینل نصب تھا۔ پینل پر اَن گنت بٹن اور ننھے ننھے بلب دکھائی دے رہے تھے۔ دو بلب روشن تھے جبکہ ایک مسلسل بلنک کر رہا تھا۔ بیڈروم سے متصلہ کمرہ کچن کم اسٹور تھا۔ اس کمرے کی ایک دیوار میں بڑی چوبی الماریاں نصب تھیں جبکہ دوسری دیوار میں سنک، چولھا اور کراکری کیبنٹ وغیرہ دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں کمرے اٹیچڈ باتھ تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مخدوش حالات میں میڈم اپنے کارندوں کو انڈر گراؤنڈ کرنے کیلئے سی ون کو استعمال کرتی تھی کیونکہ یہاں کافی تعداد میں لوگوں کے ہنگامی قیام کا بندوبست تھا۔

جس دیوار کے ساتھ رنگو پڑا تھا، اس کے دونوں کونوں میں بھی ایک ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جبکہ دیوار پر کئی گول سوراخ بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک سوراخ میں سے چمکدار زنجیر لٹک رہی تھی۔ میں بیڈروم سے ڈریسنگ اسٹول نکال کر رنگو کے پاس آ گیا۔ اپنی توجہ اس حد تک بٹانے کے باوجود میرا تنفس قدرے تیز تھا۔

وہ پہلو کے بل دیوار کے ساتھ چمٹا پڑا تھا۔ اس کے توانا اعصاب اور گھنے سیاہ بالوں والے بدن پر محض ایک ہاف ٹراؤزر تھا جو اسے خاصا تنگ تھا۔ باقی تمام بدن ننگا تھا اور دونوں ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ غور کرنے پر مجھے اس کی گردن میں اسٹین لیس اسٹیل کا انچ بھر موٹا کڑا دکھائی دیا۔ گردن کے پچھلے حصے میں جا کر یہ کڑا ایک چمکدار اسٹیل کی زنجیر سے منسلک تھا جسے میں نے بیڈروم کے دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ زنجیر کی غیر معمولی مضبوطی چھوئے بغیر محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں رنگو کے انا غفیل وجود کے قریب ہو کر بیٹھ گیا اور اسٹیل کے کڑے کا جائزہ

لینے لگا۔ وہ زنجیر سے براہِ راست منسلک تھا یعنی ویلڈ کیا گیا تھا۔ کڑے میں کوئی لاک یا کلب دکھائی نہ دیا تو مجھے ایک ذرا حیرت ہوئی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ کڑا کھلتا نہ ہو۔ اُسے سر سے گزار کر گردن تک پہنچایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ایسی حالت میں اُسے باآسانی یا بدقت اُتارا بھی جا سکتا تھا جبکہ وہ خاصا تنگ تھا۔ غور کرنے پر کڑے کے اگلے حصے میں یعنی نرخرے کے پاس ایک لکیر اور نٹ نظر آ گیا۔ یہ مخصوص ساخت کا نٹ صرف "L Key" سے ہی کھلتا تھا اور اسے ہاتھ سے، عام پیچ کس کے ساتھ یا کسی نوکدار شئے کی مدد سے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

کڑے سے جڑی ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی مضبوط زنجیر دیوار کے ایک گول سوراخ میں غائب ہو رہی تھی۔ ایسے ہی چار سوراخ اور بھی دیوار میں موجود تھے۔ یعنی اس دیوار کے ساتھ پانچ قیدیوں کو پابندِ سلاسل کیے جانے کا انتظام تھا۔ رنگو کے بائیں ہاتھ والا چوبی دروازہ نیم وا تھا۔ دکھائی دیا کہ وہ عام نوع کا ٹائلٹ تھا۔ شاطر میڈم کے دوسرے طلسم کدوں کی طرح یہاں بھی عقلِ انسانی کو تحیر زدہ کرنے کا خاصا سامان موجود تھا۔ مجھے حیران کرنے کیلئے تو یہ عجیب الوضع کڑا ہی بہت تھا جس نے ایک لحیم شحیم سورے کو زخم خوردہ کتے کی طرح زمین چاٹنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ وہ جس قماش کا شخص تھا، اس سے توقع کی جا سکتی تھی کہ اس نے اس کڑے سے سر نکالنے یا اِسے کھولنے اور توڑنے کی بھرپور کوششیں کی ہوں گی اور ناکام ہونے پر اس نے شکست تسلیم کی ہوگی۔

میں نے زنجیر کی لمبائی کو مدنظر رکھ کر اسٹول تھوڑا پیچھے کر لیا تاکہ رنگو اگر مجھ پر حملہ کرنا بھی چاہتا تو مجھ تک نہ پہنچ سکتا۔ اُسے ہلانا جلانا بے سود رہا تو میں نے جوتے کی نوک پوری قوت سے اُس کی پسلیوں میں دے ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ چند لمحے خالی خالی آنکھوں مجھے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے کے تاثرات میں شناسائی کا گمان غالب آ گیا۔ مجھے پہچانتے ہی اس کی آنکھوں میں خشونت بھر گئی۔

میں اس دوران اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔

''ہاں بھئی.....!'' میں نے اپنے تئیں بہتیری کوشش کی کہ میرے قلب و ذہن میں کھولتا ہوا لاوا میرے لبوں تک نہ پہنچ پائے مگر بے ساختہ کئی ناقابلِ اشاعت گالیاں میرے لبوں سے پھسل گئیں، ''پہچانا مجھے؟''

اس کے ہونٹ فرطِ تضحیک سے بھنچ گئے۔ آنکھوں میں نفرت پھیل گئی۔ پنجابی لب و لہجے

میں بولا، ''ہاں! تمہارے جیسے بھونکنے والے کتوں کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا۔''

یہ میری گالیوں کا ردِعمل تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بھڑک کر اس پر حملہ آور ہوتا، مجھے میڈم کا بارہا دیکھا ہوا رویہ یاد آ گیا اور میں تھم گیا۔ یہ اس کا کمالِ فن تھا کہ جب میرے نزدیک اُسے فطری طور پر شدید غصے کی حالت میں ہونا چاہیے تھا، وہ ہرگز غصے میں دکھائی نہیں دی تھی۔ میرے خیال میں جب اُسے پریشان اور حواس باختہ نظر آنا چاہیے تھا، وہ مکمل طور پر اپنے حواس میں ملی۔ اسے خود پر اختیار تھا کہ دل کی کیفیت کو کبھی چہرے تک نہیں آنے دیتی تھی۔ جب اُس نے فارم ہاؤس میں میری تربیت کا عملی امتحان لیا تھا اور ظفری ڈکیت اور امجد کے ہاتھوں ہم دونوں اغوا ہوئے تھے، اُس دن کار میں بیٹھنے کے بعد اُس نے ظفری ڈکیت اور امجد سے اچانک بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سگریٹ مانگ کر مجھے حیران کر دیا تھا۔ اُس کے چہرے بشرے سے ذرا بھر گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ اغوا ہو چکی ہے اور ان اسلحہ برداروں کے رحم و کرم میں تھی۔ خود کو نہایت لاپروا ثابت کرتے ہی اُس نے کایا پلٹ کر دونوں کو نیچا دکھا دیا تھا۔ یہی اُس کا ہنر تھا اور اِس وقت مجھے بھی ایسی ہی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ تبھی میں زبردستی مسکرایا اور لہجہ نارمل رکھتے ہوئے بولا، ''چلو شکر ہے کہ تم نے مجھے پہچان تو لیا۔ اب یہ بھی بتا دو کہ تم یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہو؟ کیا تمہیں علم ہے؟''

وہ ایک ہنکارا بھر کر خاموش رہا۔

میں نے تاؤ دلانے کے سے انداز میں کہا، ''عجیب شاہ زور ہو، ایک کڑا بھی نہیں کھول پائے اتنے دنوں میں!''

اس نے میرے لب و لہجے میں چھپے گہرے طنز کو محسوس کر لیا اور منہ بنا کر بولا، ''یار! انٹ شنٹ باتیں مت کرو اور جس کام کیلئے آئے ہو، وہ کرو اور چلتے بنو۔''

اس کا لہجہ خالصتاً پنجابی اور روایتی انداز میں کڑک دار تھا۔ مجھ سے ذرا بھر خائف یا اپنے انجام کے بارے میں فکرمند دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے اعصاب خاصے مضبوط تھے۔ میں اُسے چند لمحوں تک ایک ٹک گھورتا رہا۔

وہ بولا، ''تم مقدر والے تھے جو دو آبے سے مال لے کر زندہ نکل آئے ورنہ میری مرضی کے بغیر وہاں سے آج تک کوئی زندہ لوٹ کر نہیں آیا۔ مگر یاد رکھو کہ ہر مرتبہ قسمت ساتھ نہیں دیا کرتی۔ اُس کتیا سے بھی جا کر کہہ دو کہ اُسے یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ میرے آدمی جلد یا

بدیر میرا کھوج نکالنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ پھر اس حرافہ اور اس کے تم جیسے گندے دلالوں کو بھری دنیا میں چھپنے کی جگہ نہیں ملے گی۔ جاؤ، اُسے جا کر بتا دو۔"

اس نے میڈم کے بارے میں جو زبان استعمال کی تھی، وہ میری برداشت سے باہر تھی۔ میں آپے سے باہر ہوگیا اور بھوکے درندے کی طرح اُس پر جھپٹا۔ وہ بے خبر نہیں تھا۔ بجلی کی سرعت سے بیٹھے بیٹھے ہی پَرے کھسک گیا۔ میں اپنی ہی جھونک میں دیوار سے ٹکرایا۔ ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس کی زوردار لات میرے پہلو میں لگی۔ درد کی کٹیلی لہر میرے پورے بدن میں پھر گئی اور میں ایک بار پھر دیوار سے ٹکرا کر پہلو کے بل فرش پر ڈھے گیا۔ میں نے دانت پیس کر اُٹھنے کی کوشش کی تو اس کی دوسری لات میرے جبڑے پر کسی آہنی گرز کی طرح لگی اور میرا ذہن بری طرح جھنجھنا اُٹھا۔ سر جھٹک کر اپنے حواس بجالانے کی کوشش کی مگر آنکھوں کے سامنے چھایا ہوا اندھیرا چھٹنے سے قبل ہی اس نے میری گردن اپنے ہاتھوں کی فولادی گرفت میں لے کر پوری قوت سے دبا ڈالی۔ میری سانس سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ پھڑ پھڑا کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی مگر کم بخت کی انگلیاں میرے ماس میں اس بے دردی سے پیوست ہوگئیں کہ میں پوری کوشش کے باوجود نجات حاصل نہ کرسکا۔ جونہی میں نے پہلو بدل کر اس کی پسلیوں میں کہنی کی ضرب رسید کرنا چاہی تو اس نے گھٹنا میری ران پر دے مارا۔ اگر اس نے میری گردن نہ دبا رکھی ہوتی تو گھٹنے کی زوردار ضرب سے میرے حلق سے چیخ نکل جاتی۔

میں اپنی حماقت سے بہت بری طرح اس کے شکنجے میں جکڑا گیا تھا۔ سانس کی آمدورفت معطل ہوئی تو نہ صرف سینہ پھٹنے کو آ گیا بلکہ بدن کی قوت بھی سلب ہونے لگی تھی۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اس لحیم شحیم آکٹوپس سے نجات حاصل کرنے کی ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے اپنا داہنا پیر دیوار پر رکھا اور اپنے آپ کو پوری قوت سے پیچھے دھکیل دیا۔ میرے بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ ایک قدم پیچھے ہٹنے پر مجھے پہلو بدلنے کی مہلت مل گئی۔ وہ زنجیر میں جکڑا ہونے کی وجہ سے ایک حد تک میرے ساتھ کھنچ سکتا تھا اس لیے جونہی زنجیر کی گنجائش ختم ہوئی، اس کے بدن کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا اور میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر آزاد ہوگیا اور لڑکھڑاتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ گردن موڑ کر اُسے دیکھا تو ایک مرتبہ پھر حیران ہوگیا۔

اس کا گرانڈیل جسم جھٹکوں کی تال پر بری طرح لرز رہا تھا اور سرخی مائل چہرہ ایک دم پیلا پڑ

گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تڑپتا ہوا فرش پر گر گیا۔ بانہیں اور ٹانگیں بے ترتیب انداز میں فرش پر پھیل گئیں۔ سینہ دھونکنی بن گیا اور وہ آنکھیں بند کر کے ہانپنے لگا۔ اس کے منہ سے کریہہ خرخراہٹ بھی برآمد ہو رہی تھی۔ میں گردن سہلاتا ہوا اسٹول کی طرف بڑھا اور سوچنے لگا کہ اُسے اچانک کیا ہو گیا تھا؟

''اوئے ڈرامے باز! یہ کیا ناٹک کر رہے ہو؟'' میں نے اس کے ٹخنے پر ٹھوکر ماری۔

وہ کچھ نہ بولا بلکہ آنکھیں کھول کر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ وہ ناٹک نہیں کر رہا تھا بلکہ سخت تکلیف دہ مرحلے سے گزر چکا تھا یا گزر رہا تھا۔ چونکہ اس کے تاؤ دلانے پر میں ایک مرتبہ فاش غلطی کا ارتکاب کر چکا تھا اور اس کی نقد سزا بھی پا چکا تھا، اِس لیے میں اس کی نہ سمجھ میں آنے والی حرکات کے جواب میں دوسرا احمقانہ قدم نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنی آواز کو اشتعال اور عجلت سے مبرا رکھتے ہوئے خوش دلی کا مظاہرہ کیا، ''یہ عورتوں کے سے مکر و فریب چھوڑو اور اُٹھ کر بیٹھو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ چلو شاباش!''

اس کے حلق سے دردناک آہ برآمد ہوئی۔ نحیف سی آواز میں بولا، ''مکر نہیں..... ہائے! اس عذاب سے تو مجھے موت آ جائے، بہتر ہے۔''

''تم کس عذاب کی بات کر رہے ہو؟'' میں چونکا۔

اس نے بدقت تمام ہاتھ اُٹھایا۔ گردن تک لے جا کر کڑا تھام لیا۔ ہانپتے ہوئے بولا، ''اس..... اس میں کرنٹ آ جاتا ہے..... جب اسے تھوڑی سی بھی کھینچ پڑ جائے..... لعنت ہے؛ تم پر..... تم سب بزدل چوہوں پر۔ میں..... میں مرد ہوں۔ سینہ تان کر چلتا ہوں اور دشمن کے سینے پر وار کرتا ہوں۔ پیٹھ پیچھے حملہ نہیں کرتا۔ ہاہ! تم..... ہیجڑے ہو..... عورت کے پٹھو..... چھپ کر وار کرتے ہو مگر تمہیں ان کمینی حرکتوں کا حساب دینا پڑے گا۔''

میرے حلق سے ایک طویل سانس نکل گئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھوں کے مضبوط شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہا تھا اور اس عالم میں زنجیر کھنچ گئی تھی۔ عین اسی لمحے میں کہیں میں اس سے الگ ہو گیا تھا ورنہ عذاب گیس کرنٹ شاک مجھے بھی لگ جاتا۔ تب سمجھ میں آیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اتنی بے فکری سے کیوں آزاد چھوڑ دیے گئے تھے۔ وہ اگر کڑے کو چھیڑتا، کھینچتا یا زنجیر کو توڑنے کی کوشش کرتا تھا تو اُسے تیز شاک لگتا تھا۔ کرنٹ چونکہ براہِ راست انسانی خلیوں اور

خون کو گزند پہنچاتا ہے، اِس لیے انسان فوری طور پر حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ وہ بھی کئی مرتبہ حواس باختہ ہوا ہوگا، کئی مرتبہ لگنے والے جھٹکوں نے اُس کی جسمانی قوتِ مزاحمت کو بہت نقصان پہنچایا ہوگا۔

وہ دیوار کا سہارا لے کر اُٹھا اور لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد مجھ پر خشمگیں نگاہ ڈالتے ہوئے بولا، ''تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میرے ساتھ کی جانے والی یہ 'بے غیرتیاں' تمہیں کتنی مہنگی پڑیں گی۔''

میں نے کندھے اُچکائے، ''مہنگی پڑیں یا سستی؛ فی الحال تو تمہیں بھگتنی ہیں، بھگتو..... جان پر..... دل پر!''

''کیا تم لوگوں کو دوآبے والے واقعے پر غصہ ہے؟'' اس کی ذہنی کیفیت قدرے بحال ہو گئی تھی۔

''ہاں! مگر اس کے علاوہ ایک نہایت اہم حساب بھی تمہاری طرف نکلتا ہے۔ آج وہ بھی چکتا ہو جائے گا۔'' میرا لہجہ خنک ہو گیا تھا۔

''میں سمجھا نہیں!'' وہ حیران سے بولا، ''کون سا حساب؟''

میں کچھ دیر تک اُسے ٹٹولتی ہوئی نظروں دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا، ''رنگو! پہلی بات یہ ہے کہ دوآبے میں میرے اور سخی محمد کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا تھا، وہ غیر اہم واقعہ نہیں تھا مگر اس وقت میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہاری دھمکیوں کا مجھ پر یا میڈم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تم، تمہارے غنڈے یا آقا لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہاری تلاش میں جو شخص بھی اِدھر آ نکلا، وہ زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔ اس لیے کھوکھلی دھمکیاں دے کر میرا پارہ نہ چڑھاؤ اور فضول میں کسی کمک کا انتظار بھی نہ کرو۔ اگر تم چاہو تو آرام سے بیٹھ سکتے ہو۔ تسلی سے میری بات سن اور سمجھ سکتے ہو۔ میں کھل کھلا کر بات کرنے کا عادی ہوں۔ کیا سمجھے؟''

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر نقاہت بھرے انداز میں دیوار کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بولا، ''ہاں بولو! مجھ سے کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''

میں نے پوچھا، ''تم نے نور پور دیکھ رکھا ہے؟''

''نور پور؟''

''ہاں! سردار یارن خان والا گاؤں..... ہیں؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اس نے الجھے الجھے انداز میں سر ہلایا، ''ہاں تو!''

''آج سے بہت سال پہلے جب تم جوان ہوا کرتے تھے، تم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ نور پور کے ایک کاشتکار کے گھر آدھی رات کو حملہ آور ہوئے تھے۔ تم لوگوں نے اس شخص کو اس کی بیوی سمیت قتل کر دیا تھا۔ کیا تمہیں وہ واقعہ یاد ہے؟'' میرے روئیں روئیں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹ پڑی تھیں اور یوں لگا تھا جیسے اُس رات اور اِس لمحے کے بیچ میں موجود سارا عرصہ پل بھر میں غائب ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں پہلے الجھن پھر تردد کے ڈورے تیرے، چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا، ''میں نے زندگی میں کوئی ایک آدھ نہیں، بیسیوں ایسی وارداتیں کی ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کہ تم کس کاشت کار کی بات کر رہے ہو؟''

اس کے فاخرانہ جواب نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیے۔ میں بے اختیار چیخ کر اُٹھا مگر فوراً ہی اپنی آگ پر صبر کے چھینٹے مار کر بیٹھ گیا۔ بولا، ''رنگو! بکواس مت کرو۔ نور پور میں ہونے والی یہ اکلوتی واردات تھی جو تم نے کی۔ اپنے ذہن پر زور دے کر میرے سوال کا جواب دو۔ تم نے امام دین عرف سوہنا خان اور اس کی بیوی رضیہ عرف رجو کو قتل کیا تھا۔ تمہیں یاد ہے یا نہیں؟''

وہ ایک ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ تشکیک بھرے لہجے میں مستفسر ہوا، ''تم کون ہو؟''

میں جی کڑا کر کے مسکرایا، ''تم جانتے ہی ہو کہ میں کون ہوں۔ شہریار ہوں۔ میڈم شکیلہ کے گروپ کا ایک رکن۔''

''تمہارا نور پور سے کیا تعلق ہے؟'' وہ پوری طرح سنبھل چکا تھا۔

میں نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا اور جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں تھام لیا۔ اُسے چند لمحوں تک ڈرامائی انداز میں گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا، ''رنگو! تمہاری سانسیں گنی جا چکی ہیں.....''

اس نے میری بات فوراً ہی کاٹ دی، ''یہ تو مجھے بھی علم ہے۔ کوئی نئی بات کرو۔''

''نئی بات بھی بتاتا ہوں۔ سنو! میں کہہ رہا تھا کہ تمہاری موت کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اب کوئی سچ یا جھوٹ تمہیں موت سے نہیں بچا سکے گا۔ تم نے پوچھا کہ میں کون ہوں؟'' میں نے اس کی اعصاب شکنی کی غرض سے چند لمحے خاموشی اختیار کی، پھر کہا، ''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں

مرنے سے قبل نہ صرف اپنے جرم کا پتہ چل جائے بلکہ تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تمہیں سزا دینے والا کون ہے اور یہی نئی بات ہے تمہارے لیے کہ میں کون ہوں۔ میں شہریار ہوں۔ اُسی کاشت کار، سوہنے خان کا اکلوتا بیٹا، جسے سوہنے خان نے تمہاری آمد سے چند لمحے پیشتر اُٹھا کر بھڑولے میں پھینک دیا تھا۔ میں نے تمہیں اور تمہارے غنڈوں کو اپنی آنکھوں سے کشت وخون کا بازار گرماتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ میرے والدین کو قتل کرنے کا ایک مقصد ان کی جائیداد کا حصول تھا مگر اصل سبب یہ نہیں تھا۔ کوئی اور تھا جس کا صرف تمہیں علم ہے۔'' فرطِ کرب واشتعال سے میری آواز پھٹنے لگی۔ میں نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر تک گیانیوں کے سے انداز میں بیٹھا رہا، پھر سر اُٹھا کر بولا، ''رنگو! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے باپ کی تمہارے ساتھ نہ کوئی دشمنی تھی اور نہ لین دین کا ہی کوئی تنازع تھا۔ آج بھی اور کل بھی تم کسی خانزادے کی چوکھٹ کے کتے تھے۔ اپنے سائیں کے ہشکارنے پر انسانوں کا خون بہانے کیلئے رات کی تاریکی میں نکلتے تھے۔ دن کے اجالے میں منہ چھپائے پڑے رہتے تھے۔ میں نے تمہیں جہان بھر میں تلاش کیا اور آخر کار تمہیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا اب تمہیں سوہنا خان یاد آ گیا ہے؟''

وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا تھا۔ بہت ہی ڈھیٹ اور خبیث فطرت شخص تھا، اس لیے سب کچھ سن لینے کے بعد نہ تو خوف زدہ ہوا تھا اور نہ پریشان ہی بلکہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خباثت سے مسکرایا اور بولا، ''بس میری جان! جب تم نے مجھے اپنے باپ اور ماں کو قتل کرتے دیکھ ہی لیا تھا اور اَب پہچان بھی لیا ہے تو پھر پرابلم کیا ہے؟ ریوالور تمہارے ہاتھ میں ہے اور میں بندھا ہوا ہوں، مجھے گولی مارو اور قصہ ختم کر دو..... یہ کیا پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح لمبے لمبے ڈائیلاگ مارتے ہوئے فلمی سچوئیشن پیدا کر رہے ہو؟''

اس کی بے خوفی نے لمحہ بھر میں میرا اعتماد متزلزل کر دیا۔ ذہنی جھٹکا لگا۔ سنبھل کر بولا، ''ابھی قصہ ختم نہیں کرنا مجھے۔''

''تو کیا تین گھنٹے کی فلم پوری کرنی ہے؟'' اس کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

''ابے قصائی کے بچے! زیادہ تیس مار خان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ قیامت تم اکیلے نے میرے خاندان پر نہیں توڑی تھی بلکہ تمہارے ساتھ دو اور غنڈے بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے منہ سر ڈھاٹوں میں لپیٹ رکھے تھے۔ مجھے بتاؤ؛ وہ کون تھے؟''

اس کی آنکھیں مجھ پر ساکت ہوگئیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا، ''ڈھاٹا تو میں نے بھی باندھ رکھا تھا۔''

''ہاں! مگر تمہیں یاد نہیں کہ تمہارا منڈاسہ کھل گیا تھا اور ایک لمحے کو مجھے تمہاری شکل نظر آ گئی تھی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر جواباً کچھ نہ کہا۔

میں نے سلگتی ہوئی آواز میں کہا، ''تم ان دونوں کے بارے میں مجھے بتاؤ اور اس کتے کا نام بھی لو جس نے تمہیں میرے گھر بھیجا تھا۔ مجھے ان سوالوں کے جواب چاہئیں۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اتنی پرانی بات یاد ہی نہیں تو؟'' اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

''تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں نے تمہاری ماں اور باپ کو قتل کیا تھا۔ تم نے مجھے قتل کرتے دیکھ بھی لیا تھا۔ اب میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ تم مجھے گولی نہیں مارو گے تو کیا اپنی بہن کا دولہا بناؤ گے؟'' اس نے کندھے اُچکا کر میری تضحیک کی، ''میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ گھٹیا فلم کے ہیرو کے طرح یہ مداری پن نہ دکھاؤ اور مجھے گولی مار کر دفع ہو جاؤ۔ میں نے اپنے حصے کی زندگی بھرپور گزار لی ہے۔ دو چار سال اور جیتا رہا تو بھی قیامت کو آنے سے نہیں روک سکوں گا۔ موت آج بھی موت ہے۔ موت کل بھی موت ہی ہوگی۔''

میں گڑبڑا سا گیا۔ پیا جی نے کہا تھا کہ دشمن کو اس وقت نہیں مارنا چاہیے جب وہ مرنے کی آرزو دل میں رکھتا ہو بلکہ اُس وقت اس کی زندگی کی طنابیں کاٹنی چاہئیں جب وہ زندگی کی طلب میں گڑگڑانے لگے۔ مجھے باور ہو گیا تھا کہ وہ ٹیڑھی کھیر تھی جو سیدھی انگلیوں سے نکلنے والی نہیں تھی۔ چند لمحوں تک بیٹھا اُسے دیکھتا رہا پھر اُٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مشرقی دیوار کی طرف بڑھا جہاں میں نے ایک بڑا سا سوئچ بورڈ دیکھا تھا۔ پیا جی کے بتائے ہوئے بٹن کو پش کیا۔

چند لمحوں بعد پیا کی مدھم سی آواز بورڈ میں کہیں نصب شدہ اسپیکر سے برآمد ہوئی، ''کیا چاہیے ماسٹر؟''

میں سمجھ گیا تھا کہ بورڈ میں اسپیکر کے ساتھ ہی کوئی ننھا سا مائیک بھی نصب تھا جو مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، اس لیے بورڈ کے قریب منہ لے جا کر بولا، ''وہ حرام زادہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہے

جبکہ مجھے اُس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں میو کو تمہاری طرف بھیج دیتا ہوں۔ وہ اس میں بولنے والا پُرزہ فٹ کر دے گا۔ چند منٹ انتظار کرو۔''

اس کے ساتھ ہی اس کی آواز آنا بند ہوگئی۔ میں واپس رنگو کے پاس آ گیا اور اسٹول پر پاؤں رکھ کر سرد لہجے میں بولا، ''تم تو کیا، تمہاری پچھلی سات پشتیں بھی بول پڑیں گی۔''

اس نے محض نفرت بھرے انداز میں مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کی ادا و سکنات مجھ سے برداشت کرنا مشکل ہو رہی تھیں۔ موت کو آنکھوں کے سامنے رقص کرتا دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے مگر وہ نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس بھیانک ماحول میں کئی دن گزارنے کے بعد، اپنے ہاتھوں قتل ہونے والے کے اسلحہ بردار بیٹے کو سامنے پا کر اور اپنی فردِ جرم کھلنے پر بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کے حوصلے کی داد دینے کے بعد بولا، ''رنگو! اگر تم چاہو تو آسان موت کو گلے لگا سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ جب میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی، تمہیں بتا دوں گا۔'' اس نے ہونٹ بھینچ کر میرا مذاق اُڑایا۔

''چونکہ یہ طے ہے کہ تمہیں مرنا ہی ہے، تو پھر تمہیں اپنے فرعون نما آقا سے ہمدردی کیوں ہے؟ مرتا ہوا انسان تو کسی کا دوست نہیں ہوتا۔'' میں نے اُسے اکسانے کی کوشش کی۔

''ہونہہ!'' اس نے بہ اندازِ عجب ہنکارا بھرا، اپنے دائیں بائیں بلا جواز جھانکا اور بولا، ''جب یہ طے ہے کہ مجھے مرنا ہی ہے تو میں تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ کیوں ڈالوں؟ تم جیسے پستے کتے کو منہ کیوں لگاؤں؟ رہی بات ہمدردی کی تو مجھے اگر اپنے یار بیلیوں سے ہمدردی نہیں ہے تو پھر میں اپنی جان کے دشمن کی سُوکھ (آسانی) کیوں مانگوں گا؟''

وہ چند لمحے خاموش ہو کر بولا، ''اور موت..... موت آسان یا مشکل نہیں ہوتی..... موت تو بس موت ہی ہوتی ہے۔''

میں نے کہا، ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے تعاون کو مدنظر رکھ کر تمہیں زندہ چھوڑ دوں؟''

''توں ہالے بچہ ایں میرا چن!'' (تم ابھی بچے ہو میرے چاند!)۔ وہ ہنسا، ''میری عمر خون، بارود اور آگ میں گزری ہے اس لیے میرے منہ میں چوسنی ڈالنے کی کوشش نہ کرو اور خاموش رہ کر اپنے حرامی باپ کا انتظار کرو جسے تم نے مجھ پر تشدد کرنے کیلئے بلایا ہے۔''

مارے غصے کے میرا رواں رواں دہک اُٹھا۔ میں نے اتنے زور سے جبڑے بھینچے کہ دانتوں کی کڑکڑاہٹ گونج اُٹھی اور میو کے آنے تک میں خاموش بیٹھا رنگو کو دیکھتا رہا۔ وہ کئی سال پیشتر جوانی کو خیر باد کہہ چکا تھا مگر ابھی بھی اُس کا سرتا پاؤں گھنے اور گھنگریالے بالوں میں چھپا ہوا بدن فولادی تھا۔

میو بیڈروم سے برآمد ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سی ون میں داخلے کا ایک راستہ اِس طرف بھی تھا جو نسبتاً کم طویل اور مشکل تھا۔ نجانے کس مصلحت کے تحت پیا جی مجھے لمبی اور گھور گھپ اندھیرے والی سرنگ کے دہانے پر چھوڑ گیا تھا۔

میو نے قریب آ کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا، ''یہ کتے کا پلا بولتا نہیں ہے جبکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بج اُٹھے۔ بس!''

اس نے استفہامی انداز میں سر ہلایا۔ چٹکی بجائی۔ بولا، ''فکر نہیں کرو اُستاد! میں اس جیسوں کی بولتی بند بھی کر لیتا ہوں اور آواز گدی سے نکال کر ہتھیلی پر بھی رکھ سکتا ہوں۔ ابھی لو!''

وہ بازوؤں کے کف چڑھا کر رنگو کی طرف بڑھا۔ میں اسٹول پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے دیکھنے لگا۔

سیاہ فام میو خاصا سخت بدن اور دراز قد کا مالک تھا۔ اس نے رنگو کو بالوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا اور پے در پے طمانچوں سے اس کی درگت بنا کر رکھ دی۔ رنگو کی برائے نام مزاحمت جلد ہی دم توڑ گئی تو میو نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان غصے سے پوچھا، ''کیا خیال ہے بھوتنی کے! اتنا ہی کافی ہے یا دوسرا ٹریلر دکھاؤں؟''

اسے جواب میں چند غلیظ گالیاں ملیں۔ وہ میرے برعکس بپھر کر اس پر پل پڑا۔ اس نے چند ہی لمحوں میں لاتوں، مکوں اور ٹھوکروں سے اس کے کس بل نکال دیے۔ پھر پوچھا۔ جواب میں رنگو نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا، ''اوئے حرامیا! جو کر سگدئیں، کیتی ونج..... میں پیو کولوں کجھ نہ پچھ!''

(اوئے حرام زادے! جو کر سکتے ہو، کرتے رہو اور مجھ باپ سے کچھ نہ پوچھو۔)

مجھے اس کی سخت جانی اور بے خوفی پر پھر حیرت ہوئی۔ میو نے ہاتھ روک دیا اور اس پر ایک غصہ بھری تنبیہی نظر ڈال کر کچن کم اسٹور کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر جب اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں لمبے اور چمکدار پھل والی چھری دبی ہوئی تھی۔ اس نے بنا کچھ کہے رنگو کا ایک ہاتھ

تھاما اور چاہا کہ اس کی انگلی کاٹ دے، مگر رنگو نے چشمِ زدن میں اس کے جبڑے پر دوسرے ہاتھ کا زوردار گھونسا جڑ دیا۔ یہ وار اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ یقیناً میو کے چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے۔ وہ کئی گز دور تک لڑھکتا گیا۔ پلٹا تو میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں کے گوشوں سے خون کی دو ننھی ننھی دھاریں نکل رہی تھیں۔ اس کے جبڑے کے اندرونی جلد پھٹ گئی تھی۔ ضرب کی شدت کو دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ تھا کہ دو چار داڑھیں بھی جڑوں سے ہل گئی ہوں گی۔

چھری اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی تھی جسے رنگو نے سرعت سے اُٹھا کر سونت لیا۔ لہراتے ہوئے وحشیانہ انداز میں اسے للکارنے لگا۔ میو جبڑے پر ہاتھ رکھے خون تھوکتا ہوا سانڈ کی طرح ڈکرایا اور رنگو کی طرف بڑھا۔ میں نے چیخ کر اُسے رکنے کا حکم دیا۔ وہ رُک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا، ''جوش سے نہیں، ہوش سے کام لو پیارے!''

میری للکار نے اُسے بہت بڑے نقصان سے بچا لیا تھا ورنہ وہ جس انداز میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر حملہ آور ہوا تھا، باآسانی رنگو کا شکار ہو جاتا۔ رنگو کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ میو کے قریب آتے ہی اُس کے پیٹ میں چھری گھونپ دیتا۔

میو نے دانت کاٹے اور سلگتی ہوئی آواز میں رنگو سے کہا، ''چھری پھینک دو ورنہ.....''

ہال میں رنگو کا بھاری بھرکم قہقہہ گونج اُٹھا۔ اس کا وحشت بھرا قہقہہ تھما تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ''کیا ورنہ؟ ماں کے یار..... میں بندھا ہوا ہوں مگر شیر ہوں۔ تم کھلے ہوئے ہو مگر کتے ہو؛ گندی نسل کے۔ ہمت ہے تو میرے قریب آؤ..... چھٹی کا دودھ نہ یاد دلا دوں تو میرا نام رنگو نہیں..... میں شیدے قصائی کا پتر نہیں..... آؤ!''

میو نے اُسے زیرِ لب گالی دی اور پلٹ کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کا مطلب سمجھ نہیں پایا مگر رنگو سمجھ گیا۔ تبھی حلق کے بل چیخا، ''ہاں ہاں! جاؤ..... بجلی کا بٹن دباؤ اور اپنے اس باپ کو جھٹکے لگاؤ۔ ہیجڑوں میں بھی غیرت مند ہیجڑے ہوتے ہیں مگر تمہاری کتیا مالکن نے سب بے غیرتوں کو اکٹھا کر رکھا ہے۔ واقعی تمہیں کسی مرد نے نہیں، ڈرپوک خنزیر نے جنا ہے۔''

چیختے چیختے اُس کی آواز پھٹنے لگی اور حلق سے لگاتار مغلظات امنڈنے لگیں۔ اچانک اُس نے بھڑک کر پوری قوت سے چھری مجھے دے ماری۔ میں اس غیر متوقع حرکت کیلئے تیار نہیں تھا اس لیے بے ساختہ پیچھے جھکا۔ اسٹول مجھے سنبھال نہ سکا اور میں اسٹول سمیت فرش پر کمر کے

بل جا گرا۔ شکر ہوا کہ چھری دستے کے بل میرے کندھے پر لگی تھی۔ اگر اس کا پھل سامنے کی طرف ہوتا تو کم سے کم دو انچ تک ماس میں اُتر جاتا۔ ایسے ہی وقت ہال میں تالیوں کی زوردار آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے اُٹھا۔ بیڈروم کی طرف دیکھا۔ میڈم تالیاں بجاتی ہوئی بیڈروم سے نکل کر میری طرف چلی آ رہی تھی۔ میو اس کے عقب میں چل رہا تھا۔

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''میڈم آپ؟''

وہ قریب آ کر رُکی۔ ایک نظر رنگو کو دیکھ کر ہنسی اور ستائشی لہجے میں بولی، ''ویل ڈن استاد رنگو! تم نے تو میرے دو ٹائیگرز کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ اور تو اور..... میرے کنگ ٹائیگر کو بھی.....''

اس نے جان بوجھ کر معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور مجھے شریر نظروں سے دیکھا، پھر میو کو قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی، ''یہ اسٹول اُدھر دیوار کے ساتھ رکھو اور استاد رنگو کا نیک کلپ کھول دو۔ رنگو استاد آدمی ہے اور استاد کا مقام یہ نہیں ہوتا کہ اسے باندھ کر مارا جائے۔ کیوں استاد؟''

رنگو کے نتھنے پھڑک رہے تھے مگر خاموش تھا۔ کوئی جواب نہ پا کر میڈم میری طرف متوجہ ہوئی، ''شہریار! اسی نے تمہارے والدین کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو؛ صدقِ دل سے۔ ہے ناں؟''

میں الجھ کر بولا، ''جی میڈم!''

''تمہیں وہ کہانی بھی یقیناً یاد ہوگی جو میں نے رات بھر جاگ کر تمہیں سنائی۔ اس کہانی میں استاد رنگو کا بھی کردار شامل ہے۔ اس سے اپنا انتقام لو؛ میرا بھی..... یہ خالی ہاتھ ہے۔ اس لیے تم بھی خالی ہاتھ لڑو گے۔ کیوں استاد رنگو! تمہیں یہ بات پسند آئی؟''

رنگو نے دانت پیسے، مجھے اور میڈم کو باری باری گھورا اور دیوار پر تھوک دیا۔ بولا، ''میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ تم وہی حرافہ ہو..... کیا نام تھا تمہارا؟ ہاں..... چندو ماہی..... مفت میں بکنے والی کنجری؛ ہاہ! تم مجھ سے کیا انتقام لو گی۔ نام بدلنے سے اصلیت نہیں بدل سکتی۔ جاؤ! اپنے گندے بدن کو مل مل کر دھوؤ اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ میں کیا بُرا ہوں؛ تم تو مجھ سے بھی لاکھ درجے زیادہ گندی ہو..... تم مجھ سے انتقام لو گی؟ واہ.....''

اس کی استہزائیہ بکواس سن کر میرا خون کھول اُٹھا۔ اس نے میری موجودگی میں میڈم پر براہِ

راست اپنے من کی غلاظت اچھالی تھی جو مجھ سے برداشت نہ ہوسکی اور میں بھڑک کر اس کی طرف بڑھا۔ میڈم نے آنِ واحد میں اپنا بازو حائل کر دیا۔ بولی، ''نہیں شہریار! جلد بازی نہ کرو۔ تم چند منٹ بعد اپنے دل کی بھڑاس تسلی سے نکال لو گے مگر ابھی نہیں؛ اس کا نیک کلپ کھلنے دو۔''

یہ کہہ کر وہ اسٹول پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد میو سیاہ رنگ کی 'ایل کی' اُٹھا لایا۔ میڈم سے اجازت لے کر رنگو کے قریب چلا گیا۔ چونکہ وہ نیک کلپ کھولنے جا رہا تھا، اس لیے رنگو نے اُس پر حملہ نہیں کیا بلکہ خشمگیں نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ چند لمحوں میں میو نے اسٹیل کا کڑا کھول دیا۔

رنگو چند لمحے اپنی گردن مسلتا رہا پھر میڈم سے مخاطب ہوا، ''اپنے دونوں کتوں کو ہشکار کر میری طرف بھیجو۔ میں بھی تو دیکھوں کہ تمہاری گندی چمڑی کے دیوانے کس طرح اپنی وفاداری ظاہر کرتے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ رنگو کی بکواس سن کر بھی میڈم کی پیشانی پر ایک بل تک نہیں پڑا بلکہ ایک شریر سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر مچل گئی۔ بولی، ''شہریار! اب تم جانو اور تمہارا شکار جانے۔ میں اور میو خاموش تماشائی بن کر تمہارے ہنر کا کمال دیکھتے ہیں۔ میں یہی فائٹ دیکھنے کیلئے بڑا ضروری کام چھوڑ کر یہاں آئی ہوں۔''

اس دوران میو بڑی مستعدی سے میڈم کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ محض تماشائی نہیں تھا بلکہ مخصوص انداز میں میڈم کو کسی بھی ممکنہ خطرے کے مقابلے میں تحفظ دے رہا تھا۔

میدان صاف ہو گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے فرش پر پڑی ہوئی چھری دور پھینک دی اور کائیاں نظروں سے رنگو کو دیکھا۔ اس کی خون آشام آنکھیں بھی مجھ پر مرکوز تھیں اور وہ پہلوانوں کے مخصوص انداز میں دونوں بازوؤں کو ہلا کر خون کو گردش دے رہا تھا یعنی وارم اَپ ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ترنوالہ نہیں تھا، آسان شکار نہیں تھا، اس لیے میرے رگ و پے میں برق بھری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے حملہ کرنے میں پہل کا موقع دیا تو اُس نے بڑے نپے تلے انداز میں میری جانب قدم بڑھایا۔ جونہی قریب آیا، میں پنجوں کے بل ہوا میں اُچھلا اور میں نے اس کے سینے پر دونوں پیر پوری قوت سے مارے۔ وہ میری فلائنگ کک کی زوردار چوٹ

کھا کر کمر کے بل گرا۔ میں اس سے پہلے فرش سے اُٹھ گیا تھا اور جونہی میں نے اُس پر چھلانگ لگائی، اس نے اپنے دونوں گھٹنے اکٹھے کر لیے۔ میں پیٹ کے بل اس کے اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر گرا اور سانپ کی طرح کروٹ بدل گیا مگر اس دوران اس نے چابکدستی سے میرے بال مٹھیوں میں بھر کر میرا سر فرش پر دے مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ میں نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرے کئی بال جلد سے اکھڑ گئے مگر یہ درد کو خاطر میں لانے کا موقع نہیں تھا۔ ایڑی کے بل گھوما اور اس کے بائیں کولھے پر زوردار کک رسید کی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ ہتھیلیوں کے بل بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور اس کی دونوں جڑی ہوئی ٹانگیں میری بائیں پنڈلی پر لگیں۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے فرش پر گر گیا۔

میں نے گرتے ہی کروٹ بدل کر اُس سے دور ہونے میں کوئی تاخیر نہیں کی تھی مگر وہ مجھ سے پہلے فرش کو چھوڑ چکا تھا۔ جونہی میں نے اُٹھنا چاہا، اس کا زوردار مکا میری کنپٹی پر پڑا۔ یوں لگا جیسے میری کھوپڑی پر ہینڈ گرنیڈ پھٹ گیا ہو۔ میں نے بے ساختہ سر تھام لیا۔ چند جھٹکے دیے مگر حواس بحال نہ ہوئے۔ اس دوران موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رنگو نے مجھے مشینی انداز میں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ چونکہ وہ برہنہ پا تھا، اِس لیے بڑی چالاکی کے ساتھ اپنے ٹخنے مجھے مار رہا تھا۔ ٹخنوں کی مسلسل چوٹوں سے میرا سر چکرانے لگا تھا۔

اچانک اس کا پاؤں میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، زوردار جھٹکا دے کر پاؤں موڑ دیا۔ اس کے حلق سے تیز سسکی نکلی۔ ایسے ہی وقت میں وہ اچانک فرش پر جھکا، ہتھیلیوں کے بل اُٹھا اور اس نے بندر کی سی پھرتی سے اپنی دوسری ٹانگ پوری قوت سے گھما کر مجھے دے ماری۔ چونکہ میں اس کے ارادے کو بھانپ گیا تھا، اِس لیے سر بچا گیا اور اس کی پنڈلی میرے کندھے پر لگی۔

میں دانت پیس کر اس کا پاؤں موڑتا گیا اور وہ کروٹ پر کروٹ بدلتا گیا۔ اس کی پاؤں چھڑانے کی ہر تدبیر میں اپنی گرفت میں غیر معمولی طاقت بھر کر کاٹتا رہا۔ پھر اُس کی مزاحمت کا دم خم ٹوٹ گیا۔ میں نے موقع مناسب جانا اور اچھل کر اُس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ پاؤں چھوڑ کر اس کی ٹھوڑی کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ جب تک وہ میرا ارادہ بھانپتا، وہ بُری طرح میرے دیہاتی داؤ میں پھنس چکا تھا۔ میں نے وحشیانہ انداز میں پوری قوت صرف کر کے اُس کا سر اُوپر اُٹھا لیا۔ اب اگر وہ اندھا دھند زور لگاتا تو اس کے منکے کے ٹوٹنے کا احتمال تھا، اس لیے

مزاحمت ترک کر کے خرخرانے لگا۔

پھر اچانک میں نے اس کی تھوڑی تلے سے ہاتھ نکال لیے۔ اس کی ناک فرش پر لگی۔ پورے بدن کو جھٹکا لگا۔ میں نے اُسے سر کے عقبی بالوں سے پکڑا اور پے در پے فرش پر مار کر اس کی ناک خون میں تر کر کے چپٹی کر دی۔ اس کی خرخراہٹ نے باقاعدہ چیخوں اور گالیوں کی شکل اختیار کر لی تھی مگر وہ نہ تو میرے نیچے سے نکل سکتا تھا اور نہ اپنے بال چھڑا سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے کس بل نکل گئے اور اس نے اپنا سر ایک جانب ڈال دیا۔ میں اچھل کر دو قدم دور جا کھڑا ہوا۔ دیکھا کہ اس کے چہرے کے نیچے فرش پر خون کافی مقدار میں موجود تھا اور پچکی ہوئی بدوضع ناک سے خون باریک دھاریوں کی صورت میں نکل کر خون کے ننھے تالاب میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی انگلیوں پر جست لگائی۔ میرے سخت سول والے جوتوں نے اس کی انگلیاں پیس ڈالیں تو اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے بندر کی طرح اچھل اچھل کر اس کے دونوں پیروں کی انگلیاں بری طرح کچل ڈالیں۔ کچھ ہی دیر میں اس میں ہاتھ اُٹھانے کی سکت بھی نہ رہی۔

میں نے چند لمحے دم لیا۔ سوچا۔ پھر اس کے دونوں پیر تھام کر ہوا میں بلند کیے۔ گھٹنوں کے عقبی حصوں میں اپنے پیر رکھے اور اس کے پیروں کو پوری قوت سے موڑ کر ان پر اپنا پورا وزن ڈال دیا۔ اعصابی کھنچاؤ نے اُسے تڑپنے اور چیخنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دانت پیس کر اس کے پیروں کو فرش سے لگا دیا۔ دونوں گھٹنوں کی ہڈیاں اپنی جگہوں سے کھسک گئیں اور ہال رنگو کی دلدوز چیخوں سے گونج اُٹھا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اُسے بالوں سے پکڑ کر اُٹھا دیا اور طمانچوں کے تسلسل پر رکھ لیا۔ میرے ہاتھ خون سے لتھڑ گئے مگر مجھے پروا نہیں تھی۔ مجھ پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری تھی؛ گویا میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اُسے کتنا مارا، کہاں کہاں مارا اور اس نے میرا ہاتھ روکنے کی کیا کیا کوشش کی۔ نجانے کس وقت وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا مگر میرے ہاتھ پیر بدستور چلتے رہے۔

میرے کانوں میں میڈم کی تیز آواز پڑی، ''شہریار! رک جاؤ پلیز..... رنگو بے ہوش ہو گیا ہے۔''

میں نے ہاتھ روکا۔ جھک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ میں انگلی گھسیڑ دی۔ اس کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا مگر بے ہوشی نہ ٹوٹی۔ جونہی میں نے انگلی

دہری کی اور آنکھ کا ڈھیلا باہر کی طرف کھینچا، اس کے حلق سے دردناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کا جسم مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔

''خد.... خداواسطے.... میری اَکھ!'' اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی بے ربط آواز برآمد ہوئی۔

میری نفرت میری برداشت پر حاوی تھی۔ میں نے وحشیانہ انداز میں اس کا ڈھیلا باہر کھینچ لیا۔ خون کی باریک مگر تیز دھار میرے چہرے تک آئی جبکہ خون اور رطوبت سے لتھڑے ہوئے باریک عضلات میرے ہاتھ سے چمٹ گئے۔ اس کا جھٹکے لیتا وجود ایک دم ساکت ہو گیا۔ وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ میں نے ہاتھ جھٹک کر ڈھیلا پَرے پھینک دیا اور اس کی پچکی ہوئی ناک پر ہاتھ رکھ کر نچلا ہونٹ دہرے انگوٹھے اور انگلیوں میں جکڑ کر کھینچ لیا۔ درد کی شدت سے وہ پھر ہوش میں آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ فرش پر تڑپنے کے انداز میں ہلنے لگے اور ایک آنکھ میں دنیا جہان کا درد سمٹ آیا۔

انسانی ماس میں بڑی لچک ہوتی ہے مگر ایک حد پر جا کر کاغذ کی طرح ٹھوس ہو جاتا ہے اور پھٹنے لگتا ہے۔ اس کا نچلا ہونٹ بھی گوشے سے پھٹنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے گھٹنوں سے اوپر تک اُس کی ٹانگیں جھٹکے لینے لگیں۔ آدھا ہونٹ پھٹ گیا تو میں نے چھوڑ دیا اور اوپر والا ہونٹ مونچھ سمیت پکڑ لیا۔

ایسے ہی وقت اس کی گھگھیائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی، ''بب.... بس.... مم.... مینوں مافی....''

(بب..... بس..... مم..... مجھے معافی.....)

اس کے حلق سے نکلنے والے اس ادھورے جملے نے میرے اندر جلتے ہوئے فلک بوس الاؤ پر پانی کے چند چھینٹے مارے۔ ایک ذرا تسکین ہوئی۔ میں نے اس کا ہونٹ چھوڑ دیا اور پاؤں ناک پر سے ہٹا کر اس کی پھولی پچکتی ہوئی چھاتی پر رکھ دیا۔ عین اس طرح جیسے شکاری اپنے شکار کو مار گرانے کے بعد اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر فخریہ انداز میں فوٹو کھنچواتے ہیں۔

اس کی تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت دیدنی تھی۔ وہ چند لمحے تڑپتا رہا پھر گردن ایک طرف ڈال کر بے حد مایوسی سے بولا، ''میں ہار گیا..... ہاہ! اُستاد رنگوقس..... قصائی ہار گیا۔ کل کے لونڈے سے ہار گیا۔ ہائے!''

اس کے جسم کا کوئی عضو سلامت نہیں تھا اور اگر اُسے اسی حالت میں چھوڑ بھی دیا جاتا تو بمشکل آدھا گھنٹہ نہیں گزار سکتا تھا، پہلے ہی مر جاتا۔ چاروں شانے چت فرش پر پڑا ایک آنکھ

سے چھت کے لینٹر کو گھور رہا تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ پانی سے بھری ہوئی تھی۔ دوسری آنکھ کی جگہ پر خون سے بھرا ہوا گڑھا اور پچکی ہوئی خون آلود ناک اس کی شکل کو مزید ڈراؤنا کر رہے تھے۔ اس کی آنکھ میں بجا طور پر شکست تحریر تھی۔

میں نے چھاتی پر رکھے ہوئے پاؤں کے دباؤ میں اضافہ کیا اور موت کی خنکی لہجے میں سمیٹ کر کہا، ''امید ہے تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ ہم دونوں میں سے شیر کون ہے اور کتا کون؟''

اس کے بے جان انداز میں پھیلے ہوئے بازوؤں میں موہوم سی حرکت پیدا ہوئی جو فوراً ہی معدوم ہوگئی۔ کانپتی ہوئی شکست خوردہ آواز میں بولا، ''ہاں! میں ہار گیا ہوں۔ اب مجھے یوں بے عزت کرنے سے بہتر ہے مجھے مار دو۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ خدا کیلئے مجھے مار دو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔''

اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے متغیر ہوگیا۔ آواز میں کپکپاہٹ لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگی تھی۔ میں نے کہا، ''مجھے اعتراف ہے کہ تم بہت بہادر آدمی ہو۔ شکست پر موت کو ترجیح دیتے آئے ہو مگر آج تم زندہ رہتے ہوئے ہار گئے ہو۔ ایسی حالت میں بہادر آدمی ٹوٹ جاتا ہے اور دل سے شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ کیا خیال ہے؛ جو پوچھوں گا، بتاؤ گے یا نہیں؟''

اس نے اپنی آنکھ بند کر لی۔ ہونٹ کپکپاتے رہے۔ خاصے طویل توقف کے بعد بولا، ''اب تمہیں حق ہے کہ تم مجھ سے سوال کرو اور میں جواب دوں۔ پوچھو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

میں نے اس کے سینے پر سے پاؤں ہٹا لیا اور فرش پر پیروں کے بل بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں سوال کرنے لگا۔ وہ آنکھ بند کیے مجھے بے ربط انداز میں جواب دینے لگا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نہ تو کچھ چھپا رہا تھا اور نہ ہی جھوٹ بول کر مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بولتے بولتے نڈھال ہوگیا۔ پانی مانگا۔ میرے اشارے پر میو اس کیلئے پانی کا گلاس بھر لایا اور اس کے حلق سے لگا دیا۔ کچھ پانی ہوا کی نالی میں چلا گیا جس سے اُسے کھانسی آ گئی۔ زخموں کا درد بڑھ گیا۔ بہ دقت چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے سر فرش پر ڈال دیا۔ بولا، ''ڈرومت! قریب آ جاؤ۔ میں رنگو قصائی ہوں۔ مرد کا بچہ ہوں۔ ہار گیا تو مردوں کی طرح ہار مان بھی گیا۔ اب اگر تم مجھے قتل بھی کرنے لگو گے تو میں ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔''

وہ آدھا مر چکا تھا۔ آدھا زندہ تھا۔ آنکھ اور ناک کے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مسلسل جھٹکے لے رہا تھا۔ مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لیے اس کے کہنے پر قریب تو ہو گیا مگر

اپنے تئیں خاصا بھی محتاط رہا۔ اس میں ہاتھ ہلانے تک کی سکت نہیں تھی مگر وہ مرنے سے پہلے مجھے مار دینے کیلئے کوئی بھی فیصلہ کن حملہ کر سکتا تھا۔ اس نے کچھ میرے پوچھنے پر اور کچھ اس نے از خود بتا دیا۔ چونکہ وہ طویل عرصہ تک سردار یارن خان کا دستِ راست رہا تھا، اس لیے اُسے پسِ منظر سمیت وہ سب کچھ معلوم تھا جو نور پور کے کسی اور شخص کے علم میں نہیں آیا تھا۔ اس کی بے ربط انداز میں دی ہوئی معلومات سے میں نے سوہنے خان کی اندوہ ناک کہانی ترتیب دے لی۔

میرا باپ، امام دین عرف سوہنا خان، مردانہ وجاہت کا پیکر تھا۔ وہ جب خوشبودار تیل سے چپڑے ہوئے بالوں میں سیدھی مانگ نکال کر، سفید براق لٹھے کا تریزوں والا سوٹ پہن کر نور پور سے نکلتا تھا تو بیسیوں مجوبانہ نظریں اُس پر ساکت ہو جایا کرتی تھیں۔ چونکہ وہ زمینداری کے ساتھ ساتھ مال ڈنگر کا بیوپار بھی کرتا تھا اور مال کی خرید و فروخت کے سلسلے میں علاقے کی مال منڈیوں میں آنا جانا لگا رہتا تھا، اس لیے اسے نور پور سے باہر بھی کافی وقت گزارنا پڑتا تھا۔ وہ باہر جانے کیلئے خصوصی طور پر تیار ہو کر گھر سے نکلا کرتا تھا۔ جب رضیہ عرف رجو سے اُس کا بیاہ ہوا تو نور پور کے سبھی مرد و زن نے دانتوں میں انگلیاں کاٹ ڈالیں۔ رجو اُس سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ خدا نے اُسے آنکھوں کا اضافی حسن دے رکھا تھا۔ جس کو بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیتی، اُسی کا ہو رہتا۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد تک اُس کی شخصی دل کشی اور حسن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

نور پور میں سردار یارن خان کا ایک طرح کا بلاشرکت غیرے راج قائم تھا۔ وہ جو چاہتا تھا، کر گزرتا تھا اور جسے چاہتا تھا، اپنے دارے پر بلا کر دو چار جوتے لگوا کر، بے عزت کر کے سیدھا کر دیتا تھا۔ چونکہ سوہنا خان اپنی موج میں گم رہنے والا شخص تھا اور اپنے کام سے کام رکھتا تھا، اس لیے وہ سردار یارن خان کے دارے پر حاضری دینے یا گپ شپ لگانے کیلئے نہیں جایا کرتا تھا۔ سرِ راہ اگر اُس سے ملاقات ہو جاتی تو ادب سے سلام کر کے رُکے بغیر گزر جاتا تھا۔ اس عادت کے پیشِ نظر سردار یارن خان کی نظر میں وہ مغرور اور اکڑ خان قرار پایا تھا اور اس کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتا رہتا تھا۔

جب اُس نے دارے پر سوہنے خان کی بیوی کے حسن کا چرچا سنا تو اس کے دل میں رجو کو دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا۔ اس میں بیسیوں برائیاں تھیں مگر ابھی تک اس نے نور پور کی کسی دھی رانی کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب اس نے ایک دن دارے کے سامنے سے

سہیلیوں کے جھرمٹ میں گزرتی ہوئی رجو کو دیکھا تو بے اختیار دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ انہی دنوں اتفاق سے اُسے لاہور جانا پڑا جہاں وہ سال بھر رہا۔ واپس آیا تو وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ رجو کو بھی بھول چکا تھا۔ آتے ہی اُسے رجو یاد آئی مگر اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تیر گئی اور ایک استہزائیہ جملہ لبوں پر مچل گیا، ''ہن تاں اُہ ماں بنی وَ دی ہوسی!''

(اب تو وہ ماں بن چکی ہوگی۔)

رجو واقعتاً اس دوران ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ وہ اس کے دل سے محو ہو چکی تھی مگر جونہی اُس نے ایک دن چہل قدمی کے دوران فصلوں میں رجو کو دیکھا تو اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ ماں بن کر بھی غضب ڈھانے والی دلکشی رکھتی تھی۔ اس نے بے اختیار اُس کا رُخ کیا۔ قریب جا کر پوچھا، ''تم رجو ہی ہوناں؟ سوہنے خان کی ذال؟''

ذال مقامی زبان میں بیوی کو کہا جاتا تھا۔

رجو نے سر پر دوپٹہ درست کیا۔ ایک نظر اُسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ بولی، ''السلام علیکم خان جی! میں رجو ہی ہوں۔''

وہ یہ کہہ کر وہاں سے کھسکنے لگی۔ یارن خان نے روک لیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ وہ ناچار 'ہوں ہاں' میں جواب دینے لگی۔ یارن خان کو اس کے عدمِ دلچسپی والے رویے سے باور ہو گیا کہ وہ وہاں سے جلد از جلد کھسکنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی زبان میں کمال کی مٹھاس بھر کر اُسے کسی وقت حویلی آنے کی دعوت دی۔

وہ جاتے ہوئے بولی، ''ڈیکھساں خان جی..... آپنے سائیں کوں آکھساں جے اُہ میکوں حویلی گھن گیا تاں!''

(دیکھوں گی خان جی! اپنے شوہر سے کہوں گی اگر وہ مجھے حویلی لے گیا تو اس کے ساتھ آ جاؤں گی۔)

وہ چلی گئی مگر یارن خان کا پہلو خالی کر گئی۔ اس کے بعد وہ تاک میں رہنے لگا۔ رجو کا نسوانی دل اُس کی غیر معمولی دلچسپی اور انہماک تاڑ گیا اور وہ اپنے طور پر اس سے دور رہنے لگی۔ کوشش کرنے لگی کہ گھر سے کم سے کم نکلا کرے۔ پھر ایک دن یارن خان نے گلی میں اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ حیرت اور خوف سے دم بخود رہ گئی۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی چھڑانا چاہی تو یارن خان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ وہ کلائی نہ چھڑا سکی اور بے بسی سے نور پور کے رکھوالے کو دیکھنے

لگی۔ اس دوران ہی یارن خان نے اپنے دل کی تمام تر ہوس اس کے گوش گزار دی۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ حیران بھی تھی کہ تمام کا تمام نور پور اس کی تعریفیں کرتا نہیں تھکتا تھا کہ وہ برادری کی کسی دِھی بھین کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ آنکھ اُٹھانا تو ایک طرف رہا، اس نے گلی کے بیچوں بیچ اس کی کلائی تھام کر دعوتِ گناہ بھی دے ڈالی تھی۔ بمشکل اس سے پیچھا چھڑا کر گھر پہنچی۔ شام تک اپنے بچے کو گود میں لیے روتی رہی۔ جب سوہنا خان تھکا ہارا گھر پہنچا، اُسے روتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ جب اس کے استفسار پر رجو نے یارن خان کی تمام کارگزاری سنائی تو اس کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ آگ بگولا ہو کر اُسی وقت گھر سے نکلا اور یارن خان کی حویلی پہنچ گیا۔

یارن خان کا برادری کی کسی عورت کو گلی میں روکنا اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا تو سوہنے خان کا یوں بپھر کر دارے پہنچنا بھی نور پور کی روایت میں نہیں تھا۔ اس نے دارے میں کئی لوگوں کی موجودگی میں یارن خان کو ماں بہن کی گالیاں دیں، بُرے نتائج کی دھمکیاں دیں اور سینہ ٹھونک کر کہا، ''اگر تمہیں کسی مرد کے بچے نے جنم دیا ہے تو میری بیوی کو پھر ہاتھ لگانا۔ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تمہاری سات پشتیں بھی یاد رکھیں گی۔''

یارن خان ندامت اور تضحیک کے پسینے میں بھیگ گیا۔ جب تک سوہنا خان دارے میں چھاتی پھلائے بلند آواز میں بولتا رہا، وہ سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ سوہنا خان بے پناہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت طاقت ور اور دلیر بھی تھا۔ اس کی بانہیں سلامت تھیں۔ بھائی اور قریبی رشتہ دار بھی اس کیلئے جان دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ اور برادری کے زُعم میں انجام کی پروا کیے بغیر اس نے یارن خان کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔

پھنکارتا ہوا دارے سے نکلا۔ عشاء کے وقت اس کے گھر بھائی چراغ دین اور قریبی رشتہ دار مجتمع ہو گئے۔ اس نے جوش میں یہ اعلان کر دیا، ''اگر اس خبیث کے بچے نے دوبارہ رجو کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو میں اسے نور پور کی گلیوں میں گھسیٹ گھسیٹ کر مار دوں گا۔''

یہ دھمکی کسی ذریعے سے یارن خان تک پہنچ گئی۔ وہ سوہنے خان کی سرشت کو جانتا تھا۔ جانتا تھا کہ سوہنے کو بڑھانکنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا، اس پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ دارے میں آ کر یارن خان کو بُرا بھلا کہنے سے بھری برادری میں خان کی بہت سبکی ہوئی تھی اور اس کا ذہن مارے تضحیک کے جل رہا تھا۔

اگلے دن حیدر خان اس کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں کے درمیان نہ جانے کیا باتیں ہوئیں۔ تمام دن وہاں رہنے کے بعد جب شام کو حیدر خان کی موٹر کار دارے سے نکلی، اس سے ایک گھنٹہ بعد یارن خان نے بھی لاہور کا رُخ کر لیا۔ وہ فطری طور پر منتقم مزاج اور کمینہ انسان تھا۔ اس نے اپنے اندر بھڑکی ہوئی تضحیک کی آگ پر برف ڈالنے کیلئے چند چھٹے ہوئے بدمعاشوں کی خدمات حاصل کر لیں۔ انہیں اپنے ساتھ نور پور لے آیا۔

آتے ہی اس نے سوہنے خان سے انتقام لینے کا منصوبہ تیار کر لیا اور انتظار کرنے لگا کہ کون سی شب سوہنا خان اپنے گھر سے باہر گزارتا ہے۔ وہ اپنے معمول کے مطابق ہر پندرہ دن بعد مال ڈنگر لے کر ملتان کی منڈی مویشیاں جایا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک رات کو اپنے کارندوں کی مدد سے یارن خان نے سوہنے خان کی دیوار پھاند لی اور سوہنے خان کی عزت کی دھجیاں اُڑا دیں۔ ساتھ میں رجو کو سمجھا بھی دیا کہ اگر وہ سوہنے خان کو بتائے گی تو یا وہ قتل ہو جائے گا یا عمر بھر جیل میں گزارے گا۔ رجو دیہاتی عورت ہونے کے باوجود بہت سمجھ دار تھی۔ اس دھمکی میں پنہاں بربریت، یارن خان کی طاقت اور اپنا مخدوش مستقبل دیکھ کر لب بستہ ہو گئی مگر اس کی تمام تر شوخیاں اور جوانی کی سرمستیاں ہوا ہو گئیں جنہیں سوہنے خان کی محبت بھری آنکھوں نے چند دنوں میں ہی تاڑ لیا۔ اس کے مسلسل بجھے بجھے رہنے کو پہلے تو سوہنے خان نے طبیعت کی خرابی قرار دیا مگر کئی دن گزرنے پر بھی رجو کی کیفیت جوں کی توں رہی تو وہ گھبرا گیا اور گاہے بگاہے کریدنے لگا۔

یارن خان ہر پندرہ روز بعد سوہنے خان کے گھر نقب لگانے کیلئے پہنچ جایا کرتا تھا۔ رجو دو تین ماہ میں ہی سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ چہرہ پیلا پڑنے لگا۔ اپنے خاوند کو بتانے کی خواہش رکھنے کے باوجود نہ بتا سکی کیونکہ اُسے سوہنے خان کی سلامتی عزیز تھی۔ اس نے سکون کی سانس لی جب ہر پندرہ دن بعد رات کے اندھیرے میں اسے پامال کرنے والا یارن خان کچھ عرصہ نور پور رہنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا۔ کسی نے کہا کہ لاہور گیا ہے تو کسی نے کہا کہ جاپان سدھار گیا ہے۔ رجو کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کہاں گیا تھا، اُسے تو جان چھوٹنے کی خوشی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے سابق معمول پر لوٹ آئی مگر سوہنا خان دیکھ رہا تھا کہ رجو کے معمولات میں پہلی سی شوخی نہیں رہی تھی۔

رجو نے سوچ رکھا تھا کہ چھ سات ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ یارن خان نور پور لوٹ کر نہیں

آئے گا مگر اس کی توقع کے برعکس وہ ڈیڑھ ماہ بعد نور پور پہنچ گیا تو وہ پھر اندیشوں میں گھر گئی مگر آنے والے دنوں میں یارن خان نے اُسے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ اس نے شادی کر لی تھی۔ اس خبر کی تصدیق یوں بھی ہوئی کہ وہ مہینے میں ایک آدھ چکر لاہور کا لگانے لگا تھا۔

اس کی شادی ہو گئی تھی، اس نے کسی اور عورت سے دوستی کر لی تھی یا ویسے ہی رجو اس کے دل و دماغ سے اُتر گئی تھی، اس بحث کے قطع نظر رجو نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے محبوب شوہر کی دلداریوں میں رُجھ گئی۔ اس کے حقوق پر مارے جانے والے ناپسندیدہ شب خون کے لرزہ براندام واقعات کو اس نے اپنی تنہائی کے آنسوؤں میں چھپا دیا۔ ایک لمبا عرصہ عافیت میں گزر گیا اور وقت نے اس دُکھ پر گرد کی دبیز تہہ چڑھا دی۔

سوہنا خان اپنی ڈگر پر بدستور چل رہا تھا۔ دنوں بچے بڑے ہو رہے تھے۔ انہی دنوں ایک بھینس کے لین دین پر سردار حیدر خان سے اُس کی منہ ماری ہو گئی۔ حیدر خان بی ڈی ممبر تھا۔ آنے والے انتخابات میں ضلع کونسل کے ممبر کی نشست پر الیکشن لڑنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی نوخیز سیاسی قوت کے زعم پر سوہنے خان کو ماں کی گالی دی۔ سوہنا برداشت نہ کر پایا اور آستینیں چڑھا کر اس پر چڑھ دوڑا۔ دو چار گھونسوں میں ہی اس نے حیدر خان کو دھنک کر رکھ دیا۔ لوگوں نے پکڑ دھکڑ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔

حیدر خان نے پھولی ہوئی سانسوں کے بیچ بڑے تضحیک آمیز انداز میں کہا، ''ایڈا غیرت وَند ہووِیں تاں یارن دے بال نہ پالیں!''

(تم اتنے غیرت مند ہوتے تو یارن خان کے بچے نہ پالتے)

سوہنے خان کے دل پر گھونسا لگا۔ سرِ دست اس نے حیدر خان کو منہ بھر کر گالیاں دیں، یارن خان کیلئے بھی سخت سست الفاظ کہے اور اگر اُسے لوگوں نے مضبوطی سے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ حیدر خان کی گدی سے زبان کھینچ کر پرے (میدان) پر ڈال دیتا۔

بھینس کا سودا بیچ میں ہی رہ گیا اور وہ تلملاتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ دلیر خوشخص تھا۔ اس کے اعصاب مضبوط تھے مگر حیدر خان کے طعنے نے اُسے توڑ کر رکھ دیا۔ شام تک اندر ہی اندر گھلتا رہا، سوچتا رہا اور رجو کے طور و اطوار پر غور کرتا رہا۔ آگ جلتی ہے تو دھواں اُٹھتا ہے۔ بات ہوتی ہے تو بتنگڑ بنتا ہے۔ اگر حیدر خان کی کہی ہوئی بات سچ نہیں بھی تھی تو کچھ نہ کچھ ایسا ضرور تھا جس

کے بل پر اس نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔

اس شام اس نے بچوں کو پہلی مرتبہ تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ عادات، خال و خط، قد بُت..... وہ کسی بھی لحاظ سے یارن خان سے مشابہت نہیں رکھتے تھے۔ بیٹے نے باپ کی شکل چرائی تھی۔ بیٹی ماں پر گئی تھی۔ پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ شک کا کانٹا مسلسل پہلو میں چبھ رہا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جب اس نے شام کا کھانا غیر معمولی عدم رغبتی سے کھایا تو رجو کا ماتھا ٹھنکا۔ چنگیر خالی کر کے کندوری سے ہاتھ پونچھنے والے نے بمشکل آدھی روٹی پیٹ میں اُتاری تھی۔ متفکر ہوگئی۔ پریشانی کا سبب دریافت کرنے لگی۔ سوہنے کے ٹالنے پر اپنے مخصوص انداز میں دھرنا دے کر بیٹھ گئی اور پوچھنے پر مصر ہوگئی۔

سوہنے نے ادھر اُدھر کی ہانکیں۔ ٹالا۔ نہیں ٹلی تو چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ جب دونوں بچے کھیلتے کودتے سو گئے تو اس نے لحاف اُتار کر پائنتی پر اکٹھا کرتے ہوئے کہا، ''رجو! بول تو ذرا..... تجھے دنیا میں کون سب سے پیارا ہے؟''

وہ الجھ کر اُسے دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ عورت کے نزدیک بچے سے زیادہ پیارا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔ اس نے اپنے دل میں جھانکا۔ یہاں کچھ مختلف تھا۔ بیٹا اپنے باپ کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ سچ دکھائی دیا تو سچ بول دیا، ''میکوں توں پیارا ہیں وَل شہزادی میڈی دلڑی دا راجہ ہے۔''

(تم مجھے پیارے ہو۔ تمہارے بعد شہزادی میرے دل کا راجہ ہے۔)

سوہنے نے اُسے اپنی چارپائی پر بلایا۔ اس کا داہنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا۔ بایاں ہاتھ پہلو میں لیٹے ہوئے بیٹے کے سر پر رکھا۔ پوچھا، ''تو پھر سچ سچ بتا؛ یہ دونوں بچے میرے ہی ہیں ناں؟''

رجو کی آنکھیں خوف اور احساسِ ذلت سے پھٹنے کو آ گئیں۔ تھوک نگل کر بولی، ''میڈا خان! اِہ توں کے پیا آدھیں..... میں تیڈی..... میڈی آل وِی تیڈی..... پَر تھیا کیا ہے؟''

(میرے خان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری ہوں۔ میری نسل بھی تمہاری ہے مگر ہوا کیا ہے؟)

سوہنے خان کی غیرت مند آنکھیں جھک گئیں۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا، ''آج مجھے اُس بے غیرت حیدر خان نے رڑے میدان میں طعنہ دیا ہے کہ میں یارن خان کے بچے پال رہا ہوں۔'' سوہنے کی سانسیں پھول گئیں۔ سینہ دھونکنی ہوگیا۔ رجو کو دیکھے بغیر بولا، ''رجو! یہ بات

وسیب کے پانچ سات بندوں اور دو تین وَپاریوں (بیوپاریوں) نے بھی سنی اور وسیب میں میری غیرت کا سرِ عام جنازہ نکل گیا۔ سچ بتا رجو! میری امانت میں تم نے خیانت کی ہے؟ اس کتے یار ن خان نے.....''

رجو کا دم گھٹنے لگا۔ ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس کے ہاتھ میں پیدا ہونے والی لرزش کو سوہنے خان نے محسوس کر لیا۔ درشتی سے بولا، ''رجو! کھا ناں قسم میرے سر کی..... شہرے کے سر کی اور بول! کیا میری عزت کا جنازہ تم نے اُٹھا دیا ہے؟''

رجو نے دونوں ہاتھ کھینچ لیے۔ سسک کر چارپائی سے اُٹھ گئی۔ کمرے کا وسطی شہتیر پچھلے سال ٹوٹ گیا تھا۔ سوہنے خان نے شہتیر کے ٹوٹے ہوئے حصے تلے کھجور کا تنا کاٹ کر ستون کی شکل میں کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس ستون کے عقب میں جا کر چھپنے کے سے انداز میں چپک کر کھڑی ہو گئی۔ روتے ہوئے بولی، ''خان! میکوں مارن تو پہلے میڈی گال سن گھن!''

(خان! مجھے قتل کرنے سے پہلے میری بات سن لے۔)

رجو کی خوف سے معمور فریاد سنتے ہی چارپائی سے اترتا ہوا سوہنا تھم گیا۔ وجود ایک دم بے جان ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ چارپائی کی بانہہ پر ہاتھوں کی گرفت ہیجانی ہو گئی۔ شکست خوردہ انداز میں بولا، ''میں سن تاں گھدا ہے پَر تو اپنا دِل ولا دن کیتے سنا گھن!''

(میں نے سُن تو لیا ہے مگر تم اپنا دل بہلانے کیلئے سنا ہی دو۔)

یوں لگا جیسے اس کی آواز اندھے کنویں سے برآمد ہوئی ہو۔

رجو لرزتی ہوئی آواز میں الف سے یے تک رام کہانی سنا کر فردِ جرم بنی خاموش ہو گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر دہشت بھری نظروں سے اپنے سرتاج کو دیکھنے لگی۔ اس کے سائیں نے چارپائی سے اُٹھنا چاہا۔ اُٹھ نہ پایا۔ ٹوٹے دل سے بولا، ''تو نے میری کمر توڑ دی ہے۔ آہ! مجھے مردار کھلانے سے پہلے مجھے مار دیا ہوتا۔''

رجو تڑپی، ''میں نہ کل تجھے مرتا دیکھ سکتی تھی، نہ آج..... مگر میں تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ شہرا (شہریار) اور پَری (پروین) تمہارا خون ہے۔ میں پاک کلام کی.....''

اس نے اپنا ابھری رگوں والا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ بولا، ''قسمیں نہ کھا اور آ کر پَری کے ساتھ سو جا۔ جو ہونا تھا، ہو چکا اور جو ہونا ہے، وہ ہو کر ہی رہے گا۔''

رجو میں اتنی ہمت پیدا نہ ہو سکی کہ وہ سوہنے کے قریب آ جاتی۔ وہ جب چارپائی پر لیٹ گیا

تو ڈرتی ڈرتی قریب آئی اور اس کے پیروں پر چہرہ رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔

اس کا ایک آنسو سوہنے کے دل پر گراں گزرتا تھا۔ آج وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی مگر وہ دیکھ تک نہیں رہا تھا۔ رجو نے بچوں کا واسطہ دیا۔ اپنی محبت کا واسطہ دیا۔ اس کی گھنٹہ بھر کی ریاضت کے جواب میں سوہنے نے فقط اتنا کہا، ''معاف کرنے کا حق غیرت والوں کو ہوتا ہے، بے غیرتوں کو نہیں۔ جاؤ، مجھے تنگ نہ کرو اور سو جاؤ۔''

وہ اس کے پیروں سے لپٹی رہی۔ مقدر پہلے ہی سویا ہوا تھا۔ سسکتے سسکتے اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔ رات کے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی۔ سوہنے خان کو چارپائی پر نہ پا کر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ گہری نیند سونے کا رسیا اُسے سلا کر کہیں چلا گیا تھا۔ کہاں؟ یہی سوچ رہی تھی۔ ناگاہ اُس کی نظر بھڑولے والی نکڑ پر پڑی۔ چونک گئی۔ سوہنے خان کا کیمبل پوری کلہاڑا اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار سینے پر جا ٹھہرا، ''یا اللہ خیر!''

رجو اپنے شوہر سوہنا خان کی فطرت سے آگاہ تھی۔ فوری طور پر بھانپ گئی کہ وہ کلہاڑا سونت کر یارن خان کی حویلی میں گیا ہوگا۔ اسے یارن خان کی کمینگی کی خبر تھی۔ لوگوں سے سنی، لوگوں کی سنائی ہوئی باتوں کو ذہن میں رکھ کر ننگے پاؤں اپنے دیور کے گھر دوڑی۔ اسے سوتے میں اُٹھایا اور ہنگامی طور پر سوہنے خان کے پیچھے دوڑا دیا۔ چراغ دین ابھی قریشیوں کی حویلی کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ اسے سوہنا خان کلہاڑا کندھے پر رکھے سر نیہوڑائے آتا دکھائی دیا۔ وہ اپنے بھائی کے سوالوں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رجو، چراغ دین اور اس کی بیوی اس کے گرد چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور وہ شدید غصے کے عالم میں مشتق ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا، ''بے غیرت کا بچہ! مجھے پیٹھ دکھا کر بھاگ گیا۔ ہاتھ لگ جاتا تو صبح کا سجھ (سورج) دیکھنا اس کے نصیب میں نہ ہوتا۔ پر خیر! کل، پرسوں..... کبھی نہ کبھی تو میرے ہتھے چڑھ ہی جائے گا۔ بل سے نکال ہی لوں گا اس حرامی کو..... کسی بلوچ کا خون ہی نہیں ہے وہ۔ کسی خان کا نطفہ ہی نہیں ہے وہ۔''

وہ اپنا غصہ نکال کر سلگتی آنکھوں کو دیوار پر چپکا کر بیٹھ گیا۔ چراغ دین اور اس کی بیوی نے اُسے بہتیرا سمجھایا، چھوٹے چھوٹے بچوں کی سلامتی اور ان کے مستقبل کا حوالہ دیا مگر وہ بالکل خاموش بیٹھا نصیحتیں اور مشورے سنتا رہا۔ اس کی آنکھیں بتاتی رہیں کہ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر جا رہا تھا۔ اس کے ضدی دل نے بس یارن خان کا خون کرنے کی دھن پکڑ لی تھی

اور جب تک وہ یارن خان کو قتل نہ کر لیتا، چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ جب دونوں میاں بیوی اُٹھ کر جانے لگے تو اس کے منہ سے نکلا، ''چراغ دینا! میڈے شہرے آتے پری کوں تاں سانبھ گھنسیں ناں؟''

(چراغ دین! میرے شہر یار اور پروین کو تو سنبھال لو گے ناں؟)

''تیڈا دماغ پَرتی گیا اے۔ کملا نہ بن۔ سیاناں تھی ونج ہن تاں..... اپنے آپ کو سنبھالو اور عقل کے ناخن لو۔ وَن کی گچھی الجھ جائے تو نرم ہاتھوں سے ہولے ہولے سلجھائی جاتی ہے ناں کہ جھٹکا دے کر رسی توڑ دی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو سکھی رکھو اور ہمیں بھی کسی نئی مصیبت کا منہ نہ دکھاؤ۔'' چراغ دین نے قدرے غصے سے کہا اور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

رجو حویلی کا دروازہ بند کرنے کیلئے اُٹھی تو سوہنے نے بازو تھام لیا۔ کبیدہ خاطر تھا۔ دُکھ سے بولا، ''چوری تھی گئی تاں وَل جندرے مارن دا فیدہ؟''

(چوری ہو جانے کے بعد تالے لگانے کا کیا فائدہ؟)

رجو کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا سوہنا نہ صرف شعلہ بن گیا تھا بلکہ اس کے سینک میں غیرت کا دُکھ بھی گھلا ہوا تھا۔

یارن خان بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ساری رات جاگتا رہا، چھپا رہا۔ خوف سے نیند کوسوں دور ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو موت سے بچانے کیلئے اس نے سوہنے خان کو جان سے مارنے کا فیصلہ کر لیا اور پو پھٹنے سے پیشتر ہی نور پور چھوڑ کر لاہور سدھار گیا۔

اُسے ایک ایسے پیشہ ور قاتل کی تلاش تھی جو پیسے لے کر سوہنے خان کا قضیہ تمام کر دیتا تاکہ یارن خان پر قانون اور خاندان کی طرف سے آنچ نہ آتی۔ اس کا یہ مسئلہ اس کے سیاست دان دوست میاں دلبر حسین نے چٹکی بجاتے میں حل کر دیا، ''اوئے یارن خان! انسان کے پاس پیسہ ہو اور پیسہ خرچ کرنے کا ڈھنگ بھی ہو تو دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ چند سیکنڈوں میں حل ہو جاتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ہوں ناں۔ اوئے رحیم داد! اس مردود رنگو کے پاس جا اور اسے میرا پیغام دے کہ وہ کل کسی وقت آ کر مجھ سے مل لے۔''

''ابھی چلا جاؤں صاحب؟''

''ہاں ہاں! دیر نہ کر۔ دیکھ نہیں رہا کہ میرا یار دُکھی ہو کر آیا ہے۔''

رحیم داد فدویانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر رنگو قصائی کو اُس کا پیغام دینے کیلئے نکل کھڑا

ہوا۔ میاں دلبر حسین نے ولایتی شراب کا ڈبل پیگ بنایا۔ یارن خان کی طرف کھسکایا۔ اسے ایک نظر دیکھا۔ وہ متفکر انداز میں پیشانی سہلا رہا تھا۔ میاں دلبر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''نہیں میرے دوست! فکر کی کوئی بات نہیں..... تمہیں ڈر ہے کہ وہ چوہا تمہیں قتل کر دے گا۔ ہمارے ہوتے ہوئے بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟ چوہا ہاتھی کا بگاڑ بھی کیا سکتا ہے؟..... تم اس وقت نور پور جاؤ گے جب اس کا مردہ قبر میں گل سڑ چکا ہوگا۔ یہ لو! لہرا کے پیو، جھوم کے پیو..... کم بخت ہر غم غلط کر دیتی ہے۔ پھر بھی احمق لوگ اسے غلط قرار دیتے ہیں.....''

یارن خان نے میاں دلبر حسین کو سوہنا خان کے قتل کی سپاری دی تھی۔ وہ ایک تیر سے ایک ہی شکار کر کے خود کو موت کے خوف سے نجات دلانا چاہتا تھا مگر جب اس کی ہدایت پر رنگو قصائی اپنے ساتھی ظہور عرف جورے لادی کے ہمراہ حیدر خان کے بیلے والی حویلی پر پہنچا اور حیدر خان کو پتہ چلا کہ وہ سوہنے خان کو راستے سے ہٹا کر یارن خان کا ڈراُتارنے کیلئے اس علاقے میں آیا ہے تو اس کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک پیدا ہوگئی۔ اس نے رنگو قصائی کی جھولی نوٹوں سے بھر دی اور مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا، ''چن! یارن دے نال نال ایں یار دے بارے وِی کجھ سوچ ناں!''

(یارن کے ساتھ ساتھ اس یار کیلئے بھی کچھ سوچو ناں!)

رنگو قصائی نے کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر نوٹ سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مستفسر ہوا۔

حیدر خان نے کہا، ''اکیلے سوہنے خان کے بجائے سارے ٹبر (خاندان) کی کہانی ختم کر دو۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری.....''

اب رنگو چونکے بنا نہ رہ سکا۔ بولا، ''مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

حیدر خان نے مکاری سے کام لیا، ''دیکھ بھئی رنگو! سردار یارن لاہور میں بیٹھا ہے۔ سیانا کوا ہے۔ واردات والے دن وہ سرکاری گواہی شواہی کا بندوبست بھی کیے بیٹھا ہوگا۔ اس لیے سوہنے کے قتل کا الزام اُس پر نہیں آئے گا۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ سوہنے اور میری اَٹ سٹ وسیب سے ڈھکی چھپی نہیں رہی، اس لیے قانون اور برادری والے مجھ پر شک کریں گے۔ شک بھی کیا، پک کریں گے۔''

''پھر؟'' رنگو نے نہ سمجھنے کے انداز میں پوچھا۔

''پھر کیا؟ میں مفت میں مارا جاؤں گا۔''

''نہیں خان جی! محض اتنی سی بات پر کوئی آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔'' رنگو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے وثوق سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر جب مجھ پر برادری والے شک کریں گے تو کل کلاں سانپ کا بچہ جوان ہو کر مجھے ڈنگ مارنے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوگا۔ میں جیل جانے سے بچ گیا تو وہ کتے کا پلا میرا سر لے جائے گا۔''

رنگو بظاہر خاموش رہا مگر اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اسے خان جی کی تاویل ہضم نہیں ہوئی تھی۔

حیدر خان بھانپ گیا۔ پینترا بدل کر بولا، ''یار! سِدھی پدھری (سیدھی سادی) بات یہ ہے کہ میں تمہیں رجسٹری کے اسٹامپ پیپرز دوں گا۔ تم ان پر سوہنے اور اس کی ذال (بیوی) کے انگوٹھے لگواؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی اور دونوں سنپولیوں کو بھی ٹھکانے لگا دو گے۔ اس کی تمام زرعی جائیداد میرے ہاتھ لگ جائے گی۔ بس! اب تو تمہیں ساری رام کہانی کی سمجھ لگ گئی ہے ناں؟''

سوہنے خان نے شادی کے موقع پر اپنے حصے کی آدھی زمین رجو کے نام کر دی تھی۔ یہ رجو کی ماں کی شرط تھی۔ سوہنے خان کا عشق ایسی رکاوٹوں کو خاطر میں کہاں لاتا تھا۔ اس نے نکاح کی اس سسرالی شرط کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ آدھی زمین کے بیان بھی رجو کو دے دیے۔ اس لیے پوری جائیداد ہتھیانے کیلئے سوہنے کے ساتھ ساتھ رجو کے انگوٹھے کے نشانات بھی حیدر خان کو درکار تھے۔ ان دونوں کے شناختی کارڈز کی نقول پٹواری سے چار نوٹوں کے بدلے باآسانی مل سکتی تھیں۔

رنگو نے الجھن آمیز نظروں سے خان جی کو گھورا۔ کہا، ''خان جی! اس ماں کے..... رنگو قصائی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے۔ اگر سوہنے اور اس کی ذال کے انگوٹھے لگوا کر میں صرف سوہنے کی گردن کاٹ دوں تو بھی جائیداد آپ کو مل جائے گی۔ اس کی بیوی اور دو معصوم بچوں کو ماروں یا زندہ چھوڑ دوں، ایک ہی بات ہے۔''

حیدر خان کی ہنسی خباثت سے بھرپور تھی۔ استہزائیہ انداز میں بولا، ''رنگو! تم پیڑ نہ گنو بلکہ آم کھاؤ۔ یہ باریک باتیں تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔ او بھلے بندے! کیا تم اس

بات کا ثبوت چھوڑ کر آؤ گے کہ تم نے سوہنے اور اس کی بیوی کو قتل کرنے سے پہلے انگوٹھے لگوائے تھے؟ سوہنے کی ذال رجو نہ صرف مقدمے کی مدعیہ بن جائے گی بلکہ پولیس فوری طور پر مجھ تک بھی پہنچ جائے گی۔ واہ میاں واہ! تم اپنی کھوپڑی کو ناحق تکلیف نہ دو اور جیسا میں کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔''

رنگو قصائی نے کندھے اُچکائے۔ خان نے ذرا ہاتھ ہلکا رکھتے ہوئے ڈانٹا، ''تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ اس لیے یہاں کے معاملات مجھ سے بہتر طور پر نہیں سمجھ سکتے ہو۔ ویسے بھی میں نے تمہیں کام کی اجرت دی ہے، کم ہے تو اور مانگو مگر یہ فضول کی بک بک نہ کرو۔ ہاں! میں تمہیں ایک جی دار بندہ بھی دوں گا تاکہ میری اور یارن خان کی آنکھوں میں چبھنے والا کانٹا آسانی سے نکل جائے۔ بولو، منظور ہے؟''

رنگو قصائی اس کا پابند نہیں تھا۔ وہ صرف میاں دلبر حسین کی مانتا تھا۔ اس نے اپنے تئیں سوچا کہ وہ سوہنے خان کو قتل کرنے آیا تھا۔ علاقہ اس کیلئے اجنبی تھا جبکہ حیدر خان یہاں کا بلاشرکت غیرے بادشاہ تھا۔ اگر اس سے بگاڑ مول لیتا تو شاید اپنا کام بھی مکمل نہیں کر پاتا۔ حیدر خان جیسے منتقم مزاج شخص سے یہ بعید بھی نہیں تھا کہ وہ اُسے رنگے ہاتھوں پھنسا دیتا۔ یہی سوچ کر اس نے نوٹ کھرے کرنے کی سوچی اور حامی بھر لی۔ جہاں ایک خون کرنا تھا، وہیں تین اور گلے کاٹ دینے کیا معنی رکھتے تھے۔ کاغذات کی تیاری کیلئے حیدر خان نے اُس سے دو چار دنوں کی مہلت لی جن پر سوہنے خان اور رجو کے انگوٹھے ثبت کروائے جانے مقصود تھے۔

دستاویز کی تیاری میں توقع سے زیادہ دن لگ گئے۔ سوہنا خان اپنی جانب بڑھتی ہوئی بھیانک موت سے بے خبر اپنے معمولات میں مصروف تھا اور رنگو قصائی، جورے لادی اور حیدر خان کی حویلی میں مستقل بنیادوں پر روپوش رہنے والے شیر علی عرف شیرو بھٹی کی صورت میں ڈراؤنی موت ایک رات کی تاریکی میں سوہنے خان کے گھر کی چار دیواری پھاند آئی۔

اندازے کے مطابق عین اسی وقت سوہنا خان رفع حاجت کرنے یا پانی پینے کیلئے بیدار ہوا تھا۔ دیوار پر سے کودنے والوں کی چاپ سن کر یا محض چھٹی حس کے خبردار کرنے پر اُس نے دروازے کی درزوں سے باہر صحن میں جھانکا۔ بزدل ہوتا تو پتہ پانی ہو جاتا، اوسان خطا ہو جاتے مگر وہ بہادر مرد تھا۔ لحظہ بھر میں ہی بھانپ گیا کہ آنے والے محض چور ڈاکو نہیں تھے۔ ان کا مقابلہ کرنے سے پیشتر اس نے میرے اور پروین کے بارے سوچا۔ اولاد انسان کی کمزوری

ہوتی ہے۔ جونہی رنگو قصائی کمرے کے دروازے پر پہنچا، اس نے اپنی کمزوریوں کو سوتے میں اُٹھایا اور بجلی کی سی مستعدی سے گندم کے ادھ بھرے بھڑولے میں پھینک دیا۔ اس نے تو رجو کو بھی بڑی جستی پیٹی کے پیچھے چھپا دیا تھا مگر وہ اپنے سائیں کو تین ہٹے کٹے غنڈوں کے رحم و کرم پر خون میں نہاتے ہوئے دیکھ کر چھپی نہ رہ سکی۔ چیختی چلاتی باہر نکلی۔ شیرے بھٹی کی آہنی گرفت میں آتے ہی اس کی چیخ و پکار بے صدا ہوگئی۔

موت سے کون چھپا رہ سکتا ہے؟..... وہی؛ جسے زندگی اپنی غلام گردشوں میں چھپا لیتی ہے۔ مجھے اور پروین کو زندگی نے موت کی آنکھ سے اوجھل کر دیا جبکہ سوہنا خان اور رجو کی جوانیوں کو قبائے خون میں لپیٹ کر لقمۂ اجل کر دیا گیا۔ ابھی دونوں کی سانسیں تھمی نہیں تھی کہ جورے نے کالی روشنائی والے اسٹیمپ پیڈ کو کھول کر عرضی نویس کے رجسٹر اور اسٹامپ پیپرز پر دونوں کے انگوٹھے لگا لیے۔ انگوٹھوں پر لگی ہوئی سیاہی سارا پول کھول سکتی تھی۔ اس لیے شیرے بھٹی نے دونوں کے انگوٹھوں کو انہی کے خون سے تر کر دیا۔ مقتولین کے اپنے ہی لہو نے سٹیمپ پیڈ کی سیاہی کو سرخ کر دیا۔

جس بھیانک رات میں میرے ماں باپ کا بخت سو گیا تھا، اسی شب بھڑولے کے سوراخ کے سامنے آتے ہی رنگو قصائی کے بخت کو غنودگی کا پہلا جھٹکا لگا اور اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا جس کی وجہ سے وہ آج میری بیدار بختی کے قدموں میں پڑا لہو چاٹ رہا تھا جبکہ اپنے یار جورے لادی اور شیرے بھٹی سمیت یارن خان اور حیدر خان کے نام بتا کر عبرت انگیز انجام ان کے سرہانوں تلے رکھ چکا تھا۔

داستان تمام ہوگئی۔ بولنے والے کے پاس الفاظ ختم ہو گئے۔

اس دوران چہرے سمیت میرا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اپنی دردآگہی کی اس کیفیت کو میں کوئی نام نہ دے سکا۔ عجیب خالی الذہنی کی کیفیت مجھ پر مسلط تھی۔ ایسے میں مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ سر اُٹھا کر دیکھا۔ میو ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا گلاس تھامے کھڑا تھا۔ میں نے گلاس تھاما اور حلق میں انڈیل لیا۔

ذہن پر چھائی ہوئی بے عنوان دھند چھٹی۔ میں نے میڈم کو دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ متوجہ پا کر اسپاٹ لہجے میں بولی، ''شہریار! تمہارا دشمن تمہارے پیر چاٹ رہا ہے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے؛ یہ فیصلہ بھی تمہی کو کرنا ہے۔''

میں نے رنگو کی طرف قدم بڑھایا تو یک بارگی یوں لگا جیسے بدن کی تمام قوتیں ایک دم نڈھال پڑ گئی تھیں۔ میں نے رنگو قصائی کی اکلوتی آنکھ میں جھانکا۔ پھر بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور فرش پر اکڑوں بٹھا دیا۔ کہا، ''رنگو! تمہیں بھیانک موت مارنے کا فیصلہ تو میں نے اُس گھڑی ہی کر لیا تھا جس گھڑی میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آج چونکہ تم نے میرے دوسرے دشمنوں کے چہروں پر پڑے نقاب کو اُتار کر مجھ پر احسان کیا ہے، اس لیے تمہیں تمہارے احسان کا صلہ دیتے ہوئے آسان موت ماروں گا۔''

میری آواز میں عمر بھر کا انتقام پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔

اس کی اکلوتی آنکھ میں موت کا خوف اور زندگی کی طلب بیک وقت بیدار ہوئی۔ منت آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا، ''جس طرح تم اپنی باس کے حکم پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہو، اسی طرح میں بھی آزاد ہاتھوں پیروں والا غلام تھا۔ کل بھی؛ اور آج بھی۔ مجھے میاں صاحب نے یارن خان کی آگ بجھانے کیلئے بھیجا تھا اور میں چلا گیا تھا۔ قسم رب سوہنے کی! تمہارا حقیقی دشمن میں نہیں، وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجھے تمہاری حویلی میں بھیجا تھا۔ ورنہ میں نے تو تمہارے باپ کو زندگی میں کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس سے مجھے دشمنی کیونکر ہو سکتی تھی۔ تم جاؤ..... جا کر انہیں مارو جنہیں مار کر تمہارے دل میں بھڑکتی ہوئی انتقام کی آگ بجھ سکتی ہے، مجھے کیوں مارتے ہو؟''

''تو کیا میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں؟''

''ہاں! اس کے بدلے میں تمہاری دی ہوئی زندگی کو تمہاری غلامی میں دے دوں گا۔'' اس نے مجھے نئی راہ سجھائی۔

میڈم شکیلہ جلدی سے قریب آ گئی۔ بولی، ''یعنی تم میاں دلبر حسین کو چھوڑ کر میرا گروپ جائن کر لو گے؟''

اس نے نقاہت بھرے انداز میں پہلے میڈم کو، پھر مجھے دیکھا اور غیر محسوس انداز میں نفی میں سر ہلایا، کہا، ''نہیں..... مم..... میں شہریار کی بات کر رہا ہوں۔''

میڈم نے میرا ہاتھ تھاما۔ تھوڑا دور لے گئی۔ سمجھانے کے سے انداز میں گویا ہوئی، ''تمہارا غلام بنے یا میرا، ایک ہی بات ہے۔ اسے مارنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ زندہ رہے گا تو ہم اس سے کئی کام لے سکیں گے۔ اس کی مدد سے تم ان کمینے سرداروں کی گردن ماپ سکو گے

اور آسانی سے انتقام لے سکو گے۔ کیا خیال ہے؟''

مجھے میڈم کی سوچ پر حیرانی ہوئی۔ احتجاجی انداز میں اسے دیکھ کر کہا، ''مگر یہ میرے بے گناہ ماں باپ کا قاتل ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ آواز مزید دھیمی کر لی، ''زندگی کی اونچ نیچ کو سمجھنے والا زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔ تم اب عام آدمی نہیں رہے بلکہ خاص ہو چکے ہو، اس لیے خاص انداز میں سوچو۔ اسے آخری شکار سمجھ کر زندہ رکھو۔ بکری بنا کر اپنی مچان کے نیچے باندھو اور درندوں کو للچا کر مچان کے قریب لاؤ۔ احمقانہ انداز میں اسے قتل کر دو گے تو تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

میں نے شکوے بھرے انداز میں اُسے گھورا۔ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا رنگو قصائی کے پاس پہنچا۔ اس نے شاید میرا چہرے دیکھتے ہی موت کا نوشتہ پڑھ لیا تھا۔ تبھی ایک لمبی سانس لے کر اپنی آنکھ موند گیا۔

میں نے جھک کر اس کے کانپتے ہوئے وجود کو بانہوں میں سمیٹا۔ وہ بھاری وجود کا مالک تھا اس لیے اسے اُٹھانے میں میری پوری قوت صرف ہو گئی۔ سینے کے برابر ہوا میں بلند کرنے کے بعد میں نے اچانک اپنی بانہیں کھول دیں۔ وہ کولہوں کے بل فرش پر گرا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اسے پھر اپنی بانہوں میں جکڑ کر ہوا میں اُٹھا لیا۔ پہلے کی طرح زمین پر پھینکنا چاہا مگر وہ عین موقع پر بری طرح تڑپا۔ میری گرفت سے نکلتے نکلتے اَٹک گیا۔ اب میری بانہیں اس کی کمر میں حائل تھیں اور اس کا سر نیچے کی طرف جبکہ دونوں ٹانگیں میرے سر کے اوپر فضا میں لہرا رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت اس نے شاید از خود اپنی پوزیشن کا انجام بھانپ لیا تھا، تبھی حلق پھاڑ کر چیخا، ''نہیں..... مجھے مت مارو..... نہیں.....''

میں نے دانت بھینچ لیے۔ دشمن زندگی کی بھیک مانگ کر میرے انتقام کے شعلوں پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا تھا۔

ایسے ہی وقت میں میڈم شکیلہ تیزی سے میرے قریب آئی، ''شہریار! آئی سے یو، سٹل یور سیلف!'' (شہریار! میں کہتی ہوں اپنے آپ کو روک لو۔)

زندگی استاد سے مختلف رویہ رکھتی ہے۔ استاد سبق پڑھا کر امتحان لیتا ہے اور ناکامی پر سزا دیتا ہے جبکہ زندگی سزا دیتی ہے، پھر امتحان لیتی ہے اور بعد میں سبق دیتی ہے۔ مجھے اعتراف تھا کہ میڈم شکیلہ زندگی کے ہاتھوں مجھ سے کہیں زیادہ سبق پڑھ چکی تھی مگر اس وقت میں اس کی

بات ماننے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے اسے دیکھے بغیر کہا، ''میڈم! آپ ایک طرف ہٹ جائیں پلیز!''

وہ ہٹنے کے بجائے جھٹ سے میرے سامنے آ گئی۔ سخت لہجے میں بولی، ''میں کہہ رہی ہوں، چھوڑ دو اِسے.....''

میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''یوشٹ اَپ.....''

یہ کہتے ہی میں نے رنگو کی کمر میں حائل اپنی بانہوں کی گرفت کو سخت کیا۔ جست بھرنے کے سے انداز میں اوپر اچھلا۔ جنونی قوت کی بدولت رنگو کے بھاری وجود سمیت دو اڑھائی فٹ کی بلندی تک چلا گیا۔ نیچے گرنے سے قبل میں نے اپنی دونوں ٹانگیں پوری وسعت میں پھیلا دیں۔ رنگو سر کے بل فرش پر گرا۔ اس کے اپنے جسم کے غیر معمولی وزن پر میرا بوجھ بھی لدا ہوا تھا جس کے نتیجے میں 'کڑاک' کی زوردار آواز کے ساتھ اس کا منکا ٹوٹ گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ اتنی دردناک اور کریہہ تھی کہ ہال کی فضا جھنجھنا اُٹھی۔ میرے اندر جلتے ہوئے بھانبھڑ پر بارش کی تیز واچھڑ (بوچھاڑ) آن گری اور میں بے جان انداز میں اس پر لیٹ گیا۔ اس کا زندگی کو الوداع کہتا ہوا جسم چند جھٹکے لینے کے بعد ٹھنڈا پڑنے لگا۔

میں نے اپنی سانسوں کے غیر معمولی شور میں میڈم کی تأسف بھری آواز سنی، ''تم نے مجھے 'یوشٹ اپ' کہا، میرا حکم بھی نہیں مانا.....اوہ مائی گاڈ! یہ کیوں ہوا؟.....اور تم نے میرا کہنا نہ مان کر اچھا نہیں کیا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ پھر بولی، ''ڈرٹی مین! یہ مر چکا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ میو! کم آن..... رنگو کی لاش کو ٹھکانے لگا دو۔ ہری اَپ!''

رنگو کو دیکھے بغیر ہی مجھے یقین تھا کہ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا جبکہ میڈم شکیلہ حکم عدولی پر مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ میں نے تساہلانہ انداز میں اپنی بانہیں اس کے نیچے سے نکالیں اور ہتھیلیاں فرش پر ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ گویا ایک دم بوڑھا ہو گیا تھا۔

میڈم کو نظر انداز کرتے ہوئے تیز قدموں چلتا ہوا بیڈ روم میں گیا۔ منہ ہاتھ دھویا، ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پیا اور اپنے آپ کو معتدل کرتے ہوئے پلٹا۔ میڈم شکیلہ کو اپنے عقب میں کھڑے پایا۔ سر جھکا کر کہا، ''سوری میڈم! وہ دراصل.....میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔''

اس کا چہرہ اسپاٹ رہا۔ بولی، ''مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں نادان نہیں ہوں؛ سب سمجھتی ہوں۔''

مجھ پر شرمساری کا احساس غالب تھا۔ میں نے اس کے مرتبے کا خیال کیے بغیر میو کی موجودگی میں 'یوشٹ اَپ' جیسا غیر مہذب جملہ اچھال کر اچھا نہیں کیا تھا مگر منہ سے نکلا ہوا لفظ اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ روکنے کے سے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا کر میری چھاتی پر رکھتے ہوئے بولی، ''شہریار! میں انسان اور مشین کے فرق کو سمجھتی ہوں۔ تمہاری جگہ پر اگر میں ہوتی تو شاید یہی کچھ..... یا پھر اس سے بھی زیادہ شدید ردِعمل ظاہر کرتی۔ خیر! جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ میں چاہوں گی کہ آئندہ تمہارے منہ سے ایسا جملہ کبھی نہ نکلے۔ او کے؟''

''یس میڈم! آئی ایم سوری.....''

میں نے ایک نظر اُس کے گداز ہاتھوں کو پھر اُس کے تابناک چہرے کو دیکھا۔ اس شبِ گزشتہ کا ایک ایک لمحۂ وصال اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ نہیں بھولا تھا تو یاد اُسے بھی سب کچھ تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ میرے حواس پر سوار تھی اور میں اُس کی ذات کے طلسم سے باہر نہیں آ سکا تھا جبکہ وہ اس رات کی پرچھائیوں سے چھٹکارا پا کر نارمل ہو چکی تھی۔

میرے سینے پر اس کے ہاتھوں کے دباؤ میں کچھ اضافہ ہوا اور وہ تھوڑی اور قریب ہو گئی۔ میرے چہرے پر اپنی سانسیں چھوڑتے ہوئے بولی، ''میں نے ایک رات جاگ کر ہیر وارث شاہ کا قصہ پورے ترنم کے ساتھ گایا اور تمہیں سنایا۔ یاد ہے؟'' میرے اثبات میں سر ہلانے پر ایک ذرا مسکرائی، بولی، ''تو کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ ہیر عورت تھی یا مرد؟''

میں اس کے سوال کی گیرائی کو سمجھ نہیں پایا۔ بولا، ''وہ عورت ہی تھی؛ مگر میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ قدرے مسرور لہجے میں کہا، ''تم ابھی چالاک نہیں ہوئے ہو۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم نے پوری کہانی سننے کے بعد یہ سوچنے کی زحمت کی کہ میں تمہیں کیوں پسند کرتی ہوں؟..... تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں نے کیوں کر تمہیں وہ سب کچھ بتانے کا تردد کیا تھا جو بظاہر غیر ضروری اور بے محل تھا؟''

مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ تبھی میں نے کہانی کو بس کہانی ہی سمجھ کر سنا تھا اور بعد میں سوچا

تھا کہ وہ محض اپنا غبارِ دل نکال رہی تھی۔ میں نے بے چارگی کے عالم میں انکار میں سر ہلا دیا۔

اس نے نچلا ہونٹ اوپر والے ہونٹ پر چڑھایا۔ اپنی خوبصورت آنکھوں کو تھوڑا میچ کر مچلی اور بانہیں کھول کر میرے سینے سے لگ گئی۔ اس کی گرفت ایسی نہیں تھی میری سانس بھنچ جاتی..... مگر سانس بھنچ گئی اور دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ ایسے میں اس نے میری چھاتی پر اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے دایاں ہاتھ آہستگی سے بڑھایا۔ کسی فتح یاب سالار کی طرح ہاتھ رفتہ رفتہ بڑھاتے ہوئے میری آنکھ تک لائی۔ ہاتھ رُکنے سے پیشتر میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی انگلی کی اگلی پور میری بند آنکھ پر آ کر رُک گئی۔ میرا دِل بھی گویا رُک گیا اور اس کی انگلی کی حرکت کے ساتھ ہی میری سانس تھم سی گئی۔

اس کی انگلی سے پھوٹنے والی برقی روئیں میری بند آنکھ پر موجود ننھے سے سیاہ تِل میں سرایت ہو رہی تھیں اور میں دم بخود کھڑا تھا سوچ رہا تھا۔ وہ جو مجھے اپنی مردانہ وجاہت کا مان رہا تھا، وہ ایک سیکنڈ میں ٹوٹ گیا۔ وہ جو اپنی سادہ دلی اور غیر منافقانہ رویوں کا بھروسہ تھا، وہ نہ رہا۔ اپنی ذات میں موجود ہر خوبی معدوم ہوتی محسوس ہوئی اور میری ہویت کا تمام تر احساس اُس سیاہ نقطے میں سمٹ گیا جس پر میڈم شکیلہ نے اپنی انگلی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے نہیں، اُس تِل سے پیار کرتی تھی جو اس کی زندگی کیلئے مامون رضوان کی طرف سے نشان زد کیا گیا قسمت کا ستارہ تھا۔ وہ مجھے نہیں، اپنی خوش بختی کو پوجتی آئی تھی۔ مجھ سے پہلے اسے یہی ستارہ ڈاکٹر منور علی شاہ کی بائیں آنکھ پر دکھائی دیا تھا۔ وہ اُس پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ پھر اُسے بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے اجمل گیلانی کا تِل دکھائی دیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے، ڈاکٹر منور علی شاہ کی نصیحتوں سے روگردانی کرتے ہوئے وہیں رُک گئی تھی..... اور اَب اسے اپنی قسمت کا درخشاں ستارہ میری بند آنکھ پر جگمگاتا ہوا نظر آ رہا تھا اور وہ میری چھاتی سے لگی اُسے سراہ رہی تھی۔ بھول گئی تھی کہ میں چند لمحے قبل اُسے نہایت درشت انداز میں ''یو شٹ اَپ'' جیسا توہین آمیز جملہ کہا تھا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کے پار ہال میں میو دکھائی نہیں دیا۔ وہ رنگو کی لاش کو ٹھکانے لگانے میں کہیں مشغول تھا۔ میں نے طویل سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور کہا، ''میڈم! آپ اتنی بولڈ ہو کر بھی ایسے توہمات کا شکار ہیں، حیرانی کی بات نہیں ہے کیا؟''

میرے سینے پر اُس نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔ ہولے سے کہا، ''نہیں شہریار! ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا خمیر جس مٹی سے اُٹھا، وہاں قدم قدم پر ایسی سیکڑوں رسمیں اور توہمات منہ

کھولے کھڑے رہتے ہیں مگر میرا کیس ان سے بہت مختلف ہے۔ جب میرے سامنے کچھ بھی نہیں تھا، تب مجھے ماموں رضوان نے ایک ننھے سے سیاہ دھبے کے اندر موجود واقعات کی لمبی ٹریل دکھائی تھی۔ تب میں نے بھی اسے واہمہ قرار دیا تھا مگر تم ہی بتاؤ، اَب جبکہ میں اس ننھے سے سیاہ دھبے سے بہت کچھ حاصل کر چکی ہوں، بہت کچھ دیکھ چکی ہوں، اِسے کوئی حیثیت کیسے نہ دوں؟ ماموں رضوان کو جھوٹا تب کہوں، جب میری زندگی میں وہ سب کچھ نہ ہوا ہو جو اُنہوں نے مجھے قبل از وقت موہوم انداز میں بتایا تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ جیسے شخص سے ملاقات کو کیا نام دوں؟ اجمل گیلانی کی ذات نے مجھے دنیا سے اُٹھتے ہوئے انتہائی غربت سے نکال کر امارت کے آکاش پر براجمان کر دیا، اُسے کیا تسلیم نہ کروں؟ سیاہ تل تمہاری آنکھ پر بھی جگمگا رہا ہے۔ کیا تم 'نہیں' ہو؟..... تمہارا کوئی وجود ہی نہیں ہے؟..... مان لیا کہ تم میرے لیے اجمل گیلانی یا ڈاکٹر منور علی شاہ کی طرح نہیں آئے تھے مگر کیا تم نے دریا کے بیلے میں مجھے نئی زندگی نہیں دی تھی؟''

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ میں چاہتا تو اس کی طویل بات میں دخل دے سکتا تھا مگر بولنے سے سننا کہیں بہتر اور فائدہ مند تھا۔ اس لیے خاموش رہا۔

وہ تھوڑا توقف لینے کے بعد بولی، ''شہریار! تم نے وہ کچھ نہیں دیکھا، نہ بھگتا جو میں نے اپنے عام سے دیہاتی گھر سے نکلنے کے بعد دیکھا۔ تم اس عذاب سے نہیں گزرے جس عذاب سے مجھے قسمت نے گزارا۔ تمہیں سر منڈاتے ہی اولے نہیں پڑے بلکہ میرا بنا بنایا سسٹم مل گیا۔ ہاں! تمہیں یہ موقع میسر نہ آتا تو تمہاری حالت بھی مجھ سے کسی طور مختلف نہ ہوتی۔ تب تمہیں پتہ چلتا کہ دکھے ہوئے دل کو لاکھوں روپے کا فائدہ دینے والے محسن سے کہیں بڑا محسن وہ دکھائی دیتا ہے جو ڈھارس کے چند الفاظ موزوں انداز میں عطا کر دیتا ہے۔ بعض اوقات پانی کا ایک گلاس اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ پلانے والے پر جان قربان کرنے کو دل کرتا ہے۔ ہاں! تم نے بھی شاید مجھے پانی پلایا ہے۔ مگر نہیں..... تم نے نہیں..... اِس نے!''

اس نے اپنی انگلی کی پور میری آنکھ کے تل پر رکھی ہوئی تھی، جس پر اس نے تھوڑا دباؤ ڈالا اور پھر اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے چونک کر پوچھا، ''اب کیا ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ اسی لیے تو ہنسنے لگی ہوں۔'' وہ یک بارگی علیحدہ ہو گئی۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ دلچسپی آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ سر تا پا۔ پھر تحسین آمیز انداز میں بولی، ''تم دیہاتی ہو۔ تناور درخت کی طرح ٹھوس اور مضبوط..... بچے کی

طرح سچے اور کھرے..... کسی الہڑ دیہاتی دوشیزہ کی طرح انتہا پسند..... ہے ناں! یہی سب تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ انسان کا رونے پر دل آئے تو جی بھر کر روئے۔ ہنسنے کو روح مانے تو قہقہے لگائے۔ لوگوں کی خوشنودی کیلئے نہیں؛ محض اپنے لیے..... اور وہ یہ سوچ کر نہ روئے کہ لوگ کیا کہیں گے؛ اور خواہش کے باوجود نہ ہنس پائے کہ لوگ برا مانیں گے تو وہ منافق ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی نہیں، دوسرے کے بے وقعت جذبات اور ترجیحات کا وقت گزارتا ہے۔ شہروں میں منافقوں کی نرسریاں موجود ہیں۔ دیہاتوں میں لوگ من کے سچے مل جاتے ہیں۔ کہیں کہیں، کوئی کوئی..... تمہارا کیا خیال ہے؟''

میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ بولا، ''میڈم! مجھے عجیب لگتا ہے کہ آپ دیہاتی ہونے کے باوجود شہری لڑکیوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ ہیں۔ زیادہ امپریسو..... دیہاتوں میں حسن ہوتا ہے مگر اتنا شوخ اور نازک نہیں۔ آپ کی زیادہ عمر تو بیٹ میں، پھر عذاب میں گزری جبکہ نہایت تھوڑا عرصہ شہر میں۔ مگر لگتا نہیں ہے۔''

وہ ہنستی ہوئی بیٹھ گئی۔ شوخی سے بولی، ''عورت اگر مزدور بن جائے تو نازک نہیں رہتی۔ مرد کی طرح سخت ہو جاتی ہے۔ دھوپ میں پسینہ بہائے تو اس کی گوری اور ملیح جلد نہ صرف کھردری ہو جاتی ہے بلکہ سنولا بھی جاتی ہے۔ عورت کو نفیس اور خوبصورت بنانے کا سہرا تو مرد کو جاتا ہے جو اسے لفافوں میں، دیواروں میں اور پابندیوں میں جکڑ کر رکھتا ہے۔ محبت کے نام پر دھوپ، موسم اور تجربوں سے بچا کر نازک بنا دیتا ہے۔ حکومت کرنا چاہتا ہے ناں!..... بڑے انداز سے کمزور کرتا ہے پھر فتح پا لیتا ہے۔ بائی داوے! مجھے ملتان میں رہتے ہوئے اتنا تھوڑا عرصہ بھی نہیں ہوا۔ ائر کنڈیشنڈ اور فراغت کے ساتھ ساتھ دولت نے مجھے سہارا دے رکھا ہے۔ اجلا اور خوب صورت بنا رکھا ہے۔ بیٹ میں خوبصورت تھی۔ ملتان میں خوب تر بن گئی ہوں۔''

اس نے درست کہا تھا۔ فرزانہ اور شبانہ جب نور پور میں رہا کرتی تھیں تو ان کی جلد کھردری اور رنگ پیدائشی گورا ہونے کے باوجود سنولایا ہوا تھا جبکہ ملتان کے چھوٹے سے مکان میں قید ہوتے ہی نہ صرف ان کا رنگ نکھر آیا تھا بلکہ زیادہ دیر چھاؤں میں رہنے کی بدولت جلد غیر معمولی نرم اور ملیح ہو گئی تھی۔

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کہا، ''کیا آپ نے اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی خاکہ تیار کر رکھا ہے؟''

وہ کھڑی ہوگئی۔ میرے پہلو سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی، ''انسان بہت کچھ سوچتا رہتا ہے۔''

''تو کیا آپ نے بھی ایسا کچھ سوچ رکھا ہے؟''

اس نے رُک کر اثبات میں سر ہلایا۔ بولی، ''ہاں تو..... مگر حالات ایسے بھی درپیش آ سکتے ہیں کہ تمام عمر مارا ماری میں گزر جائے یا کسی دن کوئی گولی پلٹ کر میرا سینہ چھید جائے گی۔ ٹائیں ٹائیں فش!''

میرے لبوں سے نکلا، ''اللہ نہ کرے۔''

اس نے میری بے ساختگی سے لطف لیا۔ دروازے میں کھڑی باہر ہال میں دیکھنے لگی۔ کوئی موجود تھا جسے میو کے پیچھے جانے کا حکم صادر کرنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی، ''تمہیں پیا تمہارے گھر چھوڑ آتا ہے۔ اپنے گھر کی خبر لو۔ آج کی شب اور کل کا دن موج کرو۔ کل رات تمہیں اس کمینے نوروز بھٹی کی گردن ماپنے کیلئے موضع سمن میں جانا ہے۔ نگینہ بھٹی کے علاوہ کوئی بھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ یعنی یہ مشن تمہیں سرانجام دینا ہے۔''

مجھے ایل ایچ وی عالیہ اور نگینہ یاد آ گئیں۔ خوبصورت چہرے اور اسمارٹ وجود والی عورت مس عالیہ جس نے اپنے کلینک میں میڈم کا علاج معالجہ کیا تھا۔ پھر اپنی بے اولادی کا رونا رونے کے بعد رازدارانہ انداز میں نوروز بھٹی اور اس کے دو سفاک بیٹوں کے ظلم سے بھری داستان سنائی تھی۔ ہمارے ایما پر ایک نازک اندام دوشیزہ کو ہمارے حوالے کرتے ہوئے مدد کی درخواست کی تھی۔ مجھے بجن بھٹی، اس کے چھوٹے بھائی نوروز بھٹی اور نگینہ کے ناحق قتل ہونے والے بھائی سلامت بھٹی کے نام بھی یاد رہ گئے تھے۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ''میڈم! کیا یہ ضروری ہے کہ نگینہ بھی میرے ساتھ جائے؟''

وہ رُک کر پلٹی۔ مجھے سوالیہ نگاہوں سے گھورنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا، ''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ میرے ساتھ نہیں جائے گی تو میں زیادہ آسانی اور بے فکری سے نوروز بھٹی اور اس کے بیٹوں سے دو دو ہاتھ کر لوں گا۔ نگینہ کی موجودگی میں مجھے اس کی حفاظت بھی کرنا پڑے گی۔''

اس نے سر ہلایا۔ ایک ذرا مسکرائی۔ بولی، ''شہریار! تم نے رنگو قصائی کو اپنے ہاتھوں قتل کیا تو تمہیں قلبی سکون ملا۔ تمہارے دل پر چھائے ہوئے ماں باپ کے قتل کا دُکھ کچھ کم ہو گیا۔ اسی

طرح نگینہ اپنے بھائی کے قاتل کو اپنے ہاتھوں چھلنی کرے گی یا اُسے تڑپتا ہوا دیکھے گی تو عمر بھر کیلئے شانت ہو جائے گی۔ اسے وہاں سے کچھ کاغذات بھی اُٹھانا ہیں جو ظاہر ہے، تم تلاش نہیں کر سکو گے۔''

میں نے کہا، ''میڈم! ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میں پاتال سے بھی کاغذات نکال کر لا سکتا ہوں۔''

''بہر حال! نگینہ تمہارے ساتھ جائے گی۔ میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں۔''

میں نے سر تسلیم خم کر لیا۔ یاد آنے پر مستفسر ہوا، ''کیا آپ اور نگینہ کے درمیان قیمت طے پا چکی ہے؟''

''قیمت؟'' وہ چونکی۔

''آپ نے اُس دن شجاع آباد سے واپسی پر لینڈ کروزر میں نگینہ سے کہا تھا کہ آپ اس سے اس کام کی اُجرت لیں گی۔'' میں نے یاد دلایا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر معنی خیز انداز میں بولی، ''نہیں..... مگر میں اس سے بغیر طے کیے ہی بہت کچھ وصول کر لوں گی۔ ایسے؛ کہ اُسے پتہ بھی نہیں چلے گا اور میرا رانجھا بھی راضی ہو جائے گا۔ چھوڑو اِس تذکرے کو؛ جاؤ..... اپنی نیند پوری کرو..... موج کرو۔''

ہر انسان کے اندر ایک رانجھا چھپا ہوتا ہے جسے وہ تمام عمر راضی کرنے کی تگ و دو کرتا رہتا ہے۔ وہ کبھی تو مہربان ہو جاتا ہے تو کبھی روٹھا روٹھا ملتا ہے۔ رنگو قصائی کا ستیاناس کرتے ہوئے میرے من کا رانجھا شانت ہو گیا تھا۔ برسوں سے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے پڑ گئے تھے۔

میڈم سے جدا ہو کر پیا کے ساتھ شہر واپس آتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ آج کی رات گہری اور مطمئن نیند سوؤں گا۔ گھر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے موج دین عرف موجو، شانو اور فرزانہ کی جون ہی بدل گئی ہو۔ پہلے سے زیادہ خوش اور آسودہ دکھائی دیے تو مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ تبدیلی ان کے حلیوں اور چہروں میں نہیں، میرے اندر پیدا ہوئی تھی۔ میں خاصا تھکا ہونے کے باوجود تھکاوٹ محسوس نہیں کر رہا تھا اور چین کی بانسری بجانے کیلئے اہلِ خانہ سے تبادلۂ احوال کے بعد بیڈ پر دراز ہو گیا۔ میری خوب صورت راوی نے میرے لیے چین لکھ دیا تھا۔

❖❖○❖❖

رات دس بجے کا عمل تھا جب سخی محمد سفید رنگ کی ٹویوٹا کار میں بیٹھ کر میرے گھر پہنچا۔ اس کے ساتھ نگینہ بھی آئی تھی جو اس وقت میرے سامنے ڈرائنگ روم کے صوفے پر براجمان تھی۔ خاصی مضطرب اور بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے جادوئی حسن میں جان پڑ چکی تھی۔ جو بھی دیکھتا، وہ دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میری کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ اس کی چمکدار سپید جلد میں شفافیت کی بدولت نیلگوں حلقے پڑ رہے تھے جو اس کے حسن دل آویز میں بے پایاں اضافہ کر رہے تھے۔ آنکھیں کسی کھلنڈرے بچے کی طرح شوخ اور چمکدار تھیں۔ ان میں بھی نیلاہٹ جھلک دیتی تھی۔ وہ میرے انہماک پر رُخ پھیر گئی۔

سخی محمد نے میڈم کا حکم سنایا کہ میں اور نگینہ آج رات کو ملتان سے سمن کیلئے نکلیں گے اور نوروز بھٹی پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔ میں نے سخی محمد کی باتیں غور سے سنیں پھر قدرے چست لباس میں ملبوس نگینہ پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا، ''سخی محمد! میڈم اسے میرے ساتھ سمن بھیجنے پر مصر ہیں حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کی عدم موجودگی میں بہتر انداز سے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہوں۔ یہ میرے ساتھ ہوگی تو بار بار میری توجہ اس کی حفاظت کی جانب مبذول ہو جائے گی۔''

سخی محمد نے کندھے اُچکائے، ''یہ مشورہ تو میں نے بھی دیا تھا مگر میڈم نہیں مانیں۔''

اب تک خاموش بیٹھی نگینہ پہلو بدل کر بولی، ''نہیں پلیز! میں ساتھ ضرور جاؤں گی۔ جب تک میں ان کتوں کو اپنے ہاتھوں قتل نہیں کروں گی یا کم سے کم اپنی آنکھوں سے انہیں تڑپتا ہوا نہیں دیکھوں گی، مجھے چین نہیں آئے گا۔''

اس کے لہجے پر انگریزی زبان کا بھرپور تاثر غالب تھا مگر اس دن سے قدرے بہتر انداز میں اُردو بول رہی تھی جس دن میں نے پہلی مرتبہ اسے مس عالیہ کے ہاں دیکھا تھا۔ اس کی آواز اشتعال کی وجہ سے ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ میں نے اس لرزش کو اس کے خوف کا کرشمہ قرار دیا تھا مگر آج پتہ چلا کہ ایسا نہیں تھا۔ اس کی آواز آج بھی لرز رہی تھی۔ یقیناً یہ قدرتی وصف تھا یا اس ہیجان کا اعجاز تھا جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ میں اس کے دکھ کو سمجھ رہا تھا۔ خوشیوں بھری زندگی ایک دم کانٹوں کی سیج میں تبدیل ہو جائے تو انسان پر سانسیں بھی بوجھ بن جایا کرتی ہیں۔ اس نے پیدا ہوتے ہی پر آسائش زندگی اور ناز و انداز بھرے رویے دیکھے تھے۔ والد، والدہ اور بھائی پر مشتمل اس کی مختصر سی کائنات اس کی آنکھوں

کے سامنے اجڑی تھی۔ یوں کہ وہ سنبھلنے کیلئے ہاتھ پاؤں بھی نہ مار سکی تھی۔ تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا اس لیے قدرت کے کاموں پر صبر آ ہی جاتا ہے۔ اسے ماں باپ کی جدائی پر صبر آ گیا تھا۔ بجا کہ یہ دکھ بذاتِ خود بہت بڑا سانحہ تھا مگر اس نے نازک اندام نگینہ کو شعلہ جوالا نہیں بنایا تھا بلکہ اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں اپنے جان سے پیارے بھائی کی دردناک موت نے اُسے آگ کا گولا بنا دیا تھا۔ وہ جب تک نوروز بھٹی کے بیٹوں رفاقت بھٹی اور امانت بھٹی کو انتقام کی آگ میں نہ جھونک لیتی، قرار نہیں پا سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میڈم نے اُسے میری خواہش کے بغیر میرے ساتھ نتھی کر کے میرا کام مشکل کر دیا تھا۔

میری نگاہیں نگینہ پر جمی ہوئی تھیں اور میں بظاہر اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ سمن بستی میں پیش آنے والے متوقع حالات پر غور و خوض کر رہا تھا۔ یہ آسان مشن نہیں تھا اور نگینہ کی موجودگی کی بدولت کچھ زیادہ ہی مشکل ثابت ہو سکتا تھا۔ میڈم کے حکم کے مطابق مجھے رفاقت بھٹی کو موت کے گھاٹ اُتار کر نگینہ کی سفری دستاویزات نکال لانا تھیں مگر مجھے اندازہ تھا کہ ان چھپے ہوئے کاغذات کو کھوج نکالنے تک مجھے تینوں باپ بیٹوں کی لاشوں کو پھلانگنا پڑے گا۔ بستیوں کا مزاج شہروں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ شہروں کے برعکس وہاں دیواروں سے دیواریں جڑی ہوئی نہیں ہوتیں مگر دلوں سے دل جڑے ہوتے ہیں۔ یہ خطرہ لاحق تھا کہ ایک فائر کی آواز پوری بستی میں خطرے کا الارم بجا سکتی تھی جس پر ان گنت دیہاتی مرد لاٹھیاں، چھرے اور بندوقیں سونتے گھروں سے نکل سکتے تھے اور میری ہڈی پسلی ایک کر سکتے تھے جبکہ شہروں میں فائر کی آواز ہمسائے کے کان تک بھی نہیں پہنچ سکتی کیونکہ وہ اپنے کانوں کو ہمسائے کے معاملات سے بچانے کیلئے بے حسی کے دبیز مفلر میں لپیٹ کر سوتا ہے۔

سمن میرے لیے اجنبی جگہ تھی۔ وہاں خونخوار کتوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ بھی موجود تھا۔ دیہاتی کتے ایک ہی وقت میں مشکوک دکھائی دینے والا پر حملہ کرتے ہیں اور با آوازِ بلند بھونک بھونک کر پوری بستی کو جگا دیتے ہیں۔ میں نوروز بھٹی اور اس کے خاندان کے نہ صرف محلِ وقوع سے ناواقف تھا بلکہ ان کی طاقت کے بارے میں بھی کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی حویلی یا ڈیرے تک پہنچنے کیلئے مجھے نگینہ کی رہنمائی میں چلنا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر مجھے کامل رازداری اور غیر معمولی مستعدی سے اپنا کام سرانجام دینا تھا ورنہ میں اور نگینہ دیہاتیوں کی بربریت کا شکار ہو سکتے تھے۔

''دیپن؟'' میں نے سخی محمد سے پوچھا۔ بظاہر میرا سوال ادھورا اور محض ایک لفظ پر مشتمل تھا مگر سخی محمد سمجھ گیا۔ بولا، ''دو سائیلنسر ڈپسٹلز..... ویسی ہی ایک خاموش شارٹ گن اور کے کے.....''

تھوڑے توقف کے بعد نگینہ کی طرف دیکھ کر بولا، ''ایک سلم نائف اس کی پنڈلی سے بندھا ہے۔ تم بھی لے لینا۔''

میں نے توصیفی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اس مشن میں خاموش اسلحے کی ہی ضرورت تھی۔

وہ مسکرا کر بولا، ''اور..... میں تمہارے لیے ارادتاً پٹرول گاڑی لایا ہوں جس کا فیول ٹینک فل ہے۔ اس کی پک اَپ ایک دم زبردست ہے۔ فکر مت کرنا۔ یہ گاڑی اپنی نہیں، جہاں دل چاہے، چھوڑ کر اپنی جان بچانا۔ میڈم نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ سمن میں زور آور سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے کیونکہ وہ بھٹی برادران کا دوست ہے۔ وہاں جاتا رہتا ہے۔ اگر وہ رکاوٹ بنے تو رعایت نہ کرنا اور اسے شوٹ کر دینا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چائے پینے کے بعد سخی محمد جانے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھ کے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔ گلی میں گاڑی کے قریب رُک کر رازداری سے بولا، ''میڈم نے حکم دیا ہے کہ اس کینیڈا پلٹ دوشیزہ کو بحفاظت واپس لانا ضروری ہے کیونکہ یہ سونے کی چڑیا ہے۔ کام آئے گی..... اور ہاں! میڈم نے تم دونوں کو اکیلے ہی اس مشن پر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے مگر تم چاہو تو میں میڈم کی حکم عدولی کر کے تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں کیونکہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم بہت بڑی مصیبت میں کودنے جا رہے ہو۔''

میں نے گاڑی کی چھت پر ہتھیلی ٹکائی اور مسکرا کر کہا، ''شکریہ دوست! مگر مجھے اکیلے ہی سمن جانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ معمولی سی بات پر میڈم کو بدگمان کر لوں۔ تم فکر نہ کرو، جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ مال پچھلی سیٹ کے نیچے پڑا ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اب میں چلتا ہوں۔'' سخی محمد نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پیدل چلتا ہوا گلی کا موڑ مڑ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ڈرائنگ روم میں آیا۔ نگینہ اپنی بند مٹھی پر تھوڑی ٹکائے چائے کے خالی کپ کو گھور رہی تھی۔ ایسے میں اس کی داہنی ٹانگ مضطربانہ انداز میں فرش پر تھرک رہی تھی۔

''نگینہ!''

''یس سر!'' وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔

''میں کچھ دیر گھر والوں کے ساتھ گزارنے چلا ہوں۔ ہم یہاں سے گیارہ کے بعد نکلیں گے۔ میں تب تک تیاری بھی کرلوں گا۔'' میں نے دانستہ طور پر اسے دیکھنے سے گریز کیا، پوچھا، ''تمہیں کچھ چاہیے؟''

''نو سر!'' اس کا لہجہ مؤدبانہ تھا۔

''دین ٹیک اے ریسٹ پلیز.....'' میں نے کہا اور میں ڈرائنگ روم سے نکل کر گھر کے اندر چلا آیا۔ فوجی اختر کو حسبِ معمول ہدایات دیں۔ ایسے ہی وقت میں شانو مختصر سے ٹی وی لاؤنج میں کھڑی دکھائی دی۔ جلدی سے قریب آئی۔ شانے پر ہاتھ رکھ کر نامانوس سی شوخی سے بولی، ''بھائی! تمہاری مہمان تو بہت خوب صورت ہے۔ ہے ناں؟''

مجھے اس کا انداز قطعی اجنبی لگا۔ آنکھیں پھاڑ کر بولا، ''تم نے کیسے دیکھ لیا اُسے؟''

اس نے شرارت بھرے انداز میں اَدھ کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا، بولی، ''کیوں؟ میری آنکھیں نہیں ہیں کیا؟''

''تو؟''

''غصہ کیوں کرتے ہو بھائی؟ میں نے تو ویسے ہی کہا ہے۔'' وہ مصنوعی خوفزدگی میں بولی۔

''شانو! تم بڑی بدتمیز ہوگئی ہو۔''

''ایسے تو نہ کہو بھائی! میں نے کون سی بدتمیزی کی ہے۔ میں نے کوئی یہ تو نہیں کہہ دیا کہ تمہاری اور اس کی جوڑی بہت اچھی لگتی ہے؟''

میں نے تصنع آمیزی سے کام لیا۔ اس کی چوٹی پکڑ کر کھینچی اور کہا، ''فضول باتیں نہ کیا کرو۔ ہٹو۔ مجھے کام سے جانا ہے۔ کل لوٹ آؤں گا۔''

''اس کے ساتھ کام پر جانا ہے؟''

وہ شرارت سے باز نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا اور پہلوتہی کرتا ہوا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا بے محل چھیڑنا مجھے نجانے کیوں بُرا نہیں لگا تھا بلکہ اس کے چہرے سے پھوٹنے والے قوسِ قزح کے رنگیں رنگ میری آنکھوں کو بھلے لگے تھے۔ میں تھوڑے عرصے سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی زبان مجھے 'بھائی' کہتی تھی مگر اس کی آنکھیں اور باڈی لینگویج کچھ اور کہتی سنائی دیتی تھی۔ یہ اس کی الہڑ عمر کا تقاضا تھا یا دکھ کے گہرے اور طویل سائے

سے نکلنے کے بعد اچانک جوانی کی برسنے والی برکھا کا احساس تھا کہ وہ شوخ ہوگئی تھی۔ شہروں میں لڑکیوں کو کھلائی جانے والی مرغن غذائیں انہیں بہت جلد بالغ نظر کر دیتی ہیں جبکہ دیہاتوں میں لڑکوں کو کھلی خوراک دی جاتی ہے اور ان کے مقابلے میں لڑکیوں کو کم اور غیر مرغن غذا کھانے کو دی جاتی ہے۔ شانو بھی دیہات کی فضا سے نکل کر شہر میں آن بسی تھی اور وہ کچھ سوچنے لگی تھی جس کی نور پور کی سادہ غذا سوچنے کی اجازت نہیں تھی۔

میں جوتے اُتارے بغیر بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ چھوڑے۔ شانو کے رویے پر کچھ دیر غور کرتا رہا۔ اس سوچ نے مجھے نور پور کی فضاؤں میں دھکیل دیا جہاں غزالہ دہلیز تھامے کھڑی میرا بے سود انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ شہر جانے والے لوٹ کر نہیں آتے اور اگر آ بھی جائیں تو ویسے نہیں رہتے، جیسے جانے سے پیشتر ہوا کرتے ہیں۔ اس نے شاید درست کہا تھا۔ میں نور پور سے نکلنے کے بعد خاصا بدل گیا تھا۔ خالدہ کے بدن کی صدا نہ سننے والا، سردار بخت خان کی بیٹی ملکہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنے والا شہریار شہر کی رانی، میڈم شکیلہ کی زلف کا اسیر ہو کر اپنی متاعِ عزیز کو بھولنے لگا تھا۔ وقت سے تقسیم کا عمل سیکھ لیا تھا۔ وہ یاد تو آتی تھی مگر اس وقت جب میرے گرد کسی روشنی کا ہالا نہیں ہوا کرتا تھا۔ جب میری نظروں میں میڈم شکیلہ کا اجلا چہرہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے میں میں نے غزالہ کو اس شدت سے نہیں یاد کیا تھا جو شدت ہمارے درمیان محبت کی اکائی کا درجہ رکھتی تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ میں نے اسے یاد ہی نہیں کیا تھا۔ میرے دل کے کسی نہاں خانے سے بازگشت ابھری، 'شہرے خان! اب تم شہرے خان بھی نہیں رہے ہو۔ تم شہریار بن کر اپنی جان سے پیاری ہستی کو بھول بیٹھے ہو۔ جب اس نے تمہیں طعنہ دیا تھا کہ شہر جانے والے لوٹ کر نہیں آتے تو تم نے اس کی بات کو احمقانہ قرار دے کر جھٹلا دیا تھا۔ آج اس کے یقین کو کیا نام دو گے؟'

میں نے سر جھٹکا۔ ایک لمحہ کو ذہن تاریک ہوا مگر پھر سنبھل گیا۔ بے طرح یاد آنے والی نامراد لوٹ گئی تھی۔ میرا انہماک اس وقت پوری طرح بکھر گیا جب شانو چائے کا بھرا ہوا پیالہ تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اور نگینہ کے بارے بہت کچھ کہہ رہی ہو۔ اگر وہ مجھے میڈم کے ساتھ دیکھ لیتی اور ہماری گفتگو سن لیتی تو بہت جلد نتیجہ اخذ کر لیتی اور مختلف سوال کر کر کے میرا دماغ چاٹ لیتی۔

میں نے کہا، ''شانو! موجو کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''اب تو ٹھیک جا رہا ہے۔''

''اور تم؟''

''میں تو ایک دم زبردست ہوں۔ رہنے کیلئے نور پور کے بجائے یہ شہر اچھا ہے۔ یہاں سارا دن رونق رہتی ہے۔''

''کیا تم یہ بات دل سے کہہ رہی ہو؟''

''ہاں تو..... ویسے بھی اب نور پور میں ہمارا بچا بھی کیا ہے جس کیلئے دل کو بُرا کیا جائے۔''

''چاچا اور چاچی یاد نہیں آتے؟'' مجھے ایک ذرا اچنبھا ہوا۔

''آتے ہیں..... جب انہیں یاد کرتی ہوں تو دل بھر آتا ہے اس لیے فوراً ہی کسی کام میں رُجھ جاتی ہوں۔''

''اور فرزانہ؟''

''وہ زیادہ وقت سنجیدہ رہتی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ دکھی ہے یا ویسے ہی خاموش بیٹھی ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی، ''اور بھائی! وہ کھالے کا کیا بنا؟ کیا نور پور میں ہے یا کہیں اور چلا گیا ہے؟''

''وہیں ہوگا، کہاں جائے گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''آ جاتا تو نور پور کے بارے میں کچھ اتا پتا چل جاتا۔ کافی دنوں سے آیا نہیں۔ اور بھائی! ڈاکٹر صاحب کا کچھ پتہ چلا؟''

اس نے خالد عرف کھالے اور ڈاکٹر منور علی شاہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔

''وہ تو کافی عرصہ پہلے نور پور چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔''

''کہاں؟''

''کوئی علم نہیں۔''

''نور پور کا کوئی بندہ بھی نہیں ملا۔ وہ نگوڑ ادرزی شاعر؟''

''نہیں..... کبھی جا کر ان لوگوں کا پتہ کروں گا۔'' میں نے جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا۔ اس دوران چائے پی لی۔ انگڑائی لے کر اُٹھا۔ اسے کمرے سے جانے کا اشارہ کیا اور عجلت کے ساتھ اس عجیب مشن کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی جب میں اور نگینہ ملتان سے نکلے۔ گاڑی نئی تھی۔ انجن

اچھی حالت میں تھا۔ آدھا سفر طے ہو گیا۔ نگینہ میری طویل خاموشی سے اکتا گئی۔ بولی، ''سر! یو آر لوکنگ وری۔''

میں نے اپنے برابر بیٹھی ہوئی چست لباس میں قیامت ڈھاتی حسینۂ عالم کی طرف دیکھا۔ کہا، ''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نوروز بھٹی کے بارے سوچ رہا ہوں۔''

وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بولی، ''وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے بارے سوچا جائے۔ وہ بہت ظالم اور لالچی شخص ہے۔ اس کی اولاد اس سے بھی چار ہاتھ آگے نکلتی ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ سوچتے ہوئے کہا، ''نگینہ! میڈم نے تمہیں اسلحہ تھما دیا ہے۔ کیا تمہیں چلانا بھی آتا ہے؟''

اس نے جلدی سے کہا، ''جی سر! میں نے کینیڈا میں سیلف ڈیفنس کلاس جوائن کی تھی۔ وہاں مجھے لیڈی پسٹل چلانا سکھایا گیا تھا۔''

''اور کیا کچھ سیکھا وہاں؟'' میں نے دلچسپی لی۔

''کچھ خاص نہیں..... مگر آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کیلئے کوئی مشکل پیدا نہیں کروں گی۔ جیسا کہیں گے، ویسا ہی کروں گی اور..... اور آپ یہ یاد رکھیں گے کہ میں جیوں یا مروں، نوروز اور اس کے بیٹوں کو مرنا چاہیے۔ اگر میرے مرنے کے بعد بھی میرے بھائی کا انتقام لیا گیا تو بھی اگلے جہان مطمئن رہوں گی۔''

میرے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ نازک اندام لڑکی تھی مگر کسی سود و زیاں کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ آدھا سامنے سے آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں چمکتا ہوا اور آدھا ملگجے اندھیرے میں چھپا ہوا۔ آسمان کے قلب میں جگمگاتا ہوا آدھا چاند..... وہ جتنی دکھائی دے رہی تھی، سانسیں روکنے کیلئے اتنی ہی کافی تھی۔ بھرے بھرے گال، سرخ، قدرے موٹے ہونٹ، بھاری پلکوں والی زندہ آنکھیں جن میں بچکانہ چمک کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بدن پر زیب تن ہوا چست لباس اس کی حشر سامانیاں اجاگر کر رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ غصے میں لال اور دکھ میں گداز ہو کر اور بھی دل کش لگنے لگی تھی۔

دیکھے بھالے راستے پر چلتے ہوئے جب ہم شجاع آباد کے پہلو میں واقع اس موڑ پر پہنچے، جہاں سے ایک سڑک پونٹہ کے راستے دریا کے بیٹ کی طرف جاتی تھی، تو میرے لبوں پر بے

اختیار ایک گیت کے بول مچل گئے، ''لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے؛ یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے.....''

مگر تب میرے پہلو میں میڈم شکیلہ براجمان تھی۔ نگینہ حسن میں اس سے کم تر نہیں تھی مگر میڈم کے حسن کو اس کا جاہ و جلال اور اختیار دو آتشہ بنا دیتا تھا۔ میڈم شکیلہ کی رام کہانی میں بھی اس موڑ کو خاصی اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس کا عاشق نامدار میرزادہ عمر حیات یہیں چندو ماہی کے اغوا کاروں کے ہاتھوں بے دردی سے قتل ہوا تھا اور اتفاقات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اسی مقام سے چھڑا تھا جو آج بھی جاری و ساری تھا اور چندو ماہی کو میڈم شکیلہ کا روپ دے کر کیا سے کیا بناتا جا رہا تھا۔ میں نے بے اختیار گاڑی روک دی۔ دائیں طرف تھوڑے فاصلے تک دکھائی دینے والی سڑک کو گھورتا رہا۔ بولا، ''نگینہ! کچھ فاصلے پر پونٹہ کا سرکاری ہسپتال واقع ہے جس کے ایک کوارٹر میں مس عالیہ رہتی ہے جس نے تمہیں اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ نہیں معلوم، اس بے چاری کا کیا حال ہے؟ اگر کسی طرح بھٹی خاندان کو پتہ چل گیا ہو کہ تم یہاں دو چار دن چھپی رہی ہو تو بے چاری کی شامت آ گئی ہو گی۔''

نگینہ نے جھرجھری لی۔ زیرِ لب بڑبڑائی، ''اوہ گاڈ ڈز ناٹ لائک دِس..... شی فیورڈ می دیٹ ٹائم!''

(اوہ! خدا ایسا نہ کرے۔ اس نے اس وقت مجھ پر احسان کیا تھا۔)

چونکہ اطراف میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا اور آنے والے وقت میں میسر آنے والی مہلت کے بارے کچھ تعین نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے میں گاڑی سے اُترا۔ عقبی سیٹ کے نیچے سے اسلحہ نکالا۔ لوڈ کیا۔ نگینہ کو پسٹل اور گن تھمائی۔ اپنے ویپن پیروں میں رکھ لینے کے بعد بلاوجہ رُکا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر روانہ ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ میڈم نے اُسے بغیر ہلکی پھلکی تربیت دینے کے اسلحہ نہیں تھمایا تھا۔ پھر بھی میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ اُسے مختصراً گن چلانے کے بارے ہدایات دیں۔ یہ بھی سمجھایا کہ نوروز بھٹی کے ہاں اُسے غیر معمولی برداشت اور حوصلے سے کام لینا ہو گا کیونکہ کوئی ایک ہی معمولی سا غیر دانشمندانہ اقدام ہم دونوں کی موت کا سبب بن سکتا تھا۔

بقیہ رستے میں میرے استفسار پر وہ نوروز بھٹی کے گھر کا حدود اربعہ اور گھر والوں کی رہتل بہتل کے بارے میں بتاتی رہی۔ دس منٹ بعد دریا کا سپر بند آ گیا۔ اس نے مجھے رُکنے کا

اشارہ کیا۔ بولی، ''اِدھر بائیں ہاتھ..... بند سے پہلے..... کچے راستے پر چلیں۔ رفتار کم کرلیں۔ بہت جمپ ہیں۔''

میں نے گاڑی موڑی۔ ناپختہ راستہ غیر معمولی چکنی مٹی کی دھول سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے کھڈے اور جمپ اس تنگ سے راستے میں موجود تھے جن پر گاڑی بے ہنگم انداز میں اچھلتی کودتی چلی جارہی تھی۔ یہ راستہ ایک چھوٹے راجباہ یا بڑے کھال کی پٹڑی پر بنا ہوا تھا۔ اطراف میں آم کے باغات واقع تھے۔ آموں کے گھنے اور بلند قامت درخت چاندنی میں سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ ویسے بھی صحت مند درختوں کے پتوں کا رنگ گہرا سبز ہونے کی وجہ سے سیاہ دکھائی دیتا ہے۔

میرا جی چاہا کہ شیشہ اُتار کر اس فرحت افزا ماحول میں لمبی لمبی سانسیں لوں مگر گاڑی کے عقب میں اُڑتا ہوا گرد کا بادل مجھے اس حرکت سے روک رہا تھا۔ کوئی ایک ڈیڑھ کلومیٹر کا زگ زیگ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ دائیں ہاتھ دو چار گھر واقع تھے جبکہ بائیں ہاتھ خاصی تعداد میں مکانات واقع تھے جو راجباہ کے پل کے ذریعے اس راستے کے ساتھ منسلک ہوتے تھے۔ بستی کے خوابیدہ کتے ہڑبڑا کر بیدار ہوگئے اور اپنے اپنے انداز میں احتجاج ریکارڈ کرانے لگے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی جب ان کا احتجاج شدت پکڑے بغیر دم توڑ گیا۔ ایسے ہی وقت میرے موبائل فون کا بزر بجنے لگا۔ میں چونک گیا۔ میں نے اپنا سیل فون ڈیش بورڈ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اُٹھایا، سکرین پر نظر ڈالی اور میڈم شکیلہ کا نمبر دیکھ کر ایک ذرا نروس ہوگیا۔ میں نے اس کے واضح حکم کے باوجود موبائل فون مشن کے دوران اپنے پاس نہ صرف رکھ لیا تھا بلکہ آن بھی کر رکھا تھا۔

میں نے کال اٹینڈ کی اور 'جی' کہا تو جواب میں میڈم کی غصہ بھری آواز کانوں پڑی، ''کیا تم ابھی تک گھر میں ہو؟''

''نہیں میڈم! ہم ٹارگٹ پر پہنچنے والے ہیں۔ ویری ساری..... میں موبائل فون ساتھ لانے کی غلطی کر بیٹھا ہوں۔''

میڈم نے درشت لہجے میں کہا، ''کوئی بات نہیں۔ اپنی توجہ کام پر مرکوز رکھو۔ مزید کوئی غلطی نہ کرنا اور نہ ہی اس مشن کو آسان لینا۔ زورآور کے بارے بتانا چاہتی ہوں کہ وہ دس بجے کے لگ بھگ ملتان سے باہر نکلا تھا۔ کچھ دیر پہلے سخی محمد نے رپورٹ دی ہے کہ وہ یا تو نورو بھٹی کی

حویلی میں ہے یا وہاں کسی وقت پہنچنے والا ہے۔ اکیلا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ اکیلا ہوتے ہوئے بھی تمہارے لیے یا کسی بھی شاطر کیلئے بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ او کے!''

''یس میڈم!'' میں نے کہا اور کال منقطع کرتے ہی فون نہ صرف پاور ڈ آف کر دیا بلکہ سیلولر ماڈیول نکال کر فون سیٹ پچھلی سیٹ کی طرف اُچھال دیا۔

اس دوران نگینہ کے ایما پر میں مڑے بغیر بستی سے آگے نکل آیا۔ فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے پر اس نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ بولی، ''سر! دِس از دیٹ مرڈر پلیس!''

میرے اعصاب تن گئے۔ چند لمحے آنکھیں بند کیں۔ پھر کھول کر ادھر دیکھا جس طرف نگینہ کی انگلی اشارہ کناں تھی۔ راجباہ کی پٹڑی سے ایک ایکڑ کے فاصلے پر آم کے گھنے درختوں میں سے جھانکتا ہوا بڑا سا سفید مکان دکھائی دے رہا تھا۔ مکان پر تازہ تازہ چونا پھیرا گیا تھا۔

میں نے کہا، ''اس مکان سے متصلہ کوئی مکان ہے؟''

اُسے میری بات کی سمجھ نہیں آئی۔ میں نے الفاظ بدل کر سمجھایا۔ سمجھ گئی۔ اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولی، ''نو نو سر! ایدھر کوئی اٹیچڈ ہوم نہیں ہے۔''

''یہ سڑک آگے کس طرف جاتی ہے؟''

''آئی ڈونٹ نو!''

''اس حویلی تک کوئی اور راستہ بھی آتا ہے؟''

اس نے بے بسی سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ وہ اس علاقے کو زیادہ نہیں جانتی تھی۔ چونکہ یہ بستی سپر بند کے بالکل قریب واقع تھی، اس لیے حویلی کے عقب میں اگر کوئی راستہ موجود بھی تھا تو وہ دریا کی طرف جاتا تھا۔ راستے میں کوئی اور بستی یا ڈیرہ واقع ہوسکتا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہمیں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد واپس جانا تھا۔ یعنی جدھر سے آئے تھے، اُدھر ہی جاسکتے تھے۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ آم کے دو بڑے درختوں کے بیچ میں جگہ دیکھ کر گاڑی کو ریورس کر کے پارک کر دیا۔ میں نے یہ احتیاط مدنظر رکھی تھی کہ نوروز بھٹی کی حویلی سے ہنگامی طور پر نکلنے کی صورت میں ہمیں یہاں سے گاڑی نکالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

ایک بج کر کچھ منٹ ہوئے تھے۔ کسی بھی واردات کیلئے یہ وقت انتہائی موزوں ترین قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ رات کا یہ دورانیہ گہری نیند کا ہوتا ہے۔ جونہی ہم نے گاڑی چھوڑ کر حویلی کی طرف پیش قدمی کی، وہ میرا بازو تھام کر قدرے دبے انداز میں بولی، ''گاڑی کی چابی آپ

نے اگنیشن میں چھوڑ دی ہے۔''

میں نے کندھے اُچکائے، ''یس!''

اس نے وجہ دریافت نہیں کی۔ کہا ''آ لارج نمبر آف ڈاگز ہیئر بی کیئر فل سر!''

مجھے یہاں کتوں کی موجودگی کا یقین کی حد تک شبہ تھا مگر دیہاتی ہونے کی وجہ سے میرے نزدیک یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ یارن خان کی حویلی میں چکراتے ہوئے خونخوار کتوں نے میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہاں بھی بل ٹیریر کتوں کی موجودگی کا اندیشہ تھا مگر پریشانی کی بات تھی کہ ابھی تک کتوں کے نہ تو غرانے کی آواز سنائی دی تھی اور نہ ہی انہوں نے ہمارا استقبال کیا تھا ورنہ کتوں کی قوتِ شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ انہیں فضا میں کسی کی موجودگی کی بُو بہت جلد خبردار کر دیتی ہے۔ وہ ابھی تک خبردار نہیں ہوئے تھے۔

چاند نکلا ہوا تھا مگر گھنے درختوں کے جھنڈ کی وجہ سے اطراف میں گہرا اندھیرا پھیلا ہوا تھا جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں دبے پاؤں چلتا ہوا دم بہ دم حویلی کے قریب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ حویلی کی دیوار سے چند قدموں کے فاصلے پر ایستادہ موٹے تنے والے آم کے ایک درخت کے عقب میں پہنچ گیا۔ عین اس وقت مجھے کتے دکھائی دیے۔ وہ حویلی کے آخری سرے پر واقع بڑے سے برآمدے میں بچھی ہوئی بڑی چارپائیوں کے پاس مردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ وہ تعداد میں چھ یا سات تھے۔ ایک نظر دیکھتے ہی علم ہو گیا کہ وہ جرمن شیفرڈ اور رشین بل ڈاگ تھے۔ اپنے کندھے پر نگینہ کی گرم سانسیں محسوس کر کے بڑبڑایا، ''یہ تو خاصے خطرناک کتے ہیں۔''

نگینہ کی سانسیں تیز ہو گئیں۔ ایسے ہی وقت میں ایک کتے نے سر اُٹھایا۔ عادتاً فضا میں سونگھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا اور مضطرب انداز میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اُس کا رُخ اس پیڑ کی جانب ہو گیا جس کے عقب میں میں اور نگینہ چھپے ہوئے تھے۔ ڈراؤنی غراہٹ فضا میں گونجی اور سبھی کتے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ میری تمام تر احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ نہایت خاموشی سے بھٹی برادران کے سر پر پہنچ جاؤں گا مگر اب ایسا ممکن نہیں رہا تھا۔ کتوں کو ختم کیے بغیر خاموش نہیں کرایا جا سکتا تھا۔

کتے خوفناک انداز میں بھونکتے ہوئے ہماری جانب بڑھے۔ میں نے فی الفور فیصلہ کیا۔ نگینہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ میرے اچانک سیدھا ہونے سے اس کی ٹھوڑی میرے کندھے سے

ٹکرائی اور وہ 'اوغ' کی آواز نکال کر پیچھے لڑھک گئی۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر کندھے سے گن اُتاری اور کتوں پر تان لی۔

اب وقت ضائع کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ برآمدے میں نصب کیا گیا دوسو وولٹ کا بلب روشن ہو گیا تھا۔ یعنی کتوں نے اپنے مالک کو یا کسی پہرے دار کو ہوشیار کر دیا تھا جس نے فوری طور پر بلب روشن کر دیا تھا۔ وہ اَب تب میں حویلی سے برآمد ہونے والا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہوگا، وہ رات کے اس پہر کسی بھی صورت اسلحے کے بغیر باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں کرے گا۔

کتے مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے اور کسی آن حملہ آور ہونے والے تھے۔ ان کی تربیت اچھے انداز میں نہیں کی گئی تھی کیونکہ وہ ایک جتھے کی صورت میں میری طرف بڑھے آئے تھے۔ اگر کسی مشاق شکاری نے انہیں سدھایا ہوتا تو وہ کبھی اکٹھے حملہ آور نہ ہوتے بلکہ میرے چاروں طرف پھیل جاتے۔

میں نے بلٹ کھینچا اور گن کو 'برسٹ موڈ' پر کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ 'ٹھک ٹھک' کی آوازیں فضا میں گونجیں اور چار کتے اچھل کر زمین بوس ہو گئے۔ ایک کتے کے حلق سے بہت تیز اور ڈراؤنی خرخراہٹ برآمد ہوئی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ اس کی آواز اطراف میں بہت دور تک سنی گئی ہوگی۔ گن کی نال پر جدید طرز کا سائیلنسر فٹ تھا مگر اس کے باوجود اتنے پرسکون ماحول میں 'ٹھک ٹھک' کی آواز بھی حویلی کے اندرونی کمروں تک ضرور پہنچی ہوگی۔

ایک کتے کی ٹانگ میں گولی لگی تھی یا گولی اس کی ٹانگ کو چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ ڈر گیا اور بجائے واپس جانے کے، میرے داہنی جانب درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ دو کتوں نے دیوار کے ساتھ ساتھ حویلی کے آخری سرے کی طرف دُڑکی لگائی۔ وہاں شاید کوئی کھال واقع تھا جس میں اُتر کر وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ سر دست خطرہ ٹل گیا تھا مگر اچانک فضا بارہ بور کے فائر کی خوفناک آواز سے تھرا اُٹھی۔ اس کم بخت گن کی نہ صرف آواز خطرناک ہوتی ہے بلکہ اس کی مار بھی نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی نال سے گولی کے بجائے چھروں بھرا کارتوس نکلتا ہے جس کے چھرے بڑا دائرہ بنا دیتے ہیں۔ کئی چھرے اس پیڑ کے تنے سے ٹکرائے جس کے عقب میں ہم موجود تھے، کئی زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتوں سے، جس سے مجھے بغیر کوئی وقت ضائع کیے پتہ چل گیا کہ فائر ہم پر ہی کیا گیا تھا اور فائر کرنے والا ہماری پوزیشن سے آگاہ ہو گیا تھا۔ جس وقت میں نے کتوں پر فائر کیا تھا، اس چھپے ہوئے شخص

نے نال سے نکلنے والے شعلوں کو دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ اپنے عقب میں لہرایا۔ نگینہ کو کھینچ کر اپنے عُقب میں کیا اور بہ احتیاط جھانکا۔ برآمدہ خالی تھا۔ حویلی کی دکھائی دینے والی چھت پر بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر نا کام رہا۔ ایسے ہی وقت میں حویلی کے اندر بھی کئی بلب ایک ساتھ روشن ہو گئے۔ میں ابھی تذبذب میں تھا کہ ایک ساتھ خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ بیسیوں گولیاں آم کے تنے میں پیوست ہوگئی، کئی ایک ہمارے دائیں بائیں سے نکل گئیں۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں نے حملہ کرنے کیلئے کوئی پلان مرتب نہیں کیا تھا اور نہایت بھونڈے انداز میں یہاں چلا آیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہم دونوں اس وقت بُری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔

میں نے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے جھانکا تانی کی مگر کوئی دکھائی نہیں دی۔ فائرنگ رُک گئی۔ اچانک ایک ہیولا دکھائی دیا۔ کوئی شخص کمرے کے دروازے سے نکل کر بجلی کی سی مستعدی سے برآمدے کے پختہ اینٹوں والے چوڑے ستون کی آڑ لینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میرے پاس شارٹ گن تھی جس کی گولی اس ستون کو پھاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔

اب یہ علم نہیں تھا کہ بارہ بور گن والا ستون کی آڑ میں آیا تھا یا آٹو میٹک گن والا۔ میں نے بہ دقت اپنی آواز کو معتدل رکھتے ہوئے کہا، ''نگینہ! میں اُس طرف جا رہا ہوں۔ تم اِدھر ٹھہرو۔ جونہی وہ ستون کے عقب سے نکلے، اس کا نشانہ لے لینا۔''

خدا جانے اُسے میری بات کی سمجھ بھی آئی تھی یا نہیں، سمجھانے کا وقت نہیں تھا، اس لیے میں ایک دم اُچھلا اور بائیں طرف کوئی پانچ سات قدموں کے فاصلے پر موجود آم کے درخت کی طرف دوڑ پڑا۔ اس عمل میں زیادہ سے زیادہ دو سیکنڈ وقت لگا تھا مگر ستون کی آڑ میں کھڑا شخص بہت پھرتیلا تھا۔ میں ابھی پوری طرح تنے کی آڑ لینے میں کامیاب نہیں ہوا تھا کہ بارہ بور گن کا ایک چھرا میرے دائیں بازو کو چھو گیا۔ درد آمیز جلن کی لہر بدن میں اُتر گئی۔ گن بردار نے دو فائر کر لیے تھے۔ اب اسے مزید فائر کرنے کیلئے گن لوڈ کرنا تھا۔ میں اس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر حویلی کی دیوار سے چند بالشت کے فاصلے پر ایستادہ کیکر کے پیڑ کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس مقام پر پہنچنے کا فائدہ یہ ہوا کہ گن بردار کے جسم کا کچھ حصہ مجھے نظر آ گیا۔ میں نے شارٹ گن کو 'سنگل شاٹ موڈ' پر لیا اور فی الفور نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ عین اسی لمحے نشانے

سے ہٹ گیا اور گولی برآمدے کی دوسری نکڑ والے ستون میں جا لگی۔

اعلانِ جنگ ہو گیا۔ فضا دو طرفہ فائرنگ کی خوفناک آوازوں سے گونج اُٹھی۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ نگینہ کی طرف سے جوابی فائرنگ کا کامیاب سلسلہ چل رہا تھا۔ اچانک نگینہ کی گن کا سائلنسر پھٹ گیا یا کھل گیا، اس کی گن نے بھی گونج دار ڈراؤنی آواز نکالنا شروع کر دی۔

اس دوران میں یہ تعین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکی رائفل سے فائرنگ کرنے والا کس جگہ پر چھپا ہوا تھا مگر مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔ میں حویلی کی دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب اُترنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ستون کے پیچھے چھپا ہوا گن بردار نگینہ کی فائرنگ سے پسپا ہو کر ستون کے ساتھ اپنی پوزیشن بدلنے لگا۔ ایسے ہی وقت میرے نشانے پر آ گیا۔ میں نے نشانہ لینے اور بہ عجلت فائر کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی اور اس کی دردناک چیخ حویلی کی بلند دیواروں اور پیڑوں کے بیچ چکرا کر بازگشت پیدا کر گئی۔ وہ پہلے چارپائی پر گرا، پھر زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ معلوم نہیں کہ اُسے کہاں گولی لگی تھی۔ جونہی وہ ستون سے باہر نکلا، نگینہ کی طرف سے اوپر تلے کئی فائر ہوئے۔ میری دانست میں نگینہ کی چلائی ہوئی گولیوں میں سے بھی کوئی ایک آدھ گولی اس کے بدن میں ترازو ہو گئی تھی۔ تبھی پختہ فرش پر تڑپتا ہوا وجود چند لمحوں میں ہی ساکت ہو گیا۔

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ یہ خوف دامن گیر تھا کہ فائرنگ کی آواز فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع بستی کے لوگوں کو اب تک بیدار کر چکی ہو گی اور بعید نہ تھا کہ وہ لوگ مسلح ہو کر حویلی کی جانب پیش قدمی کر دیں۔ ایسی صورت میں ہم دونوں اطراف سے گھیرے میں آ جاتے جس کا نتیجہ ہماری بے بسی آمیز موت کی صورت میں نکلتا۔

میں نے گن کندھے پر ڈالی، پسٹل نکال کر دانتوں میں دبایا اور پوری قوت سے اُچھلا۔ حویلی کی چار دیواری کم و بیش نو فٹ بلند تھی مگر میرے ہاتھ اس کی منڈیر پر جا چکے۔ میں نے اپنے بدن کو اچھالا دیا اور لمحہ بھر میں دیوار پر چڑھ گیا۔ چونکہ دیوار کے اس حصے پر کیکر کی ایک بڑی شاخ سایہ فگن تھی، اس لیے فوری طور پر میرے دیکھ لیے جانے کا احتمال نہیں تھا مگر مجھے رائفل بردار پہرے دار کی صحیح پوزیشن کا علم نہیں تھا، اس لیے میرا خوف اپنی جگہ درست تھا۔

میں شاخ کی اوٹ لیے دیوار پر دبکا بیٹھا تھا۔ حویلی کا اندرونی حصہ میرے سامنے تھا۔ میرے داہنے ہاتھ پر حویلی کی بڑی سی دیہاتی نوع کی عمارت واقع تھی جبکہ میرے سامنے پچھلی

دیوار تک صحن پھیلا ہوا تھا جس میں تھوڑا سا حصہ پختہ فرش پر مشتمل تھا جبکہ باقی حصے میں پھول پودے لگے ہوئے تھے۔ دیسی ساخت کا باغیچہ جھاڑ جھنکار کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔

برآمدے اور آموں کے باغ کے بیچ کھلی جگہ پر تین کتے جان کی بازی ہار چکے تھے۔ ایک سخت جان تھا جو ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ بچ جانے والے کتے خوفزدہ ہو کر کہیں دبک گئے تھے۔ کبھی کبھار ان کے بھونکنے کی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ ان سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا فریضہ سرانجام دے چکے تھے۔ حویلی کے مکینوں کو اپنی جانوں پر کھیل کر خطرے سے آگاہ کر چکے تھے۔

برآمدے کے فرش پر چارپائیوں کے بیچ پڑی ہوئی لاش کسی پہرے دار کی تھی یا نوروز بھٹی کے کسی فرزندِ ارجمند کی، معلوم نہیں تھا۔ چونکہ میں نے حویلی کے کسی مکین کو دیکھ نہیں رکھا تھا، اس لیے میں اُسے قریب سے جا کر دیکھنے کے بعد بھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا تاوقتیکہ نگینہ اس کی شناخت نہ کر دیتی۔

میری چھٹی حس نادیدہ خطرے کے سگنلز تسلسل کے ساتھ نشر کر رہی تھی۔ یعنی یہ وقتی خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔ حویلی کے اندر، صحن کے پار، عمارت میں کوئی نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گویا یہاں کوئی رہ ہی نہیں رہا تھا۔ چونکہ بیرونی دیوار پر، منڈیر سے فٹ ڈیڑھ فٹ نیچے کیپ شیڈ والے تین چار مرکری بلب روشن تھے جن کی وجہ سے چھت اور منڈیر گہرے اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں۔ اگر کوئی شخص چھت پر موجود تھا تو میری صحن میں پیش قدمی فی الفور اس کی نظروں میں آ سکتی تھی اور وہ مجھے اپنے نشانے پر لے کر لمحہ بھر میں بھون سکتا تھا۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں عمارت تک پہنچنے اور اس میں داخل ہونے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ ایک مشکل یہ درپیش تھی کہ اس حویلی اور حویلی کے مکینوں کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت اندر کتنے لوگ موجود تھے اور ان کے پاس کس قسم کا اسلحہ موجود تھا۔ اب تک ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ میری گولی کا نشانہ بننے والے کے پاس بارہ بور کی ڈبل بیرل گن تھی جواب خاموش ہو چکی تھی۔ ایک مانوس سی تڑتڑاہٹ ڈبل کے گن کی تھی جبکہ زیادہ فائرسیون ایم ایم رائفل کی نال سے نکلے تھے۔ ایک آدمی بیک وقت دو گنیں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ کم سے کم

دو پہرے دار محاذ پر موجود تھے۔

میں نے صحن میں کودنے کے ارادے کو قطعی احمقانہ قرار دیا اور نہایت آہستگی سے دیوار سے واپس اُتر آیا۔ دیوار کے سائے اور درختوں کی بدولت میں با آسانی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ بلی کی سی چال چلتا ہوا دیوار کی نکڑ تک آیا۔ پلٹ کر دیکھا۔ نگینہ دکھائی نہیں دی۔ یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اسی درخت کے پیچھے چھپی کھڑی تھی یا اس نے اپنی پوزیشن بدل لی تھی۔ نکڑ کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ دیوار کی لمبائی کم و بیش سو فٹ تھی جس کے ساتھ کیکر کا بالن (ایندھن) چھوٹی بڑی ڈھیریوں کی صورت میں پڑا تھا۔ میں ان خاردار ٹہنیوں اور دیوار کے درمیان جھک کر حویلی کی عقبی سمت بڑھا۔ عین وسط میں بلیوں والا چوبی دروازہ موجود تھا۔ چونکہ اس وقت اسے بند ہونا چاہیے تھا، اس لیے میں اُسے چھوئے اور دھکیل کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ عقبی نکڑ میں پہنچا تو چند قدم کی دوری پر ایک ننھے سے ٹیلے پر ایک کتے کو موجود پایا۔ اس کی آنکھیں لگڑ بگڑ کی طرح اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی برقی رفتار سے اُچھلا اور کوئی آواز نکالے بغیر کھیتوں کی طرف دوڑ کھڑا ہوا۔ کافی دور جا کر اس کے حلق سے احتجاجی صدائیں برآمد ہوئیں۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ کچھ دیر وہیں رک کر سن گن لینے کی کوشش کی مگر جھینگروں اور بینڈوں کی مخصوص آوازوں کے علاوہ ماحول ایک دم پرسکون تھا۔ چونکہ حویلی کے عقب میں کوئی درخت موجود نہیں تھا اور چاند کی روشنی براہِ راست چونا کی گئی دیوار پر پڑ کر منعکس ہو رہی تھی، اس لیے ماحول خاصا روشن تھا۔ مجھے فوری طور پر احساس ہو گیا کہ ہنگامی حالت میں اس طرف چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ البتہ کوئی سو گز کے فاصلے پر آموں کا باغ واقع تھا جو اس وقت اندھیرے کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے چند لمبی لمبی سانسیں لیں اور خطرہ مول لیتے ہوئے دیوار کی جڑ میں اگی ہوئی جنگلی گھاس پر محتاط انداز میں چلنے لگا۔ میری رفتار خاصی سست تھی اور میں کوئی آہٹ پیدا نہیں کر رہا تھا۔

یہ سرگرمی غیر محفوظ تھی مگر میں دو چار منٹ بعد بحفاظت حویلی کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ ایسے ہی وقت پھر گنوں کے دہانے کھل گئے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا کہ فائرنگ چھت پر سے کی جا رہی تھی۔ دیوار پلستر شدہ تھی، قرب میں کوئی درخت ایستادہ نہیں تھا، اس لیے کمرے کی بلند دیوار پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نکڑ کی دوسری جانب جھانک کر جائزہ لیا۔ یہ دیوار بھی

اسپاٹ تھی۔ سوچ میں پڑ گیا۔ چھت پر جانا بہت ضروری تھا اور میرے پاس وقت بھی کم تھا۔ حویلی کے اندر موجود لوگوں کو جتنی زیادہ مہلت مل رہی تھی، وہ اتنے زیادہ محتاط، محفوظ اور مضبوط ہو رہے تھے۔

میں ایڑیوں پر گھوما، کمرے کی بلند دیوار اور چار دیواری کے سنگم پر آیا۔ حسبِ سابق بندر کی طرح اچھل کر دیوار پر چڑھا۔ سر نکال کر صحن میں جھانکا۔ میدان صاف تھا۔ کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ دیوار پر چڑھتے ہی دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ دیوار سے اوپر چھت تک باہر نکلی ہوئی اینٹوں کا مخصوص دندانہ بنا ہوا تھا۔ اینٹوں کی یہ مخصوص کنگھی اس صورت میں بنا کر چھوڑ دی جاتی ہے کہ آنے والے وقت میں کبھی مزید تعمیر مقصود ہو تو اس دندانے کی مدد سے دیوار کا مضبوط جوڑ بنایا جا سکے۔ یہ دیہاتی پیش بینی میرے کام آئی اور میں بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے چھت تک اُٹھ گیا۔ احتیاط کا تقاضا نبھاتے ہوئے سر نکال کر چمکتے چاند تلے روشن طویل و عریض چھت کو دیکھا۔ ایک طویل سانس حلق سے برآمد ہوئی کیونکہ میری ریاضت بے ثمر ثابت نہیں ہوئی تھی۔

برآمدے والی سمت مٹی سے بھری بوریوں والے دو بینکرز موجود تھے۔ اگر یہ 'ایل' شکل کے ہوتے تو ان میں چھپا ہوا دشمن اس زاویے سے مجھے صاف دکھائی دیتا مگر یہ 'یو' شکل میں بنائے گئے تھے۔ ایسا ہی ایک بینکر پچھواڑے والی اس نکڑ میں موجود تھا جس کے نیچے میں چند لمحے پیشتر کھڑا ہو کر دیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ بینکر خالی تھا کیونکہ اس کے کھلے دروازے کا رُخ میری جانب تھا۔ چھت کے عین وسط میں اسپرنگ واشل کی شکل کا گول بینکر بنا ہوا تھا۔ میں مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ اندھا دھند انداز میں چھت پر جانا نہایت خطرناک کام تھا جبکہ سوچ بچار میں وقت ضائع کرنا بھی جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ عقب میں سمندر، سامنے جنگل، یہ کس انتہا پر قسمت نے مجھے لا کھڑا کیا تھا۔ ایسے ہی وقت میں برآمدے کی جانب واقع داہنے بینکر پر گن کی نال کا ننھا سا شکارا ابھرا۔ لمحہ بھر بعد فائر کی خوفناک آواز سنائی دی۔ یہ فائر ڈبل کے گن کا تھا۔ کوشش کے باوجود نشانچی کا سر دکھائی نہیں دیا۔ پچھلے 'یو' شکل کے بینکر سے فائر کی آواز اور چنگاریاں پھوٹیں۔ نشانچی کا سر دکھائی دیا مگر میں اس کا نشانہ لینے اور فائر کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

گول بینکر میں کوئی سرگرمی دکھائی نہ دی تو میں نے اس تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی دونوں اور چہ زن افراد فائرنگ کے بعد چھپنے کیلئے نیچے چھپے، میں اچھل کر چھت پر آ گیا۔ میں نے

اپنی بہترین کوشش کر ڈالی کہ میرے وزن سے چھت میں دھمک پیدا نہ ہو۔ چھت پر آتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ حویلی کی چھت غیر روایتی طور پر ٹی آئرن اور گارڈرز سے بنی ہوئی نہیں تھی بلکہ چھت پر مضبوط آر سی سی لنٹل ڈالا گیا تھا۔ اس قسم کی چھت میں بہت کم دھمک پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ دونوں مورچہ زن گن برداروں کی تمام تر توجہ حویلی کے اگلے حصے کے آموں کے باغ پر مرکوز تھی، اس لیے میں ان کی نظروں میں آئے بغیر چوپایہ کھسکتا ہوا آسانی سے گول بینکر تک پہنچ گیا۔ چند لمحے توقف کے بعد بائیں ہاتھ گھومتا ہوا بینکر کے دروازے تک آیا۔ میری توقع کے عین مطابق بینکر خالی تھا۔ اس مورچے تک رسائی از خود بہت بڑی کامیابی تھی۔

میں کئی لمحے ساکت بیٹھا رہا اور اپنا تنفس معتدل کرتا رہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان دو افراد کے علاوہ حویلی میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ ایک حیرانی یہ بھی تھی کہ مجھے چھت پر سیڑھیوں کا دہانہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا وگرنہ عمومی طور پر یہ دیکھنے میں آیا تھا کہ اس طرز کے مکانوں کی سیڑھیوں پر چھوٹا سا کمرہ تعمیر کر دیا جاتا ہے جس کے سبب سیڑھیاں اور سیڑھیوں سے متصلہ فرش بارشی پانی سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ چھت اسپاٹ تھی۔

میں نے گن سنبھالی۔ مٹی بھری بوریوں پر مخصوص انداز میں ٹکائی۔ محتاط انداز میں سر نکالا۔ اپنے ٹارگٹس کا جائزہ لیا۔ اس دوران فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا۔ داہنے ہاتھ والے بینکر میں مورچہ زن شخص کا سر دکھائی دیا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا۔ ٹرائیگر دبانا ہی چاہتا تھا کہ آموں کے باغ کی طرف سے فائر ہوا۔ یوں لگا کہ گولی اس بینکر کی بالائی بوریوں میں دھنسی تھی۔ میرا ہدف چشم زدن میں اوجھل ہو گیا۔ نگینہ کی طرف سے آنے والی گولی نے مجھے وقتی طور پر نقصان دیا تھا مگر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ میری توقع سے کہیں بہتر انداز میں شوٹنگ کر رہی تھی۔

پچھلے بینکر سے فائر ہوا۔ میں نے گن کا رُخ بدلا۔ جونہی سر دکھائی دیا، میں نے گن کی لبلبی دبا دی۔ امید کے برعکس کوئی چیخ سنائی نہیں دی۔ مجھے اپنے نشانے پر یقین تھا کہ میری گولی اس کی کھوپڑی میں دھنس گئی ہو گی جس کی وجہ سے اس کے حلق سے چیخ تک برآمد نہیں ہو سکی تھی۔ یعنی ایک دشمن کا ٹنٹا نکل گیا تھا اور اگلے بینکر میں موجود شخص کو اپنے ساتھی کی ہلاکت کی خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بدستور وقفے وقفے سے سر نکالتا، فائر کرتا اور پھر جھک جاتا۔

پھر وہ بھی میرے نشانے سے محفوظ نہ رہ سکا اور چاند کی ناکافی روشنی میں میں نے اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں برسٹ موڈ کی تین چار گولیاں اُتار دیں۔ اس کے گرنے کی ہلکی سی

دھمک نگینہ کی طرف سے آنے والی گولیوں کی گھن گرج میں دب کر رہ گئی۔ میدان صاف ہو چکا تھا۔ میں نے چند ثانیے انتظار کیا پھر محتاط انداز میں مورچے میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے نگینہ کی طرف سے فائر کا خدشہ لاحق تھا۔ ہاتھ لہرایا۔ اپنے تئیں اسے بتانے کی کوشش کی کہ دشمن نہیں، اس کا ساتھی ہوں مگر وہی ہوا، جس کا ڈر تھا۔ نگینہ نے مجھ پر فائر کرنے میں چند لمحوں کی تاخیر بھی نہیں کی تھی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ اس کا نشانہ خطا ہو گیا اور میں بال بال بچ نکلا۔ میرے جھکتے ہی یکے بعد دیگرے کئی گولیاں بینکر کی بوریوں میں آن دھنسیں۔ چند ایک اوپر سے گزریں۔

میں اسے اپنے بارے مطلع نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ دشمن بھی میری لوکیشن سے آگاہ ہو سکتا تھا، جو ابھی تک نظروں میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا عقبی بینکر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر اندر کی سن گن لی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، سخت جان تھا۔ ابھی تک ذبح شدہ مرغ کی طرح پھڑک رہا تھا۔ میں غیر معمولی مستعدی سے بینکر میں داخل ہوا۔ اسے تڑپتا پایا۔ اس کی گن ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گری پڑی تھی۔ میں نے اپنی گن لہرائی اور پوری قوت سے بٹ تڑپتے ہوئے قوی الجثہ شخص کے پہلو میں مارا۔ وہ تھوڑا اچھلا۔ حلق سے 'اوغ' کی دردناک آواز نکال کر پہلو کے بل بوریوں پر لڑھک گیا۔ چند لمحے جھٹکے لیتا رہا پھر ایک بوری پر آڑا ترچھا چپک کر ساکت ہو گیا۔ میں نے جلدی سے گن کی نال اس کی چھاتی پر رکھی۔ دباؤ ڈالا مگر وہ کام آ چکا تھا۔

میں نے اپنی بیلٹ سے پنسل ٹارچ نکالی۔ سرسری انداز میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ خاصا طویل قامت اور مضبوط جسم کا مالک عام دیہاتی بود و باش والا جوان رہا تھا۔ اس کے پاس سوائے گن کے کوئی اور اسلحہ موجود نہیں تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی کان کے قریب رخسار سے کچھ اوپر ننھا سا سوراخ کر چکی تھی جبکہ سر کی دوسری جانب کم و بیش دو انچ کا دائروی زخم بناتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ یقینی طور پر گولی نے اس کا بھیجا اُڑا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر اپنی گن کو ری لوڈ کیا اور دوسرے بینکر کی طرف پیش قدمی کی۔

نگینہ کی طرف سے اکا دکا فائروں کا سلسلہ جاری تھا اور میں کوشش کے باوجود اس کی لوکیشن کو بھانپ نہیں پایا تھا۔ فائر تو ہو رہے تھے مگر گن کی نال سے نکلنے والا مخصوص شعلہ کہیں لپکتا ہوا دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ میری سوچ سے کہیں پختہ کار شوٹر ثابت ہو رہی تھی اور بہتر انداز میں اس ناگفتہ بہ صورت حال سے نبرد آزما تھی۔ اگلا بینکر خاصا بڑا تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی

سیڑھیوں کے دہانے کا عقدہ کھل گیا۔ دو فٹ چوڑائی کی حامل سیڑھیاں نیچے جاتی دکھائی دیں۔ اگلی بوریوں پر سیاہ یا گہرے نیلے رنگ کے لباس والا شخص رکوع کی سی حالت میں پڑا تھا۔ اس کی گن اس کے جسم تلے کہیں دبی ہوئی تھی کیونکہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں کے بائیں جانب اس حالت میں کہ اس کے بدن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔

ایسے ہی وقت میں دور کہیں پولیس کے ہوٹرز کی ابھرتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ابھی کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا تھا کہ پولیس اطلاع پا کر حویلی کی طرف رواں دواں ہوگئی تھی۔ یہ غلط ہوا تھا مگر غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس کو یہاں پہنچنے میں بدقت دس سے پندرہ منٹ کا وقت درکار تھا۔ اس مختصر وقت میں مجھے نہ صرف اپنا کام مکمل کرنا تھا بلکہ نگینہ کو یہاں سے نکالنا بھی تھا۔ یہی سوچ کر میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آن بھر میں نیچے اُتر آیا۔ میں نے دل ہی دل میں براہِ راست حملے کا فیصلہ کیا تھا۔

چند لمحوں بعد میں سیڑھیوں سے ملحقہ بڑے سے ہال میں کھڑا تھا۔ ساخت کے اعتبار سے یہ ٹی وی لاؤنج تھا مگر یہاں نہ تو کوئی سٹنگ پورشن تھا اور نہ کسی دیوار پر ٹیلی وژن ہی نصب تھا۔ کسی گوشے میں ٹی وی ٹرالی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دودھیا بلبوں کی ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چار کمروں کے دروازے اور ایک قدرے کشادہ گیلری کا دہانہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے طوفانی انداز میں چاروں کمرے کھول کر دیکھ لیے۔ وہ عام دیہاتی نوعیت کے رہائشی کمرے تھے جو اس وقت خالی تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے گھر میں کئی لوگ موجود تھے جو فوری طور پر سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر یہاں سے نکل گئے تھے۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ میں نے حویلی سے کسی کو نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ گیلری کی سمت والے کمرے میں عروسی بیڈ بچھا ہوا تھا اور بیڈ سے چھت تک چمک دار آرائشی لڑیاں آویزاں تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کمرہ نوروز بھٹی کے بیٹے رفاقت کی کینیڈا پلٹ دلہن نگینہ بھٹی کے بالجبر عروسی سواگت کیلئے سجایا گیا تھا۔ ہائے! حسرت ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میں نے اندھا دھند انداز میں ہاتھ چلائے۔ سرسری تلاشی لی۔ آف وائٹ کلر کا ایک وائلٹ پرل والا پرس کپڑوں کی دیوار گیر چوبی الماری سے ملا۔ میں نے اسے کھولنا چاہا تو نہ کھلا۔ اس کا مکینزم سمجھ میں نہ آیا۔ سائیڈ زِپ کھولی۔ ایک کریڈٹ کارڈ اور چند بورڈنگ سلپ ملیں جن پر انگریزی میں نگینہ سجن کا نام ٹائپ کیا گیا تھا۔ میں نے آس کی کیفیت میں پرس کو

اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اوپر تلے کئی جھٹکے دیے۔ اس کا لاک پینل ٹوٹ گیا۔ چند لمحوں کی اتھل پتھل کے نتیجے میں ریٹرن ٹکٹ اور نگینہ کا پاسپورٹ مل گیا۔ اس کے بھائی کے کاغذات اور دونوں ایڈنٹی کارڈز وارڈروب سے دستیاب ہوئے۔ کون سی چیز کارآمد ہے، کون سی نہیں، یہ طے کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے جو بھی میرے ہاتھ لگا، میں نے اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا۔

چھت کی کھلی فضا میں سائرن کی دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی مگر عمارت کے اندر پہنچتے ہی معدوم ہو گئی تھی۔ اب پھر سنائی دینے لگی تھی جس کا واضح مطلب تھا کہ پولیس حویلی کے خاصی قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے حویلی کے مکینوں کا سراغ لگانے کے بجائے فوری طور پر یہاں سے نکلنے اور نگینہ کو لے کر کہیں چھپنے کا فیصلہ کیا۔ اسی خیال کے تحت دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر آیا۔ جلدی میں بھول گیا کہ ایک حسین شکاری میری تاک میں بیٹھا ہے۔ نگینہ چھت پر شست باندھے کہیں چھپی ہوئی تھی۔ جب اس کا خیال آیا، تب بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ خوف ناک آواز کے ساتھ ہی میرے دائیں بازو میں ایک سلگتا ہوا انگارا اُتر گیا۔ درد کی کٹیلی لہر نے پورے وجود کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔ بہ دقت تمام میں اپنے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ کو روک پایا مگر بے اختیار بلند آواز میں کراہا، ''اوئے! یہ میں ہوں!''

اس کے باوجود دوسرا، پھر تیسرا فائر ہوا جو میرے دائیں بائیں سے گزر گئے۔ میں اپنی تکلیف کو بھول کر بجلی کی سی پھرتی سے بوریوں کی آڑ لینے میں کامیاب ہوا۔ میرے اور اس کے بیچ خاصا فاصلہ حائل تھا مگر اتنا بھی نہیں تھا کہ اس تک میری آواز نہ پہنچ پائی ہو۔ شاید جوش اور ہیجان کی وجہ سے وہ میری آواز کو پہچان نہیں پائی تھی۔ ایک اور روح فرسا خیال آیا کہ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ مجھ پر نگینہ کے بجائے کسی اور نے فائرنگ کی ہو۔ کوئی دشمن بھی تاک میں ہو سکتا تھا۔

پولیس ہوٹر کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔ موبائل پارٹی اب تب میں پہنچنے والی تھی۔ چونکہ چھت پر چھپنے کی جگہ نہیں تھی، اس لیے میرا چھت پر سے اُترنا اور حویلی سے دور ہونا نہایت ضروری تھا۔ میں ایک ہی وقت میں پولیس اور بھٹی برادران کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میری قمیص خون میں تر ہو گئی تھی۔ درد دم بہ دم بڑھ رہا تھا۔ میڈیکل باکس گاڑی میں تھا۔ گاڑی کی طرف جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مارے تکلیف کے میرا جبڑا بھنچ گیا اور میں بوریوں کی آڑ لیتا ہوا پچھواڑے کی طرف بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں بستی کی جانب گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ روشنی کے متحرک دائرے خبر دے رہے تھے کہ پولیس دو

گاڑیوں میں آ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بستی میں سے بھی کچھ بہادر طبع لوگ پولیس کی معاونت کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے تھے کیونکہ گاڑیوں کے انجن کی آوازوں کے ساتھ کئی لوگوں کے بولنے کی آوازیں بھی ماحول کا حصہ بن گئی تھیں۔

یہ غنیمت رہا کہ نگینہ کی گن خاموش ہوگئی تھی اور میں بخیریت منڈیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پہلے میرا ارادہ نگینہ کی طرف جانے کا تھا مگر ایک تو پولیس قریب آ گئی تھی اور دوسرا خطرہ نگینہ کی ہی طرف سے تھا جو مجھے بچانے بغیر گولیوں پر گولیاں داغ رہی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے میں چھت سے کود گیا۔ جونہی میرے پیروں نے زمین کو چھوا، میں حویلی کی مخالف سمت بگٹٹ دوڑ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد میں کھیت میں تھا۔ کھیت میں فصل کے بجائے آموں کی نرسری لگی ہوئی تھی۔ پودے ابھی چھوٹے تھے۔ بمشکل گھٹنوں تک آتے تھے۔ کوئی سو گز کے فاصلے پر واقع آموں کا باغ میری منزل تھا۔ میں چند لمحوں میں ہی نرسری اور باغ کے درمیانی کھال کو پھلانگ کر باغ میں گھس گیا۔ عقب میں پولیس کی سرکاری دھمکی مائیکروفون سے پھوٹنے لگی، ''تم لوگ پولیس کے گھیرے میں آ چکے ہو۔ اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر خود کو قانون کے حوالے کر دو۔''

اُردو کے بعد یہی اعلان سرائیکی زبان میں دہرایا گیا۔ مبادا کہ اَن پڑھ ڈاکو اُردو نہ جانتے ہوں اور اتنی اہم پیشکش سے فائدہ اُٹھانے سے محروم ہو جائیں۔ یہ رٹے رٹائے جملے شاید اہلکاروں کے نصابِ تربیت کا اہم ترین حصہ تھے۔ میں نے ایک ذرا پلٹ کر دیکھا۔ ایک استہزائیہ مسکراہٹ لبوں پر آئی۔ چاروں طرف سے گھیر لینے والوں میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ مجھے یقین تھا کہ ان کی پیشہ ورانہ کارگزاری کی تکمیل تک میں کئی کلومیٹرز کا فاصلہ اسی طرح سرپٹ دوڑتے ہوئے طے کر سکتا تھا۔ پیا جی نے دو ایک مرتبہ حظ لیتے ہوئے کہا تھا کہ پولیس اگر پولیس مقابلے کے دوران محض اپنی مضحکہ خیز سرکاری اداکاریاں ہی ترک کر دے تو بہتر نتائج حاصل کر سکتی ہے۔ اس کی بات صادق تھی۔ دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ پولیس نے شجاع آباد سے نکلتے ہی ہوٹر آن کر دیا تھا۔ جب وہ نہر کے پل پر پہنچی تھی، میرے کانوں میں سائرن کی آواز آن پڑی تھی اور میں ہوشیار ہو گیا تھا۔ کسی بھی شخص کو چھپنے اور خود کو محفوظ کرنے کیلئے یا پولیس کے بھرپور سواگت کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنے کیلئے یہ وقت کافی تھا۔ پولیس قبل از وقت اپنی آمد کی اطلاع دے کر دو طرح کے نقصان اُٹھاتی ہے۔ یا تو ڈاکو یا مطلوبہ افراد

بھاگ نکلتے ہیں یا ان کا مقابلہ کرنے کیلئے مچانیں بنا لیتے ہیں۔ دوسری صورت میں پولیس کو اپنے ایک آدھ اہل کار کی قربانی دینا پڑتی ہے۔

آموں کا گھنیرا باغ میری توقع سے کہیں زیادہ وسیع و عریض تھا۔ درخت پرانے تھے جس کی وجہ سے ان کے تنے اتنے موٹے ہو چکے تھے کہ انسان کی بانہوں کی پہیٹ میں نہیں آتے تھے۔ میں درختوں کی جھکی ہوئی ٹہنیوں اور جھاڑ جھنکار میں راستہ بناتا ہوا، دوڑتا ہوا خاصا دور نکل آیا۔ سانس پھول گئی۔ ایک غیر معمولی بڑے اور گھنے درخت کا انتخاب کر کے چابک دستی سے اُس پر چڑھ گیا۔ خاصی بلندی پر جا کر ایک دو سانگھے میں پھنس کر بیٹھ گیا۔ دل کو ایک طرح کا اطمینان ہوا کہ اول تو کوئی اس طرف آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بفرضِ محال کوئی مجھے تلاش کرتا ہوا ادھر آ بھی نکلا تو اسے میری موجودگی کا پتہ نہیں چل سکے گا۔

ایک ذرا مایوسی ہوئی کہ میں خواہش کے باوجود نگینہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ اب دھڑکا لگا کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہ آ جائے یا حماقت اور ناتجربہ کاری کا ثبوت دیتے ہوئے پولیس پر فائر کھول کر اپنی موجودگی کی نشاندہی نہ کر بیٹھے۔ میں ایسی حالت میں اس کی مدد کو پہنچنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے سوائے دعا کی غائبانہ ترسیل کے، اس کیلئے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ جہاں ہو، وہیں چھپی رہے اور کوئی نقل و حرکت نہ کرے۔

گھنے باغ کی وجہ سے مجھے حویلی نظر نہیں آ رہی تھی مگر پولیس والوں کے مائیکروفون سے برآمد ہونے والا اعلان سنائی دے رہا تھا۔ بھاری آواز والا اہل کار خاصی ڈراؤنی آواز میں بار بار وہی جملہ دہرا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں حویلی سے کم و بیش ایک میل دور نکل آیا تھا۔ اس دوران پولیس نہ صرف حویلی کا احاطہ کر چکی ہوگی بلکہ اپنی سالخوردہ بندوقیں اور ہولسٹروں میں گلنے سڑنے والے سرکاری پستول بھی نادیدہ ڈاکوؤں پر تان چکی ہوگی۔ حقیقی اور غیر حقیقی دونوں طرز کے پولیس مقابلوں کے دوران غیر تربیت یافتہ، سست اور بزدل وردی پوشوں کی احمقانہ پھرتیاں اور ڈری ڈری پیشکشیں بڑی لطف گیں ہوتی ہیں۔ میری توقع کے مطابق مائیکروفون کے خاموش ہوتے ہی ہوائی فائرنگ کا سلسلہ چھڑ گیا۔ سرکاری بندوقیں اور پستول بغیر ہدف کے گرجنے لگے۔

اس لاحاصل ریاضت کے دوران میں نے پنسل ٹارچ کی مدد سے اپنے زخم کا جائزہ لیا۔ میری قمیص خون سے تر ہو چکی تھی۔ بازو پر بہت سا خون جم کر پپڑی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہیں پہلے بارہ بور بندوق کی نال سے نکلنے والا ایک چھرا لگا تھا۔ یہیں گولی لگ گئی مگر یہ دیکھ کر کہ

گولی ہڈی اور اعصاب کو چھوئے بغیر ماس کو پھاڑتے ہوئے نکل گئی تھی، دل کو ذرا اطمینان ہوا کیونکہ اب زخم میں زہر پھیلنے کا اندیشہ نہ رہا تھا۔ میں نے اپنی بنیان پھاڑی، پٹی بنائی اور دانتوں کی مدد سے بازو پر کس کر باندھ دی۔ ایسا کرنے سے درد میں کچھ افاقہ ہوا۔

پولیس اہلکاروں کی کارروائی کا دورانیہ بمشکل دس منٹ تھا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ انہیں نگینہ ملی تھی، یا نہیں، اندازہ نہیں ہوا۔ یہ بھی علم نہیں ہوسکتا تھا کہ پولیس کی آمد پر کہیں چھپے ہوئے حویلی کے مکین باہر نکلے تھے یا نہیں۔ ہوسکتا تھا کہ پولیس جھک مار کر اگلی سرکاری کارروائی میں رُجھ گئی ہو۔ پھر اس اعصاب شکن خاموشی میں نصف گھنٹہ گزر گیا۔ اس دوران شاید ہمیں تلاش کیا جاتا رہا تھا مگر اس باغ کی طرف، جہاں میں چھپا تھا، کوئی سپاہی نہیں آیا تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ رخصت ہوگئے ہیں تو میں اپنی کمین گاہ سے نکل کر حویلی کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ ابھی باغ کے اندر ہی تھا جب مجھے باغ اور حویلی کے درمیانی کھیت میں اُگی ہوئی آموں کی نرسری میں ادھر اُدھر گھومتی ہوئی سرچ لائٹس کی روشنی دکھائی دی۔ میں تڑپ کر ایک موٹے تنے والے آم کے پیچھے دبک گیا۔ دو یا دو سے زیادہ لوگ اس طرف آ رہے تھے۔ میں نے از راہِ احتیاط چند لمحوں میں ہی پیڑ پر چڑھ کر اپنے آپ کو گھنی شاخوں میں چھپا لیا۔ میں کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی باغ کی طرف آنے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ منٹ بھر کے بعد وہ باغ میں داخل ہوئے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے میری طرف چلے آئے۔ وہ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ ان کی آوازوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک ہم ڈاکوؤں کی تعداد چار، پانچ یا اس سے بھی زیادہ تھی اور ہم حویلی میں لوٹ مار کی غرض سے حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ سرائیکی میں بات کر رہے تھے۔ یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ پولیس والے تھے یا حویلی کے مکین، مگر وہ چند لمحوں بعد عین اسی پیڑ کے نیچے آن رُکے جس پر میں چھپا ہوا تھا۔ میں چاہتا تو چند ٹہنیاں ہٹا کر انہیں دیکھ سکتا تھا مگر کوئی خطرہ مول لینے کے موڈ میں نہ ہونے کی وجہ سے دُبکا بیٹھا رہا۔

ان میں سے ایک بولا، ''یار یہ باغ تو بہت بڑا ہے۔ اس میں دو چار بندے تو کیا، پوری کی پوری پلٹن چھپ سکتی ہے۔ چلو واپس چلیں۔ یہ نہ ہو کہ مفت میں مارے جائیں۔ ان لوگوں کے پاس بہت جدید اسلحہ ہوتا ہے۔''

یہ یک طرفہ مکالمہ سنتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ وہ پولیس کے جری اہل کار تھے۔

دوسرا بولا، ''اور صاحب سے کیا کہیں گے؟''

اس کی آواز خاصی بھاری اور بیٹھی بیٹھی تھی۔

''کیا کہنا ہے؟'' پہلا استہزائیہ انداز میں بولا، ''یہی کہنا ہے کہ وہ باغ میں چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کہیں اور دفعان ہو گئے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ہمارے خوف سے دُم دبا کر ہوا ہو گئے ہیں۔''

بھاری آواز والے نے اسے کوئی جواب دیے بغیر بلند آواز میں للکارا، ''اوئے..... کوئی ہے باغ کے اندر..... پولیس نے باغ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اگر جان کی سلامتی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک دو اور خود کو قانون کے حوالے کر دو ورنہ تم سب بھون دیے جاؤ گے۔''

اس کے ساتھی کے حلق سے دبی دبی خوف زدہ سی ہنسی برآمد ہوئی۔ بولا، ''اوئے چھڈ کریم بخشا! اب ڈاکو ہماری دھمکیوں میں آنے سے رہے۔ دو مربعے کے باغ کو گھیرنے کیلئے پولیس لائن کی ٹوٹل نفری بھی کم پڑ جائے گی۔''

بھاری آواز والے نے شاید اس کی گدی پر ہاتھ مارا تھا۔ دھپ کی آواز سنائی دی پھر دبا دبا قہقہہ، ''یار! میں ڈاکوؤں کو ڈرا نہیں رہا بلکہ میں تو تیرے تو ندو افسر کو مطمئن کر رہا ہوں۔''

''اوہ کنجر تیڈا وی تاں افسر اے!''

(وہ تمہارا بھی تو آفیسر ہے!)

وہ دونوں سپاہی تھے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے افسر کا حکم مان رہے تھے اور نہ دکھائی دینے والوں کو تلاش کر رہے تھے۔ بھاری آواز والا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا، ''بستی والے کہتے ہیں کہ آدھا گھنٹہ فائرنگ ہوئی۔ ساڑھے تین کتے اور ایک بندہ مرا۔ بس..... باقی فائر پھوکے ہی تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بھٹی لوگ اور ڈاکو فائرنگ کے بعد کدھر نکل گئے۔ ان سب کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ہے نا عجیب بات!''

''میرا خیال ہے کہ ڈاکوؤں کو ہمارے آنے کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ گھر والوں کو یرغمال بنا کر یہاں سے نکل گئے ہیں۔''

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ پولیس ہوٹر کی اتنی تیز آواز نشر کرنے کے بعد بھی وہ 'میرا خیال ہے' کہہ رہا تھا حالانکہ اسے اس بات کا یقین تھا۔

''گاڑی تو وہیں کھڑی ہے۔''

''چوری کی ہوگی، تبھی چھوڑ گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دو گاڑیوں میں آئے ہوں۔''

''مجھے تو کوئی بڑی گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔''

''تجھے اس عمر میں بہت کچھ محسوس ہونے لگا ہے کریم بخشے! یہاں سے سیدھا دماغ کے کسی سیانے ڈاکٹر کے پاس جانا۔''

''تیری تو.....'' بھاری آواز والا، جس کا نام کریم بخش تھا، ایک بھرپور گالی دے کر بولا، ''کچھ دیر اور رُکتے ہیں تاکہ وہ تو ندو سب انسپکٹر سمجھے کہ ہم باغ کی تلاشی لے رہے ہیں۔''

اس نے خاصے پتے کی بات کی تھی۔

''وڈا کوئی کھوتے دا پتر اے تو ندو خان..... آپ ڈردا پراں ونج کھلوتا ہے تے ساکوں موت دے منہ وچ گھت مارس!''

(بڑا گدھے کا بچہ ہے تو ندو خان۔ خود تو ڈر کے مارے دور کھڑا ہے جبکہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے اس نے۔)

''تمہاری بات ٹھیک ہے پر مجھے بھی ڈر لگ رہا ہے۔''

''دھت تیرے کی! بندوق ہاتھ میں ہے، جسم پر کالی وردی ہے، پھر بھی ڈر رہے ہو۔''

کریم بخش نے پھر ہاتھوں کا بھونپو بنایا اور اعلانیہ جملے ادا کیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے تو ندو افسر کو سنانے کیلئے بار بار اعلان کر رہا تھا کیونکہ اس کے منہ کا رُخ دونوں مرتبہ بجائے باغ کے اندرونی حصے کے، حویلی کی طرف ہوا تھا۔ ان کا افسر کوئی غیر معمولی بڑے پیٹ والا سب انسپکٹر تھا جو اس ریڈ پارٹی کو لیڈ کر رہا تھا۔ اس کے ماتحت طنزاً اسے 'تو ندو افسر' کہتے تھے۔ دونوں چند لمحوں تک اس ناکام ریڈ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اپنے تو ندو افسر کی شان میں غلیظ گستاخیاں کرتے رہے۔ پھر جب انہیں حویلی کی طرف سے پکارا گیا تو انہوں نے فی الفور واپسی کا قصد کیا۔ قانون کے دونوں بہادر محافظوں نے اس گھنے باغ میں محض گونگلوؤں سے مٹی جھاڑنے کیلئے قدم رکھا تھا۔ یہ مٹی ان کے حسنِ شجاعت سے جھڑ چکی تھی اور وہ چھاتی پھلائے واپس چل دیے تھے۔

ان کا افسر خاصا تند مزاج شخص واقع ہوا تھا۔ چند لمحے بھی صبر نہ کر سکا اور تیز چیختی ہوئی آواز میں بولا، ''اوئے کتھ مر گئے وے؟ ماں دی رشتہ داری کڈھ گھدی وے ڈاکوؤں نال یا رشتہ ڈیون گھنن کھڑ گئے ہوے؟ اِڈے چخ تھیوو!''

(اوئے! کہاں مر گئے ہو؟ ڈاکوؤں سے ننھیالی رشتہ داری نکال کھڑے ہو یا رشتے کا لین

دین کر رہے ہو؟ اس طرف آؤ۔)

میں نے دونوں سپاہیوں کی آواز تو نہیں سنی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ انہوں نے زیر لب زور دار قسم کی گالیاں دی ہوں گی اور اپنی رفتار بڑھا لی ہوگی۔ نرسری اور باغ کے درمیانی کھال کو جب انہوں نے پھلانگا تو مجھے پتہ چل گیا کہ وہ باغ سے نکل چکے تھے۔

اس دوران تو ندو سب انسپکٹر کسی اور پر چلا رہا تھا، ''اوں موئے مردود کوں چاتے ڈالے وچ پاوو۔ نالے موقع ملاحظے دا فوٹو اَتے نقشے بنا گھنو.....'' (اس مردود کو اُٹھا کر پولیس موبائل وین میں ڈالو۔ ساتھ میں موقع کے فوٹو گراف اور نقشہ بنا لو۔)

دریائی علاقے میں معمول کے مطابق پڑنے والی اوس نے رات کے پچھلے پہر کو خاصا خنک کر دیا تھا۔ چاند سرکتا ہوا چھپنے کا سامان کر رہا تھا۔ میں محتاط انداز میں چلتا ہوا چار دیواری اور کمرے کے سنگم پر آیا۔ آس پاس دیکھ بھال کر دیوار پر چڑھ گیا۔ حویلی کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اور صحن خالی تھا۔ میں چند لمحوں بعد پھر چھت پر تھا۔ رینگتا ہوا گول بینکر تک پہنچا پھر سیڑھیوں والے بینکر تک آ گیا۔ بینکر میں گہرے رنگ کے لباس والے نشانچی کی لاش ہنوز رکوع کی حالت میں اوندھی پڑی تھی اور پولیس کی عمدہ پرفارمنس کا ثبوت بنی ہوئی تھی۔ پولیس والوں نے چھت پر چڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس سے بڑی کوتاہی یا کج فہمی کی اور کیا مثال ہو سکتی تھی۔

میں نے بینکر میں کھڑے ہو کر اطراف میں جھانکا۔ پندرہ بیس پولیس والے برآمدے کے باہر دکھائی دیے۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ کاغذی کارروائی میں مشغول تھے۔ یہیں انہوں نے اپنی بہادری اور واردات فہمی کے تمام گل کھلانے تھے اور اپنے آقاؤں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا تھی۔ ان کے بڑے ان کی کارگزاریوں کو بخوبی سمجھتے ہیں مگر چونکہ وہ بھی اسی نظام کا حصہ ہیں، اس لیے انگریزی کے چند رٹے رٹائے ستائشی جملے لکھ کر فائل کو آگے چلا دیتے ہیں۔

موقع واردات کے فوٹوز اور جائے قتل کا نقشہ تیار کیا اور مفت میں ہاتھ لگنے والی لاش کو موبائل وین میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ ایسے ہی وقت میں منشی نے روزنامچہ تحریر ہونے کا اعلان کر دیا۔ موٹی توند والا سب انسپکٹر کتوں کی اندوہ ناک موت سے نجانے کیا نتائج اخذ کرنے کیلئے ان کی لاشوں پر جھکا ہوا تھا۔ کوئی نتیجہ اخذ ہوا یا نہیں، اس نے سیدھا ہو کر واپسی کا اشارہ کر دیا۔ بڑھے ہوئے پیٹ اور گنجے سر پر مشتمل اس کا حلیہ خاصا مضحکہ خیز تھا۔ عام حالات میں اسے دیکھ کر اپنی ہنسی پر قابو پانا خاصا دل گردے کا کام تھا۔

میرا اندیشہ محو ہو گیا۔ نگینہ پولیس کے نرغے میں دکھائی نہیں دی۔ وہ یا تو کہیں دور نکل گئی تھی یا قریب رہ کر کسی پیڑ پر دُبکی رہی تھی۔

پولیس کی دونوں گھومتی بتی والی موبائل گاڑیوں کے عقب میں بیس کے قریب دیہاتی ایک جتھے کی صورت میں کھڑے آپس میں محوِ کلام تھے اور بڑی توجہ سے پولیس کی دفتری کارروائی کو بنظرِ اشتیاق ملاحظہ کر رہے تھے۔ اکثر نے ہاتھوں میں لمبی لمبی ڈانگیں تھامی ہوئی تھیں جبکہ دو چار کے کاندھوں پر لٹکی ہوئی رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ عرفِ عام میں انہیں کچی رائفلیں کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں پکی گولی کے بجائے چھروں والے کارتوس ڈالے جاتے ہیں۔

اونچی نیچی آوازوں کا ملا جلا شور ماحول میں رچا بسا تھا۔ تقریباً سبھی اس رائے پر متفق تھے کہ پولیس کے ڈر سے ڈاکو فرار ہو گئے ہیں۔ ایک بلند قامت دیہاتی اپنی بھاری آواز میں مختلف نظریہ پیش کر رہا تھا کہ ڈاکو پولیس کا ہوٹر سنتے ہی بھٹیوں کو یرغمال بنا کر کہیں چھپ گئے ہیں۔ ایک دو سپاہیوں نے اس کے نظریے کو توثیق دی مگر ایک نوکیلی مونچھوں والا دبلا پتلا دیہاتی سرائیکی میں مخاطب ہوا، ''نہیں سجنو! نوروز بھٹی کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ میرا خیال ہے کہ اسے ڈاکوؤں کی آمد کا پہلے سے ہی علم تھا۔ اس لیے وہ خیر محمد کو پہرے پر کھڑا کر کے اپنا خاندان ہونج میل کر (سمیٹ کر) کسی طرف نکل گیا ہے۔''

ایک اور دیہاتی بلند آواز میں مہرِ تصدیق ثبت کرنے لگا، ''نوروز بھٹی کی حویلی میں ڈاکو کیا لینے آئیں گے۔ مجھے تو یہ کوئی پرانی دشمنی کا چکر لگتا ہے۔''

میرے دیکھتے ہی دیکھتے پولیس خیر محمد نامی پہرے دار کی لاش لے کر روانہ ہو گئی۔ راجباہ والے راستے پر پہنچ کر دونوں گاڑیاں رُک گئیں۔ دو سپاہی ڈالے سے اُترے۔ ان کا رُخ اس جانب تھا، جس جانب میری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر میرے حلق سے کراہ جیسی سانس نکل گئی کہ چند ہی لمحوں بعد پولیس کی دونوں گاڑیوں کے درمیان میری سفید کرولا چلتی ہوئی بستی کی جانب بڑھ گئی تھی۔ کم بخت میری گاڑی اپنے ساتھ تھانے لے گئے تھے۔ میری واپسی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ آن حائل ہوئی تھی۔ میں جس شان سے مقتل کی طرف آیا تھا، اس شان سے واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔

دیہاتیوں نے دو چار مرتبہ بلند آواز میں نوروز بھٹی اور اس کے بیٹوں کو پکارا۔ ایک نے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر اعلان کیا، ''نوروز بھٹی! اگر تم سن رہے ہو تو ڈرے بغیر باہر آ جاؤ۔ ہم تمام

بستی والے تمہاری مدد کیلئے اسلحے سمیت باہر کھڑے ہیں۔''

اس کی آواز غیر معمولی طور پر طاقت ور تھی اور میری دانست میں میل بھر کا سفر طے کر گئی ہو گی۔ اس نے تین مرتبہ اپنا جملہ اسی انداز میں دہرایا پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا، ''منو بھانویں نہ منو..... اُہ ذال بال گھن تے دریاؤل نکل گیائے!''

(مانو خواہ نہ مانو۔ نوروز بھٹی اپنے اہل وعیال کو لے کر دریا کی طرف نکل گیا ہے۔)

وہ سب اپنی اپنی بولیاں بولتے ہوئے بستی کی طرف چل دیے۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ محض اندازہ تھا کہ تین سے کچھ اوپر تلے کا عمل تھا جب میں نے پہلے مدھم آواز میں، پھر قدرے بلند آواز میں نگینہ کو پکارا۔ جواب ندارد۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ بینکر میں کھڑا ہو گیا۔ حویلی کے اگلے باغ میں، جہاں میری دانست میں اسے چھپا ہونا چاہیے تھا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ یہ سراسر اضطراری کوشش تھی وگرنہ اس کے یوں دکھائی دینے کا جواز نہیں تھا۔ وہ گھنے درختوں میں ہی کہیں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پھر پکارا مگر مایوس رہا۔ وہ یا تو کہیں دور نکل گئی تھی یا میری آواز کو پہچان نہیں رہی تھی۔

میں سیڑھیاں اُتر کر ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔ ایک بھاری مردانہ آواز سن کر ٹھٹک کر رُک گیا۔ اعصاب ایک دم تن گئے اور میں بجلی کی سی تیزی سے سیڑھیوں سے آگے نکلی ہوئی کمرے کی دیوار کی اوٹ میں دبک گیا۔ آواز بدستور سنائی دے رہی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جھانک کر لاؤنج میں دیکھا تو چونک گیا۔ گیلری کی جانب واقع عروسی آرائش والے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا حالانکہ میں نے تلاشی لینے کے بعد کسی بھی دروازے کو بند نہیں کیا تھا۔ باقی کمروں کے دروازے پہلے کی طرح چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ جو کوئی بھی تھا، وہ اسی نیم وا دروازے کے پَرے یعنی تزئین یافتہ بیڈروم میں ہی موجود تھا۔

میں نے گن اور پستول فائر پوزیشن میں تھامے اور دبے پاؤں چلتا ہوا بیڈ روم کے دروازے پر آیا۔ احتیاط سے اندر نگاہ ڈالی۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرے پورے بدن کو ایک دم سخت جھٹکا لگا۔ نگینہ بیڈ پر اوندھے منہ پڑی تھی جبکہ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس لمبا تڑنگا مرد بیڈ پر پیر رکھے اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ قدرے نیچی آواز میں غرا رہا تھا، ''کم ذات! سیدھی طرح بول دے ورنہ مار مار کر چمڑی ادھیڑ دوں گا۔''

میں اسی ایک جملے سے مکمل متن اپنے سیاق وسباق سمیت سمجھ گیا۔ وہ لمبا تڑنگا شخص نوروز

بھٹی کا بڑا یا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح نگینہ پر قابو پالیا تھا اور اب اس سے اس کے ساتھی یا ساتھیوں کے بارے دریافت کر رہا تھا۔ نگینہ کو میں نے فوری طور پر اس کے لباس کی وجہ سے پہچانا تھا ورنہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کے سنہرے ریشمی بالوں کا جوڑا کھل گیا تھا جس سے اس کے بال بکھر گئے تھے۔ اس کا جھٹکے لیتا بدن چغلی کر رہا تھا کہ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

میں نے اردگرد دیکھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہم تینوں کے علاوہ حویلی میں بدستور کوئی ذی نفس موجود نہیں ہے۔ اس کے باوجود بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ جس طرح رازداری سے وہ شخص کہیں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا تھا، ایسے ہی باقی لوگ بھی کسی لمحے جنوں بھوتوں کی طرح دیوار پھاڑ کر سامنے آ سکتے تھے۔ میرے اس یقین کو تقویت ملی کہ اس حویلی میں کسی سرنگ یا خفیہ تہہ خانے کا دہانہ کھلتا تھا۔ میں نے پاؤں کی مدد سے دروازے کو بے آواز انداز میں دھکیلا اور آنِ واحد میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ چونکہ نگینہ سے باز پرس کرنے والے کی پشت دروازے کی جانب تھی اور نگینہ اوندھے منہ بیڈ پر پڑی تھی، اس لیے دونوں کو ہی میری آمد کا پتہ نہیں چلا۔ میں بجلی کی سی مستعدی سے طویل قامت کے عقب میں پہنچا اور گن کی نال اس کی کمر سے لگا دی، ''کاربین بیڈ پر رکھ کر دونوں ہاتھ اُٹھا لو ورنہ تمہاری جسم چھلنی کر دوں گا۔''

میری نہایت سرد آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے اور وہ پلٹتے پلٹتے ایک دم رُک گیا، ''تت..... تم کون ہو؟''

میں نے اپنی آواز میں مزید درشتی سموئی، ''جو کہہ رہا ہوں وہ کرو ورنہ.....''

اس نے سست انداز میں کاربین بیڈ کے میٹرس پر رکھ دی۔ میری آواز سن کر نگینہ رونا بھول کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنسو بھری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اس نے طویل قامت شخص کی رکھی ہوئی کاربین اُٹھانے اور اس پر تاننے میں بمشکل ایک سیکنڈ کا وقت لیا۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے طویل قامت شخص پر اپنی توجہ مرکوز کی اور اسے گن کی نال سے دیوار کی جانب دھکیلا۔ وہ بے چوں چرا دیوار تک گیا اور میرے حکم پر ہاتھ سر سے بلند کر کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا، ''تم کون ہو؟''

وہ خاموش رہا۔ نگینہ بول پڑی، ''یہ باسٹرڈ امانت ہے..... اسی کتے کے پلے نے میرے بھائی کو مارا تھا۔''

''اوہ!'' میرے حلق سے ہنکارا برآمد ہوا۔ طویل قامت شخص بھنا کر بولا، ''میں تیری زبان گدی سے کھینچ لوں گا حرامزادی..... تو مجھے جانتی نہیں ہے۔''

وہ کچھ اور بکنا چاہتا تھا مگر میری گن کی نال کے بڑھتے ہوئے دباؤ پر خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا، ''تم کہاں چھپے ہوئے تھے؟''

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اکھڑ لہجے میں بولا، ''گدھے کے بچے! زندگی کی خیر مناؤ اور ایک منٹ سے پہلے حویلی سے نکل جاؤ ورنہ چوہے کی طرح مارے جاؤ گے۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میں کون ہوں۔ میں تو اب تک تمہاری جوانی پر ترس کھا رہا ہوں ورنہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل کے رکھ دوں۔''

میرے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ نگینہ میرے پہلو سے نکل کر سامنے آئی۔ میں نے اسے ایک لمحے کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بے حد اسپاٹ اور آنکھیں بے حد خون آشام تھیں۔ میں اس کی قلبی کیفیت سمجھ گیا مگر اسے روکنے میں دیر کر بیٹھا۔ اس نے دانت کچکچائے اور فائر کر دیا۔ کاربین کی گولی کمرے میں خوفناک گرج پیدا کرتے ہوئے امانت بھٹی کی کمر میں جا دھنسی۔ وہ تڑپ کر پلٹا۔ ایسے میں اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ میرا دھکا کھا کر کمر کے بل دیوار سے جا لگا۔ اس کا چہرہ فرطِ خوف اور تکلیف سے خاصا ڈراؤنا ہو کر رہ گیا تھا۔ جبڑا بھنچ جانے سے چہرے کے اعصاب ابھر آئے تھے۔ ایسے میں نگینہ کی بھرائی ہوئی آواز میرے کانوں پڑی، ''کمینے..... تم نے میرے انوسینٹ برادر کو گولی مارا..... نو نو..... نو مور بریتھ یو ہیو..... نو مور بیٹنگ..... ہاہ! تین گولیاں..... اس معصوم کے سینے میں تم نے کسی جرم کے بغیر اتار دیں..... ہاہ!''

اس نے پھر دانت پیسے۔ کاربین کا ٹرائیگر دبایا۔ گولی نہیں نکلی۔ اس میں ایک ہی گولی تھی جو چل چکی تھی۔ دو تین مرتبہ ٹریگر دبانے کے بعد اس نے جھنجھلا کر کاربین کو اس کے سینے پر کھینچ مارا۔ بلی کی طرح تڑپ کر میرے الٹے ہاتھ آئی۔ میرے ہاتھ سے ریوالور چھین کر غرائی، ''ہماری پراپرٹی کے بھوکے..... تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتی..... نو مور بریتھ یو ہیو ڈرٹی مین.....''

میں نے ڈانٹا، ''ہوش میں آؤ نگینہ!''

''یو شٹ اَپ!'' وہ بھڑک کر بولی اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے ایک ہی سانس میں چار گولیاں امانت بھٹی کی چھاتی میں اُتار دیں۔ سائیلنسر لگے ریوالور کی مخصوص

'ٹھک ٹھک' کے بیچ میں امانت بھٹی نے چیخنے کیلئے منہ کھولا مگر حلق سے محض خرخراہٹ نکل سکی۔ آنکھیں خوف اور تکلیف سے پھٹنے کو آ گئیں۔ میں چیخ کر نگینہ کی طرف بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ فائر کرنا چاہتی تھی مگر امانت کو لہرا کر فرش پر گرتا دیکھ کر رُک گئی۔ چند ہی لمحوں میں فرش پر خون کا تالاب سا بن گیا۔ امانت بھٹی کے چھلنی بدن سے لہو بھل بھل کرتا ہوا نکل رہا تھا جو نگینہ کے سلگتے ہوئے ذہن پر پانی کے چھینٹے بن کر گر رہا تھا۔

میں نے تأسف بھرے انداز میں کہا، ''اس سے کچھ پوچھنے تو دیا ہوتا۔''

''آئی ڈونٹ کیئر.....''

''سمجھو کہ یہ مر گیا ہے۔ یہاں سے نکل چلیں کیونکہ ہمارا کام مکمل ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟ کاغذات.....''

''وہ میرے پاس ہیں۔''

''اور ابھی رفاقت اور اس کا باپ باقی ہیں۔ میں ان کا مرڈر کرنا چاہتی ہوں۔''

''اوہ نو..... تمہارے بھائی کو اس مردود نے مارا تھا، تم نے بدلہ لے لیا۔ اب چلیں۔''

اس نے سختی سے انکار میں سر ہلایا، ''نہیں سر! اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ جب تک وہ دونوں زندہ ہیں، میں واپس نہیں جا سکتی۔ کہاں اں! آئی کین نیور گو بیک.....''

اس کے اس اٹل فیصلے کو سن کر میں کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

میں نے امانت پر سے نظریں ہٹائیں۔ نگینہ کو دیکھا۔ وہ کینہ توز نظروں سے فرش پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے امانت بھٹی کو گھور رہی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا سرخ ہو گیا تھا کہ رستے ہوئے خون کا گمان ہوتا تھا۔ میں نے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور اسے اسی کیفیت میں چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔ لاؤنج میں رُک کر کچھ سوچتا رہا۔ میرا پہلا کام اس مقام کو کھوجنا تھا جہاں بھٹی خاندان چھپا ہوا تھا۔ چاروں کمروں کو اس نقطۂ نظر سے کنگھالا۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔ گیلری میں آیا۔ اس میں کچن اور اسٹور سمیت چار کمرے تھے۔ چاروں عمومی استعمال کے کمرے تھے اور سامان کے علاوہ خالی تھے۔ لاؤنج میں آیا۔ مہمان خانے کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر نگینہ کو دروازے میں کھڑے پایا تو رک گیا۔ وہ بولی، ''سر! آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟''

میں نے رُک کر اسے بتایا، ''یہاں کوئی تہہ خانہ ہے جس کا دروازہ ڈھونڈ رہا ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں حیرت بس گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی حالت بہتر نہیں تھی۔ اسے

خوب زدوکوب کیا گیا تھا۔ گالوں پر انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔ گریبان تھوڑا سا پھٹا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا، ''تم اس مردود کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟''

وہ اپنی شکستہ، اردو اور انگریزی ملی جلی زبان میں بتانے لگی، ''جب پولیس آئی، میں اُسی آم پر چڑھی ہوئی تھی جس کے نیچے آپ مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ پولیس کے جانے کے بعد میں نیچے اُتری اور حویلی میں داخل ہوگئی۔ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ یہ کمینہ نہ جانے کہاں سے نکل کر مجھ پر پل پڑا۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔''

''لاؤنج کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا؟''

''یس سر! پھر اس نے مجھ سے گن اور پسٹل چھین لیا اور مجھے چند منٹوں میں ہی مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ پھر مجھے گھسیٹ کر بیڈروم تک لایا تھا۔'' وہ اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولی۔

''تم نے شور نہیں مچایا؟'' میں نے پوچھا۔ میں نے اس خیال کے تحت دریافت کیا کہ میں نے اس کے چیخنے چلانے کی آواز نہیں سنی تھی۔

''نو سر! باہر پولیس والے جو موجود تھے۔''

''یعنی تمہیں اس وقت پولیس کی موجودگی کا احساس تھا؟'' مجھے اچنبھا ہوا۔

''یس سر! پولیس والے اگر میری آواز سن لیتے تو آ کر مجھے پکڑ لیتے۔''

''پولیس زیادہ سے زیادہ تمہیں گرفتار کر لیتی جبکہ یہ درندہ تمہیں قتل کر سکتا تھا۔ اچھا خیر! جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہاری گن اور پسٹل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا، ''تم نے دیکھا تو ہوگا کہ امانت نے تم سے اسلحہ چھین کر کہاں رکھا تھا۔ جاؤ، اُٹھا لاؤ۔''

''اوہ یس! یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اس نے میرے ویپن وہیں کمرے میں، بیڈ کے نیچے پھینک دیے تھے۔''

اس سے کئی باتیں پوچھنی تھیں مگر میں نے اس کا تفصیلی انٹرویو پھر کسی وقت پر ٹال دیا اور اسے بیڈ کے نیچے سے اسلحہ نکال لانے کا حکم دیا۔ وہ کمرے میں گھس گئی تو میں نے مہمان خانے کا رُخ کیا۔ بیرونی سمت واقع عمارت کا یہ حصہ دو بڑے کمروں، ایک کشادہ ٹائلٹ اور خاصے وسیع و عریض برآمدے پر مشتمل تھا۔ اسی برآمدے کے نیچے خیر محمد میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔ اس کا نام مجھے بستی والوں کی گفتگو سے معلوم ہوا تھا۔ بھٹی خاندان کے چال چلن کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچا جا سکتا تھا کہ وہ کوئی پیشہ ور وارداتیا تھا یا قانون کو انتہائی مطلوب مجرم تھا جو قانون

کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کیلئے نوروز بھٹی کے ڈیرے پر بطور سکیورٹی گارڈ اپنی خدمات پیش کرتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ نوروز بھٹی کا دستِ راست ہو اور ان لوگوں نے مل جل کر اپنا چھوٹا موٹا گروہ تشکیل دے رکھا ہو۔ دریائی علاقوں میں بہت کچھ ایسا دیکھنے کو ملتا ہے جو قانون سمیت پوری دنیا سے چھپا رہتا ہے۔

مہمان خانے کا ایک کمرہ وی آئی پی مہمانوں کیلئے بڑے اہتمام سے آراستہ کیا گیا تھا جبکہ دوسرے میں موٹے پایوں والی روایتی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سبھی دیواریں اور فرش اسپاٹ تھے۔ تھپتھپانے سے کہیں بھی کھوکھلا پن آشکار نہیں ہوا تو میں مایوس ہو گیا۔ میرے یقین کے مطابق حویلی کے نیچے تہہ خانہ یا کہیں دور لے جانے والی سرنگ کا دہانہ موجود تھا جس تک میری رسائی نہیں ہو رہی تھی۔ میرے اس یقین کو امانت بھٹی کی نہایت پراسرار انداز کی آمد نے تقویت دی تھی۔

میں برآمدے اور مہمان خانے کے درمیانی دروازے کو کھولنے ہی لگا تھا کہ عقب میں قدموں کی چاپ ابھری۔ تڑپ کر پلٹا تو نگینہ کو حیرت و استعجاب کی مورتی بنے کھڑے پایا۔ پوچھا: ''کیا ہوا؟''

''سر..... سر! وہ..... بیڈ کے نیچے سے تو کچھ بھی نہیں ملا حالانکہ اس کتے نے میری آنکھوں کے سامنے میری گن اور پسٹل بیڈ کے نیچے پھینکے تھے۔ نو سر..... نو سر..... ہاؤ اِز دس پاسیبل؟''

وہ اپنی حیرت کا اظہار کر ہی رہی تھی کہ میں ایک جھٹکے سے بیڈ روم کی طرف بھاگا۔ میں نے یہ سمجھنے میں لحظہ بھر دیر نہیں کی تھی کہ سرنگ یا تہہ خانے کا دہانہ اسی بیڈ کے نیچے کھلتا تھا۔ بیڈ کے پاس پہنچ کر گھٹنوں کے بل جھکا۔ فرش اسپاٹ تھا۔ تھپتھپا کر دیکھا۔ کھوکھلا پن محسوس نہیں ہوا۔ فرش میں جوڑ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بیڈ کو دائیں بائیں، اوپر نیچے ہلا کر دیکھا۔ دیوار پر نصب سوئچ بورڈ کے سبھی بٹن 'آف' اور 'آن' کر کے دیکھا۔ نہ بیڈ اپنی جگہ سے ہلا اور نہ فرش ہی میں کوئی خلا پیدا ہوا۔ نگینہ دروازے میں کھڑی میری حرکات کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

میری تمام تر کوشش کے باوجود بیڈ ایک سنٹی میٹر بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکا تو میں آخری کوشش کے طور پر فرش پر لیٹا اور پہلو کے بل کروٹ بدل کر بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ کوئی کلیو ہاتھ نہ لگا تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ بیڈ کے نیچے نصب چوبی کڑی پر ٹکائے اور پوری قوت سے بیڈ

کو اوپر اُٹھانا چاہا۔ بیڈ تو اپنی جگہ سے انچ بھر بھی نہ اُٹھا، البتہ میں فرش کے دو اڑھائی فٹ چوڑے حصے سمیت زمین میں دھنستا چلا گیا۔ میں نے سنبھلنے اور اُٹھنے میں غیر معمولی عجلت کا مظاہرہ کیا مگر دیر ہو گئی تھی۔ فرش کا ٹکڑا کم و بیش آٹھ فٹ نیچے جا کر لفٹ بکس کی طرح رک گیا۔ میرے بدن کو جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرا دل اوپر اٹک گیا ہو اور بدن نیچے کھسک رہا ہو۔ ایسے ہی وقت میں سرد سی شئے میری پسلیوں میں آن چبھی جسے محسوس کرتے ہی میرا جسم ساکت ہو گیا۔

یہ ایک گیلری نما کمرہ تھا جس میں دودھیا بلبوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں فرش کے تخت نما ٹکڑے پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا اور میری پسلیوں میں چبھنے والی سرد شئے بندوق کی نال تھی۔ میں نے گردن موڑی۔ اپنے بہت قریب امانت بھٹی جیسی قامت اور حلیے والے شخص کو خون آشام نظروں سے گھورتے پایا۔ اسے دیکھتے ہی پہلا خیال ذہن میں یہی پیدا ہوا کہ وہ نوروز بھٹی کا بڑا بیٹا رفاقت تھا کیونکہ اس کے خال و خط میں اپنے چھوٹے بھائی امانت کی مکمل شباہت موجود تھی۔ اس کی انگلی ڈبل بیرل گن کے دوہرے ٹریگر پر تھرک رہی تھی اور موٹی موٹی سرخی مائل آنکھوں میں جہان بھر کی خشونت بھری ہوئی تھی۔ میں نے کن اکھیوں سے اپنی گن کو دیکھا جو کندھے پر لٹکنے کے باوجود اس حالت میں نہیں تھی کہ اسے فی الفور حرکت میں لا جا سکتا۔

''خبردار! ذرا بھر حرکت کی تو گولی سیدھی دل میں اتار دوں گا۔'' طویل قامت رفاقت بھٹی کا لہجہ بڑا سنگین تھا۔

میری معمولی سی لاپروائی سے کام بگڑ چکا تھا۔ اس الجھے ہوئے ریشم کو فراست سے سہلایا جا سکتا تھا ورنہ اس جنگلی درندے سے ذرا بھر خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مستزاد یہ تھا کہ اس کا حقیقی بھائی اور ایک خاص کارندہ ہمارے ہاتھوں راہی اجل ہو چکے تھے۔

اس وقت میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے اس نئی صورتِ حال کے بارے سوچ رہا تھا۔ ایسے میں میری پشت پر کوئی مضبوط گرفت والا شخص آیا اور اس نے چشم زدن میں میرے دونوں ہاتھ پوری قوت سے پیچھے کھینچ لیے۔ میرے سمجھنے سے پیشتر ہی اس نے میری کلائیوں کو باہم جوڑ کر کسی آہنی کلپ میں جکڑ دیا۔

رفاقت کی آنکھیں سوجی ہوئی تھی اور سرخ ڈورے آنکھوں کی دہشت کو بڑھا رہے تھے۔ مجھے رسٹ کلپ پہنانے والے کو دیکھے بغیر سرد لہجے میں بولا، ''زورآور! اسے اُتار لو۔''

ساتھ ہی اس نے آنکھوں سے میری گن کی طرف اشارہ کیا۔

زورآور کا نام سنتے ہی میری دھڑکن بڑھ گئی۔ اس کی یہاں موجودگی غیر متوقع نہیں تھی مگر زود ہضم بھی نہیں تھی کیونکہ وہ نہایت سنگ دل انسان تھا۔ لحظہ بھر میں ملتان کے نواحی مکان کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا جہاں میں نے اس کی خباثت اور درندگی عروج پر دیکھی تھی۔

اسی دوران زورآور نے گن کے بیلٹ کا اسٹرپ بکل کھولا اور میری گن اپنی تحویل میں کر لی۔ اپنے مخصوص انداز میں ہنس کر بولا، ''بڑی خوب صورت گن ہے۔ اوہ! یہ تو سائیلنسر ڈ بھی ہے..... مجھے توقع نہیں تھی کہ یہ جنگلی بلا اتنی آسانی سے قابو میں آ جائے گا۔ اس کی طرف میرے بڑے حساب نکلتے ہیں بھٹی! اس کے ہاتھوں پر میرے جان سے پیاروں کا خون چپکا ہوا ہے۔ دیکھنا! اس کے روئیں روئیں میں آگ بھر کر اسے نچاؤں گا۔''

میں کوئی جواب دے کر انہیں برانگیختہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے خاموشی سے سنتا رہا۔ اوکھلی میں سر آ گیا تھا اور موصلے پوری قوت سے میرے سر پر سوار ہو چکے تھے۔ رفاقت کے ٹھہراؤ کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین سا ہو گیا تھا کہ اسے ابھی تک خیر محمد اور امانت کی موت کا علم نہیں ہوا تھا وگرنہ وہ اتنا پرسکون نہ ہوتا۔ مگر یہ لاعلمی زیادہ دیر برقرار رہنے والی نہیں تھی۔ اسے جس لمحے علم ہوتا، وہ اُسی پل مجھے چھلنی کر دیتا۔ اس کی آنکھوں کے تاثر سے میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ وہ نہایت عجلت پسند اور انتقامی ذہن رکھنے والا جوان تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ اس دوران زورآور نے مشاقانہ انداز میں میری تلاشی لی اور نگینہ اور سلامت بھٹی کے کاغذات، میری پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر اور بیلٹ کا سامان نکال لیا۔ پاسپورٹ دیکھتے ہی رفاقت کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ اس نے ایک لمحہ کو اوپر دیکھا۔ گیلری کی چھت کے خلا میں سے بیڈ کا نچلا حصہ اندھیرے کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمبی سانس لے کر بولا، ''ہوں! تو یہ کتا ان کاغذات کی بو سونگھتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔''

زورآور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرے داہنے پہلو میں کھڑا عجیب گھورتی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا غیر معمولی بڑی جسامت والا ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس کی نال کو ناخن سے کھرچتے ہوئے بولا، ''بھٹی! میں اسے سنبھالتا ہوں۔ تم جا کر امانت کا پتہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ شہریار یہاں اکیلا نہیں آیا ہوگا۔ اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ خطرناک لوگ ہوں گے۔ ان سے امانت نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ

اسے باہر نہ جانے دو۔''

''او یار کچھ نہیں ہوتا..... تم امانت کو نہیں جانتے۔ وہ اس جیسے دس کتوں کیلئے اکیلا ہی کافی ہے۔ بہر حال! تم اسے نیچے اُتارو، میں اس کا پتہ کر کے آتا ہوں۔'' رفاقت کے لہجے کی رعونت مجھے بری لگی مگر خاموش رہا۔

زور آور نے مجھے کالر سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ میں نے خود کو سنبھال نہ لیا ہوتا تو پیروں کے بجائے کولھوں کے بل سنگِ مرمر کے فرش پر گرتا اور خاصی چوٹ آ جاتی۔ وہ مجھے بے دردی سے گھسیٹتا ہوا گیلری میں سیدھا چلتا گیا پھر دائیں ہاتھ واقع ایک چھوٹے سے کمرے میں گھس گیا۔ کمرہ ساز و سامان سے عاری تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ لٹکتی ہوئی آہنی زنجیروں اور مضبوط کلپس کو دیکھ کر میرے حلق سے لمبی سانس خارج ہو گئی۔ وہ مجھے ٹارچر روم میں لایا تھا۔

بے دردی سے گھسیٹتا ہوا دیوار تک لایا اور کھڑا کر کے زنجیروں میں جکڑنے لگا۔ اس نے محض چند منٹ میں ہی ماہرانہ انداز سے مجھے یوں جکڑ دیا کہ میں انچ بھر حرکت کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے لفٹ نما تخت پر ہی ایکشن میں آ جانا چاہیے تھا اور دونوں سے دو دو ہاتھ کر لینا چاہیے تھا۔ اب بے بسی سے سوائے ان کے چلتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھنے اور اپنی چیخیں کو ہونٹوں پیچھے دبانے کے، میں عملی طور پر کچھ کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا، ''زور آور! تم جانتے ہو کہ مجھے میڈم نے یہاں بھیجا ہے۔''

میں نے اس جملے میں نہ صرف اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں میڈم کے نزدیک کتنی اہمیت رکھتا ہوں بلکہ یہ باور بھی کرایا تھا کہ اس کی یہ حرکت میڈم کے نزدیک اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے کے وسط میں چلا گیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ نشے کی حالت میں تھا۔ ہاتھ لہرا کر بولا، ''واہ!..... واہ! کیا ذکر چھیڑ دیا اس سرکش حسینہ کا..... پر اس کا نخرہ اس کے قد کاٹھ سے کہیں بڑا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہے۔ ہائے! وہ غلط بھی تو نہیں سمجھتی ناں..... ٹھیک ہی تو سمجھتی ہے۔ پر جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو نہ صرف مجھے اپنے جان سے پیارے یار موبی اور صفی یاد آ جاتے ہیں بلکہ میرے دل میں رقابت بھی جاگ اُٹھتی ہے۔ چلو یہی ٹھیک سہی! آج یہ دونوں پرابلمز حل ہو جائیں گی۔ نہ بانس رہے گا اور نہ ہی کبھی دُکھ کی بانسری بجے گی۔''

نشے کی وجہ سے وہ بولتے بولتے اٹک رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ جسم پر سستی مسلط تھی۔ اس کے باوجود اس کی خونخواری میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ آسان نہیں تھا۔

میں نے کہا، ''میں نے تمہیں پہلے بھی کئی مرتبہ کہا ہے کہ میں نے موبی کو قتل نہیں کیا تھا۔ ہاں! صفی کا قتل میرے ہاتھوں ہوا۔ یہ الگ بات ہے مگر اس وقت میری جگہ پر تم ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔ میں آج بھی یہی کہتا ہوں کہ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ پھر تم میرے بارے میں اتنے انتہائی انداز سے کیوں سوچتے ہو؟''

''ہاں! میں سوچتا ہوں۔ انتہائی انداز سے۔ مگر میں کیا کروں، میری فطرت ہی ایسی ہے۔ اچھا چھوڑو اس پرانی کہانی کو، یہ بتاؤ، تمہارے ساتھ سخی محمد آیا ہے یا پیاجی؟''

میں نے ایک لمحے کو سوچا، پھر کہا، ''وہ دونوں بھی میرے ساتھ آئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بری طرح چونکا، ''تم کتنے لوگ یہاں آئے ہو؟''

میری توقع کے مطابق اس کی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز لکیریں ابھر آئی تھیں۔

میں نے اسے مزید کھسکانے کی کوشش کی، ''ایک لڑکی سمیت چھ آدمی باہر موجود ہیں۔''

''لڑکی؟'' وہ ایک بار پھر ٹھٹکا، ''کیا رفاقت کی بیوی نگینہ بھی ساتھ آئی ہے؟''

''یس! امانت مارا جا چکا ہے۔ خیر محمد بھی۔ چھت پر دو لڑاکے بینکروں میں موجود تھے۔ ان کی آخری رسومات سخی محمد نے سرانجام دی ہیں۔ رفاقت کی قسمت بھلی ہوئی تو زندہ سلامت واپس آ جائے گا اور اگر اس کے دن گردش میں ہوئے تو پیاجی یا فیروز کے ہاتھ لگ چکا ہوگا اور اس وقت عالمِ بالا کی سیر کر رہا ہوگا۔''

اس دوران میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دے کر محسوس کر لیا تھا کہ ان مضبوط آہنی زنجیروں سے گلوخلاصی میرے بس سے باہر تھی۔

''تمہیں میڈم نے نگینہ کے ساتھ کیوں بھیجا؟ یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔'' وہ بغیر کسی وجہ کے ریوالور مجھ پر تان کر، سوچتے ہوئے بولا، ''مگر تم اپنا کام مکمل کرنے کے بعد واپس جانے کے بجائے تہہ خانے میں کیوں آئے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا، ''تو کیا ہوا؟ میں سمجھائے دیتا ہوں۔ ان پیپرز کی دستیابی کے بعد میڈم کا حکم مانتے ہوئے نوروز بھٹی اور اس کے دونوں بیٹوں کو ٹھکانے

لگانا ابھی باقی تھا۔اس لیے یہاں آیا ہوں۔''

''کیا تم لوگوں کو معلوم تھا کہ میں یہاں ہوں؟''

''ہاں! مگر ہمیں نہیں، میڈم کو تمہاری یہاں آمد کا پتا تھا۔ہمیں میڈم نے یہ حکم دیا تھا کہ تم سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں تمہیں نہ مارا جائے۔''

''چاہے میں تمہیں اُڑا کر رکھ دوں۔ہوں؟'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

میں نے اسپاٹ لہجے میں کہا،''میڈم نے حکم دیا تھا کہ تمہیں ہر ممکن صورت میں زندہ رکھا جائے۔اگر تم رکاوٹ بنو تو تمہیں زخمی کر کے اپنے ساتھ لایا جائے۔''

''کیا تم میں کوئی ایسا شاہ زور موجود ہے جو اس زورآور کو زخمی کر کے اپنے ساتھ لے جائے؟'' اس نے بھڑک کر اپنا سینہ ٹھونکا۔

''زورآور! ہمارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔پولیس یہاں سے خیر محمد کی لاش لے جا چکی ہے۔اب وہ دن چڑھے یہاں آئے گی اور اپنی باقی ماندہ کارروائی ڈالے گی۔دن چڑھنے میں دیر ہی کیا ہے؟.....اور امانت مر چکا ہے.....اور اب تب میں رفاقت بھی مرنے والا ہے۔صبح ہوتے ہی تم ان چار لوگوں کے قتل کے الزام میں دھر لیے جاؤ گے۔اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہماری راہ میں حائل ہونے کے بجائے اپنی خیر مناؤ۔مجھے لگتا ہے کہ تم بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔''

چونکہ وہ نشے میں تھا اور میرا پختہ لہجہ سچائی کا غمازی تھا،اس لیے وہ اندر سے ہل گیا۔بظاہر لاپروائی اور رکھائی سے بولا،''کیا نگینہ بھی میڈم شکیلہ گینگ جائن کر چکی ہے؟''

''ہاں!'' میں نے وثوق سے جواب دیا۔

ایسے میں کہیں دور سے فائر کی آواز سنائی دی۔ہم دونوں چونک گئے۔باہر، حویلی میں دو جانی دشمن موجود تھے جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ان میں سے ایک کام آ گیا تھا۔کون؟ رفاقت یا نگینہ؟.....یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔میں نے اپنا اندرونی اضطراب چھپا کر سنگین لہجے میں کہا،''زورآور! جلد فیصلہ کر لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔مجھے مارنے کے بعد تم پیا جی، فیروز اور سخی محمد کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔وہ مجھے مردہ حالت میں دیکھتے ہی میڈم کے حکم کی کچھ زیادہ پروا نہیں کریں گے۔''

''تم اس تہہ خانے کے رموز و اسرار کو نہیں جانتے اس لیے بڑھ چڑھ کر بول رہے ہو۔ان

میں سے کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔ حتیٰ کہ تم بھی ہماری مرضی کے بغیر یہاں نہیں آ سکتے تھے۔"

"تو میں کیسے یہاں آ گیا؟"

"تم دہانے کو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ تمہاری کوششوں کو سراہا جائے۔ سراہنے کیلئے تمہیں نیچے بلایا۔ تم اس غلط فہمی میں ہو کہ تم نے مین وے کھولا ہے۔"

میں نے کہا، "تمہاری ان باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ پیاجی یہاں تک پہنچ جائے گا۔"

اس نے ہونٹ چڑھائے اور نفی میں سر ہلایا۔

"دیکھو زورآور! تمہارے بھٹیوں کا مٹنا نکل چکا ہے۔ رہا ان کا باپ..... آج نہیں تو کل وہ بھی اناغفیل ہو جائے گا۔ کاغذات کا فکر نہیں ہے۔ نئے بن جائیں گے۔ ڈپلی کیٹ۔ یعنی ہمارا مشن مکمل ہو چکا ہے اور میرے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میری سرد آواز نے اسے خیر منانے پر مجبور کر دیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے اپنے مخصوص جابرانہ انداز میں کھڑا مجھے گھورتا رہا پھر ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میرا بدن زنجیروں نے آکٹوپس کی طرح جکڑ رکھا تھا کہ پہلی ہی کوشش میں پتہ چل گیا کہ ان سے رہائی ممکن نہیں تھی۔ میرے بازو دوہری بندش میں جکڑے ہوئے تھے اور زنجیروں کے تمام قفل میری پشت پر تھے جن تک رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے کھلنے کے میکانزم کو سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔ کم بخت زورآور نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ جلد ہی لوٹ آیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا، "تم نے مجھ سے جھوٹ بولا؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا، "نہیں تو....."

"دیکھ لو!"

"دیکھ لیا۔ میں نے یقیناً تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

اس کا ہاتھ چشمِ زدن میں اُٹھا اور ایک بھرپور تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ چٹاخ کی زوردار آواز کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ اُبل پڑا۔ ذرا دم لے کر بولا، "سچ سچ بتاؤ ورنہ ابھی شوٹ کر دوں گا۔"

میں اندر ہی اندر کانپ کر رہ گیا۔ وہ اپنی جون میں لوٹ آیا تھا۔ نہ جانے کون سا عمل اس کے اشتعال کا سبب بنا تھا، میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا، "میں نے

جو کہنا تھا، کہہ دیا۔ اب تم نے جو کرنا ہے، کھل کر کرو۔''

اس نے ریوالور کی نال میری آنکھوں کے درمیان پیشانی پر رکھی۔ تھوڑا دباؤ ڈالا۔ دانت پیسے۔ میں نے آنکھیں بند نہیں کیں بلکہ بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس کوشش میں میرے بدن کی آدھی جان ہوا ہوگئی۔ زورآور کی شکل میں بھیانک موت میرے سامنے تھی جس کا ہاتھ روکنے اور اپنا دفاع کرنے کی مجھے قدرت حاصل نہیں تھی۔ اس کی انگلی ٹرائیگر پر لرزی مگر اچانک ہی کایا پلٹ گئی۔ اس کے چہرے پر ثبت درشتی اور تناؤ ایک دم رخصت ہوگیا۔ ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی اور اس نے بڑے انداز سے ریوالور ہٹالیا۔ کسی تیز رفتار فلم کا ولن دکھائی دیا۔ کچھ کہے بغیر میرے پہلو میں آیا اور زنجیروں کے لاک کھولنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ باہر سے مجھے نہ مارنے اور میرے راستے میں حائل نہ ہونے کا فیصلہ کر کے آیا تھا اور محض میری سچائی کھوجنے کیلئے بن رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ میرے بیان کی حقانیت کو پرکھنے کیلئے مائل بہ تشدد دکھائی دیا تھا ورنہ سچ یہ تھا کہ وہ بُرے انجام سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔

چند لمحوں بعد میں آزاد تھا۔ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا، ''زورآور! تمہارا شکریہ! مجھے یقین ہوگیا ہے کہ جو جذبات تمہارے بارے میڈم شکیلہ رکھتی ہیں، وہی تمہارے دل میں بھی موجود ہیں۔ تم نے جذباتی ہونے کے باوجود اچھا فیصلہ کیا ہے۔''

اس نے مسکرا کر کہا، ''نہیں! یہ بات نہیں ہے۔ میں کسی کو نہیں، اپنے فائدے کو مدنظر رکھ کر چلتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ!''

بندشوں کی وجہ سے اعضا شل ہونے لگے تھے۔ خون کی روانی متاثر ہوئی تھی۔ میں نے جسم کو ہلا جلا کر گرم کیا، دورانِ خون بحال کیا اور اس کے پیچھے چلتا ہوا گیلری کے اس گوشے میں آ گیا جہاں تہہ خانے کا دہانہ کھلتا تھا۔ چھت کا وہ ٹکڑا جو لفٹ کی طرح نیچے آیا تھا، اب چھت میں موجود تھا۔ اس کے نیچے اس کی حرکت کا مکمل میکنزم موجود تھا جو دو بڑے اسپرنگ شاکس، ایک بڑی الیکٹرک موٹر اور چند ملے جلے پرزوں پر مشتمل تھا۔ مجھے اس دور افتادہ دریائی علاقے میں نصب کیے گئے اس برقی نظام پر حیرانی ہوئی۔ اس سے پہلے میں میڈم کے خفیہ اڈے 'سی ٹو' میں، یارن خان کی حویلی کے تہہ خانے میں اور سائیں دل جیت کے مزار تلے ایسے عجائب کدے دیکھ چکا تھا۔ میرا انہماک زورآور کی سخت آواز نے توڑا، ''ادھر تمہارا سامان پڑا ہے،

سمیٹ لو۔ اس الماری میں تمہارا اسلحہ دھرا ہے، وہ بھی اُٹھالو۔''

میں نے دیوار کی جڑ میں بکھرے پڑے کاغذات سمیٹ کر جیبوں میں ٹھونسے، باقی ماندہ سامان لباس کی مخصوص جگہوں میں فٹ کیا اور اس کی بتائی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اسے کھولا تو اپنی گن کے ساتھ ساتھ نگینہ کی گن اور پسٹل بھی دکھائی دیا۔ میں نے اسلحہ سنبھال لیا تو اس نے کہا، ''اب تمہیں یہاں سے فوری طور پر نکل جانا چاہیے۔''

مجھے اس کے رویے نے حیران کیا۔ اس کے پاس ایک ریوالور تھا جو اس وقت فائر پوزیشن میں نہیں تھا جبکہ میرے ہاتھ میں جدید ساخت کی مہلک گن پکڑی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو اسے گولیوں سے بھون سکتا تھا۔ اس وقت میری حالت ہرگز دوستانہ نہیں تھی مگر اس کے باوجود وہ بڑا لاپروا، پُراعتماد اور بے خوف انداز میں میرے سامنے تنا کھڑا تھا۔

میں نے کندھے اُچکائے، ''نوروز بھٹی کہاں چھپا ہے؟''

''اس کا دھیان چھوڑو، اپنا فکر کرو اور یہاں سے نکلتے بنو۔ جو کر چکے ہو، وہی بہت ہے۔ اسی کو اپنی فتح قرار دو اور اپنی جان بخشی کا جشن مناتے ہوئے ملتان کی راہ پکڑو۔'' اس کا لہجہ خاصا تضحیک آمیز تھا۔

میں نے کہا، ''جہاں تم نے اتنا تعاون کیا، وہاں یہ دُم بھی نکال ہی دو میرے دوست!''

''نہیں..... وہ، اس کی بیوی اور بیٹیاں اسی تہہ خانے میں ہیں۔ چاہوں تو تمہیں ایک منٹ میں ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ بس! تم یہاں سے فی الفور نکل جاؤ۔'' اس کا لہجہ پُرعزم تھا۔

میں نے پوچھا ''اور تم؟''

''میں..... میں یہیں رہوں گا۔''

''پولیس تمہیں اریسٹ کر لے گی۔'' میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''کس جرم میں؟'' وہ ہنسا پھر ہاتھوں کو عجیب انداز میں لہراتے ہوئے دیوار تک چلا گیا۔ سوئچ بورڈ پر نصب بٹنوں میں سے ایک کو دباتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا، ''ڈر گیا ہوں۔ تم سے اور تمہاری میڈم سے۔ تمہاری میڈم بڑی شہ زور ہے۔ ہے ناں؟ اور مجھے یقین آ گیا کہ وہ کتیا میرے بارے خاصے نرم جذبات رکھتی ہے۔ ہے ناں؟..... ایسا ہی سہی۔ فضول قسم کی ہمدردیاں مت جتاؤ۔ دوست بننے کی کوشش نہ کرو اور میری کمزوری اور خوف کا فائدہ اُٹھا کر یہاں

سے نکل جاؤ۔ پلٹ کر نہ آنا ورنہ زورآور بدلا ہوا یعنی پہلے کی طرح پتھر جیسا سخت ملے گا۔''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کے مخصوص لب و لہجے اور بے خوف اظہار نے میرے اندازوں کو بچگانہ ثابت کر دیا۔

اسی اثنا میں چھت پر نصب آرسی سی لنٹل کا ٹکڑا بڑی آہستگی سے نیچے آنے لگا۔ جب میں اس پر موجود تھا تو یہ بڑی تیزی سے نیچے آیا تھا۔ میرے وزن کی وجہ سے یا پھر اس کے نظام میں رفتار کی کمی بیشی کا آپشن بھی موجود تھا۔

جب وہ فرش سے تین چار فٹ کی بلندی پر آ کر رُک گیا تو زورآور نے مجھے اس پر سوار ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس پر چڑھتے ہوئے پوچھا، ''کیا سمجھوں! تم نے مجھ سے یہ تعاون کیوں کیا؟''

اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ہنسی میں شکست کا اعتراف، اپنے یار رفاقت بھٹی کی موت کا دُکھ اور کچھ بے عنوان جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ فرش کا ٹکڑا اوپر اُٹھنے لگا۔ رفتار خاصی کم تھی۔ جب نصف اُٹھان ہو گئی تو زورآور کی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''اس سوال کا جواب اُدھار رہا۔ ضرور دوں گا..... مگر کوئی مناسب وقت آنے پر..... تم بھی سوچ رکھنا۔ ویسے تم اتنے ذہین نہیں ہو کہ اس راز کی تہہ تک پہنچ سکو۔ ہاں! یہ ضرور سمجھ لینا کہ انسان کوئی بھی کام بلاوجہ نہیں کرتا۔ ہر کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے اپنے نفع اور نقصان کا شمار کرتا ہے..... لیٹ جاؤ احمق انسان..... ورنہ سر بیڈ میں لگے گا..... ہری اَپ!''

میں ایک دم کمر کے بل گر گیا۔ زورآور کی آواز آنی بند ہوئی اور 'کٹاک' کی ہلکی سی آواز کے ساتھ فرش اپنی جگہ پر آ کر رُک گیا۔ میں نے پہلے کی طرح اپنے ہاتھ اور پاؤں بیڈ کے نچلے حصے پر ٹکائے اور پوری قوت سے فرش کو نیچے دھکیلنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ میری غلط فہمی دور ہو گئی کہ تہہ خانے کا دہانہ میری کوشش سے کھلا تھا۔ اسے رفاقت بھٹی یا زورآور نے تہہ خانے کے اندر سے کھولا تھا۔ ضرور یہ راستہ اس کمرے سے بھی کھولا جا سکتا تھا مگر مجھے وہ کلید ہاتھ نہیں لگی تھی۔ اس دوران مجھے فوری طور پر احساس ہو گیا کہ سوائے آسمانی رنگ کے پیراہن میں ملبوس امانت بھٹی کی خون سے لتھڑی ہوئی لاش کے کمرہ خالی تھا۔ چونکہ میں نے ٹارچر روم میں بندھے وقت ایک فائر کی آواز سنی تھی اس لیے میری دانست کے مطابق یہاں ایک اور لاش بھی ہونی چاہیے تھی۔ رفاقت یا نگینہ کی..... مگر نہیں تھی۔ میں یہی سوچتا ہوا خاصے محتاط انداز میں

بیڈ کے نیچے سے نکلا۔ کمرہ واقعتاً خالی تھا۔ اچھل کر کھڑا ہوا اور بجلی کی سی تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

ٹی وی لاؤنج کو بھی کمرے کی طرح خالی پا کر میری دھڑکن بڑھ گئی۔ نہیں معلوم کہ میں نے کیوں یہ طے کر لیا تھا کہ نگینہ نے رفاقت بھٹی کو شوٹ کر دیا ہے وگرنہ یہ خطرہ بھی پوری سنگینی کے ساتھ موجود تھا کہ نگینہ اس کے غیظ و غضب کا شکار ہو گئی ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اب تک نگینہ کو خاص اہمیت نہیں دی تھی اور اسے ماہر فائٹر سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔ اب دل میں ہول اُٹھنے لگا تھا۔ نگینہ کے بغیر واپس پہنچا تو میڈم کے غصے کا سامنا کرتے ہوئے مجھے کئی جھوٹ تراشنا پڑیں گے۔

میں نے بہ عجلت تمام کمرے دیکھے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تو میں پریشانی کے عالم میں صحن کی طرف بڑھا۔ ابھی لاؤنج کے دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر رفاقت کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ میرے سینے میں پلنے والا اندیشہ خوف ناک سانپ کی صورت اختیار کر کے میری آنکھوں میں لہرانے لگا تھا۔ رفاقت کے پھیلے ہوئے بازوؤں پر نگینہ کو مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے دیکھ کر فوری طور پر جو خیال دل میں جاگزیں ہوا وہ یہی تھا کہ اسے گولی لگی تھی اور وہ کسی پل جان کی بازی ہارنے والی تھی۔

ایسے ہی وقت میں رفاقت کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ ٹھٹک کر تھم گیا۔ میری یہاں موجودگی اس کیلئے نہایت حیران کن تھی۔ اس کی ڈبل بیرل بندوق اس کے کاندھے پر لٹک رہی تھی۔ ایسے ہی وقت میں اچانک مجھے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا پسٹل دکھائی دیا اور میں غیر ارادی طور پر دائیں طرف ہٹ گیا۔ اگر مجھے لحظہ بھر کی دیر ہو جاتی تو گولی میرے سینے میں اُتر جاتی۔ فائر کی خوفناک آواز کے ساتھ ہی گولی دروازے کو پھاڑتی ہوئی ٹی وی لاؤنج کے اندر چلی گئی۔ یہ وقت معاملہ فہمی کا نہیں، برق رفتار حرکت کا تھا۔ میں پنجوں کے بل اُچھلا اور چند قدم دور پہنچ گیا۔ دوسری گولی عین اس جگہ دیوار پر لگی جہاں میں ایک پل پہلے میں کھڑا تھا۔

میں نے زمین کو چھوتے ہی زمین پر گرنے میں ایک لمحے سے بھی کم وقت لیا۔ گولی میرے اوپر سے گزر گئی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں ہتھیلیوں کے بل اچھلا اور دروازے کی طرف پہلو کے بل گرا۔ چوتھی گولی فرش پر عین اس جگہ لگی جہاں میں چند لمحے پہلے پڑا ہوا تھا۔ میری سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ پانچویں فائر کا انتظار کرنے کے بجائے میں نے پھر جگہ بدلی۔

'ٹرچ' کی مخصوص آواز نے اعلان کر دیا کہ رفاقت کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں غیر معمولی پھرتی سے اُچھلا اور لگ بھگ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر رفاقت کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میری گن کا رُخ اس کی جانب تھا، ''بس بھٹی! تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اسے نیچے لٹا دو۔''

وہ ابھی تک حیرانی کے طلسم میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کے تجربے میں شاید ایسی انسانی پھرتی کبھی نہیں آئی تھی کہ کوئی شخص پسٹل سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود رہ کر نشانہ خطا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہو۔ اس نے اچانک بازو پیچھے کھینچ لیے۔ ایسا کرنے سے نگینہ دھپ سے زمین پر گری۔ اس کے بدن کو تیز جھٹکا لگا اور حلق سے کم بلند چیخ نکل گئی۔

میں غرایا، ''بھٹی! اپنی گن کی طرف ہاتھ مت بڑھاؤ۔ میری انگلی ٹریگر پر ہے۔''

وہ غیر محسوس انداز میں کندھے سے گن اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری للکار سن کر چابی کے کھلونے کی طرح جہاں کا تہاں رُک گیا۔ اس دوران سنبھل بھی چکا تھا۔ چہرے پر پیدا ہونے والے حیرانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات غائب ہو گئے اور عجیب درشتی اور بے خوفی چہرے پر ہویدا ہونے لگی۔ میرا اور اس کا پہلی مرتبہ ٹکراؤ ہوا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا علم نہیں تھا مگر یہ اندازہ ضرور تھا کہ زور آور ایسے ہی اُس پر جان نچھاور نہیں کرتا تھا۔ وہ اس سے دو گام آگے نہ سہی، شانہ بشانہ چلنے والا شخص ضرور تھا۔ دوستی تبھی نبھ رہی تھی۔

میں چند قدم چل کر اور نزدیک ہو گیا۔ کہا، ''بھٹی! چند قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔''

وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ رک گیا۔ بولا، ''زور آور کہاں ہے؟''

میں نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا، ''اس کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ اپنا فکر کرو۔ بتاؤ، تمہارا باپ کہاں ہے؟''

اس کے چہرے پر مایوسی چھائی۔ ذرا سنبھل کر بولا، ''وہ یہاں نہیں ہے۔ ہاں! فائر..... فائر!''

اس نے میرے کندھے کے اوپر دیکھ کر بڑے بے ساختہ انداز میں کہا۔ میں بے اختیار پہلو کے بل لڑھک گیا مگر توقع کے مطابق فائر کی آواز سنائی نہیں دی۔ جونہی پیروں پر کھڑا ہو کر پلٹا، کسی کو نہ دیکھ کر اپنی حماقت پر کھول کر رہ گیا۔ رفاقت مجھے دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایسے ہی وقت میں میرے عقب میں کھٹکا ہوا۔ میں بجلی کی سرعت سے پلٹا اور میں نے ٹریگر دبانے میں سیکنڈ کا دسواں حصہ صرف کیا۔ میری گن سے نکلنے والے برسٹ کی تین چار گولیاں

رفاقت کے جسم کے بالائی دھڑ میں پیوست ہو گئیں۔ اس نے میری غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے گن کندھے سے اُتار لی تھی اور اگر مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو اس کی گن سے نکلنے والے ایل جی کے کارتوس کے تمام تر چھرے میرے جسم کو چھلنی کر جاتے۔

وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گرا اور چند ہچکیاں لینے کے بعد ساکت ہو گیا۔ اس کا بغیر چیخے یوں بے حرکت ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ گولیوں نے اس کا سینہ چھید دیا تھا۔ ایک یا دو گولیاں اس کے دل کو پھاڑ چکی تھیں۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نگینہ کی خبر لی۔ وہ پہلو کے بل لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر سختی سے باندھے ہوئے تھے اور دہری ہو رہی تھی۔

میں نے جھک کر پکارا، ''نگینہ!''

اس نے سر اُٹھایا مگر فوراً ہی ڈھے گیا۔ کراہی، ''ایم ڈائنگ..... ہی شوٹڈ می.....''

مجھے سمجھ نہ آئی کہ اسے کہاں گولی لگی تھی۔ میں نے پوچھا، ''کہاں گولی لگی؟''

اس نے آنکھیں کھولیں۔ سر اُٹھانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس کی گردن ایک جانب لڑھک گئی۔ میں نے فوری طور پر سینے پر ہاتھ رکھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نبض چل رہی تھی۔ میں نے اُسے سیدھا کیا۔ زیادہ جہت نہیں کرنا پڑی اور پتہ چل گیا کہ اسے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ اس کی شرٹ کا اگلا حصہ خون سے تر تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ پورچ یا کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی۔ یہ غیر متوقع بات تھی۔ اتنی بڑی حویلی اور حویلی کے بدقماش مالکان کے پاس گاڑی کا نہ ہونا بعید از قیاس تھا۔ میں نے نگینہ کو چھوڑا، کھڑا ہوا، ایک زوردار لات رفاقت بھٹی کے آڑے ترچھے پڑے وجود کو رسید کی اور ٹی وی لاؤنج کی طرف بھاگا۔ کمرے میں آ کر تہہ خانے کا دروازہ کھولنے کی از سرِ نو کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ اضطراری انداز میں فرش کو ٹھونکا۔ مبادا زور آور متوجہ ہو جائے مگر کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا تو میں دانت بھینچ کر عمارت سے نکل آیا۔ مہمان خانے کی طرف جا کر گاڑی یا موٹر سائیکل تلاش کرنا فضول تھا کیونکہ میں پہلے اس طرف جا چکا تھا۔ وہاں میری مطلوبہ شے موجود نہیں تھی۔

میں ایک بار پھر عمارت میں گیا۔ پانی کا گلاس بھر لایا۔ چند چھینٹے نگینہ کے چہرے پر مارے۔ وہ آہ بھر کر ہوش میں آ گئی۔ گلاس کا لبوں پر لمس محسوس کر کے چند گھونٹ پی گئی۔ نقاہت بھری آواز میں بولی، ''آ..... آئی ایم ڈائنگ سر!''

مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ رات کا گہرا اندھیرا رخصت ہو رہا تھا اور صبح کا ملجگا اجالا وارد ہو رہا تھا۔ اب تب میں ہی صبح ہونے والی تھی۔ میں اس علاقے سے نا آشنا تھا اور قرب و جوار میں کوئی ایسی جگہ معلوم نہیں تھی جہاں زندگی کی بازی ہارتی ہوئی نگینہ کو لے جاتا اور اس کے پیٹ میں دھنسی ہوئی گولی نکلواتا۔ دیر ہونے کی صورت میں زہر پورے بدن میں پھیل سکتا تھا۔

اسے مرتے دیکھنا بھی سوہانِ روح تھا۔ ایسے ہی وقت میں دوسری اُفتاد آن پڑی۔ میرے کانوں میں پولیس کے مخصوص سائرن گونجنے لگے۔ پولیس رات کا خطرناک پہر گزار کر پھر یہاں پہنچنے والی تھی۔

رات کی خنکی تلخی میں بدل چکی تھی اور میرا ذہن بحرِ بیکراں سے کوئی سوچ کنگھالنے کی جہت میں خطرناک رفتار سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔

پولیس کے سائرن کی آواز قریب آ رہی تھی۔ مجھے کچھ بھی نہ سوجھا تو سرِ دست اس موقع محل سے دور چھپنے کیلئے نگینہ کو کندھے پر لاد کر بھاگتا ہوا حویلی کے عقبی دروازے سے نکلا اور کیکر کے بالن کے بیچ بنا ہوا تنگ سا راستہ عبور کرتا ہوا ناک کی سیدھ میں چلتا گیا۔ دائیں ہاتھ پر واقع آم کے وسیع و عریض باغ کا ایک سرا اسی سیدھ میں ایک ایکڑ کے فاصلے پر اندھیرا کیے موجود تھا اور میں پولیس کے حویلی تک پہنچنے سے پہلے اس میں جا کر چھپ جانا چاہتا تھا۔

میں نرسری سے گزر کر چارے کے کھیت میں داخل ہو گیا۔ اونچی نیچی جگہ پر ہچکولا لگتا تو نگینہ کے حلق سے کراہ خارج ہو جاتی۔ میرے بازو کا زخم بھی تکلیف دے رہا تھا جس کی سرِ دست مجھے کچھ زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ ساری رات بے آرام اور بھوکا رہنے کی وجہ سے مجھ پر خاص نوع کی نقاہت طاری ہو رہی تھی اور نگینہ کا بمشکل پچاس کلوگرام کے لگ بھگ وزنی وجود اس وقت بھاری لگ رہا تھا۔ چونکہ حویلی سے ایک لاش اُٹھائی جا چکی تھی، چار لاشیں ابھی موجود تھیں جو دن کے اجالے میں پولیس کو بغیر کسی مشکل کے نظر آنے والی تھیں، اس لیے پولیس سے کسی رعایت کی توقع عبث تھی۔ ایک تجسس یہ بھی ذہن میں ہلکورے لے رہا تھا کہ دیکھا جائے کہ پولیس اور زور آور کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں مگر یہ دیکھنے کیلئے قریب رہنا یا حویلی کے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔

بھلا ہوا کہ میں پولیس کے حویلی تک پہنچنے سے پہلے باغ میں گھس گیا۔ نگینہ کو ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھایا تو وہ زیادہ کراہنے لگی۔ پیٹ دہرا ہونے سے اس کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو معتدل کیا۔ ہانپتے ہوئے وجود کو

سہلایا۔ چند لمحے اس کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اس کو حسب سابق اُٹھا کر دوسرے کندھے پر ڈالا اور تیز تیز قدموں سے درختوں کے بیچ چلنے لگا۔

میں نے پوچھا، ''نگینہ! کیا تم جانتی ہو کہ اس طرف کون سا گاؤں ہے؟''

''آ.....ہ.....!'' اس نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا مگر کہہ نہ پائی۔ آہ بھر کر خاموش رہ گئی۔

میں نے اس سے مزید پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی رفتار ممکنہ حد تک بڑھا لی۔ ایک اور اندیشہ سانپ کی طرح ذہن میں کلبلانے لگا۔ اس وقت جوان اور زخمی لڑکی کو اُٹھائے، اسلحہ سے لیس، مشکوک حلیے میں کسی کی نظروں میں آنا بہت خراب اور نقصان دہ نتائج کا شاخسانہ بن سکتا تھا۔ مجھے اس حالت میں کوئی بھی دیکھتا تو پکڑ لیتا۔ یا ڈر جاتا تو فوراً پولیس کو اطلاع دینے بھاگ کھڑا ہوتا۔ دیہاتی بعض اوقات وہ ردِعمل بھی ظاہر کر دیتے ہیں جن کی ان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ بھینس کی طرح جس سے ڈرتے ہیں، اسی پر حملہ بھی کر دیتے ہیں۔

راستے کے متوازی بغیر ستائے چلتے ہوئے میں کوئی ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر گیا اور تھک کر رُک گیا۔ میں کئی باغ عبور کر آیا تھا۔ کئی کھیتوں کی شبنم سے گھٹنوں تک پینٹ گیلی ہو گئی تھی۔ صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ کاشت کار بیدار ہو کر کھیتوں کا رُخ کرنے والے تھے۔ ایسے حالات میں میرا کسی کی نظروں میں آئے بغیر سفر جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

ایک یہ احساس بھی بڑا تکلیف دہ تھا کہ میں ناچار ملتان اور شجاع آباد سے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا جا رہا تھا جو نگینہ کی زندگی کیلئے بہتر نہیں تھا۔ میں جہاں رُکا تھا، یہاں دیسی گلاب کے پودے فصل کے مانند اُگے ہوئے تھے۔ شاید گل قند بنانے کیلئے گلاب کاشت کیے گئے تھے۔ ٹہنیاں ننھے ننھے کانٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ ایکڑ بھر کا کھیت تھا جسے عبور کر کے ہی میں دوسری طرف جا سکتا تھا۔ بائیں ہاتھ ایک آدھ ایکڑ کے فاصلے پر راجباہ والا راستہ تھا جبکہ دائیں ہاتھ تاحدِ نگاہ فصلیں اور آموں کے باغات دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی تک کوئی رہائشی عمارت دکھائی نہیں دی تھی۔

میں نے نگینہ کو نیچے لٹایا تو وہ اپنا بدن نہ سنبھالتے ہوئے لڑھک گئی۔ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش بے سود تھی اس لیے میں خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اس کی شرٹ اوپر کھینچی۔ زخم دیکھا۔ دائیں پہلو میں پسلیوں کے نیچے خون میں چھپا ہوا زخم موجود تھا۔ میں نے اپنی پھٹی ہوئی بنیان سے مزید پٹی اور ایک ننھا سا گولا (گاز) بنایا۔ گاز کو زخم پر رکھ کر پٹی کو کس کر باندھ دیا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے

احساس ہوا کہ نگینہ اس قدر خوب صورت جسم کی مالک تھی، جس قدر انسان زیادہ سے زیادہ کسی جاگتے ہوئے حسن کے بارے سوچ سکتا ہے۔ اس کا بدن گلاب کے پھول کی طرح نازک اور جلد ریشم کی طرح ملیح تھی۔ کینیڈا کے ماحول اور موسم نے اس کی جلد کو غیر معمولی حد تک سپید اور سرخ بنا دیا تھا۔ موت کی سی گہری بے ہوشی میں لپٹا ہوا چہرہ بھی محض خوابیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند لمحوں سے زیادہ اسے بغور نہ دیکھ سکا اور اپنی توجہ آئندہ کے لائحہ عمل پر مرکوز کرنے کیلئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر ستانے کے بعد میں نے نگینہ کو ایک مرتبہ پھر اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور راجباہ والے راستے کی طرف چل دیا کیونکہ بے تحاشا کانٹوں کی وجہ سے گلابوں کی اتنی چوڑی پٹی کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ راجباہ والے راستے پر ابھی آمد و رفت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا مگر ہونے والا تھا۔ میں نے تیز تیز قدموں سے اندازے کے مطابق اتنا فاصلہ طے کیا کہ گلابوں کا کھیت عبور ہو گیا تو راستہ چھوڑ کر فصلوں میں چلنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے ایک کاشتکار کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے جانور سے مخاطب ہو کر پیار بھری گالیاں دے رہا تھا۔ اکیلے میں زمیندار اپنے پالتو جانوروں سے بہت سی باتیں کرتے ہیں۔ وہ بھی کر رہا تھا۔

میں نے نگینہ کو فصل میں لٹایا اور جلدی سے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک چوڑے تنے والے درخت کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا۔ راستے پر ایک بیل گاڑی چلی آ رہی تھی۔ اس کا رُخ بستی سمن کی جانب تھا۔ سفید رنگ کے بڑے کوہان والے دیسی نسل کے بیل کو ایک ادھیڑ عمر مرد ہانک رہا تھا اور اس سے محوِ کلام بھی تھا۔ قریب آیا تو میں ارد گرد دیکھ کر درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے مخصوص آواز نکال کر بیل کو روکا اور حیرانی سے مجھے دیکھ کر بولا،

''اوئے جوان! خیر تاں ہوی؟ لہولہان تھیا وَ دیں؟''

(اوئے جوان! تم خون سے تر ہو۔ خیر تو ہے؟)

بیل رُک گیا۔ میں نے قریب پہنچ کر عمومی حلیے والے کاشت کار کو سرائیکی میں مخاطب کیا،

''لالہ! مشکل میں ہوں۔ مجھے بتاؤ، ادھر کوئی قصبہ ہے؟''

میرا اشارہ اُس طرف تھا، جس طرف سے وہ آ رہا تھا۔

اس نے مجھے سرتاپا بغور دیکھا۔ آنکھوں میں تشکیک کے سائے لہرائے۔ بولا، ''پَر خیر تاں ہے؟'' (مگر خیر تو ہے؟)

میں نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، ''خیر ہوتی تو میں اس حال میں تمہیں دکھائی دیتا۔ خیر نہیں ہے۔ میں جلد از جلد کسی قصبے میں پہنچ کر ہسپتال یا تھانے جانا چاہتا ہوں۔''

اس نے بلاوجہ اردگرد دیکھا۔ بولا، ''ادھر کوئی چار میل پر بیٹ سلانوالی کا پتن آتا ہے۔ دریا پار کر کے علی پور شہر جایا جا سکتا ہے۔''

دریا سے علی پور کا فاصلہ میرے علم میں تھا۔ میں نے مایوسی سے کہا، ''نہیں لالہ! کوئی اور راہ دکھاؤ۔ میں علی پور نہیں پہنچ سکتا۔''

''مگر تم دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہو۔ یہ خون کہاں سے نکلا ہے؟''

میں نے بازو کی طرف دیکھا۔ اپنا لباس دیکھا۔ نگینہ کے زخم سے رسنے والے خون نے میرا لباس تر کر دیا تھا۔ میں نے کہا، ''پٹی باندھنے سے پہلے اس زخم سے خون نکلا تھا۔''

اس نے یقین کیا یا نہیں، سر کو تفہیمی انداز میں ہلایا اور کہا، ''وَلا ڈس! تیڈے کیتے میں کیا کر سگدا ہاں؟'' (تو بتاؤ! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟)

''تم مجھے کسی ہسپتال میں پہنچا سکتے ہو۔ اپنی اس گڈ پر۔ جتنا کہو گے، میں اتنا کرایہ دوں گا۔''

گڈ مقامی زبان میں ریڑھی کو کہا جاتا ہے۔

اس نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں..... مجھے نوروز خان کے ڈیرے پر جانا ہے۔ اس نے کل شام کو مجھے علی الصبح ڈیرے پر پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ پہلے ہی خاصی دیر ہو گئی ہے۔ ناراض ہو گا۔''

میرے حلق سے طویل سانس نکلی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ نوروز بھٹی کے ڈیرے کی حالت اب وہ نہیں رہی تھی کہ اس سے باز پرس کی جاتی۔ میں نے کہا، ''لالہ! یہ زندگی کا معاملہ ہے۔ تم اگر نوروز خان کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کر لو تو ایک زندگی بچ جائے گی۔ سچ کہتا ہوں۔ میں اور میری بیوی ادھر آ رہے تھے۔ راستے میں ڈاکو مل گئے۔ انہوں نے ہمیں گولیاں ماریں اور ہماری کار لے کر رفو چکر ہو گئے۔ میری بیوی زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔''

اس کی آنکھیں فرطِ حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ ہکلا کر بولا، ''تت..... تیڈی زز..... زال کتھ اے؟''

(تمہاری بیوی کہاں ہے؟)

میں نے اشارہ کیا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ بولا، ''تم مجھے کرایہ کتنا دو گے؟''

میں نے کہا، ''سو روپیہ!''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے جلدی سے اپنی بتائی ہوئی رقم دگنی کر لی۔ اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ بولا، ''یہاں سے سلانوالی والا ہسپتال چار میل دور ہے۔ میں اگر تمہیں وہاں چھوڑنے جاتا ہوں تو پھر خان کے رقبے پر دیہاڑی نہیں کر سکوں گا۔ دیہاڑی تین سو روپے ہے۔ تم مجھے پانچ سو دو تو میں خان کی ناراضی مول لے سکتا ہوں۔''

میں نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ اچھل کر ریڑھی سے اُترا اور بیل کی لگام پکڑ کر اُسے موڑنے لگا۔ بولا، ''جوان! اپنی ذال کوں اڈاہیں گھن آ..... فصلاں وِچ گڈنہ ویسی.....''

(جوان! اپنی بیوی کو ادھر ہی لے آؤ۔ فصلوں میں ریڑھی نہیں جائے گی۔)

میں نے عافیت کی سانس لی اور بھاگ کر نگینہ کے پاس آیا۔ اسے اُٹھا کر دوڑتا ہوا گڈ کے پاس پہنچا۔ اسے اٹھائے واپس آیا۔ ریڑھی پر سیدھا لٹا دیا۔ بیل کی لگام تھامے کھڑے کوچوان نے اپنی پگڑی اُتار کر میری طرف اُچھال دی، ''ایں کوں کج ڈے جوان! ایندھی بے پردگی تاں نہ تھیوے ناں..... شودھی پچ تاں ویسی ناں؟''

(اسے ڈھانپ دو۔ اس کی بے پردگی تو نہ ہو ناں۔ یہ بے چاری بچ تو جائے گی نا؟)

اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کہا، ''تمہاری مہربانی لالہ! پہلے تو آس نہیں تھی۔ اب دل کو آس لگ گئی ہے کہ ہسپتال پہنچ جائے گی اور بچ بھی جائے گی۔''

میں نے پگڑی کو کھولا اور نگینہ پر پھیلا دیا۔ وہ کافی حد تک چھپ گئی۔ دیہاتی کے اشارے پر میں ریڑھی پر نگینہ سے جڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بیل کو ہشکارا، چند قدم اس کے ساتھ چلا پھر مخصوص انداز میں اچھل کر ریڑھی کی ٹکڑ پر ٹک گیا۔ گاہے گاہے گردن گھما کر مجھے اور سفید رنگ کی میلی پگڑی میں چھپی ہوئی نگینہ کو دیکھ لیتا۔ جب بیل اپنی رفتار پکڑ چکا تو وہ بولا، ''جوان! کہاں رہتے ہو اور ادھر کس کے پاس آئے تھے؟''

میں اس دوران ایک جھوٹی کہانی گھڑ چکا تھا۔ بولا، ''ہم دونوں میاں بیوی سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ سرکار کے حکم پر پرائمری سکولوں کو چیک کرتے ہیں۔ ہمیں شکایت ملی تھی کہ اس علاقے میں ایک سکول ایسا ہے جس کے ہیڈ ٹیچر نے سکول کے اندر اپنی رہائش رکھی ہوئی ہے اور بچوں کو سردی گرمی میں کھلی جگہ پر بٹھاتا ہے۔ اسے رات کو چیک کرنا ضروری تھا اس لیے ہم آدھی رات کے بعد اسے چیک کرنے آئے تھے۔ مگر راستہ بھٹک گئے۔ ادھر آ نکلے۔ چند لوگ

بندوقیں لے کر راستے پر کھڑے تھے۔ انہوں نے ہم سے گاڑی چھین لی۔ میری ذال کے تمام زیور بھی اُتار لیے اور ہم دونوں کو گولیاں مار کر اپنی طرف سے مردہ کر کے پھینک گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنی بیوی کو اُٹھا کر اس طرف چل دیا۔ آگے تم مل گئے۔''

میں نے اسے بڑے پُر اعتماد انداز میں یقین دلا دیا کہ میں نے جو کہا تھا، وہ سچ پر مبنی تھا۔ وہ ان پڑھ معلوم ہوتا تھا۔ ایسے لوگ جلد یقین کر لیتے ہیں۔ اس نے بھی یقین کر لیا۔ تأسف بھرے لہجے میں ان دیکھے ڈاکوؤں کو اس طرح کوستا رہا جیسے وہ اس کے سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہوں۔ راستہ ناہموار تھا۔ ریڑھی کو ہچکولے لگ رہے تھے۔ چند جھٹکوں نے ہی نگینہ کی بے ہوشی کو توڑ دیا۔ وہ کراہنے لگی۔ میں نے چہرے سے تھوڑا سا کپڑا ہٹایا۔ تکلیف کے آثار دیکھ کر پچکارا، ''فکر نہ کرو نگینہ! ہم تھوڑی دیر بعد ہسپتال پہنچ جائیں گے جہاں تمہارا علاج ہوگا اور تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

اس کی آنکھوں میں تکلیف کے ساتھ ساتھ حیرانی ابھری۔ بولی، ''ویئر آئی ایم؟..... یہ درخت پیچھے کیوں جا رہے ہیں؟''

اسے سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ کس چیز پر سوار تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے انگریزی میں سمجھاؤں، ''ہم بیل ریڑھی پر ہیں اور ہسپتال کی طرف جا رہے ہیں۔ تین چار میل کا سفر ہے۔''

میں اَٹک اَٹک کر بول رہا تھا کیونکہ انگریزی بولنا میری مشق میں شامل نہیں تھا۔ وہ میری بات سمجھ گئی۔

میں نے مزید کہا، ''جیسے بھی ممکن ہو، ہم دونوں انگریزی میں بات کریں گے تاکہ ریڑھی بان کو ہماری گفتگو کی سمجھ نہ آئے۔''

اس نے ہولے سے سر ہلایا۔ پھر کراہی۔ ریڑھی بان نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ سمجھا کہ میں بہت پڑھا لکھا ہوں۔ پوچھا، ''سائیں! تیڈی ذال انگریزنی ہے؟''

(سائیں! تمہاری بیوی انگریز ہے؟)

میں نے کہا، ''ہاں! کیا یہ ریڑھی مزید تیز نہیں چلائی جا سکتی؟''

اس نے کہا، ''چلائی تو جا سکتی ہے پر جمپ زیادہ لگیں گے اور تمہاری بیوی کو تکلیف ہوگی۔ ہم پندرہ بیس منٹ تک سرکاری ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ فکر نہ کرو۔''

[illegible] طلوع نہیں ہوا تھا مگر رستے پر اِکا دُکا کاشت کار دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ

اپنے معمول کے کاموں پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ جو ہمیں دیکھ لیتا، وہ حیران ہو جاتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ریڑھی بان سے دریافت کرتا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ 'وَل ڈسیساں' (پھر بتاؤں گا) کہہ کر ٹال دیتا۔ تفصیل بتانے کا وقت نہیں تھا۔ اس کا نام مراد علی تھا۔ دیہاتی روایت کے مطابق 'مرادا' کہلاتا تھا۔ کم گو تھا۔ شاید ہم سے مرعوب بھی تھا کیونکہ اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا اور نہ ہی روایتی چرب زبانی سے کام لیا تھا۔

وہ اپنی توجہ ہم سے ہٹا کر بڑی خوش گلوئی سے خواجہ فرید کی کافی گانے لگا۔ اس کا گلا اچھا تھا۔ منجھا ہوا گلوکار لگ رہا تھا۔ صبح کے پرسکون ماحول میں اس کی آواز بہت دور تک جا رہی ہوگی۔

ایسے ہی وقت میں جب وہ کافی کا ایک مصرعہ بار بار گانے لگا تھا، مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر نگینہ کی گرفت محسوس ہوئی۔ چونکا۔ دیکھا۔ وہ اپنا ایک ہاتھ زخم پر رکھ کر اپنی بڑی بڑی اور چمک دار آنکھوں سے مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ثبت تکلیف کے آثار کچھ کم ہو گئے تھے۔ میں نے انگریزی میں پوچھا، ''کیا بات ہے؟ تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔''

وہ بولی، ''کیا رفاقت اور امانت مر گئے ہیں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا میرا چچا بھی ہلاک ہو گیا ہے؟''

میں نے اسے تسلی دینے کی خاطر جھوٹ بولا، ''ہاں! وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔''

''اور کاغذات؟'' اس کے چہرے پر ایک دم تکلیف کے آثار محو سے ہو گئے اور قلبی خوشی ہویدا ہونے لگی۔

''وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔''

''کیا میں بچ جاؤں گی؟ مجھے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے۔''

''کیوں نہیں۔ زخم اتنا بڑا نہیں ہے۔''

یہ غلط تھا۔ اس کا زخم خطرناک تھا مگر اسے سنگینی کا احساس دلانا مایوس کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت اگر وہ مایوس ہوتی تو اس کی قوتِ مدافعت خاصی کمزور پڑ جاتی۔

''واقعی؟ میں بچ جاؤں گی ناں؟''

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی، ''اگر میں بچ گئی تو پھر میں کینیڈا نہیں جاؤں گی۔ میں آپ کے ساتھ شادی کروں

گی۔'' اس کی آنکھوں میں زندگی کی طلب ہلکورے لینے لگی۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ بات بنائی، ''یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تم میری ٹرانسفیریشن کا شکار ہو۔ نارمل ہونے کے بعد تمہیں اپنی یہ بات بچکانہ محسوس ہوگی۔''

''نو..... ناٹ ایٹ آل..... آئی ایم نارمل۔ ناؤ اینڈ آل کمنگ ٹائم۔'' اس کا لہجہ رومانس سے بھرپور تھا۔

''محبت جذباتی ہوتی ہے۔ تمہاری عمر بھی ایسی ہے مگر شادی کا فیصلہ جذباتی انداز میں نہیں کیا جاتا۔ تمہیں واپس جانا ہے۔''

''کیا آپ نے صرف میڈم کے حکم پر مجھے بچائے رکھا؟''

''یس..... میں میڈم کے حکم کو ٹال نہیں سکتا۔''

''یعنی آپ کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے؟''

''ایسی بھی بات نہیں ہے۔ تم بہت کیوٹ ہو۔'' میں نے اس کی دل آزاری سے پہلوتہی کیا۔

''جس دنیا میں خون کے رشتوں نے میرے بھائی کو قتل کر دیا، مجھے قتل کرنا چاہا صرف اس لیے کہ میری جائیداد حاصل کر لیں، اس دنیا میں آپ کا ہونا عجیب..... ویری سٹرینج..... میں سچ کہتی ہوں۔ میں آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ اپنے درد کو دانتوں تلے روک کر جاذبیت بھری نظروں سے مجھے ٹٹول رہی تھی۔

''ابھی تم اپنے دماغ پر زور مت دو۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتی رہی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی۔ پھر آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔

''تم بیڈ کے نیچے گئے تھے تو میں نے دیکھا تھا کہ فرش کا چوکور ٹکڑا نیچے دھنس گیا تھا۔ میں سمجھی کہ تم گر کر زخمی ہو جاؤ گے۔ زخمی نہیں ہوئے۔ وہاں کیا تھا؟'' وہ دھیمی آواز میں بول رہی تھی اور اَٹک بھی رہی تھی۔

میں نے اسے تہہ خانے کے اندر ہونے والی جنگ کے بارے میں بتایا۔ جھوٹ کی آمیزش کرتے ہوئے نوروز بھٹی کی بھیانک موت کی خوش خبری سنائی۔

وہ خوش ہوگئی۔ پوچھنے لگی، ''آپ نے تہہ خانے میں میری کزنز اور آنٹی کو بھی دیکھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں..... وہ کہیں اور چھپی ہوئی تھیں۔ چونکہ ان سے ہمیں کوئی

مطلب نہیں تھا، اس لیے میں نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

اس نے آنکھیں موندیں۔ بڑبڑائی، ''کاش! میں اپنے ہاتھوں سب کو ہلاک کرتی۔''

میں نے کہا، ''تمہاری آدھی آرزو پوری ہو چکی ہے۔ امانت کو تم نے اپنے ہاتھوں گولی ماری ہے۔''

''ہاں مگر رفاقت اور چچا۔''

''کوئی بات نہیں۔ رفاقت، جو تمہارا اصل مجرم تھا، کو تم نے اپنی آنکھوں مرتے دیکھا ہے۔ دوسرے کی موت کی خبر تم تک پہنچ گئی ہے۔ یہ سب کم تو نہیں ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر.....'' اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایسے میں دو ننھے ننھے آنسو اس کی پلکوں پر لرزے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی نم گرفت سے نکالا۔ آنسو پونچھے، کہا، ''غم نہ کرو۔ تم نے اپنے بھائی کا بھرپور انتقام لے لیا ہے۔ اب اس کیلئے آنسو مت بہاؤ۔''

وہ سسکی۔ بولی، ''آئی لو یو شہریار! آپ نے میرا دُکھ غلط کر دیا۔ آپ میرے محسن ہو۔ میں آپ کو اور میڈم شکیلہ کو کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ آئی لو یو!''

اس نے ہونٹوں کو مخصوص انداز میں جوڑا۔ پھر کھولا اور ایک بوسہ میری جانب اُچھال دیا۔ مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ بھی، اس کی دلبرانہ ادا بھی..... زندگی ایسی ہی ہوتی ہے..... لبھانے والی! ستانے والی!

میرے مزید استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ میرے تہہ خانے میں جانے کے بعد اسی بیڈروم میں موجود رہی تھی۔ پھر جب اس نے فرش کو نیچے جاتے دیکھا تو اس اندیشے کے تحت کہ آنے والا شہریار کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے، وہ پہلے ٹی وی لاؤنج میں آئی پھر لان میں نکل گئی اور مور پنکھوں میں چھپ گئی تھی۔ اس کے پاس میرا پستول تھا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسے تلاش کرتا ہوا رفاقت بھٹی اس کے عقب میں آیا اور اس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ رفاقت نے اسے سنبھلنے سے پیشتر ہی اپنی فولادی بانہوں میں جکڑ کر لان سے باہر گھسیٹ لیا۔ وہ مچلی۔ مضبوط مردانہ گرفت سے نہ نکل سکی تو اس نے اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے اس کا چہرہ چھیل کر رکھ دیا۔

جواباً رفاقت نے اسے چھوڑ کر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ پھر چند ہی لمحوں میں اس کی درگت بنا کر رکھ دی۔ وہ اُچھلی اور موقع پا کر اس سے دور ہونے کیلئے دوڑی۔ رفاقت نے اسے

وار نگ دی پھر گولی ماردی۔ وہ اس پر حملہ کرنے کیلئے پلٹی تھی جس وقت گولی اس کے پیٹ میں دھنس گئی اور وہ اپنی چیخ نہ روک پاتے ہوئے لہرا کر زمین پر آن گری۔

وہ اپنی کہانی سناتے ہوئے روتی رہی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ پیٹ میں ہر لگنے والے جھٹکے پر بیدار ہونے والے درد کی وجہ سے رو رہی تھی وگرنہ اس کا انتقام پورا ہو چکا تھا اور اس کا من پوری طرح شانت ہو چکا تھا۔ انتقام بھی کیا عجب جذبۂ انسانی ہے۔ اس کے تحت انسان کسی کی جان لے کر کتنا خوش ہوتا ہے، یہ وہی جانتا ہے جو دراز عرصہ تک انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنے آپ کو جلائے رکھتا ہے۔ اس آگ سے نکلتے ہی وہ پرسکون ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ بھی پرسکون ہو چکی تھی۔

میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی توجہ پولیس کے سائرن کی طرف مرکوز کی۔ چونک گیا۔ ابھی تک خاموش رہنے والے سائرن پھر کیوں بیدار ہو گئے تھے۔ کان لگائے۔ محسوس ہوا جیسے سائرن کی آواز دم بہ دم قریب ہوتی جا رہی تھی۔ یہ خطرناک بات تھی۔

میری بے چینی کو نگینہ نے بھانپ لیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں سے مستفسر ہوئی۔ میں نے کہا، ''میں سائرن کی آواز سے پریشان ہوں۔''

''کیا پولیس قریب آ رہی ہے؟'' اس نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

ریڑھی بان مراد ے کے کانوں میں سائرن کی آواز اور نگینہ کے منہ سے نکلنے والا لفظ 'پولیس' پڑا تو وہ پلٹ کر بولا، ''چلو اچھا ہوا کہ پولیس ادھر آ رہی ہے۔ کسی ذریعے سے پولیس والوں کو تمہارے ساتھ ہونے والی واردات کا علم ہو گیا ہوگا۔''

میں نے اس کی بات نظر انداز کی۔ پوچھا، ''ہسپتال کتنی دور ہے؟''

اس نے بتایا، ''ایک ڈیڑھ میل تو ہوگا ہی۔ اگر پیدل چلیں تو اسی سیدھ میں فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع ہے۔ نہر کے پل کی وجہ سے یہ راستہ اوپر سے گھوم کر آتا ہے۔''

میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ جلدی سے جیب میں سے ہاتھ ڈالا۔ چند نوٹ نکالے۔ بغیر گنے ریڑھی پر رکھے اور اچھل کر ریڑھی سے اُتر آیا۔ پگڑی میں لپٹی ہوئی نگینہ کو بہ عجلت اُٹھایا اور متحیر کھڑے ریڑھی بان سے مخاطب ہو کر کہا، ''لالہ! پولیس کو ہمارے بارے میں بالکل نہیں بتانا۔ او کے؟''

اس نے ہونقوں کی طرح مجھے دیکھا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے ریڑھی پر نگینہ کا خون دکھائی

دیا۔ میں نے ریڑھی بان سے کہا، ''نہیں..... بلکہ تم پولیس کو بتانا کہ ہم نے تم سے ریڑھی چھینی تھی مگر نوروز خان کی حویلی کے قریب ریڑھی چھوڑ کر بستی سمن کی طرف چلے گئے تھے۔ یہ نوٹ چھپالو ورنہ پولیس چھین لے گی۔''

اس کے منہ سے مارے حیرت اور خوف کے کچھ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے ریڑھی پر بیٹھ کر آگے جانے کا حکم دیا اور دوڑتا ہوا راستے کے کنارے اُگے ہوئے خودرو سرکنڈوں میں گھس گیا۔ یہ سرکنڈے ایک دیوار کی صورت میں راستے کے ساتھ ساتھ دور تک جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ تین چار فٹ کی اس دیوار کے پار فصلوں کا تاحدِ نگاہ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ قریب ہی پرانے آم کا گھنا پیڑ دیکھ کر میں اس کی طرف بھاگا۔ سائرنوں کی آواز قریب سے قریب ہوتی جا رہی تھی اور میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

پیڑ کے نیچے پہنچتے ہی میں سرعت سے پیڑ پر چڑھنے لگا۔ نگینہ کے جھولتے ہوئے وجود کو سنبھال کر درخت پر چڑھنا بہت دشوار کام تھا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ میرے بازو کا زخم میری گرفت مضبوط نہیں رہنے دیتا تھا۔ زندگی میں بارہا سنا تھا کہ چیتا اپنے شکار کو اُٹھا کر درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ آج سمجھ میں آ گیا کہ کسی کو اُٹھا کر درخت پر چڑھنا کتنا دشوار اور سکت طلب کام ہے۔ میرے بازو میں درد کی تیز ٹیس بار بار اُٹھ رہی تھی۔ جیسے تیسے کر کے پیڑ کی ایک گھنی شاخ تک پہنچ گیا۔ نگینہ کو قدرے افقی شاخ پر لٹایا۔ سہارا دے کر بیٹھ گیا۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں سے سوال کیا۔ میں نے دبی آواز میں کہا، ''پولیس آ رہی ہے۔ اس لیے کوشش کرو کہ تمہارے منہ سے کوئی آواز برآمد نہ ہو۔''

اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔ میں نے ہاتھ اُٹھا لیا۔ ایسے ہی عالم میں پولیس میرے اندازے کے مطابق ریڑھی بان تک پہنچ گئی۔ انجن کی گھرگھراہٹ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پولیس والے ایک ہی گاڑی میں سوار ہو کر ادھر آئے تھے۔ سرکنڈوں کی وجہ سے راستے پر ہونے والی نقل و حرکت دیکھی نہیں جا سکتی تھی مگر آوازیں سنائی دے رہی تھیں جن کو سمجھنا ممکن نہیں تھا۔

میرا حلق بار بار خشک ہو رہا تھا۔ اپنے ہونٹوں کو زبان سے گیلا کر رہا تھا۔ مجھے ریڑھی بان نے ہاتھ کے اشارے سے ہسپتال کی لوکیشن سمجھائی تھی۔ اگر میں یہیں سے راجباہ پار کر کے ناک کی سیدھ میں فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کر لیتا تو ہسپتال تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک خوف یہ بھی دامن گیر تھا

راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں ہسپتال پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ وہاں فرسٹ ایڈ مل سکتی تھی اور فرسٹ ایڈ کے دوران میں کسی سے موبائل فون لے کر میڈم سے رابطہ کر سکتا تھا۔ اسے اپنی موجودہ کیفیت اور پریشانی سے آگاہ کر کے مدد طلب کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔

میں نگینہ کو اُٹھائے ہوئے کنارے پر بیٹھا۔ ٹانگیں ٹھنڈے پانی میں ڈالیں۔ سردی کی لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ جونہی اچھل کر کھڑا ہوا، میرے پاؤں بھل سے اَنی ہوئی زمین پر لگے۔ پانی نے میری رانیں اور نگینہ کی پنڈلیاں گھٹنوں تک بھگو دیں۔ نگینہ کے نیم بے ہوش جسم کو جھٹکا سا لگا پھر شانت ہو گئی۔ راجباہ کی بھل بہت چکنی تھی، پاؤں پھسلنے کا شدید خطرہ تھا، اس لیے سنبھل کر چلتا ہوا راجباہ عبور کر گیا۔

راجباہ کے پار فصلوں اور باغوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اس سبز وادی کے بیچ ہسپتال کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ ایک مشکل یہ آن پڑی کہ فصلوں میں کئی کاشتکار اپنے معمول کے کاموں میں مگن دکھائی دے رہے تھے جن کی نظروں میں آئے بغیر میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے یہ خطرہ مول لینا تھا اس لیے ہر انجام کو بالائے طاق رکھ کر شبنم زدہ فصل میں اُتر گیا۔

میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ میں فصلوں میں کام کرنے والے کسی بھی شخص کے اتنا قریب سے نہ گزروں کہ وہ میری طرف متوجہ ہو جائے یا اسے ہمارے جسموں پر چپکا ہوا خون دکھائی دے۔ کوئی فصل کو پانی لگا تھا، کوئی گوڈی کر رہا تھا تو کوئی چارہ کاٹ رہا تھا۔ ایسے میں غیر معمولی فاصلے کے باوجود وہ آپس میں براہِ راست رابطہ کیے ہوئے تھے۔ اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں پگڈنڈیوں پر سنبھل کر چلتا ہوا ہسپتال کے قریب پہنچ گیا۔ پتہ چلا کہ یہ ہسپتال کا عقبی رُخ تھا۔ مجھے اس کے گیٹ تک پہنچنے کیلئے ابھی چار دیواری کا چکر کاٹنا تھا۔ یعنی اور فاصلہ طے کرنا تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ چل پڑا۔ گھوم کر سامنے آیا۔ ایک پختہ سڑک ہسپتال کے چھوٹے سے گیٹ تک آتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ آٹھ فٹ چوڑی شکستہ حال سڑک یہیں اختتام پذیر ہو جاتی تھی۔ اس سڑک پر صرف وہی شخص سفر کرتا تھا جس نے ہسپتال آنا ہوتا تھا۔

ہسپتال کا بڑا آہنی گیٹ کھلا ہوا تھا جسے عبور کر کے میں احاطے میں داخل ہوا۔ ایک دبلا پتلا

کہ اگر مرادے نے پولیس والوں کو بتا دیا کہ میں زخمی عورت کو اُٹھا کر ہسپتال جا رہا تھا تو وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر پکٹ لگا لیتے اور جونہی مجھے دیکھتے، اریسٹ کر لیتے۔ میں نے اپنی قوتِ سماعت کو بہتیرا امتحان میں ڈالا مگر گفتگو واضح طور پر سنائی نہ دی۔ پانچ منٹ کے انٹرویو کے بعد پولیس والوں نے گاڑی آگے کی سمت بڑھا دی۔ میرا خدشہ مزید توانا ہو گیا کہ مرادے نے انہیں بتا دیا تھا کہ میرا رُخ ہسپتال کی طرف تھا۔ تبھی وہ واپس جانے کے بجائے آگے چل دیے تھے۔

میں ابھی اسی پریشانی میں مبتلا تھا کہ پولیس کی گاڑی کے انجن کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ گاڑی بستی سمن کی طرف چلی گئی۔ چند لمحوں بعد مطلع صاف ہو گیا۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ گاڑی کو یو ٹرن کرنے کیلئے انہیں کھلی جگہ درکار تھی، اس لیے وہ آگے گئے تھے۔ اب لوٹ کر حویلی کی طرف چلے گئے تھے۔ میں نے نگینہ کو سنبھالا اور بہت سست رفتار سے پیڑ سے اُترنا شروع کر دیا۔ پاؤں زمین پر لگے تو ایک بار یوں محسوس ہوا جیسے میرا بدن مسلسل جنگ کی وجہ سے حوصلہ ہار چکا تھا اور تھکن کا شکار ہو چکا تھا۔ اب تب میں ہی کہیں دغا دینے والا تھا۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی یکجا کی اور جبڑا بھینچ کر راستے کی طرف بڑھ گیا۔

سورج کی پہلی کرنوں نے زمین کا رُخ کر لیا تھا۔ اندھیرا مکمل طور پر چھٹ گیا تھا۔ میں جونہی سرکنڈوں سے نکل کر راستے پر آیا، ریڑھی بان کچھ فاصلے پر حویلی کی جانب جاتا دکھائی دیا۔

میں نے اُسے آواز دی، ''مرادے! لالہ!''

اس نے آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا۔ ہاتھ لہرایا اور ہسپتال کی طرف اشارہ کیا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا اور رُخ پھیر لیا۔ صاف معلوم ہو گیا کہ وہ مزید کوئی تعاون کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے اسے مزید پکارنا موزوں تصور نہیں کیا اور راجباہ کی پٹڑی پر چڑھ گیا۔ راجباہ کی چوڑائی بمشکل پانچ فٹ تھی اور وہ پانی سے لبریز تھا۔ رات کا بہتا ہوا پانی صبح دم بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی گہرائی زیادہ بھی ہوئی تو بدقت چار فٹ ہو گی۔ اسے عبور کرنا تکلیف دہ مگر نہایت ضروری تھا کیونکہ مجھے فصلوں کے پار سرخ اینٹوں والی مخصوص طرز کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دیہاتی ہسپتال یعنی بنیادی مرکز صحت تھا۔ وہاں ڈاکٹر یا ڈسپنسر یا مس عالیہ کی طرح کوئی ایل ایچ وی میسر آ سکتی تھی جو نگینہ کو ابتدائی طبی امداد دے سکتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نوع کے چھوٹے ہسپتالوں میں پیٹ کے آپریشن کی سہولت میسر نہیں ہوتی۔ اگر ہسپتال کا ڈاکٹر بہت قابل سرجن بھی ہو تو بھی آپریشن تھیٹر کی صورتِ حال بڑے آپریشن کی

منحنی وجود شخص سولنگ پر جھاڑو دے رہا تھا۔ اس کا ایک بھائی بند ہسپتال کے برآمدے میں پڑے بنچوں پر کپڑا مار رہا تھا۔ ان دو افراد کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے دیکھتے ہی منحنی وجود والے کے ہاتھ رُک گئے۔ جھاڑو گھسیٹتا ہوا میری طرف بڑھا۔ مستفسر ہوا، ''کیا ہوا اسے؟''

میں نے کہا، ''چھت سے گر گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں؟''

اس نے ہسپتال کی کالونی کی طرف دیکھا۔ بولا، ''نہیں بادشاہو! اتنی جلدی ڈاکٹر صاحب نے یہاں آ کر کرنا بھی کیا ہے۔ تم ادھر ہسپتال میں لے جاؤ اپنی بیوی کو اور دائیں ہاتھ والے کمرے میں بیڈ پر ڈال دو۔''

میں نے پوچھا، ''کوئی اور ہے؟''

اس نے مجھے سرتاپا گھورا۔ پوچھا، ''تم اس علاقے کے تو نہیں لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے کالونی کی طرف دیکھا۔ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کیا، ''کالونی میں کوئی رہتا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا، ''ہاں جی! یہ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی ہے۔ وہ کوٹھی پر ہوتے ہیں..... اپنی فیملی کے ساتھ۔ پَر وہ ادھر کسی مریض کو نہیں دیکھتے۔''

میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور کوٹھی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ لپک کر میرے سامنے آ گیا۔ بولا، ''میں نے کہا جو ہے کہ وہ کوٹھی پر کسی کو نہیں دیکھتے۔''

میں نے جھوٹ سے کام لیا، ''پَرے ہٹو۔ ڈاکٹر صاحب میرے دوست ہیں۔''

اس نے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا اور ناچار راستہ چھوڑ دیا اور ساتھ چلنے لگا۔ بتانے لگا کہ ڈاکٹر صاحب مزاج کے بہت سخت ہیں۔ وہ اس وقت سوئے ہوتے ہیں۔ انہیں جگایا جائے تو سخت ناراض ہوتے ہیں۔ وہ چوکیدار یا نائب قاصد تھا، خاکروب بھی ہو سکتا تھا، اسے اپنی نوکری کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں ڈاکٹر کا غیظ و غضب اس کا مقدر نہ بن جائے تبھی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایسے ہی وقت میں جبکہ منزل دو چار گام ہی رہ گئی تھی، کہیں قریب سے پولیس کے سائرن بجنے کی آواز سنائی دی۔ کم بخت کسی اور طرف سے گھوم کر ہسپتال کی طرف آ رہے تھے۔ میرا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کی اور چند لمحوں میں ہی ڈاکٹر کی کوٹھی کے بیرونی برآمدے میں پہنچ گیا۔ بڑے سے چوبی دروازے کو بے دردی سے دھڑ دھڑا دیا۔ لاشعوری طور

پر میں پولیس سے پہلے نگینہ کو ڈاکٹر کی کوٹھی میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں یہاں غیر محفوظ تھا۔ ابھی سائرن کی آواز دور ہی تھی کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

دروازہ سرخ اور گلابی لباس میں ملبوس لڑکی نے کھولا تھا۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی، میرا دل دھک سے رہ گیا اور کانوں میں گونجنے والی پولیس کے ہوٹر کی خوفناک آواز کہیں دب کر رہ گئی۔ یوں لگا جیسے میرے قدموں نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہو اور میری زبان حلق سے چپک گئی ہو۔

''تو!''

میرے لبوں سے نکلنے والا یہ ایک لفظ میرے چہار سو گونجنے لگا اور میرے کندھے پر اٹکی ہوئی نگینہ سرک کر میرے پیروں تلے فرش پر گر گئی۔ مجھے اس کے گرنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر میں کسی چلتی ہوئی اسٹین گن کے دہانے کے سامنے آن کھڑا ہوتا تو بھی میری یہ قلبی و ذہنی کیفیت نہیں ہو سکتی تھی جو دروازہ کھولنے والی لڑکی کو دیکھ کر ہوئی تھی۔

دل کی طرح زندگی کے موسم بھی غیر یقینی ہوتے ہیں۔ دھوپ میں بارش برستی ہے اور برفیلی ہوائیں بدن کے مسام مسام میں سے پسینہ نکال سکتی ہیں۔ اس کا علم مجھے زندگی کی اُس گھڑی میں ہوا تھا۔

میری گزشتہ زندگی کی سب سے بڑی طلب میری نگاہوں کے سامنے تھی اور میں بہت زیادہ خوش ہو کر رقص کرنے کے بجائے خالی الذہنی کی سنگین کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ نگینہ سرد فرش پر، میرے پیروں میں، چت پڑی تھی۔ پہلے بے ہوش تھی، اب کراہنے لگی تھی، گویا ہوش میں آنے لگی تھی مگر مجھے اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔ میرے سامنے کھلے دروازے کو تھامے پروین ساکت کھڑی تھی..... میری پینو..... جسے نور پور سے اغوا کر کے میری نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا تھا اور قسمت نے مجھے عام سے دیہاتی بود و باش سے نکال کر دنیا کے رحم و کرم پر ڈال دیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے دل کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی خوشی کے اس عظیم اور جاں گسل لمحے سے میری طرح ہی خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈوب کر گزر رہی تھی۔ میرے لبوں سے اجنبی سی آواز برآمد ہوئی، ''پینو! تو؟''

اس کے ہونٹ لرزے۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ ایک جھٹکے سے بڑھی اور میرے اور اپنے درمیان فرش پر پڑی ہوئی نگینہ کے اوپر سے ہوتی ہوئی میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ دیوانہ وار

مجھے بانہوں میں کس رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اس کا بدن جھٹکے لے رہا تھا۔ وہ ایک ہی جملہ بار بار کہہ رہی تھی، ''اللہ تیڈا بہوں بہوں شکر اے..... میں اپنے ویر کوں جیندا جاگدا ڈیدھی پئی آں!'' (اے اللہ! تیرا بہت بہت شکر ہے کہ میں اپنے بھائی کو زندہ وسلامت دیکھ رہی ہوں۔)

میں نے اسے بدقت خود سے علیحدہ کیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ایسے ہی وقت میں نگینہ ذرا زور سے کراہی۔ پروین نے چونک کر اُسے دیکھا۔ بولی، ''یہ کون ہے بھائی؟ اسے کیا ہوا ہے؟''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نگینہ کی حالت اس جھٹکے کی متحمل نہیں تھی جو اسے فرش پر گرنے کے سبب لگا تھا۔ میں نے جھک کر نگینہ کو اُٹھانے کی کوشش کی۔ ناکام رہا۔ اس کا وجود بھاری ہو گیا تھا یا میری توانائیاں کمزور پڑ گئی تھیں۔ پروین نے میری مدد کی۔ میں نے پوچھا، ''تم ٹھیک ہو نا؟''

اس نے کہا، ''ہاں بھائی! میں ٹھیک ہوں۔ تم اسے اندر لے آؤ۔''

اس کی آواز جذبات کی شدت سے بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے نگینہ کو سنبھالا۔ ایسے ہی وقت میں پولیس کے ہوٹرز کی آواز قریب آ گئی۔ میں جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ پروین نے میرے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا، ''بھائی! خیر تو ہے؟ تم اس حال میں کیوں ہو؟''

اس کا اشارہ ایک ہی وقت میں میرے خون سے تر لباس اور نگینہ کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف تھا۔ میں نے اسے جواب دینے کے بجائے پوچھا، ''کیا یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟''

میری کم بختی یہ تھی کہ پروین، جس کو پانے کی آرزو ہر وقت دل کو بے چین رکھتی تھی، اس موقع پر ملی تھی کہ اس سے گزشتہ مرحلوں، جن سے وہ گزر کر اس دور افتادہ ہسپتال کے کوارٹر میں پہنچی تھی، کی تفصیل بھی پوچھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ مجھے نہ صرف نگینہ کو فوری طبی امداد دینی تھی بلکہ اپنے پیچھے لگی ہوئی پولیس سے بھی چھپنا تھا۔

پروین میرے پہلو سے نکل کر میرے آگے آئی۔ ہاتھ سے کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف اشارہ کر کے بولی، ''اسے ادھر لے آؤ۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں موجود ہیں۔''

ہوٹر کی تیز آواز نہایت قریب پہنچ کر رُک گئی۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس کی موبائل وین ہسپتال کے گیٹ پر آن پہنچی تھی۔ میں نے یک بارگی قدم بڑھائے۔ جس دروازے کی طرف پروین نے اشارہ کیا تھا، وہ بند تھا۔ میں نے پاؤں کے دباؤ سے دھکیلا تو

کھل گیا۔ کمرے کے اندر روشنی کم تھی مگر ایسی بھی کم نہیں تھی کہ اپنے عین سامنے کھڑے ڈاکٹر شاہ جی کو پہچان نہ پاتا۔ چونکہ نگینہ کی پریشانی کی بدولت میں نے پروین کے سیاق وسباق اور اس غیر متوقع محل وقوع کے بارے میں کچھ سوچا تھا اور نہ ہی کچھ دریافت کیا تھا، اس لیے ڈاکٹر منور علی شاہ کو کریدتی نظروں کے ساتھ اپنے سامنے پا کر حیرانی کا دوسرا جھٹکا لگا۔ میرے پاؤں تھم گئے۔

''ششش..... شاہ جی آپ؟''

چونکہ پروین نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان ہلکی آواز میں تھوڑی سی گفتگو بھی ہوئی تھی، اس لیے شاہ جی کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف جانے لگا تھا۔ تبھی میرے دروازہ کھولتے ہی سامنے دکھائی دیا۔ بولا، ''شہریار تم! بھئی یہ تو بڑی حیرانی اور خوشی کی بات ہے۔''

میں اس دوران حیرت کے ابتدائی جھٹکوں سے سنبھل گیا تھا، بولا، ''ڈاکٹر شاہ جی! یہ..... یہ نگینہ ہے۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔ حالت خراب ہے۔ پلیز! اس کا کچھ کیجیے۔''

ڈاکٹر شاہ جی کے تھمے ہوئے جسم نے کوئی حرکت نہ کی بلکہ اس کی کریدتی ہوئی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں، ''تمہارے پیچھے پولیس بھی آئی ہے؟''

میں نے جلدی سے سر ہلایا، ''جی سر!''

''کوئی واردات کر کے آئے ہو؟'' اس کا لہجہ سخت تھا۔

''میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتا دوں گا ڈاکٹر شاہ جی! پہلے اس کو طبی امداد دیں ورنہ یہ مر جائے گی۔ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر شاہ جی کے سخت رویے کے سبب میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔

ایسے ہی وقت میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ میں قدرے بلند آواز سنائی دی، ''ڈاکٹر صاب! باہر پولیس آئی ہے۔ گیٹ پر۔ کیا گیٹ کھول دوں؟''

ڈاکٹر شاہ جی کے چہرے کے گھمبیر تاثرات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا، پھر اپنے بائیں ہاتھ سے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا، ''تم اِسے ادھر لٹا دو اور..... پروین! اپنے بھائی کو اندر لے جاؤ۔ دوسرے کمرے میں۔''

میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر شاہ جی نے دل ہی دل میں میری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے

کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر نگینہ کو چارپائی پر لٹا دیا۔ اس دوران ڈاکٹر شاہ جی کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جونہی میں نے نگینہ کو لٹایا، اس نے آنکھیں کھول دیں، کراہتی ہوئی آواز میں بولی، ''سر! مم..... میں مر رہی ہوں..... درد..... ہائے!''

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہستگی سے کہا، ''تم فکر نہ کرو۔ اب تم ڈاکٹر کے پاس پہنچ چکی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بچا لے گا۔''

ایسے ہی وقت میرے کندھے پر پروین نے ہاتھ رکھا۔ ہولے سے کہا، ''بھائی! تم ادھر سے ہٹ جاؤ۔ آؤ! میرے ساتھ..... دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔''

میں نے سراسیمگی آلود نظروں سے دیکھتی ہوئی نگینہ پر ایک نگاہ ڈالی، آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور پروین کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کمرے سے نکل کر گیلری میں آ گیا۔ پروین گیلری کے آخری کمرے کی طرف چل دی۔ ڈاکٹر شاہ جی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا تھا۔ میں گیلری میں رُک گیا۔ سوچا کہ مجھے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھنا چاہیے۔ کہیں ڈاکٹر شاہ جی کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ اس خیال کے تحت میں پلٹ کر کوٹھی کے بیرونی دروازے میں آیا۔ تھوڑا سا کھول کر درز بنائی اور جھانکا۔ گیٹ اور ہسپتال کی مرکزی عمارت کے عین درمیان میں اینٹوں کے سولنگ پر پولیس کی موبائل وین کھڑی تھی۔ ایک وردی پوش اہلکار ڈاکٹر شاہ جی کے سامنے کھڑا تھا جبکہ دو تین سپاہی وین سے نکل کر اِرد گرد جھانکنے تاکنے میں مشغول تھے۔

ڈاکٹر شاہ جی کی سخت آواز میرے کانوں پڑی، ''میں نے تم سے کہہ دیا کہ یہاں کوئی نہیں آیا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کوئی نہیں آیا۔ کوئی آئے گا تو میں تھانے میں اطلاع کر دوں گا۔ ایک بار کہنا بھی وہی ہے، دس بار کہنا بھی وہی..... جاؤ! اپنا کام کرو۔ اپنے مطلوبہ افراد کو ہسپتال کے باہر تلاش کرو۔''

وردی پوش کا چہرہ میری جانب تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا خوفناک چہرہ..... وہ قدرے مؤدبانہ لہجے میں بولا، ''سر جی! ہسپتال کے باہر چند لوگوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک شخص ایک زخمی عورت کو اُٹھائے ہسپتال میں داخل ہوا ہے۔ ہمیں ان کی تلاش ہے۔ وہ قتل اور ڈکیتی کی واردات کر کے بھاگے ہیں۔ آپ ہمیں ہسپتال کی تلاشی لینے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟''

ڈاکٹر کا ہاتھ فضا میں لہرایا، بلند آواز سنائی دی، ''اوئے کرم علی! کیا ہسپتال میں کوئی آیا ہے؟ کوئی مریض یا زخمی؟''

کرم علی ہسپتال کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ فی الفور جواب دہ ہوا، ''نہیں سر جی! میں نے تو ادھر کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ چند مریض آئے بیٹھے ہیں۔ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان میں تو مجھے کوئی بھی عورت زخمی دکھائی نہیں دیتی۔''

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ اپنے مخاطب سے کہا، ''جوان! یہاں تمہارا مطلوبہ کوئی شخص چھپا ہوا نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس نے زخمی عورت کو اُٹھا رکھا تھا۔ ظاہر ہے، جلد یا بدیر، وہ یہاں آئے گا۔ ایسی صورت میں اسے ٹریٹمنٹ دینے سے پہلے میں تھانے اطلاع کر دوں گا۔ اپنا نمبر کرم علی کو نوٹ کروا دو۔ شاباش! اب جاؤ اور اپنا کام کرو۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔''

پولیس والا جو شانوں پر لگے پھولوں کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا، تلاشی لینے پر مصر تھا مگر ڈاکٹر شاہ جی کے سامنے اس کی دال نہیں گل رہی تھی۔ اس کے مقابل اگر کوئی عام شہری ہوتا تو وہ دھونس جما کر ہسپتال میں گھس آتا مگر وہ ڈاکٹر شاہ جی کے اختیارات اور اس کے سکیل کی طاقت سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر کے ایما کے بغیر وہ ہسپتال کی تلاشی نہیں لے سکتا تھا۔ کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد مایوس ہو کر رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کرم علی کو اس کا فون نمبر نوٹ کرنے اور ہسپتال کا مین گیٹ بند کرنے کا حکم دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوٹھی میں آ گیا۔ مجھے گیلری میں کھڑا دیکھ کر غیر محسوس سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تیر گئی۔ بولا، ''میں نے کہا تھا کہ پچھلے کمرے میں جاؤ مگر تم یہاں کھڑے ہو۔ اگر وہ سب انسپکٹر ادھر آ جاتا تو.....''

میں جھجک کر خاموش رہ گیا۔ وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''یہاں تمہارے لیے ایک حیرت کدہ سجا ہوا ہے۔ ہر قدم پر تمہیں حیرانی ملے گی۔ سرِ دست تم اپنی زخمی ساتھی کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کون ہے؟ تم اسے اس علاقے میں کیوں اس طرح اُٹھائے پھرتے ہو؟''

میں نے کہا، ''شاہ جی! لمبی کہانی ہے۔ ذرا سانس لے لوں۔ تفصیل سے سب ماجرا کہہ سناؤں گا۔''

اس دوران ڈاکٹر منور علی شاہ لوہے کے پائپ والی چارپائی پر جھک چکا تھا جس پر نگینہ چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پیشہ وارانہ انداز میں نبض چیک کی، دل کی دھڑکن محسوس کی اور زخم کا جائزہ لینے لگا۔ میں دھڑکتے دل سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحوں

میں وہ سیدھا ہوا اور فیصلہ کن انداز میں بولا، ''شہریار! جب تک گولی نہ نکالی جائے، تب تک اس کی حالت بہتری کی طرف نہیں آسکتی۔ خون بھی زیادہ مقدار میں بہہ چکا ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''تو ڈاکٹر صاحب! آپ گولی نکال دیں۔ خون کی ضرورت ہے تو میں دینے کو تیار ہوں۔''

ڈاکٹر شاہ جی کی آنکھوں میں استہزائیہ تاثر پیدا ہوا۔ بولا، ''کیا بات ہے تمہاری! بھلے آدمی..... گولی اور کانٹے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس کا آپریشن ہوگا۔ جس ہسپتال میں ہم کھڑے ہیں، یہ بنیادی مرکز صحت ہے۔ یہاں ایسے بڑے آپریشنوں کا بندوبست نہیں ہوتا۔ اسے فی الفور شجاع آباد کے تحصیل ہیڈ کوارٹر لے جانا پڑے گا یا ملتان..... میں سوائے پٹی باندھنے کے یا زخم کی صفائی کرنے کے کچھ نہیں کرسکتا۔ رہی بات خون کی..... یہاں خون کے ٹیسٹ کیلئے کوئی لیبارٹری نہیں ہے۔ نہ اس کا خون چیک ہوسکتا ہے، نہ تمہارا اور نہ بلڈ کراس میچنگ ہی کی جاسکتی ہے۔''

میں نے سر تھام لیا۔ اس نے میرا بازو پکڑا۔ کمرے سے نکال لایا۔ گیلری میں پروین کھڑی مضطربانہ انداز میں اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے میرا ہاتھ تھوڑا اور دباتے ہوئے کہا، ''شہریار! شی از نیئر ٹو ڈائی..... کسی بھی لمحے فنش..... اس سے جان چھڑاؤ ورنہ اپنے ساتھ ہم سب کو مصیبت میں ڈال دو گے۔''

ڈاکٹر منور علی شاہ کا لہجہ بڑا سرد تھا۔ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے بے وجہ ادھر اُدھر دیکھا۔ پروین کے خوفزدہ چہرے پر نگاہ دوڑائی۔ کہا، ''مگر میں اُسے کہیں پھینک نہیں سکتا ڈاکٹر صاحب! وہ..... وہ.....''

میری سوئی ناگاہ اٹک گئی۔ ابھی میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میں میڈم شکیلہ اور اپنے شب و روز کے معمولات کے بارے شاہ جی کو کچھ بتاؤں گا یا نہیں۔ میں نے چند لمحے سوچا پھر شاہ جی سے کہا، ''کیا میں اسے ملتان لے جاسکتا ہوں؟''

''ہاں! بشرطیکہ تمہارے پاس گاڑی ہو۔'' ڈاکٹر منور علی شاہ نے عجلت میں کہا، ''یار! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ کسی بھی لمحے مرنے والی ہے۔ اس کے مرتے ہی قیامت بپا ہو جائے گی۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

میں نے تھوک نگلا۔ خود کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ کہا، ''شاہ جی! آپ اسے فرسٹ ایڈ

دیں۔ اگر اسے مرنا ہی ہے تو خیر سلا..... میں آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ پلیز! کوشش تو کریں..... اور کیا یہاں فون ہے؟''

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ میرے حلق سے طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ ابھی تک اپنے معمولات پر قائم تھا۔ میں نے پوچھا، ''کیا عملے کے کسی آدمی کے پاس بھی موبائل فون نہیں ہے؟''

ڈاکٹر نے اپنی پیشانی سہلائی۔ مجھے عجیب سی نظروں سے گھورا اور جان چھڑانے کے سے انداز میں کہا، ''ہاں! کرم علی کے پاس موبائل ہے۔ مگر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے جلدی سے کہا، ''میں کسی کو کال کر کے گاڑی منگوانا چاہتا ہوں تاکہ اسے ملتان لے جاسکوں۔''

ڈاکٹر شاہ جی نے ترس کھاتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے کوٹھی سے نکل گیا۔

پروین نے میرا بازو تھام لیا۔ ڈرے ڈرے انداز میں بولی، ''بھائی! یہ کیا چکر ہے؟''

میں نے اسے جواب دینے کے بجائے پوچھا، ''تم کب سے یہاں ہو؟''

وہ بولی، ''کافی عرصے سے ہوں۔ بھائی! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ڈاکٹر صاحب نے تمہیں تلاش کرنے کی بہتیری کوشش کی۔ ایک دو مرتبہ وہ نور پور بھی گئے تھے۔ مگر تمہارا کوئی نام و نشان نہیں ملا تھا۔''

میں سمجھ رہا تھا کہ ہم دونوں کے پاس پوچھنے اور بتانے کیلئے بہت کچھ تھا مگر وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور رسان سے کہا، ''پینو! ایک ذرا نگینہ کی طرف سے دل کو سکون ہو جائے، پھر بہت سی باتیں کریں گے۔''

ڈاکٹر شاہ جی موبائل تھامے لوٹے۔ میں نے جلدی سے فون لیا۔ میڈم کا نمبر ملایا۔ خوش بختی سے فوراً رابطہ ہو گیا۔ وہ خاصی متفکر تھی۔ بولی، ''تم کہاں غائب ہو گئے ہو؟ نگینہ کہاں ہے؟''

میں نے کہا، ''میڈم! وہ میرے ساتھ ہے۔ اسے گولی لگی ہے۔ حالت بہت خراب ہے۔''

''تم ہو کہاں؟'' میڈم مزید متفکر ہو گئی۔

''میں اس وقت ایک سرکاری ہسپتال میں ہوں۔ پولیس ہمارے تعاقب میں یہاں پہنچی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے انہیں فی الحال ٹرخا دیا مگر یقیناً ناکام لوٹنے والے سب انسپکٹر نے کہیں قریب ہی مورچہ بنا رکھا ہو گا.....''

''کیا کہا؟ ڈاکٹر شاہ جی..... کیا تم نے ڈاکٹر منور علی شاہ کا ذکر کیا ہے ابھی؟'' میڈم کی تعجب

سے معمور آواز میرے کانوں پڑی۔

''یس میڈم! نگینہ کے پیٹ میں گولی.....''

''اوہ مائی گاڈ! ''اپنی لوکیشن سمجھاؤ۔'' میڈم نے سخت لہجے میں میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے اسے ہسپتال کا محل وقوع بتایا۔ نگینہ کی ناگفتہ بہ حالت کی خبر دی اور اپنا مدعا بیان کیا کہ فی الفور میڈم اپنے ہسپتال سے ایمبولینس اور ڈاکٹر کو یہاں بھیج دے تاکہ نگینہ کو جلد از جلد میڈم کے جدید ترین ہسپتال میں منتقل کیا جا سکے۔ میڈم نے 'او کے! ویٹ فار.....' کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کرم علی کے سیل فون سے میڈم کا 'کالڈ نمبر' ڈیلیٹ کیا اور فون ڈاکٹر شاہ جی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ گہری نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ بولا، ''شہریار! مجھے تم بہت بدلے بدلے لگ رہے ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''یس سر! میں ویسا نہیں رہا، جیسا نور پور میں ہوا کرتا تھا۔''

''وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ خیر! سب معلوم ہو جائے گا۔ پہلے تمہاری زخمی ہرنی کو دیکھ لوں۔ شاید اس کی سانسیں اُسے ملتان پہنچا ہی دیں۔''

اس نے گیلری کا دروازہ کھول کر باہر کھڑے کرم علی کو فون تھمایا اور میڈیکل باکس اور چند دوائیں پہنچانے کا حکم صادر کیا۔ پھر پلٹ کر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوتے رُک گیا۔ مجھے مخاطب کر کے بولا، ''تم اپنی بہن کو سنبھالو، میں تمہاری ساتھی کو سنبھالتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھیوں کے آنے تک زندہ رہ جائے۔''

میں نے کہا، ''میں آپ کی مدد کروں سر؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور کمرے میں چلا گیا۔ میں نے طویل سانس لی اور امید و بیم کے احساسات میں ڈوب کر پروین کی طرف دیکھا۔

وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی، ''چل بھائی! کمرے میں چل.....''

میڈم شکیلہ سے فون پر رابطہ ہو جانے اور ڈاکٹر شاہ جی کی طرف سے نگینہ کو فرسٹ ایڈ دینے کی حامی بھر لینے پر مجھے ایک ذرا قرار آ گیا۔ امید بندھ گئی۔ میڈم کے ہسپتال سے ایمبولینس کو یہاں پہنچنے میں لگ بھگ پون گھنٹہ لگ سکتا تھا۔ اس دوران اگر اللہ کی طرف سے نگینہ کی سانسوں کی مالا بندھی ہوئی تھی تو وہ بچ سکتی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کی مہارت کا میں پہلے سے ہی قائل تھا۔

معاملہ محض میڈم کی مجھ پر عائد کی ہوئی نگینہ کی ذمہ داری کا ہوتا تو میں اسے اطلاع دینے

کے بعد بالکل نچنت ہو چکا ہوتا مگر ایک رات کی ہنگامہ خیز ہمراہی کی وجہ سے مجھے نگینہ سے شدید نوع کی ہمدردی ہو گئی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طرح کا احساسِ ندامت بھی میرے ذہن میں کچوکے لگا رہا تھا کہ دو افراد پر مشتمل مختصر سی ٹیم کا اچھا سربراہ ثابت ہونے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ مشن کے آغاز میں ہی میرے بودے پن کی وجہ سے وہ مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ باوجود کہ وہ پیشہ ور فائٹر نہیں تھی اور نہ ہی نہایت نامساعد حالات سے نبرد آزمائی کیلئے تربیت یافتہ تھی، وہ نہ صرف حالات سے مردانہ وار لڑی تھی بلکہ اس نے غیر معمولی طویل دورانیے پر مشتمل درد کی کٹیلی ٹیسیں نہایت ثابت قدمی سے برداشت کی تھیں۔

پروین مجھے آہستگی سے اپنی جانب کھینچ رہی تھی جبکہ میں اپنے پیروں پر کھڑا سوچ رہا تھا۔ پھر بے جان انداز میں کھنچتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لائی۔ یہاں اس کا سامان پھیلا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ لوہے کے پائپوں والی دو چارپائیاں جڑی پڑی تھیں۔ دونوں پر عام نوع کے بستر لگے ہوئے تھے۔ دیوار پر چوبی کھونٹی نصب تھی جس پر دو تین مردانہ اور اتنی ہی تعداد میں زنانہ سوٹ لٹک رہے تھے جو پروین کے علاوہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے تھے۔ چارپائی پر بیٹھتے ہی دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ شک کی کٹیلی اور زہر خند لہر ذہن میں پیدا ہوئی اور آنِ واحد میں پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ پروین کمرے میں اکیلی نہیں رہتی تھی۔ اس بات کا احساس کمرے میں پڑی ہوئی مردانہ استعمال کی اشیا کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کا سامان اس کے کمرے میں موجود تھا جس میں وہ اس وقت نگینہ کو ابتدائی طبی امداد بہم پہنچا رہا تھا۔ تو پھر اس کمرے میں پروین کے ساتھ کون مرد رہتا تھا؟

چند لمحے قبل دل کو ملنے والی عظیم خوشی دم توڑتے ہوئے میری زخم خوردہ غیرت کے پیروں سے لپٹنے لگی۔ سسکنے لگی۔ میں نے اپنے ہونٹ زبان سے گیلے کیے اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ پروین میرے سامنے کھڑی بغور مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظروں ہی نظروں میں میرے تاثرات بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نہ سمجھ پائی تو متفکر انداز میں پوچھنے لگی، ''تمہیں کوئی زخم تو نہیں لگا ہوا ناں؟ بالکل ٹھیک تو ہو ناں تم؟''

میں اس کی پریشانی کا سبب فی الفور بھانپ گیا۔ میرا لباس خون آلود تھا اور اس کی آنکھیں خون کے بڑے دھبوں پر ثبت تھیں۔ ایسے میں مجھے اپنے زخم کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی گولی کا درد جاگ اُٹھا جسے نگینہ کی زندگی کے سوال نے محو کر رکھا تھا۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے زخم پر جا

ٹکا۔ایک طویل سانس حلق سے خارج ہوئی۔شکست خوردہ سے انداز میں کہا،''پینو! تیکوں پتا اے جو بھرا غیرت دے سرنانویں نال جیندن..... وَل ڈسا! اِتھ کون رہندے تیڈے کٹھے؟''

(پینو! تم جانتی ہو کہ بھائی غیرت کے عنوان کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔پھر بتاؤ! تمہارے ساتھ یہاں کون رہتا ہے؟)

وہ مجھے دیکھ کر خوشی میں اپنی پوزیشن بھول بیٹھی تھی۔اس لیے میرے لہجے سے ہویدا تشکیک اور سرد مہری نے اسے بری طرح چونکا دیا۔آنکھیں پھیل گئیں۔اردگرد دیکھتے ہوئے بولی،

''بھائی! تم بیٹھو تو جاؤ۔میں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔''

''میں کیا پوچھ رہا ہوں؟'' میرا لہجہ ایک دم درشت ہو گیا۔

اس نے آنکھیں چرائیں۔چہرہ متغیر ہوا۔ایک قدم بے اختیار پیچھے ہٹی۔میرے سمجھنے کیلئے یہی بہت کچھ تھا۔تبھی دل دھک سے رہ گیا۔اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے برآمد ہوتی ہوئی محسوس ہوئی،''پپ..... پانی..... میکوں پانی پوا!''

(پپ..... پانی..... مجھے پانی پلاؤ!)

وہ کمرے کی نکڑ میں دھرے ہوئے چوبی میز کی طرف بجلی کی سی تیزی سے گئی۔پانی کا گلاس بھر لائی۔میں نے ایک ہی سانس میں ٹھنڈا پانی حلق سے اُتارا مگر سینے میں لگی ہوئی آگ نہ بجھ پائی۔بدستور بھڑکتی رہی۔اپنی لاڈلی بہن کو سرد نظروں دیکھا۔پوچھا،''یہاں کون رہتا ہے تمہارے ساتھ؟''

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔چند لمحے مجھے شاکی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر سسکنے لگی۔اٹک اٹک کر بولی،''ہاں! میں تمہاری عزت ہوں؛ غیرت ہوں۔کتنا عرصہ مصلے پر بیٹھ کر پانچوں وقت رو رو کر خدا سے تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔اس لیے..... اس لیے..... کہ جب تم مجھے نظر آؤ تو تمہاری آنکھوں میں میرے لیے شک ہی شک بھرا ہوا ہو۔تمہاری غیرت میری محبت کو نگل چکی ہو..... اور..... اور تم مجھ سے پوچھو کہ میں کس کے ساتھ یہاں رہتی ہوں..... ہے نا؟''

میرا سر جھک گیا۔آگ کی لپٹیں سینے میں بدستور اُٹھتی رہیں۔سانسوں کی دھونکنی غیر محسوس انداز میں تیز ہو گئی تھی۔جی چاہا کہ اسے بڑھ کر سینے سے لگا لوں۔جی بھر کر پیار کروں۔جو ہوا، اسے بھول جاؤں اور اسے سہارا دے کر زندگی کا احساس دلاؤں مگر اپنی عزت کے نادیدہ بت

میں چبھے ہوئے کانٹوں کا فکر لاحق رہا۔

وہ کہہ رہی تھی، ''بھائی! تم تو مجھے ان بے غیرتوں کے چنگل سے نہیں نکال سکے تھے ناں..... بلکہ تم لوگوں نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ میں کسی کے ساتھ منہ کالا کر گئی ہوں۔ جس طرح آج تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں کسی مرد کے ساتھ رہ رہی ہوں، گناہ کر رہی ہوں؛ ایسے ہی پہلے بھی گناہ کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی..... ہے ناں؟ تم سب لوگ یہی سوچتے رہے اور وہ..... اور وہ..... مجھے تلاش کرتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اپنے گھر بار، خاندان اور ماں باپ کا فکر کیے بغیر ایک وہی میری تلاش میں نکلا تھا۔ اس سے میرا خون کا رشتہ بھی نہیں تھا..... اور پھر وہ خود بھی مجھے ان کتوں کی قید سے نکالنے کی کوششوں میں پکڑا گیا۔ میرے ساتھ باندھ دیا گیا۔ کمینہ حیدر خان اسے سمجھاتا رہا کہ واپس چلے جاؤ۔ اس اوکھلی میں سر نہ دو ورنہ سر جاتا رہے گا۔ وہ کہتا رہا کہ سر تو ڈال بیٹھا ہوں۔ سر جاتا ہے تو جائے، میں نہیں جاؤں گا۔ زندگی اس دہلیز پر ڈال جاؤں گا مگر اکیلا نہیں جاؤں گا۔ پری کو لے کر ہی جاؤں گا۔ ہاں بھائی! سبھی مجھے پپو کہتے تھے۔ ایک وہی تھا جو مجھے 'پری' کہتا تھا۔ وہ ضد کا پکا نکلا۔ آخر مجھے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے لیے اپنا گھر بار، وطن، یار سنگی سب چھوڑ کر آیا تھا اور مجھے ہر صورت میں قبول کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ ہاں بھائی! وہی میرے ساتھ اس کمرے میں رہتا ہے۔''

بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا، ''کون؟''

''بتاتی ہوں..... پہلے سن تو لو جو میں کہہ رہی ہوں۔'' وہ روتے روتے چپ ہو گئی تھی۔ مجھ سے چند فٹ دور کھڑی بڑے اعتماد سے بولنے لگی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اب وہ بچی نہیں رہی تھی۔ بھرپور عورت بن چکی تھی۔ اپنا مدعا بیان کرنے کا ہنر سیکھ چکی تھی۔ اس کا چہرہ فرطِ جذبات سے تمتما رہا تھا جبکہ آنسوؤں سے نم آنکھوں میں نامانوس سی چمک ابھر آئی تھی۔ بولی، ''وہ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کے پاس لے آیا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مجھے اور اُسے ڈاکٹر شاہ جی کے علاوہ دنیا میں کوئی پناہ نہیں دے گا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے ہماری خاطر نور پور چھوڑ دیا اور بڑی سفارشوں کے بعد یہاں تبادلہ کروالیا۔ ہمیں یہاں لا چھپایا۔ پھر ڈاکٹر شاہ جی نے ہم دونوں کو مجبور کیا کہ ہم شادی کر لیں۔ وہ نہیں مانا۔ وہ کہتا تھا کہ شہرے کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھائے گا۔ ہاں! مگر تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ تم سے ڈرتا تھا؟ نہیں بھائی! جو شخص حیدر خان جیسے درندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہو، وہ تم سے کیوں ڈرے گا۔ اس کی

فطرت میں ڈر کارتی بھر عنصر بھی شامل ہوتا تو وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر نہ نکل کھڑا ہوتا اور میری خاطر اپنے خاندان سے یوں دیوانہ وار ٹکرانہ گیا ہوتا۔ ہاں! وہ ڈرتا نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ میرے راستے میں کوئی کانٹا نہ رہے۔ پھر جب ہم سب نے، حتیٰ کہ میں نے بھی اسے مجبور کیا، سمجھایا تو وہ مان گیا۔ پھر شاہ جی ہمیں ملتان لے گئے جہاں ہم نے کورٹ میرج کر لی۔''

وہ پیچھے ہٹ کر میز پر ٹک گئی۔ ہانپنے لگی۔ سانسیں برابر کر کے، سر جھکا کے بولی، ''اب وہ میرا گھر والا ہے۔ میرا سائیں ہے۔ میں اس کے ساتھ رہتی ہوں۔''

''کون ہے وہ؟'' میں نے اپنے جبڑوں کے اعصاب کو حرکت دیتے ہوئے پوچھا۔ اس لمحے مجھے اپنی ذہنی کیفیت کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا چاہ رہا تھا اور کیا نہیں۔ حتیٰ کہ یہ سدھ بھی نہیں تھی کہ میں اس صورتِ حال پر غمزدہ تھا یا مطمئن۔

''امیر نواز.....'' وہ بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی، بولی، ''چاچے حیات خان کا بیٹا..... وہی مجھے بے غیرت حیدر خان کی حویلی سے نکال کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس لایا تھا۔''

میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو آ گئیں۔ ایک ہی لمحے میں امیر نواز کا بھولا بسرا چہرہ میری چشمِ تصور میں لہرا گیا۔ پروین کے اغوا کے ابتدائی دنوں میں مجھے اور چچا چراغ کو، حتیٰ کہ نور پور کے اکثر باسیوں کو اسی پر شبہ تھا۔ لوگ دبے دبے لفظوں میں کہتے تھے کہ پروین اغوا نہیں ہوئی بلکہ امیر نواز کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ پھر یہ دبیز دھند بھی چھٹ گئی تھی مگر اس کے غیاب کا عقدہ نہیں کھل سکا تھا۔

پروین گھٹنوں میں سر دیے سسک رہی تھی جبکہ میری چشمِ تصور نور پور کی گلیوں میں بھٹک رہی تھی جہاں پینے پلانے کا رسیا، لاپروا اور جذباتی امیر نواز کیمل کلر کی شال کندھوں پر مخصوص انداز میں ڈالے آوارہ گھوما کرتا تھا۔ میں نے اسے سائیں جیت شاہ کی سبز منقش چادر میں لپٹی بڑی سی قبر کے پہلو میں دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑے دیکھا تھا اور حیران ہوا تھا کہ اسے کون سی طلب یہاں کھینچ لائی ہوگی۔ میں نے دیکھا تھا کہ اُس کی آنکھیں بند تھیں، آنکھوں کے گوشوں سے نم پانی کی دو لکیریں پھوٹ کر رخساروں تک آ گئی تھیں اور ہونٹ بالکل ساکت تھے۔ وہ دل ہی دل میں کچھ مانگ رہا تھا، کچھ طلب کر رہا تھا۔ تب وہ مجھے بڑا عجیب لگا۔ کہاں وہ؛ جو شراب کے نشے میں دھت اول فول بکتا ہوا، لڑکیوں کے جذبات خیز تذکرے کرتا ہوا لاپروا امیر زادہ اور کہاں مزار پر اشکوں سے تر چہرہ لیے لب بستہ کھڑا مایوس، طلب گار، امیر

نواز!.....وہ خانزادہ تھا۔اس کا باپ حیات خان نور پور کا وڈیرا تھا۔نمبردار تھا۔اس کا خاندان اثر ورسوخ رکھتا تھا۔جائز، ناجائز، ہر طرح سے دولت کمانے کا ہنر ان کے خاندان میں پایا جاتا تھا مگر وہ بخت خان کی بیٹھک میں بیٹھ کر سائیں دل جیت کے دربار پر ہونے والے غیر قانونی دھندوں پر فکر کرتا تھا۔اس کی ذات کے تضادات تب بھی مجھے پریشان کرتے تھے۔آج بھی حیران کر گئے تھے۔

آج سمجھ میں آ رہا تھا کہ ان دنوں بھی وہ پروین سے محبت کرتا تھا۔کیونکہ وہ مجھے اکثر کہا کرتا تھا کہ ''دیکھ شہرے! اپنی بہن کو پڑھاتے رہنا۔اگر پیسوں کا مسئلہ آڑے آئے تو بے دریغ مجھے کہنا۔''

ایک مرتبہ اُس نے یہ بھی کہا تھا، ''یار! اَن پڑھ عورت بھی کوئی عورت ہوتی ہے؛ اُسے بیٹھنے کا ڈھنگ ہوتا ہے نہ چلنے کا سلیقہ.....اُس کو دیکھ کر دیکھتے رہنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔تم لوگ اچھا کر رہے ہو جو اپنی لڑکیوں کو پڑھا رہے ہو۔''

اگر اسے تب پروین میں دلچسپی نہیں تھی تو وہ اس کیلئے اس درجہ فکر مند کیوں رہتا تھا؟.....یہ عقدہ آج کھل گیا تھا۔

پروین کے اغوا ہونے کے بعد جب نور پور میں چہ مگوئیوں کا بازار گرم تھا، میری عزیز از جان غزالہ نے مجھے کہا تھا، ''شہرے! پروین کوں خان دا پتر امیر نواز گھن گیا ہے.....میں سچ آدمی ہاں پر کوئی منن کیتے راضی اِی نئیں.....''

(شہرے! پروین کو خان زادہ امیر نواز کہیں لے گیا ہے۔میں سچ کہتی ہوں مگر کوئی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔)

اس نے تو مجھے یہ بھی کہا تھا، ''پروین گھر کے پچھواڑے جنگل کے پار امیر نواز سے ملنے جایا کرتی تھی۔کبھی دِن میں، کبھی رات کو.....میں نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو ملتے دیکھا ہے۔''

پھر میرے اصرار پر غزالہ نے پروین اور امیر نواز کے مابین پروان چڑھنے والی پریم کہانی کھول سنائی تھی۔میں دونوں کی عدم موجودگی میں دونوں پر شدید برہم ہوا تھا اور میں نے چاچا حیات خان پر براہِ راست الزام عائد کرتے ہوئے اپنی بانہہ طلب کی تھی۔اس نے اپنے طور پر صفائی پیش کرنے کی بہت کوشش کی مگر میں اس کی ذات پر مطمئن نہیں ہوا تھا اور میری سوئی اسی بات پر اٹکی رہی تھی کہ امیر نواز نے میری بہن کو اغوا کر کے کہیں چھپا رکھا تھا۔

امیر نواز کے بارے میں میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند اس وقت چھٹی جب میں سائیں دل جیت کو اغوا کر کے اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا اور میڈم کے کہنے پر اس کے حلق سے پرویز کے اغوا کار کا نام اگلوانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس نے امیر نواز کے نام پر نفی میں سر ہلایا تھا اور سردار حیدر خان کا نام لے کر میرا کام آسان کیا تھا۔

پیا جی کی رہنمائی میں جب ہم نے پروین کو بازیاب کرانے کیلئے اس کی بیلے والی خفیہ حویلی پر حملہ کیا تھا تو ہمیں حویلی خالی ملی تھی۔ وہاں پروین کے ساتھ ایک اور عورت اور مرد کو باندھ کر رکھے جانے کے آثار بھی ملے تھے۔ ناکام واپسی پر عشرت عرف عاشی کا نیم مردہ بھائی وحید جھاڑیوں میں پڑا ملا تھا جس کو دیکھ کر کھالے نے ایک کہانی تیار کی تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق پروین کے ساتھ عاشی اور وحید کو رکھا گیا تھا۔ پھر وحید کو حیدر خان کے کارندوں نے مردہ سمجھ کر بیلے میں پھینک دیا۔ امیر نواز بھی یہیں قید تھا جس نے موقع ملتے ہی دونوں کو وہاں سے نکال لیا۔ یا پھر کوئی اور شخص امیر نواز، پروین یا عاشی کی تلاش میں وہاں تک پہنچا تھا جو سب کو نکال کر کہیں لے گیا تھا۔ تب مجھے کھالے کی اس کہانی پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں اس پریشانی میں مبتلا رہا تھا کہ ان کو خان کی قید سے نکالنے والا خان کے قماش کا ہی کوئی دشمن بھی ہو سکتا تھا۔ یعنی پروین آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکی ہوئی تھی جبکہ کھالا مصر تھا کہ پروین امیر نواز کے ساتھ ہے۔ وہ جیتے جی اس پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ آج کھالے کی سبھی تسلیاں، یقین اور دلاسے یقین کی صورت اختیار کر کے میرے سامنے تھے۔

میں نے پروین کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا۔ پوچھا، ''وہ کہاں ہے اس وقت؟''

میرا اشارہ امیر نواز کی طرف تھا۔

''کون؟ امیر نواز؟'' پروین نے سر اُٹھایا۔ غبارِ دل آشکار کر کے خاصی مطمئن ہو گئی تھی، سنبھل گئی تھی، ''وہ نور پور گیا ہوا ہے۔ پرسوں گیا تھا۔ کل یا پرسوں لوٹے گا۔''

وہ اُٹھ کر میرے پہلو میں آ بیٹھی۔ کندھے پر اپنے مخصوص انداز میں بازو رکھ کر بولی، ''بھائی! چاچا اور چاچی اللہ کو پیارے ہو گئے؟''

اس کی آواز میں دکھ کا گہرا تاثر چھپا ہوا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''موجو؟'' وہ سسکی، ''اور شانو، فرزانہ؟''

''زندہ ہیں۔ میرے پاس ملتان میں ہیں۔''

''ٹھیک تو ہیں ناں؟''

''ہاں!''

وہ تینوں کے بارے کرید کرید کر پوچھنے لگی۔ میں 'ہوں، ہاں' میں جواب دیتا رہا۔ وہ متواتر میرا کندھا اور بازو سہلاتی رہی۔ ایسے میں اس کا ہاتھ میرے زخم کو چھو گیا۔ میرے حلق سے بے ساختہ ہلکی سی سسکاری برآمد ہوئی جسے سن کر وہ چونک گئی۔ میری شرٹ پر خون جم چکا تھا۔ جمے ہوئے خون میں زخم تلاش کرنے میں ناکام رہی تو پوچھنے لگی، ''یہاں زخم ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کہا، ''لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ معمولی سا زخم ہے۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ کچھ مطمئن ہوئی، کچھ نا مطمئن۔ پوچھنے لگی، ''ہمارے گھر کو سردار حیدر خان نے آگ لگوائی تھی ناں؟''

زہر کا ایک گولا میرے تن بدن میں پھر گیا۔ جواب دیا، ''ہاں! ہم پر ٹوٹنے والی سبھی مصیبتوں کے پیچھے اسی بدبخت کا ہاتھ ہے۔''

''امیر نواز کہہ رہا تھا کہ ہم کبھی بھی نور پور میں جا کر نہیں رہ سکیں گے۔ ایسے ہی؟''

میرا تذبذب دیکھ کر از خود سمجھ گئی۔ بولی، ''پر اب وہاں جا کر لینا بھی کیا ہے؟ گھر جل گیا، گھر والے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ قبریں بھی خالی خولی نام کی ہیں۔ جو بچ گئے وہ در در بھٹک رہے ہیں۔ آہ! ہم نے کسی کا بگاڑا بھی کچھ نہیں تھا اور ہمارا بچا بھی کچھ نہیں ہے۔''

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے کانوں میں گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ہسپتال کے مین گیٹ کھلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میری توقع بر لائی تھی۔ میڈم کے ہسپتال کی ایمبولینس پہنچ آئی تھی۔

کمرے سے نکلا تو ڈاکٹر شاہ جی گیلری میں ٹہلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ میں اس کی ہدایت کے برعکس پھر دروازے میں آیا اور دونوں طاقوں کے درمیان جھری بنا کر جھانکنے لگا۔ کوٹھی کے برآمدے کے عین سامنے جدید طرز کی ایمبولینس کو دیکھ کر میرے ذہن میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ایمبولینس کا ہوٹر اور سرخ بتیاں آف تھیں۔ ڈرائیور کے علاوہ سفید ایپرن پہنے گنجے سر والا شخص ڈاکٹر شاہ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے سر پر بالوں کی تعداد گنی جا سکتی تھی۔ چند لمحوں کی بات چیت کے بعد ڈاکٹر شاہ پلٹا

اور میری طرف آیا جبکہ سفید ایپرن والے شخص نے ڈرائیور اور ایمبولینس کے اندر بیٹھے ہوئے شخص کو کوٹھی میں چلنے کا اشارہ کیا۔

میں جلدی سے دروازے سے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر شاہ نے اندر آ کر مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''اپنی بہن سے ملاقات کر چکے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا، ''ڈاکٹر شاہ جی! میں آپ کے اس احسان کا زندگی بھر بدلہ نہیں چکا سکوں گا۔ آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں۔''

اس کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ تیری۔ طنز اور فخر سے جذبات کی امتزاجی مسکراہٹ۔ بولا، ''میں نے امیر نواز اور پروین کی شادی کروادی ہے۔ یقیناً تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''جی شاہ جی! مجھے واقعتاً کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے سر تسلیم خم کیا، ''آپ نے جو کیا، اچھا ہی کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی قوتِ فیصلہ مجھ سے کہیں بہتر ہے۔''

''او کے!''

''نگینہ کیسی ہے سر؟''

''یہ زخمی لڑکی؟''

''جی سر! اس کا نام نگینہ ہے۔''

''زندہ ہے۔ یہ دیکھنے میں امریکن یا یورپین لگتی ہے۔'' ڈاکٹر شاہ نے دروازے میں ایک ذرا رک کر کہا، ''جبکہ نام دیسی ہے۔''

''جی! کینیڈا میں پلی بڑھی ہے۔ اس لیے ایسی دکھائی دیتی ہے۔ اُردو بول اور سمجھ لیتی ہے۔''

''وہ تو میں دیکھ ہی چکا ہوں۔''

ایسے ہی وقت میں سفید ایپرن والا اپنے دونوں ساتھیوں سمیت کوٹھی میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھیوں نے جدید طرز کا اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے ڈاکٹر شاہ کے کمرے میں جانے کا کہا اور اپنے پاس رکنے والے گنجے سر والے شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پوچھا، ''مسٹر شہریار؟''

میں نے 'یس' کہا۔ وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے پلٹا۔ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا، ''ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق زخمی عورت کو اسٹریچر پر منتقل کرو۔ ہری اَپ!''

پھر میری طرف مڑ کر بولا، ''میں ڈاکٹر یوسف امیر ہوں۔ میڈی کمپلیکس سے آیا ہوں۔

ڈاکٹر ظہور اختر صاحب کے انڈر کام کرتا ہوں۔ یہ ایمبولینس میڈی کمپلیکس کی ہے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ وہ مزید بولا، ''آپ کیلئے ڈاکٹر ظہور اختر نے میڈم شکیلہ صاحبہ نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ ایمبولینس میں ہمارے ساتھ ملتان چلیں گے۔''

میں چونکا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے تئیں میں نے سوچ رکھا تھا کہ نگینہ کو ایمبولینس میں منتقل کرنے کے بعد میں فارغ ہو جاؤں گا اور چند دن یہاں رہوں گا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور پروین سے ڈھیر ساری باتیں کروں گا اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کروں گا۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ سننا اور کہنا تھا۔ دو تین دن بعد امیر نواز واپس آنے والا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ پروین پر گزرے ہوئے کڑے لمحات کی روئیداد بھی امیر نواز سے سننا تھی۔ کیونکہ میں وہ تمام غیرت پاش قصہ پروین سے سن نہیں سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے شاید بھول گیا تھا کہ میں آزاد شخص نہیں تھا بلکہ میڈم شکیلہ کا ملازم تھا۔ اس کے حکم کا پابند تھا۔ وہ یہ بتانے کے پابند بھی نہیں تھی کہ اس نے میرے لیے یہ حکم کیوں صادر کیا تھا؟.....

میں نے ایک ذرا سہارا لیا، ''مگر ڈاکٹر صاحب! میرا آپ لوگوں کے ساتھ جانا ضروری بھی تو نہیں ہے۔ میں بعد میں آ جاؤں گا۔''

اس نے کندھے اُچکائے، ''آپ کا میرے ساتھ جانا ضروری ہے یا نہیں؛ آپ بعد میں آئیں گے یا نہیں؛ یہ میرا کیس نہیں ہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو ساتھ لانا ہے۔ آپ ساتھ چلیں گے تو ٹھیک وگرنہ میں جا کر ڈاکٹر صاحب سے کہہ دوں گا کہ آپ نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ جانیں، میڈم صاحبہ جانیں یا آپ..... یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔''

وہ درست کہہ رہا تھا۔

اس کے ساتھی ڈاکٹر شاہ جی کی رہنمائی میں نگینہ کو اسٹریچر پر لادے کمرے سے برآمد ہوئے۔ میں نے نگینہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ پیلاہٹ پکڑ چکا تھا۔ جسم میں خون کی کمی نے رنگت کو متغیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ اسٹریچر تھامنے والے گیلری میں رکے بغیر باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے ڈاکٹر یوسف امیر کو انگریزی میں کہا، ''گولی جسم کے اندر ہی ہے۔ کافی گہرائی میں۔ لگ بھگ چار انچ۔ میں نکال نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے کوشش ہی نہیں کی اسے نکالنے کی۔ البتہ اینٹی سیپٹک لوشن لگا دیا ہے۔ ممکنہ حد تک زخم کی صفائی بھی کر دی ہے۔ ڈرپ میں انٹی بیاٹک اور اٹل جیزک انجیکشن حل کر دیے ہیں۔ بی پی کم ہے۔ راستے میں

گا ہے گا ہے چیک کرتے رہیے گا۔ امید ہے کہ یہ آپریشن ٹیبل تک پہنچ جائے گی۔''

ڈاکٹر یوسف نے رسمی انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور مجھے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کوٹھی سے نکل گیا۔

ڈاکٹر شاہ بولا، ''نو پرابلم! اگر تم اپنے لوگوں میں جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ فارغ ہو کر یہاں آ جانا۔''

مجھے اپنے خون آلود لباس کا خیال آیا۔ کہا، ''ایسے جاؤں گا تو رستے میں کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤں گا۔'' میں نے آنکھوں سے اپنے لباس پر خون کے بڑے بڑے دھبوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

''کوئی بات نہیں۔ ایمبولینس میں ایپرن موجود ہوگا۔ پہن لینا۔ سب کچھ چھپ جائے گا۔''

میں نے سر ہلایا۔ بھاگ کر پروین کے کمرے میں آیا۔ وہ دروازے میں کھڑی ہماری باتیں سن چکی تھی۔ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ کہنے لگی، ''بھائی! یہ کیا۔ ابھی آئے اور ابھی جانے لگے..... ابھی تو میں نے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سمجھایا، ''وہم نہ کرو۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا۔ دل کو قرار آ گیا۔ تمہارا ٹھکانہ دیکھ لیا۔ لوٹ کر یہاں آؤں گا۔ امیر نواز سے بھی ملوں گا۔ اسے بتا دینا کہ وہ میرا محسن ہے۔ میں اس سے ناراض نہیں ہوں اور اس کا شکریہ ادا کرنے کیلئے جلد آؤں گا۔''

پروین کو دِلاسا دینے میں کچھ دیر ہوگئی۔ ایمبولینس کے ڈرائیور نے تاخیر کا احساس دلانے کیلئے ہارن بجایا۔ میں پروین پر الوداعی نظر ڈالی اور کوٹھی سے باہر آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی برآمدے میں کھڑا تھا۔ قدرے بے رخی سے ہاتھ ملا کر بولا، ''شہریار! جلدی کرو؛ ڈاکٹر صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جلد ہسپتال پہنچنے کی کوشش کرو ورنہ یہ لڑکی اپنی زندگی کی بازی ہار جائے گی۔''

میں ایمبولینس کے عقبی پورشن میں نگینہ کے اسٹریچر کے قریب سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ بائیں ہاتھ پر ڈاکٹر یوسف امیر بیٹھا تھا۔ وہ نگینہ کا ٹمپریچر لے رہا تھا۔ نوٹ کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس سے ایپرن مانگا۔ اس نے کہیں سے نکال دیا۔ سفید رنگ کا بڑا سا ایپرن پہننے سے میرا خون آلود لباس کافی حد تک چھپ گیا۔

ایمبولینس ہسپتال سے نکل کر سنگل روڈ پر گامزن ہوگئی۔ چند لمحوں بعد فراٹے بھرنے لگی۔

میں نے پوچھا، ''ڈاکٹر صاحب! آتے ہوئے آپ کو راستے میں پولیس پارٹی ملی تھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر پوچھا، ''کوئی خطرہ ہے کیا؟''

میں نے کہا، ''ہاں! ہم دونوں پولیس کی نظروں میں آ چکے ہیں۔ ہماری تلاش میں ایک سب انسپکٹر پولیس پارٹی لے کر ہسپتال آیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے اسے ٹہلا دیا۔ ممکن ہے وہ راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دے، مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ قدرے بلند آواز میں ڈرائیور کو مخاطب کیا، ''انور! پولیس روکے تو ہوٹر آن کر دینا۔ بریک نہ لگانا۔ او کے؟''

''یس سر!''

میں نے اندیشہ ظاہر کیا، ''وہ موبائل وین پیچھے بھی لگا سکتے ہیں۔ فائر بھی.....''

ڈاکٹر یوسف نے کہا، ''شہریار! آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا معمول ہے۔''

وہ میڈم شکیلہ کے گینگ کا تربیت یافتہ رکن تھا۔ نجانے کب سے میڈم کیلئے کام کر رہا تھا۔ اس کے دعوے پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اس لیے میں نے سیٹ سے کمر ٹکائی اور آنکھیں بند کر کے تن آسان ہو کر بیٹھ گیا۔ اس علاقے کے دور افتادہ ہسپتال میں غیر متوقع طور پر ملنے والی عظیم خوشی کے بارے میں سوچنے لگا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا جس نے پروین اور امیر نواز کو زندہ و سلامت مجھے ملا دیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب میں بہت حد تک پروین کی بازیابی کے معاملے میں مایوس ہو چکا تھا۔

میں اس سڑک پر پہلی مرتبہ گزر رہا تھا۔ اس میں جا بجا موڑ تھے۔ کئی ایک جگہوں پر بڑے بڑے گڑھے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر یوسف نے میرے استفسار پر بتایا کہ ہم شجاع آباد کی طرف نہیں بلکہ شجاع آباد کے پہلو سے نکل کر مظفر گڑھ جانے والی بڑی سڑک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آتے ہوئے یا اب واپسی کی راہ جاتے ہوئے کہیں پولیس سے ہماری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد اچانک نگینہ کے جسم نے اسٹریچر پر جھٹکے لینے شروع کر دیے۔ ڈاکٹر یوسف امیر نے نہایت سرعت سے اس کو دیکھا بھالا اور سلنڈر کا والو کھول کر آکسیجن ماسک اوڑھا دیا۔ ٹرے میں تیار کر کے رکھا ہوا ایک انجکشن بھی اس کی رگوں میں انڈیل دیا۔ چند منٹوں کی تگ و دو کے بعد وہ پرسکون ہو گئی۔ میں نے از راہِ گفتگو پوچھا، ''اس کی حالت کیسی ہے؟''

ڈاکٹر یوسف نے کہا، ''حالت اچھی نہیں ہے مگر میرا خیال ہے کہ خطرے میں بھی نہیں ہے۔''

میں ایک بار پھر نگینہ کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا سوچوں میں گم ہو گیا۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد کافی دیر سے ہو رہا تھا۔ جب میں پروین کے کمرے میں بیٹھا تھا، تب بھی میرا سر بھاری بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس درد کی وجوہات سے واقف تھا۔ میرا معدہ گزشتہ شام سے خالی تھا، مسلسل بے آرامی درپیش تھی۔ بارہ بور گن کے کارتوس کا ایک چھرا میرے دائیں بازو میں لگا تھا۔ زخم خطرناک نہیں تھا۔ بڑا بھی نہیں تھا مگر اب دکھ رہا تھا۔ نگینہ کی فائر کی ہوئی گولی بھی دائیں بازو کا ماس پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ کافی خون بہہ گیا تھا۔ خون بہنے سے کمزوری ہونے لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور کمزوری کی بدولت سر میں اب دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ گولی کے بارودی ذرات خاصے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ چونکہ میں نے لاپروائی برتتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی سے زخم دھلوایا نہیں تھا، اس لیے بارودی ذرات کا زہر بھی جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ بھوک، زخم اور بے سکونی کے سبب سر درد لاحق ہوا تھا جس میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خونریز مشن میں کامیابی، پروین سے ملاقات اور سانسیں لیتی نگینہ کو میڈم تک پہنچانے کی خوشی کے مقابلے یہ تکلیف بہت معمولی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ میڈی کمپلیکس پہنچ کر اپنے زخم کی بینڈیج بھی کرالوں گا تاکہ زخم خراب نہ ہونے پائے۔

میری توقع کے مطابق ڈرائیور نے محض چالیس منٹ میں میڈی کمپلیکس کے اندرونی گیٹ پر پہنچا دیا۔ ایمبولینس رک گئی۔ ڈاکٹر یوسف امیر کے دونوں ماتحتوں نے برق رفتاری اور عین پیشہ ورانہ انداز میں نگینہ کا اسٹریچر نکالا اور میکانکی انداز میں دوڑتے ہوئے ہسپتال میں داخل ہو گئے جب کہ ڈاکٹر یوسف وہیں رُکا رہا۔

ان کے جانے کے بعد اس نے ڈرائیور سے مخاطب کیا، ''شہریار کو میڈم کی کوٹھی پر پہنچا کر جلد واپس آ جاؤ۔ دوسری ایمبولینس موجود نہیں ہے۔ کسی بھی وقت ایمرجنسی کال آ سکتی ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''ڈاکٹر صاحب! مجھے فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔''

وہ چونکا، ''کیا مطلب؟ آپ زخمی ہیں؟''

میں نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا، ''ادھر گولی لگی ہے۔''

''اوہ نو!'' ڈاکٹر یوسف کے ہونٹ سکڑ گئے۔ تاسف آمیز لہجے میں بولا، ''بھلے آدمی! پہلے بتا دیا ہوتا۔ ایمبولینس میں فرسٹ ایڈ کا مکمل سامان موجود تھا۔ خیر! اندر ایمرجنسی وارڈ میں چلیں۔''

میں نے اس کی معیت میں ہسپتال میں قدم رکھا۔ چند لمحوں بعد میں ایمرجنسی وارڈ میں تھا جبکہ ڈاکٹر یوسف ایک جوان العمر ڈاکٹر کو میرے چیک اَپ اور علاج کی ہدایات دیتا ہوں باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر کی میز پر اس کے نام کی نیم پلیٹ موجود تھی۔ اس کا نام ظفر اقبال تھا۔ کچھ تو اس کی عمر شبابی تھی، کچھ چہرے پر غیر معمولی معصومیت کا راج تھا جس سے وہ ڈاکٹر معلوم ہی نہیں ہوتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ میڈم شکیلہ کے اس سیٹ اَپ میں کسی اناڑی شخص کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ یقیناً اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا۔ بازو پر خون جم چکا تھا جس کی وجہ سے کوشش کے باوجود ڈاکٹر میری آستین اوپر نہ کر سکا۔ میرے کہنے پر اس نے قینچی سے قمیص کا بازو والا حصہ کاٹ دیا۔ اس کے باوجود زخم عریاں کرنے کیلئے اسے ہائیڈرجن پر اکسائیڈ کی دو بوتلیں انڈیلنا پڑیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے سینئی انداز میں میرے بازو کا معائنہ کیا۔ بولا "دو زخم ہیں۔ ایک پر کھرنڈ جم گیا ہے۔ دوسرا بڑا زخم ہے۔ گولی بازو کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی ہے۔ اعصاب بچ گئے ہیں ورنہ کام بگڑ جاتا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر نرس اور ڈسپنسر کی مدد سے زخم کی صفائی کی۔ ماہرانہ انداز میں بینڈیج کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے سر میں شدید درد ہے۔ اس نے انجکشن دینا چاہا تو میں نے جلدی سے اس پر واضح کر دیا کہ سر کا درد بھوک کی شدت کی وجہ سے ہے۔ خالی پیٹ انجکشن ری ایکشن بھی کر سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ رُک گئے۔ پھر اس کے حکم پر نرس کنٹین سے چائے اور بسکٹ لینے کیلئے چلی گئی۔

میں کوئی نصف گھنٹہ کے قریب ہسپتال میں رہا۔ اس دوران سر کا درد تو کم نہیں ہوا البتہ بازو کی تکلیف میں افاقہ ہو گیا۔ میں نے اُسے کریدا اور چاہا کہ مجھے نگینہ کی حالتِ زار سے اَپ ڈیٹ کر دے مگر وہ لاعلم تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔ میڈم کے گینگ کی یہ روایت بہت بھلی تھی کہ ہر آدمی اپنے کام پر توجہ دیتا تھا۔ کوئی بھی گینگ ممبر کسی دوسرے کے کام میں ٹانگ نہیں اڑاتا تھا۔ دو انجکشن لگوانے کے بعد دواؤں کی پوٹلی اُٹھائے ہسپتال سے باہر آیا تو ایمبولینس کا لمبا تڑنگا ڈرائیور میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے شاید ڈاکٹر یوسف امیر نے میرا انتظار کرنے کا حکم دیا تھا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب میں میڈم کی کوٹھی کا گیٹ عبور کر چکا تھا۔ میڈم سے ملاقات میں

خاصی تاخیر حائل تھی۔ اس لیے اپنے دیکھے بھالے گیسٹ روم میں جا کر فراغت سے نہایا اور ہنگامی ضرورت کے پیشِ نظر رکھے ہوئے ملبوسات میں سے ایک سوٹ منتخب کر کے زیبِ تن کیا۔ اپنا خون آلود لباس تلف کرنے کیلئے اوپر بھجوا دیا۔ اس دوران کچن سے کھانا آ گیا جسے بڑی رغبت سے کھا کر میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ شب بھر کی تھکن، بے آرامی اور تکلیف جھیلنے کے بعد لمبی نیند کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

❖❖○❖❖

رات آٹھ بجے میں میڈم کے کمرے میں تھا۔ وہ اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ بھینی بھینی مسحور کن خوشبو کے ہالے میں گم اس کا وجود اپسرائی مخلوق کی چغلی کھا رہا تھا۔ ہوٹل میں گزرنے والی اس قیامت آگیں شب کی تمام تر جولانیاں میری نگاہوں میں ایک پل کو اُبھریں مگر میڈم کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر محو ہو گئیں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور باوقار لگ رہی تھی۔ میں کمرے کے وسط میں کھڑا بیٹھنے کی اجازت کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بولی،

''کیسے ہو؟''

میں نے کہا، ''تندرست ہوں۔''

''رپورٹ دو۔''

میں نے اُسے مشن کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ قدرے تلخی سے بولی، ''کیا اس طرح ٹیم کو لیڈ کیا جاتا ہے؟''

مجھے اس کے اس سوال کی توقع تھی۔ جواب سوچ چکا تھا۔ تبھی فوراً اپنی صفائی میں بول پڑا، ''پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی ٹیم کو لیڈ کرنے کا میرا یہ پہلا اتفاق تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری ساتھی اناڑی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان کمیونی کیشن کوڈز طے نہیں ہوئے تھے۔ کچھ حالات ہی اس قدر غیر متوقع طور پر بگڑے تھے کہ ہم دونوں سنبھل نہیں پائے۔''

''تمہیں نگینہ کی گولی لگی تھی۔ تمہیں یقین ہے؟'' اس کا لہجہ اسپاٹ تھا۔

''یس میڈم! مجھے یقین ہے کہ اسی نے غلط فہمی کی بنا پر مجھ پر فائر کیا تھا۔''

''اس یقین کی کوئی وجہ؟''

میں نے کندھے اُچکائے، ''وجہ تو ایسی کوئی نہیں ہے جسے بیان کروں مگر اس وقت کوئی اور گن بردار میرے مقابل نہیں تھا۔''

''ہوں..... زورآور سے کیا مکالمہ ہوا؟''

میں نے زورآور اور اپنے درمیان ہونے والی تمام باتیں اس کے گوش گزار دیں۔ وہ بولی، ''نگینہ کے ٹریولنگ پیپرز؟''

''ادھر گیسٹ روم میں رکھے ہیں۔''

''کیا اس کے انتقام کی آگ بجھ گئی؟''

''میں اس بارے کچھ نہیں کہتا۔ بظاہر تو وہ بڑی مطمئن تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اب اگر وہ مر بھی جائے تو اسے کوئی قلق نہیں ہوگا۔''

''مرنے کے بعد کسی کو قلق نہیں رہتا۔ یہ زندگی کی باتیں ہیں۔ زندگی تک ہی ساتھ دیتی ہیں۔'' پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تیری، ''کیا پولیس نے طے کرلیا ہوگا کہ بھٹی خاندان پر شب خون مارنے والے تم دونوں تھے؟''

''میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں نامزد نہیں کر سکتے کیونکہ براہِ راست ہماری کہیں مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ زورآور کے بیانات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ویسے میں نے اسے ڈاج کرایا تھا کہ میں اور نگینہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ساتھ کئی اور لوگ بھی موجود ہیں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید وہ میرے ساتھ تعاون پر مائل نہ ہوتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''زورآور بہت ٹیڑھا انسان ہے۔ حیرت ہے کہ وہ اتنی جلدی تمہارے ساتھ تعاون پر کیوں مائل ہوگیا؟'' اس نے سوچتے ہوئے اپنی پیشانی سہلائی۔

''جی میڈم! وہ واقعی بہت الٹی کھوپڑی کا آدمی ہے مگر بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مجھے مارنے کے بعد وہ میرے ساتھیوں کے ہاتھوں کتے کی موت مارا جائے گا۔ اس لیے اس نے بظاہر احسان کیا، لیکن حقیقت میں اس نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔'' میں نے اپنا اندازہ بیان کیا۔

میڈم نے بڑی آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی، ''نہیں شہریار! وہ ایسے سود و زیاں کو خاطر میں لانے والی سرشت کا مالک نہیں ہے۔ در پردہ کوئی اور ہی وجہ رہی ہو گی اس کے اس طرح سرنڈر کرنے کی۔ خیر! آج نہیں تو کل، سامنے آ ہی جائے گی۔''

جواب میں میں نے کچھ نہیں کہا۔

وہ بولی، ''تم نے ایک اجنبی نمبر سے مجھے کال کیا تھا۔ کال منقطع ہونے کے بعد تم نے اس

سیل فون سے میرا نمبر مٹا دیا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''گڈ! تم نے فون پر ڈاکٹر شاہ جی سے ملاقات کی بات کی تھی۔ کیا یہ ڈاکٹر منور علی شاہ ہی تھے؟''

اس کا انداز محض یاد دلانے والا تھا۔ جذباتیت نام کو بھی لہجے میں شامل نہیں تھی۔

میں نے جواب دیا، ''یس میڈم! نہ صرف میری اس سے ملاقات ہوئی بلکہ میں اپنی بہن پروین سے بھی مل آیا ہوں۔ وہ خیریت سے ہے۔''

''کیا وہ ڈاکٹر شاہ کے پاس ہے؟'' اس کا لہجہ پُر استعجاب تھا۔

''جی میڈم! اُسے امیر نواز نے سردار حیدر خان کی تحویل سے نکالا تھا اور فی القور ڈاکٹر شاہ جی کے پاس پہنچا دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر شاہ جی نے دونوں کی کورٹ میرج کروا دی ہے۔ اب ڈاکٹر کے ساتھ اس کی کوٹھی پر رہتے ہیں۔''

اس نے خوشی آمیز حیرت کے ساتھ صوفے کی ٹیک چھوڑ دی۔ ذرا آگے ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھ پر اپنی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولی، ''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس معاملے پر تفصیل سے بات کرو۔ میں سننا چاہتی ہوں۔''

شاید میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اپنی خوشی کو اس پر آشکار کرنا چاہتا تھا۔ جس طرح کسی دکھ یا تکلیف کے عالم میں انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ دکھ کو کسی پر عیاں کرے۔ اسے درونِ خانہ ہمدردی کے چند بولوں کا احتیاج ہوتا ہے۔ ایسے ہی خوشی کے موقع پر بھی آدمی کسی کو اپنا رقص دکھانا چاہتا ہے۔ اپنا آپ کھول کر دکھانا چاہتا ہے۔ میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ مجھے جو چند ایک باتیں پروین نے بتائی تھیں، میں نے من وعن میڈم کے گوش گزار دیں۔ وہ تعجب بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ خاموش ہونے پر بولی، ''تمہاری بہن دیکھنے میں کیسی لگ رہی تھی؟ خوش یا ناخوش؟''

میں نے کچھ سوچا۔ باوجود کہ میں جتنی دیر اس کے پاس رہا تھا، وہ روتی رہی تھی، مگر میرا دل اس کے روم روم سے پھوٹنے والی خوشی کو محسوس کر آیا تھا۔ میں نے کہا، ''وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔''

''تم دیہاتی ہو۔ دیہاتی مرد بہت غیرت مند ہوتے ہیں۔ دونوں کی شادی تمہیں ہضم ہو

گئی؟'' اُس کا لہجہ بڑا کڑا تھا۔

میرا اَز خود سر جھک گیا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو میں نے کہا، ''میری غیرت زندہ ہے۔ میں ہر اُس شخص کو تلاش کر کے نیست و نابود کر دوں گا جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے پروین کو اغوا کرنے میں کوئی کردار ادا کیا تھا۔ رہی بات امیر نواز اور پروین کی شادی کی..... تو اس میں میرا خیال ہے بے غیرتی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی بہت اچھا انسان ہے۔ فرشتہ ہے۔ وہ غلط فیصلہ نہیں کرتا۔ اگر اس کی جگہ پر میں ہوتا تو شاید یہی کچھ کرتا۔''

''یعنی تمہیں یہ بات قبول ہے کہ تمہاری بہن کسی کو پسند کرے اور اس سے شادی کرنا چاہے؟''

''جی میڈم! میرا مذہب مجھے یہی کہتا ہے۔''

''ہم سب کا مذہب ایک ہے۔''

''جی! مگر..... عمومی طور پر عورت کیلئے مردوں کا رویہ اور سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ میں بھی گنوار تھا۔ اب مگر نہیں ہوں۔ آپ سے بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔ اگر مجھے اپنی پسند کی شادی کا حق حاصل ہے تو میری بہن کو بھی ہے۔'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

''کیا جب تم نور پور میں رہتے تھے، تب بھی ایسا ہی سوچتے تھے؟'' وہ مجھے گہری نظروں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''کہا تو ہے کہ میں پہلے ایسا نہیں تھا..... ڈاکٹر شاہ جی کی صحبت نے میرا زندگی کو دیکھنے کا انداز کسی حد تک بدل دیا تھا۔ پھر آپ کی باتوں نے نیا رُخ دکھا دیا۔'' میں نے کہا، ''ڈاکٹر شاہ جی کی باتیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ میں اس سے پڑھا کرتا تھا۔ بہت کچھ سنا کرتا تھا۔ ان سنی ہوئی باتوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ مذہب اور قانون عورت اور مرد کیلئے ایک جیسی حدود رکھتا ہے۔ ان حدود کا احترام کرنے میں ہی معاشرتی بقا پنہاں ہے۔''

''کیا تم نے آج ڈاکٹر شاہ جی کو بدلا ہوا پایا؟''

''نہیں..... وہ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا میں نے نور پور میں آخری مرتبہ دیکھا تھا۔''

''کچھ تو بدلا ہوگا؟''

''میں بغور نہیں دیکھ پایا کیونکہ میں نگینہ کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔''

''ہوں.....'' وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر پوچھنے لگی، ''وہ بدلنے والی مٹی کا بنا ہوا نہیں ہے۔ پتھر

ہے۔اور ہاں! تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد اپنی اغوا شدہ بہن کا حصول تھا۔ وہ مل گئی۔ اب تم بہت شانت ہو گے؟''

''جی میڈم! یوں لگتا ہے جیسے میرے سینے پر پڑی ہوئی بھاری سل ہٹ گئی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔یعنی اب تم زیادہ یکسوئی سے کام کرو گے۔کیا خیال ہے؟''اس نے پوچھا۔

''یس میڈم! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ چوبیس گھنٹے کی بے چینی سے نجات پانا اچھا بہت لگا ہے۔''میں نے وثوق سے کہا۔

''تم نے ڈاکٹر شاہ جی کو میرے بارے میں بتایا؟''

''مثلاً کیا؟''میں چونکا۔

''یہی کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہو؟''

''نہیں میڈم! موقع نہیں ملا۔''

''اگر تم اسے کچھ بتاتے تو تمہارے خیال میں اس کا ردِعمل کیا ہوتا؟''اس کی دلچسپی کھلنے لگی تھی۔

میں نے کندھے اُچکائے،''سوری میڈم! وہ بہت گہرا آدمی ہے۔ جہاں کچھ نہیں کہنا چاہیے، وہاں وہ کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔جہاں بولنا ہو، وہاں وہ خاموش رہ کر حیران کر سکتا ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اپنے موبائل فون پر کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ کال ملنے پر بولی،''ڈاکٹر صاحب! نگینہ کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دیں۔''

پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی اور دوسری طرف سے دی جانے والی رپورٹ سنتی رہی۔ رپورٹ سن کر بولی،''ٹھیک ہے.....اس کا خصوصی خیال رکھیے گا۔اور ہاں! اُسے بیسمنٹ وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا ہے ناں؟''

دوسری طرف سے دیا جانے والا جواب سن کر مطمئن ہو گئی۔ کال منقطع کر کے مجھ سے مخاطب ہوئی،''نگینہ کا کامیاب آپریشن ہو گیا۔اب وہ بہت بہتر حالت میں ہے۔ ڈاکٹر ظہور اختر بتا رہا تھا کہ اُسے خون کی دو بوتلیں دی گئی ہیں۔ چند دنوں میں ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔شہریار! تم نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا جو اُسے پھینک نہیں دیا بلکہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ساتھ چمٹائے رکھا۔ اگر اس کی حالت دیکھ کر مایوس ہو جاتے اور راستے

میں کہیں ڈال دیتے تو وہ یقینی موت کا شکار ہو چکی ہوتی۔''

مجھے اپنی تعریف پر خوشی ہوئی۔ اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے جواب نہیں دیا بلکہ کسی سوچ میں مستغرق ہو گئی۔

ایک ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا، ''کیا میں بیٹھ جاؤں؟''

میرا پوچھنے کا انداز ایسا تھا، جیسے میں کہہ رہا ہوں کہ 'اب تو میں کھڑے رہ کر تھک بھی گیا ہوں۔' اس نے صوفے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ بدستور اپنی دھن میں مگن رہی۔ میں نے بھی اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھتے رہنا بھی بہت مشکل تھا۔ آنکھوں سے گزر کر اس کا حسن سر چڑھ کر بولنے لگتا تھا اور خود پر اختیار لمحہ بہ لمحہ کمزور پڑنے لگتا تھا۔

ایسے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میڈم نے 'یس کم اِن' کہا۔ دروازہ کھلتے ہی زرمینا کا چاند جیسا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھ لائی تھی۔ شاید میڈم نے اُسے پہلے سے حکم دے رکھا تھا کیونکہ میری موجودگی میں اس نے زرمینا کو ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ زرمینا کو دیکھتے ہی مجھے سونیا یاد آئی۔ اس کوٹھی میں گزرنے والی پہلی رات میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ لان میں۔ اور وہ رات کو میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ پھر خانزادی اسما کو جب اغوا کر کے کوٹھی میں لایا گیا تو اس سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ میری ثابت قدمی آزمانے کیلئے میڈم نے اس کی تپش انگیز جوانی کو چارہ بناتے ہوئے میرے سامنے رکھا تھا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جیتا جاگتا حسن اس کی غداری کے سبب خاک میں مل گیا۔ میر وشاہ نے بڑی سنگ دلی سے اُس کیلئے موت کی سزا تجویز کی تھی۔

زرمینا نے سر ہلا کر مجھے سلام کیا۔ ایک زندہ مسکراہٹ سے نوازا۔ پوچھا، ''کیسے ہیں آپ؟''

میں نے 'درست ہوں' کہا۔ میڈم نے اُسے چائے رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی ساتھی لڑکیوں کے بارے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ رضوانہ ڈیٹ پر تھی جبکہ اس کی روم میٹ زیب النسا عرف زیبی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تین چار دنوں سے کمرہ بند ہوئی پڑی تھی۔

میڈم نے شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، بولی، ''زرمینا آج فارغ ہے..... تمام رات..... تم اگر چاہو تو یہ تمہیں گیسٹ روم میں لے جا کر سلا سکتی ہے۔''

میں میڈم کا عندیہ بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا، ''شکریہ میڈم! میں ایسا بھی تھکا ہوا نہیں ہوں

کہ زرینا کو زحمت دوں۔''

زرینا شرارت آمیز انداز میں بولی، ''آپ ماس کے نہیں، پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔''

میں نے ذرا جھینپ کر چائے کا کپ اُٹھالیا۔

''میر وشاہ نہیں آیا..... تم نے اُسے فون کر دیا تھا ناں؟'' میڈم نے اُسے مخاطب کیا۔

''جی میڈم! میں نے اُسے آپ کا حکم سنا دیا تھا۔ فون پر۔ مگر ابھی تک نہیں آیا۔ شاید تھوڑی دیر میں پہنچ جائے۔''

''کہیں بگڑا نہ بیٹھا ہو؟'' میڈم کے لہجے میں ایک ذرا ناگواری اور شکایت کا عنصر شامل تھا۔

''جی میڈم! وہ ہے تو ایسا ہی..... پر کہہ رہا تھا کہ رات کو آ جاؤں گا۔''

''او کے! تم جاؤ..... ضرورت پڑی تو بیل دوں گی۔'' میڈم نے چائے کا کپ اُٹھایا، بغیر گھونٹ بھرے تپائی پر رکھ دیا اور موبائل فون سے الجھنے لگی۔ وہ کسی نمبر پر کال کرتی تھی، پھر فوراً ہی کاٹ دیتی تھی..... وہ کسی سے بات کرنے کی خواہش رکھتی تھی مگر نامناسب خیال کرتے ہوئے اپنے ہاتھ روک لیتی تھی۔

ابھی زرینا کو کمرے سے نکلے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میر وشاہ کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں پڑی، ''اڑے حسن کی دیوی..... جرا رُک تو..... ایک آدھ غمجا (غمزہ) تو دیکھ لینے دیوت ناں اِس سالے میر وشاہ کو..... تیرا کیا جاوت گوری..... چل اندر ماڑی رانی کے پاس.....''

میڈم نے ہونٹ بھینچ کر مجھے دیکھا۔ بیک وقت ہم دونوں مسکرائے۔ لمحہ بھر بعد زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ میں بے سبب ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ دیکھا۔ میر وشاہ آج بہت مختلف حلیے میں میرے سامنے تھا۔ اس نے جینز کی سیاہ رنگ کی تنگ سی پینٹ اور شوخ سرخ رنگ کی بوائے اسٹائل شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال تیل میں چپڑ رکھے تھے اور سیدھی مانگ نکال رکھی تھی۔ مجھے ہنسی کا دورہ پڑتے پڑتے رُک گیا کیونکہ اُس نے پیروں میں اونچی نوک والا 'چیکو کھسہ' پہن رکھا تھا جبکہ سر پر وکٹورین طرز کا ہیٹ۔ اس کا حلیہ کبھی بھی 'جائز' نہیں ہوتا تھا مگر آج تو اس نے حد کر رکھی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے میڈم کی طرف دیکھا جس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے میر وشاہ! ایسے کمرے میں داخل ہوا جاتا ہے؟'' میڈم کا لہجہ خاصا برہم تھا۔

میروشاہ نے زرمینا کی کلائی تھام رکھی تھی اور اُسے باقاعدہ کھینچتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ زرمینا کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر میروشاہ کی گرفت خاصی سخت تھی۔ میڈم کے قریب لا کر بولا، ''جرمینا! جرا ایدھر رکت..... بھاگ نہ لیوت۔ مہارانی بھی کمال کرت؛ اتے بڑے کمرے میں ایک آدھ تھوک دان بھی رکھ لیوت تو کیا گجب (غضب) ہووت.....''

اس نے زرمینا کا ہاتھ چھوڑ کر اُسے وہاں رکنے کا حکم دیا اور بھاگ کر کمرے سے باہر نکلا۔ وہ گیلری میں پان تھوکنے گیا تھا۔ چند لمحوں بعد پھر مسخروں کے سے انداز میں اچھلتا ہوا زرمینا کے سر پہنچ گیا۔ میڈم کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے بولا، ''دیکھ مہارانی! جرمینا کو میرو شاہ نے اک گھڑی رکنے کا بولت پر یہ نخرہ دکھاوت..... بولے تُو؛ ٹیم نہ ہووت میرے پاس! کیا سالے میروشاہ کی دو ٹکے قیمت بھی نہ ہووت اس شیش محل میں ایب کے؟''

میڈم نے ایک لمبی سانس سینے میں اُتاری۔ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی، ''زرمینا! کیا بات ہے؟''

وہ ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی، ''یہ مجھے چھیڑتا رہتا ہے۔''

''تو.....؟'' میڈم نے پوچھا۔

''تو کیا..... بس ایسے ہی۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔

میروشاہ نے پھر اُس کی کلائی تھام لی، ''بول کیوں نہ دیوت..... آگے بول دیوت ناں! کیا 'ایسے ہی'..... ماڑے کو پتہ لگ جاوت کہ سالی یہ سمجھ لیوت کہ ادھر مال شال نہیں ہووت.....''

''اس کا ہاتھ چھوڑ دو میروشاہ۔ جانے دو۔'' میڈم نے سختی کا مظاہرہ کیا۔ میروشاہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اونچی آواز میں واویلا کرنے لگا۔ اس کی لمبی چوڑی بیان بازی کا خلاصہ یہی تھا کہ اب میڈم کو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اس لیے اپنی دو ٹکوں کی ملازماؤں سے اس کی بے عزتی کرواتی تھی۔

اس نے اپنی مخصوص اچھل کود کے ذریعے جب اپنا احتجاج ریکارڈ کروا لیا تو میڈم نے قدرے لاپروائی سے زرمینا سے کہا، ''ٹھیک ہے۔ ایسے ہی سہی۔ تم میروشاہ کو چھیڑنے دو۔ نہیں! بلکہ خود چھیڑو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ میروشاہ کتنا بڑا سورما ہے۔''

''یہیں؟'' زرمینا کے حلق سے کراہتی ہوئی آواز نکلی۔

''یس! کم آن!'' میڈم نے ہاتھ لہرایا۔

زرمینا نے ٹرے تپائی پر رکھی، پلٹی۔ میر وشاہ اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ کلائی چھوڑ کر پھدکتا ہوا بیڈ کی دوسری جانب چلا گیا۔ دونوں ہاتھ لہرا کر بولا، ''اَب چلی جاوے تو..... ماڑے کو نمٹنا آوت ہے ایسے کچے غنچوں سے..... ابھی مہارانی تما شا دیکھنا مانگت پَر تو چل بھاگ ایدھر سے.....''

زرمینا میڈم کا اشارہ پا کر ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میڈم نے طنزیہ لہجے میں کہا، ''بس میر وشاہ! بہت جلد پھوک نکل جاتی ہے تمہاری۔ نہ چھیڑا کر اِن بے چاریوں کو۔ اگر میں نے انہیں اجازت دے دی تو یہ تمہارا ناطقہ بند کر دیں گی۔''

''ہاں! ہاں! ماڑے کو اندا جا (اندازہ) ہووت ان پھوکٹ ماریوں کے کرتوتوں کا۔ خیر! ان سے تو بعد میں میر وشاہ نمٹ لیوے گا؛ اب اپنی رانی کے چرن چھووت..... اڑے غنچے! ماڑے لاڈے! ماڑی رانی کے پہلو سے چمٹا بیٹھت..... اڑے واہ! بڑی قسمت ماڑے شیر جوان کی!''

میں نے ہنستے ہوئے سلام کیا۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر درباری انداز میں جواب دینے کے فوراً بعد ہی میڈم کی طرف مڑ گیا، بولا، ''ہائے! یہ سالا میر وشاہ کمجور (کمزور) نہ ہووت تو اس صوفے پر راتاں بھر چمٹا رہوت۔ رانی! ماڑے لاڈے سے دل بھر جاوت تو اس کو پھوکٹ نہ جان لیوت..... ماڑی جان ہے اِس غنچے میں.....''

میڈم کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ تیر گئی۔ بولی، ''ادھر آ کر بیٹھ جاؤ۔ خدا جانے تم صبح صبح کیا کھا کر گھر سے نکلتے ہو۔ شام تک تمہاری بولتی بند نہیں ہوتی۔ بولتے بولتے تھکتے بھی نہیں ہو۔''

''بولن ہی رہ گیا سالی جندگی (زندگی) میں۔ کرن کو تو یہ عمریا مانگے سالی جوانی.....'' اس نے میری طرف اشارہ کر کے بڑے مضحکہ خیز انداز میں کہا، ''بول دے رانی! کیوں بلایا ماڑے کو ایدھر؟ کیا ماڑے کو اپنی عاشقی معشوقی کا تماشا دکھانا ہووت؟''

''بکواس نہ کرو۔ خاموش رہو۔'' میڈم نے ڈانٹا۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میر وشاہ پر میڈم کے غصے اور ڈانٹ پھٹکار کا مطلق اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جب تک میں نے میڈم کی رام کہانی نہیں سنی تھی، مجھے اس کے رویے اور میڈم کی دی جانے والی غیر معمولی رعایتوں پر حیرانی ہوتی تھی۔

وہ منہ پھلا کر بیڈ کی نکڑ پر ٹک گیا۔ میرا جی چاہا کہ میر وشاہ سے اس کے نئے حلیے کے بارے

دریافت کروں مگر میڈم کو سنجیدہ دیکھ کر خاموش رہا۔ وہ بولی، ''شہریار اپنا مشن مکمل کر آیا ہے۔ تم کہو! اس کے پیچھے شجاع آباد تھانے میں کیا کارروائی ہوئی؟''

اس کا موڈ خراب تھا۔ بگڑے ہوئے لہجے میں اس نے بتایا کہ پولیس کے ہاتھ بھٹی خاندان کی حویلی سے سوائے لاشوں کے کچھ نہیں لگا تھا۔ نوروز بھٹی کے دونوں بیٹوں اور پہرے داروں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کیلئے بھجوانے کے بعد پولیس ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے میں مصروف تھی۔ مقدمے کا اندراج نہیں ہوا تھا کیونکہ کوئی مدعی سامنے نہیں آیا تھا۔ میر وشاہ نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ وہ شجاع آباد سے صبح نو بجے ملتان کیلئے روانہ ہو گیا تھا۔ نو بجے کے بعد وہاں کون سے گل کھلے، کیا پلان بنائے گئے، کیا کارروائی ہوئی، اُسے علم نہیں تھا۔

میڈم نے کہا، ''کیا تھانے میں تمہاری علیک سلیک والا کوئی بندہ نہیں ہے؟''

اس نے جوش میں اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ذرا زور سے پڑ گیا۔ 'اوف' کی آواز نکال کر چھاتی سہلانے لگا۔ منہ بنا کر بولا، ''ہائے جوانی! غارت کر دیجو ماڑے کو..... دو سالے ہووت میر وشاہ کے ادھر تھانے میں۔ پر ماڑے سے یہ کیوں پوچھے لاڈی رانی؟''

''رابطہ کر کے اپنی معلومات اَپ ڈیٹ کرو۔'' میڈم نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اڑے واہ رانی! کیا انگریجیاں (انگریزیاں) بولت میر وشاہ سے..... جندہ باد! یہ لو..... ایک دم بات کر لیوت اپنے سیکرٹ ایجنٹ سے۔'' میر وشاہ نے 'سیکرٹ ایجنٹ' کچھ اس انداز سے کہا کہ میں اور میڈم بے ساختہ ہنس پڑے۔

اس نے فون نکالا۔ کوئی نمبر تلاش کرنے لگا۔ بڑبڑانے لگا، ''ماڑی انگریجی پر کھی کھی کر لیوت رانی جی! پر ماڑے سوا کوئی دل والا دکھائی نہ دیوت جالم دنیا میں تیرے کو..... کدھر گیا سالا سیکرٹ ایجنٹ..... ادھر چھپا بیٹھا ہووت..... چل بات کر ماڑے سے.....''

اس نے کال کی۔ رابطہ ہونے پر اپنے 'ایجنٹ' سے رپورٹ طلب کی۔ دو تین منٹ تک سنتا رہا پھر اُسے اپنے مخصوص انداز میں ڈانٹنے پھٹکنے کے بعد فون بند کر کے میڈم کو بتانے لگا کہ دوپہر کو نوروز بھٹی تھانے پہنچ گیا تھا اور اس نے اپنے چند رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ تمام لاشیں وصول کر لی تھیں۔ اس نے نگینہ بھٹی اور اس کے چھ نامعلوم ساتھیوں کے خلاف ابتدائی رپورٹ درج کروا دی تھی۔ اس خونریز واردات کی عینی شہادت اس نے اپنی اور دو ملازموں کی لکھوائی تھی۔ حسبِ دستور زمانہ اس نے حقیقی واقعات کے ساتھ برابر آمیزش کرتے ہوئے

ایف آئی آر میں واردات کی نئی کہانی پیش کی تھی اور نگینہ کو بدچلن قرار دیتے ہوئے وجہ عناد یہ لکھوائی تھی کہ وہ اور اس کے دونوں بیٹے اپنی چچازاد نگینہ کو آوارگی اور بدچلنی سے منع کرتے تھے، اس لیے وہ ایک رات گھر سے بھاگ گئی اور گزشتہ رات اپنے آوارہ ہمراہیوں کے ساتھ حملہ آور ہوئی تھی۔ اس نے نگینہ کے کئی اسنیپ شارٹ بھی تھانیدار کے حوالے کر دیے تھے تاکہ اس کی تلاش میں آسانی رہے۔

میر وشاہ کے منہ سے تفصیل سننے کے بعد میڈم نے کہا، ''یہ تصویروں والا معاملہ خراب ہے۔ پولیس ان تصویروں کو مشتہر کر دے گی۔''

''کب؟'' میر وشاہ کا لہجہ استہزائیہ تھا، ''چھ مہینے لاگت ہیں پولیس کے لاڈوں کو جوڈیشل فائل تیار کرن میں..... پھر سمن شمن..... سال بعد عدالت اشتہار کا حکم دیوت..... نہیں جانت کیا؟''

''میر وشاہ! تم ٹھیک کہتے ہو مگر عدالتی کارروائی سے قبل پولیس مکمل ریکارڈ اور تصاویر ائر پورٹ اتھارٹی کو دے سکتی ہے۔ ای سی ایل میں اس کا نام درج کروا سکتی ہے۔'' میڈم نے تشویش بھرے انداز میں کہا، ''اس صورت میں نگینہ کینیڈا کیسے جائے گی؟ ائر پورٹ پر دیکھتے ہی گرفتار کر لی جائے گی۔''

میر وشاہ نے محض کندھے اُچکانے پر اکتفا کیا۔

''میں نے کہا، ''مگر میڈم! آپ کے خدشات قبل از وقت ہیں۔''

''امکانات کو سامنے رکھ کر لائحہ عمل تیار کرنا ہوتا ہے۔'' وہ بولی۔

میر وشاہ نے سٹ پٹا کر کہا، ''ماڑے کو یہی خطرہ ہووت تھا رانی جی! اس لیے تو روکت تھا کہ بدیشی لونڈیا کو ایدھر اودھر ڈال دیوت۔ یہ قدم نہ اُٹھاوت..... پَر سالا میر وشاہ شکل سے ہی چغد لاگت ناں! ماڑی بات کبھی نہ مانت ہے رانی..... اب بھگت لیوے ناں جان کا عجاب (عذاب)!''

''تو کیا میں اسے ایسے ہی جھٹک پھینکتی؟'' میڈم نے برہمی سے کہا۔

''وہ لونڈیا کیا تیری خالہ جاد (خالہ زاد) لاگت ہووے؟'' میر وشاہ ہتھے سے اکھڑ گیا، ''حرام جادی کے لیے دُلھا ڈھونڈٹ؛ دلہنیا بناوت؛ اس کے بچے کھلاوت..... ماڑے کو سن لیوت کہ جرورت کیا ہووت اس کے اِتے ناج (ناز) نخرے اُٹھانے کی..... دوزخ (دوزخ)

سے جندہ نکال لاوت تو جہاج (جہاز) پر لادیوت..... اس سالی حرام جادی کا غصہ ٹھنڈا کرن اِتا جروری کیوں ہووت کہ ماڑے غنچے کو تندور میں بھوڑ دیوت..... بول ناں..... اب کیوں نہ بولت ماڑے سامنے؟''

میڈم نے ہاتھ لہرا کر اسے خاموش کرایا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ پھاڑ کھانے والی آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ بیچ بیچ میں مجھ پر بھی سلگتی ہوئی نگاہ ڈال کر سمجھا دیتا کہ میں نے اس سے پوچھے بنا اتنا بڑا اقدام اٹھا کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اسے میرا یوں خطرے میں کود جانا ہضم نہیں ہوا تھا۔

میڈم بولی، ''خیر! اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ جب وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوگی، سوچوں گی کہ اسے کیسے ملک سے نکالا جا سکتا ہے۔ ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ پیاجی نے کیا رپورٹ دی ہے؟''

میروشاہ نے بتایا کہ پیاجی زورآور کی جاسوسی پر مامور ہے۔ اس نے رپورٹ دی ہے کہ زورآور سمن سے ملتان آ گیا ہے۔ ابھی اپنے گھونسلے میں دُبکا بیٹھا ہے۔

میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ پھر سخی محمد کے بارے استفسار کیا۔ دونوں کی باہمی گفتگو سے مجھے پتہ چلا کہ میڈم نے سخی محمد کو سردار حیدر خان کی نگرانی پر تعینات کر رکھا تھا۔ وہ اس کی محتاط نگرانی کرتے ہوئے اس کے معمولات نوٹ کر رہا تھا۔ مجھے میڈم کی شیطانی کھوپڑی پر حیرانی ہوئی۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی محاذ کھولے رکھتی تھی اور کسی بھی جانب سے غافل نہیں رہتی تھی۔ چومکھی جنگ لڑنے کا ہنر جانتی تھی۔ شاید اس کی بے تحاشا کامیابیوں کا سہرا اس کے اِسی وصف کے سر جاتا تھا۔

میں محویت سے دونوں کے درمیان ہونے والی سنسنی خیز گفتگو سن رہا تھا۔ میڈم نے یہ کہہ کر بحث کی بساط سمیٹ دی، ''میروشاہ! تمہیں زیادہ محنت کرنا ہوگی۔ میں نے یارن خان کی بیٹی عافیہ خان کی سپاری پکڑ رکھی ہے۔ دو کروڑ کی۔ ایک کروڑ روپے سخی محمد نے وصول کر کے مجھ تک پہنچا دیے ہیں۔ باقی رقم کام مکمل ہونے پر ملنی ہے۔ میں نے ڈیلنگ کی آدھی رقم میں یہ سپاری زورآور کو دے رکھی ہے۔ اس نے ابھی اس پراجیکٹ پر کام شروع نہیں کیا۔ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو زورآور کو میدان میں اترنے پر مجبور کیا جائے یا پھر سردار حیدر خان کا کانٹا نکال دیا جائے۔ ابھی یارن خان، میاں دلبر اور حیدر خان تینوں زندہ و سلامت دندناتے پھرتے ہیں۔ میں جلد از جلد اس کھیل کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔''

میر وشاہ نے اپنے مخصوص انداز میں میڈم کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا، ''ماڑے کو تو اتنا پتا ہوت کہ ماڑی رانی خوش رہوے..... دنیا گئی پھوکٹ میں..... بھاڑ میں..... چندروج (روز) میں ہتھیلی پر سرسوں جما دکھاوت میر وشاہ۔ فکر نہ کرت، انتجار (انتظار) کرت۔''

وہ جانے کیلئے کھڑا ہو گیا۔ میڈم پر الوداعی نظر ڈال کر میری جانب آیا۔ میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے کندھے پر اپنا منحنی سا ہاتھ مار کر بڑے مزاحیہ انداز میں بولا، ''کیوں بے لاڈے! دیکھت..... کیسا لاگت ہے سالا میر وشاہ اس تھری پیس میں؟''

میں نے مسکراتے ہوئے اس کا 'تھری پیس' سوٹ ملاحظہ کیا۔ تعریف کی۔ کہا، ''ایک دم فرسٹ کلاس!''

میڈم کھلکھلا کر ہنسی۔ میر وشاہ پلٹے بغیر بڑبڑانے کے انداز میں بولا، ''سالی جل بھن جاوت ہے میر وشاہ کی ٹور شپاد دیکھ کر..... ماڑی غلطی ہووت کہ اس سالی کو رانی..... نہیں مہارانی بنا کر سر پر بٹھالیوت.....''

میڈم نے اس کے ریمارکس کا برا نہیں منایا بلکہ صوفے کے سائیڈ ڈیک پر پڑا ہوا سگریٹ کیس اُٹھایا۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا، ''تم سے کون جیلس نہیں ہوتا میر وشاہ!''

وہ منہ بنا کر، مجھ سے ہاتھ ملا کر باز ولہراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اپنے پیچھے دروازہ زور دار آواز کے ساتھ بند کر گیا۔ گیلری میں اس کے چیخنے کی آواز گونجی، ''اڑی جرمینا..... حرام جادی! کدھر چھپ جاوت ہے۔ بڑا چھیڑن مانگ ماڑے کو..... جرا سامنے آوت ناں ایب کے..... جرا (ذرا) درشن تو دیوت سالے میر وشاہ کو۔''

میڈم کے لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تیر گئی۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کے بعد بولی، ''شہر یار! بہت تھوڑا عرصہ باقی ہے۔ بلکہ چند سانسوں کا فاصلہ ہے تینوں سورماؤں کا مجھ سے۔ میں اب اس پوزیشن میں ہوں کہ ان سے نمٹ سکتی ہوں اور نمٹنے کا فوری ارادہ بھی رکھتی ہوں۔ کیا خیال ہے؟''

میری دلی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا، ''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ان لوگوں پر زندگی مختصر کر دی جائے۔ انہیں نشانِ عبرت بنا دیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے؛

ان تینوں میں سے سردار یارن خان پر ہمیں زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ وہ بہت تیز طرار شخص ہے۔''

''میاں دلبر بھی اُس سے کم نہیں ہے۔'' میڈم نے لمبا کش پھیپھڑوں میں اُتارتے ہوئے کہا، ''البتہ حیدر خان تر نوالہ ہے۔ پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ عافیہ خان کو اغوا کر کے یارن اور حیدر خان کو آپس میں لڑوا دوں گی۔ یہی ہاتھ میاں دلبر سے کروں گی۔ اب سوچ رہی ہوں کہ اتنا لمبا چکر چلانے کے بجائے ڈائریکٹ ایکشن کر کے ان کا ٹینٹا نکال دوں۔''

''کیا زور آور عافیہ خان کو اغوا کر سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! وہ بہت شاطر انسان ہے۔ موبی اس کے دم پر شہر پر راج کرتا تھا۔''

''کیا زور آور آپ کا گروپ جائن نہیں کرتا؟''

''میں نے اس پر کام نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ پرکشش آفر پر ادھر آ ہی جائے مگر میں اُسے لانا نہیں چاہتی۔''

''کیوں؟''

''وہ بہت اَڑیل اور منہ زور ہے۔ راز دان بننے کے بعد کسی موقع پر بگڑ گیا تو بہت نقصان پہنچائے گا۔''

مجھے میڈم کی بات سے اتفاق ہوا۔ میڈم کی سگریٹ ختم ہو گئی۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے بیل دی۔ زرمینا آ گئی۔ اسے ٹھنڈی چائے اُٹھانے اور ہاٹ کافی لانے کا حکم دینے کے بعد گنگنانے لگی، ''چھو لے چھو لے، آ مجھے چھو لے.....'' اس کی آواز اس کی طرح دل کے تاروں کو چھیڑنے والی تھی۔ میں بڑی محویت سے اُسے دیکھتا رہا۔ سنتا رہا۔ جی چاہا تھا کہ وہ شب بھر ایسے ہی بیٹھی گنگناتی رہے، میں دیکھتا رہوں، سنتا رہوں مگر ایسی خواہشیں پوری نہیں ہوا کرتیں۔ زرمینا کافی کا مگ اُٹھائے وارد ہوئی۔ میر و شاہ کی شکایت کر کے واپس چلی گئی۔ میڈم کافی کے گھونٹ بھرتی رہی، سوچتی رہی..... کافی ختم ہونے کے بعد بھی اس کی سوچوں کے تانے بانے چھڑے رہے۔

دس منٹ ایسے ہی گزر گئے تو میں نے اکتا کر اسے مخاطب کیا، ''کیا آپ ڈاکٹر شاہ جی کے بارے میں سوچ رہی ہیں؟''

''آں..... ہاں..... نہیں تو..... اسے سوچ کر کیا کروں گی۔'' وہ چونکی، ''میں کچھ اور سوچ

رہی ہوں۔''

''اگر مناسب ہو تو مجھ سے شیئر کر لیں۔''

اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ جان لیوا مسکراہٹ کے سنگ بولی: ''شہریار! میں ایک ہی وقت میں تمہارے، نگینہ اور ڈاکٹر شاہ کے بارے سوچ رہی ہوں۔ تم کر گزرنے والا ذہن رکھتے ہو جبکہ مجھے ہر قدم پر بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ نگینہ، جسے میں پانچ دس دنوں میں کینیڈا روانہ کرنا چاہتی تھی، اب اسے شاید مہینہ بھر سے زیادہ وقت یہاں رہنا پڑے گا۔ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوتی، اسے یہاں رکھنا میری مجبوری بن گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بھٹی خاندان کی طرف سے اس پر براہِ راست مقدمہ درج کرا دیا جائے اور ای سی ایل لسٹ میں نام شامل کرا دیا جائے۔ ایسی صورت میں اسے کینیڈا بھیجنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ زور آور نے غیر متوقع انداز میں پینترا بدلا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس نے ایسا کیا سوچ کر کیا ہے؟ اس کے در پردہ مقاصد کیا ہیں؟ اور وہ آئندہ کیا کر دکھائے گا؟..... ڈاکٹر شاہ جی کی طرف میرا دل ملتفت ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ اس کا وجود میرے لیے بہت مبارک ہے۔ کیا مجھے اس کی طرف لوٹنا چاہیے..... یا نہیں؟..... میں تو یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ اب جبکہ تمہیں تمہاری بہن مل چکی ہے، ماں باپ کے مرکزی قاتل کو تم ٹھکانے لگا چکے ہو؛ تم کب تک میرے ساتھ چلو گے؟ کس وقت ہاتھ کھڑے کر جاؤ گے؟..... میر و شاہ کی سرگرمیاں ایک مرتبہ پھر نہ سمجھ میں آنے والی ہو گئی ہیں۔ وہ جاتا ہے تو لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ زیادہ نخرے دکھانے لگا ہے۔'' وہ صوفے سے سر ٹکا کر، آنکھیں بند کر کے قدرے بھاری آواز میں بول رہی تھی۔ میں ہمہ تن گوش تھا، ''دیکھو شہریار! زندگی سہل کبھی نہیں ہوتی۔ اس کے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ ہر موسم کیلئے مختلف لباس خریدنا پڑتا ہے۔ ہر موسم کی غذا مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارے دھندے کی طلب بھی بدلتی رہتی ہے۔''

میں نے کہا، ''آپ درست کہہ رہی ہیں مگر اپنی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی کم کر دیجئے۔ میں تب تک آپ کے ساتھ رہوں گا جب تک آپ کو میری ضرورت رہے گی۔ ویسے بھی؛ ابھی تو سردار حیدر خان، یارن خان اور میاں دلبر زندہ ہیں۔ فرید ن بھی کہیں چھپا ہوا ہے۔ رنگو قصائی وغیرہ کے مٹ جانے پر میرا کام مکمل نہیں ہو گیا۔ میرے اصل دشمن یارن خان اور حیدر خان ہیں۔ جب تک وہ زندہ ہیں، مجھے چین نہیں آ سکتا۔ رہی بات بہن کے ملنے کی، تو وہ

ایک خوشگوار واقعہ ہے۔ چونکہ مجھ پر ابھی میری چچازاد بہنوں اور بھائی کا بوجھ لدا ہے، اور آپ کی ملازمت کے علاوہ میرا کوئی ذریعۂ معاش بھی نہیں، اس لیے میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

میں نے کہا، ''میڈم! میں خوش فہمی کا شکار تھا کہ آپ مجھ سے محبت کرنے لگی ہیں۔ ہر انسان خوش فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں بھی ہو گیا تھا۔ یہ بڑی بات نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ افتخار حاصل ہے کہ آپ جس چیز کو اہمیت دیتی ہیں، جس سے محبت کرتی ہیں وہ میری آنکھ پر ثبت ہے۔ وہ آنکھ میری ہے۔ وہ ننھا سا تل میرا ہے۔ اگر یہ واقعتاً آپ کی خوش بختی کا سامان ہے تو ہمیشہ آپ کے پاس رہے گا۔''

میڈم کو میرے مضبوط لہجے نے تقویت دی۔ آنکھیں کھول کر مسکرائی۔ اُٹھ کر ایک ادا سے چلتی ہوئی میرے پہلو میں آئی۔ جڑ کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی، ''تم بہت اچھے ہو شہریار!''

''مگر آپ سے کہیں کم.....''

''اگر میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہوں تو؟'' اس کی آنکھوں کی چمک خیرہ کرنے لگی۔

''جی.....'' میرا دل اس بری طرح دھڑکا کہ میری زبان بولنا بھول گئی۔ میں اسے حیرت پاش نظروں سے دیکھنے لگا۔

''میں نے کیا پوچھا ہے؟'' اس نے اپنی انگلی اُٹھا کر ہونٹ پر رکھی۔ مخصوص انداز میں سرکا کر ہونٹوں کے گوشے تک لے گئی۔

''مجھے زندگی میں ملنے والی سب سے بڑی خوشی یہی ہو گی۔'' میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ تب مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ جواب دیا تھا یا اس کی دل آزاری سے بچنے کی کوشش کی تھی۔

''میرا ساتھ دینے والے کو ہر گھڑی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سانس لینی پڑتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی تم ایسا کہہ رہے ہو؟''

''جی میڈم! میں اس مرحلے سے گزر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی گولی بازو کی طرح میرا سینہ بھی چاٹ سکتی ہے مگر سینہ آباد بھی تو آپ کے نام سے ہی ہے ناں!'' میں نے کہنے کو کہہ تو دیا مگر یوں لگا جیسے میرا وجود ایک دم کھوکھلا ہو گیا تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی میڈم

شکیلہ کا جاہ وجلال اپنی جگہ پر قائم تھا مگر میری آنکھوں کے سامنے ہوٹل میں گزاری جانے والی رات کی رانی چندو ماہی کا گداز لمس بس گیا تھا۔ چندو ماہی ایک سادہ دل دیہاتی لڑکی تھی۔ میڈم شکیلہ سادہ دل نہیں تھی۔ ایک خون آشام گینگ کی لیڈر تھی۔

اس نے میرے کندھے پر اپنا رخسار رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کئی لمحے ایسی ہی بے خودی میں گزار کر ہولے سے بولی، ''شہریار! میں تھک گئی ہوں۔''

میں نے کہا، ''کیا مطلب؟ کیا اس تیز رفتار زندگی سے اکتا گئی ہیں یا.....''

''جو تم 'یا' کے بعد کہنا چاہتے ہو، وہی معاملہ ہے۔'' اس کی آواز میں کئی اسرار پنہاں ہو گئے۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ 'یا آپ کی جوانی بے لگام ہو رہی ہے'.....

اس نے دل کی بات زبان کی نوک سے پکڑ کر مجھے مخمصے کا شکار کر دیا تھا۔ میں نے اس کا ننھا سا گلابیں ہاتھ نہایت دھیرے سے تھام لیا۔ سرور کی ایک سرپھری لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ ایسے میں وہ گھڑی یاد آ گئی جب میڈم کے فارم ہاؤس میں ایک شب اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس گھڑی اس نرم و نازک سے ہاتھ کی حشر سامانیوں نے مجھے بے دم اور نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی سخت جانی مجھے دریائے چناب کے بیلے میں بھی نظر آئی تھی۔ وہ دیکھنے میں گلاب تھی۔ بھگتنے میں لوہے کا چنا تھی۔ اس کی ذات میں موجود اتنے بڑے تضاد کو کیا نام دیا جا سکتا تھا؟..... میں نے چند لمحے اس کا ہاتھ سہلایا پھر اپنے تشنہ لبوں سے لگا لیا۔ کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ بڑی محویت اور احساسِ تفاخر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس طرح محجوبانہ انداز میں دیکھتی ہوئی دل میں اُتر گئی اور میں نے بے اختیار ہو کر ہاتھ چھوڑا اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ کھلکھلاتے ہوئے پیش قدمی کی اجازت دینے لگی۔ پھر ایک ذرا توقف کے بعد بڑے جارحانہ انداز میں میرے وجود کی بھول بھلیوں میں سے زندگی کے روشن پہلو تلاش کرنے لگی۔ پیش رفت کرنے لگی۔ چندو ماہی کا زخمی زخمی وجود کہیں پیچھے..... بہت پیچھے رہ گیا جبکہ میڈم شکیلہ دلیرانہ انداز میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے میں مگن ہو گئی۔ ایسے میں کسی بے خود مگر مدھر سر کے آہنگ گنگنانے لگی..... 'اے محبت! تیری قسمت کہ تجھے مفت ملے؛ ہم سے دانا جو کمالات کیا کرتے تھے.....'

وہ ہولے ہولے کپکپا رہی تھی۔ اس کی گنگناہٹ بھی لرز کر جذبات کی سوختہ ترجمانی کرنے لگی۔ ایسے میں گلاب کی لچک دار ٹہنی کی طرح کچھ زیادہ جھک کر مجھ پر لہرائی۔ گلاب ٹوٹ کر

میری جھولی میں بکھر گیا۔ جو اس جہانِ آشفتہ سری میں بکھرنے پہ آئے، وہ بکھرتا ہی چلا جاتا ہے۔ میں نے اس کا ہیئر کلپ نہایت آہستگی سے کھول دیا۔ ریشم ریشہ ریشہ بکھر گیا اور میرے آدھے وجود پر سایہ فگن ہو گیا۔ میں اس جواں سال ریشم کی سرسراہٹوں میں کھو کر حسنِ فتنہ انگیز کی پرستش میں سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ نجانے کس ذہنی رو کی یرغمال بن بیٹھی تھی کہ بند آنکھوں کے پیچھے میری تمام ننھی ننھی جسارتوں کو قبول کرتی گئی۔

اگر شہر کی زندگی کے تابندہ طلسم کے پیچھے چھپے ہوئے میڈم شکیلہ کے اصل روپ، چندو ماہی کے کردار سے مجھے شناسائی نہ ہوئی ہوتی تو شاید کبھی بھی اتنی ہمت مجھ میں پیدا نہ ہوتی۔ میں اپنی کم مائیگی اور احساسِ کمتری سے مغلوب رہتے ہوئے دہلیز کے پار کھڑا ہی دم توڑ دیتا یا سرد آہ بھر کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اظہارِ محبت کے کارِ جنوں نے چند لمحوں میں کئی صدیوں کا سفر طے کر لیا۔ اس کے رخساروں کی تپش اور بند آنکھوں کی پر گداز اجازتوں نے جونہی میرے ہونٹوں کو جلانا شروع کیا اور میری سانسوں میں بچپنے کی تیز گامیاں گھل گئیں، وہ ایک جھٹکے سے علیحدہ ہو گئی۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اپنی ریشمیں زلفوں کے چیلنج کرتے ہوئے جادو کی بساط کو سمیٹنے لگی۔ اس کے گال اور آنکھوں کے حلقے دہک رہے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کا ارتعاش اس کے اندر کے مدوجزر کی خبر دے رہا تھا۔ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی، ''تم نے تو چند ہی لمحوں میں مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ یور آر ویری کریزی.....''

میں نے اپنے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا۔ ایک ذرا سنبھلاؤ دیا مگر اس گھڑی دل کم بخت کہاں سمجھنے اور سنبھلنے والا تھا۔ پہلو میں احتجاج کرنے لگا۔ میں نے کہا، ''آپ قریب ہوتی ہیں تو دل پر اختیار نہیں رہتا۔ کہیں آپ ناراض تو نہیں ہو گئیں؟''

وہ بولی، ''ہاں تو..... کیا منانے کا ہنر آزمانا چاہتے ہو؟''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ شرارت پر مائل تھی۔ میں بھی بہک گیا۔ ایک دم اسے بانہوں میں سمیٹ کر منانے کی کوشش کرنے لگا۔ عشق کی پہلی گستاخی کی۔ اس کے ہونٹ مجھے ستاتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے میرے ارتکاز کو پاش پاش کر دیتے تھے۔ ان کا احتساب ضروری تھا۔ ہمت دیدنی تھی جب میں نے ان دشمنِ جاں پھولوں کی شوخیوں کو سمیٹ لیا۔ مانا کہ وہ بہت خوب صورت تھی..... مگر اس گھڑی..... اس کا بے ساختہ تعجب اس کے حسن کی بازی مات کر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکیلا۔ میں لڑکھڑا کر صوفے پر گر گیا۔ وہ مٹھیاں بھینچے کھڑی حیرت

سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اپنا پہلو ٹٹولا۔ کچھ ہوا تھا؟ سوچ میں پڑ گیا..... کچھ ہوا بھی نہیں تھا مگر..... کچھ بچا بھی تو نہیں تھا۔ ایسا کیا دل پر گزر گیا تھا؟..... سچ کہتے ہیں؛ عشق میں پانے کا سوال نہیں؛ صرف سیکھنے کی جہت ہوتی ہے۔ میں نے کیا سیکھا تھا؟..... آگ سے ٹکرانے کا ہنر..... یا برف میں آگ لگانے کا سلیقہ؟..... وہ شعلۂ نوخیز بنی کئی ثانیوں تک کھڑی گھورتی رہی۔ ایک ذرا حوصلہ دامن گیر رہا کہ اس کی آنکھوں میں حوصلہ شکنی کا عنصر نہیں تھا۔ بجا کہ حوصلہ افزائی بھی نہیں تھی۔ کچھ اور ہی تھا۔ میں اسی 'کچھ اور' کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ اُس نے چٹکی بجائی۔ انگلی کا اشارہ الماری کی طرف کیا۔ بولی، ''وہ نکال لاؤ.....''

میں سمجھ گیا۔ وہ پینا چاہتی تھی۔ پی کر بہکنا یا بہلنا چاہتی تھی۔ میں نے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری اور اُٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔

''سنگل پیگ بنا دو۔ برف نہ ڈالنا۔ صرف پانی۔ سوفٹ پیگ بنانا آتا ہے ناں؟''

اس نے یہ کام بھی سکھا رکھا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے شیشے میں آگ بھر کر پیش کر دی۔ وہ گلاس ہاتھ میں تھام کر چند لمحے کھڑی رہی، پھر بیڈ پر چلی گئی۔ ایک گھونٹ بھر کر گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ خود نیم دراز ہو گئی۔ کروٹ بدل کر بانہوں میں چہرہ چھپا گئی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ سر اُٹھا کر بولی، ''شہریار! محبت کیا ہوتی ہے؟''

میں گڑبڑا یا۔ کیا بتاتا؟..... میں محبت کے دشت میں سفر کرنے والا کوئی فلسفی نہیں تھا۔ عام سی سوچ رکھنے والا دیہاتی شخص تھا۔ دیہات میں محبت کے اظہار کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ لڑکیاں شرما کر اس لفظ سے پردہ کرتی ہیں۔ لڑکے اس شجرِ ممنوعہ کو چھیڑ لیتے تھے مگر اپنے ہم عمروں میں..... وہ باتیں از بر تھیں مگر یہاں کرنے کی نہیں تھیں۔ بے بسی سے کندھے اُچکا کر بولا، ''آپ بہتر جانتی ہیں۔''

وہ مسکرائی، ''ہاں! میں بہتر جانتی ہوں کیونکہ میرا دل زندہ ہے۔ اس گھڑی جاگتا ہے جب اسے جاگنا ہوتا ہے۔ مگر تم کیوں نہیں..... تم کیوں نہیں جانتے؟..... کیا تمہیں کسی سے محبت نہیں؟ اگر نہیں تو پھر تم اپنی منگیتر کو یاد کیوں کرتے تھے؟..... بھلا سا نام تھا اُس کا..... ہاں!..... غزالہ۔ غز..... آ..... لہ..... یعنی ہرنی کے جیسی..... ہے ناں؟ پر ٹھیک ہے۔ تمہیں محبت نہیں، کچھ اور ہی ہوا ہو گا مگر مجھے محبت ہوئی تھی۔ میر زادے عمر حیات سے..... اُسے دیکھ کر میں دنیا کو

بھول جاتی تھی۔ سوچا کرتی تھی کہ اگر اس نے مجھے نہ اپنایا تو میں مر جاؤں گی۔ پر نہیں مری..... کیوں؟..... کیونکہ وہ صرف فاتح تھا۔ مجھے فتح کرنا خواب تھا اس کا۔ فتح کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ میں کوئی ایسی ایسرائی سلطنت نہیں ہوں..... اور جب مجھے ڈاکٹر منور شاہ نے سہارا دیا..... اپنے گھر میں رکھا اور تربیت کی؛ تب میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ مگر آہ! وہ سنگ دل تھا۔ مجھے سہارا دے کر پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تب میں نے سوچا تھا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ میں اس سے محبت کرنے لگی تھی اور محبت یا تو گروی رکھ دیتی ہے یا مار دیتی ہے..... پر نہیں۔ وہ محبت نہیں تھی..... ٹرانس فیریشن تھی جو کسی بھی افسر اور ماتحت میں ہو جایا کرتی ہے۔ کسی بھی استاد اور شاگرد کے درمیان ہو جاتی ہے۔ محبت کے جیسی ہی ہوتی ہے..... اور میں نہیں مری..... بلکہ نئی زندگی لے کر اُٹھی..... پھر اجمل گیلانی میری زندگی میں بخت کا سورج بن کر طلوع ہوا اور محبت کی کالی رات تان کر سو گیا۔ میں تب بھی نہیں مری۔ مرنا تو درکنار، اجڑی بھی نہیں..... پھر محبت کیا ہے؟''

اس نے ابھی پی نہیں تھی مگر بہکنے لگی تھی۔ شاید جوانی کا نشہ چڑھ گیا تھا۔ میں نے کہا، ''آپ فضول سوچ رہی ہیں۔ محبت مارتی نہیں ہے بلکہ انسان کو طاقت ور کر دیتی ہے۔''

''ہاں! شاید ایسا ہی ہوا ہے میرے ساتھ..... توڑنے والوں نے کسر نہیں چھوڑی..... جوڑنے والوں نے بھی اپنی سی کر دکھائی اور میں اس حال میں زندہ ہوں کہ کئی زندگیوں کو گل کر سکتی ہوں۔ مگر ایک بات تو بتاؤ.....''

وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ تپائی پر سے گلاس اُٹھایا۔ اوندھے لیٹے لیٹے ایک گھونٹ بھرا۔ ہونٹوں پر آشفتہ سر زبان پھیری۔ مجھے دیکھا۔ ایک ذرا غصے بھری آنکھ سے، بولی، ''اگر زندگی کیلئے محبت اتنی ہی لازمی ہے تو پھر ایک ہی مرتبہ کافی کیوں نہیں ہوتی..... ایک کے بعد دوسرا کیوں اچھا لگتا ہے؟ میں کہتی ہوں کہ سبھی مرد بے وفا ہیں، سبھی سنگ دل ہیں مگر پھر کیوں کسی مرد کو دیکھ کر اپنا سبق بھول جاتی ہوں؟ میر زادے، ڈاکٹر شاہ، اجمل گیلانی اور تم..... تم سب میں فرق اگر کوئی ہے تو وہ دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ اگر کوئی فرق نہیں تو میں محبت کا جرم چوتھی مرتبہ کرنے پر مجبور کیوں ہوں؟ کیا تمہارے پاس ان سوالوں کا جواب ہے؟''

میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''نہیں میڈم! میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تو پھر تم غزالہ کی زندگی میں مجھے کیوں محبت کرنے لگے ہو؟'' اس نے گلاس لبوں سے لگا کر روک دیا اور اسے آہستہ آہستہ گھمانے لگی۔ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، ''وہ مرگئی ہوتی، بے وفائی کر کے کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ گئی ہوتی، تب تم کوئی اور راستہ دیکھتے۔ کسی اور منزل کی طرف قدم بڑھاتے۔ کیا میں نے غلط کہا ہے؟''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اگر میری محبت کا دم بھر رہی تھی تو اس کے پاس مضبوط جواز موجود تھا۔ اس کے دو محبوب راہی عدم ہو گئے تھے۔ ایک نے جھٹک کر اپنے آپ سے جدا کر دیا تھا۔ مگر میری غزالہ نے نہ تو مجھے چھوڑا تھا، نہ کوئی اور در کھٹکھٹایا تھا اور نہ وہ مری ہی تھی..... میں نے ایک لمبی سانس خارج کی، کہا، ''غزالہ کس وقت مجھ سے جدا ہو گئی، میں آپ کا کیسے ہو گیا، یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اس گھڑی، اس لمحے میں آپ کا ہوں اور آپ کا رہنا چاہتا ہوں۔ بس!''

''کیا محبت بلاوجہ ہوتی ہے؟''

''ہاں..... شاید!'' میں نے مبہم جواب دیا۔

''بلاوجہ کیے جانے والا کوئی کام اہم نہیں ہوتا۔ یعنی محبت بھی غیر اہم ہے؟''

''نہیں..... ہاں..... شاید!''

وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ اوپر تلے دو تین ننھے ننھے گھونٹ بھر کر تادیر ہنستی رہی۔ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ بولی، ''شہریار! تمہاری سنائی ہوئی کہانی میں ایک جھول ہے۔ پتہ کون سی؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں میڈم!'' میں چونکا۔

''ہاں! بتاتی ہوں۔ یہ شراب ہے۔ لوگ اسے آگ کہتے ہیں۔ عجیب آگ ہے کہ معدے میں اترتے ہی وہ باتیں سوجھنے لگتی ہیں جو عقل مندوں کو نہیں سوجھ پاتیں۔ تم ڈاکٹر شاہ جی اور پروین سے مل آئے۔ امیر نواز کے بارے پوچھ آئے۔ مگر وہ..... وہ پولیس آفیسر سلیم شہزاد کا بیٹا..... کیا نام تھا اس کا؟ ہاں..... شاہد سلیم..... وہ تمہیں بھول گیا۔ اس کی محبوبہ کو تم بالکل بھول ہی گئے۔ وہ بھی تو پروین کے ساتھ ہی تھی۔ تمہارے اور تمہارے دوست کھالے کے بیان کے مطابق.....''

''اوہ نو!'' میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ میں واقعی اتنے اہم کردار کو بھول گیا تھا۔ میں نے پروین سے اس کے بارے میں نہ پوچھا تھا اور نہ میرا اس کی طرف دھیان ہی گیا تھا۔ میں

نے قدرے شرمساری سے کہا، ''واقعی میڈم! میں اسے بھول گیا تھا۔ اسے یقیناً وہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔''

''کیا مظفر گڑھ میں ہونے والی ملاقات کے بعد شاہد نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟''

''نہیں..... شاید اس کے سر سے عشق کا بھوت اُتر گیا ہے۔''

''نہیں..... میں اسے جانتی ہوں۔ وہ عشق سے دست بردار ہونے والوں میں سے نہیں لگتا تھا۔''

''تو پھر..... اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

''کچھ بھی ممکن ہے۔''

''مثلاً؟''

''اس کے باپ کا تبادلہ کسی دور دراز کے ضلع میں ہوسکتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کی زبردستی شادی کر سکتے ہیں۔ وہ دیوانہ ہو کر ہوش وخرد سے بیگانہ ہوسکتا ہے اور اس کا باپ اسے کسی مینٹل ہاسپٹل میں داخل بھی کروا سکتا ہے۔'' اس نے شوخی سے کہا اور خالی گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں لال ڈورے تیرنے لگے تھے جو دہرے خمار کے عکاس تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر اپنا موبائل اُٹھا کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد بولی، ''یہ وہ نمبر ہے جس سے تم نے مجھے کال کیا تھا۔ کیا یہ ڈاکٹر شاہ جی کا نمبر ہے؟''

میں نے بتایا، ''نہیں..... یہ اس کے ڈسپنسر کرم علی کا فون نمبر ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔''

''لو..... اسے کال کرو۔ اگر وہ ہسپتال میں ہی رہتا ہے تو ڈاکٹر شاہ جی سے بات کروا سکتا ہے۔''

اس نے اپنا موبائل فون میری طرف اچھال دیا۔ میں نے نمبر پر نظر ڈالی پھر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر کرم علی کی آواز سنائی دی، ''ہیلو! کون؟''

میں نے اسے بتایا کہ میں ڈاکٹر شاہ جی کا دوست ہوں اور اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

وہ بولا، ''ڈاکٹر صاحب اس وقت گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ میرے جگانے پر برا منائیں گے۔ آپ کل کسی وقت کال کیجئے گا۔''

میں نے ماؤتھ ہول پر انگلی رکھی، میڈم کو اس کے جواب سے مطلع کیا۔ وہ بولی، ''اسے کریدنے کی کوشش کرو۔ پتہ کرو کہ ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں ایک عورت مقیم ہے یا دو..... کچھ تو واضح ہو ہی جائے گا۔''

میں نے میڈم کی ہدایت کے پیشِ نظر کرم علی کو ٹٹولنے کی کوشش کی مگر وہ سیانا شخص نکلا۔ فوراً ہی سمجھ کر پینترا بدل گیا۔ بولا، ''نہیں صاحب! میں ڈاکٹر شاہ جی کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ خود ہی ان سے علی الصبح بات کر لیجئے گا۔ اللہ حافظ!''

اس کے ساتھ ہی اس نے کال منقطع کر دی۔ میں نے مایوسی سے میڈم کو دیکھا۔ وہ ہنسی۔ بولی، ''تم ابھی اناڑی ہو۔ ایسے پوچھا جاتا ہے بھلا؟ کوئی بات بناتے، کوئی داؤ پیچ آزماتے..... نو بابا نو..... دنیا اتنی سیدھی سادی نہیں ہے۔ ہر ٹارگٹ آسان نہیں ہوتا۔ ہر منزل مٹھی میں سمٹنے والی نہیں ہوتی بابا!..... ایک پیگ اور بنالاؤ..... دنیا گول ہے۔ گھومتے گھومتے انسان جہاں سے چلتا ہے، وہیں آن رکتا ہے۔ یہ دیکھو..... کمرہ گھوم رہا ہے..... میں بھی گھوم رہی ہوں..... تم بھی گھوم رہے ہو..... ہے ناں؟''

میں سمجھ گیا کہ اس کی کھوپڑی گھوم گئی تھی۔ پیگ بناتے ہوئے میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے پہلا پیگ بہت لائٹ رکھا تھا۔ وہ پینے کی عادی تھی۔ اتنی سی شراب پی کر بہکنے والی نہیں تھی۔ سمجھ آئی کہ وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ مگر کیوں؟ یہ سمجھ میں نہ آنے والا عقدہ تھا۔

دوسرا پیگ پکڑتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ بولی، ''ڈر گئے ناں..... نہیں..... میں بہکی نہیں۔ اتنی سے آگ پر کون جل سکتا ہے۔ میں تھا گنہ گار اسے چومتا رہا؛ تائب نے اس کو دیکھ لیا اور مر گیا۔'' اس نے انگلی مخصوص انداز میں کنپٹی پر گھمائی، بولی، ''اور میں ابھی آؤٹ بھی نہیں ہوئی مگر ہونا چاہتی ہوں۔ ادھر آ جاؤ۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے پلاؤ۔ پینے کا لطف اور ہے..... پلانے کا مزہ اور.....''

وہ بن رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں مجھے بھی بننا تھا؛ سو بن گیا۔

❖❖○❖❖

میرے گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ پروین کے مل جانے کی خوشخبری سننے کے بعد دونوں لڑکیاں اور موجو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ شانو نے پروین کا سر صدقہ اُتارا۔ فرزانہ نے زردہ چاول پکانے کا اہتمام کر دیا۔ زردرنگ کے میٹھے چاول ہم دیہاتیوں کے گھ[illegible]

ہر خوشی کے موقع پر پکائے جاتے ہیں۔ چاولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آنگن سے خوشی کی خبر اُٹھا کر اطراف کے گھروں میں پہنچا آتی۔ چونکہ گلی بھر میں صرف ہم دیہاتی تھے اور اطراف کے تقریباً سبھی مکانات دو اور تین منزلہ تھے، اس لیے مسرت بردار خوشبو میرے آنگن میں ہی چکراتی رہی۔

شانو نے مخصوص سرائیکی رہن سہن کے مطابق پروین کا تاکیدی احوال دریافت کیا۔ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ جب تک تینوں پروین کو اپنی آنکھوں دیکھ نہیں لیں گے، مطمئن نہیں ہوں گے۔ پروین کو دیکھے عرصہ ہو گیا تھا۔ اب جب اس کی خبر مل گئی تھی، صبر کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے چند مجبوریوں کا حوالہ دے کر انہیں صبر آزمائی پر مائل کر لیا تھا مگر جانتا تھا کہ میرا ٹال مٹول زیادہ عرصے تک کام آنے والا نہیں تھا۔

میں نے جب انہیں بتایا کہ اس نے امیر نواز سے شادی کر لی ہے تو دونوں لڑکیوں نے اس خبر کو اتنی اہمیت نہیں دی یا اپنے دلی تاثرات کو مجھ سے کامیابی سے چھپا لیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ انہیں بھی امیر نواز اور پروین کے درمیان رازداری سے طے ہونے والے معاملات کا پہلے سے علم تھا۔ مجھے ایک ذرا دُکھ ہوا۔ سبھی کو علم تھا مگر کسی نے مجھے بروقت نہیں بتایا تھا۔ پھر سوچا، 'اگر مجھے علم ہو بھی جاتا تو میرا ردِعمل کیا ہوتا؟..... کیا میں اپنی خاندانی روایات کے مطابق غیرت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں کو قتل کر دیتا؟'

یہ ایک لاینحل سوال تھا جس سے میں نے سر جھٹک کر چھٹکارا حاصل کیا کیونکہ جو ہو گیا تھا؛ بہتر تھا۔ اگر امیر نواز پروین سے محبت نہ کرتا تو وہ کبھی اس کے پیچھے خوار نہ ہوتا اور جب تک میں پروین تک پہنچتا، وہ شاید زندہ ہی نہ ملتی یا درندوں کے ہاتھوں بری طرح شکستہ بدن ہو چکی ہوتی۔

مجھے کرم علی کا فون نمبر یاد رہ گیا تھا۔ جونہی میں نے نیا موبائل فون خریدا، بارہا کوشش کی کہ میرا ڈاکٹر منور علی شاہ سے رابطہ ہو جائے اور میں اس سے عشرت عرف عاشی کے بارے استفسار کروں مگر کرم علی نے میری کوئی کال اٹینڈ نہیں کی۔ میں نے اپنی خواہش کو ایس ایم ایس کی شکل میں ٹائپ کر کے کرم علی کو بھیجا جس کا جواب نہیں ملا۔ ڈاکٹر شاہ کی عادات کے پیشِ نظر یہ بعید نہ تھا کہ اس نے کرم علی کو منع کر رکھا ہو کہ وہ کسی بھی شخص کی اس سے بات نہ کرائے۔ دل میں عجیب سا حبس بھرنے لگا۔ مجھے نور پور سے آئے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ جب بھی وہاں

گیا، نامساعد حالات میں گیا۔ ایک مرتبہ گھریلو اشیائے صرف بیچنے والے پٹھان سیلز مین کے سوانگ میں گیا تھا۔ تب ایک نظر غزالہ کو دیکھا تھا۔

نور پور کی یاد بے چین کرنے لگی۔ غزالہ کے ساتھ بیتے ہوئے ماہ و سال، کھالے کی رفاقت، سردار بخت خان کی حویلی اور ملکہ، امیر نواز کی بہکی بہکی باتیں، دیوانے شاعر کا پسلیاں جھنجھنا دینے والا کلام..... سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ نور پور کی گلیاں پکارنے لگیں۔ میں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ فون پر میڈم سے رابطہ کیا اور اس سے نور پور جانے کی اجازت طلب کی۔ اس نے پوچھا، ''مگر تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟''

میں نے بتایا، ''میں کھالے اور امیر نواز سے ملنا چاہتا ہوں۔ یارن خان کی سرگرمیوں سے واقف ہونا چاہتا ہوں اور.....''

''اور..... اور اپنی غزالہ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے میری بات کاٹ کر اپنے انداز میں مکمل کر دی۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ جلدی سے بولا، ''نہیں میڈم! میں نور پور جا کر اس سے ملوں گا ضرور مگر اس وقت میرے مطمح نظر میں اس سے ملنا نہیں ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ ہنسی۔

''اگر آپ حکم کریں گی تو میں اس سے ملے بغیر واپس آ جاؤں گا۔''

''اسے دیکھو گے بھی نہیں؟''

''سامنے آ گئی تو دیکھوں گا ورنہ خاص طور پر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔''

''دیکھ لو؟''

''دیکھ لیا میڈم!'' میں نے پروثوق انداز میں کہا۔ دل میں غزالہ کی شبیہہ ابھری۔ لمحہ بھر کے لیے دکھ کی ایک لہر بدن میں سرسرائی۔ میں میڈم شکیلہ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا مگر میرے اندر خوابیدہ محبت ہڑبڑا کر بیدار ہو گئی۔ اس کی توانا مزاحمت نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا، 'دیکھ لیا میڈم! میں اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ملوں گا مگر آپ کو پتہ نہیں چلنے دوں گا۔'

''او کے..... تو پھر جاؤ..... یاد رکھنا کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم غزالہ سے نہیں ملو گے۔ اور ہاں! اس وقت تم پرتھانہ چوک قریشی میں کوئی مقدمہ موجود نہیں ہے۔ جو درج کرائے گئے تھے، انہیں میر و شاہ نے خارج کروا دیا تھا۔ یعنی اگر تم چاہو تو کھلے عام بھی جا سکتے ہو مگر تمہارے علاقے کے فرعون اتنی قوت رکھتے ہیں کہ کسی جرم کے اندراج کے بغیر تمہیں حوالات

کی یاترا کرادیں۔ وہ تم پر براہِ راست حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم میک اَپ میں وہاں جاؤ۔ او کے؟''

''یس میڈم!''

''ہمیں جلد یا بدیر یارن خان کی گردن ماپنی ہے۔ یہ ذہن میں رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے اس کے معمولات کا جائزہ لینا۔''

میں نے 'جی بہتر میڈم' کہا۔ اس نے فون بند کر دیا۔ دس پندرہ منٹ بعد پیاجی نے فون پر رابطہ کیا اور میک اَپ کرانے کیلئے مجھے اپنے ہاں بلایا۔ مجھے میڈم شکیلہ پر پیار آیا۔ اس نے میری کال کے فوراً بعد ہی پیاجی کو میرے میک اَپ کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ پیاجی نے مجھے دیکھ کر بانہیں کھول دیں۔ ہم یوں بغل گیر ہوئے جیسے صدیوں بعد ملے تھے حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔

وہ مستفسر ہوا، ''بولو! کیا بناؤں؟

''گلاب خان!'' میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''نہیں..... میرا دل کسی نئے تجربے پر مائل ہے۔ اگر کہو تو تمہیں میڈیکل ریپ بنا دوں؟''

میں نے کچھ دیر سوچا۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا، ''نہیں پیاجی! میں سیلز ریپ بن کر زیادہ دیر نور پور میں نہیں رہ سکتا۔ وہاں ایک ہسپتال ہے۔ میڈیکل اسٹور کوئی نہیں ہے۔ میرے پاس وہاں زیادہ دیر گھومنے پھرنے کا جواز نہیں ہوگا۔''

''اوہ..... یہ تم نے درست کہا۔ پھر..... جوگی بنا دوں؟ ہتھ دیکھ کے جوگیا دس مینوں.....'' وہ شریر انداز میں گنگنایا۔

میں نے مسکرا کر جواب دیا، ''نہیں پیاجی! گلاب خان کے گیٹ اَپ میں مجھے کوئی پہچان نہیں پایا تھا۔ سوائے کھالے کے۔ کھالے نے بھی محض اس لیے پہچان لیا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھوں کے اس اعجاز کو جانتا تھا۔''

نہ جانے کیوں پیاجی مجھے پٹھان کا روپ دینے سے گریزاں تھا مگر میرے اصرار پر ناچار اس نے کام شروع کر دیا۔ حسبِ سابق اس کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں حرکت کرنے لگے۔ اس نے میرے سر کے بالوں پر تیز بو والا سپرے کیا جس سے میرے بال سرخی مائل بھورے ہو گئے تھے۔ پلاسٹک کے دو ننھے ننھے اسپرنگ میرے نتھنوں میں فٹ کیے اور میری اچھی خاصی ناک

کا حلیہ بگاڑ کر مجھے 'بھینا' کر دیا۔ لمبی اور گھنی داڑھی چسپاں کرنے اور مونچھوں میں اضافی لمبے بال چپکانے کے بعد اس نے میرے سر پر ٹوپی رکھی جس کے اوپر بڑی سی پلو دار پگڑی مخصوص انداز میں جما دی۔ میرے یاد دلانے پر اس نے میری آنکھوں میں سبز لینز بھی فٹ کر دیے۔ پھر اپنے ہاتھ نشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے مسکرایا ''لو..... میں نے تمہیں وہ ہٹی بنا دیا ہے۔ اگوں تیرے بھاگ لچھئے۔''

(آگے تمہارا مقدر۔)

''میں اس تجربے سے گزر چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ نور پور میں کوئی مائی کا لال مجھے پہچان نہیں سکتا۔ پیا جی! تمہارے ہاتھوں میں ہنر نہیں، جادو ہے۔'' میں نے ستائشی انداز میں اس کی تعریف کی۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ لاپروا اور لاابالی طبیعت رکھنے والے پیا جی کی مسکراہٹ میں عجیب سا کرب شامل ہو گیا تھا جسے سرِ دست کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ہر انسان کی زندگی عیاں ہوتے ہوئے بھی خاصی پیچیدہ اور مخفی معاملات کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں بھی ایسا بہت کچھ موجود تھا جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو شہریار؟'' اس نے میری دلچسپی بھانپ لی۔

میں ٹھٹکا۔ بولا، ''پیا جی! مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم اپنا کوئی غم یا اداسی چھپانے کی کوشش میں ہنس کھیل رہے ہو۔ تمہاری ہنسی مجھے کھوکھلی سی لگ رہی ہے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھ پر اپنی آنکھیں مرکوز کرتے ہوئے بولا، ''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔''

''کافی عرصے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ آج پہلے جیسے نہیں لگے، اس لیے تمہارے بارے سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ تمہیں کوئی دکھ ہے؟''

''نہیں تو!'' اس کا انداز بے ساختہ تھا مگر مصنوعی سا محسوس ہوا۔

میں نے کندھے اُچکائے اور الیکٹرونکس کا سامان خریدنے بازار کی طرف نکلنے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے تک میرے ساتھ آیا۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''شہریار! چند دنوں سے میرا دل مسلسل ہول کھانے لگا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ طبیعت کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا تمہارے

ساتھ بھی ایسا ہو رہا ہے؟''

میں نے انکار کیا۔ وہ پیشانی سہلاتے ہوئے بولا، ''مجھے لگتا ہے کہ ہمارا گروپ ٹوٹنے والا ہے۔''

اس نے بڑے عام سے انداز میں بہت بڑا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ میں تھم گیا۔ اسے حیرت بھری نظروں دیکھنے لگا۔ پھر پوچھنے لگا، ''کیا تمہیں ایسے آثار دکھائی دے رہے ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پیا جی! میڈم شکیلہ کے نیٹ ورک کو دیکھتے ہوئے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اتنا بڑا اسیٹ اَپ ختم کرنے میں بھی زیادہ نہیں تو دو چار سال کا عرصہ لگ جائے گا۔''

''نہیں یار! ایسی بھی بات نہیں ہے۔ یہ سارا کھیل تماشا میڈم شکیلہ کے دم خم سے ہے۔ وہ ایک ایگزیکٹو آرڈر کے تحت سارا نظام تحلیل کر سکتی ہے۔''

''مگر مجھے تو ایسی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی جس سے پتہ چلتا ہو کہ میڈم اپنے نیٹ ورک کو توڑنے کا سوچتی ہو۔''

''بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔'' اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اس کی آنکھوں نے فی الفور مجھ سے اختلاف کر دیا۔

''پیا جی! ٹھیک سے بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''میرے پاس کچھ بتانے کیلئے نہیں ہے۔''

''تو پھر تم نے اتنی بڑی بات کیسے سوچ لی؟''

''شہریار!'' وہ متذبذب انداز میں بولا، ''میں میڈم شکیلہ اور میر وشاہ کا حکم بجالاتا ہوں۔ کچھ سوچے اور اختلاف کیے بغیر..... مگر انسان ہوں۔ سوچتا بھی ہوں۔ دیکھتا بھی ہوں۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے گروہ کی تمام تر کلیدیں بظاہر میڈم شکیلہ کے ہاتھ میں ہیں مگر در حقیقت ماسٹر مائنڈ میر وشاہ ہے۔ میڈم اس پر ہمارے سامنے رعب جماتی ہے مگر کرتی وہی کچھ ہے جو میر وشاہ کے لبوں سے نکلتا ہے۔ کیا تم میری آبزرویشن سے اختلاف کرو گے؟''

میں نے میڈم اور میر وشاہ کے باہمی تعلق کے بارے سوچا۔ میڈم کی سنائی ہوئی کہانی پر غور کیا۔ نفی میں سر ہلایا، کہا، ''نہیں پیا جی! تم درست کہہ رہے ہو۔ مگر اس بات کا نیٹ ورک کے ٹوٹنے سے کیا تعلق ہے؟''

''وہی تو بتا رہا ہوں۔'' پیا جی کی آنکھیں متفکر انداز میں سکڑ گئیں، بولا، ''جب سے تم اور میڈم بیٹ سے واپس آئے ہو؛ تب سے میرو شاہ کا رویہ کچھ بدلا بدلا ہے۔ وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا شخص ہے مگر گزشتہ چند دنوں میں وہ ہر کام انتہائی سرعت اور بے خوفی سے سرانجام دینے پر تلا ہوا ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہ گینگ کے تمام افراد کے ڈمی کاغذات بھی تیار کروا رہا ہے۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ..... یہ درست ہے کہ وہ بہت اچھا کر رہا ہے۔ ہم سب لوگوں پر ان گنت مقدمے بنے ہوئے ہیں۔ ہم پیسے کے بل پر ہر رکاوٹ سے گزر جاتے ہیں مگر قانون کے ایکسپرٹ ہمارے وجود پر بول پڑتے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ میرو شاہ یا میڈم شکیلہ ہمیں کیوں صاف دامن بنانے میں مصروف ہیں؟''

''اس میں قباحت بھی کیا ہے؟'' میں اس کی بات میں چھپی ہوئی ہولناکی کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''اوہ..... ہو..... تم سمجھ نہیں رہے ہو۔'' وہ تھوڑا سا زچ ہوا، ''شہریار! اگر ہم سب صاف دامن ہو جائیں تو ایک طرح سے ہم آزاد ہو جائیں گے۔ اس وقت گروپ کے چالیس فیصد لوگ محض اس وجہ سے میڈم کے حکم پر موت کی اوکھلی میں سر ڈال دیتے ہیں کہ وہ زندہ یا مردہ قانون کو مطلوب ہیں۔ سوائے میڈم کے شیڈ کے، انہیں کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں مل سکتی۔ اگر انہیں علیحدہ شناخت مل گئی، ان کے پاپ دھل گئے تو وہ لحظہ بھر دیر کیے بغیر گروپ سے نکل جائیں گے۔ جس کا جدھر منہ آئے گا، ادھر چلا جائے گا۔ میرو شاہ بہت چالاک آدمی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اتنا بڑا اقدام کرتے ہوئے اسے اس حقیقت کا ادراک نہ ہو۔ یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔''

پیا جی اس گینگ کا مرکزی کردار تھا۔ کافی دیر سے یہاں کام کر رہا تھا۔ میں اس کے مقابلے میں نوآموز اور ناتجربہ کار تھا۔ اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔ پوچھا، ''میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟..... ہو سکتا ہے کہ میرو شاہ اور میڈم نے کچھ مختلف سوچ رکھا ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ بولا، ''میرا خیال ہے کہ میرو شاہ تھک گیا ہے۔ اس مار ماری سے اکتا گیا ہے۔''

''ایسی صورت میں اس اکیلے کو ریٹائرمنٹ لینی چاہیے ناں کہ بنا بنایا کھیل ہی اجاڑ دے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اس کے بغیر یہ گیئنگ نہیں چل سکتا۔'' پیا جی نے حتمی انداز اختیار کیا۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکا، ''کیا ہم سب بود ہیں؟''

''ہاں شاید..... شہریار! وہ بہت بڑا شکاری ہے۔ ہم اس کے مقابلے میں محض مسافر ہیں جو سفر کر رہے ہیں۔ اس کی شیطانی کھوپڑی تو منصوبہ گھر ہے۔ وہ نہ صرف دشمنوں کو، بلکہ ہمیں اور قانون کے رکھوالوں کو تگنی کا ناچ نچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ سچ شہریار! کبھی اس مغالطے میں نہ پڑنا کہ ہم اس جیسے ہیں۔ اس کے برابر ہیں۔ نہیں؛ ہرگز نہیں۔ ہم سب مل کر اس اکیلے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی میڈم شکیلہ ہم پر وہ بھروسہ نہیں کرتی جو میرو شاہ پر کرتی ہے۔''

میں نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کو جوڑ کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا، ''اتنا سا ہے میرو شاہ کا جسم..... وہ کسی کا گریبان پکڑنے کی ہمت نہیں رکھتا اور تم اسے بہت بڑا شکاری کہہ رہے ہو۔''

میرا لہجہ خاصا طنز بار تھا۔ پیا جی نے عجیب نظروں سے مجھے گھورا۔ کہا، ''یہی غلط فہمی ہے۔ سانڈ جیسے جسموں کو ایک ذہنی چال چت کر دیتی ہے۔ وہ لڑتا نہیں۔ لڑاتا ہے۔ لڑا کر اپنا مقصد پورا کرتا ہے۔ ہم کیا؟ ہمارے جیسے سیکڑوں لوگ اس کی انگلیوں پر ناچتے ہیں۔ کیا تم اس کا گریبان پکڑنے کی جرأت کر سکتے ہو؟..... نہیں..... پولیس کا ڈی آئی جی بھی اس سے دب کر بات کرتا ہے۔''

میں نے میرو شاہ کی شخصیت پر غور کیا۔ لحظہ بھر میں ہی فیصلہ کر چکا کہ پیا جی نے درست کہا تھا۔ بجز وکہ وہ بہت منحنی وجود کا مالک تھا مگر اس کے ہاتھوں کی رسائی بہت دور تک تھی۔ میں نے کہا، ''پیا جی! میں ابھی تک تمہاری رام کہانی سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ کہا، ''میں خود بھی کوئی فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہوں۔ کیا ہونے والا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہیں بتانے کا مقصد صرف یہی ہے کہ تم میڈم شکیلہ کے بہت قریب ہو۔ تم اس خیال کو ذہن میں رکھ کر اسے ٹٹولنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کوئی کلیو مل جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری سوچیں محض میرے تخیل کا شاخسانہ ہوں اور حقیقت میں کچھ بھی ایسا نہ ہو۔ میرو شاہ ہم سب کے ڈمی پیپرز کسی اور مقصد کے تحت بنوا رہا ہو۔''

میں نے اس کی باتوں کو ذہن میں سمیٹا اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے ٹھکانے سے نکل آیا۔ حسین آگاہی کے مصروف بازار میں مجھے چائنہ کا تیار کردہ سستا الیکٹرونکس کا سامان خریدنے میں دو گھنٹوں سے زیادہ وقت لگ گیا۔ جب رکشے میں بیٹھ کر لاری اڈے کی طرف روانہ ہوا، سہ پہر کے تین بج گئے۔ میں شام تک نور پور پہنچ سکتا تھا۔

تمام راستے پیا جی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ وہ بہت ذمہ دار شخص تھا۔ اس نے اگر یہ اندیشے محسوس کیے تھے تو بلاوجہ نہیں کیے تھے۔ کچھ نہ کچھ تھا ضرور جو سرِ دست سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انہی سوچوں میں غلطاں پانچ بجے کے لگ بھگ چوک قریشی پہنچا۔ امیر نواز کے باپ حیات خان کی ویگن دکھائی نہیں دی۔ اس کی مخصوص جگہ پر ایک اور سبز رنگ کی ہائی ایس کھڑی تھی۔ میں کندھے پر سامان کی بڑی گٹھڑی لٹکائے، ہاتھ میں قدرے چھوٹی گٹھڑی تھامے ویگن کے قریب پہنچا۔ جونہی ہوٹل کے ایک ہماچے پر شید و کنڈیکٹر کو دیکھا، دل خوشی سے بھر گیا۔ ایک اپنا دکھائی دیا تھا۔ دوسرے بھی دکھائی دینے والے تھے۔

میں اس کے قریب چلا گیا۔ پوچھا، ''اوئے خوچہ! یہ ویگن کدھر جاتا اے؟''

اس نے مجھے سرتاپا بغور دیکھا۔ شناسائی کی ایک لہر اس کی آنکھوں میں اُبھری پھر معدوم ہوگئی۔ چائے کا کپ پرچ میں رکھ کر بڑی نخوت سے بولا، ''اوئے خان! تم پھر ادھر آ گیا اے؟''

چونکہ میرا گیٹ اَپ وہی تھا جو پچھلی مرتبہ ادھر آتے ہوئے میں نے کر رکھا تھا، اس لیے اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے کہا، ''ہاں! تو کیا اَم دوبارا ایدھر نہیں آ سکتی اے؟''

وہ بولا، ''جم جم آ ؤ سو ہنا..... جم جم آ ؤ..... پَر اس سامان کا کرایہ دگنا لگے گا۔''

میں نے منہ بنا کر کہا، ''اوئے خوچہ! اَم سے بے اِمانی مت کرو۔ یہ کوئی اتنا بھارا نہیں اے۔''

اس نے لاپروائی سے کندھے اُچکائے۔ کہا، ''بھاری ہے یا نہیں..... کرایہ دگنا لگے گا۔ پورے اَسی روپے!''

وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ شریر اور نٹ کھٹ۔ اب پختہ کار کنڈیکٹر بن چکا تھا۔ آنے والے وقت میں جب وہ ویگن کا اسٹیئرنگ ویل سنبھال لیتا، اسے بھی 'استاد شیدو' کا خطاب ملنا تھا۔ اس گھڑی مجھے اس کی بے ایمانی بھی اچھی لگی۔ اندازہ تھا کہ میری مسکراہٹ میری گھنی مونچھوں

تلے چھپ گئی ہوگی۔ کہا، ''ام پوچھتی ہے کہ یہ کدھر جائے گا؟''

''نور پور..... جاؤ گے؟''

میں نے احمقانہ انداز میں سر ہلایا۔

وہ بولا، ''آج رش بہت ہے۔ چھت پر جگہ ملے گی۔''

میں نے سبز رنگ کی ہائی ایس کی طرف دیکھا۔ اس کی چھت پر باریک پائپ والا جنگلا نصب تھا۔ میں نے کہا، ''یہ پھس تو نہیں جائے گا؟''

''ویگن ہے۔ کانوں کی نہیں، اصلی لوہے کی بنی ہوئی ہے۔'' وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ اڈے پر موجود کئی ڈرائیور میرا اور شیدو کا مکالمہ سننے کیلئے آس پاس اکٹھے ہو گئے۔ یہ اڈے کا پرانا وطیرہ تھا۔

میں نے پوچھا، ''ام کو تیرا کالا استاد نظر نہیں آتی اے۔''

میں نے ہماچے کے پائے کے ساتھ زمین پر اپنا سامان ڈھیر کر دیا اور دودھ پتی چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا تھا۔ شیدو نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ استاد کھالے نے ڈرائیوری چھوڑ دی ہے اور نوکر ہو گیا ہے۔ نوکر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کوئی ملازمت مل گئی تھی۔ پتہ چلا کہ اس کے ڈرائیونگ چھوڑ جانے کے بعد اڈے کا کوئی ڈرائیور حیات خان کی کھٹارا ویگن کو چلانے پر تیار نہیں تھا۔ وہ کھالے کا دم ہی تھا جو اس کے ساتھ نباہ کر رہا تھا۔ حیات خان نے بہتیری کوشش کی مگر جب کوئی ڈرائیور بھی آمادہ نہ ہوا تو اس نے وہ تاریخی ویگن کباڑیے کے ہاتھ فروخت کر دی اور قدرے بہتر حالت کی ٹویوٹا ہائی ایس خرید لی۔ وہ اگر چاہتا تو اتنی رقم میں بیڈفورڈ بس یا ڈبا خرید سکتا تھا مگر نور پور جانے والی سواریوں کی تعداد کم ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے بس کا پورا نہیں ہوتا تھا۔ ہائی ایس کی عقبی اسکرین میری نگاہوں کے سامنے تھی جس پر ری فلیکٹڈ ٹیپ سے 'جیوے سردار حیات خان بلوچ' لکھا ہوا تھا۔ نیچے چھوٹے حروف میں 'دیماں رَن آؤٹ' بھی چمک رہا تھا۔ یہ لفظ پڑھ کر میرے لبوں پر تازگی سے معمور مسکراہٹ تیر گئی اور 'دیماں رَن آؤٹ' یاد آ گیا۔

دیسے رن آؤٹ کے گھر والوں نے اس کا نام فلم اسٹار ندیم سے متاثر ہو کر ندیم رکھا تھا۔ ندیم کا گھر بلوچ نگر میں تھا۔ اس کی ماں تنور پر روٹیاں لگاتی تھی جبکہ باپ سردار حیدر خان کے کھیتوں میں کام کاج کرتا تھا۔ ندیم جونہی پاؤں پاؤں چلتا ہوا بلوچ نگر کی گلیوں میں پہنچا، اسے

ندیم سے 'دیماں' بنا دیا گیا۔ میرا ہم عمر تھا۔ جب کرکٹ کے گراؤنڈ میں پہنچا تو فلیٹ فیٹ ہونے کے باعث اکثر رن آؤٹ ہونے لگا۔ ہر میچ میں اس کے ساتھ یہی واقعہ پیش آتا تھا جس کی وجہ سے لڑکوں بالوں نے اس کا نام 'دیماں رن آؤٹ' رکھ چھوڑا تھا جو آج بھی اس کے ہم رکاب چل رہا تھا۔

ڈرائیور بننے کے بعد بھی وہ کئی بار رن آؤٹ ہوا۔ کئی حادثوں کا شکار ہوا۔ ایک مرتبہ جب وہ بیڈفورڈ بس چلایا کرتا تھا، اس کی بس کا ٹائی راڈ بیٹ کے گاؤں غازی پور کے عین وسط میں پہنچ کر کھل گیا جس کے نتیجے میں بس بے قابو ہو کر ایک گھر میں گھس گئی۔ اس مکان کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی جس کی وجہ سے بس کی ٹکر سے نہ صرف مکان گر گیا بلکہ ایک شخص بھی جان بحق ہو گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد دیماں رن آؤٹ جونہی بس پر غازی پور کے قریب پہنچ کر ہارن بجاتا، سب گھر ہنگامی حالت میں خالی ہو جاتے اور سبھی لوگ 'شالا خیر ہووے رن آؤٹ دی' کا ورد کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آتے۔ اس مضحکہ خیز صورتِ حال نے دیسے رن آؤٹ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ جنوبی پنجاب کے عمومی دیہات نام سازی کی صنعت میں بڑے زرخیز واقع ہوئے ہیں۔ دیماں رَن آؤٹ بھی اس حد تک اپنے نام سے مانوس ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے خرچ پر ویگن کی ونڈسکرین پر اپنا نام لکھوا دیا تھا۔

چائے پی لینے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے خواہ مخواہ اتنا وقت یہاں بیٹھ کر ضائع کر دیا تھا وگرنہ میں چاہتا تو اس فراغت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سامان اُٹھائے استاد امجد کی گلی کا چکر لگا سکتا تھا جس میں عاشی کا گھر واقع تھا۔ عاشی کی ماں اور اس کے بھائی وحید کو مل سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں اندازہ کر سکتا تھا کہ عاشی گھر لوٹی ہے یا نہیں۔

ویگن کی روانگی کا وقت ہو گیا۔ معمول کے مطابق ویگن کا یہ آخری پھیرا تھا مگر مجھے پتہ چلا کہ یہ آخری پھیرا نہیں تھا۔ شیدو نے مجھے چھت پر جگہ عنایت کی۔ رش بہت تھا۔ وہ لوگ بھی ویگن پر سوار ہوئے تھے جن کو ویگن کے آخری ٹائم پر کسی بھی طرح نور پور کا رُخ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ چوک قریشی اور اطراف کی بستیوں کے باشندے تھے۔ ان لوگوں کی باہمی گفتگو سننے کے بعد میری حیرانی رفع ہو گئی بلکہ دل میں عجیب سی مسرت جاگزیں ہو گئی تھی کیونکہ نور پور میں سائیں جگ جیت کے مزار پر سالانہ میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ سبھی لوگ میلے کی شبانہ رونقوں سے لطف اندوز ہونے کیلئے نور پور جا رہے تھے۔ میلے کے دنوں میں ویگن مقررہ اوقات کے بغیر

چلتی رہتی تھی۔ ایک آدمی نے مجھے مخاطب کیا، ''او خان! ادھر میلہ لگا ہوا ہے۔ تم کیا لینے ادھر جا رہے ہو؟''

میں نے کہا، ''اَم بھی میلہ دیکھے گا اور اپنا سودا بھی بیچے گا۔''

''سودا خاک بکے گا۔ وہاں پہلے ہی بہت سی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔'' ایک دیہاتی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''او بائی! یہ نصیب کا بات ہے۔ جو اَمارے نصیب میں لکھا ہوا ہے، امیں ملے گا۔ اَم بھی میلے میں اپنا سودا بیچے گا جا کر۔''

ایک آدمی زیادہ سیانا تھا۔ بولا، ''وہ تو ٹھیک ہے خان صاحب پَر ادھر میلے کا ٹھیکیدار تمہیں پھیری نہیں لگانے دے گا۔''

مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ حیرانی سے دریافت کیا، ''کیوں؟ اَم کوئی غیر قانونی شئے بیچتا ہے؟''

''غیر قانونی ہے یا قانونی..... یہ ہمیں علم نہیں ہے مگر ٹھیکیدار اپنے آدمیوں کے علاوہ کسی کو وہاں دکان نہیں بنانے دیتا۔'' اس نے مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بتایا۔

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اسی اثنا میں دیماں رن آؤٹ بدمست ہاتھی کی طرح چلتا ہوا، سگریٹ کے مرغولے اڑاتا ہوا آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ وہ پہلے سے موٹا ہو گیا تھا۔ جونہی انجن اسٹارٹ ہوا، پتہ چلا کہ ویگن بظاہر اچھی حالت میں تھی مگر اس کا انجن پرانی کھٹارا ویگن سے کچھ مختلف پوزیشن میں نہیں تھا۔ وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بڑی مشکل سے اڈے کی غیر ہموار زمین پر رینگتی ہوئی سڑک پر نکلی اور جھومتی ہوئی نور پور کی طرف روانہ ہوئی۔

ابتدائے شب کے اندھیرے میں ہائی ایس کی چکراتی ہوئی بیم لائٹس کے جلو میں میں نور پور میں داخل ہوا۔ لاؤڈ اسپیکروں سے برآمد ہوئی چیختی چنگھاڑتی آوازیں اور فلمی گیتوں کا ملا جلا شور سنائی دے رہا تھا اور نور پور کے پار روشنیوں کا رقص دکھائی دے رہا تھا۔ شاید میرے اندر بہت سارے تغیر رونما ہو چکے تھے کہ مجھے سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اس کنویں سے باہر کی اُجلی اور خیرہ کن دنیا دیکھ آیا تھا۔ کچھ سواریاں حیات خان کے دارے کے سامنے اُتریں۔ شیدو کی چیختی ہوئی آواز کانوں پڑی، ''میلے ونجن آلے بیٹھے رہن..... ویگن توڑ

دربار تائیں ویسی!''

(میلے میں جانے والے لوگ بیٹھے رہیں۔ ویگن دربار تک جائے گی۔)

میں نے بیٹھے رہنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ رات نور پور کو اپنے احاطے میں لے چکی تھی، اس لیے میرا یہاں اترنا بے سود تھا اور میلے کی کشش بھی سوا تھی۔ سو؛ میں چھت پر بیٹھا رہا۔ شیدو نے 'چل اُستاد' کا نعرہ لگایا اور دروازے میں لٹک گیا پھر مجھ سے مخاطب ہوا، ''اوئے دو نمبر پٹھان! میلہ دیکھنا ہے کیا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کہا، ''اَمارے سینے میں دل اے۔ اَم نہیں دیکھ سکتا کیا؟''

''ڈاہڈا تپا بیٹھا اے مچھل پٹھان تان!'' شیدو نے برا سا منہ بنا کر کہا، ''کھاون کوں آندے..... سلام خان جی!''

اس نے بیک وقت مجھے ریمارکس سے نوازا اور شفیع محمد کے گھر کی نکڑ میں کھڑے بہرام خان کو سلام بھی ٹھونس دیا۔ بہرام خان کے ساتھ مراد بخش دیوانہ کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی کم وزنی شال کاندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ اسے جب بھی اسے کسی مشاعرے پر جانا ہوتا تھا، یہ شال اس کے کندھوں پر نظر آتی تھی۔ یعنی آج وہ یا تو کسی مشاعرے پر جا رہا تھا یا موج میں تھا۔

ویگن امیر نواز کے ڈیری فارم اور میرے سیاہ بام و در والے گھر کے درمیان سے گزرتی ہوئی پلی کی طرف بڑھی۔ اپنی ویران حویلی دیکھ کر دل کو گھونسا لگا۔ ان سوختہ دیواروں سے چمٹی ہوئی سیکڑوں یادیں بھی سیاہی کی چادر اوڑھ گئی تھیں۔ افسر علی کے گھر سے ملحقہ کھال عبور کر کے ویگن دائیں طرف مڑی اور چند لمحوں بعد سائیں جگ جیت کے مزار کے سامنے رُک گئی۔ شیدو نے ہائی ایس کی ڈگی کھول دی۔ سواریاں اُترنے لگیں۔ دیہاں رَن آؤٹ اپنا کاک پٹ کھول کر مزار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ باندھے، کانوں کا ہاتھ لگایا پھر ہتھیلیاں جوڑ کر دل ہی دل میں کوئی دعا کرنے لگا۔ میلہ دیکھنے کیلئے آنے والے افراد کی زیادہ تعداد ایسے ہی مزار کے سامنے کھڑی ہو کر دعا گو ہوا کرتی تھی۔

میں نے اپنا سامان اتارا۔ شیدو کو اشارے سے قریب بلایا۔ مزار کی دیوار کے قریب لے جا کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا، ''ام کو ایدھر سونے کا واسطے جگہ مل جائے گا؟''

اس نے آنکھ دبائی۔ لہجہ دھیما رکھ کر کہا، ''استاد! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم شہرے خان ہوناں؟''

اس کی نظر قیامت کی تھی۔ میں نے چونک کر کہا، ''اوئے شیدے! تم نے کیسے پہچانا مجھے؟''

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کان قریب کرنے کا کہا۔ کان میں بولا، ''اللہ کی قسم! اُکا پٹھان لگدا ایں.....''

(اللہ کی قسم! بالکل پٹھان لگ رہے ہو۔)

''پر تم نے کیسے پہچان لیا؟'' مجھے یہ خیال دہلا رہا تھا کہ اگر مجھے شیدے نے پہچان لیا تھا تو پھر مجھے کوئی بھی شخص پہچان سکتا تھا۔

''تم پچھلی مرتبہ اسی حلیے میں آئے تھے۔ مجھے استاد کھالے نے بتایا تھا۔ پر تم ڈرو مت: میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ کوئی تمہیں پہچان نہیں سکتا۔ پر تم ہو تو شہرے خان ہی ناں؟'' اس کی آواز میں تشکیک کا عنصر غالب تھا۔

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ سامان بے وجہ ادھر اُدھر کیا تا کہ کوئی مجھے شیدو کے پاس کھڑا دیکھ کر شک میں مبتلا نہ ہو۔ پوچھا، ''ہاں یار شیدیا! میں شہرا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کھالا کہاں ہوگا اس وقت؟

اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا ورنہ مجھے اس کی خوشی سے دمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیتیں۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ بولا، ''وہ تو عاشقی مشوقی میں پڑ کر کسی کام کا نہیں رہا۔ ادھر، اپنی بے بے کے ساتھ، حیدر خان کی کوٹھی پر ہوگا اس وقت۔ تمہیں پتہ نہیں؟ اس نے حیدر خان کی نوکری کر لی ہے۔ وہ خان زادی کا ڈرائیور بن گیا ہے، باڈی گارڈ بھی۔ بڑا سا پستول کچھ (بغل) میں دبائے گھومتا پھرتا ہے۔ موجاں ای موجاں نیں اُوندیاں!''

(اس کی موجیں ہیں۔)

یہ خبر میرے لیے نئی اور حیرانی کا سبب تھی۔ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ حیدر خان کوئی موقع نکال کر کھالے کو ٹھکانے لگاتے ہوئے اپنی بدنامی کے گواہ کو صفحہ ہستی سے غائب کر دے گا۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے گھر میں داخل کر لے گا اور گیدڑ کو خربوزوں کی رکھوالی پر مامور کر دے گا۔ میں نے آنکھیں نچائیں۔ شیدا بہت شرارتی طبع تھا۔ اس نے خانزادی اسما کو کھالے کی 'بے بے' قرار دیا تھا۔ مقامی زبان میں لفظ 'بے بے' ماں یا بوڑھی عورت کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں دیسے رن آؤٹ کی غصہ بھری آواز سنائی دی، ''اوئے شیدیا! اڈے مر..... بھونک مارتے سواریاں کو ہکل مار.....''

(اوئے شیدیا! ادھر آ اور سواریوں کو ادھر بلا۔)

''استاد کھالے کے گھر چلے جانا۔ میں کسی نہ کسی طرح اسے تمہارے آنے کی خبر کرتا ہوں۔''

شیدے نے مجھے کہا اور جست بھر کر ویگن کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حلق پھاڑ کر چیخا، ''اولالہ..... وڈی اَمڑی..... چوک قریشی جلنا ہے..... چوک قریشی..... آخری ٹیم اے بھج تے آ ؤ.....''

(آخری ٹائم ہے؛ بھاگ کر آ ؤ۔)

وہ سواریوں کو آوازیں دینے لگا۔ میں نے سامان اُٹھایا اور میلے کی طرف چل پڑا۔ اس سال میلے کیلئے خالی کی گئی جگہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ دربار سے پڑتک دو ایکڑ کا فاصلہ حائل تھا۔ کانوں میں مختلف آوازیں پڑ رہی تھیں۔ اونچی آواز میں چلنے والے ڈیک اور لاؤڈ اسپیکروں کا شور ماحول میں مخصوص ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ میں فصلوں کے بیچ پگڈنڈی پر چلتا ہوا پانچ دس منٹوں میں اس موج میلے بھری دنیا میں پہنچ گیا۔ وہی آب و تاب، وہی بے ہنگم ہجوم، کان چیرتا ہوا شور اور دیہاتیوں کے دمکتے ہوئے چہرے..... ان لوگوں کی واحد تفریح یہی تھی جو سال بعد میسر آتی تھی۔ سرکس، موت کا کنواں، جھولے، تھیٹر اور ہیجڑوں کا رقص..... جلیبی، خشک مٹھائی اور میوہ جات سے بھری ہوئی دل للچانے والی عارضی دکانیں؛ خوشبو کے بھبکے اُڑاتے ہوئے سموسوں پکوڑوں کے اسٹالز اور رنگا رنگ چوڑیوں اور سستے کاسمیٹکس پر عورتوں اور لڑکیوں کے ٹھٹھ..... سب کچھ ویسا ہی تھا۔ میں نے یہاں منعقد ہونے والے سبھی میلے دیکھے تھے۔ ہر بار دل خوشی سے جھوم جھوم اُٹھتا تھا۔ آج بھی کیفیت ویسی ہی تھی مگر کوئی عجیب سا خلا دل میں جاگزیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی کوئی بہت ہی قیمتی شئے اسی میلے میں رکھ کر بھول گیا ہوں اور اسے نہ چاہتے ہوئے بھی تلاش کیے جا رہا ہوں۔ میں بے سبب تیز تیز قدموں چل رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں میں نے میلے کیلئے مختص کی ہوئی تمام جگہ کو کنگھال ڈالا۔ خواہش کے باوجود میں اپنا سامان بیچنے کیلئے آواز نہ دے سکا۔ ایک بڑے سے 'پڑ' کے سامنے آ کر رکا۔ بڑا سا اسٹیج لگا ہوا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے بینرز آویزاں تھے جن پر سردار حیدر خان، وریام خان اور حیات خان کے نام بڑے بڑے حروف میں درج تھے۔ بینرز کی مکمل عبارت پڑھ کر پتہ چلا کہ یہاں محفلِ موسیقی منعقد ہونے والی تھی جس کے مہمانانِ خصوصی خانزادے تھے۔ میں کچھ دیر وہاں رکا رہا۔ ایک سرخ مفلر والا اجنبی میرے قریب آیا اور کریدتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا، ''اوئے! تم کون ہو؟''

اس کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ میں ہتھے سے اُکھڑنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی پوزیشن کا خیال آ گیا۔ مجھے یہاں لڑائی بھڑائی سے اجتناب کرنا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں میلہ دیکھنے آیا ہوں۔ اس نے پوچھا، ''کیا تم یہ سامان بیچتے ہو؟''

''ہاں! مگر اَم ایدھر کچھ نہیں بیچا۔'' میں نے عاجزی دکھائی۔

اس نے میرا بازو پکڑا اور ایک طرف کھینچا، ''چلو! ٹھیکیدار کے پاس چلو۔ وہی تمہارا فیصلہ کرے گا۔''

میں نے کہا، ''اَم کا فیصلہ..... اَم نے کیا جرم کی اے؟''

اس نے میرے واویلے پر دھیان نہیں دیا اور بے دردی سے کھینچتا ہوا سرکس کے پہلو میں لگے ہوئے ایک سرخ رنگ کے بڑے خیمے میں لے گیا۔ وہاں ایک بڑی مونچھوں والا موٹا شخص لوہے کے پائپ والی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ دو پستہ قامت ہیجڑے اس کی پنڈلیاں دبا رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر خشونت سے بولا، ''اوئے جیلے! اِہ کنوں پھڑ لیایا ایں؟''

(اوئے جیلے! یہ کسے پکڑ لائے ہو؟)

اس کا لہجہ خالص لہوری تھا۔ آنکھوں میں درشتی رچی ہوئی تھی۔ حلیے سے چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا تھا۔ جیلے نے اسے بتایا کہ میں میلے میں الیکٹرونکس کا سامان بیچنے کی غرض سے آیا ہوں۔ میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں بائی! یہ جھوٹ مارتی اے..... اَم صرف میلہ دیکھنے آئی اے۔ ایدھر کچھ بیچتا نہیں اے۔''

ٹھیکیدار نے مجھے گہری نظروں گھورا۔ پھر جیلے کو دیکھا۔ جیلا بولا، ''یہ جورے کے تھیے پر کھڑا تھا۔ میں اسے پکڑ کر ادھر لے آیا ہوں۔''

''جورے کا دھندا کیسا ہے؟''

''ایک دم زبردست ہے۔''

''پر وہ تو کہتا ہے کہ مال نہیں بن رہا۔''

''وہ بھاڑا کم کرانے کے چکر میں ہوگا۔''

''گلوکارہ آئی ہے؟'' ٹھیکیدار کی آنکھوں میں شوق سا بیدار ہوا۔

''ابھی تو نہیں آئی مگر آنے والی ہے۔ بلوچ نگر والے خان صاحب نے اپنی گاڑی بھیجی ہوئی ہے اسے لانے کیلئے۔'' جیلے نے بتایا۔

''پھر تو وہ ضرور آئے گی۔'' ٹھیکیدار نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''اور ہاں! کیا تم نے اس بے وقوف پٹھان کو میلے کی حدود میں اپنا مال بیچتے ہوئے دیکھا ہے؟'' ٹھیکیدار کی دہشت ناک آواز خیمے میں گونجی۔

''دیکھا تو نہیں ہے ٹھیکیدار جی! پر یہ ادھر مال بیچنے کیلئے آیا ہے۔'' بھیلے نے جھٹ سے کہا۔

''نہیں ٹھیکیدارا! اَم ایدھر مال نہیں بیچتی اے۔ اَم صرف تماشا دیکھتی اے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں معاملہ خراب ہو۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ بھنگ بھوسڑا ادھر کونے میں ڈال دو اور موج میلا دیکھو۔ جب تماشا دیکھ لو گے، آ کر اپنا مال اُٹھا کر یہاں سے چلتے بنو گے۔'' ٹھیکیدار نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں کہا، ''اوئے خبیثو! ٹانگیں دباؤ۔ تمہارے ہاتھ کیوں رک گئے ہیں؟''

دونوں لونڈے ہاتھ روک کر ہماری باتیں سن رہے تھے۔ ٹھیکیدار کی ڈانٹ سن کر ان کے ہاتھوں میں بجلی کوند گئی۔ میں نے کندھے اُچکائے اور سامان رکھنے کیلئے خیمے کی نکڑ کی طرف بڑھا جس طرف ٹھیکیدار نے اشارہ کیا تھا۔ سامان رکھ کر پلٹا تو ٹھیکیدار نے کہا، ''اوئے پٹھان! کیا تم میلے میں مال بیچنا چاہتے ہو؟''

میں نے اپنے انداز میں معصومیت رچاتے ہوئے کہا، ''اتنی بڑا بڑا دکانوں کے ہوتے ہوئے امارا مال کدھر بکتی اے ٹھیکیدارا.....''

اسے یقین آ گیا کہ میں محض میلہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنی چارپائی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ جیلے کو ہاتھ کے اشارے سے دفع کیا۔ وہ دفع ہو گیا تو ٹھیکیدار مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کس علاقے سے آیا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں درہ پیزو کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اس نے آنکھیں پھیلائیں، ''فرنٹیئر سے آئے ہو؟''

''ہا..... ہا! ایدھر کاروبار کرتا اے۔''

وہ بولا، ''تمہارے پاس اور سودا بھی ہوتا ہے؟''

اس نے آنکھ دبا کر مجھ سے پوچھا۔ میں سمجھ گیا۔ بولا، ''نہیں ٹھیکیدارا! ایک نمبر مال نہیں ملتی۔ دو نمبر مال بہت اے پَر ام اس کا دھندا نہیں کرتی اے۔''

''آخر ایک نمبر مال بھی تو ہو گا ہی..... کہیں نہ کہیں..... تلاش کرنے پر تو خدا بھی مل جاتا ہے۔'' ٹھیکیدار نے مجھے کریدا۔

میں نے کہا، ''خدا تو ارجگہ پرائے، اس لیے مل جاتا اے۔ مال نہیں ملتا۔''

اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ چرس مانگتا تھا یا پھر بدنامِ زمانہ دوائی سلاجیت کا طلب گار تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس سے جان چھڑائی۔ اس دوران اس نے کمال فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے چائے پلائی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ یہ آفر بھی کی کہ میں اسے میلے کا بھاڑا دے کر اپنا مال بیچ سکتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میلے میں میری دکانداری نہیں چل سکتی۔

میں اپنا سامان اس کے خیمے میں رکھ کر باہر نکل آیا۔ ایک طرح سے مجھے فائدہ ہوا تھا کہ اس کم بخت بھاری بھرکم بوجھ سے نجات مل گئی تھی۔ یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ وہ چور کی شکل والا ٹھیکیدار میری عدم موجودگی میں سامان کی تلاشی لے گا اور چرس، حشیش یا سلاجیت ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرے گا۔ اس کوشش میں ناکامی پر وہ کسی اور شئے پر ہاتھ صاف کر سکتا تھا۔ اگر وہ ایک آدھ ڈبے کی پھٹی لگا بھی لیتا تو مجھے پروا نہیں تھی۔

میلے کی رونق عروج پر تھی۔ انسانوں کے اس ہجوم میں نور پور کے تقریباً سبھی شناسا چہرے نظر آئے۔ افسر علی، ولی محمد، جمیل ڈونہ، مولا داد، دلاور، قطب دین، علم دین پٹواری، شریف چکی والا، بدر دین..... اور ان کی اولادیں..... ہر شخص کو دیکھ کر میرا دل اس سے بغل گیر ہونے کیلئے مچلتا تھا۔ بہت کم عرصے میں مجھ سمیت میرے خاندان کے کتنے چہرے نور پور کے منظر نامے سے اوجھل ہو گئے تھے۔ ایک گھر جل گیا تھا۔ میرے دل میں کسک جاگی کہ کسی بھی چہرے پر ملال ثبت نہیں تھا۔ کسی کو میرا دکھ نہیں تھا۔ دل کو سمجھایا۔ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جو سامنے ہوتا ہے، وہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جو اوجھل ہو جاتا ہے، وہ کسی کا نہیں رہتا۔ یہ بڑی بات نہیں تھی کہ نور پور کے لوگ، جن سے جدا ہو کر میں ہر وقت اپنے آپ کو ادھورا خیال کرتا تھا، وہ اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ میلا کشاں کشاں تھا۔ رستے رواں دواں تھے۔ لوگ کھا پی رہے تھے۔ شادیاں کر رہے تھے۔ رقص کر رہے تھے..... کسی کو شہر یار یاد نہیں تھا۔ چراغ دین اور اس کا خاندان کسی کے دھیان میں نہیں تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ کو بھی سب بھول چکے تھے۔ اور تو اور..... دیوانے اور کھالے نے بھی حالات سے مفاہمت کر لی تھی۔ وہ جو مجھ سے جدا ہو کر ایک دن گزار نہیں سکتے تھے، اب مہینے گزارنے کے لائق ہو گئے تھے۔

میں نے پکوڑے خریدتے ہوئے ایک طویل سانس حلق میں اُتاری اور بڑبڑایا، ''ہاں بھئی

شہرے! ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم نور پور سے ملتان گئے تو یہاں کی ڈوریں تمہارے ہاتھ سے نکل گئیں۔ ملتان سے لوٹو گے تو وہاں تمہیں یاد نہیں کیا جائے گا۔ دنیا کا چلن ایسا ہی ہے۔''

میں ایک ایک چہرہ دیکھتا ہوا رات گزارتا رہا۔ شور لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک بلند چوبی تخت پر ہیجڑوں کا رقص جاری تھا۔ میں زمین میں گڑے ہوئے ایک موٹے بانس سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا اور انہماک سے رقص دیکھنے لگا۔ دیکھنے میں ہیجڑے بھرپور اور جواں سال لڑکیاں دکھائی دے رہے تھے۔ میں اور کھالا اسی مغالطے میں جانے کتنی کتنی دیر یہاں کھڑے محوِ تماشا رہتے تھے۔ پھر جب میں نے دوربین کی مدد سے ایک خوبصورت لڑکی کو رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا تو مجھ پر راز کھلا تھا۔ وہ دوربین کھالے نے چرا کر میرے ہاتھ فروخت کی تھی۔ اس دوربین سے میری کئی یادیں جڑی ہوئی تھیں جو اس گھڑی مجھے ستا رہی تھیں۔ تب جیب خالی ہوتی تھی مگر دل خوشی کے انجذاب کی بھرپور توانائی رکھتا تھا۔ ہر چیز خریدنے کو جی چاہتا تھا جب خرید نہیں سکتا تھا۔ بس دیکھ دا کھ کر خوش ہو جایا کرتا تھا۔ آج جیب بھری ہوئی تھی مگر تمنائی پہلو خالی تھا۔ کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی خواہش دل میں پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

میں رات گزارنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک ایک چہرہ دیکھ لیا مگر مجھے غزالہ یا پھوپھی دکھائی نہیں دیں۔ وہ آج نہیں آئی تھیں۔ خانزادوں کی خواتین وفد کی شکل میں آیا کرتی تھیں۔ ان کے چاروں طرف اسلحہ بردار پہرے دار ہوا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ آنکھ اُٹھا کر انہیں دیکھ لیتا۔ آج وہ بھی نہیں آئی تھیں۔ بے نیل مرام چکراتے ہوئے میں نصف شب کا سفر طے کر آیا۔ بارہ بج گئے۔ ایسے ہی وقت میں جب میں ایک اسٹال پر بیٹھا پیٹ پوجا کے بعد کڑک چائے پینے میں مشغول تھا، شور اُٹھا۔ اپنی مخصوص ڈگر پر گامزن میلے میں گویا بھونچال سا آ گیا۔ لاؤڈ اسپیکر چیخ اُٹھے۔ لوگ جورے کے پھٹے کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے کان لگائے۔ پتہ چلا کہ جورے کے پنڈال میں گلوکارہ پہنچ چکی تھی۔ اناؤنسر ہیجان خیز آواز میں لوگوں کو بتا رہا تھا۔ میں نے اسٹیج پر آویزاں بینروں پر گلوکارہ کا نام پڑھا تھا۔ پروین نذر۔ وہ سرائیکی کی مقبول عام فن کارہ تھی۔ کسی ریاستی شہر سے آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھی۔ نور پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ میں نے اُسے ایک مرتبہ اسی میلے میں سنا تھا اور آج تک اس کی مدھر آواز کو اپنے جلو میں سرگرداں پایا تھا۔ میرے قدم خود کار انداز میں جورے کے پنڈال کی طرف بڑھنے لگے۔

پنڈال پر میلے میں شریک تمام افراد اندھا دھند ٹوٹ پڑے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہاں ٹکٹ لینا پڑے گی مگر یہ دیکھ کر حیرانی کی انتہا نہ رہی جب وہاں ہر خاص و عام کو بغیر ٹکٹ، بغیر روک ٹوک گھستے دیکھا۔ میں بھی بانسوں کی بنی ہوئی دیوار پھلانگ کر پنڈال میں پہنچ گیا اور لوگوں کو دھکیلتا ہوا، راستہ بناتے ہوئے اسٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ اسٹیج پر سازندے اپنے آلات کو چھیڑ رہے تھے۔ ان کی چھیڑ چھاڑ بھی بڑی مسحور کن تھی۔ میں اگلی قطار میں بیٹھ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر شریف چکی والا اپنے پوپلے منہ کو ہلا رہا تھا جبکہ بائیں ہاتھ پر ایک اجنبی نوجوان براجمان تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے اعصاب شکن انتظار کے بعد اچانک پنڈال کے منتظمین نے عین وسط میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اُٹھانا شروع کر دیا۔ پتہ چلا کہ خان زادے پنڈال میں تشریف لا رہے تھے۔ ان کیلئے راستہ بنایا گیا۔ چند لمحوں بعد سردار حیدر خان اپنے کروفر کے ساتھ پنڈال میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں وریام خان اور حیات خان جبکہ عقب میں بہرام خان اور دیوانے سمیت تین چار افراد چل رہے تھے۔ پانچ چھ گن بردار پہرے داروں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ حیدر خان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں چند انگارے سے سلگ اُٹھے۔ یکبارگی جی چاہا کہ لوگوں کی پروا کیے بغیر اس پر شعلہ جوالا بن کر ٹوٹ پڑوں اور اسے عبرت کا نشان بنا دوں۔ وریام خان کی طرف بھی میرے کچھ حساب کتاب نکلتے تھے۔ میں نے بدقت خود کو سنبھالا اور اپنے خون کے پیاسوں کو ملنے والے غیر معمولی پروٹوکول کو دیکھتا رہا۔ اسٹیج پر مائیک تھام کر اعلان کرنے والے شخص کو میں نہیں جانتا تھا۔ وہ میلے کی انتظامیہ کا ہی کوئی شخص معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے سردار حیدر خان کی شان میں خوب بڑھ چڑھ کر قصیدہ گوئی کی اور کئی مرتبہ بتایا کہ اس پنڈال کے انعقاد میں حیدر خان کی ذاتی کوشش کا عمل دخل ہے ورنہ اتنی بڑی گلوکارہ کو میلے میں لانا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی بتانا ضروری سمجھا کہ بڑے خان نے اپنی گرہ سے گلوکارہ کی فیس ادا کی ہے۔ اسی اثنا میں خانزادے اسٹیج پر بچھے ہوئے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ خان کے اسلحہ بردار باڈی گارڈز صوفے کے عقب میں کھڑے ہو کر شکرے جیسی نگاہوں سے پنڈال کو دیکھنے لگے جبکہ مراد بخش دیوانہ ایک طبلہ نواز کے پہلو میں دُبک کر بیٹھ گیا۔ مسلح پہرے داروں کی وہاں موجودگی محض عوام پر حیدر خان کی دہشت جمانے کیلئے تھی ورنہ یہاں اس کی جان کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں تھا۔

کچھ دیر تک خانزادوں کی مدح سرائی کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر فن کارہ کی آمد کی اطلاع نشر کی گئی۔ پنڈال نے کھڑے ہو کر پروین نذر کا استقبال کیا۔ میں اسے دوسری مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ وہ سانولے رنگ کی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ ملکوتی حسن کی مالک نہیں تھی مگر اس کی سنجیدگی اور سادگی نے خاصا جاذبِ نظر بنا رکھا تھا۔ عمومی لوک فن کاروں سے مختلف تھی۔ اپنے فن سے گہرا لگاؤ رکھتی تھی۔ اس کے اسٹیج پر بیٹھتے ہی دیہاتیوں نے اس کے سامنے فرمائشوں کے انبار لگا دیے۔ وہ مسکرا کر سبھی کی محبت پاش نظروں کا جواب دیتی رہی پھر بڑے خان کی اجازت سے سازندوں کو ہدایات دینے لگی۔

وہ بہت بڑی فن کارہ تھی۔ اس کی آواز کی پچ اور لے غیر معمولی حسن کا شاہکار تھی۔ جونہی اس نے سر چھیڑی، یوں لگا جیسے پورا پنڈال ویران ہو گیا ہو اور لوگوں نے گویا سانسیں لینا پھر کسی وقت پر موقوف کر دی ہوں۔ میرا دھیان خانزادوں کی طرف سے ہٹ کر اس کی طرف مبذول ہو گیا تھا۔ اس نے گہرے سرخ رنگ کا کامدار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو اس پر بہت جچ رہا تھا۔ سانولا چہرہ میک اَپ سے بے نیاز تھا مگر بھلا لگ رہا تھا۔ وہ ایک ادا سے مسکراتی تھی۔ نچلے سر سے لفظ اُٹھاتی تھی اور اونچے سر تک لے جاتی تھی۔ ایسے میں گمان ہوتا کہ دل مٹھی میں آ گیا ہے۔ میں دل ہی دل میں اس کے ایک معروف گیت کی خواہش کرنے لگا۔ اس نے گایا تھا، ''چٹڑے پدھرتے بہہ کے دل لٹوائی ہم وے.....ایں سانگھے اِتھ آئی ہم وے.....'' بعد میں یہی گیت اور گلوکاروں کی آواز میں سنا تھا مگر اس کی آواز کا نشہ یکتا تھا۔

خانزادوں کے چہروں پر خوشی کی غماز جھلملاہٹیں دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق رقص کرتے اسٹیج کی طرف آتے اور گلوکارہ پر نوٹ نچھاور کر کے اپنی اپنی جگہوں پر لوٹ جاتے۔ اس نے ابھی ایک ہی گیت گایا تھا کہ اسٹیج نوٹوں میں چھپ گیا۔ وہ کمال بے نیازی سے، نوٹوں کی طرف توجہ دیے بغیر، ہاتھ سے ہارمونیم سے ہٹاتی رہی، گاتی رہی۔ اس کا انہماک دیدنی تھا۔

ایسے ہی وقت میں مراد بخش دیوانے کو حیدر خان نے بلایا۔ وہ مؤدبانہ انداز میں خان کے کان لگا۔ پھر پروین نذر کے پاس آ کر جھکا۔ چند بڑے نوٹ اس کے قدموں میں رکھے اور سرگوشی میں کچھ کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ خان کو دیکھا اور ہاتھ ماتھے پر رکھ کر شکریہ ادا کیا۔ میں سمجھ گیا۔ خان نے کسی گیت کی فرمائش کی تھی۔ اسی گھڑی مجھے کھالا دکھائی دیا۔ وہ پہلی

قطار کے آخری سرے پر بانس سے چمٹ کر کھڑا تھا۔ اس کی نظریں اردگرد کچھ تلاش کرنے میں محو تھیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا رابطہ شیدو سے ہو گیا ہے اور وہ مجھے اس ہجوم میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے دل کو ایک ذرا تسلی ہوئی۔ اس کے گھر کے علاوہ میں بھرے نور پور میں کہیں رات گزار نہیں سکتا تھا کیونکہ ایک وہی میرا راز دار تھا جس پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اس کی طرف جانے کے ارادے سے اُٹھنا چاہا۔ ایسے ہی وقت میرے کانوں میں پروین نذر کی شوخ اور مدھر آواز پڑی اور یوں لگا جیسے میں پورے کا پورا اس آواز کے سحر میں جکڑا گیا ہوں۔ اس نے ایک ایسا گیت چھیڑ دیا تھا جس کا لفظ لفظ جذبات سے گندھا ہوا تھا، ''پتن تے بیڑی، بیڑی وچ ہک پھل رتا جیا..... مل کے وت نہ وچھڑوں، ایہا چن منگوں دعا.....'' اس کی آواز زندگی کی آس سے بھرپور تھی اور اس سرائیکی لوک گیت کے شگن بھرے بول پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ میرا دھیان کھالے سے ہٹ کر گیت کی طرف مبذول ہو گیا اور میں ساکت نظروں سے، سینے میں سانس کی طنابیں تھام کر، پروین نذر کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات گیت کے ہر ہر بول کا ساتھ دیتے تھے۔ یہ اس کی بہت بڑی خوبی تھی۔ ہمارے سرائیکی وسیب کا یہ سرخیل لوک گیت اپنے اندر ارمانوں کی اتنی بڑی آزمائش اور اظہار سموئے ہوئے ہے کہ انسانی ذہن جتنا غور کرتا ہے، اتنا ہی اس میں الجھ جاتا ہے۔ چند سال قبل اسی میلے میں سرائیکی گلوکار جمیل پروانہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کیلئے آیا تھا۔ اس کا بھائی مستانہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں فن کار بھائیوں نے لوک گیتوں کی اتنی عمدہ پرفامنس دی تھی کہ سننے والے سانسیں لینا بھول گئے تھے۔ مگر پروین نذر کوئی فن کارہ نہیں، ساحرہ تھی جو سحر پھونک رہی تھی، ''آ ڈھولا ٹر چلیے جتھے ساوے ساوے گھا..... تیڈی ہاں میں تیڈی چن قسم چوا.....''

موسیقی بھرپور تھی۔ گیت کا آخری بول ختم ہوا۔ لوگوں نے داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہوئے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بڑے خان نے پھر کچھ نوٹ دیوانے کے ہاتھ اس کی خدمت میں پیش کیے۔ اسی گیت کو پھر گانے کی فرمائش کی۔ فرمائش مان لی گئی۔ جب تیسری مرتبہ خان نے فرمائش کی تو پروین نذر نے آہستہ سے گردن موڑی۔ پلٹ کر بڑے خان کو دیکھا۔ ہولے سے کچھ کہا۔ خان کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلا کہ پروین نے فرمائش پوری کرنے سے انکار کیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین دوسری مرتبہ گیت نہیں دہرائے گی۔ اُٹھا اور کھالے کی طرف

چلا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ جونہی فضا میں گیت کا ابتدائی دوہڑا مرتعش ہوا، میں کھالے کے سر پہنچ گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلا کہ اس نے پہلی نظر میں ہی مجھے پہچان لیا تھا۔ قدرے بلند آواز میں بولا، ''اوئے خان! کیا بات ہے؟''

میں نے چند ایک احمقانہ ڈائیلاگ ادا کیے پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں اسے اپنے بارے بتانا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں کامیاب رہا۔ وہ اب گاہے بگاہے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جگہ تلاش کر کے بیٹھ گیا اور موسیقی کی اس محفل سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پروین نذر کی آواز کا سحر زندہ تھا۔ مجھے فطرت کی آواز پر پنڈال کچھ دیر کیلئے چھوڑنا پڑا۔ بادلِ نخواستہ کھیتوں میں نکل آیا۔ میرا تمام تر دھیان پروین کی آواز کی طرف تھا، اس لیے فصل میں کافی آگے تک نکل آیا۔ موسم اچھا تھا۔ شبنم رات کے دامن کو بھگو رہی تھی۔ میں نے گیلی فصل پر ہاتھ پھیرے۔ ہاتھ نم ہو گئے۔ اوس اچھی لگی۔ جی چاہا کہ اپنا چہرہ گیلا کروں پھر یاد آیا کہ ایسا کرنے سے میک اَپ خراب ہو جائے گا۔ ناچار خواہش رد کرنا پڑی۔ ماحول میں پروین کی شوخ آواز گونجی، ''ہرو ویلے تانگھاں یار دیاں بیٹھی رورو کانگ اڈاراں.....''

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اس نے میرا پسندیدہ گیت چھیڑ دیا تھا۔ خواجہ فرید کے کلام سے سُر اُٹھایا تھا۔ میں تیز قدموں چلتا ہوا پنڈال میں آیا۔ اس نے گیت گایا۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ اس نے کتنے گیت گائے، گائے بھی؛ یا نہیں..... میری سماعت کی سیرابیاں وہیں رکی ہوئی تھیں۔ میں تب اپنے حواس میں آیا جب محفل کے اختتام کا اعلان ہوا اور پروین نذر اسٹیج پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ آئے ہوؤں نے اسٹیج پر بکھرے ہوئے نوٹ سمیٹنا شروع کر دیے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے خانزادے اور پروین نذر اسٹیج کے عقبی راستے سے باہر نکل گئے۔ میں جلدی سے باہر آیا۔ تگ و دو کے بعد ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ بے اختیار پروین نذر کے سامنے پہنچا۔ وفورِ عقیدت سے اس کا ہاتھ تھاما اور چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ وہ فرطِ تفاخر سے مسکرائی۔ میں نے کہا، ''اے بہن! تو بہت اچھا گاتا اے.....''

اپنے جذبات کو اپنے گیٹ اَپ کی آواز دینے کیلئے میں نجانے کتنے مشکل مراحل سے گزرا تھا۔ اس کی قدرے غافلانہ نظر مجھ پر پڑی۔ مسکرائی اور آہستگی سے ہاتھ چھڑا کر آگے چلی گئی۔ میں وہیں رُکا رہ گیا۔ ایسے میں میرے کاندھے پر کھالے نے ہاتھ رکھا۔ اپنی طرف موڑ کر بولا،

''مجھے پتہ تھا.....تم باز نہیں آ ؤ گے۔ادھر آ ؤ۔''

میں خالی الذہنی کی سی کیفیت میں اس کے ساتھ چلتا ہوا میلے کی حدود سے نکل آیا۔ہم کچھ فاصلے پر فصلوں میں گھرے ہوئے کھال کے بنے پر پہنچ کر بڑے جذباتی انداز میں بغل گیر ہوئے پھر وہیں بیٹھ گئے۔اس نے کہا،''یار شہرے! خوب صورتی خدا کی دین ہے۔کسی کو قتل کرنے والی صورت دے دیتا ہے تو کسی کو مردوں میں جان ڈال دینے والی آواز بخش دیتا ہے۔مجھے ابھی بھی یوں لگ رہا ہے جیسے پروین گا رہی ہے اور پورا زمانہ اُسے سن رہا ہے۔میں نے ہی حیدر خان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ میلے میں پروین نذر کو لے آئے۔پورے پچاس ہزار روپے لیے ہیں اس نے!''

مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔وہ اگر دس لاکھ بھی لیتی تو کم تھے۔میں نے ایک بھرپور سانس سینے میں اُتاری اور کہا،''کھالے! شیدو نے مجھے پہچان لیا تھا۔''

''ہاں! مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔یہاں مطلع صاف ہے۔تم اگر اپنے حلیے میں بھی آ نکلتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

''کیا حیدر خان مجھے کچھ نہ کہتا؟'' مجھے تعجب ہوا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔تمہارے گناہوں کی فہرست خانزادوں کی دانست میں بہت لمبی ہے۔''اس نے بغل والی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی،''تم سناؤ۔تمہاری میڈم کیسی ہے؟.....میر وشاہ کا کیا حال ہے؟''

اس نے فرداً فرداً سب لوگوں کے بارے استفسار کیا۔پھر میں نے بھی اس سے نور پور کے مکینوں سے سرائیکی احوال لیا۔اس نے امیر نواز کے بارے میں بتایا کہ وہ کچھ دن پہلے نور پور آیا تھا اور دو دن رہ کر چلا گیا تھا۔اس کی ملاقات کھالے سے نہیں ہوئی تھی۔چونکہ پروین کی بابت امیر نواز سے دریافت کرنے والا کوئی مدعی نور پور میں باقی نہیں تھا،اس لیے پروین کا قصہ پارینہ ہو گیا تھا اور سب لوگ پروین اور شہرے خان کو بھول گئے تھے؛ جیسے کبھی رجو اور سوہنے بلوچ کو لوگوں نے ذہنوں سے محو کر دیا تھا۔اس نے یہ بھی بتایا کہ یار ن خان اِن دنوں حویلی آیا ہوا ہے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ بخت خان ان دنوں کھل کر سردار حیدر خان کی مخالفت پر اترا ہوا تھا۔اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ آئندہ انتخابات میں وہ بڑے خان کے مقابلے میں کھڑا ہو گا۔نور پور کے لوگ اس نئی محاذ آرائی سے خاصے خوفزدہ تھے۔کھالے کو مراد بخش دیوانے نے یہ

بتا کر مزید سراسیمہ کر دیا تھا کہ سردار یارن خان نے سردار بخت خان کی حمایت کا اعلان کر کے نیا محاذ کھول دیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ نور پور میں اگر کسی نے بخت خان کو ووٹ نہ دیا تو وہ اپنا سامان اونٹوں پر لادر کھے۔ چونکہ ابھی انتخابات میں سال بھر کا عرصہ پڑا تھا، اس لیے اس موضوع پر زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے تین بج گئے تھے۔ رات اپنے پر سمیٹنے لگی تھی اور اب تب میں پو پھٹنے کو تھی۔ میں نے کہا، ''یار کھالے! اگر مجھے کچھ دیر ستانے کا موقع مل جائے تو میں دن بھر پھیری لگا سکوں گا۔''

''اوہ ہاں! باتوں باتوں میں بہت سا وقت گزر گیا ہے۔ گھر چلیں۔ میں تمہارا بستر لگا کر ادھر آیا تھا۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم اجڑے ہوئے میلے میں سے گزرے۔ ایک اسٹال کے قریب کھالے کو کھڑا کر کے میں ٹھیکیدار کی طرف گیا۔ مجھے اپنا سامان اُٹھانا تھا۔ ٹھیکیدار ایک دبلے پتلے کمانی دار مونچھوں والے شخص سے جھگڑ رہا تھا۔ اس شخص کو میں نے خان کے آگے پیچھے دُم ہلاتے دیکھا تھا۔

''جورے! سچ سچ بتاؤ۔ بڑے خان نے تمہیں کتنا بھاڑا دیا ہے؟''

''سچ کہہ رہا ہوں استاد! اس نے مجھے بیس ہزار روپے دیے ہیں۔ آدھے تمہیں دے رہا ہوں۔'' دبلے پتلے شخص کی آواز خاصی بھاری بھرکم تھی جو اس کے وجود کا حصہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔

''صرف بیس ہزار..... کیا تم نے مجھے گاؤدی سمجھ رکھا ہے؟ اتنا بڑا پڈ اور صرف بیس ہزار رُپے..... اونٹ کے منہ میں زیرہ..... نہیں جورے میاں! مجھے چکر مت دو۔ سیدھی طرح بتا دو۔''

اسی اثنا میں ٹھیکیدار کی خشونت بھری نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ پہچان لیا۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے سامان اُٹھا کر چلتا بننے کا حکم صادر کیا۔ میں نے ان کے معاملے میں پڑ کر کیا لینا تھا۔ جلدی سے اپنا سامان اُٹھا کر، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ کھالا مجھے گدھے کی طرح لدا ہوا دیکھ کر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ بولا، ''پیا جی نے مجھ پر اس سے بھی زیادہ سامان لادا تھا۔ کندھا شل ہو گیا تھا۔''

ہم دونوں چلتے ہوئے سائیں جیت شاہ کے مزار کے قریب پہنچے۔ اکا دکا لوگ گلی میں دکھائی دے رہے تھے۔ نور پور بیدار ہونے والا تھا جب ہم کھالے کے کمرے میں پہنچے۔ گھر

خالی تھا۔ میرے استفسار پر کھالے نے بتایا سب لوگ اس کا رشتہ مانگنے فرید آباد گئے ہوئے تھے۔ فرید آباد میں کھالے کی ایک دور پار کی پھوپھی مقیم تھی۔ اس کی بیٹی کیلئے بخشو لوہار ان کی روایتی خوشامدوں میں جتا ہوا تھا۔ میں نے چھیڑا، ''کھالے! کیا تم نے شادی کیلئے حامی بھر لی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم نے خانزادی کا خیال دل سے نکال بھی دیا؟''

اس نے ایک مسکراہٹ میری طرف اچھالی۔ اس مخصوص مسکراہٹ سے غربت اور کم مائیگی کا مکمل احساس جھلکتا تھا۔ بولا، ''شہرے! بھلا میرا اور خانزادی کا کیا جوڑ..... وہ تو میری قسمت چنگی نکلی کہ مجھے اس کے زیادہ سے زیادہ دیر قریب رہنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس کی ضد پر بڑے خان نے مجھے اس کا خاص ملازم رکھ لیا ہے۔ تنخواہ اچھی ہے۔ کام کاج بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور شہرے! ایک بات بتاؤں؟'' مجھ سے سوال کرنے کے بعد اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا بلکہ اپنی بات آگے بڑھا دی، ''شہرے! یہ بڑے لوگ اندر سے بہت نکو ہوتے ہیں۔ خانزادی کو ہی دیکھ لو۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتی ہے اور جانتی ہے کہ میں اس کیلئے نرم گوشہ رکھتا ہوں مگر..... مگر وہ اُٹھتے پہر تمہارا دم بھرتی رہتی ہے۔ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ سچ بتاؤں..... زبان نہ جل جائے..... وہ تم سے محبت کرتی ہے اور جاگتی آنکھوں تمہارے سپنے دیکھنے لگی ہے۔''

میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا تھا..... مگر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا، ''جب سے تم اسے میرے حوالے کر کے یہاں سے چلے گئے ہو، وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ آج بھی؛ اگر اسے پتہ چل جائے کہ تم میرے کمرے میں بیٹھے ہو؛ تو وہ یہاں آنے میں جھٹ دیر نہیں کرے گی۔''

میں ہنسا، ''اور اس کا باپ بھی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا یہاں آ جائے گا..... واہ کھالے واہ! بڑی رپورٹ دے رہے ہو!''

''اَبے بھتنی کے..... مجھ پر طنز نہ کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو میرے ساتھ بلوچ نگر چل کر اپنی آنکھوں سے اس کی حالت دیکھ لو۔''

میں نے کھالے کی حالت سے لطف لیا۔ چھیڑا، ''کیا وہ ہر اَیرے غیرے کو اپنی حالت دکھانے لگی ہے اَب؟''

''کیا مطلب؟'' وہ برانگیختہ ہو گیا۔

''یہی..... کہ وہ مجھے؛ یعنی ایک پھیری والے پٹھان کو؛ دل کی کہہ دے گی۔ بتا دے گی کہ وہ شہریار کی محبت میں پاگل ہوئی پھرتی ہے۔''

میرے لہجے میں نہاں گہرے طنز نے اسے بے قابو کر دیا۔ میرے شانے پر بھرپور ہاتھ مار کر بولا، ''اوئے چج تھیویں؛ چاہ پیسیں؟''

(چائے پیو گے؟)

''تو کیا مجھے ماس خورا ہے جو نہیں پیوں گا؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

اس کم بخت کا ہاتھ شروع دن سے خاصا بھاری تھا۔ میں شانہ سہلانے لگا جبکہ وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد چائے سے لبریز دو پیالے اُٹھا لایا۔ بولا، ''پتی چینی پوری ہے یا نہیں؛ مجھے معلوم نہیں۔ لو! گزارا کرو۔''

اس نے چائے اچھی بنائی تھی۔ میں چائے پی کر بستر میں لیٹ گیا۔ وہ باتیں کرتا رہا۔ جب اسے احساس ہوا کہ میں اس کی باتوں سے غافل گہری نیند سو چکا ہوں، تو خاموش ہو گیا۔ شاید سو گیا۔ صبح میرے بیدار ہونے سے پہلے جاگ گیا اور شیرے قصائی کے گھر سے اپنے اور میرے لیے ناشتہ تیار کروا لایا۔ بڑے عرصہ کے بعد خالص دیہاتی طرز کا ناشتہ ملا تھا۔ رغبت سے کھایا۔ کھلاتا اس دوران مجھے کریدتا رہا۔ اسے بے قراری تھی۔ جاننا چاہتا تھا کہ میں نور پور کیوں آیا تھا۔ وہ یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھا کہ میں بے سبب یہاں آیا تھا۔ بولا، ''دیکھ شہرے! میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم اب بہت بدل گئے ہو۔ تمہارے پاس فضول گھومنے پھرنے کا وقت نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں اجازت حاصل ہے۔ سچ سچ بتاؤ! تمہیں میڈم نے کون سا مشن دے کر یہاں بھیجا ہے؟''

میں نے کہا، ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں غزالہ سے ملنے کیلئے یہاں آیا ہوں۔''

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا، ''کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتے ہو؟''

اب حیرانی کی باری میری تھی۔ میں نے جواباً سوال کیا، ''اب بھی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

اس نے آنکھیں گھمائیں۔ منہ لٹکایا۔ کہا، ''بلے بھئی بلے! کھالے استاد کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو..... جگ جگ جیو ہزار سال..... شیطان کے برابر..... بھلا میڈم شکیلہ جیسی ہستی کی موجودگی میں تم کسی غزالہ وزالہ کو کیوں دیکھو گے؟''

میں نے ایک طویل سانس لی۔ اس کا مطمح نظر بھانپ کر میں نے کہا، ''کھالے! میرا اور میڈم کا کیا جوڑ..... وہی بات؛ تمہاری اور خانزادی والی..... ویسے بھی وہ ایسی عورت تھوڑی ہے کہ اس کیلئے دل میں محبت کا گوشہ رکھا جائے۔ وہ بہت تریا چلتر ہے۔ یقین مانو؛ میں کل بھی غزالہ سے محبت کرتا تھا، آج بھی اور اپنی آخری سانسوں تک اُسے چاہتا رہوں گا۔''

اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔ بے یقینی بھری آنکھوں مجھے گھورتا رہا، اچار کی ڈلی چوستا رہا پھر چائے لینے چلا گیا۔ چائے کی چینک اور پیالے اُٹھائے واپس آیا۔ بولا، ''غزالہ کا خیال دل سے نکال دو شہرے خان! وہ تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے مایوس ہوگئی ہے۔''

میں نے کہا، ''کیوں؟ کیا میں مرگیا ہوں جو وہ مایوس ہوگئی ہے۔ وہ میری ہے۔ بس! میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ آج نہیں تو کل..... آخر کبھی تو مجھے نور پور لوٹنا ہی ہے۔ اگر نہ بھی لوٹ سکا تو اسے وہاں لے جاؤں گا جہاں میرا دانہ پانی لکھا ہوگا۔ تم یہ بتاؤ؛ وہ کیسی ہے؟''

اس نے کندھے اُچکائے، کہا، ''ویسی ہی ہے۔ اس نے کیا تبدیل ہونا ہے جو پوچھ رہے ہو۔''

مجھے اس کے بے نیازانہ ردِعمل پر غصہ آیا مگر وہ میری پروا کیے بغیر بولا، ''شہرے! بہتر یہی ہے کہ تم میڈم سے شادی کرلو۔ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ یہ خانزادے تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ اب تم کبھی بھی نور پور لوٹ نہیں سکو گے۔ آگے..... اور آگے..... ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ گے۔ تم سچ کہتے تھے کہ ایک نہ ایک دن قسمت کی دیوی تم پر مہربان ہو جائے گی اور تمہارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ بس وہ قسمت کی دیوی میڈم کے روپ میں تمہاری زندگی میں آ چکی ہے..... آہ! ایک تم ہو کہ منزل تمہارے پیچھے بھاگتی ہے۔ ایک یہ بدبخت کھالا استاد ہے جو اپنے دل کی رانی پر اپنے دل کی کیفیت بھی ظاہر نہیں کرسکتا۔''

میں نے کہا، ''کھالے! مجھے الٹی پٹی مت پڑھاؤ۔ چھوڑو میڈم اور غزالہ کی باتوں کو..... یہ بتاؤ کہ میں مرادبخش دیوانے سے کیسے اور کہاں مل سکتا ہوں؟ کیا اس پر اپنا آپ ظاہر کرنے کا خطرہ مول لے سکتا ہوں؟''

وہ کچھ دیر سوچ میں غلطاں رہا۔ پھر بولا، ''ہے تو وہ یار باش بندہ..... غدار اور یار مار نہیں ہے مگر..... مگر آج کل یار ن خان کے آگے پیچھے دم ہلاتا رہتا ہے۔ کیا خبر خان کی خوشنودی کیلئے

تمہارا راز راز نہ رکھے اور خان کے پاس جا کر بک دے۔ اس صورت میں تمہارے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔''

میں نے کہا، ''مگر میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا کروں؟''

''تم اس سے کیوں ملنے پر بضد ہو؟''

''یارن خان کے بارے کچھ معلومات لینی ہیں۔''

''ہوں..... تو یوں کہو ناں..... اس مشن پر تُو رپور آئے ہو۔ مسلسل چکر دیتے آئے ہو مجھے۔''

''ایسی بات بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر تمہیں یارن خان کی ٹوہ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟'' کھالے نے غصہ بھری نظروں گھورا۔

''ٹھیک ہے یار! ایسا ہی سہی۔ آج میری قسمت اچھی ہے۔ تمہارے گھر والے فرید آباد گئے ہوئے ہیں۔ تم غزالہ کو یہاں لے آؤ۔'' میرے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ شاید اسے میرا دماغ چل جانے کا شبہ ہوا تھا۔ بولا، ''کیسے لے آؤں؟ وہ گلی میں بیٹھی ہے ناں کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں لے آؤں۔ بھتنی کے! بتایا تو تھا کہ وہ بخت خان کی حویلی میں رہتی ہے۔ وہ باہر نہیں آتی اور میں حویلی کے اندر نہیں جا سکتا۔''

''یار کھالے! کوئی سبیل کرو..... ملا دو۔'' میں نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ برتن سمیٹتے ہوئے گنگنانے لگا، ''جے کر تیتھوں سر دا ہے تے..... مائے میڈا یار ملا دے.....''

(ماں! اگر تم سے ممکن ہے تو مجھے میرا یار ملا دے۔)

مجھے اس کی گنگناہٹ زہر لگی۔ میں نے قدرے غصے سے کہا، ''کیا بکواس ہے؛ منتیں کر رہا ہوں اور تم نخرے دکھا رہے ہو۔ کوئی طریقہ کرو، اسے یہاں لے آؤ۔''

اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا، ''شہرے! بے وقوفی نہ کرو۔ جا کر پھیری لگاؤ۔ شاید وہ تجھے گلی میں نظر آ جائے۔ اسے دیکھ کر تم اپنا جی خوش کر لینا مگر ملنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بخت خان تمہاری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دے گا۔''

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا مگر میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں نے اپنا سامان کندھے پر رکھا، شام کو دوبارہ ملنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ہاتھ ملا کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ کھالے کے گھر کے پہلو میں، اپنی مخصوص جگہ پر ہائی ایس چوک قریشی جانے کیلئے تیار کھڑی تھی۔ شیدو اپنی چیختی آواز میں سواریوں کو بلا رہا تھا جبکہ دیماں رن آؤٹ ویگن کے فرنٹ ہڈ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کھالے کے گھر سے نکل کر میں نے نور پور کی گلیوں کا چکر لگایا۔ سوائے چند چہروں کی زیارت کے بے نیل مرام رہا۔ غزالہ دکھائی دی نہ امیر نواز۔ میں نے سردار بخت خان کی حویلی کے کم و بیش دس چکر لگائے اور اپنے کھنڈر گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گلی خالی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ چشم تصور میں رنگو قصائی کا چہرہ لہرایا۔ میرے ماں باپ کا ایک قاتل دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ انتقام کے شعلوں پر پانی کا ایک چھینٹا پڑ گیا تھا۔ باقی دشمن ابھی روئے زمین پر چھاتی پھیلائے دندناتے پھرتے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے عہد کا اعادہ کیا۔

ایسے ہی وقت میں کھالا دکھائی دیا۔ وہ حیات خان کے دارے کے سامنے پہنچ کر میری جانب مڑا۔ اس کا آنے کا انداز خبر دیتا تھا کہ کوئی خاص واقعہ رونما ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جوسر کا ڈبا اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا۔ دھیمی آواز میں بتانے لگا، ''شہرے! تیری قسمت چنگی ہے۔ میرے گھر والے آ گئے ہیں۔ میں نے بلو کو تمہارے بارے بتایا ہے اور اسے بڑی مشکل سے راضی کیا ہے کہ وہ خان کی حویلی سے غزالہ کو حیلے بہانے سے گھر لے آئے۔ اب دعا کرو کہ وہ آ جائے اور تمہارے دل کی آس پوری ہو جائے۔''

میں نے کھالے کو تشکر بھری نظروں دیکھا۔ خوشی ہوئی۔ دل میں کہا، 'ملتان سے نکلا تھا تو دل دعا کرنے لگا تھا۔ اب تک خدا سے اس کے ملنے کی دعا ہی تو کر رہا ہوں، اور کر بھی کیا رہا ہوں۔'

ایسے ہی وقت میں اس کے عقب میں مجھے سردار بخت خان دکھائی دیا۔ وہ اپنی حویلی سے نکلا تھا۔ مجھے اور کھالے کو دیکھ کر ذرا تھم گیا۔ میں نے قدرے بلند آواز میں کہا، ''اوئے خوچہ! یہ دوھیا جو سرائے۔ لینی اے تو لو ورنہ اُم کو تنگ نہ کرو۔''

میری بات سن کر سردار بخت خان کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ وہیں سے کھالے کو مخاطب کر کے بولا، ''اوئے کھالے! بھئی؛ کیوں تنگ کرتے ہوئے غریب کو۔ اسے مزدوری

کرنے دو۔''

کھالا پلٹا۔ ہنس کر بولا، ''خان جی! دل لگی کر رہا ہوں اس سے۔ ہم غریبوں نے کیا خریداری کرنی ہے۔''

بخت خان باوقار انداز میں چلتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے مجھ سے کچھ خریدنا نہیں تھا مگر میرا سامان دیکھنے لگا۔ میں ایک کے بعد دوسرا ڈبا نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور بڑے جوش کے عالم میں اپنے سامان کی تعریفیں بھی کرتا۔ اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا، ''ادئے خان! یہ تو دونمبر مال ہے۔''

میں نے جھٹ سے کہا، ''نہیں خان بابا! قسم سے..... اصل جاپانی مال اے۔ اَم نے خود میڈ ان جاپان کے سٹکر لگائے ہیں۔''

وہ میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنسا۔ میں نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ بدلا نہیں تھا۔ وہی رنگ ڈھنگ، وہی وجاہت اور مزاج کی نزاکت..... بلاشبہ اس کا بڑھاپا بھی بہت وجیہہ تھا۔ اس نے کھالے کو مخاطب کیا، ''کوئی شئے لینی ہے؟''

کھالے نے انکار میں سر ہلایا۔ بخت خان نے مجھے کہا، ''جس مال پر تم نے میڈ اِن جاپان کا سٹکر نہیں لگایا، وہ نکال کر اسے دے دو۔''

میں نے ایک بلینڈر نکال کر کھالے کو تھما دیا۔ بخت خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھ سے رقم پوچھی۔ میرے بتانے پر اس نے رقم نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ کھالے نے کہا، ''خان جی! یہ لیں۔ اچھا ہے۔''

بخت خان پلٹا۔ چند قدم چل کر رُک گیا۔ شاہانہ انداز سے پلٹ کر بولا، ''کھالے! یہ میں نے تمہارے لیے خریدا ہے۔ جاؤ! صفو کو دے دو۔ وہ کسی کڑی کے داج میں رکھ دے گی۔''

کھالے نے تشکر آمیز نظروں سے خان کو دیکھا۔ خان آج بھی کھلے دل کا مالک تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا گلی میں سیدھا چلتا گیا۔ جب تک وہ یارن خان کی حویلی میں داخل نہیں ہو گیا، ہم دونوں اس کی پشت کو گھورتے رہے۔ کھالا بولا، ''اللہ خیر کرے! آج کل دونوں میں سے ہوا نہیں گزرتی۔''

مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ کہا، ''بخت خان اور یارن خان کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا جانے کیونکر تعلقات خوش گوار ہو گئے دونوں کے؟''

''یہ آنے والے الیکشن کا کمال ہے۔'' کھالے نے دانش مندانہ طور سے کہا۔

ایسے ہی وقت میں جب کھالا بلینڈر کا ڈبا اُٹھائے جانے کیلئے پلٹا، کھالے کی بہن خالدہ عرف بلو دکھائی دی۔ وہ سبز چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس نے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ خان کی حویلی کے بڑے گیٹ پر پہنچ گئی۔ رُک کر ایک نظر ہمیں دیکھنے کے بعد حویلی میں گھس گئی۔

میں نے کھالے سے کہا، ''یہ بلو کو کیا ہوا؟ بہت کمزور ہو گئی ہے۔''

اس نے کہا، ''ہاں! بیمار شمار رہتی ہے۔ سرکاری ڈاکٹر کہتا ہے کہ پیٹ میں السر ہے۔ ڈاکٹرنی کہتی ہے کہ رسولی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اس پر سایہ ہو گیا ہے۔ خدا جانے کیا ہے؟ دن بدن سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے۔''

''تم اسے ملتان لے آتے۔ وہاں کسی بڑے ڈاکٹر سے چیک اَپ کروا لیتے۔'' میں نے تأسف سے کہا۔

''خیال ہی نہیں رہا۔ چند دنوں تک اسے ملتان لے کر آؤں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم یہیں رُک کر دیکھتے رہنا۔ اگر بلو کے ساتھ غزالہ حویلی سے نکلے تو تم بھی فوری طور پر میرے گھر پہنچ جانا۔ دکان کے چھپر تلے بیٹھنا۔ ذرا دیکھ بھال کر۔ ہاں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کھالے کے جانے کے بعد دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایسا کرنے سے مجھے عجیب سا روحانی سکون ملتا تھا۔ میں نے دانستہ طور پر رقم نکال کر جھولی میں رکھ لی۔ اب مجھے دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ میں اپنی پکری شمار کر رہا ہوں۔ کمائی کا حساب کتاب کر رہا ہوں۔ میرے عقب میں میرا گھر تھا جہاں میرے والدین کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میرے سامنے کالے بزدار کا خستہ حال مکان اور ملحقہ سردار دریام خان کی حویلی واقع تھی۔ میرے بائیں ہاتھ پر نور پور کی اکلوتی مسجد تھی جس کے عقب میں مولوی کا مکان تھا۔ یہ سلطنت میری تھی۔ آج اجنبی تھی۔ وقت ایسے ہی بدل جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نور پور کے در و دیوار سے حسرتیں جھانک کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ باوجود کہ یہ محض میرا خیال تھا، مگر بہت توانا تھا۔ اسی حالت میں بیٹھے ہوئے خاصی دیر گزر گئی۔

کوئی پون گھنٹے بعد، جب مجھے بھوک اور پیاس نے ستانا شروع کر دیا، میری امید بر لائی۔ دفعت خان کی حویلی سے سبز چادر میں لپٹی ہوئی خالدہ برآمد ہوئی۔ اس کے عقب میں گبھرو کلیجی

رنگ کے کپڑوں میں چھپی ہوئی غزالہ تھی۔ دونوں پہلے آگے پیچھے، پھر برابر چلتی ہوئیں کھالے کے گھر کی طرف چلی گئیں۔ میں انہیں ایک ٹک دیکھتا رہا۔ ایسے ہی وقت میں کالے بزدار کی سالی میدو نے اپنے چوبی دروازے سے جھانکا۔ مجھے دیکھ کر تیر کی طرح میری طرف آئی، ''تم وہی پٹھان ہوناں جس سے میں نے ایک استری لی تھی؟''

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ بڑی شریر لڑکی تھی۔ میں نے گھبرا جانے کی اداکاری کی، ''کیا ہوا؟ کیا وہ خراب ہو گیا اے؟''

''وہ اصلی جاپانی نہیں تھی۔'' اس کے لہجے میں غصے کی آمیزش تھی۔

''اپنی دماغ کا علاج کراؤ بی بی..... چھ سو میں اصلی جاپانی استری کہاں سے ملتا ہے؟''

''مگر تم نے تو یہی کہا تھا۔''

''اَم تو اب بھی ہر کسی سے یہی بولتا اے۔'' میں نے کہا، ''وہ استری خراب ہو گیا اے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ مسکرائی۔ اس کے انداز سے پتہ چلا کہ وہ مجھے تنگ کرنے کیلئے ڈراما بازی کر رہی تھی۔ بولی، ''گلاس کا سیٹ ہے تمہارے پاس؟''

میرے پاس واٹر سیٹ تھا مگر سودے بازی کا وقت نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولی، ''پٹھان! تم جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ یہ تو پڑا ہوا ہے۔''

اس نے ایک ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے شرمسار ہو کر جلدی سے کہا، ''یہ دو نمبر مال اے بی بی۔ چھوڑو۔ اسے نیچے رکھ دو۔''

اس نے منہ بنا کر ڈبہ نیچے رکھ دیا۔ اس کی بڑی بہن دروازے میں آ گئی۔ شکر ہوا کہ اس نے میدو کو بلا لیا۔ دونوں بہنیں چند لمحے کھسر پھسر کرتی رہیں پھر کالے کی بیوی نے قدرے بلند آواز میں کہا، ''اساں کجھ ناں گھنسوں پٹھان..... ونج تھی۔''

(پٹھان! ہم کچھ نہیں خریدیں گی۔ جاؤ۔)

میں نے سامان اُٹھایا اور دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھالے کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بخشو لوہار کے چھپر تلے جا کر بیٹھ گیا۔ بخشو نے اپنا دھندا ابھی نہیں چھیڑا تھا۔ دکان بند تھی۔ میں جھلنگا سی چارپائی پر کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اگر میں نے سوانگ نہ رچا رکھا ہوتا تو بے دھڑک گھر میں داخل ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد دکان کا دروازہ کھٹکے سے کھلا۔ کھالا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر ہنسا، ''واہ مجنوں! بوہا مل کے بیٹھاں ہیں!''

(واہ مجنوں! دروازے پر بیٹھے ہو۔)

میں نے جھینپ کر کہا، ''اور امتحان نہ لو۔''

اس نے مجھے سامان سمیت دکان میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ شریف چکی والا کھانستا ہوا حیات خان کے دارے سے نکل رہا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں برق رفتاری سے دکان میں داخل ہو گیا۔ کھالے نے بیرونی دروازہ بند کر دیا۔ اندرونی دروازے سے نکلتے ہوئے مجھے وہیں رکے رہنے کا اشارہ کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد غزالہ میرے سامنے تھی۔ وہ کیلجی رنگ کی پھولدار چادر میں پوری طرح لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ پہچان کر دھوکہ کھا گئی۔ وہ شہریار سے ملنے کیلئے آئی تھی مگر یہاں الیکٹرانکس کا سامان بیچنے والا گلاب خان منتظر تھا۔ پلٹی۔ واپس جانا چاہتی تھی کہ میں نے لپک کر چادر تھام لی۔ اپنے اصل لب و لہجے میں بولا، ''غزالہ..... یہ میں ہوں، شہزا..... تمہارا شہریار۔''

وہ تڑپ کر مڑی۔ مجھے بغور دیکھا۔ آنکھوں میں بھری ہوئی بے یقینی فی الفور شناسائی میں بدل گئی۔ چہرے کو چھپانے والی چادر سرک گئی۔ وہ 'ہائے' کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی بے ساختگی نے مجھے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی تھی جس کی وجہ سے میں بری طرح لڑکھڑا گیا۔ فوراً سنبھل بھی گیا۔ اسے سینے سے لگا کر بھینچنے لگا۔ اس کی سسکیاں نہ تھمنے والی داستان کی طرح میری سماعت میں اترنے لگیں۔

''یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' اس نے بدقت خود کو سنبھالا۔

''تمہیں ایک نظر دیکھنے کیلئے یہ جتن کیا ہے۔ کھالے کا احسان ہے کہ اس نے تم سے ملا دیا۔'' میں نے اس کے عقب میں کھلا ہوا اندرونی دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اردگرد دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کا پرانا بنچ دکھائی دیا۔ اسے آہستہ سے چلاتا ہوا بنچ تک لایا۔ بٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں زندگی سرسرا رہی تھی۔ چہرے پر آس و امید کے کئی رنگ جھلملا رہے تھے۔ وہ یکتا نہیں تھی مگر میری جولانی طبع نے اسے یکتا بنا رکھا تھا۔ وہ حسین تھی مگر ایسی بھی نہیں تھی کہ اس کے بعد کوئی اور چہرہ حسین نہ لگتا مگر میرا عشق اسے تکمیل دے رہا تھا۔ اس کی جلد گندمی تھی۔ ملیح نہیں تھی۔ اگر تھی بھی تو میڈم شکیلہ کے آگے اس کی تابنا کی ماند پڑتی تھی۔

میں نے کہا، ''غزالہ! کیا تم مجھے یاد کرتی تھیں؟''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ بولی، ''اور میرا کون تھا، جسے یاد کرتی۔ تمہارا چھپ کر یہاں آنا اور مجھ سے ملنا ظاہر کرتا ہے کہ تم واپس چلے جاؤ گے۔ ہے ناں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی، ''تم مجھے دیکھ رہے ہو، میں تمہیں دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم کچھ دیر کیلئے اپنا بہروپ اتار دو؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں..... یہ ایک بار اتر گیا تو پھر دوبارہ نہیں اوڑھا جا سکے گا۔''

''تمہاری آنکھوں کا رنگ بھی بدلا ہوا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ مجھے ایکس رے کرتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''آنکھوں میں لینز فٹ کر رکھے ہیں میں نے۔'' میں نے کہا، ''ان باتوں کو چھوڑو..... اپنی باتیں کرو۔ میں نے ملتان میں اپنا گھر لے لیا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ ملتان چلو گی؟''

وہ گڑبڑا گئی، ''اور اماں؟''

''وہ بھی ساتھ چلے گی ناں!''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ پریشان سی ہو گئی، ''وہ نہیں مانے گی۔''

''یہاں رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ نور پور تو خالی ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا، ''شانو، فرزانہ اور موجو میرے پاس ہیں۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔''

''میں بھی انہیں بہت یاد کرتی ہوں۔ پروین کہاں ہے؟ کیا مل گئی ہے؟'' اس نے پوچھا، ''امیر نواز اکیلا یہاں آیا تھا۔ تو کیا وہ امیر نواز کے ساتھ نہیں تھی؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا، ''نہیں! مگر وہ خیریت سے ہے۔ میں اسے مل چکا ہوں۔'' میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ امیر نواز اور پینو نے شادی کر لی ہے۔ پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ غزالہ کا بتانے سے پورے نور پور کی لڑکیوں کو خبر ہو جانا تھی۔ راز، راز نہیں رہنا تھا۔

''کہاں ہے وہ؟ تمہاری بات سے لگتا ہے کہ وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ مجھ سے جھوٹ بولتے ہو؟'' اس نے قدرے تشکیک آمیز انداز میں استفسار کیا۔

''وہ میرے پاس نہیں ہے مگر ٹھیک ٹھاک ہے۔ جلد ہی میں اسے بھی اپنے پاس لے جاؤں گا۔'' میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''مگر اماں یہاں سے نہیں جائے گی۔''

''تم اپنی بات کرو۔''

''میں وہاں جا کیا کروں گی؟'' اس نے ہونٹ کاٹے۔

''ہم دونوں شادی کرلیں گے۔''

میری توقع کے مطابق وہ شرمائی نہیں۔ یوں لگا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ بولی، ''بلو نے مجھے بتایا تھا کہ تم وہاں کسی عورت کے چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ ملتان میں۔ کیا یہ سچ ہے؟'' اس کے دل کی بات لبوں پر آ گئی۔ ساتھ ہی آنکھیں پھر نم ہوگئیں۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔ کھالے نے بلو کو میڈم کے بارے میں بتایا ہوگا۔ میرا اور میڈم کا تعلق اس پر آشکار کیا ہوگا۔ اس نے غزالہ کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُتار دیا ہوگا۔ میں نے کہا، ''ایسی کوئی بات ہوتی تو میں یوں جان ہتھیلی پر رکھ کر نور پور نہ آتا۔ کوئی آ جائے گا؛ اس لیے آئیں بائیں شائیں نہ کرو اور جلدی سے مجھے بتاؤ۔''

''نہیں شہرے! میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ اماں نہیں مانے گی۔ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر جاؤں گی تو میرا نام گالی بن جائے گا۔ میرا باپ پُنا جائے گا۔ ماں کی چادر اچھالی جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہاں لوٹ آؤ۔'' اس کی لرزتی ہوئی آواز کے پیچھے کوئی گہرا گھاؤ تھا جو دکھائی نہیں دے رہا تھا، ''میں تمہیں کہتی تھی ناں کہ شہر جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ جو آتے ہیں وہ بدل کر آتے ہیں۔ تم ملتان جا کر بدل گئے ہو۔''

میں نے اس کے ہاتھ تھامے، ماتھے پر آ کر آنکھ کو مجھ سے چھپانے والی بل دار لٹ کو پیار سے ایک طرف ہٹایا اور آنکھوں میں جھانکا، ''میں بدلا نہیں ہوں میری جان! وہی ہوں۔ تمہارا شہرا۔ تمہارے بغیر ادھورا۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔ پھر بھی تمہیں مجھ پر یقین نہیں آ رہا۔ کیوں؟''

اس نے بڑے غیر محسوس انداز میں گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ چاچا چراغ دین، امیر نواز اور پروین کو موضوعِ سخن بنا لیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ شاید آدھا گھنٹہ بیت گیا۔ کھالے نے دروازے سے جھانک کر وقت کا احساس دلایا۔ اس کے اوجھل ہونے پر میں نے غزالہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ ایسے ہی سمے میڈم شکیلہ کا چہرہ چشمِ تصور میں بھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں سوالوں کے کئی سانپ کلبلا رہے تھے۔ وہ وعدہ یاد دلا رہے تھے جو میں نے کیا تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ اسے پرے ہٹانا چاہا۔ وہ نہیں ہٹی تو میں نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھیمی

آواز میں غزالہ کو مخاطب کیا، ''غزالہ! سچ کہتا ہوں۔ میں تمہارا ہوں۔ ملتان میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔ میں جس لڑکی کی ملازمت کرتا ہوں، اس کا حسن دیکھ کر انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھ پر مہربان ہے بلکہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔ مگر یقین کرو؛ میں اس کا کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہاں ایک دو ضروری کام ہیں جو اس کی معاونت کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔ ان کاموں کو مکمل کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ میں کبھی سکھ کی سانس نہیں لے سکوں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابھی میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ از خود شہری زندگی کو سروائیو کر سکوں۔''

''یعنی ابھی تم اس کی محبت کا دم بھرتے ہو؟'' غزالہ نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کی گفتگو کے انداز پر حیرانی ہوئی۔ اس کے لہجے میں ضدی پن اور بغاوت کی پرچھائیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

''ہاں! ابھی میں اسے دھوکے میں رکھتا ہوں۔ جونہی مجھے اس کی ملازمت کی ضرورت نہ رہی، اسے چھوڑ دوں گا۔ پھر میں ہوں گا اور تم..... اور ہماری ایک چھوٹی سی جنت..... بس!''

''تم مجھے ملتان لے جانا چاہتے ہو۔ اگر میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو کیا وہ کچھ نہیں کہے گی؟'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔ لبوں پر گہری طنزیہ مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

''اسے یقیناً پتہ چل جائے گا، شاید غصہ بھی کرے مگر میں اسے مطمئن کر لوں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے سمجھایا۔

''جب تم اسے چھوڑنا چاہو گے، کیا وہ آسانی سے پیچھے ہٹ جائے گی؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت امیر اور اثر و رسوخ والی عورت ہے۔'' اس کے چہرے کے تاثرات چغلی کر رہے تھے کہ وہ میری باتوں پر سرے سے اعتماد کر ہی نہیں رہی تھی۔

''کس سے سنا ہے تم نے؟''

''میں کیوں بتاؤں؟ غلط سنا ہے تو قسم کھا کر کہو۔'' وہ تنک کر بولی، ''میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ ہر وقت تمہیں اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ تم اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہو۔''

''اوہ غزالہ..... سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ ایسی عورت نہیں ہے کہ لیلیٰ مجنوں والی محبت کرتی پھرے۔ اس کے نزدیک میری خاص اہمیت نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک چاہنے والا اس کی

راہ میں کھڑا ہے۔ وہ دل داری نہیں کرتی۔ دلوں سے کھیلتی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا..... دوسرے کے بعد تیسرا..... کئی عاشق بدلتی ہے۔ کہاناں! اس کا وہم نہ کرو۔ وہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض مالکن ہے میری۔''

''میں نہیں مانتی۔''

''کیسے مانو گی؟'' میں نے زچ ہو کر کہا۔

''میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ!'' اس نے بے ساختہ کہا۔ اب تک ہونے والی گفتگو میں یہ اکلوتا جملہ تھا جس سے ہمارے عشق کا ماضی جھلکتا تھا۔

میں نے جھٹ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اظہارِ محبت کی تجدید کی۔ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں اور اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ مان گئی۔ دیہاتی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جھٹ ناراض..... پٹ راضی..... اس نے وعدہ کیا کہ وہ پھوپھی کبریٰ سے بات کرے گی اور اسے ساتھ چلنے پر آمادہ کرے گی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی ماں اس کی بات ٹالنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ پہلے بھی اس کی سبھی مان لیتی تھی؛ اب بھی مان جائے گی۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ جانا چاہتی تھی۔ ایسے میں مجھے خود پر اختیار نہیں رہا۔ میں نے نہایت آہستگی سے اسے شانوں سے تھاما۔ قریب کیا۔ پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔ وہ ہنسی۔ بولی، ''یہ داڑھی مونچھیں کتنی عجیب لگتی ہیں تمہارے چہرے پر..... ہے ناں؟''

میں کوئی جواب دینے لگا تھا کہ زور دار دھماکہ ہوا۔ غزالہ کے حلق سے بے اختیار 'ہائے' برآمد ہوئی اور وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بجلی کی سی مستعدی سے گردن موڑی۔ فوری سمجھ میں آ گیا کہ دھماکہ دروازہ ٹوٹنے کا ہوا تھا۔ بیرونی دروازے کا ایک چوبی طاق قبضوں سے اکھڑ کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ دوسرا چوپٹ کھل گیا تھا۔ جونہی میری نظر کھلے دروازے میں پڑی، میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ موت اگلنے والی ڈبل کے گن کے دہانے کا رُخ میری جانب تھا اور اس مختصر سی دکان میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

''تت..... تم کون ہو؟'' مجھے اپنے حلق سے برآمد ہونے والی آواز اجنبی لگی۔

❖❖○❖❖

میرا استفسار عبث اور بے محل تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بخشو لوہار کے کمرے کی چھت کو

سہارا دینے والا شہتیر حائل تھا جس کی وجہ سے مجھے دروازہ توڑنے والے کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گردن سے نچلا آدھا دھڑ نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیہاتی طرز کی قمیص اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ جثے کے اعتبار سے خاصا لحیم شحیم معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈبل کے گن کی نال میری جانب اٹھی ہوئی تھی اور گن بردار کے سنگین عزائم کا پتہ دے رہی تھی۔

حیرت اور خوف کا ابتدائی مرحلہ گزر گیا تو مجھے غزالہ کی موجودگی کے باعث رونما ہونے والی خطرناکی کا احساس ہوا۔ میں نے غزالہ کو دیکھا اور آنکھوں سے کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں سرعت سے دائیں طرف ایک قدم بڑھ گیا۔ اس سے یہ ہوا کہ غزالہ میری آڑ میں رہتے ہوئے کمرے سے نکل سکتی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر مجھے احساس ہو گیا کہ وہ جوں کی توں کھڑی تھی۔ خوف اور پریشانی کے سبب اس میں قدم اُٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔

میں نے قدرے دھیمی آواز مگر درشت لہجے میں کہا، ''غزالہ! نکل جاؤ یہاں سے.....''

ایسے ہی وقت میں ٹوٹے ہوئے دروازے کے باہر کئی افراد دکھائی دیے۔ گن بردار کا چہرہ بھی دکھائی دیا کیونکہ وہ دروازہ عبور کرنے کیلئے قدرے جھک آیا تھا۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا اور آنکھوں میں تیز سرخی موجزن تھی۔ اس قماش کے لوگ بہت سنگ دل ہوتے ہیں۔ میں نے ایک بار پھر غزالہ کو کمرے سے جانے کا حکم دیا۔ کمرے میں داخل ہونے والے تنومند حملہ آور کی وجہ سے میں غزالہ کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا مگر میرے کان اس کے قدموں کی چاپ پر لگے ہوئے تھے۔ ایسے ہی وقت میں گن بردار کے حلق سے غراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی، ''اے کم ذات! ایدھر ای کھڑی رہ..... نی تاں گولی مار دیاں گا!''

اس کا لہجہ ٹھیٹھ پنجابی تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ اس علاقے کا رہنے والا نہیں تھا۔ اسی اثنا میں غزالہ نے زقند بھری اور بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کا محفوظ ہونا میرے لیے طمانیت بخش امر تھا۔ میرے مقابل نے دانت کچکچائے، گن کی نال کا رُخ کمرے کے اندرونی دروازے کی طرف کیا مگر پھر فوراً ہی نال کا رُخ میری جانب کر دیا۔ میں نے اس لمحے سے فائدہ اُٹھانا چاہا تھا مگر اس کی چابک دستی نے مجھے روک دیا۔

وہ مجھ پر نظریں مرکوز رکھ کر پنجابی لب و لہجے میں بولا، ''ہاتھ سر سے بلند کر لو جوان!''

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اسی اثنا میں باہر سے آواز گونجی، ''ایں بے غیرت پٹھان

کوں باہر گھن آ.....''

(اس بے غیرت پٹھان کو باہر لے آؤ۔)

جونہی یہ شناسا آواز میرے کانوں پڑی، یک بارگی میرے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ یارن خان کی پاٹے دار آواز مجھے لمحے بھر کا مغالطہ بھی نہیں دے سکتی تھی۔ باہر کھڑے کئی افراد میں ایک وُہ بھی تھا جو ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔

''اوئے بشیرے! ادھر سے جاؤ اور کھالے کو میرے پاس بلا لاؤ۔ وہ بے غیرت دلال گھر میں دبکا بیٹھا ہوگا۔'' یارن خان کی کڑک دار آواز سنائی دی، ''کنجر کے پتر نے گھر کو کوٹھا بنا رکھا ہے۔ دلالی کرتا ہے..... اسے بھی آج دیکھ ہی لیتا ہوں۔''

اس دوران لحیم جثے والا شخص مستعدی سے گھوم کر میرے پہلو میں پہنچ گیا۔ گن کی نال میری پسلیوں میں چبھو کر خشمگیں آنکھوں سے باہر چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔ اس نے ابھی تک کسی غلطی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا ورنہ میں اس پر حملہ کرنے میں ایک پل کی تاخیر نہ کرتا۔ ناچار، اس کے دھکیلنے پر پہلو کے بل چلتا ہوا ٹوٹے ہوئے دروازے تک پہنچا۔ ایک نظر دیکھنے پر ہی پتہ چل گیا کہ یارن خان اپنے لاؤلشکر سمیت باہر موجود تھا۔ اس کے پرانے نمک خوار تو میرے ہاتھوں واصلِ جہنم ہو چکے تھے اس لیے آج نئے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے پار، شیرے قصائی کے گھر کی جانب، نور پور کے چند شناسا چہرے بھی محوِ تماشا دکھائی دیے۔

یارن خان کے پہلو میں تین گن بردار باڈی گارڈ کھڑے تھے جنہوں نے مجھے فی الفور اپنے نرغے میں لے لیا۔ مجھے بخشو لوہار کی دکان سے گن پوائنٹ پر باہر لانے والے نے مشاقی سے میری تلاشی لی اور جو ہاتھ لگا، نکال لیا۔

یارن خان نے گہری نظروں سے مجھے گھورا، ''اوئے کتے کے بچے! تمہاری یہ جرأت کہ تم نور پور میں آ کر دن دہاڑے ایسی حرکت کرو..... میں تمہارے تھوبڑے کو عبرت کا نشان بنا دوں گا۔ سارا نور پور دیکھے گا اور اپنی آنے والی نسلوں کو بھی تمہارے بھیانک انجام کی کہانی سنائے گا۔ اوئے لے چلو اسے..... حویلی میں.....''

بشیرا تیز قدموں سے چلتا ہوا خان کے قریب پہنچا اور بولا، ''خان جی! کھالا گھر میں موجود نہیں ہے۔ حکم دیں تو بخشو کو پکڑ لاؤں؟''

میری حالت دگرگوں تھی۔ میری اور غزالہ کی ملاقات ایک جانکاہ تماشا بن کر نور پور کے

سامنے آ گئی تھی۔ اگر میں اپنے اصل روپ میں ہوتا تو صورتِ حال بہتر نہ ہوتے ہوئے بھی اتنی کبیدہ خاطر نہ ہوتی جتنی اَب تب میں ہونے والی تھی۔ میں سب کی نظر میں ایک نووارد پٹھان تھا جس نے نور پور کی عزت پر ہاتھ ڈال کر بقول یارن خان 'دن دہاڑے' ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔

''اوئے بشیرے! جا اپنے سائیں کو اِدھر بلا لا۔ بڑا خان بنا پھرتا ہے۔ مونچھ تلے گندگی کی پوٹ رکھ کر ناک اونچی رکھتا ہے۔''

میں فی الفور سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ سردار بخت خان کی طرف تھا کیونکہ بشیرا بخت خان کا خاص ملازم تھا اور غزالہ اپنی ماں سمیت بخت خان کی حویلی میں اقامت پذیر تھی۔ بشیرے نے ادھر ادھر دیکھا، پھر تیز قدموں سے بخت خان کی حویلی کی طرف بڑھ گیا۔

یارن خان کے اشارے پر مجھے نرغے میں لینے والوں نے خان کی حویلی کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا اور اس مرگِ مفاجات سے کسی طور نکلنے کی ترکیب سوچ رہا تھا مگر عافیت کی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ عجیب انداز سے الجھ گیا تھا۔ اگر میں اپنی اصلیت یارن خان پر آشکار کر دیتا تو اپنی یقینی موت کا سامان کر دیتا۔ اگر خاموش رہ کر بدستور پٹھان بنا رہتا تو بھی اس سے خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ غیرت کے نام پر میرا بھرکس نکالنے والا تھا۔ جونہی میں حیات خان کے دارے کے قریب پہنچ کر یارن خان کی حویلی کی طرف مڑا، بخت خان گلی میں بشیرے کے ساتھ کھڑا دکھائی دیا۔ وہ غالباً بشیرے سے اس معاملے کی نوعیت اور جزئیات کے بارے میں دریافت کر رہا تھا اور سنگینی کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایسے میں کھالے کے گھر سے بخشو لوہار برآمد ہوا۔ خان کے ایک کارندے نے اسے اپنے ساتھ لیا اور ہمارے پیچھے چل پڑا۔ میری وجہ سے کھالے کا گھر بھی زیرِ افتاد آ گیا تھا۔ اس میں کوئی کلام نہیں تھا کہ یارن خان پرلے درجے کا کینہ پرور شخص تھا۔ وہ بے حیائی کا جواز بنا کر کھالے کے خاندان کی تکہ بوٹی کر سکتا تھا۔

سلگتے ہوئے ذہن کے ساتھ میں کائیاں گن برداروں کے نرغے میں چلتا ہوا یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ یارن خان مجھ سے چند قدم آگے روایتی طمطراق سے چل رہا تھا۔ اس نے ابھی تک پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا تھا اور نہ اس نے یا اس کے کسی کارندے نے مجھے

مخاطب کیا تھا۔ حویلی کا دیکھا بھالا کاریڈور عبور کر کے مجھے شاہانہ طرز کے ڈرائنگ روم میں لایا گیا جہاں یارن خان صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔

مجھے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے وسط میں کھڑا کر کے گن بردار چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ایک سیاہ فام باڈی گارڈ یارن خان کے عقب میں جا کھڑا ہوا اور مجھے نشانے پر لے کر خون آشام نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کی مضطرب انگلی گن کے ٹرائیگر پر کانپ رہی تھی اور مجھے یہ تنبیہہ کر رہی تھی کہ میری معمولی سی مشکوک حرکت میرے لیے موت کا سامان پیدا کر دے گی۔ میں نے گردن موڑ کر دوسرے لوگوں کی طرف نہیں دیکھا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ دروازے کے پاس بعینہٖ اسی حالت میں کھڑے ہوں گے جس پوزیشن میں سیاہ فام گن بردار کھڑا تھا۔

''ہاں بھئی! بول..... تیرا نام کیا ہے؟'' خان کی شعلے اگلتی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

میں نے چند لمحے سوچا۔ بجا کہ میرا بھیس مجھے کوئی تحفظ یا فائدہ نہیں دے سکتا تھا مگر یہ بھی طے تھا کہ میرا اصل روپ آشکار ہونے پر خان برافروختہ ہو کر مجھے گولیوں سے بھون ڈالنے کا حکم صادر کر دیتا۔ سرِ دست میں نے پٹھان بنے رہنے کا فیصلہ کیا اور کہا، ''خان جی! میں گلاب خان ہوں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''اُدھر بخور (پشاور) سے.....''

''تمہارا کھالے سے کیا تعلق ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''پھر اس نے تمہیں اپنی ورکشاپ میں کیوں گھسنے دیا حرام زادے؟'' یارن خان کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

میں نے کندھے اُچکانے پر اکتفا کیا۔

''اس لڑکی سے تمہاری واقفیت کیسے ہوئی؟''

''کس لڑکی سے؟'' میں نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

اسی لمحے میری گدی پر بھاری ہاتھ پڑا۔ دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ میرے عقب میں کھڑے ہوئے قوی الجثہ کارندے نے قدم بڑھا کر خاصے زور کا ہاتھ جمایا تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ آنکھوں کے آگے ناچنے والے تاروں سے گلوخلاصی کی۔ قدرے سخت لہجے میں کہا، ''خان جی!

اَم تمارا دشمن نہ اے۔ تم اَم سے دشمنی مت کرو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

اس نے میرے الفاظ پر غور کیا اور مجھے بغور دیکھا۔ شاید میری بات کے عقب میں چھپی ہوئی سنگین دھمکی کا دل ہی دل میں جائزہ لیا۔ سرد لہجے میں بولا، ''ورنہ کیا اچھا نہیں ہوگا؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا، ''اَم اکیلا نہیں اے۔ اَمارا گینگ اے جس نے تمارا حویلی دیکھ لیا تو تمارا جینا مشکل کر دے گا۔''

اس کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری۔ میری یہ کوشش ناکام گئی تھی۔ وہ بجائے خوفزدہ ہونے کے، زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ بولا، ''ٹھیک ہے۔ میرا جینا پہلے بھی کچھ زیادہ آسان نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے تھوڑا بہت اور مشکل ہو گیا تو کچھ نہیں ہوگا۔ شاباش! اب تمہاری زبان چل پڑے تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ جو پوچھتا جاؤں، صاف صاف بتاتے جانا۔ ہاں! اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''وہ اَم سے استری لینے آیا تھا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''اچھا! بند کمرے میں تم اسے استری دے رہے تھے..... واہ پٹھان! کیا کہنے تمہارے..... لگتا ہے، تم سیدھی طرح ماننے والوں میں سے نہیں ہو۔'' یارن خان زخمی سانپ کی طرح پھنکارا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کارندوں سے کچھ کہنا چاہا، مگر کاریڈور میں بھاری قدموں کی چاپ سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔ چند لمحوں بعد بخت خان بشیرے کے ہمراہ دروازے میں دکھائی دیا۔ وہ اپنی مخصوص شاہانہ انداز میں چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر یارن خان کے پاس چلا گیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، ''خان! اسے جانے دو۔ یہ کوئی غیر نہیں ہے، اپنا بچہ ہے۔ شہرا..... سوہنے بلوچ کا پتر شہریار..... پولیس کی نظروں سے چھپنے کیلئے اس نے یہ سوانگ رچا رکھا ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے مجھے کیسے ایک نظر میں پہچان لیا تھا؟

کم و بیش حیرانی کی یہی کیفیت یارن خان پر طاری ہوئی۔ وہ مجھے تشکیک آمیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا، ''مگر بخت خان! یہ شہرا تو نہیں ہے..... داڑھی مونچھ تو نقلی ہو سکتی ہے مگر دیکھو! اس کی تو آنکھیں تک نیلی ہیں۔ نور پور میں شہرے سمیت کسی بھی شخص کی آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔''

بخت خان نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی شکوک و شبہات کے ڈورے تیرے۔

محتاط انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا میرے پاس آیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سرد لہجے میں بولا، ''پینو کتھاں اے؟''

(پینو کہاں ہے؟)

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''میکوں پتہ کائنی خان جی!''

(مجھے علم نہیں ہے خان جی!)

اس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ ابھری۔ پلٹا۔ یارن خان سے مخاطب ہوا، ''خان! یہ شہرا ہی ہے۔ اس نے آنکھوں میں کچھ ڈال رکھا ہے۔''

میں اس گھڑی ایک دم فراموش کر بیٹھا تھا کہ میں نے اس سے یا کسی سے بھی سرائیکی زبان میں بات نہیں کرنا تھی۔ اسے جواب دیتے ہوئے مجھ سے ایک نہیں، تین غلطیاں سرزد ہوئیں تھیں۔ ایک تو میں نے آواز نہیں بدلی تھی، دوسری غلطی یہ کی تھی کہ میرا لہجہ سرائیکی تھا اور تیسرا مجھ سے اس فاش غلطی کا ارتکاب ہوا تھا کہ میں نے سوال کی نوعیت کو سمجھے بغیر پینو کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ اصولی طور پر مجھے اس حیرت کا اظہار کرنا چاہیے تھا کہ پینو کون ہے اور میں پینو کو نہیں جانتا۔

یارن خان نے کہا، ''ٹھیک ہے بخت خان! تم جاؤ۔ میں اسے چھوڑ دوں گا۔''

بخت خان نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں خان! میں اسے لے کر جاؤں گا۔ مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ اوئے! یہ بندوقیں نیچی کرو۔ خواہ مخواہ فلمی سچوئیشن مت بناؤ۔''

یارن خان نے سرد نظروں سے مجھے اور پھر بخت خان کو گھورا۔ بولا، ''اگر یہ واقعی شہرا ہے تو بھی اسے نور پور میں چوروں کی طرح آنے اور بے غیرتوں کی طرح عزت میں نقب لگانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ ہمارے خاندان کا مجرم ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیے۔''

''نہیں خان! یہ کسی اور سے نہیں، اپنی منگیتر سے ملنے کیلئے آیا تھا۔ بخشو لوہار کی دکان میں اسی سے مل رہا تھا۔ بخشو یا اس کے پتر کھالے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ انہیں اس کی اصلیت کا علم تھا۔ اس لیے انہوں نے اس ملاقات کی اجازت دے دی۔''

''تمہیں اس سارے ڈرامے کا کیسے پتہ چلا ہے؟'' یارن خان کے لہجے میں تشکیک بھری ہوئی تھی۔

''اس کی منگیتر غزالہ مائی سے..... تمہارے ادھر آتے ہی وہ بھاگ کر میرے پاس پہنچی اور

اس نے مجھے یہ ساری رام کہانی سنائی۔ اچھا! میں چلتا ہوں۔ چلو بھئی شہرے میاں! ذرا تم سے حساب کتاب کرلوں۔''

مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے بخت خان نے کمرے سے نکلنا چاہا۔ یارن خان نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ گری ہوئی بندوقیں اُٹھ گئیں۔ پہلے میں نشانے پر تھا۔ اب میرے ساتھ ساتھ بخت خان بھی نشانے کی زد میں تھا۔ بخت خان نے کارندوں کو غصہ بھری نظروں سے دیکھا پھر پلٹ کر یارن خان سے مخاطب ہوا، ''خان! اپنے بندوں سے کہو، بندوقیں نیچی کر لیں۔''

''نہیں بخت خان! شہرا میرا مجرم ہے۔ یہ میری مرضی سے جائے گا۔ تم مہمان ہو، جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ بیٹھنا چاہو تو اپنی حویلی سمجھ کر بیٹھ جاؤ۔ اگر اسے لے جانا چاہو گے تو بندوقیں چل جائیں گی۔ گولی اندھی ہوتی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ یہ اپنے پرائے کی پہچان نہیں رکھتی۔''

یارن خان کے لہجے میں بلا کی سفاکی رچی ہوئی تھی۔ بخت خان کی تیوری چڑھ گئی۔ ہاتھ ہولے ہولے لرزنے لگے۔ بولا، ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو خان! ہمارے درمیان پیدا ہونے والی دوستی ابھی اتنی پرانی نہیں ہوئی کہ ان رویوں کو برداشت کر سکے۔''

''تبھی تو کہتا ہوں کہ خاموشی سے چلے جاؤ۔ باہر جا کر کسی کو یہ نہ بتانا کہ یہ الو کا پٹھا شہریار ہے۔ اس حرام زادی کو بھی کہہ دینا کہ اس سے ملنے والا اس کا منگیتر نہیں، واقعتاً کوئی پٹھان ہے جو اسے دھوکہ دے رہا تھا۔''

''نہیں خان! میں اسے لے کر ہی جاؤں گا۔''

یارن خان نے منہ بنایا۔ ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اس کے عقب میں کھڑا ہوا سیاہ فام باڈی گارڈ بجلی کی سی تیزی سے صوفے کے باہر آیا۔ گن کی نال بخت خان کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے غرایا، ''چلو باہر!''

ایک نال میری کمر سے چھو گئی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ بخت خان کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں تشویش کے ڈورے تیر رہے تھے۔ اس نے دبنگ لہجے میں کہا، ''یارن خان! تم دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر لے رہے ہو۔ یہ ذہن میں رکھ لو؛ تم ایک قدم بھی نور پور میں نہیں چل سکو گے۔ رہی بات شہرے کی، تو میں اسے لے کر ہی جاؤں گا۔ تم میں جرأت ہے تو اس کے ساتھ مجھے بھی گولی مار دو۔''

موت کے شعلے اگلنے پر مائل بندوقوں کے سائے میں کھڑا ہونے کے باوجود بخت خان کے بے خوفی اور دلیری میرے لیے بڑی تعجب خیز تھی۔ میں اسے بزدلوں کی حد تک شریف اور پرامن شخص سمجھتا تھا۔ اس کے اٹل رویے نے یارن خان کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چند لمحے کھڑا بخت خان کو گھورتا رہا، پھر کندھے اُچکا کر بولا، ''آخر تم اس لونڈے کیلئے اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو بخت خان؟''

''یہی سوال میں بھی کر سکتا ہوں کہ تم اس بے ضرر انسان کو مارنے اور سزا دینے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟'' بخت خان کے لہجے میں غیر معمولی خنکی عود کر آئی تھی۔

یارن خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے کارندوں کو گنیں نیچی کرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلو میں صوفے کو تھپتھپا کر بولا، ''ٹھیک ہے بخت خان! تمہیں ناراض نہیں کیا جا سکتا۔ ادھر آؤ۔ بیٹھو۔ اوئے! تم بھی ادھر صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

مؤخر الذکر حکم میرے لیے تھا۔

بخت خان نے 'شکریہ' کہا اور جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یارن خان نے کچھ دیر بیٹھنے کا اصرار کیا۔ جب بخت خان اس کے پہلو میں بیٹھ گیا تو اس نے اپنے گن برداروں کو کمرے سے جانے کا حکم دیا۔ پنجابی لب و لہجے والے کارندے کو مخاطب کر کے بولا، ''شیر دل! مہمانوں کیلئے پانی وانی کا بندوبست کرو۔''

بخت خان کی دلیرانہ ضد کی وجہ سے یارن خان کی کایا پلٹ گئی تھی۔ یارن خان کے شکست خوردہ رویے کو دیکھنے کے باوجود بخت خان کے چہرے پر تشکیک اور تذبذب کے آثار ثبت تھے۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بولا، ''خان! تم نے الیکشن لڑنا ہے۔ بارہا کہہ چکا ہوں کہ تمہارا مقابلہ گھاگ سیاست دان سے ہوگا۔ حیدر خان تم سے بڑا نہیں ہے مگر اس کا سیاسی قد کاٹھ تم سے کہیں بڑا ہے۔ ویسے بھی سیاست کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جو اسے اپنے بس میں لے لیتا ہے، وہ کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ تمہیں سمجھاتا رہتا ہوں مگر تم سمجھنے کے بجائے بار بار غلطی کرنے پر مائل ہو جاتے ہو۔ سردار حیدر خان کو دیکھو۔ وہ سب کچھ کرتا ہے مگر بظاہر کچھ نہیں کرتا۔ وہ سیکڑوں گلے کاٹتا ہے، پیٹ بھر کر خون پیتا ہے مگر اس کے ہاتھ اور آستینیں صاف رہتی ہیں۔ وقت آنے پر معصوم بن کر عوام کے سامنے آن کھڑا

ہوتا ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا بخت خان!'' یارن خان نے اسے گہری نظروں سے گھورا، ''کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟..... کیا سمجھانا چاہتے ہو؟''

''یہی دیکھو! پورے نور پور کو علم ہو گیا ہے کہ پٹھان کے روپ میں نور پور آنے والا اور اپنی منگیتر سے ملنے والا کوئی اور نہیں، بلکہ سوہنے بلوچ کا پتر شہریار ہے۔ غزالہ اس کی پھوپھی زاد ہے۔ بچپن سے دونوں کی منگنی ہوئی ہے۔ اس رشتے کو بھی پورا نور پور جانتا ہے۔ تم اسے مارو گے، اس قصے کو اچھالو گے تو نور پور والے تمہیں برا کہیں گے۔ ظالم کہیں گے۔ منہ پر نہیں؛ پیٹھ پیچھے۔ اور تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ووٹ ہمیشہ پیٹھ پیچھے کھڑے ہو کر ڈالا جاتا ہے۔''

اس نے سمجھ جانے کے سے انداز میں سر ہلایا۔ بولا، ''خیر! اب تو تمہاری ضد پر میں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ دل نہیں مانا مگر میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ اب یہ قصہ ختم سمجھو۔ ہاں! اس سے کچھ پوچھ گچھ تو کر لینے دو۔''

بخت خان کے چہرے پر اطمینان کی ہلکی سی لہر ابھری۔ سر ہلا کر تن آسان بیٹھ گیا۔ گویا اس نے خان کو تفتیش کی اجازت دے دی تھی۔

''ہاں بھئی شہرے میاں! آج کل کن فضاؤں میں اُڑ رہے ہو؟ اور یہ پولیس سے چھپنے چھپانے کا کیا سلسلہ ہے؟''

میں نے بخت خان کی طرف دیکھا اور یارن خان کے سوال کا جواب نہ دیا۔ اس نے اپنا سوال الفاظ بدل کر دہرایا۔ میں نے کہا، ''خان جی! میری قسمت مجھے اس کوٹھڑی میں ڈال چکی ہے جہاں سے جنازے نکلتے ہیں مگر واپسی کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''

''میرے پاس کسی اس سوال کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

یارن خان کی آنکھوں میں خشونت کا ایک ذرا عکس لہرایا، چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ہویدا ہوئے مگر لمحہ بھر میں اس نے خود پر قابو پا لیا اور دھیمی آواز میں بخت سے باتیں کرنے لگا۔ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو مجھ سے متعلقہ نہیں تھی بلکہ انہوں نے سیاست کو موضوعِ سخن بنا لیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہاں کوئی بھی سنگین سرگرمی وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد شیر دل کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا کندھا خالی تھا۔ وہ اپنی ڈبل کے گن کہیں رکھ آیا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ٹرے پکڑی ہوئی تھی جس میں مشروب کے بھرے تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے ادب سے مشروب سرو کیا اور اجازت پا کر کمرے سے رخصت ہو گیا۔

بخت خان نے توصیفی انداز میں کہا، ''خاصا تگڑا گھوڑا ہے۔''

''ہاں! ساتھ میں خاصا اڑیل اور منہ زور بھی ہے۔ سیدھی راہ پر چلانے کیلئے ہر وقت شانٹا ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔''

''لگام مضبوط ہاتھوں میں ہو اڑیل سے اڑیل شہ زور ناک کی سیدھ میں چلتا ہے۔''

''ظاہر ہے؛ جہاں گرفت کمزور ہوئی، گھوڑے نے زمین پر گرا کر چت کر دیا۔ یہ ساری باتیں ذہن میں رکھنا پڑتی ہیں۔ تم ان باریکیوں کو کیا جانو، تم نے گھوڑے رکھے نہ زین پر بیٹھے اور نہ ہی شاہ سواری کا مزے لوٹے.....''

''ہاں خان! تم ٹھیک کہتے ہو۔'' بخت خان نے طویل سانس لی اور مشروب کا گلاس اُٹھا لیا۔

''بخت خان! اس لونڈے نے میرے بڑے قیمتی بندوں کو ٹھکانے لگایا ہے۔ اس کے کھاتے میں بہت سے جرم لکھے ہوئے ہیں مگر کیا کروں؟ تم اسے لے جانے پر ضد کر بیٹھے ہو ورنہ یہ ایسا بے ضرر شخص نہیں ہے کہ میرے ہاتھ لگنے کے باوجود زندہ واپس چلا جائے۔'' یارن خان نے مجھے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

بخت خان نے کندھے اچکائے۔ کہا، ''کہا ناں! دماغ کو ٹھنڈا رکھا کرو۔ گرم دماغ میں ہوا کے گرم جھونکے چلتے ہیں جو نتھنوں سے خارج ہونے لگتے ہیں اور نادانستگی میں مونچھوں کو جلا دیتے ہیں۔''

مشروب بڑا مزیدار تھا۔ میں نے بخت خان کی تقلید میں گھونٹ گھونٹ حلق سے اُتارا جبکہ یارن خان نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ طبیعت نے مزہ لیا مگر دل ابھی سواد سے پوری طرح سرشار نہیں ہوا تھا کہ ہوش اڑنے لگے۔ عجیب طرح کا بھاری پن رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ ابھی اپنی اس کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ سر چکرانے لگا۔ ڈرائنگ

روم میں پڑا ہوا فرنیچر آنکھوں میں دھندلانے لگا۔ میں نے سر جھٹک کر یارن خان کی طرف دیکھا تو اس کے سراپے نے کئی سائے اگل دیے۔ بخت خان پیشانی سہلاتا ہوا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھلے دروازے کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کی غلام گردشوں میں بھی مشروب کا نشہ بھر گیا تھا۔ یارن خان کی دھوکہ دہی کا احساس ہوتے ہی میں نے ایک جھٹکے سے کھڑا ہونا چاہا مگر بدن اپنا آپ سہارنے کی طاقت کھو بیٹھا تھا اور میں کمر کے بل صوفے میں گر گیا۔

بخت خان کی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''خان! تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں بچہ نہیں ہوں.....''

بصارت کی طرح میری سماعت بھی چکرا کر رہ گئی۔ بخت خان کی شکوہ بار آواز کہیں تحلیل ہو گئی۔ ایسے میں میری پلکوں پر بوجھ پڑنے لگا، خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا پایا اور پھر چند ہی لمحوں میں غنودگی کی غیر معمولی طاقتور یلغار نے مجھے دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔ میرا آخری احساس یہی تھا کہ ہم دونوں نے یارن خان کی معنی خیز مفاہمت کو شکست سمجھنے کی غلطی سرزد کر لی تھی جس کا خمیازہ بھگتنا ناگزیر تھا۔

میڈم شکیلہ جیسی مردم شناس عورت یارن خان کو شیش ناگ اور نہایت خطرناک دشمن قرار دیتی تھی تو بلاوجہ نہیں تھا۔ وہ اسے میری نسبت زیادہ بہتر طور پر جانتی تھی۔ اگر بخت خان میرے اور یارن خان کے بیچ حائل نہ ہوتا تو میں کبھی اس پر اعتماد نہ کرتا مگر اب بھروسہ کرنے کے بعد یہ دیکھا تھا کہ یارن خان اپنی شکست کے تضحیک آمیز لمحوں سے بھی کامیابی کا راستہ نکالنے کا ہنر جانتا ہے۔

بے ہوشی اور نیند کا استغراق موت کے خاندان سے تعلق رکھنے والی کیفیات ہوتی ہیں۔ میں بے ہوشی کے عالم میں کب تک اور کہاں پڑا رہا، معلوم نہیں ہوا۔ آنکھ کھلی تو خود کو قدیم ساخت کے کمرے میں پایا۔ کئی منٹوں تک میرے ذہن پر دبیز دھند سی چھائی رہی اور مجھے اپنی سدھ بدھ سنبھالنے میں خاصی توانائیاں صرف کرنا پڑیں۔ منظر کشائی ہوئی تو مجھے وہ کمرہ مانوس سا لگا مگر ذہن پر خاصا زور دینے کے باوجود یاد نہ آیا کہ اس پرانی طرز کے کشادہ کمرے کو میں نے پہلے کہاں اور کن حالات میں دیکھا تھا۔ شکستہ پلستر والی دیواریں، جن میں کہیں کہیں اینٹیں جھانک رہی تھیں، چوبی چھت اور بوسیدہ سا فرش..... کچھ دیر تک

یہ احساس کچوکے لگاتا رہا کہ میں پہلی مرتبہ یہاں نہیں پہنچا ہوں۔ مگر پہلے کب آیا تھا؟ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔

ناچار میں نے سر جھٹک کر اس خیال سے دامن چھڑایا کیونکہ یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ میں زندہ تھا اور مجھے اس قید سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ ابھی تک اس موئے شربت کا اثر تھکن اور سستی کی صورت میں رگ و پے پر طاری تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ بخت خان کو میرے پاس موجود ہونا چاہیے تھا کیونکہ ہم دونوں اکٹھے بے ہوش ہوئے تھے۔ اسے کمرے میں نہ پا کر میں نے سوچا کہ اسے مجھ سے علیحدہ رکھا گیا ہوگا۔ یہ بھی سوچا کہ اسے مجھ سے الگ کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا ہوگا یا ہسپتال پہنچا دیا گیا ہوگا۔ شک کا ایک کوندا میرے ذہن میں لپکا کہ یارن خان اور بخت خان، دونوں مجھے قابو کرنے کی سازش میں برابر کے شریک بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر پھر بخت خان کا میری تائید میں روا رکھا جانے والا جارحانہ رویہ، اس کا فی الفور میرے پیچھے آنا اور گنوں کے سائے تلے اصرار کرنا یاد آیا.....

میں بڑبڑا اُٹھا، 'نہیں نہیں..... بخت خان دوغلا بندہ نہیں ہے۔ وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔'

میں نے فرش پر ہتھیلیاں ٹکا کر اُٹھنا چاہا تو اس روح فرسا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مجھے اتنی بے دردی سے باندھ کر اس فرش پر لا پھینکا گیا تھا کہ میں آسانی سے اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دیوار کے قریب آیا اور بڑی تگ و دو کے بعد دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے میں کامیاب ہوا۔ اب مجھے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی موٹے کڑوں والی آہنی زنجیر دکھائی دینے لگی۔ اس قسم کی زنجیروں سے دیہاتوں میں بھینسوں اور اڑیل بیلوں کو باندھا جاتا ہے۔ یہ کم و بیش دس میٹر لمبی تھی۔ میرے پاؤں، ٹانگیں اور بازو دُہرے کر کے باندھے گئے تھے اور بغور دیکھنے پر کہیں قفل یا کلپ لاک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ زنجیر کا تالا میری پشت پر تھا جس تک رسائی فی الوقت ممکن نہیں تھی۔ میں نے ہاتھوں پیروں کو اس فولادی جکڑن سے نکالنے کی رسمی سی کوشش کی مگر ذرا بھر کامیابی نہیں ہوئی تو ایک طویل سانس لے کر اپنے متحل حواس مجتمع کرنے لگا۔ برق رفتاری سے سوچنے لگا کہ اس قید خانے سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔

میں یہ اندازہ قائم نہیں کر سکتا تھا کہ اس وقت کیا بجا ہے البتہ یہ علم ہو رہا تھا کہ کمرے کے باہر دن کا اجالا پھیلا ہوا ہے کیونکہ میری عقبی دیوار میں ایستادہ دروازے اور چوبی کھڑکی کی

درزوں سے چھن کر آنے والی روشنی کی بدولت کمرے کے در و دیوار واضح نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اگر کھلا ہوا بھی ہوتا تو میں کوئی فائدہ اٹھانے کی حالت میں نہیں تھا۔ جب تک اس وزنی زنجیر سے گلوخلاصی نہ کر لیتا، میں یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں غیر معمولی بھوک کے احساس نے خبردار کر دیا کہ میں کم سے کم بارہ چودہ گھنٹے بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا تھا۔ میری بے ہوشی کا دورانیہ میرے اندازے سے زیادہ طویل بھی ہو سکتا تھا۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اطراف میں سناٹا طاری تھا۔ میں نے کان لگا کر آواز سننے کی کوشش کی مگر یوں لگا جیسے میں کسی بہت بڑے ویکیوم میں آن پہنچا ہوں جہاں میرے سوا بندہ نہ بندے کی ذات موجود تھی۔ کہیں دو چار کتے بھونکے، پرندے چہچہائے تو زندگی کا یقین ہوا اور پتہ چلا کہ میں کسی دیہاتی یا جنگلی علاقے میں پڑا ہوں۔

بھوک لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی۔ دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھوک کی بدولت میرے سر میں درد ہونے لگا۔ اس دوران میری کھوئی ہوئی دماغی قوتیں لوٹ آئیں اور میں نے اس کال کوٹھڑی کو پہچان لیا۔ یہ سردار حیدر حان کی حویلی تھی جو دریائے سندھ کے کنارے پر بیلے والے جنگل میں واقع تھی۔ جب میں پروین کی تلاش میں پیاجی اور کھالے کے ہمراہ اس حویلی میں آیا تھا تو اسی کمرے میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور فرش پر چوڑیوں کے ٹکڑے اور سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔ جوں جوں میں اپنی یادداشت پر زور دیتا گیا، میرا یقین واثق ہوتا گیا۔

قسمت مجھے پھر اس جگہ پر لے آئی تھی جہاں میں ایک مرتبہ خون اور آگ کا کھیل کھیل چکا تھا۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب میں یہاں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور حیدر خان اپنی پاٹے دار فرعونیت بھری آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا، ''بتا اوئے بھتنی کے بچے! خانزادی کہاں ہے؟''

قدرت نے مجھے ایک وہ وقت بھی دکھایا تھا کہ علاقے کا سب سے طاقت ور سور ملتان کے فائیو اسٹار ہوٹل میں مجھ سے معافی مانگ رہا تھا اور خاندانی مراسم جتا رہا تھا۔ اپنی بیٹی کی بازیابی پر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بڑے شاطرانہ انداز میں یارن خان کی بیٹی عافیہ خان کو اغوا کر کے خانزادی اسما پر ٹوٹنے والی قیامت جیسی نئی قیامت توڑنا چاہتا تھا۔ پھر میری خواہش کے برعکس، میڈم شکیلہ کے حکم پر میرے اور اس کے درمیان سودے بازی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کی بیٹی کو اغوا کر کے اس کی ہوس ناک تحویل میں دینے کیلئے دو کروڑ روپے میں

سودا طے کیا تھا اور آدھی رقم حسبِ وعدہ دس دنوں میں ادا کر دی تھی۔ چونکہ ایسے کاموں میں عمومی طور پر کوئی وقت مقرر نہیں کیا جاتا، ایک دو ماہ اوپر نیچے بھی ہو جاتے ہیں، اس لیے ابھی تک وہ معاملہ بیچ میں ہی لٹکا ہوا تھا۔

ایک موہوم سی توقع پیشِ نظر تھی کہ میری اس حویلی میں موجودگی کا حیدر خان کو علم نہ ہو یا اسے یہ تو علم ہو کہ یارن خان نے کوئی مغوی یہاں رکھوایا ہے مگر اسے یہ پتا نہ ہو کہ مغوی کون ہے۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ اسے بخوبی میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو اور وہ مجھے زیر کر کے میڈم شکیلہ سے نہ صرف اپنی رقم واپس حاصل کرنا چاہتا ہو بلکہ سود سمیت وصول کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

یہ سوچ بڑی کریہہ تھی کہ حیدر خان ایک ہی وقت میں مجھے عافیہ خان کو اغوا کرنے کی بھاری سپاری دے چکا تھا اور دوسری طرف اس کے باپ سردار یارن خان سے محبت کی اس حد تک پینگیں بڑھا رہا تھا کہ اسے اپنے دشمنوں کو حویلی میں رکھنے کی اجازت دیتا تھا۔ میڈم ٹھیک کہتی تھی۔ واقعی، یارن خان، حیدر خان اور میاں دلبر حسین..... تینوں بڑے کھلاڑی تھے۔ بڑے کھیل کھیلنے کے عادی تھے جنہیں سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر مفاد کی بساط پر ایسے ملا کرتے تھے جیسے ان کے بیچ سے ہوا کا گزر بھی ممکن نہ ہو۔

بہر حال، میری شامت آنے والی تھی۔ میں چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ دونوں سورمے یک جان ہو گئے تھے۔ یہ خواہش دعا بن کر میرے لبوں پر آن چپکی کہ میڈم شکیلہ کو مجھ پر ٹوٹ پڑنے والی قیامت کی کسی نہ کسی طرح خبر ہو جائے اور وہ ان دونوں پر برق بلا بن کر کوند جائے۔ میری یہاں سے رہائی کی ایک یہی صورت ممکن تھی وگرنہ تو میں خاصا مایوس اور دل گرفتہ ہو گیا تھا۔

میری بدقسمتی تھی کہ یارن خان کے ذریعے پھر اپنے خون کے پیاسے سردار حیدر خان کے چنگل میں آن پھنسا تھا۔ میں نے اس ڈیل کے بارے میں سوچا جو میرے توسط سے میڈم شکیلہ اور سردار حیدر خان کے درمیان طے پائی تھی۔ کیا یہ ڈیلنگ مجھے یہاں مدد دے سکتی تھی؟

میں سوچوں کے تانے بانے بننے میں وقت گزار رہا تھا۔ بھوک اور پیاس کے احساس کو تھپک رہا تھا۔ جب درزوں سے چھن کر آنے والی روشنی مدھم ہو گئی تو ماحول میں ہل چل سی پیدا ہوئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کئی افراد ایک ساتھ حویلی میں آن داخل ہوئے تھے۔ کواڑوں

کے کھلنے کی آوازیں، قدموں کی بھاری چاپ اور ملی جلی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔ تب تک مارے پیاس اور بھوک کے میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جب کوئی اس طرف نہ آیا تو میں بلند آواز میں چیخا، ''اوئے! مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پلاؤ۔''

چند منٹ ردِعمل کا انتظار کیا۔ جواب ندارد پا کر پھر حلق کے بل چیخا۔ دوسری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ چند لمحوں بعد دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ دروازہ کھلتے ہی یکے بعد دیگرے دو اشخاص کمرے میں داخل ہوئے۔ استاد بلو کو پہچاننے میں مجھے لمحہ بھر سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اس کے عقب میں گہرے نیلے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی قمیص میں ریاض ملغانی تھا۔ استاد بلو خالی ہاتھ تھا جبکہ ریاض ملغانی کے بائیں کندھے پر سیون ایم ایم لٹک رہی تھی اور دائیں ہاتھ میں اڑتیس بور کا سلور سینڈ پسٹل دبا ہوا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر میری رہی سہی توانائی بھی جواب دے گئی۔ استاد بلو میرے قریب فرش پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ مجھے سرد نظروں سے گھورتے ہوئے بولا، ''جوان! میں سمجھتا ہوں کہ تم بہت بہادر آدمی ہو۔ مگر..... بہادر آدمی مصیبت کے وقت ایسے چیخ و پکار نہیں کیا کرتے۔ پہاڑ کا سا حوصلہ سینے میں پال رکھتے ہیں، ایسے وقت کیلئے۔''

اس کے پیچھے ریاض ملغانی چوکس انداز میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔ وہ اپنے طور و اطوار سے میری معمولی سی مشکوک حرکت پر گولی مار دینے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا۔

استاد بلو کی افسرانہ تراش خراش اور سرد مہری بدستور قائم تھی۔ اس کی بھاری آواز میں نفرت کا کھردرا پن اپنی پوری شدت سے موجود تھا۔ میں نے پانی مانگا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ملغانی کو پانی لانے کا حکم دیا۔ بولا، ''شہریار! آخر تم نے رنگو قصائی کا دھڑن تختہ کر ہی دیا۔ ہیں؟''

میں اس کے سوال کا مقصد نہ بھانپ سکا۔ اس لیے مبہم انداز میں بولا، ''نہیں! اسے اس کی وحشیانہ حرکات اسے لے ڈوبیں۔''

''کیا مطلب؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''ظاہر ہے؛ ہمارے دھندے میں یہی

کچھ ہوتا ہے۔ مار اماری میں مارنے والا بھی کام آ سکتا ہے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''ہوں.....'' اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، ''تمہارا میک اَپ کس نے کیا تھا؟''

میں چونکا۔ مجھے ہوش میں آنے کے بعد اپنے حلیے کا قطعی طور پر خیال نہیں رہا تھا۔ ہاتھ اٹھا کر چہرے پر پھیرنا چاہا مگر زنجیریں آڑے آ گئیں۔ میں نے کہا، ''میک اَپ؟ کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔''

اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ تیری۔ بولا، ''تمہاری بے ہوشی کے دوران میں نے تمہارا میک اَپ صاف کرایا تھا۔ نقلی داڑھی مونچھوں اور لینز سے تمہاری جان چھڑوا دی گئی ہے، اس لیے زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے کندھے اُچکائے، ''اوہ! مگر یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میک اَپ کا سامان بازار سے عام مل جاتا ہے۔ میں نے.....''

''بکواس مت کرو۔ یہ عام میک اَپ نہیں تھا۔ کیا اس لونڈے پیا جی نے میک اَپ کا کورس کر رکھا ہے؟'' اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔

میں نے کہا، ''ہم سبھی نے یہ کورس کر رکھا ہے۔''

''سامان کہاں سے لیتے ہو؟''

''میڈم مہیا کرتی ہے۔ اسے علم ہوگا کہ یہ کس مارکیٹ سے ملتا ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

اس نے میری ٹھوڑی پر چٹکی بھری۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سرد لہجے میں کہا، ''اگر تم تعاون نہیں کرو گے تو میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔ سمجھے؟''

میں نے اپنے خوف پر بدقت تمام لاپروائی کا پردہ ڈالا اور کہا، ''استاد! بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ میں تعاون کروں؛ نہ کروں؛ تم لوگوں نے وہی کچھ میرے ساتھ کرنا ہے جو تم لوگ طے کر چکے ہو۔''

اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ بولا، ''تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ کہا، ''اور نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں۔ تم سے اگر ممکن ہو تو میری زنجیریں کھول دو۔ یہاں تمہارے بہت سے گرگے موجود ہیں، اسلحے سمیت۔ ان کی موجودگی میں میں یہاں سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس لیے ڈرومت اور مجھے آسان کر دو۔''

اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ بولا، ''میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ابھی تو میں نے تمہاری 'میڈم' سے رابطہ کرنا ہے۔ اسے یہ خوش خبری سنانی ہے کہ تم میرے مہمان ہو۔''

اس نے 'میڈم' لفظ پر خصوصی زور دیا تھا۔ ملغانی سلور کے گلاس میں پانی بھر لایا۔ استاد ببلو نے اس سے گلاس لیا اور میرے لبوں سے لگا دیا۔ میری ران پر ہائیں ہتھیلی ٹکا کر بولا، ''شہریار! تم نے سردار حیدر خان کو چکمہ دیا۔ ایک کروڑ روپے اینٹھ لیے۔ ہمارے دھندے میں ایسی دھوکہ بازی نہیں ہوتی۔ تم نے دھوکہ دہی کی۔ کیوں؟''

میں نے گلاس خالی کر دیا، ''میں نے خان کو چکمہ نہیں دیا تھا۔ سودا طے پا چکا تھا۔ پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا۔ جلد اسے خوش خبری ملنا تھی۔ اگر میں یارن خان کے ہاتھ نہ لگتا تو اب تک 'اوکے' کی رپورٹ خان تک پہنچ جاتی۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا، ''اوکے رپورٹ! ہونہہ..... میں نے کئی بار تمہاری حرام زادی میڈم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے ہر کال بزی کر دی۔ اب تم نئی کہانی سنا کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ جوان میرا نام استاد ببلو ہے۔ میں تم جیسے سیکڑوں لونڈے پال پوس کر جوان کر چکا ہوں۔ مجھے چکر نہ دو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ خان کو دھوکہ کیوں دیا تم نے؟''

میں نے کہا، ''کہا تو ہے کہ ہم نے دھوکہ نہیں دیا۔ میں خان کے کام کے سلسلے میں ہی نور پور آیا تھا۔ یارن خان کی ٹوہ لے رہا تھا۔ بدقسمتی ہاتھ دکھا گئی اور میں سردار بخت خان کی وجہ سے دھوکہ کھا گیا۔ یارن خان نے نشہ آور دوا پلا کر مجھے بے دست و پا کر دیا ورنہ صورتِ حال یہ نہ ہوتی۔''

از خود جھوٹ میرے لبوں پر بڑے یقین کے ساتھ مچل گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ذرا تشکیک ابھری پھر ایک دم معدوم ہوگئی۔ بولا، ''بہرحال؛ جو بھی ہوا، برا ہوا۔ اب اس کا انجام اس سے بھی برا ہونے والا ہے۔ تم اپنی جیون کہانی کا تو 'دی اینڈ' ہی سمجھو۔ اس حرافہ کا ناپ تول بھی کر لیا گیا ہے۔ جلد ہی تم اسے یہاں پاؤ گے۔ اور ہاں! ایک اچھی خبر تمہارے لیے..... تم چاہو گے کہ مرنے سے قبل اپنے پیاروں کی ایک آدھ جھلک دیکھ سکو۔ ہے نا؟..... میں نے تمہارا بھلا کرنے کی ایک کوشش کی ہے اور دو چار بندے نور پور روانہ کر دیے گئے ہیں۔ آج رات یا کل تمہاری منگیتر یہاں پہنچ جائے گی۔ زندگی کے باقی

لمحات تم اس کے ساتھ عیش وعشرت کے ساتھ گزارو گے۔ کیا خیال ہے؛ اچھی خبر ہے ناں؟''

اس نے اتنے عام سے انداز میں کہا تھا کہ مجھے چند لمحوں تک اس کی کہی ہوئی بات کا یقین ہی نہ آیا۔ جب اس کے لہجے کے ٹھہراؤ اور چہرے کے سنگین تاثرات نے مجھے یقین دلایا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دیوار کی ٹیک چھوڑ دی۔ اس جوش میں میرا دائیں ہاتھ لڑھک گیا اور میرا وجود کہنی کے بل فرش پر ٹک گیا۔ میں دانت کچکچا کر بولا، ''استاد! جنگ ہماری ہے۔ ہمارے گھر والوں کی نہیں ہے۔ ہمارے خاندانوں کی نہیں ہے۔ اگر تم لوگوں نے میرے گھر والوں پر ہاتھ ڈالا تو میں تم میں سے کسی ایک شخص کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس پر میری غضب ناکی کا رائی بھر اثر نہ ہوا۔ مسکرا کر بولا، ''ابھی بچے ہو۔ بالکل ہی کچے ہو۔ نہیں جانتے ہو کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ ویسے بھی؛ یہ کام تو میں تمہاری زندگی کے آخری لمحات کو یادگار کرنے کیلئے کر رہا ہوں ورنہ مجھے اس سے کیا لینا دینا ہے۔ ہے ناں! پھر بھی غصہ کر رہے ہو۔ عجیب احمق ہو۔''

اگر میرے ہاتھ آزاد ہوتے تو میں بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اس کا جبڑا توڑ دیتا۔ اس کی آنکھیں نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

وہ میری برانگیختہ کیفیت سے مزہ لیتے ہوئے بولا، ''ناں بابا! اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ خون جلتا ہے۔ اور اگر جسم کا خون ہی جل جائے تو انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ بس دو چار دن..... پھر ایک شاندار جشن..... پھر ساری کہانی ختم!''

وہ ہاتھ لہراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ پلٹ کر ملغانی سے بولا، ''اسے کھانا کھلاؤ۔ اگر پینے کا شوق رکھتا ہے تو جی بھر کر پلاؤ۔ آخر ہمارا مہمان ہے ناں.....''

وہ کمرے سے نکلنے لگا۔ میں نے آواز دے کر روکا تو رک کر مجھے استفہامی نظروں سے گھورنے لگا۔

میں نے کہا، ''مجھے واش روم جانا ہے۔''

اس کی آنکھوں کا تاثر ایک دم بدل گیا۔ برا سا منہ بنا کر بولا، ''اس کمرے کو واش روم سمجھو۔ جب تک زندہ ہو، یہی تمہاری کل دنیا ہے۔ تمہارا اپنا کیا دھرا تمہارے سامنے آتا رہے گا تو تمہارا دل خوش رہے گا۔ کیوں ملغانی؟''

ملغانی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ تضحیک بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کہا، ''استاد ٹھیک کہتا ہے۔ جوگل کھلانا ہے، یہیں کھلالو۔ پر استاد! یہ تو کام خراب کردے گا۔ اگر سردار صاحب یا سردار یارن خان اس سے ملنے کیلئے ادھر آ نکلے تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔ انہیں مجبوراً ناک پر ہاتھ رکھ کر اس سے آخری ملاقات کرنا پڑے گی۔ میری مانو تو تھوڑی سی رعایت دے دو۔''

استاد ببلو نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا شخص ایک چپاتی اور تھوڑا سا سالن لے کر آ گیا۔ اس نے چند بڑے بڑے لقمے میرے منہ میں ٹھونسے اور پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگایا۔

میں نے کہا، ''یار! ہاتھ تھوڑا ہلکا رکھ لو۔''

اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا، ''کیوں؟ رشتے میں میرے سالے لگتے ہو کیا؟''

مجھے تاؤ تو بہت آیا مگر کچھ کرنے یا کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ مجبوراً کڑوا گھونٹ پی گیا۔ وہ شکل سے خاصا ڈراؤنا لگتا تھا۔ حلیہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں جیسا تھا۔ چہرہ زخموں کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ دائیں کان کی لو کٹ کر عجیب شکل اختیار کر گئی تھی۔ میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کہا، ''چائے بھی لے آؤ۔''

اس نے کھڑے ہو کر ایک زوردار دولتی میری پسلیوں پر جھاڑی اور غرا کر کہا، ''بھوتنی کے..... چائے بھی لے آؤ..... واہ! تم یہاں باپ کے ولیمے پر آئے ہو جو تمہاری خاطر مدارت کروں۔''

''اوئے! تم مجھے جانتے نہیں.....''

اس نے میری بات کاٹ دی، ''ہاں! نہیں جانتا۔ تمہارا باپ ڈی سی ہے ناں جو تمہیں ہر کوئی جانتا ہو۔ آرام سے پڑے رہو ورنہ باچھیں چیر کر کانوں سے لگا دوں گا۔ جتنا زیادہ بھونکو گے، اتنی زیادہ مار پڑے گی۔'' اس نے دو تین سنسنی خیز مغلظات بکیں اور پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

رات ابتدائی دورانیے میں محوِ سفر تھی جب مجھے ٹوائلٹ جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میری چیخ و پکار پر وہی بدنما شخص آن وارد ہوا۔ بے سبب میرے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کر کے غرایا، ''کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کیوں بھونک رہے ہو؟''

گھٹنے پر خاصی چوٹ آئی۔ بدقت سسکی لبوں پر روکی۔ کہا، ''ابے الو کے پٹھے! میں بھونک

نہیں رہا، بلا رہا تھا۔ مجھے واش روم جانا ہے۔''

اس نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچایا، ''واش روم! اوئے بھوتنی کے..... سیدھی طرح بول ناں کہ تم نے لیٹرین کی سیر کرنی ہے۔ چلو اُٹھو..... تمہیں تمہارا میکا دکھالاؤں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے میری ران پر ٹھوکر ماری۔ اس نے موٹے سول والی نوروزی چپل پہن رکھی تھی جس کی ٹو پتھر کی طرح لگتی تھی۔ میں نے بھڑک کر کہا، ''اوئے کتے کے بچے! تم پاگل ہو کہ ہر وقت گدھے کی طرح دولتیاں جھاڑتے رہتے ہو۔ میں بندھا ہوا ہوں ورنہ تمہارا ایسا علاج کر دیتا کہ زندگی بھر دم ٹیڑھی نہ کر سکتے۔ مجھے اُٹھا کر باہر لے جاؤ۔''

اس نے بھنا کر دو تین مرتبہ پھر اپنے گدھے پن کا ثبوت دیا جسے میں نے اپنی جان و تن پر قبول کیا۔ اس اہم ترین شغل سے فراغت پانے کے بعد اس نے کچھ دیر تک کھڑے ہو کر سوچا اور کچھ کہے بنا واپس چلا گیا۔ اپنے ایک ساتھی کو پکڑ لایا۔ شاید مجھے اُٹھا کر صحن کے پار واقع لیٹرین تک لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا ساتھی خاصا پستہ قامت واقع ہوا تھا۔ شاید پست حوصلہ بھی تھا۔ بولا، ''یار جیدے! یہ گدھی کا بچہ ہم سے کہاں اُٹھایا جائے گا۔ دیکھو تو گند بلا کھا کھا کر کتنا پھٹ گیا ہے۔ حرام مال تن پر ایسے ہی لگتا ہے نا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے پَر اب اسے وہاں پہنچانا بھی تو ہے۔ استاد کا حکم ہے ورنہ یہیں پڑا گند مارتا رہتا۔'' جیدے نے مجھ پر نگاہِ برہم ڈال کر اپنی مجبوری بیان کی۔ ساتھ میں عادت کے مطابق دو چار گالیاں بھی اچھال دیں۔

پستہ قامت مجھے اُٹھا کر لے جانے کے حق میں بالکل نہیں تھا۔ بولا، ''اس حالت میں یہ گدھی کا بچہ لیٹرین میں کیسے بیٹھے گا اور کیسے.....''

'گدھی کا بچہ' کہنا اس کے اندازِ گفتگو کا حصہ تھا۔ تبھی بات بات پر مجھے اسی اعزاز سے مجھے نواز رہا تھا۔ اس نے میری حقیقی مجبوری بڑے تضحیک آمیز انداز میں بیان کی۔ جیدا سمجھ گیا۔ بولا، ''پھر کیا کریں؟''

''استاد چلا گیا ہے۔ ملغانی ادھر ہی ہے۔ اس سے جا کر پوچھتے ہیں۔ چلو!''

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور تھوڑی دیر بعد ملغانی کو ساتھ لے آئے۔ اس نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے واش روم میں جانے کیلئے آزاد ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ وہ میرے ہاتھوں کو آزاد کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا

تھا۔ مجھ پر جھک کر اس نے آہنی زنجیر کی مضبوطی کا اندازہ کیا۔ پھر بولا، ''پیروں کی زنجیر تھوڑی ڈھیلی کر دو اور ایک ہاتھ کھول دو۔ زنجیر کو گردن میں اس طرح بل دے کر تالا لگا دو۔ پھر اس سرے کو کھڑکی کی سلاخوں سے باندھ کر تالا لگا دینا۔''

اس نے ہاتھوں کے اشارے سے نئی بندشوں کی ترتیب سمجھائی اور کہا، ''اس کی بھولی شکل پر مت جانا۔ یہ سالا بہت خطرناک ہے۔ اکھ ہٹیسو تاں ہک ادھے دا سر گھن ویسی۔''

(اس پر سے توجہ ہٹاؤ گے تو یہ ایک آدھ بندے کا سر لے جائے گا۔)

''ملغانی! تم کچھ زیادہ ہی ڈرنے لگے ہو مجھ سے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ میری توقع کے برعکس مسکرایا، بولا، ''ہاں یار! اس دھندے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ کہیں ڈرنا پڑتا ہے تو کہیں ڈرانا۔''

مجھے مایوسی ہوئی۔ اگر وہ بھڑک اٹھتا تو اس سے غلطی کی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔ میں نے کندھے اچکائے اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ملغانی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ان دونوں نے میرا دایاں ہاتھ آزاد کر دیا، پیروں کی زنجیر بھی قدرے ڈھیلی کر دی مگر مجموعی طور پر مجھے پہلے سے زیادہ بے بس کر دیا۔ موقع کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کارِ موہوم کو بھی غنیمت جانتے ہوئے میں بدقت اٹھا۔

جسم میں خاصی کمزوری عود کر چکی تھی۔ سر کا درد ننھے ننھے دھماکوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ملغانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ استہزائیہ مسکراہٹ سے نوازا۔ کہا، ''شہرے خان! انسان پر برا بھلا، ہر قسم کا وقت آتا رہتا ہے۔ آخری وقت بھی آ ہی جاتا ہے۔ سمجھو! تم پر بھی آ گیا ہے۔ ہم سے تعاون کرو گے تو ممکن ہے سر پر آئی ہوئی موت کی گھڑیاں ٹل جائیں۔ میں اور استاد کوشش کریں گے کہ تمہیں سردار حیدر خان کے غیظ و غضب سے بچا لیں۔ اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے، وہ مان جائے اور یہ بھی ممکن ہے، وہ ہماری بات کو کسی کھاتے میں نہ ڈالے اور تمہیں 'صفر' کرنے کا حکم جاری کر دے۔''

میں چلتے چلتے رُک گیا۔ اسے دیکھ کر گہری سنجیدگی سے بولا، ''ملغانی! تم جانتے ہو کہ میں کافی عرصے سے زندگی اور موت کا کھیل کھیلتا چلا آ رہا ہوں۔ تمہاری دھمکیاں میرا بال بیکا نہیں کر سکتیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میڈم شکیلہ مجھے کتنی اہمیت دیتی ہے۔ وہ اپنے عام سے کارندے کیلئے خون کی ندیاں بہا سکتی ہے تو میری خاطر بلاشبہ تمہارے پورے گروپ کو خاک میں ملا

دے گی۔ میں دھمکی نہیں دے رہا ہوں، بلکہ تمہیں تمہاری حماقت کے نتائج سے قبل از وقت آگاہ کر رہا ہوں۔ استاد ببلو اور اپنے بے غیرت آقاؤں تک میرا یہ پیغام پہنچا دینا۔''

اس کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا مگر اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں کی۔ سر ہلا کر بولا، ''تمہاری میڈم جو بھی کر سکتی ہوگی، ضرور کر گزرے گی؛ میں جانتا ہوں مگر کیا تمہاری لاش میں زندگی کا سور پھونک لے گی؟..... نہیں..... یہی بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سمجھ جاؤ تو بہتر ہے ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور گن برداروں کی معیت میں صحن میں آ گیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ماحول میں جھینگروں اور کتوں کی آوازیں اسرار پیدا کر رہی تھیں۔ مغربی سمت بنے ہوئے کمروں کے آگے وسیع برآمدہ تھا۔ برآمدے کے آگے دو چارپائیوں پر تین چار افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ شاید موج میلہ کر کے تھک گئے تھے کیونکہ کمرے سے نکلتے ہی چرس اور شراب کی ناگوار بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ ایک گن بردار فائرنگ پوزیشن لیے میرے بائیں پہلو میں چل رہا تھا جبکہ دوسرا گن کی نال میری پشت سے ٹکائے مجھے باتھ روم کی طرف دھکیل رہا تھا۔ میں نے پوچھا، ''یہاں کتنے افراد رہتے ہیں؟''

بائیں ہاتھ چلنے والے نے غلیظ گالی دی اور خاموش رہنے کا حکم دیا۔ میں خون کا گھونٹ حلق میں اتار کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس دیہاتی طرز کے سالخوردہ ٹائلٹ میں میرا کچھ زیادہ وقت صرف ہو گیا تو دروازے پر جیدے کی غراتی ہوئی آواز ابھری، ''کتے کے بچے! یہاں بستر لگا کر لم لیٹ ہو گیا ہے کیا؟''

ٹائلٹ کا دروازہ بند نہیں تھا۔ محض بھڑا ہوا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اندر نہیں آئے گا۔ اس لیے میں نے فی الفور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا، ''ابے خنزیر کی اولاد! دبکا کھڑا رہ نہیں تو.....''

وہ بھڑک اٹھا، ''کیا نہیں تو..... کیا کر لے گا تو حرام زادے.....''

اس کی گندی زبان نان اسٹاپ چل پڑی۔ اس کے ساتھی نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرایا۔ میں جب ٹوائلٹ سے نکلا، وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس نے گن کی نال میری پسلیوں میں چبھونی چاہی تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ چند لمحوں تک ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے، پھر اس کے ساتھی کے دخل در معقولات پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جب مجھے کھڑکی کی سلاخوں

سے باندھ دیا گیا تو پیچ و تاب کھاتے ہوئے جیدے نے گن کا بٹ میری ران پر دے مارا۔ درد کی تیز لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی۔ وہ دانت پیس کر بولا، ''جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں ایک سانس بھی نہ لینے دوں اور تمہاری چھاتی چھلنی کر دوں مگر مجبوری ہے۔ بڑے خان کا حکم ماننا پڑتا ہے۔''

''تیری..... ساتھ تیرے بڑے خان کی بھی.....'' میں نے جبڑا بھینچ کر نہایت سرد آواز میں اپنے اندر کی آگ کو اس پر اگل دیا۔ اس نے میرے کندھے پر نظریں جماتے ہوئے گن ہوا میں بلند کی مگر اس کے ساتھی نے اس کی گن تھام لی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے باز رہنے کی نصیحت کی پھر بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے کے باہر ان کے درمیان چھڑنے والی بحث باقاعدہ جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی تو میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی توجہ ان کی فضول گفتگو سے ہٹا لی۔

میں میڈم شکیلہ کے روکنے کے باوجود غزالہ کے شوقِ دیدار میں بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس تک اس افتادِ نو کی خبر پہنچانے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ مایوسی..... جان لیوا مایوسی..... میرے پیچھے ایسا کوئی کلیو نہیں رہا تھا جس کا کونہ پکڑ کر میڈم، میر و شاہ یا پیاجی مجھ تک پہنچ پاتے۔ یارن خان نے کھا لے اور اس کے گھر والوں سے کیا سلوک کیا تھا، یہ خبر بھی نہیں تھی۔ بخت خان زندہ تھا، مردہ یا یارن خان کے پہلو میں بیٹھا ہنس کھیل رہا تھا..... اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ استاد ببلو نے غزالہ کے پیچھے اپنے کارندے بھیج دیے تھے۔ وہ بے خبری میں ماری جانے والی تھی۔ چونکہ عام، سادہ لوح اور دیہاتی لڑکی تھی، خبر رکھتی تو بھی استاد ببلو اور یارن خان جیسے کمینوں کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ ادھر ملتان میں میرے گھر والے یقیناً میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ ان کی حفاظت کیلئے فوجی اختر جیسا تجربہ کار شخص موجود تھا مگر میرا غیاب گھر والوں کا داخلی دکھ اور اضطراب تھا جس کا مداوا میرے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

یعنی میں ہر طرف سے مصائب اور خطرات میں گھر چکا تھا۔ مجھ سے متعلقہ کوئی فرد بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ آزاد تھی۔ باآسانی اُٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے زنجیر کو مختلف جگہوں سے ہلا جلا کر دیکھا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے آکٹوپس کی طرح لپٹی زنجیر کے بل چیک کیے۔ مایوسی ہوئی۔ پرانی طرز کی کھڑکی میں نصب موٹی آہنی سلاخیں اس طرح چوکھٹ

میں گڑی ہوئی تھیں کہ ان کے نکلنے کا امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں، جب میں سلاخوں اور زنجیر کا معائنہ کر رہا تھا، میرے عین سامنے اندھیرے میں استاد دبلو کا چہرہ لہرا گیا۔ اس نے سلاخوں کو تھاما اور ہنس کر بولا، ''شہریار! یہ سلاخیں، یہ زنجیر..... یہ ٹوٹنے والی نہیں ہیں۔ مفت میں اپنے آپ کو اَدھ میں مت ڈالو۔''

میں نے کہا، ''استاد! تم کام کی بات بھی تو کر سکتے ہو مجھ سے۔''

''مثلاً؟'' وہ چونکا۔

''ہم جس دور میں سانسیں لے رہے ہیں، اس میں ہر کام کی قیمت ہوتی ہے۔ ہر عمل کی اجرت ہوتی ہے۔ اگر قتل کی سپاری لی جا سکتی ہے تو زندگی کا سودا بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے نکل کر اپنی دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔ زندگی اور آزادی کی قیمت چکانے کو تیار ہوں۔ کیا خیال ہے؟'' میں نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی عود کر آئی۔ مخصوص سرد آواز میں بولا، ''تم نے ٹھیک کہا ہے۔ موت کی طرح زندگی کا سودا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں نہیں..... بالکل نہیں..... تمہاری زندگی کا سودا نہیں ہو سکتا کیونکہ سردار حیدر خان تمہیں زندگی دینے والے سے زندگی چھین لے گا۔''

میں نے کہا، ''کیا تم اس سے اتنا ڈرتے ہو؟''

''ہاں..... تم سچ بولو؛ نہ بولو؛ تم بھی اس سے ڈر رہے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں تو..... میں اس کتے سے کیوں ڈروں گا؟''

''ہاں..... کہنا اور ثابت کرنا دو مختلف عمل ہیں۔ اگر تم اس سے ڈرتے نہیں ہو تو پھر مجھ سے آزادی کیوں خرید رہے ہو؟..... وہ آئے گا۔ تم اس سے بغیر سودا کیے اپنی آزادی چھین لینا۔ بس!''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ چالاک ذہن انسان تھا۔ آسانی سے پھسلن پر پاؤں رکھنے والا نہیں تھا۔ میں نے پینترا بدلا، ''تم مجھے یہاں سے نکالو؛ میں تمہیں سردار حیدر خان کے چنگل سے نکال دوں گا۔''

''اور لے جا کر اپنی میڈم کے چنگل میں ڈال دو گے۔ ہے نا؟'' اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تیر گئی۔

''نہیں..... یہ تمہاری مرضی پر موقوف ہوگا۔''

''تو کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ میں یہاں اپنی مرضی کے بغیر رہ رہا ہوں؟'' اس نے ہاتھ لہرایا، ''نہیں میری جان! نہ تو یہ غلامی ہے اور نہ شوق کی چوڑیاں میں نے کلائیوں میں پہن رکھی ہیں۔ یہ ایک ایگریمنٹ کا نتیجہ ہے۔ ویسا ہی ایگریمنٹ؛ جیسا تم نے اپنی میڈم سے کر رکھا ہے..... اگر تم اسے چھوڑنا چاہو تو وہ تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ایسے ہی، میں جس دن یہاں سے جانا چاہوں گا، خان مجھے نہیں روک سکے گا۔ مگر میں کہاں جاؤں گا؟..... جیل میں..... پھانسی گھاٹ پر..... یا کوڑے کے ڈھیر پر لاش کی صورت..... نہیں شہریار! فضول باتیں نہ کرو۔ جو کام ہم نہیں کر سکتے، اسے کرنے کی کوشش کریں گے تو اپنا پنڈا (جسم) تھکائیں گے۔ خود کو زخمی کریں گے۔''

ایسے میں دور سے ملغانی نے پکارا۔ استاد بلو نے ہاتھ کے اشارے سے 'صبر کرو' کا جواب اچھالا اور میری طرف متوجہ ہو گیا، ''تم دلیر آدمی ہو، اس لیے مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنی زندگی سے دشمنی ہے۔''

میں نے ایک طویل سانس پھیپھڑوں میں اتاری۔ رُخ بدلا۔ پوچھا، ''کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ یارن خان اور سردار حیدر خان میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں؟''

اس نے کھڑکی کی سلاخیں چھوڑ دیں۔ ایڑیوں پر گھوما۔ ہاتھ پشت پر باندھ کر ٹہلتا ہوا چند قدم دور گیا۔ پھر لوٹ آیا۔ بولا، ''رنگو قصائی کے تمہارے ہاتھوں قتل کے بعد تمہارے تینوں دشمن تمہارے خوف سے یک جا ہو گئے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ بال کی کھال نکالنا جانتے ہیں۔ تانے بننے کا ہنر جانتے ہیں۔ تینوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمہاری بہادرانہ حرکات کا سبب تمہارے سینے میں پلنے والا انتقام ہے۔ انتقام کی آگ بھیڑ کو بھیڑیا بنا دیتی ہے۔ تم بلی سے شیر بن کر میدان میں آن نکلے ہو۔ شیر آدم خور ہو جائے تو اسے گولی مارنا پڑتی ہے۔ سمجھے؟''

میرے جسم نے بے اختیار جھرجھری لی۔ کہا، ''میرے انتقام سے ان تینوں کو کیا ڈر لاحق ہے؟''

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی بہت زہر خند تھی۔ بولا، ''بھولے ہو یا مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر تمہیں اپنے والدین اور خاندان کے لوگوں کے حقیقی قاتلوں کا علم ہے تو کیا ان قاتلوں کو اپنی حیثیت کا علم نہیں ہوگا؟ کیا تم انہیں اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو کہ انہیں اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت دکھائی

نہیں دیتی ہو گی؟.....شہریار! یہ طے پا چکا ہے کہ اگر تم زندہ رہتے ہو تو ایک نہ ایک دن تینوں سورماؤں کی گردنیں ماپو گے اس لیے تینوں بڑوں نے تمہارا نٹا نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس محاذ پر متحد ہو گئے۔''

''تیسرا سورما کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔

''میاں دلبر حسین..... جانتے ہو اسے؟''

''نام سنا ہے۔''

''اس کا نام ہی کافی ہے۔ وہ ان تینوں سے بھی بڑا ہے۔''

''تم نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے۔''

''ہاں تو.....'' وہ چونکا۔

''اس ہمدردی کے ناتے تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

''تمہیں اچھا کھلا پلا سکتا ہوں۔ ممکنہ حد تک آسان رکھ سکتا ہوں۔ بس!''

''کیا میرے لیے بے ضرر سی پیغام رسانی کر سکتے ہو؟''

اس نے فوراً اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ کچھ توقف کے بعد بولا، ''نہیں..... مجھے علم ہے کہ تمہاری بے ضرر سی پیغام رسانی تمہارے گروپ کو یہاں مدعو کرنے کا سبب ثابت ہو گی۔ اس لیے پیشگی معذرت۔''

اس کے لہجے کی خنکی میں از حد کمی واقع ہو گئی تھی۔ وہ مجھے سے بڑے دوستانہ ماحول میں محو کلام تھا۔ میں نے دریافت کیا، ''تم ملتان کب گئے تھے؟''

''میں کل گیا تھا۔ دو گھنٹے وہاں رہا؛ پھر لوٹ آیا۔ خیریت؟

''میڈم کی کوئی خبر دے سکتے ہو؟''

''نہیں..... میر وشاہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی منگوج میں تھا۔ مفت کے چند مشورے عطا کر کے رخصت ہو گیا۔''

''تم لوگ میری منگیتر کو یہاں کیوں لانا چاہتے ہو؟''

''اس سوال کا جواب نہ ہی مانگو تو بہتر ہے۔''

''کیوں؟'' میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''رات بھر سو نہیں سکو گے۔'' اس کے لہجے کی سرد مہری نے مجھے سر سے پاؤں تک دہلا دیا۔

''مجھ میں سننے کا حوصلہ ہے۔ بتاؤ۔''

''ٹھیک ہے..... ایسے ہی سہی۔ تم نے اپنی زندگی میں دو چار پنجابی فلمیں تو ضرور دیکھ ہی رکھی ہوں گی۔ کسی بھی مار دھاڑ والی فلم کا ڈراپ سین ذہن میں لاؤ۔ ہاں؟ اب تمہیں میرے کہے ہوئے جملوں کی زیادہ بہتر طور پر سمجھ آئے گی۔ تینوں خانزادے یہاں ایک جشن منانا چاہتے ہیں۔ تینوں شراب پئیں گے۔ موج مستی کریں گے۔ ہم سب لوگ حویلی کی چھت پر اسلحہ تھام کر پہرے داری کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ تمہیں صحن میں عین پنجابی فلم کے ہیرو کی طرح زنجیروں سے باندھ کر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں دکھانے کیلئے تمہاری منگیتر کے حسن کی پذیرائی کی جائے گی۔ اس کی جوانی کے ماپ تول کا کام کیا جائے گا۔ تمہیں مرنے سے پہلے ایسی اذیت دی جائے گی کہ تمہاری روح تک تھراتی رہے۔ پھر تم دونوں کو..... شیت..... شیت!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر اپنی گردن پر مخصوص انداز میں انگلی پھیر کر مجھے سمجھا دیا کہ ہم دونوں کی گردن کشی کر دی جائے گی۔

خوف کی لہر میرے پورے بدن کو بے جان کر گئی۔ استاد بلو میری طرف سے کوئی ردِعمل نہ پا کر ٹہلتا ہوا صلغانی کی طرف چلا گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے کئی پنجابی فلمیں گھوم گئیں۔ ان لوگوں سے بعید نہیں تھا کہ اس لاقانونیت میں لتھڑے ہوئے ماحول میں ویسی ہی بے غیرتی کی داستانیں رقم کرنے بیٹھ جائیں۔ اس علاقے میں عام حالات میں پولیس کسی واقعے یا حادثے کے مقام پر پہنچنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگا دیتی ہے۔ اس بیلے میں ہونے والے خونریز جشن کی اول تو پولیس تک خبر ہی نہیں پہنچے گی، اور دوم: اگر اطلاع پہنچ بھی گئی تو انہیں 'جتھے' سے توبہ کرنے تک' ہمارا تیا پانچہ ہو چکا ہوگا۔ ضلع بھر کی پولیس سردار حیدر خان اور یار ن خان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

میرے دل و دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ہتھیلیاں سلگ اُٹھیں۔ سلاخوں کو تھامے رکھنا محال ہو گیا تو میں نڈھال انداز میں دیوار کی جڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نصف گھنٹے بعد میرے سامنے چائے کا پیالہ رکھ دیا گیا جسے میں نے بے دھیانی کے عالم میں اُٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

رات ڈھلنے لگی۔ استاد بلو نے درست کہا تھا۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور جا کھڑی ہوئی۔ غزالہ کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے لہرا جاتا۔ مجھے اپنی زندگی کے تفکر کا تردد نہ رہا بلکہ

غزالہ کو اغوا کر کے یہاں لائے جانے اور میری موجودگی میں اس کی عصمت دری کا احتمال آگ بن کر رگ و پے اور دل و دماغ کو جہنم کدہ بنانے لگا۔ یارن خان نے جس طریقے سے بخت خان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے یہاں پہنچا دیا تھا، اس سے بعید نہیں تھا کہ وہ بخت خان کی حویلی میں پناہ گزیں غزالہ کو بھی مکھن سے بال کی طرح نکال لائے۔ حیدر خان اور میاں دلبر حسین اس سے بڑے کمینے تھے۔ ان سے خیر کے سوا ہر توقع کی جا سکتی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ ان کے نزدیک غزالہ کوئی ایسی حسین لڑکی نہیں تھی؛ وہ محض مجھے ایذا پہنچا کر اپنی سفلی اور انتقامی طبیعت کو پرسہ دینا چاہتے تھے۔

رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ ہر کھٹکے پر دل بیٹھ جاتا۔ مبادا کہ غزالہ کو اغوا کرنے والے اسے لے نہ آئے ہوں۔ صبح کی کرنوں نے جہان پر چھائے اندھیرے کو باطل کر دیا مگر میری قسمت پر طاری اندھیرے اس سے نہ چھٹ سکے۔ مجھے ناشتہ کرایا گیا، ٹوائلٹ کی سیر کرائی گئی اور گالیوں کے پر ہنگام شور میں کوئی دس بارہ مرتبہ 'کوئی حرکت' نہ کرنے کی تنبیہہ کی گئی۔ اس دوران جیدے دلتی باز کی خواہ مخواہ کی دو چار دولتیاں مجھے اپنے تن بدن پر وصول کرنا پڑیں۔ چونکہ میرا دھیان جان لیوا اندیشوں کی طرف مبذول تھا، اس لیے بقول ملغانی، میری بہادری کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی۔ اس نے بہت حد تک درست کہا تھا کہ میرے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔

پھر جب سہ پہر میں جب دو چھٹے ہوئے بدمعاشوں نے چیختی چلاتی غزالہ کو کمرے کے وسط میں لا پٹخا، میری رہی سہی سکت بھی جواب دے گئی۔ میں اتنے زور سے چیخا کہ یوں لگا جیسے میرے پھیپھڑے پسلیاں پھاڑ کر باہر آ گئے ہوں۔ میں نے سردار حیدر خان اور یارن خان کو اپنی پوری آواز کے ساتھ گالیاں دیں جبکہ استاد ببلو اور ملغانی کو برے نتائج کی دھمکیاں دیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کچھ کہا؛ کس کس کو مخاطب کر کے گالیاں دیں۔ شور سن کر ملغانی بھاگا چلا آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دولتیاں مارنے والا جیدا بھی کمرے میں داخل ہوا۔ ملغانی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ڈپٹ کر بولا، ''بکواس نہ کر کتے کے پلے..... جان سے مار دوں گا اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔''

شاید وہ بھول گیا تھا کہ میرا ایک ہاتھ آزاد تھا۔ میں اپنے حواس میں نہیں تھا کہ سوچ بچار کرتا۔ میں نے نہایت برق رفتاری سے ہاتھ بڑھایا اور ملغانی کی گردن دبوچ لی۔ میری

گرفت اتنی سخت تھی کہ میری انگلیاں اس کے نرخرے میں کھب گئیں۔ آنِ واحد میں اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئیں۔ بھنچی بھنچی آواز میں بولا، ''چھچھ..... چھوڑ.....دد.....دو.....''

میں حلق کے بل چیخا۔ اپنی انگلیوں میں بدن کی تمام قوت پروتے ہوئے ملغانی کے بہت قریب ہوگیا۔ ایسے ہی وقت میں غزالہ کو لانے والوں میں سے ایک کی نگاہ ملغانی کے چہرے پر پڑ گئی۔ اسے سنگینی کا احساس ہوگیا۔ گالیاں دیتا ہوا تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں نے اس کی غفلت اور بڑھی ہوئی خود اعتمادی سے فائدہ اُٹھایا اور پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اس کی رانوں کے بیچ رسید کی۔ وہ 'اوغ' کی کریہہ آواز نکالتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔ جیدے نے خون آشام نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے گن کی نال میری کنپٹی پر رکھ دی، ''استاد ملغانی کو چھوڑ دو ورنہ.....''

میں نے اسے جواب دینے کے بجائے دانت کچکچائے۔ ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ انگلیاں کچھ اور کھب گئیں۔ غزالہ کو دیکھا۔ وہ چیخ رہی تھی۔ آزاد ہونے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اسے یہاں لانے والا ایک شخص رانوں کے بیچ اپنے دونوں ہاتھ گھسیڑے آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ فرطِ تکلیف سے سرخ ہوگیا تھا۔ دوسرا اغوا کار غزالہ کی بانہیں مروڑ کر اس کی پشت پر باندھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

ملغانی نے بہتیری کوشش کی کہ میری گرفت سے نکل جائے۔ اس کے دونوں ہاتھ میری کلائی سے چپکے ہوئے تھے۔ وہ جان میں مجھ سے کمزور تھا اس لیے اپنی گردن پوری قوت صرف کرنے کے باوجود میرے ہاتھ سے نہ چھڑا سکا۔ ایسے ہی وقت میں میری کنپٹی پر گن رکھنے والے شخص نے گولی چلانے کے بجائے گن ہٹائی، نال سے پکڑ کر ہوا میں بلند کی اور پوری قوت سے گن کا چوبی بٹ میرے سر میں دے مارا۔ یوں لگا جیسے میرے سر کے عقبی حصے پر بم پھٹ پڑا ہو یا میری کھوپڑی کسی بم کی طرح بلاسٹ ہوگئی ہو۔ زوردار دھماکے کے ساتھ میرا ذہن بھک سے اُڑ گیا۔ میری تمام تر سوچیں اسی نکتے پر رُک گئیں کہ میں نے ملغانی کی گردن پکڑی ہوئی ہے جسے میں نے مرتے دم تک نہیں چھوڑنا۔

مجھے اس بات کا ہلکا سا احساس ہوا کہ اس کم بخت نے اس جان لیوا وار کے بعد اپنا ہاتھ نہیں روکا تھا بلکہ میرے کندھے، بازو اور کمر پر ان گنت وار کیے تھے جن کے نتیجے میں میرا چہرہ خون

سے تر ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے خون ہی خون دکھائی دیا۔ چند لمحے، یا شاید چند منٹ میں اپنے پیروں پر کھڑا رہا، پھر بے سدھ ہو کر گر گیا یا کسی طرف لڑھک گیا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے احساس کی آخری گھڑی تک ملغانی کی گردن نہیں چھوڑی تھی۔

نجانے کس پہر میں میرے سر میں درد کی کٹیلی لہر جاگی اور مجھے بیدار کر گئی۔ میں کافی دیر تک خالی الذہنی کی سی کیفیت میں پڑا رہا۔ اس دوران میں نے بے ساختہ طور پر اپنی آنکھیں کھولنا چاہیں مگر میری انتہائی کوششیں بھی ناکام رہیں۔ یاد آیا کہ سر سے نکلنے والا خون آنکھوں تک چلا آیا تھا۔ اب جم گیا تھا یا جمنے کو تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں تک لانا چاہا۔ ناکام رہا۔ چند لمحوں میں ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ میں نہ صرف اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بلکہ پورے جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ منہ کھولنے کی کوشش کی تو جما ہوا خون رکاوٹ بن گیا۔ میں محض 'اوں آں' کی آواز نکال کر خاموش ہو گیا۔ یہ خیال بڑا روح فرسا تھا کہ میرا دھڑ کام نہیں کر رہا تھا۔ سر میں ہلکے ہلکے دھماکے ہو رہے تھے جن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی درد کی لہریں برداشت کی حد سے باہر تھیں۔ میں درد سے لڑتے لڑتے ہار گیا اور پھر گہری نیند یا بے ہوشی میں چلا گیا۔ زخم کے باعث درد کی لہریں اتنی تکلیف رساں تھیں کہ اگر میں بے ہوش نہ ہوتا تو یقیناً تکلیف سے مر گیا ہوتا۔

درد کی ہی کسی لہر نے پھر مجھے ہوش کی وادی میں لا پھینکا۔ میں نے سر کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ سر میں جنبش پیدا ہوئی یا نہیں؛ میرے حلق سے تکلیف کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں اتنے زور سے چیخا تھا کہ میرے ہونٹوں، مونچھوں اور داڑھی کے بالوں میں سوکھے ہوئے خون کی پپڑی ٹوٹ گئی۔ منہ کھل گیا۔ میں پھر چیخا، ''غزالہ..... غزالہ.....''

جواب میں غزالہ کی آواز سنائی نہیں دی۔ بلکہ ایک بھرائی ہوئی سرد آواز کانوں میں پڑی، ''غزالہ کے بچے! میں ہوں؛ تمہارا باپ..... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

مجھے اس کی آواز کسی پھٹے ہوئے ڈرم سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر تھوڑا زور دیا۔ اس کی آواز کو پہچاننے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ استاد بلو تھا۔ میں نے کہا، ''تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا استاد..... میں تم لوگوں کو چن چن کر اپنے ہاتھوں جہنم میں ڈالوں گا۔''

اس کی کھردری ہنسی میرے کانوں میں پڑی، ''اب تم شاید ساری عمر اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں رہ پاؤ گے شہریار! تمہیں کہا تھا ناں کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو؛ شاید زندہ بچ جاؤ۔ تم

نے مستی دکھائی۔اب اپنا برا انجام دیکھنے کیلئے آنکھیں کھول رکھو۔''

میں نے اس کی آواز سے اندازہ قائم کیا کہ وہ میرے آزاد ہاتھ کی طرف بیٹھا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا مگر ایک آہ میرے حلق سے نکل گئی۔ میری پوری کوشش کے باوجود میرے ہاتھ میں یا بازو میں ننھی سی حرکت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

وہ بولا، ''تم نے ملغانی کو مار دیا..... آہ! بڑا جی دار سجن تھا میرا۔ سوروں کو پچھاڑتا رہا مگر نہ جانے کیوں ایک بندھے ہوئے کتے کے ہاتھوں مر گیا..... تم نے میرا بڑا نقصان کیا ہے۔ کاش! موت سے بڑی بھی کوئی سزا دنیا میں ہوتی تو تمہیں وہ سزا دے کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیتا اور اور..... خیر..... تمہیں زمانے کیلئے عبرت بناؤں گا تو دل میں ٹھنڈ پیدا ہوگی۔'' اس کی آواز میں روایتی خنکی کے ساتھ دکھ کی گہری لہریں موجزن تھیں۔

ملغانی کی موت کا سن کر دل میں طمانیت کی لہر دوڑی۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر جمے ہوئے خون کی بدولت پلکوں میں جنبش پیدا نہ ہو سکی۔ ایسے میں سر کی ٹیسوں میں اضافہ ہو گیا۔ برداشت کرنے کیلئے ہونٹ بھینچے، دانت کچکچائے مگر بے اختیار میرے حلق سے تیز چیخیں برآمد ہونے لگیں۔

ایسے میں غزالہ کی پھٹی پھٹی آواز میرے کانوں میں پڑی، ''خدا کیتے میڈے شہرے کو اسپتال گھن ونجو نی تاں ایہ مر ویسی..... تہاکوں پیدا کرن آلے دا واسطہ!''

(خدا کیلئے میرے شہرے کو ہسپتال لے جاؤ ورنہ یہ مر جائے گا۔ تجھے پیدا کرنے والے کا واسطہ۔)

اس کی آواز میں اس کے دکھ کا تمام تر نوحہ چھپا ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کافی دیر سے مسلسل چیختی چلی آ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور آواز مردوں کی طرح بھاری ہو گئی تھی۔

استاد ببلو نے اسے ڈانٹا۔ ایک اور بھاری آواز بھی سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، غلیظ گالیاں بکتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا حکم دے رہا تھا مگر وہ شاید کسی کی بات سن ہی نہیں رہی تھی بلکہ یہی جملہ بار بار ادا کیے جا رہی تھی۔ پھر ایک زوردار طمانچے کی آواز سنائی دی۔ میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اپنی تکلیف بھول گیا۔ حلق کے بل چیخا، ''ببلو! ملغانی ریت تیکوں وِی موت گھن ویسی..... میں کیں کوں نہ چھڑیساں..... ہک ہک کوں چن کے مریساں بھاڑی دی

اولاد!''

(بلو !ملغانی کی طرح تم بھی موت کا شکار ہو گے۔ میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ چن چن کر تم لوگوں کو ماروں گا۔)

استاد ببلو نے میرے چہرے پر زوردار چانٹا رسید کیا۔ میں جس تکلیف سے نبرد آزما تھا، اس کے مقابلے میں یہ بہت معمولی چوٹ تھی۔ میں نے سر جھٹکا۔ اپنی تکلیف میں اضافہ کر بیٹھا۔ سر میں دھماکے ہونے لگے جنہوں نے غزالہ کی آواز دبا دی تھی یا وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ میرے دشمنوں سے یہ بھی تو بعید نہیں تھا کہ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دی گئی ہو۔

استاد ببلو نے غزالہ کو تھپڑ مارنے والے یا کمرے میں موجود کسی اور شخص کو مخاطب کیا، ''اوئے کرمے! ادھر آ..... اس کی آنکھوں پر پانی ڈال..... یہ خون صاف کر دے تاکہ یہ اپنا انجام دیکھنے کے قابل ہو جائے۔ وہ چوہا کپاؤڈرا بھی تک نہیں آیا۔ نجانے کہاں مر گیا ہے۔''

چند لمحوں بعد میرے چہرے پر پانی کے چند چھینٹے پڑے۔ میں نے پلکوں کو حرکت دی مگر ناکام رہا۔ چند چھینٹے مارنے کے بعد کرمے نے ایک کھردرے کپڑے سے میرے آنکھیں صاف کیں۔ یہ عمل بھی نہایت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ رگڑ کر خون صاف کرنے کے مرحلے میں سر دائیں بائیں حرکت کرتا تو موت کا فرشتہ دکھائی دینے لگتا۔ آنکھیں کھلنے تک میری سکت دم توڑ گئی تھی۔ میں خالی الذہنی کی جان کنی میں پڑا لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس دوران استاد ببلو نے مجھے کیا کہا، میرے ساتھ کیا کیا، مجھے معلوم نہ ہوا۔ جب کافی دیر بعد میرے اوسان بحال ہوئے تو وہ جا چکا تھا۔ میں نے دو تین بار اُسے پکارا مگر جواب نہ ملا۔ غزالہ کو آواز دی تو جواب میں 'غوں غوں' کی آواز سنائی دی۔

جب کھلی آنکھوں میں چھت کا گھومتا ہوا منظر ٹھہرا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں چاروں شانے چت فرش پر پڑا تھا۔ میری آنکھیں چھت کے چوبی شہتیر اور کڑیوں پر ثبت تھیں۔ میں نے سر کو حرکت دے کر غزالہ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر سوائے ناقابلِ برداشت تکلیف کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ دکھائی دی نہ اطراف کی دیواریں..... لاچاری کے سامنے ہتھیار ڈال کر میں نے اپنے جسم کے مختلف اعضا کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر یہ دیکھ کر میری سانس سینے میں اٹک گئی کہ گردن کے نیچے والا تمام دھڑ بے جان اور مفلوج ہو چکا تھا۔

میں نصف گھنٹہ کے قریب اپنے بے نتیجہ والی جنگ لڑتا رہا۔ بے بسی کے احساس سے میری

آنکھیں بھر آئیں۔ کمرے میں قدموں کی چاپ ابھری۔ ایک سے زیادہ آدمی اندر آئے تھے۔ استاد بلو کی آواز سنائی دی، ''اس کا زخم دیکھو اور صفائی کر کے پٹی کر دو۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کمپاؤڈر کو لے کر آیا تھا۔ میں نے کہا، ''جانے دو استاد! جب مجھے مرنا ہی ہے تو پھر یہ تکلف کیوں کر رہے ہو۔ ڈریسنگ کی تکلیف نہ دو مجھے۔''

اس کا فرعونی قہقہہ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑا، ''نہیں جانی! تمہیں ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بڑے خان کا حکم ہے کہ کھیل کی آخری بازی تک تمہاری آنکھیں کھلی رہیں اور تمہارا دماغ پوری صلاحیت کے ساتھ کام کرتا رہے۔''

اسی لمحے مجھے نوکیلی مونچھوں والے جواں سال کمپاؤڈر کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ جھک کر میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ شاید اس نے میری نبض بھی چیک کی تھی۔ وہ پختہ کار رہنر مند نہیں تھا۔ میری حالت دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ تھوک نگل کر بولا، ''صاحب! اس کو نشتر ہسپتال لے جانا پڑے گا۔ زخم بہت گہرا ہے۔''

''اسے کہیں نہیں جانا۔ تم اپنا کام کرو اور چلتے بنو۔'' بلو نے قدرے سختی سے کہا۔

میں نے کہا، ''ڈرو مت؛ خون صاف کر کے پٹی کر دو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس دوران اس نے کوئی چیز میری کلائی پر ماری۔ پوچھا، ''میں نے کیا کیا ہے؟''

میں نے آنکھوں سے 'نہیں' کا اشارہ کیا۔ اس نے پھر کسی عضو پر ٹھوکر ماری۔ پوچھا۔ میرے انکار پر اس نے کہا، ''پیروں کو حرکت دو۔''

میں نے کہا، ''فضول کوشش مت کرو۔ جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔ میرا تمام دھڑ سن ہو چکا ہے۔ مفلوج ہو چکا ہے۔''

میری بات سن کر استاد بلو جلدی سے مجھ پر جھکا، ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کمپاؤڈر نے کسی کی اعانت سے مجھے پہلو کر بل لٹایا اور نہ جانے میرے زخم کے ساتھ کیا سلوک کیا؛ صفائی کی بھی، یا نہیں، البتہ پٹی باندھ دی۔ فارغ ہو کر استاد بلو سے مخاطب ہوا، ''لگتا ہے اس کے بازو کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے۔ یہ دیکھیں؛ ٹیڑھا ہو رہا ہے۔ ہاں! اس کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔''

بات کرنے کے دوران اس نے شاید میرا بازو ہلا جلا کر دیکھا تھا اس لیے اپنی تشکیک آمیز

رائے پر فیصلہ کن نتیجہ چپکا دیا تھا۔ استاد ببلو نے کہا، ''نو ٹینشن..... اگر ممکن ہے تو اس کے بازو کی ہڈی کو سیدھا کر کے پٹی باندھ دو۔''

کمپاؤڈر میرے پہلو میں بیٹھا اپنے ہنر کو آزماتا رہا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنے کام کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور استاد ببلو کے کسی کارندے کی معیت میں کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد استاد ببلو نے مجھے اپنے ہاتھوں پانی پلایا۔ اُٹھا کر بٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا تو اس نے کرمے کو آواز دے کر پاس بلا لیا۔ دونوں نے مل کر مجھے اُٹھایا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ درد کی ناقابلِ برداشت ٹیسوں میں کچھ کمی آئی تو میں نے اپنے عین سامنے والی دیوار کی جڑ میں غزالہ کو گٹھڑی کی صورت میں پڑے دیکھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بے دردی سے باندھے گئے تھے۔ منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ لامحالہ طور پر اس کے منہ میں کپڑے کا گولا بھی ٹھونسا گیا ہوگا۔ میں نے کراہتے ہوئے استاد ببلو سے کہا، ''اس کا منہ کھول دو۔''

اس نے لیت ولعل سے کام نہیں لیا بلکہ ہاتھ کے اشارے سے کرمے کو غزالہ کی طرف بھیج دیا۔ وہ کپڑا کھولنے لگا۔ استاد ببلو نے جستی گلاس کا پیندا میرے ٹخنوں پر دو چار مرتبہ مارا اور میرے تاثرات میں تبدیلی کا جائزہ لیا۔ تاسف بھرے لہجے میں بولا، ''یار! تم تو واقعی اپاہج ہو گئے ہو۔ ٹائلٹ کیسے جاؤ گے؟''

یہ مجھ پر پڑنے والی مصیبت کے مقابلے میں بہت معمولی واقعہ تھا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ پوچھا، ''ملغانی واقعتاً مر گیا ہے؟''

وہ سانپ کی طرح پھنکارا، ''تو کیا میں نے بکواس کی ہے تم سے؟''

غزالہ کی زبان بندی ختم ہوگئی تو وہ پھر دریدہ آواز میں چلانے لگی، ''شہرے! شہرے! توں ہوش وچ تاں ہیں؟''

(شہرے! کیا تم ہوش میں ہو؟)

میرا دل بھر آیا۔ اس کی حالتِ زار دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا، ''ہاں! تم فکر نہ کرو۔ اوپر والا ہماری مدد کرے گا۔''

''یہ کون لوگ ہیں اور ہماری ان سے کیا دشمنی ہے؟ انہوں نے تمہیں کیوں مارا ہے؟'' وہ پاگلوں کے سے انداز میں مجھ سے دریافت کرنے لگی۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کی، ببلو سے پوچھا، ''استاد! میں کتنی دیر بے ہوش رہا ہوں؟''

''لگ بھگ چوبیس گھنٹے..... کل سہ پہر سے اب تک.....'' استاد ببلو شاید اپنے دیرینہ رفیق ملغانی کی موت سے دلبرداشتہ تھا؛ یا کوئی اور بات تھی؛ اپنے مخصوص انداز سے خاصا ہٹا ہوا اور منتشر معلوم ہو رہا تھا، بولا، ''میں نے اپنے طور پر پروگرام بنایا تھا کہ خانزادوں کو سمجھا بجھا کر تمہاری جان بخشی کرا دوں گا۔ تمہاری منگیتر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ویسا نہیں ہونے دوں گا مگر تمہاری حماقت نے نہ صرف ریاض ملغانی جیسے قیمتی آدمی کو موت کے گھاٹ سلا دیا بلکہ اپنا تیا پانچہ بھی کرالیا۔ اب تمہارے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔''

میں نے اسے بنظرِ احتیاط دیکھا، کہا، ''استاد! سچ بتاؤ؛ کیا تم نے ابھی جو کہا ہے، اس میں کوئی صداقت بھی ہے؟''

اس نے کہا، ''بالکل ہے! میں نے کہا تھا ناں کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا مگر تم نے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی مار لی ہے۔ اور ہاں! تمہاری نا گفتہ بہ حالتِ زار کے سبب دو چار دن بعد منعقد ہونے والا جشن آج رات منایا جا رہا ہے۔ ابھی چار بجے ہیں۔ آٹھ بجے، جب رات شروع ہوگی، تب تمہاری بربادی کا کھلا تماشا بھی شروع ہو جائے گا۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں وقتی طور پر بھول گیا تھا مجھے کس قیامت کے دہانے پر لا کھڑا کیا گیا تھا۔ میں نے منت آمیز لہجے میں کہا، ''استاد! مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے۔ میں مرنے کیلئے ہی پیدا ہوا تھا۔ ہر انسان کی طرح۔ مگر خدا کیلئے..... مجھ پر ایک احسان کر دو۔ اسے یہاں سے فرار کرا دو۔ نور پور پہنچا دو۔ میں اس کی ذات پر اٹھنے والی انگلی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا، ''نہ صرف مجھے بلکہ یارن خان اور حیدر خان کو بھی اس بات پر یقین ہے کہ تمہیں اپنے زخموں سے زیادہ اس کڑی سے چھیڑ چھاڑ کا دُکھ زیادہ ہوگا۔''

''کاش! میرے بدن میں سکت ہوتی تو میں تمہارے پاؤں بھی پکڑ لیتا۔ تمہاری منت سماجت کر لیتا۔ خدا کیلئے اسے یہاں سے نکال دو۔'' میری آواز بھرا گئی۔

''نہیں جانی! ڈور کا یہ سرا میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ بڑا خان ریاض ملغانی کی ناگہانی موت پر بہت مشتعل ہے۔ وہ میری کوئی غلطی یا کوتاہی برداشت نہیں کرے گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''کسی طرح میڈم شکیلہ کو ہی اطلاع کر دو۔''

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا، بولا، ''تا کہ اپنی موت کا سامان اپنے ہاتھوں کر لوں۔''

''نہیں..... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔''

اس کی مسکراہٹ میں زہر گھل گیا، ''تم اب شاہ زور نہیں رہے، اپاہج گھوڑے بن چکے ہو جسے اس کا مالک بھی گولی مارنے پر مجبور ہوتا ہے۔''

میں نے اتنی زور سے آنکھیں بھینچیں کہ سر کے عقبی حصے میں درد کی کٹیلی لہر جاگ اٹھی۔ رکے ہوئے آنسو نکل پڑے جنہیں استاد ببلو نے بڑی نرمی سے پونچھ ڈالا۔ کہا، ''جانی! یوں نہیں..... مصیبتیں مردوں پر آتی ہیں اور مرد بہادری اور سینہ زوری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ رونا عورتوں کا کام ہے۔ اپنی بے داغ بریو دستوری پر بزدلی کے آنسوؤں کے داغ مت لگاؤ۔''

میرے بدن کی تمام تر شکستگی میری آواز میں بھر آئی، ''استاد! انسان کی غیرت پاش پاش ہو جائے تو اس میں اور لاچار عورت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اگر تم لوگوں نے اسے نہ اُٹھایا ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے نہ لایا گیا ہوتا تو دیکھتے..... میں ہنس کر موت کو گلے لگاتا۔ آنسو تو کیا، میرے لہجے میں ہلکی سی نقاہت بھی نہ اترتی..... اب بھی آزمانا چاہو تو آزما لو۔ اسے واپس بھیج دو اور میری مردانگی کا امتحان لو۔ 'سی' تک نہیں کروں گا خواہ میرے جسم کے ہزاروں ٹکڑے ہو جائیں۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ نیم آزردگی سے مسکرایا۔ بولا، ''ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ میر و شاہ بڑا آدمی ہے۔ گرو اُستاد ہے۔ اس کے ہاتھ کا چنڈا ہوا (تربیت دیا ہوا) شخص عام نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں۔ تمہیں؛ اور پیا جی کو بھی..... اور ہاں شہرے! تم جس دکھ سے آج رات گزرنے والے ہو، میں اس دکھ سے اپنے لڑکپن میں گزرا تھا۔ تب سے آج تک..... میں کسی ایک لمحے میں بھی چین کی سانس نہیں لے پایا۔ خون سے کھیلتا ہوں مگر تنہائی میں اپنے آنسوؤں سے ہار جاتا ہوں۔ وہی انتقام زمانے سے لیتا آ رہا ہوں۔ مگر..... چاہتے ہوئے بھی تمہیں اس عذاب سے نکال نہیں سکتا۔ خان آج تک میری سبھی مانتا آیا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں میری ایک نہیں سنے گا۔''

''تم کوشش تو کر دیکھو!'' میں نے درد آمیز لہجے میں کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کھانے پینے کے بارے

میں پوچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ غزالہ پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے غزالہ کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے مردوں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ ایک گال پر انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔ بال کھلے ہوئے، لباس دو تین جگہوں سے پھٹا ہوا تھا جبکہ جسم گٹھڑی کی صورت فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی، ''شہرے! اَب کیا ہوگا؟''

میں جانتا تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے مگر مجھ میں بتانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے کہا، ''سوہنے رب سے دعا کرو۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ ہمیں زندہ چھوڑ دیں گے۔''

''کہاناں! دعا کرو۔''

''تمہیں بڑی بے دردی سے ان کمینوں نے مارا ہے..... میری نظروں کے سامنے..... ہائے! ان بے غیرتوں کے ہاتھ ٹوٹ جائیں..... مگر شہرے! تم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ سب مل کر بھی تمہارے ہاتھ سے اس کی گردن نہ چھڑا سکے۔ تم بے ہوش ہو گئے، پھر بھی..... اور جب انہوں نے تمہارا ہاتھ ہٹا لیا، تب وہ مر چکا تھا۔ ہائے! مجھے بخار ہو گیا ہے شہرے..... میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے..... تمہیں بھی بہت درد ہو گا سر میں۔ ہے نا؟'' وہ سرائیکی میں بڑے بے ربط انداز میں بولے چلی جا رہی تھی۔ مجھے بولنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ کافی دیر تک بے لاگ بولتی رہی۔ پھر شاید تھک گئی۔ بولی، ''تم بول کیوں نہیں رہے؟ کیا ہوا ہے؟''

میں نے اسے دلاسا دیا۔ خود پر قابو پانے کا کہا۔ پوچھا، ''تمہیں ان لوگوں نے کیسے اغوا کیا؟''

اس نے بتایا کہ وہ بخت خان کے گھر سے نکل کر حیات خان کے گھر جا رہی تھی۔ حیات خان کی بیوی نے اسے کسی کام سے بلایا تھا۔ جونہی گلی میں نکلی، سردار بہرام خان کے دارے کے باہر کھڑی ہوئی سرخ رنگ کی کار اسٹارٹ ہو کر اس کے برابر میں آ گئی۔ دو آدمی برق رفتاری سے نکلے جنہوں نے اسے آناً فاناً دبوچ کر کار میں ڈال لیا۔ جب تک وہ معاملے کو سمجھتی، کار نور پور حیات خان کے دارے کا موڑ مڑ کر بخشو لوہار کی دکان عبور کر چکی تھی۔ اسے چیخنے چلانے یا مزاحمت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اسے نور پور سے نکال کر سیدھا یہاں لا پھینکا

گیا تھا۔

میں نے پوچھا، ''کیا تمہیں کار میں ڈالتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا؟''

''گلی خالی نہیں تھی۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ میں اس طرف دھیان ہی نہیں دے پائی کہ کسی نے مجھے اغوا ہوتے ہوئے دیکھا تھا یا نہیں۔'' اس نے بتایا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ بخت خان تب سے غائب تھا، جب سے مجھے یارن خان کی حویلی سے لینے کیلئے گیا تھا۔ اس کے گھر والے بہت پریشان تھے۔ بخت خان کی بیوی یارن خان کے پاس خود چل کر گئی تھی۔ اس سے اپنے خان کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ وہ شہر یار کو اپنے ساتھ لے کر اس کی حویلی سے چلا گیا تھا۔ کہاں؟ اس سوال کا جواب یارن خان نے لاعلمی کی صورت میں دیا تھا۔ بخت خان کی بیوی نے تھانے میں رپٹ درج کرا دی۔ پولیس آئی۔ یارن خان کی حویلی کی تلاشی لینے گئی۔ کچھ نہ ملا۔ ادھر اُدھر گاڑیاں دوڑائی گئیں۔ نور پور والوں اور پولیس کے اہلکاروں کو نہ بخت خان ملا اور نہ میں ہی..... نہ انہوں نے بخت خان کی بیوی کے ایما اور اصرار پر یارن خان کے خلاف پرچہ درج کیا۔ اس نے مجبوراً عدالت کا رخ کر لیا تھا۔

میں نے کھالے اور بخشو لوہار کے بارے پوچھا تو اس نے کہا کہ یارن خان نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر، دوبارہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ لے کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ 'جان بچی سو لاکھوں پائے' کا ورد کرتے ہوئے گھر پہنچ گئے تھے۔ غزالہ نے منت سماجت کر کے کھالے کو میری تلاش پر روانہ کر دیا تھا۔ کھالا لوٹ کر نور پور نہیں گیا تھا۔ بے چارہ مجھے تلاش کرتا پھرتا ہوگا۔ اچانک امید کا ایک دیا میری آنکھوں کے سامنے روشن ہو گیا۔ کھالا اگر میری تلاش میں نکلا تھا تو مایوس ہو کر میڈم شکیلہ کے پاس ضرور پہنچا ہوگا۔ میڈم کو اگر بھنک مل گئی کہ میں مصیبت میں ہوں، یارن خان کی قید میں ہوں تو وہ بجلی کی سی تیزی سے میرا سراغ لگا کر مجھ تک پہنچ جائے گی۔ میں جب سے یہاں مقید تھا، یہ پہلی امید کی کرن تھی۔

غزالہ اور میرے بیچ ایک چارپائی کا فاصلہ حائل تھا۔ میں نے اُسے بغور دیکھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے مگر وہ مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ میں نے اُسے اپنے پاس بلایا۔ وہ چند لمحے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر میرے طرف کروٹیں لینے لگی۔ وہ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی؛ نہ بیٹھ سکتی تھی مگر گھسٹ کر یا کروٹیں بدل کر مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ اب تک یہ خیال نہ

اُسے آیا تھا، نہ مجھے۔ جب وہ میرے قریب پہنچی تو اس نے سسکتے ہوئے اپنا چہرہ میرے گھٹنوں پر ڈال دیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی رسیاں دیکھیں۔ اسے کہا، ''اپنے ہاتھ میرے منہ تک لانے کی کوشش کرو۔''

اس نے اپنے عقب میں بندھے ہوئے ہاتھ بڑی تگ و دو کے بعد میرے لبوں تک پہنچائے۔ دانتوں سے گرہیں کھولنا مشکل کام تھا مگر میں نے اپنی تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی مشکیں کھول دیں۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے۔ مجھ سے لپٹ گئی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے رونے لگی۔ میں نے کہا، ''روکر میرا حوصلہ پست نہ کرو بلکہ اپنے پیروں کی رسیاں کھول دو۔''

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ پیروں کی رسیاں کھولنے کے بعد پنڈلیاں سہلانے لگی۔ پھر ایک جھٹکے سے میری طرف آئی۔ میرا بازو تھام کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ دیوار تھام کر کھڑی ہوئی اور میرے سر کا زخم دیکھنے لگی۔ پوچھنے لگی، ''تم کیا کہہ رہے تھے کہ تمہارا جسم مفلوج ہے۔ سچ؟''

میں نے ہولے سے سر ہلایا۔ کہا، ''کمپاؤڈر کہہ رہا تھا کہ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ہڈی ٹوٹنے سے بہت درد ہوتا ہے مگر مجھے احساس تک نہیں ہو رہا۔''

کہنے کو میں نے یہ سب کہہ تو دیا مگر اندر سے دہل کر رہ گیا۔ یقیناً میرے دماغ میں کوئی خطرناک چوٹ آئی تھی جس سے میرے حرام مغز نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر منور علی شاہ سے سن رکھا تھا کہ حرام مغز یا ریڑھ کی ہڈی کے اوپر والے حصے کے نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے انسان کا دھڑ مفلوج ہو جاتا ہے۔ کم و بیش یہی کیفیت منکا ٹوٹ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ ایسے مریض مر جاتے ہیں۔ بچ جانے والوں کی تعداد محض دس بارہ فیصد ہوتی ہے۔ دماغی چوٹ کا علاج بہت مہنگا ہوتا ہے۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ میں بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہاں سے بچ نکلنے کی صورت میں بھی زندگی کے محض دس فیصد امکانات میرے پاس تھے اگر کسی جدید ترین ہسپتال تک پہنچ جاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ زندگی کی بقیہ غیر معینہ مسافت میں بیڈ پر چت لیٹے ہوئے گزار دیتا۔ ایک لمحے کو میرا ذہن تاریکی کی دبیز چادر میں لپٹ گیا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا۔ اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا، ''غزالہ! مجھے یقین ہے کہ ہم اس مصیبت سے زندہ و سلامت نکل جائیں گے۔ پریشان ہونے کے بجائے تم حوصلہ رکھو اور مجھے بھی حوصلے میں رکھنے کی کوشش کرو۔''

وہ گھٹنوں میں سر ڈال کر سسکنے لگی۔ وہ ایسے نامساعد حالات سے زندگی بھر نہیں گزری تھی اس لیے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لائق نہیں تھی۔ میں نے اسے کچھ دیر رونے دیا۔ جب غبارِ جاں تحلیل ہو گیا تو گم صم بیٹھ کر میری ٹانگیں دبانے لگی۔ اس نے میرے پیروں کے تلوے اور ہتھیلیوں کو سہلایا۔ اپنی قمیص کے پلو سے میرے چہرے پر جمے ہوئے خون کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ میری نشان دہی پر اس نے میرے جسم سے لپٹی زنجیروں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ کھولنے کی اپنی سی کوشش کی مگر بھاری قفل اس سے نہ ٹوٹنے والے تھے اور نہ کھلنے والے تھے۔ کمرے کی دیوار میں موجود الماری میں سلور کا جگ اور گلاس دھرا تھا۔ اس نے پانی پیا، مجھے بھی پلایا اور تھک کر میری گود میں سر رکھ کر پہلو کے بل لیٹ گئی۔ وہ جاگ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لب لرز رہے تھے۔ دل ہی دل میں کوئی وظیفہ کر رہی تھی یا اپنے خدائے بزرگ و برتر سے اپنی اور میری سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔ میں اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ بہت زیادہ نقاہت کا اثر تھا، دماغی کمزوری لاحق تھی یا کچھ اور تھا؛ میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ ذہن پر غنودگی چھانے لگی۔ میں نے نیند سے دامن چھڑانا چاہا مگر ناکام رہا اور چند لمحوں میں ہی دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی گھاٹ پر آ جاتی ہے۔

وقت اپنی سرمست چال سے ناک کی سیدھ میں گامزن تھا۔

❖❖○❖❖

میری آنکھ دروازے کی پرانی طرز کی بھاری کنڈی طاق پر گرنے کی آواز سے کھلی۔ میں چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے سامنے والی دیوار کو گھورتا رہا۔ جھولی میں غزالہ کا چہرہ دکھائی دیا تو تمام سچوئیشن دل و دماغ پر آشکار ہو گئی۔ وہ جاگ رہی تھی اور مجھے خالی خالی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھی۔

دروازہ استاد ببلو نے کھولا تھا۔ وہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ننھا سا پسٹل دبا ہوا تھا۔ غزالہ کو میری گود میں آزاد پڑا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرانی رچ گئی۔ پھر اس کی نظریں فرش پر بکھری ہوئی رسی پر پڑی۔ زیرِ لب کچھ بڑبڑایا پھر مجھے مخاطب کر کے بولا،

''کیا حال ہے جوان؟''

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ہونٹ بھاری بھاری محسوس ہو رہے تھے۔ شاید آنکھوں کے ارد

گرد کا ماس سوجن پکڑ گیا تھا کیونکہ آنکھیں بھی صحیح طور پر کھل نہیں رہی تھیں۔ میں نے 'ٹھیک ہوں' کہا۔ میرے عقب میں کھلی کھڑکی کے راستے مختلف آوازیں کمرے میں پہنچ رہی تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ شاید آٹھ بج چکے تھے۔ میرا مقتل سجایا جا رہا تھا یا سج چکا تھا اور میرا انتظار کیا جا رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' استاد بلو کی بھاری مگر سرد آواز میرے کانوں میں پڑی، ''تمہارے شایانِ شان انتظامات کرنے میں کچھ دیر ہو گئی ہے۔ آٹھ بجے محفل سجانے کا ارادہ تھا، نو بج گئے، ابھی دو چار کام باقی ہیں۔ پھر تمہارے طلب گاروں کو مدعو کیا جائے گا۔''

میرے دل و دماغ میں وحشت بھر گئی۔ آنکھیں سلگ اُٹھیں۔ میں نے اپنی پوری توانائی صرف کر کے اپنا ہاتھ اُٹھا کر غزالہ پر رکھنا چاہا، شاید اسے تھام کر محفوظ کرنا چاہتا تھا مگر میرے اعصاب میں رائی بھر تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کہا، ''استاد! بہت بُرا..... بہت ہی برا کر رہے ہو تم لوگ۔''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجائی اور کہا، ''رنگو قصائی نے بھی یہی ڈائیلاگ مارا ہو گا تم سے..... اس کنجری میڈم سے زندگی کی بھیک مانگی ہو گی..... مگر تم لوگوں کو اس پر ذرا ترس نہ آیا ہو گا؛ نہ ہی تمہیں اپنے انجام کا فکر لاحق ہوا ہو گا۔ ہے نا؟ آج بھی وہی منظر سجا ہے۔ تم ہمیں ہمارے انجام سے خبردار کرو، منت سماجت کرو..... کچھ نہیں ہونے والا۔ تمہاری منگیتر کو تماشا بننا ہے، سو بن کر رہے گی۔ تمہیں مرنا ہے؛ سو تم مر کر ہی یہاں سے نکلو گے۔ کل ہمارے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ ہم نے کون سی نیکیاں کی ہیں؛ کون سی اچھائیاں برتی ہیں دنیا کے ساتھ..... ہمیں کیوں یہ توقع ہو کہ ہمارے جنازے پڑھائے جائیں گے؛ ہماری میتوں پر ماؤں بہنوں کے بین ہوں گے؟..... اپنی کاشت کی ہوئی فصل ہم بھی کاٹیں گے جس طرح تمہیں آج کاٹنی ہے۔''

اس کی بے تاثر آواز میں موت کے کئی خونیں اشتہار مخفی تھے۔ میں نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ یہ ارادہ کر لیا کہ اس سے خیر کی خیرات نہیں مانگوں گا۔ اس گھڑی میں نے اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس کیا تھا جتنا زندگی کے کسی لمحے میں بھی نہیں کیا تھا۔

میرے بدن سے لپٹی ہوئی آہنی زنجیر بے معنی تھی۔ اگر وہ کھول بھی دی جاتی تو میں ایک ملی میٹر حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں سنگ دلی سے یہ طے کر چکا تھا کہ مجھے لگنے والی سرکی چوٹ کا

نتیجہ میری موت کی صورت نکلنے والا ہے۔ کل مروں یا آج..... اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ البتہ میرا دل بار بار غزالہ کے ساتھ ہونے والی متوقع درندگی سے کانپ اٹھتا تھا۔ یہ خیال ہی بڑا لرزہ خیز تھا کہ اسے میری آنکھوں کے سامنے درندے اپنی ہوس کی آگ بجھانے کیلئے تختۂ مشق بنائیں گے۔

استاد ببلو نے اپنے ایک کارندے کو بلا کر کھانا اور چائے لانے کا حکم دیا۔ چند لمحوں میں کارندہ چینک، دو پیالے اور بڑی سی چنگیر میں کھانا رکھ کر لے آیا۔ استاد ببلو کے اشارے پر اس نے تمام چیزیں غزالہ کے سامنے رکھ دیں اور الٹے قدموں چلتا ہوا دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ استاد کی بھاری آواز سنائی دی، ''اے لڑکی! خود بھی کھاؤ اور اپنے یار کو بھی اپنے ہاتھوں آخری کھانا کھلا دو۔''

خالی پیٹ ہونے کے باوجود مجھے کھانے کی احتیاج نہ تھی۔ غزالہ کو بھی طلب نہیں تھی مگر استاد ببلو کے اصرار پر ہم نے چند لقمے زہر مار کیے۔ پانی پیا اور چائے کا ایک ایک پیالہ شکم میں اتارا۔ اس دوران وہ میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ میرے پاس اس کی کسی بات کا جواب نہیں تھا کیونکہ میرے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ دل ہی دل میں کسی انہونی کے رونما ہونے کی دعا کیے جا رہا تھا۔ انہونی وقوع پذیر نہیں ہوئی بلکہ پستول انگلی میں گھماتے ہوئے استاد ببلو کھڑا ہو گیا۔ اس نے آنکھوں سے کھانا لانے والے دبلے پتلے کارندے کو کوئی حکم دیا۔ اس نے رُخ پھیر کر صحن میں کھڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ کرماا اور دولتیاں جھاڑنے والا جیدا چند لمحوں بعد کمرے میں کھڑے تھے۔

استاد ببلو نے کہا، ''اس لڑکی کو اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ اسے فٹافٹ تیار کر دو۔''

غزالہ کا رنگ سپید ہو گیا۔ ہکلا کر بولی، ''شش..... شہرے.....''

کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق میری حالت دگرگوں ہو گئی۔ آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ آن کی آن میں دونوں نے غزالہ کو بازوؤں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ وہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر مجھے پکارتی جاتی تھی۔ یہاں اس کا میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میں بھی ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کیلئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ استاد ببلو کی طرف دیکھا۔ شاید میری آنکھوں نے اس سے کوئی سوال کیا تھا۔ وہ بولا، ''اس کیلئے خان کے حکم پر نئے ملبوسات وغیرہ منگوائے گئے ہیں۔ آج کی رات یہ وہ سب کچھ پہنے گی جس کے اس

نے زندگی بھر خواب بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔''

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی سفاکی اور بے رحمی میری روح میں سردی کی تند لہر کی طرح اتر گئی اور میرا سر بے جان انداز میں ایک کندھے پر آن گرا۔ یوں لگا جیسے میرے جسم کے ساتھ ساتھ میری روح نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مجھ پر ایک ترحم آمیز نگاہ ڈال کر استاد ببلو بھی کمرے سے نکل گیا۔ اس کا جانا یا کمرے میں رکنا میرے نزدیک بے معنی ہو کر رہ گیا۔ کھڑکی کے راستے سے گزر کر آتی ہوئی مختلف آوازیں ہتھوڑوں کی طرح میرے ذہن پر ضربیں لگا رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کھڑکی بند ہو جائے مگر اذیت ناک جہنم کا وہ دَر بند ہونے کیلئے نہیں کھولا گیا تھا۔ درد جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے مگر میرے سینے میں جاگنے والا درد برداشت کی ہر حد عبور کرنے کے بعد بتدریج عذاب رساں ہوتا جا رہا تھا۔

شاید نصف گھنٹہ بیت گیا..... یا کچھ زیادہ وقت گزر گیا۔ میرے سر کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا۔ میری بغلوں میں دو آدمی ہاتھ ڈال کر مجھے کھڑا کر رہے تھے۔ ایک میرے عین سامنے گن تھامے کھڑا تھا۔ اس کی گن کی نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کیوں اُٹھا رہے ہیں؟ کہاں لے کر جانا چاہتے ہیں؟ مگر میری زبان میرے جسم کی طرح گنگ ہو گئی۔ مجھے اُٹھانے والے دونوں لحیم شحیم اور قوی الجثہ انسان تھے۔ چہروں سے چھٹے ہوئے بدمعاش ظاہر ہوتے تھے۔ مجھے اُٹھا کر کھڑا کرنے اور چلانے کے انداز میں گھسیٹ کر صحن میں لانے میں انہیں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کمرے کی دنیا تاریک اور نیم تاریک تھی۔ صحن کا منظر روشن تھا۔ مغربی کمروں کے سامنے بنے ہوئے برآمدے کے باہر تھڑے پر پانچ چھ چارپائیاں اس ترتیب سے بچھائی گئی تھیں کہ ان کے بیچ پندرہ ضرب پندرہ فٹ جگہ خالی پڑی ہوئی تھی جس پر سرخ اور پیلی لائنوں والی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس خالی قطعے کے عین درمیان میں ایک تین چار فٹ لپیٹ والی غیر تراشیدہ لکڑی زمین میں گڑی ہوئی تھی۔ اس کی بلندی آٹھ دس فٹ رہی تھی۔ دونوں اطراف میں برآمدے کے ستونوں کے ساتھ ایل پی جی گیس پر چلنے والے مینٹل لیمپ روشن تھے جن کی مخصوص 'شوں شوں' کی آواز سناٹے کا قلب چیر رہی تھی۔

حویلی کے مین گیٹ کی طرف والے کھلے حصے میں شاید کھانا پک رہا تھا کیونکہ ماحول میں گوشت بھننے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ آگ کی لپٹیں اپنے عکس برآمدے کے اوپر والے حصے پر

نقش و نگار کی صورت چھوڑ رہی تھیں۔ صحن میں آٹھ دس اسلحہ بردار محافظوں یا اشتہاری مجرموں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ان تمام افراد کو میں نے پہلے ہی باتھ روم آتے جاتے دیکھ رکھا تھا۔ ابھی خانزادوں میں سے کوئی بھی یہاں نہیں پہنچا تھا۔ وہ شاید پہنچنے والے تھے۔ میں نے آنکھیں گھما کر اردگرد دیکھا۔ غزالہ بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ ابھی تک اسی کمرے میں تھی جس میں اسے تیار کیا جا رہا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے اب تب میں دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ میں پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ اپنی طرف آنے والی موت کے خوف کا تاثر تھا یا اپنی جان سے زیادہ عزیز غزالہ کے حشر ساماں انجام کا ڈر تھا کہ میرا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ مجھے گھسیٹنے والوں نے مجھے زمین میں گڑی ہوئی کھردری لکڑی تک پہنچایا۔ دو اور آدمی قریب آ گئے۔ انہوں نے مجھے اس طریقے سے لکڑی کے ساتھ باندھا کہ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس طرح میری گردن پر اضافی بوجھ پڑ رہا تھا اور سر کا درد جو گزشتہ دو تین گھنٹوں سے خوابیدہ تھا، بیدار ہو گیا تھا مگر مجھے باندھنے والوں کو مطلق پروا نہیں تھی۔ میری نبض کے ساتھ ساتھ دھماکے ہونے لگے۔ استاد ببلو قریب آیا۔ میرا جائزہ لیا۔ ٹخنے پر بوٹ کی ٹھوکریں مارتے ہوئے میرا بے تاثر چہرہ دیکھا پھر مطمئن ہو کر پیچھے ہٹ گیا، ''کرمے! اوئے جیدے! دیکھو تو..... کھانے میں کتنی دیر ہے؟''

''بس تیار ہی سمجھو استاد!'' کرمے نے ایک چارپائی کے آگے چوبی میز رکھتے ہوئے کہا، ''کیا خیال ہے؛ میزوں پر دارُ و سجا دیا جائے؟''

استاد ببلو نے سر کی حرکت سے اجازت دی۔ کرما اپنے ساتھ دو آدمیوں کو لے کر حویلی کے سیڑھیوں کے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پانچ سات شراب کی بوتلوں اور برف کے ٹکڑوں سے بھری چھوٹی چھوٹی اسٹیل کی بالٹیوں کے جلو میں نمودار ہوا۔ اس نے بڑے مشاقانہ انداز میں چارپائیوں کے سامنے رکھی گئی میزوں پر پینے کے لوازمات سجا دیے اور ستائش طلب نظروں سے استاد ببلو کی طرف دیکھا۔ استاد نے کہا، ''شاباش! میرا خیال ہے خان صاحب اب تب میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ تمہارا کام دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے۔''

چند منٹ بعد حویلی کے اوپر نظر آتے ہوئے درختوں کے سروں پر لہراتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ کوئی کار یا گاڑی اس طرف آ رہی تھی۔ وہ حیدر خان، یارن خان اور میاں دلبر حسین میں

سے کوئی ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تینوں ایک ہی گاڑی میں ادھر آنے کیلئے نکلے ہوں۔ چونکہ میری توقعات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دم توڑ چکی تھیں اس لیے میرے دل میں یہ خوش گمانی پیدا نہیں ہوئی کہ آنے والی گاڑی پولیس یا میڈم شکیلہ کی بھی ہوسکتی ہے جو حویلی کے مین گیٹ تک پہنچ آئی تھی۔ ہارن کی آواز پر استاد ببلو تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ جونہی میں نے سردار حیدر خان کو یارن خان اور میاں دلبر حسین کے درمیان فرعونی چال چل کر اپنی جانب آتے دیکھا، میرے روئیں روئیں میں انگارے بھر گئے۔ حیدر خان نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میرے سامنے پہنچا۔ فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ثبت تھی۔ آنکھیں بھی فتح کی چمک سے معمور تھیں۔ میاں دلبر حسین میرے عین سامنے چارپائی پر براجمان ہوگیا۔ میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اب تک اس کا محض نام سن رکھا تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا شخص تھا۔ توند نکلی ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے آسمانی رنگ کا کاٹن کا شاندار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں مجھ پر مرتکز تھیں۔ یارن خان میرے دائیں ہاتھ پر بچھی چارپائی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک کارندے کو بلایا، لائٹ پیگ تیار کرنے کا حکم دیا اور پاؤں ہلاتے ہوئے حویلی کا جائزہ لینے لگا۔

حیدر خان کوئی منٹ بھر مجھے گھورتا رہا پھر بولا، ''اُٹھ پہاڑ تلے آوے تاں اُوکوں اپنی اوقات دا پتہ لگدائے.....''

(اونٹ پہاڑ تلے آن کھڑا ہو تو اسے اپنی قامت کا اندازہ ہوتا ہے۔)

میرا دل غیر معتدل تھا۔ حلق سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ تھوک نگل کر کہا، ''تم احسان فراموش شخص ہو حیدر خان! تمہارے اور میرے درمیان کچھ اور معاملات طے پا چکے تھے۔ اس کے باوجود تم نے یہ کمینی حرکت کی ہے۔ اس کا نتیجہ تمہاری توقع سے کہیں زیادہ بھیانک نکلے گا۔''

اس کے لبوں پر تیرتی ہوئی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ بولا، ''ہاں! میں یارن خان کی بیٹی کو تمہارے ہاتھوں اغوا کرانا چاہتا تھا۔ اس کیلئے میں نے ایک کروڑ روپے کی رقم بھی تمہاری میڈم کو بھیج دی تھی۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟..... یارن خان..... کیا تم نے یہ معاملہ سن رکھا ہے؟''

میری توقع کے بالکل اُلٹ یارن خان نے قہقہہ لگا کر حیدر خان کی تائید کر دی۔ میں نے

کہا، ''نہیں..... اس سودے بازی سے پہلے بھی ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ تم نے مجھے خاندان کا سرمایہ قرار دیا تھا اور میری طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں اس عہد پر قائم رہا جبکہ تم مکر گئے ہو۔''

میری آواز دم بہ دم مدھم ہوتی گئی۔ نقاہت، اندیشے اور خوف نے میرے اندر ڈیرہ جما لیا تھا۔ جو منظر میری آنکھوں کے سامنے کھلا ہوا تھا، وہ جان لیوا تھا۔ غیرت پاش موت اپنا خوفناک دہانہ کھولے میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں بے بسی سے سوائے دیکھنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

حیدر خان سنجیدہ ہو گیا۔ مجھ پر کڑی نگاہیں مرتکز کرتے ہوئے بولا، ''میں خاندانی رئیس ہوں۔ بادشاہ ہوں۔ بلوچوں کا تاج ہوں۔ تم گندی نالی کے غلیظ کیڑے ہو۔ ہوٹل میں چند لمحے میرے سامنے بیٹھنے کا موقع پا کر تم نے خود کو بہت اونچا تصور کر لیا تھا۔ ہے نا؟ وہ لونڈیا..... کیا نام ہے اس کا؟..... ہاں..... شکیلہ؛ میڈم.....'' اس نے بڑے استہزائیہ انداز میں 'میڈم' کا لفظ ادا کیا، چند قدم ٹہل کر مجھ سے دور میاں دلبر کی طرف گیا پھر پلٹ کر میرے قریب آ گیا، ''وہ اپنے آپ کو مہارانی خیال کرنے لگی ہے۔ تم بھی اس کے دم پر اتراتے تھے۔ اونچا بولتے تھے۔ اونچا اُڑتے تھے۔ آج اسے آواز دو۔ اسے بلاؤ۔ میں دیکھتا ہوں وہ کیسے تمہیں چھڑانے کیلئے یہاں آتی ہے.....''

میں نے جی کڑا کیا، ''ٹھیک ہے حیدر خان! آج تم جو کہو، کہہ سکتے ہو۔ سننا میری مجبوری ہے مگر یہ سچ ہے کہ تم جس عورت پر ہنس رہے ہو، وہ عورت تمہارے جیسے جھوٹے خانزادوں کو پیروں تلے مسلتے ہوئے چلتی ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو مجھے ایک موبائل فون لا دو۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ مجھے حیدر خان نے یہاں رکھا ہوا ہے اور وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ پھر میں کیا؛ تم کیا؛ پوری دنیا دیکھ لے گی کہ تم پہاڑ ہو یا اس پہاڑ کے سامنے محض بکری ہو..... بزدل چوہے ہو۔ ہاں! کرو ہمت.....''

اس کے لبوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے میری بات پر مشتعل ہونے کے بجائے مزہ لیا۔ تالی بجا کر کہا، ''یہ تو بچکانہ ترکیب ہے جو تم آخری داؤ کے طور پر آزما رہے ہو۔ خیر..... سوہنا بلوچ بڑا اڑیل گھوڑا تھا۔ اپنی ضد میں اپنا خاندان گل کروا بیٹھا۔ آج اس کی نشانی بھی صفحہ ہستی سے مٹنے والی ہے۔ تمہیں استاد بلو نے آج کا شیڈول تو سمجھا دیا ہو گا۔ ہے

ناں؟.....ابھی ہم موج مستی کریں گے۔ پئیں پلائیں گے۔ تمہاری لونڈی سے اٹکھیلیاں کریں گے۔ دیکھیں گے اس نے جوانی کو کیسے سنبھال رکھا ہے۔''

میں نے اتنی سختی سے اپنے ہونٹ بھینچے کہ میرے دانت ہونٹ میں گڑ گئے۔ ضبط آخری مراحل میں تھا۔ میں نے کہا، ''حیدر خان! تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ اس خباثت سے باز آ جاؤ۔ مجھے اور میری منگیتر کو یہاں سے جانے دو۔ ورنہ تمہارے خاندان کو اس ظلم کی قیمت چکانا پڑے گی۔ میری میڈم کو علم ہو گیا ہے کہ مجھے تم تینوں نے اغوا کیا ہے۔ جلد یا بدیر وہ تمہاری گردن ماپنے پہنچ جائے گی۔''

اس پر میری دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میاں دلبر حسین بھی توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے فلک شگاف نعرہ لگایا۔ بلند آواز میں بولا، ''یارن خان! ایک پیگ ادھر بھیجو.....مزہ آ گیا کل کے پدے کی لاف زنی سن کر۔ حیدر خان کے دانے مک گئے ہیں۔ بوڑھا ہو گیا ہے تبھی تو ٹخنے برابر کتے کے پلے کی دھمکیاں سن رہا ہے۔''

حیدر خان میاں دلبر کے ریمارکس پر تڑپ اُٹھا۔ تاؤ کھا کر پلٹا۔ کرمے سے مخاطب ہوا، ''اوئے کھوتے دی نسل! سندا کائنی پیا.....اِہ ٹیری دا بچہ میکوں دھمکیاں ڈیندا کھڑا ئے.....''

(گدھے کی اولاد! سن نہیں رہے ہو کہ یہ چڑیا کا بچہ مجھے دھمکیاں دے رہا ہے۔)

وہ برق رفتاری سے میری طرف آیا۔ ایسے میں استاد ببلو نے اسے آواز دے کر روک لیا، ''اوئے کرمے! رُک جا۔''

کرما چابی کے کھلونے کی طرح رک گیا تو ببلو نے سردار حیدر خان کے قریب آ کر کہا، ''خان جی! آپ کو یاد نہیں رہا۔ میں نے بتایا تھا کہ اس کا دھڑ، سر کی چوٹ کی وجہ سے مفلوج ہو گیا ہے۔ اس کی چمڑی ادھیڑ دی جائے، جوڑ جوڑ کھول دیا جائے یا اس کے ساتھ کوئی بھی سلوک کیا جائے؛ اسے کانٹا چبھنے کے برابر تکلیف بھی نہیں ہو گی۔ اسے ہم صرف وہی تکلیف دے سکتے ہیں جو آپ نے سوچ رکھی ہے۔''

حیدر خان نے غصہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور چارپائی پر بیٹھ گیا، ''اوہ.....ول چس تاں کھڑ تج گئی اے ناں.....خیر! تم اس کی حور بانو کو میدان میں لے آؤ۔ کھانے میں کتنی دیر ہے؟''

''کھانا تیار ہے خان جی۔ لگواؤں؟'' کرمے نے ہاتھ سینے پر رکھ کر تابعدارانہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے..... لے آؤ..... اُس ناری کو بھی لے آؤ..... شراب، شباب اور کباب..... دیکھ شہرے میرے نصیب.....''

استاد ببلو نے برآمدے میں اسٹیچو کی طرح کھڑے پہرے داروں کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ان میں سے دو کمرے کی طرف بھاگے۔ چند لمحوں بعد غزالہ کو دونوں کلائیوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دری پر لے آئے۔ اس گھڑی میرا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ آسمان ٹوٹ پڑے یا کم سے کم آسمانی بجلی مجھ پر آن گرے۔ ماں باپ کے قتل، پینو کے اغوا، چاچا اور چاچی کے بے بسی سے کمرے میں جلتے ہوئے لاشے..... میں نے زندگی میں کیا کچھ نہیں دیکھا تھا مگر یہ سانحہ ان سے کہیں زیادہ جانکاہ تھا۔ میری غیرت کا جنازہ میرے سامنے تھا جسے کسی بھی لمحے کندھا دیا جانے والا تھا۔ میری عزت اس حال میں میرے سامنے تھی کہ اس کا آدھا تن ننگا تھا جبکہ آدھے تن پر صرف دو جالیاں لپٹی ہوئی تھیں جن میں سے وہ مزید آدھی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ استاد ببلو اور اس کے کارندوں نے بے حیائی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ چند لمحے گٹھڑی سی بنی دری پر پڑی رہی۔ حیدر خان نے ایک تنومند سیاہ فام پہرے دار کو بلایا،

''دادو! اِڈے مر..... ایں شودھی کو کھڑا تا کر چا۔''

(دادو! ادھر آؤ، اس بے چاری کو کھڑا کر دو۔)

دادو کم و بیش سات فٹ قامت کا پہلوانوں کا سا ٹھوس جسم رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے گھٹنوں تک آتا ہوا جانگیہ زیب تن کیا ہوا تھا۔ بالائی بدن ننگا تھا جس پر اس نے تیل مل رکھا تھا۔ مینٹل لیمپوں کی روشنی میں اس کا سیاہ کسرتی بدن چمک رہا تھا۔ وہ سرعت سے دری پر آیا اور اس نے گردن سے پکڑ کر غزالہ کو کھڑا کر دیا۔ وہ حلق کے بل چیخی۔ اس نے حیدر خان اور یارن خان کو ایک ہی سانس میں ان گنت گالیاں دیں۔ جونہی دادو نے اس کی گردن چھوڑی، وہ تڑپ کر پلٹی اور بھاگتی ہوئی مجھ سے چمٹ گئی۔ اس کے بدن کا لمس مجھے محسوس نہیں ہوا مگر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ یوں لگا جیسے میں اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں۔ وہ مجھ سے لپٹی لپٹی اونچی آواز میں رونے لگی۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ میرے حلق سے پھٹی پھٹی سی آواز نکلی، ''شالا تیکوں موت آوے نجے میری جان!''

(خدا کرے کہ تمہیں موت آ جائے۔)

حیدر خان کی سلگتی ہوئی آواز سنائی دی، ''دیکھ دلبر حسین! تم نے ایسا منظر زندگی میں نہیں

دیکھا ہوگا۔ مرنے سے پہلے پریمی جوڑا بغل گیر ہو رہا ہے اور ایک دوسرے کو موت کی بد دعائیں دے رہا ہے۔ اوئے دادو! انہیں کچھ کھلا پلا۔ چل ذرا موج مستی کرا۔''

دادو میری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ خان کا حکم سن کر منٹ بھر بعد میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا چکن پیس اور شراب کی بوتل دبی ہوئی تھی۔ اس نے جنگلی انداز میں غزالہ کو بالوں سے پکڑ کر مجھ سے علیحدہ کیا اور اس کے ہاتھ میں بوتل اور پیس تھما کر بولا، ''آپ وی کھاتے اپنے یار کوں وی کھوا چا۔''

(خود بھی کھاؤ اور اپنے یار کو بھی کھلا دو۔)

غزالہ اس پر بھوکی بلی کی طرح جھپٹی۔ اس نے ہاتھ مار کر بوتل نیچے گرا دی اور ناخنوں سے سیاہ فام کا چہرہ بری طرح نوچ ڈالا۔ وہ سسکاری لے کر پیچھے ہٹا۔ اس دوران غزالہ نے دری پر لڑھکنے والی بوتل اٹھا لی۔ جب تک دادو اس کا ارادہ بھانپتا، اس نے پوری قوت سے بوتل اس کے سر میں دے ماری۔ سر کھل گیا۔ بھل بھل کرتا خون تالو سے نکل کر چمکتے ہوئے چہرے پر پھیلنے لگا۔ اسی اثنا میں حیدر خان اور میاں دلبر حسین نے زور سے تالی بجائی اور 'واہ واہ' کے ستائشی نعرے لگائے۔

غزالہ اچھل کر دادو سے کچھ دور ہوئی۔ وہ حیدر خان کی طرف جانا چاہتی تھی مگر دادو نے اس کے بال پکڑ لیے۔ اس کے بدن کو خطرناک جھٹکا لگا۔ کمر کے بل دری پر گری مگر اس نے اٹھنے اور پوری قوت سے بوتل حیدر خان کو مارنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی۔ اس کا نشانہ بڑا صادق رہا۔ بوتل ہوا میں اُڑتی ہوئی چشم زدن میں حیدر خان کی ناک پر اتنی قوت سے لگی کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور اس کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔ جونہی اس نے سر اُٹھایا، اس کی پچکی ہوئی ناک سے خون کا فوارہ اُبل پڑا۔

استاد بلو سمیت تین چار کارندے حیدر خان کی طرف دوڑے جبکہ دادو نے غزالہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بری طرح قابو میں آئی تھی۔ دادو کی آہنی گرفت سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی بانہیں بھی آزاد نہیں تھیں۔ اس نے چیختے ہوئے دادو کی ابھری ہوئی چھاتی پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو اس نے منہ کھول کر دوسری جگہ کاٹ لیا۔ وہ ناخنوں سے اس کا نچلا دھڑ اور دانتوں سے چھاتی چیرتی پھاڑتی رہی مگر اس دیو قامت پہاڑ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑے احمقانہ انداز میں منہ اوپر اُٹھائے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے سر

سے نکلتا ہوا بھل بھل کرتا خون غزالہ کے کندھوں کو سرخ کرتا جاتا تھا۔ میں نے فرطِ اشتعال سے چیخنے کی کوشش کی مگر میری آواز میرے حلق میں ہی دم توڑ گئی۔

بوتل کی ناگہانی چوٹ نے حیدر خان کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ استاد ببلو اور کرما اسے بازوؤں سے تھام کر اندر لے گئے۔ میاں دلبر حسین اور یارن خان نے اس واقعے کا نوٹس سنجیدگی سے نہیں لیا تھا بلکہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے۔ یارن خان نے کمانڈ سنبھالی اور حکم دے کر کھانا منگوالیا۔ ایک ملازم نے اس کے سامنے بڑی سی ٹرے لا رکھی جس میں بھنا ہوا سالم مرغ رکھا تھا۔ ایسی ہی ایک ٹرے میاں دلبر حسین کے سامنے بھی رکھ دی گئی۔ دونوں نے تھوڑا کھایا، تھوڑا پینے پلانے کا شغل کیا پھر یارن خان نے ایک کھلی ہوئی بوتل کھانا سرو کرنے والے کی طرف اچھال دی، ''چاندرانی کو بھی پلاؤ۔ ہمارے ہوتے ہوئے وہ اس نعمت سے محروم کیوں رہے؟''

میں زور سے چلایا، ''کتے کے بچے.....''

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میری آواز پھٹ گئی۔ دل بھی گویا پھٹنے کو آ گیا۔ ملازم نے چھلکتی ہوئی بوتل ہوا میں کیچ کی اور غزالہ کی طرف بڑھا۔ غزالہ نے ادھر ادھر گردن گھمائی مگر بے سود..... ملازم نے بوتل اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ غزالہ نے زور کی پھونک ماری۔ منہ میں گرنے والی شراب باہر بہہ گئی۔ دادو نے ڈانٹا، ''اوئے حرام زادے! اس کی ناک بند کرو۔''

ملازم نے پھر بوتل منہ میں ٹھونسی اور ساتھ میں چٹکی سے اس کی ناک بند کر دی۔ غزالہ دو سورماؤں کے بیچ ہاتھ مار رہی تھی مگر اس کی تمام تر مزاحمت اکارت گئی۔ آدھی بوتل اس کے حلق میں اُتر گئی۔ جونہی بوتل اس کے منہ سے نکالی گئی، اس نے زور کی قے کی۔ اس کا پیٹ اور دادو کے ہاتھ غلاظت سے لتھڑ گئے۔ اس نے پھر قے کی۔ وہ ہانپتی جاتی تھی اور معدہ الٹتی جاتی تھی۔ دادو نے کہا، ''دوسری بوتل لے آؤ۔ یہ ایسے نہیں مانے گی۔''

وہ سردار حیدر خان کی میز سے نئی بوتل اُٹھا لایا۔ کھولی۔ اپنا عمل دہرایا۔ اس مرتبہ کوشش کے باوجود غزالہ قے نہ کر سکی۔ مچھلی کی طرح تڑپتی رہی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس پر وحشت سوار تھی جس میں تھکن اور نقاہت کی وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمی پیدا ہو رہی تھی۔

یارن خان کے حکم پر ملازم اس کے منہ میں بھنا ہوا گوشت اور شراب ٹھونس رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر رک گئے۔ بدن کا ماس بھی شاید پتھر ہونے لگا تھا۔

ایسے میں حیدر خان استاد بلو کی معیت میں کمرے سے ڈریسنگ کروا کر نکلا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ استاد کا سہارا لے کر بیٹھا اور جھومتا رہا۔ استاد بلو نے اسے شراب پلائی، ایک چکن پیس کھلایا۔ کچھ سنبھلا مگر پوری طرح نہیں۔ اس کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی تھی جس نے مونچھوں سمیت اس کا آدھا چہرہ چھپا لیا تھا۔

میاں دلبر نے پوچھا، ''ہڈی بچ گئی؟''

حیدر خان نے نفی میں سر ہلایا۔

بلو نے کہا، ''نہیں صاحب! ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر انہیں ہسپتال لے جانا پڑے گا یا ڈاکٹر کو اٹھالانا پڑے گا۔''

حیدر خان نے ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ ہولے سے کچھ کہا۔ بلو نے سنا۔ اس نے بلند آواز میں دادو سے کہا، ''ہاں بھئی شیر جوان! اپنا کام دکھاؤ.....''

دادو شاید اسی حکم کا منتظر تھا۔ اس نے آنِ واحد میں اپنی بانہیں کھول دیں۔ غزالہ اس سے رگڑ کھاتی ہوئی نیچے گر گئی۔ دادو اس پر جھکا اور اس کے سینے پر بندھا ہوا جالی نما کپڑا کھول دیا۔ میں نے پوری سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن آنکھوں کے راستے گزر کر آنے والے دہکتے انگاروں کو دماغ تک پہنچنے سے نہ روک سکا۔ چند لمحوں میں کیا ہوا، میں نے نہیں دیکھا مگر میری روح پر کاری زخموں کی طرح ثبت ہو گیا۔ دادو کی آواز سنی، ''خان جی! ہرنی شکار کیلئے تیار ہے.....آجائیں!''

''یارن خان! ادھر آؤ.....شہر میں برائیلر ملتا ہے۔ وہی کھاتے آئے ہو آج تک۔ آج دیسی مرغی کا ذائقہ چکھو۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔'' حیدر خان کی مکروہ آواز میرے کانوں میں پڑی۔ جی چاہا کہ یہی لمحہ میری زندگی کا آخری ثابت ہو مگر نجانے قدرت مجھے کیا دکھانا چاہتی تھی، مجھ سے کیا سلوک کروانا چاہتی تھی کہ میں نہ تو مر رہا تھا اور نہ ہی بے ہوش ہو رہا تھا۔ شاید اس لمحے میری یہی دونوں خواہشیں زندگی کا حاصل تھیں جو تشنہ رہیں۔

اچانک میرے چہرے پر زور کا تھپڑ پڑا۔ تھپڑ سے کہیں زیادہ تکلیف میرے سر کو لگنے والے جھٹکے سے ہوئی۔ میں نے بے ساختہ آنکھیں کھولیں۔ کرما سامنے کھڑا تھا۔ غرا کر بولا، ''آنکھیں بند کرو گے تو یہی سلوک کروں گا۔ اس سے بھی برا کروں گا۔ آنکھیں کھول کر اپنی غیرت کی بربادی کا تماشا دیکھو۔''

میرے سامنے یارن خان کھڑا تھا۔ اس نے غزالہ کی کمر میں بازو حمائل کر رکھا تھا جبکہ غزالہ کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ بے تاثر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مر چکی تھی۔ محض سانس کی ڈور کا اس سے رشتہ ٹوٹنا باقی تھا۔ میں اس کی عریانی دیکھ نہیں سکا تو میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کرمے نے میرے زخم پر چیت رسید کر دی۔ یہ تکلیف تھپڑ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تکلیف سے کہیں زیادہ اور ڈراؤنی تھی۔ میرے حلق سے تیز چیخ نکل گئی جسے میں نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کرمے نے کھلوا دیں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا۔ شاید میں چاہتا تھا کہ تکلیف کے سبب بے ہوش ہو جاؤں مگر قسمت میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جب چوتھی مرتبہ اس نے چیت ماری، میں نے یارن خان کو خالص حیوانی انداز میں دیکھا۔

ایسے ہی لمحے جب میرے دل کی گہرائیوں سے موت کی دعا برآمد ہوئی، فضا فائر کی خوفناک آواز سے تھرا اُٹھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے حلق سے تیز چیخ نکل گئی کیونکہ میں نے غزالہ کے سینے سے خون کا فوارہ اُبلتے دیکھ لیا تھا۔ گھٹنوں کے بل کھڑی تھی۔ منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر لہرا کر اوندھے منہ زمین پر گر گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایک کے بعد دوسرا، تیسرا پھر ان گنت فائر ہوئے۔ ایس ایم جی کے برسٹ کی 'ٹریٹ ریٹ' نے فضا کو تھرا دیا مگر میں گویا اس ماحول سے یکسر بے نیاز ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں کھلی رہیں مگر سوائے غزالہ کے سینے سے نکلنے والے سرخ چشمے کے کوئی شئے دکھائی نہیں دی۔ گویا وہی ایک منظر آخری ثابت ہوا جو میری نظروں میں ثبت ہو گیا تھا۔

چند لمحے..... یا فقط چند منٹ..... پھر یہ منظر بھی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مجھ سے اپنا سر سہارنا مشکل ہو گیا۔ شاید میری دعا قبول ہو گئی تھی۔ میں بے ہوش ہو رہا تھا..... یا مر رہا تھا..... علم نہیں مگر میرے ذہن میں چلنے والے تیز جھکڑ اچانک رک گئے۔

❖❖○❖❖

انسان سو جائے، بے ہوش ہو جائے یا مر جائے..... وقت کا گھوڑا اسی چال چلتا رہتا ہے۔ ایک لمحے میں سونے والا انسان دوسرے لمحے میں بیدار ہو جاتا ہے مگر طے نہیں کر پاتا کہ وہ کتنی دیر سویا رہا۔ جب مجھے ایک تیز چمکدار عمودی لکیر آسمان سے اُتر کر زمین کی طرف آتی دکھائی دی، تب میں بھی اپنے آپ پر بیتے ہوئے زمانے کو حدود و قیود میں لانے کا میاب نہیں ہوا تھا۔

جونہی وہ چمکدار مہین لکیر زمین پر اُتری، ایک ننھا سا دھماکہ ہوا۔ میں یہ بھی طے نہیں کر پایا تھا کہ یہ دھماکہ کہاں ہوا تھا۔ میرے سامنے یا میرے سر میں۔ اس کی خوفناک آواز سے میرے سر میں درد کی ٹیس ابھری۔ میں نے اسی لمحے آنکھیں کھول دی تھیں..... یا شاید اس وقت جب مجھے دھیمی رفتار سے گھومتا ہوا سیلنگ فین دکھائی دیا تھا۔ میں کافی دیر تک اس کے پروں کو دیکھتا رہا۔ خالی الذہنی کی یہ کیفیت کافی دیر تک مجھ پر طاری رہی پھر سماعت بھی ایک دم بیدار ہو گئی۔ میرے کانوں میں کئی آوازیں پڑنے لگیں جن کا کوئی عنوان نہیں تھا۔

مجھ پر اذیت طاری ہو گئی۔ اُٹھنا چاہا تو ناکام رہا۔ بولنا چاہا تو زبان تالو سے چپک گئی۔ ہاتھ ہلانا چاہا تو غیر معمولی نقاہت نے مجھ اپنی تحویل میں لے لیا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ آہستہ آہستہ میرے کانوں میں پڑنے والی آوازیں واضح ہونے لگیں۔ ایک آواز نے مجھے پھر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ کوئی میرا نام لے کر مجھے پکار رہا تھا۔ آنکھیں کھولنے کا حکم دے رہا تھا۔ بولنے والے ہلتے ہوئے لب میرے سامنے تھے۔ چند لمحے گومگو کی کیفیت چھائی رہی۔ پھر دھند چھٹ گئی۔ مجھ پر جھکا ہوا چہرہ چندو ماہی کا تھا۔ میری میڈم شکیلہ کا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی، ''شہریار! مجھے پہچانو..... میں کون ہوں؟''

''تم..... تم..... نو..... آپ مم..... میڈم.....!'' میں نے بہت زور سے کہا تھا مگر شاید یہ میری غلط فہمی تھی۔ میری آواز خاصی کمزور تھی۔ اسے سننے میں تھوڑی دقت ہوئی۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ چیختی ہوئی آواز میں بولی، ''تھینکس گاڈ! ڈاکٹر..... اس نے مجھے پہچان لیا ہے.....''

ایک مرد مجھ پر جھک آیا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتایا۔ اس نے مجھ سے متعلقہ کئی سوالات کیے جن کے جوابات نے اسے اور میڈم کو خوش کر دیا۔ دوسری آوازیں بھی میری سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ فرزانہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے مجھ پر جھک گئی۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر میرے ہونٹوں میں درد اُٹھا۔ ہونٹوں نے شاید تھوڑی بہت حرکت بھی کی تھی۔ وہ مطمئن ہو گئی تو شانو آن جھکی۔ اس نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا۔ روتے ہوئے مجھے چومنے لگی۔ موجو نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ جب تینوں کو تسلی ہو گئی تو انہیں ڈاکٹر نے کمرے سے باہر نکال دیا۔ پھر اس نے مجھے اپنا ہاتھ ہلانے کا حکم دیا۔ میں نے ہاتھ ہلایا۔ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر

پیروں اور جسم کو حرکت دینے کا حکم دیا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنے جسم میں کامیاب حرکت پیدا کر لی تھی مگر ڈاکٹر کا مایوس چہرہ دیکھ کر میرا دل بھی بجھ سا گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے شاید کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی یا ابھی نقاہت کا اثر باقی تھا، چند لمحوں میں ہی اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی پوری کوشش کرتے کرتے سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو رات کا کوئی پہر چل رہا تھا۔ کمرے میں سرخ بلب روشن تھا۔ پنکھا بند تھا۔ چہار سو سکوت طاری تھا۔ میں نے سر کو جنبش دیے بغیر ممکنہ حد تک کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کسی جدید طرز کے ہسپتال کا وی آئی پی روم تھا جس میں بھینی بھینی خوشبو اپنے جلو میں ائر کنڈیشنر کی ٹھنڈک لیے زندگی کا احساس بخش رہی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ پر ڈرپ اسٹینڈ میں ڈرپ چل رہی تھی جو قطرہ قطرہ میری رگوں میں اتر رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ گزشتہ واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی جس میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ غزالہ سے ملنے کا ارادہ لیے ملتان سے نکلتی گھڑی سے لے کر اس کے سینے میں ہونے والے موت گیں سوراخ کے منظر تک سارے واقعات میری آنکھوں میں گھوم گئے۔ دل میں عجیب طرح کا حبس بھر گیا۔ جی چاہا کہ میں زور زور سے روؤں۔ میں نے جی کی بات مان لی۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ لبوں سے سسکیاں نکلیں پھر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کافی دیر تک روتا رہا۔ حلق خشک ہو گیا۔ زوروں کی پیاس لگی۔ کسی کے ادھر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ہاں..... میں زندگی کی دعائیں مانگتا رہا تھا..... پھر غیبی مدد کیلئے خدا کو پکارتا رہا اور بعد میں موت کا طلبگار رہا۔ مجھے سب کچھ مل گیا مگر ترتیب گڑبڑا گئی۔ میں نے وہ موت تو اپنے لیے خدا سے مانگی تھی جس نے غزالہ کو چاٹ لیا تھا۔ غیبی مدد اس کی زندگی اور سلامتی کیلئے مانگی تھی۔ ہاں! قدرت اپنے فیصلوں پر عمل کرتی ہے۔ خوب رونے سے دل ہلکا ہو گیا۔ دکھ کا تسلط کچھ کمزور ہو گیا۔ میں غیبی مدد کی صورت میں عین موقع پر پہنچنے والی میڈم شکیلہ اور اس تمام تر فلمی سچوئیشن کے بارے میں سوچنے لگا جس نے میری زندگی تاریک کر دی تھی۔ غزالہ کو کس نے گولی ماری تھی؟ کیا ان کمینوں کے کسی ہرکارے نے یا سردار حیدر خان نے؟..... میں نے اپنی یادداشت پر زور دیا۔ وہاں موجود کسی شخص نے فائر کرنے کی پوزیشن نہیں لے رکھی تھی۔ تو کیا اسے میڈم یا میرے گروپ کے کسی شخص کی گولی لگی تھی؟..... اس صورت میں یہی امکان قوی تھا کہ نشانہ

لینے والے نے سیاہ فام دادو کا نشانہ لیا ہوگا یا یارن خان کا، جو خطا ہوا اور اُن میں سے کسی کو لگنے کے بجائے گولی غزالہ کی چھاتی میں پیوست ہوگئی۔ بھلے غزالہ مرگئی تھی؛ میڈم نے اسے درندگی کا شکار ہونے سے تو بچا لیا تھا۔ اگر اس کے ساتھ وہ کچھ ہو جاتا جو استاد بلو نے مجھے معنی خیز انداز میں بتایا تھا تو شاید میں زندہ رہنے کے باوجود زندہ نہ رہ پاتا۔ اب بھی اس کے ساتھ کچھ کم نہیں ہوا تھا۔ کیا اتنا بڑا بوجھ اُٹھا کر جیا جا سکتا تھا؟..... میرا دماغ سلگتی ہوئی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

میں دوسری مرتبہ ہوش میں آیا تھا۔ پہلی مرتبہ کی سدھ مندی خواب کی صورت میں ذہن میں جاگزیں تھی۔ نجانے میں کس ہسپتال کے کمرے میں کتنی دیر سے چت لیٹا ہوا تھا۔ ایسے ہی وقت میں جب میں باآوازِ بلند کسی کو پکارنے کا ارادہ کر رہا تھا، ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ ایک نرس دروازے میں دکھائی دی۔ وہ سست روی سے چلتی ہوئی ڈرپ اسٹینڈ کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ مجھے جاگتا ہوا پا کر بولی، ''آپ کب جاگے؟ گھنٹہ بھر پہلے تو میں نے اس کمرے کا راؤنڈ کیا تھا۔ تب آپ سو رہے تھے۔''

میں نے جواب دیا، ''ابھی جاگا ہوں۔ کیا وقت ہوا ہے؟''

''ساڑھے تین بجے ہیں۔'' اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈال کر کہا، ''کہیں درد تو نہیں ہو رہا؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا اور پوچھا، ''رات کے؟''

''یس سر!'' اس نے میری پیشنٹ کیبنٹ سے میری فائل اُٹھائی۔ چند لمحے ورق گردانی کرتی رہی۔ پھر بولی، ''آپ کو صبح سات بجے دوا دی جانی ہے۔ بھوک یا پیاس تو نہیں لگی؟''

میں نے کہا، ''جی.....''

اس نے کیبنٹ میں ہاتھ مارا۔ جوس کا ایک ڈبہ اُٹھایا۔ اس میں اسٹرا ڈال کر میرے لبوں سے لگا دیا۔ میں نے چند گھونٹ بھرے۔ ہلکی سی کھانسی آئی۔ سر کے عقبی حصے میں درد کی لہر پیدا ہوئی جو دو تین سیکنڈ بعد آپوں آپ ختم ہوگئی۔ وہ جلدی سے میرے بیڈ کی پائنتی کی طرف گئی۔ لیور گھماتے ہوئے میرا سر اونچا کرنے کے بعد بولی، ''کوئی تکلیف؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے باقی ماندہ جوس مجھے پلایا۔ جاتے ہوئے مستفسر ہوئی، ''میرا نام زاہدہ ہے۔ میں نائٹ ڈیوٹی پر ہوں۔ ہر رات کو آپ سے ملاقات ہوا کرے گی۔

کوشش کروں گی کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔''

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''کوئی اور ضرورت؟''

میں نے جواب دیے بغیر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ بولی، ''او کے! میں میڈم کو آپ کے ہوش میں آنے کی اطلاع کر دیتی ہوں۔ وہ شاید جاگ ہی رہی ہوں گی۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''یہ کونسا ہاسپٹل ہے سسٹر؟''

''آپ یہ سوال میڈم صاحبہ سے کیجئے گا۔''

''اور میری حالت کیسی ہے؟ کیا میں اپنے پیروں پر کبھی چل سکوں گا؟'' میرے دل میں کسک کی طرح جاگزیں ہونے والی آس نے میری زبان کو آلۂ کار بنالیا۔

''میں نہیں جانتی سر!'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولی، ''علی الصبح ڈاکٹر صاحب ہی آپ کو بتا سکیں گے۔''

''کون ڈاکٹر صاحب؟''

''ڈاکٹر ظہور اختر صاحب۔'' اس نے بتایا، ''گڈ لک؛ ٹیک کیئر!''

مجھے کوئی دلاسا دیے بغیر دبلی پتلی نرس، زاہدہ، اپنے عقب میں دروازہ بند کر گئی۔

کمرہ خالی ہو گیا۔ باہر کا ماحول گنگ ہوا تو اندر کی دنیا آباد ہو گئی۔ غزالہ کا آخری سراپا آنکھوں میں پرّا جما کر بیٹھ گیا۔ دل میں دکھ کا دبیز دھواں بھر گیا۔ وہ میری محبت تھی۔ اس محبت کا آغاز اس لمحے میں ہوا تھا جب مجھے لفظ 'محبت' لکھنا نہیں آتا تھا۔ اس کے مفہوم کا علم نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ بھی نہیں آیا کرتی تھی کہ اسے دیکھنے کی طلب میں اس قدر بے تاب کیوں ہو جاتا ہوں یا اسے دیکھ لینے سے مجھے کیا حاصل ہو جاتا تھا۔

میڈم شکیلہ کا آتشیں حسن بھی اس کے عشق کی برف کو پگھلا نہیں پایا تھا۔ چندو ماہی کے پر کیف لمس کی جان افزا حدت بھی میرے ذہن کے دریں خانوں سے غزالہ کے نقوش محو نہیں کر پائی تھی مگر تقدیر کے ایک ہی وار نے اسے مجھ سے لامحدود فاصلے پر جا پھینکا تھا۔ اس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا جس کی پاداش میں اسے ناقابلِ برداشت مراحل سے گزر کر موت کو گلے لگانا پڑتا۔ اس کے بدن کی تمام تر پاکیزگی کو شراب کی غلاظت سے داغدار کیا گیا تھا مگر ایک اندھی گولی نے اس کی روح کے تقدس کو پامال ہونے سے بچا لیا تھا۔ بجا کہ وہ درندگی سے بچ گئی تھی

مگر میری دنیا سے بڑے بھیانک انداز میں نکال بھی دی گئی تھی۔

مجھے اپنے طور پر یقین تھا کہ یارن خان، حیدر خان اور میاں دلبر حسین میرے گروہ کی گولیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ اس یقین کی بنیاد میری یہاں زندہ موجودگی تھی۔ حویلی کے سب مسلح لوگوں کی موت کے بعد ہی مجھے اس کھردری لکڑی سے اُتار کر یہاں لایا جا سکتا تھا۔ وہاں کیا ہوا؟ میڈم کو کس طرح میری وہاں موجودگی کی اطلاع ہوئی؟ اتنے بڑے معرکے کی تفصیلات کیا ہیں اور میرے بے سدھ ہونے کے بعد کیا وقوع پذیر ہوا؟ ان سب سوالوں کے جواب مجھے میڈم سے ہی مل سکتے تھے۔ اس لیے مجھے پوری شدت سے اس کی آمد کا انتظار تھا۔ نرس نے اسے میری بیداری کی اطلاع دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر لگتا تھا کہ وہ اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکی۔ رات گزر گئی تھی۔ میرے اطراف میں چہل پہل کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق نو دس بجے کا وقت تھا جب نفیس حلیے والا ڈاکٹر ظہور اختر پانچ سات آدمیوں کے جلوس کی شکل میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے میرے قریب آن کھڑا ہوا، ''ہیلو ینگ مین! اینی پرابلم؟''

میں نے جواب میں مسکرانے کی کوشش کی، ''نو سر! کیا میرا آپریشن ہوا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا، ''یس! مگر مائنر سرجری ہوئی ہے۔ کسی نوکدار چیز کی چوٹ نے ہڈی توڑ دی تھی۔ تھوڑا سا خون جم گیا تھا۔ بہر حال! میں بہت خوش ہوں کہ تم اس وقت بہت اچھی حالت میں ہو۔''

''میں کتنی دیر سے یہاں ہوں؟''

''آج تیسرا دن ہے۔ ایک دن تمہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ کیا تم نے اپنے ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کی؟''

''نہیں سر.....'' میں نے کہا، ''کوشش کروں؟''

''یس.....یس.....'' اس کے لبوں سے نکلا۔ میں اپنے اعصاب میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا جبکہ اس نے میری پیشنٹ فائل اُٹھالی۔ اپنے اسسٹنٹ سے مخاطب ہوا، ''ایم آر آئی اور سی ٹی اسکین رپورٹ لاؤ۔''

اسسٹنٹ 'یس سر' کہہ کر روم سے نکل گیا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر ایک آدمی پورٹیبل ایکس رے پلانٹ دھکیلتا ہوا میرے بیڈ کے پاس آیا۔ پیشہ ورانہ انداز میں پلانٹ کو میرے سر کے

قریب ترین پوائنٹ پر نصب کر کے ایکسرے لینے لگا۔ اس کی معاونت ایک فربہ اندام نرس کر رہی تھی جو میرے سر کو مختلف زاویوں پر حرکت دے رہی تھی۔

میرا طبی معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا، ''شہریار! کیا تم نے اپنے جسم میں حرکت محسوس کی؟''

میں نے قدرے مایوسی سے کہا، ''نہیں سر! لیکن میں نے جب اپنی داہنی ٹانگ کو حرکت دینا چاہی تو مجھے عجیب طرح کی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ یوں کہ دل بیٹھ رہا ہو یا قے آنے والی ہو۔''

وہ مسکرایا، ''یہ اچھی علامت ہے۔ شاید تمہارے نوٹس میں نہیں ہے کہ تمہاری داہنی ٹانگ کا تین جگہوں سے آپریشن ہوا ہے۔ تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک گولی نے ران کی ہڈی کو چھوا جبکہ دو ماس میں پھنس گئیں۔''

''اوہ.....'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تمہارے بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُسے ڈاکٹر فریاد نے دیکھا تھا۔ اس نے ہڈی اپنی جگہ پر بٹھا کر ڈریسنگ کر دی ہے۔ اسے توقع ہے کہ آپریشن کے بغیر کام چل جائے گا۔''

میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا، ''اللہ کرے!''

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں مستفسر ہوا، ''کیا میں کبھی اپنے پیروں پر چل سکوں گا؟''

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی خاموشی کا لمحہ لمحہ میرے دماغ پر گرزوں کی صورت لگ رہا تھا۔ توقف کے بعد بولا، ''مسٹر شہریار! مجھے یقین ہے کہ تم دو چار ماہ میں مکمل طور پر فٹ ہو جاؤ گے۔ آپریشن میں کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں تمہارے جسم کو بہتر گھنٹوں میں سگنل دینا شروع کر دینے چاہئیں تھے مگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ اب تمہاری قوت ارادی اور قوتِ مزاحمت پر موقوف ہے۔ تم چاہو تو جلد ری کور ہو سکتے ہو۔ اگر تم ہمت کا مظاہرہ نہیں کرو گے تو بیڈ تمہاری جان نہیں چھوڑے گا۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا سر؟'' میں نے جلدی سے کہا، ''ڈاکٹر صاحب! میں جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔''

''یہ باتیں تمہیں ڈاکٹر امجد صاحب سمجھا دیں گے۔ تمہارے لیے ایک آدھ دن میں فزیو

تھراپسٹ کا انتظام کر دیا جائے گا۔ فی الحال تمہارے لیے یہی ایڈوائس ہے کہ تم اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ دو۔ ٹینشن نہ لو اور زیادہ سے زیادہ پرسکون رہنے کی کوشش کرو۔ از اِٹ او کے؟''

''یس سر! آئی وِل ٹرائی مائی بیسٹ تو سروائیو.....''

''اسے ناشتہ کروا کر معمول کی میڈیسن دے دیجئے۔'' ڈاکٹر نے میری فائل کیبنٹ پر رکھتے ہوئے میرا بلڈ پریشر نوٹ کرنے والی نرس سے کہا اور روم سے نکل گیا۔ ماسوائے نرس کے، سبھی لوگ اس کے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔ جونہی نرس مجھے جوس پلانے اور میڈیکیٹ کرنے سے فارغ ہوئی، میں نے استفسار کیا، ''میڈم شکیلہ کہاں ہیں؟''

اس نے تعجب سے کہا، ''میڈم شکیلہ؟ آئی ڈونٹ نو ہم سر!''

''او کے..... میرا کوئی اٹینڈنٹ ہسپتال میں موجود ہے؟''

''یس سر! کئی لوگ ویٹنگ روم میں بیٹھے ہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا، ''ڈاکٹر صاحب کے راؤنڈ کے بعد میں آپ کی فیملی کو کمرے میں بھیج دوں گی۔''

''اگر مجھے واش روم جانا ہوا تو.....؟'' میں نے کافی دیر سے ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشے کا اظہار کیا۔

''آپ کو فی الحال واش روم جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی کیونکہ آپ کو کیتھیٹر پاس کیا گیا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی، ''اب آپ ایزی فیل کریں۔ چاہیں تو سو جائیں۔ چاہیں تو جاگتے رہیں مگر ذہن پر قطعاً زور نہ دیں۔ او کے سر؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے جانے کے بعد میڈم کا انتظار کرنے لگا۔ وہ نہیں آئی مگر گھنٹہ بھر کے بعد میرے کمرے میں میلہ لگ گیا۔ میر وشاہ کے ساتھ گروپ کے چار آدمی عیادت کیلئے آئے جنہوں نے پھلوں کے بڑے بڑے شاپر اُٹھا رکھے تھے۔ انہوں نے مزاج پرسی کے بعد میرے لیے دعا کی اور دیوار کے ساتھ نصب شدہ بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے محبت اور ہمدردی کے دریا موجزن تھے۔

میر وشاہ پان چباتا ہوا میرے قریب آیا۔ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر آنکھیں ڈبڈبا کر پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا، ''لاڈے میاں! ماڑے کو یہ سوچ تو جندگی بھر نہ آوت کہ اپنے غنچے کو ایسن حال میں دیکھت..... ناں بابا..... ماڑے کو یہ نہ دیکھن مانگت ہے.....''

اس کی آواز گلوگیر تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ مجھے تعجب سا ہوا۔ اس دھندے میں جذبات کا کیا عمل

دخل تھا؟

میں نے کہا، ''شاہ جی! غم نہ کرو۔ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

وہ پلٹا۔ مجھ پر جھکا۔ پان کی سرخی سے لتھڑے ہونٹوں سے اس نے چٹاک چٹاک بوسوں کی بارش کر دی۔ پھر میرا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر بولا، ''غنچے! تیرے کو بھی غم نہ کرت..... تینوں مردود..... سالے..... کٹیش کٹیش..... کھتم شد۔ ماڑے لاڈوں نے جان پر کھیل کر استاد ببلو کی ایسی کی تیسی کر دیوت..... اِٹ سے اِٹ بجاویوت۔ سالا ملغانی بچ جاوت پَر کاہے کو..... میر وشاہ کی نجر سے جمین (زمین) کے سات پردوں کا راج (راز) کھل جاوت ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا، ''نہیں شاہ جی! وہ کتا بھی مر چکا ہے۔ میرے ہاتھوں سے۔'' میں نے جب اس کے استفسار پر ملغانی کے انجام کا ماجرا سنایا تو روتی آنکھوں ہنسنے لگا۔ چڑیا کی طرح پھدکنے لگا۔ 'چٹاک چٹاک' بوسوں کی بارش کرنے لگا، ''جیوے ماڑا شیر..... ببر شیر.....''

میرے دلچسپی لینے پر اس نے معرکے کی تفصیلات اپنے مخصوص انداز میں بیان کیں۔

وہ اپنے معمول کی سرگرمیوں میں مشغول تھا جب اسے فون پر میڈم نے فوری طور پر گروپ کو تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ پہلا مشن تھا جس میں گروپ کے سولہ افراد نے حصہ لیا تھا۔ سبھی لوگ جدید اسلحہ سے لیس تھے۔ پانچ افراد کے جتھے کی کمانڈ میڈم شکیلہ خود کر رہی تھی جبکہ میر وشاہ سمیت نو افراد کو پیا جی لیڈ کر رہا تھا۔ راستے میں میڈم نے میر وشاہ کو بتایا کہ وہ سب شہر یار کو حیدر خان کی حویلی والی حویلی سے نکالنے جا رہے ہیں۔ میر وشاہ کے استفسار پر میڈم نے اسے نہیں بتایا تھا کہ اسے میری اس حویلی میں مقید ہونے کی اطلاع کا ذریعہ کیا تھا۔ وہ تین گاڑیوں میں دریائی راستے سے حویلی تک پہنچے تھے۔ قریب پہنچ کر میڈم نے حکم دیا، ''پیا! یہ ذہن میں رکھو کہ یہاں بیس، تیس یا اس سے بھی زیادہ کی تعداد میں مسلح افراد ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ بالکل غافل نہیں ہوں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ شہر یار یہاں کس حال میں ہے مگر یہ طے ہے کہ اسے زندہ نکالنا ہے۔ باقی تمام افراد کو موت کی نیند سلانا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج یہ قضیہ ختم ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔''

پیا جی نے دریافت کیا، ''کیا یہاں حیدر خان کی موجودگی متوقع ہے؟''

میڈم مسکرائی اور ایس ایم گن میں بلٹ بیلٹ نصب کرتے ہوئے بولی، ''متوقع؟..... نہیں پیا! یہاں نہ صرف حیدر خان کی موجودگی یقینی ہے بلکہ میری اطلاعات کے مطابق سردار یارن

خان اور میاں دلبر حسین بھی حویلی میں موجود ہیں۔''

سخی محمد نے جلدی سے کہا، ''پیا جی! یہ تو کلائمکس اسٹوری کا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ ہے ناں؟''

پیا جی نے اسے خفگی بھری نظروں گھورا۔ ڈانٹا، ''میڈم کی موجودگی کا خیال کر لیا کرو ناں یار..... یہ موقع ایسی بکواس کا نہیں ہے۔''

میڈم نے کہا، ''نہیں پیا جی! سخی محمد کو ایزی فیل کر لینے دو۔ تم اپنے لیے کوئی بھی لائن آف ایکشن منتخب کرو؛ میں بس یہی چاہتی ہوں کہ اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔''

''ایک بات ماڑی بھی جہن (ذہن) میں رکھ لیوت کہ سالا کتا عاشق بھیڑ معشوق بھی جرور (ضرور) ایدھر اِی ہووت۔'' میر وشاہ نے ہاتھ نچایا۔

''کون؟'' میڈم پلٹی، ''میر وشاہ! سیدھی طرح بات کیا کرو نا!''

''اوہو! بس نام کی مہارانی ہووت ہونا۔ ماڑے کو سالے استاد بلو اور ملغانی خنجیر (خنزیر) کا خطرہ دیکھت ہے۔'' میر وشاہ نے ناک بھوں چڑھا کر کہا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

میڈم شکیلہ کی پیشانی پر چند سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد کندھے اچکا کر بولی، ''نو پرابلم! آج ان کی بھی آخری رات ہوگی۔''

میڈم نے حویلی کے مشرقی جبکہ پیا جی نے پچھواڑے یعنی مغربی طرف سے ہلہ بول دیا۔ پیا جی کی پیش بینی کامیاب رہی۔ اس نے براہِ راست حملہ کرنے کے بجائے درختوں پر چڑھ کر پہلے جائزہ لینے کو ترجیح دی تھی جس کی وجہ سے اسے پتہ چل گیا کہ تین آدمی حویلی کی چھت پر پہرہ دے رہے تھے۔ جس وقت میڈم نے ٹاہلی کے بلند درخت کی چوٹی پر بیٹھ کر یارن خان کا نشانہ لیا اور فائر کیا، عین اسی وقت پیا جی اور سخی محمد نے چھت پر ٹہلتے ہوئے تینوں سورماؤں کی چھاتیاں چھلنی کر دیں۔ اس کے بعد گھمسان کا رن پڑا۔ ہاتھ کو ہاتھ آرسی کرتا رہا اور سانسیں لیتے جسموں کو موت کا ایندھن بناتا رہا۔

زیادہ فاصلے کی بدولت یا عین لمحے ہاتھ ہل جانے کی وجہ سے میڈم کا نشانہ خطا ہو گیا اور گولی بجائے یارن خان کو لگنے کے، غزالہ کو جا لگی۔ میڈم کو علم نہیں تھا کہ وہ غزالہ تھی۔ اس نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ وہ کوئی کال گرل تھی جسے اس فلمی سچوئیشن میں جان ڈالنے کیلئے حیدر خان نے شہر سے منگوا رکھا تھا۔ میرے دل نے پورے وثوق سے گواہی دی، 'اگر میڈم کو غزالہ کا علم ہوتا تو وہ کوئی اور طریقہ کر لیتی، خطرے پر خطرہ مول لے لیتی مگر یارن خان پر یوں گولی چلانے

کارِ سک نہ لیتی۔'

یہ دوطرفہ فائرنگ کوئی آٹھ دس منٹ چلی پھر گنیں خاموش ہوگئیں۔ پیا جی نے چھت پر چڑھ کر جائزہ لیا اور 'او کے' کا سگنل نشر کر دیا۔ جونہی وہ اگلی منڈیر پر آیا، صحن میں پڑے ہوئے ایک زخمی نے اس پر گن کا دہانہ کھول دیا۔ شارٹ گن کے برسٹ نے پیا جی کے کسرتی بدن کو جالی بنا کر رکھ دیا۔ وہ چیخے بغیر چھت سے فرش پر آن گرا۔ میڈم شکیلہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے گولیوں کے دو بیلٹ صحن میں آڑے ترچھے پڑے ہوؤں پر خالی کر دیے۔ جب مشن پایہ تکمیل کو پہنچا، تب پتہ چلا کہ پیا جی کے علاوہ عمران عرف ماناجٹ اور ظفر اقبال یعنی میر وشاہ کا لاڈا 'جفری' جوابی فائرنگ کا شکار ہو گئے تھے۔ دونوں کی روحیں قصرِ عنصری کو الوداع کہہ چکی تھیں۔ حویلی میں موجود تمام شخص کام آ چکے تھے۔ کسی کو فرار ہونے کا موقع ملا تھا نہ چھپنے کا۔ میر و شاہ نے حویلی کا چپا چپا چھان مارا۔ وہ ملغانی کی لاش ڈھونڈ رہا تھا۔ نہ ملی تو ایک ذرا پریشان ہو گیا۔ وہ ابھی کچھ دیر اور وہاں رہ کر اسے تلاش کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ملغانی کہیں چھپا ہوا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے غافل پا کر نقصان پہنچا سکتا تھا۔ میڈم کے درشت حکم پر اسے طوعاً و کرہاً واپسی کا قصد کرنا پڑا۔ مجھے اور ان تینوں کی لاشیں گاڑیوں میں ڈال کر ملتان کی طرف ہنگامی کوچ کیا گیا۔

سخی محمد اسی گاڑی میں تھا، جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔ اس نے میڈم کو فون پر بتایا کہ میری حالت بہت خراب ہے۔ دماغ کی چوٹ لگی ہے۔ ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں اور بازو فریکچرڈ ہے۔ بعید نہیں کہ بے ہوشی کے عالم میں ہی دنیا سے 'اڑ نچھو' ہو جاؤں۔ میڈم نے اسے حکم دیا کہ وہ مجھے بجائے کوٹھی پر لے جانے کے 'میڈی کمپلیکس' میں لے جائے۔ سخی محمد مجھے ہسپتال لے آیا جہاں ڈاکٹر ظہور اختر نے میرا معائنہ کیا۔ چونکہ ہسپتال میں نیوروسرجن تعینات نہیں تھا، اس لیے ہنگامی بنیادوں پر ایک مشہور پرائیویٹ ہسپتال سے ڈاکٹر نعیم عاطف کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس نے صبح ساڑھے چار بجے میرا آپریشن کیا۔

پیا جی کی ہلاکت کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی حیثیت گروپ میں ریڑھ کی ہڈی کی سی تھی۔ وہ نہ صرف بہت دلیر، بلکہ چالاک اور وفادار انسان تھا۔ میڈم شکیلہ اس کی صلاحیتوں پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ اس نے مجھے زندگی کے بھیانک راستوں پر پراعتماد انداز میں چلنے کا سبق سکھایا تھا۔ اس کی تربیت نے مجھ جیسے دیہاتی اور کمزور انسان کو شہ زور بنا دیا تھا۔ میرے دل

میں حبس بھر گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ مانا جٹ اور جفری بھی کچھ کم نہیں تھے۔ مانا جٹ بہت زندہ دل اور مزاحیہ طبیعت رکھنے والا انسان تھا۔ وہ نہایت اعصاب شکن سچوئیشنز میں بھی مذاق کرنے اور ماحول کو بدلنے سے نہیں چوکتا تھا۔ جفری میرو شاہ کا خاص لاڈا تھا۔ ہر وقت میرو شاہ کے گن گاتا رہتا تھا۔

میرو شاہ نے پہلے اپنی، پھر میری آنکھیں پونچھیں۔ بولا، ''ماڑا غنچہ ہووت تھا سراجا..... پیا..... ہائے! جمانہ سچ بولت کہ گولی بڑی جالم اور بے نجری (بے نظری) ہووت۔ جالم نہ تو لاڈے کو دیکھت، نہ غنچے کو۔''

وہ سبھی کوئی گھنٹہ بھر میرے کمرے میں رہے۔ ان کے جانے کے بعد فرزانہ، شبانہ اور موجو آ گئے۔ ان کے عقب میں فوجی اختر کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے میرو شاہ کے وہ ریمارکس یاد آ گئے جو اس نے فوجی اختر کو مجھ سے متعارف کراتے ہوئے ادا کیے تھے، ''یہ گھوڑا..... فوجی اختر..... ایک دم تھارو پریڈ گھوڑا ہووے کیونکہ یہ فوج سے بگٹٹ بھاگ کر میرے پاس آوت ہے۔ اب یہ ماڑے غنچے کا نوکر بھی ہے اور اس گھر کا راکھا بھی.....''

❖❖○❖❖

پھر ان چاروں افراد اور ہاسپٹل کے اسٹاف کے علاوہ میں نے دس دنوں تک کسی کی شکل نہیں دیکھی۔ فوجی اختر ہر صبح دس بجے تینوں کو میرے کمرے میں لے آتا، وہ گھنٹہ بھر مجھ سے باتیں کرتے پھر واپس چلے جاتے۔ شانو چاہتی تھی کہ وہ شب و روز یہاں رہے مگر ڈاکٹرز اس کی اجازت نہیں دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ ہر روز گیلی آنکھیں لیے چلی جاتی۔ میں میڈم شکیلہ کا منتظر تھا۔ چاہتا تھا کہ اسے کہوں کہ وہ پروین، امیر نواز اور ڈاکٹر منور علی شاہ کو یہاں لے آئے۔ میں انہیں ایک نظر دیکھ لینا چاہتا تھا کیونکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میری مایوسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب خوشخبری دیتے کہ میری اپر وومنٹ کی رفتار بہت اچھی ہے مگر میں مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا کیونکہ ابھی تک میرے جسم کے کسی عضو میں حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں لیکوئڈ فوڈ اور یورن بیگ کے سہارے زندہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اب میری بقیہ زندگی اسی بیڈ پر ہی گزرنے والی تھی۔

میری خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے میری آنکھوں کے سامنے دیوار پر اکیس انچ کا ایل سی

ڈی ٹی وی نصب کرانے کا حکم دے دیا تھا۔ ٹی وی نے ایک دو دنوں تک میری توجہ بٹائی مگر پھر میرا دل اس سکرین سے بھر گیا۔ خاموشی اچھی لگنے لگی۔

بیلے والی حویلی میں وقوع پذیر ہونے والی واردات معمول کا واقعہ نہیں تھا۔ میر و شاہ کے بقول وہ حویلی میں تئیس لاشیں چھوڑ آئے تھے۔ اس پسماندہ علاقے میں اسلحے کا یوں بے دریغ استعمال، تئیس لاشوں کا ملنا جن میں یارن خان، حیدر خان اور میاں دلبر حسین جیسی قد آور شخصیات بھی شامل ہوں..... اور ایک برہنہ بدن لڑکی کا بے روح جسد..... یہ ایسا واقعہ نہیں تھا کہ با آسانی ہضم کر لیا جاتا۔ یقیناً علاقے کیا، صوبے بھر میں تھرتھلی مچ گئی ہوگی۔ وسیع پیمانے پر پولیس اور انتظامی محکمے حرکت میں آ چکے ہوں گے۔ ملزموں کی تلاش میں دھرتی کا چپہ چپہ چھان مارا گیا ہوگا۔ مقامی پولیس جتنی بھی گئی گزری تھی، بھلے صدی بھر پرانے خطوط پر چلنے والی تھی، وہ کھوج لگا سکتی تھی کہ ان تئیس افراد کو کس نے کیڑوں مکوڑوں کی طرح مسل کر رکھ دیا ہے۔ میڈم شکیلہ اور میر و شاہ ایسے بھی گم نام یا وی وی آئی پیز نہیں تھے کہ ان تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ مجھے اس کمرے کے باہر کے حالات کا علم نہیں تھا۔ خبر دینے والوں نے مجھ سے اچانک ناتا توڑ لیا تھا۔ جن لوگوں نے ناتا بحال رکھا تھا، ان کے پاس مجھے بتانے کیلئے کوئی کارآمد بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر ظہور اختر ہی وہ واحد شخص تھا جس سے میں اس موضوع پر بات کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر ظہور اختر میڈم کے اس جدید طرز کے ہسپتال 'میڈی کمپلیکس' کو چلاتا تھا۔ یہ ہسپتال شہر کی مصروف شاہراہ پر واقع تھا۔ دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں تھا مگر یہاں جدید آلات اور سرجری کی قابلِ ذکر سہولیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر ظہور اختر کی زیرِ نگرانی چار ڈاکٹر اور چھ نرسوں کے علاوہ پانچ سات دفتری اہلکار وہاں کام کرتے تھے۔ یہ سبھی میڈم کے گینگ کے افراد تھے۔ میں یہاں بالکل محفوظ تھا۔ جانتا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والے یا تلاش کرنے والے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ سی ون اور سی ٹو کی طرح اس ہسپتال کے نیچے بھی کوئی دنیا آباد ہو سکتی تھی۔ بعید نہیں تھا کہ مجھے جس روم میں رکھا گیا تھا، یہ بیس منٹ میں واقع ہو یا نہایت خفیہ کمرہ ہو۔

تحفظ کے مکمل احساس کے باوجود میں پریشان ہو جاتا تھا۔ جس دن پہلی مرتبہ میرے بائیں ہاتھ کی بڑی انگلی میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی تصدیق شانو نے بھی کر دی تو میرے

اندر طمانیت اور خوشی کی بہت توانا لہر دوڑ گئی۔ شام کو جب میں نے ڈاکٹر ظہور اختر کو خوشی خوشی یہ اطلاع دی، اس کی فرمائش پر انگلی کو حرکت دی تو اس کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے باقاعدہ طور پر مجھے مبارک باد دی اور کہا، ''اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم آنے والے وقت میں بھرپور انداز میں اپنا جسم ری کور کرلو گے۔ میں ابھی ڈاکٹر نعیم عاطف سے وقت لیتا ہوں اور اسے وزٹ کی دعوت دیتا ہوں۔''

وہ میرا معائنہ کرنے آیا تھا مگر اس خوشخبری کے زیر اثر فی الفور پلٹنے لگا۔ میں نے آواز دے کر روکا۔ کہا، ''کیا میڈم صاحبہ سے رابطہ ہوسکتا ہے؟''

اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں ڈیئر! میڈم نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ وہ بہت بزی ہیں۔''

مجھے دکھ ہوا۔ وہ اتنی بزی تھی کہ مجھ سے نہ صرف لاپرواہو گئی تھی بلکہ فون پر رابطہ کرنے سے بھی گریزاں تھی۔ میں نے کہا، ''ڈاکٹر صاحب! فون پر تو بات ہوسکتی ہے ناں؟''

''نہیں..... انہوں نے اپنے سابق تمام نمبر بند کر دیے ہیں۔ نئے ماڈیولز خریدے ہیں۔'' ڈاکٹر ظہور صاحب نے بتایا، ''مگر تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہاری طرف سے غافل نہیں ہیں۔ مجھ سے گاہے بگاہے تمہاری اپروومنٹ کے بارے پوچھتی رہتی ہیں۔''

میں میر وشاہ یا سخی محمد کے بارے پوچھنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد نیوروسرجن کو لے کر دوبارہ میرے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے محتاط معائنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ نہ صرف میرے ہاتھ کی دو انگلیاں حرکت کرنے لگی ہیں بلکہ دایاں ہاتھ بھی کانپنے لگا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بہت خوش آئند پیش رفت تھی۔ اس نے ڈاکٹر ظہور اختر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور خوش مزاجی سے کہا، ''یور پیشنٹ از میکنگ سکسیس فل ہیلدی انوائرنمنٹ!''

(آپ کا مریض کامیاب صحت مند ماحول بنا رہا ہے۔)

اس نے ادویات میں کچھ ردوبدل کیا۔ فزیوتھراپسٹ کیلئے نئے نوٹس دیے اور ڈاکٹر ظہور اختر کی معیت میں باتیں کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ مجھے امید کی مضبوط کرن دے گیا۔

مجھے ہسپتال میں پندرھواں دن تھا جب ایک رات گیارہ بجے میڈم شکیلہ نے مجھے گہری نیند سے بیدار کیا۔ وہ میرے پہلو میں، بیڈ پر بیٹھی میرا گال تھپتھپا رہی تھی۔ پکار رہی تھی۔ اسے

دیکھتے ہی میں نے بے ساختہ اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ کوشش کامیاب نہیں ہوئی مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آج نہ سہی، کسی نہ کسی دن اُٹھ کر بیٹھنے کے لائق ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''ٹیک اِٹ ایزی..... آئی ایم ہیئر..... کہو! کیسی طبیعت ہے؟''

مجھے اس کا نچلا دھڑ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شوخ سرخ اور خاصی چست شرٹ اور ٹائی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے شانوں اور کمر پر پھیلے ہوئے بالوں کے اوپر سفید رنگ کا ہیٹ اس کی جاذبیت کو چار چاند لگا رہا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو نے میرے کمرے کی فضا کو اپنی تحویل میں لے رکھا تھا۔ چمکتا ہوا چہرہ دل کی دھڑکنوں کو روکنے اور اچانک تیز کرنے کے ہنر سے آراستہ تھا۔ میں نجانے کتنی دیر تک اُسے ایک ٹک گھورتا رہا۔ اس نے بھی میری محویت کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے کہا، ''میڈم! میں نے آپ کی عدم آمد کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔''

اس نے میرے گلے کا جواب دیا، ''جہاں مجھے پہنچنا چاہیے، وہاں پہنچ جاتی ہوں۔ تم نے بیلے والی حویلی میں میری کمی محسوس کی تھی یا نہیں؛ میں تمہاری تلاش میں پہنچ گئی تھی۔ ہے ناں عجیب بات؟''

میں نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا، ''نہیں میڈم! اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ وہاں بھی میرے دل میں یہی خواہش سانسیں لیتی رہی کہ آپ کو کسی نہ کسی طرح مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر ہو جائے۔''

''اور مجھے خبر ہو گئی۔ یہی اچھی بات ہے۔ اسی کے بارے میں سوچو گے تو خوش رہو گے۔'' وہ مسکرائی، ''میں نے تمہیں روکا تھا ناں..... غزالہ سے ملنے مت جاؤ۔ تم میرا حکم ٹال کر چلے گئے۔ اس کا انجام بہت برا ہوا۔ لیکن خیر! ایک لحاظ سے بہت اچھا ہوا کہ میرے اور تمہارے سبھی دشمن مجھے ایک چھت کے نیچے مل گئے اور میں نے انہیں پچھاڑ دیا۔ تمہارے لیے اچھی بات یہ ہے کہ تم نے اپنے ہاتھوں انہیں جہنم رسید نہیں کیا مگر اپنے دشمنوں کو بے بسی سے تڑپتے اور قتل ہوتے دیکھ تو لیا۔ ہے ناں؟''

اچانک میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بہ دقت چھلکنے والے اشکوں کو پلکوں پر روکا اور آزردگی سے کہا، ''میڈم! میں نے صرف اپنی غزالہ کے سینے سے خون کا فوارا پھوٹتے دیکھا تھا۔ پھر

میری آنکھ کوئی منظر دیکھنے کے لائق نہیں رہی تھی۔''

''واٹ ڈو یو مین؟'' اس کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ششدر انداز میں بولی، ''وہ مر گئی؟ کب..... نور پور میں؟''

مجھے پوری شدت سے احساس ہوا کہ اس کا تعجب مصنوعی نہیں تھا۔ میں نے کہا، ''نہیں میڈم! وہ وہیں تھیں۔ آپ کی چلائی ہوئی پہلی گولی اسے لگی تھی۔ وہ گولی جس پر آپ نے یارن خان کا نام لکھا تھا، وہ پھسل کر میری غزالہ کو نگل گئی۔''

میرے لبوں سے سسکی نکلی۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ عجیب گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو کر بولی، ''نہیں شہریار! ایسے نہیں..... بہادر انسان زندگی کو بڑی دلیری سے فیس کرتا ہے۔ اوہ میرے خدا! تو کیا وہ..... لڑکی غزالہ تھی؟.....'' وہ کچھ دیر تک میرے منہ اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش بیٹھی رہی، پھر گویا ہوئی، ''سچ شہریار! مجھے علم نہیں تھا کہ اسے بھی وہیں رکھا گیا تھا۔ اگر مجھے یہ بھنک مل گئی ہوتی تو میں اتنی لاپروائی سے گولی نہ چلاتی۔ واقعی! میرا نشانہ چوک گیا تھا۔''

وہ چند لمحوں میں خاصی مضمحل اور نڈھال دکھائی دینے لگی تھی۔ میرے لبوں پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ ہولے ہولے کانپنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ میرے پورے چہرے کو سہلانے لگا۔ کہنے لگی، ''شہریار! کسی بڑے مقصد کے حصول کیلئے انسان کو چھوٹی بڑی قربانیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہت کچھ حاصل کرنے کیلئے کچھ نہ کچھ اور کبھی بہت کچھ کھونے کی روایت اس زمانے میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ تم نے اپنے کتنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا؟..... گنو تو دل خوش ہو جائے گا۔ یہ درست ہے کہ غزالہ اتنی غیر قیمتی نہیں تھی کہ اس کی جدائی کو معمولی خیال کر کے دل سے محو کر دیا جائے مگر یہ حقیقت ہے جس سے مفاہمت کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس کا دکھ تمہارے دل میں زندہ ہے۔ یہی اس کا ساتھ ہے جو امر ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے تم سے جدا نہیں کر سکتی۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ مجھے سمجھا کر اس کرب کی اذیت سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی جو میرے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ کوشش کے باوجود مجھے اپنی گرفت سے آزاد کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے میری آنکھوں پر ہولے سے ہاتھ پھیرا، کہا، ''تم نے مجھ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کس طرح تم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی؟''

میں نے ایک لمبی سانس خارج کی، کہا، ''آپ بہتر سمجھیں تو بتا دیں۔''

''او کے! میں جب بہتر سمجھوں گی، تمہیں بتا دوں گی۔ اب کچھ اور بتانے کے ارادے سے آئی ہوں۔ سنو گے؟''

''جی..... کیوں نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کچھ عرصہ قبل میں اس قتل و غارت سے بھری ہوئی زندگی سے اکتا گئی تھی۔ میں نے کچھ عرصہ قبل، جب تم یہاں نہیں تھے، سوچا تھا کہ میں کب تک ان تاریک راہوں پر چکراتی پھروں گی؟'' اس نے نہایت گھمبیر لہجے میں دیوار کی طرف گھورتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ''میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں بغیر کچھ کیے باقی تمام زندگی عیش و عشرت کے ساتھ گزار سکتی ہوں۔ میں دنیا کی ہر آسائش؛ محبت کرنے والے شوہر سمیت خریدنے کی استطاعت رکھتی ہوں۔ پھر میں کیوں یہ خطرات بھری زندگی گزار رہی ہوں؟..... میں نے سوچا تو میرے ذہن نے فی الفور تاویل پیش کر دی کہ مجھے گنا ہوں کی پوٹلیوں کے بار تلے دبانے والے جب تک زندہ ہیں، میں چین کی سانس سینے میں نہیں اُتار سکوں گی۔ مجھے وہ زندگی نہیں چاہیے جس میں قلق ہی قلق ہوں، کسک ہی کسک ہو اور انتقام کی لپٹیں بھری ہوئی ہوں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی، ''میں نے ڈاکٹر ظہور اختر سے پوچھا ہے کہ تمہارے سینے میں کوئی وزن اُٹھانے کی سکت ہے؛ اس نے کہا کہ 'ہے'..... میں اپنا سر تمہارے سینے پر رکھنا چاہ رہی ہو۔ رکھ لوں؟''

اس نے اپنی زندگی کی رام کہانی مجھے ایسی ہی وارفتہ محبت کے سنگ سنائی تھی۔ آج شاید وہ اپنے مستقبل کا خاکہ پیش کرنے جا رہی تھی۔ میری اجازت پر اس نے اپنا سر بڑی آہستگی سے میرے سینے پر رکھ دیا۔ دونوں پاؤں بنچ پر ٹکا کر پہلو کے بل لیٹ گئی۔ مجھے اس کے لمس کی لطافت تو نصیب نہ ہوئی مگر یہ احساس ہی بڑا جان فزا تھا کہ وہ میرے سینے پر سر رکھے لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بچالی تھیں۔ اس طرح شاید بولنے میں، اپنا دل کھول کر رکھنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی تھی، تبھی دل کھول کر رکھنے لگی، ''شہریار! میری جان! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ جس سے محبت کی جاتی ہے، اس سے کچھ چھپایا نہیں جاتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ تمہیں میری محبت کا یقین ہے یا نہیں..... ہاں! مجھے اپنی محبت کا یقین ہے۔ اسی

محبت کے بل پر کہتی ہوں کہ میں اس لامحدود مسافت سے اکتا گئی تھی مگر جب تک میرے دشمن دھرتی کے سینے پر اکڑ کر چل رہے تھے، میں اس اندھی، تاریک اور خون سے لتھڑی ہوئی مسافت سے دامن نہیں چھڑا سکتی تھی۔ کوئی پھولوں بھری روش مجھے تسکینِ قلب نہیں دے سکتی تھی۔ اس لیے دولت اکٹھی کرتی گئی۔ اختیار بڑھاتی گئی۔ پھر تم مل گئے۔ میں نے اپنے مستقبل کا ایک سہانا خواب اپنے سرہانے رکھ لیا۔ جب جی چاہا، خواب اُٹھا کر آنکھوں کے حوالے کر دیا۔ ایک رات کی رانی بن کر اپنے ماضی کے تمام دکھ فضا میں تحلیل کر لیے۔''

میں جانتا تھا کہ اسے بولتے ہوئے ٹوکنا اسے برہم کرتا تھا، اس لیے خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے چند لمبی لمبی سانسیں پھیپھڑوں میں اتاریں اور سلسلہ کلام جوڑا، ''تم دیہاتی تھے۔ سادہ لوح۔ مکر و فریب کی دنیا کے آدمی نہیں تھے۔ میں نے تمہیں جو بنانا چاہا، تم بن گئے۔ تمہیں جس ڈھنگ سے آراستہ کرنا چاہا، تم سج گئے۔ موم کے پتلے کی طرح۔ تم گناہ کرتے تھے مگر گناہ کا احساس بھی دل میں رکھتے تھے۔ تمہاری یہ خوبی تو بڑی جان لیوا تھی کہ تم اس حد کو عبور نہیں کرتے تھے جہاں تمہارا اختیار ختم ہو جاتا تھا۔ یعنی تم شجرِ ممنوعہ پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ تم ہر لحاظ سے وہ انسان ہو جس کی تمنا دنیا کی ہر لڑکی کرتی ہے۔'' وہ مجھے بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی تھی۔ میں سن رہا تھا مگر مخل نہیں ہو رہا تھا۔

''اور ہاں! تم نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میرے سنگھاسن کے زینوں پر میرزادے، ڈاکٹر شاہ جی اور اجمل گیلانی کے بعد تم نے قدم رکھا۔ گویا یہ قدم دل پر رکھا۔ فاتح بن کر تم مجھے مغلوب کرتے گئے اور میں غیر اعلانیہ طور پر تمہاری محبت میں اسیر ہو گئی۔ میں نے میر و شاہ کی اجازت سے اپنے مستقبل کا خاکہ تشکیل دیا جس میں تم اور میں آزاد اور پر امن فضاؤں میں نغمہ ریز تھے.....'' اس کی آواز جذبات کے احساسات سے بوجھل ہونے لگی۔ رات کے اس پہر میں، خاموشی اور تنہائی میں اس کا یوں بولنا میری روح پر ضرب کناں ثابت ہو رہا تھا، ''شہریار! میں نے طے کر لیا کہ جونہی میں اپنی بربادی کے ذمہ داروں سے انتقام لے لوں گی، اس ملک سے دور چلی جاؤں گی۔ یورپ، امریکہ یا کہیں دور دراز کی کسی ریاست میں..... اور یہاں سے صرف تبدیل شدہ کرنسی نوٹ اور شہریار کو لے جاؤں گی۔ یہی وہ دن تھے جب پونٹے کے ہسپتال میں ہمیں عالیہ کے کوارٹر سے نگینہ ملی تھی۔ اس کے حالات کا علم ہوتے ہی میرے ارادے نے مزید تقویت پکڑ لی۔ میں نے اس کی مدد کا فیصلہ کیا۔ محض یہ سوچ کر کہ وہ مجھے کینیڈا

میں منتقل ہونے اور ایڈجسٹ ہونے میں معاونت کرے گی۔ چونکہ وہ کینیڈین سٹیزن تھی؛ نیشنلٹی ہولڈر تھی؛ وہ مجھے اور تمہیں باآسانی کینیڈا منتقل کرسکتی تھی۔ وہ اسی تکلیف میں تھی جس میں سے میں اور تم گزر رہے تھے۔ میں نے اس کی تکلیف دور کردی۔ یاد ہے ناں تمہیں؟''

میں نے کہا، ''جی میڈم! میں بڑے انہماک سے آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔''

اس نے میرا بے جان بازو اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ہاتھ کی پشت پر لب رگڑتی رہی۔ اپنے خیالات کو مجتمع کرتی رہی۔ بولی، ''اور پھر میں نے ایک طرف تو اپنے دشمنوں کے گرد حلقہ تنگ کرنا شروع کردیا اور دوسری طرف اپنا سرمایہ نگینہ کی اعانت سے کینیڈا منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کام میں میرو شاہ نے میری بہت معاونت کی۔ وہ بادشاہ گر انسان ہے۔ چھوٹے وجود میں بڑا ذہن اور بہت بڑا دل رکھتا ہے۔ کاش! مجھے اس سے محبت ہوجاتی..... کاش! کسی خوب صورت جسم میں اس کے جیسا خوب صورت دل اور دماغ سما گیا ہوتا..... مگر نہیں..... نہیں..... قدرت کی ہر تخلیق جداگانہ ہوتی ہے۔ وہ بھی یکتا ہے۔ کوئی اس کے جیسا نہیں۔ وہ کسی کے جیسا نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی.....'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔ آہستہ سے میرے اور قریب ہو گئی۔ اتنی کہ اس کی سانسیں میرے چہرے پر محسوس ہونے لگیں۔ دل میں عجیب طرح کی ہلچل پیدا ہوگئی۔ خود پر بیتی ہر داستان محو ہونے لگی۔ نئی رقم ہونے لگی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ سانس کی ڈور لپیٹ کر جیتے جاگتے بدن کو مردہ کردیتی تھی۔ ہاں! وہ ایسی ہی تھی۔ جب چاہتی، محبت کا زہر پلا کر مار دیتی پھر محبت کو ہی تریاق بنا کر دوبارہ دنیا میں لے آتی تھی۔

میں خود پر اختیار کھو بیٹھا۔ اسے اور قریب کرنا چاہتا تھا مگر قدرت نہیں رکھتا تھا۔ خود قریب ہوگیا۔ اس کے گداز گال پر ہونٹ سرسراتے ہوئے بولا، ''میرو شاہ آپ کو مہارانی کہتا ہے؛ بالکل درست کہتا ہے۔ آپ ہمارے دلوں پر راج کرتی ہیں۔''

اس نے میری بات سنی ان سنی کردی۔ بولی، ''پھر اچانک میرے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ میرے روکنے کے باوجود تمہارے قدم غزالہ کی سمت اُٹھ گئے۔ ہائے شہریار! تم کبھی اس دکھ سے گزرے نہیں۔ تم اس کرب سے شناسا نہیں ہوئے۔ اس لیے تمہیں میری اس رات کی بے چینی اور اضطراب کی خبر نہیں ہوسکتی جس رات تم ملتان میں نہیں تھے۔ میں نے خود کو نہایت کم تر اور غزالہ کو بہت خوش بخت تصور کیا۔ جیلس ہوگئی۔ جل کر راکھ ہوگئی..... بری بات تھی ناں؟'' اس نے مجھ سے اچانک پوچھا۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی، ''ہاں!

بہت بری بات تھی مگر سچ یہی تھا کہ میں حسد کی آگ میں جل بھڑ کی تھی۔ تم چلے گئے۔ اگر نہ جاتے..... مگر کیوں نہ جاتے؟ تمہیں جانا ہی تھا۔ کسی نہ کسی دن مجھے دکھ دینا ہی تھا۔ جب کوشش کے باوجود مجھے قرار نہ آیا تو میں شکست خوردہ ہونے لگی۔ بجھنے لگی۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اطلاع ملی کہ تم یارن خان کی دہکائی ہوئی دوزخ میں جا پھنسے ہو۔ چاہتی تو تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیتی۔ شاید ایسا ہی کرتی مگر دوسری اطلاع بڑی بھرپور اور پرکشش تھی۔ تمہارے قتل کا تماشا دیکھنے کیلئے تینوں کمینے اکٹھے ہو رہے تھے۔ میں نے ایک آدمی کو سردار حیدر خان کی ٹوہ پر لگا دیا جبکہ زور آور کو مجبور کر کے عافیہ خان کے اغوا کے مشن پر روانہ کر دیا۔ وہ ناکام رہا کیونکہ عافیہ خان تین ماہ کیلئے دوبئی گئی ہوئی تھی۔ اس دوران میرے مخبر نے مجھے بے حیائی کے جشن کا ہنگامی ٹائم فریم مہیا کر دیا۔''

میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ اور بدن کی حرکات محبت کا اظہار کر رہی تھیں مگر زبان کوئی اور عقدے کھول رہی تھی۔ میں اس تضاد میں بری طرح الجھنے لگا۔

اس نے تھوڑا توقف لیا۔ بولی، ''اور پھر جو کچھ ہوا، وہ تمہارے سامنے ہے۔ مجھے بتانے والے نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہاری غزالہ بھی تمہارے ساتھ ہے ورنہ اتنی بڑی غلطی مجھ سے یا میری ٹیم سے سرزد نہ ہوتی۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ تم مجھے نیم مردہ حالت میں ملو گے۔ جہاں میری زندگی کی تمام تر بے چینیوں کو قرار مل گیا وہاں میرا بہت بڑا نقصان بھی ہوا۔ میرے بہت پیارے لوگ مجھ سے بچھڑ گئے۔ خیر! یہ تو ہوتا ہی ہے۔ زندگی دھوکہ دینے والی ہے۔ کسی بھی وقت چھوڑ سکتی ہے۔ میں بھی مر سکتی ہوں۔ تم بھی۔ ہمارے اردگرد رہنے والے سبھی لوگ مرنے کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔'' اس کا لہجہ بھرّا گیا۔ شاید آنکھوں میں نمی بھی تیر گئی تھی۔ سنبھل کر بولی، ''اور شہریار..... میری مسافتوں کا حاصل مجھے مل گیا۔ اب میرے پاس کوئی جواز نہیں رہا تھا اس مارا ماری والی زندگی کا..... بہت سارا پیسہ مجھے پولیس کو دینا پڑا تاکہ وہ ہم پر اتنی بڑی واردات کا ملبہ نہ ڈالیں۔ اگر وہ ہمارے خلاف مقدمہ درج کر دیتے تو میں اور نگینہ پاکستان سے باہر نہ جا سکتے۔ تم بھی آزاد نہ رہ پاتے۔ سمجھ رہے ہو ناں؟''

میرے دل پر ایک پتھر آن پڑا۔ اس نے پاکستان سے جانے والوں میں میرا نام شامل نہیں کیا تھا۔ میں نے بدقت تمام کہا، ''جی میڈم! آپ اپنی بات جاری رکھیے۔''

''او کے..... جب ڈاکٹر ظہور اختر اور نیوروسرجن نے تمہاری صحت کے بارے اطمینان

دلایا تو میں اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل میں جت گئی۔ میر و شاہ اور سخی محمد نے ہتھیلی پر سرسوں جما دکھائی۔ آدھے صوبے میں بکھرے ہوئے معاملات کو آٹھ دس دنوں میں سمیٹنا ناممکن کام تھا جسے ان دونوں نے رات دن ایک کر کے ممکن بنا دیا۔ تمہیں یہ جان کر بہت خوشی ہو گی کہ میں نے جرائم کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے اور صبح چار بجے میں، میر و شاہ اور نگینہ کراچی کیلئے ملتان چھوڑ دیں گے۔ وہاں سے کینیڈا کیلئے پاکستانی دھرتی چھوڑ دیں گے۔ شاید کبھی لوٹ کر نہ آنے کیلئے....."

اس نے مجھے کسی خانے میں فٹ نہیں کیا تھا۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ بہت دھیمے لہجے کا احتجاج میرے لبوں پر رقصاں ہوا، "مم..... میں..... میں کہاں جاؤں گا میڈم؟"

وہ ایک دم مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہوئی اور ہتھیلیاں بیڈ کے میٹرس پر ٹکا کر مجھ پر جھک گئی، بولی، "شہریار! میں نے تم سے محبت کی ہے۔ انمٹ سی۔ تمہیں بہت اونچا لے جانا چاہتی تھی مگر ناکام رہی مگر میں نے تمہارا معقول بندوبست کر دیا ہے۔ جب تک تم بالکل تندرست نہیں ہو گے، یہیں رہو گے۔ یہ ہسپتال میں نے ڈاکٹر ظہور اختر کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ تمہارے مکمل واجبات ایڈوانس ادا کر دیے ہیں۔ تمہاری فیملی اسی مکان میں قیام پذیر رہے گی جس میں رہ رہی ہے۔ فوجی اختر بدستور اپنا کام کرتا رہے گا۔ تم اسے ہر ماہ اس کی مقررہ تنخواہ ادا کرتے رہو گے۔ اور ہاں! میں نے تمہاری کزن شانو کے نام کا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں ساڑھے تین کروڑ روپے ٹرانسفر کر دیے ہیں۔ چیک بک اُسے دے دی ہے۔ اس کی ذمہ داریاں بھی اسے سمجھا دی ہے۔ اس رقم سے تم اپنے مستقبل کا خاکہ تیار کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھی زندگی گزارنے کے لائق ہو جاؤ گے۔"

میری سانس پھول گئی۔ الفاظ میرے سینے میں ہی نیزوں کی طرح دھنس گئے۔ وہ بولتی رہی، "تم حیران ہو گے کہ میں نے یہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں کیوں نہیں ڈالی؟ ہے ناں؟..... تمہیں علم ہے ناں کہ میں ہر پہلو نظر میں رکھتی ہوں۔ تم ابھی تک دستخط کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہو۔ اگر میں تمہارے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرا دیتی تو تم اسے اپنے تصرف میں نہیں لا سکتے تھے۔ تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ شانو ہی کیوں؟ میں نے اس کا ہی انتخاب کیوں کیا؟..... ڈاکٹر ظہور اختر کے سیکورٹی کیمرے نے مجھے بتایا کہ شانو تم سے والہانہ محبت

کرتی ہے۔ میں نے دو تین فوٹیج دیکھی ہیں جن میں وہ خوابیدہ شہر یار کے پاؤں دباتی ہے، ہاتھ سہلاتی ہے اور شیو زدہ چہرے پر اپنی بے اظہار محبت کی مہریں ثبت کرتی ہے۔ میں نے تمہارے مستقبل کے خالی صفحات پر اس کا نام لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ موزوں نام میرے ذہن میں نہیں آیا۔ اب قسمت کیا کرتی ہے؟ یہ خدا کو ہی معلوم ہے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ میری خواہش پر اپنی عنایت کی بارش برسا دے گا۔''

مجھے سننا محال تھا تو شاید اسے بولنا بھی آسان نہیں تھا۔ بولتے بولتے رک کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتی تھی، ''میں نے زور آور کو ایسے ایسٹس تحفتاً دے دیے ہیں جنہیں بیچا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ محبت کرنے والا اکھڑ مزاج انسان ہے۔ منافق نہیں ہے۔ جو بولتا ہے، وہ دل میں سنبھال رکھتا ہے۔ اسے اپنی جگہ پر گینگ لیڈر بنا کر تمام ساتھیوں کے سامنے دو صورتیں رکھ دیں۔ جرائم کی دنیا چھوڑنے والوں کیلئے ایک ایک کروڑ روپے جبکہ اس دنیا کے لطف کشید کرنے کی خواہش رکھنے والوں کے لیے زور آور کا گروپ اور پچاس لاکھ فی کس..... کچھ میری راہ پر چل نکلے۔ کچھ زور آور سے مل گئے۔ میں بری الذمہ ہوگئی۔ میر و شاہ اپنی مہارانی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش بھی میں نے پوری کر دی۔ میں صبح کراچی کیلئے فلائی کر جاؤں گی جہاں سے سہ پہر تین بجے اس ملک کو الوداع کہہ جاؤں گی۔ پھر تم سے؛ سب سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ شاید فارایور..... نہیں..... یقیناً فارایور..... ائر پورٹ تک میڈم شکیلہ سفر کرے گی۔ جہاز میں چند ماہی سوار ہوگی کیونکہ اس کا دامن قانون کی کتابوں میں پاک ہے۔ اس پر جو مقدمات تھے، وہ نوٹوں سے دھل چکے ہیں۔''

میں خاموش رہا، میری آنکھوں نے سوال کیا، ''مجھے دوسروں کے مستقبل سے کچھ لینا دینا نہیں؛ میں اپنی بات کرتا ہوں۔ میرا کیا بنے گا؟''

اس نے میری آنکھیں پڑھ لیں۔ مسکرائی۔ تھوڑا اور جھکی۔ میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ کر چند لمحے تھمی رہی پھر علیحدہ ہو کر بولی، ''تم یقیناً شانو کے ساتھ خوش رہو گے۔ جب ٹھیک ہو جاؤ، اس سے شادی کر لینا۔ وہ تب تک انتظار کرے گی۔ ڈاکٹر منور علی شاہ، تمہاری بہن اور بہنوئی تمہیں پانچ سات دنوں تک ملنے آئیں گے۔ ٹھیک ہونے کے بعد تم چاہو تو نور پور میں اپنی زمین کاشت کرو، چاہو تو بیس پچیس ایکڑ اراضی خرید کر شہر یار خان بن جاؤ اور چاہو تو یہ علاقہ، یہ صوبہ، یہ ملک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور نکل جاؤ مگر اپنی شانو کے ساتھ..... ساڑھے تین

کروڑ کی رقم تمہیں مضبوط مستقبل دے سکتی ہے۔ اگر کبھی برے حالات سے واسطہ پڑے تو زور آور کو آواز دے لینا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور..... اور..... میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی..... ہمیشہ..... مجھے بھولنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا، بھول جانا، ورنہ کہیں کے نہیں رہو گے۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ گویا اس نے جو کہنا تھا، کہہ دیا تھا۔ مجھے جو سننا تھا، میں سن چکا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ مجھے پیاس لگی۔ ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس نے پانی پلا دیا۔ بولی، ''تم بالکل خاموش کیوں ہو؟ کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو؟''

میرے دل سے آہ نکلی، ''میڈم.....''

''نہیں..... میں اب میڈم نہیں، صرف چندو ماہی ہوں۔''

''او کے..... چندو! کیا آپ..... نہیں..... بلکہ تم؛ کیا تم واقعتاً مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' مجھے اپنا سوال نہایت اجنبی اور بے محل لگا۔

''ہاں..... اس میں تعجب کیسا؟ تم نے مجھے اور میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ صرف وقت اور مرحلے کا فرق ہے دونوں فیصلوں میں مگر یقیناً پہل تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔'' اس کا پختہ لہجہ اس کی آنکھوں کے بیان کی تصدیق نہیں کر رہا تھا۔

''مگر میں نے تو تمہیں نہیں چھوڑا۔ میں تو اب بھی تمہارے پاس ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''نہیں شہریار! جھوٹ کی ریتلی زمین پر محبت کا پرشکوہ محل تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اس محبت کی اہل کبھی نہیں رہی جس محبت کی اہلیت تمہاری مگیتر غزالہ کے پاس تھی۔ تم نے میرے پہلو میں رہ کر اسے سوچا۔ میرے چہرے پر اس کا چہرہ سجا کر چوما۔ میں نے غلط نہیں کیا۔ سوچ سمجھ کر تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ترکِ تعلقات کو اچھا موڑ دینے کیلئے اس وقت یہاں ہوں ورنہ میں پابند نہیں تھی کہ تمہیں بتا کر جاتی۔ یہ باتیں تو ڈاکٹر ظہور بھی تم تک پہنچا سکتا تھا۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی چندو ماہی! میں نے کبھی تم پر غزالہ کو فوقیت نہیں دی۔ اس کی ذات کا حصار اس دن ٹوٹ گیا تھا جس دن تم نے مجھے اپنے ماضی سے آگاہ کیا تھا۔ اس لمحے کے بعد میں نے صرف اور صرف تمہیں چاہا۔ اب معذوری کی حالت میں، آس اور ناامیدی کی سانسیں

لیتا ہوا یہ سوچ رہا ہوں کہ شاید..... شاید یہ گھوڑا لنگڑا ہو گیا ہے جسے جنگل میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے یا فائر مار دیا جاتا ہے۔'' میرا لہجہ بہت شکوہ آمیز اور تلخ ہو گیا تھا۔

وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔ دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی اور مجھے ایک ٹک دیکھنے لگی۔ بولی، ''تمہارے خوبصورت چہرے پر جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔ میں نے تمہارا جو امیج بنا رکھا ہے، اسے خراب نہ کرو۔''

''میں جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ کہتا ہوں۔ تم میں اتنی ہمت نہیں کہ الزام اپنے سر لے لو۔ تم جانا چاہتی ہو۔ بصد شوق جاؤ۔ میں تمہیں روکنے کی نہ تو قدرت رکھتا ہوں اور نہ ہی میری اتنی اہمیت ہے کہ میرے روکنے سے تم رک جاؤ۔ تم نے میرے لیے جو کچھ کیا، اس کے بار سے نکلنے کی ہمت بھی مجھ میں زندگی بھر پیدا نہیں ہو گی۔'' میں نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا اور جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا، ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

اس نے میری آنکھوں سے نکلتے آنسو دیکھ لیے۔ تڑپ کر قریب آئی۔ ہتھیلیوں سے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بولی، ''آئی لو یو شہریار..... آئی لو یو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم دونوں سفر میں تھے۔ ہمیں مجبوراً اس ٹریک میں اکٹھے دوڑنا پڑا جس کی منزل تمہاری اور میری دونوں کی نگاہوں میں ثبت تھی۔ ہمارا ٹارگٹ پورا ہو گیا تو وہ ٹریک ختم ہو گیا۔ کسی ٹریک کے ختم ہونے سے سفر نہیں رکتا۔ نیا ٹریک کھلتا ہے۔ اتفاق سے اب کے ہمارے لیے علیحدہ علیحدہ راستے کھلے ہیں۔ تم اپنی راہ چلو۔ مجھے اپنی راہ جانے دو۔ رہی بات تمہارے جھوٹ کی..... تم نے پوچھا تھا کہ مجھ تک تمہارے نامساعد کی خبر کیسے پہنچی..... ہے ناں؟..... اب بتاتی ہوں کیونکہ یہی موزوں وقت ہے۔ مجھے تمہارے پل پل کی رپورٹ ملتی رہی تھی۔ جونہی یہ سلسلہ موقوف ہوا، تمہارا دوست خالد عرف کھالا مجھ تک پہنچ گیا۔ اس سے ایک غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے غزالہ کے بارے میں مجھے نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ اس کے نور پور سے نکلنے کے بعد اغوا ہوئی تھی۔ خیر..... میں بتا رہی تھی کہ جب تم میری خواہش کے بغیر نور پور جانا چاہتے تھے تو میں نے پیا جی سے کہا تھا کہ میک اَپ کے دوران ایسا کوئی انتظام کر دینا کہ ہمیں تمہاری پل پل کی رپورٹ ملتی رہے۔ اس نے ایک وائس ڈیٹیکٹر تمہاری نقلی داڑھی میں نصب کر دیا۔ اس کی رینج کم تھی۔ اس لیے پیا جی نے مانے جٹ کو ریسیور دے کر تمہارے پیچھے روانہ کر دیا۔ وہ مخصوص فاصلے پر رہ کر تمہاری آواز ریکارڈ کرتا رہا۔ پیا جی نے مجھے تمہاری وائس ریکارڈنگ لا تھمائی۔

میں نے سنی۔ میں چاہوں گی کہ تم بھی سن لینا۔ تب؛ جب میں یہاں سے جا چکی ہوں گی۔ تمہارا آئینہ تمہارے جھوٹ کی قلعی تنہائی میں کھولے گا تو شاید تمہارے نزدیک میری حیثیت زیادہ معتبر ہو جائے اور میں تمہاری ندامت دیکھنے کے عذاب سے نہیں گزروں گی۔''

اس نے بنچ پر رکھے ہوئے ہینڈ بیگ کو اُٹھا کر کھولا۔ ایک سی ڈی اور ایک ننھا سا سی ڈی پلیئر جس کے ساتھ دو مکعب انچ کا خوبصورت سا سیاہ اسپیکر باکس منسلک تھا، نکال کر پیشنٹ کیبنٹ پر رکھ دیا۔ بولی؛ ''رات اپنے دامن میں بہت کچھ چھپائے رکھتی ہے۔ کئی مسافروں کو، کئی پوٹلیوں اور کئی راستوں کو..... اس رات کے دامن میں بھی بہت کچھ چھپا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ میرے بعد، جب میری فلائٹ زمین چھوڑے گی، نرس کمرے میں آئے گی اور سی ڈی پلیئر کو آن کر کے تمہارے سینے پر رکھ دے گی۔ تمہیں تنہائی بھی فراہم کر دے گی تاکہ رات کا راز صرف تمہاری ذات تک محدود رہے۔ سننے کے بعد سی ڈی توڑ دینا۔ چاہو تو محفوظ رکھ لینا۔ مجھے ہر دونوں صورتوں میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ صبح دم شانو اور اس کے بہن بھائی یہاں آ جائیں گے۔ وہ تمہیں سنبھال لیں گے۔ وہ کمزور ہیں مگر تم کمزور نہیں ہو۔ بہادر بن کر زندگی کے مسائل کو فیس کرو گے تو زندہ رہو گے۔ اپنے خاندان کو بھی زندہ رکھو گے۔ او کے..... اب میں چلتی ہوں۔''

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی پھر برق رفتاری سے پلٹ کر کمرے سے نکلنے لگی۔ میں نے بے ساختہ آواز دی، ''چندو..... میڈم.....''

وہ دروازے میں رک گئی۔ پلٹے بغیر گردن موڑ کر بولی، ''نو پلیز.....''

''پلیز..... ایک منٹ.....'' میرے لہجے میں بے بسی عود کر آئی، ''کاش کہ میں معذور نہ ہوتا تو اپنے بازوؤں سے روک لیتا۔''

وہ چند لمحے کھڑی مجھے گھورتی رہی پھر پلٹ کر میرے پاس آئی۔ مجھ پر جھکی۔ اس نے میری آنکھوں پر اپنے سرخ تر ہونٹ رکھے۔ پھر پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔ آخر میں کچھ کہے بغیر اس نے میرے ہونٹوں کو آخری بار سیراب کیا۔ میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''خدا حافظ میرے یار..... میرے شہریار.....''

اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آواز بھرا گئی۔ ایک الم ناک سسکی کو میرا زادِ سفر کر کے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور نڈھال سے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔ اس مرتبہ اس نے

گردن موڑ کر مجھ پر نگاہ ڈالنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مجھ میں پھر آواز دے کر روک لینے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ہیولا کئی منٹوں تک اَدھ کھلے دروازے پر ثبت رہا پھر آہستہ آہستہ محو ہونے لگا۔ آخر میں میری غیر معتدل سانسوں اور گھٹتی بڑھتی دھڑکنوں کے سوا کمرے میں کچھ نہ رہا۔

میرے روم میں وال کلاک نہیں تھا۔ مجھے وقت کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے آج تک بخوبی یاد ہے کہ اس وقت میرے دل میں کوئی خواہش نہیں تھی..... بس ایک نہ عبور کیا جاسکنے والا خلا تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اس ویکیوم میں میرا بے وزن وجود بس ادھر اُدھر ہچکولے کھا رہا تھا اور کسی ٹریک، سمت کے تعین اور خواہش کے بغیر بھٹک رہا تھا۔

کافی دیر گزر گئی۔ شاید گھنٹوں نے صدیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ جونہی دبلے پتلے بدن والی معصوم چہرہ نرس نے میرا دروازہ کھولا، میرے لبوں سے بے ساختہ برآمد ہوا، ''چار بج گئے ہیں؟''

وہ مسکرائی، ''نہیں..... سوا چار کا عمل ہے۔''

اس نے بغیر کچھ کہے سنے چوبی بنچ پر سے سی ڈی پلیئر اُٹھایا۔ میرے سینے پر رکھا اور سوئچ بورڈ میں پلگ لگا کر پلیئر میں سی ڈی ڈالی اور ایک بٹن پش کر کے بولی، ''سر! میں آدھے گھنٹے بعد آؤں گی۔ او کے؟''

میں کوشش کے باوجود کوئی جواب نہ دے سکا تو وہ عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی۔ اس نے میڈم کے حکم کے مطابق مجھے مکمل تنہائی مہیا کر دی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر آنکھیں جھکائیں۔ سیاہ جالی والا ننھا سا اسپیکر دکھائی دیا جس سے 'شوں شوں' کی اونچی نیچی آوازیں نکل رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنی آواز سنائی دی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''تمہیں ایک نظر دیکھنے کیلئے یہ جتن کیا ہے۔ کھالے کا احسان ہے کہ اس نے تم سے ملا دیا۔ غزالہ! کیا تم مجھے یاد کرتی تھیں؟''

غزالہ کی آواز اسپیکر سے برآمد ہوئی، ''اور میرا کون تھا جسے یاد کرتی۔ تمہارا چھپ کر یہاں آنا اور مجھ سے ملنا ظاہر کرتا ہے کہ تم واپس چلے جاؤ گے۔ ہے ناں؟''

سی ڈی پلیئر کے اسپیکر سے وہ مکالمے پھوٹ رہے تھے جو بخشو لوہار کی دکان میں ہونے

والی ملاقات میں غزالہ اور میں نے ادا کیے تھے۔ آواز زیادہ صاف نہیں تھی مگر لفظ لفظ سنا سمجھا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں جھکڑ سے گھلنے لگے۔ میڈم کی آخری گفتگو بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر سامنے والی دیوار پر ثبت ہوگئی۔

میں اپنی اور غزالہ کی آوازیں مفہوم سمجھے بغیر سنتا رہا۔ میرا ادا کیا ہوا ایک جملہ جب دو تین مرتبہ دہرایا گیا تو میں چونکا۔ سنا، ''میں جس لڑکی کے ہاں ملازمت کرتا ہوں، اس کا حسن دیکھ کر انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھ پر مہربان ہے بلکہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔ مگر یقین کرو؛ میں اس کا کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہاں ایک دو ضروری کام ہیں جو اس کی معاونت کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔''

کچھ آگے چل کر پھر میرے ایک جملے کو تین مرتبہ دہرایا گیا، ''ہاں! ابھی میں اسے دھوکے میں رکھتا ہوں۔ جونہی مجھے اس کی ملازمت کی ضرورت نہ رہی، اسے چھوڑ دوں گا۔ پھر میں ہوں گا اور تم..... اور ہماری ایک چھوٹی سی جنت..... بس!''

غزالہ کے کسی جملے کو ہائی لائٹ نہیں کیا گیا تھا۔ اس سی ڈی میں میرے اس جملے کو آخری بار دہرایا گیا، ''وہ ایسی عورت نہیں ہے کہ لیلیٰ مجنوں والی محبت کرتی پھرے۔ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک چاہنے والا اس کی راہ میں کھڑا ہے۔ وہ دل داری نہیں کرتی۔ دلوں سے کھیلتی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا..... دوسرے کے بعد تیسرا..... کئی عاشق بدلتی ہے۔ کہاں ناں! اس کا وہم نہ کرو۔ وہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ محض مالکن ہے میری۔''

سی ڈی ختم ہوگئی۔ اس کا دورانیہ کم و بیش بیس منٹ تھا۔ سیاق و سباق نہیں دیا گیا تھا مگر اسے سمجھنے کیلئے مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

اس نے سچ کہا تھا۔ اس نے اگر محبت کے باب میں تمام تر بے وفائی کے جرائم میرے کھاتے میں ڈال دیے تھے تو غلط نہیں کیا تھا۔ میں بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھے وہی سزا ملنی چاہیے تھی، جو مل گئی۔

وہ مسافر تھی۔ میں بھی مسافر تھا۔ دونوں کو ایک جیسے ٹارگٹس نے ایک ٹریک پر چلا دیا تھا۔ ٹریک ختم..... مسافتوں میں ہمراہی کا راگ بند..... میری آنکھیں ندامت سے جھک گئیں، پھر بند ہوگئیں۔ پلکوں کے دونوں گوشوں سے دو ابلتی ہوئی لکیریں پھوٹ نکلیں۔

میں نجانے کتنی دیر اس ٹرانس میں پڑا روتا رہتا مگر نرس کی آمد نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے

قریب آئی۔ پلیئر بند کیا۔ اُٹھا کر پیشنٹ کیبنٹ پر رکھا۔ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی پھر ہمدردی آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی، ''سر! میڈم صاحب کی فلائیٹ کو ٹیک آف کیے آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے۔''

''پپ..... پانی..... سسٹر!''

اس نے گلاس میں اسٹرا ڈال کر میرے لبوں سے لگایا۔ میں نے دو گھونٹ حلق میں اتارے اور اسپاٹ دیوار پر نظریں جمائے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ زندگی ایک سفر ہے، طویل بھی اور نہایت مختصر بھی..... اور ہم سب مسافر..... کہیں مل گئے، کہیں جدا ہو گئے۔ راستوں کے مزاج پر قربان گاہیں سجتی ہیں۔ ہمیں منزلوں کا انتخاب باہم کرنا ہے اور منزلوں کا حصول ہمیں جدا کر دیتا ہے۔ کیا اس روایت سے لڑا جا سکتا ہے؟

نہیں..... نہیں..... کبھی نہیں.....

یہ اپنے آپ سے نمٹ نہیں سکی
یہ زندگی کبھی پلٹ نہیں سکی

(تمت بالخیر)

PakistaniPoint.com
Waqar Azeem